حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

دعواتِ عبدیت

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۲۷۷۶۲۰ - ۲۷۰۰۹۴

کتب خانہ اشرفیہ
قاسم سینٹر، دوکان نمبر ۳۳، اردو بازار کراچی
فون: ۲۲۱۳۰۵۸

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اول کا

پہلا وعظ ملقب بہ

آداب المساجد

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ - بندر روڈ - کراچی ۱

ایم - اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد اول کا

پہلا وعظ ملقب بہ

آداب المساجد

این	متےٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمینی	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۴ محرم ۱۳۲۹ھ	قریباً ۲ ½ گھنٹہ	بیٹھ کر	آداب مساجد	مولوی نور حسین صاحب		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلے اللہ علیہ وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قال اللہ تعالیٰ (آیت) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ط اُولٰٓئِکَ مَاکَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَا اِلَّا خَآئِفِیْنَ ط لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ہ (اور اس شخص سے زیادہ اور ظالم کون ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر اور عبادت کئے جانے سے بندش کرے اور ان کے ویران اور معطل ہوتے میں کوشش کرے ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیئے تھا بلکہ

جب جاتے ہیبت اور آداب سے جاتے) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی نصیب ہوگی اور انکو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی) شان نزول میں گو اختلاف ہو مگر قدر مشترک اتنا ضرور ہے کہ آیت عام اور شامل ہے تعطل مساجد کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم کو جیسا آگے آتا ہے اور جملہ ما بعد اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا الخ (ان لوگوں کو بے ہیبت ہوکر) ان میں قدم رکھنا نہ چاہئے تھا) گویا بطور دلیل کے ہے ماقبل کے لئے۔ گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کو تو چاہئے تھا کہ خود بھی جب مساجد میں داخل ہوتے تو خاشع و خاضع ہوکر داخل ہوتے نہ یہ کہ اور دوسرے آنے والوں کو جو ذاکرین مخلصین ہیں ان کو بھی روکتے ہیں کیونکہ یہ فعل تو بے خوف ہونے کی اور بھی زیادہ علامت ہے اس لئے ایسا شخص بہت زیادہ ظالم ہوگا یہاں پر ایک طالبعلمانہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ آیت تو کفار کے حق میں ہے اس کا مصداق و مخاطب مسلمانوں کو کیوں بنایا جاتا ہے تو اس کا جواب بطور اصولیین کے یہ دیا جا سکتا ہے کہ اَلْعِبْرَةُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوْصِ الْمَوْرِدِ (اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ خصوص مورد کا) اور اس کی نظیر شرعی لعان و حد زنا ہے اور تمثیل عقلی یہ کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی نوکر کو کسی بات پر سزا دے اور کہے کہ جو ایسی حرکت کرے گا اس کو ایسی سزا ہوگی۔ تو اس کہنے کا سبب اس وقت یہ خاص نوکر ہے۔ مگر چونکہ الفاظ عام ہیں اس لئے دوسرے نوکر بھی اپنے لئے اس کو عبرت سمجھتے ہیں اور وہ کام نہیں کرتے مگر میرے نزدیک یہ قاعدہ اصولیہ کہ اَلْعِبْرَةُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ الخ (اعتبار عموم لفظ کا ہے) اسی عموم کے ساتھ مقید ہے جہاں تک مراد متکلم کی ہو اس کے آگے بتجاوز کر کے زائد عموم کو شامل نہیں ہو سکتا اس کی نظیر حدیث لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ (سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے) کے باوجود لفظ کے عموم کے چونکہ مطیق کو عام ہونا مراد متکلم کی نہیں ہے ہر مسافر کو شامل نہیں بلکہ صرف اسی کو جس کو خوف ہلاک و ازدیاد مرض ہو۔ دوسری نظیر یہ کہ اگر آجکل کوئی شخص کسی عالم سے رہن کا مسئلہ پوچھے تو وہ عالم بوجہ اطلاع عرف متعارف کے حکم منع ہی کا دے گا کیونکہ عرف رہن مع الانتفاع ہی کا ہے اس لئے مراد بھی رہن خاص ہوگا گو فتوے کا لفظ ہوگا کہ رہن جائز نہیں۔ پس محض کسی لفظ

کا عام ہونا دلیل ہر عموم کی نہیں ہے تا وقتیکہ قرائن مستقلہ سے اس عموم کا مراد متکلم ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

حاصل یہ کہ آیت میں لفظاً تعمیم نہیں مسلم و غیر مسلم کو بلکہ آیت تو کفار ہی کے حق میں ہے کیونکہ جو منع خاص یہاں مراد ہے ایسا منع مخصوص ہے کفار سے مگر مسلمان کو یہ ذم دوسری طرح سے شامل ہے وہ یہ کہ منع کے بعد سَعٰى فِي خَرَابِهَا (ان کی ویرانی میں کوشش کریں) فرمانا بطور تعلیل کے ہے اور خراب مقابل عمارت کا ہے اور عمارت مسجد کی ذکر و صلوٰۃ سے ہے۔ پس خراب یعنی ویرانی ایسے امر سے ہوگی جو منافی ہو ذکر و صلوٰۃ کے۔

پس اگر مسلم سے مسجد میں کوئی فعل خلاف ذکر و صلوٰۃ ہو تو وہ بھی اس ملامت کا مورد ہوگا بوجہ اشتراک علت کے رہا یہ کہ قیاس ظنی ہوتا ہے تو ذم یقینی نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ قیاس ظنی جب ہوتا ہے کہ اس کی علت بھی ظنی ہو اور اگر علت منصوص علیہ قطعی ہو جیسا کہ یہاں ہے تو قیاس بھی قطعی ہوگا رہا یہ کہ مسلمان اگر ایسا فعل بھی کرے تو قصد خرابی مسجد کا تو نہ ہوگا جو متبادر ہے سعی سے پھر اس کو کیسے شامل ہوا۔ جواب یہ ہے کہ اگر سعی خاص ہوتی مباشر کے ساتھ تو اس شبہ کی گنجائش تھی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی عام ہے مباشر اور مسبب کو دلیل اس کی یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں خواب دیکھا (انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہے) کہ عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ تشریف لائے اور صحابہ سے آپ نے یہ خواب بیان کیا۔ گو اس میں یہ نہ تھا کہ اس سال ہوگا مگر شدت اشتیاق میں صحابہ نے سفر کی رائے دی اور آپ نے خوش خلقی سے قبول فرمایا تو کفار قریش نے آپ کو دخول مکہ مکرمہ سے روک دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس رکنے کو مسجد کی ویرانی کا سبب قرار دے کر ان کو وَسَعٰى فِي خَرَابِهَا (اور ان کی ویرانی میں سعی کریں) کا مصداق بنایا حالانکہ کفار مکہ مکرمہ نہ صرف مسجد حرم بلکہ تمام حد حرم کی غایت تعظیم کرتے تھے اور عمارت بھی مگر بایں ہمہ ان کو وَسَعٰى فِي خَرَابِهَا (اور ان کی ویرانی میں کوشش کریں) کا مصداق بنایا گیا۔ صرف اس لئے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام کو کہ ذاکرین مخلصین تھے روکا۔ پس اب بدلالۃ النص یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی ایسا کام کرنا

مسجدیں جس میں ذکر اللہ سے اس کا تعطل ہو گو علی سبیل التسبب ہی سہی مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا (اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے روکنا اور ان کی ویرانی میں کوشش کرنا) کا مصداق بنتا ہے ورنہ کفار نے کوئی مسجد میں قفل نہیں ڈالا تھا اور نہ مسجد میں بے تعظیمی کی تھی اور نہ عمارت میں کوئی خرابی کی تھی اور ظاہر ہے کہ مسجد میں بلا ضرورت دنیا کی باتیں کرنا دنیا کے کام کرنا نہ ذکر ہے نہ ذکر کے متعلق ہے۔ اس لئے بلا شبہ معصیت اور ظلم ہے پھر ان یذکر کی تقریب سے فضیلت ذکر کے متعلق متعدد واقعات بیان کئے گئے اس میں یہ بھی بیان تھا کہ بعضے آدمی ذکر و تلاوت پر عوض دنیوی لیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا نام ایسا گراں مایہ ہے کہ دونوں عالم بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتے۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تو نے اپنی قیمت دونوں جہاں بتلاتی ہے نرخ بڑھاؤ ابھی ارزانی ہے)

مگر اس کا ذوق وہی پا سکتا ہے جو شناسا ہو ؎

گفت لیلےٰ را خلیفہ کان توئی　　　کز تو مجنوں شد پریشان غوی
از ہمہ خوبان تو افزوں نیستی　　　گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی
دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا　　　ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

(لیلیٰ سے خلیفہ نے پوچھا وہ تو ہی ہے جس سے مجنوں پریشان اور عقل گم کردہ ہو گیا دوسرے حسینوں سے تو کسی بات میں زیادہ تو ہے نہیں اس نے جواب دیا جب تو مجنوں نہیں تو خاموش ہی رہ اگر تجھ کو مجنوں کی آنکھ میسر ہوتی تو اس وقت دونوں عالم تیرے نزدیک بے قدر معلوم ہوتے۔)

؎ عجب داری از سالکان طریق　　　کہ باشند در بحر معنی غریق

(سالکین طریق سے تم کو تعجب ہے کہ حقیقت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں)

؎ عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(خدا تعالیٰ کا عشق لیلےٰ سے کیا کم ہو اس کے لئے کوچہ گردی اولےٰ ہے)

؎ س تقریب ختم کلام مجید حفاظ کا بعوض مال رمضان میں یا سوم وغیرہ میں اور قبور پر

بہ اجرت پڑھنے کا ممنوع ہونا بیان ہوا اور اہل اللہ دنیا کو تو اللہ کے نام اور رضا سے بڑا کیا سمجھتے۔ آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت تو نعمائے جنت سے بھی افضل ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ (رضاء الٰہی بہت بڑی چیز ہے) نص صریح ہے اور اسی دین فروشی کے شبہ سے بچنے کے لئے بعض بزرگ بازار میں نہیں جاتے کہ شاید ان کو دیندار سمجھ کر ان کے دین کی وجہ سے کوئی دوکاندار داموں میں رعایت کرے تو وہ ایک قسم کا عوض ہو جائے گا دین کا پس نہ جانا بازار میں دو وجہ سے ہوتا ہے ایک کبر کی وجہ سے وہ تو حرام ہے۔ دوسرا اس وجہ سے کہ لوگوں پر ہماری وجاہت سے دباؤ پڑے گا اور وہ دب کر ارزاں دیں گے جس سے ان کو نقصان ہوگا سو یہ مستحسن اور ضروری ہے۔ اس میں شبہ دین فروشی سے بچنے کے علاوہ رفع التاذی عن الخلق (مخلوق سے اذیت پہنچنا) بھی ہے۔ پس جاہ کے اثر سے لینا یہ ایک قسم کی رشوت ہے۔ اسی لئے حاکم کو ہدیہ لینے کی اجازت نہیں۔ اس میں اس خدشے کو دفع کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود حاکم ہونے کے ہدیہ قبول فرماتے تھے کیونکہ وہ محض محبت کی وجہ سے ہوتا تھا نہ حاکم ہونے کی وجہ سے۔ اور اب ہدیہ نہیں رشوت ہے۔ الا ماشاء اللہ اور اوپر جو کہا گیا کہ عمارت مسجد کی ذکر صلوٰۃ ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے مَا کَانَ لِلْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰہِ اِلٰی قَوْلِہٖ مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ (مشرکین کے لئے مساجد اللہ بنانے کی لیاقت نہیں ہے) بعض نے اس آیت مَا کَانَ لِلْمُشْرِکِیْنَ الخ سے تعمیر مساجد کا مسئلہ مراد لیا ہے اور اس سے مسجد میں کافر کا روپیہ نہ لگانے میں استدلال کیا ہے۔ مگر میرے نزدیک خود وہ مسئلہ مستقلہ دوسرے دلائل سے متعلق ہے لیکن اس آیت سے مراد یہ ہے کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ورنہ اگر اس آیت سے یہ مراد ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بنائے قریش کو باقی نہ رکھتے قریش نے بوجہ کافی خرچ نہ ہونے کے بیت کو بنائے ابراہیمی سے گھٹا دیا تھا۔ اور حطیم کو کہ داخل بیت ہے خارج کر دیا تھا اور دروازہ صرف ایک رکھا تھا اور وہ بھی اونچا۔ پھر بعد انقضائے زمانہ خلفائے راشدین حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس حدیث کو

سنکر موافق ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از سر نو بنائے ابراہیمی پر بہت کچھ بنوا یا پھر عبد الملک کی خلافت میں اس کے عامل حجاج بن یوسف نے عبد اللہ بن زبیر کے قتل کے بعد ان کی بنا کو تڑوا کر وہی بنائے قریش قائم کی اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے پھر بنائے ابراہیمی کی نسبت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے استصواب کیا۔ انھوں نے بدیں وجہ کہ بیت اللہ تختۂ مشق سلاطین بن جائے گا اسی بنا پر قائم رہنے کی رائے دی۔ جب سے اب تک اسی بنا پر ہے۔ اور گو عبد اللہ بن زبیر کی بنا کا نہ رہنا ظاہراً کسی قدر افسوس کے قابل ہے کیونکہ وہ متضمن مصالح کو تھا لیکن اس بنائے قریش پر قائم رہنے میں حق جل وعلیٰ کی معلوم نہیں کتنی مصلحتیں ہوں گی۔ مگر ایک بہت بڑی مصلحت اور کھلی حکمت جس کو گنوار سے گنوار بھی سمجھ سکتا ہے یہ ہے کہ اگر عبد اللہ بن زبیرؓ کی بنا پر رہتا گو دروازے بھی زمین کے برابر دو ہی ہوتے مگر تاہم قفل کنجیاں تو خدام ہی کے ہاتھ میں رہتیں اور ہر کسی کو بیت اللہ کے اندر جانا نصیب نہ ہوتا مگر اس صورت موجودہ میں حطیم کہ درحقیقت داخل بیت تھا باہر ہے۔ اگر کوئی شخص خدام کے منع کرنے کی وجہ سے اندر بیت کے نہ جا سکے تو بلا روک ٹوک حطیم میں جا سکتا ہے اور دخول بیت کی برکت حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کفار مکہ نے بھی باایں ہمہ شرک و کفر بیت اللہ کی تعمیر میں صرف مال حلال خرچ کیا تھا اسی وجہ سے خرچ کم ہوگیا اور پورے طور پر بنائے ابراہیمی کو پورا نہ کر سکے غرض مَا کَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ (نہیں مشرکین کے لئے) کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین میں لیاقت مسجد کے آباد کرنے کی نہیں کیونکہ جس چیز سے اس کی آبادی ہے جس کا ذکر آیت آئندہ میں ہے وہ ان میں نہیں ہے۔ یعنی وہ تعمیر ذکر اللہ ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ الی آخر الآیۃ۔ (اللہ تعالیٰ کی مساجد کو وہی بناتا ہے جو اللہ پر ایمان لائے الخ) اس آیت میں مقصود اصلی اقام الصلوٰۃ ہی جس کے لئے مسجد موضوع ہے اور آمَنَ (ایمان لایا) بطور شرط کے لایا گیا اور اٰتَی الزَّکٰوۃَ (زکوٰۃ دی) اقام کی تتمیم ہے یعنی اقامت بمعنی ادائے حقوق صلوٰۃ موقوف ہے خلوص اور محبت پر

اور اس کی ایک علامت انفاق اموال ہے حاصل یہ کہ نرا ذکر زبان سے جیسا کہ نمازیں ہوتا ہے دلیل خلوص قلب کی نہیں بلکہ کچھ مال بھی دینا چاہئے اور زکوٰۃ وہی دے گا جس کے قلب میں خلوص ہو کیونکہ کوئی حاکم تو مطالبہ کرنے والا ہے ہی نہیں اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ زمانہ خلفاء میں تو تحصیل زکوٰۃ کے لئے عامل مقرر تھے وہ جبراً لیتے ہوں گے پھر اس میں خلوص کہاں رہا، جواب یہ ہے کہ عامل صرف مواشی کی زکوٰۃ لیتے تھے اور اموال باطنہ زر و سیم خود مالکوں کے اختیار میں تھے۔ مواشی کے لئے بھی عامل کا تقرر تحصیل مال یا ظلم کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض بہ نظر سہولت مصارف تاکہ اصحاب اموال کو تقسیم اموال میں دقت نہ ہو اور مال پورے طور پر مستحقین کو مل جائے اور اموال تجارت میں بھی عاشر کی طرف سے کچھ زبردستی نہ تھی بلکہ پوچھا جاتا تھا کہ حولان حول سال گذرنا ہوا یا نہیں۔ اگر کسی نے کہا نہیں گذرا تو چھوڑ دیا۔ اور اگر کسی نے کہا کہ ہم نے زکوٰۃ خود دیدی ہے تب بھی چھوڑ دیا۔ دوسری دلیل اس دعوے کی مسجد کا موضوع لہ ذکر ہے یہ آیت ہے فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ الخ (ایسے گھروں میں جاکر عبادت کرتے ہیں جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے) اس میں رفعت معنویہ مراد ہے۔ تیسری دلیل حدیث اِنَّمَا بُنِیَتِ الْمَسَاجِدُ لِذِکْرِ اللّٰہِ (مساجد اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بنائی گئی ہیں) پس جو کام ذکر کے متعلق نہ ہو وہ مسجد کی ویرانی ہے منع ہے۔ جیسا بعض کاتب بہ اجرت مسجد میں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں یا درزی سینے بیٹھ جاتے ہیں، بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص اجرت پر علم دین پڑھاتا ہو اس کو بھی مسجد میں بیٹھ کر پڑھانا منع ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مسجد میں قرآن خواں لڑکوں کا پڑھانا جن سے کسی قسم کی اجرت لی جاتی ہے ممنوع ہے۔ البتہ درس دینیات بلا اجرت خود ذکر ہے اس کا کچھ مضائقہ نہیں، ایسا ہی معتکف کے لئے جو ذکر اللہ کی غرض سے مسجد میں آبیٹھا ہے اس کو بیع و شرا کا معاملہ بلا حضور مبیع بضرورت جائز ہے تاکہ ذکر اللہ سے حرمان نہ رہے ورنہ مشتغلین بالتجارت کو اعتکاف کبھی میسر نہ آتا اور یہ شرط عدم حضور مبیع کی اس وقت ہے جب وہ متاع مسجد کی جگہ کو گھیرے ورنہ اگر کوئی مختصر سی چیز ہو تو احضار سلعہ (سامان تجارت

بھی جائز ہے اور بجز معتکف کے دوسرے کو خرید و فروخت کا معاملہ خواہ کیسا ہی چھوٹا ہو مثلاً ریزگاری وغیرہ کا لین دین مسجد میں منع ہے اسی طرح کسی ایسی چیز کا اعلان سے پوچھنا جو مسجد سے کہیں باہر کھوئی گئی ہو منع ہے۔ البتہ اگر مسجد کے اندر کوئی چیز گم ہو گئی تو اس کا پوچھ لینا مضائقہ نہیں۔ اسی طرح اپنی تجارت کے اشتہار مسجد میں تقسیم کرنا ممنوع ہے۔ چوتھی دلیل دعویٰ مذکور کی یہ کہ حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں وارد ہے مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ (مساجد ان کی آباد ہوں گی مگر خلوص سے کم ہوں گی) عمارت اور خرابی کا جمع ہونا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظاہری عمارت میں تو بڑی زیب و زینت اور مجمع کی کثرت ہوگی مگر معنوی آبادی کہ ذکر و خلوص ہے کم ہوگا۔ اس سے بھی وہی بات ثابت ہوئی۔ پانچویں دلیل لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ شَرُّ الْبِقَاعِ (بری جگہیں) کیا چیز ہے اور خیر البقاع (اچھی جگہیں) کون سی جگہ ہے فرمایا مجھے معلوم نہیں جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا انھوں نے بھی یہی جواب دیا اور یہ کہا کہ دربار خداوندی سے دریافت کر کے جواب دوں گا چنانچہ وہ پوچھنے گئے اس وقت بہ برکت اس مسئلہ کے پوچھنے کے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ان کو اس قدر قرب ہوا کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو کبھی اتنا قرب نہیں ہوا یعنی ستر ہزار حجاب درمیان میں رہ گئے۔ غرض دربار خداوندی سے جواب ارشاد ہوا کہ شر البقاع بازار ہے اور خیر البقاع مسجد۔ سو غور کرنا چاہئے کہ دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے بجز ذکر اللہ و ذکر الدنیا کے پس معلوم ہوا کہ مسجد کا موضوع لہ اصلی ذکر اللہ ہے پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو شر البقاع بنانا ہے جو کہ اس کی ویرانی ہے اور اس جگہ پر آپ کے اور جبرئیل علیہ السلام کے لَا اَدْرِیْ (مجھے معلوم نہیں) فرما دینے سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ باوجود نہ معلوم ہونے کے مسائل کا غلط سلط جواب دینے پر مستعد ہو بیٹھتے ہیں، نیز وہ لوگ سمجھیں اور متنبہ ہوں جو باوجود کتاب کا مطلب نہ آنے کے طالب علموں کو کچھ نہ کچھ جواب دیئے چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں کہدیتے کہ یہ مقام نہیں آتا جو نہ معلوم ہو کہدینا چاہئے کہ نہیں معلوم۔ بزرجمہر سے کسی بڑھیا نے

کچھ پوچھا اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ بڑھیا نے کہا کہ تم بادشاہ کی اتنی تنخواہ کھاتے ہو اور یہ بات تم کو معلوم نہیں۔ بزرجمہر نے جواب دیا تنخواہ تو مجھے معلومات کی ملتی ہے اگر مجہولات کی ملنے لگے تو بادشاہ کا سارا خزانہ بھی کافی نہ ہو اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ستر ہزار حجاب کو کمال قرب کہنا قابل غور ہے کہ جو لوگ دنیا میں تھوڑا سا ذکر وشغل کرکے حق تعالیٰ کی رویت کی ہوس میں پڑتے ہیں کتنی بڑی غلطی ہے۔ کیا جبرئیل علیہ السلام سے زیادہ قرب چاہتے ہیں اور اس سے بھی بڑی غلطی ہے اگر رویت سے بڑھ کر ذات کی کنہ کو ادراک کرنا چاہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کی کنہ تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اس کو ہرگز نہ سوچنا چاہئے۔ البتہ افعال خداوندی میں غور اور تدبر کرنا چاہئے تَفَکَّرُوْا فِیْ اٰلَاءِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِیْ ذَاتِہٖ (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور کرو ان کی ذات میں غور نہ کرو)

کسی بزرگ کا قول ہے ؎

دوربینان بارگاہ الست غیر ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست
انچہ اندر راہ مے آید بدست حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

(بارگاہ الست کے دوربین حضرات نے سوائے اس کے کہ موجود ہے کوئی سراغ نہ لگایا جو کچھ طریق میں ان کو حاصل ہوا ہے حیرت اندر حیرت اندر حیرت ہے)

؎ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

(اے اللہ آپ خیال اور قیاس گمان و وہم سے برتر ہیں جو کچھ لوگوں نے بیان کیا اور جو کچھ ہم نے سنا اور پڑھا ہے اس سے آپ برتر ہیں)

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(دفتر تمام ہوگیا اور عمر انتہا کو پہنچ گئی ہم ایسے پہلے ہی وصف رہے ہیں)

ہاں البتہ قیامت میں حسب وعدہ رویت ذات بلا حجاب ہوگی اور حدیث میں جو آیا ہے کہ اس دن کوئی اور پردہ نہ ہوگا بجز رداء الکبریا کے اس سے بلا حجاب ہونے پر شبہ نہ ہوا کیونکہ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ رویت تو بلا حجاب ہوگی مگر عظمت و

جلال و کبریائی کی وجہ سے احاطہ نہ ہو سکے گا۔ ردائے کبریا اس کو فرمایا ہے دنیا میں بلا حجاب رویت نہیں ہو سکتی یہی عقیدہ اور مسئلہ شرعی ہے۔ اور حضرت پیران پیر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کی طرف جو یہ شعر منسوب ہے کہ ؎

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما الخ

تو یہ موول بحجاب محجوبین غافلین ہے یا قیامت کے روز کے لئے اشتیاق لقا کا اظہار فرماتے ہیں کیونکہ درآمد آصفیہ امر ہے اور وہ استقبال کے لئے ہے اور اگر یہ شعر کسی اور شاعر کا ہو تو ہم کو ضرورت تاویل کی نہیں۔ غرض حدیث مذکور سے بازار کی سی باتیں مسجد میں کرنے کا مذموم ہونا ثابت ہوا۔ بعض لوگ صحابہ پر تہمت لگاتے کہ وہ حضرات بھی مساجد میں ہماری طرح خرافات باتیں کیا کرتے تھے۔ سو یہ بالکل تہمت ہی تہمت ہے اگر صحابہ کرام ہی ارشاد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والے نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا۔ ایک تو خود دنیا کی باتیں مسجد میں کرنا ظلم تھا ہی۔ یہ ظالم صحابہ پر تہمت لگا کر اور بڑھ کر ظلم کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ خود توبہ کریں اور الٹا اخیار امت کو بدنام کرتے ہیں۔ البتہ بعض لوگوں کی یہ بھی غلطی ہے کہ وہ ہر بات کو دنیوی بات سمجھ جاتے ہیں مثلاً بیمار پرسی یا کسی مسلمان کا حال دریافت کرنا۔ جان لینا چاہئے کہ عیادت اور تفقد حال مسلم حقوق شرع میں سے ہیں۔ ان کا مسجد میں پوچھنا کچھ حرج نہیں اسی طرح اگر کوئی چیز مسجد میں گم ہو جائے تو اس کا پوچھنا بھی جائز ہے علیٰ ہذا معتکف کی خرید و فروخت جیسا اوپر مذکور ہوا اور شریعت نے کیا ہی آسانی رکھی ہے اگر کوئی سوداگر اعتکاف کرنا چاہے اور اس کے لئے معاملہ مسجد میں ناجائز ہوتا تو وہ بیچارہ اس عبادت سے محروم رہتا۔ شریعت نے اس کے لئے اجازت دیدی تاکہ وہ اس عبادت سے محروم نہ رہے ایسی ہی باتیں شریعت کے حق ہونے کی گواہی دیتی ہیں کہ اس میں اہل تعلق کی بھی رعایت ہے۔ تارکین کی بھی رعایت ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار دل و جان کو تر و تازہ رکھتی ہے اصحاب ظاہر کو رنگ سے اور

ارباب باطن کو حقیقت سے)

باقی غیر معتکف کے لئے ممانعت بیان ہو چکی۔ ایک بار مجھ کو اپنے ایک دوست کی کہ ان کو تلمذ کا تعلق بھی تھا ایک بات نہایت پسند آئی کہ میں مسجد میں بیٹھا تھا ایک روپیہ کی ریزگاری ایک شخص سے خریدی انھوں نے فوراً متنبہ کیا کہ یہ بیع ہے اور مسجد میں نہ چاہئے۔ اہل حق کی یہ شان ہوتی ہے کہ اپنے بڑوں کو بھی کہدے مگر ادب کو نہ چھوڑے اس موقع پر اسی مناسبت سے یہ ذکر آیا، کہ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شہید رحمۃ اللہ کے پیر ایک دن صبح کی نماز میں بوجہ نئی شادی ہونے کے ذرا دیر سے پہنچے ان کے مرید مولوی عبدالحیؒ صاحب نماز کے بعد وعظ فرمانے بیٹھ گئے اس میں یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ جورو کی بغل میں پڑے رہتے ہیں اور تکبیر اولیٰ قضا ہو جاتی ہے۔ جناب سید صاحب نے نہایت شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس بیان کے بعد فرمایا کہ مولوی عبدالحیؒ صاحب نے باوجود یہ کہ ظاہراً یہ عنوان خلاف ادب تھا اس واسطے اس عنوان سے کہنے کی جرأت کی تھی کہ ان کو معلوم تھا کہ سید صاحب کے دل میں اس سے میل نہیں آئے گا بلکہ خوش ہوں گے ان کے خوش کرنے کو بے ادبی اختیار کی ہے

گفتگوئے عاشقاں درکار رب جوشش عشق است نے ترک ادب

باادب ترنیست زوکس درجہاں بے ادب ترنیست زوکس درجہاں

(عاشقین خدا کا اس کی شان میں جوش اور غلبۂ حال میں کوئی کلمہ منہ سے بظاہر خلاف شان نکال دینا بے ادبی نہیں ہے دنیا میں اس سے زیادہ بے ادب کوئی نہیں باطنی طور پر اس سے زیادہ باادب کوئی نہیں)

ایسا ہی قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو حدیث میں ہے کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو تو اس وقت لا و رب ابراھیم (قسم ہے ابراہیمؑ کے رب کی) کہتی ہو اور جس وقت خوش ہوتی ہو اس وقت لا و رب محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کہتی ہو حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ لا اھجر

اِلَّا اِسْمَكَ (بجز آپ کے نام کے نہیں چھوڑتی ہوں) بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر کوئی اور کرلے بے ادبی میں داخل ہوجائے بلکہ کفر ہوجائے مگر عاشق صادق جوش محبت اور علاقۂ محبت سے کرتا ہے اس لئے وہ عفو ہوتی ہیں حاصل یہ کہ ظاہراً باتیں بے ادبوں کی سی ہوتی ہیں اور باطناً ہوتی ہیں باادب ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمےٰ — درمیاں فرقے بود بے منتہا
احمد و بوجہل در بت خانہ رفت — زیں شدن تا آں شدن فرقیست ژرف

(نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ دیکھنے میں تمہارا اور ان کا کام یکساں ہو جیسے لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہے تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اولیاء اللہ کو نہ پہچانا اور کہنے لگے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ان میں ہم میں بڑا فرق ہے احمد اور ابوجہل بت خانہ میں گئے ان کے اور ان کے جانے میں بڑا فرق ہے ابوجہل بُت پرستی کے لئے گیا اور آپ بُت توڑنے کے لئے)

خلاصہ مطلب یہ کہ آداب مسجد کو بلا ارادہ تشبہ ایسا خیال کرنا چاہئے جیسا کہ حاکم دنیوی کی حضوری میں قلب اور جوارح کی حالت ہوتی ہے کہ اس کا مصداق بن جاتا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب سے غافل نہ رہو شاید تم پر لطف کی نگاہ کرے اور تم آگاہ نہ ہو)

اتنا تو ہونا چاہئے۔ اور ایسی حالت اول تو ہر وقت ہو ورنہ حضوری مساجد کے وقت تو ضروری ہے اور ہر وقت حاصل ہونا اس حالت کا یوں نہ سمجھا جائے کہ بزرگان پیشیں پر ختم ہوگیا ہم کو کب ہوسکتا ہے ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست — با کریماں کارہا دشوار نیست

(یوں مت کہو بھلا ہماری رسائی اس دربار تک کہاں ہے کیونکہ کریموں کو کوئی کام دشوار نہیں ہے وہ کریم ہیں) دیکھئے صحابہ کی کیفیت ادب مساجد کی یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دو شخصوں کو جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بلند آوازی سے باتیں کر رہے تھے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ اگر تم باہر کے مسافر نہ ہوتے تو تمہیں سزا دیتا اَتَرْفَعَانِ اَصْوَاتَکُمَا فِیْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (کیا تم مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی آواز بلند کرتے ہو) اور اس میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ حکم عدم رفع صوت مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ مساجد سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہیں۔ چنانچہ فَلَا یَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا (پس ہرگز نہ قریب جائیں ہماری مساجد کے) میں آپ نے جمیع مساجد کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ ہاں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اور زیادہ ادب ہوگا علاوہ ازیں یہ تو ہے ہی کہ اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ اور جب اللہ کی ہوئیں تو یہ ادب کو بدرجہ اولیٰ مقتضی ہوگا اور جس طرح مسجد قابل ادب ہے ایسے ہی اہل مسجد کا ادب بھی ضروری ہے وہ یہ کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے اہل مسجد کو تاذی ہو مثلاً یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ایسی جگہ نہ کھڑا ہو جہاں اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہو کیوں کہ اس میں تکلیف ہے ذاکرین کو علیٰ ہذا ذکر جہر جس وقت کوئی اور شخص نماز پڑھ رہا ہو نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس کی نماز میں خلل ہوگا اور اس کو تکلیف ہوگی اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مسجدیں بموجب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ریاض الجنۃ ہیں اور جنت میں آزار تکلیف نہ ہونا چاہئے ؎

بہشت آنجاکہ آزارے نباشد کسے را باکسے کارے نباشد

(وہ جگہ بہشت ہے جہاں کسی قسم کی آزار نہ ہو کسی شخص سے کچھ سروکار نہ ہو)

ختم شد

معروضہ قارئین سے التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمادیں کہ ناشر اور اس کی اولاد کی کوشش دینیہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں اور مقبولان حق کے ساتھ محشور فرمادیں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرمادیں۔ آمین بحرمۃ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ دوم ملقب بہ

مہمات الدعاء

حصہ اوّل

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

ایم۔ اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعوات عبدیت جلد اوّل کا

وعظ دوم ملقب بہ

مہمات الدعاء

کا

حصہ اوّل

این	متیٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲ صفر ۱۳۲۹ھ	قریب دو گھنٹہ	بیٹھ کر	بیان تنبیہات متعلقہ دعاء	مولوی نور حسین صاحب پنجابی		

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمد اعبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ قال اللہ تعالیٰ (آیت) وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (اور تمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے)

اس آیت کے مضمون ہی سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ آج کا مقصود وعظ بیان تنبیہات متعلقہ دعا

ہے اور شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ ہم تو دعا کیا کرتے ہیں اور اس کی ضرورت وغیرہ کو بھی جانتے ہیں پھر کیوں تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ تنبیہ تو اس امر میں ضروری ہے جس کو جانتا نہ ہو یا کرتا نہ ہو۔ سو ضرورت تنبیہ کی یوں ہے کہ باوجود جاننے اور کرنے کے بھی جب دعا کے بارے میں تغافل برتا جاتا ہے یعنی اس کی ضروری آداب و شرائط سے بے پروائی کی جاتی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ جانی ہوئی چیز وں سے بھی بڑھ کر کوئی قوی حجاب ہے کیونکہ مجہولات میں تو صرف جہل حجاب ہے کہ اس کا رفع ہونا سہل ہے اور جانی ہوئی چیز میں جب ایسا معاملہ کیا جائے تو وہ حجاب زیادہ سخت ہوگا اور ہر چند کہ یہ تغافل اور قلب کا حاضر نہ ہونا سب عبادت میں قبیح ہے مگر دعا میں اقبح ہے۔ وجہ یہ کہ عبادات میں گو اصل مقصود معنی ہے مگر تاہم ایک درجہ میں صورت بھی مقصود ہے بخلاف دعا کے کہ اس میں صرف معنی ہی معنی مقصود ہے اور وہ نیاز و افتقار و انکسار وخشوع قلب ہے جب یہ بھی نہ ہوا تو وہ دعا کیا ہوئی بیان اس کا یہ ہے کہ مثلاً نماز ہے کہ قرائن سے اس میں علاوہ مقصود معنوی یعنی توجہ الی اللہ کی صورت بھی مراد اور مطلوب ہے کہ اس کے قیود ظاہری سے مفہوم ہوتا ہے مثلاً وضو۔ جہت قبلہ وقت تعین رکعات وغیرہ اب اگر کوئی شخص بغیر حضور قلب کے رکوع وسجود وغیرہ شرائط سے نماز پڑھ لے تو گو مقصود معنوی توجہ الی اللہ اس میں نہیں ہوئی مگر فقیہ عالم یہی حکم دے گا کہ فرض ادا ہوگیا اس سے ثابت ہوا کہ صورت بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے اور اس کی تحقیق سے صحت صلوٰۃ کا فتویٰ صحیح ہوا اس تقریر سے اُن بے دینوں کا یہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو کہا کرتے ہیں کہ صاحب دل تو حاضر نہیں پھر نماز کیا پڑھیں معلوم ہوا کہ علاوہ حضور قلب کے کہ معنی اور حقیقت ہے نماز کی یہ صورت ظاہری رکوع سجود بھی مقصود ہے۔ دوسری نظیر لیجئے۔ روزے سے مقصود معنوی قوت بہیمیہ کا توڑنا اور مغلوب کرنا مطلوب ہے۔ مگر با ایں ہمہ اگر کوئی شخص سحری کو ایسا پیٹ بھر کھائے کہ افطار تک اس کو بھوک نہ لگے تو اس صورت میں قوت بہیمیہ تو کچھ بھی نہیں ٹوٹی مگر روزے کی چونکہ ظاہری صورت پوری ہوگئی ہے روزہ صحیح ہوگیا۔

تیسری نظیر اور لیجئے۔ زکوٰۃ کہ مقصود معنوی اس سے اغناء مساکین ہیں مگر با ایں ہمہ اس کے لئے ایک خاص مقدار۔ ایک خاص وقت معین ہے جس سے مقصودیت صورت ایک درجہ میں یہاں بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ صرف اغناء توان امور پر موقوف نہیں لیکن دعا میں نہ کسی وقت کی شرط نہ زبان عربی کی شرط نہ کسی خاص جہت کی شرط نہ کوئی مقدار معین نہ وضو وغیرہ کی قید اس میں صرف عاجزی۔ نیازمندی۔ اپنی احتیاج کا اظہار اپنے مولیٰ کے آگے بس یہ کافی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں صورت پر بالکل نظر نہیں معنی ہی مقصود ہیں۔ بس اب یہ صرف زبانی دعا کہ آموختہ سا رٹا ہوا پڑھ دیا۔ نہ خشوع نہ خشیت۔ نہ دل میں اپنی عاجزی تصور یہ خالی از معنی دعا کیا ہوئی۔ اس بے توجہی کی مثال تو ایسی ہوئی جیسا کوئی شخص کسی حاکم کے ہاں عرضی دینا چاہے اور اس طور پر عرضی پیش کرے کہ حاکم کی طرف بیٹھ کرے اور منہ اپنا کسی دوست یار کی طرف کر کے اس عرضی کو پڑھنا شروع کرے دو جملے پڑھ لئے۔ پھر یار دوست سے ہنسی مخول کرنے لگے پھر دو جملے پڑھ دیئے اور ادھر مشغول ہو گئے۔ اب سوچ لینا چاہئے کہ حاکم کی نظر میں ایسی عرضی کی کیا قدر ہو سکتی ہے بلکہ الٹا یہ شخص قابل سزا ٹھہرایا جائے گا۔ بس یہی معاملہ ہے دعا کا دعا میں جب تک کہ پورے طور پر قلب کو حاضر نہ کرے گا اور عاجزی اور فروتنی کے آثار اس پر نمایاں نہ ہوں گے۔ وہ دعا۔ دعا نہیں خیال کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو قلب کی حالت کو دیکھتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را ۔۔۔ ما دروں را بنگریم و حال را

ناظر قلبیم گر خاشع بود ۔۔۔ گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن اور حال کو ہم دل کو دیکھنے والے ہیں۔ اگر عاجزی و فروتنی کرنے والا ہو اگرچہ اس کا قول عاجزی و فروتنی کرنے والا نہ ہو)

حدیث شریف میں ہے إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَىٰ قُلُوْبِكُمْ (اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے لیکن تمہارے قلوب کو دیکھتے ہیں) اور آیت إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ الخ (میں اپنے دل کو متوجہ کرتا ہوں) میں وجہی سے بھی مراد یہی وجہ قلب ہے ورنہ بر تقدیر وجہ ظاہری کے خداوند تعالیٰ کا ذوجہت ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ

معنی تو یہی ہیں کہ میں نے اپنی وجہ کو خدا کی طرف کیا۔ اور ظاہر ہے کہ وجہ ایک خاص سمت میں ہوگا۔ تو کیا ذات منزہ اسی سمت میں ہوگی۔ یہ تو محال ہے عقلاً اور شرعاً کیونکہ وہ قیود سے منزہ ہے چنانچہ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (جس طرف منہ کرلو ادھر ہی اللہ تعالیٰ کا رُخ ہے) اس کی شرعی دلیل ہے اور اس نفی جہت و تنزہ عن القیود سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ذات باری میں تشخص اور تعین کے تو کسی شے کا وجود محض ہے جیسا کہ بعض کے کلام سے متوہم ہوتا ہے کیونکہ بدون تشخص اور تعین کے تو کسی شے کا وجود خارجی محال ہے البتہ اس کی ذات کے لائق تشخص و تعین ہے کہ ہم اس تشخص و تعین کی حقیقت و کنہ کا ادراک نہیں کر سکتے اور اگر شبہ ہو کہ جیسے وجہ کے لئے جہت ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی قلب کی بھی تو کوئی جہت ہوگی وہی اشکال یہاں لازم آئے گا۔ تو جواب یہ ہے کہ قلب سے مراد یہ مضغۂ صنوبری نہیں بلکہ قلب ایک لطیفۂ غیبی ہے مجردات سے اور ہر چند کہ بعض متکلمین کا اس میں اختلاف ہے کہ مجردات کا وجود ہے یا نہیں مگر محققین صوفیہ کا یہ مکشوف ہے کہ بعض اشیاء مجردات سے ہیں مگر حادث ہیں ذاتاً بھی اور زماناً بھی اور یہی فرق ہے درمیان صوفیہ اور حکماء کے کیونکہ حکماء مجردات کو صرف ذاتاً حادث مانتے ہیں اور زماناً قدیم مانتے ہیں اور متکلمین کے پاس نفی مجردات کی جبکہ وہ زماناً بھی حادث ہوں کوئی دلیل سالم نہیں اور یہ مضمون کے قلب سے مراد ایک لطیفۂ غیبی ہے اور مجرد عن المادّہ ہے یہ ٹکڑا گوشت کا مراد نہیں جو کہ ذو جہت ہے علاوہ کشف کے۔ ہمارے ایک محاورے سے بھی جو کہ روزمرّہ بولا جاتا ہے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہمارا دل اس وقت بازار میں ہے اور فرض کیجئے کہ ہم اس وقت بازار میں موجود نہ ہوں۔ اور مقصود محاورات سے حقائق علمیہ پر استدلال کرنا نہیں۔ محض تنویر اور تقریب ہے۔ غرض یہ بات پورے طور پر ثابت ہوگئی کہ دعا میں حضور اور خشوع ہی مقصود ہے۔ اگر بے اس کے بھی کسی کی دعا قبول ہو جائے تو اس کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ خداوند تعالیٰ کا محض ابتدائی احسان ہے دعا کا اثر نہیں یہ ایک تمہید تھی مضمون دعا کی اب آیت کا مضمون سنئے۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ نے اس آیت میں بڑے اہتمام سے دعا کا مضمون بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ شروع میں یہ تصریح

فرمائی کہ وَقَالَ رَبُّكُمْ (تمہارے رب نے فرمادیا) حالانکہ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے مگر پھر اس کو اس لئے ظاہر فرمادیا کہ اس کی تاثیر نفس میں قوی ہوجائے اور مضمون مابعد کی وقعت دلوں میں زیادہ ہو پھر لفظ رَبُّكُمْ (تمہارا رب) ارشاد فرمایا اس میں بوجہ اظہار ربوبیت گویا اشارہ ہے دعا کے قبول کرلینے کا اس طور پر کہ چونکہ ہم ہمیشہ سے تمہاری پرورش کرتے آئے ہیں حتیٰ کہ بدون تمہاری درخواست کے بھی کی ہے تو کیا تمہاری عرض کو درخواست کرنے پر بھی قبول نہ کریں گے نہیں ضرور قبول کریں گے ۔

ما نبودیم وتقاضا ما نبود   لطف تو ناگفتۂ ما مے شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف وکرم ہمارے بلا کہے ہوئے سنتا تھا)

آیت اِذْ اَنْشَاَکُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ الخ (جبکہ تم کو زمین سے پیدا کیا تھا جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے) میں اسی تربیت بے درخواست کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد پیدائش کے بعد کی حالت قابل غور ہے کہ یہ حالت ایسی تھی کہ کسی قسم کی تمیز اور شعور اس وقت تک نہ ہوا تھا اس حالت میں اگر تمام دنیا کے حکماء سقراط بقراط وغیرہ اکٹھا ہو کر صرف اتنی ہی تدبیر کرنا چاہیں کہ بچہ دودھ پینا سیکھ جائے تو ہرگز وہ قیامت تک اس پر قادر نہیں ہوسکتے یہ اُسی قادر ذوالجلال کی حکمت اور اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے بچہ کو دودھ چوسنا سکھایا حکماء کہیں گے کہ یہ خود طبیعت کا فعل ہے مگر جبکہ خود وہ طبیعت ہی کو بے شعور مان چکے ہیں تو ایسے پر حکمت کاموں کا اس کی طرف منسوب کرنا بے شعوری نہیں تو اور کیا ہے تیسرا اہتمام رَبُّكُمْ کی اضافت ہے گویا فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں تم ہم سے مانگو اور اسی کی نظیر دوسری آیت میں اضافت ہے وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ اِلٰی قَوْلِهٖ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِیْرًا (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے ظلم کے سبب دارو گیر فرماتے تا وہ اپنے بندوں پر بصیر ہے) حالانکہ یہاں عباد ماخوذین کا ذکر ہے مگر ان کو بھی اپنی طرف مضاف فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا رحمت ہے اس آیت کے متعلق ایک فائدہ علمیہ تفسیریہ سمجھنے کے قابل ہے کہ آدمیوں کے مواخذے کی تقدیر پر تمام دواب کے ہلاک کو کیسے مرتب فرمایا تو وجہ اس کی یہ ہے

کہ سب چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا یعنی تمام چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے ہی لئے پیدا کی ہیں خواہ ان کا نفع بلا واسطہ تم کو پہنچے یا واسطہ در واسطہ پس چونکہ انسان کے لئے ہی سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں اس لئے انسان اگر گناہ پر ہلاک کیا جاتا تو دوسری چیزیں بھی اس لئے ہلاک کی جاتیں کہ جب وہی نہ رہا جس کے لئے یہ سامان تھا تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت جب آدمی نہ ہوں تو پھر خیمے ڈیرے و دیگر سامان اسباب کس کام کے البتہ یہ شبہ اور باقی رہ گیا کہ بُروں کو تو اُن کے بُرے کام کی سزا ملتی ہے اور نیک آدمیوں کو کیوں ہلاک کیا جاتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھے آدمی قدر قلیل ہوتے ہیں اور انسان کی ضرورتیں تمدن و آسائش کے متعلق اس کثرت سے ہیں کہ تھوڑے آدمی ہرگز ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ پھر اگر بروں کے بعد نیک زندہ رہتے تو ان کو جینا وبال ہو جاتا ان کے لئے یہ مرنا ہی مصلحت و رحمت ہوتا۔ اس سے بڑھ کر مقدمہ دعا میں اس آیت میں یہ اہتمام فرمایا کہ دعا نہ کرنے والوں کے واسطے ترہیب فرمائی کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ الخ (بلاشک جو لوگ تکبر کرتے ہیں) اس موقع پر ایک فائدہ علمیہ کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ ترہیب اعراض عن الدعا پر ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو مادہ دعا کا اور ترہیب میں مادہ عبادت کا چنانچہ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ (میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں) ہے یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ دُعَائِیْ (میری دعا سے سرتابی کرتے ہیں) نہیں ہے اور تطابق ضروری اس لئے یا تو دعا بمعنی عبادت لیا جائے یا عبادت بمعنی دعا قرار دیا جائے احتمال دونوں فی نفسہ برابر ہیں۔ مگر چونکہ کلام مجید کا سمجھنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص زیادہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مخاطب اول آپ ہی ہیں اس لئے اس کی تعیین کے لئے حدیث کو دیکھا گیا سو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ (دعا عبادت کا مغز ہے) اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی جس سے ثابت ہوا کہ دعا اپنے معنی پر ہے اور عبادت سے مراد یہاں خاص دعا ہے ان اہتماموں سے دعا کی شان و عظمت کس درجہ ظاہر ہوتی ہے۔

ایک خصوصیت خاص دعا میں اور عبادات سے زیادہ یہ ہے کہ اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لئے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں۔ مگر دعا ایک ایسی چیز ہے کہ یہ اگر دنیا کے لئے ہی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے مثلاً مال مانگے دولت مانگے۔ یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے جب بھی ثواب کا مستحق بنے گا برخلاف اور عبادات کے کہ اگر ان میں دنیوی حاجت مطلوب ہو تو ثواب نہیں ملتا۔ چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر طبیب نے کسی کو رلئے دی کہ تم آج دن کا کھانا نہ کھاؤ اگر کھایا تو ضرر دے گا اس نے کہا لاؤ آج روزہ ہی رکھ لیں۔ پس روزہ رکھ لیا تو اس کو خالص روزہ کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ اس کو دراصل روزہ رکھنا مقصود نہیں۔ ایسے ہی کوئی شخص مسافرت میں اس نیت سے مسجد کے اندر اعتکاف کرلے کہ سرائے کے کرایہ وغیرہ سے بچوں گا تو اس کو خالص ثواب اعتکاف کا نہ ملے گا۔ مگر دعا میں یہ بات نہیں چاہے کتنی ہی حاجتیں دنیوی مانگو مگر پھر بھی ثواب ملے گا اور دعا میں یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ دعا سراسر نیازمندی ہے اور عجز و انکسار اور اظہار عبدیت واحتیاج اور یہ دنیا کے مانگنے کے وقت بھی متحقق ہے اور نیازمندی خود ایک بڑا محبوب عمل ہے کیونکہ جہاں نیازمندی ہوگی وہاں کبر نہیں رہے گا اور کبر اور خودی بھی بڑا مبغوض اور بڑا حائل ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَۃُ اِزَارِیْ (بڑائی میری چادر اور عظمت میرا ازار ہے) ردار اور ازار مراد یہ کہ دونوں میرے وصف خاص ہیں کہ کوئی دوسرا ان دو وصفوں کا مدعی محق نہیں ہوسکتا اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ منام میں جناب باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ دُلَّنِیْ عَلٰی اَقْرَبِ الطُّرُقِ اِلَیْکَ (مجھے اپنی طرف آنے کا قریب تر طریق بتلادو) جواب ارشاد ہوا دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالَ (اپنی خودی کو چھوڑ اور آجا) حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کو کیا خوب فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

(اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے تو اپنے حجاب خودی کو اے

حافظ درمیان سے ہٹا دے)

تو درو گم شو وصال این است و بس   گم شدن گم کن کمال این است و بس

(تو اس میں فنا ہو جا یہی وصال کافی ہے اپنا گم ہونا بھول جا انتہائی کمال یہ ہے)

حاصل یہ کہ اپنی خودی کو مٹاؤ یہاں تک کہ اس مٹانے پر بھی نظر نہ رہے۔ یعنی اس صفت فنا پر بھی نظر نہ رہے اور اس کا نام اصطلاح میں فناء الفناء ہے اور اس کو شاعرانہ مضمون نہ سمجھا جائے کہ مٹانے کو بھی مٹاؤ۔ اس کے نظائر تو روزمرہ واقع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ فناء الفناء کی توضیح اس مثال سے اچھی طرح ہو سکتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی دلربا معشوق ہو اور عاشق اس کے خیال میں مستغرق ہو اس حالت میں اس عاشق کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں خیال کر رہا ہوں کسی کو یاد کیجئے اس یاد کی طرف ذرا بھی ذہن نہیں جاتا۔ آدمی سوتا ہے مگر اس وقت یہ خبر نہیں ہوتی کہ میں سوتا ہوں اور اگر یہ خبر ہو جائے تو وہ سوتا ہوا نہیں ہے اور ان احوال عالیہ کو سن کر یہ ناامیدی نہ چاہئے کہ بھلا ہم کو یہ دولت کب میسر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل بڑا وسیع ہے اس کو کچھ دشوار نہیں ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست   با کریماں کارہا دشوار نیست

(یہ مت کہو کہ بھلا اس دربار تک ہماری رسائی کہاں ہے کیونکہ کریموں پر کوئی کام دشوار نہیں)

البتہ ایسے ماحول کے لئے صحبت شیخ کی ضرورت ہے اور صحبت وہ چیز ہے کہ دیکھو انڈا کیا چیز ہے سفیدی اور زردی کے سوا اس میں کچھ بھی نہ تھا مگر مرغی کے سینے سے اس میں جان آ گئی تو کیا صحبت کاملین کی اس سے بھی گئی گذری اور یہ وسوسہ بھی نہ ہو کہ صحبت تو ایسی چیز ضرور ہے مگر خود وہ لوگ کہاں ہیں جن کی صحبت میں یہ برکت ہو تو یقین کے ساتھ سمجھو کہ اب بھی اللہ کے نیک بندے اس برکت کے موجود ہیں ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است

(اب بھی ابر رحمت دُرفشاں ہے خم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے)

دل سے میدان طلب میں آنا چاہئے۔ نری روکھی سوکھی آرزو سے کام نہیں چلتا صدق طلب ہونی چاہئے اور کوشش ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　خیرہ یوسف دار می باید دوید

(اگرچہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا یعنی کوشش تو کرنی چاہئے)

یوسف علیٰ نبینا و علیہ السلام کو کیسا اپنے مولیٰ پر بھروسہ تھا کہ باوجود دروازے بند ہونے کے دوڑے اور کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے دروازے بھی کھولدیئے اگر صدق دل سے طلب اور کوشش ہو تو مقصود ملنے کی یقینی امید ہے۔ بعض صوفیہ نے بطور تاویل اور اعتبار کے نہ بطور تفسیر اس آیت اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ (اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو نکلو) میں امر فَانْفُذُوْا کو امر تعجیزی نہیں لیا بلکہ تکلیفی اسی مضمون کے مناسب سمجھا ہے غرض حاصل یہ ہے کہ دعا کا خلاصہ نیازمندی ہے اور دعا خواہ کسی قسم کی دینی ہو یا دنیوی ہو مگر ناجائز امر کے لئے نہ ہو سب عبادت ہے خواہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا تعالیٰ سے مانگا کرو۔

ایک بزرگ رو رہے تھے کسی نے پوچھا کیوں روتے ہو فرمایا بھوک لگی ہے اس نے کہا کیا بچے ہو کہ بھوک سے روتے ہو انہوں نے فرمایا کہ جب مولیٰ کی یہی مرضی ہو کہ میں بھوک سے روؤں تو پھر استقلال کیوں اختیار کروں ؎

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(اگر شاہنشاہ دیں مجھ سے طمع کرنے کا خواہش مند ہو تو میں قناعت پر خاک ڈال دوں گا)

نالم ایں نالہا خوش آیدش　　از دو عالم نالہ و غم بایدش

(میں اس واسطے نالہ کرتا ہوں کہ اس کو نالے پسند آتے ہیں دو عالم سے نالہ وغم اس کو چاہیے)

بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ اب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ میں مرض کی شکایت کا اظہار کروں تب فرمایا رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ الخ (اے میرے پروردگار مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے) ورنہ یہ اظہار بے صبری کی وجہ سے نہ تھا اگر بے صبری ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کو یوں تعریف نہ فرماتے اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ الخ (ہم نے اس کو صابر پایا اچھا بندہ ہے) ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

(خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا بات مختصر چاہیے تطویل کلام سے کیا فائدہ والسلام)

غرض ان کاملین کی نظر خدا تعالیٰ کی رضا پر ہوتی ہے۔ اپنا حظ ظاہری یا باطنی کچھ مقصود نہیں ہوتا جس میں خدا تعالیٰ راضی ہوں وہی کرنے لگتے ہیں ؎

گفت معشوقے بعاشق اے فتا تو بغربت دیدۂ بس شہرہا
پس کدامی شہر ازانہا خوشتراست گفت آں شہرے کہ دروے دلبراست
ہر کجا یوسف رخ باشد چو ماہ جنت است او گرچہ باشد قعر چاہ
با تو دوزخ جنت است اے جانفزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(کسی معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ تم نے سیاحت میں کونسا شہر پسند کیا ہے اس نے جواب دیا سب سے عمدہ وہ شہر ہے جہاں محبوب کی زیارت ہو جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو اے محبوب بے تمہارے جنت بھی دوزخ ہے اور تمہارے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے)

عاشقوں کی کچھ اور ہی شان ہے۔ حضرت حافظ محمد ضامن شہید علیہ الرحمۃ کی حکایت ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو اس واسطے ذکر کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (پس تم مجھ کو یاد کیا کرو میں تم کو یاد رکھوں گا) یعنی احوال وکیفیات باطنی پر نظر نہ تھی دیکھئے محققین کی تو یہاں تک نگاہ ہے کہ خدا کے نام اور احکام میں

کیفیات باطنی تک کا قصد نہ کریں اور افسوس آجکل لوگوں کا یہ حال ہے کہ وظائف تحصیل دنیا کے لئے پڑھتے ہیں کوئی دست غیب تلاش کرتا پھرتا ہے۔ حالانکہ اس میں جواز تک بھی نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو کچھ ملتا ہے وہ حرام ہے کیونکہ جن مسخر ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کا مال چرا چرا کر عامل کو دیتے ہیں۔ یا اگر اپنا لائیں تب بھی مجبور ہو کر لاتے ہیں۔ ایسا ہی تسخیر قلوب کا حال ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے جو مال دیا جاتا ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیا جاتا۔ مغلوب الرائے و مضطر ہو کر دیتا ہے اور اگر کسی عمل میں جواز بھی ہو تب بھی ایسے اغراض کے لئے اللہ تعالٰے کے نام کی بے قدری کرنا اور بھی بے ادبی ہے اور احادیث میں جو سورۂ واقعہ کا پڑھنا وغیرہ آیا ہے وہ دنیا کو معین دین بنانے کی غرض سے ہے جو کہ دین ہی ہے۔ کاش یہ لوگ بجائے ان اعمال کے دعا کیا کرتے اگر مقصود حاصل ہو جاتا تو بھی مطلب کا مطلب اور ثواب کا ثواب اور اگر نہ ہوتا تو بھی دعا کا ثواب کہیں گیا ہی نہ تھا۔

مذکورۂ بالا خرابیوں کے علاوہ عمل میں ایک اور خرابی ہے کہ دعا سے تو پیدا ہوتی ہے عاجزی اور فروتنی۔ اور عمل سے پیدا ہوتا ہے دعویٰ۔ عامل جانتا ہے کہ بس ہم نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی علیہ الرحمتہ کا لوگ ذکر کرتے ہیں کہ فرماتے تھے کہ اگر صاحب نسبت عمل کرے تو نسبت سلب ہو جاتی ہے، اس کی یہی وجہ ہے کہ عامل کو خدا پر توکل نہیں رہتا اور عجب پیدا ہو جاتا ہے اور یہ منافی ہے نسبت مع اللہ کے یہ قدر ضروری بیان تھا دعا کے مہتم بالشان ہونے کا اب دعا سے لوگوں کے تغافل کے اسباب کا بیان باقی رہا۔ انشاء اللہ تعالیٰ کسی مواقع پر وہ ہو جائیگا فقط

ختم شد

معروضہ قارئین سے التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیں کہ ناشر اور اس کی اولاد کی کوشش دینیہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں اور مقبولان حق کے ساتھ محشور فرما دیں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرما دیں۔ آمین بحرمۃ حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ؂

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ سوم ملقب بہ

مُہمّات الدُّعاء

حصہ دوم

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

مسافر خانہ - بندر روڈ کراچی

ایم - اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ سوم ملقب بہ

مُہمّات الدُّعاء

حصّہ دوم

این	متیٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۶ر صفر ۱۳۳۹ھ	قریباً تین گھنٹہ	بیٹھ کر	دعاء سے تغافل کے اسباب	مولوی نور حسین پنجابی		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (آیت) وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ۝ (اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا مجھ ہی کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا بلاشک جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے)

اس سے پہلے وعظ میں دعا کی عظمت اور اس کے مہتم بالشان ہونے کا بیان بقدر ضرورت کیا گیا تھا وعظ کے ختم پر یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ آئندہ کسی موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ

دعا سے غفلت کرنے کے اسباب کے متعلق بیان کیا جائے گا۔ سو آج ان اسباب کا بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ آیت وہی ہے جو پہلے وعظ میں بھی پڑھی گئی تھی۔ آج کا بیان بھی چونکہ دعا کے متعلق ہے اس لئے اسی آیت سے بیان کو شروع کیا جاتا ہے اور اس بیان کو بھی اس پہلے وعظ کا بقیہ یا تتمہ سمجھنا چاہئے قبل اس کے کہ غفلت عن الدعا کے اسباب بیان کئے جائیں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ دعا صرف امور غیر اختیاریہ کے ساتھ خاص نہیں۔ جیسا عام خیال ہے کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے بلکہ امور اختیاریہ میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے اور ہر چند کہ ان کا وجود اور ترتب بظاہر تدبیر اور اسباب پر مبنی ہے لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود ان اسباب کا جمع ہو جانا واقع میں غیر اختیاری ہے اور اس کا بجز دعا اور کوئی علاج نہیں۔ مثلاً کھیتی کرنے میں ہل چلانا۔ بیج بونا وغیرہ تو اختیاری ہے مگر کھیتی اُگنے کے واسطے جن شرائط اور اسباب کی ضرورت ہے وہ اختیار سے باہر ہیں مثلاً یہ کہ پالا نہ پڑے یا اور کوئی ایسی آفت نہ پڑے جو کھیتی کو اُگنے نہ دے اس لئے اللہ جل جلالہ فرماتے ہیں کہ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ الخ اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو (تخم وغیرہ) بوتے ہو اس کو تم اگاتے ہو یا ہم۔ پھر ان سب کو احتیاج ہے تعلق مشیت خداوندی کی اور صاف ظاہر ہے کہ وہ عبادت کے اختیار میں نہیں پس ثابت ہو گیا کہ امور اختیاریہ میں بھی تدبیر اور کسب کے ساتھ دعا کی ضرورت ہے خصوصاً جبکہ اس پر نظر کی جائے کہ ہم جن اسباب کو اسباب سمجھے ہوئے ہیں وہ بھی درحقیقت برائے نام ہی اسباب ہیں۔ ورنہ اصل میں ان میں بھی وصف سببیہ بمعنی تاثیر محل کلام میں ہے بلکہ احتمال ہے کہ عادت اللہ اس طرح جاری ہو کہ ان کے تلبس واقتران کی بعد حق تعالٰی اس اثر کو ابتداً پیدا فرما دیتے ہوں اور جب چاہیں اثر مرتب نہ فرمائیں۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے واقع میں اثر کو پیدا نہ فرمایا تو جو شخص اس راز کو سمجھ گیا وہ کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے سرد ہونے میں تعجب نہیں کرے گا کیونکہ اگر تعجب ہے تو تاثیر کے مسلوب ہونے میں ہے

اور اثر پیدا نہ ہونا چنداں عجب نہیں۔ اور آگ اگر مستقل التاثیر ہو جیسا طبعیین کہتے ہیں تو ہم پوچھتے ہیں کہ اگر شعلہ کے اندر سے جلدی سے ہاتھ ڈال کر نکال لیا جائے تو ہاتھ کیوں نہیں جلتا۔ اگر آگ کی ذات مقتضی احراق ہے تو یہاں پر بھی ہاتھ جل جانا چاہیے تھا۔ معلوم ہوا کہ آگ کی ذات مقتضی احراق کو نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ مؤثر تو اسی کی ذات ہے مگر مکث یعنی معتد بہ حصہ مدت تک ٹھہرنا اس کے لئے شرط ہے تو اس سے ہم کو انکار نہیں مگر کلام اس میں ہے کہ یہ شرط عادی ہے یا عقلی اُس وقت وجود شرط کے ترتب اثر کا آیا لزوم کے ساتھ ہے یا بلا لزوم۔ سو اس کی فلسفی کے پاس کیا دلیل ہے اور اگر تجربہ کو اس کی دلیل کہا جائے تو تجربہ سے صرف ترتب ثابت ہوتا ہے لزوم کیسے ثابت ہوا اس کا دعویٰ بلا دلیل ہی رہا کیونکہ تجربہ سب افراد کا ابتدا سے انتہا تک احاطہ نہیں کر سکتا چند محدود افراد کے تجربے اور مشاہدے پر حکم لگا دیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد جس کا اب تک مشاہدہ نہیں ہوا اس کے خلاف ہو۔ درحقیقت ان سب خرافات کے قائل ہونے کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالےٰ کے فاعل با اختیار ہونے کے قائل نہیں۔ اس لئے ایسی ایسی رکیک تاویلیں کرنی پڑتی ہیں بالجملہ ان اسباب کے تاثیر کی ایسی مثال معلوم ہوتی ہے کہ جیسے سرخ جھنڈی دکھانے سے ریل رک جاتی ہے اب کوئی نادان یہ سمجھے کہ سُرخ جھنڈی میں کوئی تاثیر ہے جس سے ریل رک جاتی ہے تو یہ اس کی نادانی ہوگی سرخ جھنڈی سے تو کیا رکتی وہ تو کسی چلانے والے کے روکنے سے رُکی ہے سرخ جھنڈی صرف اصطلاحی علامت قرار دی گئی ہے یہی مثال ہے اسباب اور ترتب اثر کی۔ اصل کام تو اللہ تعالےٰ کے اختیار میں ہے یہ اسباب و علامات محض عباد کی تسلی و دیگر حکمتوں کے لئے مقرر فرما دیئے ہیں ؎

این سببہا در نظر با پردہا ست — درحقیقت فاعل ہر شے خدا ست

(یہ اسباب نظر میں پردے ہیں حقیقت میں فاعل ہر شے کا خدا تعالیٰ ہے)

؎ کب فلک کو یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

عارفین اس بات کو سمجھے اور حقیقت حال معلوم کر کے یوں گویا ہوئے ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں یار بیروں فتنۂ او در جہاں
(یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہاں کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا)

ے کہاں میں اور کہاں یہ نگہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ٭ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند
(مشک افشانی محبوب کے زلف کا فعل ہے لیکن عاشق نے مصلحت کی بنا پر چین کے ہرنوں کی طرف منسوب کر دی ہے)

ے آب و خاک و باد و آتش بندہ اند با من و تو مردہ با حق زندہ اند
(خاک ہوا پانی آگ یہ چاروں عنصر حق تعالے کے بندہ ہیں ہمارے اور تمہارے روبرو گو مردہ ہیں مگر حق تعالے کے روبرو زندہ ہیں)

مثنوی میں اس یہودی بادشاہ کی حکایت ہے جو مسلمانوں کو بتوں کے سجدے پر مجبور کر کے آگ میں ڈلواتا تھا یہاں تک کہ اخیر میں یہ قصہ ہوا کہ وہ آگ میں نہیں جلتے تھے اس پر اس یہودی بادشاہ نے آگ سے مجنونانہ غصہ میں یہ خطاب کیا کہ تجھے کیا ہو گیا کہ تو نہیں جلاتی۔ تو آگ نہیں رہی آگ نے باذن خالقہا (اپنے خالق کی اجازت سے) جواب دیا

ے گفت آتش من ہمانا آتشم اندر آتا تو بہ بینی تابشم
(آگ نے کہا میں آگ ہی ہوں آپ تشریف لایئے تاکہ میری تیزی حرارت کو دیکھو)

پھر اس گستاخی کا یہ انجام ہواے

بانگ آمد کار تو ایں جا رسید پائے دار اے سگ کہ قہر ما رسید
(آواز آئی کام تیرا اس جگہ تک پہنچا کھڑا رہے کتے کہ ہمارا قہر و غضب نازل ہو)

دیکھئے وہی آگ تھی ایک کو جلایا ایک کو نہ جلایا اس سے یہ بات بہت وضاحت سے ثابت ہو گئی کہ اسباب بھی باختیار حق ہیں۔ جب یہ ہے تو اسباب کے اعتماد پر خالق سے قطع نظر و استغنا کرنا بڑی غلطی ہے غرض امور اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ سب میں دعا کی حاجت ثابت ہوئی۔ البتہ امور اختیاریہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تدبیر بھی کی جائے اور دعا بھی یہ نہ ہو کہ بلا تدبیر صرف دعا پر اکتفا

کیا جائے۔ مثلاً کوئی شخص اولاد کی تمنا رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ اول نکاح کرے اور پھر دعا کرے اور بے نکاح کے اگر یوں ہی چاہے کہ اولاد ہو جائے تو یہ اس کی نادانی ہے اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا کئے ہیں اور ان میں حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں۔ مطلق اسباب کا اس طور پر معطل چھوڑنا افراط و غلو ہے اور ایک گونہ تعلیل ہے حکم الٰہیہ کی۔ جو کہ سوئے ادب اور خلاف عبدیت ہے اور مباشرت اسباب میں اظہار عبدیت اور افتقار الی اللہ بھی ہے جو کہ اعظم مقاصد سے ہے اس لئے ایسے امور میں مباشرت اسباب اور دعا دونوں کا ہونا ضروری ہے کہ اس میں اعتدال اور تعدیل ہے۔ غرض یہ ثابت ہوگیا کہ دعا کی حاجت سب کو ہے اور اگرچہ اعتقاد تو اکثر مسلمانوں کا یہی ہے مگر پھر بھی دعا سے غفلت کی جاتی ہے اس کی کیا وجہ ہے تو اگرچہ اسباب غفلت کے بہت ہیں مگر اس وقت چند اسباب جو بطور امور کلیہ کے ہیں بیان کئے جاتے ہیں۔ باقی اسباب کا بطور تصریح کے ان ہی سے سمجھ لینا اور نکال لینا آسان ہوگا۔ سو ایک سبب تو جس کا آجکل زیادہ تسلط ہے یہ ہے کہ طبائع میں تعلیم جدید کے اثر سے توغل طبیعیات کے سبب جمود ظاہر بینی حسن پرستی اس درجہ آگئی ہے کہ معنوی اور خفی اسباب تک ان کی نظر کو رسائی نہیں ہوتی اس لئے دعا کو بھی بیکار سمجھا جانے لگا ہے اور تمام تر آثار کو ان ہی اسباب طبیعہ میں منحصر مان لیا ہے۔ حالانکہ یہ حضرات جن سائنس دانوں کی تقلید کر رہے ہیں خود ان کے محققین اسباب کے آثار اور قدرت کے اسرار کی پوری تحقیق و احاطہ سے لاعلمی کا اقرار کر رہے ہیں۔ اور کیوں نہ کریں آخر اس سائنس کی ساری پونجی اور تمام دولت استقرار ہی تو ہے جو کہ نہایت ناقص و ناتمام درجہ کی دلیل ہے۔ یہ حضرات چونکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کے وجود کا انکار تو نہیں کر سکتے تھے جیسا کہ یورپ کے آزاد منش لوگ کر بیٹھتے ہیں انہوں نے یہ کیا کہ ایک قانون فطرت اپنے ظن و گمان میں تجویز کیا اور اس کو بننے میں تو اللہ تعالیٰ کا ماتحت مانتے ہیں لیکن چلنے میں اس کا بھی محتاج نہیں مانتے بلکہ نعوذ باللہ خود واجب الوجود کو اس کا تابع سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بس اس کو خاص انتظام پر پیدا تو کر دیا لیکن وہ اب اسی طرح پر خود چل رہا ہے اس میں تغیر نہیں ہو سکتا جیسے گھڑی

کہ کوک دینے میں تو دوسرے کی محتاج ہے اُس کے بعد از خود چلتی رہتی ہے۔ گویا اب اللہ تعالیٰ کو بھی تغیر و تبدل کا کچھ اختیار نہیں۔ معاذ اللہ مسلمان ہو کر یہ عقیدہ۔ جو اس وجہ سے عقل کے بھی خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اضطرار اور عجز۔ لازم آتا ہے۔ نیز اس صورت میں مشیت کا تعطل بھی لازم آئے گا اور مشیت کے تحقق پر نصوص قطعیہ شاہد ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی ہے کہ جیسے حکمائے یونانیین اللہ تعالیٰ کے وجود حدوث عالم کے لئے علت موجبہ اضطراریہ قرار دیتے ہیں اور اختیار مشیت کی جو اس میں نفی لازم آتی ہے اس کے قائل ہوتے ہیں لیکن ان کی اس لئے زیادہ شکایت نہیں کہ وہ التزام اسلام کا کئے ہوئے ہیں اور یہ تو سب سے زیادہ اسلام کے جان نثار و خیر خواہ بنتے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر صفت اختیار باری تعالیٰ میں نہ مانی جائے تو احداث عالم میں یا ترجیح بلا مرجح کا قائل ہونا پڑے گا جو عقلاً محال ہے۔ یا عالم کو قدیم کہنا پڑے گا جو سمعاً محال ہے۔ اور یہ خدشہ نہ کیا جائے کہ اختیار میں بھی ترجیح بلا مرجح کا لزوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی کیا وجہ کہ یہ اختیار پہلے متعلق نہ ہوا پھر متعلق ہوگیا۔ جواب یہ ہے کہ صفت ارادہ و اختیار کے لئے یہ امر ذاتی یا لازم ہے کہ تخصیص مَاشَاءَ مَتٰی شَاءَ (جو چاہے اور جب چاہے) اور ذاتی اور لازم کے لئے علت کا سوال نامعقول ہے کیونکہ اس میں تخلل جعل کا درمیان ذات و ذاتیات کے یا درمیان ملزوم و لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔ پس وہ خدشہ رفع ہوگیا اور اعتقاد اختیار کا بلا غبار ثابت رہا۔ پس اس تمام بیان سے معلوم ہوگیا کہ مذہب تعطل و انکار قدرت بالکل باطل ہے۔ مذہب حق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل باختیار ہے جب یہ ہے تو اس کی قدرت جس کی وجہ سے ممکن کا خود وجود اور ظہور ہوا ممکنات کی تاثیرات کو ظاہر بھی کرسکتی ہے اور روک بھی سکتی ہے۔ اسی وجہ سے دعا کی جاتی ہے کہ آپ اپنی مشیت کا تعلق اس سے فرمائیں۔ یہ تو جب ہے کہ اسباب خاصہ سے وہ مسبب پیدا ہو لیکن خود یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام اسباب جمع ہونے پر ہی ترتب اثر ہو بلکہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ اپنی رحمت و عنایت سے نیک بندوں کی

عاجزی اور دعا وزاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے تھوڑے سے یا تمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں یہ قصہ موجود ہے کہ ایک نیک بی بی نے تنور میں سوختہ جھونک کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا (اے اللہ ہم کو رزق دے) تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھا کہ تنور روٹیوں سے پُر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں قوت یقینیہ زیادہ تھی پورا یقین اس کی رزاقی پر تھا چنانچہ اس کا ظہور بلا اسباب ہوا اور یہ حضرات تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ تھے۔ ابلیس کے یقین اور توقع اجابت دعا کی کیفیت دیکھئے کہ عین غضب اور قہاری کے موقع پر بھی اس کو پورا بھروسہ تھا کہ غضب الٰہی اجابت دعا کیلئے مانع نہیں اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ (میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی) حالانکہ یہ سوال ایسا بعید ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی خلود اور دوام نہیں عنایت کیا گیا۔ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ (اور ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کے لئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا) مگر شیطان نے رحمت کی وسعت کے بھروسے پر اس کی دعا کر دی اور حکم بھی ہوگیا اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (جا تجھ کو وقت معین کی تاریخ تک مہلت دی گئی) دعا کے قبول ہونے پر بھروسہ اور یقین ہو تو ضرور اثر ہوتا ہے۔ اور یقین ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علاء بن الحضرمی حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت میں جب غزوہ مرتدین کے لئے بحرین پر گئے اور راستے میں دریا پڑا تو ساتھیوں نے اس وجہ سے کہ کشتی تیار نہ تھی ٹھہرنے کو کہا، فرمانے لگے خلیفہ کا حکم ہے جلدی پہنچنے کا اس لئے میں نہیں ٹھہر سکتا اور یہ کہکر دعا کی کہ اے اللہ جس طرح تو نے اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کیا اسی طرح آج ہم کو ہمارے نبی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی برکت سے پار اُتار دے اور دعا کر کے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دریا پایاب ہوگیا اور سارا لشکر پار ہوگیا۔

اور مشہور حکایت ہے کہ ایک مولوی صاحب بسم اللہ کے فضائل میں وعظ فرما رہے تھے

کہ بسم اللہ پڑھ کر جو کام کریں وہ پورا ہو جاتا ہے۔ ایک جاہل گنوار نے سنا اور کہا یہ ترکیب تو اچھی ہاتھ آئی۔ ہر روز کشتی کے پیسے دینے پڑتے ہیں پس بسم اللہ پڑھ کر دریا سے پار اتر جایا کریں گے۔ چنانچہ مدتوں وہ اسی طرح آتا جاتا رہا۔ اتفاقاً ایک روز مولوی صاحب کی دعوت کی اور گھر لے جانے کے واسطے ان کو ساتھ لیا راستہ میں وہی دریا آملا۔ مولوی صاحب کشتی کے انتظار میں رُکے۔ اُس نے کہا مولوی صاحب آیئے کھڑے کیوں رہ گئے۔ مولوی صاحب بولے کہ کیسے آؤں، اُس نے کہا کہ بسم اللہ پڑھ کر آجایئے میں تو ہمیشہ بسم اللہ ہی پڑھ کر اترجاتا ہوں۔ مولوی صاحب کی تو ہمت نہ ہوئی مگر اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ان کو بھی پار اُتار دیا۔ یہ قوت یقینیہ ہی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے اُس کو یہ آسان کر دیا۔ اسی وجہ سے بعض بزرگ تعویذ دیتے وقت کہدیتے ہیں کہ اس کو کھولنا مت ورنہ اثر نہیں ہوگا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کھولنے سے دیکھنے والا وہی معمولی کلمات سمجھ کر ضعیف الیقین ہو جاتا ہے اور اثر نہیں ہوتا۔ ان مثالوں سے ظاہر ہو گیا کہ تھوڑے بہت اسباب جمع کر کے اگر اللہ تعالےٰ کے بھروسے دعا کی جائے تو اللہ تعالےٰ اس تھوڑے حیلے میں یقین کی برکت سے سب کچھ دے دیتا ہے اور یہی معنے معلوم ہوتے ہیں۔ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ (میانہ روی اختیار کرو طلب میں اور اس پر بھروسہ رکھو) کے تدبیر اور مباشرت اسباب میں اختصار ہو۔ اَجْمِلُوْا اس کی طرف اشارہ ہے اور نظر تقدیر پر ہو وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ (اور اس پر بھروسہ کرو) میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ اور درحقیقت اگر روزی صرف سعی و تدبیر پر ہی موقوف ہوتی تو اکثر آدمی حکمت و تدبیر سے خفار حاصل کر سکتے تھے مگر غنا اور تمول دیکھا جاتا ہے کہ حکمت اور تدبیر اور سعی پر موقوف نہیں بلکہ بکثرت دیکھا گیا ہے کہ ایک معمولی آدمی جو دو آنے تین آنے کی مختصر مزدوری کیا کرتا تھا چند سال میں وہ لکھ پتی ہو گیا۔ اگر غنا تدبیر اور سعی سے بلا تقدیر حاصل ہو سکتا ہے تو ہم ایک دوسرا آدمی منتخب کرتے ہیں جو قوت اور ہمت رائے و تدبیر میں اس سے زیادہ ہو اور مدت بھی اس کے لئے دونی تجویز کرتے ہیں اور اس پہلے کو دو آنے

روزانہ ملتے تھے ہم اس کے چار آنے یومیہ دیتے ہیں اور اس پہلے شخص کا تمام کارنامہ اس کو دیئے دیتے ہیں پھر ہم دیکھیں گے کہ اس پہلے کے برابر یا اس کے قریب مضاعف مدت میں کما سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ترقی کے اسباب اور تدابیر بہت قومیں جانتی ہیں۔ مگر ترقی وہی قومیں کرتی ہیں کہ جن کی تدبیر اور سعی کے ساتھ تقدیر بھی مساعدت کرتی ہے ورنہ ان سے دُگنی محنت کرتے ہیں اور افلاس نہیں جاتا۔ اصل یہ ہے کہ نہ تو نرے اسباب پر مدار ہے بلکہ تقدیر اور مشیت کی موافقت شرط ہے اور نہ یہ کارخانہ اسباب بالکل معطل ہے کہ اس کو چھوڑ کر صرف دعا سے ہی کام لیا جائے۔ افراط اور تفریط دونوں کو چھوڑیں۔ اس طرح سے کہ اسباب کو بھی اختیار کریں کیوں کہ اس میں بھی اظہار ہے عبدیت اور افتقار الی اللہ کا اور اسباب کے بھروسہ دعا سے بھی غفلت نہ کی جائے۔ ہم میں بعضے جو متوکل ہوئے تو اس میں بھی غلو کرنے لگے ہیں ہماری بھی وہی مثال ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے کیا کی

اس غلو کی بدولت بعض اوقات توکل نام ہوتا ہے واقع میں تعطل و کم ہمتی ہے ؎

بچو باز باش کہ صیدے کنی ولقمہ دہی   طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پر و بال

(باز کی طرح ہو کہ شکار کرو اور لقمہ دو بے پر و بال کوے کی طرح طفیل خوار مت بنو)

البتہ اگر اسباب معیشت میں اشتغال مضر اس کے دین کو یا مانع خدمت دین کو ہو اور یہ شخص اس کا اہل ہے اور توکل کی ہمت بھی ہے تو توکل بہتر ہے۔ مثلاً اس کے متعلق تعلیم و ترتیب دینی ہو اور یہ شخص اس کا توکل و دینی خدمت سے بہتر کوئی کام نہیں البتہ یہ ضروری بات ہے کہ توکل صرف اللہ پر ہو لوگوں کے ہدایا و تحف کی طرف نفس کا اشراف نہ ہو۔ حدیث میں مِنْ غَيْرِ اَشْرَافِ نَفْسٍ (بغیر اشراف نفس سے) کی قید آتی ہے ورنہ وہ توکل علی اللہ نہیں غرض لوگوں کی اموال کی تاک میں نہ بیٹھا رہے۔ اس مقام پر ایک نکتہ سننے کے قابل ہے وہ یہ کہ بعض اوقات اہل کشف کو کشف سے آمد معلوم ہو کر مال کی طرف اشراف نفس پیدا ہو جاتا ہے۔ یا بعض اوقات اموال مشتبہ کی حقیقت ظاہر ہو کر مال حلال ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سو کشف نہ ہونا بھی اللہ تعالےٰ

کا بڑا احسان ہے کہ عمل بالسنۃ میں مخل نہیں ہوتا اشراف کے متعلق بلگرام کے ایک بزرگ عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان کے خاص شاگرد یا مریدان کے پاس آئے شیخ کے اضمحلال اور ناتوانی کو دیکھ کر انہوں نے جانچ لیا کہ آج فاقہ ہے اس لئے وہ اٹھے اور کچھ کھانا لیکر حاضر ہوئے اور پیش کیا۔ شیخ نے فرمایا کہ گویہ پہنچا ہے حاجت کے وقت لیکن مجھ کو اس کے قبول کرنے میں ایک عذر ہے۔ اس واسطے کہ جس وقت تم میرے پاس سے اُٹھ گئے تھے اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا کہ کھانا لائیں گے۔ چونکہ میرے دل کا اور اشراف نفس اس کے ساتھ ہو گیا اور ایسی حالت میں ہدیہ لینا خلاف سنت ہے۔ اس لئے اس کے لینے سے معذور ہوں ماشاء اللہ مرید یا شاگرد تھے سمجھدار کہ ذرا اصرار نہیں کیا جیسا کہ بعض کم فہم لوگوں کی عادت ہے کہ بزرگوں سے جھک جھک کیا کرتے ہیں حالانکہ نہایت سوء ادب ہے۔ بلکہ فوراً کھانا لے کر اُٹھ گئے اور آدھے رستے سے پھر لوٹ آئے اور وہی کھانا پھر پیش کیا اور عرض کیا کہ حضرت لیجئے اب تو میرے واپس چلے جانے سے اشراف نہیں رہا ہوگا اب قبول فرمالیجئے شیخ نے قبول فرمالیا اور ان کی اس نکتہ رسی اور ذہانت پر آفریں فرمائی۔

آپ نے سنا بزرگان دین نے اشراف سے کس قدر تحرز کیا ہے غرض توکل کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اشراف نہ ہو اور بدون اس کے اگر توکل ہو تو محمود ہے اور جو توکل کے شرائط نہ ہوں تو تدبیر مسنون ہے بالجملہ افراط تفریط دونوں سے برکنار رہے اور اعتدال اختیار کرلے ؎

گر توکل میکنی در کار کن — کسب کن پس تکیہ بر جبار کن
گفت پیغمبر بآواز بلند — بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

(اگر توکل کرو تو کام کے اندر توکل کرو پھر اسباب کے اندر اثر بخشنے میں اور ان کے مسبب ہونے پر اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جو اونٹ پر سوار ہو کر آیا تھا اور دروازہ مسجد پر اس کو بٹھا دیا تھا آواز بلند فرمایا صرف توکل مت کر بلکہ توکل کے ساتھ اونٹ کا زانو بھی رسی سے باندھ دو)

اور جان لینا چاہیے کہ تدبیر و اسباب کا اختیار کرنا بھی توکل فی نفسہٖ کے خلاف نہیں ہے۔ اس کی بعینہٖ مثال توکیل کی سی سمجھ لینا چاہیے۔ مثلاً جب کوئی شخص کسی مقدمہ میں وکیل مقرر کرتا ہے تو کیا وکیل کرنے کے بعد یہ شخص نکما خالی بیٹھ جاتا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ جتنی کوشش اس سے ہوسکتی ہے خود بھی کرتا ہے اور اس کے خلاف توکل نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ وکیل کے کرنے کا جو کام ہے وہ کرے گا۔ جو مجھ سے کچھ ہوسکتا ہے مجھ کو کرنا چاہیے اسی طرح تدبیر کرنا اعتدال کے ساتھ توکل کے خلاف نہیں بلکہ تدبیر ایسی چیز ہے کہ جو امور محض غیر اختیاری ہیں جن میں تدبیر کو اصلاً دخل نہیں محض دعا ہی پر ان کا مدار ہے۔ سنن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی دعا کے ساتھ کچھ صورت تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک قصہ حدیث سے بیان کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوجائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح توکل اور دعا کو جمع فرمایا اور اس حدیث کے ضمن میں اور بھی فوائد ہیں۔ ایک صحابی جن کا نام مقدادؓ ہے جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر مسافرانہ مقیم تھے اور ان کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بکریاں بتلا دی تھیں کہ ان کا دودھ نکال کر کچھ خود اور رفقہ پی لیا کرو اور کچھ ہمارے لئے رکھدیا کرو اور اُن کا اِس طرح معمول تھا وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو آنے میں دیر ہوئی تو میں سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کہیں دعوت ہوگئی ہوگی یہ خیال کرکے آپ کا حصہ بھی پی گیا۔ مگر اتفاق سے جب پی چکا اس وقت خیال آیا کہ شاید آپ نے کچھ نہ کھایا ہو۔ اور بے چینی کا یہ حال ہوا کہ کروٹیں بدلتا ہوں اور نیند نہیں آتی اسی شش و پنج میں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی عادت شریفہ آنے کے وقت یہ تھی کہ جب تشریف لاتے اور دیکھتے کہ گھر والے لیٹے ہیں تو بہت آہستہ سے سلام کرتے اس طرح سے کہ اگر حاضرین جاگتے ہوتے تو سُن لیتے اور اگر سوتے ہوتے تو آنکھ نہ کھلتی اسی طرح نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ کا شب برات میں بقیع میں جانے کیلئے آہستہ اُٹھنا اور آہستہ سے کواڑ کھولنا سب کام آہستہ سے کرنا تاکہ سونے والے

کو تکلیف نہ ہو آیا ہے۔ سو اسی طرح سلام بھی آہستہ سے فرماتے کہ اگر کوئی جاگتا ہو تو سنے
اور سوتا ہو تو اس کی نیند میں خلل نہ آئے۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے
کہ بعض لوگ دوسرے آدمیوں کی تکلیف کا اصلا خیال نہیں کرتے۔ سوتے آدمیوں میں
اٹھ کر سب کام بے تکلف زور زور سے کرتے ہیں اور اس سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے
اسی طرح یہ امر بھی موجب ایذا ہے کہ مشغول کار آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں
جس سے اس کے ضروری کام میں حرج ہوتا ہے اور پریشانی بھی۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب کے بیٹے کی ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایک روز
بھوپال میں وہ مغرب کی نماز پڑھتے تھے اور ایک صاحب مدعی عمل بالحدیث ان کے
پاس کھڑے تھے۔ یہ خیال کر کے کہ صاحبزادے صاحب بہت خوش ہوں گے بڑے
زور سے آمین کہی۔ صاحبزادے صاحب نے بعد نماز کے ان سے کہا کہ آپ سے مجھے
کام ہے ذرا مجھ سے مل کر جائیے وہ خوشی خوشی انتظار میں بیٹھ گئے دیکھئے کیا انعام
ملتا ہے۔ اتنے میں صاحبزادے صاحب مسجد کے باہر تشریف لائے۔ وہ صاحب سامنے
آئے کہ حضور کیا ارشاد تھا۔ انہوں نے ان صاحب کے ایک دھول جمائی اور فرمایا
کہ آمین بالجہر تو ضرور حدیث میں آئی ہے مگر یہ بتلا کہ آمین کی اذان کس حدیث میں
آئی ہے جو تو نے اس زور سے کہی کہ پاس والے بھی گھبرا اٹھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محض
مخالفت بھڑکانے کو ایسا کیا جاتا ہے اس لئے یہ سزا دی گئی۔

حضرات ہماری سبھی حالتیں بگڑ رہی ہیں ہر چیز میں افراط و تفریط ہو رہی ہے
اور عوام کی کیا شکایت کریں۔ انصاف یہ ہے کہ آداب کو بعض اہل علم تک نہیں جانتے
محض لفظ پرستی رہ گئی ہے ؎

مولوی گشتی و آگہ نیستی   خود کجا و از کجا و کیستی

(مولوی بن گیا اور آگاہ و خبردار نہ ہوا خود کہاں اور کہاں سے اور کون ہے تو)

اس لفظ پرستی پر ایک مثال یاد آئی۔ ایک شخص کا انتقال ہوا موت کے قریب بیٹے
کو وصیت کی کہ جو کوئی میری تعزیت کو آئے اس کو اونچی جگہ بٹھانا اور نرم اور شیریں

باتیں کرنا۔ اور بھاری کپڑے پہن کر اس سے ملنا اور قیمتی کھانا کھلانا۔ اب صاحبزادے کی سنیئے۔ ایک صاحب ان کے والد کے دوست تعزیت کو آئے۔ آپ نے فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ ان کو مچان پر بٹھا دو وہ آئے اور مجرموں کی طرح ان کو زبردستی پکڑ کر مچان پر بٹھا دیا۔ اب وہ پوچھتے ہیں کہ یہ کیسا معاملہ ہے نوکر کہتے ہیں کہ آقا کا یہی حکم ہے۔ اب آقا صاحب تشریف لائے تو اس انداز سے کہ جاجم، دری، قالین میں لپٹے ہوئے ایک عجیب بغلول کی سی شکل بنے ہوئے ہیں۔ آخر مہمان نے کچھ تعزیت میں کہا تو جواب میں فرماتے ہیں گڑ۔ انہوں نے کچھ اور کہا تو جواب ملتا ہے روئی۔ مہمان بے چارہ دنگ ہے۔ غرض کھانے کا وقت آیا گوشت گلا نہ تھا مہمان نے کہیں اس کا شکوہ کیا تو آپ تیز ہو کر کہتے ہیں واہ صاحب میں نے آپ کے لئے پچاس روپیہ کا کتّا کاٹ ڈالا اور آپ کو پسند نہیں آیا۔ اب مہمان اور بھی پریشان۔ آخر تحقیق کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ابا جان نے وصیّت کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد اگر کوئی شخص تعزیت کے واسطے تمہارے پاس آئے تو اس کو اونچی جگہ بٹھانا اس واسطے میں نے مچان پر بٹھایا کہ سب سے اونچی جگہ یہی تھی۔ اور یہ کہا تھا کہ بھاری کپڑے پہن کر ان سے ملنا تو اس دری قالین سے بھاری کوئی کپڑا نہ تھا۔ تیسرے یہ کہا تھا کہ نرم اور میٹھی باتیں کرنا تو گڑ اور روئی سے زیادہ نرم اور میٹھی چیز مجھ کو نہ معلوم ہوئی۔ اور وصیت کی تھی کہ قیمتی کھانا کھلانا تو اس کتے سے زیادہ کوئی جانور قیمتی ہمارے گھر نہ تھا۔ مہمان لعنت بھیجکر وہاں سے رخصت ہوا۔ پس یہی حالت ہماری ہے کہ الفاظ یاد کر لئے ہیں حقیقت آداب و اخلاق اعمال کی نہیں سمجھے۔ چنانچہ ہم نے اخلاق نام صرف چاپلوسی اور خوشامد اور میٹھی باتیں کرنے کا رکھ لیا ہے سو حقیقت میں اخلاق کو نفاق سے بدل دیا ہے اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ ہم سے کسی کو کسی قسم کی ایذا ظاہری یا باطنی یا حضور یا غیبت میں نہ پہونچے۔ ہم نے یہ سمجھا کہ اخلاق ظاہر داری کا نام ہے گو اس سے ایذا ہی پہنچے اس کی کچھ پروا نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت اور رعایت کہ سلام بھی کرتے ہیں تو اس طرح سے کہ کوئی بے چین نہ ہو۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشا کے بعد تشریف لائے

اور حسب معمول سلام کر کے برتنوں کی طرف چلے اور وہ صحابی جو دودھ پی کر لیٹ گئے تھے یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو اس میں دودھ نہ ملا۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بھوک لگی ہوئی تھی اور طعام کی حاجت تھی آپ نے حسب معمول کچھ نفلیں پڑھیں اور یوں دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَطْعِمْ مَنْ اَطْعَمَنِیْ (اے اللہ کھانا کھلا اس کو جس نے مجھ کو کھانا کھلایا ہے) دیکھئے یہ امر قابل غور ہے کہ اس دعا میں آپ نے توکل کے ساتھ اسباب کی کس لطیف طور پر رعایت فرمائی کہ یہ ظاہر کر دیا کہ کھانا اکثر اس طرح ملتا ہے کہ کوئی شخص ظاہر میں لے آئے ورنہ یہ بھی تو دعا فرما سکتے تھے کہ اے اللہ آسمان سے مائدہ یا رزق بھیج مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے توکل اور تدبیر کو کس لطیف طریق پر جمع فرمایا جیسا مذکور ہوا۔ تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ اس دعا کے سننے کے بعد وہ صحابی اُٹھے چونکہ ان کو یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوئی ہوگی اس لئے گو بکریوں کا دودھ دوہ چکے تھے مگر پھر برتن لے کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بکریوں نے اتنا دودھ دیا کہ برتن بھر گیا۔ اس برتن کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ غرض اس قصے کے بیان سے یہ تھی کہ دیکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت کس طور پر فرمائی۔ پس معلوم ہوا کہ نہ دعا کے بھروسے اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا انہماک ہو کہ مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے۔ اعتدال اصل طریقہ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہ بدون تحصیل و تبحر علوم دین کے حاصل ہونا مشکل ہے کوئی آسان کام نہیں جو ہر ایک دعوے کرنے لگے ؎

بر کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

(ادھر شریعت کا مقتضیٰ اُدھر عشق کا مقتضیٰ شریعت اور عشق دونوں کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال سے تو یہاں تک اس اعتدال کا پتا چلتا ہے کہ معجزات میں بھی جو کہ بالکل بطور خرق عادت ظہور میں آتے ہیں ان میں بھی تدبیر اور اسباب کی صورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت جابرؓ کی دعوت کا قصہ جو جنگ احزاب میں خندق کھودنے کے

وقت ظہور میں آیا اس کا شاہد ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا کہ ہانڈی چولھے سے مت اتارنا پھر اس میں آکر آب دہن ملا دیا۔ اور وہ چند آدمی کی خوراک لشکر کے لشکر کو کافی ہوگئی۔ اسی طرح حدیث میں اور بھی معجزات کے قصے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ خرق عادت میں تھوڑی سی رعایت اسباب کی گئی مثلاً چولھے پر ہانڈی اور توے کا رکھا رہنا اور ڈھک دینا وغیرہ کی صورت اسباب کو حجاب بنایا گیا ورنہ ویسے بھی کھانا بڑھ سکتا تھا۔ یہ آداب ہیں توکل اور تدبیر کے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو سیکھنا چاہئے ان سے غافل رہنا بعض اوقات سبب ہوجاتا ہے انہماک فی الاسباب کا جو ایک سبب ہے ترک دعا کا جس کا حاصل ہے کہ اسباب میں انہماک اور مسبب الاسباب پر نظر نہ رکھنا اور عقیدت کی کمزوری۔

اب ایک دوسرا سبب دعا نہ کرنے کا سنئے۔ وہ یہ کہ عقیدہ تو دعا کا ہے مگر یہ خیال ہوجاتا ہے کہ ہم دعا[1] کے قابل نہیں ہم کیا دعا کریں اور درحقیقت یہ بھی شیطان کا ایک وسوسہ ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں تواضع کے رنگ میں ڈالا گیا ہے درحقیقت بعض احوال باطنہ کچھ اس قسم کے ظاہراً مشتبہ معلوم ہوا کرتے ہیں کہ ان کو بھلا یا برا قرار دینے میں بڑی فہم و دقت نظر آگاہی شرع شریف کی سخت ضرورت پڑتی ہے چنانچہ آیت مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (اس نے دو دریاؤں کو ملایا کہ باہم ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے کہ دونوں بڑھ نہیں سکتے) میں اہل لطائف اس طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر دو امر میں التباس ہوجاتا ہے۔ ایک تو تواضع اور حیا۔ اس کی علامت یہ ہے کہ گناہ کرتے ہوئے بھی اس کا خیال رہے۔ اپنی عبدیت اور خدائے تعالیٰ سے شرم کرنا ملحوظ رہے ورنہ اگر صرف دعا کے وقت تو تواضع کے خیال سے دعا نہ کی جائے اور گناہ کرتے وقت بیباک اور نڈر ہوجائیں تو یہ درحقیقت تواضع نہیں ہے بلکہ کم ہمتی اور سستی ہے۔ شیطان

---

[1] چنانچہ ایک بار ایک شخص نے مجھ سے قرض کی شکایت کی میں نے کہا دعا کرو کہنے لگا زبان دعا کے قابل ہی نہیں میں نے کہا کہ تو پھر کلمہ کیوں پڑھتے ہو کیا کلمہ کے قابل ہے اور دعا کے قابل نہیں۔ چپ رہ گیا ۱۲ منہ

نے برکات دعا سے محروم کرنے کے واسطے ایک حیلہ سکھا دیا ہے لہٰذا اس کا وسوسہ بھی دل میں نہ لانا چاہیئے اور دعا بڑے اہتمام سے کرنی چاہیئے۔ کہ وہ خالی نہیں جاتی اور کچھ نہ ہو۔ یہ کیا کچھ کم ہے کہ آخرت کے لئے اس کا اجر جمع رہے گا اور اہل حال کے جو اقوال ہیں مثلاً ؎

اَحَبُّ مُنَاجَاتِ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٍ وَلٰکِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْلُ

(محبوب کی پسندیدہ تر مناجات کے بہت سے طریقے ہیں لیکن گنہ گاروں کی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے)

سو وہ غلبۂ حال کے ہیں جس میں وہ معذور ہیں۔ مگر قابل تقلید نہیں۔ الحاصل حیا و تواضع میں رضائے خداوندی پیش نظر ہوتی ہے اور یہ نہ ہو تو کم ہمتی ہے۔ ان باتوں میں فرق کرنے کے واسطے بڑی ضرورت ہے علم شریعت کی اسی طرح اگر کوئی شخص لاصلوٰۃ الا بحضور القلب (بلا حضور قلب نماز نہیں ہوتی) میں بھی یہی حیلہ جو دعا میں کیا ہے نکال لے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز چھوڑ بیٹھے گا لہٰذا ایسے وساوس ناقابل اعتبار ہیں۔ جو کچھ جیسا کچھ ہو سکے کرنا چاہیئے۔ بھلا برا جو کچھ بھی ہو خدا کے دروازے پر آنا چاہیئے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(جو کچھ بھی تجھ سے غلطی ہوگئی ہو اس سے باز آجاؤ خواہ کافر و ملحد اور بت پرست ہی کیوں نہ ہو اپنی ان حرکات سے باز آ یہ ہماری درگاہ اور دربار مایوسی کی جگہ نہیں ہے اگر تو نے سو بار توبہ کرنے کے بعد توڑی ہے باز آجا اور پھر توبہ کرلے)

ایسا شخص ایک غلطی تو یہ کرتا ہے کہ کم ہمتی سے عبادت اور طاعت اور دعا کی طرف نہیں آتا اور دوسری غلطی یہ کرتا ہے کہ اپنی نسبت گمان کرتا ہے کہ میں کسی وقت پاک صاف ہو کر حق عبادت ادا کر سکتا ہوں اور ایسے وقت عبادت کروں گا اور جو عبادت کر رہا ہے گویا بزبان حال اس کا حق ادا کرنے کا مدعی ہے اور یہ بھاری غلطی ہے۔ انسان کبھی پورا پاک نہیں ہو سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی درگاہ کے قابل بننا اور اس کا حق عبادت کرنا کیا اس سے ممکن ہے

ع وُجُوْدُکَ ذَنْبٌ لَا یُقَاسُ بِہٖ ذَنْبٌ

(تمہاری ہستی ہی گناہ ہے اور کسی گناہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا)

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خود ثنا گفتن ز من ترک ثنا است کایں دلیل ہستی و ہستی خطا است

(خود ثنا کرنا میری طرف سے ترک ثنا ہے یہ ہستی کی دلیل ہے اور ہستی خود خطا ہے)

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (میں تیری تعریف نہیں کر سکتا جبکہ تو نے اپنی ذات کی تعریف کی ہے) مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ اس معنی میں کہ ہم آپ کی ثنا نہیں کر سکے فرماتے ہیں ؎

خدا در انتظار حمد ما نیست محمدؐ چشم بر راہ ثنا نیست

خدا مدح آفرین مصطفا بس محمدؐ حامد حمد خدا بس

مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد بہ بیتے ہم قناعت مے تواں کرد

محمدؐ از تو میخواہم خدا را الٰہی از تو حب مصطفا را

(حق تعالیٰ کو ہماری حمد کی ضرورت نہیں ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ثنا کا انتظار ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا کی مدح کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کافی ہے۔

اگر کوئی مناجات کرنا چاہتے ہو تو ان دو بیتوں پر اکتفا کرو۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے خدا کی محبت مانگتے ہیں اور اے اللہ آپ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مانگتے ہیں)

اسے پاک سمجھنے کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ الخ (اپنے نفسوں کی پاکی بیان نہ کرو) ہم اور ہماری عبادت تو ایسی ہے کہ یہی غنیمت ہے کہ اس پر مواخذہ نہ ہو، کیونکہ ہماری ثنا ایسی ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

(اگر کوئی شخص بادشاہ کو کہے جولاہہ نہیں ہے یہ اس کی تعریف نہیں ہے بلکہ وہ اس کے مرتبہ

سے واقف نہیں ہے)

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ — وز گرانجانی و چالاکی ہمہ

من نکردم پاک از تسبیح شان — پاک ہم ایشان شوند و درفشاں

(یعنی جیسی پاکی تم بیان کرتے ہو ہم اس سے بھی پاک ہیں اور ہم ہر طرح کی سستی اور تیزی سے بھی پاک ہیں میں ان کی تسبیح سے پاک نہیں ہوتا بلکہ وہ خود پاک ہو جاتے ہیں اور ان سے خوبیوں کا اظہار رہوتا ہے)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اِنِّی لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِی کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً (میں ہر دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں) حالانکہ عصمت انبیا ایک مسلم مسئلہ ہے پھر یہ استغفار گویا اپنی حالت عبادت کو کمال خداوندی کے مقابلہ میں ناتمام دیکھ کر ہوتا ہے یعنی اپنی عبادت وحمد وثنا کو غیر قابل قرب خداوندی سمجھ کر استغفار کر رہے ہیں۔ یہ حالت ہے اکابر مقبولین کی کہ بایں ہمہ علو مرتبت بمقابلہ کمال حقوق خداوندی اپنے آپ کو محض ہیچ سمجھ رہے ہیں اور یہ نہیں کہ وہ واقع میں کمال و وصال سے خالی ہیں بلکہ ؎

دل آرام در بر دل آرام جو — لب از تشنگی خشک و برطرف جو

نگویم کہ برآب قادر نیند — کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کی تلاش کر رہے ہیں نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں میں نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں ہیں لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں)

؎ دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار — گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

جب خواص کی یہ کیفیت ہے تو ہم عوام کس شمار میں ہیں۔ ہم پر یہ اُن کی عنایت کہ باوجود ہماری بداعمالی خراب حالی جاننے کے پھر ہم کو اپنی طاعت وحمد وثنا۔ دعا والتجا کی رخصت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ کرو۔ اگر وہ باوجود علم کے ہم سے کھوٹے مال اور ناقص عبادت کو قبول کرتے ہیں تو پھر بندہ کو کسی قسم کا عذر پیش کرنا گو وہ عذر ناقابلیت ہی کا ہو کس درجہ حماقت ہے ؎

چوں طمع خواہد ز تو سلطان دین　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(جب شاہ دین مجھ سے طمع کا خواہشمند ہو تو اس کے بعد قناعت پر خاک ڈالدوں گا)

ایں قبول ذکر تو از رحمت است　　جو نماز مستحاضہ رخصت است

(یہ آپ کا ہمارے ذکر کو قبول فرمانا رحمت ہی سے ہے جیسے مستحاضہ کی نماز رخصت کی بنا پر قبول فرمالیتے ہیں)

یہ دوسرا سبب تھا دعا کے نہ کرنے کا۔ یعنی اپنے آپ کو دعا کے قابل نہ سمجھنا جس کی اصلاح پوری طور سے کردی گئی۔

اب تیسرا سبب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ یعنی یہ سمجھ کر دعا نہیں کرتے کہ قبول تو ہوتی ہی نہیں پھر دعا سے کیا فائدہ۔ سو خود یہی سمجھنا غلط ہے کہ خداوند تعالیٰ دعا قبول نہیں کرتے واقع میں موانع قبول دعا خود اپنی ذات میں ہوتے ہیں مثلاً دل سے خشوع و خضوع کے ساتھ جو روح ہے۔ ملکر دعا نہ کرنا محض زبان سے کہدینا۔ حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ (اللہ تعالیٰ قلب غافل سے دعا قبول نہیں فرماتے) قصور اپنا ہے ورنہ وہ ذات تو سب پر مہربان اور اس کا فیض سب پر محیط ہے اپنے میں قابلیت نہ ہو تو اس کا کیا علاج ہے

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے ؎

توبہ برلب۔ سبحہ برکف۔ دل پُر از ذوق گناہ　　معصیت را خندہ مے آید بر استغفار ما

(لب پر توبہ ہاتھ میں تسبیح دل ذوق گناہ سے پُر ہمارے استغفار پر گناہ کو بھی ہنسی آتی ہے)

اور مثلاً گناہ کی بات کی دعا کرنا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے جب تک گناہ اور قطعیہ رحم کی دعا نہ ہو۔ سو بعض دفعہ اکثر دعائیں گناہ کی ہوتی ہیں اب اُن کا قبول نہ کرنا ہی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ مثلاً موروثی زمین کے جھگڑے میں مالکانہ قبضے کی دعا خود گناہ ہے۔ ایسے ہے۔ بعض لوگ بزرگوں سے دعا کراتے ہیں کہ ہمارا لڑکا

فلاں امتحان میں پاس ہو جائے۔ اُس کو ڈپٹی کلکٹری، تحصیلداری وغیرہ مل جائے سو یہ دعا ہی سرے سے ناجائز ہے۔ کیونکہ حکومت کی اکثر ملازمتیں خلاف شرع ہیں اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بزرگوں کے متعلقین بعض ڈپٹی کلکٹری تحصیلداری وغیرہ حکومت کے عہدوں پر ہوتے ہیں۔ سو اگر یہ نوکری ناجائز ہے تو وہ بزرگ ان کو کیوں نہیں روکتے جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ ہیں تو یہ نوکریاں ناجائز مگر جو لوگ اس میں مبتلا ہیں اور اُن کے روزگار کی صورت بجز اس کے اور کچھ ہے نہیں۔ اگر ان کو اِس سے علیحدہ کر دیا جائے گا اور وہ نوکری چھوڑ دیں گے تو بوجہ عدم سبیل معاش وہ اس سے زیادہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں گے۔ سو درحقیقت اُن کو اجازت نہیں دی جاتی بلکہ اور بہت سے بڑے گناہوں سے بچا کر ایک چھوٹے گناہ پر رکھا جاتا ہے۔ اور ایسی دعا میں خود مشائخ اور علماء کو احتیاط کرنی چاہیئے کہ ایسے ناجائز مقدمات اور امورِ ممنوعہ کے واسطے دعا نہ کیا کریں کیونکہ گناہ ہوگا اور صاحب حاجت تو صاحب الغرض مجنون ہوتا ہے اس پر اعتبار اور بھروسہ نہیں چاہیئے اگر ایسا ہی کسی کی دل شکنی وغیرہ کا خیال ہو تو یوں دعا کریں کہ یا الٰہی جس کا حق ہو اس کو دلوایئے باقی ایسی ناجائز دعا نہ اپنے لئے کرے نہ غیر کے لئے۔ ناجائز امور کی دعا یا دعا کا غافل دل سے کرنا منجملہ ان موانع کے ہے جن کی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوتی کہ درحقیقت وہ دعا اس کے لئے بہتر نہیں ہوتی اور خلاف حکمت ہوتی ہے۔ اس لئے ترحماً قبول نہیں فرماتے۔ اس کی ایسی ہی مثال کیجئے۔ جیسے بچہ انگارے کو اچھا سمجھ کر منہ میں ڈالنے لگے تو شفیق ماں باپ اُس کو منع کرتے اور اس کے ہاتھ سے چھین لیتے ہیں ؎

آنکس کہ تونگرت نمی گرداند　　آں مصلحتِ تو از تو بہتر داند

(جس ذات نے تجھ کو مالدار نہیں بنایا وہ تیری مصلحت کو تجھ سے بہتر جانتا ہے)

چنانچہ حکایت ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ دعا کرائی تھی کہ کل کی بات معلوم ہو جایا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو نصیحت کی کہ اس کو جانے دے اُس نے نصیحت نہ مانی اور اصرار کیا۔ انہوں نے دعا کر دی اور وہ قبول ہو گئی۔ اس کو

معلوم ہوا کہ کل کو میرا گھوڑا مر جائے گا۔ اس نے فوراً بازار میں جا کر بیچ ڈالا۔ اور خوش ہوا پھر معلوم ہوا کہ کل کو میرا غلام مر جائے گا وہ اس کو بھی بیچ آیا اور بہت خوش ہوا پھر معلوم ہوا کہ کل کو میں مر جاؤں گا۔ بہت پریشان ہوا۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے جا کر عرض کیا کہ کیا کروں۔ وحی آئی کہ اس سے کہدو تجھ کو اس کشف راز سے منع کیا گیا تھا تو نے نہ مانا آخر تو نے دیکھا کہ اصل یہ ہے کہ تیرے گھر پر ایک بلا آنے والی تھی ہم نے چاہا جانور پر پڑ جائے تو نے اس کو جدا کر دیا۔ ہم نے چاہا کہ غلام پر پڑ جائے تو نے اُس کو بھی جدا کر دیا۔ اب تو ہی رہ گیا۔ اگر تجھ کو پہلے سے آئندہ کی خبر نہ ہوا کرتی تو گھوڑا اور غلام کیوں بیچا جاتا اور تو معرضِ ہلاکت میں کیوں پڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی بعض مصلحت انسان نہیں سمجھتا تو اس معلوم ہونے پر اُس کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ یہاں سے ذاکرین اور شاغلین کے واسطے بھی نصیحت بتائی ہے کہ جو حالت غیر اختیاری اللہ تعالیٰ وارد فرمائیں اُس کو اپنے لئے بہتر جانیں اور اپنی خواہش سے کسی پسندیدہ حالت کی تمنا نہ کریں ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکس — کہ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

(درد و صاف یعنی قبض و بسط تجویز کرنے کا تم کو کچھ حق نہیں ہے جو کچھ عطا ہو جائے تربیت باطنی کے لئے مصلحت اور وہی عین لطف ہے)

مجاہدے سے کسی خاص حالت کا قصد ٹھیک نہیں ؎

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری دارد

(تو فقیروں کی طرح بندگی مزدوری کی شرط سے نہ کر کیونکہ آقا بندی پروری کا طریقہ خود جانتا ہے)

ہر حالت جو اس کی طرف سے آئے وہی مناسب ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذوق و شوق و انبساط باعث عجب ہو جاتا ہے۔ تو مربیٔ حقیقی اُس کا علاج اس طرح فرماتے ہیں کہ حزن و ملال اور انقباض کو اس پر مُسلّط کر دیتے ہیں جس سے تواضع و انکسار پیدا ہوتا ہے الغرض اپنے لئے کوئی فکر اپنی خواہش و پسند پر نہ کرنا چاہیے ؎

فکر خود رائے خود در عالم رندی نیست کفر است درین مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

بعض لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں اور کسی خاص حالت اور ثمرہ کو حاصل ہونے پر جس کو غلط فہمی سے انہوں نے مقصود سمجھ رکھا ہے غمگین ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ حاصل نہیں ہوا یہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اصل مقصود رضائے حق ہے جس کا طریق ذکر و طاعت ہے جس کو یہ حاصل ہے سب کچھ حاصل ہے تو اُن کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اُن کو ذکر اور اطاعت کی توفیق تو دی ہے۔ ع

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

حقیقت میں یہ طلب اور درد و غم بھی نعمت عظمیٰ ہے جس کا شکر کرنا چاہیئے ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(فرمایا تیرا اللہ ہی کہنا ہمارا جواب ہے اور تیرا یہ سوز و نیاز اور درد ہمارا قاصد ہے)

اگر حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے کوئی خادم اس امر کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ خدا کا شکر کرو کہ اس نے اپنا نام لینے کی توفیق تو دی ہے اور اس موقع پر اکثر یہ شعر فرمایا کرتے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں)

اور فرمایا کرتے کہ جس طاعت کے بعد پھر اس طاعت کی توفیق ہو یہ طاعت سابقہ کے قبول کی علامت ہے۔ تو قبول کتنی بڑی نعمت ہے غرض قبول اسی میں منحصر نہیں کہ اس کی خواہش کے موافق ہو اور عشاق کی نظر تو کسی قسم کے قبول پر ہی نہیں ہوتی اُن کی حالت تو یہ ہے ؎

از دعا نبود مراد عاشقاں — جز سخن گفتن باں شیریں زباں

(مراد عاشقوں کی دعا سے محبوب حقیقی کی ہمکلامی کے سوا اور کچھ نہیں ہے)

عاشقان خدا کو عشق میں مجنوں سے کم نہ ہونا چاہیئے کیا اُس کے نام کی مشق کچھ کم دولت ہے جو اور چیزوں کی تمنا کی جاتی ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد

ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم — می نمودی بہر کس نامہ رقم

گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں — مینویسی نامہ بہر کیست ایں

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم — خاطر خود را تسلی می دھم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے اس نے پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں)

اور علاوہ اس کے کہ وہ دعا ان کی مصلحت کے مناسب نہ ہو کبھی یہ بھی ہوتا ہے اس کا اجر آخرت کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے سو تعجب ہے کہ مومن ذخیرۂ آخرت پر قناعت نہ کرے۔ متاع دنیا کے حاصل نہ ہونے پر افسوس کرے۔ مومن کامل تو نعمت اخرویہ کے روبرو دنیوی سلطنت تک کو گرد سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ سلطان سنجر شاہ ملک نیمروز نے حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں مُلک نیمروز آپ کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں حضرت نے یہ دو شعر تحریر فرمائے ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد — در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم

زانگہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من ملک نیمروز بیک جو نمیخرم

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو جب سے مجھ کو نیم شب کی سلطنت حاصل ہے نیمروز کی سلطنت میری نظر میں ایک جَو کی برابر بھی نہیں)

یہ بیان تھا بقدر ضروری دعا کا بعض لوگوں کو شاید یہ شبہ ہو کہ دعا، رضاء بالقضاء کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ دعا اور رضا دونوں جمع ہو سکتے ہیں اس طور پر کہ عین دعا کے وقت یہ قصد ہے کہ اگر دعا کے موافق ہو گیا تو یہی قضا ہے اُس پر راضی ہوں گے اور اگر اس کے خلاف ہوا تو وہی قضا ہے اُس پر راضی ہوں گے اور چونکہ دعا بھی مامور بہ ہے اس لئے وہ بھی داخل قضا ہے۔ اگر کوئی شخص حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے آگ میں ڈالے جانے کے قصّے سے استدلال کرے کہ انہوں نے باوجود جبرئیل علیہ السلام کے کہنے کے کہ دعا کرو۔ دعا نہیں کی اور فرمایا حَسْبُہٗ عَنْ سَوَالِیْ عِلْمِہٖ بِحَالِیْ (اس کا میرے حال کو جاننا کافی ہے میرے سوال کرنے سے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کرنا رضا بالقضاء اور تفویض و تسلیم کے خلاف ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ قصہ سیر کی روایت ہے جس کو معرض استدلال میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اگر اس قصہ کو مان بھی لیا جائے تو آسان طالب علمانہ یہ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ قصہ پہلی امت کا ہے ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا مسئلہ نہیں جو ہم پر حجت ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ صاحب وحی تھے اُن کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس وقت دعا کرنا خلاف رضا ہے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

کفر باشد نزد شان کردن دعا که اے خدا از ما بگردان ایں قضا

(ان کے نزدیک دعا کرنا کفر ہے کہ اے خدا ہم سے اس حکم قضا کو پھیر دے)

ہم لوگ کوئی صاحب وحی نہیں جو خاص وقت کا حکم معلوم ہو سکے۔ ہمیں تو دعا کرنے کا حکم ہے۔ اس لئے دعا کریں گے۔ چوتھے یہ بھی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ علم میں اتم و اکمل ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر۔ اُس وقت غلبۂ حالیہ تفویض اور تسلیم کی فضیلت منکشف تھی اور دعا کی فضیلت مستور۔ اور ہمارے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ہر وقت تفویض تسلیم اور رضا کی فضیلت بھی منکشف رہتی تھی اور دعا کی فضیلت بھی۔ اسی لئے دونوں کو جمع فرمایا۔ اور اکثر بزرگوں سے غلبہ

حال میں اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ جن کی نہ تقلید درست ہے نہ اُن کی باتوں سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اُن پر انکار درست ہے۔ وہ معذور ہیں چنانچہ شاہ فخر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتے تھے کہ سیڑھیوں پر ایک بڑھیا نے شربت کا پیالا پیش کیا اور کہا۔ بیٹا اس کو پی لو۔ شاہ صاحب روزے سے تھے۔ روزے کا کچھ خیال نہ کیا اور شربت پی لیا۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ فرمایا روزے کی تلافی قضا سے ہوسکتی ہے۔ مگر دل شکنی کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اس واسطے میں نے پی لیا۔

ہمارے حاجی صاحب علیہ الرحمۃ نے اس قصے کے متعلق فرمایا کہ خواجہ صاحب پر اس وقت غلبۂ حال میں قلب کی فضیلت منکشف اور روزے کی فضیلات مستور تھی اس واسطے ایسا کیا۔ اگر کوئی صاحب تمکین اور اپنی حالت پر غالب ہوتا تو وہ یوں کرتا کہ نرمی سے اس کا جواب دے کر اُس کو بھی راضی رکھتا اور روزہ بھی نہ توڑتا مغلوب الحال کی تقلید کسی دوسرے کو جائز نہیں۔ اس کے واسطے خود شریعت کے صاف اور کھلے ہوئے احکام موجود ہیں جن میں کوئی کھٹکا نہیں۔ فِیْ طَلْعَةِ الشَّمْسِ مَا یُغْنِیْكَ عَنْ زُحَلٍ (آفتاب طلوع ہونے میں وہ ہے جو تجھ کو آدمی سے بے نیاز کر دے گی)

الغرض یہ چند اسباب موانع دعا کے بطور امور کلیہ کے بیان کئے گئے ہیں اب اُن سے اور جزئی اسباب بھی معلوم ہو سکتے ہیں جو سمجھدار آدمی سمجھ کر نکال سکتا ہے۔
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

معروضہ

قارئین سے التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمادیں کہ ناشر اور اسکی اولاد کی اللہ تعالیٰ کوشش دینیہ قبول فرمالیں اور مقبولان حق کے ساتھ محشور فرمادیں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرمادیں۔ آمین بحرمۃ حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اوّل کا

وعظ چہارم ملقب بہ

سیرۃ الصوفی

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

مسافر خانہ۔ بندر روڈ کراچی

ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد اول کا
وعظ چہارم ملقب بہ

سیرت الصوفی

این	متٰی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۳ صفر ۱۳۲۹ھ	تقریباً ۳½ گھنٹہ	بیٹھ کر	طرز زندگی دستور العمل	مولوی نور حسین صاحب پنجابی		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیأت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ (صلی اللہ علیہ وسلم)

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(آیت) یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۭ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ۭ اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ۭ وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا ۭ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا ۭ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا ۭ وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَۃِ وَمَھِّلْھُمْ قَلِیْلًا ۭ

(اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات کہ اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو یا اس نصف سے کسی قدر کم کرو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب خوب صاف پڑھو ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں بے شک رات کے اٹھنے میں دل و زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات ٹھیک نکلتی ہے اور بے شک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ ہو وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اور اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو اور ان جھٹلانے والوں ناز و نعمت میں رہنے والوں کو حالت موجودہ میں چھوڑ دو اور ان لوگوں کو تھوڑے دنوں اور مہلت دو ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے جس دن پہاڑ اور زمین ہلنے لگیں گے اور پہاڑ ریگ رواں ہو جائیں گے)

بعض احباب ارباب سلوک نے مجھ سے استدعا کی کہ اگر ہمارے لئے کچھ دستور العمل کے طور پر بیان ہو جائے تو بہتر ہے اس وقت بوجہ کسی مضمون کے حاضر نہ ہونے کے اور نیز ایسے مضامین کے لئے خلوت مناسب ہونے کے میں نے حتمی وعدہ نہیں کیا مگر آج صبح کو سورۂ مزمل کی یہ ابتدائی آیات قلب میں وارد ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں تمام طریق سلوک ہی مذکور ہے۔ اس لئے آج ان ہی آیات کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے[ف] اور بیان سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ اس میں ہمارا کیا نفع ہوگا۔ یہ طریقہ تو خواص کے لئے ہے ہم دنیا داروں کے لئے نہیں۔ سو بات یہ ہے کہ سرے سے یہ تقسیم ہی صحیح نہیں۔ کہ دنیا داروں کے لئے اور احکام اور دینداروں کے لئے اور احکام۔ کیونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ اور احکام شرعی سب کے ساتھ یکساں متعلق ہیں۔ بلکہ حقیقت میں مسلمان دنیا دار ہوتا ہی نہیں کیونکہ دنیا داری حقیقت میں یہ ہے کہ حرام و حلال میں کچھ امتیاز نہ رہے جس طرح سے بنے مال حاصل کرنے کو مقصود سمجھے۔ اگر کہیں دونوں غرضیں دین و دنیا کی

ف اور چونکہ مسائل علوم معاملہ کے ہیں۔ علوم مکاشفہ کے نہیں اس لئے اعلان کا بھی مضائقہ نہیں ۱۲

جمع ہوجائیں تو دنیوی غرض کو مقدم رکھا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ دین سے ہم کو کوئی غرض نہیں کیونکہ شریعت کے احکام اس قدر دشوار ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کریں تو دنیا کی زندگی مشکل ہے سو ظاہر ہے کہ اسلام کے ساتھ ان خیالات کی گنجائش کہاں ہے۔ کیونکہ اس سے تو باری تعالیٰ کی تکذیب کی نوبت پہنچتی ہے۔ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ احکام میں دشواری منظور نہیں اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ ہم تکذیب نہیں کرتے۔ مگر جب واقعات ہی روزمرہ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ احکام شرعیہ پر چلنا بہت مشکل ہے تو ہمارا کیا قصور ہے اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ ایک مشقت تو ہوتی ہے ذات حکم میں مثلاً وہ حکم فی حد ذاتہ سخت اور دشوار ہو۔ یہ اصر اور اغلال کہلاتے ہیں۔ امم سابقہ میں بعض ایسے احکام تھے مگر اس امت میں اس قسم کے احکام نہیں رکھے گئے۔ اور ایک مشقت یہ ہے کہ دراصل ذات حکم میں تو کوئی دشواری نہیں مگر ہم نے اپنے اغراض فاسدہ کی وجہ سے خود اپنی حالت ایسی بگاڑ لی اور قوم نے متفق ہو کر شریعت کے خلاف عادتیں اختیار کر لیں کہ وہ رسم عام ہوگئی اور ظاہر ہے کہ جب اس رسم عام کے خلاف کوئی حکم شرعی پر چلنا چاہے گا تو ضرور اس کو اس آسان اور بے ضرر حکم میں دشواری پیدا ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کو دو پیسہ کا نسخہ لکھ دے مگر مریض چونکہ ایسے گاؤں میں رہتا ہے جہاں کے لوگوں کی نادانی کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ وہ لوگ اس قسم کی ضروری اور مفید چیزوں کی رغبت نہیں رکھتے وہ چیزیں وہاں نہیں مل سکتیں۔ اس دو پیسہ کے نسخہ کو وہاں نہیں پی سکتا۔ اب فی نفسہ گراں نہیں کمیاب نہیں مگر اس گاؤں والے نے خود اپنا دستور بگاڑ رکھا ہے اس واسطے وہاں نہیں مل سکتا۔ اس صورت میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ علاج بالکل آسان ہے۔ مگر یہ قصور اس جگہ کے رہنے والوں کا ہے کہ ایسی معمولی چیزیں بھی نہیں مل سکتیں۔ ایسا ہی ہمارا حال ہے کہ مجموعۂ قوم نے مل کر ایسی حالت بگاڑ دی ہے کہ اب احکام شرعیہ کے بجا لانے میں دشواری پیدا ہوگئی ہے۔

مثلاً بہانہ کیا جاتا ہے کہ تنخواہ کم ہے بھلا اگر رشوت نہ لیں تو کام کیسے چلے اگر اپنے اخراجات اندازہ سے رکھے جائیں تو تنخواہ کیوں نہ کفالت کرے۔ یا مثلاً عام طور پر بیر آم کی بیع پھل آنے سے پہلے کی جاتی ہے اور اگر ایک بچنا چاہے تو ضرور کسی قدر دقت پیش آتی ہے لیکن اگر سب اتفاق کرلیں کہ اس طرح سے کوئی خرید و فروخت نہ کرے تو دیکھیں پھر کیا دشواری پیش آتی ہے۔ دشواری حقیقی تو وہ ہے کہ اگر سب مل کر بھی اس کو دور کرنا چاہیں جب بھی دور نہ ہوسکے اور جو سب مل کر اس مذموم رسم اور طریق کو چھوڑنا چاہیں اور وہ چھوٹ جائے تو یہ دشوار نہیں آسان ہے۔ یہ عارضی دشواری تو صرف اپنا طرز معاشرت بگاڑ دینے اور طریق تعامل کو خراب کردینے سے پیدا ہوگئی ہے سو یہ تنگی خود اپنے اوپر تنگی ڈال لینے سے ہوئی۔ تعجب ہے کہ خود اپنی تنگی کو نہ دیکھیں۔ شریعت پر تنگی کا الزام دیں۔ جیسا کہ اس شیر نے جس کا قصہ مثنوی میں ہے خرگوش کے بھاگنے سے اپنا عکس دیکھا اور اس کو دوسرا شیر سمجھکر اس پر حملہ کرنے کو کنوئیں میں کود پڑا۔ دراصل وہ خود اپنے اوپر حملہ کر رہا تھا۔ ایسے ہی ہم اپنے عیب کو آئینہ شریعت میں دیکھ رہے ہیں اور ناسمجھی سے اس کو شریعت کی تنگی بتلا رہے ہیں سو یہ درحقیقت شریعت پر حملہ نہ ہوا بلکہ خود اپنی ذات پر حملہ کر رہے ہیں ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(بیوقوف تو اپنے اوپر ہی حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا)

ہماری تنگی کا یہی قصہ ہے۔ بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم ناجائز معاملات رشوت ستانی وغیرہ ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ لوگ جس کو ضرورت کہتے ہیں وہ ضرورت بھی نہیں۔ بلکہ محض حظوظ نفسانیہ ہیں جن کا نام ضرورت رکھدیا ہے مثلاً کسی کی نوکری کے پیسے میں اتنی گنجائش ہے کہ معمولی درمیانی قیمت کے کپڑے پہن سکتا ہے مگر بیش قیمت زرق برق کپڑے بنانے کی گنجائش نہیں اس صورت میں عقلمند آدمی کبھی بھی ایسے گراں قدر کپڑوں کی ضرورت تسلیم نہیں کرسکتا کہ جس ضرورت کے واسطے رشوت لینا پڑے اور اگر اس پر بھی کچھ تنگی ہو تو آخر صبر کی تعلیم اسی حالت کے لئے ہے۔

اور جو مرتبہ صبر سے گزر جائے تو ایسے لوگوں کی امداد کے واسطے شریعت نے خاص قواعد مقرر کیئے ہیں اُن سے منتفع ہونا چاہیے۔

غرض مسلمان ہونے کی حیثیت سے کسی حالت میں بھی دنیا کو دین پر ترجیح دینا جائز نہیں۔ پس اس اعتبار سے مسلمان دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا صرف کفار ہی اہلِ دنیا ہیں جو دین کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اس شعر کا مطلب تقریر پر بالکل صاف ہو گیا ؎

اہل دنیا کافران مطلق اند   روز و شب در حق حق و در بق بق اند

(صرف کفار اہل دنیا ہیں رات دن زق زق بق بق میں گرفتار ہیں)

یعنی پہلے مصرع میں مبتدا موخر۔ اور خبر مقدم ہے۔ یعنی جو محض کافران مطلق ہیں صرف وہی اہلِ دنیا باقی مسلمان کی تو شان ہی اور ہے۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اللہ ساتھی ہے ان لوگوں کے جو ایمان لائے) اس میں عام مومنین کے لئے درجہ ولایت ثابت کیا گیا ہے گو وہ ولایت عامہ ہی ہو کیونکہ خاصہ میں اتنا اور زیادہ ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ اور اگر دنیا داری کے معنی عام لئے جائیں کہ طَلَبُ الْمَالِ وَلَوْ عَلٰی وَجْہِ الْحَلَالِ (مال کی طلب اگرچہ حلال ہی ذریعہ سے ہو) تو یہ منافی دین کی نہیں۔ تا کہ ایسا شخص مخاطب احکام دینیہ کا نہ ہو۔ کیونکہ خود حضرت انبیاء علیہ السلام سے کاروبار دنیوی اکل و شرب و نکاح و صنعت و غیرہ سبھی کچھ ثابت ہے غرض دنیوی کاروبار دین کے منافی نہیں۔ بشرطیکہ وہ شریعت کے دائرے میں ہوں۔ اللہ جل جلالہ کی رحمت تو یہاں تک وسیع ہے کہ باوجود ظلم اور گناہ کے بھی ولایت عامہ اور اصطفائے عام سے مومنین کو محروم نہیں کیا۔ فرماتے ہیں ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (پھر یہ کتاب ان لوگوں کے ہاتھ پہنچائی جن کو ہم نے اپنے بندوں سے پسند کیا پھر بعضے تو ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے متوسط درجہ کے ہیں۔ اور بعضے ان میں خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کیئے چلے جاتے ہیں) ظاہر ہے کہ مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ

مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ (اور بعضے ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور متوسط درجہ کے ہیں اور بعض ان میں سے نیکیوں میں ترقی کرکے چلے جاتے ہیں وہ ہیں جن کو ہم نے پسند کرلیا ہے) کی قسمیں ہیں۔ اور مقسم کا صدق ہر قسم پر واجب ہے۔ پس اصطفا ظالم لنفسہ کو بھی شامل ہوا۔ بھلا جب گناہ کے ساتھ بھی ولایت عامہ اور اصطفا باقی رہتا ہے تو ضروری اشتغال دینا کیسے منافع دین ہوسکتا ہے۔ تعجب ہے کہ اپنے منہ سے اس ذلت و بے حمیتی کا اقرار کیا جاتا ہے گویا حق تعالیٰ نے ان کو دین کے واسطے پیدا ہی نہیں کیا اور غضب تو یہ ہے کہ ان بھلے مانسوں نے اپنے لئے تو ایسے ناجائز لقب تراشے ہی تھے اہل دین کے لئے بھی ایسے القاب نازیبا کا بے محابا استعمال کرتے ہیں جیسے مسجد کے مینڈھے۔ اس پر بطور جملہ معترضہ کے ایک ہنسی کی حکایت یاد آگئی ایک طالب علم کو کسی متکبر نے کہدیا مسجد کا مینڈھا اس نے کہا بلا سے پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو اچھے ہی ہیں۔ اور اس جواب میں لطیفہ یہ ہے کہ اہل دین کے لئے جو وہ لقب تجویز کرتے ہیں وہ تو ایک دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے۔ مگر دنیا کا کتا یہ اقراری لقب ہے اور اَلْمَرْءُ يُؤْخَذُ بِإِقْرَارِهٖ (آدمی اپنے اقرار سے پکڑا جاتا ہے) بالجملہ ایسے القاب اپنے لئے یا غیر کے لئے تراشنا ممنوع ہے۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ (ایک دوسرے کو بُرے القاب سے مت پکارو ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بُرا ہے) حدیث شریف میں ہے لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ۔ عجب ہے کہ بعض لوگ ایسے واہیات القاب کو انکسار اور تواضع سمجھتے ہیں اس کی مثال میں ایک قصہ یاد آگیا کہ میرے سامنے ریل میں ایک دولت مند مسخرے نے اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ کر ایک شخص کو مدعو کیا تھا اور ان ہی کے ایک جلیس نے ان کو کہا کہ ہاں کھانے کی ایسی بے ادبی کی تو انھوں نے تواضع کی توجیہ کی سو ایسی تواضع حماقت ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتیٰ کہ اپنا نفس بھی ہمارا ملک حقیقی نہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ یہ ہم سب سرکاری چپراسی ہیں۔ سرکاری حد سے زیادہ اس سے کام لینا یا سرکاری حق کے خلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔ اہل اللہ اسی بنا پر کبھی اپنے نفس

کی بھی قدر کرنے لگتے ہیں اور عام لوگ کچھ اور سمجھ جاتے ہیں۔ سچ کہا ہے ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام — پس سخن کوتاہ باید والسّلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہیئے اور سلام)

سو وہ حضرات اس حیثیت سے اپنے نفس کی قدر کرتے ہیں کہ وہ اُس نفس کو سرکاری چیز سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہاتھ پاؤں دماغ۔ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے اُن کو بگاڑیں گے تو خود مورد عتاب مستوجب عذاب بنیں گے۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے کہ اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔ وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔ وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (تجھ پر اپنے نفس کا بھی حق اور اپنی بیوی کا بھی حق اور اپنی آنکھوں کا بھی حق ہے) اگر اپنے دل و دماغ آنکھ کی حفاظت اور خدمت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولیٰ کی سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں ان کی عزت و حرمت خدمت و حفاظت ہم پر بوجہ عبد و خادم ہونے کے ضروری ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا۔ یہی معنی ہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا ثواب نیتوں پر ہے) کے اور اس مرتبہ میں کہ ان اعضاء کو محبوب سے تعلق ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں ہر گھڑی اپنے ہاتھوں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

اور بعض کے کلام سے جو ان اشیاء کا اپنی طرف منسوب ہونا اور اس نسبت کے درجے میں ایسے اقوال صادر ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے کہا گیا ہے ؎

بخدا رشکم آید ز دو چشم روشن خود — کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(بخدا مجھ کو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ وہ محبوب کے چہرہ انور کو دیکھتی ہیں)

تو یہ غلبہ ہے حال کا ورنہ اہل مقام کی تحقیق وہی ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمہ سے کسی نے کہا کہ

جب آپ کو دولت وصول میسر ہوچکی تو اب کیوں تسبیح رکھتے ہیں۔ آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ میاں جس کی بدولت ہم کو یہ دولت ملی کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دیں۔ ہرگز نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے گھوڑا پالتا ہے اس گھوڑے کا بول و براز بھی ضائع نہیں جاتا بلکہ میزان اعمال میں اُس کے اندازے کے موافق اعمال رکھے جائیں گے اور ان پر ثواب ملے گا۔ یہ سب برکت نسبت الی اللہ کی ہے۔ اور ایسی نفیس اشیاء کے حسنات میں شمار ہونے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص مصری خریدے تو جو تنکا مصری میں ہوگا وہ بھی مصری کے بھاؤ ملے گا اور دعا کے اول و آخر درود شریف پڑھنے کی بھی یہی حکمت ہے کہ درود شریف کو تو اللہ تعالیٰ ضرور ہی قبول کریں گے۔ اور یہ ان کے کرم سے بعید ہے کہ اول و آخر کو تو قبول کرلیں اور بیچ والی لپٹی ہوئی چیز کو رد کردیں۔ اور درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے خاص مقبول و محبوب ہیں آپ پر بے کسی کی درخواست کے بھی رحمت فرماتے ہیں سو جب کسی نے آپ پر رحمت کرنے کی درخواست کی تو یہ گویا اُس شخص کی خیر خواہی ظاہر ہوئی جس سے یہ بھی مقبول ہوگیا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہر عید پر اپنے لڑکے کو کچھ انعام دیا کرتا ہے تو وہ تو دے ہی گا۔ اگر کسی شخص نے اس کو انعام دینے کی نسبت کہہ بھی دیا تو وہ شخص اُس کہنے کی وجہ سے اس کہنے والے پر بھی مہربان ہوجائے گا۔ اور یہ سمجھے گا کہ اس کو ہمارے لڑکے سے محبت ہے اس لئے درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے۔ اور طفیل میں یہ شخص بھی جب درود شریف قبول ہوگا تو دعا اس کے ساتھ وہ بھی ضرور قبول ہوگی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کھانڈ کے چنے کے اندر چنا ہوتا ہے اور اوپر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اُس مٹھائی کے سبب وہ چنے بھی مٹھائی کے حساب میں بکتے ہیں۔ کیونکہ اُن پر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس واسطے وہ اسی کے حکم میں ہوگئی۔ اسی طرح وہ دعا بھی گویا درود شریف کے حکم میں ہوگئی۔ یا جیسے پتے مٹھائی کے ساتھ جاتے ہیں اور پھر اُن کو کوئی واپس نہیں کرتا اور یہی راز اور حکمت ہے نماز میں جماعت کی کیونکہ ؏ بد انرا بہ نیکاں بہ بخشد کریم (اللہ تعالیٰ بروں کو

نیکوں کے ساتھ بخشدیں گے) جماعت میں نیک بھی ہوتے ہیں ان کی نماز غالباً قبول ہو گی۔ اور بروں کی نماز بھی چونکہ نیکوں کے ساتھ ہیں اس واسطے وہ بھی قبول ہو جائے گی۔ اس کی ایک فقہی نظیر ہے وہ یہ کہ اگر متعدد اشیا ایک سودے سے خریدی جائیں تو یا سب واپس کی جاتی ہیں۔ یا سب رکھی جاتی ہیں اور جو ہر ایک کا الگ الگ سودا ہوتا ہے تو معیب کو واپس کر سکتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ بھی بندوں سے یہی معاملہ کرتے ہیں۔ اس لئے جماعت مشروع فرمائی۔ کیونکہ یہ تو مستبعد ہے کہ سب کی نمازیں واپس فرمائیں تو سب ہی کو قبول فرمالیں گے۔ البتہ اس میں ایک یہ شبہ رہ گیا کہ جماعت تو صرف فرضوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ تو اس جماعت کے ذریعہ قبول ہو گئی مگر سنت باقی رہ گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تابع ہمیشہ اپنے متبوع کے حکم میں ہوا کرتا ہے سنتیں تابع ہیں فرضوں کی وہ بھی فرضوں کے ساتھ قبول ہو جائیں گی جیسے کہ کوئی شخص گائے بھینس خریدے تو اس کے رسّے وغیرہ بھی گو وہ کیسے ہی بوسیدہ ہوں لے لیتا ہے۔ غرض انضمام واقتران کے یہ فوائد ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اعمال دنیویہ بھی نیت خیر رکھے گا تو اس کو ضرور ثواب ملے گا۔ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی اپنے مرید کے گھر گئے۔ وہاں اُن کے گھر روشندان دیکھا۔ پوچھا یہ کیوں رکھا ہے اس نے جواب دیا روشنی کے واسطے انہوں نے فرمایا کہ روشنی تو بدون نیّت روشنی کے بھی آتی اگر اس کے رکھنے میں یہ نیّت کر لیتا کہ اس میں سے اذان کی آواز آیا کرے گی تو تجھے اس کا ثواب بھی ملتا اور روشنی تو خود ہی آجاتی مطلب یہ ہے کہ نیت صالحہ رکھنے سے سب اعمال دنیوی بھی قابل ثواب بن جاتے ہیں۔ پس ایسی دنیا منافی دین نہیں۔ پس ایسا دنیا دار بھی دیندار ہی ہے اور پہلے معنی کہ دنیا دار کوئی مسلمان نہیں تو سب مسلمان دیندار ہی ہوئے اور دو قسمیں بنکر کوئی فرق نہیں ہوا یہ دیندار دنیا دار کا فرق بوجہ جہل بالاحکام کے ہم نے تراش لیا ہے اور جب فرق نہ ہوا تو کیا وجہ ہے کہ دستور العمل الگ الگ رکھا جائے۔ یہ بات جدا رہی کہ حالت عذر ضرورت میں کسی کے لئے کچھ تخفیف کر دی جائے سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دستور العمل ہر ایک کے واسطے الگ الگ تجویز کیا جائے دستور العمل تو ایک ہی

رہیگا مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ سمجھے جائیں گے بس یہ تو طے ہو چکا کہ دستور العمل سب کا ایک ہے مگر عوام کا ایک شبہ اور وسوسہ اور رہ گیا کہ شاید اس دستور العمل کا نفع مشروط ہو فہم کے ساتھ اور وہ مخصوص ہے خواص کے ساتھ تو ہم کو اُس پر چلنے سے کچھ نفع نہ ہوگا سو یہ خیال اور عذر بھی درست نہیں کیونکہ نفع اعمال کا علی حسب استعداد رب کو ہوتا ہے جیسے متنجن کھانے سے اُس شخص کو لذت ہوگی جو اس کی حقیقت اور اجزا سے واقف اور ماہر ہے ایسے ہی وہ شخص بھی متلذذ ہوگا جو متنجن کی حقیقت سے بالکل واقف نہ ہو اور اسی طرح اس کا نفع قوت وغیرہ بھی جس طرح اس پہلے شخص کو ہوا ہے اسی طرح اسکو بھی حاصل ہوگا ایسا ہی خیال کرنا چاہیئے کہ اعمال حسنہ کے نفس منافع اور برکات سب کے لئے عام ہیں ۔ ع ادیم زمین سفرۂ عام اوست (روئے زمین اس کا عام دستر خوان ہے) البتہ خواص کے لئے بوجہ زیادہ فہم کے ایک خاص زائد لذت ہوگی اور آخرت میں بھی اس کا ثواب اصل عمل کے ثواب پر زائد ملے گا مگر اصل مقصود میں عوام و خواص سب شریک ہیں اب وہ دستور العمل بیان کیا جاتا ہے اتفاق سے وہ ضروری ہدایات جو اس مبحث کے مناسب ہیں ان آیات میں پورے طور پر جمع ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے یا ایھا المزمل قم الیل الا قلیلا نصفه او نقص منه قلیلا او زد علیه الآیۃ ہرچند کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل ہے اور مزمل معنی ہیں چادر اوڑھنے والا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو چاہتے تھے کہ یہ کمبخت ایمان لے آئیں تاکہ نار جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے اُلٹی تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیات الٰہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے اس وجہ سے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم بوجہ شدت غم و رنج و حزن و ملال کے چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے یا ایھا المزمل ندا و خطاب میں فرمایا گیا۔ تاکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک گونہ تسلی ہو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہجوم اعدا اور اُن کے طعن و تشنیع سے پریشان ہو رہا ہو اُس وقت اس کا محبوب خاص اُسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کے ساتھ اس کا تلبس ہے تو دیکھئے اس شخص کو کتنی

تسلّی ہوگی اور اس لفظ کی لذت اس کو کتنی معلوم ہوگی جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت سے ہے ندا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین دی گئی ہے اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض عارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر بھی اسی طرح ارشاد فرمایا ہے کہ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اوپر کہ مثال میں اس شخص کا محبوب اُس کو یہ کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو۔ ہم کو دیکھو دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں۔ آؤ تم ہم سے باتیں کرو۔ یہ کام کرو وہ کام کرو۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تسلیہ بذریعہ وحی کے ہوا۔ مگر امت میں اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات کے ہوتے ہیں اور اس مقام پر لفظ مُزَّمِّلْ کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ سابقاً معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھنے کی وجہ شدت ملال وحزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا۔ جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی وضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غم بوجہ غایت شفقت ورحم کے تھا آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے اس وجہ سے اُن پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الخ (شاید ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دیدیں گے) ۵

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر وشیر

(نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگر شیر اور شِیر لکھنے میں ایک ہی کی طرح ہیں مگر معنوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے)

مگر یہ تو ثابت ہو کہ کامل باوجود کمال عرفان کے لوازم طبعی سے نہیں نکلتا اور یہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر کسی کو اذیت ومصیبت میں تکلیف جو لازمۂ طبعی ہے محسوس

نہ ہو تو صبر کیسے متحقق ہوگا کیونکہ صبر تو نام ہے ناگوار چیز پر ضبط نفس کرنے کا اور جب کسی کو کوئی چیز ناگوار ہی نہ معلوم ہو تو ضبط کیا کرے گا البتہ غلبۂ حال میں محسوس نہ ہونا اور بات ہے لیکن غلبۂ حال خود کوئی کمال کی چیز نہیں۔ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ بیٹے کے مرنے کی خبر سنی تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے بیٹے ابراہیمؓ پر آنسو بہانا ثابت ہے اور یہ فرمانا کہ اَنَا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ہیں تمہاری جدائی میں اے ابراہیم غمگین ہوں) اب اگر کسی ظاہر بین شخص کے سامنے یہ دونوں قصے بیان کر دیئے جائیں اور یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ قصہ کس کا ہے اور وہ کس کا۔ تو ظاہر بات ہے کہ یہ شخص پہلے بزرگ کو جنہوں نے قہقہہ لگایا زیادہ کمال سمجھے گا۔ حالانکہ یہ مسئلہ مسلم و بدیہی ہے کہ ولی کسی حال میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا اور یہ بھی مسلم ہے کہ اولیا کے کمالات انبیا کے کمالات سے مستفاد ہیں سو دراصل ان دونوں قصوں کی حقیقت یہ ہے کہ اس ولی کی نظر صرف حقوق حق پر تھی حقوق عباد۔ اولاد کی اہمیت اس کے قلب سے مستور تھی اس واسطے حقوق عباد کا اثر ظاہر نہیں ہوا جو ترحم کی وجہ سے غم پیدا ہوتا۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر دونوں حقوق پر تھی۔ حقوق حق پر بھی اور حقوق عباد پر بھی اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت سے صبر کیا اور جزع فزع نہیں کیا۔ اور حقوق عباد یعنی ترحم علی الاولاد کی وجہ سے آنسو جاری ہوئے سخت دلی نہیں کی۔ اِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَآءَ اس کی ایک مثال ہے مثلاً آئینہ کے دیکھنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو ضرورت سے خریداری وغیرہ کے صرف آئینے کو دیکھتے ہیں اس کی موٹائی چوڑائی شفافیت پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ یہ مثال ہے محجوبین غافلین اہل صورت کی اور ایک وہ کہ صرف اُس چیز کو دیکھتے ہیں جو کہ آئینہ میں منعکس ہوتی ہے اور آئینہ کو نہیں دیکھتے یہ مثال ہے غیر کاملین مغلوب الحال لوگوں کی یہ غلبۂ حال سے مظہر کو نہیں دیکھتے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ایک وہ جو آئینہ اور صورت منعکسہ دونوں کو دیکھتے ہیں اور دونوں کے حقوق کی رعایت کرتے ہیں اس کو جمع الجمع کہتے ہیں۔ یہ شان ہے انبیاء علیہ السلام اور عارفین کاملین کی کہ حقوق حق کی رعایت کے ساتھ حقوق عباد کی رعایت بھی اُن کے

نصب العین رہتی ہے یہ لوگ جامع ہیں ؎

بر کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام سندان باختن

(ادھر شریعت کا خیال ادھر عشق کا خیال شریعت اور عشق کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

ایسی باریکیوں کے سمجھنے کے واسطے بڑی فہم کی ضرورت ہے ورنہ ظاہر بین تو ناگوار نہ گذرنا زیادہ کمال معلوم ہوتا ہے۔ بہ نسبت ناگوار گذرنے کے۔ اسی طرح دوسری کیفیات وجدانیہ کے تفاضل میں اسی قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے کہ بعض باتیں کمال سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ان میں کوئی نقص خفی ہوتا ہے جیسے مبالغہ فی التواضع کہ بعض دفعہ مقتضی ہوجاتا ہے ناشکری کی طرف کیونکہ اس میں ایہام ہوتا ہے انکار نعمت کا ایسا ہی بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ذکر شغل کیا مگر کچھ نہیں ہوا اور سمجھتے ہیں کہ یہ کہنا انکسار ہے حالانکہ علاوہ ناشکری نعمت ذکر کے اس میں ایک نقصان یہ بھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اپنے ذکر و شغل کو اس قابل سمجھا کہ اس کو قبول کیا جائے اور اس کے صلہ میں ان کو بڑا رتبہ دیا جائے اور یہ کبر ہے۔ یہ نفس کے بڑے بڑے مکر ہیں ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ذکر خود ایک مستقل نعمت ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ سے اگر کوئی خادم اس قسم کی شکایت کرتا تو آپ فرماتے کہ خود ذکر کی توفیق ہونا کیا تھوڑی نعمت ہے جو دوسرے ثمرات کی تمنا کرتے ہو۔ اور اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں۔)

ع۔ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے۔ الخ (مصیبت ہوتی اگر یہ نہ ہوتا)

کسی خادم نے حضرت سے بیان کیا تھا کہ میں نے اب کے چلّہ کھینچا اور روزانہ سوا لاکھ اسم ذات پڑھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا شاید حضرت مجھ سے ناراض ہیں کہ ثمرہ نہیں ملا۔ فرمایا اگر میں ناراض ہوتا تو تمہیں سوا لاکھ پڑھنے کی توفیق ہی کہاں ہوتی۔ اور یہ ثمرات کے طالب ایک اور بہت بڑی غلطی میں ہیں کیونکہ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ ثمرات اصل مقصود

ہیں اور اعمال مقصود بالغرض اور یہ سخت غلطیاں ہیں۔ اعمال خود مقصود بالذات نہیں۔ اور اصل ثمرہ اُن کا حصول رضا دخول جنت دیدار خداوندی ہے۔ افسوس ہے کہ طالب ثمرات عشق میں مجنوں سے بھی کم ہیں وہ تو لیلیٰ کے نام کی مشق کو بڑا مقصود سمجھ رہا ہے مگر یہ لوگ دوسری چیزوں کی تلاش میں ہیں کیا مولیٰ کا عشق لیلے کے عشق سے بھی کم ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابانِ غمش شستہ فرد

ریگ کاغذ بود۔ انگشتاں قلم — مینمودے بہر کس نامہ رقم

گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں

گفت مشق نام لیلے میکنم — خاطر خود را تسلی میدہم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے اور ریت پر انگلیوں سے کسی کو خط لکھ رہا ہے۔ اس نے دریافت کیا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کرکے اپنے دِل کو تسلی دے رہا ہوں)

؎ ہمینم بس کہ داند ماہ رویم — کہ من نیز از خریداران اویم

(یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں۔)

کبھی ثمرات کا قصد مت کرو یہ تو ایک قسم کی مزدوری ہوئی جو کہ عشق و محبت کے سراسر خلاف ہے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

(تو بندگی فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط سے مت کر کہ آقائے حقیقی بندہ پروری کا طریقہ خود جانتے ہیں)

ایک عارف کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں۔ اُنہوں نے اس پر بھی عبادت کو نہ چھوڑا بلکہ بدستور اسی طور پھر عبادت کرتے رہے۔ کسی نے اُن سے کہا کہ جب تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی تو پھر اُس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

لہ یعنی بہ نسبت ان ثمرات خاصہ مطلوبہ کے ۔ ۱۲ منہ

اُنھوں نے کیا اچھا جواب دیا بھائی کہ اگر اور کوئی دروازہ ہوتا تو اس کو چھوڑ کر اُس طرف چلے جاتے جب دوسرا دروازہ ہی نہیں پھر اور کہاں جائیں اور کیا چارہ کریں ؎

توانی ازاں دل بپرداختن ۔۔۔ کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(اس شخص سے دل خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اسکے گذر کر سکتے ہو)

بس معاً غیب سے آواز آئی کہ جب ہمارے سوا تمہارا اور کوئی نہیں تو خیر جیسی کچھ ہے وہی قبول ہے ؎

قبول است اگرچہ ہنر نیستت ۔۔۔ کہ جز ما پناہے دگر نیستت

(قبول ہے اگرچہ تمہارا کوئی اس میں کمال نہیں بجز اس بات کے کہ تو نے کہدیا کہ ہمارے سوا تیری کوئی جگہ پناہ کی نہیں ہے)

عبادت میں بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا ہی اخلاص کے بالکل خلاف ہے وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ -

از خدا غیر خدا را خواستن ۔۔۔ ظن افزونیست کلی کاستن

(خدا کا نام دوسری چیز کے مانگنے کی نیت سے لینا تنزلی ہے اللہ کا نام تو اس واسطے ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوں)

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش ۔۔۔ کہ انچہ ساقی ماریخت عین الطاف ست

(درد و صاف یعنی قبض و بسط تجویز کرنے کا تم کو کچھ حق نہیں جو کچھ ساقی نے عطا کردیا اس کی عین عنایت ہے)

اور اوپر جو بیان ہوا ہے کہ کامل لوازم بشریہ سے نہیں نکلتا اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ طبیعت کا میلان انسانی خواہشوں کی طرف یہ ایک امر طبعی ہے سو طبیعت کا میلان اگر کسی معصیت کی طرف ہو یہ منافی کمال نہیں۔ بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ میلان کو بھی مقبولیت و تقوے کے خلاف سمجھتے ہیں اور پھر جی میں کڑھتے ہیں اور قلب کی ساری توجہ اسی فکر و غم میں مصروف کر دیتے ہیں مثلاً

پہلے کبھی کسی کے ساتھ تعشق تھا پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق توبہ کی عطا فرمائی اور وہ تعلق نہ رہا اب اگر حصول کمال کے بعد کبھی طبیعت کی رغبت اس طرف معلوم ہونے لگی تو پریشان ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ میلان بھی تقوے کے خلاف ہے خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ خود معصیت تو خلاف تقویٰ ہے میلان معصیت اس کے خلاف نہیں۔ میلانِ معصیت بعض اوقات بعد کمال کے بھی زائل نہیں ہوتا اس کے زوال کی فکر فضول ہے۔ ہاں البتہ کاملین اور دوسرے میں یہ فرق ہے کہ کاملین کا میلان غیر ثابت اور مغلوب ہوتا ہے تھوڑے سے تذکرہ سے زائل ہوجاتا ہے جناب باری ارشاد فرماتے ہیں اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا تو وہ یاد میں لگ جاتے سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) اور اس سے پہلے وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے) اور متوسطین اہل سلوک کا میلان ذرا شدید ہوتا ہے دل کو بہت تنگی پیش آتی ہے اور مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے اور مجوبین کا میلان ادھر غالب ہوجاتا ہے اور حقیقت میں کہ اگر میلان نہ رہے تو معاصی سے بچنا کوئی کمال ہی نہیں اور میلان میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور مجاہدہ سے ترقی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کو ان مدارج میں ترقی نہیں ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ متصور نہیں اور بشر میں مجاہدہ بوجہ میلان اور رغبت معاصی کے متصور ہے اس لئے ان کے مدارج میں بسبیل لاتقف عند حد (کسی حد پر نہیں ٹھیرتا) ترقی ہوتی رہتی ہے حکیم ترمذی ایک بزرگ گذرے ہیں جوانی میں ایک عورت اُن پر عاشق ہوگئی تھی اور ہر وقت ان کی تلاش وجستجو میں رہتی آخرکار ایک دن موقع پر ایک باغ میں ان کو دیکھا اور وہ باغ چاروں طرف سے چاردیواری کی وجہ سے بند تھا وہاں پہنچ کر اُن سے اپنے مطلب کی درخواست کی۔ یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے کی غرض سے بھاگ کر دیوار سے کود پڑے۔ اس قصہ کے بعد ایک روز بڑھاپے

کے زمانہ میں وسوسے کے طور پر یہ خیال آیا کہ اگر میں اس عورت کی دل شکنی نہ کرتا اور اس کا مطلب پورا کر دیتا اور پیچھے توبہ کر لیتا تو یہ گناہ بھی معاف ہو جاتا اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی اس وسوسہ کا آنا تھا کہ بہت پریشان ہوئے اور روئے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر خلالے از بہارش کم شود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)

اور اس پر قلق ہوا کہ جوانی میں تو اس گناہ سے اس کوشش سے بچا اور آج اس بڑھاپے میں یہ حال ہے اور یہ سمجھے کہ جو کچھ میں نے اعمال اشغال کئے ہیں وہ سب غارت اور اکارت گئے اس پر حکیم موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ اے حکیم کیوں غم کرتے ہو تمہارا درجہ وہی ہے اور جو کچھ تم نے کیا وہ ضائع نہیں ہوا اور اس وسوسہ کی یہ وجہ تھی کہ یہ زمانہ وسوسہ کا میرے زمانہ سے دور ہو گیا تھا اور اس گناہ سے بچنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ زمانہ میرے زمانہ سے قریب تھا اور قرب عہد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم میں برکت ہے۔ ایک بزرگ اسی وجہ سے باسی روٹی کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قریب ہے اور تازی میں کسی قدر بعد آگیا ہے سبحان اللہ جب قرب عہد نبوت میں یہ برکت ہے تو ارشادات نبوت پر عمل کرنے میں کیسی برکت ہو گی۔ ایک مولوی صاحب کہ طبیب بھی تھے مجھ سے اپنا قصہ بیان فرماتے تھے کہ میں بیمار ہوا بخار تھا۔ ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا آخر کار میں نے اس حدیث کے مطابق جس میں بخار کا علاج غسل سے آیا ہے نہر میں غسل کیا ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد مجھے اور بیماریاں تو ہوئیں مگر بخار کبھی نہیں ہوا۔ ہر چند کہ بعض شراح اس علاج غسل کو غیر مادی بخار کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں مگر اہل عقیدت کے لئے سب اقسام کو عام ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسئلہ طبیہ ہے کہ دوا معین ہے فاعل نہیں۔ سو

اہلِ عقیدت کی طبیعت میں اِس عمل سے قوت ہوگی اور وہ اپنی قوت سے فعل کرے گی حکیم ترمذی کے اِس قصّہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ باوجود میلان کے اُن کو میلانِ معصیت کا ہوا اور ان کے کمال کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رویائے صادقہ میں فرمائی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو شیوخ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز بتلا دیجئے کہ کبھی ہم میں بُرے کام کی رغبت ہی نہ پیدا ہو یہ بالکل غلطی ہے اور منشا اُس کا ناواقفی ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے لوازم بشریہ سے چھوٹ نہیں سکتا۔ کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ وسوسہ یا خیال آ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کسی عورت کے دیکھنے وغیرہ سے اس کی طرف میلان یا وسوسہ معلوم ہو تو اپنے گھر میں بیوی سے رفع حاجت کرے کیونکہ اِنَّ الَّذِیْ مَعَہَا مِثْلُ الَّذِیْ مَعَہَا جو چیز اس عورت کے پاس ہے وہ اس کی بیوی کے بھی پاس ہے) اس علاج سے وہ طبیعت کا میلان دور ہو جائے گا۔ اطبار نے بھی تعشق کا علاج تزوج لکھا ہے۔ اگر خاص معشوقہ سے ہو تو بہت ہی بہتر ہے۔ ورنہ غیر جگہ بھی نکاح کرنے سے دوسرے کے تعشق میں کمی آجاتی ہے۔ باقی تھوڑا بہت میلان تو تمام عمر رہتا ہے۔ اگر اس کے مقتضی پر عمل نہ ہو تو اس کی فکر نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی طرف توجہ کرنے سے اور اس فکر میں پڑنے سے وہ اور بڑھے گا اور تنگی پیش آئے گی اور سالک اس جھگڑے میں پڑ کر مطالعہ محبوب سے غافل ہو جائے گا۔ اور انسان صرف مطالعۂ محبوب ہی کے لئے پیدا ہوا ہے اس کو دوسری جانب اتنی توجہ ہی نہ کرنی چاہیئے اگر ان باتوں کی طرف طبیعت کو نہ لگایا جائے گا یہ آپ سے آپ دور ہو جائیں گی بالخصوص وسوسہ کا تو علاج یہی ہے کہ اُس کی طرف خیال ہی نہ کرے اور اپنی توجہ ذکر کی طرف رکھے اس سے وہ وسوسہ خود بخود جاتا رہتا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وسوسہ کا آنا کوئی نقصان کی بات نہیں ہے اس کی وجہ سے جو تنگی پیدا ہوتی ہے وہ موجب تصفیۂ قلب ہو جاتی ہے اور اس کے دور کرنے میں جو مجاہدہ ہوتا ہے اس سے رفع

درجات ہوتا ہے اور جو بیان کیا گیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے اوپر بدگمانی نہ کرے اور ان باتوں کی طرف زیادہ التفات نہ کرے اور نہ زیادہ موشگافی اور باریک بینی سے کرید کرید کر عیوب کو نہ دیکھے۔ یہ خواص اہل طریق کے واسطے ہے کیونکہ وہ اس طرف لگ کر مطالعۂ محبوب سے غافل ہو جائیں گے باقی عوام کو بے فکر نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر وہ اپنے عیوب کی نگہداشت اس مستعدی سے نہ کریں گے تو اور بڑے بڑے گناہوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اب ندائے یَاۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (اے کپڑوں میں لپٹنے والے) کے بعد احکام کا بیان شروع ہوتا ہے حاصل احکام کا یہ ہے کہ تعلق دو طرح کے ہیں ایک خالق کے ساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے وہ دو قسم کا ہے موافق کے ساتھ اور مخالف کے ساتھ۔ ان ہی تعلقات کے کچھ اعمال و آداب ہیں چند امر بیان ہوتے ہیں۔ اول تعلق خالق کے ساتھ ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی رات) اس میں ایک تو قیام و طاعت۔ ادب تعلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ اقتصاد (میانہ روی) کا اشارہ فرمایا ہے۔ ادب یہ کہ قیام لیل کے لئے وہ وقت مقرر فرمایا گیا جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدہ کی پری کا وقت ہے کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہو اور قیام میں کدورت ہو بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اس میں تشبہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کیونکہ ان کی یہی شان ہوتی ہے کہ نہ بھوک لگے نہ کھانے سے گرانبار رہوں۔ اور نیز رات کے وقت یکسوئی بھی ہوتی ہے اور اقتصاد یہ کے ساری رات کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ اس میں تعب تھا بلکہ کچھ حصہ سونے کے لئے بھی رکھا گیا اور چونکہ ہر وقت اور ہر حالت اور ہر شخص کے لئے ایک مقدار معین نہیں ہو سکتی اس لئے او تخییرہ سے نصف اور ثلث اور دو ثلث میں جو مفہوم ہے اُنْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْهِ (اس نصف سے کسی قدر کم یا نصف سے کچھ بڑھا دو) کا جیسا دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے۔ اختیار دے کر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا کہ اگر زیادہ قیام نہ ہو سکے تو تھوڑا ہی سہی۔ حدیث

میں ہے وَشَیْءٌ مِنَ الْوَجْدِ (کچھ بھی کسی حصہ میں ہو) اس اقتصاد میں ایک یہ بھی مصلحت اور حکمت ہے توسط میں دوام ہو سکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں رہ سکتا۔ اور پہلے یہ قیام لیل کہ مراد تہجد ہے فرض تھا۔ بعد اس کے فرضیت منسوخ ہوکر مستونت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت مؤکدہ ہونا ہے۔ تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہو رہی ہیں بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف آخیر ہی شب میں ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے اس لئے انھوں نے چھوڑ رکھا ہے۔ یاد رکھو کہ اگر اخیر شب میں نہ اُٹھ سکے تو اول شب میں بھی وتر سے پہلے تہجد پڑھنا جائز ہے بعضے یہ سمجھ رہے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہ چاہئے اور سونے سے تہجد جاتا رہتا ہے۔ یہ لوگ اس لئے نہیں اُٹھتے یہ بھی غلطی ہے تہجد کے بعد سونا بھی جائز ہے غرض اہل سلوک کے لئے یہ عمل تہجد کا بھی ضروری ہے اور اگر کبھی قضا ہو جائے تو زیادہ غم میں نہ پڑے تہجد کی قضاؤں میں کر لے اس آیت سے یہی مراد ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ الخ (وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے بنائے اور یہ سب کچھ جو دلائل مذکور ہوئے اس شخص کے سمجھنے کے لئے ہیں جو سمجھنا چاہے) بعض لوگوں کا تہجد اگر قضا ہو جائے تو حد سے زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ اور کراہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا یہ کیا ہوگیا۔ یاد رکھو اتنی پریشانی کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بجائے مطالعہ محبوب کے اپنے مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعہ محبوب کے لئے پیدا ہوا ہے اُس کو غیر میں مشغول نہ ہونا چاہئے۔

ع ماضی و مستقبلست پردۂ خداست (ماضی و مستقبل بندہ اور خدا کے درمیان حجاب ہے۔)

غرض نفس کو پریشانی میں زیادہ مبتلا نہ کیا جائے۔ اور تجربہ ہے کہ بعض اوقات آسانی رکھنے سے نفس خوشی سے کام دیتا ہے اور تنگی اور بوجھ ڈالنے سے پہلا کام بھی چھوٹ جاتا ہے۔ اِس لئے بہت تنگی نہ کرو۔ کہ مزدور خوش دل کند کار بیش (مزدور خوش دل کام زیادہ کرتا ہے)

بعض محققین کا قول ہے کہ ذاکر شاغل کو مرغن کھانا کھانا چاہئے۔ ورنہ ضعف ہو جائے گا۔ اور کسی وقت بیکار ہو جائے گا۔ خوب کھاؤ پیو اور اس سے کام لو۔ البتہ یہ یاد رہے کہ کھانے پینے میں ایسی زیادتی نہ ہو کہ کسل ہو جائے یا بیماری ہو جائے۔ بیمار ہو کر اور خرابی میں پڑ جائے اسی لئے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ اور پیو) کے ساتھ لَا تُسْرِفُوْا (فضول خرچی نہ کرو) پھر فرمایا ہے حضرات اہل بیت میں سے کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ اُن سے کسی نصرانی حکیم نے پوچھا تھا کہ قرآن کو کتاب جامع کہتے ہیں اس میں طب کہ ضروری چیز ہے نہیں ہے۔ فرمایا اصل طب موجود ہے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو) وہ دنگ رہ گیا بطور جملۂ معترضہ کے یاد آگیا کہ غالب جو ایک آزاد شاعر ہے اس نے اپنے مذاق پر یہ شعر کہا تھا ؎

ہم توجب کریں گے شراب وکباب سے
قرآن میں جب آیا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا نہ ہو (کھاؤ اور پیو)

کسی نے کیا خوب جواب دیا ؎

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب
جب آگے وَاشْرَبُوْا کے وَلَا تُسْرِفُوْا نہ ہو

ایسا ہی روحانی تنگی قبض حزن وغیرہ سے بھی پریشان نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس میں بھی تذکیہ نفس ہوا کرتا ہے۔ خاص کر وسوسہ کی طرف تو التفات بھی نہ کرنا چاہئے کیونکہ درپے ہونے سے اس میں اور بھی ترقی ہوتی ہے۔ محقق اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتا اور وسوسہ کے پیچھے پڑنے میں اس کے سوا اور بھی بہت خرابیاں ہیں۔ اسی ایک وسوسہ سے اور شاخیں نکلنی شروع ہوتی ہیں اور رہا غم سو وہ الگ ہے اور غم کی وجہ سے اصل ذکر شغل کا فوت ہونا یہ الگ ہے ایسا ہی استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکر و استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہئے یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جائیے۔ صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کرے ہر گناہ کا نام ضروری نہیں۔

حدیث میں ہے وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ (اور وہ گناہ بھی جن کو آپ مجھ سے زیادہ

جانتے ہیں) اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے اس میں سب گناہ آ گئے اگرچہ یاد نہ آئیں کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا مطالعۂ محبوب سے غافل ہونا ہے۔ البتہ جو خود یاد آ جائے اس سے بالخصوص بھی توبہ کرلے۔ ایک شخص کا ذکر ہے کہ رمی جمار کے وقت وہاں جوتیاں مار رہا تھا اور ایک ایک گناہ گن کر شیطان کو گالیاں دیتا تھا اور مارتا تھا سو یہ لغو ہے۔ ہر ایک گناہ کا نام لینا اور تلاش اور سوچ میں عمر عزیز کو جو دراصل مطالعہ محبوب کے لئے تھی اس سوچ بچار میں کھونا نہ چاہیئے ؎

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست　　　ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

(عمر عزیز مفت ضائع نہ کرنی چاہیئے یہ رشتہ دراز نہیں اس کو مت جلاؤ)

اہل سلوک کو بالخصوص اس کا خیال بہت ضروری ہے کہ مطالعہ محبوب سے غفلت نہ ہو واقعہ میں عارف ہی کی نظر ان امور تک پہنچتی ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی خادم نے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اب کی بیماری کی وجہ سے مدت تک حرم میں حاضر ہونا نصیب نہ ہوا۔ آپ نے خواص سے فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف ہوتا تو اس پر کبھی افسوس نہ کرتا کیونکہ مقصود قرب حق ہے اور اس کے لئے جس طرح نماز حرم ایک طریق ہے اسی طرح اس کے لئے مرض بھی ایک طریق ہے تو بندہ کا کیا منصب ہے کہ اپنے لئے خود ایک طریق معین کرے۔ یہ مربی کے اختیار میں ہے طبیب کی تجویز مریض کی تجویز سے ہزار درجہ زیادہ بہتر ہے ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　کہ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

(درد و صاف یعنی قبض و بسط کی تجویز کا ہم کو حق نہیں ہے جو کچھ عطا ہو جائے ترتیب باطنی کے لئے وہی مصلحت اور وہی عین لطف ہے)

یہ سب بیان تھا قیام لیل اور اس کے آداب کا اقتصاد کے ساتھ۔ اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (قرآن پاک کو ترتیل کے ساتھ پڑھو) ترتیل کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا۔ صحابہؓ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے تھے۔ چنانچہ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آجکل کے صوفیہ کے طریقوں میں سے کونسا طریقہ آپ کے موافق ہے اور اُس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانہ میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز بھی تھا اور اب صرف ذکر پر اکتفا کرلیا ہے مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کے قلوب بہ برکت صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس قابل تھے کہ اُن کو اور قیود کی جو بعد میں حادث ہوئیں ضرورت نہ تھی۔ ان کے قلوب میں صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے خلوص ہو چکا تھا وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کرسکتے تھے اُن کو اذکار کے قیود زائد کی حاجت نہ تھی۔ برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدون اہتمام کے پیدا نہیں ہوسکتا اس لئے صوفیۂ کرام نے کہ اپنے فن کے مجتہد گذرے ہیں۔ اذکار اشغال خاصہ اور اُن کی قیود ایجاد کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بتکرار ورد کیا جاتا ہے اور اُس کے ساتھ ضرب وجہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اور اس کی تاثیر نفس وقلب میں اوقع واثبت ہوتی اور رقت وسوز پیدا ہوکر موجب محبت ہوجاتا ہے اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَاُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدُ الخ (ان لوگوں کو یہی حکم کیا گیا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لئے خاص رکھیں اور مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں اس طرح عبادت کروں الخ وغیرہ من الآیات پس معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ نے یہ قیود ذکر کے بطور معالجہ تجویز فرمائے ہیں اور اصل مقصد وہی اخلاص ہے۔ پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن میں پورا اخلاص پیدا ہوسکتا ہو تو صوفیۂ کرام ایسے شخص کے لئے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

پس اب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ تمام قیود اصلاح وتقویت کے واسطے علاجاً تجویز کئے گئے ہیں کوئی شرعی امر قربت مقصود نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے۔ الحاصل یہ دوسرا

دستور العمل تھا اہل سلوک کے واسطے یعنی تلاوت قرآن۔ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں
اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں) اس کو ما قبل سے
اس طور پر ربط ہے کہ مراد قَوْلًا ثَقِیْلًا (بھاری کلام) سے وحی ہے جو کہ ثقیل تھی اور نماز اور
تلاوتِ کلام مجید کی مزاولت سے قوت احتمال اثقال وحی کی پیدا ہوگی اس لئے پہلے
نماز اور تلاوت کا حکم فرمایا۔ پھر اِنَّا سَنُلْقِیْ الخ میں وحی کا وعدہ کیا اب اس کی تحقیق کہ نزول
وحی کے وقت ثقل معلوم ہونے کا کیا سبب تھا سو یہ امر عقول متوسطہ سے خارج ہے باقی
روایات سے ثقل ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ نزول وحی کے وقت اونٹنی کا بیٹھ جانا اور ایک
صحابی کا یہ قول کہ نزول وحی کے وقت (جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران اُن کی
ران پر تھی) یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری ران بیٹھی جاتی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کو سخت شدت سرما میں بھی نزول وحی کے وقت پسینہ آجاتا۔ اس ثقل کے آثار
روایت میں وارد ہیں اور ان آیات میں کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ
الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (کیا ہم نے آپ کی خاطر سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے آپ کا وہ بوجھ
اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی) یہ شرح صدر اور وضع وزر جو موجب نقض ظہر تھا میرے
نزدیک اسی طرف اشارہ ہے اور آیت لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ الخ (اگر ہم اس
قرآن کو پہاڑ پر اتارتے) اس معنی میں بھی بہت ہی صاف ہے اور نماز اور تلاوت اور ذکر
کی مزاولت اور کثرت سے قوت کا پیدا ہونا اور ثقل وحی کی احتمال کی حماقت
پیدا ہوجانا اس طور پر ہے کہ چونکہ ذکر وغیرہ سے واردات اور فیوض غیبیہ علمی و
عملی قلب پر فائض ہوتے ہیں اُن کے ورود سے قلب میں بتدریج قوت پیدا
ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے شدت و ثقل کا مقابلہ اس کے لئے آسان ہوجاتا
ہے۔ چنانچہ اہل تلوین کا اضطراب اور اہل تمکین کا استقلال اسی وجہ سے
ہے کہ پہلے قلب میں قوت تحمل کی نہ تھی۔ پھر ذکر کی کثرت سے احتمال اثقال
کی طاقت آگئی اور اس شعر میں ان واردات میں سے بعض کا
ذکر ہے ؂

بینی اندر خود علوم انبیا   بے کتاب و بے معید و اوستاد

(اپنے اندر بغیر کتاب و معاون اور استاد کے انبیاء علیہم السلام جیسے علوم دیکھو گے)

اور یہ حالات وارده مختلف قسم کے ہوتے ہیں کبھی ذوق و شوق و سرور وانبساط ہوتا ہے۔ کبھی حزن وانقباض ہوتا ہے۔ بسط کے الگ فائدے ہیں اور قبض کے علیحدہ مصالح۔ اور سب محمود ہیں کیونکہ قبض میں بھی تزکیہ نفس واصلاح عجب ہوتی ہے ؎

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

(جب قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا ملاحظہ کرو خوش و خرم رہو پیشانی پر بل نہ ڈالو)

چونکہ قبض آید اے راھرو   آں صلاح تست آیش دل مشو

(جب تم کو قبض کی حالت پیش آئے وہ تمہاری اصلاح باطنی کے لئے ہے اس سے رنجیدہ مت ہو)

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (بیشک رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے) اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت چونکہ شور و شغب سے سکون ہوتا ہے اور افعال معاش کا بھی وقت نہیں ہوتا اس لئے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اور اس لئے اس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل کو اس سے بہت تاثیر ہوتی ہے اور جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا اثر قوی ہوتا ہے تو گویا اس آیت میں اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ الخ مضمون آیت ما قبل قُمِ الَّيْلَ اور رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ ان اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے لہٰذا قیام لیل و ترتیل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا۔ اور حضور قلب کے متعلق ایک طریقہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مبتدی ہر ہر لفظ پر بتکلف مستقل ارادہ کرے۔ اسی طرح الفاظ پر توجہ رکھنے سے حضور حاصل ہو جاتا ہے اور بعد چندے ملکہ ہو جاتا ہے زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی اور منتہی کو ملاحظۂ ذات سے حضور میسر ہو سکتا ہے ابتداء میں یہ مشکل ہے کیونکہ مبتدی کو غائب کا تصور جمتا نہیں اور منتہی ذات کا ملاحظہ رکھ سکتا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (بے شک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے) پہلے بطور حکمت کے بیان ہوا ہے کہ تہجد اور قرآن مجید پڑھا جائے کیونکہ اس وقت اس کا اثر زیادہ ہوگا اب اس کے علاوہ ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور کام بھی رہتے ہیں ان کی وجہ سے خاص قسم کی توجہ الی اللہ تام نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ وقت شب کا کہ مصروفیت سے خالی ہے تجویز کیا گیا اور وہ کارو بار یہ ہیں۔ مثلاً تبلیغ دین۔ تربیت خلائق۔ حوائج ضروریہ لازمیہ بشریت ہر چند کہ تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے لیکن چونکہ ان میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے لہذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہو سکتی جیسی خاص خلوت میں ہو سکتی ہے یہاں سے بھی اُس اوپر والی بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان باوجود کمال کے بھی لوازم بشریہ سے بالکل نہیں چھوٹ سکتا۔ دیکھئے آیت صاف دلالت کر رہی ہے کہ تہارا کا سبح طویل یکسوئی سے ایک درجہ میں آپ کو بھی مانع ہو جاتا تھا اور چونکہ آپ کے تمام احوال کامل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ خلق کی طرف مشغول ہونا منافی کمال نہیں۔ پس صاحب کمال پر بھی ہر وقت یکساں حالت نہیں رہتی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت حنظلہ رضؓ کا قصہ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہؓ نے اپنے کو اس بنا پر منافق کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ اور حالت ہوتی ہے اور پیچھے کچھ اور اس پر حضرت صدیق اکبر رضؓ نے فرمایا کہ یہ حالت تو ہماری بھی ہے۔ آخر یہ قصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً ایک گھڑی کیسی ایک گھڑی کیسی اور درحقیقت اگر ہر وقت وہی حالت تجلّی کی رہے خود جسمانی ترکیب بھی ٹھیک نہ رہے اول تعطل ہوگا کیونکہ حالت علیہ میں انتظام تغذیہ وغیرہ کا ممکن نہیں۔ پھر اس فنا کی نوبت آجائے گی ولنعم ما قیل ؎

چو سلطان عزت علم برکشد ۔۔۔ جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ ذوق ولذت جب ہی آتی ہے کہ اس حالت میں دوام نہ ہو ورنہ دوام سے عادت ہو جائے گی اور لذت جو بسبب جدت کے معلوم ہوتی ہے نہ رہے گی۔ کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ غلبۂ استغراق میں قصد نہ رہے گا اور بلا قصد کے اعمال کا اجر نہیں اور بلا اعمال قرب نہیں ملتا اور اعمال ہی دنیا میں مقصود ہیں۔ دنیا میں انہیں اعمال کے واسطے بھیجا گیا ہے۔ ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے روح کو خود ایسی حالتیں حاصل تھیں اور حضور دائم میسر تھا مگر اعمال نہ تھے ان کے واسطے دنیا میں بھیجا گیا لہٰذا اعمال اور ان کا اجر امر مہتم بالشان ٹھہرا۔ اس لئے محققین صوفیہ نے فرمایا ہے کہ استغراق میں ترقی نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں سے معلوم ہو گیا کہ تجلّی میں جیسی حکمتیں ہیں ویسی ہی استتار میں بھی ہیں اور یہاں ایک فائدہ قابل غور معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ تبلیغ دین و تعلیم احکام متعدی نفع ہے اور وہ نفع لازمی سے بڑھ کر ہے اس لئے منتہی کو اس کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ ارشاد ہے کہ چونکہ آپ کو دن میں بہت کام رہتے ہیں رات کو تہجد اور ترتیل سے قرآن پڑھا کیجئے اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ (آپ جب فارغ ہو جایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھئے) اس سے یہ ثابت ہوا کہ کامل کو اپنے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے اور بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیئے اور نہ از خود اس کا وہ حال رہے گا نہ دوسروں کو اس سے کامل نفع پہنچے گا کیونکہ بدون خود کئے ہوئے تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ یہی معنے ہیں قول مشہور مَنْ لَا وِرْدَ لَهٗ لَا وَارِدَ لَهٗ (جس کے لئے ورد نہیں اس کے لئے وارد بھی نہیں) کے البتہ یہ غلطی ہے کہ منتہی قطع تعلق کر کے دوام خلوت اختیار کر لے ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(طریقت خدمت خلق کا نام ہے تسبیح مصلیٰ اور گدری کو نہیں کہتے ہیں)

لیکن خود اپنے کو قابل ارشاد نہ سمجھنے لگے۔ البتہ جب شیخ اجازت دیدے تو امتثالاً اس کام کو بھی شروع کر دے اور پہلے سے اس کی نیت کرنا اور ذکر و شغل اس

نیت سے کرنا بھی مضر ہے۔ اور اس نیت کے ساتھ کامیابی مشکل ہے۔ وجہ یہ کہ یہ نیت بڑا بننے کا شعبہ ہے۔ اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ اشتغال بالخلق یاد اُس کو یاد حق سے مانع ہوگا۔ سو اس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں کیونکہ منتہی کی بسبب وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یاد حق سے مانع نہیں ہوتا۔ اور نیز خلق کے ساتھ اُس کا مشغول ہونا بھی بامر حق ہوتا ہے اور اُس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل وعلا ہی ہوتی ہے اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے اُس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق (مخلوق میں مشغول ہونا حق سے مانع نہیں ہوتا) نہیں ہوسکتا بلکہ یہ اشتغال خود حقوق خلق سے ہے۔ اور اس آیت میں سَبۡحًا طَوِیۡلًا بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے اس حق کی طرف اشارہ ہے اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے۔ تصحیح عام۔ تربیت ارشاد لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہئے۔ چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے بیان سے پہلے قُمِ الَّیۡلَ الخ میں حقوق اللہ بیان کئے گئے تھے۔ اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ (اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو) فرمایا گیا ہے۔ تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا۔ اول آخر دونوں جگہ یاد دلایا گیا ہے اور وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ میں اکثر مفسرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہوگیا اور اختلاف اُمَّتِیۡ رَحۡمَۃٌ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) کا ظہور ہوگیا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادۃ اسم کا قول تو موافق حالت منتہی کے ہے اور عدم زیادۃ کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے کیونکہ مبتدی کو خود مسمی اور مذکور کا تصور کم جمتا ہے اس کے لئے یہی کافی ہے کہ اسم ہی کا تصور ہوجائے برخلاف منتہی کے۔ اُس کو ملاحظۂ ذات بلا واسطہ سہل ہے اور حدیث اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ (تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو) میں مشہور توجیہ پر منتہی کا طریق اور اس کی حالت کا بیان ہے اور عام کے لئے حضور کا ایک سہل اور مفید طریق خدا کے فضل سے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ کہ آدمی یہ خیال کرلے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثلاً

فرمائش کی ہے اور میں اس فرمائش پر اُس کو سنا رہا ہوں اس سے بہت آسانی سے حضور میسر ہو جاتا ہے اس کے بعد ارشاد ہے وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (اور سب سے قطع کر کے اس طرف متوجہ ہو جاؤ) اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تبتل کو صرف وَاذْكُرِ اسْمَ کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تبتل سے ارشاد ہوگا مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کے ساتھ مراقبہ ہوا اور ایک یہ کہ تبتل کو مستقل حکم کہا جائے۔ مطلب یہ ہوگا۔ کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کرو بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور حبی سے مغلوب ہو جائے اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک وقت میں دو کام متضاد پیش آئے۔ ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے تعلق کا ہے اور دوسرا غیر اللہ کے تعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا بس یہی معنی ہیں قطع تعلق کے۔ نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے ؎

تعلق حجاب است وبی حاصلی ۔۔۔ چو پیوندہا بگسلی واصلی

(تعلقات غیر اللہ حجاب اور لا حاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کرلوگے تو تم واصل ہوگے)

البتہ اختلاط میں افراط کرنا مضر ہے۔ اس کے آگے فرماتے ہیں کہ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں تو اسی کو اپنے کام سپرد کرنے کے لئے قرار دیتے رہو)

مطلب یہ کہ اللہ پر توکل کرو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سلوک کے لئے توکل کی بھی ضرورت ہے اور یہ ان کا معمول ہونا چاہئے۔ نکتہ اس توکل کی تعلیم میں یہ ہے کہ اعمال مذکورہ بالا کے اختیار کرنے کے بعد حالت میں تغیر تبدل قبض وبسط شروع ہوگا اس میں ضرورت توکل کی ہوگی اس لئے فرماتے ہیں کہ آخر وہ مشرق و مغرب کا رب ہے اس لئے اس نے جو حالت تم پر وارد کی ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہوگی اور ثابت ہے کہ اکثر قبض میں تصفیہ وتذکیہ خوب ہوتا ہے اس لئے تم کو تنگ دل نہ ہونا چاہئے اور خدا پر بھروسہ رکھنا چاہئے اس میں کچھ مصلحت رکھی ہوگی

اور مشرق و مغرب کا ذکر قبض و بسط کی حالت کے کس قدر مناسب ہے، مشرق تو حالت بسط کے مناسب ہے کہ اس میں ظہور ہوتا ہے واردات کا اور مغرب مناسب ہے حالت قبض کے۔ پس مشرق و مغرب کا نمونہ باطن انسان میں بھی پایا گیا۔ ولنعم ما قیل ؎

آسمانہا است در ولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں

در رہِ روح پست و بالاہاست کوہ ہائے بلند و بالا ہاست

(ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں روح (باطن) کے راستہ میں نشیب و فراز کوہ صحرا موجود ہیں)

اور جس طرح مغرب میں آفتاب مستور ہوتا ہے معدوم نہیں ہوتا اسی طرح قبض میں کیفیات سلب نہیں ہوتیں بلکہ مستور ہو جاتی ہیں اور پھر بسط میں گویا طلوع ہو جاتی ہیں حاصل کُل کا یہ ہوا کہ اہل سلوک کے لئے یہاں چند ضروری معمول بیان کئے گئے قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن تبلیغ دین ذکر و تبتل۔ توکل اور چونکہ تعلق خلق کی دو قسم ہیں ایک موافقین کے ساتھ اس کا بیان اشارۃً اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (اور بے شک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے) میں ہوا ہے۔ جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد و تربیت ہے چونکہ موافقین سے تعلق محبت کا ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے تقاضائے حب کی وجہ سے خود بخود ادا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی البتہ مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط و تفریط ہو جاتی اس لئے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے اور ان سے علیحدہ رہیئے اچھے طور پر کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے اُن کی آتش عناد اور بھڑک اُٹھے اور زیادہ تکلیف پہنچائیں۔ ہجر جمیل سے مراد قطع تعلق ہے اس طرح پر کہ قلب میں تنگی نہ ہو پھر جب صبر کی تعلیم دی گئی تو اس کی تسہیل کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی اپنے انتقام لینے کی خبر سُنا کر آپ کی تسلی بھی فرمائی

جاتی ہے کہ وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَۃِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا۔ یعنی مخالفین کے معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیجئے ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا انتقام لیتے ہیں اس لئے بھی مناسب یہی ہے کہ صبر اختیار کیا جائے کیونکہ جب اپنے سے بالا دست بدلہ لینے والا موجود ہے تو کیوں فکر کی جائے خدا تعالیٰ کی اس سنت کے موافق مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسوائی ہو جاتی ہے ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات با درد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(اس دیر مکافات میں بہت تجربہ ہم نے کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے اُلجھا ہلاک ہو گیا)

؎ ہیچ قومے را خدا رسوانہ کرد تا دل صاحبدلے نامد بدرد

(خدا تعالیٰ نے کسی قوم کو رسوا نہیں کیا جب تک اس نے کسی صاحبدل کو رنجیدہ نہیں کیا)

الغرض اہل تصوف کی معمول یہ چند چیزیں ہوئیں جن کا بیان اس مقام پر ہوا قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن۔ تبلیغ دین۔ ذکر تبتل۔ توکل۔ صبر۔ اس لئے اس مجموعہ بیان کو جو کہ اہل تصوف کے معمولات کو بفضلہ حاوی اور شامل ہے سیرۃ الصوفی کے لقب سے ملقب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ میں دو لطیفے بھی معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن والم اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں کہ نظر منتشر نہ ہو اور اس سے قلب منتشر نہ ہو اور جمعیت کے ساتھ ذکر میں لگا رہے۔ دوسرا لطیفہ یہ کہ المزمل کے معنی عام کمبل اوڑھنا بھی ہے تو یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ میں اشارہ ہوگا لقب یَا اَیُّهَا الصُّوْفِیُّ کی طرف کیونکہ لفظ صوفی میں گو اختلاف ہے مگر ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کمبل وغیرہ مراد لیا جائے۔ پس صوفی اور مزمل

متقارب المعانی ہوئے۔ اور اہل تصوف نے یہ لباس اس لئے اختیار کیا تھا کہ جلدی پھٹے نہیں جلدی میلا نہ ہو اور بار بار دھونا نہ پڑے اور بعض اہل شفقت اس خاص وجہ سے بھی یہ شعار رکھتے تھے مستور ہونے کی حالت میں بعض لوگ ان کو ایذا پہنچا کر مبتلائے وبال ہو جاتے تھے اِس لئے انھوں نے ایک علامت مقرر کی جیسے آیت ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ اس کی نظیر ہے بس یہ حکمتیں تھیں اس لباس میں اور اب تو محض ریا وسمعہ کی غرض سے پہنتے ہیں جو بالکل اس شعر کا مصداق ہے ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

(صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست اور بیغش نہ ہو وہ صوفی نہیں اگرچہ خرقہ پہن لے اے شخص! بہت سے خرقہ آگ میں جلانے کے قابل ہیں)

اس لئے یہ اب قابل ترک ہو گیا ہے۔ و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وَسَلٰمٌ علی المرسلین و علی عباد اللّٰہ الصالحین برحمتك یا ارحم الراحمین۔ فقط

چند مفید کتابیں

مسلمانوں کا عروج وزوال

یعنی بیان الامرا ترجمہ اردو تاریخ الخلفاء

اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہوجاتا ہے اس میں امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رض کی خلافت سے لیکر ۹۰۳ھ تک کے شان وحکومت وجاہ و رفعت کا منظر، عدل وانصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولوالعزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے

قیمت مجلد ڈسٹ کور اعلیٰ علاوہ ڈاک خرچہ

شریعت اور طریقت

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے افادات کا انتخاب ہیں، اس میں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات احوال، توجیہات، تعلیمات، مسائل مع دلائل وحقائق سالک کے لئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علمار محققین واولیا کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے۔ قیمت مجلد علاوہ ڈاک خرچ۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اوّل کا

وعظ پنجم ملقب بہ

استخفاف المعاصی

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی
ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد اول کا
وعظ پنجم ملقب بہ

استخفاف المعاصی

این	متے	کم	کیف	ماذا	مزضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
رامپور منہاران برمکان قاضی صاحب	۳ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ بعد نماز عشا	ڈھائی گھنٹہ	کھڑے ہو کر	گناہ کو ہلکا سمجھنے کی مذمت	مولوی نور حسین صاحب پنجابی		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ علیہ وسلم **امابعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قال اللہ تعالیٰ (اٰیت) اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ۔

(جب تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو کسی دلیل سے مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے)

یہ سورۂ نور کی آیتیں ہیں ان میں ایک خاص گناہ کا ہلکا سمجھنے کی مذمت بیان کی گئی ہے وَ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی بھاری بات ہے) اس میں نص ہے یہ قصہ افک کا ہے اس میں تہمت اور بہتان کا بیان ہے اور اس کو ہلکا سمجھنے پر توبیخ ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا خاص اسی گناہ کو جیسا کہ مقتضا سبب نزول کا ہے یا ہر گناہ کا جبکہ وہ کبیرہ ہو ہلکا سمجھنا برا اور مذموم ہے سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تخصیص کسی گناہ کی نہیں کیونکہ سبب نزول سے تو جگہ کی تخصیص ہوا ہی نہیں کرتی۔ رہا شبہ تخصیص کا عظیم سے سو ہر گناہ گو وہ صغیرہ ہو اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہی ہے۔ کیونکہ حقیقت گناہ کی نافرمانی ہے۔ اللہ تعالٰے جل جلالہ کی۔ اور ظاہر ہے نافرمانی گو کسی قسم کی ہو زیادہ ہی بری ہے اور گناہوں کے درجات میں جو چھٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک امر اضافی ہے کہ ایک بہت بڑا گناہ ہے اور دوسرا اس سے چھوٹا ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ بڑے ہی ہیں کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس چھوٹے بڑے ہونے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آسمان دنیا عرش سے تو چھوٹا ہے مگر درحقیقت کوئی چھوٹی چیز نہیں۔ دوسری مثال ناپاکی اور پلیدی کی ہے کہ پلیدی چاہے تھوڑی ہو یا بہت مگر حقیقت تو دونوں کی پلیدی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ جتنی کسی کی عظمت اور احسان ہوتا ہے اتنی ہی اس کی نافرمانی کرنا بری بات ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالٰے کی عظمت اور احسان کے برابر نہ کسی کی عظمت نہ کسی کا احسان۔ تو اس کی نافرمانی سب سے زیادہ بری ہو گی پس وہ اپنی اس حقیقت اور مقتضی کے اعتبار سے عظیم ہی ہو گی اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا جاتا مگر اس جزا کے چند اسباب ہیں بعضے گناہ کو تو صغیرہ سمجھ کر ارتکاب کر لیا جاتا ہے حالانکہ اسی راز کی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ استخفاف گناہ کفر ہے گو چھوٹا ہی ہو غرض خدا تعالٰے کی ہر نافرمانی عظیم ہی ہے اس اعتبار سے

توضیح یہ ہے سمجھنے کے ہر گناہ کو عام ہوئی گناہ کی مثال تو آگ کی سی ہے۔
ایک چنگاری بھی مکان جلانے کے لئے کافی ہے اور بڑا انگارہ بھی۔ پس صغیرہ
چنگاری ہے اور بڑا انگارہ۔ پس عمل کرنے کے لئے یہ پوچھنا کہ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ
شبہ میں ڈالتا ہے کہ اگر کبیرہ ہوگا تو بچیں گے اور اگر صغیرہ ہوا تو خیر ہم ایسے
شخص سے اجازت لیتے ہیں کہ لاؤ تمہارے چھپر میں چھوٹی سی چنگاری رکھدیں
اگر یہ ناگوار ہے تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیسے گوارا ہے وہ چنگاری گو چھوٹی
ہو مگر پھیلتے پھیلتے انگارہ ہی ہو جائے گا۔ اسی طرح آدمی اول صغیرہ
کرتا ہے اور وہ چھوٹتا نہیں اس اصرار سے وہ صغیرہ کبیرہ ہو جاتا
ہے اور زیادہ مدت تک کرتے رہنے سے اُس کو ہلکا ہی سمجھنے لگ جاتا
ہے اور وہ اس جہت سے کبیرہ ہو جاتا ہے یعنی بعضے توبہ کے بھروسہ
گناہ کرتے ہیں اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ گناہ کی جب عادت ہو جاتی
ہے پھر توبہ بھی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ نئے گناہ سے جن کی ابھی لذت
نہیں رچی توبہ کرنا آسان ہے اور عادت والے گناہ سے توبہ بہت مشکل
ہے۔ علاوہ اس کے جب چھوٹے گناہوں سے اجتناب نہیں کیا جاتا
ہے تو طبیعت بے باک ہو جاتی ہے اور دل کُھل جاتا ہے پھر رفتہ رفتہ کبیرہ بھی
ہونے لگتے ہیں جیسے صاف کپڑے کو بارش میں کیچڑ وغیرہ سے بچایا جاتا
ہے اور جب بہت چھینٹے پڑ جاتے ہیں تو پھر دامن کُھلا چھوڑ دیا جاتا ہے
اور وہ کپڑا بالکل خراب ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی گناہ کا معاملہ ہے کہ جس
گناہ کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے وہ پرانا ہو جاتا ہے اور چھوٹتا نہیں۔
مثلاً زمینداروں، کاشتکاروں وغیرہ میں یہ گناہ بمنزلہ عادت ہو گئے
غضب، ظلم، بیع باطل جیسے آم اور بیر کی بیع متعارف اور یتیموں
نابالغوں کے مال میں تصرف دیکھ لیجئے یہ گناہ کس طرح سب بے کھٹکے کرتے
ہیں اور خیال میں بھی نہیں لاتے۔ البتہ شراب نہیں پئیں گے تو یہ تفاوت

اسی عادت کے ہونے نہ ہونے سے ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ عادت ہو جانے سے اصرار و استخفاف بلکہ استحسان کی نوبت آجاتی ہے اس لئے توبہ مشکل ہو جاتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو زبانی جیسے کسی نے کہا ہے ؎

سبحہ در کف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ　　　معصیت را خندہ مے آید بر استغفار ما

(ہاتھ میں تسبیح زبان پر توبہ دل ذوق گناہ سے بھر پور ہے۔ ہمارے گناہ کو بھی ہمارے استغفار پر ہنسی آتی ہے)

چنانچہ ان امور متذکرہ بالا سے توبہ تو کیسی اور الٹے ان امور کے ترک کو خلاف ریاست اور ذلت سمجھتے ہیں اور گناہ سے دل بُرا نہیں ہوتا۔ حالانکہ ایمان کی نشانی یہ ہے اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ (جبکہ تیری نیکی تجھ کو خوش کرے اور تجھ کو اپنی برائی بُری معلوم ہو) غرض توبہ ان وجوہ سے مشکل ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا نہایت حماقت ہے مگر بعض نادان پھر بھی دھوکے میں ہیں اور توبہ کے توقع پر گناہوں پر دلیری کرتے ہیں۔ اس شخص کی ایسی مثال ہے کہ اس کے پاس مرہم ہو اور اُس کے بھروسے وہ اپنی انگلیاں آگ میں جلا لیتا ہو۔ کیا یہ شخص پورا احمق نہیں ہوگا۔ کیا کسی عاقل نے کبھی ایسا کیا ہے جب اس آگ پر دلیری نہیں کی جا سکتی تو دوزخ کی آگ تو اس آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے بلکہ مرہم تو پھر بھی من کل الوجوہ اختیاری ہے اور توبہ گو بظاہر اختیاری ہے مگر مرہم کی طرح من کل الوجوہ اختیاری نہیں کیونکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے۔ اَلتَّوْبَةُ نَدَمٌ (توبہ شرمندگی ہے) جس کو یوں بھی تعبیر کیا ہے وَهُوَ تُحْرِقُ الحشا عَلَى الخَطَا وَتَالَمُ الْقَلْبُ عَلَى الاِثْمِ

(وہ خطا پر اندرونی اعضاء کو جلا دیتی ہے اور قلب گناہ پر متالم ہوتا ہے)

پس توبہ اس سوزش اور جلن کو کہتے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ تالم مقولہ انفعال سے ہے اور وہ اختیار سے خارج ہے۔ البتہ اس پر ایک طالبعلمانہ شبہ

ہوتا ہے کہ جب توبہ امر اختیاری نہیں اور حسب الارشاد وَلَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے) سے غیر اختیاری کی تکلیف دی نہیں گئی تو پھر تُوْبُوْا (تم توبہ کرو) کا امر کیوں کیا گیا اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اختیاری کی دو قسم ہیں ایک وہ جو خود اختیار میں ہو۔ ایک وہ جس کے اسباب اختیار میں ہوں سو توبہ بایں معنی اختیاری ہے کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کا مراقبہ سو اس کے کرنے سے عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ ندامت اور تالم قلب جو حقیقت میں توبہ ہے پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا تُوْبُوْا (توبہ کرو) کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے یا اپنے نفس پر ظلم ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور عذاب کو یاد کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں) مطلب یہ کہ اگر ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کو یاد کرتے ہیں۔ یہاں پر ذکر اللہ میں مضاف محذوف ہے یعنی ذَكَرُوْا عَذَابَ اللّٰهِ اَوْ عَظَمَةَ اللّٰهِ اور واقعی اللہ تعالیٰ کی عظمت ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے یاد رکھنے سے نافرمانی نہیں ہو سکتی اور وہ ہے بھی قابل یاد رکھنے کے۔ پس اس کو دل سے بھلا کر اس کی نافرمانی پر کمر باندھ لینا بڑی بے باکی کی بات ہے بعضے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام کر کے توبہ اور تدارک کر لیں گے حالانکہ ممکن ہے کہ اس کو موانع کے ہجوم سے اتنی مہلت ہی نہ ملے اس لئے اس وقت کے امکان اور فراغت کو غنیمت سمجھو اور جب یہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے عذاب کے مراقبہ کرنے سے توبہ نصیب ہوتی ہے تو اب دوسری بات قابل غور ہے کہ اس مراقبہ کے لئے بھی فرصت اور فراغ کی ضرورت ہے بعض لوگ اس

فراغ کی بھی قدر نہیں کرتے حالانکہ وہ بہت بڑی غنیمت چیز ہے حدیث شریف میں ہے اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ (پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو) اور ان میں سے ایک یہ ہے فَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ (تیری فراغت تیرے مشغول ہونے سے پہلے) مشغول آدمیوں کی حالت میں غور کرنے سے فراغ کی قدر معلوم ہوتی ہے وہ بیچارے ہر وقت بلا میں مبتلا ہیں ان کو کوئی وقت فرصت کا اور ایسے سوچ کا نہیں ملتا بس یہ حالت ہے کہ ع

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد (جو مرتے ہیں مبتلا مرتے ہیں جب اٹھتے ہیں مبتلا اٹھتے ہیں) فراغ کی قدر کے بارے میں خوب کہا گیا ہے ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے | کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر ضرورت بسارے بود | کند کارے از مرد کارے بود

(فراغت عجیب چیز ہے اگر کسی کو حاصل ہو زیادہ کی اس کو طمع نہ ہو ضرورت کے موافق اس کے پاس مال بھی ہو تو اس کو کچھ کرنا چاہئے اپنے اوقات کو ضائع نہ کرے)

اور اسی حدیث شریف میں دوسری چیز ہے کہ صِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ (تیری تندرستی بیماری سے پہلے) تیسری شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ (تیری جوانی تیرے بڑھاپے سے پہلے) نیز حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ اَصْبَحَ اٰمِنًا فِي سَرْبِهٖ مُعَافًى فِي جَسَدِهٖ وَعِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا واقع میں یہی بات ہے کیونکہ اگر زیادہ بھی ہوا تب بھی اس کی تو ہر روز ایک ہے روز کا قوت آئے گا بس اس میں یہ اور قلیل والا بس برابر ہوا ؎

گر بریزی بحر را در کوزۂ | چند گنجد قسمت یک روزۂ
چوں ترا نانی وخرقانی بود | ہر بن موئے تو سلطانے بود

(اگر دریا کو کوزہ میں ڈالے کتنا سماوے مگر ایک دن کی قسمت کا جب تو ایک روٹی اور ایک کپڑا مل جائے تو ہر بن مو تیرا بادشاہ ہے)

چنانچہ اسی زمانہ کے ایک متمول کی حکایت ہے کہ وہ ایک روز اپنے خزانہ کو دیکھنے گیا

جو زیر زمین بڑے مکان میں تھا اور وہ مکان گاہ گاہ کھلتا تھا اتفاق سے اس کو وہاں دیر لگ گئی اور کسی کو خبر تھی نہیں ملازموں نے دروازہ بند کرلیا اور وہ بہت بڑا مکان تھا اور دروازوں کا سلسلہ بڑی دور تک تھا اور یہ اتنی دور تھا کہ وہاں سے آواز باہر نہیں آسکتی تھی الغرض وہ یہودی وہاں جواہرات کے ڈھیروں میں بھوکا پیاسا مرگیا۔ اس وقت کوئی اس سے پوچھتا تو اس کے نزدیک ایک بسکٹ اور پانی کے گلاس کے سامنے سارا خزانہ ہیچ تھا۔ ایسی ہی حکایت ہے کہ کسی بھوکے کو ایک تھیلی ملی کھول کر دیکھا تو اشرفیاں پھینک کر زمین پر ماردی اور افسوس کیا اور کہا کہ اگر یہ گیہوں کے دانے ہوتے تو کچھ کام آتے۔

الغرض فراغ اور صحت اور ضروری سامان خرچ یہ بہت غنیمت چیزیں ہیں۔ یہ ہر وقت میسر نہیں آتیں۔ اس لئے اس کو غنیمت سمجھے۔ اس وقت کی فرصت کو ہاتھ سے نہ دے اور توبہ بہت جلدی کرلے۔ بعضے لوگ اللہ تعالےٰ کی رحمت اور مغفرت کے ناز پر توبہ نہیں کرتے حالانکہ رحمت اور مغفرت کی خبریں اس لئے دی گئی ہیں کہ تائب کو یاس نہ ہو جیسا کہا گیا ہے ؎

باز آ باز آ ہر انچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آجا اگر کافر آتش پرست اور بت پرست ہے تو بھی واپس آ یہ ہمارا دربار ناامیدی کا دربار نہیں ہے اگر سو بار تونے توبہ توڑی ہے تو بھی واپس آجا۔)

اور جرأت اور دلیری کے واسطے نہیں کہ اور دلیر ہو کر گناہ کرو بلکہ احسان اور رحمت خداوندی کی اطلاع کا مقتضا یہ تھا کہ متاثر ہو کر اور بھی طاعت اور فرمانبرداری کرتے نہ کہ اور جرأت اور گستاخی اور نافرمانی کی جائے چنانچہ

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ احسان کرتا ہے تو وہ اور زیادہ محبت و اطاعت کرتا ہے نہ کہ مخالفت و سرکشی۔ رہا یہ اشکال کہ واقعی اس کا مقتضا تو یہی تھا مگر ایک دوسرا مقتضی کہ لذت ہے وہ غالب ہوگیا۔ چنانچہ گناہ میں ظاہر ہے کہ کیسا مزا اور لذت ہے اس کو چھوڑنا اس لئے مشکل ہے سو اگر ادراک صحیح ہو تو یہ اشکال بالکل ٹھیک نہیں کیونکہ گناہ میں جو لذّت ہے اُس کی مثال کھجلی جیسی ہے کہ خود اس میں کوئی لذت نہیں محض مرض کی وجہ سے لذت معلوم ہوتی ہے پھر فوراً ہی سوزش پیدا ہوتی ہے سو یہ دراصل مرض ہے جیسا کہ سانپ کے کاٹے ہوئے کو کڑوا بھی میٹھا معلوم ہونے لگتا ہے سو کسی عاقل کو ایسی لذت علاج سے نافع نہیں ہوتی۔ البتہ حقیقی لذت طاعت میں ہے چونکہ ان لوگوں نے ابھی اعمال آخرت اور پرہیزگاری اور طاعت کی لذت چکھی نہیں اس لئے گناہ اور نفسانی لذّات ان کو مرغوب معلوم ہوتے ہیں۔ آخرت اور پرہیزگاری کی لذت حضرت ابراہیم ادھم رحؒ سے پوچھئے کہ کس طرح اس کے پیچھے سلطنت کی لذّت ترک کردی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ نے اس لذت کے پیچھے لباس شاہانہ ترک کرکے غریبانہ کپڑوں پر کفایت کی اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ کو سلطان سنجر نے ملک نیمروز دینا چاہا اس کے جواب میں یہ شعر تحریر فرمائے ؎

چو چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد — در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من مُلک نیمروز بیک جو نمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجری کا وسوسہ بھی ہو جب سے مجھے نیم شب کی سلطنت ملی ہے میری نظر میں نیمروز کی سلطنت ایک جو کے برابر نہیں)

؎ بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روے — بہ ازانکہ چتر شاہی روز ہاؤ ہوئے

(فراغت سے ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کے اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی داروگیر شاہی سے بہتر ہے)

۵ پس از سی سال معنی محقق شد بخاقانی ۔ کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

رخاقانی تیس سال کے بعد یہ ثابت ہو کہ ایک گھڑی اللہ تعالے کے ساتھ مشغول ہونا بہتر ہے ملک سلیمانی سے)

چونکہ یہ لذات و تنعمات درحقیقت جان کے لئے عذاب ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الخ (سو ان کے اموال اور اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ کو یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں ان کو گرفتار عذاب رکھے) اول تو ان چیزوں کا مرضی کے موافق حاصل ہونا غیر اختیاری اور اگر حاصل بھی ہو گئی تو ان سب مشغولی اور تعلق کی پریشانی اور بے آرامی یہ دوسرا عذاب۔ حقیقت میں آرام تو صرف اللہ تعالے کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (اللہ تعالے ہی کے ذکر سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے) یہ کلفتیں تو گناہ انفسی ہیں اور بعض کلفتیں آفاقی بھی مرتب ہوتی ہیں چنانچہ ان نافرمانیوں کی بدولت طرح طرح کی بیماریاں طاعون وغیرہ وبائی امراض آپس کی نااتفاقیاں وغیرہ ظہور میں آتی ہیں اور ان بیماریوں سے ظاہری اسباب گو کچھ امور طبعیہ ہوں مگر ذنوب ان کے اسباب حقیقیہ اور اصلیہ ہیں اور دونوں میں تعارض نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ سزا تو ہو گناہ کی وجہ سے مگر ظہور اس سزا کا اسباب طبعیہ کے ذریعہ سے ہوا ہو۔ اور چونکہ ذنوب کو ان امراض کا سبب نہیں قرار دیتے اس لئے صرف طبّی علاج کرتے ہیں اصل علاج استغفار ہے وہ نہیں کرتے وہ بھی کرنا چاہئے ۔

چند خوانی حکمت یونانیاں ۔ حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

صحت ایں حس بجوئید از طبیب ۔ صحت آں حس بجوئید از حبیب

صحت ایں حس ز معموری تن ۔ صحت آں حس ز تخریب بدن

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے کچھ دن حکمت ایمانی یعنی معرفت کی بھی تو پڑھو حس جسمانی کو درست کرنا چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور

اگر حس روحانی کی ترقی منظور ہو تو مرشد کامل سے رجوع کرو حس جسمانی سے تو بدن کی درستی ہے اور حس روحانی سے بدن کی تخریب ہوتی ہے)

اور ذنوب سے مصائب کا آنا نصوص سے ثابت ہے مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کئے کئے ہوئے کاموں سے) ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تھے وہ شوخی کرنے لگا فرمانے لگے ہم سے آج کوئی گناہ ہوگیا ہے اس کی وجہ سے یہ ہماری نافرمانی کرتا ہے ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ — کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

(تو بھی حق تعالیٰ کے حکم سے گردن نہ پھیر کہ تیرے حکم سے کوئی گردن نہ پھیرے)

ہر کہ ترسید از حق و تقوے گزید — ترسد ازوے جن و انس و ہر کہ دید

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقوے اختیار کرتا ہے اس سے جن و انسان اور جو شخص دیکھتا ہے ڈرتا ہے)

اس کے مناسب جناب پیر و مرشد حاجی صاحب علیہ الرحمۃ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ پیران کلیر سے واپس ہوتے ہوئے سہارنپور تشریف لائے لوگوں نے آپ کو ایک ایسے مکان میں اتروایا کہ وہاں ایک جن نے سخت آزار پہنچا رکھا تھا حتیٰ کہ وہ مکان بالکل معطل چھوڑ دیا گیا تھا جب حضرت رات کو اٹھے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک آدمی آیا اور سلام کیا اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا حضرت نے تعجب سے پوچھا تم کون ہو کیونکہ مکان بند تھا اس نے عرض کیا میں ایک جن ہوں اور میری ہی وجہ یہ مکان خالی پڑا ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تم کو خدا کا خوف نہیں کہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔ اس نے عہد کیا کہ میں اب تکلیف نہ دوں گا۔ اس کے بعد وہ جن اس مکان سے چلا گیا اور وہ مکان آباد ہو گیا تو یہ اثر جن پر حضرت کی طاعت ہی کا تھا۔

ایک سیرؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمرو ابن العاص نے جب مصر فتح کیا تو ایک بار دریائے نیل خشک ہو گیا لوگوں نے عرض کیا آپ نے فرمایا کہ

کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے اور لوگ ایسے وقت کیا کرتے ہیں عرض کیا کہ یہاں یہ رسم ہے کہ جب دریائے نیل خشک ہو جاتا ہے تو لوگ ایک کنواری لڑکی کو بناؤ سنگار کر کے اس میں ڈال دیتے ہیں دریائے نیل پھر جوش مار کر جاری ہو جاتا ہے آپ نے فرمایا ایسا کبھی نہ ہوگا اور یہ سب مضمون حضرت عمرؓ کو لکھ کر بھیجا حضرت عمرؓ نے اپنا ایک رقعہ دریائے نیل کے نام لکھ کر بھیجا جس کا یہ مضمون تھا کہ اگر تو اپنی خوشی سے چلتا ہے تو ہم کو تیری حاجت نہیں اللہ تعالےٰ کفیل رزق ہے اور اگر خدا کے حکم سے چلتا ہے تو شیطان کے تصرف سے کیوں بند ہوتا ہے۔ اُس کے ڈالتے ہی دریا کو جوش ہوا اور ہمیشہ کے لئے جاری ہو گیا اور وہ بدرسم موقوف ہو گئی یہ برکت صرف اطاعت کی ہے حقیقت میں جو شخص اللہ تعالےٰ کی رضا طلب کرتا ہے اس کے لئے سب باتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ غرض طاعت کا سبب راحت اور معصیت کا سبب کلفت ہونا ثابت ہو گیا آج کل اول تو گناہ کو معصیت کا سبب ہی نہیں سمجھتے اور اگر کوئی سمجھا بھی ہے تو اپنے گناہ کو سبب نہیں سمجھتا دوسرے کے گناہ کو سمجھتا ہے چنانچہ ایسے مواقع پر اپنے گناہ کو نہیں دیکھتے پہلے بزرگوں کی حالت اس کے برعکس تھی حضرت ذوالنون مصری سے لوگوں نے درخواست کی کہ حضرت بارش نہیں ہوتی فرمایا کہ میں سب سے زیادہ گناہ گار ہوں شاید بارش میری وجہ سے نہیں ہوتی میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ اس کے بعد چلے گئے اور بارش بھی ہوئی۔ پس ہم لوگوں کو اپنے گناہوں پر نظر کرنا چاہیے مگر آجکل بجائے گناہ کے اپنی خوبیوں پر نظر ہوتی ہے حالانکہ وہ خوبیاں ہی کیا ہیں اور اس کی خبر نہیں کہ ہمارے ناقص اعمال درگاہِ خداوندی کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتے ہیں تو بس یہ سب محض دعوے اور پندار ہے ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصلِ خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ کا گمان ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہو خواجہ کو بجز غرور کے کچھ حاصل نہیں)

۵ از دست و زبان کہ بر آید کز عہدہ شکرش بدر آید
(ہاتھ اور زبان سے کس کو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے شکر سے عہدہ برآ ہو سکے)

۵ منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت
(یہ احسان مت جتاؤ کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں اس کا احسان مانو تم جیسے کو خدمت میں رکھ لیا ہے)

یہ لوگ اپنے جن اعمال خیر پر نازاں ہوتے ہیں وہ خیر صرف ان کے گمان ہی کے موافق ہے ورنہ حقیقت میں بوجہ خلاف طریق اور بے ضابطہ ہونے کے وہ قابل قبول بھی نہیں مثال کے طور پر یاد آیا کہ ایک شخص بیطور مجھ کو پنکھا جھلنے لگے مجھ کو ناگوار ہوا وہ صاحب تو سمجھتے ہوں گے کہ ہم خدمت کر رہے ہیں اور آرام دے رہے ہیں مگر یہاں اس کے خلاف کلفت اور کدورت ہو رہی ہے اور بعض لوگ اپنے ہی گناہوں کو سبب مصائب کا سمجھ کر طاعت و استغفار میں مشغول ہوتے ہیں مگر اس استغفار اور عبادت میں ابتدا سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب یہ مراد حاصل ہو جائے گی تو اس کو چھوڑ دیں گے مثلاً طاعون کے زمانے میں نماز پڑھتے ہیں مگر اس کے ختم کے ساتھ ہی اس کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یہ تو بالکل دھوکہ کی صورت ہو گئی ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق رابسجودے ونبی را بدرودے
(تم ان لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں)

اسی باب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو دَعَانَا لِجَنْبِہٖ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا (تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی بیٹھے بھی کھڑے بھی) اور جب اس کی تکلیف جاتی رہتی ہے اور سزا تو اس طرز عمل کی سخت ہونا چاہئے تھی مگر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ کَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَآ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّہٗ (گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہیں) اس کی رحمت وعنایت ہے کہ باوجود اتنی خطاؤں اور شوخیوں اور گستاخیوں کے روزی وعافیت ویسی ہی برقرار رکھتے ہیں۔

خدائے راست مسلم بزرگواری و حلم   کہ جرم بیند و ناں برقرار مے دارد
(اللہ تعالیٰ ہی کی بزرگواری اور بردباری مسلم ہے کہ گناہ دیکھتے ہیں اور رزق بند نہیں کرتے)

لیکن فی نفسہ گناہ کا مقتضا کلفت ہی ہے فی الحال بھی فی المآل بھی تو ایسی چیز میں لذت ہی کیا ہوئی تو وہ اشکال رفع ہو گیا اور کوئی عذر گناہ کرنے کا معقول نہ رہا اور ثابت ہو گیا کہ گناہ ہلکا سمجھنے کی چیز نہیں نہ اعتقاداً کہ کفر ہے اور نہ عملاً و حالاً کہ خلاف دین اور خلاف عقل ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومن گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو کہ وہ گرا چاہتا ہے اس لئے اس سے بچتا ہے اور ڈرتا ہے اور منافق گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے ایک مکھی آکر بیٹھی اور اُس کو ہاتھ سے اڑا دیا اس لئے بے دھڑک گناہ کرتا ہے اور ڈرتا نہیں۔
گناہ کا خوفناک ہونا تو بیان ہو چکا اب اس کے تدارک کے لئے ایک طریقہ بیان کیا جاتا ہے جس سے توبہ کرنے کا طریقہ معلوم ہوا اور گناہ سے خوف ہو وہ طریقہ یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت مقرر کر کے اُس میں اُن مضامین کا مراقبہ کرے اور پھر نفس سے محاسبہ کرے چنانچہ اول گناہ کے مفاسد اور مضار کو سوچے اور پھر اُس کے اوپر جو عذاب ہونے والا ہے اس کا خیال کرے پھر یہ دیکھے کہ میں کس کی نافرمانی کرتا ہوں اور اللہ تعالٰے کی نعمتوں کو سوچے اور پھر اپنے معاملہ کو سوچے جو اللہ تعالٰے سے کر رہا ہے پھر نفس سے خطاب کر کے اس کو تنبیہ اور تہدید کرے اس کے بعد موت اور ما بعد الموت کے تمام امور کو سوچے اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ دنیا کی محبت کم ہو گی جو سبب اکثری ہے گناہوں کا۔ حدیث شریف میں ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ (لذتوں کی توڑنے والی یعنی موت اکثر یاد رکھو) مراقبہ کے لئے یہ اشعار نہایت مناسب ہیں۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے   خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی   اس طرف آواز طبل اودھر صدائے کوس ہے

صبح سے تا شام چلتا ہے مئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں ۔ تو تو قید آز کا محبوس ہے

لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف
جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے

مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمت دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

اس مراقبہ کے بعد دنیا کی بھی محبت کم ہو گی اور توبہ بھی ہو گی اور مرض گناہ کا بفضلہ تعالیٰ دور ہو جائے گا ۔ سبحان اللہ شریعت نے کیا علاج تجویز فرمایا ہے اگر امر تکوین سے مبتلائے مرض ہوا تھا تو امر تشریعی سے صحت یاب ہوا ؎

درد از یار ست و درمان نیز ہم
دل فدائے او شد و جان نیز ہم

(درد محبوب کی طرف سے ہے اور علاج اس کا اسی کی جانب سے ہے اس پر دل بھی قربان ہو اور جان بھی)

ملفوظات کمالات اشرفیہ ۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چودہ سو پینتیس ۱۴۳۵ ملفوظات وارشادات کا قابل قدر مجموعہ مجلد ڈسٹ کور

مجموعہ کلیاتِ امدادیہ از شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ ۔ یہ وہ بزرگ ہستی ہیں جن کے بڑے بڑے جلیل القدر خلیفہ مثلاً حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح وغیرہ وغیرہ جیسے ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب عرب پاکستان، ہندوستان کے بہت بڑے شیخ ہیں، یہ ان کا مکمل مجموعہ دس کتابوں پر مشتمل ہے اس مجموعہ میں سلوک و تصوف اور تمام سلسلوں سے تعلق رکھنے والے پیروں اور مریدوں کے لئے بہترین رہنما اور شریعت و طریقت کے بہترین راستے دکھانے والی یہ واحد کتاب ہے اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل دس کتابیں ہیں۔ ضیاء ۱ القلوب، فیصلہ ۲ ہفت مسئلہ، ارشاد ۳ مرشد، مثنوی ۴ تحفۃ العشاق، رسالہ ۵ وحدۃ الوجود غذائے ۶ روح، گلزار ۷ معرفت، رسالہ ۸ درد غمناک، جہاد ۹ اکبر، نالہ ۱۰ امداد غریب ۔ اس کتاب سے کوئی گھر خالی نہیں ہونا چاہیے۔

صفحات ۴۲۲، کاغذ لکھائی اور چھپائی نہایت ہی عمدہ ۔ قیمت صرف علاوہ خرچہ ڈاک ۔

النفائس المرغوبہ فی حکم الدعاء بعد المکتوبہ از مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رح ۔ پاکستان میں چونکہ نماز کے بعد دعا کے عجیب عجیب طریقے رائج ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہیں حضرت مفتی صاحب رح نے احادیث کی روشنی میں دعا کا مسنون طریقہ بتلایا ہے، اور آج کل جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان سب کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ ایک اور چیز جس کی وجہ سے کتاب کی وقعت زیادہ ہوگئی ہے یہ ہے کہ اسکی ایک سو سے زیادہ علمائے کرام نے تصدیق کی ہے، جن میں علمائے دہلی، رنگون، مولمین، مانڈلے، مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری، حضرت مولانا تھانوی رح حضرات علمائے دیوبند، سہارنپور، میرٹھ، مراد آباد، علمائے بریلی، کانپور، اجمیر شریف، ریاست بھوپال، لکھنؤ، مولانا شبلی نعمانی رح ڈابھیل، سورت، راندیر، مولوی احمد رضا خانصاحب بریلوی، علمائے صوبہ بہار علمائے لاہور و دیگر اضلاع پنجاب، مکہ معظمہ کے قاضی القضاۃ، غرض یہ کہ پورے ہند و پاکستان کے بڑے بڑے حضرات علمائے کرام کی اس کتاب پر تصدیقات ہیں، نماز کے بعد آج کل جو بدعت طریقہ کی دعا کرنے کا مساجد میں اختیار کر لیا ہے اس کتاب سے مسنون طریقہ معلوم ہوگا اور انشاء اللہ اس بدعت سے نجات مل جاویگی ۔ قیمت

خط امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خاص شاگرد کے نام، معہ مختصر سوانحعمری امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام صاحب نے اس قدر سبق آموز نصیحتیں لکھی ہیں کہ عام مسلمان اب بھی فائدہ نہ اٹھاویں تو بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ قیمت صرف

شب برأت ۔ شب برات کے فضائل اور شب برات میں کیا مسلمان کو کرنا چاہیے حدیث کے حوالہ سے جمع فرمایا ہے قابل قدر رسالہ ہے ۔ قیمت صرف علاوہ خرچہ ڈاک

ملنے کا پتہ

مکتبہ تھانوی ۔ بندر روڈ ۔ کراچی ۱

ایم اے جناح روڈ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً (رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ ششم ملقب بہ

حقوق المعاشرت

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی؛ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱
ایم ۱۰ اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد اوّل کا

وعظ ششم ملقب بہ

حقوق المعاشرت

این	متےٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۸ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ	تخمیناً ڈھائی گھنٹہ	بیٹھ کر	حقوق و طرز معاشرت	مولوی نورحسین صاحب پنجابی		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم **امابعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم (آیت) یٰاَھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا اَھْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ (آپ فرمایئے کہ اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق کا غلو مت کرو اور ان لوگوں کے خیالات پر مت چلو جو پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور ابھی بہتوں کو غلطی میں ڈال چکے ہیں اور وہ لوگ راہ راست سے دور ہو گئے تھے) **پہلے میں نے ایک**

وعظ میں کچھ حقوق کے متعلق بیان کیا تھا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کتنے حقوق ہیں اور وہ چند ہیں۔ سلام۔ جابۃ الداعی ہر دو معنی کے اعتبار سے یعنی دعوت قبول کرنا اور بلائے تو جواب دینا۔ چھینکنے کے وقت الحمد للہ کہے تو جواب دینا۔ بیمار ہو تو بیمار پرسی کرنا۔ مرجائے تو جنازے میں شریک ہونا یہ تو حاضر ہونے کی حالت کے ہیں اور بعض ایسے حقوق ہیں جو غائب ہونے کے وقت میں مثلاً اس کی غیبت کو دفع کرنا، اس پر کوئی بہتان باندھے اُس کا دور کرنا وغیرہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ ان حقوق کے ضروری آداب کسی موقع پر بیان کروں گا۔ سو ان حقوق کے متعلق بعض ضروری آداب کو آج بیان کرتا ہوں۔

جاننا چاہئے کہ اخلاق اور معاشرت کے بھی کچھ حدود و قوانین ہیں مثل احکام نماز روزے وغیرہ کے جن کی کمی بیشی سے افراط تفریط میں مبتلا ہو کر ادائے حقوق سے آدمی قاصر رہتا ہے۔ پس جس طرح چار رکعت والی نماز پانچ رکعت یا تین رکعت پڑھنے سے ادا نہیں ہوتی اور عصر کی نماز ظہر کے وقت پڑھنے سے نہیں ہوتی یا جیسے رکوع میں قرأت جائز نہیں بلکہ اور گناہ ہے یا جیسے روزہ عصر تک روزہ نہیں ہوتا اور نیز عشا تک روزہ رکھنے سے معصیت لازم آتی ہے اسی طرح حقوق معاشرت واخلاق کے بھی حدود ہیں کہ ان میں کمی بیشی کرنے سے قبیح کا ارتکاب لازم آتا ہے اس لئے ان کے آداب اور حدود کا جاننا ضروری ہے آجکل باہمی برتاؤ کے طرز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احکام معاشرت سے اکثر کو ناواقفی ہے گویا اس کو دین ہی سمجھتے نہیں اس لئے اپنی رائے میں جو آیا کر لیا اس لئے اس کے احکام کی تحقیق بھی نہیں کرتے اور بعض جاننے والے معاشرت اور اخلاق میں کمی اور تفریط کو تو برا جانتے ہیں مگر افراط کو برا نہیں جانتے بلکہ مطلقاً کثرت کو مطلوب اور محبوب سمجھتے ہیں حالانکہ اوپر غلو کے مذموم ہونے سے معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح کمی بری ہے اسی طرح زیادتی بھی بُری ہے مثلاً سلام ہے کہ لوگ اس میں کتنی زیادتی کرتے ہیں کہ ذکر قرآن، خطبہ۔ اذان وغیرہ سب میں آتے جاتے سلام کرتے ہیں مثلاً مشہور ہے

او چھے نے سیکھا سلام نہ صبح دیکھے نہ شام اس قسم کے افراط بھی دین میں پسندیدہ نہیں بلکہ حدود سے تجاوز اور غلو فی الدین ہے جس کو اس آیت لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (اپنے دین میں غلو مت کرو) میں منع فرمایا گیا ہے اس کی مثال نسخے کی سی ہے سمجھنا چاہیے مثلاً طبیب نسخے میں ۲ ماشہ کوئی دوا لکھے تو اگر یہ خیال کر کے کہ یہ چیز جب طبیب نے لکھی ہے تو مفید ضرور ہے زیادہ ڈالنے سے اور زیادہ فائدہ ہوگا کوئی شخص وزن بڑھا وے تو وہ دوا ہرگز مفید نہ رہے گی کیونکہ نفع مقدار خاص کے ساتھ مشروط تھا۔ اسی طرح شریعت جب طب روحانی ہے تو اس کے احکام کی مثال نسخے کی سی سمجھنا چاہیئے تو اس میں کمی بیشی کرنے سے ضرور نقصان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (یہ اللہ تعالیٰ کے حدود ہیں ان سے آگے نہ بڑھو) آداب وحقوق کے بیان کرنے کا وعدہ میں نے کیا تھا اس لئے آج اس کا ایفاء کرتا ہوں کیونکہ یہ بھی ضروری ہے اور ایفائے وعدہ بطور دین کے واجب الذمہ ہو جاتا ہے اور لوگ اس میں بھی سستی کرتے ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات بعض ایسے حقوق کا جو کہ دراصل کم درجہ کے ہیں یعنی بڑے حقوق سے زیادہ شرع نے اہتمام کیا ہے کیونکہ ضروری حقوق کو تو خود ہی لوگ ضروری سمجھ کر ادا کریں گے مگر جن حقوق کو ہلکا سمجھ رہے ہیں ان میں ضرور کوتاہی کریں گے اس لئے ان پر خاص تنبیہ کی جاتی ہے اور یہی نکتہ ہے قرآن میں وصیت کو دین پر ذکر میں مقدم کرنے کا چنانچہ ارشاد ہے مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصٰی بِهَآ اَوْ دَیْنٍ حالانکہ شرعاً تجہیز و تکفین کے بعد سب سے مقدم دین ہے اور اس کے بعد وصیت مگر ذکر میں اللہ تعالیٰ نے وصیت کو اس لئے مقدم فرمایا کہ لوگ وصیت کے باب میں تساہل زیادہ کرتے ہیں اور قرض تو سب ہی کے نزدیک ضروری ہے۔ پھر اس کے مطالبہ میں جبر کرنے والے بھی موجود ہیں اور وصیت فی نفسہ تبرع ہے۔ اس میں جبر کرنے کا کسی کو حق نہ تھا اس لئے وصیت کا ذکر میں مقدم کر کے تنبیہ کر دی کہ دیکھو اس کا بہت بہت خیال رکھنا، خیر یہ ایفائے وعدہ کا ذکر بطور جملہ معترضہ کے ہو گیا

تھا اب آداب۔ اُن حقوق کے بیان کیئے جاتے ہیں ایک سلام ہے کہ یہ کفایہ کے طور پر سنت ہے مگر اُس میں یہ یہ احتیاطیاں کی جاتی ہیں کہ ایک تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ وقت سلام کا ہے یا نہیں بعض اوقات سلام ممنوع بھی ہے مثلاً عبادت کے وقت خواہ وہ ذکر ہو یا قرآن یا نماز۔ سلام ممنوع ہے کیونکہ ایسے وقت سلام کرنا خدا تعالےٰ کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول کرنا ہے اس کی مثال ہے جیسے کوئی شخص حاکم کے پاس بیٹھا ہوا اس سے باتیں کر رہا ہو ایک دوسرا شخص اس کو اپنی طرف مشغول کرنا چاہے کیا یہ خلاف ادب نہ ہوگا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جو شخص مشغول خدا کو اپنی طرف مشغول کرنا چاہتا ہے اَدْرَکَهُ الْمَقْتَ فِی الْوَقْتِ (پہنچتا ہے اس کو غضب الٰہی اسی وقت) ہاں اگر ضرورت شدید آپڑے تو اس وقت ذکر کو چھوڑ کر دوسرا کام کرنا یہ اور بات ہے۔ مثلا نابینا کوئیں میں گرنے لگے تو ایسے وقت میں نماز بھی توڑ کر اس کو بچانا ضروری ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ جیسے ذکر کے وقت سلام ممنوع ہے ایسی ہی کوئی حرکت جس سے دل بٹ جائے ممنوع ہے مثلاً اس کو آگاہ کرنے کے لئے کھنکھارنا کھانسنا یا اس کی عین پشت کے پیچھے بیٹھ جانا کہ اس سے دوسرے آدمی کی طبیعت پریشان ہوتی ہے، اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھ لینا چاہیے۔

آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند

(جو اپنے لئے ناپسند سمجھتے ہو دوسروں کے لئے پسند مت کرو)

بعض لوگ بیٹھ پیچھے بیٹھنے کو ادب سمجھتے ہیں حالانکہ ادب ویسی چیز میں کبھی نہیں ہو سکتا جس میں تکلیف ہو وہ تو بے ادبی ہوئی ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

(وہ جگہ جہاں تکلیف نہ ہو جنت ہے کسی کو کسی سے کوئی غرض نہ ہو)

جو لوگ ایسا کرتے ہیں اگر کوئی شخص ان کے پیچھے اسی طرح آکر بیٹھ جائے

تب حقیقت معلوم ہو جائے۔ بعض نے ان مضامین کے بیان کرنے پر اعتراض کیا کہ تمہارے مزاج میں تو انگریزی انتظام ہے افسوس ہے۔ در مختار تو کوئی انگریزی کتاب نہیں۔ آج تو اس میں سلام کے یہ آداب مذکورہ لکھے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ ذکر کے وقت دوسرے آدمی کو انتظار میں تکتے رہتے ہیں اس سے بھی طبیعت پریشان ہوتی ہے بلکہ اگر انتظار کرنا ہو ایسی جگہ انتظار کرنا چاہئے کہ ذاکر اس شخص کو نہ دیکھے تاکہ اس کا قلب پریشان نہ ہو اور یہ شخص اس کو دیکھ سکے اسی طرح بعض لوگ اور جگہ موجود ہونے کے عین پیٹھ پیچھے نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں سو اول تو یہ مشابہ شرک ہے دوسرے کسی آدمی کو مقید و محبوس کر دینا کہ جب تک یہ سلام نہ پھیریں وہ غریب کہیں جا بھی نہیں سکتا کون عقل کی بات ہے بعضے بخیال فیض لینے کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ سو یاد رہے فیض دینے کی حالت میں نہیں ہو سکتا یہ سخت غلطی ہے کہ تکلیف بھی دیں اور فیض کی بھی تمنا رکھیں۔ یہ واقعی بعضا ادب بھی تکلیف دہ ہوتا ہے تو ایسا ادب خود چھوڑ دینا چاہئے۔

دیکھئے حضرات صحابہ کرام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں اٹھتے تھے چونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے کراہت و ناگواری ہے۔ ادب یہی ہے کہ اپنے بزرگ کی رضا و خوشنودی کی کوشش کرے حتیٰ کہ اگر تصریح یا قرینے سے یہ معلوم ہو جائے کہ راہ میں ان کے ساتھ ہمارے چلنے سے تکلیف ہوتی ہے تو ساتھ بھی نہ جانا چاہیے۔ اسی طرح جوتا اٹھانے سے اگر تکلیف ہو تو جوتا بھی نہ اٹھائے۔

جناب مولانا فتح محمد صاحب مرحوم و مغفور کی حکایت ہے کہ جمعہ کے بعد مسجد سے باہر کو تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے آ کر جوتا لینا چاہا مولوی صاحب نے تواضعاً نہ دیا اس نے اصرار کیا۔ مولوی صاحب نے زور سے پکڑ لیا تو اس شخص نے ایک ہاتھ سے تو مولوی صاحب کا ہاتھ دبایا اور دوسرے ہاتھ سے زور

جھٹکا دے کر چھین لیا دیکھئے کہ اس شخص نے ایک ذرا سے خیالی ادب کے لئے ان بزرگ کو کیسی اذیت اور تکلیف دی اور اس ادب سے بڑھ کر بے ادبی ہو گئی۔ یہ سب ناسمجھی کی باتیں ہیں اور یہ باتیں ہلکی نہیں ہیں اور گو یہ نماز روزہ کی طرح ارکان و شعائر اسلام سے نہیں لیکن اس حیثیت سے کہ اخلاق کا تعلق دوسروں سے ہے اور اس طور پر یہ حقوق العباد سے ہیں اس لئے ان میں خرابی اور افراط تفریط کرنے سے نماز روزہ کی کوتاہی سے بھی زیادہ ان میں مواخذہ کا اندیشہ ہے کیونکہ عبادات تو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں ان میں اگر کچھ کمی ہو تو اللہ تعالیٰ چونکہ کریم ہیں عفو کی امید بعید نہیں مگر حقوق العباد صاحب حق کے ہیں معاف کرانے سے معاف کرنے سے معاف ہوتے ہیں اس لئے ان کی رعایت بھی زیادہ ضروری ہے چنانچہ حدیث شریف میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا وہ قصہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رات کو قبرستان کی طرف لے جانا اور حضرت کا پشت پیچھے جانا مذکور ہے آداب معاشرت کے مہتم بالشان ہونے کے لئے کافی دلیل ہے وہ قصہ یہ ہے کہ ایک رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے مکان سے قبرستان کو تشریف لے گئے اُنھوں نے سمجھا کہ شاید کسی اور بیوی کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ ہوا کہ جاگتی ہیں کیونکہ علم محیط صرف خدائے تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخیال اس کے کہ حضرت عائشہ کی آنکھ نہ کھل جائے آہستہ سے اٹھے اور آہستہ سے دروازہ کھولا اور آہستہ سے بند کیا (ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے کہ سونے والوں کو تکلیف نہ ہو) اور قبرستان کی طرف تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہ رضؓ چونکہ جاگتی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ شاید کسی اور بیوی کے ہاں تشریف لے گئے ہیں یہ بات ان کو بوجہ غایت تعلق و محبت گوارا نہ ہوئی اور دبے پاؤں پیچھے پیچھے ہولیں اور آپ کی شان محبوبیت تو اس درجہ تھی کہ حضرت عائشہ رضؓ کو یا آدمیوں کو تعلق عشق ہوتا ہو تو کیا عجیب ہے جبکہ حیوانات تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بیقرار تھے

حج میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ ذبح کئے ہیں جن میں تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے تھے (اس سے قوت جسمانیہ کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے) اونٹوں کی یہ حالت تھی کہ بیقرار ہوکر اپنی گردنیں جھکاتے تھے اور آپ کی طرف مشتاقانہ بڑھتے تھے کہ ہم کو ذبح کریں۔ حدیث میں ہے کہ کُلُّهُنَّ يَزْدَلِفْنَ إِلَيْهِ (ان میں سے ہر ایک آپ کی طرف جھپٹتا تھا) خوب کہا ہے ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(اس امید پر کہ آپ شکار کو آئیں گے جنگل کے سب ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے)

جب حیوانات کو یہ بیقراری ہو تو حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو تو خاص تعلق تھا ان کی بیقراری کیا عجیب ہے۔ غرضکہ حضرت عائشہ رضؓ پیچھے پیچھے قبرستان میں پہنچیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں اموات کے لئے دعا فرمائی اور اس کے بعد گھر کی طرف لوٹے اور یہ بھی لوٹیں تو اب یہ آگے ہولیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے آگے آدمی دیکھ کر تحقیق کے لئے اس طرف تیز چلنا شروع کیا حضرت عائشہ رضؓ دوڑیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوڑ کر آگے بڑھنا چاہا وہ اور دوڑیں اور گھر آکر بستر پر چپکے سے لیٹ گئیں۔ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو پوچھا کہ سانس کیوں چڑھا ہوا ہے۔ الی آخر الحدیث بعض لوگوں کو ان آداب کی تعلیم بضرورت ذرا سخت الفاظ سے کی جاتی ہے (کیونکہ تعلیم کے لئے بعض حالات و بعض طبائع کے اعتبار سے ذرا سختی کی ضرورت ہوتی ہے) تو برا مانتے ہیں اور اس کو اخلاق کے خلاف سمجھتے ہیں سو جان لینا چاہیئے کہ بے تمیزی کی بات پر تشدد کرنا اور سختی سے تعلیم کرنا اخلاق کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ کی نسبت پوچھا کہ اگر کوئی آوارہ بکری ملے تو کیا کیا جائے آپ نے فرمایا کہ لے لینا چاہیئے ورنہ کوئی اور یا کہ بھیڑیا لے لیگا۔ پھر ایک شخص نے اونٹ کی نسبت بھی یہی سوال کیا تو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ناخوش ہوئے اور تیزی سے جواب دیا اس سے معلوم ہوا کہ غصہ کرنا بے تمیزی پر جائز ہے ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

(سختی اور نرمی ساتھ ساتھ اچھی ہوتی ہے جس طرح فصد کھولنے والا نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے)

پس اصل اصول اخلاق کا یہ ہے کہ بلا وجہ کسی کو تکلیف و اذیت نہ پہنچائے بعضے لوگ گھر پر آکر تقاضے پر تقاضا اور آوازیں دینی شروع کرتے ہیں یہ بھی تکلیف دینا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں ان میں سے اکثروں کو عقل نہیں ہے) پہلے سے سلام کے آداب بیان ہو رہے تھے تو ایک ادب تو مذکور ہوا کہ طاعت و ذکر میں جو شخص مشغول ہو اس کو سلام نہ کرے۔ کیونکہ عاصی کا اکرام جائز نہیں اور ایک ادب یہ ہے کہ حاجت ضروریہ یعنی بول و براز کی حالت میں سلام نہ کرے نیز کھانے پینے کی حالت میں سلام نہ کرنا چاہئے اس وقت اگر جواب دیا تو احتمال ہے کہ گلے میں پھندا پڑ جاوے اس بیان کے ضمن میں بہت آداب اور احکام آگئے پھر سلام کا متمم مصافحہ ہے اس کے بھی چند ضروری آداب بیان ہوتے ہیں سو جاننا چاہیے کہ مصافحہ اول لقاء میں بالاتفاق مسنون ہے اور رخصت کے وقت مختلف فیہ اور ان دو کے سوا تیسرا ثابت نہیں پس اس کے لئے بھی ضوابط و حدود مقرر ہوئے اور اس کی کیا تخصیص ہے ہر چیز کے واسطے خاص ضوابط اور شرائط ہیں کہ بدون ان کے وہ چیز درست نہیں ہوتی مثلاً نماز ہے اگر کوئی چار رکعت کی جگہ پانچ رکعت پڑھنے لگے تو صحیح نہیں ہوگی یا جمعہ حنفیہ کے نزدیک دیہات میں پڑھنے لگے تو نہیں ہوگا یا حج بمبئی جا کر کرے تو نہیں ہوتا اسی طرح ہر امر میں ضابطہ اور قاعدہ ہے چنانچہ مصافحہ معانقہ کے بھی قاعدے مقرر ہیں مثلاً عیدین اور جمعہ میں

جو لوگ محض رسم جان کر مصافحہ یا معانقہ کیا کرتے ہیں کہیں ثابت نہیں اور عیدین اور جمعہ کو اس میں کوئی دخل نہیں اس لئے یہ رسم بدعت ہے اس کو ترک کر دینا چاہیئے اور بتلانیوالے علماء سے ایسے امور میں مزاحمت نہ کرنا چاہیئے کہ صاحب اس کی کیا وجہ ہے یہ کیوں منع ہے کیونکہ دلائل کا سمجھنا آسان ہے اس کے لئے خاص علوم کی بھی ضرورت ہے البتہ احکام بیشک آسان ہیں کہ مسئلہ معلوم کر لو اور عمل کر لو۔ باقی دلائل ہر شخص کے سمجھ میں نہیں آ سکتے مگر عوام کے حال پر افسوس ہے کہ باوجود جہل کے علماء سے مقابلہ کرتے ہیں اصل یہ ہے کہ ان کے دل میں علماء کی وقعت نہیں ورنہ وقعت خود مانع ہوتی ہے مزاحمت سے دیکھو اگر کوئی انجینئر کسی سرکاری عالی شان قیمتی عمارت کے گرانے کا حکم دیدے اور اس عیب و نقصان کی تفصیل نہ بیان کرے تو وہ عمارت فی الفور گرادی جاتی ہے ذرا تامل نہیں کیا جاتا کیونکہ اس کو ماہر و معتبر سمجھ کر اس کی اس تجویز کو باوقعت سمجھا جاتا ہے اور بڑا سے بڑا فاضل دل میں یوں جان لیتا ہے کہ جس بات کو انجینئر کی عقل اور نظر معلوم کر سکتی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آ سکتی افسوس علماء کو اتنا بھی نہیں سمجھا جاتا جتنا انگریز ڈاکٹر اور انجینئر کو سمجھتے ہیں۔ احکام کا آسان اور دلائل کا مشکل ہونا ایسا ہے جیسا اقلیدس کا یہ دعویٰ سمجھنا تو چنداں دشوار نہیں کہ مثلث کے تین زاوئے مل کر تین قائموں کے برابر ہوتے ہیں مگر اس کی دلیل ہر شخص کو آسان نہیں بجز اس کے جو اس کے مبادی جانتا ہو۔ بعض اس سے بڑھ کر شریعت میں ترمیم کی رائے دیتے ہیں اگر ایسی رائے دینے والوں کی باتیں مانی جاویں تو شریعت تو تمام مٹ کر رہ جائے اور بجز کفر و دہریت کے اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے ان رائے دہندگان کی بالکل ایسی مثال ہے ؎

گربہ میر و سگ وزیر موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(بلی حاکم کتا وزیر اور چوہا دیوان ہو تو ایسے اراکین سلطنت ملک کو ویران کردیں یعنی نااہلوں سے ملک برباد ہو جاتا ہے)

مسلمان من حیث مسلمان کا مشرب تو احکام الٰہیہ میں یہ ہے ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو   نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

افسوس یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ وکیل سے قانون اور دفعہ پوچھی جاوے تو معقول ہے مگر بناء قانون دریافت کرنا محض غیر معقول ہے اول تو اکثر وکیل جانتے ہی نہ ہوں گے اور جو جانتے ہیں وہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا فرض منصبی قانون بتلانا ہے نہ کہ علت قانون اگر بناء قانون کی تحقیق منظور ہے تو واضعان قانون سے جا کر پوچھو اور تبدیل قانون کی رائے دینا اور اس میں بحث وگفتگو کرنا تو صریح انکار حکومت ہے افسوس حکومت دنیویہ کے قانون میں تو یہ مداخلت ناجائز سمجھی جاوے مگر شریعت کے احکام میں مداخلت کو سہل سمجھا جاوے حکیم، ڈاکٹر، سول سرجن جب کوئی نسخہ تجویز کرتا ہے اُس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ نسخہ کیوں تجویز کیا ہے اس کی وجہ اور علت کیا ہے مگر علماء سے علتیں پوچھی جاتی ہیں اور حجتیں نکالی جاتی ہیں اصل یہ ہے کہ وہاں تو اصلاح اور شفا مقصود ہے اور یہاں یہ مقصود ہے نہیں ورنہ اطباء روحانی کے نسخہ کو بعد تحقیق ان کے طبیب ہونے کے بے چون وچرا پی جاتے ان کے دلوں میں خود احکام ہی کی وقعت اور عظمت نہیں بلکہ احکامِ خداوندی کو کھیل بنا رکھا ہے احکام کا حال رسم ورواج کا سا سمجھتے ہیں کہ ان میں حسب مصلحت تغیر وتبدل ہوا کرتا ہے ؂

سحر را با معجزہ کردہ قیاس   ہر دو را بر مکر پنہادہ اساس

(سحر اور معجزہ کو یکساں سمجھا اور دونوں کو مکر اور نظر بندی پر مبنی قرار دیا)

احکام کے دلائل سمجھنا محققین کا کام ہے اور محقق ہونے کے لئے خاص اسباب وآلات کی ضرورت ہے اور جو آدمی درجہ تحقیق پر پہنچنے کی ہمت نہ رکھتا ہو اُس کو محققین کی تقلید اور اتباع کرنا چاہئے اور اگر نہ محقق ہوا نہ مقلد تو عنقریب

وہی حالت ہو گی جیسا ارشاد فرمایا ہے وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ الخ (اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں نہ ہوتے) اب مصافحہ کے متعلق عرض کرتا ہوں بعض وقت مصافحہ کرنے سے دوسرے آدمی کو بار ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ایک ہاتھ میں جوتا ہے دوسرے ہاتھ میں چھتری ہے اب مصافحہ کیسے کرے بجز اس کے کہ جوتے کو رکھے تو خود اس کی تکلیف دینا یہ امر غیر معقول ہے اسی طرح جو آدمی کام میں مشغول ہو اس سے مصافحہ نہ کرنا چاہئے اس سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور حرج بھی ہوتا ہے اسی طرح جو شخص تیز چلتا ہو اس کو مصافحہ کے لئے محبوس رکھنا مناسب نہیں کیونکہ اس میں دوسرے ضروری کام کا حرج ہوتا ہے اس لئے تنگی ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض آدمیوں کی عادت ہے کہ مجلس میں پہنچکر سب آدمیوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور اگر وہ لوگ کسی شغل میں ہوں تو اتنی دیر تک سب بیکار ہو جاتے ہیں اور اس سے تنگی ہوتی ہے اسی طرح اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بعد وعظ واعظ سے ضرور مصافحہ کرتے ہیں سو اول تو یہ بدعت ہے اور پھر تکلیف بھی ہے جس بات میں دوسرے کو تکلیف ہو وہ نہ کرنا چاہئے مثلاً اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سفارش کرنے سے دوسرے آدمی پر بوجھ ہوگا تو ایسی سفارش نہ کرے بعض دفعہ سفارش پر عمل کرنا اس آدمی کی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے اور سفارش کنندہ کے لحاظ اور دل شکنی کی وجہ سے اپنی مصلحتوں کے خلاف پر اس کو مجبور ہونا پڑتا ہے اور اب سفارش کنندہ تو اس خیال میں مست ہیں کہ ہم نے فلاں کی حاجت روائی کر دی۔ مگر اس کی خبر نہیں کہ بلا وجہ اور ناحق دوسرے آدمی پر بوجھ ڈال کر اس کی مصلحتوں کا خون کیا ایک نیکی کے لئے جو کہ واجب بھی نہ تھی مفت میں کئی برائیاں ذمہ لیں اکثر لوگ ایک مصلحت تو دیکھ لیتے ہیں کہ ایک آدمی کو نفع پہنچ گیا مگر ان مضرتوں اور کلفتوں کو نہیں دیکھتے جو دوسروں کو پہنچیں حَفِظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءُ (ایک چیز تجھے یاد رہی اور بہت چیزیں تجھ سے غائب ہو گئیں

اگر سفارش کی ضرورت ہو تو اس میں صاف ظاہر کر دینا چاہیئے کہ تمہاری مصلحت کے خلاف نہ ہو تو یہ کام کر دو ورنہ خیر تاکہ دوسرے آدمی پر بوجھ نہ پڑے دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ سے مغیث کی سفارش کی ان کو نکاح میں قبول کرلو بریرہؓ چونکہ جانتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفارش میں بوجھ نہیں ڈالتے اس لئے انھوں نے پوچھا کہ آپ حکم فرماتے ہیں یا سفارش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں حکم نہیں دیتا سفارش کرتا ہوں اس پر بریرہؓ کو چونکہ معلوم تھا کہ آپ اس سے ناخوش نہ ہوں گے انھوں نے صاف انکار کر دیا تو پس سفارش ایسی ہونی چاہیئے کہ دوسرے پر بوجھ نہ پڑے بلکہ صاف کہدے کہ اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو کر دیکھ زور نہیں ڈالا جاتا ہے کہ صاحب یہ کام آپ کو ضرور کرنا ہوگا۔ افسوس ہم نے سب طریقے اور معاملات اور طرز معاشرت وغیرہ کو بدل دیا ہے کس کس چیز کی اصلاح کی جاوے۔ مثل اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل ہے سیدھی۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تمام بدن پر داغ ہی داغ ہیں کہاں کہاں پھایہ رکھا جائے)

یہ ایسا وقت ہے کہ ان سب خرابیوں کو دیکھ کر زبان پر یہ شعر آجاتا ہے

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے وہ ذات جو یثرب میں آرام فرما ہے اٹھ کر مشرق و مغرب خراب ہوگئی)

غرض اس بات کا خیال رکھے کہ جو کام کلفت دہ ہو وہ نہ کرے مثلاً دعوت تو کم آدمیوں کی کی اور زیادہ آگئے یہ مرض بھی کچھ ایسا عام ہو رہا ہے کہ لوگ اکثر شادی بیاہ میں اس کی پرواہ نہیں کرتے خواہ اہل خانہ کے ہاں اتنا سامان بھی نہ ہو۔

ایک ظریف آدمی تھے انھوں نے جو دیکھا کہ شادی بیاہ وغیرہ عام دعوتوں میں ایک ایک دو دو کو ضرور ساتھ لے جاتے ہیں انھوں نے کیا دل لگی کی ایک دفعہ جو دعوت میں گئے تو ایک بچھیڑے کو بھی ساتھ لیتے گئے اور جب کھانا رکھا جانے لگا تو انھوں نے بچھیڑے کے حصہ کی بھی رکابی رکھوائی لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے انھوں نے کہا بھائی اور لوگ اپنی اولاد کو لاتے ہیں میرے کوئی اولاد نہیں میں اس کو عزیز رکھتا ہوں میں اس کو لایا غرض سب شرمندہ ہوئے اور اس رسم کو موقوف کیا گیا۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دعوت میں ایک آدمی ویسے ہی چلے گئے آپ نے مکان پر پہنچکر صاحب خانہ سے صاف فرمادیا کہ یہ ایک آدمی ہمارے ساتھ ہولیا ہے اگر تمہاری اجازت ہو تو آوے ورنہ چلا جاوے۔ صاحب خانہ نے اس کو اجازت دیدی اور وہ شریک ہوگیا۔ رہا یہ شبہ کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے اُس نے اجازت دیدی ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے امور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس قدر آزادی دے رکھی تھی کہ جس کا جی چاہتا قبول کرتا تھا اور جس کا جی چاہتا انکار کردیتا تھا۔ چنانچہ حضرت بریرہؓ کا قصہ آپ نے ابھی سُنا ہے۔

ایک قصہ اس سے بڑھ کر سنئے مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ ایک فارسی شخص نے کہ شوربا عمدہ پکاتا تھا۔ شوربا پکا کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی آپ نے فرمایا بشرطیکہ عائشہ رضہ کی بھی دعوت کرو تو قبول کرتا ہوں۔ اُس شخص نے عرض کیا کہ نہیں حضرت عائشہ رضہ کی نہیں اُس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری بھی نہیں۔ پھر اُس نے اصرار کیا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی یہی فرمایا اُس نے چند بار

انکار کیا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ کا بوجھ اور دباؤ ہوتا تو وہ انکار کیوں کرتا۔ پھر اپنی خوشی سے اس نے حضرت عائشہ رضؓ کی بھی دعوت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمائی اور یہ جائز ہے کہ دعوت قبول کرنے میں کوئی شرط لگا دے۔ غرض اس قسم کا تکلف اور تکلیف جو آجکل ہم لوگوں میں ہے اُس زمانہ میں نہیں تھا ہم لوگوں نے اپنی حالت خود بگاڑ رکھی ہے اور مذہب اسلام کو غیر قوموں کی نظروں میں ہلکا بنا دیا ہے وہ ہماری حالت کو جو ہم نے خود اپنے افعال سے کر رکھی ہے دیکھ کر غلطی سے مذہب اسلام کو ناقص سمجھنے لگے ہیں اور در اصل ہم ہی نے اسلام کو بدنام کر رکھا ہے اور جس طرح بعض مواقع مذکورہ میں مصافحہ کے موجب اذیت میں اسی طرح کھانے وغیرہ کے وقت مصافحہ کرنا بھی سراسر خلاف تہذیب ہے، ہاتھ تو سالن میں سَن رہا ہے ان کو مصافحہ کی پڑی ہے بعض ایسی بے تمیزی کرتے ہیں کہ ہاتھ میں قارورہ پیشاب کا ہے بس اس کو رکھا اور مصافحہ کرنے لگے یہ بالکل نظافت کے خلاف ہے اگرچہ ہاتھ میں کچھ نہ لگا ہو اصل اس کی حدیث مَنْ مَسَّ فَرْجَہٗ فَلْیَتَوَضَّأْ (جو شخص اپنی شرمگاہ کو مس کرے پس اس کو چاہیے کہ وضو کرے) امام شافعی صاحب رحؒ اس حدیث سے مس فرج کو ناقض وضو قرار دے کر وضو کا حکم فرماتے ہیں مگر ہمارے ائمہ اس کو نظافت پر محمول فرماتے ہیں۔ اور کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ ہاتھ اب قابل نماز کے نہیں استحباباً وضو لغوی یعنے ہاتھ دھونا یا وضو شرعی کر لیا جاوے اور منجملہ حقوق اسلام ایک حقوق اِجَابَۃُ الدَّاعِی پھر دو معنی ہے یعنی ایک معنے یہ کہ مسلمان بھائی کے پکارنے پر جواب دے اس کے بھی آداب ہیں چنانچہ امام یوسف کو امام صاحب نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ اگر کوئی تم کو پیچھے سے پکارے تو جواب مت دو کیونکہ اُس نے تمہاری اہانت کی ہے اس نے تم کو حیوان

چارپایوں کی طرح پیچھے سے آواز دی ہے کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً (اس کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ ایسے جانور کے پیچھے چلا جارہا ہے جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا) اور یہ جواب نہ دینا تکبر نہیں ہے بلکہ ایک شخص کی اصلاح ہے اور واقع میں پیچھے سے آواز دینا کتنی بے تمیزی کی بات ہے کہ کام تو ہمارا اور رئیس اس کو یہ خلاف تہذیب ہے خود آگے بڑھ کر سامنے کی طرف سے آکر بولنا چاہئے۔ دوسرے معنی اجابتہ الداعی کے دعوت قبول کرنے کے ہیں۔ اس کے بھی آداب ہیں بعض آدمی تکبر کی وجہ سے دعوت غریب کی قبول نہیں کرتے یہ تکبر مذموم اور قبیح ہے۔

ایک حکایت یاد آئی ایک مولوی صاحب کی دعوت ایک بیچارے غریب نے کی۔ مولوی صاحب اس کے ساتھ دعوت کھانے جارہے تھے۔ راستہ میں ایک رئیس صاحب سے ملاقات ہوئی۔ رئیس صاحب نے پوچھا مولوی صاحب کہاں تشریف لے چلے مولوی صاحب نے جواب دیا کہ اس سقّہ نے دعوت کی ہے اس کے یہاں جارہا ہوں، رئیس صاحب ملامت کرنے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے تو بالکل ہی بات ڈبودی اور ایسی ذلت اختیار کی۔ مولوی صاحب نے ایک لطیفہ کیا اس سقہ سے فرمایا کہ بھائی اگر ان کو بھی دعوت میں لے چلو تو چلتا ہوں ورنہ میں بھی نہیں چلتا۔ اب وہ سقّہ امیر صاحب کے گرد ہوا اور منت سماجت کرنے لگا اول اول تو بہت عذر کئے مگر خوشامد عجیب چیز ہے پھر اور لوگ بھی جمع ہوگئے اور مجبور کرنے لگے لامحالہ جانا پڑا وہاں جا کر دیکھا کہ غریب لوگ جس تعظیم و تکریم اور محبت سے پیش آتے ہیں وہ امیروں و نوابوں کے یہاں خواب میں بھی

نہیں دکھلائی دیئے تو قائل ہو گئے کہ واقعی راحت عزت اور محبت جو غریبوں سے ملنے میں ہے وہ امیروں سے ملنے میں قیامت تک نہیں اور حقیقت میں غریبی میں جو پریشانی کی حد تک نہ ہو جسقدر دینی اور دنیوی راحت ہے وہ ثروت میں نہیں اور فضیلت الگ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ احْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنَ پس مال کی اتنی ضرورت ہے کہ فاقہ نہ ہو اور پریشانی نہ ہو غرض یہ کہ یہ غریب لوگ اگر دعوت کریں تو صاحب ثروت کو جاہ و تکبر کی راہ سے انکار نہیں چاہیئے باقی یہ کہ ہر جگہ کی دعوت بلا امتیاز اخلاص عدم اخلاص قبول کرے گو زیادہ تحقیق و تفتیش اور کھود کرید کی تاہم ضرورت نہیں مگر تاہم جن لوگوں کے ہاں بظن غالب اکثر آمدنی حرام کی ہے ان کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں جیسا آجکل موروثی زمینوں کی کثرت ہے۔ اسی طرح رشوت کی سو ایسے لوگوں کے ہاں دعوت قبول نہ کرے ہاں اگر غالب مال حلال ہو تو جائز ہے لیکن اگر زجر کے لئے نہ کھاوے تو زیادہ بہتر ہے اسی طرح اگر مجمع معصیت میں دعوت ہو قبول نہ کرے اور اگر اس کے جانے کے بعد فعل معصیت شروع ہو مثلاً راگ باجا جو اکثر شادیوں میں ہوتا ہے تو اگر خاص اس جگہ ہے جہاں پر یہ بیٹھا ہوا ہے تو چھوڑ کر چلا آوے اور اگر فاصلہ سے ہے تو اگر یہ شخص مقتدائے دین ہے تب بھی اس کو وہاں سے اٹھ آنا چاہیئے اور اگر مقتدائے دین نہیں تو خیر کھانا کھا کر چلا آوے اسی طرح جو رسوم خلاف شریعت اکثر شادیوں میں ہوا کرتی ہیں ان ہی سے وہ مجمع مجمع معصیت ہو جاتا ہے وہاں نہ بیٹھے اور

رسوم تو الگ ہیں خود آجکل برات ہی مجمع معصیت ہے اگر کوئی اور خرابی نہ ہو تو یہ خرابی تو ضرور ہی براتوں میں ہوتی ہے کہ براتی مقدار دعوت سے زائد جاتے ہیں جس سے بیچارہ میزبان کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے کہیں قرض لیتا ہے کہیں اور کچھ فکر کرتا ہے غرض بہت خرابی ہوتی ہے پھر ایسے شخص کی نسبت حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ دَخَلَ سَارِقًا وَخَرَجَ مُغِیْرًا ایسی ہی شادی غمی کے موقع پر جو اکثر لوگ تفاخر کے طور پر دعوت کرتے ہیں ان کی دعوت بھی قبول نہ کرنی چاہیئے۔ اسی طرح جو دعوت دین اور اطاعت کا عوض ہو وہ بھی درست اور جائز نہیں جیسے تیجے وغیرہ میں قرآن اور کلمہ درود پڑھ کر اس کے عوض دعوت اور الائچی دانہ اور چنے وغیرہ ملتے ہیں ؎

زیاں میکند مرد تفسیر داں کہ علم و عمل می فروشد بناں

(عالم قرآن نقصان کرتا ہے کہ علم و عمل کو روٹی کے عوض فروخت کرتا ہے)

اسی طرح وعظ کی خاص دعوت یا اجرت بھی ایسی ہی ہے جس کے دل میں کچھ بھی دین کی غیرت اور عزت ہوگی وہ خود ایسی باتوں سے پرہیز کرے گا۔ البتہ واعظ اگر مسافر ہو اور مسافرت کے طور پر کھالیو تو یہ اور بات ہے مگر پھر بھی جہاں پر وعظ ہو اس جگہ سے نہ کھاوے ایسا ہی مرید ہونے کے موقع پر پیر کی دعوت کرنا کیونکہ یہ بالکل صورۃً مبادلہ کی ہے۔ اسی طرح نذر ہدیہ وقت بیعت اور علاوہ اس کے کہ یہ ہدیہ بیعت کے وقت کا مبادلہ کی صورت ہے اس میں کئی اور بھی خرابیاں ہیں مثلاً بعض نادار غربا جو بیعت ہونا چاہتے ہیں وہ بوجہ شرم کے رُک جاویں گے اسی طرح ذلت کی دعوت بھی قبول نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ذلت سے بچنا امر شریعت میں

محمود ہے حدیث شریف میں ہے کہ لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ (مومن کو اپنے نفس کو ذلیل نہ کرنا چاہیئے)
ذلت کی دعوت آجکل زیادہ تر ایک ہے یعنی جو کہ مُردوں کے ایصال ثواب کے لئے دعوت کی جاتی ہے اور طالب علموں اور ملاؤں وغیرہ کو بلایا جاتا ہے بس یہ دعوت ہے کہ اس کے کھانے والے عام لوگوں میں حقیر سمجھے جاتے ہیں چنانچہ کانپور میں ایک دفعہ ایک دعوت میں جاتے ہوئے طالب علموں کی نسبت سُنا کہ خدا خیر کرے کِس کے گھر چڑھائی ہوئی ہے۔ بس اس قسم کی دعوت طعام ذلت ہے اس سے بچنا چاہیئے ؎

بِئْسَ الْمَطَاعِمُ عَیْنَ الذُّلِّ تَکْسِبُھَا فَالْقِدْرُ مُنْتَصِبٌ وَالْقَدْرُ مَخْفُوْضٌ

(وہ کھانے بُرے ہیں ذلت کے وقت تجھ کو حاصل ہوئے ہیں ہانڈی چڑھی ہوئی ہے اور عزت گری ہوئی ہے)

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اہل علم کو اس دعوت سے بچنا چاہیئے جس میں ذلت ہو وجہ یہ کہ اہل علم کی ذلت خود علم کی ذلت ہے قبول کرنے کے لائق صرف وہ دعوت ہے جو محض محبت سے ہو حلال کھاتا ہو نہ اس میں رسم کی پابندی ہو نہ تفاخر اور نہ ریا ہو نہ ذلت ہو بلکہ اس کی بنا محض محبت ہی ہو ایسی ہی ہدیہ میں بھی ہونا چاہیئے۔ بس اس قسم کی دعوت اور ہدیہ مسنون ہے اس کا قبول کرنا سنت کیونکہ صرف محبت سے ہے تَھَادُوْا تَحَابُّوْا (آپس میں ہدیہ دیتے دلاتے رہو آپس میں محبت بڑھاتے رہو)
حدیث شریف ہے باقی رسم کے طور پر جو کچھ دیا جاتا ہے مثلاً شادی کے جوڑے وغیرہ اس میں محبت کا نام بھی نہیں ہاں اگر محض محبت سے بلا قید و پابندئ رسوم ہو تو جائز ہے بلکہ ایسا ہدیہ کھانے سے

دل میں نور پیدا ہوتا ہے اور منجملہ ان حقوق کے جو ایک مسلمان کے دوسرے پر ہیں عیادت یعنی بیمار پرسی ہے اس کے بھی آداب ہیں ان میں بھی افراط تفریط ہو رہی ہے چنانچہ بعض آدمی تو سرے سے بیمار کو پوچھنے ہی نہیں جاتے یہ تفریط ہے اور بعض جو پوچھنے جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ بیمار کو ان سے راحت ہوتی یہ اور اُلٹے موجب تکلیف بنتے ہیں مثلاً وہاں جاکر زیادہ دیر تک بیٹھا رہے یہ تکلیف کی بات ہے بیمار آدمی کو مختلف حوائج اور ضروریات ہوتے ہیں اور وہ بیچارہ ان کا لحاظ کرتا ہے اور تکلیف اٹھاتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ عَادَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا فَلْيُخَفِّفْ جُلُوْسَهٗ (جو شخص مریض کی تم میں سے عیادت کردے اس کو چاہیئے کہ مریض کے پاس کم بیٹھے) البتہ تیمارداری اور چیز ہے اس میں بیمار کے پاس ہر وقت بیٹھنا خدمت کے لئے ہے۔ خدمت ہر کسی پر ضروری نہیں مگر دفع اذیت اور راحت سب پر ضروری ہے بعض آدمیوں کی عادت ہے کہ بیمار آدمی کے پاس بیٹھ کر فضول قصے ہانکا کرتے ہیں یا خود اس بیمار ہی سے بیماری کا سارا قصہ پوچھتے ہیں ایسی باتوں سے بیمار کو تکلیف ہوتی ہے ان سے بچنا چاہیئے۔

ع بہشت آنجاکہ آزارے نباشد (وہی جگہ جنت ہے جہاں تکلیف نہ ہو)

ایک ان حقوق میں سے تعزیت و شرکت جنازہ ہے اس کے بھی آداب ہیں مثلاً کندھا دینا، قبر میں اتارنا کچھ پڑھ کر ثواب بخشنا مگر شریعت کے موافق جس سے اس کو نفع پہنچے ورنہ بیکار ہے۔ مثلاً بعض لوگ ایصال ثواب کے لئے میت کے تمام پارچہ جات پوشیدنی دے دیتے ہیں اور تمام ورثہ سے اجازت نہیں لیتے

یا ورثہ نابالغ ہوتے ہیں جن کی اجازت قبل از بلوغ معتبر نہیں سو یہ تصرف میت کے ترکہ میں جو کہ سب ورثہ میں مشترک ہے ناجائز ہے ہاں بعد تقسیم ترکہ جس کا جی چاہے اپنے حصہ میں سے دے سکتا ہے اور ایسے کپڑے وغیرہ اشیائے استعمالی اکثر مساجد اور مدارس میں آتے ہیں لہٰذا مدرسہ اور مسجد والوں کے ذمہ ضروری ہے کہ امور مذکورہ کی تحقیق کرلیا کریں۔ وعظ ختم ہوا اور تمام وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ معاشرت باہمی میں اس کا خیال رہے کہ مردہ اور زندہ سب کو راحت اور نفع پہنچے اور کسی کو مضرت اور تکلیف نہ ہو اور ان امور میں سلیقہ صحبت اہل اللہ سے حاصل ہوتا ہے مگر بعضے لوگ خود بزرگوں کے ہاں جانے میں ایسی بے احتیاطی کرتے ہیں کہ اُن کو تکلیف ہوتی ہے مثلاً جانے کے وقت اپنی فرصت کا تو لحاظ رکھتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ آیا یہ وقت ان کی فرصت کا بھی ہے یا نہیں چاہے وہ وقت اُنکے آرام کا ہو مگر ان کو اُسی وقت جاکر تکلیف دی جاتی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اتنی دیر بیٹھتے ہیں کہ ان کے آرام کا سارا وقت ختم ہوجاتا ہے۔ ان جانے والے بزرگ کا تو کوئی نقصان نہ ہوا مگر اگلے آدمی کو جو اذیت پہنچی وہ کس مد میں ہے۔ سو یہ نہایت بے تمیزی اور حماقت ہے اگر اتفاق سے ایسے وقت جانا ہو تو نہایت اختصار کرنا چاہیئے، تھوڑا بیٹھے۔ ایک شخص حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس عین دوپہر کے وقت آتے تھے اور حضرت کی نیند ضائع ہوتی مگر حضرت اپنی خوش اخلاقی سے کچھ نہ فرماتے ایک روز حضرت حافظ ضامن صاحب شہید علیہ الرحمتہ کو تاب نہ رہی اور اس شخص کو سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ بیچارے درویش رات کو جاگتے ہیں دوپہر کا وقت تھوڑا سا سونے کا ہوتا ہے وہ تم خراب کرتے ہو یہ کس قدر بے انصافی ہے

آخر کچھ لحاظ چاہیئے اور حضرت حافظ صاحب کی یہ تیزی بضرورت تھی بعض اوقات اصلاح اخلاص بجز سیاست اور سختی کے نہیں ہوتی اور کسی کے پاس جانے میں ایک اس کا خیال رکھے کہ اطلاع کر کے جاوے اور عام بیٹھک میں اگرچہ بلا اطلاع جانا جائز ہے اور لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا الخ (گھروں میں داخل نہ ہو) سے مستثنےٰ ہے مگر خاص خلوت کے وقتوں میں وہاں بھی نہ جانا چاہیئے شاید تکلیف ہو یا گرانی ہو حاصل یہ کہ ہر وقت ہر حالت میں اس کا خیال بہت رکھے کہ کسی کو اپنے سے تکلیف اور گرانی نہ ہو۔ فقط

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعواتِ عبدیت جلد اوّل کا

وعظ ہفتم ملقب بہ

الاخلاص

حصّہ اوّل

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمّد عبدالمنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ کراچی ا

ایم۔ اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ ہفتم ملقب بہ

الاخلاص

حصہ اول

این	متے	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
تھانہ بھون جامع مسجد	وسط جمادی الاخریٰ ۱۳۲۵ھ		بیٹھ کر	اخلاص	مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

امابعد: فقد کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی نِیَاتِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ (ترجمہ) حدیث شریف کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نظر نہیں فرماتے لیکن تمہاری نیتوں اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

اُس شے کی تعیین فرمائی ہے جس پر حق تعالےٰ کی نظر ہے گو مخلوق کی نظر نہیں اور اس شے کی بھی تعیین فرما دی جس پر حق تعالےٰ کی نظر نہیں گو مخلوق کی نظر ہے اور صور و اموال کی تخصیص وجہ حالانکہ غیر منظور اور اشیاء دنیویہ بھی ہیں یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان ہی امور کو بیان فرماتے ہیں کہ جن کی ضرورت ہے اور جن میں ابتلا ہے اور جو غیر ضروری امور ہیں یا جس میں ابتلا کبھی نہیں ہوتا ان کو بیان نہیں فرماتے ہیں کیونکہ ایسے امور کے بیان کی ضرورت ہی نہیں چنانچہ یہ کہیں نہیں فرمایا کہ گوبر مت کھایا کرو پیشاب مت پیا کرو اس لئے کہ اکلاً و شرباً ان چیزوں کا استعمال منعاد نہیں ہے۔ البتہ ان میں ابتلاء کی صورۃ یہ ہو سکتی تھی کہ ثوب یا بدن نجاست میں آلودہ ہو جائے سو اس کو تصریحاً بیان فرما دیا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم طبیب ہیں آپ کے تمام خطابات بعینہٖ ایسے ہی ہیں جیسے کہ ایک طبیب کی مخاطبۃ مریض کے ساتھ طبیب امراض جسمانی کا علاج کرتا ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم امراض روحانی کے ازالہ کے لئے تشریف لائے ہیں۔ پس طبیب مریض کو ان ہی اشیاء سے منع کرتا ہے کہ جس میں ابتلاء ہو مثلاً انبہ کی فصل میں انبہ سے منع کرے کہ انبہ مت کھانا اور اگر فصل نہ ہو گی منع کرنے کی ضرورت ہی نہیں اس وقت منع کرنا عبث ہے بلکہ ایسے طبیب کی مثال اس بقال کی سی ہو جاوے گی کہ بقال کی تھالی گم ہو گئی تھی تمام جگہ تلاش کی یہاں تک کہ گھڑے میں بھی تلاش کی کسی نے پوچھا کہ گھڑے میں تھالی کیسے آ سکتی ہے بقال نے کہا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر احتیاطاً دیکھ لینا اچھا ہے۔ شاید اس تقریر سے ایک نہایت کارآمد اور قابل قدر مضمون معلوم ہوا وہ یہ کہ قرآن و حدیث کا اصلی مذاق یہ ہے

کہ اُس میں انہیں اشیاء سے بحث ہے کہ جس میں ابتلاء واقع ہے جیسا طبیب کا معاملہ مریض کے ساتھ اور یہ مذاق نہیں کہ تمام شکوک محتملہ بعیدہ کو دفع کیا کرے جیسا مدرس کا خطاب طلبہ سے ہوتا ہے کہ عبارت میں جس قدر شکوک ہوتے ہیں سب کو دفع کرتا ہے حتیٰ کہ ایسے شکوک کو بھی دفع کرتا ہے کہ ان کی طرف ذہن بھی بمشکل منتقل ہوتا ہے غرض یہ کہ قرآن و حدیث بمنزلہ کتب طب کے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ طبیب کے نہ کہ قرآن و حدیث بمنزلہ کتب درسیہ کے ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ مدرس کے اسی لئے جو لوگ منطق و فلسفہ پہلے پڑھتے ہیں اور ان کا مذاق فلسفی ہوجاتا ہے وہ قرآن و حدیث کو بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں پھر اس میں اشکال پیدا کرتے ہیں اور سمجھنے میں ان کو دقّت واقع ہوتی ہے کیونکہ مذاق ان کا بدل جاتا ہے۔ جیسے کہ ایک مولوی صاحب معقول پڑھ کر ایک محدث کی خدمت میں پڑھنے گئے ترمذی میں حدیث آئی لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ صَلٰوۃً بِغَیْرِ طُھُوْرٍ (حق تعالےٰ بغیر پاکی کے نماز قبول نہیں فرماتے) تو ان مولوی صاحب نے شبہ کیا کہ یہ حدیث تو اس کو بھی عام ہے کہ اگر نماز پڑھ کر کوئی وضو کرے تو چاہیئے کہ وہ قبول ہو تو وجہ اس لغو شبہ کی یہی ہے کہ اُن کا مذاق فلسفہ و منطق سے بدل گیا تھا احتمالات عقلیہ کو گو وہ شرعاً محتمل نہ ہوں حدیث و قرآن میں بھی جاری کرتے تھے۔

حالانکہ شارع کے احکام میں عادات و واقعات پر زیادہ نظر ہے اسی لئے شریعت کو وہ زیادہ سمجھے گا جو عادات ناس سے واقفیت رکھتا ہوگا اس لئے کہ شارع نے ہمارے ان ہی امراض کا جس میں ابتلاء ہے علاج بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس حدیث شریف میں بھی ایسے ہی ایک مرض کا جس میں ابتلاء تھا علاج فرمایا ہے اور وہ مرض یہ ہے کہ مخلوق نے مطمع نظر ایک ایسی شئے کو بنا رکھا ہے جس پر خالق کی بالکل نظر نہیں

اور مطروح النظر ایسی شئے کو بنا رکھا ہے جس پر خالق کی نظر ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس غلطی پر متنبہ کیا جاوے تاکہ علاج کیا جاوے اور اس وقت اس حدیث کے ہمارے اختیار کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرض میں عام طور سے ابتلا ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے زمانہ خیریت نشانہ میں یہ مضمون فرمایا حالانکہ اس وقت غالب خیر تھی تو آیندہ کے لحاظ سے فرمایا کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تو قیامت تک کے لئے سب کے طبیب ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام تمام واقعات شدنی کے متعلق ہیں چنانچہ قیامت تک کوئی مرض کوئی عمل کوئی قول کوئی فعل ایسا نہیں ہوگا جس کے متعلق شریعت میں حکم موجود نہ ہو۔ کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ فرماتے ہیں اُوْتِیْتُ عِلْمُ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ (مجھ کو اولین اور آخرین کا علم دیا گیا ہے) اور فرماتے ہیں اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ وَعَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ (مجھ کو میرے رب نے ادب دیا پس میرا ادب دینا اچھا ہوا مجھ کو میرے رب نے تعلیم دی پس اچھی ہوئی تعلیم میری) اور یہاں سے شریعت کی وسعت معلوم ہوگئی ہوگی کہ شریعت اسلامی کے سوا کوئی قانون ایسا نہیں کہ جس میں تمام واقعات جو قیامت تک ہونے والے ہیں سب کا حکم موجود ہو اگر کوئی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض مسائل کے متعلق لَآ اَدْرِیْ (مجھ کو معلوم نہیں) فرمایا ہے تو جواب یہ ہے کہ لَآ اَدْرِیْ اُس وقت تک تھا کہ جب تک شریعت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اور جب آیۃ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (میں نے آج کے دن تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا) نازل ہوئی اور شریعت من کل الوجوہ مکمل ہوگئی پھر کوئی حکم غیر مبین نہیں رہا سب مبین ہو گئے اور

مبین ہونے کے یہ معنی نہیں کہ بالتخصیص ہر ہر واقعہ کا حکم بیان فرمایا ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ قواعد کلیہ ایسے فرمائے جن سے تمام واقعات کے احکام مستنبط ہوتے ہیں چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے بدن گودنے والے پر جو لعنت فرمائی تو ایک عورت نے دریافت کیا کہ قرآن میں تو یہ حکم ہی نہیں حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر تو قرآن پڑھتی تو اس میں یہ حکم پاتی کیا تو نے قرآن میں پڑھا نہیں مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یعنی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم کو دیں (یعنی کسی شئے کا امر فرمادیں) اُس کو لو اور جس شے سے منع فرمادیں اُس سے باز رہو اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدن گودنے والے پر لعنت فرمائی ہے پس یہ حکم بھی من اللہ ہوا اسی طرح سے آجکل جو اخباروں میں لکھا جاتا ہے کہ ڈاڑھی رکھنے کا حکم قرآن میں ہی نہیں یہ مولویوں کی گھڑت ہے یہاں سے اس کا جواب بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ قرآن میں تصریحاً نہیں ہے لیکن جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تو امر فرمایا ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمایا ہوا اللہ تعالے ہی کا فرمایا ہوا ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ان کا فرمان اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اگرچہ اللہ کے بندہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے نکلا ہے)

آپ کی شان یہ ہے ؎

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو آں گویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

پس اس قاعدے سے ڈاڑھی رکھنے کا حکم بھی قرآن میں مذکور ہو گیا اور یہاں

سے ایک اور ضروری بات ثابت ہوئی وہ یہ کہ جب معلوم ہو گیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمایا ہوا گویا اللہ تعالےٰ کا فرمایا ہوا ہے تو اب ہم کو اپنی حالت میں غور کرنا چاہیئے کہ ہمارا معاملہ حق تعالےٰ کے اوامر کے ساتھ کیسا ہے سو تجربہ سے ایک قاعدہ دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے آپس میں اوامر کے ساتھ دو قسم کا برتاؤ ہے ایک یہ کہ بعض امر کا امر سنکر تو ہم اُس میں حجت اور حیلہ نکال سکتے ہیں اور بعض مرتبہ صاف انکار بھی کر دیتے ہیں اور بعض آمر کا امر سُن کر ہم سر نگوں اور دم بخود رہ جاتے ہیں اور بجز تسلیم و انقیاد کے کچھ چارہ نہیں ہوتا اور ہماری حالت یہ ہوتی ہے جیسا کہ شیخ نظامی نے کہا ہے ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو   نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

پس غور کرنا چاہیئے کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے کہ کسی آمر کے ساتھ یہ برتاؤ اور کسی کے ساتھ دوسرا تو مابہ الفرق تامل کے بعد عظمت اور عدم عظمت معلوم ہوتا ہے جس آمر کی ہمارے قلب میں عظمت ہوتی ہے اُس کے آمر کے سامنے ہم سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں پیدا ہوتا اور جس کے قلب میں عظمت نہیں ہوتی اس کی کچھ پروا نہیں کرتے عظمت وہ شے ہے کہ زبان پر مہر لگا دیتی ہے بلکہ زبان تو کیا قلب میں بھی اُس کا امر کے متعلق شبہ تک نہیں آتا بلکہ اگر دوسرا کچھ وسوسہ پیش کرتا ہے تو اس کو یوں دفع کیا جاتا ہے کہ میاں یہ ایک جلیل القدر کا امر ہے ضرور ضرور اس میں کچھ مصلحت ہوگی ورنہ ایسا شخص اس کا امر ہی کیوں کرتا گو وہ مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آوے مثلاً اہتمام

قیمتی ۲؍ کا خرید کر اگر ہم ڈاک خانہ میں چھوڑ دیں اور اس پر ڈاک کا ٹکٹ نہ لگا دیں تو وہ بیرنگ ہو جاوے گا اور ۲؍ کا لفافہ بیرنگ نہیں ہوتا حالانکہ اس کی قیمت اور اس کی قیمت میں ۱۵؍ کا فرق ہے سو ظاہراً یہ بالکل خلاف قیاس ہے مگر اس کے متعلق کبھی سوال تک نہیں کیا جاتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے بلکہ بلا وسوسہ وشبہہ تسلیم کر لیتے ہیں اور شب وروز اس پر عمل درآمد ہے کبھی کسی کی زبان پر تو کیا دل میں بھی شبہ نہیں ہوتا علیٰ ہذا دیگر احکام حکام میں بھی کبھی کوئی شک واعتراض نہیں کرتا اور اگر بالفرض کوئی اسٹام کے متعلق شبہ بھی کسی کے سامنے پیش کرے تو اول تو اُس شخص کو پاگل اور احمق سمجھیں گے کہ کیا سوال کرتا ہے اور پھر جواب بھی دیں گے کہ قانون اسی طرح ہے اور اس مجیب کو اس جواب غیر مفصل وغیر مدلل کی وجہ سے یوں نہ کہیں گے کہ جواب سے عاجز ہے بلکہ ہر شخص سمجھے گا کہ جواب کافی ہو گیا تو اس تسلیم وانقیاد کی وجہ بجز عظمت کے کیا ہے چونکہ حکام کی عظمت قلوب میں راسخ ومتمکن ہوتی ہے اس نے زبان بلکہ قلب پر مہر لگا دی اور سوائے آرے بلیٰ نعم کے لا اور نہ زبان پر نہیں آسکتا جب یہ قاعدہ ثابت ہو گیا تو اب میں سخت حیرت اور تعجب میں ہوں کہ اللہ اکبر ایک ادنیٰ حاکم مجازی فانی عاجز اپنے ہم جنس کے حکم کے سامنے ایسے مجبور اور جماد محض بن جاتے ہیں اور احکم الحاکمین حاکم حقیقی قادر مطلق (کہ اگر چاہے تو ایک دم میں سب کو برباد وہلاک کر دے) اس کے امر میں لم اور علت اور حکمت پوچھی جاتی ہے افسوس صد افسوس

۱؎ جب یہ وعظ ہوا ہے اس وقت لفافہ ۲؍ کا تھا۔

کوئی پوچھتا ہے کہ صاحب عن الفرار فی الطاعون (طاعون میں فرار کرنا) کی کیا وجہ ہے کوئی صاحب تشبہ کے مسئلہ میں گفتگو کرتے ہیں حتی کہ روزہ نماز حج وزکوٰۃ مواریث سب احکام میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں نعوذ باللہ ۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ (دیکھو راستہ میں تفاوت کہاں سے کہاں تک ہے) احکام شرعیہ میں جو بیجا سوالات کئے جاتے ہیں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان احکام کی دل میں عظمت ہے اور اس سائل سے زیادہ مجیبین زمانہ پر حیرت ہوتی ہے کہ آجکل مجیبین نے یہ شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ سائلین کے مذاق کے تابع ہو گئے ہیں جو شخص جس حکم کی حکمت اور علت کو پوچھتا ہے اس کو کچھ نہ کچھ علت اور حکمت بتلانا ضروری سمجھتے ہیں اور اگر معلوم نہیں ہوتی تو گھڑ کر کچھ بتاتے ہیں یہ جواب کیوں نہیں دیا جاتا کہ یہ قانون الٰہی ہے جیسا کہ حکام مجازی کے حکم کی تعمیل کے متعلق کہا جاتا ہے افسوس معلوم ہوتا ہے کہ احکم الحاکمین کی عظمت کو حاکم مجازی سے بھی کم سمجھ لیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سائل کے دل میں تو ظاہر ہے عظمت نہیں مجیب صاحب کے قلب میں بھی نہیں ہے کیونکہ عظمت اگر ہوتی تو وہی جواب دیتے جو اسٹام کی مثال میں گذرا کہ بس چپ رہو قانون اسی طرح ہے ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے اور جب حاکم مجازی کے بہت سے احکام کے اسرار اور حکمتیں اور مصلحتیں ہم کو معلوم نہیں اور نہ ہوس ہوتی ہے تو پھر حاکم حقیقی کے اسرار معلوم کرنے کے درپے کیوں ہوتے ہیں اور جب ایک ادنیٰ آدمی اپنے نوکروں کو اپنی خانگی معاملات کے اسرار نہیں بتاتا تو حق تعالےٰ جل وعلا شانہ باایں ہمہ عظمت اپنے مخلوق و مملوک کو کیوں اسرار بتا دیں اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

(حل بیث) از مطرب و مے گو راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود نکشاید بحکمت این معما را

(مطرب دمے یعنی عشق و محبت کی باتیں کرو زمانہ کے بھید اور اسرار کی ٹوہ میں مت لگو کیونکہ یہ عقیدہ حکمت سے نہ کسی نے حل کیا نہ کوئی حل کر سکے گا)

اس زمانہ میں بہت لوگ علل اور حکم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں بہت غور و خوض کے بعد اگر کوئی بات کسی حکم کے متعلق سمجھ میں آگئی تو اس پر بے انتہا اتراتے ہیں فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (جو علم ان کو حاصل ہے اس پر وہ خوش ہیں) حالانکہ وہ حقیقی اسرار کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ؎

بحر لیست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست — آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(بحر عشق ایسا بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اس میں بجز جان دے چارہ نہیں ہے)

خود اہل سائنس میں جو وسیع النظر ہیں معترف ہیں کہ دریائے سائنس میں سے ابھی ایک قطرہ پر بھی ہم کو دسترس نہیں جب اسرار مخلوق پر ان لوگوں کو ابھی تک عبور نہیں ہوا تو خالق کے اسرار اور علل کیسے سمجھ سکتے ہیں اور اگر غور و خوض کے بعد کوئی علۃ کسی کی سمجھ میں بھی آگئی تو ظاہر ہے کہ منصوص تو نہیں ہے کیونکہ ان کی ہی طبع زاد ہے پس وہ خود ظنی اور تخمینی ہوگی پس اگر احتمالاً کوئی شخص منکر ان کی علۃ مخترعہ کو باطل کر دے تو چونکہ اس مجیب نے اُس کی علۃ اور مدار حکم ہونے کا اعتراف کر لیا ہے پس اس کے انہدام سے وہ حکم شرعی بھی منعدم ہو گیا پس ان بزرگوں نے علل مخترعہ نکال کر اور ان کو مدار حکم ٹھہرا کر تمام شریعت ہی کو اصل سے منہدم کر دیا۔ سچ ہے ؎

دوستی بیخرد چوں دشمنی است (نادان کی دوستی مانند دشمنی کے ہے)

ایسے ہی محققین من الحمقہ کی بدولت اسلام پر انواع انواع کے اعتراض ہو رہے ہیں تو حضرت اسلام آپ کی ایسی ہمدردی سے مستغنی ہے اسلام خود ایسا روشن اور ثابت ہے کہ اس کو ایسے تخمینات سے

ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے ع فِیْ طَلْعَۃِ الشَّمْسِ مَا یُغْنِیْکَ عَنْ زُحَلٖ آفتاب جس کے سامنے ہو وہ زحل کو لے کر کیا کرے گا
ع آفتاب آمد دلیل آفتاب ٭ (آفتاب کا نکلنا ہی آفتاب کی دلیل ہے)
پس جب کوئی تم سے پوچھے کہ فلاں حکم کی کیا علت ہے بے تکلف کہدو کہ ہم نہیں جانتے کیا علت اور حکمت ہے پس حکم خدائے تعالیٰ کا ہے جیسا کہ فرشتوں نے عرض کیا تھا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ یعنی تو پاک ذات ہے ہم کو کچھ علم نہیں مگر وہ جو آپ نے ہم کو سکھا دیا بیشک آپ ہی باخبر اور حکمت والے ہیں یہی طریق ہم کو اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ ظاہر ہے کہ ہمارا علم ناقص فرشتوں کے علم سے تو زیادہ نہیں جب اُنھوں نے تفویض محض سے کام لیا اور اپنی رائے کو دخل نہیں دیا تو ہم کون ہیں دخل در معقولات دیں بس یہ جواب کافی ہے حضرات صحابہ باانہمہ فضل وکمال مناظرۂ کفار میں جو بات معلوم نہ ہوتی صاف فرما دیتے کہ ہم نہیں جانتے ہم اپنے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) سے پوچھ کر بتادیں گے اور بھی خوبی کی بات ہے بلکہ اس میں احکام کی زیادہ عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک حکایت یاد آئی ایک آریہ نے دعوے کیا کہ ہم اپنے مذہب کے ہر جز کی بنا عقل سے بتلا سکتے ہیں اور مسلمان ایسا نہیں کر سکتے میرے ایک عزیز نے جواب دیا کہ بس اسی سے معلوم ہوا کہ تمہارا مذہب کسی مخلوق کا بنایا ہوا ہے کہ دوسرا مخلوق اس کے اسرار تک پہنچ سکتا ہے اگر خالق کا فرمایا ہوا ہوتا مخلوق کہیں تو ادراک اسرار سے عاجز ہوتا آجکل ایسے لوگ زیادہ ہیں کہ علم تو خاک نہیں مگر مناظرہ اور مباحثہ میں قدم رکھتے ہیں اور بعض آریوں سے بعض شیعوں سے بعض عیسائیوں سے مناظرہ شروع کر دیتے

ہیں اور جب ان کے ایسے سوالات کے جواب میں خود احکام کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تو علماء سے پوچھتے پھرتے ہیں مگر یہ نہیں کہا جاتا کہ ہم نہیں جانتے علماء سے پوچھ لو سو دین کو ایسا ارزاں بنا رکھا ہے کہ اُس کے جاننے کا ہر شخص مدعی ہے اور فنون میں تو یہ کہتے ہوئے شرم اور عار نہیں آتی کہ ہم اس بات کو نہیں جانتے مگر دین ایسا ہو گیا کہ ہر شخص مدعی ہے کہ میں بھی مجتہد ہوں اور نہ بےخبری کے اقرار سے عار ہے حاصل یہ کہ اسرار کی تفتیش دلیل اس کی ہے کہ حق تعالےٰ کی عظمت پیش نظر نہیں ہے اگر عظمت پیش نظر ہوتی تو احکام میں کاوش اور ان کی علل سے سوال کرنا تو کیا اس کا وسوسہ تک بھی نہ گذرتا چنانچہ جن کے دل میں عظمت ہوتی ہے ان کے دل میں ہرگز وسوسہ نہیں آتا یعنی ایسا وسوسہ جو عقیدہ کے مرتبہ میں ہو اور جو محض خطرہ کے مرتبہ میں ہو وہ منافی عظمت کے نہیں بلکہ وہ تو علامت کمال ایمان کی ہے چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسے وساوس آجاتے تھے اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جب آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم کو ایسے خطرات گذرتے ہیں کہ ہم جل کر خاک سیاہ ہو جاویں تو اس کی تکلم سے اس کو بہت جانتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَوَ جَدْتُمُوْہُ فَذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانَ یعنی کیا تم ایسے خطرات کو اپنے قلوب میں پاتے ہو یہ تو صریح ایمان ہے اور یہ فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ کَیْدَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ یعنی اللہ کا شکر ہے کہ شیطان کے مکر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا اعمال اور عقائد تک اُس کو دسترس نہیں ہوئی اہل سلوک کو بھی بعض مرتبہ ایسے وساوس آتے ہیں کہ خودکشی کرنی آسان معلوم ہوتی ہے چنانچہ جو اُن میں جاہل ہیں وہ خودکشی کر بھی لیتے

ہیں اور جو واقف ہیں وہ صبر کرتے ہیں اور راز اور علت وسوسہ کی یہ ہے کہ جب سالک اللہ کی راہ میں قدم رکھتا ہے تو شیطان کو بڑا رنج ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو ضرر پہنچاؤں اول نماز روزہ فرائض واجبات کے ترک کی کوشش میں لگتا ہے کہ دینی ضرر ہے جب جانتا ہے کہ اس میں مجھ کو کامیابی نہ ہوگی اس وقت جسمانی ضرر اور پریشانیوں کو غنیمت سمجھ کر اس کے گوشِ قلب میں بڑے بڑے وسوسہ پھونکتا ہے سالک اس سے پریشان ہوتا ہے اور رنج کرتا ہے کہ اللہ اکبر میرے تو ایمان ہی میں نقص ہے کہ مجھ کو ایسے خطرات گذرتے ہیں حالانکہ ان وسوسوں کا آنا اس کو مطلق مضر نہیں ہاں موجب پریشانی کا ہے اور پریشانی کا موجب بھی اس سبب سے کہ اس میں ایک غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ سالک سمجھتا ہے کہ یہ وسوسہ میرے قلب سے پیدا ہوتے ہیں منشاء ان کا میرا قلب ہے حالانکہ یہ غلط ہے منشا اُس کا شیطان ہے کیونکہ وہی قلب میں پھونکتا ہے قلب محض محل اور گذرگاہ وسوسہ ہے اس راز کے سمجھنے اور ذہن نشین ہونے کے بعد انشاء اللہ مطلق پریشانی نہ ہوگی بلکہ وسوسہ ہی کی جڑ کٹ جاوے گی کیونکہ شیطان وسوسہ اس کے پریشان کرنے کے لئے ڈالتا ہے جب وہ پریشان ہی نہ ہوگا وہ وسوسہ ڈالنا چھوڑ دے گا تو یہ علمی علاج ہے کہ جب وسوسہ آوے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھے کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ فعل شیطان ہے اور تعوذ سے بلکہ مطلق ذکر سے شیطان دفع ہوتا ہے و نیز جب ذکر کی طرف خوب متوجہ ہو گیا اور کامل توجہ دو طرف ہوتی ہیں تو وسوسہ کی طرف التفات نہ رہے گا اور بالفرض اگر اس پر بھی وسوسے آویں اور دفع نہ ہوں اور بالاضطرار پریشانی

ہو تو یہ بھی ایک مجاہدہ ہے تب بھی نفع ہی ہوا اس لئے رنج نہ کرے اور جو شخص اسی فکر میں لگا رہے کہ وسوسے دفع ہوں اور عبادت و ذکر اللہ میں مزا آوے جیسا کہ آجکل اکثر اہلِ سلوک کا حال ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ شخص اپنے مزے کے لئے ذکر کرتا ہے رضائے حق کے لئے نہیں کرتا ؎

بس زبون وسوسہ باشی ولا گر طرب را باز دانی از بلا

(تم بالکل مغلوب وساوس سمجھے جاؤگے اگر محبوب کے طرب و بلا میں فرق سمجھوگے)

گر مرادت را مذاق شکر است بے مرادی نے مراد دلبر است

(مراد کا مزہ شیریں ہے تو کیا بے مرادی دلبر کی مراد نہیں ہے)

دوسرا علاج وسوسہ کا مطلق ذکر اللہ ہے جیسا اوپر بھی اشارہ ہوا سو جب وسوسہ آوے ذکر اللہ شروع کردے حدیث میں ہے اِذَا ذَکَرَ اللّٰہَ خَنَسَ یعنی جب مومن ذکر اللہ کرتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ (جب غافل ہوتا ہے تو وسوسہ ڈالتا ہے) اوپر اس کے عقلی لم بھی مذکور ہوئی ہے اور وسوسہ آنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس میں حق تعالے کی طرف سے سالک کا امتحان ہے کہ اس کی عبادت حظ نفس کے لئے تھی یا یہ کہ اس کشاکشی اور بے لطفی میں بھی عبادت کرتا ہے اور یہ کہ اس وسوسہ کے وقت کس طرف متوجہ ہوتا ہے بعض تو جب شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اُس سے مناظرہ میں مشغول ہو جاتے ہیں سو ایسا شخص عارف نہیں ہے اگر عارف ہوتا تو اس طرف ہرگز متوجہ نہ ہوتا جیسا کہ شیخ علیہ الرحمہ نے حکایت نقل فرمائی ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو چو بگذشت بر عارف جنگجو

گر ایں مدعی دوست بشناختے به پیکار دشمن نہ پرداختے

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ ایک عارف جنگ جو پر گذرے اگر اس مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

لہٰذا ان وسوسوں سے ہرگز پریشان نہ ہو اور کام میں لگا رہے آج کل یہ بھی اہل سلوک کو خبط ہوگیا ہے کہ مزہ کے طالب ہیں یہ چاہتے ہیں کہ ذکر میں کوئی وسوسہ نہ آوے اور مزہ آوے طالب صادق کی ہرگز یہ شان نہیں صادق وہی ہے مزہ آوے یا نہ آوے کلفت ہو یا راحت ہو ہر حالت میں طالب رضا کا ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

روزہا گر رفت گورو باک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(یعنی ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک ہے اس کا رہنا کافی ہے)

واردات اور کیفیات کو اصطلاح صوفیہ میں روز بھی کہتے ہیں فرماتے ہیں کہ اگر واردات اور کیفیات جاتی رہیں کھدو جاؤ کچھ حرج نہیں اے پاک ذات تو رہ کہ تیرے مثل کوئی پاک نہیں ہے یعنی تیری رضا مطلوب ہے وہ فوت نہ ہونی چاہیئے لہٰذا اصل مقصود کیفیت اور مزہ کو نہ بنانا چاہیئے رضا کو مقصود بناوے سرمد کیا خوب فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید کرد یا قطع نظر زیار می باید کرد

(اے سرمد شکوہ شکایت مختصر کر اور دو کاموں میں سے ایک کام کر یا تو تن کو دوست کی خوشنودی حاصل کرنے کے وقف کر یا دوست سے قطع نظر کرلے)

اور محب کی تو یہ شان ہونی چاہیئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور قتل کریں آپ پر فدا ہوں
دل آپ پر فدا ہے جو کچھ کریں اس پر میں راضی ہوں)

پس جس حالت کو وہ سالک کے لئے پسند فرماویں اس پر راضی رہے کیونکہ حق تعالٰے عالم الغیب والشہادۃ ہے اور اپنے بندوں کے حال سے خوب واقف ہیں بعضوں کی تربیت کا یہی طریقہ ہے کہ ان کو ہمیشہ پریشانی انقباض رنج میں مبتلا رکھیں سب کو تو ہر امر میں محبوب کی رضا جوئی کرنا چاہیئے مثلاً اگر کوئی محبوب محب سے یہ کہے کہ اگر تم کو ہماری رضا مطلوب ہے تو باہر دروازہ پر بیٹھے رہا کرو اور ہم کو مت دیکھا کرو جناب اگر سچا محب ہے تو دل و جان سے امتثال کرے گا اور اگر ہوسناک ہے تو صبر نہ آوے گا اور مبتلائے ناراضی محبوب ہوگا غرض یہ ہے کہ سالک کو مختلف حالتیں پیش آتی ہیں کبھی جمعیت ہے کبھی پریشانی کبھی غیبت ہے نہ بمعنے نسیان بلکہ بمعنے عدم دلچسپی اور کبھی حضور ہے اور یہ جملہ حالات محمود ہیں اس لئے کہ گو یہ بظاہر غیبت ہے مگر فی الواقع یہ بھی حضور کی ایک ہیئت ہے پس رضائے محبوب اس میں بھی ہے اور یہی مطلوب ہے اور اگر حضور اصطلاحی ہو اور رضا نہ ہو تو وہ بظاہر حضور ہے لیکن حقیقۃً غیبت ہے الحاصل کبھی حضور برنگ غیبت ہوتا ہے کبھی غیبت برنگ حضور ہوتا ہے کبھی قرب بصورۃ بُعد ہوتا ہے کبھی بُعد بصورت قرب ہوتا ہے اس کی مثال ہمارے معاملات دنیوی میں ایسی ہے کہ ایک شخص تو وہ ہے جو پادشاہ وقت سے دور ہے مگر بادشاہ نے اس کو کسی عہدہ

جلیل القدر اور خطابات اعزاز سے نوازا ہے اور شب و روز شاہی الطاف و عنایات اس پر متوجہ ہیں تو گو یہ شخص صورۃً بادشاہ سے بعید ہے مگر فی الحقیقۃ قریب ہے اور ایک وہ شخص ہے جو جرائم شاہی کا مرتکب ہے جس کی وجہ سے بادشاہ اُس سے سخت ناراض ہے اور حکم ہے کہ جہاں اُسکو پاؤ گرفتار کرلو چنانچہ حسب الحکم شاہی وہ بادشاہ کے روبرو حاضر کیا گیا پس یہ شخص گو ظاہراً قریب ہے مگر واقع میں یہ بعید اور مردود ہے حاصل یہ کہ ایسے وسوسوں سے پریشان نہ ہو کہ یہ قرب کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ شخص مقرب ہے اور واقع میں یہ وساوس بھی باطن قلب کے اندر نہیں ہوتے گو متوہم ایسا ہی ہوتا ہے مگر حقیقت میں بیرون قلب ہوتے ہیں جیسے کہ آئینہ کے باہر مکھی بیٹھ جاوے تو دیکھنے والے کو تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ مکھی آئینہ کے اندر بیٹھی ہے حالانکہ وہ باہر ہے اسی طرح وسوسہ قلب کے باہر ہے قلب کے اندر جہاں ذکر اللہ ہو ان کی گنجائش نہیں ہے ایسے مومن کا قلب بالفعل محفوظ ہے ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِیَ التَّائِہٖ وَھَوَی الْاَحِبَّۃِ مِنْہُ فِیْ سَوْدَائِہٖ

(ملامت گروں کی ملامت قلب کے ارد گرد ہے اور احباب کی محبت سودائے قلب میں ہے)

اسی طرح قلب ذاکر میں وساوس کا گذر نہیں اور وہ جو اسکو معلوم ہوتا ہے وہ عکس وساوس کا ہے ایک بزرگ اس کے علاج میں فرماتے ہیں کہ جب وسوسے آویں خوب خوش ہونا چاہئے کیونکہ یہ علامت ہے ایمان کی لقولہ علیہ السلام ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ (یہ صریح ایمان ہے) چور گھر میں جب ہی آتا ہے جبکہ گھر میں مال ہو اسی

وجہ سے وساوس صالحین ہی کو آتے ہیں اور جو فسق و فجور میں مبتلا ہیں ان کو کبھی وسوسہ نہیں آتا اور مصلحت اس خوش ہونے میں یہ ہے کہ اس سے وسوسہ قطع ہو جاوے گا کیونکہ شیطان کا مقصود تو وسوسہ ڈالنے سے یہ ہے کہ یہ غم و حزن میں مبتلا ہو اور جب یہ برعکس خوش ہوتا ہے تو وسوسہ ڈالنا چھوڑ دے گا سبحان اللہ کیا علاج ہے یہاں سے حضرات صوفیہ و فقہاء کا کمال علمی معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ سے یہ حضرات بدرجہا زیادہ ہیں اس لئے کہ فلاسفہ اکثر اعیان اور محسوسات کے حقائق سے بحث کرتے اور یہ کوئی مشکل نہیں جو شئے ہمارے سامنے موجود ہے اس کو ہم کسرا و قطعاً و تحلیلاً و ترکیباً ہر طرح تحقیق کر سکتے ہیں اور جہاں معانی سے بحث کی ہے وہاں ٹھوکریں کھائی ہیں اور حضرات فقہا و صوفیہ معانی سے جو کہ غیر محسوس ہیں بحث کرتے ہیں اور ان کے علل و اسرار بیان کرتے ہیں اور آثار و نتائج سے صحیح ثابت ہوتے ہیں یہ نہایت مشکل ہے حاصل یہ ہے کہ ایسے وسوسوں کا آنا عظمت الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔ گفتگو ان وسوسوں میں ہے جن پر مدار کار کھے اور وہ مرتبہ عقیدہ میں ہو جاویں ایسے وسوسے اُسی کے دل میں آویں گے جس کے دل میں عظمت نہ ہو جب مابہ الفرق عظمت ہوا پس عظمت حق تعالیٰ کی اور اس کے احکام کی دل میں پیدا کرنا چاہیئے تاکہ یہ شبہات کہ وساوس مذمومہ ہیں قطع ہوں اور مراد احکام الٰہیہ سے خاص قرآن نہیں بلکہ حدیث و فقہ بھی اس میں داخل ہے پس جس طرح عظمت اللہ تعالیٰ کے احکام کی ضروری ہے اُسی طرح جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کی بھی عظمت ضروری ہے اس لئے کہ آپ کے احکام حقیقت میں خداوند تعالیٰ ہی کے احکام ہیں اور اِسی طرح احکام فقہیہ کی عظمت بھی

لازم ہے اس لئے کہ وہ سب احکام قرآن و حدیث ہی سے مستنبط ہیں اس لئے کہ جزئیات تابع کلیات کے ہوتے ہیں یہ نہ کہیں گے کہ اس جزئی خاص کا حکم بالتصریح مذکور نہیں ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہوا اور وہ قانون ہندوستان میں آیا اب جب کبھی کوئی شخص اس قانون کا خلاف کرے گا اس کو وہی سزا دی جائے گی جو پاس ہو چکی ہے یہ ہرگز نہ کہا جاوے گا کہ خاص اس شخص کا واقعہ تو تعزیرات میں درج نہیں ہے کیونکہ یہ واقعہ بھی تو جزئی اسی کلی کے ہے اسی طرح فقہاء کتاب و سنت سے ایک علت سمجھ کر ایک کلیہ حاصل کرتے ہیں پھر اس کو تمام جزئیات کی طرف متعدی کرتے ہیں پس خواہ وہ حکم کتاب اللہ سے ثابت ہو یا سنت سے یا اجماع و قیاس سے سب حکم الٰہی ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت را می شناسم

(خواہ کسی ہی رنگ کا لباس پہن لو میں قد کے انداز سے پہچان لوں گا)

اسی واسطے فقہا نے کہا ہے اَلْقِیَاسُ مُظْہِرٌ لَا مُثْبِتٌ (قیاس حکم شرعی کو ظاہر کرنے والا ہے نہ کہ ثابت کرنے والا) پس جب تمام احکام فقہیہ کا احکام الٰہی ہونا معلوم ہو چکا اب اُس میں بھی چون و چرا کرنا اور اس کی علت دریافت کرنا نہایت بے ادبی ہے ہاں طالب علم اگر مستفیدانہ علت سے سوال کرے تو کچھ حرج نہیں مثلاً طبیب نے مریض کو ایک نسخہ لکھ کر دیا اگر مریض دریافت کرنے لگے کہ جناب آپ نے گل بنفشہ کا وزن ۵ ماشہ کیوں لکھا ہے طبیب غصہ ہوگا اور اس کو کان پکڑ کر نکال دے گا اور اگر کوئی طالب علم جو اس فن کو حاصل کرنے آیا ہے سوال کرے اس کے سوال کرنے سے خوش ہوگا اور بیان کرے گا پس عوام الناس کا علل و اسرار سے سوال کرنا ایک بیہودہ حرکت ہے اور اگر معاندانہ سوال کرے تو سخت

بے ادبی اور قریب بکفر ہے افسوس ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ و سلم نے تو بیان احکام میں کیسی مشقتیں اٹھائیں انواع انواع کی تکالیف برداشت کیں اور ہماری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہمارے روشن خیال بھائیوں نے اس کی یہ قدر کی کہ اُن احکام پر بجائے عمل کرنے کے ان میں اپنی رائے کو دخل دینے لگے کہ فلاں حکم عقل کے خلاف ہے فلاں موافق ہے چاہیئے تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شکر گذار ہوتے اور جب کوئی حکم ملتا سر آنکھوں پر رکھ کر عمل شروع کر دیتے پھر دیکھئے کہ وہ کیا نتیجہ دیتا غرض آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہیئے جیسا مریض ایک مشفق اور صادق طبیب سے کرتا ہے کہ اس کی ہر تجویز کو بلا چون و چرا اپنی مصلحت پر محمول کرتا ہے اور ممنون ہو کر عمل کرتا ہے سو اس حدیث میں بھی ہماری ضرورۃ و حالت موجودہ پر نظر فرما کر ارشاد فرمایا گیا ہے کیونکہ ہم اس بلا میں مبتلا ہو رہے ہیں اور یہی وجہ ہے اس حدیث کے اختیار کرنے کی سو یہ مرض جو حدیث میں بیان کیا گیا ہے ہم لوگوں میں آجکل رچ رہا ہے یعنی جس شئے پر ہم لوگوں کی نظر ہے اس پر حق تعالیٰ کی نظر نہیں اور جس پر حق تعالیٰ کی نظر ہے اس پر ہماری نظر نہیں لوگوں کا مطمح نظر تو صور اور اموال ہیں اور حق تعالےٰ کی اس پر نظر نہیں اور حق تعالےٰ کی نظر نیّات اور اعمال پر ہے اس پر مخلوق کی نظر نہیں اور یہ صریح مقابلہ ہے حق تعالےٰ کے ساتھ نعوذ باللہ من ذلک۔ صورۃ پر نظر تو یہ ہے کہ شب و روز یہ کوشش ہے کہ ہماری صورۃ ہمارا لباس ہماری وضع ہمارا طرز و انداز لوگوں کی نظر میں بھلا معلوم ہو ہر شخص کم و بیش اسی دھن میں ہے اور رات دن سوائے بناؤ سنگار کے کوئی مشغلہ نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ تزئین ممنوع ہے تزئین مباح ہے مگر جب تک کہ اس میں

تجاوز عن الحدود اور انہماک نہ ہو اور جب انہماک ہوا تو وہ غفلت کا سبب ہو جاتا ہے اور تجاوز کا حکم تو ظاہر ہے غرض تزین کو منظور الیہ قرار دینا نہ چاہیئے اسی واسطے حدیث میں آیا ہے نَهَىٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّرَجُّلِ اِلَّا غِبًّا (ایک دن چھوڑ کر کنگھی کرنے کے علاوہ روزمرہ کنگھی کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے) اور یہ بھی تجربہ ہے کہ جو لوگ شب و روز تزین میں مشغول رہتے ہیں کمال سے عاری ہوتے ہیں اس لئے کہ اگر ان میں کمال ہوتا تو اس میں مشغول ہونے سے اس طرف توجہ نہ ہوتی غرض ایسا تزین جس میں شب و روز مشغولی ہو منہی عنہ ہے اگرچہ ہیئت مباحہ سے بھی ہوتا اور مباحہ سے آگے بڑھ کر اوضاع منہی عنہا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ غیر اقوام کے لباس اور طرز کو پسند کرتے ہیں ڈاڑھی کے دشمن ہیں اور قطع نظر جواز ناجواز سے اسلامی غیرت بھی تو اس کو مقتضی تھی کہ ہم اپنی وضع کو محفوظ رکھتے جیسے اور قومیں اپنی اپنی وضع کی پابند ہیں اور ہم کو دوسری قوموں سے امتیاز ہوتا مگر اب وہ غیرت اسلامی بھی اڑ گئی مابہ الامتیاز افعال اور ہیئت سو افعال کا امتیاز تو مدت ہوئی جاتا ہی رہا تھا الا ماشاء اللہ صرف امتیاز ہیئت کا باقی تھا سو افسوس ہے کہ اب وہ بھی رخصت ہوا شاید کوئی کہے کہ ہمارا ٹوپی سے امتیاز ہے جواب یہ ہے کہ اول تو یہ ٹوپی پنجاب میں ہندو بھی استعمال کرنے لگے ہیں اس لئے اس سے کچھ بھی امتیاز نہ رہا دوسرے یہ کہ اگر ٹوپی کسی وقت سر پر نہ ہو (جیسا کہ اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کا شعار ہے) تو پھر امتیاز کس چیز سے ہوگا اس کو ضروری کہا جاوے گا کہ ہر وقت ٹوپی سر پر ہے جیسے مجھکو ایک حکایت یاد آئی۔ میرے یہاں ایک مہمان آئے میں نے اپنے ایک بھولے دوست سے کہا کہ دیکھو ان کو پہچان لو میں مکان سے ان کو کھانا بھیجوں گا کھلا دینا اس کے

بعد مکان سے کھانا آیا تو وہ مہمان میرے پاس بیٹھے تھے وہ دوست آ کر کہنے لگے کہ کھانا تو آ گیا مگر وہ معلوم نہیں کہاں ہیں میں نے کہا کہ یہ سامنے کیا بیٹھے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان کے پاس چادر تو ہے نہیں میں نے مزاحاً ان مہمان سے کہا کہ آج سے یاد رکھئے آپ چادر ہر وقت اوڑھے رہئیے ورنہ کھانا نہ ملا کرے گا تو کیا چادر کی طرح ہر وقت ٹوپی سر پر رکھنا لازم ہوگا۔ غرض ٹوپی کوئی علامت نہیں ہے ذات کے اندر کسی علامت کا ہونا ضروری ہے سو وہ ڈاڑھی ہے اور دوسری علامت خارجی لباس اور بغیر ان دونوں علامتوں کے امتیاز نہیں ہوسکتا نہ تو صرف ڈاڑھی کافی ہے اس لئے کہ لڑکوں کے ڈاڑھی نہیں ہوتی اگر صرف ڈاڑھی کو مابہ الفرق کہا جاوے تو لڑکوں کا امتیاز کس چیز سے ہوگا اور نیز بہت سی غیر قومیں بھی ڈاڑھی رکھتی ہیں ان سے امتیاز بجز لباس کے کسی چیز سے نہیں ہوسکتا اور نہ صرف لباس کافی ہے وہذا ظاہرٌ۔

غرض حمیت کا مقتضا یہ ہے کہ ہم اپنی وضع اسلامی کو محفوظ رکھیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ ڈاڑھی رکھنے کا مسئلہ قرآن میں دکھلاؤ سو پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ جو احکام احادیث سے ثابت ہو چکے ہیں وہ سب احکام الٰہی ہیں کیونکہ اتباع حدیث کا حکم خود قرآن میں ہے پس اس طور پر تمام احکام حدیث قرآن میں ہیں مگر آجکل عام طور سے یہ خبط ہے کہ کوئی کہتا ہے کہ قرآن سے دلیل لاؤ کوئی کہتا ہے حدیث سے دلیل لاؤ سخت افسوس ہے کہ اپنے اصول کو چھوڑ دیا خوب سمجھ لو کہ اصول شرعیہ چار ہیں۔ کتاب و سنت اجماع و قیاس ان کا دلائل ہونا دلائل عقلیہ وسمعیہ سے جب طے ہو چکا ہے پھر خاص یہ معنے ہوں گے کہ هٰذَا الْحُكْمُ ثَابِتٌ اِمَّا بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ وَالْاِجْمَاعِ اَوِ الْقِيَاسِ (یہ حکم قرآن سے یا حدیث یا اجماع امت سے یا قیاس سے ثابت ہے)

پھر ان ادلہ اربعہ میں سے جس دلیل سے ہم ثابت کر دیں گے حکم شرعی ہونا اس حکم کا

کا ثابت ہو جاوے گا۔ سائل کا یہ منصب نہیں کہ یہ کہے کہ صرف قرآن اور حدیث سے ثابت کرو اور ایسا سائل درپے مدعی اس امر کا ہے کہ قرآن و حدیث کے سوا اور کوئی دلیل حجۃ نہیں ہے جیسے کوئی شخص ہزار روپیہ کا دعوےٰ عدالت میں دائر کرے اور گواہ پیش کرے تو مدعا علیہ کو یہ منصب نہیں ہے کہ کہے کہ میں ان گواہوں کی گواہی تسلیم نہیں کرتا جب تک فلاں فلاں گواہی نہ دیں گے میرے نزدیک حکم ثابت نہ ہوگا۔ عدالت سے سوال ہوگا کہ ان گواہوں میں تمہارے نزدیک کوئی جرح ہے مدعا علیہ کہے کہ جرح کچھ نہیں معتبر ہیں مگر میں تو فلاں فلاں کی گواہی تسلیم کروں گا اس کی یہ بکواس ہرگز معتبر نہ ہوگی اور عدالت سے ان ہی گواہوں پر فیصلہ ہوگا تاوقتیکہ کوئی جرح ثابت نہ کیا جاوے۔

پس شریعت میں جب چار گواہ تسلیم کر لئے گئے تو ہم حکم کو جس گواہ سے چاہیں گے ثابت کر دیں گے ہاں اگر گواہ میں یعنی ان دلائل کی صحۃ میں کوئی کلام ہو تو اُس کو طے کر لینا چاہیئے اور اس سے زیادہ مجیبین پر افسوس ہے کہ قرآن و حدیث سے اگر دلیل طلب کی جاتی ہے تو وہ اس کی فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ قرآن و حدیث سے اس مسئلہ کو ثابت کریں اور نہیں ملتا تو پریشان ہوتے ہیں حالانکہ اس قید کے ساتھ جواب کا ضروری ہونا خود اصول کے خلاف ہے مگر جہل کا ایسا غلبہ ہو گیا ہے کہ حقیقی اور اصلی جواب پسند نہیں آتا اور جو اصول صحیحہ سے جواب دے وہ احمق گنا جاتا ہے اور جو خلاف اصول جواب دے وہ عاقل اور ہوشیار سمجھا جاتا ہے اس کے علاج کے لئے علم دین کی سخت ضرورت ہے سو بعض ہئیات تزین کا ناجائز ہونا یقیناً شرع سے ثابت ہے مگر وضع اسلامی کے ایسے دشمن ہوتے ہیں کہ اس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے ہیں بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (جس نے جس قوم کا تشبہ اختیار کیا وہ اسی میں سے شمار کیا جائے گا) حدیث ضعیف ہے سبحان اللہ اچھے اچھے محققین پیدا ہوئے ہیں۔ حدیث کے ضعف اور قوۃ پہچاننے والے بھی آپ

ہیں خیر اگر تمہارے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہی ہے تو دوسری احادیث قویہ بھی تو موجود ہیں تشبہ کا منہی عنہ ہونا تو شروع میں متواتر المعنی ہو گیا ہے حدیث میں ہے کہ اللہ نے لعنت فرمائی ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی شکل بنائیں اور ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی شکل بنائیں جبکہ عورتوں کے ساتھ تشبہ غیر جائز ہے حالانکہ ہمارے میں اور عورتوں میں اسلامی شرکت ہے تو جہاں اسلامی شرکت بھی نہ ہو جیسے کفار اور ان کی وضع بنانا تو کیسے جائز ہوگا جو صاحب تشبہ کے مسئلہ میں گفتگو کرتے ہیں ان سے ہماری ایک التجا ہے اگر اس کو انھوں نے پورا کر دیا تو ہم آج ہی سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہرگز ان سے تشبہ کے مسئلہ میں گفتگو نہ کریں گے آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنا لباس اتار دیجئے اور اندر دولت خانہ میں جا کر بیگم صاحبہ مکرمہ معظمہ کا کمخواب کا پاجامہ اور سرخ ریشمی کامدار کرتہ اور بنارسی دوپٹہ اور ہاتھوں میں چوڑیاں اور پاؤں میں پازیب اور گلے میں ہار اور تمام زیوروں سے آراستہ پیراستہ ہو کر اور جہاں آپ کے دوست ہمچشم اور آپ کے بڑے چھوٹے بیٹھے ہوں وہاں تشریف لا کر تھوڑی دیر کے لئے ذرا کرسی پر اجلاس فرمالیجئے اگر آپ نے یہ حرکت کر لی تو ہم آپ کے تشبہ کے مسئلہ میں کبھی گفتگو نہ کریں گے مگر مجھے امید نہیں کہ کوئی صاحب اس پر راضی ہو جاویں بلکہ اگر ان کو ہزار روپیہ بھی دیں تب بھی راضی نہ ہوں گے اور عار سمجھیں گے تو بتلایئے یہاں انقباض اور ناگواری کا مبنی بجز تشبہ بالنساء کے کچھ اور بھی ہے افسوس ہے کہ عورتوں کی وضع بنانا تو عار ہے اور اعداء اللہ کی وضع بنانا گوارا ہے بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ اگر سب کفار مسلمان ہو جائیں تو کیا اس وقت بھی تشبہ ممنوع ہوگا جواب یہ ہے کہ اس وقت وہ تشبہ ہی نہ ہوگا کیونکہ وہ وضع اب وضع الکفار نہ رہی غرض یہ سب شعبے ہیں صورۃ آرائی کے یہ تو اپنی صورۃ پر نظر ہوئی اور دوسرے کی صورۃ پر نظر یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ امیر ہے یا غریب کالا ہے یا گورا اچھا لباس پہنے ہوئے ہے یا برا لباس اور پھر معاملہ اس سے مختلف کرتے

ہیں جو عمدہ لباس پہنے ہوئے ہو اس کی تعظیم بھی ہوتی ہے وقعت بھی ہوتی ہے اگرچہ وہ کمال سے بالکل خالی ہو اور جو خستہ حالت میں ہے اگرچہ باکمال ہو اس کی پوچھ تک نہیں ہوتی اِسی طرح امراء کی بہت تعظیم ہوتی ہے غرباء کو پاس تک نہیں آنے دیتے اور دین اہل کبیر کی ظاہری تعظیم سے مطلقاً منع نہیں کرتا بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ تعظیم اگر دفعہ مضرت کے لئے ہو یا محض تالیف قلب کے لئے ہو تو جائز ہے اگر دنیا کے نفع کے لئے امرا کے سامنے جبہہ سائی کرے تو یہ ممنوع ہے حاصل یہ کہ آج کل اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ (لوگ لباس سے پہچانے جاتے ہیں) پر عمل ہے اس لئے اہلِ علم کی قدر نہیں کیونکہ یہ بیچارے خستہ حالت میں رہتے ہیں لباس اور وضع کے اعتبار سے بھی مال کے اعتبار سے بھی غرض ہر طرح ظاہراً پستی کی حالت میں ہیں اِسی لئے اہلِ دنیا کی نظر میں پست خیال تاریک خیال سمجھے جاتے ہیں لیکن بخدا اگر ان اہل علم کو دین کا ذرا چسکا لگ جاوے تو یہ بھی دنیا اور اہل دنیا کی طرف تھوکیں بھی نہیں اور ان کی یہ کیفیت ہو جاوے ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے ۔ چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

(تمام شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے میں ایک چاند ہی کے خیال میں محو ہوں کیا کروں کہ چشم بدخو کسی کی طرف نہیں دیکھتی)

اور یہی وجہ ہے جو علماء باعمل اور دیندار ہیں وہ دنیا کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے اور نہ ان کو اپنے موجودہ حالت قلت دنیا پر حسرت ہوتی ہے کہ ہم نے یہ علم کیوں پڑھا تھا جس سے یہ پستی نصیب ہوئی مگر شرط یہی ہے کہ چسکا لگ جاوے غرض نہ ان کو حرمان عن الدنیا پر افسوس ہے اور نہ وہ تحصیل دنیا کی تدبیریں لگتے ہیں اور ہم نے بعضے دنیا داروں کو جو کہ دنیا کا علم پڑھتے ہیں دیکھا ہے کہ دین کی طرف آتے ہیں اور علوم دنیویہ چھوڑ چھوڑ کر علم دین پڑھتے ہیں اور جو پڑھ چکے ہیں ان میں بہت لوگ جو کہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں پچھتاتے

ہوئے اور علم دین حاصل نہ کرنے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں ایک لطیفہ یاد آیا ایک طالب علم انگریزی چھوڑ کر علم دین پڑھنے کے لئے آئے اُن سے کسی نے پوچھا کہ تم نے انگریزی کیوں چھوڑ دی کہا کہ میں نے چاہا کہ میں بھی جامۂ انسانیت پہن لوں سائل نے پوچھا کہ کیا اب تک تم جامۂ انسانیت پہنے ہوئے نہیں تھے کہا نہیں کیونکہ اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ (لوگ لباس کو دیکھتے ہیں) مشہور مقولہ ہے اور لباس کی تعیین خدائے تعالیٰ نے فرمائی ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ (تقویٰ اچھا لباس ہے) پس بدون تقویٰ کے جامۂ انسانیت میسر نہیں ہوتا پس دنیا سے بہتوں کا دین کی طرف آنا اور دین سے دنیا کی طرف ایک کا بھی نہ جانا کیا یہ دلیل نہیں ہے دین کے علو اور دنیا کی پستی کی مگر فاسد المذاق لوگوں نے حالت دینیہ کو پستی اور حالت غیر دینیہ کو علو قرار دیا ہے اور بالکل لباس پر نظر ہے اور غربا بیچارے خواہ باکمال ہوں یا بے کمال ان کو نظر انداز کر رکھا ہے اور اس پر عجب یہ کہ ہمدردی کا دعویٰ ہے افسوس دیکھئے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غرباء کے ساتھ کس طور پر عنایت رحم دلی سے پیش آتے تھے اس مقام پر ایک حکایت یاد آئی حضرت زاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک صحابی ہیں گاؤں میں رہا کرتے تھے کبھی کبھی مدینہ طیبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گاؤں کی چیزیں ہدیۃً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو شہر کی چیزیں مرحمت فرمایا کرتے اور یہ فرمایا کرتے کہ زاہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم زاہر کے شہر ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت زاہرؓ بازار میں چلے جاتے تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے آکر پیچھے سے اُن کو آغوش میں پکڑ کر دبا لیا آنکھوں پر ہاتھ نہیں رکھا جیسا آجکل کرتے ہیں کیونکہ اس سے تو ایذا اور وحشت ہوتی ہے حضرت زاہرؓ بولے یہ کون ہے چھوڑ دو پھر جب معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہیں پھر تو انھوں نے غنیمت سمجھا کہ آج کا دن پھر کہاں نصیب اپنی پیٹھ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر سے خوب ملنا شروع کر دیا اس کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مزاحاً فرمایا کہ

کوئی ہے جو اس غلام کو خریدے حضرت زاہرؓ نے فرمایا کہ یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میرا گاہک کون ہے میں تو کم قیمت ہوں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ کے نزدیک تو کم قیمت نہیں ہو دیکھئے آپ ان کے ساتھ کس طرح پیش آئے اور ان کے خوش کرنے کو مزاح بھی فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی مصلحت کے لئے گاہ گاہ مزاح بھی فرمایا کرتے تھے ۔ ایک یورپ کے بادشاہ کو میں نے خواب میں دیکھا اس نے یہ اعتراض کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر مجھے صرف ایک شبہ ہے اور کچھ نہیں وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ سے مزاح فرمایا کرتے تھے اور مزاح وقار کے خلاف ہے اور وقار لوازم نبوۃ سے ہے میں نے جواب دیا کہ مطلق مزاح وقار کے خلاف نہیں بلکہ خلاف وہ ہے جس میں کوئی معتد بہ مصلحت نہ ہو اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں مصلحت و حکمت تھی وہ یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تعالےٰ نے ہیبت اور رعب ایسا عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے شان وشوکت اور جرأت والے آپ کے رو برو ابتداءً کلام نہ کر سکتے تھے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے پس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے ایسی بے تکلفی کا برتاؤ نہ فرماتے تو صحابہ کو جرأت نہ ہوتی کہ آپ سے کچھ دریافت کریں اور ہیبت اور رعب کی وجہ سے الگ الگ رہتے اور اس حالت میں ہدایت کا ایک بڑا باب کہ استفسار ہے بند ہوجاتا اور تعلیم و تعلم کا بڑا حصّہ مسدود ہوجاتا اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اُن سے مزاح فرماتے تھے تاکہ بے تکلفی سے جو چاہیں پوچھیں پھر مزاح بھی تین قسم کا ہوتا ہے ایک مزاح وہ جو ہلکے پن اور چھچھورپن پر دلالت کرے اس سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم پاک ہیں اور ایک مزاح وہ جس سے کسی کو تکلیف پہنچے اور تیسرے وہ کہ وقار اور متانت سے ہو کذب اور خلاف حق اس میں نہ ہو چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا مزاح اسی قسم کا ہوتا تھا جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے غرض کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ غرباء کے ساتھ یہ تھا آج کل بہت لوگ

قومی ہمدردی کے مدعی ہیں مگر حالت یہ ہے کہ قوم سے ان کو نہ مناسبت ہے نہ مواانست ہے بنگلوں میں آبادی سے باہر رہتے ہیں اور دو وقت گوشت بُھنا ہوا اور چار اور بیضہ اور بسکٹ قسم قسم کی ان کی غذا ہے اور ان کے غریب بھائی شہر میں بھوکے ننگے پھرتے ہیں اور ان کو خبر تک نہیں اگر کسی کے لئے کچھ خیر خواہی وغیرہ کرتے بھی ہیں تو وہ امرا کے لئے سو اس کو قومی ہمدردی نہیں کہتے اس لئے کہ قوم نام ہے مجموعہ آحاد کا اور مجموعہ میں ہمیشہ غالب کا اعتبار ہوتا ہے اور اکثر افراد قوم میں غربار ہیں امرار تو بالکل اقل قلیل ہیں بس اس اعتبار سے قوم گویا غربار کا نام ہوا پس قومی ہمدردی کے معنے یہ ہوں گے کہ غربار کے ساتھ ہمدردی کی جاوے سو وہ لوگ غربار کی کیا ہمدردی کریں گے جن کے یہاں غریبی وافلاس خود جرائم کی فہرست میں درج ہو البتہ قومی ہمدردی شریعت نے سکھلائی ہے دیکھئے حدیث شریف میں ہے اَلْمُسْلِمُوْنَ کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ اِذَا اشْتَکٰی عُضْوٌ اِشْتَکٰی لَہٗ سَائِرُ الْجَسَدِ اَوْ کَمَا قَالَ (مسلمان مثل ایک جسم کے ہیں جب کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے) اسی حدیث کا ترجمہ شیخ علیہ الرحمۃ نے کیا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

(بنی آدم مثل اعضار کے ہیں کہ پیدائش میں ایک ذات کے ہیں جب کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرے اعضار کو قرار نہیں رہتا)

اور افلاس کو جرم جب قرار دیا جاوے کہ جب یہ ہمیشہ بے تدبیری کا نتیجہ ہو یہ تو محض منجانب اللہ ہے اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ (اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں سے جس کو روزی چاہیں کشادہ کر دیں جس کی چاہے تنگ کر دیں) اور اس میں حق تعالےٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں چنانچہ جو لوگ افلاس و فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں ان کے لئے بھی حکمۃ الٰہی ہے اور جو غنی ہیں ان کے لئے اسی میں حکمت ہے کوئی ایک دوسرے کو حقیر نہ جانے اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کی

حالت سے خوب واقف ہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث قدسی نقل کی ہے کہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ ان کا ایمان افلاس سے ہی باقی ہے اگر اللہ تعالیٰ ان کو غنی کردیں تو وہ اس قدر طغیان اختیار کریں کہ کفر تک پہنچ جاویں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ان کا ایمان ان کی غنا کی وجہ سے محفوظ ہے اگر ان پر افلاس آجاوے تو کفر والحاد میں مبتلا ہوجاویں بہت سے مریض ایسے ہیں کہ ان کا دین مرض کی وجہ سے سالم ہے اگر تندرست ہوجاویں تو دنیا میں لگ کر خدائے تعالیٰ کو بھول جاویں اور بہت سے تندرست ایسے ہیں کہ ان کا دین صحت کی وجہ سے ہے غرض جو جس حالت میں ہے اس کے لئے وہی مصلحت اور پسندیدہ ہے کسی نے خوب لکھا ہے ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر　　　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(خاکسار لوگوں کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو ممکن ہے کہ ان میں کوئی اہلِ دل صاحب حال ہو)

غرض ہمدردی کا سبق آجکل بہت گایا جارہا ہے لیکن فی الحقیقت سچی ہمدردی وہی کرسکتا ہے جو مطیع ہو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیونکہ آپ کے برابر کسی نے ہمدردی کے اصول نہیں سکھلائے حتیٰ کہ آپ نے جانوروں تک کے ساتھ ہمدردی کے احکام فرمائے ہیں اور سچے مطیعین نے اس پر عمل کیا ہے چنانچہ خود حضرت احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک خارشتی کتا نہایت تکلیف میں ہے اور تمام بدن اس کا خارش سے مجروح ہوگیا اور ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور اور اس کے ابنائے جنس بھی اُس کو پاس آنے نہیں دیتے ان کو اس پر رحم آیا اور اس کو گھر لائے اور اپنے ہاتھ سے دوا ملا کرتے تھے حتیٰ کہ وہ تندرست ہوگیا حضرت بایزید کو کسی نے بعد وفات کے خواب میں دیکھا پوچھا کہ حق تعالےٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا فرمایا کہ میرے تمام اعمال میں سے یہ عمل پسند آیا کہ ایک روز میں چلا جاتا تھا اور جاڑے کا موسم تھا میں نے دیکھا کہ ایک بلّی کا بچہ

سردی میں اکڑ رہا ہے مجھ کو رحم آیا اور اپنے لحاف میں اُس کو لیکر سو یا یہ عمل میرا پسند آیا اور حکم ہوا کہ اس عمل کی وجہ سے ہم نے تم کو بخشدیا مجھ کو اس وقت حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ دہلوی یعنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے والد ماجد قدس سرہٗ کی حکایت یاد آئی کہ ایک بار انھوں نے ایک کتے کا بچہ کیچڑ میں پڑا دیکھا سردی سے اُس کا بُرا حال تھا کوئی حمام تھا وہاں لیجا کر اُس کو غسل دلایا اس کے ایک مدت بعد یہ اتفاق ہوا کہ وہ کہیں تشریف لے جارہے تھے ایک چھوٹا راستہ ملا جس کو پگ ڈنڈی اور پٹیہ کہا جاتا ہے اور وہ راستہ اس قدر تنگ تھا کہ تکلف سے ایک آدمی اس پر سے چل سکتا تھا اور دونوں طرف اُس کے کیچڑ اور نجاست تھی اور سامنے سے ایک کتا آگیا دونوں رُک گئے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اے کتے تو نیچے اتر تا کہ میں نکل جاؤں ان کو منکشف ہوا کہ کتے نے کہا کہ کیا تعجب ہے آجکل کے درویشوں نے اختیار[ع۱] کی عادت کرلی ہے اور پہلے بزرگوں کا طریقہ ایثار[ع۲] ہوتا تھا آپ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ میں مکلف ہوں اگر میں نجاست میں آلودہ ہو گیا تو بے دھوئے نماز کیسے پڑھوں گا اور دھونے سے مشقت میں مبتلا ہوں گا اور تو غیر مکلف ہے تو اگر نجس ہو گیا تو تیرا کچھ حرج نہیں سوکھ کر پھر ویسا ہی ہو جاوے گا اس نے کہا کہ حضرت یہ سچ ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر آپ اُتر گئے اور نجاست ظاہری میں آلودہ ہوگئے تو یہ نجاست ایک لوٹے سے دُھل جائے گی اور اگر میں نیچے اتر گیا اور تم پاک صاف چلے گئے تو یاد رکھنا کہ تمہارے قلب میں وہ نجاست یعنی عجب پندار پیدا ہو گا کہ وہ حقیقت قلزم سے بھی نہ جائیگا اب آپ مختار ہیں اس سے حضرت شاہ صاحب پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور نیچے کود پڑے اور کتا نکل گیا اس کے بعد الہام ہوا کہ اے عبدالرحیم تم کو معلوم ہوا کہ یہ کیا واقعہ ہے بات یہ ہے کہ اس کے ہم جنس پر تم نے ایک مرتبہ احسان کیا تھا ہم نے چاہا کہ اس پر تمہارا احسان رہے۔ اس کے بنی نوع سے اُس کے بدلہ میں اتنا بڑا علم دلایا سبحان اللہ بزرگوں کی کیا شان ہے اور کیسے کیسے معاملات ان کو حق تعالٰے کی جانب سے پیش آتے ہیں صاحبو ہمدردی اس کا نام ہے

[ع۱] اپنے نفس کو دوسروں پر ترجیح دینا ۱۲ منہ [ع۲] دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دینا ۱۲ منہ

جو ان حضرات میں تھی جن کو بدنام کرتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان میں سختی بہت ہے اور بڑے متعصب و متشدد ہیں بات بات میں بگڑتے ہیں حضرت آپ کو تعصب کے معنے ہی کی آج تک خبر نہیں ہے جو دین کے لئے جوش ہو وہ تعصب نہیں ہے اس کا نام حمیت اور غیرت ہے تعصب کہتے ہیں ناحق کی حمایت کرنے کو سو جو شخص ان کو متعصب کہے وہ اول اس بات کو ثابت کرے کہ جس چیز پر اُن کو جوش آیا وہ ناحق تھی میں نے ایک روشن دماغ سے کہا کہ اگر کوئی کسی سے آکر کہے کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کی اماں جان بازار میں بیٹھا کرتی تھیں تو وہ سن کر بگڑے گا یا نہیں اور اس شخص کے بے اختیار دھول رسید کرے گا کیا نہیں کہ نالائق ہماری اہانت کرتا ہے مجھ کو تو یہ امید نہیں کہ وہ نہایت نرمی سے دلائل سے اس کا جواب دیں تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس کو آپ کیا کہیں گے آیا یہ غیرت و حمیت کہلائے گی یا تعصب اس کو جس طرح ماں کے لئے جوش آیا اسی طرح جو دین کے شیدائی ہیں اور دین کی حرمت پر اپنی عزت و حرمت کو نثار کر چکے ہیں ان کو دین کے لئے جوش ہوتا ہے ان کے سامنے جب کوئی بددین ایسا کلمہ بکتا ہے جس سے دین پر دھبہ آوے خصوص جبکہ بدتہذیبی و تمسخر و طعن سے کہے تو ان کو غیظ و غضب آجاتا ہے اور اگر نہ آوے تو وہ دیندار نہیں ہے بے غیرت ہے سو یہ تو اور بات ہوئی اس میں رحمت و شفقت کے خلاف کیا بات ہوئی یہ حضرات تو اس درجہ رحیم کریم ہوتے ہیں کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں ہے ایک بزرگ نے اپنے مرید سے کہا کہ اگر تم کو کوئی ستائے تو نہ صبر کیجیو اور نہ بدلہ لیجیو بدلہ تو اس لئے نہ لینا جیسے تم کو تکلیف ہوئی ہے ایسی ہی تمھارے بھائی کو تکلیف ہو گی اور صبر اس لئے نہ کرنا کہ یہ صبر اس پر پڑے گا اور پھر اس پر کوئی بلا آوے گی یہ بھی گوارا نہ ہونا چاہیئے اس نے پوچھا کہ پھر کیا کریں فرمایا ذرا بھلا بُرا کہکر دل کا بخار نکال لیا کرو سبحان اللہ اصلی ہمدردی یہ ہے ایک اور بزرگ کی حکایت ہے کہ انھوں نے بازار سے شکر خریدی اور خوب مضبوط کپڑے میں باندھ لی گئی منزل پر گھر تھا گھر جا کر جو کھولا تو دیکھا کہ اس میں ایک چیونٹی ہے پریشان ہو گئے

پھر اُسی جگہ واپس تشریف لے گئے اور اس چیونٹی کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑ آئے البتہ ترحم وہمدردی میں ہی اعتدال واجب ہے پس گاؤکشی یا گوسفند کشی خلاف ترحم وہمدردی نہیں کیونکہ وہ امتثال ہے خالق تعالیٰ شانہ کے حکم کا (جو کہ مالک ہے تمام اشیاء کا) حق تعالیٰ نے اُس کو ہمارے لئے حلال فرمایا ہے اس لئے ایسی ہمدردی کے ہم مامور نہیں ہیں ایسی ہمدردی کریں گے تو معتوب ہوں گے کیونکہ گائے بھینس بکری خالق تعالیٰ شانہ کے حکم کے سامنے کوئی چیز نہیں ہے اگر ہم ان کی رعایت کریں اور ان کو ذبح نہ کریں تو خالق تعالےٰ کے حکم کے خلاف کرنا لازم آتا ہے مولانا نے اس مضمون کی ایک حکایت لکھی ہے کہ سلطان محمود نے ایک مرتبہ ایاز کی آزمائش کی ایک موتی نہایت بیش بہا تھا اس کی نسبت وزیراعظم سے کہا کہ اس کو توڑ ڈالو وزیر نے عرض کیا کہ حضور ایسا درموتی نایاب کہاں ملے گا پھر اور وزرا امرا سے کہا غرض کسی کی ہمت نہ ہوئی آیاز کا نمبر آیا ایاز سے کہا کہ ایاز یہ موتی توڑ ڈالو ایاز نے فوراً توڑ ڈالا پھر محمود نے عتاب کے لہجہ میں پوچھا یہ کیا حرکت کی کہا حضور خطا ہوئی وزرا نے ایاز کو ملامت کی کہ تونے ایسا موتی توڑ ڈالا ایاز نے کہا بے وقوفو تم نے تو شاہی حکم توڑا اور میں نے موتی جس کی حکم شاہی کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں وہ توڑا مولانا الٰہی بخش فرماتے ہیں ؎

نقض امر از کسر در دشوار تر لاجرم بستم بامراد کمر

(حکم عدولی موتی توڑنے سے زیادہ دشوار ہے ناچار میں نے اس کے حکم کے موافق عمل کرنے پر کمر باندھی)

تو حضرت، ہماری تو ہمت نہیں کہ اللہ تعالےٰ تو فرماوے اِذْبَحُوْا بَقَرَۃً (گائے کی قربانی کرو) اور ہم کہیں لَا نَذْبَحُ بَقَرَۃً (ہم گائے کی قربانی نہیں کرتے) دوسرے اگر ہم رحم کھاکر گائے کو چھوڑ دیں تو یہ معنی ہوں گے کہ ہم خدا سے زیادہ رحیم ہیں حالانکہ صفات واجب تعالےٰ شانہ جملہ کامل اکمل ہیں اور صفات ممکنات سب اس کی ظل ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

یعنی زنا کار عورت اور زنا کار مرد ہر ایک کے سو سو درّے لگاؤ اور تم کو ان پر اللہ کے دین کے بارہ میں (یعنی اس حکم کے اجراء میں) رحم نہ آجاوے اگر تم مومن ہو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں   خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(جب شاہ دین مجھ سے طمع کرنے کا خواہاں ہو تو اس کے بعد قناعت کو ترک کر دوں گا)

پس ہم کو تو حکم کا بندہ بننا چاہئے جہاں جو حکم ہو وہاں اسی پر عمل کریں اور حقیقت میں ایسے موقع پر بے رحمی بھی نہیں ہے بلکہ انسان پر رحم کرنے کے لئے اس کے منع میں اس کے مصالح فوت ہوتے ہیں ادنیٰ کو انسان پر فدا کر دیا ہے اور خود اس کو جو ظاہراً تکلیف ہوتی ہے وہ موت طبعی کی تکلیف سے بہت کم ہے اس تقریر سے ذبح کا مسئلہ خوب حل ہو گیا یہ تھی تحقیق ہمدردی کے مسئلہ کی جس کی مدعیان ہمدردی کو ہوا بھی نہیں لگی جو صورت آرائی میں مشغول رہ کر غربا کو ان کی ظاہری حالت شکستگی و بے سروسامانی پر حقیر سمجھتے ہیں یہاں تک بیان صورۃ کے متعلق تھا۔ اب مال کو لیجئے اس وقت اکثر نے مال کو بھی قبلہ و کعبہ بنا لیا ہے حالانکہ مال کو سوچنا چاہئے کہ مال قارون کے پاس کس قدر تھا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ بھی نہ تھا اگر مال کا ہونا کوئی شرف ہوتا تو امر بالعکس ہوتا لیکن اب مال ہی کو کمال سمجھتے ہیں اور اس کے لئے دین بھی برباد کرتے ہیں اب تو اس پر نظر ہے کہ جس طرح ہو سکے مال ہاتھ آنا چاہئے خواہ جائز ہو یا ناجائز کسی پر ظلم ہو یا رحم ہو ایک شخص مدعی علم سود لیتے تھے ان پر کسی نے اعتراض کیا کہ میاں تم سود لیتے ہو حالانکہ وہ حرام ہے تو وہ صاحب فرماتے ہیں کہ میاں چپ رہو کس کا حلال کس کا حرام یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کو مال جس طرح ہاتھ لگے چھوڑنا نہ چاہئے میں ان سے اور جو صاحب ان کے ہم رنگ ہوں کہتا ہوں کہ جب آپ کا یہ دعوٰے ہے کہ مال جس طرح ہاتھ آوے لے لو سو مال ڈکیتی اور چوری سے بھی ہاتھ آتا ہے یہ بھی شروع کر دو احکام شرعیہ کو چھوڑا ہے احکام سلطنت کو بھی چھوڑ دو دیکھو پھر کیا ہوتا ہے تو اُس کو سب مہذبین مستثنٰی کریں گے تو ان کے اقرار ہی سے یہ ثابت ہوا کہ یہ عام مخصوص البعض ہے اور دو

بعض مستثنیٰ اور مخصوص ہیں جو کہ احکام کے خلاف ہوں افسوس صد افسوس کہ حاکم مجازی ظاہری کے خلاف تو جیل خانہ کے خوف سے مستثنیٰ کیا جاوے اور حاکم حقیقی کی مخالفت پر دلیری کی جاوے اور اس کے خلاف حکم کو اُس کلیہ سے مستثنیٰ نہ کیا جاوے بعض اہل حیلہ کہتے ہیں کہ ہم تو دنیا کے لئے کماتے ہیں اگر دنیا نہ ہوگی تو دین کی بھی درستی نہ ہوگی مگر یہ کہنا اُن کا اُس وقت صحیح ہوتا جبکہ ہم یہ دیکھتے کہ دنیا کی ترقی کے ساتھ وہ دین کی بھی ترقی کر رہے ہیں ہم تو روز روشن کی طرح یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس قدر دنیا بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر دین میں کمی آتی جاتی ہے حضرات یہ دنیا کچھ کام نہ آوے گی اور آخرت میں کام نہ آنا تو ظاہر ہی ہے ہم تو اس کا کام میں نہ آنا اور اس کی تحصیل پر حسرت ہونا یہاں ہی مشاہدہ کر رہے ہیں جب کوئی دنیا پرست مرنے لگے مرتے وقت پوچھنا چاہیئے کہ دنیا طلبی کے بارہ میں اس وقت تمہاری کیا رائے ہے آیا تمہاری اب بھی وہی تحقیق ہے یا بدل گئی میں بقسم کہتا ہوں کہ وہ ضرور پہلی تحقیق سے رجوع کریں گے کیونکہ جس بازار میں وہ اب جا رہے ہیں وہاں یہ سکہ نہیں چلتا جو انھوں نے عمر بھر جمع کیا ہے اور جو سکہ وہاں چلتا ہے وہ ان کے پاس ہے نہیں کیونکہ وہ اس کے جمع کرنے کو عمر بھر بلیسو دبتایا کرتے تھے وہاں تو وہ سکہ چلتا ہے جو ظاہر میں تم کو کالا معلوم ہوتا ہے اور واقع میں وہ خالص چاندی ہے اور جو جمع کیا ہے وہ بظاہر چاندی اور واقع میں وہ لوہا ہے مگر اس وقت آنکھیں بند ہیں لیکن عنقریب کھل جاویگی اور حقیقت نظر آجاوے گی ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ　　　اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(غبار ہٹ جائے گا عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے یعنی مرنے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ ہم نے اچھا کیا ہے یا بُرا)

اس وقت تو خواب کا سا قصہ ہو رہا ہے جب آنکھ کھلے گی اس وقت معلوم ہوگا کہ ہم سراسر خسارہ میں تھے۔ ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ ہمیشہ بستر پر پیشاب

کر دیا کرتا تھا اُس کی بیوی نے کہا کہ کمبخت تجھ کو کیا ہو گیا کہ ہر روز بستر پر پیشاب کر دیتا ہے ۔ اُس نے کہا کہ میں خواب میں شیطان کو دیکھتا ہوں کہ مجھ کو سیر کے لئے لیجاتا ہے اور جب مجھ کو حاجت ہوتی ہے کسی جگہ پر بٹھا کر کہتا ہے کہ پیشاب کرلے میں پیشاب کر دیتا ہوں بیوی نے کہا کہ شیطان تو جنات میں سے ہے اور جن کو بڑے تصرفات دیئے گئے ہیں اس سے کہنا کہ ہم فقر و فاقہ میں رہتے ہیں ہم کو روپیہ کہیں سے دلادے اس نے کہا بہت اچھا اب اگر خواب میں آیا تو ضرور کہوں گا حسب معمول شیطان پھر خواب میں آیا اس نے کہا کہ کمبخت تو مجھ کو ہمیشہ پریشان کرتا ہے اور ہم پریشانی میں مبتلا ہیں ہم کو کہیں سے روپیہ نہیں دلاتا شیطان نے کہا تو نے مجھ سے پہلے سے نہ کہا روپیہ بہت غرض ایک جگہ لے گیا اور وہاں سے بہت سا روپیہ اس کو اٹھوادیا اور اس روپیہ کا اس قدر بار معلوم ہوا کہ پائخانہ نکل گیا جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بستر پر پیشاب پائخانہ تو موجود ہے اور روپیہ کا پتہ بھی نہیں یہ حکایت تو ہنسنے کی تھی مگر اس سے ایک نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس عالم کی مثال بالکل خواب کی سی ہے اور جو طالبین دنیا ہیں ان کی مثال اس خواب دیکھنے والے کی ہے اور مال دنیا پائخانہ ہے اس وقت ہم خواب غفلت میں ہیں ہم کو خبر نہیں کہ ہم کیا جمع کر رہے ہیں جب آنکھ کھلے گی یعنی موت آوے گی اس وقت معلوم ہوگا کہ مال تو ندارد مگر پائخانہ یعنی گناہ موجود ہے اس وقت کہیں گے ارے ہم تو بڑے دھوکہ میں تھے جس کو ہم موتی سمجھتے تھے یہ تو سب سنگریزے نکلے ؎

حال دنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ — گفت یا خوابے است یا بادیست یا افسانۂ

باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے بہ بست — گفت یا غولیست یا دیوے است یا دیوانۂ

(ایک عقلمند سے میں نے دنیا کا حال دریافت کیا اس نے کہا یا تو خواب ہے یا ہوا یا افسانہ ہے پھر میں نے کہا اس شخص کا حال بیان کرو جس نے اس میں دل لگا لیا جواب دیا کہ وہ بھتنا ہے یا شیطان یا دیوانہ ہے)

بعض لوگ شبہ کیا کرتے ہیں کہ یہ علما اوروں کو تو ترک دنیا کی ترغیب دیتے ہیں

اور خود مال دنیا میں جمع کرتے ہیں ہم تو جب جانتے کہ خود چھوڑ بیٹھتے اور اگر دنیا آتی تو رد کر دیتے جواب یہ ہے کہ ہم مذمت اس دنیا کی کرتے ہیں جو سبب غفلت ہو جاوے اور اُن دنیا داروں کی مذمت کرتے ہیں جو دنیا میں ایسے منہمک ہیں کہ دین کو بھی برباد کر دیتے ہیں اور جائز ناجائز کا بھی امتیاز نہیں کرتے جو اس کے مصداق ہیں ؎

مباد ادل آں فرومایہ شاد کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(اس کمینہ کے دل کو خوشی نصیب نہ ہو کہ دنیا کے واسطے دین کو برباد کر دیتا ہے)

اور جو دنیا بقدر ضرورت ہو یا ضرورت سے زائد ہو مگر غفلت میں نہ ڈالے وہ مذموم نہیں بلکہ بقدر ضروری کے تحصیل ضروری ہے ملا جامی جب پیر کی تلاش میں خواجہ عبید اللہ احرار کے یہاں پہنچے تو خواجہ صاحب کے یہاں بڑا ٹھاٹ تھا ہر طرح کی نعمتیں دنیا کی موجود تھیں ملا جامی آکر بہت پچھتائے اور جوش میں خواجہ صاحب کے سامنے ہی بے اختیار منہ سے نکلا ؎

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

اور یہ کہکر بہت حسرت افسوس کے ساتھ کسی مسجد میں جاکر لیٹ رہے خواب میں دیکھا کہ میدان حشر قائم ہے اور ملا صاحب کسی قرض خواہ کے تقاضے سے سخت پریشان ہیں کہ ایک جانب سے حضرت خواجہ صاحبؒ باتزک واحتشام تشریف لائے اور فرمایا کہ درویش کو کیوں پریشان کیا ہم نے جو خزانہ یہاں جمع کیا ہے اس میں سے دلوادو. اس کے بعد آنکھ کھل گئی اس وقت خواجہ صاحب اسی مسجد میں آرہے تھے فوراً حاضر ہو کر پاؤں پر سر رکھ دیا اور عرض کیا کہ میری گستاخی معاف فرما دیجئے انھوں نے فرمایا کہ وہ مصرعہ آپ نے کس طرح پڑھا انہوں نے عرض کیا حضرت وہ تو حماقت تھی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ نہیں ہم اُس کو سننا چاہتے ہیں ملا جامی ؒ نے فرمایا کہ میرے مُنہ سے یہاں کے سامان کو دیکھ کر یہ نکلا تھا۔

ع نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد
(وہ مردِ خدا نہیں جو دنیا کو دوست رکھے)

فرمایا کہ یہ صحیح ہے مگر ناتمام ہے اِس کے ساتھ یہ مصرعہ اور ملا دو۔

ع اگر دارد برائے دوست دارد
(اگر رکھتا ہے تو محبوب حقیقی کے لئے رکھتا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مال دنیا بھی دین کے لئے ہو تو سبحان اللہ ایسا مال دنیا نہیں بلکہ وہ سب دین ہے مال کی مثال پانی کی ہے اور قلب کی مثال کشتی کی سی ہے اگر پانی کشتی کے اندر آ گیا تو اس کو غرق کر دیتا ہے اور اگر باہر رہے تو اس کے لئے امداد کا سبب بن جاتا ہے اسی طرح مال اگر قلب کے اندر ہو یعنی اس کی محبت قلب میں متمکن ہو جاوے تو وہ باعث ہلاکت ہے اور اگر باہر رہے تو کچھ مضر نہیں ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است آب اندر زیر کشتی پشتی است
مال را گر بہر دیں باشی حمول نِعْمَ مالٌ صالحٌ گفت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(پانی اگر کشتی میں بھر جائے تو کشتی کی بربادی ہے اور اگر کشتی کے نیچے (باہر) رہے تو اس کی رفتار میں معین ہے مال کو اگر دین کے لئے اپنے پاس رکھو تو اس کے حق میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نعم المالُ للرجُلِ المصَالِح نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے)

غرض کہ قدرِ ضرورت مال تو بہت ضروری ہے ورنہ پریشانی ہوتی ہے اور پھر وہی حالت ہوتی ہے۔

شب چو عقد نماز بربندم چہ خورد بامداد فرزندم
(رات کو جب نماز کی نیت کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ صبح کو میرے بال بچے کیا کھائیں گے)

ایک فارسی داں نے اس شعر کے معنے عجیب و غریب بیان کئے اور بعد سننے کے واقعی معلوم ہوتا ہے کہ ذوق لسانی کے موافق یہی معنی ہیں

وہ یہ ہے کہ

شب چو عقد نماز بر بندم — بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد الخ

(رات کو جب نماز کی نیت کرتا ہوں تو بجائے تکبیر تحریمہ کے کہتا ہوں کہ صبح کو میرے بال بچے کیا کھائیں گے)

یعنی میری حالت پریشانی کی یہاں تک پہنچی ہے کہ ہر وقت اسی کا خیال رہتا ہے حتیٰ کہ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ منہ سے کیا نکل رہا ہے چنانچہ بجائے تکبیر تحریمہ کے یہی کہہ کر نیت باندھ لیتا ہوں چہ خورد بامداد فرزندم یہ معنے اس شعر کے نہایت لطیف ہیں اور اس میں مبالغہ بھی بہت ہے غرضکہ ایسے مال کے طلب سے نہی نہیں ہے گفتگو اس مال میں ہے جو سبب غفلت کا ہو اور دوسرے غریب بھائیوں کی اہانت اور تحقیر کا ذریعہ ہو آگے فرماتے ہیں وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى اَعْمَالِكُمْ وَنِيَاتِكُمْ یعنی اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال اور نیات کو دیکھتے ہیں جبکہ ثابت ہو گیا کہ حق تعالےٰ کی نظر اعمال اور نیت پر ہے اور صور اور اموال پر نہیں تو صاحبو! آپ اپنی نیت اور اعمال سنوارنے کی فکر کرو ماشاءاللہ بقدر ضرورت اس حدیث شریف کے پہلے ہر دو جز کی تفصیل ہو گئی ہے اور باقی دو جز کی تفصیل باقی ہے انشاءاللہ وہ پھر کسی وقت ہو جائے گی۔ فقط

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اوّل کا

وعظ ہشتم ملقب بہ

الاخلاص

حصّۂ دوم (۲)

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمّد عبد المنّان غُفِرلہٗ

مکتبہ تھانوی ——— دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی

ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد اول کا
وعظ ہشتم ملقب بہ

الاخلاص

حصۂ دوم

این	متیٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	۰	کس نے لکھا	کمتنا ہوا	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۵ جمادی الاخری سنہ ۱۳۲۹ھ	بیٹھ کر	اخلاص	۰	مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی	۰	۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلے اللہ علیہ وعلی الہ وبارک وسلم **اما بعد** فقد قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی اَعْمَالِکُمْ وَنِیَّاتِکُمْ ۔ (اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے تمہارے اعمال اور نیتوں کو دیکھتے ہیں) اس حدیث کے اول دو جزء کا بیان جمعہ گذشتہ کو بالتفصیل ہو چکا۔ اخیر کے دو جزء باقی ہیں حسب وعدہ آج ان کو بیان کرتا ہوں۔ اس حدیث

کے اختیار کرنے کی وجہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ہر زمانہ میں ابنائے زمان مختلف امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اس زمانہ کے امراض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری نظر ہمہ تن دنیا پر ہے (جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعنوان صورۃ و مال تعبیر فرمایا) اور جو اصل چیز ہے جس پر مدار فلاح کا ہے یعنی دین (جس کو عمل اور نیت سے تعبیر فرمایا ہے) اُس پر بالکل نظر نہیں ہے عوام دنیا دار تو اس مرض میں مبتلا ہیں یہی ہم دیکھتے ہیں کہ جو دیندار ہیں یعنی اپنے کو دیندار کہتے ہیں یہ مرض ان میں بھی موجود ہے دنیا دار کی جس قدر وقعت ان کے نزدیک ہے اُس قدر دیندار کی نہیں مثلاً اُن کے پاس ایک دنیا دار آوے اور ایک دیندار۔ اس دیندار کو نہ جاہ حاصل ہو اور نہ وہ شیخ اور بزرگ ہو نہ اُس کے پاس مال ہو نہ کوئی کمال اس کا مشہور ہو نہ وہ عالم اصطلاحی ہو بلکہ بقدر ضرورت دین کا علم بغیر پڑھے لکھے حاصل کر لیا ہو جیسا کہ اکثر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کو تھا چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے روحی فداہ وصلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں فرمایا ہے نَحْنُ اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ (ہم اَن پڑھ لوگ ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب جانتے ہیں) کیونکہ پڑھنا لکھنا مقصود بالذات تو ہے ہی نہیں اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اس کی ضرورت تھی ہر صحابی کو نور فہم اور علم دین بے لکھے حاصل تھا بعد زمانہ خیریت نشانہ کے نہ تو وہ قوت حافظہ رہی اور نہ تدین عالم رہا اس وقت تدوین علوم کی اور بطرز خاص وتدریس وتعلیم وتعلم کی حفاظت علوم کے لئے بھی اور غلط دعویٰ اور تلبیس کے قطع کرنے کے لئے بھی ضرورت واقع ہوئی غرض فرض کیا جاوے کہ اُس شخص کا علم غیر درسی ہو کہ جس سے کچھ وقعت ہوتی اور یہ شخص عفیف صالح متقی بھی ہے اور ظاہری حالت اس کی یہ ہے کہ صورت بھی اس کی بدنما ہو کپڑے بھی خستہ ہوں اور حسب ونسب اس کا اچھا نہ ہو بلکہ ایسی قوم میں سے ہو جو ادنےٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہو۔ غرض ظاہری امتیاز کچھ نہ ہو اور دوسرا شخص دنیا دار ہو دین کا کوئی پہلو لئے ہوئے نہ ہو نہ زہد ہو نہ تقویٰ نہ علم ہو اور نسب میں بھی بڑھا چڑھا ہو اور یہ دونوں شخص یکے بعد دیگرے ان مدعی دین کے پاس آویں تو مین تقسم

کہتا ہوں اور کسی کو کیا کہوں خود اپنے کو کہتا ہوں کہ جو قدر اور وقعت اور وجاہت نظر میں اس دنیا دار کی ہوگی اس دیندار کی نہ ہوگی حق یہ ہے کہ نفوس میں عموماً دنیا کی طرف میلان ہے ظاہری جاہ و مال کو دیکھا جاتا ہے اگرچہ وہ جاہ دین کی وجہ سے حاصل ہو بزرگوں میں سے بھی اسی بزرگ کی تعظیم کریں گے جس کی چار آدمی تعظیم کرتے ہوں اس لئے کہ اس کی تعظیم و خدمت کرنے سے عار نہیں ہے یہ سخت کید خفی ہے ظاہراً تو یہ تعظیم و خدمت نہایت صلاح کے اوپر دال ہے لیکن راز اور کید نفس اس میں یہ ہے کہ اُن بزرگ کی خدمت اور تعظیم اس لئے کرتے ہیں کہ اس فعل سے لوگوں کی نظر میں خود اپنے کو بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ پس ہماری یہ تعظیم اپنی تعظیم کے لئے ہے اسی واسطے اس خدمت اور تعظیم سے نفس خوش ہوتا ہے کچھ شکستگی اس کو نہیں ہوتی۔

اپنے اساتذہ میں اگر دو شخص ہوں ایک مشہور اور دوسرا غیر مشہور تو ہم اپنے کو مشہور کی طرف نسبت کرتے ہیں غیر مشہور کی طرف نسبت کرتے ہوئے عار آتی ہے۔ اسی واسطے بزرگان دین نے لکھا ہے کہ ریا بہت آخر میں دل سے نکلتی ہے ہاں اگر یہ اکرام دنیا کے لئے نہ ہو دفع شر یا دلجوئی کے لئے ہو اور غریب کی تحقیر بھی نہ ہو تو وہ مذموم نہیں حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کی دینداری بس صورۃً اور ظاہراً ہے اور حقیقی دینداری بہت ہی کم ہے خود ہی فرماتے ہیں وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ (میرے بندوں میں سے شکر گذار بندہ کم ہیں) اکثر لوگ رسم پرستی اسم پرستی ظاہر پرستی میں مبتلا ہیں اور یہ سب دنیا ہے اور دنیا کی نسبت ارشاد ہے لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَاسَقٰى مِنْهَا كَافِرًا شَرْبَةَ مَاءٍ یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کی برابر بھی قدر رکھتی تو کافر کو اس سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتے۔

حاصل یہ کہ خواہ حسب نسب کی وجہ سے قدر ہو یا علم کی وجہ سے ہو نہ من حیث العلم بلکہ اس حیثیت سے کہ علم سے بھی جاہ دنیوی حاصل ہوتا ہے یا

مال کی وجہ سے ہو سب دنیا ہے اور اسی کو صورت اور اموال سے تعبیر فرمایا ہے اس کو نظر انداز کرنا چاہئے اور دین جس کو اعمال اور نیات فرمایا اس پر نظر ہونا چاہئے حتیٰ کہ اگر دوسروں کی قدر کی جاوے تو دین ہی کی وجہ سے ہونا چاہیئے اور اس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے لفظ دین کے دو چیزیں ارشاد فرمائی ہیں ایک عمل دوسری نیت اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دین کا مدار اعمال پر ہے کسی اور شئے پر مثلاً کسی دینوی و دینی شرف کی طرف انتساب پر نہیں بہت لوگ آج کل مغرور ہیں کہ ہم فلاں بزرگ کے مرید ہیں، ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں ہماری نجات ہو جاوے گی اعمال کی ہم کو ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ ہی اُن لوگوں کے رد میں فرماتے ہیں تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ گذر گئے ان کے لئے ان کے اعمال ہیں تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں تم سے اُن کے اعمال کی نسبت سوال نہ ہوگا ہاں بزرگوں کے انتساب سے برکت البتہ حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ اعمال وعقائد کا ذخیرہ بھی اپنے پاس موجود ہو اور اگر اعمال نہ ہوں نہ عقائد صحیح ہوں تو نری برکت کیا کام آوے گی برکت مثال چٹنی اور مربے کی سی ہے اور اعمال کی مثال غذا کی سی ہے جو کہ جزو بدن ہوتی ہے۔ مربے اور چٹنی معین ہضم طعام ضرور ہیں لیکن غذا بھی ہونی چاہیئے اور اگر غذا نہ ہو صرف مربے اور چٹنی مہمان کے سامنے رکھدیں اور روٹی وغیرہ کچھ نہ ہو تو کیا اس سے کام چل سکتا ہے۔ پس اسی طرح انتساب الی الانبیاء والاولیاء باعث برکت فی الاعمال ہے نہ کہ نجات کے لئے انتساب ہی کافی ہو اسی لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی خاص بیٹی کو خطاب کر کے فرمایا یَا فَاطِمَةُ اِنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ لَا اُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا یعنی اے فاطمہ نفس آگ سے بچا و میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ کام نہ آؤں گا یعنی اگر تمہارے پاس اعمال کا ذخیرہ نہ ہوگا تو میں کچھ کام نہ آؤں گا اور اس کی نفی نہیں کہ اعمال کے ہوتے ہوئے بھی میں باعث ترقی درجات ہونا خود منصوص ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے اُن کا ایمان کے ساتھ اتباع کیا ہم اس اولاد کو بھی اُن کے ساتھ ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں سے کچھ کمی نہ کریں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ اولاد کے اعمال اس درجہ کے نہ ہوں جیسے کہ آباد کے تھے لیکن اگر اس اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کا اتباع کیا ہوگا تو ہم اُن کو ان کے آبار کے درجہ میں پہنچا دیں گے تو اس الحاق کا انکار نہیں ہوسکتا مگر اس کی کوئی دلیل نہیں کہ صرف یہ انتساب ہی الحاق کے لئے کافی ہے بلکہ اس آیت میں ایمان کو خود شرط فرمایا ہے اور وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ (اور ان کے عمل میں سے کچھ کمی نہ کریں گے) میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضروری عمل بھی شرط ہے کیونکہ دفع دخل میں یہ فرمایا کہ ہم ان اسلاف کے عمل سے کچھ کم نہ کریں گے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصل مدار درجات کا عمل ہے اور ظاہر ہے کہ اصل کا ہونا ضروری اور یوں اضافہ خواہ غیر عمل سے ہوجاوے پس خود آیت میں بھی دلالت ہوگئی کہ آبار کے مرتبہ میں ذریت اُس وقت پہنچے گی جبکہ اعمال اور عقائد دونوں کا ضروری ذخیرہ جمع ہو۔ آج کل کے پیروں نے اپنی دُکان جمانے کے لئے اور دنیا کمانے کے لئے اپنے مریدین کے دلوں میں یہ جما رکھا ہے کہ تم کو اعمال کی کچھ ضرورت نہیں ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہی تمہارے لئے کافی ہے۔ افسوس پیری مریدی کی غرض تو اصلاح نفس اور مجاہدۂ نفس تھی کہ خود شاید عمل کی توفیق نہ ہوتی پیر کے اثر یا تاکید سے عمل کی توفیق ہوجاوے گی اور نفس مہذب ہوجاوے گا اب لوگوں نے اس طریق کو تعطل کا آلہ بنا رکھا ہے ایک ایسے پیر کی حکایت ہے کہ وہ ایک گاؤں میں گئے اور لاغر اور کمزور ہو رہے تھے مریدوں نے پوچھا کہ پیر جی دُبلے کیوں ہو رہے ہو کہنے لگے ارے کمبختو تمہارے ہی وجہ سے تو دبلا ہو رہا ہوں اور تم کو خبر بھی نہیں تمام کام تمہاری طرف سے مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں تم نماز نہیں پڑھتے تمہاری طرف سے نماز پڑھتا ہوں تم روزے نہیں رکھتے میں روزے رکھتا ہوں پھر سب سے بڑھ کر یہ مصیبت کہ پلصراط پر جو کہ تلوار سے تیز اور

بال سے باریک ہے اس پر بھی چلتا ہوں۔
مرید بہت خوش ہوئے کہ پیر ہی سب کام ہماری طرف سے کر لیتے ہیں اور ایک مرید خوشی میں بولا کہ جا میں نے تجھ کو فلاں کھیت وہاں کا دیا پیر بہت خوش ہوئے مگر یہ بھی سوچے کہ اس نے کھیت تو دے دیا لیکن قبضہ ہمارا اس پر ہوا نہیں مبادا یہ زبانی لین دین ہوا مناسب یہ ہے کہ قبضہ کر لیں اور اس کو دیکھ لیں یہ سوچکر اس مرید سے فرمایا کہ چل کر دکھلا دے وہ ساتھ ہوا اور پیر صاحب تشریف لے چلے چانول کے کھیت میں پانی زیادہ تھا اور مینڈ تنگ تھی ایک جگہ پیر صاحب پھسل پڑے مرید نے ایک لات جڑی اور کہا ارے تو پلصراط پر کیا چلتا ہوگا اتنے چوڑے رستہ میں تو تجھ سے چلا نہ گیا تو جھوٹا ہے جا ہم تجھ کو کھیت نہیں دیتے آجکل کے پیروں نے خوب سمجھا دیا ہے کہ جو چاہو کرو سب بخشے جاؤ گے اِس حدیث شریف میں اس زعم باطل کا رد ہے اِسی واسطے بجائے لفظ دین کے لفظ اعمال فرمایا اور ہر چند کہ عمل میں نیت بھی آ گئی تھی لیکن نیت کو علٰحدہ اس لئے بیان فرمایا کہ یہ معلوم ہو جاوے کہ خود اعمال ہی جب معتبر ہیں جبکہ نیت درست ہوا اور نیز ان دو لفظوں سے دو گروہوں کی اصلاح فرمائی لفظ اعمال سے تو غالب عوام کی کیونکہ عوام کو دنیا کے دھندوں میں شب و روز غلطاں پیچاں رہنے سے اکثر اعمال کی طرف توجہ کم ہوتی ہے لیکن بدنیتی یعنی ریا، وغیرہ سے اس لئے مبرا ہیں کہ ان کو کوئی بزرگ نہیں سمجھتا اس لئے وہ اس کا قصد بھی نہیں کرتے اور لفظ نیات سے غالب خواص کی جو دیندار کہلاتے ہیں تمام شعائر اسلام کے پابند ہیں لیکن اخلاص سے خالی ہیں اس لئے ان کی یہ دینداری محض صورتًا ہے۔ روح دین کی اُن کو حاصل نہیں ایسے لوگوں میں اکثر مرض ریا کا ہوتا ہے ان کو لفظ نیت سے اخلاص کی طرف متوجہ فرمایا تو مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ نماز روزہ ذکر حج زکوٰۃ تم کرتے ہو اگرچہ نفس اعمال نفع سے خالی نہیں ہیں اور بہ نسبت اس شخص کے جو کچھ نہ کرے اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے مگر جو اصل مقصود ہے یعنی رضا وہ جب ہی حاصل ہوگا جبکہ اخلاص بھی ہو اور اس کی ایسی مثال ہے کہ دو شخص

کسی بادشاہ کے ہاں گئے ایک تو ہدیہ لے گیا اگرچہ وہ ہدیہ بادشاہ کے لائق نہ ہو اور دوسرا بغیر ہدیہ کے گیا تو اگرچہ اس ہدیہ نہ لے جانے والے کی یہ شکایت تو نہ ہوگی کہ ہدیہ کیوں نہ لایا جیسا اس دوسرے سے یہی باز پرس ہوگی اور اس اعتبار سے یہ اس سے غنیمت ہے مگر یہ شکایت ضرور ہوگی کہ تمہارا ہدیہ ہمارے لائق نہیں اور چونکہ مقصود ہدیہ ہے ارضاء رہے اور اگر وہ حاصل نہ ہوگا تو ہدیہ کالعدم ہوگا اسی طرح مقصود عبادت سے رضاء رہے پس جس عبادت میں غرض مفاسد کی آمیزش ہوا ور نیت درست نہ ہو تو ایسی عبادت کا بھی عدم و وجود برابر ہوگا سو ہم لوگ اعمال کرتے ہیں مگر ہمارے اغراض اکثر فاسد ہوتے ہیں۔ چنانچہ اہل علم اہل زہد اپنی حالت کا موازنہ صحیح کر کے دیکھیں تو زیادہ حصہ اپنے اعمال میں اغراض نفسانیہ کا پائیں گے مثلاً عبادات نافلہ تلاوت قرآن و ذکر و نوافل تہجد اور جو اعمال اخفا کے قابل ہیں اُن کو کر کے ہمارا جی چاہتا ہے کہ ان کا عام طور پر ظہور ہو جاوے اور لوگوں میں ہم عابد زاہد مشہور ہوں مثلاً تہجد میں اگر کوئی شب کو ایسے وقت اُٹھا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی اور تہجد پڑھ کر سو رہا تو اس حالت میں اور جس حالت میں کہ دوسرے کو اطلاع ہو بڑا فرق ہوتا ہے اطلاع ہونے پر بڑی خوشی ہوتی ہے اور اگر اطلاع نہ ہو تو جی چاہتا ہے کہ کسی طرح ظہور ہو جاوے اور اس کے متجسس رہتے ہیں کہ کوئی ہمارا ذکر تو نہیں کرتا اگر کسی نے ذکر نہ کیا تو نفس کو ایک طرح کا افسوس ہوتا ہے کہ رات کا اٹھنا بیکار رہی ہوا۔ اسی طرح تمام اعمال میں ہماری یہ حالت ہے۔

جاننا چاہیئے کہ عمل نیک کے دیکھنے پر جو دل خوش ہوتا ہے اس خوشی کی تین قسمیں ہیں ایک تو طبعاً جی خوش ہوتا ہے کہ الحمد للہ اس شخص نے ہم کو اچھی حالت میں دیکھا یہ خوش ہونا تو ایسا ہے جیسے لذیذ کھانا کھانے سے جی خوش ہوتا ہے طبیعت کا مقتضا ہے کہ اچھی شئے سے خوشی ہوتی ہے غرض یہ فرحت تو آثار طبعیہ میں سے ہے اس کے ازالہ اور رفع پر قدرت نہیں ایسے خوش ہونے میں کچھ ملامت نہیں اہل خلوص کو سخت غلطی ہوتی ہے کہ اس فرحت میں اور ریا میں ان کو امتیاز نہیں ہوتا اس لئے اہل خلوص

کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے وہ رات دن اسی غم میں گھلتے ہیں کہ ہماری نماز کو جو فلاں شخص نے دیکھا اور ہم کو خوشی ہوئی یہ بھی ریا ہو گئی حالانکہ یہ فرحت طبعی ہے ریاء نہیں مگر یہ نہیں سمجھتے اور اپنی عبادت کو بیکار جانتے ہیں اور شب و روز اسی غم میں رہتے ہیں انجام ایسے اخلاص کا یہ ہوتا ہے کہ شیطان بہکا دیتا ہے کہ جب تمہارا عمل کارآمد نہیں ہے تو ایسے عمل سے فائدہ ہی کیا پس یہ شخص مایوس ہوکر اس عمل ہی کو چھوڑ دیتا ہے اور کبھی عمل تو نہیں چھوڑتا لیکن اخلاص کے اندر سعی ترک کر دیتا ہے اور بعض مرتبہ یہ مضرت ہوتی ہے کہ اپنے شیخ سے بدگمانی ہوجاتی ہے کبھی اُن کے کمال میں بدگمانی ہوجاتی ہے کہ میاں اگر یہ صاحب کمال ہوتے تو ہم کو اخلاص ضرور نصیب ہوتا اور کبھی توجہ میں بدگمانی ہوتی ہے کہ ہماری طرف توجہ نہیں ہے اور یہ کفران نعمت ہے جو شخص تمہارا مربی اور مصلح ہوا اور اس کو ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہو یہ خیالات تمہارے اگر اس کو معلوم ہوجاویں تو اس کا دل ضرور دکھے گا اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ نعمت تم سے سلب ہوجاوے گی۔ یہ غلو فی الاخلاص ہے کہ ایک دولت حاصلہ کی نفی کر رہے ہو۔ کسی درویش سے ایک ہاتھی سوار نے کہا کہ یا وادعا کرو کہ ترقی ہو درویش نے کہا کہ با وا ہاتھی پر تو سوار ہے کیا بانس پر سوار ہوگا اسی طرح تم کو اللہ تعالے نے اخلاص نصیب فرمایا ہے اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ نہ کہ اس کا کفران کیا جاوے۔ غرض یہ فرحت طبعی ہے اس کو ریا سمجھنا غلطی ہے خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ریا اعمال اختیاریہ میں سے ہے اور وسوسہ ریا غیر اختیاری پس وسوسہ ریا نہیں ہے جیسے کہ وسوسہ کفر کفر نہیں۔ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کو وساوس آجاتے تھے۔

بس وسوسۂ ریا سے ریاکار نہیں ہوتا ہے یہ بھی شیطان کی رہزنی کا ایک طریق ہے کہ ضروری مقصود سے دور کرکے اِس دھندے میں لگا دیتا ہے۔ پس یہ ایک قاعدہ کلیہ نکل آیا کہ جو امر غیر اختیاری ہو وہ مذموم نہیں اور اس قاعدے کے ذہن نشین کر لینے سے بہت سے صعوبات جو سالک کو پیش آتے ہیں سب حل ہوجاتے ہیں عارف

شیرازی اسی کو فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(طریقت میں جو کچھ سالک کو پیش آئے اس کے لئے خیر ہی ہے صراط مستقیم پر کوئی گمراہ نہیں ہے)

پیش آید کا مطلب یہی ہے کہ جو بلا اختیار پیش آوے وہ اس کے لئے خیر ہی خیر ہے اور فعل اختیاری تو پیش آور ہوتا ہے اس پر البتہ مواخذہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ ایک قسم تو خوش ہونے کی یہ ہوئی اور دوسری قسم یہ ہے کہ دوسرے کے دیکھنے سے اس لئے خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال نیک دیکھنے سے اس کو بھی توفیق ہوگی اور اس کا ثواب ہم کو بھی ملے گا۔ یہ خوشی بھی مذموم نہیں ہے۔ مگر یہاں مبتدی کو ایک دھوکا ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس اظہار سے اصل مقصود تو نفس میں یہی ہوتا ہے کہ میری جاہ بڑھے اور لوگ مجھ کو معظم سمجھیں مگر ذہن تراش یہ لیتا ہے کہ میں اس لئے اظہار کرتا ہوں کہ لوگ دیکھ کر میرا اقتدا کریں لہذا مناسب مبتدی کے حال کے یہی ہے کہ اظہار کا قصد ہی نہ کرے البتہ کوئی صاحب کمال ہو اور نفس اس کا فنا ہو چکا ہو اور وہ اظہار عمل کا اس نیت سے کرے تو اس کو جائز ہے اور باعث ثواب ہے اسی واسطے بزرگوں کا قول ہے رِیَاءُ الشَّیْخِ خَیْرٌ مِّنْ اِخْلَاصِ الْمُرِیْدِ یعنی شیخ کا اظہار مرید کے اخلاص سے بہتر ہے یہاں ریا بمعنی لغوی ہے اصطلاحی نہیں مطلب یہ ہے کہ شیخ کا اظہار چونکہ موجب نفع متعدی ہے کہ دوسرے دیکھ کر اقتدا کرتے ہیں اس لئے وہ مرید کے اخلاص سے کہ اس کا نفع اسی کی ذات تک ہے بہتر ہے پس اس مقصد سے اگر خوشی ہو تو یہ خوشی عبادت ہے۔

تیسرے خوشی اظہار عبادت پر اس لئے ہوتی ہے کہ ہماری نیک نامی ہوگی اور لوگ ہمارے معتقد ہوں گے یہ ریا ہے اور مذموم ہے اور اس کے لئے سخت وعیدیں حدیث شریف میں آئی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز شہید کو بلایا جاویگا اور کہا جاوے گا کہ ہم نے تجھ کو فلاں فلاں نعمت دی تھی تو نے اس کا کیا شکر ادا کیا وہ عرض کرے گا کہ اے رب میں نے آپ کی راہ میں جان تک دیدی ارشاد ہوگا کہ تو نے

ہمارے واسطے نہیں کیا بلکہ محض اس لئے کہ شجاع مشہور ہو سو یہ غرض حاصل ہو گئی اب یہاں کیا لیتا ہے اور حکم ہوگا کہ اس کو منہ کے بل اوندھا گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دو چنانچہ یہ اسی طرح پھینک دیا جاوے گا پھر اسی طرح ایک عالم اور ایک سخی سے گفتگو ہوگی اور ان دونوں کے عمل میں بھی یہی جب شہرت کا نقص نکالا جاوے گا اور ان سب کو دوزخ میں ڈالدیا جاوے گا۔ دیکھئے یہ افضل الاعمال ہیں مگر ریا ایسی شئے ہے کہ ان اعمال کو بھی اس نے بیکار کر دیا ایک عجیب بات سنئے کہ بعض اوقات آدمی خدا سے بھی ریا کرتا ہے آپ کو حیرت ہوگی کہ خدا سے ریا کیسے ہو سکتی ہے میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی صورت یہ ہے اور بہت واقع ہوتی ہے کہ ایک آدمی کی عادت تھی کہ سب کے سامنے تو لمبی لمبی نمازیں پڑھتا تھا اور خلوت میں جلدی جلدی اس کے بعد اس کو شرم آئی کہ افسوس میں خلوت میں جلدی جلدی نمازیں پڑھتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھ کو کیا کہیں گے اس لئے جلوت کی سی نماز پڑھنے لگا لیکن نہ اس وجہ سے کہ اصل مقصود خلوت کی تطویل ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اصل مقصود جلوت کی تطویل ان ہی اغراض فاسدہ کے لئے ہے مگر خلوت کی تطویل اس لئے اختیار کی ہے کہ اس سے وہ تطویل جلوت مورد الزام نہ ہو پس اصل مقصود تو اس کا یہی ہے کہ مخلوق کے نزدیک میری قدر ہو مگر اللہ میاں کے الزام سے بچنے کے لئے تنہائی میں بھی وہ لمبی لمبی پڑھنے لگا یہ ہے ریا خدا تعالیٰ کے ساتھ اور بعض اوقات نیت اچھی نہیں ہوتی مگر فرضی نیت تصنیف کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ریا کار نہ ہو مگر یہ نیت ایسی ہی ہے کہ ایک مسافر کا اسباب بندھا رکھا ہے ٹکٹ اسٹیشن سے لانے کو آدمی کو بھیج رکھا ہے اور کوئی صاحب اس سے کہیں کہ تم امام بن کر پوری نماز پڑھا دو اور اس کے لئے قیام کی نیت کر لو غرض مبحث ریا کا طویل اور زوال اس کا قدرے عسیر ہے مگر یہ نہیں کہ اس مرض کا ازالہ نہ ہو سکے یقیناً ازالہ ہو سکتا ہے مگر معالجہ کرنے سے پس جو لوگ اس کے معالجہ میں مصروف ہیں اور پھر بھی ان کو شائبہ ریا کا پیش آجاتا ہے وہ بے فکر رہیں کیونکہ وہ واجب کو ادا

کر رہے ہیں ان کے ذمہ اسی قدر ہے اللہ تعالے فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی اللہ تعالےٰ سے ڈرو جس قدر تم سے ہو سکے اور دوسرے مقام پر جو فرمایا ہے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے اور بظاہر اس میں اور آیۃ سابقہ میں تعارض معلوم ہوتا ہے چنانچہ سلف سے بھی منقول ہے کہ یہ ناسخ و منسوخ ہیں یعنی اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) منسوخ ہے اور اتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس قدر تم سے ہو سکے) ناسخ ہے اور نسخ فرع ہے تعارض کی اس لئے سلف کے اس قول سے بھی تائید تعارض کی ہوئی سو حقیقت میں کچھ تعارض نہیں ہے کیونکہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ تو منتہائے سلوک ہے یعنی مقصود سلوک کا یہ ہے کہ حق تقویٰ حاصل ہو اور اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ میں ابتدا ر سلوک کو بیان فرمایا ہے کہ اس میں شیئاً فشیئاً کوشش کی جاتی ہے اِن دونوں امروں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی امر کرے کہ چھت پر چڑھو اور وہ گھبرا جاوے کہ میں کیسے جاؤں تو اس کو کہا جاوے گا کہ زینہ پر بقدر استطاعت ایک ایک درجہ طے کر کے پہنچ جاؤ دوسری مثال یہ ہے کہ کوئی امر کرے کہ علاج کر کے اپنا بخار دور کرو اور گھبرا جاوے کہ کیا کوئی دوا ایسی ہے کہ آج ہی بخار جاتا رہے تو اس کو کہا جاوے گا کہ تھوڑی تھوڑی دوا پیا کرو بخار جاتا رہے گا اسی طرح مطلب حق تعالیٰ کا یہ ہے کہ بقدر استطاعت تقوے کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جاوے اور سلف نے جو اس میں نسخ کہا ہے تو وہ نسخ اصطلاحی نہیں ان کے عرف میں نسخ مطلق اختلاف کو کہتے ہیں وَلَوْ بِالْاِجْمَالِ وَالتَّفْصِیْلِ (اگرچہ اجمال اور تفصیل کے ساتھ ہو) جیسا یہاں ہے غرض دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہو گیا کہ کام میں لگنے والے اور معالجہ کرنے والے ہرگز نہ گھبرائیں انپر کوئی ملامت نہیں وہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالےٰ سے ڈرو جس قدر ہو سکے) پر عمل کر رہے ہیں انشاء اللہ ایک روز ان کو حق تقوے بھی حاصل ہو جاوے گا ہاں جو معالجہ سے غافل ہیں اور مرض کو بڑھا رہے ہیں ان پر البتہ ملامت ہے بہر حال ہمکو

اپنی نیت کا خالص کرنا ضروری ہے تاکہ دین کی حقیقت ہم کو حاصل ہو اور آجکل اکثر لوگ اس خیال سے خالی ہیں حتیٰ کہ دینداروں تک کی یہ حالت ہے کہ اعمال خیر کے ارتکاب اور اعمال سوء کے اجتناب میں بھی وضع اور رسم و رواج کے پابند ہیں چنانچہ بعض اعمال کے پابند ہیں جیسے نماز اور جس کا ترک ان کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس کے پابند ہیں جیسے نماز اور جس کا ترک خلاف شان نہیں سمجھا جاتا اس کے پابند نہیں جیسے حقوق العباد۔ اسی طرح ہم لوگ غیبت تو کرتے ہیں مگر شراب نہیں پیتے سو شراب نہ پینا اس لئے نہیں کہ حق جل مجدہٗ راضی ہوں ورنہ غیبت کو بھی ترک کرتے بلکہ اس لئے ہے کہ باپ دادا نے شراب نہیں پی یہ خلاف وضع ہے اور غیبت وہ بھی کرتے رہے اس لئے خلاف وضع نہیں رشوت لیتے ہیں۔ جوا نہیں کھیلتے تو وجہ یہی ہے کہ جوا بازاروں میں بیٹھ کر کھیلنا بے حرمتی کا سبب ہے اور رشوت خاندانی رسم ہے وضع کے خلاف نہیں، باپ نے لی دادا نے لی اور اپنے اور اپنے تمام ہمعصر ہم چشم لیتے ہیں اس لئے اس کے لینے میں باک نہیں بہت کم رہن کی آمدنی کھاتے ہیں اور عرفی سود نہیں لیتے وجہ یہ ہے کہ سود لینے والے کو ذلیل و خوار سمجھتے ہیں اور رہن کی آمدنی تو باپ دادا سے کھاتے چلے آئے ہیں وہ شان ریاست ہے بعض اعمال میں یہ ہے کہ جن کی ہمیں عادت ہے اور عرفاً وہ موجب ذلت بھی نہیں اور رسم و رواج کے بھی خلاف نہیں ہیں ان کے پابند ہیں اور جن کی عادت نہیں ہے یا موجب استخفاف سمجھے جاتے ہیں ان کے پابند نہیں ہیں اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (بعض کتاب پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو) کے مصداق بن رہے ہیں اس پر دعوے ہے تقدس کا اور مدعی ہیں بزرگی کے۔ صاحبو یہ صورت دینداری کی تو ہے مگر حقیقت دینداری کی نہیں ہے۔ صاحبو بادام اور شئے ہے اور بادام کا چھلکا اور شئے ہے پستہ اور ہے اور پوست اور شئے ہے۔ اخروٹ اور شئے ہے اور چھلکا اسکا اور شئے ہے۔ اسی طرح آدمی کی صورت اور شئے ہے اور حقیقت اور ہے۔ شعر

گر بصورت آدمی انساں بدے احمد و بوجہل ہم یکساں بدے

اینکہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند
(اگر آدمی کی صورت کی وجہ سے انسان ہوتا تو احمد اور ابوجہل یکساں ہوتے یہ کہ
خلاف آدم کے تجھ کو نظر آتا ہے آدم نہیں ہیں آدم کے غلاف میں ہیں)
ایسی ہی ہمارے اعمال کی حالت ہے کہ اعمال کی صورت ہے حقیقت نہیں ہے ۔
خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست
(خواجہ کو گمان ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہے خواجہ کو بجز غرور کے کچھ حاصل نہیں)
ان ہی صور اعمال پر نظر مقتصر کر کے ہر شخص بجائے خود سمجھ رہا ہے کہ مجھ میں کچھ ہے
میں متقی ہوں ذاکر ہوں کوئی سمجھتا ہے کہ عالم ہوں حافظ ہوں اور اگر باطن کو دیکھا جاوے تو
یہ حالت ہے ۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید واز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے (ظاہر میں) کافر کی قبر کی طرح آراستہ اور مزین ہیں اور اندر (باطن میں)
خدائے عزوجل کا عذاب ہو رہا ہے ظاہر سے تو بایزید بسطامی جیسے پر تو طعنہ زنی
کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے)
اصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو حس نہیں رہی اگر بصیرت ہو تو معلوم ہو کہ سب اعمال میں
نفس کی پچر لگی ہوئی ہوتی ہے واللہ العظیم ہم لوگوں کے اعمال وہ ہیں کہ قیامت کے
روز اگر ہمارے جوتیاں نہ لگیں تو غنیمت ہے کس کا تقرب اور کیسے درجے یہ نیتیں
تو بزرگوں کی ہوتی تھیں چنانچہ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ کی حکایت ہے کہ ان کو ایک
شخص نے کچھ نذر کی آپ نے کچھ عذر فرمایا اس لئے کہ اس میں کچھ شبہ تھا اگرچہ فتوے کی
رو سے وہ شے جائز تھی مگر تقوے کے اعتبار سے اس کا لینا درست نہ تھا اور حکم
شرعی یہ ہے کہ اگر تقویٰ کے اس خاص درجہ پر عمل کرنے سے دوسرے کی دل شکنی
ہو تو فتوے پر عمل کرنا چاہیئے ایسے موقع پر تقوے کی حفاظت جائز نہیں اور ہماری حالت
یہ ہے کہ اگر کسی بڑی مقدار میں ملے مثلاً پانچ سو روپیہ اور مشتبہ تو کیا مشتبہ ۔

اور بڑھ کر ہو تو تاویل کر کرا کر اس کو جائز کر لیں گے اور اگر کوئی ایک روپیہ دے تو سارا تقویٰ اس میں چلا دیں گے، القصہ حضرت حاتم نے اول انکار کیا جب اس نے اصرار کیا تو لے لیا بخلاف ہم لوگوں کے کہ اگر ہمارے منہ سے ایک مرتبہ نہ نکل جاوے تو ہرگز نہ لیں گے کیونکہ اب لینا اپنی آن کے خلاف ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت آپ نے اول انکار کیوں کیا اور دوبارہ کیوں لے لیا۔ فرمایا کہ اول اس لئے انکار کیا کہ اس کا لینا تقوے کے خلاف تھا اور جب اس نے اصرار کیا تو خیال کیا کہ نہ لینے میں تو میری عزت اور اس کی ذلت ہے اور لے لینے میں میری ذلت اور اس کی عزت ہے۔ میں نے اس کی عزت کو اپنی عزت پر ترجیح دی یعنی میرے نہ لینے سے میری بات تو بنی رہتی مگر میرے بھائی کی وجاہت اور آبرو میں فرق آتا اور لینے میں میری شان کو دھبہ لگتا ہے لیکن اس کی بات بنتی ہے پس میں نے اپنی عزت اور آبرو کو لات ماری اور اپنے بھائی کی بات کو اونچا رکھا سبحان اللہ نیت یہ ہے اور حقیقت دین یہ ہے اور ہمارے اندر تو صورت ظاہری بھی کامل نہیں ہے اور حقیقت تو کہاں تھی۔ اور یہ حال تو ہمارے آجکل کے دینداروں کا ہے کہ ان کی نیتیں خالص نہیں پھر عوام کا تو کیا ذکر ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ عوام الناس کی نیتیں اکثر اعمال میں بہ نسبت خواص کے اچھی ہوتی ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال صالحہ سے مثلاً لمبی لمبی نماز پڑھنے سے اور ذکر و شغل اور وظائف وغیرہ سے جو جاہ بڑھتی ہے وہ خواص کی ہی بڑھتی ہے اس لئے وہی محل ریا بن سکتے ہیں اور عوام بیچاروں کو کون پوچھتا ہے اگر کسی گمنام عامی نے لمبی نماز پڑھی تب اور مختصر پڑھی تب ہر صورت میں کوئی بھی التفات نہیں کرتا ہاں عوام میں ایک کمی ہے وہ یہ کہ عمل کے وقت اکثر خالی الذہن ہوتے ہیں اس عمل کی نہ کوئی غایت مذمومہ ان کے ذہن میں ہوتی ہے اور نہ غایت محمودہ مگر عادت سے اور اجمالاً اس اعتقاد سے کہ خدا کا حکم ہے پڑھ لیتے ہیں مگر یہ خُلُوٌّ عَنِ الْغَايَةِ الْمَحْمُوْدَةِ وَالْمَذْمُوْمَةِ (عرض محمود یا مذموم سے خالی) بھی اخلاص ہی میں داخل ہے اس مقام پر اسی

وقت ایک تحقیق ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ اخلاص نیت کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ کسی نیک عمل کے کرنے کے وقت اس امر کا بھی تصور و قصد ہو کہ یہ عمل حق تعالے کی رضا کے واسطے ہے اب دیکھنا چاہیئے کہ اس معنے کے اعتبار سے اخلاص کا وجود کہیں متحقق ہے کہ نہیں ہم غور کر کے جو دیکھتے ہیں تو اس معنے کے اعتبار سے عوام میں تو کیا خواص میں بھی اخلاص نہیں نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں تلاوت کرتے ہیں اور کبھی عمل سے پہلے خصوصیت کے ساتھ ابتغاء مرضاۃ حق کا تصور تک بھی نہیں ہوتا ہے چنانچہ ابھی سب نے نماز جمعہ کی پڑھی ہے کسی کے دل میں بھی تصور اللہ تعالےٰ کی رضا مندی کا نہیں ہوا ہوگا۔ غایۃ مافی الباب گاہ گاہ نیک عمل کرتے وقت اس کا تصور ہو جاتا ہے کہ یہ ایک نیک کام ہے پس اگر نیت کے معنے یہی ہیں کہ قصد کرنا رضائے حق کا تو اس معنی کو تو کسی کی نیت بھی خالص نہیں اور دنیا میں کوئی بھی مخلص نہیں کیونکہ اکثر اوقات اس کا بلکہ کسی اور غایت کا بھی مطلق تصوّر نہیں آتا اور اسی بنا پر یہ جو عقلی مسئلہ مشہور ہے کہ افعال اختیاریہ کا صدور مسبوق بتصور الغایۃ ہوتا ہے مجھ کو اس مسئلہ میں ایک شبہ ہے کیونکہ اکثر مواقع پر کوئی غایۃ بھی ذہن میں نہیں ہوتی۔ تنویر اس کی یہ ہے کہ ہم سے بہت سے افعال میں اگر بمجرد صدور کوئی دریافت کرے کہ یہ فعل کیا فائدہ سمجھ کر کیا ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ کیا فائدہ بیان کریں ہاں کچھ دیر کے بعد گڑھ مڑھ کر کوئی وجہ بیان کر دیں تو وہ اور بات ہے ہاں اگر غایت پہلے سے سوچ لیتے ہیں تو بمجرد سوال اس کو بیان کر دیتے ہیں مثلاً ہم کسی امر پر زدوکوب کریں اور بعد اس ضرب کے کوئی ہم سے وجہ پوچھے تو فوراً بتلا دیں گے کہ اس وجہ سے مارا تو وجہ یہ ہے کہ پہلے سے اس غایت کا قصد ہو گیا تھا۔ اور اگر دو وقت کے کھانا کھانے کے بعد فوراً اس کا جواب لینا چاہیں کہ تم نے کھانا اس وقت کیا فائدہ سوچ کر کھایا تو کوئی معقول وجہ بے سوچے نہیں بتلا سکتے کیونکہ پہلے سے تصور نہ تھا اس لئے نہیں بتلا سکتے۔ اس لئے یہ قاعدہ اب تک سمجھ میں نہیں آیا

ہاں اگر یوں کہا جاوے کہ اجمال کے درجہ میں غایۃ کا تصور ہوتا ہے تو خیر مگر علم تفصیلی تو ہرگز نہیں ہوتا پس نیت کے اگر یہ معنے لئے جاویں گے تو تمام ہی مسلمانوں کے اعمال بیکار ٹھہریں گے۔ اب نیت کے معنے میں عرض کرتا ہوں۔ نیت کے معنے ہیں ارادہ کے یعنے وہ فعل اختیاراً اور قصداً ہوا ہو مثلاً وضو کے دو طریق ہیں ایک تو یہ کہ ارادہ کر کے وضو کرے اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص حوض میں یا نہر میں غوطہ لگا وے اور اس کے ضمن میں وضو بھی ہو جاتا ہے اور شافعیہ فرماتے ہیں کہ وضو نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کے نزدیک نیت ضروری ہے اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ نیت کے معنے ارادہ کے ہیں۔ دوسری مثال لیجئے اگر کوئی شخص بلا ارادہ صلوٰۃ اٹھک بیٹھک کرتا رہے اگرچہ تمام ارکان صلوٰتیہ ادا کرے مگر فقہا فرماتے ہیں کہ نماز نہ ہوگی اس لئے کہ بلا نیت یہ صلوٰۃ ہے پس ان تمام جزئیات سے معلوم ہوا کہ نیت کے معنے ارادہ کے ہیں پس نیک عمل میں نیت تین طرح کی ہو سکتی ہے ایک یہ کہ وہ فعل قصداً اور اختیاراً کیا جاوے لیکن اس میں نہ غایۃ محمودہ کا تصور ہو نہ غایۃ مذمومہ کا دوسرے یہ کہ غایۃ محمودہ کا قصد ہو مثلاً یہ کہ میں نماز اس لئے پڑھتا ہوں کہ اللہ تعالے خوش ہو۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ غایۃ مذمومہ کا ارادہ ہو مثلاً نماز اس لئے پڑھے کہ مخلوق کے نزدیک بڑا بنے۔ پس ان تینوں صورتوں میں سے ریاء مذموم اخیر کی صورت ہے اور صورت اولیٰ و ثانیہ اخلاص میں داخل ہے اس لئے کہ ریاء یہ ہے کہ مخلوق کے نزدیک بڑا بننے کے لئے کوئی فعل کرے سو اس کے ارتفاع کی دونوں صورتیں ہیں ایک یہ کہ کوئی غایۃ مقصود نہ ہو ہاں محرک اس کا امتثال ہو گو اس امتثال کی کوئی غایۃ تصور میں نہ آوے۔ اور ایک یہ کہ مقصود ہو اور محمود ہو مقید کا ارتفاع کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ وہ قید نہ ہو دوسری خاص قید سے مقید ہو اور کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ وہ دوسری قید بھی نہ ہو۔ البتہ صورۃ اولیٰ اخلاص کا ادنےٰ درجہ ہے اور صورۃ ثانیہ اعلےٰ درجہ۔

غرض کہ یہ جو سمجھتے ہیں کہ اگر کسی خاص غایت کی نیت نہ ہو تو اخلاص نہیں یہ غلط ہے۔ پس نیت کے معنے واضح ہو جانے سے معلوم ہوا کہ الحمد اللہ خوش نیت اور مخلصین سے دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی شاید میری ابتدائی تقریر اور اخیر تقریر میں کوئی تعارض سمجھے کہ اول میں تو شکایت تھی کہ اخلاص مفقود ہو گیا ہے اور فساد نیت میں عوام و خواص سب مبتلا ہیں اور آخر میں ثابت ہوا کہ ابتلاء عام نہیں ہے بلکہ مخلصین بھی بہت ہیں تو ظاہر نظر میں یہ شبہ ہوتا ہے ورنہ واقع میں کچھ تعارض ہی نہیں اس لئے کہ میری تقریر کا حاصل دو امر کا اہتمام ہے اول یہ کہ جن لوگوں کے اعمال میں غایۃ مذمومہ پائی جاتی ہے مثلاً جاہ وحب مال وارضا خلق ان کو متنبہ کرنا مقصود ہے دوسرا امر یہ ہے کہ جن کے اندر امراض موجود ہیں اور انھوں نے معالجہ شروع نہیں کیا اور نہ معالجہ کی فکر ہے ان کو معالجہ کی طرف توجہ دلانا ہے اور جن میں غایات مذمومہ نہیں پائی یا ہیں مگر انھوں نے معالجہ شروع کر دیا ہے اگرچہ ان کے اندر امراض بھی ہیں ان پر ملامت نہیں ہے کیونکہ انھوں نے فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس قدر ہو سکے) پر عمل شروع کر دیا ہے۔ اور کثرت سے وہ لوگ پائے جاتے ہیں جن میں غایۃ مذمومہ موجود ہے اور معالجہ کی فکر نہیں کرتے پس مراد ابتدا تقریر سے یہ ہے کہ بکثرت مبتلا ہو کر بھی بے فکر ہیں اور آخر تقریر سے مقصود یہ ہے کہ اخلاص کے ادنیٰ درجہ سے بھی نفی اخلاصیت کی نہ کرنی چاہیئے۔ باقی جنھوں نے اپنے کو کسی معالج کے سپرد کر دیا ہے ان کو پریشان نہ ہونا چاہیئے ان کو یہ کہا جاتا ہے ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست　　　سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں)

وہ جب لگے ہیں تو انشاء اللہ تعالےٰ پہنچ جاویں گے۔ اور ؎

اندریں رہ می تراش و میخراش　　　تا دم آخر دمے فارغ مباش

(اس طریق وصول الی اللہ میں تراش خراش کرتے رہو اور آخر وقت تک بھی

ایک لحظہ فارغ مت رہو)

البتہ معالجہ کے لئے دو شرطیں ہیں اول شرط یہ ہے کہ علم دین ہو تاکہ اعمال یا اغراض کا محمود و مذموم ہونا معلوم ہو سکے اور ہر کام میں یہ سمجھ سکے کہ اس میں میرا کیا قصد ہے آیا مذموم ہے یا محمود ہے پھر عمل سے پہلے مراقبہ و محاسبہ کرتا رہے دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے کو کسی طبیب حاذق (مرشد کامل) کے سپرد کر دے اور اپنے حال کی اُس کو وقتاً فوقتاً اطلاع دیتا رہے اور اس کی رائے کا اتباع کرے جو کچھ وہ تجویز کرے خواہ سمجھ میں آوے یا نہ آوے انقیاد کرے۔ بعض دفعہ شیخ یہ تجویز کرتا ہے کہ تم تمام رات سویا کرو اور آدھ گھنٹہ جاگا کرو یا یہ کہ تلاوۃ قرآن اور نوافل چھوڑ دو تو بظاہر تو یہ ارشاد شیخ کا سمجھ میں نہیں آتا لیکن اتباع اس کا ضروری ہے اس لئے کہ ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

(امر مباح جو بظاہر طریقت کے خلاف ہونے سے منکر معلوم ہوتا ہے اگر مرشد بتلا دے تو اس پر عمل کرے اس کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ شیخ کو اس کے نشیب و فراز کا زیادہ تجربہ ہے)

اس شعر کے معنے یہ نہیں ہیں کہ شیخ کے حکم سے شراب اس قدر پیو کہ سجادہ بھی آلودہ ہو جائے اس لئے کہ ہر جگہ ترجمہ حقیقی ہی نہیں مراد ہوا کرتا جیسا کسی کی حکایت ہے کہ ایک مقام پر دو شخصوں کی آپس میں لڑائی ہو رہی تھی اور آپس میں مار پٹائی کی نوبت آگئی اُن میں سے ایک کا کوئی دوست وہاں آنکلا اس نے آکر اپنے دوست کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لئے اب وہ کچھ نہ کر سکا مقابل نے اس کو خوب فراغت سے مارا کوٹا لوگوں نے پوچھا کہ میاں تم نے یہ کیا حرکت کی تو وہ کہتا ہے کہ میں نے شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے قول پر عمل کیا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

(دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا پریشانی اور عاجزی کی حالت میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑے یعنی مدد کرے)

اس سے زیادہ پریشانی کی حالت کیا ہوگی اس لئے میں نے اس حالت میں اس کے ہاتھ

پکڑ لیئے تو اس جاہل نے گیر دوست دوست کے حقیقی معنی لیئے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہاں حقیقی معنے مراد نہیں ہیں بلکہ دست گرفتن (ہاتھ پکڑنا) اعانت کردن (مدد کرنا) مراد ہے اسی طرح آجکل چونکہ اصطلاحات سے واقفیت نہیں ہے اس لئے حافظ صاحبؒ کے اشعار کو اکثر لوگ غلط سمجھتے ہیں اور مے اور رندی وغیرہ سے حقیقی معنی مراد لیتے ہیں حالانکہ اس شعر کے اندر ہی اگر غور کیا جاوے تو خود اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب خلاف شرع امر کا حکم نہیں فرماتے اس لئے کہ آگے فرماتے ہیں کہ ؎

سالک بیخبر نبود زراہ ورسم منزلہا : (کہ سالک راہ و رسم اور منزل سے بے خبر نہیں ہوتا)

جبکہ وہ سالک طریق ہے تو خلاف شریعت کیسے بتائے گا۔

خلاصہ مطلب شعر کا یہ ہے کہ تربیت کے دو طریق ہیں ایک جذب دوسرا سلوک جذب یہ ہے کہ طالب پر ذکر و فکر کے ذریعہ سے غلبہ محبت کا کیا جاوے اور اعمال زاہدہ یں کم لگایا جاوے اور اس طریق محبت کے ذریعہ سے اس کو مقصود تک پہنچایا جاوے دوسرا طریق سلوک ہے وہ یہ ہے کہ تلاوۃ قرآن اور نوافل وغیرہ یں زیادہ مشغول کیا جاوے پس مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص طریق سلوک کو اپنی استعداد کے مناسب سمجھ کر پسند کرے اور شیخ اس کے طریق جذب کو پسند کرے تو اس کو خطاب کر رہے ہیں بمے سجادہ الخ مے سے مراد عشق و محبت ہے یعنے اے طالب تو اپنی رائے کو دخل مت دے بلکہ شیخ نے جو تیرے لئے طریق محبت کو تجویز کیا ہے اسی کو اختیار کرو دوسری جگہ حافظ صاحب فرماتے ہیں ؎

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خود بینی وخود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک یں کچھ دخل نہیں ہے اس طریق یں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

پس اتباع شیخ کے ساتھ اعتماد بھی ہونا ضروری ہے اس زمانہ میں اعتماد بہت کم رہ گیا ہے شیخ کی بعض سرسری تجویز پر یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ کو ہمارے حال پر توجہ نہیں

ہے یا ہماری طفلی تسلی کر دیتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ جس مریض کو طبیب پر اور طبیب کے نسخے پر بھروسہ نہ ہو اس کو کبھی شفا نہ ہو گی طبیب پر بھروسہ ہونا چاہیئے اور شفا میں تاخیر ہونے سے گھبراوے نہیں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور شفا ہو گی مگر یہ ضروری نہیں کہ جب مریض نے شفا کی نیت کی ہے جب ہی ہو جاوے۔ معالجہ باطن کی حالت بالکل معالجۂ ظاہری کی سی ہے جس طرح طبیب نہایت آہستہ رفتار سے حسب استعداد مریض معالجہ کرتا ہے اور ادویہ مناسبہ وقتاً فوقتاً بدلتا ہے اسی طرح بعینہ مرشد کامل طالبین کی تربیت کرتا ہے اور عروق میں سے مرض کو نکالتا ہے طالب کو چاہیئے کہ پریشان نہ ہو اور نہ شیخ سے بد اعتقاد ہو شیخ گویا زبانِ حال سے کہتا ہے ؎

من غم تو میخورم تو غم مخور — بر تو من مشفق ترم از صد پدر

(میں تیرا غم خوار ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

حاصل یہ ہے کہ شیخ کا اتباع اور انقیاد کرتا رہے اور اپنی رائے اور تدبیر پر نہ چلے کام میں لگا رہے تو انشاء اللہ ایک دن کامیاب ہو گا۔ ایک شخص میرے پاس اپنی حالت لکھا کرتے تھے اور پریشانی اپنی ظاہر کیا کرتے تھے میں برابر ان کی تسلی کرتا تھا کہ آپ پریشان نہ ہوں آپ کی حالت بہت اچھی ہے جب کسی بات سے تسلی نہ ہوئی آخر میں نے لکھا کہ ہم کو تمہاری تسلی کی ضرورت نہیں ہم کو تمہاری حالت سے اطمینان اور تسلی ہے اس لکھنے سے ان کی تسلی ہو گئی۔ حاصل یہ کہ اتنی بیفکری بھی بری ہے کہ علاج ہی نہ کرے اور اس قدر فکر بھی مضر ہے کہ باوجود طبیب کے سپرد کر دینے کے بھی کسی وقت فکر سے خالی نہ ہو جب طبیب کے سپرد کر دیا اب بے فکر ہو جانا چاہیئے۔ بس صرف اس کی اتباع کی فکر رکھے اور منتظر رہے انشاء اللہ ایک وہ دن ہو گا کہ ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

(یوسف گم گشتہ کنعان میں واپس آتا ہے غم مت کرو غم کدہ کسی دن گلستاں بن جائے گا غم مت کرو)

الحمد للہ حدیث شریف کے تمام اجزاء کی بقدر ضرورت تفصیل ہوگئی ہے حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ فقط

ختم شد

مسلمانوں کا عروج وزوال

اگر یہ درست ہے کہ کسی قوم کے گذشتہ بزرگوں، بادشاہوں اور بڑے لوگوں کے حالات و واقعات بعد والوں کے لئے درس ہدایت وموعظت ہوتے ہیں اگر یہ درست ہے کہ ایک مردہ قوم کے لئے اس کے آباؤ اجداد کے بہادری کے کارنامے اس کے لئے حیاتِ ثانیہ کے اسباب بن سکتے ہیں تو اے پاکستان کے باشندو! جو ابھی انگریزی کی غلامی سے آزاد ہوئے ہو انگریزیت کی غلامی کا طوق بھی اپنی گردن سے اتار دو دیکھو کہ تمہارے بڑے کیا تھے اور انہوں نے کس طرح حکومت کی کس طرح دنیا کو مسخر کیا۔ آیئے اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب تاریخ الخلفاء کا بامحاورہ سلیس اردو ترجمہ بیان الاحرار کا مطالعہ کیجئے اس کے مطالعہ سے تاریخ اسلام کی پوری واقفیت ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ خلافت کس طرح اور کس کس پر منتقل ہوتی رہی کچھ سال کم ایک ہزار سال کی تاریخ کا علم اس کتاب سے ہوجاتا ہے اس میں امیرالمؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی کی خلافت سے لیکر ۹۰۳ھ تک کے شان و حکومت و جاہ و رفعت کا منظر عدل وانصاف کا سچا فوٹو اس خوبی سے کھینچا گیا ہے کہ جس سے اسلام کی اولوالعزمی کا بخوبی پتہ چلتا ہے اس میں خلافت راشدہ پھر حالات سلاطین بنوامیہ پھر بنوعباس، مسلمانوں کا عروج و فتوحات پھر مسلمانوں کا زوال، خروج چنگیز خاں تاتاری پھر تاتاریوں پر مسلمانوں کی فتح غرضیکہ ۹۰۳ھ تک کے حالات ہیں اس میں تقریباً بچھتر خلفاء و سلاطین کے حالات ہیں ایسی کتاب کا اردو بامحاورہ ترجمہ ہے جو اکثر مدارس میں داخل ہے۔

مُعَلِّمُ الحُجّاج

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا عالم ہے۔ اب چند سال سے مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور جدہ میں بالکل تبدیلیاں ہوگئی ہیں، ان سب جگہ پر بالکل موجودہ صورت حال پر تمام کتاب میں ترمیم و تنسیخ کردی ہے بلکہ یوں کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ یہ کتاب پھر سے تصنیف ہوئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ جہاز کا سفر اونٹ کا سفر جدہ اور معلمین حجاج۔ یہ تمام عنوانات از سرِ نو لکھے گئے ہیں، اسی طرح کتاب کے شروع میں چند صفحات کے ایک مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں طواف کی وہ دعائیں جن کو بلا تفریق عقائد حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی تمام معلم پڑھاتے ہیں جمع کردی ہیں۔ اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لے کر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا پروگرام شائع کردیا ہے یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کرسکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفر حج کا پورا پروگرام اس مقدمہ میں مل جائے گا نیز عربی کی اکثر عبارتوں کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ کردیا ہے جس کی وجہ سے انشاء اللہ عوام کو اور سہولت ہوجائے گی۔ غرضیکہ کتاب کی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ کتاب انڈیا میں چھپتی رہی ہے مولانا مفتی قاری سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اس کے مصنف ہیں۔

حج کا ارادہ رکھنے والے ضرور یہ کتاب منگالیں۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی

ایم اے جناح روڈ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ نہم ملقب بہ

اِصلاحُ النِّساء

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

دعوات عبدیت جلد اول کا
وعظ نہم ملقب بہ
اِصلاح النّساء

این	متٰی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
کانپور	۲۶ جمادی الاخری ۱۳۳۲ھ	.	.	.	مولوی عبدالکریم صاحب گنتھلوی	.	.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یَا مَعۡشَرَ النِّسَآءِ تَصَدَّقۡنَ فَاِنِّیۡ اُرِیۡتُکُنَّ اَکۡثَرَ اَھۡلِ النَّارِ فَقُلۡنَ وَبِمَ یَا رَسُوۡلَ اللہِ قَالَ تُکۡثِرۡنَ اللَّعۡنَ وَتَکۡفُرۡنَ العشیر مَا رَأَیۡتُ مِنۡ نَاقِصَاتِ عَقۡلٍ وَدِیۡنٍ اَذۡھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الۡحَازِمِ مِنۡ اِحۡدٰکُنَّ قُلۡنَ وَمَا نُقۡصَانُ دِیۡنِنَا وَعَقۡلِنَا یَا رَسُوۡلَ اللہِ قَالَ اَلَیۡسَ شَھَادَۃُ الۡمَرۡاَۃِ مِثۡلَ نِصۡفِ شَھَادَۃِ الرَّجُلِ قُلۡنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنۡ نُقۡصَانِ عَقۡلِھَا قَالَ اَلَیۡسَ اِذَا حَاضَتۡ لَمۡ تُصَلِّ وَلَمۡ تَصُمۡ قُلۡنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنۡ نُقۡصَانِ دِیۡنِھَا مُتَّفَقٌ عَلَیۡہِ۔ ترجمہ حدیث شریف کا یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (عورتوں کو خطاب کرکے) فرمایا کہ اے عورتوں کے گروہ تم صدقہ دو اس لئے کہ دکھلایا گیا ہوں کہ تم اہل نار

لہ وعظ سابق دو وعظوں کے درمیان غیر جمعہ میں ہوا تھا مگر ان دونوں کے تناسب سے ترتیب میں اس کو متصل و اسکو مؤخر کر دیا

میں سے سب سے زیادہ ہو۔ عورتوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کیا وجہ ہے فرمایا کہ تم لعنت ملامت بہت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم سے زیادہ کہ تم ناقصات العقل والدین بھی ہو ہوشیار مرد کی عقل کو سلب کرنے والا کوئی نہیں دیکھا عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دین اور عقل کے نقصان کی کیا وجہ ہے فرمایا کہ کیا عورت کی شہادت مرد کی شہادت سے نصف نہیں ہے عورتوں نے عرض کیا کہ بیشک ہے فرمایا کہ یہ نقصان عقل ہے پھر فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب کوئی حائضہ ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے عرض کیا کہ بے شک فرمایا کہ بس یہ نقصان دین ہے میں نے اس وقت اس حدیث کو جس میں عورتیں مخاطب ہیں حالانکہ یہاں مردوں کا بھی مجمع ہے اس لئے اختیار کیا ہے کہ عورتوں کو ایسا موقع بہت کم ملتا ہے اس لئے وہ بالکل بے خبر ہیں اور طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہیں اور وہ خرابیاں عورتوں سے تجاوز کر کے مردوں اور بچوں تک پہنچتی ہیں اس لئے ان کی اصلاح سے گھر بھر کی درستی ہے اس کے اعتبار سے یہ مضمون عام اور مشترک النفع بھی ہو گیا اور نیز اس میں بعض مضامین بلا واسطہ بھی مشترک ہیں البتہ مقصود زیادہ عورتوں ہی کو سنانا ہے۔ اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے پانچ نقصائص بیان فرمائے دو اضطراری اور تین اختیاری۔ دو اضطراری یہ ہیں نقصان عقل، نقصان دین اور تین اختیاری اکثار لعن کفران عشیر مرد حازم کی عقل کو صلب کرنا نقصان عقل و دین کی ماہیت سے سوال کے جواب میں بجائے بیان حقیقت کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی علامتیں اس لئے بیان فرمائیں کہ مخاطب کم سمجھ ہیں اس لئے حقیقت کے سمجھنے میں تکلف ہوتا اور جہاں مخاطب کم عقل ہو ایسا ہی کرنا مناسب ہے مثلاً کوئی عامی نار کی حقیقت سے سوال کرے تو کہا جاوے گا کہ جس میں دھواں ہوتا ہے وہ نار ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نقصان عقل کو بھی ایک علامت سے بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ دو عورتوں کی

گواہی بمنزلہ ایک مرد کے قرار دی گئی ہے اور نقصان دین کو بھی اس علامت سے کہ حیض کے ایام میں روزہ نماز نہیں پڑھتی اس زمانہ میں چونکہ انقیاد للحق غالب تھا یہ علامتیں بیان کر دینا کافی تھیں آجکل طبائع کا رنگ بدل گیا بجائے انقیاد کے عناد غالب ہے اب تو اسی میں سوال پیدا ہوگا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دو کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوئی سو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث و قرآن کوئی فن کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں ایسی کاوش کی جاوے بلکہ قرآن و حدیث تو طب کی سی کتابیں ہیں اس لئے اس کو اس نظر سے دیکھنا چاہیئے جس نظر سے شفیق طبیب کے کلام کو دیکھا جاتا ہے کہ کہیں وہ ایک مریض کی حالت کے لحاظ سے کلام کرتا ہے اور کہیں دوسرے مریض کے مناسب حال اسی واسطے قرآن و حدیث کو وہ خوب سمجھے گا جو شان نزول سے واقف ہو کیونکہ اس سے معلوم ہو جاوے گا کہ کس موقع پر یہ ارشاد ہوا ہے وہاں کیا حالت تھی کیا مقتضیات اور خصوصیات تھیں اور اسی وجہ سے ہم فہم قرآن و حدیث میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے سخت محتاج ہوں گے بڑا فرق ہے اس شخص میں نسخہ لکھنے کے وقت طبیب کے پاس حاضر ہوا اور جو حاضر نہ ہووے مدت کے بعد اس نے صرف نسخہ دیکھا ہو جو حاضر ہے وہ مریض کے سن اور مزاج اور دوسری خصوصیات کو مشاہدہ کریگا اس لئے نسخہ کے محل کو وزن کو جیسا وہ سمجھے گا دوسرا شخص نہیں سمجھے گا۔ اسی طور پر قرآن و حدیث کی تفسیر میں سلف کا قول مقدم ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن و حدیث پر اس اعتبار سے نظر نہ کرنا چاہیئے کہ وہ کوئی فن کی کتاب ہے جس میں تعریفات کے جامع مانع نہ ہونے سے یا قیود کے مفید احتراز نہ ہونے سے تصنیف کو ناقص سمجھا جاتا ہے۔ اسی واسطے میری یہ رائے ہے کہ قرآن و حدیث ایسے وقت پڑھنا چاہیئے کہ دماغ فلسفہ و منطق سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بہرحال اس وقت نقصان دین و عقل کی علامت کو بیان کر دینا کافی ہو گیا اور اگر آج یہ کافی نہیں ہے تو حقیقت کے بتلانے والے بھی بفضلہ تعالےٰ موجود ہیں اور نقائص

اختیاری تو اس لئے بیان فرمائے ہیں کہ اپنے نقائص پر مطلع ہو کر ان کے علاج کی فکر کریں اور نقصائص اضطراری غیر اختیاری جو معالجہ سے نہیں جا سکتے ان کو اس لئے بیان فرمایا کہ اپنے اندر ان نقصائص کو دیکھ کر کبر اور پندار جاتا رہے اس لئے کہ عورتوں میں کبر اور پندار کا بہت مرض ہے ذرا سا کمال ہوتا ہے اس کو بہت کچھ سمجھتی ہیں اور منشا اس عجب و کبر کا ہمیشہ جہل ہوتا ہے بڑا عالم اپنے کو وہی سمجھتا ہے جو کچھ نہ ہو کیونکہ جو واقع میں بڑا ہوگا اس کی نظر کمال کی حد آخر تک ہوگی اور اپنے کو اس سے عاری دیکھے گا اس لئے ممکن نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے البتہ ایسے شخص کو اپنا بڑا سمجھنا شایان ہے جو تمام مراتب کمال کو جامع ہو اور وہ صرف ایک ذات وحدہٗ لاشریک ہے اس لئے متکبر اس کا کمالی نام ہے اس کے معنے ہیں اپنے کو بڑا سمجھنے والا سو چو کہ واقع میں حق تعالیٰ بڑا ہے اس لئے اگر وہ اپنے کو بڑا جانتا تو یہ جہل ہوتا اور جہل نقص ہے اور حق تعالیٰ تمام نقائص سے پاک ہیں بس خدا کا تو یہی کمال ہے کہ وہ اپنے کو بڑا جانے اور بندہ کا یہ کمال ہے کہ اپنے کو چھوٹا سمجھے اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے تو یہ نقص ہوگا حدیث قدسی میں ہے اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْهِمَا قَصَمْتُهٗ یعنی عظمت و کبریا میرا خاصہ ہے جیسے ازار اور ردا انسان کا جلوس خاص ہوتا ہے پس جو شخص مجھ سے (ان صفات میں) کھینچا تانی کرلے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا اس سے معلوم ہوا کہ عظمت اور بڑائی حق تعالیٰ کی صفات خاصہ میں سے ہیں اس لئے بندہ کا کمال اپنے کو عاجز سمجھنا ہے چنانچہ جن حضرات کے قلب میں حق تعالیٰ کی عظمت اور کبریا آگئی ہے وہ اپنے کو ہیچ در ہیچ سمجھتے ہیں جس شخص کی رستم کی قوت پر حاتم کی سخاوت پر نظر ہوگی وہ اپنے کو قوی اور سخی نہ سمجھے گا جس کے پیش نظر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ہوگا وہ اپنے کو کیا عالم سمجھے گا آجکل یہ خبط ہو گیا ہے کہ تھوڑا سا کمال ہو جاتا ہے تو اپنے کو بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے اگر کوئی عورت ذرا نماز اور تلاوت کی پابند

ہو جاتی ہے تو اپنے کو رابعہ سمجھنے لگتی ہے اور ہر ایک کو حقیر سمجھتی ہے اور وجہ اس کی بھی ہے کہ ان کی کسی نے تربیت نہیں کی کتابیں پڑھ پڑھ کر دیندار ہو جاتی ہیں پس ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کتب طب دیکھ کر دوا دیکھانے لگے، بنانے لگے۔ اس سے بجائے نفع کے خوف ضرر غالب ہو گا جب تک طبیب کی رائے سے دوا نہ کھائے کچھ نفع نہ ہو گا اسی طرح چونکہ عورتوں کے اخلاق کی تربیت نہیں ہوتی اور کسی مربی سے رجوع نہیں کرتیں اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے کرلیتی ہیں اس لئے اپنے کو باکمال سمجھنے لگی ہیں ایک لڑکی کا کسی شخص سے نکاح ہوا وہ لڑکی نماز روزہ کی پابند تھی اور شوہر اس قدر پابند نہ تھا اور آوارہ سا تھا تو وہ لڑکی کہتی ہے کہ افسوس میں ایسی پرہیزگار اور ایسے شخص کے جال میں پھنس گئی میری قسمت ڈوب گئی حالانکہ بے وقوف یہ نہیں سمجھی کہ اگر ہم نے نماز پڑھی روزہ رکھا تلاوت کی تو اپنا کام کیا دوسرے پر کیا احسان کیا کوئی دوا پی کر بڑا فخر کرتا ہے کہ میں بڑا بزرگ ہوں کہ دوا پیا کرتا ہوں اسی طرح یہ سب طاعات میں اپنا ہی نفع ہے اور اس سے اپنا ہی حق ادا کر رہا ہے اور حقوق اللہ جو اس کا لقب ہے یہ اس اعتبار سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے منتفع ہے یا اس کا حق اس سے اتر جاتا ہے کیونکہ صاحب حق کو تو دیکھنا چاہیئے کہ اس کی ہم پر کس قدر نعمتیں ہیں اگر نعمتوں کو دیکھا جاوے تو درحقیقت یہ ہماری نماز روزہ کچھ بھی نہیں اور جہاں ہزاروں انبیاء و اولیا و ملائکہ کی عبادتوں کے ذخیرے کے ذخیرے انبار کے انبار موجود ہوں ان کے مقابلے میں ہمارے روزہ نماز کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ جواہرات کے سامنے مٹی کے کھلونے تو حقیقت میں احسان تو حق تعالیٰ کا ہے کہ ہماری ایسی عبادتوں کو قبول فرماتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کسی اپنے مخدوم کی خدمت بدون اس کی حاجت کے اس کی مرضی کے موافق نہ کرے اور اس مخدوم کو اس خدمت سے بجائے راحت کے تکلیف پہنچی مگر خوش اخلاقی سے خاموش ہو جاوے تو وہ خادم اپنی جہالت سے یہ سمجھے گا کہ میں نے بڑا کام کیا حالانکہ بڑا کام تو مخدوم نے کیا کہ اس ناگوار خدمت کو قبول فرمایا دیکھئے قاعدہ عقلیہ او رشرعیہ ہے

کہ کامل و ناقص کا مجموعہ ہمیشہ ناقص ہوتا ہے اور پاک و ناپاک مل کر ناپاک ہوتا ہے پس جبکہ ہماری نمازیں وساوس و خطرات اور ترک سنن اور خلاف خشوع امور بھی شامل ہیں تو وہ مجموعہ نماز کامل کیسے ہوئی اسی بنا پر حدیث شریف میں وارد ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز پڑھنے والے کو جو کہ تعدیل ارکان نہ کرتا تھا فرمایا صَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ یعنی تو نماز پڑھ اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی چونکہ اسی حدیث کے آخر میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اس کو طریقہ نماز کا مع تعدیل ارکان اور آداب کے سکھایا اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ جس قدر اس میں سے کمی ہوگی اسی قدر نماز میں کمی ہو جاوے گی اس لئے فقہاء امت رحمہم اللہ نے سمجھا کہ نماز تو ہو جاوے گی مگر ناقص ہوگی ورنہ ظاہر الفاظ حدیث سے تو معلوم ہوتا تھا کہ بالکل ہی نماز نہ ہو بہر حال یہ محض رحمت ہے کہ ہماری ناقص عبادت کو بھی عبادت گردانا یہ محض فضل ہے پھر ایسی عبادت پر خوش ہونا اور فخر کرنا جہالت ہے اور منشاء اس فخر و کبر کا وہی جہل ہے اور جس قدر عقل کم ہوتی ہے یہ مرض کبر کا زیادہ ہوتا ہے چنانچہ مردوں کی نسبت عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے حاصل یہ ہے کہ نقائص اضطراری پر نظر و تنبہ و توجہ ہونے سے یہ مرض کم ہوتا ہے اور اول معلوم ہو چکا ہے کہ نقص اضطراری کہ جن کے ازالہ پر قدرت نہیں اس مقام پر دو ہیں نقصان عقل اور نقصان دین نقصان عقل کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علامت سے بیان فرمایا کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان کی عقل میں نقصان ہے آجکل یہ سوال اس مسئلہ میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دو کی گواہی ایک کے برابر ہے جواب حقیقی اور قاطع شغب تو یہی ہے کہ اس میں کوئی حکمت ہوگی کہ جس کی ہم تعیین نہیں کرتے اور اگر دین ہماری طرف سے تبرع ہے جواب تو اسی قدر کافی ہے باقی ہم تبرعاً کہتے ہیں کہ حکمت یہ ہے کہ عورتوں کی خلقت ہی میں نقصان ہے تمام قویٰ اور اعضاء میں اُن کے بہ نسبت رجال کے نقصان آفتاب نیمروز کی طرح آتا ہے اور جبکہ خلقتاً ناقص ہیں تو حافظہ بھی ناقص ہوگا اور مدار شہادت

کا حفظ پر ہے اس لئے دو کی گواہی ایک کے برابر قرار دی گئی اور چونکہ حافظہ بھی معین عقل ہے اِس لئے یہ علامت ہو گی ایک درجہ میں نقصان عقل کی پھر اس پر سوال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ضعیف کیوں پیدا فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تمدن کی حفاظت ہے تا وقتیکہ ایک کو دوسرے کا تابع اور محتاج نہ بنایا جاوے تمدّن محفوظ نہیں رہ سکتا اور تبعیت دو مساوی میں ہوتی نہیں اسی واسطے فرماتے ہیں اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ یعنی مرد عورتوں پر سردار ہیں اور وجہ اس کی آگے ارشاد فرمائی ہے فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ یعنی بسبب اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور جن لوگوں نے برعکس اس حکم کے عورتوں کو متبوع بنا لیا وہاں کی خرابیاں پوشیدہ نہیں ہیں آجکل اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں کے مزدور ہیں سبحان اللہ کیا تفسیر دانی ہے ان مفسر صاحب سے کوئی پوچھے کہ فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ (اللہ تعالیٰ نے بعض کو فضیلت دی) کے کیا معنی ہیں اگر جرأت کر کے یہ کہیں کہ اس میں بھی بعضہم سے مراد عورتیں ہی ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے مسلم لیکن آگے جو فرماتے ہیں وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ (اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں) اس میں تو ضمیر یقیناً رجال ہی کی طرف ہے کیونکہ متفق وہی ہیں تو کیا پھر فَضَّلَ اللّٰہُ کی وہ تفسیر سرتاسر مہمل اور تحریف قرآن نہ ہو گی اگر یہ معنے ہوتے تو للنساء فرماتے علیٰ جو کہ تسلّط کے لئے ہے نہ فرماتے خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر خلقتاً بھی فضیلت ہے چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے اَفَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَھُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ مشرکین جو ملائکہ کو بنات اللہ کہتے تھے ان کا رد اس طرح فرماتے ہیں کہ کیا تم ایسی مخلوق کی حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہو جو کہ پست خیال ہے کہ ہمیشہ بناؤ سنگار اور زیور میں نشو و نما پاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ ان میں مقابلہ کے وقت قوت بیانیہ نہیں ہے واقعی یہ دو صفتیں جو عورتوں کی ارشاد فرمائی ہیں کھلم کھلا نظر آتی ہیں زیور اور آرائش اور بناؤ سنگار میں شب و روز رہتی ہیں اس سے آگے ان کا خیال ترقی ہی نہیں کرتا غایۃ مقصود اپنا اسی کو سمجھتی ہیں اور مقابلہ

اور مناظرہ کے وقت ان کے دلائل میں قوت بالکل نہیں ہوتی ادھر اُدھر کی باتیں بہت کریں گی لیکن کسی امر پر دلیل صحیح ہرگز نہ بیان کر سکیں گی کوئی عورت یہ نہ کہے کہ یہ زیور تو ہم کو ماں باپ نے پہنا دیا اس سے عادت ہوگئی اس سے میلان کہاں ثابت ہوا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل غلط ہے اگر ماں باپ بھی نہ پہناویں تب بھی ان کا طبعی میلان نمائش و آرائش کی طرف ہے چنانچہ بہت سے واقعات اس کے مشاہد ہیں اور اسی طرح اگر کوئی صاحب دوسری جزو میں یعنی قوۃ بیانیہ میں کمی کے بارے میں فرمادیں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہماری عورتوں کی تعلیم نہیں ہوتی اگر تعلیم و تربیت کامل ہو تو یہ نقصان ہرگز نہ رہے یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ جو عورتیں تعلیم یافتہ کہلاتی ہیں وہ بھی معلوم ہوا کہ لکچروں میں ناقص تقریر کرتی ہیں ان کے شوہر اس لکچر کی تکمیل کرتے ہیں یہ حکمت تبرعاً بیان کردی گئی ورنہ یہ کہنا کافی ہے کہ خدا تعالیٰ کی کوئی حکمت ہوگی ہمارا کوئی فائدہ اس کے تعیین پر موقوف نہیں اسی واسطے جو چیزیں فضول ہیں ان کی تحقیق و تفتیش سے منع کردیا گیا ہے ہم کو اس تحقیق سے کیا فائدہ ہے کہ فلاں ناقص کیوں ہے فلاں کامل کیوں ہم کو تو اس کے نتائج و احکام پر عمل کرنا چاہئیے۔ بہرحال تقریر سے معلوم ہوگیا کہ نقصان عقل اضطراری اور خلقی ہے اور دوسرا نقصان یعنی نقصان صلوٰۃ جس کو نقصان دین فرمایا ہے جس کا سبب حیض کا آنا فرمایا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے کہ خلقی ہے اور تین امر اختیاری ان کی طرف منسوب فرمائے کہ ان کا ازالہ ان کے اختیار میں ہے وہ کفران عشیر و اذہاب لب رجل حازم و اکثار لعن چونکہ یہ اختیاری ہیں اس لئے ان کو نقص نہ کہنا چاہیئے بلکہ ان کو شر کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے حاصل یہ ہوا کہ عورتوں میں دو نقص اور تین شر ہیں جو نقص ہیں ان کا فکر تو بے سود ہے اس لئے کہ وہ معالجے زائل ہونے والے نہیں بلکہ اس کی تو تمنا سے بھی منع کیا گیا ہے چنانچہ وارد ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی نے مردوں کے فضائل سن کر فرمایا تھا کہ یَا لَیْتَنَا کُنَّا رِجَالاً یعنی اے کاش ہم مرد ہوتے تو مردوں کی سی فضیلت ہم کو بھی ملتی اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ

یعنی مت تمنا کرو اس شئے کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس شئے سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے یعنی خلقی آگے فرماتے ہیں لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ یعنی مردوں کے لئے حصہ ہے اس شئے سے جو انھوں نے کمایا (اور عورتوں کیلئے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا ہے) مطلب یہ ہے کہ ایسی تمنا چھوڑ و عمل میں کوشش کرو اب اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر ہم عمل بھی کریں تب بھی نا تمام ہی رہیں گے نقصان ہمارا کہاں دور ہوگا تو اس کا جواب فرماتے ہیں وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو مطلب یہ ہے کہ عمل نیک کرے اگر خدا کا فضل ہو تو تم مردوں سے بڑھ سکتی ہو غرضکہ جو نقص اضطراری ہیں اس کی فکر تو بالکل فضول ہے۔
اور جو اختیاری ہیں جن کو ہم نے شر کہا اس کی اصلاح واجب ہے اور وہ کل تین شر ہیں اکثار لعن، کفران عشیر، اذہاب لب رجل۔ اکثار لعن یعنی لعنت ملامت زیادہ کرنا چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ صبح سے شام تک ان کا یہی مشغلہ ہے کہ جس سے دشمنی ہے اس کی غیبت کرتے ہیں اور جس سے محبت ہے اس کو کوستی ہیں اپنی اولاد کو کوستی ہیں اپنی جان کو کوستی ہیں اور ہر شئی کو خواہ وہ قابل لعنت ہو یا نہ ہو کوستی ہیں یاد رکھو بعض وقت اجابت کا ہوتا ہے اور وہ کوسنا لگ جاتا ہے پھر نادم ہونا پڑتا ہے ہمارے یہاں ایک شخص تشنج زدہ ہے جو کہ چارپائی سے ہل نہیں سکتا اور سخت تکلیف میں ہے اس کی ماں نے اس کو کسی شرارت پر کہا تھا کہ خدا کرے تو چارپائی کو لگ جاوے خدا کی قدرت وہ ایسا ہی ہوگیا اور اس کی مصیبت والدہ صاحبہ ہی کو اٹھانا پڑی۔
کفران عشیر یعنی زوج کی ناشکری جس قدر ان کو دیا جاوے سب تھوڑا ہے مجھ کو مولوی عبدالرب صاحب کا ایک لطیفہ یاد آگیا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ان کے پاس کتنا ہی کپڑا ہو جب پوچھو کہ کپڑا ہے تو کہیں گی کہ کیا ہیں چار چیتھڑے اور کتنے جوڑے جوتہ کے ہوں مگر پوچھنے پر یہی کہیں گی کہ کیا ہے دو لیتھڑے۔ اور برتن کیسے ہی عمدہ اور کثرت سے ہوں مگر یوں ہی کہیں گی کہ کیا ہیں چار ٹھیکرے ایک عورت خود کہتی تھی کہ ہمارا حال تو دوزخ کا سا ہے کہ اس کو کہا جاوے گا هَلِ امْتَلَأْتِ کیا تو بھر گئی وہ جواب میں کہے گی

هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (کہ کچھ اور بھی ہے) ایک مرض ان میں اور بھی ہے جو کفران ہی کا شعبہ ہے کہ کوئی چیز خواہ وہ درکار آمد ہو یا نکمی ہو پسند آنا چاہیئے بے سوچے سمجھے اس کو خرید لیتی ہیں اور کہتی ہیں گھر میں بہتی چیز کام آہی جاتی ہے اور یہ شعبہ کفران کا اس لئے ہے کہ اضاعۃ مال شوہر کا ہے خود اپنے مال کی اضاعۃ بھی کفران ہے جیسا ارشاد ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے) اور جب مال بھی دوسرے کا ہو تو کفران حق کے ساتھ کفران شوہر بھی ہے مومن کا قلب تو زیادہ بکھیڑے سے گھبرانا چاہیئے گو کہ اسراف بھی نہ ہو اور بے ضرورت کوئی شئے خریدنا تو صریح اسراف میں داخل ہے حدیث میں ہے نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اِضَاعَةِ الْمَالِ یعنی منع فرمایا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مال کے ضائع کرنے سے آجکل گھروں میں اور خصوصاً بڑے گھروں میں نہایت اسراف ہوتا ہے۔ برتن ایسے خریدے جاتے ہیں جو قیمت میں تو بہت زیادہ مضبوط خاک بھی نہیں ذرا ٹھیس لگ جاوے چار ٹکڑے اور پھر حاجت سے بھی زائد بعض گھروں میں اس کثرت سے شیشہ و چینی وغیرہ کے برتن ہوتے ہیں کہ عمر بھر بھی ان کے استعمال کی نوبت نہیں آتی علیٰ ہذا کپڑوں میں بھی بہت اسراف ہے۔ ؎ گز کا اور ؎ روپے گز کا کپڑا بہت باریک جو کہ علاوہ ممنوع ہونے کے کسی کام کا نہیں پہنتی ہیں اگر کہیں سے نکل گیا تو کسی کام کا نہیں اور موٹا کپڑا اگر پرانا ہو جاتا ہے کسی غریب ہی کے کام آجاتا ہے یہ تمام مصیبت اس کی ہے کہ عورتیں اس کی کوشش کرتی ہیں کہ میرا جوڑا ایسا ہو کہ کسی کے پاس نہ ہو اپنی حیثیت کو نہیں دیکھتیں ظروف و لباس مکان ہر شئے میں شانِ نمود تفاخر ریا کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں یہ حال تو روزمرہ کے برتاؤ کا ہے اور اگر کہیں کوئی تقریب پیش آجاوے تو کیا ٹھکانا ہے تمام رسوم پوری کی جاویں گی جن میں سراسر نمود ہی نمود ہے بعض عورتیں فخر کرتی ہیں کہ ہم نے رسوم سب چھوڑ دیں۔ مگر رسمیں دو قسم کی ہیں ایک تو شرک و بدعت کی رسمیں مثلاً چٹائی پر بھو کا بٹھانا اس کی گود میں بچہ دینا کہ اس سے شگون لیتے ہیں

کہ اولاد ہو تو واقعی ایسے ٹونے ٹوٹکے تو اکثر جگہ چھوٹ گئے دوسری تفاخر اور نام آوری کی رسمیں سو یہ دوسری قسم متروک نہیں ہوئی بلکہ بسبب تمول کے بہ نسبت پہلے کے کچھ بڑھ گئی ہیں پہلے زمانہ میں اتنا تفاخر اور ریاء و نمود نہ تھا کیونکہ کچھ سامان کم تھا کچھ طبائع میں سادگی تھی اب تو کھانے میں الگ تفاخر ہوگیا وہ پہلی سی سادگی ہی نہیں رہی۔ پلاؤ بھی ہو کباب بھی ہوں فیرنی متنجن، بریانی سب ہوں اور کپڑے کے تکلفات کو اول بیان ہی کیا گیا ہے۔ ایک دلہن ایک جگہ ڈیڑھ ہزار کا صرف کپڑا ہی کپڑا جہیز میں لائی تھی شاید یہ کپڑا اس کے مرتے تک بھی ختم نہ ہوا ہوا ور اکثر ایسا ہوا ہے کہ دلہن مرگئی ہے اور یہ سب سامان ہزاروں روپیہ کا ضائع ہوا پھر علاوہ دلہن کے کپڑوں کے تمام کنبہ کے جوڑے بنائے جاتے ہیں اور بعض دفعہ ان کو پسند بھی نہیں آتے اور ان میں عیب نکالے جاتے ہیں کس قدر بے لطفی ہوتی ہے اور اس پر دعوے یہ کہ ہم نے رسمیں چھوڑ دیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ جہیز کو دکھاتے تک نہیں دیکھو ہم نے رسمیں چھوڑ دیں سو جناب اس میں کیا کمال کیا اپنی بستی میں تو برسوں پہلے سے سامان جمع کر کر کے ایک ایک کو دکھلا چکی ہو جو مہمان آتی ہے اس کو بھی اور جو رشتہ دار آتی ہے اس کو بھی ایک ایک چیز دکھلائی جاتی ہے اور خود سامان آنے میں جو شہرت ہوتی ہے وہ الگ آج دہلی سے کپڑا آرہا ہے اور مراد آباد گئے تھے وہاں سے برتن لائے ہیں اور اس کے بعد وہ دولہا کے گھر جا کر کھلتا ہے اور عام طور پر دکھایا جاتا ہے اور اسی واسطے لڑکی کے ہمراہ بھیجا جاتا ہے تو یہ قصداً اعلان نہیں ہے تو کیا ہے ہاں اگر ہمراہ نہ کیا جاتا تو عقل کے بھی موافق تھا کیوں کہ یہ سب سامان لڑکی ہی کو دیا جاتا ہے اور اس وقت وہ قبضہ نہیں کرتی اور نہ اس کو خبر ہوتی ہے اس کو دینا تو یہ ہے کہ سردست اپنے گھر رکھو جب وہ اپنے گھر آوے اس وقت وہ تمام سامان اس کے سامنے رکھوا ور کہو کہ یہ سب چیز تمہاری ہے تمہارا جب جی چاہے لے جانا بلکہ مصلحت یہ ہے کہ وہ اب نہ لے جاوے کیونکہ اس وقت

تو اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے کسی وقت جب ضرورت ہو گی مل جائیں گے اور اوفق للعقل ہونے کے ساتھ اس میں ریا بھی نہ ہوئی اس وقت یہ دعویٰ ترک رسم کا صحیح ہوتا مگر چونکہ اس میں کوئی تفاخر اور دکھاوا نہیں ہے اس لئے ایسا کوئی بھی نہیں کرتا تیسرا اذھاب لُبّ رجل حازم یعنی بڑے ہوشیار مرد کی عقل کو سلب کر لینا چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ ایسی اتار چڑھاؤ کی باتیں کرتی ہیں کہ اچھے خاصے عاقل بے عقل ہو جاتے ہیں ان کے لہجہ میں خلقۃً ایسا اثر رکھا گیا ہے کہ خوامخواہ مرد اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ عقل میں مردوں سے زیادہ ہیں بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ مکر اور چالاکی ان میں مردوں سے زیادہ ہوتی ہے عقل اور شے ہے اور مکر اور چالاکی دوسری شئے ہے۔ شیطان میں مکر اور چالاکی تھی عقل نہ تھی اسی واسطے دھوکہ کھایا جبکہ حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو سجدہ نہ کیا اور خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (مجھ کو تو نے مٹی سے بنایا ہے اور اس کو تو نے خاک سے پیدا کیا ہے) کہہ گذرا اور یہ نہ سوچا کہ جب حق تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا ہے تو ضرور اس میں کوئی مصلحت ہو گی اور مصلحت و حکمت تو بہت ہی ظاہر تھی چنانچہ فرمایا ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً یعنی میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اور قاعدہ ہے کہ جب کوئی جانشین تخت سلطنت پر بیٹھتا ہے تو اس کو نذریں گذرائی جاتی ہیں جو معاملہ منیب کے ساتھ کیا جاتا تھا وہ اب نائب کے ساتھ کیا جاتا ہے اسی لئے یہاں بھی حکم ہوا کہ ہم کو جس طرح سجدہ کرتے تھے اسی طرح آدم کو کرو اس لئے کہ ہمارا خلیفہ ہے ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا وہ سجدۂ تحیت تھا اور حق تعالیٰ کو سجدہ کرنا سجدۂ عبادت ہے تو اتنی موٹی بات میں اس نے غلطی کی اس سے معلوم ہو گیا کہ اس میں عقل نہ تھی ہاں چالاکی اور مکر میں بیشک بے مثل ہے اس پر ایک میاں جی کی حکایت یاد آئی کہ ان کے پاس کہیں سے بتاشے آئے انھوں نے ایک مٹی کے بدھنے میں آٹا لگا کر بند کر کے رکھدیئے تاکہ کوئی لڑکا نہ کھا جاوے لڑکوں نے آپس میں

مشورہ کیا کہ کوئی تدبیر ایسی ہونا چاہئے کہ بدھنے کا منہ بھی نہ کھلے تاکہ راز ظاہر نہ ہو اور بتاشے بھی وصول ہو جاویں سوچتے سوچتے ایک تدبیر نکالی کہ پانی لا کر ٹونٹی کی راہ سے اس میں بھرا اور شربت گھول کر پی گئے تو یہاں یہ نہ کہا جاوے گا کہ یہ لڑکے بڑے عاقل تھے بلکہ یوں کہا جاوے گا کہ بڑے شریر اور چالاک و مکار تھے کیونکہ عقل کا مقتضا تو اپنے استاد کی خدمت اطاعت ہے نہ کہ ضرر رسانی کیونکہ عقل کے معنے لغت میں بستن کے ہیں عقل وہی ہے جو کہ مضرت سے بند رکھے رکے بندر بہت عجیب عجیب کام کرتے ہیں مگر اس سے بندر کو عاقل نہ کہا جاویگا بلکہ مکار کہیں گے۔ غرض عقل اور شے ہے اور چالاکی و مکر اور چیز ہے۔ عقل محمود ہے اور اس کا نہ ہونا مذموم اور چالاکی مذموم ہے اور اس کا نہ ہونا محمود چنانچہ شریعت میں یہ بھی محمود نہیں ہے کہ دوسروں کو ضرر پہنچائے کہ مکر ہے اسی طرح یہ بھی کمال نہیں کہ اپنے کو مضرت سے نہ بچائے کہ کم عقلی ہے حدیث میں ہے لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَیْنِ یعنی مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں کاٹا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر مومن کو کسی جگہ سے ضرر پہنچے تو اس کی شان یہ نہیں ہے کہ پھر وہاں جاوے یا کسی آدمی سے تکلیف و نقصان پہنچا تو یہ مناسب نہیں کہ پھر اس سے معاملہ کرلے اس سے معلوم ہوا کہ مومن کے لئے اتنی بیدار مغزی کمال کی بات ہے کہ اپنے کو مضرت سے بچائے اسی واسطے دین کو نفع ہمیشہ عقلا ہی سے ہوا ہے انبیا راور مقتدائے دین جس قدر ہوئے ہیں سب بڑے عاقل تھے کسی نبی کی ایسی حکایت نہ سنی ہوگی وہ بھولے ہوں ان کو کچھ خبر نہ ہو ہاں چالاک و مکار نہ تھے عاقل ہوشیار حکیم تھے اور یہی تو وہ شئے ہے کہ جس کی بنا پر خلیفۃ اللہ بنایا گیا ہے غرضکہ عورتوں میں چالاکی اور مکر ہے عقل نہیں اس چالاکی اور مکر کی وجہ سے عاقل کی عقل کو سلب کرلیتی ہیں چنانچہ تنہائی میں ایسی باتیں کرتی ہیں کہ جس سے شوہر کا دل اپنی طرف ہو جاوئے اور سب سے چھوٹ جاوے۔ بیاہ کے بعد گھر آتے ہی سب سے اول کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ شوہر ماں باپ سے چھوٹ جاوے بڑے ظلم کی بات ہے

کہ جس ماں نے مشقتیں اٹھا کر اس کو پالا اپنا خون جگر پلایا خود تکلیف میں رہی اس کو آرام سے رکھا اس کے تمام ناز برداشت کئے اور جس باپ نے دھوپیں کھائیں اور اولاد کے لئے گھر چھوڑا محنت کر کے ان کو پالا آج ان کی خدمات کا یہ صلہ دیا جاتا ہے کہ ان سے چھڑایا جاتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون پھر اگر یہ منتر ان کا چل گیا تو اس پر بھی اکتفا نہیں کہتی ہیں کہ تم تو الگ ہو گئے مگر تمہاری کمائی تو ان کے پاس جارہی ہے کبھی ماں کو جوتہ لادیا کبھی نقد کچھ دے دیا غرض کوشش کر کے اس میں بھی کامیاب ہوتی ہیں پھر اس پر بھی صبر نہیں آتا اس کے بھائی بہن سے اور اگر پہلی زوجہ سے اولاد ہو اس سے چھڑاتی ہیں غرض شب و روز اسی فکر میں گذرتا ہے اور یہی دن رات سعی ہوتی ہے کہ سوائے میرے اور میری اولاد کے کوئی نہ ہو اور انہیں کی بدولت بہت سے گھروں میں بلکہ بہت سے خاندانوں میں نا اتفاقی ہو جاتی ہے۔ مردوں میں یہ بے احتیاطی ہے کہ ان کی باتیں سنتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں اور خود اس کفران اور اذہاب کی وجہ دو ہیں اول تو ان کو زوج کی مساوات کا زعم ہوتا ہے کہ ہم اس سے کیا کچھ کم ہیں چنانچہ یہاں تک کوشش ہوتی ہے کہ مناظرہ میں بھی ہم غالب رہیں جو بات شوہر کہتا ہے اُس کا جواب ان کے پاس تیار رہتا ہے کوئی بات بے جواب نہ چھوڑیں گی خواہ ناگوار ہو یا گوارا ہو خواہ معقول ہو یا نامعقول ہو اور کفران کے آثار اکثر اس دعوئے مساواۃ سے پیدا ہوتے ہیں اب ان میں ان حضرات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو مساوات حقوق زوجین کی کوشش کرتے ہیں ان سے التماس ہے کہ آپ حضرات جو اس سعی میں ہیں کہ رجال و نساء میں مساواۃ ہو جاوے تو قطع نظر سب جوابوں کے کہتا ہوں اگر آپ ہی کی بیگم صاحبہ آپ سے مساواۃ کا دعویٰ کرے اور مقابلہ میں آ کر جواب سوال کرے تو سچ کہنا کہ آپ ناخوش نہ ہوں گے ضرور ہوں گے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ میرے اہل و عیال میرے تابع ہو کر رہیں اور خصوصاً جنٹلمین حضرات کہ مساواۃ تو کیا رکھتے معمولی حقوق بھی بیبیوں کے ضائع کرتے ہیں بیبیو تم مردوں کے برابر کیسے ہو سکتی ہو تم ہر طرح اور ہر امر میں پیچھے رکھی

گئی ہو دیکھو تمہاری امامت جائز نہیں میراث شہادت امارت ولایت وغیرہ میں ہر طرح مردوں سے پیچھے ہو تم آگے کیوں بڑھنا چاہتی ہو. امام صاحب کا قول ہے کہ اگر صف میں مرد کے برابر عورت کھڑی ہو جاوے تو نماز فاسد ہو جاوے گی جب عبادات میں مساوات نہیں ہے جس میں زیادہ ہمت زیادہ عقل کی بھی ضرورت نہیں تو معاملات میں کہ جن میں بہت سے ان امور کی ضرورت ہے جو خاص مردوں میں پائے جاتے ہیں کیسے برابر ہو سکتی ہو اور تم برابری کا دعوے کرنا چاہتی ہو حالانکہ تمہارا مرتبہ لونڈی سے بھی کم ہے اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر میں خدا کے سوا کسی غیر کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے مولیٰ کو سجدہ کرے اور یہ نہیں فرمایا کہ لونڈی کو حکم دیتا کہ اپنے مولے کو سجدہ کرے معلوم ہوا کہ تمہارا مرتبہ لونڈی سے بھی کم ہے اور شوہر کا مرتبہ مالک سے بھی زیادہ ہے مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ خاوند سے دبنا نفس کے خلاف ہونے سے عار سمجھا جاتا ہے. تم ان احکام کو دین ہی نہیں سمجھتیں بڑا شوق دین کا ہوگا تو وظائف اور سبحان اللہ اور الحمد للہ کی بہت سی تسبیح پڑھ ڈالیں گی میں کہتا ہوں کہ وظائف کا مرتبہ تو ان سب سے پیچھے ہے بڑی فضیلت اسی میں ہے جس کا میں نفس کا خلاف ہو اور ان وظائف کو اجزار دین میں سے اکثر نے انتخاب کیا ہے اس کے اندر نفس کا ایک خفی کید ہے وہ یہ ہے کہ عام میں اس کی وجہ سے تعظیم و تکریم بہت ہوتی ہے عام بزرگ سمجھنے لگتے ہیں اس لئے اس میں نفس خوش ہوتا ہے اور خاوند کی حرمت اور تعظیم اور اطاعت نفس کے خلاف ہے اس لئے اس سے اعراض ہے غرضکہ ایک وجہ خرابی کی تو زعم مساوات ہے۔ دوسری وجہ حسد ہے یہ مرض بھی عورتوں میں بہت ہے ذرا ذراسی شئے پر ان کو حسد ہوتا ہے مثلاً اسی پر حسد ہوتا ہے کہ ماں باپ کو یہ شئے کیوں دیتا ہے اگر ماں باپ نہ ہوتے تو یہ شئے ہمارے پاس رہتی لیکن اے عورتوں میں تمہاری اس امر میں تعریف کرتا ہوں

کہ تمہارا ایمان تقدیر پر بہ نسبت مردوں کے زیادہ ہے۔ مردوں کو صدہا وسوسے پیش آتے ہیں علماء سے الجھتے ہیں لیکن تم کو اس میں شک وشبہ بھی نہیں ہوتا مگر معلوم نہیں کہ یہ تمہارا تقدیر ایمان لانا اس موقع پر کہاں گیا خوب سمجھ لو کہ جس قدر تقدیر میں ہے وہ تم کو مل کر رہے گا پھر حسد اور جلن کا ہے کے لئے کرتی ہو اور یہی حسد ہے جن کی وجہ سے سوت سے ہمیشہ ان کی لڑائی رہتی ہے لیکن کوئی عورت اس کا اقرار ہرگز نہ کرے گی کہ مجھ کو حسد ہے بلکہ مختلف پیراؤں میں یہ جلن نکالتی ہے کبھی کہتی ہے کہ فلانی میں یہ عیب ہیں فلاں باہر کی ہے یا شرافت میں میرے برابر نہیں ہوسکتی۔ ہمارے قصبات میں بالخصوص دعوئے شرافت کا ایسا مرض ہے کہ باہر کی عورت یا مرد کیسا ہی شریف ہو مگر اپنی شرافت کے گھمنڈ میں کسی کو منہ نہیں لگاتے اور مجھ کو تو اسی میں شبہ ہے کہ ہم لوگ جو شریف کہلاتے ہیں آیا واقع میں ایسے ہی ہیں یا نہیں کیونکہ یہ عجیب بات ہے کہ جس قدر شیوخ ہیں کوئی تو اپنے کو صدیقی کہتا ہے کوئی فاروقی کوئی علوی کوئی عثمانی کوئی انصاری کیا ان چار پانچ صحابہ کے سوا نعوذ باللہ اور صحابہ منقطع النسل تھے کوئی اپنے کو یہ نہیں کہتا کہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہوں یا حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہوں سب ان چار پانچ حضرات ہی کی طرف نسبت کرتے ہیں شبہ ہوتا ہے کہ یہ سب تراشیدۂ یاراں ہے مشاہیر اور جلیل القدر والشان صحابہ کو لیکر ان کی طرف نسبت کرنے لگے جن کے پاس نسب نامہ محفوظ نہیں ظاہر ہے کہ ان کا بیان تو زبانی ہی قصہ ہے اور جن کے پاس نسب نامہ ہے اس میں بھی اوپر سے اشتباہ ہے کوئی تحقیقی بات نہیں ہے چنانچہ ہم لوگ تھانہ بھون کے فاروقی مشہور ہیں مگر تاریخ سے اس میں شبہ پڑتا ہے اس لئے کہ ابراہیم بن ادہمؒ اس سلسلۂ نسب میں موجود ہیں اور

ان میں اختلاف ہے کوئی ... فاروقی لکھتا ہے کوئی عجلی کوئی تیمی کوئی سید زیدی لکھتا ہے پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ ہم کہیں کہ فلانی کم قوم کی ہے خوب یاد رکھو قیامت کے دن صرف یہ پوچھا جاوے گا مَاذَا اکْتَسَبْتَ یعنی تونے کیا کمایا یہ نہ پوچھا جاوے گا بِمَنِ انْتَسَبْتَ یعنی کس کی طرف منسوب تھا اور جس قدر اقوام ہیں سب کے مرجع اور منتہا یقینی طور پر آدم علیہ السلام ہی ہیں مگر معلوم نہیں ان کی طرف اپنے کو نسبت کیوں نہیں کرتے اگر جواب میں کہا جاوے کہ وہ بعید ہیں اور نسب میں قریب کا اعتبار ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر قریب کا اعتبار ہے تو میں ایک شے نہایت قریب بتاتا ہوں اس کی طرف نسبت کرو وہ کیا ہے ایک آب ناپاک۔ ایک بزرگ کے سامنے سے ایک شخص نہایت فخر اور تکبر سے اکڑتا ہوا نکلا اُن بزرگ نے اس کو نصیحت فرمائی کہ بھائی اتراؤ مت اُس نے کہا کہ تم مجھ کو نہیں جانتے میں کون ہوں فرمایا ہاں جانتا ہوں اَوَّلُكَ نُطْفَةٌ قَذِرَةٌ وَاٰخِرُكَ جِيْفَةٌ مَذِرَةٌ وَاَنْتَ بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ اور اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں ہے آخرت میں تو واقعی نسب کوئی چیز نہیں ہے عمل ہی کام آنے والا ہے لیکن دنیا میں وہ بیکار بھی نہیں ہے شریعت نے خود اس کا اعتبار کیا ہے اگر نسب کوئی شے نہ ہوتی تو غیر کفو میں نکاح کرنے سے منع نہ کیا جاتا اور یہ قانون مقرر نہ ہوتا اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ (ائمہ قریش میں سے ہیں) ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ شرع نے بھی شرفا میں ضرور تفاوت رکھا ہے اور یہ تفاوت مصالح تمدنیہ کی حفاظت کے لئے ہے اگر سب کے سب اس میں یکساں ہوتے تو تمدن محفوظ نہ رہ سکتا نہ کوئی کام چل سکتا مثلاً اگر کوئی گھر بنانے کے لئے کسی کو کہتا تو وہ کہتا تم ہی ہمارا گھر تعمیر کردو۔ نائی سے خط بنانے کو کہتے وہ کہتا تم ہی میرا بنادو۔ دھوبی کپڑے نہ دھوتا غرض سخت مصیبت ہوتی۔ اگر بڑھئی کی ضرورت ہوتی تو وہ نہ ملتا۔ اگر نوکر کی ضرورت ہوتی نوکر نہ ملتا یہ ادنیٰ اعلیٰ کا تفاوت ہی ہے

جس سے لوگوں کے کام چل رہے ہیں چنانچہ اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ میں بھی ایک انتظامی مصلحت ہے قدرتی طور سے اللہ تعالیٰ نے قریش کو فضیلت دی ہے تو جب ائمہ اور امراء ان میں سے ہوں گے تو اوروں کو ان کے اتباع سے عار نہ ہوگا اور ان کو دوسروں کے اتباع سے عار ہوتا اور جنگ و جدل کی صورت قائم ہوتی اور نیز یہ قاعدہ ہے کہ آدمی اپنے خاندانی شے کی بہت حفاظت کیا کرتا ہے تو اگر قریشی امام ہوگا تو دین کی حفاظت دو وجہ سے کرے گا ایک اس وجہ سے کہ دین ان کے گھر کا ہے دوسرے مذہبی تعلق سے پس معلوم ہوا کہ نسب میں مصالح تمدنیہ لودع ہیں اس لئے وہ بیکار نہیں مگر نسب پر تکبر کرنا اور فخر کرنا ہر حالت میں حرام ہے اور آجکل کے شرفا میں تو نسب پر تکبر ہی ہے مگر غیر شرفا میں دوسرے طور تکبر پایا جاتا ہے کہ اپنے کو شرفا کے برابر سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور ان میں کچھ فرق نہیں جانتے یہ بھی زیادتی ہے جو فرق اللہ تعالیٰ نے رکھدیا ہے اس کو کون مٹا سکتا ہے غرض یہ کہ تفاخر اور کبر بھی برا ہے جیسا مدعیان شرافت خصوص عورتوں میں ہے اور فرق مراتب نہ رکھنا بھی ناپسندیدہ ہے جیسا دوسری قوموں نے اختیار کیا ہے۔ میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ ہماری عورتوں کے اخلاق نہایت خراب ہیں ان کو اپنی اصلاح کرانا نہایت ضروری ہے اور یاد رکھو کہ بغیر اخلاق کے درست ہوئے عبادت اور وظیفہ کچھ کارآمد نہیں حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلانی عورت بہت عبادت کرتی ہے راتوں کو جاگتی ہے لیکن اپنے ہمسایوں کو ستاتی ہے فرمایا ھِیَ فِی النَّارِ (وہ دوزخی ہے) اور ایک دوسری عورت کی نسبت عرض کیا گیا کہ وہ عبادت نہیں کرتی مگر ہمسایوں سے حسن سلوک کرتی ہے فرمایا ھِیَ فِی الْجَنَّۃِ (وہ جنتی ہے) مگر ہماری عورتوں کا سرمایہ بزرگی آجکل تسبیح اور وظیفہ پڑھنا رہ گیا اخلاق کی طرف اصلا التفات نہیں حالانکہ اگر دین کا ایک بھی جزء کم ہوگا تو دین ناتمام ہوگا مگر آجکل لوگوں نے جیسے اور چیزوں کا ست نکالا ہے اسی طرح دین کا بھی ست

نکال لیا ہے بعض نے تو نماز روزہ ہی کو دین سمجھ لیا ہے معاملات اخلاق وغیرہ کو چھوڑ دیا اور بعضوں نے صرف اخلاق کو لے لیا اور عبادات و عقائد کو چھوڑ دیا اگرچہ ان مدعیان اخلاق کے اخلاق بھی درست نہیں ہیں لیکن اگر ہوتے بھی تو بیکار تھے ایک جماعت وہ ہے کہ ان کے عقائد و اعمال و معاملات اچھے ہیں مگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوش عقیدہ ہیں اور اس پر تفاخر کرتے ہیں اور دوسروں کی تحقیر کرتے ہیں تو ان میں اخلاق کی کمی ہے اسی طرح ہماری عورتوں نے عقائد اور وظائف و نماز کو لے لیا مگر اخلاق کو چھوڑ دیا صبح سے شام تک غیبت حسد لعن طعن کبر میں مبتلا ہیں اور اس پر یہ سمجھتی ہیں کہ ہم بڑے بزرگ ہیں تو بزرگی صرف یہ نہیں ہے اسی طرح مردوں کو بھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق کی ان میں بھی کمی ہے وہ بھی اصلاح کریں بلکہ اخلاق کے بعض حیثیات سے اعمال سے بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہیئے اس لئے کہ اگر اعمال میں کمی ہوگی تو اس کا ضرر اپنی ذات ہی تک محدود رہے گا اور اخلاق اگر خراب ہوئے تو اس کا ضرر دوسروں کو پہنچے گا یہ حق العبد ہے افسوس ترک صلوٰۃ اور دیگر کبائر کو تو گناہ سمجھا جاتا ہے اور غیبت اور حسد و طمع زیور اپنی سوت سے لڑنا وغیرہ وغیرہ خصال کو گناہ نہیں سمجھتیں خلاصہ تمام تر وعظ کا یہ ہوا کہ اس حدیث میں تین شر بیان فرمائے گئے ہیں اور یہ تین شر ایسے ہیں کہ تمام شرور کا تعلق ان ہی تین سے ہے بعض شرور کا تعلق تو ان سے ابتدًا ہے اور بعض کا لمًّا ہے یعنی بعض شرور ان سے پیدا ہوتے ہیں اور بعض شرور سے یہ پیدا ہوتے ہیں مثلاً کُفْرَانِ عَشِیْر کا منشا حرص و طمع ہے اِکْثَارِ لعن سے غیبت نامی وغیرہ ہوتی ہے اِذْھَابُ لُبِّ رَجُلٍ حَازِمٍ سے نااتفاقی جنگ و جدال آپس کی خانہ جنگیاں وغیرہ اسی طرح غور کرنے سے سب کا تعلق معلوم ہو سکتا ہے پس یہ تینوں واجب الاصلاح ٹھہرے اب طریقہ اصلاح کو غور سے سننا اور سمجھنا چاہیئے اور اسی پر بیان ختم ہو جاوے گا اور وہ طریقہ اصلاح مرکب ہے علم و عمل سے اور علم یہی نہیں ہے کہ ترجمہ قرآن شریف پڑھ لیا تفسیر سورۂ یوسف پڑھ لی یا نور نامہ وفات نامہ پڑھ لیا

بلکہ کتاب وہ پڑھو جس میں تمہارے امراض کا بیان ہے یہ تو علم ہوا۔
اور عمل ایک تو یہ کہ اول تو زبان کو روک لو تمہاری زبان بہت چلتی ہے تم کو کوئی بُرا کہے یا بھلا تم ہرگز مت بولو اس سے کفران عشیر اذھاب لب لرجل حازم اکثار لعن وحسد وغیبت وغیرہ جاتے رہیں گے اور جب زبان روک لی جاوے گی تو امراض کے مبانی بھی قلب سے جاتے رہیں گے کیونکہ جب اس قوۃ سے کام ہی نہ لیا جاوے گا تو ان امراض کے مناشی بھی ضعیف اور مضمحل ہو جاویں گے اور دوسرے یہ کہ ایک وقت مقرر کر کے یہ سوچا کرو کہ دنیا کیا چیز ہے اور یہ دنیا چھوٹنے والی ہے اور موت کا اور موت کے بعد جو امور پیش آنے والے ہیں جیسے قبر اور منکر نکیر کا سوال اور اس کے بعد قبر سے اٹھنا اور حساب وکتاب اور پلصراط کا چلنا سب کو بالتفصیل روزانہ سوچا کرو اس سے حُبِ جاہ حُبِ مال تکبر حرص اور اس کے فروغ غیبت حسد وغیرہ سب امراض جاتے رہیں گے غرض حاصل معالجہ کا دو جز ہوئے ایک علمی دوسرا عملی علمی کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے بعد ایسی کتابیں پڑھو جس میں احکام فقہیہ کے ساتھ امراض قلب مثل حسد تکبر وغیرہ کا بھی بیان ہو کم سے کم بہشتی زیور ہی کے دس حصے پڑھ لو اور عملی جز کا حاصل دو چیزیں ہیں کف لسان اور مراقبۂ موت لیکن طوطے کی طرح بہشتی زیور کے الفاظ خود پڑھ لینے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا بلکہ یہ ضروری ہے کہ کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لو جبکہ گھر میں عالم ہو ورنہ گھر کے مردوں سے درخواست کرو کہ وہ کسی عالم سے پڑھ کر تم کو پڑھا دیا کریں مگر پڑھ کر بند کر کے مت رکھ دینا ایک وقت مقرر کر کے ہمیشہ اس کو خود بھی پڑھتی رہنا اوروں کو بھی سناتی رہنا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس طریقہ سے انشاء اللہ بہت جلد اصلاح ہو جاویگی اور یہاں اس سے زیادہ بیان کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ماشاء اللہ

یہاں کی عورتیں خود سمجھدار ہیں اور اصل الاصل ان تمامتر خرابیوں کا ایک ہی امر ہے اس کا اگر ازالہ ہو جاوے تو سب امور کی اصلاح ہو جاوے وہ یہ کہ آجکل بے فکری ہو گئی ہے اگر ہر امر میں دین کا خیال رکھا جاوے کہ یہ امر جو ہم کرتے ہیں آیا دین کے موافق ہے یا نہیں تو انشاء اللہ چند روز میں اصلاح ہو جاوے۔ اب دعا کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالے توفیق عطا فرمائے۔ آمین آمین آمین فقط

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ دہم ملقب بہ

ذم ہویٰ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب

تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافرخانہ بندر روڈ۔ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعوات عبدیت جلد اول کا

وعظ دہم ملقب بہ

ذم ہویٰ

این	متے	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	شعبان ۱۳۲۹ھ		بیٹھ کر	علاج اتباع ہویٰ	مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی		

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا محمدا عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے داؤد (علیہ السلام) بیشک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ

بنایا ہے پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفسانی کا اتباع مت کرو یہ تم کو اللہ کے راستہ سے بے راہ کردے گی بیشک جو لوگ اللہ کی راہ سے گم ہوئے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا بسبب اس کے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے۔ اس آیت شریفہ میں ہر چند کہ خطاب داؤد علیہ السلام کو ہے لیکن مضمون عام ہے کچھ داؤد علیہ السلام کی تخصیص نہیں ہے بلکہ داؤد علیہ السلام کی طرف خطاب کرنے سے معنی اس مضمون کے اور زیادہ تقسیم ہوگئے اس لئے کہ جب بڑوں کو کسی امر کا خطاب کیا جاتا ہے اور ان کو باوصف ان کی عظمت کے اُس امر پر وعید کی جاتی ہے تو چھوٹے بطریق اولیٰ مخاطب ہوجاتے ہیں مثلاً طبیب اگر صحیح قوی کو کہے کہ فلاں شئے نہ کھاؤ تم کو مضر ہوگی تو مریض ضعیف کو تو بطریق اولیٰ اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت مفہوم ہوگی اسی طرح سے یہاں داؤد علیہ السلام کو خطاب ہے گویا مطلب یہ ہے کہ جب داؤد علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے اس حکم کے مامور ہیں اور مضمون بھی کوئی خصوصیات نبوت سے نہیں تو اوروں کو تو بطریق اولیٰ اس حکم کی پابندی کرنی چاہیئے اور وہ حکم جو کہ داؤد علیہ السلام کو اس آیۂ شریف میں کیا گیا ہے اتباع ہوے سے نہی ہے اور اتباع ہویٰ کی مذمت ہے یعنی اپنی جی چاہی بات پر عمل کرنا۔ اب ظاہر ہے کہ داؤد علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی صاحب کتاب کہ زبور شریف ان پر نازل ہوئی ہے اور داؤد علیہ السلام عموماً اور ان میں جو صاحب کتاب ہیں خصوصاً ان کے تمام ملکات محمود اور جذبات طاہر مطہر اور نفوس نہایت مہذب ہوتے ہیں جب باوجود ان کے ان کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اپنی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا حالانکہ ان کا نفس بالکل مہذب ہے اگر اس میں خواہش بھی ہوگی تو ظلمانی نہ ہوگی تو ہم تو جو کہ سر سے پا تک گند در گند ہیں اگر خواہش نفسانی کی پیروی کریں گے تو بالکل ہلاک ہی ہوجائیں گے اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا (اے اللہ ہم کو اس سے محفوظ رکھ) اور

آج اس مضمون کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مضمون وہ قابل بیان ہوتا ہے کہ جس کی ضرورت ہو اور یوں تو ہر وقت ہر حکم کو ہم کو ضرورت ہے لیکن ازمنہ اور حالات ناس کے اختلاف سے بعض احکام دوسرے بعض کے اعتبار سے زیادہ مہتم بالشان ہو جاتے ہیں جیسے اگر طبیب مریض کو غیر موسم انبہ میں کہے کہ دیکھو ترش انبہ نہ کھانا تو یہ حکم یعنی انبہ ترش کی ممانعت طباً فی نفسہ ضروری ہے لیکن اس وقت اس کا ممانعت کرنا بالکل امر زائد ہے اس وقت تو اس چیز سے منع کرنا چاہیئے جو موجود ہو اور مضر ہو اسی طرح ناصح کا حق یہ ہے کہ جس وقت جو مرض پائے اس کی اصلاح کے متعلق بیان کرے اور اگر چند امراض ہوں تو ان میں اہم کو مقدم کرے اور استیعاب کے ساتھ احکام بیان کرنا اس وقت ہوگا جبکہ کوئی طالب علم مخاطب ہو مثلاً ہدایہ میں پڑھتے پڑھتے کتاب الحج ماہ ربیع الثانی میں آئے تو یہ نہ کہا جاوے گا کہ اس وقت اس کی کیا ضرورت ہے اس کی ضرورت تو ماہ ذی الحجہ میں اور وہ بھی جبکہ کوئی حج کو جانے لگے اس وقت ہوگی کیونکہ اس کا تو صاحب فن بننا مقصود ہے بخلاف وعظ کے کہ اس میں وقتی ضرورت پر نظر ہوتی ہے اس لئے کہ مخاطبین کو جامع الفن اور محقق بننا مقصود نہیں بلکہ محض اصلاح مقصود ہے مجھ کو ہمیشہ اسی قاعدہ کی وجہ سے اُن مضامین کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا کرتا ہے جو اس وقت ضروری ہوں سو مجھ کو یہ خیال ہوا کہ منجملہ امراض کے کہ جن میں عام ابتلا ہے اتباع ہوی بھی ہے جو اصل ہے تمام امراض کی کہ اس مرض میں عوام و خواص یعنی جہلاء اور علماء بلکہ اخص الخواص بھی یعنی علماء میں جو اہل اللہ اور صاحب ارشاد ہیں سب ہی مبتلا ہیں اگر ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو واللہ سچ عرض کرتا ہوں کہ اپنے اندر اتباع شریعت کا بہت کم حصہ پائیں گے زیادہ تر اتباع ہوی ہی نظر آوے گا کیونکہ جس امر میں ہم شریعت سے استدلال کرتے ہیں ان میں اصل محرک اکثر ہوی ہی ہے اتباع نہیں ہے اتباع شریعت کا محض حیلہ ہے اور یہ مرض عوام میں اور رنگ میں ظاہر ہوتا ہے

اور علماء ہیں اور رنگ ہیں عوام میں جو دنیا دار کہلاتے ہیں وہ تو کھلے مہار معاصی میں اتباع ہویٰ کا کرتے ہیں مگر جو اتقیا اور دیندار کہلاتے ہیں وہ دین میں اتباع ہوے کرتے ہیں اس کا یہ رنگ ہے کہ مثلاً مولوی صاحب سے کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کوئی مسئلہ ایسا بھی ہے جس میں یہ کام اس طرح ہو جاوے کیوں صاحب تم سے اپنی حالت کو قانون شرعی کے تابع نہیں بنایا جاتا قانون کو چاہتے ہو کہ تمہاری موافقت کرے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مولوی صاحب کوئی روایت ہمارے موافق کہیں سے نکال دیں۔ کچھ دن ہوئے کہ ایک شخص آئے اور کہا کہ رضاعی بھائی بہن کا آپس میں نکاح ہو گیا ہے اور نکاح کے وقت علم نہ تھا بعد نکاح معلوم ہوا۔ اب کیا کیا جاوے میں نے کہا کہ تفریق کرادو۔ یہ حکم سن کر وہ شخص سہم گیا اور کہنے لگا کہ صاحب اس میں تو بڑی بدنامی ہے افسوس صد افسوس کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ساتھ مسلمان کی یہ حالت ہو اور فرمائش کی جاوے کہ ہمارے موافق مسئلہ مل جاوے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی اس میں تو نیک نامی ہوگی کہ بڑے اچھے آدمی ہیں ایک غلطی ہو گئی تھی جب حقیقت پر اطلاع ہوئی حق کو اختیار کرلیا اور بدنامی تو اب ہو رہی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بھائی بہن دونوں جمع ہو رہے ہیں اور یہ جواب تو علیٰ سبیل التبرع تھا ورنہ جواب حقیقی تو یہ ہے کہ بلا سے بدنامی ہو ہونے دو اگر ایسا ہی بدنامی کا خوف ہمارے بزرگوں کو ہوتا تو آج ہم مسلمان نہ ہوتے مگر ہمارے بزرگوں نے اسلام لانے میں کیسی کیسی مصیبتیں اور بدنامیاں اٹھائیں ہیں کیونکہ جب کوئی مذہب باطل کو چھوڑتا ہے تو اہل باطل اس پر ایسی ہی ملامت کرتے ہیں جیسے حق کو چھوڑتے وقت اہل حق ملامت کرتے ہیں کیونکہ اہل باطل بھی اپنے گمان فاسد میں اپنے طریق کو حق اور محبوب سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ موضع سونتہ گیا۔ وہاں ایک بوڑھے چمار کو دیکھا کہ بہت پاک صاف ستھرا رہتا ہے اور رات کو اٹھ کر رام رام بھی کرتا ہے اور معلوم ہوا کہ اس کے اولاد وغیرہ بھی کچھ نہیں ہے میں نے اس سے کہلایا کہ مسلمان ہو جا۔ اس نے کہا کہ میں اپنے لوگوں سے صلاح کر کے جواب دونگا صلاح کر کے اس نے جواب دیا کہ لوگ یوں کہتے ہیں

کہ بڑھاپے میں کیوں ایمان کھوتا ہے۔ سچ ہے ؎

گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد　　بخود گماں نبرد ہیچ کس کہ نادانم

(اگر تمام دنیا سے عقل معدوم ہو جائے تو کوئی شخص اپنے آپ کو نادان گمان نہ کریگا)

تو میں نے اس سائل سے کہا کہ اگر جناب سب کے سب آپ کے مذاق پر ہوتے اور حق کے اختیار کرنے میں بدنامی سے ڈرتے تو اس وقت آپ بھی کافر ہوتے مسلمان کی تو یہ شان ہونی چاہیئے کہ ؎

نسازد عشق را کنج سلامت　　خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق کو گوشہ سلامتی موافق نہیں اس کے مناسب کوچہ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے)

بلکہ طالب حق کو تو ملامت میں اور زیادہ مزا آتا ہے اور ملامت میں ایک عجیب نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ اس سے دین میں پختگی ہو جاتی ہے جب تک ملامت نہ ہو خامی رہتی ہے وجہ یہ کہ جب چاروں طرف سے ملامت کی بوچھار پڑنے لگتی ہے تو اس کو طبعاً چڑ ہو جاتی ہے اور اپنے فعل پر اصرار پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے اس کام میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر شخص نے شادی میں کوئی رسم نہیں کی اس پر اس کو لوگوں نے ملامت شروع کی تو یہ شخص ترک رسوم میں اور زیادہ پختہ ہو جائے گا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حق تعالےٰ نے کوئی شئے بے حکمت پیدا نہیں فرمائی خواہ وہ شئے آفاقی ہو یا انفسی مثلاً چڑ کہ بظاہر موذی اور مضر معلوم ہوتی ہے مگر اس میں یہ نفع نکلا کہ اس سے دین کو پختگی ہو سکتی ہے اسی طرح جس قدر خواص طبعی ہیں سب نافع ہیں ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ بخل اور جبن بھی مطلقاً بُری خصلتیں نہیں بلکہ کبھی اچھی بھی ہیں جب کہ اچھے مصرف میں صرف کریں مثلاً ایک سائل آیا کہ مجھ کو سو روپے دیدیجئے شادی میں ناچ کراؤں گا سو یہاں بخل ہی بہتر ہے اسی طرح غصہ پہلے مسلمانوں کو آیا کرتا تھا بعد اصلاح کے اپنے نفس اور شیطان پر اور اعداء اللہ پر غصہ آنے لگا۔ پس محل بدل گیا اور تزکیہ کے بعد اخلاق بدلتے نہیں۔ بلکہ اخلاق طبعیہ بحالہا باقی رہتے ہیں صرف ان کا محل بدل جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر ایک چیز چڑ بھی ہے کہ وہ بھی نافع ہے

اگر اپنے محل میں ہو جیسا مثال مذکور میں بیان ہوا ہاں اگر اس کا مصرف بھی برا ہو تو یہ چڑ دوزخ میں لے جانے والی ہے کفار عرب کو چڑ ہی تو ہو گئی تھی حالانکہ حق اُن کو واضح ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک شخص نے خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا۔ کہ میں ایمان تو لے آتا لیکن قریش کی بڑھیاں کہیں گی کہ دوزخ سے ڈر گیا۔ بہادری میں فرق آجائے گا چنانچہ اسی حال میں مرگیا آپ کو بہت رنج ہوا۔ اس پر آیت نازل ہوئی کہ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے لیکن اللہ جس کو چاہے ہدایت کرتا ہے۔ تو ایسی چڑ بُری ہے ورنہ حق پر ملامت ہونے سے چڑ بڑھ جائے تو خیر ہے۔ بہر حال اللہ کے بندوں نے ملامت سر پر لی اور حق کو اتباع ہوی پر ترجیح دی۔ غرض اتباع ہوی کا سخت مذموم ہونا ثابت ہو گیا اب یہ بات رہی کہ اتباع کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیئے سو وہ معیار بجز وحی کے اور کچھ نہیں اس لئے کہ طبیعت تو کافی نہیں جیسا ابھی واضح ہوا کہ خواہش نفسانی انبیاء کی بھی ان کے لئے متبوع نہیں رہی عقل سو ظاہر ہے کہ عقول میں خود اختلاف ہے تو آخر کس کی عقل کو ترجیح دی جاوے اگر عام کی عقل کو چھوڑ کر حکماء کی عقل کو لیا جاوے تو خود ان میں بھی اختلاف پھر کس کو لیا جاوے۔

اور دوسرے یہ کہ خود عقل پر اکثر تسلط ہو جاتا ہے طبیعت اور رسوم کا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات رسم و رواج کے غلبہ سے عقلاء بلکہ بڑے بڑے علماء بھی بے وقوفی کے کام کرنے لگتے ہیں مثلاً جب بیاہ لکھا آتا ہے تو نائی کے سامنے شکرانہ بنا کر رکھا جاتا ہے اور کھانے کے بعد جوڑہ کے ساتھ اس کے سامنے سو روپیہ خوان میں ڈالتے ہیں اور وہ اس میں سے ایک دو اُٹھا لیتا ہے باقی پھیر دیتا ہے سب جانتے ہیں کہ واقع میں اس کو اتنی بڑی رقم دینا منظور نہیں مگر پھر بھی اس کے سامنے یہ سو روپے نہ معلوم کس غرض سے رکھے جاتے ہیں اس میں تو ریا بھی نہیں اس لئے کہ ریا تو دوسرے کے دکھاوے کو

کہتے ہیں یہاں وہ بھی نہیں اس لئے کہ یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا منظور نہیں ہے یہ تو نرا لڑکوں کا کھیل اور محض لغو بیہودہ حرکت ہے مگر بڑے بڑے عقلاء جو دوسروں کو عقل سکھاتے ہیں وہ بھی اس میں مبتلا ہیں اس سے معلوم ہوا کہ عقول پر بھی رسوم غالب ہو جاتی ہیں پس ہماری عقل بھی معیار نہیں بن سکتی اور وحی ان سب شوائب سے منزہ ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ لائق اتباع کے صرف وحی ہے لیکن اس شرط سے کہ خود وحی میں اپنی ہوائے نفسانی سے کچھ تصرف یا تغیر نہ کر لیا ہو جیسا آجکل اکثر اہلِ علم اور غیر اہل علم قصداً تو اتباع کرتے ہیں ہوائے نفسانی کا اور وحی کو صرف آڑ بنا لیتے ہیں سو یہ کتنا بڑا حیلہ د فریب ہے اس سے صرف اتنا تو نفع ہو جاتا ہے کہ خلق کے اعتراض سے بچ جاتے ہیں مگر خالق تعالیٰ شانہ تو ظاہر اور باطن کا جاننے والا ہے اس سے کیسے بچیں گے ؎

خلق راگیرم کہ بفریبی تمام — در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

کارہا باخلق آری جملہ راست — باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

کارہا اور راست باید داشتن — رایت اخلاص و صدق افراشتن

(اے اپنے فرض کر لیا اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے مخلوق کے ساتھ سب تیرے کام درست ہیں۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر و حیلہ کب جائز ہے حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنے چاہئیں۔ اخلاق اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیئے)

خدائے تعالیٰ کے ساتھ فریب کرنا نہ چاہئے اور نیک نامی اور بدنامی کو بالائے طاق رکھ کر سچا اتباع کرنا چاہیئے۔

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا — جو کہ خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

اور عاشق کو جو ناکام اور بے مراد کہدیا ہمارے حضرت اس کی تفسیر فرماتے تھے کہ بے مرادی عشق کو کہتے ہیں کیونکہ عاشق کا خاصہ ہے کہ وصل کے جس مرتبہ پر پہنچے اس کو آگے کی ہوس ہوتی ہے اور اشتیاق بڑھتا ہے ہاں جس کے محبوب کا جمال متناہی ہو اس کی مرادیں

ختم ہو سکتی ہیں۔ اور جہاں جمال غیر متناہی ہو وہاں نہ حسن ختم نہ طلب ختم بلکہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے اشتیاق اور زیادہ ہوتا جاتا ہے اور وہ حالت ہوتی ہے جس کو شیخ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

دلارام در بر دلارام جو لب از تشنگی خشک برطرف جو
نہ گویم کہ برآب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہو، نہر کے کنارے پر کھڑے ہو اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں یہ تو ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ جلندھر والے کی طرح دریائے نیل کے کنارے پر ہیں)

غرض ناکام کو بدنامی سے کیا ڈر حافظ صاحب فرماتے ہیں ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے تو ہم ننگ و نام کے خواہاں نہیں ہیں)

جو بدنامی سے ڈرے وہ عاشق نہیں ہوسکتا۔ ہے آج کل یہ کیفیت ہے کہ دین پر بھی عمل اس وقت کریں گے کہ جب وہ حکم اپنی خواہش کے خلاف نہ ہوا ور نہ اس میں کچھ خرچ ہو، اور نہ کسی مصلحت دنیوی کے خلاف ہو اور اس پر پھر دعویٰ دینداری کا ؎

وَجَائِزَۃٌ دَعْوَی الْمَحَبَّۃِ فِی الْھَوٰی وَلٰکِنْ لَا یَخْفٰی کَلَامُ الْمُنَافِقِ

(عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے لیکن منافق کا کلام چھپا نہیں رہتا)

چنانچہ ان سائل صاحب نے فرمایا کہ کوئی ایسا مسئلہ نکال دو کہ جس میں یہ عورت حلال ہو جاوے میں نے کہا کہ دیوانہ ہوئے ہو میں کون حلال کہنے والا ہوں اور اگر کہہ بھی دیا تو اس سے حلال تو نہیں ہو جاوے گی جب تک شرعی دلیل سے حلال نہ ہو۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور سوال کیا کہ فلاں مرد عورت کی آپس میں یہ قرابت ہے ان میں نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں حضرت نے فرمایا نہیں۔ وہ کیا کہتا ہے کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا تو نہ ہونے کا مطلب یہ سمجھے کہ زبان سے الفاظ نہ نکل سکتے ہوں گے اسی واسطے فرماتے ہیں کہ ہم نے

کیا تھا اور ہو گیا تھا یعنی منہ بند نہیں ہو گیا تھا۔ اسی طرح یہ سائل صاحب بھی اس رضاعی بھائی بہن کو حلال کرانا چاہتے تھے۔ جب ان سائل صاحب نے مجھ سے صاف جواب سنا تو اب تاویل کی فکر ہوئی کہ کوئی تاویل کرنی چاہیئے تو فرمانے لگے۔ کہ اس لڑکے نے دودھ پیا تو تھا مگر تھوڑا سا پیا تھا وہ عقلمند یہ سمجھے کہ بہت سا پینے سے حرمۃ ہوتی ہوگی تھوڑا پینے میں کیا حرج ہے میں نے کہا کہ جناب ایک قطرہ پینے میں بھی حرمۃ ہو جاوے گی۔ اس پر فرمانے لگے کہ جی جو کچھ پیا تھا وہ بھی قے ہو گیا تھا اندر نہیں رہا دہ یہ سمجھا کہ بس دودھ کے ساتھ حرمۃ بھی نکل پڑی میں نے کہا کہ بھائی حلق کے نیچے اترتے ہی حرمۃ ثابت ہو گئی اور ثبوت کے بعد اس کا سقوط نہیں ہوتا اس پر وہ ناامید ہو کر چلے گئے۔ اور دھلی پہونچے۔ اہل حدیث سے جا کر رجوع کیا تو اہل حدیث اور نیز شافعیؒ کا مذہب ہے کہ پانچ گھونٹ سے کم میں حرمۃ نہیں ہوتی یہ مسئلہ سُن کر ان سائل صاحب نے ایک سوال اسی قید کے ساتھ تیار کیا کہ ایک لڑکے نے پانچ گھونٹ سے کم دودھ پیا ہے آیا حرمۃ رضاعۃ ثابت ہوئی یا نہیں۔ ان میں سے کسی نے جواب لکھ دیا کہ اس صورت میں حرمۃ رضاعۃ ثابت نہ ہوگی۔ بس آپ راضی رضا آ گئے اور بہن بھائی کو اسی حالت پر ہنسی خوشی جمع رکھا۔ دیکھئے اس مسئلہ میں ان سائل صاحب نے کس قدر اپنے نفس کی پیروی کی ہے۔ جیسا اُس کے مکالمہ مفصلہ سے ثابت ہوتا ہے پھر بھی امید نہیں کہ موافق مذہب شافعیؒ کے یہ نکاح جائز ہوا ہو۔ اس لئے کہ بچے کے دودھ پینے کے وقت جب ان امور کی اطلاع بھی نہ تھی تو کس نے گنا تھا کہ اس نے پانچ گھونٹ پیئے ہیں یا کم دوسرے یہ کہ یہ شخص حنفی تھا اور پہلے سے اس کا یہ عقیدہ نہ تھا جس پر عمل کیا اگر پہلے سے شافعی ہوتے تو اس فتوی پر عمل کرنا مضائقہ نہ تھا یا اس ابتلاء رضاع سے پہلے اپنی تحقیق یا کسی کی تقلید سے اس مسلک کی ترجیح ثابت ہو جاتی تب بھی مضائقہ نہ تھا اب تو کھلا اتباع ہوئی کیا اسی طرح ہم فرائض میں دیکھتے ہیں کہ اگر اپنے آپ کو ملتا ہوا دیکھتے ہیں تو فرائض

نکلواتے ہیں اور بعضے تو اول ہی پوچھ لیتے ہیں کہ ہمارا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں۔ اگر کچھ حصہ ہوا تو مسئلہ نکلواتے ہیں اور اگر نہ ہوا تو چل دیتے ہیں اور بعضے اس امید پر مسئلہ نکلوا لیتے ہیں مگر جب ان کو مسئلہ نکال کر سنایا جاتا ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا اس میں کچھ نہیں ہے تو بہت بد دل ہوتے ہیں اور بعض اوقات فرائض بھی مفتی ہی کے پاس چھوڑ کر چل دیتے ہیں یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ نکالنے والے کا جی بُرا ہوگا اس کی خاطر ہی سے لے جاویں۔ ایک شخص میرے پاس ایک فرائض لائے اور پوچھا کہ میرا کتنا حصہ ہے۔ میں نے بتلا دیا کہ اس قدر ہے ان کو وہ بہت کم معلوم ہوا کہنے لگے کہ میرا حصہ کیوں گھٹ گیا، میں نے کہا کہ فلاں وارث کی وجہ سے کم ہو گیا اگر وہ نہ ہوتا تو تم کو زیادہ ملتا تو کہنے لگے کہ جناب پھر اس کو نہ لکھئے۔ اور اکثر فرائض وہی پوچھتا ہے جس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو اور قبضہ چاہتا ہو اور جو قابض ہوتا ہے وہ کبھی فرائض نہیں نکلواتا کیونکہ جانتا ہے کہ تقسیم کرنی پڑے گی اور قبضہ سے شئے نکل جاوے گی۔ غرض لینے کے لئے فرائض نکلواتے ہیں دینے کے لئے کوئی نہیں نکلواتا الا ماشاء اللہ تمام عمر میں ایک شخص ایسے آئے کہ بڑے رئیس تھے اور تمام ریاست پر قابض تھے انھوں نے فرائض لکھوائے تھے تاکہ جائداد موافق شرع شریف تقسیم کردیں۔ گڑگانوہ کے رہنے والے تھے کئی بار آئے اور گئے جو ضروری بات اس میں کوئی رہ جاتی تھی اس کے دریافت کرنے کے لئے مکرر سہ کرر آتے اور جاتے۔ اور ان کے سوا جو آتا ہے ایسا ہی آتا ہے جو لینا چاہتا ہے اور دینا نہیں چاہتا ایک بار ایک ایسے ہی شخص آئے اور انھوں نے مسئلہ پوچھا کہ ہماری بہن بے اولاد مر گئی اور خاوند اس کا شیعی ہے آیا اس کے خاوند کو بھی عورت کے ترکہ میں سے کچھ ملے گا۔ میں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ملے گا نصف ترکہ اس کا ہے تو وہ بھائی یہ چاہتے تھے کہ خاوند کو نہ ملے مال بہت تھا اور انھوں نے کہیں سنا تھا کہ شیعہ پر کفر کا فتوی ہے تو اس لئے چاہتے تھے کہ اس تاویل سے اس کے خاوند کو کچھ نہ ملے سب مال ہمارے قبضہ میں آوے کہنے لگے کہ سنیہ کا تو شیعی سے بوجہ کفر شیعی کے نکاح نہیں ہوتا پھر وہ شوہر کب ہے۔ میں نے کہا کہ تم کو کچھ خدا کا خوف بھی ہے کہ دوسرے کا حق رکھنا چاہتے ہو اور اگر خوف نہیں تو اچھا حمیت اور غیرت کہاں اڑ گئی کہ تھوڑی سی دنیا کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری بہن تمام عمر

حرامکاری میں مبتلا رہی اور دوسرے یہ تو بتلایئے کہ آپ نے نکاح کے وقت کیوں نہ پوچھا کہ یہ خاوند شیعی ہے اس سے نکاح جائز ہے یا نہیں اور تیسرے یہ کہ سچ سچ کہنا اگر یہ مال خاوند کے قبضہ میں ہوتا اور وہ مرتا اور تمہاری بہن کو ملنے کے بعد پھر تمہاری طرف سے منتقل ہونے کا احتمال ہوتا تو کیا اس وقت بھی تم اس نکاح کے صحیح نہ ہونے کی کوشش کرتے میرے پاس کثرت سے ایسے سوال آتے ہیں کہ کوئی بات نکال دو۔ چنانچہ ابھی ایک مسئلہ آیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیں۔ اس کی درخواست تھی کہ کوئی ایسی صورت نکال دو کہ حلالہ نہ کرنا پڑے یہ تو عوام الناس کی کیفیت ہے جو بیان ہوئی کہ ہر امر میں اتباع ہوی کرتے ہیں حتیٰ کہ مسائل شریعت میں بھی علماء سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہماری مرضی کے موافق فتوے دیدیں۔ رہے علماء ان سے تو کسی سے کہنے سننے کی ہی ضرورت نہیں ہدایہ شرح وقایہ درمختار ان کے سامنے ہے جس طرح چاہیں عمل کریں۔ اور میں سب علماء کو نہیں کہتا بلکہ صرف ان کو جو حب جاہ و مال میں مبتلا ہیں سو ایسے عالم کا فتوے بھی معتبر نہیں جو دنیا کا حریص اور محب ہو اور ہمیشہ گمراہی ایسے ہی لوگوں سے پھیلی ہے ؎

بدگہر را علم و فن آموختن دادن تیغ است دست راہزن

(نااہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ تلوار دے دینا ہے)

پہلے زمانہ میں جو رسم تھی کہ ہر ایک شخص کو مقتدا و عالم بننے کی اجازت نہیں تھی اس میں بڑی مصلحت تھی مگر اس میں اتنی کمی تھی کہ انتخاب غلط تھا۔ خاص خاص قوموں کا انتخاب کر رکھا تھا کہ ان ہی کو علم دین پڑھنے کی اجازت تھی البتہ انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ اساتذہ طلبہ کے زمانہ تحصیل میں اس کا اندازہ کیا کریں کہ کس شخص میں حرص دنیا کی غالب ہے۔ اور کس شخص میں نہیں ہے جس میں حرص دنیا کی غالب دیکھیں اس کو رخصت کریں اور مدرسہ سے خارج کریں اور جس میں حبّ دنیا نہ ہو اس کو مقتدائے دین بنائیں۔ بغداد میں ایک مدرسہ نظامیہ تھا کہ جس سے بڑے بڑے علماء جیسے امام غزالی اور شیخ سعدیؒ پڑھ کر نکلے۔ اور وجہ اس مدرسہ کی بناء کی یہ ہوئی تھی کہ اس زمانہ میں قضاء اور افتاء اور دیگر بڑے بڑے عہدے علماء ہی کو دیئے جاتے تھے تو جس کا باپ مثلاً قاضی ہوتا تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا اور

دعویٰ استحقاق تقاضا کا کرتا تھا خواہ وہ اہل ہو یا نہ ہو تو سلطان وقت نے بمشورہ وزراء وارکان دولت اس لئے یہ مدرسہ تیار کیا کہ جو اس مدرسہ میں پاس حاصل کرلے اس کو یہ عہدے دیئے جاویں گے تاکہ نااہلوں کو اور جہلاء کو حوصلہ ایسے عہدوں کی درخواست کا نہ ہو تو جس روز اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی اس روز علماء بخارا میں ماتم ہوا تھا کہ آج کی تاریخ سے علم دین دنیا کے لئے پڑھایا جائے گا۔ لیکن تاہم ایسے بڑے علماء اس میں سے پڑھ کر نکلے کہ فخر علماء ہوئے اور جن کا نظیر اس وقت روئے زمین پر نہیں۔ ایک روز بادشاہ اس مدرسہ کے دیکھنے کے لئے تشریف لائے اور مخفی طور سے طلبہ کے خیالات کی آزمائش کی کہ دیکھیں علم پڑھنے سے ان کی کیا غرض ہے۔ چنانچہ ایک طالب علم سے پوچھا کہ آپ کس لئے پڑھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ میرا باپ قاضی ہے میں اگر عالم بن جاؤنگا تو میں بھی قاضی ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد دوسرے سے پوچھا، اس نے کہا کہ میرا باپ مفتی ہے میں مفتی بننے کے لئے پڑھتا ہوں۔ غرض جس سے پوچھا اس نے کوئی غرض دنیا ہی کی بتلائی۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا کہ افسوس ہے کہ علم دین دنیا کے لئے پڑھا جارہا ہے اور ہزاروں روپیہ مفت میں برباد ہو رہا ہے۔ ایک گوشہ میں امام غزالی بھی خستگی کی حالت میں بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تک یہ طالب علم تھے نہ کوئی جانتا تھا نہ شہرت تھی ان سے دریافت کیا کہ تم کیوں پڑھتے ہو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے دلائل عقلیہ و نقلیہ سے معلوم کیا ہے کہ ہمارا ایک مالک حقیقی ہے جو سموات وارض کا مالک ہے۔ اور مالک کی اطاعت ضروری ہوتی ہے کہ اس کی مرضیات پر عمل کرے اور نامرضیات سے بچے۔ سو میں اس لئے پڑھتا ہوں کہ اس کی مرضیات و نامرضیات کی اطلاع حاصل ہو۔ بادشاہ سن کر خوش ہوئے اور ظاہر کر دیا کہ میں بادشاہ ہوں اور کہا کہ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس مدرسہ کو توڑ دوں مگر تمہاری وجہ سے یہ مدرسہ رہ گیا۔ پس تحصیل علم اس غرض سے ہونی چاہیئے جو امام غزالیؒ نے ظاہر کی اور جس کی غرض تحصیل دنیا اور باعث حب دنیا ہوگا اس کے علم سے کچھ نفع نہ ہوگا اور حب دنیا کا امتحان سلف سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں اساتذہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ طلباء میں کون

ایسا ہے جو امراء کی طرف راغب ہے اور کون نہیں ہے۔ جو امراء کی طرف راغب ہوتا تھا اس کو اپنے حلقہ میں آنے سے روک دیتے تھے کیونکہ امراء کے پاس سوائے دنیا کے کیا ہے جو امراء سے مانوس ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ طالب دنیا ہے۔ چنانچہ امراء کے دربار میں جو علماء ہوتے ہیں وہ ان کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے ہیں خواہ حق ہو یا ناحق ہو ہاں جو عالم حق گو ہو اور مغلوب نہ ہوتا ہو وہ اگر امراء کے یہاں جاوے اور حق بات کہے وہ مجاہدہ ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ کی ملاقات کے لئے سفر کر کے گئے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ بادشاہ کی ملاقات کے واسطے گئے ہیں یہ شخص بہت نادم ہوئے اور پچھتائے کہ بزرگ سن کر آئے تھے یہ تو دنیا دار نکلے اور وہاں سے واپس ہو کر جا رہے تھے اس بادشاہ کے لوگوں نے ان کو جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا اور بادشاہ کے دربار میں حاضر کر دیا۔ وہ بزرگ اس وقت وہاں تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے فرمایا کہ جاسوس نہیں ہے ہمارا مہمان ہے۔ یہ چھوڑ دیئے گئے۔ وہ بزرگ بھی وہاں سے چلے اور اس شخص سے کہا کہ میں اس لئے بادشاہ کے یہاں آیا کرتا ہوں۔ مگر ایسے فیصدی ایک بھی نہیں ہماری اور امراء کی مثال تو چھری اور خربوزہ کی سی ہے۔ خربوزہ کی سلامتی چھری سے الگ ہی رہنے میں ہے خواہ خود ان کے پاس جاؤ یا وہ تمہارے پاس آویں۔ اور تم اُن کے آنے سے متاثر ہو امراء سے ملنا اور ثابت قدم رہنا بڑے قوی آدمی کا کام ہے۔ جس کی شان حضرت ابو الحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کی سی ہو ان کی حکایت ہے کہ ایک بار ایک موقع پر چلے جا رہے تھے چلتے چلتے دجلہ کے کنارے پہنچے دیکھا کہ شراب کے مٹکے کشتیوں سے اُتر رہے ہیں پوچھا کہ ان میں کیا ہے کشتی والے نے کہا کہ شراب ہے خلیفۂ وقت معتضد باللہ کے لئے آئی ہے اور وہ دس مٹکے تھے شیخ کو غصہ آیا اور کشتی والے کی لکڑی مانگ کر انھوں نے نو مٹکے یکے بعد دیگرے توڑ ڈالے اور ایک مٹکا چھوڑ دیا چونکہ یہ شراب خلیفہ کے لئے لائی گئی تھی اس لئے ان کا براہ راست خلیفہ کے ہاں چالان کر دیا گیا معتضد نہایت ہیبت ناک صورت میں بیٹھ کر اجلاس کیا کرتا تھا لوہے کی ٹوپی اوڑھتا تھا اور لوہے کی زرہ اور لوہے کا گرز ہاتھ میں ہوتا تھا اور لوہے کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔

معتضد نے نہایت کڑک کر ہولناک آواز سے پوچھا کہ تم نے یہ کیا کیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے آپ کو بھی معلوم ہے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ مجھ یہاں تک نہ لایا جاتا۔ معتضد یہ جواب سن کر برہم ہوا اور پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی کیا تم محتسب ہو۔ شیخ نے فرمایا کہ ہاں محتسب ہوں خلیفہ نے پوچھا کہ تم کو کس نے محتسب بنایا ہے۔ فرمایا کہ جس نے تجھ کو خلیفہ بنایا ہے۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کوئی دلیل ہے فرمایا کہ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ (قائم کر نماز کو حکم کر نیک باتوں کا اور روک لوگوں کو بری باتوں سے اور اس سے جو تجھ کو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر) معتضد یہ بے باکی کی تقریر سن کر متاثر ہوا اور کہا کہ ہم نے تم کو آج سے محتسب بنایا۔ مگر ایک بات بتاؤ کہ ایک مٹکہ تم نے کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ جب میں نے نو مٹکے توڑ ڈالے تو نفس میں خیال آیا کہ اے ابوالحسن تو نے بڑی ہمت کا کام کیا کہ خلیفۂ وقت سے بھی نہ ڈرا میں نے اسی وقت ہاتھ روک لیا کیونکہ اس سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے توڑے تھے اگر اب توڑ دوں گا تو وہ نفس کے لئے ہوگا اس لئے دسواں مٹکا چھوڑ دیا۔ ایسی ہی حکایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لکھی ہے کہ آپ ایک کافر کے قتل کرنے کے واسطے اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھے اس نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا آپ فوراً اُتر پڑے اور اس کو چھوڑ دیا اس نے پوچھا کہ آپ باوجود اس کے کہ مجھ پر غالب ہوگئے تھے اور میں پوری طرح آپ کے قبضہ میں آگیا تھا، پھر گستاخی بھی سخت کی باوجود ان مقتضیات کے پھر کیا وجہ پیش آئی کہ الگ ہوگئے اور قتل نہیں کیا۔ فرمایا کہ تیرے تھوکنے سے پہلے تو میری نیت اللہ کے واسطے تجھ کو مارنے کی تھی اور جب تو نے تھوکا تو غصّہ آگیا اور نفس نے کہا کہ جلدی اس گستاخ کا کام تمام کردو۔ تو اب نفس کی آمیزش ہوگئی اگر قتل کرتا تو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوتا اس لئے میں نے چھوڑ دیا وہ یہ دیکھ کر مسلمان ہوگیا۔ یہ حکایت خلوص کی مناسبت سے بیان کی گئی اصل قصہ حضرت شیخ ابوالحسن نوری کی حق گوئی کا بیان کیا گیا تھا۔ حاصل یہ کہ اگر علماء امراء کے پاس جاکر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر سکیں تو خیر ان سے ملنے کا ڈر نہیں اور اگر ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑے اور حق گوئی نہ کرسکے تو

اجتناب ہی بہتر ہے۔ حدیث میں ہے اَلْعُلَمَاءُ اُمَنَاءُ الدِّیْنِ مَالَمْ یُخَالِطُوا الْاُمَرَاءَ فَاِذَا خَالَطُوا الْاُمَرَاءَ فَهُمْ لُصُوْصُ الدِّیْنِ یعنی علماء الدین کے امانت دار ہیں جب تک کہ امراء و حکام سے میل جول نہ کریں اور جب امراء و حکام سے میل جول کرنے لگیں تو وہ دین کے رہزن ہیں چنانچہ تھوڑے دنوں کا قصہ ہے کہ ایک عورت کی ایک مرد سے آشنائی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح خاوند سے چھوٹ کر آشنا سے نکاح ہو جاوے۔ ایک ایسے ہی مولوی صاحب نے جو دین کے رہزن تھے اس کو ترکیب سکھائی تو کافر ہو جا نکاح ٹوٹ جاوے گا۔ پھر توبہ کر کے دوسرے سے نکاح کر لینا۔ نعوذ باللہ ایسے ہی ظالموں نے علماء کو بدنام کیا ہے۔ غرض اہلِ علم میں یہ مرض اس رنگ سے ظاہر ہو رہا ہے اور جو اہلِ علم میں اخص الخواص ہیں اُن میں بھی یہی مرض موجود ہے اگرچہ وہ نہ مال کے طالب ہیں اور نہ جاہ ان کو مطلوب ہے مگر ان میں بھی ایک وسیع اتباع ہوئی کا موجود ہے مثلاً کسی کے ساتھ سختی کی اور اس کو برا بھلا کہا تو نفس یہ تاویل کرتا ہے کہ سختی سے اصلاح ہوتی ہے۔ اس لئے تم پر کچھ مواخذہ نہیں۔ تمہاری نیت اس میں اچھی ہے لیکن یہ تاویل اس وقت صحیح ہو سکتی ہے کہ جس وقت سختی کی تھی۔ اس سے پہلے یہ بات ذہن میں ہوتی اور یہی محرک تشدد کا ہوتی اس وقت تو بجز غیظ کے کچھ بھی دل میں نہ تھا۔ اب فرصت میں تاویلیں گڑھتے ہیں اور دھبہ دھونے کے لئے بعض مرتبہ زبان سے بھی کہتے ہیں کہ کیا کہیں بڑی سختی ہو گئی یہ اس لئے کہ معتقدین و متبعین کے دل میں شبہ نہ رہے اور یہ سمجھیں کہ حضرت بڑے متواضع ہیں اور بڑے صاف ہیں خود اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہیں پھر اس پر معتقدین بناتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں ہماری ہی اصلاح کے واسطے آپ کی اس میں کیا غرض ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے غرض ایسے معتقدین اس کے دماغ اور زیادہ خراب کر دیتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکلست اما خار جاں ۔۔۔ از فریب داخلان و خارجاں
اینش گوید نے منم ہمراز تو ۔۔۔ آنش گوید نے منم انبار تو
او چو بیند خلق را سرمست خوش ۔۔۔ از تکبر می رود از دست خویش

(تن قفس کے مثل ہے اسی وجہ سے وہ جان اور روح کے لئے مثل خار کے ہو رہا ہے ایک
اس کو کہہ رہا ہے میں آپ کا ہمراز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال
ہوں وہ شخص بیچارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست و عاشق دیکھتا ہے بس تکبر کی وجہ سے
ہاتھوں سے نکل جاتا ہے)

ایسے لوگوں کو یہی چاہئے کہ کام کرنے سے پہلے غور کر کے دیکھا کریں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں خواہش نفسانی کس قدر ہے اور اتباع شریعت کس قدر. خواہش نفسانی کا حصہ ترک کر دینا چاہیئے۔ ایک مثال اور لیجئے مثلاً ایک امیر آیا اور اس کی تعظیم وتکریم کی گئی اب بعض کا نفس کہتا ہے کہ اس میں دنیوی غرض نہیں ہے بلکہ شرعاً بھی اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ مناسب ہے اگر ایسا نہ کیا جاوے تو اس کی دل شکنی ہوگی اور حدیث میں آیا ہے اِذَا جَاءَكُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ فَاكْرِمُوْهُ (جب تمہارے پاس کسی قوم کا بڑا آئے اسکا اکرام کرو) درحقیقت یہ سب مقدمات فی نفسہا بالکل صحیح ہیں لیکن گفتگو اس میں ہے کہ آیا ہم نے جو اس کی تعظیم کی ہے کیا اسی مصلحت سے کی ہے یا اور کوئی وجہ ہے تو غور کر کے جو دیکھا جاتا ہے تو یہ وجہ ہرگز محرک نہیں ہوتی یہ تو نکتہ بعد الوقوع کے طور پر تصنیفی وجہ ہے اصل وجہ وہی دنیا کی خوشامد یتوقع نفع ہے. غرض یہ کہ نفس میں اکثر کے شرارتیں ہی ہیں مگر بدمعاشوں میں اور طرح کی ہیں اور نیک بختوں میں نیک بختی کے رنگ میں ہیں اور علماء اور طلباء میں اور رنگ سے ہیں اور درویشوں میں دوسرے رنگ سے ہیں اسی واسطے مولانا فرماتے ہیں ۔؎

صد ہزاراں دام ودانہ است اے خدا   ما چو مرغانِ حریصِ بے نوا
دم بہ دم پابستۂ دام تو ایم   ہر یکے گر باز وسیمرغے شویم
میرہانی ہر دمے مارا و باز   سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

(اے خدا لاکھوں دام دانے موجود ہیں اور ہماری حالت مرغانِ حریص کی سی ہے وقتاً فوقتاً ایک نئے دام میں پھنس جاتے ہیں گو ہم باز وسیمرغ ہی کیوں نہ ہو جائیں آپ کی یہ عنایت ہے کہ ہر وقت ہم کو ان داموں سے نکالتے رہتے ہیں مگر ہم پھر دوسرے دام میں چلنے لگتے ہیں)

لیکن یہ ضروری امر ہے کہ جو شخص عمل کرتا ہے اور اخلاص کی سعی میں رہتا ہے اس کو غلطی پر تنبیہ ضرور ہوتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر تنبیہ پر بھی تدارک نہیں کرتے تدارک کرنے سے عار آتی ہے نفس کہتا ہے کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے اور اب تدارک خلاف مصلحت ہے لیکن یاد رکھو کہ اگر اس وقت تدارک کر لیا جاوے اور علی الاعلان غلطی کا اقرار کر لیا جاوے تو آئندہ کو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور تدارک نہ کرنے سے پستی ہوتی جاتی ہے۔ اور توفیق کم ہوتی جاتی ہے یہ تجربہ کی بات ہے ایک دھوکا اور ہو جاتا ہے وہ یہ کہ جب کچھ نشیب و فراز ہو جاتا ہے تو نفس کہتا ہے کہ تمہارے اندر اللہ کے نام سے لطافت پیدا ہو گئی ہے تمہارے وجدان میں جو کچھ آتا ہے وہ صحیح ہی ہوتا ہے۔ تم سے غلطی نہیں ہوتی سو یہ امر فی نفسہ تو صحیح ہے کہ واقعی مومن کے اندر عمل اور تقویٰ کی بدولت فراست صحیح پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ آیا ہے کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ (مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے) میں نے سنا ہے کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص آئے انھوں نے مشورہ کیا کہ مجھے مدینہ جانا ہے کس طرف کو جاؤں۔ فرمایا کہ ینبوع کو جاؤ، دوسرا ایک اور آیا اس نے بھی مشورہ لیا اس کو فرمایا کہ سلطانی راستہ کو جاؤ۔ سو جس کو ینبوع کے راستہ سے جانے کے لئے فرمایا تھا وہ بھی کسی مصلحت سے سلطانی ہی راستہ کو گیا اور حضرت کے مشورہ پر عمل نہ کیا اس کو ویسے بھی بہت تکلیف ہوئی اور بدوؤں سے بھی سابقہ پڑ گیا اور اُن سے الگ تکلیف پہنچی اور جس کو سلطانی راستہ کا مشورہ دیا تھا وہ راحت سے چلا گیا حضرت سے اس کی وجہ دریافت کی گئی کہ آپ نے اس کو اس راستہ کا مشورہ دیا۔ اور اس کو دوسرے راستہ کا اس میں کیا حکمت تھی۔ فرمایا جب پہلا آیا میرے دل میں وہی آیا جو اس کو بتایا اور جب دوسرا آیا میرے دل میں اس وقت یہی آیا جو اس کو مشورہ دیا۔ سو ایسے شخص سے واقعی غلطی کم ہوتی ہے۔ اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں چند آدمی جو سفر کرنے والے تھے ملنے اور رخصت ہونے آئے جب وہ جانے لگے تو انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم کو کچھ وصیت کیجئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاتھی کا گوشت مت کھانا انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم کو تو ہاتھی کے گوشت کھانے کا خطرہ بھی نہیں گذرتا یہ آپ نے کیوں فرمایا۔

فرمایا کہ میرے منہ سے اس وقت ایسا ہی نکلا۔ واللہ اعلم۔ کیا وجہ ہے وہ لوگ رخصت ہوگئے اتفاقاً راستہ بھول گئے اور ایک بیابان میں پہنچ گئے۔ اور بھوک اور پیاس سے بے تاب ہوئے اتفاق سے ایک ہاتھی کا بچہ سامنے سے دکھائی دیا سب نے اتفاق کیا کہ اس کو کاٹ کر کھانا چاہیئے ایک نے اُن میں سے منع کیا کہ تم کو کیا حضرت کی وصیت یاد نہیں ہے انھوں نے کچھ پرواہ نہ کی اور سب نے خوب اس کا گوشت کھایا لیکن اس ایک نے نہیں کھایا۔ اور گوشت کھا کر سو رہے کیونکہ تھکے ماندے ہو رہے تھے مگر جس نے نہیں کھایا تھا اس کو نیند نہیں آئی جاگتا رہا تھوڑی دیر میں ایک جماعت ہاتھیوں کی آئی اور ان میں ایک ہتھنی بھی تھی اس ہتھنی نے اپنے بچہ کو تلاش کرنا شروع کیا تلاش کرتے کرتے وہاں بھی آئی جہاں یہ لوگ سوتے تھے اور ان سونے والوں میں سے ہر ایک کا منہ سونگھا تو اس کو گوشت کی بو آئی اس نے ایک ٹانگ پر پاؤں رکھا اور دوسری سونڈ سے پکڑ کر اس کو چیر ڈالا اسی طرح سب کا کام تمام کر دیا پھر آخر میں اس کے پاس آئی چونکہ اس کے منہ سے بو نہ آئی اس کو سونڈ سے اٹھا کر اپنی کمر پر بٹھا لیا اور ایک جانب کو لے چلی اور ایک میوہ دار درخت کے نیچے لے گئی اور ٹھہر گئی اس نے خوب سیر ہو کر میوے کھائے اس کے بعد اس کو راستہ پر چھوڑ آئی ان حضرات کی یہ شان ہو جاتی ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ تعالیٰ کا کہا ہوا ہے اگرچہ بندے کے منہ سے نکلا ہے)

لیکن گفت گو اس میں ہے کہ تم بھی اُن میں ہو یا محض تمہارے نفس کی تسویل ہی ہے ؎

اے مری کردہ پیادہ با سوار سر نخواہی برد اکنوں ہوش دار

(اے شخص جو پیادہ ہو کر سوار کا مقابلہ کرتا ہے تو اپنا سر سلامت نہ لے جائے گا ذرا سنبھل)

چو نتو یوسف نیستی یعقوب باش ہمچو او با گریہ و آشوب باش

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد روئے نازیبا و ناز عیب باشد چشم نابینا و باز

(جب تم یوسف علیہ السلام یعنی مطلوب نہیں ہو تو یعقوبؑ یعنی طالب ہی رہو اور اس کی طرح گریہ و آشوب یعنی درد و طلب میں رہو۔ ناز کے لئے گلاب جیسا چہرہ چاہیئے۔ جب ایسا چہرہ

نہیں رکھتے تو بد خوئی کے پاس نہ پھٹکو نابینا آنکھ کا کھلا رہنا عیب ہے بد شکل کا ناز کرنا برا معلوم ہوتا ہے)

پس ناقصین کا اپنے کو کاملین پر قیاس کرنا اور اپنی نفسانی خواہش کو ان حضرات کی ذرا سے وجدان پر قیاس کرنا سخت غلطی ہے تم کو چاہیئے کہ اپنے نفس پر ہر وقت بدگمانی رکھو اگر کسی وقت اس میں خواہش کو مفقود بھی پاؤ تب بھی اس کو نفس مردہ ہرگز نہ جانو اس کی مثال اژدھے کی سی ہے۔ کوئی شخص پہاڑ پر چلا گیا دیکھا کہ اژدھا مردہ پڑا ہے اور وہ جاڑے کی وجہ سے ٹھٹھر رہا تھا۔ مردہ نہیں تھا۔ اس نے اس کو پکڑ لیا اور شہر میں لایا اور سر مجمع اس کو لیکر بیٹھا تھوڑی دیر میں جو آفتاب نکلا اور اس کو گرمی پہنچی اور افسردگی اس کی جاتی رہی تو اس نے حرکت شروع کی اور لوگوں نے بھاگنا شروع کیا اور سینکڑوں اوپر تلے گر گر کر ہلاک ہو گئے۔ یہی حال نفس کا ہے اس کے پاس سامان نہیں ہے اس لئے یہ پژمردہ ہے سامان ہونے پر یہ دیکھنے کے قابل ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

نفس اژدر ہاست او کے مردہ است از غم بے آلتے افسردہ است

(نفس اژدھا ہے۔ وہ نہیں مرا، غم بے التی سے افسردہ ہو رہا ہے)

ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ دو چار روز ذکر و شغل کیا تہجد پڑھنے لگے سمجھنے لگے کہ ہم ولی کامل ہو گئے اور نفس پر اعتماد ہو جاتا ہے حالانکہ نفس خواہ کیسا ہی ہو جائے مگر اس سے بدگمان ہی رہنا چاہیئے جو خیال آوے اور جو عمل کرو پہلے سوچ لو اور غور کر لو کہ اس میں کوئی آمیزش نفس کی تو نہیں ہے بعض اوقات خلوص کے رنگ میں نفس اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو ذکر جہر تعلیم فرمایا، اس نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو خفی کی اجازت دیدیجئے کیونکہ جہر میں ریا ہو جاتی ہے۔ حضرت نے فرمایا سبحان اللہ اس میں تو ریا ہو گی اور ذکر خفی میں ریا نہ ہو گی جب آنکھیں بند کر کے بیٹھو گے اور لوگ سمجھیں گے کہ خدا جانے حضرت کہاں کی سیر میں ہیں عرش کی یا کرسی کی اور ذکر جہر میں تو بجز اس کے کوئی بھی کچھ نہ سمجھے گا۔ کہ اللہ اللہ کر رہا ہے۔ سو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے سو ایک وسوسۂ نفس تو اس میں یہ ہوا کہ چھوٹی ریا کو چھوڑ کر بڑی ریا تجویز کی اور دوسری شرارت نفس کی ذکر جہر نہ کرنے میں بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ نفس یہ سمجھتا ہے کہ اگر ذکر جہر شروع کیا تو اگر کسی روز آنکھ نہ کھلی تو بھانڈا پھوٹے گا اور فضیحتہ ہو گا، دوسروں کو معلوم ہو جائے گا کہ میاں رات نہیں اُٹھے اور خفی میں کسی کو راز کی خبر ہی نہ ہو گی سب

سمجھیں گے کہ خفی کیا کرتے ہیں آج بھی کیا ہوگا تو اس سے رسوائی سے بچے رہیں گے ایک بزرگ کا قول ہے کہ نفس بھی مولوی ہے یعنی بڑے دور کے احتمالات نکالتا ہے ہاں اگر مطمئن ہو جاوے اور اس کی خواہش محض خیر ہی خیر ہو تو سبحان اللہ لیکن اعتماد کسی حالت میں نہ کرنا چاہیئے۔ اکثر اس کی تجویز میں کچھ نہ کچھ مکر ضرور ہوتا ہے۔ ایک بزرگ ایک حجرہ میں عزلت نشین تھے اور ذکر اللہ کیا کرتے تھے اتفاقاً کفار و مسلمین میں مقابلہ پیش ہوا۔ ان بزرگ کے نفس میں خیال آیا کہ چلو جہاد کریں اور شہید ہوں گے پھر سوچا کہ یہ کیا بات ہے نفس نے یہ کیوں تجویز کیا فرور اس میں کوئی کید خفی ہے بہت سوچنے سے معلوم ہوا کہ نفس نے اس میں اپنے لئے نجات سمجھ کر یہ بات تجویز کی تھی اور سوچا تھا کہ یہ شخص رات دن مجھ کو ستاتا ہے اور میرے سر پر ناگوار امور کے ہر وقت آرے چلاتا رہتا ہے اور طاعات میں ہر وقت مجھ کو گھوٹتا ہے۔ اور کسی وقت چین لینے نہیں دیتا شہید ہونے میں ایک دفعہ پاپ کٹ جاوے گا اور اس مصیبت سے نجات ہو جاوے گی جب یہ مکر معلوم ہوا تو انھوں نے نفس کو جواب دیا کہ میں تجھ کو اس مصیبت سے کبھی نجات نہ دونگا۔ میں تو تجھ کو یہاں حجرہ میں ہی شہید کروں گا۔ بعض لوگوں پر حج فرض نہیں ہوتا اور ان کو حج کی ہوس ہوتی ہے اس میں بھی نفس و شیطان کی یہ تسویل ہوتی ہے کہ ایک نفل کی تحصیل میں بہت سے فرائض برباد ہوتے ہیں کیونکہ بہت لوگ حج کے سفر میں نمازیں چھوڑ بیٹھتے ہیں اور رفقا سے جنگ و جدال اور سب و شتم میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعضے اس لئے حج کرتے ہیں کہ حاجی صاحب بن جائیں گے لوگ تعظیم سے پیش آئیں گے ایسے ہی لوگوں کے لئے حضرت مسعود فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید ‌ ‌ معشوق درا ینجاست بیائید بیائید

یعنی اے قوم حج میں گئی ہوئی تم کہاں ہو تم کہاں معشوق تو یہاں ہے یہاں آؤ یہاں آؤ یعنی محبوب حقیقی کی رضا تو حالات خاصہ میں وطن رہنے میں ہے اس لئے کہ حج تم پر فرض نہیں ہے اور حج نفل ادا کرنے میں بہت سے واجبات و فرائض ترک ہوتے ہیں غرض شیطان ہر شخص کو اس کے مذاق کے موافق دھوکا دیتا ہے۔ تھوڑے روز ہوئے کہ ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے ان کے نفس نے یہ تجویز کیا تھا کہ نوکری چھوڑ کر اللہ کے واسطے

پڑھائیں اس لئے کہ تنخواہ لینے سے خلوص نہیں رہتا میں نے ان سے کہا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ شیطان نے دیکھا کہ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں ان سے یہ کام کسی تدبیر سے چھوڑانا چاہیئے تو اگر یہ کہتا کہ پڑھانا چھوڑ دو تو اس کی ہرگز نہ چلتی اس لئے اس کی وہ صورت تجویز کی جو دینداری کے رنگ میں ہے کہ اس میں خلوص نہیں ہے۔ نوکری چھوڑ کر پڑھاؤ تو سمجھ لو کہ اب تو پابندی تنخواہ سے بھی کام ہو رہا ہے اور اگر نوکری چھوڑ دو گے تو پابندی تو ہوگی نہیں رفتہ رفتہ پڑھانا ہی چھوٹ جائے گا اور شیطان کامیاب ہوگا۔ اور یہ جو تم کو وسوسہ ہے کہ ہم نے معاوضہ لے لیا ہے خلوص نہیں رہا تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم کو اب مثلاً ملتے[۲۵] ملتے ہیں سو بتلاؤ کہ اگر تم کو ۳۰ یا ۴۰ دیں تو تم اس صورت موجودہ کو چھوڑ کر وہاں چلے جاؤ گے یا نہیں کہنے لگے کہ میں تو ہرگز نہ جاؤں گا میں نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا کہ تم روپیہ کے لئے نہیں پڑھاتے بلکہ اللہ کے واسطے پڑھاتے ہو اور روپیہ گذران کے لئے لیتے ہو دنیا تم کو مقصود نہیں پس خلوص نہ ہونے کا وسوسہ غلط ثابت ہوا اس لئے نوکری ہرگز مت چھوڑو بلکہ میری رائے تو یہ ہے اگر عالم امیر ہو اور تنخواہ ملنے لگے تب بھی اس کو چاہیئے کہ تنخواہ لے کر پڑھائے اگر ایسا ہی امارت کا جوش اٹھے وہ تنخواہ پھر مدرسہ میں دیدے مگر لے لے ضرور تاکہ پابندی سے کام ہوتا رہے ہمارے فقہاء رحمہم اللہ خیرا نے لکھا ہے کہ اگر قاضی امیر کبیر ہو تو اس کو بھی تنخواہ لینا چاہیئے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی قاضی تنخواہ نہ لے اور دس برس تک وہ قاضی رہا اور اس کے بعد کوئی غریب قاضی ہو کر آیا تو اب تنخواہ کا اجراء مشکل ہوگا سبحان اللہ فقہاء کا کیا فہم ہے یہ حضرات حقائق شناس تھے اس شان کا علم و فہم یہ اخلاص و تقویٰ کی برکت تھی مولانا فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علم انبیاء بے کتاب و بے معین و اوستا

(انبیاء جیسے علوم بلا کتاب و استاد اور معاون کے اپنے قلوب پر قابض پاؤ گے)

علم چوں بر دل زنی یارے بود علم چوں بر تن زنے یارے بود

(علم جب قلب پر اثر کرے کہ خشیت اور خلوص پیدا ہو جائے تو وہ وصول الی اللہ میں معین ہوگا اور اگر

تن پر اثر ہو یعنی زبان پر تقریر ہی ہو یا اس کو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو تیرا بوجھ اور وبال ہے۔
ان حضرات کے خلوص کی یہ کیفیت تھی کہ صاحب ہدایہ کی تصنیف تمام نہیں ہوئی روزہ برابر رکھتے تھے اور طرفہ یہ کہ کسی کو روزہ رکھنے کی خبر نہیں ہوئی خدا جانے کتنے سال میں ھدایہ لکھا ہوگا برابر روزہ رکھنا اور کسی کو خبر نہ ہونا کس قدر اخلاص کی بات ہے مردانہ مکان میں بیٹھ کر لکھتے تھے لونڈی مکان سے کھانا لاتی تھی اور رکھ کر چلی جاتی جب کوئی مسافر ناآشنا سامنے سے گذرتا اس کو وہ کھانا دیدیتے لیکن چونکہ اپنے مخصوصین سے پردہ نہیں ہوتا اس لئے تحدث بالنعمۃ کے طور پر کبھی خاص سے یہ سب قصہ ذکر فرمایا ہوگا اس لئے ہم تک منقول ہوا اس خلوص کی برکت سے جن کو نور فہم عطا ہوا ہے یہ ان کی تحقیق ہے کہ تنخواہ لینے میں مصلحتیں ہیں پس نفس بعض اوقات ان مصلحتوں کے برباد کرنے کے لئے یہ رائے دیتا ہے کہ تنخواہ مت لو غرض شیطان اور نفس ہر شخص کو اسی کے مذاق کے موافق بہکاتا ہے اور فقیہہ اور محقق اس لئے شیطان پر گراں ہے کہ وہ اس کے ان مکائد سے واقف ہوتا ہے اور ان کو مطلع کرتا ہے حدیث میں ہے فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ یعنی ایک فقیہہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے ذاکر شاکر لوگوں کو اس طرح اتباع ہوی میں گرفتار کرتا ہے کہ ان کو ذوق شوق وجد و کیفیت و محویت کا طالب بناتا ہے خوب یاد رکھو مقصود ذکر سے قرب ہے اور جس عمل میں مجاہدہ زیادہ ہوگا اس میں زیادہ قرب ہوگا نفس نے اپنی جان بچانے کے لئے یہ حیلہ نکالا ہے کہ ذوق شوق کی تحصیل میں پڑ گیا کیونکہ ذوق شوق ہونے سے پھر طاعت میں مشقت نہیں ہوتی ہاں ذوق شوق کا بھی ایک وقت ہے اس وقت مربی حقیقی خود عطا فرمادیں گے لیکن ابھی وقت نہیں آیا تو اس کی فکر فضول ہے کیونکہ تمہاری تجویز سے مربی حقیقی کی تجویز بہتر ہے مثلاً ایک مریض ہے اس کے لئے حکیم صاحب نے خمیرہ گاؤزبان جواہر والا چاندی سونے کے ورق میں لپیٹ کر تجویز کیا اور ایک دوسرے مریض کے لئے املتاس لکھا اگر یہ دوسرا مریض کہنے لگے کہ حکیم صاحب بھی عجیب شخص ہیں اس کے واسطے مزیدار مفرح دوا تجویز کی اور میرے واسطے ایسی بدمزہ تو یہ احمق ہے یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے اندر سے تو مادہ فاسد نکل چکا ہے اور املتاس کے

پیالے پی چکا ہے اب اس کے لیے یہی مناسب ہے اور میرے اندر ہنوز مادہ فاسدہ موجود ہے وہ بغیر ایسی بدمزہ دواؤں کے نہ نکلے گا اس لئے یہی مناسب ہے اس طرح مبتدی منتہی کی جو کہ اپنی اصلاح کر چکا ہے حرص کرے اور اپنے کو اس پر قیاس کرے تو اس کی حماقت ہے عاشق کی تو یہ شان ہونا چاہیے کہ ہر حال میں راضی رہے جیسا فرمایا گیا ہے

خوشا وقت شوریدگان غمش اگر ریش بینند و گر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس کا مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)

دمادم شراب الم درکشند دگر تلخ بینند دم درکشند

(ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں)

حضرت سرمد فرماتے ہیں

سرمد گلہ اختصار می باید کرد یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار مے باید کرد

(سرمد شکایت کو مختصر کرو اور دو کاموں میں سے ایک کام کر دیا تو تن کو محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کر دو یا محبوب سے قطع نظر کرو)

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضہ میں دے دینا اور حیران رہنا)

سوئے زلفش نظر کردن و رویش دیدن گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(محبوب کی زلف یعنی تجلی کی طرف نظر کرنا کبھی فانی ہونا کبھی باقی ہونا)

اس شعر میں اسلام سے مراد بسط ہے اور کفران سے مراد قبض ہے یعنی قبض و بسط دونوں

کو جیسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون محبوب ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تین سال کامل قبض کی کیفیت رہا بارہا ارادہ فرمایا کہ پہاڑ سے نیچے گرادیں کیونکہ ؎

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

(بے دوست کے جینے کا کچھ مزہ نہیں بے دوست کے زندگانی بالکل بے مزہ ہے)

لیکن سنبھال لئے جاتے تھے پس اگر قبض علامت بعد ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں ہوتا جب علامت بعد نہیں پھر اس پر کاہے کو پریشان ہوا امام غزالی رح جب مدرسہ نظامیہ سے فارغ ہوکر نکلے ہیں تو بہت بڑے عالم ہوئے تین سو علماء ان کے ساتھ چلتے تھے ایک مدت تک اسی حالت میں رہے اس کے بعد خدا طلبی کا جوش ہوا اور دل میں آیا کہ سب چھوڑ کر خلوت اختیار کریں ایک مدت امروز فردا میں رہے آخر ایک بار سب ترک کر کے صحرا رقدس میں جا کے معتکف ہوگئے اور مدّت تک سخت مجاہدہ وریاضت کی اور دس برس تک ان پر قبض واقع رہا اور بجز پوست اور استخواں کے کچھ باقی نہ رہا قریب المرگ ہوگئے بعض آس پاس کے رہنے والے ان کی حالت دیکھ کر کسی نصرانی ڈاکٹر کو لائے اور ان کی نبض دکھائی اس نے نبض دیکھ کر کہا کہ ان کو محبت کا مرض ہے اور محبت بھی مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی ہے جب تک ان کو وصل میسر نہ ہوگا شفا نہ ہوگی ؎

قَدْ لَسَعَتْ حَيَّةُ الْهَوٰى كَبِدِىْ فَلَا طَبِيْبٌ لَّهَا وَلَا رَاقِىْ
اِلَّا الْحَبِيْبُ الَّذِىْ شَغَفْتُ بِهٖ فَعِنْدَهٗ رُقْيَتِىْ وَتِرْيَاقِىْ

(میرے جگر کو عشق کے سانپ نے کاٹ لیا ہے نہ اس کے لئے کوئی طبیب ہے نہ جھاڑ پھونکنے والا بجز اس محبوب کے جس کی محبت نے میرے دل میں جگہ کرلی ہے اسی کے پاس میری جھاڑ پھونک اور میرے لئے تریاق ہے)

امام غزالی چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے غرض مدتوں کے مجاہدہ وریاضت کے بعد کامل ہوئے اور پھر بغداد میں آئے تو اور ہی شان سے آئے کہ علماء وطلبہ وصوفیہ سب کے امراض روحانی بیان فرماتے تھے اس پر بعض علماء دشمن ہوگئے اور کفر کا فتویٰ ان پر لگایا گیا احیاء العلوم جلائی گئی الحمدللہ یہ سنت امام غزالی کی ہم کو بھی نصیب ہوئی کہ مجھ پر کفر کا فتویٰ بھی دیا گیا اور میری کتاب

بہشتی زیور جلائی گئی حاصل یہ کہ کسی کے لئے ذوق شوق مصلحت ہے کسی کے لئے گھلنا اور پگھلنا ہی حکمت ہے اس لئے ان خیالات کو چھوڑ کر کام میں لگنا چاہیئے غرض کہ مختلف طبقوں میں مختلف اقسام کی ہوا پائی جاتی ہے اور کلیات ان سب قسموں کی تین ہیں ایک ہویٰ متعلق علوم سے دوسرے متعلق اعمال کے تیسرے متعلق امور تکوینیہ کے علوم کے متعلق جو ہوئی ہے اس کا نام بدعت ہے جس کی حقیقت غیر دین کو دین سمجھنا ہے اور بدعات بہت سی ہیں لیکن شب برات جو عنقریب آنے والی ہے اس کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے شب برات میں دو قسم کی بدعتیں ہیں ایک علمی دوسری عملی علمی یہ ہے کہ حلوہ پکانے کو ضروری یا مثل ضروری کے جانتے ہیں اور اس کے متعلق مختلف روایتیں گڑھی ہیں بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہوا تھا اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حلوا کھایا تھا بعض کہتے ہیں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب شہید ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلوے پر ان کی فاتحہ دلائی تھی حالانکہ یہ دونوں واقعے غزوہ احد کے ہیں اور وہ شوال میں ہوا ہے اور شب برات شعبان میں ہوتی ہے تو یہ عقل کے بھی خلاف ہوا اور نقلاً بالکل بے اصل ہی ہے بعضے کہتے ہیں کہ شب برات میں روحیں آتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ روحوں کو آنا یا تو مشاہدہ سے ثابت ہوگا اور یا وحی سے تو مشاہدہ تو ظاہر ہے کہ نہیں رہ گئی وحی سو اُس سے بھی کہیں ثابت نہیں بلکہ وحی تو اس پر دال ہے کہ روحیں یہاں نہیں آتیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمِنْ وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ حاصل یہ کہ روح اور اس عالم کے درمیان قیامت تک کے لئے ایک پردہ ہے جو اس کو اس طرف نہیں آنے دیتا ہاں اگر خرق عادت کے طور پر بعض کو اجازت ہو جاوے تو وہ دوسری بات ہے۔ جیسے شہداء کو تو یہ آنا بطور کرامت کے ہوگا لیکن کرامت دائمی اور اختیاری نہیں ہوتی اور وہ جو اختیاری ہوتا ہے اس کا نام تصرف ہے کیونکہ کرامت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی ولی کا کسی طور سے بذریعہ کسی خارق کے اعزاز اظاہر فرمادیں اسی لئے بعض مرتبہ صاحب کرامت کو بھی کرامت کی خبر تک نہیں ہوتی ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی نے بادشاہ کو ان کے متعلق کچھ کہدیا بادشاہ نے ان کو طلب کر کے اپنے سامنے بلایا اور جو سوال اُن سے

بادشاہ کرتا تھا براہ جرات وہی سوال وہ بزرگ کرتے تھے حتیٰ کہ آخر میں بادشاہ نے کہا کوئی ہے ان بزرگ نے بھی فرمایا کہ کوئی ہے اسی وقت ایک شیر غراتا ہوا ایک گوشہ سے نمودار ہوا بادشاہ اور سب لوگ بھاگے سب کے ساتھ یہ بھی بھاگے۔ جیسے جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ عصا کو ڈالدو اور ڈالنے سے اژدہا ہو گیا تو موسیٰؑ خود ڈر گئے اگر اختیاری فعل ہوتا تو خوف نہ کرتے غرض کہ کرامت اختیاری اور دائمی نہیں ہوا کرتی اور تصرفات اختیاری روح کے لئے کسی دلیل سے ثابت نہیں اور بلا دلیل اعتقاد جائز نہیں کہ خلاف ہے۔ قال اللہ تعالےٰ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عملدرآمد مت کر) بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی اس رات میں ایصال ثواب نہ کرے تو روحیں کوستی ہوئی جاتی ہیں۔ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ مردہ کو ایصال ثواب کرنا یہ نفل ہے اور نفل کے چھوڑنے پر ملامت کرنا یا بددعا کرنا گناہ ہے اس عقیدہ سے تو لازم آتا ہے کہ مردہ بھی گناہ کرتا ہے حالانکہ مرنے کے بعد انسان گناہ نہیں کرسکتا کیونکہ اس وقت تو کشف عطا ہو جاتا ہے غرض یہ سب امور بے اصل ہیں۔ شب برات میں صرف تین امر حدیث سے ثابت ہیں اول یہ کہ اس شب میں قبرستان میں جاکر اموات کیلئے دعا کریں اور ان کو پڑھ کر بخشیں لیکن گروہ بن کر جانا چاہیئے بلکہ کیفما اتفق اپنے اپنے طور پر جا دے اور سنت میں اسی قدر منقول ہے مگر چونکہ اس کی غرض ایصال ثواب تھا مردہ کیلئے اس پر دوسرے طریق کو قیاس کرسکتے ہیں کہ عبادت مالیہ کا بھی کچھ ثواب پہنچا دیں پس اگر کچھ کھانا وغیرہ بلا قید حلوے وغیرہ کے پکا کر ایصال ثواب کریں تو مضائقہ نہیں دوسرے یہ کہ پندرھویں شب کو عبادت کریں تیسرے یہ کہ پندرہ تاریخ کو روزہ رکھیں پس یہ سب امور مستحب ہیں باقی سب خرافات ہیں جس وقت میں یہ رسوم ایجاد ہوئی ہوں گی ممکن ہے کہ اس وقت کوئی مصلحت ہو لیکن اب چونکہ ان کو ضروری سمجھنے لگے ہیں اس لئے اگر کوئی مصلحت بھی ہوتی تب بھی بوجہ مفسدہ کے اس مصلحت کا اعتبار نہ کیا جاتا جیسا فقہی قاعدہ ہے کہ امور غیر مقصودہ شرعاً میں دفع مفسدہ کے لئے مصلحت کو ترک کر دیتے ہیں اس لئے اب وہ واجب الترک ہیں اور اگر وہ بزرگ جو اس کے موجد ہیں اب زندہ ہوتے تو یقیناً ان

رسوم کو وہ خود بھی منع کرتے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے بعض عادات کو جو کسی مصلحت سے تھی اور ضروریات دین سے نہیں تھیں منع کر دیا تھا جیسا عورتوں کا جماعات و مساجد میں آنا سو اگر ہم بھی پہلے بزرگوں کی ان رسوم کو روک دیں تو کیا حرج ہے علماء کا یہی کام ہے کہ زمانہ کے رنگ اور ہوا کو دیکھتے ہیں زمانہ کے بدلنے سے اس قسم کے احکام نہ کہ تمام احکام ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں بقراط مطب کے نسخے اگر کوئی طبیب آجکل برتے تو ہرگز نفع نہ ہوگا بلکہ ضرر ہونے کا احتمال ہے حاذق طبیب نسخہ وہ تجویز کرتا ہے کہ مریض کے مزاج اور اس وقت کی آب و ہوا کی موافق ہو البتہ قواعد وہی ہیں جو متقدمین نے مدون کئے ہیں۔ حاصل یہ کہ حلوی اور آتشبازی وغیرہ سب خرافات ہے اس کے علاوہ ایک اور التزام کر رکھا ہے کہ اس روز مسور کی دال بھی ضرور پکتی ہے معلوم نہیں حلوے اور مسور کی دال کا کیا جوڑ ہے ایک مناسبت تو دونوں میں معلوم ہوتی ہے کہ حلوے اور مسور کی دال کے لئے دو ضرب المثل ہم معنی بولے جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے حلوا خوردن را روئے باید (حلوا کھانے کے لئے منہ چاہیئے) اور یہ بھی ہماری زبان میں بولتے ہیں یہ منہ اور مسور کی دال اس کے سوا اور کوئی مناسبت تو سمجھ میں آتی نہیں۔ ایک اعتقاد بعض لوگوں کا شب برات کے متعلق یہ ہے کہ جو مردہ اس سال میں مرتا ہے وہ مردوں میں شامل نہیں ہوتا جب تک اس کو شب برات سے ایک روز پہلے حلوا دے کر مردوں میں شامل نہ کیا جاوے اس کا نام عرفہ رکھا ہے ان تمام اعتقادات کے موجد یہ مسجد کے ملا ہیں انھوں نے ایسی ایسی ایجاد کی ہیں جس میں آمدنی ہو ان ملانوں کی حرص اس قدر ہوتی ہے کہ ان کو جائز ناجائز کی بھی کچھ تمیز نہیں ہوتی ان کی بدنیتی اور حرص پر حکایت یاد آئی ایک بھانڈ نے دوسرے سے پوچھا سب سے بہتر فرقہ کون ہے اور سب سے بدتر کون ہے تو اس نے جواب دیا کہ سب سے بہتر فرقہ تو ہمارا ہے کہ ہمیشہ خوشی ہی مناتے ہیں کہ خدا کرے کسی کے یہاں شادی ہو اور ہماری پوچھ ہو اور سب سے بدتر فرقہ مسجد کے ملانوں کا ہے کہ ہمیشہ غمی مناتے ہیں کہ کوئی مرے تو ہم کو ملے، واقعی اس فرقہ کی یہی حالت

ف لطیفہ میرے ایک دوست نے اس مثل کی ایک عجیب اصل بیان کی کہ یہ اصل میں اسی طرح ہے یہ منہ اور منصور کی دار یعنی انا الحق کا ہر ایک کا منہ نہیں واللہ اعلم ۱۲ منہ

ہے اگر کوئی موٹا سا آدمی بیمار ہوتا ہے اور ان ملانوں سے کہا جاوے کہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحت دے تو ہرگز دل سے دعا نہ کریں گے بلکہ دل سے یہ چاہیں گے کہ یہ مرے تو اچھا ہے تاکہ ہماری مونچھیں تر ہوں۔ یہ شب برات کا حلوہ اور محرم کا کھچڑا سب ان ہی اکالین کی ایجاد معلوم ہوتا ہے اسی لئے ایصال ثواب میں ایسی پخیں لگائی ہیں کہ بغیر ان کے کوئی کچھ کسی کو دے ہی نہ سکے مثلاً کھانا یا پانی سامنے رکھ کر پنج آیت وغیرہ پڑھنا کہ عوام تو خود پڑھنا نہیں جانتے لامحالہ ان ہی کو بلاویں گے اور جب بلاویں گے تو حصہ بھی ضرور ملے گا اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جہاں بدعات سے منع کرنے میں لوگوں میں لوگوں کو وحشت ہو تو یوں کہنا چاہیئے کہ تم سب کچھ کرو مگر ان ملانوں کو کچھ مت دو اللہ کے واسطے فاتحہ دلوایا کرو پھر دیکھ لینا یہی لوگ بدعات کو منع کرنے لگیں گے کیونکہ ملنا ملانا تو کچھ رہے گا نہیں اور فاتحہ کے لئے جگہ جگہ سے گھسیٹے جاویں گے بدعات خود چھوٹ جاویں گی دوسری قسم ہوا کے متعلق اعمال کی ہے یعنی کوئی عمل کسی غرض فاسد مثلاً جاہ مال وغیرہ کے لئے کیا جاوے جیسا کہ اوپر مفصل اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے تیسری قسم ہوی کے متعلق احکام تکوینیہ کی ہے احکام کی دو قسمیں ہیں ایک احکام تکلیفیہ تشریعیہ جیسے روزہ نماز زکوٰۃ وغیرہا دوسری قسم تکوینیہ احکام تکوینیہ وہ ہیں جو قضا و قدر کے متعلق ہیں مثلاً بارش ہونا یا نہ ہونا مفلس ہونا یا غنی ہونا وغیرہ وغیرہ اس کے متعلق جو ہوی ہے اس کا نام رائے ہونا مناسب ہے گو لفظ رائے عام ہے مگر بہ نسبت بدعت وغیرہ کے یہ لفظ اس کے زیادہ مناسب ہے غرض یہ کہ ان احکام میں بھی لوگ اپنی خواہش نفسانی کے موافق رائے لگاتے ہیں مثلاً آج کل بارش نہیں ہوئی ادب کی بات تو یہ ہے کہ دعا کریں گناہوں سے استغفار کریں یہ تو ہوتا نہیں بلکہ رائے لگایا کرتے ہیں کہ صاحب اگر ساون اُتر گیا تو بس کھیتی گئی ان سے کوئی پوچھے یہ مشورہ کس کو سناتے ہو ہم کو سنانا تو بیکار ہے کوئی نفع نہیں اس لئے کہ ہمارے قبضہ کی تو بات نہیں اور خدا تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہیں ان کو ہر امر کی اطلاع ہے ان کو بھی سنانا مقصود نہیں تو بس یہ محض اعتراض ہوا اور خدائے تعالیٰ کو رائے دی کہ بارش ہونا چاہیئے اللہ اکبر کیسی سخت بے ادبی اور گستاخی ہے حق تعالیٰ کی حاکمیت اور حکومت کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر ان کا اذن نہ ہوتا ان کے سامنے

درخواست کے طور پر زبان ہلانا بھی روا نہ ہوتا اور دعا نہ کرنے کی بھی اجازت نہ ہوتی چہ جائیکہ اعتراض کرنا اور رائے مشورہ دینا ان کی تو یہ شان ہے ؎

ہست سلطانی مسلم مرد را نیست کس را زہرہ چون وچرا

(بادشاہی اسی کی مسلم ہے کسی شخص کو چون چرا کی طاقت نہیں ہے)

خود فرماتے ہیں قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا یعنی آپ فرمادیجئے کہ کون اختیار رکھتا ہے خدائے تعالیٰ کے سامنے کچھ بھی اگر وہ مسیح بن مریم اور ان کی والدہ اور تمام دنیا بھر والوں کو ہلاک کرنا چاہیں اور آسمانوں اور زمین کی اور ان کی درمیانی چیزوں کی سلطنت خدا ہی کے لئے ہے اور بعضے ایسے بیباک ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جوان مرجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کی عمر تو مرنے کی نہ تھی کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو اچھا تھا۔ دوسرے صاحب آتے ہیں وہ کہتے ہیں ارے میاں خدا کے سامنے کس کی مجال ہے کہ کچھ بولے یہ بات فی نفسہ تو سچی ہے مگر مطلب ان جہلا کا تو اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا مرنا ہے تو بے موقع لیکن نعوذ باللہ اگر خدائے تعالیٰ بے موقع کام ہی کرے تو اس کے سامنے کون دم مار سکتا ہے گویا نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے یہاں بڑی بے انتظامی ہے مصلحت پر نظر نہیں ہے اس کے مرنے کے دن نہ تھے اس کو موت دیدی۔ یاد رکھو کہ یہ نہایت ہی بے ادبی اور گستاخی ہے حق تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں وہی مصلحت اور حکمت ہے ع ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ بادشاہ حقیقی کرتے ہیں وہی بہتر ہے) ایک بزرگ ایک جنگل میں خلوت گزیں تھے ایک روز بارش ہوئی وہ کہنے لگے کہ سبحان اللہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی غیب سے آواز آئی او بے ادب اور بے موقع کس روز ہوئی تھی دیکھئے بزرگوں کو ایسی مدح پر بھی جس میں ابہام بعید گستاخی اور بے ادبی کا ہو ڈانٹا جاتا ہے مقربان را بیش بود حیرانی (مقربین کو حیرانی بہت ہوتی ہے) مگر ہم لوگ تو شب و روز کھلم کھلا بے ادبیاں ہی کر رہے ہیں غرض حکومت اور حکمت کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم کو دعا کی بھی اجازت نہ ہوتی مگر ہمارے ضعف کو دیکھ کر دعا کی اجازت دی یہ غایت رحمت ہے اور پھر اس اجازت اس کی طور سے تکمیل فرمائی کہ ہم کو مغیبات کی خبر نہیں کی ورنہ اگر خبر ہو جاتی تو ہرگز دعا نہ کر سکتے کہ ایک گونہ صورت مزاحمت کی تھی قدر کے ساتھ مثلاً اگر مکشوف ہو جاتا کہ

بارش فلاں دن تک نہ ہوگی اور بعد میں ہوگی تو دعا کیسے کرتے اور جب دعا نہ کرتے تو حق تعالیٰ کی ایک خاص ہمکلامی کی لذت سے محروم رہتے اس سے معلوم ہوا کہ احکام تکوینیہ کا منکشف نہ ہونا بھی رحمت ہے البتہ احکام تکلیفیہ میں منکشف ہونا اور معلوم ہونا ہی رحمت ہے حاصل یہ کہ بڑی رحمت ہے کہ ہم کو دعا کی اجازت مل گئی حکام مجازی سے بات کرنے میں لوگ سینکڑوں روپیہ خرچ کر ڈالتے ہیں اور محبوبان مجازی سے دو باتیں کرنے کے لئے سب کچھ دے بیٹھتے ہیں اور پھر بھی کامیاب نہیں ہوتے اور احکم الحاکمین اور محبوب حقیقی کے یہاں نہ فیس ہے نہ کسی زبان کی قید ہے نہ وقت کی قید ہے۔ نزدیک دور، اندھیرے اجالے جس وقت چاہو ہمکلام ہوا ور دعا کرو اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی پھر حکام مجازی اور محبوبان مجاز زیادہ بولنے سے ناخوش ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں کیوں جان کھائی اور حاکم حقیقی درخواست اور دعا نہ کرنے سے ناخوش ہوتے ہیں اور جو زیادہ دعا کرے اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ المُلِحِّیْنَ فِی الدُّعَاءِ یعنی بیشک اللہ تعالیٰ دعا میں اصرار کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ پس دعا بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی میسر ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

از دعا نبود مراد عاشقاں | جز سخن گفتن باں شیریں زباں

(عاشقوں کی دعا سے مراد محبوب حقیقی کی ہمکلامی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی)

حاصل یہ کہ اتباع ہویٰ کی تین قسمیں ہوئیں بدعت جو متعلق علوم اور عقائد کے ہے دوسری معصیت جو متعلق اعمال کے ہے تیسری قسم رائے جو احکام تکوینیہ کے متعلق ہے اور ہر ہوا میں یہ خاصیت ہے کہ راہ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے لقولہٖ تعالیٰ فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (سو اللہ کے راستے سے بچھ کو گمراہ کردیتی ہے) جو ہوا اعلیٰ درجہ ہے یعنی کفر و شرک وہ تو اسلام ہی سے خارج کردیتی ہے اور جو ادنیٰ درجہ کی وہ کمال اتباع سے ڈگمگا دیتی ہے تو یُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اللہ کے راستہ سے تم کو گمراہ کردیتی ہے) دونوں کو شامل ہے کیونکہ ضلال کے مراتب مختلف ہیں مولانا فرماتے ہیں

؎ با ہوا و آرزو کم باش دوست | چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست
تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست | چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست
تازہ کن ایماں نہ از گفت زباں | اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

(یعنی آرزو اور ہوائے نفسانی کے پیر ۔ چونکہ اس کی یہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے بہکا دیتی ہے جب تک خواہش نفسانی کے تابع ہے تیرا ایمان تازہ نہیں ہے مانند ہوا کے سوائے قفل کے اس کا دروازہ نہیں ہے ایمان کو صدق دل سے تازہ کرو صرف زبان سے کہنا کافی نہیں تم نے تو باطن میں ہوائے نفسانی کو تازہ کر رکھا ہے)

اب یہ بات رہ گئی کہ اس کا علاج کیا ہے سو علاج اس کا منصوص میں تو اتباع ہوا ہے اور غیر منصوص اتباع ان حضرات کا ہے جنھوں نے اپنے کو فنا کر دیا ہے مولانا اشعار مذکورہ کے بعد فرماتے ہیں ؎

دیں ہوا را بشکند اندر جہاں ہیچ چیزے ہمچو سایہ ہمرہاں

(دین ہی ہوائے نفسانی کو شکستہ کر دیتا ہے اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں توڑ سکتی)

یار باید راہ را تنہا مرد بے رفیقے اندریں صحرا مرد

(راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہیئے اس میں تنہا قدم مت رکھو بلا مرشد کے اس عشق کی وادی میں مت چلو)

یہاں شبہ ہو سکتا تھا کہ بے اتباع بھی تو بعضے بزرگ واصل ہوئے ہیں مولانا اس کا جواب دیتے ہیں۔

؎ ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اتفاقاً جس شخص نے اس راہ سلوک اکیلے خود طے کیا ہے وہ بھی مردان خدا کی توجہ سے طے کیا ہے)

اس میں اس شبہ کے دو جواب دیئے ایک تو یہ کہ بے اتباع کے پہنچنا نادر ہے اور نادر پر حکم کرنا اور اس کو قاعدہ بنا لینا اور اس کے بھروسہ رہنا صحیح نہیں فرض کرو کوئی شخص مفلس ہو نہ اس کو کھانے کو ملتا ہو نہ پینے کو میسر ہوتا ہو اور اہل و عیال رکھتا ہو نہایت دق ہو کر خودکشی کرنے کا ارادہ کرے اور اس کے لئے کنواں کھودے کہ اس میں ڈوب کر مر رہوں گا یا زندہ در گور دفن ہونگا وہ کھود ہی رہا تھا کہ وہاں سے ایک ہنڈ یا اشرفیوں سے لبالب نکل آئی اب اس طرح ہنڈیا نکلنا ایک اتفاقی بات ہے۔ اس پر کوئی قیاس کر کے چاہے کہ میں بھی کنواں کھود کر ہنڈیا نکال لوں یہ محض اس کا خیال خام ہوگا اسی طرح اگر کوئی اتفاقاً بے اتباع شیوخ واصل ہو گیا تو اس پر اپنے کو قیاس کر لینا اور اس کو قانون بنا لینا بڑی غلطی ہو گی۔ دوسرا جواب یہ دیا کہ اے معترض تجھ کو دھوکا ہوا ہے جن کو تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ بغیر اتباع کے پہنچے ہیں وہ

بھی بغیر واسطے مردان خدا کے نہیں پہنچے اس لئے کہ مردان خدا کے فیوض دو قسم کے ہیں ایک بلا اطلاع اور بے طلب طالب کے اور دوسرے طلب سے اور اتباع سے اور جو بلا اطلاع اور بے طلب طالب کے فیوض ہوتا ہے اس کی بھی دو قسم ہیں ایک وہ جو باختیار ان حضرات کے ہو جیسے دعا کرنا اور توجہ و ہمت لوگوں کے حال پر مبذول کرنا دوسرے وہ جو بلا اختیار اور بلا اطلاع ان حضرات کے ہو صرف ان کے وجود باوجود سے وہ فیض بلا ان کے اختیار سے ہر ایک کو پہنچتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو جہاں جہاں اس کی شعاعیں پہنچتی ہیں سب کو نفع پہنچتا ہے مگر شمس کو اطلاع بھی نہیں ہوتی پس جن کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بلا اتباع پہنچے ہیں تو یہ محض غلط خیال ہے وہ بھی مردان خدا کے فیض باطنی اختیاری سے جیسے دعا و ہمت یا جبر اختیاری سے واصل ہوئے اور اس قسم کا فیض بڑوں سے ہوتا ہی ہے بعض اوقات چھوٹوں سے بھی ہوتا ہے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عجیب حال ہے کہ ان میں ہر ایک سے فیض ہوتا ہے اور یہ اس واسطے ہے تاکہ بڑوں کو کبر نہ ہو چھوٹوں کے محتاج نہیں ہے ان کا حال تو وہ ہے کہ کسی عورت کے کئی بیٹے تھے اس سے پوچھا تھا کہ ان میں کون افضل ہے اس نے کہا کہ ہم کَالْحَلْقَةِ الْمُفْرِغَةِ لَا يُدْرٰى اَيْنَ طَرْفَاهَا (مثل حلقۂ مفرغہ کے کہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں اس کی طرف) کسی میں کوئی بات کم ہے تو دوسری بات زیادہ ہے جیسے آئینہ ایک سرخ ہو ایک زرد ہو ایک سبز ہو اور سب ایک دوسرے کے مقابل رکھے ہوں تو ہر ایک کا عکس دوسرے میں پڑتا ہو ایسی ہی حالت اِس اُمّتِ مرحومہ کی ہے اور جماعت کی نماز میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ایک کو دوسرے سے نفع پہنچے اور نیز جماعت میں کوئی تو مقبول ہوگا اس کی وجہ سے کیا عجب ہے سب کی نماز مقبول ہو جاوے بعض برکات ایسے شخص سے پہنچتی ہیں جس پر گمان بھی نہیں ہوتا، ایک شخص رہزنی کا پیشہ کیا کرتا تھا حق تعالیٰ نے اس کو ہدایت فرمائی وہ ایک بزرگ سے بیعت ہو گئے اور اُن کے حلقۂ خدام میں شامل ہو کر ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے۔ سب لوگ ان کو رہزنی کی وجہ سے حقیر سمجھا کرتے تھے۔ ایک روز ایک شخص نے ان بزرگ کی مع سب مریدین کے دعوت کی جب اس شخص کے مکان

پر سب چلے تو سب کے اوپر ایک ابر نے سایہ کر لیا اور آفتاب کی تمازت سے بچ گئے پیر یہ سمجھے کہ یہ میری برکت کا فیض ہے اور بھی بڑے بڑے خلفاء و مرید تھے وہ اپنی کرامت سمجھے اور اس رہزن کو تو خیال تک بھی نہ تھا اس لئے کہ جانتا تھا میں سیہ کار گنہگار ہوں جب وہاں سے دعوت کھا کر واپس ہوئے تو وہ ابر پھر بھی موجود تھا سب سے پہلے اس راہزن کا راستہ پھٹا اور یہ ان سے الگ ہو کر اپنے راستہ پر ہوا، اس وقت وہ ابر ان کے ساتھ چلا اور پیر صاحب مع دیگر مریدین سب دھوپ میں رہ گئے تب سب کو معلوم ہوا کہ یہ ان کی برکت تھی حق تعالیٰ کو اس کی تواضع اور عجز پسند آیا اس سے یہ برکت ہوئی۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں ہم اس نیت سے بیعت کر لیتے ہیں کہ وہ زور ہو گا تو ہم کو لے جاوے گا اور ہم زور ہوں گے تو اس کو لے جاویں گے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف — گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(قسمت اگر یاوری کرے تو کسی طرح اس کا دامن ہاتھ میں آ جائے پھر اگر وہ مجھے کھینچ لے تو نہایت خوشی اور اگر میں اسے کھینچ لوں تو نہایت عزت)

جو مشائخ اہل ادراک ہیں وہ رات دن دیکھتے ہیں کہ مریدین سے ان کو کیا کیا فیض ہوئے ہیں لیکن ان سے کہتے اس لئے نہیں کہ کہیں ان کا دماغ نہ بگڑ جائے اور عجب و کبر کی بلا میں مبتلا نہ ہو جاویں غرض یہ کہ جب چھوٹوں سے فیوض پہنچتے ہیں تو اپنے اکابر سے استغنا کرنے کی گنجائش نہیں اس لئے کسی اہل اللہ کا اتباع کرنا یہ علاج اعظم ہے اتباع ہویٰ کا خلاصہ یہ کہ اتباع شریعت اور اہل اللہ کے پاس رہنا اور ان کا اتباع اختیار کرنا اس سے انشاء اللہ ہوائے نفسانی سے نجات ہو جاوے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

دعواتِ عبدیت

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون ۲۷۷۶۲۰-۲۷۷۰۰۹۴

کتب خانہ اشرفیہ
قاسم سینٹر، دوکان نمبر ۳۳، اردو بازار کراچی
فون ۲۲۱۳۰۵۸

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

رَوَاہُ الْبُخَارِی

دعوات عبدیت جلد دوم

کا

پہلا وعظ ملقّب بہ

تطہیر رمضان

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

ناشر

محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ؀ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

دعوات عبدیت جلد دوم کا

پہلا وعظ ملقب بہ

تطہیر رمضان

این	متی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مرادآباد محلہ ٹھٹیرہ	۲۱ شعبان ۱۳۱۹ھ	۲ گھنٹہ	بیٹھ کر	اصلاح منکرات رمضان	حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری	تخمیناً ۵۰۰	۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ

امابعد۔ بوجہ قرب رمضان شریف مناسب ہے کہ کچھ احکام اس کے بیان کردئے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے اس کے تو بیان کی ضرورت نہیں۔ اور ایسے ہی تراویح سنّت مؤکدہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے اس کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ ضروری مضمون یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس مہینہ میں کچھ منکرات[1] بڑھا دیئے ہیں اور وجہ اسکی یا تو عدم علم

[1] بری اور ناروا باتیں

ہے یا قصور علم یا جانتے بھی ہیں مگر احتیاط نہیں کرتے بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ میاں نے اس مہینہ میں اُن چیزوں کو بھی حرام کر دیا جو پہلے حلال تھیں کیا یہ اس بات پر دال نہیں کہ جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس میں اور شدت زیادہ ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ سبحانہ نے تو علت بیان کی روزہ رکھنے کی۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ روزہ اس واسطے ہے کہ متقی بن جاؤ۔ اب ہر شخص غور کرلے کہ قبل رمضان میں اور رمضان میں کچھ فرق اس کی حالت میں ظاہر ہوا اس نے نظر بد کو یا غیبت کو چھوڑ دیا، یا نہیں سو کچھ نہیں، دونوں حالتیں یکساں ہیں کسی باب میں بھی کمی نہیں ہوئی۔ اب رہا کھانا سو اُس کے بھی وقت بدل دیئے مقدار میں کچھ تغیر نہیں کیا۔ غرض یہ کہ شارع علیہ السّلام کا تو مقصود یہ تھا کہ منکرات میں کمی ہو مگر لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اہل تحقیق تو کھانے تک میں بھی کمی کر دیتے ہیں۔ اس مہینہ میں بہ نسبت شعبان کے مگر اس کی مقدار کچھ معین نہیں ہو سکتی ہے۔ جتنا شعبان میں کھاتے تھے اس سے کم کر دیا۔ بعض نے صرف بقدر لایموت کھا کر روزہ رکھا۔ جب ہی تو کچھ اثر پایا۔ ہمیشہ اچھی طرح کھایا ایک مہینہ عبادت ہی کے واسطے سہی۔ حاصل یہ کہ ان لوگوں نے اکل میں بھی کمی کر دی مگر یہ بات مندوب خواص کے لئے ہے۔ یہ ہر شخص سے نہیں ہو سکتا مگر معاصی تو چھوڑ دو۔ خیر کھانے کے لئے جواز کا مرتبہ تو ہے معاصی کے واسطے تو جواز بھی نہیں۔ ہم برخلاف اس کے دن بھر معاصی میں مشغول رہتے ہیں بلکہ بعضے تو عصیاں میں اور زیادہ ہو جاتے ہیں اسی کو دیکھ لیجئے کہ صبح اس مہینہ میں اپنے وقت پر ہوتی ہے یا نہیں۔ اس نماز کی تو وقت سے تاخیر کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ بہتیروں کو تو قضا ہوتی ہے اور قضا نہ بھی ہو تو اس قدر تاخیر تو ہوتی ہے جس سے جماعت فوت ہو جاوے۔ خوش ہیں کہ ہم نے روزہ رکھ لیا بڑا تعجب ہے کہ نماز کو چھوڑ دیا روزہ کیا کفایت کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اس قدر بڑھا دیا کہ دس ضعف ثواب کا وعدہ فرما دیا اور ہم اس قدر گناہ کرتے ہیں کہ حسنات باوجود اتنے بڑھائے جانے کے بھی سیئات کے برابر نہیں ہوتیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حسنات کی تعداد بڑھی ہوئی رہتی۔ اس کو بھی جانے دیجئے برابر تو رہتی کہ پھر بھی حسنات بموجب سبقت رحمتی علی غضبی کے غالب ہو جاتیں اور جب باوجود اَضعَافاً مُّضٰعَفَۃً ہونے کے بھی نیکیاں گناہوں کے برابر نہیں ہوتیں بلکہ گناہ بڑھتا رہتا ہے تو پھر کیا حشر ہونا ہے۔ اچھا اس کو بھی جانے دیجئے اگر ہمیشہ ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ معاصی کو گھٹا دیں تو رمضان میں تو ایسا کر لیا جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عبادت کا اثر اس کے

بعد گیارہ مہینے تک رہتا ہے جو کوئی اس میں کوئی نیکی تبکلف کر لیتا ہے اس کے بعد اس پر بآسانی قادر ہو جاتا ہے اور جو کوئی کسی گناہ سے اسمیں اجتناب کر لے تمام سال بآسانی اجتناب کر سکتا ہے اور اس مہینہ میں معصیت سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں پس جب شیاطین قید ہو گئے معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ محرک کے قید ہونے کی وجہ سے اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل مفقود ہی ہو جائیں کیونکہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے اس مہینہ میں وہ معصیت کرائے گا مگر یہاں کم اثر ہوگا کیونکہ ایک ہی محرک رہ گیا۔ اس میں ایک مہینہ کی مشقت گوارا کر لی جائے کوئی بات نہیں۔ غرض اس میں ہر عضو کو گناہ سے بچایا جاوے۔ ایک زبان ہی کے بیس۲۰ گناہ ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ایک ان میں سے کذب ہے جس کو لوگوں نے شیرِ مادر سمجھ رکھا ہے اور کذب وہ شئے ہے کہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں اور پھر اس کو مسلمان کیسا خوشگوار سمجھتے ہیں۔ ذرا سا بھی لگاؤ کذب کا ہو جائے بس معصیت ہو گئی یہاں تک کہ ایک صحابیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے ایک بچہ سے بہلانے کے طور پر یوں کہا کہ لے یہاں آؤ چیز دیں گے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اگر وہ آجائے تو کیا چیز دو گی انھوں نے دکھایا کہ یہ کھجور ہے میرے ہاتھ میں، فرمایا اگر تمہاری نیت میں کچھ نہ ہوتا تو یہ معصیت لکھ لی جاتی۔ حضرات! کذب یہ چیز ہے۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں اگر اس سے احتراز نہ ہو سکے تو کذب مُضر سے تو بچنا چاہیئے۔ پھر روزہ میں۔ دوسرا گناہ زبان کا غیبت ہے لوگ یوں کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم تو اُس کے منہ پر کہدیں۔ منہ پر عیب جوئی کرو گے تو بہت اچھا کرو گے اور پیچھے تو ظاہر ہے جیسا اچھا ہے بلکہ اگر منہ پر برا کہو گے تو بدلا بھی پاؤ گے وہ شخص تمہیں بُرا کہہ لے گا یا اپنے اوپر سے اس الزام کو دفع کرے گا۔ پیچھے بُرائی کرنا تو دھوکہ سے مارنا ہے یاد رکھو جیسا کہ دوسرے کا مال محترم ہے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ آبرو ہے چنانچہ جب آبرو پر آبنتی ہے تو مال تو کیا چیز ہے جان تک پرواہ نہیں رہتی پھر آبروریزی کرنے والا کیسے حق العبد سے بری ہو سکتا ہے مگر غیبت ایسی رائج ہوئی ہے کہ باتوں میں احساس بھی نہیں ہوتا کہ غیبت ہو گئی یا نہیں اس سے بچنے کی ترکیب تو بس یہی ہے کہ کسی کا بھلا یا بُرا اصلاً ذکر ہی نہ کیا جاوے کیونکہ ذکر محمود بھی اگر کیا

جاوے کسی کا تو شیطان دوسرے کی برائی تک پہنچا دیتا ہے اور کہنے والا سمجھتا ہے کہ میں ایک ذکر محمود کر رہا ہوں اور اس طرح ایک خیر اور ایک شر مل جانے سے وہ خیر بھی کالعدم ہوگئی اور حضرات اپنے ہی کام بہتیرے ہیں پہلے ان کو پورا کیجئے دوسرے کی کیا پڑی ۔ علاوہ بریں غیبت تو گناہ بے لذّت بھی ہے اور دنیا میں بھی مُضر ہے جب دوسرا آدمی سنے گا تو عداوت پیدا ہو جائے گی اور پھر کیا ثمرات اس کے ہوں گے اسی طرح زبان کے بہت گناہ ہیں، سب سے بچنا ضروری ہے ان کے علاوہ ایک گناہ جو خاص روزہ کے متعلق ہے افطار علی الحرام ہے ۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس مہینہ میں حلال کا کھانا بھی ایک وقت میں حرام ہو گیا اور پھر دن بھر تو لوگ اسے چھوڑے رہیں اور شام کو حرام سے افطار کریں اور در اصل بعض لوگوں نے خبط میں ڈال دیا ہے یوں کہتے ہیں کہ رزق حلال تو پایا نہیں جاتا سوائے اس کے کہ دریا میں سے مچھلی شکار کر کے کھا لی جائے یا سبزی کھا کر یا گھاس چر کر پیٹ بھر لیا جائے اور کچھ قصے اس کے متعلق مشہور کئے ہیں وہ ایک بزرگ کا قصّہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ان کا بیل لڑتے لڑتے دوسرے کے کھیت میں چلا گیا تو انہوں نے اس کھیت کا غلّہ کھانا چھوڑ دیا کہ نہ معلوم دوسرے کے کھیت کی مٹی جو میرے بیل کے کھر میں لگ کر بلا اجازت چلی آئی کون سے دانے میں شامل ہو گئی ۔ اگر یہ قصّہ ہوا ہے تو وہ صاحبِ حال ہے دوسرے کے لئے اُن کا فعل حجت نہیں ہو سکتا ۔ قصداً اتنا مبالغہ کرنا تقویٰ کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں ۔ جب اتنے شبہ کو بھی حرام میں داخل سمجھا وے گا اور اس سے بچنا ظاہر ہے کہ مشکل ہے تو گمان یہ ہو گا کہ حرام سے بچنا مشکل ہے پس سب حراموں میں مبتلا ہو گئے اور حلال کو بالکل چھوڑ ہی دیا میں کہتا ہوں کیا کنز و ہدایہ بالکل لغو ہی ہیں جب یہی بات ٹھہری کہ حلال کا وجود ہی نہیں تو ناحق اتنا بسط کیا صرف اتنا کافی تھا کہ اَلْحَلَالُ لَا یُوْجَدُ (حلال کا وجود ہی نہیں) ہرگز نہیں جس پر کنز و ہدایہ فتویٰ دے دیں وہ حلال ہے ۔ میں کہتا ہوں کیا سب علماء حرام خور ہیں ۔ ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحب ان کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی اُن کو مال حرام دھوکے سے بھی کھلا دیتا تھا تو قے ہو جایا کرتی تھی اور پھر بھی وہ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے

کہ حلال کا وجود دنیا میں ضرور ہے ورنہ وہ کیا کھاتے تھے اگر فرض کیجئے کہ مال حرام ہی کھاتے تھے تو طبیعت کو یہ نفرت نہیں ہوسکتی یا یہ کہ ہمیشہ قے ہی کیا کرتے ہوں گے تو کھانا فضول ہے غرض دنیا میں حلال بھی ہے حرام بھی ہے جو مسائل دریافت کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے مگر لوگ پوچھتے ہی نہیں اور یہ فساد کا ہے سے ہوا کہ لوگوں نے پوچھنا چھوڑ دیا جو جی میں آیا کرتے رہے حتیٰ کہ اس کے عادی ہو گئے اب جو کسی نے منع کیا تو اس کا چھوڑنا نہایت دشوار معلوم ہوا بس کہہ دیا کہ میاں یہ لوگ تو خواہ مخواہ حلال کو حرام ہی کہا کرتے ہیں ان کی تو غرض بھی یہ ہے کہ مال بھی نہ بڑھے اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے، حلال کا وجود ہی نہیں جو حلال تھا وہ بھی حرام ہی سمجھنے لگے اور خوف سے مفتی کے پاس جانا چھوڑ دیا کہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے کس معاملہ کو حرام بتا دیں یا حلال بتائیں تو ہماری خاطر سے ہی شاید کہہ دیں اور فی نفسہٖ حرام ہی ہوگا کیونکہ حلال کا تو وجود ہی نہیں سو یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس کو مفتی مباح کہے وہ عنداللہ مباح ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔ شیطان کے بہت سے جال ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ سب حرام ہے۔ پھر بعض لوگ حرام و حلال میں خواہ مخواہ شبہ کر کے حلال کو بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب اس میں وسوسہ ہے تو چھوڑ ہی دو چاہے مفتی کتنا ہی کہے کہ یہ حلال ہے مگر وہ اس کے چھوڑنے ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں نہیں اس فعل میں کچھ حرج نہیں جو مباح ہے اہل علم سے پوچھ لو کہ کوئی وجہ اس میں اباحت کی بھی ہے وہ کوئی عالم نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بھی یہ ہی چاہتے ہوں کہ تم کو دقت میں ڈالیں اور یہ خیال مت کرو کہ حلال موجود ہی نہیں۔ پوچھ لو پھر جس سے وہ منع کریں اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت باندھو اور اگر نفس کم ہمتی ہی کرے تو اس سے یوں کہو کہ یہ جو حکام وقت کے احکام ہیں ان کو کس طرح مانتا ہے اس کو بھی حاکم حقیقی کا حکم سمجھ کر مانو پھر دوسرے لوگ بھی انشاء اللہ تم سے معارضہ نہ کرینگے۔ میرا ہی خود قصہ ہے کہ کبھی زیور بنوانا تو چونکہ چاندی کے واسطے روپیہ دینے سے ربوا لازم آجاتا ہے اس لئے جب کبھی زیور بنوانے کا اتفاق ہوتا تو میں چاندی دوسری جگہ سے خرید کر اسے دے دیتا دو ایک مرتبہ تو اس نے کہا روپیہ دے دو پھر تول کر حساب کر دینا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ میرے دین کے خلاف بات ہے، بس اس نے اس کو خوشی سے منظور کر لیا۔ تو لوگ سب مان جاتے ہیں آدمی پکا چاہیئے اور اللہ میاں کی طرف

سے اسباب ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ خیال کر لیجئے کہ حاکم جب کسی کو امر شاق کا حکم دیتا ہے تو اس پر ماموں کی اعانت بھی کیا کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ دل کو مضبوط کرو اور اس پر عزم کر لو کہ ہم کوئی کام بلا پوچھے نہ کریں گے، ہاں اس پوچھنے پر بعض صورتیں عدم جواز کی بھی نکلیں گی اور اس میں آمدنی کم ہی ہو جاوے گی تو خوب سمجھ لو اور تجربہ کر لو کہ اس کم ہی میں برکت ہو جاوے گی اور اس کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک من گیہوں لائے اور گھر پر آ کر دو من اُترے ممکن تو ایسا بھی ہے۔ ایک صاحب خیر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ مسجد بنواتے تھے اور ایک تھیلی میں روپیہ رکھتے تھے اور کام شروع کیا جب ضرورت ہوتی اس میں ہی سے ہاتھ ڈال کر نکال لاتے یہاں تک کہ سب کام بن گیا حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اس سے کم نہیں ہوا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں اور وہ یہ کہ یہ مقدار قلیل جب تمہارے ہی صرف میں آئے بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں مقدمات میں لاطائل تکلفات میں ضائع نہ جائے۔ جو کچھ آئے تمہاری ہی ذات پر صرف ہو، چاہے تھوڑا ہو اس سے بہتر ہے کہ زیادہ آئے اور تم پر خرچ نہ ہو اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اللہ میاں ملیں پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی، مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو۔ حضرت اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت ایک بزرگ کہتے ہیں ع بمان اے آنکہ چیز نو پاک نیست، دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کیا کچھ خرچ کرنا پڑتا اور پھر ان کی خوشنودی دیرپا نہیں۔ ذرا سی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم شکور ہیں خیال کیجئے اس لفظ کو۔ ایک بادشاہ کے سامنے کوئی چیز لے جایئے اور وہ اس کی نسبت منظوری و عدم منظوری کچھ ظاہر نہ کرے مگر اس میں کوئی عیب نہ نکالے اور خازن کو حکم دے دے کہ رکھ لو تو لے جانے والے کے دماغ آسمان پر پہنچ جاویں گے اور رستا تا پھرے گا کہ بادشاہ نے ہمارا ہدیہ رکھ لیا۔ اور اللہ میاں کے یہاں ہم لوگ اپنے اعمال لے جاتے ہیں اور ذرا ان اعمال کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کس قابل ہیں ایک نمازی ہی کو لے لیجئے اس وقت نظیر کے واسطے کہ کھڑے ہوتے ہیں اللہ میاں سے

باتیں کرنے کو اور کرتے ہیں کس سے گاؤخر سے ۔ یا یوں مثال دیجئے کہ ایک بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے اپنے غلام کو دربار میں حاضری کی اجازت دی بلکہ یوں کہیئے کہ زبردستی طلب کیا ۔ (ہم لوگ ایسے بھلے مانس تو کاہے کو ہیں کہ حاضری کی اجازت سے ہی دربار میں پہنچنے کو غنیمت سمجھیں) زبردستی بلائے ہوئے بلکہ پابہ زنجیر ہوکر دربار میں پہنچے اور کام ہم سے کیا ہے کہ بادشاہ کو ان پر رحم آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے دربار میں کچھ گفتگو کرلے کہ درباریوں اور تمام رعایا میں ان کی عزت ہوجائے اپنا کچھ نفع مقصود نہیں ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

..... ہائے ..... من نکردم خلق تا سودے کنم ٭ بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

اللہ میاں کا کیا نفع ہے ہمارے پیدا کرنے یا عزت دینے سے ۔

خیر۔ ان حضرات نے کیا مکافات کی اس بلانے کی کہ پہنچتے ہی تو منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے ۔ اور کانوں میں انگلیاں دے لیں مگر بادشاہ تو کم ظرف نہیں ہے اس گستاخی پر نظر نہیں کردیتا اور حکم دیتا ہے اپنے خادموں کو کہ اس بے وقوف کی انگلیاں کانوں سے نکال دو بلکہ ہاتھ باندھ دو کہ پھر انگلیاں کانوں میں نہ دے سکے اور منہ اس کا ہماری طرف کردو اور جلدی سے یہ شفقت آمیز کلمات زبان سے فرمانے لگا کہ ایک دفعہ تو اس کے کان میں پڑجائیں دیکھیں تو معلوم کیسے نہیں ہوتا ۔ مگر یہ تو قسم کھا کر چلے ہیں کہ الٹا ہی کریں گے چٹ سے پھر انگلیاں کانوں کی طرف بڑھائیں مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے جلدی سے اس خوف سے کہ کہیں محبوب کا کلام کان میں پڑجائے اس جگہ سے بھاگ اصطبل میں گھوڑے کے پاس جا چھپے وہاں آدمی پکڑنے کے لئے پہنچا گدھے کے پاس جا چھپے ۔ غرض ایک گھنٹہ بھر یہی کیفیت رہی کہ یہ بھاگا کئے اور بادشاہ کے نوکر بلکہ خود بادشاہ ۔ اللہ اکبر ان کے پیچھے پھرا کیا مگر انہوں نے وہی کیا جو شامت اعمال سے ہونا تھا ۔ اب فرمائیے کہ یہ شخص کس سزا کا مستحق ہے یا بادشاہ کو اس پر رحم آنا چاہیئے یہ تو اس قابل ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی یہ حرکت اس نے کی ہے تو توہین بادشاہ کے جرم میں اس کو لے لیا جائے اور کبھی دربار کی حاضری کی اجازت نہ ہو ۔ اب آپ اپنے معاملہ

کو اللہ میاں کے ساتھ دیکھ لیجئے کہ ادھر سے تو حاضری کی اجازت ہر وقت یعنی نفل نماز کے لئے اجازت ہے جب چاہو پڑھو (باستثناء تھوڑے سے وقتوں کے) مگر ہمیں توفیق نہیں ہوتی کہ اس اجازت کو غنیمت سمجھیں یہاں تک کہ پکڑ کر بلانے کی نوبت پہنچی یعنی فرض نماز کا وقت آیا۔ نہایت کاہلی کے ساتھ گرتے پڑتے پہنچے برا بھلا وضو کیا اور با کراہ نیت نماز کی یعنی سامنے باتیں کرنے کو کھڑے کئے گئے کھڑے ہوتے ہی منہ ایسا پھیرا کہ کچھ خبر نہیں صرف الفاظ زبان پر جاری ہیں دھوکہ دینے کے واسطے آداب شاہی بجا لا رہے ہیں یعنی سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھا۔ اللہ میاں نے اس منہ پھیرنے پر نظر نہ کی اور کلام شروع کیا چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ پر جواب ملنا حدیثوں میں آیا ہے ذراسی بھنک کان میں پڑتے ہی ایسے بھاگے کہ سیدھے گھر آکر دم لیا کبھی بیوی کے پاس کبھی بچوں کے ساتھ کبھی مکان میں کبھی طویلہ میں پھرا کئے۔ مراد اس سے خیالات کا جولانی دینا... غرض یہی مسخراپن کیا کئے یہاں تک کہ بمشکل تمام دربار کی حاضری ختم تک پہنچی یعنی سلام پھیرا۔ بڑی خیر ہوئی بادشاہ کی ہمکلامی سے بچ گئے جانے وہ کاٹ کھاتا یا کیا کرتا (یہ خبر نہیں کہ کیا کرنا اور کیا ہوتا اور یہ کیا پاتے) صاحبو! اب ان گستاخیوں کی سزا وہی ہونی چاہیئے تھی یا نہیں جو مثال میں نے عرض کی کہ اگر ایک دفعہ بھی ہم ایسی نماز پڑھتے تو کبھی اللہ میاں کے یہاں ہم کو گھسنے نہ دیا جاتا اور فوراً دربار سے نکلتے ہی گرفتاری اور حبس دوام کا روبکار جاری ہو جاتا مگر سنئے کہ اللہ میاں سے کیا روبکار جاری ہوا... وَکَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا (تمہاری کوشش قابل قدر ہے) اس نے دربار میں آکر اتنی دیر کی مصاحبت کو بہت اچھے طرح انجام دیا۔ مرحبا نے کی بات ہے۔ اچھی طرح تو جیسے انجام دی وہ ہم بھی خوب جانتے ہیں اور جو وہاں حاضر تھے انہوں نے بھی خوب دیکھا۔ بلکہ حاضرین کے سامنے شرم رکھنے کے واسطے اور فرماتے ہیں..... اُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِہِمْ حَسَنَاتٍ (وہی لوگ ہیں جن کے گناہوں کو خداوند کریم نیکیوں سے بدل دیتے ہیں) گویا یہ بیوقوف ہے کتنی ہی گستاخیاں کیں مگر ہم اس آنے کو حاضری میں لکھ لیتے ہیں اور اس کی وہی عزت کی جائے جو باقاعدہ آنے والے کی کیجاتی ہے اب فرمائیے کہ اگر ایک مرتبہ ایسا معاملہ بادشاہ کسی کے ساتھ کرے تو کیا دوبارہ اس شخص کی ہمت پڑ سکتی ہے کہ پھر اسی طرح وحشیانہ طریق سے دربار میں جاوے ہرگز نہیں بلکہ سر سے پیر تک خجالت

کے پسینہ میں غرق ہو جائے گا مگر ہم ایسے احسان فراموش ہیں کہ ایک دو دفعہ کیا معنی سینکڑوں بار بلکہ ہر روز پانچ بار یہی جفا کاری کرتے ہیں، مگر اُدھر سے مطلق خیال نہیں کیا جاتا اس پر طرہ یہ ہے کہ ان لنگڑے لولے اعمال (بلکہ اعمال کیسے کہا جا سکتا ہے بد اعمالیوں) میں بھی کمی اور کوتاہی ہے بلکہ خدائے تعالٰے کے محرمات کی طرف میلان ہے۔

صاحبو! ذرا شرماؤ اور عمل کرو اور حرام سے بچو خاص کر رمضان کے مہینہ میں۔ منکرات تو روزے کے ہوئے اب ایک عمل اور رہے خاص رمضان کا جیسے دن کا عمل روزہ ہے ایسے رات کا عمل قیام ہے اس میں یوں خبط کر دیا کہ تراویح کی ۲۰ رکعت گنتی میں تو پوری کر لیں مگر یہ پتہ نہیں کہ چلتا کہ ان میں توریت پڑھی جاتی ہے یا انجیل پڑھی جاتی ہے یا تو شروع کا حرف سمجھ آتا ہے یا رکوع کی تکبیر، ایک حافظ کا قصہ ہے کہ قرآن شریف پڑھتے پڑھتے جہاں بھولے وہاں کچھ اپنی تصنیف سے پڑھ دیا۔ بڑی تعریف ہوتی رہی مدتوں کہ اُن کو کہیں متشابہ بھی نہیں لگتا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ صاحبو! اللہ میاں کو دھوکہ مت دو بیس رکعتیں گنا کر ذرا ڈھنگ سے بھی تو کرو۔ ایک یہ ظلم ہوتا ہے کہ حافظ مقتدیوں کو بھگاتا ہے اس طرح کہ قراۃ کو اتنا طول دیتا ہے کہ کوئی ٹھہر ہی نہ سکے پانچ پانچ سیپارہ ایک ایک رکعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَيَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا خوشخبری سُنا اور نفرت مت دلاؤ اور آسانی کرو اور تنگی میں مت ڈالو۔ ہاں ایسا ہی شوق ہے تو تہجد میں پڑھو جتنا چاہو اور اس میں اور جس کا جی چاہے شریک ہو جائے مگر اس بھی امام کے علاوہ تین سے زیادہ جماعت میں نہ ہوں کہ فقہائے نے مکروہ کہا ہے کیونکہ پھر نفل میں فرض کا سا اہتمام ہو جائے گا بعضے لوگ ایک ہی شب میں ختم کرتے ہیں جسے شبینہ کہتے ہیں اس میں تو کئی بدعتیں ہیں غور کر کے دیکھ لیجئے کہ اس میں نیت صرف نمود کی ہوتی ہے کیا امام اور کیا مہتمم اور کیا سامعین امام تو داد ملنے کے امید وار رہتے ہیں کہ جہاں سلام پھیرا اور لوگوں نے منہ پر تعریف کر دی تو خوش ہو گئے ورنہ پڑھا بھی نہیں جاتا۔ حدیث شریف میں منہ پر تعریف کرنے والے کے لئے حکم ہے کہ اس کے منہ پر خاک جھونک دو اور امام صاحب کے قلب پر بھی اثر ہوتا ہی ہے اور سی تعریف کرنیوالے کو بعضے امام تو لقمہ بھی نہیں لیتے کہ اسی وجہ سے کہ لوگ کہیں گے کہ اچھا یاد نہیں اور مہتمم تو سامعین میں شامل ہی نہیں ہوتے چائے پانی ہی سے فرصت نہیں ہوتی میں پوچھتا ہوں کہ

شبینہ سے چائے پانی مقصود ہے یا قرأت و سماعت' قرآن ایک شئے ہیں البتہ چائے سے مدد مل جاتی ہے سماعت اور قرأت میں مگر جب ذریعہ مقصود میں مخل ہوئے تو ذریعہ کہاں رہا اور یہ بھی جانے دیجئے مہتمم صاحب کو یہ ثابت کرنا منظور ہے کہ ہمارے ہاں فلانی مسجد سے اہتمام اچھا رہا ہے بس چائے پانی اچھا رہا مگر اصل شئے تو اچھی نہیں رہی اور رہے سامعین تو انصاف سے کہہ دیجئے کہ وہ قرآن شریف سننے کے لئے آتے ہیں یا نماز کے ساتھ دل لگی کرنے کو۔ کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں کچھ کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں کبھی بیٹھ جاتے ہیں کبھی کچھ لوگ بیٹھ بھی نہ سکے تو نیت توڑ کر لیٹے لیٹے سن رہے ہیں اور کریں بھی کیا بیچارے گھنٹوں تک کیسے کھڑے رہ سکتے ہیں اور بعضے جو اپنے اوپر جبر کر کے کھڑے بھی ہیں تو امام کی لغزشوں کو چھوڑتے جاتے ہیں وہ خواہ کیسی ہی غلطی کرتا چلا جائے بتلا نہیں سکتے کیونکہ حرج ہوگا اور قرآن شریف ختم سے رہ جائیگا۔ بعضے تو یہ غضب کرتے ہیں کہ خارج صلوٰۃ سے لقمہ دیئے جاتے ہیں اس صورت میں اگر امام نے لیا نماز سب کی فاسد ہوئی اور نہ لیا تو وہ غلطی اگر مغیر معنی ہیں تو یہ یوں نماز فاسد ہوئی۔ اب ان سامعین کا گھنٹوں سے اپنے اوپر جبر کرنا بالکل ضائع گیا علیحٰدہ بیٹھ کر سننا اور یہ برابر ہوا، اور تکلیف مفت میں ہوئی۔ غرض لقمہ لینے کی صورت میں بھی معصیت ابطال عمل کی لازم آئی اور نہ لینے سے بھی نماز فاسد ہوئی ان سب صورتوں کو ملا کر آپ ہی کہد یجئے کہ نماز ہے یا کھیل احکام ظاہری کے لحاظ سے بھی تو نماز صحیح نہ ہوئی' خشوع و خضوع کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اور ایک خرابی شبینہ میں یہ بھی ہے کہ اکثر نفل کی جماعت لازم آتی ہے کیونکہ بعض ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو تراویح کی جماعت میں کرتے ہوں کیونکہ سب مقتدیوں سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اوّل سے آخر تک شریک رہیں اور اسی کو تراویح رکھیں اس لئے تراویح علیحدہ پڑھ لیتے ہیں پھر نفلوں میں اس کو پڑھتے ہیں اور نفلوں میں جماعت مکروہ ہے غرض بہت سے منکرات اس شبینہ میں لازم آتے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض حفّاظ اپنا اپنا پڑھنے کے بعد مغالطہ دینے آتے ہیں یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ سننے کو آئے ہیں اور یہ بے ادبی نہیں ہے اور ایسے بہت سے بدعات ہیں۔

ہاں اگر شبینہ میں ختم ہی مد نظر ہے (مگر اخلاص کو غور کر لیجئے گا) تو امر حسن ہے اس میں بھی اعلان

کی ضرورت نہیں تاکہ ریا و سمعہ سے خالی رہے۔ جتنی ہمت ہو قرآن شریف پڑھوا م کو گڑ بڑ میں نہ ڈالو اور سب منکرات مذکورہ سے بچو۔ ایک بدعت رمضان میں یہ ہے کہ نامحرم حفاظ گھروں میں جا کر عورتوں کو محراب سناتے ہیں اس میں چند قباحتیں ہیں ایک یہ کہ اجنبی مرد کی آواز جب خوش آوازی کا قصد کرے عورت کے لئے ایسی ہی ہے جیسے اجنبی عورت کی آواز مرد کے لئے اور رواج یہی ہے کہ خوش آواز مرد تلاش کئے جاتے ہیں اور حافظ صاحب بھی مردوں کی جماعت میں تو شاید سادہ ہی پڑھتے یہاں خوب بنا بنا کر ادا کرتے ہیں سو عورتوں کے لئے جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے اپنی اپنی الگ پڑھیں اور کچھ ضرورت محراب سننے کی نہیں ہے اگر حافظ ہیں تو فرادی فرادی اپنی تراویح میں ختم کر لیں اور اگر حافظ نہیں ہیں تو الم تر کیف سے پڑھ لیں اور ناظرہ جتنا ہو سکے پڑھ لیا کریں کیوں روپیہ خرچ کر کے گناہ مول لیا۔ دوسری بدعت اس میں استیجار علی العبادۃ ہے یعنی حافظ صاحب سے اجرت دیکر قرآن شریف پڑھوایا جاتا ہے اور استیجار علی العبادۃ حرام ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قبر پر حافظ کو مقرر کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں بھی استیجار علی العبادۃ ہے اس پر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کیا ہو گیا ہے۔ علماء کو میت کا ثواب ہی بند کر دیا۔ ہم کہتے ہیں اس کا ثواب ہی نہیں پہنچتا پھر بند کیا کر دیا کیونکہ ثواب پہنچنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اول عمل خیر کرنیوالے کو ثواب ملتا ہے پھر اسکو اختیار ہے جسے چاہے بخشدے جیسے اپنا مال جسے چاہے دیدے اور یہاں خود کو ہی ثواب نہیں ملا تو بخشا ہی کیا گیا۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ثواب کی بات ہے اور اجرت لینا گناہ تو ایک معصیت اور ایک ثواب ہو گیا تو ثواب پہنچ جائیگا اور گناہ ہمارے ذمہ رہ جائیگا پھر ہم توبہ کر لیں گے تو یہ عمل حسن رہ گیا تو ہم کہیں گے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ قاری کی نیت دیکھ لیجئے کہ استحصال مال ہے نہ ثواب پھر ثواب کہاں۔ جب اسی کو ثواب نہ ملا تو دوسرے کو کیا بخشے گا۔ بعض لوگ یہاں کہتے ہیں کہ یہ استیجارہ نہیں کیونکہ ہم کوئی مقدار مقرر نہیں کرتے جو ہمارے مقدر میں ہے پہنچتا ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ اَلْمَعْرُوْفُ کَالْمَشْرُوْطِ جو بات مشروط ہوتی ہے اُس کو ٹھہرانے کی ضرورت کیا ہے اگر کسی طرح معلوم ہو جائے کہ یہاں کچھ نہ ملے گا وسط رمضان ہی میں حافظ صاحب چھوڑ کر بیٹھ رہیں۔ ثابت ہوا کہ مقصود حافظ صاحب کو اُجرت ہی ہے ختم سے بحث نہیں اگر کوئی شخص خالی الذہن ہو اور اس جگہ رواج بھی دینے کا نہ ہو تو جو کچھ ہدیہ قبول کیا جائے اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ ان کو ان کی ضرورت کے موافق بطور ہدیہ دیدیا کرو اور چونکہ اس طرح سے دینے کی عادت نہیں اسی وجہ سے

ان کی نیتوں میں فساد پیدا ہوگئے۔ اگر بلا سوال و حیلہ ان کو دیدیا جایا کرے تو یہ نوبت کاہے کو آئے۔ ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ پڑھنے گئے کھانا مقرر نہ ہوا اتفاق سے ایک موت ہوگئی اوروں کے لئے تو غمی تھی مگر اس بیچارہ کے لئے عید کا دن آگیا۔ ان کا کھانا چالیس دن کیلئے مقرر ہوگیا غنیمت سمجھا جب چلہ قریب ختم کے پہنچا تو فکر ہوئی کہ پھر وہی فاقہ آتا ہے اتفاق سے چلہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک اور موت ہوگئی ان کے ایک چلہ کا سامان اور ہوگیا اسی طرح کئی موٹے موٹے یکے بعد دیگرے لڑھک گئے ان طالبعلم صاحب کو چاٹ لگ گئی اور ہر وقت انتظار میں رہنے لگے کہ کسی طرح کوئی مرے! ایک روز ایک شخص نے کہا کہ یہ طالب علم سارے محلہ کو اسی طرح کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر کردو کہیں اس طرح بھی اللہ میاں پہنچا دیتے ہیں غرض یہ نوبت بدنیتی کی کاہے سے پہنچی صرف مستحقین کی خبر نہ لینے سے۔ یوں تو کبھی سالن بھی ڈھنگ کا نہ ملے ہاں جمعرات کے دن حلوے آجائیں گے اور جو کوئی جمعرات کی تخصیص سے منع کرے تو برا معلوم ہوگا۔ صاحبو! کیا آٹھ دن کا کھانا ایک دن کھا سکتے ہو طالب علم غریب نے کیا قصور کیا ہے کہ ہفتہ بھر تک تو فاقہ کراؤ اور ایک دن اتنا لاکر رکھدو کہ کھا نہ سکے۔ چاہیئے کہ ان کی خدمت کردی جایا کرے تاکہ ان کی نیت نہ بگڑے لوگوں نے اس کو تو بالکل چھوڑ دیا اور سبب اس کا یہ ہے کہ خادمان دین کو لوگ حقیر سمجھتے ہیں اس لئے نہ اُن کی کچھ وقعت ہے نہ خدمت اور یہی وجہ سے یہ بھی رواج ہوگیا کہ مؤذن وہی ہوتا ہے جو کسی کام کا نہ ہو لولے لنگڑے اپاہج جو کسی کام کے نہ رہیں وہ مؤذن بن جاتے ہیں پھر کوئی خبر نہیں لیتا اسی وجہ سے نیتیں بگڑ گئیں۔ ایک میت کا چادر کسی نے ایک فقیر کو دیدیا تھا مؤذن کو جو خبر لگی تو فوراً پہنچے کہ واہ صاحب میرا حق اس کو دیدیا خدا خدا کرکے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی ہمارا حق اوروں کو دیدیتے ہو۔ بیشک یہی بات ہے بہت انتظار کے بعد یہ دن نصیب ہوتا ہے مگر اس میں اس کا قصور نہیں ہے بلکہ ایک محلہ کا قصور ہے کیوں یہ نوبت پہنچائی اگر ہم لوگ مقرر کرلیں کہ گیارہ مہینہ میں اپنے کپڑوں کے ساتھ ایک کپڑا ان کو بھی بنادیں اور جہاں آپ کھاتے ہیں کبھی کبھی اُن کی بھی دعوت کردیا کریں اور اپنے خرچ کے روپوں کے ساتھ ان کے لئے بھی کچھ روپیہ نکال دیا کریں غرض غیر رمضان میں ان کی برابر خبر گیری کرتے رہا کریں پھر رمضان شریف میں ان سے سوال کیا جائے کہ قرآن شریف سنا دیجئے تو کیا نہیں سنا دیں گے ضرور اور بخوشی منظور کرلیں گے اسمیں استیجار علی العبادۃ وغیرہ بھی کوئی قباحت نہ لازم آئیگی۔ غرض اجرت پر حافظ سے قرآن شریف پڑھوانا جائز نہیں اور ایسے ہی عورتوں کو گھروں میں سنانا نامناسب ہے۔ میں کہتا ہوں جب عورتوں کو مسجد میں

آنے سے روکا گیا ہے تو عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف مباعدت ہے مردوں اور عورتوں میں اور یہاں اختلاط لازم آتا ہے کیا حاجت عورتوں کو قرآن ختم سننے کی جب شارع علیہ السّلام ہی کی طرف سے لازم نہیں کیا گیا تو ان کے ذمہ کچھ ضرور نہیں ہے بس الم تر کیف سے پڑھ لیا کریں اور ایک خرابی اور ہوتی ہے کہ جب ایک جگہ حافظ عورتوں کو سنانے کیلئے مقرر کیا جاتا ہے تو سارے محلّہ سے عورتیں آ کر جمع ہوتی ہیں اور اس میں خروج بلا ضرورت ہے اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے المرأۃ عورۃ عورت چھپانے کی چیز ہے۔ ایک بدعت رمضان شریف میں چراغوں کی کثرت ہے ختم کے روز لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس میں شوکت اسلام ہے ہم کہتے ہیں رمضان میں ہی اظہار شوکت اسلام کی ضرورت ہے یا باقی تمام مہینوں میں بھی تو ہمیشہ چراغ بہت سے جلایا کیجئے یا یوں کہئے کہ اور دنوں میں اسلام کے چھپانے کا حکم ہے خوب جان لیجئے کہ شوکت اعمال صالحہ ہی میں ہے۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصّہ سنا ہوگا کہ جس وقت شام کو گئے ہیں اور نصاریٰ کے شہر کے پاس پہنچے تو کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے تھے اور سواری میں اونٹ تھا اس پر بھی خود سوار نہیں تھے غلام سوار تھا لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں اظہار شوکت کا موقع ہے۔ کم سے کم گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ آپ نے بہت اصرار سے منظور کر لیا۔ جب سوار ہوئے تو گھوڑے نے کودنا اُچھلنا شروع کیا آپ فوراً اتر پڑے کہ اس سے نفس میں عجب پیدا ہوتا ہے۔ اللہ اکبر کیا پاکیزہ نفس حضرات تھے اپنے قلب کا خیال ہر وقت رہتا تھا، اور اظہار شوکت کے جواب میں فرمایا نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام ہم وہ قوم ہیں کہ اسلام سے ہی ہماری عزّت ہے چراغوں سے کہیں شوکت ہو سکتی ہے۔ شوکت اسلام تو اسلام ہی سے ہے اسلام کو کامل کرو میں کہتا ہوں کہ ٹٹول کر دیکھ لو دلوں کو اگر اور کوئی شخص تمہارے سوا مساجد کی زینت کر دے تو تمہیں ویسی ہی خوشی ہوگی جیسی کہ اس بات سے ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے خرچ یا اہتمام سے زینت کی ہے غور کر لیجئے کہ نہ ہوگی بس معلوم ہوا کہ صرف اپنا نام جتلانے کے لئے ہے وَرنہ اظہار شوکت تو دونوں حالت میں برابر تھا پھر ایک صورت میں فرحت کم کیوں ہوئی اور اس سے تو یہ روپیہ باذن مالک اگر مؤذن کو دیا جاتا تو اولی تھا مگر اس کو کیوں دیتے نام کیسے ہوتا۔ کیا یہ اسراف نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں، اسراف کے معنی ہیں صرف المال بلا غرض محمود۔ اور غرض کئی طرح کی ہوتی ہے اوّل غرض رفع ضرورت ہے یعنی ہر چیز کو اُس مقدار پر اختیار کرنا کہ اس سے کم میں نہ ہو سکے مثلاً لباس کہ درجۂ

اوّل اُس کی غرض کا رفع ضرورت ہے یعنی ستر اور یہ غرض ٹاٹ سے بھی حاصل ہوسکتی ہے دوسری غرض آسائش ہے یہ لباس میں ٹاٹ سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ سردی کے موسم میں تھوڑی سی روئی کے لحاف سے بھی حاصل نہیں ہوتی جب تک کافی روئی نہ ہو۔ شریعت میں اس کی بھی اجازت دی گئی ہے تیسری غرض آرائش ہے اور یہ بھی شریعت میں جائز ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَ یُحِبُّ الْجَمَالَ (اللہ تعالیٰ جمال والا ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے) پس آرائش مباح ہے اور اس میں طبائع مختلف ہوتی ہیں بعضوں کی غرض تو آرائش سے تحدیث بالنعمۃ یعنی خدا تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوا کرتا ہے اور یہ محمود ہے اور بعضوں کی غرض آرائش سے یہ ہوتی ہے کہ محتاج لوگ اس کی وسعت کو دیکھیں اور اپنی حاجت کا سوال کریں اور ایک غرض عشّاق کی آرائش سے (جیسا حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ فرمایا کرتے تھے) وہ یہ کہ اللہ میاں کو اچھا معلوم ہو اور اس سے اچھی کوئی غرض نہیں ہوسکتی۔ دکھایا بھی جائے تو اللہ میاں کو۔

اور ایک غرض مباح ہے آرائش سے وہ یہ کہ اپنے ہی نفس کو لذّت و فرحت ہو اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ یہ غرضیں صرف مال کی تو محمود ہیں اور اغراض میں سے ایک غرض مذموم بھی ہے اور وہ ریا و نمائش ہے تو جان لو کہ اوّل تو نفس ریا ہی جائز نہیں پھر کثرت چراغ کے متعلق ایک دوسرا مقدمہ اور قابل نظر ہے وہ یہ کہ معصیت کو معصیت سمجھ کر کرنا اسہل ہے اس سے کہ معصیت کو دین سمجھ کر کیا جائے تو چراغ ریا کے لئے جلائے جاتے ہیں اور ریا معصیت ہے پھر یہ لوگ اس کو دین اور ثواب سمجھتے ہیں تو کتنی سخت بات ہوئی۔ یہ قباحتیں ہیں روشنی میں علاوہ بریں اہتمام کرنے والے تو روشنی ہی میں مشغول رہتے ہیں نماز میں ان کا دل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات جسمی شرکت بھی نہیں ہوتی اُس روز کی تراویح ان کو معاف ہوجاتی ہے کہیں صفوں کے بیچ میں پھرتے ہیں کہیں ایک صف سے دوسری میں جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی گردنوں کو پھلانگے گا اس کو پل کی طرح ڈال دیا جائیگا۔ قیامت کے روز کہ مخلوق اُس پر ہو کر گزرے گی اتنے احکام کی مخالفت لازم آتی ہے۔ روشنی میں۔ میں کہتا ہوں قرآن شریف اور احادیث کے احکام کیا اس لئے ہیں کہ بت پرست اس پر عمل کریں یا نصاریٰ عمل کریں اور مسلمان اپنے ہاتھوں میں لے کر بس فخر ہی کر لیا کریں۔ کچھ بعید نہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت میں شکایت فرمادیں یارب ان قومی اتخذ وا ھذ

القرآن مہجوراً۔ قرآن کو صرف اپنے گھروں میں رکھنا اور زبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ جو کچھ اس کے اندر ہے اس کو بھی دیکھو اور دل پر اثر ڈالو اور ایک منکر ختم کے دن شیرینی کا تقسیم کرنا ہے اور اس کا منکر ہونا اگرچہ خلاف ظاہر ہے مگر سمجھائے دیتا ہوں۔ یہ مٹھائی اگر ایک شخص کی رقم سے آتی ہے تو اُس کا مقصود ریا و اشتہار و افتخار ہوتا ہے اور اگر چندہ سے ہوتی ہے تو اس کے تحصیل میں جبر سے کام لیا جاتا ہے اور جبر جیسا ایلام بدن سے ہوتا ہے ایسا ہی ایلام قلب سے بھی جب دوسرے کو دبایا شرمایا جبر میں کیا شبہ رہا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کا حکم اُسی غصب کا سا ہے جو لاٹھی کے زور سے ہو۔ اللہ میاں اُس تھوڑے ہی میں برکت دیتے ہیں جو رضا و خوشی کے ساتھ دیا جائے اس کا خیال بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں۔ اکثر مسجدوں کے لئے بھی لوگوں سے محصل کی وجاہت کے ذریعہ سے وصول کرتے ہیں پھر اُس میں بھی بعضے محض فضول زینت کے لئے جس کی مُمانعت آئی ہے اگرچہ اپنے ہی مال سے ہو۔ ہاں استحکام منع نہیں ہے مصالحہ عمدہ لگایا جائے معمار تجربہ کار ہوں، اینٹ پختہ ہو۔ آرائش بالتبع کسی قدر ہو تو مضائقہ نہیں اور اس کی تو کسی درجہ میں بھی ضرورت ہی نہیں کہ لوگوں سے غصب کر کر کے آرائش میں خرچ کیا جائے۔ مسجد چھپّر کی بھی ادائے نماز کے لئے کافی ہے بلکہ جو مقصود ہے یعنی خشوع وہ چھپّر میں پکی مسجد سے کچھ کم نہیں ہوتا بلکہ اس کے نقش و نگار میں ہی خیال بٹ جاتا ہے اور وہ اس سے محفوظ ہے تو جب اصل مقصود ہی حاصل نہ ہوا تو یہ تزئین کیا کرے گی۔ ایسا ہی حال ہے مٹھائی میں کہ اُس میں بھی کہیں جبر کہیں تفاخر ہوتا ہے اور اس کا امتحان یوں ہو سکتا ہے کہ اگر وسط صلوٰۃ میں آدمی زیادہ جمع ہو جائیں تو مٹھائی کی فکر پڑ جاتی ہے نمازیوں کو بھی اور مہتممین کو بھی۔ مہتممین کو تو اپنی آبرو کی پڑ جاتی ہے اور نمازیوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب ایک ہی بتاشہ ملے گا خشوع تو کوسوں دور گیا، مٹھائی کیا آئی کہ اتنے گناہ چپکا لائی۔ علاوہ بریں اکثر عام بے نماز لوگ آتے ہیں اور تعجب نہیں کہ بعضے جنب بھی ہوں پھر لوگ باتیں کرتے اور مغالطے دیتے ہیں اور لغویات بکتے ہیں غیبتیں کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا ظلم سمیٹتے ہیں۔ یہی حال مولود شریف کی مٹھائی کا ہے بعضے لوگ اس میں عرب کے فعل سے حجت پکڑتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اوّل تو کسی کا فعل حجت نہیں پھر تم اپنے فعل کو ان کے فعل پر قیاس بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی تو ایسی بے

تکلف عادت ہے کہ جب کچھ آدمی رہ جائیں اور مٹھائی ختم ہو جائے کہہ دیتے ہیں خلاص یعنی ہوچکی، ان کو یہاں کی طرح سے آبرو وغیرہ کی فکر نہیں ہوتی، جس کو پہنچ گئی پہنچ گئی نہ پہنچے تو کچھ خیال نہیں بس کہاں تمہارا فعل اور کہاں اُن کا فعل ؎

کار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

میں کہتا ہوں شیرینی کی ایجاد کی وجہ اصل میں اظہار مسرت ہے شکراً للہ علی حصول النعمۃ لیکن جب مباح میں ایک منکر منضم ہو جائے بلکہ مستحب میں بھی تو اُس کا ترک ضروری ہے اور اس سے تو بہتر یہ ہے کہ محتاجوں کو دے دیا جائے جو روپیہ مٹھائی میں صرف ہوتا ہے۔ محتاج کی خبر گیری بالاتفاق امر حسن ہے تمام زمانہ میں کوئی بھی اس کا مخالف نہ ہوگا اور نہ منکرات لازم آئیں گے جو نماز میں مخل تھے اور شیرینی میں فی نفسہ کچھ حرج نہیں بلکہ حرج اس ہئیت میں ہے بلکہ اس ہئیت کے ساتھ بھی فسادات دُور ہو جائیں۔ فساد لازم بھی فساد متعدی بھی، اور اس کے لئے پچاس برس سے کم میں کافی نہیں سمجھتا جب کہ اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہے اور اصلاح میں اس وقت یہ کافی نہیں کہ خاص لوگ منکرات سے بچ جاویں کیونکہ عوام اپنے فعل کے لئے اُسی کو سند گردانیں گے اور عوام سے جلدی ازالۂ منکرات کی توقع نہیں پس اس وقت اصلاح یہ ہے کہ یہ عمل بالکل ہی ترک کر دیا جائے اور پھر اصلاح عقیدہ کا سلسلہ جاری رہے۔ جب عام طور سے عقیدے درست ہو جائیں تب میں بھی اجازت دیدونگا لیکن اب تو بس ترک ہی کرایا جاوے گا غور کر لیجئے اور لا تقربوا الصلوٰۃ کا قصہ نہ کیجئے جہاں شیرینی کا جواز ہے وہاں ان منکرات کی حُرمت بھی ہے اور جب تک دونوں جمع ہیں حرمت ہی کو ترجیح ہوگی۔

منجملہ ان رسوم کے ہمارے قصبات میں ایک یہ رسم ہے کہ عید کے دن سحری کے وقت اذانِ فجر کا انتظار کرتے ہیں، اور اذان کے وقت کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو پھر کچھ کھاتے ہیں تو انکے نزدیک اب تک رمضان ہی باقی تھا شوال کی پہلی رات بھی گذر لی اور اُن کے یہاں ابھی روزہ ہی ہے۔ حدیث شریف میں تو افطر الرویۃ ہے اور ان کے یہاں ایک شب اور

گذرنا چاہیئے اور کوئی یہ نہ کہے کہ افطر الرویۃ پر عمل ہو گیا چاند دیکھ کر افطار کر لیا تھا اب رات میں کھانا نہ کھانا اور اذان کے وقت کھانا اپنا فعل ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ انکار اکل یا عدم اکل پر نہیں بلکہ یہاں عقیدے میں فساد ہے چنانچہ اس کو روزہ کھولنے سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے اور یہ زیادت فی الدین نہیں ہے تو کیا ہے، ایسے موقع پر تو بالقصد رسم توڑنے کے لئے فجر سے پہلے ہی کھانا چاہیئے۔ بعض کا خیال یوں ہے کہ عقیدہ بدل دو اور درست کر دو لیکن اعمال کے بدلنے میں عام مخالفت ہوتی ہے اگر عمل باقی رہے جو کہ مباح ہے اور عقیدہ درست ہو جاوے تو کیا حرج ہے لیکن یہ خیال غلط ہے اس لئے کہ ثابت ہوتا ہے تجربہ سے کہ جیسا کہ عقیدہ کو اثر ہے عمل میں ایسا ہی اس کا عکس بھی ہے۔ ایک مدت تک میں اس خیال میں رہا کہ علماء کیوں پیچھے پڑے ہیں نکاح ثانی کے جائز ہی تو ہے کیا کیا نہ کیا پھر سمجھ میں آیا کہ جرح صدر سے نہیں نکلتا مگر عمل کو ایک مدت تک بدل دینے سے اس لئے رسوم میں عمل کی تبدیلی بھی ضروری ہے اور میرا یہ مطلب نہیں کہ عید کی شب میں کھانا فرض ہے بلکہ اخراج جرح کے لئے ایسا کرنے سے ضرور ماجور ہوگا اس کی نظیریں حدیث شریف میں موجود ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک مرتبہ منع فرمایا۔ بعضے روغنی برتنوں میں بنید بنانے سے پھر فرماتے ہیں کنت نھتیکم عن الدباء والحنتم فانبذوا فیھا فان الظرف لایحل شیئاً ولا یحرم یعنے پہلے میں نے منع کر دیا تھا اب اس میں بنید بنایا کرو اور علت ارشاد فرماتے ہیں کہ برتن نہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے اور نہ حلال کرتا ہے پھر باوجود اس کے بھی منع فرما دیا تھا صرف وجہ یہ تھی کہ لوگ شراب کے عادی ہیں تھوڑے سے نشہ کو محسوس نہ کر سکیں گے اور ان برتنوں میں پہلے شراب بنائی جاتی تھی اس لئے خمر سے پورا اجتناب نہ کر سکیں گے اور گنہگار ہوں گے پس پورے اجتناب کا طریقہ یہی ہے کہ ان برتنوں میں بنید بنانے سے مطلقاً روک دیا جائے جب طبیعتیں خمر سے بالکل نفور ہو جائیں اور ذرا سے نشہ کو پہچاننے لگیں تو پھر اجازت دے دی جائے اسی طرح ان رسموں کی حالت ہے کہ ظاہری اباحت دیکھ کر لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں اور ان منکرات کو پہچانتے نہیں جو ان کے ضمن میں ہیں تو اس کے لئے اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ چند روز اصل عمل ہی کو ترک دیں اور یہ بات کہ اصل عمل باقی رہے اور منکرات

عام طور سے دور ہو جائیں سو ہمارے امکان سے تو باہر ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا تو ہم کیا ہیں اس کے سوا اور تدابیر اختیار کرتے پھریں اور جب ایک تدبیر عقلاً بھی مفید معلوم ہوتی ہے اور نقلاً ثابت ہو چکی تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس سے عدول کیا جائے۔

ایک رسم عید کے دن ایک کھانے کی تعیین کی ہے کہ سوئیاں ہی پکائی جاتی ہیں اس میں ایک مصلحت ہے جس کی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ہے وہ یہ کہ اس کی تیاری میں زیادہ بکھیڑے کی ضرورت نہیں اور دن عید کا کام کاج کا ہوتا ہے اور مستحب ہے کچھ کھا کر عیدگاہ کو جانا اس لئے سہل الحصول چیز کو اختیار کر لیا بعد ازاں دوست احباب کے یہاں بھیجنے کا رواج ہو گیا۔ اس کی نظیر میں تہادی الی العروس کو پیش کیا جاتا ہے یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالے عنہم سے ثابت ہوا ہے یوں کہتے ہیں کہ جیسے دولہا کے پاس خوشی کا دن دیکھ کر ہدیہ بھیجنا مستحسن ہے اسی طرح عید کا دن بھی خوشی کا ہے احباب کے پاس کیوں تحفے نہ بھیجے جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ مقیس علیہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ ہر چند کہ تہادی الی العروس فی نفسہ موجب زیادتی محبت ہے لیکن واللہ بطریق رسم بھیجنا بغض کو بڑھاتا ہے تجربہ اس پر دال ہے۔ ہاں خلوص کے ساتھ بھیجنے سے محبت بڑھتی ہے جیسا کہ دو دوست آپس میں ہدیہ کبھی کبھی بھیجا کریں اور رسم سے تو محبت بڑھتی نہیں۔ محبت اور خلوص کا جو اعلیٰ فرد ہے اس کو دیکھئے کہ رسم کو دخل دینے سے کیا حقیقت اس کی رہ جاتی ہے اور وہ فرد وہ محبت ہے جو پیر و مُرید میں ہوتی ہے کہ ایسی کہیں دو شخصوں میں نہیں پائی جاتی کہ جان سے زیادہ عزیز مرید کے نزدیک شیخ ہوتا ہے اور مال تو کیا چیز ہے اور کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں نذر گزرا کرتے ہیں اور اس سے خلوص بڑھ جاتا ہے مگر جب اسی نذر کو رسم قرار دے دیا تو دیکھ لیجئے کہ زمانہ کی پیری مریدی کا کیا حال ہے۔ خلوص تو کیسا جس جگہ پیر صاحب پہنچ گئے مرید آپ آپ کو چھپنے لگے کہ ایسا نہ ہو کہ چندہ کی فہرست آپ پہنچے دعائیں مانگنی پڑتی ہیں کسی طرح پیر صاحب جلدی ٹلیں۔ اب فرمائیے کہ فی نفسہ تو شیخ کو ہدیہ دینا موجب محبت تھا۔ یہاں موجب بغض کا ہے سے ہو گیا۔ صرف رسم سے میرے ایک دوست کا قصہ ہے کہ ایک مدت تک انھوں نے حضرت حاجی صاحب کے

پاس خط نہیں بھیجا میں نے ان سے وجہ پوچھی تو کہا بس اس عرصہ میں خالی ہاتھ تھا فکر میں ہوں کچھ روپیہ کہیں سے مل جائے تو عریضہ لکھوں۔ میں نے کہا اس خیال میں مت پڑو اب تو ضرور بلا ہدیہ خط بھیجو۔ اب دیکھ لیجئے کہ ایک عرصہ تک اس خیال نے ان کو استفادہ سے روک دیا۔ فی نفسہ حسن ہو مگر قید رسم سے قبح آ گیا۔ ایسے ہی عید کے دن کے ہدیہ ہیں اور اگر غور کیجئے گا تو ان ہدایا کو قرض پائے گا۔ کیونکہ دیتے وقت یہ ضرور نیت ہوتی ہے کہ اس کے یہاں سے بھی آئے گا اور اگر ایک مرتبہ نہ آئے تو اُدھر سے بھی بند ہو جاتا ہے اور ہدیہ کی تعریف میں بلا عوض کی شرط ماخوذ ہے پس یہ ہدیہ بھی نہ رہا پھر قرض دار ہونے سے یا قرض دار کرنے سے کیا فائدہ

حاصل یہ کہ جن اعمال میں فساد ہے ان اعمال سے اجتناب چاہیئے ذرا سی خوبی کو دیکھ کر بڑے بڑے منکرات میں پڑ جانا عقل سے بعید ہے۔ اب بیان ختم کرتا ہوں اور اصل مقصود کا خلاصہ پھر مختصراً اعادہ کرتا ہوں کہ روزہ رکھا مگر پیٹ حرام سے بھرا اور دن کو بھی غیبت وغیرہ میں مبتلا رہے تو یہ روزہ کس شمارہ میں ہے۔

حاصل یہ کہ روزہ کے آداب سیکھو اور عورتوں کو بھی سکھاؤ۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کم من صائم وقائم الحدیث یعنے بہت سے روزہ رکھنے والے اور قیام اللیل کرنے والے وہ ہیں کہ ان کی بھوک اور پیاس کی طرف اللہ میاں کو کچھ حاجت نہیں۔ اور آداب کے موافق اگر ختم کر لیا تو اُس کے حق میں فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تشفعان

یعنے روزہ نماز دونوں شفاعت کریں گے۔ پس اس شخص کے ساتھ وو محافظ موجود ہوں گے۔ عذاب سے بچانے کے لئے پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے دو محافظ سرکاری موجود ہوں کیا اسکی نجات نہ ہوگی۔ خدائے تعالےٰ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔ والسلام

تمت بالخیر

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد دوم کا

دوسرا وعظ ملقب بہ

حقوق القرآن

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمْ

دعوات عبدیت جلد دوم کا

وعظ دوم ملقب بہ

حقوق القرآن

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کون تھے تعداد تقریبی	متفرقات
مدرسہ جامع العلوم کانپور [illegible]	۱۳ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ [illegible]	//	//	ترغیب تعمیل تعلیم قرآن	حکیم محمد مصطفٰی صاحب بجنوری	//	//

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمْ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہٖ واصحابہٖ وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

یہ آیت سورۂ بقر کی ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو تلاوت

کرتے ہیں جیسا حق ہے تلاوت کا ایمان والے یہی ہیں اور جو کتاب پر ایمان نہ لائے وہ خسارہ والے ہیں۔
اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے
اس آیت میں ہر چند کہ کتاب سے مراد توریت ہے مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت کے قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے محض کتاب ہونا نہیں ہے اور چونکہ قرآن پاک افضل کتب ہے تو اس کی تلاوت اور زیادہ قابل مدح ہوگی اور اسی آیت سے اُس کی فضیلت بطریق اولیٰ ثابت ہوگئی چونکہ اس مدرسہ کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اس لئے بیان کے لئے یہ آیت زیادہ مناسب معلوم ہوئی۔ اس آیت سے قرآن مجید کے تلاوت کرنے کی اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ تلاوت بلا سیکھے ہوئے اور پڑھے ہوئے کیسے ہو سکتی ہے۔ سیکھنا اور پڑھنا اس کا موقوف علیہ ہے اور مقدمہ ضروری کا ضروری ہوتا ہے اگر آپ باورچی کو حکم دیں کہ کھانا پکا تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ہانڈی چولہے پر رکھ کر آنچ دے لا بلکہ بازار سے گوشت لا اور مصالحہ لا اور اناج لا اور پکانے کے برتن مہیا کر اور آگ جلا تب ہانڈی کو آنچ دے چنانچہ کھانا پکانے کے حکم کے بعد باورچی کا ان سامانوں میں لگا رہنا آپ کے نزدیک اور کاموں کے نہ کرنے کا عذر سمجھا جاتا ہے اور ان کاموں میں اُس کا لگا رہنا پکانے ہی کے حکم کی تعمیل سمجھا جاتا ہے اگر اناج مثلاً نہ ہو اور وہ بیٹھا رہے اور عین وقت پر عذر کرے تو یہ عذر اُس کا آپ ہرگز نہ سنیں گے کہ حضور آپ نے مجھے صرف پکانے کا حکم دیا تھا یہ نہیں فرمایا تھا کہ اناج بھی منگانا اس عذر نہ سننے کی وجہ کیا ہے یہی کہ کسی چیز کا حکم اس کے اسباب و مقدمات کا بھی حکم ہے۔
الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ (جو چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے تمام لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔)
بنا بریں تلاوت کتاب کا مطلوب ہونا اُس کے سیکھنے اور پڑھنے کا بھی مطلوب ہونا ہے جو فضیلت تلاوت کی ہوگی وہی فضیلت سیکھنے کی ہوگی۔ اور جس قدر ضرورت تلاوت کی ہوگی اسی قدر ضرورت سیکھنے کی بھی ہوگی غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری ہوا اور دیکھئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے صرف یتلون نہیں فرمایا بلکہ حق تلاوت کی قید بھی بڑھائی اور اس میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔
مثلاً ایک تو یوں کہیں کہ یہ کام کر لاؤ اور ایک یہ کہ یہ کام خوب سوچ سمجھ کر کر لاؤ۔ اس دوسرے لفظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نفس کام کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ من کل الوجوہ

مکمل نہ ہو اس سے نفس امر کی اور زیادہ تاکید ہو جاتی ہے تو آیت میں نفس تلاوت کی اور زیادہ تاکید ہو گئی۔ پھر نفسِ تلاوت میں تشدید ہو جانے سے اس کے مقدمہ یعنی سیکھنے کے حکم میں بھی تشدید ہو گئی۔ غرض قرآن شریف کا سیکھنا ضروری بلکہ نہایت ضروری ہوا۔ پھر اتنا سیکھنا بھی کافی نہیں ہوگا کہ نفس تلاوت کا ذریعہ ہو بلکہ اتنا سیکھنا چاہیئے کہ حقوقِ تلاوت ادا ہوں۔ اب سمجھئے کہ حقِ تلاوت کیا ہے ہمیشہ یاد رکھیئے کہ جس چیز کی فضیلت بیان ہو اور جس چیز کی بُرائی بیان ہو اس کی حقیقت سمجھ لینا چاہیئے۔ اگر وہ چیز اپنی حقیقت پر ہو تو قابلِ فضیلت یا برائی ہے ورنہ نہیں یہاں تلاوتِ کتاب اللہ کی فضیلت بیان ہوئی لہٰذا اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ حق سُبحانہٗ تعالےٰ نے اپنی کتاب اتاری جو مجموعہ ہے اوراد کا اور قصص اور حکایات کا اور احکام اور جامع ہے تمام بھلائیوں کو۔ قطع نظر تمام خوبیوں سے محض کلام اللہ ہی ہونا اس کا مقتضی اس امر کا ہے کہ ہم جیسے ناچیز بندوں کی اس تک رسائی بھی نہ ہوتی۔ کہاں وہ کلام مقدس کہاں ہم حقیر بندے۔ دیکھ لیجئے دنیا کے ذرا ذرا سے بادشاہوں کے دربار کی حاضری کے لئے لوگ کتنی کتنی کوشش کرتے ہیں اور عمریں گذار دیتے ہیں تب کہیں سلام کرنے کا موقع ملتا ہے اور جس کو ایک دو بات کرنے کا موقع مل گیا وہ اپنے آپ کو کتنا کچھ سمجھنے لگتا ہے اور تمام سلطنت بھر میں اس کی کیا عزت ہو جاتی ہے جب کلام شاہانِ دنیا کی یہ عزت ہے تو شاہِ شاہان اور احکم الحاکمین کے کلام کی کیا کچھ عظمت ہونی چاہیئے۔ شاہانِ دنیا کا کلام دو چار برس کی تمنا اور کوششوں کے بعد بیسر ہوتا تو کلامِ الٰہی اگر کچھ بھی نہیں تو دو چار برسوں کی محنت کے بعد تو نصیب ہونا چاہیئے مگر نہیں کس درجہ رحمت ہے اللہ میاں کی کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنی کتاب دیدی اور اذنِ عام دے دیا کہ جس کا جس وقت جی چاہے ہم سے باتیں کرے۔ پھر صرف اذن ہی نہیں بلکہ مطالبہ بھی ہے بندوں سے کہ باتیں کرو۔ اب ہم بندے اپنی ذلت اور احکم الحاکمین کی عزت کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں کہ یہ باتیں کرنیکی فرمائش کیا چیز ہے سوائے اسکے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ محض فضل ہے۔

معلوم ہو گیا کہ تلاوتِ کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے اب اس آیت میں فرماتے ہیں کہ تم ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا۔ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ترکیبًا تو اخبار ہے مگر مقصداً انشاء ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیئے کہ تلاوت

کے حقوق ادا کریں، جب تلاوت کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں باطنی اور ظاہری۔ قربان جایئے تعلیم شریعت کے اعمال میں صرف بناوٹ نہیں سکھلائی بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائے ہیں اور باطنی بھی اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا۔ مثلاً ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ کہ ان کے سامنے پستی اختیار کرو وضع میں قطع میں تکلم میں نشست و برخاست میں غرض ہر چیز میں ان سے تذلل برتو۔ کسی بات میں ان پر ترفع مت کرو۔ یہ تو حق ظاہری ہے اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے ادا فرمایا یعنی "مِنَ الرَّحْمَةِ" یعنی ان کے سامنے نری ظاہری پستی پر اکتفا نہ کرو اس کا کچھ اعتبار نہیں بلکہ اس ظاہری پستی کا منشاء رحمت ہو۔ رحمت رقت قلب کو کہتے ہیں یعنی ان کی خدمت دل سے کرو جیسا کہ ظاہر ان کے سامنے پست کیا ہے۔ باطن کو بھی پست کرو۔ دل کے اندر خشوع بھی ہو خضوع بھی ہو۔ قرآن میں کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں جاتی۔ یہی خوبی ہے کلام اللہ کی تعلیم کی کسی حکیم یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور اس پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ آگے فرماتے ہیں "وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا" (اور کہو اے پروردگار ان دونوں (یعنی والدین) کو رحمتوں سے نواز جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی) اوپر تو ان حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا علم والدین کو اور اور لوگوں کو وقت ادا ہو جائے گا اور اس میں فرما دیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو ان کو بھی دل سے ادا کرو یہاں حکم ہے کہ ان کے حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع نہ ہو قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا یعنی ان لوگوں کے لئے دعا بھی کرو۔ یہ بھی ایک حق باطنی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حق تین ہیں ظاہری اور باطنی اور ابطن اور تینوں قسم کے ادا کا حکم ہے۔ اسی طرح حق تلاوت بھی مختلف ہوتے ہیں میں اس کی ایک مثال دیئے دیتا ہوں جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائے گی۔

فرض کیجیے کہ بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دیکر کہے کہ اسکو پڑھو تو اس کی حالت پڑھنے کے وقت یہ ہو گی کہ ہر ہر لفظ کو صاف صاف پڑھے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کے ناپسند ہو اور اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا ایک تو اس خیال سے کہ عبارت کا لہجہ بلا معنے سمجھے ہوئے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ایک اس خیال سے کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو اور ایک حالت ان پڑھنے والوں کی یہ ہو گی کہ دل میں اس قانون کے

احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے دے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں بلکہ حال سے قال سے یہی ثابت کرے گا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا ہوں بس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھئے اور سمجھئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی اسی طرح کے تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور اپنے مخرج سے ادا کرنا۔ اور ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا یہ نہیں کہ خیال کہیں ہے صرف طوطے کی طرح سے لفظ ادا کر دیئے۔ یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے۔ اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت کا ادا کیا۔ غرض کل تین حق ہوئے ایک حق ظاہری یعنی تلاوت۔ دوسرا حق باطنی یعنی معنی سمجھ لینا۔ تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابطن کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ فیما بینہ و بین اللہ ہے۔ ان تینوں میں وجوداً سب سے مقدم حق ظاہری ہے۔ اور مؤکد سب سے زیادہ تیسرا درجہ ہے یعنی عمل۔ ان دونوں میں حقیقت اور صورۃ کا فرق ہے اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے اسی وجہ سے صورت مقدم ہوتی ہے اور ضروری دونوں ہیں۔ پس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت کے عاطل غرض ثابت ہوا کہ عمل بھی ایک حق ضروری ہے یہ نہیں کہ محض مرتبہ مستحب ہی میں ہے دیکھئے اللہ میاں نے آگے فرما دیا اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ جو لوگ تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی کامل انہیں کا ہے پس عمل موقوف علیہ ہے کمال ایمان کا اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے ضرور عمل بھی واجب ہوگا۔ کمال ایمان کا وجوب اس آیت میں صاف مصرح ہے یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (اے ایمان والو خدا سے ڈرو جیسے کہ ڈرنا چاہیئے) اس میں صیغہ امر کا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ آیت اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ دوسری آیت فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو) سے منسوخ ہے تو سمجھ لیجئے کہ نسخ فرع ہے تعارض کی اور ان دونوں میں خود تعارض نہیں بلکہ دوسری آیت پہلی کی موضح ہے کیونکہ جب فَاتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ اتری تو صحابہؓ کو شبہ ہوکہ امر گا ہے فور میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں کہیں یہ ہی مراد نہ ہو اور ایسے امر عظیم میں فور دشوار تھا اس لئے دوسری آیت میں مراد بیان

فرمادی کہ تکلیف بقدر استطاعت ہے تدریجاً مامور بہ کو حاصل کرلو۔ اس کو بعض روایات میں نسخ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ سلف کی اصطلاح اس لفظ میں اصطلاح مشہور سے عام تھی اور چند کہ امر سے فور کا مفہوم ہونا موقوف قرینے پر ہے لیکن صحابہؓ کو بوجہ غلبۂ خشیت کے اس کا احتمال ہوا کسی نے خوب کہا ہے ؎

با سایہ ترا نمے پسندم عشق ست و ہزار بدگمانی

(یعنی یہ بات مجھے گوارا نہیں کہ تو اپنے سایہ کے ساتھ ہی کھڑا ہو کیونکہ عشق و محبت میں ہزاروں بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں)

اس توجیہہ سے دونوں آیتوں میں تطبیق ہوگئی اور نسخ لازم نہ آیا۔

غرض حق تلاوت کا تیسرا درجہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔ ہاں وجوب فی الفور نہیں تدریجاً ہے مسلمان ہوتے ہی یہ فرض نہیں ہو جاتا کہ جملہ فروعِ ایمان پر بھی عبور ہو جائے اور نہ یہ فرض ہو جاتا ہے کہ قرآن شریف کے تینوں حق فوراً ہی ادا کرے بلکہ مہلت دی گئی ہے کہ اس میں سیکھ لینا چاہیئے۔ البتہ یہ جائز نہیں کہ بالکل بیٹھ رہے اور کمال کی طرف توجہ نہ کرے۔ غرض حق ظاہری تو یہ ہے کہ ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ترتیل کی یہ تفسیر منقول ہے۔ تَجْوِیْدُ الْحُرُوْفِ وَمَعْرِفَۃُ الْوُقُوْفِ ترتیل اس کو کہتے ہیں۔ پھر ہم آجکل کی حالت دیکھتے ہیں کہ ہمارے امام جن کو بڑی بڑی جماعت ہیں سے منتخب کر کے مقرر کرتے ہیں وہ بھی قرآن صحیح نہیں پڑھتے۔ اس سے تمام مسلمانوں کے پڑھنے کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب امام لوگ جو اقل النّاس اور منتخب ہیں وہی غلط پڑھتے ہیں تو عام لوگ کیا صحیح پڑھتے ہوں گے۔ اس ظاہری حق کے ادا کی یہ کیفیت ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترتیل سکھائی ہے اور وہی آج تک چلی آرہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھلانا باری تعالےٰ کی تعلیم ہے اسی کو کہا ہے ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(یعنی ان کا کلام خدا ہی کا کلام ہے اگرچہ (بظاہر) خدا کے بندے کی زبان سے ادا ہو رہا ہے)

اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی یعنے آپ کی زبان سے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں نکلتی۔ اس دلیل سے ترتیل باری تعالےٰ کی سکھلائی ہوئی ٹھہری پھر اس

نعمت عظمیٰ کی کیا یہی قدر ہے کہ اس کو اس طرح سے غارت کیا جائے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو تو اس کا اہتمام کہ حدیث میں ہے لا یزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خذلھم میری امت میں ایک گروہ حق پر ہمیشہ کامیاب رہے گا کہ اس کو کسی کے ساتھ چھوڑ دینے سے نقصان نہ پہنچے گا اس گروہ میں تمام وہ لوگ داخل ہیں جو دین کی کسی قسم کی علمی یا عملی خدمت کر رہے ہیں اسی میں علوم قرآن کی خدمت بھی آ گئی پس اس میں ضمانِ قرآن کے قائم رکھنے کا وعدہ ہے اور خود قرآن میں بھی وعدہ فرمایا گیا ہے وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ کہ ہم خود اس کے محافظ ہیں اور یہ بدیہی بات ہے کہ اللہ میاں نے کسی تالے میں بند کر کے تو اس کی حفاظت کی نہیں۔ اللہ میاں کی حفاظت کی صورت یہی ہے کہ اپنے چند بندوں کو اس کام پر تعینات رکھیں گے۔ معلوم ہوا کہ ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا کہ تصوف پڑھے پڑھائے گا اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ فقہ سکھائے گا اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ حدیث شریف کی خدمت کرے گا اور ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ تفسیر کا مشغلہ رکھے گا اور ان کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی رہے گا کہ قرآن شریف پڑھے گا۔ اور قرأت کا محافظ ہوگا۔ غرض حق سبحانہٗ تعالیٰ کو تو اس کا اتنا اہتمام اور اُن کے بندوں کو اتنی بے پروائی کہ مسلمانوں میں فی ہزار بھی ایک قاری نہیں افسوس کہ اس طرف توجہ ہی نہیں رہی اور اگر کوئی توجہ بھی کرتا ہے تو اس کی بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے کہ ضاد اور ظاد کا مباحثہ شروع کر دیا اس میں رسالے لکھے جا رہے ہیں۔ اور کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں علماء کے پاس استفتے بھیجے جاتے ہیں اور اکثر تو یہی دیکھا ہے کہ اکثر اس پوچھنے سے اصلی غرض صرف اپنی بات اونچی کرنی ہوتی ہے۔ تحقیق کسی کو مقصود نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے جھگڑے کرنے والے دور ہی سے استفتے بھیجتے ہیں یہ توفیق نہیں ہوتی کہ تھوڑا خرچ گوارا کر کے دونوں کسی ماہر کے پاس چلے جائیں اور اس حرف کو صحیح طور پر سیکھ لیں۔ میں کہتا ہوں اس استفتے کے جواب میں مجیب کیا لکھے گا سوائے اس کے کہ مخرج بیان کر دے۔ سو یہ تو کتابوں میں بھی لکھا ہے پھر جو اختلاف اور نزاع باوجود کتاب میں مخرج لکھے ہونے کے ہوا ہے وہی اس فتوے کے بعد بھی ہوگا کیونکہ مفتی ضاد کی صورت کو کاغذ پر نہیں لکھ سکتا۔

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید   لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

(یعنی اگر یہ تسلیم کرلیں کہ مصوّر اس دلبر کی تصویر (واقعی) اتارے گا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ اس کے ناز و ادا کی عکاسی کیسے کرے گا)

علم موسیقی اور قرأت میں تو سننے ہی کی ضرورت ہے لکھ بھیجنے سے کیا ہوتا ہے صوت کی صورت کاغذ پر کیسے آسکتی ہے۔ بعض لوگ فن قرآت کو حاصل نہ کرنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم قاری تو ہونے سے رہے پھر اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ کام ہو تو پوری طرح ہو اور نہیں تو چھیڑنا فضول۔ صاحبو! یہ محض حیلۂ نفس ہے مانا کہ قرأت میں عاصمؒ اور حفصؒ نہیں ہو جاؤ گے تو اچھا فقہ میں بھی ابو حنیفہ نہیں ہو جاتے پھر فقہ کیوں پڑھتے ہو اور دنیا میں بھی تو ہر شخص بادشاہ نہیں ہو جاتا پھر دنیا کی طلب کیوں کرتے ہو۔ اس میں یہ قاعدہ جاری نہیں کرتے کہ کام ہو تو پوری طرح ہو ورنہ چھیڑنا فضول ہے۔

صاحبو! قرأت میں عاصمؒ اور حفصؒ ہونے کی اور فقہ میں ابو حنیفہؒ ہونے کی تکلیف آپ کو نہیں دی جاتی صرف اس قدر تکلیف دی جاتی ہے کہ بقدر وسع کوشش کرو اور بقدر ضرورت قرآن شریف کو صحیح کرلو۔ اگر آپ اپنی حیثیت کے موافق کوشش کریں تو قدر ضروری تو حاصل ہو جائیگا بالفرض اگر کوشش پر کامیابی بھی نہ ہو تب بھی کچھ غم نہیں اللہ میاں کے ہاں تو زمرۂ قراء میں لکھ لئے جاؤ گے۔ کسی کا قول ہے ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم   کہ من نیز از خریدارانِ اویم

(یہ ہی ہمارے لئے بہت ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اسی کے ساتھ ہوں اور میں خریداروں اور طلب گاروں میں سے ہوں)

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا کہ فرماتے تھے طلب مقصود ہے وصول مقصود نہیں اور ظاہر بھی ہے کہ اللہ میاں نے تکلیف مالایطاق نہیں دی۔ صرف امور اختیاریہ کی تکلیف دی ہے اور مقصود تک پہنچ جانا بندے کے اختیار میں ہے نہیں تو اس کی تکلیف کیوں ہوگی کیا اچھا کہا گیا ہے ؎

گر مرادت را مذاقِ شکر است   بےمرادی نے مرادِ دلبر است

اور صاحبو ضروری قرأت کچھ مشکل بھی تو نہیں کل اٹھائیس حرف ہیں اگر ایک ایک دن میں ایک ایک حرف سیکھے تب بھی اٹھائیس دن میں بقدرِ ضروری قاری بن سکتا ہے مگر بات یہ ہے کہ شیطان نے رہزنی کر رکھی ہے۔ جب کوئی اس کا ارادہ کرتا ہے تب ہی وہ کہہ دیتا ہے میاں قرأت کہیں تمہارے بس کی ہے۔ جب کسی سے کہا جاتا ہے قرآن شریف صحیح کرو تو کہتے ہیں ہم بڈھے طوطے ہیں اب ہماری زبان کہیں ٹوٹ سکتی ہے۔ اچھا صاحب، آپ تو بڈھے طوطے ہیں بھلا اولا دنے کیا قصور کیا ان کو کیوں نہیں سکھاتے۔ یاد رکھو جیسے اولاد کے اور حقوق آپ پر ہیں ویسے ہی یہ بھی حق ہے اگر آپ نے یہ حق ادا نہ کیا اور وہ تمام عمر قرآن شریف غلط پڑھتے رہے تو اس کی جواب دہی آپ کے ذمہ ہوگی۔ لیکن قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں قرأت تو درکنار اس کا تو پڑھنا بھی بہت کم ہوتا جاتا ہے۔ بعضے کہتے ہیں اس سے دماغ خراب ہوتا ہے انگریزی کے قابل نہیں رہتا۔ بعض کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب سمجھ میں نہ آیا تو نرے پڑھنے سے کیا فائدہ میں کہتا ہوں کیا فائدہ سمجھنے ہی میں منحصر ہے۔ بس فائدے کا یہ ایک ہی مصداق ہے کیا اور کوئی مصداق نہیں۔ یاد رکھو اس کے بلا سمجھے ہوئے پڑھنے میں بھی فائدہ ہے اور وہ فائدہ یہ ہے جس کی خبر حدیث میں ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ کیا نیکیاں ملنا فائدہ نہیں اور دوسرا فائدہ وہ ہے جو دوسری حدیث شریف میں ہے ما اذن اللہ لشیٔ ما اذن لنبي يتغنى بالقرآن۔ یعنی اللہ میاں کسی چیز کو ایسا کان لگا کر نہیں سنتے جیسا کہ قرآن شریف کو سنتے ہیں جب کہ اُس کو نبی خوش آوازی سے پڑھتے ہوں اس میں نبی کی تخصیص اتفاقی ہے اور تغنّی کی تفسیر خود روایات میں آئی ہے کہ خشوع سے پڑھتا ہو تو کیا خدا تعالیٰ کا متوجہ ہونا بندہ کی طرف یہ فائدہ نہیں ہے۔ ایک قصّہ یاد آیا میرے مرشد علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ ایک بار دہلی میں ایک دُکان پر گذر ہوا تو کیا دیکھتے ہیں ایک ہجوم ہو رہا ہے اور درمیان میں ایک شخص بیٹھا ہوا رسالۂ دردنامہ جو حضرت مرشد کا کلام ہے ذوق و شوق سے پڑھ رہا ہے حضرت بھی اس کو سننے کو کھڑے ہو گئے۔ اور خوش ہوئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ایکبار پانی پت کو جاتے ہوئے راہ میں پیش آیا۔ غرض قاعدہ یہ ہے کہ مصنّف جب کسی اپنی تصنیف

پڑھتے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ قرآن شریف کیا ہے حق سبحانہ کی تصنیف ہے جب یہ پڑھا جاتا ہے تو حق تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں کہ میرا بندہ میری تصنیف پڑھ رہا ہے اگر کچھ بھی نہ ہو تو یہ کیا کم ہے کہ اللہ میاں کی خوشنودی ہوتی ہے۔

ذرا ذرا سے حکام کی خوشنودی کے لئے لوگ کیا کیا کلفتیں گوارا کرتے ہیں اور کتنے کتنے خرچ کے متحمل ہوتے ہیں کہیں ڈالیاں بھیجی جاتی ہیں کہیں دعوتیں ہوتی ہیں اپنے بہت سے کام حرج کئے جاتے کیا حق سبحانہ تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں۔ اس غلطی میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں کہ فائدہ کو منحصر جان لیا ہے معانی کے سمجھنے میں اسی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ بچوں کو قرآن شریف پڑھانے سے کیا فائدہ بس پڑھانا ہی چھوڑ دیا۔ اگر کسی نے پڑھا بھی۔ لیکن حفظ کرنے کا رواج چھوڑ دیا حالانکہ صرف ناظرہ پڑھا ہوا قرآن شریف بلا حفظ کے اگر چند روز کو چھوٹ جائے تو پھر دیکھ کر بھی پڑھنا مشکل ہے۔ غرض ہر طرح سے قرآن شریف کو چھوڑ دیا اور اکثر دیکھا ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر لوگ وظیفوں پر مرتے ہیں کوئی کہتا ہے تسخیر کا کوئی عمل بتایئے کوئی کہتا ہے دستِ غیب کی ترکیب بتا دیجئے۔ کوئی کہتا ہے اولاد ہونے کے لئے کوئی نقش کر دیجئے۔ غرض وظیفوں کو بہت سہل پا لیا ہے ساری دنیا کے کام وظیفوں ہی سے بیٹھے بیٹھے ہو سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہی بات ہے تو کھاؤ پیو بھی مت نکاح بھی نہ کرو نوکری چاکری کے جھگڑے میں بھی مت پڑو وظیفوں ہی سے پیٹ بھی بھر جائے گا اور انہیں سے اولاد بھی ہو جائے گی اور انہیں سے گھر بیٹھے روپے مل جایا کریں گے آپ یہ کہیں گے کہ اللہ میاں کے نام میں تو بڑے بڑے اثر ہیں۔ اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ غور کر کے دیکھ لیجئے آج کل وظیفوں کی طرف زیادہ میلان کا سبب اللہ میاں کے نام کی عظمت نہیں ہے بلکہ اس کا سبب صرف کم ہمتی ہے جو لوگ اپنی عمر ابتداء میں لہو و لعب میں برباد کر دیتے ہیں۔ جب بار اپنے سر پر پڑتا ہے اس وقت حسرت و ندامت ہوتی ہے کہ اس عمر میں کوئی بھی کمال حاصل نہیں کیا جواب کام دنیا اور ضرورت سر پر آ ہی پڑتی ہے اس لئے چاروں طرف نظر دوڑتی ہے اور ہر کام مشکل اور اختیار سے خارج نظر آتا ہے بس اگر کوئی چیز سہل اور اپنے اختیار میں دیکھ پڑتی ہے تو وہ عمل ہے کہ اس میں نہ کسی کی خوشامد ہے نہ کوئی امتحان دینا ہے نہ کچھ خرچ

ہے زبان کا کام ہے۔ تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ بس یہ وجہ ہے عمل کی طرف میلان کی اور اگر اس کی وجہ عظمت اسم اللہ ہوتی تو سب سے بڑا وظیفہ اور سب سے مفید عمل وہ سمجھتے جس کو اللہ میاں نے نازل فرمایا یعنی قرآن پاک شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ اور رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ خود باری تعالیٰ ہی نے اس کی شان میں فرمایا ہے۔ مگر نہیں فی الحقیقت وجہ وہی ہے جو میں نے عرض کی اسی واسطے اُن عملیات سے بھی اجتناب نہیں ہوتا جو خلاف شرع ہیں۔ خوب یاد رکھئے کہ عملیات میں زیادہ پڑنے میں بہت سے مفاسد ہیں جس کو دست غیب کہتے ہیں۔ اس طریق سے روپیہ حاصل کرنا حرام ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ اس عمل کی حقیقت یہ ہے کہ جن تابع ہو جاتے ہیں اور وہ روپیہ چرا چرا کر لا دیتے ہیں یہ ایسا ہے کہ جیسے چند بدمعاش کوئی نوکر رکھ لے اور اُن سے چوری کرایا کرے۔ اور اگر کوئی ایسا عمل ہو کہ اس میں وہ اپنے ہی پاس سے لاتے ہوں تو یہ جبر اور غصب ہے کہ ان کا مال جبراً عامل لوگ لے لیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے عملیات میں خرابیاں ہیں سب سے بہتر اور سہل عمل تو دُعا ہے اسے کیوں نہ اختیار کیا حق تعالیٰ کی اجازت ہے کہ جس کام کے لئے چاہو دعا کرو (بشرطیکہ وہ کام ناجائز نہ ہو) بلکہ دُعا نہ کرنا باعث عتاب ہے۔ اگر وظیفوں ہی کا شوق تھا تو قرآن شریف پڑھ پڑھ کر حق تعالیٰ سے دُعا مانگی ہوتی۔ سب سے بڑا وظیفہ یہ تھا جس میں کوئی محذور لازم نہیں آتا مگر افسوس جو لوگ کہ قرآن شریف بھی پڑھتے ہیں اُن کی نیت درست نہیں ہوتی۔ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں مسجد میں قضائے حاجت کر رہا ہوں۔ یہ خواب ایک بزرگ سے بیان کیا فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے تم کوئی عمل دنیا کے لئے مسجد میں پڑھتے ہو۔ غرض ہر کام کے لئے وظیفوں کو بہت سہل پالیا ہے اس کی وجہ صرف کم ہمتی ہے دنیا کے لئے بڑی ہمت کی تو وظیفے پڑھ لئے اور دین کے لئے ہمت کی تو کہتے ہیں صاحب کچھ سینے میں سے دلوا دیجئے۔ سینہ کوئی خرجین ہے کہ اس میں ہاتھ ڈالا اور جو چاہا نکال کر دیدیا اور اگر دیا بھی جائے تو اسے رکھے گا کون جو چیز بے محنت ملتی ہے اُس کی قدر نہیں ہوتی ؎

ھر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص نا دہد

(یعنی جو شخص آسانی وارزانی سے کوئی چیز حاصل کرتا ہے اسے اونے پونے دوسرے کے ہاتھ فروخت بھی کر دیتا ہے دیکھتے نہیں اگر بچہ کو کوئی موتی پا جائے تو وہ ایک روٹی کے بدلہ دوسرے

کو دے دے گا)

جو طریقہ ہے حاصل کرنے کا اس طرح حاصل کرو۔ دنیا حاصل کرو تدبیر مشروع سے دین حاصل کرو علم و عمل سے جس کی اصل اعظم قرآن ہے جس کو چھوڑ ہی دیا۔ ایک اس کام کیلئے قرآن شریف رہ گیا ہے کہ جب کسی کے یہاں بچہ ہوا تو اس میں سے نام نکال لیا کہ سات ورق اُلٹ کر ساتویں سطر میں دیکھ لیا اگر شروع میں الف ہوا تو اللہ بخش اور خ ہوا تو خدا بخش اور ر ہوا تو رمضان اور ع ہوا تو عبدو نام رکھ لیا کہ بڑا متبرک نام ہے اللہ میاں کے کلام میں نازل ہوا ہے۔

ایک اس کام کے لئے رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرا تو تیجہ میں پڑھوا دیا۔ مُٹھی مٹھی بھر چنوں کے لالچ میں کیسی گت قرآن شریف کی بنتی ہے۔ بہت سے پڑھنے والے بے وضو ہوتے ہیں۔ بہت سے صرف پابندیِ رسم کی نیت سے شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نہ آئے تو شکایت ہوتی ہے اور اگر آجائے اور عُذر کر کے چلا جائے تو شکایت نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ پڑھنا غرض نہیں صرف رفع شکایت منظور ہے۔ بہت جگہ نقد اُجرت دے کر پڑھوایا جاتا ہے حالانکہ اُجرت علی العبادۃ حرام ہے۔

آپ شاید کہیں گے کہ یہ مولوی لوگ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ بعض اوقات آپ بھی تو نماز سے منع کرتے ہیں حالانکہ افضل اعمال ہے۔ میں آپ سے استفتاء کرتا ہوں کہ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور حیض سے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور جنابت کے ساتھ نماز پڑھنا کیسا ہے؟ سب کا جواب یہ ہے کہ لا یجوز لا یجوز ۔ میں کہتا ہوں آپ نماز سے منع کرتے ہیں۔ بس ایسے ہی ہم بھی رسموں سے منع کرتے ہیں۔ جانتے سب ہیں کہ رسموں میں یہ یہ خرابیاں ہیں مگر کسی بات کا رواج پا جانے کے بعد چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ نیز رسموں میں ظاہری رونق بھی ہے۔ اور ان کے چھوڑنے سے سادگی رہتی ہے اسی لئے بھی چھوڑنا مشکل ہے شادی میں ناچ گانا نہ ہو کہتے ہیں چلو بھائی چنے پڑھ آویں یہ اللہ والوں کی شادی ہے یہ خطاب ہم کو تو بسر و چشم قبول ہے ؎

؎ جائز نہیں جائز نہیں۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(اگر حاجت مند اور دیوانہ نظر آتے ہیں تو کیا ہوا ہمارے لئے یہ ہی بات انتہائی قابل فخر ہے کہ ہم ساقی الست کہ نگاہ کیف بار کے امّید وار اور پیمانہ شریعت کے جرعہ نوش ہیں۔

اور آپ کے اس طعن کا جواب اور بھی ہے مگر تہذیب سے خارج ہے میں دینا نہیں چاہتا بلکہ بجائے اُن لوگوں کو جواب دینے کے اپنے ہی لوگوں کو کہتا ہوں کہ منکرات کو منع تو کریں مگر اس طرح کہ نفسانیت کو دخل نہ ہونے پائے۔ پھر انشاء اللہ ضرور اثر ہوگا۔ کسی پر انکار کرنے کا مضائقہ نہیں ہاں اتنا ہو کہ خلوص ہو ہم میں یہ مرض ہو جاتا ہے کہ تقویٰ کی صورت میں نفسانیت کو ادا کرتے ہیں۔ علماء کو چاہیئے کہ اس سے محفوظ رہیں۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ جس طرح منع کرنے والے تقوے کی صورت میں نفسانیت کو برتتے ہیں اسی طرح تداعی الی الخیر میں خوشامد کی جاتی ہے۔ مدرسے میں جس کا چندہ داخل ہے۔ اس کا مدرسین اور طلبہ سب دباؤ مانتے ہیں سلام اور مزاج پُرسی کے لئے جاتے ہیں بات بات پر ان کی بے جا مدح کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس خوشامد کی ضرورت نہیں۔ یہ کچھ مدرسین کا ذاتی کام تو نہیں ہے یہ کام تو ہو ہی گا یہ نہ کریں گے کوئی اور کرے گا وہ نہ کریں گے کوئی اور کرے گا۔

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ علماء کو استغنا برتنے کی ضرورت ہے کسی کی خوشامد کی ضرورت نہیں کوئی اس خیال میں نہ رہے کہ ہم ہاتھ کھینچ لیں گے تو یہ کام بند ہو جائے گا۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ۔ اگر تم مُنہ پھیرو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم کو کھڑا کریں گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ علماء کو احتیاج نہیں ہاں اس احتیاج کے کسی کے سامنے لے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام دین کا ہے اور دین کے اللہ میاں کفیل ہیں۔ میں بدخلقی نہیں سکھاتا ہوں خُلق ضروری چیز ہے اور ہر شخص سے نرمی کے ساتھ پیش آئیں مگر ان کے اموال پر نظر نہ رکھیں اور کسی خاص شخص کی اعانت کو دین کا موقوف علیہ نہ سمجھیں۔ البتہ ترغیب اور اظہارِ ضرورت کا مضائقہ نہیں یہ طریقہ مسنون ہے۔

اس میں راز یہ ہے کہ فی الحقیقت کام کے کفیل اللہ میاں ہی ہیں اور ظاہری صورت اس کی تکمیل کی یہ رکھی گئی ہے کہ چند بندے ایک دوسرے کی اعانت کریں اور اسکو انجام دیں۔

اگر بندوں کو اطلاع نہ ہوگی تو وہ کیونکہ شریک ہوں گے۔ یہ ضرورت اُن کو اطلاع کرنے کی ہے اطلاع نہ کرنے میں صوزتاً کام کو بگاڑ دینا ہے اور خوشامد کرنے میں بندوں پر تکیہ لازم آتا ہے اس میں حقیقتاً کام کو بگاڑنا ہے۔ اس وجہ سے خوشامد سے منع کیا جاتا ہے غرض محض اگر کوئی ظاہراً معین ہوتا ہے وہ اعانت بھی درحقیقت کارساز حقیقی ہی کی اعانت ہے ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اماعاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئی چیں لبستہ اند

(یعنی درحقیقت مشک جیسی خوشبودار شئے تیری زلف نکہت بیز ہی کی پیداوار ہے۔ عاشقوں نے تو کسی مصلحت کے پیش نظر آہوئے ختن کی جانب غلط نسبت کردی)

اس لئے کہا جاتا ہے کہ خوشامد نہ کرو اور یہ بدخلقی نہیں۔ بدخلقی اور چیز ہے اور استغنا اور چیز۔ بدخلقی تو دوسرے کے حقوق کا ادا نہ کرنا ہے اور استغنا اپنے حقوق دوسرے کے سامنے نہ لے جانا۔ آج کل اس کی احتیاط بہت کم لوگ کرتے ہیں اپنی احتیاج لوگوں کے سامنے لے جاتے ہیں اور اس کا بھی لحاظ نہیں رکھتے کہ وہ لوگ اس کے اہل میں نہیں بہت سے اُمرا فاسق وفاجر ہوتے ہیں۔ ان اہل غرض کو اُن کا فسق وفجور دیکھنا پڑتا ہے اور چونکہ حاجت مند بن کر گئے ہیں۔ کان نہیں ہلا سکتے۔ یاد رکھو کہ باوجود قدرت کے منکر کی تغییر نہ کرنا اور سکوت کرنا اس میں شامل ہونا ہے حدیث شریف قصہ آیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ایک گاؤں کی نسبت حکم ہوا کہ اس گاؤں کو الٹ دو عرض کیا کہ یا اللہ اس میں ایک ایسا آدمی بھی ہے جس نے کبھی گناہ نہیں کیا، کیا مع اُس کے الٹ دوں حکم ہوا ہاں اگرچہ اُس نے گناہ نہیں کیا۔ لم یتمعر فی وجہہ قط۔ یعنی ہماری نافرمانی کو دیکھتا تھا اور کبھی اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑتا۔ یہ وبال ہے منکر پر سکوت کرنے کا۔ اس پر بعض پڑھے لکھے لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ سکوت میں مصلحت ہے اس سے چندہ لیتا ہے۔ کیوں صاحب کیا اس کے چندے پر اللہ میاں کا کام موقوف ہے۔ اللہ میاں خود ذمہ دار ہیں۔ چھوڑ و مصلحت کیا ہے ؎

خلیل آسا دُرِ ملکِ یقیں زن صدائے لا اُحِبُّ الاٰفِلِیْن زن

(یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مانند عزم ویقین کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے نعرہ لا احب الاٰفلین بلند کر)

ان کے کام تو اللہ میاں بناتے ہیں یہ اللہ کا کام کیا بنائیں گے؟ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ علماء کو استغناء کی ضرورت ہے اسی کو چھوڑ کر اپنی وقعت کھو دی ہے اور طرح طرح کی خرابیاں مول لے لی ہیں جب اہل دنیا ان سے کھنچتے ہیں تو یہ کیوں ان کی طرف جھکیں۔

میں نے مولویوں کو خطاب کیا حالانکہ وہ خود زیادہ جانتے ہیں اس واسطے کہ اسکی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مولویوں کو چاہیئے کہ اہل دنیا سے استغنا برتیں ہاں اس کی بنا نفسانیت اور ترفع نہ ہو اور اپنے کام کو خلوص سے کریں اور کسی کو دخل نہ دیں۔ دخل نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی قاعدے کے بھی پابند نہ ہوں بلکہ ان قواعد کے انضباط میں ہر کس و ناکس کی رائے محض اس وجہ سے کہ چندے میں شریک ہے لینے کی ضرورت نہیں آج کل یہ بھی ایک خبط ہو گیا ہے کہ ہر چندہ دینے والے کو یہ حوصلہ ہے کہ میری رائے کیوں نہیں لی جاتی میں انضباط قواعد کا راز بتائے دیتا ہوں جس سے انشاء اللہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ہر شخص کی رائے لینا کیوں مناسب نہیں۔ سنیئے دو قسم کی چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک آلات و ذرائع۔ دوسری مقاصد۔ مقاصد مقصود بالذات ہوتے ہیں اور آلات صرف مِنْ جِهَتِهِ الْإِيصَالِ إِلَى الْمَقْصُوْدِ مقصود ہوتے ہیں خود مقصود نہیں ہوتے۔ اب میں کہتا ہوں کہ مدرسوں کے لئے جو قواعد ضبط کیئے جاتے ہیں یہ قواعد مقاصد نہیں ہیں۔ یہ صرف اس واسطے ہیں کہ درس کا انتظام رہے تو گویا یہ درس کے لئے آلات ہیں اور مقصود اصلی درس ہے۔ اب میں ایک مثال میں پوچھتا ہوں کہ بڑھئی کا کام جاننے والا بڑھئی کے اوزاروں کی تعداد اچھی طرح جان سکتا ہے یا کوئی بہت پڑھا لکھا قابل آدمی۔ اس کا جواب یہی ہے کہ بڑھئی ہی جان سکتا ہے۔ بس افسوس ہے کہ بڑھئی کے آلات کے انتخاب کے لئے تو بڑھئی ہی کی ضرورت ہے اور دیگر بڑے علوم کی قابلیت کچھ کام نہیں آتی اور علم دین کے آلات کے انتخاب کیلئے علماء کی ضرورت نہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے علم اور پیشہ کی قابلیت اس میں رائے دینے کے لئے کافی ہے۔ علماء کو انکے کام میں ان کی رائے پر چھوڑ دو وہی درس کرتے ہیں اور وہی اس کے ضروریات کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ تم ان سے یہ کام لو پڑھنے کا طریقہ سیکھو دین کی جو باتیں بتائیں اس کے موافق عمل کرو۔ جس طرح قرآن شریف پڑھائیں اس طرح پڑھو۔ جو جو حق اس کے بتائیں ان

کو ادا کرو۔

ایک کام عورتوں نے قرآن شریف سے یہ لیا کہ چادر میں رکھ کر دو عورتوں نے اس چادر کو پکڑ لیا اور بچے کو اس کے نیچے سے نکال دیا کہ اس سے جملہ بلاؤں کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ اب نہ اُس پر جادو چل سکتا ہے نہ نظر لگ سکتی ہے اور نہ کوئی اور آفت آسکتی ہے یوں کہتی ہیں کہ اللہ میاں کے نام کی برکت سے جو کچھ ہو کم ہے جیسے دعائے گنج العرش جو کوئی بازو پر باندھ لے نہ اُس پر تلوار اثر کرے نہ پانی میں ڈوبے نہ آگ میں جلے نہ سولی پر چڑھے۔ دعائے گنج العرش باندھ کر چوری کیا کرو، خوب بیدھڑک ہو کر جو چاہو سو کیا کرو کیونکہ کوئی آفت تو آنے ہی کی نہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

ایک کام قرآن شریف سے چھاپہ خانہ والوں نے لیا کہ اُس کو فوٹو کے ذریعے سے اتنا چھوٹا کر لیا کہ بلا شیشے کے پڑھا نہیں جا سکتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھوٹا قرآن شریف ایک شخص کے پاس دیکھا تو اُس کو دُرّے سے مارا کہ قرآن شریف کی توہین کرتا ہے اور فرمایا کہ ایک ایک حرف الگ لکھو اور صاف صاف چمکتا ہوا لکھو۔ اور اس کو بڑا کمال سمجھ کر شائع کیا جاتا ہے کہ لو اب تو تمام عملیات اور تعویذوں کا اصل اصول ہی ایک تعویذ کی صورت میں آگیا ہر شخص کو بازو پر باندھنا چاہیے؛ یہ گت بنی قرآن شریف کی کہ تماشے کے طور پر شیشے سے دیکھا جا رہا ہے اور جب تمام عملیات کا اصل اصول ہی پاس ہے تو کسی آفت کا خوف نہیں رہا اعمال سیّئہ کی جرأت بڑھ گئی۔ گھر میں بیٹھے ہیں تب بازو پر بندھا ہے پیخانے میں ہیں تب پاس ہے۔ عورت کے پاس جائیں تب ساتھ ہے جنابت کی حالت میں ہوں تب لئے ہوئے ہیں یہ حق قرآن شریف کا مطبع والوں نے ادا کیا۔ حضرت قرآن شریف وہ چیز تھی کہ دروازے سے آتا ہوا دیکھتے تو ہیبت ہوتی بے اختیار کھڑے ہو جاتے نہ یہ کہ شیشے سے اس کا تماشا بنائیں۔ بس میں جیسے کہ دلی تعظیم اور توقیر کو دخل ہے جسامت کو بھی دخل ہے۔ بڑی چیز کو دیکھ کر خواہ مخواہ بھی قلب میں ایک اثر ہوتا ہے۔

ایک کام قرآن شریف سے یہ لیا گیا کہ فوٹو گراف میں سُورتیں بند کی جاتی ہیں اور دو دو پیسے لے کر سنائی جاتی ہیں۔ یہ اس آیت پر عمل ہے لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا اللہ میاں کی آیتوں کی یہ قدر کہ کوڑیوں پر بازاروں مارے پھریں فقہا اس میں زیادہ کلام کر سکتے ہیں میں تو کچھ جانتا نہیں ہوں۔ اتنی بات تو ظاہراً معلوم ہوتی ہے کہ یہ محض لہو ولعب ہے جہاں کسیوں

کے راگ بھرے ہوئے ہیں قرآن شریف بھی ہے تاکہ جو لوگ راگ گانے سے احتیاط کرتے ہیں وہ اس ذریعے لہو میں شامل ہوں۔ کہاں کسبیوں کے راگ اور کہاں قرآن پاک جہاں برہمن وہیں قصائی۔ غرض قرآنِ پاک سے بجائے اس کے کہ اسکو پڑھا جاتا اور قرأت سیکھی جاتی آج کل یہ کام لئے جاتے ہیں اور قرأت کو بہت مشکل سمجھ رکھا ہے حالانکہ بقدرِ ضرورت صحت کے لئے صرف اٹھائیس دن کی محنت کی ضرورت ہے جیسا کہ میں اُوپر عرض کر چکا ہوں اور کمال بھی کچھ مشکل نہیں۔

مسلمانوں سے میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب قاری بن جائیں ہاں یہ سب کے ذمہ ہے کہ بقدرِ ضرورت قرآن شریف کو صحیح کریں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ایک اُستاد سکھانے والا ہو اور تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سیکھنے والا خواہ کسی حد تک کوئی فن سیکھنا چاہے مگر سکھلانے والا پورے فن کا ماہر ہونا چاہیئے۔ حاصل یہ کہ قرآن شریف صحیح کرنے کے لئے ایک قاری کی ضرورت ہے مگر کام تو باتوں سے نہیں ہوتا جب قاری رہے تو اس کے اخراجات کی کفالت آپ کے ذمہ ہے اور ہر فن کے لئے کچھ آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ قاری کے لئے کچھ کتابیں بھی مہیا کی جائیں اور جتنے امور ضروری ہیں ان سب کی کفالت آپ کو کرنی چاہیئے۔ پھر اس کفالت کے دو طریق ہیں، ایک تو یہ کہ ہر ہر شخص کے یہاں ایک ایک قاری رہے اور ہر جگہ کتابیں اور دیگر سامان ضروری منگایا جائے، اور ایک یہ کہ ایک جگہ اس کا انتظام کافی طور سے کر لیا جائے اور سب اُس سے مستفیض ہوں اس میں بہت سہولت ہے۔ آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس مکان میں جہاں آپ بیٹھے ہیں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ قرأت سکھائی جائے اور اس کے لئے جتنے سامان کی ضرورت ہے سب یکجائی ہیئت سے جمع کیا جائے۔ قرأت سیکھنے اور قرآن شریف کے صحیح کرنے کی ضرورت تو ہر شخص کے لئے ثابت ہو گئی۔ پھر اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے جو بھی طریق ہوتا خواہ کیسا ہی مشکل ہوتا اختیار کرنا ضرور تھا مگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے آسانی کر دی کہ اپنے کچھ بندوں کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ میاں کا نام لے کر اس کام کو شروع کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دین میں عجب خوبی ہے کہ تھوڑی رقم میں بے بہا دولت ملتی ہے۔ کاش اس دولت کی ضرورت لوگوں کو محسوس ہو جائے تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک کسی چیز کی ضرورت نہیں ثابت ہوتی اس وقت تک اس میں دیر ہوتی ہے اور جہاں ضرورت ذہن نشین ہوئی پھر کہیں نہ کہیں سے اُس کا سامان ہو ہی جاتا ہے

اُن آدمیوں کو دیکھئے جن کی اوقات بہت ہی تھوڑی ہے اگر اُن سے کہا جائے کہ مسجد یا مدرسے میں چندے کی ضرورت ہے تو عذر کریں گے کہ ہم خود مفلس ہیں اور جب شادی ہو تو انہیں کے پاس کہیں نہ کہیں سے مال آجاتا ہے وجہ کیا ہے کہ شادی کے خرچہ کی ضرورت اُن کے ذہن میں ثابت ہوگئی ہے کہ برادری میں نک کٹی ہوگی اور مسجد اور مدرسے کے چندے کی ضرورت ثابت نہیں ہوئی اور مسجد اور مدرسے کی بھی جہاں ضرورت ثابت ہو جاتی ہے تو بحمد اللہ مسلمان اس کام کو بھی انجام دیتے ہی ہیں مسلمانوں میں جوش تو ہے مگر ؎

لوگ کہتے ہیں چاہ مشکل ہے ۔۔۔ سب غلط ہے نباہ مشکل ہے

ایسے لوگ کم ہیں کہ اپنی بات کو نباہ دیں۔

چندہ دینے والوں کے لئے دو باتیں ہیں کہ خیال رکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ اپنی وسعت سے کم مت دو اور خواہ تھوڑا دو مگر نباہ دو احب الاعمال الی اللہ ادومہا وان اقلّ دوسرے یہ کہ چندہ دے کر مدرسے کو اپنی ملکیت مت سمجھو۔ اور مہتممین کی رائے میں دخل مت دو۔ آج کل یہ مرض بکثرت شائع ہوگیا ہے کہ ذرا سا چندہ دے کر حکومت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ بھی جس کا مدرسے میں شامل ہے وہ مدرسے کے ہر کام میں دخل دینے کو تیار رہے اور اپنی ہی رائے کو ترجیح دینا چاہتا ہے اور اگر بلا رائے اُن کے کوئی انتظام کر لیا جائے تو چندہ بند کر لیتے ہیں بعض لوگوں کی تو یہاں تک عادت ہے کہ خواہ مخواہ اعتراض کیا کرتے ہیں خود کوئی تدبیر اصلاح کی نہیں کرتے اور دوسروں کی تجویزوں میں عیب چھانٹا کرتے ہیں۔ ان کی وہ حالت ہے کہ ایک لڑائی میں کشت و خون زیادہ ہوا تھا میدان جنگ میں صدہا مُردے پڑے ہوئے تھے ایک صاحب ان میں ایسے بھی پڑے تھے کہ وہ مرے تو نہ تھے مگر زخم ایسے لگے کہ اٹھ نہیں سکتے تھے اتفاقاً لشکر کا بنیا اُن کے پاس کو ہو کر نکلا انہوں نے آواز دی کہ بھائی ذرا سنتے جاؤ تمہارے کام کی بات ہے بنیے نے تھوڑی دور کھڑے ہو کر پوچھا کیا ہے کہا میں تو اب مر ہی جاؤں گا۔ میری کمر میں ہمیانی ہے وہ تم کھول لو تمہارے ہی کام آئے گی مبادا کسی اور کے ہاتھ پڑ جائے بنیے لالچی ہوتے ہی ہیں یہ آگے بڑھے جب خوب قریب پہنچ گئے تو ان مجروح صاحب نے اپنے پورے زور سے ان کی ٹانگ میں ایک تلوار ماری کہ ہڈی ٹوٹ گئی انھوں نے کہا کم بخت تو نے

یہ کیا حرکت کی ہمیانی تو کہاں رکھی ہے کوئی ہمیانی بھی کمر سے باندھ کر لڑائی میں آتا ہے۔ ہم اس میدان میں رات کو اکیلے پڑے رہتے دوسرا بت کے لئے تمہیں بھی بلا لیا تو وہ بنیا گیا کہنا ہے کہ ادت کا اوت نہ آپ چلے نہ اور کو چلنے دے۔ بس یہی حال ان معترضین کا ہے کہ نہ خود چلیں نہ دوسرے کو چلنے دیں۔ ایسے لوگوں سے یہ التماس ہے کہ ہم نے آپ کے چندے سے دست بر داری دی ہمارے کام میں رخنہ مت ڈالو ع مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں، ہم لوگوں کی خاصیت بچھو کی سی ہو گئی ہے کہ اس کی خیر یہی ہے کہ شر نہ پہنچائے سو خود مدد نہ دیں مگر دوسروں کے کام کو نہ بگاڑیں۔ رہا اعتراض کرنا اور عیب نکالنا سو بے عیب تو خدا کی ذات ہے جن کو عقل دی گئی ہے وہ نرے عیب پر نظر نہیں کرتے جہاں عیب و ہنر دونوں پاتے ہیں ہنر کی طرف دیکھتے ہیں اور عیب کو چھپا دیتے ہیں یا اصلاح کر دیتے ہیں اور عناد کی تو بات ہی دوسری ہے مدرسوں میں اعتراض پیدا ہونے کیا مشکل ہیں جب کہ مدرسوں کے اصل اصول بھی نہیں چھوٹے چنانچہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کون لاتا ہے آپ نے جواب دیا کہ جبریل علیہ السلام لاتے ہیں کہنے لگے کہ جبرئیل تو ہمارے دشمن ہیں اگر میکائیل علیہ السلام لاتے تو ہم بھی ایمان لے آتے یہ بھی تو اعتراض ہی تھا۔ ایسے اعتراضوں سے تو کوئی بھی نہیں بچا اہل مدرسہ پر اگر کئے جائیں تو کیا بعید ہے۔ صاحبو! آپ کو تو دل وجان سے امداد کرنی چاہیئے نہ کہ عیب نکالنا ہاں اگر کوئی عیب آپ کے نزدیک ثابت ہو تو اس کو اس طور سے دفع کیجئے جو اس کا طریقہ ہے حدیث میں ہے (فرمان جائیے شریعت کی تعلیم کے) فرماتے ہیں (المؤمن مرآۃ المومن) لوگوں نے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی ہے۔ جو ہمارے مشائخ کے نزدیک ہے وہ یہ ہے کہ مومن کو مومن کے لئے آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس بات میں کہ آئینہ دیکھنے والے کا راز دار ہوتا ہے اس کے عیب کو اسی کے سامنے ظاہر کرتا ہے دوسروں سے ہرگز نہیں کہتا۔ اس طرح جو کوئی بھی مدرسے کے عیب چھانٹا کرے ہماری عین خوشی ہے اس سے اصلاح ہوتی ہے مگر ایسے آدمی کم ہیں آج کل تو مرض یہ ہے کہ چندہ دے کر یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ہم مدرسے کے مالک ہیں اور جو لوگ اس خیال سے بچنا بھی چاہتے ہیں بسا اوقات ان کو بھی رائے دیتے وقت اشتباہ ہو جاتا ہے کہ عیب جوئی کو نصیحت سمجھتے

ہیں پھر نصیحت کی صورت میں عیب جوئی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ میں بتائے دیتا ہوں کہ آپ کے نزدیک جو بات قابل اعتراض ہو اس کو علی الاعلان پھیلاتے نہ پھرے خلوت میں مہتمم یا کسی مدرس پر ظاہر کیجئے اور پھر یہ انتظار نہ رکھئے کہ ہمارے کہنے کے موافق ہی ہو جائے اس طرح آپ ناصحین میں شمار ہوں گے اور عیب جوئی سے بچ جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ رائے دو اور انتظام میں دخل نہ دو۔ مدرسے کو اللہ میاں کا سمجھ کر کام کرو اپنا مت سمجھو۔ یہ وہ گر ہے کہ اگر اس کا سب لوگ خیال رکھیں تو کوئی بھی خرابی پیدا نہ ہو چندہ دینے والے اس کا خیال اسی طرح رکھ سکتے ہیں جیسے میں نے عرض کیا اور مہتممین یوں رکھ سکتے ہیں کہ اس کی رقم کو امانت سمجھیں اور اپنی اپنی خدمات منصبیہ کو حق اللہ سمجھیں اور ان کو نہایت خلوص کے ساتھ بجالائیں اور خلوص کے دو جزو ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو عبد اور حق تعالے کو مولے سمجھ کر احکام کی تعمیل کریں اور ظاہری یہ ہے کہ اپنے آپ کو حاکم نہ کہیں بلکہ خادم کہیں وہ نام تک نہ اختیار کریں جن سے حکومت اور ترفع پایا جائے۔ آج کل یہ بھی ایک خبط ذہنوں میں سما گیا کہ کام چاہے کتنا ہی ذرا سا شروع کریں مگر عہدے اور خطابات بڑے بڑے اختراع کر لیتے ہیں کوئی سیکرٹری بنتا ہے کوئی جنٹ ہوتا ہے۔ ایک صاحب کا خط میرے پاس آیا جس پر کاتب صاحب ہی کے قلم کا لکھا ہوا تھا راقم فلاں گورنر یتیم خانہ مقام فلاں میں نے کہا کہ بہتر تھا کہ خادم یتیم خانہ لکھتے۔ بہت جگہ تجربہ ہوا کہ جہاں یہ خطابات بلبے چوڑے ہوتے ہیں، وہاں کارروائی صرف رجسٹر ہی تک محدود رہتی ہے خارجی وجود کی نوبت نہیں آتی چند روز کے لے عہدے البتہ مل جاتے ہیں سو یہ بچوں کا کھیل ہی ہوا یا کچھ اور۔ ان الفاظ کو اختیار مت کرو۔ اس سے برکت نہیں رہتی یہ غیر قوموں کی تقلید ہے من تشبہ بقوم فھو منھم یہ حدیث لباس اور وضع ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے جس بات میں مشابہت پائی جائے سب اسی کے اندر داخل ہے یہ اچھا ہے کہ تم اپنے آپ کو خادم کہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تسلیماً تمہارا نام سردار رکھیں سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ یہ کتنی برکت کا سبب ہے۔ آج لوگوں نے اس کے برعکس کر رکھا ہے کہ بڑے بڑے خطاب لے لیتے ہیں خواہ ان کی اہلیت ہو یا نہ ہو حدیث حدیث میں ہے اذا مدح الفاسق اهتزله العرش۔ یعنی جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش کانپ اٹھتا ہے اور

آج کل اکثر مدرسے فساق ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اُن کی مدح ہوتی ہے پھر زمین کانپ اٹھتی ہے تو کیوں تعجب کیا جاتا ہے زلزلہ کو بہت لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے اسکی حقیقت کیا ہے اور کیوں آتا ہے۔ زلزلہ کی نسبت لوگوں کے خیالات عجیب طرح مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے گائے سینگ بدلتی ہے یہ وہ حرکت ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ آج کل جو مدعیانِ تحقیق ہیں اُن کی بڑی دوڑ یہ ہے کہ مسامات و منافذ بند ہونے سے زمین کے بخارات زور کرتے ہیں اس سے یہ حرکت ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ صرف تخمین ہے اس پر کوئی دلیل قطعی نہیں ہے اور کبھی بخارات سے بھی یہ حرکت واقع ہو تو ہم انکار نہیں کرتے لیکن اس کی کیا دلیل ہے کہ ہمیشہ یہی سبب ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حرکت کبھی بخارات سے ہوتی ہو اور کبھی اور کسی سبب سے۔ لیکن کسی سبب سے بھی ہو یہ بات تو مسلّم ہے کہ سبب میں تاثیر بالذات نہیں پھر اگر سبب کو صحیح طور پر معلوم بھی بھی کر لیا تو کیا نتیجہ۔ مسبّب ہی کی طرف کیوں نہ رجوع کیا جائے تاکہ بلا ٹلے مگر مرض یہ ہے کہ سبب کی تحقیق میں لگ جاتے ہیں اور جو واہی تباہی سمجھ میں آجائے اسی کو یقینی اور قطعی سمجھ لیتے ہیں۔ زلزلہ کے لئے بخارات کو یقینی سبب جان لیا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر قیامت آجائے اور اس کے بعد ایک اور قیامت آجائے اور اس کے بعد ایک اور قیامت آجائے اسی طرح قیامت ہزار قائم ہو جائیں مگر انحصار کی دلیل نہ لاسکیں گے کہ سوائے بخارات کے اور کوئی سبب زلزلہ کا نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی دلیل ہے کسی کے پاس تو میں بھی سننا چاہتا ہوں۔

غرض ان خرافاتوں کا لوگوں کو بہت شوق ہے اور اپنی تخمین کو یقینی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ صاحبو! تمام آفتیں گناہوں سے آتی ہیں۔ گناہوں کو چھوڑو۔ منجملہ گناہوں کے فاسق کی مدح اور ترفع بھی ہے جس سے عرش کو زلزلہ ہو جاتا ہے اگر کبھی زمین کو بھی ہو جائے تو کیا تعجب ہے اور ان بڑے بڑے خطابات میں یہ مدح لازم آتی ہے لہذا یہ الفاظ مت اختیار کرو۔ انکسار اختیار کرو۔

اہل علم کے لئے یہ الفاظ زیبا نہیں ہیں سچ کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت میں تشریف رکھتے ہوتے تو ان الفاظ سے ضرور منع فرماتے لفظِ رَاعِنَا تک سے نہی قرآن شریف میں موجود ہے صرف اس وجہ سے کہ مشابہتِ کفار لازم آتی ہے چہ جائیکہ یہ الفاظ کہ ان میں علاوہ مشابہت کے ترفع اور تکبر بھی ہے اگر فرض کر لیجئے کہ مشابہت کفار بھی نہ ہوتی

تب بھی وجود ترفع و تکبر ہی ان کے منع کے لئے کافی تھا۔ کیا ممبر اور گورنر ہی لفظ رہ گئے ہیں۔ اگر ضرورت ہے تو اپنے قرآن شریف میں سے تلاش کر لو فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ اس سے رائے دہندوں کا نام مشیر اور مکان کا نام مجلس شوریٰ اخذ کیا جا سکتا ہے یہ الفاظ ممبر اور کمیٹی کا کام بخوبی دے سکتے ہیں پھر کیوں دوسروں کی شاگردی کی جائے اور صاحبو تجربہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی بھی چنداں ضرورت نہیں کام پورا ہونا چاہئے جہاں خطابات اور ضوابط بڑے بڑے دیکھے وہاں کام خاک بھی نہیں پایا۔

وہاں کی کارروائی صرف رجسٹر ہی تک محدود رہتی ہے۔ ان زوائد کو چھوڑ و اور اصل کام خلوص اور تندہی کے ساتھ کرو۔ مدرسے میں صرف ممبر یا مشیر ہی مت بنو بلکہ لڑکوں کو بھیجو اور جو اصل کام ہے یعنی قرآن شریف کی تصحیح اس کو کمال تک پہنچا کر دکھاؤ۔ اللہ میاں یہ نہیں پوچھیں گے کہ ممبری یا گورنری کا خطاب بھی حاصل کیا تھا یا نہیں ہاں یہ پوچھیں گے کہ قرآن کو قرآن ہی کی طرح پڑھا تھا یا نہیں۔ اس کا حق ادا کیا تھا یا نہیں یہ خدمت الفاظ کی ہوئی اور دوسری خدمت قرآن شریف کی یہ ہے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھیں جب تصحیح الفاظ سے فراغت ہو تو اس کا ترجمہ پڑھیں تا کہ احکام سے آگاہی ہو۔ آج کل اس میں بھی لوگوں نے خبط کر دیا اوّل تو ہمت کا منتہا صرف عبارت ہی پڑھنے تک رہتا ہے اور اگر کسی نے شوق کیا اور ترجمہ دیکھنا شروع کیا تو ترجمہ بھی کسی بڑے آدمی کا تلاش کیا جائے گا جیسا کہ دنیاوی امور میں تموّل اور جاہ مابہ الامتیاز قرار دیا گیا ہے ایسے ہی دین میں بھی بڑا آدمی ہونا دیکھا جاتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ بھی ڈپٹی اور تحصیلدار صاحب کا ترجمہ بھی تحصیلدار ہی ہو گا حالانکہ لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ ہر کام کے لئے کچھ آدمی ہوتے ہیں۔ کسان کسان ہی کا کام کر سکتا ہے اور بڑھئی بڑھئی ہی کا کام اور لوہار لوہار ہی کا کام کر سکتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ڈپٹی صاحب اور تحصیلدار کا کام مولوی لوگ بھی کر سکتے ہیں اور ان کو اُن کے کام میں دخل دینا زیبا ہے جواب یہی ہے کہ نہیں کر سکتے اور اُن کو دخل دینا نازیبا ہے پھر ڈپٹی صاحب اور تحصیلدار صاحب کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ان کا کام کرنے لگے اُن سے اپنا ہی کام خوب ہوتا ہے۔ اس خدمت کو انھیں کے لئے چھوڑ دیا ہوتا یہ ان کا کام نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے

فاش غلطیاں کی ہیں۔ قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے علماء کا مذاق موزوں ہے کتاب اللہ میں جیسے کہ اصل کتاب میں شانِ سلطانی برستی ہے ایسے ہی ترجمہ میں بھی ہونی چاہیئے۔ زبان میں بناوٹ نہ ہو زنانہ پن نہ ہو جب پڑھا جاوے تو یہ معلوم ہو کہ شاہی حکم رعایا کو سنایا جاتا ہے کوئی لفظ آدابِ شاہی کے خلاف نہ ہو قرآن شریف کا ترجمہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ کے معنی لکھے ہیں ہم کبڈی کھیلنے لگے حالانکہ قطع نظر اس سے کہ یہ لفظ رکیک ہے خود لغت کے بھی خلاف ہے کیونکہ استباق سبق سے ہے سبق سے مراد آگے بڑھنا استباق سے مراد یہ ہے کہ ہم اس لئے دوڑے کہ دیکھیں کون آگے نکلے اور کبڈی میں یہ مراد مقصود نہیں پھر خود عقل کے بھی خلاف کیونکہ کبڈی میں حافظ متاع نظر سے غائب نہیں ہو جاتا کہ بھیڑیے کے لے جانے کا عذر ہو سکے لیجئے یہ ترجمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف زبان عربی جاننے سے ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کے ترجمے کے لئے مختلف علوم کی ضرورت ہے اور لوگ صرف نیا رنگ دیکھ کر ڈھلنے ہیں، اتنا مادہ نہیں کہ بھلے برے کو پہچانیں بس خود گمراہ ہوتے ہیں اور اوروں کو گمراہ کرتے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو قرآن شریف پڑھایا بھی تو اکثر تو یہ ہے کہ بس صرف الفاظ پڑھا دیئے اور اس کے لہجے اور آواز کو سُن کر خوش ہوتے ہیں کہ بچے طوطے کی طرح پڑھتا ہے سو اطمینان رکھئے طوطا ہی رہے گا۔ انشاء اللہ آدمی نہیں ہوگا آدمی ہوتا ہے علم سے اور علم صرف الفاظ ہی کا نام نہیں ہے۔

صاحبو! اُس کو آدمی بنایئے اور وہ علوم پڑھایئے کہ الفاظ کے مفہوم کو سمجھے اور صحیح اور غلط ترجمہ میں تمیز کر سکے تاکہ گمراہی سے خود بھی بچے اور اوروں کو بھی بچائے مگر اس کی تو ضرورت ہی ذہنوں سے نکل گئی اور عام لوگوں کا اعتراض ہے کہ اگر تمام عمر ان علوم میں صرف کی جائے تو نہ بڑھئی بڑھئی رہے گا اور نہ لوہار لوہار پھر دنیا کا کام کیسے ہو معاش کی کیا تدبیر ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ تو نہیں کہا جاتا کہ سب کے سب متبحر عالم ہی بن جاؤ عربی ہی میں تکمیل کرو بلکہ ضرورت کے موافق احکام الٰہی سیکھ لو اور اس سیکھنے کی صورتیں مختلف ہیں جس کو جس طرح آسان ہو عربی میں ممکن ہو عربی ورنہ چھوٹے چھوٹے اردو کے رسالے پڑھ لو اور کچھ بھی نہ ہو علماء سے پوچھ پوچھ کر معلوم کر لو اور اگر عربی کا شوق ہو اور فرصت کم ہو تو ضروری کتابیں پڑھ لو۔ اس ضرورت کو دیکھ کر نصاب تعلیم کا اختصار کیا گیا ہے کہ جہاں پہلے دس برس صرف ہوتے تھے اسمیں صرف ڈھائی برس لگتے ہیں اس کو

نئی بات سمجھ کر آپ چونکیں نہیں اور یہ نہ کہیں کہ جب ڈھائی برس میں وہی کام ہوتا ہے جو دس برس میں ہوتا تھا تو کیا پہلے علماء نے وقت ضائع کرنے کو یہ مدت رکھی تھی کیونکہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعینہ وہی تعلیم جو دس برس میں ہوتی تھی اب ڈھائی برس میں ہوا کرے گی بلکہ ضروریات کو منتخب کرلیا گیا ہے کہ ان کو معلوم کرکے آدمی اپنے دین کو مستحکم کرسکتا ہے اور متوسط استعداد کا مولوی ایک گونہ جامعیت کے ساتھ بن سکتا ہے اگرچہ متبحر نہ ہو مگر اتنی استعداد ہو جائیگی کہ اگر چاہے تو اپنی لیاقت بڑھا سکتا ہے۔

یہ نصاب کم فرصت لوگوں کے لئے تو ضروری ہی ہے اگر وہ لوگ بھی جو نصاب قدیم کی تکمیل چاہتے ہیں پہلے اس کو پورا کرکے نصاب قدیم کو پورا کرلیں تو نہایت مفید ہو مجھے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ کارآمد ہے میں دھوکا نہیں دیتا ہوں میں نے ایک عرصے تک پہلے اپنے عزیزوں پر تجربہ کیا جب پورا اطمینان ہوگیا تب شائع کیا ہے اس کے شائع کرنے سے یہ غرض نہیں کہ نصاب قدیم عبث ہے اور اس کو بالکل چھوڑ دیا جائے بلکہ جس کو فرصت و ہمت ہو نصاب قدیم کی تکمیل کرے اور جن کو کم فرصتی کا عذر ہو وہ اسے اختیار کرلیں۔ کام نکالنے کے لئے کافی ہے۔ چونکہ یہ شکایت عام طور سے زیادہ تر ہوگئی ہے کہ اگر علم دین حاصل کریں تو اور کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ اس لئے بعض اہل رائے کی تجویز ہے کہ دیگر علوم کی گنجائش دینے کو نصاب جدید پڑھایا جائے اور اس کے لئے ہر شہر میں ایک مدرسہ ہو۔ چنانچہ یہاں بھی ایک شاخ اس مدرسے میں اس کے لئے بڑھائی گئی ہے اب آپ صاحبان کو کوئی عذر علم دین حاصل نہ کرنے کا باقی نہ رہا لیکن یہ سب اس وقت ہے کہ دین کی ضرورت آپ کے ذہن میں ہو اگر ضرورت ہی ذہن میں نہ ہو تو تھوڑی مدت اور بہت سب برابر ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں جس چیز کی ضرورت دلیل سے ثابت ہو چکی اس کے ذہن میں نہ ہونے کی کیا وجہ ہے کوئی صاحب عقل ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس کی ضرورت کو تسلیم نہ کرے پھر باوجود ضرورت کے اگر کوئی اس کو پورا نہ کرے تو اسکو غفلت کہتے ہیں جس کا انجام حسرت وندامت ہے۔ صاحبو! اس حسرت سے بچئے دین کی ضرورت دنیا سے زیادہ ثابت ہوتی ہے اس بنا پر تو دنیا کے علوم میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اس سے زیادہ دین کے علوم میں صرف کرنا چاہیئے اگر زیادہ نہ ہو تو برابر تو ہو لیکن اب تو برابر کو بھی نہیں

کہا جاتا ہے صرف اتنا وقت تجویز کیا گیا ہے جس میں دیگر علوم کی بھی گنجائش رہے اس مدت میں بچے کو جملہ کاموں سے برطرف کیجئے صرف علم دین میں مشغول رکھئے پھر اختیار ہے جو فن چاہیے سکھایئے پھر انشاء اللہ دین میں اس کے کبھی خلل نہ آئے گا۔ اگر ڈاکٹر کسی بچے کی نسبت کہدے کہ تین برس تک انگریزی نہ پڑھاؤ ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا تو آپ مان لیں گے خواہ یہی زمانہ اس کے امتحان اور پاس ہونے کا ہو۔ اور آپ جانتے ہوں کہ اگر یہ تین برس خالی رہے گا تو پہلا پڑھا ہوا سب بھول جائے گا اور آئندہ پڑھنے کی عمر نہ رہے گی مگر اس خیال سے ڈاکٹر کا کہا مان لیں گے کہ تندرستی مقدم ہے۔ اگر پاس بھی ہو گیا اور تندرستی نہ رہی تو نوکری کیسے کریگا۔ بس اسی طرح سمجھ لو کہ ڈھائی برس کے لئے ہم نے بچے کو ہسپتال میں یعنی دینی مدرسے میں بھیجدیا ہے پہلے اپنی روحانی صحت کو درست کرلے پھر جسمانی صحت بھی درست کرلے گا۔ اول تو ڈھائی برس میں دنیا کا کوئی نقصان نہیں اتنا اتنا وقت لبا اوقات لہو ولعب میں غارت ہو جاتا ہے اور اگر کچھ نقصان بھی ہو تب بھی مسلمان کے لئے تو دین ہی مقدم ہے احکام خداوندی کے سامنے کسی چیز کی بھی وقعت نہیں۔ پہلے ان کی تعمیل چاہیئے پھر اور کام۔ ان کی تعمیل جب ہی ہو سکتی ہے کہ کتاب اللہ کو پڑھے اور کتاب اللہ کے پڑھنے کے معنی یہ نہیں کہ صرف لفظ پڑھ لے بلکہ اس کے مفہوم کو سمجھے جو کہ موقوف ہے تحصیل علوم دین پر تیسرا حق تلاوت عمل ہے اور سب سے زیادہ اہم اور مقصود یہی ہے پہلے دونوں حقوق کو اسکے ساتھ ذریعہ کو مقصود کے ساتھ جیسی نسبت ہے میں یہ نہیں کہتا طالب علموں سے عمل کی نیت نہ ہو تو پڑھو ہی مت پڑھ تو ضرور ہی لو گو جرأت کی بات ہے مگر میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ علم دین شروع کرتے وقت اگر نیت عمل کی نہ بھی ہو تو پرواہ مت کرو علم دین وہ چیز ہے کہ نیت کو بھی ٹھیک کرلیگا۔ ایک بزرگ کا قول ہے تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی العلم الا ان یکون للہ یعنی ہم نے علم پڑھا تو تھا غیر اللہ کے لئے مگر علم نے خود ہی نہ مانا اور اللہ میاں ہی کا ہو کر رہا مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں چنداں خلوص نہ تھا مگر انتہا میں خلوص پیدا ہو ہی گیا۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ اگر عمل کی توفیق نہ بھی ہو تب بھی علم پڑھے جاؤ انشاء اللہ ضرور عمل نصیب ہو گا جب آدمی ہمیشہ قال اللہ وقال الرسول کے قصے اور حالات پڑھے گا تو کب تک اثر نہ ہو گا ہاں یہ خیال رکھو کہ معصیت کا بھی عزم مت کرو۔ کیونکہ معصیت سے نور علم مٹ جاتا ہے ابتداء میں اگر علماء حق کا سا خلوص نہ ہو تو پرواہ مت کرو لیکن بالقصد معصیت کے پیچھے مت پڑو اور بیباک مت ہو جاؤ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ انہوں نے

اپنے استاد سے اپنے حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے جو جواب دیا اس کو اس طرح نقل فرماتے ہیں۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم فضل من اللہ وفضل اللہ لا یعطی لعاصی

یعنی میں نے اپنے استاد وکیع سے سوءِ حفظ کی شکایت کی تو انہوں نے مجھ کو نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو کیونکہ علم اللہ میاں کا فضل ہے اور اللہ میاں کا فضل گناہگار کو نہیں نصیب ہوتا تجربہ کر لیجئے کہ معصیت سے کھانے تک کا مزہ مٹ جاتا ہے طبیعت کو عجیب طرح کی پریشانی ہوتی ہے کہ سونے کا لقمہ بھی ہے تو مٹی سے بدتر ہو جاتا ہے اس سے زیادہ میں کیسے سمجھا دوں معصیت سے اس نور کو مت مٹاؤ اس نور کو حاصل کرو خود پڑھو دوسروں کو پڑھاؤ۔ اس میں مدد کرو علماء کے زمرے میں شامل ہو الدال علی الخیر کفاعلہ نیک کام کا بتا دینے والا بھی کرنیوالے کے حکم میں ہوتا ہے بتا دینا ذرا سی امداد ہے جب اس کا حکم یہ ہے تو پوری امداد دینے والے کا حکم ظاہر ہے روپئے سے مدد کرو ہاتھ پاؤں سے مدد کرو، بہت سے کام ایسے ہیں کہ روپئے سے ہوتے ہیں اس میں روپئے سے شریک ہو۔ اگر کسی کے پاس روپیہ نہ ہو اور ہاتھ پاؤں سے بھی مدد نہ دے سکے تو دعا سے مدد کرو کہ اللہ میاں اس میں سعی کرنیوالوں کی مدد فرما دیں یہ تو کہیں نہیں گیا ہے کہ اس سے تو کوئی بھی معذور نہیں غرض ہر طرح مدد کرو اور اس کا خیال رکھو کہ آپس میں اختلاف نہ کرو سب مل کر خلوص سے کام کرو یہ قرآن شریف کی خدمت ہے۔ اگر آپ ہمت کرینگے تو قرآن شریف کے تینوں قسم کے حقوق ادا ہو جائیں گے اور سب ہی کچھ ہو جائے گا۔ اب دعا کرو کہ حق تعالےٰ توفیق عطا فرما دیں۔

خلاصہ قال اللہ تعالیٰ۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ الآیۃ اس آیت میں توریت کی تلاوت کی مدح ہے اور یہ مستلزم ہے مدح تلاوت قرآن کو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تلاوت سیکھنے پر موقوف ہے اور مقدمہ ضروری کا ضروری ہوا کرتا ہے تو آیت میں مدح ہوئی قرآن شریف کے سیکھنے کی بھی اور سیکھنا ضروری ہوا اور صرف اتنا سیکھنا نہیں جس سے قرآن شریف فقط پڑھ ہی سکیں بلکہ اتنا کہ اُس سے تلاوت کے پورے پورے حقوق ادا کر سکیں حقوق تلاوت تین قسم کے ہیں ظاہر اور باطن اور ابطن۔ سب سے مقدم ظاہری ہے اور سب سے مؤکد ابطن فان الحقیقۃ بدون الصورۃ باطل والصورۃ بدون الحقیقۃ عاطل۔ حق ظاہری ترتیل ہے اور حق باطنی معانی کا سمجھنا اور ابطن عمل۔ اب لوگ حق اول کو بھی جو سب سے سہل ہے چھوڑ بیٹھے نفس کے اس کہنے سے کہ تم قراۃ میں عاصم یا حفص تو ہو نہیں سکتے پھر سیکھنے سے کیا فائدہ جواب یہ ہے کہ دنیا میں بھی سب کے سب بادشاہ تو ہونے سے

پھر تدبیر کیوں کرتے ہیں اور نفس کے اس کہنے سے کہ صرف الفاظ سے بدون معنی سمجھے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ فائدہ کے فہم معنی میں منحصر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ لوگ بجائے قرآن شریف کے وظیفوں اور عملیات پر جھک پڑے اور قرآن شریف سے صرف یہ کام لیتے ہیں کہ بچوں کا نام اسمیں سے نکالا جائے یا تیجے وغیرہ میں پڑھا جائے اور جب ایسی رسموں سے منع کیا جائے تو کہتے ہیں کار خیر سے روکتے ہو۔

جواب یہ ہے کہ تم بھی تو بعض وقت نماز سے روکتے ہو جیسے نماز بحالت جنابت (مگر ہم ان کا جواب دینے سے اسکو بہتر جانتے ہیں کہ اپنے گروہ سے کہیں کہ خلوص اختیار کریں اور استغنا برتیں)

ایک یہ کام لیتے ہیں کہ بذریعہ عکس پورے قرآن شریف کو ایک تعویذ کی صورت میں کر لیتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ چادر میں رکھ کر بچے کو نیچے سے نکال دیتے ہیں۔ اور ایک یہ گراموفون میں بند کر کے پیسے کماتے ہیں اور حق تلاوت یعنی قرأۃ کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا میں کہتا ہوں بقدر ضرورت مشکل نہیں۔ ہاں تھوڑے سے اہتمام اور مجمع کی ضرورت ہے۔ یہ مدرسہ اسی کا مجمع ہے اس میں سعی کرو اور خیال رکھو کہ اپنی وسعت سے کم نہ دو اور اُس کو نباہ دو اور انتظام میں دخل نہ دو سب کے سب اللہ میاں کا کام سمجھ کر کرو۔ چندہ دینے والے تو اُس طرح جیسا کہ ابھی کہا گیا اور اہل مدرسہ اس طرح کہ اُس کے مال کو امانت سمجھیں اور خدمات کو اللہ میاں کا کام اور انکسار کو شعار رکھیں۔ تکبر آمیز القاب تک نہ اختیار کریں کہ بسا اوقات فساق کی مدح لازم آتی ہے اس سے عرش کانپ اٹھتا ہے اور زمین میں زلزلہ آجاتا ہے۔

دوسرا حق تلاوت فہم معانی ہے۔ اس میں لوگوں کی حالت یہاں تک ہے کہ صحیح و غلط کو تمیز نہیں کر سکتے۔ ترجمے بھی ڈپٹیوں اور تحصیلداروں ہی کے بڑے سمجھتے ہیں وجہ وہی ہے کہ علم دین صرف بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھا دینے تک محدود کر دیا ہے آگے کم فرصتی کا عذر ہے (اب آپ کو واضح ہو کہ نصاب قدیم کا اختصار کر دیا گیا۔ صرف ڈھائی برس صرف ہونگے اب یہ عذر نہیں چل سکتا)

تیسرا حق تلاوت عمل ہے یہ سب سے زیادہ موکد ہے اسکی ہمت کرو اور اُسکے ذریعے یعنی علم کو اختیار کرو علم کو کسی طرح نہ چھوڑو حتیٰ کہ اگر اول میں عمل کا عزم بھی دل میں نہ ہو تب بھی پڑھے جاؤ۔ علم خود دل کو درست کر لیگا ہاں قصداً معاصی میں مت پڑو کہ اس سے نور علم مٹ جاتا ہے غرض علم کیلئے کوشش کرو مال سے ہاتھ پاؤں سے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو دعا ہی سے تمہارے ذرا سے ارادے کی دیر ہے سب حقوق القرآن ادا ہو سکتے ہیں تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ)

دعوات عبدیت جلد دوم کا

تیسرا۳ وعظ ملقّب بہ

عِلاجُ الکِبر

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

ناشر

محمد عبدالمنّان غُفِرلہٗ

مکتبہ تھانوی ، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ا

ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد دوم

کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

علاج الکبر

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
تھانہ بھون مکان حضرت مولانا صاحب	۲۳ صفر ۱۳۳۸ھ بعد نماز ...	ایک گھنٹہ ۷ منٹ	بیٹھ کر	علاج الکبر	مولوی محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری	۵ یا ۶	بعد کو زائد تحریر کیا مولوی محمد مصطفیٰ صاحب نے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّاٰت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمّدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ؆

(اور اُسی کو بڑائی ہے آسمانوں و زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے)

اس آیت میں حق سبحانہ تعالیٰ نے خاص اپنی ایک صفت بیان فرمائی ہے کہ اگر اُسکو انسان نظر

میں رکھے تو کل مفاسد اس سے الگ رہیں۔ خلاصہ اس کا معرفت تعلق انسانی ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ۔ ظاہر ہے تعلق امر نسبتی ہے جو طرفین کو چاہتا ہے ایک طرف حق تعالیٰ ایک طرف بندہ۔ تو اس کے تعلق کے پہچاننے کا طریق دو معرفتوں کا جمع کرنا ہے۔ معرفت حق تعالیٰ کی اور معرفت اپنے نفس کی اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ تلازم بھی ہے اگر حق تعالیٰ کو پہچان لیا جائے تو نفس کی پہچان ہو جائے گی اور اگر نفس کا علم ہو جائے تو معرفت حق تعالیٰ ہو جائیگی۔ اسی واسطے کہا گیا ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنی حقیقت پہچان لی اُس نے پروردگار کو جان لیا) اور پہلی معرفت دوسری معرفت سے اس لئے اہم ہے کہ نفس تو حاضر ہے اور اللہ غائب اور غائب کا پہچاننا مشکل ہے حاضر سے اس اہمیت کے سبب اس آیت میں اسی کی تعلیم کی گئی ہے کہ اس میں اپنی ایک صفت ذکر فرمائی کہ اُس صفت سے پہچانیں اور وہ صفت کبریاء ہے جو تمام صفات کے درجۂ کمال کو شامل ہے اور معنی اسکے بڑائی جس کو حق تعالےٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور جب یہ حق تعالےٰ کے ساتھ خاص ہے تو دوسرے میں نہ ہونی چاہیئے اور بندے میں اس کی بالکل نفی ہونی چاہیئے سو جب تک یہ معرفت محفوظ رہیگی حاشا وکلا جو کوئی مفسدہ بھی ہونے پائے اور جب یہ معرفت نہ رہیگی اور بندہ صفت کبریاء کو اپنے اندر لینا چاہے گا تو جو کچھ بھی مضرتیں اور عیوب پیدا ہوں کم ہیں۔

اور واقع میں یہی ایک صفت کبر ہے کہ جڑ ہے تمام مفاسد کی حتیٰ کہ شرک کی۔ دنیا میں جو کوئی بھی کافر ہوا ہے وہ کافر نہیں ہوا مگر اپنے نفس کے کبر سے ورنہ حق مخفی نہیں رہتا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ الآیۃ ظلم اور علو کو سبب فرمایا ہے جحد کا علو اور کبر ہم معنی ہیں۔ ابو طالب کو ایمان سے کس نے روکا صرف عار نے یوں کہا کہ مرتے وقت ایمان لاؤں گا تو قوم میری کہے گی ابو طالب دوزخ سے ڈر گیا۔ اس کی حقیقت یہی تو ہے کہ رفعت قوم پر حاصل ہے وہ نہ رہے گی۔ اس رفعت نے پیچھا نہ چھوڑا یہاں تک کہ کام تمام ہی کر دیا۔

اور کبر کا وجود کسی ایک گروہ میں نہیں بلکہ یہ وہ عام مرض ہے کہ کم وبیش ہر طبقہ کے لوگ اس میں مبتلا ہیں اور دوسرے عیوب میں تو اکثر جاہل لوگ پھنسے ہوتے ہیں تعلیم یافتوں میں وہ عیب کم ہوتے ہیں کیونکہ وہ اُن کے بُرے نتائج کو جانتے ہیں لیکن اس میں جاہل عالم سب کم وبیش مبتلا ہیں۔ مشرکین عرب تو جاہل تھے۔ اب اس گروہ کو دیکھئے جو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا یعنی اہل کتاب اُن کو بھی ایمان

لانے میں جو حارج ہوا سو وہی کبر۔ اس مختصر بیان سے بقدر کفایت اس کی توضیح ہو گئی کہ کفر و شرک کا مبنیٰ ہمیشہ کبر ہے۔ اب غور کر کے دیکھئے تو یہ بھی ثابت ہو جائیگا اور بہت سے معاصی کا مبنیٰ بھی کبر ہی ہے جو کفر و شرک سے نیچے ہیں۔ ایسے گناہ کبر سے اس طرح ہوتے ہیں کہ گنہگار اپنے برے عمل کو صرف اس عار کی وجہ سے نہیں چھوڑتا کہ لوگ کہیں گے کیا اتنے روز سے یہ احمق رہا اس کام کو ہمیشہ سے کیوں کرتا رہا جواب چھوڑنا پڑا۔ اس شخص نے عیب حماقت سے اپنے نفس کو بچایا یا یہی کبر بڑا مرض ہے اور علاج بالضد ہوا کرتا ہے۔ یہ مرض پیدا ہوا عدم معرفت کبریا حق سے تو علاج معرفت کبریا حق ہوگا۔ یعنی عظمت حق تعالیٰ کی اس کو حق تعالیٰ نے آیت میں بلفظ حصر اپنے واسطے ثابت کیا ہے وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ یعنی اسی کے واسطے ہے عظمت۔ بلاغت کے قاعدے سے لہٗ کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمت مخصوص ہے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی نیز یہ نہیں فرمایا وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ العظمیٰ۔ کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لئے ہے اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اس کا دوسرے کیلئے بھی ثابت ہے بلکہ مطلق کبریا کو دوسرے سے نفی کر دیا۔ اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ العظمۃ ازاری والکبریاء ردائی فمن نازعنی فیھما قصمتہ یعنی عظمت میرا تہبند ہے اور کبریا میری چادر ہے۔ جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ چادر اور تہبند فرمانا کنایہ ہے خصوصیت سے معنی یہ ہوئے کہ یہ دونوں صفتیں خاص ہیں میرے ساتھ دوسرا کوئی مدعی ہوگا تو میں اسکو سزا دوں گا جب کبریا حق ہوا باری تعالیٰ کا تو اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساواۃ ہوئی باری تعالیٰ کے ساتھ اور دیگر معاصی کے لئے تو حدود ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی مثلاً کھانا کہ اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اسوقت تک مباح ہے یا بھوکا رہنا کہ جب تک سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے مگر وہ کبر معصیت ہے کہ اس کیلئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائیگا بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تشدد ہے۔ آخر جوا من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان۔ یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہے اسے دوزخ سے نکالو۔ اسکو پہلی حدیث سے ملائیے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے وہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر کبر جس کے دل میں ہے جنت میں نہ جائیگا۔ یہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر بھی

ایمان جس کے دل ہے جنت میں جائے گا اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرّہ بھر کبر بھی جس دل میں ہے اس میں ذرّہ بھر ایمان نہیں ہوسکتا۔ اور ذرہ بھر ایمان جس دل میں ہے اسمیں ذرّہ بھر کبر نہیں ہوسکتا ہے دونوں میں بالکل تقبضیں ہیں۔ گو اسکی توجیہہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرّہ بھر کبر نہ ہوگا لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا مُضاد ایمان کسی درجے میں ہونا ثابت ہوا۔

اب سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت معصیت ہے اور ہونا ہی چاہیئے کیونکہ سب سے بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود اسکی بھی اصل ہے اور کفر اُسکی فرع تو مسلمان کو چاہیئے غور کیا کرے کہ اسکے دل میں کبر ہے یا نہیں۔ مگر ہماری تو عادت ہوگئی ہے کہ سوچتے ہی نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ نہ دیندار ہمارے خالی ہیں کبر سے نہ دُنیا دار خالی ہیں کبر سے جو دیندار کہلاتے ہیں وہ دین کے پیرایہ میں اس میں گرفتار ہیں اور جو دنیا دار ہیں ان کو خبر ہی نہیں۔ کہ کِبر کوئی چیز ہے ہا نہیں۔ چنانچہ دیندار لوگ نماز پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا داروں سے اچھے ہیں جتنی ترقی ان کو نماز پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے زیادہ تنزّل اس پندار سے ہوتا ہے دین کے ساتھ ساتھ بدترین دنیا ان کے قلب میں جگہ پکڑے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ نماز میں جب یہ خرابی ہے تو اُن کو چاہیئے نماز چھوڑ دیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ خرابی نماز میں جب پیدا ہوتی ہے جبکہ حق تعالیٰ کی عظمت قلب میں نہ ہو اور جب عظمت ہو تو دوسری طرف توجہ ہی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنی نماز سے آدمی بجائے اسکے کہ اترادے اُلٹا شرمندہ ہوتا ہے اسکی ایسی مثال ہے کہ کسی بہت بڑے شہنشاہ کے حضور میں ایک نہایت ذلیل آدمی کوئی تحفہ بہت کم قیمت لے جائے دربار کی عظمت وشوکت دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوگی مختصر یہ ہے کہ اُس ذلیل تحفہ کو پیش کرنے پر بھی اسکو قدرت نہ ہوگی ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور غنیمت سمجھے گا کہ کسی سزا کا حکم نہ ہوجائے جلدی کسی طرح یہاں سے خیریت سے نکل جاؤں۔ ہماری نمازوں کی جو کچھ حقیقت ہے وہ خوب معلوم ہے۔ پھر اس کو حق تعالیٰ احکم الحاکمین کے سامنے پیش کرکے ذرا شرم بھی نہ آنا اسی وجہ سے ہے کہ عظمت وجلال حق تعالیٰ سے ہم نے قطع نظر کر لی ہے اور اسی سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ دوسری طرف توجہ ہوئی اور اپنی نماز کو کچھ سمجھ کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے اس تقریر سے بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نماز پڑھنے یا اور دین کے احکام بجالانے سے اگر دل میں کبر پیدا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اُس عمل کو چھوڑ دیا جاوے بلکہ جو سبب ہے اُس کو قطع کیا جائے سبب اس کبر کا تعمیلِ حکم دین نہیں بلکہ عظمتِ الٰہی کا دل میں نہ ہونا

ہے سو اس کو پیدا کرنا چاہیئے اس سے تعمیل حکم بھی ہوگی اور جو خرابی جو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہ بھی نہ رہے گی۔ اس غلطی میں بہت سے پڑھے لکھے اور سمجھدار بھی مبتلا ہیں۔ خوب سمجھ لو غرض ہمارے دیندار بھی کبر میں مبتلا ہیں اور دنیادار بھی۔ دنیاداروں میں اس طرح کا کبر تو نہیں ہے جو دینداروں میں ہے ہاں دنیاداروں میں اور طریقے کبر کے ہیں۔ وضع میں لباس میں۔ بیاہ شادی میں۔ کبر میں سب گناہوں سے بڑھ کر ایک خرابی اور ہے وہ یہ کہ مسلمان خواہ کسی درجہ کا ہو مگر اس کے دل میں یہ بات ضروری ہے کہ جب کوئی گناہ ہو جائے کر تو گذرتا ہے کسی ضرورت سے لیکن کرنے کے بعد دل میں چوٹ ضرور لگتی ہے اور پشیمان ہوتا ہے مگر کبر کہ یہ گناہ ساری عمروں میں رہتا ہے اور دل پر صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ بیاہ شادی کی جتنی رسمیں ہیں سب تفاخر ہی پر مبنی ہیں پھر کسی کے دل کو صدمہ تو کیا اور ان سے خوش ہوتے ہیں خاص کر جب کہ ان پر وہ ثمرہ مرتب بھی ہو جائے جس کے واسطے کی جاتی ہیں یعنی علو اور شہرت جبکہ کسی کے یہاں تقریب میں بدنظمی نہ ہو اور کوئی اختلاف پیدا نہ ہو اور خیریت سے اختتام کو پہنچ جائے تو نام ہوتا ہے۔ یوں کہتے ہیں اپنی حیثیت سے زیادہ لگا دیا بڑی ہمت کی پانچ روپیئے کی اوقات میں کھانا کیا اچھا دیا۔ بارات کیسی بڑھیا لایا۔ اس کو کفر نہ کہیئے مگر قریب کفر ضرور ہے دیکھئے شرعی مسئلہ ہے اور کتابوں میں لکھا ہے کہ گناہ کو چھوٹا سمجھنا کفر ہے اس کو سب جانتے ہیں مگر اس کو خاص کر لیا ہے معاصی ظاہرہ کے ساتھ کیوں صاحب معاصی قلبیہ میں یہ حکم کیوں جاری نہیں حالانکہ وہ ام المعاصی ہیں پھر کبر کے ساتھ رضا اور فرح قریب کفر بھی نہ ہوگا۔ اب سمجھ لیا آپنے نام آوری سے خوش ہونا کس درجے کا گناہ ہے۔ رسموں کے متعلق ایک یہ دلیل سیکھ لی ہے مستورات نے آج ہی کل نئے مولوی نکل آئے ہیں اگر یہ بری تھیں تو پہلے کسی مولوی نے کیوں منع نہیں کیا۔ خوب سمجھ لو کہ نصیحت خواہ کیسی ہی معمولی سی ہو دل میں جب ہی جمتی ہے جبکہ توجہ ہو تو یہ کہنا تو غلط ہے کہ کسی مولوی نے منع نہیں کیا۔ مولویوں نے ہمیشہ سے منع کیا ثبوت اس کا یہ ہے کہ انہیں کی کتابیں موجود ہیں جن میں منع لکھا ہے ہاں تم نے ان کے منع کرنے کو سنا نہیں کیونکہ توجہ ہی نہیں تھی اب یہ بات اپنے دل سے گھڑلی کہ منع نہیں کیا۔ ایک یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رسمیں تو وہ تھیں جو کسی زمانے میں تھیں مثلاً کنگنا باندھنا بامن سے تاریخ رکھوانا وغیرہ وغیرہ اور اب تو کچھ رسمیں رہی ہی نہیں ان میں کیا کفر و شرک ہے

بیبیو! کیا کفر و شرک ہی علت ہے منع ہونے کی کیا تفاخر اور سمعہ اور اسراف علت نہیں ہے جس شریعت میں کفر و شرک کو برا لکھا ہے کبیرہ گناہ کو بھی تو برا لکھا ہے زائد سے زائد گوہ اور موت کا سا فرق کہہ لو۔ بلکہ میں کہتا ہوں ایک معنی کر موجودہ رسمیں اُن رسموں سے زیادہ بُری ہیں جو چھوٹ گئیں اس واسطے کہ تمہارے ہی قول کے بموجب اُن کا مبنیٰ کفر پر تھا اور ان کا مبنیٰ اس چیز پر ہے کہ وہ کفر کی بھی جڑ ہے یعنی کبر۔ پہلی رسمیں کفر تھیں لیکن حظِ نفس سے خالی تھیں اُن کے ترک میں نفس مزاحم نہ تھا کیونکہ ان میں حظ نہیں تھا اور رسوم موجودہ میں حظِ نفس ہے ان سے متنبہ ہونے کی امید نہیں۔ سمجھ لو کہ کفر و شرک میں حظِ نفس نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ نفس کو سب سے زیادہ ناگوار کسی کے سامنے لچنا ہے تو جو شخص مشرک ہے اُس کو بہت سوں کے سامنے لچنا پڑتا ہے تو اُس میں حظ کہاں۔ جہالت وغیرہ اور داعی اُن کو ہو جاتے ہیں ورنہ نفس کے وہ رسوم خلاف ہیں علیٰ ہذا یہ سمجھنا کہ آج کی رسمیں کچھ رسمیں ہی نہیں ہیں اور زیادہ خطرناک ہے کیونکہ جس گناہ کو آدمی گناہ نہ سمجھے اُس سے توبہ کی کیا امید ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ نام ندم یعنی پشیمانی کا ہے اور پشیمانی اسی چیز سے ہوا کرتی ہے جس کی کچھ بُرائی دل میں ہو۔ جب ان رسموں کی بُرائی ہی دل میں نہیں ہے تو پشیمانی کیوں ہوگی اور جب پشیمانی نہیں تو اس سے توبہ کیسی۔ بعض رسموں کی نسبت یہ کہدیتی ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے جیسے جہیز دینا بچوں کو کرتا ٹوپی دینا ولیمہ یا عقیقہ بہ ہیئتِ مروجہ کرنا۔ میں پوچھتا ہوں نماز پڑھنا کیسا فعل ہے ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ فعل مستحسن ہے اس میں فرض بھی ہے اور واجب بھی ہے اور سنت بھی ہے کم از کم مستحب تو ہے ہی اب اگر کوئی اس میں ذرا سا تغیر کر کے پڑھے مثلاً قبلہ کی طرف پشت کر کے پڑھے تو بتاؤ یہ نماز کیسی ہے جائز ہے کہ ناجائز اور اگر اس سے منع کریں تو یہ نماز سے منع کرنا کہلائے گا حاشا وکلا۔ یہ نماز سے منع کرنا نہیں۔ بلکہ قبلہ کی طرف پشت کر کے پڑھنے سے منع کرنا ہے۔ نماز سے منع کرنا کیسا نماز کو درست کرنا ہے یہی حال رسموں کا ہے جہیز دینے سے منع نہیں کیا جاتا بلکہ دکھلاوے اور تفاخر اور اسراف سے منع کیا جاتا ہے جہیز اگر اپنی بیٹی کو محبت کی وجہ سے دیا جاتا ہے تو اس میں اسکو کیا دخل ہے کہ برادری کے سامنے ایک ایک عدد دکھا کر گنوا کر دیا جائے اگر اسی کا نام محبت ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی بیٹی سے شادی ہی کی تاریخ میں محبت ہوئی اس سے پہلے نہ تھی کیونکہ پہلی کی عادت تو یہ تھی کہ جو

پہ کچھ کھلایا پلایا کبھی اس کی تشہیر نہیں کی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محلے کے دو چار آدمیوں کو بھی جمع کر کے دکھایا ہو کہ لڑکی کے لئے حلوا بنایا ہے یا کوئی کپڑا عمدہ سلوایا ہے بلکہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو خبر بھی نہ پہنچے کہ پیٹ میں پڑ جائے کسی کی نظر نہ لگے اس وقت جو کچھ پیٹ میں پڑ جائے گا کام آئے گا یہ آج نئی محبت کیسی پیدا ہوئی اگر وہ محبت ہے تو یہ محبت نہیں اور اگر یہ محبت ہے تو اس سے پہلے بجائے محبت کے عداوت تھی بیبیو! ذرا عقل سے کام لو کیا جہیز دینے کی یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ کپڑے برتن وغیرہ جو کچھ سامان دینا ہو صندوق بند کر کے بند بھیجدیئے جائیں اور بند بھیجنے میں بھی یہ ضرور نہیں کہ لڑکی کے ساتھ جاوے کیونکہ اس میں بھی ضرور ہے کہ وہ وہاں فوراً سب کے سامنے کھلے گا۔ وہی ریا۔ پھر رہی بلکہ جب لڑکی میکے میں آوے اس کو دیدو پھر وہ جب چاہے لے جاوے خواہ دفعتاً یا تدریجاً مگر اس کو کوئی گوارا نہیں کرتا ہے۔ ہمارے پاس یہ کافی ثبوت ہے اس امر کا کہ تفاخر اور دکھلاوا ہی منظور ہے پھر جہیز میں وہ چیزیں ہوتی ہیں جو کبھی کام نہیں آتیں صرف ضابطہ کی خانہ پری کر دیتے ہیں۔ چوکی ضرور دی جاتی ہے جس کا ناپ تول ایسا تجویز ہوا ہے کہ کارآمد نہیں نہ اتنی چھوٹی کہ ہر وقت اٹھانے بٹھانے کے قابل ہو اگر چھوٹی ہوتی تو باورچی خانے ہی میں پڑی رہا کرتی اور اتنی بڑی نہیں کہ نماز پڑھ سکیں۔ ایک عجیب دردسر ہے ایک جگہ ڈال دیں اور دیکھا کریں۔ پیڑھی تو اڑکی بنی ہوئی ضرور ہوتی ہے حالانکہ کبھی کام میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ ایک طرف احتیاط سے رکھدی جائے اور گل کر اور ٹوٹ کر ایندھن ہو جائے کیونکہ پیڑھی کا کام تو یہ ہے کہ چولہے کے پاس اس پر بیٹھ سکیں اور جہیز کی پیڑھی اس قدر نازک سبک اور تکلف کی ہوتی ہے کہ چولہے کے پاس رکھنے سے جی دکھتا ہے چولہے کے پاس اس واسطے نہیں رکھی جاتی اور کسی کام کی ہے نہیں۔ بتاؤ یہ کون عقل کی بات ہے اسی کو التزام مالا یلزم کہتے ہیں جس سے علماء منع کرتے ہیں۔ جہیز کی چیزیں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں جو ایک دفعہ دکھلانے کے لئے بنا دی جاتی ہیں اور واقع میں بیکار اور برائی ہوتی ہیں حتیٰ کہ بازار والے بھی جانتے ہیں جب خریدنے جاؤ تو پوچھتے ہیں گھر کے استعمال کیواسطے چاہیئے یا دینے کے لئے محبت اسی کا نام ہے جہیز بڑھیا ہونے کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ لڑکے کے سارے خاندان کو جوڑے دیئے جاتے ہیں اور خاندان میں کئی کئی پشت تک کے مُردے بھی شمار کئے جاتے ہیں ان کے بھی جوڑے

ہوتے ہیں شاید دُولہا دُولہن کو پہنانا منظور ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ جوڑے پہننے کے قابل ہوتے بھی نہیں صرف ضابطہ کی خانہ پُری کے لئے کپڑوں کے عدد پورے کر دیئے جاتے ہیں۔ پاجامہ کا کپڑا دیکھئے وہ چھوٹا کرتے کا دیکھئے وہ چھوٹا جن کے یہاں پہنچتے ہیں وہ اُن کا پاجامہ کُرتا بناتے نہیں کیونکہ بن ہی نہیں سکتا اور کاموں میں لاتے ہیں۔ کیا یہ باتیں عقل کی ہیں۔

یہ حالت تو جہیز کی ہے۔ اب ولیمہ کی سنئے اس پر بہت ہی زور دیا جاتا ہے کہ یہ تو بالیقین سنّت ہے سنت کا نام تو سن لیا یہ بھی معلوم ہے کہ سنّت کہتے کس کو ہیں سنّت نام ہے مَاثَبَتَ بِالسُّنَّۃِ کا یعنی وہ فعل جو حدیث سے ثابت ہو۔ ولیمہ بیشک حدیث سے ثابت ہے مگر لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ کی مثل نہ کرو کہ نفسِ ولیمہ کا ثبوت تو حدیث سے لے لیا اور اسکی کیفیت جو حدیث میں آئی ہے چھوڑ دی جس طرح کہ نفسِ ولیمہ ثابت بالحدیث ہونے کی وجہ سے اختیار کرتی ہو اُسی طرح اس کی کیفیت اور طریقہ بھی کیوں نہیں اختیار کرتیں اگر وہ ثابت ہے تو یہ بھی ثابت ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ولیمہ کی کیفیت سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک سفر میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ صبح کو صحابہ سے فرمایا جو کچھ کھانے کی چیز کسی کے پاس ہو لے آؤ لوگوں کے پاس سفر میں جیسا کچھ توشہ موجود تھا لا رکھا کسی کے پاس کھجوریں تھیں کسی کے پاس پنیر تھا کسی کے پاس سوکھی روٹیاں تھیں جو کچھ تھا لا کر رکھ دیا اور سب نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ولیمہ ہو گیا۔ ولیمہ کا ثبوت تو سبکو یاد ہے اس کیفیت کا ثبوت کسی کو یاد نہیں۔ کیا کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ یہ حدیث تو فعلی ہے قولی حدیث لیجئے شر الطعام طعام الولیمۃ یدعی لہا الاغنیاء ویترک الفقراء یعنی بُرا کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے جس میں امیروں کو بلایا جائے غریبوں کو چھوڑ دیا جائے اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ سب ولیمے اچھے ہی نہیں بعضے بُرے بھی ہوتے ہیں جب بُرا ہے تو منع کرنیکے قابل ہے یا نہیں آجکل ولیمہ ایسا ہی ہوتا ہے اگر کوئی غریب محتاج مانگے تو کہہ دیتے ہیں پہلے جن کیواسطے پکا ہے اُن کو تو کھا لینے دو تم کو پیچھے ملے گا۔ اس ولیمہ کی بُرائی میں تے حدیث سے سنا دی پھر علماء اگر منع کریں تو کیا الزام دوسری حدیث سے سنئے نہٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم عن طعام المتباریین یعنی منع فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن دو شخصوں کے کھانے سے جو آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہوں یعنی بختا بختی سے کھلاتے ہوں۔ اب دیکھ لو کہ برادری کے کھانے ایسے ہی ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر

ایک نے گوشت روٹی دیا ہے تو دوسرے کی کوشش ہوتی ہے کہ بریانی دے تیسرے کی کوشش ہوتی ہے کہ فرینی بھی موجود ہو چوتھا شیرمال اور بڑھاتا ہے حدیث شریف کے بموجب ایک کے یہاں بھی کھانا نہ چاہیئے دیکھو یہ اُن تقریبوں کی حالت ہے جن کو مسنون بتاتے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے طعام المیت یمیت القلب اس کے معنی متعارف اور مشہور تو یہ ہیں کہ وہ کھانا جو کسی کی موت میں پکا ہو اس تقدیر میں طُعام کی اضافت میت کی طرف بہت ہی بعید ملابست سے ہو سکتی ہے میرے نزدیک میت کے معنی عاصی کے لئے جائیں تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ استعمال قرآن شریف میں بھی آیا ہے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو دولت حیات بخشی۔ اب معنی طعام المیت کے یہ ہوں گے وہ کھانا جو گناہ کے طریق پر پکا ہو یعنی اضافۃ الی الفاعل ہو گی اس کھانے میں یہ نحوست ہے کہ دل مر جاتا ہے۔ یعنی حس نہیں رہتی۔ مُردہ اور زندہ میں احساس اور عدمِ احساس ہی کا تو فرق ہوتا ہے۔ جب قلب میں حس نہ رہی تو جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے۔ یہ برکت ہے ان ولیموں اور عقیقوں اور بھاجیوں کی جن کو کہتی ہو یہ رسمیں تھوڑا ہی ہیں۔ انھیں رسم نہ کہو اثم کہہ لو۔ یاد رکھو یہ سب رسمیں ہی ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ رسم وہی ہو جو کفر و شرک ہو اگلے زمانے کی رسمیں بڑی رسمیں تھیں یہ اُن کے مقابلے میں چھوٹی سہی مگر ہیں تو رسمیں ہی اور ان کو چھوٹا بھی تنزلاً کہتا ہوں ورنہ درحقیقت اُن سے کچھ کم نہیں بلکہ من وجہ زیادہ ہی ہیں جیسا ابھی میں نے بیان کیا کہ رسوم متروکہ مبنی علی الکفر تھیں اور یہ مبنی علی الکبر ہیں اور کبر کفر کی جڑ ہے۔ غرض موجودہ رواج بھی سارے کے سارے رسوم ہی ہیں تغافل کی وجہ سے ذہنوں میں سے اُن کا قبح جاتا رہا ہے۔ رسمیں سب چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ان میں جتنی مصلحتیں بتائی جاتی ہیں سب من سمجھوتی ہیں حقیقت میں سب التزام مالا یلتزم ہے اچھے اچھے سمجھدار ان میں بیوقوف بن جاتے ہیں اور پیروی کیے جاتے ہیں۔ بہت سی رسموں کی مصلحت اور وجہ ایجاد معلوم بھی نہیں مگر اسی ہیئت کے ساتھ ادا برابر ہوتی ہیں جب کوئی وجہ بھی اُن کی ذہن میں نہیں تو تقلید محض ہوئی یا نہیں اور کسی کی تقلید شریعت کی تو درکنار کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی عقلمند کی بھی تقلید ہے۔ حاشا وکلا بس سوائے اس کے نہیں کہ جہلا کی تقلید ہے اور رسم محض ہے مصلحت کا نام بھی لینا غلط ہے اور غضب یہ ہے کہ بہت سی رسمیں اب بھی برکت حاصل کرنے کیلئے ادا کیجاتی ہیں جب تک فلاں فلاں کام نہ ہوں شادی سزاوار نہیں ہو گی۔ نعوذ باللہ اور انھیں رسموں کی

نسبت جن کی بناء پر تقلید جہلاء پر ہے۔ قرآن شریف میں ہے وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ اور اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ۔ ازواج مطہرات کو حکم ہے کہ جیسا جاہلیہ میں بے دھڑک نکلتی تھیں اب نہ نکلو۔ اور بطور انکار فرماتے ہیں کیا جاہلیت کا حکم پسند کرتے ہیں بہت لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ رسموں کا شریعت میں کہیں ثبوت نہیں تو منع کا بھی ثبوت کہاں ہے۔ کیا اچھے کپڑے پہننا منع ہے اپنی اولاد کو دینا ناجائز ہے مہمانوں کی خاطر داری بُری بات ہے میں کہتا ہوں منع کا ثبوت قرآن سے تو ڈھونڈ کر ہوا اب حدیث لیجئے۔ ارشاد ہے مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ الشُّهْرَةِ فِي الدُّنْيَا أَلْبَسَهُ اللَّهُ ثَوْبَ الذُّلِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی جو کوئی کپڑا دکھاوے کے لئے پہنے گا اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنایا جائے گا۔ یہ حدیث کپڑے کے بارے میں بالکل صریح ہے اور رسوم کو باشتراک علت شامل ہے اس وعید کی علت شہرت ہے جس کام میں شہرت کا قصد کیا جائے سب اُس کے اندر آ گئے خواہ اُس کو بیٹی کا دینا کہہ لو۔ یا مہمانوں کی خاطر سمجھا کرو جب عقل سے کام لوگی تو حقیقت میں بناء ان رسموں کی صرف دکھلاوے اور التزام مالا یلتزم ہی پر پاؤ گی۔ بیبیو! اگر ان رسموں میں بھلائی ہوتی تو دونوں جہان کے بادشاہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں ضرور ہوتیں۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں کہیں کی کمی تھی حق تعالیٰ جو چاہتے دید یتے۔ آپ کی منگنی کا قصہ میں بیان کرتا ہوں۔ اول یہاں کی منگنی کے خرافات سنئے یہاں شادی سے پہلے اُس کے مقدمہ ہی میں جس کی حقیقت سوائے زبانی بخت و پز کے کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا کیا کچھ طومار پھیلائے جاتے ہیں اس کا بھی پورا ایک قانون مرتب ہے دور دراز سے سفر کر کے لڑکے والا جائے۔ اپنا وقت ضائع کرے روپیہ برباد کرے اتنے دنوں میں جو کچھ کمانا اُس کو سوخت کرے تب اُس سے بات قرار پائے یہ بہت اجمال کے ساتھ بیان ہے ورنہ جو جو قیدیں منگنی میں طرفین سے مقرر ہیں سب جانتے ہیں۔ حاصل یہ کہ جو کام دو پیسے کے خط سے نکلتا اُس میں صد ہا روپے ضائع کئے جاتے ہیں کیوں صاحب اس میں کیا مصلحت ہے اگر یہ کہو کہ خط پہنچا نہ پہنچا کیا اعتبار ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ خط کو رجسٹری کرا دیا ہوتا یا بیمہ کرا کے بھیجا ہوتا اگر اس میں بھی ضائع ہونے کا احتمال ہے تو یہ احتمال غیر ناشی عن دلیل ہے اور اُس کو خبط اور وہم کہتے ہیں ہم جس مکان میں بیٹھے ہیں اس میں ہر وقت امکان عقلی موجود ہے کہ گر جائے لہٰذا چاہیئے کہ بھاگیں پھر جس مکان میں جائیں گے وہاں بھی یہی احتمال ہے نتیجہ یہ کہ بھاگے پھریں

یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور ایسے احتمالات پر اگر حکم کریں تو دنیا کا ایک کام بھی نہ چلے۔ ہزار ہا روپیہ کے نوٹ ڈاک ہی میں بھیجے جاتے ہیں پارسل ڈاک ہی میں جاتے ہیں اگر ضائع ہونے کا خوف ہے تو سب کاموں کے لئے آدمی ہی بھیجا کیجئے۔ غرض منگنی کے لئے اس قدر دردسری کرنے میں مصلحت کچھ بھی نہیں صرف پابندی رسم ہے ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

میں کہتا ہوں اسی میں غور کیا ہوتا کہ ہمیشہ سے کب سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ہندوستان میں پہلے مسلمان نہ تھے۔ اب دو حال سے خالی نہیں یا تو جب مسلمان ہندوستان میں آئے ان رسموں کو بھی اپنے ساتھ لائے یا یہاں کی رسمیں تھیں مسلمانوں نے بھی لے لیں۔ شق اوّل تو غلط ہے کیونکہ اگر یہ رسمیں اسلامی رسمیں ہوتیں تو مسلمانوں کی کتاب میں ہوتیں حالانکہ ایسا نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ شق ثانی ہی صحیح ہے یہ سب رسمیں ہندوؤں کی ہیں انھیں کی صحبت سے مسلمانوں میں بھی آ گئیں۔ رسموں کے نام خود بتاتے ہیں کہ ہندوستان کی ایجاد ہیں مثلاً بَری لفظ ہندی ہے بَر دولہا کو کہتے ہیں۔ اگر کسی اور ملک کی رسم ہوتی تو فارسی یا عربی میں نام ہوتا۔

اسی طرح بھوڑا ٹھیٹھ ہندی لفظ ہے عقل صاف کہتی ہے کہ ہندوؤں کی رسمیں ہیں ہندوؤں سے خلا ملا ہونے سے مسلمان بھی سیکھ گئے مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ جنے جس قوم کی مشابہت کی وہ اسی میں سے ہے بہت مشہور حدیث ہے مگر تعجب ہے کہ اس کا مصداق صرف کوٹ اور پتلون یعنی انگریزی وضع کو قرار دے رکھا ہے حالانکہ تشبیہ عام ہے لباس میں ہو یا رسم و رواج میں۔ ایک قصہ مجھ کو یاد آیا۔ ایک بزرگ تھے وہ ہولی کے دن باہر نکلے تو ہندوؤں کی ہر چیز کو رنگین پایا حتیٰ کہ جانوروں کو بھی۔ راستے میں ایک گدھا پڑا ہنسی میں کہنے لگے۔ تجھ کو کسی نے نہیں رنگا اور یہ کہہ کر اس پر پان کی پیک ڈال دی مرنے کے بعد کسی نے خواب میں دیکھ کر حال پوچھا فرمایا کہ اس پیک ڈالنے پر مواخذہ ہوا کہ اس کو ہولی کھیلنے والوں کے ساتھ لے جاؤ۔ تشبیہ ایسی چیز ہے محمود بادشاہ نے جب ہندوستان کو فتح کیا اور سومنات کا مندر توڑا تو تمام بُت توڑ ڈالے جو بُت سب سے بڑا تھا اس کو بھی توڑنا چاہا پجاریوں نے بہت الحاح وزاری کی اور کہا اس کے برابر ہم سے سونا لے لیا جائے اور اس کو نہ توڑا جائے محمود نے ارکان سے مشورہ کیا سب نے کہا ہم کو فتح ہو ہی چکی اب ایک بُت کے چھوڑ دینے سے ہمارا کیا جاتا ہے اس قدر مال ملتا ہے لشکر اسلام کے کام آئیگا۔ چھوڑ دینا

چاہیئے مجلس میں سید سالار مسعود غازی بھی تھے فرمایا یہ بُت فروشی ہے اب تک بادشاہ بت شکن مشہور تھا اب بت فروش کہلائے گا۔ محمود کے دل کو یہ بات لگ گئی مگر گو نہ تردد باقی تھا دوپہر کو سو یا تو خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر ہے اور ایک فرشتہ ان کو دوزخ کی طرف یہ کہہ کر کھینچتا ہے کہ یہ بُت فروش ہے دوسرے فرشتے نے کہا کہ نہیں یہ بُت شکن ہے اس کو جنّت میں لے جاؤ اتنے میں آنکھ کھل گئی فوراً حکم دیا بُت توڑ ڈالا جائے اُس کو جو توڑا تمام پیٹ میں جواہرات بھرے ہوئے نکلے حق تعالیٰ کا شکر کیا کہ بُت فروشی سے بھی بچا اور جس مال کی طمع میں بت فروشی اختیار کرتا تھا اس سے زیادہ مال بھی مل گیا۔ یہ جنّت اور دوزخ کی طرف کھینچا جانا اس تردد کی صورت دکھائی گئی جو محمود کے قلب میں تھا خیال کرنے کی بات ہے کہ بت کو چھوڑ دینا حقیقت میں بت فروشی نہ تھا لیکن صورۃً بت فروشوں کی مشابہت تھی جس کا یہ نتیجہ ہوا خدا بناہ دے مسلمانو! اس میں سب کفّار کی رسمیں ہیں مزید برآں مل گیا ہے ان میں تفاخر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت اور بدعات ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ تہ نہ بتہ تاریکیاں شر کے اندر سر گھسا ہوا ہے۔ ہاں سنیئے بی بی صاحبہ کی منگنی کیونکر ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود جا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ فاطمہؓ کا نکاح مجھ سے کر دیجئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی سے منظور فرمالیا۔ یہ منگنی ہوگئی۔ یہاں کچھ بھی نہ ہو فقط دولہا مجمع میں بول بھی اٹھے تو غضب آجائے کیسا بے حیا دولہا ہے۔ اب بی بی صاحبہ کے نکاح کی سنیئے اور بارات کا سامان سنیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اور چند صحابہؓ کو بلا بھیجا اور نکاح پڑھ دیا۔ مواہب لدنیہ میں ہے کہ حضرت علیؓ اس وقت موجود بھی نہ تھے نکاح ہو جانے کے بعد آپ کو خبر پہنچی تب آپ نے قبول کیا۔ یہ بارات تھی کہ نوشاہ بھی ندارد پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امّ ایمن کو حکم دیا (یہ ایک لونڈی تھیں) کہ فاطمہؓ کو علیؓ کے گھر پہنچا آؤ۔ بی بی صاحبہ منہ لپیٹے ہوئے ہاتھ پکڑے اپنے گھر پہنچ گئیں۔ یہ رخصتی ہوئی۔

جہیز دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مگر نہ اتنا کہ گھر لٹا دیا نہ کسی کو دکھایا جہیز دینے سے منع نہیں کیا جاتا۔ ہاں جس طرح دیتے ہیں وہ بیشک منع ہے۔ ایک ایک عدد اٹھا اٹھا کر سب کو دکھایا جاتا ہے جوڑوں پر گوٹہ لپیٹا جاتا ہے کہ جو کوئی نہ بھی دیکھے تو اُس کی چمک سے نگاہ اٹھ جائے بیبیو!

یہ تو جائز نہیں ہوسکتا۔ بعض لوگوں نے آجکل اسکی یہ اصلاح کی ہے کہ جہیز کھول کر دکھاتے اور گنواتے نہیں صندوقوں میں بند کرکے برادری کے سامنے رکھدیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ اس سے بھی بدتر ہے کھولکر دکھانے سے تو ایک حد اور مقدار اس کی ذہنوں میں آجاتی ہے اسی کے موافق تحسین و آفریں ہوتی ہے اور بند چیز کی نسبت یہی خیال ہوتا ہے کہ خدا جانے کیا کیا کچھ ہوگا اس سے دینے والے کے نفس کو اور زیادہ بڑائی کا موقع ملتا ہے۔ جہیز کو رخصتی کے وقت بالکل بھیجو ہی مت گھر میں رکھا رہنے دو۔ جب لڑکی کا گھونگھٹ کھل جائے تب لے جاؤ اور اسکے ہاتھ میں فہرست دو اور گنوا دو اور کنجیاں اس کے حوالے کردو کہ یہ تیرا جہیز ہے یہ طریقہ تو ہے محبّت سے دینے کا باقی سب ریاء و نمود ہے۔ یہ طریقہ اس رواج سے بہتر ہے کہ جس کا جہیز ہے اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ سسرال والوں کو کنجی دیدی جاتی ہے اگر کوئی چیز جاتی آتی رہتی ہے تو تمام عمر کی لڑائی بندھ جاتی ہے اور ایسا ہوا ہے کہ سسرالیوں کی بدنیتی سے یا غفلت سے چیزیں ضائع ہوگئی ہیں۔

اب چوتھی اور چالا یعنی بھوڑا سنئے نکاح سے اگلے دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم حضرت علی رضؓ کے یہاں تشریف لے گئے اور حضرت علی رضؓ سے فرمایا ذرا سا پانی لاؤ اور حضرت فاطمہ رضؓ سے فرمایا تم بھی ذرا سا پانی لاؤ۔ دونوں پر پانی چھڑکا اور دعا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس وقت گھر چلتی پھرتی تھیں۔ یہاں کی طرح بُت بنی نہیں بیٹھی تھیں۔ یہاں یہ بھی ایک تکلف ہے کہ بہو بالکل بُت ہوتی ہے حیوانِ متحرک کی جگہ جیوانِ غیر ذی حرکت بن جاتی ہے۔ بیچاری پیشاب کو بھی بلا دوسرے کے نہیں جاسکتی۔ ہنس بول نہیں سکتی۔ سچ مچ کے حبس بیجا میں رکھی جاتی ہے کئی کئی دن پہلے سے کھانا کم کیا جاتا ہے اس خوف سے کہ پاخانہ کی حاجت ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہو ایسی ہونی چاہیئے جس کے پیچھے حاجاتِ انسانی نہ ہوں انسانیت سے خارج ہو بولتی نہ ہو گونگی ہو۔ اس حبس بے جا کو یہاں تک بڑھایا ہے کہ بہو نماز بھی نہیں پڑھتی۔ اوّل تو نمازی ہوتی بہت کم ہیں اور جو کوئی نمازی ہوئی بھی تو نماز کے وقت اگر کوئی سہیلی موجود ہے تو دبے دبائے پڑھ لی اور نہیں تو یہ عذر ہے کہ کوئی تھا نہیں کون پڑھواتا۔ اکیلی کس طرح پڑھتی۔ تُف ہے اس پردے پر بہت جگہ اس قید سے لڑکیاں بیمار ہوگئی ہیں اور جان کے لالے پڑگئے ہیں۔ ہم لوگوں نے جو بات اختیار کی ہے افراط و تفریط سے خالی نہیں پردہ ہو تو اتنا گہرا اور نہ ہو تو بالکل نہیں دیور جیٹھ

خالہ پھوپھی کے لڑکوں سے بالکل پردہ نہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے الحمو الموت یعنی دیور موت ہے۔ سفر میں جب چلیں گی تو ریل جیسے آسان سفر میں نمازیں قضا صرف اس عذر سے کہ قبلہ معلوم نہ تھا یا وضو کے لئے پانی کہاں سے آتا پانی مانگنے یا قبلہ پوچھنے میں بے پردگی ہوتی ہے کیوں بیبیو! جس گاڑی میں تم بیٹھی ہو اگر اس میں کوئی حادثہ ہو جائے مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور ڈاکو گھس آئے تو اس وقت بھی نہ بولوگی اس وقت تو وہ دہائی مچاؤ گی کہ قیامت برپا ہو جائے اس وقت پردہ کہاں جائے گا۔ بات یہ ہے کہ وہ دنیاوی حادثات کی تو ہول دل میں ہے اور اخروی حادثے یعنی گناہ کے انجام کچھ سمجھے نہیں جانتے بہت ہلکی اور معمولی چیزیں ہیں۔ یہ خبر ہے کہ گاڑی میں آگ لگنے یا چور ڈاکو کے ہاتھ سے زائد سے زائد جان جاتی رہیگی یہ تھوڑی سی دیر کی تکلیف ہے کہ ہوئی اور گزر گئی اور ایک نماز کے بدلے ہزاروں برس اس عذاب میں رہنا ہو گا جس کے سامنے دوزخی موت کی تمنا کریں گے۔ بہو بیچاری حیوانِ غیر حسّاس کو یہ عذر ہے کہ کوئی پاس نہ تھا نماز کیسی پڑھتی گھر والوں کو اور سب کاموں کے ہوش ہیں کھانا کھلانے دینے دلانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوتی ہاں نماز پڑھوانے کا بیشک خیال نہیں رہتا خوب سمجھ لو کہ سارے گھر والے مجرم ہیں گناہ ایک بہو پر ہی نہیں سکو سزا ہو گی۔ غرض پردہ میں جہاں افراط ہے وہاں اس حد تک اور جہاں تفریط ہے وہاں بالکل اڑا ہی دیا۔ یہ سب تراشی ہوئی رسمیں ہیں یا نہیں کیا ان کا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خود اٹھ کر پانی لائیں کسی سہیلی نے لا کر نہیں دیا۔

بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ اگلے مولویوں نے کبھی ان رسموں کو نہ ٹوکا ساری نصیحت آج ہی کل کے مولویوں کے حصے میں آ گئی اس کا جواب ایک تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ نصیحت جب ہی دل میں پڑتی ہے کہ جب توجہ ہو ورنہ دیوار کو سنانا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمیں کچھ بحث نہیں مولویوں نے منع کیا ہو یا نہ کیا ہو جب حدیث میں موجود ہے تو آگے کچھ حجت کی ضرورت نہیں۔ نیز میں کہتا ہوں اگلے مولویوں نے بھی ضرور منع کیا۔ فقہاء نے عورتوں کو اس مجمع میں جانے سے منع کیا ہے جس میں یہ مفاسد ہوں دیکھو درّ المختار میں لکھا ہے۔

یہ مسئلہ ایک طالب علم بھی بتا سکتا ہے مگر یہ ترکیب غضب کی ایجاد ہے کہ مفاسد کو مفاسد ہی نہ کہو موجودہ رسموں کو رسم ہی نہ کہو کہ ان پر منع وارد ہو۔ یہ جہل مرکب اور قلب کی موت ہے

کرنے کو جو چاہو کر گذرو مگر یہ یاد رکھو کہ گناہ کا گناہ ہونا تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے پر موقوف نہیں واقع میں جو اثر گناہ کا ہے وہ ضرور ظاہر ہوگا۔ اگر کوئی زہر کھالے اور دل میں خیال کرے کہ زہر نہیں شکر ہے تو کیا وہ شکر ہو جائیگا ہرگز نہیں۔ تھوڑی سی دیر میں مزہ دکھائیگا حق کو اختیار کرلو یا باطل کو۔ ایک طرف کا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ غلطی میں پڑے رہو اور اس کو غلطی نہ سمجھو جو شخص غلطی میں مبتلا ہو مگر اس کو غلطی سمجھتا ہے تو کبھی نہ کبھی یہ امید ہے کہ اس کو چھوڑ دے گا۔ اور جو شخص غلطی کو غلطی ہی نہیں سمجھتا اس سے کیا امید ہو سکتی ہے خود تو متنبہ کیوں ہونے لگا۔ اگر کوئی اور بھی خبردار کرے تو جواب میں کہے گا واہ اس میں بھی کچھ برائی ہے جو میں چھوڑ دوں ایسا شخص ہمیشہ گناہ میں مبتلا رہے گا موت کے وقت بھی توبہ نصیب ہونے کی کیا امید ہے غرض یہ خیال بالکل غلط سمجھو کہ موجودہ رسمیں رسمیں نہیں ہیں اور ساتھ ہی اس کے رسمیں چھوڑنے کی بھی ہمت کرو۔ ان کو ہلکا نہ سمجھو یہ اس اصل کی فرع ہیں جو تمام گناہوں کی حتیٰ کفر و شرک کی بھی جڑ ہے۔

یہ میں نے چند نظریں کبر کی بطور مثال کے بیان کی ہیں ان کو اور ہر اس عمل کو جو کبر کی فرع ہو چھوڑ دو جیسے غیبت حسد وغیرہ۔ غیبت کوئی جب ہی کرتا ہے کہ جب اپنے آپ اس سے اچھا سمجھتا ہے جس کی غیبت کرتا ہے۔ کسی مریض کو ہنستا وہی شخص ہے جو خود تندرست ہو اور اگر اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ مریض پائے تو کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے سے کم مریض کو ہنستا ہو یہ اچھا سمجھنا ہی کبر ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر جو آدمی جلتا ہے (جسے حسد کہتے ہیں) اس کی بناء پر بھی اس پر ہے کہ اس صاحب نعمت سے زیادہ اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل سمجھتا ہے یہ بھی اپنے نفس کی بڑائی ہے جس کو کبر کہتے ہیں غرض اکثر گناہوں کو ٹٹولو گی تو بنا کبر ہی پر پاؤ گی۔ لہذا سب کو چھوڑ دو حتیٰ کہ معاصی کی اصل ہی دل میں سے نکل جائے کیونکہ بڑائی کو حق تعالےٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہیں تو جو شخص کبر کو نہیں چھوڑتا وہ نہیں پہچانتا کہ یہ کس کا حق تھا اور کس کو دیتا ہے تو اس نے نہ نفس کا حق پہچانا نہ حق تعالیٰ کا اس سے بڑھ کر جاہل کون ہوگا یہ شخص معاصی سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے کیونکہ معاصی کی جڑ اس کے دل میں موجود ہے ایک سے نکلے گا دوسرے میں پڑ جائے گا۔ اس واسطے حق تعالےٰ نے ایک ایسا علاج اس کا بتایا کہ جب اس کو مستحضر رکھا جائے تو نہ چھوٹتا

گناہ ہو نہ بڑا۔ وہ علاج یہ ہے کہ اپنی ایک صفت کو بیان فرمایا کہ جب خیال رکھو گے کہ یہ کسی دوسرے کے لئے کسی وقت اور کسی حالت میں ثابت نہ ہونے پائے تو گناہ تم سے خود بخود چھوٹ جائیں گے۔ وہ صفت عظمت ہے وَلَہُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اور اسی کو زمین اور آسمانوں میں بڑائی حاصل ہے) یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفت کبریا یعنی عظمت مختص ہوئی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا۔ تذلل یہ اصل ہے تمام عبادات کی تو جس شخص نے صفت کبریا کو مختص مان لیا حق تعالیٰ کے ساتھ اُس نے حق تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بڑھ کر کوئی عالم یا محقق ہو سکتا ہے انھیں کی شان میں ہے وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی عقلمند لوگ یہی ہیں۔ جب آدمی کے دل میں سے تمام گناہوں کی اصل نکل گئی اور تمام عبادات کی جم گئی تو سبھی کچھ اُس نے پالیا اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لو کہ یہ اصل کلی بہت مختصر الفاظ میں سمجھائی گئی ہے مگر بعض اوقات بلا تفصیل کے اس پر عمل دشوار ہوتا ہے یعنی جب تک ہر ہر عمل کی نسبت معلوم نہ ہو کہ اس کا منشا کبر کس طرح ہے اُس کا ترک آسان نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے سہل اور مفید تدبیر یہ ہے کہ کتابوں کا مطالعہ کیا جائے بلکہ کسی سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے اور جو کوئی پڑھ نہ سکے وہ کسی عالم سے وقتاً فوقتاً سُن لیا کرے۔ واقعات کو پوچھتا رہے اور وعظ سُنا کرے اور عورتوں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں اُن کی ہانڈی چولہے کا ایک وقت ہے کتاب کے پڑھنے یا سننے کا بھی ایک وقت ہونا چاہیئے لیکن افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ مستورات کو اس سے بالکل مس بھی نہیں مرد تو کبھی کوئی مسئلہ پوچھ بھی بیٹھتے ہیں مگر عورتوں کو نہ کہیں زبانی پوچھواتے دیکھا نہ کوئی تحریر کسی کی آتی ہے (الا ماشاء اللہ) حالانکہ بعض مسائل عورتوں کے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ جواب دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں مثلاً پاکی اور ناپاکی کے مسائل کی کہ فقہ کی تمام بحثوں سے اَدَق بحث یہ مشہور ہے صورتیں مشکل سے مشکل پیش آتی ہیں مگر اس پر عمل ہے کہ نہ پڑھی نہ قضا ہوئی۔ کچھ عورتیں تو شرم کے مارے نہیں پوچھتیں اور بعض جو کسی قدر پڑھی لکھی ہیں وہ کسی اُردو کی کتاب میں دیکھ کر جو الٹا سیدھا سمجھ میں آیا کر گذرتی ہیں حیف کی بات ہے کہ اگر کوئی مرض شرم کا ہو جاتا ہے تو اس کے علاج میں یہ نہیں کرتیں کہ بلا سے

جان جاتی رہے مگر شرم نہ جائے۔ علاج کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر ایسی نکال لیتی ہیں کہ شرم بھی نہ جائے اور علاج بھی ہو جائے۔ بیبیو! کسی مسئلہ کا تحقیق کر لینا تو آج کل کچھ بات بھی نہیں دو پیسے میں چاہے جہاں سے جواب منگالو اگر خود نہ کر سکو اپنے خاوند کی معرفت پوچھوالو یا اور کسی بی بی کے ہاتھ سے لکھوا کر دریافت کر لو اگر نہ خود لکھ سکو نہ شوہر موجود ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ سب جب ہو جب دین کا خیال ہو اس غفلت کو چھوڑو اور دین کو دنیا سے بھی زیادہ ضروری سمجھو۔ دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت ختم نہ ہو گی۔ جو طریقہ میں نے بیان کیا اس سے بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ گھر میں جب مسائل کا تذکرہ ہوگا بچوں کے کان میں پڑیں گے اور ساری عمر اُن کو یاد رہینگے جو لوگ تمہارے تابع ہیں اُن کی اصلاح ہو گی ان کی اصلاح بھی تمہارے ذمہ ضروری ہے حدیث میں ہے کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ یعنی ہر بڑے کو چھوٹے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محافظ فرمایا کہ ہر ہر شخص کچھ نہ کچھ ذمہ دار ہے اور اُس کی جواب دہی اُس کے ذمہ ہے اگر نوکرنی تمہاری نماز نہیں پڑھتی ہے تو وہ گنہگار ہے مگر تم بھی اُس کے ساتھ گنہگار ہو اور جواب دینا ہو گا کہ اُسے نماز کیوں نہیں سکھائی تھی۔ بعض لوگوں نے اس کا جواب یہی اختیار کر لیا ہے کہ ہم نے تو بہتیری تاکید کی مگر وہ نماز پڑھتی ہی نہیں۔ کیوں بیبیو!۔ اگر کھانے میں وہ نمک کم و بیش کر دے تو تم کیا کرتی ہو کیا ایک دو دفعہ سمجھا کر کہ نیک بخت نمک ٹھیک رکھا کر خاموش ہو رہتی ہو اور پھر نمک ویسا ہی کھا لیتی ہو جیسا اُس نے ڈال دیا ہو۔ یہ تو کبھی بھی نہ کرو گی چاہے نوکرنی رہے نہ رہے اسے سمجھاؤ گی پھر مارو پیٹو گی۔ اگر کسی طرح نہ مانے گی تو نکال باہر کرو گی۔ بیبیو! دین کا اتنا بھی خیال نہیں جتنا نمک کا جو نماز کے مقابلے میں بالکل غیر ضروری چیز ہے۔ دین کا خود بھی خیال کرو اور جن پر تمہارا قابو چل سکتا ہے اُن کو بھی دیندار بناؤ تمہاری کوشش سے جو کوئی دیندار بنے گا تمہیں بھی اسی کے برابر ثواب ملے گا۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ جہاں دنیا کے دس کاموں کا وقت ہے ایک دین کے کام کا بھی وقت نکال لو۔ جو بی بی خود کتاب پڑھ سکیں وہ کتابوں کو دیکھ کر اپنی اصلاح کریں اور جو خود نہ پڑھ سکیں کسی اپنے رشتہ دار سے پڑھوا کر سُنیں علماء سے وعظ اپنے مکانوں میں کہلوایا کریں جو واقعات پیش آیا کریں اُن کی پوچھ پاچھ کیا کریں علماء سے اُن

کی بی بی کی معرفت یا خط کے ذریعے سے جواب منگا لیا کریں اس سے دین میں ایسی بصیرت
پیدا ہو جائے گی کہ رفتہ رفتہ ہر ہر عمل کی نسبت حکم معلوم ہو جائے گا جب کسی چیز کی
بُرائی معلوم ہو جاتی ہے تو کبھی نہ کبھی تو دل میں اُس سے بچنے کا ارادہ پیدا ہونا ہی ہے
اس صورت میں اگر ذرا سی بھی ہمّت سے کام لوگی تو دن دونی رات چوگنی ترقی ہو گی۔ اور
اسی میں شدہ شدہ تمام مفاسد کی جڑ یعنی کبر بھی قلب سے نکل جائے گا۔ اسی کو
حق تعالےٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے گو اور تمام مفاسد کا علاج بتا دیا کہ اس ایک
صفت کو حق تعالےٰ کے ساتھ مخصوص مان لو۔ یہ صفت کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتی وہ
صفت کبریا ہے یہ ایک جڑ ہے جس کے ہزاروں شعبے ہیں اجمالاً نہیں بلکہ تفصیلاً اس کے
تمام شعبوں کو حق تعالےٰ کے ساتھ خاص کر دو اور میں یہ نہیں کہتا کہ سب کی سب متبحّر
مولوی بن جاؤ بلکہ جہاں تک موقع ملے غفلت نہ کرو جیسا روپیہ اور زیور کے جمع کرنے
کا سب کو شوق ہے یہ یقینی بات ہے کہ تمام بیبیاں اپنا دل بھر کے زیور اور روپیہ
نہیں پا سکتیں مگر غریب سے ہے تو امیر ہے تو ہر بی بی کو کوشش ضرور ہے کہ زیور اور روپیہ
مل جاوے جتنی کوشش سے ایک مقدار روپیہ کی مل سکتی ہے اتنی کوشش سے بلکہ
اُس سے کم سے دین کی بہت بڑی مقدار مل سکتی ہے ہمت نہ ہارو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔
تم ایک حصّہ کماؤ گی تو خدا تعالےٰ کی طرف سے دس حصّے مرحمت ہوں گے۔ آگے اس
مضمون کو حق تعالےٰ نے وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (وہ غالب وصاحب حکمت ہے۔)
سے مؤکد کیا اُن لوگوں کے چونکانے کے لئے جو اس مفسدے سے کسی طرح بچتے ہی نہیں۔
اور اپنے عیب پر اُن کی نظر پڑتی ہی نہیں جب اُن کو سمجھانے اور اُن کی بھلائی سوجھانے
سے اثر نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں میں عزیز یعنی غالب بھی ہوں اگر تم کہنا نہ مانو گے تو میرے ہاتھ
سے کہیں جا نہیں سکتے جیسی چاہوں سزا دوں گا۔

اور اگر کسی بُرے عمل پر فوراً سزا نہ ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ میں حکیم بھی ہوں کسی مصلحت
سے مہلت دیتا ہوں بعض لوگ رشوت لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں رشوت سزا وار ہے۔ صاحبو!
اس دھوکے میں نہ رہو خدا کے غضب کو مت بھولو۔ اوّل تو دنیا ہی میں سزا ملے گی اور اگر دنیا

میں کسی حکمت اور مصلحت سے ٹل ہی گئی تو آخرت تو دار الجزاء ہے وہاں کی سزائیں اور زیادہ سخت ہیں وہاں کی سزا سے تو دنیا ہی کی سزا بھگت لینا اچھا ہے۔ وہاں کے احوال وآفات کو سوچتے رہنا چاہیئے نص صریح موجود ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ یعنی چاہیئے کہ خیال رکھے ہر شخص کا کہ کل کے لئے کیا سامان کیا ہے۔ اور اسی کے یاد دلانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں زُوْرُوا الْقُبُوْرَ وَاَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَادِمِ اللَّذَّاتِ یعنی قبروں پر جایا کرو اور لذتوں کو مٹانے والی چیز یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو۔

(اس سے عورتیں یہ فتوے نہ نکال لیں کہ قبرستان میں جانا جائز ہے عورتوں کے پردے سے نکلنے میں بہت سی خرابیاں ہیں مُراد تذکرِ آخرت وقیامت ہے۔ جس طرح بھی ہو کسی معتبر[ع] کتاب میں قیامت کے حالات پڑھیں یا سُنیں) اور یہ موت اور قیامت کی اجمالی حالت کافی نہیں کو کوئی موت موت کی تسبیح پڑھا کرے بلکہ موت کو یاد رکھنا یہ ہے کہ جب کوئی کام کرے سوچ لے کہ بعد موت کے اُس پر کوئی جواب دہی تو میرے ذمّہ عائد نہ ہوگی۔ ہمیشہ اس کا خیال رکھو اور اگر کچھ کام قابلِ جواب دہی ہو گئے ہیں تو اُن سے توبہ کرو اور برابر توبہ کرتی رہو۔

اب دُعا کرو کہ خدا تعالیٰ اس کی توفیق دیں

[ع] معتبر کتاب قیامت کا سچا فوٹو یعنی احوال الآخرت مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۱ سے طلب فرما کر پڑھیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد دوم

کا

چوتھا وعظ ملقب بہ

حیوۃ طیبہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد دوم کا

چوتھا وعظ ملقب بہ

حیوٰۃِ طیبہ

اَیْن	مَتٰی	کَمْ	کَیْف	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْن	مُتَفَرِّقَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	رجب ۱۳۲۹ھ یوم جمعہ	نماز جمعہ سے وقت عصر تک	بیٹھ کر	ثمرات اطاعت	مولوی عبداللہ صاحب	تقریباً ۱۰۰	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَّلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ آیت شریف کا یہ ہے کہ جو شخص عمل نیک کرے مرد یا عورت اور وہ مومن ہو پس بیشک ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا فرما دیں گے اور بیشک ہم اُن کا اجر بدلہ میں دیں گے بسبب اُن کے اچھے اعمال کے اس آیۃ شریف میں حق تعالیٰ نے اپنے مطیع بندوں کے لئے اطاعت پر دو بڑی دولت کے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اور نیز اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی تبلا یا ہے اوّل ایک مضمون بطور مقدمہ سمجھنا چاہیئے اُس کے بعد آیت کریمہ کا مضمون بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا۔ دُنیا میں جس قدر عقلاً

ہیں کہ جن کے افعال کی غایتہ ہوتی ہے ان میں ہر ایک شخص ایک شئے کا طالب ہے کوئی مال کا طالب کوئی جاہ کا کوئی صحت کا کسی کو درویشی مطلوب ہے کوئی علم کا دیوانہ ہے کسی کو تجارت میں لطف آ رہا ہے کوئی اولاد کی دُھن میں ہے کوئی مکانات کی تعمیر کا شوق رکھتا ہے کسی کو باغ لگانے کی حرص ہے غرض کوئی ایسا نہیں جو طلب سے خالی ہو۔ بعضے ان میں ہی خدا کے بھی طالب ہیں۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اشیائے متعدّدہ مختلفہ کے طالب ہیں لیکن اگر غور کیا جائے اور نظر کو عمیق کر کے دیکھا جائے تو فی الواقع ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شئے ہے۔ صرف اختلاف اُس کے تعیین طریق میں ہے کسی نے سمجھا کہ وہ شئے تجارت سے حاصل ہوگی وہ تجارت میں مشغول ہو گیا۔ کسی نے خیال کیا کہ علم سے اُس کی تحصیل ہوگی وہ علم کا طالب بن گیا۔ کسی نے اولاد میں اُس مطلوب کو گمان کیا وہ اولاد کا شیفتہ ہو گیا آپ کو تعجّب ہوگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کا مقصد جُدا ہے اور تم کہتے ہو کہ سب کا ایک ہی مقصد ہے۔ اختلاف طرق میں ہے اس لئے اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیئے ایک شخص کے پاس دس[۱۰] سائل آئے ایک[۱] نے روٹی طلب کی دوسرے[۲] نے چاول پختہ مانگے تیسرے نے پیسہ مانگا چوتھے[۴] نے روپیہ پانچویں[۵] نے غلّہ چھٹے[۶] نے آٹا۔ ساتویں[۷] نے کوڑیاں، آٹھویں[۸] نے چنے بھنے ہوئے۔ نویں[۹] نے کچے چاول دسویں نے حلوا پس اس مثال میں بظاہر مطلوب ہر ایک کا جُدا ہے۔ لیکن درحقیقت مقصود واحد ہے طرق مختلف ہیں مقصود پیٹ بھرنا ہے کسی نے سمجھا پکانے کا کون قصّہ کرے اس نے پکی ہوئی روٹی مانگی۔ کسی نے خیال کیا کہ کچی جنس ملے گی تو اپنی مرضی کے موافق پکا کر کھائیں گے۔ کسی نے یوں ہوس کی کہ روپیہ پیسہ ملے گا تو جنس بھی اپنی خواہش کے موافق خرید کر پکائیں گے اس مثال سے آپ کو مختلفات کا جمع کرنا آسان ہو گیا ہوگا اسی طرح ان لوگوں کے مطلوب کو دیکھنا چاہیئے۔ کہ اُن کا مقصود کیا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو شئے واحد مقصود ہے اور وہ لذّت وراحت ہے طرق کا اختلاف ہے کسی نے سمجھا کہ روپے کے حاصل ہونے میں مزہ ہے وہ اس کا طالب ہو گیا کسی نے سمجھا کہ جاہ میں مزہ ہے کسی نے اولاد میں لطف دیکھا کسی نے تجارت میں کسی کی سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مزے تو سب فانی ہیں مزہ اصلی تو آخرت میں ہے۔ الیٰ غیر ذالک من الطرق مگر حاصل سب کا ایک ہے کہ قلب کو چین ہو راحت ہو مسرّت ہو انبساط ہو۔

دوسری مثال اور لیجئے کہ تاجر مختلف اشیاء کی تجارت کرتے ہیں کوئی بساطی ہے کوئی بزاز ہے کوئی بقال ہے اور کوئی لکھنو میں تجارت کرتا ہے کوئی کلکتہ میں کوئی بمبئی میں تو یہ سب ایک شئے کے طالب ہیں وہ شئے کیا ہے نفع مگر اس کے طرق مختلف ہیں کسی نے سمجھا کہ بزازی کی دکان میں نفع ہے کسی نے خیال کیا کہ بساط خانہ میں بہت نفع ہے اس نے اسی کو اختیار کرلیا کسی نے سمجھا کہ لکھنؤ میں چکن اچھی ہوتی ہے وہ وہاں جا پہنچا کسی نے یہ خیال کیا کہ کلکتہ میں تجارت سے بہت نفع ہوگا وہ وہاں پہنچ گیا چنانچہ اگر کسی تاجر سے کہا جاوے کہ تم کو جو نفع کلکتے میں ملے وہ ہی نفع تم کو ہم یہاں دیتے ہیں وہ ہرگز کلکتہ نہ جاوے گا کیونکہ مقصود اس کو حاصل ہوگیا غرض یہ امر بالکل اب واضح ہوگیا ہوگا کہ لوگ بظاہر اشیاء مختلفہ کے طالب ہیں مگر حقیقتاً مطلوب ایک ہی اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس مطلوب یعنی لذت وراحت کے حاصل کرنے میں رائیں مختلف ہیں کسی کی رائے تجارت کی ہے کسی کی زراعت کی ہے اور گاہے آپس میں ایک دوسرے کو خاطی بناتے ہیں چنانچہ جو تجارت کرتا ہے وہ احیاناً زراعت کرنے والے کو خطا پر بناتا ہے اور زراعت کرنے والا تاجر کو خاطی بنا رہا ہے اور ان ہی طالبین میں بچے بھی ہیں وہ بھی اسی مطلوب یعنی لذت وراحت کے حاصل کرنے میں مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں لڑکیاں گڑیاں کھیلتی ہیں لڑکے کوئی گیند کھیلتا ہے کوئی کنکوا اڑاتا ہے کوئی ریتے کا مکان بناتا ہے ان کے مکان کو ہم بیہودہ شغل سمجھتے ہیں اور ہم جو قرض لے لیکر مکان بناتے ہیں اس کو بے ہودہ نہیں سمجھتے وجہ یہ ہے کہ اپنے مکان کو پائیدار سمجھتے ہیں اور معتدبہ راحت کا آلہ پس معلوم ہوا کہ اس مقصود کے باوجود کہ اس کے کہ وہ واحد ہے درجات مختلف ہیں ایک معتبر اور قابل شمار اور دوسرے غیر معتبر اور ناقابل شمار اور مجموعہ تقریر سے دو امر معلوم ہوئے ایک یہ کہ مقصود کے طرق میں اختلاف ہے دوسرے یہ کہ اس مقصود یعنی لذت وراحت کے افراد بعض قابل شمار ہیں اور بعض نہیں ہیں اب یہاں دو امر تنقیح طلب ہیں کہ مقصود یعنی لذت و راحت کا کون فرد حقیقتہً معتبر ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا طریقہ تحصیل کا کیا ہے پس اس کا فیصلہ ایسا شخص کرسکتا ہے کہ جو حقائق اشیاء اور آثار اشیاء سے من کل الوجوہ واقف ہو اور نیز وہ خود غرض نہ ہو کیونکہ کسی کا علم اگر ناقص ہوگا یا کوئی خود غرض ہوگا تو وہ ہرگز ان دو امور کے متعلق فیصلہ نہیں کرسکتا تو اب دیکھنا چاہیئے کہ جس میں یہ دو صفتیں علی وجہ الکمال موجود

ہوں وہ کون ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوق میں یہ دونوں صفتیں ناقص ہیں جو عالم نظر آتا ہے اس سے زیادہ اور عالم موجود ہے وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ اور استغنا اور بے غرضی کی صفت میں بھی مخلوق ناقص ہے جس کو دیکھئے وہ خود غرض ہے اگر کہا جاوے کہ بعضے ہمدرد ان قوم ایسے ہیں کہ دوسروں کو بلا غرض نفع پہنچاتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں بعضے ثواب کے طالب ہیں اور بعضوں کی ایسی طبیعت ہوتی ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچا کر ان کے دل کو ٹھنڈک اور راحت پہنچتی ہے یہ ازاحتہ رقت جنیت بھی ایک غرض ہے اسی طرح ماں باپ اور جملہ اقربا جو کچھ کرتے ہیں سب اپنی شفائے قلب کے واسطے کرتے ہیں اگر کوئی کہے کہ بعضے لوگ ایسے طور سے دیتے ہیں کہ نہ دینے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لینے والا کون ہے اور نہ لینے والے کو دینے والے کا حال معلوم ہوتا ہے اس میں کون سی غرض ہے جواب یہ ہے کہ یا تو اسکو ثواب مطلوب ہوگا اور اگر ثواب مطلوب نہ ہو تو نفس عطا سے اس کے دل کو حظ ہوگا یہ بھی ایک غرض مطلوب ہے بالجملہ مخلوق میں ایسا کوئی نہیں جو علم اور استغنا کی صفت علی وجہ الکمال سے موصوف ہو ایسی ذات پاک تو حق تعالیٰ کی ہی ہے علم کی تو اُن کے وہ شان ہے کہ عالم الغیب والشہادۃ ہیں اور بے نیازی ایسی ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

من نکردم خلق تا سُودے کنم   بلکہ تا بر بندگاں جُودے کنم

میں نے مخلوق اس لئے نہیں پیدا کی کہ میں کوئی نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا تا کہ اپنے بندوں پر عنایت کروں

اور خدا تعالیٰ کو اپنا نفع مقصود ہو نہیں سکتا اس لئے کہ نفع جو ہمکو مقصود ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہمارے اندر ایک نقصان تھا اس نفع کے حاصل ہونے سے اس کی تکمیل ہوگئی اور حق تعالیٰ کی ذات خود کامل اکمل ہے اگر حق تعالیٰ کو بھی اپنا نفع مقصود ہو تو نعوذ باللہ ذات باری میں نقصان اور استکمال بالغیر لازم آتا ہے بہرحال نہ خدا تعالیٰ کی برابر کسی کا علم ہے اور نہ کوئی ایسا بے غرض ہے لہٰذا ان دونوں مسئلوں کا فیصلوں حق تعالیٰ سے ہی کرانا چاہیئے۔

چنانچہ کلام اللہ کی ان آیات میں ان دونوں امروں کا فیصلہ فرما دیا کہ بطور حاصل ارشاد ہے کہ اے بندو تم جو اپنے مقصود یعنی راحت کو مختلف چیزوں میں ڈھونڈتے ہو کوئی مال میں راحت و لذت کا طالب ہے کوئی بیوی بچوں میں اپنے مطلوب کو تلاش کرتا ہے کوئی جاہ میں کوئی مکانات

میں مشغول ہے ہم تم کو راحتِ حقیقی کے تحصیل کا طریقہ تبلاتے ہیں وہ یہ ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا الخ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک کام کرتا ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو یعنی عقیدہ اس کا درست ہو ہم اس کو مزہ دار زندگی عطا فرما دیں گے اور ہم اُن کو جزا دیں گے بسبب احسن اُن اعمال کے جو کیا کرتے تھے اس ترجمہ سے دونوں امر تنقیح طلب جو اوپر مذکور ہوئے معلوم ہو گئے یعنی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود معتبر کیا ہے اور اس کا طریق تحصیل کیا ہے مقصود دو چیزیں ہیں حیاتِ طیبہ اور اجر اور اس کا طریق بھی دو چیزوں کا حاصل کرنا ہے عمل صالحہ اور عقائد صحیحہ۔

اور حیاتِ طیبہ اور اجر کا حاصل ایک ہی ہے یعنی لذت اور مسرت کیونکہ حیات طیبہ جس کو فرمایا ہے اس کی تکمیل اجر اخروی سے ہو گی اس لئے کہ جس حیات کے بعد اجر نہ ہو وہ حیاتِ طیبہ نہیں اس لئے کہ جب اسکو معلوم ہے کہ یہ آرام و راحت دنیا ہی میں ہے اور بعد اس حیاتِ دنیوی کے پھر تکالیف کا سامنا ہے تو وہ حیات بھی مزہ دار نہ ہو گی۔ مثلاً کوئی شخص نہایت ہوادار اور شاندار پُر لطف کمرے میں ہے اور کھانے پینے کی اشیاء سب موجود ہیں اور آرام کے سب سامان مہیا ہیں لیکن اُس پر ایک مقدمہ فوجداری کا قائم ہے اور اس کو معلوم ہو کہ فلاں دن میرے لئے پھانسی کا حکم ہو گا تو اس کو یہ زندگی اور یہ ظاہری تمتع وبال جان ہو گا اور ہر شئے اس کو خار نظر آئے گی اسی طرح دنیا کا حال ہے کہ یہاں خواہ کتنا ہی آرام ہو جب یہ معلوم ہو کہ یہ فانی ہے تو کیا لطف ہے اور دنیا تو خواہ ملے یا نہ ملے ہر صورت میں پریشان کرنے والی ہے ؎

اذا ادبرت کانت علی المرء حسرۃ وان اقبلت کانت کثیرا ھمومہا

اگر نہ ملے تو نہ ملنے کا افسوس اور حسرت رہتی ہے اور اگر ملے تو طرح طرح کے افکار اور ہموم ہوتے ہیں۔ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے یہاں خیریت ہے وہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ خیریت ہو گی تمہارے یہاں ہمارے یہاں تو بفضلہ تعالیٰ کچے بچے چھوٹے بڑے موجود ہیں آج فلاں بیمار ہے کل اس کو بخار ہے کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے جس کے یہاں کوئی نہ ہو اُس کے یہاں خیریت ہوتی ہے۔ غرض دنیا میں پریشانی ہی پریشانی ہے۔ اگر حس صحیح ہو تو واقعی سخت مصیبت کی جگہ ہے کسی طرح چین نہیں، ایک مقصود اگر حاصل ہوتا ہے دوسرے کی فکر ہوتی ہے مثلاً شادی بھی ہو گئی مال و دولت سب کچھ ہے

اولاد نہیں ہے تو اولاد کا ہر وقت فکر ہے کہ اولاد ہو یہی دھن ہے یہی فکر ہے شب و روز اسی میں گذرتا ہے کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ سب جائداد وقف کردوں کبھی خیال ہوتا ہے کہ کسی کو متبنیٰ بناؤں خدا خدا کرکے اولاد ہو گئی اب شب و روز اسی دُھن میں ہیں کہ کسی طرح کہ یہ جلدی پرورش ہو جائے تو اس کے ختنے دھوم دھام سے ہوں اور اس کی شادی ہو۔ اللہ اللہ کرکے اولاد سیانی ہو گئی اور شادی بھی ہو گئی اب رات دن یہی فکر ہے کہ اولاد کے اولاد نہیں ہے اسی غم میں گھلتے ہیں غرض ساری عمر عزیز اسی میں صرف ہو جاتی ہے اور کوئی وقت اللہ کی طرف مشغول ہونے کا میسّر نہیں ہوتا ؎

وما قضیٰ احد منہا لبانتہ　　　لا ینتہی ارب الا الیٰ ارب

بہ خلاف اُس شخص کے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو وہ پھر بہ نسبت اُس شخص کے راحت میں ہے اُس کا تو یہ حال ہے ؎

نے غم دزد دنے غم کالا　　　بالا　　　لنگکے زیر لنگکے

ایک رئیس تھے اُن کے ایک بچہ تھا اتفاقاً وہ بیمار ہو گیا تمام جائداد و سامان اُن کو تلخ معلوم ہوتا تھا۔ یہ حالت دنیا کی ہے سچ ہے وان اقبلت کانت کثیرا ھمومھا حاصل یہ ہے کہ اگر تمام نعمتیں میسّر بھی ہوں اور آخرۃ میں اُس کے لئے کچھ نہ ہو تو سب ہیچ ہے اس لئے حیات طیبہ اسی وقت ہو گی جب کہ اجر بھی ہو اسی واسطے فَلَنُحْيِيَنَّهُ الخ کے ساتھ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ الخ فرمایا حاصل دونوں کا حیات کاملہ ہوئی خلاصہ یہ ہوا کہ گویا حق تعالیٰ بطور حاصل ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے دنیا میں بھٹکنے والو تم میں سے ہر ایک جو مقصود معتدبہ کا طالب ہے ہم بتاتے ہیں کہ مقصود معتدبہ حیات طیبہ کاملہ ہے اور اس کے طرق میں جو تم غلطیاں کر رہے ہو تو اس کے طریق کو بھی متعین کرتے ہیں وہ اطاعت اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے گویا تمام آیۃ کا حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا نتیجہ و ثمرہ لطف دائم ہے یہ ایک دعویٰ ہے اور یہ ایسا دعویٰ ہے کہ اگر ہم اس کا صدق مشاہدہ بھی نہ کرتے تو بھی ہم کو بلا تامل تصدیق کرنا چاہیئے اس لئے کہ یہ ایسی ذات کا فیصلہ ہے کہ جس کا علم کامل ہے اور بے غرض اور مستغنی بالذات ہے چہ جائیکہ اس کا صدق ہم کو کالشمس فی نصف النہار نظر بھی آرہا ہے اور مشاہدہ روز بروز اسکو پختہ کرتا جاتا ہے جیسا کہ ہم اسکو آئندہ چل کر واضح بیان کریں گے اس وقت فَلَنُحْيِيَنَّهُ

حیوٰۃً طیبۃً کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے کہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ حیات طیبہ سے کیا مراد ہے دنیا کی حیات یا برزخ کی کیونکہ عالم تین ہیں عالم آخرت عالم دنیا عالم برزخ اور آخرت کو گو مشاہدہ نہیں کیا مگر اہل ملت میں بلکہ حکما و فلاسفہ قدما میں بھی اس کے منکرین کم ہیں حتیٰ کہ سوائے اہل اسلام کے اور لوگ بھی اس کے قائل ہیں اس لئے اس کا کوئی نمونہ دنیا میں بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بخلاف برزخ کے کہ اس کے منکرین بہت ہیں حتیٰ کہ اہل اسلام میں معتزلہ نے اُس کا انکار کیا ہے اور حدیثوں میں جو آیا ہے کہ جب آدمی مرتا ہے قبر میں دو فرشتے منکر نکیر آتے ہیں ان کا معاملہ مختلف ہوتا ہے اگر بندہ مومن ہوتا ہے اُس کے پاس نہایت اچھی صورت میں آتے ہیں اور اُس سے سوال کرتے ہیں وہ پسندیدہ جواب دیتا ہے پھر اُس کے لئے قبر کشادہ ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جہاں تک اُس کی نگاہ جاتی ہے۔ اس کو ایک وسعت نظر آتی ہے اور اس کو کہا جاتا ہے نَمْ کَنَوْمَۃِ الْعَرُوْسِ اور اگر وہ کافر ہوتا ہے اُس کے پاس نہایت ہولناک صورت میں آتے ہیں اور جو سوال اس سے کیا جاتا ہے وہ جواب میں لَا اَدْرِیْ یعنی میں نہیں جانتا کہتا ہے اس کے لئے قبر تنگ ہو جاتی ہے اور اس کو اس قدر دباتی ہے کہ اسکی پسلیاں ادھر کی ادھر اور ادھر کی اُدھر ہو جاتی ہیں گرزوں سے اس کو مارتے ہیں اور سانپ اور بچھو اس کو ڈستے ہیں غرض انواع انواع کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے معتزلہ اور ہمارے نو تعلیم یافتہ ان احادیث کا بالکل انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو قبر کو کھود کر دیکھتے ہیں نہ اس میں فرشتہ ہے نہ گرز ہے نہ وسعت ہے نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ایک آدمی کو بھیڑیا کھالے یا دو شیر کھالیویں تو وہاں کس طرح یہ سوال و جواب ہوں گے اور کیسے وہاں وسعت ہو گی اور وہاں سانپ بچھو کہاں ہیں ہم تو صریحًا دیکھتے ہیں کہ بھیڑیئے اور شیر کے پیٹ میں نہ سانپ ہیں نہ بچھو ہیں نہ گرز ہے بات یہ ہے ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اسلام کا دعویٰ کرنے والوں میں سے بہتر فرقوں میں سے ہر ایک نے اپنی لڑائی کے لئے عذر تراش رکھا ہے جو حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا وہ قصہ کہانیوں کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

وجہ یہ کہ خود علم نہیں اور علماء کی اتباع سے عار آتی ہے حالانکہ سلامتی کی بات یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ جاننے والے کا دامن پکڑنا چاہیئے کاش اگر ہم پوچھ لینے تو پتہ لگ جاتا ان تمام شبہات کا منشاء یہ ہے کہ قبر نام اس گڑھے کا رکھ لیا ہے۔ حالانکہ قبر سے مراد احادیث میں یہ گڑھا نہیں۔ بلکہ مراد قبر سے عالم برزخ ہے اور عالم برزخ اُس گڑھے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ برزخ اس حالت کا نام ہے جو آخرۃ اور دُنیا کے درمیان کی حالت ہے اگر قبر میں دفن کر دیا وہی اس کا برزخ ہے اس سے وہاں ہی سوال وجواب وثواب وعذاب ہوگا اور اگر بھیڑیئے وشیر نے کھا لیا اُس کے لئے وہی برزخ ہے اور اگر جلا دیا تو جہاں جہاں اس کے اجزاء اس سے وہاں ہی یہ سب واقعات پیش آئیں گے لیکن چونکہ شریعت میں دفن کرنے کا حکم ہے اس لئے عالم برزخ کو قبر سے تعبیر فرمایا ہے اور دفن کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں اوّل تو یہ کہ رُوح کو مرنے کے بعد اس جسدِ خاکی سے ایک تعلق رہتا ہے جیسا کہ مثلاً آپ یہاں موجود ہیں اور آپ کا گھر مثلاً جلال آباد ہے تو آپ کو گھر سے تعلق ہے تو اگر مُردہ کو جلا دیا جاوے گا اور قبر میں دفن نہ کیا جاوے گا تو رُوح کو چین نہ ہوگی اور اس کو اس جسدِ عنصری کے جلنے کا حُزن ہوگا جیسے کسی کے گھر میں آگ لگا دی جاوے اس کو رنج ہوتا ہے یا جیسے مثلاً کسی شخص کا کچھ اسباب ایک جگہ رکھا ہے اور کچھ دوسری جگہ اس کی طبیعت پریشان رہتی ہے اسی طرح اگر اس جسم کے اجزاء منتشر ہوتے ہیں تو رُوح کو ایک پریشانی ہوتی ہے ایک حکمت یہ ہے کہ دفن کرنے میں ابقائے نفع باطنی ہے یعنی اگر کسی صاحب کمال کی وفات ہو جائے اور ان کو دفن کر دیا جائے تو بعد وفات باطنی نفع ان سے زیادہ ہوگا۔ بہ نسبت اس کے کہ جلایا جاوے یا اجزاء اس کے کسی اور وجہ سے منتشر ہو جاویں اور ایک حکمت دفن کرنے میں یہ بھی ہے کہ عنصرِ غالب خاک ہے تو مقتضائے عقل کا بھی یہی ہے کہ اس کے ہی جنس میں ملا دیا جائے اسی بنا پر ایک بزرگ کہتے تھے کہ ہندو جو جلاتے ہیں اُس کی غالباً ایک وجہ ہے وہ یہ کہ آدمیوں سے پہلے زمین پر جن تھے اُن کی شریعت میں عجب نہیں کہ جلانے کا حکم ہو اس لئے کہ ان میں عنصر غالب نار ہے تو جلانے سے نار نار میں مل جائے گی ہندوؤں نے اس مسئلے میں ان کی تقلید کی اور یہ نہ سمجھے کہ ان میں تو جزوِ غالب نار تھا اس لئے جلانے کا حکم ہوا اور ہم میں جزوِ غالب خاک ہے

اس لئے ہم کو دفن کا حکم ہوا حاصل یہ کہ قبر کے متعلق جس قدر شبہات ہیں وہ سب اس پر مبنی ہیں کہ قبر کی حقیقت نہیں سمجھتے اسی استبعاد کی وجہ سے چونکہ اس کا بکثرت انکار کیا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کا ایک نمونہ دنیا میں پیدا فرمایا ہے وہ کیا ہے خواب یعنی سونا سوتے ہوئے آدمی دیکھتا ہے کہ سانپ نے کاٹ لیا ہے دریا میں ڈوب گیا ہے کسی نے لٹھ مار دیا ہے اور اس کو الم محسوس ہو رہا ہے حالانکہ وہ نرم نرم بستر پر لیٹا ہوا ہے اگر گرمی ہے تو پنکھے ہو رہے ہیں خس کی ٹٹیاں لگ رہی ہیں یا دیکھتا ہے کہ وہ مسند پر سریر آرائے سلطنت ہو رہا ہے اور باندیاں اور غلام صف بہ صف دست بستہ کھڑے ہیں اور طرح طرح کے آرام و راحت کے سامان ہیں حالانکہ وہ زمین پر لیٹا ہوا ہے نہ تکیہ ہے نہ بستر ہے۔ نہ کوئی پرسان حال ہے بیمار ہیں سخت درد میں مبتلا ہیں یہ سونے والے اگر ان حکایات کو بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی دلیل عقلی کا ان واقعات پر مطالبہ نہیں کرتا۔ بلکہ اگر کوئی دلیل عقلی پوچھے تو اس کو احمق بنایا جاتا ہے اور اس کو وہ سونے والا کہے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی سوئے نہیں خدا کرے تم سوؤ تو تم کو یہ سب باتیں واضح ہو جائیں گی پس ہمارا بھی یہی جواب ہے کہ جب مرو گے معلوم ہو جائے گا بقول شخصے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　　گفتم کہ چو ما شوی بدانی

(کسی نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہے میں نے کہا کہ جب تو میرے جیسا ہو جائیگا تجھے معلوم ہو جائیگا یعنی عشق سمجھانے کی چیز نہیں)

غرض کہ خواب برزخ کا پورا نمونہ ہے کہ جیسے ہم سونے والے کو دیکھتے ہیں کہ وہ آرام سے لیٹا ہوا ہے حالانکہ وہ سخت تکلیف کا مشاہدہ کر رہا ہے یا یہ کہ وہ تکلیف میں ہے اور خواب میں مزے لوٹ رہا ہے۔ اسی طرح مردے کا حال ہے کہ اگر قبر کو کھود کر دیکھا جاوے تو جس طرح دفن کر آئے تھے اسی طرح ہے لیکن وہاں کے واقعات اس پر سب گذر رہے ہیں لیکن اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بس معلوم ہو گیا کہ برزخ کے واقعات خواب جیسے ہیں جس طرح خواب کی کوئی اصل نہیں اسی طرح فی الواقع یہ کوئی شئے نہیں مردے کو یہ واقعات محض متخیل ہوتے ہیں اس لئے کہ ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ خواب نمونہ ہے یعنی خواب مشابہ برزخ ہے مماثل نہیں کیا عالم برزخ کے واقعات حقیقت رکھتے ہیں۔ تحقیق اس کی یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ روح اس جسم سے تو مفارق ہو جاتی ہے۔

اس لئے اس جسم کو تو عذاب ثواب تکلیف آرام کچھ نہیں ہوتا ہاں اس جسم سے روح کو تعلق قدیم کی وجہ سے ایک تعلق خاص ہوتا ہے جیسا کہ آدمی کو اپنے گھر سے یا کپڑے سے وہ گھر اور کپڑا اس سے مفارق ہے لیکن اُس سے تعلق ہے اور اسی تعلق کی بنا پر اگر مُردے کے جسم کو کوئی مارے تو رُوح کو ایک قسم کی کوفت ہوتی ہے پس اس جسم عنصری کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہتا مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عذاب و ثواب کا مورد جسم ہی ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ برزخی ثواب عقاب اور تمام برزخی واقعات اور سوال وجواب کے لئے روح کو ایک اور جسم عطا ہوتا ہے کہ اس کو جسم مثالی کہتے ہیں اور یہ تکلیف و راحت سب اس کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جسم مثالی کی حقیقت یہ ہے کہ یہ سوائے اس عالمِ ظاہر کے ایک اور عالم ہے کہ صوفیہ کو اُس کا انکشاف ہوا ہے اور نیز اشارات کتاب وسنت سے بھی اس کا وجود معلوم ہوتا ہے اس عالم میں تمام اشیاء اور تمام اعمال وافعال کی صورتیں ہیں خواب میں جو کچھ آدمی دیکھتا ہے وہ بھی اسی عالم کی صورتیں ہیں مثلاً خواب میں دیکھتا ہے کہ میں کلکتے گیا ہوں اور وہاں کوٹھیاں بنگلے اور بازاروں کی سیر کر رہا ہوں تو یہ سب صورتیں چونکہ عالمِ مثال میں موجود ہیں اس لئے وہ خواب میں نظر آتی ہیں میں نے ایک رسالہ مسمّٰی الفتوح فی الاحکام الرّوح لکھا ہے اِس میں روح کے متعلق مفصّل بحث لکھی ہے اُس کے دیکھنے سے انشاء اللہ تعالیٰ سب شبہات جاتے رہیں گے۔

بہر حال اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ ایک عالم اور ہے جس کا نام برزخ ہے کل تین عالم ہوئے۔ ؀۱ عالم دنیا۔ ؀۲ عالم برزخ۔ ؀۳ عالم آخرۃ۔ اس میں اختلاف ہے کہ حیوٰۃ طیّبہ سے مراد کونسی حیات ہے۔ حیاتِ برزخیہ یا حیاتِ دنیویہ۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں مُراد ہوں اور لَنَجْزِیَنَّهُمْ کو آخرۃ کے ساتھ خاص کیا جاوے اس تقریر پر حاصل آیۃ کا یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کرے اور عقائد بھی اس کے صحیح ہوں اُس کو ہم دنیا میں اور مرنے کے بعد برزخ میں مزہ دار زندگی عطا فرمادیں گے اور آخرۃ میں بعد قیامت کے اُن کے نیک اعمال کی وجہ سے اجر کی جزا دیں گے اور ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حیاتِ طیّبہ سے مُراد حیات دنیویہ ہو اور برزخ اور آخرت لَنَجْزِیَنَّهُمْ میں داخل ہو کیونکہ برزخ میں جو کچھ ہوگا وہ بھی جزا ہوگا

خلاصہ یہ کہ دو چیزوں کا وعدہ ہے اوّل حیات طیّبہ دوسرے اجر کہ جو مکمل ہے حیاتِ طیّبہ کا ان میں سے ایک شئے یعنی حیاتِ طیبہ کو تو ہم دلائل سے ثابت کرسکتے ہیں بلکہ مشاہدہ کرا سکتے ہیں دلیل تو یہ ہے کہ قاعدہ عقلی ہے کہ تجربے سے جب ایک شخص کا صدق ثابت ہو جائے تو اس کو ہر امر میں صادق مانا جائے گا ہر امر پر دلیل کا مطالبہ اُس سے نہ کیا جائے گا جب کہ حق تعالیٰ کے اخبار کا صدہا ہزار جگہ صدق ہم نے مشاہدہ کرلیا تو یہ خبر بھی بلا تأمل صادق ہے مشاہدہ یہ کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں مطیع اور غیر مطیع دیکھ لیجئے کہ ان میں سے راحت اور آرام میں کون ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ غیر مطیعین طالبین دنیا ہر وقت پریشانی میں ہیں کسی وقت ان کو چین نہیں بخلاف مطیعین کے کہ وہ جس حالت میں ہیں راحت میں ہیں شاید ہر شخص کہے کہ میں مطیع ہوں اس لئے کہ نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں بہت خوبصورت ہے کیونکہ اُس کے رخسار ایسے ہیں سر ایسا ہے آنکھیں ایسی ہیں ایک شخص دُور سے دیکھنے آوے دیکھے تو میاں نکٹے ہیں تو ان کا سارا حسن وجمال اس ناک نہ ہونے سے کالعدم ہے اور عقلاء اُس کو ہرگز حسین نہ سمجھیں گے۔ ایسے ہی ہم لوگوں کا دین ہے کہ دو چار باتیں اسلام کی لے کر سمجھتے ہیں کہ ہم دیندار ہیں تو ایسے دینداروں کی نسبت یہ وعدہ نہیں ہے کہ اگر کوئی پورا دیندار ہو ایمان اور عمل اس کا کامل ہو تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کو مزہ دار زندگی عطا ہوتی ہے بلکہ کامل الاطاعۃ کے پاس تک پریشانی نہیں آتی۔ اطاعۃ کاملہ میں ایک جزو اور بھی قابلِ تنبیہ ہے وہ یہ کہ اطاعۃ کاملہ کے معنیٰ یہ سمجھتے کہ بس ظاہر درست کرلیں یعنی صوم وصلوٰۃ حج وزکوٰۃ ومعاملات کی پابندی کرلیں بس کامل فرماں بردار ہوگئے خواہ اخلاق کسی درجے میں ہوں تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا شخص بھی کامل دیندار نہیں ہے کامل دیندار وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن دونوں آراستہ ہوں واللہ ہم میں جو دیندار کہلاتے ہیں ان میں سے بہت سے لوگوں کی حالت یہ ہے۔ اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰی مِنَ السکر و قلوبهم قلوبُ الذّئاب نماز کے بھی جماعت سے پابند ہیں روزے کا بھی اہتمام ہے داڑھی بھی بڑھائی ہے۔ نیچا کرتہ ہے۔ غرض تمام وضع شرعی سے آراستہ ہیں لیکن اخلاق کے اعتبار سے صفر ہے قلب میں کبر عجب حقد غضب

وغیرہ کی بلائیں موجود ہیں اور بعضے ایسے ہیں کہ متکبر ہیں لیکن اپنے کو متواضع سمجھتے ہیں حالانکہ وہ تواضع کی حقیقت سے واقف نہیں جیسے ایک شخص کریما پڑھتے تھے، اس میں تواضع کا بیان آیا اُستاد نے پوچھا کہ تواضع جانتے ہو کیا شئے ہے کہنے لگے کہ تواضع یہی ہے کہ کوئی گھر اپنے گھر آئے اس کو حُقہ پان دے دیا اس کو کھانا کھلا دیا۔ اس کی آؤ بھگت کرلی۔ آج کل بڑے بڑے سمجھدار تواضع کی حقیقت اسی قدر سمجھے ہوئے ہیں اور جو زیادہ سمجھدار ہیں وہ جانتے ہیں کہ تواضع یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے نرمی سے پیش آوے۔

صاحبو! تواضع یہ نہیں ہے نہ ایسے شخص کو حقیقتہً متواضع کہتے ہیں ایسے شخص کو متواضع کہنے کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی نقّال کسی تحصیلدار کی نقل کرے اُس کو کوئی بے وقوف تحصیلدار سمجھنے لگے تواضع حقیقت میں ایک صفتہ کا نام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دِل میں اپنے نفس کو سب سے کم سمجھے یہ صفتہ دنیا میں بہت مفقود ہے ایسے تو بہت نکلیں گے جو تقریراً تحریراً اپنی مذمت کرتے ہیں۔

بعضے کہتے ہیں میں بڑا نالائق ہوں بڑا ناکارہ ہوں۔ بعضے اپنے کو حقیر فقیر عاصی پُرمعاصی لکھتے ہیں لیکن جب وہ یہ کلمات فرمادیں اس وقت اگر کوئی کہدے کہ ہاں صاحب آپ بڑے نالائق ہیں۔ پھر دیکھئے ان کی کیا حالت ہوتی ہے سُن کر تلملا ہی تو جائیں گے وضعداری سے چاہے چپ ہو رہیں مگر دل میں تو یہ آئے گا کہ اِس کو کھا جائیں۔ ہاں اگر دل میں ذرا بھی بُرا نہ مانیں اور کچھ تغیر نہ ہو تو واقعی متواضع ہیں یہ بڑا عمدہ امتحان ہے مگر ایسے کہاں ہیں آج کل تو ظاہری نیازمندی خضوع خشوع سب کچھ ہے لیکن دل میں کچھ نہیں بس یہ حالت ہے۔

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل	وز دروں قہر خدائے عزّ و جل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید	وز درونت ننگ مے دارد یزید

(یعنی باہر سے بدن کو دیکھو تو ایسے معلوم ہوں جیسے کسی بدبخت کافر کی شاندار قبر ہے اور اندر سے دل کو دیکھو تو بس خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے اپنی ظاہری ریاکاری سے تو ایسا بنتا ہے کہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ کی بھی غلطیاں نکالتا ہی اگر تیرے دل کی اندرونی حالت دیکھی جائے تو یزید جیسے بدنام کو بھی شرم آنے لگے اور نفرت کرے

خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ کامل دیندار نہیں ہیں اس لئے کہ جیسا کہ خدا تعالےٰ نے ان سے دیندار

ہونے کا مطالبہ فرمایا ہے ویسے نہیں بنے اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے اور میں دو لفظوں میں خلاصہ بتاتا ہوں اور میں کیا خود اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں اگر تفصیلاً بیان کیا جاوے کہ خدا تعالیٰ نے کیسا چاہا ہے تو دفتر کے دفتر ختم ہو جاویں پھر بھی بیان ناتمام ہی رہے۔ اس لئے گُر کی بات عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ امور اختیاریہ میں ایسے بن جاؤ اور ایسے ہو کر آؤ کہ جیسے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں گویا حق تعالیٰ نے ہمارے پاس ایک نمونہ بھیجدیا ہے اور گویا فرمادیا کہ ہم تفصیلاً کہاں تک بیان کریں کہ یہ صفت پیدا کرو وہ صفت چھوڑ دو ہم ایک نمونہ بھیجے دیتے ہیں ایسے بن جاؤ اپنے اخلاق و عادات کھانا پینا سونا بیٹھنا اٹھنا چلنا پھرنا وضع طرز انداز چال ڈھال ایسا ہو جیسا ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ بس اب غور کر لیجئے کہ اگر ایک صفت کی بھی کمی ہوئی تو ہم نمونہ کے موافق نہ ہوئے اسکی ایسی مثال ہے کہ درزی سے ہم کو ایک اچکن سلوانا منظور ہے ہم نے نمونہ کیواسطے ایک اچکن بھیجدیا کہ ایسا سی لاؤ اب تبلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آستین اسقدر رہوں سلائی اس طرح کی ہو۔ اس قدر نیچا ہو وہ سی کر لایا تو دیکھا کہ اُس کے مطابق ہے لیکن ایک آستین ٹیڑھی ہوئی ہے تو اُس درزی سے کہا جاوے گا کہ ظالم تیرے پاس ہم نے نمونہ بھیجدیا تھا پھر بھی تو نے اُس کے موافق نہ سیا اور اُس اچکن کو ہرگز نمونے کے موافق نہ کہا جائے گا وہ اچکن اس درزی کے منہ پر ماریں گے اور اسکو سزا دیں گے تو صاحب جب ہم حاکم حقیقی کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور ہماری نماز ایسی نہ ہوگی۔ جیسی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی وضع لباس طرز انداز ایسا نہ ہوگا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا تو کچھ عجب نہیں کہ نکال دیئے جائیں۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا وَاحْشُرْنَا فِیْ زُمْرَتِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ایک حکایت بطور تمثیل کے یاد آئی کہ بادشاہ عالمگیر جب صاحب تخت و تاج ہوئے تو تمام اہل فن و اہل حرفہ و صنعت کو موافق دستور شاہی انعام دیا گیا بہروپئے آئے لیکن عالمگیر ایک مولوی آدمی تھے اس لئے اُن کو دینا ناجائز سمجھا لیکن صراحتاً اُن کو ٹالنا اور صاف جواب دینا مناسب نہ سمجھا یہ چاہا کہ کسی حیلۂ لطیف سے ان کو ٹالدیا جائے کہا کہ جب ایسی شکل آؤ کہ ہم نہ پہچانیں تو انعام دیں گے وہ مختلف شکلوں میں آئے مگر عالمگیر نے پہچان لیا جب دکن کی مہم پیش آئی اور عالمگیر نے دکن کا سفر کیا تو سفر میں عالمگیر کا طریق یہ تھا کہ راستے میں جس صاحب کمال کو سنتے تھے اس سے جاکر ملتے

تھے دکن کے سفر میں بھی حسب عادت اہل کمال سے ملتے جاتے تھے ایک مقام پر سنا کہ یہاں ایک درویش بڑے باکمال ہیں اوّل وزیر کو ملنے کے لئے بھیجا وزیر نے ہر طرح ان کو جانچا وہ ہر بات میں پورے اُترے آکر عالمگیر سے بہت تعریف کی اور کہا کہ اُن کو تکلیف دنیا بے ادبی ہے آپ خود تشریف لے جا کر ان سے ملئے عالمگیر خود گئے اور مل کر بہت خوش ہوئے عالمگیر کو بعض مسائل تصوّف میں کچھ شبہات تھے وہ پیش کئے سب شبہات کے شافی جواب پائے بالکل اطمینان ہوگیا اور نہایت متاثر ہوئے اور ایک توڑا اشرفیوں کا پیش کیا۔ درویش نے ایک لات ماری اور کہا کہ مجھ کو بھی اپنی طرح دنیا دار سمجھتا ہے عالمگیر اور زیادہ متاثر ہوئے اور اُس توڑے کو اٹھا لیا اور وہاں سے چلے راہ میں وزیر سے دیر تک اُس درویش کا ذکر مذکور رہا جب لشکر میں پہنچے تو سامنے دیکھا وہ بزرگ تشریف لائے ہیں اور بادشاہ کو جھک کر سلام کیا اور انعام مانگا، عالمگیر حیرت میں ہوگئے اور غور کر کے پہچانا اور اس کو کچھ انعام دیا اور یہ پوچھا کہ میں نے اب تسلیم کر لیا کہ تو بڑا ہوشیار اور اپنے فن کا کامل ہے مگر یہ تبلا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اس وقت میں نے تجھ کو اس سے کہیں زیادہ دیا تھا اُس کو تو نے رد کر دیا اور یہ روپیہ اُس سے بہت کم ہے یہ خوشی سے لے لیا۔ اُس نے کہا کہ جو نقل میں نے کی تھی وہ لینا اُس کے خلاف تھا اس لئے نہیں لیا تو صاحبو ہم لوگ تو اُس نقال سے بھی گئے گذرے ہوتے ہم سے تو نقل بھی دین کی نہیں ہوتی حاصل یہ کہ دیندار کامل تو وہ ہے کہ ظاہراً بھی دیندار ہو اور باطناً بھی کیونکہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی۔ ظاہری تو روزہ نماز حج زکوٰۃ وغیرہا اور باطنی۔ انس رضا شوق صبر قناعت وغیرہا ہیں اور ان کے مقابلے میں بداخلاقیاں غضب حقد تکبر بے صبری حرص ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں کہ جو مشائخ کے یہاں ملتی ہیں اساتذہ کے یہاں تو ظاہر درست ہوتا ہے اور مشائخ کے یہاں یہ اخلاق درست ہوتے ہیں اور اسی کا نام بزرگی ہے آج کل تو درویشی اور بزرگی کشف و کرامت کو جانتے ہیں۔ مجھ کو ایک شیخ صاحب کے ارشاد پر تعجّب ہوا کہ انھوں نے ایک شخص سے کہا کہ میاں تم فکر و شغل کرتے ہو کچھ نظر بھی آتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا تو ہنس کر فرمایا خیر بھائی ثواب جمع کئے جاؤ آہ افسوس ہے کہ ان شیخ نے ثواب کی کچھ بھی قدر نہ کی میں تو اسی دن سے اُنکی مشیخت سے بے اعتقاد ہوگیا جو شخص خدا تعالیٰ کی رضا کو چھوڑ کر کشف کو ڈھونڈھے اُسکی مثال ایسی ہے

کہ جیسے وزارت کو چھوڑ کر گھاس کھودنے لگے اس لئے کشف کا حاصل بعض غیر معمولہ غیر مقصود اشیاء کا معلوم ہوجانا ہے سو یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ ظاہر اور باطن موافق شریعت کے ہو پس ایسے شخص کے لئے میں دعویٰ کرکے کہتا ہوں کہ اس کو حیات طیبہ نصیب ہوگی اور کسی قسم کی پریشانی اس کو نہ ہوگی اگر کوئی کہے کہ ہم تو بچشم خود دیکھتے ہیں اور سنتے آئے ہیں کہ اکثر اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں پھر مزیدار زندگی کہاں ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بیشک مسلّم ہے کہ ان حضرات کو بلا اور مصائب کا سامنا رہتا ہے بلکہ اوروں سے زیادہ لیکن ان کو ان مصائب میں بھی مزہ آتا ہے اور جس کا نام پریشانی ہے وہ نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہوجائے اور محبوب اُس سے مدتوں سے نہ ملا ہو اور وہ اس کی یاد میں گھلتا ہو، ایک روز دفعتہً محبوب آ پہنچا اور آ کر لپٹ گیا اور اس کو خوب دبایا اور اس قدر دبایا کہ پسلیاں ٹوٹ لگیں لیکن اگر وہ سچا عاشق ہے تو واللہ اس کو اس قدر مسرت ہوگی کہ دنیا وما فیہا سے بڑھ کر اس کو سمجھے گا اور کہے گا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس کے واسطے تمام عمر کھودی اور مال و دولت آبرو اس پر نثار کردیئے اگر محبوب کہے بھی کہ اگر تکلیف ہو تو چھوڑ دوں تو وہ کہے گا کہ خدا نہ کرے وہ دن کہ تم مجھ کو چھوڑ دو بلکہ یوں کہے گا ؎

اسیرت نخواہد رہائی زبند　　　شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی کبھی قید سے رہائی نہ چاہے گا اور تیرا شکار کبھی تیرے پھندے سے باہر نکلنا پسند نہ کریگا)

اور اگر وہ کہے کہ میں اُس رقیب کو جو پاس کھڑا ہے دبالوں اور تم کو راحت دوں گا تو کہے گا ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت　　　سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن تو یہ چاہتا ہے کہ تیری تلوار ٹوٹ جائے مگر ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ الٰہی دشمن کا کہنا پورا نہ ہو دوستوں کا سر سلامت چاہیئے تاکہ تو اپنے خنجر کی مشق کرتا رہے۔)

اور کہے گا ؎

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے　　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

؎

مرنے جو موت کے عاشق بیاں کبھی کرتے　　　مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

دیکھئے لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ مصیبت موت ہے اور عشاق کے نزدیک وہی موت عجیب دولت ہے کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم وزپئ جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے
تا درِ میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

یہ دنیا محبوب کے بغیر درا صل ایک ویران منزل ہے وہ دن کس قدر خوشی کا ہوگا جس دن اس اُجڑے گھر کو چھوڑوں گا اور میری جان کو آرام ملے گا اور میں اپنے محبوب کے ساتھ ساتھ پھروں گا میں نے یہ منت مانی ہے کہ جس دن دنیا کے فکر و غم سے نجات مل گئی یعنی موت آگئی تو حق تعالےٰ کے دربار تک خوشی خوشی اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں گا۔

اور یہ تمنائیں تو ان حضرات کی موت آنے سے پہلے ہوتی ہیں لیکن عین موت کے وقت بھی یہی ہونا ہے۔ ایک بزرگ وفات کے وقت کہتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم
جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(آج وہ وقت آگیا ہے کہ میں دنیا کے ہر قسم کے بوجھ سے خالی اور ہلکا ہوگیا ہوں اور جسم کو چھوڑ کر صرف روح ہی روح رہ گیا ہوں)

ابنِ فارضؒ کا جب انتقال کا وقت آیا تو آٹھوں جنتیں اُن کے لئے مکشوف ہوئیں دیکھ کر مُنہ پھیر لیا اور فرمایا ؎

اِنْ کَانَ مُنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَ کُمْ
مَا قَدْ رَأَیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

یعنی اگر میرا مرتبہ عشق میں آپ کے نزدیک یہی ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنا وقت ہی ضائع کیا یعنی میرا مقصود تو آپ کی ذاتِ پاک ہے اگر آپ نہ ہوئے تو جنت کو لے کر کیا کروں گا اس کے بعد ان پر تجلی حق ہوئی اور اسی میں رحلت فرمائی سبحان اللہ اب فرمائیے کہ جب موت سے بھی یہ حضرات پریشان و ہراساں نہیں ہوتے تو فقر و فاقہ میں افلاس و تنگی میں تو کیا تکلیف و پریشانی ہے حضرت بہلولؒ سے کسی بزرگ نے پوچھا کہ کس حال میں ہو فرمایا کہ ایسے شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ جو کچھ عالم میں ہو رہا ہے سب اس کی مرضی کے موافق ہو رہا ہے وہ کچھ مزے میں ہوگا۔ اُن بزرگ نے کہا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی مخلوق کے لئے ایسا کب ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے

سب اس کی خواہش کے موافق ہونا ہے یہ شان تو حق تعالیٰ ہی کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے ارادے کو ارادۂ اللہ میں فنا کر دیا ہو تو جو امر ارادۂ الٰہیہ کے موافق ہوگا وہ اس کے ارادے کے بھی موافق ہوگا۔

حاصل یہ کہ ہم اپنے نفس کو اپنی رائے کو حق تعالیٰ کی رضا میں فنا کر چکے ہیں جس حالت میں ہیں خوش ہیں بات یہ ہے کہ پریشانی کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں اوّل تو جس سے معاملہ ہو اس سے محبّت نہ ہو جب پریشانی ہوتی ہے اور اگر محبّت ہو تو پریشانی کسی طرح نہیں ہو سکتی مثلاً محبوب اگر یوں کہے کہ مجھ سے دو گھنٹے دھوپ میں کھڑے ہو کر باتیں کرو اگر وہ کہے کہ نہیں تو دعویٰ محبّت میں جھوٹا ہے اور اگر سچّا ہے تو اس کی یہ حالت ہوگی ؎

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ جنّت ست آں گرچہ باشد قعرِ چاہ
با تو دوزخ جنّت ست اے جانفزا بے تو جنّت دوزخ ست اے دلربا

(میرا محبوب جو حضرت یوسف علیہ السّلام کے جیسے چہرے والا چاند کی طرح ہے جس جگہ موجود ہو پھر چاہے وہ جگہ اندھا کنواں ہو مگر میرے لئے تو وہی جنّت کی طرح ہے اے میرے محبوب میرے ساتھ ہو تو میرے لئے تو دوزخ بھی جنّت ہے اور اگر تو میرے پاس نہ ہو تو میرے لئے جنّت بھی دوزخ کے برابر ہے

یہ قضایا شرطیہ ہیں یعنی اگر آپ کی معیت ہے تو دوزخ بھی جنّت ہے اور اگر معیت نہیں ہے تو جنّت بھی دوزخ ہے اور یا قضایا شرطیہ کے صدق میں مقدم کا واقع ہونا ضروری نہیں ہی تلازم کافی ہے اس لئے دوزخ میں تو معیت باری تعالیٰ کی ہو ہی نہیں سکتی اور جنّت جو مطلوب ہے محب کو وہ بھی لذاتہ مطلوب نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مقام رضائے محبوب ہے اور دوزخ سے جو پناہ مانگی جاتی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ مقام محبوب کی نارضامندی کا ہے اگر فرضاً جنّت مقام غضب ہو تو محب اُس سے بُعد کو چاہے گا اور بالفرض اگر دوزخ مقام رضا ہو تو محب کو وہی مطلوب ہوگا۔ ملٰئکۃ النّار نار میں ہیں لیکن خوش ہیں کیونکہ ایک شئے خوش کن یعنی رضائے حق اُن کے ساتھ ہے اگر اُن سے کہا جاوے کہ جنت میں رہو لیکن اللہ تعالیٰ تم سے وہاں راضی نہ ہوں گے وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہوں گے۔

دوسری وجہ پریشانی کی یہ ہوتی ہے کہ خلاف امید کوئی امر پیش آوے کہ سوچا کچھ اور

ہوگیا کچھ مثلاً طاعون آیا ہم چاہتے تھے کہ تندرست رہیں نہ رہے چاہتے تھے کہ تجارت میں نفع ہو نہ ہوا چاہتے تھے کہ اولاد ہو نہ ہوئی تو اس وقت پریشانی ہوگی اور جو شخص اپنی رائے کو فنا کرچکا ہو اور اپنے ارادے کو رضائے مولیٰ میں مٹا چکا ہو اُس کو پریشانی کی یہ وجہ بھی نہ ستائے گی۔ حضرت بہلولؒ سے کسی نے کہا کہ اناج بہت گراں ہوگیا ہے فرمایا کچھ پرواہ نہیں ہمارے ذمہ یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ذمہ ہے کہ ہم سب کو حسب وعدہ رزق دیں۔ ایک بزرگ نے اپنی توبہ اور رجوع الی اللہ کا قصہ بیان کیا کہ ایک سال قحط بہت تھا مخلوق بہت پریشان تھی اُسی حالت میں ایک غلام کو دیکھا کہ بے فکری سے گاتا ہوا خوش بخوش جارہا ہے اُس سے کسی نے پوچھا کہ مخلوق تو پریشان ہو رہی ہے اور تو اس طرح بفکر ہے۔ اُس نے کہا کہ میں بے فکر کیوں نہ ہوں میرے مالک کے یہاں دو گاؤں ہیں اس وقت نفس کو ایک تازیانہ لگا اور یہ بات ذہن میں آئی کہ ارے نفس جس کے مالک کے پاس دو گاؤں ہیں وہ تو بے فکر ہے اور تیرے مالک کے قبضے میں آسمان و زمین عرش کرسی ہے اور تو پریشان ہے اسی وقت سے توجہ الی اللہ کی توفیق ہوئی افسوس کہ اس وقت معاملہ بالعکس ہوگیا ہے دنیا کمانے اور شب و روز اسی دُھن میں رہنے کو ترقی اور اولوالعزمی سمجھتے ہیں اور بے فکری اور توکل کو پستی کہتے ہیں اور طرّہ یہ ہے کہ اپنے کو خیر خواہ اور ہی خواہ قوم کہتے ہیں، جو شخص رات دن ہوائے نفسانی میں مبتلا ہو اور سوائے دنیا کمانے کے کوئی مشغلہ نہ ہو اس سے دوسرے کی خیر خواہی کیا ہوسکتی ہے حقیقی خیر خواہ انبیاء علیہم السلام اور بزرگان دین ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ جو شب و روز ان کی فکر میں گھلتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی فکر میں کہ یہ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کو ہلاک کردیں گے۔ ان حضرات کا مشرب یہ ہے کہ ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست   بہ تسبیح و سجادۂ و دلق نیست

درویشی یا تصوف کا طریقہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ تسبیح ہاتھ میں لے لی اور مصلّے پر ہر وقت بیٹھے رہے اور فقیروں جیسی گدڑی یا کملی اوڑھ لی بلکہ درویشی یہ ہے کہ مخلوق کی صحیح خدمت کی جائے۔

شاہ اسحٰق صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ حضرت فلاں شخص کے نام

ایک رقعہ لکھدیجئے اُس سے میرا ایک کام ہے آپ کا رقعہ دیکھنے سے وہ کردے گا وہ شخص حضرت کا سخت مخالف تھا حضرت نے رقعہ لکھدیا اس نے جاکر اس شخص کو دیا اُس نے اس رقعہ کی بتی بنا کر دی اور یہ کہا کہ شاہ صاحب سے کہو کہ اس کی بتی بنا کر فلاں جگہ رکھ لو، اس شخص نے اسی طرح آکر یہ مقولہ شاہ صاحب کی خدمت میں نقل کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر اس فعل سے تیرا کام چلتا تو مجھے اس سے بھی دریغ نہ ہوتا یہ جواب اس کو پہنچا وہ شخص یہ بات سنکر تڑپ گیا اور اس قدر متاثر ہوا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں آکر اس نے معذرت کی اور اس کو ہدایت ہوگئی دس برس کے مجاہدہ میں بھی وہ بات نہ ہوتی جو شاہ صاحب کے ایک کلمہ میں ہوگئی اب تبلایئے کہ ایسی نفع رسانی آج کس میں ہے آج ترقی کا دم بھرنے والے اس کو پست ہمتی کہتے ہیں ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو انہوں نے فرمایا کہ دنیا اللہ کا گھر ہے اور ہم اس کے ضیف ہیں اور ضیافت بروئے حدیث تین دن ہے اور اللہ کے نزدیک ایک دن ایک ہزار برس کا ہے چنانچہ فرمایا ہے وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ٥ (تمہارے حساب سے جتنے دن ایک ہزار برس ہوتے ہیں تیرے پروردگار کے نزدیک صرف ایک دن شمار ہوتا ہے) تو تین ہزار برس تک تو دعوت ہی ہے اس کے بعد پوچھنا، میرا مطلب ان حکایات سے یہ نہیں ہے کہ روپیہ نہ کماؤ اور جاگیر گھر لٹا دو مقصود یہ ہے کہ انہیں کھپ مت جاؤ بلکہ ضرورت پر نظر رکھو اور ایسے خصائل حاصل کرو جیسی کہ بزرگوں میں تھیں اور مال جمع کرنے کی ممانعت نہیں کرتا بلکہ بعض بزرگ روپیہ بہت رکھتے تھے مگر وہ اپنے نفس کیلئے نہیں بلکہ خدمتِ خلق کے لئے جیسے خزانچی اور تحصیلدار ہوتا ہے یہ حضرات بھی اسی طرح سے روپیہ رکھتے ہیں اور بلا اذن اس میں سے خرچ نہیں کرتے جیسے سلیمان علیہ السّلام کو سلطنت دی گئی اور حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی یوسف علیہ السلام کو مصر کی بادشاہی ملی لیکن حالت کیا تھی کہ جب مصر میں قحط پڑا تو یوسف علیہ السلام پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتے تھے اور اگر اہل اللہ میں کوئی خوش خوراک خوش لباس پایا جاوے تو وہ بھی باذنِ الٰہی ہے مثلاً ایک شخص ہے اس کو یہ ثابت ہوا کہ خلق کی ہدایت میرے متعلق ہے اور مواعظ سے تقریر سے تدریس سے لوگوں کو ہدایت کرنا اُس کا مشغلہ ہے سو اگر وہ گھی دودھ اغذیۂ مقویہ کا استعمال چھوڑ دے تو دماغ میں خشکی

آوے گی اور کچھ کام اُس سے نہ ہو سکے گا اور دماغ کی حفاظت کرے گا تو سب کام ہو سکیں گے یہ نفس بطور مزدور کے ہے اور یہ دماغ سرکاری مشین ہے اگر اس کو مزدوری ملتی رہے اور مرمت ہوتی رہے تو کام دیتا رہے گا پس وہ خدمت نفس کی اس اعتبار سے نہیں کہ وہ ہمارا ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ سرکاری خدمت سے تعلق رکھتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎ نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است ؂ ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ؂ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است ؂ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان لنفسك عليك حقا ولزوجك عليك حقًا (بیشک تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے) اور فرماتے ہیں المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف (طاقتور مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے) اور بعضوں کے کچھ نفع خلق کا متعلق نہیں ہوتا اُن کو اپنے ہی نفس کے اصلاح کی فکر ہوتی ہے ان کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎ احمدؔ تو عاشقی بہ مشیخت تُرا چہ کار ؂ دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد ؂ اے احمد تو عاشق ہے تجھے ولی یا پیر بننے کی فکر کیوں ہے۔ ارے دیوانہ کہ جیسا بن جا اور کام کرتا رہے پھر چاہے کچھ مرتبہ حاصل ہو یا نہ ہو) اور کہتے ہیں ؎ خلق میگو ید کہ خسرو بت پرستی میکند ؂ آرے آرے میکند با خلق و عالم کار نیست ، اے خسرو تجھے مخلوق کہتی ہے کہ تو بت پرستی کرتا ہے، ہاں ہاں تم یہ ہی سمجھو کہ وہ بت پرستی کرتا ہے لیکن اس مخلوق اور دنیا سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے) تو یہ کسی قسم کی بدنامی سے نہیں ڈرتے ایک وہ ہیں جو شُبہ سے بھی بچتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں معتکف تھے کہ حضرت صفیہؓ جو ازواج مطہرات سے ہیں تشریف لائیں جب واپس تشریف لے گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پہنچانے کے لئے لب مسجد تک تشریف لائے تھے کہ سامنے سے دو شخص آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا ٹھہر و اور پھر فرمایا انّھا صفیۃ یعنی یہ صفیہ ہیں یہ بات اُن کو بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توبہ توبہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہم کچھ گمان کر سکتے تھے فرمایا کہ شیطان ابن آدم کے رگ و ریشے میں بجائے خون کے دوڑتا ہے مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈالدے۔ غرض اولیاء مختلف رنگ کے ہوئے ہیں سرکاری گلدستہ ہے اُس میں گلاب بھی ہے چنبیلی بھی ہے بیلا بھی ہے اور خار بھی ہے حاصل یہ ہے کہ جس شخص کا یہ مذاق ہو انصاف کیجئے اور سوچئے کہ اُس کو کیا کلفت ہوگی ہرگز نہیں وہ ہر وقت راحت میں ہے پریشانی اُس کے پاس نہیں اگر کوئی کہے کہ ہم نے انبیاء کی حکایتیں

سنی ہیں کہ اُن کو غم ہوئے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام ایک مدت تک یوسف علیہ السلام کی جُدائی میں مغموم رہے ایوب علیہ السلام سخت مصائب میں مبتلا رہے۔ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے ایذا پہنچائی جواب یہ ہے کہ ان حضرات کو رنج و غم تو ہوا لیکن پریشانی نہیں ہوئی۔ غم اور شئے ہے۔ پریشانی اور چیز ہے اور غم ہونا کمال کے منافی نہیں بلکہ عین کمال ہے۔ بعض بزرگوں کا حال آیا ہے کہ ان کے بیٹے کا انتقال ہوا اور وہ ہنس رہے تھے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم محزون تھے ظاہر ہے کہ کمال وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ جو مغموم نہیں ہوئے انہوں نے تو صرف حق تعالیٰ کا حق ادا کیا اور جن کو غم ہوا انہوں نے اولاد کا بھی حق ادا کیا اور اللہ تعالیٰ کا بھی۔ کاملین کو جو غم دیا جاتا ہے اس میں یہ حکمت ہوتی ہے کہ صبر کی فضیلت حاصل کریں اس لئے کہ صبر بدون غم کے نہیں ہوتا اور دوسری حکمت یہ ہے کہ حُزن سے تصفیہ ہوتا ہے قلب کا۔ اگر کوئی کہے کہ جب حُزن ہوا تو حیاتِ طیبہ کہاں ہوئی بات یہ ہے کہ عین واقعہ رنج میں دو حیثیتیں ہیں، باعتبار مصیبت ہونے کے تو وہ الم رساں ہے اور بہ اعتبار من المحبوب ہونے کے وہ مرضی ہے اور ان حضرات کے ہر واقعہ من اللہ ہونا ہر وقت پیشِ نظر رہتا ہے اس لئے خواہ کسی طرح کی مصیبت پیش آوے وہ اس حیثیت سے پسندیدہ ہے اور اُن کے اطمینان قلب میں کسی طرح خلل انداز نہیں ہاں تکلیف پہنچنا امر آخر ہے اسکی حقیقت جو بفضلہ تعالیٰ آج ہی سمجھ میں آئی ایک مثال کے ضمن میں یہ ہے کہ طیّب ہونے کے دو درجے ہیں اوّل مزہ دار ہونا اور نافع ہونا دوسرے صرف نافع ہونا مثلاً کہتے ہیں کہ یہ غذا طیّب ہے تو معنی یہ ہیں کہ مزیدار بھی ہے اور نافع بھی اور کہتے ہیں کہ یہ دوا طیّب ہے تو اس کا طیّب ہونا یہ ہے کہ شفا ہو جاوے امراض زائل ہو جاویں پس حزن مثل دوا کے ہے دوا کا کڑوا ہونا گو طبع کے خلاف ہے لیکن گوارا ہے کڑوی دوا بھی خوشی سے پی لی جاتی ہے اور تلخی اسکی برداشت کی جاتی ہے اور یہ بھی حصولِ لذت کے لئے ہی اسلئے کہ دوا سے صحت ہوگی اور صحت لذیذ ہے تو دوا بھی اس قاعدے سے لذیذ ہوگی اور اس میں بھی ایک گونہ مسرت ہوگی بشرطیکہ اس کا نافع ہونا پیش نظر ہو۔ بحمد اللہ اس تقریر سے سب شبہات رفع ہو گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات کو خواہ مصیبت ہو رنج ہو، فقر و فاقہ ہو وہ ہر وقت خوش ہیں اور اصل میں خوش

کرنے والی ان کو محبت ہے چونکہ ان کو حق جل وعلا شانہ سے محبت ہے اس لئے لقاء حق کے انتظار میں ان سب کو سہل ہے دنیا میں دیکھ لیجئے اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو کہ فلاں وقت وہ ہم سے ملے گا تو اُس وقت کے انتظار میں سب بلائیں اس کو سہل ہیں یہ انتظار کہ خدا تعالیٰ ہم سے خوش ہوں گے یا اس وقت ہم سے خوش ہیں اس کی ایسی خوشی ہوتی ہے کہ سب مصائب سہل ہو جاتے ہیں یہ سب محبت کی برکت ہے۔ خدا کی قسم یہی وہ شئے ہے جس کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم تمام امّتہ میں ممتاز ہوئے اور یہی وہ دولت ہے کہ جس کے سبب سے سلف رحمہم اللہ کے آج تذکرے لکھے جاتے ہیں صحٰ۔ اور اصل سبب ترقی کی یہی شئے ہے آج کل صحابہ کرام کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یوں ترقی کی یوں کی اور اس امر میں اُن کا اپنے نزدیک اقتداء کرتے ہیں اور اصل روح اور سبب ترقی سے مس تک نہیں اور نہ ترقی کی حقیقت سے واقف ہیں دنیا سمیٹنے کو اور جاہ مذموم کے تحصیل کا نام ترقی کر رکھا ہے۔ صحابہؓ نے جو فتوحات کی وہ سب للہ تھی دنیا ان کے پاس تک نہ تھی سو ایسی ترقی کو کون منع کرتا ہے باقی صحابہ اور نیز دیگر سلف صالحین میں بھی مختلف رنگ کے لوگ تھے حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے گھر تک نہیں بنایا حضرت سلیمان علیہ السلام صاحب سلطنت ہوئے۔ حضرت ابو ذر غفّاری رضی اللہ عنہٗ مال جمع کرنے کو بالکل حرام فرمایا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہٗ سے فرمایا تھا کہ اے ابو ذرؓ میں تمہارے لئے وہ پسند کرتا ہوں تم دو شخصوں کے درمیان کبھی فیصلہ مت کرنا اور نہ یتیم کے مال کے ولی بننا اس لئے کہ میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں یعنی تعلّقات کی برداشت نہ ہو گی یہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا ہی جگر تھا کہ مدینۂ طیبہ میں چٹائی پر بیٹھے ہیں اور روم و شام دمشق و فارس کا انتظام کر رہے ہیں۔ غرض انبیاء اور صحابہ اور اولیا اللہ میں بھی ہر ایک کا جدا رنگ ہے اور اُن کے لئے وہی رنگ مناسب ہے۔ بعضے روپے پیسے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ میاں کون جھگڑے میں پڑے ہم سے حقوق ادا نہ ہوں گے زکوٰۃ عشر قربانی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حقوق ہیں یہ بڑا قصہ ہے ایسے لوگوں کے لئے البتہ یہ برتاؤ ہوتا ہے کہ ان کو کچھ نہیں دیتے اور ہمیشہ وہ مفلس رہتے ہیں جیسے

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کہ سلطنت چھوڑ دی اور جیسے حضرت شاہ ابو المعالی قدس سرہٗ کہ ہمیشہ فقر و فاقہ میں گذرتی تھی۔ ایک روز کا قصہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے یہاں ان کے پیر و مرشد تشریف لائے حضرت مکان پر تشریف نہ رکھتے تھے بی بی تھیں انہوں نے تعظیم و تکریم سے پیر کو ٹھہرایا لیکن حسب عادت شاہ صاحب کے یہاں اس روز بھی کچھ کھانے پینے کو نہ تھا بی بی نے پڑوس میں سے آٹا اُدھار مانگنے کے لئے خادمہ کو بھیجا۔ پڑوسیوں نے اُدھار بھی نہ دیا کہ ان کو ادھار دے کر کہاں سے لیں گے۔ پیر صاحب خادمہ کو برابر آنا جانا دیکھ کر فراست سے سمجھ گئے پوچھا کہ کس فکر میں ہو۔ بی بی نے سمجھا کہ ان سے کیا چھپانا واقعی یہ حضرات خدا کے نائب ہوتے ہیں ان سے اپنا کوئی حال چھپانا نہ چاہیئے۔ بی بی نے صاف کہہ دیا کہ حضرت آج ہمارے یہاں کچھ نہیں ہے۔ پیر صاحب نے ایک روپیہ عطا فرمایا آج کل کے پیر تو مریدوں کا ہی کھا جاتے ہیں۔ کچھ خیال نہیں کرتے کہ ان کے یہاں کہاں سے آیا ہے اور کس طرح بچارے لائے ہیں القصہ پیر صاحب نے فرمایا کہ اس ایک روپیہ کا اناج لاؤ اور ہمارے پاس لانا۔ چنانچہ غلہ حضرت پیر و مرشد کے پاس لایا گیا۔ حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر غلہ میں دبا دیا اور یہ فرمایا کہ اس تعویذ کو مت نکالنا پیر صاحب تو رخصت ہوتے اب روزمرہ اس میں سے غلہ نکالا جاتا تھا اور پکایا جاتا تھا اور وہ کم نہ ہوتا تھا کئی روز ہو گئے کہ صبح و شام کھانا آنے لگا یہ دیکھ کر حضرت شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہائیں یہ کیا بات ہے۔ کئی روز ہوئے فقر و فاقہ نہیں ہے بی بی نے فرمایا کہ پیر صاحب تعویذ دئے گئے تھے اس کی برکت ہے فرمایا کہ ہمارا فاقہ اختیاری ہے اضطراری نہیں اب یہ مقام بڑی کشاکشی کا تھا کہ پیر کا تعویذ اگر رکھا جاتے تو اپنے مذاق کے خلاف اور نہ رکھیں تو پیر کے تعویذ کی بے اَدبی مگر سبحان اللہ ان حضرات کو حق تعالیٰ ایسا نورِ باطن عطا فرماتے ہیں کہ اُن کا فہم نہایت صحیح اور عقل اُن کی کامل ہو جاتی ہے فرمایا کہ اس تعویذ کا حقدار تو میرا سر ہے مٹکا نہیں ہے لاؤ وہ تعویذ میں اپنے سر میں رکھوں گا۔ تعویذ منگا کر سر میں رکھ لیا اور اناج فقراء کو تقسیم کر دیا شام کو پھر فقر و فاقہ ہوا شکر حق تعالیٰ کا

ادا کیا اور بعضوں کو جانتے ہیں کہ اگر ان کو نہ ملے گا تو پریشان ہوں گے اور یہ جانتے ہیں کہ ان سے برداشت حقوق کی ہو گی اُن کو خوب دیتے ہیں غرض اولیاء اللہ کے مختلف طبقات ہیں مگر جس حال میں ہیں خوش ہیں ؎

دُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　که انچه ساقی ما ریخت عین الطافست

(تجھے نیچے کا تلچھٹ ملے یا صاف شراب تجھے اس بات کی اجازت نہیں کہ کوئی اعتراض کرے کیونکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ ہم کو دیا ہے اس کی مہربانی ہے۔)

اور کہتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن　　که خواجه خود روش بنده پروری داند

(تو محتاجوں کی طرح مزدوری کی شرط پر عبادت مت کر کیونکہ ہمارا آقا خود ہی اپنے بندوں کی پرورش کے طریقے سے واقف ہے)

قبض کی حالت میں فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزی صحبت گل بایدش　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

ایدل اندر بند زلفش از پریشانی منال　　مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(اے باغ کے مالی اگر تو چند روز کے لئے پھول کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے تو جدائی کے کانٹوں کے ظلم پر تجھ کو صبر بلبل اختیار کرنا چاہیئے اے دل محبوب کی زلف کی قید میں پھنسکر پریشان ہو کر مت چیخ۔ عقلمند پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اسکو صبر و برداشت سے کام لینا چاہیئے۔

اور اس سے زیادہ فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چه باشد رضائے دوست طلب　　که حیف باشد از و غیر او تمنائے

(جدائی اور ملاقات کا خیال چھوڑ دے اور صرف محبوب کی رضامندی کو تلاش کر کیونکہ اس سے سوائے اس کی ذات کے دوسری چیز کی طلب کرنا افسوسناک ہے)

اب میں پوچھتا ہوں کہ جس کا یہ حال ہو اس کو کیا پریشانی ہو گی وہ تو ہر وقت مسرور ہے۔ ہر وقت خوش ہے حیاتِ طیبہ یہ ہے اور اس کے ماسوا پریشانی ہے اور بے حاصلی ہے لیکن ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(یہ کامیابی اپنی قوت اور محنت سے حاصل نہیں ہوسکتی جب تک بخشش کرنے والا خدا خود بخشش نہ کرے)

مگر ہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مرتبہ کس کو حاصل ہوسکتا ہے ہم لوگ تو دنیا دار ہیں۔ سینکڑوں طرح کے اشغال ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں سو یہ خیال شیطانی ہے اور منشا اس کا یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام کاروبار دنیا کے چھوڑ کر حجرے میں بیٹھ کر تسبیح ہلاؤ ہرگز نہیں ہر شخص کے لئے جُداگانہ طریق ہے اگر اس مقام پر ہر ایک کی تفصیل بیان کی جاوے تو ایک طویل وقت درکار ہے اور پھر بھی کافی نہیں اس لئے کہ یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ میرے لئے کونسا طریق نافع ہے اس لئے میں تم کو ایک مختصر سی بات بتلاتا ہوں اور جھگڑے کی بات بالکل نہیں بتاتا وہ یہ کہ مرشدِ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بے فکر ہوجاؤ۔ لِمَ وَکَیْفَ کو چھوڑ دو اپنے کو اس کے سپرد کردو اور اپنی رائے کو ہرگز دخل نہ دو جو وہ طریقہ بتائے اس پر عمل کرو انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہوگے ؎

بُود مورے ہَوسے داشت کہ در کعبہ رسَد دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

یعنی ایک چیونٹی کو ہوس ہوئی کہ خانہ کعبہ میں پہنچے لیکن اپنے ضعف و عجز کو دیکھ کر مایوس تھی اس نے دیکھا کہ ایک کبوتر کبوترانِ حرم محترم سے بیٹھا ہے وہ چیونٹی اس کے پاؤں کو لپٹ گئی اس نے ایک پرواز کی اور بیت اللہ شریف میں جا پہنچا چیونٹی نے جو آنکھ کھولی دیکھا تو خانہ کعبہ کے سامنے ہے۔ تو صاحبو اسی طرح ہم اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اہل اللہ کا دامن اگر پکڑ لیں گے تو انشاء اللہ محروم نہ رہینگے اسی واسطے تو فرمایا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۞ بس اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں، اب دعا کرنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ توفیق عطا فرما دیں + آمین یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ ۞ تمّت بالخیر

معروضہ قارئین سے التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرما دیں کہ ناشر کی کوشش دینیہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور مقبولانِ حق کے ساتھ محشور فرما دیں اور تمام زندگی بعافیت پوری فرما دیں۔ آمین بحرمتہ حضور سیّد المرسلین صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلّم۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رَوَاہُ الْبُخَارِی)

دعوات عبدیت جلد دوم

کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

تسہیل الاِصلاح

ارشادات

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ، بندر روڈ، کراچی ۱

ایم اے جناح روڈ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعوات عبدیت جلد دوم کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

تسہیلُ الاصلاح

مَنْ ضَبَطَ	مَاذَا	کَیْفَ	کَمْ	مَتٰی	اَیْنَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	مُتَفَرِّقَات
کس نے لکھا	کیا مضمون تھا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مولوی محمد عبداللہ صاحب	اصلاح اعمال	کھڑے ہو کر	۱ گھنٹہ	۱۱ شعبان ۱۳۲۹ھ	جلال آباد	۲۰۰	قدیم وضع کے لوگ تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہٗ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ، صلی اللہ علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وسلم

فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا ۝

یہ ایک آیۃ ہے جس میں حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں ایک کارآمد مضمون پر متنبہ فرمایا ہے حاصل اُس کا یہ ہے کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جو آدمی جو کام کرتا ہے اس سے دو چیزوں میں سے ایک شئے مقصود ہوتی ہے یا تو دفع مضرت یا جلب منفعت مثلاً کھانا کھاتا ہے لذت و تغذی کے لئے یہ ایک منفعت ہے دوا پیتا ہے دفع مرض کے واسطے یہ مضرت کا دفع ہوا، اور

مثلاً نوکری کرتا ہے روپیہ کی تحصیل کے لئے تجارۃ کرتا ہے منفعت وفائدہ کیواسطے رشوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کی سزا نہ ہو جاوے یا کسی بلا میں مبتلا ہے اُس سے رہا ہو جاوے مکان بناتا ہے سردی وگرمی سے بچنے کے واسطے خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے جلب منفعت کے لئے کرتا ہے یا دفع مضرت کے واسطے اس میں کسی عاقل کو کلام نہیں اور نہ اس پر براہین و دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہے البتہ منفعت و مضرت کی تعین میں اہل الرائے اور اہل ملت میں اختلاف ہے باقی نفس مسئلہ میں اتفاق ہے چنانچہ اوّل واضح ہو چکا ہے تعین میں البتہ بہت بڑا اختلاف ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منفعت کی تحصیل تو ہر ایک کا مقصود ہے لیکن منفعت کی تعین میں ہر ایک نے ایک رائے قائم کر رکھی ہے ایک شخص ساعی ہے کہ مجھ کو مثلاً تحصیلداری یا تھانہ داری یا ڈپٹی یا ڈپٹی کلکٹری وغیرہا مثلاً علی حسب اختلاف المقاصد مل جائے کہ اس میں میری عزت و آبرو ہے دوسرا ساعی ہے کہ مجھ کو نہ ملے کہ غریبوں پر ظلم ہوگا۔ چنانچہ بعضوں پر زور دیا جاتا ہے کہ حکومت قبول کرو اور وہ نہیں کرتے ایک وہ لوگ ہیں جنھوں نے سلطنت کے لئے ہزاروں جانیں ضائع کر دیں ایک وہ تھے کہ بھاگتے تھے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کوئی اس کو منفعت سمجھا اس کی تحصیل کے لئے سعی کی اور دوسرے نے اس کو مضرت خیال کیا اس لئے اُس کے دفع میں کوشش کی اور جس قدر اختلافات عالم میں ہیں سب کی وجہ یہی ہے کہ ایک شخص ایک امر کو منفعت و مستحسن سمجھتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے اُس کی تحصیل کے درپے ہوتا ہے دوسرا اُسی کو مضرت سمجھتا ہے اس لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اختلاف مذاہب کی یہی وجہ ہے لیکن اس وقت اس میں بحث نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت بفضلہ تعالیٰ سارا مجمع ایک مذہب کا ہے۔

اس وقت قابل غور امر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہونا ضرور ہے کہ آیا کون منفعت واقع میں قابل تحصیل کے ہے کون مضرت قابل دفع کے ہے تو بعد تامل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ منفعت وہ لائق تحصیل کے ہے جس میں دو صفتیں ہوں ایک تو یہ کہ وہ منفعت زیادہ باقی رہنے والی ہو دوسری یہ کہ خالص ہو مشوب بمضرت نہ ہو دیکھ لیجئے اگر کوئی منفعت چار

سال رہنے والی ہو اور دوسری آٹھ سال تو ہر عاقل دوسری ہی کو پسند کریگا اور اسی کو اختیار کرے گا۔ مثلاً دو مکان ہوں ایک بڑا عالی شان اور خوبصورت ہو اور دوسرا چھوٹا اور بدصورت ہو اور وہ مکان کسی شخص کے سامنے پیش کئے گئے لیکن یہ کہا گیا کہ بڑا مکان چار پانچ روز کے بعد خالی کرالیا جاوے گا اور چھوٹا کبھی خالی نہ کرایا جاوے گا تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چھوٹے ہی مکان کو پسند کرے گا اور اگر یہ کہہ دیا جاوے کہ نسلاً بعد نسل تم کو دیدیا جاوے گا تو ضرور ہی پسند کرے گا۔ معلوم ہوا کہ منفعت باقی رہنے والی ہوگی اسی قدر زیادہ اعتبار کے قابل ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ مکان عالیشان باوجود اپنی خوبصورتی کے کسی ضرر پر مشتمل ہو مثلاً ہمسایہ اچھا نہ ہو یا اور کوئی مضرت کا احتمال ہو اور اس چھوٹے مکان میں یہ اندیشہ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ چھوٹا ہی مکان پسند ہوگا۔ پس یہ قاعدہ ثابت ہوا کہ منفعت وہ قابل تحصیل کے ہے جو مضرت سے خالص ہو اسی طرح مضرت بھی وہ زیادہ قابل اہتمام کے ہوتی ہے جو زیادہ باقی رہنے والی ہو اور نیز من کل الوجود مضرت ہی ہو کوئی شائبہ اس میں منفعت کا نہ ہو دیکھو اگر اتنا سفر میں آدمی کسی مکان میں ایک دو شب کے لئے قیام کرتا ہے اور وہاں کوئی ناگوار امر پیش آتا ہے اس کے دفع میں زیادہ اہتمام اور فکر نہیں کرتا بخلاف اس کے کہ وطن اصلی میں کوئی امر پیش آوے تو اس کی دور کرنے کی زیادہ فکر ہوتی ہے اس لئے کہ وہاں ہمیشہ رہنا ہے اور مثلاً اگر کہا جاوے کہ اگر تم چار دن کے لئے دھوپ میں سفر کرلو تو تم کو عمر بھر راحت ملے گی یا اگر چار ماہ راحت سے رہوگے تو عمر بھر جیل خانے میں رہوگے تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چار روز کے سفر کی مشقت کو گوارا کرلیگا اور دوسری صورت کو پسند نہ کرے گا۔ معلوم ہوا کہ مضرت باقیہ و خالصہ زیادہ فکر کے قابل ہے۔ اور مضرت فانیہ زیادہ قابل التفات نہیں ہے پس منفعت و مضرت دونوں کی دو قسمیں ہوئیں منفعۃ[۱] باقیہ خالصہ منفعۃ[۲] فانیہ غیر خالصہ مضرۃ[۳] باقیہ خالصہ مضرۃ[۴] فانیہ غیر خالصہ۔ اسکے بعد معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ دنیا کی منفعۃ و مضرۃ تو ہر شخص کے پیش نظر ہے ہمکو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور منفعت و مضرت کی بھی خبر دی ہے جو مرنیکے بعد واقع ہونیوالی ہے۔ اب محل کے اعتبار سے منفعۃ و مضرۃ کی دو دو قسمیں اور نکلیں منفعۃ دنیویہ منفعۃ اخرویہ مضرۃ دنیویہ مضرۃ اخرویہ اب ہمکو یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ چار قسمیں آخر کی یعنی منفعت دنیویہ و اخرویہ مضرت دنیویہ و اخرویہ پہلے اقسام کی کس قسم میں داخل ہیں۔

یعنی غور کرنا چاہیئے کہ منفعۃ دنیویہ ایا منفعۃ باقیہ خالصہ ہے یا فانیہ غیر خالصہ اسی طرح مضرۃ دنیویہ کو بھی دیکھنا چاہیئے اور منفعۃ اخرویہ و مضرۃ اخرویہ کو بھی دیکھنا چاہیئے یعنی یہ کہ کونسی منفعۃ اور مضرۃ کس قسم میں داخل ہے سو دیکھ لیجئے کہ دنیا کی منفعۃ تو فانیہ ہے اور آخرۃ کی باقیہ ہے اور آخرۃ کی مضرۃ باقی رہنے والی ہے۔ اور دنیا کی مضرۃ فنا ہونے والی ہے۔

اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ دنیا کی منفعۃ کیسی اعلیٰ درجہ کی ہو مگر خالص نہیں مثلاً کھانا ہی لے لیجئے اول تو حاصل کس کلفت سے ہوتا ہے کہ اول زمین کو درست کیا جاتا ہے، اس کے لئے بیل و آلات زراعت مہیّا کرنے ہوتے ہیں اس کے بعد بوتے ہیں پانی دیتے ہیں، حفاظت کرتے ہیں۔ کاٹتے ہیں۔ گاہتے ہیں۔ اوڑاتے ہیں۔ پیستے ہیں پکاتے ہیں۔ اس قدر کلفتوں کے بعد جب اس سے عین انتفاع کا وقت ہوتا ہے کہ اس وقت بظاہر تمام کلفتیں ختم ہو جاتی ہیں اور التذاذ ہی کا وقت ہوتا ہے لیکن اس وقت بھی اکثر اوقات کوئی نہ کوئی کلفت پیش آجاتی ہے کہ وہ کلفت التذاذ میں سد راہ ہو جاتی ہے مثلاً روٹی کا ٹکڑا گلے میں اٹک گیا، کھانا کھانے بیٹھے کسی عزیز کے مرنے کی خبر آگئی یا اور فکر میں ڈالنے والی کوئی بات سُن لی کہ سب کھانا پکایکایا بے لطف ہو گیا یا یہ وہ کھانا ہضم نہیں ہوا قبض ہو گیا یا دست آنے لگے، سلاطین اور امراء کے عیش سے زیادہ کسی کا عیش نہیں ہے لیکن ان کو سب سے زیادہ پریشانیاں ہیں اولاد کو دیکھ لیجئے کہ بڑی بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوتی ہے الواع الواع کی تکالیف اٹھا کر ان کو پرورش کرتے ہیں پھر اکثر اولاد خلاف مزاج ہوتی ہے والدین کو سینکڑوں طرح کی ان سے تکالیف پہنچتیں ہیں غرض دنیا کی جس منفعۃ کو دیکھو گے خالص نظر نہ آوے گی اور اپنے مقصد کے موافق نہ ہوگی۔ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں ام للانسان ما تمنی فللّٰہ الاٰخرۃ والاولیٰ کیا یہ انسان کے لئے جو جو تمنا کرے وہ حاصل ہو جاتے ہیں (یعنی نہیں) پس آخرۃ اور دنیا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔

لیکن اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے لِلّٰہِ الاٰخرۃ والاولیٰ سے تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے

دنیا ہمارے اختیار میں نہیں ہے اسی طرح آخرۃ بھی نہیں ہے پھر فرق کیا ہوا بلکہ نہ وہ قابل تحصیل ہوئی نہ یہ ہوئی تو جو اس تقریر سے تمہارا مقصود ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرۃ کی رغبت دلانا وہ حاصل نہ ہوا جواب یہ ہے کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا یعنی جو شخص صرف دنیا طلب کرے تو دنیا میں جو ہم چاہیں گے جس کو چاہیں گے وہ دیں گے پھر اُس کے لئے ہم جہنم تجویز کریں گے اس میں داخل ہوگا اس حالت میں کہ مرموم و مردود ہوگا اور جو شخص آخرۃ چاہے گا اور اس کے لئے پوری سعی کرے اور وہ مومن بھی ہو پس ان لوگوں کی سعی کی قدر کی جاویگی دیکھئے دنیا کی نسبت تو یہ فرمایا کہ ہم جس کو چاہیں گے اور جتنی چاہیں گے دیں گے اور آخرۃ کی نسبت وعدہ فرمایا کہ جو اس کے لئے سعی کرے گا اس کی سعی کی قدر کی جاوے گی یعنی اس کا بدلہ ملے گا دونوں جگہ قضیہ شرطیہ ہے مگر دوسری جگہ کامیابی کا وعدہ ہے اور پہلی صورۃ میں نہیں ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اختیار میں تو خدا ہی کے ہے دنیا بھی آخرۃ بھی مگر آخرۃ کی سعی پر بدلہ دینے کا وعدہ ہے اس لئے وہ قابل تحصیل ہوئی بخلاف دنیا کے بہرحال آیۃ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ الخ سے جو شبہ ہوا تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ اب ہم لوگوں نے برعکس معاملہ اختیار کیا ہے کہ جس کا (یعنی دنیا) وعدہ نہیں ہے اور اس کو اپنی مشیتہ پر رکھا ہے اس کے طلب میں تو منہمک ہیں اور نیز اس کے اسباب تحصیل (نوکری تجارت زراعت وغیرہا) کی نسبت تو ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ گویا ان کے نزدیک مسبب ان پر ضرور مرتب ہوگا اور جس کا وعدہ ہے (یعنی آخرۃ) اس کے اسباب (صلوٰۃ صوم حج زکوٰۃ وغیرہا من المامورات) کی طرف مطلق التفات نہیں، ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کی ہر منفعت کے اندر کدورت ہے، بخلاف آخرۃ کی منفعت کے کہ جس کو حق تعالیٰ اپنی رضامندی کے ساتھ جنت نصیب فرمادے وہاں اس کو کوئی آزار نہیں فرماتے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ

یعنی تمہارے لئے جنت میں وہ شے ملے گی جس کو تمہارا جی چاہے گا۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ یعنی ہم کو جنت میں نہ تعب لگے گا اور نہ اس میں تکان ہوگا۔

اگر کوئی کہے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک کے پاس دنیا کا سامان جیسے مال اولاد مکان گھوڑے جوڑے وغیرہ بہت ہوتا ہے تو دوسرا دیکھ کر اس کو حسد کرتا ہے اور حسد کی آگ سے جلتا ہے تو یہ مسلم ہے کہ جنت میں سب نعمتیں ہوں گی لیکن اختلاف درجات کی وجہ سے شاید آپس میں حسد ہو تو یہ بھی ایک قسم کی تکلیف اور کدورت ہے جواب یہ ہے کہ وہاں پر حسد نہ ہوگا ہر شخص اپنے حال اور نعمتوں میں بیحد خوش ہوگا اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھے گا یا نہیں اگر افضل جانے گا تو حسد ہوگا اور اگر نہ جانے گا تو جہل لازم آئے گا۔ جواب یہ ہے کہ ہم اس شق کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ افضل کو اپنے سے افضل جانے گا۔ لیکن وہ اُن کے درجات کی تمنا نہ کرے گا اس لئے کہ اپنی استعداد اس کو معلوم ہوگی اور اپنے اعمال اس کو اپنے پیش نظر ہوں گے اور تفاوت درجات وہاں تفاوت اعمال سے ہوں گے اس لئے اس کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ درجہ مجھ کو نہیں مل سکتا اس لئے وہ اسی میں خوش ہوگا نہ کسی پر اس کو حسد ہوگا اور نہ زیادہ کا متمنی ہوگا۔

دوسرا جواب اس سے باریک ہے وہ یہ کہ وہاں سب عبد کامل ہوں گے تمام مقامات باطنی حاصل ہوں گے اور مقامات میں سے رضا بھی ہے اس لئے مقام رضا بھی اس کو حاصل ہوگا اور وہ اُس میں اس قدر خوش ہوگا کہ درجات فاضلہ کی اُس کے قلب میں تمنا نہ ہوگی جیسا کہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض طبایع میں قناعۃ کا مضمون ایسا راسخ ہے کہ اُن کے قلب میں ترقی دینا نہ ہونا کیا معنی بلکہ اُس سے نفرت ہے۔ ایک پولیس کے اہل کار دیکھے گئے کہ ان کے افسر کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی ترقی کریں مگر وہ منظور نہیں کرتے اور ان کے ہم چشم اُن پر ہنستے ہیں، بات یہ ہے کہ طبایع کا مذاق مختلف ہے جبکہ دنیا میں اس کا نمونہ موجود ہے آخرت میں تو کیا بعید ہے۔ ہاں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ حدیثوں

میں آتا ہے کہ جنتی آپس میں ملیں گے اور ایک جنتی دوسرے کو دیکھ کر تمنا کرے گا کہ جیسا لباس اس کا ہے ایسا ہی میرا بھی ہو۔

چنانچہ فوراً اسی طرح اس کا لباس ہو جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ تمنا کرے گا جواب یہ ہے کہ یہ تمنا صرف لباس کے بارے میں آئی ہے درجہ کے بارے میں نہیں ہے اور لباس کے اندر مساواۃ ہونے سے درجہ کی مساواۃ یا فضیلت لازم نہیں کما ھو ظاھر جداً پس جس میں فرق رہنا ضروری ہے یعنی درجہ اس کی تو تمنا نہ ہوگی اور جس کی تمنا ہوگی یعنی لباس اسی میں فرق ہونا ضروری نہیں۔ پس حسد کی کوئی گنجائش نہ ہوئی حاصل یہ کہ جنت کی نعمتیں سب خالص ہوں گی کدورت کا ان میں نام ونشان نہ ہوگا بخلاف نعماء دنیا کے کہ ان سب میں کچھ نہ کچھ کدورت ضرور رہی ہوتی ہے اب مضرت دنیوی کو دیکھئے کہ مضرت دنیویہ خواہ کیسی ہی اشد ہو لیکن فنا ہونے والی ہے اگر کسی کو کوئی بیماری ہے اول تو دنیا ہی میں صحت ہو جاتی ہے ورنہ مر کر تو تمام مصائب کا خاتمہ ہو ہی جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی افلاس میں یا کسی اور طرح کے رنج وغم فکر میں مبتلا ہوتا ہے سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ مضرت دنیا کو بقا نہیں ہے اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ مضرت دنیا خالص مضرت نہیں بلکہ تامل سے دیکھا جاوے تو اس میں سینکڑوں منفعتیں دنیا اور دین کی ہوتی ہیں دنیا کی منفعت تو یہ کہ مثلاً ایک شخص کسی بیماری میں مبتلا رہتا ہے تو اگر یہ تندرست رہتا تو خدا جانے کیا کیا فساد کرتا اور اس کے سبب سے بے آبرو ہوتا جیل خانہ جاتا اور ظاہر ہے کہ عاقل کے لئے آبرو جان سے زیادہ عزیز ہے اور دین کی منفعت تو بہت ہی ظاہر ہے کہ بیماری ذنوب کو محو کرتی ہے اور بہت سے منہیات سے روکتی ہے خلاصہ یہ کہ دنیا کی مضرت فنا ہونے والی بھی ہے اور من کل الوجوہ مضرت نہیں ہے بخلاف مضرت اخرویہ کے کہ وہ مضرت ہی مضرت ہے تمام مضرتیں وہاں علی الکمال موجود ہیں پس ثابت ہوا کہ منفعت دنیویہ فانی بھی ہے قلیل بھی ہے اور مشوب بہ کلفت ہے اور اخروی منفعت باقی بھی ہے کثیر بھی ہے اور

خالص بھی ہے اسی طرح مضرت دنیا فانی ہے اور غیر خالص اور اخروی مضرت باقی بھی ہے اور خالص ہے۔

اب روز روشن کی طرح فیصلہ ہو گیا اور آپ خود موازنہ کر سکتے ہیں کہ حاصل کرنے کے قابل کونسی منفعت ہوئی سو ظاہر ہے کہ مسلمان (جو کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جانتا ہے) اس سوال کا یہی جواب دے گا کہ منفعت اخرویہ تحصیل کے قابل ہے اسی طرح دنیا اور آخرۃ کی مضرتوں میں موازنہ کر لیجئے کہ کون مضرت زیادہ بچنے کے قابل ہے ظاہر ہے کہ دنیا کی مضرت آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں اصلا قابل التفات نہیں زیادہ اہتمام کے قابل آخرۃ کی مضرۃ ہے۔ اس کے بعد سمجھئے کہ آخرۃ کی منفعت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور آخرۃ کے ضرر سے کس طریق سے بچ سکتے ہیں۔

تو سمجھ لیجئے کہ آخرۃ کی منفعۃ جنت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریق اعمال صالحہ ہیں اور آخرۃ کی مضرت دوزخ ہے اور اس سے بچنے کا طریق بداعمالیوں سے بچنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اعمال صالحہ کو اختیار کیا جاوے اور ذنوب سے بچا جاوے اور جو ہو چکے ہیں ان سے توبہ کی جاوے خلاصہ یہ کہ مقصود دو شئے ہیں اصلاح اعمال محو ذنوب اور محو ذنوب کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ سے توبہ کی جائے اور آئندہ بچنے کا عزم کیا جائے لیکن اعمال کی تحصیل اور گناہوں سے بچنا اول تو اکثر لوگوں پر ہمیشہ ہی سے گراں اور ثقیل ہے۔

پھر خصوصاً اس زمانہ میں تو اعمال صالحہ لوگوں پر بہت ہی بھاری ہیں چنانچہ بڑی ضروری اعمال صلوٰۃ صوم حج زکوٰۃ ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ان سب کے اندر بے حد سستی کی جاتی ہے بلکہ مصیبت سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ نماز نے ترقی کو روک دیا ہے کیونکہ یہ سن کر کہ مسلمان ہو کر پانچ وقت کی نماز پڑھنی پڑے گی اسلام سے بعضے آدمی رک جاتے ہیں اس لئے اس کو اسلام سے خارج کر دیا جاوے نعوذ باللہ ان احمقوں سے کوئی پوچھے کہ جس اسلام میں نماز نہیں وہ کیا اسلام ہوا۔ اس بے ہودہ رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عقل پرستوں پر نماز بہت ہی بھاری ہے۔

ہمارے مدرسہ دیوبند میں ایک طالب علم نو وارد آئے تھے منطقیوں کی صحبت میں بہت رہے تھے دین کی مطلق پروانہ تھی نماز کی پابندی نہ تھی اور یہاں دیوبند میں نماز کا بڑا اہتمام ہے پانچ وقت سب طلبہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو جب نماز کا وقت آتا ان کو بھی زبردستی لے جاتے ایک روز کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو معراج میں تشریف لے گئے تھے وہاں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں پھر کم ہوتے ہوتے پانچ رہی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند میں پوری پچاس کی پچاس ہی باقی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نماز ان کو سخت مصیبت معلوم ہوتی تھی حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۔ یعنی بے شک نماز بہت بھاری ہے مگر اُن لوگوں پر جو خشوع کرنے والے ہیں اسی واسطے میں تو نماز ہی کو ولی سمجھتا ہوں حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا روزہ کو بہت ثقیل سمجھتے ہیں، کانپور میں ایک شخص تھے انھوں نے کبھی روزہ ہی نہیں رکھا میں نے ان سے کہا تو کہنے لگے کہ میں کسی طرح متحمل ہی نہیں میں نے کہا کہ امتحان کے لئے ایک تو رکھو چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا تب معلوم ہوا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا کہ میں متحمل ہی نہیں۔

بعضے لوگ حج کا نام سُن کر وہاں کی بہت مذمت کرتے ہیں کہ وہاں بدو مار ڈالتے ہیں لوٹ لیتے ہیں اور بعضے تو گئے بھی نہیں مگر اوروں سے سُن سُن کر وہ بھی مذمت کیا کرتے ہیں یہ سب کم ہمتی کی باتیں ہیں میں ان کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا ہندستان میں ایسے واقعات نہیں ہوتے بلکہ اگر وہاں کے مجمع پر نظر کی جائے تو حق تو یہ ہے کہ جس قدر واقعات ہونا چاہیئے ان سے بہت کم ہوتے ہیں ہندوستان میں اس کا عشر عشیر بھی اگر مجمع ہو جائے تو بہتیرے واقعات ہو جاتے ہیں بلکہ بغیر مجمع کے بھی راستوں میں واقعات ہو جاتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے جیسا بعض کہتے ہیں کہ بدوؤں کو لوٹ مار حلال ہے اس لئے کہ وہ دائی حلیمہ سعدیہ کی اولاد ہیں یہ تو بالکل لغو ہے وہ اگر ایسا کرتے ہیں تو زیادہ گنہگار ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور کہیں گے اور تم اس کو یاد رکھو کہ حج کا سفر سفر عشق ہے راہ عشق میں تو سب کچھ پیش آتا ہے بلکہ

پیش نہ آنا عجیب ہے دنیا کے محبوب سے ملنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں پیش آتی ہیں مگر سب گوارا کرتے ہیں ؎

نسازد عشق را گنج سلامت ✣ خوشا رسوائی کوی ملامت

(عشق کے لئے سلامتی گوشہ مناسب نہیں بلکہ بدنامی کے کوچہ کی رسوائی بہترین چیز ہے) ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ✣ گوی گشتن بہر او اولے بود

(اللہ تعالیٰ کا عشق لیلےٰ کے عشق سے کب کم ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کیلئے تو گلی گلی پھرنا ہی بہتر ہے)

ایک بزرگ ایسے باہمت تھے کہ انھوں نے ۳۳ حج کئے تھے۔ ایک شخص مولوی منظور احمد صاحب بنگالی تھے مدینہ طیبہ میں رہتے تھے مگر ہر سال حج کیا کرتے تھے اور حج کر کے مدینہ طیبہ لوٹ جاتے تھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیکھ کر ایک بار یہ شعر پڑھا ؎

زہے سعادتِ آن بندۂ کہ کرد نزول
گہے بہ بیت خداؐ گہے بہ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ کس قدر خوش نصیب ہے جو کبھی خدا کے گھر میں جا پہنچتا ہے اور کبھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں)

اور بعضے ایسے بھی ہیں کہ قریب بیت اللہ شریف کے رہتے ہیں اور اُن کو اب تک بھی حاضری نصیب نہیں ہوئی ایک صاحب فرماتے تھے کہ ایک بدوی بیس پچیس برس سے مکہ معظمہ آتا تھا اس نے ایک دن پوچھا کہ یہ لوگ اطراف وجوانب سے اس کثرت سے یہاں کیوں آتے ہیں اللہ اکبر اس کو اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ یہاں کیوں آتے ہیں۔

علیٰ ہذا۔ زکوٰۃ میں گرانی ہوتی ہے چالیس ہزار میں سے جب ایک ہزار روپیہ نکلتا ہے تو گراں گذرتا ہے حالانکہ چالیسواں حصہ بہت ہی کم ہے امم سابقہ پر چوتھائی حصہ مال کا فرض تھا یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ چالیسواں حصہ ہی فرض کیا گیا یہ بھی لوگوں پر بھاری ہے۔

آج کل کے نو تعلیم یافتہ اس فکر میں ہیں کہ احکام شرعیہ ہماری عقل کے موافق ہوتے ہیں واللہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ عقل کے فتوے پر حکم شرعی نہیں ہے عقل تو یوں چاہتی

ہے کہ اگر کسی کے پاس چالیس ہزار روپیہ ہو تو ۳۹ ہزار بلکہ زیادہ زکوٰۃ میں دیا جائے اور ایک ہزار خود رکھا جائے اس لئے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ غرباؤ مستحقین زکوٰۃ کی تعداد زیادہ ہے اور اغنیاء کی کم ہے اور ادھر یہ ثابت ہے کہ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند اور نیز مساواۃ بین الاقوام آجکل کے اصول عقلیہ سے ہے تو ایک شخص کو کوئی حق اس بات کا نہیں ہے کہ اس کے پاس ۴۰ ہزار روپیہ ہوں اور دوسرا نان شبینہ کو محتاج ہو پس یہ رحمت نہیں تو کیا ہے ایک ہزار زکوٰۃ کے واجب ہوئے اور ۳۹ ہزار رکھنے کی اسکو اجازت ہوئی اگر کوئی کہے کہ جب یہ عقل کا مقتضا تھا تو شریعت نے اس کا کیوں اعتبار نہیں کیا احکام شرعیہ عقل کے خلاف ہیں جواب یہ ہے کہ اگر عقل کے فتوے کے موافق زکوٰۃ میں حکم ہوتا تو اس میں تمدن محفوظ نہ رہتا اس لئے کہ سب یکساں حالت میں ہوتے اگر کسی کو کوئی کام پیش آتا اور مزدور کی ضرورت ہوتی تو کہاں سے آتا، خدمت گار کہاں سے ملتا۔ حجام، دھوبی، نائی، بھنگی کے کام کون کرتا غرضیکہ یہ سب کام اٹکے رہتے اور زندگی گذارنا مشکل ہوتا۔ اس سے آپ کو شریعت کی خوبی معلوم ہوئی ہوگی کہ اس کے احکام کتنے مصالح اور حکم پر مبنی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ شریعت جو ہمدردی کرتی ہے وہ آپ کی عقل نہیں کر سکتی حاصل یہ کہ جس قدر احکام شرعیہ ہیں سب کے اندر لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جو احکام کرنے کے ہیں ان میں گرانی ہو تو زیادہ تعجب نہیں ہے جن امور سے منع کیا گیا ہے اُن میں بھی گرانی ہوتی ہے حالانکہ ترک فعل سے اسہل ہے فعل میں تو ایک کام کا کرنا ہوتا ہے اور ترک میں کیا مشقت ہے بلکہ سہولت ہونا چاہیئے دیکھئے ایک ادنیٰ سی شئے غیبت ہے کہ بجز مضرت کے اس میں اور کچھ نہیں اور گناہوں میں تو کچھ حظ یا نفع دنیوی بھی مرتکب کے زعم میں ہوتا ہے اور اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن ہم لوگوں سے یہ نہیں چھوٹتی غرضکہ احکام شرعیہ خواہ متعلق فعل کے ہوں یا ترک کے سب میں لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جب ایک ایک فعل اور ایک ایک ترک بھی گراں ہے تو جب کہ پچاس عمل کرنے کے ہوں اور پچاس نہ کرنے کے جیسے احکام کی اب موجودہ حالت

ہے تو سو مشقتیں ہوئیں سُنکر بھی جی گھبرا جاوے گا کہ میاں یہ تو بڑی مصیبت آپڑی کہ یہ کام کرو وہ نہ کرو سخت اُلجھن اور دشواری ہے کوئی میاں فلسفی بتلائے تو سہی کہ یہ معمہ کس طرح حل ہو اور یہ دشوار کس طرح سہل ہو اگر تمام فلاسفہ قدیم و جدید جمع ہو کر سوچیں تو ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہیں نکال سکتے جس سے یہ پیچیدگی اور یہ گلیھڑے کھلے اور اگر کوئی سوچ بچار کر کوئی طریقہ نکالے بھی تو وہ سہل نہ ہوگا۔

حق تعالےٰ شانہ نے اپنے بندوں کی اس مشقت اور اس الجھن کو دفع کرنے کے لئے ایک طریقہ نہایت مختصر لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے۔ اس آیہ کریمہ میں جو میں نے تلاوت کی ہے اسی طریقہ کا بیان ہے یہ حاصل ہے اس تقریر کا اجمالاً اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول ثابت ہو چکا ہے کہ دو شئے مقصود ہیں اعمال صالحہ کا حاصل کرنا اور محو ذنوب اور اُن میں بھی گرانی اس کی سہولت کے لئے دو طریق ارشاد فرمائے ہیں کہ ان کو اختیار کرلو تو وہ دو چیزیں جو بڑی مشقت کی تھیں وہ آسان ہو جاویں گی۔ ان میں سے ایک اتقوا اللہ ہے اور دوسرے قولو قولاً سدیداً ہے یعنی اللہ سے ڈرو اور بات ٹھیک کہو اس پر دو شے مرتب فرمائی ہیں یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم یعنی اگر تم ان دو باتوں کو اختیار کرلو گے تو اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادیں گے اور تمہارے گناہ بخشدیں گے اور ان ہی میں تم کو گرانی تھی جس کا اوپر بیان ہوا۔ حاصل یہ کہ تقوےٰ جس کا ترجمہ خدا کا خوف ہے فعل قلب کا ہے اور کہنا فعل زبان کا ہے خلاصہ طریق کا یہ ہوا کہ دل اور زبان کو تم درست کرلو باقی سب کام ہم کردیں گے قلب ایک شے ہے اس کے متعلق صرف ایک شے بتلائی ہے کچھ جھگڑے کی بات نہیں ہے ایک نہایت مختصر کام فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کا ڈر پیدا کرلو جیسے کسی شخص سے کہا جاوے کہ یہ پچاس گاڑیاں ہیں انکو ایک دم سے چلاؤ اور وہ سخت پریشان ہو کہ میں کس طرح چلاؤں یہ تو سخت مشکل ہے پھر اس کو طریق ایک بتلایا جاوے کہ اسی میں انجن لگا دو سب

گاڑیاں خود بخود چل پڑیں گے واللہ ایسی بے نظیر تعلیم ہے کہ کوئی حکیم کوئی فلسفی کوئی عاقل مثل نہیں لاسکتا اور کیوں نہ ہو وہ ایک مطب ہے ایسی ذات پاک کا جو انسان کے رگ پٹھوں کے ریشہ ریشہ سے واقف ہے اس لئے اس کی حالت کو دیکھ کر علاج تجویز کیا ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ ان دونوں چیزوں کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں دخل ہے یا نہیں تو بعد تامل یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے افعال کی ترتیب یوں ہے کہ اول قلب سے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد صدور ہوتا ہے گویا انجن قلب ہے تو اگر قلب درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو یہ دنیا کا سارا جہاز اور تمام بکھیڑے سب کے سب قلب ہی کے خیال پر چل رہے ہیں یہ پہاڑ کی برابر عمارتیں یہ ہرے بھرے باغ یہ طرح طرح کے سامان سب کا انجن خیال ہی ہے اسی واسطے تو حدیث میں آیا ہے کہ ان فی الجسد مضغة اذا صلح صلح الجسد کله واذا فسد فسد الجسد کله یعنی آدمی کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے اور یہ مسئلہ طبّی قاعدہ سے بھی درست ہے اس لئے کہ امراض قلب تمام امراض میں بہت سخت ہیں اگر قلب صحیح اور قوی ہے تو اور امراض کو طبیعت خود دفع کر دیتی ہے اور اگر قلب میں ضعف اور مرض ہے تو اور جسد کتنا ہی قوی ہو سب بیکار ہے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قلب کی درستی سے تمام اعمال کی درستی ہوتی ہے تو قلب کی درستی کس سے ہو؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ قلب کے بھی بہت سے افعال ہیں تو اگر حق تعالیٰ تمام افعال کا حکم فرما دیتے یا اجمالاً یہ فرما دیتے کہ اپنے قلب کو درست کرو تو اس صورت میں بھی نفس کو ایک مشقت ہوتی کہ قلب کو کس طرح درست کریں کیا رحمت ہے کہ قلب کے تمام افعال میں سے صرف ایک مختصر سی بات فرمائی کہ صرف ہمارا خوف اختیار کر لو باقی سب ہم درست کر دیں گے اور وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکم کا اگر ڈر دل میں بیٹھ

جاتا ہے تو اس کی مخالفت پر جرات نہیں ہوتی اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا خوف کسی کے دل پر بیٹھ جائے تو اس سے گناہ نہ ہوں گے اور اعمال کی اصلاح ہو جاوے گی اور گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کے لئے عزم ترک بھی کرے گا یہ محو ذنوب ہوا پس معلوم ہو گیا کہ تقوی کو اصلاح اعمال و محو ذنوب میں پورا دخل ہے اور تقوے اصلاح اعمال کے لئے بمنزلہ علت تامہ کے ہے۔

اب اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ ہر شئے کے لئے کچھ موانع ہوتے ہیں اور کچھ ذرائع اس کی تحصیل کے ہوتے ہیں اسی طرح خوف کے لئے موانع بھی ہیں اور ذرائع کی تحصیل کے بھی موانع کو بیان کیا جاتا ہے اور طریقہ تحصیل آخر میں بیان کیا جاویگا تو سمجھنا چاہیے کہ خوف سے روکنے والی صرف دو چیز ہیں اول تو عدم ایمان دوسرے تسویل شیطانی عدم ایمان تو ظاہر ہے کہ بفضلہ تعالیٰ یہاں نہیں ہے اس لئے اُس کے متعلق تو کچھ کلام کرنا ضروری نہیں البتہ تسویل شیطانی میں ابتلائے عام ہو رہا ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان نے سب کو یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ میاں جو کچھ کرنا ہے کر لو اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے آخر میں توبہ کر لیں گے سب بخشدیں گے۔

چنانچہ ارشاد بھی ہے قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

تو سن لیجئے کہ حق تعالیٰ بیشک غفور الرحیم ہے لیکن غفور رحیم کے وہ معنی نہیں ہیں جو یہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ غفور الرحیم کے معنے یہ ہیں کہ جو لوگ نافرمانیاں کر چکے ہیں اور نادم ہیں لیکن اُن کو یہ تردد ہوتا ہے کہ آئندہ کے لئے تو خیر یہ تدبیر ہے کہ گناہ نہ کریں لیکن گذشتہ کرتوت کی اصلاح کیسے ہو تو ان کے لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گذشتہ گناہوں کو بخشنے والا ہے چنانچہ شان نزول میں اسی خیال کے جواب میں نازل ہونا اس آیت کا مصرحاً مذکور ہے پس یہ آیت گناہان ماضی کے لئے ہے نہ یہ کہ آئندہ کے لئے بھی گناہ کی اجازت دے رہے ہیں۔ اب لوگ مستقبل کے لئے بھی اسی آیۃ کو اپنا متمسک بناتے ہیں یہ سراسر غلطی ہے یاد رکھو کہ توبہ کی مثال مرہم کی سی ہے

اور گناہ کی مثال آگ کی سی ہے مرہم تو اس لئے ہے کہ اتفاق سے اگر جل جاوے تو مرہم لگا دیا جاوے اس لئے نہیں ہے کہ اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس مرہم ہے آگ میں گھسا کریں جس شخص کے پاس نمک سلیمانی ہو اس کو یہ کب روا ہے کہ جان جان کر بہت سا کھایا کرے نمک سلیمانی تو اس واسطے ہے کہ اگر اتفاق سے بہت کھایا جائے تو نمک سلیمانی کھا لیا جاوے اس سے ہضم ہو جاوے گا اور ایسا کرے گا تو ایک روز جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ اسی طرح جو شخص توبہ کے اعتماد پر گناہ کرتا رہے گا ایک دن عجب نہیں وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے غرضیکہ توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا بہت حماقت ہے۔

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ طریقہ اصلاح اعمال و محو ذنوب کا فقط اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالے کا خوف پیدا کر لو تو اسی سے تمام اعمال درست ہو جاویں گے اور زبان کی درستی بھی اگرچہ اس میں داخل ہے مگر پھر زبان کی درستی کو استقلالاً طریقہ کا جزو کیوں بنایا گیا اس میں کیا راز ہے پس بجائے اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیداً کے یوں فرماتے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ یسدد لکم لسانکم ویصلح لکم اعمالکم الخ یوں نہیں فرمایا بلکہ وقولوا قولاً سدیداً کا اتقوا اللہ پر عطف کیا اور اس کو مستقل طریقہ قرار دیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال بہت سے ہیں ایک وہ جو ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہا سے ہوتے ہیں ایک وہ جو زبان سے ہوتے ہیں اور ان دونوں قسموں میں کئی قسم کا تفاوت ہے۔

ایک یہ کہ سوائے لسان کے اور سب جوارح عمل کرنے سے تھک جاتے ہیں پاؤں تھک جاتا ہے کثرت سے چلنے سے، ہاتھ تھک جاتا ہے اُن اعمال سے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں آنکھ تھک جاتی ہے زیادہ دیکھنے سے۔

مگر یہ لسان بولنے سے نہیں تھکتی اگر لاکھ برس تک بک بک کرو تو ہرگز نہ تھکے گی۔ یہ بات دوسری ہے کہ بکثرت بولنے سے دل کے اندر بے رونقی سی پیدا ہو کر بولنے سے نفرت ہو جاوے لیکن زبان کو فی نفسہٖ کوئی تکان نہ ہو گا اس سے معلوم

ہوا کہ لسانی اعمال سب جوارح کے اعمال سے عدد میں زیادہ ہوں گے بس گناہ بھی اس سے زیادہ ہوں گے ایک تو یہ تفاوت ہوا دوسرے یہ کہ زبان مثل برزخ کے ہے درمیان قلب وجوارح کے قلب سے بھی اس کو مشابہت ہے اور جوارح سے بھی اور یہ مشابہت خلقی بھی ہے اور باطنی بھی خلقی یہ کہ قلب بالکل مخفی ومستور ہے اور جوارح بالکل ظاہر اور زبان مستور من وجہ ومکشوف من وجہ ہے چنانچہ شارع نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے کہ صائم اگر منہ میں کوئی چیز لے کر بیٹھ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں کے مکشوف ہونے کا اعتبار کیا گویا جوف میں وہ چیز نہیں گئی اور اگر تھوک نگلے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں مستور ہونے کا اعتبار کیا گویا جوف سے جوف میں ایک چیز چلی گئی اور غسل میں کلّی کرنا فرض ہوا یہ مکشوف ہونے کا اعتبار فرمایا اور باطنی مشابہت یہ ہے کہ جیسے قلب کی اصلاح سے تمام بدن کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح زبان کی اصلاح سے تمام اعمال جوارح کی اصلاح ہو جاتی ہے جو شخص ساکت ہو کر بیٹھ جاوے اس کے ہاتھ سے نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی ہوگی نہ کسی سے لڑائی ہوگی نہ تکرار ہوگا اس لئے زبان چلانے ہی سے نوبت ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے ان سب سے حدیث کی بھی تنویر ہوگئی اذا اصبح ابن ادم فان الاعضاء کلھا تکفر اللسان فتقول اتق اللہ فینا فانا نحن بک فان استقمت استقمنا وان اعوججت اعوججنا یعنی جس وقت ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اے زبان) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں پس اگر تو راست ہوگی تو ہم سب راست رہیں گے اور اگر تو کج ہوگی ہم سب کج ہو جاویں گے۔ تیسرا تفاوت دیگر جوارح اور لسان میں یہ ہے کہ زبان قلب کی معتبر ہے زبان سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے پوری حالت قلب کی معلوم ہو جاتی ہے اور اگر ساکت رہے تو کچھ حال معلوم نہ ہوگا کہ یہ شخص کیسا ہے زبان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متواضع ہے یا متکبر ہے قانع ہے یا حریص عاقل ہے یا احمق دشمن ہے یا دوست خیر خواہ ہے یا بدخواہ بخلاف ہاتھ پاؤں کے سب شبہ ہو سکتا ہے ایک ہی طرح کا فعل ہاتھ پاؤں سے دوست دشمن سے صادر ہو سکتا ہے

مثلاً قتل واقع ہوا تو اس سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے یہ کہ قاتل دشمن ہی تھا ممکن ہے کہ دوست ہو اور وہ کسی اور کو قتل کرنا چاہتا ہو اور ہاتھ چوک گیا ہو چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی نے بندوق چلائی دوسرا بھائی کی آنکھ میں ایک چھرہ جا لگا اسی طرح سے مار پیٹ کبھی عداوت سے ہوتی ہے کبھی تادیب کے لئے ہوتی ہے غرض ایک شق متعین کرنے کیلئے خارجی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف لسان کے کہ یہ پوری نائب قلب کی ہے۔

چوتھا تفاوت یہ ہے کہ تعلقات دو قسم کے ہیں ایک اپنے نفس کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ جو تعلق اخوت محبت عداوت کا ہوگا وہ بدولت زبان کے ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں ہم کو دوسروں کی امداد کی ضرورت ہے بغیر دوسروں کی امداد کے ہم رکعت تک نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ نماز کا طریقہ ہم کو کسی نے بتلایا ہوگا اس لئے ہم نماز پڑھتے ہیں قرآن شریف کسی نے پڑھایا اس لئے ہم پڑھتے ہیں روزہ کی فرضیت اور اس کی تاکید اور اس کی ماہیت کسی نے بتائی اس لئے روزہ رکھتے ہیں علیٰ ہذا تمام اعمال صالحہ اور ان بتلانے سکھلانے والوں نے بلا تعلق تو بتلایا نہیں اور وہ تعلق پیدا ہوا ہے لسان سے اور نیز تعلیم بھی ہم کو بذریعہ لسان کے کی گئی ہے تو اس اعتبار سے لسان کو تمام اعمال صالحہ میں داخل ہوا گویا یہ تمام اعمال صالحہ بدولت اس لسان ہی کے ہم سے صادر ہوتے ہیں جبکہ دیگر جوارح اور لسان میں اس قدر تفاوت ہوئے اور لسان کو اعمال صالحہ کے وجود میں ایک دخل عظیم ہوا اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس کو مستقل جزو طریقہ اصلاح کا بنا دیا اگرچہ تقوے سے جو درستی ہوگی درستی لسان بھی اس کا فرد عظیم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ دو کام ہوئے ایک خدا کا خوف دوسرے زبان کی اصلاح ان دونوں کے جمع ہونے سے آئندہ کے لئے اعمال کی اصلاح ہوگی اور گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اور یصلح کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی حالانکہ بظاہر اصلاح اعمال کام عبد کا ہے تو وجہ اس کی یہ اشارہ ہے کہ ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہئے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ نازمت کرو جو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں اور خیر اگر کچھ ہمارے اختیار میں بھی ہے تو یہ ہے کہ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن پوری درستی جو مفہوم ہے یصلح

کا یعنی یہ کہ جیسے چاہیئے اس طرح کی نماز پڑھنا اور قلب کا اس میں حاضر ہو جانا یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور اس نسبت میں ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ گویا فرماتے ہیں کہ یہ اعمال تو تم نے کر لئے لیکن ہم اس کی اصلاح کر کے فرشتوں کی معرفت پیش کرا دیں گے جیسے بچے سے کہا کرتے ہیں کہ یہ شئے اٹھا لاؤ اور وہ اٹھا نہیں سکتا تو خود اٹھاتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی لگوا لیتے ہیں اور اٹھانے کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں اور اس پر انعام دیتے ہیں ایسی ہی ہمارا نماز روزہ ہے کہ خود توفیق دیتے ہیں خود رکھواتے ہیں اور خود ہی انعام عطا فرماتے ہیں۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت ہے اور دوسری شئے جو اتقوا اللہ الخ پر مرتب فرمائی وہ یغفر لکم ذنوبکم ہے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے یغفر لکم ذنوبکم کے یجنبکم ذنوبکم فرماتے یعنی تم کو گناہوں سے بچالیں گے یہ نہیں فرمایا اس لئے کہ گناہوں سے بچانا تو یصلح لکم میں آچکا ہے ذنوب ماضیہ باقی تھی ان کی نسبت فرمایا کہ ان کی بھی فکر نہ کرو ان کو بھی اللہ تعالیٰ محو فرما دیں گے۔

اب میں آپ کو خوف (کہ جس سے تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں) اس کے حاصل ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ گویا ایک گر ہے اور میرے تمام وعظ کا گویا خلاصہ ہے اور وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے وہ یہ ہے ولتنظر نفس ما قدمت لغد یعنی فکر آخرت کیا کرو اور فکر آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر لو مثلاً سوتے وقت روزمرہ بلا ناغہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ معاد کیا ہے اور مر کر ہم کو کیا پیش آنے والا ہے مرنے سے لیکر جنت میں داخل ہونے تک جو واقعات ہونے والے ہیں سب کو سوچا کرو کہ ایک دن وہ آئیگا کہ میرا اس دار فانی سے کوچ ہو گا سب سامان مال اسباب باغ نوکر چاکر اولاد بیٹا، بیٹی، ماں، باپ، بھائی، خویش، اقارب، دوست، دشمن سب یہیں رہ جاویں گے میں تن تنہا سب کو چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جالیٹوں گا اور وہاں دو فرشتے آویں گے اگر میرے دن بھلے ہیں تو اچھی صورت میں ورنہ خدانخواستہ ڈراونی صورت میں نہایت ہولناک آواز سے آکر سوالات کریں گے پس اے نفس اس وقت کوئی تیرا مددگار نہ ہو گا تیرے اعمال ہی وہاں کام آویں گے اگر سوالات کے جواب درست ہو گئے سبحان اللہ جنت کی طرف کی کھڑکی کھل جاویں گی اور اگر خدانخواستہ امتحان میں ناکام رہا تو قبر حفرۃ من حفر النار ہو گی اس کے بعد تو قبر سے اٹھایا جائیگا اور نامۂ اعمال اڑائے جاویں گے

حساب کتاب کیلئے پیش کیا جاویگا، پل صراط پر چلنا ہوگا اے نفس تو کس دھوکہ میں ہے اور ان سب واقعات پر تیرا ایمان ہے اور یقیناً جانتا ہے کہ یہ ہو کر رہیں گے پھر کیوں غفلت ہے اور کس وجہ سے گناہوں کے اندر دلیری ہے کیا دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اے نفس تو ہی اپنا غمخوار بن اگر تو اپنی غمخواری نہ کرے گا تو تجھ سے زیادہ کون تیرا خیر خواہ ہوگا اسی طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان واقعات کو تفصیل سے سوچا کرے میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انشاء اللہ چند ہی روز کے بعد دیکھو گے کہ خوف پیدا ہو گیا اور خوف پیدا ہونیکے بعد آپ کو ماضی سے توبہ کی فکر ہوگی اور آئندہ کے لئے اطاعت کی توفیق ہوگی اسوقت آپ کو مشاہدہ ہوگا اتقوا اللہ پر کیسے اصلاح اعمال و محو ذنوب مرتب ہو گئے آگے فرماتے ہیں ومن یطیع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیما یعنی جو شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے وہ بیشک بڑی کامیابی کو پہنچا یطیع میں اشارہ ہے کہ جو شخص خوشی سے کہنا مانے اس لئے کہ یہ طلوع سے مشتق ہے اور خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہوتا۔

اور اللہ کی محبت کے حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہے اس کیلئے بھی ایک وقت مقرر کرکے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں ہیں چند روز کے بعد آپ کو مشاہدہ ہوگا کہ ہم سرتا سر عنایات اور نعمتوں میں غرق ہیں اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہوگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ یطیع کا تعلق آپ سے بھی ہے آپکے ساتھ محبت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہمارے لئے مشقتیں اٹھائیں اور اپنی امت پر شفقت فرمائی اس کو سوچا کرو جب محبت پیدا ہوگی۔ اطاعت خوشی سے ہوگی ادھر محبت ہوگی اور پہلے جو طریقہ بیان کیا اس سے خوف ہوگا یہ دونوں شے آپکے دین دنیا دونوں درست کردیں گے اور بڑی کامیابی سے یہی مراد ہے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اصلاح اعمال کی توفیق عطا فرماویں وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین۔ والسلام

ناظرین! آپ سے استدعا ہے کہ جامع وعظ ہذا او رعبدالمنان کیلئے بھی دعائے حسن خاتمہ فرمادیں
تاریخ تحریر ۱۵ شوال ۱۳۳۰ھ فقط تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد دوم

کا

وعظ ششم ملقب بہ

احکام العشر الاخیرہ

ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ ایم اے جناح روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دعوات عبدیت جلد دوم کا

وعظ ششم ملقب بہ

احکام العشر الاخیرہ

این	متٰی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۱ رمضان ۱۳۳۹ھ یوم جمعہ	نماز جمعہ سے نماز عصر تک	بیٹھ کر	احکام عشرۂ اخیرہ رمضان	مولوی سعید احمد صاحب	تقریباً ۱۰۰	دیہات کے لوگ بکثرت تھے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ۔

یہ ایک آیۃ کا ٹکڑا ہے اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے رمضان کی ایک فضیلت کا بیان فرمایا ہے گذشتہ جمعہ میں رمضان کے ضروری آداب وحقوق کا بیان ہوچکا ہے آج رمضان کے ایک خاص جزو یعنی عشرہ اخیرہ کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے اس آیت سے بظاہر عشرہ اخیرہ کے مضمون کو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن غور کیا جائے تو

عشرہ اخیرہ سے اس آیت کا تعلق معلوم ہو جاوے گا خدا تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان کی جو فضیلت بیان کی ہے اسی فضیلت میں غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ وہ فضیلت عشرہ اخیرہ کے لئے بدرجۂ اولیٰ واتم ثابت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ایسا اور ایسا ہے سو اس آیت سے اس قدر معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا۔ لیکن ظاہر ہے کہ رمضان تیس دن کے زمانہ کا نام ہے اور اس آیۃ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل زمانہ کے کس جزء میں نزول ہوا ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے ساتھ دوسری آیۃ کو بھی ملالیں تو دونوں کے مجموعہ سے تعیین وقت بھی ہم کو معلوم ہو جاوے گی۔ سو دوسری آیۃ فرماتے ہیں اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ پس ان دونوں آیتوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کا نزول ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔ رہا یہ شبہ کہ ممکن ہے کہ شب قدر رمضان میں نہ ہو تو اس صورت میں دوسری آیت کا ضم مفید نہ ہوگا سو اس کا جواب یہ کہ اول تو شب قدر کا رمضان میں ہونا حدیث میں موجود ہے اس سے قطع نظر اگر ہم ذرا فہم سے کام لیں ان دونوں آیتوں سے ہی معلوم ہو جاوے گا کہ شب قدر رمضان ہی میں ہے اس لئے کلام مجید کا نزول دو طرح ہوا ہے ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے خود کلام مجید سے ہوتا ہے لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا کہ یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب دفعۃً پوری کی پوری آسمان سے کیوں نہیں دی گئی جس طرح موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ کذلک لنثبت به فوادک جس کا خلاصہ یہ کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعہ سے آپ کے دل کی تثبیت اور اس کو محفوظ کر لینا اور سمجھ لینا آسان ہو جائے۔ واقعی غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جسقدر تثبیت فواد اور ضبط وفہم بتدریج نازل کرنے میں ہو سکتا ہے نزول واقعی میں نہیں ہو سکتا

دفعۃً نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعۃً نازل کیا جائیگا تو یقیناً اس کے احکام امور کلیہ ہوں گے اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے گا سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے باسانی تعلیم ہوجاویگی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر رہ جاوے گا اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاریٰ اور یہود سے ہوئیں اس تفاوت کی ایسی مثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آوے اور اپنی حالت بیان کرکے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا نہ میں وقتاً فوقتاً آکر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کرسکتا ہوں آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخہ مجھے لکھ دیجئے جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جاوے اور مرض میں کمی یا بیشی ہوئیں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں پس اس صورت میں اگرچہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو اور کتنے ہی غور وخوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہوسکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھلاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر وتبدل کمی وبیشی کرالیجاتا ہے اس لئے اگرچہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخے لکھ دیئے لیکن تغیرات تعیین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رائے العلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے ممکن ہے کہ زیادتی صفرا کی ہو اور وہ سودا کا ہیجان سمجھ جائے اور جیسی سنبھالے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جاوے اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ جس قدر عام اور تام قاعدہ جزئی جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر وتبدل کرنے میں ہے امور کلیہ سمجھا دینے میں اسقدر فائدہ نہیں اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید کو جزء اً جزء اً نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا یہاں بظاہر دو شبہ ہوتے ہیں اول یہ کہ جب تدریجی نزول میں اس قدر فائدہ اور دفعی نزول میں اس نقصان کا احتمال ہے تو خدا نے قرآن سے پہلی کتب کو دفعۃً کیوں نازل فرمایا جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا امم سابقہ کے لئے مصالح کی رعایت نہیں کی گئی اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند

روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جس سے تمام جزئیات حل ہو جاتی تھیں اس لئے کتب سابقہ کا دفعۃً نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضر نہیں ہوا دوسرا شبہ یہ ہے کہ باوجود قرآن کے تدریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطائیں اور امم سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے ان سے زیادہ اور مضر غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے جس کو تعیین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعیین مراد کے بعد کی غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعیین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔ اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ بلا تعیین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السّلام کے بیان سے تعیین ہو جاتی تھی سو اول تو انھوں نے اس کی حفاظت نہیں کی دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعیین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا اس میں حکمت تھی توسیع مسالک کی پس وہ رحمت ہوا پس دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا یہ ایک جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ کلام اللہ کا نزول دو طرح کا ہے ایک نزول تو یہ ہے جس کو تدریجی کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس آیت شھر رمضان الذی میں یہ نزول مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صرف رمضان یا لیلۃ القدر میں نہیں ہوا بلکہ ۲۳ برس میں ہوا اور دوسرا وہ نزول ہے جو کہ دفعۃً ہوا ہے اور اس آیت میں بھی مراد ہے اور یہ نزول اس عالم دنیا میں نہیں ہوا جس میں کہ نزول تدریجی ہوا ہے بلکہ یہ نزول عالم غیب میں ہوا ہے یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور یہ دونوں عالم کے جزء ہیں اور اس کے ذی اجزاء ہونے کو بعید نہ سمجھا جاوے اس میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ عالم دنیا اُس سے وہ نسبت رکھتا ہے جو سوئی پر لگا ہوا ایک قطرہ سمندر سے نسبت رکھتا ہے یعنی یہ عالم دنیا اس کے سامنے مثل ایک قطرہ کے ہے اور وہ اس کے اعتبار سے مثل سمندر کے ہے۔ اہل کشف نے لکھا ہے کہ دونوں عالموں میں وہی نسبت ہے جو کہ رحم مادر

اور عالم دنیا میں ہے بچہ اول رحم مادر میں رہتا ہے اور اس کیلئے وہ ایک عالم ہوتا ہے اور اس سے اس قدر مانوس ہوتا ہے اگر شاید وہاں سے اسکی رائے لیکر عالم دنیا میں لایا جاوے تو وہ کبھی گوارا نہ کرے اور محل جاوے لیکن اگر اس کو کسی طرح وہاں سے نکال لیا جاوے جیسا کہ اسی طرح لایا جاتا ہے اور عالم دنیا میں وہ یہاں کی رونق چہل پہل یہاں کی آبادی اور معمورۂ دنیا کو دیکھے تو عالم رحم اس کو بالکل ہیچ اور عدم معلوم ہونے لگے اسی طرح اہل دنیا جو کہ اس عالم میں محبوس اور اسیر ہیں جنھوں نے آنکھ کھولنے کے وقت سے آنکھ بند کرنے تک اس کے سوا اور کسی عالم کو دیکھا ہی نہیں جب ان سے اس عالم کو چھوڑ دینے اور دوسرے عالم میں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں ان کا دل مضطرب ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس عالم کی جدائی کو گوارہ نہیں کرتے ہاں وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عیناً یا ذوقاً علم مکاشفہ دیا ہے اور وہ اس عالم کو مشاہدہ کر چکے ہیں اور ان کو اس کی جدائی کا نہ قلق ہوتا ہے نہ وہ اس سے گھبراتے ہیں بلکہ وہ اس عالم سے انتقال کے متمنی اور آرزومند رہتے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے لوگوں کے مقابلہ میں یہ لوگ زیادہ مقبول اور صاحب کمال ہیں اس واسطے کہ ان کی فضیلت یا تو اشتیاق کی وجہ سے ہوسکتی ہے یا کشف کی وجہ سے سو اشتیاق کیوجہ سے تو اس لئے یہ صاحب فضیلت نہیں کہ صاحب عالم غیب اور اس کے نعم ولذائذ کو دیکھ چکے ہیں پھر اس کی طرف رغبت کرنا اور اس کا مشتاق ہونا کیا کمال کی بات ہے خوشنما باغیچہ کو جو شخص بھی دیکھے گا اس کی سیر کا متمنی ہوگا اور کشف کی وجہ اس لئے صاحب فضیلت نہیں کہ کشف دلیل بزرگی اور مقبولیت کی نہیں اس کی بنا محض مجاہدہ اور کثرت ریاضت پر ہے اکثر ہندو کو بھی ہونے لگتا ہے اور مرنے کے بعد تو سب ہی کو ہوگا۔ البتہ اہل کشف کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت ہے کہ دنیا میں رہ کر جو ذوق ان کو حاصل ہے دوسروں کو نہیں۔ اور کشف کی حقیقت معلوم ہو جانے سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ بعض ناواقف لوگ جو کشف کے درپے ہوتے ہیں اور اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ کشف نہ ہونے کی صورت میں اگر عمل ہو تو وہ زیادہ کمال کی بات ہے چنانچہ خدا وند جل وعلا جائے مدح فرماتے ہیں الذین یومنون بالغیب اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے

فرمایا ای الخلق اعجبھم ایماناً یعنی تمام خلق میں سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے صحابہ نے عرض کیا الملائکۃ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی فرشتوں کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے آپ نے فرمایا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوتی جبکہ ہر وقت کلام و احکام سے مشرف ہوتے ہیں صحابہ نے کہا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا آپ نے فرمایا بھلا وہ کیوں نہ ایمان لاتے ہر وقت تو ان پر وحی نازل ہوتی ہے، صحابہ نے کہا کہ پھر ہمارا آپؐ نے فرمایا کہ تم کیوں ایمان نہ لاتے ہر وقت مجھے دیکھتے ہو مجھ سے سنتے ہو آخر صحابہ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر کون لوگ آپؐ نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آویں گے جنھوں نے نہ مجھ کو دیکھا ہوگا نہ نزول قرآن کی کیفیت دیکھی ہوگی محض چند لکھے ہوئے کاغذ دیکھ کر ایمان لاویں گے ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے مقصود اس سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ مکاشفہ کی نسبت عدم مکاشفہ کی حالت زیادہ افضل اور اسلم ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مطلقاً غیر مکاشفین مکاشفین سے افضل ہیں اگر اہل کشف میں اور فضائل بھی ہوں جیسے انبیاء علیہم السلام تو وہ افضل ہونگے اور اعجب ہونا دوسری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑتے وقت گھبراتے ہیں اور مضطرب ہوتے ہیں جالینوس کے متعلق مشہور ہے کہ جب مرنے لگا تو یہ تمنا کرتا تھا کہ میری قبر میں ایک سوراخ رہے کہ دنیا کی ہوا آتی رہے لیکن غیر مکاشفین اگر اہل ایمان کامل ہیں تو گوان کو طبعاً اس عالم کو چھوڑنا گراں گذرے اور وہ موت سے گھبراویں جیسا حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کلنا یکرہ الموت مگر مرنے کے بعد جب اس عالم کی سیر کریں گے اور اس کو دیکھیں گے اور اس کی وسعت آنکھوں کے سامنے ہوگی تو ان کی وہی حالت جو کہ رحم مادر سے اور عالم دنیا دیکھ کر بچے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے۔

اور عالم دنیا کے سامنے اپنے اس پہلے عالم کو ہیچ بلکہ لاشئے محض سمجھنے لگتا ہے حکیم سنائیؒ اسی کی نسبت فرماتے ہیں۔

آسمانہاست در ولایت جاں ۔۔۔ کارمائے آسمان جہاں

در رہ روح پست و بالا ہست ۔۔۔ کوہ ہائے بلند و صحراہاست

(روح کے ملک میں بہت سے آسمان ہیں جو اس دنیا کے آسمانی کاموں کو چلانے والے ہیں روح راستے میں بھی گڑھے اور ٹیلے ہیں اور بہت سے اونچے پہاڑ اور جنگلات ہیں)

غرض وہ عالم جب ذی اجزاء ہے اور یہ دفعی نزول اسی عالم کے ایک جزء سے دوسرے جزء میں ہوا ہے اور اسی کی نسبت کلام مجید میں ایک جگہ شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن فرمایا اور دوسری جگہ انا انزلناه فی لیلة القدر فرمایا اور مراد دونوں مقام میں نزول دفعی ہے جیسا اوپر معلوم ہوا تو ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے کیونکہ اگر لیلۃ القدر غیر رمضان میں ہو تو کلام مجید کی آیتوں میں تعارض لازم آویگا کہ ایک آیت سے دفعی نزول رمضان میں اور ایک جگہ غیر رمضان میں ثابت ہوگا جو کہ محال ہے اور حدیثوں سے بھی شب قدر کا عشرہ اخیرہ میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پس جب شب قدر میں نزول ہوا تو عشرہ اخیرہ میں نزول ثابت ہوگیا اور یہی مناسب ہے اس آیت کو عشرہ اخیرہ کے ساتھ اور رمضان کی فضیلت کے ساتھ عشرہ اخیرہ کی فضیلت بھی اس آیت سے ثابت ہوگئی اور فضیلت بھی بہت بڑی کہ اس میں قرآن کا نزول ہوا ہے کیونکہ قرآن ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے جس زمانہ میں نازل ہوگا وہ زمانہ بھی ضرور مبارک اور مشرف ہوگا اور اس فضیلت کی قدر کوئی عشاق کے دل سے پوچھے کہ جس زمانہ میں ان کو محبوب کے خط کی زیارت ہوتی ہے وہ زمانہ اُن کے نزدیک کس قدر معزز و مشرف ہوتا ہے قرآن شریف بھی کلام خداوندی ہے اور خدا تعالیٰ محبوب حقیقی ہیں پس وہ زمانہ کہ جس میں محبوب حقیقی کا کلام نازل ہو کیوں مبارک اور مشرف نہ ہوگا مظروف کے شرف سے ظرف کو بھی ضرور شرف ہوا کرتا ہے چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق کای فتا
تو بغربت دیدۂ بس شہرہا

پس کدامی شہر از انہا خوشتر است
گفت آن شہرے کہ در وے دلبر است

(ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا کہ تو نے اپنے سفر میں بہت سے شہر دیکھے ہیں تو ان میں سے کونسا شہر بہتر ہے۔ عاشق نے جواب دیا کہ وہی شہر سب سے بہتر ہے جس میں معشوق موجود ہے)

دیکھو اگر کسی عاشق کو کنوئے کے اندر وصال حبیب ہو تو وہ اس کنوئے کو کنواں نہ سمجھے گا اس کے دل میں اس کنوئے کی عظمت ایک پھولوں سے بھرے چمن سے بھی زیادہ ہوگی اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس زمانہ کو بھی شرف ہے اکثر وہ کسی مظروف ہی کی شرف کی وجہ سے ہے یہی وجہ ہے کہ جمعہ کا دن اور ایام سے افضل ہے کیونکہ اس دن میں ایک ایسا مظروف موجود ہے جو کہ دوسرے ایام میں نہیں اکثر لوگ جمعہ کی فضیلت پر اعتراض کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ کیا وجہ جمعرات کو وہ فضیلت کیوں حاصل نہیں جو جمعہ کو حاصل ہے وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں وہی ایک دن جمعرات میں ہے وہی ایک دن جمعہ میں ہے حالانکہ یہ اعتراض بالکل ہی لغو ہے کیونکہ اشتراک فی الساعات اور تشابہ فی الظاہر ہے اور یہ لازم نہیں آتا کہ جو ایک کی حالت ہو وہی دوسرے کی بھی ہو کیا اگر کسی شخص کی بہن اور بیوی بالکل ہم شکل ہوں اور سامان زینت میں بھی دونوں برابر ہوں تو کیا ان میں حلال وحرام کے فرق ہونے کو خلاف عقل کہا جاوے گا اور کیا یہ شخص دونوں سے برابر برتاؤ کرے گا اور کیا اس شخص کے دل میں دونوں کی محبت ایک قسم کی ہوگی اور جو علاقہ کشش بیوی کے ساتھ ہے وہ بہن کے یا ماں کے ساتھ بھی ہو جاوے گا۔ یہ ضرور ہے کہ محبت ماں اور بہن سے بھی ہوگی لیکن کیا دونوں محبتوں میں فرق عظیم نہ ہوگا ضرور ہوگا بہن اور ماں بھی محبوب ہیں اور بیوی بھی محبوب ہے لیکن دونوں کی محبت بالکل الگ الگ ہے۔ کبھی کسی شخص کو نہیں دیکھا گیا کہ وہ بیوی کی طرح ماں کو بھی پیار کرے یا اس کو بغل میں لینے کی خواہش کرتا ہو بلکہ طبعاً اس قسم کے خیالات سے اس قدر نفرت ہوتی ہے کہ اگر خواب میں بھی اپنی ماں کے ساتھ صحبت کرتے دیکھ لیتا ہے تو بیدار ہو کر بے حد پریشان ہوتا ہے اور اپنے کو لعنت ملامت کرتا ہے حالانکہ تعبیر اس خواب کی بری نہیں۔ تعبیر یہ ہے کہ ایسا شخص متواضع اور منکسر المزاج ہوگا کیونکہ خواب میں معانی اپنے مناسب صورتیں اختیار کرتے اور اس میں متمثل ہوتے ہیں اس قسم کے خواب میں ماں سے مراد زمین ہوتی ہے باعتبار اپنی صفت خاکساری اور صحبت سے مراد تلبس۔ پس یہ اشارہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو صفت خاکساری سے تلبس اور تعلق ہوگا۔

ایک بزرگ سے کسی نے یہی خواب بیان کیا انھوں نے یہی تعبیر دی اگر کسی جاہل سے ایسا خواب بیان کیا جائے معلوم نہیں کیا تعبیر دے۔ اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہوتا ہے لا تحدث الا لبیبًا او حبیبًا یعنی جاہل آدمی سے اپنا خواب نہ بیان کرو بلکہ کسی عقلمند یا دوست سے بیان کرو کیونکہ عقلمند آدمی تم کو واقعی تعبیر سمجھ کر بتلا دے گا اور تمہارا دوست اگر نہ بھی جانتا ہوگا تو خاموش ہو رہے گا گڑبڑ نہ بتلا دیگا بخلاف اجنبی بیوقوف یا دشمن کے کہ وہ خدا جانے کیا بتلا دے مولانا فضل الرحمن صاحب نے ایک بار یہ مقولہ نقل فرمایا۔ تا آنکہ با مادر خود جفت نشود برادر خود را نکشد عارف نشود۔ کسی نے کہا کہ حضرت جزء اول تو میں نے بھی دیکھا ہے دوسرا جزء البتہ نہیں دیکھا فرمایا بس اتنی ہی تو کسر ہے مراد جزء ثانی سے نفس کا مغلوب ہوجانا ہے بس باوجود اس کے کہ اس قسم کے خواب کی تعبیر ایسی حسین ہے لیکن اگر کوئی ایسا خواب دیکھتا ہے تو بہت پریشان اور تنگ دل ہوتا ہے اور بیداری میں تو کیا پوچھنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری نوع کی ہے اور بیوی کیساتھ جو محبت ہے وہ دوسری قسم کی ہے دونوں محبتیں یکساں نہیں اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ احادیث محبت میں جو بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سب سے زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے دوسری سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تیسری سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا واقع میں ان میں تعارض اور اختلاف کچھ نہیں ہے سب حدیثیں مختلف درجات محبت کے اعتبار سے صحیح ہیں کیونکہ جس حدیث سے حضرت عائشہ کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ازواج مطہرات میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور جس حدیث سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا زیادہ محبوب ہونا پایا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحبزادیوں میں اور جس حدیث سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اصحاب واحباب میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔

الغرض اشتراک فی الساعات تساوی کل الوجوہ کو موجب نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایک میں دوسرے پر فضیلت بالذات ہو بالخصوص جبکہ ازدیاد برکت کی کوئی دوسری وجہ بھی

موجود ہو جو حاصل ہے فضیلت لغیرہ کا جیسا ہم نے بیان کیا کہ ظرف کا شرف مظروف کے شرف سے ہوتا ہے اور اس کی تفصیل یوں سمجھنا چاہیئے۔

کہ وہ مظروف جس کی وجہ سے ظرف کو شرف ہوا ہے یا تو خداوند جل وعلا کا کوئی فعل ہوگا یا بندے کا کوئی فعل ہوگا پس اگر خدا تعالیٰ کا فعل ہے تو چونکہ افعال خداوندی میں بعض نافع ہیں اور بعض انفع اس لئے اس تفاوت کی وجہ سے ان ازمنہ میں بھی تفاوت ہوگا جن میں یہ افعال پائے جاویں مثلاً توراۃ کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے اور وہ بھی نافع ہے اور قرآن کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے مگر یہ بوجہ انفعیت قرآن کے انفع ہے پس زمانۂ نزول توراۃ اور زمانۂ نزول قرآن میں اسی درجہ کا تفاوت ہوگا جو کہ تنزیل قرآن اور تنزیل توراۃ میں ہے اور اگر وہ فعل بندہ کا ہے تو اس میں بھی یہی حالت ہے کیونکہ فعل عبد یا عبادت ہے یا معصیت ہے اور ہر ایک میں نافع ہیں وانفع وضار واضر موجود ہیں پس جس طرح کا فعل جس زمانہ میں ہوگا اسی طرح کی صفت زمانہ کے لئے ثابت ہوگی اگر کسی نافع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اسی قسم کی برکت آ جاویگی اور کسی انفع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اس قسم کی برکت حاصل ہوگی علیٰ ہذا کسی خفیف گناہ کا صدور ہوا تو زمانۂ صدور اس کے لئے بُرا زمانہ ہے اور اگر کسی بڑی معصیت کا صدور ہوا تو زمانۂ صدور اس کے لئے بہت بُرا زمانہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آثار کا تفاوت اول اعمال کے لئے ثابت ہوتا ہے اس کے بعد اور اس کے واسطہ سے زمانہ کے لئے۔ پس چونکہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا اور وہ مشرف ومعظم ہے اس کے شرف کی وجہ سے زمانہ نزول یعنی رمضان بھی ضرور مشرف ہوگا۔ صاحبو کیا مجازی محبوب کی گفتگو اور خط ملنے کا وقت تو پیارا اور عزیز ہو اور محبوب حقیقی کے کلام نازل ہونے کا وقت مشرف وممتاز نہ ہو قطع نظر اس کے کہ خدا کا کلام ہے اور اس کو انتساب ایک ذات عظیمہ کے ساتھ ہے۔

یہ بھی دیکھو کہ اس آفتاب کے نور نے تمہارے قلوب کو کیا روشنی بخشی ہے اور تم کو کس ضغطہ کی حالت سے نکالا ہے تمہارے اعتبار سے کیا نافع ہوا ہے ورنہ اگر اس کلام الٰہی کو صرف حق تعالیٰ ہی سے تعلق رہتا تم سے تعلق نہ ہوتا تو تم اس سے کیسے مستفید ہوتے۔ غور کرو اگر آفتاب دنیا چند روز تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جاوے اور تم اُس زمانہ میں بیمار بھی ہو

ہو یا مثلاً ایک ماہ تک لگا تار بارش رہے اور گھڑی بھر کو بھی بادل نہ ہٹے تو تمہاری کیا حالت ہو گی۔ آخر یہ اس قدر پریشانی کیوں ہے محض اس وجہ سے کہ خدا نے تم کو ایک نور دیا تھا جو برائے چندے تم سے لے لیا گیا ہے اور پھر خدا کا فضل دیکھو کہ نور بھی کس چیز سے دیا جو کہ تم سے لاکھوں کوس دور مگر اس کی شعاعیں ہیں کہ تم کو منور کر رہی ہیں اور تم طرح طرح کے فائدے اس سے حاصل کر رہے ہو اور اگر شعاعیں نہ ہوتیں تو گو نور آفتاب کے ساتھ پھر بھی تعلق ہوتا مگر چونکہ تم تک نہ پہنچتا اس لئے تم اس کے فیض سے محروم رہتے۔ اسی طرح کلام اللہ صفت قدیم ہے کہ وہ مثل آفتاب کے ہے اور اس کے لئے کچھ شعاعیں ہیں جو تم پر فائض ہو رہی ہیں جن کو کلام لفظی کہا جاتا ہے۔ صاحبو اگر آفتاب ہوتا اور یہ شعاعیں نہ ہوتیں تو ہم اس کے فیض سے کس طرح فیضیاب ہوتے۔ علیٰ ہذا کلام نفی کے لئے کلام لفظی کی شعاعیں نہ ہوتیں تو ہم اس صفت کی فیضان سے کس طرح فیض حاصل کرتے اور چونکہ کلام اللہ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص تعلق ہے یہ ہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کلام مجید کی تلاوت سے بہت خوش ہوتے ہیں خواہ سمجھ کر پڑھا جائے یا بے سمجھے پڑھا جائے بخلاف دوسرے اعمال لسانیہ مثل دعاؤں ذکر کے کہ اگر ان کو بے سمجھے کرو تو اس درجہ معتد بہ محبوب نہیں مگر قرآن ہر طرح مقبول ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحؒ کی حکایت ہے کہ انھوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ کیا ہے ارشاد ہوا قراۃ القرآن یعنی قرآن پڑھنا امام صاحب نے عرض کیا بفہم اور بلا فہم یعنے سمجھ کر یا بلا سمجھے ارشاد ہوا بفہم اور بلا فہم یعنے کسی طرح ہو اور کچھ مدار اس کا خواب ہی پر نہیں بلکہ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں ظاہر ہے کہ حروف صرف الفاظ ہیں ان کی تلاوت بلا فہم پر بھی تلاوت صادق آتا ہے معلوم ہوا کہ بلا فہم بھی قبول تام ہے گو بفہم پر اتم ہوتا ہے۔

اس تقریر سے آجکل کے روشن خیالوں کی غلطی بھی ظاہر ہو گئی ہو گی اکثر حضرات یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب کلام اللہ کو سمجھا نہیں جاتا تو اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ سو ان کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ کلام مجید کا بے سمجھے پڑھنا بھی پورا فائدہ رکھتا ہے۔

کیونکہ تلاوت قرآن میں صرف ایک یہ بھی فائدہ نہیں کہ ہم اس کے معنی کو سمجھیں بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہم سے خدا تعالیٰ راضی ہوں جیسا بیان ہوا۔

اور یہ بات عقل اور عادت کے موافق بھی ہے دیکھو قاعدہ ہے کہ اگر مصنف کسی کو اپنی کوئی کتاب پڑھتے دیکھے تو اگرچہ اس کو یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ شخص بے سمجھے پڑھ رہا ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے کلام پر توجہ کی اور اس کی قدر کی مصنف پڑھنے والے سے ضرور محبت ہو جاوے گی اور دل میں اس کے قدر ہو گی۔ حضرت مرشدنا حاجی امداداللہ صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک بار دہلی بازار میں جاتا تھا ایک دکان پر ایک مجمع دیکھا کہ اس کے درمیان میں ایک شخص رسالہ دردنامہ غمناک نہایت شوق سے پڑھ رہا تھا کوئی عاشق مزاج معلوم ہوتا تھا حضرت صاحب بھی اس مجمع میں کھڑے سُن رہے تھے اور طبعاً خوش ہو رہے تھے کہ میرا کلام پڑھ رہا ہے اس شخص کو گو خبر نہ تھی مگر مصنف پاس تھے اور خوش تھے۔ اسی طرح ایک بار پانی پت تشریف لے جاتے تھے راہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ یہ رسالہ پڑھتا جاتا ہے اور یہ رسالہ دردنامہ غمناک اگرچہ شاعری کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کا رسالہ نہیں ہے لیکن چونکہ درد دل سے نکلا ہے اس لئے نہایت اثر رکھتا ہے واقعی از دل خیزد و بر دل ریزد غالب کے زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ آشفتہ کے اس شعر پر ؎

حال آشفتہ چہ دانی بے خبر ❖ در خیال زلف عنبر بوئے تو

(بے خبر شخص آشفتہ کے حال کو کیا جان سکتا ہے وہ تو عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں مست ہے)

آشفتہ کے استاد نے جب یہ اصلاح دی ؎

حال آشفتہ پریشان تر شدہ ❖ در خیال زلف عنبر بوئے تو

(تیری عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں پریشان شخص کی حالت اور بہت زیادہ پریشان ہو گئی ہے)

اور غالب کو دونوں شعر پہنچے تو سن کر کہنے لگا کہ اوستاد صاحب قال ہے اور شاگرد صاحب حال ہے واقعی جب دل سے کوئی کلام نکلتا ہے اور دل میں درد ہوتا ہے تو جیسی بھی کلام بھی وہ مزہ دے جاتا ہے کہ ہزار چست بندشیں وہ مزہ نہیں دیتی۔ مولانا روم اپنے

اس شعر میں اسی درد دل اور استغراق کو ظاہر فرما کر قافیہ وغیرہ پر اعتراض کرنیوالوں سے عذر فرما رہے ہیں۔

۵ قافیہ اندیشم و دلدار من ❊ گویدم مندیش جز دیدار من

(میں شعر کیلئے قافیہ سوچنے لگتا ہوں تو میرا معشوق مجھ سے کہتا ہے تو سوائے میرے دیدار کے کسی اور چیز کی طرف خیال مت کر)

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مجھ سے کسی مقام پر شاعرانہ فروگذاشت ہوگئی تو وہ قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ نکات پر نظر رکھنا توجہ الی الشعر پر موقوف ہے اور یہاں دیدار سے اتنی فرصت کہاں کہ اس فضول دھندوں میں وقت ضائع کریں۔

صاحبو! اس تقریر میں غور کرو گے تو معلوم ہو جاوے گا کہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ملکۂ شاعری نہ دینے کی ایک یہ بھی وجہ تھی بھلا غیرت خداوندی کیونکر جائز رکھتے کہ اُن کا محبوب و محب اس کی طرف سے التفات ہٹا کر دوسری چیز پر ملتفت ہوا اور یہی بھید ہے کہ اکثر محققین صوفیہ نے مریدوں پر متعارف توجہ دینے کے طریق کو بالکل ترک فرما دیا وجہ یہی ہے کہ اس طریق توجہ میں مریدین کے اندر کسی کیفیت کے بقا رکھنے کے لئے اس قدر استغراق کرنا شرط تصرف ہے کہ بجز اس مقید القار کے کسی طرف التفات نہ ہوا اور تمام تر خیالات سے بالکل خالی ہو جاوے حتیٰ کہ واقعی اس وقت حق تعالیٰ کی طرف بھی توجہ کم ہو جاتی ہے سو اس قدر توجہ مستغرق خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے ان کو غیرت آتی ہے اور ان پر سخت گراں گذرتا ہے کہ یہ شخص خدا سے بالکل غائب ہو جاوے اور فرمایا کہ ایک ضرر شیخ کو توجہ متعارف میں یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصرفات دیکھ کر چند روز میں عجب پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ اس متعارف طریق توجہ سے شہرت ہو جاتی ہے اور جس شہرت کے اسباب مقدور الترک ہوں وہ اکثر مضر ہوتی ہے تیسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ شیخ اگر ضعیف القویٰ ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے یہ تین ضرر شیخ کو ہوتے ہیں اور مرید کو یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ شیخ پر اتکال کر لیتا ہے اور خود کچھ نہیں کرتا اس لئے اس کی نسبت محض انعکاسی ہوتی ہے اکتسابی نہیں ہوتی اور نسبت انعکاسی کو قیام نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ توجہ تو خود حدیث سے ثابت ہے چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ غطنی فبلغ منی الجھد سو اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ اس غط کو توجہ کہنا محض بے دلیل ہے اس کا حاصل صرف

الصاق بالصدر مع شدۃ ہے نہ کہ توجہ متعارف اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بوجہ قوت ملکی توجہ میں اس قدر استغراق کی ضرورت نہ ہوئی ہو جو توجہ الی الحق کو مانع ہو۔ وذالک لایضر۔ اگر کہا جاوے کہ ممکن ہے کہ منفعل کی تفاوت استعداد سے کسی وقت کمال استغراق کی ضرورت نہ ہو۔ تو جواب یہ ہے کہ فاعل کو تو ہر صورت میں کمال استغراق کی ضرورت ہوگی البتہ تفاوت استعداد سے منفعل میں فرق ہوگا کہ تام الاستعداد بسہولت اور جلد متاثر ہوگا اور ناقص الاستعداد بدیر متاثر ہوگا۔

ہاں دو صورتیں فیض رسانی کی اور ہیں ایک تو ان کے اختیار سے بھی خارج ہے وہ یہ کہ ان کی ذات بابرکت کے فیوض برکات سے کہ اُن کو اس طرف التفات بھی نہیں عالم مستفیض ہوتا ہے جس طرح بارش کہ اس کے برسنے سے ہر قابل حصہ زمین میں قوت نمو پیدا ہو جاتی ہے خواہ بارش چاہے یا نہ چاہے یا آفتاب کہ اُس کے طلوع کے وقت جو چیز اس کے مقابل ہوگی ضرور منور ہوگی دوسری اختیاری ہے جیسے مریدین کے لئے دعا کرنا ان کی حال کی نگرانی کرنا شفقت سے نصیحت کرنا اس کو بھی توجہ بالمعنی اللغوی کہا جاتا ہے مگر اصطلاحی توجہ بمعنی تصرف نہیں سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ مسنون ہے کیونکہ طریق توجہ کے ترک کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں ذات باری سے غیبت ہے اور چونکہ اس دوسرے طریق میں ترک التفات الی اللہ نہیں بلکہ زیادت التفات الی اللہ ہے اس لئے یہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے اور گو اس وقت توجہ الی الخلق بھی ہوتی ہے مگر وہ توجہ صارف عن التوجہ الی الخلق نہیں ہے بلکہ دعا کی تو حقیقت ہی توجہ الی الخالق ہے گو لنفع الخلق ہی اور یہ نفع بھی خاص مرضی حق ہے اور نگرانی و نصیحت و تعلیم وغیرہ میں بھی اعتدال توجہ الی الخلق غیر عن الحق ہے۔ اور وہ بھی باذن الخالق ہے تو ہے انہماک فی الخلق و غیب عن الحق نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جس میں خدا تعالیٰ سے غیبت ہے دوسرے وہ کہ اس میں احداث التفات الی الخلق ہو پہلی قسم اکملاء کے یہاں متروک ہے دوسری قسم مطلوب و محمود ہے البتہ پہلی قسم کی توجہ سے اگر اپنے تصرف اور بزرگی کا اظہار مقصود نہ ہو بلکہ محض افادۂ خلق مقصود ہو تو وہ جائز ضرور ہے گو اکملاء نے اس کو ایک باریک وجہ سے چھوڑ دیا اور

اگر اس سے اپنے تصرف کا اظہار یا زیادت جاہ مقصود ہو تو مذموم ہے پس اس کا وہی مرتبہ ہے جو غلام پہلوان اور رنجیت سنگھ کی کشتی کا جس درجہ میں یہ کشتی محمود مذموم ہے بالکل اسی درجہ میں یہ توجہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ توجہ مروج فی نفسہ کوئی مطلوب و محبوب چیز نہیں ہے لیکن اگر اس کی غایۃ محمود ہو تو اس میں بالعرض مطلوبیۃ کی شان پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ورزش کہ اگر اس سے غرض محض اظہار قوت وصولت ہے تو لغو ہے اور اگر اعانۃ مخلوق اس کی غرض ہے تو محمود ہے پس یہ توجہ ایک مرتبہ میں طاعت ہے لیکن اس سے زیادہ درجہ میں وہ توجہ ہے جو کہ انبیاء اپنے اصحاب و امت پر فرماتے تھے یہی انبیاء کا طریق توجہ ہے جس کو کاملین نے اختیار کیا ہے کہ اس میں وہ خطرہ نہیں ہے جو کہ مروج طریق میں ہے اور وہ توجہ ہے خلق کی طرف جو کہ سالک کے لئے نہایت مضر ہے حتیٰ کہ ابتداء میں مطلق افادہ کے ارادہ سے بھی توجہ کرنا مضر ہوا ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت مشہور ہے کہ اپنے ایک مرید کو مدت تک ذکر شغل بتلاتے رہے اور اس میں تغیر و تبدل بھی کرتے رہے لیکن مرید کو کچھ نفع نہ ہوا آخر مدت کے بعد اس سے یہ پوچھا کہ تم یہ ذکر و شغل کس نیت سے کرتے ہو اس نے کہا کہ حضرت یہ ہی نیت ہے کہ اگر کسی قابل ہو جاؤں گا تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے کہا توبہ کرو یہ شرک ہے کہ ابھی سے بڑے بننے کا خیال ہے اور خلق مقصود بالنظر ہے۔ جب اس نے اس خیال سے توبہ کی فوراً فائدہ محسوس ہوا۔ گویا افادہ کی غرض سے بھی جو کہ بظاہر محمود ہے خلق کی طرف توجہ کرنا ابتداء سلوک میں مضر ہوتا ہے۔ اور اس حکایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ کامل کبھی مایوس نہیں ہوتا نہ مرید کو مایوس کرتا ہے جیسا یہ شیخ مدت تک تغیر و تبدل کرتے رہے اور نفع نہ ہونے سے جواب نہیں دیا بلکہ اس کاوش میں رہے حتیٰ کہ مرض اور اس کا علاج نکال ہی لیا وہ طبیب حاذق کی طرح کسی نہ کسی ادھیڑ بن میں برابر لگا ہی رہتا ہے برخلاف ظاہر اور ناقص پیروں کے وہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں اور دوسرے کو بھی مایوس کر دیتے ہیں اسی پر حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بندہ پیر خرا باتم کہ لطفش دائم است ⁂ زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست گاہ نیست

(میں میکدہ کے مالک کا غلام ہوں کہ اس کی ہمیشہ مہربانی رہتی ہے جبکہ ناقص شیخ اور پابند شریعت زاہد خشک کی مہربانی کبھی کبھی رہتی ہے)

مصرع ثانی میں شیخ سے مراد شیخ ناقص ہے بلکہ اگر کشف سے کبھی کسی کی شقاوت ظاہر ہو جاوے تب بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ دعا تبدل بالسعادہ کی کرتے ہیں البتہ اگر کسی نبی کو وحی سے کسی کا ختم علی الکفر معلوم ہو جاوے تو اس وقت مایوس ہونا وہ خدا ہی کے حکم سے ہے نیز اسی حکایت سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ ہر شخص منصب ہدایت کی لیاقت نہیں رکھتا بہت سے نام کے ایسے ہادی ہیں کہ جن کی غرض ہدایت سے محض طلب جاہ ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لایقص الا امیر او مامور او مختال یعنی وعظ کہنے کی ہمت وہی کرے گا کہ یا تو خود امیر المومنین ہے یا امیر المومنین کی طرف سے مامور ہے یا متکبر اور نفس پرور ہے اس لئے کہ جب کہ ہدایۃ عامہ کا کام امیر المومنین کی ذمہ داری میں ہے تو اس کو وہ خود کرے گا یا خود نہ کرے گا تو کسی کو اس خدمت پر مامور کرے گا پس جو شخص نہ یہ ہے نہ وہ ہے اور پھر بھی ایسا کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ بھی خواہمخواہ اپنے کو پانچویں سواروں میں گنتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب بغیر امیر یا مامور ہووے وعظ کہنا مختال ہونے کی علامت ہے تو آجکل کے تمام وعاظ میں سے تو ایک شخص بھی امیر یا مامور نہیں تو کیا یہ سب کے سب حدیث کی تیسری شق میں داخل ہیں۔ جواب یہ ہے کہ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس جگہ حاکم نہ ہو وہاں اگر متقی پرہیزگار اہل الرائے مسلمان کسی ایک شخص کو کوئی منصب دیدیں تو وہ سب ملکر امیر کے قائم مقام سمجھے جاویں گے اور انکا اعطار امیر ہی کا اعطا ہوگا۔ کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اعطار مناصب کا اختیار جو امام کو ہے وہ درحقیقت اہل اسلام ہی کو ہے۔ اور امام بحیثیت ان کا نائب ہونے کے ان کا کام کرتا ہے کیونکہ امام کا امام ہونا تو خود اہل اسلام کے اتفاق پر ہے پس اگر وہ موجود نہ ہو تو خود ان کا فعل ضرور جائز ہوگا جیسے جمعہ کی نماز کے لئے انتخاب امام کا کہ اگر امیر موجود نہ ہو اور مسلمان مل کر کسی کو منتخب کر لیں تو وہ امام صحیح ہو جاتا ہے یا ناظر

وقف کو امام کی عدم موجودگی میں اہل اسلام کے انتخاب سے کسی خاص شخص کو عہدۂ نظارت وقف دیا جاسکتا ہے پس جب دیندار فہیم مسلمانوں نے مل کر ایک شخص کو وعظ و نصیحت کے لئے انتخاب کرلیا ہو خواہ قولاً یا حالاً تو ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز ہے باقی بدوں اہل دین اور اہل عقل کے انتخاب کے جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں اور اہل نہیں ہیں وہ وعظ کے رنگ میں گمراہی پھیلا رہے ہیں ضروری مسائل تک سے ان کو واقفیت نہیں ہوتی اور وعظ کہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔

سہارنپور میں ایک جاہل دیہاتی نے آکر وعظ کہا انداز یہ کہ آپ نے قبل از نماز پوچھا کہ یہاں اُواج تو نہیں ہوتی معلوم ہوا کہ نہیں پس نماز کے بعد پکارا کہ ساہبو (صاحبو) اُواج (واعظ) ہوگی سنتیں پڑھ کر وعظ کہنے بیٹھے اعوذ بسم اللہ غلط سلط پڑھ کر یٰسین کی شروع کی آئتیں الٹی سیدھی پڑھ کر ترجمہ کیا خوبصورت ہوا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تجھ کو پیدا نہ کرتا نہ زمین پیدا کرتا نہ آسمان نہ عرش و کرسی وغیرہ وغیرہ پھر فرماتے ہیں۔ بھائیو تھکے ماندہ ہیں اس واسطے آدھی اُواج اب ہوئی آدھی پھر ہوگی۔ کوئی نابینا ذی علم اس مجلس میں موجود تھے انھوں نے واعظ صاحب کو اپنے پاس بلا کر بٹھلایا اور پوچھا آپ کی تسئیل (تحصیل) کہاں تک ہے فرماتے ہیں ہماری تسئیل ہے ہا پڑ (ہماری تحصیل ہے ہاپڑ) بس ایسے واعظ رہ گئے ہیں لیکن اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ گو لغو ہیں اور اپنی اور دوسروں کی تضیع اوقات کرتے ہیں مگر پھر بھی ان بیچاروں سے اس قدر نقصان نہیں اور اتنی گمراہی نہیں پھیلتی جتنے وہ لوگ پھیلاتے ہیں کہ آب و تاب کی تقریریں مشق کئے ہوئے ہیں بڑے بڑے الفاظ یاد ہیں صوفیہ کی اصطلاحات از بر ہیں حافظ کا دیوان پیش نظر ہے زبان ہے کہ آب رواں کی طرح بہتی چلی جاتی ہے لیکن واقفیت اور حقیقت دیکھو تو محض ہیچ یہی لوگ ہیں کہ ان سے امت کے اکثر افراد تباہ ہوتے اور ہو رہے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

حرف درویشان بدزد مرد وزن ::: تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(درویشوں کی باتیں چور دوں اور کمینہ ٹولیوں کے سامنے ایسی ہیں جیسے جاہلوں کے سامنے عملیات کا پڑھنا)

اور یہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں اور مختال کے لفظ سے فرمایا گیا ہے غرض اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ وعظ طاعت ہے لیکن اگر اس میں نیت خراب ہو تو وہی گناہ ہو جاتا ہے۔ صوفیہ نے اسی راز کو سمجھ کر ابتداء سلوک میں وعظ گوئی سے بالکل منع فرمایا کہ قبل اصلاح نفس اس میں اغراض فاسدہ غالب ہوتے ہیں پس معلوم ہوا کہ ہر شخص اہلیت ارشاد کی نہیں رکھتا سو شیخ ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے دیکھو محقق شیخ کی وہ شان ہوا کرتی ہے جو اوپر کی حکایت میں مذکور ہوئی کہ کس دقیق مرض کو مرید کے سمجھ لیا جس کی نیت ذکر و شغل سے بڑا بننا اور خلق کو مطمح نظر بنانا تھا پس اسی طرح تو اگرچہ طاعت ہو لیکن وہ کاملین کے لئے طاعت نہیں کیونکہ اس میں مخلوق کی طرف کامل توجہ لازمی اور ان کے حق میں غیر اللہ کی طرف التفات کرنا سخت گناہ ہے ؎

بہ ہر چہ از دوست دامانی چہ کفر آں حرف چہ ایماں ✿ بہ ہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(جب تجھ کو دوست سے دور رہتا ہو تو پھر کفر و ایماں برابر ہے جب یار سے دور پڑا پھر چاہے اچھا نقشہ ہو یا بُرا)

خلاصہ یہ ہے کہ نفس توجہ اگرچہ زیبا ہو لیکن جب کہ اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً زشت ہے اسی طرح تصور شیخ کا شغل بھی محققین نے اکثروں کو بتلانا بالکل ترک کر دیا ہے سبب یہی ہے کہ تصور شیخ میں مرید کی پوری توجہ شیخ کی طرف ہوتی ہے۔ ذات باری کی طرف بالکل التفات نہیں ہوتا اور یہ غیبت کاملین کے ہاں جرم ہے خوب کہا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نہ باشی ✿ شاید کہ نگاہِ کند آگاہ نباشی

(اس بادشاہ سے ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی غافل نہ رہنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ وہ متوجہ ہو اور تجھے خبر ہی نہ ہو)

ممکن ہے کہ جس وقت یہ شخص پیر کے تصور میں مصروف ہے وہی وقت ادھر کی طرف کی توجہ کے نافع ہونے کا ہو اسی کے جرم ہونے کو کہا گیا ہے ؎

ہر آن کو غافل از حق یک زماں است ✿ دراں دم کافر است اما نہان است

(جو شخص تھوڑی دیر کے لئے بھی حق تعالیٰ سے غافل ہے اتنی دیر کے لئے کافر ہے اگرچہ ظاہر نہیں ہے)

کفر سے مراد فقہی کفر نہیں اصطلاحی کفر ہے اس لئے کاملین کی طبیعت اوچھٹتی ہے اور ان کو سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اوجھڑی کہ اس کو حلال

تو ضرور کہیں گے اگر غلیظ سے صاف ہو لیکن ایک لطیف المزاج آدمی سے پوچھو کہ اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے اور صاحبو اصل تو یہ ہے کہ جب ایک دل میں دو خیال نہیں آ سکتے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں پھر کیونکر کہا جاوے کہ جو توجہ کہ اس میں خدا کا خیال ضعیف اور مخلوق کا خیال غالب ہو پھر اس کو قصداً پیدا کیا جائے وہ مطلوب ہوگی۔

حضرت ابراہیم ادہمؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب بیٹے سے جو شیخ محمود کے نام سے مشہور ہیں ملے اور مسرت کا جوش غالب ہوا تو ندا آئی کہ ؎

حُب حق ہو دل میں یا حُبِ پسر ؞ جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

آخر وہ حجاب بھی مرتفع ہوگیا اور ان کا انتقال ہوگیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بیٹے سے بالکل ہی محبت نہ کرے جس قدر اس کا حق شرعی ہے وہ جب حق پر غالب نہ ہو عین سنت ہے۔ پس شیخ سے بھی ایسی محبت نہ ہونی چاہیئے جو کہ خدا کو بالکل بھلا دے۔ جیسا آجکل جاہل فرقوں میں متعارف ہے اسی طرح بیوی بچوں سے ایسی محبت نہ ہو کہ خدا کی طرف توجہ نہ رہے لاتلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکراللہ الطاف خداوندی کے قربان ہو جیئے یہ حکم نہیں فرمایا کہ اولاد سے بالکل محبت نہ کرو کیونکہ جانتے ہیں کہ محبت اولاد طبعی ہے امتثال ہو نہ سکے گا۔ اس لئے یوں فرماتے ہیں کہ اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ خدا کو بھول ہی جاؤ ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ توجہ تو اس قدر مذموم ٹھہری اور جو غرض توجہ کی ہے وہ ضروری پس اگر توجہ ترک کریں تو امر ضروری کا ترک لازم آتا ہے اور توجہ اختیار یں تو امر مذموم کا اختیار لازم آتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ توجہ سے جو غرض ہے اس کا حصول توجہ ہی میں منحصر نہیں کیونکہ اگر اس کا حصول اسی میں منحصر ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اسی طریق کو اختیار فرماتے جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسی طریق میں اس کا انحصار نہیں ہے۔ بلکہ دوسرا طریق بھی موجود ہے یعنی تعلیم وارشاد شفقت ودعا اور یہ طریق ایسا ہے جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ کوئی اندیشہ۔ بات کہیں کی کہیں جا پڑی جو رسالہ دردنامہ غمناک کی نوعیت شعریہ کے سلسلہ میں پڑھی گئی

یں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر مصنف کے سامنے اس کے کلام کو بے سمجھے بھی کوئی شخص محبت اور ذوق شوق سے پڑھے تو اس کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس شخص کو رسالہ دردنامہ غمناک پڑھتے سُنا تو آپ بہت خوش ہوئے اسی طرح کلام خداوندی کو جب ہم پڑھیں گے اور خدا تعالیٰ سنیں گے کیونکہ خدا سے تو کوئی چیز غائب ہی نہیں۔ ما یکون من نجوی ثلثة الا ھو رابعھم ولا خمسة الا ھو سادسھم اور ما تکون فی شان وما تتلوا منه من قران ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شھودا اذ تفیضون فیه وما یعزب عن ربک من مثقال ذرة فی السموات ولا فی الارض الخ کہ خدا سے کوئی چیز بھی آسمان اور زمین کی اوجھل نہیں ہو سکتی تو خدا تعالیٰ ضرور خوش ہوں گے اور متوجہ ہوں گے حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ کسی طاعت پر اتنا متوجہ نہیں ہوتے جتنا قراۃ قرآن پر متوجہ ہوتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ اس وقت سب لوگ سمجھ ہی کر پڑھتے تھے اس لئے اس وقت کی حالت پر یہ ارشاد ہوا ہے اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اگر بے سمجھے پڑھے تب بھی توجہ ہوگی سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن صرف عرب ہی کے لئے نازل نہیں کیا گیا اور ساری دنیا کی زبان عربی ہے نہیں اور حدیث بشارۃ میں عرب کی تخصیص نہیں فرمائی گئی اس کے علاوہ حدیث میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ سات آٹھ آدمی تلاوت قرآن کر رہے تھے ان میں کچھ عربی تھے اور کچھ عجمی تھے جن سے اچھی طرح پڑھتے بھی نہ بنتا تھا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور سن کر ارشاد فرمایا کہ اقراء فکل حسن اور اس کی دلیل کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے کہ ان سے پڑھتے نہ بنتا تھا لفظ حدیث ہیں کیونکہ سب اچھی طرح پڑھتے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ارشاد کی ضرورت نہ تھی فکل حسن معلوم ہوا کہ کچھ لوگ پوری طور پر قادر نہ تھے بس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو حسن فرمایا تو معلوم ہوا کہ حسن ہونے کے لئے بالکل عرب کے موافق ہو جانا ضرور نہیں بلکہ کچھ کوتاہی بھی رہے جب بھی فضیلت حاصل ہے اور لفظی اور معنی کوتاہی میں کوئی معتدبہ تفاوت نہیں یہ تو حدیث تھی اور لیجئے کشف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کی حکایت پہلے مذکور ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا

اور عرض کیا کہ سب سے زیادہ کون سی طاعت سے آپ خوش ہوتے ہیں وہاں سے ارشاد ہوا کہ قرآن پڑھنے سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ سمجھ کر پڑھنے سے یا بلا سمجھ بھی ارشاد ہوا بفہم اور بغیر فہم پس معلوم ہوا کہ قرآن شریف خواہ کسی طرح پڑھا جاوے وہ ضرور مفید ہے خواہ سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے ہو اور اس کے پڑھنے سے خدا ہم سے ضرور خوش ہوں گے یعنی ہم کو ثواب و انعام و اکرام ہوگا کیونکہ خدا کی خوشی کے یہ معنی نہیں جو ہماری تمہاری خوشی کے معنی ہیں کہ ایک بات جی کے موافق ہوئی طبیعت باغ باغ ہوگئی جس کی حقیقت انفعال ہے خداوند جل وعلا طبیعت اور انفعال سے بالکل پاک ہے اس پر صفات کا اطلاق غایت کے اعتبار صحیح سے ہوتا ہے مبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتا بہرحال قرآن کی تلاوت میں آپ نے سُنا کہ کیا اجر عظیم ہے افسوس ہے کہ اس اجر عظیم کو چھوڑ کر ہوا و ہوس کے بندوں نے کلام اللہ کو جو کہ رضا خداوندی کا ذریعہ تھا دنیا طلبی کا ذریعہ بنالیا ہے کہ روپیہ لے کر اور مقرر کر کے قرآن سُناتے ہیں یہ صریح دین فروشی ہے لیکن تعلیم قرآن کو اس پر قیاس نہ کیا جاوے کیونکہ تعلیم قرآن پر تنخواہ لینا جائز ہے اور اس جواز کے حنفیہ کے یہاں دو طریق ہیں ایک تو یہ کہ امام شافعیؒ نے جائز کہا ہے اور حنفیہ نے بوجہ ضرورت کے اس پر فتوے دیا ہے۔ لیکن یہ طریق بالکل کمزور ہے ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ابو حنیفہؒ کی تقلید کا التزام کر کے بلا وجہ امام شافعیؒ کے مذہب پر عمل کریں دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہا جاوے کہ خود حنفیہ کا قاعدہ ہے کہ محبوس کا نفقہ من لہ الحبس پر ہوتا ہے۔ پس جب یہ شخص خدمت دین میں محبوس ہے اس کا نفقہ اہل اسلام پر واجب ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی قسم کی خدمتِ دینیہ میں مشغول ہو سب کا یہی حکم ہے بعض مسلمانوں کا دے دینا بطور فرض کفایہ کے سب کو سبکدوش کر دے گا رہا یہ شبہ کہ اگر یہ بحیثیت نفقہ کے دیا جاتا ہے تو تنخواہیں کیوں مقرر کی جاتی ہیں کیونکہ نفقہ بقدر کفایت ہوتا ہے۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ فی نفسہ تو یہی حکم ہے مگر اس میں ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوا کرتے۔ عامل کہتا کہ اب کے مہینہ میں میرے پچاس روپے خرچ ہوئے دوسرے کہتے کہ بیس ہی ہوئے جب روزانہ جھگڑہ رہا کرتے تو سلسلۂ تعلیم چند روز میں درہم برہم ہو جاتا اس عارض کے لئے انتظاماً تعیین صح کی بھی اجازت ہوگی جیسا کہ آپ کے ظاہر رہنے کے لئے اصل میں کثیر ہونا شرط ہے لیکن نظم عوام کے لئے اس کی وہ درده کے ساتھ تقلید کر دی گئی یہ تقریر بالکل اصول حنفیہ کے موافق ہے البتہ یہ تقریر معلم کے لئے نہ چل سکے گی بلکہ وہاں ہی چلے گی جو اپنے کو خادم دین سمجھ کر کام کر رہے ہیں اس کا معیار یہ ہے کہ اگر موجودہ تنخواہ میں کام چل رہا ہو اور دفعتہً ترقی کی خبر آوے اور بجز ترقی کے اور کوئی مصلحت تعلق سابق کے قطع کرنے کی نہ ہو پس اگر وہ شخص تعلق ترک کر کے چلا جاوے تب تو سمجھنا چاہیئے کہ طلب دنیا اس شخص کا اصلی مقصود ہے اور اگر ترک تعلق نہ کرے تو سمجھنا چاہیئے کہ مقصود اصلی خلق اللہ کو دینی نفع پہنچانا ہے معاوضہ اصل مذکور پر لیتا ہے ایک کے لئے جزاء حبس نہ ہوگا اور ایک کے لئے جزاء حبس سمجھا جاوے گا غرض اجرت تعلیم اس عدم جواز میں داخل نہیں۔ البتہ تراویح پڑھنے کا جو مروج قاعدہ اکثر مقام پر ہے وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ حافظ رحمۃ اللہ نے خوب فرمایا ہے۔ دام تزویر مکن چوں دگراں قرآن را۔ اور اسی طرح مردوں پر قرآن پڑھ کر دام لینے کا حال ہے کہ قرآن فروشی ہے اور ان کا قیاس تعلیم پر اس لئے نہیں ہو سکتا کہ تعلیم شعائر میں سے ہے اس خدمت کے لئے محبوس ہونا موجب جزاء ہے اور تراویح کا ختم اور ایصال ثواب یہ شعائر سے نہیں اگرچہ طاعت ہے البتہ خود تراویح یا پنجگانہ نماز کی جماعت یہ شعائر سے ہے اگر اس لئے اگر مفت کا امام نہ ملے تو اجرت ٹھہرانا درست ہے اور اس تمام تقریر سے قرآن شریف کا مشرف و معظم ہونا ثابت ہو گیا پس جب ایسی معظم چیز رمضان میں نازل ہوگی تو رمضان شریف کیوں معظم و مشرف نہ ہوگا قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس رہ نمائے رب ناس آمد بہ ناس
حرف حرفش راست در بر معنے معنے در معنے در معنے

(اے حق بات کے سمجھنے والے تو سمجھتا بھی ہے کہ قرآن کیا چیز ہے انسانوں کے پاس انسانوں کے رب کی شان دکھانے والا ہے)

اس کا ہر ہر حرف بالکل ٹھیک ہے اور اپنے اندر معنے رکھتا ہے بلکہ معنی میں بھی معنی رکھتا ہے اور رونما اس واسطے کہا کہ خدائے تعالیٰ کو دنیا میں بلا واسطہ تو دیکھ نہیں سکتے پس کلام اللہ کو پڑھنا گویا دیدار خداوندی سے محظوظ ہونا ہے اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی اس سے اس کی پوری حقیقت ظاہر ہو گی ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کے خیال میں اتفاقاً ایک مصرع آگیا "در ابلق کسے کم دیدہ" موجود مصرعہ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن دوسرا مصرع تیار نہ کر سکے شعراء کو جمع کیا اور مصرع لگانے کی فرمائش کی کسی سے مصرع نہ لگ سکا کیونکہ ایک مہمل مضمون ہے آخر سب کو زنداں کی دھمکی دی ان لوگوں نے پریشان ہو کر ہندوستان میں عالمگیر کے پاس خط لکھا کہ تمہارے یہاں بڑے بڑے شاعر ہیں کسی سے مصرعہ کہلا کر ہماری جان بچاؤ۔ شعراء کو وہ مصرعہ دیا گیا لیکن مضمون ایسا بے تکا تھا کہ کسی کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا شدہ شدہ زیب النساء مخلص بہ مخفی کو بھی اس کی خبر پہنچی اس نے بھی غور کیا لیکن مصرع نہ لگ سکا۔ اتفاقاً ایک روز مسند پر بیٹھی ہوئی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی آئینہ سامنے تھا کہ سرمہ کی تیزی سے آنکھ سے ایک آنسو گرا اس کی ہیئت کو دیکھ کر فوراً دوسرا مصرعہ اس کے ذہن میں آگیا۔ مگر اشک بتاں سرمہ آلود۔ (مگر معشوق نے جب سرمہ ڈال رکھا ہو تو سرمہ ملا ہوا آنسو) چنانچہ عالمگیر کو خبر ہوئی اور شعر پورا کر کے ایران بھیجا گیا۔ جب بادشاہ نے مصرعہ سنا اس کے اور تمام شعراء کے دل میں اس شاعر کی بڑی قدر ہوئی اور شاہ ایران نے عالمگیر کو لکھا کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیجدو۔ عالمگیر کو جب اس پیغام کی خبر پہنچی تو بہت رنج ہوا کہ اگر شاعر کو ظاہر کرتا ہوں تب بھی مشکل ہے اور انکار کرتا ہوں تو بھی

مشکل ہے آخر اس نے زیب النساء سے کہا کہ تمہاری شاعری کا یہ نتیجہ ہوا۔ زیب النساء نے کہا کہ تم اس کے جواب میں میری طرف سے یہ لکھ دو کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ٭ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

(میں بات ہی میں چھپا ہوا ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول میں چھپی ہوئی ہوتی ہے جو شخص مجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے)

چنانچہ یہ لکھ کر بھیج دیا گیا معلوم ہوا کہ مستورات سے ہے۔ پس اسی طرح ہمارا مطلوب حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں بوجہ اس کے کہ ہم دیدار کی تاب نہیں لا سکتے اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے گویا یہ فرما رہے ہیں کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوی گل در برگ گل ٭ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اور وہ سخن یہی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے معنے در معنے، در معنے۔ جس قدر زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف ہوتے جاویں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے لا تنقضی عجائبہ اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی لطف آتا ہے اور عالم کو بھی مزہ آتا ہے صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے

عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد ٭ برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنے را

اس کے حسن کے عالم کی بہار دل کو اور روح کو تازہ و خوش رکھتی ہے اس کی رنگت سے صورت کو پسند کرنے والے خوش ہوتے ہیں اور اس کی خوشبو سے معنی کو پسند کرنے والے خوش ہوتے ہیں۔

اور اسی حدیث میں ہے لا یخلق من کثرۃ الرد واقع میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ کتنا ہی سنو جی نہیں بھرتا نیا مزہ آتا ہے۔ اگر کہا جاوے کہ یہ سارا لطف خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ آخر وہ لطف اور وہ ربودگی جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی اس میں وہ مزہ کیوں نہیں حاصل ہوتا اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزہ آتا ہو تو وہ ابھی قابل خطاب ہی نہیں ہوا اس کو چاہیئے کہ صحت ادراک و سلامت حال پیدا کرنے

کی کوشش کرے پھر موازنہ کرے۔

صاحبو! قرآن تو قرآن ہے کبھی اگر مکہ مکرمہ میں جا کر وہاں کی تکبیر نماز میں سنو جو ایک جزو سے قرآن کا تو معلوم ہو کہ کیا چیز ہے سچ مچ اس وقت وہ تکبیر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ذبح کے وقت کی تکبیر کہ دل میں چھری نکلتی چلی جاتی ہے لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آوے وہ تلاوت ترک نہ کرے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو اس وقت قرآن پڑھیں گے کہ جب ہم کو مزہ آنے لگے مگر یہ خیال بالکل ہی لغو ہے اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص سے کہا جاوے کہ تم مقویات کھا پی کر جلدی سے بالغ ہو جاؤ تاکہ تم کو سن بلوغ کے لطف حاصل ہو جائیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ پہلے صاحب سن بلوغ کی لذت صحیح کو میں دیکھ لوں کیسی ہوتی ہے تب اس کی تدبیر کروں گا فرمایئے اس احمق کو کس طرح وہ لذت دکھلا دی جائے اور سوا اس کے اور کیا جواب اس کو دیا جاوے گا کہ تم جب بالغ ہو جاؤ گے خود تم کو معلوم ہوں گے اس کے سوا کوئی تدبیر اس کے حصول کی نہیں اسی طرح ان نابالغ پیروں کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس لذت کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ ہمت کر کے پڑھنے لگو چند روز میں جب تمہارا قلب عالم طفلی سے نکل کر سن بلوغ میں پہنچے گا خود بخود اس کو یہ لذت حاصل ہو گی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ خاص بلوغ اس وقت حاصل ہو گا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں ہوا نفسی کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً اس ہوا نفسانی کا اتباع چھوڑ دو اور اطاعت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سرگرم ہو جاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہ ہی ہے ؎

خلق اطفال اند جز مست خدا ✤ نیست بالغ جز رسیدہ از ہوا

(سوائے اس شخص کے جو قوم کی محبت میں مست ہے ساری مخلوق نابالغ ہے سوائے اس شخص کے خواہشات نفس کو چھوڑ دیا ہے کوئی بھی بالغ کہلانے کا مستحق نہیں۔)

اور بعینہ یہ ہی غلطی اکثر اہل سلوک کو ہوتی ہے کہ وہ ابتداء میں یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذکر میں لذت آنے لگے اور جب لذت حاصل نہیں ہوتی تو پریشان ہوتے ہیں

اور بعض اوقات ذکر کو چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ذکر میں لذت آنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ ذکر کی زیادتی کرے۔ جس قدر ذکر زیادہ ہوگا قلب زیادہ معتاد ہوگا دوسرے خیالات کم ہو پڑیں گے۔ ذکر میں خود بخود لذت حاصل ہو گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ فن شاعری میں جو ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شعر سن لیا اور طبیعت تلملا گئی ایک عمدہ بات کان میں پڑی کہ چہرہ کھل گیا۔ آخر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اور کثرت مشق ممارست سے ہوتی ہے۔ اور ابتدا میں ہرگز یہ حالت نہیں ہوتی بلکہ اول اول تو محض مشقت ہی ہوتی ہے۔ دیکھئے بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں سبق فارسی پڑھاتے ہیں مارتے ہیں پکڑ بلاتے ہیں اسی طرح جب سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اس کو زباندانی وسخن فہمی کا ایسا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کلام لطیف سن کر کیسا کچھ محظوظ ہوتا ہے۔ پس کیا کسی شخص نے محض اس وجہ سے کہ ہم کو غالب اور مومن کا سا وجد کیوں نہیں پیدا ہوتا شاعری کی مشق چھوڑ دی ہے یا کسی شاگرد نے اپنے استاد سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں اس وقت شاعری شروع کروں گا کہ جب آپ کی طرح مجھے شعر میں لطف آنے لگے گا۔ صاحبو کیا قرآن شریف کی تلاوت اتنی بھی ضروری اور مرغوب نہیں جتنی فارسی اور شاعری کی تحصیل۔ صاحبو جس طرح اس مثال میں ظاہری کیفیات میں ایک وقت وہ تھا کہ نہ تھیں اور اب ایک وقت وہ ہے کہ اعلیٰ درجہ اکمال ہیں اسی طرح باطنی کیفیات بھی گو اس وقت حاصل نہیں لیکن اگر کام کئے جاؤ گے تو ایک وہ وقت بھی ضرور آوے گا کہ سب حاصل ہو جاویں گی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ کذلک کنتم من قبل فمن اللہ علیکم ؕ

اندریں رہ میتراش ومی خراش ⁂ تادمے آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود ⁂ کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس راستہ میں آخر دم تک خراش وتراش (محنت ومشقت) سے فارغ مت رہ تاکہ

تیرا آخری سانس آخر وقت تک شاید اللہ کی مہربانی سے کارآمد ہو جائے۔
اس قسم کے مواقع پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ یہ پڑھا کرتے تھے ؎

حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم ❊ یا بم اورا یا نیابم جستجوئی میکنم

(میں اس کو پا سکوں یا نہ پا سکوں اس کی جستجو کرتا رہوں گا حاصل ہو یا نہ ہو اس کی تمنا کرتا رہوں گا)

جو کچھ بھی ہو تم کام کئے جاؤ تمہارا کام محض طلب ہے کیونکہ تمہارے اختیار میں وہی ہے ثمرہ کا ملنا نہ ملنا ان کا کام ہے تم اس کے درپے نہ ہو ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ❊ کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

(جدائی اور ملاقات کی پرواہ نہ کر معشوق کی خوشنودی ڈھونڈ کہ اس سے اس کے سوائے دوسری چیز طلب کرنا قابل افسوس ہے)

ایک دوسرے بزرگ اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں ؎

ارید وصاله ویرید ہجرے ❊ فاترک ما ارید لما یرید

(میں چاہتا ہوں اس کا وصال اور وہ چاہتا ہے مجھ سے جدائی پس میں اس کے ارادہ پر اپنے ارادہ کو قربان کرتا ہوں اور چھوڑتا ہوں)

اور صاحبو اگر یہ نہ کہا جاوے تو کیا خدا سے بدلہ لینا ہے اگر وہ ہمارا کام نہیں کرتے تو ہم اس کا کام کیوں کریں۔ غور کرو اگر ایک مردار بازاری عورت سے تعلق ہو جاتا ہے تو قلب پر کیا کیا صدمے گزرتے ہیں کس کس انداز سے وہ امتحان اور آزمائش کرتی ہے کتنا موقع بموقع ستاتی ہے لیکن آتش محبت مشتعل ہی ہوتی چلی جاتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امتحانات یا غمزوں سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دیں تو کیا ذات باری جل مجدہ کی محبت اور عظمت مسلمانوں کے دل میں اتنی بھی نہ ہو جتنی ایک بازاری عورت کی حیف ہے ہم پر اور ہمارے اس اسلام پر ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ❊ گوئی گشتن بہر او اولیٰ بود

(کیا مولا کا عشق لیلےٰ سے بھی کم درجہ میں ہو سکتا ہے گلی کوچوں میں اس کے لئے

گشت کرنا تو اور بھی زیادہ بہتر بات ہے۔

ایک عارف کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ایک روز یہ آواز آئی کہ کتنی ہی عبادت کرو کچھ قبول نہیں اس آواز کو ان کے ایک مرید نے بھی سنا دوسرا دن ہوا تو وہ بزرگ پھر عبادت کے لئے اٹھے پھر وہی آواز آئی جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مرید نے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں اُدھر کوئی پوچھتا بھی نہیں اور آپ ہیں کہ خوامخواہ مرے جاتے ہیں جب قبول ہی نہیں ہے تو محنت سے کیا فائدہ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا ؎

توانی ازاں دل بہ پرداختن ⁂ کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلادو کہ چھوڑ کر کس در پر جا پڑوں اس جواب پر رحمت باری کو جوش ہوا اور آواز آئی کہ ؎

قبولست گرچہ ہنر نیستت ⁂ کہ جز ما پناہِ دگر نیستت

کہ اگرچہ تمہاری عبادت تو کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر جب ہمارے سوا تمھارا کوئی نہیں ہے تو تم کو بھی ہم ہی لے لیں گے۔ صاحبو طالبین کی یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

طلب گار باید صبور و حمول ⁂ کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(کسی چیز کے طلب کرنے والے کو صبر اور برداشت چاہیئے میں نے کسی کیمیا گر کو مایوس و رنجیدہ ہوتے نہیں دیکھا)

افسوس ہے کہ طلب خدا طلب کیمیا کی بھی برابر نہ ہو کہ اس میں تو انسان سالہا سال گنوادے، مال و متاع غارت کردے چین و آرام کو خیرباد کہدے اور طلب خدا میں کچھ بھی نہ ہو سکے طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

بر اندار برائے دلے بارہا ⁂ خورند از برائے گلے خارہا

(اپنے دل کو بار باراس کے راستہ پر چلا پھول حاصل کرنے کے لئے تو بہت سے کانٹوں کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے)

اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

خوشا وقت شوریدگان غمش ⁂ اگر ریش بینند گر مرہمش

گدا یانی از بادشاہی نفور ٭ بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند ٭ اگر تلخ بیند دم درکشند

اس کے غم میں مبتلا رہنے والوں کے لئے بہت ہی خوش نصیبی ہے چاہے کوئی زخم لگے یا زخم کا مرہم ملے اس کے فقیر بادشاہی سے نفرت کرتے ہیں اس کی مہربانی کی امید میں گدائی پر صبر کرتے ہیں۔ اللہ کے مشتاق عشق کے غم کی شراب برابر پیتے رہتے ہیں اگر کسی قسم کی تلخی دیکھتے بھی ہیں تو خاموش رہتے ہیں۔

اور جو شخص صرف مرہم کا طالب ہو وہ طالب نہیں ہے وہ بیچارے تو بجائے حصول کی امید پر ہی نظر لگائے بیٹھے ہیں جیسا کہ اوپر کے شعر میں ہے امیدش اندر گدائی صبور ایک طالب کا قول ہے

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم ٭ کہ شاید دست من مارہ دیگر جانان من گیرد

(اگر میں دور پڑا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا معشوق پھر دوسری بار میرا ہاتھ پکڑلے)

طالب وہی ہے کہ اگر ہزار مرتبہ اس کو کہا جاوے تو وہ زخمی ہے تو مایوس نہ ہو اور دس ہزار مرتبہ کہا جاوے کہ تو جنتی ہے تو کاہل اور سست نہ بنے اس کے طلب کی یہ حالت ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہی است ٭ ہر کہ بردے میرسی بردی مایست

(اے بھائی اس کے دربار کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے کہ کس جگہ پہنچ کر کوئی یہ کہدے کہ میں منزل پر پہنچ چکا ہوں اگر تو کسی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اب بھی اس کے اوپر اور منزل ہے)

ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ اس کو روزانہ یہ آواز آتی کہ تو کافر ہو کر مرے گا جب ایک مدت تک یہ آواز آئی تو شیخ سے ذکر کیا انھوں نے فرمایا کہ میاں یہ دشنام محبت ہے مایوس نہ ہو جانا محبوبوں کی عادت ہے کہ محب کو چھیڑا کرتے ہیں خوب کہا ہے ؎

بدم گفتی وخورسندم عفاک اللہ نکو گفتی ٭ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

(تو نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تجھ کو معاف کرے تو نے ٹھیک کہا ہے میٹھے میٹھے سرخ ہونٹوں سے کڑا جواب بھی اچھا ہی معلوم ہوتا ہے)

اور یہ ایک قسم کا امتحان ہے لیکن یہ ساری باتیں اس وقت برداشت ہوتی ہیں کہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو۔ پس اس کی کوشش کرو۔ اور اس طریق کے دو

امر ہیں ذکر کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت ان کے پاس آنا جانا اس سے تدریجاً ماسویٰ اللہ سب تمہارے دل سے نکلنے شروع ہو جاویں گے اور یہ حالت ہو گی ؂

عشق آن شعلہ است کہ چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

عشق آگ کا ایسا شعلہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے تو معشوق کے سوائے جو کچھ ہوتا ہے سب کو جلا دیتا ہے لفظ لا کی تلوار سے اللہ کے سوا ہر معبود کو دور کر دے پھر دیکھ اب کیا باقی رہ گیا صرف الا اللہ رہ گیا باقی سب کچھ چلا گیا مبارک ہو اے عشق کہ تو دوسروں کی شرکت کو جلانے والا اور دور کرنے والا ہے۔

اس تقریر سے ترتیب سلوک کی یہ نکلی کہ اول کسی صاحب محبت کو ڈھونڈھ کر اس کے پاس جا پڑو اور اس کی حسب ہدایت کام میں لگ جاؤ ثمرات کے طالب نہ ہو خود بخود ہوں تو خدا کا فضل سمجھو طاعت میں لذت نہ ہو تو اس کو چھوڑو مت کثرت سے ذکر کرو اس میں قرآن بھی داخل ہے اگر پڑھتے ہوئے طبیعت اکتانے لگے تو اس کی کثرت کرو اگر الفاظ بھی صحیح نہ ہوں تو اپنے امکان بھر کوشش تصحیح کی کرو اگر پوری کامیابی نہ ہو تو دلگیر مت ہو اسی طرح قبول ہے الفاظ پر تو انھیں سے گرفت ہو گی جو الفاظ درست کر سکتے ہیں اور پھر نہیں کرتے ورنہ زیادہ تر دیکھ بھال اور چھان بین دلوں کی ہو گی اگر موٹی زبان کا آدمی غلط پڑھتا ہے لیکن دل سے پڑھتا ہے تو خدا کے نزدیک یہ غلط اس صحیح سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی غرض ریا یا اظہار کمال ہو اس موقع پر مجھے ایک شخص کی حکایت یاد آئی ایک شخص مجھ سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں کسی فقیر سے طالب ہو جاؤں میں اس پر ناراض ہوا اور سمجھا دیا چند روز کے بعد پھر آیا تو میں اس سے مزاحاً کہنے لگا کیوں کسی فقیر کے طالب بھی ہوئے تو وہ نہایت خلوص اور سادگی سے جواب دیتا ہے کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا اس کا یہ تیرا کہنا ہزاروں حضور اور جناب سے زیادہ لذت بخش تھا، کیونکہ دل سے تھا۔

اس موقع پر بطور جملہ معترضہ کے ایک اور بات بھی کہہ دینی ضروری ہے کہ جس طرح نرمی علاج ہے گرمی بھی اس سے بڑھ کر علاج ہے اور یہی وجہ ہے بعضے بزرگ درشت مزاج مشہور ہو جاتے ہیں تو خوب سمجھ لو وہ درشت مزاج نہیں۔ بات یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک بات کو نرمی سے سمجھایا جاوے تو دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا اور نہ وہ اتنی مدت تک یاد رہتی ہے جتنا کہ بدرشتی سمجھانے سے کالنقش علی الحجر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس شخص پر ڈانٹ کا یہ اثر پڑا کہ اس کا یہ تذبذب بالکل دل سے نکل گیا اور آنکھیں کھل گئیں۔ غرض غلط بولنا جو پیارا معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں راعی کا قصہ مشہور ہے کہ زمین پر بیٹھا ہوا محبت کے جوش میں خدا تعالیٰ کو خطاب کر کے یہ کلمات کہہ رہا تھا ؎

تو کجائی تا شوم من چاکرت | چارقت دوزم کنم شانہ سرت

تو کہاں ہے کہ میں تیری خدمت کروں تیرے پھٹے ہوئے کپڑے سی دوں اور تیرے سر کے بالوں کو کنگھی کر دوں۔

وامثال ذالک۔ اتفاقاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف سے گذرے۔ یہ کلمات سن کر فرمایا کہ میاں کس کو کہہ رہے ہو اس نے کہا کہ خدا سے حضرت موسیٰؑ نے ڈانٹا اور ڈانٹ کر چلے گئے۔ راعی نے جو یہ سنا تو مارے خوف کے تھرا گیا اور سخت پریشان ہوا۔ اسی وقت حضرت موسیٰؑ پر وحی آئی کہ اے موسیٰؑ تم نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ اسی حکایت کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

زیں نمط بیہودہ میگفت آں شبان | گفت موسیٰؑ با کیست اے فلان
گفت با آں کس کہ مارا آفرید | ایں زمین و چرخ آواز آمد پدید
گفت موسیٰؑ ہائے خیرہ سر شدے | خود مسلمان ناشدہ کافر شدے
گفت اے موسیٰؑ دہانم دوختی | وز پشیمانی تو جانم سوختی
وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا | بندہ مارا چرا کردی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

اس طریقہ پر وہ چرواہا فضول باتیں کر رہا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا اے شخص تو یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہے چرواہے نے کہا کہ میں اس ذات پاک سے بات کر رہا ہوں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور یہ زمین و آسمان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہائے افسوس تو تو برباد ہو گیا تو خود مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہو گیا۔ چرواہے نے کہا کہ اے موسیٰؑ تو نے تو میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے تو نے میری جان کو جلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کیوں کر دیا۔ تو مجھ سے ملاقات کرنے آتا ہے یا میرے بندے کو مجھ سے جدا کرنے کے لئے آتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے جو یہ سنا تو گھبرا گئے اور جلدی سے آ کر چرواہے سے معافی چاہی چرواہے کی عجب حالت تھی۔ موسیٰؑ نے جو معافی چاہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ اے موسیٰؑ ایسا تازیانہ لگا ہے کہ میں بڑی دور پہنچ گیا۔ ع

آفریں بردست و بربازوی تو

تیرے ہاتھوں اور بازوؤں کو شاباش ہے۔

اس جملہ کی حکایت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگر زبان پر بوجہ کم سمجھی اور کم عقلی کے گستاخانہ الفاظ بھی ہوں لیکن دل محبت سے معمور ہوں تو الفاظ پر نظر نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور ہے کہ ان فروگذاشتوں کی معافی انھیں لوگوں کے لئے ہے کہ جن کو تصحیح پر قدرت نہیں ہے ورنہ اگر قدرت کے باوجود ایسا کرے تو ضرور گناہ گار ہو گا۔

افسوس ہے کہ اس وقت ایسے امر کی طرف سے ایسی بے توجہی ہے کہ لوگ اس کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے اکثر لوگ پوری درسیات ختم کر جاتے ہیں لیکن ان کو قرآن پڑھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ سمجھتے ہیں کہ صرف کی کتابوں میں صفات حروف و مخارج پڑھ لیتے ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے قرآن کا پڑھنا اُس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ خاص کسی سے اس کو نہ سیکھا جاوے۔ ترقی درسیات سے

کچھ نہیں ہوتا بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشق نہیں کی تو ہم کو غلط پڑھنا جائز ہونا چاہئے اور ہم کو معذور سمجھنا چاہیئے۔ لیکن یہ عذر ایسا ہے کہ میں نے ایک سپارہ پڑھنے والے طالب علم سے کہا کہ حاجی جی کو بلالا وہ حافظ جی کو بلالایا میں نے کہا یہ حماقت ہے کہاں حافظ جی کہاں حاجی جی ان کے تو حروف بھی الگ الگ ہیں تو کہتا ہے کہ میں نے مخارج کی مشق نہیں کی تو کیا یہ عذر قبول ہو سکتا ہے تو جیسا یہ شخص اس غلطی سے بچ سکتا تھا اسی طرح جب مشق ممکن ہے تو ایسے اغلاط سے اُن کو بچنا ممکن ہے صاحبو یہ سب بہانے ہیں بات اصل وہی ہے کہ خدا کی محبت اور اس کا خوف دل سے جاتا رہا۔ اگر آج یہ اشتہار دیدیا جائے کہ جو شخص مخارج حروف صحیح کر کے سُنائے اس کو فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو آج ہی شہر کے شہر قرات شروع کر دیں اور کچھ نہ کچھ تصحیح کر کے انعام لینے کھڑے ہو جائیں لیکن افسوس ہے کہ خدا کی رضا کے لئے امنگ نہیں پیدا ہوتی یہ تو تفریط تھی متعلمین کی اب افراط سنئے بعض معلمین و مصلحین کا کہ جن سے بالکل نہ ہو سکے وہ ان کو بھی مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدون اس کے قرآن پڑھنا ہی بے فائدہ ہے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک پیر جی صاحب نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ روزہ کی نیت بھی یاد ہے۔ اس کو چونکہ کوئی خاص عبارت یاد نہیں تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں بتلائی۔ پیر جی صاحب نے فرمایا کہ بے نیت روزہ نہیں ہوتا دیکھو روزہ کی نیت یوں کیا کر۔ بصوم غد نویت اس بیچارہ نے کا ہے کو کبھی الفاظ اس قسم کے سُنے تھے فوراً تو یاد نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن روزہ نہ رکھا ان ہی بزرگ نے پوچھا تو یہ کہا کہ بلا نیت روزہ نہیں اور نیت یاد نہیں ہوتی۔ غرض جو لوگ صحیح پڑھ سکتے ہیں وہ تو صحیح پڑھیں اور جو لوگ اُس پر قادر نہیں ان کو جس طرح وہ پڑھ سکیں جائز ہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہماری آواز چونکہ اچھی نہیں اس لئے ہم نہیں پڑھتے۔ سو ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تحسین صوت اس کو نہیں کہتے کہ خوب راگنی سے گا کر پڑھا جاوے تحسین صوت کے معنی جیسا بزرگوں سے منقول ہے یہ ہیں کہ سننے والے کو اس کی آواز سن کر یہ معلوم ہو کہ اس کے دل پر کسی با عظمت کا رعب چھایا ہوا ہے۔ بات بہت دور جا پڑی اصل مقصود یہ تھا کہ

جب قرآن ایسا مشرف و معظم ہے تو جس ماہ میں اس کا یہ نزول واقعی ہوا ہے وہ بھی معظم ہوگا بالخصوص وہ عشرۂ خاص ماہ رمضان کا کہ جس میں شب قدر ہے کیونکہ رمضان کو جب قرآن کی وجہ سے شرف حاصل ہوا تو رمضان کا وہ حصہ خاص جس میں نزول ہوا ہے دوسرے حصوں کی نسبت ضرور اشرف ہوگا اس لئے کہ دوسرے حصوں میں شرف اس حصہ کی بدولت آیا ہے پس جب نزول شب قدر میں ہوا ہے اور شب قدر جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے تو عشرہ اخیر بقیہ حصہ رمضان سے ضرور افضل ہوگا۔ ایک فضیلت تو عشرہ اخیرہ کی اس نزول قرآن سے ہوئی دوسری فضیلت اس کی اس سے ہے کہ اس میں شب قدر ہے جس کی فضیلت کے لئے خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لیلۃ القدر لیلۃ القدر خیر من الف شھر۔ کیونکہ حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ اور بعض حدیثوں میں مطلق عشرہ اخیرہ بھی آیا ہے دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری کی تفسیر ہے اور یا اکثر تو طاق راتوں میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جفت راتوں میں بھی ہو جاتی ہے۔ نیز بعض لوگوں کو جفت راتوں میں بھی ہونا مکشوف بھی ہوا ہے تو قوی اور تندرست لوگوں کو تو یہ مناسب ہے کہ وہ اس عشرہ کی ہر رات میں اور شبوں سے زیادہ عبادت کریں اور ضعفاء کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کم از کم طاق راتوں میں ضرور جاگ لیں طاق راتوں میں سے اس وقت ایک رات تو گزر گئی اب صرف چار باقی رہ گئیں ہیں اس میں کوشش کر کے کچھ تو ضرور جاگ لیا جائے صاحبو یہ ایسی برکت اور خیر کی چیز ہے کہ اس سے محروم ہو جانا گویا تمام چیز سے محروم ہو جانا ہے چنانچہ حدیث میں ہے من حرم لیلۃ القدر فقد حرم الخیر کلہ لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر جاگا جاوے تو تمام شب جاگا جاوے اور اگر تمام شب نہ جاگا جاوے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ خیال بالکل لغو ہے۔ اگر اکثر حصۂ شب میں بھی جاگ لے تب بھی لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ساری رات بھی جاگ لیا جاوے تو کیا مشکل ہے۔ صاحبو رمضان سال بھر کے بعد آتے ہیں آپ کو

معلوم ہوگا کہ پچھلے سال رمضان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں رہے ہم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ رمضان تک کس کس کی باری ہے اس لئے اگر ایسی بڑی نعمت حاصل کرنے کے لئے کوئی ایک دو رات جاگ ہی لیا تو کیا وقت کی بات ہے لیکن خیر اگر تمام رات کی ہمت نہ ہو تو اکثر حصہ کو تو چھوڑنا ہی نہ چاہیئے اور بہتر یہ ہے کہ اکثر حصہ اخیر شب کا تجویز کیا جاوے کیونکہ اول تو اس وقت معدہ کھانے سے پُر نہیں ہوتا دعا میں جی لگتا ہے۔ دوسرے حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ اخیر شب میں روزانہ اپنے بندوں کے حال پر رحمت خاص متوجہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ اخیر شب میں ویسے بھی سکون ہوتا ہے اور اس میں ہر شب شریک ہے کسی نے خوب کہا ہے من لم یعرف قدر اللیلۃ لم یعرف لیلۃ القدر اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر انہیں راتوں میں سے کسی رات میں ہوگی تو جو شخص راتوں کی قدر کرے گا وہ لیلۃ القدر بھی پاوے گا جو بیقدری کر کے خواب غفلت میں گزارے گا وہ حسب عادت لیلۃ القدر سے بھی محروم رہے گا اس لئے بعضے بزرگوں نے کہا ہے۔ من احیی السنۃ کلھا ادرک لیلۃ القدر کیونکہ جب سال بھر تک برابر شب بیداری کرے گا تو لیلۃ القدر میں عبادت ضرور ہو جاوے گی کہ انہیں راتوں میں ایک رات وہ بھی ہے۔

بوستان میں حکایت ہے کہ کسی شاہزادہ کا ایک لعل شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اٹھا کر جمع کریں اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جاتیں تو ممکن تھا کہ لعل ان میں نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اٹھائی گئی ہیں تو لعل ضرور آگیا ہے کسی نے اُس جملہ کا ترجمہ خوب کیا ہے

اے خواجہ چہ پرسی از شب قدر نشانی　　ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

اے میاں تو شب قدر کی نشانی کو کیا پوچھتا ہے ہر رات قدر کے قابل ہے اگر تو اس کی قدر کرے۔

لیکن خیر ایسے باہمت لوگ تو اس وقت کہاں ہیں کہ وہ اس گوہر بے بہا کی تلاش میں سال بھر شب بیداری کریں مگر رمضان کے عشرۂ اخیر میں تو ضرور ہی بیدار رہنا

اور عبادت کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان راتوں میں شب قدر کا ہونا اغلب ہے اور اگر کوئی شخص نہایت ہی کمزور کم ہمت ہو تو خیر وہ ستائیسویں رات کو تو ضرور ہی بیدار رہے کہ وہ شب اکثر شب قدر ہوتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شب قدر نہ بھی ہوئی اور تم نے یہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو ان شاء اللہ تم کو شب قدر ہی کا ثواب عطا ہوگا اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے۔ حدیث میں ہے اس کی اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ انما الاعمال بالنیات (درحقیقت اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کی تشفی نہ ہو تو دوسری حدیث موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون والاضحیٰ یوم تضحون (روزہ اسی دن سمجھا جائیگا جس دن تم یقین کر کے روزہ رکھ لو اور اسی دن افطار سمجھا جائے گا جس دن تم یقین کر کے افطار کر لو اور اسی دن قربانی شمار ہوگی جس دن تم یقین کر کے قربانی کر لو) جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی اور اس تحقیق کی بناء پر روزہ رکھنے شروع کر دیئے پھر رمضان ختم پر عید کے چاند کی اسی طرح چھان بین کی اور اس کی بنا پر عید کر لی اسی طرح عید الضحیٰ میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلاف واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ جس دن روزہ رکھا وہی دن عند اللہ باعتبار قبول روزہ کا تھا اور جس دن عید کی وہی دن عید کا تھا یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں۔ پس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شب قدر نہ ہوئی تو ثواب شب قدر کامل جاوے گا۔

صاحبو! اس تقریر کے بعد تو بہت ہی آسان معاملہ ہو گیا اب بھی اگر ہمت نہ کی جاوے تو غضب ہے۔ یہ دوسری فضیلت تھی عشرہ اخیر کی۔

تیسری فضیلت اس عشرہ میں یہ ہے کہ اس میں اعتکاف مشروع اور ممکن ہے کہ یہ پہلی فضیلت کا تتمہ ہو جیسا کہ بعض نے کہا کہ اعتکاف شب قدر ڈھونڈنے کے لئے ہے

اور ممکن ہے کہ یہ مستقل فضیلت ہو جبکہ اعتکاف کو دوسری حکمتوں سے مشروع کہا جاوے غیر جو کچھ بھی ہو ہم کو اس سے کیا غرض ہم کو کام کرنا چاہیئے احکام کے حکم اور مصالح کی تلاش اور کاوش ہمارا کام نہیں کیونکہ یہ علوم فکریہ نہیں ہیں کہ سوچنے اور غور کرنے سے سمجھ میں آجاویں گے یہ الہامی علوم ہیں خدا جس کو دے اس لئے جب تک شرح صدر نہ ہو جاوے اس وقت تک کسی ایک کی تعین نہ کرنی چاہیئے دونوں احتمال ہیں۔

اور اس اعتکاف میں دو درجہ ہیں ایک درجہ کمال کا ہے وہ تو یہ ہے کہ بیس تاریخ کو قبل از مغرب اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر باہر نکلے سو یہ تو اب ممکن نہیں ہے کیونکہ دن گزر گیا۔ اور دوسرا درجہ اس سے کم ہے۔ اور وہ یہ دس دن سے کم ہو لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر درجہ کمال حاصل نہ ہو تو ناقص درجہ سے حاصل کرنے سے فضیلت حاصل نہیں ہوتی اگر اس قدر نہ ہوگی تو کچھ تو ضرور ہو جاوے گی صاحبو اگر دس دن ممکن نہ ہو سکے ۹ دن سہی اس قدر بھی نہ ہو سکے سات دن ہی سہی۔ غرض جس قدر بھی ہو سکے اور جتنے بھی دن ہو سکے چھوڑنا نہ چاہیئے اور ایک بہت بڑی فضیلت اعتکاف کی یہ ہے کہ معتکف کو ایام اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نماز میں ملتا ہے دلیل اس کی یہ حدیث ہے لایزال احدکم فی الصلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا جاوے تو وقت انتظار میں بھی وہی ثواب ہوتا ہے جو کہ وقت ادار الصلوٰۃ میں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ معتکف جب ہر وقت مسجد میں رہے گا تو اس کو صلوٰۃ کا انتظار ضرور رہے گا اگر یہ سوئے گا بھی تو اس نیت سے کہ اٹھ کر فلاں نماز پڑھنی ہے۔ کوئی کام بھی کرے گا تو اس نیت کے ساتھ کہ فلاں نماز تک یہ کام ہے غرض اس کا سونا جاگنا' اٹھنا بیٹھنا ہر ہر حرکت صلوٰۃ کے حکم میں لکھی جائے گی اور اس تقریر کے بعد خیال میں آتا ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے المعتکف یعتکف الذنوب کلھا ویجری لہ لہ الحسنات کلھا۔ الحسنات میں

الف لام عہد کا نہیں جیسا اب تک سمجھا جاتا ہے جس کی بنا تھی کہ اعتکاف میں خاص خاص حسنات کا صدور ہوتا ہے کل حسنات کا صدور خلاف مشاہدہ ہے بلکہ استغراق کا ہو سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ معتکف اپنے ایام اعتکاف میں گو ہر نیکی کر رہا ہے اس کو سب نیکیوں کا ثواب ملتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انتظار الصلوٰۃ صلوٰۃ کے حکم میں ہے اور معتکف منتظر الصلوٰۃ ہے تو وہ مصلی کے حکم میں ہوا اور صلوٰۃ ام العبادات ہے تو اس کا ادا کرنے والا گویا تمام عبادتیں کر رہا ہے پس معتکف بحالت اعتکاف سب عبادتیں ادا کر رہا ہے۔ صاحبو اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی یہ تقریر تو اس پر مبنی ہے کہ عشرۂ اخیرہ میں ایک فضیلت اعتکاف سے ہوئی اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اعتکاف میں جو فضیلت آئی ہے وہ عشرۂ اخیرہ کی وجہ سے ہے کہ زمانہ افضل میں عبادت کی زیادہ فضیلت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہم کو کچھ مضر نہیں کیونکہ کبھی زمانہ میں بالذات ہی فضیلت ہوتی ہے جیسا کبھی بالغیر بوجہ اس کے مظروف کے ہوتی ہے جیسا شروع میں بیان ہوا بعد حکایت گفت معشوقے بعاشق الخ کے پس غرض خواہ اعتکاف عشرہ کی وجہ سے فضیلت ہو یا عشرہ میں اعتکاف کی وجہ سے دونوں صورتوں میں اعتکاف کی فضیلت ثابت ہے ہم کو اس کا حاصل کرنا ضروری ہے اس کریدکی ضرورت نہیں کسی نے خوب لکھا ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(نصیبہ) اگر مدد کرے تو میں اس کے دامن کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لوں اگر وہ اپنی طرف کھینچ لے تو بڑی خوشی کا مقام ہے اور اگر میں اسے اپنی طرف کھینچ لوں تو یہ بھی میرے لئے عزت کی بات ہے۔

صاحبو چار دواؤں کا مرکب آپ کے مرض کو مفید ہے آپ کو اسے استعمال کرنا چاہیئے اس تفتیش کی ضرورت نہیں کہ اس دوا سے اس میں قوت بڑھی یا اس سے یہ تفتیش دوسرے کا کام ہے جو اس فن کو من حیث الفن حاصل کرے

مریض کا کام صرف استعمال ہے ؎

کار کن کار بگذر از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دم بے قدم

کام کرو باتیں کرنے کا کام چھوڑ دو کہ اس راستہ میں صرف کام ہی کام چاہیئے اس راستہ میں کام کے لئے قدم چاہیئے باتیں بنانے کی ضرورت نہیں کہ بغیر عمل کے باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ فضیلت تو اس عشرہ کے خلاصہ خاص تھی اب ایک اور مضمون عام جو اس عشرہ اخیرہ کے ساتھ ہی چسپاں ہیں بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ کے مجمع میں فرمایا رغم انفہٗ رغم انفہٗ رغم انفہٗ (اس کی ناک کو مٹی لگ جائے یعنی خدا کرے وہ ذلیل ہو جائے) صحابہؓ یہ الفاظ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون شخص آپ نے فرمایا ایک تو وہ شخص کہ اپنی زندگی میں بوڑھے ماں باپ کو پاوے اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے کی قید اس لئے بڑھا دی۔ کہ اگر ماں باپ خود جوان ہیں تو اول تو وہ اس کے محتاج نہیں ہوں گے جیسے اس کے پیر ہاتھ چلتے ہیں ان کے ہاتھ پیر بھی چلتے ہیں دوسرے ان کی خدمت سے دل بھی نہیں گھبراتا اس لئے اگر ان کی کچھ خدمت بھی کر دی تو کچھ بڑی بات نہیں بخلاف بوڑھے ماں باپ کے کہ وہ اس کے محتاج ہوتے ہیں اور چونکہ اکثر قویٰ بالکل کمزور ہو جاتے ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتے اور اکثر کام مرضی موافق نہیں ہوتے تو تنگ مزاج بہت ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے ماں باپ کی خدمت کرنا بوجہ ان کی معذوری کی ضروری اور ان کی تنگ مزاجی سے تنگ ہو جانا اور نا فرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے مگر اکثر آدمی تنگ ہونے لگتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ طفولیت و عالم احتیاج کو بھول جاتا ہے کہ اس وقت والدین نے کیسے کیسے

تازہ اٹھائے ہیں اگر وہ یاد ہیں تو بڑا نفع ہو۔

ایک بنئے کی حکایت مشہور ہے اس نے اپنے بڑھاپے میں ایک مرتبہ اپنے ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے صاحبزادہ اول تو اس پر دل میں بہت خفا ہوئے کہ اس لغو سوال کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر خیر تہذیب سے کام لے کر بتلا دیا کہ ابا جان کوا ہے بنئے نے پھر پوچھا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔ صاحبزادہ نے کہا کہ ابھی تو بتلا دیا تھا کہ کوا ہے۔ تیسری بار اس نے پھر پوچھا تو صاحبزادہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے چپکے پڑے رہو اس پر بنئے نے اپنا بہی کھاتہ منگایا اور کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادہ دیکھو تم نے ایک سو بار مجھ سے اپنے بچپن میں یہی سوال کیا تھا اور میں نے ہر مرتبہ محبت سے جواب دیا تھا تم دو ہی بار میں گھبرا گئے لیکن شاید کوئی شخص یہ کہے کہ صاحب بوڑھوں کی تنگ مزاجی سے ناگواری امر طبعی ہے اگر اس پر بھی بازپرس ہے تو سخت مشکل کی بات ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ امور طبیعہ پر خدا تعالیٰ نے کہیں بازپرس نہیں فرمائی بازپرس امور اختیاریہ میں ہیں۔ کلام مجید اس شبہ کا خود ازالہ فرما رہا ہے۔ پارۂ سبحان الذی میں حقوق والدین کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صَالِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجیوں سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے یہ تو امر طبعی ہے اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جاوے اس میں معذور ہو لیکن خدا تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخشند دیتا ہے۔ صاحبو ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے۔ اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ قرآن سے کلام اللہ ہونے کی یہ بھی

ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں ہر ہر بات کے وہ وہ مخفی پہلو لئے گئے ہیں کہ دوسرے کے کلام میں اس قدر رعایات ممکن نہیں اسی طرح کلام مجید کی تمام آیتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں مگر افسوس ہے لوگ کلام اللہ کو رسمی طور پر پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں اس کی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ایک شخص تو رغم انفہ کا محل یہ ہوا دوسرا وہ جس کے سامنے میرا نام آوے اور وہ درود نہ پڑھے۔ تیسرے وہ شخص کہ رمضان شریف آئے بھی اور گذر بھی گئے اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی یعنی ایسے عمل اور توبہ نہ کرلی جس سے گناہ معاف ہو جاتے۔ ایک دوسری حدیث میں مغفرت سے رمضان کے متعلق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے ھو اشھرا ولہ رحمۃ واوسطہ مغفرت وآخرہ عتق من النیران (یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کے پہلے دس دن رحمت کے ہیں اور درمیانی دس دن مغفرت کے اور آخری دس دن دوزخ سے آزادی کے ہیں) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ سراپا رحمت و مغفرت ہے۔ پس اس میں انسان اپنی مغفرت کا سامان کرے اور مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہی ہے کہ نیک عمل کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغفرت کی تحصیل امر اختیاری ہے چنانچہ خدا تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں ہیں۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ الخ۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کو متقی لوگوں کے واسطے تیار کیا گیا ہے تو جو شخص اس رستہ چلے اور اس مقرر شدہ قانون پر عمل کرے گا وہ مغفرت کو حاصل کرے گا جو شخص ایسا نہ کرے گا محروم رہیگا بس معلوم ہوا کہ مغفرت کا حاصل کرنا خود ہمارے اختیار میں ہے اور اگر ہم چاہیں اس کو خود حاصل کر سکتے ہیں کہ متقی بن جاویں۔

اس موقع پر بے علم وعظوں کی ایک غلطی کا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ وعظوں میں کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات بالکل بے پرواہ ذات ہے وہ چاہے تو ایک نکتہ میں بخشدے اور چاہے تو ایک نکتہ میں جہنم بھیجدے اور یہ بات ایسے طور سے کہتے ہیں جس سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون نہیں بلکہ یوں ہی اناپ شناپ

بے تکے طور پر جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سننے سے اکثر لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور عبادت و ریاضت سب چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لئے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کس نکتہ پر اچانک پکڑ ہو جاوے اور ساری محنت ہی برباد ہو جاوے اسی طرح اکثر لوگ خوب جی بھر کر معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون ہی نہیں ایک نکتہ ہی پر عذاب ثواب کا مدار ہے تو اپنی خواہشات کو کیوں ترک کریں اور خواہ مخواہ کی مصیبت کیوں اختیار کریں ممکن ہے اسی میں سے کوئی نکتہ پسند آ جاوے کہ اس پر نوازش ہو جاوے گویا کارخانہ خداوندی اینا ؤ نگری کی سلطنت ہے کہ جہاں سارے کام بے ڈھنگے ہی ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ چیلہ گرو سفر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے نام پوچھا تو انیاؤ نگر معلوم ہوا جس کے معنی ہیں بے اتفاقی کا شہر اشیاء کا نرخ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اناج سے لے کر گھی دودھ تک ہر ہر چیز سولہ[16] سیر ملتی ہے یہ سن کر چیلہ تو بہت خوش ہوا کہ خوب گھی دودھ کھا کر فربہ ہوں گے مگر گرو نے کہا کہ بھائی اس جگہ قیام کرنا مناسب نہیں یہ شہر تو بہت ہی بے تکا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے میں کچھ امتیاز نہیں مگر چیلہ نے اصرار کیا آخر رہ پڑے۔ چند روز میں سیر کرتے کرتے عدالت کی طرف پہنچے دیکھا کہ ایک مقدمہ راجہ صاحب کے اجلاس میں درپیش ہے اور لوگوں کا ہجوم ہے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کوئی چور مدعی ہے مہاجن مدعا علیہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم دونوں چوری کرنے اس کے گھر گئے نقب لگایا میرا رفیق اندر جانے لگا تو دیوار اوپر سے آپڑی مر گیا' قصاص چاہتا ہوں مدعا علیہ سے باز پرس ہوئی کہ وہ دیوار ایسی کیوں بنائی تھی اس نے کہا معمار سے پوچھئے بنانے والا وہ ہے وہ بلایا گیا اس نے کہا گارا دینے والے سے پوچھا جاوے اس کو بلایا' اس نے کہا گارہ بنانے والے سے پوچھا جاوے اس کو بلایا اُس نے کہا سقہ نے پانی ڈال دیا جس سے گارہ پتلا ہو گیا اس کو بلایا اس نے کہا سرکاری ہاتھی جھپٹا ہوا آتا تھا خوف سے پانی زیادہ نکل پڑا فیل بان کو بلایا اس نے کہا ایک عورت پازیب پہنے آتی تھی اس کی جھنکار سے ہاتھی دوڑ پڑا عورت کو بلایا اس نے کہا سنار نے ایسا ہی باجا ڈال دیا اس کو بلایا وہ کچھ جواب

نہ دے سکا حکم ہوا کہ سنار کو پھانسی دی جاوے پھانسی کے لئے لے چلے جب اس کو پھانسی پر چڑھایا گیا تو پھانسی کا حلقہ اس کے گلے سے بڑا نکلا لوگوں نے آکر راجہ صاحب سے عرض کیا کہ حلقہ اس کے گلے سے بڑا ہے راجہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دے دو غرض موٹے آدمی کی تلاش شروع ہوئی اتفاق سے مجمع بھر میں اس چیلہ سے زیادہ موٹا کوئی نہ نکلا آخر اسی کو تجویز کیا گیا اب تو چیلہ صاحب بہت گھبرائے اور گرو سے کہا کہ خدا کے لئے بچاؤ اس نے جواب دیا میں نہ کہتا تھا یہاں رہنا اچھا نہیں آخر نتیجہ دیکھا آخر گرو نے یہ تدبیر نکالی کہ پھانسی کے وقت خود بڑھ کر کہا کہ صاحبو اس کو پھانسی نہ دو مجھ کو دیدو لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ اس وقت میں نے جوتش میں جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت جو شخص پھانسی دیا جاوے گا وہ سیدھا بیکنٹھ میں جاوے گا۔ راجہ صاحب نے جو یہ سُنا تو بڑھ کر فرمایا اچھا جب ایسی بات ہے تو ہم کو پھانسی دیدو تاکہ جنت ہمیں حاصل کریں۔ چنانچہ راجہ صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔ خس کم جہاں پاک صادق ہوا۔ تو ان نیم واعظوں سے ایسے بیانوں سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ کارخانہ خداوی بھی دوسرا نیاؤ نگر ہے صاحبو! یاد رکھو کہ خدا تعالے کے ہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا بھی ایک قانون ہے، عذاب کا بھی ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا قانون تو یہی ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے وسارعوا الخ یعنی تقویٰ حاصل کرلو۔ اور مغفرت وجنت لے لو تو معلوم ہوا کہ مغفرت ورحمت کا لینا بالکل ہمارے اختیار میں ہے ورنہ اگر اس کو اختیار میں نہ مانا جاوے تو سارعوا کے کوئی معنی نہیں ہوں گے کیونکہ تکلیف مالا یطاق محال ہے اور خلاف نص ہے اور یہاں امر ہوا مسارعة الی المغفرة کا تو ضرور وہ تحت الاختیار ہے پس جب رمضان کی رحمت رغم انفہ اور مغفرت کا حاصل کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کی تحصیل کی کوشش کرو اور اس وعید رغم انفہ کے مصداق نہ بنو۔ اگر یہ خوف ہو کہ توبہ ٹوٹ جاوے گی اور گناہوں سے باز نہ رہ سکیں گے تو ہمت نہ ہارو کیونکہ پھر توبہ کرلینا دیکھو اگر ایک کپڑا پھٹ جاتا ہے تو اس کو بالکل پھٹا ہوا نہیں

چھوڑتے کہ سینے کے بعد پھر پھٹ جاوے گا بلکہ سی کر پھر کام میں لاتے ہیں پس یہی حالت توبہ کی ہے کہ محض اس کے ٹوٹنے کے احتمال سے اس کو ترک نہ کرنا چاہئیے بلکہ اس وقت پھر توبہ کرلے نا چاہیئے باب توبہ بند نہیں ہوا بلکہ اگر دن میں سو دفعہ بھی توبہ ٹوٹ جاوے تو پھر توبہ کرلو مایوس نہ ہوجاؤ خوب کہا ہے ؎

باز آ باز آ ہر انچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(پھر آؤ پھر آؤ تم جس حالت میں ہو چلے آؤ اگرچہ کافر ہو یا آتش پرست ہو یا بت پرست ہو چلے آؤ۔ ہمارا یہ دربار نا امیدی کا دربار نہیں ہے اگر سو مرتبہ بھی توبہ توڑ چکے ہو جب بھی چلے آؤ۔

بلکہ اسی ترک توبہ ہی کی وجہ سے ہم کو معاصی پر زیادہ جرأت ہو گئی ہے کیونکہ جو شخص توبہ کرتا رہے گا اس کے دل میں عظمت خداوندی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہے گی یہ بڑا سبب ہے معاصی سے رُک جانے کا برخلاف اس شخص کے جو کبھی توبہ نہ کریگا وہ خدا کو بالکل بھول جاوے گا اور جب اس کی عظمت پیش نظر نہ ہوگی تو کچھ بھی اس سے ہو جاوے بعید نہیں۔ یہ مضمون اس عشرہ اخیرہ کے متعلق تھا اور ایک بات اس کے متعلق یاد آئی چونکہ بعض لوگوں کو اس کی ضرورت ہوگی اس لئے اس کا بیان کر دینا بھی اس مقام پر مناسب ہے۔ بات اگرچہ بہت پُرانی ہے اور بہت دفعہ تقریراً اور تحریراً لوگوں کے سامنے پیش ہو چکی ہے مگر چونکہ اکثر لوگوں نے اس کو دل سے بھلا دیا ہوگا اس وقت پھر اعادہ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اس عشرہ میں اکثر مساجد میں قرآن شریف ختم ہوگا اس میں اکثر لوگ پڑھنے والوں کو کچھ دیا کرتے ہیں سو یہ لینا چھوڑ دو۔ دوسرے اکثر مساجد میں ختم کے دن شیرینی تقسیم ہوتی ہے اس میں جو گڑ بڑ ہوتی ہے سبھی جانتے ہیں اور ان گڑبڑوں کی وجہ سے جو شرعی قباحتیں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کو بھی متعدد مرتبہ بیان کر دیا گیا ہے اس وقت ان کے دہرانے کا وقت ہے نہ چنداں ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ

اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس کو بھی چھوڑ دو دیکھو اس کی بدولت بیچارے بعض غربا پر سخت بار ہو جاتا ہے اس انتظام کے متعلق بعض غریب جلاہوں نے شکریہ میں یہ کہا کہ ہم بہت ممنون ہیں کیونکہ ہم کو چندہ دینے کی مصیبت سے بچا لیا معلوم ہوا کہ لوگوں پر چندہ لینے سے بار ہو جاتا ہے یہ کیونکر جائز ہوگا بعض رئیسوں نے مجھ سے کہا کہ آپ غریبوں کو منع کیجئے لیکن امیروں کو منع کرنے کی ضرورت نہیں حالانکہ یہ خیال بالکل لغو ہے اس لئے کہ اگر امیروں نے نہ چھوڑا تو شرم و حجاب کی وجہ سے غربا سے چھٹنا بہت مشکل ہے اور اگر امیروں نے چھوڑ دیا تو غریبوں کو چھوڑنا کچھ مشکل نہیں بعض مساجد ایسی بھی ہیں کہ ان میں چندہ سے شیرینی تقسیم نہیں ہوتی لیکن وہاں دوسری خرابیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً ریاؤ نمود کے لئے تقسیم کرنا عوام الناس اور بچوں کے ہجوم سے مسجد کی بے حرمتی ہونا لڑکوں کا حصہ مانگنے میں بلا وجہ پٹنا غرض اس قسم کی بہت سی خرابیاں ہیں کہ زیرک آدمی ان کو خود سمجھ سکتا ہے۔ ایک دفعہ بریلی میں قرآن سنانے کا اتفاق ہوا ختم کے روز میرے بھائی نے تقسیم شیرینی کے لئے کہا میں نے منع کیا لیکن انھوں نے کہا کیا مضائقہ ہے۔ ان کا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو خود ان خرابیوں کا مشاہدہ ہو جاوے۔ چنانچہ میں خاموش رہا شب کو شیرینی تقسیم کی گئی اور انھوں نے اپنے اہتمام سے خود تقسیم کی۔ لوگوں کے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعد تقسیم خود کہا کہ آپ کی رائے بہت صائب تھی واقعی یہ خرافات کبھی نہ کرنی چاہیئے اور اس کا احساس ان کی دانشمندی کی دلیل ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود خرابیاں سمجھ جانے کے بھی اپنے خیال سے باز نہیں آتے اور اس کو نہیں چھوڑتے۔ یہ احکام تھے عشرۂ اخیرہ کے متعلق ان سب کو یاد رکھنا چاہیئے اور کوشش کرنا چاہیئے کہ ان پر پورے طور سے عمل ہو جاوے اور جو لوگ مجمع میں حاضر نہیں ہیں ان کو بھی پہنچا دینا چاہیئے اور خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ توفیق عمل میں لاوے۔ اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اٰمین بحرمتہ جاہ سید المرسلین صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد دوم ۲

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

اکمال الصوم والعید

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد دوم کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

اکمال الصوم والعید

این	متیٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمینی	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۸ رمضان ۱۳۲۹ھ	۳ گھنٹہ	بیٹھ کر	تدارک تقصیرات رمضان و احکام عید	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم	تقریباً ۲۵۰	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ لشھر رمضان۔ ھو شھر اولہ رحمۃ واوسطہ مغفرۃ وآخرہ عتق من النیران۔

فضائل رمضان کے متعلق گزشتہ جمعہ میں مبسوط مضمون بیان ہو چکا ہے

آج صرف دو مضمونوں کا بیان کرنا مقصود ہے ایک بقیہ رمضان المبارک کے متعلق اور دوسرا عید کے متعلق۔ اس حدیث شریف کو اس لئے اختیار کیا گیا کہ اس میں دونوں مضمونوں کے متعلق ذکر ہے یہ حدیث شریف ایک بڑی حدیث کا جزء ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری جمعہ کے دن خطبہ میں پڑھا تھا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری جمعہ میں ایک خاص خطبہ پڑھا جو کہ اور جمعوں میں نہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں سے تعجب ہے کہ انھوں نے اس منصوص خطبہ پر تو توجہ نہ کی اور شعبان کے آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز نہ کیا جس سے وہ عامل بالسنت ہوتے اس کے بجائے رمضان کے آخری جمعہ کے لئے ایک خاص خطبۃ الوداع اختراع کیا جس کا کہیں حدیث میں پتہ نہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسا شغف ہوا کہ بغیر اس خاص خطبہ کے پڑھے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا جمعہ ہی نہیں ہوا اگرچہ بحمد اللہ اس وقت لوگوں کو اس کے نہ پڑھنے سے وہ وحشت جو کہ اس کے قبل ہوتی تھی نہیں ہوتی لیکن تاہم اب بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہ اس خاص الوداعی خطبہ کو آخری جمعہ رمضان کا لازمی عمل سمجھتے ہیں اور بڑا تعجب تو یہ ہے کہ بعض اہل علم کو بھی دھوکا ہو گیا اور وہ سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ آخری جمعہ کے لئے کوئی خاص خطبہ تجویز کرنا بدعت ہے لیکن چونکہ اس کی وجہ سے لوگ اکثر جمع ہو جاتے ہیں اس لئے اس کو اجتماع کے لئے معین اور ادار صلوٰۃ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے باقی رکھنا چاہیے حالانکہ یہ سخت غلطی اور من وجہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا ہے۔ غلطی تو اس لئے کہ شریعت کا مشہور حکم ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں کچھ مصلحتیں بھی ہوں اور کچھ مفاسد بھی ہوں اور وہ کام بالذات یا بغیر مطلوب شرعی نہ ہو تو ان مفاسد پر نظر کر کے اس کام کو ترک کر دیں گے اور مفاسد سے بچیں گے مصالح کا اعتبار نہ کریں گے۔ اور یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے جس کو اہل علم بخوبی سمجھ گئے ہوں گے لیکن عوام کے سمجھانے کے لئے میں اس کو ایک مثال میں عرض کرتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص مجلس رقص منعقد کرے

اور کہے کہ اگرچہ رقص فی نفسہ ممنوع اور حرام ہے لیکن میری غرض اس مجلس سے لوگوں کو جمع کرنا ہے تاکہ جمع ہو جانے کے بعد میں اپنی وجاہت سے کام لے کر ان کو نماز پڑھنے پر مجبور کر دوں اور اس طرح ان کو نماز پڑھنے کی عادت ہو جاوے تو دیکھئے بظاہر اس مجلس کی غایت کس قدر خوبصورت ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو نماز پڑھنے کی عادت ڈالی جاتی ہے لیکن چونکہ اس مجلس میں ایک مصلحت کے ساتھ بہت سے مقاصد بھی ہمدوش ہیں اور مجلس رقص بالذات یا بالغیر مطلوب نہیں جیسا کہ ظاہر ہے اس لئے شریعت اس مصلحت مذکورہ کی وجہ سے اس کی اجازت نہ دے گی بلکہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس مجلس کے انعقاد سے باز رکھے گی۔ ہاں اگر کوئی کام بالذات یا بالغیر مطلوب ہو اور اس میں مصالح کے ساتھ مفاسد بھی ہوں تو اس کام کو ان مفاسد کی وجہ سے ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ اس کو باقی رکھ کر مفاسد کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاوے گی مثلاً عیدگاہ کا اجتماع ادائے صلوٰۃ کے لئے شرعاً مطلوب ہے پھر اگر لوگ اپنی بدتمیزی کی وجہ سے اس میں کچھ خرابیاں آمیز کر لیں جیسا کہ مثلاً آج کل عام طور سے بچوں کو عیدگاہ لے جانے کا رواج ہو گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دُم چھلا ضرور لئے ہے اور حیرت تو یہ ہے کہ باوجود ہر سال تکلیف اٹھانے کے پھر بھی لوگوں کو اس کی ذرا حس اور تمیز نہیں ہوتی شاید کوئی سال ایسا ہوتا ہو کہ بچے عیدگاہ میں جا کر عین نماز کے وقت رونا بسورنا نہ شروع کرتے ہوں بلکہ ایک دو تو ان میں سے ہگ موت بھی دیتا ہے۔ خود میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ میرے ایام تعلیم میں ایک میرا عزیز کم عمر میرٹھ کی عیدگاہ میں والد صاحب کے ساتھ گیا اور اس نے نماز کے وقت تقاضائے حاجت کی فرمائش کی اس کی فرمائش سن کر سخت پریشانی ہوئی اول تو عین نماز کا وقت دوسرے میرٹھ کی عیدگاہ جس میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع کہیں قریب ایسا جنگل بھی نہیں جس میں اس کو بٹھلا دیا جاتا پھر نماز کھڑے ہونے کا وقت بالکل

قریب آخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک حلوائی کو چار آنے دیئے گئے اس نے اپنے تختے کے نیچے ان کو بٹھلا لیا چاروں طرف سے کپڑا لٹکا ہوا تھا اوپر رنگ برنگ کی مٹھائی اور اندر یہ تحفہ بھرا ہوا تھا یہاں ایک عبرت ناک مضمون خیال میں آیا کہ یہ بھی حالت ہم لوگوں کی ہے کہ اس مٹھائی کی طرح ہمارا ظاہر تو نئے نئے انداز سے پر رونق اور چکنا چپڑا رہتا ہے لیکن ہمارے باطن کی یہ حالت ہے کہ گوہ در گوہ مرغی کا گوہ ہوائے نفسانی سے لبریز بیہودہ خیالات سے پُر خدا سے دور شیطان سے قریب ایک محقق نے خوب فرمایا ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ واندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید ۔۔۔ واز درونت ننگ میدارد یزید

ظاہر کے اعتبار سے تو کافر کی قبر کی طرح ہے جو کپڑوں سے آراستہ ہے حالانکہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب ہے۔ تو نے اپنی ظاہری حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ تو حضرت بایزید بسطامی رحؒ پر طعنہ کرنے والا ہے حالانکہ تیرے باطن سے یزید بھی شرماتا ہے۔

صورت تو ایسی مقطع کہ معلوم ہو کہ اگر وحی منقطع ہو نہ چکی ہوتی تو حضرت جبرئیل انھیں کی خدمت میں آتے۔ اور دل کی یہ حالت کہ شیطان کے بھی شیطان جیسا حدیث میں ہے۔ السنتھم احلی من السکر وقلوبھم امر من الذیاب یلبسون جلود الضان (ان کی زبانیں تو شکر سے بھی زیادہ شیریں ہیں اور ان کے قلوب بھیڑیوں سے بھی زیادہ سخت ہیں جو پہنے ہوئے ہوں بھیڑیوں کی کھالیں) غرض عیدگاہ کی حاضری میں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے تو اگر کوئی عاقل پہلے کلیہ کی بنا پر یہ کہے کہ ان مفاسد کی وجہ سے عیدگاہ کا اجتماع بھی چھوڑ دینا چاہیئے جس طرح رقص کی مجلس باوجود ایک مصلحت کے کثرت مفاسد کی وجہ سے واجب الترک ہوئی تو اس سے کہا جاوے گا کہ چونکہ عیدگاہ کا اجتماع شریعت میں مطلوب ہے، اس لئے اس موقع پر وہ قاعدہ نہ برتا جاویگا اور عیدگاہ اور عیدگاہ کا جانا ترک نہ کیا جاوے گا بلکہ بجائے اس کے ان مفاسد کی اصلاح کی کوشش کی جاوے گی یعنی مثلاً لوگوں سے کہا جاوے گا کہ بچوں کو

عیدگاہ میں لے کر نہ آیا کریں اور اگر کسی کو اس اجتماع کی مطلوبیت میں کلام ہو جیسا اس وقت بعض نام کے مشائخ بجائے عیدگاہ کے اپنی مساجد ہی میں بلاضرورت صرف اتفاقیانہ کے لئے عیدین پڑھتے ہیں تو میں اس کا ثبوت حدیث سے دیتا ہوں دیکھئے مسجد نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے لیکن باوجود اس کثرت ثواب کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس موقع پر عیدگاہ میں تشریف لے گئے اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز نہیں پڑھی پس معلوم ہوا کہ عیدگاہ کا اجتماع ایک مہتم بالشان مطلوب ہے اور ممکن ہے کہ عیدگاہ کے ثواب میں بجائے کثرت کمی کے کیفاً کثرت ہو جاتی ہو یعنی وہ ایک ثواب ہی ان پچاس ہزار ثواب سے زیادہ ہوتا ہو اور اسی کثرت کیفی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کو چھوڑ کر عیدگاہ جاتے ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچے کے سامنے ایک گنی اور دس روپیہ پیش کئے جاویں تو بچہ دس روپوں کو عدد میں زیادہ دیکھ کر انہیں کو اٹھالے گا۔ اگر کسی بڑے آدمی کے سامنے ان دونوں کو پیش کیا جاوے تو وہ روپوں کو چھوڑ دے گا اور گنی اٹھالیگا کیونکہ گنتی میں گو ایک اور دس کا فرق ہے لیکن کیفاً وہ ایک اُن دس سے زیادہ ہے پس اسی طرح ممکن ہے کہ عیدگاہ کے اجتماع میں کیفاً اس قدر ثواب ہو کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتماع میں وہ نہ ہو اور ہر چند کہ یہ تضاعف ثواب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہے فرائض کے ساتھ اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ کسی کو استدلال مذکور میں خدشہ ہو کہ صلوٰۃ عیدین میں یہ تضاعف مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھا۔ پس استدلال تام نہیں سو جواب یہ ہے کہ واجب بھی ملحق ہوتا ہے فرض کے ساتھ پس دونوں کا یکساں حکم ہوگا اور عیدگاہ کے اجتماع میں بالخصوص یہ بھی بھید ہے کہ مسلمان مختلف اطراف سے سمٹے ہوئے ہر ایک میدان میں جمع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا اجتماع ان کے بدخواہوں کے قلب پر موثر ہوتا ہے اور اسلامی شوکت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اعظم مقاصد ملت سے ہے اور اس خاص اجتماع میں مطلق اجتماع جو محقق ہے وہ خود بھی اسرار مہمہ پر مشتمل ہے چنانچہ ایک ادنیٰ راز یہ ہے کہ سب کی عبادات مجتمع ہو کر جو سرکار میں پیش

ہوں گی اگر بعض قابل قبول ہوئی تو اس کی برکت سے بقیہ بھی مقبول ہوں گی اور انہیں حکمتوں سے شرع میں جماعت کا بہت اہتمام ہے حتیٰ کہ جماعت کی نماز اگر وسوسوں کے ساتھ بھی ہو تو تب بھی تنہا نماز سے بدرجہا بڑھ کر ہے اس لئے کہ وہ شرعاً مطلوب ہے اور قطع وساوس اس درجہ مطلوب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

افسوس ہے کہ بعض اکابر کو یہ دھوکہ ہو گیا کہ اگر جماعت کی نماز میں وسوسہ آویں اور تنہائی میں اجتماع قلب ہو تو تنہا پڑھنا بہتر ہے جماعت کو چھوڑ دینا چاہیئے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس کو ہم اپنی رائے سے غلط نہیں کہتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی تغلیط فرمائی ہے ہم ان بزرگوں پر اعتراض نہیں کرتے ہم صرف ان کی غلطی کا اظہار کرتے ہیں غرض چونکہ شریعت میں اجتماعی مصالح کی زیادہ رعایت ہے اور ظاہر کہ جو اجتماع عیدگاہ میں ہوگا مسجد میں نہ ہوگا لہٰذا گو کماً عیدگاہ کا ثواب زیادہ نہ ہو لیکن کیفاً زیادہ ہے اس لئے باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع کا ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں ارشاد ہے جنبوا مساجدکم صبیانکم (اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو) کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عیدگاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب دیں گے کہ مساجدکم میں دو احتمال ہیں یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہو تب تو عیدگاہ کا اس حکم میں داخل ہونا ظاہر ہے اور اگر اس کو عام نہ کیا جاوے تو گو ان الفاظ میں عیدگاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک وصاف نہیں ہوتے ان کی آمد ورفت سے ایسی جگہ کے ملوث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی اور اس سے نماز میں خلل پڑے گا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عیدگاہ میں بھی پائی جاتی ہے لہٰذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا چنانچہ خود عیدگاہ کے

باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ولیعتزلن الحیض المصلیٰ (البتہ الگ رہیں حائضہ عورتیں عیدگاہ سے) پس اس مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا۔
کہ وہ کلیہ اس وقت ہے جبکہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ یہ تو دعویٰ غلطی کی دلیل میں تھا' رہا دوسرا دعویٰ کہ خطبۃ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض ہے سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصالح مطلوب ہوئیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب وسنت کی تعلیم ناتمام ہوئی کہ بعض مصالح ضروریہ کی تعلیم میں فروگذاشت ہوگئی کیا کوئی اس کا قابل ہوسکتا ہے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت فرمایا ہے اور بعض بدعت کے حسنہ ہونے سے اگر شبہ ہو تو درحقیقت وہ بدعت ہی نہیں اور اس قسم کا احتمال خطبۃ الوداع میں نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر یہ معنی سنت ہوتا کو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لی جاوے تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہوگیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نار کی وعید فرمارہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عین ارشاد حق ہے تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض بھی ہے اور خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاح بھی ہے لیکن ہمارے اس قول سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ارشاد خداوندی ہے کوئی یہ نہ سمجھ جاوے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہ فرماتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے لیکن آپ کا اجتہاد موقوف رہتا تھا اگر وحی میں اس پر نکیر نہ ہو تب تو وہ حجت رہتا تھا کیونکہ سکوت اس کی تقریر پر دلالت کرتا ہے ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہوجاتی تھی غرض ہر حال میں وہ اجتہاد بھی حکماً وحی ہوجاتا تھا لہٰذا باوجود وجود اجتہاد کے بھی یہ کہنا صحیح ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اہل علم کی ایسی ہی لغزشوں کی وجہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ بعضے لوگ بدعات

میں مصالح بیان کرتے ہیں اور اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے یہ کہا جاتا ہے کہ تربیۃ اور ارشاد خصوص حکمت فہمی اور اجتہاد ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے چند اصطلاحات یاد کر کے مسند ارشاد یہ پر متمکن ہو جاوے بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے کہ ظاہری ضروری علم کے ساتھ مدد خداوندی بھی اس کے ساتھ ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ علماء امت نے اس کے اقوال کو قبول کر لیا ہو اور علماء کا گروہ اس کی طرف متوجہ ہو چنانچہ اس قسم کی ایک لغزش یہ ہے کہ بعضے لوگ جمعہ کی نسبت کہتے ہیں کہ دیہات میں گو نہ ہو لیکن اگر پڑھ ہی لیا جاوے تو نہ پڑھنے سے تو بہر صورت پڑھنا اچھا ہے میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ بمبئی میں گو حج نہیں ہوتا لیکن اگر پھر بھی کر لیا جاوے تو کیا حرج ہے نہ کرنے سے تو اچھا ہی ہے اس کا کیا جواب ہے آخر یہی کہو گے کہ بمبئی حج کا محل نہیں ہے میں کہونگا دیہات جمعہ کا محل نہیں غرض فہم دین کے لئے عقل کامل کی ضرورت ہے اس میں ظاہر بینی اور بھولا بھالا ہونے سے کام نہیں چلتا اور یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کامل العقل ہوئے ہیں کوئی نبی بھی بھولا نہیں ہوا۔ اکثر لوگ بزرگوں کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ بہت بھولے ہیں لیکن یاد رکھو کہ بھولے ہونے سے اگرچہ بعض اوقات انسان بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے اور اس لئے بھولا ہونا بھی گونہ فضیلت ہے لیکن فی نفسہ بھولا ہونا کوئی کمال نہیں ہے کیونکہ اس سے آدمی بہت سے فضائل سے محروم رہتا ہے اس لئے کوئی نبی بھولا نہیں ہوا تمام انبیاء کرام کامل العقل ہوئے ہیں اور در واقع میں عقل ہے بھی بڑی نعمت۔ ایک صوفی سے میرے سامنے ایک شخص نے سوال کیا کہ سالک کا مرتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا انھوں نے اس کا عجیب جواب دیا مجھے وہ جواب بہت ہی پسند آیا فرمانے لگے کہ اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ عقل اتنی بڑی نعمت ہے کہ شریعت نے شرب خمر کو حرام کر دیا جس سے وہ زائل ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ سالک کی عقل ٹھکانے رہتی ہے اور مجذوب عقل سے باہر ہوتا ہے اب تم خود سمجھ لو کہ سالک کا رتبہ بڑا ہے یا مجذوب کا شرح الصدور علامہ سیوطی رح کی ایک کتاب ہے وہ اس میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت

فرمایا کہ اے عمر اس وقت تمہاری کیا حالت ہو گی کہ جب تم قبر میں تن تنہا رکھے جاؤ گے اور دو عجیب الخلقت فرشتے تم سے آکر توحید و نبوت کے بارے میں سوال کریں گے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اور کس قدر پیارا جواب عرض کیا اور اگر وہ بھی یہ جواب نہ دیتے تو کون دیتا عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمایئے کہ اس وقت ہماری عقل رہے گی یا نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں عقل باقی رہے گی بلکہ عقل میں اور ترقی ہو جاوے گی (کیونکہ ہیولانی حجاب اس وقت باقی نہ رہیں گے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر عقل باقی رہے گی تو کوئی خوف کی بات نہیں انشاء اللہ سب معاملہ درست ہوگا۔ دیکھئے یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم عقل کی کس قدر عزت کرتے تھے اور اس کو کتنی بڑی نعمت سمجھتے تھے ایک ہم لوگ ہیں کہ ذہاب عقل کو امارات بزرگی سے سمجھتے ہیں ایک قصہ اس مقام پر یاد آیا گو میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا اور اس لئے ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن اس کے غلط ہونے سے ہمارا ضرر نہیں کیونکہ ہم تو اپنے مضمون کو حدیث سے مؤید کر چکے ہیں وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت رابعہؒ کو جس وقت دفن کیا تو حسب قاعدہ فرشتوں نے آکر سوال کیا تو حضرت رابعہؒ نہایت اطمینان سے جواب دیتی ہیں کہ کیا اس خدا کو جسکو عمر بھر یاد رکھا گر زمین کے نیچے آکر اُسے بھول جاؤں گی تم اپنی خبر لو کہ بڑی مسافت طے کر کے آئے ہو تم کو بھی یاد ہے کہ نہیں سبحان اللہ ان حضرات کا بھی کیا اطمینان ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

(اگر منکر نکیر آکر پوچھیں گے کہ تمہارا رب کون ہے تو کہوں گا کہ وہی ہے جو ہمارے اس دیوانے دل کو لے گیا ہے)

کیسے اطمینان سے فرماتے ہیں کہ میں تو یہ جواب دیدوں گا کہ ؏

آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

تو یہ سارا اطمینان بقاء عقل ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لئے اس صوفی نے یہ کہا کہ

بھائی سالک کا رتبہ بڑا ہے کیونکہ اس کی عقل باقی رہتی ہے جس کی بدولت اس کو سینکڑوں مصیبتوں سے نجات ہو جاتی ہے لیکن اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام تو سب کے سب کامل العقل ہوئے جو صوفیاء ہیں جو کہ انبیاء ہی کے نائب ہیں کچھ سالک یعنی کامل العقل اور کچھ مجذوب یعنی جن کی عقل علیہ حالات سے مغلوب ہو گئی ان میں یہ دو قسمیں کیوں ہوئیں سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو سب کے سب ارشاد و تربیت کی غرض سے بھیجے گئے تھے اس لئے ان کا کامل العقل ہونا ضروری تھا کیونکہ اس کے بغیر تربیت نہیں کر سکتے تھے اور اولیاء بعضے تو ارشاد خلق کی غرض سے پیدا ہوتے تھے ان کو تو سلوک کا مرتبہ عطا ہوتا ہے تاکہ بقائے عقل کے ساتھ تربیت کا کام انجام دے سکیں اور یہ ہی لوگ ہیں جن کو ورثۃ الانبیاء کہا جاتا ہے اور بعضے محض اپنے ہی کام کیلئے پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق تربیت نہیں ہوتی مجذوبین ان ہی میں ہوتے ہیں گو بعض غیر مجذوبین بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی یہ شان ہوتی ہے کہ ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

بخلاف سالکین کے کہ ان کی حالت ان کی حالت کے بالکل خلاف ہے ان کی یہ حالت ہے کہ ع خاص کند بندہ مصلحت عام را

ہاں مجذوبین سے بھی ایک قسم کا فیض ہوتا ہے جو بلا ان کے اختیار کے محض وجود با وجود کی بدولت ہے سو اس کے لئے بھی عقل کی ضرورت نہیں عقل کی ضرورت اس فیض کے لئے ہے جو باختیار ہو غیر اختیاری فیض کی مثال آفتاب کا نور ہے کہ گو آفتاب قصد نہ کرے لیکن اس کا نور عالم کو پر نور ضرور کرے گا۔ اسی طرح اللہ کے نیک بندے جہاں کہیں ہوتے ہیں ان کی برکات عالم کو منور ضرور کرتے ہیں اسی برکت کی نسبت ارشاد خداوندی ہے۔ ماکان اللہ لیعذبھم وانت فیھم (جب تک آپ ان لوگوں میں ہیں اللہ کبھی ان لوگوں کو عذاب نہیں دے گا) جیسا کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے کہ بدکاروں کی بدولت اچھے لوگ تباہ و ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے پہلا قاعدہ ٹوٹ گیا کیونکہ وہ اچھے لوگ جو کہ ان بدکاروں کی وجہ سے تباہ

و برباد ہوئے یا تو وہ صورۃً اچھے ہوتے ہیں واقعے میں اچھے نہیں ہوتے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاں شہر کو اُلٹ دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی اے اللہ اس شہر میں فلاں شخص رہتا ہے جس نے کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی کیا اس کو بھی سب کے ساتھ الٹ دوں ارشاد ہوا کہ گو ظاہراً اس نے نافرمانی نہیں کی مگر دوسروں کی نافرمانی دیکھ کر اس میں کبھی تغیر پیدا نہیں ہوا لہٰذا اس کو بھی الٹ دو دیکھئے یہ شخص ظاہری حالت میں ایسا بزرگ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی دھوکا ہو گیا لیکن واقع میں ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا تھا کہ اس کو خدا تعالیٰ اور اس کے احکام کے ساتھ محبت کا جوش ذرا نہیں تھا ورنہ یہ ممکن نہیں کہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو اور ان کی مخالفت و نافرمانی دیکھ کر یا شریعت کا استخفاف سن کر اس کے دل میں مخالفین سے غیظ نہ پیدا ہو یا اس کو ان کی حرکات ناگوار نہ ہوں اگر کسی دیندار کو ایسے امور ناگوار ہوتے ہیں تو اس کو متعصب اور بدمزاج کہا جاتا ہے اور یہ رائے دی جاتی ہے کہ صاحب نرمی سے جواب دینا چاہیئے تھا مگر میں کہتا ہوں کہ کسی شخص سے یہ کہا جاوے کہ ہم نے تمہاری ماں کو بازار میں بیٹھے ہوئے بازاری عورتوں کے حرکات میں مبتلا پایا ہے تو کیا یہ شخص اپنی ماں کی نسبت ٹھنڈے دل سے یہ الفاظ سن لے گا اور کہنے والے پر حملہ کرنے کو آمادہ نہ ہو جاوے گا کیا اُس کے اُس جوش کو تعصب کہا جاوے گا اس کو بھی ایسی رائے دی جاوے گی مگر مولویوں پر الزام ہے کہ یہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں اور ان کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے یہ بڑے متعصب ہیں لیکن صاحبو ذرا غور کیجئے اور انصاف سے کام لیجئے کوئی مولوی بھی سیدھی بات پر خفا نہیں ہوتا نہ کسی مولوی کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے اگر پوچھنے کی طرح ان سے پوچھا جاوے اور بات کرنے کی طرح ان سے بات کی جاوے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولوی غصہ کریں اور خفا ہوں، ہاں جب ان کے ساتھ استہزا اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر اعتراض بطور عناد کیا جاتا ہے تو ضرور وہ بے تاب ہو جاتے ہیں اور غصہ یا بے تابی

تعصب نہیں ہے یہ دین کی حمیت ہے صاحبو کیا شریعت کے احکام کی وہ عظمت اور محبت بھی دل میں نہ ہونا چاہیئے جو کہ اپنی ماں کی ہے کہ ماں کے نسبت ناگوار کلمات سن کر تو انسان قابو سے باہر ہو جائے اور اپنے آپے میں نہ رہے اور شریعت کی ہتک ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کو غصہ بھی نہ آجاوے اور جن کو غصہ نہیں آتا وہ ناحقیقت شناس ہیں اس لئے ان کو غیرت نہیں آتی کچھ دنوں اس رنگ میں اپنے قلب کو رنگواور پھر بھی اگر یہ حالت رہے تو جانیں۔ صاحبو محض الفاظ کے سننے سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ کیفیت کیونکر ہو جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ اپنے اوپر یہ حالت گذری نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

یکے پرسید کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ما شوی بدانی

کسی شخص نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہے۔ میں نے کہا کہ جب تو ہمارے جیسا ہو جائے گا خود ہی جان جائے گا۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تقلیداً کہہ رہا ہوں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جن حضرات کی تقلید اختیار کی ہے ان کو سچا سمجھتا ہوں۔ صاحبو ان حضرات کی غیرت کی یہ حالت تھی کہ خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کرنے والی چیزوں کو گو وہ چیزیں ان کی کیسی مرغوب ومحبوب ہوں طاغوت سمجھتے ہیں۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک پرندہ اس میں اڑ کر آگیا اور چونکہ باغ نہایت گنجان تھا باہر نکل جانے کے لئے اس کو کوئی راستہ نہ ملا پریشان اِدھر اُدھر اُڑتا پھرنے لگا۔ اس پرندہ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے دل میں باغ کے گنجان ہونے پر گونہ مسرت پیدا ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ ماشاء اللہ کہ میرا باغ کس قدر گنجان اور اس کے درخت ایک دوسرے سے کیسے پیوستہ ہیں کہ کسی پرندہ کو بھی باآسانی نکل جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ خیال آتو گیا لیکن چونکہ دل میں عظمت ومحبت خداوندی معراج کمال پر تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پُر برکت سے فیضیاب تھے اس لئے فوراً ہی تنبہ ہوا اور دل میں سوچے کہ اے طلحہؓ تیرے دل میں مال کی یہ محبت کہ حالتِ نماز

ہیں تو اُدھر متوجہ ہوا آخر نماز کے بعد بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے باغ نے آج مجھے عین نماز کی حالت میں خدا سے غافل کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا لہٰذا اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا اور وہ اس غفلت عن الحق کے کفارہ میں میں اس کو وقف کرتا ہوں آخر اس کو وقف کر دیا جب دل کو اطمینان ہوا ان حضرات کی یہ شان ہے کہ اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون کہ اگر شیطان کے وسوسہ سے کسی ضعیف درجہ میں بھی ان کے قلب کو میلان الی الدنیا ہو جاتا ہے تو فوراً متنبہ ہوتے ہیں اور ایسا قلق ہوتا ہے کہ گویا ہفت اقلیم کی سلطنت ان کے قبضہ سے نکل گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت نکل جانے میں بھی اتنا صدمہ نہیں ہوتا جو ان حضرات کے قلب پر اس میلان سے ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا بہر چہ دوست وا مانی چہ کفراں حرف چہ ایماں

جو کلمات دوست سے ملانے والے ہیں اس میں کفر کے کلمے ہوں یا ایمان کے برابر ہے اور جو نقش دوست سے دور کرنے والا ہے وہ اچھا ہو یا بُرا سب برابر ہے۔

شاید لوگوں کو یہ تعجب ہے کہ ذرا سا خیال آجانے سے ان کے دل پر ایسا صدمہ کیسے گذرا تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان لوگوں کے نزدیک تمام دنیا بھی شغل بحق کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے تو اللہ والوں کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں۔

ایک خلال اتنا قیمتی ہے کہ دنیا تمام اس پر فدا ہے اور دنیا تو کیا ان کو مطلوب ہوتی عالم آخرت کی طرف بھی ان حضرات کی توجہ صرف اس لئے ہے کہ وہ ان کے مطلوب یعنی رضائے حق کا محل ہے ورنہ ان کی یہ شان ہے کہ ؎

باتو دوزخ جنت است اے جاں فزا بے تو جنت دوزخ است اے دل ربا

اے میری جان کو بڑھانے والے تیرے ساتھ رہ کر تو دوزخ بھی جنت ہے

اور اے میرے محبوب تیرے بغیر جنت بھی میرے لئے دوزخ ہی ہے۔

اور مولانا یہ بھی فرماتے ہیں ؎

گفت معشوقے بعاشق کاے فتیٰ تو بغربت دیدهٔ پس شہر ہا

پس کدامی شہر ازانہا خوشتر شت گفت آں شہرے کہ دروے دلبر ست

کسی معشوق نے اپنے عاشق سے کہا کہ اے میاں تو نے سفر کی حالت میں بہت سے شہر دیکھے ہیں تو ان میں سے کونسا شہر تیرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

جنگل میں اگر محبوب کا ساتھ ہو جاوے تو ہزار آبادی سے بڑھ کر ہے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ اقوال غلبہ حالت وولولہ محبت کے ہیں کوئی واقعی تحقیق نہیں ہے تو یاد رکھو کہ اس کے بارہ میں نص موجود ہے۔ حدیث میں ایک صحابی حضرت ثوبانؓ کا واقعہ آیا ہے کہ وہ حضرت سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم جنت میں گئے بھی تو ہم کو وہ درجہ تو نصیب نہیں ہوسکتا جو درجہ آپ کا ہوگا اور جب ہم اس درجہ پر نہ پہنچ سکیں گے تو آپ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوگا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر سکوت فرمایا آخر وحی نازل ہوئی کہ من یطع اللہ والرسول فالئک مع الذین انعم اللہ علیہم الایہ (جو شخص اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرتا ہے وہ قیامت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی یعنی یہ ضرورت نہیں کہ اس درجہ میں عارضی طور پر پہنچنے کے لئے اسی درجہ کے اعمال کی ضرورت ہو صرف اتباع اور محبت نبی کافی ہے جیسے دربار شاہی میں خدمت گار محض معیت وخدمت شاہ کی وجہ سے دیگر رؤسا سے پہلے پہنچتا ہے اس لئے مع الذین فرمایا آگے ذالک الفضل میں بھی تصریح

بھی فرمادی ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا اثر مت سمجھنا یہ محض فضل ہے اور واقع میں اگر غور کیا جاوے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین اور ایمان اور ہماری دنیا اور سب سامان ہماری نماز ہمارا روزہ ہمارا ثواب درجات جو بھی کچھ ہے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی طفیل ہے۔ چنانچہ ان آیات کے شان نزول کے انضمام سے صاف معلوم ہوتا ہے جن میں ارشاد ہوتا ہے ذلك الفضل من الله وكفى بالله عليما اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں یہ محض فضل خداوندی ہے کہ تم کو ایک بہانہ محبت سے باریابی کی دولت نصیب ہوگئی اور یا یہ مطلب ہے کہ ذالك الفضل سے بعض مغلوب الیاس لوگوں کی ناامیدی دور کرنا ہے کہ شاید کسی کو یہ خیال ہو جاوے کہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ ہم اس درجہ تک پہنچ سکیں تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ اگرچہ تم اس قابل نہیں لیکن نعمت تمہارے اعمال کی جزا نہیں ہے کہ تم ان پر نظر کر کے اس نعمت سے مایوس ہو جاؤ یہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل وجود ہے جس کے لئے تمہارے اعمال کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے سبحان اللہ قرآن پاک بھی کیا عجیب چیز ہے کہ دو متعارض شبہے ایک عُجب دوسرا یاس اور ایک جملہ میں دونوں کا جواب خواہ یوں کہہ لو خواہ یوں کہہ لو ۔

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ میدارد ۔ برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اس کے عالم حسن کی بہار دل کو بھی اور جان کو بھی تازہ رکھتی ہے جو رنگ وروپ کو پسند کرتے ہیں ان کو صورت کے ذریعہ اور جو لوگ اندرونی حقیقتوں کا خیال رکھتے ہیں ان کو اپنی خوشبو سے تازہ اور خوش رکھتا ہے۔

ہر مذاق ہر طبیعت ہر رنگ کا علاج قرآن میں موجود ہے پس روایت ثوبان رضی اللہ عنہ سے بھی یہ بات بالکل صاف معلوم ہوگئی کہ ۔

با تو دوزخ جنت است اے جانفزا بے تو جنت دوزخ است اے دلبر با

کیونکہ ان کے اس خیال پر انکار نہیں فرمایا گیا بلکہ تسلیم کر کے تسلی کی گئی غرض یہ مضمون بالکل سنت کے موافق ہے نرا نکتہ تصوف یا شاعرانہ نہیں۔ سو یہ ہے ان حضرات کی شان کہ دونوں عالم بھی ان کے نزدیک خدا تعالیٰ کی رضا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لقا کی برابر نہیں خوب کہا ہے ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن ارزانی ہنوز

تو اپنی قیمت یہ دونوں عالم بتلاتے ہیں قیمت اور بڑھاؤ یہ تو بہت سستا ہے

محبت اور غیرت کی تو خاصیت ہی ہے کہ جب یہ بڑھ جاتی ہے تو سب کچھ چھوٹ جاتا ہے حضرت ابراہیم بن ادہم نے غیرت ہی میں سلطنت چھوڑ دی تھی اور وجہ اس سب کی یہ ہوتی ہے کہ ایک حالت میں دو طرف توجہ کرنی پڑتی ہے اور یہ ممکن نہیں اس واسطے مجبوراً ایک طرف کی توجہ کو ترک کر دینا پڑے گا۔ اب رہی یہ بات کہ کس جانب کو ترک کیا جاوے تو ظاہر ہے کہ توجہ الی اللہ کی دولت تو قابل ترک نہیں لہذا دنیا ہی پر لات ماردیتے ہیں، خوب کہا ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے بہ ازآنکہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

دل کے اطمینان کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے محبوب کی طرف نظر کرنا اس سے بہتر ہے کہ سر پر شاہی تاج ہو اور سارے دن ہوہا ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم نے اسی کے تحصیل کے لئے سلطنت پر لات ماردی لیکن انبیاء علیہم السلام پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب دو طرف کامل توجہ نہیں ہو سکتی اور یہ حضرات علی سبیل الیقین جیسا کہ حکمت بعثت شاہد ہے متوجہ الی الخلائق تھے۔ اور جب متوجہ الی الخلق تھے تو توجہ الی اللہ یقیناً کم ہوگی اور جب یہ کم ہوگی تو نقص ہوگا۔ اور نقص اس لئے منافی نبوت ہے کہ مرتبہ نبوت مراتب کمال کے اعلیٰ پایہ کا نام ہے کہ بشر کو اس سے بڑھ کر مرتبہ عطا ہو ہی نہیں سکتا۔ پس اگر ان کو بھی جانا جاوے اور اس کی وجہ سے کامل فرض کیا جاوے

تو کیا وجہ کہ ان میں انقطاع عن الخلق جو لازمہ کمال ہے نہیں پایا جاتا وجہ اس شبہ کی گنجائش نہ ہونے کی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جو توجہ الی الخلق ہوتی ہے وہ چونکہ بامر خداوندی ہے لہذا اس امتثال کی وجہ سے اس توجہ الی الخلق میں خود توجہ الی اللہ موجود ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام امت کی طرف جو متوجہ ہوتے اور ان کو پیغام حق پہنچاتے ہیں سو اسی لئے کہ اس توجہ اور تبلیغ کا ان کو حکم ہے اور اس کا امتثال ان پر واجب ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اس توجہ الی الخلق کے ساتھ توجہ الی اللہ کی مثال یہ ہے کہ اگر تم کسی آئینہ کی طرف اس لئے متوجہ ہو کہ اس میں تمہارے محبوب کا عکس نظر آرہا ہے جب کہ کسی وجہ سے خود اس کے عین کو نہ دیکھ سکو تو گو ظاہراً تمہاری توجہ آئینہ کی طرف ہے لیکن عین یہ توجہ عین محبوب کی طرف توجہ ہے اسی طرف انبیاء علیہم السلام کے لئے تمام خلائق مرأت ہیں جس کی طرف متوجہ ہونے سے مقصود اُن کا توجہ الی الخلق ہے پس ان کے لئے توجہ الی الحق سے مانع نہیں غرض محبان حق غیر حق کی طرف متوجہ ہونے سے غیرت کرتے ہیں اور اسی صفت غیرت سے ان میں جوش دین پیدا ہوتا ہے جس کو لوگ تعصب کا غصہ سمجھتے ہیں اور وہ ایسا مطلوب ہے جس کے نہ ہونے سے وہ شخص اُلٹ دیا گیا پس یہ شخص ظاہر میں نیک تھا اور واقع میں نیک نہ تھا پس وہ قاعدہ نہ ٹوٹا یا اگر وہ واقع میں بھی نیک ہوں تو وہ صورۃً ہلاک ہوتا ہے اور معنی رحمتہ بہرحال یہ بات ثابت رہی کہ نیکوں کی بعض برکات اضطراری بھی ہوتی ہے جس میں قصد اور اختیار کی ضرورت نہیں لیکن جو برکت اختیاری ہوگی اس کے لئے عقل کامل وافر کی احتیاج ہے سو ایسے ہی لوگ جو کامل العقل ہیں اہل ارشاد ہوئے ہیں اور بعض اولیاء اللہ جن سے کوئی تربیت عام کا متعلق نہیں ہوتا ایسے لوگ البتہ بھولے بھالے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی سپرد صرف اپنی ذات کا معاملہ ہے اور اس میں وہ اسی قدر کے مکلف ہیں جس قدر ان کو عقل دی گئی ہے کسی دوسرے شخص کی تربیت اُن کے متعلق نہیں سو حاصل یہ ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق تربیت عام ہے جیسے انبیاءٔ

امت مسند ارشاد پر متمکن ہیں ایسے لوگ بھولے بھالے نہیں ہوتے یہ لوگ بڑے فطین پورے عاقل ہوتے ہیں اور یہی کامل ہیں اور جن لوگوں کے متعلق کسی دوسرے کی تربیت نہیں ہوتی بلکہ محض اپنے ہی نفس کیلئے پیدا ہوتے ہیں یہ لوگ البتہ بھولے بھالے ہوتے ہیں اس لئے بعض نے یہ تقسیم کی ہے کہ انسان چار قسم کے ہیں ایک وہ جن کو دین کی عقل بھی ہے اور دنیا کی بھی جیسے انبیاء علیہم السلام اور ورثۃ الانبیاء یعنی وہ علماء مسند ارشاد پر متمکن ہیں دوسرے وہ جن کو دین کی عقل ہے اور دنیا کی نہیں جیسے بھولے بھالے صلحاء اولیاء امت تیسرے وہ جن کو دین کی عقل نہیں ہے اور دنیا کی عقل ہے جیسے عاقل کفار چوتھے وہ جن کو نہ دنیا کی عقل نہ دین کی عقل جیسے بیوقوف کفار غرض انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں۔ گو تجربہ میں اس لئے کمی ہو کہ وہ دنیاوی امور میں منہمک نہیں ہیں۔ بعض لوگوں نے اس میں عجیب خلط کر دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو ایک چیز سمجھتے ہیں اس میں فرق نہیں کرتے اور چونکہ علماء کو تجربہ کار نہیں پاتے اس لئے علماء کو کم عقل اور بیوقوف کہتے ہیں، حالانکہ تجربہ دوسری چیز ہے اور عقل دوسری چیز ہے تجربہ تکرار مشاہدہ جزئیات کا نام ہے مثلاً سقمونیا کو دس مرتبہ آزمایا گیا اس نے اسہال کا فائدہ دیا تو اس مشاہدہ تکرار سے کہیں گے کہ سقمونیا مسہل ہے اور عقل ایک قوت ہے جو خدا تعالٰے نے انسان میں ودیعت کی ہے جس سے کلیات کا ادراک کرتا ہے۔

مولوی محمد حسین عظیم آبادی سے جو کہ میرے ایک دوست تھے ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ایک کالج کے طالب علم نے سوال کیا کہ آسمان پر کل کس قدر ستارے ہیں انھوں نے فرمایا مرصودہ تو معلوم ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں اس طالب علم نے کہا کہ مولوی صاحب تعجب ہے کہ سائنس کا اتنا ضروری مسئلہ اور آپ کو اس کی اطلاع نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا اچھا بتلایئے سمندر میں کس قدر مچھلیاں ہیں اس طالب علم نے کہا کہ مجھے تو علم نہیں۔ تو مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ افسوس ہے آپ اس قدر سائنس کے دلدادہ ہیں اور

آپ کو زمین کی چیزوں کی بھی اطلاع نہیں پھر جب آپ کو ہنوز زمین کی بھی پوری اطلاع نہیں ہے تو مجھ کو آسمان کے تاروں سے اطلاع نہ ہونا کیا تعجب ہے یہ جواب سن کر ان طالب علم صاحب کی آنکھ کھلی اور ہوش آیا اس طرح لوگ صنّاع قوموں کو کہتے ہیں کہ یہ بڑے عاقل ہیں حالانکہ وہ صرف ایک صنعت کے تجربہ کار ہیں لہذا ان کو صنّاع کہنا چاہیئے نہ کہ عاقل صنّاعی دوسری چیز ہے عاقل ہونا دوسری بات ہے۔ اگر ہم ایک بڑی فلسفی مثلاً افلاطون کو ایک جلاہے کے گھر لے جاویں اور اس کی کارگہ میں بٹھلادیں اور کہیں کہ ایک مہین تنزیب بنو تو یقیناً وہ اس پر قادر نہ ہوگا۔ اور جلاہا عمدہ سے عمدہ بُن دے گا اس فرق کی وجہ سے یہ کہدیں گے کہ یہ جلاہا اس فلسفی سے زیادہ عاقل ہے، ہرگز نہیں ہاں یہ کہیں گے کہ یہ فلسفی اس صنعت کو اس قدر نہیں جانتا جس قدر یہ جلاہا جانتا ہے۔ پس علماء محققین خواہ تجربہ کار نہ ہوں مگر کامل العقل ہوتے ہیں اور یہی ورثۃ الانبیاء ہیں۔ انہی کے متعلق ارشاد و تربیت کا کام ہوتا ہے۔ پس ان کے ساتھ احکام و حکم دینیہ میں کسی کو حق مزاحمت نہیں ہے جیسا کہ اس قاعدہ شرعیہ کو کہ مفسدہ کی وجہ سے مصلحت غیر ضروریہ کو چھوڑ دیتے ہیں نہ سمجھنے سے بعض کو غلطی ہوگئی کہ وہ علماء سے مزاحمت کرنے لگے غرض جو چیز مطلوب نہ ہو اور اس کے ارتکاب میں مفسدہ بھی ہو تو اس کو ترک کر دیں گے۔ جب یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہوگیا تو اب سمجھنا چاہیئے کہ الوداع کا خطبہ کسی دلیل سے شرعاً مطلوب نہیں ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت سے مفاسد ہیں لہذا اس کو ضرور ترک کیا جاوے گا رہی یہ بات کہ لوگ اس بہانہ سے آجاتے ہیں اگر یہ نہ ہوگا تو لوگ نماز میں آنا چھوڑ دیں گے سو سمجھ لینا چاہیئے کہ جو لوگ خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں وہ تو ہر حالت میں آویں گے خطبہ وداع پڑھا جاوے یا کوئی دوسرا خطبہ اور جو لوگ محض پابندی رسم کے لئے آتے ہیں وہ اگر اس کے ترک سے آنا چھوڑ بھی دیں تو ان کے اس خیال سے ہم ایک مقدمہ

قبائح کے کیوں مرتکب ہوں خواہ وہ آویں یا نہ آویں۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر نکاح بیوگان کا ذکر نہ کرو تو میں وعظ میں آؤں، میں نے کہا کہ تو آج ضرور ہی بیان کروں گا تمہارا جی چاہے آؤ نہ جی چاہے نہ آؤ دین کسی کے آنے کا محتاج نہیں ؎

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست یاب درنگ و خال خط چہ حاجت روئے زیبارا

جس کا حسن ذاتی ہے اس کو تکلفات کی اور کسی کے دیکھنے نہ دیکھنے کی کیا پرواہ ہے خواہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے وہ بالکل مستغنی ہے، اسی طرح ہم کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ نہ کریں گے اور شرع کو محض اس مصلحت سے نہ چھوڑیں گے۔ ہمارے اکابر سلف کا اس استغنا مذکور پر پورا عمل تھا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جبلہ ابن ایہم غسانی جو کہ ملوک غسان میں سے تھا مسلمان ہوا موسم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ ایک دوسرا غریب آدمی بھی ساتھ ساتھ طواف کرتا تھا اتفاق سے اس غریب آدمی کے پاؤں کے تلے اس کی ازار کا کنارہ دب گیا جبلہ جب آگے بڑھا تو اس کی لنگی کھل گئی اور برہنہ رہ گیا۔ چونکہ وہ اپنے کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور یہ دوسرا شخص نہایت غریب آدمی تھا لہذا اس کو بہت غصہ آیا اور اس نے ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ اس بیچارے کا دانت ٹوٹ گیا وہ شخص اس حالت کو لئے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پہنچا عرض کیا کہ امیر المؤمنین جبلہ نے میرا دانت توڑ دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جبلہ کو ہمارے پاس بلا لاؤ۔ صاحبو غور کیجئے یہ امتحان کا وقت ہے کہ ایک بادشاہ کو ایک غریب آدمی کے معاملہ میں پکڑ کر بلایا جاتا ہے۔ چنانچہ جبلہ کو لایا گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ دریافت فرما کر اس غریب شخص کو اجازت دی کہ جبلہ سے اپنا بدلہ لے لے۔ جبلہ نے جب یہ سُنا تو طیش میں آکر کہا کہ امیر المؤمنین مجھ کو ایک معمولی بازاری غریب آدمی کو کس چیز نے برابر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے اور اس میں امیر غریب سب برابر ہیں تم نے اس کا دانت توڑا تمہارا دانت ضرور

توڑا جاوے گا دیکھئے یہ ہے اخوت اسلام ایک آج وقت ہے کہ امراء و روسا ء کا عالم ہی اس عالم سے جدا اور نرالا ہے غرباء کو وہ گویا انسانیت ہی سے خارج سمجھتے ہیں لیکن اگر اسی گئے گذرے وقت میں بھی اگر اس کا کچھ اثر باقی ہے تو اللہ والوں میں ہے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک بڑے عہدہ دار کوئی شخص مہمان آئے جب کھانے کا وقت ہوا تو حضرت نے اپنے ساتھ ان کو بٹھلایا کیونکہ وہ بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے ان کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر دوسرے غریب طلبہ مہمان پیچھے کو ہٹے۔ حضرت مولانا نے فرمایا صاحبو آپ لوگ کیوں ہٹ گئے کیا اس وجہ سے کہ ایک عہدہ دار میرے ساتھ بیٹھا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ آپ لوگ میرے عزیز ہیں میں جس قدر آپ کو معزز سمجھتا ہوں اس کے سامنے ان کی کچھ بھی وقعت نہیں چنانچہ سب غریب طلبہ کو بھی ساتھ بٹھلا کے کھلایا شاید اس سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ مولانا نے اپنی شان جتلانے کو ایسا کہہ دیا ہو گا خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ وہاں شان اور بڑائی کا نام بھی نہ تھا جن صاحبوں نے مولانا کو دیکھا ہے تو وہ خوب جانتے ہیں مگر جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے ان کے لئے ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے اندازہ ہو گا کہ وہاں شان اور بڑائی کتنی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا حدیث شریف کا درس دے رہے تھے ابر ہو رہا تھا کہ اچانک بوندیں پڑنا شروع ہو گئیں جس قدر طالب علم شریک درس تھے سب کتاب کی حفاظت کے لئے کتابیں اٹھا کر بھاگے اور سہ دری میں پناہ لی اور کتابیں رکھ کر جوتے اٹھانے چلے صحن کی طرف جو رخ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مولانا سب کے جوتے سمیٹ کر جمع کر رہے ہیں اس واقعہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہاں کس قدر شان کو جتلایا جاتا تھا شان نہ تھی بلکہ محض محبت دینی تھی کہ غرباء کو امراء سے کچھ کم نہیں سمجھا یہ ہی لوگ ہیں کہ جن کی بدولت دنیا کا کارخانہ قائم اور نظام عالم مسلسل ہے جس دن یہ حضرات نہ رہیں گے قیامت قائم ہو جاوے گی

غرض یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا امتحان تھا جس میں وہ پورے اترے آگے جبلہ کا امتحان ہے کہ دیکھیں کیا سمجھ کر ایمان لایا ہے آیا کوئی دنیاوی غرض عز و جاہ کی ہے کہ مسلمان ذی عزت ہوتے چلے جا رہے ہیں ان کے ہمرنگ ہو جاویں گے تو ہم کو بھی عزت نصیب ہو گی یا یہ کہ محض طلب آخرت کے لئے ایمان لایا ہے چنانچہ بعض لوگ بزرگوں سے بھی اس لئے ملتے ہیں کہ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں ان کو بڑا سمجھتے ہیں اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے ہماری بھی عزت ہو گی اکثر چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی بزرگوں سے بیعت ہوتے ہیں کسی جلا ہے تیلی کے گو وہ کیسا ہی بزرگ اور نیک ہو مرید نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ محض مدعی ہیں بس ہم کو نہ طلب صادق ہے نہ محبت واقعی جہاں اپنی دنیاوی غرض پوری ہوتے دیکھتے ہیں چار قدم بڑھا دیتے ہیں یہ نہ ہو تو یہ بھی نہیں ایسے ہی لوگ ہیں جو کہ امتحان کے وقت ادھورے اترتے ہیں عندالامتحان یکرم الرجل اور یہاں خوب کہا ہے

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

کوئی صوفی اس وقت تک صاف دل نہیں ہوتا جب تک کہ جامے یعنی کسی کامل کے در پر نہ پڑا رہے بہت سفر چاہیئے تب خامی دور ہو کر پختگی حاصل ہوتی ہے

چنانچہ جبلہ کا امتحان ہوا اور وہ اس میں ناکام ثابت ہوا یعنی اس نے کہا کہ اچھا مجھے ایک دن کی مہلت ہو سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہو سکتی ہے اگر یہ شخص مہلت دے صاحب حق سے پوچھا گیا وہ بیچارہ اس قدر نیک دل تھا کہ اس نے اجازت دیدی جبلہ موقع پا کر رات کو اٹھ بھاگا اور رومیوں سے جا ملا اور بدستور سابق نصرانی ہو گیا دیکھئے اس کو طلب صادق اور محبت واقعی دین سے نہ تھی کہ ذرا دنیا کی ذلت کے خوف سے دین چھوڑ دیا جس کا نتیجہ ابدالآباد کی ذلت ہے اُدھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھئے کہ ذرا پرواہ نہ کی کہ یہ امیر ہے دوسرا غریب ادھر اُس کو دیکھئے کہ ذرا سی تکلیف نفس پر گوارا نہ کر سکا۔ ایسے بہت لوگ ہیں کہ وہ اتباع شریعت محض نفع دنیاوی کے لئے کرتے ہیں لیکن جو خدا کے مخلص بندے ہیں ان کی یہ حالت ہے

ان پر کچھ بھی گذر جائے مگر ان کو حق کے مقابلہ میں سب ہیچ معلوم ہوتا ہے ؎

کشند از برائے دلے بارہا
خورند از برائے گلے خارہا

ایک دل کی دل داری کے لئے بار بار تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور ایک پھول کے لئے بہت کانٹے کھاتے ہیں۔

اور پھر چاہے طلب اور جستجو میں عمر بھی ختم ہو جاوے مگر گھبراتے اکتاتے نہیں کیونکہ ان کی طلب صادق طلب ہے اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ محبوب اور مطلوب کون ہے وہ زبان حال سے یوں کہتے ہیں کہ ؎

طلب گار باید صبور و حمول
کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

یعنی فن کیمیا کا طالب اکثر ساری عمر طلب میں برباد کر دیتا ہے اور ہمیشہ ایک تاؤ کی کسر میں رہتا ہے۔ لیکن آپ نے کسی طالب کیمیا کو نہ دیکھا ہو گا کہ وہ ناکامی سے گھبرا کر اکتا گیا ہو اور کیمیا کی فکر چھوڑ دی ہو تو کیا خدا کا طالب طالب کیمیا کے برابر بھی نہ ہو خوب سمجھ لو کہ جو اکتا گیا وہ طالب نہیں صورت طلب کو طلب نہیں کہتے جیسے صورت آدمی کو آدمی نہیں کہتے، خوب کہا ہے ؎

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند
نیستند آدم غلاف آدم اند

یہ جو کچھ کہ تو دیکھ رہا ہے آدمی ہونے کے خلاف ہے یہ آدمی نہیں ہیں بلکہ آدمی کا اوپر کا غلاف ہے۔

پس جو لوگ الوداع کے خطبہ نہ ہونے سے نہ آدیں ان کے نہ آنے کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جاوے گی اور ایسے وہمی مصالح سے اس قسم کی بدعات کی اجازت نہ دی جائیگی البتہ اس سے زیادہ آخری شعبان کا خطبہ بیشک مسنون ہے چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ پڑھا جس میں کا یہ ایک ٹکڑا ہے جس کے متعلق یہ بحث خطبہ الوداع کی بطور جملہ معترضہ کے بیان کی گئی اب اصل مقصود مذکور ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینہ کے برکات و آثار کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں ھو اشھرٌ اولہ رحمۃ و اوسطہ مغفرۃ و اٰخرہ عتق من النیران۔ (ترجمہ اس کا یہ ہے) کہ ماہ

رمضان ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرۃ ہے اور آخری حصہ آگ سے آزادی ہے میں نے کہا تھا کہ اس حدیث کو دو باتوں کے بیان کے لئے پڑھا ہے مگر اول اس حدیث کی شرح کر دوں تو پھر ان کو بیان کروں تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ جو فرمایا گیا کہ اس کا اول حصہ رحمت ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ رحمت ایک لطف ہے چونکہ ابتداء حصہ میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے عمل کرنے کی توفیق عطا ہوتی ہے کہ بدون اس توفیق کے کوئی عمل بھی نہیں ہو سکتا اس لئے اول رحمۃ فرمایا گیا اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ بعض لوگوں کو جو اپنے تھوڑے سے عمل پر ناز ہو جاتا ہے کہ ہم بہت کچھ کرتے ہیں یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے انسان کوئی کام نہیں کر سکتا جبتک کہ اُدھر سے امداد و توفیق نہ ہو خوب کہا ہے ؎

بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

حق تعالیٰ جل شانہٗ اور اللہ والوں کی عنایات کے بغیر اگر کوئی فرشتہ بھی ہو تو اس کا کارنامہ سیاہ ہی رہے گا۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ بے عنایات خدا ہیچیم و ہیچ

یہ کچھ ہم نے کہا ہے لیکن درحقیقت حق تعالیٰ کی عنایات کے بغیر ہیچ اور بیکار ہے کہ گو ہم نے سب کچھ بتلایا لیکن عنایات خداوندی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہیں پس خدا کی عنایت سے توفیق ہوتی ہے اپنا کوئی کمال نہ سمجھے جب تک کہ دل میں کوئی بات نہیں ہوتی آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا اور یہ خدا کے اختیار میں ہے ؎ "من چو کلکم درمیاں اصبعین" آخر کیا سبب تھا کہ ابو جہل جو کہ نہایت سمجھدار سمجھا جاتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ میں کا چچا ہوتا تھا تیرہ برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دعوت ایمان فرمائی لیکن اس کو کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو سکا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو کہ حبشہ کے رہنے والے تھے یہ کچھ بڑے زیرک سمجھے جاتے تھے نہ پہلے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر ہوئی تھی کیونکہ مکہ مکرمہ میں آ کر ایک کافر کے پھندے میں پھنس گئے کہ آزادی بھی نصیب

نہ تھی جس سے تحقیقات ہی کا موقع ملتا پھر تکالیف کا یہ عالم کہ پتھر تپتا ہوا سینہ پر رکھ دیا جاتا تھا لیکن باوجود اس کے آپ کی زبان سے احد ہی احد نکلتا تھا۔ پس وجہ یہ ہی تھی کہ ابو جہل کو توفیق نہیں دی گئی اُن کو توفیق دی گئی ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم　　ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجبی است

بڑے درجے کے لوگ بصرہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حبشہ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور روم سے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جیسے شخص پیدا ہوئے اور مکہ شریف میں ابو جہل (زبردست کافر) پیدا ہوا یہ عجیب معاملہ ہے۔

حقیقت میں جب تک ادھر سے جذب اور مدد نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا تو یہ کہنا کہ انا کذا وانا کذا محض جہل ہے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ چلے جارہے تھے شاہی محل کے نیچے سے گزر ہوا بادشاہ نے ان کو اپنے پاس ملنے کے لئے بلایا انھوں نے کہا کہ کیوں کر آؤں کہ دروازہ بڑی دور پھر وہاں پہرہ چوکی بادشاہ نے کمند لٹکا دی یہ اس کے سہارے سے اوپر پہنچ گئے، جب یہ وہاں پہنچے تو بادشاہ نے ان سے گفتگو شروع کی۔ اثناء گفتگو میں بادشاہ نے پوچھا کہ آپ خدا تعالیٰ تک کیونکر پہنچے، انھوں نے کہا کہ جس طرح آپ تک پہنچا۔ یعنی جس طرح تم نے وہ کمند ڈال دی اور اس کے ذریعے مجھے کھینچ لیا اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی جذب کی کمند ڈال کر مجھے کھینچ لیا خوب کہا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

عشق کا راستہ ہرگز بھی بھاگ دوڑ سے پورا نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس راستہ پر خود بخود بڑھتا ہے جیسے انگور کی شاخ کاٹنے سے بڑھتی رہتی ہے۔

یہ تو اپنے عمل کے بارہ میں ہے اور ایک دوسرے شخص نے جذب کے بارہ میں کہا ہے لیکن یہ مضمون محبوب مجازی کے باب میں ہے اس لئے الفاظ اچھے نہیں ؎

خود بخود آں بت عیار بہ بر می آید　　نہ بزور و نہ بزاری نہ بزر می آید

وہ چالاک معشوق خود ہی پہلو میں آسکتا ہے روپیہ پیسے سے یا رونے پیٹنے سے یا دباؤ سے نہیں آتا ہے۔

میں نے الفاظ بدل دیئے ہیں کہ محبوب حقیقی کے مناسب ہو جاوے ؎

خود بخود آں مہ دلدار بہ می آید

جب محبوبان مجازی کا یہ عالم ہے تو اس محبوب حقیقی کو کون مجبور کر سکتا ہے وہ تو اس کے شائبہ سے بھی منزہ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان ہو جایئے فرماتے ہیں لاتقل اللھم ارحمنی ان شئت فانہ لامکرہ لہ کہ یوں دعا نہ مانگو کہ اے خدا اگر آپ چاہیں تو ہم پر رحم فرمایئے۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ پر تو کوئی اکراہ و جبر کرنے والا نہیں ہے۔ صاحبو دیکھئے ظاہر نظر میں مشیّت موقوف کر کے دعا مانگنا ادب معلوم ہوتا ہے لیکن واقع میں سخت بے ادبی ہے لیکن کسی کی نظر اس بے ادبی تک نہیں پہنچ سکتی یہ نظر نور نبوت اور وحی کی محتاج ہے اور وجہ اس کی داخل بے ادبی ہونے کی یہ ہے کہ درخواست میں مشیّت کی قید لگانے کی ضرورت تو اسی وقت ہوتی جب کہ خدا تعالیٰ میں مجبور ہونے کا احتمال بھی ہوتا اس لئے یہ قید لگاتے کہ اللہ تعالیٰ پر دباؤ نہ پڑے یہاں یہ بات کہاں تم دس ہزار مرتبہ مانگو اور دعا کرو وہ چاہیں گے قبول کر لیں گے یا رد کر دیں گے کیوں تم قید لگاتے ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر دنیا بھر کے عقلا جمع ہو کر غور کرتے تو اس دقیقہ تک نہ پہنچتے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے ہیں اور جب خدا تعالیٰ مجبوری سے بالکل پاک ہیں تو اگر تم کو توفیق روزہ رکھنے اور تراویح و قرآن پڑھنے کی نہ دیتے تو تم کیا کر سکتے تھے اسی لئے فرمایا کہ اولہ رحمۃ کیونکہ صوم وغیرہ کی توفیق دینا عبادت کی توفیق دینا بہت بڑی رحمت ہے۔ اور چونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیئات کہ نیکیوں سے برائیاں معاف ہو جاتی ہیں تو جب اول رمضان میں توفیق ہو جانے کی وجہ سے اعمال نیک شروع کئے تو ان سے گناہ معاف ہونے شروع ہوئے جب ان کی بدولت گناہ معاف ہو گئے تو وسط رمضان مغفرۃ ہوا اسی کو فرماتے ہیں واوسطہ مغفرۃ اور ظاہر ہے کہ گناہوں کا معاف ہو جانا ہی دوزخ سے بچنا ہے

تو اس پر متفرع ہو کر یہ ارشاد بھی صحیح ہوا کہ واخرہ عتق من النیران اور یہ تقسیم یا تو مجموعہ شہر کے اعتبار سے لئے جاویں تو اس میں رات بھی آجاوے گی اور اس صورت میں روزہ کی تخصیص نہ ہو گی بلکہ اعمال لیل کا بھی اس فضیلت میں دخل ہو گا اور یا باعتبار اجزاء متفرقہ کے کہ وہ صرف دن کے اوقات ہیں جیسے اس قول میں بھی مراد ہوتا ہے کہ صمت الشہر کلہ تو ظاہر ہے کہ ضمیر مہینہ کی طرف اجزاء متفرقہ یعنی نہار کے اعتبار سے راجع ہو گی پس اسی طرح حدیث میں بھی احتمال ہے تو اس صورت میں یہ مصلحت خاص ہو جاوے گی روزہ کے ساتھ اور اسی طرح اس تقسیم میں دوسرے اعتبار سے بھی دو احتمال ہیں یعنی ایک یہ ممکن ہے کہ ایک ایک اثر ایک ایک حصہ میں ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تینوں اثر ہر حصہ میں ہوں لیکن غلبہ اثر کے اعتبار سے تقسیم فرمادیا گیا یعنی چونکہ اول حصہ رمضان میں وصف رحمۃ کا غلبہ تھا اس کو رحمت کہا گیا گو مغفرۃ و عتق اس میں بھی ہو اور وسط میں مغفرت غالب تھی اس پر مغفرت کا اطلاق کیا گیا اور اخیر حصہ عتق من النار کا وصف غالب تھا اس لئے اس کو عتق من النیران کہا گیا غرض جس اعتبار سے بھی لیا جاوے آج کا دن حدیث کی آخری جزو کا مصداق ہے ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس نے ہم کو دوزخ سے نجات بخشی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آزادی کو رحمۃ اور مغفرۃ پر مرتب فرمایا ہے لہذا ہر شخص اپنی حالت کو دیکھ لے اور سوچ لے کہ اس نے رحمت و مغفرۃ کا کام کیا ہے یا نہیں اور صرف روزہ و تراویح کی ظاہری صورت سے کوئی گمان نہ کرے کہ میں نے رحمت و مغفرۃ کا کام کیا ہے کیونکہ ہر عمل کی فضیلت اس وقت ثابت ہوتی ہے کہ جب اس عمل کو مع اس کے حقوق کے ادا کیا جاوے اور حدیث میں روزہ کے باب میں ہے من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ (جو شخص جھوٹ بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ بندہ صرف اپنا کھانا پینا چھوڑ دے

اب ہر شخص خود دیکھ لے کہ اس لئے آج تک کے دن کیونکر گذارے نمازیں پڑھیں یا نہیں پڑھیں اور پڑھیں تو ان کے جملہ حقوق ادا کئے یا نہیں کئے دن میں ہماری کیا حالت رہی رات کو ہم نے کیا کام کئے کسی جگہ نگاہ کو تو آلودہ نہیں ہونے دیا کسی کی غیبت تو نہیں کی جھوٹ تو نہیں بولا۔ پس اگر کسی نے ہمت کی کہ وہ سب گناہوں سے بچا اور سب عبادتوں کو مع اس کے حقوق سے بجا لایا تو آج اس کے لئے خوشخبری کا دن ہے اور جس نے ہمت سے کام نہیں لیا اس پر آج حسرت ہے لیکن جن لوگوں نے آج تک کچھ نہیں کیا ہے ان کو بھی مایوس ہو کر نہ بیٹھ رہنا چاہیئے بلکہ ابھی کم و بیش وقت باقی ہے اس میں ہی جو کچھ ہو سکے کر لینا چاہیئے انشاء اللہ اس کو بھی عتق من النار ہو گا وہ بارگاہ عجیب بارگاہ ہے یہ حالت ہے کہ ؎

باز آ باز آ ہر انچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

ہمارے پاس آ ہمارے پاس آ جس حالت میں بھی ہے تو ہمارے پاس آ۔ اگرچہ تو کافر ہے یا بد مذہب ہے بت پرست ہے پھر بھی آ جا کہ ہمارا یہ دربار نا امیدی کا دربار نہیں ہے اگر تو سو مرتبہ بھی توبہ توڑ چکا ہے پھر بھی آ جا۔

اور جس طرح وہاں ہر وقت باب رحمت کشادہ ہے کہ کسی کو آنے کی ممانعت روک ٹوک نہیں اسی طرح وہاں کسی کے آنے نہ آنے کی پرواہ بھی نہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو دار و گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

کہ جس کا جی چاہے آئے اور جس کا جی چاہے چلا جائے اس دربار میں کسی پر روک ٹوک یا دروازہ پر دربان و پہرہ دار نہیں ہے۔

کہ جس کا جی چاہے جب چاہے چلا آوے اور جس حالت میں چاہے چلا آوے اور ہر کہ خواہد کے عموم سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ بعضے لوگ جو کسی ہندو یا عیسائی کو مسلمان کرنے کے قبل اول غسل دیا کرتے ہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہر کہ کے عموم میں بے غسل والا بھی داخل ہے صاحبو اسلام میں آنے کے لئے نہ غسل کی ضرورت

ہے نہ وضو کی بلکہ اگر استنجا بھی نہ کیا ہو تو اس کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں پہلے مسلمان کر لو اور اس کے بعد غسل وغیرہ دو اور ایک یہ بھی تو بات ہے کہ کسی کو کیا خبر ہے کہ چار منٹ کے بعد زندہ رہے گا یا ختم ہو چکے گا۔ بعض لوگ تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ مسلمان کرنے کے بعد مسہل دینے کی تجویز کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر طہارت حاصل کرنے کے لئے یہ ہی شرط ہے کہ حالت کفر کی کوئی چیز باقی نہ رہے تو فصد بھی لینا چاہیئے بلکہ گوشت پوست بھی نیا ہونا چاہیئے الحاصل یہ سب لغو قیود ہیں اس دربار میں جس کا جی چاہے جب چاہے اور جس حالت میں بھی ہو چلا آوے۔ صاحبو کیا آج کوئی بادشاہ ہے کہ وہ ناپاکوں کو بھی اپنے دربار میں حاضری کی اجازت دے اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

غرض جس طرح یہاں کسی کو آنے کی ممانعت اور روک ٹوک نہیں اسی طرح اگر بگڑ جاؤ تو رکھنے کی بھی کوئی تمنا نہیں کرتا کسی کو اس طرح سر نہیں چڑھایا گیا کہ وہ ذرا بھی ناز کر سکے پس جب یہ حالت ہے تو ہم لوگوں کو مایوس نہ ہونا چاہیئے اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اب تو سارا رمضان گزر چکا ہے اب ہماری مغفرت کیونکر ہو سکے گی آج اٹھائیسواں روزہ ہے ابھی ایک یا دو دن باقی ہیں میں حسب وعدہ شریعت دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر آپ چاہیں گے اور کوشش کریں گے تو آج ہی مغفرت ہو جاوے گی یہ ایک دو دن ہی کافی ہو جاوے گا۔ اس کی ایسی مثال ہے ؎

گر جہان بر برف گردد سر بسر تاب خور بگدازدش از یک نظر

یعنی اگر سارا عالم بھی برف سے الٹ جاوے تو عالمتاب آفتاب کے نکلتے ہی سب پانی ہو کر بہ جاوے گی اسی طرح اگر سارا عالم بھی گناہ سے بھر جاوے تو ادھر کی ایک نگاہ کافی ہے۔ سبحان اللہ کس پاکیزہ مثال سے کتنے بڑے مسئلہ کو بآسانی حل کر دیا۔

واقعی بات یہ ہے کہ اہل اللہ پر چونکہ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اس لئے

ان سے زیادہ بہتر کوئی مثال بھی پیش نہیں کر سکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہی لوگ سچے فلسفی ہیں چنانچہ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے ایک ایک حکیم کا نام لے کر پوچھا کہ یہ کیسے تھے سب کی نسبت یہی کہتا رہا کچھ نہیں پھر اسے حضرت بایزید حضرت شیخ شہاب سہروردیؒ کی نسبت پوچھا تو اس نے کہا کہ اولئک هم الفلاسفة حقاً خیر مقصود یہ ہے کہ دو دن جو باقی ہیں ان میں تو اپنی کچھ فکر کر لینی چاہیئے پھر تو بعد رمضان معلوم ہی ہے کہ آزاد و غافل ہو جاؤ گے اگرچہ ادھر کے الطاف و مراحم پر نظر کرکے تو ایک دم کی غفلت بھی جائز نہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازان شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

جتنی دیر میں پلک جھپکتے ہیں اتنی دیر بھی اس بادشاہ سے غافل نہ رہنا چاہیئے شاید کہ وہ توجہ فرمائے اور تو بے خبر رہے۔

بخدا جس کا کام بنتا ہے ایک ہی لمحہ میں بن گیا ہے ایک ہی لمحہ کی عنایت کافی ہوگئی ہے مگر بہت دن تک اس لئے لگے رہتے ہیں کہ وہ لمحہ معین نہیں یعنی یہ خبر نہیں کہ وہ ایک لمحہ کس وقت ہوگا جس میں نگاہ اکسیر اثر پڑ جاوے گی اسی کو مولانا بھی ایک تفسیر پر فرماتے ہیں ؎

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

یک زمانے صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اولیاء اللہ کے ساتھ ایک گھڑی کی صحبت نصیب ہو جائے تو وہ سو سال کے زہد و طاعت سے بہتر ہے اولیاء اللہ کے ساتھ تیری تھوڑی دیر کی صحبت تیری سو سال کی بے ریا کاری کی عبادت سے بھی بہتر ہے۔

بعض نے اس کی یہی توجیہہ کی ہے کہ تمام اوقات میں سے ایک وقت ایسا ہوتا ہے چنانچہ شاہ بھیک صاحب اور شاہ ابو المعالی صاحب کا قصہ ہے کہ شاہ ابو المعالی صاحب کسی بات پر شاہ بھیک صاحب سے خفا ہو گئے اور علیحدہ کر دیا یہ جنگلوں میں

روتے پھرتے تھے برسات آئی حضرت کا مکان گر پڑا بی بی صاحب نے فرمایا ایک آدمی گنوار سا ان کاموں کے لائق تھا اسی کو آپ نے نکال دیا حضرت نے فرمایا کہ میں نے ہی تو نکالا ہے تم بلا لو تم کو تو منع نہیں کرتا۔ بی بی صاحب نے بلا بھیجا ان کی عید آ گئی آ موجود ہوئے۔ بی بی صاحب نے مکان کی حالت دکھلائی وہ فوراً جنگل پہنچے اور لکڑی مٹی جمع کر کے مرمت میں لگ گئے حتیٰ کہ مکان کی تکمیل کر کے چھت پر مٹی کوٹ رہے تھے کہ حضرت گھر میں تشریف لائے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور چھت پر سے مٹی کوٹنے کی آواز سن کر رحمت کا جوش ہوا اور باہر صحن میں تشریف لا کر ان کو ٹکڑا روٹی کا دکھلایا کہ لو وہ وہیں سے کود پڑے حضرت نے ان کے مُنہ میں لقمہ دیا اور سینہ سے لگایا بس سارا کام ایک لمحہ میں بن گیا۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ایک لمحہ بھی غفلت مت کرو مگر خیر اتنی ہمت نہ ہو تو رمضان رمضان تو بیدار رہو یہ ایک دو دن رہ گیا ہے اس کو ضائع مت کرو۔ نیز اس مضمون کے متعلق میں وہ حدیث پھر یاد دلاتا ہوں جو کہ جمعہ گذشتہ کو بیان کی گئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رغم انفه رغم انفه رغم انفه اس کی ناک خاک میں بھرے یعنی وہ شخص ذلیل ہو جائے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون شخص فرمایا ایک تو وہ کہ میرا نام اس نے سُنا اور مجھ پر درود نہ بھیجا دوسرا وہ شخص کہ اس کے سامنے اس کے بوڑھے ماں باپ زندہ رہے اور اس نے ان کی خدمت کر کے جنت نہ لے لی۔ تیسرا وہ شخص کہ رمضان شریف آئے بھی اور گذر بھی گئے اور وہ اسی طرح گنہگار سیہ کار رہا اور نیک عمل کر کے اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی۔

صاحبو! غور کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو کوس رہے ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کوسنا خدا کا کوسنا ہے اور جس شخص کو خدا تعالیٰ کوسیں اس کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے ؎

چوں خدا از خود سوال و گد کند پس دعائے خویشتن چوں رد کند

جب حق تعالیٰ اپنے بندہ سے خود ہی سوالات اور صحبتیں کرنے لگے تو پھر اپنی خواہش کو وہ کس طرح رد کر سکتی ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ ارشاد خداوندی ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو وہ حالت ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ ام انچہ استاد ازاں گفت بگو میگویم

میں تو آئینہ کے پیچھے طوطے کی طرح رہتا ہوں جو کچھ استاد کہتا ہے کہ کہو میں وہی کہتا ہوں۔

تو آپ کا بددعا کرنا خالی نہیں جا سکتا اب فکر کرلو اگر مغفرت چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور معاف کرانے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ صرف تسبیح ہاتھ میں لیکر استغفر اللہ استغفر اللہ پڑھتے رہو۔ بلکہ یہ بھی کرو اور اُس کے ساتھ اہل حقوق کے حقوق بھی ادا کرتے رہو اگر کسی شخص کے پاس دوسرے کی زمین دبی ہو یا موروثی ہو اس کو چھوڑ دو کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کو ادا کردو اور سبکدوش ہو جاؤ لوگ اپنے جی میں کہتے ہوں گے کہ موروثی زمین چھوڑنے کی بے ڈھب کہی پھر ہم کھاویں گے کہاں سے لیکن صاحبو غور کرو اگر کسی شخص کے موروثی کھیتوں میں کو ریل نکل جاوے اور اس کے سب کھیت ریل میں آجاویں اور معاوضہ ملے زمیندار کو تو یہ کیا کرے گا اور کہاں سے کھاوے گا۔ افسوس ہے کہ ظاہری حکومت کے سامنے تو کان نہ ہلایا جاوے اور خداوندی حکم کے سامنے چون و چرا کی گنجائش ہو۔ اصل یہ ہے کہ آپ لوگوں کے دلوں میں اسلام اور اس کے احکام کی چونکہ بلا مشقت مل گئے ہیں باوجود سر تا سر نافع ہونے کے کہ بڑا نفع رضائے حق ہے قدر و قیمت نہیں ہے۔ خوب کہا ہے ؎

اے گرانجاں خوار دیدستی مرا
زانکہ بس ارزان خریدستی مرا

اے سست طبیعت والے تو مجھ کو حقیر سمجھ رہا ہے اس لئے
کہ تونے مجھ کو سستا خرید لیا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے ما قدروا اللہ حق قدرہ سبب یہ ہے کہ اسلام کے ملنے میں کچھ زر تو خرچ نہیں ہوا کہ اس کی قدر ہوتی۔ ؎

ہرکہ او ارزاں خرد ارزاں دہد   گوہرے طفلے بقرص نان دہد

جو شخص کہ اس کو سستا خریدتا ہے سستا ہی دیتا ہے قیمتی موتی کو بچہ روٹی کے بدلہ میں دے دیتا ہے۔

حکام کی خوشنودی تو بڑی بڑی کوششوں سے زروجواہر خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے بخلاف رضائے خداوندی کے لیکن حقیقت میں یہ سخت رذالت ہے کیونکہ جس قدر زیادہ احسان کسی کا ہوتا ہے اسی قدر زیادہ اس کے سامنے پگھلا کرتے ہیں اور شرماتے ہیں نہ کہ الٹی شرارت اور نافرمانی پر کمربستہ ہوجاویں لہذا اپنی اس معمولی تکلیف اور مشقت کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیئے اگر کسی کے پاس موروثی زمین ہے تو اس کو چاہیئے کہ فوراً اس کو چھوڑ دے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص موروثی زمین کو چھوڑ دے تو وہ زیادہ آرام و آسائش میں رہے گا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ایماندار اور خوش معاملہ مشہور ہوجاوے گا پھر ہر زمیندار کوشش کرے گا کہ اس کی زمین اسی کے کاشت میں رہے۔ اگر اب بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آوے اور نہ مانیں تو وہ جانیں۔ دو شخص ضلع سہارنپور کے میرے پاس آئے، میں اتفاق سے موضع بھنسانی گیا ہوا تھا وہ میرے پاس وہیں پہنچے کہ ہم کو مرید کرلو۔ میں نے پوچھا تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں معلوم ہوا کہ ہے میں نے کہا کہ اس کو چھوڑ دو کہنے لگے کہ پہلے مرید کرلو پھر چھوڑ دیں گے میں نے کہا کہ پہلے چھوڑ آؤ جب مرید کروں گا۔ یہ سُن کر چھوڑ آنے کا وعدہ کر گئے اور آج تک

واپس نہیں آئے۔

ایک گاؤں کے لوگ مدت سے مجھے بلا رہے ہیں لیکن اس لئے جانے کی نوبت نہیں آئی کہ وہاں سب کے پاس موروثی زمینیں ہیں۔ بس وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ مجھ کو روٹی کہاں سے کھلاؤ گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک درہم حرام اور نو حلال کے ہوں تو اس ایک کے مل جانے سے اس کی سب عبادت غارت ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ لوگ حرام کمائی بیوی بچوں کے لئے کماتے ہیں یہ بھی نہیں کہ اپنے لئے ایسا کریں۔ لیکن اسی سے کوئی یہ تجویز نہ کرلے کہ جب ہمارے پاس حلال کی آمدنی نہیں ہے اور حرام کی آمدنی کھانے سے روزہ قبول نہیں ہوتا تو روزہ رکھنے سے کیا فائدہ کیونکہ اب تو صرف ایک گناہ ہے کہ حرام مال سے پیٹ بھرا اگر روزہ نہ رکھو گے تو ایک دوسرے اس سے بھی زیادہ سخت گناہ میں ماخوذ ہوں گے۔

یہ بیان تھا بقیہ رمضان کے متعلق اب حسب وعدہ دوسرا مضمون عید کے متعلق بیان کرتا ہوں اور اتفاق سے اس حدیث سے اس کا بھی تعلق ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں رمضان کے آخری حصہ کو عتق من النیران فرمایا گیا ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ عتق رحمۃ اور مغفرت پر مرتب ہے۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی تو معلوم ہوا کہ آخر رمضان میں رحمۃ اور مغفرت اور عتق من النیران تینوں کا تحقق ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ قرآن سے ملاؤ کہ قل بفضل اللہ وبرحمۃ فبذلک فلیفرحوا (کہہ دو کہ یہ صرف اللہ کا فضل ورحمت ہے پس اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت ہی سے خوشی حاصل کرو) ان دونوں مقدمون کے ملانے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس موقع رحمت پر کوئی فرحت ہونی چاہیئے اور اس فرحت کا جزئیاً بھی حدیث سے اثبات کیا جاتا ہے فرماتے للصائم فرحتان

فرحة عند الافطار وفرحة عند لقاء ربہ (روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی افطار کے وقت اور ایک خوشی اپنے رب سے ملنے کے وقت) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وقت افطار کا وقت فرحت کا ہے اس کے بعد یہ سمجھنا چاہیئے کہ افطار دو ہیں ایک افطار صغیر جو کہ روزمرّہ ہوتا ہے دوسرے افطار کبیر یعنی وہ افطار کہ ختم رمضان پر ہو جس پر روزے پورے ہو جاتے ہیں جس کی طرف عید کو مضاف کر کے عید الفطر کہتے ہیں پس یہ افطار مجموعہ شہر کا ہے نہ کہ کسی خاص جزو کا جیسا کہ ہمارے ناواقف بھائیوں نے ایک جاہلانہ مسئلہ ایجاد کیا ہے کہ عید کی شب کو بالکل نہیں کھاتے جب صبح صادق ہو چکتی ہے تو کچھ کھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ اس رسم کو اپنے ایام طفلی سے میں دیکھتا چلا آتا ہوں تحقیق کرنے سے اس کی اصل یہ معلوم ہوئی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عید کے روز صبح کو کچھ کھا لیا کرتے تھے اس کے بعد نماز کو تشریف لے جاتے تھے اور دقیقہ شناساں امت نے اس کی ایک حکمت بالقارحق بیان کی ہے اور بالقارحق کی قید میں نے اس لئے لگادی کہ اسرار حکم میں غور و فکر کرنا مناسب نہیں کیونکہ جو کچھ فکر سے حاصل ہوگا تمہارے ذہن کا اختراع ہوگا حکمت کیونکہ وصول الے الحقائق کا طریق ہی نہیں ۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ مے نگیر و فضل شاہ

دل و دماغ کو تیز کرنا صحیح راستہ نہیں ہے جب تک کہ خلوص کا ساتھ شکستہ دل نہ ہو اللہ تعالے کا فضل نہیں ہوتا ۔

پس ہم کو بالکل شکستگی اختیار کرنی چاہیئے اس سے البتہ ہم پر فیضان ہو سکتا ہے خوب کہا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا درد ے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

پانی ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں پستی ہوتی ہے جس بات کو سمجھنا مشکل ہوتا

ہے جواب کی اس جگہ ضرورت ہوتی ہے دوا کی اس جگہ ضرورت ہے
جہاں درد تکلیف ہوتی ہے شفار کی ضرورت و فکر اسی جگہ ہوتی ہے
جہاں مرض ہوتا ہے۔

توجب تم بالکل اپنے کو سپرد کر دوگے تو خدا تعالیٰ خود بخود ان علوم کا القار
تمہارے قلب میں کریں گے اور وہ حالت ہوگی ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

اپنے اندر انبیار علیہ السلام کے علوم کو دیکھو گے جو کسی کتاب
و مددگار اور استاد کے بغیر تم کو حاصل ہوں گے۔

غرض دقیقہ شناسان است کو بالقار حق یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور نبی کریم
علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے اس فعل سے یہ بات ظاہر فرماتے ہیں کہ آج روزہ
نہیں ہے تاکہ لوگ حد شرعی سے آگے نہ بڑھ جاویں تو جس طرح حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے ابتدار رمضان کی ایک حد مقرر فرمادی ہے اسی طرح انتہا
رمضان کی بھی ایک حد مقرر فرمادی اگر ایسا نہ فرماتے تو یہود و نصاریٰ کی
طرح سب لوگ گڑ بڑ میں پڑ جاتے اسی واسطے رمضان سے پہلے مستقلاً
روزہ رکھنے کو بھی منع فرمایا لیکن اس میں فرق کیا کہ تقدم کو تو حرام نہیں کیا
اور تاخر کو حرام کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقدم میں احتمال اس بات کا
بھی ہے کہ ممکن ہے آج رمضان ہو کیونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ
۲۹ کا چاند دس پانچ جگہ نظر آوے اور دو چار جگہ نظر نہ آوے پس ممانعت
خفیف ہوئی تاکہ ممانعت بھی اپنے حد پر رہے۔ اور رمضان کے ختم پر اس وقت
تک عید کرنا جائز نہیں جب تک کہ رویت کا تیقن نہ ہو جاوے اور جب
تیقن ہو جاوے تو اب اس میں احتمال رمضانیت کا نہیں اس لئے رمضان
کے بعد متصلاً یعنی عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہوا وھٰذا من المواھب

پس اتباع سنت اسی اظہار کے لئے اکثر بزرگ صبح ہوتے ہی کچھ کھا لیتے تھے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ آج روزہ نہیں لوگوں نے سمجھا کہ یہ رات کے روزہ کا افطار ہے حالانکہ وہ افطار کبیر تھا اور یہ سمجھ کر اس رات میں روزہ رکھنا شروع کر دیا جس کا نام شبہ ہونا زیادہ مناسب ہے غرض اس سے معلوم ہوا کہ شرعاً افطار کبیر بھی کوئی چیز ہے اور وہ بھی محل فرحت ہونا چاہیئے پس اسی افطار کبیر کی فرحت کا نام عید ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر اس کی نصاً تشریح نہ ہوتی تو اس حکمت کی بنا پر رائے سے تقرر عید کا ہو سکتا حکمت کا رائے سے سمجھنا اور اس پر بنا ر حکم کرنا یہ کافی نہیں مدار اصلی تشریع ہی پر ہے۔ اگرچہ اس کی حکمت بالکل نہ معلوم ہو۔ البتہ بعد تشریع کے بھروسہ کچھ حکمت بھی سمجھ میں آسکتی ہے باقی حکمت کے سمجھنے پر حکم کا ماننا موقوف نہیں ہماری تو وہ حالت ہونی چاہیئے۔

زبان تازہ کردن با قرار تو
نینگیختن علت از کار تو

اور ہمارا وہ مذہب ہے جیسا حضرت استادی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے کہ ہر درویشے کہ چوں چرا کند وہر طالب علمے کہ چوں و چرا نکند ہر دو را در چراگاہ باید فرستاد (جو درویش ہر بات میں چوں چرا کرے یعنی اعتراض کرے اور ہر وہ طالب علم جو مسائل میں چوں چرا نہ کرے یعنی اس کی دلیل اور وجوہ کے سمجھنے میں سوالات کر کے اطمینان حاصل نہ کرے ان دونوں کو اس چراگاہ یعنی خانقاہ مدرسہ سے دور بھیج دینا چاہیئے)

طالب علم کو تو چون و چرا کا حق اس لئے ہے کہ وہ طالب فن ہوتا ہے لیکن طالب عمل کو اس کی اجازت ہرگز نہیں۔ اور حکمت کی تلاش میں ایک مفسدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عوام یوں سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہی مصالح بنار حکم ہیں اور جب کسی حکم میں اُن کو مصالح نظر نہیں آتے تو اس حکم کے من اللہ ہونے میں ان کو شبہ ہونے لگتا ہے یا اگر کوئی مصلحت اپنے

ذہن سے مخترع کی اور اس کو مدار حکمت سمجھا اور وہ مخدوش ہوگئی تو اس کے انہدام سے حکمت کے انہدام کا شبہ ہو جاتا ہے ہاں اگر مصلحت خود بخود بلا تلاش ذہن میں آجاوے تو اس کے بیان میں مضائقہ نہیں ہے اور وہ بھی ظناً غرض جب ادھر سے بولنے کا اشارہ پاوے جیسا بلا فکر کوئی وارد قلب میں آجاوے زبان کھولے ورنہ لب بستہ رہے کہ نطق وسکوت میں اسی کا تابع رہنا چاہیئے۔ خوب کہا ہے ؎

بگوش گل سخن گفتہ کہ خندان ست بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان ست

غرض یہ کہ عید ایک ایسا زمانہ ہے جس میں ہم کو بشاشت کا حکم ہے اور چونکہ یہ دینی خوشی ہے اس لئے اس کے اظہار کا طریقہ بھی دین ہی سے تحقیق کرنا چاہیئے تفصیل اس کی یہ ہے کہ خوشی دو قسم کی ہوتی ہے ایک دنیوی خوشی اور ایک دینی خوشی سو دینی خوشی پر کسی خاص ہیئت پر خوشی منانا یہ محتاج وحی کا ہے یعنی اگر ہم کسی مذہبی خوشی میں کسی خاص طریقہ سے خوشی منانا چاہیں تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ شریعت نے اس موقع پر عید کرنے اور خوشی منانے کی ہم کو اجازت دی ہے یا نہیں کیونکہ اس میں اپنی رائے سے اختراع کرنا متضمن ہوگا ایک مفسدہ پر یعنی چونکہ اصل بناء اس کی دین ہے۔ اس لئے عوام اس طریق مخترع کو بھی دین سمجھیں گے اور یہ مفسدہ عظیم البتہ دنیوی عید جبکہ اس میں کسی مفسدہ کا اندیشہ نہ ہو خود اپنی تجویز سے بھی ہو سکتی ہے۔ آج کل ہمارے چند اخوان زمان نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے۔ اور یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو جو اپنے اکابر دین کے ساتھ کرتے ہیں دیکھ کر پیدا ہوئے۔ لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیوی خوشی نہیں ہے یہ مذہبی خوشی ہے پس اس کے تعین طریق کے لئے وحی کی

اجازت ضروری ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سالگرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا کرنے والے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کر رہے ہیں۔ صاحبو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جلالت و عظمت پر دنیا کے بادشاہوں پر جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اُسی طرح کا کرتے ہو جیسا اُن سلاطین کے لئے کیا کرتے ہو ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

"اس عالم پاک کے ساتھ اسی خاک مٹی کی کیا برابری"

مجھے اس موقعہ پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آ گئی۔ وہ جنگل میں رہتے تھے ایک کتیا پال رکھی تھی اتفاق سے ایک مرتبہ کُتیا نے بچے دیئے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا۔ لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے ان کو نہیں بلایا۔ ان بزرگ نے ازراہِ بے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیئے تھے اس کی خوشی میں سگان دنیا کی دعوت کر دی۔ سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا۔ جس روز میرے اولاد ہو گی اور مجھ کو خوشی ہو گی اس دن آپ کو مدعو کروں گا اور ان کتوں میں سے ایک کو بھی نہ پوچھوں گا۔ جب اولیا کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہو گی۔ اب اس کی دلیل سنئے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی نہیں ہے یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دنیا کے اطلاق اس خطۂ زمین پر زیادہ سے زیادہ چند فرسخ اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہو گی تو اس کا

اثر اسی خطۂ زمین تک محدود رہے گا اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش وکرسی اور باشندگان عالم بالا سب کے سب مسرور اور شاداں تھے وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کفر و ضلالت کی ماحی اور توحید حق کی حامی تھی جس کی بدولت عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت کے قائم ہونے سے فرشتے بھی اکثر فنا ہو جائیں گے۔

آپ کا ظہور چونکہ سبب تھا تمام عالم کے بقاء کا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہو گیا تو اس خوشی کو دنیوی خوشی نہیں کہہ سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی یعنی اس کے وجود میں بھی اور اس کی کیفیت میں بھی اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم العید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے۔ اگر کوئی قل بفضل اللہ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا بالخصوص جب کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی اُن کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ علیٰ ہذا تابعین رحمہم اللہ جن میں بڑے بڑے مجتہد ہوئے ہیں اُن کی نظر یہاں تک کیوں نہیں پہنچی

ہاں جن امور کے متعلق حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم سے

اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہیئے۔ مثلاً آپ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا ذالك اليوم الذى ولدت فيه (یہ وہ دن ہے جس دن میں پیدا کیا گیا ہوں) اس لئے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے دوسرے پیر کے دن نامۂ اعمال حق تعالیٰ کے روبرو پیش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ وجہ ہو گی اس حکم کی اور اگر منفرداً بھی مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہو گی جتنا کہ ثابت ہے اور جس طرح یوم ولادت کی خوشی میں اختراعات باطل ہیں اسی طرح کسی کی وفات کی تاریخ کے کہ وہ دن بزرگوں کی خوشی کا دن ہے۔ اختراعات بھی اور یہیں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ آجکل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختراع کیا ہے یہ بھی محض لغو اور تجاوز عن الحد ہے اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عرس کے معنی لغت میں شادی کے ہیں اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محب کا محبوب سے وصل ہو۔ پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے۔ اس لئے ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے نیز ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے اس کی قبر میں آکر سوال کرتے ہیں تو سوال وجواب کے بعد کہتے ہیں نم کنومة العروس (سوجا جیسے کہ دلہن آرام سے اور عزت کے ساتھ سوجاتی ہے) تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا۔ اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں ؎

خوشا روزے وخرم روزگارے　　کہ یارے برخورد از وصل یارے

وہ کیا اچھا دن ہے اور خوشی کا زمانہ ہے کہ ایک دوست اپنے محبوب کے وصل کا پھل کھاتا ہے۔

اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اُس وصل میں فرق ہے کہ یہاں بہ حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب جیسا مولانا نے فرمایا ؎

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من   می نہ گنجم با صنم در پیرہن

مکشوف و برہنہ ہو کر کہنے لگا کہ میں معشوق کے ساتھ لباس میں نہیں سما سکتا ہوں

اگرچہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے کہا جاتا ہے اور جیسا کہ حضرت غوث پاکؒ فرماتے ہیں ؎

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما   کہ کسے نیست بجز درد تو در خانۂ ما

ہمارے محل کے دروازہ سے بے پردہ ہو کر آ کیونکہ ہمارے گھر تیرے درد کے سوائے اور کوئی نہیں ہے۔

یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے کے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

دل آرام در بر دل آرام جو   لب از تشنگی خشک بر طرف جو

نگویم کہ بر آب قادر نیند   کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

تو اپنے محبوب کو ڈھونڈ رہا ہے حالانکہ تیرا محبوب تیرے پہلو میں ہے تو دریا کے کنارے کھڑا ہے اور تیرے ہونٹ پیاس کی وجہ سے خشک ہیں میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ وہ پانی میں قدرت نہیں رکھتے بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ دریائے نیل کے کنارہ پر استسقار کے بیمار کھڑے ہیں۔

اور چونکہ مر کر اُن کو یہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ اس کی تمنائیں کرتے ہیں اور شدت شوق میں یوں کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم   راحت جاں طلبم وزپئ جاناں بردم

وہ دن کس قدر خوشی کا ہوگا کہ اس ویران منزل سے میں جاؤں گا میں اپنی روح کا آرام ڈھونڈوں گا اور محبوب کے پیچھے پیچھے جاؤں گا۔

اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ لے چلو تو ایک شخص یہ اشعار ساتھ ساتھ پڑھتا چلے ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بر دست و بر بازوئے تو

ہم سب محتاج ہیں تیری گلی میں آئے ہیں خدا کے لئے اپنے موئے مبارک کے جمال سے کچھ تو مل جائے اپنے ہاتھ کو ہماری جھولی کی طرف بڑھا دے تیرے دست و بازو کو شاباش ہے۔

کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوجھ سکتی ہے یہ غایت فرحت کا اثر تھا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی حکایت مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال ہوگیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شدت غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے ؎

سرو سیمینا بصحرا میروی سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

اے سرو سمین تو جنگل کی طرف جارہا ہے بڑی بے مروتی ہے کہ ہم کو چھوڑ کر جارہا ہے۔ اے وہ ذات کہ تیرا روئے مبارک ایسا ہے کہ سب لوگ اس کو ہر وقت دیکھنا چاہتے ہیں تو خود کس طرف تماشا دیکھنے جارہا ہے۔

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہوگیا۔ صاحبو ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ ع پا بدستے دگرے دست بدست دگرے۔ کیا اس کو وجد ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے۔ ایک دوسرے بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ ومشتاقانہ فرماتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

وہ وقت آگیا ہے کہ میں برہنہ ہو جاؤں جسم کو بھی چھوڑ دوں اور پوری طرح روح ہی روح بن جاؤں۔

اور یہ حالت کیوں نہ ہو جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اب پردہائے ہیولانی جو کہ مانع دیدار تھے اٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار

نصیب ہوگا صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت کی یا حوروں کی ہوس ہوتی ہے
حضرت ابن الفارض رح کا واقعہ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا
تو جنت منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا ؎

ان کان منزلتی الحب عندکم ماقد رأیت فقد ضیعت ایامی

اگر میرے لئے یہ کوئی خاص مقام علٰحدہ اپنے نزدیک مقرر کر دیا گیا
ہے آپ کی محبت کی وجہ سے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی عمر
ضائع ہی کر دی۔

کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کروں آخر جنت چھپ
گئی اور فوراً تجلی ظاہر ہوئی اور جان بحق ہوئے ان کی بالکل وہی
حالت ہو گئی کہ ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح ومیدن ندہم

اگر میری جان لینے کے لئے ملک الموت آئے گا تو میں اس وقت تک جان کر
نہ نکلنے دوں گا جب تک کہ تیرے روئے مبارک کو نہ دیکھ لوں۔

اکثر لوگ ان حالات کو سُن کر تعجب کریں گے۔ لیکن یہ تعجب صرف اس
وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم ہیں مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ

ع تو مشو منکر کہ حق بس قادر است

غرض بزرگوں کے حالات اور حدیث وغیرہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی
ہے کہ ان بزرگوں کی وفات کا دن یوم العرس ہے۔ لیکن لوگوں نے اسکی
مفہوم و مصداق دونوں کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ مصداق کی خرابیاں تو
ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہو گئی باقی مفہوم کی
خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنی لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے
چنانچہ اکثر جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر مہندی چڑھاتے ہیں نوبت نقارہ
رکھتے ہیں اسی طرح مزامیر وغیرہ سب لغو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں غریب مردہ پر

تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے تو حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی کا دن ہے اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لئے ضرورت وحی کی ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا تتخذ وا قبری عیداً کہ میری قبر کو عید نہ بنانا عید میں تین چیزیں ضروری ہیں ایک اجتماع دوسرے تعین وقت تیسرے فرحت تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا' ہاں اگر خود بخود کسی وقت میں کسی غرض سے اجتماع ہوجاوے تو اور بات ہے۔ دوسرے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہاں سے تشریف لیجانا اگرچہ آپ کے لئے باعث سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب[1] میں لکھا ہے وہ دوسرے اعتبار سے ہے۔ پس جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر جائز ہوگا اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی خاص دن معین نہیں ہوا۔ بحمد للہ اس مسئلہ کی تحقیق کافی ہوگئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث سے ہم کو افطار اکبر پر عید کرنے کا حکم ہے اور اس میں یہ باتیں ہونی چاہئیں ملاقات کرو خوش ہو اکثار صدقہ کرو سب مجتمع عید گاہ میں دوگانہ ادا کرو۔ صاحبو غور کیجئے کہ خدا تعالےٰ ہماری خوشی کو بھی کس انداز پر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں نماز کا حکم فرمایا اکثار صدقہ کا حکم فرمایا کہ یہ زکوٰۃ کے مشابہ ہے۔ اور نماز کی بھی ایک خاص ہیئت

[1] نشر الطیب ملنے کا پتہ : مکتبہ تھانوی بندر روڈ (ایم - اے جناح روڈ) کراچی ملا

مقرر مائی کہ اس میں چند تکبیریں بڑھا دیں کہ امتیاز علامت ہے اہتمام شان کی اور اسی لفظ سے قرآن میں بھی ارشاد ہے ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھداکم (تاکہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی اس بات پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے) اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہو گیا کہ لتکملوا العدۃ میں تکمیل رمضان مراد ہو اور لتکبروا سے عید اور ایک حکمت دیکھئے مسلمان میں دو چیزیں ہیں ایک دین اور ایک طبیعت اور جس طرح اس کی طبیعت میں بعض امور کا جوش اور تقاضا پیدا ہوتا ہے اسی طرح اس کے دین کو بھی جوش ہوتا ہے اور ان دونوں کی معدّل عقل ہوتی ہے۔ پس خدا تعالےٰ نے جوش دین کا تو یہ انتظام فرمایا کہ نماز مقرر فرمائی اور جوش طبیعت کا یہ انتظام فرمایا کہ اس دن اچھے سے اچھا کپڑا پہننے کی اجازت دی سبحان اللہ شریعت کا کیا پاکیزہ انتظام ہے کسی نے خوب کہا ہے گویا جمال شریعت ہی کے شان میں ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است

چوٹی سے لیکر ایڑی تک جس جگہ بھی میں دیکھتا ہوں ہر جگہ کی خوبی دل کے دامن کو کھینچتی ہے کہ دیکھنے کی جگہ یہی ہے یعنی ہر جگہ پسندیدہ ہے۔

افسوس اس شریعت کو لوگوں نے بھیانک صورت میں ظاہر کیا اور لوگوں کو اس سے متوحش بنا دیا ورنہ وہ تو عجیب دلفریب ہے یہ احکام تھے عید کے متعلق لیکن عید کے متعلق فرعی احکام میں نے اس وقت اس لئے بیان نہیں کئے کہ متعدد بار بیان ہو چکے ہیں مثلاً چاند دیکھنے میں کوشش کرنا خبروں کے اعتبار کرنے میں احتیاط کرنا وغیرہ لیکن صدقہ فطر کے متعلق اس وقت اتنا بیان کرتا ہوں کہ جس کے پاس پچاس روپیہ کی مالیت اپنی حاجت سے زیادہ ہو اس پر واجب ہے کہ اپنی اور اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے پونے دو سیر پختہ گندم مساکین کو دے دو مگر تنخواہ میں دینا درست نہیں کیونکہ تنخواہ دار کی تنخواہ میں دینے سے صدقہ فطر ادا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک فضیلت یوم عید کی

اور یاد آئی حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں کے عید گاہ میں جمع ہونے کے بعد خدا تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب بنا کر فرماتے ہیں ما جزاء اجیر و فی عملہ یعنی اس مزدور کو کیا بدلہ دیا جاوے جس نے اپنے عمل کو پوری طرح کیا ہو فرشتے عرض کرتے ہیں جزاء وان یوفی اجرہ کہ اس کی جزا یہ ہے کہ اسے پوری مزدوری دی جاوے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وعزتی وجلالی وارتفاع شانی لاغفرنھم فیرجعون مغفوراً لھم یعنی خدا تعالیٰ فرما دیں گے کہ اپنے جلال اور عزت کی قسم آج میں اُن کی مغفرت کئے دیتا ہوں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس گفتگو کو نقل فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ بس لوگ بخشے بخشائے واپس آتے ہیں تو اس حدیث کے سننے کے بعد اب لوگوں کو غور کرنا چاہئے کہ عیدگاہ میں کیسی ہیئت بنا کر جانا چاہئے کہ اس کرامت کے اہل تو ہوں افسوس ہے کہ اکثر لوگ نافرمانوں کی صورت بنا کر جاتے ہیں بہتر بلکہ ضروری بات ہے کہ جو لوگ ڈاڑھی منڈاتے ہیں یا ترشواتے ہیں آج سے توبہ کرلیں ہمیشہ کے لئے نہ ہو سکے تو عید بقرعید کے گزرنے تک تو اس سے بچے رہیں کہ ان دنوں میں بڑی حاضری ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ڈاڑھی نہ منڈائی جائے تو کوئی نقصان بھی تو نہیں اور منڈانے سے کوئی نفع بھی تو حاصل نہیں ہوتا پھر اس بے لذت گناہ سے کیا نتیجہ کہ خدا کے سامنے ذلیل بھی ہوئے دنیا میں کچھ مزا تک بھی نہیں آیا اسی طرح بعض لوگ ریشمی لباس پہن کر عید گاہ میں جاتے ہیں ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ ان کی نماز مقبول نہیں ہوتی نیز اپنے لڑکوں کو بھی ایسا لباس نہ پہنا دیں صاحبو کیا کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہوئے کوئی شخص بغاوت کے تمغے سجا کر جا سکتا ہے۔ پھر کیا خدا کی عظمت شاہان دنیا کے برابر بھی نہیں اس کو سوچو اور خدا تعالیٰ کے عذاب کو پیش رکھ کر ان سب خرافات سے باز آجاؤ۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عمل دے آمین ثم آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رواہ البخاری)

دعواتِ عبدیت جلد دُوم

کا

آٹھواں وعظ ملقب بہ

غضُ البَصَر

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

: رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ :

ناشر:۔ محمد عبدالمنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

مسافر خانہ ۔ بندر روڈ (ایم ۔ اے جناح روڈ) کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد دوم کا

آٹھواں وعظ ملقب بہ

غض البصر

اشتات	المستمعون	من ضبط	ماذا	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تخمینی تعداد	کس نے لکھا	کیا مضمون تھا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
.	تقریباً دو ہزار	مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی	معصیت چشم	بیٹھ کر	۳ گھنٹے	۱۲ شوال ۱۳۲۹ھ	جامع مسجد تھانہ بھون

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور۔

ترجمہ آیۃ شریفہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتے ہیں اور جس شئے کو سینے میں چھپاتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں۔ یہ ایک آیۃ ہے جس کے الفاظ تھوڑے ہیں اور معانی بہت ہیں اس اللہ تعالےٰ نے ایک امر قبیح پر مطلع فرمایا ہے اور علاوہ اطلاع کے اس میں زجر بھی ہے اس کو اس وقت اس لئے اختیار کیا۔ ہے کہ جس مرض کا اس میں بیان ہے آج کل اس میں بہت ابتلا ہے اور امراض میں سے

وہی مرض متنبہ کرنے کیلئے لیا جاتا ہے جس میں ابتلا ہوا اور مرض سے یہاں مراد معصیت ہے گو لوگ اس کو مرض سمجھیں کہ تعجب ہوگا کہ اس کو مرض کیوں کہا گیا لیکن بعد بیان حقیقت مرض کے اس کی وجہ سمجھ میں آجاوے گی مرض کی حقیقت ہے اعتدال سے مزاج کا خارج ہوجانا اور معصیت میں بھی قلب کا مزاج اعتدال سے خارج ہوجاتا ہے بلکہ یہ خروج عن الاعتدال جو قلب کے متعلق ہے زیادہ مضر ہے اس لئے کہ بدنی مرض کا انجام بہت سے بہت یہ ہے کہ مرجاوے گا اور مرنے سے بعض اوقات نفع ہوتا ہے کہ بہت سے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے کیونکہ جس قدر آلام ہیں وہ اس بدن اور روح ہی کے تعلق کی وجہ سے ہیں دیکھئے مرض حذر یعنی سُن ہوجانے میں بدن کو اگر کاٹ ڈالیں تو کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور مفلوج کے فالج زدہ حصہ میں اگر سوئیاں بھی چبھوئیں تو کچھ بھی اثر نہیں ہوتا کیونکہ روح کا تعلق بدن سے ویسا نہیں رہا باوجودیکہ اس حالت میں روح سے تعلق رہتا ہے گو وہ تعلق ضعیف ہی سہی اور اس تعلق ہی کا اثر یہ ہے کہ وہ عضو گلتا سڑتا نہیں جیسے مردہ کا بدن گل جاتا ہے اور جبکہ بالکل ہی روحی مفارقت ہوجاوے اور یہ تعلق ضعیف بھی نہ رہے گا تو ظاہر ہے کہ بطریق اولیٰ تکلیف نہ ہوگی یعنی جو مفہوم تکلیف کا ہمارے نزدیک ہے اور جو معنی متبادر الم کے ہیں وہ نہ ہوگی ہاں دوسری دلائل سے معلوم ہوا کہ روح کو بعد مفارقت جسم کچھ تازی ہوتی ہے، جیسا کہ بعض نصوص میں ہے کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا جس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فعل سے روح کو کچھ الم ہوتا ہے مگر جس قسم کا الم روح کے تعلق مع الجسم کی حالت میں ہڈی توڑنے سے روح کو ہوتا ہے وہ الم نہیں ہوتا اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیئے کہ مثلاً زید کے بدن کو اگر مارا جاوے تو اس کو تکلیف ہوگی اور زید کی رضائی اتار کر چوطھے میں رکھ دی جاوے تب بھی تکلیف ہوگی مگر دونوں تکلیفیں جُدا جُدا ہیں پس روح کے مفارق ہونے کے بعد روح کو ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے رضائی جلانے سے زید کو ہوئی اور اس تکلیف کی وجہ بھی وہی تعلق سابق ہے جو بدن کے ساتھ اس کو تھا وہ تعلق اس کو مستحضر ہوتا ہے۔

اس لئے تکلیف ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب روح مفارق ہوجاتی ہے توکوئی الم نہیں رہتا۔ اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا ایک طبیب کی تعریف کی گئی کہ یہ بڑے اچھے حکیم ہیں ان کے علاج سے مرض ہی نہیں رہتا یعنی مریض ہی نہیں رہتا جو مرض رہے کیونکہ مرض نہ رہنے کی دو صورتیں ہیں یا تو مریض رہے اور تندرست ہوجاوے، یا یہ کہ مریض ہی چل دے۔ جیسے کسی افیونی کی ناک پر مکھی آکر بیٹھی اس نے اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی جب کئی بار اڑانے سے نہ گئی تو آپ نے چھری لے کر ناک اڑا ڈالی اور کہا وہ اڈا ہی نہیں رہا جس پر اب بیٹھے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے نہ زکام رہتا ہے نہ کھانسی نہ بخار نہ فکر نہ رنج سب بلائیں اور آلام دور ہوجاتے ہیں بالکل سکون ہوجاتا ہے سکون کے لفظ پر ایک شرعی لطیفہ یاد آیا اور وہ حکیمانہ لطیفہ ہے۔ اور وہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بی بی ام سلیمؓ کا قصہ ہے ان دونوں میاں بی بی کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے ایک مرتبہ ان کا بچہ بیمار ہوگیا۔ حضرت ابوطلحہؓ ہمیشہ آکر بی بی سے اس کا حال پوچھتے۔ ایک روز وہ بچہ انتقال کر گیا حضرت ابوطلحہؓ اس وقت باہر تھے بی بی نے یہ خیال کیا کہ اگر میں اب اطلاع کروں گی تو شب کا وقت ہے نہ کھانا کھائیں گے اور نہ ان کو نیند آئیگی خواہ مخواہ بے چین ہوں گے اس لئے مناسب ہے کہ اس وقت اطلاع ہی نہ کیجائے حقیقت میں دین عجیب شئے ہے تمام عمر کی اصلاح کردیتا ہے۔ حضرت ابوطلحہؓ جب باہر سے تشریف لائے تو حسب عادت دریافت فرمایا کہ بچہ کیسا ہے، اب یہ وقت بڑے امتحان کا تھا اگر سچ بولیں تو وہ مصلحت فوت ہوتی ہے اور جھوٹ میں شرعاً گناہ حقیقت میں بڑی کشمکش کا وقت تھا لیکن دین فہم کو تیز کر دیتا ہے چنانچہ من جانب اللہ ایک جواب ان کو القاء ہوا۔ فرمایا اب تو اس کو سکون ہے آرام ہے اس لئے کہ موت سے بڑھ کر کوئی سکون اور آرام نہیں ہے اس لئے کہ آرام وراحت کی دو صورتیں ہیں دفع مضرت یا جلب منفعت دونوں حالتوں میں عرفاً آرام سے ہوتا کہا جاتا ہے۔ موت میں دونوں چیزیں موجود ہیں۔ دفع

مضرت بھی ہے وہ تو ظاہر اور جلبِ منفعت یہ ہے کہ موت سے وصول الی المحبوب الحقیقی ہوتا ہے یہ خاص مسلمانوں کے لئے ہے ایک لطیفہ یاد آیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میرے باپ یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو جیسا کہ ایک اعرابی نے مجھ کو تسلّی دی ایسی کسی نے نہیں دی سچ یہ ہے کہ دیندار خواہ گاؤں کا ہو یا شہر کا اس کا فہم چونکہ دین کی وجہ سے درست ہو جاتا ہے اس لئے وہ حقائق امور کو خوب سمجھتا ہے وہ مضمون تسلّی کا یہ ہے۔ اصبر نکن بك صابرين فانما صبر الرعية بعد صبر الراس خير من العباس اجرك بعده - والله خير منك للعباس مطلب یہ ہے کہ اب صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑے کے صبر کے بعد ہوتا ہے اور اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور وہ ثواب تمہارے لئے حضرت عباسؓ سے بہتر ہے اور حضرت عباسؓ کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوا اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ عباسؓ کے لئے تم سے بہتر ہے یعنی تمہارے پاس رہنے سے اللہ کے پاس رہنا بہتر ہے یہ عجیب مضمون ہے حقیقت میں موت ایسی ہی آرام کی شے ہے حدیث میں آیا ہے کہ موت مؤمن کا تحفہ ہے اور انسان کی حالت یہ ہے کہ اس سے بھاگتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس عالم کو دیکھا نہیں۔ موت ایک ریل گاڑی کی طرح ہے جیسے گاڑی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے اسی طرح موت اس عالم سے دار آخرت میں پہنچا دیتی ہے جب گاڑی میں آدمی بیٹھا ہوتا ہے تو اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میرے لئے وہاں کیا کیا تیار ہو رہا ہے جب ریل سے اسٹیشن پر اُترے دیکھا تو وہاں طرح طرح کے سامان ہیں ایک مخلوق استقبال کے لئے کھڑی ہے اقسام اقسام کی نعمتیں کھانے پینے کی موجود ہیں تو اس وقت جانتا ہے کہ اللہ اکبر یہاں تو ہمارے لئے بڑا سامان ہے اور جہاں سے آیا تھا وہ سب اُس کی نظر میں ہیچ معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کا خیال تک بھی نہیں آتا اسی طرح اس دنیا کا حال ہے کہ اس وقت یہاں کچھ خبر نہیں لیکن جب یہاں سے رحلت ہوگی تو انشاء اللہ تعالیٰ وہاں دیکھ لیں گے کہ یہاں ہمارے لئے

کیا نعمتیں ہیں اور بزرگوں نے بصر سے یا بصیرت سے دیکھا ہے اس لئے اُن کی نظر میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ دنیا کو عالمِ آخرت کے ساتھ وہ نسبت ہے جو ماں کے رحم کو اس دنیا کے ساتھ ہے جیسے بچہ اپنی رضا مندی سے دنیا میں نہیں آتا اسی طرح آدمی وہاں جانا نہیں چاہتا اور جیسے بچہ ماں کے رحم ہی کو سمجھتا ہے کہ تمام جہان یہی ہے اور آگے اس کی نظر ہی نہیں جاتی اور جب ماں کے رحم سے نکلتا ہے تو حقیقت معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہم لوگ جب یہاں سے جاویں گے تو اس دنیا کی حقیقت معلوم ہوگی۔ بہرحال موت ہر طرح سکون اور آرام کی شے ہے۔ اسی واسطے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا اب اس کو سکون ہے اس کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کھانا کھایا اور پھر ان کو بی بی کے پاس جانے کی رغبت ہوئی اور بی بی کا حال یہ کہ ظاہر میں تو جو کچھ میاں کہتے تھے ان کی رضا مندی کے واسطے سب کچھ کر رہی تھیں مگر اندر جو کچھ تھا وہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا غرض میاں تو فارغ ہو کر سو رہے اور بی بی کو کیا نیند آئی ہوگی صبح کے وقت جب حضرت ابوطلحہؓ نماز پڑھ کر تشریف لائے تو بی بی نے پوچھا کہ بھلا ایک بات تو بتلاؤ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھ دے تو جب وہ اپنی امانت مانگے تو ہنسی خوشی دینا چاہیے یا ناک منہ چڑھانا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں ہنسی خوشی دینا چاہیے کہا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت لے لی۔ اب تم صبر کرو، میاں ناراض بھی ہوئے کہ رات تم نے خبر نہ کی، فرمایا کہ کیا نفع تھا تم پریشان ہوتے مجھے اس پر قصہ یاد آیا تھا کہ انھوں نے موت کا نام سکون رکھا۔ حاصل یہ کہ امراض بدنیہ کا انتہائی انجام موت ہے اور موت چونکہ قاطع تمام مصائب کی ہے اس لئے کچھ مضر نہیں مگر پھر بھی امراض بدنیہ کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں بخلاف مرض روحانی کے جس کی حقیقت ہے حدود شرعیہ سے تجاوز کرنا اور اعتدال سے خارج ہو جانا کہ اس کا انجام وہ ہلاکت ہے جس کی نسبت فرمایا ہے لا یموت فیها ولا یحییٰ جس کا نام جہنم ہے اگر موت آ جاتی تو سب قصے ختم ہو جاتے

مگر وہاں موت بھی نہیں پس جس مرض کا انجام صرف ہلاکت بدن ہے اس کو جب قابل اہتمام سمجھتے ہیں تو جس مرض کا نتیجہ ہلاکت ابدی یا مدید شدید ہے کیا وہ قابل اہتمام نہیں کیا اس کو مرض نہ کہا جاوے گا مگر حالت یہ ہے کہ زکام ہو جاوے تو حکیم جی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور ہزار ہا روحانی امراض میں مبتلا ہیں اور کچھ پرواہ نہیں اور یوں تو ہر معصیت قابل اہتمام و فکر ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ معصیت زیادہ قابل فکر ہے جس کو خفیف سمجھا جاوے کسی نے بقراط سے پوچھا تھا کہ امراض میں کونسا زیادہ شدید ہے کہا کہ جس مرض کو خفیف سمجھا جاوے وہ بہت اشد ہے۔ اسی طرح جس گناہ کو ہلکا سمجھا جاوے وہ بہت شدید ہے اس لئے کہ وہ لا علاج ہے سو منجملہ ایسے امراض کے ایک مرض یعنی گناہ وہ ہے جس کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے اور اسی واسطے اس کو اس وقت اختیار کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں یعلم خائنۃ الاعین الخ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس آیۃ میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے آنکھوں کے گناہ کو اور دل کے گناہ کو اور یوں تو آنکھوں کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں ایک خاص گناہ کا ذکر ہے وہ گیا ہے بدنگاہی۔ اسی طرح دل کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں بقرینہ سباق خاص گناہ کا ذکر ہے یعنی نیت بُری ہونا ان دونوں گناہوں کو لوگ گناہ سمجھتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ جس درجہ اُن کی مضرت ہے اس قدر نہیں سمجھتے چنانچہ گناہ کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہیئے کہ دل تو میلا ہو جائے مگر اس گناہ کے بعد دل بھی میلا نہیں ہوتا بہت خفیف سمجھتے ہیں۔ کسی عورت کو دیکھ لیا کسی لڑکے کو گھور لیا اس کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا یا کسی پھول کو دیکھ لیا اور یہ گناہ وہ ہے کہ اس سے بوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ بدکاری سے تو بہت محفوظ ہیں کیونکہ اس کے لئے بڑے اہتمام کرنے پڑتے ہیں اول تو جس سے ایسا فعل کرے وہ راضی ہو اور روپیہ بھی پاس ہو اور نیز حیا و شرم بھی مانع نہ ہو غرض اس کے لئے شرائط بہت ہیں اسی طرح موانع بھی بہت ہیں۔ چنانچہ کہیں تو یہ

امر مانع ہوتا ہے کہ اگر کسی کو اطلاع ہو گئی تو کیا ہو گا۔ کسی کو خیال ہوتا ہے کہ کوئی بیماری نہ لگ جاوے۔ کسی کے پاس روپیہ نہیں ہوتا کسی کو اس کی وضع مانع ہوتی ہے چونکہ موانع زیادہ ہیں اس لئے کوئی شائستہ آدمی خصوصاً جو دیندار سمجھے جاتے ہیں اس میں بہت کم مبتلا ہوتے ہیں۔ بخلاف آنکھوں کے گناہ کے کہ اس میں سامان کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ نہ اس میں ضرورت روپیہ کی اور نہ اس میں بدنامی کیونکہ اس میں خبر تو اللہ ہی کو ہے کہ کیسی نیت ہے کسی کو گھور لیا اور مولوی صاحب مولوی صاحب رہتے ہیں اور قاری صاحب قاری صاحب رہتے ہیں نہ اس فعل سے ان کی مولویت میں فرق آتا ہے اور نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں کوئی دھبہ لگتا ہے اور گناہوں کی خبر تو اوروں کو بھی ہوتی ہے مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی۔ معصیت کرتے ہیں اور نیک نام رہتے ہیں۔ لڑکوں کو گھورتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو بچوں سے بڑی محبت ہے جبکہ آنکھوں کے گناہ میں اطلاع نہیں ہوتی تو دل کے گناہ پر تو کیسے ہو سکتی ہے اور جن کو اطلاع ہوتی بھی ہے وہ حضرات ایسے متحمل اور ظرف والے ہیں کہ کسی کو خبر نہیں کرتے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور وہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ کر آیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطاب خاص سے تو اس کو کچھ نہ فرمایا لیکن یہ فرمایا ما بال اقوام یترشح الزنا من اعینھم۔ یعنی لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے تو یہ عنوان ایسا ہے کہ اس میں رسوائی کچھ نہیں لیکن جو کرنے والا ہے وہ سمجھ جائے گا کہ مجھے فرما رہے ہیں اہل کشف نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایک ایسی ظلمت ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بصیرت ہو وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے اگر دو شخص ایسے لئے جاویں کہ عمر میں حسن و جمال میں اور ہر امر میں وہ برابر ہوں فرق ان میں صرف اس قدر ہو کہ ایک فاجر ہو دوسرا متقی ہو جب چاہے دیکھ لو متقی کی آنکھ میں رونق اور دل فریبی ہو گی اور فاسق کی آنکھ میں ایک قسم کی ظلمت اور بے رونقی ہو گی لیکن اہل کشف

خصوصیت سے کسی کو کہتے نہیں بلکہ عیب پوشی کرتے ہیں اس پر مجھے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حسب معمول حدیث کا درس ہو رہا تھا کہ ایک طالب علم وقت سے دیر کر کے سبق کے لئے آئے۔ حضرت شاہ صاحب کو منکشف ہوگیا کہ یہ جنبی ہے غسل نہیں کیا وہ طالب علم معقولی تھے معقولی ایسے ہی لاپرواہ ہوتے ہیں شاہ صاحب نے مسجد سے باہر ہی روک دیا اور فرمایا کہ آج تو طبیعت سست ہے جمنا پر چل کر نہائیں گے سب لنگیاں لے کر چلو سب لنگیاں لے کر چلے اور سب نے غسل کیا اور وہاں سے آکر فرمایا کہ ناغہ مت کرو دیکھو پڑھ لو وہ طالب علم ندامت سے پانی پانی ہوگیا۔ اہل اللہ کی یہ شان ہوتی ہے کیسے لطیف انداز سے اس کو امر بالمعروف فرمایا اور جب بزرگوں کی شان معلوم ہوگئی کہ وہ کسی کو رسوا نہیں کرتے تو اب مستفیدین کو بھی چاہیئے کہ ایسے شیوخ سے اپنے عیب کو نہ چھپایا کریں اس لئے کہ عیب ظاہر نہ کرنا دو وجہ سے ہوتا ہے یا خوف ہوتا ہے کہ یہ ہم کو حقیر سمجھیں گے سو ان حضرات میں نہ تو یہ بات ہے کہ کسی کو حقیر سمجھیں اس لئے کہ یہ حضرات سوائے اپنے نفس کے کسی کو حقیر نہیں سمجھتے اور یا یہ خوف ہوتا ہے کہ کسی کو اطلاع کر دیں گے سو نہ ان حضرات میں یہ بات ہے اس لئے ان سے صاف کہدینا چاہیئے مگر یہ اظہار معالجہ کے لئے ہے نہ کہ بلا ضرورت کیونکہ بلا ضرورت گناہ کو ظاہر کرنا بھی گناہ ہے اور بضرورت ظاہر کرنے کے حق میں حضرت عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

چنداں کہ گفتیم غم با طبیباں — درماں نکردند مسکیں غریباں
ما حال دل را با یار گفتیم — نتواں نہفتن درد از حبیباں

میں نے طبیبوں سے جتنی بھی اپنے غم کی داستان کی وہ بے چارے میرا کوئی علاج نہ کر سکے ہم نے اپنے دل کا حال اپنے دوستوں سے کہدیا کیونکہ دوستوں سے حالت چھپائی ہی نہیں جاتی۔

غرض چونکہ وہ لوگ کسی کو فضیحت نہیں کرتے اور جو نصیحت کرنے والے ہیں ان کو اطلاع نہیں ہوتی اس لئے یہ گناہ بدنگاہی کا اکثر چھپا ہی رہتا ہے اس لئے لوگ بے دھڑک اس کو کرتے ہیں۔ پھر زنا و دیگر معاصی مثل سرقہ وغیرہ میں تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ قوت و طاقت ہو اس میں اس کی بھی ضرورت نہیں اس لئے بوڑھے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ دیکھئے بوڑھا اگر عاشق ہو جاوے اور قابو بھی چل جاوے تو کچھ بھی نہیں کر سکتا اس لئے کہ وہ قوت ہی نہیں ہے۔ مگر آنکھوں کے سینکنے میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں خواہ لب گور ہی ہو جاویں مجھ سے ایک بوڑھے آدمی ملے اور وہ بہت متقی تھے انھوں نے اپنی حالت بیان کی کہ میں لڑکوں کو بری نظر سے دیکھنے میں مبتلا ہوں۔ ایک اور بوڑھے بھی عورتوں کے گھورنے میں مبتلا تھے اور یہ مرض اول جوانی میں پیدا ہوتا ہے بلکہ سب گناہوں کی یہی شان ہے کہ اول جوانی میں تقاضے کی وجہ سے کیا جاتا ہے پھر وہ مرض اور روگ لگ جاتا ہے اور لب گور تک کیا جاتا جیسے حقہ کہ اول کسی مرض کی وجہ سے پینا شروع کیا تھا مگر پھر یہ مرض لگ جاتا ہے اور شغل ہو جاتا ہے لیکن جوان اور بوڑھے میں فرق یہ ہے کہ جوان آدمی تو معالجہ کے لئے کسی سے کہہ بھی دیتا ہے اور بوڑھا آدمی شرم کی وجہ سے کسی سے کہتا بھی نہیں پس اس کے مخفی رہنے اور خفیف ہونے کی وجہ سے اس میں کثرت سے ابتلاء واقع ہے اسی واسطے فرماتے ہیں یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور یعلم کا لفظ دال ہے کہ اور لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ہم ہی واقف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں یہ صحیح نہیں ایسے کو خبر ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے اس لئے کہ اس کو تم پر پوری قدرت ہے اور اس گناہ کو ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ ان کی سزا ساتھ ساتھ بیان فرما دی ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ طبائع ہم لوگوں کی مختلف ہیں بعض طبائع تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سزا ہونا مانع اور زاجر ہوتا ہے وہ تو وہ

لوگ ہیں جو بے حیا و بے شرم ہیں کہ جوتوں سے ڈرتے ہیں اور بغیر جوتیوں کے خواہ کسی کو خبر ہو جاوے اُن کو کچھ باک نہیں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ سزا کی اگر اطلاع ہو جائے تو رکاوٹ کم ہوتی ہے لیکن اس سے وہ گڑ جاتے ہیں کہ فلاں کو خبر ہو جاوے گی بالخصوص جب یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارا یہ جرم معاف بھی ہو جاوے گا تو اور بھی زیادہ عرق عرق ہو جاتے ہیں کیا خوب کہا ہے ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں کہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا

ادھر سے ایسے گناہ پیہم اُدھر سے وہ دمبدم عنایت

اسی بنا پر ایک آیۃ کی تفسیر یاد آگئی وہ یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس ناکہ پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطا اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے۔ اذ تصعدون ولا تلون علی احد والرسول یدعوکم فی اخراکم فاثابکم غما بغم لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم ولا ما اصابکم واللہ خبیر بما تعملون۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا بہ سبب اس کے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تاکہ حزن ہو نہ کہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لا زائد ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تاکہ تم کو حزن ہو۔ لیکن الحمد للہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لا ماننے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست ہیں۔ وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شرماتے تھے۔ جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی تو ساری

عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ و جان فرسا تھا اس بنا پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دے دی تاکہ تم کو غم نہ ہو۔ غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سُن کر رُکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اُس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رُکے کہ یَعْلَمُ میں اشارہ کی سزا کی طرف بھی ہے۔ چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر فیجازیکم بہ فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رُکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہر حال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے وعید ہے اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مرض نہایت اہتمام کے قابل ہے اب ہم کو اپنی حالت دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو ورنہ ابتلائے عام ہے اور اس کو نہایت درجہ خفیف کہتے ہیں جو جوان ہیں ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہویہ ضعیف ہو گئی ہے ان کو احساس بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت ہی نہیں اس لئے کچھ حرج نہیں ہے سو ان کو مرض کا بھی پتہ نہیں لگتا۔ اور بعضوں کو اور دھوکہ ہوتا ہے وہ یہ کہ شیطان بہکاتا ہے کہ جیسے کسی پھول اچھے کپڑے اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے سو یہ بالکل دھوکہ ہے۔ یاد رکھو کہ رغبت کے مختلف انواع ہیں جیسی رغبت پھول کی طرف ہے ویسی انسان کی طرف نہیں۔ اچھے کپڑے کو دیکھ کر کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کو گلے لگالوں چمٹا لوں، انسان کی طرف ایسی ہی رغبت ہوتی ہے۔ ایک دھوکہ اور ہوتا ہے وہ یہ کہ بعضے یہ کہتے ہیں جیسے اپنے بیٹے کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گلے لگالوں اسی طرح دوسرے کے بچے کو دیکھ کر بھی ہمارا یہی جی چاہتا ہے صاحبو! کھلی ہوئی بات ہے اپنے سیانے بچہ اور دوسرے کے سیانے

لڑکے میں بڑا فرق ہے اپنے لڑکے کو گلے لگانا چمٹانا اور طرح کا ہے اس میں شہوۃ کی آمیزش ہرگز نہیں اور دوسرے کے لڑکے کی طرف اور قسم کا میلان ہے کہ اس میں گلے لگانے سے بھی آگے بڑھنے کو بعض کا جی چاہتا ہے۔ محبوب کی جدائی میں اور طرح کا رنج ہوتا ہے اور لڑکے کی جدائی میں اور قسم کا اور لڑکوں کی رغبت تو اور بھی سم قاتل ہے نصوص میں تو اس کی حرمت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی جو اس کے آثار لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سخت بلا ہے۔ ایک بزرگ مطلق نظر کے لئے فرماتے ہیں النظرۃ سھم من سھام ابلیس۔ یعنی نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ حضرت ابوالقاسم قشیری دونوں امر کی نسبت فرماتے ہیں کہ سالک کے لئے امردوں اور عورتوں کی مخالطت رہزن ہے ایک بزرگ کا خاص امردوں کے حق میں قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو لڑکوں کی محبت میں مبتلا کر دیتے ہیں غرض یہ نہایت مضرت کی چیز ہے اور دوسرے معاصی اور بدنگاہی کی معصیت میں ایک اور فرق ہے وہ یہ کہ صدور کے بعد سب گناہوں کا اثر ختم ہوجاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے مگر بدنگاہی ایسی شے ہے کہ جب صادر ہوتی ہے اور زیادہ تقاضا ہوتا ہے کہ اور دیکھو آدمی کھانا کھاتا ہے سیر ہوجاتا ہے پانی پیتا ہے پیاس بجھ جاتی ہے مگر یہ نظر ایسی بلا ہے کہ اس سے سیری نہیں ہوتی ہے اس حیثیت خاص سے یہ تمام گناہوں سے بڑھ کر ہے۔ بعضے لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ اس سے خدا کا قرب ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہم خدا کی قدرت دیکھتے ہیں مگر نرا شیطانی دھوکا ہوتا ہے۔ شیخ شیرازیؒ نے ایسے ہی لوگوں کے جواب میں ایک حکایت تحریر فرمائی ہے، فرماتے ہیں ؎

یکے صورت دید صاحب جمال	بگردیدش از شورش عشق حال
برانداخت بیچارہ چنداں عرق	کہ شبنم بر آرد بہشتی ورق
گذر کرد بقراط بردرے سوار	بپرسید کیں راچہ افتاد کار

کسے گفتش ایں عابد پارساست | کہ ہر گز خطائے ز دستش نخاست
بہ برداشت خاطر فریبے دلش | فرو رفتہ پائے نظر در گلش
نہ ایں نقش دل می رباید ز دست | دل آں مے رباید کہ ایں نقش بست

بقراط جواب دیتا ہے۔

نگارندہ را خود ہمیں نقش بود | کہ شوریدہ را دل بیغما رہ بود
چرا طفل یک روزہ ہوشش بزد | کہ در صنع دیدن چہ مانع چہ خرد
محقق ہماں بیند اندر ابل | کہ در خوبرویانِ چین و چگل

اگر کوئی دعوے کرے کہ مجھ کو اونٹ اور انسان صاحب جمال دونوں برابر ہیں وہ کاذب ہے آدمی اپنی طبیعت کا خود اندازہ کر سکتا ہے اور یہ میلان جس کو عشق کہتے ہیں عشق نہیں ہے یہ شہوت ہے ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود | ایں فساد از خوردن گندم بود

یہ عشق نہیں ہے جو کہ لوگوں میں عام طور پر موجود ہے یہ گیہوں کھانے اور پیٹ بھرا ہونے کی خرابی ہے۔

یہ سارا فساد دو روٹیوں کا ہے ایسے لوگوں کو چار روز تک روٹی نہ ملے اس کے بعد پوچھا جاوے کہ روٹی لاؤں یا لڑکا لاؤں یہ کہے گا کہ لڑکا اپنی ایسی تیسی میں جائے روٹی لاؤ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملا جامی نے عشق مجازی کا امر کیا ہے اور حکایت لکھی ہے کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب گیا تھا انھوں نے کہا کہ عاشق ہو کر آؤ اور آگے لکھتے ہیں ؎

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست | کہ آں بہر حقیقت کارسازیست
اگر اول الف با تا نخوانی | ز قرآں حرف خواندن کے توانی

اگر یہ عشق مجازی ہے مگر اس کا برا نہ سمجھ اور منہ نہ پھیر۔ کیونکہ یہی عشق مجازی حقیقت کے لئے کام بنانے والا ہے۔ جب تک تو الف با تا نہیں پڑھے گا قرآن پاک کا ایک حرف بھی نہ پڑھ سکے گا۔

اس سے بعضے نادانوں نے سمجھا کہ جب تک کسی رنڈی کسی لونڈے کو قبلہ توجہ نہ بنایا جاوے اس وقت تک عشق حقیقی نہ میسر ہوگا بڑی غلطی اور سخت کم فہمی ہے میں اس کا مطلب عرض کرتا ہوں بات یہ ہے کہ اصلی مقصود طالب کا تو یہ ہے کہ جملہ تعلقات قطع کرکے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ ہو تو اس کے دو جزء ہیں تعلقات مخلوق سے قطع کرنا اس کو تو اصلاح میں فصل کہتے ہیں اور دوسری طرف تعلق پیدا ہونا اس کو وصل یعنی فصل و وصل کہتے ہیں اور یہ تعلقات ہی فاصل وجاہت بن رہی ہے اگرچہ درمیان سے اٹھ جاویں تو وصل ہی وصل ہے شیخ فرماتے ہیں ؎

تعلق حجابست بے حاصلی چو پیوند ہا بگسلی واصلی

تعلقات بیکار کے پردہ بن جاتے ہیں جب تو پیوندوں کو توڑ دے گا مقصد حاصل کرلے گا۔

پس معلوم ہوا کہ مقصود انقطاع عما سوی اللہ (اللہ کے سوا دوسروں سے تعلقات توڑ لینا) ہے جب یہ ہو جاوے تو قصہ سہل اور اس انقطاع کی تحصیل کے لئے بزرگوں نے مختلف معالجے اور تدبیریں فرمائی ہیں مقصود ایک ہی ہے صرف طرق مختلف ہیں ان میں سے ایک طریق تو ہے کہ جس جس مخلوق سے تعلق ہوا اور جو جو مرض ہو اس کو قلب سے ایک ایک کرکے زائل کردیا جاوے۔ چنانچہ متقدمین کا یہی طریق تھا لیکن اس طریق کے اندر سخت مشقت تھی اس لئے کہ مثلاً کسی شخص کو دس چیزوں سے تعلق ہے مکان سے باغ سے اولاد وغیرہ سے اور دس ہی اس کو مرض ہیں کینہ، حسد، تکبر وغیرہ تو سب کا بالتفصیل علیحدہ علیحدہ معالجہ کیا جاوے اس کے لئے عمر نوح چاہیئے اور پھر بھی بیخ کنی ان امراض کی نہ ہو گی۔ اس مشقت کو دیکھ کر یا لہام حق پچھلے بزرگوں نے ایک طریقہ ایجاد کیا ہے جیسے طبیب مشفق کی شان ہوتی ہے کہ مریض اگر کڑوی دوا سے ناک منہ چڑھاتا ہے تو وہ اس کو کسی اچھی تدبیر سے کھلا دیتا ہے یا بدل دیتا ہے۔ ایسے ہی انھوں نے دیکھا کہ مثلاً ایک شخص کو ایک ہزار چیزوں سے تعلق ہے تو اگر ایک ایک شے سے تعلق چھڑایا

جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی کوئی تدبیر ایسا ہونا چاہیئے کہ ایک دم سے سب کا خاتمہ ہو جائے جیسے کسی مکان میں کوڑا بہت ہو تو اس کی صفائی کا ایک طریق تو یہ ہے کہ ایک ایک تنکا لیا اور پھینک دیا اسی طرح سب تنکے اور کوڑا مکان سے باہر پھینک دیا جاوے اس میں تو بڑا وقت صرف ہوگا اور ایک طریق یہ ہے کہ جھاڑو لے کر تمام تنکوں کو ایک جگہ جمع کر کے پھینک دیا تو ایسے ہی یہاں بھی کوئی جھاڑو ہونا چاہیئے کہ سب تعلقات کو سمیٹ کر ایک جگہ کر دیوے پھر اس ایک کا ازالہ کر دیا جاوے چنانچہ ان کی سمجھ میں آیا کہ عشق ایک ایسی شئے ہے کہ سب چیزوں کو پھوک کر خود ہی رہ جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی کسی کسبی وغیرہ پر عاشق ہو جاتا ہے تو مال بیوی بچے۔ باغ مکان حتیٰ کہ اپنی جان تک اس کے واسطے ضائع کر دیتا ہے ایک رئیس کو بیلوں کا عشق تھا ہزارہا روپیہ اس میں ضائع کر دیا۔ ہمارے استاد حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کتابوں کا شوق تھا خود نہ دیکھتے تھے مگر سینکڑوں کتابیں اس قسم کی خرید کر رکھ چھوڑیں تھیں غرض عشق وہ شئے ہے کہ سوائے معشوق کے سب کو فنا کر دیتا ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت — ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

عشق ایسی آگ ہے کہ جب وہ سلگ جاتی ہے تو سوائے معشوق کے ہر چیز کو جلا دیتی ہے۔

اس لئے ان بزرگوں نے تجویز کیا کہ طالب کے اندر عشق پیدا کرنا چاہیئے خواہ کسی شئے کا ہو اس واسطے وہ اول دریافت کرتے تھے کہ کسی پر عاشق بھی ہو۔ پس معلوم ہوا اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہی کا عشق ہو بھینس کا عشق بھی اس کے لئے کافی ہے اس لئے کہ مقصود تو یہ ہے کہ تمام اشیاء سے توجہ منصرف ہو کر ایک طرف ہو جاوے تاکہ پھر اس کا امالہ عشق حقیقی کی طرف سہل ہو جاوے چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک شخص ان کے پاس مرید ہونے آیا انھوں نے معلوم کیا کہ کسی شئے سے تم کو محبت بھی ہے اس نے

کہا کہ مجھ کو اپنی بھینس سے محبت ہے فرمایا کہ جاؤ چالیس روز تک بھینس کا تصور کرو لیکن خدا کے لئے اور لوگ اس کا وظیفہ نہ کریں اس لئے کہ ہر شخص کی حالت جدا ہے کسی کے لئے کچھ مناسب ہے کسی کے لئے کچھ کبھی طبیب اور اُس کے احمق شاگرد کا سا قصہ نہ ہو جاوے وہ یہ ہے کہ ایک طبیب تھے وہ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ پہلے روز کی حالت سے اس روز کچھ تغیر پایا تو کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نارنگی کھائی ہے اُس سے تم کو یہ تکلیف بڑھ گئی اس نے کہا حضور بیشک نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے فارغ ہو کر آئے تو راستہ میں شاگرد صاحب نے پوچھا کہ حضرت آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اس نے نارنگی کھائی حکیم صاحب نے فرمایا بھائی بات یہ ہے کہ اس کے مزاج اور حالت دیکھ کر مجھ کو معلوم ہو گیا کہ کوئی بارد شے اُس نے کھائی اور نارنگی کی تعین اس سے معلوم ہوئی کہ اُس کی چارپائی کے نیچے میں نے نارنگی کے چھلکے دیکھے شاگرد صاحب احمق تو تھے ہی جب طب پڑھ کر فارغ ہوئے تو کسی رئیس کو دیکھنے کے لئے بلائے گئے اُن کی چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا تھا فرماتے ہیں کہ بس معلوم ہو گیا آپ کو جو یہ مرض ہوا آپ نے نمدہ کھایا ہے حاضرین سب ہنس پڑے اور طبیب کا حمق سب پر واضح ہو گیا تو خدا کے واسطے ایسا قیاس نہ کیجیو کہ آج سے نماز روزہ ذکر شغل چھوڑ کر بھینس کا تصور باندھ کر بیٹھ جاؤ کہ یہ اس شخص کی خصوصیت تھی۔ الحاصل ان بزرگوں نے فرمایا کہ جاؤ بھینس کے تصوّر کا چلہ کیجیو اور چالیس روز کے بعد ہم کو خبر دو چنانچہ پانچ وقت نماز سے فارغ ہو جاتے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر اسی بھینس کا تصور کیا کرتے۔ جب چالیس روز پورے ہو گئے تو پیر صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ بیٹا باہر آؤ کہتے ہیں کہ حضور باہر کیسے آؤں بھینس کے سینگ اڑتے ہیں پیر صاحب نے شاباشی دی کہ مقصود حاصل ہو گیا سب روگ جاتے رہے اب صرف بھینس رہ گئی اس کا نکل جانا سہل ہے پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اس کے لئے کسی عورت یا لڑکے کا عشق ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں سخت خطرہ ہے کہ اس لونڈے یا عورت ہی میں

نہ رہ جائے اور مقصود اصلی سے محروم رہے اس لئے قصداً ہرگز اس کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے ہاں اگر اضطراراً بلا قصد اس میں ابتلا کسی کو ہو جائے تو وہ بھی وصول کے لئے خاص شرائط کے ساتھ بعض اوقات ذریعہ ہو جاتا ہے ؎

عاشقی گرزیں سروگرزاں سرشت　　عاقبت مارا بداں شہ رہبر است

مگر اس کی چند شرطیں ہیں اول تو یہ ہے کہ اس کے پاس نہ رہے نہ اس کو دیکھے نہ کلام کرے نہ اس کی آواز سنے حتیٰ الوسع دل سے بھی اس کو زائل کرنے کی فکر کرے غرض حتی الامکان اس سے بچے اگرچہ اس طرح کرنا نفس کو بے حد شاق ہوگا لیکن ہمت نہ توڑے اور دل کو مضبوط کر کے اس پر عمل کرے چند روز کے بعد ایسا کرنے سے اس کے قلب میں ایک سوزش پیدا ہوگی اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ جاہ مال اولاد سب کی محبت جاتی رہیگی اب اس میں مادّہ تو محبت کا پیدا ہو چکا ہے شیخ کامل اس کو مائل الحق کر دے گا اس صورت سے عشق مجازی وصول الی الحقیقۃ کا ذریعہ بن جاوے گا۔ اور اگر اس محبوب سے جدا نہ ہوا بلکہ اس سے اختلاط رکھا ہم کلام ہم نشین ہوا تو پھر اسی بلا میں پھنسا رہے گا اور کسی دن بھی اس کو اس سے خلاصی نہ ہوگی چنانچہ خود ملّا جامیؒ جن کے کلام سے عشق مجازی کی تحصیل پر استدلال کیا جاتا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

ولے باید کہ در صورت نمانی　　وزیں پل زود خود را بگذرانی

لیکن یہ چاہیئے کہ صورت ہی میں نہ لگا رہے گا بلکہ اس پل پر سے جلد گزر جائے۔

مولانا اسی عشق کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

عشق بامردہ نباشد پائیدار　　عشق را باحی و باقیوم دار

عشق ہائے گز پئے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

مرنے والی چیزوں سے عشق ہمیشہ رہنے والا نہیں ہوتا اس لئے حی وقیوم کے ساتھ عشق کرو۔

جو عشق رنگ وروپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ عشق نہیں ہے اس سے آخرت کا نقصان ہوتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں ؎

غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں　　عشق ہائے اولیں وآخریں

عشق میں بالکل ڈوب جاؤ کہ اس میں غرق ہو جانا ہی پہلے اور بعد کے لوگوں کا طریقہ ہے

پھر یہاں یہ شبہ ہوتا تھا کہ ہم جیسوں کو عشق حقیقی تک رسائی کہاں ممکن ہے اس کا جواب دیتے ہیں ؎

تو مگو ما را بدان شہ بار نیست   با کریماں کارہا دشوار نیست

تو یہ مت کہہ کہ ہم کو اس بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں ہے وہاں تک پہنچنا ہی دشوار ہے

یہ غلط ہے کیونکہ وہ کریم ہے اور کرم کرنے والے کے لئے کوئی کام مشکل نہیں۔

یعنی ان کو کچھ مشکل نہیں تم کو مشکل نظر آتا ہے تم ذرا اس طرف متوجہ ہو کر تو دیکھو وہ خود تم کو اپنے قریب کر لیں گے وہ دنیا کے محبوبوں کی طرح نہیں ہیں کہ عشاق مرجاتے ہیں اور وہ نخرے کرتے ہیں یہ ہے غرض اس مسئلہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوب نظر بازی کریں مزے اڑائیں اور یہ سمجھیں کہ ہم صوفی ہیں ہم کو سب حلال ہے اور یہ فعل ہمارا قرب کا راستہ ہے استغفر اللہ قرب سے اس کو کیا واسطہ یہ تو بہت بعید کرنے والا ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔ چنانچہ حدیث شریف ہے انا غیور واللہ اغیر منی ومن غیرۃ حرم الفواحش ما ظہر منہا وما بطن (میں بہت غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ غیرتمند ہے اور اسی غیرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بے شرمی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے چاہے اس کی برائی کھلی ہو یا اندرونی برائی ہو) اور یہ سب فواحش ہیں۔ آنکھ سے دیکھنا ہاتھ سے پکڑنا پاؤں سے چلنا کیونکہ ان سب کو شارع نے زنا ٹھیرایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں العینان تزنیان وزناھما النظر والاذنان تزنیان وزناھما الاستماع واللسان یزنی وزناہ النطق والیدان تزنیان وزناھما البطش الحدیث۔ یعنی کہ آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا ہے اور کان زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا سننا ہے اور زبان بھی زنا کرتی ہے اور اس کا زنا بولنا ہے۔ (یعنی کسی عورت ولڑکے سے شہوت کی راہ سے باتیں کرنا) اور ہاتھ بھی زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا (غیر محرم) کو پکڑنا ہے اور جب یہ فواحش ہیں اور فواحش پر غیرت حق اوپر معلوم ہو چکی ہے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ افعال نہایت ناپسند ہیں اور افسوس ہے کہ بعضے پیر بھی اس میں مبتلا ہوتے ہیں

کہ عورتیں ان سے پردہ نہیں کرتیں اور کہتی ہیں کہ یہ تو بجائے باپ کے بلکہ باپ سے بھی زیادہ ہیں اور بے حیا سب بے محابا سامنے آتی ہیں اور بڑے بے حیا و دیّوث وہ مرد ہیں جو ایسے پیروں کے سامنے اپنی بیٹیوں بہوؤں کو آنے دیں بعض جگہ تو ایسا سنا گیا ہے کہ مریدنیاں تنہا مکان میں جاتی ہیں اور وہاں مرید ہوتی ہیں نعوذ باللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتیں پردہ کرتی تھیں ساری امت کی عورتیں آپ کی روحانی بیٹیاں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود معصوم کسی قسم کے وسوسہ کا بھی شائبہ نہیں لیکن باوجود اس کے پھر پردہ کا حکم تھا اور ازواج مطہرات تمام امت کے مردوں عورتوں کی مائیں تھیں چنانچہ ارشاد ہے وازواجہ امہاتھم (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں تمام مسلمانوں کی مائیں ہیں) اور کسی کو ان کی نسبت تو بہ توبہ وسوسہ تک بھی شرکا نہ تھا لیکن باوجود اس کے ارشاد ہے وقرن فی بیوتکن یعنی اپنے گھروں میں جمی رہو باہر نہ نکلو۔ اور فرماتے ہیں ولا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض یعنی نرم بات مت کرو کہ جس کے قلب میں روگ ہے وہ طمع کرے گا چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جیسے مردوں کے لئے خوش اخلاقی صفت حمیدہ ہے عورتوں میں بداخلاقی صفت حمیدہ ہے یعنی غیر مردوں سے نرمی اور میٹھی باتیں نہ کریں اور نہ تند مزاجی سے بلکہ ایسے انداز سے بات کریں کہ اس کو مضمون مفہوم ہو جائے اور کسی قسم کی طمع اس کے قلب میں نہ آوے نہایت خشکی وصفائی سے بات کریں۔ البتہ اپنے خاوند اور دوسری عورتوں کے ساتھ خوش اخلاقی برتیں۔ اللہ اکبر یہ خاندان نبوت کا انتظام ہے آج کون ہے وہ شخص کہ اُن سے زیادہ اپنے کو مقبول کہے بلکہ یہ وقت چونکہ فتنہ کا ہے اس لئے نہایت سخت انتظام کی ضرورت ہے۔ ایک بزرگ تھے وہ اس میں احتیاط نہ کرتے تھے اس لئے کہ بوڑھے بہت تھے غیر اولی الاربہ میں داخل ہو گئے تھے اس لئے ان کو عورتوں سے زیادہ اجتناب نہ تھا ایک دوسرے بزرگ نے ان کو نصیحت کی انھوں نے نہ مانا اُن بے احتیاط بزرگ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا یہ مسئلہ پوچھا فرمایا کہ اگر مرد جنید ہو اور عورت رابعہ بصریہ ہو اور وہ دونوں ایک جگہ تنہا ہوں تو ثالث اُن کا شیطان ہوگا۔ اور آدمی خواہ کسی قدر بوڑھا ہو جاوے لیکن مادہ تو اس کے

اندر باقی رہتا ہے۔ وہ فرشتہ تو ہے نہیں ہاں یہ اور بات ہے کہ کچھ نہ کر سکے لیکن نظر سے تو محفوظ نہیں رہ سکتا اور کیسے محفوظ رہ سکتا ہے مرد کے اندر تو عورت کی طرف میلان خلقۃً پیدا کیا ہے کوئی اُس فطری جوش کو کیسے روک سکتا ہے۔ گنج مراد آباد میں ایک بزرگ تھے جناب مولانا فضل الرحمٰن صاحب تقریباً ایک سو دس برس کی ان کی عمر ہوئی۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جاڑے کا موسم تھا صبح کو اٹھ کر خادم کو آواز دی ارے فلانے مجھ کو کچھ شبہ سا ہوگیا ہے جی چاہتا ہے کہ نہالوں طبیعت صاف ہو جائے گی چنانچہ خادم نے پانی رکھ دیا اُسی جاڑے میں غسل فرمایا۔ بتلایئے اگر کچھ نہ رہا تھا تو شبہ کیسا۔ ایک مرتبہ کانپور میں ہمارے گھر بہت عورتیں آئیں اس میں اختلاف تھا کہ حضرت مولانا صاحب موصوف سے پردہ چاہیے یا نہیں میں نے یہ اختلاف سن کر یہ حکایت ان کو سنائی اور کہا کہ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ پردہ ضروری ہے یا نہیں، سب سُن کر چُپ ہو رہیں حضرت جب سو برس کی عمر میں یہ قصہ ہو سکتا ہے تو پچاس برس کی عمر میں اب کیا مشکل ہے اور بہت سے پیر جوان بھی ہوتے ہیں اور آجکل تو پیر بننا کچھ بھی مشکل نہیں ہے لمبے لمبے بال ہوں، موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ہو رنگا کرتا ہو بس پیر ہو گئے پھر وہ خواہ عورتوں کو گھوریں، لونڈوں کو تکیں، حرام حلال میں کچھ امتیاز نہ کریں ان کی پیری ایسی مضبوط ہے کہ وہ کہیں سے نہیں جاتی بلکہ جس قدر کوئی خلاف شرع ہوگا اسی قدر زیادہ مقبول ہے۔ اور جس قدر حدود شرعیہ کے اندر ہوگا وہ پیری سے دور ہے وہ تو نرا ملّا ہے۔ یہ تو مردوں کی حالت تھی اب عورتوں کی کیفیت سُنیئے بعض عورتیں ایسی بے حیا ہوتی ہیں کہ وہ خود مردوں کو دیکھتی ہیں یا پردہ وغیرہ اٹھا دیتی ہیں کہ دوسرا مرد ان کو دیکھ لیتا ہے اور احتیاط نہیں کرتیں۔ حدیث میں لعن اللہ الناظر والمنظور الیہ (اللہ تعالیٰ دیکھنے والے اور دکھانے والے پر لعنت کرے) اس کے متعلق جو یوں عورتوں سے کہا جاتا ہے نصیحت کی جاتی ہیں تو کہتی ہیں کہ انھیں ایک دفعہ دیکھ کر پھر کیا دیکھے گا ساری

عمر ترسے گا۔ جو بڑی پردہ نشین کہلاتی ہیں اُن کی یہ حالت ہے کہ خاوند کے سامنے تو بھنگن ہی بنی رہیں گی اور اگر کہیں جاویں گی تو تمام زیب و زینت ختم کر کے بیگم بن کر جاویں گی سخت بے حیائی کی بات ہے کہ خاوند جس کے لئے زیب و زینت کا حکم ہے اس کے سامنے تو زینت نہ کی جاوے اور دوسروں کے دیکھنے کے لئے کی جاوے۔ چاہیئے تو یہ کہ اس کا برعکس ہو بعض عورتیں دولھا دولہن اور بارات کو دیکھتی ہیں اور ان کے مرد بھی کچھ نہیں کہتے۔ اسی طرح دوسری بے احتیاطی قابل نظر ہے وہ یہ کہ بعض مرد بڑے بے احتیاط ہوتے ہیں کہ گھر میں پکار کر نہیں جاتے ذرا کھنکارا اور فوراً اندر گھس گئے اور اکثر عورتیں بھی ایسی بے احتیاط ہوتی ہیں کہ ڈولی سے اترنے سے پہلے تحقیق نہیں کراتیں کہ کوئی مرد تو اندر نہیں ہے۔ میں ایک دفعہ بیمار تھا بہت عورتیں ڈولی سے عیادت کے لئے آئیں اور بلا تحقیق اندر آگئیں، میں نے ان کو خوب بُرا بھلا کہا اور جب عورتیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اس وقت اور زیادہ بے حیائی ہوتی ہے چنانچہ لبسا اوقات بے کہے اس گھر کے مرد دروازے میں آکر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اندر کسی نے منہ پھیر لیا کسی نے آنچل سے منہ ڈھک لیا، کوئی کسی کے پیچھے ہو گئی اور طرفہ یہ کہ ہر ایک یہ جانتی ہے کہ مجھ کو نہیں دیکھا حالانکہ اس نے سب کو دیکھ لیا۔ خلاصہ یہ کہ آنکھوں کا گناہ سخت ہے اور اس میں بہت ابتلا ہو رہا ہے اس کا بہت انتظام کرنا چاہیئے اپنا بھی اور گھر والوں کا بھی اور اس کا علاج سہل یہ ہے کہ راہ میں چلنے کے وقت نیچی نگاہ کر کے چلنا چاہیئے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھے انشاء اللہ تعالیٰ محفوظ رہے گا شیطان جب مردود ہوا تو اس نے کہا تھا لاقعدن لھم صراطک المستقیم ثم لاٰتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم یعنی میں ان کے (گمراہ کرنے کے) لئے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا پھر ان کے پاس آؤں گا ان کے سامنے سے اور پیچھے سے اور داہنے سے اور بائیں سے چار سمتیں تو اس نے بتلائیں اور دو سمتیں باقی رہیں اوپر اور نیچے۔ بزرگان دین نے اس میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ اوپر نیچے کا ذکر اس لئے نہیں کیا

کہ اکثر گناہ چار سمتوں سے ہوتے ہیں پس بچنے کی دو صورتیں رہیں یا تو اوپر دیکھ کر چلو یا نیچے دیکھ کر۔ مگر اوپر دیکھنے میں ٹوکر جانے کا آنکھ میں کچھ پڑجانے کا اندیشہ ہے اس لئے نجات کے لئے یہی شق متعین ہوئی کہ نیچے دیکھ کر چلیں۔

قال اللہ تعالیٰ وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا (اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کے نیک بندے نیچی نظر کرکے چلتے ہیں)

ایک بزرگ تھے وہ بات کرنے کے وقت مردوں کو بھی نہ دیکھتے تھے۔ ان سے کسی نے اس کی وجہ پوچھی فرمایا دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو میں پہچانتا ہوں اور دوسرے وہ جن کو میں نہیں پہچانتا جن کو پہچانتا ہوں ان کو بلا دیکھے بھی آواز سے پہچان لیتا ہوں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اور جن کو نہیں پہچانتا ان کے دیکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ سبحان اللہ۔ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ (کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بے فائدہ باتوں یا کاموں کو بالکل چھوڑ دے) پر عمل اس کو کہتے ہیں بعض بزرگوں نے اس نظر کے گناہ سے بچنے کے واسطے جنگل میں رہنا اختیار کرلیا ہے۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

بزرگے دیدم اندر کوہسارے | قناعت کردہ از دنیا بغارے
چرا گفتم بشہر اندر نیائی | کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویان نغزند | چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

میں نے ایک پہاڑ میں ایک بزرگ کو دیکھا جو ایک کوہ میں زندگی بسر کررہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ شہر کے اندر کیوں نہیں آتے کہ کبھی دل تو پر سے بوجھ ہلکا ہوتا۔ ان بزرگ نے جواب دیا کہ اس جگہ پری جیسے چہرہ والے پھسل رہے ہیں اور جب مٹی زیادہ ہوجاتی ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں۔

ایک بزرگ طواف کررہے تھے اور ایک چشم تھے اور کہتے جاتے تھے اللھم انی اعوذ بک من غضبک (اے اللہ میں آپ سے آپ کے غضب کی

پناہ چاہتا ہوں، کسی نے پوچھا کہ اس قدر کیوں ڈرتے ہو کیا بات ہے کہا میں نے ایک لڑکے کو بُری نظر سے دیکھ لیا تھا غیب سے چپت لگا اور آنکھ پھوٹ گئی اس لئے ڈرتا ہوں کہ پھر عود نہ ہو جاوے۔

حضرت جنیدؒ چلے جا رہے تھے ایک حسین لڑکا نصرانی کا سامنے سے آ رہا تھا۔ ایک مرید نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ایسی صورت کو بھی دوزخ میں ڈالیں گے حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تو نے اس کو نظر استحسان سے دیکھا ہے عنقریب اس کا مزہ تم کو معلوم ہوگا چنانچہ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ شخص قرآن بھول گیا نعوذ باللہ بعضے سمجھے۔ بزرگ حسن پسند ہوئے ہیں بعض کو اس سے دھوکہ ہو گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ حسن پرست تھے تو ہم اگر ایسا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ سبحان اللہ کیا استدلال ہے بات یہ ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(اچھے لوگوں کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس مت کر اگرچہ لکھنے میں شیر اور شیر دودھ ایک جیسے ہیں)

میں ان کی حسن پرستی کی حقیقت بتلاتا ہوں کہ وہ اس معنی کے حسن پرست نہ تھے جیسے کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ اُن کو ہر حسین شے اچھی معلوم ہوتی تھی اور ہر بُری بے قاعدہ شے سے اس قدر نفرت تھی کہ ان کو بدصورت اور بے ڈھنگی شے دیکھنے سے تکلیف ہوتی تھی چنانچہ حضرت مرزا صاحب کو جب کہیں جانا ہوتا تھا تو پالکی میں بیٹھ کر جاتے تھے اور پالکی کے پٹ بند کرا دیا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ پٹ کیوں بند کرا دیتے ہیں فرمایا کہ راستہ میں بازار وغیرہ ملتے ہیں اس میں بعض دوکانیں بے قاعدہ بنی ہوئی ہوتی ہیں مجھ کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے۔ تھانہ بھون کے قاضی صاحب

مع اپنے ایک ہمراہی کے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اس ہمراہی کو ناک صاف کرنے کی ضرورت ہوئی تو مرزا صاحب کی نظر پیچھے سے اس کے پائجامے پر پڑ گئی سب چھینٹیں پائجامے کے پیچھے تھیں۔ مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور فرمایا کہ قاضی صاحب اس شخص کے ساتھ آپ کا کیسے گذر ہوتا ہو گا۔

اکبر بادشاہ ثانی جو کہ بادشاہ وقت تھا ایک مرتبہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا بادشاہ کو پیاس لگی کوئی خادم اس وقت موجود نہ تھا خود اٹھ کر پانی پیا اور پانی پی کر صراحی پر کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور طبیعت پریشان ہو گئی لیکن ضبط فرمایا چلتے وقت بادشاہ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے یہاں کوئی آدمی خدمت کے لئے نہیں ہے۔ اگر ارشاد ہو تو کوئی آدمی بھیج دوں۔ اب تو مرزا صاحب سے نہ رہا گیا جھنجلا کر فرمایا کہ پہلے تم تو آدمی بنو کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا میری طبیعت اب تک پریشان ہے۔ ایک شخص نے مرزا صاحب کی خدمت میں انگور بھیجے بہت نفیس اور وہ منتظر داد کے ہوئے مگر مرزا صاحب ساکت تھے آخر اس نے خود پوچھا کہ حضرت انگور کیسے تھے۔ فرمایا کہ مُردوں کی بُو آتی تھی تحقیق سے معلوم ہوا کہ قبرستان میں انگور بوئے گئے تھے وہ انگور وہاں سے آئے تھے۔ مرزا صاحب کے اندر حسن پسندی تھی تو وہ طبعی تھی، طبیعت کی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ ہر اچھی شے پسند فرماتے تھے۔ ان کے نفس میں بُرے خیال کا شائبہ بھی نہ تھا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بچپن میں بھی بدصورت کی گود میں نہ جاتے تھے بھلا اس وقت کیا احتمال ہو سکتا ہے۔ خواجہ میر دردؒ کی نسبت لوگوں نے آکر مرزا صاحب سے عرض کیا کہ خواجہ صاحب راگ سنتے ہیں۔ فرمایا کہ بھائی وہ کن رس میں مبتلا ہیں میں آنکھ رس میں یعنی ان کو کانوں کا مرض ہے مجھ کو آنکھوں کا آپ نے اس کو بھی مرض سے تعبیر فرمایا ایک بزرگ کی کیفیت یہ تھی کہ حسین لڑکے ان کی خدمت کرتے تھے

اور گاہ گاہ ان کو پیار بھی کرتے تھے۔ ایک روز ان کے ایک مرید نے بھی ایک لڑکے کو پیار کر لیا پیر سمجھ گئے کہ اس نے میرا اتباع کیا ہے ایک روز بازار میں گئے لوہار کی دوکان پر دیکھا کہ لوہا سرخ انگارا سا ہو رہا ہے پیر صاحب نے فوراً جا کر اس کو پیار کر لیا اور اس مرید سے فرمایا کہ آیئے تشریف لایئے اس کو بھی پیار کیجئے پھر تو یہ گھبرائے اس وقت انھوں نے ان کو ڈانٹا کہ خبردار ہم پر اپنے کو مت قیاس کرو ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ ایک حسین لڑکے سے پاؤں دبوا رہے ہیں ایک شخص کو وسوسہ ہوا کہ یہ کیسے شیخ ہیں لڑکے سے پاؤں دبواتے ہیں فرمایا کہ آگ کی انگیٹھی اٹھا لاؤ دہکتی آگ میں پاؤں رکھ دیئے اور یہ فرمایا کہ ہم کو کچھ حس نہیں ہمارے نزدیک یہ آگ اور یہ لڑکا برابر ہے۔ لیکن یاد رکھو ایسے بزرگوں سے جن کا ظاہر خلاف شرع نظر آوے بیعت ہونا جائز نہیں محققین کی یہ شان نہیں ہے جو لوگ مسند ارشاد پر متمکن ہوتے ہیں اور العلماء ورثۃ الانبیاء کے خطاب سے مشرف ہیں وہ بالکل متبع سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہیں ان کی ہر وضع سنت کے موافق ہوتی ہے اور تہمت اور بدگمانی کے موقع سے بچنا بھی سنت ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس باب میں یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو کہ ازواج مطہرات میں ہیں وہاں تشریف لائیں۔ واپسی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پہنچانے کے لئے ان کے ساتھ دروازے تک کہ وہ مسجد ہی کی طرف تھا تشریف لائے سامنے دیکھا کہ دو شخص آرہے ہیں فرمایا کہ علی سلکما یعنی اپنی جگہ ٹھہر جاؤ یہاں پردہ ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا یا ایتھا صفیۃ یعنی یہ عورت صفیہ تھی اور کوئی اجنبیہ نہ تھی فکبر علیھما ذالک یعنی یہ بات ان دونوں پر بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ پر ایسا گمان ہو سکتا ہے، فرمایا شیطان ابن آدم کے اندر بجائے خون کے دوڑتا ہے مجھے خیال ہوا کہ کبھی وہ تمہارے ایمان کو نہ تباہ کر دے۔ پس جو لوگ ارشاد کی شان

لئے ہوئے ہیں وہ تو ابہام سے بھی بچتے ہیں ایسے حضرات قابل بیعت ہیں باقی جن کا ظاہر شریعت کے موافق نہ ہو ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ مکار ہیں باطن بھی ان کا موافق نہیں ہے وہ مردود ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ باطن ان کا بالکل شریعت کے موافق ہوتا ہے لیکن ظاہر ان کا ہماری سمجھ میں نہیں رہتا ان پر اعتراض نہ کرے اور نہ ان کا اتباع کرے غرض مرشد ایسے کو بنا دے جو ظاہراً باطناً پاک صاف ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل اور سہارا بدنگاہی کے متعلق نہیں بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں وما تخفی الصدور یعنی جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں یہ پہلے سے اشد ہے یعنی معصیت صرف نگاہ ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی ہوتی ہے بہت لوگ دل سے سوچا کرتے ہیں اور عورتوں و مردوں کا تصور کرتے ہیں اور خیال سے مزے لیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم متقی ہیں خوب سمجھ لو کہ یہ سب تلبیس ابلیس لعین ہے بلکہ بعض مرتبہ دل کے اندر سوچنے سے اور دل کے اندر باتیں کرنے سے اور زیادہ فتنہ ہوتا ہے کیونکہ نگاہ کرنے میں تو بعض مرتبہ قبیح و بدصورت ثابت ہوتا ہے اور دل کے اندر باتیں کرنے میں تو طبیعت کو زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے اور قلب سے کسی طرح وہ بات نہیں نکلتی بلکہ محض نگاہ نہ کرنے سے اپنے کو صاحب مجاہدہ سمجھ کر زیادہ مقرب سمجھتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ دل میں متمتع ہو رہا ہوں تو مجاہدہ کہاں رہا غرض اس کا انسداد بھی بہت ضروری ہے اور چونکہ قلب کے اندر کانوں کے واسطے سے بھی باتیں اس قسم کی پہنچتی ہیں اس لئے جس طرح آنکھوں کی حفاظت ضروری ہے کانوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کہ ایسے قصے اور حکایات نہ سنے نہ ایسے مقام پر جاوے جہاں گانا بجانا ہو رہا ہو بعض مرتبہ خود قلب ہی سے معصیت صادر ہوتی ہے صدور کے وقت آنکھ کان کا واسطہ نہیں

ہوتا مثلاً پہلی دیکھی ہوئی صورتیں یاد آتی ہیں اوران سے التذاذ ہوتا ہے اور معصیت قلب کا معصیت عین سے اشد ہونا ایک اور درجہ سے بھی ہے وہ یہ کہ قلب سے سوچنے اور آنکھوں سے دیکھنے میں ایک فرق بھی ہے یعنی آنکھوں کے گناہ میں تو نفس فعل کو کوئی دیکھ بھی سکتا ہے گو نیت پر مطلع نہ ہو اور دل کے اندر سوچنے کے فعل کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا اس کی اطلاع سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اس سے وہی بچے گا جس کے قلب میں تقویٰ ہو۔ اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ اس مرض کے ازالہ میں تین درجہ ہیں قلب کو باوجود تقاضے کے روکنا تقاضے کو ضعیف کردینا اور قلع المقتضے یعنی مادہ ہی کا قلع قمع کردینا ان میں سے قلب کو روکنا یعنی دل کو خود اُس طرف متوجہ نہ ہونے دینا یہ امر تو اختیاری ہے کہ اگر آپ سے آپ جائے تو تم اُس کو روکو اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جب قلب کسی حسین کی طرف مائل ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کسی کریہ المنظر بدشکل بدصورت بدہیئت کی طرف دیکھو اگر کوئی موجود نہ ہو کسی ایسے بدصورت کا خیال باندھو کہ ایک شخص ہے کالا رنگ ہے چیچک کے داغ ہیں آنکھوں سے اندھا ہے سر سے گنجا ہے رال بہ رہی ہے دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں ناک سے نکٹا ہے ہونٹ بڑے بڑے ہیں۔ سینک بہ رہا ہے اور مکھیاں اس پر بیٹھی ہیں گو ایسا شخص دیکھا نہ ہو مگر قوت متخیلہ سے تراش لو کیونکہ تمہارے دماغ میں ایک قوت متخیلہ ہے آخر اس سے کسی روز کام تو لوگے متخیلہ کا کام توجوڑ کا ہے جب ایسا شخص فرض کیا جاسکتا ہے اس کا مراقبہ کرو انشاء اللہ تعالیٰ وہ فساد جو حسین کے دیکھنے سے قلب میں ہوا ہے وہ جاتا رہے گا اور اگر پھر خیال آوے پھر بھی تصور کرو اور اگر یہ مراقبہ کفایت کے درجہ میں نافع نہ ہو اور بار بار پھر اُسی حسین کا تصور ستادے تو یوں خیال کرو کہ یہ محبوب ایک روز مرے گا اور قبر میں جاوے گا وہاں اس کا نازک بدن سڑ گل جاوے گا کیڑے اس کو کھالیں گے یہ خیال تو فوری علاج ہے اور آئندہ کے لئے تقاضا پیدا ہونے کا علاج یہ ہے کہ ذکر اللہ کی کثرت کرو دوسرے یہ کہ عذاب الٰہی کا تصور

کرو تیسرے یہ کہ یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اس کو مجھ پر پوری قدرت ہے طول مراقبات اور کثرت مجاہدات سے یہ چور دل میں سے نکلے گا۔ جلدی نہ جاوے گا جلدی نہ کرے اس لئے کہ ایسا پرانا مرض ایک دن یا ایک ہفتہ میں نہیں جاتا یہاں مجھ کو شاہ محمود غزنوی کی حکایت یاد آگئی محمود نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک ہمراہی سپاہی نے ایک مندر میں جاکر دیکھا کہ ایک بوڑھا برہمن پوجا پاٹ کر رہا ہے۔ سپاہی نے تلوار دکھلائی کہ کلمہ پڑھ اور مسلمان ہو ورنہ اس تلوار سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ برہمن نے کہا کہ حضور ذرا ٹھہریئے سپاہی نے پھر تقاضا کیا برہمن نے عرض کی حضور نوے برس کا رام تو دل میں سے نکلتے ہی نکلتے نکلے گا ذرا سی دیر میں کیسے نکل جاوے خوب کہا ہے ؎

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

صوفی کے دل کی صفائی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ جامی دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔ بہت سے سفر کرنے چاہئے تاکہ کچاپن جاتا رہے اور پکا صوفی بن جائے۔

ہمت مت ہارو مجاہدہ کرتے رہو رفتہ رفتہ یہ تقاضا ضعیف ہو جاوے گا اور قابو میں آجاوے گا کہ اپنے محل پر صرف ہوگا اور غیر محل کے لئے متحرک نہ ہوگا اور یہی مطلوب ہے۔

تیسرا درجہ یہ کہ مادہ بھی منقطع ہو جاوے یعنی بالکل میلان ہی کبھی پیدا نہ ہو یہ وہ مرتبہ ہے کہ جس کو نادان سالک مطلوب سمجھتے ہیں اور اس حاصل نہ ہونے پر پریشان ہوتے ہیں یعنی جب اپنے اندر کسی وقت ایسا میلان پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب ذکر شغل و مجاہدہ ضائع گیا حتیٰ کہ ایسے کلمات پریشانی میں ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں کہ بے ادبی اور گستاخی ہو جاتی ہے مثلاً ہم اتنے زور سے طلب حق میں رہے مگر ہم پر رحم نہیں آتا کہ ویسے ہی محروم ہیں یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ مادہ منقطع ہو جاوے اور اگر مادہ جاتا رہے تو گناہ سے بچنے میں کوئی کمال نہیں۔ اندھا اگر فخر کرے کہ میں دیکھتا نہیں کون فخر کی بات ہے، دیکھے گا کیا دیکھنے کا آلہ نہیں عنین اگر عفت کا دعویٰ کرے تو کیا کمال ہے لطف اور کمال مطلوب تو یہ ہے گناہ کر سکو اور پھر اپنے دل کو روکو جس کا میں نے فوری علاج اور تقاضا روکنے کی تدبیر دونوں بیان کر دیئے رہا مادہ

زائل کر دینا یہ مطلوب ہی نہیں بلکہ اس کا زائل کرنا جائز ہی نہیں خلاصہ یہ کہ مجھے اس گناہ پر متنبہ کرنا منظور ہے اس لئے کہ اس گناہ کا ابتلا عام تھا حتےٰ کہ جو نیک کہلاتے ہیں وہ بھی اس میں مبتلا ہیں خدا کے واسطے اس کا انتظام کرنا چاہیئے افسوس منہ سے تو حق تعالےٰ کی محبت کا دعویٰ اور غیر پر نظر افسوس صد افسوس اس وقت مجھ کو ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عورت جا رہی تھی کوئی ہوا پرست اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا اس عورت نے پوچھا تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں آتے ہو کہا کہ میں تجھ پر عاشق ہو گیا اس لئے آتا ہوں عورت نے جواب دیا کہ پیچھے ایک میری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے اس کے دیکھنے کو پیچھے چلا اس عورت نے اس کے ایک دھول دی اور کہا ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی — در بیان دعوے خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر — ایں بود دعوے عشق اے بے ہنر

کہا کہ اے بے وقوف اگر تو سچا عاشق ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو پھر کیوں غیر پر نظر ڈالتا ہے اے بے خبر کیا اسے ہی عشق کا دعویٰ کہتے ہیں۔

صاحبو اگر حق تعالیٰ سامنے کھڑا کر کے اتنا دریافت فرمالیں کہ تو نے ہم کو چھوڑ کر غیر پر کیوں نظر کی تو بتلایئے کیا جواب ہے۔ یہ ہلکی بات نہیں اس کا بہت بڑا اہتمام کرنا چاہیئے ایک اور تدبیر ہے جو مقوی ہے ان تدابیر کی وہ یہ کہ جب قلب میں ایسا خیال پیدا ہو تو ایسا کرو کہ وضو کر کے دو رکعت پڑھو اور توبہ کرو اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرو جب نگاہ پڑے یا دل میں تقاضا پیدا ہو فوراً ایسا ہی کرو ایک دن تو بہت سی رکعتیں پڑھنا پڑیں گی دوسرے دن بہت کم ایسا خیال آوے گا اسی طرح بتدریج نکل جاوے گا۔ اس لئے کہ نفس کو نماز بڑی گراں ہے۔ جب دیکھے گا کہ ذرا سا مزہ لینے پر یہ مصیبت ہوتی ہے یہ ہر وقت نماز ہی میں رہتا ہے پھر ایسے وسوسے نہ آویں گے اب اللہ تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالےٰ ہم کو سب آفات سے محفوظ رکھیں۔

آمین ثم آمین

تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد دوم

کا

نواں ۹ وعظ ملقب بہ

تطہیر الاعضاءُ

منجملہ ارشادات :

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

(ناشر)

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوات عبدیت جلد دوم

کا

نواں وعظ ملقب بہ

تطہیر الاعضاء

این	متٰی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۰ شوال ۱۳۲۹ھ	ایک گھنٹہ	بیٹھ کر	حفظ قلب و جوارح	مولوی عبداللہ صاحب مدرس مدرسہ امداد العلوم	تقریباً ۱۵۰	.

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

(ترجمہ آیۃ کریمہ کا یہ ہے) مت اتباع کر اس شے کی جس کی تجھ کو تحقیق نہیں بیشک کان اور آنکھ اور قلب ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا جائے گا اس آیت کے سیاق و سباق میں بعض ضروری نصائح و مواعظ مفیدہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں اور سب کے آخر میں بطور امتنان کے فرمایا ہے ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب مذکورہ نصائح اُن حکمت کی باتوں سے ہیں کہ تمہارے رب نے تمہاری

طرف وحی فرمائی ہے۔ اس امتنان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام نصائح جو یہاں مذکور ہیں نہایت اہتمام کے قابل ہیں منجملہ ان کے یہ آیت ہے اس آیت میں چار چیزوں کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے قلب، آنکھ، کان یہ تین چیزیں تو بالتصریح بیان فرمائیں چوتھی چیز بقیہ جوارح یعنی ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ کی حفاظت ہے وہ بالتصریح اس آیۃ میں مذکور نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کی حفاظت کو ولا تقف ما لیس لك به علم میں دلالۃً ذکر فرمایا ہے چنانچہ ولا تقف ما لیس لك به علم کی حقیقت میں بلا تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تمام جوارح کی حفاظت بھی آگئی ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے بلا تحقیق کسی امر کا اتباع کرنا اب اس کی تحقیق کی چند صورتیں ہیں مثلاً کوئی شئے گم ہو جائے بلا تحقیق قرائن موہومہ پر کسی کو چور کہدیا چور کہنا زبان کا گناہ ہے ولا تقف ما لیس لك به علم اس گناہ سے روکتا ہے دیکھئے ولا تقف ما لیس لك به علم پر عمل نہ ہونے سے زبان کا گناہ ہو گیا ایک عجیب حکایت یاد آئی۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا اس سے فرمایا کہ تو چوری کرتا ہے اس نے کہا کلا واللہ الذی لا الہ الا ھو یعنی ہرگز نہیں قسم ہے اس ذات کی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صدقت ربی وکذبت عینی یعنی میں اپنے رب کی تصدیق اور اپنی آنکھ کی تکذیب کرتا ہوں یعنی میری آنکھ نے غلط دیکھا تو سچا ہے شاید کوئی خشک مغز اس کو غلو فی الدین سمجھے یا کوئی یوں کہے کہ یہ تو استغراق یا غلبہ حال ہے سو یاد رکھو کہ انبیاء علیہ السلام میں نہ غلو فی الدین ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے اور وہ مغلوب الحال کبھی نہیں ہوتے بلکہ اپنے حال پر غالب ہوتے ہیں بزرگوں کی دو قسمیں ہیں ابوالحال و ابن الحال ابوالحال وہ ہیں جو اپنے حال پر غالب ہوتے مخلوق سے ملے جلے رہتے ہیں اسباب ظاہرہ کو چھوڑتے نہیں ہر امر کو ضابطہ اور قاعدہ سے کرتے ہیں مال کو انتظام سے خرچ کرتے ہیں ان امور میں جیسے اور عوام کی حالت ہوتی ہے ایسی ہی ان کی بھی ہوتی

ہے اور ابن الحال آزاد ہوتے ہیں خلقت سے بھاگتے ہیں کسی امر کی تدبیر نہیں کرتے موجی بندے ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ہاں خلاف شریعت کچھ نہیں کرتے اس لئے کہ جو خلاف شریعت کرے گا وہ مقبول و بزرگ نہیں ہوسکتا البتہ اس کا قول و فعل کبھی بظاہر خلاف شریعت ہوتا ہے جس کی تاویل ضروری ہے۔ اکثر عوام الناس ایسے لوگوں کو باکمال سمجھتے ہیں اور اہل کمال کو کم پہچانتے ہیں اس لئے میں اہل کمال اور غیر اہل کمال کی شناخت کے لئے ایک قاعدہ کلیہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ وہ نہایت مفید ہے وہ یہ ہے کہ ولایت نبوۃ سے مستفاد ہے جس بزرگ کی حالت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوگی وہ باکمال ہوگا سو انبیاء نے نہ کبھی نعرے مارے نہ کبھی کپڑے پھاڑے نہ خلقت سے بھاگے خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہر امر کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تھا۔ سلطنت کا انتظام حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا کہ سلاطین دنیا نے آپ سے سیکھا خانہ داری کا انتظام ایسا تھا کہ آج کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اسی طرح ملنے جلنے کھانے پینے حتیٰ کہ بول و براز کے قواعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تعلیم فرمائے۔ اہل کمال کی حالت اسی طرز کی ہوتی ہے اور جس طرح آجکل عوام ایسے اہل کمال کو بزرگ و خدارسیدہ نہیں جانتے اس وقت بھی عام لوگوں نے انبیاء کو کامل نہیں سمجھا چنانچہ کہا کرتے تھے مَالِهٰذَا الرَّسُولِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا یعنی اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ان کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا کہ ان کے ساتھ رہ کر لوگوں کو تبلیغ کرتا ان کے پاس کوئی خزانہ ہوتا یہ ہم سے بھی زیادہ غریب مفلس ہیں، ہم دو وقت کھانا کھاتے ہیں ان کو ایک وقت بھی کئی کئی دن میں ملتا ہے اچھے اللہ کے پیارے ہیں کوئی اپنے پیارے کو بھوکا بھی مارا کرتا ہے یا

ان کے پاس کوئی باغ ہوتا کہ اس سے کھاتے غرض کوئی وصف ایسا ہوتا جو ہم میں نہیں یہ کیسے نبی ہیں جو ہم سے ممتاز نہیں ہیں اسی طرح جو اولیاء اللہ اس شان کے ہوتے ہیں اُن پر لوگ اعتراض کرتے ہیں اور جو خلقت سے بھاگتا ہے کھاتا پیتا نہیں ننگا رہتا ہو کسی سے بات نہ کرتا ہو وہ بزرگ ہے اور اگر خلاف عادت کوئی امر اس سے صادر ہو گیا کسی پر کوئی تصرف کر دیا اس کو تو نبی سے بڑھ کر جانتے ہیں حالانکہ تصرف کوئی چیز نہیں ہے یہ تو ریاضت سے ہندو جوگیوں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے بلکہ اہل کمال اس کو اچھا نہیں جانتے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ عارف را ہمت نباشد۔ یعنی عارف کو ہمت یعنی تصرف نہیں ہے ہمت کے وہ متعارف معنی نہیں کہ کسی کام کی ہمت نہیں بلکہ ہمت کے معنی تصرف وغیرہ کے ہیں مطلب یہ ہے کہ عارف کو تصرف نہیں ہوتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جس قدر عرفان بڑھیگا فنا بھی ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنے سے نظر اٹھتی جاتی ہے دیکھئے تحصیلدار اپنے اجلاس میں بیٹھ کر بڑے بڑے احکام صادر کرتا ہے۔ لیکن گورنر جنرل کے سامنے جب آتا ہے تو اس کی وہ حالت ہوتی ہے جو ادنیٰ اردلی کی ہے۔ اُسی طرح عارف کو جس قدر معرفت بڑھے گی وہ مٹتا چلا جائے گا۔ فنا سے اس کو فاعلیت مستقلہ من وجہ کے تصور سے غیرت آئے گی اور فاعلیۃ کبریٰ اور معرفت سے دوسرے کی طرف توجہ تام کرنے سے غیرت آوے گی اور تصرف میں یہی ہوتا ہے کہ دوسری طرف توجہ تام کرنا پڑتا ہے اور تدبیر مسنون اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس میں فاعلیۃ و توجہ میں استغراق نہیں ہوتا۔ عارفین میں دو باتیں ہوتی ہیں برکت اور کرامت برکت یہ ہوتی ہے ان کے ذوجود باوجود سے بارش ہوتی ہے۔ بیماری دور ہوتی ہے آفات اور حوادث ٹل جاتے ہیں لیکن ان کو خبر تک نہیں ہوتی جیسے آفتاب جب نکلتا ہے تو سب کو منور کر دیتا ہے لیکن آفتاب کو کچھ خبر تک نہیں کہ میری ذات سے کس کس شے کو نفع پہنچ رہا ہے اور

دوسری شے کرامت ہے وہ بھی کبھی عارفین میں ہوتی ہے کرامت یہ ہے کہ کسی خارق عادت کا ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونا کرامت میں قصد نہیں ہوتا گو علم ہو اور تصرف میں قصد کرتا اور توجہ اس طرف مبذول کرنا ضروری ہے ہاں اگر اذن الٰہی اس تصرف کا ہو تو اور بات ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امور نازلہ میں دعائیں بہت کی ہیں مگر یہ کہیں نہیں آیا کہ آنکھیں بند کر کے اس طرف توجہ و تصرف کیا ہو چنانچہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اللھم اعز الاسلام لعمر بن الخطاب او لعمر بن ھشام یعنی اے اللہ اسلام کو قوۃ دے عمر بن خطاب سے یا ابوجہل بن ہشام سے یعنی ان کو مسلمان کر دے یہ نہیں کیا کہ ان کی جانب توجہ فرمائی ہو اور تصرف کیا ہو بلکہ دعا فرمائی، اگر تصرف ہوتا تو دو کا نام نہ لیتے کیونکہ تصرف میں یکسوئی لازم ہے ایک کو معین کر کے جب تک اس کی طرف کامل توجہ نہ کی جاوے کچھ نہیں ہوتا حق تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بارہ میں دعاء قبول فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے غرض یہ تو آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی دعائیں فرمائی ہیں چنانچہ احادیث ان دعاؤں سے تلو ومشحون ہیں اور یہ بہت کم منقول ہے کہ تصرف کیا ہو اسی واسطے میں نے اوپر باذن الٰہی کی شرط و قید ذکر کر دی ہے۔ اس لئے کہ تصرف بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گاہ گاہ فرمایا ہے چنانچہ آیا ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کے سینہ پر ہاتھ مارا ان کا شبہ زائل ہو گیا۔ ایک صحابی گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا وہ سوار ہونے لگے سینہ پر ہاتھ مارنا یہ قرینہ اس کا ہے کہ یہ فعل تصرف ہے اور اگر کسی کے سمجھ میں اس کی کوئی اور توجیہ آجاوے تو پھر استثناء کی حاجت نہیں ہے انبیاء علیہ السلام کے تصرف نہ فرمانے کا حکم اپنے عموم پر رہے گا۔ بہرحال اگر ثابت بھی ہو جاوے تو شاذ ہے اور شاذ پر حکم نہیں ہوا کرتا سنّت وہ ہے جس پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مواظبت فرمائی ہو

مثلاً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبا پہنی تھی اس میں سونے کی گھنڈیاں تھیں تو یہاں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سنت ہے یہاں جواز کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا کیا اسی طرح یہاں بھی کہا جائے گا کہ سنت تو دعا کرنا ہے اور یہاں جواز کے لئے شاذ و نادر تصرف بھی فرمایا ہے خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کوئی امتیاز خاص نہ تھا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے اتنا بھی امتیاز نہ رکھا تھا جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس گروہ میں سردار کون ہے چنانچہ اگر کوئی آتا تو پوچھتا من محمد فیکم یعنی تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں نہ گاؤ تکیہ نہ مسند تھی حتیٰ کہ جب چلتے تھے تو اس کے لئے بھی کوئی خاص وضع مقرر نہیں فرمائی تھی کہ آگے ہی چلتے ہوں چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اول اول مدینہ طیبہ تشریف لائے تو قبا میں قیام فرمایا تھا اہل مدینہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہت کم جانتے تھے نادیدہ عاشق تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبریں آرہی تھیں ہفتے گذر گئے تھے کہ ہمیشہ استقبال کو جاتے تھے لیکن ناکام آتے تھے جس روز تشریف لائے تو ایک یہودی نے جو پہاڑ پر چڑھا تھا دور سے دیکھا اور پکار کر کہا کہ یا اھل المدینۃ ھذا جدکم یعنی تمہارا نصیبہ آگیا۔ چنانچہ سب آئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قبا میں قیام فرمایا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمراہ تھے، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی میں سفید بال زیادہ تھے اس لئے جو لوگ آتے تھے وہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیغمبر سمجھتے تھے جو آتا اُن سے مصافحہ کرتا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ادب دیکھئے کہ انھوں نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرو برابر سب سے مصافحہ کر لیتے تھے اگر کوئی کہے یہ تو بے ادبی ہے یاد رکھو کہ ادب حقیقت اور اسکا

حاصل راحت رسانی ہے لوگوں نے جو ادب کے معنی گڑھے ہیں کہ جوتیاں اٹھائے دست بستہ کھڑے ہوگئے کہ جب تک اجازت نہ ہوگی بیٹھیں گے نہیں، خواہ دوسرے کو اس سے تکلیف ہی ہو یہ ادب نہیں ہے آجکل اگر کوئی بزرگوں کے سامنے ایسا کرے جیسے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا تو اس کو بے ادب سمجھیں گے۔ اب میں بیان کرتا ہوں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ادب کیونکر ہے۔

بات یہ ہے کہ آپ تھکے ماندے تشریف لائے تھے اگر تمام مجمع سے آپ مصافحہ کرتے اور علیحدہ علیحدہ سب کا حال پوچھتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضرور تکلیف ہوتی اور آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) وہ ذات مقدس ہیں کہ جن کی راحت کے لئے غار میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سانپ سے کٹوا لیا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت رسانی کے واسطے حرکت تک نہیں فرمائی پس ایسے محبوب کی اس قدر تکلیف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے جاں نثار و محب کو کیسے گوارا ہوتی چنانچہ لوگ آرہے ہیں اور آپ مصافحہ کر رہے ہیں اب تو یہ مصیبت ہے کہ اگر ایسا کرنے لگیں تو اس کو بے ادب گستاخ مدعی سمجھا جاتا ہے یہ تو ظاہری حکمت اس مصافحہ کی ہوئی اور ایک باطنی راز ہے وہ یہ ہے کہ محبت کا خلاصہ ہے کہ محب میں فنا فی المجبوب کا مضمون پیدا کر دیتی ہے اور فنا کا خلاصہ ہے من وجہ اتحاد سو اللہ تعالیٰ نے یہ دکھلا دیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایسے محب ہیں کہ لوگ ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سمجھ کر ان سے مصافحہ کرتے ہیں ؎

من تو شدم تو من شدی
من تن شدم تو جان شدی

لیکن حضرت صدیق اکبر اس پر بھی مغلوب الحال نہیں ہوئے چنانچہ انھوں نے انا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں کہا اللہ تعالےٰ نے خود ہی اس

واقعہ سے اس اتحاد کو ظاہر فرما دیا جیسے احمد جام کا قول انا احمد بلا میم یہ غلبہ حال میں انھوں نے فرمایا تھا یہ احمد جام کا قول ہے لوگ اس کو حدیث سمجھتے ہیں حدیث نہیں ہے۔ خیر یہ ایک لطیفہ ہے جس میں کوئی امر خلاف شریعت نہیں ہے حاصل یہ ہے کہ لوگ مصافحہ کرتے رہے جب آفتاب اونچا ہوا اور دھوپ کے اندر تیزی ہوئی اور آپ پر دھوپ آئی اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ پر ایک کپڑے کا سایہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور یہ خادم ہیں لیکن اس معلوم ہونے پر ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے پھر دوبارہ اٹھ کر مصافحہ نہیں کیا اگر آجکل کے لوگ ہوتے تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرتے اور ہر شخص کہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں معافی چاہتا ہوں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی صحابہؓ کے اندر یہ تکلف نہ تھا حالت یہ تھی کہ وقت پر تو جان دینے کو تیار رہتے اور دوسرے وقت یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ ان میں کون مخدوم ہے کون خادم ہے اور یہاں ایک بات اور معلوم ہوئی وہ یہ کہ یہ مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا اور وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سر پر ہر وقت ابر کا سایہ رہتا تھا اس قصہ سے معلوم ہوا کہ ابر کا سایہ رہنا دائمی نہ تھا لیکن ہم سایہ نہ ہونے کی نفی نہیں کرتے ہیں ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو مگر ہم نے اس کے متعلق کہیں صراحۃً روایت نہیں دیکھی مواہب لدنیہ میں بہت مبسوط کتاب ہے مگر انھوں نے بھی کوئی روایت نہیں لکھی واجعلنی نوراً سے استنباط کیا ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ اس سے استدلال کرنا کیا درجہ رکھتا ہے۔ بہرحال مقصود اس قصہ سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کوئی حالت ممتاز نہیں رکھتے تھے۔ اولیاء کاملین کی یہی حالت ہوتی ہے اس کی بحث بہت طویل ہے لیکن بقدر ضرورت تحقیق ہو چکی ہے اسی پر اکتفا کر کے میں اصلی مقصود بیان کرتا ہوں کہ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں شبہ

مغلوب الحال ہونے کا نہ کیا جاوے جیسا کہ واضح ہو گیا۔ اب رہی یہ بات کہ جب یہ نہ غلو فی الدین ہے اور نہ غلبہ حال ہے تو پھر اس حدیث کی کیا توجیہ ہے کیونکہ ظاہراً تو یہ عقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ صریح چوری کرتے دیکھ رہے ہیں اور پھر اپنے مشاہدہ کی تکذیب کر رہے ہیں اور عقل کے خلاف ہونے سے خود حدیث کی صحت مخدوش ہو گئی اور مبنی اس شبہ کا یہ ہے کہ آجکل ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے انھوں نے کچھ اصول درایۃ کے تراشے ہیں اور احادیث کو ان اصول پر منطبق کرتے ہیں اور عدم انطباق کے وقت حدیث کے معنی میں تحریف کرتے ہیں یا حدیث کا انکار کر دیتے ہیں انھوں نے عقل و درایت کی حکومت کو اس قدر عام مانا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھی اس کو حاکم بنا دیا خوب سمجھ لو کہ اول تو درایۃ باوجود حاکم ہونے کے خدائے تعالیٰ پر حاکم نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں نہ جلنے کے خلاف درایۃ بتلاتے ہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے خدا تعالےٰ نے اس کو واقع نہیں کیا عجب بات ہے تمھاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کیسے لازم آیا کہ اس کا وقوع بھی نہیں ہوا درایۃ خدا تعالےٰ کے قبضے میں ہے خدا تو درایۃ کے قبضے میں نہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ نے ایسی ہی ایک حکایت لکھی ہے۔ جس میں درجہ درایت کی بھی بتلائی ہے کہ ایک بادشاہ نے بڑی بڑی گھاٹیاں آگ سے بھر وا رکھی تھیں جو بُت پرستی نہ کرتا تھا اُس کو آگ میں پھینک دیتا تھا ایک موحد عورت آئی اس کے پاس ایک بچہ تھا۔ اس عورت کو کہا تو بت کو سجدہ نہ کرے گی تو اس بچہ کو آگ میں پھینک دیں گے۔ اس نے صاف انکار کیا چنانچہ اس بچہ کو آگ میں پھینک دیا۔ اس بچہ نے آگ میں سے ماں کو ندا دی ؎

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم — گرچہ در صورت میان آتشم
اندر آ اسرار ابراہیم بیں — کہ در آتش یافت در د و یاسمیں
اندر آ پیدائے مسلماناں ہمہ — غیر عذاب دیں عذاب است آں ہمہ

اے ماں اندر آجا اگرچہ بظاہر میں آگ میں ہوں لیکن اس جگہ بہت خوش ہوں اندر آجا اور ابراہیم علیہ السلام جیسا معاملہ دیکھ کہ انھوں نے آگ کے اندر گلاب اور یاسمین کے پھول دیکھے تھے۔ اے مسلمانوں تم سب اندر آجاؤ سوائے دین کی شیرینی کے سب عذاب ہی عذاب ہے۔

چنانچہ ماں بھی آگ کے اندر کود پڑی اور مسلمانوں نے گرنا شروع کیا اور سب صحیح و سالم رہے۔ آخر بادشاہ نے جھلا کر آگ کو خطاب کیا اے آگ تجھ کو کیا ہوا کیا تو آگ نہیں رہی آگ نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم — اندر آ تا تو ببینی تابشم
طبع من دیگر نگشت و عنصرم — تیغ حقم ہم بدستوری برم

آگ نے کہا کہ میں تو وہی آگ ہوں تو خود اندر آجا تاکہ میری گرمی اور جلن کو دیکھ لے میری خاصیت بدلی نہیں میں تو وہی اصل سے آگ ہی ہوں لیکن میں خدا کی تلوار ہوں حکم کے موافق چلتی ہوں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کا راز فرماتے ہیں جس میں درایۃ کی وجہ بتلائی ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

مٹی، ہوا، پانی، آگ سب اللہ کے بندے ہیں اور تیرے لئے مردہ معلوم ہوتے ہیں لیکن اللہ کے لئے سب زندہ ہیں۔

پس آگ بیشک فاعل ہے مگر کب تک جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو معطل نہ فرمادیں اور جب معطل فرمادیں کسی کام کی نہیں جیسے تحصیلدار حاکم ہے جب

تک معطل نہ ہو جب معطل ہو گیا تو جیسے اور ہیں ویسا ہی وہ بھی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا اس لئے کہ اس کو حکم ہو گیا یا نار کونی برداً وسلاماً علیٰ ابراھیم (اے آگ تو ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا سبب بن جا)

پس گو یا ظاہراً خلاف درایۃ ہے لیکن خود یہ حکم درایۃ کا کہ النار محرقۃ حق تعالیٰ پر تو حجت نہیں دوسرے آپ کی درایت بھی تو ناتمام ہے چنانچہ آپ کی درایۃ تو صرف اس قدر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو اپنے خلاف درایۃ سمجھ لیا حالانکہ واقع میں یہ درایت کے بھی خلاف نہیں ہے اس لئے کہ سرقہ کی حقیقت یہ ہے اخذ مال الغیر خفیۃ اس کے تحقیق کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے اول لینا دوسرے مال کا لینا تیسرے غیر کا مال چوتھے خفیۃ لینا آنکھ سے صرف اس قدر دیکھا جاتا ہے کہ خفیہ مال لینا مگر مال الغیر ہونا یہ آنکھ سے کیسے معلوم ہوا ممکن ہے کہ وہ شے اس کی ہے یا اس نے اجازت لے لی ہو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اول اس ہیئت کو دیکھ کر فرمایا کہ چوری کی ہے پھر اس کی قسم کے بعد دوسرے عقلی احتمال مستحضر ہو گیا کہ شاید یہ سرقہ نہ ہو اور یہ سمجھا ہو کہ اس ہیئت میں کوئی عارضی مصلحت ہو گی آپ نے دیکھا آپ کی عقل اس قدر ہے اسی طرح جن جن چیزوں کو آپ خلاف عقل کہتے ہیں میں انشاء اللہ تعالیٰ ایک ایک کو عقل پر منطبق کر سکتا ہوں ہم اور آپ عاقل نہیں ہیں ہاں آکل ہیں یعنی ہم کو کھانے کی عقل ہے مثل بہائم کے چنانچہ بعض جانور اپنے کھانے پینے کی ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ عقلا بھی نہیں کر سکتے رجواڑوں میں سنا ہے کہ ریت کے اندر تربوز چھپے رہتے ہیں۔ بیلوں کو جب پیاس لگتی ہے تو ریت کو کرید کر تربوز نکال کر کھا لیتے ہیں اور آدمی کو تلاش سے بھی نہیں ملتے اس کھانے پینے کی تدبیروں کو لوگ ترقی کہتے ہیں ترقی یہ ہوئی کہ بیل کے برابر ہو گئے حضرت یہ ترقی نہیں ہے ترقی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے تم کو عقل دی ہے اس کو دین کے کاموں

میں صرف کرو کھانے پینے کی عقل تو جانوروں کو بھی ہوتی ہے بلکہ تم سے زیادہ ہوتی ہے اس پر تو چاہیئے کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ہوں اگر یہی ترقی ہے تو ہم میں اور جانوروں میں فرق کیا ہوگا غرض یہ قصہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا کہ انھوں نے کس قدر احتیاط فرمائی اور لا تقف مالیس لک بہ علم پر کیسا عمل کیا ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ذرا سے شبہ میں چور کہدیتے ہیں محض قرائن سے کسی کو چور کہدینا نہایت برا ہے اس پر ایک اور مضمون یاد آگیا کہ بعض لوگ چور کے معلوم کرنے کے واسطے ایک عمل لوٹا گھمانے کا کیا کرتے ہیں اس پر سورۂ یٰسین شریف پڑھتے ہیں جس کے نام پر لوٹا گھوم جائے اس کو یقیناً چور سمجھتے ہیں اور اس عمل میں غلطی کا احتمال ذرا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کا عمل ہے یاد رکھو کہ یہ حرام ہے شریعت میں بلا اپنے دیکھے یا دو عادل کی گواہی بغیر کسی کو چور سمجھنا ممنوع ہے اور یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کا عمل غلط نہیں ہوسکتا اس میں مغالطہ ہے یہ عمل اگر قرآن کا مدلول ہوتا تو واقعی یقینی ہوتا اور یہی معنی ہیں اس کے قرآن میں احتمال غلطی کا نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عمل قرآن کا مدلول نہیں خود تمہارا گھڑا ہوا ہے کیا اگر کوئی شخص ایک بڑا سا قرآن لے کر کسی کے سر میں ماردے اور وہ زخمی ہو جاوے تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ عمل جائز ہے کیونکہ قرآن کے ذریعہ ہوا ہے حاصل یہ ہے کہ ولا تقف مالیس لک بہ علم میں بطریق مذکور زبان کی حفاظت کا حکم بھی داخل ہوگیا اور ہاتھ کی حفاظت اس طور داخل ہوئی کہ بلا تحقیق جرم کسی پر ظلم کرنا حرام ہے اور اس میں بھی مخالفت ہوئی ولا تقف الایہ کی اسی طرح پاؤں کی حفاظت اس طرح داخل ہے کہ بلا تحقیق جواز شرعی کسی ناجائز مجمع میں جانا حرام ہے اسی طرح سب جوارح کی حفاظت اس میں داخل ہوگئی اور سمع و بصر و فواد کی حفاظت تو بالتصریح ہے اس میں مذکور ہے مثلاً کان کو غیر مشروع اصوات و مضامین سے بچانا آنکھ کو غیر محارم کیطرف نظر کرنے سے بچانا قلب کو گمان بد وغیرہ سے بچانا اور اس سے کسی کو شبہ قیاس فقہی کے بطلان کا نہ ہو

کہ ظاہراً وہاں بھی اتباع ہے ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں کیونکہ حکم مجتہد فیہ ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے۔ خصوص جب کہ دوسری آیت میں بھی اتباع ظن کی مذمت فرمائی گئی ہے ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا (وہ لوگ اتباع کرتے ہیں مگر خیال باتوں کا اور خیالی چیز ان پر حق سے علیحدہ اور مطمئن نہیں ہوسکتے) جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے یہ مسئلہ تحقیق کو پہنچ گیا کہ قیاس اور اجتہاد جائز اور واجب العمل ہے تو اس پر ما لیس لک بہ علم صادق نہ آوے گا بلکہ وہ مالک بہ علم کا مصداق ہوگا کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلہ مثبتہ حجۃ قیاس بالیقین داخل ہیں اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بیشک اس کا اتباع ما لیس لک بہ علم کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع مالک بہ علم کا ہوگا خوب سمجھ لو اور اتباع ظن کی جو مذمت آئی ہے وہاں ظن کے معنی مصطلح فقہی نہیں ہیں بلکہ ظن اصطلاح قرآن میں عام ہیں باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی چنانچہ منکرین بعث کے قول میں ان نظن الا ظنا آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اُس کا احتمال بھی نہ تھا چہ جائے کہ احتمال راجح بلکہ وہ اس کو اپنے زعم میں علم صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا پس ثابت ہوا کہ اصطلاح قرآن میں ظن عام ہے امور باطلہ کو بھی پس معنی آیۃ ذم ظن کے یہ ہیں ان یتبعون الا ما خالف الدلیل القطعی وکل ما خالف الدلیل القطعی لا یغنی من الحق شیئاً بل ھو باطل قطعاً (وہ نہیں پیروی کرتے ہیں مگر اس چیز کی جو دلیل کے خلاف ہو اور قطعی دلیل کے خلاف ہو وہ حق بات سے بے پرواہ نہیں کرسکتا بلکہ وہ باطل ہے) پس اس آیت سے بھی شبہ کی گنجائش نہ رہے فقط۔ جامع التماس کرتا ہے کہ بعض عوارض سے میں پورا نہ لکھ سکا جس قدر ضبط ہوا اس کو صاف کر دیا کہ خالی از نفع نہ تھا خصوص تحقیق اخیر کی بے حد لطیف و نافع خصوص طلبہ کے لئے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تمت بالخیر

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد دوم کا
دسواں وعظ ملقب بہ

تقویم الزیغ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر
محمد عبد المنان غفرلہٗ
مکتبہ تھانوی۔ دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد دوم کا

وعظ دہم ملقب بہ

تقویم الزیغ

اشتات	المستمعون	مزضبط	ماذا	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد تخمینی	کس نے لکھا	کیا مضمون تھا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
تعلیم یافتہ بہت تھے	تخمیناً ۹۰۰	جناب مولوی سعید احمد صاحب تھانوی	انسداد بدعات و الحاد	کھڑے ہو کر	۲-۳۰ گھنٹے	۲۹ شوال ۱۳۳۲ھ بعد نماز عشاء	ضلع بجنور [illegible] انجمن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

خطبہ ماثورہ اما بعد - فقد قال اللہ تبارک و تعالیٰ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ - یہ ایک آیۃ کا ٹکڑا ہے اس سے اوپر خدا تعالیٰ نے بعض احکام اعتقادیہ اور بعض احکام عملیہ بیان فرمائے ہیں ان کے بعد یہ جملہ ارشاد ہوا ہے - ترجمہ اس کا یہ ہے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا رستہ ہے جو سیدھا ہے اس کا اتباع کرو دوسرے طریقوں کا اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو خدا کے رستہ سے دور کر دیں گے - اس ترجمہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اس وقت کس مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہ کہ یہ کوئی نیا مضمون نہیں بارہا کان اس سے آشنا ہوئے ہوں گے - اس پر ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ جب یہ مضمون بارہا سنا ہوا ہے تو اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ سننا دوسری چیز ہے اور سمجھنا دوسری چیز - ہے ہم نے سنا تو ہے مگر سمجھا نہیں خدا تعالیٰ نے کہیں کہیں اس کی ترغیبات بھی کی ہے اس کو تدبر و تفکر کہتے ہیں - چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

مسلمان تحصیل علوم وغیرہ کو ضروری سمجھتے ہیں اور وہ ہیں بھی ضروری لیکن ان کی جو اصل ہے جس کی یہ سب فرع ہیں اس کی ضرورت کا تصور بھی نہیں ہوا بلکہ اس حالت کا بھی تصور نہیں اور ترقی کرکے کہتا ہوں کہ ذرا التفات بھی نہیں ہوا الا ماشاء اللہ کہ بعض کو تو اس کا خیال ہے ورنہ علی العموم اس طرف سے بالکل بے پروائی ہے اور وہ بات کچھ بہت لمبی چوڑی نہیں بہت چھوٹی سی بات ہے لیکن چھوٹی ظاہر ہی میں ہے ورنہ مثل قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کلمتان خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حقیقت میں وہ بات بہت بڑی ہے اور اسی کی بدولت کچھ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تدبر اور تفکر کیا کریں مسلمان اس سے کچھ ایسے غافل اور بے خبر ہیں کہ گویا انھوں نے اس کا سبق ہی نہیں پڑھا اور دوسروں کی کیا شکایت کروں خود اپنی ہی یہ حالت ہے کہ زبان پر لمبے چوڑے مضامین ہیں لیکن اپنی حالت میں تدبر اور تفکر نہیں اور جب میں اپنے کو مریض سمجھتا ہوں اپنی شکایت کرتا ہوں تو اگر سننے والوں کی بھی شکایت کروں تو کچھ بے موقع نہیں ہے ہاں اگر اپنا تبریہ کرتا تو سامعین کی تکدر خاطر کا ضرور خیال تھا غرض ہم مسلمانوں میں اس کی بہت کمی ہے ہم نے تدبر سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا ہر شخص اپنے یوم ولیلہ کو دیکھ لے جن لوگوں کے اوقات کا کوئی انضباط ہی نہیں وہ تو شمار ہی سے خارج ہیں اور اکثر لوگ ہم میں ایسے ہی ہیں کہ صبح کا کام شام پر اور شام کا کام صبح پر ملتوی رکھنا معمولی بات ہے میں نے ایسے افراد بھی دیکھے ہیں کہ انھوں نے ایک ایک خط کو صبح شام میں ہفتہ بھر تک ڈالے رکھا جیسے بعض حفاظ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے جب سے قرآن پڑھا ہے ایک ختم کی بھی نوبت نہیں آئی ایسے لوگ تو شمار ہی سے خارج ہیں لیکن جن لوگوں کے اوقات منضبط ہیں وہ اپنے نظام الاوقات میں دیکھیں کہ پانچ منٹ کے لئے بھی تدبر کے لئے انھوں نے رکھے ہیں کہیں نام ونشان بھی نہ ہوگا اکثر مسلمانوں کو اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں خدا تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ دوسری جگہ فرماتے ہیں اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا کہ یہ لوگ قرآن میں غور ہی نہیں کرتے۔ یا دلوں پر قفل لگ گئے ہیں کہ تدبیر کی قدرت ہی نہیں رہی۔ کیونکہ اگر تدبر کرتے تو یہ حالت ہرگز نہ رہتی تدبر کا خاصہ ہے کہ اس سے رحمت کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور بغیر اس کے کچھ نہیں ہوتا چنانچہ فرماتے ہیں اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ

یعنی کیا ہم ان کو زبردستی اپنی رحمت چمٹا دیں اگرچہ وہ کراہت کرتے ہوں اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے کیا ہمارے یہاں اس کے رکھنے کو جگہ نہیں اگر ہزار بار چاہیں تو ہم بھی متوجہ ہوں گے اور تمہاری توجہ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اور کام بھی ہماری توجہ سے چلتا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بچے کو آپ لینا چاہیں اور لینے کو ہاتھ بڑھائیں تو اگر بچہ اپنی بساط کے بموجب دوڑے اور کوشش کرے اگرچہ گر ہی جاوے تو آپ خود دوڑ کر اٹھالیتے ہیں اور یہ مسافت آپ ہی کے بڑھ کر اٹھالینے سے طے ہوتی ہے ورنہ اس بچہ میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ خود اس مسافت کو طے کر سکے اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی طرف بلاتے ہیں اگر یہ بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائے اور کوشش کرے تو اس جانب سے جذب ہوتا ہے اور اس جذب کی بدولت یہ وہاں تک پہنچتا ہے۔ اور یہ فرلانگ دو فرلانگ کی مسافت تو ممکن ہے کہ بچہ قطع کر لے برخلاف اس بعد کے جو ممکن اور واجب میں ہے کہ اگر اُدھر سے جذب نہ ہو تو کبھی یہ مسافت طے ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اُدھر سے جذب ہونا آپ کی طلب پر موقوف ہے جس کا افسوس ہے کہ آپ نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہر وقت ہدایت دینے کو تیار ہیں مگر افسوس کہ ہم ہی قاصر ہیں اور وہ طلب یہی ہے کہ ہم تدبر کریں اور سوچ لیا کریں۔ اس سے خدا تعالیٰ کا بہت بڑا افضل ہوتا ہے۔

صاحبو! میں پھر کہتا ہوں کہ تدبر اور سوچ اگرچہ بظاہر بہت چھوٹی سی بات ہے لیکن ثمرہ کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے ترک کر دینے سے ہم بہت خرابیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اسی طرح یہ مضمون جو آج بیان کرنا مقصود ہے اس کو بھی آپ نے بہت دفعہ سنا ہوگا مگر کبھی اس میں غور کرنے اور سمجھنے کی نوبت نہیں آئی اس لئے آج سمجھانے کے لئے اس کو اختیار کیا گیا۔ میں مضمون آیۃ کو پھر دوہرائے دیتا ہوں تاکہ وہ تازہ ہو جائے اور وعظ سے یہ ہی مقصود بھی ہوتا ہے کہ جو مضامین کانوں میں پڑے ہیں لیکن ان سے غفلت ہو گئی ہے وہ پھر تازہ ہو جائیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر وعظ میں کوئی نئی بات ہی بیان کی جاوے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ وعظ سننے سے اصل مقصود کیا ہونا چاہیئے کیونکہ آجکل وعظ سننے والوں کے مختلف مقاصد ہوا کرتے ہیں بعض لوگ تو

اس لئے وعظ سننے آتے ہیں کہ واعظ کی تقریر کا اندازہ کریں کہ وہ کس قبیل کی ہے بیان مسلسل ہوتا ہے یا اکھڑا اکھڑا ہوتا ہے مضامین کی آمد کا کیا حال ہے بعض لوگ اس لئے سنتے ہیں کہ مضامین سنکر واعظ کے خیالات کا اندازہ کریں گے کہ یہ کس خیال کا آدمی ہے بعض لوگ اس لئے آتے ہیں کہ اس کے بیان اور مضامین میں عیب نکالیں گے بعض کی نیت اچھی بھی ہوتی ہے لیکن صرف یہ مجلس وعظ میں شریک ہونے سے اتنا وقت ثواب کے کام میں گزرے گا یہ نیت اگرچہ مستحسن ہے لیکن کافی نہیں کیونکہ وعظ سننے سے یہ مقصود نہیں ہوتا ثواب تو نفلوں میں، تلاوت قرآن میں بھی بہت کچھ ملتا ہے وعظ سننے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ امراض باطنی جن پر ہماری نظر بھی نہیں جاتی ان کو سُنے اور ان پر ہم کو توجہ ہو پس اس غرض کو پیش نظر رکھ کر وعظ سننا چاہیئے۔ غرض خدا تعالیٰ اس مقام پر فرماتے ہیں اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ۔ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا میں عامل اُشیر ہے جو کہ ہذا سے مفہوم ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ کہ میرے اس سیدھے رستہ کا اتباع کرو اور دوسرے رستوں پر نہ ہو لو کہ وہ تم کو خدا کے رستہ سے جدا کر دیں گے۔ ترجمہ سے معلوم ہوا کہ رستے بہت ہیں جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا رستہ ہے اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں۔ پس ان سب رستوں میں ایک تو اتباع کے قابل ہوگا باقی سب ترک کے قابل۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الٰہی کو دوسرے طرق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہمکو یہ بات معلوم ہو سکے کہ فلاں رستہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اور اس کے سوا دوسرے قابل ترک اگر غور کیا جائے تو اسی آیت کے پورے مضمون سے اُس معیار کا پتہ چل جاویگا اور معلوم ہو جاوے گا کہ اس معیار کو چھوڑ دینے ہی سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی کہ بعض لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے طرق الٰہی کو چھوڑ دیا یا لئے ہوئے ہیں چنانچہ اس جزو آیہ سے اوپر کا جزو اس کے ساتھ ملایا جاوے تو اس سے معیار معلوم ہو جاوے گا۔ فرماتے ہیں قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَنْ لَّا تُشْرِکُوْا

بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ آؤ میں تم کو احکام خداوندی بتلاؤں اور وہ فلاں فلاں ہے اس ارتباط باہمی سے اس بات کا فیصلہ ہوگیا کہ معیار طریق خداوندی کے دوسرے طرق سے ممتاز ہو جانیکا یہ ہے کہ جس بات کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرماویں و پڑھ کر سنادیں وہ طریق خداوندی ہوگا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرمادیں وہ وحی ہوتا ہے۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ وحی سے جو ثابت ہو وہ طریق الٰہی ہے تو وحی معیار ہوئی مختلف طرق کے ممتاز کرنے کی اور اسی پر دارو مدار رہوا اس مضمون کو بھی مسلمانوں نے بہت دفعہ سنا ہوگا لیکن برتاؤ اور مسلمانوں کے حالات میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں تو وحی کی مطلق عظمت ہی نہیں اور بعض کے دل میں وحی کی وقعت تو ہے لیکن اس کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔ اس وقت مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں مگر سب میں مرض مشترک یہ ہے کہ وحی کو معیار نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے مناسب تھا کہ سب کو ایک ہی فرقہ کہا جاتا لیکن چونکہ انداز الگ الگ ہیں اس لئے سب کو ایک نہیں کہا جا سکتا اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بادشاہ کی عملداری میں مختلف طرح کے آدمی رہتے ہوں بعض تو ایسے ہوں کہ وہ قوانین کو تسلیم ہی نہ کرتے ہوں بعض ایسے ہوں کہ قوانین کو تو تسلیم کریں لیکن ان قوانین کے صحیح غرض کو نہ سمجھتے ہوں تو یہ سب لوگ اس قدر مشترک میں تو شریک ہیں کہ معیار قانون پر نہیں چلتے لیکن چونکہ تسلیم اور عدم تسلیم کا فرق بھی ہے اس لئے دونوں کو الگ الگ شمار کیا جاوے گا اور برتاؤ بھی دونوں کے ساتھ مختلف ہوگا قانون غلط سمجھنے کے متعلق مجھے ایک حکایت یاد آئی اس سے انشاء اللہ یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاوے گی کہ قانون کو تسلیم کرنے کے بعد بھی کیونکر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے۔ ایک غیر ملک کے دیہاتی نے ریل کا سفر کیا اور قریب ایک من کا بورا اپنے ساتھ لیا اسٹیشن پر پہنچا تو ملازمین ریلوے نے ٹکٹ کے ساتھ اسباب کی بلٹی بھی طلب کی اس نے جب بجائے بلٹی کے بھی اپنے ٹکٹ ہی کی طرف اشارہ کیا ملازم ریلوے نے اس کو سمجھانے کے طور پر کہا کہ تمہارا اسباب چونکہ پندرہ سیر سے زیادہ ہے اور پندرہ سیر سے زیادہ اسباب محصول ادا کئے بغیر لیجانے کی قانون میں اجازت نہیں ہے اس لئے ایک بلٹی اس اسباب کی بھی ہونی چاہیئے یہ سن کر وہ دیہاتی کہتا ہے کہ پندرہ سیر سے بہ خاص وزن مراد نہیں

بلکہ وہ مقدار جس کو ایک آدمی اٹھا سکے اور چونکہ ہندوستانی لوگ پندرہ سیر ہی اٹھا سکتے ہیں اس لئے یہ خاص وزن لکھدیا گیا ہے اور ہم ایک من اٹھا سکتے ہیں اس لئے ہمارے ایک من کے لئے وہی قانون ہوگا جو تمہارے پندرہ سیر کے لئے ہے خیر یہ حکایت تو ایک لطیفہ ہے لیکن ہم کو اس سے سبق لینا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا وہ ٹکٹ کلکٹر اس دیہاتی کے جواب کو سنکر اس کو معذور سمجھے گا یا اُس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کتاب قانون کی لاکر اس دیہاتی کے سامنے رکھدے اور اس کو قانون سمجھانے کی اور اس کے اشتباہ دفع کرنیکی کوشش کرے اور اگر وہ ہر شخص کے ساتھ ایسا کیا کرے تو کیا اپنے منصبی کام کو پورے طور پر انجام دے سکے گا۔ کبھی نہیں بلکہ یہ مشغلہ اس کو معطل کر دے گا پس ان ساری دقتوں کو پیشِ نظر رکھ کر آپ بتلایئے کہ ٹکٹ کلکٹر کیا کرے گا۔ صرف یہ ہی کہ ہاتھ پکڑ کر اس کو پولیس کے حوالہ کر دے گا۔ تو جیسا اس دیہاتی نے قانون کی غلط تفسیر کی تھی اسی طرح آجکل قرآن کی غلط تفسیر کی جاتی ہے اور زور دیکر کہا جاتا ہے کہ اس قانون قرآنی کا یہ ہی مطلب ہے حالانکہ نہ وہ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا نہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سمجھا نہ خدا تعالیٰ نے بتلایا۔ صاحبو! قرآن فہیم لوگوں کی نظروں میں اس قسم کی تفاسیر کی وقعت اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی وقعت اس دیہاتی کی تفسیر قانون کی تھی حالانکہ بظاہر اس کی یہ تفسیر اور تاویل جی کو لگتی ہے کہ اگر کوئی شخص قانون پر نظر نہ رکھتا ہو تو وہ اس کو سنکر یقین کرے کہ یہ ہی معنی اس قانون کے ہیں اور آپ کو یہ تفسیر منکر معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون مدت سے سنا ہوا ہے ورنہ جس نے کبھی اس قانون کو نہ سُنا ہو اور وہ اس گفتگو کو سنے کہ ٹکٹ کلکٹر تو کہتا ہے قانون یوں ہے اور دیہاتی کہتا ہے کہ قانون کی لِم کیا ہے کیوں یہ خاص وزن قانون میں رکھا گیا ٹکٹ کلکٹر جواب دیتا ہے کہ ہم عالم قانون ہیں مجوزہ قانون نہیں ہم نہیں جانتے کہ کیا لم ہے اس پر دیہاتی کہتا ہے کہ تم اگرچہ نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں لم اس کی یہ ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ اکثر ہندوستانی اٹھا نہیں سکتے اور جب یہ لم ہے تو جہاں یہ منتفی ہوگی قانون بھی منتفی ہوگا تو اس دیہاتی کی آب و تاب کی تقریر اور ٹکٹ کلکٹر کا بظاہر عاجزانہ جواب اس کا یہ خیال قائم کرا دے گا کہ قانون کی اصل حقیقت دیہاتی نے سمجھی اور

ٹکٹ کلکٹر محض زبردستی کررہا ہے حالانکہ قانون دان آدمی جانتا ہے کہ قانون وہی ہے جو ٹکٹ کلکٹر کہہ رہا ہے اور اس لئے وہ ٹکٹ کلکٹر کی جملہ تجاویز کو جو اس دیہاتی کے متعلق ہوں بجا اور مناسب سمجھے گا۔ یہ ہی حالت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے بچپن سے کبھی شریعت کے احکام نہیں سُنے اور ہوش سنبھال کر انھوں نے ایک عالم اور ایک جاہل کی گفتگو سُنی کہ عالم کہتا ہے شریعت کا یہ قانون ہے اور جاہل اس کی لم دریافت کررہا ہے جس کے جواب میں عالم یہ کہکر ختم کردیتا ہے کہ ہم عالم قانون ہیں واضع قانون نہیں لم اور مصلحت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے جو کہ واضع قانون ہے ہم اس کے ذمہ دار نہیں اور وہ جاہل مدعی عقل کہتا ہے کہ میں اس کی لم جانتا ہوں اور یہ کہکر احکام میں تحریف شروع کردیتا ہے جس طرح اس دیہاتی نے قانون ریلوے میں تحریف کی تھی۔ تو صاحبو! کیا وجہ کہ اس گنوار کے قصہ میں تو اس کو ناحق پر اور ٹکٹ کلکٹر کو حق پر کہا گیا اور اس جاہل کی گفتگو میں علماء کے جواب کو زبردستی پر محمول کیا گیا اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو بتلایئے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ احکام خداوندی کی عظمت دل میں نہیں اور گورنمنٹ کے احکام کی عظمت دل میں ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کے احکام میں علتیں نہیں تلاش کی جاتیں بے چون وچرا تسلیم کرلیا جاتا ہے اور جس کی عظمت دل میں نہیں رہتی اس کی ہر بات میں لم اور کیف کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ کوئی ایسا حکم سرکار کی طرف سے آتا ہے کہ جس سے طبیعت منقبض ہوتی ہے عقل بھی ابا کرتی ہے لیکن اس کو بلا تامل تسلیم کرلیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تو اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جن کی علت عوام کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ان کو مانا اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک روپیہ کا عدالتی ٹکٹ لفافہ پر لگاکر ڈاک میں بھیجدیا جاوے تو لفافہ بیرنگ ہوجائے اور ڈاک خانہ کا دو پیسہ کا ٹکٹ لگادیں تو بیرنگ نہ ہو ہزاروں آدمی ہوں گے جو اس قانون کی لم نہیں جانتے لیکن اگر ان میں کا کوئی عدالتی ٹکٹ لگاکر بھیجے اور لفافہ بیرنگ ہوجاوے تو گورنمنٹ سے یہ نہیں پوچھا جاتا نہ اس کی لم دریافت کی جاتی ہے کہ ایک روپیہ (عہ) میں لفافہ کیوں بیرنگ ہوا اور دو پیسہ میں کیوں بیرنگ نہیں ہوتا، غرض کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا کہ اس کی مخالفت

کی جائے یا علت تلاش کی جائے برخلاف اس کے اگر ایک دوست کوئی حکم کرے یا کسی امر میں رائے دے تو اس میں صدہا عیب نکال دیتے ہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ گورنمنٹ کی وقعت دل میں ہے اور دوست کی نہیں کیونکہ وہ آپ کی برابر کا ہے اور گورنمنٹ بالادست ہے۔ صاحبو! ذرا غور کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام میں علت ڈھونڈھ کر آپ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عظمت آپ کے دلوں میں نہیں رہی اور اگر اس کے سوا کوئی دوسری وجہ ہے تو مجھے بتلایئے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے حکم یا رائے کو باوجود اس کے بالادست نہ ہونے اور ہمارے دل میں اس کی عظمت نہ ہونے کے بھی اس وجہ سے کہ ہم اس رائے کو اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی طبیب کے پاس گیا اور جا کر مرض کی تشخیص کرائی اور نسخہ لکھوایا تو اس موقع پر آپ نے کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اگر اجزاءِ نسخہ کی حکمت اور علت اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس نے طبیب سے دریافت کیا ہو یا اس کے ساتھ الجھنے لگا ہو کہ یہ اوزان خاص کیوں رکھے گئے واللہ کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو زبان سے کبھی نہیں کہتے کیونکہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہی فائدہ کے لئے اس نے نسخہ تجویز کیا ہے ایسا نہ ہو چوں وچرا کرنے سے کبیدہ خاطر ہو کر ہم کو نکال دے اور کبھی نہ گھسنے دے۔ تو صاحبو! اگر احکام خداوندی کی قدر بھی دلوں میں نہ ہو تب بھی اس لئے ان کو تسلیم کر لو کہ وہ صرف تمہارے ہی فائدے کے لئے تجویز کئے ہیں ایسا نہ ہو تمہارے اعراض سے خدا تعالیٰ خفا ہو جائیں اور تم پر کوئی مصیبت آ پڑے ؂

من نکردم خلق تا سودے کنم ۔۔۔ بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

تو اگر احکام خداوندی کی وقعت گورنمنٹ کے احکام کے برابر نہیں ہے تو حکیم ہی کا سا برتاؤ کیا ہوتا اور جب یہ بھی نہیں تو معلوم ہوا کہ احکام خداوندی کی اتنی بھی قدر نہیں۔ البتہ حکیم کی تجاویز میں ایسے لوگ ضرور چھیڑ چھاڑ نکالا کرتے ہیں جن کو نسخہ پینا منظور نہ ہو بلکہ محض مشغلہ کے طور پر گئے ہوں تو میں لوگوں کے حالات دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر وہی لوگ احکام خداوندی میں لِم کیف کرتے ہیں جن کو

کچھ کرنا نہیں ہوتا اور جن کو عمل کرنا ہوتا ہے وہ اگر سوال کرتے ہیں تو یہ کہ نماز میں فرض کس قدر ہیں، واجب کتنے ہیں کیونکہ ان کو یہ فکر ہے کہ لاعلمی میں ہم سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جس سے نماز ہی جاتی رہے ان کو لم کیف سے بالکل تعلق نہیں ہوتا۔ پس حجت تلاش کرنے کے دو سبب ہوئے ایک تو احکام کی وقعت نہ ہونا دوسرے عمل کی نیت نہ ہونا اور علل تلاش کرنیوالوں کے دلوں میں نہ وقعت ہے نہ عمل کی نیت ہے بہرحال مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہے جو وحی کی عظمت اور قدر نہیں کرتے اور ایک ایسی جماعت ہے جو وحی پر نہیں چلتے ان دونوں کے لئے معیار وحی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے بالجملہ جس طرح معاملات حکام و رعایا میں معیار تعین و تصحیح کا قانون ہے اسی طرح طریق نجات کے لئے بھی معیار صحیح قانون الٰہی ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ کہ جو آپ پر وحی ہوا ہے اس کو پڑھئے تو خلاصہ دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اور ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا میں صراط کو جو اپنی طرف منسوب و مضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہونچانے والا اور میرا بتلایا ہوا رستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو رستہ خدا تک پہونچانے والا ہوگا وہ مستقیم ہی ہوگا۔ مُسْتَقِیْمًا فرمایا اور مستقیم کے یہ معنی نہیں کہ کوئی خط مستقیم ہے نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم رستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفت مستقیم لائے ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک ہی رستہ بتلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے تو آجکل چونکہ لوگوں نے اس طریق کو معیار نہیں بنایا اس لئے بہت سے فرقے ہو گئے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ فرقوں سے مراد مسلمانوں کے فرقے ہیں کافروں کے نہیں تو بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے وحی الٰہی کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو اس دیہاتی نے کیا تھا کہ وحی کو وحی تو مانا مگر اس میں تغیر و تبدل کرنے لگے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ایک بڑے فرقے کی یہ کوشش ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کو جس طرح بن سکے سائنس پر منطبق کیا جائے اور ایسے لوگ علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر ہیں۔ صاحبو! میں دعویٰ کرتا ہوں کہ سائنس کا کوئی حقیقی مسئلہ قرآن شریف کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اور حقیقی کی قید اس لئے

لگائی ہے کہ سائنس کے مسائل دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں کہ محض تخمین سے ان میں کام لیا گیا ہے اور اکثر اسی قسم کے ہیں دوسرے وہ ہیں جو تحقیق سے ثابت ہوئے ہیں تو جو مسائل تحقیقی ہوں گے وہ کبھی قرآن شریف کے دعویٰ کے معارض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ قطعی عقلی قطعی نقلی کے معارض نہیں ہوسکتا۔ صاحبو! آج کل تو تحقیق کا زمانہ ہے اور مسائل میں غور و فکر سے کام کیا جاتا ہے تو ذرا اس میں بھی تو غور کرو کہ اہل سائنس کے جتنے دعاوی ہیں سب صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ مثلاً اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں تو دیکھو یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی تو سائنس کی رو سے آسمان کا عدم قطعی طور سے ثابت نہیں ہوسکتا، آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم الوجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود و عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر نہیں مخبر جو قطعاً صادق ہو دیتا ہے تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے اور اس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی کہ آسمان موجود ہے اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری العدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی زیادہ سے زیادہ اگر کہا جاسکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں، البتہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے ان کو وجود آسمان تسلیم کرادیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفۂ یونان کے دلائل قریب قریب سب

مخدوش ہیں جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں واقعیت یہ ہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم۔ رہی یہ بات کہ علی العوام اس نیلگوں رنگ کو جو جانب فوق نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا تھا اور آج یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ نیلگوں رنگ آسمان نہیں ہے اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔ پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے دلائل سائنس سے مصادم ہے سخت غلطی ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق اور تصادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا اور جب تعارض نہیں ہے تو سماء کی تفسیر کواکب یا ما فوقنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی جس طرح اس دیہاتی کو کہا گیا تھا کہ اس نے قانون پر عمل نہیں کیا۔ ایک صورت تو وحی کو معیار نہ بنانے کی یہ تھی۔ ایک اور یہ صورت ہے کہ بعض لوگ وحی کو مانتے بھی ہیں اور اس کی حقیقت کو بھی کچھ سمجھتے ہیں لیکن اس کو قرآن شریف میں منحصر سمجھتے ہیں اور فقہ و حدیث کو وحی سے خارج کر دیتے ہیں تو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بھی وحی کو نہیں مانتے اور اس کو معیار نہیں سمجھتے وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ قانون کی شرح اگر مقنن کر دے تو وہ شرح بھی قانون ہی ہے یا اگر اصول اقلیدس سے اشکال جدیدہ بنائی جائیں تو ان اشکال کو بھی اقلیدس کی اشکال کہا جائے گا۔ پس حدیث تو چونکہ وحی ہے اگرچہ غیر متلو ہے اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے قرآن شریف کی شرح ہے اور اس لئے اس کا حکم بھی قرآن شریف کا سا ہے اور مسائل فقہ چونکہ انہیں اصول پر مبنی ہے جو قرآن و حدیث میں ہیں اس لئے وہ بھی حکم میں وحی کے ہوں گے۔ تو وحی کبھی جلی ہوتی ہے کبھی خفی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ط چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ط نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ سمجھا کہ شاید وساوس پر بھی گرفت ہو اس لئے بہت گھبرائے اُن کی گھبراہٹ پر دوسری آیت نازل ہوئی جس نے اس کی تفسیر کردی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا اس آیت نے بتلادیا کہ وساوس پر جب تک کہ وہ وسوسہ کے درجے میں رہیں مواخذہ نہ ہوگا۔ نیز حدیث کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر فرمائی اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ عَمَّا وَسْوَسَتْ صُدُوْرُہَا مَا لَمْ تَعْمَلْ اَوْ تَتَکَلَّمْ اَوْ کَمَا قَالَ۔ پس حدیث قرآن شریف کی تفسیر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بعض چیزیں چونکہ حدیث میں بھی مجمل رہ گئی تھیں مثلاً ربٰوا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ مَثَلًا بِمَثَلٍ یَدًا بِیَدٍ وَالْفَضْلُ رِبٰوا اور دوسری جگہ فرمایا کہ دَعُوا الرِّبٰوا وَالرِّیْبَۃَ اس سے معلوم ہوا کہ ربٰو حرام ہے اس کی جزئیات کا پتہ اس سے نہیں چلتا تھا ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالےٰ نے مَثَلًا بِمَثَلٍ اور یَدًا بِیَدٍ سے سب جزئیات کو نکال دیا جن کو عوام الناس نہ سمجھ سکتے تھے اور اسی لئے علم اصول مدون کیا نیز یہ بھی کہدیا کہ اَلْقِیَاسُ مُظْہِرٌ لَا مُثْبِتٌ جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہمنے کوئی نئی بات نہیں کہی جو کچھ کہا ہے حدیث و قرآن شریف ہی کی تفسیر ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جابجا یہ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وحی سے فرماتے ہیں کوئی بات وحی کے خلاف نہیں تو اس سے اُن لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو حدیث یا فقہ کو نہیں مانتے اور محدثین اور فقہاء پر اعتراض کرتے ہیں۔ صاحبو! حدیث سے کیونکر استغنا ہوسکتا ہے فرمائیے کہ اگر حدیث کو نہ مانا جائے تو رکعات کی تعداد یا اوقات نماز کی تعین کس طرح معلوم ہوگی۔ اگرچہ اوقات خمسہ کا ذکر قرآن شریف میں ہے لیکن وہ اس طرح ہے کہ جس کو پیشتر سے معلوم ہوئے وہ اُن پر منطبق کرسکتا ہے ورنہ خود قرآن شریف سے بلا مدد حدیث تعین نہیں ہوسکتی کیونکہ قرآن شریف میں صراحۃً نہیں ہے اشارات ہیں اور تعداد رکعات کا اشارہ بھی نہیں اور یوں زمین کا آسمان مان لیا جائے تو اس کو ثبوت بالقرآن نہ کہا جائے گا۔ مثلاً ایک صاحب نے

تعداد رکعات کو قرآن شریف کی اس آیت سے ثابت کیا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ اور کہا ہے کہ اس آیۃ سے نماز کا دو رکعت اور تین رکعت اور چار رکعت ہونا ثابت ہوتا ہے۔

صاحبو! کہاں فرشتوں کا ذکر کہاں رکعات کی تعداد یہ سب نفس کا زیغ اور کید ہے۔ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ نفس کا کید ایسی بلا ہے کہ بہت سی اصلاح کرنے سے بھی دفع نہیں ہوتا اور جس نے اصلاح ہی نہ کی اس کے کید کے دور ہونے یا سرے سے کید نہ ہونے کی تو کیا امید ہوسکتی ہے اور کید یہ ہے کہ نفس نے دیکھا کہ حدیث و فقہ میں احکام بکثرت ہیں اور ان سب پر عمل ہونا دشوار ہے اس لئے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ ان سب کو چھوڑو صرف قرآن شریف کو لو اور اپنی مرضی کے موافق تفسیر کرو کہ جس سے کچھ کرنا ہی نہ پڑے میں کہا کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں اعمال کیمیاوی کی بہت ترقی ہوئی کہ دین کا بھی ست نکل آیا۔ صاحبو! جس کو طلب شریعت ہوگی وہ کبھی ایسی ترکیبیں نہیں نکال سکتا۔ دیکھئے جس کو بھوک کی شدت ہوتی ہے وہ زیادہ کا طالب ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ موجود کو بھی اڑانے کی فکر کرے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

حقیقت میں جب طلب ہوتی ہے تو موجودہ ذخیرہ کو سن کر بھی تمنا ہوتی ہے کہ کچھ اور ہوتا اور جب طلب نہیں ہوتی تو سب میں اختصار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک تفسیر بالرائے کی جاتی ہے کہ ایک صاحب نے حرمت ربوٰا ہی کا انکار کردیا اور کہا کہ کلام مجید میں جو ربوا آیا ہے بضم بالرائے ہے جس کے معنی اُچک لینے کے ہیں۔ چونکہ اعراب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے بعد کو لگائے گئے اس لئے غلطی ہوگئی اور بکسر الرائے لکھدیا گیا۔ صاحبو! رُبا بضم الرائے عربی کا لغت تو ہے نہیں جس کے معنی اچک لینے کے ہوں البتہ فارسی میں ربودن کے معنی اُچک لینے کے ہیں، پس کیا یہ لفظ فارسی کا قرآن شریف میں داخل کردیا گیا۔ اور محرفین پر تو زیادہ افسوس نہیں کہ وہ تو اپنے

مطالب کے لئے کرتے ہیں مگر افسوس ان پر ہے جو قرآن شریف کو مانتے ہیں اور پھر
اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب احکام قرآن شریف سے ثابت ہو جائیں سچ ہے ؂

دوستیٔ بے خرد چوں دشمنی ست حق تعالیٰ ازیں چنیں خدمت غنی ست

واللہ اسوقت وہ حالت ہے کہ دیندار اور بے دین سب کی حالت خراب ہے وہ شعر یاد آتا
ہے جو کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا ہے کہ ؂

اے بسر پردۂ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

ایک صاحب مجھ سے ملے کہنے لگے کہ ڈاکٹری تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ منی میں کچھ
کیڑے ہوتے ہیں مجھے مدت سے خیال تھا کہ قرآن شریف کی آیت سے بھی یہ بات ثابت
ہو تو اچھا ہے چنانچہ ایک روز میں قرآن شریف پڑھ رہا تھا اُس میں یہ آیت نکلی۔
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ؕ اور عَلَق جونک کو کہتے ہیں مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بھلا خیال
تو فرمایئے کہ آیت کے یہ معنیٰ ہیں؟ کہاں جونک کہاں کیڑے۔ کہاں ڈاکٹری کے مسائل
کہاں قرآن شریف اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص فن طب کی کتابوں میں کپڑا
بننے کی ترکیب تلاش کرنے لگے، یا فن طب میں حدیث ڈھونڈنے لگے چنانچہ ایک صاحب
نے ایسا کیا بھی کہ میرے پاس طب اکبر یا میزان الطب لے کر آئے اور کہنے لگے کہ آپ رسم بسم اللہ
کو منع لکھتے ہیں حالانکہ اس کتاب میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسین یا حسن رضی اللہ عنہ
کا چار سال چار ماہ چار دن کی عمر میں مکتب کرایا اور لوگوں کو جمع کرایا۔ صاحبو! جس فن کی کتاب
ہو اس فن کے مسائل اس میں تلاش کرنے چاہئیں۔ تو اب یہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن شریف
کس فن کی کتاب ہے قرآن شریف جغرافیہ نہیں کہ اس میں جغرافیہ کے مسائل ڈھونڈھئے،
طب ادیان نہیں کہ بخار کھانسی کی ادویہ اس میں ملیں۔ قرآن شریف طب روحانی اور تہذیب
نفس کی کتاب ہے تو جیسے طب ابدان میں زراعت اور صناعی کے مسائل نہ ملیں گے قرآن
شریف میں بھی بجز طب روحانی کے دوسرے مسائل کی تلاش سعی بے حاصل ہے، اور اگر کسی
دوسری چیز کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ کسی روحانی مرض کے دفع کے لئے مثلاً منجملہ امراض روحانی
کے ایک مرض جہل باللہ و بصفاتہ بھی تھا قرآن شریف نے اس کو دفع کیا اور اس ضرورت

کے لئے یہ فرمایا کہ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّہَارِ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کو معلوم کرنے کے لئے مصنوعات میں غور کرو مثلاً آسمان کے وجود میں زمین کے وجود میں رات اور دن کے وجود میں مگر نہ اس حیثیت سے کہ آسمان سیال ہے یا نہیں اور زمین کروی الشکل ہے یا مُسَطَّح بلکہ مطلق موجود اور مصنوع ہونے کے اعتبار سے پس قرآن شریف میں ایک مسئلہ سائنس کا بحیثیت سائنس کے مذکور نہیں اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں کیونکہ کسی طب کی کتاب میں جوتے بنانے کی ترکیب نہ ہونا اس کتاب کا کمال ہے مسلمانو! خدا کی قسم یہ قرآن کا غایت درجہ کمال ہے کہ اس میں یہ خرافات نہیں ہیں نہ قرآن شریف کو اس کی ضرورت کہ زبردستی اس میں ان مسائل کو داخل کیا جائے۔ ع

بے نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

اگر قرآن شریف میں یہ خرافات ہوتے تو قرآن شریف کتاب الطبعیات ہوتی نہ کہ طب روحانی لہٰذا قرآن شریف سے کیڑوں وغیرہ کے وجود ثابت کرنے کی کوشش۔ دوستی بجز وجوں دشمنی ست ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر علق کے یہی معنی ہیں جو کہ ان ڈاکٹر صاحب نے فرمائے تو کیا وجہ کہ اس کو نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا نہ ابوبکرؓ سمجھے نہ دوسرے صحابہؓ اور تابعینؒ نے سمجھا۔ چنانچہ کسی نے یہ تفسیر نہیں کی۔ اگر کہا جائے کہ آج مسئلے کی تحقیق ہوئی ہے اس سے پیشتر یہ محقق نہ تھا تو اس میں اول تو اپنے اسلاف کے کتنے بڑے جہل کا اقرار ہے دوسرے اگر کوئی ملحد تم سے کہے کہ تمہارا قرآن شریف نازل ہوا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور پڑھا تمام صحابہؓ اور تابعینؒ نے لیکن سمجھا ہم نے تو تم کیا جواب دو گے۔ اور اگر قرآن شریف ایسا ہی وسیع ہے کہ اس میں ہر چیز کو داخل کیا جا سکتا ہے تو پھر اپنے کو اور اپنے متعلقین کو بھی داخل کر دو جیسے مشہور ہے کہ کسی گاؤں میں تین چودھری تھے ایک کا نام ابراہیم تھا دوسرے کا موسیٰ تیسرے کا عیسیٰ امام نے نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ سورت پڑھی جس کے اخیر میں ہے صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى تو عیسیٰ چودھری خفا ہو گیا۔ امام نے پھر وہی سورت پڑھی اور موسیٰ کے بعد عیسیٰ بھی بڑھا دیا۔

اسی طرح مجھ سے ایک مقام پر ایک ڈاکٹر ملے کہنے لگے کہ جدید تحقیقات سے

یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جس طرح حیوانات میں نر و مؤنث کا جوڑا ہوتا ہے اسی طرح نباتات کے تخم میں بھی ہوتا ہے کہ تخم کا ایک حصہ نر ہوتا ہے، دوسرا مادہ۔ مجھے خیال ہوا کہ قرآن شریف سے بھی یہ بات ثابت ہو تو بہت خوب ہو ڈپٹی صاحب کا ترجمہ دیکھا اس میں بھی نہ ملا آخر ایک روز بیوی سورۂ یٰسین پڑھ رہی تھی اس میں یہ جو آیت پڑھی سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ الآیۃ تو فوراً سمجھ میں آگیا کہ اس آیۃ میں وہ مسئلہ مذکور ہے۔ صاحبو! یہ خبط نہیں تو کیا ہے اس آیت کو اس مسئلہ سے کیا تعلق زوج کے معنی خاص میاں بیوی کے نہیں ہیں بلکہ مطلق جوڑے کے معنی ہیں خواہ وہ مذکر و مؤنث کے طور پر ہو یا دوسرے طور پر چنانچہ زوجی الخف بولتے ہیں۔ پس حق تعالیٰ نے اس میں یہ فرمایا ہے کہ نباتات میں بھی اقسام مختلفہ ہیں نہ یہ کہ ان میں میاں بی بی ہے۔ غرض بطور مثال کے یہ ایک مسئلہ پیش کردیا گیا ہے اس کے علاوہ اور بہت مسائل ہیں جو کہ بالکل تخمینی ہیں اور وہ قرآن شریف سے کچھ تعلق نہیں رکھتے اور میں کہتا ہوں کہ اگر ان مسائل سائنس پر قرآن شریف کی تفسیر کی بنا رکھی جائے اور چند روز کے بعد یہ دعاوی سائنس کے کاذب ثابت ہوں تو اس کی کیا تدبیر کی جائے گی کہ ملحدین اس وقت آپ کو کہیں کہ دیکھئے تمہارے محققین اس مسئلے کو قرآن شریف کا مدلول بتلا گئے ہیں اور یہ مسئلہ غلط ثابت ہوا تو قرآن شریف کا غلط ہونا ثابت ہو گیا اس کا کیا جواب دو گے؟ افسوس ہمارے بھائی مسلمان ذرا غور نہیں کرتے کہ اس کا کیا انجام ہوگا اور بالکل نہیں سمجھتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سمجھنے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو تحقیق ہو اس کا تو ان کے پاس سامان نہیں یا علماء کی تقلید ہو اس سے عار آتی ہے۔ اور بڑا لطف یہ ہے کہ قرآن شریف سے ثابت کرنے کی کوشش ہے مگر ثابت کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ چنانچہ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ ڈاڑھی رکھنے کا وجوب قرآن شریف سے ثابت نہیں تو دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ میں قرآن شریف سے ثابت کرتا ہوں دیکھئے قرآن میں ہے قَالَ ابْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ تو اگر حضرت ہارون علیہ السلام کے ڈاڑھی نہ تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیسے اس کو پکڑ لیا اور اُن کو لَا تَاْخُذْ کہنے کی کیوں ضرورت پڑی اس

جواب کو سن کر معترض صاحب بھی خاموش ہو گئے۔ حالانکہ اس جواب سے صرف ڈاڑھی کا وجود معلوم ہوتا ہے وجوب سے اس میں تعرض نہیں۔ اور جب دوسرے وقت ان مستدل صاحب سے ان کے وجوب کی حقیقت ظاہر کی گئی تو فرماتے ہیں کہ خیر اُس وقت تو معترض کو خاموش کر دیا۔ صاحبو! اہل علم کو تو اس قسم کے جوابوں سے عار آنی چاہیئے اور یہ خرابی اسی کی ہے کہ اگرچہ نیت خراب نہیں لیکن چونکہ مجیب نے دیکھا کہ ہمارے زمانہ کے لوگ بغیر آیت قرآن شریف پیش کئے مانتے نہیں اس لئے سائل کے تابع ہو کر ہر جواب کو قرآن شریف سے ثابت کرنے لگے۔ حالانکہ اس کا کھلا نتیجہ تحریف ہے پس آج ہی سے کیوں تحقیقی جواب نہ دیا جائے۔ اور سائل کی تبعیت چھوڑ دی جائے۔ مثلاً ڈاڑھی رکھانے کے متعلق میں تحقیقی جواب عرض کرتا ہوں لیکن اول یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ جواب بالکل پھیکا اور سیدھا سادہ ہوگا کیونکہ تحقیقی بات ہمیشہ بے مزہ ہوتی ہے دیکھئے غالب اور مومن خاں کے اشعار میں کیا کچھ لطف آتا ہے اور حکیم محمود خاں کے نسخہ پر کسی کو وجد نہیں ہوتا۔ غرض وہ تحقیقی جواب یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے کے وجوب کا ثبوت قرآن شریف سے دینا ہمارے ذمہ نہیں ہے اور درحقیقت یہ سوال کہ قرآن شریف سے ثابت کرو متضمن ایک دعویٰ کو ہے کہ احکام شرعیہ کا ثابت ہونا قرآن شریف ہی میں منحصر ہے۔ تو اول سائل سے اس دعویٰ کی دلیل دریافت کی جائیگی جب وہ دعویٰ پر دلیل قائم کر دے گا۔ اس وقت ہمارے ذمہ جواب ہوگا اور جب وہ جواب نہ دے سکے گا تو ہم ثابت کریں گے کہ اصول شریعت کے چار ہیں۔ قرآن شریف حدیث۔ اجماع۔ قیاس۔

پس جب کسی حکم کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حکم شریعت سے ثابت ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ حکم ان چاروں میں سے کسی ایک سے ثابت ہے، ہاں اگر کسی ایک سے بھی ثابت نہ کر سکے تو حکم شرعی کہنا غلط ہوگا۔ اس کی تائید کے لئے میں ایک قانونی نظیر بیان کرتا ہوں۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے عدالت میں جا کر کسی دوسرے شخص پر دعوے کیا عدالت نے

اس سے دعویٰ کے گواہ طلب کئے اور اس نے قانون کے موافق گواہ پیش کر دیئے جن پر کسی قسم کی جرح نہیں ہو سکی کیا اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق ہے کہ وہ یوں کہہ سکے کہ میں ان گواہوں کی گواہی تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ اگر جج صاحب خود اگر گواہی دیں تو میں تسلیم کروں گا۔ اور اگر کوئی مدعا علیہ ایسا کہے تو عدالت اس کو کیا جواب دے گی یہی کہ ان گواہوں میں جرح کر دیا دعویٰ تسلیم کرو۔ وجہ اس جواب کی یہ ہے کہ اثباتِ دعویٰ کیلئے مطلق حجت کی ضرورت ہے۔ حجت خاص کی ضرورت نہیں ہے پس کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ میں فلاں حکم قرآن شریف ہی سے مانوں گا۔ حدیث شریف یا اجماع وغیرہ سے تسلیم نہ کروں گا البتہ اگر کسی حدیث یا اجماع میں جرح کرے تو اس کا حق ہے اور علماء اس جرح کا جواب دینے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے تحقیقی جواب۔ لیکن ہمارے بھائیوں نے اس طرز کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور بالکل معترضین کے تابع ہو گئے ہیں، لیکن کہاں تک ان کے تلووں کے نیچے ہاتھ دیں گے کبھی تو عاجز ہونا پڑے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ؏: بروئے خود در طماع باز نتواں کرد۔

ایسے ہوسناک لوگوں کا اول ہی علاج کرنا چاہیئے۔ خوب سمجھ لو کہ قرآن ہی سے ہر بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا سخت مشکل میں پڑنا ہے حدیث فقہ سب قرآن شریف ہی کے حکم میں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ حکیم علوی خاں کے مطب کو لے کر ایک شخص نے جمع کیا اور ہر نسخہ کے متعلق ضروری ہدایات لکھ دیں کہ فلاں نسخہ غلبۂ صفرا کے لئے ہے اور فلاں نسخہ غلبۂ بلغم کے لئے اور دوسرے شخص نے ان سب نسخوں کی تبویب کر دی کہ امراض راس کے نسخے الگ کر دیئے اور امراض چشم کے الگ تو اس مفسر اور مبوّب کو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حکیم علوی خاں کا مطب نہیں ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ۔ اور یہ کہا جائے گا کہ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش من اندازِ قدت را مے شناسم

ہاں اس پہچان کے لئے طلب شرط ہے اگر طلب ہی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ورنہ طالب کو حدیث فقہ سب میں قرآن شریف ہی نظر آئے گا۔ صاحبو! یہ تفریق طلب نہ ہونے کا

نتیجہ ہے طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ ؎

بسکہ در جانِ نگار دچشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

ایسا شخص حدیث و اجماع کو ہرگز الگ نہ سمجھے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح محبوب کبھی غیر محبوب کے لباس میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے اسی طرح کبھی غیر مطلوب بھی مطلوب کے لباس میں آجاتا ہے تو ان میں تمیز کرنی بھی نہایت ضروری ہے چنانچہ آجکل یہ مرض عام ہے کہ غیر محبوب کو محبوب سمجھ کر اس پر عاشق ہوگئے ہیں تو وہ لوگ ہیں جو اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اس حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تو گویا ایک جماعت نے اتباع کو ایسا چھوڑا کہ وہ الحاد تک پہونچ گئے۔ دوسرے فرقے نے اس شدت سے اتباع کیا دعویٰ کیا کہ بدعات میں مبتلا ہوگئے۔ یعنی ان کو اپنی رسوم میں بھی عبادات نظر آنے لگیں اور وہ رسوم اگرچہ جائز بھی ہوں لیکن ان کو عبادت سمجھنا سخت غلطی ہے کیونکہ عبادت وہ ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہو اور ان رسوم میں ثواب کا وعدہ کسی حدیث یا آیت میں نہیں ہے غرض اس وقت یہ دو مرض کہ دلائل کو غیر دلائل سمجھنا جو کہ الحاد ہے اور غیر دلائل کو دلائل سمجھنا جو کہ بدعت ہے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ذی اثر دو فرقے ہیں ایک امراء کا اور ایک عام فقراء کا۔ ان دونوں فرقوں کی حالت نہایت درجہ خراب ہے ان دونوں فرقوں کی بدولت بہت زیادہ الحاد اور بدعت دنیا میں پھیلا امراء میں الحاد زیادہ پایا جاتا ہے اور فقراء میں بدعت زیادہ پائی جاتی ہے اگرچہ ایک تیسرا فرقہ علماء کا بھی ہے، لیکن میں نے ان کو اس لئے اضلال سے خارج کیا ہے کہ جہانتک دیکھا جاتا ہے علماء کا دوسروں پر اثر کم ہے[1]۔ پس ان کی وجہ سے چنداں خرابی نہیں پڑ سکتی اور جن علماء کا کم و بیش اثر ہے تو وہ ان کی بزرگی اور درویشی خیال کی وجہ سے ہے صرف عالم ہونے

[1] اور اس سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ علماء جو کبھی چندہ وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں ان کے ترغیب دینے میں اُس قدر خرابیاں نہ ہوں گی جتنی اہل دنیا کے طلب چندہ میں خرابیاں واقع ہوتی ہیں۔ کیونکہ اہل دنیا کا ایک دوسرے پر اثر ہوتا ہے اور وہ دباؤ سے کام لے سکتے ہیں اور کام لیتے ہیں۔ بخلاف علماء کے کہ وہ دباؤ ڈال ہی نہیں سکتے۔ ۱۲ منہ

کی وجہ سے کسی عالم کا کچھ اثر نہیں بلکہ جو صرف عالم سمجھے جاتے ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ اگر عوام اہلِ دنیا ان کی توہین نہ کریں تو غنیمت ہے یا اگر کسی عالم کے باوجود بزرگ نہ سمجھے جانے کے عزت اور اثر ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے اعتبار سے ذی جاہ ہوتا ہے اور علی العموم اہلِ جاہ کی طرف لوگ اپنے کو منسوب کرتے ہیں کیوں کہ کسی بڑے کی عظمت کرنا خود اپنی عظمت ہوتی ہے اس لئے کہ ان کے ساتھ منتسب ہونے سے اپنی بڑائی ہوتی ہے غرض صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا کچھ اثر نہیں یا فقیری کی وجہ سے ہے یا جاہ کی وجہ سے اور بلفظ دیگر امیری کی وجہ سے ورنہ اگر صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا اثر ہوتا تو طلبہ کا بھی بہت اثر ہونا چاہئے تھا کہ وہ بھی تو عالم ہیں اور میں دوسروں کو کیا کہوں خود اپنے اندر بھی یہی حالت دیکھتا ہوں کہ طلبہ کی زیادہ وقعت نظر میں نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ علمار کی من حیث العلم کچھ وقعت نہیں ہے۔ ایک رئیس صاحب کے ہاں ایک طالب علم کا کھانا مقرر تھا۔ چونکہ اکثر اس کو وہاں انتظار کرنا پڑتا تھا اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اتنا وقت بیکار جاتا ہے اس میں اگر کچھ دین ہی کی خدمت ہو تو اچھا ہے۔ رئیس سے کہنے لگا کہ میں یہاں دیر تک بیٹھا رہتا ہوں اگر آپ کا لڑکا کچھ پڑھ ہی لیا کرے تو اچھا ہے۔ رئیس صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے عربی پڑھی تو یہ نتیجہ ہوا کہ میرے دروازہ پر کھانا لینے کے لئے آتے ہیں میرا لڑکا پڑھے گا تو کسی دوسرے کے دروازے پر جائے گا۔ اس حکایت سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ علمار کے ساتھ لوگوں کا کیا برتاؤ ہے۔ اور علمار کا کتنا اثر ہے۔ اور جب علمار کا کچھ اثر نہیں تو ان کو ذی اثر لوگوں میں کیوں شمار کروں اور اپنی اس حالت کو سنکر علمار کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اب وہ کیا کریں اگر اب بھی انکی سمجھ میں نہ آیا ہو تو سخت افسوس ہے۔ خیر میں بتلاتا ہوں کہ ان کو بالکل استغنار چاہیئے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے ؎

اریٰ الملوک باذنی الدین قد قنعوا	وما اراھم رضوا فی العیش بالدون
فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما	استغنی الملوک بدنیاھم عن الدین

وہ دنیا کو لیکر تم سے مستغنی ہو گئے تم دین لیکر ان کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ۔ میں خدا کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ اگر اہل علم دنیا سے مستغنی ہو جائیں تو خدا تعالیٰ اُن کی غیب سے مدد کریں اور بلکہ خود یہی اہل دنیا جو آج کو ذلیل سمجھتے ہیں اس وقت ان کو معزز سمجھنے لگیں اور ان کے محتاج ہوں گے کیونکہ ہر مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے جس طرح اپنی ضروریات کیلئے کم و بیش دنیا کی ضرورت ہے دین کی اس سے زیادہ ضرورت ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل رئیس ہو یا غریب اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے پاس بقدر ضرورت دنیا موجود ہے اور اہل دنیا کے پاس دین کچھ بھی نہیں تو ان کو ہر ہر امر میں موت میں حیات میں نماز میں روزے میں سب میں علماء کی احتیاج ہو گی اور اگر کوئی کہے کہ مجھے دین کی ضرورت ہی نہیں تو وہ مسلمان ہی نہیں غرض ایک وقت ایسا آئیگا کہ اہل دنیا خود علماء کے پاس آئیں گے۔ پس علماء کو بالکل استغنا چاہیئے اور خدا تعالیٰ کے دین میں مشغول ہونا چاہیئے ہم لوگوں میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کرتے اگر خدا تعالیٰ سے ہم کو تعلق ہو تو کسی کی بھی پرواہ نہ رہے۔ البتہ میں علماء کو بداخلاقی کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ بعض استغنا بداخلاقی کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نوراللہ مرقدہم امراء کی بہت خاطر داری کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ فرماتے تھے کہ نِعْمَ الْاَمِیْرُ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ یعنی جو امیر فقیر کے دروازہ پر جائے وہ بہت اچھا ہے پس جب کوئی امیر آپ کے دروازہ پر آیا تو اس میں امارات کے ساتھ ایک دوسری صفت بھی پیدا ہو گئی یعنی نعم کی پس اس صفت کی عظمت کرنی چاہیئے لہذا بداخلاقی کی اجازت نہیں۔ ہاں استغنا ضروری ہے خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اصل مقصود اس مقام پر یہ تھا کہ علماء کی وقعت اور ان کا کچھ اثر نہیں کیونکہ جس کو دیکھئے علماء پر اعتراض کرنے اور ان کو مشورہ دینے کو آمادہ ہے۔ ایک صاحب ایک مرتبہ علماء پر نہایت برہم اور علماء کو برا بھلا کہہ رہے تھے کچھ دیر تک بوجہ اس کے کہ وہ مہمان تھے میں نے صبر کیا آخر جب وہ حد سے بہت آگے نکل گئے تو میں نے پوچھا کہ علماء نے کیا قصور کیا کونسی ایسی خطا ان سے ہوئی۔ کہنے لگے کہ علماء انگریزی پڑھنے کو منع کرتے ہیں اور قوم کے تنزل کا سبب یہ ہیں حالانکہ انگریزی کی بہت ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ اول تو یہ افتراء محض ہے علماء انگریزی پڑھنے کو منع نہیں کرتے دوسرے قطع نظر انگریزی کے جواز اور عدم جواز کے

آپ یہ بتلایئے کہ علماء کی ممانعت کا کچھ اثر ہے یا نہیں اگر کہیے اثر تو ہے میں کہوں گا کہ کیا وجہ علماء کے اثر نے قوم کے بچوں کو عربی پڑھنے پر کیوں نہ لگا دیا جب علماء ایسا نہیں کر سکے تو معلوم ہوا کہ علماء کا کچھ اثر قوم پر نہیں اور جب اثر نہیں تو علماء سے کچھ نقصان قوم کو نہیں پہنچا۔ اصل سبب قوم کے تنزل کا کوئی دوسرا امر ہے اور وہ یہ ہے کہ قوم علی العموم سست کام چور آرام طلب ہے جفاکشی تو ہو نہیں سکی اپنے چھٹکارے کے لئے مولویوں کے فتوے کو آڑ بنا لیا۔ صاحبو! کیا وجہ کہ تمام فتاوے میں سے علماء کا صرف یہ ہی ایک فتویٰ پسند ہوا کبھی دوسرے فتووں پر کیوں عمل نہ کیا گیا وجہ یہ ہی ہے کہ یہ اپنی مرضی اور نفس کے موافق تھا۔ ایک شخص سے کسی نے پوچھا تھا کہ قرآن شریف کا کونسا حکم تم کو زیادہ پسند ہے کہنے لگا كُلُوا وَاشْرَبُوا اور دعا کو پوچھا تو یہ بتلائی۔ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ کیا کوئی شخص اس کو عامل بالقرآن سمجھے گا ہرگز نہیں بلکہ تابع نفس و ہوا کہیں گے۔ بس یہی حال آجکل علماء کی پیروی اور ان کے اتباع کا ہے کہ جس بات کو اپنی مرضی کے موافق دیکھتے ہیں اس میں علماء کو آڑ بنا لیتے ہیں اس جملہ تقریر سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اثر جو کچھ ہے امراء اور فقراء کا ہے اور جو کچھ خرابیاں پھیلیں انھیں دو فرقوں کی وجہ سے پھیلیں پہلا فرقہ الحاد میں مبتلا ہے دوسرا فرقہ بدعات میں غرق ہے۔ بس اُس ملت کے مریضوں کا کیا مآل ہو گا جس کے اطباء خود مریض ہیں۔ نیز علماء کے اس زمرہ سے خارج ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر خود بگڑیں بھی اور اعمال کو ترک بھی کر دیں تو اپنے کو گنہگار سمجھتے ہیں اور اپنے بُرے اعمال کی طرف کسی کو دعوت نہیں کرتے اور لوگوں کو اپنے اس طرز پر چلانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو نیک ہی رستہ بتلا دیں گے برخلاف امراء اور فقراء کے کہ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس رستہ پر ہم ہیں دوسرے بھی اسی پر ہو لیں اگرچہ ہم اور وہ دونوں جہنم کے غار میں جا گریں چنانچہ چند روز ہوئے کہ ایک روشن خیال نے یہ مضمون شائع کیا تھا کہ اسلام کی ترقی کو سب سے بڑی مانع نماز ہے اگر علماء مل کر نماز کو اسلام سے خارج کر دیں تو اسلام کو بہت ترقی ہو ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بعض عالموں نے اپنا طرز عمل ایسا کر دیا کہ اہلِ دنیا کو ان کی بدولت خود علم سے نفرت ہو گئی یعنی بعض علماء نے امراء سے

ملنا اور اختلاط کرنا اس قدر بڑھا دیا اور اس اختلاط کی وجہ سے ان امراء کے ہاں ہیں یہاں ملانے لگے کہ ان کو دیکھ کر اہل دنیا نے یہ سمجھا کہ سب عالم ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ ٹونک کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس نے ڈاڑھی منڈا رکھی تھی ایک عالم نے ان پر اعتراض کیا اور وہ رئیس متاثر ہوا اتفاق سے مجمع میں ایک دوسرے صاحب بھی بیٹھے تھے اور یہ مولوی کہلاتے تھے آپ فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی ہرگز نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ اور وہ زنا کرتی ہیں۔ فرمایئے کہ اس رئیس کی نظر میں کیا وقعت ان عالم کی رہی ہوگی۔ اور زیادہ مناسب ان صفات کا کمی خاندان ہوتا ہے۔ ایک شخص نے ڈھاکہ میں مجھ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ انگریزی خواں طالب علم نہایت باہمت عالی حوصلہ جری جفاکش ہوتے ہیں۔ اور عربی خواں طالب علم نہایت پست ہمت تنگ خیال سست کم حوصلہ ہوتے ہیں۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ یہ فرق عربی اور انگریزی کے اثر سے ہے یعنی پست ہمتی وغیرہ عربی کے آثار ہیں اور علو حوصلگی وغیرہ انگریزی کے آثار ہیں۔ میں نے کہا جناب علو حوصلگی وغیرہ جس قدر صفات ہیں یہ علو خاندان پر موقوف ہیں یعنی جو عالی خاندان ہوگا اس میں یہ صفات ہوں گے۔ وہ خواہ عربی پڑھے یا انگریزی اور جو عالی خاندان نہ ہوگا اس میں یہ صفات نہ ہوں گی۔ اگرچہ وہ انگریزی کے اعلیٰ پایہ کی ڈگری حاصل کرلے بلکہ اکثر واقعات اور مشاہدات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پست خاندان آدمی اگر عربی پڑھ لیں تو کم وبیش ان کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اگر انگریزی پڑھیں تو بالکل ہی برباد ہو جائیں۔ عربی انگریزی کے آثار کا پورا مقابلہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ ایک خاندان کے ایک طبیعت کے دو بچے لیے جائیں ایک کو انگریزی شروع کرائی جائے اور دوسرے کو عربی۔ اور دس برس کے بعد دونوں کا موازنہ کیا جائے اور جبکہ خوش قسمتی سے انتخاب ہی ایسا پاکیزہ ہو کہ عربی کے لئے جولاہے تیلی۔ اور انگریزی کے لئے شرفاء۔ تو عربی کہاں تک اپنا اثر کرے اور کس حد تک ان کی پستی کو مٹائے اور شرفاء میں کوئی بچہ عربی کے لئے دیا بھی جاتا ہے تو ایسا کہ جو بالکل ہی کودن ہو تو جب عربی میں سارے کودن ہی کودن منتخب ہونگے پھر ان سے علو حوصلگی کیا ہوگی اور میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمراہ چلیئے تو میں آپ کو دکھلاؤں

کہ علماء ایسے ہوتے ہیں۔ غرض ایسے علماء سے ایک یہ ضرر پہونچ سکتا ہے اور میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس پر بھی کسی کو علم کمال حاصل ہو تو وہ اس دنارت وخست سے ضرور دور ہوگا سو ایسے لوگوں کو جب غور سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ عالم ہی نہیں ہیں کیونکہ علم کمال ہے اور کمال کا خاصہ ہے استغناء دیکھئے۔ بڑھئی راج لوہار جب اپنے فن میں کامل ہو جاتے ہیں تو کیسے مستغنی ہو جاتے ہیں تو کیا علم ان ذلیل کاموں کے برابر بھی اثر نہیں رکھتا ضرور رکھتا ہے اور بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ جس میں استغناء نہیں اس کے کمال ہی میں کمی ہے۔ علامہ تفتازانی کا واقعہ لکھا ہے کہ جب امیر تیمور کے دربار میں آئے تو امیر تیمور بوجہ لنگ ہونے کے پیر پھیلائے بیٹھا تھا آپ نے بھی بیٹھ کر پیر پھیلا دیا۔ امیر تیمور کو ناگوار ہوا اور کہا کہ معذورم دارکہ مرا لنگ است۔ علامہ فرماتے ہیں۔ معذور دارکہ مرا ننگ است۔ صاحبو! یہ ہے علم کا خاصہ۔ جن لوگوں کو آپ عالم کہتے ہیں یہ واعظ ہیں جنھوں نے چند اردو فارسی کے رسالے یاد کر لئے ہیں ان کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ لوگ اپنے کو علماء کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں اور جہل کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ ایک واعظ صاحب نے سورۂ کوثر کا وعظ کہا اور ترجمہ پہلی آیت کا یہ کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے تجھ کو کوثر کے مثل دیا اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کاف تو اعطینا کا مفعول ہے پھر مثل کس لفظ کا ترجمہ ہے۔
اسی طرح ایک واعظ گنگوہ میں آیا اور وعظ کہا جب جنت دوزخ کا تذکرہ آتا تو بجائے جہنم کے جہندم کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظالم نے کہیں لکھا بھی نہیں دیکھا صرف کسی کی زبان سے سن لیا ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ پرلطف یہ واقعہ ہے کہ سہارن پور میں ایک واعظ آیا جمعہ کی نماز کے بعد آپ نے پوچھا کہ ساہبو! (صاحبو!) یہاں اواج (وعظ) بھی ہوا کرے ہے معلوم ہوا کہ نہیں ہوتا۔ آپ نے پکار دیا بھائیو! اواج (وعظ) ہوگی۔ لوگ ٹھہر گئے۔ منبر پر پہنچکر یٰسین شریف کی غلط سلط آیتیں پڑھیں اور غلط سلط ترجمہ کر کے دعا مانگ کر کھڑا ہو گیا کوئی نابینا عالم موجود تھے، انھوں نے اس کو بلا کر پوچھا تمہاری تحصیل کہاں تک ہے تو آپ کیا فرماتے ہیں ہماری تسیل (تحصیل ہے) ہاپوڑ

پھر انھوں نے صاف کر کے پوچھا کہ تم نے پڑھا کیا کیا تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا ہے۔ نور نامہ۔ سائین نامہ۔ دائی حلیمہ کا قصہ۔ معجزہ آل نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تو کیا جانے اندھے۔ یہ نمونہ ہے واعظ صاحب کی لیاقت کا۔ لیکن پھر بھی ان لوگوں سے اتنا ضرر نہیں ہوتا کیونکہ دیکھنے والے اور سننے والے ان کے جہل کے سبب پہلے ہی معتقد نہیں ہوتے۔ البتہ ان لوگوں سے گہرا ضرر پہنچتا ہے جن کی زرق برق تقریریں مہذب الفاظ، شستہ بندشیں مسلسل بیان معلوم ہوتا ہے کہ غزالی وقت خطبہ دے رہے ہیں۔ یا رازی زماں بول رہے ہیں مگر علم دیکھئے تو ہدایۃ النحو بھی شاید نہ پڑھی ہو۔ یہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو تباہ کیا خود ڈوبے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبے۔ غرض حقیقی علماء پر کسی قسم کا الزام اس بارے میں نہیں آسکتا۔ ایک شبہ شاید کسی کو پیدا ہو کہ علماء میں چونکہ آپس میں اختلاف ہے اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہی میں مبتلا ہوئے میں کہوں گا اگر اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے تو اس میں بھی انہیں کا قصور ہے اس لئے کہ اختلاف صرف طبقۂ علماء میں منحصر نہیں۔ دنیا میں شاید کوئی جماعت کوئی طبقہ ایسا ہو جس کے افراد متفق اللسان ہوں مثلاً فن طب، ڈاکٹری، صناعی، تجارت۔ غرض جس قدر بھی دنیا میں فنون ہیں سب میں اختلاف ہے پس اگر کسی طبقے کا اختلاف عوام کے لئے ضرر رساں ہو سکتا ہے تو اطباء اور ڈاکٹروں کا اختلاف کیوں ان کے لئے مہلک نہیں ہوا وہاں کونسی تدبیر انھوں نے کی جس کی بدولت حکیم عبدالمجید اور حکیم عبدالعزیز کے اختلافات کے ضرر سے محفوظ رہے۔ تدبیر یہ کی کہ دونوں کو کسی معیار پر جانچ کر جس کو زیادہ کامل سمجھا اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔ صاحبو! کیا مستعار زندگی اور چند روزہ آرام کے لئے تو اس تدبیر کی ضرورت ہے اور حیات دائمی کے لئے اس تدبیر کی ضرورت نہیں۔ اگر نہیں معلوم ہوتی تو حیف ہے اس اسلام پر۔ اور اگر ضرورت ہے تو کیوں اس تدبیر پر عمل نہیں کیا جاتا اور اختلاف کے ضرر سے کیوں نہیں بچا جاتا اور جس طرح انتخاب اطباء کے لئے مثلاً یہ معیار ہوگا کہ اس نے کسی بڑی جگہ پڑھا ہو سند حاصل کی ہو، اس کے ہاتھ سے اکثر مریض اچھے ہوتے ہوں۔ اس میں

حرص و طمع نہ ہو بندۂ دنیا، نہ ہو مریضوں پر شفقت ہو تشخیص مرض میں پوری مہارت ہو۔ اسی طرح علماء میں بھی انتخاب اسی معیار سے ہوگا کہ جس کے ہاتھ سے اکثر لوگوں کو ہدایت ہوتی ہو طالبین پر شفقت کرتا ہو خود دنیا سے نفور ہو۔ گناہوں سے بچتا ہو کسی بزرگ کی صحبت میں رہا ہو اس پر خشیت الٰہی غالب ہو۔ پس اس کے کہنے پر عمل کرو کیونکہ یہ تم کو جو کچھ بتلائے گا اس میں خدا کا خوف کرے گا اور گڑبڑ کچھ کا کچھ نہ بتلائے گا۔ لیکن دوسروں کو بھی بُرا نہ کہو۔ بہرحال یہ خدشہ بھی جاتا رہا کہ علماء کے اختلاف سے لوگ گمراہ ہوئے۔ اب صرف دو فرقے ایسے رہ گئے کہ جن کی وجہ سے زیادہ تر گمراہی پھیلی ایک امراء اور دوسرے فقراء کہ ان میں اکثر گمراہ کن اور گمراہ ہیں (الا ماشاء اللہ) بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کو ابراہیم بن ادہمؒ کہنا چاہیئے اور جنید بغدادیؒ حضرت جنیدؒ کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص آپ کا امتحان کرنے آیا اور دس برس تک آپ کے پاس رہا مگر معتقد نہ ہوا۔ ایک روز کہنے لگا کہ میں نے آپ کی بزرگی کی شہرت سُنی تھی لیکن میں دس برس سے آپ کے پاس ہوں۔ اس مدت میں میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی آپ نے فرمایا کہ تو نے اس مدت میں جُنید کو کسی گناہ صغیرہ یا کبیرہ میں بتلا دیکھا۔ اس نے جواب دیا کہ گناہ تو کوئی نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جنید کی یہ کچھ چھوٹی کرامت ہے کہ دس برس تک اُس سے خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو؟ علیٰ ہذا ایک دوسرا واقعہ ان کا مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں چند مدعیان تصوف کا یہ قول آپ کے پاس پہنچا کہ وہ کہتے ہیں نَحْنُ وَصَلْنَا وَلَا حَاجَةَ لَنَا اِلَى الصِّيَامِ وَالصَّلٰوةِ۔ آپ نے سن کر فرمایا صَدَقُوْا فِي الْوُصُوْلِ وَلٰكِنْ اِلٰى سَقَرَ اور پھر فرمایا کہ اگر میں ہزار برس زندہ رہوں تو نفل عبادت بھی بدوں عذر شرعی ترک نہ کروں۔ تو فقراء میں بعضے ایسے بھی ہیں کہ وہ جُنید بغدادی کے مثل ہیں۔ اور امراء میں بھی بعض حضرات ابراہیم بن ادہمؒ کی طرح ہیں لیکن کثرت سے ایسے ہی ہیں جن میں الحاد اور بدعت کا زور ہے ایک جماعت کو تو مثالوں میں میں بیان کر چکا ہوں۔ دوسری اہل بدعت کی وہ جماعت ہے

جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا کیونکہ وہابی وہ لوگ جو کہ ابن عبدالوہاب کی اولاد میں ہیں یا اس کے متبع ہیں۔ ابن عبدالوہاب کے حالات مدوّن ہیں ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں نہ نسب کے رو سے۔

البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے ان کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے کیوں کہ ان کے اکثر خیالات ابن عبدالوہاب سے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہیئے کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصول چار ہیں۔ کتاب[1] اللہ۔ حدیث[2] الرسول۔ اجماع[3] امت۔ قیاس[4] مجتہد۔ ان چار کے سوا اور کوئی اصل نہیں اور مجتہد اگرچہ متعدد ہیں لیکن اجماع امت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ۔ امام مالک بن انسؒ) کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں سے جس ملک میں جس کا مذہب رائج ہو اس کا اتباع کرنا چاہیئے۔ تو چونکہ ہندوستان میں امام ابو حنیفہؒ کا مذہب رائج ہے اس لئے ہم انھیں کا اتباع کرتے ہیں۔ ہم لوگ وہابی کے لقب سے بُرا نہیں مانتے لیکن اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی بازپرس ضرور ہوگی۔ میں بدعت کی جزئیات بھی بتلاتا لیکن اول تو علماء نے پوری طرح رسائل کے ذریعہ سے بتلا دیا ہے، دوسرے وقت میں گنجائش نہیں۔ البتہ ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن حدیث اجماع قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی نہ ثابت ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جائے وہ بدعت ہے۔ اس پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں مثلاً عُرس کرنا، فاتحہ دلانا، تخصیص اور تعین کو ضروری سمجھ کر ایصال ثواب کرنا وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت ہیں اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اور اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں۔ لیکن یہ فقہ حنفیہؒ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے جس مستحسن امر سے جبکہ وہ مطلوب عندالشرع نہ ہو عوام میں خرابی پھیلے خواص کو چاہیئے کہ اس امر کو ترک کر دیں۔

ہاں اگر وہ امر مطلوب عند الشرع ہو اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہوں تو منکرات کو مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھوڑیں گے مثلاً اگر جنازے کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو متابعت جنازے کو ترک نہ کریں گے کیونکہ متابعت جنازہ کی مطلوب عند الشرع ہے۔ پس ایصال ثواب میں دو امر ہیں ایک تعین وقت دوسرا ایصال ثواب اور ان میں سے تعین وقت مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے اور چونکہ تعین سے عوام میں خرابی پھیلتی ہے اس لئے ہم تعین کو ترک کر دیں گے البتہ اگر ساری امت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعین کی اجازت دیدیں گے لیکن حالت موجودہ میں (جبکہ اکثروں کا یہ خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ قبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے) کیسے اجازت دیدی جائے۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا گیارہویں اٹھارہ تاریخ تک ہو سکتی ہے۔ پھر نہیں ہو سکتی۔ ایک وعظ میں میں نے ان رسوم کا بیان کیا بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے لگے کہ علماء کو ایسے مضامین بیان نہ کرنا چاہئیں کہ تفریق امت ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے ویسا ہم بیان کریں گے۔ اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے تو تفریق کا الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر غرض یہ امور مطلوب عند الشرع نہیں۔ اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہیں۔ اس لئے ان کو ترک کر دینا چاہیئے۔ ایک تو تخصیص اور تعین قابل ترک ہے۔ دوسرے جو ہیئت ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہے وہ قابل ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھانے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو حرج ہی کیا ہے میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپے پر یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتیں۔ اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر نیت یہ ہوتی ہے۔ ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو ان سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے تو صاحبو! قطع نظر فساد اعتقاد کے اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیۃً مٹھائی لیجائیں اور پیش کرنے کے بعد اُس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمے میں گواہی دیدیں۔

اندازہ کیجئے کہ یہ شخص کس قدر کبیدہ ہوگا اور اس سے اسکو کیسی اذیت ہوگی پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے تو اہل اللہ کو تو اس سے زیادہ اذیت ہوگی۔ پھر خصوصاً وفات کے بعد کیونکہ وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ قفس عنصری ٹوٹ جاتا ہے اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے پس جس وقت ان کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کس قدر ناگواری ہوتی ہوگی اس کے ماسوا کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لئے تعلق اور محبت ہو۔ صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے ان سے دنیا کی امید رکھنی بالکل ایسی بات ہے جیسے کسی سنار سے کھرپا بنانے کی امید رکھنی یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنی کہ تم چل کر ہمارے گھر کی گھاس کھودو۔ صاحبو! ہم کو حضرت سید غوث الاعظم رحمۃ اللہ سے جو محبت ہے تو اس لئے کہ انہوں نے ہم کو راہ ہدایت دکھلائی اس کے مکافات میں ہم ان کو کچھ ثواب بخشدیں کہ ان کی روح خوش ہو اور اس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ خوش ہوں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم لوگ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے بلکہ اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور جس دن اصلاح عام ہو جائے گی اس دن ہم یہ بھی نہ کہیں گے مگر جب تک اصلاح نہ ہو اس وقت تک ہم ضرور لایجوز کہتے رہیں گے۔ رہی بدنامی سو بحمد اللہ اشاعت دین میں ہم کو اس کی مطلق پرواہ نہیں۔ ہمارا وہ مذہب ہے ؎

ساقیا برخیز و دردہ جام را — خاک برسر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — مانمی خواہیم ننگ و نام را

(ساقی جام اٹھاؤ اور زمانے کے غم کو دور کرو اگر اس میں بدنامی ہے لیکن ہم ننگ و نام کے خواہشمند ہیں)

غرض مقصود اس بیان سے حق ظاہر کرنا ہے اعتدال کے ساتھ اور اس قاعدہ کلیہ کو اگر آپ یاد رکھیں گے تو بہت سے اعمال آپ کو حد جواز و عدم جواز معلوم ہو جائے گی یہ تو اعتقاد کے متعلق تھا۔ ایک فرقہ مسلمانوں میں ایسا بھی ہے کہ اس کے عقائد و اعمال سب درست ہیں مگر یہ فرقہ اپنے تقدس پر مغرور اور نہایت متکبر ہے اور دوسرے مسلمانوں کو

ذلیل و حقیر سمجھتا ہے۔ صاحبو! خوب سمجھ لو ؎

غافل مرد کہ مرکب مردان مرد را — درسنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش — تاکہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل نہ رہو سب کو ایک جگہ چلنا ہے ان شراب نوشوں کی بھی منزل ہے)

اور۔ ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

اور صاحبو! تکبر کس پر کیجیے جو لوگ گنہگار ہیں ان کو بھی برا اور ذلیل نہیں سمجھ سکتے کسی کا قول ہے

؎ گناہ آئینۂ عفو و رحمت ست اے شیخ — مبیں بہ چشم حقارت گناہگاراں را

(گناہ رحمت و بخشش کا آئینہ ہے اس لئے کسی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھنا چاہئے)

جن کو تم گنہگار سمجھتے ہو ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ اعتقادی گمراہی میں مبتلا ہیں مگر ان کو کچھ بھی گناہ نہیں کیونکہ مَنِ افْتٰی بِغَیْرِ عِلْمٍ فَاِنَّمَا اِثْمُہٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاہُ (بغیر علم کے جس نے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ پوچھنے والے پر ہوگا) تو بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کو کچھ بھی خبر نہیں اس کے ماسوا وہ شخص کس منہ سے دعویٰ کر سکتا ہے جو دوسرے مسلمانوں کو ذلیل سمجھے اور ان پر طعن کرے۔ حدیث کا مضمون ہے جس کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ترجمہ کیا ہے ؎ بنی آدم اعضائے یکدیگر اند ∴ تو گویا تمام مسلمان مثل ایک تن کے ہیں۔ اور جب یہ حالت ہے تو آپ کو مسلمانوں کے جہنم میں جانے سے صدمہ اور رنج ہونا چاہیئے اور ان کے بچانے کی تدابیر میں لگنا چاہیئے۔ ہم کو گنہگار مسلمانوں کے ساتھ وہی دلسوزی ہونی چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تھی۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور زنا کرنے کی اجازت چاہی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سن کر اس کو ڈانٹنا چاہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور نہایت اطمینان سے فرمایا کہ کیا تو اپنی ماں کے ساتھ ایسا کیا جانا پسند کرتا ہے اس نے کہا نہیں۔ فرمایا بہن کے ساتھ کہا نہیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا بس جس سے تم ایسا فعل کرو گے وہ بھی کسی کی ماں کسی کی بہن ہو گی ؎ آنچہ برخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند (جس کو تم خود پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کیلئے بھی مت پسند کرو) بس وہ سمجھ گیا۔ سبحان اللہ حضور صلے اللہ علیہ

وسلم کے پاکیزہ اخلاق اور تربیت کی یہ حالت تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مخالفین اور کفار تک کی خاطر داری فرماتے تھے۔ کفار آپ کو ستاتے اور فرشتۂ جبال آکر عرض کرتا کہ اگر اجازت ہو تو میں ان سب کو پہاڑوں سے ہلاک کردوں آپؐ فرماتے کہ دَعْوٰنِیْ وَقَوْمِیْ تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار تک کی خاطر منظور تھی تو ہم میں آج کونسی بڑائی پیدا ہوگئی ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو ذلیل سمجھیں اور ان سے تکبر سے پیش آئیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا ۔۔۔ دل دشمناں ہم نکردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام ۔۔۔ کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

اور جب تم دوستوں سے لڑتے اور ان کو حقیر سمجھتے ہو تو کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ نیز یہ امور خدا شناسی کے بھی مخالف ہیں۔ حضرت بہلولؒ کی حکایت ہے ؎

چہ خوش گفت بہلولِ فرخندہ خوئے ۔۔۔ چو بگذشت بر عارفِ جنگ جوئے

گر ایں مدعی دوست بشناختے ۔۔۔ بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

صاحبو! کیا بھروسہ ہے کہ شام تک ہماری کیا حالت ہوگی اور چار دن کے بعد ہم کیا ہوں گے؟ اگر قبر میں ایمان ساتھ گیا تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تو جب ہم کو اپنی حالت پر اطمینان نہیں موجودہ حالت کے اعتبار سے بھی کہ اس میں صدہا نقص ہیں اور آئندہ کے اعتبار سے بھی کہ زیادہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہے تو سخت جہل کی بات ہے کہ ہم دوسروں پر ہنسیں اور ان کو ذلت کی نظر سے دیکھیں۔ بڑا پاگل ہے وہ شخص کہ اُس پر بیسیوں فوجداری کے مقدمات قائم ہیں اور وہ دوسرے دیوانی کے مقدمات والوں کو ذلیل سمجھتا اور بُرا بھلا کہتا پھرتا ہے تو اس وجہ سے اس فرقے کو خصوصاً میں کہتا ہوں کہ اگرچہ تمہارے اعتقادات درست ہیں اور بظاہر اعمال بھی خراب نہیں معلوم ہوتے لیکن تم اپنی اندرونی حالت میں غور کرو اور اندرونی حالت کو اچھا نہ سمجھو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مدار صرف عقائد پر ہے اگر عقائد درست کر لئے تو پھر نجات ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ یہ سہی کہ عقائد درست ہونے سے کبھی نہ کبھی نجات ہو جائے گی لیکن محض عقائد پر نجات تام کا مدار سمجھنا غلط ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرنا کافی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے محبت ہو تو نہ سوال جواب ہوگا نہ حساب کتاب ہوگا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کا ظاہر درست ہے مگر دل مثل بھیڑیئے کے نہایت سخت ہے۔ ایک بزرگ ایسے لوگوں کی شان میں کہتے ہیں ؎

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل و اندروں قہرِ خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید و ز دو ونت تنگ میدارد یزید

(کافر کی قبر اوپر سے بڑی ہی بارونق ہے لیکن اندر خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے اوپر سے یزید پر طعنہ زنی کرتے ہو لیکن اندر کا کچھ اور ہی حال ہے)

اس لئے ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ باطن کی بھی فکر کریں جس کا طریق یہ ہے کہ ؎

قال را بگذار مردِ حال شود پیشِ مردے کاملے پامال شود

(قال سے گذر کر حال ہو جاؤ اور ایک مرد کامل)

اصل علاج یہی ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا دے اور تواضع پوری اختیار کرے اور یہی تواضع جڑ ہے اتفاق کی بھی۔ آج کل لوگ اتفاق کی کوشش کرتے ہیں مگر اتفاق کی جو جڑ ہے اس کو بالکل چھوڑ رکھا ہے کیونکہ اتفاق ہمیشہ اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے اس سے کبھی اختلاف کی نوبت آہی نہیں سکتی۔ افسوس آج اس پاکیزہ خصلت کو بالکل چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کے برخلاف خودداری اور تکبّر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لباس میں ہمیشہ ایسی وضع اختیار کی جاتی ہے کہ تمام مجمع بھر میں ہمیں کو ممتاز اور بڑا سمجھا جائے اور غضب یہ ہے کہ اپنی اولاد کو بھی ابتدا ہی سے اس وضع کا عادی بناتے ہیں۔ غرض ہر فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کو فرعون کا ہمسر سمجھتے ہیں پھر فرمایئے اتفاق کیونکر ممکن ہے۔ صاحبو! اگر اتفاق کی واقعی تمنّا ہے تو حضرات صوفیہ کے طرز پر چلنے کی کوشش کرو ان حضرات کے قدموں پر جا گرو پھر دیکھو کیسا اتفاق ہوتا ہے۔

ایک رئیس سے میری گفتگو ہوئی کہ اگر لڑکے سے کسی نوکر پر زیادتی ہو جائے تو اس کو سزا دینی چاہیئے یا نہیں۔ ان رئیس صاحب کی یہ رائے تھی کہ سزا نہ دینی چاہیئے کیونکہ سزا دینے سے بچہ کی طبیعت پست ہو جاتی ہے اور دماغ میں

علو حوصلگی نہیں رہتی سمجھ میں نہیں آتا کہ علو کے کیا معنی ان لوگوں کے نزدیک ہیں۔ ایسے علو کو غلو کہا جائے تو بہتر ہے اور نہ کہئے تب بھی ہمارا مقصود حاصل ہے کیونکہ یہ وہی علو ہے جس کو فرماتے ہیں لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وہ نہ زمین علو ہی چاہتے ہیں اور نہ فساد دیکھ لیجئے کہ قرآن نے اس علو کو محمود بتلایا ہے یا مذموم بتلایا ہے تو کیونکر یہ علو مطلوب ہو سکتا ہے۔ صاحبو! قرآن شریف کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف آجکل کے مخترع تمدن کی بالکل جڑ کاٹ رہا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اتفاق پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے اعمال درست کرو اور جو لوگ اپنے اعمال درست کر چکے ہیں ان کے پاس آمد و رفت رکھو مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ بزرگوں کی خدمت میں اگر جاؤ تو نیت محض اپنی اصلاح کی کر کے جاؤ۔ بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن نیت ان کی محض وقت پورا کرنا اور دل بہلانا ہوتی ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور ان بزرگ کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اصلاح ہی کی نیت سے جاتے ہیں لیکن عجلت پسند ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ دو ہی دن میں ہماری اصلاح ہو جائے۔ ان ان لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے اَلْحَائِكُ اِذَا صَلّٰی یَوْمَیْنِ انتظر الوحی۔ (جولاہا جب دو دن نماز پڑھ لیتا ہے تو وحی کا انتظار کرنے لگتا ہے) ایسے لوگوں کے جواب میں ہماری حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کیا کم فائدہ ہے کہ تم کو خدا کے نام لینے کی توفیق ہو گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اگر واقعی کچھ بھی حاصل نہ ہو تب بھی طلب نہ چھوڑنی چاہیے

> ۵ یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم
>
> (چاہے ہم کوئی چیز پائیں یا نہ پائیں تلاش رکھنی چاہیے۔ حاصل یہ ہو اکہ امید رکھنی چاہیے)

طالب خدا کی یہ شان ہے کہ اگر سو دفعہ اس کو یہ آواز آئے کہ تو دوزخی ہے تب بھی مایوسی نہ ہو۔

ایک بزرگ کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ تم کو عبادت کرتے کتنے دن ہوگئے نہ پیام ہے نہ سلام پھر اس سے کیا نفع وہ معمول چھوڑ کر سو رہا خواب میں حضرت خضر علیہ السلام آئے اور وجہ پوچھی اس نے کہا کہ نہ لبیک ہے نہ پیک ہے پھر کیسے دل بڑھے۔ جواب ارشاد ہوا کہ ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست — ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(انھوں نے کہا تمہارا اللہ ہماری لبیک ہے۔ تمہارا سوز و درد ہماری پکار ہے)

ایک بزرگ کی حکایت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے لکھی ہے کہ وہ ذکر کرنے بیٹھے تو یہ آواز آئی کہ تم کچھ بھی کرو یہاں کچھ بھی قبول نہیں مگر وہ پھر کام میں لگ گئے ان کے ایک مرید نے کہا کہ جب کچھ نفع ہی مرتب نہیں تو محنت سے کیا فائدہ بزرگ نے جواب دیا۔ بھائی اگر کوئی دوسرا ایسا ہوتا کہ میں خدا کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اعراض ممکن بھی تھا۔ اب تو ایک یہی در ہے قبول ہو یا نہ ہو ؎

تو انی ازاں دل بہ پرداختن — کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

اس جواب پر رحمتِ خداوندی کو جوش آیا اور ارشاد ہوا کہ ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت — کہ جز ما پناہی دگر نیستت

(قبول ہے حالانکہ تمہارے پاس ہنر نہیں ہے اور ہمارے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں ہے)

غرض طالب کو ہر حال میں طلب میں مشغول رہنا چاہیئے اور یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش — تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

تا دمِ آخر دمِ آخر بود — کز عنایت با تو صاحب سر بود

(ہمیشہ اصلاح کرتے رہو کسی وقت بھی فارغ نہ ہو اس لئے کہ یہ سانس آخری سانس ہے)

البتہ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے کہ کامل کی کوئی پہچان بتلائی جائے کیونکہ آج کل بہت سے شیطان بھی لباس انسان میں ہیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست

(آج کل شیطان یعنی انسان کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے پس ہوشیار رہنا چاہیے اور اس کی علامتیں بتا دینا چاہئیں)

(۱) تو پہچان اس کی یہ ہے کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو۔
(۲) کسی کامل شیخ کی تربیت میں رہا ہو۔
(۳) اور اس سے اجازت تربیت حاصل ہو۔
(۴) خود شریعت پر عامل ہو۔
(۵) شریعت کے خلاف پر اصرار نہ کرتا ہو۔
(۶) سنت کا پورا پابند ہو۔
(۷) اپنے متعلقین پر شفقت کرتا ہو
(۸) احتساب میں کمی نہ کرتا ہو۔

جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں وہ کامل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے

یک زمانے صحبتِ با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(بزرگوں کی صحبت میں رہنا سوسال کی عبادت سے بہتر ہے وہ بھی ریاکاری کے)

بحمد اللہ سب طبقات کا بیان بقدر ضرورت ہو گیا اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ سبیلِ نجات صرف ایک ہے اور اس پر چلنے کا طریقہ یہ ہے جو مذکور ہوا۔ اگر اس کو پیشِ نظر رکھا جائے گا تو ان شاء اللہ بہت کار آمد ہے اگرچہ لذیذ نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ خدا عمل کی توفیق دے۔ آمین۔

مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

دعواتِ عبدیت

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون ۲۷۷۶۲۰۰ - ۲۷۰۰۹۴

کتب خانہ اشرفیہ
قاسم سینٹر دوکان نمبر ۳۳ اردو بازار کراچی
فون ۲۲۱۳۰۵۸

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

دعوات عبدیت جلد سوم کا

پہلا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ الاعتنا بالدین

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی نمبر ۱

دعوات عبدیت جلد سوم کا

پہلا وعظ ملقب بہ ضرورۃ الاعتناء بالدین

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد	۳ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ	۲ گھنٹہ	بیٹھکر	ضرورۃ اہتمام دین	مولوی سعید احمد تھانوی	۱۰۰۰ تقریباً	عربی طلبہ اور عوام الناس کا زیادہ مجمع تھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (ترجمہ) اے رب ہمارے اور بھیجئے ان میں ایک رسول جو انہیں میں سے ہو۔ پڑھے ان پر آیتیں آپ کی اور سکھاوے ان کو کتاب آپ کی اور حکمت اور پاک کرے ان کو آپ قدرت والے ہیں حکمت والے ہیں۔

یہ ایک آیت ہے جس کے نظائر قرآن میں اور بھی ہیں یعنی دوسرے مقامات پر بھی یہ مضمون قرآن میں آیا ہے۔ اس مقام پر یہ مضمون حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنائے کعبہ کے وقت جو دعائیں ان دونوں صاحبوں نے کی ہیں اُن میں

ایک دعاء یہ بھی ہے کہ جس کا نفع اُن کی اولاد کو پہنچا۔ ان حضرات نے اوّل اپنے لئے دُعاء کی اُس کے بعد اپنی اولاد کے لئے دُعاء کی منجملہ دعا للاولاد کے یہ بھی ہے۔ حاصل اس دعا کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیل علیہما السّلام نے اپنی اولاد کو ایک دینی نفع پہونچایا اس دعا کے طرز سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امرِ اصلی قابلِ التفات نفعِ دینی ہے اور نفع دینوی اُس کے تابع اور اُس کے ساتھ ملحق۔ ہم کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے سبق لینا چاہیئے کہ اُنھوں نے جہاں اپنی اولاد کے لئے نفعِ دنیاوی کی دعا کی کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اُن کی اولاد میں جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اُس کو پھلوں سے رزق پہونچائے۔ وہاں اس دینی نفع کی بھی دعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ الخ تو نفع دنیاوی کے لئے دعا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ضروری ہے اور ظاہر بھی ہے کہ اگر دنیا کا نفع نہ ہو تو دنیا میں بہت کم طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوں۔ پس اپنے رزق کی وسعت کے لئے اپنی صحت کے لئے بھی خدا تعالےٰ سے دعا کرنی چاہیئے اور یہ ہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ایک صحابی کو دیکھا کہ بہت لاغر ہو رہے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم نے کچھ دعا تو نہیں کرلی کہنے لگے کہ ہاں دعا تو کی تھی آپؐ نے فرمایا کیا دعا کی تھی کہنے لگے کہ یہ دُعا کی تھی کہ جو کچھ عذاب ہونا ہو دنیا ہی میں ہو جاوے آپؐ نے اُن کو متنبہ فرمایا۔ تو یہ غلطی کی بات ہے کیونکہ انسان ضعیف ہے اور احتیاج اُس کے خمیر میں ہے۔ ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا کہ میرے لئے دس۱۰ روپے کا انتظام کر دیجئے کیونکہ مجھے سخت ضرورت ہے اس کے بعد اِدھر اُدھر کا تذکرہ کر کے لگے فقیری کا دم بھرنے لگے کہ جنّت کی کیا پرواہ ہے اور دوزخ کا کیا ڈر ہے میں نے کہا میاں بیٹھو تم سے دس۱۰ روپے سے تو صبر ہو نہیں سکا جنّت سے کیا صبر کرسکو گے اگر ایسے مستغنی تھے تو دس۱۰ روپے ہی سے صبر کرلیا ہوتا۔ تو واقعی ایسا انسان محتاج ہے کہ دُنیا اور آخرت دونوں کی اس کو ضرورت ہے اور آخرت کا دنیا سے زیادہ محتاج ہے اسی لئے ابراہیم علیہ السّلام نے جیسے دنیا کے لئے دُعا کی ایسے ہی آخرت کے لئے بھی دُعا کی تو گویا ہم کو

سبق سکھلاتے ہیں اور اولاد عام ہے خواہ اولاد حقیقی ہو یا مذہبی بلکہ اولاد حقیقی بھی جب اولاد ہوتی ہے کہ اتباع کرے چنانچہ ارشاد ہے مَنْ سَلَكَ طَرِيْقِيْ فَهُوَ اٰلِيْ جو میرے طریقے پر چلا وہ میری اولاد ہے گو بعض لوگوں نے مَنْ سَلَكَ طَرِيْقِيْ کو عام لیا ہے کہ جو شخص بھی متبع ہو وہ آل میں داخل ہے خواہ نسبتاً آل ہو یا نہ ہو مگر میرے خیال میں اتنا عام نہیں بلکہ صرف آل کو عام ہے پس مطلب یہ ہے کہ اولاد نسبتی میں معتد بہ آل وہ ہے کہ اتباع کرے یعنی شرف تو صرف اولاد ہونے سے بھی ہوگا لیکن پورا شرف اسی وقت ہوگا کہ جب اتباع ہو۔ تو مَنْ سَلَكَ آل ہی کے لئے ہے مگر آل ہی میں ایک قید معتبر ہے کہ معتد بہ درجہ میں شرف اسی وقت ہوگا بہرحال انبیاءؑ کی اولاد بھی وہی مقبول ہے کہ جو متابعت رکھتی ہو۔ ورنہ ایسا ہے جیسے غلط لکھا ہوا قرآن کہ اس کا نہ ادب ہے نہ بے ادبی۔ ادب تو اس لئے نہیں کہ وہ صحیح قرآن نہیں ہے اور بے ادبی اس لئے نہیں کی جائے گی کہ کچھ تو قرآن کے اجزا ہیں تو انبیاءؑ کی زیادہ نظر اس پر ہے کہ دین کا نفع ہو اور آل ہو تو ایسی ہو کہ وہ اُن کے قدم بقدم ہو۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریۃ کے لئے یہ دعا کی اور اس سے گویا ہم کو یہ سبق سکھلایا کہ اپنی اولاد کے لئے دنیا سے زیادہ اہتمام دین کا کرنا چاہیے۔ اَب ہم کو سبق لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہم کہاں تک اپنی اولاد کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر چلتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ اپنی اولاد کے حقوق ادا نہیں کرتے لیکن یہ ضرور ہے کہ زیادہ توجہ محض دنیا پر ہے اس کی زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ اولاد چار پیسے کمانے کے قابل ہو جاوے اور جب اس قابل بنا دیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے حقوق واجبہ ادا کر چکے آگے اپنی اصلاح یہ خود کر لیں گے اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے دین کی وقعت بالکل نکل گئی ہے اس لئے ہمہ تن دُنیا پر جُھک پڑے ہیں۔ اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی ضرورتوں کی خبر نہ تھی اس لئے ان کو دنیا کی طرف توجہ نہیں ہوئی تو عقل اور نقل دونوں اس شبہ کی تکذیب کر رہی ہیں۔ نقل تو یہی سابق دُعاء جو اپنی اولاد کے لئے انہوں نے فرمائی وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ۔ اور عقل اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حق سبحانہ وتعالیٰ کے نائب ہیں اور جیسے حق سبحانہ وتعالیٰ معاش اور معاد دونوں کی تربیت

فرماتے ہیں حق سبحانہ، وتعالیٰ کے نائب بھی دونوں کی تربیت فرماتے ہیں کیوں کہ ان حضرات کو اصلاح کیلئے بھیجا جاتا ہے اور اصلاح اُسوقت تک ممکن نہیں جب تک کہ معاش اور معاد دونوں کی اصلاح نہ کی جاوے نیز تاریخ اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاءؑ کو عقل معاش بھی کامل ہوتی ہے مگر لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں عقلِ معاش ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نوکریوں اور صنعتوں کے طریقے بتلادیں لوگ یہ ہی سمجھ کر بزرگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہیں. باوجودیکہ دنیا کی ضرورت یقینی ہے مگر یہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے. صاحبو یہ تسلیم ہے کہ دنیا کی ضرورت ہے لیکن اوّل تو یہ غور کیجئے کہ ضرورت کس کو کہتے ہیں دوسرے معاش کے طریقے بتلانا اور اُس پر ترغیب دینا یہ علماء کا کام نہیں ہے.

دیکھو حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالمجید اپنے فن کے ماہر تھے اور اُن کا کام یہ تھا کہ وہ امراض کی تشخیص کریں اب فرض کرو کہ ایک مریض اُن کے پاس آیا حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر تپ دق تجویز کی اور اس کے لئے نسخہ لکھدیا جب وہ نسخہ لے کر چلا تو رستے میں ایک موچی ملا اور اس مریض کی کیفیت دریافت کی اُس نے کہا کہ حکیم صاحب نے تپ کہنہ تجویز کیا ہے کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے جوتے کے متعلق کچھ کہا اس نے کہا کہ جوتے کے متعلق تو کچھ نہیں کہا کہنے لگا کہ وہ حکیم نہیں ہے اُن کو اتنی ضرورت کی تو اطلاع نہیں یہ نہ دیکھا کہ ایک شخص جوتے لئے بیٹھا ہے اور یہ ننگے پیر ہے آخر اس کو جوتہ پہننا چاہیئے یا نہیں اب میں پوچھتا ہوں کہ اس موچی کی نسبت آپ کیا فتویٰ دیں گے کیا اُس کو عقلاء میں شمار کیا جاوے گا ہرگز نہیں بلکہ پاگل کہا جاوے گا اور کہا جاوے گا کہ اس نے طبابت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور اُس کے فرائض منصبی پر اُس کو اطلاع نہیں. البتہ حکیم پر اُس وقت الزام تھا کہ وہ نسخے کے اندر بلا وجہ یہ کہہ دیتے کہ جوتہ نہ پہننا اور جب کہ وہ اس سے سکوت کرتے ہیں تو اُن پر کوئی الزام نہیں وہ اپنے فرضِ منصبی کو ادا کر چکے. تو علماء پر دنیا کی ترغیب نہ دینے کا الزام اس وقت ہوسکتا تھا کہ جب اُن کا فرضِ منصبی ترغیب دینا ہوتا یا وہ دنیا حاصل کرنے اور اُدھر متوجہ ہونے سے روکتے اور اگر کہیئے کہ علماء تو روکتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یہ روکنا بلا وجہ نہیں اس روکنے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے حکیم عبدالمجید کسی کو دیکھیں کہ اس نے

اس طرح جوتی سلوائی کہ ٹانکے کھال کے اندر سے نکالے گئے ہیں تو وہ اس طرح سے جوتہ سلوانے کو ضرور روکیں گے کہ زخم کی سمیت تمام بدن میں دوڑ جانے کا احتمال ہے آپ لوگ بھی دنیا کی جوتیاں اس طرح سلوا رہے ہیں کہ آپ کا دین برباد ہو رہا ہے لہٰذا اب ان پر فرض ہے کہ وہ آپ کو منع کریں تو یہ منع کرنا بے وجہ نہ ہوا ؂

اگر بینم کہ نا بینا و چاہست　　　اگر خاموش بنشینم گنا ہست

اگر نابینا کے سامنے کنواں دیکھ کر بیٹھ رہوں تو گناہ ہے۔

غرض علماء کی نسبت یہ تجویز کرنا کہ وہ دنیا کی ترغیب دیں غلط ہے اور مبنیٰ اس کا یہ ہے کہ سلف کو اپنی طرح معاش و معاد کا جامع سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ بتلایئے کسی نبیؑ نے کسی رفادمرنے کہیں دنیا کے حاصل کرنے کے طریقے لکھے ہیں ایک جگہ بھی نہیں۔ البتہ اخلاق اعمال معاشرت پر گفتگو کی ہے۔ یہ کسی نے نہیں بتلایا کہ یوں ہل چلتا ہے اور اس طرح بویا جاتا ہے انبیاءؑ اور سلف کا یہ کام نہ تھا۔ ہاں معاش کا وہ حصہ جو مضرِ معاد ہو اُسکو بتلا کر منع فرما دیا ہے اور اُس میں گفتگو کرنا ایسا ہے جیسے طبیب کسی مریض کو گوشت کھانے سے منع کرے تو حکیم کا کام بحالتِ ضرر منع کرنے کا تو ہے لیکن گوشت کے پکانے کا طریقہ بتلانا یہ حکیم کا کام نہیں پس معاش کے متعلق انبیاءؑ کی جو گفتگو ہے وہ یہ ہے کہ نافع کو مجملاً بتلا دیا اور مُضر کو منع کر دیا غرض انبیاء علیہم السّلام نے اپنی اولاد کے لئے اس کی رعایت کی ہے کہ دینی نفع اُن کو زیادہ پہونچے اور دنیاوی نفع کے واسطے جو رعایت رکھی ہے اُس سے اُن حضرات کا مذاق معلوم ہوتا ہے ابراہیم علیہ السّلام فرماتے ہیں مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اے اللہ میرے اہلِ بلد کو ثمرات دے مگر سب کو نہیں بلکہ اہل ایمان کو تو فرمانبردار اولاد کے لئے دعا کی اس سے اندازہ کیجئے کہ اُن کی نظر میں دین کس قدر عزیز ہے کہ باغی کے لئے دعا بھی گوارا نہیں اگرچہ خدا تعالےٰ نے تخصیص نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا جس نے کفر کیا اُسے تھوڑا نفع پہونچاؤں گا۔ یعنی کچھ دنوں کے لئے دنیا میں کفار کو بھی عیش دوں گا تو اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت کو عام فرمایا مگر حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے بوجہ کفار کے باغی ہونے کے اُن کے لئے دعا نہیں فرمائی اس سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے مذاق کا پتہ چلتا ہے یہی اہل اللہ کا ذوق ہے اور ہونا چاہیئے کہ باغیوں پر کچھ رحم نہ کریں نہ اُن کے لئے دُعا کریں اور خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل فرما کر چونکہ کفار کے لئے دُعا کرنے کا حکم نہیں فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ وہ ذوق مقبول ہے تو یہی مذاق ہونا چاہیئے کہ مطیعین کے لئے دعا کریں اور باغیوں کو خدا کے سپرد کریں خیر یہ جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو دُعا کی ہے اُس کا مضمون قابلِ غور ہے اور اس وقت اس کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔ چونکہ ہم میں اس وقت ایک بہت بڑا مرض ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے وہی اصلی مرض پیدا ہو گیا ہے یعنی قلتِ اہتمام دین اور یہ وہ مرض ہے کہ اسکی بدولت آج ہم مسلمان کہلانے کے قابل نہیں رہے اسکی بدولت اکثر حصّہ دین کا ہم سے نکل گیا دیکھو مالدار وہ شخص کہلاتا ہے جس کے پاس کافی سے بھی کچھ زیادہ مال ہو اور جس کے پاس دو چار پیسہ ہوں وہ مالدار نہیں کہلاتا ورنہ چاہیئے کہ ساری دنیا مالدار کہلانے لگے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ دو قسمیں کہی جاتی ہیں ایک غریب ایک امیر تو جیسے مالدار وہ شخص ہے جس کے پاس وافر روپیہ ہو اسی طرح ایماندار بھی وہی ہے جو عقائد اور اعمال وغیرہ میں پوری طرح شریعت کا متبع ہو اور یہ ایمان کچھ ایمان نہیں جس کو اکثر لوگوں نے مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ سے سمجھ رکھا ہے اگرچہ یہ کلمہ واقع میں صحیح ہے لیکن اس وقت اس کو پیش کر کے جو مقصود ثابت کیا جاتا ہے اُس کے اعتبار سے کَلِمَۃُ حَقٍّ اُرِیْدَ بِہِ الْبَاطِلُ بات تو ٹھیک ہے لیکن اس سے باطل کا قصد کیا جاوے۔ کہا جا سکتا ہے تو پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اعمال کو نا قابل شمار سمجھتے ہیں دوسرے یہ کہ خود ایمان کے کلمہ میں بھی اختصار کیا ہے یعنی اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کہنے کی بھی ضرورت نہیں (نَعُوْذُ بِاللہِ) میں نے خود یہ تقریریں چھپی ہوئی دیکھی ہیں کہ رسالت پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے مجھ سے ایک سفر میں اس کے متعلق ایک صاحب نے دریافت کیا کہ وہ بھی اس مرض میں مُبتلا تھے میں نے کہا آپ یہ بتلائیے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں یٰسین پڑھتا ہوں تو اس یٰسین پڑھنے کے کیا معنی ہیں آیا یہ کہ صرف یہ کلمہ

پڑھتا ہوں یٰسین یٰسین یا یہ کہ ساری سورت پڑھتا ہوں کہنے لگے کہ یٰسین پڑھنے کے معنی تو ساری سورۃ پڑھنے کے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھنے کے معنیٰ سارا کلمہ پڑھنے کے ہیں دلالت کے لئے صرف ایک جز کا اطلاق کافی ہے دوسرے جز پر بوجہ ملازمت خود دلالت ہوجائے گی ان لوگوں کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھنے کے معنی سمجھنے پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا ریاست رامپور سے ایک طالب علم نے میرے پاس خط بھیجا کہ مجھ کو فلاں تردد ہے اس کے لئے کوئی دعا بتلا دیجئے میں نے کہا لاحول پڑھا کرو چند روز کے بعد وہ مجھ سے ملے اور پھر شکایت کی میں نے پوچھا اس سے قبل میں نے کیا بتلایا تھا کہنے لگے کہ لاحول پڑھنے کو بتلایا تھا سو میں پڑھتا ہوں اتفاقاً میں نے یہ سوال کیا کہ کس طرح پڑھا کرتے ہو کہنے لگے یوں کہا کرتا ہوں لاحول لاحول لاحول لاحول وھلم جرا۔ تو جیسے یہ بزرگ لاحول پڑھنے کے یہ معنی سمجھے کہ صرف لفظ لاحول کو پڑھ لیا جائے حالانکہ لاحول اس پورے کلمہ کا لقب ہے۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے صرف یہ ہی جملہ سمجھا حالانکہ لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے وہی مراد ہے جس کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بھی ہو لہٰذا اس سے استدلال نہیں ہوسکتا نیز دوسرے دلائل پر بھی تو نظر ہونی چاہیئے مشکوٰۃ میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث میں ہے شَھَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ تو اس انہماک فی الدنیا کے سبب سے اس قسم کی غلطیاں کر رہے ہیں۔ بس اس کا علاج یہ ہے کہ دین کی طرف توجہ کریں اور علوم دینیہ حاصل کریں اسی خیال کے ایک اور صاحب مجھے ملے کہنے لگے کہ رسالت کے اقرار کی ضرورت نہیں ہے صرف توحید کا اقرار نجات کے لئے کافی ہے میں نے کہا کہ اوّل تو دلائل عقلیہ و نقلیہ جو رسالت کے ضروری ہونے پر قائم ہیں وہ تمہاری مکذب ہیں۔ دوسرے رسالت کا انکار کرنے سے خدا تعالیٰ کی خدائی کا بھی انکار ہوجاتا ہے۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے ماننے کے یہ معنی نہیں کہ ان کو صرف موجود مان لیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان کو کمالِ ذات و صفات میں یکتا سمجھے کیونکہ یہ مسئلہ اجماعیہ ہے کہ اگر ذات کا قائل ہو لیکن صفات کا قائل نہ ہو تو وہ کافر ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص بادشاہ کو بادشاہ تو مانے لیکن اس کے اختیاراتِ شاہی نہ مانے تو کیا ایسے شخص کی نسبت یہ کہا جاوے گا کہ اس نے بادشاہ کو مانا کبھی نہیں تو خدا تعالیٰ کے ماننے اور

توحید کے مقرر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر صفتِ کمال کے ساتھ علیٰ وجہ الکمال اتصاف سمجھے کہنے لگے کہ بیشک یہ تو ضروری ہے میں نے کہا کہ صفاتِ کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے اس کے ساتھ بھی متصف ماننا ضروری ہوگا کہنے لگے کہاں ضروری ہوگا میں نے کہا کہ قرآن شریف میں موجود ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پس اس کا ماننا ضروری ہوا اور جو اس کو نہ مانیگا وہ موحد بھی نہ ہوگا کیونکہ اُس نے خدا تعالیٰ کے صدق کو نہ مانا جسکا ماننا ضروری تھا اور میں نے کہا کہ دس برس کی مہلت جواب کے لئے دیتا ہوں۔ یہ تو عقائد میں اختصار تھا جس کی مثالیں آپنے سُن لیں۔ اسی طرح اعمال میں بھی اختصار کرلیا ہے کہ بعض تو اعمال کی فرضیت ہی کے منکر ہو گئے اور بعض منکر تو نہیں مگر عملاً مثل منکرین کے ہیں تو ان دونوں قسم کے لوگوں کی غلطی قرآن کی آیات سے ثابت ہوتی ہے رہا مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ سو اس کے معنی کے لئے ایک مثال عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح کرے تو نکاح میں محض ایجاب و قبول دو لفظ ہوتے ہیں پس اگر اس ایجاب و قبول کے بعد بیوی اپنے خورد و نوش کے لئے طلب کرے اور شوہر کہے کہ میں نے ان چیزوں کا دینا قبول نہیں کیا تھا تو وہ اس کا کیا جواب دے گی ظاہر ہے کہ یہی جواب دیگی کہ اگرچہ تم نے ہر ہر چیز کو علیحدہ علیحدہ قبول نہیں کیا لیکن میرا قبول کرنا ان سب چیزوں کا قبول کرنا ہے۔ اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں اگر آپ بھی اُس مجلسِ گفتگو میں موجود ہوں تو کیا کہیں گے ؟ کہ یہ ایک قبول ہی سب کا قائم مقام ہے تو جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ لیا تو سارے عقائد اور اعمال کا ذمہ لے لیا تو اس حدیث کا یہ مدلول ہے اب چاہے ایمان کو جزو اعمال کہا جائے یا اُس سے خارج مگر لازم۔ لیکن ایمان میں اختصار سخت غلطی ہے ایمان جب ہی کہلائے گا کہ جب اُس کی شان پائی جائے۔ ہم لوگ مسلم کہلاتے ہیں مگر غور کرنے کے قابل یہ ہے کہ ہماری حالت اسلام سے کس قدر قریب اور اُس کے کتنی مناسب ہے۔ جیسے میں نے مثال دی ہے کہ مالدار اُسی کو کہتے ہیں جس کے پاس ہر قسم کا سامان ضرورت سے زیادہ ہو یہ ہی حالت اسلام کی ہے تو ہم کو اپنی حالت دیکھنی چاہئے کہ کس قدر بے اعتنائی ہوگئی ہے کہ نہ عقائد کی پروا نہ اعمال کی فکر نہ حُسنِ معاشرت کا خیال نہ بد اخلاقی پر رنج۔ یہ حالتِ موجودہ دیکھ کر اس وقت یہ آیت تلاوت کی گئی ہے۔ اور میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کو نقل کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مدت سے تجویز شدہ بھی ہے اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی لیکن اس وقت مذاق کچھ ایسا

بدل گیا ہے کہ اپنی شریعت میں خواہ کسی امر کی کتنی بھی تحسین کی گئی ہو لیکن اُس وقت اُس کو نہیں مانا جاتا جب تک کہ گذشتہ تاریخ میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہ ہو اس لئے میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کر دیا۔ سو دیکھ لیجئے کہ دعائے ابراہیمی میں کن کن اجزائے ایمان کو ضروری کہا گیا ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ ہماری اولاد میں ایک رسول بھیجئے جن کی یہ صفت ہو کہ ان لوگوں کو آپ کے احکام سُنا دیں اور یہ شان ہو کہ ان کو کتاب اور حکمت تعلیم کریں اور ان کا تزکیہ کریں رزائل سے بیشک آپ قادر ہیں اور حکیم ہیں کہ موافق حکمت کے کرتے ہیں اور ایسا کرنا مصلحت ہے۔ تو آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں گے اس آیت کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ رسول کی تین صفتیں اس آیت میں بیان کی گئی ہیں اور ان رسول سے مراد ہمارے حضور انور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں اس لئے کہ داعی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ہیں لہٰذا ضرور ہے کہ یہ رسول ان دونوں حضرات کی اولاد میں ہونا چاہیئے اور ہر چند کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے علاوہ بھی متعدد انبیاءؑ ہوئے مگر وہ بسلسلۂ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ہوئے ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے سلسلے میں صرف ہمارے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی ہیں لہٰذا آپ ہی مراد ہوئے اور دعا کے درمیان میں بعثت رسول کی دعا کرنا ایک بڑی رحمتِ کاملہ کا مانگنا ہے ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یوں کہتے ان کو پاک کیجئے اور ان کو کتاب دیجئے اور ان کو قبول کیجئے لیکن تعلیم بواسطۂ وحی اُس تعلیم سے افضل ہے جو کہ بلا واسطہ وحی کے بذریعہ الہام کے ہو اگر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم بلا واسطہ زیادہ قرب کا ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے اکثر عوام اور بعض خواص کی یہی رائے قائم ہو گئی ہے اور یہاں تک اس کا اثر ہوا ہے کہ انبیاءؑ کی تعلیم کی وہ قدر نہیں کی جاتی جس قدر کسی بزرگ کی تعلیم کی قدر ہوتی ہے۔ میرے اُستاد مولانا فتح محمد صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور اپنی عُسرت اور قرض کو بیان کیا اور کہا کہ کوئی دُعا بتلا دیجئے کہ قرض ادا ہو جائے مولانا نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ اے اللہ مجھے حلال کو

کافی فرمادے اور اپنے فضل سے سوال سے زیادہ عطا فرما۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ یہ حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ حدیث کا نام سُنکر اُس شخص کی یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے سرد پڑگیا اور کہنے لگا کہ حدیث میں تو بہت سی دُعائیں ہیں آپ اپنے پاس سے کوئی چیز بتلائیے جو سینہ بسینہ چلی آتی ہو۔ یہ فاسقانہ کلمہ سُنکر مولانا کو بہت ہی غصہ آیا اور فرمایا کہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر دوسروں کی تعلیم کو ترجیح دیتا ہے تو یہ اُسی خیال کا اثر ہے جس کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر کفایت نہ ہوئی آپ نے دیکھا ہوگا کہ جاہل عابد جس شوق سے وظیفہ یا نفلیں پیر کی بتلائی ہوئی پڑھتے ہیں قرآن شریف اور پانچ وقت کی نماز اُس شوق سے نہیں پڑھتے۔ ایک شخص نے مجھ سے فخراً کہا اگرچہ کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے لیکن پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ کبھی قضا نہیں ہوتا اُس کے معنی یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس قدر تعلق نہیں ہے جس قدر کہ پیر سے ہے اگرچہ یہ ضرور ہے اگر پیر سے تعلق نہ ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کم تعلق ہوگا لیکن یہ تو نہیں ہوسکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سے بھی بڑھ جائے۔ ع　　گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

اگر فرق مراتب نہ کروگے تو زندیقی ہو

غرض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الہام بلاواسطہ ہے اور وحی بواسطہ ہے تو جس میں واسطہ کم ہوگا اُس میں زیادہ قرب ہوگا مگر شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ تعلیم بواسطہ تعلیم بلاواسطہ سے زیادہ افضل ہے وجہ یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ تعلیم بواسطہ میں واسطہ کس کا ہے اگر واسطہ کسی معمولی شخص کا ہو تو بیشک بلاواسطہ تعلیم افضل ہے لیکن جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ ہے تو اتنے بڑے واسطہ کے ذریعے سے جو تعلیم ہوگی وہ افضل ہوگی اور راز اس میں یہ ہے کہ جو علم بلاواسطہ وحی کے ہے اس میں غلطی کا احتمال بوجہ نقصان استعداد کے زیادہ ہے اور بواسطہ وحی تعلیم میں غلطی کا احتمال نہیں ہے رہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم تک پہنچنے کا واسطہ سو اُس میں چونکہ ثقات ہیں اُن میں غلطی کا احتمال نہیں ہے ایک تو یہ تفاوت ہے دوسرے ایک

لطیف تفاوت ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے تو جو تعلیم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے سے ہوگی اُس میں ابتلاء کا احتمال نہیں ہوگا برخلاف بلا واسطہ کے کہ اُس میں احتمال ابتلا کا ہوتا ہے۔ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کو فرما رہے ہیں کہ شراب پی اُس نے علماء سے کہا انہوں نے کہا کہ شراب حرام ہے تجھ کو خواب پورا یاد نہیں رہا میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ شراب سے مُراد محبّت الٰہی ہو تو دیکھئے چونکہ بلا واسطہ یہ تعلیم تھی اُس میں ابتلاء ہوا کہ دیکھئے یہ سمجھتا ہے یا نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے جو علوم ہوتے ہیں اُن میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو شخص خواب میں دیکھے تو اُس میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ یہ شیطان ہوگا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محض ہدایت کی ہے لہٰذا اس میں یہ اختلاط نہیں ہو سکتا بزرگوں نے لکھا ہے کہ شیطان خواب میں آکر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں خدا ہوں لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حکمتِ ابتلا کے لئے صفتِ مضل کے ساتھ بھی متصف ہیں دوسرے اوّل صورت میں متنبہ ہو جانا ممکن ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ منزّہ ہے اور جس کو خواب میں دیکھا منزّہ نہیں اور دوسرے میں ممکن نہ تھا اس لئے آپ کے واسطے کو تمام خطرات سے محفوظ رکھا تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ ایک بڑی نعمت ہے لہٰذا ابراہیم علیہ السّلام نے بجائے کتاب وغیرہ براہ راست مانگنے کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واسطہ قرار دیا نیز اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کی طبیعت اس پر مجبول ہے کہ اپنے بنی نوع کو دیکھ کر اقتدا کرتے ہیں یعنی اُن کو ایک نمونے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ہی فرق ہے اس میں اور جانور میں کہ جانوروں کو ضروریات کی تعلیم کی حاجت نہیں غرض جانوروں میں جو کچھ کمالات ہیں وہ سب طبعی ہیں اکتسابی نہیں ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ بطخ کا بچّہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے اور ایک بڑے سے بڑے تیراک شخص کا بچّہ

تیراک نہ ہوگا کیوں کہ کمالات انسان کے طبعی نہیں بلکہ ان کو ایک نمونہ دیکھنے کی ضرورت ہے اور ضرورتِ نمونہ ہی باعث ہے کہ انسان کو تعلیم کتب سے بھی اس قدر نفع نہیں ہوتا جس قدر کاملین کی صحبت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو اسکی ضرورت ہے۔اکثر لوگ اپنی اولاد کے لئے تمام آسائشوں کی فکر کرتے ہیں مگر اس کی ذرا پروا نہیں کرتے کہ صحبت بھی نیک ہو بلکہ اکثر بد اخلاق معلموں کے سپرد کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگرچہ یہ ناقص ہیں لیکن ابھی بچپن ہے کیا حرج ہے حالانکہ یہ تجربہ ہے کہ اگر مبادی خراب ہوں تو مقاصد بھی خراب ہوتے ہیں یاد رکھو کہ خاک از تودۂ کلاں بردار یہ ضرور ہے کہ اگر کامل سے سیکھے گا تو کامل نہ ہو جلئے گا لیکن ذی استعداد ہو جائے گا کیونکہ کامل آدمی فن کی حقیقت کو ظاہر کر دیتا ہے بخلاف ناقص کے اور یہ تو علمی ضرر ہے جس پر کم و بیش توجہ بھی ہے مگر بڑا ضرر یہ ہے کہ ناقص کی صحبت میں اخلاق بالکل برباد ہوتے ہیں اس پر لوگوں کو ذرا توجہ نہیں۔ ہمارے ہاں ایک معلم ہیں اُن کی نسبت سُنا گیا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو دوسرے معلم کے ہاں بھیجتے ہیں کہ جا کر اُس کے مکتب کی چٹائیاں توڑ ڈالیں بتلائیے جب بچپن ہی سے یہ حالت ہوگی تو بڑے ہو کر اُن کی کیا اصلاح ہوگی مگر اس پر بالکل خیال نہیں بلکہ اکثر کہتے ہیں کہ بچّہ وہی ہے جو کہ شوخ ہو حالانکہ شوخی دوسری چیز ہے اور شرارت دوسری چیز ہے۔ غرض انسان اپنے ابنائے نوع سے سبق لیتا ہے جو حالت دوسرے کی دیکھتا ہے وہی خود اختیار کرتا ہے مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنے گھر کے لوگوں کو علاج کرانے کے لئے ایک طبیب کے پاس لے گیا اُن کو میں نے دیکھا کہ بے حد متحمل تھے باوجودیکہ بیحد نازک مزاج تھے تو میں چونکہ اُن کے پاس جاتا تھا اس لئے میرا غصّہ کم ہو گیا تھا میں نے غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ محض پاس بیٹھنے کا اثر ہے تو بہت اچھا طریقہ تربیت کا صحبت ہے۔ اب لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنی عمر کو پہنچ کر خود ہی سنبھل جائیں گے یہ غلط ہے بلکہ جب بچّہ بولنے پر بھی قادر نہیں ہوتا اُسی وقت سے اُس کے دماغ میں دوسروں کی تمام حرکات منقش ہوتی ہیں اور وہ اُن سے متاثر ہوتا ہے اسی واسطے حکماء نے لکھا ہے کہ بچّہ کے سامنے کوئی حرکت خلافِ تہذیب نہ کرنی چاہیئے۔ راز اس میں یہ ہی ہے کہ

انسان کے دماغ کی مثال پریس کی سی ہے کہ کاپی لکھ کر جب لگاؤ تو چھپ جائے گا اسی طرح جو چیز دماغِ انسان کے رو برو ہوتی ہے وہ اس میں منقش ہو جاتی ہے اگرچہ اُس وقت شعور نہیں ہوتا لیکن اس انتقاش کے لئے شعور کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم پریس میں انگریزی چھاپ لیں اور پھر انگریزی سیکھ لیں تو چند روز کے بعد ضرور پڑھ لیں گے علیٰ ہذا بچّہ اگرچہ اُس وقت نہیں سمجھ سکتا لیکن بڑا ہو کر سمجھے گا چنانچہ ایک عاقل عورت نے یہ کہا ہے کہ پانچ چھ برس کے بعد بچّہ قابل تربیت نہیں رہتا ہے بلکہ ہر حالت پختہ ہو جاتی ہے وہ کہتی تھی اگر پہلے بچّے کو درست کر دے تو اس کے بعد کے سب بچّے اُسی سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ غرض معلوم ہوا ہو گا کہ صحبت کا کیا اثر ہے تو جنابِ باری تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام سے یوں دُعا کرائی کہ ان میں ایک پیغمبر بھیجے اور پھر آپ کو مبعوث فرمایا کہ آپ نمونہ ہوں سو بعض نے آپ کو دیکھا اور بعض نے آپ کی سیرت دیکھ کر آپ کی حالت معلوم کی اور اسی طرح آپ ہمارے بھی پیش نظر ہیں اور اس اعتبار سے اگر فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ عالم لیا جائے تو درست ہوگا۔ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر کو دیکھ کر جس قدر آسانی سے ہم اتباع کر سکتے ہیں قوانین کلیّہ کو دیکھ کر نہیں کر سکتے تھے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں تو ہم سے یہ ہی باز پُرس ہو گی کہ تم اس نمونے کے موافق بن کر کیوں نہیں آئے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ہم کسی درزی سے اچکن سلوائیں اور نمونے کے لئے اپنی اچکن اُس کو دیدیں تو اس اچکن دینے کے معنی یہ ہی ہوتے ہیں کہ جدید اچکن کی کاٹ تراش سلائی وغیرہ سب اس پہلے کے مطابق ہو اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ تراشش وغیرہ میں فرق ہو جائے تو درزی کو مستحقِ عتاب سمجھا جاتا ہے اس عتاب کے جواب میں اگر وہ یہ کہنے لگے کہ زیادہ تر تو موافق نمونے کے ہے اور لِلۡاَکۡثَرِ حُکۡمُ الۡکُلِّ۔ تو ہرگز یہ جواب مسموع نہیں ہوتا تو جو برتاؤ آپ نے اُس درزی سے کیا اُسی کے لئے آپ خدا تعالےٰ کے سامنے تیار ہو جائیے اور سوچ لیجئے کہ جب آپ خدا تعالےٰ کے سامنے

کھڑے ہوں گے اور نمونۂ نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر پورے نہ اتریں گے تو کس سخت عتاب کے سزاوار ہوں گے اسی کو خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔ تم میں اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے لئے نمونہ ہے کہ بالکل اُس نمونے جیسے بن جاؤ۔ نماز ایسی ہو جیسے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تھی روزہ وہی ہو۔ نکاح شادی کا طرز وہی ہو وضع وہی ہو علیٰ ہذا ہر چیز میں وہی طرز ہو جو کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا طرز تھا یہ تو نمونہ ہے لیکن یہ خدا تعالےٰ کی رحمت ہے کہ اُس نے اس نمونے میں وسعت کر دی یہ ایک شبہ کا جواب ہے یعنی آج کل اکثر لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں نے اعتراض تو کر دیا کہ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ جس شخص نے کسی قوم کی شکل وصورت بنائی وہ انھیں میں سے ہے۔ مگر اب یہ بھی تو بتلائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ٹوپی کیسی تھی کرتہ کیسا تھا اور مقصود اس سے علماء کو خاموش کرنا ہوتا ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے کہ جو چاہو پہنو نیز اس کی تائید میں "درعمل کوش و ہر چہ خواہی پوش" بھی پیش کیا کرتے ہیں میں اس شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ وضع وہی ہونا ضروری ہے جو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وضع تھی لیکن اس میں کچھ وسعت ہے شرح اُس کی یہ ہے کہ ہمیشہ سلاطین میں یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ قوانین لباس میں وردی والوں کے لئے مَاذُوْن فِیْہِ کے اَفْرَاد مَنْھِیْ عَنْہُ کے افراد سے کم ہوتے ہیں مثلاً پولیس کی وردی ہے کہ افراد لباس کے بہت ہیں مگر اس قانونِ مجوزہ کی وجہ سے پولیس کو صرف ایک کی اجازت ہے کہ اس قسم کا لباس ہو اور مَنْھِیْ عَنْہُ زیادہ ہے کیونکہ اس کے سوا سب لباسوں کی ممانعت ہے چنانچہ اگر کسی کی وردی میں عمامہ نہ ہو تو وہ معتوب ہوگا کیونکہ وہ بھی وردی کا جزو ہے۔ اب ہمارے بھائی یہ چاہتے ہیں کہ قانونِ خداوندی بھی ایسا ہی تنگ ہو جائے کہ ایک ہی لباس اُس میں رہے یعنی خاص قسم کی ٹوپی اور خاص طرز کی ازار وغیرہ وغیرہ اور جب یہ بات نہیں ہے تو اُن کے نزدیک ہر لباس جائز ہے تو صاحبو! وردی تو متعین ہے لیکن یہاں تعین کی

یہ صورت ہے کہ مَنْھِیْ عَنْہُ کم ہے اور مَاذُوْنٌ فِیْہِ زیادہ ہے یعنی جو لباس ناجائز قرار دیا گیا اُس کو شمار کرا دیا اور اُس کے ماسوا سب جائز رکھا گیا۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کیونکہ اگر یہ حکم ہوتا کہ ایک قبا ہو ایک کرتہ ہو ایک عمامہ ہو تو جس شخص کے پاس اتنا کپڑا نہ ہوتا وہ کیا کرتا آج کل بعض اسکولوں میں خاص وضع کی پابندی ہوگئی ہے لیکن یہ سخت مصیبت ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم تو بہت امیر ہیں تو میں کہوں گا کہ کیا قوم کو ان ہی افراد میں حصر کیا جائے گا۔ لوگ اس میں بھی سخت غلطی کر رہے ہیں کہ قوم کے افراد امراء کو سمجھتے ہیں حالانکہ غرباء شمار میں زیادہ ہیں تو قوم غرباء کا نام ہوگا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے گیہوں کا ڈھیر کہ اُس میں جَو اور چنے بھی ہوتے ہیں مگر کثرت پر نظر کر کے اُس ڈھیر کو گیہوں کا ڈھیر کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ قومی ہمدرد وہ ہوسکتا ہے جو کہ غرباء کے ساتھ ہمدردی کرے اس زمانہ میں جو لوگ اپنے کو اپنے منہ سے ہمدرد قوم کہتے ہیں وہ صرف اُمراء کے ساتھ ہمدرد ہیں نہ کہ غرباء کے ساتھ حالانکہ جب تک غرباء کے ساتھ ہمدردی نہ ہو اُس وقت تک قومی ہمدردی کا دعویٰ بالکل غلط دعویٰ ہے تو چونکہ یہ لوگ قوم کے معنی نہیں سمجھے اس لئے اپنی اس تجویز میں دقت اور تنگی اُن کو محسوس نہیں ہوئی اور خدا تعالےٰ نے اسی پر نظر کر کے ماذونات کو زیادہ اور منہیات کو کم فرمایا کہ حریر نہ ہو زری نہ ہو ٹخنے ڈھکے نہ ہوں تشبّہ نہ ہو علیٰ ہٰذا اور ان کے ماسوا عام اجازت ہے کہ اَلْبِسْ مَا شِئْتَ تو وردی تو متعیّن ہوئی لیکن رحمت اور وسعت کے ساتھ لہٰذا وہ اعتراض کہ اگر تشبّہ ناجائز ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص لباس بتلانا چاہیئے مُندفع ہوگیا پس معلوم ہوا کہ ہم کو لباس میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مشابہ ہونا ضروری ہے لیکن اس طرح کہ اُن منہیات میں سے ہمارے بدن پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ پس جب ہمارے پاس یہ نمونہ موجود ہے تو خدا تعالےٰ ہم سے باز پرس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالےٰ نے شادی کا ایک نمونہ (یعنی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی) ہم کو دکھلا دیا ہے کہ اُس میں

نہ مہمان آئے تھے نہ لال خط گیا تھا نہ ڈوم گیا تھا نہ نائی نہ واسطہ سے پیغام پہونچا بلکہ پیغام خود دولہا صاحب لے کر گئے تھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بھیجے ہوئے تھے۔ اوّل حضرت فاطمہ زہراؓ سے حضرات شیخین نے پیغام دیا تھا لیکن ان کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر فرمادیا اللہ اکبر۔ صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو کیسے کیسے گہرے امور پر مطلع فرما دیا ہے۔ یعنی حضراتِ شیخین سے انکار فرما کر آپ نے یہ بتلا دیا کہ اپنی اولاد کے لئے شوہر کی ہم عمری کا لحاظ بھی ضرور کرو۔ ایک نوجوان عورت کی شادی ایک بوڑھے مرد سے ہوگئی تھی وہ کہتی تھی کہ جب میرے سامنے آتے ہیں تو مجھ کو بہت شرم آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دادا آگیا اور اکثر عورتیں عمروں میں تفاوت ہونے کی وجہ سے آوارہ ہوجاتی ہیں کیوں کہ ان کا دل نہیں ملتا بتلایئے حضرات شیخین سے زیادہ کون ہوگا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض عمر کے تفاوت کی وجہ سے انکار فرما دیا۔ جب دونوں صاحبوں کو اس شرف سے مایوسی ہوئی تو ان دونوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں سے تو اس خاص وجہ سے انکار فرمادیا ہے تم کم عمر ہو بہتر ہے کہ تم پیغام دو جو لوگ شیخین پر حضرت علی کے ساتھ عداوت رکھنے کا الزام رکھتے ہیں اُن کو اس واقعہ میں غور کرنا چاہیئے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے گئے اور جا کر خاموش بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جس غرض سے تم آئے ہو اور مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح تم سے کردوں۔ منظوری کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ چلے آئے ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو چار اصحاب کو جمع کر کے خطبہ پڑھا اور نکاح پڑھا دیا چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجلسِ نکاح میں موجود نہ تھے اس لئے یہ فرما دیا کہ اگر علی رضی اللہ عنہ منظور کریں حضرت علیؓ کو جب خبر ہوئی تو آپ نے منظور کیا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمِّ ایمن کے ساتھ حضرت فاطمہؓ

کو حضرت علی رضؓ کے گھر روانہ کر دیا نہ ڈولہ تھا نہ برات تھی۔ اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف لائے اور حضرت فاطمہ زہرا رضؓ سے پانی مانگا انہوں نے اٹھ کر پانی دیا آج ہم نے اس سادگی کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ نکاح کے بعد ایک مدت تک دلہن منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے میں کہا کرتا ہوں کہ بجائے منہ پر ہاتھ کے ہاتھ پر منہ رکھنا چاہیئے بہرحال جو کچھ بھی کہا جائے منہ ڈھکا جاتا ہے اور وہ اس قدر پابند بنائی جاتی ہے کہ نماز وغیرہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتی جس طرح بندے کو خدا کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے تھا اس طرح وہ نائن کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کس قدر بے حیائی ہے کہ عورتیں منہ دیکھ کر فیس دیتی ہیں تو آج کل پابندی کی یہ حالت ہے اور حضرت فاطمہؓ نے اگلے ہی دن کام کیا اور پھر حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ پانی لاؤ وہ بھی لائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضؓ پانی لائی تھیں حضرت علی رضؓ بھی موجود تھے اب عورتیں اس فعل کو بالکل ناجائز سمجھتی ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی جہالتیں ہیں چنانچہ عورتوں کا یہ بھی خیال ہے کہ شوہر کا نام لینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور شوہر کا نام لینا گویا بالکل ناجائز ہے مگر عورتوں کو نام لینا تو بے ادبی ہے زبان چلانا اور گستاخی کرنا بے ادبی نہیں ہے شوہر سے لڑنا یا عورتوں کو گالیاں دینا گویا ناجائز نہیں ہے بعض عورتیں تو اس کی یہاں تک پابند ہیں کہ اگر قرآن میں وہ لفظ آجائے تب بھی اس کو نہیں پڑھتیں گویا قرآن میں ان کے شوہر ہی کا نام لکھا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض عورتیں اس کے شہر کا نام بھی نہیں لیتیں اور شوہر کے نام کے ہم وزن الفاظ بھی نہیں کہتیں لیکن معلوم نہیں کہ یہ ساری باتیں ناجائز ہو کر گستاخی کرنا کیسے جائز ہو گیا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کر کے بھی دکھلا دی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غمی کر کے بھی دکھلا دی کہ آپ کے صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا آپ نے نہ جزع فزع کیا نہ کسی کو اجازت دی صرف آنسو نکلے اور یہ فرمایا کہ اَنَا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ ابراہیم تیری جدائی سے ہم بڑے مغموم ہیں۔ اور ایک جگہ

تشریف فرما رہے لوگ آکر تعزیت کرتے رہے پس ہم کو بھی چاہئیے کہ تسلی دیں اور ثواب بخشیں یہ دونوں امر مسنون ہیں اور باقی سب لغو ہیں مثلاً دور دراز کے مہمانوں کا آنا اور دسویں چالیسویں میں شریک ہونا پھر عدت کے ختم کے بعد اُس عورت کو عدت سے نکالنے کے لئے جمع ہونا گونا وہ کسی کوٹھری میں بند تھی کہ یہ سب مل کر اُس کا قفل توڑیں گی۔ ضلع بلند شہر کے ایک رئیس کا انتقال ہوا اُن کے صاحبزادے نے رسم چالیسویں کو توڑنا چاہا لیکن اس کی یہ صورت اختیار نہیں کی کہ کچھ نہ کریں بلکہ یہ کیا۔ حسب رسم تمام برادری کی دعوت کی اور بہت سے عمدہ عمدہ مُرغن کھانے پکوائے بڑے لوگوں پر ایک یہ بھی آفت ہے کہ جب تک وہ گھی کی نہر نہ بہادیں اُس وقت تک اُن کا کرنا کچھ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ غرباء بحمد اللہ اس سے بَری ہیں میں جب ڈھاکہ گیا تو وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب گھی کوئی زیادہ کھانے کی چیز نہیں ہے ورنہ جنت میں گھی کی بھی ایک نہر ہوتی جیسے دودھ شہد کی نہریں جنت میں ہیں۔ غرض جب سب لوگ جمع ہوگئے تو ہاتھ دھلوا کر کھانا چنوا دیا اور سب کو بٹھلا دیا اجازت شروع سے پہلے کہنے لگا کہ صاحبو آپ کو معلوم ہے کہ میرے والدِ ماجد کا انتقال ہوگیا ہے اور والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ جانا جیسے عظیم الشان صدمہ کا باعث ہوتا ہے ظاہر ہے۔ تو صاحبو کیا یہ ہی انصاف ہے کہ ایک تو میرا باپ مرے اور اوپر سے تم لوگ مجھ کو لوٹنے کے لئے جمع ہو تم کو کچھ شرم بھی آتی ہے اسکے بعد کہا کہ کھائیے لیکن سب لوگ اُسی وقت اُٹھ گئے اور یہ رائے ہوئی کہ ان رسوم کے متعلق علیحدہ بیٹھ کر غور کرنا چاہیئے چنانچہ بہت سے آدمی جمع ہوئے اور باتفاق رائے ان کو موقوف کردیا اور وہ کھانا سب فقراء کو تقسیم کردیا گیا۔ ہمارے جوار میں ایک قصبہ کیرانہ ہے وہاں ایک حکیم صاحب فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک گوجر آیا اُسکا باپ بیمار ہو رہا تھا۔ کہنے لگا کہ حکیم صاحب جس طرح ہوسکے ابکی مرتبہ تو اس کو اچھا ہی کردیجئے کیوں کہ قحط بہت ہو رہا ہے اگر بُڈھا مرگیا تو مرنے کا تو چنداں غم نہیں مگر چاول

بہت گراں ہیں برادری کو کس طرح کھلاؤں گا خیر غنیمت ہے۔ آج کل ان رسوم کا مذموم ہونا تو اکثر نوجوان سمجھ گئے ہیں اور منع بھی کرتے ہیں تو گویا زندوں کا غم مُردے کے غم سے زیادہ ہوا ان کی روک ٹوک زیادہ قابل مدح نہیں کیوں کہ ان کی غرض اس روک ٹوک سے یہ ہوتی ہے کہ اگر بیوی کے خرچ سے بچے گا تو ہم کو ہارمونیم اور میز کرسی میں خرچ کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ تو جس روک کا منشاء یہ ہو وہ قابل مدح نہیں ہے لیکن خیر پھر بھی ان کی حالت اس خاص اعتبار سے دوسروں سے غنیمت ہے اس وقت واقعی عقول میں گونہ روشنی آ گئی ہے لیکن یہ روشنی ناکافی ہے کافی اُس وقت ہوگی کہ جب ضَمِّ ضمیمہ بھی ہو یعنی ایک عاقل کی عقل بھی ان کی عقل کے ساتھ اور اُس کی رہبر ہو اور عاقل وہ ہیں کہ جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؎

خلق اطفالند جز مستِ خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوٰی

مستِ خدا کے علاوہ تمام مخلوق بچے ہیں جو ہوٰی اور ہوس سے خالی نہیں وہ بے عقل ہیں

تو عاقل وہی ہے جو رہیدہ از ہوٰی ہو بہرحال کہاں تک تفصیل کروں۔ خلاصہ یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے نمونہ ہیں لہٰذا ہر ہر حالت میں ہم کو غور کرنا چاہیے کہ ہم اُس نمونے کے موافق ہیں یا نہیں۔ سلف صالحین نے تو یہاں تک کیا ہے کہ ایک درزی کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تھی درمیان میں ایک جملہ معترضہ یاد آیا کہ ہماری شان خدا جانے کیا بڑھ گئی ہے کہ ہم غریبوں کے ہاں جاتے ہوئے عار کرتے ہیں بلکہ اُن کو بلاتے ہوئے بھی عار آتی ہے اکثر دیکھا گیا کہ جو لوگ ذرا معزز عہدوں پر ہیں وہ اپنی برادری کے غریب لوگوں کو اپنے پاس بُلاتے ہوئے اور اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے عار کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھئے کہ آپ ایک غریب آدمی کے ہاں تشریف لے لئے۔ اور اگر کوئی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غریب تھے (نعوذ باللہ) تو سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فقر اختیاری تھا اضطراری نہ تھا۔ فقیر وہ ہے کہ جس کا فقر اضطراری ہو ؎

شریف گر متواضع شود خیال مبند که پائگاهِ رفیعش ضعیف خواہد شد

شریف متواضع نہ ہو تو خیال مت کر کہ اس کا بلند مقام کمزور ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے سلطنت چھوڑ دی تھی تو کیا ان کو فقیر کہا جائے گا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی اپنے اختیار سے فقر اختیار کیا تھا اور اختیاری بھی کیسا کہ حضرت جبریل علیہ السّلام نے فرمایا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو خدا تعالیٰ آپ کے لئے جبلِ اُحد کو سونا کردیں کہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ چلا کرے۔ شاید کوئی کہے کہ جبلِ اُحد کیوں کر چلتا تو صاحبو آپ کے نزدیک زمین متحرک ہے یا نہیں تو جب زمین حرکت کرسکتی ہے تو جبلِ اُحد کے حرکت کرنے میں کیا محال لازم آتا ہے اگر کہیئے کہ زمین کششِ آفتاب کی وجہ سے چلتی ہے تو میں کہوں گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسم مبارک میں اگر کشش ہو تو کیا قباحت ہے سائنس کے مسئلے ابھی ختم نہیں ہیں۔ کشش کے لئے جسم کا بڑا ہونا کچھ ضروری نہیں۔ اور کشش تو محض آپ کی خاطر سے تنزل کرکے مان لی ہے ورنہ کشش کیا چیز ہے جو شخص خدا کو مانتا ہے اُس کو کشش وغیرہ کے ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے جبریلؑ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ اور اگر غور کیجیئے گا تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تجویز میں کتنی عظیم الشان حکمت پنہاں ہے۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جانتے تھے کہ میری امت مجھ سے محبت کرے گی اگر میں دنیا لوں گا تو تمام اُمت تحصیل دنیا کو سنّت قرار دے گی اور دنیا کے مفاسد سے بچنے کی قوت ہوگی نہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ اُمّت ہلاک ہو جائے گی اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک کامل آدمی جو کہ سانپ پکڑنے کا منتر جانتا ہو وہ باوجودیکہ اپنے ضرر سے بالکل مطمئن ہے لیکن اس خیال سے کہ مجھے پکڑتے دیکھ کر بچّہ بھی سانپ کے منہ میں اُنگلی نہ دیدے خود بھی سانپ کو نہیں پکڑتا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے تکلیف برداشت کی تو کیا آپ کا فقر اضطراری فقر ہوگا ہرگز نہیں بلکہ فقر اختیاری تھا۔

مجھے حضرت شاہ ابوالمعالی رحمہ اللہ کی حکایت یاد آئی۔ آپ کے ہاں اکثر فقر و فاقہ ہوا کرتا تھا ایک مرتبہ اُن کے پیر اُن کے ہاں آکر مہمان ہوئے اُس روز بھی اتفاق سے فاقہ تھا اور حضرت شاہ ابوالمعالیؒ مکان پر نہ تھے گھر کے لوگوں نے پڑوس سے قرض منگانا چاہا لیکن وہاں سے قرض نہ ملا کئی جگہ آدمی کو بھیجا لیکن سب جگہ سے جواب ملا۔ جب ان کے پیر نے کئی

بار آدمی کو آتے جاتے دیکھا تو دریافت فرمایا معلوم ہوا کہ آج فاقہ ہے۔ آپ نے کچھ نقد اپنے پاس سے دیا اور فرمایا کہ جاکر بازار سے اناج لے آؤ اور جب لاؤ تو مجھے دکھلانا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ نے ایک نقش لکھ کر اُس اناج میں رکھدیا۔ نقش کا رکھنا ایک پردہ تھا ورنہ یہ آپ کا تصرف تھا اور یہ اوپر سے ہوتی چلی آئی ہے خدا تعالےٰ جب کوئی خارق پیدا کرتے ہیں تو اس کو ناسوت کے پردے میں پیدا کرتے ہیں جیسے بارش وغیرہ کا ہونا۔ اسی کے موافق انہوں نے بھی وہ تعویذ لکھ کر اناج میں رکھ دیا اور فرمایا کہ اس میں سے لے کر پکایا کرو چنانچہ مدّت تک پکتا رہا اور ختم نہ ہوا۔ حضرت شاہ ابو المعالی صاحبؒ سفر سے واپس تشریف لائے اور یہ حالت دیکھی تو ایک روز فرمایا کہ مدّت سے فاقہ نہیں ہوا اس کی کیا وجہ ہے۔ صاحبزادی نے یہ سارا واقعہ عرض کیا۔ اب اِس وقت حضرت پر سخت تنگی کا وقت ہے کہ اگر تعویذ سے کام لیں تو مذاق کے خلاف اور نہ کام لیں تو پیر کے تعویذ کی بے ادبی ہوتی ہے۔ واقعی یہ حضرات جامعِ اضداد ہوتے ہیں۔ اس جامع بین الاضداد پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی۔ ہمارے حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ بیٹھے ہوئے تھے اور یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ جس طرح راحت و آرام نعمت ہے اُسی طرح بلا بھی نعمت ہے کہ اُسی وقت ایک شخص آیا اُس کا ہاتھ زخم کی وجہ سے خراب ہورہا تھا اور سخت تکلیف میں مبتلا تھا اور کہا کہ میرے لئے دُعا فرمایئے اُس وقت میرے قلب میں یہ خطرہ گزرا کہ حضرت اس کے لئے کیا دعا کریں گے اگر صحت کی دعا کریں تب تو اپنی تحقیق سے رجوع لازم آتا ہے اور اگر دعا نہ کریں تو اس شخص کے مذاق کی رعایت نہیں ہوتی اور یہ شیخ کامل کے لئے ضروری ہے آپ نے فرمایا کہ سب لوگ دعا کریں کہ اے اللہ اگرچہ ہم کو معلوم ہے کہ یہ تکلیف بھی نعمت ہے لیکن ہم لوگ اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کے متحمل نہیں ہوسکتے اس نعمت کو مبدل بہ نعمتِ صحت فرمادیجئے۔ اسی طرح حضرت شیخ ابو المعالیؒ نے فرمایا کہ نقش حضرت کا تبرک ہے میرا سر اس کا زیادہ مستحق ہے یہ کہکر اُس کو تو اپنے سر میں باندھ لیا اور اناج کے لئے حکم دیا کہ اس کو صدقہ کردیا جائے تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادنیٰ خدام کی یہ حالت تھی تو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کو کون فقیر کہہ سکتا ہے۔ اور جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی اسکے ساتھ یہ بھی تھا کہ ایک مرتبہ حضرت نے سنٔو اونٹ بھی اپنی طرف سے ذبح فرمائے تھے تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریب تھے اور غریب ہونے کی وجہ سے تشریف لے گئے بلکہ آپ سُلطان تھے اعتقاداً بھی اور واقعتہً بھی کیوں کہ صلح جنگ قتال وغیرہ سب آپ کے حکم سے ہوتی تھی اور باوجود اس کے پھر آپ درزی کے گھر تشریف لے گئے اب ہم کو اُن کے گھر جاتے بلکہ اُن کو سلام علیکم کی اجازت دیتے بھی ننگ آتا ہے۔ کسی قصبے میں ایک حجام نے ایک رئیس صاحب کو السّلام علیکم کہدیا تو رئیس صاحب نے اُٹھکر ایک چپت رسید کیا اور کہا تو اس قابل ہو گیا ہے کہ ہم کو السّلام علیکم کہے۔ حضرت سلامت کہا کر۔ جب نماز کا وقت ہوا تو اس نے نماز پڑھی اور ختمِ نماز پر بجائے السّلام علیکم و رحمۃُ اللہ کے پکار کر کہا حضرت سلامت و رحمتہ۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے کہنے لگا کہ آج میں نے السّلام علیکم کہا تھا تو ایک چپت لگا مجھے ڈر ہوا کہ نماز میں فرشتوں کو بھی سلام کیا جاتا ہے اور اُن میں حضرت عزرائیل بھی ہیں اگر کبھی وہ خفا ہو گئے تو میرا دم ہی نکال دیں گے۔ تو جب ہمارے رؤسا کو سلام سے عار آتی ہے تو کھانا پینا تو بہت بڑی بات ہے۔ لکھنؤ کا واقعہ ہے کہ وہاں کے ایک عالم ایک سقّے کے گھر تشریف لے جاتے تھے کہ ایک رئیس ملے پوچھا کہ مولانا کہاں جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اس سقّے نے دعوت کی ہے رئیس نے کہا لَاحَوْلَ وَلَا قوۃ۔ آپ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی سقّے کے گھر دعوت کھانے جاتے ہیں مولوی صاحب نے کہا ہاں صاحب ٹھیک ہے اور سقّے سے کہا کہ اگر تو ان کو لے چلے تو میں بھی چلتا ہوں ورنہ میں بھی نہیں جاتا وہ رئیس کے سر ہوا اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر لے چلا مولوی صاحب نے اس تدبیر سے یہ بات دکھلا دی کہ ان غرباء کا اصرار کس طرح کا ہوتا ہے اور ان کو کس درجہ خلوص ہوتا ہے حقیقت میں امراء کو خبر نہیں ورنہ اگر اُن کو بھی معلوم ہو جائے کہ غرباء کو اہل اللہ وعلماء سے کتنی محبت ہے تو ان کو مجبور و معذور سمجھیں جیسے خود تھوڑے سے اصرار سے یہ رئیس مجبور ہو گئے۔ محبت وہ چیز ہے کہ ؎

عشق را نازم کہ یوسف را بباز ار آورد   ہمچو صنعا زاہدی را او بزنار آورد

میرے عشق کو ناز ہے کہ یوسف علیہ السلام کو سرے بازار لے آیا۔ صنعا جیسے زاہد کو زنار پہنا دیا۔

تو اگر کسی بڑے شخص کو غریب کے گھر پہونچا دے تو کیا تعجب ہے اس کے عجیب غریب تصرفات ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ امراء کو ان کی اطلاع نہیں کیونکہ لوگوں کو اُن سے محبت ہی نہیں ہے اُن کی اگر تعظیم بھی کرتے ہیں تو ایسی جیسے کہ بھیڑیئے کی تعظیم کرتے ہیں یا اگر کھڑے ہوتے تو جیسے سانپ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ متکبّرین سمجھتے ہیں کہ ہماری تعظیم کی۔ حالانکہ یہ تعظیم نہیں ہے بلکہ خوف ہے۔ تو چونکہ اُن سے کسی کو محبّت نہیں ہوتی اس واسطے اُنکو محبّت کا اندازہ نہیں ہوتا اور اگر کسی کے ساتھ محبّت ہو تو اُس کے ساتھ اُن کا وہی برتاؤ ہوتا ہے جو کہ علماء کا عوام سے۔ غرض وہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ دو سَو تین سَو سقّے کھڑے ہیں اور اُن کو دیکھتے ہی سب کے سب تعظیم کے لئے بڑھے رئیس صاحب نے یہ عظمت و محبت کبھی عمر بھر میں بھی نہ دیکھی تھی آخر کھانا آیا تو مولوی صاحب نے سقّوں کو اشارہ کیا انہوں نے نہایت اصرار و خوشامد سے کھلانا شروع کیا آخر اس رئیس نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ مولانا واقعی میں نے آج دیکھا اور آج مجھ کو معلوم ہوا کہ عزّت رئیسوں میں جانے سے نہیں بلکہ غریبوں کے گھر جانے میں ہے۔ تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی غرباء کی دعوت منظور فرما لیتے تھے چنانچہ ایک درزی کے ہاں چلے گئے اور حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ ساتھ تھے آخر وہ درزی کپڑا سینے بیٹھ گئے آج کل اس کو بے تہذیبی سمجھتے ہیں کہ مہمان کے سر پر مُسلّط کیوں نہ ہوا۔ صاحبو! یوں سمجھ میں آتا ہے کہ جن اُمور کا نام آج تہذیب رکھا ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کو کوئی کام نہ ہو یا ہو تو دماغی کام نہ ہو ورنہ اگر کوئی دماغی کام ہو تو یہ آج کل کی تعظیم و تہذیب مثلاً میزبان کا مہمان پر مُسلّط ہو جانا اس قدر گراں گذرتا ہے کہ جس کی حد نہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سر پر کوئی پہاڑ رکھ دیا لیکن اس زمانے میں لوگوں کو یہ حرکتیں گراں نہیں گذرتیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کے متعلق کوئی فکر کا کام نہیں اگر کوئی فکر کا کام ہو تو ممکن نہیں کہ اس سے گرانی نہ ہو اسی طرح اکثر لوگ اپنے نوکروں کو حکم کرتے ہیں کہ تم کھڑے رہو میں کہتا ہوں کہ اس طرح کھڑے رہنے سے اُن اُمراء

کا دل نہیں گھبراتا دوسرے اگر وہ بیٹھ جائیں تو کیا مضائقہ ہے اُن کی شان ریاست میں کیا کمی آئی جاتی ہے اور ان حرکتوں کا اثر یہ ہے کہ ان سے تکبر پیدا ہوتا ہے اور تکبر خدا تعالےٰ اور بندے کے درمیان ایک بڑا حجاب ہے خدا تعالےٰ نے کلام مجید میں ایک جگہ اپنے بندوں کی مدح فرمائی ہے تو سب سے پہلے صفت یہ فرمائی ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا ۔ اللہ کے نیک بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں ۔ اس کے بعد نماز اور اس کے بعد معاملات اُسکے بعد عقائد وغیرہ کو فرمایا ہے اس ترتیب میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سب میں اوّل تواضع کی صفت کو فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ اگر تواضع نہ ہو تو ایمان نہیں ہے ۔ اسی طرح ایک مقام پر خدا تعالےٰ نے کفّار کی مذمت فرمائی ہے تو اُس میں ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۔ ظلم و زیادتی ۔ فرمایا ہے ۔ غرض خدا تعالےٰ کو یہ بات بالکل ناپسند ہے کہ انسان بُت کی طرح بیٹھا رہے اور نوکر اُس کے سامنے کھڑے رہیں ۔ اب چونکہ کھانے میں بھی اس قسم کے تکلفات اور تصنّعات ہوتے ہیں لہٰذا اگر کوئی ایسا کرے جیسا اُس درزی نے کیا تو لوگ اُس کو بے تہذیب بتلاویں تو حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتے دیکھکر اُس روز سے مجھے کدُو سے محبّت ہوگئی ہے آپ نے دیکھا محبّت ایسی چیز ہے ہم کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ہم کو محبّت نہیں ہے ورنہ محبّت وہ چیز ہے کہ محبوب کی ہر ہر ادا محبوب ہوجاتی ہے اس سے اس زمانہ میں عظمت ۔ اسکی مثال سمجھو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں ایک حاکمِ اعلیٰ لنگڑا کر چلتا تھا تو دلدادگان فیشن نے اُس کی تقلید میں لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا تھا ۔ اسی طرح ایک بادشاہ کی ڈاڑھی گاؤدم تھی تو لوگ مدّت تک اُسی قسم کی ڈاڑھی رکھتے تھے بلکہ شاید دعا کرتے ہوں کہ ہماری ڈاڑھی اُسی قسم کی ہوجائے اور ہم لنگڑے ہوجائیں تو دیکھئے عظمت سے اس زمانے میں تشبہ کا مسئلہ ایسا چلا کہ علماء منع کرتے کرتے عاجز آ گئے لیکن لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا حالانکہ اس میں کوئی معذوری بھی نہیں ہے بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ بظاہر اُس میں معذوری بیان کی

جاسکتی ہے جیسے رشوت کا دینا یا بعض اوقات میں لینا اگرچہ واقعیت کے اعتبار سے اس میں بھی کوئی معذوری نہیں ہے لیکن وضع میں تو کوئی مجبوری وہمی بھی نہیں مگر وضع کا چھوڑنا دشوار ہو رہا ہے وجہ اس کی یہی ہے کہ عظمت نے اس کو محبوب بنا دیا ہے۔ تو اہلِ دنیا کی عظمت نے جب یہ رنگ دکھلایا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کیوں یہ رنگ نہ دکھلاتی۔ صاحبو! اس کا کوئی شافی جواب دیجئے کہ اطمینان ہو ورنہ اپنی حالت درست کیجئے کیا جواب ہے اس کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت سے تو ذرا بھی رنگ نہ بدلے اور ایک بے دین کی ایسی عظمت ہو کہ اُس کی تقلید میں حلال و حرام کی بھی تمیز نہ رہے میں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عذاب بھی نہ ہو صرف خدا تعالیٰ اپنے روبرو کھڑا کر کے یہ پوچھ لیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت تمہارے دلوں میں زیادہ تھی یا شاہانِ دُنیا کی تو کیا جواب دو گے۔ اگر کہو کہ یہ اتباع عظمت کی وجہ سے نہیں تو میں کہوں گا کہ بالکل غلط ہے بلکہ محض عظمت ہی کی وجہ سے ہے پس معلوم ہوا کہ لباس میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہیئے اور معاملات میں بھی اور یہ ہی معنی ہیں اس حدیث کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کے ۷۳ فرقے ہوں گے سب دوزخ میں جائیں گے مگر ایک اور وہ مَآ اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں مَا اَنَا عَلَیْہِ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بعینہٖ وہی لباس ہو بلکہ اگر قولی اجازت ہو تو اُس پر عمل کرنے والا بھی عامل بالسُّنت ہے تو یہ حکمت تھی حضرت ابراہیم علیہ السَّلام کے ارشاد میں وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلاً بھیج ان میں رسول یعنے یہ کہ آپ ایک نمونہ ہوں گے حضرت ابراہیم علیہ السَّلام نے اس ضرورت کو محسوس فرما کر دُعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلاً مِّنْھُمْ الخ یہ تو تمہید تھی اب صرف یہ مضمون رہ گیا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حالت تھی اور وہ مہتم بالشان ہے کہ اُس میں یہ بتلایا جائے گا کہ ہم میں اہتمام بشانِ دینی نہیں رہا۔ سو اس کو کسی دوسرے وقت بیان کر دیا جائے گا۔ اب خدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ ہماری اصلاح فرمائیں۔ اور ہمیں توفیقِ عمل عطا فرمائیں۔ آمین۔

تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

دوسرا وعظ مسمّٰی بہ

ضرورۃ العلم بالدین

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

دعواتِ عبدیت جلد سوم کا دوسرا وعظ مسمّٰی بہ

ضرورۃ العلم بالدین

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کتنے تھے	متفرقات
اٹاوہ مدرسہ احیاء العلوم	۵ ذیقعدہ ۱۳۲۹ ہجری	۱۲ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	ضرورت علم دین	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم	تخمیناً ۳۰۰	انگریزی خواں طلباء اور عوام اہل شہر اور عمائد زیادہ تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ۔ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

(ترجمہ) اے رب ہمارے اور بھیجیے اُن میں ایک رسول جو انہیں میں سے ہو پڑھے ان پر آیتیں آپ کی اور سکھا دے ان کو کتاب اور حکمت۔ اور پاک کرے اُن کو آپ قدرت والے ہیں اور حکمت والے ہیں یہ وہی آیت ہے جس کی تلاوت جمعہ کے روز کی گئی تھی اور اس کے متعلق بطور تمہید کے کچھ عرض کیا گیا

تھا۔ اور اس کا خلاصہ یہ عرض کیا گیا تھا کہ اِس حکایت میں یہ بات سُنا دی ہے کہ تمہاری یہ خصلت کہ اعتناء فی الدین میں قلت ہے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن شریف میں جتنی حکایتیں ہیں اُن سے مقصود حُمل اِنشائیہ ہیں اگرچہ عنوان خبر کا ہے یعنی صرف حکایت مِنْ حَیْثُ ھِیَ حکایت مقصود نہیں ہے اس لئے کہ قرآن شریف کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ ایک روحانی مطب ہے جس میں امراضِ باطنی کا علاج بتلایا گیا ہے اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ آج کل لوگوں نے قرآن کے مَاوُضِعَ لَہٗ کو بالکل نہیں سمجھا قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن میں نہیں ہیں۔ کوئی اس میں سائنس ڈھونڈھتا ہے کوئی جغرافیہ تلاش کرتا ہے اور بہت زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو اُس کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔ کیونکہ ڈھونڈھتا وہ شخص ہے جو کہ جانتا نہیں تو اُس پر تو یہی تعجب ہے کہ اُس نے ناواقفی سے غلطی کی مگر جو لوگ ثابت کر رہے ہیں اُن پر زیادہ تعجب ہے کہ جان بوجھ کر غلطی کرتے ہیں میں دیکھتا ہوں کہ جب کوئی فلسفے کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اُس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھوس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نے تیرہ سو برس پہلے اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے اور ان علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔ افسوس اِن علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اِن صاحبوں کو اسلامی علوم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ صاحبو صنعت اور سائنس سے انکار نہیں کیا جاتا مگر گفتگو یہ ہے کہ قرآن کو اس سے کیا تعلق قرآن میں اگر اس کا ذکر ہے تو محض تبعاً قرآن میں صرف ایک مضمون ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس میں خدا تعالےٰ کے ساتھ قرب کے طریقے بتلائے گئے ہیں اِن طریقوں سے جس چیز کو تعلق ہے اُس کا ذکر مقصوداً یا تبعاً آگیا ہے مثلاً اعتقادات اور اعمال مقصود بالذات ہیں کیوں کہ قرب کا طریقہ یہی ہیں اور بعض چیزیں جن کو مِنْ وَجْہٍ دخل ہے وہ تبعاً آگئی ہیں مثلاً قرآن نے توحید کا دعویٰ کیا اس کی دلیل میں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ آسمان اور زمین پیدا کرنے

ہیں۔ فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ ان کائنات میں بھی توحید کے دلائل ہیں تو ان کائنات میں چند حیثیتیں ہیں اوّل ان کا دلیل توحید ہونا۔ دوسرے اُن کے پیدا ہونے کے طریقے اور تیسرے اُن کے تغیرات کے ڈھنگ۔ قرآن کو صرف پہلی حیثیت سے اِن سے تعلق ہے اِس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیوں کر ہوتی ہے اور اِسی قسم کے حالات۔ تو قرآن سے اِس کا تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ خود اِس کی فکر میں پڑنا لغو ہے۔ حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو ترک کردے یہ ایسی کام کی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بتلائی ہے کہ اگر اس پر کاربند ہو جائیں تو ہم بہت سی مشکلات سے نجات پا جائیں۔ اور اِس کا ذرا عنوان بدل دیا جائے تو اُس کی حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اضاعتِ وقت سے منع فرما رہے ہیں۔ اِس وقت لوگ علی العلوم اضاعتِ اوقات کی قباحت اور حفاظتِ اوقات کے اِستحسان پر متفق اللسان ہیں لیکن اُس پر عمل اگر کیا ہے تو شریعت نے کیا ہے۔ دوسرے محض دعوےٰ ہی دعوے کرتے ہیں تو جس چیز میں کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو وہ لایعنی ہے۔ اَب فرمایئے کہ اگر کسی طرح یہ ثابت بھی ہو گیا کہ بادل اس طرح بنتا ہے اور بارش یوں ہوتی ہے تو کیا نفع ہوگا اور اگر نہ معلوم ہوا تو اس پر کونسا کام اٹکا ہوا رہ جائے گا محض ایک تحقیق ہے کہ جس میں نفس کو حظ ہے دوسرے اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ان تحقیقات میں کوئی دنیاوی نفع ہے تو گفتگو اس میں ہے کہ قرآن جس امر کے لئے ہے اُس کے ساتھ بھی اس کو کوئی تعلق ہے یا نہیں موٹی بات ہے کہ قانونِ شاہان میں تجارت اور زراعت سے بحث کی جاتی ہے مگر اس طرح کہ کونسی تجارت جائز ہے اور کون سی ناجائز تاکہ امن قائم رہے یہ کسی قانون میں نہیں ہے کہ تجارت اس طرح کرنی چاہیئے اور نفع کی فلاں فلاں صورتیں ہیں

اگر قانون کی کتاب میں ساری باتوں کا ہونا ضروری ہے تو دکھلائیے کہ قانونِ گورنمنٹ میں یہ سب چیزیں کہاں ہیں بس قرآن بھی ایک قانون ہے امن اور نجات کا اور وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں امن قائم رہے اور آخرت میں نجات ہو غرض قرآن ایک قانون ہے تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ حکامِ ظاہری کے قانون میں تو ان مسائل سائنس کو تلاش نہ کیا جائے اور خدا تعالےٰ کے قانون میں ان تمام باتوں کو تلاش کیا جائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں تو اس تقریر سے ثابت ہوا کہ جغرافیہ وغیرہ مقصود نہیں ہیں البتہ اگر اُن کا ذکر ہوگا تو تبعًا ہوگا کسی ضرورت کی وجہ سے اور بقاعدہ اَلضَّرُوْرِیُّ یَتَقَدَّرُ بِقَدَرِ الضَّرُوْرَۃِ - ان کا ذکر بھی اسی قدر ہوگا جس قدر سے کوئی ضرورۃ متعلق ہے چنانچہ سائنس وغیرہ کے متعلق جو گفتگو ہے محض اِس قدر کہ یہ سب مصنوعات ہیں اور ہر مصنوع کے لئے ایک صانع کی ضرورت ہے لہٰذا اِن کے لئے بھی کسی صانع کی ضرورت ہے سو اِس استدلال کے لئے اِس کی ضرورت نہیں ہے کہ اِن چیزوں کی حقیقت بھی دریافت ہوجائے بلکہ مجملاً اُن کا علم ہونا کافی ہے۔ بلکہ اِن مسائل کو موقوف علیہ کہنا مُضر ہے راز اس میں یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ مقدمات دلیل کے یا نظری ہوتے ہیں یا بدیہی اور نظری کا مرجع مقدماتِ بدیہیہ مسلمہ ہونگے۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو سمجھو کہ قرآن ہُدًی لِّلنَّاس ہے اور ہُدًی للمتقین ہے۔ لیکن ہدًی للمتقین سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض متقیوں کے لئے ہے اور غیر متقی کے لئے نہیں اس آیت سے اکثر لوگوں کو دھوکہ ہوجاتا ہے نیز دوسری آیات میں بھی غلط سمجھ لیتے ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قرآن کو فلسفی نظر سے دیکھا جاتا ہے چنانچہ اس سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے اِس کے متعلق دریافت کیا میں نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں یہ محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ متقی نظر آتے ہیں یہ اسی کی بدولت متقی بنے ہیں اِس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اَب بالکل صاف

ہوگیا۔ تو اس میں کوئی توجیہہ یا تاویل نہیں ہے صرف بات یہ ہے کہ لوگ محاورات سے قطع نظر کر کے فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں اسی واسطے ضروری ہے کہ قرآن کو تمام علوم فلسفیہ سے پہلے کسی محقق عالم سے پڑھ لیں باقی نرے ترجمے کا خود مطالعہ کرنے سے قرآن حل نہیں ہوتا مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک وکیل میرے ہاں مہمان ہوئے اُن کے پاس قانون تھا میں نے اُس کو دیکھا اور اُن کے سامنے اُس کی تقریر کی تو کہنے لگے کہ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اب اس سے اندازہ کر لیجئے کہ جب ہم اپنے ابنائے جنس کے تجویز کردہ قانون کی اُردو عبارت کو مطالعہ سے بدون اِس کے کہ کسی ماہر سے حاصل کریں حل نہیں کر سکتے تو قرآن شریف کو محض اُس کا اُردو ترجمہ دیکھ کر کیسے حل کر لیں گے۔ پس وہ لوگ جو محض ترجمہ کو دیکھ کر قرآن کے مطالب حل کرنا چاہتے ہیں کیسی بڑی غلطی میں مبتلا ہیں اور پھر غضب پر غضب یہ ہے کہ ترجمہ بھی وہ دیکھا جاتا ہے جو بحیثیتِ ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ترجمہ میں یہ ضروری بات ہے کہ قرآن کا مدلول باقی رہے اور آج کل کے ترجموں میں اُن کو بامحاورہ کرنیکے درپے ہو کر اِس کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ قرآن کے ترجمے میں بامحاورہ کے اتّباع کی ضرورت نہیں کیوں کہ قرآن کوئی ادب کی کتاب نہیں ہے۔ اِس کا فیصلہ علماء سے کرانا چاہیئے۔ ترجمہ قرآن کی ایسی مثال ہے جیسے نسخہ لکھنا اگر کوئی غیر فصیح الفاظ میں نسخہ لکھے لیکن ادویہ سب ٹھیک ہوں تو نسخہ کارآمد ہے اور اگر نہایت فصیح بلیغ الفاظ میں لکھے لیکن ادویہ کا نام غلط لکھدے تو نسخہ بیکار ہے تو لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ترجمے میں محض محاورے کا اِتّباع کرتے ہیں گو اصل مدلول محفوظ نہ رہے۔ اِس وقت اِس قسم کے بہت سے ترجمے ہو گئے ہیں تعیین کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ آپ لوگوں کو اتنا ضرور کرنا چاہیئے کہ جب تک علماء سے دریافت نہ کر لو اس وقت تک کسی ترجمے کو بھی نہ دیکھو اور دریافت کرنے کے بعد بھی اپنے دیکھنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ کسی سے پڑھ لو یہ صورت قرآن مجید کے صحیح سمجھنے کی ہے غرض یہ ہے کہ اس وقت یہ غلطی عام ہو رہی ہے کہ قرآن کو

پڑھتے ہیں لیکن سمجھ کر نہیں پڑھتے اسی واسطے اشکالات ہوتے ہیں ورنہ کوئی بھی اشکال نہیں ہے مثلاً هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہی میں یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف متقی کے لئے ہدایت ہے اور کسی کے لئے نہیں حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ تعلیم اس کی عام ہے اور دلائل بھی عام فہم ہیں۔ بیچ میں ایک جملہ معترضہ کہتا ہوں وہ یہ کہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب قرآن مجید کے دلائل عام فہم ہیں تو ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت ہونی چاہیئے چنانچہ آج کل اجتہاد کا ایسا زور ہے کہ لوگ محض ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس ایک مرتبہ ایک مؤذن آیا اور کہنے لگا کہ قرآن شریف سے مسح ارجل بھی ثابت ہے اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ لاکر دکھلایا وہ ترجمہ اگرچہ صحیح اور بامحاورہ ہے لیکن اُس کو بھی خود دیکھ کر سمجھنا مشکل ہے اُس میں لکھا تھا کہ دھوؤ اپنے مُنہ اور ہاتھوں کو اور ملو اپنے سروں کو اس کے بعد ہے وَاَرْجُلَكُمْ اُس کا عطف ہے اَيْدِيَكُمْ پر اور وہ معمول ہے اَغْسِلُوْا کا ترجمے میں یہ لکھا تھا کہ اور پیروں کو۔ آپ کو بوجہ صرف نحو نہ جاننے کے یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ یہ کس کے ساتھ متصل ہے آپ نے اُس کو قریب کے ساتھ متصل کیا اور ظاہر ہے کہ جو شخص صرف ونحو سے واقف نہ ہوگا وہ قریب ہی کے ساتھ متصل کرے گا اور جاننے والا یہ دیکھ لیگا کہ اَرْجُلَكُمْ ہے منصوب لہٰذا مجرور کے ساتھ نہیں ہو سکے گا یہ دوسری بات ہے کہ قراءت بھی دوسری لی جائے اس وقت دوسرے قواعد سے اس عطف کا پتہ چلے گا۔ مجھکو سخت پریشانی ہوئی کہ اِس کو کیوں کر سمجھاؤں اور کیوں کر کہوں کہ اِس کا عطف اَيْدِيَكُمْ پر ہے کیونکہ یہ عطف ہی کو نہیں جانتا آخر میری سمجھ میں یہ آیا کہ اِس کے ساتھ دماغ تھکانا فضول ہے کیوں کہ یہ اِس کی استعداد سے بالکل باہر ہے۔ یہ بھی آجکل مرض ہو گیا ہے کہ لوگ اپنی استعداد سے زیادہ سوال کرتے ہیں۔ ایک انجینئر ملے اور مجھ سے سوال کیا میں نے کہا کہ یہ بلاغت کے متعلق ہے آپ اس کو نہ سمجھ سکیں گے کہنے لگے کہ واہ صاحب عالم تو وہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے فہم کے مطابق سمجھا دے میں نے کہا کہ بہتر مجھے آپ اُقلیدس کے مقالۂ اوّل کی

پانچویں شکل سمجھا دیجئے لیکن اِس طرح کہ نہ تو اصول موضوعہ کا حوالہ ہو نہ علوم متعارفہ کا واسطہ ہو اگر اس طرح سمجھانا ممکن ہے تو میں اُس تقریر کے سُننے کا بہت زیادہ مشتاق ہوں اور اگر کہیئے کہ اس طرح سمجھانا ممکن نہیں تو میں کہوں گا کہ عالِم اقلیدس وہی ہے جو کہ ہر شخص کو اُس کے فہم کے موافق سمجھادے کہنے لگے کہ اچھا تو ہم کو کیا کرنا چاہیئے میں نے کہا کہ اگر شوق ہے تو انجینئری کو طاق پر رکھیئے اور ہمارے پاس آکر میزان سے کتابیں شروع کیجئے۔جب اس مقام تک تعلیم پہنچے گی تو ہم بتلائیں گے کہنے لگے کیا ہم اب بڈھے ہو کر پڑھنے بیٹھیں گے میں نے کہا اگر تحقیق کا شوق ہے تو اس کی تو یہی صورت ہے اور اگر یہ صورت منظور نہیں تو ہماری تقلید کیجئے اور جو کچھ ہم کہیں اُس کو مان لیجئے اور یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ ہر شخص اِس کو جانتا ہے اور رات دن اسی کے موافق کارروائی ہوتی ہے مثلاً اگر ایک شخص بوڑھا آپ کے پاس ع۱۰ روپیہ ماہوار کی تنخواہ چھوڑ کر آیا اور سولہ دن کی تنخواہ کی مقدار آپ سے پوچھے اور آپ نے حساب کر کے بتلا دی تو اگر وہ یہ کہے کہ سولہ دن کی تنخواہ کی یہ مقدار کیونکر ہوگئی تو آپ اُس کو کیا جواب دینگے ظاہر ہے کہ یہی کہا جائے گا کہ تو فنِ حساب سے ناواقف ہے تیری سمجھ میں یہ نہ آئے گا اور اگر تو یہ سمجھنا چاہتا ہے تو ابتدا سے جمع تفریق ضرب تقسیم وغیرہ سیکھ اُس کے بعد اس کی وجہ دریافت کرنا اِس پر اگر وہ یہ کہے کہ کیا میں بڑھاپے میں حساب سیکھوں گا تو آپ یہی جواب دیں گے کہ وجہ سمجھنے کے لئے تو اِسی کی ضرورت ہے اگر اس کی ہمّت نہیں تو جو کچھ ہم کہتے ہیں اُس کو سچ سمجھو علی ہذا اور ایسے ہی واقعات روز مرّہ ہوتے رہتے ہیں دیکھئے دنیوی امور میں کبھی کوئی نہیں اُلجھتا ہمیشہ تقلید کی جاتی ہے اور دینی امور میں ہر شخص خود مجتہد ہے طبیب کے پاس جاتے ہیں اور جو کچھ وہ کہدیتا ہے اُس کو بلا چون وچرا مان لیا جاتا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ نسخے میں یہ دوا کیوں لکھی اور اس دوا کا یہ وزن کیوں لکھا وجہ یہ ہے کہ اُس پر عمل کرنا منظور ہوتا ہے جان کو عزیز سمجھتے ہیں کھود کرید میں اندیشہ ہوتا ہے کہ طبیب بگڑ نہ جائے اور دین پر عمل کرنا منظور نہیں۔ واللہ

اگر دین پر عمل کرنا ہوتا تو غنیمت سمجھتے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو ہم کو سیدھا رستہ تبلا سکتے ہیں کیوں کہ جب انسان کو کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو اُس کے متعلق عمل کے موافق علم ہو جانے کو بہت غنیمت سمجھا کرتا ہے یہ چون وچرا وہیں ہوتی ہے جہاں کام کرنا مقصود نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کو اسٹیشن جانا ہے اور رستے سے واقفیت نہیں تو اگر کوئی معمولی آدمی بھی کہے کہ آؤ میں اسٹیشن پر پہنچادوں تو بے تامل اُس کے ساتھ ہو لیتے ہیں کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ اِس امر پر کہ جس رستے کو تم جارہے ہو یہ اسٹیشن پر پہنچا دے گا۔ اور اسٹیشن سے زیادہ دور نہ کردے گا کیونکہ جانتا ہے کہ اِس میں چون وچرا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خفا ہو کر یہ مجھے یہیں چھوڑ دیگا اور پھر میں نہ پہنچ سکوں گا اسی طرح اگر کسی بڑے اسٹیشن پر یہ معلوم نہ ہو کہ دِلّی اور لکھنؤ کی جانے والی گاڑی کونسی ہے تو ایک قلی کے کہنے پر یقین آجاتا ہے اور بغیر کچھ پس وپیش کئے ہوئے اُس کو مان لیا جاتا ہے اور اِس مفت کے علم کو غنیمت سمجھ کر قلی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ ہاں اگر جانا ہی نہ ہو تو اُس میں نکتہ چینیاں نکالی جاتی ہیں اور اس کو بتایا جاتا ہے کہ ہاں جناب تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ کانپور کو یہی گاڑی جائے گی اور میں یہ کیونکر مان لوں کہ یہ دس۱۰ بجے ہی چھوٹ جائیگی علیٰ ہذا غرض جب تک استعداد محققانہ نہ ہو اُس وقت تک تقلید کرنی چاہیئے اور جب ایسی استعداد ہو جائے تو وہ مبارک ہے اُس وقت جس قسم کے سوالات بھی (بشرطیکہ لغو نہ ہو) چاہیں پیش کریں لیکن اس کی کچھ عادت ہو گئی ہے۔ چنانچہ اُس مؤذن نے مسح ارجل کے متعلق سوال کیا میں نے کہا کہ یہ کونسی کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہے کہنے لگا کہ قرآن ہے میں نے کہا کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ قرآن ہے کہنے لگا کہ علماء کے کہنے سے میں نے کہا کہ جب قرآن کا قرآن ہونا علماء کے کہنے سے مان لیا تو اس کو بھی علماء کے کہنے سے مان لو کہ پیروں کا مسح نہیں ہے بلکہ غسل ہے اور واقعی یہ موٹی بات ہے کہ جب علماء کے کہنے سے ایک عربی کتاب کو خدا کا کلام مان لیا تو ایک مسئلے کو علماء کے کہنے سے ماننے میں کیا تامل ہے۔ ایک شخص پرتاب گڑھ میں ملے اور فاتحہ خلف الامام کے متعلق

سوال کیا۔ میں نے کہا کہ آپ کو دوسرے سب مسائل محقق ہو گئے انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں پھر میں آپ سے دلیل پوچھوں گا اور دُنیا بھر کے مذاہب کو پیش کر کے سب کی تردید کراؤں گا اگر آپ ایک جگہ بھی جھجکے تو آپ مقلّد ہیں اور جب کہ آپ اصل مذہب میں مقلّد ہیں تو فرعی مسائل میں تقلید کرتے کیوں عار آتی ہے بات وہی ہے کہ اس وقت لوگوں کو کام کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ کام کرنے والوں کی صورت ہی اور ہوتی ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ترجمہ اس وقت تک کافی نہیں ہے جب تک کسی عالِم سے اس کو پڑھ نہ لیا جائے۔ اگر خود پڑھنے کا شوق ہو تو لفظ ہی پڑھنے چاہئیں کیونکہ خود مطالعہ کرنے سے مطلب حل نہیں ہو سکتا اس کی ایسی مثال ہے کہ اگر قانون میں امتحان دینا چاہیں اور کسی سے پڑھا نہ ہو تو ہرگز پاس نہ ہوں گے اور جب لکھنے بیٹھیں گے بیسیوں شبے پڑیں گے اور اپنی سمجھ کو ہرگز کافی نہ سمجھا جائے گا۔ تو جب ایک معمولی قانون میں یہ حالت ہے تو قرآن ہی اس قدر سستا کیوں ہو گیا کہ ہر شخص اس میں محقق ہے اور اپنی ساری تحقیقات اِس میں ختم کر دی گئی ہیں علماء سے مزاحمت کی جاتی ہے۔ غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب قرآن بہت آسان ہے تو ہر شخص کو محقق بننے کی اجازت کیوں نہیں دیجاتی تو بات یہ ہے کہ الفاظ اور ترجمہ آسان ہے لیکن اخذ اور استنباط بہت مشکل ہے اس کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اور اس کیلئے کچھ سامان کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہے تو قرآن کا یہ جزو مشکل ہے باقی آسان۔ اور دلائل توحید بھی اس اعتبار سے آسان ہیں کہ جو شخص مجتہد بھی نہ ہو وہ بھی اُن کو سمجھ سکتا ہے۔ اب سمجھئے کہ اگر دلائلِ توحید میں سائنس کے مسئلے مذکور ہوتے تو توحید کا سمجھنا اُن کے علم پر موقوف ہوتا اور وہ خود نظری ہیں تو توحید بدون اُن کے سمجھے ہوئے ثابت نہ ہوتی اور مخاطب اُن دلائل کے عرب کے بادیہ نشین تک ہیں تو وہ توحید کو کیسے جانتے۔ تو یہ نقصان ہے قرآن میں مسائلِ سائنس کو داخل کرنے کا کہ اصل مقصود ہی اُڑا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے

کہ گو قرآن میں جگہ جگہ سمٰوٰت اور ارض ہیں لیکن سمٰوٰت بہ صیغۂ جمع اور ارض بہ صیغۂ واحد لایا گیا تاکہ مقدمات میں شغب نہ ہونے لگے پھر مستقل دلیل سے بتلا دیا کہ زمین بھی سات ہیں چنانچہ بعض کو اس پر بھی اعتراض ہے. کہ ہم تو سب جگہ پھرے ہم کو تو کوئی دوسری زمین نہیں ملی اور ارض کا ترجمہ حدیثِ تعدّدِ ارض میں اقلیم کا کیا اور غضب تو یہ ہے کہ بعض اہلِ علم نے بھی یہ لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب قرآن شریف میں بعد سبع سمٰوٰتٍ طباقاً کے مِنَ الارض مثلھن فرمایا ہے تو اقلیم ترجمہ کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔ اور حدیث میں صاف آگیا ہے کہ سات آسمان ہیں اور ہر دو آسمان کے درمیان ۵۰۰ برس کی راہ ہے۔ پانچسو برس سے مُراد کثرت ہے اس کے بعد زمین کے متعلق یہی فرمایا اب اقلیم کی تاویل کیسے چل سکتی ہے رہا یہ اِشکال کہ ہم کو دوسری زمین نظر نہیں آتی۔ سو اِس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آپ نے اُس کو کوکب سمجھا ہو. مثلاً اِن ہی سیّاروں میں سے چند سیّارے ہوں۔ افسوس ہے کہ مُسلمان اگر ایک بات کو اپنے لوگوں کے مُنہ سے سُنتے ہیں تو یقین نہیں کرتے اور اگر اُسی بات کو دوسری قومیں کہدیتی ہیں تو صیح سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اِسی زمین کے مسئلے کے متعلق علماء مدّت سے کہہ رہے ہیں اور لوگ یقین نہیں کرتے اور اب چند روز سے جو دوسری قومیں مرّیخ کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کر رہی ہیں جن سے بعض اُمور میں اُس کا مشابہ اِس زمین کے ہونا معلوم ہوتا ہے اُن کا یقین کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دیکھئے کتنی بڑی اور کتنی نئی تحقیق ہے غرض ممکن ہے کہ یہ سیّارے ہی وہ زمین ہو اور کوئی دوسری مخلوق وہاں رہتی ہو جس کی تعیین ہم نہیں کرسکتے نہ ہم کو بتلایا گیا اور نہ اس کی ضرورت۔ اور ہم کو اپنی تو خبر ہی نہیں دوسری مخلوق کی کیا خاک خبر ہوسکتی ہماری وہ حالت ہے ؎

تو کارِ زمیں رانکو ساختی   کہ با آسماں نیز پرداختی

زمین کے کام کو تونے خوب کرلیا ہے جو آسمان کی طرف چلے۔

ہماری وہ حالت ہے کہ جیسے ایک شخص ہے کہ اُس پر فوجداری کے بہت سے مقدمات قائم ہیں مگر وہ احمق اپنی فکر کو چھوڑ کر سارے الہ آباد کے مقدمات کی تحقیق کرتا پھرے ظاہر ہے کہ اگر اُس کو ذرا بھی عقل ہوتی تو وہ ان سب کو چھوڑ کر اپنے مقدمات کی فکر کرتا اِسی طرح جو لوگ دنیا بھر کی تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ ان پر تعزیراتِ الٰہیّہ کی بہت سی دفعات عائد ہو رہی ہیں یہ اُن کی سخت نادانی اور غفلت ہے غرض ہم کو بتلایا نہیں گیا لیکن ممکن ہے کہ کچھ مخلوق چاند اور مرّیخ وغیرہ میں ہو پس نصوص کی تکذیب کی کوئی ضرورت نہیں تو باوجودیکہ یہ بات ثابت تھی مگر پھر بھی قرآن میں ارضین نہیں فرمایا بلکہ ارض بصیغۂ واحد ارشاد فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف یہ ہے کہ اِن مصنوعات سے توحید پر استدلال کیا جائے اور استدلال مقدماتِ مسلمہ سے ہوا کرتا ہے تو اگر ارضین فرماتے تو اصل مقصود تو ثابت نہ ہو سکتا اور یہ مسئلہ گفتگو کے قابل ہو جاتا اور اب یہ ہوا کہ جو لوگ واقف ہیں وہ لفظِ ارض ہی سے جو کہ اسمِ جنس ہے قلیل کثیر سب کو شامل سمجھ لیتے ہیں اور جو لوگ واقف نہیں وہ بھی بوجہ ایک ارض کے محسوس ہونے کے نفسِ استدلال کو بخوبی سمجھ گئے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں کسی ایسے مسئلے سے کام نہیں لیا گیا جس سے سامع کو اُلجھن ہو تو اگر سائنس کے مسئلے اِس میں ہوتے تو سامعین اُنکی تحقیق میں پڑ جاتے اور ہر شخص کو اُس کے آلات و ذرائع کی تحصیل ممکن نہ تھی تو ہر شخص ایک اُلجھن میں پڑ جاتا نیز ان میں اختلاف اس قدر ہے کہ آج تک بھی کوئی بات محقق نہیں ہوئی دیکھئے قطب تک پہنچنے میں جو کہ محسوس ہے کس قدر اختلاف ہے پس مسائلِ حقہ کی بناء ان پر کیوں کر ہو سکتی ہے تو واجب ہے کہ قرآن کو سب سے خالی کیا جائے یہی قرآن کی خوبی ہے اور ہر فن کے لئے یہی بات خوبی کی ہوتی ہے۔ نحو کی خوبی یہ ہے کہ اُس میں طب کے مسئلے نہ ہوں۔ طب کی خوبی یہ کہ اس میں زراعت تجارت کے مسئلے نہ ہوں اگر طب کی کتاب میں ہر ورق کے بعد زراعت اور تجارت

کا بھی ایک ایک مسئلہ ہو تو تمام عقلاء اس کو ہنسیں گے اِس لئے کہ طب کی کتاب میں ان مسائل کا ہونا بے موقع ہے اِس موقع پر مجھے یاد آیا ہمارے وطن میں ایک شاعر تھے اب انکا انتقال ہوگیا ہے انہوں نے اپنا ایک دیوان مرتّب کیا تھا۔ نہایت ہی بیہودہ اس میں ردیفِ ضاد نہ تھی لوگوں نے کہا جناب اِس میں ردیف ضاد نہیں ہے کہنے لگے کہ دوسری کسی ردیف میں سے ایک غزل لے کر ہر شعر کے آخیر میں لفظِ مقراض بڑھا دو اور ردیف ضاد میں لکھدو۔ اب غور کیجئے کہ اُن کی اس حرکت کو کس نظر سے دیکھا جا رہا ہے کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن بھی ایسا ہی دیوان ہو کہ اُس میں تمام ردیفیں ہوں گو بے ربط ہوں قرآن شریف نے صرف دو چیزوں کا اہتمام کیا ہے ایک امنِ عام کہ اِس دنیا میں رہ کر یہ حالت ہو کہ کسے را با کسے کارے نباشد۔ میں کہتا ہوں کہ جو امن قرآن نے سکھلایا ہے کسی قانون نے نہیں سکھلایا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت لوگ مسلمانوں کو شورش پسند کہتے ہیں حالانکہ اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے تو مسلمانوں سے زیادہ امن پسند اور عافیت جو کوئی قوم دنیا میں نہیں ہے مثال کے طور پر ایک ایک جزئی بیان کرتا ہوں جمعے کے متعلق فرماتے ہیں اِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ جب نماز ہوچکے تو پھیل جاؤ زمین میں وہ مجمع جو کہ محض خدا تعالےٰ کی عبادت کے لئے اور خدا تعالےٰ کے سامنے سر جھکانے کیلئے جمع ہوا ہے اُس کو بھی یہ حکم ہو رہا ہے کہ جب اپنا کام کرچکو تو جمع رہنے کی کوئی ضرورت نہیں سب منتشر ہو جاؤ کیوں کہ ممکن ہے فضول اجتماع سے کوئی خرابی پیدا ہو آگے فرماتے ہیں وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ تلاش کرو فضل خدا کا جس سے مقصود یہ ہے کہ منتشر ہو کر بھی اِدھر اُدھر مارے مارے نہ پھرو کیونکہ اُس میں پھر فساد کا احتمال ہے بلکہ رزق حلال کی تلاش میں لگو پھر فرماتے ہیں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا یعنی خدا تعالےٰ کو بہت یاد کرو کیونکہ اصل مقصود یہی ہے کہ خدا تعالےٰ کا قرب حاصل ہو۔ تو حق تعالیٰ کے اِس کلام سے معلوم ہوا کہ مجمع بلا ضرورت نہ ہونا چاہیئے اور اگر کسی ضرورت سے ہو تو ضرورت کے ختم ہو جانے پر سب کو منتشر ہو جانا چاہیئے۔ غور کیجئے کہ نمازیوں کا مجمع جس میں شورش و فساد کا احتمال ہی نہیں ہے مگر چونکہ خدا تعالےٰ جانتے ہیں کہ

انسان ضعیف ہے عجب نہیں کہ اس میں تُو تُو مَیں مَیں ہو جائے اگرچہ جُوتی پیزار نہ ہو اس لئے حکم فرمادیا کہ سب منتشر ہو جاؤ۔ غرض ایک تو قرآن میں امن کی رعایت ہے دوسرے خدا تعالےٰ کی رضا جوئی اِن دو امر کے سوا اگر کوئی تیسرا مسئلہ آگیا ہے وہ اُس کے تابع ہوکر آیا ہے تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اِس کے سوا اور کوئی مسئلہ نہ ڈھونڈھنا چاہیئے۔ علیٰ ہذا اگر حکایتیں قرآن میں ہیں تو وہ بھی ان ہی کی خادم ہوکر ذکر کی گئی ہیں کہ فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو اُن کو یہ سزا ملی اور فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو اُن کو یہ اجر مِلا ہم اگر ایسا کرینگے تو ہم کو بھی ایسی ہی سزا یا اجر ملے گا اِس سے معلوم ہوا کہ جہاں جُمل خبریہ ہیں اُن سے مقصود جملِ انشائیہ ہی ہیں چنانچہ اِس مقام پر بھی یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السّلام کی دُعا نقل فرمائی جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اعتناء فی الدین نہایت ضروری ہے جس کی تفصیل آیت میں ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہماری اولاد میں ایک رسول پیدا کر کہ وہ اُن کو تیری آیات سُنادے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے اور اُن کو پاک کرے اِس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اے سننے والو سمجھ جاؤ کہ ضروری چیزیں یہ ہیں جن کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے کیا اور سمجھ کر ہم سے دُعا کی۔ اب سمجھنا چاہیئے کہ وہ ضروری چیزیں کیا ہیں سو وُہ مفصلاً تو تین چیزیں ہیں یَتْلُوْا اور یُعَلِّمُ اور یُزَکِّیْ اور مجملاً ایک چیز ہے جس کو دین کہتے ہیں کیونکہ یہ سب دین ہی کے شعبے ہیں اس لئے کہ دین مرکب ہے دو چیزوں سے ایک علم اور دوسرا عمل جیسے فنِ طب کہ اُس میں اوّل علم کی ضرورت ہوتی ہے پھر عمل کی۔ تو قرآن بھی حقیقت میں طبِ رُوحانی ہے کہ اُس میں روحانی امراض کے علاج کے قواعد اور جزئیات بتلائے گئے ہیں امراض خواہ متعلق قلب کے ہوں یا جوارح کے اور امراضِ قلب کا مرض ہونا حواس سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ وجدان سے معلوم ہوتا ہے اور جب تک وجدان صحیح نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی اطلاع بالدلیل ہوتی ہے وہ دلیل یہ ہے کہ اطاعتِ خداوندی صراط مستقیم ہے اور صراطِ مستقیم سے خارج ہونا اعتدال سے خارج

ہونا ہے کیونکہ خطِ مستقیم ایک ہی خط ہوتا ہے یعنی اگر دو نقطوں کے درمیان بہت سے خطوط سے اتصال کیا جائے تو اُن خطوط میں خطِ مستقیم ایک ہی ہوگا جو کہ سب سے اقصر ہو باقی سب ٹیڑھے ہوں گے۔ اور اعتدال سے خارج ہونا مرض ہے تو خدا تعالےٰ کی نافرمانی کرنا مرض ہوا اور اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ سب طریقوں سے مختصر طریق اور اقصر طریق شریعتِ اسلامی ہے تو اس اعتدال سے جب کوئی خارج ہوگا وہ مریض کہلاوے گا اور قرآن میں اِس کو مرض کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ اِس کی تفسیر جب تک کہ وجدان صحیح نہ ہو سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کے مرض ہونے کی صفت اَمرِ مُبطن ہے جو حواس سے ادراک نہیں ہوتا لیکن جب وجدان صحیح ہوجاتا ہے تو اُس کا مرض ہونا وجدان سے معلوم ہوجاتا ہے۔ جیسے امراضِ ظاہری کی حالت ہے کہ بعض اوقات وجدان سے معلوم ہوجاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔ تو جیسے امراضِ طبیہ میں بعض امراض وجدانی ہیں اسی طرح امراضِ باطنی بھی وجدانی ہیں کہ جب وجدان صحیح ہوتا ہے تو اُن کا ادراک ہوتا ہے اور اس کا ایک امتحان بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو دیکھئے کیسی تکلیف اور رنج ہوتا ہے اور اپنے نفس کو انسان کیسی ملامت کرتا ہے اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو کبھی نہیں ہوتا دن رات گناہ کرتے ہیں لیکن کچھ بھی تکلیف و رنج کا احساس نہیں ہوتا تو میں کہوں گا کہ اس کا سبب یہ ہے ابتدا سے آج تک یہ شخص مرض ہی میں مبتلا ہے صحت کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی کہ اس کی راحت کا ادراک ہو اور اس سے مرض گناہ کی کلفت کا احساس ہو اِس شخص کی ایسی مثال ہے جیسے ایک اندھا مادر زاد کہ اُس کو یہی ادراک نہیں ہوسکتا کہ میں اندھا ہوں کیوں کہ عمی عدم البصر کو کہتے ہیں تو جس کو بصر کا ادراک نہ ہوگا اُس کو عمی کا ادراک کیوں کر ہوگا تو مریض بھی اپنے کو وہی سمجھے گا اور مرض کی کلفت بھی اُسی کو ہوگی جس نے کبھی صحت دیکھی ہو۔ پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم کو تو کبھی تکدّر نہیں ہوتا تو وجہ اُس کی یہ ہے کہ اُس کو

کبھی انشراح ہی نہیں ہوا اُس کو چاہیئے کہ انشراح پیدا کرے اُس کے بعد دیکھے
کہ اگر کبھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اُس میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ کم از کم یہی
کرے کہ امتحان ہی کے لئے ایک ہفتہ کی رُخصت اپنے معمولی کاموں سے لے اور
کسی صاحب برکت کے پاس جا کر رہے اور اس سے اللہ کا نام پوچھ کر جس طرح وہ
بتلاوے ایک ہفتہ تک کام میں مشغول رہے کام میں مشغول ہونے کے بعد
دیکھئے گا کہ دل کی ایک نئی حالت ہوگئی جو کہ اِس کے قبل نہ تھی اس کو تو محفوظ
رکھیئے پھر دیکھئے کہ پہلی حالت اور اِس جدید حالت میں کوئی فرق ہے یا نہیں واللہ
آپ دیکھیں گے کہ پہلی حالت نہایت مکدّر تھی اور اب ایک صحت نصیب ہوگئی ہے اور
یہ ایک قسم کا انشراحِ قلب ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ جب وجدان صحیح ہو جاتا ہے
تو وجدان سے اُس کا مرض ہونا معلوم ہو جاتا ہے تو اس کی کوشش کیجئے کہ وجدان
صحیح ہو تاکہ مرض کا مرض ہونا تو معلوم ہو جائے کہ اس کے بعد علاج پر توجہ ہو۔
دیکھئے اگر معمولی زکام ہو جاتا ہے تو اُس کے لئے کس قدر اہتمام کیا جاتا ہے مگر
افسوس ہے کہ اتنا بڑا مرض ہم کو لگ رہا ہے کہ ہماری رُوح اُس میں تحلیل ہو رہی ہے
لیکن ہم کو ذرا فکر نہیں ہے۔ قرآن نے ہم کو اس کا علاج بتلایا ہے اور اِسے مضار
پر اطلاع دی ہے تو قرآن مطبِ روحانی ہے اُس میں صرف یہی دو چیزیں ہیں ایک
علم اور دوسرا عمل یُزَکِّیْ میں عمل کی طرف اشارہ ہے اور یُعَلِّمُ میں علم کی طرف
حاصل یہ ہوا کہ اے سُننے والو اہتمام کے قابل دو چیزیں ہیں علم اور عمل انہی کا اہتمام
حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے فرمایا۔ پھر علم میں دو مرتبے ہیں ایک الفاظ اور
ایک معانی کیونکہ کسی چیز کے جاننے کی شان یہ ہوتی ہے کہ اُس میں کچھ الفاظ ہوتے
ہیں اور کچھ اِن الفاظ کے معانی خواہ اُردو میں ہو یا عربی میں خواہ زبانی علم ہو یا کتاب
سے تو گویا ترتیب کسی فن کے جاننے کی یہ ہوتی ہے کہ اوّل الفاظ کا تحقیق ہوتا
ہے اور پھر دلالت علی المعانی اور پھر اُن کی حقیقت کا انکشاف اور پھر عمل
مثلاً اگر کسی طبیب سے کوئی نسخہ دریافت کیا تو اوّل اس کے الفاظ معلوم ہوئے

پھر اُن الفاظ سے معانی پر دلالت ہوئی۔ پھر اُن کی حقیقت کا انکشاف ہوا اِن سب مراتب کے بعد اُس نسخے پر عمل کیا گیا یہی ترتیب عقلی دین میں بھی ہے۔ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اُس نے دین کی کوئی عجیب شکل نہیں بنائی بلکہ جو ترتیب ہمارے روز مرّہ امور میں ہے وہی ترتیب اُس میں بھی رکھی کہ سہولت ہو حالانکہ دین وہ چیز ہے کہ اگر اس کا ڈھنگ بالکل نرالا اور سخت بھی ہوتا تب بھی اُس کو بکوشش حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ دین کے حاصل کرنے میں ہمارا ہی نفع ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کا اور نہ حاصل کرنے میں ہمارا ہی نقصان ہے جیسے کوئی طبیب کڑوا نسخہ لکھدے تو اُس کے پینے سے جو کچھ نفع ہوگا مریض کو ہوگا اور نہ پینے سے بھی جو کچھ ضرر ہوگا مریض کو ہوگا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس مضمون کو دو ٹوک کرکے فرما دیا ہے کہ مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر کرے اور قرآن میں بہت سی جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ ہمارا نہ کوئی نفع تمہارے ایمان سے اور نہ کوئی ضرر تمہارے کفر سے اور یہ فرمانا ایسا ہے جیسے کوئی طبیب کہنے لگے کہ اگر تم دوا پیو تو ہمارا کیا نفع اور نہ پیو تو ہمارا کیا ضرر۔ بلکہ حکیم کو تو ایک گونہ نفع بھی ہے خدا تعالیٰ کو تو کچھ بھی نفع نہیں اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے لئے استکمال بالغیر محال ہے ہر چیز اُن کے افادۂ وجود کی محتاج ہے مگر وہ کسی امر میں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ آفتابِ عالمتاب عطر خانہ اور گھورہ سب پر روشن ہے لیکن نہ اُس کو عطر خانہ سے خوشبو پہونچتی ہے نہ گھورے سے بدبُو اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ ۔۔۔ وز گراں جانی و چالاکی ہمہ

کہ ہم تو ایسے مقدّس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں۔ پاکی سے پاک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اُس پاکی سے پاک ہیں کیوں کہ انسان کتنی بھی تقدیس کرے لیکن احصاء غیر ممکن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَآ اُحْصِىْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔ واقعی بڑی سے بڑی تعریف

اور تقدیس بھی اُس کے واقعی تقدس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اِس کی مثال مولانا نے بیان فرمائی ہے کہ ؎

شاہ راگوید کسے جولاہہ نیست   ایں نہ مدح ست او مگر آگاہ نیست

یعنی اگر کوئی شخص بادشاہ کی یہ تعریف کرے کہ آپ اِتنے بڑے آدمی ہیں کہ جولاہہ نہیں ہیں تو کیا اس کو کوئی مدح کہے گا ہرگز نہیں۔ اسی طرح ہمارے فہم کے موافق ہمارے نفع کے لئے تسبیح کو مشروع قرار دیا گیا ہے اِسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

من نگردم پاک از تسبیحِ شاں   پاک ہم ایشا شوند دُور فشاں

یعنی لوگوں کی تسبیح اور تقدیس سے ہم پاک نہیں ہوگئے بلکہ اِس سے وہی پاک ہوگئے غرض خدا تعالےٰ کی شان یہ ہے کہ وہاں نہ نفع پہونچے نہ ضرر۔ حدیث میں ہے کہ اگر ساری دنیا مطیع ہو جائے تو خدا تعالےٰ کی سلطنت میں اتنا بھی اضافہ نہیں ہوتا جتنا مچھر کا پر۔ برخلاف یہاں کے سلاطین کے کہ جس قدر رعایا اطاعت کرے سلطنت زور دار ہے اور اگر رعایا اطاعت نہ کرے تو سلطنت کمزور ہے وجہ یہ ہے کہ دُنیا کے بادشاہ رعایا کے بنائے ہوئے ہیں اور خدا تعالےٰ خود بالذات کامل ہیں لہٰذا رعایا کو خود اپنے نفع کی فکر کرنی چاہیئے اللہ تعالےٰ کو اُن کی عبادت سے کچھ بھی نفع نہیں غرض طبیب کہ جس میں بوسائطِ بعیدہ نفع کا احتمال ہے جب اُس طبیب کو حق ہے وہ جیسا نسخہ چاہے تجویز کرے تو خدا تعالےٰ کو اُس سے زیادہ حق ہے کہ جیسا قانون چاہتے مقرر کرتے کیونکہ وہ حاکم علی الاطلاق بھی ہیں اور اُس میں ہمارا ہی نفع بھی ہے مگر یہ اس کی رحمت ہے کہ اُس نے نہایت آسانی اور سہولت رکھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اِس پر عمل کرتے بھی جان چُراتے ہیں. علماء سے درخواست کی جاتی ہے کہ احکام میں کچھ آسانی کردو گویا یہ سمجھتے ہیں کہ احکامِ شریعت کی تبدیل و تغیر بالکل علماء کے ہاتھ میں ہے. مجھے ایک بڑھیا کا واقعہ یاد آتا ہے کہ جب وہ حج کو گئی اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے لگی تو دو تین پھیرے کرکے مطوّف سے کہنے لگی کہ اب تو مجھسے نہیں ہوسکتے خدا کے لئے اب تو مجھے معاف کردو تو جیسے وہ بڑھیا یہ

سمجھتی تھی کہ مطوّف کے معاف کردینے سے معاف ہو جائیں گے اسی طرح یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں۔ ایک رئیس والیِ مُلک ایک بڑے حاکم سے ملنے کے لئے گئے یہ رئیس بہت دُبلے ہو رہے تھے اُس حاکم نے پوچھا کہ آپ اِس قدر دُبلے کیوں ہو رہے ہیں اُنہوں نے کہ آج کل رمضان کا مہینہ ہے روزہ رکھنے کی وجہ سے دُبلا ہو رہا ہوں کہنے لگا کہ آپ اپنے پادریوں سے کمیٹی کرا کے اِن کو فروری کے مہینے میں کیوں نہیں کرا لیتے انھوں نے کہا کہ جناب اِس قسم کے اختیارات آپ ہی کی کمیٹی کو ہیں ہمارے علماء کی کمیٹی کو ایسے اختیارات نہیں ہیں۔ غرض پہلے تو غیر تو میں اس قسم کی درخواستیں پیش کرتی تھیں مگر افسوس ہے کہ اب مسلمان ہی اِس قسم کی درخواستیں پیش کرنے لگے ہیں بلکہ یہاں تک ستم ہونے لگا ہے کہ لوگ درخواست سے گذر کر رائے دینے لگے ہیں کہ ضرور ایسا کرنا چاہیئے میں ایک مرتبہ لاہور گیا تو بہت سے خیرخواہانِ قوم نے یہ طے کیا کہ اِس وقت سُود کے مسئلے پر گفتگو ہو جانی چاہیئے۔ چنانچہ اُن کی خواہش پر گفتگو کی گئی لیکن جلسہ گفتگو کا خاص تھا یعنی صرف علماء تھے۔ سب لوگ نہایت مشتاق تھے کہ دیکھئے کہ تجویز ہوتا ہے حالانکہ وہاں اس کے سوا کیا تجویز ہو سکتا تھا جو کہ تیرہ سو برس سے چلا آرہا ہے اس واسطے کہ اہل علم میں سے کس کی وہ ہمّت ہو سکتی جو کہ آجکل کے نوجوان ہمّت کرتے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے ایک رسالہ میں حَرَّمَ الرِّبٰوا میں یہ تحریف کی کہ رِبٰوا کو بضم را کہا اور اس کے معنی اُچکنے کے لئے۔ میں کہتا ہوں کہ اِس سے سیدھی بات تو یہ تھی کہ زنا ہی کہہ دیتے کیونکہ زنا عربی کا لفظ تو ہے رُبا تو عربی کا لغت بھی نہیں بلکہ ربودن سے فارسی کا لغت ہے۔ رہا رسمِ خط کا اِشکال سو رُبا بضمِ الرّا بھی واؤ سے نہیں ہے۔ اِس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے مشہور ہے کہ ایک شخص اپنی ماں کو کچھ نہ دیتا تھا اُس نے جاکر ایک عالم سے شکایت کی اُنھوں نے لڑکے کو بُلا کر اِس کا سبب پوچھا کہنے لگا اگر قرآن شریف میں ماں کا حق کہیں نکل آئے تو میں ضرور دُوں گا چونکہ یہ بالکل جاہل تھا اس لئے اُن کو فکر ہوئی کہ کوئی ایسی سبیل ہو کہ اسکی سمجھ میں بھی آجائے آخر کہنے لگے کہ تو نے کچھ قرآن

بھی پڑھا ہے اُس نے کہا کہ دو چار سورتیں پڑھی ہیں کہنے لگے کہ تَبَّتْ یَدَ آ اَبِیْ لَھَبٍ پڑھی ہے اس نے کہا ہاں جب اُس نے تَبَّتْ پڑھی اور اُس میں مَا کَسَبَ پڑھا تو کہنے لگے کہ دیکھ اس میں تو لکھا ہے کہ ماں کا سب یعنی سب کچھ ماں ہی کا ہے تیرا کچھ بھی نہیں لڑکے نے کہا کہ مولوی صاحب اب دیا کردوں گا تو انھوں نے تو ایک ثابت شدہ مسئلے کو اُس جاہل کے ذہن نشین کرنے کے لئے محض ظرافت کے طور پر ایک اردو کے جملے کو قرآن کا جزو کہا تھا لیکن اس ظالم نے قرآن میں صریح تحریف کی کہ ربوا کو حلال کرنے کے لئے اُس کی حُرمت کو قرآن سے اُڑانا چاہا غرض ہر شخص قرآن اور احکام شریعت کے متعلق ایک نئی رائے اور تجویز رکھتا ہے۔ گویا قرآن ایک بچوں کا کھیل ہے کہ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ آج کل کی اصلاح ایسی ہے جیسے کہ ایک بُڑھیا نے بادشاہی باز کی کہ وہ اتفاقاً اس کے ہاتھ آگیا تھا اصلاح کی تھی یعنی جب اُس نے دیکھا کہ اِس کے ناخن بھی بہت بڑھ رہے ہیں اور چونچ بھی ٹیڑھی ہے تو بہت کڑھی اور کہنے لگی کہ تو کس بے رحم کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا جس نے نہ تیرے ناخنوں کی خبر لی نہ تیری چونچ کو درست کیا۔ تو کس طرح کھاتا ہوگا۔ کس طرح چلتا ہوگا۔ اور یہ کہہ کر اُس کے ناخن اور چونچ سب قینچی سے کاٹ دیئے تو جیسے اُس نے باز شاہی کی اصلاح کی تھی ایسے ہی یہ لوگ بھی قرآن میں اصلاح کرتے ہیں۔ آخر جب وہ مجلس ختم ہوئی اور وہ مضمون شائع ہوا تو ان لوگوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے کہ افسوس اب تک بھی علماء کو ہوش نہیں آیا کہ اِتنی ضرورت ہے اور یہ لوگ ابھی تک اُسکو ناجائز ہی کہتے ہیں۔ میں نے ایک بیان میں کہا کہ ظالمو! اگر تم کو اپنی عاقبت ہی خراب کرنا ہے تو حلال کہکر ابد الآباد کے لئے تو برباد نہ ہو۔ تمہاری مخترعہ ضرورتیں تو اس طرح بھی پوری ہوسکتی ہیں کہ حرام سمجھو اور مبتلا رہو اور خدا تعالیٰ سے معافی چاہتے رہو اپنی حرکت پر نادم رہو اور میں نے کہا کہ یاد رکھو اگر دنیا بھر کے علماء متفق ہوکر ربوٰا کو حلال کہدیں تو جو لوگ اس کو حرام سمجھتے ہیں وہ اُس وقت بھی حلال نہ سمجھیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ علماء

کو گالیاں دینگے کہ یہ پڑھ لکھ کر اور سمجھ بوجھ کر برباد ہوئے۔ اس واسطے کہ اس دین کا حافظ خدا تعالیٰ ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی خاص جماعت کی تحریف کرنے سے یہ دین محرّف ہوسکے۔ اس دین میں انقلاب کا اگر کسی درجے میں اندیشہ تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر تھا اور جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر بھی دین میں انقلاب نہ ہوا تو اب قیامت تک کے لئے اطمینان ہے اب اس میں بگڑنے کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا تو اگر کوئی مولوی اس میں تحریف کرنا چاہے تو نتیجہ وہی ہوگا جو اس وقت کے محرّفین کا ہو رہا ہے یعنی مردود عند اللہ وعند الناس۔ ازیں سُو راندہ ازاں سُو ماندہ (نہ خدا ہی ملا نہ ربُوا ہی ملا۔ نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ جامع وعظ) غرض یہ حالت ہو رہی ہے کہ طرح طرح کے تصرفات اور تکلفات قرآن میں کئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے کو محقق فی الدین سمجھتا ہے حالانکہ ترقی یافتہ قوم نے جن کی ہمارے بھائی تقلید کرتے ہیں اِس کی بھی تحقیق کرلی ہے کہ ہر شخص ہر چیز کا ماہر نہیں ہوسکتا ایک فن کا ماہر دوسرے فن میں دوسرے شخص کا مقلّد ہے دیکھئے اگر ایک بڑا سائنس داں کسی مکان میں قیام کرے اور کوئی انجینئر آکر کہے کہ دو گھنٹے کے اندر یہ مکان گر جائے گا تو وہ فلسفی اس کے کہنے سے فوراً مکان خالی کردیگا اور باوجود بہت بڑا فلسفی ہونے کے اُس انجینئر کی تقلید کرے گا اور اِس تقلید میں اُس کو کچھ بھی عار نہ ہوگی اور جب یہ مسئلہ مسلّم ہے تو اِس کے موافق تو ضرور عمل کرنا چاہیئے اِس واسطے کہ یہ آپ ہی کے پیشوا لوگوں کی تحقیق ہے غرض یا تو محقق بنئے اور اس کا سامان کریئے جہل کو دور کیجئے اور علم سیکھئے کیونکہ یہ ساری خرابی کم علمی کے سبب سے ہے اور یا تقلید کیجئے کہ جو لوگ جاننے والے ہیں وہ جو کچھ کہدیں اُس کو صحیح سمجھئے اور عمل کیجئے۔ پس دین میں تسہیل کی غرض سے اپنی رائے سے کام نہ لیجئے دین مکمّل ہے اور سہل بھی ہے چنانچہ اس مقام پر اصلاح کی ترتیب کس قدر سہل ہماری فطرت کے موافق رکھی ہے کہ اوّل علم کی طرف اشارہ کیا پھر عمل کی طرف۔ سو اس آیت میں ان ہی دو چیزوں یعنی علم وعمل کو بیان کیا گیا ہے۔ اور

چونکہ علم کے دو شعبے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا اس لئے گویا اس آیت کی مدلول تین چیزیں ہوئیں الفاظ اور معانی اور عمل اور ہم کو ان تینوں کا حاصل کرنا ضروری ہوا۔ اب دیکھئے کہ ہم نے ان تینوں جزوں کے ساتھ کیا معاملہ کر رکھا ہے سو عمل تو قریب قریب بالکل ہی مفقود ہے اور علم کا جو طریقہ ہے وہ مفقود ہے اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ علم بھی مفقود ہے لیکن خیر تھوڑا بہت مشغلہ ہے گو دنیا ہی کے لئے ہو اور جن لوگوں کو تحقیق حقیقت ہے وہ کچھ تھوڑا بہت عمل پر بھی متوجہ ہیں مگر ایک جزو ایسا ہے کہ اُس کو بالاتفاق سب نے چھوڑ رکھا ہے یعنی خدمتِ الفاظ قرآن جو کہ علم کے دو شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے چنانچہ آجکل کے عقلاء کا تو اس پر اجماع ہوگیا ہے کہ قرآن کے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے چنانچہ اپنے بچوں کو قرآن نہیں پڑھاتے اور کہتے ہیں کہ بچے کے اتنے دن کیوں ضائع کئے جائیں میں کہتا ہوں کہ اگر تلاوت ایک بیکار اور فضول چیز ہے تو قرآن میں جو جا بجا تلاوت کی فضیلت آئی ہے اور حکم فرمایا گیا ہے اور تلاوت کرنے والوں کی مدح فرمائی گئی ہے کیا یہ سب ترغیب اور حکم محض بیکار چیز پر ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط دوسری جگہ فرماتے ہیں یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ کیا قرآن کے یہ اجزاء عمل کرنے کے لئے نہیں محض دیکھنے کیلئے ہیں اور کیا یہ حالت پیدا کر کے ہم لوگ صاحب کتاب کہلانے کے مستحق ہیں۔ صاحبو! اگر کسی شخص کے پاس بہت سامال ہو اور وہ اُس کو کسی ایسی جگہ رکھدے کہ اُس سے منتفع نہ ہو سکے تو کیا اُس شخص کو مالدار کہیں گے پس ایسی حالت میں جیسا وہ صاحب مال ہے ایسے ہی آپ صاحب کتاب ہیں افسوس آپ نے ایک عظیم الشان دولت کو چھوڑ دیا ہے اور پھر آپ کو ذرا غم نہیں ہے حالانکہ اگر دینی پہلو سے دیکھا جاوے تب تو قرآن ہی میں یہ حکم موجود ہے اور اگر کسی کو قرآن کافی نہ ہو تو میں عقلی قواعد کی رُو سے پوچھتا ہوں کہ آیا علومِ دینیہ کا باقی رہنا ضروری ہے یا نہیں یقیناً اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ ضروری ہے اور جب ضروری

ہے تو چونکہ قرآن اِن کا منبع ہے اُس کا محفوظ رہنا بھی ضروری ہوگا ورنہ وہ کونسی صورت ہے کہ علم بدون الفاظ کے باقی رہ سکے۔ اگر کہو کہ عربی ہی کی کیا ضرورت ہے تو میں کہوں گا کہ ترجمہ کبھی کامل نہیں ہو سکتا کیونکہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ ذو وجوہ ہوتے ہیں اور ان کی مختلف تفسیریں ہوتی ہیں اب اگر الفاظ کو نہ لیا جائے تو اس کی وہ حالت ہوگی جو کہ آج کل توریت و انجیل کی حالت ہو رہی ہے کہ طالبِ حق کو اصل احکام معلوم ہی نہیں ہوتے۔ معلوم ہوا کہ اصل الفاظ کا باقی رہنا نہایت ضروری ہے اور اگر کہو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تو سمجھو کہ اگر پڑھنا چھوٹ جائے تو قرآن کا لکھنا اور چھپنا اور فروخت ہونا سب چھوٹ جائے اور قرآن کہیں بھی دستیاب نہ ہو یہ بات اس وقت آپ کو ہلکی معلوم ہوتی ہے مگر ایک صدی کے بعد آپ دیکھئے کہ کیا حالت ہو اور اگر دستیاب بھی ہو تو صحیح لکھا جانا اور صحت معلوم ہونا یہ سب اِسی تلاوت اور حفظ کی بدولت ہے اس وقت علومِ دینیہ کی جو گت ہو رہی ہے ظاہر ہے تو اگر تلاوت بھی بالکل ترک کر دی جائے اور لوگوں کے ذہن سے قرآن شریف اتر جائے اور پھر کسی لفظ یا آیت میں اختلاف ہو تو کون شخص فیصلہ کرے بلکہ میں کہتا ہوں کہ علومِ دینیہ اگر باقی بھی رہیں تب بھی پڑھنا چھوڑ دینے کی صورت میں قرآن مجید کی صحت نہیں ہو سکتی مجھے اپنے بچپن کا قصہ یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نماز میں قرآن شریف سُنا رہا تھا اور والد ماجد مرحوم سُن رہے تھے میں اس میں زمانے صرف ونحو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بڑھا کرتا تھا۔ جب میں نے یہ آیت پڑھی فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ۔ تو يُعَذِّبُ کی ذال کو مفتوح پڑھا اور اپنے ذہن میں عَذَابَهُ کی ضمیر کا مرجع نائب فاعل انسان کو جو اس کے قبل آیت میں مذکور ہے قرار دیا اور کسر ذال کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہ آئی والد صاحب مرحوم نے ٹوکا میں نے پھر وہی پڑھا اُنھوں نے مکرر ٹوکا میں نے پھر وہی پڑھا اُنھوں نے تیسری بار پھر ٹوکا تو میں نے یکسرِ ذال

پڑھا لیکن دل میں یہ خیال رہا کہ والد صاحب نے صحیح نہیں بتلایا۔ جب سلام پھیرا تو انھوں نے پوچھا کہ تم اِتنا اصرار کیوں کرتے تھے میں نے کہا کہ کسرہ کے معنی نہیں بنتے اس لئے غلط ہے قرآن دیکھا گیا تو کسرہ نکلا۔ مارے وہم کے اور قرآن دیکھا سب میں وہی کسرہ۔ آخر اپنی غلطی ظاہر ہوئی یہ مثال کے طور پر اپنا ایک واقعہ بیان کردیا ہے اسی طرح اور بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن حفظ کی بدولت وہ سب صحیح ہو جاتی ہیں اور اگر حافظ باقی نہ رہیں تو باوجود علماء کے ہونے کے بھی تحریف ممکن ہے تو یہ سب حافظوں کی بدولت ہے کہ قرآن صحیح موجود ہیں اب فرمائیے کہ حفظ کی کتنی ضرورت ثابت ہوئی بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ اگر حفظ کرنے کا سلسلہ بند ہوجائے اور پڑھنا پڑھانا چھوٹ جائے اور قرآن کے صحیح نسخے موجود ہوں تب بھی صحیح نہیں پڑھے جاسکتے اِس کی تائید کے لئے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں میرے بھائی ریل میں سوار تھے اور ایک تفسیر اُن کے ہاتھ میں تھی جو کہ ٹائپ کے چھاپے کی چھپی ہوئی تھی ایک صاحب بہادر بھی اُسی درجے میں سوار تھے بھائی سے کہنے لگے کہ میں اس کتاب کو دیکھ سکتا ہوں اُنھوں نے کہا کہ دیکھئے آپ نے تفسیر کو اُٹھاکر دیکھا اوّل ہی الٓرا نکلا صاحب بہادر نے بہت دیر تک اُس کو سوچا جب سمجھ میں نہ آیا تو بھائی سے پوچھتے ہیں یہ کیا ہے؟ آلو؟ بھائی نے تفسیر ہاتھ سے لے لی اور کہا کہ یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ اپنی اِس تجویز پر اُس روزِ بد کو سوچکر دیکھئے کہ جبکہ آپ بھی اس انگریز کی طرح الٓرا کو آلو پڑھنے لگیں گے۔ واللہ جب تک کسی پڑھے ہوئے سے نہ پڑھا جائے ممکن ہی نہیں کہ الٓرا یا اُس کے مثل دوسرے الفاظ کو صحیح پڑھ دیا جاوے آخر یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ تلفّظ میں الف لآم را علیحدہ علیحدہ پڑھے جائینگے اور اگر کوئی کہے کہ اِس کے صحیح پڑھنے کی ضرورت ہی کیا تو اُس کا جواب یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے جو اِس حد تک پہنچ چکے ہوں اِس وقت ہماری گفتگو نہیں ہے ایک اور دلیل حفظِ قرآن کے ضروری ہونیکی بیان کرتا ہوں اور دلیل اس وقت

کے مذاق کے اعتبار سے بہت عجیب دلیل ہے اُس کے لئے اوّل دو مقدمے سنئے۔
پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جتنی ارضی و سماوی کتابیں ہیں اُن میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ یاد ہوکر یاد رہ سکے اور اگر کسی نے یاد بھی کرلیا تو بہت بڑے حافظے کی ضرورت ہے اور قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جاتا ہے اور بہت تھوڑی عمر میں لڑکے اُس کو حفظ کرلیتے ہیں چنانچہ قصبۂ پانی پت میں تو اگر دس برس کا بچّہ حفظ نہ کرے تو کہتے ہیں کہ کیا بوڑھا ہوکر حفظ کرے گا اور اکثر لڑکیاں بھی وہاں کی حافظ ہوتی ہیں اور سبع کی جاننے والی لڑکیاں متعدّد ہیں اور قرآن شریف کے حفظ کے ایسے عجیب و غریب قصّے ہیں کہ لوگ سُنکر تعجب کرتے ہیں چنانچہ میرے ایک دوست بردوان کے رہنے والے ہیں انھوں نے تین ماہ سے بھی کم میں قرآن شریف حفظ کرلیا تھا ایک اور میرے دوست نے اپنے پیر یعنی میرے اُستاد کو خواب میں دیکھا کہ اُنھوں نے اُن کو اپنے سینے سے لگایا اور اُن کے سینے میں ایک نور داخل ہوا اُنھوں نے ایک مُعبّر سے بیان کیا اُنھوں نے تعبیر یہ دی کہ تم کو قرآن شریف حفظ ہو جائے گا چنانچہ انھوں نے یاد کرنا شروع کیا سو چھ ماہ میں اچھا خاصہ حفظ ہوگیا ایک اور قصہ یاد آیا ایک واعظ مظفرنگر میں وعظ کہہ رہے تھے ایک آیت میں قصداً رُکے اور حاضرین سے خطاب کیا کہ اِس مجلس میں جتنے حافِظ ہوں کھڑے ہوجائیں تاکہ میں اُن سے یہ آیت پُوچھ سکوں اِس کو سُنکر ایک جماعت کثیر کھڑی ہوگئی اُنھوں نے کہا کہ صاحبو! مجھ کو آیت یاد ہے میں نے صِرف یہ دکھلانا چاہا کہ مُسلمانوں کے اِس اتفاقی اور مختصر مجمع میں جہاں خاص حُفّاظ ہی کو جمع نہیں کیا گیا ایسی تعداد سے مذہبی کتاب کے برزبان یاد رکھنے والے موجود ہیں کیا دوسری کوئی قوم قصداً جمع کرکے بھی اِس قدر تعداد اپنی مذہبی کتاب کے حافظوں کی دکھلاسکتی ہے۔
غرض قرآن مجید بہت سہولت سے یاد ہوتا ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اِس زمانے میں عقلاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں

کہ نیچر ہر زمانے میں اُس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے میں اس کو شرعی اصطلاح میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہر زمانے میں اُس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں مقدموں کے ممہّد ہونے کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ مادہ طبیعت میں ودیعت کیا ہے کہ قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فطرۃً اس کے حفظ کی ضرورت ہے۔ تو صاحبو! اپنے نیچر کی مخالفت نہ کرو۔ سنا ہے کہ نول کشور کے ہاں ایک پتھر قرآن لکھا ہوا نالی پر رکھا ہوا تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سہارنپوری نے اُسے دیکھا تو اُس سے کہا۔ منشی صاحب! یہ تو ہمارے اور آپ کے دونوں کے نزدیک معظم ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن شریف ہونے سے اور آپ کے نزدیک پتّھر ہونے سے کہ مادہ بُت کا ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہیں اُن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے سے اور جو لوگ نیچر کے متبع ہیں اُن پر نیچر کے کہنے سے اِس کی حفاظت ضروری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حافظ بننا ضروری ہے۔ ہاں آپ ڈریے نہیں۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ ہر شخص حافظ ہو البتہ ہر شخص پر حفظ کو ضروری سمجھنا ضروری ہے مگر ضروری سمجھنے کی یہ علامت نہیں کہ صرف مُنہ سے کہنے لگو کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس کا ضروری ہونا دل میں رچ جانا چاہیے اور اِس کا پتہ آثار سے خود بخود چل جاتا ہے دیکھئے اگر شراب نہ پی ہو تو کبھی وجد اور بے ہوشی نہیں ہوگی اگرچہ زبان سے کتنا بھی کہا جائے کہ شراب پی ہے اور جب پی جائے گی تو فوراً ہی اُس کا اثر بھی ظاہر ہوگا اگرچہ اُس کو کتنا ہی روکا جائے تو محض یہ کہدینا کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کافی نہیں ہے بلکہ دل سے ضروری سمجھنا چاہیے۔ جس پر آثار بھی مُرتّب ہوں اور عمل بھی ہو۔ اور اگر کہیئے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ سارے کام ہم ہی کریں ضروری بھی ہم ہی سمجھیں اور اُس پر عمل بھی ہم ہی کریں۔ دُنیا میں اور لوگ بھی تو ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے پس ضروری سمجھنا بھی جب کبھی متحقق

ہوگا اپنے لوازم کے ساتھ متحقق ہوگا اور وہ عمل ہے اِس اعتراض پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ۔حضرت مولانا محمود حسن صاحب سلمہٗ کے ہاں ایک طالب علم تھے نہایت ہی کم سمجھ ایک مرتبہ سبق میں اُنھوں نے مولانا سے ایک سوال کیا جو متضمن ایک دعوے کو تھا مولانا نے فرمایا کہ اِس کی دلیل بیان کرو تو آپ فرماتے ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ سارے کام ہم ہی کریں دعوے بھی ہم ہی کریں دلیل بھی ہم ہی بیان کریں پس دعوے ہم نے کردیا ہے دلیل آپ بیان کردیں۔ اب غور کیجئے کہ اِس حکایت پر سب کو ہنسی آتی ہے لیکن اپنے اِس خیال پر کہ جب ہم حفظ قرآن شریف کو ضروری سمجھتے ہیں تو ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہنسی نہیں آتی۔ حالانکہ دونوں واقعے ایک ہی مرتبے میں ہیں۔ صاحبو! غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر سب کے سب اِسی پر متفق ہوجائیں کہ ہم کو محض ضروری سمجھ لینا کافی ہے اور اِس سمجھنے پر عمل ایک بھی نہ کرے تو آخر قرآن شریف کو حفظ کون کرے گا؟ کیا یہود اور نصاریٰ کریں گے؟ اور اِس وقت جو رنگ پلٹ رہا ہے اور زمانے کی رفتار میں جو تغیّر ہوگیا ہے اُس پر نظر کرکے یہ بھی بعید نہیں معلوم ہوتا اگرچہ ابھی تک اِس تغیّر کی ابتدائی حالت ہے کہ سنبھالنے سے سنبھل سکتی ہے لیکن اگر اس پر توجہ نہ کی گئی تو پچاس برس کے بعد بالکل ہی نئی حالت ہوگی۔ اس واسطے کہ اس وقت مسلمانوں نے اکثر قرآن شریف کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور دوسری قوموں نے بہ غرض اعتراض کرنے کے پڑھنا شروع کیا ہے تو اگر یہی رفتار رہی تو چند روز میں عجب نہیں کہ مسلمانوں کو اسلام سے بُعد اور اِن کُفّار کو اسلام سے قرب ہوتا جاوے۔ اور اسلام سے بُعد کا پہلا زینہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دین کو چھوڑ صرف دُنیا کے حاصل کرنے پر متوجّہ ہو رہے ہیں اور تحصیلِ دین کو مخلِ دنیا سمجھ رہے ہیں اور واقعی حقیقت یہ ہے کہ دُنیائے حلال دین کے ساتھ سایہ کی طرح ہے اگر کوئی سائے کو پکڑنا چاہے تو اُس کی صُورت یہی ہے کہ اصل چیز کو حاصل کرے تو دُنیا بھی جبھی حاصل ہوسکتی ہے کہ جب دین کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا ہو

آج افسوس ہے کہ فلسفہ و حقیقت شناسی کی اتنی بڑی ترقی ہے لیکن لوگ دنیا کی حقیقت میں ذرا غور نہیں کرتے محض مال اور جاہ کی طلب کو اصلِ مقصود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ امر دیکھنے کے قابل ہے کہ مال کیوں مقصود ہے اور جاہ کیوں مطلوب ہے۔ سو مال تو جلب منفعت کے لئے مطلوب ہے اور جاہ دفعِ مضرت کے لئے یعنی ہم کو بڑائی کی اتنی ضرورت ہے کہ ظالموں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں دیکھئے سقّے چمار وغیرہ بیگار میں پکڑے جاتے ہیں کیوں کہ وہ ذی جاہ نہیں اور جاہ ایک قدرتی قلعہ ہے۔ تو یہ دونوں چیزیں جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کیلئے ہیں۔ پس مال اِس قدر کافی ہے کہ جس سے ہم منافع حاصل کرسکیں۔ اب لوگوں نے نفسِ مال کو معبودِ مطلق بنا رکھا ہے تو یہ کتنی بڑی فلسفی غلطی ہے۔ صاحبو! اصل مقصود محض دین ہے جب وہ حاصل ہو جاتا ہے تو دوسرے مقاصد خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ خدا کے کام میں لگے ہیں اُن میں کوئی بھی پریشانی میں مبتلا نہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اہل اللہ اس قدر آسائش میں ہیں کہ اہلِ دنیا کو بھی اُتنی آسائش نصیب نہیں ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اوّل ایک بڑے سے بڑے دنیا دار کے پاس ایک مہینہ رہیئے اس کے بعد اہل اللہ میں سے کسی ایک کے پاس ایک مہینہ بھر رہ کر دیکھئے پھر دونوں کی حالت میں موازنہ کیجئے آپ کو صاف معلوم ہوگا کہ وہ دنیا دار طرح طرح کے افکار میں مبتلا ہے اور یہ دیندار پریشانی سے محفوظ و مامون ہے۔ یہ تو مال کی غایت تھی۔ رہی جاہ اُس میں بھی اہل اللہ دنیا سے زیادہ بڑے ہوئے ہیں۔ عزّت جس چیز کا نام ہے وہ انہی حضرات کو نصیب ہے کیونکہ عزّت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو عزّت زبان سے اور ایک دل سے۔ اہلِ دنیا کی جو کچھ عزّت ہوتی ہے وہ محض زبان اور ہاتھ پیر سے ہوتی ہے یعنی لوگ ظاہر میں اُن کی عزّت کرتے ہیں دل میں کسی قسم کی وقعت اُن کی نہیں ہوتی اور اہلُ اللہ کی عزّت دل سے ہوتی ہے دوسرے اہل دنیا اور اہل اللہ میں اس سے بھی زیادہ

ایک فرق ہے۔ اور وہ ایک تمدنی مسئلہ ہے یعنی معزز وہ شخص کہلائے گا کہ جو اپنی قوم میں معزز ہو ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مجموع مرکب ہیں قوم وہ جماعت ہے جس کے احاد زیادہ ہوں جیسے کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ گیہوں کا ڈھیر وہ کہلائے گا جس میں گیہوں زیادہ ہوں اس پر قیاس کر کے اب میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں میں زیادہ افراد کن لوگوں کے ہیں؟ غُرباء کے یا اُمراء کے؟ ظاہر ہے کہ غُرباء مسلمانوں میں زیادہ ہیں تو مسلمانوں کی قوم غُرباء کی جماعت کا نام ہوگا۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غُرباء میں کس کی عزت زیادہ ہے۔ اہل اللہ کی یا اہل دنیا کی ہر شخص جانتا ہے کہ اہل اللہ کی عزّت غرباء میں زیادہ ہے تو قوم کے نزدیک معزز اہل اللہ ہوئے تو اس تمدّنی مسئلے سے ثابت ہو گیا کہ مال اور جاہ سے جو امر مقصود ہے وہ اہل اللہ ہی کو حاصل ہے بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ دنیا کو تمام مقصود نہیں کہتے لیکن دین اور دنیا دونوں کا جامع بننا چاہتے ہیں اور اس کو بہت بڑی خوبی اور کمال سمجھا جاتا ہے مگر یہ جمع ایسا ہوتا ہے جیسے کہ ایک شخص سارے زنانے کپڑے پہن کر اُن کے ساتھ ایک ٹوپی بھی پہن لے ظاہر ہے کہ جو شخص اسکو دیکھے گا ایک مسخری عورت کہے گا۔ جو لوگ جامع بن رہے ہیں اُن کو دیکھ لیجئے کہ غالب اُن کے اوپر دنیا ہی ہے۔ مسلمان کے جامع ہونے کے معنی تو یہ ہونے چاہئیں کہ اُس پر دین غالب ہو اور حسبِ ضرورت دنیا بھی لیتا ہو۔ غرض مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن میں سب کے سب دیندار ہوں اور چونکہ معاش کی بھی ضرورت ہے اس لئے کچھ افراد اس میں بھی لگیں اور کچھ افراد ایسے بھی ہونے چاہئیں کہ وہ محض خادمِ قوم ہوں کیونکہ اگر سب کے سب تحصیلِ معاش ہی میں پڑ جائیں تو دین کا سلسلہ آگے کو نہیں چل سکتا۔ مثلاً سررشتۂ تعلیم ہی کو لیا جائے کہ اگر اُس میں کوئی نہ جائے تو ساری نوکریاں بند ہو جائیں گی اسی طرح دین کے کام میں بھی اگر کوئی نہ لگے تو یہ کام بند ہو جائے گا لہٰذا ضروری ہے کہ ایک جماعت محض خادمانِ دین کی ہو کہ یہ لوگ اِس کے سِوا اور کوئی کام نہ کریں

اور میں اس کی ایک نظیر رکھتا ہوں کہ قانونی حکم ہے کہ جو شخص ملازمِ سرکار ہو وہ دوسرا کام نہیں کرسکتا چنانچہ اگر کسی نے کیا تو اُس کو یا ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور یا اُس دوسرے کام کے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ علیٰ ہذا سیّد صاحب کو دیکھئے کہ اُن کو دُنیا کی دُھن تھی تو اُس میں کیا حالت تھی کہ اپنی زندگی اور آسائش سب اُس میں صرف کردی۔ میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ لیکن یہ حالت ہے کہ جب کبھی کوئی رسالہ لکھتا ہوں تو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ پنسل کاغذ پاس لیکر سوتا ہوں اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر جو کچھ یاد آتا ہے اُس کو لکھتا ہوں تو اگر ایسے شخص کو کوئی دوسرا کام دے دیا جاوے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بھی خراب ہوگا اور وہ بھی۔ ایک شاعر کی حکایت مشہور ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک مصرعہ سُوجھا فوراً نماز توڑ دی اور اُس مصرعے کو لکھا۔ اگرچہ اُس کی یہ حرکت پسندیدہ نہ تھی لیکن اِس سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ جب کِسی کام کی دھن ہوتی ہے تو کیا حالت ہو جاتی ہے تو اِس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ایک جماعت کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ دین کے کام کے سوا اور کوئی کام نہ کرے۔ اور اس جماعت پر یہ الزام بھی بالکل خلافِ انصاف ہے کہ یہ قوم کے محتاج ہیں۔ البتہ اگر وہ تم سے مانگیں تو اُن کو جو چاہو سو کہو۔ سو بحمد اللہ ان کا تو یہ مذاق ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو کہنے لگے کہ ہم خدا کے مہمان ہیں اور مہمانی تین دن کی ہوا کرتی ہے اور اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ہ

اللہ کے یہاں کا ایک دن تمہارے دنوں کے حساب سے ایک ہزار سال کا دن ہوگا حضرات

واللہ اِس وقت بھی ایسے خدا کے بندے موجود ہیں کہ لوگ اُن کو دیتے ہیں اور وہ نظر بھی نہیں کرتے۔ اور اُن کی وہ حالت ہے کہ ؎

دلا رامے کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر تم محبوب رکھتے ہو تو دل کا تعلق اسی سے رکھو اور اپنی نگاہ کو سارے عالم سے بند ہی کرلو

وہ ایک ہی ذات میں ایسے مُنہمک ہیں کہ کسی دوسرے کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا

شاہِ نیمروز نے ایک بزرگ کو لکھا (دیکھئے اِس حکایت سے معلوم ہوگا کہ دینے والے درخواست کرتے ہیں اور لینے والے صاف انکار کر دیتے ہیں) کہ میں چاہتا ہوں اپنا آدھا ملک نیمروز آپ کے حوالے کردوں آپ نے جواب میں تحریر فرمایا ؎

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد | در دل اگر بود ہوسِ مُلکِ سنجرم

زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب | من مُلکِ نیمروز بیک جَو نمے خرم

اگر میرے دل میں مملکت سنجر کی ہوس ہو تو میرا مقدر چتر سنجری کی طرح سیاہ ہو جاوے کیونکہ مجھے دولت نیم شبی کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اس لئے میں زوال پذیر دولت نیم روز کو ایک جو کے بدلے میں بھی نہیں لوں گا۔

غور کیجئے کہ اُدھر سے اصرار ہے اور اِدھر سے سوکھا جواب۔ کہ ہم کو کوئی ضرورت نہیں اور اِس میں تصنع نہیں تھا ورنہ اثر کیوں ہوتا۔ تو جب وہ آپ سے مانگتے نہیں تو آپ کو کیا فکر ہے اور جب یہ بات ہے تو آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں سے کھائیں گے اور اگر کہئے کہ یہ تو شافی جواب نہ ہوا کیونکہ اِس میں یہ تو پتہ ہی نہ چلا کہ آخر کہاں سے کھائینگے تو صاحبو یہ جواب تو میں نے معترضین کی رعایت کر کے دیدیا تھا۔ لیجئے اب میں اصلی جواب دیتا ہوں لیکن اس میں معترضین کی رسوائی ہوگی۔ اُس جواب کے لئے اوّل میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے نکاح کیا اور جب بیوی اُس کے گھر آئی تو وہ بیوی سے پوچھنے لگا کہ تم نے نکاح تو کرلیا مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے تو وہ بیوی اُس کو کیا جواب دے گی ظاہر ہے کہ یہ جواب دے گی کہ میاں میں تمہاری جیب سے لے کر کھاؤں گی اور کہے گی کہ تم کو یہ پوچھتے ہوئے شرم نہیں آتی اِس سوال سے خود اپنی بے عزتی ظاہر کر رہے ہو۔ اور یہ جواب نہایت سچا اور حق جواب ہوگا۔ جب یہ مثال سمجھ میں آگئی تو اب میں اُس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ یہ لوگ انہی معترضین کی جیبوں سے وصول کر کے کھائیں گے اور اِس سوال سے یہ معترضین اپنی قلعی کھول رہے ہیں کہ ہم میں حمیت نہیں ہے کہ خادمانِ دین کی خدمت کو ضروری نہیں سمجھا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ شرعی مسئلہ ہے کہ جو شخص کسی کام میں محبوس

ہو اُس کا نان نفقہ اُس پر واجب ہوتا ہے چنانچہ بیوی کا نان نفقہ اِسی لئے شوہر پر واجب ہے چنانچہ اگر وہ از خود اپنے گھر چلی جائے تو شوہر پر اُس کا نفقہ واجب نہیں رہتا حالانکہ بیوی اس وقت بھی رہتی ہے۔ اسی طرح قاضی کا نفقہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ لوگوں کی ضرورت میں محبوس ہے۔ اب دیکھئے کہ بیت المال کس چیز کا نام ہے۔ سو بیت المال کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اموال کا مجموعہ اور بلفظ دیگر مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے مگر چندہ ذلیل لفظ ہے اور بیت المال اور خزانہ معظّم لفظ ہے لیکن حقیقت ایک ہی ہے چنانچہ بادشاہ کو جو خزانۂ شاہی سے تنخواہ ملتی ہے وہ خزانہ کیا چیز ہے کیونکہ خزانہ بھی مسلمانوں کے پیسہ پیسہ دو دو پیسہ کے مجموعہ کا نام ہے تو اگر یہ ذلت ہے تو بادشاہ نے بھی یہی کیوں لیا نیز تمام حکام کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ اسی مد میں سے ملتی ہے کیونکہ وہ اس قدر محبوس اور مجبور ہوتے ہیں کہ اگر کوئی دوسرا کام کریں تو مجرم سمجھے جاتے ہیں اور لیجئے جب کسی کو گواہی میں طلب کیا جاتا ہے تو اُس کی خوراکی دیجاتی ہے اور اُس کی مقدار متفاوت ہوتی ہے یعنی بڑے آدمی کے لئے زیادہ اور ادنیٰ درجے کے لئے کم۔ اس میں بھی وہی راز ہے کہ اس مدت تک یہ شخص من لہ الشہادۃ کے کام میں محبوس رہا۔ یہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ کفار تک نے بھی اس کو سمجھا۔ تو خادمانِ قوم جب قوم کے کام میں لگے ہیں تو وہ بھی اپنا خرچ قوم سے لیں گے اور اگر یہاں نہ ملے گا تو خدا تعالےٰ کے ہاں نالش کر کے لیں گے۔ غرض عقلاً نقلاً دونوں طرح یہ مسئلہ ثابت ہے مگر چونکہ ہماری قوم کو اُس وقت تک تسلّی نہیں ہوتی جب تک کہ دوسری اقوام کو بھی کوئی کام کرتے بھی نہ دیکھ لیں اس لئے ایک تیسری دلیل بھی بیان کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آریا اپنے مذہب کی اشاعت میں بہت سرگرم ہیں انھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ایک جماعت اُن میں مذہب ہی کی حمایت کرنے کے لئے رہے اور تمام قوم اُس جماعت کی متکفّل ہو۔ صاحبو! افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسی قوم جس کے پاس مذہبی جماعت نہ تھی اُس نے مذہبی جماعت تیار کرنے کی کوشش کی اور تمہارے پاس

ایک عظیم الشان جماعت موجود ہے اور تم اس کو توڑنے کی فکر میں ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نہ بھی کفالت کرو بلکہ تمام لوگ اس جماعت کے مخالف ہو جائیں اور سب اس کو دینا اور مدد کرنا بند کر دیں۔ تب بھی یہ جماعت قائم ہی رہے گی۔ اور مولوی کھاتے ہی رہیں گے۔ اگر کہیئے کہ کیونکر کھاتے رہیں گے اور کہاں سے ان کو ملے گا تو لیجئے میں بتلاتا ہوں کہ کہاں سے ان کو ملے گا قرآن شریف میں ارشاد ہے هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ ۖ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِۦ ۚ وَٱللَّهُ ٱلْغَنِىُّ وَأَنتُمُ ٱلْفُقَرَآءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا۟ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا۟ أَمْثَٰلَكُم ۝ حاصل ترجمہ اس کا یہ ہے کہ تم کو انفاق فی سبیل اللہ کے لئے بلایا جاتا ہے مگر بعضے بخل کرتے ہیں اور اس بخل سے اپنا ہی نقصان کر رہے ہو ورنہ خدا تعالیٰ غنی ہے اور تم محتاج ہو اگر تم اس سے بے توجہی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دیں گے اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے (بلکہ وہ انفاق والے ہوں گے) یعنی وہ تم جیسے کم ہمت بد دل نہ ہوں گے تو حاصل جواب کا یہ ہوا کہ اگر تم نہ دو گے تو خدا تعالیٰ دوسری قوم کو پیدا کر دیں گے جو کہ دین کی خدمت کرے گی۔ اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ قوم کہاں سے پیدا ہو گی تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ روزانہ یہ سلسلۂ خلق جاری ہی ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت تمام عالم کے انسانوں کی حالت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہیں وہ اسلام کے احکامات اور اس کی تعلیمات کو چھوڑ چھوڑ کر اس سے دور ہو رہے ہیں اور نا مسلم لوگ اسلام کی خوبیوں کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور جزئیاتِ شرع کے اسرار و حِکَم تک بیان کرنے کا ان کو خیال ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر نے مٹی کے ڈھیلے سے استنجا پاک کرنے کے متعلق کہا ہے کہ مٹی بہت سے قروح کا علاج ہے تو پیشاب میں جو مادہ تیزاب کا ہے اس کی مضرت رد کرنے کے لئے مٹی کا استعمال مصلحت ہے۔ اسی طرح ایک اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کا ارشاد دیکھا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اگر کتا برتن کو چاٹ جائے تو اُس کو سات مرتبہ دھوڈالو اِن سات دفعہ میں ایک دفعہ مٹی سے بھی دھو ڈالو۔ اِس ارشاد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ مٹی سے دھونے کو کیوں فرمایا کیا سات مرتبہ پانی سے دھونا کافی نہیں آخر بہت دنوں کی چھان بین اور تلاش کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مٹی میں ایک جُز و نوشادر کا بھی ہے اور نوشادر لُعاب کلب کی سمیّت کا دافع ہے مگر ہر جگہ وہ میسّر نہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی چیز ارشاد فرمائی جو کہ ہر جگہ میسّر ہو اور بآسانی میسّر ہو یعنی مٹی۔ تو مسلمانوں کی وہ حالت ہے اور غیر مسلموں کی یہ حالت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہید ہے اُس دن کی جس دن کہ عجب نہیں کہ ایسے مسلمان خارج از اسلام ہو جائیں اور ایسے غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور اگر مسلمانوں کو اس امر کا خیال ہے کہ یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑے اور حفاظت اسلام کی سعادت تمہارے نام رہے تو سنبھلو اور کام میں مشغول ہو جاؤ۔ مسلمانوں کا ہرا بھرا کھیت سوکھتا ہے لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا اگر ذرا سی توجہ بھی یہ کریں تو کافی ہوگا ورنہ مجھے اِس وقت کی حالت سے سخت اندیشہ ہے۔ غرض یہ معلوم ہو گیا کہ خادمان دین کی خدمت اور ان کی مدد خود غیب سے ہو گی اب جس کا جی چاہے اپنے نفع کے لئے اِس سعادت کو حاصل کرے اُن کو کسی خاص شخص یا خاص جماعت کی کوئی ضرورت نہیں اُن کی وہ حالت ہے کہ گرنستانی بستم میرسد۔ اور میں اہل انجمن اور اہلِ مدارس کو بھی یہی رائے دیتا ہوں کہ وہ مانگنا بالکل چھوڑ دیں انشاءاللہ جس دن یہ ایسا کریں گے خدا تعالےٰ اِن کو بہت کچھ دیں گے ارشاد ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۔ اللہ تعالےٰ جسے چاہتے ہیں بے گمان رزق دیتے ہیں۔ تو ایک خاص جماعت تو ایسی ہونی چاہیئے مگر ہر شخص چونکہ خادمِ دین نہیں ہو سکتا اس لئے اکثر کو یہ کرنا چاہیئے کہ ؎

چو باز باش کہ صیدے کنی ولقمہ دہی طفیل خوارہ مشو چوں کلاغِ بے پرّ بال

کسی کے لقمہ خوار نہ بنو بلکہ خود شکار کرو اور کھاؤ۔

یعنی یہ لوگ، کمائیں اور دوسروں کی مدد کریں اور اس حالت سے کوئی اہل اللہ کو طفیل خوار نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ سرکاری لوگ ہیں دیکھئے گورنر جنرل کو کثیر التعداد رقم ہر مہینے ملتی ہے حالانکہ بظاہر اُس کو کوئی ایسا بڑا کام نہیں کرنا پڑتا لیکن محض اس لئے کہ اُس کا کام دماغی کام ہے تو حضرات اہل اللہ پر جو گذرتی ہے اور جو دماغ سوزی اُن کو کرنی پڑتی ہے اگر آپ پر وہ گذرے تو چند روز میں جنون ہوجائے اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اہل اللہ پر اپاہج ہونیکا الزام بھی بالکل غلط ہے وہ ہرگز اپاہج نہیں ہوتے ہاں وہ بدن کے اعتبار سے اپاہج ہیں سو یہ فخر ہے اُنکی یہ شان ارشادِ خداوندی میں مذکور ہے اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ وہ اللہ تعالٰے کے راستہ میں اس قدر جکڑ دیئے گئے ہیں کہ زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رہی۔ تو یہ عدمِ استطاعت مایۂ فخر ہے نیز یہ خود کہتے ہیں کہ ؎

ما اگر قلاشں دگر دیوانہ ایم مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس ہیں تو دوسرے کے دیوانے ہیں وہ مست ساقی ہیں ہم اس کے پیمانے ہیں۔

یہ اگر طفیلی ہیں تو اُسی کے طفیلی ہیں اور اِن کا جسم گو مُعطّل ہے لیکن اِن کی روح ایک بہت بڑے کام میں ہے۔ اِن کی روح نے اُس بارِ گراں کو اُٹھایا ہے جس کے اُٹھانے کی پہاڑ بھی تاب نہیں لاسکتا اور زمین آسمان سے بھی نہیں اُٹھ سکا چنانچہ ارشاد ہے لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے کہ تم دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ہم نے قرآن کی امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اس بار امانت کو اٹھانے سے انکار کردیا اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا تو جس کی روح اتنا بڑا بار گراں اٹھائے ہوئے ہے وہ اپاہج کیسے کہا جاسکتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حالِ شیرانے کہ شمشیرِ بلا بر سر خورند

لے وہ شخص کہ جس کے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ان شیروں کا حال کیا جان سکتا ہے کہ
اپنے سروں پر مصیبت کی تلوار کے زخم پر زخم کھائے جاتے ہیں۔

آپ کو کیا خبر اُن پر کیا گذرتا ہے۔ صاحبو! وہ اُس مشقت میں ہیں جس کا ایک نمونہ یہ ہے فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اگر وہ ایمان نہ لاویں تو آپ تو اپنے آپ کو ہلاک کریں گے۔ غور کیجئے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا گذرتی ہوگی جو یہ لفظ فرمایا گیا۔ تو اکثر لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ تحصیل معاش کی طرف متوجہ ہوں لیکن دیندار ہونا اُن کا بھی ضروری ہے اور احکام شریعت پر چلنا اور دین کی حفاظت کرنا اُن کو بھی لازم ہے محض ضروری سمجھنے پر بس کرنا کافی نہیں۔ دیکھئے اگر ایک جائداد کئی آدمیوں میں مشترک ہو کہ ایک کے اُس میں آٹھ آنہ ہوں دوسرے کے چار آنہ تیسرے کے دو آنہ چوتھے کا ایک آنہ اور کوئی ظالم اُس جائداد پر دستبرد کرے تو کیا ایک آنہ کا شریک خاموش ہو کر بیٹھے گا ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ مشترک چیز کی حفاظت تمام شرکاء کو چاہیئے اسی طرح قرآن شریف مسلمانوں کی مشترک جائداد ہے اس لئے اس کی حفاظت بھی سب کو کرنی چاہیئے اور اگر کہئے کہ مشترک نہیں تو مہربانی کر کے یہ لکھ کر کے دید یجئے کہ ہم اُس کو شائع کر دیں پھر ان لوگوں سے ہم ہرگز اسکی حفاظت کا خطاب نہ کریں گے اور انشاء اللہ کوئی بھی نکرے گا اور جب یہ گوارا نہیں تو معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ بھی ضروری ہے اور دوسروں کو بھی اِس کا حق ہے کہ وہ آپ سے جبراً اس کی حفاظت کرائیں خواہ مال لے کر یا کسی دوسرے طریقے سے۔ اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ چین و آرام تو ہر طرح کا ہم کو رہے اور مصیبت و مشقت دوسروں پر رہے ہم جس طرح چلیں مولوی ہمارے تابع ہو جائیں اور ہمارے جادۂ موصل الی المستقر سے سرمو ہم کو نہ ہٹائیں۔ میں ایسے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ پُرانے مولوی تو تمہارے قابو سے نکل چکے ہیں وہ تمہارے تابع نہیں ہوں گے اُن سے یہ اُمید رکھنی تو فضول ہے البتہ تم اپنی اولاد کو پڑھاؤ وہ تمہارے کہنے میں ہوگی اُن سے اپنی مرضی کے موافق کام لینا۔ مگر ہم نے آج تک کسی ہمدرد قوم کو نہ دیکھا کہ اُس نے قومی ہمدردی میں اپنی

اولاد کو پڑھایا ہو۔ کیونکہ سمجھتے ہیں کہ علمِ دین پڑھ کر ہماری اولاد کو یہ بڑے بڑے عُہدے کہاں سے مل سکیں گے۔ اور کسی نے اپنی اولاد میں سے کسی کو علم دین کے لئے تجویز بھی کیا ہے تو اُس کو جو سب میں احمق اور کودن ہو۔ سبحان اللہ کیا علوم شریعت کی قدر کی ہے۔ صاحبو! غور کیجئے کہ جب سارے اُلّو ہی پڑھیں گے تو وہ تو اُلّو ہی رہینگے مولوی منفعت علی صاحب سلمہٗ سے ایک شخص نے کہا کہ کیا وجہ علماء میں اب رازیؒ و غزالیؒ پیدا نہیں ہوتے انھوں نے کہا کہ اُس وقت انتخاب کا قاعدہ یہ تھا کہ قوم میں جو سب سے ذہین اور ذکی ہو وہ علومِ دین کے لئے منتخب ہوتا تھا اور اب انتخاب کا یہ قاعدہ ہے کہ جو سب میں احمق اور غبی ہو وہ اُس کے لئے تجویز ہوتا ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اب بھی جو ذہین و ذکی پڑھتے ہیں وہ غزالیؒ اور رازیؒ سے کم نہیں ہوتے۔ میرے ساتھ چلو اور علماء کی حالت دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ اِس وقت بھی غزالیؒ اور رازیؒ سب موجود ہیں اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں لیکن عدد میں کم ضرور ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ جو لوگ قابل ہیں وہ تو اِدھر متوجہ نہیں ہوتے ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر بیس آدمی ایسے پڑھیں تو اُن میں پندرہ غزالیؒ اور رازیؒ ضرور نکلیں گے۔ اب بیچارے غریب غُرباء جولاہے، دُھنئے پڑھتے ہیں اُن کی جیسی سمجھ ہوتی ہے ویسے ہی نکلتے ہیں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ غریب غرباء کے بچّوں کو نہ پڑھایا جائے کیونکہ اُمراء نے خود چھوڑا اور ان سے ہم چُھڑا دیں تو پھر علم دین کس کو پڑھائیں نیز غریب غُرباء کیا کریں انگریزی تو پڑھ نہیں سکتے کیونکہ اُسکی تعلیم نہایت گراں ہے اور عربی ہم نہ پڑھائیں تو یہ بیچارے تو بالکل ہی کورے رہے۔ اور واقعی علم دین ایسی عجیب چیز ہے کہ اُس میں محنت بھی کم اور خرچ بھی کم بہ خلاف انگریزی کے علمِ دین کی ارزانی دیکھئے کہ اگر کوئی شخص میزان سے اخیر تک ایک کتاب بھی نہ خریدے تو ہر کتاب اُس کو میسر آسکتی ہے۔ اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے تمام درسیات مدرسوں سے مستعار ہی لے کر پڑھی ہیں۔ آپ ایک شخص کو بھی نہیں بتلا سکتے کہ جس نے بی اے تک پڑھا ہو اور اُس کو قریب قریب کُل کتابیں نہ خریدنی پڑی ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دینی تعلیم نہایت ارزاں اور دُنیاوی تعلیم نہایت گراں ہے
اِس پر مجھے اپنے بھائی کا ایک مقولہ یاد آیا ایک مرتبہ انہوں نے والد صاحب سے کہا
کہ اس کی کیا وجہ کہ آپ مجھ سے تو حساب لیتے ہیں اور بڑے بھائی سے نہیں لیتے حالانکہ
میرا خرچ بھائی سے بہت زیادہ ہے مجھ کو تو اگر ایک قلم کی ضرورت ہو تو وہ بھی آٹھ آنے
کو آئے گا اور وہ تو چھپّر میں سے ایک سیٹھا نکال قلم بنالیں تو کارروائی ہوسکتی ہے
تو دیکھئے کس قدر ارزاں ہے اور یہی دلیل ہے اِس کے معزز ہونیکی کیونکہ فطرت کا
قاعدہ ہے کہ جتنی ضرورت کی چیز ہوتی ہے اُسی قدر سستی ہوتی ہے اور ہر جگہ میسّر آسکتی
ہے اور جس قدر بیکار ہوتی ہے اُسی قدر گراں اور کم یاب ہوتی ہے یہ خدا تعالےٰ
کی عجیب قدرت ہے۔ اِسی پر غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو کہ عربی کی کیا قدر ہے اور
انگریزی کی کیا قدر ہے یعنی عربی کی طرف زیادہ توجہ ہونی چاہیئے کیونکہ وہ زیادہ
ضرورت کی چیز ثابت ہوئی اور انگریزی کی طرف کم اور کم متوجہ ہونے کی اجازت
بھی دینداروں کے لئے ہے ورنہ جن کے دین بگڑ جانے کا ڈر ہے اُن کو تو انگریزی سے
قطعاً روکا جائے وہ انگریزی کو بالکل چھوڑ دیں صرف عربی کی طرف متوجہ ہوں۔
یہاں تک اصلاح یا حفاظتِ دین کی ضرورت کے واسطے عربی کا ضروری ہونا ثابت
ہوا۔ اب میں اخیر درجہ کہتا ہوں کہ اگر خدا کے لئے عربی نہ پڑھو تو کم سے کم انگریزی ہی
کے لئے عربی ضرور ہی پڑھ لو توضیح اِس کی یہ ہے کہ علومِ عربیہ کے پڑھنے سے استعداد
میں ترقی ہوتی ہے اور اِس استعداد سے انگریزی تعلیم میں بہت مدد ملتی ہے۔ میرے
سب سے چھوٹے بھائی ٹریننگ مرادآباد میں گئے وہاں اُن کی ذہانت کی یہ حالت تھی
کہ تمام لوگ متحیّر تھے حتّٰی کہ اُن کے ماسٹر بھی اُن کی ذہانت سے عاجز تھے۔ ایک دفعہ یہ واقعہ
ہوا کہ رمضان المبارک کا زمانہ قریب آگیا اور ٹریننگ کے لڑکوں نے چاہا کہ کسی
حافظ کو بلا کر ایک قرآن سُنیں پرنسپل سے پوچھا تو جواب ملا کہ یہ امر جدید ہے اجازت
نہیں ہوسکتی بھائی نے کہا کہ اگر قدیم ہوتا تو اجازت مل جاتی کہا گیا ہاں۔ بھائی نے کہا
کہ آپ کے قاعدہ سے تو لازم آتا ہے کہ کبھی کوئی امر قدیم پایا ہی نہ جائے کیونکہ ہر قدیم

کسی وقت جدید تھا اور جدید ہونا مانع اجازت ہے جب اُس کی اجازت نہ ہوگی وہ قدیم کب بن سکے گا پرنسپل حیران رہ گیا آخر انہوں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارو مدار اجازت کا قدیم ہونے پر نہیں ہے بلکہ اِس پر ہے کہ اس میں کوئی مفسدہ نہ ہو تو اس میں کیا مفسدہ ہے پرنسپل نے اجازت دیدی یہ محض عربی کی استعداد کے بدولت تھا کیونکہ اُس میں احتمال آفرینی کی استعداد ہو جاتی ہے۔ ایسے بہت سے قصے اُن کے ہوئے نیز اُن کے سوا میں نے بہت سے واقعے دیکھے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر خدا کے لئے عربی نہیں پڑھتے تو اپنی انگریزی ہی کے لئے پڑھ لو۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے علم دین کے پڑھنے سے کیا فائدہ کہ اس کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ سو سمجھو کہ علمِ دین وہ چیز ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ اپنا اثر ضرور کرتا ہے اور اُس شخص کو اپنا بنا لیتا ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَاَبَى الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ لِلّٰهِ ہم نے علم کو غیر اللہ کے لئے سیکھا تو علم نے غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے انکار کردیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ علمِ عربی وہ علم ہے کہ ہر چیز کو اس سے انجلا ہو سکتا ہے اخلاق بھی اس سے درست ہوتے ہیں میں ایک انگریزی خواں کی حکایت بیان کرتا ہوں اُس سے اندازہ کرو کہ اُن پر علمِ دین نے کیا اثر کیا اور کیا یہ اثر نری انگریزی تعلیم سے آسکتا ہے اور وہ اثر کس قدر ضروری ہے واقعہ یہ ہے کہ میں جس زمانے میں کانپور میں پڑھاتا تھا ایک روز حسبِ معمول بیٹھا پڑھا رہا تھا کہ ایک نائب تحصیلدار آئے اور اپنے لڑکے کی تعلیم کے لئے ایک اُستاد کی ضرورت ظاہر کی۔ اُس وقت جو طالب علم مجھ سے پڑھ رہے تھے میں نے عربی زبان میں اُن سے دریافت کیا تاکہ یہ نہ سمجھیں میری گفتگو شروع کرتے ہی وہ کہنے لگے کہ جناب کے عربی میں گفتگو کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت کی گفتگو کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا منظور ہے لیکن میں عربی سے واقف ہوں اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں یہاں سے اُٹھ جاؤں۔ اُن کے اِس کہنے سے مجھے بیحد شرمندگی ہوئی اور یہ خیال ہوا اللہ اکبر میں نے تو اِن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا کیا اور انھوں نے میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ آخر میں نے اُن سے کہا کہ جناب یہ میری

غلطی تھی واقع میں کوئی پوشیدہ بات نہ تھی اب میں اردو میں گفتگو کرتا ہوں۔اب میں دو باتیں اس کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں اوّل تو یہ کہ کیا بدون علم دین کے یہ اثر پیدا ہوسکتا ہے سو ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں ہوسکتا دوسری بات یہ پوچھتا ہوں کہ آیا یہ اثر نہایت ضروری ہے یا نہیں ظاہر ہے نہایت ضروری ہے کیونکہ ہم کو باہم جائز نہیں کہ ہم کسی کے اسرار پر مطلع ہوں۔غرض تہذیب اخلاق تعلیم انگریزی ہر ایک کے لئے علم دین کی ضرورت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ علم دین کی جس میں قرآن شریف بھی داخل ہے ہر شخص پر حفاظت ضروری ہے۔یہ تو ضرورت کے متعلق گفتگو تھی۔اب ایک سوال اور رہ گیا ہے جو اکثر لوگوں کی زبان پر آیا کرتا ہے وہ یہ کہ قرآن شریف کو اگر پڑھا جائے تو نرے الفاظ کے پڑھنے سے کیا نفع اس سوال کا ایک جواب تو ہوگیا کہ اس کے پڑھنے کی ضرورت ہے اور ضرورت کے ہوتے کسی جدید نفع کا ہونا ضروری نہیں۔ کیا اگر کسی شخص کو پیاس لگی ہو اور وہ پانی پینا چاہے اور کوئی شخص اُس سے کہے کہ پانی پینے سے کیا فائدہ تو اُس کو یہ کہدینا کافی نہیں کہ اسوقت اسکی ضرورت ہے اگرچہ کوئی جدید فائدہ مُرتب نہ ہو۔اور اگر بالخصوص نفع ہی کی تلاش ہے تو لیجئے نفع بھی بیان کئے دیتا ہوں مگر پہلے یہ بتلایئے کہ نفع کس کو کہتے ہیں کیونکہ منشاء اشتباہ یہی ہے کہ نفع کو منحصر سمجھ لیا ہے صرف ایک ہی میں کیونکہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ جب سمجھ ہی میں نہ آیا تو طوطی کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ معلوم ہوا کہ محض سمجھنے کو نفع سمجھتے ہیں سو اِس میں ہے گفتگو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ایک شخص امتحان دینا چاہے تحصیلداری کا اور اس میں یہ قانون ہوجائے کہ جو شخص فلاں کتاب سُنادے گا وہ پاس ہوجائے گا اگرچہ اُس کتاب کو نہ سمجھے تو اگر ایسا قانون واقع میں ہوجائے تو کیا اِس قانون کے مقرر ہونے کے بعد آپ سوال کریں گے کہ اِس کتاب کے حفظ کرنے سے کیا فائدہ ہرگز نہیں تو معلوم ہوا کہ فائدہ صرف سمجھنے میں منحصر نہیں بلکہ اور بھی منافع ممکن ہیں البتہ اگر قرآن میں اس کے سوا کوئی نفع نہ ہوتا تو یہ سوال متوجہ ہوسکتا تھا اور جبکہ دوسرے منافع بھی ہیں تو یہ سوال نہیں ہوسکتا چنانچہ حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کہ جن کی شان یہ ہے کہ ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

فرمان اللہ تعالیٰ کا تھا زبان آپ کی تھی۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اُس کے لئے دس نیکیاں لکھی گئیں تو جب ایک ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی گئیں تو پورے قرآن پر کس قدر نیکیاں لکھی جائیں گی تو یہ کتنا بڑا نفع ہوا اور اگر کوئی کہے کہ نیکیوں کو کیا کریں تو سمجھو کہ نیکیاں اس وقت تم کو بیکار نظر آتی ہیں لیکن جب تم دارِ دنیا سے چل کر دارِ عقبے میں پہنچو گے تو معلوم ہوگا کہ حسنات کیسا کار آمد سکّہ تھا دیکھو اگر ایک شخص مکّہ مکرمہ جارہا ہو اور بمبئی میں پہونچکر اس کو کسی نے خاص مکّہ مکرمہ کا رائج الوقت سکّہ دیا تو اگرچہ یہ سکّہ بمبئی یا عدن میں نہیں چلتا لیکن چونکہ وہ جانتا ہے کہ میں چار دن بعد مکہ مکرمہ پہونچ جاؤں گا اس لئے یہ نہیں کہتا کہ میں اِس کو کیا کروں اور اگر کہے تو اُس کو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ آٹھ دن بعد دیکھ لینا کہ تم اس کو کیا کرو گے۔ اس وقت حسنات بیکار معلوم ہوتے ہیں لیکن جب قیامت کے میدان میں کھڑے ہو گے اور لوگوں کے اعمالنامہ وزن کئے جارہے ہوں گے اور ان کے موافق جزا مل رہی ہوگی اور تم تہیدست ہو گے اُس وقت معلوم ہوگا کہ حسنات کیا چیز تھیں فرماتے ہیں ؎

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر

بازار جو کہ بھرا ہوا رہتا ہے اس میں تہی دست کا دل پریشان رہتا ہے۔

اگر کسی عمدہ بازار میں کسی مفلس کو بھیجدیا جائے تو اُس کو انتہائی پراگندگی ہوگی کیونکہ جدھر نظر پڑے گی اچھی اچھی قیمتی چیزیں نظر آئیں گی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا افلاس اور تہیدستی بھی یاد آئے گی اس لئے حسرت بھی بڑھتی جائے گی بالخصوص جبکہ بازار جاتے وقت اس سے کہا گیا ہو کہ کچھ نقد لیتے جاؤ اور وہ چھوڑ کر چلا گیا ہو پس یہی حالت میدان قیامت میں اِن لوگوں کی ہوگی اور وہ ایسا وقت ہوگا کہ سوائے اِس سکّے کے اور کوئی سکّہ کام نہ دے گا کیونکہ کوئی چیز یہاں سے ساتھ ہی نہ جائے گی چنانچہ فرماتے ہیں

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَاءَ ظُهُوْرِكُمْ کہ تم اکیلے آئے ہو اور جتنی چیزیں ہم نے تم کو دی تھیں سب پس پشت چھوڑ آئے اور اگر لاتے بھی تو کیا ہوتا چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر تمام زمین کے خزانے بھی اس وقت مل جاتے تو انسان اپنی جان کا فدیہ دیتا لیکن اُس سے قبول نہ ہوتا۔ تواب اس کا جواب معلوم ہوگیا کہ نیکیوں کو کیا کرینگے یعنی اِس وقت اِن کی قدر ہوگی۔ وہاں نیکیوں کی یہ حالت ہوگی کہ سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہوں گی حتیٰ کہ ایک شخص کے اعمال وزن کئے جائیں گے تو اُس کے گناہ اور نیکیاں دونوں برابر ہوں گی حکم ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے لے آؤ تو تمہاری مغفرت ہو جائے گی یہ سُنکر بہت خوش ہوگا کہ بھائی بیٹا باپ ماں وغیرہ دوست احباب بہت لوگ ہیں کوئی تو ضرور ہی دے گا چنانچہ یہ سوچکر سب کے پاس جائے گا اور سب کے سب اِنکار کر دینگے سخت پریشان ہوگا اور بالکل مایوس ہوجائیگا کہ ایک شخص سے ملاقات ہوگی اور وہ اُس کی حالت کو دیکھ کر پوچھے گا کہ کس فکر میں ہو۔ یہ کہے گا کہ ایک نیکی کی تلاش میں ہوں کیونکہ میری مغفرت میں ایک نیکی کی کمی ہے لیکن کوئی شخص نہیں دیتا یہ سُنکر وہ کہے گا کہ جب صرف ایک نیکی کی کمی مانعِ مغفرت ہوگئی تو میرے پاس تو صرف ایک ہی نیکی عمر بھر کی ہے باقی تمام معاصی وہ ایک نیکی کیا کام آسکے گی۔ اچھا لو میں وہ نیکی تم کو دیتا ہوں کہ تمہاری مغفرت تو ہوجائے چنانچہ یہ شخص نہایت خوش و خرّم اس نیکی کو لے کر جائے گا اور اس کی مغفرت ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی اُس نیکی دینے والے کی بھی مغفرت ہو جائے گی۔ اس مضمون سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ نیکی کتنی قدر کی چیز ہے اور میدان قیامت میں اس کی کیا کچھ ضرورت ہوگی اور یہ کیسی نایاب ہوگی اُس وقت معلوم ہوگا کہ اگر کسی نے قرآن شریف کا ایک ختم دنیا میں کر لیا تھا تو اُس سے کیسا کچھ فائدہ اُس کو ہوا اور کتنی نیکیاں اُسکے صحیفۂ اعمال میں لکھی گئیں اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال میں سمجھئے۔ اسکولوں میں لڑکوں کو اقلیدس پڑھائی جاتی ہے بیس لڑکوں میں ایک بھی بہ مشکل ایسا ہوتا ہے کہ مسائلِ اقلیدس کو سمجھ سکے لیکن امتحان

کے زمانے میں بغیر سمجھے ہی اس کو رٹ لیتے ہیں اور اسی کی بدولت پاس ہو جاتے ہیں. اس سے معلوم ہوا کہ بے سمجھے محض رٹ لینا بھی مفید ہے. تو صاحبو کیسے افسوس کی بات ہے کہ دُنیا کی معاملات میں جو باتیں مُسلّم ہیں وہی باتیں دین کے معاملات میں پیش کی جائیں تو تردّد یا انکار کیا جاتا ہے تو ہجّے تو صحیح اور رواں غلط. ہم لوگوں کی وہ حالت ہو رہی ہے کہ جیسے ایک شخص نے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ شروع کی تھی ہجّے تو کئے ت ب زبر تب ب ت زبر بت کہا اور رواں پڑھا تو بطخ اسی طرح اِس وقت لوگ فرداً فرداً ہر مقدمے کو تسلیم کرتے ہیں اور مانتے ہیں لیکن مجموعہ مقدّمات سے جو نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بمنزلہ رواں کے ہے اس کو نہیں مانتے کیسی ہٹ دھرمی اور تعصب ہے آخر کیا وجہ ہے کہ جب سارے مقدّمات مُسلّم ہوں تو نتیجہ مسلم کیوں نہ ہو. ضرور مسلّم ہونا چاہیئے پس معلوم ہوا کہ قرآن شریف کا پڑھنا اگرچہ بے سمجھے ہو نہایت ضروری ہے اُس کی حفاظت کی وجہ سے اور نہایت مفید ہے اجرِ جزیل کے مرتب ہونے کی وجہ سے اور سب سے اوّل مسلمان کے بچّے کو قرآن شریف پڑھانا چاہیئے کیونکہ یہ تجربہ ہے کہ تھوڑی عمر میں علوم حاصل کرنے کی استعداد تو ہوتی نہیں تو قرآن شریف مُفت برابر پڑھ لیا جاتا ہے ورنہ وہ وقت بیکار ہی جاتا ہے اور بعضے لوگ بڑی عمر کے بھروسے کہ یہ خود پڑھ لے گا نہیں پڑھاتے سو مشاہدہ ہے کہ زیادہ عمر ہو جانے کے بعد نہ خیال میں وہ اجتماع رہتا ہے نہ اس قدر وقت ملتا ہے نہ وہ سامان بہم پہنچتے ہیں. فکرِ معاش الگ ستاتی ہے اہل و عیال کا جھگڑا الگ چُکتا ہے خیالات میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اِتنے موانع کے بعد کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور اگر کسی ایک دو نے کر لیا تو وہ قابلِ اعتداد نہیں ایسے مستثنیات ہر جگہ میں ہوتے ہیں مگر یہ حکم کی کلیتہ کو مبطل نہیں اور جب بڑے ہو کر پڑھنا مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہے تو عجب نہیں کہ اگر یہی حالت رہی جو اَب ہے تو چند روز میں مسلمانوں کے بچّوں کو نماز میں قرآن شریف پڑھنے کے لئے آریوں اور عیسائیوں سے قرآن شریف پوچھنا پڑے. آپ شاید اِسکو

تعجب کی نظر سے دیکھیں لیکن غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ رفتار کا یہ مآل چنداں عجیب نہیں۔ دیکھئے احکامِ شریعت کو آپ نے چھوڑا اور دوسری قوموں نے اُنکی خوبیاں دریافت کرکے اُن کو اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج آپ بہت سے اسلامی احکام کو اسلامی احکام نہیں سمجھتے بلکہ انگریزوں یا کسی دوسری قوم کے خصوصیاتِ معاشرت میں سے سمجھتے ہیں اور اُن سے لے لے کر عمل کرتے ہیں از آنجملہ مسئلہ استیذان ہے کہ شریعتِ مطہرہ کا یہ حکم ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے مکانِ خلوت میں اگرچہ وہ مکان مردانہ ہی ہو اُس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ صاحب مکان سے اجازت نہ لے لے واقعات اور تجربات سے اِس کی خوبی دریافت کرکے تمام متمدّن قوموں نے اِس پر عمل شروع کردیا لیکن مسلمان اس کو معاشرت یورپ کے خصوصیات سے سمجھتے ہیں اُن کو یہ خبر نہیں کہ یہ حکم شریعتِ مطہرہ کا ہے اور دوسروں نے یہیں سے لیا ہے حالانکہ یہ ایسا صریح حکم ہے کہ صاف صاف قرآن شریف میں موجود ہے يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ اے ایمان والو کسی کے گھر میں بغیر اجازت یا بغیر سلام کئے اندر نہ جاؤ یہی تمہارے لئے بہتر ہے (یہ بات تم کو اس لئے بتلائی ہے) تاکہ تم خیال رکھو۔ اور راز اِس مسئلے میں یہ ہے کہ اِس پر عمل کرنے سے اتفاق قومی باقی رہتا ہے کیونکہ اتفاق کی جڑ صفائے قلب ہے اور صفائے قلب اُس وقت باقی رہتی ہے کہ جب ایک سے دوسرے کو تکلیف نہ ہو اور مسئلہ استیذان پر عمل نہ کرنے سے بسا اوقات تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف موجبِ تکدّر ہے اور تکدّر مورثِ نفاق وافتراق ہے اور جب اس مسئلے پر عمل کیا جائے گا تو ہرگز یہ نوبت نہ آئے گی کیونکہ فرض کیجئے ایک شخص نے آپ سے اجازت چاہی آپ نے بے تکلف کہدیا کہ میں اس وقت کام میں ہوں یا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جو قومیں اس مسئلے کو برت رہی ہیں وہ اِسی کی بدولت دیکھ لیجئے کہ کس قدر آرام میں ہیں علیٰ ہذا اور بہت سے دوسرے مسائل ہیں کہ وہ ہمارے اسلام نے

بتلائے تھے اور آج ہم نے اُن کو چھوڑ دیا ہے اور دوسری قوموں نے اُن پر عمل کیا ہے اور اب اگر ہم اُن پر عمل کرتے ہیں تو دوسروں سے اخذ کر کے اور اُن کی چیز سمجھ کر عمل کرتے ہیں. تو اِن احکام کی طرح مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن شریف بھی دوسروں سے پوچھ کر پڑھنے کی نوبت نہ آجاوے. اور اگر ایسا (خدا نہ کردہ) ہو تو کیا مسلمانوں کی غیرت اِس کو گوارا کرے گی اگر نہیں تو کیوں اِسی وقت سے اُس کا تدارک نہیں کیا جاتا صاحبو! یاد رکھو ؎

سرچشمہ باید گرفتن بہ میل چو پُرشد نہ شاید گذشتن بہ پیل

چشمے کے سوت کو ابتدا ہی میں سوئی سے بند کر سکتے ہو لیکن بڑھ جانے پر اگر ہاتھی بھی رکھ دو گے تو بند نہیں ہوگا۔

جب سر سے پانی گذر جائے گا تو اس وقت کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکے گی. اور ان ساری باتوں کے علاوہ قرآن مجید کے الفاظ اس قدر شیریں اور با حلاوت ہیں کہ اُن کی طرف خود کشش ہونی چاہیئے. اگر اس پر ثواب وغیرہ کا وعدہ بھی نہ ہو تب بھی اُس کو یاد کرنا چاہیئے تھا. بعض لوگ کہتے ہیں کہ حفظ کرنے سے دماغ کمزور ہوجاتا ہے اِس لئے ہم اپنے بچّوں کو حفظ نہیں کراتے کیونکہ کمزوری دماغ کے بعد وہ کسی دوسرے کام کے نہیں رہتے. اس کے جواب میں ایک ڈاکٹر کا قول نقل کر دینا کافی ہے. ایک ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ دماغ صرف قوتِ فکریہ سے کمزور ہوتا ہے حفظ الفاظ سے نہیں ہوتا کیونکہ حفظ دماغ کی اصلی ریاضت نہیں وہ صرف زبان کی ریاضت ہے اور دماغ کی ریاضت غور و فکر ہے تو حفظ سے دماغ نہ تھکے گا اگر تھک سکتی ہے تو زبان اور زبان تھکتی نہیں دوسری بات اُنہی نے یہ بھی کہی کہ قرآن شریف اس وقت یاد ہوجاتا ہے کہ بچّہ اس وقت تک کچھ بھی نہیں کر سکتا یعنی اُس کے دماغ میں کسی کام کے کرنے اور غور و فکر کی قابلیت ہی نہیں ہوتی اور اگر زبردستی اس وقت کسی دوسرے کام میں لگا دیئے جاتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضرتیں اُٹھاتے ہیں. پس معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اعتدال کی رفتار سے چلے تو قرآن شریف

اس وقت حفظ ہو جائے گا جس وقت تک کہ وہ خود بھی بچے کو کسی کام کے فکر میں نہ لگائے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ دماغ کمزور ہو جائے گا تو میں کہتا ہوں کہ دماغ کس کا ہے؟ صاحبو! کتنی شرم کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا دماغ ساری عمر اپنے لئے اُس کو صرف کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے لئے دو چار سال بھی نہ دیئے جائیں غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے قرآن شریف کا یاد کرنا نہایت ضروری ثابت ہوتا ہے اور ایک بڑا فائدہ اِس میں یہ ہے کہ اِس کے حفظ سے دوسرے علوم نہایت درجہ آسان ہو جاتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس جب کوئی اپنے بچے کو لاتا تو دریافت فرماتے کہ اس نے قرآن شریف حفظ کیا ہے یا نہیں اگر وہ حافظ ہوتا تو فرماتے کہ انشاء اللہ یہ پڑھ لے گا اور اگر حافظ نہ ہوتا تو وعدہ نہیں کرتے تھے یوں فرماتے تھے کہ میں بھی دعا کروں گا تم بھی دعا کرنا۔ اور واقعی یہ تجربہ بھی ہے کہ جو لوگ حافظ ہیں اکثر اُن کو دوسرے علوم بھی نہایت آسانی سے آجاتے ہیں۔ لیکن اگر حافظ بناؤ تو اس کا خیال رکھو کہ ان کو یاد بھی رہے کیونکہ اکثر لوگ انگریزی میں اس قدر کھپ جاتے ہیں کہ ماں باپ کی ساری کوشش اور اپنے بچپن کی تمام محنت رائیگاں جاتی ہے اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کی بدولت عقلائے وقت کو یہ مہمل خیال پیدا ہوا کہ قرآن شریف پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس لئے اُس کے بقائے حفظ کا ضرور خیال رکھو اور کوئی وقت روزانہ اُس کی تلاوت کا نکال لو اگر کہو کہ کثرتِ کام سے وقت نہیں ملتا تو میں کہتا ہوں کہ اگر تم کو کوئی بیماری لگ جائے اور ڈاکٹر اس بیماری میں یہ تجویز کرے کہ ایک گھنٹے تک روزانہ صبح کو قرآن شریف پڑھا کرو تو اُس وقت تمہارے پاس کہاں سے وقت نکل آئے گا تو تھوڑی دیر کے لئے دین کو ایسا ہی سمجھ کر اِس کے لئے وقت نکال لیا کرو۔

(یہاں پہونچکر مجلسِ وعظ میں کاتب کے پاس کاغذ نہ رہا اور حاضرین میں سے کسی سے دستیاب بھی نہ ہوا مجبوراً آگے مضمون نہ لکھا جاسکا اور بیچ میں چھوڑنا پڑا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ٥

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَة

رَوَاهُ الْبُخَارِیْ

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ العمل فی الدین

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافرخانہ بندر روڈ / ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

دعوات عبدیت جلد سوم
کا
تیسرا وعظ ملقب بہ
ضرورۃ العمل فی الدین

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
الہ آباد ۔ مکان عبدالباقی صاحب	۶ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ وقت شب بعد عشاء	۳ گھنٹے	کھڑے ہو کر	ضرورت العمل فی الدین	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم	تقریباً ۳۰۰ ہزار	صوفی لوگ بھی کچھ تھے اور مجمع مستورات بھی تھا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی. رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡھِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡھُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُزَکِّیۡھِمۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ٥

یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل پڑھی گئی تھی دو مجلسوں میں اس کی تلاوت ہوئی ہے۔ مجلسِ اول میں اس کے متعلق تمہید عرض کی گئی تھی اور مجلسِ دوم میں ایک جز کی یعنی بحث الفاظ کی زیادہ تفصیل اور دوسرے جز کی یعنی علمِ معانی کی قدرے تفصیل کی گئی تھی۔ تیسرا جز یعنی عمل باقی تھا اُس کی تفہیم اور دوسرے جز کی تتمیم کے لئے یہ وقت تجویز کیا گیا یہ حاصل ہے اس آیت کا۔ اس کے قبل یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس آیت میں خدا تعالٰی نے تین جزو کا بیان کیا ہے یَتْلُوْا اور یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ اور یُزَکِّیْهِمْ اور یہ تینوں سب دین کے جز ہیں۔ دین کی ضرورت اس سے پہلے بیانوں میں ثابت کر دی گئی تھی اُس کے اعادے کی ضرورت نہیں اور اُس کے تین جزو ہیں سے یَتْلُوْا کے متعلق تحصیل الفاظِ قرآنیہ کا مضمون بھی اس کے قبل بیان کیا جا چکا ہے پس اس وقت صرف جزو عملی کا بیان ہوگا باقی محض مضامین سابقہ کا مختصراً اعادہ بطور استحضار تمہید کے مکرر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر مقصود میں خواہ وہ ادنٰی درجے کا ہو یا اعلٰی درجے کا ہو دو جُزو ہوتے ہیں ایک جُزو علمی اور ایک جزو عملی۔ مثلاً اگر ہم کوئی دنیاوی کام کرنا چاہیں تو اوّل ہمیں اُس کا علم ہوگا پھر اُس کے بعد ہم اُس پر عمل کریں گے۔ یا جیسے میں نے پہلے بیان میں عرض کیا تھا کہ طبیب اُسکو کہیں گے جس کو علمِ ادویات بھی ہو اور اُن کا استعمال بھی جانتا ہو۔ اسی طرح ہر مقصود کے اندر یہی دو جزو ہیں تو دین بھی چونکہ مقاصدِ عُلیہ سے ہے اس لئے اُس میں بھی یہ دو جزو معتبر ہوں گے۔ اور میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ علوم میں ایک مرتبہ دال کا ہوا کرتا ہے اور ایک مرتبہ مدلول کا۔ سو جس طرح تقسیم الی الجزئین ہر مقصود میں ہوتی ہے کچھ دین کی تخصیص نہیں اسی طرح دال و مدلول کا مرتبہ بھی ہر مقصودِ علمی میں ثابت ہوگا۔ اس میں دین کی تخصیص نہ ہوگی۔ مثلاً طب کے الفاظ کہ وہ دال ہیں معانیِ مقصودہ پر اُن کے بغیر اُن معانی کا سمجھنا مشکل ہے۔ پس الفاظ دال ہوئے معانی مدلول ہوئے۔ یہاں سے الفاظ کے دال علی المعانی اور کافی فِی الدلالۃ ہونے کے متعلق ایک عجیب کام کی بات یاد آئی کہ وہ اہل باطن کے لئے بہت مناسب ہے

چونکہ مجمع میں اس قسم کے لوگ بھی ہوں گے اس لئے اُس کا ذکر مفید ہوگا وہ یہ ہے کہ بعض اہلِ باطن یہ سمجھتے ہیں کہ سلوک طے کرنے کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں اور اس خیال کی وجہ سے اگر کسی کو تجویز کرتے بھی ہیں تو پھر اُس کو چھوڑ دیتے ہیں بالخصوص اگر قلب میں کچھ حرکت و حرارت عبادت میں کسی قسم کی لذّت آنے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہم کامِل ہوگئے حالانکہ تکمیل اُس کو کہتے ہیں جسے اہل فن تکمیل کہدیں۔ بچّہ ایک دو کتاب پڑھ کر سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوگیا حالانکہ علم سے ابھی اُس کو مناسبت بھی نہیں ہوتی ہاں جب اہلِ علم یہ تجویز کردیں کہ اب یہ عالم ہوگیا ہے اس وقت کہا جائے گا کہ اُس کو کمال فی العلم ہوگیا۔ ان لوگوں کی بعینہ وہ حالت ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ بندر کے ہاتھ ایک ہلدی کی گرہ آگئی تھی کہنے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں تو جیسے وہ بندر ایک ہلدی کی گرہ سے پنساری بنا تھا ایسے ہی یہ لوگ بھی اپنے خیال میں ذراسی قلب کی حرارت وغیرہ کو دیکھ کر اپنے کو کامل سمجھ بیٹھے. بہرحال تکمیل سے مراد وہ ہے کہ جس کو اہلِ فن تکمیل سمجھیں. تو اگر قبل تکمیل شیخ کی وفات ہوجائے تو دوسرے سے رجوع نہیں کرنے بالخصوص اگر کشفِ قبور ہی ہو کہ اس صورت میں تو اپنے کمال میں شبہ بھی نہیں رہتا کیونکہ کشفِ قبور کے لئے صاحبِ نسبت فنا ہونا ضروری ہے تو جب صاحب نسبت بھی ہوگئے پھر کیا کسر رہی حالانکہ کشف قبور کوئی کمال نہیں ہے نہ مطلق نسبت کا حصول دلیل کمال ہے. کشف قبور کے نسبت فنا پر موقوف ہونے پر مجھے ایک محقق کی حکایت یاد آئی کہ اُن سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں فرمایا کہ فیض لینے والا کون ہے اُس شخص نے کہا کہ مثلاً میں ہوں. فرمایا کہ نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کتنا بڑا مسئلہ اور کس طرح دو جملوں میں حل کردیا۔ یہ بات اہل علم کے یاد رکھنے کی ہے کہ اُن کو جواب سائل کے تابع ہرگز نہ ہونا چاہیئے. اور جو طرز جواب کا اُن کے لئے مصلحت ہو اُس کو اختیار کرنا چاہیئے گو وہ اُن کی رائے کے خلاف ہو یہ ضروری نہیں کہ جس راہ سائل لے چلے اُسی راہ چلیں جس طرح اس حکایت میں سائل نے تو یہ چاہا کہ پوری تحقیق مسئلے کی بیان کی جائے اور محقق مجیب نے اُس کو بیکار سمجھ کر اُن کی حالت کے

مناسب جواب دیدیا کہ تم پورے مسئلے کو کیا کرو گے اپنا تعلق جس قدر مسئلے سے ہے اسکو سمجھ لو کہ تم کو قبور سے نفع نہیں ہو سکتا۔ پس سائلین تو یہ چاہتے ہیں کہ جس راہ ہم لے چلیں اُس راہ اگر چلیں تو ہم جانیں گے کہ ہمارے سوال کا جواب ہوا ورنہ ہم سمجھیں گے کہ جواب نہیں ہوا۔ مجیبوں نے جب دیکھا کہ اُن کی یہ حالت ہے تو جس چال انھوں نے چلایا اُسی چال انھوں نے چلنا اختیار کیا۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہوئی کہ سائلین کے امراض میں ترقی ہوتی گئی اور شبہات ترقی پذیر ہوتے گئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے طبیب کے پاس کوئی مریض جائے کہ جس کو مرض دق بھی ہو اور زکام بھی ہو اور جاکر حکیم سے فرمائش کرے کہ اوّل زکام کا علاج کر دیجئے تو اگر طبیب زکام کے علاج میں ایک مدید مدّت صرف کر دے تو وہ خائن ہے۔ اُس کو چاہیئے کہ مریض کو رائے دے کہ ہرگز ایسا نہ کرو اوّل دق کی خبر لو اگر مریض اس تجویز پر یہ کہے کہ حکیم صاحب کچھ نہیں جانتے تو طبیب اُس وقت کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اس کے جہل پر رحم کرے گا اور پھر بھی اپنی ہی تجویز اور اُس کی مصلحت پر عمل کرے گا اور اگر اس نے مریض کا اتباع کیا تو وہ خود غرض ہے۔ اسی طرح محقق پر واجب ہے کہ جواب مصلحت کے موافق دے نہ کہ سائل کی مرضی کے موافق سوال میں جتنا ناشائستہ جز ہو اُس کو نکال دے اگر سارا ہی ناشائستہ ہو تو جواب ہی نہ دے اور اگر جواب دے تو یہ ضروری نہیں کہ سب کا جواب دے بلکہ جتنا مناسب ہو اُتنا جواب دے مجھے یاد آیا کہ مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کافر سے سود لینا کیوں ناجائز ہے تو اُن کی مرضی کے موافق تو یہ تھا کہ میں دو ورق میں مُدلّل جواب دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا اُن کی مصلحت کے خلاف تھا بلکہ میں نے یہ لکھا کہ کافر عورت سے زنا کیوں ناجائز ہے یہ اُس سوال کا جواب تحقیقی ہی تھا لیکن اس وقت کم علمی اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ اس کو سمجھے ہی نہیں حاصل اس جواب کا یہ تھا کہ جو حرام قطعی ہے وہ کسی محل میں بھی جائز نہیں یہ تھا جواب اس کو سمجھ کر وہ جتنے شبہے کرتے وہ صحیح ہوتے۔ اتفاق سے وہ شخص ایک مرتبہ مجھ سے ملے وہ تو مجھے پہچانتے تھے لیکن میں نہ پہچانتا تھا کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھے نہ پہچانا ہوگا میں نے کہا بیشک میں نے نہیں پہچانا کہنے لگے کہ میں وہی شخص ہوں جس کے پاس سے اس قسم کا سوال جناب کے پاس آیا تھا اور اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس قسم کا جواب کیوں

دیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ جواب کو ابھی تک نہیں سمجھے تو میں نے اُن کی سمجھ کے موافق اس استفسار کا ایک دوسرا جواب دیا میں نے کہا کہ آپ ایک عہدیدار ہیں آپ کو ہر قسم کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے کیا آپ سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں یا احباب کے ساتھ دوسری قسم کا برتاؤ ہے اور اجانب کے ساتھ دوسری قسم کا کہنے لگے کہ ہر قسم کے آدمیوں سے علیحدہ برتاؤ ہوتا ہے میں نے کہا کہ جب یہ ہے تو افتاء کا بھی ایک محکمہ ہے اس میں بھی اسی طرح کسی کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے کسی کو دوسری قسم کا میں چونکہ آپ کی حالت سے واقف نہ تھا۔ اس لئے میں نے آپ کو ضابطہ کا جواب دیا اور اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے اب انشاء اللہ تعالیٰ اس قسم کا جواب نہ آئے گا لیکن اس ملاقات کا جیسا اثر مجھ پر ہوگا آپ پر بھی ہوگا آپ کے پاس سے بھی اس قسم کا لغو سوال کبھی نہ آئے گا۔ غرض اس وقت یہ ایسی آفت ہے کہ مجیب سائل کے تابع ہوجاتے ہیں مگر اُن محقق کا جواب نہایت ہی نفیس تھا کہ اگر فیض لینے والا تو ہے تو نہیں ہوتا مقصود یہ ہے کہ قبور سے جو فیض ہوتا ہے تو صاحب نسبت فناء کو ہوتا ہے خیر یہ حکایت تو تبعًا بیان ہوگئی۔ اصل بیان اس کا ہے کہ طالب اگر صاحب کشف بھی ہوجائے تب بھی اسکو شیخ سے استغناء جائز نہیں کیونکہ اُس میں کفایت نہیں ہوتی وجہ یہ ہے کہ فیض کی دو قسمیں ہیں ایک بہ دلالتِ لفظیہ یعنی تعلیم و تلقین ایک غیر لفظیہ یعنی تقویت نسبتہً افادہ اور استفادہ میں لفظیہ بہت مفید اور ممد ہے پس صرف قبور سے استفادہ پر بس کرنا غلطی ہے کیونکہ قبور سے اتنا فیض ہوتا ہے کہ حالتِ موجودہ میں ترقی ہوتی ہے وبس بخلاف زندہ کے کہ اگر کوئی شبہ ہو تو اُس کو پیش کر کے حل کرسکتا ہے خوب مشبع طور سے تو اس کی برابر ہرگز فیضِ قبور نہیں ہوسکتا یہ اس کی فرع تھی کہ الفاظ کی برابر افادہ نہیں ہوسکتا یہی میں نے اجمالاً بیان کیا تھا پس علم کے متعلق دو جز ہوئے الفاظ اور معانی اور تیسرا مقصود عمل ہوا یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ میں نے بیان کردیا تھا کہ الفاظ کے متعلق کافی بحث ہوگئی ہے اور چونکہ اور علوم میں الفاظ کی ضرورت مقصود نہیں ہے اس لئے اُس میں اردو وغیرہ نفس مقصود کے حصول میں سب برابر ہیں اور قرآن شریف میں بخصوصہا الفاظ بھی مقصود ہیں، اس کو خوب بیان کر دیا تھا البتہ الفاظ کے متعلق ایک چھوٹی سی بات رہ گئی تھی وہ اب بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ الفاظ کے کچھ حقوق ہیں مثلاً یہ کہ

وہ اپنی ہئیت کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محفوظ رہیں کیونکہ عربیت ایسی ہی ہے جیسے اُردو سو اگر اردو کے قواعد پر رہے تو وہ اُردو کہلائیگی ورنہ نہیں جیسے آج کل تشبّہ کے لئے اُردو غلط بولنے لگے ہیں ظاہر ہے کہ وہ اردو نہیں ہے میں نے خود اسٹیشن کان پور پر دیکھا کہ ہندوستانی شخص نے اُردو کو خراب کر کے ایک شخص سے کہا کہ ہم یہ بات سُننا نہیں مانگتا. اور صحیح اُردو کا چھوڑنا محض اس نیّت سے کہ انگریزوں سے تشبّہ ہو. افسوس ہے کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ہم کو اُردو آجائے اور ہم اس کوشش میں ہیں کہ جو کچھ آتی ہے وہ بھی خراب ہو جائے. میں نے پہلی مجلس میں عرض کیا تھا کہ وہ تو ہماری چیزیں لیتے جاتے ہیں اور ہم اُن کی چیزیں اختیار کرتے جاتے ہیں یہ بھی اسی کا ایک شعبہ ہے کیا انتہا ہے کہ الفاظ میں بھی. باوجود اختیار اور قدرت کے اُن کے موافق ہونے کی کوشش کی جاتی ہے غرض جیسے یہ اردو نہ تھی اسی طرح اگر عربی کو بگاڑ کر پڑھا جائے تو وہ عربی نہ ہوگی. اس وقت جو لوگ قرآن شریف کے پڑھنے کی طرف توجہ کرتے ہیں وہ بھی اُس کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اکثر علماء کو بھی اس کا خیال نہیں ہے حالانکہ اس پر توجہ نہ کرنے سے بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں قرآن شریف میں تین قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں ایک تو وہ کہ جن کو عوام بھی سمجھتے ہیں دوسرے وہ جن کو خواص سمجھتے ہیں تیسرے وہ جن کو خواص الخواص سمجھتے ہیں اسکی ایک مثال اردو میں پیش کرتا ہوں مثلاً لفظ پنکھا بولتے ہیں تو نون کے بعد کاف ہے اور نون ساکن ہے لیکن نون کو اُسکے مخرج سے نہیں نکالتے بلکہ اُس کو خیشوم سے نکالا جاتا ہے اس کو سب جانتے ہیں اس کو اصطلاح میں اخفا کہتے ہیں یہ اظہار اور ادغام کے بین بین ہوتا ہے تو پنکھا میں نون اخفا کے ساتھ ہو تو اگر کوئی یہاں اظہار کرے یعنی نون کو اُس کے مخرج سے نکالے اس طرح پَن تو سب ہنسیں گے اور اُس کو اردو نہ کہیں گے اس لئے کہ اخفا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اگر قواعد سے زبان ہے تو اصلی ہے ورنہ نہیں. بس اسی طرح عربی زبان میں بھی ہے مثلاً موقع اخفاء میں اخفاء واجب ہوگا جیسے پنکھا اظہار کے ساتھ غلط ہے اسی طرح عربی میں بھی اگر اخفاء کی جگہ اخفا نہ ہوا تو لفظ غلط ہے کتنی موٹی بات ہے مگر اسکو کوئی نہیں سمجھتا تو جیسے پنکھا اظہار سے اردو نہ رہیگا اسی طرح عربی لفظ بھی اخفاء کی جگہ اظہار کرنے سے عربی نہ رہے گا اور خدا تعالےٰ فرماتے ہیں قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا تو جب قرآن عربی میں ہے اور تجوید کے خلاف کرنے سے عربی نہ رہے گا تو قرآن عربی میں نہ پڑھا.

عاقل کے لئے یہ تقریر بالکل کافی ہے میں نے علماء قرآءت کے اقوال اس لئے نقل نہیں کئے کہ لوگ ان کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک مثال دے دی جس کو سب ملنتے ہیں اور یہ ایک مثال نمونے کے طور پر بتلادی ہے اسی طرح بہت سے قاعدے ہیں۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس کثرت سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ہے یا وَلَا الظَّآلِّيْنَ لیکن اس کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جو کام تلفظ کا ہے اُس کو کتابت سے نکالا جاتا ہے حالانکہ تلفظ کا کام کتابت سے کیسے ادا ہو کتابت میں تو صرف صفات آسکتے ہیں باقی جو امور مدرک بالسمع ہیں وہ کس طرح کتابت میں آجائیں گے کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

اگر مُصَوّر کی بنائی ہوئی تصویر لوگوں کے دلوں کو کھینچ لے گی۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اس محبوب کے ناز و انداز کس طرح دکھائے گا۔

اگر محبوب کی تصویر مُصوّر بنا بھی لے گا تو اُسکے ناز و اداء کو کیونکر دیکھا جائے گا تو اگر کوئی صفات لکھ کر بھیجدے تو اُسکے ادا کرنے کی کیفیت تو نہیں لکھ سکتا۔ کوئی فوٹو گراف تو نہیں کہ اسکو بھیجدیا جائے ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک قاری بھیجدیا جائے تو خیر غرض یہ سخت غلطی ہے کہ کتابت سے کام نکالنا چاہیں بلکہ اگر سیکھنا چاہیئے۔ تو تجوید کی ضرورت ثابت ہوگئی اور بدوں اسکے جس طرح آپ جاہلوں کو غلط بولتے دیکھتے ہیں اور اُن پر ہنستے ہیں اسی طرح مجوّدین آپ پر بھی ہنستے ہیں مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مدنی لکھنؤ میں آئے اور انھوں نے قرآن سُنایا ہندوستانی ذہین تو ہوتے ہیں ایک لڑکے نے اُن کی قراءت کا چربہ اُتارا لوگوں نے اُس کو خوب مشق کرائی اور جب اپنے نزدیک وہ قاری صاحب سے افضل ہوگئی تو اپنا کمال ظاہر کرنے کے لئے قاری صاحب کے پاس اُس لڑکے کو لے گئے اور کہا کہ اسنے کچھ تبرکاً آپ کا اتباع کیا ہے انھوں نے کہا کہ ہاں سُنایئے چنانچہ لڑکے نے سُنایا جب سُنا چکا تو یہ لوگ داد کے منتظر ہوئے قاری صاحب نے کچھ نہ کہا تو خود ہی پوچھا کہ اس نے کیسا پڑھا قاری صاحب نے کہا کہ ایسا پڑھا جیسا ہم نے ایک لغات اردو بنایا ہے کہ اَلْجَنَادُ (بفتحتین) ککری اَلْحَطَبُ (بفتحتین) لکری اَلْعَنْکَبُوْتُ (بفتحتین) مکری۔ اُسوقت حقیقت معلوم ہوئی کہ کیسا قرآن صاحبزادے نے

پڑھا ہے۔ دیکھئے اگر کوئی شخص ککری اور لکری کہنے لگے تو کیا اس کو اردو بولنے والا کہیں گے ہرگز نہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی مہاجر مکی سے ایک عربی نے کہا کہ آپ لوگ اتنے دنوں سے عرب میں رہتے ہیں لیکن اب تک عرب جیسا قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے انھوں نے کہا کہ غیر زبان میں اہل زبان کی سی مہارت نہیں ہو سکتی کہنے لگے کہ کیوں نہیں ہو سکتی آخر ہم اردو بولتے ہیں انھوں نے کہا کہ آپ ہرگز اہل زبان کے برابر نہیں بول سکتے اور اگر بول سکتے ہیں تو کہئے ٹٹو۔ ٹھٹھا۔ ان بیچارے نے کہا تو تتو، تتا ہی نکل سکا مگر یہ تو دفع الوقتی تھی وہ لوگ تو اس کے مکلّف نہیں کہ اردو صحیح بولیں اور ہم تو مکلف ہیں قرآن صحیح پڑھنے کے مگر خدا کا شکر ہے کہ اب چند روز سے علماء نے اس پر توجہ کی ہے مدارس میں قُرّا بھی نوکر رکھے ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ سب ادھر متوجہ ہوں اور کچھ لہجہ کی ضرورت نہیں صرف حروف کو صحیح کر لینا چاہیئے اور اس میں کچھ زیادہ مدت نہیں لگے گی صرف اٹھائیس حرف ہیں اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ ان کی مشق کی ضرورت ہی نہیں البتہ بعض حروف کی مشق کی ضرورت ہے جیسے ت ط ز ض ظ ر کی ترقیق تفخیم تو اگر ایک ایک حرف کے لئے تین تین دن لئے جائیں تو ایک ماہ سے زیادہ صرف نہ ہوگا اور قرآن شریف صحیح ہو جاوے گا رہے محسنات سو ان کا سیکھنا ہر ایک کے لئے ضروری نہیں نیز سارے قرآن کو سیکھنے کی ضرورت نہیں قواعد کے موافق اگر تھوڑا بھی پڑھ لیا جائے تو کافی ہے پھر سب خود صحیح ہو جائے گا ہاں کسی اُستاد سے پیش کرنا سارے قرآن شریف کا ضروری ہے اور یہ مضمون بہت ہی ضروری ہے اس کی طرف علماء کو بالخصوص توجہ کرنا چاہیئے۔ اس وقت اگر پچاس مولویوں کو جمع کر کے قرآن شریف سنا جائے تو بمشکل دو آدمی صحیح قرآن شریف پڑھنے والے نکلیں گے کتنے افسوس کی بات ہے کہ طلبہ فلسفہ پڑھتے ہیں منطق پڑھتے ہیں اور راس العلوم قرآن شریف کو نہیں پڑھتے اور پھر غضب یہ کہ ایسے لوگ امام ہو جاتے ہیں

اور اس میں دنیوی خرابی یہ ہے کہ بعض اغلاط پر عوام بھی مطلع ہوجاتے ہیں اور علماء کی بے قدری کرتے ہیں ایک صاحب نے سورۂ ناس میں مِنَ الْجِنَّاتِ وَالنَّسْ پڑھا ایک صاحب نے سورۂ ابی لہب میں تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَحَبْ پڑھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ حضور اتنے بڑے عالم ہوکر غلط پڑھتے ہیں کہنے لگے کس طرح پڑھوں ان صاحب نے آہستہ سے بتلایا کہ اَبِیْ لَھَبْ آہستہ اس لئے بتلایا کہ کوئی سنے نہیں ناحق کی رسوائی ہے تو وہ بزرگ اس آہستگی ہی کو مقصود سمجھ کر فرماتے ہیں۔ ہاں زور سے نہ پڑھا کروں ہلکے سے پڑھا کروں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ سمجھانے پر بھی نہ سمجھے بات یہ ہے کہ بلا حاصل کے ہوئے کچھ آتا نہیں۔ دیکھئے آجکل اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انگریزوں کا لب ولہجہ آجائے اور اس کیلئے کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں۔ کوئی اپنے اولاد کو لندن بھیجتا ہے کسی نے اپنے بچوں کو میموں کے سپرد کردیا ہے حالانکہ اس پر نہ پاس ہونا موقوف ہے نہ ڈگری لیکن باوجود اس کے اس کی طرف تو اتنی توجہ کہ اس کے صرف پڑھنے پر ہی اکتفا نہیں بلکہ لب ولہجہ حاصل کرنے کی بھی تمنا اور کوشش ہے اور قرآن شریف کو ایسا چھوڑا جائے کہ اول تو پڑھا ہی نہ جائے اور اگر پڑھیں بھی تو یوں خراب کرکے! صاحبو! اگر قرآن شریف کو ہم چھوڑدیں تو بتلایئے کہ پھر اور کون اس کو پڑھے گا۔ ہر شخص کو قرآن شریف اس طرح پڑھنا چاہیئے کہ معلوم ہو کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔ واللہ اس میں ایسی لذت ہے کہ اگر ادراک میں تھوڑی سی صحت ہو تو ساری تغنی ایک طرف اور تلاوت قرآن شریف ایک طرف۔

ایک بزرگ تھے مولوی کرامت علی صاحب۔ انھوں نے قرآن شریف عرب میں سیکھا تھا۔ ایک مغنّی نے ان کو پڑھتے سُنا اور کہا اس سے اچھی بھیرویں میں نے آج تک نہیں سُنی۔ مولوی صاحب نے فرمایا میں کیا جانوں بھیرویں کیا ہوتی ہے۔ کہنے لگا آپ کو خبر نہیں کہ یہ بھیرویں ہے۔ تو قرآن شریف ایسی عجیب چیز ہے کہ ہر

لہجے میں ڈھل جاتا ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب کو خبر بھی نہیں مگر اس مغنی کو اس کے مذاق کے موافق لطف آیا ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد بر نگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنیٰ را

اس عالم کی دلکش بہار دل و دماغ کو تازہ کر دیتی ہے اصحاب صورت کے رنگ معنی ادا ہو جاتے ہیں

کبھی مکہ معظمہ جانا ہو تو دیکھئے گا کہ ہر گوشے سے کیسی پیاری پیاری آوازیں آتی ہیں واللہ انسان محو ہو جاتا ہے اور ہم کو جو مزہ نہیں آتا تو اس لئے کہ ہم کو پڑھنا آتا نہیں ورنہ صحیح پڑھنے والوں کو خود مزہ آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کی تو خاصیت یہ ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (قرآن سن کے تو ان اللہ سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں) اور ہم میں یہ اقشعرار ہے نہیں تو کیا بات ہے کچھ تو قلوب ہی درست نہیں کچھ غلط پڑھنے کی بدولت اور جب کبھی کوئی صحیح پڑھنے والا آجاتا ہے تو غور کر کے دیکھ لیجئے کہ قلوب کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پڑھنے میں جو ہم کو مزا نہیں آتا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کو پڑھنا نہیں آتا لہذا اس کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم کو پڑھنا آئے۔ یہ حصہ لفظی علم کا تو بحمد اللہ ختم ہو گیا اب علم معانی کا درجہ اور عمل باقی رہ گیا آج اس میں جو رہ گیا تھا قابل بیان ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت کتنی بے التفاتی علوم دینیہ سے ہو رہی ہے اب دیکھئے کہ یہ مضر ہے یا نہیں۔ میں فضائل بیان نہیں کرتا کیونکہ ضرورت کے بتلا دینے کے بعد فضائل کے ذکر کی حاجت نہیں تو میں صرف اتنا بیان کر دوں گا کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت کوئی شخص رہتا ہے اس کو اس گورنمنٹ کے قوانین جاننے کی ضرورت ہے اور قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جن میں محض ہار جیت ہو جیسے مال کے قوانین۔ سو اول تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں جلب منفعت اور دفع مضرت ہے لیکن اگر ان کو نہ سیکھا جائے تو زیادہ ضرر نہیں کیونکہ ہار جانا خسارہ ہے جرم نہیں۔ دوسرے وہ قوانین ہیں کہ ان کی خلاف ورزی جرم اور بغاوت ہے اس کا سیکھنا واجب ہوتا ہے خواہ پڑھ کر یا پوچھ کر جیسے ایک شخص تجارت کرنا چاہے تو اس کے لئے

ضروری ہے کہ یہ دریافت کرے کہ کس کس چیز کی تجارت کی اجازت ہے اور جب معلوم ہو کہ مثلاً کوکین کی تجارت کی اجازت نہیں تو اس سے رکے اب یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم لوگ خدا تعالیٰ کی عملداری میں ہیں یا نہیں اور دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ کے کچھ قوانین ہیں کہ نہیں اگر ہم اسکی عملداری سے باہر ہوتے یا وہ صاحب قوانین نہ ہوتا تب توچنداں فکر نہ تھی اور جبکہ یہ دونوں باتیں ہیں تو اب بدون قوانین سیکھے چارہ نہیں خدا تعالےٰ کی عملداری سے باہر نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ سب کو قدرۃً محیط ہے ہر مذہب کے لوگ بلکہ حکماء بھی اس کو جانتے ہیں۔ رہا دوسرا جُز تو اس کو سب مسلمان بلکہ ہر مذہب کے لوگ مانتے ہیں۔ اب یہ بات رہ گئی کہ وہ قوانین کس قسم کے ہیں آیا ان میں صرف اپنا نقصان ہے یا اُن کی مخالفت جرم اور بغاوت بھی ہے۔ سو قرآن شریف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ تمام قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے کہیں اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اللہ نے خرید و فروخت حلال کی ہے اور سود حرام کیا ہے) لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (دور رہو زنا سے) غرض تمام قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے ہمارے معاشرت اور معاملات دونوں کے متعلق کافی انتظام فرمایا ہے اور عدمِ اطاعت پر وعید بھی فرمائی ہے پھر کیا شبہ رہ گیا۔ آج کل لوگ قوانین خداوندی صرف نماز روزہ کو سمجھتے ہیں باقی دوسرے امور میں اپنے کو آزاد محض سمجھتے ہیں سو اول تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے نماز روزے ہی میں کونسا اہتمام کیا ہے۔ افسوس ہے کہ معاملات سے یہ آزادی شروع ہوتی تھی۔ مگر چونکہ زمانہ ترقی کا ہے ہر چیز کو ترقی ہوتی ہے اس کو بھی یہاں تک ترقی ہوئی کہ تحریراً اور تقریراً یہ کہا جاتا ہے کہ جس غرض سے نماز مقرر ہوئی تھی یعنی تہذیب نفس۔ اب بوجہ غلبۂ تہذیب کے چونکہ وہ ضروری نہیں رہی اس لئے نماز کی ضرورت نہیں۔ روزہ کے متعلق

کہتے ہیں کہ فدیہ دیدیں تو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں اور یہ خرابی اس کی ہے کہ ہر شخص قانون شریعت کے معنی بیان کرنے میں آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کہدے حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ اس وقت قانون کی کتابیں موجود ہیں لیکن پھر بھی اگر کوئی فیصلہ ہائی کوٹ میں جا کر منسوخ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ماتحت نے اس دفعہ کے معنے نہیں سمجھے اب دیکھئے کہ ماتحت بھی جج ہے اور حاکم بالا بھی جج ہے مگر چونکہ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہائی کوٹ کے جج کی برابر کوئی قانون کو نہیں سمجھتا تو سب اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ گو قانون عام ہوا اور سب کے پاس ہو مگر پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بعض لوگ اس قدر سمجھتے ہیں کہ دوسرے نہیں سمجھتے۔ اب میں اس کی شرح کرتا ہوں کہ قرآن شریف کے سمجھنے والے ایک ابوبکرؓ وعمرؓ و حنیفہؒ تھے۔ ایک آج کل کے زید و عمر ہیں تو اپنے اور ان کے علوم کا مقابلہ کر کے دیکھ لیں بلکہ ان حضرات کے متبعین ہی کے علوم سے مقابلہ کر لیں جو کہ اپنے کو ان سے بدرجہا کمتر سمجھتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان ہی کے علوم سے زمین و آسمان کا فرق ظاہر ہوگا اور ابوحنیفہؒ کے علم سے تو کیا جانے کتنا فرق ہوگا تو دیکھئے کہ ہائی کورٹ کے جج اور ماتحت جج باوجودیکہ دونوں یکساں ہیں مگر پھر بھی فرق مانا گیا تو دین میں اس کا قائل کیوں نہ ہوا جائے گا خود رائی کی اجازت کیونکر دی جائیگی ان سلف صالحین کے مقابلہ میں اگر ہم تفسیر کرنے بیٹھیں تو وہ تفسیر ایسی ہوگی جیسے کہ ایک غیر ملکی دیہاتی کے پاس ایک من کا بورا تھا جب وہ اسٹیشن پر پہونچا تو پلیٹ فارم پر جانے کے وقت ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ اس کی بلٹی لاؤ کہنے لگا کہ ہمارے پاس یہ ٹکٹ ہے یہ ہی کافی ہے ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے ہم اس اسباب کا ٹکٹ مانگتے ہیں کیونکہ یہ پندرہ سیر سے زائد ہے۔ اب یہ دیہاتی صاحب قانون ریلوے کی تفسیر کرتے ہیں کہ پندرہ سیر کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس لئے کہ ہندوستانی لوگ اس سے زائد اسباب اپنے ہاتھ میں اٹھا نہیں سکتے اور ہم چونکہ اٹھا سکتے ہیں اس لئے یہ حد ہمارے واسطے نہیں بلکہ جس قدر ہم اٹھا سکیں اس قدر کی ہم کو اجازت ہے۔

آپ اس تفسیر کو سن کر اندازہ کیجئے۔ کیا یہ تفسیر ٹکٹ کلکٹر کے مقابلہ میں صحیح مانی جائے گی اور کیا ٹکٹ کلکٹر کے ذمہ یہ واجب ہے یا اس کو جائز ہے کہ اس کو اس تفسیر کی اجازت دے نیز کیا اس کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ مناظرہ کرے یا صرف یہ کافی ہے کہ اس کو ڈانٹ دے اور اس سے محصول وصول کرے اور کیا اس کا یہ کہنا کہ منشاء قانون کا یہ ہے کہ ہندوستانی پندرہ سیر سے زیادہ نہیں اٹھا سکتے قابل سماعت ہے اور کیا ٹکٹ کلکٹر پر یہ ضروری ہے کہ اس کو نہایت ٹھنڈے دل سے سن کر نہایت اطمینان سے اس کو سمجھا دے کہ نہیں بھائی تم غلط سمجھے قانون کا یہ منشاء نہیں اور اگر وہ غصہ ہو تو کیا وہ قابلِ ملامت ہے جیسے آجکل علماء پر الزام دھرا جاتا ہے کہ ان کو بہت جلد غصہ آجاتا ہے ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ صاحب فن غیر فن داں سے کلام کرنے کو اپنے لئے عار اور تضیع اوقات سمجھتا ہے اور بزبانِ حال وہ کہتا ہے کہ ؎

تو ندیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبانِ مرغاں را

(تو تم نے حضرت سلیمان علیہ السلام تک کو نہ دیکھا تم چڑیوں کی زبان کیا جانو گے)

بلکہ غیر فن والوں پر واجب ہے کہ بجائے مناظرے کے وہ یہی کہدے کہ

؎ من نہ دیدم گہے سلیماں را ٭ چہ شناسم زباں مرغاں را

(میں نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہ دیکھا میں چڑیوں کی زبان کیا جانوں)

باقی سوالات کا پیدا ہونا وہاں بھی ہے جس نے کبھی قوانین نہ سنے ہوں اس کو بھی یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ پندرہ سیر کی اجازت کیوں ہوئی چودہ سیر یا سولہ سیر کی اجازت کیوں نہ ہوئی تو اگر اس دیہاتی کی رائے مقبول ہے تو آج کل کے عقلاء کی رائے بھی مقبول ہے۔ صاحبو! کیا فن داں اور غیر فن داں برابر ہوسکتے ہیں کبھی نہیں۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ

یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ (کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں) معلمین خوب جانتے ہیں کہ ان کو اپنے طالب علموں کی کم فہمی پر اکثر غصہ آتا ہے کہ کمبخت سمجھتا ہی نہیں تو گیا ان لوگوں کو طالبعلموں سے عداوت ہوتی ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ طبعی قاعدہ ہے غرض دیکھئے کہ باوجود اس بات کے کہ اس دیہاتی کی تفسیر ناواقف کے دل کو لگتی ہے مگر جس نے ریلوے کا یہ قاعدہ بچپن سے سنا ہے اس لئے اس کی تفسیر پر ہنسی آتی ہے۔ کاش اگر اہل علم کو قابل اعتماد سمجھتے تو ان کے مقابلے میں کوئی مخترع تفسیر آپ کے دل کو نہ لگتی۔ صاحبو! کیا تیرہ۱۳ سو برس کے بعد آج قرآن شریف کے معنی حل ہوئے ہیں۔ دوسرے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آج کل کے قاعدہ کے موافق کثرت رائے سے ہر بات طے ہوتی ہے اور اگر کسی بات پر اتفاق رائے ہو جائے تو بہت ہی قوت کے ساتھ وہ بات طے ہو جاتی ہے۔ سو مسائل شرعیہ تو تیرہ سو برس سے آج تک مسلمہ متفقہ چلے آتے ہیں اور اگر یہ بات بھی نہ ہو تو کثرت کے بعد غیر ممبروں کی رائے کوئی قابل وقعت نہیں شمار ہوتی بس اسی طرح دین میں بھی کثرت رائے کے بعد چند ناواقفین کا اختلاف کرنا کوئی چیز نہ سمجھا جائے گا افسوس سے کہا جاتا ہے کہ روزے کے بارے میں اس قدر گڑبڑ کی ہے کہ جس کی حد نہیں اور آیت کی تفسیر بالکل اہل رائے سے خلاف مقصود کی ہے حالانکہ اس کی حقیقت کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن بعض لوگوں کو کچھ شوق ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے مرتبے سے زیادہ سمجھنا چاہا کرتے ہیں اگر ان کی اصلی جواب دیا جائے تو سمجھتے نہیں اور اگر دوسرا جواب دیا جائے تو زبردستی پر محمول کرتے ہیں سو روزے ہی کو لیجئے کہ یُطِیْقُوْنَ کا ترجمہ اثبات کا کیا اور نسخ سے انکار کر دیا حالانکہ یہ آیت معنی اثبات پر منسوخ ہے اور عدم نسخ کی تقدیر پر معنی نفی پر محمول ہے تو ایک توجیہ پر تو اصول کے جاننے کی ضرورت ہے اور دوسری توجیہ پر عربیت کے جاننے کی ضرورت ہے اور جس کا ذہن دونوں سے

خالی ہو وہ تو اس کو بات بنا تا ہی سمجھے گا اور اگر نفس فن سے مناسبت ہو تو تھوڑے اشارے سے اس کو شفا ہو جاتی ہے۔ ایک منطقی صاحب کو شبہ ہو گیا کہ قرآن شریف سے مسئلہ غلامی کا ابطال ثابت ہوتا ہے کیونکہ قرآن شریف میں ہے اِمَّا مَنًّا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً (یا تو یونہی احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر) اور یہ صیغہ حصر کا ہے پس غیر مَنّ اور غیر فدا منفی ہوگا۔ ایک عالم مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے اُن سے کہا کہ یہ قضیہ کونسا ہے کہنے لگے منفصلہ پھر انھوں نے پوچھا کہ حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو اس کو سن کر ان منطقی مولوی صاحب کی آنکھیں کھلیں اور شبہ زائل ہوا اور بے انتہا خوش ہوئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یہ حقیقیہ ہے انھوں نے تنبیہ کردیا کہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو تو وہ تو چونکہ ذی علم تھے اس لئے ایک اشارہ کر دینے سے ان کو حل ہو گیا لیکن جس شخص کو معلوم ہی نہ ہو کہ حقیقیہ مانعۃ الخلو یا مانعۃ الجمع کس کو کہتے ہیں وہ تو اس کو گھیر گھار کا جواب ہی سمجھے گا اگر ایک شخص سے کہا جائے کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں اور فن اقلیدس سے واقف نہ ہو تو کسی طرح بھی آپ اُس کو نہ سمجھا سکیں گے اگرچہ ہزار دفعہ ناپ کر دکھلا دیجئے جیسے ہمارے ہاں ایک شاعر تھے کہ وہ اپنے اشعار کے مصرعے دھاگے سے ناپ کر برابر کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے کسی نے کہا کہ آپ کا ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہے کہنے لگے کہ یہ تو اوپر سے ہوتی آئی ہے۔ الٰہی غنچۂ امید بکشا۔ اس کو تو کھینچ کھینچ کر پڑھا۔ گلے از روضۂ جاوید بنما اس کو جلدی سے پڑھ دیا۔ دیکھو اس میں بھی مصرعۂ ثانی چھوٹا ہے۔ اب جو لوگ فن شعر سے واقف ہیں وہ اس کو سن کر داد دیں گے اور سمجھیں گے کہ اس شخص کو کسی طرح بھی نہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مصرعے برابر ہیں۔

واللہ اے صاحبو! علماء کے نزدیک آج کل کی دلیلیں اس سے بھی بدتر ہیں جیسے یہ شاعر سمجھا تھا کہ میں نے بہت بڑی دلیل

قائم کردی ہے۔ ایسے ہی آجکل کے عقلاء اپنے دلائل کو نہایت مدلل سمجھتے ہیں حالانکہ وہ علماء کے نزدیک اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ (مکڑی کے جالے سے بھی کمزور ہوتے ہیں) علماء فضلاء اُن پر ہنستے ہیں اور ان بیچاروں کو قابلِ رحم سمجھتے ہیں اور جس طرح وزن اور تقطیع نہ جاننے کی وجہ سے اس شاعر کو نہیں سمجھا سکتے تھے اسی طرح مانعۃ الجمع اور مانعۃ الخلو نہ جاننے کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی نہیں سمجھا سکتے مگر جاننے والوں سے پوچھئے کہ یہ ایک چھوٹا سا لفظ سن کر ان کی کیا حالت ہوئی کہ وجد آنے لگا۔ اسی طرح اس یُطِیْقُوْنَہٗ کے دو جواب ہیں ایک موقوف ہے عربیت جاننے پر دوسرا اصول جاننے پر مگر ناواقف لوگ دونوں کو زبردستی کا جواب کہتے ہیں، اچھا صاحب زبردستی ہی کا جواب سہی لیکن جیسے اُس دیہاتی کا علاج حکومت سے ہوگیا ایسے اگر آج یہ بات حاصل ہو تو ہم بھی بتلادیں کہ ایسے لوگوں کے لئے اصلی جواب کیا ہے۔ باقی اس کے سوا تو اگر دفتر کھول کر بھی سامنے رکھدیجئے تو تسلی نہیں ہوسکتی اس وقت علماء سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ایسا جواب دیں جس سے تسلّی ہوجائے صاحبو! وہ اسباب بھی تو پیدا کرو جو موجب تسلّی ہیں یعنی علوم حاصل کرو۔ علیٰ ہذا آج ایک یہ مرض بھی عام ہورہا ہے کہ احکام میں علتیں نکالی جاتی ہیں چنانچہ روزے میں یہ علت نکالی گئی ہے کہ چونکہ ابتدا میں بہیمیت کا غلبہ تھا اس لئے روزہ اس کی کسر کے لئے مشروع ہوا تھا اور اب چونکہ ہم مہذب ہوچکے ہیں اس لئے ہم کو ضرورت نہیں افسوس ہے کہ ہم لوگ تہذیب ہی کو نہیں سمجھتے۔ صاحبو! تہذیب یہ ہے کہ تمام رزائل نفس کے دور ہوجائیں نہ یہ کہ مزاج میں قدرے نظافت یا تکلف آجائے ہم لوگوں میں ہرگز تہذیب نفس

نہیں ہے ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم میں تو اضع تحمل، بُردباری، ایثار کا نام تک نہیں بلکہ خودغرضی غضب چھچھوراپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے میں ایک زندہ مثال دیتا ہوں کہ اگر ہم میں سے ایک شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دے رکھی ہو اور یہ شخص خوش حال فارغ البال ہو اور اسی دوران میں ایک دوسرا شخص بھی اسی عہدے کی درخواست دے جو کہ نمبر درخواست میں اس کے بعد ہو لیکن یہ دوسرا شخص مفلوک الحال غریب مقروض ہو تو ایسی صورت میں ہم نے کبھی سُنا بھی نہیں اس پہلے فارغ البال نے اُس کی فلاکت پر ترس کھا کر اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور اس کو اپنے سے مقدم کر دیا ہو علیٰ ہذا ہر معاملہ میں۔ تو اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ہم میں ایثار کی صفت نہیں بلکہ خود غرضی ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اخلاق درست ہیں تو یہ دیکھو کہ اس کا منشا کیا ہے سو تہذیب اخلاق کے دو منشا ہوتے ہیں کبھی تو مصلحت تمدن کے لئے اپنے اخلاق کو گونہ مہذب کیا جاتا ہے اور کبھی ضرورت دینیہ کے لئے جیسے ایک تاجر اس لئے سچ بولتا ہے کہ اس میں دکان کی بات بنی رہے گی اور لوگ اعتبار کریں گے۔ اور دوسرا اس لئے بولتا ہے کہ خدا خوش ہو تو سمجھئے کہ دنیاوی اور تمدنی مصالح چونکہ ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں اگر اس کو کبھی معلوم ہو کہ اب جھوٹ بولنے میں یہ مصلحت حاصل ہوگی تو وہ فوراً جھوٹ بولے گا اور دین کے مصالح چونکہ متبدل نہیں ہوتے اس۔لئے اس میں یہ احتمال نہیں ہے اس کا کتنا ہی نقصان ہو تب بھی یہ جھوٹ بولنا گوارا نہ کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ مرضیٔ خدا کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر تہذیب اخلاق خدا کے خوف سے ہو تو وہ مستحکم ہے

ورنہ نہیں تو اول تو تہذیب کے وجود ہی میں کلام ہے اور اگر وجود مان بھی لیا جائے تو اس کی پائیداری میں کلام ہوگا اور یقیناً وہ بالکل ناکافی ہوگا تو اگر تہذیب نفس ہی نماز روزے کی علت ہوتی تب بھی ہم کو چھوڑنا ناجائز تھا کیونکہ ہم کو تہذیب بھی حاصل نہیں۔ اور بالخصوص جبکہ نماز روزے سے غرض بھی دوسری ہو کہ یہ ثابت ہو کہ یہ کسی کا غلام ہے کہ اس کے حکم پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور اگر کہو کہ بعض نصوص کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے میں شہوت کا انکسار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حکمت ہے اور میں اس کے حکمت ہونے کی نفی نہیں کرتا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ امور علت نہیں ہیں جن پر نفیاً اور اثباتاً مدار حکم ہو حکمت وہ ہے کہ حکم پر مرتب ہو اور علت وہ ہے کہ اس پر حکم مرتب ہو تو نماز روزے کا وجوب اس کے سبب سے نہیں ہوا بلکہ وجوب محض خدا کے حکم سے ہوا اس پر یہ حکمتیں مرتب ہوئیں اور اگر کوئی امر علت بھی ہو تو جب موجب نے خود اس کو متعین نہیں فرمایا تو ہماری کیا مجال ہے۔

کسی بزرگ سے پوچھا کہ معراج میں خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کیا باتیں ہوئی تھیں انھوں نے جواب میں فرمایا کہ۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان ⁂ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(اب کسے ایسا دماغ ہے جو مالی سے پوچھے بلبل نے کیا کہا کہ پھول نے کیا سنا اور ہوا نے کیا کیا۔)

حقیقت میں ہمارا کیا منصب ہے کہ ہم پوچھیں کہ اس حکم کی کیا علت ہے اور اس کی کیا حکمت ہے بانیانِ قوانین سے عام رعایا کو ہرگز یہ مجال نہیں کہ کسی ایک قانون کی وجہ بھی دریافت کریں تو خدا تعالیٰ سے بازپرس کرنے کی کیونکر اجازت ہوگی۔ البتہ اگر کوئی مشیر قانون ہو تو اس کو ایسی اجازت ہے تو اگر ہم کو کوئی سارٹیفکٹ خدا تعالیٰ کے ہاں سے مل گیا ہو تو پیش کریں

کتنی غضب کی بات ہے کہ یہ معترض ایک سلطنت دنیوی کا ممبر تو نہ بن سکے اور خدا کی حکومت میں دخیل ہو جائے۔ صاحبو! خدا تعالےٰ کو تو پارلیمنٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پس ہمارا تو مذہب یہ ہونا چاہیئے کہ ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو
نیگیختن علت از کار تو

(آپ کا ذکر کرنا چاہیئے نہ آپ کے کاموں کی علت)

دیکھئے خدا تعالےٰ کے تو بہت سے حقوق ہیں۔ حاکم ہونے کا بھی محبوب ہونے کا بھی۔ فرض کیجئے اگر کسی بازاری عورت سے پوری محبت ہو جائے اور وہ بے ڈھنگے ہی حکم کرے تو ان کو نہایت خوشی سے پورا کرو گے یا نہیں تو اگر خدا تعالےٰ کی طلب ہی نہیں تب تو ایسے لوگوں سے گفتگو ہی نہیں ورنہ یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ۔۔۔ در بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ۔۔۔ ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر مجھے زندہ کیجئے تو آپ کی عطاء ہے اگر مجھے مار ڈالئے تو میں آپ پر قربان ہوں بہرحال روح کو آپ سے تعلق ہے جو چاہیں کر سکتے ہیں)

آج کل لوگوں کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ سے کچھ بھی محبت ان کو نہیں ہے اگر محبت ہوتی تو کیا اتنا بھی نہ کیا جاتا جتنا ایک بازاری عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ۔۔۔ گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

(خدا کا عشق لیلےٰ کے تعلق سے کم کیسے ہو سکتا ہے اس کے عشق میں سراپا ذلت بنجانا بہتر ہے)

بہرحال محبت کی رو سے دیکھئے یا حکومت کی رو سے دیکھئے ہر طرح سر تسلیم خم کر دینا واجب ہے۔ بعض لوگوں کو تو اس طرح ترقی ہوئی اور بعض لوگ ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہوئے۔ یعنی وہ نماز روزے میں شبہات

نکالتے ہیں چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ روزہ ہے تو اچھی چیز لیکن فروری کے مہینے میں ہونا چاہیئے تھا گویا آپ نے خدا تعالیٰ کو یہ رائے دی۔ افسوس اول تو ہم کو رائے دینے کا حق کیا ہے دوسرے رائے بھی مہمل کیونکہ فروری میں سردی تمہارے ملک میں ہوتی ہے نہ کہ سارے عالم میں خدا تعالیٰ کی کیا عجب حکمت ہے کہ سارے عالم کو مساوی حالت میں رکھا کہ ایک سال ہندوستان میں سردی میں ہے تو دوسرے ممالک میں گرمی میں ہے اور اگر دوسرے ممالک میں سردی میں ہے تو ہندوستان میں گرمی میں ہے تو اس میں سب کا اوسط برابر ہوگیا جو عین عدل ہے بعض لوگوں نے ایک اور شبہ نکالا ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں نماز روزہ کیسے کریں گے۔ یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ احکام خداوندی کی عظمت نہیں۔ دیکھئے قوانین حکومت میں کبھی آپ کو یہ شبہ نہ ہوا کہ ڈاکخانہ کا ۱۰ کا ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو خط بیرنگ نہ ہوگا اور اگر ۹، کا ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو خط بیرنگ ہوجائے گا۔ جو لوگ اس کا راز جانتے ہیں ان کو تو چھوڑیئے جو لوگ نہیں جانتے ان کو بھی کبھی شبہ نہیں ہوتا اور اگر شبہ کریں تو احمق بنائے جائیں اور سب اُن کو ہنسیں اور یہ ہی جواب دیں کہ قانون یہی ہے۔ جب یہی جواب ہے تو اگر کوئی مولوی بھی آپ کے لغو سوالات کا یہی جواب دے کہ قانون یہی ہے تو وہ جواب زبردستی پر کیوں محمول کیا جاتا ہے اور اس کو قابل سماعت کیوں نہیں سمجھا جاتا اور علماء کو کیوں متعصب کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون شریعت کی عظمت دل میں نہیں اور قانون حکومت کی عظمت دل میں ہے اور جب قانون شریعت کی عظمت نہیں تو پھر

کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ تو ایسے شبہات، اسی وقت دل میں آتے ہیں جب عظمت نہ ہو۔ ایسا ہی یہ شبہ بھی ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہو تو وہاں کیونکر نماز پڑھیں اور کیسے روزہ رکھیں مجھے اس پر ایک واقعہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا۔ ایک مرتبہ وہ ریل میں انٹر میں سفر کر رہے تھے اور برابر کے درجہ میں چند نوجوان آکر بیٹھے جو وضع سے انگریزی طالب علم معلوم ہوتے تھے اُن کے قبل سے ایک معمر شخص سوار تھے جو صورت سے مولوی معلوم ہوتے تھے اور کسی ضرورت سے اس وقت اُتر گئے تھے ان نوجوانوں نے ان بیچارے کا اسباب منتشر کر کے اپنا سامان رکھ دیا وہ مولوی صاحب جو آئے اور معلوم ہوا تو اُن پر بہت ملامت کی کہ آپ لوگوں کو اس تحکم کا کیا حق تھا۔ غرض یہ سب شرمندہ ہوئے اور براہ شرارت یہ چاہا کہ ان مولوی صاحب کو بھی کسی بات میں شرمندہ کریں۔ اتنے میں مولوی صاحب نماز پڑھنے لگے تو ان کو ایک بات ہاتھ آئی بعد فراغ ان میں سے بعض نے ان مولوی صاحب سے کہا کہ کیا ہم آپ سے کچھ دریافت کر سکتے ہیں۔ آجکل کی تہذیب میں یہ بھی لازم ہے کہ اگر کچھ پوچھے تو اول اجازت لے۔ چنانچہ ان مولوی صاحب نے اجازت دی اس پر ان لڑکوں نے یہ سوال کیا کہ مولوی صاحب نماز فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ کہنے لگے کئے وقت کی فرض ہے مولوی صاحب نے کہا پانچ وقت کی۔ کہنے لگے سب پر پانچ وقت کی فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں ہر مکلف پر پانچ وقت کی فرض ہے۔ کہنے لگے سب جگہ فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ اس پر کہنے لگے کہ کیوں؟ جس مقام پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں بھی نماز پانچ ہی وقت فرض ہے اگر یہ ہے تو سال بھر میں پانچ ہی نماز فرض ہوئیں۔ مولوی صاحب

نے ایک نہایت دانائی کا جواب دیا۔ کہ تم لوگ وہاں سے آرہے ہو یا وہاں جانے کا قصد ہے کہنے لگے کہ صاحب! نہ آرہے ہیں نہ جانے کا قصد ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب دونوں باتیں نہیں تو یہ سوال قبل از وقت ہے۔ جب اس کی ضرورت پڑے گی اس وقت پوچھنا۔ لیکن ان شریروں نے اس جواب کی قدر نہ کی بلکہ سب ہنس پڑے۔ اور ان مولوی صاحب کو شرمندہ کرنا چاہا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص پختہ عمر کے بھی بیٹھے تھے جو وضع سے کوئی معزز اہلکار معلوم ہوتے تھے وہ بھی ہنسنے میں شریک تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب کو ان صاحب پر نہایت غصہ آیا کہ یہ تو لڑکے بھی نہیں ان کو کیا شامت سوار ہوئی۔ غرض کوئی اسٹیشن آیا مولوی صاحب اپنے درجے سے ان کے درجے میں پہونچے مگر وہ لڑکے تو اتر گئے اور وہ صاحب موجود رہے۔ انھوں نے نماز کے لئے وضو کیا تب تو مولوی صاحب کو زیادہ غصہ آیا کہ ماشاء اللہ نمازی ہو کر ان کی یہ حالت ہے مولوی صاحب نے ان سے عہدہ اور فرائض عہدہ دریافت کر کے پوچھا کہ آپ کے ذمہ دن رات میں کتنے گھنٹے کام کرنا ہے۔ انھوں نے مثلاً چھ گھنٹے بتلایا مولانا نے کہا کہ اگر ایسے مقام پر جہاں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے گورنمنٹ کی حکومت ہو جائے اور آپ کی وہاں بدلی ہو جائے تو کیا وہاں بھی رات دن میں چھ گھنٹے کام کرنا ہوگا تو سال بھر میں چھ گھنٹے کام کرنا پڑا اس کا حساب کس طرح ہوگا۔ کہنے لگے اندازہ کریں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ افسوس دنیوی حکومت کے قانون پر جو اشکال وارد ہو اس کی توجیہ تو اس طرح آسانی سے ہو سکتی ہے اور یہی توجیہ اس اشکال میں نہ ہو سکی بلکہ اس پر تمسخر کرتے ہوئے شرم نہیں آتی بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ کی۔ غرض اس قسم کے شبہات ہونے لگے ہیں۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ شب قدر میں فضیلت ہے تو کہاں کی شب قدر میں۔ ہندوستان کی یا لندن

کی کیونکہ غروب ہر جگہ کا مختلف ہے مولانا احمد حسن صاحب نے خوب جواب فرمایا کہ بعض مواسم میں کچہری دس بجے ہوتی ہے تو کہاں کے دس بجے مراد ہوتے ہیں ہندوستان کے یا لندن کے جو جواب اس کا ہے وہی اُس کا ہے کہ ہر جگہ کی شب قدر میں فضیلت ہے خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے۔ جب یہاں غروب ہو یہاں کیلئے۔ جب وہاں غروب ہو وہاں کیلئے۔ یہ دو چار مثالیں نمونے کے طور پر بیان کر دی ہیں۔ اس قسم کے لغو شبہات بہت سے ہیں اور ان سب کی وجہ یہ ہے کہ احکام شریعت کی عظمت دلوں میں نہیں رہی اور دوسرے یہ کہ ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیونکہ انسان جس چیز کو ضروری سمجھا کرتا ہے اس میں شبہات نہیں نکالا کرتا مثلاً اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جاوے اور وہ نسخہ لکھ کر دے اور مرض سخت ہو تو اعتماد کے بعد یہ سوال نہیں کرتا کہ آپ نے فلاں دوا کیوں لکھی یا فلاں دوا کا یہ وزن کیوں لکھا اس کا دونا یا نصف کیوں نہیں لکھا کیونکہ جانتا ہے کہ اگر ذرا بھی بے ڈھنگا کیا تو حکیم صاحب خفا ہو کر مطب سے نکال دیں گے اور نسخہ بھی نہ دیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ میں مروں گا۔ اگر شریعت کو بھی ضروری سمجھتے تو احکام کے بتلانے والوں کا وجود غنیمت سمجھتے جیسے طبیب کا وجود غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ ہاں اگر نسخہ پینا ہی نہ ہو تو اس میں جتنے چاہیں عیب نکال دیتے ہیں۔ صاحبو! واللہ اگر دین کی طلب ہوتی تو غنیمت سمجھتے کہ احکام کے معلوم ہونے کے ذرائع موجود ہیں مگر چونکہ کام کرنا نہیں ہے اس لئے طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور انواع انواع کے بے ڈھنگے سوالات کئے جاتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی میں نے کہا کہ تمہاری ناک منہ پر کیوں لگی ہے گدی پر کیوں نہ لگی کہنے لگے کہ گدی پر اگر لگتی تو بری لگتی میں نے کہا کہ بری تو جب لگتی کہ صرف تمہاری ناک گدی پر ہوتی اور اگر سب کی گدی پر ہوتی تو ہر گز بری نہ لگتی تو کیا وجہ کہ سب کے ناک گدی پر کیوں نہیں لگی میں کہتا ہوں کہ اول اپنی خبر لیجئے اس کے بعد نماز وغیرہ تک نوبت آئے گی۔ بہت بہتر ہے کہ انسان

اپنی دنیا کی تحقیقات میں لگے دین کی تحقیق ہو چکی ہے اس پر عمل کافی ہے دوسرے جب تیرہ سو برس کی تحقیق آپ کے نزدیک غلط ثابت ہوئی تو تیرہ منٹ کی تحقیق کیوں کر صحیح یقینی ہے۔ صاحبو! سلامتی کی بات یہ ہی ہے کہ شاہرہ پر چل کر سیکڑوں پار ہو گئے اس کو چھوڑ کر ایک غیر مجرب پگڈنڈی کو اختیار نہ کرو نیز کیا آپ سے قبل کوئی عاقل اور ہمدرد انِ اسلام ہوا ہی نہیں۔ کیا ابوبکرؓ و عمرؓ کو دین کا کچھ درد ہی نہ تھا اور کیا ان کو آپ کے برابر بھی عقل نہیں تھی اور اگر عقل نہ تھی تو کیا وجہ کہ ہرقل اور کسریٰ تک پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے مصاحبین کی گفتگو کا اثر ہوتا تھا۔ ان کی عقلوں کا اندازہ اس سے کرو کہ ان کے پاس نہ نقشے تھے نہ جغرافیہ اور جب مصر دمشق قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو ان مقامات پر کس طرح قبلہ رُخ نہایت ٹھیک سمت میں مسجدیں بنائیں کہ آج تک آلاتِ ہندسہ سے سب برابر ثابت ہوئیں اور یہ ایک چھوٹی سی بات ہے اس سے بڑی بڑی ہزاروں باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت درجہ عاقل تھے اور بہت بڑے مدبر تھے دیکھئے ملکی انتظام کس طرح کا کیا پھر ان کو وہ شبہات کیوں نہ پیدا ہوئے وہ اتنے مہذب تھے انھوں نے کیوں نمازیں نہ چھوڑیں کیوں روزہ میں ترمیم نہ کی۔ معلوم ہوا کہ اول کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کرنا نہایت خطرناک ہے نابینا کے لئے یہ ہی مناسب ہے کہ کسی بینا کے ساتھ ہو لے اور جدھر کو وہ لے چلے اُدھر کو چلے اور اگر کسی موقع پر بینا نے کہا کہ یہاں نالی ہے اور نابینا صاحب لگے دلیل پوچھنے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہاتھ چھوڑ دے گا اور یہ گر کر مریں گے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ یہ ترمیمیں جو پیش کی جاتی ہیں ان سے غرض کیا ہے آیا دنیا کا فائدہ یا دین کا سو ظاہر ہے کہ دین کا تو کوئی فائدہ نہیں ہاں

دنیا کا فائدہ ہے کہ نماز پڑھنے سے بچیں گے پھر وہ نہ رہے گا تو آزادی نصیب ہو گی سود حلال ہو جائے گا تو مال میں ترقی ہو گی ہر مسئلہ طویل الذیل ہے میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر فرضاً مصلحت نکل سکتی تو صرف یہ ہی نکل سکتی ہے اور فرضاً اس لئے کہا کہ ہنوز اس میں بھی کلام ہے کہ ان کو مصلحت کہنا بھی درست ہے یا نہیں لیکن اگر مان بھی لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ یہ مصالح تو بغیر دین میں کلام کئے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مال میں ترقی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ سود کو حرام سمجھا جائے اور پھر اس کا مرتکب ہو جائے کیونکہ ترقی تو فقط سود لینے سے ہے نہ کہ سود کے حلال کہنے سے تو اگر بربادی ہوتا ہے تو سود ہی لو سود کو حلال تو نہ کرو کہ ایمان بھی جاتا رہے اور سود لینے سے تو فقط تم گنہگار رہو گئے آئندہ نسلیں تو ایمان سے خارج نہ ہوں گی۔ برخلاف اس کے کہ اگر سود کو حلال کہا تو تم بھی ایمان سے خارج ہوئے اور آئندہ نسلیں بھی۔ علیٰ ہذا پردے سے گھبرانا سو اول تو یہ عجیب بات ہے کہ پردے میں رہیں تو عورتیں اور جی گھبرائے مردوں کا خیر اگر تمہارے نزدیک پردے کا توڑ دینا ہی مصلحت ہے تو پردے کو واجب سمجھ کر ہی توڑ دو بے پردگی کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو جائے گا اور تمہارے نزدیک اس واسطے کہا کہ واقع میں پردے کا توڑنا ہرگز مصلحت نہیں ہو سکتا اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ صاحب جب طبائع میں فساد ہوتا ہے تو پردے میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے سو یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے۔ واقع میں جو کچھ خرابیاں وہ بے پردگی یا ادھورے پردے کی وجہ سے ہوئیں۔ بھلا کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ مرد کبھی اجنبی عورت کو نہ دیکھے اور عورت کبھی اجنبی مرد کو نہ دیکھے اور پھر ان میں کسی قسم کا فساد ہو سکے اور جب ذرا سی بے پردگی اتنے

فساد ہوئے تو پوری بے پردگی میں جتنے فساد ہوں کم ہیں اسی طرح اگر نماز کو چھوڑنا ہی ہے تو فرض سمجھ کر بھی تو چھوڑا جا سکتا ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ فرضیت سے انکار کرکے ایمان بھی برباد کرلو۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ اگر سود کو حلال نہ سمجھیں تو قوم ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ حرام سمجھنے کی صورت میں کم لوگ سود لیں گے میں نے کہا کہ اول تو آپ کو دوسروں کی کیا فکر دوسرے حلال کہہ کر بھی تمام قوم ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ جو مسلمان قوت ایمان سے سود کو چھوڑ بیٹھے ہیں وہ تمہارے یا مولویوں کے کہدینے سے بھی کبھی نہ لیں گے بلکہ یوں کہیں گے علماء بگڑ گئے تو حلال کہہ کر بھی سود خواروں کی تعداد دس پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

ایک صاحب نے قربانی پر اعتراض کیا کہ اس سے کیا فائدہ کہ ذبح کرکے کھیتوں میں دبا دیا اور وجہ اس فساد کی یہ ہے کہ اپنے خیال میں احکام کا ایک مبنیٰ تراش کیا ہے مثلاً قربانی کا مبنیٰ یہ تراش لیا ہے کہ مساکین کو نفع ہو اور چونکہ ذبح کرکے کھیتوں میں دبانے سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اس لئے اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب صرف اس قدر کافی ہے کہ۔ ع۔ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا ست۔ میں بیان کرتا ہوں کہ اگر قربانی کرکے ایک حبہ گوشت کا بھی کسی کو نہ دو تو قربانی کا ثواب ملتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مقصود قربانی کا نہیں کہ لوگوں کو نفع ہو ورنہ صرف ذبح کرنے سے کیوں ثواب ملتا اب رہی یہ بات کہ پھر کیا حکمت ہے تو حکمت یہ ہے کہ بندے کو بحیثیت محب ہونے کے یہ مناسب تھا کہ اپنی جان فدا کرتا اس کا بدل خدا تعالیٰ نے یہ مقرر فرمایا کہ ایک پیارے جانور کو ذبح کرو اور دلیل تاریخی اس کی یہ ہے کہ اول ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم ہوا تھا کہ ہماری راہ میں بیٹے کو ذبح کرو۔

بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہوتا ہے تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جانِ جاں مانگی گئی تھی اسی کو قرآن شریف میں فرماتے ہیں سُنَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ (تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) تو مقصود یہ تھا کہ اپنی جان دی جائے مگر اس کا بدلہ یہ مقرر فرما دیا کہ جانور کو ذبح کر دو۔ اور محبت ایسی چیز ہے کہ موقع پر لوگوں نے اپنی جانیں بھی قربان کر دی ہیں ایک وکیل صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بزرگ صاحب حال جن کو لوگ مسخرا سمجھا کرتے تھے حج کرنے کے لئے گئے جب خانۂ کعبہ کے سامنے پہونچے تو مطوف کی زبان سے یہ نکلا کہ یہ کعبہ ہے اُس وقت اُن پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور یہ شعر ان کی زبان سے نکلا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنّا

(جب محبوب کے کوچہ میں جاؤ تو جان مضطر کو حاضر کر دو ہو سکتا ہے دوبارہ اس تمنا کو نہ پہونچ سکو۔)

یہ کہتے ہی ایک چیخ ماری اور جان بحق ہو گئے اور سیکڑوں اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ ایسے اوقات میں ان کی جان نکل گئی۔ حضرت نجم الدین کبریٰ کی حکایت ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ پڑھ دیا۔ جان بدہ و جاں بدہ وجاں بدہ۔ آپ نے فرمایا کہ محبوب جان طلب کر رہا ہے مگر افسوس کوئی جان دینے والا نہیں اور پھر فرمایا کہ جاں دادم و جاں دادم وجاں دادم۔ اور یہ کہتے ہی جان نکل گئی۔ لیکن پھر بھی ایسے لوگ بہت کم ہیں فرماتے ہیں۔ وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِکُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ (اگر ہم ان پر

یہ فرض کردیتے کہ تم اپنی جان مارلو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو تھوڑے ہی لوگوں نے ایسا کیا) اور اگر سب کے سب ایسے ہی ہوتے بھی تو ایک سال میں سب کے سب ختم ہو جاتے یہ تو رحمت ہے کہ اگر خیر جانور ہی دیدو تو وہ بھی کافی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ جانور عزیز ہو۔ حدیث میں ہے سمنوا ضحایاکم فانھا علی الصراط مطایاکم (تم موٹی تازہ قربانی کیا کرو صراط مستقیم پر یہ ہی تمہاری سواریاں ہوں گی) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب سورۂ بقرہ ختم کی تو ایک اونٹنی ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفی ملتی تھی۔ الحاصل یہ معلوم ہوگیا کہ حکمت قربانی کی وہ نہیں ہے جو کہ اس وقت لوگوں نے تراش رکھی ہے بلکہ یہ حکمت ہے اور یہ بھی ہم نے تبرعاً بتلا دیا ورنہ اصل مسلک ہمارا یہ ہے کہ ؎

حدیث از مطرب دمے گو وراز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ساقی شراب کی بات کرو گردش ایام کو کچھ نہ کہو اس معمّے کو نہ کوئی کھول سکا نہ کھول سکے گا۔

خدا تعالیٰ کے اسرار کا احاطہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور جب ضرورت ثابت ہوگئی تو ہم کو حکمت یا اسرار کے دیکھنے اور بتلانے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہرحال دین میں اختراع نہ کرو۔ بلکہ علم کی تکمیل کرو یا علماء کی تقلید کرو اور بدون ان دونوں باتوں کے ہمارا مذہب اور دین بالکل ڈانواں ڈول ہے۔ بالخصوص اس آزادی کے زمانے میں اسی ضرورت علم دین کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اس میں مختلف تفسیریں ہیں میرے خیال میں حکمت سے مراد علوم اجتہادیہ اور کتاب سے مراد علوم منصوصہ۔ اور میں اس وقت

اس کی تفصیل نہیں کرتا۔ مگر اس وقت کے رفع اغلاط کے لئے اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ اجتہاد ہر شخص کا معتبر نہیں بلکہ اس کا اجتہاد معتبر ہے جس میں سامان اجتہاد بھی ہو اور یہ طے ہوگیا ہے کہ ہم میں قوتِ اجتہادیہ نہیں ہے۔ اس کے لئے میں ایک مسئلہ مثال کے لئے عرض کرتا ہوں اس سے پورے طور پر سمجھ میں آجائے گا کہ ہم میں قوتِ اجتہادیہ بالکل نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو شخص جنگل میں ہوں اور ایک کو غسل کی ضرورت ہو اور دوسرے کو وضو کی ضرورت ہو اور پانی وہاں ہو نہیں اس لئے دونوں نے تیمم کیا اور یہ دونوں شخص جمیع صفاتِ علمیہ و عملیہ میں مساوی ہوں سوائے اس تفاوتِ مذکور کے تو اگرچہ امامت دونوں کی جائز ہے لیکن گفتگو اس میں ہے کہ افضل کس کی امامت ہے سو ہمارے اجتہاد سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کو وضو کی ضرورت ہے اس کی امامت افضل ہے کیونکہ اس میں حدث اصغر تھا اور اس لئے نجاست حکمی اس میں کم تھی اور طہارت میں دونوں برابر ہوئے تو وضو والے کی طہارت اکمل ہوئی مگر فقہا کے اقوال دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حکم برعکس ہے اور وجہ یہ ہے کہ تیمم خلیفہ ہے غسل اور وضو کا اور غسل افضل ہے وضو سے تو افضل کا خلیفہ بھی افضل ہوگا تو غسل کا تیمم افضل ہوگا وضو کے تیمم سے۔ اب دیکھئے فقہائے متاخرین کا یہ اجتہاد ہے مگر ہم اس تک بھی نہ پہونچ سکے کیونکہ اجتہاد محض پڑھنے سے نہیں ہوتا بلکہ احادیث کے جمع کرنے اور تعمق پر عبور ہونے اور اس کے بعد تقویٰ و طہارت کے حاصل ہونے سے ایک خاص ملکہ ہوتا ہے اور جب ہم میں یہ سب باتیں نہیں تو ہم کو سوائے تقلید کے چارہ نہیں۔

اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ مسلمانوں میں علم کیونکر عام ہو،

کیونکہ یہ تو بہت مشکل ہے کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں آج کل لوگ اس سے بھی گھبراتے ہیں کہ علماء اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں سو میں کہتا ہوں کہ ہم سب کو مولوی نہیں بناتے بلکہ اگر سب بنیں بھی تو ہم روک دیں کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں ہمت اور قناعت اور دانائی اور ورع نہ ہو ان کو مقتدا بنا دینے سے بہت سی خرابیاں دین میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ہمت سے مراد دین کی ہمت ہے نہ کہ دنیا کمانے کی ہمّت۔ اور ایسے ہی طماع لوگ ہیں جنھوں نے دنیا داروں کے سامنے دست طمع دراز کر کے اکثر لوگوں کو علم دین سے متنفر کر دیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ علم دین کا ثمرہ یہ ہوتا ہے تو اگر ہماری اولاد پڑھے گی تو ان میں بھی یہ ہی باتیں پیدا ہوں گی لہذا ایسے لوگوں کو ہم ہرگز مولوی ہونے کی رائے نہ دیں گے۔ بلکہ مولوی ہونا اور خدمت دین اس کا کام ہے جس کی یہ حالت ہو ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل شراب گلگوں سے خراب رہ اور بے مال و دولت قارون کی سینکڑوں عزت پر بھاری رہ)

یہ تو مال میں اس کی حالت ہو اور جاہ میں یہ حالت ہو کہ ؎

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(لیلیٰ کے گھر جانے کے راستے میں جان پر بڑے خطرے ہیں۔ تو اولین شرط یہ ہی ہے کہ مجنوں بن جاؤ)

اور یہ حالت ہو کہ صرف ایک کا طالب ہو ؎

دلا رامے کہ داری دل درد بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر محبوب رکھتے ہو تو دل اس سے بند رکھو اور تمام دنیا سے آنکھ بند رکھو اور یہ حالت ہو کہ عاشقاں را مذہب و ملت جدا ست۔ اب آپ ہی اندازہ کیجئے کہ سب کے سب ایسے کہاں ہیں تو اگر سب کو مولوی بنایا جاوے تو کس قدر خرابیاں پیدا ہوں۔

میں نے ایک استفتاء دیکھا کہ اس میں ایک مولوی صاحب نے ساس کو حلال کر دیا تھا اور کیونکر چالاکی سے یعنی یہ لکھا کہ اس شخص کی بیوی بوجہ جہالت کلماتِ کفر و شرک میں ہمیشہ سے مبتلا ہے اس لئے اس کا نکاح اس مسلمان سے صحیح نہیں ہوا اور جب نکاح نہیں ہوا تو ساس ساس نہ ہوئی اور حرمتِ مصاہرۃ حنفیہ کا مذہب ہے ہم پر حجت نہیں پس بیوی کو چھوڑ کر ساس سے نکاح درست ہے خوب کہا ہے ؎

بد گہر را علم و فن آموختن
دادنِ تیغست دست راہزن

بے اصل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دیتا ہے۔
تو اگر اس مذاق کے لوگ مقتدا بنیں گے تو کیا کچھ خرابیاں ہوں گی اس لئے مولویت کے لئے انتخاب صحیح ہونا چاہیئے سو آپ بھی اپنے بچوں میں سے انتخاب کیجئے اور اگر کہو کہ دیہاتی یا غریب لوگ تو پڑھ رہے ہیں تو سمجھو کہ وہ آپ کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ وہ آپ کے اندرونی حالات سے واقف نہیں اس لئے وہ آپ کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ لہذا شہر والوں کے لئے شہر والے اور گاؤں والوں کے لئے گاؤں والے مولوی ہونے چاہئیں اور غرباء کے لئے غرباء اور امراء کے لئے امراء کیونکہ غرباء کی وقعت امراء کی نظر میں نہیں دوسرے

اپنے کام میں لگے ہیں اس لئے بھی امرار کو توجہ کرنا نہایت ضروری ہے یہ اپنی اولاد میں سے منتخب کریں لیکن خدا کے لئے ایسا انتخاب نہ کیجئے جیسا کہ اب تک کیا ہے کہ اولاد میں جو سب سے زیادہ بیوقوف ہوا اس کو عربی پر متوجہ کر دیا۔ بلکہ زیادہ فطین زیادہ ذکی ہو اس کو عربی کے لئے انتخاب کیجئے اور اس کے اخلاق درست کیجئے اس میں تواضع پیدا کیجئے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اپنے سے جدا کر کے کسی صاحب دل کے پاس بھیج دیجئے۔ چند روز بھی اگر وہاں رہے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ انسانیت آجائے گی اس کے بغیر انسانیت نہیں آتی دیکھئے انگریز اپنے بچوں کو کتنی تھوڑی عمر سے جدا کر دیتے ہیں۔

ایک بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے اپنے لڑکے کو کسی معلم کے سپرد کیا۔ ایک روز دیکھا کہ معلم صاحب گھوڑے پر سوار ہیں اور شہزادہ سائیس کے مثل پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے بادشاہ کو یہ دیکھ کر سخت ناگوار ہوا لیکن ضبط کر کے معلم سے بہ آہستگی دریافت کیا معلم نے کہا کہ حضور چند روز میں یہ بادشاہ ہوگا مخلوق اس کی جلو میں ہوگی اگر اس وقت پیدل نہ دوڑیگا تو اس وقت کیسے خبر ہوگی کہ پیدل دوڑنے والوں پر کیا گذر رہی ہے۔ اس لئے میں نے اس کو دوڑایا کہ یہ اپنی حالت یاد کر کے دوسروں پر رحم کرے۔ تو یہ برتاؤ باپ نہیں کر سکتا اور استاذ کر سکتا ہے مگر ایسے استاذ نہیں جیسے آجکل کے استاذ ہیں ظالم اور قصائی جن میں شفقت نام کو نہیں۔ میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ چار برس سے زیادہ اس کی عمر نہ ہوگی اور لڑکے اس کو ڈنڈا ڈولی کئے لا رہے ہیں۔

ع پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

افسوس ہے کہ اکثر بچے انہی ذابحین کے قبضے میں آتے ہیں اور وہ تباہ برباد ہوتے ہیں کہ ان کے برتاؤ سے تو طبیعت کند ہو جاتی ہے

یا پڑھنا چھوڑ بیٹھتے ہیں اور یہ پُرانا مقولہ ہے کہ حافظ جی۔ ہڈی ہماری چمڑہ تمہارا۔ صاحبو! استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مربی ہو۔ اور اگر ایسا نہ کرسکے تو وہ استاذ بننے کے قابل نہیں۔ تو ایک طرف تربیت ہو ایک طرف تعلیم۔ پھر دیکھئے کہ یہ شخص کس شان کا نکلتا ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لڑکوں کو علوم دینیہ پڑھا جائے تو یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ تو اول تو امرار کو یہ سوال ہی کرنا نہ چاہیئے اور غربار کے لئے ساری قوم کو ادھر متوجہ ہو کر اس کے لئے سرمایہ جمع کرنا چاہیئے کہ ان کی خدمت کریں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر بچپن سے امارت میں گذرے تو ان کو روز اول ہی سے استغنار کی عادت ہو جائے بڑے ہو کر حرص وغیرہ نہیں پیدا ہوتی اور اگر اول ہی سے سوال اور ذلت کا خوگر ہو جیسا آج کل قوم کی بے توجہی سے ہو رہا ہے تو بڑے ہو کر وہی عادت رہے گی۔ پس آجکل جو اکثر طلبہ پر اعتراض کیا جاتا ہے یہ واقع میں اپنے اوپر الزام ہے کیوں یہ نہیں کیا جاتا کہ قوم طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح رکھے مثلاً جس کے چار بچے ہیں وہ ایک طالب کو ملا کر پانچ سمجھے اور اس طالب علم کی ہر طرح امداد کیا کرے۔ عالمگیر نے یہ کیا تھا تو ایک جماعت کی جماعت جو پریشانی میں مبتلا تھی کیسے آرام سے فارغ ہوئی اور انھوں نے کتنے بڑے بڑے کام کئے لیکن چونکہ عالمگیر رحمدلی کے ساتھ مدبر بھی تھے ترکیب یہ کی تھی کہ طالب علموں کو جو پریشان دیکھا اور بیت المال کو بار سے بچانا چاہا تو صورت یہ کی کہ ایک امیر دربار سے نماز کے فرائض پوچھے تو وہ بالکل کورے تھے۔ عالمگیر نے اس کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ اتنے طالب علم شہر میں ہیں تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان سے تھوڑی دیر مسائل سیکھ لیا کرو۔ پھر کیا تھا ہر شخص طالب علموں کا طالب ہو گیا اور اس طرح سب طالب علم ولباس وتنخواہ

سے بے فکر ہو گئے مگر یہ سب حکومت کے بدولت تھا کہ حکومت عجیب چیز ہے۔ مگر اب اتفاق باہمی بھی اس سے زیادہ عجیب کام کر سکتا ہے جب اس کی ضرورت ثابت ہو چکی ہے تو ضرور اس پر توجہ کرنی چاہیئے۔ یہ تدبیر تو مولوی بنانے کی تھی۔ اب رہے وہ لوگ جو کہ مولوی نہ ہوں ان کے لئے ضروریات کی تعلیم ہونی چاہیئے خواہ اردو میں ہو یا عربی میں مگر انگریزی کے قبل ہو کیونکہ پائدار اثر نقش اول کا ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آنکھ کھولتے ہی انگریزی میں ان کو لگا دیا جائے۔ تو اول تو قرآن شریف پڑھاؤ اگر پورا نہ ہو تو دس[1] سپارے ہی سہی اور اس کے ساتھ ہی اس کے روزانہ تلاوت کا بھی التزام رکھو اور اس کے بعد کچھ رسالے مسائل دین کے اگرچہ اردو ہی میں ہوں ان کو کسی عالم سے پڑھواؤ اس کے بعد اگر ضرورت معاش مجبور کرے تو انگریزی بھی پڑھاؤ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر دین کے خلاف اس میں کوئی بات پیدا ہو تو فوراً اس کو تنبیہ کرو اور اگر باز نہ آئے تو انگریزی چھڑا دو۔ اب رہے وہ لوگ جو کہ بالکل ہی نہیں پڑھے ان کے لئے یہ ترکیب ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں ہر ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ کسی سے مسائل اور اخلاق کی کتابیں پڑھوا کر ان کو سنوا دیں اور عورتوں کے لئے یہ کیا جائے کہ جو ان میں سے پڑھ سکیں ان کو تو پڑھایا جاوے اور جو نہ پڑھ سکیں ان کو ان کے مرد دینی رسالے سنا دیا کریں۔ اور جن کے مرد پڑھے نہ ہوں وہ خواندہ عورتوں سے سن لیا کریں۔ اور ساتھ ہی جو مسائل پیش آئیں ان کو مرد بلا واسطہ اور عورتیں

---

[1] لوگوں کو اپنی حالت پر شرم کرنا چاہیئے کہ حکیم الامت مایوس ہو کر کس قدر تنزل کر کے رائے پیش کرتے ہیں ۱۲ جامع

بواسطہ مردوں کے علماء سے پوچھتی رہیں یہ وہ ترکیب ہے کہ اگر اس پر کاربند ہوا جائے۔ تو چند ہی روز میں ساری جہالت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام قوم میں دین پھیل جائے گا۔ یہ تو علم کے متعلق تھا اب تیسری چیز جزو دین عمل ہے اگر وہ نہ ہو تو علم کچھ بھی نہیں تو عمل کی تقسیم یہ ہے کہ ایک تو اعمال ظاہری ہیں اور ایک اعمال باطنی اس وقت جو لوگ عمل کرتے بھی ہیں وہ صرف اعمال ظاہری پر متوجہ ہیں ورنہ باطن کی یہ حالت ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل   و اندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وز درونت ننگ میدارد یزید

(اوپر سے کافر کی قبر کی طرح مزین ہو اور نیچے اللہ کا عذاب ہے اوپر سے بایزید پر طنز کرتے ہو اور اندر سے یزید جیسا شخص شرماتا ہے)

کیا معنی کہ باطن اکثر لوگوں کا درست نہیں باطن کی درستی ایک تصحیح عقائد ہے جس کو کم و بیش حاصل بھی کیا جاتا ہے۔ دوسرے تہذیب اخلاق جس کو تصوف کہتے ہیں اور وہ بالکل متروک ہے جس کی دو وجہ ہیں ایک تو بے التفاتی اہل دنیا کی۔ دوسرے بے عنوانی منتسبین الی التصوف کی یعنی آجکل رسوم کا نام تصوف رکھ چھوڑا ہے۔ حقیقت تصوف کی ہے تعمیر الظاہر والباطن۔ ظاہر کا درست کرنا یہ ہے کہ اقوال و افعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ ہے کہ قلب کی حالت درست ہو یعنی ایک تو اخلاق باطنی درست ہوں توکل ہو شکر ہو۔ رذائل کو دور کیا ہو جیسے حب دنیا وغیرہ یہ ہے تصوف۔ تو اس وقت لکھے پڑھے بھی صرف ظاہر کو لئے ہوئے اور جنھوں نے باطن کو لیا انھوں نے ظاہر کو چھوڑ دیا تو گویا تقسیم کر لیا

ہے کہ جو ظاہر کو لیں وہ باطن کو چھوڑ دیں اور جو باطن کو لیں وہ ظاہر کو چھوڑ دیں اور بعض نے دونوں کو چھوڑ دیا وہ نہ نماز روزہ کریں نہ تصفیۂ باطن۔ بلکہ حُبِّ دنیا میں حبِّ جاہ میں غرق ہیں اور یہ تینوں قسم کے لوگ تصوّف سے بمراحل دور ہیں۔ غرض تصوف اصلاحِ ظاہر و باطن کا نام ہے نہ کہ رسوم کا بلکہ احوال متعارفہ کا نام بھی نہیں۔ یہ احوال اگر نہ بھی ہوں تو نسبت مع اللہ پیدا ہو سکتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ طاعت میں سہولت ہو اور دوام ذکر پہ توفیق ہو رہی ہے رسوم کہ قبر پر کپڑے چڑھانا عرس کرنا کپڑے رنگیں پہننا سماع سننا۔ سو اس کو کوئی تعلق تصوف سے نہیں ہے اور احوال اگرچہ کبھی مقامات پر مترتب ہو جاتے ہیں لیکن وہ تصوف کے اجزاء یا اس کے لوازم نہیں اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذکر میں کبھی ان کو وجد وغیرہ ہونے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اصل مقصود حاصل ہو گیا اور اگر نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ کچھ فائدہ ہی نہیں ہوا حالانکہ ذکر سے مقصود یہ نہیں بلکہ حقیقی مقصود یہ ہے کہ حکم ہے فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) جس کا ظہور آخرت میں ہوگا اور عاجل مقصود یہ ہے کہ کثرت ذکر سے نسبت مع اللہ ہو جائے اور اس سے سہولت فی الطاعۃ ہو تو یہ ایک غلطی تو متصوفین کو ہوئی دوسری غلطی منکرین کو ہوئی کہ انھوں نے صوفیہ کو خشک دماغ بتلایا حالانکہ وجد وغیرہ کا سبب یہ نہیں اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی اس میں تھوڑا دخل احوالِ طبعہ کو بھی ہوتا ہے غرض ان کو عین تصوف سمجھنا بھی غلطی ہے اور بالکل مبائن خارج سمجھنا بھی غلطی ہے فیصلہ یہ ہے کہ داخل تو نہیں مگر متعلق ہے۔

اور ایک درستی قلب کی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں اس کو مفصل بیان کر چکا ہوں۔ جس کے اعادے کی ضرورت

نہیں ہاں رہا عمل ظاہر تو وہ ظاہر ہی ہے۔ پس یہ آیت علم و عمل کی تمام شاخوں کو جامع ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں گے اور وہ یہ اہتمام کریں گے۔ اب آپ کو اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ یہ تینوں چیزیں کیسی ضروری ہیں دوسرے یہ کہ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے شفیق تھے کہ ایسی باتیں بتلائیں کہ اگر ان کو چھوڑا جائے تو دین اور دنیا سب بگڑ جائے دین کا بگڑنا تو ظاہر ہے اور دنیا اس لئے کہ مسلمانوں کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ ہے کہ جب یہ دین چھوڑتے ہیں تو دنیا بھی ان سے رخصت ہوجاتی ہے۔ دوسرے دنیا نام ہے راحت کا اور دین کو چھوڑ کر راحت نصیب نہیں ہوتی۔ توجب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی بڑی رحمت ہیں تو اب یہ دیکھئے کہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق کیا ادا کیا۔ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں ایک یہ کہ آپ کے ساتھ محبت ہو۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کی عظمت قلب میں ہو۔ تیسرے یہ کہ آپ کی متابعت کی جائے اس وقت بعض نے عظمت کو تو لیا مگر محبت اور متابعت دونوں کو بالکل چھوڑ دیا تو بعض نے متابعت تو کی مگر محبت اور عظمت کو چھوڑ دیا اور بعض نے محبت وعظمت دونوں کو لیا مگر متابعت چھوڑ دی۔ میں نے اس مضمون کو القاسم میں لکھدیا ہے یہ ایک ماہواری رسالہ ہے جو کہ بہت ہی مفید ہے۔ میں یہ بھی رائے دیتا ہوں کہ لوگ اس کو خریدیں اس میں اختلافی مسائل نہیں ہیں بلکہ محض متفق علیہ اصلاح ہے۔ بہرحال یہ حقوق ہیں آپؐ کے۔ اور آپ اللہ کی بڑی نعمت ہیں اور نعمت کی قدر یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کریں اور وہ ابھی مذکور ہوئے ہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور خدا تعالے سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو توفیق نیک عطا فرمائیں آمین ؞

تمت

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

وعظ چہارم ملقب بہ

طریق القرب

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر محمد عبد المنان غفر لہ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم - اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

وعظ چہارم ملقب بہ

طریق القرب

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
قصبہ قنوج مسجد جامع	۱۰ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ یوم جمعہ	سوا دو گھنٹہ	بیٹھ کر	طریق قرب حق	مولوی سعید احمد صاحب	تخمیناً ۳۰۰	عوام اہل شہر کا مجمع زیادہ تھا اور اہل حدیث بھی تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ

وَسَلَّمَ۔ اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَمَا اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَھُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ۔

(باری تعالیٰ فرماتے ہیں. تمہارے مال اولاد مجھ سے قریب نہیں ہو سکتے بلکہ قریب وہ ہے جو ایمان لایا اور اچھے کام کئے ان کے لئے کرنے کا دگنا بدلہ ہے وہ بہترین کمروں میں پناہ گزیں ہوں گے)

یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے اس میں خدا تعالیٰ نے اپنی بندوں کی ایک بڑی دولت کا پتہ اور اس کے حصول کا طریقہ بتلایا ہے اور جو غلطیاں ان سے واقع ہو گئی ہیں ان پر تنبیہ فرمائی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت کے ترجمہ سے اس دولت کا پتہ چل جاوے گا۔ مگر اول مجملاً اس کا پتہ بتلاتا ہوں کیونکہ بہت لوگ اس کو دولت سمجھتے ہیں اور اہلِ دنیا تو کیا سمجھتے اکثر اہلِ دین بھی اس پر نظر کم کرتے ہیں اور وہ دولت قربِ خداوندی ہے اور وہی اس آیت میں مذکور ہے اور اس قرب کی حقیقت عنقریب معلوم ہو گی اس لئے کہ وہاں قرب جسمانی تو ہے نہیں کہ فاصلہ کم ہو جائے کیونکہ یہ خواص جسم سے ہے باقی جو چیزیں مادی نہیں ہیں اگرچہ حادث اور ممکن ہوں ان میں بھی یہ قرب متصور نہیں ہے تو جو ذات پاک امکان اور حدوث سے بھی منزہ ہے اس میں یہ قرب کیونکر متصور ہو سکتا ہے۔ اور یہاں سے ان عوام الناس کی غلطی معلوم ہو گئی ہو گی جو خواص کی صورت میں ہیں اور خواص سے علماء مراد نہیں

کیونکہ وہ ایسی غلطیوں سے محفوظ ہیں بلکہ مشائخ اور صوفیہ مراد ہیں تو جو لوگ ان حضرات کی صورت بناتے ہیں اور حقیقت میں وہ عامی ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرب خداوندی بھی قرب جسمانی ہے اور اس کا پتہ ان کی مثالوں سے چلتا ہے اور اگر محققین سے اس قسم کی کوئی مثال منقول ہو تو ہم اس میں تاویل کریں گے لیکن یہ عوام اس قسم کے اقوال میں تاویل بھی نہیں کرتے بلکہ ان کی ظاہری متبادر معنی مراد لیتے ہیں اور اس قسم کے اقوال بولنے والے بعض تو وہ ہیں کہ خدا کو دریا اور اپنے کو موج کے ساتھ تشبیہ دیتے اور بعض لوگ قطرہ اور دریا کی تشبیہ دیتے ہیں تو اگر تشبیہات کسی معتبر کلام میں پائے جائیں گے تو ہم اس کی تاویل کریں گے کیونکہ محض تشبیہ پر انکار کرنا تو غلو ہے۔ قرآن شریف میں خود تشبیہ موجود ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ۔

(اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس نور (ہدایت) کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا ہے اور) وہ چراغ ایک قندیل میں ہے (اور وہ قندیل ایک طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو)

اس میں تصریح ہے کہ نور خداوندی کی صفت ایسی ہے جیسے کہ ایک طاقچہ ہو کہ اس میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو اور اس شیشہ کی یہ حالت ہو جیسے کہ ایک درخشاں ستارہ الیٰ آخر القول۔ پس جب قرآن میں خود تصریح تشبیہ کی ہے تو

اگر مطلق تشبیہ مذموم ہوتی تو قرآن میں یہ تشبیہ کیوں مذکور ہوتی اور یہ اس واسطے میں نے ذکر کر دیا کہ آج کل بعض متشدد دین بہت غلو کرنے لگے ہیں کہ محض ظاہری الفاظ دیکھ کر معنی میں غور نہ کر کے کفر و بدعت کے فتوے لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ ارشاد خداوندی ہے لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ کہ حق سے آگے نہ بڑھو کہ یہ غلو فی الدین ہے مثلاً جس چیز کا نظیر قرآن میں موجود ہو اس کو علی الاطلاق حرام کہدیا جائے۔ ہاں وجہ شبہ متعین کرنی چاہیئے تو سمجھ لو کہ تشبیہ میں مشارکت ہوتی ہے دو چیزوں کی کسی خاص امر میں مثلاً کسی کے چہرہ کو چاند سا کہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس میں یہ اور چاند شریک ہیں یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چہرہ بھی اسی قدر بڑا جسم ہے جس قدر چاند یا چاند میں بھی آنکھ ناک۔ کان خدو خال موجود ہیں یا جیسے چاند کے ہاتھ پیر نہیں اس شخص کے بھی نہیں۔

علیٰ ہذا خدا تعالیٰ نے جو تشبیہ دی ہے تو مطلق نورانیۃ میں تشبیہ دی ہے کہ کمال نورانیۃ میں اس کے مشابہ ہے۔ اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ دونوں کمال ایک درجہ کے نہیں ہیں جس طرح کلی مشکک کے افراد مختلف ہوتے ہیں برابر نہیں ہوتے مگر کوئی امر مشترک اس میں ضرور ہوتا ہے مثلاً شدت ضیاء اور مشبہ بہ کا اکمل ہونا بھی ضروری نہیں البتہ اوضح یا اشہر ہونا ضروری ہے تو اسی طرح سے اگر کسی محقق کے کلام میں خدا کو دریا اور اپنے کو قطرہ کے ساتھ تشبیہ دی ہو تو وہ کسی خاص امر میں ہوگی جیسا کہ مغربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ؎

ز دریا موج گوناگوں برآمد ٭ ز بے رنگی بہ رنگ چوں برآمد

(دریا سے بڑی بڑی موجیں اٹھتی ہیں جس طرح بے رنگ سے رنگ نکلتا ہے)

افسوس ہے کہ آج یہ حالت ہے کہ جنھوں نے ایک پارہ قرآن بھی نہیں پڑھا وہ ان اشعار کو پڑھتے اور سنتے ہیں اور ان پر وجد کرتے ہیں حالانکہ خاک بھی نہیں سمجھتے اور اگر کچھ سمجھتے ہیں تو یہی کہ خدا پھیلا ہوا ہے اور ہم اُس سے نکلے ہیں اور یہ سمجھ کر اپنا دین برباد کرتے ہیں ایسے اشعار کا ان لوگوں کے سامنے پڑھنا بھی جائز نہیں ہے اور اس عدم جواز کے حکم سے کوئی تعجب نہ کرے دیکھئے حکماء امت نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ بعض لوگوں کے لئے حج کو ناجائز کہدیا ہے۔

مثلاً ایک ایسا شخص کہ جس کے پاس زادراہ بھی نہ ہو بیوی بچوں کے دینے کو بھی کچھ نہ ہو اس کے لئے سفرِ حج کو بالکل ناجائز کہا جاویگا اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں دیکھو عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنا نصاً ناجائز ہے۔ حالانکہ نماز کتنی بڑی عبادت ہے۔

علیٰ ہذا عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر عبادت میں کچھ قیود وجوب کے ہوتے ہیں اور کچھ شرائط جواز کے ہوتے ہیں تو حج میں استطاعت وجوب حج کی شرط ہے اور اہل وعیال کا حق ضائع نہ ہونا جواز حج کی شرط ہے۔

اس کو حضرت مسعود بک رحمۃ اللہ علیہ اور واقعی حضرت کا کلام بدون علم ظاہری کے سمجھنا نہایت دشوار ہے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ اس فرمانے کا ہر شخص مخاطب ہے مگر واقع مخاطب ایسے ہی لوگ ہیں سو فرماتے ہیں۔ ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید ؞ معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(حج کو گئی ہوئی قوم کہاں ہو کہاں ہو، ادھر یہاں آؤ یہاں آؤ معشوق اسی جگہ ہے)

یعنی تمہارے لئے محبوب اسی جگہ ہے کیونکہ مقصود رضائے حق ہے تو اگر بحالت مذکورہ بالا مکہ مکرمہ جاوے گا تو خلاف رضائے حق ہوگا اس لئے خدا نہ ملے گا اس واسطے کہ محض سفر مکہ مکرمہ سے خدا نہیں ملتا۔ مثلاً اگر کوئی نفل حج کر کے بیوی کا حق ضائع کر دے تو خدا تعالےٰ کب راضی ہو سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں حج کرنا بھی ناجائز ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایسے شخص کے سامنے کعبہ کے حالات بیان کرنا جس سے وہ مغلوب الشوق ہو کر سفر میں چلا جاوے جائز نہیں۔ دیکھو ظاہر نظر میں یہ بات سمجھ میں بھی نہیں آتی لیکن واقع میں بالکل صحیح فرمایا ہے اس واسطے کہ حالات سُنکر سفر کا شوق پیدا ہوگا اور بوجہ عدم استطاعت کے یہ سفر معصیت ہوگا تو اس کا جو سبب ہے وہ بھی معصیت ہوگا واقعی اوّل اوّل جس نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول سُنا ہوگا اس نے امام کو کافر کہا ہوگا حالانکہ امام بالکل ٹھیک لکھ رہے ہیں کہ جب سفر معصیت ہے اور تذکرہ اس کا سبب ہے تو تذکرہ بھی معصیت ہوگا۔ غرض کیسی ہی عبادت ہو وہ کسی نہ کسی وقت ناجائز ہو جاتی ہے۔

ایک اور مثال یاد آئی نیک کام میں چندہ دینا عبادت لیکن بعض اوقات یہ بھی جائز نہیں۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا چندہ لینے سے اس لئے انکار فرما دیا کہ وہ اس واقعہ سے پہلے خود سوال کر چکا تھا تو اس چندہ دینے کا مال یہ ہوتا کہ جب اپنے پاس کچھ نہ رہتا تو پھر سوال کرتا۔ خوب سمجھ لو بس شریعت جو کچھ حکم کرے وہ کرو جہاں شریعت پڑھنے کی اجازت دے پڑھو جہاں روک دے رُک جاؤ۔ بالکل مسلمان کی وہ حالت ہونی چاہیئے کہ جیسے ایک شخص نے

ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کھایا کرتے ہو کہنے لگا جو کچھ آپ کھلا دیں گے وہی میری غذا ہے اور بزبان حال یہ کہا ؎

زندہ کنی عطائے تو ۔۔۔ ور بکشی فدائے تو

جان شدہ مبتلائے تو ۔۔۔ ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر مجھے زندہ رکھے تو آپ کی عطاء ہے اور اگر مار ڈالے تو میں آپ پر قربان ہوں۔ بہرحال روح کو آپ سے تعلق ہے آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں)

جب غلام کی شان آقا کے سامنے یہ ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے سامنے بندہ کی یہ شان بھی نہ ہو غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کے سامنے ایسا ہو جائے جیسے مردہ بدست زندہ اور آپ کے احکام جیسے کبھی منصوص ہوتے ہیں اسی طرح کبھی غیر منصوص اور مستنبط بھی ہوتے ہیں اور یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے احکام ہیں اور فقہ اور حدیث میں یہ ہی فرق ہے کہ حقیقت ایک ہے لباس جدا جدا ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

من انداز قدت را مے شناسم

(آپ جس رنگ اور لباس میں رہیئے مجھے تو آپ کے قد کا اندازہ ہے خوب جانتا ہوں)

عاشق کی یہ شان ہوتی ہے کہ محبوب جس جوڑہ میں بھی آوے وہ پہچان لیتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ عاشق نہیں تو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق ہیں ان کو حدیث فقہ سب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشادات نظر آتے ہیں۔

بہرحال شریعت کے احکام یہ ہیں اور یہ واجب العمل اور متبوع ہیں تو جب حج کو جانا بعض کو ناجائز ہے تو یہاں سے قیاس کر کے دیکھ لو کہ جب بعض وقت عبادت ناجائز ہو جاتی ہے تو ایسے اشعار گو وہ صحیح ہوں

ذکر کرنا ان لوگوں کے سامنے جبکہ ان میں کوئی مفسدہ ہو اگر ناجائز ہو جائے تو عجب کیا ہے اسی لئے حدیث میں ہے کَلِّمُوا النَّاسَ عَلیٰ قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ (کلام کرو لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق) ایک حدیث میں ہے کہ جب کسی کے سامنے اس کی عقل سے بڑھ کر کلام کیا گیا تو وہ اس کے لئے فتنہ ہوگا تو اب جو ایسے اشعار عوام کے سامنے پڑھے جاتے ہیں کہ ان کے سمجھنے میں نہیں آتے اگرچہ وہ حافظ اور مغربی ہی کے ہوں تو یہ عوام کے لئے فتنہ ہوں گے یا نہیں۔ ان حضرات کے کلام کے صحیح ہونے میں کلام نہیں جو کچھ انھوں نے کہا صحیح ہے لیکن اس کے سمجھنے کے لئے فہم صحیح اور طبیعت سلیم درکار ہے تو مولانا ایسے ہی نازک مضامین کی نسبت فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ پولاد ست تیز
گر نداری تو سپر واپس گریز

(کہ بہت سے نکتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور سپر سے مراد فہم یعنی اگر فہم نہ ہو تو دور رہو۔) آگے فرماتے ہیں۔

پیشِ ایں الماس بے سپر میا
کز بریدن تیغ را نبود حیا

(کہ اس کے سامنے بدون سپر نہ آؤ کیونکہ ایمان اگر اس کے سامنے پڑے گا یہ اس کو قطع کر دے گا۔)

اور اسی واسطے ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یحرم النظر فی کتبنا (ہماری کتابوں میں نظر کرنا حرام ہے) رہا یہ شبہ کہ جب کتاب کے دیکھنے کی اجازت نہیں تو پھر لکھا تھا کیوں یہ شبہ اکثر بڑے لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے تو وجہ یہ ہے کہ وہ حالات جو ان پر طاری ہوئے دوسرے لوگوں پر بھی طاری ہو سکتے ہیں تو انھوں نے اپنے سے

پچھلے لوگوں کے لئے جن پر وہ حالات طاری ہوں اپنے قول و احوال کو مدون کیا ہے تاکہ پچھلوں کے پاس معیار رہے ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ہماری طاعت مقبول ہے یا مردود اور جب پہلوں کے حالات مدون ہیں تو نہایت آسان ہے کہ اس پر منطبق کر کے دیکھ لو اگر مطابق ہو تو صحیح ورنہ باطل۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے جیسوں کے لئے لکھا ہے نہ عوام الناس کے لئے اسی لئے اس کو دیکھنے سے منع کر دیا بلکہ وہ اخفار کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ ان کے سامنے ان مضامین کا اگر کوئی انکار بھی کرتا ہے تب بھی ان کو جوش نہیں آتا اور وہ بیان نہیں کرتے۔ بلکہ یوں کہتے ہیں ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے عشق و مستی کے راز نہ بتائیے بلکہ چھوڑ دیجیے کہ وہ خود پرستی کے رنج میں جاتا ہے)

رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اعلان کرے اور ولی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے علوم کا اخفار کرے اس لئے ان کو کبھی ہیجان بھی نہیں ہوتا۔ البتہ اپنے خواص سے بیان کرتے ہیں تو کوئی کلام غیر اہل کے سامنے بیان نہ کرو۔ تصوف کے اجزاء بہت سے ہیں منجملہ ان کے احوال بھی ہیں ان کو کسی سے بیان نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اپنے خاص معاملات ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ ان کے ظاہر کرنے سے اپنا باطنی نقصان ہوتا ہے۔

نیز ایک جزء اس میں علم مکاشفہ اور اسرار بھی ہیں ان کو بھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے اور بہت سی غلط فہمیاں سننے والے کو ہو جاتی ہیں جن سے اس کا بہت نقصان ہو جاتا ہے اور عوام کے نہ سمجھنے کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

دیکھو اگر کسی شخص نے کبھی آئینہ نہ دیکھا ہوا اور اس کے سامنے آئینہ

کی کیفیت بیان کی جاوے تو کیسی ہی جامع مانع حقیقت بیان کرو لیکن اس کے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کسی نے کہا ہے۔

پُرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چو ما شوے بدانے

(ایک عاشق سے کسی نے پوچھا عاشقی کیا ہے اس نے کہا جب مجھ جیسے ہو جاؤ گے تو معلوم ہو جائے گا)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور وجدانیہ وجدان ہی سے سمجھ میں آتی ہیں اور وجدان محض سننے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی واسطے محققین اجانب پر کبھی ظاہر نہیں کرتے اب بے احتیاطی ہوگئی ہے کہ عام مجالس میں اس قسم کی غزلیں پڑھی جاتی ہیں اور کوئی نہیں سمجھتا میں ایسے لوگوں سے بہت ملا ہوں کہ ان الفاظ کے معنی غلط سمجھتے ہیں۔ ایک ایسا ہی شخص مجھ سے ملا اور پوچھا کہ تصور شیخ جائز ہے یا نہیں۔ میں جائز کہنے کو تھا بشرائط مگر میرے ذہن میں آیا کہ شاید یہ تصور شیخ کے معنی غلط سمجھ رہا ہو اس لئے میں نے اس سے پوچھا کہ تصور شیخ کے کیا معنی ہیں کہنے لگا خدا کو بشکل شیخ سمجھنا۔ انا للہ حالانکہ قرآن شریف میں تصریح ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور یہ جو بعض آیات میں یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ۔ (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے) وغیرہ آیا ہے وہاں ید وغیرہ سے مراد یہ نہیں کہ ہم جیسے ہاتھ پیر ہیں بلکہ جو اس کے مناسب ہوں ہم اس کی حقیقت دریافت نہیں کر سکتے۔

ہماری مثال عدم احاطہ حقیقت میں ایسی ہے جیسے کہ ایک پانی کا کیڑا انسان کی مصنوعات ریل اور تار وغیرہ کو دیکھے اور ان کی ناتمام حقیقت دریافت کر کے اندازہ کرے کہ جس نے یہ بنایا ہوگا وہ اس قسم کا ہوگا کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کی حقیقت کو دریافت کر سکتا ہے

خدا تعالےٰ اس مثال سے بھی بالا تر ہیں لیکن تقریب فہم کے لئے اس مثال کے ضمن میں اُس کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان وہم　　وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر　　ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(ہمارے خیال قیاس گمان وہم سے بلند ہے اور ہر چیز سے جسے ہم بولتے سنتے پڑھتے ہیں۔ ہم نے تمام دفتر پوری عمر میں چھان مارا لیکن جس طرح ہم پہلے وصف اول میں تھے وہیں اب بھی ہیں۔)

غرض خدا تعالےٰ کو کیا کوئی پہچان سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ اَعْلَمُنَا بِاللّٰہِ۔ جیسا کہ خود ارشاد فرمایا ہے اِنِّیْ اَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ آپ بھی اس سے اپنا عجز ظاہر فرماتے ہیں۔ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (اللہ کی حمد سے ہماری زبان قاصر ہے) یہاں تو منتہائے ثناء یہ ہے کہ ؎ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست (خاموشی ہی تیری حد درجہ کی حمد ہے) اور یہی خاموشی حاصل ہے حدیث مذکور کا۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اس عجز کو عجیب عنوان سے فرماتے ہیں ؎

خدا در انتظار حمد ما نیست　　محمد صلی اللہ علیہ وسلم چشم بر راہ ثنا نیست
خدا مدح آفرین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بس　　محمد صلی اللہ علیہ وسلم حامد حمد خدا بس

(نہ خدا کو ہماری حمد کا انتظار ہے اور نہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ثنا کیلئے چشم براہ ہیں بلکہ خدا تعالےٰ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مسرور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بطور حامد کافی ہیں)

خدا تعالیٰ کی طرف سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خدا کی تعریف کافی ہے۔

آگے فرماتے ہیں ؎

مناجاتے اگر خواہی بیان کرد
بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمد از تو مے خواہم خدا را
الٰہی از تو حب مصطفےٰ را صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(اگر چاہو تو تمنائیں بیان کی جاسکتی ہیں اور صرف ایک شعر پر قناعت ہوسکتی ہے آپ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) سے خدا کو چاہتا ہوں اور خداوند آپ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کا طلب گار ہے)

حقیقت میں بے مثل مضمون ہے۔ باقی کوئی یہ نہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْكَ (یعنی آپ کی ثنا شمار ہی نہیں کرسکتا) اور مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ثنا کرنا کافی ہے بات یہ ہے کہ یہ کفایت ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ خدا تعالیٰ کو کما حقہٗ کوئی نہیں پہچان سکتا ؎

دور بیناں بارگاہ الست
جز ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

یعنی اتنا معلوم ہوا کہ موجود ہے باقی یہ کہ کیا ہے اور کیسا ہے اس کے لئے بس یہ سمجھئے کہ ؎

اندریں رہ آنچہ مے آید بدست
حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

(ہمیں اس راستہ میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ حیرت ہی حیرت ہے۔)

شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم
کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم
محیط ست علم ملک بر بسیط
قیاس تو بروے نگردد محیط
دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نشد تختۂ بر کنار

(کتنی راتیں میں اس منزل میں اسیر رہا ہوں کہ بالآخر حیرت نے میری دستگیری کی ہے تمام دنیا پر ایک بادشاہی کا علم محیط ہے۔ تمہارا قیاس اس کا احاطہ نہیں کرسکتا اس طوفان میں ہزاروں کشتیاں اس طرح ڈوبیں کہ کنارے پر ایک تختہ تک باقی نہیں)

کون احاطہ کرسکتا ہے خدا تعالیٰ کے کمالات کا ہاں ہم ایمان لاتے ہیں کہ ہم اس سے آگے رائے سے کلام نہیں کرسکتے۔ دیکھو افعال تک کا تو پتہ لگ ہی نہیں سکتا تو صفات کا کیا پتہ لگ سکتا ہے۔ یہاں تو اقرار عجز کی بالکل وہ حالت ہونا چاہیئے کہ جیسے ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ شب معراج میں کیا کیا گفتگو خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی انھوں نے جواب میں فرمایا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس میں یہ مجال ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا تھا گل نے کیا سنا تھا اور ہوا کیا کر گئی)

حقیقت میں کس کی مجال ہے اور جو کچھ کہہ دیتے ہیں وہ اوچھے ہیں کہ اوچھلتے ہیں ورنہ اہل کمال کا یہ ہی مشرب ہے جو میں نے بیان کیا ہے اسی طرح اسرار خداوندی کا بھی جو متعلق اکوان کے ہیں احاطہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی نسبت عارف شیرازی کہتے ہیں ؎ حدیث مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو ✿ کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معما را (شراب و ساقی کی بات کرو اور گردش زمانہ کی گفتگو چھوڑو کہ اس معمہ کو نہ کوئی حل کرسکا ہے نہ کرسکے گا)

جب راز دہر کے پیچھے پڑنے سے منع کرتے ہیں تو راز حق کی تو کیا انتہا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر شفیق تھے کہ جس چیز کو بے سود دیکھا اور فلاح دین و دنیا میں اس کی حاجت نہ دیکھی اس میں گفتگو کرنے سے منع کردیا اور ایسے دقائق و غوامض پر چونکہ نجات موقوف نہیں اس لئے اسکی حاجت نہیں۔ پس ان میں کلام کرنا پسند نہیں کیا گیا۔ اضاعۃ عمر ہے اور احتمال ضرر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک مرتبہ مسئلہ قدر میں کچھ گفتگو فرمارہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور سنا فرمایا کہ تم لوگ کیا گفتگو کررہے تھے معلوم ہوا تو عتاب فرمایا کہ تم اس میں گفتگو کرتے ہو کیا میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں

اور فرمایا کہ جو اس میں گفتگو کرے گا اس سے باز پرس ہوگی یعنی پوچھ ہوگی کیوں اس میں گفتگو کی اور ایک لطیف معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ سوال ہوگا ذرا ہم بھی سنیں تم نے اس بارہ میں کیا تحقیق کیا ہے اس سے وہ شخص دم بخود رہ جاویگا اور عجز کی وجہ سے کچھ جواب نہ دیگا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اس قسم کے علوم میں گفتگو کرنے سے ممانعت کی طرف اشارہ کردیا کیونکہ یہ علم وہبی ہے دلائل سے کبھی حل نہیں ہوسکتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان امور کے اظہار کی حاجت تو ہے نہیں جیسا اوپر بیان ہوا اور الفاظ وضع ہوئے ہیں حاجت کی چیزوں پر دلالت کرنے کے لئے سو ان مفہومات کے لئے الفاظ موضوع نہیں ہیں تو اگر ان مضامین کو الفاظ سے تعبیر کیا جاوے گا تو وہ تشبیہات ہوں گی اور وہ بالکل ناکافی ہیں۔

تشبیہات کے ناکافی ہونے کی مثال کے لئے ایک قصہ عرض کرتا ہوں۔ مشہور ہے کہ ایک اندھے مادر زاد کی دعوت اس کے کسی شاگرد نے کی حافظ جی نے پوچھا کہ کیا پکاؤ گے شاگرد نے کہا کہ کھیر پکاؤں گا کہنے لگا کھیر کیسی ہوتی ہے شاگرد نے کہا کہ سفید کہنے لگا کہ سفید کس کو کہتے ہیں اس نے کہا جیسے بگلا حافظ جی نے کہا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے شاگرد نے ہاتھ سے اس کی ہیئت بنائی حافظ جی نے اس کو ٹٹول کر دیکھا اور کہنے لگا کہ بھائی یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے حلق میں کیسے اترے گی۔ اب غور کیجئے کہ کھیر جو اتنی ٹیڑھی ہوگئی اس کا کیا سبب ہوا یہی کہ اس کو تشبیہات میں بیان کیا گیا تو اس اندھے مادر زاد کو اگر ساری دنیا بھی سمجھا دینے کی کوشش کرتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ ہاں سمجھانے کی یہ صورت ہے کہ ایک انگلی لے کر اس کے منہ میں دیدی جاوے کہ وہ ہونٹ چاٹتا رہے۔ اور لیجئے اگر کسی نابالغ بچے کو لذت مجامعت سمجھانا چاہیں تو عمر ختم ہوجائے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ البتہ جب وہ بالغ ہوجاوے گا تو خود بخود بغیر سمجھائے سمجھ میں آجاوے گی۔

اسی طرح کملاء کے سامنے نااہل لوگ مثل اطفال نابالغ کے ہیں بڑے بڑے حکماء ارسطو، افلاطون ان کے سامنے ایسے ہیں جیسے بچے تو ایسوں کے سامنے یہ مضامین بیان کرنا بچے کے سامنے لذت مجامعت کو بیان کرنا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

خلق اطفالند جز مرد خدا

نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

جو شخص نفسانی خواہشات سے چھوٹ گیا وہی بالغ ہے باقی اس کے مقابلہ میں سب نابالغ ہیں تو ان کے سامنے جو کچھ بیان کیا جاوے گا وہ تشبیہات میں بیان کیا جاوے گا اور تشبیہات میں غلطیاں واقع ہوں گی لہذا اسرار وجدانیہ کسی کے سامنے بیان نہ کرنے چاہئیں۔

آج کل افسوس ہے کہ لوگوں نے اسی جمع عبارات کا نام تصوف رکھ لیا ہے اور اکثر اسی قسم کے اسرار کہنے والے خود بھی رسمی لوگ ہوتے ہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

حرف درویشاں ندر زد مرد دوں

تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(ایک پست انسان، فقیروں کی چند باتیں اس لئے لے اڑا ہے کہ جاہلوں کے سامنے سحر کاری کر سکے)

کہ چند الفاظ سنے سنائے یاد کر لئے اور انہیں کو مختلف مجالس میں گاتے پھرے اور اگر کوئی آگے پوچھ بیٹھے تو خاک بھی نہیں۔

صاحبو! محض ملفوظات کے یاد کر لینے کا نام تصوف نہیں ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ملفوظات یاد کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس کی سعی کرو کہ تم بھی ایسے ہو جاؤ کہ تمہاری زبان سے وہی باتیں نکلنے لگیں جو ان کے منہ سے نکلیں اور وہ حالت بنا لو کہ

بینی اندر خود علوم انبیاء

بے کتاب بے معید و اوستا

(علوم انبیاء علیہم السلام میں خود کو بغیر کسی استاذ اور بغیر کسی مذکر کے دیکھو تو بات ہے)

اور اگر یہ نہ ہو تو محض دعوے و تصنع سے کیا ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

کہ گہے آہے دروغے میزنی | از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق راگیرم کہ بفریبے تمام | در غلط اندازے تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آرے جملہ راست | با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن | رایت اخلاص و صدق افراشتن

(کبھی کبھی محض فریب سے آہیں کھینچتے ہو مکھن کے لئے چھاچھ بلوتے ہوئے مجھے مخلوق پر رحم آتا ہے تم نے فریب تمام سے ہر خاص و عام کو مبتلائے غلطی کر دیا ہے مخلوق کے ساتھ ہر قسم کے کام روا ہیں لیکن خدا کے ساتھ فریب کاری کہاں روا ہے ان کے ساتھ معاملہ درست رہنا چاہیئے صدق و اخلاص کے پرچم کو بلند رکھنا چاہیئے)

امام صاحب کا واقعہ ہے کہ آپ چلے جا رہے تھے ایک شخص نے کہا کہ یہ امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ یہ پانچسو رکعتیں روزانہ پڑھتے ہیں آپ اس کو سن کر رونے لگے اور اُسی روز سے اتنا ہی عمل شروع کر دیا۔ کیونکہ جانتے تھے کہ مخلوق تو دھوکہ میں آسکتی ہے لیکن خالق کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں چل سکتا۔

آج یہ حالت ہے کہ لوگ اپنی نسبت تقوے و طہارت کے لئے مشہور ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے تدابیر کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کلکتہ میں گیا اور اس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے چند گرگے اس غرض کے لئے چھوڑ دیئے کہ اس کو مشہور کریں۔ بہرحال علم میں خواہ حال و قال میں نگر کرنا سخت غلطی ہے غرض جو حال یا سر ہے یہ دل حصول سمجھ میں نہیں آتا اور جو سمجھ میں نہ آوے اس کے پیچھے نہ پڑنا چاہیئے نہ دوسرے کو بتلانا چاہیئے۔ تعلیم اسی چیز کی دینی چاہیئے کہ جس کی ضرورت ہے ورنہ محض مجلس گرم کرنے کے لئے بے ضرورت باتیں یا محتمل الفرد مسائل کو ہرگز بیان نہ کرنا چاہیئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قدر کے بارہ میں گفتگو کرنے کی ممانعت سے سبق لینا چاہیئے۔ دیکھو بچے کے سامنے کتنے ہی نفیس کھانے ہوں لیکن جب کافی مقدار پیٹ میں پہونچ جاتی ہے

تو شفیق ماں کھانے سے روک دیتی ہے۔ بچہ ضد کرتا ہے لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتی اس کی نظر مصلحت اور فائدہ پر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم کو چاہیئے کہ جن امور کو ہمارے لئے غیر ضروری یا مضر قرار دیا ہے ان کے درپے ہم نہ ہوں اور اپنا یہ مذہب رکھیں ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

(دیکھو تلچھٹ ہو کہ صاف شراب تمہیں مجال نہیں کہ بچالو ساقی نے جو کچھ دیا ہے وہ عین الطاف ہے)

اور اسی کی نظیر ہے کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو تنگدل نہ ہو کیونکہ کبھی کبھی دیر لگانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالےٰ کو اپنے بندہ کا گریہ وزاری پسند ہوتا ہے۔ بزرگوں نے اس کی مثال لکھی ہے کہ جیسے کوئی حسین عورت کسی سے سوال کرے تو وہ ٹالتا ہے تاکہ اس کو مکرر سوال کی نوبت آوے اور اس کے ذریعہ سے اس سے خطاب کا موقع مل جاوے۔ اور دیکھئے آپ اپنے بچہ کے لئے کوئی چیز لاتے ہیں مگر اس کو دق کر کے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچہ رونے لگتا ہے اور آپ کو اس کا رونا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اب جن لوگوں کی دعا قبول ہو جاتی ہے وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور جن لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی وہ سخت نالاں رہتے ہیں۔ حالانکہ نہ قبولیت دعا مقبول ہونے کی علامت ہے نہ عدم مقبولیت مردود ہونے کی علامت ہے۔ خدا تعالےٰ انسان کی اسی حالت کی شکایت فرماتے ہیں۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ آگے فرماتے ہیں كَلَّا یعنی جب خدا تعالیٰ انسان کو فراغت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے میرا بڑا اکرام کیا اور جب رزق تنگ کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے مجھے ذلیل کیا اور خدا تعالیٰ مجھے چاہتے نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے کہ ہرگز یعنی یہ بات نہیں ہے کہ رزق کی فراغت دلیل اکرام ہو اور عسرت دلیل اہانت ہو۔ تو اسی طرح اگر دعا بھی قبول نہ ہو تو وہ دلیل عدم قبولیت اور مردودیت کی نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ جو مناسب سمجھتے ہیں وہ دیتے ہیں۔ تشریعاً بھی اور تکویناً بھی غرض جو علم نہ دیا اس کا نہ دینا ہی نعمت ہے۔ جیسا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قدر میں گفتگو کرنے سے ممانعت فرمادی۔ اور اسی حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جو امور غامضہ ہیں ان کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی ان میں گفتگو نہ کرنی چاہیئے۔

یہ سلسلہ اس پر چلا تھا کہ قرب کے معنی یہ نہیں جو دریا و قطرہ میں سمجھا جاتا ہے اور ایسے الفاظ کو لغوی معنی پر محمول کرنا غلطی ہے۔ بلکہ مراد اس قرب سے جو اس آیت میں مذکور ہے رضا ہے یعنی خدا تعالےٰ کا راضی ہونا مراد ہے کیونکہ قرب کے مختلف درجے ہیں ایک تو قرب علمی ہے اور وہ خدا تعالےٰ کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ۔ اور ارشاد ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ اور ایک قرب رضا کا ہے اور وہ بعض کو حاصل ہے اور اس آیت میں قرب رضا مراد ہے قرب علم مراد نہیں کیونکہ وہ مومن اور صالح کے ساتھ ساتھ خاص نہیں اور یہ قرب رضا بڑی دولت ہے مگر اس کو اہل دنیا تو کیا مقصود سمجھتے بہت سے اہل دین بھی پورے طور سے مقصود نہیں سمجھتے۔ پس اس آیت میں حق تعالےٰ نے اس کا طریق بیان فرمایا ہے۔ وَمَآ اَمْوَالُکُمْ الآیۃ یعنی مال اور اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ ذریعہ قرب نہیں ہوسکتے بلکہ ایمان اور عمل صالح اس کے ذرائع ہیں اور ظاہر ہے کہ ایمان وعمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہوگا جو کامل ہو کیونکہ ناقص پورا پسندیدہ نہ ہوگا اور وہ ذریعہ رضا کا کیسے بن سکتا ہے۔

اور اس کا کامل ہونا موقوف ہے تین چیزوں پر علم وعمل دائم حال۔ اور دین کے

یہ ہی شعبے ہیں۔ سو اگر علم نہیں تو احکام کی اطلاع ہی نہ ہوگی اور اگر عمل نہیں تو اس اطلاع کا نفع کیا ہوا۔ اور اگر علم نہیں تو اگرچہ بظاہر عمل کا ہونا کافی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ حالت بھی کچھ مفید نہیں کیونکہ اس میں خلوص اور بقار کی امید نہیں اور حال سے مراد ملکہ ہے۔ اس کی ایسی مثال سمجھو کہ اگر کسی سے محبت ہو جاوے اور اس کو کھلاؤ پلاؤ تو ایک تو یہ حالت دوسرے یہ کہ اس کی محبت میں بے چینی ہونے لگے۔ پہلی حالت عمل ہے۔ دوسری حالت حال ہے اور پہلی حالت یعنی نرا عمل بلا حال پائدار نہیں۔ اور حال ہو جانے کے بعد پائدار ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نماز روزہ کرتا ہے لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کر کرتا ہے اگر ایک وقت چھوٹ بھی جاوے تو کچھ زیادہ قلق نہیں ہوتا۔ اور ایک دوسرے کی یہ حالت ہے کہ اگر ایک وقت نماز بھی چھوٹ جاوے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے تو یہ دوسرا صاحب حال ہے اسی کو کہتے ہیں ؎

بردلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم اگر باغ دل میں گنجائش کم تھی)

اور اس کا پیدا کرنا گو واجب نہیں کیونکہ اگر تکلف سے بھی کرتا رہا لیکن اخلاص ہو کہ عبادت سے کوئی دوسری غرض نہ ہو تو خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے کچھ کمی اس میں نہیں لیکن ہے خطرناک حالت کیونکہ جب قلب میں تقاضا نہیں تو خدا جانے کہاں گاڑی اٹک جاوے اور کہاں پہنچکر عمل کا خاتمہ ہو جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حال کو بھی پیدا کرلے اس کو کہا ہے ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(قلندر کی راہ میں بڑے صنم ہیں لیکن میں پارسائی کی راہ و رسم سے خوب واقف ہوں)
دراز دور کے معنی یہ ہی ہیں کہ عمل ہو اور حال نہ ہو تو رشتہ قطع ہوجائیگا
لیکن بڑی دشواری اور مشکل سے قطع ہوگا۔ اور اسی معنی میں مولانا نے فرمایا
ہے قال را بگذار مرد حال شو (قال کو چھوڑو حال ہو جاؤ) آگے اس کا
طریقہ بتلاتے ہیں کہ پیش مرد کامل پامال شو (مرد کامل کے سامنے
پامال ہو جاؤ) یعنی یہ حالت لکھنے پڑھنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ محض محبت
سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ ملکہ ہے اور ملکہ صحبت سے ہوتا ہے۔ اگر
کوئی شخص ارژنگ چین لے کر خط کی مشق کرے تو کبھی وہ ملکہ پیدا
نہیں ہوگا جو کہ مثلاً منشی شمس الدین کی خدمت اور صحبت سے پیدا ہوگا
اسی طرح حال باطنی کی بھی کیفیت ہے تو علم اور عمل اور حال ان تینوں
چیزوں کی ضرورت ہوئی اگر ان میں سے ایک بھی نہیں تو کچھ بھی نہیں
اور یہی دین ہے۔ اسی حال کی تعلیم اس آیت میں بھی ہے۔
اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ ۔ مطلب یہ
ہے کہ اس طرف جلد توجہ کرو ایسا نہ ہو کہ ایک زمانہ گذر جانے سے
قلب میں قساوت پیدا ہو جاوے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ
حال کی تاکید بھی کسی درجہ میں قرآن سے ثابت ہے۔ غرض ارادہ
اور قصد تو ضروری ہے اور حال مصلحت ہے کہ اس سے تسہیل
ہو جاتی ہے اور یہ ہی وہ شان ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ (آپ کا اخلاق قرآن تھا)
جب کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
اخلاق کیا تھے تو آپ نے یہ جواب دیا کہ قرآن آپ کا امر طبعی بن گیا تھا
آپ کا جی اسی چیز کو چاہتا تھا جس کو خدا چاہتا ہے۔ جس شخص کی حالت ہوگی
وہ کبھی انشاء اللہ تعالیٰ راجع نہ ہوگا نہ واقف ہوگا بلکہ برابر ترقی

کرتا چلا جاوے گا کیونکہ اول تو قلب میں ایک چیز محرک ہے دوسرے اس حالت کی برکت سے یہ محب ہونے کے ساتھ محبوب بھی ہوجاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کی وہ حالت ہوتی ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے لئے اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ حَیْثُ دَارَ (کہ یہ جس طرف ہوں حق بھی اسی طرف ہوجائے) ظاہر تو یہ تھا کہ آپ یہ دعا دیتے کہ ادرہ مع الحق۔ لیکن آپ نے بجائے اس کے یہ فرمایا اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ اور یہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی بات فرمائی اور بہت بڑی دعا دی اور یہ بتلا دیا کہ ان کی محبوبیت ایسی ہوجاتی ہے کہ اگر ان سے معاملات یومیہ میں اجتہادی غلطی بھی ہو تو اسباب ایسے جمع ہوجاتے ہیں کہ وہ حق واقعی ہوجاتا ہے مثلاً اگر دو شخصوں میں لڑائی ہوجاوے اور ایک ایسا ہی محبوب حق اپنے حق اجتہاد سے ان میں سے کسی ایک کی طرف ہوجادیں جو کہ واقعی میں حق پر نہ ہو تو خدا تعالےٰ حق کو اسی کے ساتھ اس طرح کر دیتے ہیں کہ وہ شخص تائب ہو کر حق پر ہوجائے اور ان کو اس کی طرف رائے سے پھرنا نہ پڑے یا اگر خود انہیں سے کسی کے مقابلہ میں غلطی ہوجائے تو خدا تعالےٰ حق کو ان کے ساتھ اس طرح کر دیتے ہیں کہ ان کا مقابل جو ابھی تک مظلوم تھا انتقام لینے میں حد جائز سے آگے نکل جاوے۔ پس انتقام کی وجہ سے ان کا ظلم عفو ہوجاوے گا اور مقابل کے اعتدار کی وجہ سے اب یہ مظلوم ہوجاویں گے اور حق ان کے ساتھ ہوجاوے گا۔

الحمدللہ یہ بالکل نئی بات ہے اور اس تفصیل سے آج ہی ذہن میں آئی ہے اور اس کی ایک نظیر حدیث میں صاف آئی ہے۔ فرماتے ہیں رب اشعث اغبر لا یوبہ لہٗ مدفوعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَے اللہِ لَاَبَرَّہٗ۔ یعنی بہت سے ایسے پراگندہ مو غبار آلودہ خستہ حال

لوگ ہیں کہ کوئی ان کی پرواہ بھی نہیں کرتا مگر حالت ان کی یہ ہے اگر کسی امر کے متعلق قسم کھا بیٹھیں کہ یوں ہوگا تو خدا تعالیٰ اسی طرح کر دیتے ہیں تو یہ مضمون بھی اسی کے قریب ہے کہ واقعہ ان کی قسم کے موافق بدل جاتا ہے۔

میں نے ایک سیاح سے سنا کہ کسی مقام پر انھوں نے ایسی چیز دیکھی کہ اس کا ایک حصہ پتھر ہے ایک لکڑی ایک کنکر ایک غیر معلوم الجنس اور لوگوں نے اس کا قصہ یہ بیان کیا کہ اندھیرے میں کسی بزرگ کی ٹھوکر لگی تھی انھوں نے فرمایا یہ کیا ہے پتھر ہے یا لکڑی یا کنکر یا کچھ اور اس میں ان سب چیزوں کا تھوڑا تھوڑا جزو پیدا ہو گیا یعنی کچھ حصہ لکڑی کا ہو گیا کچھ پتھر کچھ کنکر کچھ غیر معلوم الجنس۔

مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ میاں ان کے کہنے میں ہیں ہرگز نہیں بلکہ یہ حضرات خود حق تعالیٰ کے کہنے میں ہیں اور یہ اسی کی برکت ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ کبھی کبھی ان کے کہنے کے خلاف بھی کر دیتے ہیں۔ اور کسی کا تو کیا منہ ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دعائیں فرمائیں۔ ان میں سے دو قبول ہوئیں اور ایک نامنظور ہوئی سو اس سے سمجھ لیجئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دعائیں منظور اور ایک نامنظور ہوئی تو اور کون ہو گا جس کا سب کہنا ہو جاوے اور میں اس مضمون کو کہتا بھی نہیں مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ غرض آپ فرماتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ حَیْثُ دَارَ اور یہ کبھی کبھی ہوتا ہے اور غالب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے ساتھ ہوتے ہیں اور خداوند تعالےٰ ان کے ذہن میں ادراک پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ خلاف حق چلتے ہی نہیں۔ غرض ان کو مرتبہ محبوبیت کا عطا ہوتا ہے جس سے وہ خلاف نہیں کرتے یہ وجہ ہوتی ہے صاحب حال کی ترقی و استقامت کی پس علم و عمل و حال کا جمع کرنا یہ طریقہ ہے قرب اور رضا کا جو کہ بہت بڑی دولت ہے۔ کیونکہ دولت راحت قلب ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہوگی۔ کہ اس کا محبوب حقیقی اس سے راضی اور قریب ہو

یہ راحت کسی کو بھی نصیب نہیں بلکہ اس دولت میں تو اگر کچھ محنت بھی ہوتی وہ اس پر بھی راضی ہوتے۔

چنانچہ کبھی ایسی حالت ابتلاء گو پیش آتی ہے تو قانع ہوتا ہے اس وقت ان کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

دمادم شراب الم در کشند
دگر تلخ بینند در کشند

(لمحہ بہ لمحہ شراب الم کھینچتے ہیں اگرچہ دوسرے لوگ اسے دیکھ کر ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں)

لوگ جس کو کلفت سمجھتے ہیں وہ اس کو بھی راحت سمجھتا ہے۔

مجنوں کو اس کے اقارب خانہ کعبہ میں لے گئے اور کہا کہ کہہ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ مِنْ لَیْلٰی وَحُبِّہَا تو وہ کہتا ہے اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ حُبَّ لَیْلٰی اور یہ شعر پڑھا ؎

اِلٰھِیْ تُبْتُ مِنْ کُلِّ الْمَعَاصِیْ اِلَیْکَ فَقَدْ تَکَثَّرَتُ الذُّنُوْبُ
فَاَمَّا مَنْ ھَوٰی لَیْلٰی وَتَرْکِیْ زِیَارَتِہَا فَاِنِّیْ لَا اَتُوْبُ

(الٰہی میں بہت گناہگار ہوں آپ سے میں ہر گناہ سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت اس کی زیارت سے توبہ نہیں کرتا ہوں۔)

غور کرو کہ ایک عورت کی محبت میں یہ حالت تھی۔ اب مولانا کا قول سنو! فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود
گوئی گشتن بہر او اولےٰ بود

(خدا کا عشق لیلیٰ سے کیسے کم ہو سکتا ہے وہ اولیٰ ہی رہیگا)

یعنی کیا خدا تعالےٰ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہو گئی ہرگز نہیں تو اب غور کیجیے کہ وہ کیسی لذت کی چیز ہو گی۔ پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا قرب بڑی دولت

ہے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ جو لوگ خدا لئے تعالیٰ کو چھوڑ بیٹھے ہیں وہ بڑی مصیبت میں ہیں گو ان کے پاس اموال و اولاد بھی ہو اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ حقیقت میں اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جنھوں نے دنیا کو قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے وہ کس قدر مصیبت میں ہیں۔ عیش کے ذرائع سوچتے اور جمع کرتے ساری عمر گذر گئی اور کھانے پینے کو وہی چار چپاتیاں اور تین کپڑے ہی ملے جو کہ سب کو ملتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ اس قدر انہماک کے بعد بھی ذرائع عیش نصیب نہ ہوئے اور غضب یہ کہ آج تک بھی اس کا حس نہیں ہوا اب تک بھی وہی ترقی کی تعلیم دی جاتی ہے اور اگر پورا عیش حاصل ہو بھی گیا تو یہ کیا عیش ہے کہ خوب کھا لیا اگر یہی عیش ہے تو بیل کو سب سے زیادہ عیش میسر ہے کہ اس کو نہ گذشتہ کل کی یاد نہ آئندہ کل کی سوچ اس کی برابر سلطان بھی عیش میں نہیں۔

غرض محض بے فکری سے کھالے نا کوئی عیش نہیں۔ عیش یہ ہے کہ نہ کہ ماضی کی فکر ہو نہ مستقبل کا اندیشہ ہو۔ بس نہ ابن الحال ہے کہ جو اس پر گذرتا ہے سب کو خوشی سے برداشت کرتا ہے اور اس کو نعمت سمجھتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔

صوفی ابن الحال باشد اے رفیق

یعنی جو حالت اس پر طاری ہو وہ اسی میں راضی ہے اور یہ کہتا ہے کہ

ہر چہ از دوست میر سد نیکوست

اگر طیش بھی ہو تو عیش ہی ہے اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے دیکھئے اگر ایک مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو کہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے نہ بات کی ہمت ہو نہ سلام کی جرءت ہو اور اسی حالت میں محبوب اس پر رحم کرے کہ اس کو سینہ سے لگالے اور خوب دبا دے کہ اس کا دم نکلنے لگے اور اسی حالت میں اس کا کوئی رقیب آجاوے اس کو دیکھ کر محبوب دریافت کرے کہ اگر تم کو تکلیف ہو رہی ہو تو میں تم کو چھوڑ کر اس کو دبانے لگوں تو اس وقت کیا کہے گا کیا یہ تکلیف اس کو محسوس ہو گی اور کیا اس کی وجہ سے وہ محبوب کے علیحدہ ہونے پر

راضی ہوگا کبھی نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا کہ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(نصیب دشمناں یہ نہ ہو کہ آپ کی تیغ سے ہلاک ہو بلکہ ہم تو خنجر آزمائی کے لئے کافی ہیں)

اور یہ کہے گا کہ ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

تو جب آدمی کی محبت میں یہ حالت ہے تو خدا تعالےٰ کی محبت میں کیا عالم ہوگا بقول سعدی رحمۃ اللہ علیہ ؎

عجب داری از سالکان طریق

کہ باشند در بحر معنے غریق

(سالکین کی عجب راہ ہے کہ وہ ہمیشہ معانی کے سمندر میں غرق رہتے ہیں)

اور ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من

دل فدائے یار دل رنجانِ من!

(آپ کی خوشی ناخوشی میری جان پر ہے دل تو محبوب ہی کا ہے)

اور وہ یوں کہتے ہیں ؎

پس زبونِ وسوسہ باشی دلا :. گر طرب باز دانی از بلا!

یعنی اگر طرب اور بلا میں فرق کیا تو تم طالب خدا نہیں بلکہ طالب مخلوق ہو ایک مخلوق کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کو لیا ہے جس نے اس کی حقیقت سمجھ لی اس کی برابر کوئی دولت مند نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑی دولت ہے۔ جو اس سے محروم ہو وہ محروم بھی ہے مرحوم بھی ہے مرجوم بھی ہے۔ محروم ہونا تو ظاہر ہی ہے اور مرحوم اس لئے کہ اہل اللہ کو ایسے شخص پر رحم آتا ہے۔ ہاں اگر باغی ہو

تو اس پیران کو رحم نہیں آتا۔ اس لئے کہ خدا کو اس پر رحم نہیں آتا لیکن اگر باغی نہ ہو بلکہ گنہگار ہو تو ان حضرات کو اس پر بہت رحم آتا ہے اور وہ اس کو ذلیل نہیں سمجھتے کیونکہ جانتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی یہ شان ہے ؎

گنہ آمرزِ رندانِ قدح خوار

بطاعت گیر پیران ریا کار

(رند شراب خور کے گناہوں کو بخشتا ہے اور ریا کاروں کی اطاعت کو پکڑتا ہے)

کسی نے خوب کہا ہے ؎

غافل مرد کہ مرکب مردان مرد راہ | در سنگ لاخ بادیہ پہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش | تاگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل مت ہو کہ مرد خدا پتھر بھی زمینوں جنگلوں کو طے کرتا ہے، ہم سے ناامید مت ہو کہ رند شراب نوش اچانک منزل تک پہونچ جاتے ہیں)

دوسرے کہتے ہیں ؎

گنہ آئینہ عفو و رحمت است اے شیخ

مبیں بچشم حقارت گناہگاراں را

(گناہ عفو و رحمت کا آئینہ ہے گناہگاروں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو)

یعنی حقیر نہ سمجھو البتہ قابل رحم سمجھو اور وہ برتاؤ کرو جیسے کہ تمہارا بیٹا بیمار ہو جائے اور اس کے ساتھ تم برتاؤ کرتے ہو۔ دیکھو اگر وہ تم پر ہگ بھی دے تو تم کو غصہ نہیں آتا بلکہ رحم آتا ہے تو مسلمان وہ ہے کہ مسلمان کی حالت پر آنسو بہا دے نہ یہ کہ ان کو ذلیل حقیر سمجھے اور بُرا بھلا کہے:

تا یار کرا خواہد و میلش بہ کہ باشد

(جب تک یار کسی کو چاہتا ہے اس کا رجحان اسی طرف ہوتا ہے)

اور اگر اصلاح کی امید نہ رہے تو خدا کے سپرد کرو اور دعا کرو یہ ہے اسلامی شان۔

آج کل ذراسی بات پر بدعت اور وہابیت کا الزام لگا دیا جاتا ہے صاحبو کس کی بدعت کس کی وہابیت۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں بعض مختلف فیہ بھی ہیں کوئی کسی طرف گیا کوئی کسی طرف تو اس کے لئے لڑتے کیوں ہو اور اگر کوئی مسئلہ متعین الصواب ہے اور اس میں کسی کو لغزش ہے تو اس کے غیر کے لئے دعا کرو۔ خوب کہا ہے ؎

گر ایں مدعی دوست بشناختے

بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(اگر یہ مدعی دوست کو پہچان لیتے تو دشمن کی تلوار سے مشغول نہ ہوتے)

دیکھو ایک مجلس میں محبوب بھی ہو اور اس نے اجازت دے دی ہو کہ میری طرف دیکھو اور یہ دیکھنے میں مشغول ہو کہ اتنے میں ایک شخص آکر اس کی انگلی کو چھو دے اب بتاؤ کہ وہ کیا کرے گا۔ کیا محبوب کی طرف سے نظر ہٹا کر اس شخص کو دیکھنے لگے گا یا اس سے الجھنا شروع کر دے گا۔ ہرگز نہیں وہ کبھی دوسری طرف التفات بھی نہ کرے گا اور اگر التفات کرے گا تو محبوب سے حرمان ہوگا۔ اور یہ توجہ و استغراق اسی وقت ہوگا کہ دوست کو پہچانے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

اگر ایں مدعی دوست بشناختے

بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

اگر ادھر متوجہ ہوتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم سے کوئی مناظرہ کرے تو تم کبھی مناظرہ نہ کرو اس سے دل سیاہ ہوتا ہے۔

میں عوام میں سے جس کو بیعت کرتا ہوں اس سے یہ بھی کہتا ہوں کہ بدعت کو چھوڑو لیکن بدعتی لوگوں سے مت لڑو خدا تعالیٰ تم سے یہ نہ پوچھے گا کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا اور قرآن مجید سے بھی اس مشرب کی تائید ہوتی ہے فرماتے ہیں

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ الخ (تم میں ایک جماعت بھلائی کی طرف بلاتی ہے) لفظ منکم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کام کے لائق نہیں ہیں اور یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ اس کے اہل نہیں سمجھے جاتے ان کا کہنا لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے اور جو لوگ اہل ہیں ان کا کہنا چنداں گراں نہیں گزرتا نیز علماء جو کچھ کہتے ہیں تہذیب سے اور شائستگی سے کہتے ہیں غرض یہ طعن و تشنیع کا شیوہ مناسب نہیں ہے اپنے کام میں لگے رہو اگر کوئی بُرا ہو تم اس پر ترحم کرو اور اس کے لئے دعا کرو۔

چنانچہ اہل اللہ دنیا داروں پر رحم کرتے ہیں جیسے بیمار کو دیکھ کر اس پر رحم آیا کرتا ہے بلکہ وہ مال داروں کو دیکھ کر بھی رحم کرتے کہ بیچارے حمال ہیں لدے ہوئے ہیں ہانپے جارہے ہیں۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ جب کسی امیر کو دیکھتے تو کہتے الحمد للہ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔

یہ دعا حدیث میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے کہ جب کسی بیمار کو دیکھو تو یہ دعا پڑھو۔ تو دنیا کی محبت سے زیادہ کونسی بیماری ہوگی کہ قلب کی بیماری ہے اور قلب کی بیماری سب سے بدتر ہے جیسا ارشاد ہے کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ (ان کے دلوں میں بیماری ہے بڑھایا اللہ نے ان کی بیماری کو)

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اس کو سمجھے اور انھوں نے مرض کی حقیقت معلوم کی غرض دنیا دار بیمار ہیں اور اس بیماری سے بچا رہنا خدا کی نعمت ہے جو قابل شکر ہے۔

اکبر لوہر کا واقعہ ہے کہ ایک خاں صاحب نے ایک جلاہے سے براہ تمسخر پوچھا کہ میاں جی کیا کر رہے ہو کہنے لگا کہ خدا کا شکر کر رہا ہوں کہ مجھ کو خاں صاحب نہ بنایا کسی غریب پر ظلم کرتا اور دوزخ میں جاتا۔ خانصاحب چپ ہی تو رہ گئے حقیقت میں خدا کی یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ گناہ کا سامان ہی نہ دے ۔ ۵

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند
اومصلحت تو از تو بہتر داند

(ہر وہ شخص جو تیری مالداری کو نہیں سمجھتا ہے۔ وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے)

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ لوگ رحم کے قابل ہیں کہ ایک بڑی مصیبت میں پھنسے ہیں مگر ان کو خبر بھی نہیں ان کی وہ حالت ہے جیسے ایک سرحدی وحشی ہندوستان میں آیا تھا کہ کسی حلوائی کی دکان پر حلوا رکھا دیکھا قیمت پاس تھی نہیں آپ اس میں سے بہت سا اٹھا کر کھا گئے حلوائی نے حاکم شہر کو اطلاع دی حاکم نے یہ سزا مقرر کی کہ ان کا منہ کالا کر کے جوتیوں کا ہار گلے میں ڈالا جائے اور گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا جاوے اور بہت سے لڑکے ساتھ کر دیئے جائیں کہ وہ ڈھول بجاتے پیچھے پیچھے چلیں، چنانچہ ایسا کیا گیا۔ جب یہ حلوا خور صاحب اپنے گھر واپس گئے تو وہاں کے لوگوں نے پوچھا کہ آغا ہندوستان چگونہ ملک است کہنے لگے ہندوستان خوب ملک ست حلوا خوردن مفت ست فوج طفلاں مفت ست سواری خر مفت ست ڈم ڈم مفت ست ہندوستان خوب ملک ست بس دنیا داروں کا خوب ملک ست کہنا ایسا ہی ہے جیسے اس آغا نے ہندوستان کو خوب ملک ست کہا اور دنیا کے حشم و خدم پر ناز کرنا ایسا ہی ہے جیسا اس نے سواری خر اور فوج طفلاں پر ناز کیا تھا۔

صاحبو! یہ بے حسی ہے واللہ اگر حس صحیح ہو تو یہ سب عذاب نظر آنے لگے حکومت دنیوی کی نسبت حدیث شریف میں ہے کہ جس کی دس آدمیوں پر بھی حکومت ہو گی قیامت میں اس کو مشکیں کس کر لایا جاوے گا اگرچہ اس کے بعد چھوٹ ہی جاوے آج اس کی درخواست کی جاتی ہے اس کے لئے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم میں اگر صاحب

حکومت نہ ہوگے تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ حاکم ہوں لیکن کون شخص ہو اس کا فیصلہ خود حدیث میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ اِثْنَانِ فِی النَّارِ وَوَاحِدٌ فِی الْجَنَّةِ اور اس واحد کو عالم باعمل بتلایا ہے تو حکومت ضروری ہے مگر حکومت کے لئے متبحر عالم ہونا چاہیئے ورنہ بدون علم کے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور امتحان علم کا یہ ہے کہ ان کے سامنے جتنے واقعات و مقدمات پیش ہوں ان میں اپنی رائے لکھیں اور اس کے بعد اہل علم سے ان کا حکم دریافت کریں پھر دونوں میں موازنہ کریں واللہ زمین آسمان کا فرق نکلے گا۔

دوسری اس میں ایک اور شرط ہے کہ حکومت کی خود درخواست نہ کرے کیونکہ جو درخواست کرے گا وہ خود غرض ہوگا۔ اور نفسانیت سے کام کرے گا اس کو لوگوں کی مصلحت پر ہرگز نظر نہ ہوگی بلکہ اپنی مصلحت پر نظر ہوگی اور اس سے جتنی خرابیاں پیدا ہوں کم ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قضا کا عہدہ قبول کرنے کے لئے کہا انھوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم منظور نہیں کرتے تو اپنے انکار کی کسی کو خبر نہ کرنا کیونکہ ایسا نہ ہو سب ہی انکار کر دیں۔

اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سلف صالحین رحمہم اللہ حکومت کو کیسا سمجھتے تھے اور حقیقت میں ایسا ہی شخص کام کر سکے گا۔

اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ دنیا کے لوگ حقیقت میں بڑی تکلیف اور عذاب میں مبتلا ہیں اور دولت حقیقی دوسری چیز ہے۔ تو خدا تعالیٰ اس آیت میں اس دولت کو بتلاتے ہیں اور اس کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں اور مروج طریقہ کو رد کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

تمہارے مال اور اولاد اس قابل نہیں کہ تم کو ہم سے

قریب کریں البتہ ایمان اور عمل صالح اس کا ذریعہ ہے۔ جیسا بیان ہوا اور اس میں آج کل کے اہل مذاق جدید کا بھی جواب ہو گیا یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترقی دنیا سے ہمارا مقصود ترقی دین ہے تو خدا تعالے نے بتلا دیا کہ ترقی دین کی یہ صورت نہیں کہ بہت سا مال سمیٹ لو۔ ہم اس آیت کا ترجمہ کئے دیتے ہیں اگر تین پانچ کرنا ہو تو خدا تعالے سے کرو اور پوچھو کہ یہ کیوں فرمایا۔

آج کل یہ بھی ایک عجیب عادت ہو گئی ہے کہ لوگ ہر بات کا ذمہ دار مولویوں کو سمجھتے ہیں۔ صاحبو مولوی تو صرف منادی کرنے والے ہیں دیکھو اگر کلکٹر کسی سے منادی کرادے تو اس منادی کی حکمت منادی کرنے والے سے نہیں پوچھی جاتی کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ اس کا ذمہ دار نہیں پھر کیا وجہ کہ مولویوں کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اگر یہ کچھ بتلا دیں تو ان کا احسان ہے باقی ان کے ذمہ کچھ نہیں۔ غرض مال اور اولاد ذریعہ قرب نہیں بلکہ ایمان اور اعمال صالح ذریعہ قرب ہیں اور یہ دونوں طویل الذیل ہیں مگر میں ان کے متعلق کچھ مختصر سا بیان کرتا ہوں۔ سو بعض لوگ تو ہم سے ایسے ہیں کہ وہ ایمان ہی کو بگاڑ بیٹھے ہیں اگرچہ ان کے عمل کسی درجہ میں اچھے ہیں لیکن عقیدہ بالکل ہی تباہ ہے۔

بہت سے لوگ پیروں سے اس قدر علاقہ رکھتے ہیں کہ خدا تعالے سے بھی اتنا علاقہ نہیں رکھتے وہ ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ جیسا ایک سر منہ چڑھا سر رشتہ دار ہو کہ جو کچھ کہہ دے گا اسی پر دستخط ہو جاویں گے اور ان کے نام پر کہیں ہنسلی چڑھاتے ہیں کہیں منتیں مانتے ہیں بعض نے تعزیوں کو اس قدر ضروری سمجھ رکھا ہے کہ ان کا سارا دین ایمان وہی ہیں۔

ایک شخص کہنے لگے کہ جب سے میں نے گیارھویں شریف

چھوڑی ہے اس وقت سے مجھ پر آفتیں آنی شروع ہوگئیں۔ استغفر اللہ میرا یہ مطلب اس سے نہیں ہے کہ بزرگوں کو ایصال نہ کرو مطلب یہ ہے کہ اپنا عقیدہ خراب نہ کرو بلکہ اس نیت سے ایصال ثواب کرو کہ انھوں نے ہمارے ساتھ دینی احسان کیا تھا ہم ان کو ثواب پہنچائیں۔ باقی یہ بات کہ ان سے ہمیں مال یا اولاد ملے گی یہ کچھ نہ ہونا چاہیئے اور غور کرکے دیکھو کہ اس نیت سے ایصال ثواب کرنا کیسی بے ادبی ہے۔ دیکھو اگر تمہارے پاس کوئی شخص مٹھائی لے کر آوے اور پیش کرنے کے بعد کہے کہ جناب آپ سے میرا فلاں کام ہے تو تمہارے دل پر کیا اثر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ خوشی اس کے مٹھائی لانے سے تم کو ہوئی ہوگی وہ سب خاک میں مل جاوے گی۔ اور سمجھوگے کہ یہ سب خوشامد اسی غرض کے لئے تھی۔

دوسرے جب وہ حضرات اپنی زندگی میں اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی نہ رکھتے تھے تو اب مرنے کے بعد کیوں ان کو دلچسپی ہوگی تو ایمان کی درستی جب ہوگی کہ اس قسم کی ساری باتوں سے توبہ کرو۔

دوسری چیز ہے عمل صالح اس کے متعلق یہ حالت ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے بلکہ عقائد کی درستی کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ جب عمل نہیں تو نری عقائد کی درستی کیا کرے گی۔ اور جو لوگ عمل کو ضروری بھی سمجھتے ہیں تو صرف دیانات روزہ نماز وغیرہ کو باقی معاملات بالکل ہی خراب ہیں۔ میں نے بہت سے متقی ایسے دیکھے کہ ان کے معاملات نہایت گندہ در گندہ ہیں۔ خدا جانے کیسا تقویٰ ہے کہ وہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں گویا بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ بس ایک دفعہ

کر کے عمر بھر کو چھٹی ہو گئی۔ بعض لوگ ایسے کہ ان کے معاملات بھی اچھے ہیں لیکن اخلاق نہایت خراب ہیں نہ خدا کی محبت نہ خوف نہ توکل نہ صبر و شکر نہ توحید بلکہ ان کے بجائے تکبر ریا عجب حسد کینہ وغیرہ سے پُر ہیں۔ یہ حال ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پُر حلل !
واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید
و از درونت ننگ میدارد یزید

(اوپر سے تو کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر اللہ کا عذاب ہے۔ اوپر سے بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر طعنہ کرتے ہو اور اندر یزید کی طرح ہے)

تو عمل صالحہ میں یہ اخلاق باطنی بھی آگئے اور یہی ہے وہ چیز جس کو تصوف کہتے ہیں۔ اسی کی نسبت فرماتے ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ٥

(خبردار ہو کہ اولیاء اللہ کو خوف و ملال نہیں اور وہ لوگ جو ایماندار اور متقی ہیں)

اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ تصوف نہیں بلکہ غیر معمولی چیز ہے۔ تو سمجھو کہ اہل فن کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی تصوف ہے۔ حواشی قشیریہ میں ہے۔

اَلتَّصَوُّفُ تَعْمِیْرُ الظَّاھِرِ وَالْبَاطِنِ۔

اور باطن کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک عقیدہ اور دوسرے اخلاق ان سب کی اصلاح بھی قرآن میں ہے مگر صوفیہ نے

اس کو تصوف سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا ہے تو تصوف کی حقیقت یہ ہے۔ ثمرہ اس کا یہ ہے تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰی۔

الحمد للہ اس وقت دو غلطیاں رفع ہوئیں ایک تو یہ کہ لوگ تصوف کی حقیقت کو غلط سمجھے ہوئے تھے۔ یعنی تصوف میں تین چیزیں ہیں ایک تو ایمان اور عمل صالح کہ یہ عین تصوف ہیں ایک وہ کہ ان کو تصوف سے کچھ بھی علاقہ نہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مباحات دوسرے ممنوعات۔ جیسے یہ عقیدہ کہ طریقت میں سب کچھ مباح ہوجاتا ہے یا یہ کہ میرے پیر کو سب کچھ خبر ہے جیسے چند روز ہوئے ایک پیر صاحب نے کہا کہ میرے سپرد پولیس کا کام ہے۔ اور ہر جمعرات کو سب اولیاء پیران کلیر میں جمع ہوتے ہیں اور اشرف علی بھی وہاں آتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے میں سنکر خوش ہونگا اور ان کی تعریف کرونگا مگر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں ان کو یقینی کاذب سمجھنے لگا۔ تو گویا خدائی کو اپنا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کے اختیار میں کچھ سمجھنا بھی ایسا ہی ہے یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ معاصی لعینہ ہیں۔ دوسری وہ چیزیں کہ وہ معصیت لغیرہ ہیں جیسے سماع کا سننا کہ اگر کسی سے مجبوری کی وجہ سے سن لینا منقول ہے تو وہ حجت نہیں اور بلا عذر ناجائز ہے اور اب تو اس کی حالت نہایت گند در گند ہو گئی ہے اور واقع میں یہ سب اعمال فقیہہ ہیں ان کو تصوف سے کچھ علاقہ نہیں۔ اور بعض وہ اعمال ہیں کہ ان کو تصوف سے علاقہ تو ہے مگر وہ عین تصوف نہیں جیسے احوال کہ کثرت ذکر سے کبھی مرتب ہوجاتے ہیں تو مقصود کے متعلق چار چیزیں ہوئی ایمان اور اعمال اور اخلاق اور حالات کہ ان کو تصوف سے تعلق ہے بعض کو عینیت کا اور بعض کو ترتب و مناسبت کا جیسے احوال کہ اگر ہوں تو اچھا ہے نہ ہوں کو کچھ مضائقہ نہیں

اور یہیں سے شیخ کامل کی پہچان بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اس کے اندر ایک تو ایمان خالص ہونے کی ضرورت ہے دوسرے اعمال صالحہ کی تیسرے اخلاق کی کہ اس میں صبر و شکر ہو دنیا سے اس کو نفرت ہو کہ اس کی صحبت سے بھی دنیا سے جی ہٹ جاوے اور ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی طرف عوام کم متوجہ ہوں اور اہل علم و فہم زیادہ متوجہ ہوں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش پر اہل دنیا زیادہ ہجوم کریں معلوم کر لینا چاہیئے کہ یہ خود بھی دنیا دار ہے کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس اور جس کی طرف صلحاء زیادہ متوجہ ہوں وہ ہادی ہونے کے لائق ہے۔ جب ایسا شخص مل جاوے تو اس کی صحبت اختیار کرو۔ اور جس کو یہ سب حاصل ہو جائیں ان کے لئے خدا تعالیٰ آگے فرماتے ہیں کہ

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِى الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ۔

یعنی ان کو اس سے امن ہو گا کہ ان کو بُعد ہو چونکہ آج کل جاہل صوفی گمراہ کرتے پھرتے ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ تصوف کی حقیقت اور کاملین کی علامات کو بیان کر دوں تاکہ لوگ ان کے پھندے سے بچ سکیں۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق نیک عطا فرماویں۔ آمین۔

ناظرین وعظ کی خدمت میں جامع وعظ (وناشر وعظ) کی عاجزانہ التماس ہے کہ بارگاہ رحمت میں میرے لئے حسن خاتمہ اور عفو و عافیت کی دعاء فرماویں۔

بالخیر تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

فضائل العلم والخشیۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی

دعواتِ عبدیت جلد سوم

کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

فضائلُ العِلم وَالخشیۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
بانس بریلی مدرسہ اشاعۃ العلوم	۱۳ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ ہجری	۴ گھنٹے	کھڑے ہو کر	فضائل علم دین وخشیت حق	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی	تقریباً ۵۰۰ آدمی	طلبہ عربی اور نو تعلیم یافتہ کثرت سے تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَ سَلِّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ؁

(خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے) یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس مضمون کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے اس کے لئے چونکہ یہ ٹکڑا کافی تھا اس لئے اس پر اکتفا کیا گیا مضمون کی تعین آیت کے ترجمے سے معلوم ہو جائے گی اور اس کا ضروری ہونا بھی اجمالاً ساتھ کے ساتھ ہی معلوم ہو جائے گا اس جملہ کے قبل آیت میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے مضامین ہیں اس جملہ سے بھی ان ہی مضامین کو تقویت مقصود ہے بوجہ اس کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار کی مخالفت سے حزن و غم غالب رہتا تھا اور اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت شفقت وصفت تراحم کی ثابت ہوتی ہے یعنی آپ ان لوگوں کے راہ راست پر نہ آنے سے بہت ہی بے چین ہوتے تھے اور سوچا کرتے تھے کہ کونسی تدابیر ایسی ہوں کہ یہ لوگ اس کفر وضلالت سے باز آکر سیدھے رستہ پر آجائیں اور عذاب دائمی سے نجات پائیں آپ کی وہ حالت تھی جیسا کہ ایک شفیق باپ اپنے نافرمان بیٹے کی حکایت پر کڑھتا ہے اور پریشان ہوتا ہے اور ہر وقت کسی نہ کسی تدبیر میں لگا رہتا ہے کبھی مصلحین سے مشورہ کرتا ہے کبھی کسی سے دعا کراتا ہے کبھی تعویذ لکھواتا ہے کہ کسی طرح یہ ٹھیک رستہ پر آجائے غرض اس کو بیٹے کی نافرمانیوں پر اُس سے عداوت نہیں ہوتی بلکہ اس پر رحم آتا ہے اور کڑھتا ہے۔ اگر کبھی اس کو اپنے گھر سے نکالنے کا قصد بھی کرتا ہے تو بہ نیت اصلاح کے کرتا ہے۔ اس کو چھوڑ دینے یا اس سے قطع تعلق کر لینے کی نیت کبھی نہیں ہوتی اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کفار سے یہ حالت تھی کہ تمام عمر آپ کو یہی غم لگا رہا حتیٰ کہ آپ کے غلبہ غم کی وجہ سے آپ کو تسلی دینے کے لئے خاص اس مضمون کی بار بار آیتیں نازل فرمائیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ جس کا حاصل یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کہ آپ سے ان لوگوں کی حالت کا سوال نہ

کیا جائے گا یعنی پھر آپ کیوں غم کرتے ہیں اگر یہ ایمان نہیں لاتے نہ لائیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ کہ آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ ضرور ہی ان سے تعمیل کرالیں آپ کا کام صرف تبلیغ ہے کیونکہ آپ مبلغ ہیں رہا عمل کرانا یہ کام مصیطر کا ہے اور آپ مصیطر مقرر نہیں ہوئے۔ پھر اگر یہ لوگ عمل نہیں کرتے اور تبلیغ کو نہیں مانتے تو آپ کو کیا غم ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ط (اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈھ لو۔ پھر کوئی معجزہ لے آؤ) ایک جگہ فرماتے ہیں وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ط أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ کہ آپ زبردستی تو ان کو ایمان دار نہیں بنا سکتے گو ان کی قسمت میں دولت ایمان نہ ہو ایک اور جگہ ارشاد ہے وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ۝ کہ آپ ان کی حالت پر غم نہ کیجئے اور ان کے مکروں سے تنگدل نہ ہوجیے۔ ایک جگہ ارشاد ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝ کہ ہم جانتے ہیں ان لوگوں کے اقوال سے جو تنگدلی آپ کو ہوتی ہے سو آپ تسبیح و تحمید میں لگئے اور عبادت کو اپنا مشغلہ بنا لیجئے۔ کہ اس سے یہ تنگدلی دفع ہو جائے گی اور یہ غم ہلکا ہو جائیگا غرض بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کفار کی حالت پر بہت ہی حزن و غم تھا۔ نیز ان آیات سے اس کے مبنیٰ کا بھی پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں اور اپنے کفر و ضلالت سے باز آجائیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو ان لوگوں سے نفسانی عداوت اور بغض نہ تھا بلکہ ان کی اس ردی حالت پر رحم آتا تھا اور دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کیونکہ اگر آپ کو ان کے ساتھ اس قسم کی عداوت اور بغض ہوتا تو آپ ہرگز ان کے ایمان لانے اور راہ راست پر آجانے کی تمنا نہ کرتے بلکہ یوں چاہتے کہ

یہ لوگ ساری عمر اس کفر و گمراہی کے تیرہ و تاریک غار میں پڑے رہیں اور کبھی ان کو اس سے نکلنا نصیب نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے دشمن کے لئے انسان خیر خواہی نہیں کیا کرتا بلکہ عادۃً اس کی بدخواہی کے درپے ہوتا ہے اور اگر بدخواہی کے درپے بھی نہ ہو تو خیر خواہی کی تو گنجائش نہیں ہوتی اور آپ کی یہ حالت تھی کہ یوں چاہتے تھے گو مجھے تکلیف ہو لیکن ان لوگوں کو تکلیف نہ ہونے پائے حتیٰ کہ جس معجزے کے وہ طالب ہوتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ وہ معجزہ ہو ہی جائے تاکہ اسی کو دیکھ کر یہ لوگ سنبھل جائیں اور اپنی حالت درست کرلیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ رؤسائے مکہ نے یہ درخواست کی کہ آپ ان غریب لوگوں کو جو کہ آپ کے پاس میں ہمارے آنے کے وقت علیحدہ کردیا کریں تو ہم ایمان لے آئیں جیسا آجکل کے رؤسا کہ وہ بھی اس قسم کی فرمائش علماء سے کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ اگر ان جلاہے تیلیوں کو مساجد وغیرہ میں آنے سے روک دیا جائے تو ہم مساجد میں آنے لگیں اور جماعت سے نماز پڑھنے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا کہ کسی سقے یا جلاہے کے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہوں حالانکہ ان کو غیرت کرنی چاہیئے اس لئے کہ یہ کہنا کہ ہم ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے درحقیقت اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے کہ یہ خود اس قابل نہ ہو سکے کہ امامت کا منصب ان کو عطا ہوتا اور یہ دوسروں کے امام بنتے غریب لوگ تو بے چارے خود ہی دب جاتے ہیں اگر ان میں لیاقت اور قابلیت ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی اگرچہ یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ ہم میں لیاقت نہیں ہے کیونکہ آج کل روشن دماغی کے زمانے میں ذرا سا دنیا وی عزو جاہ بھی لیاقت اور قابلیت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا دار لوگ کچھ ایسے مغرور و مست ہوتے ہیں کہ گو وضو کے فرائض و سنن سے بھی واقفیت نہ رکھتے ہوں لیکن اپنے کو علوم دین و دنیا دونوں کا محقق سمجھتے ہیں حالانکہ واقفیت یہ ہے کہ ؂

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(بعض عقلمند سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کچھ رتبہ حاصل کرلیا ہے حالانکہ اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سوائے تکبر اور بڑائی کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا)

میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس صاحب کو عید کی امامت کا شوق پیدا ہوا اور وہ امامت کو چلے اس کے قبل کبھی کیوں امامت کی تھی بلکہ شاید نماز کا بھی کبھی کبھی اتفاق ہوتا ہوا اور وہ بھی کسی مجبوری ہی کی وجہ سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تکبیرات بھول گئے۔ اب کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کروں آخر میں نے تکبیرات بتلائیں تو انھوں نے پوری کی جب یہ حالت ہے تو اب بتلایئے اگر سقے امامت نہ کریں تو کون کرے اور وہ بیچارے بھی آگے نہ بڑھیں تو کون بڑھے تو جیسے ان کی حالت ہے اسی طرح اُس زمانہ میں بھی رئیسوں کی یہی حالت تھی اس لئے ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ آپ ہمارے آنے کے وقت ان لوگوں کو ہٹا دیا کیجئے تو ہم آپ کے پاس آیا کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ شفقت کہ شاید اسی سے یہ لوگ کچھ مانوس ہوں اور رفتہ رفتہ راہ راست پر آجائیں ان کی درخواست کو منظور فرمانے کا کچھ خیال ہوا لیکن خدا تعالے نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی درخواست منظور فرمانے سے منع فرمایا اور درخواست کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہے وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ کہ آپ کبھی ان لوگوں کو نہ ہٹایئے ان کا کچھ لین دین آپ سے نہیں ہے اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ بے موقع کام کرنے والوں میں سے ہوں گے۔

یہ بات طالب علموں کے یاد رکھنے کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز کو جو خدا تعالے نے ظلم فرمایا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز ناجائز کیونکہ لفظ ظلم کلی مشکک ہے جس کے افراد مختلف مراتب کے ہیں جیسا کہ امر ممنوع کو ظلم کہا جاتا ہے اسی طرح اُس امر جائز حسن کو بھی کہ اس کے

مقابلہ میں کوئی امر اس سے احسن ہو ظلم سے تعبیر کر دیا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تجویز فرمائی تھی وہ حسن تھی جیسا ابھی آتا ہے لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز اس سے احسن تھی اس لئے اس کے اعتبار سے اس کو نامناسب کہدیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز کا حسن ہونا ظاہر ہے کہ اس تجویز سے یہ نیت تھی کہ کفار ہدایت پا جائیں اور اپنی حالت موجودہ سے نکل جائیں اور ظاہر ہے کہ اہتمام ہدایت حسن ہی ہوگا اس کے حسن ہونے میں شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ رہا یہ شبہ کہ تجویز اگرچہ کفار کے لئے ہدایت کا سامان تھی لیکن اس سے مسلمانوں کی تو دل شکنی ہوتی تو سمجھ لو کہ صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی محبت تھی اگر آپ ان کی دھجیاں بھی اڑا دیتے تو ان لوگوں کے دل پر ذرا میل نہیں آسکتا تھا وہ بزبان حال یوں کہتے تھے کہ۔ ہرچہ آں شیریں کند خسرو بود (جو کچھ وہ شیریں کر دیتا ہے وہی پسندیدہ ہوتا ہے) اور ان کی آپ کے ساتھ یہ حالت تھی ؎

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو ۔۔۔ جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر تو زندہ کرتا ہے تو یہ تیری عطا و مہربانی ہے اور تو موت دے تو میں تیرا ہوں میری جان تجھ پر قربان ہے، تو جو بھی کچھ کرے تیری رضا پر راضی ہوں) جن کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ تھوکتے تو اس کو زمین پر نہ گرنے دیتے تھے ہاتھوں میں لیتے اور اپنے چہرے پر مل لیتے اور اگر ہاتھ میں نہ آتا تو دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر چہرے کو مل لیتے اور بزبان حال یوں کہتے کہ ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست ۔۔۔ ہوس را رہ مدہ بوئے بسندست

(تیرے بال میری زلفوں کے چند پسندیدہ بال ہیں ہوس کے لئے راستہ مت کھولو کہ بہت ہی پسندیدہ خوشبو ہے)

تو جن عشاق کا یہ مذہب ہو کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(اللہ تعالیٰ دشمنوں کی خواہش پوری نہ کرے کہ تیری تلوار ہی ٹوٹ جائے دوستوں کا سر سلامت رہے

اور تو اپنے خنجر کی روانی کی آزمائش کرتا رہے)

ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی ضیع مبارک کیونکر ناگوار ہو سکتا تھا تو یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی دل شکنی ہوتی۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اپنی ذات میں حسن تھا۔ مگر احسن کے مقابلہ میں اس کو نامناسب کہہ دینا کچھ مضائقہ نہیں ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود لیک بس عالیست پیش خاک تود

(عرش الٰہی کے مقابلہ آسمان نیچے درجہ میں ہے لیکن تیری زمین کے مقابلہ میں ہزاروں درجہ بلندی پر ہے)

پس چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز احسن تھی اس لئے اس کے سامنے اس تجویز نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو بے موقع فرما دیا۔ باقی اس تجویز خداوندی کا احسن ہونا غور کرنے سے معلوم ہوگا کیونکہ یہ بہت زیادہ نظری ہے اس لئے کہ سب سے زیادہ نظری وہ ہے کہ اس کے حل کرنے کے لئے وحی کی ضرورت ہو اور عقول قدسیہ بھی اس تک بلا وحی نہ پہونچ سکیں۔ مجھے اس موقع پر ایک بڑی بات یاد آئی۔ ہمارے زمانہ کے عقلاء بڑی غلطی میں ہیں کہ وہ تمام نظریات کو عقل سے دریافت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ نظریات کی دو قسم ہیں ایک وہ نظریات کہ محض نظر اور فکر ان کے ادراک کے لئے کافی ہو جائے سماع اور نقل پر موقوف نہ ہو دوسرے وہ نظریات کہ اس میں عقل کے ساتھ نقل کی بھی ضرورت ہو سو ایسی نظریات بغیر انضمام نقل شرعی عقل و فکر سے حل نہیں ہو سکتی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہمارے بعض دنیاوی معاملات بھی ایسے ہیں کہ ان کی نسبت جب تک کہ خود صاحب واقعہ بیان نہ کرے اس وقت تک دوسرے کو کچھ بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ مثلاً فریمسن زونا کہ اس کے رازوں کو کوئی دریافت نہیں کر سکتا خواہ کتنا ہی عقلمند ہو اس لئے کہ وہ راز معقول محض نہیں کہ عقل سے دریافت ہو سکیں بلکہ ان میں نقل کو بھی دخل ہے تو جب تک کہ نقل کی بھی آمیزش نہ ہو ان کا پتہ نہیں چل سکتا اور نقل مفقود ہے اس لئے کسی کو معلوم نہیں کہ وہاں کیا کیا

معاملات ہوتے ہیں اور فریسن ہونے والے کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر چیز کو اپنی عقل نارسا سے دریافت نہیں کر سکتے۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ ہر قوت کی ایک حد ہوتی ہے کہ وہ قوت اس حد تک کام دیتی ہے اس کے بعد معطل ہو جاتی ہے مثلاً آنکھ کہ اس کا کام دیکھنا ہے مگر وہ ایک خاص حد تک دیکھتی ہے جو لوگ آسمان کے منکر ہیں وہ بھی اس مسئلے کو مانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ نیلگوں سطح جو جانب فوق میں ہم کو نظر آتی ہے یہ حد بصر ہے یعنی آنکھ کی قوت اس حد تک جا کر ختم ہو جاتی ہے آگے کام نہیں دیتی اس لئے یہ رنگ محسوس ہوتا ہے تو قوت بصر کا محدود ہونا تسلیم کیا اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس حالت میں انکار سمٰوٰت محض باطل ہے کیونکہ اس حد سے آگے ہونے کا احتمال باقی ہے یا مثلاً آپ کے کان کہ اُن میں سُننے کی قوت ہے لیکن وہ ایک مقررہ حد تک کی آواز کو سن سکتے ہیں کبھی کسی نے بریلی میں بیٹھ کر کلکتہ کی توپ کی آواز نہ سنی ہوگی حالانکہ یہاں ایک ذریعہ بھی موجود ہے کیونکہ جزم ہوا کہ جس کے ذریعہ سے کان میں آواز پہنچتی ہے یہاں سے وہاں تک متصل واحد ہے کیونکہ خلا منتفی ہے اب خواہ انتفاء امتناع عقلی ہو یا عدم عادی لیکن واقع یوں ہے کہ خلا کا وجود نہیں اور لیجئے آپ کی ناک کہ جس میں قوت شامّہ مودَع ہے کبھی یہاں بیٹھے ہوئے لکھنؤ کے عطر خانہ کی خوشبو محسوس نہیں کرتی پس جب تمام قویٰ ایک حد تک کام کر سکتے ہیں اور اس سے آگے عاجز ہیں تو عقل کہاں سے غیر محدود ہو گئی کہ اُس کی قوت کا سلسلہ غیر متناہی چلا جائے اور کہیں ختم ہی نہ ہو بلکہ جیسے اور قویٰ ایک مقام تک جا کر معطل ہو جاتے ہیں اسی طرح عقل بھی اُس حد تک پہونچکر کہ وہ نقل ہے عاجز ہو گی خواہ نقل خدا کی ہو یا انسان کی۔ صاحبو! اگر عقل سے ہر بات دریافت کی جا سکتی ہے تو کیا وجہ کہ جب کوئی دیوانی یا فوجداری کا مقدمہ پیش آتا ہے اس میں وکلاء سے رائے لیا کرتے ہو کیونکہ اس کے ہر پہلو کو اپنی عقل سے دریافت نہیں کر لیتے اور کیا وجہ کہ عقل سے ایک قانون تجویز کر کے حاکم کے سامنے پیش نہیں کر دیتے کیا وجہ کہ ہائی

کورٹ کے نظائر کی تلاش کی جاتی ہے کیا کسی صاحب کے پاس اس کا جواب ہے اور اگر کبھی کسی شخص کی سمجھ میں بھی کوئی بات آجائے تو کیا وہ یہ جرات کر سکتا ہے کہ خود یا بذریعہ وکیل خلاف قانون ہائی کورٹ کے ججوں کے سامنے پیش کر دے ہرگز نہیں کیونکہ جانتا ہے کہ خلاف قانون کوئی بات پیش کرنے سے حاکم کان پکڑ کر اجلاس سے باہر کر دے گا۔ افسوس مسلمانو! اگر ایک جج اس بنا پر کہ قانون کے خلاف کو قابل سماعت نہ سمجھے اور قانون کی دلیل پوچھنے کو گستاخی قرار دے کر کان پکڑ کر نکال دے تو اس کو متعصب نہ کہا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں اگر کوئی عالم یہی بات کہے کہ خلاف قانون شرعی قابل سماعت نہیں نہ حکمت پوچھنے کا ہر شخص کو منصب ہے تو اس عالم کو متعصب کہا جائے حیف صد حیف کہ ہائی کورٹ کے جج کی تجاویز تو سب بلا تعین حکمت عقل کے موافق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجاویز میں چون وچرا کی جرأت کی جائے۔ غرض جہاں تک عقل نہیں پہونچ سکتی وہ نظری وحی کا محتاج ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر وہاں تک نہ پہونچ سکی اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ وہ کونسا جزء تھا جس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر نہیں پہونچ سکی اور نہ پہونچ سکتی تھی وہ جزء یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ایمان لے آنے کا احتمال تھا خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے بتلا دیا کہ یہ ایمان تو لائیں گے نہیں پھر ان کے لئے کسی اہتمام کی کیا ضرورت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے صرف تبلیغ واجب ہے مگر اہتمام فضول ہے اسی کو فرمایا ہے

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا ط (ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے)

غرض آپ کی اس تجویز کی وجہ یہ تھی اور اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو کبھی آپ مسلمانوں کو علیحدہ کرنا گوارا نہ فرماتے۔ اب جبکہ معلوم ہو گیا تو یہی تجویز احسن تھی کہ خواہ آئیں یا نہ آئیں ان کو علیحدہ نہ کیا جائے گا۔ یہ ہے شرح اس آیت کی کہ میرا مقصود اس آیت کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ کبھی آپ کی جدائی کو گوارا نہ کرتے تھے کفار کے ایمان لے آنے کی امید کہ

ان کی جدائی کو بھی گوارا فرمالیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت کی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ حالت تھی کہ ایک صحابی نے ایک مرتبہ آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ یہ تو امید ہے کہ ہم جنت میں جائیں گے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کا درجہ جنت میں ہم سے بہت اعلیٰ ہوگا تو جب ہم کو آپ کا دیدار نصیب نہ ہو سکے گا تو ہم جنت کو لیکر کیا کریں گے خوب کہا ہے ؎

با تو دوزخ جنت ست اے جانفزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(اے محبوب دوزخ بھی تیرے ساتھ رہ کر تو گویا جنت ہے اور اے میرے دل کے بسنے والے تیرے بغیر تو جنت ہی گویا دوزخ ہی ہے)

اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ الآیۃ (جس کسی نے اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری کی وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء) کہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اعلیٰ ہوگا لیکن تم لوگ دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم نہ رہو گے بلکہ تم لوگ بھی اُس مقام تک پہونچ جایا کرو گے جیسے دنیا میں گو مکان الگ الگ ہوتا ہے لیکن ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے اس کے گھر چلے جاتے ہو تو اسی طرح وہاں بھی گو مکان الگ الگ ہونگے مگر ملاقات ہو سکے گی ارشاد ہے وَلَكُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُكُمْ کہ جو تمہارا جی چاہے گا وہاں تم کو ملے گا تو اگر کسی کا یہ جی چاہے کہ میں ہر وقت زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف رہوں تو ضرور اس کو زیارت ہو سکے گی۔ رہی یہ بات کہ ایسی خواہش کسی کو پیدا ہوگی یا نہیں یہ ہم کو معلوم نہیں ہے یہ وحی کے متعلق ہے ممکن ہے کہ بعض کو یہ دولت نصیب ہو بعض کو نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ جس کو یہ دولت نصیب ہوگی کیا وہ ہر وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر پر پڑا رہے گا سو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اپنے گھر ہی بیٹھے بیٹھے ہر وقت زیارت سے مشرف ہوتا رہے جس کی صورت یہ ہو کہ خدا تعالیٰ نظروں میں ایسی قوت پیدا کردیں کہ وہ درمیان کی حائل چیزوں کو پار کر کے وہاں تک پہونچ جائیں

اس زمانے میں بھی ایسے آلات ایجاد ہوئے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے بہت دور دور کی چیزیں دکھلا دیتے ہیں اور درمیان کے پردے سب دور ہو جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ اگر نظر ہی میں ایسی قوت پیدا کر دے تو کیا بعید ہے اور نظیر اس لئے بیان کی گئی کہ آج کل کے روشن دماغ لوگ جب تک کہ ولایت کی کوئی نظیر نہ ہو اس وقت تک منصوصات کو نہیں مانتے ورنہ ہم کو تو شرم آتی ہے کہ خدائی خبریں منوانے کے لئے یورپ کے صنائع پیش کریں غرض صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ جنت میں جانا بھی اس وقت تک ان کو پسند نہ تھا جب تک کہ دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل نہ ہو ؎

دیدہ از دیدنش نہ گشتے سیر ہمچناں کز فرات مستسقی

(اس کے دیکھنے سے آنکھ کا جی نہیں بھرتا ایسے ہی جیسے دریائے فرات پر بھی پیاس کی بیماری والے کی پیاس نہیں بجھتی)

تو باوجود اس کے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا کر لیا کہ تھوڑی مدت کے لئے یہ لوگ نظر سے غائب رہیں اور حقیقت میں یہ غیبت ظاہری تھی ورنہ اصل غیبت نہ تھی صحابہؓ کی تو حالت یہ تھی کہ ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

گو اس حضور اور ظاہری حضور میں فرق بھی ہے اور یہی معنوی حضور ہے کہ جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو سب سے بڑے محب تھے وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل رہے یعنی صدیق اکبرؓ ورنہ کیا ممکن ہے کہ ایسے سانحۂ عظیم کی حالت میں اتنی محبت مضبوط رہنے دے یہ اسی معائنہ کی بدولت ہے ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہم خود ہی اس سے بے بہرہ ہیں۔ تو صحابہؓ کو گو پوری غیبت نہ ہوتی مگر یہ ظاہری غیبت بھی کب گوارا تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان لوگوں کے ایمان لاتے کے احتمال پر اس غیبت کو گوارا فرما لیا یہاں سے بطور تفریع کے کہتا ہوں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شفقت تھی تو ورثۃ الانبیاء کو بلکہ ہر فرد امت کو کیونکہ ہر فرد امت من وجہٍ وارث ہے کیونکہ منشاء وراثت علم دین ہے کیا کوئی فرد بشر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا علم دین سے بالکل بے بہرہ ہے ہرگز نہیں خواہ وہ علم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی کا ہو اور جب ہر فرد امت کو یہ علم ہے تو کوئی مسلمان وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے خارج نہیں تو جب آپ وارث ہوئے تو آپ کے ذمہ بھی وہی حق ہوگا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یعنی آپ اپنے مخالفین سے وہی برتاؤ کریں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یعنی شفقت آج کل یہ حالت ہے کہ ذرا سے اختلاف میں عداوت اور تنفر ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو اپنے مخالف کے اس قدر درپے ہوتے ہیں کہ اس کو دنیاوی نقصان بھی پہونچانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اگر اتفاق سے اس کو کوئی دنیاوی نقصان پہونچ جائے تو اس کو اپنی کرامت اور اپنی بد دعا کا نتیجہ سمجھتے ہیں یہ سچ ہے کہ اہل دل کا ستانا اچھا نہیں اس سے طرح طرح کے نقصان ہوتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد تا دلے صاحبدلے نامد بدرد

(جب تک کسی صاحب دل کے دل کو درد نہیں پہونچتا رسوائی نہیں ہوتی)

خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات با درد کشاں ہر کہ درآویخت برآویخت

(یہ دنیا ادلے بدلے کی ہم نے اس دنیا میں بہت تجربہ کیا ہے کہ شرابیوں کے ساتھ لپٹ گیا وہ لپٹ ہی گیا)

تو یہ بات بالکل سچ ہے مگر یہ کسی کو کب جائز ہے کہ وہ اپنے کو ایسا سمجھے ہاں البتہ اگر کوئی دوسروں کی نسبت یہ گمان کرے تو بیجا نہیں اور اس وقت بھی بیجا نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ مصیبت زدوں کی مصیبت کو دیکھ کر خوش ہو بلکہ غمگین ہونا چاہیئے۔ اور ان کے لئے دعا کرنا چاہیئے اور یہ حالت ہونی چاہیئے کہ جیسے کسی کا لڑکا کہ وہ جوا کھیلتا تھا اور اس میں پکڑا گیا تو دیکھئے کہ اس کے باپ کی کیا حالت ہوگی اگرچہ اس خبر کو سن کر زبان سے یہ کہدیگا کہ اچھا ہوا پکڑا گیا لیکن دل کی یہ حالت ہوگی کہ بیقرار ہو جائے گا تدبیریں کرے گا دعائیں کرلئے گا اور جگہ جگہ کہتا نہ پھرے گا بلکہ اگر کوئی اس کے سامنے یہ تذکرہ کرے گا تو اس کو ناگوار ہوگا لوگ اگر عیادت کو آئیں گے تو ان کی عیادت لے گا۔

تو صاحبو کیا وجہ ہے کہ اگر اپنے بیٹے پر کوئی مصیبت آجائے تو قلب کی یہ حالت ہو جائے اور کسی دوسرے مسلمان پر کوئی مصیبت آئے تو دل کو اثر بھی نہ ہو میں اس کی شکایت کرتا ہوں ہاں اگر شفقت کی وجہ سے غصہ ہو تو وہ بُرا نہیں معلوم ہوتا حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے غصے کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی شخص ان کے غصے سے بچتا ہو لیکن باوجود اس کے کبھی کسی کو ناگوار نہ ہوتا تھا اس لئے کہ وہ خلوص سے ہوتا تھا خوب کہا ہے ؎

محبت ہو کسی سے یا عداوت مزا دیجائے گی جو دل سے ہو گی

صاحبو! تمہارے پاس دل نہیں تمہاری ہمدردی محض لفاظی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں آجکل کے مدعیان ہمدردی کے لئے ایک مثال پیش کیا کرتا ہوں کہ اگر ایک ایسے شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دی جو کہ اپنے گھر سے خوش حال ہے ایسا کہ اگر نوکری نہ بھی کرے تو اس کے ضروریات پورے طور سے چل سکتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک دوسرا ایسا شخص درخواست دے کہ وہ بالکل مفلوک الحال ہے ایسا کہ اگر اس کو یہ ملازمت نہ ملے تو کھانے پینے کی ضروریات بھی اس کی مشکل سے پوری ہوں اور یہ خوش حال صاحب درخواست دینے میں مقدم ہو گئے اور وہ غریب دوسرے نمبر پر ہو گیا تو ہم نے آج تک کسی مدعی ہمدردی کو نہیں سُنا کہ اس نے اس غریب آدمی کی غربت پر خیال کر کے اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور میں اہل اللہ میں ہزاروں نظیریں اس سے زیادہ دکھلا دوں جو کہ دنیا داروں میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں دنیا داروں میں ایک وضعداری ہے کہ دنیا کی لاج کے مارے اس کو نباہتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک تو ہمدردی نہیں ہوتی اور دوسرا فرق ان میں اور اہل اللہ میں یہ ہے کہ اللہ والے کریں گے بہت کچھ اور کہیں گے کچھ نہیں اور یہ لوگ کریں گے خاک نہیں اور دنیا بھر میں غل مچاتے پھرینگے وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کے خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں دنیاوی غرض ان کی نہیں ہوتی اور یہ جو کچھ کم و بیش کرتے بھی ہیں تو محض دنیاوی اغراض کے لئے اور اسی سے یہ بھی سمجھ لو کہ ان دنیا داروں کی ہمدردی کو بقاء دوام نہیں

ہوتا کیونکہ دنیا جس کے لئے یہ ہمدردی کرتے ہیں خود فانی اور متغیر ہے اس کے حالات اغراض و مصالح بھی بدلتے رہتے ہیں صبح کچھ ہے تو شام کچھ ہے تو جب مصلح دنیا متغیر ہیں تو ان کی ہمدردی باقی کیونکر ہو سکتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں بھی تغیر پیش آئے ممکن ہے کہ کل سچ بولنے میں دنیوی مصلحت تھی اور آج جھوٹ بولنے میں دنیوی مصلحت ہے اور اہل اللہ کی ہمدردی قائم و دائم ہے کیونکہ جس ذات کے خوش کرنے کے لئے وہ ہمدردی کرتے ہیں وہ خود غیر فانی ہے پھر غرض ان کی ایک متعین ہے خدا تعالیٰ کو خوش کرنا اور وہ جس امر سے آج خوش ہیں قیامت تک اسی سے خوش ہیں نیز دنیا داروں کی ہمدردی تو محض قومی ہمدردی ہے یعنی وہ جو کچھ کم زیادہ ہمدردی کرتے ہیں اپنی قوم سے من حیث القوم کرتے ہیں اور اہل اللہ کی ہمدردی عام ہمدردی ہے کہ وہ ہر شخص سے وہی برتاؤ شفقت کا کرتے ہیں جو اپنوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جانوروں تک سے ہمدردی ہوتی ہے اُن کی وہ شان ہوتی ہے جس کو فرمایا ہے وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہ تمام جہان کے لئے ان کی ذات بابرکات رحمت خداوندی ہوتی ہے۔ چنانچہ مُلّا دُپیازہ نے اپنے آل نامہ میں لکھا ہے ، الرّسول خیر خواہ دشمناں۔ حضرت جنید کو ایک مرتبہ خلیفہ وقت نے کسی بات پر برہم ہو کر بلا بھیجا۔ حضرت شبلی بھی ساتھ تھے۔ جب رو برو ہوئے تو خلیفہ نے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ حضرت شبلیؒ چونکہ نوجوان تھے نیز ان کے پیر کو بُرا بھلا کہا جا رہا تھا آپ کو جوش آیا قالین پر ایک شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی آپ نے اُس پر نظر ڈالی تو وہ شیر مجسم ہو کر خلیفہ کی طرف خشم آگیں نظر سے دیکھنے لگا حضرت جنیدؒ کی جو اس پر نظر پڑی تو آپ نے حضرت شبلیؒ کو گھور کر دیکھا اور اس شیر کو تھپک دیا وہ مثل سابق شیر قالین ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں حضرت شبلیؒ نے پھر اُسے اشارہ کیا اور وہ پھر مجسم ہو کر سامنے ہوا اس مرتبہ خلیفہ وقت کی نگاہ بھی اُس پر پڑی خوف کے مارے تھرّا گیا اور دست بستہ اپنی جراءت کی معافی چاہی حضرت جنیدؒ نے اس شیر کو تو فوراً مثل سابق کر دیا اور خلیفہ وقت سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچ

سکتا آپ خلیفۂ وقت ہیں آپ کی اطاعت اور ادب ہم پر واجب ہے یہ لڑکا ہے آداب شاہی سے واقف نہیں ہے آپ کا جو دل چاہے کہیئے۔

صاحبو! آپ نے سُنا یہ ہوتی ہے ان حضرات کی شان۔ دنیادار اگر اطاعت کرتے بھی ہیں تو اسی وقت تک اطاعت کرتے ہیں کہ اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہے ورنہ اطاعت اور فرماں برداری سب ختم ہو جاتی ہے ان حضرات کی یہ حالت ہے کہ گو سب کچھ کر سکتے ہوں مگر کچھ نہیں کرتے کیونکہ جانتے ہیں کہ امر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اَطِیْعُوْا اِذَا اَمَّرَکُمْ تو ان حضرات کی جو بات بھی ہو گی پائدار ہو گی اس لئے کہ یہ پورے شفیق اور سچے رفیق ہیں اس سے زیادہ کیا شفقت ہو گی کہ شیر کو مٹا رہے ہیں اور بادشاہ کو خبر بھی نہیں کرتے اس لئے کہ مقصود اس کے ساتھ ہمدردی کرنے سے خدا کو خوش کرتا ہے۔ حضرت مجددؒ صاحب کی حکایت لکھی ہے آپ کے زمانہ میں ایک شیخ تھے آپ کو مکشوف ہوا کہ ان کا نام خدا تعالیٰ کے یہاں اشقیاء میں لکھا ہوا ہے تو باوجودیکہ ہمعصری میں ایک قسم کی منافست ہوتی ہے لیکن آپ نے ان کو اطلاع کئے بغیر برابر ان کے لئے دعا کی کہ اے خدا ان کا نام اشقیاء سے محو کر کے سُعداء کی فہرست میں لکھ دیجئے۔ دیکھئے ان بزرگ کے ساتھ کتنی بڑی ہمدردی کی لیکن ان کو خبر بھی نہیں ہونے دی نہ ہمعصری کی وجہ سے آپ کے قلب میں کسی قسم کی منافست کی شان پیدا ہوئی بعض لوگ شیخ نہیں ہوتے مگر وہ دعویٰ شیخیت کا کرتے ہیں اور ان کو اہل حق سے کشیدگی ہوتی ہے اور یہ ہونا عجب بھی نہیں کیونکہ یہ حضرات خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اہل باطل کو عداوت ہوتی رہی ان کے ساتھ بھی اہل باطل کو پرخاش ہونی چاہیئے۔ محققین نے اس کو علامات کمال میں سے لکھا ہے۔ حضرت سلطان جی کے زمانے میں ایک بزرگ تھے ان پر اتفاق سے ایسا افلاس آیا کہ تمام مال و متاع ختم ہو کر صرف ایک لونڈی رہ گئی جب اس لونڈی نے دیکھا کہ اب کچھ نہیں تو اُن سے عرض کیا کہ اب مجھے بیچ دیجئے آخر میں کس کام کی ہوں گو یہ ضرور ہے کہ ؎

ترا بندہ چوں من بیفتد بسے مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

مگر کسی دیندار کے ہاتھ بیچئے گا آپ نے کہا کہ میں تجھے ایسے شخص کے ہاتھ بیچوں گا کہ اس سے زیادہ اس وقت کوئی دیندار نہیں یعنی حضرت نظام الدین سلطان جیؒ کے ہاتھ اس نے عرض کیا کہ حضور ہے تو گستاخی لیکن ان بزرگ کی بزرگی میں تو مجھے شبہ ہے کیونکہ بزرگی کی علامت سے یہ بات بھی ہے کہ کوئی نہ کوئی تو اس کو برا کہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ان کو کوئی بھی برا نہیں کہتا۔ افسوس آج کل یہ علامت بزرگی سے سمجھا جاتا ہے کہ جہاں گئے اس رنگ کے ہو گئے کہ ساری دنیا خوش رہے۔ گنگا پر گئے گنگا رام، جمنا پر گئے جمنا رام۔ نیز حضرت سلطان جی کے در پر بڑے بڑے اکابر دنیا سلاطین و وزرا تک دست بستہ آتے تھے اس لئے بھی اس کو شبہ ہوا۔ اس موقعہ پر ایک حکایت یاد آگئی کہ ایک مرتبہ آپ کے ہاں ایک وزیر حاضر تھا کھانے کا وقت آیا خادم نے کھانا لانے کی اجازت چاہی وزیر کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر آج مچھلی کے کباب ہوں تو خوب ہو حضرت سلطان جی اس کے خطرے پر مطلع ہو گئے خادم سے فرمایا ذرا ٹھہر و تھوڑی دیر میں اس نے پھر دریافت کیا آپ نے پھر یہی جواب دیا حتیٰ کہ کچھ دیر کے بعد ایک شخص ایک خوان میں مچھلی کے کباب لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ مچھلی کے کباب آپ کے لئے لایا ہوں آپ نے دسترخوان لگانے کا حکم دیا وزیر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا آپ نے وزیر سے فرمایا لیجئے مچھلی کے کباب حاضر ہیں مگر ذرا دقت کی گنجائش رکھ کر فرمائش کیا کیجئے۔ غرض آپ کے اندر ایک محبوبیت کی شان تھی۔ ایک حضرت علاء الدینؒ تھے کہ گولر کھا کر بسر کرتے تھے اور کبھی کبھی وہ بھی نہ ہوتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان است
بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان ست

(پھول کے کان میں جو بات تو کہے کہ وہ تیرا تابعدار ہے اور عندلیب سے جو کچھ بھی آوے کہتے ہیں وہ شکوہ کرتا ہے)

ہر ایک کا رنگ و بو الگ ہے کوئی کسی شان کا ہے کوئی کسی شان کا ہے تو حضرت سلطان جی کی یہ حالت تھی کہ آپ کے در پر سب سر نیاز خم کرتے تھے۔ اس لئے اس لونڈی کو

آپ کی بزرگی میں شبہ ہوا ان بزرگ نے اس سے کہا کہ میں تجھے بیع خیار کے طور پر بیچوں گا دو تین دن کے اندر تو ان کی حالت دیکھ لینا پھر اگر تیری مرضی ہوگی تو رہنا ورنہ میں تجھے واپس لے لوں گا۔ غرض آپ نے حضرت سلطان جی کے ہاتھ اس کو فروخت کردیا وہ چونکہ آپ کی پورے طور پر معتقد نہ تھی اس فکر میں لگی رہی حضرت سلطان جی کو کشف کے ذریعے سے اس کے وسوسہ پر اطلاع ہوگئی۔ آپ نے اس سے فرمایا جاکر پڑوس سے آگ لے آ وہ پڑوسن کے ہاں گئی اور کہا حضرت جی کے ہاں تھوڑی آگ کی ضرورت ہے پڑوسن نے حضرت کا لفظ سن کر آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہا اور کہا ڈاکو کو حضرت کہتے ہیں لونڈی یہ سن کر بہت خفا ہوئی اور بگڑ کر واپس چلی آئی حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ اب تو معلوم ہوگیا کہ مجھے سب اچھا نہیں سمجھتے دیکھ میری پڑوسن ہی مجھ کو کیسا برا سمجھتی ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت یہ میری جہالت تھی واقعی آپ صاحبِ کمال ہیں پھر مدت خیار گذرنے کے بعد اس کے پہلے مالک آئے اور آکر اس سے پوچھا اُس نے عرض کیا کہ حضور واقعی یہ بزرگ ہیں اب آپ کو واپس لینے کی ضرورت نہیں۔ غرض مقبول عام ہونا کوئی بزرگی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ عدم کمال کی علامت ہے۔ کاملین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اُن کو اگر سب بھی برا کہیں تب بھی یہ کسی کو کچھ نہ کہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان حضرات کو غصہ نہیں آتا، غصہ ضرور آتا ہے مگر وہ غصہ خدا کے لئے ہوتا ہے اپنے نفس کے لئے نہیں ہوتا، اپنے نفس کے لئے اُن کی وہی حالت ہوتی ہے جس کو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جو کہ دس برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے کہ مَا قَالَ لِیْ قَطُّ لِمَا فَعَلْتَ کہ کبھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے یہ نہیں فرمایا کہ فلاں کام تو نے اس طرح کیوں کرلیا اُس طرح کیوں نہیں کیا حتیٰ کہ بوجہ بچپن کے یہ اس قدر بے تکلف تھے کہ ایک مرتبہ آپ نے کسی جگہ ان کو جانے کو فرمایا تو انھوں نے صاف کہدیا کہ میں تو نہیں جاتا مگر دل میں یہ تھا کہ ضرور جاؤں گا چنانچہ گئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انکار پر خفا نہیں ہوئے۔ اگر کوئی کام اُن سے بگڑ جاتا تو آپ فرماتے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا مگر اُن پر خفا نہ ہوتے تھے آج کل کے

روشن خیال لوگوں نے مسئلہ تقدیر کو بالکل ہی چھوڑ دیا کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر ہی سے مسلمانوں کو تنزّل ہو رہا ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ تقدیر ہی کے مسئلے کی بدولت ترقی ہوئی ہے اس سے تنزل ہرگز نہیں ہوا کیونکہ مدار ترقی کا ہمّت پر ہے اور ہمت قائل تقدیر کی برابر کسی کو نہیں ہو سکتی منکر تقدیر تو فقدان اسباب کے وقت جی چھوڑ دیتا ہے اور معتقد تقدیر اس وقت بھی خدا تعالیٰ پر نظر کر کے ہمّت نہیں ہارتا اس کا مسلک یہ ہے کہ ؎

عقل دراسباب میدارد نظر عشق میگوید مسبّب را نگر

(عقل اسباب اور وسائل پر نظر رکھتی ہے مگر عشق و محبت یہ کہتی ہے کہ اسباب کے پیدا کرنے والے کو دیکھ)

اسی طرح اس شخص کو کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ اپنے دل کو یہ سمجھ کر تسلّی دے لیگا کہ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہونچ سکتی بجز اس کے کہ جس کو خدا تعالیٰ نے ہمارے واسطے لکھدیا ہے) غرض پوری راحت تقدیر ہی کے ماننے سے ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر دو شخص ایسے ہوں کہ تموّل میں بھی برابر ہوں دنیاوی عیش بھی دونوں کو برابر حاصل ہو عقل اور مزاج اور قوت وغیرہ سب میں یکساں ہوں دونوں کے ایک ایک بیٹا بھی ہو۔ غرض ہر طرح کے سامان دونوں میں برابر ہوں کسی وجہ سے ایک کو دوسرے پر فوقیّت نہ ہو مگر اتنا فرق ہو کہ ایک مسئلہ تقدیر کا قائل اور دوسرا منکر ہو اور اتفاق سے ایک ہی تاریخ میں ان دونوں کی اولاد مرجائے اور فرض کیجئے کہ اُن کے مرنے کا ظاہری سبب یہ ہوا ہو کہ دونوں کی بیماری تشخیص ہوتے میں اور علاج میں غلطی ہو گئی تھی تو اب بتلایئے کہ ان میں سے کس کا صدمہ جلدی ختم ہو گا اور کس کا صدمہ دیرپا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جو تقدیر کا قائل ہے اس کو بہت جلد راحت نصیب ہو جائے گی۔ کیونکہ صدمہ پڑتے ہی اس کو یہ خیال ہو گا کہ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (جو کچھ بھی پہنچی تم کو مصیبت میں سے بس وہ خدا کی اجازت سے پہنچی ہے) کہ خدا کو یہی منظور تھا نیز اس کو فوراً خیال ہو گا کہ ممکن ہے اس کی موت ہی

یں کوئی مصلحت ہو ان خیالات کے آتے ہی اُس کا صدمہ ختم ہو جائے گا برخلاف منکرین تقدیر کے کہ اس کو ساری عمر یہ غم لگا رہے گا۔ کبھی سوچے گا کہ افسوس میں نے فلاں تدبیر نہ کی ورنہ ضرور میں کامیاب ہوتا اور لڑکا بچ جاتا، کبھی کہے گا کہ فلاں بد پرہیزی نہ کی جاتی تو ہرگز نہ مرتا۔ غرض اسی طرح کے پریشان کن خیالات میں تمام عمر غلطاں پیچاں رہے گا۔ اب میں پوچھتا ہوں عقلاء زمان بتلایئے کہ اس موقعہ پر پریشانی کا دفعہ کرنا اور راحت حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری ہے تو ذرا مہربانی کر کے بتلا دیجئے کہ سوائے مسئلہ تقدیر کے ماننے کے اور کونسی ایسی صورت ہے کہ اس شخص کی پریشانیاں دور کر دی جائیں اور اُسے راحت نصیب ہو جائے۔ افسوس شریعت نے کتنا پاکیزہ مسئلہ ہم کو دیا اور ہم نے اس کی یہ قدر کی۔ ہماری وہ حالت ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۲۳ برس تک وحی کا بوجھ اُٹھا اُٹھا کر اس کی سختیاں برداشت کر کے ہم کو زر و جواہر دیئے اور ہم نے سنگریزوں کی طرح اُنکی ناقدری کی وحی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ حضرت زید بن ثابت کی ران پر زانوں رکھے بیٹھے تھے اس وقت وحی نازل ہوئی۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کَادَاَنْ تَرُخی فَخِذِیْ یعنی کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ران پاش پاش ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ آپ اونٹنی کے اوپر سوار تھے اسی حالت میں وحی نازل ہوئی اس قدر شدت تھی کہ اونٹنی سہار نہ سکی اور بیٹھ گئی۔ غرض کتنی تکالیف برداشت کر کے عالم غیب سے فیوض لئے اور آپ کو مفت دیئے گویا تخم ریزی کی، کھیت کاٹا آٹا بنایا، پکایا اور لقمہ تیار کر کے آپ کے منہ میں رکھ دیا مگر آپ ہیں کہ اس کو منہ سے باہر پھینکے دیتے ہیں۔ صاحبو! اگر قیامت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا ہی دریافت فرما لیا کہ میرے احکام کی تم نے کیا قدر کی تو بتلاؤ تم کیا جواب دو گے۔ یہ سب بیچ کے مضامین استطرادی تھے بمناسبت مضمون شفقت کے ان کا ذکر آ گیا۔ اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ کفار بہت ستاتے تھے (اور جب آج کل مدعیانِ موافقت ہی طرح طرح سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو صدمہ دیتے ہیں تو وہ لوگ تو کافر تھے آپ کو مانتے بھی نہ تھے جتنا ستاتے کم تھا) اور آپ غایت شفقت رکھتے تھے تو آپ کو ان کی مخالفتوں سے بہت غم ہوتا تھا اور اُن کے مآل کو سوچ کر بہت کُڑھتے تھے اور چونکہ واقعات بہت زیادہ تھے جن کی وجہ سے غم بھی بہت زیادہ ہو گیا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے جابجا آپ کی تسلی فرمائی ان میں سے ایک مقام یہ بھی ہے جس کو تلاوت کیا گیا چنانچہ اسی کی تمہید و تائید میں اس آیت کے پہلے فرماتے ہیں اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ الخ (آپ اُن لوگوں کو ڈراتے ہیں جو اپنے پروردگار سے غائبانہ طور پر ڈرتے ہیں اور نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں) یعنی آپ کے انذار سے منتفع ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ قلب میں خشیت ہو اور خدا کی اطاعت ہو اور یہ اس سے معرا ہیں اور آگے فرماتے ہیں وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ الخ (اور نہیں برابر ہو سکتے اندھے اور دیکھنے والے) کہ اندھے اور بینا تاریکی اور نور سایہ اور دھوپ برابر نہیں ہو سکتی تو یہ لوگ تو اندھے ہیں اور ان کے قلب تاریک محض ہیں پھر یہ کیونکر منتفع ہو سکتے پھر آپ ان کے حالات سے غمگین کیوں ہوتے ہیں آگے ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ (بے شک خدا تعالیٰ سناتے ہیں جس کو چاہتے ہیں اور نہیں سنا سکتے ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں نہیں آپ مگر ڈرانے والے) کہ خدا جس کو چاہیں سنا دیں آپ ان لوگوں کو جو کہ بے حسی میں مثل مردوں کے ہیں نہیں سُنا سکتے (آپ اس غم میں نہ پڑیں) آپ تو ایک نذیر ہیں آگے فرماتے ہیں اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی۔ پس نکالا ہم نے اس کے ذریعہ سے رنگ برنگ کے پھل اور پہاڑوں سے چکنے سفید اور سرخ پتھر جن کے رنگ ہیں اور انوکھے نایاب سیاہ پتھر) حاصل یہ کہ جس طرح ثمرات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اعیان بھی مختلف ہیں۔

آگے ارشاد ہے وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ط (لوگوں میں سے (انسان) چوپاؤں اور جانوروں میں سے ان کا رنگ بھی اسی طرح مختلف ہوتا ہے) کہ انسانوں میں چوپاؤں میں سب میں مختلف طرح کے ہوتے ہیں پھر اگر یہ لوگ بھی اس خاص طور کے ہوگئے تو تعجب کیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (بے شک اُس کے بندوں میں سب سے زیادہ ڈرنے والے علماء ہیں) یعنی اوپر معلوم ہوا ہے اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ الخ کہ انذار سے انتفاع موقوف ہے خشیت پر اور یہاں فرماتے ہیں کہ خشیت ان لوگوں میں ہوگی کہ جن لوگوں میں علم ہو کہ خلاصہ یہ ہوا کہ آپ کے انذار سے وہ منتفع ہوسکتا ہے جس میں خشیت ہو اور خشیت ان میں ہوگی کہ جن میں علم ہو تو آپ کے انذار سے منتفع وہ لوگ ہوں گے جن میں علم ہو کیسی کامل تسلی فرمائی اور منتہا کیسی اچھی چیز پر رکھا کہ وہ محسوس ہے تاکہ آپ کی پوری پوری تسلی ہو جائے کہ جہاں آپ علم دیکھیں وہاں اہتمام بھی کریں اور جہاں یہ نہ ہو وہاں غم نہ اٹھائیں اور اس آیت سے کئی فائدے معلوم ہوئے ایک تو یہ کہ علماء کو چاہیے کہ وہ مایوسوں پر بھی شفقت کیا کریں دوسرے یہ کہ غم کی بھی ایک حد ہونا چاہیے کہ اس حد سے آگے نہ بڑھا جائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو قوی تھے ہم ضعیف ہیں اگر غم کا زیادہ بار ہم پر پڑے گا تو اندیشہ ہے کہ ہم کو مالیخولیا نہ ہو جائے تو ایسے لوگوں کے لئے زیادہ اہتمام کے بھی درپے نہ ہوں۔ یہ شریعت کی خوبی ہے کہ اُس نے افعال حسنہ اور اخلاق حسنہ کی بھی حدود مقرر کر دیں کہ ان سے آگے نہ بڑھا جائے میں اس کی کچھ تفصیل کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (میں آپ سے درخواست کرتا ہوں آپ کے ایسے خوف کی جو ہمارے اور آپ کی نافرمانی کے درمیان حائل ہو جائے) اور یہ اس لئے بیان کرتا ہوں کہ آجکل کے عقلاء معلوم کر لیں کہ تعلیم محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر غامض ہے کہ کوئی پہلو اس میں چھوڑا نہیں گیا۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ ہم تو اس کے قائل ہیں اگر منکر ہوتے تو ہمارے سامنے اس کا بیان کرنا ضروری تھا تو میں کہوں گا کہ حضور اگر قائل ہو

اور واقعی دل سے یہ کہتے ہو تو پھر احکام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دخل کیوں دیتے ہو اور اگر تم کو کسی حکم کی حکمت نہیں معلوم ہوتی تو اس کو خاموشی کے ساتھ مان کیوں نہیں لیتے آج کل ایسے تو کم ہیں کہ وہ یوں کہدیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں مانتے مگر ایک اور غلطی میں مبتلا ہیں کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم پر حکمت ہے اور فلاں حکم میں کوئی حکمت معلوم نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں بلکہ مولویوں کا بنایا ہوا ہے اور یہ مرض اس زمانہ بھی تھا کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ آپ کا تراشا ہوا ہے۔ چونکہ یہ تکذیب آیات کی تھی آپ کو اس سے حزن ہوتا تھا جس پر یہ آیت تسلی کے لئے نازل ہوئی قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (تحقیق کہ ہم جانتے ہیں کہ بیشک وہ آپ کو رنجیدہ کرے گا وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں پس بیشک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے لیکن بیشک (یہ) ظالم ہیں خدائے تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں) اس کی مشہور تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ ان کے اقوال سے مغموم ہوتے ہیں سو آپ کیوں غم کرتے ہیں یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے یہ تو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں مگر میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کو ان کے اقوال سے رنج ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے کہ آپ اس پر صبر کرلیں بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں جس پر آپ کو صبر ہو ہی نہیں سکتا اور اس کو کوئی تفسیر بالرائے نہ سمجھے کیونکہ تفسیر بالرائے وہ ہے جو قاعدہ شرعیہ و قواعد عربیہ کے خلاف ہو اور یہ تفسیر نہ قواعد عربیہ کے خلاف نہ شرعیہ کے، یہ مضمون کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی برائی سننا اتنا ناگوار نہ ہوتا تھا جتنا خدا کی برائی سننا خود حدیث سے ثابت ہے۔ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذمم رکھا تھا اور یہی نام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ناگوار نہیں ہوا بلکہ ایک مرتبہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اُنْظُرُوْا كَيْفَ صَرَفَ اللّٰهُ عَنِّيْ شَتْمَ

قُرَيْشٍ يَشْتُمُوْنَ مُذَمَّمًا وَيَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ (دیکھو کس طرح پھیر دیا خدا تعالیٰ نے قریش کی گالیوں کو جو گالیاں دیتے بُرائی کیے ہوئے کو اور لعنت بھیجتے برائی کیے ہوئے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو حالانکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں کفار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بجائے محمد (تعریف کیے ہوئے) مذمم (برائی کیے ہوئے) کہا کرتے تھے) اور خدا کو برا کہنے میں کبھی آپ نے اس قسم کی توجیہ نہیں کی بلکہ آپ کو سخت ناگوار گذرتا تھا چاہے جس انداز سے بھی وہ بُرا کہتے۔ تفسیر بالرائے کی مثال میں آپ کو بتلاتا ہوں آج کل کے روشن دماغوں میں سے ایک صاحب نے ربوٰا کو حلال لکھا اور فرمایا کہ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا اور سود کو حرام کر دیا ہے) میں یہ لفظ ربوٰا نہیں بلکہ رُبا بضم الرّا ہے جس کے معنے ہیں اُچکنے کے۔ گویا یہ فارسی کے مصدر ربودن سے ہے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اعراب تو قرآن پر تھے نہیں بعد میں مولوں نے جو چاہا اعراب لگا دیا۔ غرض قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج اس واسطے ہوا تھا کہ وہ لوگ خدا کو بُرا بھلا کہتے تھے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا کہتے تو آپ کو اس قدر ناگوار نہ ہوتا اسی طرح ہم لوگ بھی خوش ہیں کہ آج کل کے روشن دماغ جو کچھ الزام لگاتے ہیں ہمیں پر لگاتے ہیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں کہتے مگر ان پر اتنا افسوس ہے کہ انھوں نے محض اس وجہ سے کہ کسی قول میں ان کو کوئی حکمت معلوم نہیں ہوئی اُس قول کو قول نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا انکار کر دیا۔ میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ صاحبو! کیا تمہاری عقل تمام حکم کو حاوی ہوگئی ہے ہرگز نہیں۔ جب یہ ہے تو بس تمہاری یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو | نینگیختن علت از کار تو

(زبان تیرے اقرار سے تروتازہ کرنا

اور اگر عقل سے کام لو تو صاف طور سے معلوم ہو جائے کہ علماء سے جو یہ پوچھا جاتا ہے

کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے یہ سراسر غلطی ہے اور علماء کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ شفقت کر کے جواب کی مصیبت میں نہ پڑیں اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کسی جج کے یہاں آپ کا کوئی مقدمہ ہو اور وہ کسی قانون کی رو سے اس مقدمہ کو خارج کر دے تو کیا آپ اس کے بنگلے پر پہونچکر یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ اس قانون کے تقرر میں کیا حکمت ہے اور اگر آپ دریافت کریں تو کیا جج کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کو اس قانون کی حکمت بتلائے اور سمجھا دے کہ یہ وجہ ہے اگر کہئے کہ ضروری ہے تو میں آپ کو قوانین کے متعلق چند سوالات دیتا ہوں ذرا مہربانی فرما کر ان کی حکمت جج صاحب سے لکھوائیے اور اگر کہئے کہ اس کے ذمہ ضروری نہیں کیونکہ وہ عالم قانون ہے واضع قانون نہیں اور حکمت بتلانا واضع قانون کا منصب ہے تو میں کہتا ہوں کہ علماء بھی تو عالم قانون ہیں واضع قانون نہیں پھر ان سے کیوں قوانین شرعیہ کی حکمتیں دریافت کی جاتی ہیں اور ان کا انکار زبردستی کا جواب کیوں سمجھا جاتا ہے اور اگر ان کا انکار زبردستی کا جواب ہے تو کیا وجہ ہے جج صاحب کا انکار زبردستی کا جواب نہیں سمجھا جاتا۔ ایک جج کے جواب کی وقعت کے برابر علمائے امت کے جوابوں کی قدر نہیں اور علماء تو کیا واضع قانون ہوتے خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی واضع و بانی قانون نہیں ہیں صرف عالم و حاکم بالقانون ہیں اور یہیں سے مسلمانوں کی ایک اور غلطی بتلاتا ہوں کہ اکثر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بانی اسلام کے لقب سے ملقب کرتے ہیں حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ یہ لقب عیسائیوں نے تجویز کیا تھا کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتے بلکہ آپ کے احکام کو آپ کا تجویز کردہ کہتے ہیں مگر مسلمانوں نے محض تقلیداً یہ لفظ اختیار کر لیا۔ صاحبو! یاد رکھو بانی اسلام صرف خدا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حالت ہے کہ ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　انچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ان کا کہا ہوا خدا کا کہا ہوا ہے اگرچہ عبداللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے

زبان مبارک سے نکلے)

تو آپ کا ارشاد خدا کا ارشاد ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى (وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے وہ تو وحی من جانب اللہ ہے جو ان کی طرف بھیجی گئی) اور اس سے اجتہاد کی نفی نہیں ہوتی آپ اجتہاد فرماتے تھے مگر وہ بھی جبکہ وحی اس کی تائید کرتی یا وحی اس پر سکوت کرتی حکم میں وحی کے ہو جاتا تھا کہ اس کا منکر بھی ویسا ہی کافر تھا جیسے وحی صریح کا منکر آپ کی شان بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں بانسلی ہو اور وہ اس کو بجا رہا ہو تو ظاہر میں جو کچھ آواز نکلتی ہے بانسلی سے نکلتی ہے ناواقف یہی سمجھتا ہے کہ یہ بانسلی بول رہی ہے لیکن جو جاننے والا ہے وہ جانتا ہے کہ بانسلی کے ایک دوسرا منہ بھی ہے جو بجانے والے کے منہ سے ملا ہے یہ بجانے والے کی آواز ہے جو کہ اس منہ سے ہو کر بانسلی میں آ رہی ہے اور بانسلی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اسی شان کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　یک دہاں پنہانست در لبہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما　　ہائے ہوئے درفگندہ در سما

اور لیجئے شجرۂ وادی ایمن نے انی انا اللہ کہا تھا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ آواز شجرہ کی تھی ہرگز نہیں بولنے والا کوئی دوسرا ہی تھا شجرہ محض مظہر تھا تو جب شجرہ سے کلام خداوندی نے ظہور کیا تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے کلام خداوندی کا ظہور ہو تو کیا تعجب ہے اور جب یہ بات ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بانی اسلام کہاں سے ہوئے۔ مگر ہمارا مذاق کچھ ایسا بگڑا ہے کہ ہم نے اپنے گھر کی سب چیزوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور غیر قوموں کی ہر چیز کو اختیار کر لیا اگرچہ وہ ہم کو اور ہمارے مذہب کو مضر ہی ہو۔ چنانچہ بانی اسلام کا لقب عیسائیوں نے اپنے انکار کی وجہ سے دیا تو ہم نے بھی اس کو اختیار کر لیا۔ علیٰ ہذا معاشرت کہ اس کا ہر ہر پہلو ہم نے غیروں سے لے رکھا ہے وہی بات جو کل علماء کہتے تھے اور اس کو خاطر میں نہ لایا جاتا تھا اگر دوسری

تو وہیں کرنے لگیں اُس کی ضرورت اُن کو بھی محسوس ہونے لگی چنانچہ علماء نے مدت تک نہایت شد و مد کے ساتھ کہا کہ علماء کی ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے کہ وہ صرف خدمت دین کا کام کریں دوسرا کوئی کام ان کے سپرد نہ ہو تو علماء پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ اور سوال کیا جاتا تھا آخر یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے حالانکہ یہ اعتراض واقع میں اپنے اوپر تھا نہ کہ علماء پر ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اپنے اوپر حملہ کرتا ہے اے بھولے مرد اس شیر کی طرح جو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے)

اس کو آپ ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص نے نکاح کیا اور نکاح کرنے کے بعد بیوی کے پاس جاکر کہنے لگا کہ تم نے نکاح تو کیا لیکن یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ بیوی اس کو کیا جواب دے گی یہی تاکہ میاں جب میں تمہارے نکاح میں آگئی تو میری تمام ضروریات کا تکفل خود بخود تمہارے ذمہ ہوگیا۔ اب میں تم سے لے کر کھاؤں گی۔ خلاصہ اس جواب کا یہ ہوا کہ میں چونکہ تمہارے کام میں محبوس ہوں اور محبوس کا نفقہ مَنْ لَهُ الْحَبْسُ پر ہوتا ہے اس لئے میرا نفقہ تم پر ہے۔ تو حضرات مدت تک مولوی خاموش رہے مگر اب آپ صاف صاف کہلاتے ہیں تو سنئے کہ مولوی آپ کی خدمات میں محبوس ہیں تو بقاعدہ مذکورہ اُن کا نفقہ آپ کے ذمہ ہے اور یہ قاعدہ تمدنی بھی ہے شرعی بھی۔ اول شرعی پہلو کو بیان کرتا ہوں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (**اس میں حق ہے ان** فقراء کا جو کہ اللہ کے راستے میں کھڑے ہوئے ہیں زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے حاصل ان کو غنی گمان کرتے ہیں ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے)

دیکھو! لام لِلْفُقَرَآءِ میں استحقاق کا ہے یعنی یہ لوگ اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ اگر نہ دو تو نالش کر کے لے سکتے ہیں گو دنیا میں نالش نہ ہوسکے لیکن خدا تعالیٰ کے ہاں قیامت میں دیکھئے گا کتنی ڈگریاں آپ پر ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے

آیت میں ان لوگوں کو بلفظ فُقَرا ذکر فرمایا ہے۔ فقیر آجکل کے عرف میں ایک ذلیل لفظ ہے مگر یہ ذلت اگر ذلت ہے جیسا کہ تمہارے نامعقول عرف نے سمجھ لیا ہے تو صرف انہیں لوگوں کو نہیں ساری دنیا کے لئے فرماتے ہیں یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ (اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو) تو ہم کو تو فخر ہے کہ ہم خدا کے فقیر ہیں ؎

یا اگر قلاش و گر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں لیکن پھر اس ساقی اور اس پیمانہ میں مست ہیں)

غرض جو لوگ دین کے کاموں میں وقف ہیں ان کا حق آپ کے ذمہ ہے اور علامت وقف ہونے کی یہ ہے کہ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یہ وہی بات ہے جس کو آپ بروئے طعن مولویوں سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپاہج ہو جاتے ہیں صاحبو! بیشک اپاہج ہیں اور کیوں نہ ہوں جب خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ دوسرے کام کریں۔ اگر طاقت سے مراد شرعی طاقت ہے کہ ان کو اجازت نہیں کہ یہ دوسرے کام میں لگیں اس مسئلے کو میں ایک مثال دیکر زیادہ واضح کرتا ہوں۔ ہمارے اطراف میں ایک صاحب نے جو کہ سرکاری ملازم تھے ایک مطبع کر لیا شدہ شدہ حکام کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے نام ایک پروانہ آیا کہ یا تو نوکری سے استعفیٰ دیدو ورنہ مطبع بند کر دو۔ آخر اس حکم کی کیا وجہ۔ وجہ یہی ہے کہ مطبع کرنے کی صورت میں وہ نوکری کا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اب تو غالباً تسکین ہو گئی ہوگی کیونکہ سفید رنگ والوں کا بھی اس پر اتفاق ہے یہ تو شرعی طور پر تھا۔ اب میں تمدنی طور پر اس مسئلے کو بیان کرتا ہوں کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام قوم کا ایک ایک پیسہ دو دو پیسہ جمع کر کے جس کو خزانہ کہا جاتا ہے کیونکہ خزانہ واقع میں اسی مجموعے کا نام ہے جو کہ تمام قوم سے چن چن کر جمع کیا جاتا ہے کسی نے پوچھا تھا کہ بیوی فوج کسے کو کہتے ہیں اس نے کہا کہ میرا میاں تیرا میاں

بس یہی تو حرج ہے۔ تو آپ کا پیسہ اُن کا پیسہ اسی کے مجموعے کا نام خزانہ ہے تو واقع میں خزانہ قوم کی چیز ہے اب سمجھئے کہ اس خزانہ سے جو تنخواہ دی جاتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بادشاہ اور پارلیمنٹ ایسے قومی کاموں میں مصروف ہے کہ وہ دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتی اس لئے قوم کے مجموعہ مال میں سے اس کو نفقہ دیا جاتا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو قومی کام میں مشغول ہو اس کا حصہ قوم کے اموال میں ہے۔ اگر کہا جائے کہ خزانہ تو سلطنت کی ملک ہو گیا تو سمجھو کہ وہ سلطنت مجموعہ افراد قوم کی نائب ہے۔ تو سلطان کے ہاتھ سے جو کچھ پہونچ رہا ہے وہ واقع میں قوم ہی کے ہاتھ سے پہونچ رہا ہے اگرچہ قوم کا ہاتھ ایک حجاب میں دست سلطان کی آڑ میں آگیا ہے۔ اب تو غالباً آپ پورے طور پر اس کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اسی کو علماء مدت تک کہتے رہے۔ مگر چونکہ دوسری قوموں نے اس کو شروع نہ کیا تھا جیسے عیسائیوں کی مشن کہ ان کا خلاصہ یہی ہے تو ہمارے مسلمانوں کو خبر نہ تھی اور سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ اب جبکہ ایک دوسری ہمسایہ قوم اُٹھی اور اس نے جا بجا گروکل قائم کئے اور ایک جماعت کی جماعت کو اپنے مذہب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تو اب بعض بعض مسلمانوں کو جنبش ہوئی کہ جب ہندوؤں نے اس کام کو کیا تو یہ کام بیشک ضروری ہے۔ افسوس ہے تعلیم قرآن محرک نہ ہوئی تعلیم حدیث سے جنبش نہ ہوئی۔ اقوال علماء سے ہوش نہ آیا۔ حرکت ہوئی تو برادران وطن کی مثال دیکھ کر۔ بات بھی دور پہونچ گئی۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب صاحب جج کے اس جواب سے کہ ہم عالم قانون ہیں ہم سے حکمت کا سوال نہیں ہو سکتا تسلی ہو جاتی ہے تو کیا وجہ کہ اقوالِ علماء سے تسلی نہیں ہوتی اور ان کو زبردستی کا جواب کہا جاتا ہے اور ان کو عاجز سمجھا جاتا ہے کیا ایسے منہ سے نکلی ہوئی بات کہ وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے بھی آشنا نہ ہو با وقعت سمجھی جائے اور وارثانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو عجز پر محمول کرنا فساد مذاق نہیں ہے۔ اب علماء کو بھی چاہیئے کہ وہ ضابطہ پر رہیں اور کہدیں

کہ خدا سے پوچھو وہی واضع قانون ہیں۔ بس سُنار کی کھٹ کھٹ سے یہ لوہار کی ایک بہت اچھی ہے۔ غرض یہ معلوم ہو گیا کہ گو قانون کی حکمت نہ بتلائی جائے مگر کوئی قانون ایسا نہیں کہ وہ پُرحکمت نہ ہو اسی لئے میں یہ نظیریں بتلاتا ہوں کہ جہاں حکمت معلوم نہ ہو وہاں یہ نہ سمجھو کہ حکمت نہیں ہے سو وہ نظیر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ (میں آپ سے سوال کرتا ہوں آپ سے ڈرتے رہنے کا اس چیز سے جو حائل بنے ہمارے اور تیری نافرمانی کے درمیان) صاحبو! غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے خوف مانگتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قید لگا دی ہے کہ خوف اس قدر ہو کہ گناہ نہ ہونے دے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ خوف جب حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو موجب تعطل ہو جاتا ہے اور انسان کسی قابل نہیں رہتا۔ دیکھئے ہم لوگ پڑھتے ہیں پڑھاتے ہیں مگر سمجھتے وہی لوگ جن کی شان یہ ہے کہ ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اُوستا

(اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم دیکھتا ہے

کہ ان کے اندر وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم انبیاء بھرے ہیں۔ چنانچہ الحمد للہ میں بھی انہی کی تقلید کر کے کہتا ہوں کہ شدت خوف سے امور معاش اور امور دین سب معطل ہو جاتے ہیں۔ اس میں راز یہ ہے کہ جب کوئی چیز حدِ اعتدال سے بڑھتی ہے تو اول اس کا اثر مباحات پر ہوتا ہے کہ ان کو ترک کراتی ہے پھر جب اور غلبہ ہوتا ہے تو واجبات تک نوبت آتی ہے۔ پھر جب بالکل ہی انتہا ہو جاتی ہے تو مایوسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے خیال ہوتا ہے کہ میں اس قدر گنہگار ایسا شریر ہوں تو میری مغفرت کس طرح ہو سکتی ہے اور جب مغفرت نہیں ہو سکتی تو کیوں بلا وجہ مصیبت بھروں۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کہتے تھے کہ دوزخ تو میرے لئے ضرور ہی لکھی ہے پھر نفس کے حظوظ میں کیوں کسر رکھوں چنانچہ انھوں نے اس قدر ظلم کئے کہ کچھ انتہا ہی نہیں چھوڑی

پس جب اس مقام کا خاصہ تعطل ہے اور وہ غیر محمود ہے تو اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے خدا مجھے اتنا خوف دے کہ وہ گناہوں سے بچائے۔

صاحبو! کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ کسی نے اخلاق حسنہ کی حد بتلائی ہو۔ اور فرماتے ہیں کہ مجھے شوق دے لیکن مِنْ غَيْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ (بغیر کسی نقصان پہونچانے والے کے نقصان کے اور نہ کسی گمراہ کرنے والے فتنے سے) کہ وہ شوق اتنا نہ ہو کہ میرے جسم کو ضرر دے یا میرے لئے موجب فتنہ ہو جائے کیونکہ شوق کا خاصہ یہ ہے کہ اول جب اس کی شدت ہوتی ہے تو اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے کہ سوزش قلب پیدا ہوتی ہے اور اس سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور قویٰ مختل ہونے لگتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات ضروری عبادات ترک ہونے لگتی ہیں۔ دوسرا ضرر اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب شوق بہت بڑھتا ہے تو اس سے ناز کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور ہیبت خداوندی کم ہوجاتی ہے اور گستاخانہ کلمات زبان سے نکلنے لگتے ہیں حالانکہ ناز کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے ؎

ناز را روئے بباید ہمچو ورد   چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا علاج کیا کہ نہ مجھے اس سے ضرر ظاہری ہوا اور ضرر باطنی۔ جب معلوم ہوا کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے تو شفقت کی بھی ایک حد ہونی چاہیئے۔ آجکل حد شکن دو قسم کے لوگ ہیں ایک اہل دنیا کہ وہ بھی حد شکنی کرتے ہیں اور دوسرے اہل دین کہ وہ بھی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اہل دنیا کی حد شکنی تو یہ ہے کہ وہ قوم پر ایسی شفقت کرتے ہیں کہ اس میں دین کا بھی ضرر ہوجاتا ہے بلکہ اکثروں کو تو نصب محض قوم ہوگئی ہے وہ اگر ہمدردی بھی کرتے ہیں تو اس لئے کہ یہ ہماری قوم ہے اس سے ہمدردی کرنا ضروری ہے اور مذہب پر بھی قائم ہیں تو محض اس لئے کہ دنیا کی اقوام ترقی کررہی ہیں تو ہم کو بھی ترقی کرنی چاہیئے۔ اور ترقی بدون اتفاق کے ممکن نہیں اور اتفاق بدون اتحاد مذہب کے ہو نہیں سکتا تو ہم کو مجبوراً ایک مذہب پر رہنا چاہیئے بلکہ دوسروں کو اگر تبلیغ اسلام کرتے

ہیں تو وہ بھی اس لئے کہ اگر یہ ہمارے مذہب میں آجائیں گے تو ہماری تعداد قومی بڑھ جائے گی اور ہم دوسری قوموں سے آگے نکل جائیں گے تو گویا ان کے نزدیک اسلام مطلوب لغیرہ ہے فی نفسہ وہ کوئی قابل طلب چیز نہیں اگر اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ترقی کا ممکن الحصول ہو تو ان کے نزدیک اس کو چھوڑ دینا بھی گویا کچھ مضر نہیں ہے ورنہ اگر ان کے نزدیک مذہب کوئی قابل وقعت چیز ہے تو کیا وجہ کہ اس کے ایک جزء کو تو لیا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دیا گیا مطلوب کا ہر جزء مطلوب نہیں ہوتا؟ جب ہوتا ہے تو کیا وجہ کہ حرمت سود کو چھوڑا نماز کو چھوڑا صرف ایک اتفاق اور ہمدردی کو لے لیا اکثر دیکھا گیا ہے کہ قومی چندوں میں ایک ایک روپیہ کو نیلام کیا جاتا ہے اور وہ چارسو پانسو کو فروخت ہوتا ہے حالانکہ یہ کھلا ہوا سود ہے صرف ایک قوم کا لفظ یاد کر لیا ہے۔ بس صاحبو! غور تو کرو قوم کی خدمت جو محمود ہے آخر کس لئے اس لئے کہ خدا کا حکم ہے کہ قوم کی خدمت کرو تو جب خدا کو ناراض کر کے تم نے قوم کی خدمت کی تو وہ خدمت محمود کہاں رہی، جب خدا ہی سے سلسلہ توڑ دیا تو قوم سے جوڑ کر کیا فلاح ہوگی ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　　فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

جب خدا سے بیگانگی ہوگئی تو کس کی قوم۔ صاحبو! حضرت نوح علیہ السلام سے زیادہ تو خیر اہ قوم نہیں بن سکتے پھر دیکھ لیجئے انھوں نے اپنی قوم کے ساتھ جو خدا کی نافرمان تھی کیا کیا پھر مرض یہ ہے کہ ان کی فلاح کی صورتیں جو سوچی جاتی ہیں اُن کے مدار کے متعلق آجکل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کالانعام کی اگر ان ہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انھوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی، کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا اسی لئے کہ وہ

قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔ آجکل علماء پر بھی یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے صاحبو! علماء کب اتفاق سے روکتے ہیں۔ لیکن اتفاق کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ علماء اپنے مرکز سے ہٹیں اور آپ کے مرکز پر آجائیں سو یہ اتفاق تو یقیناً محمود نہیں ہاں دوسری صورت اتفاق کی کہ علماء اپنے مرکز پر رہیں اور قوم اپنی وہمی ترقیوں اور مضر خیالوں کو چھوڑ کر ان کے مرکز پر آجائیں بیشک محمود ہے۔ اور اس طرح اتفاق ہونا چاہئے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قوم کو جو متفق بنایا جائے گا تو اس اتفاق کے لئے آخر کوئی معیار بھی ہوگا یا نہیں کہ قوم کو اس معیار کی طرف بلایا جائے گا' ظاہر ہے کہ ضرور ہوگا۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ وہ معیار کیا ہے سو سب جانتے ہیں کہ وہ معیار حق ہے یعنی حق کی طرف قوم کو بلایا جائے گا کہ یہی ایک مامون اور صاف وہموار شاہراہ ہے جس میں نشیب وفراز کا نام نہیں۔ اس معیار سے الگ جتنا اتفاق پکارتے ہو اسی قدر اتفاق بڑھتا ہے اور جب معیار متعین ہو گیا تو دیکھو کہ کون اس معیار پر چل رہا ہے اور کون اس سے علیحدہ ہے جو شخص صحیح معیار پر ہو اس کو مت کہو کہ تو اتفاق کر بلکہ جو اس معیار سے ہٹ گیا ہے اس کو معیار پر لانے کی کوشش کرو اور اس کو اتفاق کی رائے دو۔ دیکھو اگر ایک قوم ٹھکانے پر بیٹھی ہے اور ایک دوسری قوم بھٹکتی پھرتی ہو تو کیا تم پہلی جماعت کو مجبور کرو گے کہ ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو کر اُس بھٹکی ہوئی جماعت کے ساتھ ہولے یا اُس بھٹکی ہوئی جماعت کو ٹھکانے پر لانے کی کوشش کرو گے۔ پس مولویوں کو اتفاق کی ترغیب دینا اور ان پر نا اتفاقی کا الزام لگانا عجیب بات ہے۔ صاحبو! اتفاق تم پیدا کرو کہ جس صحیح مرکز پر وہ ہیں تم بھی اس پر آجاؤ بس اتفاق کی حقیقت یہ ہے اور جس کو آپ حضرات اتفاق کہہ رہے ہیں وہ محض لفظ ہی ہے معنی نہیں جیسا مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست
میم واؤ میم ونون تشریف نیست

یہ الفاظ تو صرف پہچان ظاہری کے لئے ہیں ورنہ ان میں کیا رکھا ہے نرے الفاظ کا تو وہی

حال ہے کہ جیسے ایک بنئے کا کارکن بہی کھاتے میں حساب جوڑ رہا تھا کہ پندرہ کا پانچ ہاتھ لگا ایک اور ۲۵ کا پانچ ہاتھ ہاتھ لگے دو وغیرہ وغیرہ۔ ایک فقیر بھی وہاں بیٹھا تھا اور ان سب حاصلوں کو ساتھ ساتھ جوڑتا جاتا تھا شام تک سیکڑوں تک نوبت پہونچ گئی۔ اٹھتے وقت سوال کیا اس نے ناداری کا عذر کیا سائل نے کہا کہ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ ابھی تو میرے سامنے تو نے سیکڑوں کے حاصل ہونے کا اقرار کیا اُس نے کہا بھائی وہ صرف کاغذ میں حاصل ہوئے ہیں واقع میں حاصل نہیں ہوئے جب الفاظ خلاف معنے ہوں تو وہی مثل ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل واندروں قہر خدائے عزّ وجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید وز درونت ننگ میدارد یزید

(اوپر سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کافر کی قبر زیورات سے لدی ہوئی ہے اور اندر خدائے تعالیٰ کا غضب بھرا ہوا ہے۔ باہر سے تو یزید کو برا بھلا کہتا ہے اور تیرا باطن یزید کو رسوا کرنے والا ہے)

تو جہاں نرے الفاظ ہوں وہاں محض ہاتھ لگنے سے کیا جمع ہوتی ہے تو یہی آجکل کے اتفاق کے معنے رہ گئے ہیں تو ایک شفقت تو یہ ہے کہ غل شور مچا کر دنیا کا بھلا کر لو چاہے دین رہے یا برباد ہو بلکہ اگر مولوی کچھ کہتے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ یہ مذہبی لوگ ہیں یوں ہی کہا کرتے ہیں ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مذہب کی کچھ وقعت نہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا اس سے معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں مذہب کی وقعت کس قدر ہے۔ میرے ایک دوست لکھتے ہیں کہ آج یہاں چند عقلاء جمع ہوئے اور اس میں گفتگو ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب کیا ہے۔ بہت سی گفتگو کے بعد اخیر فیصلہ یہ ہوا کہ اصلی سبب تنزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہ چھوڑا جائے گا اس وقت تک ترقی ناممکن ہے لیکن مجبوری ہے کہ مذہبی ضرورت روکتی ہے۔ صاحبو! کیا اس تجویز کے بعد یہ لوگ مسلمان رہے افسوس اسلام کو خار راہ بتایا جائے اور طرہ یہ کہ پھر بھی اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ صاحبو! کیا یہ لوگ اسلامی

خیر خواہ ہیں ہاں اسلام بمعنے قوم اگر ہو تو ضرور اسلامی خیر خواہ ہیں اور اسی کو آجکل شفقت سمجھا جاتا ہے مگر یہ شفقت کا ہیضہ ہے کہ ایک بچے کو اس کی ضد پر برابر کھلاتے ہی چلے جاؤ آخر نتیجہ کیا ہوگا یہی کہ اس کا پیٹ پھٹ جائے گا اور مر جائے گا۔ پس یہ خیر خواہی اسلام سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی مگر خود اسلام ہی کی اُن کے قلب میں کچھ وقعت نہیں۔ ایک قصہ اور یاد آیا کہ دیوبند میں ایک مسلمان جن پر اس نئی تہذیب کا اثر پڑا تھا کہنے لگے کہ قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک ناصح نے ان سے کہا کہ میاں قیامت کے قائل ہونے میں کیا حرج ہے اگر بالفرض تمہارے خیال کے مطابق قیامت نہ ہوئی اور تم اس کے وجود کے معتقد رہے تو تمہارے اس غلط عقیدے کا تم پر کوئی ضرر نہ ہوگا کیونکہ باز پرس ہی کرنے والا نہیں اور اگر ہمارے خیال کے مطابق قیامت ہوئی اور تم اس کے منکر ہوئے تو یاد رکھنا بہت جوتیاں لگیں گی۔ یہ جواب اصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جو انھوں نے کسی دہری کو دیا تھا اس کو کسی نے نظم بھی کیا ہے ؎

قال المنجم والطبیب کلاھما   لا تحشر الاجساد قلت الیکما

ان صح قولکما فلست بخاسر   او صح قولی فالخسار علیکما

(نجومی اور طبیب دونوں نے کہا کہ اجسام کو جمع نہ کیا جائیگا (مراد قیامت) میں نے کہا یہ بات تمہاری ہی طرف۔ اگر تمہارا قول صحیح ہے تو میرا کون نقصان اگر میرا قول صحیح ہو گیا تو تمہارا ہی گھاٹا (نقصان) ہے۔)

تو ان روشن خیال صاحب نے یہ کہا کہ یہ تو اس کے سامنے کہیئے کہ جس کو کچھ احتمال ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ قیامت کوئی چیز نہیں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ حضرات ایسے بہت سے لوگ اس وقت ہم مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کی بدولت پیدا ہو گئے ہیں گو وہ زبان سے صاف نہیں انکار کرتے مگر دل میں محض انکار ہے۔ میرٹھ میں ایک عہدہ دار مسلمان کے پاس عید کے دن بہت سے مسلمان ملنے گئے تو وہ عہدہ دار صاحب اُن لوگوں سے کہتے ہیں آج آپ لوگوں کا عید ہے۔ افسوس ان کو اسلامی عید کا اپنی طرف منسوب ہونا بھی ناگوار ہوا اور لیجئے ایک مسلمان کلکٹر ہو گئے تھے ان کو اسلام سے اس قدر وحشت

ہوئی کہ اپنے اصلی نام کو بھی باقی نہ رکھا اس کو کاٹ چھانٹ کرکے انگریزی ناموں کے طرز پر بنایا اور لطف یہ ہے کہ پھر اپنے مسلمان بھی کہتے تھے۔

صاحبو! یہ ترقی اسلام کی ترقی تو ہرگز نہیں۔ اسلام ایسی ترقیوں سے غنی اور بیزار ہے بلکہ سچ پوچھو تو اسلام کی ترقی تو تمہارے صوفی وضع بننے سے بھی نہیں ہوتی۔ جب تک ایمان دل میں پیوست نہ ہو جائے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (گواہی دینا اس بات کی کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) اور شہادت میں بشہادت آیۃ اِذَا جَآءَ الْمُنٰفِقُوْنَ الخ (جبکہ آتے ہیں آپ کے پاس منافقین) توافق قلب و لسان ضروری ہے تو ترقی شہادتین کی یہ ہوئی کہ وہ دل میں رچ جائے اور یہ حال ہو جائے

قال را بگذار مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

(قیل وقال (اعتراض وجواب) کو چھوڑ صاحب حال (بزرگ) بنجا اور بزرگ کامل کے سامنے پامال (اپنے کو عاجز کردے) ہو جا)

دوسرے حکیم کہتے ہیں ؎

علم رسمی سربسر قیل است وقال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

(رسمی علم سراسر قیل وقال ہے اُس سے نہ تو کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا حال پیدا ہوتا ہے)

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی ز دل بزدایدت

(علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھلائے اور تیرے دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کردے)

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت در دلت افزوں کند

(یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف و عاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کردے)

تو ندانی جز یجوز و لا یجوز خود نہ دانی تو کہ حُوری یا عجوز

(تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی عورت)

ایها القوم الذی فی المدرسہ　　کل ما حصلتموہ وسوسہ

(اے وہ لوگو جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ بھی تم نے حاصل کیا ہے وہ محض وسوسہ ہے)

علم نبود غیر علم عاشقی　　ما بقی تلبیس ابلیس شقی

(سوائے علم عاشقی کے اور کوئی علم کارآمد نہیں　باقی تمام علوم ابلیس کی تلبیس ہے)

یہ ہے وہ علم جو قلب کے اندر پہونچے پس ترقی اسلام کی یہ ہے نہ کہ مال و دولت کی ترقی بلکہ اگر ساری دنیا کے مسلمان نادار ہو جائیں اور لنگلے زیر لنگلے بالا کی حالت ہو جائے تب بھی اسلام کی ترقی باقی ہے کیونکہ اسلام فنٹ اور چوکڑی کا نام نہیں تو یہ جتنی ترقی ہو رہی ہے اسلام کی ترقی نہیں ہے البتہ اہل اللہ کا اسلام اب بھی ترقی پر ہے گو ان کے پاس ظاہری سامان نہ ہو اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی انکی یہ حالت ہے

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(شراب خانہ کا مجاور ہوں لیکن مستی کے وقت دیکھ کہ فلک پر ناز کرتا ہوں اور سیارو پر حکومت کرتا ہوں)

اور کہتے ہیں کہ ؎

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم　　شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(عشق حقیقی کے پر چلے کو خیریت جانو کیونکہ یہ قوم بادشاہ ہیں بغیر کسی سہارا کے ہوں اور بغیر تاج کے بادشاہ ہیں)

آخر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کیا بات تھی حالانکہ وہ حضرات ٹوٹی ہوئی چٹائیوں پر بلکہ کنکریوں پر بیٹھے ہوئے سلطنت فارس و روم کا فیصلہ فرماتے تھے مگر کوئی مال و دولت ان کے پاس نہ تھی اور نہ اس کی ہوس تھی اسی لئے ان حضرات کو ثروت کے ملنے سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ حضرت حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آپ روتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا افسوس ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں پلّہ داری کرتے تھے اور آج اس قدر مال و دولت جمع ہے کہ بجز مٹی میں دفن کرنے

کے اور کہیں رکھنے کی جگہ نہیں۔ حضرات اگر وہ اصلی ترقی آپ کو نصیب ہو جائے تو واللہ اس ظاہری نمود کو آپ ہیچ در ہیچ سمجھنے لگیں آپ کو معلوم ہوا کہ ان حضرات کے دل میں دنیا کی کیا قدر تھی۔ آپ کی ساری عمر دنیا پرستی میں گذری ہے اس لئے آپ کو کچھ خبر نہیں ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را — چہ شناسی زبان مرغاں را

(تو نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا۔ تو پرندوں کی بولی کیسے پہچانیگا)

ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر اتفاقاً تم شکار میں نکل جاؤ اور تن تنہا رہ جاؤ اور اس وقت تم کو شدت سے پیاس لگے کہ تمہارا دم نکلنے لگے اس وقت اگر کوئی شخص تمہارے پاس ایک پیالہ پانی لائے اور نصف سلطنت اس کی قیمت بتلائے تو تم اس کو خرید لوگے کہ نہیں اس نے کہا میں ضرور خرید لونگا پھر ان بزرگ نے کہا کہ اور اتفاق سے تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور کسی طرح ادرار نہ ہو، اور ایک شخص اس شرط پر کہ بقیہ نصف سلطنت اس کو دیدو پیشاب اُتار دینے کا وعدہ کرے تو تم کیا کروگے۔ اس نے کہا کہ میں بقیہ نصف بھی اس کو دیدوں تو اُن بزرگ نے کہا کہ آپ کی سلطنت کی یہ قیمت ہے ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب جس کے لئے آپ اس قدر منہمک ہیں تو اُن حضرات کو دنیا کا یہ نرخ معلوم ہے اِسی لئے صحابہؓ نے توسیع سلطنت پر بھی، دنیا کا کام نہیں کیا وہ کام کیا جس کی خبر حق تعالیٰ نے دی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط (وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر حکومت دیدیں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیک کام کرنے کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ وقت تھے مگر کھانا کپڑا جو تھا معمولی سے بھی کم تھا کیونکہ وہ حضرات جانتے تھے کہ اصل چیز دوسری ہے ہمارے بعضے بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے لڑتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما نے خلافت لے لی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دی۔ میں کہتا ہوں کہ شیخین رضی اللہ عنہما کے

لئے دعا کیجئے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اول ہی سے خلافت دیدی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت و تعب دین کے لئے اور قلت دنیا کے لئے معلوم ہو چکی تو ان کو کس قدر مدید کلفت ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی اُن حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو تکلیف نہ پہنچنے دی اور جو کچھ ان حضرات میں شکررنجی ہوئی اول تو بہت واقعے غلط مشہور ہیں دوسرے جب اتحاد و دوستی ہوتی ہے تو شکررنجی بھی ہو ہی جاتی ہے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو خادموں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے پوچھا کہ تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے کہ نہیں انھوں نے عرض کیا کہ حضور کبھی کبھی ہو جاتی ہے مگر پھر اتحاد ہو جاتا ہے، فرمایا کہ تمہارا اتحاد پائدار رہے۔ ذوق کہتا ہے ناسہ

بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے   بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے

ایک عربی حکیم لکھتا ہے وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ الْعِتَابُ (اور باقی رہے گی محبت جب تک عتاب باقی رہے گا) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دوستی جب باقی رہتی ہے کہ دل میں غبار باقی نہ رہے اور اگر عتاب نہ کیا جائے اور بات کو دل میں رکھا جائے تو تمام عمر بھی دل سے کدورت نہ نکلے گی اور اگر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو پھر دل صاف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو کہ سب سے زیادہ محب اور محبوب تھیں وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہارے خوشی اور ناراضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی ہو تو قسم میں لَا وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ (نہیں ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم) کہتی ہو اور جب خوش ہوتی ہو تو لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) (نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم) کہتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتی ہیں وَهَلْ اَهْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ (نہیں چھوڑتی میں لیکن آپ کے نام کو) کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ ہی بسے ہوتے ہیں تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوئی بھی ہو تو باہم ایک کا دوسرے پر ناز ہے ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔ کانپور میں ایک

صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میں اُن سے ملا انھوں نے وہی تذکرہ چھیڑا اور حدیث پڑھی من سبّ اصحابی فقد سبّنی ومن سبّنی فقد سبّ اللہ (جس نے صحابہ کو گالی دی پس تحقیق کہ اس نے مجھ کو گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی پس تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی) اور کہا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہدیتے تھے تو وہ اس حدیث کے مصداق ہو گئے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ نے غور نہیں کیا اس حدیث کے یہ معنی نہیں جو آپ نے سمجھے بلکہ اس کے معنے دوسرے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا تو اب بتلایئے کہ یہ وعید کس شخص کے لئے ہے آیا اپنی دوسری اولاد کے لئے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو اُن کے ساتھ بھی یہی کیا جائیگا یا غیروں اور اجانب کے لئے ہے۔ ظاہر ہے کہ اجانب کے لئے یہ وعید ہے پس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو بُرا کہے اس کے لئے یہ حکم ہے اس کو سُن کر وہ کہنے لگے کہ یہ ذہانت کی باتیں ہیں میں نے کہا کہ صاحب پھر کیا غباوت کی باتیں کہوں اس پر وہ شرمندہ سے ہو گئے۔ تو مجھے بہت حجاب ہوا اسی لئے میں نے اپنا یہ معمول کر لیا ہے کہ اگر کوئی بڑا آدمی مجھے بلاتا ہے تو اول یہ شرط کر لیتا ہوں کہ خلوت میں گفتگو کروں گا کیونکہ جلوت میں گفتگو کرنے سے اکثر مخاطب لاجواب ہو کر شرمندہ ہو جاتا ہے اور میں اس کو باوجاہت لوگوں کے لئے پسند نہیں کرتا۔ آخر میں نے ان کی شرم یوں اتاری کہ میں نے ان سے کہا کہ میں نے سُنا ہے آپ عامل ہیں مجھ کو نیند کم آتی ہے اگر آپ پانی پڑھ کر بھیج دیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ چنانچہ وہ اس سے خوش ہوئے اور تشتری لکھدینے کا وعدہ کیا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرفداری کر کے دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بُرا نہ کہنا چاہیئے۔ اور صاحبو! اس وقت کی سلطنت ہی کیا تھی جس پر کوئی لالچ کرتا۔ اس وقت کی سلطنت یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوپہر کے وقت گرمی میں چلے جارہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دیکھا پوچھا کہ امیر المومنین کہاں چلے آپ نے فرمایا کہ

بیت المال کا ایک اونٹ غائب ہوگیا ہے اس کی تلاش کو جارہا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرت آپ نے اس گرمی میں کیوں تکلیف کی کسی کو حکم دیا ہوتا کہ وہ تلاش کرلیتا آپ نے فرمایا کہ اے عثمان میدان قیامت کی گرمی اس گرمی سے اشد ہے غرض کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ ترقی پر نہ تھے یہ حضرات اس ترقی پر تھے کہ ساری دنیا جانتی ہے بلکہ مانتی ہے حالانکہ نہ ان کے پاس فنٹ تھی نہ سامان آرائش اور فنٹ تو کیا ہوتی واقعہ یرموک میں جو کہ ایک عظیم الشان جنگ تھی۔ جب ایک شخص اونٹنی پر سوار فتح کی خوشخبری لے کر آیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو کہ روزانہ انتظار خبریں باہر جاکر گھنٹوں کھڑے رہتے تھے جنگل میں ملاقات ہوئی آپ نے اس سے پوچھا کہ تو کہاں سے آتا ہے معلوم ہوا یرموک سے آپ نے جنگ کا حال پوچھا وہ چونکہ پہچانتا نہ تھا اس لئے کہ کوئی نشان خلافت نہ تھا کوئی تاج نہ تھا اس نے ان کی طرف التفات نہیں کیا اور اونٹنی دوڑاتے ہوئے چلا جاتا تھا اور یہ اونٹنی کے ساتھ دوڑے جاتے تھے۔ جب آبادی کی طرف قریب آئے تو لوگوں نے پہچانا اور امیر المومنین کو سلام کیا اس وقت اس کو معلوم ہوا تو اس نے بہت معذرت کی آپ نے فرمایا کہ میں نے جو قدم بھی اٹھایا ہے ثواب کے لئے اٹھایا ہے تجھے عذر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت تھی ایک ہماری حالت ہے کہ جو قدم اٹھتا ہے خود بینی اور خودداری کے لئے۔ ایک صاحب معزز مجھ سے فرمانے لگے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا لڑکا ایسا ہو جائے کہ پندرہ روپے میں گذر کرلیا کرے اور حالت لڑکے کی یہ تھی کہ پندرہ سے زیادہ کا اس کا ایک کوٹ ہی تھا' افسوس ہے کہ ہم کو دوسری قوموں کی تقلید نے برباد کیا ہم تقلید کرتے ہیں اور وہ بھی بری باتوں کی انھوں نے ہماری تقلید کرکے اپنا گھر آباد کرلیا اور ہم ان کی تقلید کرکے اپنی رہی سہی حالت بھی برباد کئے دیتے ہیں دعوےٰ ہے قومی ہمدردی کا اور اجنبیت یہ ہے کہ شہر میں رہنا بھی گوارا نہیں الگ جنگل میں جاکر رہتے ہیں۔ صاحبو! کیا ترقی اس پر موقوف ہے کہ قوم کا قرب بھی چھوڑ دیا جائے۔ دیکھئے رئیسہ بھوپال والی سلطنت ہیں آجکل کے ترقی یافتہ لوگوں سے تو بہرصورت بہت زیادہ ترقی پر ہیں مگر معتبر طور پر معلوم ہوا ہے کہ اگر کوئی

غریب رعایا میں سے شادی وغیرہ میں ان کی دعوت کرتا ہے تو قبول کرتی ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ہمارے روشن خیال سب سے زیادہ دعوت کو ذلیل سمجھتے ہیں مجھے ایک لکھنؤ کی حکایت یاد آئی، ایک مولوی صاحب کی دعوت ایک سقے نے کی مولوی صاحب اس کے گھر جارہے تھے کہ ایک رئیس صاحب ملے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں جارہے ہو، مولوی صاحب نے بیان کیا کہ اس سقے نے دعوت کی ہے اس کے ہاں جارہا ہوں تو رئیس صاحب فرمانے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے تو لٹیا ہی ڈبودی کیا سقوں کی دعوت بھی کھانے لگے۔ مولوی صاحب نے یہ سن کر سقے سے فرمایا کہ بھائی! میں تو دعوت میں نہیں جاتا یہ رئیس صاحب اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔ البتہ اس شرط سے چلتا ہوں کہ ان رئیس صاحب کو بھی لے چل۔ چنانچہ اس سقے نے ان کی منت کرنی شروع کی اب تو رئیس صاحب بہت گھبرائے اول تو عذر کیا مگر جب اس نے بہت ہی لجاجت کی اور دو چار ہم مرتبہ آدمیوں نے بھی جو کہ اتفاقاً جمع ہوگئے تھے ملامت کی کہ ایک غریب آدمی اس قدر لجاجت کرتا ہے اور تم مانتے نہیں عجب سنگدل ہو تو مجبوراً اُن رئیس صاحب کو ماننا پڑا آخر اس کے گھر گئے، وہاں جاکر دیکھا کہ تمام گھر میں فرش لگا ہوا ہے اور سقے دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں کوئی ہاتھ چومتا ہے کوئی پاؤں پکڑتا ہے آخر کھانا کھلایا گیا اور خود غلاموں کی طرح کھڑے رہے، جب وہاں سے فارغ ہوکر آئے تو کہا کہ حضرت واقعی میں غلطی پر تھا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ عزت وحرمت غرباء کے ساتھ رہنے میں ہے، میں نے آج تک یہ تعظیم نہیں دیکھی تھی جو ان لوگوں نے کی۔ سچ یہ ہے کہ محبت کے لوگ یہی ہیں، رؤسا کو جو کچھ عزت نصیب ہوتی ہے اپنے نوکروں یا ماتحتوں میں حق یہ ہے کہ ان لوگوں کی تعظیم صرف ظاہری تعظیم خوف کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسے بھیڑیئے کی تعظیم کی جاتی ہے۔

غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ معاشرت تھی اور وہی حقیقی ترقی تھی اگر دنیا میں اس کی ترقی ہو تو اسلام کو بیشک ترقی ہے لیکن اگر ساری دنیا کے پاس مال وجاہ ہو جائے تو اسلام کی کچھ بھی ترقی نہیں یہ تو اہل دنیا کی شفقت کے متعلق بیان تھا۔

اب ایک شفقت اہلِ دین کی ہے کہ ان لوگوں کو جوش اٹھتا ہے کہ جس طرح ہوسکے

قوم کی اصلاح ہو جائے اس کوشش میں مختلف طرح کی مشکلات اُن کو پیش آتی ہیں اور ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جو کچھ مدارس یا انجمنیں قائم کرتے ہیں ان سے مقصود صرف اپنا نفع ہوتا ہے کہ ہم کو خوب روپیہ ملے یا ہمارا خوب نام ہو یہ لوگ تو مصلحین کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں دوسرے وہ لوگ ہیں کہ واقعی وہ اصلاح چاہتے ہیں اور ان کی سچی تمنا یہ ہے کہ قوم کی حالت درست ہو جائے مگر اُن کو شفقت میں غلو ہو گیا ہے۔ اس میں اول تو جسمانی تکلیف ہوتی ہے۔ دوسرے بعض اوقات دین کی بھی خرابی ہو جاتی ہے کہ اس کے اہتمام میں بعض ناجائز طریقوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے بہت پیچھے پڑنے سے عداوت ہو جاتی ہے یاد رکھو لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا خدا تعالیٰ کے دربار میں وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی۔ مجھے تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یاد آتا ہے اگر ان کے پاس کوئی فہرست مسجد کے چندہ وغیرہ کی لیکر آتا اور دستخط کرنے کی درخواست کرتا تو فرماتے کہ میاں کیوں لوگوں کے پیچھے پڑے ہو، مسجد یا مدرسہ بنانا ہی ہے تو کچی دیواریں اٹھا کر بنالو، اگر وہ کہتا کہ حضرت کچی دیواریں گر جائیں گی تو فرماتے کہ میاں پکی بھی آخر گریں گی تو جب گر جائیں گی کوئی دوسرا بنا دے گا تم قیامت تک کا بندوبست کرنے کی فکر میں کیوں پڑے بات یہ ہے کہ ؎

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ! برنتابد کوہ را یک برگ کاہ
چارپا را قدر طاقت بار نہ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(تمنا کر لیکن اپنے مرتبہ کے موافق کر اس لئے کہ پہاڑ کو ایک گھاس کا پتہ نہیں اٹھا سکتا۔ چوپایوں پر ان کی طاقت کے بقدر بوجھ رکھ۔ کمزوروں پر ان کی ہمت کے بقدر کام رکھ یعنی کام سپرد کر)

تو بوجھ اسی قدر اٹھاؤ کہ تم سے اُٹھ سکے۔ ترمذی شریف میں حدیث ہے لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ (کسی مومن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے) کہ مومن کو چاہئے کہ اپنے کو ذلیل نہ کرے۔ اگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کی

تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ فرمالیتے تو آجکل کے مدعیان اجتہاد اس کے یہ معنی سمجھتے کہ مومن کو پھٹا کپڑا نہ پہننا چاہیئے بلکہ خوب بن سنور کر عمدہ پوشاک میں رہنا چاہیئے وَمِثْلُ ذٰلِكَ لیکن صحابہؓ نے پوچھ کر حل کر دیا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا یَذِلُّ نَفْسَہٗ (انھوں (صحابہؓ) نے کہا اور اپنے نفس کی ذلت کیا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفسیر میں فرمایا اَنْ یَتَحَمَّلَ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا یُطِیْقُہٗ (ایسی مصیبت کہ جس کے برداشت کرنے کی وہ اپنے اندر طاقت نہیں رکھتا) اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ تعلیم اسلامی ذلت اختیار کرنے سے مانع ہے مگر آج کل روشن خیالوں نے ذلت کو مولویت کا اثر سمجھ لیا ہے، حالانکہ مولویوں سے زیادہ ہی لوگ اس ذلت کو اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے وہاں مثل دیگر قصبات کے یہ رسم ہے کہ شادی میں دلہن کے میانہ پر بکھیر ہوتی ہے اس بکھیر کو بھنگی اٹھاتے ہیں، چند روز ہوئے کہ وہاں شادی ہوئی اور اس موقعہ پر ایک دلدادہ تہذیب جدید نے ان بھنگیوں کے ساتھ مل کر بکھیر کے پیسے جمع کئے۔ مشکل سے شاید تین چار آنے پیسے ان کے ہاتھ لگے۔ کیوں صاحب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے چندے کے واسطے یہاں تک گوارا کر لیا جاتا ہے تو اگر کوئی مولوی اسلامی مدارس کے لئے چندہ جمع کرے تو اس کو بھک منگا کیوں کہا جاتا ہے اور اس پر ذلت کا اطلاق کیوں کیا جاتا ہے۔ آخر جب نماز کا وقت آیا اور وہ نماز پڑھنے کے لئے آیا تو ایک ظریف نے اُن کی خبر لی کہا کہ تم ہماری جماعت سے الگ ہو جاؤ کیونکہ تم نجس ہو اور انھوں نے کہا کہ میرے نجس ہونے کی وجہ۔ اُن ظریف نے جواب دیا کہ چونکہ تم بھنگیوں کے ساتھ ملکر پیسے لوٹ رہے تھے اور اس وقت تم کو بھی پسینہ آرہا تھا اور اُن کو بھی اور ان کے ناپاک بدن سے تمہارا بدن مس کرتا تھا مگر وہ ایسا باہمت تھا کہ اس کو اس سے کچھ بھی اثر نہ ہوا پھر جب نیگ لینے کا وقت آیا تو آپ وہاں بھی جا موجود ہوئے ایک روپیہ آپ کو بھی ملا۔ الحمد للہ کسی مولوی نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی مگر چونکہ ان بیچاروں کی صورت غریبانہ صورت ہے وہ ایسی حرکت نہ کرنے پر بھی بھک منگے ہیں اور ان کی صورت چونکہ معزز ہے یہ بھیک مانگ کر بھی معزز رہے۔ مولویوں کے صدہا واعظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں

چندہ کا نام بھی نہیں ہوتا اور ان صاحبوں کا کوئی لکچر بھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں چندہ کی ترغیب نہ ہو۔ سید اکبر حسین صاحب جج نے خوب تضمین فرمائی ؎

در پسِ ہر لکچر آخر چندہ ایست　　　مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر لکچر کے پیچھے چندہ ہے انجام کا دیکھنے والا آدمی خدا مبارک بندہ ہے)

دوسرے یہ کہ بعضے مولوی اگر چندہ لیتے بھی ہیں تو دباؤ ڈال کر نہیں لیتے کیونکہ دباؤ ڈال کر وہ لے سکتا ہے کہ جس کا کچھ اثر ہو ان بیچاروں کا اثر ہی کیا ہے کہ ان کے دباؤ کا اثر پڑے بر خلاف ان حضرات کے کہ دباؤ ڈال کر ظلم کر کے وصول کرتے ہیں غرض میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ تم کو اس حالت تک صرف تمہاری ضرورت سے زیادہ شفقت علی القوم لائی ہے۔ پس تم اسی قدر شفقت کرو کہ جو تم کو تمہارے دین میں مضر نہ ہو بعضے اس لئے ناجائز کوشش کرتے ہیں کہ بدون اس کے کام نہیں چلتا اسی طرح کام بند ہو جائے گا مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کو کیا فکر قیامت میں اگر بازپرس ہوگی کہہ دینا کہ میں نے لوگوں کو ترغیب دی تھی مگر لوگوں نے نہ مانا' میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس جواب کے بعد تم پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ ہم نے اپنے وطن میں ایک مدرسہ کر رکھا ہے مگر اس انداز سے کہ نہ کسی سے چندہ مانگا جاتا ہے نہ کسی کو ترغیب دی جاتی ہے، طلبہ سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر توکل کر کے رہیں تو رہیں ہم ذمہ داری نہیں کرتے۔ خدا تعالےٰ نے دیا تو ہم دیدیں گے مگر باوجود اس استغناء کے اچھی خاصی طرح مدرسہ چل رہا ہے بلکہ یہاں تک انتظام کیا کہ طلبہ کی دعوت بھی جس میں کسی کے گھر جانا پڑے قبول نہیں کی جاتی۔ اگرچہ دعوت کا کھانا لینا بھیک نہیں ہے مگر چونکہ آجکل طلبہ کی دعوت اکثر لوگ اُن کو ذلیل سمجھ کر کرتے ہیں اس لئے ہم نے اس کو بھی قبول نہیں کیا اور میں دینے والوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ طلبہ کو کچھ دیں تو عزت سے دینا چاہیئے وہ آپ کے مہمان ہیں دیکھئے اگر آپ کا کوئی مہمان آکر مسجد میں ٹھہرے اور کھانے کے وقت گھر جانے سے انکار کرے تو آپ کیا کریں گے آیا اس مہمان سے کہیں گے کہ دروازے پر جا کر کھانا لے آؤ یا مسجد میں جا کر خود اس کو کھانا دیں گے پھر طلبہ کے ساتھ یہ کیوں نہیں کیا جاتا اور جب تم نے خود

ان کو دروازے پر بلایا تو گویا اپنے مہمانوں کو تم نے خود ذلیل کیا پھر کس منہ سے خود ہی ان کو ذلیل کہتے ہو۔ غرض بحمد اللہ مولویوں کی حالت تو ایسی گئی گذری نہیں ہے۔ بہر حال میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ اپنی یہ حالت چھوڑ دو اور کام کو چھوٹے پیمانہ پر شروع کرو تم لوگ یہ کرتے ہو کہ اول ہی سے کام کو بڑے پیمانہ پر اٹھاتے ہو اس کے لئے لابدی زیادہ اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجبوراً تم کو ناگوار کوششیں کرنی پڑتی ہیں ایک سہل ترکیب آپ کو بتلاتا ہوں کہ جو کام شروع کرنا ہو اتنا شروع کیجئے جو آپ اپنی ذات سے کر سکیں جب کام شروع ہو جائے گا اور دوسرے دیکھیں گے خود بخود تمہاری مدد کریں گے۔ دیکھئے اسلام کا کام بھی یوں ہی ترقی پذیر ہوا اگر اسلام کا کام متعارف ضابطے سے ہوتا تو کم سے کم ایک جماعت تو ہوتی حالانکہ وہاں صرف ایک تن تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک دم تھا خدا تعالیٰ اسلام کی ترقی کو بیان فرماتے ہیں کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ الخ (مانند اس کھیتی کے جس کو اس نے اگایا ہو پھر اس کو ہلاک کر دیا ہو) تو صاحبو! ترقی اسلام کی ہمیشہ یوں ہی ہوئی ہے۔ خلاصہ اس تقریر کا یہ ہوا کہ شفقت کی بھی ایک حد متعین ہے تم بھی اس پر رہو چنانچہ اس آیت میں اس مضمون کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی کہ شفقت ان لوگوں پر کیجئے کہ جن میں خدا کا خوف ہو اور وہ علماء ہیں۔ فرماتے ہیں اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (بے شک ڈرتے (خوف) کرتے ہیں اس کے بندوں میں سے علماء) ایک بات تو اس سے یہ ثابت ہوئی دوسری بات اس آیت سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رتبہ نہایت عظیم الشان ہے کہ خدا تعالیٰ کو آپ کا غمگین ہونا کسی طرح منظور نہیں۔ جب کوئی بات ہوتی ہے فوراً تسلی فرمائی جاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو اور ہی ہے آپ کے اولیاء امت کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے فرماتے ہیں لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (بشارت ہے ان لوگوں کے لئے دنیا کی زندگی اور آخرت میں) ان کی ہر وقت یہ حالت ہے کہ

؎ کوئے نومیدی مرو کامیدہا ست سوئے تاریکی مرو خورشیدہا ست

(ناامیدی کے راستہ کی طرف مت جا کہ امید بہت ہیں تاریکی اور اندھیرے کی طرف مت جا کہ بہت سے سورج موجود ہیں)

کبھی ان حضرات کا دل منقبض نہیں ہوتا ہمیشہ شاداں رہتے ہیں اور کیونکر نہ رہیں ان حضرات کے پاس وہ چیز ہے کہ جس کے پاس ہوگی شاداں ہی رہے گا بلکہ ان حضرات کے سرور کی یہ حالت ہے کہ ان کو سلاطین پر رحم آتا ہے اور لوگ تو اُن کی ظاہری حالت پر رحم کرتے ہیں کہ ان بیچاروں کو کھانے کو نہیں ملتا بھوکوں مرے جاتے ہیں اور یہ حضرات اہل دنیا پر رحم کھاتے ہیں کہ ان کو ہیضہ ہو رہا ہے سمیّت تمام جسم میں سرایت کر گئی ہے اور ان کو حس تک نہیں اس مرض کو مبارک مرض سمجھ رکھا ہے۔ صاحبو! تم ان فاقہ مستوں اور روزہ داروں پر رحم مت کرو اپنی حالت پر رحم کرو، ان کے لئے خوان نعمت تیار ہو رہا ہے ان کو کہا جائے گا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (خوشی خوشی کھاؤ اور پیو اس چیز کی وجہ سے کہ تم عمل کرتے تھے) اسی لئے ایک بزرگ نے ایک بادشاہ کو ایک قطعہ لکھا ہے جس میں اپنا کھانا اس کا کھانا اپنا پہننا اس کا پہننا سب بیان کر کے آگے فرماتے ہیں ؎

نیک ہمیں ست کہ مے بگذرد   راحت تو محنتِ دوشین ما

(یہی ہے کہ گذرتی ہے تیری راحت ہماری گذشتہ راحت کی محنت ہے)

یعنی یوں ہی کام چلنے دو ؎

باش کہ تا طبلِ قیامت زنند   آنِ تو نیک آید و یا اینِ ما

(تو ٹھیر یہاں تک کہ قیامت کا نقارہ بجادیں تیری ملکیت اچھی ثابت ہوتی ہے یا ہماری)

یعنی اس روز معلوم ہو جائے گا کہ کونسی حالت عمدہ تھی۔ غرض اہل دنیا کو ان پر رحم آتا ہے مگر رحم کے قابل درحقیقت وہ ہیں حاصل یہ کہ اللہ والوں کے غم کے وقت اب بھی تسلّی ہوتی ہے تو اس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلّی فرمائی گئی ہے چونکہ تمہید میں بہت سا وقت ختم ہو گیا ہے اس لئے مقصود کو اب مختصراً بیان کر کے ختم کر دیا جاتا ہے اور مقصود کے اختصار کا اسی لئے مضائقہ نہیں کہ نتائج اکثر مختصر ہی ہوا کرتے ہیں اور یہی راز ہے اَلدِّيْنُ يُسْرٌ کا کہ یہ یسر مختص ہے مقصود کے ساتھ آجکل ہمارے بھائیوں نے غلطی کی ہے کہ ہر جگہ اَلدِّيْنُ يُسْرٌ لے لیا حالانکہ مصداق اس کا صرف نتیجہ ہے

ذرائع مراد نہیں مثلاً اگر یوں کہئے کہ اَلْاُکُلُ یُسْرٌ تو اس کے معنے یہ نہیں کہ اکل کے ذرائع مثلاً کھیتی کرنا وغیرہ وغیرہ یہ بھی آسان ہیں بلکہ معنے یہ ہیں کہ کھیتی وغیرہ کا جو نتیجہ ہے یعنی اکل وہ آسان ہے ہمارے بھائیوں نے یہ معنی سمجھ لئے کہ نہ علم کی ضرورت نہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت نہ محنت و مشقت کی ضرورت نہ اعمال و طاعات کی ضرورت کیونکہ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ غرض مقصود مختصر بھی ہے اور وقت بھی کم رہ گیا ہے اس لئے اس کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کیوں غم فرماتے ہیں آپ تو ان لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جن کو خشیت ہو اور خشیت صرف علم سے ہوتی ہے اسی لئے بصیغہ حصر فرمایا اور علم ان کو ہے نہیں مگر اس کا ہونا ان کے قبضے کی بات تھی پس جب یہ خود ہی توجہ نہیں کرتے آپ بھی غم نہ فرمایئے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم میں کیا فضیلت ہے اور یہی مقصود ہے دیکھئے اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہو گی کہ علم موقوف علیہ ہے، خشیت کا اور شرط ہے اس کی گو علۃ تامہ خشیت کی نہیں اس جملہ کو طلبہ یاد رکھیں آگے چل کر اس سے کام لیا جائے گا۔ اب یہ دیکھئے کہ خشیت جو موقوف ہے علم پر کیسی چیز ہے تو علم بھی اسی درجے کی چیز ہو گی کیونکہ موقوف علیہ واجب کا واجب اور مندوب کا مندوب ہوتا ہے تو نصوص میں دیکھنے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت کی برابر کوئی چیز مہتم بالشان اور اس سے زیادہ واجب نہیں کسی کسی مقام پر اس کو بلفظ تقویٰ بھی فرمایا گیا ہے جیسے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (ہدایت ہے متقین کے لئے) میں۔ اس جملہ کی اگرچہ دوسری تفسیر بھی ہے لیکن سیدھی تفسیر یہ ہے کہ تقویٰ کے معنی خوف کے لئے جائیں اور معنی یہ ہوں کہ ڈرنے والوں کے لئے ہدایت ہے کیونکہ جب خوف پیدا ہو گا تب ہی حق کی تلاش بھی ہو گی خوف وہ چیز ہے کہ اسلام بھی اسی کی بدولت پھیلا ہے یہ تو نقلی طور پر خشیت کا مہتم بالشان ہونا ثابت ہوا اب عقلی طور پر لیجئے ظاہر ہے کہ انتظام عالم کا بقا خشیت ہی سے ہوتا ہے دیکھئے انسان جو قبائح سے بچتا ہے تو کیوں یا تو محض تعلیم اخلاقی سے بلا کسی خشیت کے یعنی اس لئے کہ یہ کام برا ہے اور برے کام سے بچنا چاہیئے مگر دنیا میں اس انداز کی طبیعتیں بہت کم ہیں کہ صرف یہ تعلیم ان کے لئے مانع ہو جائے۔ فرض کیجئے کہ دو شخص ایک ساتھ سفر کریں اور ان میں سے ایک

شخص کے پاس ایک لاکھ روپئے کا نوٹ ہے اور دوسرا تہیدست ہے اور اتفاق سے یہ دونوں ایک پہاڑ پر پہونچ گئے جہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں اور تہیدست اس دوسرے کا مخالف بھی ہے، مذہباً بھی اور خاندانی طور سے بھی اور پہاڑ پر پہنچکر اس تہیدست کے دل میں روپئے کا لالچ پیدا ہوا اور نفس نے رائے دی کہ اس کو قتل کرکے روپیہ اپنے قبضہ میں کرلو اور یہ قادر بھی ہوا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس موقعہ پر کون چیز ہے کہ اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے دنیا دی خوف تو اس لئے مانع نہیں ہوسکتا کہ یہ فرض کیا جاچکا ہے کہ اس مقام پر کوئی دیکھنے والا نہیں غرض دنیا بھر کے سارے اجزا تلاش کرلیجئے کوئی چیز سوائے خشیت خداوندی کے ایسی نہ ملے گی کہ اس کو اپنے ارادے سے روک سکے تو دیکھئے اس غریب کی جان بچانے کے لئے اس موقعہ پر اگر کوئی چیز مدد کو پہنچی تو وہ صرف خشیت اور مذہب ہے، اس کے سوا ہزاروں صورتیں ایسی ہیں کہ اگر مذہب کی روک نہ ہو تو انسان کسی طرح نہیں رُک سکتا۔ اودھ میں ایک سب جج مسلمان کے ہاں دو تعلقداروں کا مقدمہ تھا ایک فریق ایک لاکھ روپیہ اور دوسرا سوا لاکھ روپیہ رشوت لیکر پہنچے۔ اب بتلائیے کہ کس چیز نے اُن رشوت لینے سے روکا کیا تہذیب یا تعلیم نے ہرگز نہیں سینکڑوں تہذیب اور تعلیم یافتہ عام لوگوں کا گلا دبا کر دو دو چار چار روپیہ تک وصول کر لیتے ہیں اور اگر کسی مہذب نے اس سے احتراز ہی کیا تو اسی وقت تک کہ جب تک قلیل مقدار ہو ورنہ اتنی بڑی مقدار کے سامنے تہذیب میں ہرگز قوت نہیں رہ سکتی یہ صرف خدا کا خوف تھا جس کی بدولت وہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہوئے اور دونوں کی رشوت لینے سے انکار کر دیا۔ اور ہم نے تو آجکل ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ تھوڑی مقدار بھی لینے میں ان کو عار نہیں۔ ایک عہدہ دار کو کسی دیہاتی ایک روپیہ رشوت دینا چاہا، اتفاق سے جیب میں ایک روپیہ اور ایک ادھنّا پڑا تھا چونکہ ہاتھ بند کرکے دیا اس لئے پتہ نہ چلا اور بجائے روپے کے ادھنّا دینے لگا اس عہدہ دار نے اول لینے سے انکار کیا مگر جب اس نے اصرار کیا تو لے لیا گھر پر جاکر جو اس دیہاتی نے جیب کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بجائے روپیہ کے ادھنّا دے دیا ہے بہت شرمایا اور شرم اُتارنے کو ان کے پاس آیا اور معذرت کرکے ان کو روپیہ دیا اور ادھنّا واپس

مانگا اُن حضرت نے روپیہ بھی لے لیا اور ادھنا واپس نہ دیا اور فرمایا کہ میاں واپس کیوں دیں آخر کچھ آیا ہی ہے گیا تو نہیں۔ تو بعض کی تہذیب تو اس قدر سستی ہوتی ہے کہ دو پیسہ میں بھی بک جاتی ہے اور جن کی کچھ قیمتی ہے وہ محض تھوڑی مقدار ملنے کے وقت مانع ہوتی ہے ورنہ اگر ان کو لاکھ دو لاکھ روپیہ ملے تو ہرگز نہ چھوڑیں غرض قبائح سے روکنے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف مذہب اور خشیت خداوندی ہے تہذیب ہرگز نہیں روک سکتی۔

آجکل کی تہذیب کی حقیقت اور اس کا انجام اگر دیکھنا چاہیں تو کتاب مآل التہذیب مصنفہ مولوی قمر الدین صاحب مرحوم کی دیکھیں اس کے نو مقالے تیار ہونے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا انھوں نے جابجا دکھلایا ہے کہ اس تہذیب کا مآل کیا ہونے والا ہے اور ہر مضمون کے آخر میں یہ ظرافت آمیز جملہ بھی موجود ہے کہ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُهَذَّبِيْنَ اگر اعتقاد سے بھی اس کتاب کو نہ دیکھا جائے تو اس کو ایک ناول ہی فرض کر کے دیکھ لو خلاصہ یہ ہے کہ خشیت ہی سے دین و دنیا کے انتظام کا بقا ہو سکتا ہے اگر خشیت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اور ایک نئے انداز سے سمجھئے کہ اگر خشیت قلب میں ہو تو اس سے نرمی پیدا ہو گی اور نرمی سے اخلاق حمیدہ جن کی آج بھی تعلیم ہوتی ہے جیسے ایثار وغیرہ یہ سب بآسانی پیدا ہو سکیں گے اور اس سے نظامِ عالم احسن صورت پر باقی رہے گا، پس اس اخلاق کو بھی روح تمدن کہا جائے وہ بھی خشیت ہی سے درست ہوتے ہیں لیکن خشیت کا موقوف علیہ علمِ دین ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کا علم نہ ہو گا اس وقت تک اس کا خوف پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص کی گائے کھوئی گئی تھی اس کی تلاش میں نکلا رات کے اندھیرے میں پتہ تو چل نہیں سکا ایک شیر کو پڑا دیکھا سمجھا کہ گائے ہے۔ کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا جب معلوم ہوا تو روح ہی نکل گئی۔ تو واقعی بدون معرفت کے خشیت نہیں ہو سکتی۔

صاحبو! میں نے علم کے فضائل نہیں بیان کئے کیونکہ اول تو وقت نہیں دوسرے آجکل کے عقلاء کو نرے فضائل سے تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ عقل سے اس کی ضرورت ثابت نہ کی جائے حالانکہ عقل اس درجے کی چیز نہیں کہ ہر امر میں اس کو

مدار قرار دیا جائے حکمِ عقل موجب پریشانی اور شرع موجب راحت ہوتا ہے خوب کہا گیا ہے ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزما لیا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنا لیا)

اور واقعی اگر عقل کو ہر بات میں حکم بنایا جائے تو ہم کو بڑی مشکل پڑے گی، مثلاً یہ قاعدہ عقلی ہے کہ منعم علیہ پر منعم کا شکر بقدر نعمت کے واجب ہے پس اگر اس قاعدہ میں ہم عقل کو حکم بنائیں تو ذرا غور کیجئے کہ ہم کو کتنی مشکل درپیش ہوگی کیونکہ ہر سانس کی آمد و رفت میں ہم پر دو نعمتیں ہیں پس اس طرح دن رات میں کتنی نعمتیں ہم پر ہوئیں اور ان کی کثرت کے لحاظ سے کتنا شکر ہم پر واجب ہوا تو بتلایئے کہ اس شکر کو کون ادا کر سکتا ہے اور نہ ادا کرو تو عقل مجرم ٹھہراتی ہے اب شرع کا احسان دیکھئے کہ اس میں سے تھوڑی سی مقدار کو واجب قرار دیا تو ہر جگہ عقل کی ٹانگ اڑانا سخت مشکل کا اٹھانا ہے۔ مجبوراً یہی کہنا پڑے گا کہ ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزمایا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنا لیا)

ہاں عقل بیکار بھی نہیں وہ اتنا کام دے سکتی ہے کہ اس سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ حاکم کون ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا تو آگے عقل کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مثلاً بادشاہ کا بادشاہ ہونا عقل سے معلوم ہو سکتا ہے مگر اس کے ہر قانون کی لم ہرگز ہر شخص کو معلوم نہیں ہو سکتی عقل کی حالت بالکل گھوڑے کی سی ہے تو دیکھئے اگر آپ کا ایک محبوب پہاڑ کی چوٹی پر ہو اور آپ سے وہاں تک چار میل کا فاصلہ ہو جن میں دو میل سڑک اور دو میل پہاڑ کی چڑھائی ہو تو آپ گھوڑے کی سواری کہاں تک کریں گے ظاہر ہے کہ دامن کوہ تک سواری ہو سکے گی۔ آگے جہاں سے کوہی زینہ شروع ہوا ہے وہاں سے گھوڑا بیکار ہے۔ پس اسی طرح فرعیات کے زینہ میں عقل کو مرکب بنانا

اوندھے منہ گرنے کی کوشش کرتا ہے وہاں سے یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

وزاں جا بباِل محبت پری

غرض آپ کو معلوم ہوا کہ علمِ دین کیا چیز ہے کہ نظامِ عالم اس پر موقوف ہے صاحبو! میں یہ نہیں کہتا کہ ساری دنیا عالمِ اصطلاحی بنے مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ علمِ دین خواہ وہ اردو میں ہو خواہ فارسی میں خواہ عربی میں اور خواہ کتاب سے یا صحبت سے ہر شخص کو سیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد تھوڑا سا چسکا خشیت کا بھی ضرور لینا چاہیئے اگر یہ شبہ ہو کہ علم کے بعد تو خشیت ہو ہی جائے گی۔ تو سمجھو کہ علم موقوف علیہ ہے اور شرط ہے خشیت کی نہ کہ خشیت کی علت تامہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خشیت بدون علم کے نہیں ہوتی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں علم ہوگا خشیت بھی ضرور ہو گی۔ اور یہی وہ بات ہے جس کے لئے میں نے پہلے کہا تھا کہ طلبہ اس جملہ کو یاد رکھیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس مقام پر دو شبہے ہو رہے ہیں ایک تو علماء کو ایک عوام کو، علماء کو تو یہ شبہ ہوا کہ جب اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (بیشک خدائے تعالیٰ سے اُس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں) فرمایا گیا ہے اور ہم عالم ہیں تو ہم میں خشیت بھی ہے تو ہم اس فضیلت میں داخل ہوئے اور مخدوم الخلائق و وارث نبی ہوئے حالانکہ یہ غلط ہے جیسا کہ تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ محض علم سے خشیت ہونا ضروری نہیں اس کے لئے تدبیر مستقل کی حاجت ہے اور عوام کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ علم سے خشیت ہوتی ہے حالانکہ ہم نے تو بہت سے عالم دیکھے ہیں کہ وہ دنیا کے بندے ہیں اور ان کو خدا کا خوف کچھ بھی نہیں ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ بھی زائل ہو گیا عوام کے اعتراض کا اکثر لوگ یوں جواب دیا کرتے ہیں کہ جس عالم کو خوفِ خداوندی نہ ہوا اس کا علم معتد بہ نہیں ہے

پس جہاں علم معتد بہ ہوگا وہاں خشیت ضروری ہے۔ یہ جواب فی نفسہٖ تو صحیح ہے مگر اس مقام پر نہیں چلتا اس لئے کہ اس پر مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ خشیت علم پر ضرور مرتب ہو گی اور علم سے مراد علم مع الخشیۃ ہوگا پس خشیت مرتب ہو گی خشیت پر پس تقدم الشئ

علیٰ نفسہٖ لازم آئے گا اور یہ دور صریح ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ خوف کا پیدا کرنا ضروری اور اس کا موقوف علیہ ہے علم۔ اس کو حاصل کرو لیکن علم حصولِ خشیت کی علۃ تامہ نہیں بلکہ اس علت کا ایک جزء ہے دوسرا جزء قرآن شریف کے دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ (اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور چاہئے کہ ہر نفس غور کرے کہ کل کے لئے کیا بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تقویٰ بمعنی خشیت کا حکم ہے پھر وَلْتَنْظُرْ میں اس کا طریقہ ہے کہ اپنے اعمال کو سوچا کرو اس کے بعد بطور نتیجہ کے ارشاد ہے کہ اِتَّقُوا اللَّهَ یعنی جب یہ غور وفکر کروگے تو تم کو تقویٰ وخوف حاصل ہو جائے گا علاوہ آیت کے تجربہ سے بھی معلوم ہے کہ نرے علم سے خشیت نہیں ہوتی بلکہ علم کے ساتھ خوض اور غور کی ضرورت ہے۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو علم دین کی کیونکہ یہ نہ ہو تو خشیت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوطُ (جب شرط فوت ہوگئی تو مشروط بھی فوت ہوگیا) اور دوسری چیز یہ ہے کہ خلوت میں بیٹھ کر خوب سوچا کرو کہ قیامت کے لئے ہم نے کیا سامان تیار کر رکھا ہے جب وہاں پوچھ ہوگی تو ہم کیا جواب دیں گے جس کو دوسری جگہ فرماتے ہیں اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُعْرِضُونَ ۝ (قریب آگیا لوگوں کے لئے ان کا حساب اور وہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کرنے والے ہیں) اس سے ایک خاص اثر پیدا ہوگا اور جس کو اصطلاح میں حال کہتے ہیں تو اصلاح میں تین امر ضروری ہوئے۔ ایک علم، دوسرا عمل، تیسرا حال چونکہ جب تک حال نہ ہو نرے علم وعمل سے کام نہیں چلتا مثلاً ایک شخص جانتا ہے کہ زنا حرام ہے اور اس پر عمل بھی کرے کہ زنا سے بچا رہے لیکن اس عمل کو بقاء اس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اس عمل میں صاحب حال نہ ہو جائے بغیر حال کے عمل ایسا ہے جیسے بے انجن کی گاڑی کہ اس کو ہاتھ سے ڈھکیل کر کچھ دور تک لیجائیے لیکن جہاں چھوڑ دیجیے رہ جائے گی کیونکہ اس میں آگ نہیں پس یا تو خود انجن بن جاؤ کہ تمہارے اندر آتش محبت الٰہی بھری ہو نہیں تو کسی انجن کے ساتھ ہو لو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہی حالت ہو گی

جس کو پہلی مثال میں عرض کیا۔ حضرت عراقی کہتے ہیں ؎

صنمارہِ قلندر سزا وار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے صنم قلندر کا راستہ لائق ہے اگر تو مجھ کو دکھائے اس واسطے کہ میں پارسائی کے راہ و رسم سے دور دیکھتا ہوں)

پارسائی سے مراد عمل محض ہے کہ یہ دور و دراز راستہ ہے۔ بلکہ اس راستہ میں اکثر نیت بھی خراب ہوجاتی ہے اور اخلاص کے ساتھ ریا شامل ہوجاتی ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

بزمیں چو سجدہ کردم زِ زمیں ندا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

(جب میں نے زمین پر سجدہ کیا تو زمین سے ندا آئی کہ تو نے ریا کے سجدہ سے مجھکو خراب کیا)

اور فرماتے ہیں کہ ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

(میں کعبہ مکرمہ کے طواف کے لئے گیا مجھ کو حرم کا راستہ نہ دیا اس واسطے کہ دروازہ کے باہر تو نے کیا کیا ہے کہ جس کے سبب حرم میں داخل ہو)

غرض حال نہ ہو تو عمل اکثر بیکار ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھئے کہ نرا حال بھی کافی نہیں جیسا کہ آجکل جہلا نے برنگ تصوف اس کا دعویٰ کیا ہے کیونکہ اول تو قرآن شریف سے عمل کی ضرورت ثابت ہے۔ دوسرے عقلاً بھی حال کے لئے عمل لازم ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص محض صاحب حال ہو اور اس کا حال کبھی ظہور پذیر نہ ہو اور یہی عمل ہے دیکھو اگر مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو تو کیا حالت ہوتی ہے کہ اول تو اس کو دیکھتے ہی اس کی تعظیم کے لئے زمین پر گر پڑے گا پھر جا کر اس کو لپٹ جائے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ محبوب کو دیکھے اور اس کو حرکت بھی نہ ہو یوں ہی دیوار کی طرح کھڑا رہے تو اگر ان درویش کو محبت خداوندی ہے تو اس کا ظہور کیوں نہ ہوتا اطاعت کیوں نہ ہوتی۔

غرض علم بھی ضروری عمل بھی ضروری حال بھی ضروری پس اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ میں خشیت حال ہے اس سے بقا اور سہولت ہوتی ہے گو یا خشیت ہی سے عمل کی بقا رہوتی ہے اسی سے عمل میں سہولت ہوتی ہے اسی سے عمل کی توفیق ہوتی

ہے کیونکہ جب تک چسکا نہ ہو کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ حال ہی سے دنیا کے کام بھی چلتے ہیں دیکھئے اگر رات کے دو بجے کسی جگہ ریل میں جانا ہو تو عین وقت پر بلا کسی کے بیدار کئے خود بخود آنکھ کھل جانا یہ حال ہی کی بدولت ہے اور صاحبو یہی حال اور جاذب وہ چیز ہے کہ آپ کو تو کیا سونے دیتا اس نے تو محبوب حقیقی تک کو تمہاری طرف متوجہ کر دیا ہے خوب کہا ہے۔

ع عشق را نازم کہ یوسف را ببازار آورد

(عشق پر ناز کرتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بازار میں لایا)

تو زلیخا کو تو کیا چین ہوتی یوسف علیہ السلام کو بھی چین سے کنعان میں نہ بیٹھنے دیا ع۔ ہمچو صنعا زاہدے را زیر زُنّار آورد (زاہد صفا کی طرح زنار کے نیچے لایا) اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ جو ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں بلکہ مراد زُنّار سے بدنامی اور ملامت ہے اور واقعی جو شخص بھی عشق کے رنگ میں آتا ہے بدنام ہوتا ہے ہمارے ایک دوست ہیں ڈپٹی کلکٹر جس روز سے ان پر یہ حالت غالب ہوئی ہے دنیا سے دل سرد ہو گیا اب صرف ان کو یہی ایک سبق یاد ہے۔ بس گویا یہ حال ہے کہ

؎ ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ۔۔۔ اِلا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(جو کچھ پڑھا ہم نے بھلا دیا مگر یار کی باتیں نہیں بھلائیں کہ ان کا بار بار تکرار کرتے ہیں)

ان کے خاندان کے لوگ ان سے خفا اور میرے شاکی ہیں کہتے ہیں کہ قیامت میں ان سے باز پرس ہوگی یہ قوم کے افراد کو تباہ کر رہے ہیں، مگر میں اس کے جواب میں وہی کہونگا جو کہ ہمارے بزرگ حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا۔ کہ میاں ہم کو بھی تو کسی نے بگاڑا ہے ہم کو بھی یہی بگاڑنا آتا ہے۔ لوگ کیوں ہمارے پاس بگڑنے آتے ہیں ہم کسی کو بلانے تو نہیں جاتے۔ صاحبو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے قوم کے افراد کو کیا بگاڑ دیا نوکری سے میں منع نہیں کرتا قطع تعلقات کو میں نہیں کہتا ہاں یہ کہتا ہوں کہ فرعون نہ بنو تم کسی نے بندے ہو بندگی کو اپنا شعار رکھو۔ غرض عاشق کے لئے بدنامی لازم ہے یہ معنی ہیں۔ ہمچو صنعا زاہدے را۔ کے

لیکن صاحب محبت کو بدنامی کی ذرا پرواہ نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ ؎

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کو نہیں چاہتے)

بلکہ بدنامی سے قلب میں اور جوش پیدا ہوتا ہے اور ہمت بڑھتی ہے اور یوں کہتا ہے کہ ؎

ساقیا برخیز و دردہ جام را خاک برسر کن غمِ ایّام را

(اے ساقی اٹھ تو اور جام دے تو اور زمانہ کے غم پر خاک ڈال)

اور

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کو نہیں چاہتے)

الحاصل اس کو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی اس کا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

غرض جب یہ محبت اور جمال محبوب تک کو متوجہ کر دیتا ہے تو آپ کو تو کیا چین سے رہنے دے گا بس یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

(مجھ کو جاناں کی منزل میں کیا امن و عیش جبکہ ہر سانس گھنٹہ فریاد رکھتا ہے کہ محمل باندھو)

کہ ہر وقت گھنٹی بج رہی ہے کہ چلو اور بیدار رہو۔ دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

ایں قدر ہست کہ بانگے جرسے می آید

اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ واقعی گھنٹی بجتی ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ گھنٹی کا کام جگا دینے کا ہے۔ ان کے دل میں ہر وقت ایک محرک تقاضا کرتا ہے اور وہی حال ہے اسی نے بزرگوں کو بے چین کر رکھا ہے۔ ہمارے حضرتؒ رحمۃ اللہ علیہ رات رات بھر پڑتے تھے اور فرمایا کرتے تھے ؎

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن گو بدم من سرّ من پیدا مکن

(اے خدا اس بندہ کو ذلیل مت کر گرچہ میں برا ہوں میرے بھید کو ظاہر مت کر)

ایک اور بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ رات بھر پریشان رہتے جب بیوی زیادہ

تقاضا کرتی تو آرام کرتے لیکن تھوڑی دیر میں پھر چونک کر اُٹھ بیٹھتے اور فرماتے کہ کیا کروں یہ آیت نہیں سونے دیتی یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَھۡلِیۡکُمۡ نَارًا ط (اے ایمان والو! اپنے آپ اور اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ) حاصل یہ کہ تقوے کیلئے فکر غد ضروری ہے کہ یوں سوچے کہ اس کے لئے ایک خاص زاد کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہم بالکل مفلس پراگندہ ہیں یہ ایسا افلاس ہے کہ دنیا کا افلاس اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں دنیا کا افلاس آخر ایک دن ختم ہو جائے گا اور اس افلاس کا کہیں خاتمہ نہیں وہاں یہ حالت ہوگی ؎

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر

(بازار کتنا ہی سامان سے زیادہ بھرا ہو لیے خالی ہاتھ والے کا دل زیادہ پریشان ہوتا ہے)

کہ وہاں کا بازار گرم ہوگا اقسام اقسام کی عمدہ چیزیں سجی ہوں گی مگر ہماری جیب خالی ہوگی۔ ذرا غور کرو اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی صاحبو! ہنوز وقت باقی ہے اپنا علاج کر لو اور زاد راہ جمع کر لو وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ ایک کلیہ ہے اللہ کے بندوں نے اس کے جزئی طریقے نکال کر بتلا دیئے ہیں ان میں ایک طریقہ یہ ہے کہ دن رات میں ایک وقت تجویز کر لو اور اس وقت بیٹھ کر سوچا کرو۔ سب سے اول یہ سوچو کہ خدا تعالےٰ کی کیا کیا نعمتیں ہم پر ہیں اس کے بعد یہ سوچو کہ ہمارا خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا برتاؤ ہے ہم اس کی نعمتوں کا کس قدر شکر ادا کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں تو صبح سے شام تک کے گناہ ہی گن ڈالے اس کے بعد غور کرے کہ اگر ہمارا یہ برتاؤ کسی دوسرے سے خصوص حاکم یا آقا سے ہوتا تو وہ کیا کرتا اور جو کچھ ذہن میں آئے اُس کی بابت سوچے کہ خدا تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ یہ کر سکتا ہے اس کے بعد سوچے کہ میدان قیامت برپا ہے آفتاب قریب آگیا ہے احکم الحاکمین کا اجلاس ہو رہا ہے نہ کوئی بیرسٹر ہے نہ کوئی وکیل ہے اور اس اثنا میں مجھے پکارا گیا ہے فرشتے آئے اور مجھ کو پکڑ کر لے گئے اور وہاں لے جا کر چھوڑ دیا۔ اب مجھ سے میرے اعمال کی بازپرس ہو رہی ہے اور میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں نہ کوئی ٹھکانا ہے کہ وہاں بھاگ کر پناہ لوں وہاں سامنے جہنم ہے ملائکہ گرفتار کر کے مجھ کو ؎ پا بدستے دگرے دست بدست دگرے + جہنم کی

طرف لے جا رہے ہیں بس یہ سوچ کر فوراً سر بسجود ہو جاؤ اور نہایت گڑگڑا کر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور روؤ اور اگر رونا نہ آئے رونے کی صورت بناؤ اور یہ دعا کرو کہ اے خدا میرے گناہوں کو معاف کر اور مجھے ہمت دے کہ مجھ سے گناہ نہ ہوں یہ تو رات کو کرے اور دن میں علماء کے رسائل لے کر ان کو پڑھے اور اپنے بچوں اور بیوی کو بھی پڑھاوے اگرچہ بچے انگریزی ہی پڑھتے ہوں افسوس تم لوگ اولاد کو کندۂ جہنم بنانے کے لئے پرورش کرتے ہو صاحبو! جب ان کا مآل یہ ہوا تو ان کے پیدا ہونے سے اور پرورش ہونے سے کیا نفع ہوا اس سے تو پیدا نہ ہوتے اور بچپن میں مرجاتے تو اچھا تھا ؎

مرا اے کاشکے مادر نمیزاد دگر میزاد کس شیرم نمی داد

(مجھ کو کاش کہ میری ماں نہ جنتی اور اگر پیدا کرتی کوئی مجھ کو دودھ نہ دیتا)

اور اُن رسائل میں جہاں شبہ ہو اس کو علماء سے حل کر لو جب یہ دو کام شروع کر دو گے ان شاء اللہ خود بخود اعمال کی توفیق ہو گی یہ حالت ہو جائے گی جس کو فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور کہو سیدھی بات درست کر دے گا وہ تمہارے لئے تمہارے اعمال کو) کہ تقویٰ سے مراد خشیت اور قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ سے مراد اعمال جب یہ دو کام جمع کر لو گے تو اس سے خشیت پیدا ہو گی پھر اعمال خود بخود درست ہو جائیں گے اور یہ زندگی عمدہ زندگی ہو جائے گی پھر یوں کہہ سکو گے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

(ہرگز نہیں مرتا وہ شخص کہ اس کا دل عشق سے زندہ ہو گیا دنیا کے تمام اخبارات پر ہمارا دوام ثابت ہو گیا)

تم اپنی اس زندگی موجودہ پر کیا ناز کرتے ہو حیات یہ ہے جس کو حیات ابدی کہتے ہیں اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ موت تو آئے گی پھر جریدۂ عالم پر دوام کہاں ہوا ؎

تو سمجھو کہ وہ موت ظاہری موت ہے وہ ایسی موت ہے کہ جس کی تم خود تمنا کرو گے

کہ وہ آئے تو یہ ہیولانی حجابات کی دیوار اٹھے اور موت کے وقت یوں کہو گے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وہ وقت آگیا کہ میں برہنہ ہو جاؤں جسم کو چھوڑ دوں اور بالکل روح ہو جاؤں)

گویا جسم کے چھوٹنے پر خوش ہو گے اسی لئے کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　　راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　　تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(میں خوش ہونگا اس دن کہ اس ویران منزل (دنیا) سے چلا جاؤں۔ روح کی آرام طلب کرتا ہوں اور جاناں کے دربار میں چلا جاؤں میں نے نذر کی کہ اگر یہ دن غم کے ساتھ بسر ہو جائیں تاکہ شراب خانہ کی طرف خوش خوش غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

اللہ اکبر کیا خوشی ہے صاحبو! وہ اس موت کو اتنا خفیف سمجھتے ہیں کہ اس کی تمنا کرتے ہیں اور اس زندگی کا ان کو ایسا یقین ہے کہ اس یقین کے بعضے آثار تک ظاہر ہونے لگتے ہیں چنانچہ ہمارے حضرت مرشدؒ نے مرض الموت میں ایک بزرگ سے یہ وصیت فرمائی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے جنازے کے ساتھ ذکر ہو دیکھئے ان کو پورا یقین تھا کہ میں اس حیات کی وجہ سے استماع ذکر سے متلذذ ہوں گا مگر اتفاق سے ان بزرگ نے کہا کہ مناسب نہیں حضرت اسی پر راضی ہو گئے اور کسی کو اس وصیت کی اطلاع نہیں ہوئی۔ اتفاق سے جس وقت جنازہ چلا اس کے ساتھ ایک عرب تھے انہوں نے للکار کر کہا اَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوا اللّٰہَ (اے لوگو خدا تعالیٰ کو یاد کرو) چنانچہ ذکر ہونے لگا یہ کرامت ہے کہ ان حضرات کی تمنا پوری ہو کر رہتی ہے۔ خوب کہا ہے۔ ؏ تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں۔ اور ایک دوسرے بزرگ نے یہ وصیت کی تھی کہ میرے جنازے کے ساتھ یہ اشعار پڑھتے چلیں ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو　　　شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما　　　آفریں بر دست و بر بازوئے تو

(مفلس ہیں ہم اور تیرے کوچہ میں آئے ہیں تیرے رخ انور کے جمال سے اللہ کے لئے کچھ مجھکو بھی ہاتھ کھول ہماری بھیک کی جھولی کی طرف شاباش تیرے ہاتھ اور بازو پر)

حضرات! اگر روح میں حیات نہ تھی تو یہ وصیتیں کیوں کیں اور فقط یہ نہیں کہ یہ محض ان کا خیال ہی ہو بلکہ بعض اوقات آثار کا بھی ظہور ہوا ہے حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی حکایت ہے کہ جب ان کا انتقال ہوگیا اور جنازہ لے چلے تو جنازے پر ان کے ایک خادم نے یہ اشعار پڑھنا شروع کئے ؎

سرو سیمینا بصحرا میروی سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

(ہمارا سرو سیمیں ہمارا وہ محبوب جس کا قد سرو جیسا چاندی چاندی جیسا ہے جنگل کی طرف جاتا ہے بڑی بے وفائی ہے کہ ہمارے بغیر جاتا ہے اے پیارے تیرا چہرہ تماشا گاہِ عالم ہی تو تماشا کے لئے کہاں جاتا ہے)

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہوگیا۔ آخر یہ کس چیز نے ہاتھ بلند کرا دیا تھا پھر کیا یہ کہنا غلط ہے ع ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما۔ مگر مجھے خوف ہے کہ جہلا ان کو زندہ سمجھ کر ان سے مرادیں نہ مانگنے لگیں، مرادیں مانگنا زندوں سے کب جائز ہے کہ بر تقدیر ان کی زندگی کے ان سے جائز ہو دوسرے ان سے مانگو تو وہ چیز مانگو جو ان کے پاس ہو مال و دولت یا اولاد ان کے پاس کہاں ہیں کہ وہ تم کو دیدیں گے ان کے پاس صرف ایک چیز ہے جس کو ساری عمر انھوں نے ڈھونڈا اور اسی میں عمریں تمام کر دیں یعنی خدا تعالیٰ سو اس کو اس کی مرضی کے موافق ان سے مانگو۔ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ زندگی کیسی زندگی ہے اور اس کے حاصل ہونے کا طریق کیا ہے علم دین سیکھو اس پر عمل کرو اور اُس عمل کو حال بنالو اس سے دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی، دنیا اس معنی کر کہ تم کو راحت کلی نصیب ہوگی یہ نہیں کہ بہت سا مال مل جائیگا آگے ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ سبحان اللہ کیا بلاغت ہے کہ اول عزیز فرمایا اس کے بعد غفور پر خاتمہ آیت کیا کیونکہ اگر اس کا عکس کرتے کہ اول غفور فرماتے اور پھر عزیز فرماتے تو چونکہ خاتمہ مضمون جلال پر ہوتا اس لئے غلبۂ خوف سے مایوسی ہو جاتی کہ ہم تو اس قدر گنہگار اور خدا تعالیٰ ایسے قہار تو ہماری مغفرت کس طرح ہوگی برخلاف اس ترتیب کے کہ اس میں خاتمہ مضمون رحمت پر فرمایا ہے جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اول کچھ باز پرس ہوئی بھی تو انتہا رحمت ہی پر ہوگی لہذا تم مایوس نہ ہو جاؤ۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق دے۔ آمین یا رب العالمین ؎

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً (رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

چھٹا وعظ ملقب بہ

ترغیب الاضحیہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ ایم۔ اے جناح روڈ کراچی

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

چھٹا وعظ ملقب بہ

ترغیبُ الاضحیہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۰ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ روز جمعہ	تقریباً ایک گھنٹہ	بیٹھ کر	فضیلت اضحیہ	مولوی عبداللہ صاحب	تقریباً ۱۰۰ آدمی	دیہات کے لوگوں کی کثرت تھی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیّئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہٖ واصحابہٖ وسلم اما بعد فقد ورد فی حدیثٍ طویلٍ قالوا ما ھٰذہ الاضاحی یا رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم) قال سنۃ ابیکم ابراھیم

(یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ قربانیاں کیا چیز ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے باپ

ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے فضیلت اضاحی میں اس وقت ایک مختصر سا مضمون اضاحی کے متعلق عرض کرتا ہوں ہر چند کہ خستگی سفر کی وجہ سے تکان تھا مگر بعض عزیز مہمان اس وقت آئے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے خیال آیا کہ کچھ بیان ہو جائے اور اس قدر مقدم بیان کرنے کی اگرچہ ابھی ایام اضحیہ میں مدت زیادہ باقی ہے یہ وجہ ہے کہ پھر سفر کا ارادہ ہے خدا جانے پھر وقت ملے یا نہ ملے اس وقت فقط ترغیب کے لئے فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ باقی مفصل احکام اگر وقت ملا تو ان شاء اللہ تعالیٰ قریب زمانہ میں بیان کر دیئے جائیں گے مضمونِ مقصود سے پہلے ایک مضمون بطور تمہید کے بیان کیا جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے کریم ہیں کہ ہمارے نفع کی کوئی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر تبلیغ کے نہیں چھوڑی۔ قربانی، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ سب احکام اس وقت ہم کو ایک معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ہم کو ان کی کچھ قدر نہیں یعنی جیسی قدر کرنا چاہئے اس درجہ قدر نہیں ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمیشہ سے آباؤ اجداد سے سنتے چلے آئے ہیں جن لوگوں کو جستجو کے بعد یہ دولت ملی ہوگی اُن کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ جیسے بھوکا آدمی اگر آدھی روٹی بھی مل جاتی ہے تو غنیمت سمجھتا ہے اور اگر معدہ فاسد ہوگا تو اُس کو پلاؤ زردے کی بھی قدر نہ ہوگی چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوالات کے بعد جو جواب عنایت ہوئے ان کو تو بعد طلب ملے اور ہم کو مفت جیسا اس حدیث میں بھی ایسا ہی مضمون ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ہم کو بھی ان کی قدر کرنا چاہیئے اور یہ مضامین ثواب وعذاب کے وہ ہیں کہ کوئی شئے ان سے زیادہ افضل وانفع ہمارے لئے نہیں ہے ورنہ لازم آئیگا کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے دریغ فرمایا اور کام کی بات چھپائی۔ حالانکہ یہ بات ممکن نہیں۔ اور باوجود نافع ہونے کے سہل اس قدر ہیں کہ کسی قسم کی تنگی ان میں نہیں ہے بلکہ ان احکام کا سہل ہونا یہ خود دلیل انفع ہونے کی ہے اس لئے کہ قاعدہ تکوینیہ ہے کہ جو شئے زیادہ نافع ہوتی ہے وہ نہایت سہل الحصول ہوا کرتی ہے دیکھو آدمی اور سب حیوانات کو سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے کہ اگر ایک منٹ بھی ہوا نہ ہو تو حیات ہی معرض ہلاک میں آجائے وہ ہی اس قدر ارزاں ہے کہ اس کی کچھ قیمت ہی نہیں اس کے بعد پانی کی ضرورت ہے وہ اس قدر سستا نہیں ہے لیکن اور چیز ذل

کے اعتبار سے ارزاں ہے اس کے بعد غذا کی ضرورت ہے، وہ اس سے زیادہ گراں ہے اور جس شے کی بالکل ہی ضرورت نہیں ہے وہ نہایت گراں ہے جیسے جواہرات کہ عمر بھر بھی اگر کسی کو نہ ملیں تو کچھ حرج نہ ہو چنانچہ صدہا آدمی ایسے ہیں کہ وہ جانتے بھی نہیں کہ لعل کیا ہے اور زبرجد کس چیز کا نام ہے۔ اسی طرح جس قدر علوم زیادہ نافع اور کارآمد ہیں وہ نہایت سہل ہوتے ہیں چنانچہ علوم شریعت بھی ایسے ہی ہیں کہ نہایت ضروری اور نافع ہونے کی وجہ سے نہایت سہل ہیں اور ہر جگہ ان کے بتلانے والے موجود ہیں اور وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے اور یہی راز ہے اس میں قرآن شریف کی تعلیم کرنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور نہایت قلیل معاوضہ پر مل جاتے ہیں بخلاف دیگر علوم کے کہ وہ کم ہیں اور گراں ہیں۔ غرض دیکھنے کی چیز نفع ہے نہ کہ مضمون کی۔ دوسرے صفات مثل نایابی یا رنگینی یا لذت یا غموض وغیر ذالک اکثر لوگ رنگین مضامین ڈھونڈھا کرتے ہیں چنانچہ وعظ میں بھی اس کا تجسس رہتا ہے کہ جس کے وعظ میں مزہ دار اشعار ہوں اور نکتے اور لطائف وحکایات ہوں اس کو پسند کرتے ہیں اور اگر کوئی وعظ مسئلے مسائل سنا دے اس سے بھاگتے ہیں حالانکہ یہ زیادہ نافع ہے لیکن ان کو کیا معلوم ہے کہ ہمارے نفع کی کیا چیز ہے۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَسٰۤی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ (بہت سی مرتبہ تم ایک چیز ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہوتی ہے اور بہت سی مرتبہ تم ایک چیز کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے نامناسب ہوتی ہے) حق تعالےٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ایسے ایسے مضامین ہم کو بتائے جو ہمارے کام آنیوالے ہیں اور بیکار اور غیر ضروری مضامین ہم کو نہیں سکھائے گو وہ رنگین ہوں یہ تمام تقریر اس لئے عرض کی گئی کہ جو مضمون اس وقت بیان کیا جائیگا اس کو بیقدر اور معمولی نہ سمجھا جائے حاصل یہ کہ ان مضامین نافعہ میں سے یہ مضمون بھی ہے کہ جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے ہمکو بتایا ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قربانی کے متعلق ارشاد فرما رہے تھے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قربانیاں کیا چیز ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ اس مضمون کو سن کر لوگ کہیں گے کہ قربانی کی اس میں کیا فضیلت ہوئی لیکن سمجھدار کیلئے یہ بڑی بھاری فضیلت ہے بلکہ جسقدر فضائل قربانی کے آئے ہیں ان میں سب سے زیادہ بڑی فضیلت یہی ہے چنانچہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ کیوں فرمایا سنۃ ابراہیم فرما دیتے اَبِیْکُمْ کا لفظ کیوں بڑھایا اس کے متعلق دو اعتبار سے کلام ہے اول تصحیح کے اعتبار سے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تمام امت کا باپ کیسے فرما دیا دوسرے غرض کے اعتبار سے کہ اس نسبت کی تصریح سے کیا فائدہ نکلا سو تصحیح کے اعتبار سے تو یہ ہے کہ اَبِیْکُمْ فرمانا ایک تو اس طرح اس لئے صحیح ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اکثر عرب کے باپ ہیں اس لئے

کہ اکثر عرب بنو اسمٰعیل ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام بیٹے ہیں ابراہیم علیہ السلام کے اسلئے ابیکم فرمایا لیکن چونکہ آیت میں خطاب تمام امت کو ہے اس لئے کہ احکام مخصوص اہل عرب کے ساتھ تو ہیں نہیں اس لئے بہتر وجہ دوسری ہے کہ اَبِیْکُمْ سے مراد روحانی باپ لئے جائیں اس لئے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے روحانی باپ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت قرب ہے نسباً بھی اور شریعۃً بھی نسبًا تو ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور شریعۃً اس لئے کہ شریعۃ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام شریعت ابراہیمی سے بہت ملتی جلتی ہے اصولاً بھی اور فروعاً بھی اسی واسطے فرمایا ہے فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا یعنی اتباع کرو ملت ابراہیم علیہ السلام کا یہاں پر ایک شبہہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت تو تمام ملل وادیان کی ناسخ ہے پھر ملت ابراہیمی کے اتباع کا آپ کو امر کیوں فرمایا جواب یہ ہے کہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا امر اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ملت ابراہیم ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ملت ابراہیمی بھی اسکا ایک لقب ہے اور یہ لقب اس لئے ہے کہ یہ دونوں ملتیں آپس میں اصولاً و فروعاً باعتبار فروع کثیرہ کے متناسب و متوافق ہیں اور اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ اِتَّبِعُوْا اِبْرَاهِيْمَ کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرو بلکہ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ فرمایا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جائے کہ مذہب حنفی اختیار کرو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ شریعت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتباع شریعت میں جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے وہ اختیار کرو اب یہاں سے ان معترضین کا اعتراض بھی جاتا رہیگا جو مقلدین امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کہا کرتے ہیں۔ کہ یہ لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں ۔ الحاصل جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام سے دینی بھی بہت قرب ہے اور نسبی بھی کہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے باپ ہیں تو اب یہ سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے روحانی باپ ہیں اور اس کی تین دلیل ہیں اول وجہ عقلی ہے وہ یہ کہ دیکھنا چاہیئے کہ باپ بیٹے کے ساتھ کیا کیا کرتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ باپ کا کام یہ ہے کہ محنت مشقت جھیلتا ہے اپنے اوپر طرح طرح کے مصائب اٹھاتا ہے جس طرح اس سے ہو سکتا ہے اولاد کو پرورش کیا کرتا ہے اسی طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ روحانی پرورش فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے واسطے باپ کی طرح بلکہ زیادہ قسم قسم کی تکالیف برداشت فرمائیں اور امت کی تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ پس آپ روحانی باپ ہوئے۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ

اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ یعنی نبی مومنین کے ساتھ ان کے نفوس سے بھی زیادہ قریب ہیں اور نبی کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں جب آپ کی بیبیاں ہماری مائیں ہیں حالانکہ وہ مربی امتہ نہیں ہیں صرف مربی کی بیبیاں ہیں تو خود آپ جو کہ مربی ہیں ضرور باپ ہیں اور اس ابوۃ اور امومیت کو اس درجہ قوت ہے کہ نبی کی بیبیوں سے بعد وفات کے نکاح بھی حرام ٹھہرا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔ لوگوں کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس آیت سے باپ ہونے پر کیسے استدلال ہو سکتا ہے بلکہ اس سے تو ابوۃ کی نفی مستنبط ہوتی ہے لیکن بعد تقریر مقصود کے انشاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائیگا کہ اس سے نہایت صاف طور سے ابوۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھی جاتی ہے جس میں کلام ہو رہا ہے۔ اول ایک مقدمہ عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد ہوتا ہے اور لکن کا مابعد ایک شبہ کا جواب ہوتا ہے جو لکن کے قبل سے پیدا ہوا ہے جیسے کہتے ہیں کہ زید آگیا لیکن اس کا بھائی نہیں آیا۔ اب اس آیت میں غور فرمایئے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد بظاہر سمجھ میں نہیں آتا اس لئے باپ نہ ہونے اور رسول ہونے میں کیا تضاد ہے حالانکہ تضاد ہونا چاہیئے تو غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جب فرمایا مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ تو اس سے شبہ ہوا کہ جب حق تعالیٰ نے ابوۃ کی نفی فرمادی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے کسی قسم کے باپ نہیں ہوئے اس لئے آگے لکن سے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہاں ایک قسم کے باپ ہیں وہ یہ کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں یعنی روحانی باپ ہیں کہ تمہاری روحانی تربیت فرماتے ہیں پس اگر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دلالت معنی ابوۃ پر معتبر نہ کی جاتی تو کلام میں ربط نہ ہوگا۔ غرض عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی باپ ہیں تو ثابت ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے باپ کے باپ ہیں اس لئے کہ جب صرف زوجیت کے تعلق سے آپ کی بیبیوں کو ہماری مائیں فرمادیا تو نسبی تعلق تو اس سے زیادہ ہے۔ اور قرآن شریف میں بھی آیا ہے مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ یہاں تو ظاہر ہے کہ روحانی باپ مراد ہیں کیونکہ خطاب یقیناً عام ہے یہ کلام تو تصحیح میں تھا اب سمجھئے کہ غرض اور نکتہ اس لفظ کے بڑھانے میں کیا ہے کیا سُنَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ کافی نہ تھا بات یہ ہے کہ باپ شفیق بیٹے کو قسم قسم سے سمجھایا کرتا ہے اور

ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے کہ ایسے عنوان سے اُس کو سمجھانا چاہیئے کہ مؤثر ہو جائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ باپ ہیں بلکہ باپ سے زیادہ شفیق ہیں اس لئے ترغیب کے مؤثر ہونے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان کو اختیار فرمایا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کی طبعی بات یہ ہے کہ اس کو اپنے باپ دادے سے اور ان کے رسم ورواج سے نہایت تعلق ہوتا ہے اور اس رسم کا دل سے نکلنا بہت بھاری ہے چنانچہ جب کفار کو بت پرستی سے رد کا جاتا تھا یا آجکل کی رسم مروجہ کو روکا جاتا ہے تو بڑا جواب یہ ہوتا ہے کہ ادھر سے اسی طرح ہوتی آئی ہے۔ غرض خاندانی بات کی بڑی پیچ ہوتی ہے اور یہی حکمت ہے حدیث اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ میں کہ یہی تخصیص کی وجہ ہے وہ یہ کہ دینِ اسلام کا ظہور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوا اور آپ قریش میں سے ہیں تو گویا دین قریش کے گھر کی چیز ہے سو جس قدر ان کو حمایت دین کی ہوگی اس قدر دوسرے کو نہ ہوگی باقی یہ کہ بنی ہاشم کو خاص کیوں نہیں کیا تو وجہ یہ ہے کہ بنی ہاشم بہ نسبت قریش کے بہت کم ہیں اور قریش زیادہ ممکن ہے کہ ان میں سے کسی وقت صاحب صلاحیت کی تلاش میں وقت ہوتی بہر اس حکمت سے تائید ہوگئی کہ خاندانی شئے سے بہت تعلق ہوتا ہے اور خصوصاً عرب میں کہ وہاں حمیتِ قومی کا بڑا جوش تھا جب یہ ثابت ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں کہ میاں یہ قربانی کرنا تو کوئی باہر کی بات نہیں ہے یہ تو تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے یہ تو خاندانی مذہب ہے اس کو کیوں چھوڑتے ہو۔ دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت پر کس قدر شفقت ہے کہ طرح طرح کے عنوانوں سے آپ ہم کو ترغیب دیتے ہیں کہ شاید عنوان مؤثر ہو جائے شاید وہ عنوان کافی ہو جائے اللہ اکبر بہرحال مقصود فضیلت بیان کرنا ہے اضحیہ کی رہا یہ امر کہ اس سے فضیلت کیسے ثابت ہوئی تو اسکا سمجھنا چند مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ اول یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت جو فرمایا تو اس کی کیا وجہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا تھا کہ جس کی وجہ سے اضحیہ سنتِ ابراہیمی ہوئی۔ سو کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا کہ اس کو معلوم نہ ہو کہ انھوں نے کیا کیا تھا انھوں نے یہ کیا تھا کہ بامر الٰہی اپنے پیارے بیٹے کے ذبح کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔ دوسرے مقدمہ یہ ہے کہ عزم شئے اس شئے کے کر دینے کے حکم میں ہے جو ثواب یا عقاب کسی فعل کے ارتکاب کرنے پر مرتب ہوتا ہے وہ ہی اُس فعل کے عزم پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر دولہا کے پاس جو بیوی کو پہچانتا نہ ہو کسی عورت کو اجنبی عورت کہکر بھیجدیا جائے حالانکہ وہ اس کی منکوحہ ہو

اور وہ اُس سے مجامعت کرے تو زنا کا گناہ ہوگا اور اگر منکوحہ بتلا کر اجنبیہ کو بھیجدے تو کچھ گناہ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر حلال کھانے کو کسی نے مغصوب کہا تو اس کا کھانا حرام ہے اور اگر حرام کو حلال کہدیا اور اس کو کوئی شبہ تو یہ نہیں ہوا تو اس کا کھانا حلال ہے ان مسائل سے معلوم ہوا کہ ثواب و عذاب کا مدار عزم پر ہے تو گویا ابراہیم علیہ السلام نے ذبح نہیں کیا لیکن عزم تو فرمایا بلکہ فعل کا وجود بھی ہوا گو امر تب نہیں ہوا یعنی چھری پھیر دی اور یہی سمجھ کر چھری پھیری کہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں لیکن حق تعالیٰ نے بجائے اُن کے مینڈھے کو بھیجدیا۔ پس حسب قاعدہ مذکورہ ان کو تو فضیلت ذبح ولد کی حاصل ہو گئی۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیئے بیٹے کے ذبح کرنے اور اللہ کی راہ میں نثار کرنے کا کتنا ثواب ہے تو قواعد شرعیہ سے یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ جس شئے کو خرچ کیا ہے وہ جس قدر زیادہ محبوب ہوگی اسی قدر زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ (تم ہرگز بھلائی حاصل نہ کرسکو گے جب تک کہ اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر زیادہ محبوب کا انفاق ہوگا اسی قدر برّ حاصل ہوگی اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے تو نفس برّ کا حاصل ہونا معلوم ہوا۔ فضیلت اس سے کیسے معلوم ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ برّ سے مراد برّ کامل ہے اور دلیل اس کی اگلی آیت ہے فرماتے ہیں وما تنفقوا من شیٍٔ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ یعنی یوں جو بھی تم خرچ کروگے اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں یعنی اس کا ثواب دے ہی دیں گے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہ محبوب شئے خرچ کی جائے یا غیر محبوب ثواب تو ہر صورت میں ہوتا ہے اس لئے کہ شئے بیان ہے ما کا اور وہ عام ہے شامل ہے ہر قلیل و کثیر کو پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ نفس ثواب تو تم کو ہر شئے کے انفاق میں مل جائے گا لیکن برّ خاص محبوب ہی کے انفاق میں ہے تو یہ اسلوب دال ہے اس پر کہ برّ سے مراد ثواب کامل ہے پس وہ مدعا ثابت رہا کہ شئے منفق جس درجہ محبوب ہوگی اسی درجہ کا ثواب زیادہ ہوگا پس جب یہ امر ثابت ہو چکا تو دیکھنا چاہیئے کہ بیٹے سے آدمی کو کس قدر محبت ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹے کے ساتھ اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اپنے لئے جو کمال انسان کو محبوب ہوتا ہے وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دوسرے کو ہو لیکن بیٹے کے لئے چاہتا ہے کہ ہر کمال میں مجھ سے بڑھ جائے ان مقدمات سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وہ کام کیا کہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا تو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب نہایت ہی عظیم الشان ہوگا۔ اس کے

بعد معلوم کرنا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضحیہ کو سنت ابراہیم علیہ السلام فرمایا ہے حالانکہ جو عمل ابراہیم علیہ السلام نے کیا وہ اور ہے اور تضحیہ دوسرا عمل ہے ابراہیم علیہ السلام کا عمل ذبح ولد ہے اور تضحیہ ذبح حیوان ہے پھر اضحیہ سنت ابراہیمی کیسے ہوئی تو یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم کو اضحیہ میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا دونوں عملوں کی غایت کی اتحاد کی وجہ سے دونوں عمل کو ایک فرمایا گو عمل متغائر ہوں گویا یہ فرمایا اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جانور کے ذبح میں وہی اجر ملیگا جو ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دیکھئے کہ کس قدر فضیلت اضحیہ کی اس حدیث سے معلوم ہوئی اور ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے ان کو ان کے مرتبے کے موافق انعام ملا کرتا ہے پھر اُن سے جو کم درجے کے ہیں ان کو اسی درجے کا انعام ملے گا مثلاً وزراء و ارکان دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چپراسیوں اور خدّام کو کم۔ پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے جلیل القدر ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام ان کو دیا گیا ہوگا ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جانا چاہیئے یعنی اگر یہی فعل ذبح ولد کا دوسرا کرتا تو وہ اس قدر انعام ملنے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جس قدر کہ ابراہیم علیہم السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں فعل بھی اس فعل سے ادون ہو وہاں تو اتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں مگر باوجود اس کے کہ یہ عمل ہمارا ذبح ولد سے بدرجہا ادون ہے پھر وہی انعام ہمارے لئے تجویز ہوا ہے اللہ اکبر کتنا بڑا انعام ہے اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسا کچھ لطف و کرم ہے یہ فضیلت تو اضحیہ کی ایسی ہے کہ اگر کسی کے ذمہ واجب بھی نہ ہو تو اس ثواب کی تحصیل کے واسطے وہ بھی نہ چوکے اور جس طرح بن پڑے بغیر کئے نہ رہے آخر دنیا کے بہت سے کام بلا ضرورت محض تفریح کے واسطے کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے اگر تھوڑا سا خرچ کر دو گے تو کیا حرج ہوگا اور اگر ضرورت ہی پر مدار رکھتے ہو اور یوں کہتے ہو صاحب جو فرائض و واجبات ہیں ہم تو وہی ادا کریں گے تو دنیا کے کاموں میں اس پر عمل کیوں نہیں ضرورت تو اس قدر ہے کہ سد رمق جو کی روٹی اور گرمی سردی مہلک سے بچاؤ کے واسطے گاڑھے گزی کا

کپڑا مل جاوے پھر یہ پلاؤ اور زردے اور کوفتے کیوں کھاتے ہو اور ململ وتن زیب ومخمل کیوں پہنتے ہو اللہ اکبر نفس کے خوش کرنے کو تو غیر ضروری کام بھی کریں اور دین کے کام میں یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب کیا بہت ضروری ہے اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس کا ترک بہت بڑا حرج ہے تو اس کا اہتمام کریں ورنہ ترک کردیں صحت اعتقاد کے لئے تو بیشک ضرور پوچھو کہ ضروری ہے یا نہیں کیونکہ ضروری کو ضروری اور غیر ضروری کو غیر ضروری اعتقاد رکھنا ضروری ہے لیکن کرنے کے لئے تو یہ پوچھنا کافی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل سے خوش ہوتے ہیں بلا تامل نہایت مستعدی اور رغبت سے اس کو کرو بہت لوگ محبت دین کا دم بھرتے ہیں اور بدنی اعمال میں مستعد ہیں لیکن روپیہ خرچ کرنیکا جہاں وقت آیا تو وہ حیلہ حوالہ کرتے ہیں۔ اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بدو کو کسی نے دیکھا کہ نہایت پریشان بدحواس ہے اور رو رہا ہے اور پاس روٹیوں کا تھیلا بھر ارکھا ہے کسی نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو کہا کہ میرا کتا مر رہا ہے اس شخص نے کہا کہ تھیلے میں کیا ہے کہنے لگا روٹیاں ہیں اس نے کہا کہ پھر اس کو کیوں نہیں دیتا کہنے لگا کہ اتنی محبت نہیں یہ کہتا کہ روٹی دوں کہ اس کو دام لگے ہیں صرف آنسو بہانے کی محبت ہے کہ مفت کے ہیں تو بعض لوگوں کی محبت کا دعوے بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جہاں ٹکا خرچ ہو وہاں صفر ہے اور یہاں تو درحقیقت خرچ بھی نہیں ہوتا کیونکہ صدقات وخیرات میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ کہیں جاتا نہیں جو کچھ ہے اپنے ہی لئے ہے بلکہ قربانی تو ایسی شئے ہے کہ کچھ ہاتھ سے بھی نہیں نکلتا اس لئے کہ ثواب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اجزاء قربانی کے تقسیم ہی کردو بلکہ اختیار ہے خواہ تقسیم کردو یا خود منتفع ہو ہاں بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔ غرض سب اپنے پاس سے رکھو جب بھی ثواب ملتا ہے اگر کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ خرچ کرا کر لیتے بھی نہیں پھر کیا چیز مطلوب ہے کیوں خرچ کرواتے ہیں اس سے مقصود کیا ہے اگر کہو گوشت کھلانا ہم کو منظور ہے تو منیٰ اور مکہ معظمہ میں ہزاروں جانور ذبح ہوتے ہیں ان کا کوئی گوشت بھی نہیں کھاتا بالکل ضائع ہوتے ہیں اور یہ عقل کے خلاف ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو فحش بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شئے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقے سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک

بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہ خانہ میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اسکا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی کس طرح پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئیگا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقے سے انسان پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم کو خلاف عقل معلوم نہیں ہوتا تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلاف عقل ہیں ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا کہ چار روٹیاں ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھا لو پی لو اور باتیں بنا لو جب اتنی عقل ہے تو اسرار شریعت کہاں سے سمجھ میں آئیں۔ ایسے ہی نفس اضحیہ بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے اور اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابل انکار کیسے ہوگئی اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اُس حکمت و راز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنت ابراہیمی کا اتباع ہے اور شئے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح ولد کے کر دیا اور یہاں سے ایک امر اور بھی ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ جب قائم مقام ولد کے ہے تو اس جانور کے اندر ضرور ایسے صفات ہونا ضروری ہیں کہ جن سے قائم مقام ولد کے ہو وہ یہ کہ خوب موٹا تازہ جانور ہو کہ ذبح کرتے ہوئے کچھ تو دل دُکھے جیسے ذبح ولد میں دل دکھتا۔ بالکل مریل تھو کہ جس کے ذبح ہو جانے کو غنیمت سمجھے کہ مرتا تو یہ ضرور خیر اچھا ہوا اس سے یہی کام نکل آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفیاں تھیں یہ جو لوگوں کی عادت ہے کہ ردّی خدل کم قیمت جانور ذبح کر دیتے ہیں یاد رکھو کہ وہاں بھی ایسا ہی ملے گا اور جبکہ وہ پھر تم کو ہی ملنے والا ہے تو جس قدر اس میں خرچ کرو گے اپنے ہی واسطے ہے اور یاد رکھو صدقہ سے مال گھٹتا نہیں حدیث شریف میں ہے لَا یَنْقُصُ مَالٌ مِّنْ صَدَقَۃٍ قَطُّ اور اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اگر دس روپیے پاس تھے تو دس ہی رہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ برکت ہوتی اور کام آتا ہے اگر صدقہ نہ دیتا تو وہ ادھر اُدھر ضائع ہو جاتا اور صدقہ

دینے سے جس قدر باقی رہتا ہے وہ سب اسی کے کام آتا ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آجکل کے نو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سر تا سر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہار محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے پھر مال ضائع کہاں ہوا۔ اور اگر کہا جائے کہ جی دکھتا ہے کہ ہماری شئے جاتی رہی جواب یہ ہے کہ وہ تمہاری شئے ہے کہاں تم خود تو اپنے ہو ہی نہیں تمہاری شئے کہاں سے آئی تم خود مملوک ہو غلام کسی شئے کا مالک نہیں ہوا کرتا اگر کوئی کہے کہ ہم مملوک نہیں ہیں اول تو کون ایسا ہوگا جس کا یہ اعتقاد ہو کہ ہم اللہ کے مملوک نہیں ہیں دوسرے یہ کہ اس کی ایک دلیل بھی ہے وہ یہ کہ دیکھو خودکشی حرام ہے اگر تم اپنے مالک ہوتے تو اپنے اندر جو چاہتے تصرف کر سکتے تھے پس آپ بھی خدا کے ہیں اور جانور بھی خدا کے اگر کوئی کہے کہ جناب مال خرچ کرنے سے تو دل تنگ نہیں ہوتا بلکہ اس سے دل دکھتا ہے کہ جانور کی جان ضائع ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ آپ بے فکر رہئے جب خود مالک ہی ضائع کرائے تو آپ کون ہیں بڑے دردمند نکل کر آئے ہیں۔

ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر ست (جس عیب کو بھی بادشاہ پسند کرے وہ ہنر ہے)

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(اگر دین کا بادشاہ مجھ سے یہ خواہش کرے کہ میں لالچ اور حرص کروں تو اس کے بعد قناعت پر خاک ڈال دینا چاہیئے)

اور اگر کسی طرح اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو اس طرح سمجھو کہ بعض دوائیں تو مؤثر بالکیفیت ہوتی ہیں اور بعض مؤثر بالخاصہ ہم یہ کہتے ہیں کہ نصوص سے ثابت ہو گیا کہ یہ اعمال صالحہ مؤثر بالخاصہ ہیں ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ اضحیہ ہمارے لئے نافع ہے اس میں یہ خاصہ ہے ہم کو لم اور علت معلوم نہیں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے عزیز محمد بن ذکریا طبیب اگر کہہ دیں کہ فلاں دوا میں یہ خاصہ ہے تو اس کے کہنے پر تو ایسا یقین رکھتا ہے کہ اس میں شبہ ہی نہیں ہوتا اور محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کسی فعل کا خاصہ بیان فرما دیں تو اس میں تجھ کو شبہ ہوتا ہے بفضلہ تعالیٰ بقدر ضرورت فضیلت اضحیہ کی ثابت ہو گئی اس وقت میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں فقط۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

ضرورۃ التوبۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔اے جناح روڈ

دعواتِ عبدیت جلد سوم

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

ضرورۃ التوبہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد ریاست خیرپور سندھ	۲۷ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ	۲ گھنٹے	کھڑے ہوکر	ضرورۃ توبہ	مولوی سعید احمد صاحب	تقریباً ۲۰۰ آدمی	عہدہ داران ریاست زیادہ تھے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ

تَوْبَةً نَّصُوحًا ط عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط (اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے آگے سچی توبہ کرو امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کردیں گے اور تم کو جنت کے ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی)

یہ ایک آیت ہے سورۂ تحریم کی اس میں خدا تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو اپنی رحمت کاملہ سے ایک عجیب وغریب نسخہ اکسیر کا دیا ہے جس سے لوہا بھی سونا ہو جائے۔ دیکھئے لوگ کیمیا کی تلاش میں اپنا عزیز مال اور وقت ضائع کرتے ہیں حالانکہ کیفیت اس کی یہ ہے کہ حکماء اس کے وجود ہی میں مختلف الرائے ہیں بعض کہتے ہیں کہ کیمیا کا وجود ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں پس اس کا وجود مشکوک ہوا تو یقینی نفع کو یعنی مال اور وقت کو ایک موہوم توقع میں برباد کردیتے ہیں اور اگر مان بھی لیا جائے کہ کیمیا کا وجود ہے تو آپ نے بہت کم سنا ہوگا کہ کسی نے کیمیا بنائی ہو اگرچہ اس قسم کے واقعات بہت مشہور ہیں لیکن اس کا وقوع ثابت ہونا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اس کا وجود مشکوک ہی رہا اور اس کے وقوع میں احتمال ہی رہا اور احتمال وہ چیز ہے کہ اس کی بنا پر بہت ضروری ہے منفعت موہوم واجب السعی نہیں اور مضرت موہوم واجب الاحتمال ہے بالخصوص جبکہ اس میں کوئی فوری مضرت ہو کیمیا بھی ایسی ہی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے یقینی نفع کو نقصان پہنچتا ہے اسی لئے فقہا نے اس کو ناجائز کہا ہے حتیٰ کہ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کسی متولی وقف کی نسبت یہ معلوم ہو کہ وہ کیمیا کی لت میں ہے تو اس کو موقوف کردیا جائے۔ اسی طرح جتنے جرائم قانونی ہیں سب میں مضرت ہے اگرچہ مضرت فوری نہ ہو بلکہ اس کے مآل میں ضرر ہو دیکھئے جوا کھیلنے میں فوری نفع ہے اور اس وجہ سے وہ طبعاً مطلوب ہے مگر مآل اس کا ہمیشہ تباہی و بربادی ہوتا ہے اور یہاں سے ایک عجیب راز معلوم ہوگیا ہوگا ایک وجدانی شبہ کے رفع کا کہ اکثر لوگوں کو گناہوں کے چھوڑنے میں گرانی ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس قدر نفع اور لذت کی چیز ہے لیکن شریعت اس کو منع کرتی ہے حتیٰ کہ ہمارے روشن خیال حضرات تو علماء کو رلائے تک دینے لگے ہیں کہتے ہیں کہ ترقی وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ سود حلال نہ ہو جائے اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی ترقی کے مانع نماز ہے کہ ایک شخص اسلام کی طرف راغب ہوتا ہے

مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ نماز بھی گلے پڑے گی تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اسلام لانے سے رُک جاتا ہے تو نماز کو اسلام کی برادری سے علیحدہ کرنا چاہیئے۔ افسوس یہ مسلمانوں کی رائے ہے۔ صاحبو! مجھے اس موجودہ رفتار سے سخت اندیشہ ہے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ایک جانب تو احکام اسلامیہ کے استحسان کو ماننے جانتے ہیں اور اُن پر مضامین لکھتے ہیں کوئی نماز کی حکمت بیان کرتا ہے کوئی روزے کی حکمت بیان کرتا ہے ایک ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں جو یہ تعلیم ہے کہ اگر کسی برتن کو کتا چاٹ جائے تو اس کو سات مرتبہ دھو ڈالو جس میں ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرو۔ ایک مدت تک میں سوچتا رہا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ مٹی سے صاف کرنے کو کہا گیا آخر غور کرنے اور مٹی کے اجزاء کو دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مٹی میں ایک جزء نوشادر کا بھی ہوتا ہے اور وہ کتے کے لعاب دہن کی سمیت کو دفع کر دیتا ہے۔ ایک عیسائی نے لکھا ہے کہ شریعت اسلامی کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں یعنی کوئی حکم خلاف عقل نہیں اگرچہ بعض احکام احاطۂ عقل سے باہر ہوں اور عقل ان کی لم دریافت نہ کر سکے اُدھر تو ان اجانب کی مدح سرائی کا یہ حال اِدھر ہمارے مسلمان بھائیوں کی یہ حالت نہ دین سے واقفیت نہ متابعت اور اعتراض کرنے کو آمادہ ہیں اسلامی تعلیم کے خلاف مضامین شائع کرتے ہیں کہ روزہ میں یہ خرابی ہے اور نماز سے ترقی رکتی ہے اگر یہی رفتار ہے تو عجب نہیں کہ ایک صدی کے اندر اندر بہت سے مسلمان بالکل دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں اور غیر مسلم مسلمان ہو جائیں۔ صاحبو! حیرت کی بات ہے مجھے خدا تعالیٰ کا وہ قول یاد آیا ہے فرماتے ہیں اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝ کہ یہ نہ سمجھو کہ مدار دین کا اور اس کی ترقی اور اشاعت کا تم پر ہے۔ یاد رکھو اگر تم اسلام سے رُو گردانی کرو گے خدا تعالیٰ تمہارے بجائے ایک دوسری قوم بھیجے گا جو تمہاری طرح نہ ہو گی تم کو تو احسان مند ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو ایسی نعمت دی قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ ط (کہہ دیجئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت رکھو بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر احسان جتاتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت کی)

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

(یہ احسان مت رکھ کہ تو بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ اس کا احسان مان کہ اس نے تجھ کو اپنی خدمت کے لئے رکھ لیا ہے)

تو خدا تعالیٰ کا ہم پر احسان ہے کہ ہم کو نورِ اسلام دیا ہمارا کیا احسان ہے۔ صاحبو! اس آیت میں اور اپنی حالت میں ذرا غور کرو استبدال کی یہ بھی صورت ہے کہ جو آجکل ہو رہی ہے کہ مسلمان اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور غیر قومیں اسلام کی طرف جھکتی چلی جا رہی ہیں تو گویا موجودہ حالت تمہید ہے استبدال کی۔

اگر اس اندیشہ سے بچنے کی فکر ہے تو اس کی تدبیر یہی ہے کہ اپنے اس رویہ کو چھوڑو اور وہ حالت پیدا کرو کہ جیسے ایک غلام کی حالت ہوتی ہے خدا تعالیٰ سے جو ہمارا تعلق ہے وہ آقا اور نوکر کا سا نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق خدا سے سید اور غلام اور محب اور محبوب کا ہے پس ہم کو ان ہی دو تعلقوں کو غلبہ دینا چاہیئے کہ اپنے کو مملوک اور اس کو مالک اور اپنے کو محب اور اس کو محبوب سمجھیں لیکن ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو محب نہیں بنتے کہ ہم پر حقوق واجب ہوں تو میں کہوں گا کہ حضرات اب آپ کیا محب نہیں بنیں گے محب تو آپ اس دن ہو چکے جس دن مسلمان کہلائے کیونکہ یہ قاعدہ مسلّمہ ہے کہ الشیئ اذا ثبت ثبت بلوازمہٖ کہ جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اور اسلام کے لوازم سے ہے محب ہونا فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (اور وہ لوگ جو ایمان دار ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ زیادہ محبت رکھنے والے ہیں) اور شدتِ محبت ہی کا نام عشق ہے پس آپ تو عاشقِ خدا ہو چکے اور اگر کہیئے کہ ہم کو تو اپنا عاشق ہونا معلوم بھی نہیں پھر ہم کیونکر عاشق ہوئے تو سمجھئے کہ کسی وصف کے حاصل ہونے کے لئے یہ ضرور نہیں ہے کہ اس کا علم یا اس کی طرف التفات بھی ہو۔ دیکھئے اگر ایک شخص مر ے اور دس ہزار کی جائیداد چھوڑ جائے یا بنک میں دس ہزار روپیہ چھوڑے اور ایک نابالغ لڑکا وارث چھوڑے تو باپ کے مرنے کے بعد اس لڑکے کے لئے وصفِ مالکیت ثابت ہوا لیکن اس لڑکے کو خبر بھی نہیں تو ہماری بھی یہی حالت ہے کہ ہم کو عشق ہے اگرچہ خبر نہیں اور اس کی طرف

التفات نہیں گویا وہ حالت یہ ہے کہ ؎

یک سبد تانے ترا بر فرق سر تو ہمے جوئی لب نان دربدر

(کہ ایک ٹوکرا بھرا ہوا روٹیوں کا سر پر رکھا ہوا ہے اور بھیک مانگتا پھرتا ہے)

اور طریقہ خبر ہونے کا یہ ہے کہ ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں رایک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(برسوں تک تو پتھر کی طرح دل کو تکلیف دینے والا رہا آزمائش کے طور پر ہی تھوڑی دیر کے لئے مٹی بن جا۔ بہار کے موسم میں بھی پتھر کب سرسبز ہوتا ہے تو مٹی بن جا تاکہ تجھ میں رنگ برنگ کے پھول اگیں)

کہ آزمانے ہی کے لئے ایک تھوڑی مدت خاک ہو جاؤ تو آپ اگر اپنی دولت کی خبر چاہتے ہیں تو اپنے ادراک سے خبر لیجئے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ آنکھ ہو کیونکہ مثلاً اگر ایک نابینا مادرزاد سے رنگ کی حقیقت پوچھے تو اس سے یہی کہا جائیگا کہ رنگ تو تمہارے کپڑے ہی میں موجود ہے مگر اس کے لئے صرف ہاتھ کافی نہیں نہ محض سُن لینے سے اس کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے اگر اس کو دریافت کرنا چاہو تو اول آنکھ پیدا کرو۔ اسی طرح جو لوگ قرآن شریف میں تاویلیں کرتے ہیں اور اپنی رائے سے قرآن شریف کے معنے بیان کرتے ہیں تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ہاتھ سے رنگ کا دریافت کرنا جس طرح محض ہاتھ سے رنگ دریافت نہیں ہوتا اسی طرح محض رائے سے قرآن کے مقصود تک نہیں پہونچا جا سکتا ؎

بر ہوا تاویل قرآن میکنی پست و کثر شد از تو معنی سنی

چوں ندارد جانِ تو قندیلہا بہر بینش میکنی تاویلہا

کردہ تاویل لفظِ بکر را خویش را تاویل کُن نے ذکر را

(تو اپنی خواہش کے موافق قرآن کے معنے بیان کرتا ہے تیری وجہ سے اچھے معنی خراب ہوگئے ہیں جبکہ تیرے پاس روشنی کی قندیلیں نہیں ہیں تو تو اس کے دیکھنے کے لئے تاویلیں کر رہا ہے تو نے لفظ بکر کی تاویل کر دی ہے یعنی نئی نئی تاویلیں کر رہا ہے حالانکہ تجھے اپنی

خواہشات کو بدل کر قرآن کے موافق کرنا چاہیے قرآن کو نہیں بدلنا چاہیے)

صاحبو! اپنے اندر تصرف کرو کلام اللہ میں تصرف نہ کرو اپنی آنکھیں کھولو اور اس سے حجاب اٹھاؤ پھر دیکھو تم کو کیا کنز مکنوں نظر آتا ہے اور وہ حجاب حُبّ دنیا ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ مال وجاہ کی محبت بہت بڑا حجاب ہے اسی کی محبت تھی کہ بنی اسرائیل کے علماء باوجودیکہ ان کو آپ کا نبی ہونا معلوم تھا لیکن ایمان نہ لاتے تھے جانتے تھے پر مانتے نہ تھے یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (وہ اس کو اتنا جانتے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں) لیکن باوجود اتنی معرفت کے ان کو حقیقت نظر نہ آتی تھی کیونکہ حُبّ مال وجاہ کا حجاب آنکھوں پر پڑا ہوا تھا اور جب حقیقت معلوم نہیں ہوتی تو دل میں وقعت اور عظمت نہیں ہوتی۔ دیکھئے اگر کوئی آگ میں کود ے تو اگرچہ کہا جائے گا کہ یہ آگ کو جانتا تھا لیکن یہ نہ کہا جائے گا کہ آگ کی حقیقت اس کی نظر میں تھی اور جتنے جرائم اس قسم کے لوگ کرتے ہیں اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کو اصلی حقیقت اس چیز کی معلوم نہیں ہوتی اکثر عورتیں اور بعض مرد بھی کنوئیں میں گر جاتے ہیں لیکن گرنے کے بعد جب ان کو کنوئیں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اس وقت کوئی ان سے پوچھے کہ کنوئیں میں گرنے کی بابت اب آپ کا کیا فتویٰ ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب نے کسی بات پر طیش میں آکر سنکھیا کھالیا کھا تو گئے لیکن جب کھانے کے بعد اس کی حقیقت معلوم ہوئی تو آنکھیں کھلیں پھر یہ حالت تھی کہ لوگوں سے التجائیں کرتے تھے کہ کسی طرح مجھے اس سے نجات دلواؤ۔ تو بنی اسرائیل کو اگرچہ معرفت تھی لیکن آپ کی حقیقت اُن سے مخفی تھی اس لئے کہ حجابات مرتفع نہ ہوئے تھے اور سہ

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد   صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

(جب کسی کام میں ذاتی غرض پیش نظر ہوتی ہے تو بھلائی اور ہنر چھپ جاتا ہے اور دل کی طرف سے سیکڑوں پردے اٹھ کر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں)

پس آپ ان حجابوں کو دور کر دیجئے حقیقت بالکل قریب ہے بلکہ حقیقۃ الحقائق جل وعلا کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم تو اس کی گردن کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں)

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے خداوند تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا کہ یَارَبِّ دُلَّنِیْ عَلٰی اَقْرَبِ طُرُقِ اِلَیْکَ کہ اے خدا مجھے آپ تک پہنچنے کا وہ رستہ بتلا دیجئے جو سب سے زیادہ قریب کا ہو۔ سبحان اللہ کیسے سچے رہبر تھے کہ ہمارے لئے کتنا سہل رستہ تحقیق کر گئے۔ یہ آج جو لوگ آسانی سے منزلیں طے کرتے چلے جا رہے ہیں انہیں حضرات کا طفیل ہے۔ غرض خواب میں عرض کیا کہ اے خدا مجھے قریب کا رستہ بتلا دیجئے ارشاد ہوا کہ یَابَایَزِیْدُ دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالْ کہ پندار اور خود بینی کو چھوڑ دو پھر رستہ سیدھا ہے بے خطر چلے آؤ اس مضمون کا عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق اور معشوق کے درمیان میں کسی چیز کا بھی پردہ نہیں ہے اے حافظ تو خود ہی پردہ بنا ہوا ہے تو ہی درمیان سے ہٹ جا)

حقیقت میں سچ کہا ہے صاحبو! اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پاس دولت حُبِّ خداوندی ضرور ہے بلکہ اہل تدقیق تو کہتے ہیں کہ کفار کو بھی خدا تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ قرآن شریف میں کفار کو محرومی دیدار کی دھمکی دی گئی ہے۔ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ؕ (قیامت کے روز وہ کفار اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے) کہ ان کو خدا کا دیدار نصیب نہ ہوگا اور محرومی دیدار سے اُسی وقت دھمکی ہو سکتی ہے کہ جب ان کو خدا سے محبت ہو اور محرومی کی خبر سے ان کو تکلیف پہونچے اس کے علاوہ اس کا ایک بدیہی ثبوت بھی ہے کہ ہم لوگ اپنے خیال میں جس کو دین سمجھتے ہیں اگر کسی کو اس کے خلاف دیکھتے ہیں تو ہم کو اس پر کس قدر طیش آتا ہے کہ ہم اس کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں اور دل کو اس سے نفرت ہو جاتی ہے آخر یہ نفرت اور وحشت کیوں ہے اس لئے کہ وہ طریق جس کو ہم دین سمجھتے ہیں ہمارا محبوب ہے کیونکہ وہ ہمارے خیال میں خدائی رستہ ہے جو کہ خدا نے ہم کو بتلایا ہے پس ہماری محبت کی ایسی مثال ہے جیسے کہ راکھ کے نیچے چنگاری دبی ہوتی ہے کہ اگر اس کو چھیڑا اور کریدا نہ جائے تو وہ نظر بھی نہیں آتی لیکن جب وہی چنگاری راکھ سے باہر نکلتی ہے تو شہر کے شہر جلا دینے

کے لئے کافی ہوتی ہے اور اگر کسی کو اب بھی شک رہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر براہ راست خدا سے محبت معلوم نہیں ہوئی تو اس شخص کو کسی سے تو محبت ہوگی۔ کم از کم اپنی جان سے تو ضرور اُس کو محبت ہوگی۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محبت کسی نہ کسی کمال کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے علم و فضل حسن صورت حسن سیرت اور تیسرا مقدمہ یہ ہے اور مسلّم ہے کہ ہر کمال ظلِ کمال خداوندی ہے تو ہر شخص اگرچہ وہ کسی کا عاشق ہو واقع میں کمالِ خداوندی کا عاشق ہے اور یہی معنی ہیں محبت خدا کے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے دیوار پر دھوپ دیکھی اور اس نور کی وجہ سے وہ دیوار کا عاشق ہو گیا اس صورت میں ہر شخص جانتا ہے کہ یہ شخص واقع میں دیوار کا عاشق نہیں آفتاب کا عاشق ہے کیونکہ دیوار کا عشق ایک کمال کی وجہ سے پیدا ہوا تھا یعنی نور اور وہ کمال واقع میں آفتاب کا کمال ہے نہ کہ دیوار کا یہی وجہ ہے کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے اور اس سے وہ نور زائل ہو جائے عشق بھی زائل ہو جاتا ہے اسی کو کہا ہے ؎

عشق با مردہ نہ باشد پائدار ۔۔۔ عشق را با حیّ و با قیوم دار

عشق ہائے کز پئے رنگے بود ۔۔۔ عشق نبود عاقبت ننگے بود

عاشقی با مُردگاں پائندہ نیست ۔۔۔ زانکہ مُردہ سوئے ما آیندہ نیست

(مرنے اور فنا ہونے والے کے ساتھ عشق و محبت مضبوط نہیں ہوتے عشق اس ذات کے ساتھ قائم کر جو زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ جو محبتیں رنگ و روپ کی وجہ سے ہوتی ہیں وہ عشق نہیں ہے اس کا انجام تو شرمندی ہے۔ مردوں کے ساتھ عشق کرنا قائم نہیں رہتا اس لئے کہ مرنے والا مر کر پھر ہماری طرف آنے والا نہیں ہے)

علیٰ ہذا جس چیز کا بھی جو کمال ہے وہ واقع میں کمالِ خداوندی کا ظل ہے خود اس کا ذاتی نہیں دیکھئے ہر چیز کمال کے ساتھ اگر ایک وقت متصف ہے تو دوسرے وقت اس سے خالی بھی ہے تو اس خلو کی یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک وہ کمال خدا تعالیٰ کی جانب سے عطا نہیں ہوا اسی طرح جب اس کے ساتھ اتصاف ہوتا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ اُدھر سے فیضان ہو گیا اس لئے ایک بزرگ لکھتے ہیں ؎

حسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردہٗ پس بچشمِ عاشقاں خود را تماشا کردہٗ

(تونے اپنی خوبی کو خوبصورتوں کے چہرے سے ظاہر کر دیا ہے مگر تو عاشقوں کی نظروں میں تماشا بن گیا ہے)

اس کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ خدا کو حسینوں کے ساتھ اتحاد ذاتی ہے یا اس نے ان میں حلول کیا ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو ایمان کے بالکل خلاف ہے اور کفر ہے کوئی عامی بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا اگر ذرا سمجھ سے کام لے چہ جائیکہ کسی صاحب دل کے کلام کے یہ معنے ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اُس ذات مستجمع الصفات کے مظہر ہیں اور اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل کی اس موقع پر ضرورت نہیں یہ فن کا مستقل مسئلہ ہے غرض جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ عشق کمال سے ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہر کمال واقع میں کمالِ خداوندی ہے اگرچہ وہ دوسرے کے اندر نظر آئے تو یہ بات بلاشک ثابت ہوگئی کہ ہر عاشق خدا کا عاشق ہے اس کے معلوم کر لینے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ عاشق کو معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اس کے دل میں معشوق کی کتنی عظمت اور وقعت ہوتی ہے کیا اگر کسی عاشق کو اس کا معشوق حکم کرے کہ تم میرے پاس آؤ یا گرمی کے چلچلاتے ہوئے دوپہر میں چار کوس تک برہنہ پا چلتے ہوئے ریت پر چلنے کا حکم کرے تو وہ عاشق انکار کرے گا یا اُس سے اس حکم کے مصالح پوچھے گا۔ ہرگز نہیں اور اگر کوئی مدعی عشق اپنے معشوق کے حکم پر لِمَ اور کَیف کرے تو کیا اس کو اس دعوے میں سچا کہا جائے گا کبھی نہیں ظاہر ہے کہ اگر اس کو سچا عشق ہوگا تو اُس کے بلانے پر دوڑا ہوا آئیگا بلکہ اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہیں رُکے گا۔ اور کہے گا کہ مجھ میں امتثال کی وہ حرارت بھری ہے کہ یہ روک اس کے سامنے کچھ بھی نہیں غرض کسی قسم کے کسی امر و نہی میں اس کو ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا لوگ اُس کی حرکات پر اس کو دیوانہ بتلائیں گے پاگل کہیں گے مگر اس کو ان خطابوں سے ذرا عار نہ ہوگی بلکہ وہ نہایت خوش ہوگا اور کہے گا کہ ؎

ما اگر قلاشِ و گر دیوانہ ایم مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر غریب و مفلس یا اگر دیوانہ ہیں تو کیا ہوا ہم تو اس ساقی اور اس حقیقی پیالے کے مست

دعاشق ہیں)

جس طرح آجکل کے عقلاء علماء دین کو نیم وحشی وغیرہ وغیرہ خطاب دیتے ہیں لیکن وہ نہایت مسرور ہیں اس واسطے کہ ان کا یہ مذہب ہے کہ ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ وھوالاحبۃ منہ فی سودائہ

کہ ملامت گر کی ملامت تو قلب کے باہر ہے اس کے گرد اگرد چکر اکر رہ گئی ہے اور محبت سویدائے قلب تک پہنچ کر جاگزیں ہو چکی ہے الحاصل جب معلوم ہوا کہ عاشق کو معشوق کے ساتھ یہ برتاؤ چاہیئے اور ہم خدا کے عاشق ہیں جیسا ابھی ثابت ہوا تو ہم کو بھی اس کے ساتھ یہی برتاؤ رکھنا چاہیئے اور اس کے احکام کے امتثال میں بے چون وچرا گردن جھکا دینی چاہیئے مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طالبعلمی کہ چون وچرا نکند و ہر درویشے کہ چون وچرا کند ہر دو را در چراگاہ باید فرست (جو طالب علم استاد سے پوچھ پوچھ کر اپنی معلومات نہ بڑھائے اور جو درویش اپنے پیر سے جھک جھک کرے دونوں اس قابل ہیں کہ ان کو جنگل کی طرف بھگا دیا جائے)

وجہ یہ ہے کہ طالب علم اور تعلم کے وقت طلب فن میں ہے اور حصول فن کے لئے لازمی ہے کہ سوالات کرے اور قیل وقال سے مسئلے کی تہ تک پہنچے اور سالک سلوک کرتے وقت عمل میں مشغول رہے اُس کے لئے جرح وقدح موجب حرمان اور سبب ہلاکت ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک حکیم کے مطب میں کچھ مریض بھی علاج کرانے کو آئیں اور کچھ لوگ طلب فن کے لئے درسیاتِ طب پڑھنے بھی آئیں پس اگر ان طالبین فن میں سے کوئی شخص درس کے وقت بالکل خاموش بیٹھا رہے اور کسی قسم کا سوال نہ کرے تو وہ طبیب اس کو نالائق کہکر درس سے اٹھا دے گا لیکن اگر کوئی مریض نسخہ لکھواتے وقت کسی قسم کی چون وچرا کرے اور ادویہ یا ان کے اوزان کی حکمت دریافت کرنے لگے تو اس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہوگا۔ غرض طالب علم کا کرید کرنا اور حکمت و مصلحت دریافت کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع نہیں اور عوام کا چون وچرا کرنا بُرا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بے موقع ہے۔ لیکن یہ مرض کچھ ایسا عام ہوا ہے کہ ہر شخص احکام کی حکمتیں دریافت کرنے کے درپے ہے

اور اپنے کو حکمتیں سمجھ لینے کے قابل سمجھتا ہے۔ ایک شخص نے جو کہ پٹواری گری کرتے تھے میرے پاس ایک مسئلہ فرائض کا بھیجا۔ صورت مسئلہ یہ تھی کہ ایک شخص مرا اور اس نے ایک بھتیجا اور ایک بھتیجی چھوڑی۔ میں نے جواب دیا کہ بھتیجے کو حصہ پہونچے گا اور بھتیجی محروم ہوگی۔ کہنے لگے کہ آخر اس کی کیا وجہ بھتیجی بھی تو اس بھتیجے کی بہن ہی ہے اس کو کیوں نہیں ملے گا۔ میں نے کہا کہ جناب آپ پٹواری گری کرتے ہیں اس کو چھوڑیئے اور آکر درسیات شروع کیجئے۔ تین چار برس تک عربی کی کتابیں پڑھئے اس کے بعد پھر دریافت کیجئے تو بتلا دیں گے۔ راز اس میں وہی ہے طالب علم طالب فن ہوتا ہے اور عوام محض عمل کے لئے مسئلہ دریافت کرتے ہیں ان کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ حکم مسئلہ کا معلوم ہو جائے بس۔ دوسرے ایک راز اس میں یہ بھی ہے کہ طالب علم کو یہ تمیز ہوتی ہے کہ کونسی بات دریافت کرنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں اس لئے وہ جو کچھ دریافت کرتا ہے سمجھ بوجھ کر کام کی بات پوچھتا ہے۔ برخلاف عوام کے کہ ان کو اس کی تمیز نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی۔ میں نے بطور نظیر کے ان سے یہ پوچھا کہ اول یہ بتلایئے کہ آپ کی ناک چہرے پر کیوں لگائی گئی کمر پر کیوں نہیں لگائی گئی جب اس ترتیب کے وجوہ اور مصالح سب آپ کو معلوم ہو جائیں تو اس کے بعد اوقات نماز کی تعیین کے مصالح دریافت کیجئے گا غرض جس کو فن سے مناسبت نہیں ہوتی اس کا بولنا ہمیشہ بے موقع ہوتا ہے اور اس لئے وہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ایک مرتبہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے کچھ بیان فرما رہے تھے اور لوگ لکھ رہے تھے اور پوچھ بھی رہے تھے ان ہی میں ایک شخص بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی تم بھی کچھ پوچھو۔ عرض کیا اب پوچھوں گا۔ بیان میں آپ نے فرمایا کہ جب آفتاب غروب ہو جائے تو افطار میں دیر نہ کرے۔ اس شخص نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ بولوں۔ امام صاحب نے فرمایا کہو۔ تو کہنا ہے کہ اگر کسی روز آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کریں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ تمہارا خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔

اسی طرح مشہور ہے کہ ایک دلہن بالکل بولتی ہی نہ تھی اس کی ساس نے اس سے کہا دلہن تم بھی بولا کرو تم خاموش کیوں رہتی ہو دلہن نے کہا کہ بہت اچھا اب بولوں گی۔ چنانچہ

ایک روز بولی۔ساس کو خطاب کرکے کہنے لگی کہ اماں بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر تمہارا لڑکا مر گیا تو میرا نکاح کسی دوسرے سے بھی کردو گی۔ساس نے کہا کہ دلہن بس تم خاموش ہی رہا کرو تمہارے لئے وہی بہتر ہے۔ تو دیکھئے تمیز نہ ہونے کی وجہ سے بات بھی پوچھی تو کیسی خوبصورت کہ ساس کا کلیجہ ہی ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کی برابر ہوتے ہیں تو جس شخص کو اقلیدس سے مناسبت نہ ہو اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکتا کہ کیونکہ تین زاویے دو قائموں کی برابر ہوں گے اگرچہ اس کو سمجھانے کے لئے کوئی اقلیدس ثانی ہی پیدا ہو ہاں اگر اس کو سمجھنے کا شوق ہے تو اول اقلیدس حاصل کرے اس کے بعد نہایت آسانی سے یہ مسئلہ اس کو حل ہو جائے گا کیونکہ وہ علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ سے واقف ہوگا بلکہ جب اقلیدس سے مناسبت ہو جائے گی تو اپنے اس پہلے سوال پر ہنسے گا اور کہے گا کہ واقعی میرا سوال قبل از وقت تھا میں اس سے بھی زیادہ واضح مثال دیتا ہوں اگرچہ وہ ایک گونہ فحش مثال ہے لیکن اس سے یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ قبل از وقت کوئی چیز سمجھ میں نہیں آسکتی فرض کرو کہ ایک بہت بڑا ماہر حکیم ایک چار برس کے بچے کو جماع کی لذت اور اس کا طریقہ سمجھانا چاہے یہ ممکن ہے کہ وہ بچہ آرے اور بلے کہدے لیکن اس کی حقیقت کبھی اس کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ البتہ وہی بچہ جب تھوڑے دن کے بعد جوان ہوگا اور سن بلوغ کو پہونچیگا تو بغیر کسی کی تعلیم کے خود بخود لذتِ جماع کی حقیقت ذوقی کے طور پر اس کو معلوم ہو جائے گی اور اگر خود نہ بھی معلوم ہوئے تو تھوڑا سا اشارہ کافی ہوگا لیکن طالب علم بھی اگر کسی وقت طلب عمل میں ہو تو اس وقت اس کو بھی مناسب نہیں کہ اس عمل کی حکمتیں دریافت کرے مثلاً ایک طالب علم کو نماز میں کوئی شبہ ہوا اور اس نے کسی عالم سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو اس وقت اس کو مناسب نہیں کہ اس عالم کے جواب میں چون و چرا کرے اور علل دریافت کرنے کے درپے ہو بلکہ اس وقت سن کر تسلیم کرے اور اسرار کے دریافت کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھے اور اگر اس وقت دریافت کرے گا تو مجیب اگر حکیم ہے تو بھی اس کو جواب نہ دے گا اور اگر نرا خلیق ہے تو جواب کے لئے تیار ہو جائے گا۔ چنانچہ اس وقت عوام کے اخلاق کو زیادہ تر علماء کے اخلاق ہی نے خراب کیا ہے کہ اکثر علماء کو

اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جواب سائل کے مذاق کے موافق ہو ادھر علماء کی یہ شفقت ادھر سائلین کا یہ جہل کہ ان کو یہ خبر نہیں کہ کون سی بات ضابطے کی رو سے ہم کو پوچھنی چاہئے اور کون سی بات میں بغیر لِمَ اور کیف کے سرِ تسلیم جھکا دینا چاہیئے غرض دونوں کی بدولت عوام تباہ ہوئے۔

صاحبو! شریعت کے احکام کے ساتھ ہمارا بالکل وہ مذہب ہونا چاہیئے جو عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک کا مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے اس نے کہا کہ جو آپ مقرر کریں پھر آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھایا کرتا ہے غلام نے کہا جو آپ کھلائیں اِسی طرح لباس کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ جو کچھ آپ پہنائیں وہی لباس ہے۔ تو صاحبو! کیا خدا سے جو علاقہ ہمارا ہے وہ غلامی نہیں ہے بلکہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خدا تعالےٰ کے ساتھ ہم کو حقیقی غلامی حاصل ہے دیکھو انسانی غلامی سے انسان ایک وقت میں نکل بھی سکتا ہے یعنی جبکہ آقا غلام کو آزاد کر دے برخلاف ہماری غلامی کے کہ یہ طوق ہماری گردن سے کبھی نکل ہی نہیں سکتا کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی یہی صورت ہے کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور خدا خدا نہ رہے اور یہ غیر ممکن تو ہماری آزادی بھی غیر ممکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری آزادی محال عقلی ہے اور ہم ہمیشہ کے لئے غلام ہیں تو ہم کو غلام ہی کا برتاؤ بھی کرنا چاہیئے اور کسی حکم کے امتثال میں گرانی نہ ہونی چاہیئے اور میں کہتا ہوں کہ احکام کے دشوار معلوم ہونے سے اُن میں کسی قسم کا شبہ کرنا تو بالکل ہی لغو ہے کیونکہ احکام کا نفس پر گراں گذرنا یہی تو دلیل ہے اس حکم کے خداوندی حکم ہونے کی کیونکہ جو حکم نفس کے موافق ہو اس کو تو نفس خود ہی اپنے لئے تجویز کر لیتا ہے اس میں کسی دوسرے کے حکم کرنے کی کیا ضرورت تو خدا کی جانب سے تو وہی احکام مقرر ہوں گے جو کہ نفس پر بار ہوں تاکہ خدا تعالیٰ دیکھیں کہ جو کچھ کرتے ہو اس سے اپنے نفس کا خوش کرنا منظور ہے یا خدا کا اور اس خوش کرنے میں بھی ہماری ہی مصلحت ہے نہ کہ خدا کی ؎

من نہ کردم خلق تا سُودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جُودے کنم

(میں نے مخلوق کو اپنے نفع کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ اپنے بندوں پر سخاوت کروں)

اتنا وسیع نظام عالم ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے اور ہمیں کو نفع پہنچانا مقصود رہے اور ہر طرح ہماری ہی مصلحتوں پر نظر ہے البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہماری مصالح حال کی بھی جن کو ہم نے اختراع کر کے مصلحت کا لقب دیا ہے ان احکام میں رعایت ہو لہذا ہم کو بھی یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الحال ہماری کیا مصلحت ہے بلکہ اگر مصالح حال پر نظر ہوتی تو احکام بتلانے کی ہی کیا ضرورت تھی جب ہم نے مصالح کو اختراع کیا تھا ان کے مناسب تجاویز بھی خود ہی سوچ سکتے تھے۔ غرض احکام کی سختی وسوسہ کا سبب ہوتی ہے۔ لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ سختی ہی ان احکام کے من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ دیکھئے جب بچہ کا دودھ چھڑاتے ہیں تو کیسی کچھ مصیبت ہوتی ہے کتنی تکلیف بچہ کو پہونچتی ہے اور وہ دودھ پینے کے لئے کیا کچھ قصد یں کرتا ہے لیکن اس کی ایک نہیں سُنی جاتی بلکہ کبھی ایلوا لگا کر کبھی کسی دوسری تدبیر سے اس کو دودھ پینے سے روکا جاتا ہے وجہ یہی ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے سے زیادہ اس کی مصلحتوں کو جانتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت اس کی مرضی کے موافق کیا گیا تو جوان ہو کر تباہ ہوگا اور ساری عمر اسی بلا میں مبتلا رہے گا۔ بعینہٖ یہی حالت انسان کے نفس کی ہے ارشاد ہے لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ کہ اگر حق اُن کی خواہشوں کے تابع ہوجائے تو زمین و آسمان سب خراب اور برباد ہوجائیں۔ بس ہمارے لئے یہی شفقت ہے کہ ہماری ایک نہ سنی جائے۔ جس طرح بچے کی رائے کو نہیں سُنا جاتا اور محض اس وجہ سے کہ جوان ہو کر جو اجزائے بدن حرارت سے تحلیل ہوتے ہیں ان کے لئے صرف دودھ بدل ما یتحلل نہیں ہوسکتا بچے کی ضد کو مسترد کر دیا جاتا ہے حالانکہ بچے اور اس کے ماں باپ کا علم باوجود متفاوت ہونے کے پھر بھی کسی درجے میں متقارب ہے کیونکہ دونوں متناہی ہیں اور متناہیین کا تقارب ظاہر ہی ہے۔ برخلاف بندے کے علم اور خدا کے علم کے دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کے علم کو بھی خدا کے علم سے کوئی تناسب نہیں ہے کیونکہ مجموعہ کائنات کا علم کیسا کچھ بھی ہو پھر بھی متناہی تو ضرور ہوگا برخلاف علم خداوندی کے کہ وہ غیر متناہی ہے، خوب کہا ہے ؎

اگر آفتاب ست یک ذرہ الیست وگر ہفت دریاست یک قطرہ الیست

چو سلطانِ عزت علم برکشد جہاں سر بجیبِ عدم درکشد

(اگر وہ آفتاب ہے تو تو اس کے مقابلہ ذرہ کے جیسا ہے اگر وہ سات دریا کے برابر ہے تو تو ایک قطرہ کے برابر ہے۔ جب بادشاہ اپنی عزت کا جھنڈا بلند کرتا ہے تو ساری دنیا عدم کے گریبان میں سر چھپا لیتی ہے)

اور یہی وہ کیفیت ہے جس کو اہل فن نے وحدۃ الوجود کہا ہے وحدۃ الوجود کے جو معنے عوام میں مشہور ہیں کہ میں بھی خدا اور تو بھی خدا اور دیوار بھی خدا یہ معنے بالکل غلط ہیں اور بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی بالکل ہی موجود نہیں یہ بھی بالکل غلط ہے اور قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ (اللہ تعالیٰ ہر چیز کے پیدا کرنے والے ہیں اور وہی ہر چیز کے ذمہ دار ہیں) حقیقت میں یہ حالی مسئلہ ہے قالی نہیں وہ حال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی ذات پیش نظر ہوتی ہے اس وقت دوسروں کا اور اپنا وجود کالعدم معلوم ہوتا ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص اگر کسی خیال میں منہمک ہو تو اس کو دوسری تمام چیزوں کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا اگر کوئی اس کو آواز دیتا ہے تو وہ نہیں سنتا بلکہ بعض اوقات خاص خیالوں میں اس قدر انہماک ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی سر کے پاس آکر آواز دے تو مطلق خبر نہیں ہوتی اس کیفیت میں وہ شخص محاورے میں مجازاً کہہ سکتا ہے کہ لاموجود الا الامر الفلانی لیکن ظاہر ہے کہ یہ کہنا واقع کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے ہے اسی طرح وحدۃ الوجود بھی ایک اصطلاح ہے صوفیہ کی کہ وہ اپنی اس قسم کی کیفیت کو وحدۃ الوجود کے عنوان سے مجازاً تعبیر کرتے ہیں جس طرح قرآن و حدیث کے محاورات میں مجاز کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح اصطلاح تصوف میں بھی کیونکہ وہ بھی قرآن و حدیث ہی سے مستنبط ہے تو خلاصہ وحدۃ الوجود کا یہ نکلا کہ یہ وجودات متکثرہ گویا کہ نہیں ہیں پس حکم وحدۃ مجازاً ہوا اسی کو ان اشعار میں حل کیا ہے ؎

اگر آفتابست یک ذرہ نیست دگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست
چو سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بجیب عدم درکشد

بلکہ ان اشعار ہی میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ موجودات کچھ ہیں ضرور، کیونکہ آفتاب اور دریا کے ساتھ است کا حکم کیا گیا ہے باقی آگے جو کہا ہے کہ "جہاں سر بجیب عدم درکشد" اس سے بھی یہی مراد ہے کہ اس کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر اس سے بھی زیادہ صاف عنوان سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید

کہ ایک قطرہ ابر سے انا کذا و کذا کہتا چلا مگر دریا کی وسعت دیکھ کر شرمندہ ہو گیا اور باوجودیکہ اپنے اندر نور انیت اور شفافی سب کچھ پاتا تھا لیکن کہتا ہے ؎

کہ جائیکہ او ہست من کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم

(کہ جس جگہ وہ موجود ہے میں کون ہوتا ہوں درحقیقت اگر وہ ہے تو میں قابل شمار نہیں ہوتا)

اس کے بعد شیخ نتیجہ نکالتے ہیں کہتے ہیں کہ ؎

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمتر اند — کہ با ہستیش نام ہستی برند

کہ اگرچہ سب موجود ہیں لیکن ذاتِ باری کے سامنے سب کی ہستی ہیچ ہے زیادہ وضوح کے لئے۔ اس کو ایک اور مثال میں سمجھو مثلاً کسی گاؤں میں جہاں سب جاہل ہوں ایک شخص قل ہو اللہ کا حافظ ہو اور تمام گاؤں کے لوگ اس کو حافظ کہتے ہوں، اتفاق سے اسی گاؤں میں کوئی ماہر قاری آجائے جس کو علاوہ حفظ قرآن شریف و مشق سبعہ میں بھی مہارت ہو اور اس قاری کے سامنے کوئی شخص اس قل ہو اللہ کے حافظ کو حافظ صاحب کہکر پکارے تو اندازہ کیجئے کہ اس کی کیا حالت ہوگی شرم سے گڑ جائے گا اور اپنے کو اس قاری کے سامنے ہیچ تصور کرے گا۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے ہر شخص کے تمام دعاوی انانیت اس وقت تک ہیں کہ جب تک اپنے اوپر نظر ہے جس وقت کسی اپنے سے بڑے پر نظر پڑے اس وقت معلوم ہو کہ ہمارے کمالات کیا وقعت رکھتے ہیں ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک گاؤں کا چودھری اپنے بیٹے کے ساتھ چلا جا رہا تھا، رستہ میں بادشاہ کا لشکر پڑا دیکھا اس کی صولت اور حشمت دیکھ کر ڈر گیا اور آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی لڑکے نے کہا ابا آپ کیوں ڈرتے ہیں اگر بادشاہ ہے تو کیا ہوا، آپ بھی تو اپنے گاؤں کے چودھری

ہیں چودھری نے جواب دیا کہ بھائی میں اگرچہ چودھری ہوں لیکن میری حکومت صرف اسی قطعہ گاؤں تک ہے اور وہ بھی جب کہ مجھ سے کوئی بڑا وہاں موجود نہ ہو یہ بادشاہ ہے اس کی حکومت سارے ملک پر ہے میں اس کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں اس پر شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

تو اے غافل از حق چناں در دہی کہ بر خویشتن منصبے مے نہی

(غافل تو حق تعالیٰ سے ایسی طرح معاملہ کر رہا ہے کہ تو نے اپنے لئے بھی ایک خاص درجہ مقرر کر رکھا ہے)

تحصیلدار اسی وقت تک تحصیلدار ہے کہ گورنر کے سامنے نہ ہو لیکن اس کے سامنے آنے کے بعد اس کی تحصیلداری ہیچ ہے اگر گورنر کے سامنے کوئی اس کو حضور کہدے تو عرق عرق ہو جائیگا بس یہی حالت وحدۃ الوجود کی ہے۔ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ جس وقت حضور خداوندی ہوتا ہے اپنی تعظیم سے بلکہ اپنے کو موجود کہنے سے شرم آتی ہے اور جس قدر حضور خداوندی میں ترقی ہوگی اس کیفیت میں ترقی ہوتی ہوتی جائے گی۔ چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سب سے زیادہ اعلم باللہ ہیں بلکہ آپ کا ارشاد ہے اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰہِ (میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہوں) آپ کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے کہ باوجود سردار عالم ہونے کے کس قدر سادگی آپ کے ہر ہر انداز میں تھی بیٹھنے میں کبھی آپ نے کوئی ممتاز جگہ نہیں بنائی حتیٰ کہ لوگ جب زیارت کو آتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کرتے مَنْ مُحَمَّدٌ فِیْكُمْ (تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہم جواب دیتے کہ ھٰذَا الْاَبْیَضُ الْمُتَّکِیُٔ یہ جو گورے گورے سہارا لگائے بیٹھے ہیں اور سہارا لگانے کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے۔ عربی محاورہ میں ہاتھ پر سہارا لگا لینے کو بھی اتکا کہا جاتا ہے یہ ضروری نہیں کہ تکیہ وغیرہ ہی ہو چلنے میں یہ حالت تھی کہ ہمیشہ ملے جلے چلتے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ باوجودیکہ آپ کی شان یہ ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ بات یہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذات باری کی عظمت ہمیشہ پیش نظر تھی۔ غرض آپ کے کسی انداز سے بھی امتیاز اور بڑائی کی شان نمایاں نہیں ہوتی اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تو مدینے کے لوگ حضور صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کو پہچان نہیں سکے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مصافحہ کرتے تھے کیونکہ ان کے کچھ بال پک گئے تھے جس کی وجہ سے وہ سب سے بڑے معلوم ہوتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ادب دیکھئے کہ برابر خود ہی مصافحہ کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہیں ہونے دی اسی طرح دوسرے صحابہ بھی خاموش دم بخود بیٹھے رہے کیونکہ سب حکیم تھے اگر آجکل کوئی شیخ مجلس کے سوا کسی غلطی سے کسی دوسرے سے مصافحہ کرلے تو جملہ حاضرین غل مچانا شروع کردیں اور جس سے مصافحہ کرلیا ہے اس کی تو ایسی بری گت بنے کہ الامان۔ حتیٰ کہ جب دھوپ آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک پر شعاعیں پڑنے لگیں تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کپڑا تان کر کھڑے ہوگئے اس وقت حاضرین نے پہچانا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے اِنِّیْ اٰکُلُ کَمَا یَاکُلُ الْعَبْدُ کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ صاحبو! یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں اس کی قدر اس وقت ہوگی کہ جب اپنے اوپر یہ کیفیت غالب ہوا اور یہی راز ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کھاتا کھاتے میں کوئی لقمہ گر جائے تو مٹی صاف کرکے کھالو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا جلدی جلدی تناول فرمایا کرتے آج اس کو سخت عیب سمجھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح کھاتا ہے کہ گویا کبھی اس کو کھانے کو نہیں ملا۔ وجہ یہ ہے کہ جو چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر تھی ہم اس سے محروم ہیں۔ صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی والی ملک کسی معمولی سے آدمی کو بلا کر حلوا کھانے کو دے اور کہے کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ تو ذرا غور کیجئے کہ یہ شخص کس طرح کھائے گا ظاہر ہے کہ اس کے ہر لقمہ کا انداز یہ ہوگا کہ اس سے معلوم ہو جائے کہ بڑی رغبت اور شوق سے کھا رہا ہے اور یہی انداز اس وقت محبوب ہے اس کو طمع کہنا ہرگز درست نہیں اور اگر فرض کر دیہ طمع ہی ہے تو سمجھ لو کہ ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں | خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(جب دین کا بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں کمی نہ کروں تو اس کے بعد پھر میرا قناعت کو اچھا سمجھنے اور نہ مانگنے پر افسوس ہے)

ع ہر عیب کہ سلطاں بہ پسند د ہنر است (جس کسی عیب کو بادشاہ پسند کر لیتا ہے وہ ہنر بن جاتا ہے)
اور اگر کھاتے ہوئے اتفاق سے کوئی لقمہ اس کے ہاتھ سے گر جائے تو یہ کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اس کو اٹھائے گا اور صاف کر کے کھا جائے گا۔ علیٰ ہذا یہ بھی سوچو کہ بادشاہ کے سامنے کس انداز سے بیٹھ کر کھائے گا کیا اسی طرح جیسے اپنے گھر میں بیٹھ کر کھاتا تھا، کبھی نہیں بلکہ نہایت ادب سے بیٹھ کر کھائے گا تو جب شاہانِ دنیا کے سامنے ان تین باتوں کا لحاظ ضروری ہے تو کیا خداوند جل وعلا کے سامنے ضروری نہیں۔ آجکل کی تہذیب نری لفاظی رہ گئی ہے جس میں اصل حقیقت کا نام و نشان بھی نہیں ہے بہتر ہے کہ اس میں ہ کی جگہ عین بدل دیا جائے کہ اسم بھی مسمیٰ کے مطابق پڑے۔ اور صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانے کے آداب کی تعلیم جو فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح باطنی حالات کا اثر ظاہری اعضاء پر پڑتا ہے یوں ہی ظاہری ہیئت کا اثر بھی انسان کی اندرونی حالت تک پہنچتا ہے۔ اگر ظاہری ہیئت پر رعونت و تکبر برستا ہے تو دل تک بھی اس کا چھینٹا ضرور پہونچے گا اور یہ ملکہ بد دل میں ضرور پیدا ہونا شروع ہوگا۔ اور اگر ظاہری حالت منکسرانہ ہے تو دل میں بھی انکسار و خشوع و تذلل کے آثار نمایاں ہوں گے اور سبب اس کا یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اپنے ظاہر کو اتباعِ سنت سے آراستہ کیا اور راہِ سنت پر گامزن ہوا تو اس نے کسی قدر قرب کا قصد کیا اور وعدہ ہے کہ مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا۔ کہ جو میری طرف تھوڑا سا بھی بڑھتا ہے میں اس کی طرف بہت سا بڑھتا جاتا ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کا قرب اس سے زیادہ ہوگا کہ قرب باطنی میسر ہو جائے تو لازم آ گیا کہ درستی ظاہر سے قرب باطنی نصیب ہوتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اسی کو فرماتے ہیں ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں | آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(اگرچہ عام طور پر دنیا میں پیاسے ہی پانی کو تلاش کرتے ہیں مگر کبھی پانی بھی اس دنیا میں پیاسوں کو ڈھونڈا کرتا ہے)

یہ وہ پانی ہے کہ پیاسے کے ڈھونڈھے نہیں ملتا بلکہ وہ خود پیاسے تک پہنچتا ہے یہ شرط ہے کہ پیاس ہو ورنہ خدا بیکار نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کے سر منڈھیں ارشاد ہے

اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ ؕ یعنی کیا ہم رحمت کو تمہارے سر مڑھ دیں باوجودیکہ تمہارے دلوں میں اس سے کراہت ہے خیر یہ جملہ معترضہ تھا اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تو اس قدر خشوع و خضوع بڑھا ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ذاتِ خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر وقت پیشِ نظر تھی اور جب یہ ہے تو ہم کو بھی احکام سُن کر بس یہی چاہیئے کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علّت از کارِ تو

(تیری یاد سے زبان کو تر و تازہ رکھنا چاہیئے اور کوئی عذر تیری اطاعت سے مجھے روک نہیں سکتی)

اور قطع نظر اس کے کہ یہ مقتضاء عبدیت کا ہے ہمارے لئے مصلحت عقلاً بھی یہی ہے اور واقعی اگر یہ کاوش ہمارے لئے مضر نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو اجازت دیتے ممانعت نہ فرماتے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ممانعت فرمائی۔

دیکھئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور جن کی فطرتیں بالکل سلیم تھیں جب ان حضرات نے مسئلہ قدر میں گفتگو کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل روک دیا اور بہت خفا ہوئے اور فرمایا اگلی قومیں اسی کھود کرید کی بدولت ہلاک ہوئیں اور مضر ہونے کا سبب یہ ہے کہ جس طرح بہت سے امور استدلال سے حل ہوتے ہیں اسی طرح بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں کہ ان میں استدلال کا گذر نہیں اُن کے لئے مشاہدہ اور معاینہ کی ضرورت ہے اور وہ ہم کو نصیب نہیں تو ایسی باتوں میں لِم و کیف دریافت کرنے کا بدیہی یہ نتیجہ ہے کہ ہم تباہ ہوں اور خسر الدنیا والآخرۃ ہماری حالت ہو۔ مجھے اس کی مناسب ایک حکایت یاد آئی۔ مشہور ہے کہ ایک لڑکے نے اپنے نابینا استاد کی دعوت کی اور کہا کہ میں آپ کو کھیر کھلاؤں گا۔ استاد صاحب نے چونکہ کھیر کو نہ کبھی دیکھا تھا نہ ابھی تک کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس لئے لڑکے سے پوچھا کہ بھائی کھیر کیسی ہوتی ہے لڑکے نے جواب دیا کہ کھیر سفید ہوتی ہے استاد نے کہا کہ سفید کس کو کہتے ہیں اس نے کہا جیسے بگلہ مگر استاد صاحب نے کبھی بگلہ بھی نہ دیکھا تھا اس لئے اُس کی بابت بھی پوچھا اس نے ہاتھ سے بگلہ کی ہیئت بتائی استاد صاحب نے ہاتھ سے مس کر کے دیکھا تو فرمانے لگے کہ بھائی

یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے کیسے کھاؤں گا۔ تو جیسے اس نابینا کے سمجھنے کی غلطی کی وجہ یہی تھی کہ معاینہ کی چیز۔ کو بیان سے سمجھنا چاہتا تھا یہی حالت ہماری بھی ہے۔

ہاں اگر سمجھنا ہو تو اول قلب میں نور پیدا کرو خود بخود یہ کیفیات پیدا ہوں گی اور ہر چیز کی سینکڑوں حکمتیں نظر آنے لگیں گی۔ دیکھو اگر کوئی معمولی شخص کسی والی ملک سے کہے کہ مجھے اپنے خزانہ کے جواہرات دکھا دو تو اس کی سخت غلطی ہے اور کبھی یہ شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ کامیابی کی یہ صورت ہے کہ پہلے صاحب جواہرات سے ایک خاص تعلق پیدا کرے اور اس کے خواص میں داخل ہو جائے اس کے بعد بغیر درخواست ہی کبھی وہ مہربان ہوگا تو خود دکھلا دے گا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیا　　　بے کتاب و بے معید داد ستا
علم چوں بر تن زنی مارے بود　　　علم چوں بر دل زنی یارے بود

(تو اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم کو بغیر کتاب کے اور مددگار کے اور بغیر استاد کے دیکھے گا۔ تو علوم سے اگر نفس کی موافقت میں کام لے تو وہ سانپ کے جیسا بن جاتا ہے اور جب تو علم کو روحانیت پر چلائیگا وہ تیرا دوست بن جائیگا)

تو دل پر مؤثر بناؤ اس کے بعد دیکھو کن علوم کا انکشاف ہوتا ہے۔ اب لوگ چاہتے ہیں کہ ساری باتیں استاد کے سامنے بیٹھ کر حل کر لیں حالانکہ یہ محض فضل خداوندی سے ہوتا ہے اور وہ بھی جبکہ خدا تعالیٰ چاہیں کہ فضل اسی خاص طریقے سے ہو کیونکہ کبھی کسی خاص شخص کے بارے میں یہی فضل ہوتا ہے کہ اس کو اسرار پر مطلع کیا جائے جیسا کہ بعض کے لئے مطلع ہونا فضل ہوتا ہے اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو جو کچھ اسرار معلوم ہونے لگتے ہیں تو ان کو ناز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض بعض اپنے کو اکابر کی برابر سمجھنے لگتے ہیں۔ لہذا اس لئے یہی مناسب ہے جب ہر ایک کے لئے مصلحت جدا ہے تو خود کچھ بھی تجویز نہ کرو۔ ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن　　　کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو فقیروں اور مزدوروں کی طرح مزدوری حاصل کرنے کے لئے عبادت مت کر کیونکہ جو مالک ہے وہ اپنے بندوں کی پرورش کے طریقوں سے خود واقف ہے)

اسی واسطے یہ مذہب ہے کہ بلا اختیار جو وارد بھی ہو اسی میں خوش رہے اور خود ہرگز کسی خاص وارد کی خواہش نہ کرے گویا یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ ؎

بدُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　که آنچہ ساقی ما ریخت عین الطافست

(تجھے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ یہ صاف شراب ہے یا نیچے کا میل کچیل ہے بس تو پی جا کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے ساقی کی طرف سے حاصل ہو رہا ہے وہ اس کی عین مہربانی ہے)

اگر دُرد پلائیں تب بھی اسی ذوق سے پینا چاہیئے جس طرح مئے صاف پی جاتی ہے کیونکہ اس میں بھی کوئی حکمت ضرور ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر خلافِ مصلحت بھی ملتا تب بھی ہم کو دَم مارنے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ ہم عبد ہیں ہم کو اس نیت کی بھی مجال نہیں کہ یہ ہمارے لئے مصلحت ہے۔ کیونکہ آخر ہم ہیں کیا چیز۔ کچھ بھی نہیں جو کچھ ملے جتنا ملے جس طرح ملے سب اُن کا احسان ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت لقمانؑ نے کسی شخص کے ہاں باغبانی کی نوکری کی ایک روز وہ باغ میں آیا اور ان سے کہا کہ ایک ککڑی لیکر آؤ آپ ایک ککڑی لائے آقا نے اس کو چھیل کر اس کی قاشیں کیں اور اول ایک قاش حضرت لقمانؑ کو دی آپ لے کر کھا گئے اس کے بعد جو آقا نے کھائی تو معلوم ہوا کہ بالکل کڑوی ہے اُس نے حضرت لقمانؑ سے کہا کہ تم نے یہ تلخ ککڑی کھالی کہا کیوں نہیں کہ یہ تلخ ہے حضرت لقمانؑ فرماتے ہیں کہ جس ہاتھ سے ہزاروں شیریں چیزیں کھائیں اگر ایک دفعہ تلخ بھی مل جائے تو شکایت نہیں کرنی چاہیئے ؎

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے　　عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

(ایسی ذات جو تجھ پر ہر دم اپنا کرم کر رہی ہے اس کو قابل غور سمجھو اگر کسی وقت اسکی طرف سے کوئی تکلیف پہونچ جائے۔)

پس اگر کبھی ہماری مصلحت کے خلاف بھی اُدھر سے برتاؤ ہو تب بھی ہمارے ادب میں فرق نہ آنا چاہیئے۔ صاحبو! عاشق تو ہر حالت میں عاشق ہی رہتا ہے کیا لوگوں کے خیال میں خدا تعالےٰ سے برادری کا سا تعلق ہے کہ اس سے کاوش کی جائے۔ دیکھئے عشاق کو تو جان جان کر ستایا جاتا ہے مگر وہ یہی کہتا ہے ؎

ناخوشِ تو خوش بود بر جانِ من　　　دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

(تیری ناراضی بھی خوشی ہی رکھتی ہے کہ یار پر ہی دل فدا ہے اور کو میری ہی فکر ہے)

غرض جو شخص اپنی تربیت چاہتا ہے اور اس کو اسرارِ شریعت پر مطلع ہونے کی ہوس ہوتی ہے تو اپنے اندر یہ کیفیت پیدا کرے یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب کیا ہم جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بن جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ صاحب آپ جنید بغدادی نہ بنیں لیکن یہ بھی تو نہ ہو کہ بالکل نکمے ہی رہیں۔ غور کیجئے آپ جنید بغدادی کی برابر تو کسی بات میں بھی نہیں مثلاً ایک نماز ہی ہے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں جنید بغدادیؒ کی برابر نماز پڑھتا ہوں۔ ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ ایک رات قیام کی نیت کی ہے تو نیت باندھ کر ساری رات کھڑے ہی گذار دی۔ ایک رات رکوع کے لئے تجویز کی ہے تو تمام رات رکوع ہی میں ختم ہو گئی اور فرمایا کرتے تھے کہ افسوس رات بہت جلد ختم ہو جاتی ہے دل نہیں بھرتا یہ حالت تھی کہ ؎

نہ آیا وصل میں بھی چین ہم کو　　　گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

پس جب کسی حالت میں بھی ہم ان کی برابر نہیں لیکن پھر بھی ہم کسی بات کو چھوڑ نہیں دیتے نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں مثل مشہور ہے کہ گندم اگر بہم نہ رسد جو غنیمت ست (اگر گیہوں نہ مل سکے تو جو ہی غنیمت ہے) تو جب ساری چیزیں ہم میں ادنیٰ درجہ کی ہیں تو یہ حالت بھی ادنے درجے کی سہی۔ اور اس کا طریق یہی ہے کہ کسی صاحب باطن سے تعلق پیدا کیا جائے اگر صحبت ممکن ہو تو بہت ہی خوش قسمتی کی بات ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم مراسلت تو ضرور رکھنی چاہیئے اور اُن پر اپنا پورا حال ظاہر کر کے علاج کی تدبیر دریافت کیجئے صاحبو! اگر اپنی رائے سے کوئی شخص اپنی اصلاح کی تدبیر سوچ کر چار گھنٹے اس میں مشغول رہنے کے لئے مقرر کرے تو اس میں وہ بات حاصل نہ ہوگی جو کسی ماہر کی تجویز پر نصف گھنٹہ عمل کرنے میں حاصل ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں بخار میں مبتلا ہوا ایک طبیب سے رجوع کیا انھوں نے نسخہ تجویز کر دیا جس کے

استعمال سے چند روز میں فائدہ ہوگیا۔ میں نے نسخہ کو مفید دیکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھا اتفاق سے دوسرے برس پھر کچھ شکایت ہوئی تو میں نے اسی نسخے کو منگا کر استعمال کیا لیکن کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اس کے آخر پھر اُسی طبیب سے رجوع کیا اور ان کے تجویز کردہ نسخے سے صحت ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اول حکیم صاحب کی زبان میں یا قلم میں کوئی خاص اثر رکھا ہوا تھا کہ صحت اس پر موقوف تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ نسخے کی تجویز میں جس طرح مریض کے مزاج کی رعایت کی جاتی ہے زمان اور مکان کی رعایت بھی کی جاتی ہے یعنی ایام ربیع میں ایک نسخہ تجویز کیا جاتا ہے تو ایام خریف میں دوسرا کیونکہ دونوں موسموں کے مزاج بالکل الگ الگ ہیں۔ اسی طرح سرد ملک میں جو دوا مفید ہوگی گرم ملک میں اس کا مفید ہونا ضروری نہیں۔ تو جیسے بدن کے امراض میں محض اپنی تدبیر اور رائے میں مرض کے زوال کے لئے کافی نہیں ہے یوں ہی نفسانی امراض میں بھی ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ کی زبان میں بھی اثر ہے اور اہل اللہ سے تعلق رکھنے کو جو کہتا ہوں کوئی شخص میری اس تقریر سے یہ نہ سمجھے کہ میں نوکری کرنے یا تجارت میں لگنے کو منع کرتا ہوں اور ترکِ تعلقات کی رائے دیتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی اہلِ دل سے وابستگی پیدا کیجئے۔ صاحبو! یہ حضرات نہایت ذی عقل ہوتے ہیں۔ ان کو دین کی عقل کے ساتھ دنیا کی بھی کامل عقل ہوتی ہے۔ ان کی نسبت یہ گمان ہرگز نہ کرو کہ وہ اس وابستگی کے بعد تم کو تمہاری اہل وعیال سے چھڑا دیں گے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہٗ سے جب کوئی خادم عرض کرتا کہ حضور جی چاہتا ہے کہ ملازمت چھوڑ دوں تو فرماتے کہ بھائی ایسا نہ کیجیو نوکری بھی کرو اور خدا کی یاد میں بھی لگے رہو۔ اور وجہ اس ممانعت کی یہ تھی کہ جانتے تھے قلب میں قوتِ توکل ہے نہیں۔ ظاہری سہارے کو چھوڑ کر خدا جانے کن مصیبتوں میں پھنس جائے اور حالت کیا سے کیا ہو جائے اکثروں کو ایسے

واقعات پیش آئے کہ انھوں نے معاش کی وجہ سے نصرانیت یا یہودیت کو اختیار کیا بعض کی دل میں خدا کی شکایت پیدا ہوگئی۔ اور وہ یوں دین سے برباد ہوگئے۔ تو اگر نوکری پر لگے رہیں گے تو زیادہ سے زیادہ کسی معصیت ہی میں مبتلا ہوں گے کفر و شرک سے تو بچے رہیں گے۔ پس یہ حضرات چونکہ چہار طرف نظر رکھتے ہیں اس لئے بقاعدہ مَنِ ابْتُلِیَ بِبَلِیَّتَیْنِ فَلْیَخْتَرْ اَھْوَنَھُمَا (جو شخص دو مصیبتوں میں پھنس جائے ایک کو اختیار کرنا ضروری ہو تو اس مصیبت کو اختیار کرے جو آسان ہو) کبھی ضعفاء کو ترکِ تعلقات کی رائے نہیں دیتے اور جن لوگوں کو گوشہ نشینی اور ترک تعلقات کا حکم انھوں نے کیا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن کو انھوں نے پورے طور سے جانچ لیا ہے اور دیکھ چکے ہیں کہ ان کی قوّتِ توکل کامل ہے۔ ایسوں کے لئے نہ ترک تعلق کی ترغیب مضر نہ اس پر عمل کرنا نقصان دہ۔ تو اہل اللہ سے تعلق پیدا کرتے ہوئے اس کا بالکل خوف نہ کیجئے وہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کے قصدِ ترک پر بھی نہ چھوڑنے دیں گے۔ غرض یہ ہے کہ بڑی عقل سے اسرار کو دریافت کرنے کی فکر بے سُود فکر ہے اِس کی تمنّا ہے تو خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرو۔ دیکھو تجربہ کاروں کا قول ہے ؎

آزمودم عقل دوراندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

کہ اول ہم نے عقل سے کام لیا وہ تھوڑی دور چلے مگر تھک کر رہ گئے۔ آخر اس کو چھوڑا اور دیوانگی اور عشق کا دامن پکڑا اس نے منتہا تک پہونچا دیا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقل بالکل بے کار ہے عقل کار آمد ضرور ہے۔ لیکن ایک حد تک کام دیتی ہے اس کے بعد معطل ہو جاتی ہے۔ عقل کی حالت گھوڑے کی سی ہے۔ دیکھو اگر کسی کا محبوب ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہو۔ اور یہ عاشق اس کے پاس پہونچنا چاہے اور

ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلے تو ظاہر ہے کہ گھوڑا دامنِ کوہ تک پہونچ کر عاجز ہو جائے گا۔ آگے جہاں سے پہاڑی زینہ شروع ہوا ہے وہاں گھوڑا نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ عاشق آگے بھی جانا چاہے تو اس کی کیا صورت ہے۔ بجز اس کے کہ ؎ وز انجا ببالِ محبت پری ؎ یعنی عشق کا جوش اپنے اندر پیدا کرے اور راہ طے کرتا چلا جائے۔ غرض عقل سے کام لینا چاہیئے لیکن صرف اس قدر کہ فلاں شخص مقتدا بنانے کے قابل ہے اور فلاں شخص نہیں۔ مریض کو عقل سے کام لینا ہے لیکن محض انتخاب معالج میں کیونکہ ایسا نہ کرے گا تو کثرتِ مدّعینِ طبابت سے وہی حالت ہوگی کہ

ع۔ شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

(مختلف قسم کی تعبیروں کی وجہ سے میرا خواب ہی برباد ہوگیا)

مگر انتخاب کے بعد، پھر چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ جس رستہ معالج ڈالدے اس پر بے خوف و خطر چلا جائے ورنہ اگر وہاں بھی این چون ست و آں چرا ست سے کام لیا تو ایک قدم بھی نہ سرک سکے گا اور صدہا الجھنیں پیش آئیں گی اس لئے کہ معمولی عقل کبھی ایک فتوے پر قائم نہیں رہ سکتی صبح کچھ رائے دیتی ہے شام کو کچھ دن کو کچھ رات کو کچھ۔ بعضوں کو دیکھا ہے کہ آج اہل سنت و جماعت میں داخل ہیں کل تشیع پر مائل ہیں۔ صبح کو قدری ہیں شام نہیں ہو کہ جبری بن گئے۔ یہ انقلاب اور تبدیلیاں اسی باعث ہیں کہ عقل ایک ٹھکانے نہیں رہنے دیتی دربدر خاک بسر پھراتی ہے۔ گویا اس کی یہ حالت ہے ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(میں تیری اس پرانی خدائی سے جو تو رکھتا ہے۔ بیزار ہوں میرے لئے روزانہ تازہ خدا ہونا چاہیئے)

ابن العربی کا ایک خط اپنی کشکول میں علامہ بہاء الدین عاملی نے نقل کیا

ہے جو انھوں نے اپنے ایک معاصر عالم کو لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک روز بیٹھے رو رہے تھے۔ آپ کے کسی شاگرد نے وجہ پوچھی تو آپ نے وجہ بیان کی کہ میں اتنے سال سے ایک دعوے کو دلیل عقلی سے صحیح سمجھے ہوئے تھا آج ایک مقدمہ اس دلیل کا مخدوش معلوم ہوا تو میں اس لئے رو رہا ہوں کہ اتنے زمانے تک جہل میں مبتلا رہا اور اب بھی اطمینان نہیں کہ جواب ثابت ہوا وہ بھی صحیح ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ تم نے اپنے علم ظاہری کی قوت دیکھی اب چاہیئے کہ دوسرا علم حاصل کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ خلوت اور دوام ذکر اختیار کرو۔ بس اسی قسم کا مضمون لکھا ہے۔ امام رازی اتنے تبحّر کے بعد جب کہ ان کو کچھ حقیقت شناسی کا رائحہ نصیب ہوا اُس وقت یوں کہتے ہیں ؎

نهاية اقدام العقول عقالٌ — وغاية سعي العٰلمين ضلال

وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بحثنا طول عُمْرِنَا — سوی ان جمعنا فیہ قِیْلَ یُقَالُ

(اور ہماری ساری عمر کی بحثا بحثی نے ہمیں اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہونچایا کہ ہم نے یہ باتیں لکھ کر جمع کرلی ہیں کہ یوں کہا گیا ہے اور یوں کہا جائے گا)

کہ ساری عمر کے مباحث اور علوم کا نتیجہ جو اخیر میں کھلا تو یہ تھا کہ قِیْلَ کَذَا اَوْ قَالَ فلان کذا (اس طرح کہا گیا ہے اور فلاں نے اس طرح کہا ہے) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ انتخاب جو کیا جائے تو کس معیار پر کیا جائے کیونکہ آجکل عوام الناس نے عجیب وغریب معیار تراش رکھے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کا دربار نہایت عالی ہو لوگوں کی آمد ورفت اس کی طرف زیادہ ہو سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا بزرگ ہے خصوصاً اگر امراء اور رؤسا کی جماعت بھی ادھر مائل ہو تب تو گویا ان کی بزرگی پر رجسٹری ہو گئی۔ حالانکہ میں نے ایک نہایت کامل اور ماہر فن جامع شریعت و طریقت شیخ سے سُنا ہے فرماتے تھے کہ جس درویش

کے پاس زیادہ تر دنیا داروں کا ہجوم ہو اور علماء و صلحاء کا رجوع کم ہو تم ادھر متوجہ نہ ہو کیونکہ دنیا داروں کا گرتا اور دیندارں کا پرہیز اس درویش کے نقص کی دلیل ہے اس لئے کہ اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ (ہر چیز اپنی چیز کی طرف جاتی ہے) کبوتر با کبوتر باز با باز۔ تو وہ درویش بھی دنیا دار ہے۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک معیار بزرگی اس کے علاوہ ایک دوسرا امر ہے اور وہ اس سے ذرا دقیق ہے۔ وہ یہ ہے کہ اکثر کم سمجھ لوگ یوں جانتے ہیں کہ جس شخص میں کشف وکرامات زیادہ ہو خوارق کا صدور اس سے زیادہ ہوتا ہو وہ سب سے بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ معیار بھی بالکل لغو ہے کیونکہ کشف و کرامت کا صدور کثرت ریاضت ومشاقی وصحت قوائے جسمانی ونفسانی پر موقوف ہے جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں گی اُسے کشف ہونے لگے گا اگرچہ وہ کافر ہی ہو۔ ایسے واقعات بکثرت سننے میں آئے اور نہ بھی سنتے تب بھی یہ بات ظاہر تھی۔ دیکھو دجّال جو کہ مدّعی الوہیت ہوگا کیسے کیسے شعبدے اس سے ظہور پذیر ہوں گے۔ بارش تک کر کے دکھلا دے گا۔ زمین کے خزانے اس کے ہمراہ چلیں گے۔ پس ظاہر ہوا کہ خوارق کا صدور بھی صحیح معیار نہیں۔ اب صحیح معیار دریافت کرنے کے لئے اول یہ سمجھو کہ انسان کے لئے سب سے بڑا کمال اس کی وہ حالت ہے جس کے لئے اس کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کشف وکرامت کے لئے انسان کو دنیا میں نہیں بھیجا گیا کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو دنیا میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی عالمِ ارواح میں اس پر بہت کچھ منکشف تھا نیز مرنے کے بعد کافر تک کو بہت سے مغیبات منکشف ہو جائیں گے ارشاد ہے وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وہ وہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں جن کا ان کو گمان بھی نہ تھا) پس معلوم ہوا کہ دنیا میں اس کو کسی دوسری بات کے حاصل کرنے کو بھیجا گیا ہے اور وہ حالت عبدیت ہے یعنی دنیا میں انسان کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ امتثال اوامر ونواہی کر کے عبدیت

حاصل کرے کیونکہ جب تک اس عالم میں نہ آیا تھا تو محض روح تھا اور روح بوجہ مجرّد ہونے کے نہ قیام پر قادر تھی نہ تعود پر نہ رکوع پر نہ سجود پر تو روح کو اس عالم میں وہ ترقی کرنا جو ان عباداتِ خاصّہ پر موقوف ہے ممکن نہ تھا اور یہ صفت عبدیت بکمالہا اس میں پیدا نہ ہوتی۔ اور جب صفت عبدیت مطلوب ہے تو جس کو اس سے تعلق ہو وہ مطلوب ہوگا۔ اسی معیار کی نسبت مولانا روم علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی ست　　　　کارِ دُوناں حیلہ و بے شرمی ست

(مردوں کا کام یہ ہے کہ ان کی روشنی یعنی علم حقیقی اور گرمی یعنی محبت موجود ہو۔ اور کمینوں کا یہ کام ہے کہ ان میں بہانہ بازی اور بے شرمی ہو)

دو چیزیں اس شعر میں علامت کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ ایک روشنی دوسرے گرمی۔ روشنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں سے بیٹھے ہوئے کلکتہ اور بمبئی نظر آنے لگے بلکہ یہ معنی ہیں کہ دل میں عرفان اور علم حقیقی پیدا ہو جائے اور گرمی سے مراد محبت ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ جس کو محبوب حقیقی سے محبت ہو اور معرفت حاصل ہو وہ مرد ہے۔ لیکن محبت قلبی صفات میں سے ہے جن کا احساس نہیں ہو سکتا اس لئے اس کے کچھ لوازم بیان کئے جاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے ایک تو اس کی یاد کسی وقت دل سے نہیں اُترتی۔ سوتے ہوئے خواب بھی دیکھتا ہے تو محبوب ہی نظر آتا ہے اور دوسرے اس کے ہر حکم کو گوشِ قبول سے سُنتا اور نہایت شوق سے آمادہ امتثال رہتا ہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عاشق سے محبوب کے کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی کا ظہور ہو کیونکہ بھول ہمیشہ اس کام میں ہوا کرتی ہے جس کی جانب پوری توجہ اور التفات نہ ہو اور جو چیز ہر وقت دل پر مستولی ہو اس میں بھول کا ہونا عادۃً ممکن نہیں اسی طرح نافرمانی اس کے حکم کی ہوتی ہے جس کی وقعت اور محبت دل میں نہ ہو۔ جب ہر دم کی یاد اور کامل اطاعت علاماتِ محبت سے ہوئی اور یہ بھی معلوم ہو کہ قابلِ انتخاب وہ ہے جس کی روشنی علم و معرفت اور گرمی

یعنی محبتِ خداوندی حاصل ہو۔

تو خلاصہ مقتدا کی صفات کا یہ نکلا کہ اس کو بقدر ضرورت علم دین ہو اگرچہ وہ اصطلاحی مولوی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کو کسی شیخ کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہو کیونکہ گرمی امرِ مکتسب نہیں بلکہ موہوب امر ہے اور عادۃ اللہ ہے کہ وہ اسی طرح حاصل ہوتا ہے کہ کسی گرمی والے کے پاس رہے اور اس کی ہدایت کے بموجب عمل کرے اور یہی وہ چیز ہے کہ جو سینہ بسینہ چلی آتی ہے نہ مولوی بن کر حاصل ہوتی ہے نہ مورخ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ دنیا میں اس کے ماسوا بھی اکثر کام ایسے ہیں جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں مثلاً باورچی گری کا کام، درزی کا کام کہ اگر کوئی ساری خوانِ نعمت حفظ کر لے مگر جب تک کسی کامل استاد کے پاس نہ رہے تو اس کو باورچی گری نہیں آسکتی اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب میں دیکھ کر کرتا اچکن وغیرہ کی کاٹ ۔۔ اش بالکل ازبر کر لے تو اس کو درزی کا کام نہیں آسکتا تصوف کے سینہ بسینہ ہونے کے یہی معنی ہیں نہ یہ کہ اس کے مسائل سینہ بسینہ ہیں کیونکہ مسائل تو تمام کتابوں میں مدوّن ہیں بلکہ وہی ایک نسبت ہے جس کو گرمی سے تعبیر کیا ہے کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے ایک صفت یہ ہے کہ وہ باعمل ہو یہ تو علامات کامل ہونے کی ہیں اور مکمل ہونے کی علامات دوسری ہیں اور وہ بھی نہایت ضروری ہیں کیونکہ مریض کو اپنے مرض دور کرنے کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ خود بھی تندرست ہو اور طبیب بھی ہو تو اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دل میں ایک سکون اور راحت پیدا ہو اور خدا تعالیٰ کی محبت بڑھے دنیا کی محبت کم ہو اگرچہ یہ باتیں فوراً نہ پیدا ہوں بلکہ کچھ دنوں کے بعد ہوں۔ دوسرے اگر اس سے اپنا مرض بیان کیا جائے تو جواب سے دل کو تسلی ہو یوں معلوم ہو کہ یہ ہمارے مرض کو بالکل سمجھ گیا خوب کہا ہے:؎ وعدۂ اہلِ کرم گنجے بود؛ پس جب ایسا شخص میسر ہو جائے تو ضرور ہے کہ اس کی صحبت اختیار کی جائے۔ اگرچہ اس سے بیعت نہ ہو کیونکہ بیعت ہونا چنداں ضروری نہیں ہے لیکن یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ بیعت بالکل بے سود ہے۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ بیعت بالکل بیکار ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر ہی کام کرے میں نے کہا کہ صاحب آپ نے کبھی علاج بھی کرایا ہے کہ نہیں کہنے لگے کہ بیشک ضرورت کے وقت علاج کرایا ہے میں نے پوچھا کہ کسی ایک طبیب سے رجوع کیا ہے یا اس طرح کہ آج ایک سے کل دوسرے سے پرسوں تیسرے سے کہنے لگے کسی ایک ہی کی طرف جس پر اطمینان ہوا رجوع کیا ہے پھر میں نے پوچھا کہ اس میں آپ نے کیا مصلحت سوچی کہنے لگے کہ روز روز نئے طبیب بدلنے سے کسی ایک کو بھی توجہ اور شفقت مریض پر نہیں ہوتی کیونکہ کوئی ایک بھی اس کو اپنا مریض نہیں سمجھتا میں نے کہا بس یہی حکمت اور نفع ہے بیعت ہونے کا کیونکہ بیعت ہونے کے بعد مرشد مرید کو اپنا سمجھنے لگتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے کہ یوں کہتا ہے ع من غم تو میخورم تو غم مخور :. مرید کو ہر وقت یہ تسلی رہتی ہے کہ میرا ایک شفیق میرے ساتھ موجود ہے اور مُرشد کو یہ لاج ہوتی ہے کہ یہ میرا شخص ہے ۔ یہ مصلحت ہے بیعت میں ہاں اگر نرے نذرانے کی بیعت ہو تو کسی درجے میں بھی مفید نہیں ۔ آج کل یہ حالت ہے کہ بعضے فخر کرتے ہیں کہ میرے ایک لاکھ مرید ہیں معاذ اللہ گویا ایک فوج جمع کی ہے ۔ غرض اگر اس قسم کی پیری مریدی نہ ہو تو اس میں بیحد نفع ہے ۔ کلام بہت دور پہونچ گیا ۔ میں بیان کر رہا تھا کہ نسبت مع اللہ ایسی چیز ہے کہ جب یہ دل میں جگہ کر لیتی ہے تو خس و خاشاک ماسوا سب بہ جاتے ہیں بس نہ کوئی شبہ رہتا ہے نہ مُزاحم ؎

عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اور اس کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ ؎

تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

لا الٰہ الا اللہ میں لفظ لا ایک تلوار کی طرح ہے اس تلوار کو اللہ تعالیٰ کے سوا تمام معبودوں کے قتل کرنے پر چلانا چاہیئے اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اول میں لفظ لا لگانے کے بعد دوسرا کیا باقی رہ گیا صرف الا اللہ باقی رہ گیا اور باقی سب چلا گیا

ہے اے عشق تجھے کو مبارک باد ی کہ تو ہر شرکت د د ر کر دینے والا ہے)

تو جب یہ تمام دساوس منقطع ہو جائیں گے تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو گا اور معلوم ہو جائیگا کہ ہم کو خدا تعالےٰ سے کیا تعلق ہے اس کے بعد کوئی حکم ناگوار نہ گذرے گا. کیونکہ عاشق کو کوئی حکم محبوب کا ناگوار نہیں ہوتا بلکہ یوں چاہے گا کہ کسی طرح ہر وقت ادھر سے کچھ ارشاد ہی ہوتا رہے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک طبیب پر عاشق ہو گیا تھا آخر بیمار پڑا لوگ اسی طبیب کو علاج کے لئے لائے تو یہ مریض یوں تمنا کرتا تھا کہ مجھے کبھی شفا نہ ہو تاکہ اسی بہانہ سے روزانہ یہ طبیب میرے پاس چلا تو آیا کرے. صاحبو! واقعی یہ آگ بہت غضب کی چیز ہے کہ عاشق تو عاشق معشوق کو بھی متوجہ کر دیتی ہے

عشق را نازم کہ یوسفؑ را بیازار آورد ہمچو صنعا زاہدی را زیر زنار آورد

(مجھے عشق پر ناز ہے کہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کو بازار میں لے آیا ہے جیسا کہ عشق ہی ایک زاہد کو شہر صنعا میں زنار کے نیچے لے آیا تھا یعنی عشق کی وجہ سے مذہب تک بدل دیا)

دیکھئے اس مریض کو مرض ہی تھا کہ جس نے طبیب کو بھی کھینچ ہی لیا آجکل کے عقلاء اس کو نہ سمجھیں گے کیونکہ یہ محض ذوقی و وجدانی امر ہے چند ہی روز ہوئے کہ سفر الہ آباد پیش آیا ہمراہ میرے ایک دوست بھی تھے وہ چونکہ شاعر بھی ہیں ایک موقع پر اپنے کچھ اشعار پڑھ رہے تھے کہ ان میں یہ شعر بھی پڑھا ؎

کیا بیٹھا ہے سینے پر زانو کو دھرے قاتل ہاں پھیر بھی دے خنجر کیا دیر لگائی ہے

اس مجمع میں ایک مولوی صاحب بھی تھے جن کی کتابیں عربی کی سب تمام تھیں لیکن شعر سے بالکل مناسبت نہ تھی انھوں نے جو یہ شعر سنا تو نہایت تعجب سے کہا کہ اس شعر کا کیا مطلب ہے یہ تو بالکل لغو معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ تو محبوب حقیقی نے کسی کے گلے پر خنجر پھیرا نہ اس شاعر کے مرشد نے کبھی ایسا کیا البتہ طمانچہ شاید کبھی کسی کو مار دیا ہو لیکن سینے پر زانو رکھ کر تو کبھی نہیں بیٹھے. غرض ان کو ہر چند سمجھایا گیا لیکن اخیر تک ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا وہ اُس کو برابر غلط ہی کہتے رہے اور لوگ ہنسا کئے تو دیکھئے شعر سے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایک صاف شعر کو نہ سمجھ سکے تو اسی طرح جن لوگوں کو یہ نسبت حاصل نہیں ہے ان کی سمجھ میں نہ آئیگا کہ کیا بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسے لوگوں کو اہل محبت پر طعن کرنا ہرگز زیبا نہیں غرض محبت ایک عجیب چیز ہے ذرا غور کر لیجئے کہ اگر ایک مرد اور عورت سے محبت ہو جاتی ہے،

؎ زنار سے مراد خلاف وضع و ناموس نہ کہ خلاف شرع کیونکہ عشق میں ننگ و ناموس و نخوت و کبر سب زائل ہو جاتا ہے ۱۲ منہ

تو کیا حال ہوتا ہے کہ اس کے درشت اور ناز یب کلمات بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں اور بے جا فرمائشیں بھی پوری کی جاتی ہیں اور دل پر ناگواری نہیں ہوتی۔ یہ سب تمہید تھی اس آیت کے متعلق جس کی اس وقت تلاوت کی گئی تھی کیونکہ اس میں حکم ہے توبہ کا اور توبہ بوجہ اس کے کہ گناہ میں لذت ہے انسان پر گراں ہوتی ہے لیکن اس کو چھوڑنا نہ چاہیئے کیونکہ گرانی اس کی صرف ابتداء میں ہے چند روز کے بعد تمکین حاصل ہو جاتی ہے پھر کچھ گرانی نہیں رہتی چونکہ تمہید بہت طویل ہو گئی ہے۔ نیز ضروری مضامین اکثر بحمد اللہ اس میں آ گئے ہیں اور وقت بھی زیادہ گذر گیا ہے۔ اس لئے میں آیت کا صرف ترجمہ کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں نفس مضمون آیت کے متعلق خدا تعالےٰ نے چاہا تو کسی دوسرے موقع پر بیان ہو جائے گا۔ سو آیت میں خدا تعالےٰ نے توبہ کا حکم دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو خدا کی جانب رجوع کرو خالص رجوع ترجمہ پر غور کیجئے اور خدا تعالےٰ کے احسان وعنایت کو ملاحظہ فرمایئے کہ یوں نہیں فرمایا کہ بالکل گناہ ہی نہ کرو بلکہ یہ فرمایا کہ اگر گناہ ہو جائے تو توبہ کر دو۔ صاحبو! اس میں تو کوئی دقت نہیں ہے اس سے تو ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ دیکھئے شریعت کی آسانی کو ملاحظہ فرمایئے کہ اول تو یہ ہے کہ بد پرہیزی کر کے بیمار ہی نہ پڑو اور اگر بیمار پڑ جاؤ تو دوا پی لو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ توبہ سے کیا فائدہ کیونکہ پھر گناہ ہوگا۔ میں جواب میں کہا کرتا ہوں کہ یہ قانون امراض ظاہری میں کیوں نہیں چلایا جاتا کہ علاج سے کیا فائدہ جبکہ اگلے بھادوں میں پھر بخار کی آمد ہو گی۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیل اس آیت کی دوسرے وقت ہو جائے گی، اور اگر نہ بھی ہوئی تو جس کو طلب ہو گی جزئیات کی تفصیل اس کو خود ہی تلاش سے معلوم ہو جائے گی۔ دیکھئے جو شخص اسکول کے حالات معلوم کرنا چاہے اگر اس کو طلب ہے تو خود ہی اسکول میں داخل ہونے کی فکر کرے گا اور وہاں داخل ہو کر سب حالات خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ اب خدا تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل دے۔ آمین۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم کا
آٹھواں وعظ مسمّٰی بہ

تفصیلُ التوبہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبدالمنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی

دعوات عبدیت جلد سوم کا

آٹھواں وعظ مسمّٰی بہ

تفصیل التوبہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
ریاست خیرپور سندھ بر مکان وزیر صاحب	شب ۲۰ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ	۲ گھنٹے	کھڑے ہو کر	تفصیل التوبہ	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم	تقریباً پچاس ۵۰ ساٹھ	مستورات بھی تھیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ الخ (اے ایمان والو

تم اللہ تعالیٰ کے آگے سچی توبہ کرو امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔)

یہ ایک آیت ہے جس کی صبح بھی تلاوت کی گئی تھی اور بطور تمہید کے اس کے متعلق کچھ بیان کیا گیا تھا اس وقت یہ علم نہ تھا کہ دوسرا موقع اتنی جلدی بیان کرنے کا مل جائیگا اس لئے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کا تتمہ پھر کبھی بیان کر دیا جائیگا۔ مگر یہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے اتنی جلدی موقع دیدیا لیکن یہ ضرور ہے کہ چونکہ مجمع مستورات کا بھی ہے اور اس بیان کی اصل مخاطب بھی وہی ہیں اس لئے رنگ بیان کا دوسرا ہوگا کیونکہ مستورات کے سمجھنے کے لائق دوسرے مضامین ہوتے ہیں۔ بعضے تو مضامین ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو عورتیں نہیں سمجھ سکتیں اور بعض دفعہ مضمون تو سہل ہوتا ہے مگر اس کا عنوان علمی ہوتا ہے اس وقت چونکہ مخاطب عورتیں ہیں اس لئے مضامین ان کی ضرورت کے لائق اور ان کے ساتھ مخصوص یا مشترک ہوں گے اور جو مشترک ہوں گے ان کو ایسے طرز سے بیان کیا جائیگا جو کہ عورتوں کی سمجھ کے مناسب ہو لہذا اگر مردوں کو اس وقت کے بیان میں حظ نہ آئے تو تنگ دل نہ ہوں اس لئے کہ اول تو حظ مقصود نہیں دوسرے کبھی تو عورتوں کو بھی سننا چاہیئے۔ صبح اس آیت کے متعلق صرف تمہید تھی مقصود باقی رہ گیا تھا مقصود اس آیت کا یہ ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے ایمان والے بندوں کو توبہ کا حکم کرتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ سے معلوم ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ اسی کو توبہ کہتے ہیں کہ بندہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے یہی توبہ کی حقیقت ہے اور صرف لفظ توبہ زبان سے کہہ لینا کافی نہیں کیونکہ صرف زبانی وہی توبہ ہے جس کو کہتے ہیں ؎

سبحہ برکف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ — معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(ہاتھ میں تسبیح ہو ہونٹوں (زبان) پر توبہ توبہ ہو اور دل اندر اندر گناہ کے مزے لے رہا ہو تو ایسی حالت میں خود گناہ کو بھی ہماری ایسی توبہ و استغفار پر ہنسی آجاتی ہے)

تو حقیقت توبہ کی یہ ہوئی کہ دل سے توجہ ہو تو فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا الخ (اے مسلمانو توبہ کرو) چونکہ توبہ کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اس لئے اب میں توبہ ہی کا لفظ کہوں گا کہ اے ایمان والے بندو توبہ کرو خدا کی طرف خالص توبہ یہ حاصل ہے اس جملہ کا

اور مقصود اس وقت صرف اسی جملہ کا بیان کرنا ہے آیت کے دوسرے اجزاء کا بیان اس وقت نہ ہوگا۔ اور اگر ہوا بھی تو صرف ترجمہ یا تفصیل صرف جزو اول ہی کی مقصود ہے اس آیت کا یہ مضمون کوئی نیا مضمون نہیں ہے بہت دفعہ کانوں میں پڑا ہوگا لیکن شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب یہ پرانا مضمون ہے تو اس کے اس وقت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سو ضرورت یہ ہے کہ وعظ میں جو مضمون بیان کیا جاتا ہے اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور جب ایک مضمون پر متعدد مرتبہ سننے کے بعد بھی عمل نہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ہنوز اس کے مکرر بیان کی ضرورت ہے تاکہ اس طرف التفات پیدا ہو بلکہ نامعلوم مضامین سے بھی ایسے مضمون کی ضرورت زیادہ ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ ؎

فَاِنْ کُنْتَ لَا تَدْرِیْ فَتِلْکَ مُصِیْبَۃٌ وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ

(اگر تو نہیں جانتا تو یہ نہ جاننا کہ خود ایک بری بات ہے اور اگر تو جانتا ہے اور پھر عمل نہیں کرتا تب تو بہت بُری بات ہے)

جان بوجھ کر خلاف کرنا بہت بڑی مصیبت ہے اس کا علاج نہایت ضروری ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بار بار کان میں پڑ کر عمل نہ ہونا یہی وجہ ہے اس کے ضروری الغرض ہونے کی دوسری بات یہ ہے کہ بعض احکام تو خاص حالتوں کے متعلق ہوتے ہیں کہ جن کی ضرورت مخصوص اوقات میں واقع ہوتی ہے اور بعض احکام ہر حالت کے متعلق ہوتے ہیں کہ ان کی ہر وقت حاجت ہوتی ہے سو جس شخص کو یعنی واعظ کو کسی موقع پر اکثر بیان کرنے کا موقع ملتا ہو اس کو تو چاہیئے کہ بالترتیب خاص خاص حالتوں کے احکام بیان کرلے اور جس کو گاہ گاہ موقع ملے جیسا اس وقت میرا آنا مسافرانہ ہوگیا ہے اس کو چاہیئے کہ اہم مضامین کو بیان کرے اور ظاہر ہے کہ اس مضمون سے زیادہ اہم کونسا مضمون ہوگا کہ جس کی ہر وقت ہم کو ضرورت ہو تو یہ کا مضمون ایسا ہے کہ ہر حالت کو عام ہے اور ہر وقت ہم کو اس کی ضرورت ہے کیونکہ توبہ گناہ سے ہوا کرتی ہے اور گناہ ہم سے ہر وقت ہوتے ہیں اس پر شاید کسی کو تعجب ہو کہ ہر وقت تو ہم گناہ نہیں کرتے پھر یہ کیونکر صحیح ہوا کہ کوئی وقت ہمارا گناہ سے خالی نہیں تو وجہ اس تعجب کی یہ ہے کہ لوگوں کو گناہ کی حقیقت معلوم نہیں صرف ٹوٹی پھوٹی فہرست گناہوں کی یاد کر رکھی ہے کہ چوری

قتل. زنا. جوا وغیرہ جب گناہ کی حقیقت معلوم ہو گی تو معلوم ہو گا کہ کوئی وقت بھی ہمارا گناہ سے خالی نہیں اور جب ایسا ہے تو ہر وقت ہم کو توبہ کی ضرورت ہے۔

گناہ کا خلاصہ ہے خدا کی نافرمانی کرنا تو اول یہ معلوم کرو کہ خدا نے کس کس بات کا ہم کو حکم کیا ہے۔ پھر دیکھو کہ ہم ان میں سے کتنے حکموں پر عمل کرتے ہیں اور کتنے نواہی سے اجتناب نہیں کرتے اور یہ اس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت کا علم سیکھا جائے کیونکہ یہ اس پر موقوف ہے افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں نے بالخصوص عورتوں نے علم دین کی طرف سے بالکل توجہ ہٹالی ہے عورتوں کو اول تو موقعہ نہیں ملتا کہ علم دین سیکھیں نیز ان کو توجہ بھی نہیں اور عورتوں کے بارے میں بڑا الزام مردوں پر ہے کہ وہ ان سے صرف کھانے پکانے کا کام لیتے ہیں اور علم دین سکھلانے کا ذرا اہتمام نہیں کرتے کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح باہر پھر کر نہیں سیکھ سکتیں اس لئے کہ ان کو پردے سے نکلنا جائز نہیں۔ اب اگر ان کی کوئی سبیل تعلیم کی ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ مرد توجہ کریں اور ان کی تعلیم کا خود ذمہ لیں۔ آج کل کے عقلاء پردے کے مسئلے میں بھی بہت موشگافیاں کرتے ہیں میں اس کے لئے مختصراً اتنا بیان کرتا ہوں کہ دیکھئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تمام امت کی امہات ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ماں کے ساتھ بیٹیوں کو کسی قسم کے فتنہ کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا لیکن باوجود اس کے دیکھ لیجئے پردے کے بارے میں اُن کو کیا کیا حکم ہوئے ہیں پہلا حکم یہ ہے کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰی (اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے موافق مت پھرو) کہ گھر میں بیٹھو تو جب ان کو بصیغۂ امر ارشاد ہوا ہے کہ گھر میں رہو اور باہر نہ نکلو تو اور بیبیوں کو کیسے حکم نہ ہو گا بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ اس کا خطاب خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو ہے تمام امت کی عورتوں کو نہیں لیکن ان معترضین پر افسوس ہے کہ انھوں نے یہ نہ سمجھا کہ جب ازواج مطہرات کو یہ حکم ہے تو دوسری عورتوں کے لئے تو علی سبیل الاولویت ثابت ہو گا بدلالۃ النص اور یہ اس وقت ہے کہ جب قرآن شریف میں اسی پر اکتفا ہوتا حالانکہ دوسری

آیات بھی موجود ہیں فرماتے ہیں قُل لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ الخ کہ مومنات کو حکم فرما دیجئے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور اپنی زیب و زینت ظاہر نہ کریں الخ دوسری جگہ ارشاد ہے یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں اپنی بیبیوں سے اور بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ ڈالیں اپنے اوپر اپنی چادریں) دیکھئے اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب عورتوں کے لئے برابر حکم ہے تو جب پردہ ضروری ہے تو ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسا موقع نہیں مل سکتا کہ وہ باہر پھر کر علم دین سیکھیں۔ اس لئے مردوں پر واجب ہے کہ ان کو دین کے احکام بتلائیں۔ حدیث میں ہے کلکم راعٍ وکلکم مسئولٌ عن رعیتہٖ یعنی تم سب ذمہ دار ہو اور تم سے قیامت میں تمہاری ذمہ داری کی چیزوں سے سوال ہوگا قرآن شریف میں ہے یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (اے مسلمانو! بچاؤ خود اپنی جانوں اور اپنی اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے) تو گھر والوں کو بچانے کے معنی یہی ہیں کہ ان کو تنبیہ کر دو بتلاؤ بعض لوگ بتلا تو دیتے ہیں مگر پھر ڈھیل چھوڑ دیتے ہیں کہتے ہیں کہ دس دفعہ تو کہہ دیا نہ مانیں تو ہم کیا کریں۔ صاحبو! یہ سب قلت تدبر کی وجہ سے ہے میں نمونہ کے طور پر ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ اگر کسی دن کھانے میں نمک تیز ہو گیا ہو اور اس قدر تیز ہوا ہو کہ اس کی اصلاح ہی ممکن نہ ہو اور آپ بہت کچھ سخت و سست کہہ لیں لیکن باوجود آپ کے برا بھلا کہنے کے اگلے دن بھی وہی حالت ہو حتیٰ کہ پندرہ روز تک برابر کھانے میں نمک تیز رہے تو اس وقت آپ کیا معاملہ کریں گے آیا یہی جو کہ احکام دین میں کیا یا کچھ اور ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ نہ کیا جائے گا بلکہ کم از کم اتنا ضرور کیا جائے گا کہ اس کا پکایا ہوا کھانا نہ کھایا جائیگا کیا کوئی صاحب بتلا سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسے موقع پر نہایت نرمی سے کہا ہو کہ بی صاحبہ کھانے میں نمک تیز نہ کیا کیجئے اور اگر اس پر نہ مانا ہو تو یہ کہکر خاموش ہو رہے ہوں کہ ہم نے تو دس دفعہ کہہ دیا نہ مانے تو ہم کیا کریں۔ تو صاحبو! جب اپنے معاملات میں اس قدر سختی برتی جاتی ہے تو کیا وجہ کہ دین کے معاملہ میں یہ سختی نہیں معلوم ہوا کہ دین کا

اس قدر اہتمام خود تمہارے قلب میں نہیں ہے۔ اگر نماز روزے کے بارے میں بھی اسی تشدد سے کہا جاتا جس تشدد سے نمک تیز ہو جانے پر کام لیا گیا تھا تو ممکن نہ تھا کہ اثر نہ ہو ضرور اثر ہوتا۔ اور میں ایک آسان تدبیر اس کی بتلاتا ہوں کہ اس پر عمل کرنے سے ضرور دین کی پابندی ہو جائے گی وہ یہ ہے کہ جس روز نماز وغیرہ میں عورتوں کی ذرا سستی دیکھو اس روز ان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھاؤ۔ یہ ایسی سخت سزا ہے کہ اس کے بعد بہت جلد اصلاح ہو جائے گی کیونکہ جس روز تم ان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھاؤ گے اس روز یقیناً اُن کا بھی فاقہ ہو گا بس جب دو چار روز ایسا ہو گا خود سنبھل جائیں گی۔ تو طریقہ یہ ہے۔

صاحبو! کام تو کرنے ہی سے ہوتا ہے نرے الفاظ سے نہیں ہوتا۔ تو زیادہ تر الزام مردوں پر ہے بہرحال چونکہ اسباب عورتوں کی تعلیم کے کم ہیں اس لئے مناسب ہے کہ جب عورتوں کو کچھ سنائے تو انھیں کی ضرورت کا زیادہ لحاظ رکھے مردوں کی رعایت نہ کرے اس لئے اس وقت کا بیان بالکل سادہ ہو گا۔ اگرچہ ان میں سہل الفاظ سوچنے میں مجھے گو نہ دقت ضرور ہے اور چونکہ اس وقت عورتوں کی طبائع کے انداز پر بیان ہو گا اس لئے جو مضامین صرف مردوں سے متعلق ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور یہ اس لئے بیان کر دیا کہ آگے یہ شبہ نہ ہو کہ فلاں چیز بیان سے رہ گیا۔ دوسرے اس لئے بھی اس وقت خاص عورتوں کے مضامین بیان کئے جائیں کہ مردوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ہم جب عورتوں کو نصیحت کیا کریں تو کیسا نصیحت کیا کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس مقام پر توبہ کا حکم ہے اور توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور گناہ کا علم دین کے جاننے سے ہوتا ہے کہ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گناہ کس قدر ہیں اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی وقت ایسا گذرتا ہو کہ ہم سے گناہ نہ ہوتے ہوں مثلاً دل ہی ہے کہ اس کے گناہوں کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا حالانکہ اس کے بہت سے گناہ ہیں مثلاً کسی شخص کو بنظر حقارت دیکھا یہ بھی گناہ ہے جس کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو سوال کرتے دیکھا جو کہ صحیح و تندرست تھا آپ نے دل میں فرمایا کہ یہ شخص صحیح سالم ہے اور پھر سوال کرتا ہے

رات کو آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص آپ کے پاس مردار لایا اور کہا کہ اس کو کھایئے انھوں نے کہا کہ یہ تو مردہ ہے کیونکر کھاؤں۔ اس شخص نے جواب دیا کہ آج صبح تم نے اپنے ایک بھائی کا گوشت کھایا ہے تو اس کے کھانے میں کیوں تامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو غیبت نہیں کی اس نے جواب دیا کہ گو زبان سے غیبت نہیں کی لیکن دل میں تو اس کو حقیر سمجھا اور دل ہی سے تو سب کچھ ہوجاتا ہے آخر جنید رحمۃ اللہ علیہ بہت گھبرائے اور اس فقیر کے پاس پہنچے وہ کوئی کامل شخص تھا ان کو دیکھتے ہی کہا وھوالذی یقبل التوبۃ عن عبادہٖ (وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے) سو ان گناہوں کی طرف کبھی ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی گناہ ہیں۔ اسی طرح بعض جوارح کے ایسے گناہ ہیں کہ ان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ نہایت بے تکلف کیا جاتا ہے جیسے زبان کے اکثر گناہ، اسی طرح اپنے کو بڑا سمجھنا اس کو بھی ہم لوگ گناہ نہیں سمجھتے بلکہ خود بینی اور خودداری کو عزت سمجھتے ہیں اور ضروری جانتے ہیں۔ صاحبو! گناہ کی علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہو دیکھ لیجئے کہ ان گناہوں پر کیا کیا وعیدیں ہیں غیبت پر کیا وعید ہے، تکبر پر کیا وعید ہے اسی طرح بلا تحقیق کسی واقعہ پر حکم کر دینا اس پر کیا وعید ہے تو جب لوگ علم دین حاصل کریں گے اس طرح کہ مرد تو پڑھیں اور عورتیں یا تو پڑھ لیں یا اگر اس کا موقعہ نہ ملے تو اہل علم کے چھوٹے چھوٹے رسائل سن کر یاد کرلیں اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ گناہ کیا کیا ہیں چنانچہ شادی اور غمی میں اس قدر رسوم خلاف شریعت ہوتی ہیں جن کی کچھ حد نہیں۔ اکثر لوگ شادی میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ناچ نہ کرایا اور گانا نہ ہوا تو بس کوئی رسم ہم نے نہیں کی شرعی نکاح ہوگیا حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی رسمیں ایسی ہیں کہ وہ بدعت بلکہ بعض شرک ہیں اگرچہ الحمد للہ ایسی رسوں میں سے اکثر چھوٹ گئی ہیں جیسے دولہا کو آلو کا گوشت کھلانا یا دامن میں ہلدی باندھنا میانہ سے اُتر کر چارپائی پر نہ بیٹھنا وغیرہ وغیرہ کہ اس قسم کی رسمیں اکثر ترک ہوگئی ہیں لیکن ان کے چھوٹنے کے ساتھ ہی وہ رسمیں کہ جن میں فخر اور مباہات ہے اور زیادہ ہوگئی ہیں کیونکہ بہ نسبت سابق کے اس وقت تموّل زیادہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ پہلے لوگوں میں اس قدر تموّل کہاں تھا ایسا ساز و سامان کہاں تھا یہ رنگ برنگ کے کپڑا کوئی جانتا بھی

نہ تھا چنانچہ اب بھی جو لوگ پرانی وضع کے باقی ہیں ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی ہے اور آجکل کے نئے رنگینیوں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک مقام پر پہونچکر مجھے معلوم ہوا کہ شادی میں ڈیڑھ ہزار کا صرف کپڑا ہی کپڑا دیا گیا شاید اس کی تو ساری عمر میں بھی اس کپڑے کا نصف بھی اس کو پہننا نصیب نہ ہو کیونکہ اول تو اتنا کپڑا۔ دوسرے عورتوں کا پہننا کہ ایک ایک کپڑے کو دس دس برس تک احتیاط سے رکھ کر پہنتی ہیں کیونکہ ان کی حالت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ایسی حالت میں رہیں گی کہ صورت دیکھ کر بھی نفرت پیدا ہو اور دوسری جگہ جائیں گی تو بن سنور کر خدا جانے دوسری جگہ کسی کو دکھلانا منظور رہوتا ہے اور پھر اس کپڑے سے اس قدر مشغولی ان کے قلب کو ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ آج دھوپ دکھلائی جارہی ہے اور کل صاف کیا جارہا ہے کپڑا جو کہ خادم تھا ان کا مخدوم ہو گیا تعجب ہے کہ ان کا جی نہیں گھبراتا لیکن جب دوسرا کوئی کام نہیں تو آخر یہ بچاری دن کس طرح کاٹیں۔ اسی طرح شادی میں فضولیات ہوتے ہیں مثلاً کھانا کھلانا ہے کہ ساری برادری کو نوتا جاتا ہے مشورہ کرنا ہے کہ ایک ایک سے رائے لی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح کرنا چاہا اور یہ رائے ہوئی کہ اس خوشی میں ایک ہزار روپے کسی اسلامی مدرسے میں دیدیں اُن بیچاروں سے خطا یہ ہوئی کہ برادری کو جمع کر کے رائے لی تمام برادری نے ان کو دق کر دیا اور کہا کہ ہمارا جو کچھ آپ نے کھایا ہے وہ واپس کیجئے آخر مجبور ہو کر بچاروں کو ساری رسمیں کرنا پڑیں اِن لوگوں سے کوئی پوچھے کہ اس رقم کے برباد کرنے سے آپ کا کیا نفع ہوا۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ صاحب اس میں کیا گناہ ہے کہ برادری کو کھلا دیا پلا دیا صاحبو! یہ عنوان تو بہت پیارا ہے مگر ذرا اس کی حقیقت کو تو دیکھو یہ ایسا ہی عنوان ہے جیسا کہ ایک چور نے کہا تھا کہ ہم تو جو کچھ کھاتے ہیں حلال کر کے کھاتے ہیں۔ دیکھئے رات کو نیند برباد کرتے ہیں محنت کرتے ہیں جب کہیں ہم کو کھانے کو نصیب ہوتا ہے تو جیسا اس چور نے ایک نیا عنوان نکال کر چوری کو حلال کیا تھا ایسی ہی ہماری حالت ہے کہ ایسا عنوان اختیار کرتے ہیں کہ گناہ بظاہر نظر گناہ ہی نہ معلوم ہو کہ برادری کو کھلا دیا ادائے حق کیا لڑکی کو دیا صلہ رحمی کی تو اس میں کیا حرج ہے میں کہتا ہوں کہ اگر لڑکی کے ساتھ صرف صلہ رحمی

کرنی ہے تو کیا وجہ کہ برادری کو جمع کر کے ان کو دکھلا کر صلہ رحمی کی جاتی ہے اور اگر صلہ رحمی کے لئے برادری کو جمع کرنا ضروری ہے تو کیا وجہ کہ پندرہ سولہ برس تک جو صلہ رحمی لڑکی کے ساتھ کی گئی ہے اس میں برادری کو جمع کیوں نہیں کیا گیا کہ صاحبو دیکھ رکھو میں آج لڑکی کے واسطے کپڑا لایا ہوں آج اس کے لئے حلوا تیار کرایا ہے معلوم ہوا کہ شادی کے موقعہ پر مقصود تفاخر ہوتا ہے نہ کہ صلہ رحمی. دوسری علامت تفاخر مقصود ہونے کی یہ ہے کہ سامان دینے کے بعد اس طرف کان جھکتے ہیں کہ دیکھیں لوگ ہماری نسبت کیا کہہ رہے ہیں اگر کسی نے کہہ دیا کہ واقع حوصلے سے زیادہ کام کیا تو سمجھا جاتا ہے کہ بہت بڑی تعریف کی حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت بڑی ہجو ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہت بڑی حماقت کی کہ اپنی وسعت سے زیادہ خرچ کر دیا لیکن یہ تعریف کم نصیب ہوتی ہے اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ نیت بھی پوری نہیں ہوتی بلکہ جتنا بھی یہ زیادہ خرچ کرتا ہے برادری زیادہ عیب نکالتی ہے اور ہمدردی بھی اگر کی جاتی ہے تو دل میں اس کے بگاڑنے کی فکر کی جاتی ہے ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے بگھرہ وہاں ایک نودولت تھے انھوں نے اپنے لڑکے کی شادی کی برادری کے لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے یہ شخص بہت بڑھ گیا ہے اس کو اپنا جیسا بنانا چاہیے چنانچہ دو چار آدمیوں نے متفق ہو کر اُن کو یہ رائے دی کہ اس شادی میں طائفہ کو ضرور بلانا چاہیے اور کہا کہ میاں کیا روز روز یہ موقع آتا ہے چنانچہ طائفہ کو بلایا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ کما کر جمع کیا تھا سب کھو کر بیٹھ رہے۔ برادری نے جب جب دیکھا کہ یہ بھی ہماری طرح کنگال ہو گیا تو بہت خوش ہوئے واقعی لوگوں کی وہ حالت ہے کہ کسی کو اچھی حالت میں دیکھ نہیں سکتے۔ کسی کبڑی سے پوچھا تھا کہ تیری کیا تمنّا ہے اس نے کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں تاکہ میں بھی ان کو ہنسوں اور اگر اتفاق سے کسی نے ایسا سامان کر بھی لیا کہ اس میں کوئی عیب نہ نکل سکا تو کہتے ہیں کہ میاں اگر کیا تو کیا بڑی بات ہوئی جن کے پاس ہوا کرتا ہے کیا ہی کرتے ہیں بتلایئے کہ جب برادری بھی خوش نہ ہوئی اور خرچ بھی ہوا تو کیا فائدہ ہوا۔ تو صاحبو! کیا اس ساری کارروائی کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کھلا دینا پلا دینا ہے کیا یہ اسراف اور تفاخر نہیں ہے اور

کیا تفاخر گناہ نہیں ہے قرآن شریف سے ثابت حدیث شریف سے ثابت دیکھئے حدیث میں ہے مَنْ لَبِسَ ثوب شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (جس کسی نے شہرت کا لباس پہنا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے) غور کیجئے کہ کپڑے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے جب اس میں یہ وعید ہے تو دوسرے فضولیات جن میں زیادہ خرچ ہوتا ہے کیا ان میں یہ وعید نہ ہوگی۔ اسی طرح کے اور بہت گناہ ہیں جو سرسری سمجھے جاتے ہیں غرض گناہوں کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان کی فہرست پیش نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم ہر وقت گناہ میں مبتلا ہیں تو ہم کو توبہ کی بھی ہر وقت ضرورت ہے۔ اور توبہ کرنا ہر وقت ہم پر واجب ہے لہٰذا اس کا بیان کرنا بھی ضروری ہوا لیکن چونکہ نرے وجوب کا بیان کر دینا کافی نہیں ہوا کرتا اس لئے کہ اکثر موانع قوی ہوتے ہیں کہ ان کے ارتفاع کا ذریعہ نہ بتلانے سے طبیعت پر گرانی اور مایوسی ہوتی ہے اس لئے موانع کا بتلانا اور ان کے ارتفاع کی تدابیر بتلانا بھی ضرور ہوا کہ کن کن چیزوں سے توبہ کرنی چاہیئے۔ تو نہ محض اجمالی کافی ہے اور نہ زیادہ تفصیل کا وقت ہے اس لئے بیان مواقع کے ساتھ چند کثیر الوقوع گناہ بھی بتلاتا ہوں کہ ان سے اجتناب کیا جائے اور چونکہ وہ کثیر الوقوع ہیں جب ان سے اجتناب ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ سب گناہوں سے اجتناب ہو جائے گا۔ دوسرے یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی ایک گناہ کو چھوڑتا ہے تو سب گناہ اس سے چھوٹ جاتے ہیں یعنی ایک گناہ کا ترک دوسرے کے ترک میں معین ہوتا ہے تو گویا اب دو باتیں بیان کرنی رہ گئیں۔ ایک تو مختصر سی فہرست گناہوں کی دوسرے توبہ کرنے کے موانع اور ان کے ارتفاع کے ذرائع سو سمجھنا چاہیئے کہ جب توبہ کا وجوب قرآن شریف سے ثابت حدیث شریف سے ثابت تو اس کی طرف سے بھی توجہ ہونے کے اسباب کا ارتفاع واجب ہوگا۔ اسباب یہ ہیں جن کو میں مع ان کے علاج کے بیان کرتا ہوں اور یہ موانع استقراری ہیں ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی موانع ہوں۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہم کو گناہوں کی تفصیل معلوم نہیں تو جب گناہ ہی کا علم نہ ہوگا اور توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے تو توبہ کیونکر ہوگی افسوس ہے ہم لوگوں کو علم سے اس قدر اجنبیت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی عالم ہمارے سامنے ہمارے افعال کا گناہ ہونا بیان کرتا ہے تو سُن کر تعجب ہوتا ہے علم سے اجنبیت کے متعلق ایک حکایت یاد آگئی ایک معتبر راوی سے معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی کے فاضل کو سفر میں پانی نہ ملا تو نماز کے وقت آپنے تیمم کیا اور مٹی لے کر اس سے کلی بھی کی خدا جانے کیا کیا ہوگا منہ میں مٹی لے کر اس کو تھوکا ہوگا۔ یا اور کوئی صورت نکالی ہوگی۔ ملاحظہ کیجئے کہ ناواقفی کس حد تک پہونچ گئی۔ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر دس بیس عورتوں کو جمع کر کے ان کی نمازیں سُنی جائیں تو شائد ایک کی بھی نماز صحیح نہ نکلے اور اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ مردوں سے سیکھ کر نماز صحیح کر لو تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کو تو شرم آتی ہے انھیں شرم والیوں سے اگر ان کا شوہر یہ کہے کہ میں تم کو ایک ہزار کا زیور بنا دوں گا بشرطیکہ تم نماز صحیح کر لو تو دیکھیں اس وقت ان کی شرم کہاں جاتی ہے خاص کر اگر کسی بوڑھی عورت سے کہا جاتا ہے تو وہ تو ذرا بھی متوجہ نہیں ہوتی اور کہتی ہے کہ اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے لیکن اگر انہی بوڑھے طوطوں کو کوئی دنیا کا لالچ ہو تو دیکھئے کیسی زبان کھلتی ہے۔ افسوس ہے کہ عورتوں کو تو ثواب عذاب کا مردوں سے زیادہ خیال ہوتا ہے کہ وہ عذاب سے ڈرتی ہیں اور ثواب کی طرف راغب ہوتی ہیں پھر بھی وہ کیوں متوجہ نہیں ہوتیں ہاں اگر کسی نے تصحیح قرآن شریف میں محنت و مشقت کی اور پھر بھی حروف درست نہ ہوئے تو وہ معذور ہے پھر اس سے جس طرح بھی ادا ہو سکے جائز ہے لیکن محنت کئے بغیر معاف نہیں ہوگا غرض کوشش کرنی چاہیئے کہ نماز صحیح ہو جائے اسی طرح نماز تنگ وقت میں پڑھنا بھی عام عادت ہوگئی ہے خاص کر اکثر عورتیں کام کاج میں اس قدر دیر کر دیتی کہ مکروہ وقت میں نماز پڑھتی ہیں لیکن اس کو ذرا بھی بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ علیٰ ہذا جلدی جلدی نماز پڑھنا کہ گویا ایک بیگار ہے جس طرح بنے اس سے جان چھڑاؤ اس میں بعض اوقات ایسی صورتیں پیش آجاتی ہیں کہ نماز بالکل ہی نہیں ہوتی کہ پڑھی بھی اور ثواب بھی نہ ملا بلکہ اُلٹا گناہ ہوا عورتوں سے

تعجب ہے کہ وہ ان باتوں کی طرف ذرا خیال اور توجہ نہیں کرتیں اسی طرح بہت سے ایسے امور ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کی خبر بھی نہیں سو اس کا علاج یہی ہے کہ علم دین پوری طرح حاصل کیا جائے اور کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم بہشتی زیور کے دسوں حصے ہی پڑھ لیں اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے کہ مرد علماء سے پڑھ لیں پھر جو کچھ پڑھا ہے عورتوں کو پڑھا دیں اور یہ نہ سمجھیں کہ صرف دیکھ لینا کافی ہوگا عورتیں تو بھولی بھالی ہوتی ہیں اکثر مقامات کو مرد بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے اور علم دین ہی کے ساتھ خاص نہیں ہر فن ہر علم کی یہی کیفیت ہے مثلاً دیکھئے کسی شخص نے آج تک ایسی جرأت نہیں کی کہ طب کی کتابیں دیکھ کر اپنا یا اپنی بیوی بچوں کا علاج کر لیا ہوا اور منضج اور مسہل کے نسخے تجویز کر لئے ہوں بلکہ ہر مرض میں یہی کہتے ہیں کہ کسی طبیب سے رجوع کرو پس جب دوسرے علوم میں صرف مطالعہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا اور اپنے کو صاحب فن کا محتاج سمجھا جاتا ہے تو علوم دینیہ میں اپنے دیکھ لینے کو کافی کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی، ایک شخص مدت سے مجھ سے خط و کتابت رکھتے تھے لیکن جب ان کا خط آتا تھا کسی نہ کسی دنیاوی ہی غرض کے لئے آتا تھا، میں نے ان کو لکھا کہ تم جب لکھتے ہو دنیا ہی کی باتیں لکھتے ہو کیا تم کو دین کی باتوں میں کبھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو وہ جواب میں لکھتے ہیں کہ میرے پاس بہشتی زیور موجود ہے مجھ کو جو دین کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں دیکھ لیتا ہوں گویا ان کے نزدیک سارا دین بہشتی زیور ہی کے اندر آگیا ہے یا ان کو بجز ان مسائل کے جو اس میں ہیں اور کسی مسئلے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اس میں شک نہیں کہ بہشتی زیور میں ایک کافی تعداد مسائل کی موجود ہے لیکن اول تو اس میں زیادہ تر وہ مسائل ہیں جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں یا مشترک ہیں عورتوں اور مردوں میں اور قطع نظر اس سے اس میں مسائل اس قدر نہیں کہ ان کے بعد ضرورت دریافت کی ہی نہ ہو نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے سارے مسائل مطالعے سے حل ہی ہو جائیں اور کسی مسئلے میں شبہ ہی پیدا نہ ہو غرض ضرورت اس کی ہے کہ اول اس کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھا جائے اس کے بعد عورتوں کو پڑھایا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اول خود کتابیں دیکھیں اور جس مقام پر شبہ ہو وہاں نشان بنا دیں اور جب کبھی علماء سے ملاقات ہو اس کو حل کر لیں۔ یا کسی عالم کے

پاس لکھ بھیجیں کہ وہ اس کا مطلب لکھ کر بھیجدیں اگر ایک مدت تک اس التزام سے مطالعہ کیا جائے تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ بہت کم غلطی ہوگی دوسرے ایک دفعہ دیکھنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ دینیات کی کتابیں روزانہ مطالعہ میں رکھیں جیسے کھانا پینا روزانہ ہوتا ہے۔ صاحبو! جب قالب کا تغذیہ روزانہ ہوتا ہے تو کیا روح کے تغذیہ کی روزانہ ضرورت نہیں ہے بیشک ضرورت ہے اور میں تجربہ کی بات بتلاتا ہوں کہ ایک دفعہ کا دیکھا ہوا بہت کم یاد رہتا ہے بلکہ اکثر ذہن سے نکل جاتا ہے پس اگر کسی نے ایک دفعہ دیکھ کر کتاب کو اٹھا کر طاق میں رکھ دیا تو اس کو دیکھنے سے کیا نفع ہوا۔ غرض خورونوش کی طرح روزانہ اس کا بھی دور رکھو اگرچہ قلیل ہی مقدار میں ہو جب دیکھتے دیکھتے کتاب ختم ہو جائے پھر دوبارہ ابتداء سے دیکھنا شروع کردو اسی طرح سلسلہ جاری رکھے پس اس طرح کتاب بالکل حفظ ہو جائے گی لیکن پھر بھی بعض صورتیں تم کو ایسی پیش آئیں گی کہ ان کا حکم اس کتاب میں نہ ملے گا ایسی صورتوں کو کسی سے دریافت کرلو اور ساری عمر اسی شغل میں رہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی دنیا کا حرج کرو بلکہ تم کو دنیا کے کاموں سے جو وقت بچے اس وقت میں کچھ دین کا کام بھی کرلو اب یہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کے کاموں میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے اور فضول غپ شپ میں غیبت شکایت میں کتنا وقت جاتا ہے بس اس کے وقت میں سے کچھ تھوڑا سا دین کے کام میں بھی صرف کردو اگرچہ مناسب تو یہ ہے کہ یہ زائد وقت سارا دین ہی کے کام میں صرف ہوتا اور زائد وقت کو میں نے دین کے لئے اس واسطے تجویز کیا کہ آج کل اکثر لوگ خدا کے لئے وہی چیز تجویز کرتے ہیں جو اپنے سے بیکار ہو جائے مثلاً کپڑا جب تک سالم رہے تو اپنے لئے اور جب بالکل بیکار ہو جائے کہ پیوند بھی اس میں نہ لگ سکے اس وقت وہ خدا کے لئے دیا جاتا ہے مجھے اس کے مناسب ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ ایک عورت نے کھیر پکائی اور اس کو ایک رکابی میں لگایا اتفاق سے اس میں کتے نے منہ ڈال دیا اور کچھ اس سے کھا بھی گیا اس عورت نے اپنے لڑکے سے کہا کہ جا اس کو موذن کو دے آ چنانچہ وہ لے گیا اُس بچارے غریب کو خدا جانے کئے وقت کے بعد کھانے کو ملا تھا، مشہور ہے کہ یہ لوگ حریص ہوتے ہیں

صاحبو! کیوں نہ ہوں ان بیچاروں کا رزق تو آپ کے ذریعہ سے ہے اور آپ ان کو غمی کے سوا کسی وقت پوچھتے ہی نہیں اگر ہمیشہ ان کا خیال رکھو تو کیوں وہ حریص ہوں۔ واقعی ان لوگوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ دعائیں کرتے ہیں کہ کوئی مرے تو ہماری پوچھ ہو ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے وہاں ایک شخص کا انتقال ہوا اس کے ورثاء نے کفن کا چادرہ ایک غریب آدمی کو دیدیا تو وہاں کا تکیہ دار کہتا ہے کہ صاحب یہ تو ہمارا حق ہے یہ آپنے دوسرے کو کیوں دیدیا انھوں نے کہا بھائی تم کو تو ہمیشہ ملتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ واہ صاحب خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی آپ نے ہمارا حق دوسرے کو دیدیا۔ غرض اس مؤذن نے کھانا شروع کر دیا اور ادھر ہی سے ہاتھ مارا جدھر سے کتے کا کھایا ہوا تھا لڑکے نے کہا مُلاّ جی ادھر سے مت کھاؤ کتے کا کھایا ہوا ہے یہ سن کر اس ملاّ نے رکابی کو اٹھا کر پھینکدیا کہ وہ ٹوٹ گئی رکابی کے ٹوٹنے سے لڑکے نے رونا شروع کیا اس نے کہا کہ کمبخت ایک تو مجھے کتے کی جھوٹی کھیر کھلادی پھر روتا ہے کہنے لگا اس لئے روتا ہوں کہ یہ رکابی میرے بھائی کے ہگنے اٹھانے کی تھی تو نے وہ توڑ ڈالی مجھے ڈر ہے کہ میری والدہ مجھے مارنے نہ لگیں۔ یہ حکایت صحیح ہو یا غلط لیکن ان لوگوں کے ساتھ ہمارا جو برتاؤ ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں تو جیسے ہم لوگ ہر چیز بیکار خدا کے لئے تجویز کرتے ہیں اسی طرح وقت بھی تھوڑا سا نکمے ہی وقت میں سے نکال کر خدا کے کام میں صرف کر لینا چاہیئے۔ اور صاحبو! یہ نہ سمجھو کہ اس طرح ہم فاضل تو بن ہی نہ سکیں گے پھر کیا فائدہ۔ دیکھو مَالَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ (جو اچھی چیز پوری نہ حاصل کی جا سکے اس کو بالکل چھوڑا بھی نہ جائے) اگرچہ تم پورے عالم نہ ہو جاؤ گے لیکن جو کچھ علم ہو جائے گا وہ کیا کم ہے۔ بڑا فائدہ اس میں یہ ہے کہ جب چار باتیں تم کو معلوم ہوں گی ان کی بنا پر اپنے ماتحتوں کو تم روکتے ٹوکتے رہو گے اس روکنے سے بہت بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ جب انسان ایک بات کو دس دفعہ سنے گا تو ضرور ہے کہ اس پر اثر ہوگا۔ دوسرے جب بڑے آدمی کو کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو اس سے بہت سے لوگوں کو

نفع ہوتا ہے کیونکہ وہ جس طرح چھوٹوں کو کہہ سکتا ہے بڑوں کو بھی کہہ سکتا ہے۔ برخلاف ایک غریب اور ادنیٰ درجہ کے آدمی کے کہ وہ اگر کہے گا بھی تو صرف اپنے سے چھوٹے یا اپنے برابر کے لوگوں کو اس کی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ان بڑے لوگوں کو کچھ کہے۔ علیٰ ہذا ایک یہ انتظام کیا جائے کہ عوام الناس کے لئے ایک وقت مقرر کیا جائے اگرچہ دن میں ایک ہی گھنٹہ ہو بلکہ خواہ ہفتہ میں ایک ہی گھنٹہ ہو کہ اس وقت میں سب کو ایک جگہ جمع کر کے احکام سنائے جائیں اور اگر زیادہ مجمع ہو جائے تو ایک ایک معلم کو چالیس چالیس پچاس پچاس آدمی دیدیئے جائیں یا یہ کیا جائے کہ ایک محلے کے لئے ایک آدمی تجویز کر دیا جائے دوسرے محلے کے لئے دوسرا آدمی اور اگر متعدد آدمی نہ مل سکیں تو ایک ہی آدمی نمبر وار ہو ہر محلے میں جایا کرے اور جس قدر لوگ جمع ہو جائیں ان کو احکام سُنا دیا کرے لیکن احکام کتاب میں دیکھ دیکھ کر سنائیں اس طرح سے اگر ایک سال بھی سلسلہ رہے تو تمام مسلمان دین کے عالم ہو جائیں غرض ضرورت اس کی ہے کہ تعلیم دین بالکل عام ہو اور جب تک تعلیم دین عام نہ ہو گی احکام کی خبر ہی نہ ہو گی تو پھر توبہ کیونکر ہو سکے گی۔ دوسرا مانع توبہ سے یہ ہے کہ بعض لوگ گناہ کا گناہ ہونا تو جانتے ہیں لیکن اس کو کوئی بڑی چیز نہیں سمجھتے بلکہ ایک ہلکی بات سمجھتے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ کبھی گناہ کر کے ان لوگوں کا جی بُرا نہیں ہوتا دوسرے توبہ نہیں کرتے دیکھئے اگر اس شخص کو جو کہ شراب نہ پیتا ہو دھوکے میں کوئی شراب پلا دے تو دل پر کتنا صدمہ ہوگا لیکن جن گناہوں کی عادت ہو گئی ہے اور عادت کی وجہ سے ان کو خفیف سمجھ لیا ہے جیسے غیبت اس کے کرنے سے ذرا بھی جی بُرا نہیں ہوتا اور گناہ کے خفیف سمجھنے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ اس گناہ کے کرنے سے ہم کو کیا سزا ملے گی اور کتنا عذاب ہوگا اس کا علاج یہ ہے کہ احادیث ترغیب و ترہیب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا ترجمہ کر دیا جائے اور ایسے لوگ ان کو مطالعہ میں رکھا کریں لیکن ابواب فقہ کے دیکھنے کی اجازت عوام کو نہ دی جائے۔ کیونکہ ایسے احکام مختلف فیہا ہیں اگر عوام ان کو دیکھیں گے تو ان کو ضرر زیادہ ہوگا اس لئے صرف ترغیب و ترہیب کی احادیث ان کو دی جائیں چنانچہ منذری کی ترغیب و ترہیب بہت عمدہ کتاب ہے

اس بارے میں اگر اس کا ترجمہ ہو گیا ہو تو اس کو دیکھیں اور اگر اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو تو کسی اہل علم کو چاہیئے کہ اس کا ترجمہ کر دے اور بہشتی زیور میں بھی میں نے سو حدیثوں کا ترجمہ کر دیا ہے اس کا دیکھنا بھی بہت مفید ہے اس سے معلوم ہو گا کہ فلاں گناہ میں یہ عذاب ہو گا اس لئے اس گناہ سے بچنا چاہیئے۔ دوسرا سبب گناہ کے خفیف سمجھنے کا یہ ہے کہ گناہ کرتے کرتے ہماری عادت ثانیہ ہو گئی ہے کہ اس سے ذرا بھی طبیعت میلی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی طرف التفات بھی نہیں جاتا کہ ہم نے فلاں گناہ کیا ہے چنانچہ بعض اوقات اگر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو تعجب سے پوچھا جایا کرتا ہے کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا جس کے پاداش میں یہ مصیبت ہم پر نازل کی گئی ہیں۔ اس تعجب پر تعجب کرتا ہوں صاحبو! کیا کوئی وقت بھی گناہ سے بچا ہے پھر اس کے کیا معنے کہ جانے کونسا گناہ ہو گیا ہے بلکہ انصاف اور عقل کی رو سے تو یوں چاہیئے تھا کہ اگر ہم پر خدا تعالیٰ کا کوئی انعام ہو تو تعجب کریں کہ ہم جیسے گنہگاروں سے کیا بھلائی بن پڑی ہو گی جس پر یہ انعام ہوا ہے عادت ایسی بری چیز ہے کہ اس کی بدولت معصیت کا معصیت ہونا بھی ذہن سے نکل جاتا ہے۔
اس کا علاج یہ ہے کہ گناہ کی عادت چھوڑی جائے اور اپنے اوپر جبر کر کے گناہ کو ترک کیا جائے مثلاً غیبت کا گناہ ہے کہ اس میں علی العموم لوگ مبتلا ہیں اس کے چھوٹ جانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہمت کر کے ایک ہفتہ تک زبان کو غیبت کرنے سے اور کان کو غیبت سننے سے بند رکھا جائے جب ایک ہفتہ اس طرح گذر جائے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ دیکھو گے کہ غیبت کرنا تو درکنار غیبت سننا بھی گوارا نہ ہو گا بلکہ ایسا معلوم ہو گا گویا کسی نے ایک پہاڑ تم پر رکھدیا ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

(اللہ والوں کے دل پر ہزار درجہ کا غم ہوتا ہے اگر دل کے باغ (دلی وزحاتی میزان میں) سے ایک تنکے کے برابر کمی ہو جائے)

ایک مانع توبہ کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہ کو بہت ہی بڑی چیز سمجھ لیتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اتنے بڑے گناہ کے مقابلہ میں توبہ سے کیا کام نکل سکے گا علیٰ ہذا بعض کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ اس قدر

کثیر ہیں کہ ان کی معافی ممکن ہی نہیں اگرچہ ہم کتنی ہی توبہ کریں ان دونوں غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی بارگاہ کو بندوں پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں عادت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بہت بڑے امر میں کسی کی نافرمانی کرے یا معمولی باتوں میں ہمیشہ نافرمانی کرے تو ان دونوں کے قصور کو معاف نہیں کیا جاتا اسی طرح گویا خدا کے کارخانے کو بھی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے بندہ اول تو محتاج ہے اس کو اپنا دل ٹھنڈا کرنے کی بھی ضرورت ہے دوسرے کے مقابلہ میں اپنی بات رکھنے کی بھی ضرورت ہے دوسرے بندہ متاثر ہے کہ جب کسی نے اس کی مخالفت کی تو اس پر کچھ اثر ہوا اگر مکرر مخالفت ہوئی اُس اثر اور انفعال میں ترقی ہوئی اسی طرح ترقی ہوتے ہوتے اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ استعداد موافقت سلب ہو جاتی ہے اس لئے یہ معاف نہیں کر سکتا برخلاف خدا تعالیٰ کے کہ اُن کا ہر فعل اختیاری ہے وہاں تاثر کا نام بھی نہیں وہ عذاب بھی کرتے ہیں تو ارادہ محض سے کہ اس میں غیر اختیاری جوش کا شائبہ بھی نہیں ہوتا اس کا علاج یہ ہے کہ اس خیالِ فاسد سے توبہ کرے اور رحمت کی حدیثیں مطالعہ میں رکھے یقین ہے کہ اُن سے یہ مایوسی مبدل بأمید ہو جائے گی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے تمام روئے زمین کی برابر گناہ کئے اور وہ توبہ کرے تو خدا تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرما دیں گے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدد گناہوں کا بڑھ جانا موجب یاس نہ ہونا چاہیئے رہی کیفاً زیادتی اس کو یوں سمجھئے کہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کفر ہے کہ اس کی برابر کوئی دوسرا گناہ نہیں ہے پھر دیکھ لیجئے جس وقت حضور پرنور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم رونق افروز عالم ہوئے دنیا کا کیا حال تھا بجز معدودے چند فرقوں کے اور ان میں بھی گنتی کے چند آدمیوں کے علاوہ ساری دنیا کفر و جہل سے پُر تھی خصوصاً عرب اور اور پھر اس میں بھی خاصکر قریش کے انھوں نے تین سو ساٹھ بُت اپنے لئے بنا رکھے تھے یعنی ہر دن ایک نیا خدا (بزعم شاں) اُن سے سر تسلیم خم کرتا تھا لیکن دیکھ لیجئے خدا تعالیٰ نے اسی قبیلۂ قریش سے فلکِ اسلام کے لئے کیسے نیر اکبر پیدا کئے۔ حضرت ابوبکر

رضی اللہ عنہ اِسی قبیلے کے ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ (جب وہ کہنے لگے اپنے ساتھی سے غم نہ کرو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قبیلے کے ہیں جن کے لئے حدیث ہے اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ وَ عَلٰی ھٰذَا (احکام الٰہی کے جاری کرنے میں سب سے زیادہ مضبوط حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہیں) غرض یہ سمجھنا کہ ہمارے گناہ معاف نہ ہوں گے غلطی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بغیر توبہ کئے مرجاتا ہے۔

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ مجھ سے پھر گناہ ہوجائے گا اور جبکہ ہنوز صدورِ گناہ کا احتمال باقی ہے تو توبہ سے کیا فائدہ ہوگا لہٰذا توبہ اس وقت کرنی چاہیئے کہ اس کے بعد پھر گناہ نہ ہوگا۔

صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ زندگی کا کون سا حصہ ہے جس میں نہ ہونے کا یقین کرلیا ہے جوانی میں اگر چالاکی عیاری نہیں ہوتی تو بدمستی لاابالی پن ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں اگر آوارگی بدمستی نہیں ہوتی تو حرص طولِ امل حیل سازی مکروفریب حسد بغض۔ غرض بیسیوں امراض باطنی پیدا ہوجاتے ہیں تو حاصل اس عذر کا یہ ہوا کہ مرکر توبہ کریں گے مگر سمجھ لو کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ (جو مرگیا تو سمجھ لو کہ بس اس کی قیامت کا سلسلہ شروع ہوگیا) اور قیامت میں قبول توبہ ہے نہیں نتیجہ جو ہے ظاہر ہے اور سبب اس مانع کے پیش آنے کا یہ ہوتا ہے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب توبہ کے بعد بھی گناہ کا صدور ہوا تو وہ توبہ ٹوٹ گئی حالانکہ یہ غلط خیال ہے بلکہ پچھلے گناہ جو معاف ہو چکے ہیں وہ معاف ہوچکے ہیں اُن پر اب داروگیر نہ ہوگی اسی طرح جس جس گناہ سے توبہ کرتے جاؤ گے وہ محو ہوتا جائیگا لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بہت آسان ترکیب آئی بس آئندہ سے یہی کیا کریں گے کہ خوب جی بھرکر گناہ کئے پھر توبہ کرلی پھر گناہ کئے پھر توبہ کرلی کیونکہ جس توبہ کے وقت آئندہ گناہ کرنے کا بھی قصد ہو وہ توبہ مقبول نہیں جیسا کہ میری پچھلی تقریر بابت حقیقت توبہ سے معلوم ہوا ہوگا اور قبول توبہ کے مضمون میں یہ خیال کہ خوب گناہ کریں اسی کو پیدا ہوگا جو کہ نہایت بلید الطبع ہو اور بالکل ہی گیا گزرا ہو ورنہ سلیم الطبع کو تو اس سے اطاعت کا زیادہ

جوش پیدا ہوگا کہ اللہ اکبر جب بارگاہ خداوندی میں اس قدر رحم و کرم ہے تو ہم کو ہرگز مناسب نہیں ہے کہ اُس کی مخالفت کریں حاصل یہ کہ حدیث میں ہے مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ یعنی جس شخص نے گناہ کے بعد توبہ کرلی وہ گناہ پر ہٹ کرنے والوں میں نہیں ہے اور فرماتے ہیں کُلُّکُمْ خَطَّاؤُن وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ کہ گنہگار تو سب ہیں مگران میں اچھے وہ ہیں کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے رہتے ہیں۔ پس اگر اتنی ہمت نہ ہو کہ گناہ چھوڑ دو تو توبہ کرنے سے تو ہرگز ہمت نہ ہارو بلکہ جو گناہ ہوجایا کرے اس سے فوراً توبہ کرلیا کرو۔ اگر پھر ہوجائے پھر توبہ کرلو۔ دیکھو ایک شخص بیمار ہوجائے اور اس کو کوئی یہ رائے دے کہ علاج سے کیا فائدہ آخر پھر بھی احتمال ہے کہ بیمار ہوجاؤ گے، تو وہ جواب دیتا ہے کہ میاں اگر پھر بیمار ہوں گے تو پھر علاج کرلیں گے آئندہ کی بیماری کے اندیشے سے موجودہ بیماری کا علاج کیوں نہ کریں تو جو فتویٰ آپ کی عقل نے جسمانی مرض میں دیا ہے وہ فتویٰ روحانی امراض میں کیوں نہیں ہوتا اسی حدیث مَا اَصَرَّ میں وَاِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً یعنی اگرچہ ستر دفعہ توبہ ٹوٹ جائے۔

ایک مانع توبہ سے یہ ہے کہ بندہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالےٰ غفور رحیم ہے اس کو ہمارے گناہ بخش دینے کیا مشکل ہیں لیکن صاحبو! یہ جواب ظاہری بیماریوں میں کیوں نہیں دیا جاتا اور امراض سمی میں اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اس نے اس خیال سے کہ خدا تعالےٰ غفور رحیم ہے وہ ہم کو ضرور تندرست کردے گا۔ امراض جسمانی کا علاج نہ کیا ہو یا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ اُس نے خدا کی رحمت پر بھروسہ کرکے زہر کھالیا ہو کبھی نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا یوں کہے کہ میاں خدا کی رحمت پر بھروسہ کرکے سنکھیا کھاؤ تو اس کو دیوانہ بتلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا کے غفور رحیم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سنکھیا کھاؤ تو ضرر نہ کرے بلکہ سنکھیا ضرر بھی کرے گا اور خدا غفور رحیم بھی رہے گا۔ اسی طرح گناہ کا ضرر ہوتا ہے لیکن اس سے خدا تعالےٰ کے غفور رحیم رہنے میں کوئی نقص نہیں آتا۔

صاحبو! اس خیر سے کہ ہم غفور رحیم ہیں مقصود یہ ہے کہ جو گناہ تم سے ہوگئے ہیں

ان کی وجہ سے پریشان خاطر مت ہو اور توبہ کو بیکار نہ سمجھو ہم اُن سب کو معاف کر دیں گے چنانچہ اس آیت قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (آپ فرما دیں کہ اے میرے بندو جو اپنے نفسوں پر زیادتی کر کے گناہ کر چکے ہو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو جاؤ بیشک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کر دے گا درحقیقت وہی بخشش کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں) کا شانِ نزول یہی ہے کہ جب حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اول مکہ مکرمہ میں مبعوث ہو کر دعوتِ اسلام فرمائی تو لوگوں نے آ کر عرض کیا کہ ہم آپ پر ایمان تو لے آئیں لیکن جو گناہ ہم نے اس کے قبل کئے ہیں اُن پر تو ہم کو ضرور سزا ہو گی۔ پس جب دین آبائی بھی چھوڑا بدنامی بھی اُٹھائی اور آخرت کا عذاب بھی باقی رہا تو ہم کو فائدہ ہی کیا ہوا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم لوگ پچھلے گناہوں کا اندیشہ نہ کرو ہم غفور رحیم ہیں سب پچھلے گناہ بھی معاف کر دیں گے اور اگلے بھی بس معلوم ہوا کہ مقصود آیت سے ان لوگوں کی ناامیدی کو دور کرنا ہے جو اسلام اور توبہ سے اس خیال پر رُکتے تھے نہ کہ وہ مقصود جو لوگوں نے سمجھا۔ ایک مانع یہ ہے کہ یوں سمجھتے ہیں بلکہ زبان سے کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے جنت یا دوزخ وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ پھر نہ طاعت سے کچھ فائدہ اور نہ گناہ سے کوئی ضرر مگر تعجب ہے کہ یہ تقدیر دنیا کے کاموں میں مثلاً کمانا کھانا مال و دولت جمع کرنا ان میں کہاں چلی جاتی ہے ہم نے کسی کو نہ دیکھا کہ اس نے تقدیر کے بھروسہ پر کمانا چھوڑ دیا ہو یا کھانا نہ کھایا ہو یا کھیتی کرنی چھوڑ دی ہو اور اس میں تخم ریزی نہ کی ہو۔ کہ اگر تقدیر میں ہے تو خود بخود سب کام ہو جائیں گے اس موقعہ پر تو کہتے ہیں کہ صاحب تقدیر حق ہے لیکن تدبیر بھی تو کرنی چاہیئے بدون تدبیر کے کوئی کام نہیں ہوتا افسوس یہاں تو تدبیر کی ضرورت اور دین کے کام میں تدبیر کی ضرورت نہیں حالانکہ آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی خدا تعالیٰ نے ایک حد تک ذمہ داری بھی کی ہے فرماتے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (زمین پر چلنے والی اور رہنے والی جتنی بھی چیزیں ہیں سب کا رزق اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔) اور معاد کے بارے میں ذرا بھی ذمہ داری نہیں

فرمائی بلکہ صاف ارشاد ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کو اسی قدر ملے گا جس قدر وہ کوشش کرے گا) اور مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْھَا (جس نے اچھے عمل کئے تو اپنے فائدے کے لئے کئے جس نے بُرا عمل کیا اپنے لئے کیا) کہ ہم بالکل وعدہ نہیں کرتے جو جیسا کرے گا بھرے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ارشاد فرمایا اَیَطْمَعُ کُلُّ امْرِءٍ مِّنْھُمْ اَنْ یُّدْخَلَ جَنَّۃَ نَعِیْمٍ کَلَّا (کیا ہر شخص اس کی خواہش کرتا ہے کہ وہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جائے ایسا تو ہرگز نہ ہوگا یعنی عمل کے موافق جزا ملے گی) تو جب تک پاک نہ بنوگے ہرگز دخولِ جنت کے قابل نہ ہوگے۔

غرض معاش کو تدبیر پر رکھنا اور معاد کو تقدیر پر چھوڑ دینا سخت غلطی ہے بالخصوص جبکہ تحصیل معاد کی تدابیر خود خدا تعالیٰ ہی نے بتلائی ہیں اگر معاد کا حصول محض تقدیر سے ہوتا۔ اور تدبیر کو اس میں دخل نہ ہوتا تو تدابیر بتلانے کی کیا ضرورت تھی اسی طرح اور بہت سے موانع ہیں گو یہاں سب مذکور نہیں ہوئے مگر اس مختصر سی فہرست سے تھوڑے سے غور کے بعد وہ بھی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ پس جب موانع اور ان کے ازالہ کی تدابیر معلوم ہوگئی تو جلدی سے ان موانع کو زائل کرنا چاہیئے اور توبہ کر لینا چاہیئے تاخیر نہ کرنا چاہیئے کیونکہ تاخیر کی خاصیت یہ ہے کہ پھر اکثر توبہ میسر ہی نہیں ہوتی یہ حالت ہوتی چلی جاتی ہے کہ ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم ۔۔۔ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(میں ہر رات کو توبہ کے وقت یہ کہتا ہوں کہ ضرور اس بُرے خیال کو چھوڑ دوں گا لیکن جب دوسرا دن آتا ہے پھر یہی کہتا ہوں کہ کل سے نہ کروں گا۔)

کیونکہ توبہ ندامت کا نام ہے اور ندامت کہتے ہیں جی بُرا ہونے کو اور قصور پر شرمندہ ہونے کو اور شرمندگی اس وقت ہوتی ہے کہ طبیعت پر اثر باقی رہے اور اثر تھوڑے دنوں کے بعد زائل ہو جاتا ہے تو جب دل سے مقدمۂ توبہ ہی نکل گیا تو توبہ کیونکر نصیب ہو سکے گی۔ غرض کبھی توبہ کرنے میں دیر نہ کرے بلکہ دن کے گناہوں سے رات آنے کے قبل توبہ کر لے اور رات کے گناہوں سے دن ہونے سے پہلے۔ اور اگر کہو کہ سب سے آخری جو توبہ ہوگی اس کے بعد کے گناہ تو پھر بھی بلا توجہ کے رہ جائیں گے تو مؤاخذ

ہر حال میں ہوا پھر روز کی توبہ کیا مفید ہوئی تو جواب یہ ہے کہ کیا وہ شخص جس پر دس برس کے گناہوں کا بار ہو اور وہ شخص جس پر ایک دن کے گناہوں کا بار ہو برابر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص پر دس مقدمے فوجداری کے ہو جائیں اور اس سے وکیل یوں کہے کہ اگر پیروی کی گئی تو امید ہے کہ نو مقدموں سے تم بری ہو جاؤ گے لیکن ایک مقدمہ میں باوجود پیروی کے بھی تم کو سزا ہو گی تو میں پوچھتا ہوں کہ ایسی صورت میں کیا رائے قائم کی جائے گی آیا یہ کہ جب ایک میں سزا ہو گی تو پیروی کی کیا ضرورت بقیہ نو میں بھی ہو تے دو یا یہ کہ باوجود ایک میں یقین سزا ہونے کے دوسرے مقدمات کی اس لئے پیروی کی جائیگی کہ جس قدر بھی سزا کم ہو بہتر ہے ظاہر ہے کہ دوسری تجویز پر عمل ہوگا تو جو شخص پچاس برس کے گناہوں کی پوٹ لے گیا اور جو شخص ایک دن کے گناہ لے گیا کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں اور اگر کہئے کہ برابر ہیں تو میں کہتا ہوں کہ مقدمات کی پیروی میں دونوں کو برابر کیوں نہیں سمجھا گیا اور نو مقدمات کی پیروی کیوں کی گئی۔ بعض موانع ضروری اور بھی قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ ایک مانع خاص معصیت اکتساب حرام سے توبہ کرنے کا یہ بھی ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتا کیونکہ ہم کھانے کمانے کی طرح طرح کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اُن میں حلال وحرام کی تمیز بہت مشکل ہے ہاں مولویوں کو گناہ چھوڑ دینا آسان ہے کیونکہ ان لوگوں کو مفت کا ملتا ہے اس لئے بآسانی گناہ چھوڑ سکتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو میں وقت ترک گناہ کے لئے کہہ نہیں رہا میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب گناہ ہو جایا کرے توبہ کر لیا کرو تو گناہ کے نہ چھوٹ سکنے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ توبہ بھی نہ ہو سکے دوسرے اگر غور کر کے دیکھا جائے تو کوئی ناجائز ذریعہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو ترک نہ کیا جا سکے اور یہ جو ہم کو ترک کرنا گراں معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اخراجات روزمرہ میں بعض ایسی چیزیں بڑھالی ہیں کہ جن کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم ان کو ضروری سمجھ رہے ہیں تو اس کا جواب وہی ہے جو کہ کسی شخص نے ایک ادھورے شاعر کو جس نے شعر میں تشدید آنے میں ضرورت کا عذر کیا تھا اُس کو جواب

دیا تھا کہ شعر گفتن چہ ضرور تو اگر بضرورت کثرت تعلقات گناہ ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ تکثیر تعلقات چہ ضرور اصل جواب تو یہی ہے لیکن یہ جواب ان لوگوں کے لئے جو کہ عالی ہمت ہوں اور دین کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح نہ دیتے ہوں کم ہمتوں کے لئے دوسرا جواب بھی ہے مگر میں اس جواب کو زبان پر لاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کم فہم لوگ اس سے گناہ کی اجازت نہ سمجھ جائیں مگر حاشا وکلا گناہ کی اجازت دینا ہرگز مقصود نہیں بلکہ منظور تقلیل اثم ہے حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ اگر ان کو نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی کام اٹکتا ہے بعض وہ ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان نہیں ہے مثلاً لباس خلاف وضع اسلامی پہننا اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو دنیا کا کوئی بھی نقصان نہیں۔ اسی طرح ٹخنوں سے نیچے پاجامے پہننا کہ ان کے ترک سے دنیا کا کوئی نقصان نہیں ہے یا مثلاً عورتیں اس قدر باریک لباس پہنتی ہیں کہ اس میں پورے طور پر ستر نہیں ہوتا تو ان باتوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان بھی نہیں ہے رشوت وغیرہ میں تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بغیر ان کے ہمارے کام چلنے دشوار ہیں لیکن ان معاصی بے لذت میں کیا نفع ہے اور ان کے ترک میں کیا نقصان ہے علیٰ ہذا کسی اَمرد یا اجنبی عورت کو بری نظر سے دیکھنا کہ اس میں کچھ بھی نفع نہیں نہ اس کے ترک میں کوئی ضرر۔ اگر کہو کہ صاحب نہ دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے تو یہ بالکل غلط ہے بلکہ تکلیف دینے میں ہوتی ہے کہ اول نظر پڑتے ہی قلب میں ایک سوزش پیدا ہوئی اس کے بعد جب وہ نظر سے غائب ہوگیا تو اس سوزش میں ترقی شروع ہوئی حتیٰ کہ بعض لوگوں کا اس میں خاتمہ ہوگیا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ نہ دیکھنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے تو تھوڑی سی تکلیف کا پھر وہ بھی چند دن کی۔ برداشت کر لینا کیا دشوار ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بہت ہی تکلیف ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر ضرر کیا ہوا کیا اس تکلیف سے تنخواہ بند ہوگئی یا کھانا بند ہوگیا ہرگز نہیں اور خود یہ تکلیف وہمی کوئی معتد بہ ضرر نہیں۔ غرض ان معاصی کو تو فی الفور چھوڑ دیا جائے اور جن معاصی کو یہ زعم خود

موقوف علیہ حوائج دنیویہ کا سمجھ رکھا ہے اُن کو اگر ترک نہ کر سکیں تو روزانہ ندامت واستغفار اور یہ دعا کہ اے اللہ ہم کو اس سے نجات دے یہ تو ممکن ہے اتنا ہی کر لیا کرو یہ بے فکری و بے پروائی تو بہت بُری چیز ہے۔

ایک مانع یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ گناہ کو لذیذ سمجھتے ہیں اور اس لئے نہیں چھوڑ سکتے اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ مآل پر نظر کرے اور سوچے کہ یہ ساری لذت ایک دن ناک کے رستے نکلے گی۔ دوسرے اہل فہم کے لئے اِس کا یہ جواب ہے کہ کہنا ہی غلط ہے کہ گناہ میں لذّت ہوتی ہے۔ دیکھئے اگر عادت سے زیادہ مرچیں سالن میں ڈال دی جائیں تو اگرچہ اُن میں لذت ہوگی لیکن اس لذت کے ساتھ سوزش ایسی ہوگی کہ اس کے سامنے لذّت کا ادراک بھی نہ ہوگا اور اگر کچھ ادراک ہو بھی تو لذّت کا ادراک تو فوراً ہی ختم ہو جائےگا لیکن سوزش بہت دیر تک باقی رہے گی اسی طرح گناہ کرنے میں گو کچھ لذت بھی ہو لیکن اس روحانی تکلیف و پریشانی کے مقابلہ میں جو کہ گناہ میں ہوتی ہے یہ لذّت کچھ بھی نہیں۔ دوسرے اس لذت کا خاتمہ تو فوراً ہی ہو جاتا ہے اور اس روحانی تکلیف کا اثر مدت تک باقی رہتا ہے ہم کو التفات نہیں ورنہ معلوم ہو سکتا ہے کہ گناہ کر کے کس قدر کدورت اور طبعی توحش پیدا ہوتا ہے فوراً ہی مرتکب کی طبیعت یہ فتویٰ دیتی ہے کہ تم نے بہت بُرا کام کیا کبھی اُس کو وہ مسرت نصیب نہیں ہوتی جو کہ نیکی کر کے مثلاً نماز پڑھ کر یا روزہ رکھ کر ہوتی ہے کہ قلب میں ایک اطمینان ایک نور سا معلوم ہوتا ہے برخلاف گناہ کے کہ اس کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سر پر جوتیاں ماردیں مگر افسوس ہے کہ ہم پھر بھی باز نہیں آتے گویا جوتیاں کھانے کی عادت ہوگئی ہے جیسے چماروں کی عادت ہو جاتی ہے یا جیسے نمرود کی عادت ہوگئی تھی اور یہ تکلیف تو فی الحال ہوتی ہے پھر اس کا ایک مآل ہوتا ہے یعنی دنیا ہی میں کہ اس پر طرح طرح کی آفتیں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اکثر رزق سے محروم ہو جاتا ہے اور اُس کو بشرطِ غور معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے خوب کہا ہے ؎

ہرچہ برتو آیدت ظلمات وغم آں زبیباکی وگستاخی ست ہم
غم چو بینی زود استغفار کن غم بامر لق آمد کار کن

ابن ماجہ کی حدیث میں ہے اِنَّ الْعَبْدَ یُحَرَّمُ الرِّزْقُ بِخَطِیْئَۃٍ یَعْمَلُھَا (درحقیقت بندہ کے گناہ کی وجہ سے اس پر رزق بند کردیا جاتا ہے اور بندہ اپنے گناہ کو جانتا ہے) اور کھانے کو ملے بھی تو اس کی برکت بالکل جاتی رہتی ہے اس کا سہل طریقہ مشاہدہ کا یہ ہے کہ آپ دو مہینے کی رخصت لے کر ان میں سے ایک مہینہ تو کسی ایسے شخص کے پاس گذاریے جو کہ نہایت تنعّم اور آرام میں زندگی بسر کرتا ہو اور کسی گناہ سے نہ بچتا ہو اور دیکھئے کہ ان گناہوں کی بدولت اس کے قلب کی کیا کیفیت ہے آخر بات چیت سے اُس کے انداز کا پتہ لگ ہی جائے گا خاص کر اس وقت میں جب اس پر کوئی مصیبت آئے مثلاً بیمار ہو جائے یا کسی دشمن کی مخالفت کا اندیشہ ہو اس کے بعد کسی ایسے شخص کے پاس رہیئے کہ اس کو اچھی طرح کھانے کو بھی میسر نہ آتا ہو مگر خدا کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کے قلب کی کیفیت دیکھئے خاص کر کسی مصیبت کے وقت اس کے بعد ان دونوں کی قلبی حالت کا موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ سرور اصلی کس کے قلب میں ہے آپ پائیں گے کہ وہ فاقہ مست ہر وقت شاداں و فرحاں ہے اور یہ متنعّم ہر وقت غم و الم میں مبتلا ہے اور یہ ایسا یقینی اور بیّن فرق ہے کہ جب چاہے اور جس کا جی چاہے امتحان کر دیکھے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ یہ پریشانی کس چیز کی ہے اور وہ سرور کس چیز کا ہے ظاہر ہے کہ پریشانی نافرمانی کی اور سرور فرمانبرداری کا ہے بس نافرمانی میں لذت اور فرمانبرداری میں کلفت کہنا غلط ہوا بلکہ امر بالعکس ہے قرآن شریف میں ارشاد ہے وَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً (ہم ضرور اسی کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے) یہ تو فرمانبردار کیلئے ہے اور ارشاد ہوتا ہے فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا (بیشک اس کے لئے تنگی کی زندگی ہے) یہ نافرمان کے لئے ہے غرض فرمانبرداری میں پوری راحت ہے اور راحت کا نام عیش ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر ایک امیر کبیر کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس سے

کہا جائے کہ تم اس پر راضی ہو کہ یہ تمام دولت اس غریب کو دیدو اور یہ تمہاری عوض پھانسی لے لے تو وہ یقیناً قبول کرلے گا اب بتلایئے کہ یہ قبول کیوں ہوا اس لئے کہ دولت کے بدلے میں ایک مصیبت سے نجات ہوئی اور راحت نصیب ہوئی، غرض یہ کہنا کہ لذّت کی وجہ سے گناہ نہیں چھوٹ سکتے غلط ہوا یہاں تک تو توبہ کے موانع اور اُن کے علاج کا ذکر تھا اب ایک مختصر سی فہرست اُن گناہوں کی جن میں سب مبتلا ہیں بیان کرنی باقی ہے۔

سو اول یہ سمجھے کہ دین کے پانچ جزو ہیں۔ پہلا جزو عبادات جیسے نماز، روزہ زکوٰۃ، حج وغیرہ دوسرے معاملات جیسے بیچنا خریدنا، نوکر رکھنا، رشوت لینا، سود لینا روپے کے عوض پیسے لینا یا گوٹہ ٹھپّہ خریدنا وغیرہ۔ تیسرے عقائد کہ خدا کو ایک جاننا اور اس کو قادرِ مطلق ماننا سیتلا وغیرہ کے توہمات کو باطل سمجھنا وغیرہ چوتھے معاشرت کہ آپس میں میل جول کس طرح رکھیں، جب ملیں سلام کریں مصافحہ وغیرہ، پانچویں اخلاق یعنی ملکاتِ باطنہ کا درست کرنا حسد، بغض، کینہ، عداوت وغیرہ سے دل کو پاک کرنا۔ تحمّل، بردباری، وقار، نرمی، خوش کلامی اپنے اندر پیدا کرنا۔ یہ پانچ حصے دین کے ہیں۔ ہمارے مسلمان بھائیوں نے دین کو صرف عبادات میں منحصر کردیا ہے۔ اس کے علاوہ چاروں اجزاء کو دین سے خارج سمجھتے ہیں گویا اُن کے نزدیک بہت سی نقلیں پڑھ لینا گلے میں تسبیح ڈال لینا روزہ رکھ لینا بس اِسی کا نام دین ہے۔ بعضے عبادات کے ساتھ تصحیح عقائد کو بھی دین سمجھتے ہیں۔ باقی معاملات اور معاشرت اور اخلاق کو کوئی شخص دین کا جزو ہی نہیں سمجھتا الا ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے دنیا کے حالات ہیں ان میں ہم جس طرح چاہیں کریں شریعت کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ یہ سب شریعت کے اجزاء ہیں اسی طرح عقائد بھی۔ ان اجزاء میں ہر جزو کے اندر بہت سے احکام ہیں مگر میں ہر ایک میں سے بطور نمونہ کے دو چار اجزاء کا بیان کرکے وعظ کو ختم کردوں گا۔ اول عقائد کو لیجئے کہ ان میں سے بعض عقائد غلط اور خلافِ واقع ہیں۔ مثلاً عورتیں بہت سی اچھی چیزوں کو بُری یا بُری چیزوں کو اچھی سمجھتی ہیں جیسے دنوں کو منحوس کہنا اکثر عورتیں بدھ

کے دن کو منحوس سمجھتی ہیں اور غضب ہے کہ بعض مرد بھی اس میں ان کے ہم عقیدہ ہیں یا مثلاً عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی دن کوّا گھر میں بولے تو اس دن مہمان ضرور آتے ہیں اسی طرح اگر آٹے میں پانی زیادہ ہو جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ آج کوئی مہمان آنے والا ہے اکثر جانوروں کو منحوس سمجھ رکھا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ قمری منحوس ہے اس کو گھر میں نہ پالو بلکہ اگر شوق ہو تو مسجد میں پالنا چاہیئے شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ اگر اُجڑے تو اللہ ہی کا گھر اُجڑے۔ نعوذ باللہ۔

غرض جتنی چیزیں اپنے سے نکمی ہوں سب خدا کے لئے۔ بعض عورتیں کیلے کے درخت کو منحوس سمجھتی ہیں کہتی ہیں کہ یہ درخت مُردے کے کام میں آتا ہے اس لئے اس کو گھر میں نہ ہونا چاہیئے کہ شگون بد ہے اور مردے کی چارپائی کو اُس کے کپڑوں کو منحوس سمجھتے ہیں مگر تعجب ہے کہ اس کے کپڑوں کو تو منحوس سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اس کا قیمتی دوشالہ ہو یا اس کی جائداد ہو تو اس کو منحوس نہیں سمجھتے حالانکہ اگر مردے کے ساتھ تلبّس سے اُس کے لباس میں نحوست آئی ہے تو اس تلبّس سے اس کے قیمتی کپڑوں میں نحوست آنی چاہیئے اور اگر مُردے کی طرف نسبت سے ان چیزوں میں نحوست آئی ہے تو اسی نسبت سے اس کی جائداد میں بھی نحوست آنی چاہیئے یہ عقیدہ بالکل مہمل اور وہم ہے مسلمانوں میں اس کا رواج ہندؤں سے آیا اور بعض چیزوں کو مرد بھی منحوس سمجھتے ہیں جیسے اُلّو کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ جس مقام پر بولتا ہے وہ مقام ویران ہو جاتا ہے اس لئے وہ منحوس ہے حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے نہ الّو منحوس ہے نہ اس کے بولنے سے کوئی جگہ ویران ہوتی ہے یاد رکھو وہ جو بولتا ہے تو خدا کا ذکر کرتا ہے تو کیا خدا کے ذکر سے یہ نحوست آئی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ذاکر تو ہے لیکن اس کا ذکر جلالی ہے اس لئے اس کا یہ اثر پڑتا ہے حالانکہ خود یہ تقسیم اور یہ کہ جلالی میں یہ خاصیت ہوتی ہے یہی بے اصل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ الّو ایسے مقام کو تلاش کرتا ہے جہاں یکسوئی ہو اور اس کو اندیشہ نہ رہے اس لئے وہ ویرانوں میں بیٹھتا ہے اب یہ دیکھئے کہ وہ ویرانی جو پہلے سے ہے کہاں سے آئی سو وہ ہم لوگوں کے گناہ اور اعمال بد کی وجہ سے ہوتی ہے اُس کے

بعد کو اُس مقام پر آتا اور بولتا ہے بس ویران کن ہم اور ہمارے گناہ ہوئے نہ کہ الو اور جب یہ ہے تو منحوس گنہگار ہوئے الو کیوں منحوس ہوا بعض پڑھے ہوئے لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ہے دن کے منحوس ہونے پر فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ الخ (اور ہم نے ان پر ایک تند و تیز ہوا ایسے دنوں میں بھیجی جو ان کے حق میں منحوس تھے) کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میں عاد پر عذاب نازل ہوا ہے وہ دن منحوس ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ دن کون کون ہیں اس کا پتہ دوسری آیت کے ملانے سے چلے گا فرماتے ہیں کہ وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ حُسُوْمًا (اور قوم عاد کو ہلاک کر دیا گیا تیز و تند ہوا کے ذریعہ جو ان پر سات رات اور آٹھ روز مقرر کر دی گئی تھی) کہ آٹھ دن تک ان پر وہ عذاب رہا۔ تو صاحبو! اس اعتبار سے تو چاہیئے کہ کوئی دن مبارک ہی نہ ہو بلکہ ہر دن منحوس ہو کیونکہ ہفتہ کے ہر دن میں اُن کا عذاب پایا جاتا ہے جن کو ایامِ نحسات کہا گیا ہے تو کیا اس کا کوئی قائل ہو سکتا ہے۔ اب آیت کے صحیح معنے سنیئے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان پر جن ایام میں عذاب ہوا وہ ایام بوجہ نزولِ عذاب خاص اُن کے لئے منحوس تھے نہ کہ سب کے لئے اور وہ عذاب تھا بوجہ معصیت کے پس مدار نحوست کا معصیّت ہی ٹھیری اب بحمد اللہ کوئی شبہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں نے قرآن شریف کی دوسری آیت سے استدلال کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نحوست ہمیشہ کے لئے ہے قرآن شریف میں ہے فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (منحوس دن میں آندھی چلائی) مگر میں کہتا ہوں کہ مستمر کے دو معنی ہیں ایک دائم دوسرے منقطع۔ دوسری تفسیر پر یہ معنی ہونگے کہ وہ نحوست منقطع ہو گئی اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ اِذَا جَآءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ (جب کسی چیز میں شک پیدا ہو جائے تو اس کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں) اور اگر کسی کی خاطر سے ہم مان

بھی لیں کہ مستمر کے معنی دائم ہی کے ہیں تو ہم وہی پہلا جواب دیں گے کہ نحس سے مراد نحس علیہم ہے اور ان کے حق میں بوجہ عذاب کے دائم ہونے کے وہ یوم ہمیشہ ہی کے لئے منحوس ہے۔ غرض یہ اعتقاد کہ چیز وں میں نحوست ہے غلط ہے۔

ایک ہندو کا ایک قصہ یاد آگیا جو مجھ سے ایک معتبر راوی نے کہا کہ وہ شہر بھر کے وہ گھوڑے جن کو منحوس سمجھ کر مالک بیچ دیتے تھے ارزاں خرید لیتا تھا اور ان کو خوب نفع سے بیچتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مجھ کو اُن کی نحوست نہیں لگتی۔ بعضے لوگ اگر کسی عورت کی جیب کالی ہو تو اس کو منحوس سمجھتے ہیں اس کا نام رکھا ہے کال جیبی یہ بھی لغو ہے۔ صاحبو! یہ جو کچھ نحوست ہے بدولت معاصی کے ہمارے اندر رہے۔ مگر افسوس کہ ہم کو اپنے اندر نہیں نظر آتی دوسروں میں نظر آتی ہے۔ ہماری وہ حالت ہے جیسے ایک حبشی چلا جاتا تھا رستے میں دیکھا کہ ایک آئینہ پڑا ہوا ہے اٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر آئی بہت خفا ہوا اور غصے میں آکر اس کو زمین پر پٹک دیا اور کہنے لگا کہ ایسا بد صورت تھا تب تو کسی نے یہاں پھینک دیا۔ ایک اور دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا اتفاق سے ایک ٹکڑا پانی کی بدھنی میں گر گیا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر آئی باپ سے کہنے لگا کہ ابا جان اس نے ہمارا ٹکڑا لے لیا۔ ابا جان نے جو لوٹے میں دیکھا تو اپنی صورت نظر پڑی آپ نے سمجھا کہ یہی ہوگا جس نے ٹکڑا چھینا تو آپ فرماتے ہیں کہ سفید ڈاڑھی مُنہ پر لگا کر بچے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے شرم تو نہ آئی آخر غصے میں آکر لوٹے کا پانی گرا دیا پھر جو دیکھا تو ٹکڑا موجود ہے مگر صورت ندارد، تو آپ فرماتے ہیں کہ اگرچہ غاصب تھا مگر تھا حیادار دیکھو ٹکڑا ڈال کر غائب ہوگیا۔ بعینہ یہی ہم لوگوں کی حالت ہے کہ اپنے عیوب دوسروں میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ نحوست اپنے اندر ہے کہ گناہ پر گناہ کرتے چلے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ الّو منحوس ہے اور قمری منحوس ہے۔ ایک گناہ عقیدے کے

متعلق عورتیں یہ کرتی ہیں کہ ٹونے ٹوٹکے کرتی ہیں افسوس ہے کہ نہ شریعت کا لحاظ ہے نہ خدا کا خوف ہے۔

ایک گناہ عقیدے کے متعلق یہ ہے کہ اکثر عورتیں منّت مانتی ہیں کہ اگر ہمارا یہ کام ہوجائے تو ہم فلاں بزرگ کی نیاز دیں گے اور کہا جاتا ہے کہ ہم تو ایصال ثواب کرتے ہیں اور ایصال ثواب میں کیا حرج ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے وہاں محض ثواب پہنچانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس فعل سے یہ خوش ہوں گے اور چونکہ یہ خدائی کارخانے میں دخیل ہیں اس لئے ان کی خوشی سے ہمارا کام پورا ہوجائے گا۔

سو بیبیوا یاد رکھو کہ خدائی کارخانے میں کوئی دخیل نہیں ہے نہ وہاں کسی کا کچھ اثر ہے۔

ایک گناہ عقیدے کے متعلق یہ ہے کہ عورتیں قریب کل کے اور اکثر مرد بھی نکاحِ ثانی کو برا سمجھتے ہیں اور افسوس ہے کہ بعض لکھے پڑھے لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب نکاح ثانی فرض نہیں تو نکاح اول فرض ہے اور اگر نہیں ہے تو نکاح اول کے ساتھ یہی معاملہ کیوں نہیں کیا جاتا اگر اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے تو خیر مولویوں کے کچھ تو آنسو پچھ جاتے۔ کیا وجہ ہے کہ نکاح اول کے لئے تو اس قدر کوشش کی جاتی ہے کہ اگر لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہو جاوے اور کہیں سے پیام نہ آئے تو فکر پڑ جاتی ہے اور اس کے تذکرے کئے جاتے ہیں ہاں اگر کسی عورت پر شوہر اول کا بہت رنج غالب ہو یا اس کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے ہوں کہ ان کی پرورش کا انتظام نکاح کے بعد دشوار ہو یا بچوں کی جائیداد وغیرہ موجود ہو کہ اس کا انتظام اس کے سپرد ہو تو البتہ ایسی عورت کو اجازت ہے کہ وہ نکاح نہ کرے بشرطیکہ مرد کی بالکل خواہش نہ ہو لیکن اگر کوئی مانع بھی نہ ہو اور پھر بھی عرف کی شرم کی وجہ سے نکاح ثانی نہ کرے اور اس کو عیب سمجھے تو سخت گناہ ہے بعض مقامات پر اس قدر جہالت ہے کہ اگر منگنی کے بعد لڑکے کا انتقال ہوجائے تب بھی نکاح نہیں کرتے اور لڑکی کو بٹھلائے رکھتے ہیں یہ سخت جہالت ہے۔ اور عورتوں سے زیادہ مردوں کی حالت

پر افسوس ہے کہ وہ باوجود ذی عقل ہونے کے بھی اس کو عیب سمجھتے ہیں اور بعضے مرد اگرچہ زبان سے اس کو برا نہیں کہتے لیکن ایسی عورت کو جس نے دوسرا نکاح کرا لیا ہو ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کے دل میں اس کی اتنی عزت نہیں ہوتی جتنی اس عورت کی جو کہ ساری عمر بیوہ بنی بیٹھی رہے علماء اس بارے میں جتنی کچھ کوشش کرتے ہیں ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں کے دل سے اس کے عیب سمجھنے کا خیال نکل جائے یہ تو مختصر سی فہرست عقائد کے متعلق تھی۔ اب عبادات کو لیجئے کہ ان میں بھی بہت سی باتوں میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ مثلاً عورتیں اکثر تو نماز ہی نہیں پڑھتیں اور یہ عذر کرتی ہیں کہ ہم کو گھر کے کاموں سے فرصت نہیں ہوتی میں کہتا ہوں کہ ان عذر کرنے والوں کو اگر عین کام کے وقت پیشاب کی ضرورت اس شدت سے ہو کہ اس کو روک ہی نہ سکیں اور اتفاق سے بیت الخلا میں جانے کے بعد بند پڑ جائے تو اس صورت میں یہ کیا کریں آیا اس وقت تک کہ جب تک پیشاب سے فراغت ہو کام کا حرج کریں یا نہیں ظاہر ہے کہ مجبوراً کام کا حرج کرنا پڑے تو کیا خدائی حکم کی اتنی ضرورت بھی نہیں جتنی کہ طبعی تقاضوں کی اور بعض عورتیں اگر نماز پڑھتی بھی ہیں تو بہت ہی دیر کر کے اور مکروہ وقت میں اور پھر اس قدر جلدی کہ نہ قیام درست نہ رکوع ٹھیک گویا ایک قید ہے کہ جس طرح بنے اس سے چھوٹیں۔ بیبیو! اگر زیادہ ہمت نہیں ہے تو خیر نفلیں نہ پڑھا کرو لیکن فرائض و سنن میں تو کتر بیونت نہ کیا کرو ان میں تو ارکان کی تعدیل کا لحاظ ضرور کر لیا کرو۔ اسی طرح زکوٰۃ دینا حج کرنا اس میں عورتیں بہت سستی کرتی ہیں یاد رکھو کہ جس مال پر زکوٰۃ نہیں دی جاتی وہ قیامت کے دن سانپ کی شکل بن کر ڈسیگا۔ اب معاملات کو سنئے ان میں بھی بہت زیادہ گڑبڑ کر رکھی ہے مثلاً عورتیں اکثر گیہوں کے آٹے سے چنے یا مکئی کا آٹا بدلتی ہیں مگر ان کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے بدلنے کا کیا طریقہ ہے اس میں بعض صورتیں ایسی ہیں کہ اُن کے بدولت یہ لین دین سود کا لین دین ہو جاتا ہے اور اس سے سود کا گناہ ہوتا ہے یہ مثال میں نے اس لئے بیان کی کہ ہم کو معلوم ہو کہ کھانے پینے میں بھی مسائل شرعیہ کے جاننے کی ہم کو ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ مردوں کو بھی ان مسائل سے آگاہی نہیں اور لیجئے عورتیں زیور بنواتی ہیں اور خرید کرتی ہیں۔ اس میں

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ پرانے زیور سے نیا زیور بدلا گیا اور فرض کیجئے کہ نیا تو بارہ تولہ ہے اور پرانہ پندرہ تولہ ہے اور اس بارہ تولہ کو بیس تولہ کی عوض میں لیا گیا تو یہ معاملہ سود کا معاملہ ہو گیا۔ اسی طرح اکثر چاندی کا زیور روپے سے خریدا جاتا ہے اس میں بھی بہت گڑ بڑ کی جاتی ہے۔

صاحبو! ان میں سخت ضرورت ہے مسائل دین کے سیکھنے اور معلوم کرنے کی بتلایئے کہ جب بدن پر ناجائز مال لپٹا ہوا ہوگا تو نماز روزے کی توفیق اور اعمالِ صالحہ کی ہمت کیونکر ہوگی۔ اسی طرح سفر ریل میں اکثر عورتیں اور بعض مرد بھی اس قدر اسباب لیجاتے ہیں کہ وہ حدِ اجازت سے زیادہ ہوجاتا ہے اور نہ اس کا محصول دیتے ہیں نہ اس کو وزن کراتے ہیں اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود تو تیسرے درجے کا ٹکٹ لیا تھا لیکن اتفاق سے درمیانہ درجے میں کوئی دوست بیٹھا ہے اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور دو تین اسٹیشن تک اس میں بیٹھے چلے گئے۔ یا ٹکٹ لیا دو تین اسٹیشن کا اور چلے گئے بہت دور تک ان سب صورتوں میں یہ شخص ریلوے کمپنی کا قرضدار رہتا ہے اور قیامت کے دن اس سے وصول کیا جائے گا۔ اگر کبھی ایسی غلطی ہوگئی ہو تو اس کا سہل طریقہ ادا کرنے کا یہ ہے کہ حساب کر کے جس قدر قیمت ریلوے کی اپنے ذمہ نکلے اس قیمت کا ایک ٹکٹ خرید کر اُس سے کام نہ لے اس سے کمپنی کا روپیہ بھی ادا ہو جائے گا اور اس شخص پر کوئی الزام بھی نہ آئے گا۔ اب معاشرت کو لیجئے کہ اس میں لوگوں سے بہت گناہ ہو جاتے ہیں آجکل نوجوانوں نے اہلِ یورپ کی تقلید کو تہذیب اور انسانیت سمجھ رکھا ہے صاحبو! قرآن و حدیث کو دیکھو تو معلوم ہو کہ تمہارے مذہب کی برابر تہذیب اور شائستگی دنیا کے کسی مذہب اور کسی فرقے میں نہیں ہے علیٰ ہذا عورتوں کی معاشرت بالکل خراب ہے اکثر عورتوں میں پردہ بہت ہی کم ہے اور سر تو ان کا ہمیشہ ہی کھلا رہتا ہے خصوصاً آدھا سر تو گویا ڈھانپنا ان کو ضروری ہی نہیں ہے اکثر عورتیں زیور ایسا پہنتی ہیں جس میں آواز پیدا ہوتی ہے یاد رکھو ایسا زیور پہننا جائز نہیں ہے ہاں آپس میں لگ کر بجے اور قدم بھی آہستہ سے رکھا جائے کہ اس میں زیادہ آواز پیدا نہ ہو تو جائز ہے۔ عورتوں میں ایک مرض یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو بالکل میلی کچیلی خراب حالت میں رہیں گی اور جب برادری میں جائیں گی تو خوب بن

سنور کر بلکہ پڑوس تک کا زیور بھی مانگ کر لیجائیں گی اور بجتا ہوا زیور ضرور پہنیں گی۔ اور پھر اس پر اس قدر توجہ ہے کہ ہر عورت سے مجمع بھر کی عورتوں کا زیور اُن کا لباس سب ایک ایک کر کے دریافت کر لیجیئے گویا اس فہرست لینے ہی کے لئے یہ اُس مجمع میں گئی تھیں۔ اسی طرح لباس ایسا بیہودہ پہنتی ہیں کہ اس میں ذرا بھی پردہ نہیں ہوتا اور سارا بدن جھلکتا ہے اور ایک جزء معاشرت کا یہ ہے کہ عورتیں سلام شریعت کی تعلیم کے بالکل خلاف کرتی ہیں بعض عورتیں تو صرف سام کہتی ہیں گویا اس قدر تخفیف کہ چار حرف بھی پورے زبان سے نہ نکلیں اور اس سے بھی زیادہ لطف یہ کہ جواب دینے والی سارے کنبے کی فہرست گنوادیگی کہ بھائی جیتا رہے اور بیٹا زندہ رہے اور شوہر خوش رہے لیکن ایک لفظ وعلیکم السلام نہ کہا جائیگا وغیرہ وغیرہ۔ اب رہے اخلاق ان کو تو کوئی جانتا ہی نہیں بس یہ سمجھتے ہیں کہ نرمی باتیں کر لینا یہی اخلاق ہے۔ صاحبو! اخلاق کہتے ہیں ملکاتِ باطنہ کو مثلاً اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا اعمال میں ریا نمود نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آجکل تواضع کی شکل میں تکبر ہوتا ہے یعنی بہت سے لوگ صورت تواضع اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ لوگ اُن کی اور زیادہ تعریف کریں مثلاً کہتے ہیں کہ صاحب میں تو کوئی چیز نہیں ہوں اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ میں سب کچھ ہوں یہ صرف اس لئے کہہ رہا ہے کہ سننے والے زیادہ تعریف کریں گے اور اس کا امتحان کہ ان الفاظ سے واقعی تواضع مقصود ہے یا محض تصنع اور بناوٹ ہے یہ ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ میں تو نالائق ہوں سامع بھی اگر اس کی موافقت کرے اور کہے کہ واقعی آپ نالائق ہیں تو پھر دیکھئے اِنکی کیا حالت ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کی بالکل وہ حالت ہے کہ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو (میں تجھ کو حاجی کہوں تو مجھے حاجی کہہ) غرض اخلاق کی اصلاح کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے اس وقت زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ میں اس کے متعلق بہت سی جزئیات بیان کرتا۔ بس یہ پانچ قسم کے گناہ ہیں جنکی اصلاح کی ہم کو ضرورت ہے ان کے علاج کا خلاصہ یہ ہے کہ اول احکام کو معلوم کرو دوسرے عمل کا قصد پختہ کرو تیسرے قصد کے پختہ کرنے کیلئے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو لیکن عورتیں چونکہ پردہ نشین ہیں اس لئے وہ اس کیجائے اہل اللہ کی حکایات دیکھا کریں خاصکر بزرگ عورتوں کی حکائتیں کہ ان سے بہت کچھ اثر ہوگا اور ہمت قوی ہوگی اس سے تمام گناہ چھوٹ جائیں گے اور خدا تعالیٰ کی طرف کامل توجہ ہو جائیگی اور اس کے بعد تم اس کے مخاطب ہو سکو گے۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (قریب ہے کہ آپ کا رب ان کے گناہوں کو بدلدے اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کر دے جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں)

اب خدا سے دعا کرو کہ وہ توفیق دے۔ آمین

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم کا

نواں وعظ ملقب بہ

تکمیل الاسلام

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ـــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی ۱

دعوات عبدیت جلد سوم

کا

نواں وعظ ملقب بہ

تکمیل الاسلام

اَشْتَات	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	مَنْ ضَبَطَ	مَاذَا	کَیْفَ	کَمْ	مَتٰی	اَیْنَ
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کیا مضمون تھا	کیسے ہوا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
اکثر معززین دنیا اور اہل علم تھے انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اور کسی قدر عوام بھی موجود	تقریباً ۳۵۰	مولوی سعید احمد صاحب	تکمیل الاسلام	کھڑے ہو کر	۲ گھنٹے	شب ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ	کراچی بندرگاہ مدرسہ حسن علی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَسَلَّمَ ۔ **اَمَّا بَعْدُ** فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ

اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ
مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ
وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ
اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ
وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

(مومنو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا۔ اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح خدا تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام بین کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف و) اختلاف کرنے لگے

یہ وہ لوگ ہیں جن کو (قیامت کے دن) بڑا عذاب ہوگا۔ جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ تو جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوں گے (اُن سے خدا فرمائے گا) کیا تم ایمان لاکر کافر ہو گئے تھے؟ سو (اب) اس کفر کے بدلے عذاب (کے مزے) چکھو، اور جن لوگوں کے منہ سفید ہوں گے وہ خدا کی رحمت (کے باغوں) میں ہوں گے اور ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ خدا کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو صحت کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں اور خدا اہل عالم پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ اور سب کاموں کا رجوع (اور انجام) خدا ہی کی طرف ہے)

صاحبو! قبل اس کے کہ میں ان آیات کے متعلق کچھ بیان کروں دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ میرے بیان کے متعلق ابھی جو کچھ کہا گیا ہے[1] یہ محض ان حضرات کا حسن ظن ہے۔ نیز اشتہار[2] میں میرے متعلق جو الفاظ لکھ دیئے ہیں یہ بھی ان حضرات کے حسن ظن کا ثمرہ ہے ورنہ میں اپنے کو ان الفاظ کا مستحق نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کے ساتھ ہی جب یہ سوچتا ہوں کہ حدیث میں اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ فِی الْاَرْضِ۔ (تم دنیا میں اللہ کی طرف سے گواہ ہو) فرمایا گیا ہے حتیٰ کہ مسلمان اگر کسی کے متعلق حسن ظن سے کچھ کہہ دے تو حق جل و علا شانہٗ اس کی برکت سے تصدیق شہادت کے لئے اس کو کسی اچھے درجے پر پہونچا دیتے ہیں تو میں اس نعمت پر خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں دوسرا امر یہ ہے کہ اگرچہ میں نے پورا رکوع تلاوت کیا ہے مگر میں مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ زیادہ بیان کرنے میں لوگوں کا حرج ہوگا خاص کر ایسے لوگوں کا جو اپنے اوقات کے پابند ہیں۔ دوسری بات کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ وعظ درحقیقت

---

[1] قبل شروع وعظ ایک صاحب نے اس کی اطلاع مجمع کو دی تھی کہ ایک ایسا ایسا وعظ ہونے کو ہے۔

[2] دن میں اس وعظ کا ایک اشتہار بھی دیا گیا تھا۔

امراض روحانی کا علاج ہوتا ہے یعنی اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ امراض روحانی کی تشخیص کی جائے اور پھران کا علاج بتلا دیا جائے۔ میں نے اس لئے عرض کر دیا تاکہ سامعین کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ وعظ سننے کے وقت کیا نیت رکھیں۔ اور وجہ اس کے عرض کی یہ ہوئی کہ تتبع احوال سے یہ معلوم ہوا کہ سامعین کی اغراض وعظ سننے سے مختلف ہوتی ہیں اور اسی طرح واعظ کی بھی مختلف نیتیں ہوتی ہیں میں اپنا تبریہ اغراض فاسدہ سے نہیں کرتا۔ لیکن بحمداللہ مجھے اس پر تنبیہ ہوجاتا ہے اور لغزش ہوجانے سے میں استغفار کرلیتا ہوں۔ واعظین کے متعلق کہنا تو اس وقت فضول ہے کیونکہ یہ مجمع واعظین کا نہیں ہے ہاں سامعین کی اغراض کے متعلق دو چار جملے کہدینا خالی از فائدہ نہ ہوگا وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی غرض تو وعظ کے سننے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ واعظ کے بیان سے قابل اعتراض اجزاء کو انتخاب کریں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں بعضوں کی نیت یہ ہوتی ہے کہ تقریر سے لذت حاصل کریں گے۔ صاحبو! اس میں شک نہیں کہ اللہ جلّ شانہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اور اس کی شرح میں لذت ضرور ہے لیکن ہر ایک چیز کا اصلی موضوع لہٗ علیحدہ ہوتا ہے سو یہ دیکھو کہ اس کلام کی اصلی غرض کیا ہے لذت یا اور کچھ سو اس کی نسبت ارشاد ہے کِتَابٌ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ اس میں خدا تعالیٰ نے تصریحاً فرمادیا کہ یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس سے علم اور عمل کا فائدہ حاصل کریں لِیَدَّبَّرُوْا میں علم کی طرف اشارہ ہے اور لِیَتَذَکَّرَ میں عمل کی طرف۔ بعضوں کی غرض یہ ہوتی ہے اور یہ بظاہر اور اغراض سے اسلم ہے کہ ہم کو اس مجلس کی شرکت سے ثواب ہوگا سو خوب سمجھ لو کہ اگرچہ شرکت فی الوعظ سے ثواب لازم آجائے اور اس پر مرتب ہوجائے لیکن اصلی غرض یہ بھی نہیں ہے جیسا کہ اور آیت سے معلوم ہوا ثواب کے لئے دوسرے کام بہت ہیں نماز روزہ تلاوت قرآن اگرچہ بے سمجھے ہی تلاوت ہو تو نفس ثواب

کے لئے کچھ ضرورت نہیں کہ قطع مسافت کر کے گھر سے مجلس وعظ تک آئے وقت صرف کرے پس معلوم ہوا کہ وعظ کی غرض اصلی یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ مجھ میں کیا کیا مرض ہیں جتنے امراض وعظ میں بیان کئے گئے ہیں ان میں سے میرے اندر کتنی باتیں پائی جاتی ہیں اور جو پائی جاتی ہیں ان کا علاج کیا ہے اس مقصود کے سوا باقی سب خیالات غیر اصلی ہیں اور جب یہ ہے تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر کسی وعظ میں ذرا بھی لذت نہ آئے تو اس کی پروا نہ کرنی چاہیے دیکھئے آپ نے کبھی طبیب سے نسخہ لکھوا کر یہ انتظار نہ کیا ہوگا کہ آپ کو اس میں لذت بھی آئی یا نہیں۔ البتہ اگر کوئی صاحب فن خود نسخے کو دیکھ کر اس طرح لذت یاب ہو کر کیسی دقائق کی رعایت اس میں رکھی گئی ہے تو دوسری بات ہے باقی اصلی غرض نسخے سے یہی ہوتی ہے کہ مرض وعلاج متعین ہو جائے اور علاج کرنے سے مرض کا قلع قمع ہو جائے بس یہی غرض وعظ میں بھی ہونی چاہیے کہ ہم میں کیا کیا امراض ہیں اس کے سوا ساری اغراض کو فراموش کر دینا چاہیے۔ بالکل یہ حالت ہونا چاہیے کہ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(ہم نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا مگر دوست کی باتیں کہ جن کو بار بار دہراتا رہتا ہوں)

حقیقت میں بڑی بات یہی ہے اور قرآن مجید میں جو قصص مذکور ہیں ان سے بھی یہی غرض ہے کہ لوگ سابقین کی حالت پر اپنی حالت کو قیاس کریں اور دیکھیں کہ انھوں نے کیا کیا اور اس کا کیا ثمرہ ان کو ملا اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم کو بھی وہی ثمرہ حاصل ہوگا۔ تو اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ وعظ کی اصلی غرض کیا ہے یعنی جو کچھ بیان ہو اس کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھنا اور میں درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اس بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھئے اس وقت جو کچھ خرابیاں ہو رہی ہیں وہ سب اسی سبب سے ہیں کہ ہم اپنی حالت کو نہیں دیکھتے جو کچھ سنتے ہیں اس مصداق دوسروں کو سمجھتے ہیں یہ کبھی احتمال بھی نہیں ہوتا کہ ہم میں بھی یہ امراض ہوں گے۔

بس اب اپنا بیان شروع کرتا ہوں اور اول اجمالاً یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اس وقت جو مضمون میں بیان کروں گا وہ کیا ہے سو وہ یہ ہے کہ اسلام حقیقی کیا ہے۔ تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ہم جو کہتے ہیں اَنَا مُسْلِمٌ آیا یہ سچ ہے یا نہیں کیونکہ محض زبان سے کہہ لینے سے اسلام نہیں حاصل ہو سکتا ہے

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوٰی ولکن لایخفیٰ کلام المنافق

(عشق میں محبت کا دعویٰ کرنا جائز ہے مگر منافقوں کی بات چھپی ہوئی نہیں رہتی)

اس میں شک نہیں کہ آجکل مسلمان بیدار ہیں اکثر کو اپنے اسلام کی طرف توجہ ہے غفلت کی شکایت اب بہت کچھ دور ہو گئی ہے لیکن نرا تنبہ مفید نہیں جب تک کہ اس کی حقیقت معلوم نہ ہو دیکھو اگر ایک شخص کو یہ معلوم ہو کہ مال کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے لیکن نہ اس کی حقیقت معلوم ہو اور نہ ذریعۂ تحصیل تو کیا نرا احساس ضرورت مال حاصل کرنے کے لئے کافی ہو جائے گا ہرگز نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مال کی حقیقت بتلا دی جائے ممکن ہے کہ ایک شخص ایک پیسے کو بھی مال سمجھتا ہو اور ایک پیسہ کما کر اپنے کو مالداروں کی فہرست میں شمار کرنے لگے کیا کوئی شخص اس کو مالدار سمجھے گا یا یوں کہا جائے گا کہ اس کو جنوں ہو گیا ہے۔ پیسہ بھی کوئی مال ہے۔ حالانکہ اَدْنیٰ مَایُطْلَقُ عَلَیْہِ اِسْمُ الْمَالِ کم سے کم درجہ میں جس کو مال کہا جا سکے پیسہ بھی ہے۔ لیکن یہاں دقائق فلسفیہ کا لحاظ نہیں ہوتا یوں تو ہر شخص اپنے کو مالدار سمجھ سکتا ہے لیکن مال کی حقیقت معتبرہ معلوم کرنے کے بعد وہی مالدار سمجھا جائے گا جس کے پاس معتد بہ مقدار مال کی موجود ہو ورنہ وہی حال ہوگا کہ

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

پس اسی طرح حالت موجودہ میں کہ بہت سے اعمال دین سے ہم متروک ہیں ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم مسلمان ہیں ایسا ہی دعوےٰ ہے جیسا کہ اس شخص کا ایک پیسہ کما کر صاحب مال ہونے کا دعوےٰ تھا پس جس طرح اس کو مجنوں کہا گیا ہم کو بھی مجنوں

کہا گیا ہم کو بھی مجنوں کہا جائے گا۔ البتہ ہمارا دعویٰ اس وقت قابل التفات ہوگا کہ جب ہمارے پاس اُس حد تک ایمان ہو کہ اس غرض علی وجہ الکمال حاصل ہوسکے اور دیکھئے میں خدا تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت پر متنبہ کرتا ہوں یعنی اس تقریر کا مقتضا تو یہ تھا کہ ناقص الایمان کو مؤمن ہی نہ کہا جاتا جیسا کہ ایک پیسے کے مالک کو مالدار نہیں کہا جاتا تھا چنانچہ خوارج اور معتزلہ نے ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہا پھر معتزلہ تو اس کو ایمان سے خارج کرتے ہیں لیکن کافر نہیں کہتے اور خوارج تو بالکل کافر ہی کہتے ہیں اب دیکھئے اہل سنت والجماعت نَصَرَهُمُ اللّٰهُ کو کہ انھوں نے شارع کی نصوص رحمت کو سمجھ کر ایسا حکم نہیں کیا۔ اس پر مجھے بطور جملہ معترضہ کے ایک ضروری بات یاد آئی یعنی ہم میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ نصوص کو عقل پر منطبق کرتی ہے اور اصل رہبر عقل کو قرار دیتی ہے میں کہتا ہوں کہ یہ رائے بڑی مصیبت کی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ عقل آپ کی اتنی خیر خواہ نہیں ہے وحی جیسی ہے دیکھئے عقل آپ کی ایسی دشمن نکلی کہ ایک نافرمانی میں کافر بنا دیا جس کی اوپر تقریر ہوئی۔ اب وحی کے خواص کو دیکھئے کہ باوجود آپ کی نافرمانی کے ارشاد ہے کہ لاتکفرہ بذنب ولاتخرجہ عَنِ الْاِیْمَانِ (کافر کہے ان کو گناہ کی وجہ سے اور خارج کرے ان کو ایمان سے) اور دو جملے ارشاد فرمانے کی ایک وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جملۂ اول سے خوارج کا رد فرمانا منظور ہے اور جملہ ثانیہ سے معتزلہ اور خوارج دونوں کا۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے کتنے خیر خواہ ہیں اور آپ کی عقل کس قدر دشمن ہے اسی لئے خدا تعالےٰ فرماتے ہیں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے لئے ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں) کیا معنے کہ ہمارے نفس نے تو عقل کے مشورے سے ایک نافرمانی سے کفر کا فتوےٰ دے دیا تھا اس قاعدے سے کہ ناتمام ذخیرے پر تموّل کا حکم نہیں کیا جاتا جیسا کہ اوپر کی مثال سے معلوم ہوا۔ اس طرح ایمان ناقص پر بھی ایمان کا حکم نہ کیا جائے گا۔ یہ تو عقل کا فتویٰ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود گناہ میں مبتلا دیکھنے کے بھی مسلمان ہی فرمایا

تو معلوم ہوا کہ شریعت ہم سے زیادہ ہماری خیر خواہ ہے لہذا اب یوں کہنا چاہیئے اور یہی مذہب رکھنا چاہیئے کہ ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے اپنی عقل کو جو بہت دور کی سوچنے والی ہے خوب ہی آزمایا پھر اپنے آپ کو دیوانہ بنانا ہی مناسب سمجھا)

یعنی عقل کا تو امتحان کر لیا وہ تو مخالف ثابت ہوئی اب دیوانہ وحی رہنا چاہیئے اور اس دیوانگی کے واسطے یہ کہنا چاہیئے کہ ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم
مستِ آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر محتاج اور پاگل سے بنے ہوئے ہیں تو اس ساقی اور اس پیمانہ پر ہی مست ہیں)

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد
اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

(دیوانہ اور پاگل تو در اصل وہی ہے جو اس کا عاشق نہیں ہوا اور عقل مند در اصل وہی شخص ہے جو اپنی عقل پر چلنے کی بجائے محبت سے اطاعت کرے)

یہ وہ دیوانگی ہے کہ اس پر ہزار فرزانگی قربان ہے۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ جیسے مالدار وہ ہے کہ اس کے پاس اصلی ذخیرہ ہو ایسے ہی اسلام کا دعوے اس کو زیبا ہے کہ اس کے پاس کامل ایمان ہو ورنہ ہمارا دعویٰ ایسا ہے جیسے اس ایک پیسے والے کا اور مثال لیجئے۔ حسین اس کو کہیں گے جس کی آنکھ ناک سب درست ہو اور جس کی یہ حالت ہو کہ ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے لیکر پاؤں تک اور چوٹی سے لیکر ایڑی تک جہاں سے بھی دیکھتا ہوں اس کی کشش دل کو اپنی طرف کھینچے لیتی ہے کہ یہی جگہ دیکھنے کے قابل ہے)

ورنہ اگر کسی کی ناک کاٹ لی جائے اور وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر آئے تو کتنا حسین

معلوم ہوگا لیکن کوئی ہاتھ ہٹا دے تو پھر دیکھئے کتنا پژمردہ ہوتا ہے۔ تو جیسا ایک حسن ظاہری ہے ویسا ہی ایک حسن باطنی بھی ہے جب ہر صفت کمال کے ساتھ ہوگی اس وقت حسین اور معلم کہیں گے ورنہ اس کا حسن باطنی اور اسلام ایسا ہے جیسے آپ کسی دوست سے کہیں کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور وہ ایک مدت کے بعد آپ کے پاس ایک آدمی کو ایک چارپائی پر لاد کر لایا جتنے امراض ہیں قریب سب میں مبتلا ہے آنکھیں بھی نہیں کان بھی نہیں ہاتھ پیر بھی بیکار ہیں فاتر العقل بھی ہے البتہ جاندار ہے کہ اگر اس کو کوئی قتل کردے تو قانوناً اس کو پھانسی ہو جائے مگر کیا اس آدمی سے آپ کی غرض پوری ہو سکتی ہے ہرگز نہیں کیا آپ تعجب سے نہ پوچھیں گے کہ اس کو کیوں لائے ہو اب اگر وہ دوست یہ کہے کہ آپ کے واسطے لایا ہوں آپ نے فرمائش کی تھی کہ ایک آدمی لا دو۔ تو آپ ہنسیں گے اور کہیں گے کہ اگرچہ یہ لغتہً اور قانوناً آدمی ہے لیکن جب اس سے میری غرض حاصل نہیں تو میرے لئے تو یہ آدمی نہیں ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب دیکھئے کہ اسلام سے کیا غرض ہے آیا نجات کاملہ یا محض ایک قومی شعار بنانا جیسا کہ آج کل کے عقلاء نے سمجھ رکھا ہے کہ غرض مذہب سے صرف یہ ہے کہ اس سے ہماری ایک قوم بن جائے اور ہمارے اندر ایک اجتماع کی شان پیدا ہو جائے جیسا کہ اس وقت اکثر لوگوں نے یہی غرض سمجھی ہے مذہب کی حیثیت سے بہت کم لوگ اس پر متوجہ ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں مذہبی رنگ نہیں ورنہ اگر مذہب کے لحاظ سے متوجہ ہوتے تو مذہبی رنگ بھی ان میں ضرور پیدا ہوتا۔ میں ایک انجمن میں بلایا گیا اس کی حالت جو تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نہ اس کے ممبروں کی آمدنی شریعت کے موافق ہے نہ اعمال ان کے درست ہیں ترک صلوٰۃ و شرب خمر تک میں بعضے مبتلا ہیں میں نے داعی سے کہا کہ غرض اہل انجمن کی خیرخواہی قوم بیان کی جاتی ہے لیکن اگر وہ خیرخواہ قوم ہیں تو اپنے خیرخواہ کیوں نہیں اور جب انھوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو کیسے مان لیا جائے کہ ان کو قوم پر توجہ ہے۔ صاحبو! میں لیڈران قوم کو متوجہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ اپنی اصلاح

نہ کریں گے اس وقت تک، ان کی خیر خواہی کسی درجے میں مؤثر نہ ہوگی نہ ان کی خیرخواہی کو کوئی تسلیم کرے گا اسی کو تو فرماتے ہیں اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو) تو ان حالات کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام من حیث الاسلام بہت کم لوگوں میں ہے صرف اسلام من حیث القوم رہ گیا ہے۔ جیسے اپنے ہمعصروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب کے ذریعہ سے ایک اجتماعی شان پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح خود بھی ان کے قدم بقدم چلتے ہیں اور بڑی علامت اس کی یہی ہے کہ یہ لوگ اپنی اصلاح کچھ بھی نہیں کرتے اور میں کچھ ان ہی کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اپنی بھی شکایت کرتا ہوں کہ ہم بھی فکر اصلاح سے خالی ہیں چنانچہ ہم لوگ گو شراب نہیں پیتے زنا نہیں کرتے لیکن غیبت میں ہی مبتلا ہیں اگر ہم نے زنا کو خدا کا گناہ سمجھ کر چھوڑا ہے تو دوسرے گناہوں کو کیوں نہیں چھوڑتے۔ معلوم ہوا کہ شراب وغیرہ کو چھوڑنے کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ خاندان و وضع کے خلاف ہونے سے چھوڑا ہے کہ کبھی باپ نے نہیں پی تھی، دادا نے نہیں پی تھی تو اگر ہم پیئیں گے تو سخت رسوائی ہوگی تو اپنی وضع کی حفاظت کے لئے اس سے اجتناب کیا نہ کہ شریعت کے زجر سے بخلاف غیبت کے کہ باپ دادا سب کرتے چلے آئے ہیں اس لئے اس کو عیب نہیں سمجھا گیا لہٰذا اس کے ترک پر کبھی توجہ نہیں ہوئی ورنہ گناہ ہونے کی رو سے شرب خمر اور ارتکاب غیبت دونوں مساوی ہیں، خوب کہا ہے ؎

ریا حلال شمارند جام بادہ حرام — زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

کہ عجیب بات ہے ریا کو تو عملاً حلال سمجھ رکھا ہے اور جام بادہ کو حرام سمجھ رکھا ہے حالانکہ دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو چھوڑنا چاہیئے۔ اور یہ مطلب نہیں کہ دونوں میں مبتلا ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا ماٹ کا ماٹ ہی بگڑ گیا ہے۔ خوب کہا ہے اور یہ بزبان حال استغاثہ ہے نہ اس اعتقاد سے کہ

حضور صلے اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں بلکہ محض جوش میں کہا ہے کہ ؎

اے بہ سراپردۂ یثرب بہ خواب ۔۔۔ خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے مدینہ منورہ میں اپنی خوابگاہ میں آرام فرمانے والے اٹھئے کہ پورب دپچھم ساری دنیا خراب ہوگئی ہے)

جدھر جا کر دیکھتے ہیں خرابی ہی خرابی ہے۔ بہرحال گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑنا چاہیئے اور چونکہ اس امر میں سب گناہ مشترک ہیں اس لئے سب کو چھوڑنا چاہیئے ایسا نہ کرنا چاہیئے جیسے بعضے لوگ اپنے تقدس میں بٹہ لگنے کے خیال سے شراب تو چھوڑ دیتے ہیں مگر غیبت نہیں چھوڑتے کیونکہ عرفاً اس سے تقدس میں بٹہ نہیں لگتا اس تقدس پر کہ معصیت سے بھی زائل نہ ہو مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حکایت تو بے تمیزی کی ہے لیکن آج کل کے تقدس کا پورا فوٹو ہے۔

مشہور ہے کہ ایک آوارہ عورت تھی بی بی تمیزہ اس کو کسی بزرگ نے نماز کا پابند کر دیا اور وضو بھی سکھلا دیا وہ سمجھے تھے کہ اس کی بدولت فحش گناہ بھی چھوڑ دے گی۔ پانچ چھ مہینے کے بعد جو آنے کا اتفاق ہوا تو پوچھا کہ بی بی نماز پڑھا کرتی ہو کہنے لگی کہ جی ہاں انھوں نے کہا کہ وضو بھی کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ آپ کرا تو گئے تھے بس اُسی سے پڑھ لیتی ہوں۔ تو جیسے اس بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ نہ سونے سے ٹوٹتا تھا نہ بدکاری سے ٹوٹتا تھا۔ ایسا ہی آج کل کا تقدس بھی ہے کہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں بس عوام میں تقوے اس کو سمجھا جاتا ہے کہ وضع ظاہر کو درست کرلیں رہا باطن اس کی جو حالت بھی ہو۔ خوب کہا ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔۔۔ و اندروں قہر خدائے عزّ و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید ۔۔۔ وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے ایسی حالت کہ جیسے بہترین نقش و نگار والی قبر ہو اور اندر خدائے بزرگ و برتر کا غضب بھرا ہوا ہے اپنی ظاہری حالت سے

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے جیسے بزرگ پر بھی طعنے مارے اور تیری اندرونی حالت ایسی خراب ہے کہ یزید جیسا شخص بھی شرمندہ ہو جائے۔

اور جیسے یہ پرانے لوگوں کی شکایت تھی ایسے ہی نئی وضع کے لوگوں کی یہ شکایت ہے کہ انہوں نے اسلام کو بالکل ہی نہیں سمجھا غرض جب اسلام سے مقصود نجات کاملہ ہے اور وہ حاصل ہوتی ہے اسلام کامل سے جس طرح مقصود تموّل سے انتفاع کامل تھا اور وہ حاصل ہوتا تھا تمول کامل سے پس اب اسلام کامل کو تحقیق کرنا چاہیئے پس میں چند جملوں میں اس کے متعلق بیان کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں اے مسلمانو! ڈرو خدا سے جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو بجز اسلام کے کسی حالت پر موت نہ آنا چاہیئے۔ یہ ایک آیت کا ترجمہ ہے اس ترجمہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس میں خدا تعالےٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا ہے دو چیزوں کا جن میں ایک امر ہے اور ایک نہی ہے امر یہ ہے کہ خدا تعالےٰ سے ڈرو اور نہی یہ ہے کہ بجز اسلام کے کسی حالت پر مت مرو۔ یہاں چند امور قابل غور ہیں انہی سے میرا مضمون نکل آئے گا ایک یہ کہ یہ خطاب جو ایمان والوں کو ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ دوسرے لوگ نہ ڈریں بلکہ اوروں کو خطاب اس لئے نہیں کیا کہ یہ خطاب ان کے لئے قبل از وقت تھا اور اسی سے فیصلہ ہو جائے گا کہ کفار جزئیات کے مخاطب ہیں یا نہیں سو قبل از وقت و مخاطب جزئیات کے نہیں ہیں البتہ جب وہ اس زمرے میں داخل ہو جائیں اس وقت وہ بھی مخاطب ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی کالج میں ایک کورس بنایا گیا اور یہ خطاب کر کے اس کو پیش کیا گیا کہ اے طالب علمو! اس کو سیکھو تو یہاں جو خاص طالب علموں کو خطاب ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اوروں سے سیکھنے کا مطالبہ نہیں کیونکہ یہ پرنسپل اوروں کو بھی کالج میں داخل ہو کر طالب علمی کرنے کی ترغیب دے رہا ہے تو مطلوب ہر ایک سے ہوا لیکن جو شخص ہنوز کالج کا طالب علم نہیں بنا اس کو یہ خطاب قبل از وقت ہے اس کو اول یہ کہیں گے کہ تم اس کالج کے طالب علم ہو جاؤ۔

اس کے بعد جب وہ نام لکھالے گا تو اس کو یہ خطاب کیا جائے گا کہ تم فلاں کورس سیکھو۔

اسی طرح کلام مجید کے اس خاص خطاب کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اہل اسلام سے تقویٰ مطلوب نہیں لیکن ان کو یہ خطاب کرنا قبل از وقت ہے ان سے اول یہ کہا جائے گا کہ تم ایمان لے آؤ اس کے بعد تقوی کا حکم کیا جائے گا اور اگر کہیں قرآن شریف میں خطاب عام سے اِتَّقُوْا فرمایا ہے تو وہاں اِتَّقُوْا سے اٰمِنُوْا مراد ہے کیونکہ ایمان بھی تقوٰے کا ادنیٰ درجہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں ایک بات کا تو امر فرمایا ہے اور ایک سے نہی چنانچہ ترجمے سے ظاہر ہے اس کا قائل ہونا ممکن نہیں کہ مضامین میں ارتباط نہیں اور یہ تو ایک ہی آیت کے دو جملے ہیں خود آیتوں میں بھی اس کا قائل ہونا صحیح نہیں کیونکہ اگر آیتوں میں ترتیب نہ ہوتی تو ترتیب تلاوت کو ترتیب نزول کے خلاف کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ نازل تو کہیں ہوئی اور رکھی گئی کسی دوسری جگہ اس سے معلوم ہوا کہ مناسبت مضامین کے لحاظ سے ترتیب مقرر ہوئی ہے اور جب آیتوں میں ارتباط ہے تو اجزائے آیات میں علی سبیل الاولیت ارتباط ہوگا اور جب یہ ہے تو بظاہر امر و نہی دونوں میں عنوان ایک ہونا چاہیے تھا یہ کیا بات ہے کہ امر میں تو تقوٰے کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ فرمایا گیا ہے کہ مرتے وقت تک مسلمان رہنا اور ربط کا ہونا ضروری ہے پس یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ اور مُّسْلِمُوْنَ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقوٰے کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں علیٰ ہذا اسلام کامل حق تقوٰے ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں سو اس کے لئے حق تقوٰے کی تفسیر کو دیکھ لیجئے اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ہے ورنہ نہیں تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے ان یطاع ولا

یعصی اور بعض نے یہ لکھا ہے ان یشکر ولا یکفر اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں مگر ان میں کچھ تعارض نہیں سب کا اجتماع مقصود ہے خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اعمال اسلام کو کامل کر لیا جائے سو اس کا ایک جزو اطاعت و ترک معصیت بھی ہے ایک جزو شکر و ترک کفر بھی ہے اور ان کی تخصیص بطور تمثیل کے ہے مقصود یہ ہے کہ سب اعمال کو جمع کرنا چاہیئے ۔ پس اسلام کامل تو یہ ہے مگر اس وقت لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو دوسرے طور پر سمجھ رکھا ہے اہل سائنس نے سمجھ رکھا ہے اہل سائنس نے دواؤں کا ست نکالا تھا مگر اس وقت کے عقلاء نے اسلام کا ست نکالا ہے کہ اپنے خیال کے موافق کچھ چیزیں اسلام میں داخل رکھ لیں کچھ چیزوں کو خارج کر دیا مگر صاحبو! ست اس چیز کا نکلا کرتا ہے جس میں کوئی فضول جزو بھی ہو تو کیا آپ کے نزدیک اسلام میں کوئی فضول جزو بھی موجود ہے ۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے تو اس سے تو خدا تعالیٰ پر اعتراض لازم آتا ہے ۔ صاحبو! اسلام کا کوئی جزو بھی قابل ترک کے نہیں حتیٰ کہ حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر میں اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف نہ ہوگا کیونکہ کچھ فرض نہیں اور توریت پر بھی عمل ہو جائے گا ۔ اس پر یہ آیت نہایت شدومد کے ساتھ نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ الخ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ شیطان کے قدم بقدم مت چلو) خیال کیجئے کہ گوشت کھانا بھی کیا کوئی رکن اعظم تھا مگر اس کے ترک کو قربت سمجھنے پر کس قدر شدومد ہوا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا اتنا جزو بھی ترک کے قابل نہیں پھر ست کیسے نکل سکتا ہے اور ست اسلام کا اس طرح نکالا ہے کہ بعض نے تو صرف عقیدوں کو کافی سمجھا اور اعمال وغیرہ کی کچھ بھی ضرورت نہ سمجھی اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عقیدوں میں بھی انتخاب کیا ہے لیکن وہ بہت اقل و نادر ہیں مگر ہیں ۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز کی ضرورت اب نہیں رہی یہ عرب کے واسطے مقرر ہوئی تھی کہ وہ نامہذب تھے اب ہم

متمدن ہیں ہم میں کوئی توحش کی شان باقی نہیں رہی لہذا (نعوذ باللہ) اس کو اسلام سے حذف کر دیا جائے۔ انا للہ۔ اس مشورے کا سیدھا اور صحیح جواب یہ ہے کہ یہ قرآن شریف کے خلاف ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ آجکل اس جواب کی قدر نہیں کرتے اور اس کو عجز اور دفع الوقتی پر محمول کرتے ہیں اور علماء سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ قطع نظر حوالہ قرآن وحدیث سے ہر قانون کی لم بیان کرو۔ صاحبو! قوانین ظاہری جن میں بہت سے خلاف عقل عوام بھی ہیں ان کی لم کیوں نہیں تلاش کی جاتی۔ صرف وجہ یہ ہے کہ اس قانون کی وقعت دلوں میں ہے اور قانون اسلام کی وقعت نہیں ورنہ اگر اس کی بھی وقعت ہوتی تو ہرگز اس میں چون وچرا نہ کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(زبان کو ہر وقت تیرے ذکر سے تازہ رکھنا چاہیئے تیرے کام کے لئے کوئی وجہ اور شرط نہ ہونی چاہیئے)

اور یہ شان ہوتی ہے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر تو زندگی بخشے تو یہ تیری مہربانی ہے اور اگر تو موت دے تو ہم خود تجھ پر فدا ہیں میری جان تیرے حوالہ ہے جو تیری مرضی چاہے وہ کر میں ہر حالت پر راضی ہوں)

دیکھئے انسان کو اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے کیسا سرافگندہ ہو جاتا ہے مجنوں کی لیلیٰ کے عشق میں کیا حالت ہو گئی تھی تو ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر اداولیٰ بود

(اللہ کا عشق لیلیٰ سے کب کم ہوتا ہے بلکہ اس کی یاد اور تلاش میں گلی گلی پھرنا زیادہ بہتر ہے)

کیا خدا کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہو گئی۔ اور لیجئے اگر محبوب دس روپے مانگے تو محب کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ دس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے بلکہ غنیمت سمجھتا ہے اور مسرور ہوتا ہے افسوس کہ ایک مردار کی فرمائش پر تو مسرت ہو اور خدا تعالیٰ کے ارشاد کی لم تلاش کی جائے اور میں ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ قانون کی حکمت واضع قانون سے دریافت کرنی چاہیئے نہ کہ عالم

قانون سے۔ مثلاً اگر کوئی حاکم قانون مروج کی رو سے فیصلہ کردے اور آپ اس سے پوچھیں کہ اس قانون کے مقرر کرنے میں کیا مصلحت ہے تو وہ کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ ہم قانون کے حافظ ہیں واضع نہیں مصالح واضعانِ قانون سے دریافت کرو صاحبو! جب حاکم کو یہ جواب دینے کا اختیار ہے تو کیا علماء یہ جواب نہیں دے سکتے اور جب حاکم کا یہ جواب زبردستی اور عجز پر محمول نہیں کیا جائے گا تو علماء کے اس جواب کو عجز پر کیوں محمول کیا جاتا ہے اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ سائلین پر اتنی شفقت نہ کیا کریں اور خواہ مخواہ عوام کو دلیر نہ بناویں اور اپنے درپے نہ کریں۔ رہا یہ ڈر کہ بعض لوگ مصالح نہ معلوم ہونے سے اسلام سے نکل جائیں گے تو میں کہتا ہوں کہ بلا سے نکل جائیں ؎

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست — بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

(ہمارے ناقص عشق سے یار کا جمال بے پرواہ ہے۔ خوبصورت چہرہ کو رنگ و روپ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی کیا ضرورت ہے)

اسلام کو ایسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس قانون کے موافق جواب دو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس لئے پوچھتے ہیں کہ دوسروں کو بتلائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ؎

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ — بر نتابد کوہ را یک برگ کاہ

(جتنی چاہے تمنائیں کرو مگر حد کے اندر کرو۔ گھاس کا پتہ پہاڑ کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا)

تمنا کرو لیکن اپنے تحمل سے نہ بڑھو اسلام کی خدمت کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق اگر تم نے دو چار باتیں معلوم کر کے ایک دو سوال کا جواب دیدیا تو ان کے علاوہ دوسرے سوالات میں کیا کرو گے ؎

چار پا را قدرِ طاقت بار نہ — بر ضعیفاں قدرِ قوت کار نہ

طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر — طفلِ مسکیں را ازاں ناں مُردہ گیر

یعنی بچے کو اگر روٹیاں دینے لگو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مرے گا، تو عوام کو چاہیئے کہ اپنے درجے پر رہیں

میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کی خدمت نہ کرو مگر جو خدمت تحقیق لمیات کی تم نے شروع کی ہے اس کو محدود کرو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے۔ غرض بعض نے عقائد میں بھی تلخیص کی ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں۔ باقی اعمال کی تلخیص و حذف کرنے والے تو بہت ہی ہیں اور بعض نے عقائد کے ساتھ اعمال کو بھی ضروری سمجھا مگر کسی نے تو صرف نماز کو اختیار کیا اور زکوٰۃ کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ اگر چار ہزار روپیہ ہوگا تو اس میں سے ایک سو روپیہ دینا پڑے گا اس لئے اُس کو بالکل ہی ترک کر دیا ان لوگوں کی وہ حالت ہے کہ ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ، ور زر طلبی سخن دریں ست

(اگر تو میری جان چاہتا ہے تو کچھ حرج نہیں لیکن اگر روپیہ پیسہ طلب کروگے تو سوچنا پڑیگا)

کوئی صاحب اندیشہ نہ کریں کہ شاید اب چندے کی فرمائش کی جائے میں چندہ نہیں مانگوں گا مقصود زکوٰۃ دینے والوں کی حالت کا بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا صرف زبانی دعوے رکھتے ہیں باقی امتحان کے وقت جی چراتے ہیں۔ مشہور ہے کہ کسی بخیل سے اس کے دوست نے انگوٹھی مانگی تھی کہ وہ یادگار کے طور پر رہے اس نے کہا کہ جب اپنا ہاتھ خالی دیکھا کروگے تو مجھے یاد کر لیا کیجو کہ ہم نے ایک دوست سے انگوٹھی مانگی تھی مگر اس نے نہیں دی۔ تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بھی ایسی ہی محبت رکھیں کہ صرف نماز تو پڑھ لیا کریں تاکہ اس کے ذریعے سے بزرگوں میں داخل سمجھے جائیں باقی اور اعمال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بعض نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی لیا لیکن حج کو چھوڑ دیا کہ اتنے دنوں تک دکان بند کرنی پڑے گی نقصان ہوگا۔ سفر میں تکالیف ہوں گی۔ بعض نے اس کو بھی کیا لیکن ابواب آمدنی کو نہیں روکا پھر ان میں بعض نے تو رشوت لینی شروع کر دی بعض نے سود خواری اختیار کر لی اور کہا جاتا ہے کہ اگر رشوت یا سود لینا چھوڑ دیں تو آمدنی کے وسائل بند ہو جائیں گے یہ تو وہ کوتاہیاں تھیں جن میں اکثر اہل دنیا مبتلا ہیں۔ بعض وہ کوتاہیاں ہیں کہ ان میں دیندار بھی مبتلا ہیں مثلاً اکثر لوگ جن میں دیندار بھی ہیں ریل کے سفر میں اسباب زیادہ لے جاتے ہیں حالانکہ یہ بالکل ناجائز ہے

خوب سمجھ لو کہ قیامت میں یہ سب دینا پڑے گا۔ علیٰ ہذا ڈاکخانہ کے بعض قواعد مثلاً اگر کسی ٹکٹ پر بالکل مہر نہ لگی ہو اور وہ ایک مرتبہ کام میں آچکا ہو تو اس کو دوسری دفعہ کام میں لانا جائز نہیں ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ میرے ایک عزیز سے کسی نے پوچھا کہ دیانت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دیانت یہ ہے کہ ڈاکیا ایک لفافہ دے کر جائے اور اس کا ٹکٹ مہر سے محفوظ نظر آئے اور اس وقت کوئی شخص اس مکتوب الیہ کے پاس نہ ہو نہ کسی کو خبر ہونے کا اندیشہ ہو اور یہ ٹکٹ کو سالم اتار کر کام میں لا سکتا ہو اور وہ ایسے وقت میں محض خدا کا خوف کر کے لفافہ کھولنے سے پہلے اس ٹکٹ کو اتار کر پھاڑ ڈالے اگر کوئی ایسا کرے تو سمجھا جائے گا کہ یہ پورا دیانتدار ہے۔ مقصود اس سے دیانتداری کی ایک مثال دینا ہے نہ کہ اس میں منحصر کرنا اور اس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اسلام کی کیا خوبیاں ہیں۔ واللہ اسلام ہرگز چالاکیوں اور مکّاریوں کی اجازت نہیں دیتا کہ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ یعنی کسی کو ذرا سی تکلیف پہونچانا بھی اسلام کے خلاف ہے یہاں تک حکم ہے کہ جانور کو اگر ذبح کرو تو اس کو راحت دو یعنی چھری کو خوب تیز کر لیا کرو کیا انتہا ہے رحمت کی کہ ذبح کہ بظاہر تکلیف ہے لیکن شرافت انسانی کی وجہ سے اس کی اجازت دیدی گئی ہے اس میں بھی راحت رسانی کا کتنا بڑا خیال ہے۔ رہا یہ شبہ کہ تکلیف تو اب بھی ہوہی گی سو اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو کیا خبر ہے کہ خود مرنے میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے یا ذبح میں زیادہ ہوتی ہے اگر شبہ ہے تو مرنے میں بھی ہونا چاہیئے کیونکہ ذبح کا شارع اور موت کا خالق ایک ہی ہے اگر اس کی تشریع پر شبہ ہے خلاف رحمت ہونے کا تو موت کی تکوین پر بھی شبہ ہونا چاہیئے تو جس نے جانور پر رحمت کا حکم کیا ہے وہ انسان کے لئے رحم کو کیوں نہ واجب کریگا۔ پھر دھوکا دغا بازی خیانت کو کیسے جائز رکھے گا مگر افسوس کہ ہم نے اس کی ذرا بھی رعایت نہ کی اپنے بھائیوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بخصوص جو لوگ آجکل بھی بڑے کہلاتے ہیں ان کے معاملات کی تو بری حالت ہے۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ریل میں سوار ہوئے ایک قلی کے سر پر اُن کا

اسباب تھا اسباب رکھوا کر انھوں نے قلی کو ایک گھسی ہوئی دونی دی اُس نے کہا حضور یہ تو خراب ہے کہنے لگے ہم کیا کریں اُس نے کہا بدل دیجئے کہنے لگے ہم نہیں بدلتے۔ اُس نے کہا کہ صاحب میں کیا کروں گا کہنے لگے کہ چلا دینا اس نے کہا میں کیسے چلا دوں گا تو کہنے لگے جیسے ہم نے چلا دی۔ بھائی تم نے تو اس لئے چلا دی کہ تم بڑے شخص ہو اگر اس قلی کو بھی کوئی ایسا ذلیل مل جائے جس کی ذلت کی نسبت اس کی عزت کے ساتھ ایسی ہو جیسے اس کی ذلت کی نسبت تمہاری عزت کے ساتھ تو وہ بھی چلا سکے مگر ایسا شخص اس کو کہاں ملے گا آخر وہ روتا ہوا واپس چلا گیا اور گاڑی چھوٹ گئی۔ ایسا افسوس ہوا کہ جب یہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ہمدردی کے لکچر دیتے ہیں اس وقت ان کی زبان کیسی چلتی ہے اور کس قدر زور ہوتا ہے جس سے معلوم ہو کہ ان کی برابر دنیا بھر میں کوئی ہمدرد نہیں اور اعمال کی یہ حالت ہے صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ مذہب کا پابند ہو کر تو ہمدردی کرنا ممکن ہے ورنہ ہرگز ممکن نہیں۔ نرے تمدن سے کبھی کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل واقعات سے ظاہر ہے اس وقت لوگوں نے مذہب کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اگر مذہب کی پابندی ہو جائے تو ہرگز کبھی کسی سے کسی کو تکلیف نہیں پہونچ سکتی اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے امن عام کی کتنی حفاظت کی ہے۔ میں ایک دوسری بڑی مثال تعلیم حفظ امن کی اسلام میں دکھلاتا ہوں۔ ابن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے لَا تَسُبُّوا الْمُلُوْکَ فَاِنَّمَا قُلُوْبُهُمْ بِيَدِیْ (الحدیث) یعنی اگر حکام سے تم کو تکلیف پہونچے تو اُن کو بُرا بھلا نہ کہو کیونکہ ان کے قلوب تو میرے اختیار میں ہیں بلکہ مجھ سے اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرو میں ان کے قلوب کو نرم کر دوں گا۔ اللہ اکبر کس قدر امن پسندی ہے کہ حکام کو زبان سے بھی کچھ کہنے کی اجازت نہیں اگرچہ ان سے بظاہر کچھ تکلیف ہی پہونچی ہو بلکہ یہ حکم ہے کہ میری اطاعت کرو غرض معاملات کے متعلق یہاں تک تعلیم ہے مگر ہم لوگوں کے معاملات میں دیکھ لیجئے کیا حالت ہے۔ اور بعض نے معاملات کو بھی لیا لیکن معاشرت کو بگاڑ دیا حالانکہ شریعت نے معاشرت کا بھی اسی قدر انتظام کیا ہے جس قدر معاملات وغیرہ کا۔ وضاحت کے لئے میں معاشرت کی ایک جزئی بیان

کرتا ہوں۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ (اے مسلمانو اپنے گھر کے علاوہ کسی دوسرے کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کرلو اور سلام کرو اس کے رہنے والوں پر یہ تمہارے لئے بہتر ہے) یہ مسئلہ استیذان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر استیذان کے کسی کے گھر میں داخل نہ ہو اور یہ آیت مجمل ہے اس میں استیذان کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ کب تک اجازت مانگا کریں۔ حدیث شریف میں اس آیت کی شرح ہے کہ تین مرتبہ اجازت چاہو اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ چوتھی بار مت پوچھو کہ مخاطب تنگ ہوگا اور یہ مردانہ و زنانہ دونوں کے لئے ہے لیکن مردانہ قطعات مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہاں آنے کی ہر شخص کو اجازت ہوتی ہے جیسے حکام کی عدالتیں یا مجلس عام وہاں استیذان کی ضرورت نہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں بیٹھنے کی غرض قرائن سے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خلوت ہے اور علی العموم سب کو آنے کی اجازت نہیں۔ تو شریعت کا حکم ہے کہ اگر قرائن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت اس شخص کو خلوت مقصود ہے تو بغیر استیذان وہاں ہرگز نہ جاؤ پھر کیا کوئی صاحب اس پر عمل کرتے ہیں اور اگر کوئی کرتا ہے تو اس کو طعن کیا جاتا ہے نیز حکم ہے کہ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اجازت نہ دے پھر دیکھئے جو عمر بھر اس طرف رُخ بھی کریں۔ کیوں صاحب اگر وہ آزاد نہ ہوا تو طلب اجازت کیا ہوئی یہ تو محض اطلاع ہوئی کہ ہم آگئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ لیجئے۔ حکم ہے کہ جب نماز جمعہ سے فارغ ہو جاؤ اور کوئی دوسرا ابھی جلسہ مثل وعظ وغیرہ کے نہ ہو تو منتشر ہو جاؤ اور کماؤ کھاؤ۔ لیکن دل بیار دست بکار۔ خدا کو نہ بھولو۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جس کام کے لئے جمع ہوئے تھے جب وہ کام ہو چکے تو متفرق ہو جاؤ کیونکہ بیکار ازدہام میں ممکن ہے کہ کوئی فساد کھڑا ہو جائے اسی طرح حدیث میں ہے کہ اگر تین آدمیوں کا مجمع ہو تو ان میں سے دو کو یہ جائز نہیں کہ

ایک کو تنہا چھوڑ کر کسی خفیہ مشورے میں لگ جائیں جب تک کہ تیسرا چلا نہ جائے یا کہ کوئی چوتھا نہ آجائے کیونکہ اس کو ناگوار ہوگا اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ مجھ کو غیر سمجھا اور مجھ سے پردہ رکھا اور جب چوتھا آجائے گا تو اس تیسرے کو اس لئے رنج نہ ہوگا کہ اس کو احتمال ہوگا کہ شاید چوتھے سے مخفی کرنا راز کا مقصود ہے اور چوتھے کو اس تیسرے پر یہی احتمال ہوگا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر چیز کے متعلق ایک نہایت مناسب قانون مقرر فرمادیا مگر افسوس ہے ہمارے بھائیوں نے ان قانونوں کو کبھی دیکھا بھی تو نہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے معاشرت کو بھی کچھ کچھ لیا ہے مگر اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور ایسے لوگ بکثرت ہیں کہ جن کو اخلاق کے صحیح معنے بھی معلوم نہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ تہذیب اخلاق وہی چیز ہے جس کو تصوف کہتے ہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ہم جس طرح اعمال ظاہرہ کے مکلف ہیں اسی طرح اعمال باطنہ کے بھی مکلف ہیں۔ ہم کو حکم ہے کہ تکبر نہ کریں ہم کو حکم ہے کہ خدا کی محبت پر کسی کی محبت غالب نہ کریں ہم کو حکم ہے کہ دل میں بغض و کینہ نہ رکھیں پھر بتلائیے کہ ہم نے اس کی کیا فکر کی ہے اور جو لوگ کچھ کر بھی رہے ہیں وہ حقیقت کو چھوڑ کر رسم پرستی کر رہے ہیں اصل حقیقت کی طرف کسی کو بھی توجہ نہیں الا ماشاء اللہ۔ تو اسلام کامل یہ ہوا کہ عقائد بھی درست اور کتاب و سنت کے موافق ہوں اور اعمال یعنی دیانات و معاملات گواہی وکالت تجارت زراعت وغیرہ۔ اور معاشرت مثلاً کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا اور اخلاق باطنہ صبر و شکر و اخلاص یہ سب کے سب موافق شریعت کے ہوں۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام کامل ہے اگر ان میں سے ایک جزو بھی کم ہو تو وہ اسلام ایسا ہے جیسا کوئی شخص حسین ہو لیکن اس کے ناک نہ ہو اس تقریر سے آپ کو اسلام کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی۔ اب غور کیجئے کہ ہم نے مسلم کہلانے کا استحقاق کس درجہ تک حاصل کیا ہے واقعی ہماری وہ حالت ہے کہ ؎

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق ❊ تحسیں کنند او خجل از زشت پائے خویش

(مور کے بدن پر جو کچھ پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں مخلوق اس کی تعریف کرتی ہے۔ اور وہ اپنے بدصورت پیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہے)

اے مسلمانو! اگر تمہیں کسی نے مولوی کہدیا یا شاہ صاحب کہہ دیا یا رفارمر کہہ دیا تو مغرور نہ ہو جانا کہ ہم بھی کچھ ہوں گے۔

صاحبو! خود بھی تو اپنی حالت کو دیکھو کہ ہم واقع میں کیا ہیں۔ ہماری وہ حالت ہے جیسا ایک قصہ ہے کہ کسی شخص کے پاس ایک عیبی گھوڑا تھا اس نے ایک چابک سوار سے کہا کہ میرا گھوڑا بیچ دو اس نے بازار میں کھڑا کر کے بیچنے کے لئے خلاف واقع اس کی بہت کچھ تعریف کرنی شروع کی، مالک نے جو سُنا تو کہنے لگا کہ جب یہ ایسا ہے تو لاؤ مجھی کو دے دو۔ احمق نے چابک سوار کی حکایت کو تو سُنا اور اس سے دھوکا ہوا۔ مگر یہ خبر نہ ہوئی کہ گھوڑا تو میرا ہی ہے۔ میں نے ہی پانچ برس تک خود اس کو رکھا ہے اور بیچ رہا ہوں۔ اسی طرح ہم کو اگر کوئی مولوی یا لیڈر کہتا ہے تو ہماری ہی تلبیس سے تو پھر اپنے مشاہدے کو غلط سمجھنا اور خوشامدیوں کی روایت کو صحیح سمجھنا عجیب بات ہے ان خوشامدیوں کے باب میں اور ہمارا دھوکا کھانے کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست آنا خار جاں
از فریب داخلان و خارجاں

اینش گوید نے منم ہمراز تو ⁂ آنش گوید نے منم انباز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش ⁂ از تکبر میرود از دست خویش

(بدن روح کے لئے ایک پنجرے کی صورت رکھتا ہے مگر یہ اپنے گھر والوں اور دیگر متعلقین کے فریب کے سبب اس کے لئے کانٹا بنا ہوا ہے۔ ایک کہتا ہے میں تو تیرے راز جان ہی نہیں سکتا۔ دوسرا کہتا ہے آپ کے سامنے بھلا ہماری کیا مجال اور وہ جب مخلوق کو اپنے اوپر فریفتہ دیکھتا ہے تو تکبر کی وجہ سے اپنے آپ میں نہیں رہتا)

حالانکہ آدمی سے اپنی حالت مخفی رہ نہیں سکتی خدا تعالیٰ فرماتے ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (انسان اپنے نفس کی علتوں سے خوب واقف ہے اگرچہ عذر بنا تا رہے) میری تقریر گو مختصر ہے مگر یہ ایک کافی میزان ہے ہم لوگوں کی حالت کی۔

اب میں مختصراً ان امراض کا علاج بیان کرتا ہوں:

ہمارے ان امراض کے دو سبب ہیں ایک تو قلتِ علم۔ دوسرے ضعف ہمت۔ یعنی بعض خرابیاں تو قلتِ علم سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض خرابیاں باوجود جاننے کے قلتِ ہمت سے اور قلت ہمت قلت خشیت سے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً سردی کے وقت نماز کا قضا کر دینا اس کا سبب قلت خشیت اور قلت ہمت ہے۔ نفس کہتا ہے کہ اس وقت سردی میں تکلیف ہوگی صبح کو قضا پڑھ لینا بھی تو ممکن ہے تو ان اسباب کو دور کرنا چاہیئے۔ یعنی اول تو بقدر ضرورت علمِ دین پڑھنا چاہیئے اگر اصطلاحی عالم بنے تو بہت ہی اچھا ہے۔

رہا دنیا داروں کا اس پر یہ شبہ کہ اصطلاحی عالم بن کر پھر لوگ کھائیں گے کہاں سے یہ واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے کیونکہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جو شخص کسی جماعت کی خدمت میں محبوس ہو اُس کا نفقہ اُس شخص کے ذمہ ہے اور جب یہ بات ہے تو یہ کہنا کہ کہاں سے کھاؤ گے واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے یہ سوال تو علماء کر سکتے تھے کہ یہ کہاں سے کھائیں گے۔ مگر وہ تو خدا پر نظر کر کے بیٹھ رہے۔ اب یہ خود یاد دلاتے ہیں کہ ہم میں ایک عیب ہے کہ باوجود ہمارے ذمہ ہونے کے ہم خیال نہیں کرتے۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ قوم کے ذمہ ہے کہ ان لوگوں کے اخراجات کی متکفل ہو۔ مگر علماء کو یہ چاہیئے کہ وہ قوم پر ہرگز نظر نہ کریں بلکہ ؎

دلا رامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(تو جو بھی اپنا معشوق رکھتا ہے اسی میں دل لگا کر دوسری تمام دنیا سے آنکھیں بند کر)
اور ہر وقت اس کو پیش نظر رکھیں وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں زمین کے خزانے)

اکبر بادشاہ کی حکایت مشہور ہے کہ یہ ایک مرتبہ شکار میں گئے اور ساتھیوں سے بچھڑ کر کہیں دور نکل گئے ایک دیہاتی نے ان کو مہمان رکھا۔ اکبر اس سے بہت خوش ہوئے اور کہا دارالسلطنت میں آنا' چنانچہ وہ دہلی آیا اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگی دیہاتی نے یہ حالت دیکھی جب دعا سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے اکبر نے کہا کہ خدا تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا اور مراد مانگ رہا تھا کہنے لگا کیا تم کو بھی مانگنے کی ضرورت ہوتی ہے اکبر نے کہا کہ بیشک کہنے لگا کہ پھر میں اسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے تم کو بھی ضرورت مانگنے کی ہوتی ہے۔ اہل علم کو چاہیئے کہ اگر خدمت دین کریں تو نہ اس لئے کہ ہم کو نذرانہ ملے گا۔ خدا کی قسم خدا کا نام دونوں عالم سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ خوب کہا ہے۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تو اپنی قیمت دونوں عالم کو بتلاتا ہے اور قیمت بڑھاؤ' ابھی تو بہت سستا ہے)

غرض مولویت کے درجے تک اگر پہونچیں تو بہت ہی اچھا ہے لیکن اگر کوئی مولوی نہ بنے تو بقدر ضرورت علم دین ضرور حاصل کر لینا چاہیئے اور ضروریات یہ ہیں۔ عقائد دیانات، معاملات، معاشرت' اخلاق اس کے بعد خواہ انگریزی پڑھو یا صنعت سیکھو جو چاہو کرو۔ نیز اگر کوئی ذی استعداد ہو تو اس کو علاوہ اجزائے مذکورہ کے وہ کتابیں بھی پڑھا دی جائیں جن میں ملحدین کے اعتراضات علی الاسلام والمسلمین کا جواب دیا گیا ہے یہ تو خواندہ ہی لوگوں کی تحصیل علم کا طریقہ ہے۔ رہے بے پڑھے لوگ ان کی تعلیم کی یہ تدبیر ہے کہ کوئی عالم ہفتے میں ایک دو بار عام لوگوں کو کسی

مسجد وغیرہ میں جمع کر کے احکام سنا دیا کرے اور سمجھا دیا کرے اور عورتوں کی تعلیم یوں ہو سکتی ہے کہ ان کے گھروں کے مرد روزانہ دینی رسائل ان کو پڑھ پڑھ کر سنا دیا کریں اور جو علماء سے سنیں وہ اُن کے کان میں ڈالتے رہیں اور اگر کوئی محلے میں خواندہ عورت ہو کبھی کبھی اُس سے کتاب پڑھوا کر سن لیا کریں یہ وہ طریقہ ہے کہ اس سے عام اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم ہو سکتی ہے۔

رہا ضعف ہمّت و قلتِ خشیت اس کا علاج یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اس میں یہ سوچا کرو کہ ہم کو خدا تعالےٰ نے کیا کیا نعمتیں دی ہیں اور ہم نے کیا معاملہ خدا تعالےٰ کے ساتھ کیا ہے۔ کچھ سوچو کہ حشر کا میدان ہوگا اور ہم خدا تعالےٰ کے سامنے ہوں گے اور ہم سے ان سب نعمتوں اور ہمارے معاصی کی نسبت سوال کیا جائے گا پھر خدا تعالےٰ کے عذابوں کو یاد کرو اور اس وقت خدا تعالےٰ کے سامنے سجدے میں گر کر خوب گڑگڑا کر دعا کرو اور استغفار کرو۔ اگر اس کو نباہ کروگے تو ایک ہفتے میں ان شاء اللہ تعالےٰ عظیم الشان تغیر حالت میں ہوگا اور اِس سے ہر وقت جائز و ناجائز کی فکر ہوگی۔ اور ایک کام یہ کرو کہ اہل اللہ کی خدمت میں جایا کرو۔ لیکن کسی ایسے کے پاس جاؤ جو کہ بقدر ضرورت عالم ہوں اور اگر ایسا میسر نہ ہو تو بزرگوں کی حکایات و نصائح دیکھا کرو یہ علاج ہے قلتِ علم و ضعفِ ہمّت کا اور پھر اس حالت پر دوام رکھو جب تم اس حالت پر دائم رکھوگے تو لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (مرنا تو مسلمان ہی مرنا) پر پورا عمل ہو جائے گا۔ اب خدا تعالےٰ سے دعا کرو کہ وہ توفیق عمل دیں۔ آمین ط

ناظرین وعظ سے التماس ہے کہ جامع (ناشر) وعظ کے لئے بھی خاتمہ وحصول رضائے باری کی دعا فرمائیں اور تا قیدِ حیات حصول استقامت کی۔

الخیر

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد سوم کا

دسواں وعظ ملقب بہ

ترک المعاصی

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی

دعوات عبدیت جلد سوم کا

دسواں وعظ ملقب بہ

تُرکُ المعاصی

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
کراچی بندر مسجد گاڑی احاطہ	۲۵ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ ہجری	ایک گھنٹہ	کھڑے ہو کر	ترکُ المعاصی ظاہرہ وباطنہ	مولوی سعید احمد صاحب	تقریباً ۴۰۰ آدمی	اکثر عوام الناس تھے اور کچھ تعلیم یافتہ تھے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ۔ (انعام ۱۲۰)

(اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو بلا شبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے کی عنقریب

یہ ایک مختصر سی آیت ہے اس میں خدا تعالیٰ نے اپنے ایمان والے بندوں کو ایک نہایت عظیم الشان اور بڑے ضرر کی چیز سے بچایا ہے جس سے خدا تعالیٰ کی رحمت کاملہ اپنے بندوں پر معلوم ہوتی ہے یہ بات ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ محتاج نہیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کا کوئی کام بندوں کی اصلاح پر موقوف نہیں ہے اس کی سلطنت مثل سلاطین دنیا کے نہیں ہے کہ اگر رعایا مطیع اور فرمانبردار رہے تو وہ بادشاہ ہیں اور اگر نافرمان یاغی ہو جائے تو کچھ بھی نہیں۔ دنیا کے سلاطین کی سلطنت کا مدار ہی اطاعت رعایا پر ہے۔ اس لئے اگر کوئی بادشاہ دنیا کا رعایا کو کچھ مصلحت کی بات بتلائے تو اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اپنی مصلحت کے لئے بتلا رہا ہے تاکہ بغاوت نہ ہو اور ہمارے ملک میں ضعف نہ آئے لیکن خدا تعالیٰ کی وہ سلطنت ہے اگر سب کے سب مل کر بھی بغاوت کریں تو اس میں ذرہ برابر کمی نہیں آسکتی اس لئے کہ اس کی تمام صفات قدیم ہیں جن پر زوال ممتنع ہے مسئلہ مسلمہ ہے مَاثَبَتَ قِدَمُهُ امْتَنَعَ عَدَمُهُ یعنی جو چیز قدیم ہوگی اُس کا عدم ممتنع ہوگا تو چونکہ خدا تعالیٰ کی صفت سلطنت اور ملک و حکومت کی قدیم ہے اس لئے اُس کو زوال ہو ہی نہیں سکتا نہ اس میں کوئی تغیر آسکتا ہے۔ تو اس حالت میں اگر خدا تعالیٰ کوئی بات مصلحت کی بتلائیں گے تو وہ سراسر ہماری مصلحت کے لئے ہوگی اس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ اپنی منفعت کے لئے بتلایا ہوگا۔ بس اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی کہ بلاغرض نفع رسانی ہو دنیا میں اگر کوئی نفع پہونچاتا ہے تو اس میں اپنا بھی نفع ملحوظ رکھتا ہے جیسا مثال مذکور سے معلوم ہوا اور بعض کی نفع رسانی میں اگرچہ کوئی ظاہری مصلحت اس شخص کی معلوم نہ ہو جیسے طبیب کا نسخہ تجویز کرنا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس میں بھی اپنی کوئی غرض مخفی ضرور ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اس شخص سے ہم کو مال حاصل ہوگا یا اس کے ذریعہ سے ہماری شہرت ہوگی یا کم از کم اگر کچھ بھی توقع نہ ہو اور کوئی بہت ہی بڑا دیندار ہو تو اس کو ثواب کی توقع تو ضرور ہی ہوگی اور یہ بہت ہی بڑی غرض ہے کہ دوسری تمام اغراض اس کے سامنے گرد ہیں اگرچہ یہ غرض مذموم نہیں بلکہ محمود و

مطلوب ہے لیکن غرض تو ضرور ہے اور غرض بھی بہت بڑی ہے طالب ثواب کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بے غرض نفع رسانی کی اور اگر کوئی شخص ایسا رحم دل ہے کہ اس کی نیت حصول ثواب کی بھی نہ ہو جیسے ماں باپ کی پرورش کہ بلا نیت ثواب ہوتی ہے گو اس پر ثواب بھی مرتب ہو جائے۔ یا مثلاً طبیب کا اپنے بچے کو دوا پلانا کہ بلا قصد ثواب ہوتا ہے وہ بھی غرض سے خالی نہیں، کم سے کم اپنے نفس کی راحت رسانی تو ضرور مقصود ہے یعنی بچے کی تکلیف دیکھ کر جو اپنے کو تکلیف ہوتی ہے اس علاج اور تجویز نسخہ سے اپنی اس تکلیف کا دفع کرنا اور اپنے کو راحت پہونچانا ہی مقصود ہے۔ اسی طرح اگر اجنبی کے ساتھ ہمدردی کی تو وہاں بھی ازالہ رقت جنسیت کا مقصود ہے غرض کوئی عاقل صدہا برس تک بھی سوچے تو وہ ایسی مثال نہیں بتلا سکتا جس میں کسی شخص نے دوسرے کو بلا اپنی کسی غرض کے نفع پہونچایا ہو۔ بہ خلاف خدا تعالیٰ کے کہ ان کو کسی کی احتیاج نہیں نہ مال کی ضرورت نہ جاہ کی طلب نہ جوش طبیعت مثل مادر و پدر کے کیونکہ انفعال سے خدا تعالیٰ بالکل پاک ہیں ان پر کوئی چیز مؤثر نہیں اور اس کی رحمت اختیاری ہے اس کا غصہ بھی مثل غصہ اہل دنیا کے نہیں کہ وہ بے چین ہو جاتے ہوں بلکہ انتقام عین ارادہ اُس کے غصے کا حاصل ہے اور انفعال کے امتناع کی وجہ یہ ہے کہ اس پر کوئی حاکم نہیں نہ اس پر کوئی قادر اور مؤثر متاثر سے زور دار ہوتا ہے تو اگر خدا تعالےٰ پر کوئی چیز مؤثر ہو سکے تو خدا خدا نہ رہے گا۔ غرض یہ اہل اسلام کا عقیدہ اور مسلمہ مسئلہ ہے کہ خدا تعالےٰ پر کوئی چیز قادر و مؤثر نہیں تو رحمت کے بھی یہ معنی نہیں کہ اس کو جوش ہوتا ہے جیسے مادر شفیق کو۔ بلکہ وہ صرف ارادے سے کرتے ہیں اور جب ایسا ہے تو وہاں یہ نفع بھی مطلوب نہیں کہ ہم کو راحت ہو گی۔ پس وہ جو شفقت کریں گے تو بالکل بے غرض شفقت ہو گی۔ وہ ہر طرح بے نیاز اور ہم ہر طرح محتاج ہیں۔ اب دیکھئے کہ اگر دنیا میں دو شخصوں میں ایسا علاقہ ہو کہ زید کو عمرو کی کوئی حاجت نہ ہو اور عمر کو زید کی حاجت ہو تو حالت یہ ہوتی ہے

کہ محتاج الیہ منہ بھی نہیں لگایا کرتا اور محتاج اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا ہے تو اگر خدا تعالیٰ بھی اپنے استغنا، اور مخلوق کی احتیاج کے اس مقتضائے مذکورہ پر عمل کرتے تو وہ بھی توجہ نہ کرتے۔ اللہ اکبر اتنی مستغنی ذات اور پھر اتنی بڑی رحمت کہ ہم کو ہمارے ضرر سے مطلع فرماتے ہیں اس سے زیادہ کیا رحمت ہوگی اسی رحمت کے مقتضاء پر اس آیت میں ہم کو ہماری ایک ضرورت پر مطلع کیا ہے جس سے ہم کو اس کی رحمت کا ممنون ہونا چاہئے کیونکہ قاعدہ شریف طبائع کا یہ ہوتا ہے کہ جس قدر کسی کی عنایت دیکھتے ہیں اسی قدر اس کے سامنے پگھل جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ (انسان غلام ہے احسان کرنے والے کا) مگر عجب بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت کو سن کر ہماری اور زیادہ سرکشی بڑھتی ہے اور لوگ اور زیادہ جری ہو جاتے ہیں چاہیئے تو یہ تھا کہ رحمت اور مغفرت کی آیتوں کو سن کر اور زیادہ اطاعت کرتے اور معاصی پر جرأت نہ کرتے کیونکہ یہ آیات اس لئے نہیں فرمائی گئیں کہ سب بے فکر ہو جائیں بلکہ سبب اس کا یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو تمام عالم جہل سے پر تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طریقۂ نجات ارشاد فرمایا تو سلیم الطبع لوگوں نے اس کو سمجھا اور مانا لیکن ان کو یہ شبہ ہوا جس کو بعض نے خود آ کر عرض بھی کیا کہ تمام عمر تو نافرمانی میں گذری ہے اب توبہ کر لینے سے اور اطاعت کرنے سے وہ نافرمانی کیونکر دُھل جائے گی اور اس کا اثر کیسے جاتا رہے گا تو پھر اپنے آبائی مذہب کو بھی کیوں چھوڑا ان حضرات نے خدا تعالیٰ کے معاملے کو دنیا کے لوگوں کے معاملے پر قیاس کیا کیونکہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا علم ان کو نہ تھا وہ خدا کو پورا پہچانتے نہ تھے اور یہی وجہ تھی اُن کے شرک میں مبتلا ہونے کی کہ وہ یوں سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ مثل شاہانِ دنیا کے ہوں گے کہ جس طرح شاہانِ دنیا تن تنہا سلطنت کے کام کو نہیں سنبھال سکتے بلکہ ہر کام کا عملہ الگ ہوتا ہے اور ہر کام کے لئے کارکُن جُدا مقرر ہوتے ہیں ایسے ہی وہ سمجھے کہ خدا تو ایک ہے

وہ سارے کام کیسے کرے گا تو ایک عملہ گڑھا اور نائب مقرر کر لئے کہ چھوٹے چھوٹے کام ان سے نکال لیں گے اور بڑے بڑے کام خدا تعالیٰ سے چنانچہ اُن کے اس خیال کو قرآن مجید کی اس آیت میں ظاہر کیا گیا ہے اِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ الخ (جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں خلوص دل کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں) نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا کہ سات ہیں ایک آسمان میں اور چھ زمین میں۔ آپؐ نے پوچھا بڑے کاموں کے لئے کس کو تجویز کیا ہے کہا کہ آسمان والے کو غرض وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ ایسے ہی ہیں جیسے شاہانِ دنیا اِس قیاسِ فاسد سے ان کو یہ بھی شبہ ہوا کہ اسلام لانے پر بھی شاید پچھلے جرائم باقی رہیں جیسے مثلاً فرض کرو اگر کوئی کسی کے باپ کو قتل کر دے اور پھر بیٹے سے معاف کرائے تو گو وہ معاف بھی کر دے مگر دِل کا میل نہیں جا سکتا تو انھوں نے بھی یہی سمجھا کہ جب معاف یا خوش ہونے کی امید نہیں پھر ماں باپ اور قدیم مذہب کو بھی کیوں چھوڑا اور یہی شبہ آکر پیش کیا کہ اگر ہم مسلمان ہوں تو ہمارے گناہ کیسے معاف ہوں گے اور اگر نہ معاف ہوئے تو مسلمان ہونے سے فائدہ کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے بندوں سے کہدیجئے کہ خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو وہ سب معاف کر دے گا تم توبہ کر لو اُس میں خاصیت یہ ہے کہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں گو ہر گناہ کی معافی کے قوانین الگ الگ ہیں جس کی تفصیل کتب شرعیہ میں ہے۔ تو آیات رحمت سے مقصود یہ ہوا کہ شکستہ دل لوگوں کو تسکین ہو نہ یہ کہ عام لوگوں کو اور جری کر دیا جائے۔ غرض رحمت کے ذکر سے زیادہ متاثر اور مطیع ہونا چاہیئے۔

اس آیت سے یہ بھی ایک بڑی رحمت ثابت ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو مضرت سے بچنے کی تعلیم دی ہے پس ہم کو چاہیئے کہ اور زیادہ مطیع ہو جائیں اور

اس مضرت سے بچنے کی کوشش کریں۔ اب سمجھئے کہ وہ مضرت کیا ہے۔ سو اس کی تعیین آیت کے ترجمہ ہی سے ہو جائے گی۔ ترجمہ یہ ہے کہ اے مسلمانو! چھوڑ دو ظاہر گناہ کو اور باطن گناہ کو تو وہ مضرت گناہ ہے۔ اور ظاہر اور باطن فرمانا اشارہ ہے تعمیم کی طرف یعنی ہر قسم کے گناہ کو چھوڑ دو یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ امر کا صیغہ وجوب کے لئے ہوتا ہے اور یہاں خدا تعالے نے بصیغۂ امر فرمایا ہے تو ہر قسم کے گناہ کا ترک واجب ہوا پھر بلفظِ اِثم فرما کر اس وجوب کو اور بھی مؤکد کر دیا ہے۔ یعنی اگر کسی فعل کے ترک کو واجب کہا جائے پس واجب کہنا اس فعل کے گناہ ہونے پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہے اور جو اس کے ساتھ اس فعل کو گناہ بھی کہا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے اور زیادہ تاکید ہو جائے گی۔ غرض معلوم ہوا ہو گا کہ وہ مضرت گناہ کرنا ہے۔ رہا یہ شبہ کہ ہم کو تو گناہ کرنے سے کوئی مضرت نہیں معلوم ہوتی نہ کبھی کوئی سزا ہوتی ہے تو سمجھئے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں کہ جن کا وجدان صحیح نہیں ہے اور ان کو کسی قسم کی مضرت محسوس نہیں ہوتی ان کے لئے تو جواب یہ ہے کہ نصوص میں دیکھ لو گناہ میں آخرت کی کیا کیا سزائیں مقرر ہیں چنانچہ فرماتے ہیں سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ یعنی انکو آخرت میں بہت جلد سزا ہو گی تو کیا یہ سزا کوئی چھوٹی مضرت ہے ہرگز نہیں۔ دیکھئے دنیا کی مضرت اگر آپ کی سمجھ میں آجاتی تو اس کو آپ بھی مضرت سمجھتے تو آخرت کی سزا تو اس سے زیادہ ہی ہے چنانچہ دنیا کی مضرت میں اور آخرت کی مضرت میں فرق یہ ہے کہ دنیا کی کیسی ہی مضرت ہو اس میں منفعت کا شائبہ ضرور ہوتا ہے اگر سر میں درد ہے تو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ پیٹ میں نہیں اگر مال جاتا رہا تو یہ کتنی بڑی منفعت ہے کہ آبرو نہیں گئی۔ نیز ایک درد کے ساتھ دس دردمند ہیں۔ باپ۔ بیٹے احباب، وغیرہ تو کیا اس سے تسلی نہیں ہوتی ضرور ہوتی ہے اور دکھ درد میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے۔ پس دنیا میں ہر مضرت کے ساتھ ایک منفعت ضرور ہوتی ہے۔ اور ایک بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں

اسی تکلیف کے بہت سے مبتلا بھی نظر آتے ہیں اور مشہور ہے اَلْبَلِیَّۃُ اِذَا عَمَّتْ خَفَّتْ (جو مصیبت عام ہو جاتی ہے ہلکی معلوم ہوتی ہے) اور طبعی امر بھی ہے کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بعض اوقات درد اور تکلیف میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے خوب کہا ہے۔ ؎

پای در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

(دوستوں کے ساتھ قید میں رہنا بھی غیروں کے ساتھ باغ میں رہنے سے بہتر ہے)
پھر بعض اوقات اُس کے ازالے کے اسباب بھی اختیار میں ہوتے ہیں اور اگر اُن سے زوال نہیں ہوتا تو بعض اوقات کچھ سکون ہی ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اگر شدت ہوتی ہے تو اتنی کہ سہار ہو سکے چنانچہ شدت تکلیف میں نیند کا آجانا اس کی دلیل ہے کہ تکلیف قابل برداشت ہے۔ اکثر اوقات دل بھی بٹ جاتا ہے غرض دنیا کی تکلیف کی تو یہ کیفیت ہے۔ اب آخرت کے عذاب کو دیکھئے کہ اس میں راحت کا نام بھی نہیں ہے سر سے پانوں تک تکلیف ہی میں غرق ہوگا کہ نہ سر کو چین نہ پیر کو نہ ہاتھ کو۔ ایک شخص جس کو سب سے کم عذاب ہوگا اس کی بابت حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس کو آگ کی جوتیاں پیر میں پہنا دی جائیں گی مگر شدت کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا سر مثل دیگ کے پکتا ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ کوئی عذاب میں نہیں۔ صاحبو! کیا یہ کچھ کم مصرت ہے اور اگر اب بھی اس کا احساس نہیں ہوا تو امتحان کے لئے اپنی انگلی آگ کے اندر رکھ کر دیکھ لیجئے اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ اس عذاب کی کیا کیفیت ہوگی جو دنیا کی آگ سے ستر درجے زیادہ ہے کیونکہ جب اس آگ میں ایک منٹ بھی انگلی نہیں رکھی جاتی تو اس آگ کا برسوں تحمل کیسے ہوگا بلکہ اگر بہت ہی کم مثلاً ایک ہی دن کی اُس میں قید ہوگئی تو اس کا بھی تحمل کیسے کیا جا وے گا بالخصوص جبکہ وہ دن بھی ہزار برس کے برابر ہو۔ چنانچہ خود ارشاد ہے۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (تحقیق وہ دن تیرے رب کے نزدیک تمہاری شمار کے لحاظ سے ہزار برس کے برابر ہوگا) اس پر شاید لوگوں کو تعجب ہو بلکہ عجب نہیں کہ ہمارے نوجوان جدید تعلیم یافتہ جماعت کو

اس پر ہنسی آئے کہ ایک دن ہزار برس کا کیسا ہوگا۔ لیکن واقع میں یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے دیکھو دنیا میں بھی عرض تسعین میں چھ ماہ کا ایک دن ہوتا ہے تو جیسا دنیا میں اتنا بڑا دن موجود ہے تو اگر اس عالم کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہو تو کیا تعجب ہے کیونکہ معظم معمورہ اور ارض تسعین تو پھر بھی اس عالم کے اجزاء ہیں جب ایک ایک عالم کے اجزاء ہو کے خواص میں اس قدر تفاوت ہے تو جہاں عالم ہی بدل گیا وہاں اگر اس سے زیادہ تفاوت ہو جائے تو تعجب کیا ہے۔ تو اگر وہاں ایک دن کی سزا بھی ہو گئی تو کمیۃً یہاں کے ہزار برس کے سزا کی برابر ہے۔ اور کیفاً اس سے بھی زیادہ۔ دوسرے دنیا میں یہ راحت تھی کہ ہمدرد غمخوار موجود تھے وہاں یہ حالت ہو گی کہ کوئی بھی نہ پوچھے گا پھر یہ کہ یہاں تو اپنے سے زیادہ تکلیف میں دوسرے کو مبتلا دیکھ کر تسلی بھی کر لیتا ہے اور وہاں ہر شخص کو یہ خیال ہوگا کہ مجھ سے زیادہ کوئی تکلیف میں مبتلا نہیں ہے۔ اور اگر خدانخواستہ عذاب ابدی ہوا تو غضب ہی ہے کیونکہ وہاں کبھی موت بھی نہ آئے گی بلکہ یہ حالت ہوگی کہ

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ط

(جب ان کی کھال جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو ہم ان کی دوسری کھال بدل دیتے ہیں۔ تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں)

تو تعجب ہے مسلمان پر کہ دنیا کی اتنی ہلکی تکلیف کو تو تکلیف سمجھے۔ اور اتنی بڑی مضرت پر نظر نہ کرے یہ تو جواب اُن لوگوں کے لئے تھا کہ اُن کا وجدان صحیح نہیں ہے کہ اُن کو گناہ کی مضرتِ عاجلہ محسوس نہیں ہوتی اور وجدان کے بطلان کی اکثر وجہ یہ ہوتی ہے کہ گناہ کا یہ بھی خاصہ ہے کہ انسان کی عقل اور سلامتِ فطرت اِس سے بالکل برباد ہو جاتی ہے لیکن جن لوگوں کا ادراک صحیح ہے اُن کے لئے اس سوال کا کہ گناہ میں کیا مضرت ہے علاوہ جواب مضرتِ آخرت کے یہ بھی جواب ہے کہ گناہ میں مضرتِ عاجلہ بھی ہے لیکن ہم اپنی بے تمیزی سے اُس مضرت کو لذت سمجھتے ہیں۔ میں ابھی اس کو عرض کروں گا لیکن اول ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

مشہور ہے کہ ایک غیر ملکی وحشی ہندوستان میں آیا اتفاق سے آپ ایک حلوائی کی دُکان سے گذرے وہاں گرم گرم حلوا رکھا ہوا تھا خوشبو سونگھ کر طبیعت للچائی۔ درم و دام کچھ پاس نہ تھے۔ آپ نے اس میں سے ایک لپ بھر کر حلوا اٹھایا اور کھا گئے۔ حلوائی نے رپٹ لکھوائی افسر نے چالان کو غلیجان سمجھ کر تنبیہ کے لئے حکم دیا کہ اس کو گدھے پر سوار کر کے اس کے پیچھے لڑکے ڈفلی خنجری بجاتے ہوئے تشہیر کرتے ہوئے شہر بدر کر دیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ جب یہ اپنے ملک واپس ہوا لوگوں نے ہندوستان کا حال پوچھا۔ آپ فرماتے ہیں۔ ہندوستان خوب ملک ست حلوا خوردن مفت ست سواری خر مفت ست فوج طفلان مفت ست ڈم ڈم مفت ست ہندوستان خوب ملک ست۔ تو جیسا اس وحشی نے غایت غباوت سے اس سامانِ ذلت کو سامانِ عزت قرار دیا تھا ایسا ہی ہم بھی اپنے سامانِ کلفت کو سامان لذّت سمجھتے ہیں۔ یہ تو مثال تھی مگر میں مثال پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اس کی حقیقت بتلاتا ہوں غور کیجئے اور غور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو آپ نے سامانِ لذت سمجھ رکھا ہے کبھی اس سے گذر کر اُس کے متضاد حالت پر بھی نظر کیجئے تب آپ کو اس لذتِ ظاہری کے کلفتِ حقیقیہ ہونے کا احساس ہو کیونکہ ادراک کے غلط ہو جانے کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اس سامان کے مقابل کو نہیں دیکھا قاعدہ مقررہ ہے کہ اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِھَا (ہر قسم کی چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) دیکھو جو مینڈک کیچڑ میں رہتا ہو اور اُسی میں پیدا ہوا ہو وہ چونکہ شفّاف پانی سے واقف نہیں اس لئے اُس کے نزدیک وہ سڑا ہوا کیچڑ ہی شفاف پانی ہے لیکن اگر کسی شفاف شیریں خوش ذائقہ خوش رنگ چشمہ پر اس کا گذر ہو تو اس کو حقیقت اس کیچڑ کی معلوم ہو سکتی ہے۔ تو ہم نے چونکہ ہوش کدورات ہی میں سنبھالا ہے اس لئے ہم کو اس کی برائی یا اچھائی کی اطلاع نہیں۔ امتحان کے لئے یہ کیجئے کہ ایک ہفتہ بھر کے لئے گناہ کو چھوڑ دیجئے اور اپنے دنیوی کاموں کا کوئی بندوبست کر کے اور ان

ایام میں تلاوت اور ذکر اللہ میں مشغول رہیے اور کسی قسم کی نافرمانی اس زمانے میں نہ کیجئے صرف ایک ہفتہ بھر ایسا کر لیجئے اس کے بعد اپنے قلب کو دیکھئے کہ کیا حالت ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے قلب میں ایک بہار اور شگفتگی پائیں گے اور اس کے بعد پہلی حالت معصیت پر تو آپ خود بہ خود آہی جائیں گے اس کے بعد جب ایک دو دن معصیت میں گذر چکیں پھر دیکھئے قلب کو کہ کیا حالت ہے اور پہلی حالت سے موازنہ کیجئے۔ واللہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ جمعیت تھی اور یہ تشویش ہے وہ راحت تھی یہ کلفت ہے وہ لذت تھی یہ مصیبت ہے اس وقت آپ کو گناہ کر کے ایسی تکلیف ہوگی جیسے کسی کانٹے کے لگ جانے سے ہوتی ہے۔ بخدا جو لوگ گناہ سے بچتے ہیں ان کو گناہ سے ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے بلکہ اگر بلا ضرورت نافرمان کے پاس بھی بیٹھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی کم ہمتی سے یہ امتحان بھی نہ کرنا چاہے کہ اس میں چندے فارغ للطاعات ہونا پڑتا ہے تو میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بحالت موجودہ ہی غور کر لیجئے کہ آپ کو کبھی سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے یا ہر وقت تکلیف اور پریشانی ہی میں گذرتی ہے اگر اس کا بھی اندازہ نہ ہو تو اور آسان بتلاتا ہوں کہ اہل اللہ کے پاس جایئے اور اہل اللہ سے مراد خاص وہ لوگ نہیں ہیں کہ ان کے بیوی بچے کچھ بھی نہ ہوں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن کو اصلی محبت صرف خدا سے ہے اگرچہ بیوی بچے بھی ان کے ہیں تو ایسوں کے پاس جایئے اور دیکھئے کہ مصیبت میں ان کی کیا حالت ہوتی ہے اور راحت میں کیا حالت ہوتی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مصیبت وراحت دونوں میں ان کی یہ حالت ہے کہ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست۔ ایک بزرگ کی خدمت میں کسی نے ایک نہایت قیمتی موتی بھیجا جب ان کے پاس پہونچا تو فرمایا الحمد للہ اس کے بعد وہ موتی گم ہو گیا آپ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا الحمد للہ۔ خادم نے عرض کیا کہ حضرت یہ اجتماع المتضادین کیسا کہ آنے پر بھی خوشی

اور گم ہونے پر بھی خوشی۔ فرمایا اصل خوشی آنے جانے پر نہیں ہوئی بلکہ ایک دوسری بات پر ہوئی وہ یہ کہ جب یہ موتی آیا تھا تو میں نے اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھا تھا کہ اس کے ساتھ قلب کو زیادہ تعلق تو نہیں ہوا مگر معلوم ہوا کہ نہیں میں نے خدا کا شکر کیا۔ اس کے بعد جب یہ گم ہو گیا تو میں نے قلب کو دیکھا کہ اس میں غم کا اثر تو نہیں ہوا معلوم ہوا کہ نہیں۔ اس پر میں نے پھر خدا کا شکر کیا تو یہ الحمدللہ اس پر تھا کہ نہ آنے سے خوشی ہوئی اور نہ جانے سے غم ہوا۔

اسی طرح حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آئینہ چینی لایا گیا آپ نے خادم کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ جب ہم طلب کیا کریں تو لایا کرو۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ آئینہ خادم سے ٹوٹ گیا۔ وہ نہایت خوف زدہ ہوا اور سہم گیا اور عرض کیا کہ از قضا آئینہ چینی شکست۔ آپ نے فرمایا کہ خوب شد اسباب خود بینی شکست گویا محض مزاح میں اس کو اڑا دیا اور کچھ بھی اثر یا تغیّر مزاج مبارک پر نہ ہوا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جتنی پریشانی ہوتی ہے تعلق ماسوی اللہ سے ہوتی ہے اور جن لوگوں کو خدا سے تعلق نہیں ہے وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں اور وجہ ان کی اس پریشانی کی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر امر کے متعلق ایک خاص تجویز اپنے ذہنوں میں تراش لیتے ہیں جیسے شیخ چلّی کا تجویز کردہ خاندان تھا۔ تو ہم سب اس بلا میں مبتلا ہیں کہ ہر وقت بیٹھ کر یہ دھن لگایا کرتے ہیں کہ یوں تجارت ہوگی، اتنا نفع اس میں ہوگا، یوں ہم بنک میں روپیہ داخل کریں گے۔ اور یہ تجربہ کی بات ہے کہ ہر تمنا پوری ہوتی نہیں تو سارے رنج کی بات یہ ہے کہ آرزو کرتا ہے اور وہ پوری ہوتی نہیں۔ کوئی دنیا دار کسی وقت آرزو سے خالی نہیں ہے تو ہر وقت کسی نہ کسی تمنا میں رہتا ہے اور تمنا پوری ہونا ضروری نہیں اس سے پریشانی ہوتی ہے تو کوئی دنیا دار پریشانی سے خالی نہیں۔ اور اہل اللہ کی راحت کا راز یہ ہے کہ ہر کام انھوں نے مفوّض بحق کر دیا ہے۔ اپنی کچھ تجویز نہیں کرتے تو جو کچھ ہوتا ہے ان کے لئے ایذا دہ نہیں ہوتا۔

حضرت بہلول نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے کہنے لگے کہ اس شخص کے مزاج کی کیا کیفیت پوچھتے ہو کہ دنیا کا ہر کام اُس کی خواہش کے موافق ہوتا ہو۔ حضرت بہلول نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے وہ کہنے لگے کہ یہ تو عقیدہ ہی ہے کہ کوئی کام خدا کی خواہش کے خلاف نہیں ہوتا تو جس نے اپنی خواہش کو بالکل خدا تعالیٰ کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو جس طرح ہر کام خدا کی خواہش کے موافق ہوگا اس طرح اس شخص کی خواہش کے موافق بھی ہوگا کوئی بات اُس کی خواہش کے خلاف نہ ہوگی اور جب یہ نہیں تو اس کو رنج کیوں ہوگا۔ یہ راز ہے اس کا کہ اہلِ دنیا کو کبھی راحت نصیب نہیں ہوتی اور اہل اللہ کو کبھی رنج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو اہل اللہ کو مریض ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اُن پر مختلف انواع کے صدمات بھی پڑتے ہیں تو صاحبو میں نے الم یعنی دکھ کی نفی نہیں کی اُن کو الم ہوتا ہے لیکن پریشانی وکوفت نہیں ہوتی اُس الم کی ایسی مثال ہے جیسے فرض کرو کہ ایک شخص کسی پر عاشق ہے اور ایک مدت کے بعد محبوب کی زیارت اس کو نصیب ہوئی اور اس کو دیکھ کر بالکل از خود رفتہ ہوگیا۔ اِسی حالت میں محبوب کو سلام کیا اس نے بجائے جواب دینے کے دوڑ کر اس کو گلے سے لگا لیا اور خوب زور سے دبایا کہ اس کا ارمان پورا ہوجائے۔ عاشق چونکہ فراق کی تکلیف میں بالکل ہی گھُل چکا تھا اس کے دبانے پر لگیں ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے عین اس دبانے کی حالت میں اتفاقاً ایک رقیب آگیا اس کو دیکھ کر محبوب نے کہا کہ اگر میرے دبانے سے تم کو تکلیف ہوتی ہو تو تم کو چھوڑ کر اس کو دبا لوں۔ اب غور کیجئے کہ وہ عاشق اس کا کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا نصیبہ ایسا نہ ہو کہ وہ تیری تلوار کا مقتول ہو خدا کرے یہ سعادت تیرے عشاق کی قسمت میں ہی آئے اور دوستوں کا سر سلامت چاہئے کہ اپنے خنجر کو آزماتا رہے)

اور یہ کہے گا۔ ؎

اسیرت نخواہد رہائی زبند
شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی تیری قید سے رہائی کی خواہش نہ کرے گا تیرا شکار پھندے سے نکلنا پسند نہ کرے گا)

اور یہ کہے گا کہ ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار دلبرم

(اگر تو دو سو زنجیریں بھی لگا ئیگا تو میں ان کو توڑ دوں گا سوائے اس معشوق کی زلف کے جو میرے دل کو لے جانے والا ہے)

کیا اس قید کو وہ گراں سمجھے گا ہرگز نہیں ہاں تکلیف جسمانی ضرور ہوگی مگر قلب کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس میں راحت بھری ہوئی ہوگی بلکہ زبان سے یہ نکلتا ہوگا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

اسی طرح اہل اللہ کو اگر تکلیف پہونچتی ہے تو جسمی مگر قلب اُن کا ہر وقت راحت میں ہے۔ اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ گناہ کرنے والے کیسی تکلیف میں ہیں کہ کسی وقت راحت نصیب نہیں تو گناہ سے یہ فوری مضرت ہوتی ہے نیز اس کے سوا ایک اور بھی تکلیف ہوتی ہے اور ہے وہ بھی عاجل مگر فعل کے بعد ہوتی ہے اور یہ مذکورہ بالا فعل کے ساتھ تھی وہ یہ ہے کہ جتنے گناہ کرنے والے ہیں وہ ہمیشہ کسی نہ کسی آفاقی مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں جیسے یہ مذکورہ کلفت مصیبت انفسی تھی ارشاد خداوندی ہے اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (اور کیا ان کو نہیں دکھلائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں مگر بھی باز نہیں آتے اور نہ کچھ سمجھتے ہیں)

مگر لوگ اس قسم کے مصائب کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسے وقت کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کونسا گناہ ہوا تھا جس کے سبب یہ تکلیف جھیلنی پڑی۔ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں تکلیف گناہ کے سبب ہوا کرتی ہے مگر تعجب صرف اس پر ہے کہ کونسا گناہ ہم سے ہوگیا تھا۔ مجھے لوگوں کے اس تعجب ہی پر تعجب ہے کیونکہ ہم میں وہ ایسا کون ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا نہیں رہتا اور جب ہر وقت گناہ میں مبتلا رہیں تو تعجب تو آفات میں مبتلا نہ ہونے پر کرنا چاہیئے تھا۔ بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ گناہ کرنے سے دنیا کی بھی پریشانی ہوتی ہے اور آخرت کی الگ رہی۔ اب خدا تعالےٰ کی رحمت کو دیکھئے کہ فرماتے ہیں کہ اس مضرت سے بچو وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ (تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو) آپ نے دیکھا کہ کتنی بڑی مضرت سے خدا تعالےٰ نے بچایا ہے۔ اور میں نے اس کے بیان کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس کے متعلق ہم میں چند طرح کی کوتاہیاں ہیں ایک تو یہ کہ ہم میں اکثر کو تو دین ہی کی خبر نہیں اُن کا تو یہ مذہب ہے کہ ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

کیوں صاحب اگر کوئی شخص آپ کو زہر بھرا لڈو لا کر دے تو کیا اسی اپنے قول کے موافق وہاں بھی عمل کرو گے کہ کل کے دن کیا خبر کیا گذرے اب تو لڈو کھانے کو ملتا ہے یا کہ اس کے انجام بد پر نظر کر کے اس کو ترک کر دو گے۔ تو کیا قیامت آپ کے نزدیک کل سے کچھ زیادہ دور ہے۔ صاحبو! کل کے چار بجے تو ۲۴ گھنٹے یقینی ہیں اور قیامت کے متعلق تو ۲۴ منٹ کی بھی خبر نہیں اس لئے کہ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود (شاید یہ ہی سانس آخری سانس ہو) موت کا کوئی مقرر اور معین وقت نہیں۔ لوگ اس دھوکے میں ہیں کہ ابھی تو ہم جوان ہیں۔ صاحبو! لوگوں کو اس طرح موت آگئی ہے کہ خود ان کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ اب ہم مر جائیں گے۔

کانپور میں ایک صاحب گھر میں آئے کھانا مانگا۔ ماما کھانا اتار کر لائی دیکھا تو آقا صاحب ختم ہو چکے۔ غرض موت کا کوئی قاعدہ اور وقت مقرر نہیں ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض آپ سو برس کے بھی ہو گئے تو کیا ہوگا۔ وہ سو برس بھی جب گذر جائیں گے تو ایک دن کی برابر بھی نہیں معلوم ہوں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے جن کی عمر قریب ڈیڑھ ہزار برس کے ہوئی حضرت عزرائیل علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ نے دنیا کو کیسا پایا، فرمایا جیسا دو دروازے والا ایک گھر ہو کہ ایک دروازے سے داخل ہوا اور گذرتا ہوا دوسرے دروازے سے نکل جائے اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھو کہ آپ کی عمر کے مثلاً چالیس چالیس پچاس پچاس برس گذر گئے ہیں مگر غور کر کے دیکھو کہ یہ اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا جیسے آیندہ کل کا دن تو موت کو مدید اور بعید سمجھنا بڑی غلطی کی بات ہے۔ جب وہ آئے گی تو یہ حالت ہوگی جیسے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ۝ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّينَ (ارشاد ہوگا کہ اچھا یہ بتلاؤ تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین پر رہے ہوگے وہ جواب دیں گے کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے ہوں گے اور سچ یہ ہے کہ ہم کو یاد نہیں سو گننے والوں سے پوچھ لیجئے) خیال تو کیجئے اتنی بڑی بڑی عمریں اور جب پوچھا جائے گا تو ایک دن سے بھی کم معلوم ہوں گی تو جب یہ حالت ہے تو پھر کاہے پر اُدھار کھائے ہوئے بیٹھے ہو۔ صاحبو! جس وقت ڈاکو ڈاکہ ڈالتا ہے تو جیل خانہ کو بہت بعید سمجھتا ہے لیکن جب سزا کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قریب تھا۔ تو یہ کہنا کہ اب تو آرام سے گذرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے کتنی بڑی غلطی کی بات ہے۔ حضرت خدا تعالیٰ تو جانتا ہی ہے عاقبت کی خبر لیکن جس کو خدا بتلا دے وہ بھی جانتا ہے۔ اگر کوئی مریض کہے کہ طبیب جانے کہ اس غذا میں کیا نقصان ہے تو اُس سے کیا کہو گے یہی کہ بھائی طبیب تو بے شک جانتا ہے لیکن جب اس نے تمہیں بتلا دیا تو اب تو تم بھی جانتے ہو اسی طرح عاقبت کی حالت جب خدا تعالیٰ نے تم کو بتلا دی تو تم بھی تو جان گئے

پھر غفلت اور جرأت کیسی اور بہت لوگ جو دنیا کے پیچھے پڑے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ موت اور عاقبت کو بھول گئے ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ اَلْمَوْتُ (دنیا کی لذتوں اور مزوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھو) ہر مسلمان کو چاہیئے کہ اس مراقبہ کا دوام کرے اور سوتے وقت اس طرح غور کرے کہ مرنے کے بعد یہ خدم وحشم سب چھوٹ جائے گا اور میں اکیلا رہ جاؤں گا اور صرف باز پرس رہ جائے گی اور سوچے کہ حضرت سیوطی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اگر ہزار تلوار لگیں تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی جان کے نکلنے میں ہوتی ہے اور ظاہر بھی ہے کہ ذرا بدن کا ایک رُواں توڑ کر دیکھے تو کس قدر تکلیف ہوتی ہے تو جب فرشتہ پوری جان نکالے گا اس وقت کیا عالم ہوگا اسی طرح سوچو کہ حشر ونشر کے وقت کیا حالت ہوگی جب اس طرح سوچو گے تو دنیا سے دل سرد ہو جائے گا میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم تجارت زراعت کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے کسی کام میں دل نہ لگاؤ۔ ایک قطعہ مجھے اس مضمون کے مناسب ایک ناصح کا یاد آیا فرماتے ہیں ؎

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملکِ روس اور کیا سرزمین طوس ہے
گر میسّر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی
اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

یہ تو ہوس کا فتوےٰ تھا آگے کہتے ہیں کہ ؎

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قیدِ آز کا محبوس ہے

اور کیا تماشا دکھلایا کہ ؎

لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنّا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا اور یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سے آج
کچھ بھی اِن کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

خیال فرمایئے بڑے بڑے ملوک اور سلاطین گذر گئے مگر اُن کا کہیں نشان بھی باقی نہیں ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ بادشاہوں کا تو کہیں تاج بھی باقی نہیں لیکن بزرگوں کی جوتیاں تک بھی تبرکاً باقی ہیں اس سے موازنہ کرنا چاہیئے طلب دنیا اور طلبِ حق کے اثر ہیں۔ غرض ایک کوتاہی تو ہم میں یہ تھی کہ دین کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور دوسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر توجہ کرتے ہیں تو بے ترتیبی سے کرتے ہیں ترتیب موافق عقل اور شرع کے یہ ہے کہ جلبِ منفعت سے دفع مضرت اہم ہے چنانچہ اطبّا کا اتفاق ہے کہ علاج سے زیادہ ضروری پرہیز ہے تو اس وقت اگر توجہ بھی ہوتی ہے تو وظائف کی طرف اوراد کی طرف جو کہ جالبِ منفعت ثواب ہے اور آجکل اسی کا نام لوگوں نے بزرگی رکھا ہے کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا دین دار ہے کہ ایک قرآن شریف روزہ پڑھتا ہے۔ رات بھر جاگتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ دین نہیں اپنے مرتبہ میں یہ بھی دین ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ ضروری کوئی چیز ہے اور وہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ گناہ کی چیزوں سے بچے جو کہ دفع مضرت ہے اس وقت اس کا مطلقاً خیال نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک تسبیح بھی نہ پڑھے مگر گناہ چھوڑ دے غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے اور غیر خدا کی محبت سے دل کو خالی کر دے اور ایک نفل بھی نہ پڑھے ایک تو ایسا ہو اور دوسرا ایسا ہو کہ ساری رات جاگے عبادت کرے قرآن شریف پڑھے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو حقیر

سمجھے ان کو تکلیف پہونچائے اور بھی گناہ کرے تو خوب سمجھ لو کہ پہلا ناجی ہے اور دوسرا ناری ہے خدا تعالیٰ نفلوں کو نہیں دیکھتے۔ حدیث میں ہے لَا تَعْدِلُ بِالرِّعَۃِ یعنی ورع کی برابر کسی عمل کو نہ سمجھو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے ذکر کیا کہ فلاں عورت بہت روزے رکھتی ہے لٰکِنْ تُؤْذِیْ جِیْرَانَھَا (لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے) فرمایا ھِیَ فِی النَّارِ (وہ دوزخی ہے) پھر ایک دوسری عورت کے بارے میں پوچھا کہ وہ بہت زیادہ عبادت (یعنی نفل وغیرہ نہیں کرتی لَا لٰکِنْ تُؤْذِیْ جِیْرَانَھَا (لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی) فرمایا ھِیَ فِی الْجَنَّۃِ (وہ جنت میں ہے) آجکل ہمارے دین دار بھی دین کی وہ چیزیں لیتے ہیں جن کی کوئی صورت محسوس ہے یعنی وجودی عبادت اور جس کی کوئی صورت محسوس نہ ہو جیسے ترک معصیت کا اس کا اہتمام کم کرتے ہیں حالانکہ اس میں نفس کا کید ہے کہ وجودی عبادت میں لوگوں کی نظروں میں عزت و وقعت ہوتی ہے اور ترک میں کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا مثلاً اگر ایک شخص ساری عمر کسی کی غیبت نہ کرے تو دوسروں کو پتہ بھی نہیں چل سکتا کیونکہ وہ تو ترک ہے اور ترکِ فعل نظر میں نہیں آیا کرتا نظر میں توکسی فعل کا ارتکاب واخذ آتا ہے یہی وجہ ہے کہ وجودی عبادت تو کرتے ہیں مگر گناہ کو نہیں چھوڑتے اور اگر چھوڑا بھی تو بعض کو اور یہ بعض کا چھوڑنا بعض کا نہ چھوڑنا تو نہ چھوڑنے ہی کے حکم میں ہے۔ مثلاً اگر ہم نے غیبت کو نہ چھوڑا اور گالی کو چھوڑ دیا تو من وجہٍ نہ چھوڑنا ہی ہے۔ کیونکہ گالی وغیرہ کو ہم نے اس لئے چھوڑا ہے کہ اس میں بدنامی کا اندیشہ ہے۔ تو راز اس میں بھی وہی ہے کہ ایک گناہ مضر جاہ ہے اور دوسرا نہیں ورنہ اگر خدا کے خوف سے چھوڑا جاتا تو سب گناہ چھوڑ دینے چاہئیں تھے۔

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر گناہ کو چھوڑتے ہیں تو بعض کو اور بعض کو نہیں جیسا پہلے ضمناً عرض کیا اور اگر کوئی بزعم خود سارے گناہوں کو بھی

چھوڑے تو اس میں کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ ظاہری گناہوں کو جو کہ ہاتھ پیر کے ہیں اُن کو چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ گناہ انہی کو سمجھتے ہیں اگر کسی سے پوچھا جائے کہ گناہ کیا کیا ہیں تو وہ انہی کو گنوائے گا۔ کبھی ریا اور کینہ وغیرہ کا نام بھی نہ لے گا وجہ یہی ہے کہ ان کو گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ خدا تعالیٰ نے ان سب کوتاہیوں کا علاج اس میں فرمایا ہے کہ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ (تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو) پس اس میں یہ بات بھی بتلادی کہ بڑی بات یہ ہے کہ گناہ کو چھوڑا جائے اور سب کو چھوڑا جائے، اور یہ بھی بتلادیا کہ گناہ دو قسم کے ہیں ظاہری اور باطنی یعنی جوارح کے متعلق بھی اور قلب کے متعلق بھی۔

گناہ کی فہرست تو بہت بڑی ہے مگر میں مثال کے طور پر مختصراً کہتا ہوں کہ مثلاً آنکھ کا گناہ ہے، کسی نامحرم کو دیکھنا اَمرد کا دیکھنا یا اجنبی کا ایسا بدن دیکھنا کہ اس کا دیکھنا شرعاً ناجائز ہے جیسے عورت کے سر کے بال اور یہ مسئلہ عورتوں کو بھی بتلانا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اس میں بہت مبتلا ہیں۔ ایک گناہ آنکھ کا یہ ہے کہ کسی کی چیز دیکھ کر حرص کرے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الخ

(ہرگز مت اٹھاؤ اپنی آنکھوں کو اس چیز کی طرف جو ہم نے کفار کو ان کی آزمائش کے لئے نفع کے واسطے دی ہیں یعنی دنیا کی رونق وغیرہ)

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ مال حاصل نہ کرو بلکہ مطلب یہی ہے کہ مال کو قبلہ وکعبہ نہ بناؤ کہ اس کی بدولت دین ہی ہاتھ سے جاتا رہے۔ اسی طرح زبان کا گناہ چغلخوری ہے، غیبت ہے جھوٹ بولنا ہے آج کل کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں الا ماشاءاللہ اس کا علاج یہ ہے کہ جو کچھ بولو سوچ کر بولو کہ میں

کیا کہوں گا اور وہ بات خلاف مرضیٔ حق تو نہ ہو گی پھر ان شاء اللہ تعالیٰ زبان کا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ کان کا گناہ یہ ہے کہ چھپ چھپ کر کسی کی بات سُننے گا نا سُننے۔ ہاتھ کا گناہ یہ ہے کہ کسی نامحرم کو چھوئے کوئی ناجائز مضمون لکھے پیر کا گناہ یہ ہے کہ کسی ناجائز موقع پر چلا جائے۔ اور ایک پیٹ کا گناہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روزی حلال مل ہی نہیں سکتی۔ جب حلال نہیں مل سکتی تو حرام حرام سب برابر پھر کہاں تک بچیں۔ صاحبو! یہ گمان بالکل غلط ہے جس کو فقہ حلال کہدے وہ بلاشبہ حلال ہے۔ لوگ علماء سے پوچھتے نہیں ورنہ بہت سی حلال صورتیں نکل آئیں۔ افسوس ہے معاملات میں وکلاء سے تو مشورہ کیا جاتا ہے مگر اہل علم سے کبھی مشورہ نہ کریں گے اور یہ نہ پوچھیں گے کہ یہ ناجائز ہے یا جائز۔ صاحبو! اگر عمل کی بھی توفیق نہ ہو تب بھی ہر معاملہ کو پوچھ تو ضرور ہی لو۔ اگر آتشک ہو تو اس کا نسخہ تو ضرور ہی یاد کر لو اگرچہ اس کو برتو نہیں کیونکہ معلوم ہوگا تو کبھی تو توفیق ہو ہی جائے گی۔ اسی طرح تمام بدن کے متعلق ایک گناہ ہے کہ لباس کفار کے مشابہ پہنا جائے۔ صاحبو! اگر تمہارے نزدیک مذہبی حکم کوئی چیز نہیں تو اسلامی غیرت تو ہونی چاہیئے۔ کیا یہ غیرت کی بات نہیں آخر قومی امتیاز بھی کوئی چیز ہے اور اگر ہے تو اس کا کیا طریقہ ہے۔ غضب ہے کہ اکثر ہندو تو ایسی وضع اختیار کرنے لگے ہیں جیسے مسلمان کی ہونی چاہیئے۔ اور مسلمان ہندوؤں کی وضع اختیار کرنے لگے ہیں۔ میرے بھائی کے پاس ایک تحصیلدار اور ایک سب انسپکٹر آئے۔ تحصیلدار ہندو مگر ریش بردوت مسلمانوں کا سا۔ اور سب انسپکٹر صاحب مسلمان مگر چہرہ ہندوؤں کا۔ خدمت گار نے پان تحصیلدار کے سامنے رکھدیئے تو سب انسپکٹر ہنسے، تحصیلدار صاحب بھی ہنسے، نوکر سمجھ گیا اور پان سب انسپکٹر کے سامنے رکھدیئے۔ بھائی

نے کہا کہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک نوکر آپ کو ہندو سمجھے صاحبو! غیرت کرنی چاہیئے اور ہماری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اس تبدّلِ ہیئت میں مصلحت کیا ہے بجز اس کے کہ یہ ایک غیر مسلم قوم کا لباس ہے تو گویا نعوذ باللہ یہ مطلب ہوا کہ لاؤ ہم بھی کافر بنیں اگرچہ صورۃً ہی ہوں مجھے ایک ظریف کا قول یاد آیا کہنے لگے کہ اس وقت نوجوانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر اہلِ یورپ کسی مصلحت سے اپنی ناک کٹوانے لگیں تو یہ نوجوان بغیر سوچے سمجھے اپنی ناک بھی کٹوانے لگیں گے اور اصل وجہ یہ ہے کہ اس تبدّل ہیئت کو باعثِ شوکت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ وضع اہل حکومت کی ہے۔ لیکن صاحبو! اگر شوکت بھی ہوئی تو نتیجہ کیا، شوکت تو اس لئے حاصل کی جاتی ہے کہ اغیار کے مقابلے میں اس سے کام لیا جائے نہ اس لئے کہ اپنوں ہی پر رعب جماویں پھر اوپر سے یہ لوگ ہمدردی قومی کے بھی مدعی ہیں یاد رکھو ہمدردی اور نفع رسانی اس شخص سے ممکن ہے کہ وہ قوم سے اختلاط و مناسبت پیدا کرے نہ کہ ان سے نفور ہو اور ان کو اپنے سے متوحش بنادے بعض لوگ اس مسئلے میں یہ جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم اس لباس سے کافر ہو جائیں گے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر آپ عورت کا لباس پہن لیں تو کیا آپ عورت ہو جائیں گے، اور جب نہ ہو جائیں گے تو اس کو بھی کیوں اختیار نہیں کیا جاتا اور بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان کو شوکت سے بھی کوئی تعلق نہیں مثلاً تصویر رکھنا، کتا پالنا، ڈاڑھی منڈانا۔ مجھے ایک اپنی اور ایک دوسرے صاحب کی حکایت یاد آئی۔ اپنی تو یہ کہ میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا کہ ایک جنٹلمین جو کُتّا لئے ہوئے تھے مجھ سے فرمانے لگے کہ کتّے میں ایسے ایسے اوصاف ہیں پھر اس کو پالنا کیوں منع کیا گیا۔ میں نے کہا کہ صاحب اس کا ایک تو عام جواب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور یہ جواب ہزاروں شبہات کا ہے۔ دوسرا جواب خاص جواب ہے جو اس باب کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ اس میں باوجود ان صفات کے ایک ایسا عیب ہے کہ جس نے سب

اوصاف کو گرو کر دیا اور یہ وہ ہے کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں اس لئے اس کا پالنا منع ہے۔ بس چپ ہی تو ہو گئے اور خوش ہو کر تسلیم کیا۔ اور دوسرے کی حکایت یہ ہے کہ ایک صاحب کتا بغل میں دبائے بیٹھے تھے کسی نے کہا کہ اس میں کیا مصلحت ہے کہنے لگے تاکہ فرشتہ موت کا نہ آئے۔ انھوں نے کہا یہ تو کوئی بات نہیں آخر دنیا میں کتے بھی تو مرتے ہیں جو فرشتہ اُن کی جان نکالتا ہے وہی تمہاری بھی نکالے گا۔ اور پہلی حکایت میں جو میں نے دوسرا جواب دیا تھا جس سے وہ بہت خوش ہوئے تھے واقع میں وہ کوئی بڑی بات نہیں بات اصلی تو وہی تھی کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے غرض بعضے گناہ میں تو بالکل ہی ضرورت و مصلحت کا کوئی درجہ نہیں گو جن کو ضروری سمجھا جاتا ہے بایں معنی کہ ان کے نہ کرنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے اور اُن کے لئے نفس کچھ حیلہ نکال لیتا ہے عقل صحیح کے سامنے وہ بھی لغو ہیں لیکن اس وضع کے بدلنے میں تو کسی درجے کا بھی نفع نہیں اور اس کے چھوڑنے میں کونسی تکلیف ہے تو یہ گناہ بالکل گناہ بے لذّت ہوا اور اگر بالفرض کوئی لذت و ضرورت ہو بھی تو خدا کے حکم کے سامنے اپنی مصلحت کیا چیز ہے یہ تو ظاہری گناہ تھے اور باطنی گناہ یہ ہیں کہ مثلاً اہل دنیا تو دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور دیندار اس پیرایہ میں تو نہیں لیکن وہ اپنے کو بزرگ سمجھ کر دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ خوب کہا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ کہاں کی بزرگی یہ کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردانِ مرد راہ
در سنگلاخ بادیہ بپا بریدہ اند

(غافل مت رہ کہ جو لوگ منزلوں کو طے کرنے والے ہیں اُن کے گھوڑے پتھریلے راستوں کو بھی میدان کی طرح طے کر لیتے ہیں)

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش
ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(ناامید بھی مت ہو جاؤ کہ شراب عشق سے مست لوگ ایک آواز میں منزل پر پہونچ جاتے ہیں)

یہ گناہوں کی مختصر سی تفصیل ہے اب اس کا طریقہ سمجھئے کہ یہ کس طرح چھوٹیں۔ سو طریقہ یہ ہے

کہ سوچا کرو کم از کم سونے کے وقت آج ہم نے کیا کیا شرارتیں کی ہیں اس کے بعد سوچو کہ ان پر کیا سزا ہونے والی ہے اس کے بعد سوچو کہ ہم نے اس سزا سے بچنے کی کیا تدبیر کی ہے جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو توبہ کرو اور خوب روؤ اسی طرح روزانہ کیجئے پھر ایک چلہ کے بعد دیکھئے کہ کتنی کایا پلٹ جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی بھی کوشش کیجئے کہ آپ کو گناہوں کی مفصل فہرست معلوم ہو جائے۔ آپنے آج تک شاید سنا بھی نہ ہو کہ اگر ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرے اور بیس سیر اسباب ہو تو بغیر محصول دیئے لیجانا حرام ہے تو آپ کو ضروری ہے کہ علم دین حاصل کریں خواہ اردو ہی کی کتابیں ہوں مگر ہر رطب ویابس دیکھنے کے قابل نہیں بلکہ محقق علماء سے انتخاب کرا کے کتابیں دیکھو ہر قسم کی کتابیں نہ دیکھو بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب دیکھنے میں کیا حرج ہے تو صاحبو! حرج یہ ہے کہ آدمی ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے اور یہی راز ہے تقلید کا کہ اس تذبذب سے محفوظ رہے تو ہر قسم کی کتابیں نہ دیکھو بلکہ جو علماء محقق بے غرض ہیں ان کی کتابیں دیکھو۔ دوسرے یہ کہ ان کو کسی عالم سے پڑھ لو اور اگر پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو خود دیکھ لو مگر اس طرح کہ جہاں ذرا بھی شبہ رہے فوراً اس پر نشان بنا دو اور کسی عالم سے اس کو پوچھ کر حل کر لو۔ اور جیسے کھانے کی روزانہ ضرورت ہے اسی طرح اس کو بھی ساری عمر کے لئے ایک ضرورت کی چیز سمجھو اور مطالعہ کرو اور جو پڑھ نہیں سکتے وہ پڑھے ہوؤں سے سُن لیا کریں اس طریقے سے ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں تمام امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افراد باخبر ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ وہ مراقبہ مفید ہوگا جو اوپر مذکور ہوا اس ترتیب کے ساتھ اگر کریں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد سب گناہ چھوٹ جائیں گے خدا تعالیٰ نے تھوڑے سے لفظوں میں ان سب کو بتلا دیا ہے کہ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ○

(تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں اُن کو ان کے کئے کی عنقریب سزا ملے گی)

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو وہ توفیق عمل عطا فرمائیں آمین یارب العالمین۔

بالخیر

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

دعواتِ عبدیت

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۲۷۷۶۲۰ - ۲۷۰۰۹۴

کتب خانہ اشرفیہ
قاسم سینٹر دوکان نمبر ۳۳ اردو بازار کراچی
فون: ۲۲۱۳۰۵۸

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد چہارم

کا

اوّل وعظ ملقب بہ

اصلاح النفس

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم
کا
اول وعظ ملقب بہ

اصلاح النفس

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۵ صفر سنہ ۱۳۳۰ھ	۳ گھنٹہ	بیٹھ کر	اپنی اصلاح کی فکر اہم ہے	مولوی سعید احمد مرحوم	تقریباً ۱۵۰ آدمی	

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکّلُ علیہ ونعوذ باللّٰہِ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بعد فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ o

(ترجمہ) اے ایمان والو! لازم پکڑو اپنے اوپر اپنے نفسوں کو نہ نقصان پہونچا سکے گا تمہارا وہ شخص جو گمراہ ہے جبکہ تم نے ہدایت پائی اللہ تعالیٰ کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے پس اللہ تعالیٰ تم کو

آگاہ کرے گا جو تم لوگ عمل کرتے ہو)

یہ وہی آیت ہے کہ جس کے متعلق اس کے قبل بھی بیان ہوا ہے۔ اس روز خیال تھا کہ آیت کے متعلق جتنا کچھ ضروری مضمون ہے وہ بیان ہو گیا ہے لیکن بعد کو تامل سے معلوم ہوا کہ ابھی آیت کے ایک جزو کے متعلق بیان کرنا باقی ہے کیونکہ آیت میں ایک جملہ انشائیہ ہے اور دوسرا جملہ خبریہ جو کہ معنی انشائیہ ہے کیونکہ ہر جگہ نفس خبر مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

حاصل یہ ہے کہ علوم دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ خود وہ علوم ہی مقصود بالذات ہیں جیسے عقائد مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اور اَلْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ۔ (آپ فرمادیجئے اللہ تعالیٰ ایک ہے وزن (اعمال کا تولا جانا) اُس دن حق ہے) تو اس میں تو خود خبر ہی مقصود ہوتی ہے کیونکہ ان کے متعلق کوئی عمل نہیں ہوتا دوسرے وہ علوم ہیں کہ خود وہ علم مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس علم سے عمل مقصود ہوتا ہے خواہ وہ امر ہو یا نہیں ایسے مقام پر اگر خبریہ ہو تو وہ معنیً انشاء ہو گا جس کی تعیین قرائن سے ہو جائے گی مثلاً اس مقام پر خدا تعالیٰ نے اول ایک امر فرمایا ہے اس کے بعد جملہ خبریہ ذکر فرمایا ہے جس سے مقصود اس امر کی تاکید ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ اس امر کی مخالفت نہ کرو پس معلوم ہوا کہ اعمال میں خبر مقصود نہیں ہوتی لہٰذا میں اس خبر سے تعرض نہیں کرتا بلکہ صرف دو مضمونوں کو لیتا ہوں ایک امر کو دوسرے نہی کو جو کہ جملہ خبریہ سے مقصود ہے یعنی لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ سے کیونکہ مقصود یہ ہے کہ تم دوسروں کی فکر میں نہ پڑو۔ گذشتہ جمعہ کو بیان کا زیادہ رُخ اسی نہی کی طرف رہا اور آیت میں مقصود بھی زیادہ تر یہی ہے کہ دوسروں کی فکر میں نہ پڑو۔ اور اس وجہ سے امر کے متعلق کچھ بیان نہیں ہو سکا تھا اور صرف نہی کے متعلق بہت کافی مضمون بیان ہو گیا تھا کیونکہ اس وقت تک ذہن میں یہ تھا کہ محط فائدہ صرف لَا يَضُرُّكُمْ ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کے بیان کرنے کی بھی ضرورت ہے اور اگرچہ مسوق لہ

الکلام صرف لَا یَضُرُّکُمْ ہے لیکن جملہ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا کا زیادہ تعلق عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ سے ہے کیونکہ دوسروں کی فکر کرنا کچھ ایسا گناہ نہیں جس پر اس جملہ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ کو مرتب فرمایا جائے پس وہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ کے ساتھ مرتبط ہے اور اس پر مرتب ہے اور اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ عَلَیْکُمْ بھی مقصود ہے کیونکہ حاصل اس کا یہ ہے کہ چونکہ تم کو خدا کے پاس جانا ہے اس لئے تم اپنی فکر کرو اور غفلت میں نہ پڑو اور اپنی اصلاح کرو بہرحال یہ ایک ضروری مضمون ہے اس مقام پر بھی اور فی نفسہٖ بھی اس وقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت یہ ہوئی کہ اگر ہم اپنی حالت میں غور کریں تو ہم کو معلوم ہو کہ ہم کن کن خرابیوں میں مبتلا ہیں ہاں اگر غفلت ہی میں رہیں جیسا کہ اس وقت تک رہے ہیں تو اور بات ہے لیکن باوجود شدید غفلت کے اتنا ہر مسلمان کو علم ہے اور اگر غور کرے تو اس کو معلوم بھی ہو جائے کہ آخرت کی فکر کتنی ضروری ہے نیز اپنی حالت موجودہ میں غور کرنا اس ضرورت کو اور بھی مؤکد کر دیتا ہے کیونکہ ہر شخص اپنی روزمرہ کو دیکھ لے اور سوچ لے کہ اس کے تمام وقت میں سے آخرت کی فکر میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے حالانکہ ہر شخص کے نزدیک موت کا آنا یقینی ہے بلکہ ایسا یقینی کہ دوسرے تمام خطرات اتنے یقینی نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی سخت مقدمہ میں ماخوذ ہوا اور مسل پوری اس کے خلاف ہو تو اگرچہ اس کو غالب گمان اپنے سزا پانے کا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی رہائی کا احتمال بھی باقی رہتا ہے اسی طرح ایک شخص کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو جائے تو جس طرح اس کو ہلاک ہونے کا گمان ہوتا ہے اسی طرح صحت کا بھی گمان ہوتا ہے غرض ہر امر میں دونوں پہلو ہوتے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی کس تندھی اور توجہ سے اس کی فکر میں مشغول ہوتے ہیں اور ہمہ تن اسی میں کھپ جاتے ہیں۔ لیکن موت میں کسی شخص کو بھی یہ احتمال نہیں کہ میں اس سے محفوظ رہوں گا نہ کافر اس سے بچے گا نہ مسلمان حتیٰ کہ شیطان جو سب سے بڑا کافر اور شریر ہے اس کو

بھی ایک دن موت آئے گی کیونکہ اس کو جو مہلت دی گئی ہے تو قیامت تک مہلت دی گئی ہے جیسا کہ اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (مہلت دیجئے مجھ کو قیامت تک کے لئے) سے ظاہر ہے غرض موت میں کسی کو شبہ نہیں بلکہ توحید جیسی یقینی چیز سے لوگوں نے انکار کیا مگر موت سے انکار نہیں کر سکے معاد کے متعلق مختلف رائیں ہوئیں کوئی حق پر رہے کوئی باطل پر رہے لیکن موت میں سب متفق رہے۔ مگر باوجود اس قدر یقینی اور متفق علیہ مسئلہ ہونے کے اس کو ہم نے ایسا بھلا دیا ہے کہ یاد دلانے سے بھی ہم کو یاد نہیں آتی نہ تذکیر قولی سے نہ تذکیر فعلی سے مثلاً اگر ہمارے سامنے کوئی شخص مرتا ہے تو ہم اس کے جنازے میں شریک ہوتے ہیں، قبرستان تک جاتے ہیں لیکن ہنستے کھیلتے چلے آتے ہیں ہمارے قلب پر تفکر یا تدبر کے آثار ذرا بھی نہیں ہوتے۔ غرض کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ ہم کو اس سے موت کی طرف توجہ ہو جائے تو صاحبو کیا یہ حالت مہمل چھوڑنے کے قابل ہے کیا یہ ضروری العلاج نہیں اگر ہے تو فرمایئے آج تک اس کا کیا علاج کیا اگر نہیں کیا تو اب کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ علاج میں جس قدر دیر اور غفلت کی جاتی ہے مرض بڑھتا جاتا ہے چنانچہ مشاہدہ ہے ہر شخص غور کر لے کہ جس قدر خوف بچپن میں تھا جوانی میں نہیں ہے اور جس قدر جوانی میں ہے بڑھاپے میں نہیں ہے حتیٰ کہ بعض افراد ایسے بھی ہیں کہ سالہا سال تک ان کو ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اور بعض کو اگرچہ موت یاد ہے لیکن خوف اور دہل نہیں ہے۔ دیکھو اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ میرے گرفتار کرنے کے لئے گارد پھرتی ہے تو اس کے قلب کی کیا حالت ہو گی کہ عیش تلخ ہو جاتا ہے، چین آرام برباد ہو جاتا ہے، ہر وقت یہ دُھن ہوتی ہے کہ کسی طرح میں اس مصیبت سے نجات پاؤں غرض موت سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے خصوص جبکہ گناہوں کا انبار بھی سر پر لدا ہوا ہو جس سے سزا کا بھی سخت اندیشہ ہے آخرت میں بھی اور

دنیا میں بھی مگر ہم لوگ اس سے ایسے بے خبر ہیں کہ کسی مصیبت میں گناہوں کو کبھی یاد ہی نہیں کرتے بلکہ مصیبت میں اکثر یہ مقولہ زبان پر لے آتے ہیں کہ کر تو ڈر نہ کر تو ڈر مطلب یہ کہ ہم نے تو کوئی جرم نہیں کیا مگر اڑنگے میں آگئے سو خوب سمجھ لو کہ یہ ایک جاہلانہ مقولہ ہے کیونکہ نہ کر کے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ورنہ اگر کچھ نہ کر کے بھی ڈرنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا تعالےٰ گویا ظالم ہیں خوب یاد رکھو کہ ایسا کہنا سخت توہین کرنا ہے خدا تعالیٰ کی۔ صاحبو! خدا تعالےٰ تو کئے پر بھی بہت کم گرفت کرتے ہیں اور بے کئے تو پکڑتے ہی نہیں چنانچہ قرآن شریف میں منصوص ہے مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ط (جو تم کو پہنچتی ہے مصیبت اور تکلیف تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہونچتی ہے) اور بہت سی تو درگذر ہی کر دیتا ہے یعنی ہمارے کرتوتوں میں بھی بہت سی معاف ہو جاتے ہیں اور اُن پر گرفت نہیں ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک چور کو گرفتار کیا اور قطع ید کا حکم دیا اُس چور نے کہا کہ اے امیر المومنینؓ یہ میرا پہلا قصور ہے مجھے معاف کر دیجئے، پھر کبھی نہ کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ تو غلط کہتا ہے خدا تعالےٰ پہلے جرم میں کسی کو رسوا نہیں کرتے۔ چنانچہ تحقیق کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے قبل بھی وہ تین مرتبہ چوری کر چکا ہے ؎

حلمِ حق با تو مواسا ہا کند چونکہ از حد بگذری رسوا کند

(خدا تعالےٰ کا حلم تیری رحمت و ہمدردی کرتا ہے اگر جب تو حد سے گذر جاتا ہے تو ذلیل کرتا ہے)

خدا تعالےٰ کا حلم بہت کچھ مواسات کرتا ہے لیکن جب ہم حد سے بالکل ہی نکل جائیں تو آخر غیرت خداوندی ہم کو رسوا کر دیتی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ گناہوں پر بھی ہم کو بہت کم پکڑتا ہے لیکن چونکہ ہم لوگ اپنے بہت معتقد ہیں اپنے معاصی کی

خبر ہم کو نہیں ہے اور بعض اوقات تجاہل بھی ہوتا ہے کہ غفلت کی وجہ سے ہم کو
پتہ نہیں چلتا چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ مصیبت ہم پر
نازل ہوئی، اللہ اکبر گویا ہم کو کسی وقت اپنے گناہ سے خالی ہونے کا بھی گمان ہوتا
ہے۔ صاحبو! اپنے گناہوں سے غفلت کرنا بہت بڑا مرض ہے جس میں ہم سب مبتلا
ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کے معتقد ہیں ایسے لوگ اور
بھی زیادہ تباہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے تقدس کی گویا دلیل بھی موجود ہوتی
ہے کہ جب اتنے لوگ ہم کو اچھی کہتے ہیں تو یقیناً ہم اچھے ہوں گے ہماری بالکل وہ
حالت ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک مکتب کے لڑکوں نے اتفاق کیا کہ آج استاد
صاحب سے چھٹی لینی چاہیئے اور تو کوئی سبیل نہ نکل سکی آخر اس پر رائے ٹھہری
کہ جب استاد صاحب آئیں تو سب مل کر اُن کی مزاج پُرسی کرو اور ان کو بیمار بتلاؤ
چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا دو چار لڑکوں کو تو استاد صاحب نے جھڑک دیا لیکن
جب متواتر سب نے یہی کہا تو استاد صاحب کو بھی خیال ہوا آخر سب کو لے کر
گھر چلے گئے اور حکم کیا کہ تم دہلیز میں بیٹھ کر پڑھو میں گھر میں آرام کرتا ہوں
لڑکوں نے دیکھا کہ مقصود اب بھی حاصل نہ ہوا تو آخر نہایت زور سے چلا کر
پڑھنا شروع کیا استاد صاحب کو مصنوعی درد وغیرہ تو پیدا ہو ہی گیا تھا
چلا کر پڑھنے سے اس میں واقعی ترقی ہونے لگی مجبور ہو کر سب کو چھوڑ دیا جیسا
وہ معلم لڑکوں کے کہنے سے مبتلائے وہم مرض جسمانی ہو گیا تھا سب معتقدین کے
کہنے سے مبتلائے وہم مرض نفسانی یعنی گمان تقدّس ہو گئے ہیں لیکن بطور لطیفہ
یہ بھی کہا جائے گا کہ ایسے لوگوں میں جہاں اپنے کو مقدّس سمجھنے کا مرض ہے اس
کے ساتھ ہی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی مقدّس سمجھتے ہیں
کہ اُن کے خیال کو باوقعت جانتے ہیں تو خیر ان میں جہل کے ساتھ تواضع بھی ہے
مگر یہ اعتقاد دوسروں کو اس باب میں سچا سمجھنے کا ایسا ہے کہ جیسے کسی نائن نے
ایک عورت کو دیکھا کہ وہ نتھ اُتار کر منہ دھو رہی ہے نتھ اُتری دیکھ کر فوراً

اپنے شوہر کے پاس دوڑی گئی اور کہا کہ بیوی صاحبہ تو بیوہ ہوگئیں جلدی جاکر اس کے شوہر کو خبر کرنا نائی صاحب فوراً اس بیوی کے شوہر کے پاس پہونچے اور کہا کہ حضور آپ کیا بے فکر بیٹھے ہیں آپ کی بیوی صاحبہ بیوہ ہوگئیں جحمان صاحب نے رونا شروع کر دیا گریہ وبکار کی آواز سُن کر دوست احباب جمع ہوگئے سبب پوچھا تو یہ لغو حرکت معلوم ہوئی دوستوں نے کہا کہ بھائی جب تم زندہ ہو تو تمہاری بیوی کیونکر رانڈ ہوگئیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن یہ نائی نہایت معتبر شخص ہے یہ جھوٹ نہ بولے گا۔ یہی ہماری حالت ہے کہ اپنے گناہوں کا ہم کو علم ہے اپنی حالت خوب جانتے ہیں لیکن محض اس وجہ سے کہ دوسرے لوگ ہم کو اچھا کہتے ہیں ہم بھی اپنے معتقد ہوگئے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ اُن کا کوئی معتقد نہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے معتقد ہیں تو چونکہ تقدس کا یقین اپنے اوپر ہے اس لئے اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں ہم پکڑے گئے صاحبو! ہم کو تو نہ پکڑے جانے پر تعجب ہونا چاہیے۔ جو شخص روزانہ ڈکیتی ڈالتا ہو اگر چھ ماہ تک بچا رہے تو تعجب ہے اور گرفتار ہو جائے تو کچھ بھی تعجب نہیں۔ ہم لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جن گناہوں پر مواخذہ نہیں ہوا اُن سے خدا تعالیٰ ناراض نہیں ہوئے۔ چنانچہ جب مصیبت کے التفات کرتے ہیں تو نئے گناہوں کو دیکھتے ہیں۔

حالانکہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اگر گناہ آج کیا ہو تو آج ہی مواخذہ بھی ہو دیکھئے اگر کوئی شخص کچی مٹھائی کھالے تو عادةً پھوڑے پھنسان نکلتی ہیں لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ جس روز کھایا ہے اسی روز نکلنے لگیں۔ فرعون نے چار سو برس تک خدائی کا دعویٰ کیا لیکن سر میں درد بھی نہیں ہوا، اور پکڑا گیا تو اس طرح کہ ہلاک ہی کر دیا گیا۔ خدا تعالیٰ کے ہاں ہر کام حکمت سے ہوتا ہے۔ کبھی ہاتھ در ہاتھ سزا مل جاتی ہے اور کبھی مدّت کے بعد گرفتاری ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا نیکیوں میں بھی کبھی ہاتھ در ہاتھ جزا دیدی جاتی ہے۔ کبھی توقف ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بددعا فرمائی اور قبول بھی ہوگئی چنانچہ ارشاد ہوا قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا (بیشک تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی) لیکن باوجود دعا کے قبول ہو جانے کے اُسی وقت اس پر اثر مرتب نہیں ہوا بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ فَاسْتَقِیْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ (پس تم دونوں موسیٰ و ہارون علیہما السلام) ثابت قدم رہنا اور نادانوں کا طریقہ اختیار نہ کرنا) کہ تم دونوں ترتّبِ اثر میں جلدی نہ کرنا کہ یہ نادانوں کا طریقہ ہے بلکہ استقامت اور استقلال سے کام لینا حتّٰی کہ چالیس برس تک حضرت موسیٰؑ نے انتظار کیا اور اس کے بعد فرعون اور اس کی قوم ہلاک ہوئی ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ نہ کسی جرم پر فوراً اثر مرتب ہونا ضروری ہے نہ نیکی پر۔ چنانچہ فرعون کو چارسو برس کی مہلت دی گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو چالیس سال تک منتظر رکھا گیا اور حبیب یہ ہے تو کبھی جرم کی فوراً سزا نہ ملی تو اس کی نسبت یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اس جرم سے خدا تعالیٰ ناخوش نہیں ہوئے یا یہ جرم قابلِ سزا و گرفت نہ تھا یا ہم کو معاف کردیا گیا لوگ اس غلطی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمیشہ نئے گناہ کو دیکھا کرتے ہیں اور جب کوئی نیا گناہ نظر میں نہیں آتا تو اپنی مصیبت پر تعجب کرتے ہیں اور گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت کرکے یہ کہتے ہیں کہ کر تو ڈر نہ کر تو ڈر۔ صاحبو! کسی مسلمان کے مُنہ سے اس جملہ کا نکلنا سخت حیرت ہے کیا کسی کے نزدیک خدا تعالیٰ کی سلطنت اودھ کے نوابوں کی سلطنت ہے کہ جس کا کوئی ضابطہ ہی نہیں جب جس طرح جی چاہا کرلیا' خیر یہ جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ دنیا کے خطرات کو تو یہاں تک مہتم بالشان بنایا کہ کچھ نہ کرکے بھی ڈرتے ہیں اور آخرت کے بارے میں اس قدر غفلت ایسی بے پروائی کہ آئے دن سینکڑوں خرافات میں مبتلا ہیں ہزاروں گناہوں کے بارے میں دبے جاتے ہیں لیکن ذرا بھی پروا نہیں کیا یہ مرض نہیں ہے اور اگر ہے تو کیا اس کی تدبیر ضروری نہیں ہے۔ صاحبو یہ یاد رہے کہ جسقدر

اس کی جانب غفلت ہوگی تدبیر دشوار ہوتی جائے گی۔ اور صاحبو ہماری وہ حالت ہے کہ ؎ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ یعنی ایک تو یہ مرض تھا جو ابھی بیان ہوا۔ دوسرا مرض جو دینداروں میں زیادہ ہے یہ ہے کہ جب کبھی ان کی حالت زار ان کو یاد دلائی جاتی ہے تو تنبہ ہوتا ہے لیکن صرف اس قدر کہ تھوڑی دیر روئے بڑی ہمت کی ایک دو وقت کا کھانا ترک کر دیا، صورت غمگین بنا کر بیٹھ گئے لیکن تدبیر کی جانب ذرا توجہ نہیں بلکہ اس غمگینی میں بھی اگر کوئی دنیا کا قصہ یاد آگیا تو فوراً اس میں مصروف ہو گئے۔ خوب کہا ہے ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

(تم اس قوم میں سے مت ہو جو کہ حق تعالیٰ کو فریب میں ڈالتی ہے اپنے سجدے سے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو درود سے)

بعض لوگ ان سے بھی چند قدم آگے ہیں کہ تاسف سے پریشان بھی ہوتے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی کبھی تدبیر کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور تدارک کا خیال نہیں ہوتا حالانکہ نری پریشانی سے کیا ہوسکتا ہے اگر کسی شخص کو اول درجہ دق کا شروع ہو جائے اور اس کو اطلاع بھی ہو جائے اور پریشانی بھی ہونے لگے لیکن وہ صرف یہی کرے کہ جب کوئی اس سے ملنے کو آئے تو اس کے سامنے رونا شروع کر دے اور دن رات کڑھا کرے مگر علاج کی طرف توجہ نہ کرے تو نتیجہ اس کا کیا ہوگا۔ صرف یہی کہ دس پانچ روز میں دوسرا تیسرا درجہ بھی شروع ہو جائے گا اور آخر کار ایک روز خاتمہ ہو جائے گا تو غلطی اس کی یہ ہے کہ پریشانی کو علاج سمجھتا ہے حالانکہ تدبیر اس کی یہ تھی کہ روپیہ خرچ کرتا طبیب سے رجوع کرتا تلخ دواؤں پر صبر کرتا اور پرہیز پر مستعد ہو جاتا اگرچہ کسی ایک کے آگے بھی پریشانی کا اظہار نہ کرتا۔

اسی طرح امراض باطنی اور معاصی میں بھی اصل تدبیر یہ ہی ہے کہ کسی کامل کی طرف

رجوع کرے گناہوں سے پرہیز پر مستعد ہو جائے تلخ تجاویز پر صبر کرے۔ اس
تدبیر سے ان شاء اللہ تعالےٰ چند روز میں امراض دُور ہو جائیں گے اور اخلاق حَسَنَہ
پیدا ہوں گے خوب کہا ہے ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد　　　اے خواجہ درد نیست و گرنہ طبیب ہست

(وہ عاشق ہی کیسا جس کی طرف محبوب نے کبھی التفات ہی نہ کرے۔ اے دوست
تجھے کوئی مرض ہی نہیں ورنہ طبیب تو موجود ہے وہ کیوں برائے علاج نہیں آتا)

یہ شیطان کی رہزنی ہے کہ دین کے رنگ میں دین سے ہٹا رہا ہے یعنی یہ خیال دل
میں جما دیا ہے کہ صرف گریہ و بکا ہی کافی ہو جائے گا۔ عُرفی کہتا ہے ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال　　　صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن

(اگر رونے گڑگڑانے سے وصال میسر آجاتا تو سو سال اسی طرح تمناؤں میں گذار دیتے)

مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک بدوی کو دیکھا کہ وہ بیٹھا رو رہا ہے اور سامنے
ایک کتا پڑا سسک رہا ہے، بدوی سے رونے کا سبب پوچھا تو کہا یہ کتا میرا رفیق تھا
چونکہ مر رہا ہے اس کے غم میں رو رہا ہوں اس شخص نے کتے کے مرنے کا سبب پوچھا
تو بدوی نے کہا کہ صرف بھوک سے مر رہا ہے۔ یہ سُن کر اس شخص کو بہت صدمہ ہوا نظر
اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بوری نظر پڑی بدو سے پوچھا کہ اس بوری میں کیا
چیز ہے بدو نے جواب دیا کہ اس میں روٹی ہے اس شخص نے کہا کہ ظالم تیرے
پاس روٹی موجود ہے اور کتا بھوکوں مر رہا ہے اور اُس کے مرنے کا تجھے غم ہے
تو اس میں سے روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا تو آپ کہتے ہیں کہ صاحب اتنی محبت
نہیں کہ اس کو روٹی بھی دیدوں کیونکہ اس کو دام لگتے ہیں ہاں اتنی محبت ہے
کہ اس کے غم میں رو رہا ہوں کیونکہ آنسو میں تو دام نہیں خرچ ہوتے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست　　　ور زر طلبی سخن دریں ست

(اگر جان طلب کرو تو کوئی حرج نہیں ہے اگر پیسہ طلب کرو تو کلام اس میں ہے)

ہماری وہی حالت ہے کہ گھربار سب تمہارا لیکن کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ کہ

گناہوں میں بتلا ہونے سے رنج بھی ہے اور ان کے مٹ جانے کی تمنا بھی ہے لیکن تدبیر نام کو نہیں ہاں ہے تو صرف اس قدر کہ دو آنسو بہا لئے اور بعض لوگوں کو توجہ بھی ہوتی ہے تدبیر بھی کرتے ہیں لیکن یہ کہ کسی بزرگ کے پاس گئے اور اپنی حالت بیان کر کے فرمائش کی کہ آپ کچھ توجہ کیجئے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص طبیب کے پاس جائے اور اپنے امراض کو بیان کرے اور جب طبیب نسخہ تجویز کرے تو اس سے کہے کہ حکیم صاحب میری طرف سے یہ نسخہ آپ ہی پی لیں۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی اور سب لوگ قہقہہ لگائیں گے۔ بس یہی حالت طالبین توجہ کی بھی ہے کہ مریض تو یہ مگر توجہ کریں بزرگ اور یہ توجہ نہ کریں۔

حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ جب بمبئی تشریف لے گئے تو ایک سوداگر نے عرض کیا کہ حضور دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کرے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک شرط سے دعا کروں گا وہ یہ کہ جس دن جہاز چلے اس دن مجھے پورا اختیار اپنے نفس پر دے دو کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں تم کو بٹھلا دوں اور وہ جہاز تم کو لے کر روانہ ہو جائے اور جب تک یہ نہ ہو صرف میری دعا سے کیا کام چل سکتا ہے کیونکہ جب تم قصد نہ کرو گے دنیا کے کاروبار کو نہ چھوڑو گے نہ وہ خود کم ہوں گے تو صرف میری دعا تم کو حج کیونکر کرا دے گی۔ کیونکہ خود کعبہ تو تم تک آنے سے رہا اس کو کیا غرض پڑی ہے اور جن کو یہ شرف نصیب ہو بھی گیا ہے تو ان کو بھی اس صورت سے حج نصیب نہیں ہوا اور یہ مضمون کہ بعضوں کو یہ شرف کعبہ کے از خود آنے کا نصیب ہوا ہے قابل ذکر کے نہ تھا کہ نازک مضمون ہے لیکن ضرورت اس کے ظاہر کرنے کی یہ ہوئی کہ آج کل تمام علوم اردو میں ہوتے جاتے ہیں ممکن ہے کہ کسی کی نظر سے یہ حکایت گذرے کیونکہ بعض بزرگوں کی نسبت مشہور ہے کہ مکہ معظمہ پہونچے تو جا کر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کئے دیتے ہیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ

ایک بزرگ آرہے تھے کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا، اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی۔ ایک تو اُن کو جنھیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی اور کہنے والوں کو ہنستا اور وہم پرست کہنا شروع کیا دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں ایسے لوگوں نے ان کو صوفیہ کے ڈھکوسلے کہہ کر اڑایا۔ تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے انھوں نے اُس کو خلاف عقل بتلایا اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا، سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے۔

ع : چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

غرض اس ضرورت سے اس مضمون کا ذکر ضروری ہوا تو سمجھو کہ ایک تو کعبہ ظاہری اُس کا مظہر ہے۔ پس جن بزرگ نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اُس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ روحِ کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعضے ایسے بزرگ ہوئے ہیں کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی لیکن حج کرنے کے لئے اُن کو بھی خود کعبے ہی میں آنا پڑا، اور جب ایسوں کو بھی خود کعبے کی طرف جانے کی احتیاج تھی تو اس سوداگر کو تو کیوں ضرورت نہ ہوگی اور یہ تجارت چھوڑ کر جائیں نہیں تو محض حاجی صاحب کی دعا سے اُن کو کیا نفع ہو سکتا ہے تو جو لوگ کچھ تدبیر کرتے بھی ہیں صرف اس قدر کہتے ہیں صاحبو! خیال کیجئے ابو طالب جو کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں اور بہت بڑے محب کہ جس موقعہ پر تمام قریش نے مخالفت کی اور آپ کے دشمن ہوگئے اُس موقعہ پر بھی ابو طالب نے ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور آپ نے بے حد کوشش اُن کے مسلمان ہونے کی فرمائی لیکن محض اس وجہ سے کہ انھوں نے نہیں ارادہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوشش اور محبت کچھ بھی اُن کے کام نہ آئی اور آخر کار

اپنی قدیم ملت پر اُن کا خاتمہ ہو گیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت رنج ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (بیشک آپ ہدایت نہیں دیتے جس شخص کو آپ چاہیں لیکن بیشک اللہ تعالےٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں) **اس موقعہ پر ایک بات طالب علموں کے** کام کی ذہن میں آئی وہ یہ کہ یَشَآءُ کی ضمیر جس طرح خدا تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے کہ جس کو خدا تعالےٰ چاہیں ہدایت دیں اسی طرح مَنْ کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور معنیٰ یہ ہوں گے کہ جو شخص خود اپنی ہدایت چاہے اُس کو خدا تعالےٰ ہدایت فرماتے ہیں اور دلیل اس معنیٰ کے صحت کی یہ آیت ہے مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (اور جو شخص آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہیئے ویسی سعی بھی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی) کیونکہ اَرَادَ اور یَشَآءُ ایک ہی بات ہے تو معلوم ہوا کہ اصلاح کا مدار خود اپنے چاہنے پر ہے دوسرے کے چاہنے اور کوشش کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کا ارادہ اُسی وقت بار آور ہوگا کہ جب خدا تعالےٰ بھی چاہیں لیکن اس کا چاہنا بھی ضرور ہے تو مَنْ کی طرف اگر ضمیر راجع ہو تو معنیٰ بہت لطیف ہوں گے کہ ہدایت اس کو ہوتی ہے جو خود اپنی ہدایت چاہے اور ابو طالب نے چاہا نہیں اس لئے ہدایت نصیب ہوئی نہیں اور جب ابو طالب کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چاہنے سے کچھ نفع نہ ہوا تو آج کون شخص ہے جو ابوطالب سے زیادہ حق دار ہو اور کون بزرگ ہے جس کی تمنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمنا سے زیادہ مقبول ہو۔ پس معلوم ہوا کہ جب تک خود ارادہ نہ کرے دوسرے کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے کیونکہ تمنا دوسری چیز ہے، ارادہ دوسری چیز ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں دو شخص حج کو جانے کی بابت تذکرہ کر رہے تھے ان میں سے ایک

نے کہا بھائی ارادہ تو ہر مسلمان کا ہے میں نے کہا کہ صاحب یہ بالکل غلط ہے اگر ارادہ ہر مسلمان کا ہوتا تو ضرور سب کے سب حج کر آتے۔ ہاں یوں کہئے کہ تمنا ہر مسلمان کی ہے سو نری تمنا سے کام نہیں چلتا ارادہ کہتے ہیں سامان کے مہیا کرنے کو مثلاً ایک شخص تو زراعت کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا کوئی سامان مہیا نہیں کرتا اور ایک شخص اس کا سامان بھی کر رہا ہے تو پہلے شخص کو متمنی اور دوسرے کو مرید کہیں گے اسی طرح اگر دو شخص جامع مسجد پہونچنا چاہیں مگر ایک تو اپنی جگہ بیٹھا ہوا تمنا ظاہر کئے جائے اور ایک شخص چلنا شروع کر دے تو دوسرے کو مرید کہیں گے اور پہلے کو متمنی تو جب ارادہ ہوتا ہے کام بھی ضرور پورا ہو جاتا ہے اگر کسی وجہ سے خود قدرت نہیں ہوتی تو کوئی رہبر مل جاتا ہے جو معین ہو کر کام پورا کر دیتا ہے اسی کو کہتے ہیں اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللہِ (کوشش کرنا میری طرف سے ہے اور اس کو پورا کرنا اللہ کی طرف سے ہے) پس کام شروع کر دینا چاہیئے خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے اور کام پورا ہو جائیگا میں ایک عالی ہمتی کی حکایت آپ کو سناتا ہوں۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے بلایا ہے تو جس مکان میں ان کو لے کر گئی ہے تو یکے بعد دیگرے سات حصے اس مکان کے تھے اور ہر حصہ مقفل تھا اور قفل بھی ہر حصے کے نہایت مضبوط تھے غرض پورا سامان کیا گیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام باہر نکل کر نہ جا سکیں آخر زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی خواہش کا اظہار کیا دھمکی بھی دی لجاجت بھی کی لیکن عصمتِ نبوت کے سامنے ایک بھی نہ چلی۔ واقعی حضرت یوسف علیہ السلام ہی کا کام تھا کہ اس مصیبت میں بھی ان کو اتنا قوی توکل رہا جو آگے معلوم ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ مکان سب مقفل ہیں نکلنے کی کوئی صورت بظاہر نہیں مگر ساتھ ہی قوتِ توکل نے ہمت دلائی کہ مجکو اپنا کام تو کرنا چاہیئے خدا تعالیٰ ضرور مدد کریں گے۔ چنانچہ آپ نے وہاں سے بھاگنا شروع کیا اور زلیخا آپ کے پیچھے ہوئی، لکھا ہے جس دروازے پر آپ ؒ

پہونچتے تھے قفل ٹوٹ کر گر جاتا تھا اور دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور آپ صحیح وسالم عفت کے ساتھ باہر نکل آئے اسی کی طرف اشارہ کر کے مولانا ؒ فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسفؑ وارمے باید دوید

کہ اگرچہ قصر عالم میں کوئی دروازہ نظر نہیں آتا کہ اس سے نکل کر تم نفس شیطاں کے پھندے سے بچ سکو لیکن مایوس پھر بھی نہ ہونا چاہیئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا تو چاہیئے پھر دیکھئے دروازہ پیدا ہوتا ہے کہ نہیں۔ بہت لوگ اس انتظار میں ہیں کہ فلاں کام سے فراغت کرلیں تو پھر توبہ کر کے اپنی اصلاح کی تدابیر میں لگیں کسی کو لڑکے کی نکاح کی فکر ہے، کسی کو مکان بنانے کی فکر ہے کسی کو جائداد کا شغل ہے۔ صاحبو! ذرا غور کرو کتنے برس یہ کہتے ہوئے گذر گئے کہ اب کے برس کچھ ضرور کرلیں گے مگر آج تک ضروریات اور حاجات کا سلسلہ ختم ہونے نہیں آتا۔ ع لا ینتھی ادب الا الی ادب

دنیا کی ہر ضرورت کا خاتمہ ایک نئی ضرورت پر ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ دوسری ضرورت پر وھکذا الی غیر النہایۃ۔ آخر یہ عمر دنیا یوں ہی تمام ہو جاتی ہے۔ پس امروز فردا پر ٹالنے سے کیا فائدہ ہمت کر کے کام شروع کر دینا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے کامل نہ ہوگے تو خالی بھی نہ رہو گے اگر تم کو صدیقیت کا درجہ بھی نصیب نہ ہوا تو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہو رہو گے کم از کم خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک محبت اور لگاؤ دنیا سے بے تعلقی اور طبیعت کا اچاٹ ضرور ہی ہو جائیگا مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ حالت ہے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترکِ ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز افردا کنم

(ہر رات وعدہ کرتا ہوں کہ کل اس پاگل پن کو چھوڑ دوں گا اور جب کل ہو جاتی ہے تو اگلے دن پر ٹال دیتا ہوں)

کہ روز یہی وعدہ رہا کہ کل ضرور کرلیں گے مگر ساری عمر اسی کل کل میں گذر گئی اور کل نصیب نہ ہوئی حتیٰ کہ موت کا وقت سر پر آجاتا ہے اور اس وقت بجز حسرت کے اور کچھ نہیں بن پڑتا اور یہ تمنا کرتا ہے کہ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (اے میرے پروردگار کیوں نہیں مؤخر کر دیا مجھ کو تھوڑی سی مدت کے لئے تاکہ میں تصدیق کرتا اور صالحین میں سے ہوجاتا) مگر یہ تمنا رد کر دی جاتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (اور ہرگز نہ مہلت دے گا اور اللہ تعالیٰ کسی نفس کو جبکہ آجائے اُس کا وقت) کہ اب ایک ساعت کی مہلت بھی نہیں مل سکتی اور صاحبو ہم تو کیا چیز ہیں کہ ہم کو کچھ مہلت مل سکے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جو کہ نبی معصوم و مقبول ہیں اُنھوں نے جب بیت المقدس کی تعمیر شروع فرمائی اور اختتام تعمیر سے قبل آپ کی وفات کا وقت آگیا تو آپ نے یہ تمنا کی کہ بیت المقدس کی تعمیر تیار ہوجانے تک مہلت دی جائے لیکن قبول نہ ہوئی غور کیجئے نبی کی درخواست اور بیت المقدس کی تعمیر کیلئے مگر نامنظور۔ آخر آپ نے یہ درخواست کی کہ مجھے اس طرح موت دی جائے کہ جنات کو میری موت کی اطلاع اس وقت تک نہ ہو جب تک کہ یہ تعمیر پوری نہ ہوجائے چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور آپ حسب عادت اپنے عصا پر سہارا لے کر کھڑے ہوگئے اور اسی حالت میں روح قبض ہوگئی اور سال بھر تک آپ کی لاش اُسی طرح کھڑی رہی۔ جنات نے آپ کو زندہ سمجھ کر کام جاری رکھا حتیٰ کہ جب تعمیر پوری ہوگئی اس وقت آپ کی لاش زمین پر گر گئی اور جنات کو اس وقت آثار سے معلوم ہوا کہ آپ کے انتقال کو اس قدر زمانہ گذر گیا ہے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ؀ (اور نہیں خبردار کیا ان (جنات) کو ان (حضرت سلیمان علیہ السلام) کی موت کے واقع ہونے پر لیکن زمین پر رینگنے والے جانوروں نے جو کھا رہے تھے اس ڈنڈے کو

پس جب وہ گرے تب جنات پر دلیل ظاہر ہوئی کہ اگر غیب کی باتوں کو جانتے ہوتے تو اس رسوائی کے عذاب میں نہ ٹھہرے رہتے) اور اس طریقہ پر موت دینے سے لوگوں کو یہ بھی ہدایت ہوگئی کہ جنوں کو علم غیب نہیں تو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو بیت المقدس تیار کرنے کے لئے مہلت نہیں دی گئی تو ہم کو بیت القدس تیار کرنے کے لئے مہلت کب مل سکتی ہے۔

غرض اس جملہ تقریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہم لوگ ارادہ تو کرتے ہیں لیکن ارادۃ الفعل نہیں کرتے کیونکہ ارادۃ الفعل وہ ہے جو کہ مقارن ہو فعل کے ساتھ کہ اس کے بعد فعل متخلف ہی نہ ہو اور جس کو ہم ارادہ کہتے ہیں وہ نری ہوس ہے دیکھئے اگر ایک شخص کھانا کھانے کا ارادہ کرے لیکن نہ ہاتھ ہلائے نہ منہ چلائے نہ منہ کھولے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کھانے کا ارادہ کیا ہاں یہ کہیں گے کہ اس نے کھانے کی ہوس اور تمنا کی اور جو لوگ بزرگوں کی توجہ کے امیدوار بیٹھے ہیں اُن سے کوئی یہ تو پوچھے کہ کیا ان بزرگ کو بھی نری توجہ سے سب کچھ حاصل ہو گیا تھا یا ان کو کچھ کرنا پڑا تھا اگر ان کو کچھ خود بھی کرنا پڑا ہے تو کیا وجہ کہ تم کو نری توجہ سے حاصل ہو جائے۔ اور بزرگوں کی توجہ سے انکار نہیں بیشک بزرگوں کی توجہ سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن اس توجہ کے اثر کے لئے محل قابل کی بھی ضرورت ہے دیکھو اگر کھیتی کرنا چاہو تو زمین میں تخم ریزی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ تخم ریزی اس وقت کارآمد ہوتی ہے جبکہ زمین بنجر نہ ہو ورنہ تخم بھی ضائع ہوتا ہے اور محنت اور جانکاہی بھی رائیگاں جاتی ہے پس اول قابلیت پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول ارادہ کرو ہاں نرا ارادہ بھی کافی نہیں جب تک کہ توجہ بزرگان نہ ہو، کیونکہ ؎

بے عنایاتِ حق وخاصانِ حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(بغیر خدائے تعالےٰ اور ان کے مخصوص بندوں کی عنایت اور مہربانیوں کے اگر بادشاہ ہو تو اس کی ہستی کا ورق بھی سیاہ ہو جاتا ہے)

اصل میں ارادہ کے پورا ہونے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ عنایت خداوندی متوجہ ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ بزرگان خود متوجہ ہوں اکیلے کوئی کسی کا کام نہیں ہوا ؎

یار باید راہ را تنہا مرو　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

کہ اس جنگل میں تنہا نہ چلو کسی رہبر کو ضرور ساتھ لے لو کہ وہ تم کو رستے کے خطرات سے محفوظ رکھے آگے کہتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید　　ہم بہ عون ہمت مرداں رسید

(اول تو یہ سفر بہت ہی کم لوگ طے کر پاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی کسی واسطہ سے بزرگوں کی توجہ ہی سے کامیاب ہوگئے)

کہ اگر تم نے کسی کی حکایت سن لی ہو کہ وہ بغیر کسی رہبر کے اس رستے کو طے کر گئے تو اول تو یہ نادر ہے دوسرے واقع میں وہ بھی کسی کی ہمت کی بدولت منزل تک پہونچے ہیں اگرچہ ظاہر نظر میں معلوم نہ ہو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی بہت سی مخلوق بلا کسی تعلق کے ہمارے لئے دعا کرتی ہے گو ہم کو خبر بھی نہ ہو تو کوئی شخص اپنے کو مستغنی نہ سمجھے اسی لئے فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

بے رفیقی ہر کہ باشد در رہِ عشق　　عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق

گر ہوائے ایں سفر داری دِلا　　دامنِ رہبر بگیر و پس بیا

در ارادت باش صادق ای فرید　　تا بیابی گنج عرفاں را کلید

(بغیر ساتھی کے جو بھی عشق کے راستے میں چلا تو اس کی عمر تمام ہوگئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہوسکا۔ اے دل اگر اس سفر کی خواہش رکھتا ہے تو کسی راستہ بتانے والے کا دامن پکڑ پھر چل اپنے ارادے میں مخلص ہوجا اے فرید تاکہ معرفت کے خزانہ کی کنجی تیرے ہاتھ آئے)

غرض نہ بغیر چلے کام چلتا ہے نہ بے رفیق سیدھا رستہ ملتا ہے۔ دیکھو اگر ایک نابینا شخص کسی جگہ پہونچنا چاہے تو اول اس کو چلنے کی ضرورت ہے اگر چلے ہی نہیں

تو ہزار رفیق ملنے پر بھی رستہ قطع نہیں ہوگا اور چلنے کے بعد رفیق و رہبر کی ضرورت ہے کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو نا آشنا رستہ میں کسی جگہ ضرور ٹکر کھا کر گر پڑے گا۔ بے خطر منزل پر پہونچنے کی صورت یہ ہی ہے کہ اپنے پیروں چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑ لے بالکل ایسی ہی حالت اس رستہ کی بھی ہے کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں چلنا ہے اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کا ہاتھ پکڑنا ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ لوگ جو آج کل نری پیری مُریدی کو اصل کام سمجھتے ہیں یہ غلطی ہے۔ نری پیری مُریدی میں کچھ نہیں رکھا اصل کام خود چلنا ہے اور کسی رہبر کا ہاتھ پکڑ لینا اگرچہ مرید کسی سے بھی نہ ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ سلسلہ میں داخل ہونے کے برکات کچھ بھی نہیں ہیں اس کے برکات ضرور ہیں لیکن اسی کو اصل الاصول سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ آج اس پیری مُریدی کے متعلق وہ جہل پھیلا ہے کہ الامان الحفیظ۔ میرے ایک دوست بیان کرتے ہیں کہ ایک مکار پیر صاحب کسی گانوں میں پہونچے اتفاق سے بہت ہی نحیف ہو رہے تھے، مریدوں نے پوچھا کہ پیر تم اس قدر ضعیف کیوں ہو۔ پیر صاحب نے جواب دیا کہ ظالموں تمہیں میرے ضعف کی خبر نہیں۔ دیکھو میں اپنا بھی کام کرتا ہوں اور تمہارا بھی۔ تم نماز نہیں پڑھتے میں تمہاری طرف سے نماز پڑھتا ہوں تم روزہ نہیں رکھتے میں تمہاری طرف سے روزے رکھتا ہوں اور سب سے بڑی مشقت یہ ہے کہ سب کی طرف سے پل صراط پر چلتا ہوں جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے بس ان فکروں نے لاغر کر دیا۔ مرید یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور ایک گوجر نے خوش ہو کر کہا کہ پیر میں نے تجھے اپنا موٹھ کا کھیت بخش دیا پیر کو خیال ہوا کہ دیہاتی لوگوں کا کچھ اعتبار نہیں ہے اسی وقت چل کر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ کہا بھائی ابھی چل کر دیدو چنانچہ وہ گوجر ساتھ ہو لیا رستہ میں اتفاق سے کسی ڈول سے پیر صاحب کا پیر پھسل گیا۔ اور گر گئے۔ گرنے کے ساتھ ہی اس گوجر نے ایک لات رسید کی اور کہا کہ تو جب اتنی چوڑی مینڈ پر

نہیں چل سکا تو پل صراط پر کس طرح چلتا ہوگا تو جھوٹا ہے جا ہم تجھے اپنا کھیت نہیں دیتے تو صاحبو! سچ بات یہی ہے کہ کام اپنے ہی کئے سے ہوتا ہے کسی دوسرے کے کئے کوئی کام نہیں ہوتا اور میں کہتا ہوں کہ اگر دوسرے کے کرنے سے کام ہوجاتا ہے اور اپنے کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو اس کی کیا وجہ کہ یہ قاعدہ دین ہی کے کاموں میں برتا جاتا ہے دنیا کے کاموں سے بھی کیوں ہاتھ نہیں اٹھا لیا جاتا اور ان کو بھی کیوں پیر صاحب کے بھروسہ پر نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ بس نہ کھاؤ نہ پیو نہ کھیتی کرو سب کام تمہاری طرف سے پیر ہی کرلیا کریں گے۔ ان ہی کے کھانے سے تمہارا پیٹ بھر جائے گا اُن ہی کے پانی پینے سے تمہیں تسکین ہوجائے گی افسوس ان کاموں میں تو اس قاعدے پر عمل نہ کیا گیا بلکہ اپنے کرنے کو ضروری سمجھا گیا اور دین کے کام کو اس قدر سستا اور بے وقعت سمجھا گیا کہ اُس میں اس قسم کے قاعدے برتے گئے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ اودھ میں ایک پیر تھے کہ وہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے مرید کہا کرتے تھے کہ مکہ مکرمہ میں جاکر نماز پڑھتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے سُن کر کہا کہ صاحب اس کی کیا وجہ کہ نماز کے لئے تو مکہ مکرمہ کو اختیار کیا جائے اور کھانے ہگنے کے لئے ہندوستان کو اگر نماز وہاں پڑھی جاتی ہے تو کھانا ہگنا بھی وہیں ہونا چاہیے اور اگر یہ ہندوستان میں ہوتا ہے تو نماز بھی ہندوستان میں ہونی چاہیئے کیونکہ ہندوستان میں ہم لوگ نہیں ہے اور اپنے اس قاعدے میں کہ سب پیر ہی کرلیں گے غور کرکے دیکھو اس کا حاصل تو یہ ہے کہ گویا پیر تمہارے کمین ہیں کہ گناہ تم کرو اور پیر اس کو اٹھائیں یاد رکھو کہ پیر صرف رستہ بتلانے کے لئے ہیں کام کرنے کے لئے نہیں کام تم کو خود کرنا چاہیئے۔ اس تقریر پر شاید اہلِ فن کو یہ شبہ ہو کہ بعض مرتبہ مرشد کی توجہ سے طالب کے قلب میں ایک کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جو کہ خود محنت کرنے سے پیدا نہیں ہوتی سو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اس کیفیت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اگر خود کچھ نہ کیا جائے تو یہ کیفیت باقی بھی نہیں رہتی۔ اس کیفیت کی

مثال ایسی سمجھنی چاہیئے جیسے آگ کے سامنے بیٹھنے سے بدن کا گرم ہو جانا لیکن یہ گرمی باقی نہیں رہتی آگ کے سامنے سے ہٹ کر ہوا لگی کہ بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوئی۔ اسی طرح اس کیفیت میں بھی پیر سے جدا ہوتے ہی کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

ایک بزرگ نے اپنے ایک ہم عصر بزرگ سے کہا کہ تم اپنے مریدوں سے محنت لیتے ہو اور ہم نہیں لیتے انھوں نے یہ سن کر اپنے مرید سے کہا کہ تم ذرا ان کے مرید سے مصافحہ تو کرو مصافحہ کرنا تھا کہ وہ کم محنت مرید خالی رہ گئے پیر نے ان سے کہا کہ دیکھا نتیجہ محنت نہ کرنے کا اب تم ہمارے کسی مرید کو تو اس طرح کورا کر دو بات یہ ہے کہ اپنی کمائی کی قدر بھی خوب ہوتی ہے اور مفت کی چیز کی کچھ قدر نہیں ہوتی ہے

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص سستا کماتا ہے وہ سستا دیتا ہے۔ بچہ روٹی کی ٹکیہ کے بدلے موتی دے دیتا ہے)

مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتہ دوشالے سے جھاڑ رہا تھا لوگوں نے اس سے سبب پوچھا تو کہا کہ دوشالہ تو میرے والد کی کمائی کا ہے اور جوتہ میری کمائی کا ہے۔ تو جو لوگ اپنے بوتہ پر کرتے ہیں ان کی حالت ساری عمر یکساں رہتی ہے البتہ ان میں شور و غل اچھل کود نہیں ہوتی اور نہ یہ مطلوب ہے دیکھو اگر کوئی بچے کی تربیت کرنا چاہئے تو طریقہ اس کا یہ ہے کہ اس کو تھوڑا تھوڑا کھلائے کہ جزو بدن ہو اور اس سے نشو و نما پیدا ہو۔ اسی طرح شیخ کامل بھی ایک ہی دن سب کچھ نہیں بھر دیتا کیونکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ طالب کو حالات کا ہیضہ ہو اور ایک ہی دن میں خاتمہ ہو جائے بلکہ وہ بتدریج اس کو آگے کو بڑھاتا ہے اور جو لوگ اناڑی ہیں اور طریق تربیت سے ناواقف ونا آشنا ہیں وہ ایک دم میں بھر دینا چاہتے ہیں

ایسے لوگوں کو عوام الناس بہت بزرگ سمجھتے ہیں حالانکہ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے تعلقات اس سے چھوٹ جاتے ہیں نہ بیوی کے کام کا رہتا ہے نہ بچوں کے اور یہ کمال نہیں بلکہ نقص ہے ؂

تو برائے وصل کردن آمدی　　نے برائے فصل کردن آمدی

(تو ملانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جدائی پیدا کرنے کے لئے)

خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں ایک عام عنوان سے فرماتے ہیں وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ أَنْ يُّوْصَلَ (اور وہ لوگ قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے) افسوس آج اسی کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں دیکھتے اولاد کو منہ بھی نہیں لگاتے بیوی تک کو نہیں پوچھتے ہر وقت قرب خداوندی میں غرق رہتے ہیں۔ صاحبو کیا کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی قرب میں زیادہ ہو سکتا ہے کبھی نہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت کیا تھی، آپ ازواج مطہرات کے حقوق بھی ادا فرماتے تھے اولاد حقوق بھی ادا فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدینا حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سے ایک کو پیار کر رہے تھے اور ایک نجد کے رئیس پاس بیٹھے ہوئے تھے اُنھوں نے دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے دس بیٹے ہیں میں نے تو آج تک کسی ایک کو بھی کبھی پیار نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا اگر خدا تعالیٰ نے تیرے دل ہی میں سے رحم نکال نکال لیا تو اس کو میں کیا کروں۔ اور آپؐ کا ارشاد ہے مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا (جس شخص نے نہیں رحم کیا ہمارے چھوٹوں پر اور جس شخص نے نہ احترام کیا ہمارے بڑوں کا پس وہ ہم میں سے نہیں) اس واقعہ سے پورا اندازہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت اور مرضی کا ہو گیا ہوگا۔ پس نرا جوش اور مستی یا ترکِ تعلقاتِ واجبۃ الابقاء

بزرگی نہیں ہوسکتا اور اگر کسی کا نام بزرگی ہے تو نشۂ شراب اور حالت جنون بھی بزرگی ہے کیونکہ ان دونوں میں یہ بات خوب حاصل ہوجاتی ہے صاحبو. بزرگی کا معیار یہ ہے کہ جتنی درویشی میں ترقی ہوتی جائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مشابہت بڑھتی جائے کیونکہ ولایت مستفاد عن النبوۃ ہے افسوس یہ ہے کہ یہ لوگ علماء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس لئے بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ بزرگی کا ایک معیار یہ بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کردے اٹھاکر زمین پر پٹک دے وہ بڑا بزرگ ہے حالانکہ یہ بالکل ہی لغو ہے، اگر یہ بزرگی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ضرور اس کو برتنا چاہیئے تھا پھر کیا وجہ کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ غافل ہو جائیں تو میں نکل کر جاؤں، کیوں آپؐ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش نہیں کردیا۔ جب مدینہ طیبہ تشریف لے چلے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چاروں طرف دیکھتے چلتے تھے۔ سراقہ جو کہ آپ کی تلاش کے لئے بھیجا گیا تھا جب سامنے آگیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراقہ چلا آرہا ہے۔ آپؐ نے اس وقت بھی خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ اکْفِنَا شَرَّہٗ (اے اللہ روک دے ہم سے اُس کے شر کو) چنانچہ پیٹ تک اس کا گھوڑا زمین میں دھس گیا۔ سراقہ نے کہا کہ غالباً آپ نے میرے لئے بددعا کی ہے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں قریش کو آپ کا پتہ نہ دوں گا۔ چنانچہ آپؐ نے دعا فرمائی اور اُس کا گھوڑا زمین سے نکل آیا اور پھر کسی سے اطلاع نہیں کی اس واقعہ سے آجکل کے لوگوں کو سبق لینا چاہیئے کہ اس زمانہ کے کفار میں بھی صدق وایفائے عہد تھا۔ آج کل کی طرح پولیٹیکل چالیں نہ تھیں بلکہ آج سے

چند روز پیشتر تک بھی یہ اوصاف اکثروں میں موجود تھے مگر صد حیف کہ آج بالکل مفقود ہیں اور بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو اس وقت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے دن میں سینکڑوں جھوٹے وعدے کرتے ہیں بیسیوں مکر کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ رنج کی بات یہ ہے کہ مقدسین بھی اس حالت سے پاک نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

بقمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

کہ میں قمار خانہ میں گیا تو دیکھا کہ سب پاکباز جمع ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قمار خانہ کے جو مقرر کردہ اصول تھے سب کے سب ان پر چل رہے تھے اس میں کسی قسم کا دغل نہ تھا اور بعنوانِ محاورہ کسی قسم کی بے ایمانی نہ تھی کیونکہ وفائے عہد کو لوگ ایمانداری کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جن اصول پر قمار ٹھہرا تھا اُن میں خلاف عہد نہ ہوتا تھا اور جب صومعہ میں گیا تو دیکھا کہ جن اصول پر یہاں حق تعالیٰ سے عہد کیا تھا اس میں وفا نہیں اور ان کو پورا نہیں کیا جاتا مثلاً عہد کیا تھا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ (ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں) حالانکہ اس عہد کو وفا نہیں کیا جاتا کیونکہ دل میں ہزاروں غیر اللہ من وجہ درجۂ معبودیۃ اور مستعانیۃ لئے ہوئے بھرے ہیں۔ صاحبو پہلے لوگ اس قدر سیدھے سادے بھولے ہوتے تھے کہ ان کی کسی قسم کی چالاکی آتی ہی نہ تھی میرے ایک رشتہ دار بزرگ بیان کرتے تھے کہ ان کے والد زمیندار تھے ایک مرتبہ کاشتکار اناج لایا۔ اُن زمیندار نے پوچھا کہ یہ کس قدر ہے کاشتکار نے نوّے من بتلایا انھوں نے کہا کہ ہم سے تو اسی من ٹھہرا تھا کاشتکار نے کہا نہیں جناب نوّے من ٹھہرا تھا بہت دیر تک اس میں جھگڑا رہا۔ آخر ان کے صاحبزادے نے بہت سی کنکریاں جمع کر کے ایک ڈھیر نوّے کنکریوں کا اور دوسرا اسی کنکریوں کا لگایا اور ان زمیندار سے گنواکر پوچھا کہ یہ اسی زائد ہیں یا نوے انھوں نے نوّے کو زائد بتلایا تو انھوں نے کہا کہ کاشتکار اس قدر من دینا چاہتا ہے جس قدر یہ نوّے کنکریاں ہیں تب ان دونوں کا جھگڑا ختم ہوا۔ سبحان اللہ کیسے اچھے وقت تھے کہ کفاریں بھی چالیں نہ تھیں۔ یہی وجہ

تھی کہ سراقہ نے جو عہد آپ سے کیا تھا اس کو پورا کیا۔ اور جو شخص اس کو رستے میں ملتا گیا اس سے کہتا گیا کہ میں بہت دور تک دیکھ آیا ہوں ادھر کہیں نہیں ملے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت امن وامان سے مدینہ منوّرہ پہونچ گئے۔ تو دیکھئے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سراقہ کے ساتھ یہ نہیں کیا کہ اس کو ایک نظر میں اڑا دیتے یا گرا دیتے بلکہ خدا تعالےٰ سے دعا فرمائی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تشویش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے راس کا یعنی نظر بے ہوش کرنے کا کبھی احتمال ہی نہ تھا ورنہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ پریشان نہ ہوتے بلکہ مطمئن رہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نظر بھی کریں گے تو یہ فوراً لوٹ پوٹ ہو جائے گا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ ہاں نظر و توجہ سے صرف اس قدر ہوتا ہے کہ راہ پر لگایا جائے آگے جو کچھ ہوتا ہے اپنے کرنے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سُنا ہے کہ بڑے امیر زادہ ہیں اور نظر کردہ ہیں ان کی حالت یہ تھی کہ متوحشانہ جنگلوں میں پھرا کرتے تھے، ان کے والدان کو نکما بیکار سمجھا کرتے تھے۔ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کو منکشوف ہوا کہ فلاں مقام پر فلاں رئیس کا ایک لڑکا ہے اُس کی تربیت کرو۔ حضرت نجم الدین تشریف لائے حافظ شیرازی رحمہ اللہ کے والد نے نہایت تعظیم وتکریم سے مہمان کیا اور عرض کیا کیسے تکلیف کی انھوں نے فرمایا کہ اپنے بیٹوں کو جمع کرو چنانچہ انھوں نے حافظ رحمہ اللہ کے سوائے سب بیٹوں کو بلا کر پیش کیا، آپ نے سب کو دیکھا اور فرمایا کہ کیا ان کے سوا کوئی اور لڑکا نہیں حافظ رحمہ اللہ کے والد حافظ رحمہ اللہ کو کالعدم کہتے تھے اس لئے جواب دیا کہ اور کوئی نہیں، انھوں نے فرمایا کہ مجھکو معلوم ہوا ہے اور وہ ان میں معلوم نہیں ہوتا تب اُنھوں نے کہا کہ ایک اور ہے مگر نہایت آوارہ دار جنگلوں میں پھرتا ہے۔ حضرت نجم الدین نے فرمایا کہ ہاں اسی کی ضرورت ہے

حافظ رحمہ اللہ کے والد کو بڑا تعجب ہوا کہ اس دیوانے سے حضرت کو کونسا کام ہوگا اور یہ خبر نہ تھی۔

ع : کہ آبِ چشمۂ حیواں درون تاریکی ست

(ابِ حیات کا چشمہ تو تاریکی میں ہے)

چنانچہ تلاش کے بعد حافظ ملے وحشی خاک آلودہ اور ان کو حضرت نجم الدین کبریٰ کے سامنے پیش کیا گیا حافظ رحمہ اللہ نے جب حضرت کی صورت دیکھی تو بے اختیار زبان سے نکلا ؎

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند | آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند
دردم نہفتہ بہ طبیبانِ مدعی | باشد کہ از خزانۂ غیبش دوا کنند

(کیا وہ ہماری جانب بھی التفات فرمائیں گے ان بڑے بڑے دعوے کرنے والے طبیبوں سے میرا درد چھپائے رکھنا ہی اچھا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ خزانہ غیب سے میری دوا کریں۔)

آپ نے سینے سے لگا کر فرمایا کہ بہ تو نظر کردم۔ حضرت نجم الدین کبریٰ بہت بڑے شخص ہیں ان کا انتقال اس طرح ہوا ہے کہ ایک مرتبہ اُنھوں نے کسی کو کوئی شعر پڑھتے سُنا کہ اس کا ایک مصرعہ یہ تھا

جاں بدہ وجاں بدہ وجاں بدہ

آپ نے فرمایا کہ افسوس محبوب جان طلب کر رہا ہے اور کوئی نہیں سنتا اور فرمایا کہ۔ جاں دادم و جاں دادم وجاں دادم اور اس میں انتقال ہوگیا۔ غرض حافظ رحمہ اللہ کو سینے سے لگا کر انھوں نے فیض دیا لیکن وہ فیض کافی نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد یا اس سے قبل مجاہدے کی بھی ضرورت ہوئی یہ دوسری بات ہے کہ قابلیت تامّہ کی وجہ سے زیادہ مجاہدہ کی ضرورت نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ قوی الاستعداد ہوتے ہیں ان کو تھوڑے کام میں بہت کچھ نفع ہوجاتا ہے۔ حضرت سلطان نظام الدین

اولیاء قدس اللہ سرہ کے پاس ایک شخص آیا اور ایک ہفتہ میں خلافت لے کر چلا گیا آپ کے دوسرے مرید اس کو دیکھ کر دل میں بہت خفا ہوئے اور یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شیخ ہماری طرف پوری توجہ نہیں فرماتے آپ نے ان لوگوں کے انداز سے اس وسوسہ کو تاڑ لیا اور ان کے علاج کے لئے فرمایا کہ کچھ تر اور کچھ سوکھی لکڑیاں جمع کرو جب جمع ہو گئیں تو فرمایا کہ گیلی لکڑیوں میں آگ لگاؤ سب نے بہت کوشش کی لیکن ان میں آگ نہ لگی اس کے بعد فرمایا کہ ان سوکھی لکڑیوں میں آگ لگا دو چنانچہ ان میں فوراً آگ سلگ اٹھی آپ نے فرمایا کہ کیا وجہ یہ لکڑیاں اس قدر جلد کیوں سلگ اٹھیں اور پہلی لکڑیوں میں کیوں آگ نہیں لگی۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ حضور پہلی لکڑیاں گیلی تھیں اور یہ سوکھی ہیں گیلی لکڑیوں میں آگ نہیں لگا کرتی۔ آپ نے فرمایا کہ ظالمو تم گیلی لکڑیاں ہو کر میری شکایت کرتے ہو اور اس سوکھی لکڑی کے جل اٹھنے پر تعجب کرتے ہو وہ سوختہ ہو کر آیا تھا صرف ایک پھونک کی ضرورت تھی چنانچہ ایک ہی پھونک میں بھڑک اٹھا اور تم گیلی لکڑی ہو کہ رات دن دھونکتا ہوں مگر تم آگ ہی نہیں پکڑتے سو اس میں میری جانب سے کمی ہے یا تمہارا قصور ہے غرض بعضے سوختہ دل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے تھوڑے ہی کام میں سب کچھ حاصل ہو جائے لیکن آگے یا پیچھے کچھ نہ کچھ مجاہدہ ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اور کرنے پر بھی جو کچھ ملتا ہے وہ محض فضل خدا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ پر کسی کا زور نہیں ہے مگر عادۃً اللہ یوں جاری ہے کہ جو ادھر توجہ کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کو بہت کچھ دیتے ہیں مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا (جو شخص میری طرف ایک بالشت ہوتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں) کے یہی معنی ہیں تو صاحبو کیا یہ بات کچھ کم ہے کہ کام پیسے کا کیا جائے اور ملے ایک اشرفی ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را کہ بیک گل مے خری گلزار را

(اپنے لئے اتنا بڑا بازار حاصل کرتا ہے جو کہ ایک پھول دے کر باغیچہ خرید تا ہے)

کہ دیا تو ایک پھول اور اس کے عوض مل گیا ایک باغ خوب کہا ہے ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد این چہ در وہمت نیاید آں دہد

(آدھی جان لیتے ہیں اور سو جانیں دیتے ہیں اور جو خیر تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی وہ عطا کرتے ہیں)

کہ آدھی جان لے کر سینکڑوں جانیں دیتے ہیں غرض یہ ہے کہ جو تدبیر کرنے کی ہے لوگ اُسے نہیں کرتے صرف ناتمام تدابیر پر اکتفا کرتے ہیں حالانکہ تدبیر پوری کرنی چاہیئے تب فائدہ مرتب ہوتا ہے۔ اب میں مختصر کرتا ہوں اور غفلت عن الآخرۃ کے مضمون کو ایک جملہ سے واضح کرتا ہوں کہ دیکھئے جب کسی سفر کا قصد ہوتا ہے تو اس کے لئے کس قدر سامان کرتے ہو کہ مثلاً چار دن پہلے سے دھوبی کو حکم کرتے ہو کہ کپڑے جلدی دینا ناشتہ کا سامان کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں کیا جاتا کہ عین وقت پر سارا سامان کیا جائے بلکہ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو بیوقوف بنائے جاتے ہیں اور خود بھی اپنے کو بیوقوف سمجھتے ہیں کیوں صاحب جب اس چھوٹے سے سفر کے لئے اتنے بیشتر سامان فراہم کیا جاتا ہے تو یہ موت کا اتنا بڑا سفر کتنے پہلے اور کتنا بڑا سامان چاہتا ہوگا، کیونکہ یہ وہ سفر ہے کہ اس سے پھر کبھی واپسی ہی نہ ہوگی پھر اس کے لئے کیا سامان مہیا کیا۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو اطاعتِ خداوندی میں سرگرم ہیں دوسرے وہ جو مخالفت میں پھنسے ہیں پہلی قسم کے لوگوں کے لئے یہ سفر سفرِ رغبت اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے سفرِ رہبت ہے اور یہ دونوں صورتیں دنیا کے سفروں میں بھی ہوتی ہیں پس دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کا مدعو ہو جو کہ سفرِ رغبت ہوگا تو اس کے لئے کیا کچھ سامان پہلے سے کرے گا اپنے پاس نہ ہوگا تو دوسروں سے قرض لے کر مستعار مانگ کر چیزیں جمع کرے گا۔ اور ہر طرح سے درست ہو کر ارادۂ سفر کرے گا اسی طرح اگر کسی شخص نے مثلاً چوری کی ہو اور گورنمنٹ کی طرف سے اس کے نام سمن آگیا ہو تو غور کیجئے کہ جانے سے پہلے وہ کیا کیا سامان کرے گا اپنی صفائی کے گواہ جمع کرے گا وکلاء سے

مل کر مشورہ کرے گا، دوست احباب سے رائے لے گا وغیرہ وغیرہ غرض دونوں قسموں کے سفر میں مختلف طرح کے سامان کئے جاتے ہیں۔ تو کیا وجہ جب یہی دونوں صورتیں آخرت کے سفر میں بھی محتمل ہیں اس میں کیوں سامان نہیں کیا جاتا اور سہل انگاری برتی جاتی ہے۔ صاحبو یہ تو یقینی ہے کہ سفر آخرت آنے والا ہے پس اگر ہم مطیع ہیں تو یہ سفر ہمارے لئے رغبت اور شوق کا سفر ہوگا ورنہ رہبت اور خوف کا سفر ہوگا۔ پس بتلایئے کہ آپ نے رغبت کے کیا سامان جمع کئے ہیں اور خلاصی کی کونسی صورتیں پیدا کی ہیں کونسی عبادت کی ہے کتنے حق العبد ادا کر دیئے ہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھو تو سفر آخرت ہر مسلمان کے لئے رغبت اور رہبت دونوں پہلو لئے ہوئے ہے کیونکہ ایمان بین الخوف والرّجا ہے، یعنی نہ خدا تعالےٰ پر نازہو سکتا ہے اور نہ مایوس ہونا چاہیئے۔

غافل مرد کہ مرکب مردان زہد را ۔۔۔ در سنگلاخ بادیہ پیہا بُریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ۔۔۔ ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

تو مسلمانوں کی اصل حالت یہ ہونی چاہیئے کہ رغبت اور رہبت ملی ہوئی ہو چنانچہ انبیاء علیہم السّلام کی حالت بیان فرماتے ہیں یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وصف ان میں جمع ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میدانِ قیامت میں یہ ندا ہو کہ صرف ایک شخص جنت میں جائے گا تو مجھے یہ امید ہو گی کہ وہ شخص میں ہوں۔ اور اگر یہ ندا ہو کہ صرف ایک شخص جہنم میں جائے گا تو مجھے یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔ غرض مسلمان کو ہر وقت رغبت بھی ہونی چاہیئے اور رہبت بھی اور جب یہ ہے تو ہر وقت استغفار بھی کرتے رہنا چاہیئے۔ اور اعمال میں بھی پوری کوشش ہونی چاہیئے۔ اور صاحبو! ایک آدھ وقت کر لینے سے کام نہیں چلتا ضرورت اس کی ہے کہ روز کا دھندا ہو جائے فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (اے ایمان والو!

خدا سے ڈرو اور چاہیئے کہ نظر میں رکھے نفس اس چیز کو جس کو اس نے کل کے لئے بھیجا ہے)
یعنی اس کو سوچو کہ کل کیلئے کیا کر رکھا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر معطل ہو جاؤ
ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی دھن لگ جائے۔ اگر روزانہ نصف گھنٹہ بھی اس تفکر کیلئے نکال لیا جائے تو ان شاء اللہ
تعالیٰ بہت کم نافرمانی ہوگی اور دنیا کی محبت جاتی رہیگی پھر ان شاء اللہ تعالیٰ یہ حالت ہوگی کہ تم دنیا
کے سب کاروبار کروگے لیکن ان کاموں میں جی نہ لگے گا۔ اور اس کے بعد دو چیزوں کی اور ضرورت ہوگی ایک
تو بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنے کی سو بحمد اللہ اب اس کا سامان بہت میسر ہوگیا ہے اور ہر شخص کو ہر جگہ
رہ کر اسکا سیکھنا آسان ہے اسکے لئے یہ کرو کہ کوئی جامع رسالہ لیکر اس کو کسی عالم سے پڑھنا یا اگر پڑھنے کا موقع
نہ ہو تو نہایت غور سے دیکھنا شروع کردو اور ہمیشہ اس کا ورد رکھو دوسرے کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کرلو
مگر تعلق دین کیلئے پیدا کرو دنیا طلبی کیلئے اہل اللہ سے تعلق نہ پیدا کرنا چاہئے ہاں شاذونادر اگر کوئی
دنیا کا کام بھی ان سے نکل جائے تو مضائقہ نہیں لیکن محض دنیا ہی کو نصب العین بنا کر ان سے راہ اور رسم پیدا
کرنا نہ چاہئے۔ مثلاً بعضے لوگ اہل اللہ سے اس لئے ملتے ہیں کہ ان کی ملاقات بڑے لوگوں سے ہے،
ان کے ذریعہ سے ہمارے کام نکلیں گے یا بعضے لوگ تعویذ گنڈوں کے لئے ملتے ہیں حالانکہ اہل اللہ
سے اس قسم کے کام لینے کی ایسی مثال ہے کہ کسی سُنار سے کھرپا بنانے یا لوہار سے زیور بنانے کی فرمائش
کی جائے بعض لوگ مشورہ کیا کرتے ہیں کہ ہم کس قسم کی تجارت کریں۔ اناج کی تجارت کریں یا کپڑے کی خدا
جانے یہ لوگ اہل اللہ کو خدا تعالیٰ کا رشتہ دار سمجھتے ہیں کہ ان کا بتلانا خدا کا بتلانا ہوگا اور جب
خدا تعالیٰ بتلادیگا تو اس کام میں ضرور نفع ہوگا یا خدا تعالیٰ کا رازدار سمجھتے ہیں کہ یہ خدا سے مشورہ
کرکے بتلادیں گے ابھی کل کی بات ہے کہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ کو تو سب
خبر ہوگئی ہوگی۔ صاحبو! اس دربار میں انبیاء علیہم السلام کا پتہ بھی پانی ہوتا ہے دوسروں کی
تو کیا مجال ہے ؎

ہست سلطانی مسلّم مر ورا نیست کس را زہرۂ چون و چرا

(بادشاہت اور سلطانی صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے اس میں کسی کو اعتراض کرنے کی مجال نہیں ہے)
فرماتے ہیں قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
(آپ یوں پوچھئے کہ اگر ایسا ہے تو یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم کو اور ان کی والدہ کو اور جتنے زمین

یں ہیں ان سب کو ہلاک کرنا چاہیں تو کوئی شخص ایسا ہے جو خدا تعالیٰ سے ان کو ذرا بھی بچا سکے، توانبیاء علیہم السلام کی نسبت جب یہ کہا جا رہا ہے تو دوسرے کس شمار میں ہیں۔ ایک صاحب نے مجھ سے یاد نہیں رہا کوئی دنیوی فرمائش کی میں نے کہا یہ کام مجھ کو نہیں آتا کہنے لگے کہ اللہ والوں کو سب کچھ آتا ہے میں نے کہا کہ اگر سب کچھ آتا ہے تو کل ایک چارپائی بھی لے آنا کہ اس کو بن دیجئے۔ غرض مولویوں سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پوچھئے اور اہل طریقت سے اللہ تعالیٰ کا نام پوچھئے دنیا کی فرمائش کسی سے نہ کیجئے ہاں دنیا کے لئے دعا کرانے کا مضائقہ نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے کاموں میں کسی قسم کا اثر کا دخل سمجھنا سخت غلطی ہے دعا کے متعلق بھی یہ نہ کرو کہ صرف ان ہی پر ڈال دو بلکہ تم خود بھی اپنے لئے دعا کرو اور بزرگوں سے بھی دعا کراؤ۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ خود دعا کروں، میں نے کہا کہ کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں کہنے لگے کہ پڑھتا ہوں میں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ کہ تم کلمہ پڑھنے کے قابل تو ہو مگر دعا کرنے کے قابل نہیں۔ یہ شیطان کی شرارت ہے کہ دل میں یوں ڈالتا ہے کہ دعا کے قابل نہ سمجھنا تواضع ہے۔ ایک صاحب نے یہ فرمائش کی تھی کہ تم ہی استخارہ بھی دیکھ دو غرض اپنے اوپر کسی قسم کی تکلیف نہ ہو سب کچھ دوسرے ہی کر دیں۔ مجھے پھر یاد آتا ہے کہ کھانے میں کبھی یہ نہ سوجھا کہ بزرگوں سے کہتے کہ آپ ہی کھا لیا کیجئے ہمارے کھانے کی ضرورت نہیں تو تمہ تدبیر کا یہ ہے کہ کام دین کا خود کرو اور بزرگوں سے اس میں صلاح و مشورہ لیتے رہو اور عمر بھر اسی تدبیر میں لگے رہو یہ نہ کرو کہ چار دن کیا اور چھوڑ دیا کیونکہ ہم کو تو جنم روگ لگا ہے اس کے لئے عمر بھر کی ضرورت ہے۔ عارف رومی فرماتے ہیں ؎

اندریں رہ مے تراش و مے خراش　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

تا دمِ آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

یہ مختصر سا بیان اس آیت کے متعلق تھا میں پھر آیت کا ترجمہ مکرر کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اے مسلمانوں اپنی فکر میں لگو کیونکہ تم کو خدا تعالیٰ کی طرف جانا ہے وہ تم کو بتلا دیں گے جو کچھ تم کرتے تھے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور پھر کہہ دیتا ہوں کہ یہ ضرور ہونے والا ہے اس لئے اس کے لئے آج ہی سے تیار ہونا چاہیئے۔ اب خدا سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل دے۔

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد چہارم کا

دوسرا وعظ ملقب بہ

تفاضلِ الاعمال

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم کا

دوسرا وعظ ملقب بہ

تفاضلُ الاعمال

یعنی

طاعات ومعاصی

تھانہ بھون ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ -

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ه بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ه (خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ایسے لوگوں کے برابر ٹھہرا دیا جو ایمان لاتے اللہ پر اور آخرت پر اور خدا کے راستہ پر جہاد بھی کیا۔ خدا کے نزدیک وہ لوگ برابر نہیں ہوسکتے۔ اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے)

میں آج ایک ضروری مسئلہ بیان کرتا ہوں جس کی طرف اس کے قبل کبھی التفات نہ ہوا تھا اور غالباً اور لوگوں کے خیال میں بھی یہ بات کم آئی ہوگی۔ لیکن مسئلہ نہایت ضروری اور منصوص ہے

اور چونکہ مسئلہ مختصر ہے لہذا اس وقت کا بیان بھی مختصر ہی ہوگا اور آج اس کے بیان کرلے کی ضرورت علاوہ مسئلے کے ضروری الاظہار ہونے کے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے جمعہ کو جو مضمون بیان کیا گیا تھا اس سے ایک شبہ پیدا ہوسکتا ہے اور اس مسئلے کے ذہن میں آجانے کے بعد وہ شبہ مُندفع ہو جائے گا تو اس حیثیت سے یہ مضمون سابق مضمون سے بھی مرتبط ہوگا۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا ترجمہ کرنے سے پیشتر مستقلاً اُس مسئلہ کو بیان کردوں تاکہ تفصیل ذہن نشین کرنے کے بعد آیت کے ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ مسئلہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

یہ بات تو ہر خواص و عوام کو معلوم ہے کہ جس قدر بھی نیک کام ہیں سب کے سب ایک درجہ اور ایک پایہ کے نہیں۔ بلکہ متفاوت ہیں مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، مسجد بنوانا، حج کرنا مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ بہت سے نیک کام ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو ثواب نماز پڑھنے میں ملتا ہے اسی قدر مسجد بنوانے میں بھی ملتا ہے۔ یا حج کا ثواب ایک پیسہ خیرات کرنے میں بھی اس کی برابر ہے علیٰ ہذا گناہ بھی سب برابر نہیں چوری، ڈکیتی، زنا قتل، شراب خوری کبائر ہیں اور آپس میں متفاوت اسی طرح بہت سے صغائر ہیں لیکن کوئی بہت ہلکا ہے کوئی اس سے زائد۔ نیز یہ تفاوت حسنات میں منصوص ہے۔ حدیث میں ہے کہ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً اَفْضَلُھَا قَوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاَدْنٰھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی وَالْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ (ایمان کے کچھ اوپر ستر درجے ہیں سب سے افضل کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ہے اور سب سے کم مرتبہ موذی چیز کو راستہ سے ہٹا دینا ہے اور شرم و حیا بھی ایمان ہی کا ایک درجہ ہے) یعنی ایمان کے متعلق بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے زیادہ کامل تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ہے اور سب سے ادنیٰ درجے کا کام یہ ہے کہ رستے سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دے مثلاً رستہ میں کانٹے پڑے ہوں یا کوئی بڑی لکڑی پڑی ہو جیسا کہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ سڑک پر ایسی چیزیں ڈال دیتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں جن سے رستہ چلنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ بہلی یا چھکڑے رستے میں کھڑے کر دیتے

ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نابینا شخص وہاں سے گزرتا ہے اور اس سے ٹھکر کھا جاتا ہے ہاں اگر کسی ایک کنارے پر ہو تو مضائقہ نہیں لوگوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے اور یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شریعت نے ان باتوں کے متعلق کوئی قانو مقرر ہی نہیں کیا۔ صاحبو ہر ہر کام کے لئے شریعت میں ایک حکم موجود ہے۔ دیکھو جب اماطۃ الاذیٰ کو شعبۂ ایمان قرار دیا ہے تو اس کے خلاف گناہ ہوگا یا نہیں یہ مسئلہ اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قریب بصراحت ہے غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بصراحت بتلا دیا کہ حسنات باہم متفاضل ہیں ایمان اعلیٰ ہے حیا اُس سے کم ہے اماطۃ الاذیٰ اُس سے کم ہے بلکہ اگر عاداتِ ناس میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اور لوگ بھی عملاً اعمال کو متفاوت مان رہے ہیں دیکھئے اگر کسی شخص کے پاس دس روپیہ ہوں اور وہ ان کو کسی مصرفِ خیر میں لگانا چاہتا ہے تو اول اس کی تحقیق کرتا ہے کہ سب مصارف میں بہتر مصرف کون ہے اور اگر خود معلوم نہیں ہوتا تو علماء سے رجوع کرتا اور ان کے بتلائے ہوئے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر وہ مدرسہ میں خرچ کرنے کو افضل بتلاتے ہیں تو مدرسہ میں خرچ کرتا ہے مسجد میں خرچ کو افضل بتاتے ہیں تو مسجد میں دیتا ہے پس اگر اس متجسس کو معتقد تفاضل نہ مانا جائے تو اس کی چھان بین کیوں ہے پس ہر طرح سے تفاضل بین الحسنات متیقن ہے دلیل سے بھی تسلیم ناس سے بھی یہ تو اجمالی مسئلہ ہے اور یہ بالکل مطابق واقع کے ہے لیکن اس کی تفاصیل میں اکثر نے غلطی کی ہے عوام نے بھی اور علماء نے بھی۔ اس لئے اس کے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے وہ غلطی یہ ہے کہ لوگ افضل کی تعیین اپنی رائے سے کرتے ہیں یا اگر بعض لوگ کسی دلیلِ شرعی سے تعین کرتے ہیں تو وہ لوگ اُس دلیلِ شرعی میں غور نہیں کرتے کہ یہ دلیل اس دعوی کے لئے کافی ہوگی یا نہیں اور انطباق ہوا یا نہیں ہوا، چنانچہ عوام الناس جب تفاضل کی تحقیق کرتے ہیں اول تو اکثر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور اس تفاضل کا معیار بھی ایک مقرر کر لیا ہے کیونکہ ہر تفاضل کے لئے کوئی نہ کوئی معیار تو ضرور ہونا چاہیئے۔ ایک چاندی کو دوسری چاندی پر یا ایک کپڑے کو دوسرے کپڑے پر اگر ترجیح دیں تو اس ترجیح کا کوئی معیار ضرور ہوگا۔

پس اسی بنار پر عوام نے بھی اس تفاضل کے لئے ایک معیار مقرر کر لیا ہے کہ جس عمل کو وہ صورۃً عبادت سے زیادہ تلبیس دیکھتے ہیں اس کو افضل سمجھتے ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں کہ جس طرح وہ واقع میں عبادت ہیں اسی طرح صورۃً بھی وہ عبادت ہیں یا عبادت سے ان کو تلبیس ہے مثلاً نماز پڑھنا کہ یہ حقیقتاً اور صورۃً دونوں طرح عبادت ہے یا مسجد تیار کرانا کہ اس کو صورتاً عبادت سے تلبیس ہے دوسرے وہ اعمال ہیں کہ واقع میں وہ عبادت ہیں لیکن ان کی ظاہری صورت عبادت نہیں معلوم ہوتی نہ ان کو کسی عبادت سے ایسا ظاہری تلبس ہے کہ ہر شخص کی نظر میں آجائے جیسے کسی طالب علم کی مدد کرنا کھانے یا کپڑے سے (کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے کسی طالب علم کا کھانا مقرر کرانا ہے ہرگز نہیں) کیونکہ طالب علم کا کھانا مقرر کرنا جو عبادت ہے تو اس لئے کہ یہ خدمتِ دین ہے اور اس کا خدمت دین ہونا اُس وقت سمجھ میں آسکتا ہے کہ جب طالب علم فارغ ہو کر خدمتِ دین میں مصروف ہو تو یہ دونوں قسم کے اعمال عبادت ہیں لیکن دونوں میں تفاوت یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر صورتاً بھی عبادت ہے کہ اس کے ساتھ عبادت کو تلبّس ظاہر ہے یعنی اس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں اور تلبّس بھی بلاواسطہ ہے اور اسی وجہ سے یہ تلبّس بہت ظاہر ہے۔ اور عبادت بھی ایسی کہ وہ بصورتہا عبادت ہے یعنی اس کا عبادت ہونا نظری نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ نماز پڑھنا عبادت ہے، لہٰذا اس کو یوں سمجھا جاتا ہے کہ بنا مسجد یا اس میں تیل بتّی دینا بہت بڑی عبادت ہے۔

برخلاف تقرر طعام طالب علم کے کہ یہ جس سے متلبّس ہے اول تو وہ ایسی ظاہر عبادت نہیں کہ عوام بھی فوراً سمجھ لیں دوسرے اطعام کو اس عبادت سے تلبیس بھی بوسائط ہے کیونکہ امدادِ طلبہ میں علمِ دین کی مدد ہے اور وہ اتنی ظاہر عبادت نہیں کیونکہ اگر ایک شخص میزان الصرف یا درس کی کوئی کتاب بالخصوص فلسفہ یا ہیئت پڑھتا ہے تو کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ عبادت کر رہا ہے اس لئے کہ اس کا عبادت ہونا مآل اور انجام کے اعتبار سے ہے یعنی اگر دس برس تک یہ شخص مثلاً اسی میں لگا رہے اور فراغت حاصل کرے تو وہ اس قابل ہوگا کہ دین کی خدمت کر سکے اور خدمتِ دین افضل العبادات ہے۔

اسی خدمت دین کی بدولت شیخین رضی اللہ عنہما کو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل کہا جاتا ہے ورنہ عبادت کی کثرت اور قلت کسی کی مدوّن نہیں اور اگر کسی نے ظاہری فضائل کی چھان بین کی بھی ہے تو اُس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کثیر الفضائل ہونا معلوم ہوا ہے محدّثین نے اس کی تشریح کی ہے اب یا تو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس قسم کے فضائل اس قدر مدوّن کم ہوئے ہیں یا فی الواقع حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے فضائل میں دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے زائد ہوں لیکن پھر بھی محققین اور اہل نظر یہی کہتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں۔

اور اس نظر کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات عالم شہادت اور برزخ دونوں سے ہوتی ہے سو احادیث تو سب کے پیش نظر ہیں اور نہ ہوں تو وہ مدوّن ہیں ہر ایک دیکھ سکتا ہے ہاں برزخی اقوال سے ایک قول نقل کرتا ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین باتوں کا حکم فرمایا اور یہ تینوں باتیں میری مرضی کے خلاف ہیں مگر ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں نے اپنی مرضی کو چھوڑ دیا۔

ایک تو یہ کہ میرا رجحان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفضیل کی طرف تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شیخین رضی اللہ عنہما کو افضل الصحابہ رضی اللہ عنہم سمجھو۔

دوسرے میرا میلان ترک تقلید کی جانب تھا ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوا کہ مذاہب اربعہ سے باہر نہ ہو۔

تیسرے میں ترک اسباب کو پسند کرتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روک کر تشبّث بالاسباب کا حکم فرمایا۔

ان تینوں حکموں میں بہت سے راز ہیں لیکن یہ وقت ان کی تفصیل کا نہیں لہٰذا اس کو یہیں چھوڑا جاتا ہے مقصود یہ ہے کہ عالم برزخ میں بھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھو۔ غرض حدیث سے کشف سے محققین کی رائے سے ہر طرح شیخین رضی اللہ عنہما کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اگر کسی کو اس مسئلے کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو ازالۃ الخفار کا مطالعہ کرے وہ ان شاء اللہ تعالیٰ خاص اسی متن کی پوری طرح شرح

ہو گی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاتھ سے اسلام کی خدمت بہت زیادہ ہوئی پس علم کی افضلیت کی تو یہ حالت لیکن باوجود افضل العبادات ہونے کے اس کی صورت عبادت کی نہیں ہے پھر اطعام کو جو اس سے تلبّس ہے وہ تلبّس بلاواسطہ نہیں بلکہ بوسائط ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کس قدر ثواب ہے مثلاً آپ نے ایک طالب علم کو کھانا کھلایا جس کے بدل مایتحلّل کا کام دیا اور اُس نے مطالعہ وحفظِ سبق کی قوت پیدا کی اور اس قوت سے اس نے کام لیکر ایک سبق یاد کیا اور اسی طرح مسلسل سات آٹھ برس تک یہ کرتا رہا اور اس مدت میں فراغ حاصل کر کے اس قابل ہو گیا کہ دین کی خدمت کرے اور اس نے دین کی خدمت شروع کر دی پس یہ خدمت دین اسی مدد اور اطعام کی بدولت ہے جو آٹھ برس تک اس کو پہنچتی رہی اور اس خدمت کا ثواب ان سب لوگوں کو ملے گا جو اس کی امداد میں شریک رہے ہیں لیکن عوام الناس اس کو نہیں سمجھتے اور اس لئے ان کے پاس جب کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے اور ان کو خدا کی راہ میں دینے کا کچھ خیال پیدا ہوتا ہے تو مسجد بنواتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہیں کہ اُن کے پاس وافر روپیہ ہے اور وارث ایک بھی نہیں یا وارث بھی ہیں مگر ان کو اُس کی دنیا کی احتیاج نہیں تو اول تدبیر ان کی سمجھ میں یہی آتی ہے کہ اپنے گھر کی مسجد بنا دیں آخر مسجد بنا کر اپنی زندگی بھر اُس کے حجرے میں رہتے ہیں اور چھوڑ کر مر جاتے ہیں ایسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس جدید مسجد میں جو نمازی آئیں گے وہ دوسری قدیم مسجد کے جانے والے اور وہاں کی جماعت کے ہوں گے اور جب قدیم مسجد کے لوگ یہاں آنے لگیں گے تو اس مسجد کی جماعت میں قلت ہو جائے گی۔ ہم نے اسی قصبے میں دیکھا ہے کہ چار پانچ مسجدیں بالکل ہی قریب بنی ہیں ایسی کہ اگر ایک ہی وقت میں سب جگہ نماز شروع ہو تو ایک مسجد کا امام دوسری مسجد کے امام کی قرارت پوری طرح سن سکتا ہے بلکہ عجب نہیں کہ سب آوازیں مختلط ہونے کے سبب کسی کو بھول بھی ہو جائے۔ اس میں بعضے لوگوں کی نیت تو تفاخر کی ہوتی ہے ایسے لوگ تو کسی شمار ہی میں نہیں لیکن بعض مخلص بھی ہوتے ہیں اگرچہ وہ ثواب میں مفلس ہی ہوتے ہیں (لطیفہ عوام الناس ان اطراف میں مفلس کو مخلص کہتے ہیں میرے پاس ایک دیہاتی دوست آئے میں نے تذکرے میں کہا کہ تم بہت مخلص ہو کہنے لگے نہیں تمہاری دعا سے میرے پاس سب کچھ ہے میں مخلص نہیں یعنی مفلس نہیں) غرض ایسے لوگوں کو باوجود اخلاص نیت کے کچھ ثواب نہیں ملتا بلکہ اُلٹا

ضرار ہوتا ہے۔ لیکن ایسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان لوگوں کی نیت خراب نہیں ہوتی آجکل اکثر مستفتی چالاکی کرتے ہیں کہ صورت سوال ایسی بناتے ہیں جس میں مجیب کو خواہ مخواہ مسجد ضرار ہی کہنا پڑے اور اکثر مجیب بھی بالکل سائل کے تابع ہو کر جواب دیدیتے ہیں صاحبو کسی مسجد کا ضرار ہونا آسان نہیں کیونکہ مسجد ضرار ہونے کے لئے نیت کا خراب ہونا شرط ہے۔ پس ممکن ہے کہ بانی کی نیت اچھی ہو اگرچہ اس کو غلطی ہوگئی ہو اور اگر فرض بھی کیا جائے کہ بانی کی نیت خراب ہی تھی تو اس مستفتی کو اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ ایسی مسجد بنانی جائز ہے مقصود یہ ہے کہ سائل کو اصل نیت کا پتہ کیسے لگ سکتا ہے کہ اس پر مسجد ضرار کا اطلاق کر دیا جائے۔ اس کے سوا ممنوعات بھی ایک درجے کے نہیں ہوتے تو زیادہ سے زیادہ مسجد ضرار کی مثل ہو جائے گی لیکن مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی مسلمان کافروں کی سی حرکت کرنے لگے تو اس کو متشبہ بالکفار کہیں گے لیکن کافر نہیں کہہ سکتے الحاصل ایسی مسجد بنانا ناپسندیدہ ہے تو عوام کو ایک تو اس کا بہت شوق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی صورت عبادت کی ہے۔

اور اسی بنا پر قرآن کے وقف کرنے کو بہت ثواب سمجھتے ہیں ہدایہ وقف کرنے کو کوئی ثواب نہیں سمجھتا اگرچہ لینے والا قرآن کو پڑھے بھی نہ کیونکہ قرآن اس قدر طبع ہوگئے ہیں کہ کوئی ان کو پڑھتا بھی نہیں اسی طرح جب کوئی مرتا ہے تو اس کے ترکہ میں سے قرآن وقف کرتے ہیں اگرچہ وہ اتنا غلط ہو کہ کوئی پڑھ بھی نہ سکے ایک مرتبہ ایک شخص بہت سے قرآن مسجد میں لایا کہ میں ان کو وقف کرتا ہوں دیکھا گیا کہ سب غلط تھے آخر میں نے ان کو دفن کرا دیا تو ایسے قرآن وقف کرنے سے کیا نتیجہ ہاں کوئی اوراق ہی کے وقف کرنے میں وقف قرآن کا ثواب سمجھے تو دوسری بات ہے۔ پس ایک معیار تو عوام کے ذہن میں یہ ہے۔

دوسرا معیار یہ ہے کہ جس کام کا نفع فوراً ظاہر ہو اس میں زیادہ ثواب سمجھتے ہیں اور جس کا نفع بدیر ہو اس میں اتنا ثواب نہیں سمجھتے۔ اسی بنا پر پانی پلانے کا ثواب زیادہ سمجھا جاتا ہے چنانچہ اگر کسی شخص کا ارادہ کنواں بنوانے کا ہو اور اس سے کہا جائے کہ

مسجد کا ایک حجرہ شکستہ ہو رہا ہے اس کو بنوا دو تو وہ کنوئیں کو ترجیح دے گا۔

تیسرا معیار عوام کے نزدیک یہ ہے کہ جس چیز کا نفع عام ہو اس میں زیادہ لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے چنانچہ کنواں بنوانا اس کی بھی مثال ہے یہ نمونہ کے طور پر عوام الناس کے تجویز کردہ معیاروں کا ذکر تھا جو ان کے حالات میں غور کرنے سے سمجھ میں آئے کہ نفع عاجل ہو اور نفع عام ہو اور اس کام کی صورت عبادت کی ہو اور عوام الناس اس طرح اپنے لئے ان تین معیاروں سے کاموں کی تجویز کرتے ہیں۔

اسی طرح بزرگوں میں بھی موازنہ انہی تین معیاروں سے کرتے ہیں مثلاً اگر ایک شخص تمام رات جاگتا ہے کسی سے بات بھی بہت کم کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو کہ فرائض واجبات اور سنن ادا کرتا ہے رات کو گھنٹہ دو گھنٹہ جاگ لیتا ہے حفاظت دماغ کی تدبیر بھی کرتا ہے نصیحت و پند بھی کرتا ہے خلق اللہ کی دلجوئی کے لئے لوگوں سے ملتا بھی ہے بچوں سے مزاح بھی کر لیتا ہے تو عوام الناس اس کے مقابلہ میں پہلے شخص کو زیادہ کامل سمجھیں گے چنانچہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا عابد ہے بلکہ عابد کی جگہ معبد کہتے ہیں خدا جانے یہ لغت کہاں سے ایجاد کیا اور دوسرے شخص کو چونکہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ عبادت نہیں کرتا اس لئے اس کو زیادہ کامل نہیں سمجھتے حالانکہ ممکن ہے کہ عابد واقع میں یہی شخص ہو کیونکہ عبادت عبد بننے کو کہتے ہیں اور عبدیت بجاآوری احکام کا نام ہے جس وقت بھی جو کلمہ ہو لیس اختلاط خلق اغراض صالحہ سے نیز عبادت میں داخل ہے۔

اس کے متعلق حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحقیق بیان کرتا ہوں فرمایا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (میں نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) تو باوجود اس کے کہ ملائکہ اور حیوانات عبادات سے نباتات جواہر واعراض سب کے سب عبادت میں مصروف ہیں جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بارے میں ارشاد ہے يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ۝ (پاکی بیان کرتے ہیں رات اور دن اور اس سے نہیں تھکتے)

حیوانات وغیرہ کے بارے میں فرماتے ہیں اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ط (کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ اللہ کی حمد و تعریف نہ کرتی ہو لیکن ان کی تسبیح کو تم لوگ نہیں سمجھتے) ان کے علاوہ اور متعدد آیات سے ہر ایک چیز کا عبادت میں مشغول ہونا معلوم ہوتا ہے پھر انسان اور جن کی تخصیص عبدیت میں کیوں فرمائی گئی فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ ایک تو نوکر ہوتا ہے، ایک غلام ہوتا ہے۔ نوکر کی خدمات ہمیشہ معین ہوا کرتی ہیں یعنی اگرچہ کتنے بھی مختلف کام نوکر سے لئے جائیں لیکن کوئی کام ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس میں نوکر عذر کر دے اور کہدے کہ میں اس کام کے لئے نہیں ہوں مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر سے کہنے لگے کہ تو مہتر کا کام بھی کیا کر تو وہ ہرگز نہ منظور کرے گا اور عذر کر دے گا۔ علیٰ ہذا اور بہت سے کام ایسے نکلیں گے جن میں نوکر کی جانب سے عذر ہوگا بلکہ اولاد بھی جس پر نوکر سے زیادہ قبضہ اور تسلط ہوتا ہے بعض کاموں میں انکار کر دیتی ہے، چنانچہ ہمارے ایک خاندانی سیدا ور معزز دوست نے ایک ایسے موقع پر کہ سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا تھا اپنے لڑکے کو کہا کہ بھائی سقوں نے تو پانی بھرنے سے جواب دیدیا ہے اہل محلہ کو سخت تکلیف ہوتی ہے تم ہی لوگوں کے یہاں پانی بھر آیا کرو وہ لڑکا بہت خفا ہوا۔ برخلاف غلام کے کہ اس کا کوئی خاص مقرر کام نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک وقت آقا کی نیابت کرتا اور زرق برق لباس میں ہوتا ہے اور دوسرے وقت آقا کے نجس کپڑوں کو صاف کرتا ہے ایک وقت بھنگی کا کام کرتا ہے تو دوسرے وقت سفارت کا کام کرتا ہے پس غلام نوکر بھی ہے مہتر بھی ہے سفیر بھی ہے خلیفہ بھی ہے پس انسان اور جن تو بمنزلہ غلام کے ہیں اور دوسری مخلوقات مثل نوکر کے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی عبادت کو تسبیح و تقدیس وسجدہ وغیرہ الفاظ سے فرمایا اور انسان اور جن کی عبادت کو بلفظ عبدیت فرمایا اور جب انسان اور جن عبد اور غلام ہیں تو ان کی کوئی خاص خدمت نہ ہوگی بلکہ ایک وقت نماز روزہ کرنا عبادت ہوگا تو دوسرے وقت سونا اور قضائے حاجت کرنا لوگوں سے ملنا

وغیرہ وغیرہ کام عبادت ہوں گے چنانچہ حدیث میں ہے نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَنْ یُّصَلِّیَ حَاقِنًا اَوْ کَمَا قَالَ (قضا حاجت کی شدت کے وقت نماز ادا کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا) کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور دفعِ فضلہ واجب ہے۔ دیکھئے ایک وقت انسان کے لئے ایسا نکلا کہ اس کو مسجد جانا حرام اور بیت الخلا جانا واجب ہوا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اول وقت نماز پڑھنا چاہے اور اس کو شدت سے بھوک لگی ہو تو شریعت حکم کرے گی کہ نماز کو مؤخر کرو اور کھانا کھاؤ۔ اسی راز کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت پاکیزہ الفاظ میں فرماتے ہیں لان یکون اکلی کلہ صلوٰۃ خیر من ان یکون صلوٰتی کلھا اکلا۔ (کھانا کھاتے رہنا اور خیال نماز کی طرف رہنا یہ بہتر ہے اس بات سے کہ نماز پڑھتا رہے اور نیت کھانے کی طرف رہے) کیونکہ جب کھانا کھانے میں نماز کا برابر خیال رہا تو یہ سارا وقت انتظارِ صلوٰۃ میں گذرا اور انتظارِ صلوٰۃ میں صلوٰۃ کا ثواب ملتا ہے برخلاف اس کے اگر بھوک میں نماز شروع کر دی جائے تو جوارح تو نماز میں مشغول ہوں گے اور دل کھانے میں پڑا ہوگا تو نماز کھانے کی نذر ہو گی اور یہی فہم ہے جس کی بدولت ان حضرات کو فقیہ اور مجتہد کہا جاتا ہے۔ آج یہ فہم مفقود ہے۔ ہم لوگ کتابیں ان سے زیادہ پڑھتے ہیں مگر وہ بات حاصل نہیں۔

ع: نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ سکندری فن سے واقف ہو)

اور اسی راز کی بناء پر ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ نور اللہ مرقدہم فرمایا کرتے تھے کہ اگر جسم ہند میں رہے اور دل مکہ مکرمہ میں تو اس سے بہتر ہے کہ جسم مکہ مکرمہ میں رہے اور دل ہندوستان میں۔ غرض انسان کے لئے کوئی خاص عبادت مقرر نہیں کیونکہ اس کی شان عبدکی ہے اور جب یہ ہے تو ایک تو وہ شخص ہے کہ نماز پڑھ کر کسی

دیہاتی سے باتوں میں مشغول ہے اور یہ کھیتی باڑی کے حالات پوچھ رہا ہے، اور دوسرا شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے تو بظاہر یہ دوسرا شخص افضل اور اکمل معلوم ہوتا ہے لیکن غور کریں تو معلوم ہو کہ اگر پہلے شخص کی نیت درست ہے مثلاً مسافر کے انبساطِ خاطر کے لئے ایسا کر رہا ہے یا کوئی دوسری ایسی نیت ہے تو یہ باتیں زیادہ افضل اور مقبول ہیں، کیونکہ ہر عمل اپنے آثار اور غایت کے اعتبار سے افضل ہوتا ہے تو ہر عمل کی غایت دیکھنا چاہیئے لیکن عوام الناس اس کو نہیں سمجھتے۔

حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ میں حضرت رحمۃ اللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا بہت دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ ہاں آخر جب بہت دیر ہوگئی تو میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت آج میں نے آپ کی عبادت میں بہت حرج کیا، حضرت فرمانے لگے کہ مولانا یہ کیا فرمایا کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے اور دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھتے تھے اور حدِّ جواز تک جس قسم کی باتیں صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے ساتھ شریک رہتے، مگر عوام الناس کیا سمجھیں۔

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

(تجربہ کار آدمی کی حالت کو غیر تجربہ کار آدمی نہیں سمجھ سکتا لہذا بات کو طول نہ دے (بڑوں کی شان میں اعتراض کرنے سے اپنی زبان کو تھامے رکھ، اسی میں بھلائی و خیریت ہے)

عوام الناس کی حالت اور مذاق پر مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب شیخ نہال احمد رئیس دیوبند کا نکاح ان کے والد نے کیا تو چماروں کو بھی زردہ پلاؤ فرینی وغیرہ کھلائی اور کھانے تو انھوں نے جس طرح ہوا کھائے مگر جب فرینی سامنے آئی تو

اس کو چکھ کر ان میں سے ایک شخص کیا کہتا ہے کہ یہ تھوک سا کیسے ہے یعنی کیا ہے واقعی جس نے ہمیشہ گڑ اور شیرا کھایا ہو وہ کیا جانے کہ قند میں کیا مزا ہے اور فیرینی کیسی ہوتی ہے اسی طرح معانی کے عوام الناس کو خبر نہیں ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ کھانے پینے حتیٰ کہ ایام جاہلیت کے تذکروں میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شامل رہتے تھے اور ان لوگوں کے تذکروں کو سُنکر آپ تبسّم فرماتے تھے۔ اور آپ کا ہنسنا تبسّم سے زیادہ نہ ہوتا تھا اور کبھی کسی نے آپ کی آواز قہقہہ کی نہیں سُنی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تجربہ ہے کہ جب کسی وجہ سے غم کا غلبہ ہوتا ہے تو ہنسی کی آواز نہیں نکلتی اگرچہ کم و بیش تبسم کی حالت ہوجاتے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو تجربہ سے ثابت ہے۔ اور ایک مقدمہ شمائل ترمذی سے ملا ئی شمائل میں ہے کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان (حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکرمند رہتے اور آپ پر غم یکے بعد دیگر آتے رہے) اور وجہ اس کی خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ میں کیونکر چین سے رہوں حالانکہ صاحب صُور تیار کھڑا ہے کہ اب حکم ہو اور صور پھونک دوں گویا یہ حالت تھی کہ ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

(مجھے محبوب کے گھر پہنچ کر بھی امن و عیش نہیں ملا وجہ یہ ہے کہ گھنٹہ ہر وقت کوچ کی خبر دے رہا ہے)

ہنسی تو ان لوگوں کو آسکتی ہے جو بالکل بے فکر ہوں سو اللہ والوں کو بیفکری کہاں البتہ دوسروں کی خاطر سے کبھی کچھ ہنس دیتے ہیں۔ اس کے مناسب حکایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حضرت یحییٰؑ کی ملاقات ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کثیر التبسّم تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کثیر البکا تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ (علیہ السلام) کیا تم خدا تعالےٰ کی رحمت سے بالکل ناامید ہوگئے ہو کہ کسی وقت تمہارا رونا ختم ہی نہیں ہوتا۔ حضرت یحییٰؑ نے

فرمایا کہ اے عیسیٰؑ کیا تم خدا تعالیٰ کے قہر سے بالکل مامون ہو کہ تم کو ہر وقت ہنسی ہی آتی رہتی ہے۔ آخر ایک فرشتہ آیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم تم دونوں میں فیصلہ کرتے ہیں کہ اے عیسیٰؑ جلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب رہتے ہو، لیکن خلوت میں یحییٰؑ کی طرح گریہ و زاری کیا کرو اور اے یحییٰؑ خلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب ہو لیکن لوگوں کے سامنے کچھ تبسّم بھی کر لیا کرو کہ لوگوں کو میری رحمت سے مایوسی نہ ہو جائے کہ جب نبیؑ کا یہ حال ہے تو ہم کو نجات کی کیا امید ہے۔

اور یہ حکایت اس لئے بیان کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسّم جو کچھ تھا وہ محض اس لئے تھا کہ آپ کے ساتھ مصالح خلق کے وابستہ تھے اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید تبسّم بھی نہ ہوتا غرض جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باتوں میں مشغول ہوتے تھے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمال کی عام کو کیا خبر ہوتی ہوگی۔ اسی لئے کافر کہتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ الخ (یہ کیسا رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے کہ کھانا بھی کھاتا ہے (ان کے زعم میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف تھا) اور بازار میں بھی چلتا ہے)

مولانا رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسے ز ابدالِ حق آگاہ شد

(تمام عالم اسی سبب سے گمراہ ہو گیا کہ بہت کم لوگ خدا کے نیک بندوں سے مطلع ہوتے ہیں)

ہمسری با انبیاء برداشتند اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

(اپنے کو انبیاء کے برابر رکھتے ہیں اور اولیاء اللہ کو اپنی ہی طرح سمجھتے ہیں)

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

(کہتے ہیں کہ ہم بھی انسان اور یہ بھی انسان ہم اور وہ دونوں خواب اور کھانے میں فطرۃً مجبور ہیں)

این ندانستند ایشاں از عمیٰ — درمیاں فرقے بود بے منتہا
(یہ ان کو عدم بصیرت کی وجہ سے پہچان ہی نہیں سکتے جبکہ دونوں میں بے انتہا فرق ہے)

ایں خورد گردد پلیدی زو جُدا — واں خورد گردد ہمہ نورِ خدا
(یہ جو کچھ کھاتا ہے سب پلیدگی اور گندگی ہوجاتا ہے اور اللہ سے جدا ہوجاتا ہے اور وہ جو کچھ کھاتے ہیں سب خدا کا نور بنتا ہے)

کہ ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی نکلتی ہے دوسرا کھاتا ہے تو اس سے نورِ خدا نکلتا ہے۔

میں جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مثنوی پڑھا کرتا تھا تو اس شعر میں مجھے خیال ہوا کہ یہ فرق محض شاعرانہ طور پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمادیا ہے کیونکہ واقعی فرق تو اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب اہل اللہ کے پیٹ سے فضلہ نہ نکلتا جب سبق شروع ہوا تو حضرت قبلہؒ نے کیا خوب فرمایا کہ پلیدی سے مُراد اخلاق ذمیمہ ہیں اور نورِ خدا سے مراد اخلاقِ حسنہ ہیں مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاقِ حمیدہ میں مدد ملتی ہے اور دوسرے لوگ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق ذمیمہ میں مدد ملتی ہے تو باوجود اس فرق عظیم کے کفار نے نہ سمجھا اور انبیاءؑ کو اپنی مثل کہا کیونکہ ان میں کوئی انوکھی بات نہ تھی کھانا بھی کھاتے تھے پانی بھی پیتے تھے۔

آجکل بھی ایسے لوگوں کو جو کھانا چھوڑدیں بہت بزرگ سمجھا جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ اگر پانی کی یا کھانے کے چھوڑتے پر بزرگی کا مدار ہے تو سُرسُری اور سانڈا اور سمندر جو جانور ہیں بہت بزرگ ہیں کیونکہ سُرسُری پانی بالکل نہیں پیتی اور سانڈا نہ کھانا کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے صرف ہوا اس کی غذا ہے۔

صاحبو! بزرگی تو وہ چیز ہے کہ ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست — کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست
(عاشق اور معشوق کے درمیان بعض راز ایسے پنہاں ہوتے ہیں کہ کراماً کاتبین دو

فرشتے ہیں جو نیکی اور بدی لکھتے ہیں) کو بھی خبر نہیں ہوتی)
یعنی بزرگی نسبت مع اللہ کا نام ہے جس کی پوری حقیقت کا بعض دفعہ فرشتوں کو بھی پتہ نہیں لگتا البتہ اُس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام افعال اقوال حرکات میں زیادہ تشبّہ ہو یعنی جس طرح نماز ادا کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری متابعت کی کوشش کی جائے اسی طرح آپس کے برتاؤ روزمرہ کی باتوں میں سونے میں جاگنے میں۔ غرض ہر ہر بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی کوشش کی جائے۔ اور یہ اتباع عادت ہو جائے کہ بے تکلف سنت کے موافق افعال صادر ہونے لگیں اور عادات کو اس عموم میں اس لئے داخل کیا گیا کہ حدیث میں مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ (جس راستے پر میں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے صحابہ ہیں) آیا ہے اور مَا عام ہے عبادت اور عادت دونوں کو تو بزرگی اور نسبت کی علامت یہ ہے اور کم کھانے یا کم پینے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

دوسرے کسی شخص کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بہت کھاتا ہے یا کم کھاتا ہے تو قطع نظر بزرگی کی علامت ہونے سے خود اس کا حکم بھی مشکل ہے کیونکہ کم کھانا یہ ہے کہ بھوک سے کم کھائے تو ممکن ہے کہ جس کو تم بہت کھانے والا سمجھے ہو اس کی بھوک اس خوراک سے دونی ہو تو وہ تو کم کھانے والا ہوا۔ ایک شیخ سے اُن کے مریدوں نے ایک دوسرے مرید کی شکایت کی کہ حضرت یہ بہت کھاتا ہے چالیس پچاس روٹیاں کھا جاتا ہے۔ شیخ نے اس کو بلا کر کہا کہ بھائی اتنا نہیں کھایا کرتے خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا (تمام کاموں میں میانہ روی بہتر ہے) اس مرید نے کہا کہ حضرت ہر ایک کا اوسط الگ ہے یہ صحیح ہے کہ میں اتنی مقدار کھا جاتا ہوں لیکن یہ غلط ہے کہ میں زیادہ کھاتا ہوں کیونکہ اصلی خوراک میری اس سے بہت زیادہ ہے جب تک مرید نہ ہوا تھا اس سے دونی کھایا کرتا تھا۔ تو اس حکایت سے معلوم ہوا ہوگا کہ بعض آدمیوں کی خوراک ہی بہت زیادہ ہوتی ہے اور اصلی خوراک کے اعتبار سے وہ بہت کم کھاتے ہیں تو یہ معیار صحیح نہیں ہے۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ بزرگوں نے قلۃ الطعام اور قلۃ المنام کا حکم فرمایا ہے تو سمجھو کہ اول تو ہر ایک کی قلت جُدا ہے جیسا حکایتِ بالا سے معلوم ہوا دوسرے ہر ایک کے لئے قلت کو تجویز بھی نہیں کیا جاتا بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی بڑے مفسدے کے دفع کرنے کے لئے کسی خفیف مکروہ کے ارتکاب کو بھی جائز رکھا جاتا ہے جبکہ اس کے ذریعہ سے کسی گناہِ کبیرہ سے بچانا منظور ہو۔

چنانچہ ایک چور کسی بزرگ سے بیعت ہوا اور چوری کرنے سے توبہ کی لیکن چونکہ مدّت کی عادت پڑی ہوئی تھی اس لئے ہر شب چوری کرنے کا سخت تقاضا طبیعت میں پیدا ہوتا اور اس کو دبانے کے لئے وہ یہ کرتا کہ تمام ذاکرین کے جوتے اٹھا کر گڑبڑ کر دیتا اس کے جوتے کے ساتھ اس کا اور اُس کے جوتے کے ساتھ اس کا غرض کسی ایک کا جوتا بھی اپنے ٹھکانے نہ ملتا آخر لوگوں نے دق ہو کر ایک شب بیدار رہ کر دیکھا معلوم ہوا کہ یہ نو گرفتار ہیں صبح ہوئی تو شیخ سے شکایت کی انھوں نے بلا کر اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ حضور میں بیشک ایسا کرتا ہوں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مدّت سے مجھے چوری کرنے کی عادت تھی اب میں نے توبہ کر لی ہے لیکن رہ رہ کر طبیعت میں تقاضا پیدا ہوتا ہے جس کو میں یوں پورا کرتا ہوں اب اگر آپ مجھے اس سے منع فرمائیں گے تو میں اضطراراً پھر چوری کروں گا۔ غرض میں نے چوری سے توبہ کی ہیرا پھیری سے توبہ نہیں کی شیخ نے کہا کہ بھائی تجھ کو اس کی اجازت ہے تم ہیرا پھیری کر لیا کرو۔ ان مراتب کو سمجھنا بڑی بصیرت پر موقوف ہے

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترکِ ملازمت اور قطع تعلقات کی ہرگز اجازت نہ دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اب تو صرف ایک بلا میں گرفتار ہے چھوڑ دے گا تو خدا جانے کیا کچھ کرے گا۔ اور کس قسم کی آفات کا شکار ہوگا تو اتنی بلاؤں سے ایک ہی بلا اچھی ہے۔ اب لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ پیر صاحب لنگوٹہ بند ہوا دیں اور بیوی بچوں کو چھڑا دیں ایسے لوگوں کو تنخواہ پیر صاحب تو دینے سے رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ جب حوائج ضروری پوری نہیں ہو سکتی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا تو جھوٹی شہادتیں دینا جھوٹے مقدمے لڑانا قرض لے کر دبا لینا غرض اسی طرح کے صدہا آفات میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

فرمایا کرتے تھے کہ ملازمت ترک کرانے کی کیا ضرورت خدا تعالے کا نام جب دل میں جگہ کرے گا وہ خود ہی چھڑا دے گا۔ کیونکہ ؎

عشق آن شعلہ است کو چوں برفروخت ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے جب بھڑک گیا، معشوق کے سوا باقی سب کا سب جلا دیتا ہے)

تیغ لَا در قتلِ غیرِ حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

(لا الہ کی تلوار غیر حق والوں کے قتل کرنے میں چلتی ہے۔ پھر دیکھو لا کے بعد کیا رہ جاتا ہے)

ماند اِلّا اللہ و باقی جملہ رفت مرحبا ای عشقِ شرکت سوز رفت

(صرف الا اللہ رہ گیا اور باقی تمام کا تمام ختم ہو گیا۔ اے عشق اے سب شرکتوں کے جلا دینے والے تجھے شاباش)

مشہور ہے کہ آب آمد و تیمم برخاست۔ تو آب تو آنے دو تیمم خود ہی جاتا رہے گا یہی راز تھا جس کے لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے وقت پر خود ہی چھوٹ جائے گا اور یہ حکم ایسے شخص کے لئے تھا جس کے کھانے پینے کی کوئی سبیل نہ ہو کہ ایں بلا دفع بلا ہائے بزرگ۔ اور اگر کسی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود ہو تو اس کو یہی مناسب ہے کہ اس پر قناعت کرے اور یادِ خدا میں مشغول ہو۔ مولانا نظامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے کہ بازار حرصش نیاشد بسے

(جو کام کسی شخص کو مل گیا ہے وہ اچھا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی حرص و ہوس محدود ہو جائیگی)

بقدرِ ضرورت یسارے بود کند کارے مردِ کارے بود

(پھر بقدر ضرورت آسانی ہوگی پھر اگر وہ کام کا آدمی ہے تو بھلا کام بھی مل جائے گا)

یعنی اگر ضرورت کے لائق موجود ہو اور اس پر قناعت کرکے کام میں مشغول ہو جائے تو یہ بہت اچھا ہے تو اس فرق کو دریافت کرنا اور لوگوں کے حالات اور طبائع کا اندازہ کرنا یہ کامل ہی کا کام ہے۔ اور یہی شانِ مشیخت ہے ورنہ کسی بزرگ کے ملفوظات یاد کر لینے یا تصوّف کے مسائل ازبر ہونے سے شیخ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

حرفِ درویشاں بدزدد مردِ دوں تاکہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(درویشوں کا کلام چراتا ہے دنیا دار کمینہ آدمی، تاکہ جاہلوں کے سامنے جادو جیسا بیان کرکے اُنھیں اپنا گرویدہ کرے)

باتوں کے یاد کر لینے سے کچھ نتیجہ نہیں۔ اگر ایک شخص کو بہت سی مٹھائیوں کے نام یاد ہوں اور نصیب ایک بھی نہ ہو تو اس حفظِ اسماء سے کوئی فائدہ بھی نہیں لیکن اگر نام ایک کا بھی یاد نہ ہو اور کھانے کو دونوں وقت ملتی ہوں تو سب کچھ حاصل ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

میم و واؤ میم ونون تشریف نیست لفظِ مؤمن جز پئے تعریف نیست

(لفظ میم اور واؤ اور میم اور نون ان کے اندر کوئی بزرگی نہیں ہے یعنی لفظ مؤمن تو صرف پہچان کے لئے ہے)

کہ نام تو صرف پہچان کے لئے ورنہ اس میں کیا رکھا ہے اصل چیز معنی ہے اور وہ اس سے بفراسخ دور۔ آج یہ حالت ہے کہ دو چار تعویذ گنڈے یاد کر لئے کچھ جھاڑ پھونک سیکھ لی اور شیخ وقت بن گئے۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی تا راہ بیں نباشی کے راہ بر شوی

(اے بے خبر کوشش کر تاکہ خبر والا ہو تو، جب تک راہ دیکھنے والا نہ ہو تو رہبر کیسے ہو سکتا ہے)

در مکتب حقائق پیشِ ادیب عشق ہاں اے پسر بکوش کہ روزی پدر شوی

(اور حقائق کے مدرسہ میں عشق سکھانے والے استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر تاکہ ایک دن تو بھی استاذ کا درجہ پانے کے قابل ہو جائے)

تو پہلے پسر تو بن لیں اس کے بعد پدر بننے کی نوبت آئے گی۔ یہ تو پیروں کی حالت ہے۔

مریدوں کی یہ حالت ہے کہ انھوں نے انتخاب کی معیار عجیب وغریب اختراع کر رکھی ہے جس میں ذرا ہو حق پاتے ہیں اس کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ محض گرمی طبع سے ہونے لگتا ہے۔

ایک شخص حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت میرا قلب جاری ہو گیا، آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ دل کے دھڑکنے کو قلب کا جاری ہونا نہیں کہتے قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے۔

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں یہ بہت کامل ہیں اور جن لوگوں میں یہ بات نہیں ہوتی ان کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک بخت ہیں یعنی ان میں کمالات باطنی نہیں حالانکہ کمالات باطنی بالکل مخفی ہیں اور ان کو بوٹیوں کے تھرکنے سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

اور وہ کمالات یہ ہیں کہ فن میں ماہر ہو۔ امت کے لئے حکیم ہو شریعت کا پورا پابند ہو یہ باتیں نہ ہوں تو ہزار مجاہدہ، ریاضت ہو کچھ نہیں۔ جفاکش کہیں گے، محنتی کہیں گے لیکن بزرگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ بہرحال عوام الناس اپنے اعمال میں بھی غلط معیار پر چلتے ہیں اور انتخاب بھی غلط معیار سے کرتے ہیں کہ ان کی بدولت اکثر حقوق واجبہ بھی تلف اور ضائع ہو جاتے ہیں۔

ایک سرحدی عابد کی نسبت سنا ہے کہ آخر شب میں تہجد ادا کرنے کے لئے مسجد میں آئے اتفاق سے اُس روز مسجد میں کوئی مسافر بھی سو رہا تھا۔ آپ نے نماز شروع کی لیکن مسافر کے خراٹوں کے سبب نماز میں مرضی کے موافق یکسوئی اور اجتماع خیالات نہ ہو سکا آپ نے نماز توڑ دی اور مسافر کو خواب سے جگا دیا کہ ہماری نماز میں خلل پڑتا ہے اس کے بعد پھر آ کر نیت باندھ لی مسافر چونکہ تکان سے بہت خستہ ہو رہا تھا تھوڑی دیر میں پھر سو گیا اور خراٹوں کی آواز پھر شروع ہوئی آپ نے پھر نماز توڑ کر اس کو بیدار کیا اور اس کے بعد نماز شروع کی تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور چھری لے کر اس غریب مسافر کو شہید کر دیا اور پھر بفراغت نماز پڑھی۔ صبح کو نماز کے لئے لوگ جمع ہوئے تو مسجد میں لاش کو دیکھا تعجب سے پوچھا کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا تو عابد صاحب فرماتے ہیں کہ اس نے ہماری نماز میں خلل ڈالا اس لئے ہم نے قتل کر ڈالا یہ تو بالکل کھلی حماقت تھی اس لئے سب نے اس پر نفریں کی ہو گی۔ لیکن آجکل اس سے بہت بڑی بڑی حماقتیں لوگ کرتے ہیں اور ان کی طرف ذرا التفات نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس سے غامض ہوتی ہیں۔

افسوس ہے کہ آج دین کی سمجھ بالکل مفقود ہے ناواقفی سے ہم لوگوں کی بعض اوقات یہ حالت ہے ہوتی ہے۔ جیسے ایک سرحدی کی نسبت سنا ہے کہ وہ ہندوستان میں آیا ہوا تھا اتفاقاً چوروں نے کسی موقع پر اس کو زخمی کر دیا ایک شخص نے اس پر رحم کھا کر اس کا علاج کرایا چند روز میں اس کو آرام ہو گیا جب اپنے وطن جانے لگا تو اس شخص سے کہا کہ اگر تم کبھی ہمارے دیس میں آؤ گے تو ہم تمہارے احسان کی مکافات

کریں گے چنانچہ ایک مرتبہ کسی ذریعہ سے وہ شخص اس کے وطن گیا اور یاد آیا کہ اپنے دوست سے ملے دریافت کرتا ہوا اس کے گھر پہونچا ملاقات ہوئی نہایت عزت سے پیش آیا اور اپنے گھر پر لے گیا اور اس سے کہا کہ تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں اس کے جانے کے بعد گھر والوں نے اس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو اس نے سارا قصہ ان سے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ خدا کے لئے تم فوراً یہاں سے بھاگو ورنہ وہ تم کو ہلاک کردے گا، کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کبھی ہمارا دوست ہمارے وطن آئے تو ہم اس کے احسان کی مکافات کریں گے اس طرح کہ اول اس کو اسی قدر زخمی کریں گے جتنے ہم ہوئے تھے اور پھر اس کا علاج کرکے اس کو تندرست کریں گے چنانچہ وہ ابھی چھرا لیکر آئیگا اور تم کو زخمی کریگا یہ غریب وہاں سے بھاگا اور اس طرح اسکی جان بچی۔

تو بہت لوگوں کی عادت ایسی ہوتی ہے جیسی اس کی مکافات تھی لیکن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا مثلاً بعض لوگوں کو مراقبہ کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ اگر حالت مراقبہ میں کوئی شخص اُن کے پاس آکر نماز کے متعلق مسئلہ دریافت کرے اور نماز کا وقت نکلا جاتا ہو اور کوئی دوسرا آدمی مسئلہ بتلانے والا بھی نہ ہو تو یہ ہرگز مراقبہ سے سر نہ اٹھائیں گے حالانکہ ایسے وقت میں فرض ہے کہ مراقبہ چھوڑ کر مسئلہ بتلا دیں۔ میں نے خود ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں ہے لیکن نہ بیوی کی خبر ہے نہ بچے کی گویا ماسوی اللہ کو چھوڑ دیا اور سبب اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ کیفیات کو مطلوب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے تو ہم پر یہ کیفیات کیونکر طاری ہوتیں حالانکہ یہ کفار پر بھی ہوتی ہیں اس کی حقیقت ایک واقعہ سے سمجھ میں آئے گی۔ ایک سجادہ نشین نے مجلس عرس میں کلکٹر اور صاحب جج کو مدعو کیا وہ چونکہ خلیق تھے شریک ہوگئے آخر تن تن شروع ہوئی اور قوالوں نے گانا شروع کیا کچھ ایسا سماں بندھا کہ صاحب جج پر محویت کے آثار طاری ہونے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر گرنے لگے تھوڑی دیر تو تحمل کیا جب نہ سنبھل سکے تو صاحب کلکٹر سے کہا کہ مجھ کو کیا ہو گیا کہ میں گرا جاتا ہوں صاحب کلکٹر نے کہا کہ میری بھی یہی حالت ہے آخر دونوں وہاں سے اُٹھ گئے اور چلدیئے۔ تو صاحبو کیا یہ صاحب کلکٹر اور صاحب جج بھی بزرگ تھے۔ معلوم ہوا کہ کیفیات کا مدار قبول اور بزرگی نہیں وہ ایک انفعال ہے جو اکثر

ذکر و شغل سے اور دوسرے اسباب سے بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح بعض اشغال سے ذکر میں یکسوئی بھی زیادہ ہوتی ہے اور خطرات کم ہونے لگتے ہیں کیونکہ ان اشغال سے رطوبات کم ہو جاتی ہیں تو یہ سب اسباب طبیعیہ کے دخل سے ہوتی ہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ کیفیات محض بیکار ہیں ہرگز نہیں کیفیات نافع بھی ہیں لیکن مقصود یہ ہے کہ ان میں زیادہ دخل اسباب طبیعیہ کو ہے۔

ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے بڑھاپے میں روتے تھے سبب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ جوانی میں نماز میں لذت زیادہ ہوتی تھی میں سمجھتا تھا کہ یہ نسبت کا اثر ہے لیکن اب وہ حالت نہیں رہی معلوم ہوا کہ وہ سب جوانی کا نشاط تھا اب چونکہ وہ نہیں رہی اس لئے وہ کیفیت بھی نہیں رہی اور نسبت کی گرمی بڑھاپے میں جا کر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے ؎

خود قوی تر میشود خمر کہن   خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب خود بخود زیادہ تر قوی ہو جاتی ہے خاصکر وہ شراب جو میرے ساقی کے ہاتھ سے آئے)

دوسرے بزرگ کہتے ہیں ؎

ہرچند پیر و خستہ دل بس ناتواں شدم   ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(اگرچہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور کمزور و ناتواں ہو گیا ہوں مگر پھر بھی جب تیرے (پرکیف) چہرہ پر نگاہ ڈالتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں)

غرض یہ نفسانی کیفیات نہ محمود ہیں نہ مذموم ہیں البتہ اگر یہ آلہ مقصود کا بن جائیں تو پھر محمود ہو جاتی ہیں ورنہ ہیچ مثلاً بعض کیفیات کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھی باقی رہتی ہیں اور اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مقبول اور خاصانِ خدا ہیں لیکن یاد رکھو کہ وہ مذموم ہیں اور یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ مخالفتِ احکام پر بھی دعوے مقبولیت کا کرتے تھے چنانچہ وہ کہا کرتے تھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ (ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں) یعنی ہم مثل بیٹے کے ہیں کہ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو ہر حال میں چاہتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ ہم کو ہر حال میں چاہتے ہیں خدا تعالیٰ ان کے اس خیال کا رد فرماتے ہیں کہ قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ (آپ فرما دیجئے

کہ پھر کیوں وہ تم کو تمہارے گناہوں کی وجہ سے تم کو عذاب دیتا ہے) تو اس امت میں بھی بعض لوگ اس خیال کے موجود ہیں مگر سمجھ لینا چاہیئے کہ قیامت میں ایسے لوگوں کی گردن ناپی جائے گی ان اعمال کی وہاں کچھ بھی قدر نہ ہوگی کیونکہ مقصود عبادات ہیں مجاہدات و ریاضت مقصود نہیں لیکن چونکہ ہم لوگوں کی عبادات میں وہ خلوص مطلوب پیدا نہیں ہوتا اس لئے یہ مجاہدات کئے جاتے ہیں کہ ہماری نمازوں اور نیز دوسری عبادات میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان پیدا ہو جائے پس یہ ریاضت مقصود بالغیر ہوئی لکھا ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کہ حضرت وہ تصوف کے نکات جو زندگی میں بیان ہوتے تھے یہاں بھی کچھ کام آئے فرمایا کہ سب فنا ہو گئے ہاں کچھ نماز اخیر شب میں پڑھ لیتا تھا وہ البتہ کام آئی مَا نَفَعَتْنَا اِلَّا رُكَيْعَاتٌ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ (نہیں نفع دیا ہم کو لیکن نیم شبی کی چند رکعتوں نے) لوگ خدا جانے ان کیفیات کو کیا کچھ سمجھے ہوئے ہیں ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(سردار گمان کرتا ہے کہ وہ مقصود حاصل کر چکا ہے حالانکہ خواجہ کا حاصل سوائے گمان کے اور کچھ نہیں)

لیکن اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اور مجاہدات کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ ظاہری اعمال میں خلوص شرط ہے اور آج وہ مفقود ہے اور یہ مجاہدات اس خلوص کا مقدمہ ہیں اور مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے جیسے وضو مقدمہ ہے صلوٰۃ کا خود مطلوب بالذات نہیں لہذا بدون ان مجاہدات کے نرے اعمال اکثر کافی نہیں یہاں تک عوام الناس کے مقرر کردہ معیاروں اور ان کے آثار کا بیان تھا۔

اب مناسب ہے کہ اصلی اور صحیح معیار بیان کر دیا جائے۔ خدا تعالےٰ فرماتے ہیں۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ (کیا تم حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ان لوگوں کے برابر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں)

اس کی شانِ نزول میں مختلف قصے آئے ہیں جن کی تفصیل اس وقت مستحضر نہیں اتنی قدر مشترک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بعض لوگوں میں گفتگو ہوگئی تھی کہ ایک جماعت اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے کو افضل سمجھتی تھی۔ دوسری جماعت اپنے تئیں۔ خدا تعالیٰ اس آیت میں افضلیتِ اعمال کا فیصلہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ کونسی جماعت افضل ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔

کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر کرنے کو اس شخص کے اعمال کے برابر کرتے ہو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے دین کو نفع پہونچایا ہو یہ دونوں جماعتیں ہرگز برابر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عمارت مسجد اور سقایہ حاج ایمان باللہ و اعلائے کلمۃ اللہ کی برابر نہیں ہے کیونکہ جَعَلْتُمْ کا مفعول سِقَايَةَ کو قرار دیا ہے جو کہ عمل ہے تو مقصود اعمال کا تفاضل بیان کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ ایک جانب میں تو جَعَلْتُمْ کا مفعول اعمال کو بنایا اور دوسری جانب میں کاف کا مدخول مومنین کی ذات کو قرار دیا اس کی وجہ یہ ہے جو ابھی ذہن میں آئی کہ جو لوگ معمّرین مسجد تھے وہ اس وقت تک کافر تھے اور عمل ان کا نیک تھا اگرچہ خصوصیت محل کی وجہ سے اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں تھا تو اس جانب میں اعمال کو ذکر کرکے یہ بتلادیا کہ اب بوجہ عامل کے مؤمن نہ ہونے کے یہ اعمال مقبول ہی نہیں لیکن اگر اس سے قطع نظر بھی کی جائے اور نفس اعمال کو دیکھا جائے تب بھی اپنے مقابل اعمال سے کم ہیں اور دوسری جانب میں ذات کو کاف کا مدخول بنا کر یہ بتلا دیا کہ ان اعمال کی یہ حالت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے خود عمل کرنے والا بھی مقبول ہوجاتا ہے الغرض اس آیت میں افضلیت سقایہ و عمارت کے دعوے کی تغلیط ہے اور مبنیٰ اس دعویٰ کا وہی تھا جو آجکل عوام الناس میں ہے یعنی عمل کا نفع عاجل ہو اور عام ہو اور

عمل کی صورت عبادت کی سی ہو سقایۃ الحاج میں تو نفع عام اور نفع عاجل تھا اور تعمیر
مسجد کی صورت عبادت کی تھی۔ اس لئے ظاہراً معنی فضیلت کے اس میں زیادہ
تھے اور اس کی تغلیط کر کے خدا تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ فضیلت فلاں فلاں عمل میں
ہے لیکن اس میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے
افضل بتایا ہے ان میں وجہ اس افضلیت کی کیا ہے اور اس میں غور کرنے سے
یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ نفع لازم سے نفع متعدی افضل ہے یا نہیں اور تعدیہ
یا لزوم مدار افضلیت کی بنا ہو سکتی ہے یا نہیں۔

تو آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ افضلیت کی اور اس کا
معیار ایمان ہے یعنی جس چیز کو ایمان سے زیادہ تلبس ہوگا وہ زیادہ افضل ہوگی
اور اسی وجہ سے ایمان کے ساتھ ایک دوسری صفت یعنی جَاھَدَ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ (اللہ کے راستے میں اس نے جہاد کیا) کو بھی ذکر کر دیا کیونکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کا
باعث اور اسلام کے پھیلانے میں معین ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کوئی عمل ایسا
نہیں کہ بدون اس کے دوسرے عمل بالکل مقبول نہ ہوں۔ مثلاً ایسا نہیں کہ نماز
بدون زکوٰۃ کے قبول نہ ہو اور زکوٰۃ بدون حج کے بجز ایمان کے کہ اس پر تمام
اعمال موقوف ہیں۔ پس اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ متعدی کو من کل الوجوہ
افضل کہنا غلطی ہے چنانچہ ایمان عمل متعدی نہیں اور پھر سب سے افضل ہے اور
یہیں سے یعنی ایمان کے افضل الاعمال ہونے سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم
ہوگئی۔ جو کہ غیر اہل ایمان کو اہل ایمان پر فضیلت دیتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ
مسلمانوں سے فلاں قوم اچھی ہے البتہ اگر ایسے مضامین سے مسلمانوں کو غیرت دلانا
مقصود ہو تو مضائقہ نہیں۔ بعض لوگ بے دھڑک کہدیتے ہیں کہ فلاں شخص مسلمان ہو کر بھی
فلاں عیب کو نہیں چھوڑتا اس سے تو مسلمان ہی نہ ہوتا تو بہتر تھا یہ سخت غلطی اور جہل ہے
ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ رنڈیوں کو مسلمان نہ کرنا چاہیے اسلام کو ایسے مسلمانوں سے عیب لگتا ہے
میں نے کہا اگر اسلام ایسے مسلمانوں کو نکالے تو تم کو ان سے پیشتر نکال دے گا تمہارے اعمال

کہاں کے اچھے ہیں۔ بعضے لوگ چمار بھنگی کے مسلمان ہونے کو بوجہ تحقیر کے پسند نہیں کرتے۔ مگر یاد رکھو جب قیامت کا دن ہوگا اس روز معلوم ہو جائے گا کہ ہم جن کو ذلیل سمجھتے تھے ان کی کیا حالت ہے اور ہماری کیا گت ہے

فَسَوْفَ تَرٰى اِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ ۔ اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(پس عنقریب تو اے مخاطب دیکھ لے گا جس وقت کہ غبار ختم ہو جائے گا کہ آیا تیرے پیروں کے نیچے گھوڑا ہے یا کہ گدھا میدانِ جنگ میں کس قسم کے سوار پر فتح پائی ہے اسی طرح دنیا کی زندگی ایک قسم کا غبار جب موت واقع ہوگی اور دنیاوی پردہ ختم ہو جائے گا اس وقت حقیقت حال ظاہر ہو جائے گی)

اسی طرح مؤمن عیب دار کو کافر با کمال کے مقابلے میں آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص جو صرف ایمان لایا تھا اور کوئی عمل اس نے اچھا نہیں کیا اس کو تھوڑی مدت کے بعد عذاب سے نجات ملے گی اور کہا جائے گا اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ○ (جنت میں داخل ہو جاؤ اب نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا نہ کسی کا غم) اور اس کے مقابلہ میں ایک ایسا شخص جو کہ دنیا میں بڑا خلیق مہربان با کمال تھا لیکن دولت ایمان سے محروم تھا وہ ابدالآباد جہنم میں رہے گا اور کبھی اس کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

اس کو واضح طور سے یوں سمجھو کہ اگر گورنمنٹ کی رعایا میں دو شخص ارتکاب جرم کریں ایک تو چوری میں ماخوذ ہو اور دوسرا بغاوت میں تو اگرچہ سزا دونوں کو دی جائے گی لیکن چوری کی سزا محدود اور کم ہوگی ایک دن ایسا ضرور ہوگا کہ وہ سزا بھگت کر پھر اپنے گھر آئے اور چین سے بسر کرے پر وہ باغی کبھی عذاب سے نجات نہ پائے گا اور زندگی بھر سزا کی تکالیف میں رہے گا یا فوراً پھانسی کا حکم ہوگا کہ زندگی ہی کا خاتمہ ہو جائے گو وہ کتنا ہی بڑا لائق فائق ہو اور وہ چور بالکل جاہل کندۂ ناتراش ہو۔

صاحبو! ایمان ایک آفتاب ہے اگر ہزاروں بدلی کے ٹکڑے اس پر حائل ہوں تب بھی اس کا نور فائض ہو کر رہے گا اور جھلک جھلک کر روشنی پڑے گی اور کفر کی

خوش اخلاقی آئینہ کی سی چمک ہے جو کہ بالکل عارضی ہے۔

دوسری مثال لیجئے اگر ایک گلاب کی شاخیں کسی گملہ میں لگا دی جائیں اور اس کے مقابل کاغذ کے ویسے ہی پھول بنا کر رکھدیئے جائیں تو اگرچہ اس وقت کاغذ کے پھولوں میں زیادہ رونق اور شادابی ہے اصل گلاب کی وہ حالت نہیں لیکن ایک چھینٹا بارش ہو جائے پھر دیکھئے کہ گلاب کیا رنگ لاتا ہے اور کاغذ کے پھول کیسے بدرنگ ہوتے ہیں پس مسلمان اگرچہ دنیا میں کسی حالت میں ہو لیکن قیامت میں جب ابر رحمت برسے گا تو دیکھنا کہ اس کا اصلی رنگ کیسا کچھ نکھرتا ہے اور کافر کی زرق برق حالت پر کیسا پانی پڑتا ہے۔ صاحبو غیرت آنی چاہیئے کہ مسلمان ہو کر اسلام کی حقیقت جان کر اپنے منہ سے کافر کو مسلمان پر فضیلت دو اور مسلمان کی مذمت اور کافر کی تعریف کرو۔ جب معلوم ہوا کہ ایمان ایسی بڑی چیز ہے تو اس کے ساتھ جن چیزوں کو زیادہ تلبّس ہوگا وہ افضل ہوں گی لیکن تلبس بالایمان کو سمجھنا ذرا دشوار ہے کیونکہ بعض ایسے اعمال ہیں کہ وہ خود اسلام کا مبنیٰ ہیں بعض ایسے ہیں کہ وہ اسلام پر مبنی ہیں۔

تو معیار وہ اعمال ہیں جو کہ مبنیٰ ہوں اسلام کا چنانچہ آیت میں ایمان کے ساتھ اُسی عمل کو ذکر کیا گیا ہے جس سے اسلام کو قوت پہونچتی ہے اور مسجد حرام کی تعمیر خود اسلام پر مبنی ہے۔ پس یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسجد کی خدمت سے دین کی مدد اور اس کو قوی بنانا زیادہ افضل ہے اسی طرح اور جس قدر اعمال ہیں سب میں یہی دیکھنا چاہیئے جیسے تعلیم و تعلم وعظ ارشاد یعنی اصلاح خلق۔

پس وظیفہ وظائف سے اِصلاحِ خلق میں زیادہ فضیلت ہو گی کیونکہ یہ مبنی ہے ایمان کی تکمیل کا مگر یہ افضلیت باعتبار معیار مذکور کے فی نفسہ ہے ورنہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو عمل فی نفسہٖ افضل نہیں وہ کسی عارض کی وجہ سے زیادہ قابل توجہ ہو جائے اور کسی خاص وقت میں اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ افضل ہو جیسے وضو کہ نماز سے افضل نہیں لیکن بعض اوقات بوجہ شرطیت نماز کے

زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً وعظ کہنا کہ فی نفسہ تخلیہ للعبادۃ سے افضل ہے لیکن جبکہ وعظ پر مقصود بقدر ضرورت مرتب ہو چکے تو بلا ضرورت ہر وقت اس میں مشغول رہنے سے یہ بہتر ہوگا کہ کسی وقت عبادت کے لئے تخلیہ بھی اختیار کرے اور کسی وقت اپنی بھی فکر کرے۔ اور خدا کی یاد میں لگے اور اسی کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ۔ کہ ایک وقت ایسا بھی نکال لئے کہ صرف خدا ہی کی یاد میں اس وقت مشغول ہوں کوئی دوسرا کام نہ ہو ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ... بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(ایک زمانہ فراغ دلی کے ساتھ نظر کرنا اس خوبصورت کی طرف بہتر ہے چتر شاہی سے اور تمام دن کی ہاؤ ہو سے)

اور ؎

خوشا وقتے وخرم روزگارے ... کہ یارے برخورد از وصل یارے

(مبارک ہے وہ وقت اور وہ گھڑیاں جب ایک محب اپنے محبوب کے وصل سے سرفراز ہو)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر شئے کے بقاء کے لئے ایک سبب ہوتا ہے اور نسبت جس کی بدولت وعظ بھی مؤثر ہوگیا ہے اس کی بقاء کا سبب یہ ہے کہ کسی وقت صرف شغل مع اللہ رہے اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی ہوگی جو کہ مشیخت تک پہنچ کر اپنا کام بالکل چھوڑ دیتے ہیں اس سے ان کی نسبت ضعیف ہو جاتی ہے اور فیض بند ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو اعمال اسلام کا مبنیٰ ہوں وہ افضل ہوں گے اس قاعدے کو محفوظ کر کے اعمال میں فیصلہ کر لینا چاہیئے اور جس کو اس قدر قوت نہ ہو کہ خود فیصلہ کر سکے وہ کسی عالم سے پوچھ لے کیونکہ ہر شخص کچھ نہ کچھ عمل کرتا تو ضرور ہے اور ہر شخص کو اس کی تمیز

نہیں ہوسکتی جیساکہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ بعض اوقات اعمال غیر فاضلہ بھی کسی عارض کی وجہ سے افضل ہوجاتے ہیں تو ایسے مواقع پر دریافت کر لینا چاہیئے البتہ اگر کوئی عمل ایسا ہو کہ اس کی ضرورت محسوس ہو اور کوئی دوسرا عمل اس وقت اس کے مقابلے میں ایسا ضروری نہ ہو تو اگرچہ یہ مفضول ہی ہو اُس کو کرنا چاہیئے مثلاً ایک آباد مسجد گر گئی اور نمازی پریشان ہیں یا عیدگاہ گر گئی تو ایسے موقع پر اس کا کرنا زیادہ ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن اعمال کی ضرورت متعین ہو اور وہ معلوم بھی ہو جائے وہاں تو اُس کو کرلینا چاہیئے۔ اگرچہ مفضول ہو اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں اپنی رائے سے ایک عمل کو دوسرے عمل پر ترجیح نہ دینا چاہیئے بلکہ کسی عالم سے استفتا کرنا چاہیئے جیسے مثلاً بخاری شریف کا وقف کرنا یا کسی غریب کو کھانا کھلا دینا۔ اب اس کے مقابلے کے لئے یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ جس طرح حسنات میں تفاضل ہے اسی طرح گناہوں میں بھی تفاوت ہے لیکن جس طرح حسنات میں استفتا کرنے کی ضرورت ہے کہ کس عمل کو کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے۔ اسی طرح سیئات میں استفتا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سب کو چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ چھوٹے بڑے گناہ سب گناہ ہیں اور حرام ہیں۔ اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کیا فلاں کام بہت ہی گناہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر چھوٹا ہو تو ہم کرلیں۔ یاد رکھو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی ایک چنگاری کی نسبت پوچھے کہ کیا یہ چنگاری بہت بڑی ہے یا انگارا۔ تو صاحبو جس طرح ایک بڑا انگارا مکان بھر کو پھونک دے گا اسی طرح ایک چنگاری بھی گھر بھر کو پھونک دے گی۔ تو ایمان کے قصر کو ایک چھوٹا گناہ بھی ویسا ہی برباد کر دے گا جس طرح بہت بڑا گناہ تو سب سے بچنا چاہیئے۔ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ رشوت لینا زیادہ گناہ ہے یا سود کھانا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ پیشاب زیادہ گندہ

ہوتا ہے یا پاخانہ تاکہ جو کم گندہ ہو اس کو تناول فرمائیں۔ غرض یہ ہے کہ حسنات میں تو تفاضل کو دریافت کرو اور گناہ سب چھوڑ دو۔

اب میں اس وعظ کا ربط سابق وعظ سے بیان کرتا ہوں کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید دوسرے کو نفع پہونچانے کی اجازت نہیں تو آج کے بیان سے یہ شبہ جاتا رہا کیونکہ اس بیان سے اس کی فضیلت بھی ثابت ہوئی پس وہ آیت نفع پہونچانے کے معارض نہیں ہے البتہ کسی کے پیچھے نہ پڑو کہہ کر ختم کر دو۔

مثلاً اس وقت میں نے وعظ کہا ہے یہاں تک تو مناسب ہے اب اگر میں ایک ایک کے درپے ہوں اور تحقیق کرتا پھروں کہ کس نے عمل کیا اور کس نے نہیں کیا اور پھر اس کی فکر و تدبیریں لگوں یہ اکثر اوقات مضر ہے۔ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ (اور آپ نصیحت فرمایئے اس لئے آپ نصیحت کرنے والے ہیں) اور دوسرے موقع پر یہ بھی ارشاد ہے کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى (اور جو شخص آپ سے بے پروائی اختیار کرتا ہے تو آپ اس کے درپے ہو جاتے ہیں) تو تذکیر تو مطلوب ہے مگر پیچھے پڑنا بیکار ہے۔ ہاں جہاں اپنی پوری قدرت ہو وہاں ضروری ہے۔ جیسے اپنی اولاد یا شاگرد اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اسی موقع پر یہ آیت بھی ذکر کرنی چاہیئے تھی کیونکہ اصل مضمون تو معلوم ہو گیا گو آج معلوم ہوا۔ یہ مضمون دس بارہ دن سے میرے ذہن میں تھا درمیان میں ذہول بھی ہو گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج یہ بیان ہو گیا یہ بالکل نیا مضمون ہے اس سے اپنے اعمال میں بھی تفاضل سمجھنے کا طریقہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے اور انتخاب بھی اس معیار سے بآسانی ممکن ہے۔ اب خدا سے دُعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق دے۔

اٰمین یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ط

تمام شد

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ)

دعوات عبدیت جلد چہارم

کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

الرّضا بالدُّنیا

(منجملہ ارشادات)

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ـــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم
کا
تیسرا وعظ ملقب بہ

الرَّضَا بِالدُّنیَا

اَینَ	مَتٰی	کَم	کَیفَ	مَاذَا	مَن ضَبَطَ	اَلمُستَمِعُونَ	اَشتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جلال آباد مسجد علی حسن صاحب	۱۵ صفر ۱۳۳۴ ہجری	۱½ گھنٹہ	بیٹھ کر	ردع از اشتغال بدنیا و غفلت از آخرت	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی	تقریباً سو آدمی	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّئَاتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تعالٰی عَلَیہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَبَارِکَ وَسَلَّم۔ اَمَّا بَعدُ فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ط اِنَّ الَّذِینَ لَا یَرجُونَ لِقَآءَنَا وَرَضُوا بِالحَیٰوۃِ الدُّنیَا وَاطمَاَنُّوا بِھَا وَالَّذِینَ ھُم عَن اٰیٰتِنَا غٰفِلُونَ اُولٰٓئِکَ مَاوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوا یَکسِبُونَ ط (جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بالکل غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے)

ان آیتوں میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک خاص جماعت کی مذمت ایک خاص صفت پر فرمائی ہے جس جماعت کی مذمت اس میں ہے بحمد اللہ حاضرین میں اُس جماعت کا ایک فرد بھی نہیں ہے لیکن اس سے اس بیان کو بے ربط یا بے ضرورت نہ سمجھنا چاہیئے ایک اس میں غور کرنا

کہ جس کی مذمت ہوتی ہے ذات کی وجہ سے نہیں ہوتی کیونکہ نفس ذات میں تو سب انسان شریک ہیں تو ذات کسی کی مقصود نہیں ہوتی بلکہ مبنی مذمت کا خاص صفات ہوتی ہیں تو صفات ذمیمہ جس میں ہوں گی وہ مذموم ہوگا جس میں نہ ہوں گی وہ نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جس کی مذمت فرمائی گئی ہے ساتھ ہی وہ صفات بھی ذکر فرمادی ہیں جن پر مذمت فرمائی گئی ہے اسی طرح خوشنودی اور رضا میں بھی اُن کا خاص مبنی صفات ہی ہوتی ہیں کہ چونکہ یہ صفات ان میں پائی جاتی ہیں اس لئے ہم اُن سے خوش اور راضی ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مدح اور مذمت وغیرہ کا مدار حمیدہ یا ذمیمہ صفات ہیں جس میں جیسی صفات ہوں گی ویسے ہی آثار اُس پر مرتب ہوں گے اس کے بعد یہ اشکال رفع ہوجائے کہ جس جماعت کے باب میں یہ آیتیں ہیں جب حاضرین میں ان میں سے ایک فرد بھی نہیں۔ تو ان آیتوں کو کیوں اختیار کیا گیا اور ترجمے سے معلوم ہوجائیگا کہ کس جماعت کی مذمت ہے مگر میں پہلے ہی بتلائے دیتا ہوں کہ وہ جماعت کفار کی ہے اور اسی وجہ سے وہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ یہاں اس کی تلاوت کی کیا ضرورت ہوئی اور اسی شبہ کی بنا پر بعض لوگ یہ سنکر کہ فلاں آیت کفار کے حق میں ہے بیفکر بھی ہوجاتے ہیں کہ خیر ہم تو اس کا مورد نہیں ہیں مگر غور کرنے کی بات ہے کہ وہ آیت جو کفار کی شان میں ہے وہ مسلمانوں کے لئے بجائے بیفکر کرنے کے بہت بڑا تازیانہ ہے مگر مسلمان اس کو سنکر بے فکر ہو جاتے ہیں کہ یہ تو کفار کی شان میں ہے۔ صاحبو یہ صحیح ہے کہ یہ کفار کی مذمت ہے اور قرآن شریف میں اکثر مواقع پر کفار ہی کی مذمت کی گئی مسلمانوں کی مذمت قرآن شریف میں بہت کم ہے مگر یہ تو غور کرنے کی بات ہے کہ کفار کی مذمت ہم مسلمانوں کو کیوں سنائی گئی ہے مطلب اس سے یہ ہے کہ ان صفات کا مسلمانوں میں ہونا بہت زیادہ عجیب ہے یہ صفات تو صرف کفار میں ہوتیں ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے بغض نہیں۔ کسی کی ذات سے محبت نہیں۔ بلکہ صفات حمیدہ بنائے رضا ہیں اور صفات ذمیمہ بنائے ناراضی و مذمت تو اگر یہ وہی صفات ذمیمہ مسلمانوں میں بھی ہوں جو مدعی اطاعت اور عبدیت کے ہیں تو ان کو اور بھی شرمانا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ کفار کو جن صفات پر لتاڑا

گیا ہے ہم میں وہی صفات ہیں تو اُن کی درستی بہت زیادہ کرنی چاہیئے مثلاً ایک باغی کو بادشاہ
برا بھلا کہے کہ تو نے بغاوت کی تو نے سرکار کا مقابلہ کیا تو نے یہ کیا تو نے وہ کیا اس خطاب
کو سن کر دوسرے اہل جرائم کو ڈرنا چاہیئے اور بے خوف نہ ہونا چاہیئے اس کو یہ دیکھنا چاہیئے
کہ جو الزامات باغی پر لگائے گئے ہیں وہ مجھ میں تو نہیں ہیں کلاً یا بعضاً یا مثلاً ایک بادشاہت
آدمی ظلم کرتا ہے اور رعایا کو ستاتا ہے یا ڈکیتی کرتا ہے لیکن باغی نہیں ہے ہاں فوجداری
کی بہت سی دفعات اس پر عائد ہیں اور اتفاق سے بادشاہ نے اسی کے سامنے ایک
باغی کو تہدید کی اور ان صفات پر بھی تہدید کی جو اس کے اندر بھی پائی جاتی ہے تو اس کے
بھی کان ہونے چاہئیں ہاں ایک فرق ضرور ہے کہ اگر جرائم کم ہوں گے تو ناخوشی کم ہوگی
اور اگر زائد ہوں گے تو ناخوشی زائد ہوگی۔ سو مسلمان خواہ کیسا ہی بددین مجرم ہو مگر
اُس کے جرائم کافر کے برابر نہیں ہو سکتے تو یہ تو ماننا پڑے گا کہ مسلمان سے اتنی ناخوشی نہ
ہوگی لیکن اس پر تو تسلی نہ ہونی چاہیئے کہ ہم سے کم ناخوشی ہے دیکھو اگر کسی مجرم کو دس برس
کی قید ہو اور دوسرے کو پانچ برس کی تو کیا اس دوسرے کو بے فکری ہوگی میرے خیال میں کوئی عاقل ایسا
نہیں کہ وہ اس وجہ سے بے فکر ہو جائے کہ میری سزا فلاں شخص سے تو کم ہے۔ بلکہ ایک باریک بات
یہ ہے کہ بعض اوقات بڑی دفعہ اور بڑی سزا سن کر اتنی کلفت
نہیں ہوتی جتنی چھوٹی دفعہ اور چھوٹی سزا سن کر ہوتی ہے۔ کیونکہ بڑی
سزاؤں میں تو مایوسی ہو جاتی ہے اور مشہور ہے الیاس احدی الراحتین
(مایوسی ایک طرح کی راحت ہے) ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اس کو ایک جرم میں جج نے سات
برس کی قید کا حکم دیا اور اس سے کہا کہ دیکھو تم اپیل نہ کرنا ورنہ تم کو زیادہ سزا ہو جائے گی
میں نے تم کو بہت کم سزا دی ہے۔ مگر اس شخص نے اپیل کی اس میں شاید ۲۸ برس کی سزا
ہوئی۔ ۲۸ برس کا نام سن کر اس کو بالکل یاس ہوگئی کہ اب زندہ بچ کر نہیں نکل سکتا اور
اس یاس سے گونہ راحت ہوگئی۔ تو اس حیثیت سے تو مسلمان کو چھوٹی سزا سن کر زیادہ فکر
میں پڑنا چاہیئے کہ اس کو تو یاس بھی نہ ہوگی غرض اس حیثیت سے یہ تفاوت ہے اگرچہ
دوسری حیثیت سے دوسرے تفاوت بھی ہیں مگر میں نے اس کو اس لئے بیان کیا کہ بیفکری

نہ رہے کیونکہ اس کو سن کر کہ ایک نہ ایک دن دوزخ سے نکل آئیں گے اکثر لوگ بے فکر ہیں سو یہ بڑی غلطی کی بات ہے کہ تھوڑی سزا کو سن کر بے فکر ہو جائے غرض کفار اور مسلمانوں کی سزا میں تفاوت کا انکار نہیں لیکن وہ تفاوت بے فکر نہیں کر سکتا بلکہ زیادہ فکر ہونا چاہیئے یا برابر ہی ہو یا کم ہی فکر ہو مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ بالکل ہی بے فکر بیٹھے ہیں بعض تو بالکل ہی خیال نہیں کرتے اُن کی تو شکایت ہی کیا مگر غضب تو یہ ہے کہ بعض خبردار بھی بے فکر ہیں کہتے ہیں کہ کفار کی برابر سزا تھوڑا ہی ہو گی۔ میں اس بے فکری کے رفع کرنے کے لئے یہ تمام تقریر کر رہا ہوں کہ اس خیال کو کبھی دل میں نہ لاتے اور اس اعتراض کا جواب دے رہا ہوں کہ یہ تو کفار کے حق میں ہے پھر ہم کو کیا فکر جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن صفات پر کفار کو یہ وعید سنائی گئی ہے اگر آپ میں بھی وہ صفات ہیں تو آپ کو ضرور فکر ہونی چاہیئے۔ دوسرے اگر چمار کو چمار کہکر دس جوتیاں مار لی جائیں تو عجب نہیں لیکن اگر کسی بڑے آدمی کو یہ کہدیا جائے تو نہایت شرم کی بات ہے تو کافروں کو اگر منکر لقاء اللہ اور راضی بالحیوٰۃ الدنیا اور غافل عن الآیات کہدیا جائے تو کچھ عجب نہیں لیکن اگر مسلمان میں یہ صفات پائی جائیں اور اس وجہ سے اسکا اتصاف ان کے ساتھ ہو تو زیادہ شرم کی بات ہے اور لیجیئے اگر کسی کو بھنگی کیساتھ قید کر دیں تو اس کے لئے کتنی ننگ کی بات ہے۔ یاد رکھو کہ جہنم خاص کافروں کے لئے ہے مگر مسلمان اپنے ہاتھوں وہ اخلاق اختیار کر کے جو کافروں میں پائے جاتے ہیں مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کے مصداق بنتے ہیں اور ان کے ساتھ قید ہونے کے کام کرتے ہیں اس حدیث مَنْ تَشَبَّهَ کو اوّل توگوں نے اڑا ہی دیا اور اگر لیا بھی ہے تو صرف لباس میں بہت سے ثقات بھی اس میں مبتلا ہیں کہ وضع اہل شرع کی بنا کر اپنے کو متقیوں میں شمار کرنے لگے گو افعال کیسے ہی ہوں لیکن اس حالت میں اس خیال کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے میرے وطن میں ایک بہروپیا میرے پاس انعام لینے کی غرض سے کسی بڈھے کی شکل بن کر آیا ایک شخص نے مجلس میں کہا کہ خدا کے یہاں ان بہروپیوں کی کیا حالت ہو گی کہ کبھی عورت بنتے ہیں کبھی اور کوئی مکر کی شکل بناتے ہیں وہ کہتا ہے کہ ہم وہاں اس طرح تھوڑا ہی جائیں گے مولویوں کا لباس پہن کر جائیں گے بس فوراً مغفرت ہو جائے گی میں نے ڈانٹا کہ کیا واہیات ہے کیا خدا تعالے کو کوئی دھوکا دے سکتا

ہے یہی حالت ہماری ہے کہ شکل تو بنا لیتے ہیں علماء کی، فضلاء کی، صلحاء کی لیکن باطن میں سینکڑوں خباثتیں بھری ہیں ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل و اندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح خوشنما مزین ہے اور باطن ایسا کہ قہر خداوندی نازل ہو رہا ہے ظاہراً تو بایزید بسطامی پر طعنہ مارتا ہے یعنی اپنا ظاہر کچھ ایسا بنا رکھا ہے کہ بایزید کو لوگ کچھ نہ سمجھیں اور اپنے باطن میں یزید کے لئے بھی باعث شرم ہے)

کہ صورت تو کافر کی قبر کی سی نہایت مزین اسی کو کہتے ہیں از بروں طعنہ زنی بر بایزید کہ بیرونی وضع تو ایسی کہ بایزید بھی شرما جائیں اور قلب کی یہ حالت کہ یزید کو بھی اُس سے عار آئے ہم میں صورت کے دیندار تو بہت ہیں مگر سیرت کے دیندار کم ہیں غرض یہ حدیث صورت اور لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر حالت میں عام ہے اور لوگ اس حدیث میں خواہ مخواہ کلام کرتے ہیں یہ تو عقلی بات ہے اور ہر کس و ناکس اس کو سمجھتا ہے دیکھو اگر کوئی شخص لغو و بیہودہ باتیں کرنے لگے تو اسس کو کہتے ہیں کہ تو چمارہو گیا یا اگر ایک شخص ہر وقت ہیجڑوں میں رہنے لگے تو انھیں میں شمار ہونے لگے گا۔ جب یہ بات ہے تو اگر ہم اخلاق کافروں کے اختیار کریں گے تو ہم بھی ان ہی جیسے ہوجائیں گے پس ان کے ساتھ دوزخ میں بھی جائیں گے (اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ (اے اللہ ہم آپ سے جنت کا سوال کرتے ہیں اور جہنم سے پناہ چاہتے ہیں جامع) ورنہ دوزخ سے مؤمن کو کیا علاقہ جیسے جنت خاص متقیوں کے لئے ہے ایسے ہی دوزخ خاص کفار کے لئے ہے۔ بیچ کے لوگ تو چونکہ وہ نہ کافر ہیں اور نہ متقی اس لئے ہمیشہ کو دوزخ میں بھی نہ جائیں گے اور ابتداءً جنت میں بھی نہ جائیں گے مگر چونکہ ایمان کی وجہ سے متقیوں کے مشابہ ہیں اس لئے بعد چندے جنت میں چلے جائیں گے ۔ تو جنت میں جانے کے قابل وہ ہے کہ یا تو خود متقی ہو یا مشابہ ہو متقی کے ورنہ نہیں۔ ہاں ایسے لوگ جب پاک صاف ہو جائیں گے اس وقت جنت میں

جانے کے قابل ہوں گے جیسے چراغ کہ اس پر اگر بہت سی کیٹ (چیکٹ) جمع ہو جائے تو اس کو آگ میں ڈال کر صاف کیا جاتا ہے اور اس وقت وہ نفیس جگہ کے استعمال کے قابل ہوتا ہے اسی طرح اُن لوگوں کو دوزخ کے چولھے میں ڈال کر صاف کیا جائے گا۔ یا دوسری مثال میں یوں سمجھو کہ بچہ اگر نجاست میں لتھڑا ہوا آئے تو کہا جائے گا کہ اس کو حمام میں لے جاؤ اور خوب رگڑو اور اس پر سے نجاست کو کھرچو۔ تو دوزخ بھی حمام ہے لیکن اس کی برداشت ہرگز نہ ہو سکے گی۔ غرض مسلمانوں کا دوزخ میں جانا بوجہ مشابہت کفار کے ہے فرق اتنا ہے کہ کفار کو تعذیب کے لئے بھیجا جائیگا مسلمانوں کو تہذیب کے واسطے مگر تکلیف تو ضرور ہی ہو گی۔ دیکھو جب حمام میں جھانوے سے رگڑا جاتا ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے تو تہذیب کہدینے سے ان کا کیا نفع ہوا تکلیف تو ہوئی جہنم میں تو گئے۔ دیکھو اگر ایک شخص کے بدن میں چھریاں بھونکی جائیں اور دوسرے کے بدن میں سوئیاں کو چی جائیں تو کیا اس دوسرے کو اطمینان ہو سکتا ہے ہرگز نہیں اور ہم لوگ اُس سزا کو تو کیا برداشت کر سکتے ہم سے نشتر کی تکلیف تو برداشت نہیں کی جاتی۔ تو ان باتوں سے ہرگز تسلی نہیں ہونی چاہیئے ابو طالب کے لئے آیا ہے کہ چونکہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی تھی خدا تعالےٰ کی حکمت کے قربان ہو جایئے دیکھئے اتنے بڑے تو محب اور ان کو کلمہ نصیب نہ ہوا۔ موت کے وقت کلمہ پڑھنے پر راضی ہو گئے لیکن خدا ناس کرے ابو جہل کا کہ اس نے اس وقت بھی بہکا یا آخر اُسی حالت پر خاتمہ ہو گیا تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا اور اسی لئے اس کو بیان بھی کیا ورنہ جی نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ ایک مسئلہ کا استنباط مقصود تھا اس لئے بیان کیا سو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ آجکل لوگ مجلس کر لینے کو یا مولود کر لینے کو نجات کا باعث سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو بہت محبت ہے اور بس اسی کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں نہ نماز کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ روزے کی نہ حج کی نہ استغفار کی اور اس میں زیادہ تر خطا پڑھے لکھے لوگوں کی ہے انھوں نے اپنی طمع اور لالچ کے لئے ایسا کیا کہ عوام الناس کو

راضی کرنے کے لئے ان کو ایسے ایسے مضامین سنائے ان کے کہنے پر ایسی مجلسیں کیں وعظ میں یہ مضامین بیان کئے جاتے ہیں کہ صاحبو ڈاڑھی منڈواؤ ناچ کرو سب معاف ہو جائے گا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھو اور ان منکر وہابیوں کے پاس نہ بیٹھو۔ اور وہابی نام رکھا ہے اہل سنت کا گو وہ مقلد اور حنفی ہوں غیر مجالس وعظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ جو چاہو کرو مگر صرف محبت رکھو اور اس کا اثر لوگوں پر یہ ہوا کہ انھوں نے تمام اعمال کو غیر ضروری سمجھ لیا تو ایسے لوگوں کو اس حدیث سے سمجھ لینا چاہیے کہ ابوطالب کی برابر کوئی بھی ان مدعیانِ محبت میں سے محبت رکھنے والا نہیں۔ ابوطالب وہ تھے کہ سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا لیکن ابوطالب نے ساتھ دیا اور بہت سی تکالیف اٹھائیں۔ آج تو وہ حالت ہے کہ مخالفتِ شریعت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگر ایک پیسے کا نفع ہو تو مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک مجلس میں یزید کے تذکرے پر ایک شخص کہہ رہا تھا کہ افسوس میں نہ ہوا ورنہ یوں کرتا اور یوں کرتا یہ سن کر ایک دیہاتی شخص کو جوش آگیا کہنے لگا کہ میں کہتا ہوں کہ میں یزید ہوں اور میں نے ایسا ایسا کیا ہے اگر کچھ محبت ہے تو آجاؤ یہ سنکر ان بہادر صاحب کے حواس باختہ ہو گئے یہ ہی حالت آج کل کے محبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے تو دیکھئے ابوطالب جس کو اس قدر محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی ان کو بھی نرے دعوے محبت نے بلکہ محبت نے بھی دوزخ سے نہ بچا لیا کیونکہ اطاعت نہ تھی اور آج تو کس کا منہ ہے کہ اتنی محبت کا بھی دعوے کرے اور اگر کرے بھی تو خوب یاد رکھو کہ ؎

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوی ولکن لایخفی کلام المنافق

(عشق و محبت کا دعویٰ تو ہر شخص کر سکتا ہے مگر یاد رکھئے کھوٹے شخص کا باطن ظاہر ہو جاتا ہے۔)

میں کہتا ہوں کہ محبت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرو مگر جس طرح ذکر کا طریق ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے لیکن کیا وہاں کوئی تاریخ مقرر ہوتی تھی۔ ہرگز نہیں ان کی تو ہر وقت

یہ حالت تھی کہ ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ۔۔۔ الا حدیثِ یار کہ تکرار مے کنیم

(ہم نے جو کچھ بھی پڑھا سب بھلا دیا مگر محبوب کی باتیں نہیں بھلائیں بلکہ انھیں بار بار دہراتے ہیں)

وہ تو ہر وقت زبان پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کا ذکر رکھتے تھے بقول مولانا فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کہ ہم تو ہر وقت مولد کرتے ہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتے ہیں جب بھی آپؐ ہی کا ذکر ہوتا ہے ہمارے تو ہر وقت دل میں بسے ہیں زبان سے ہاتھ سے ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یادیں ہیں سبحان اللہ کیا محققانہ بات کہی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم تو ہر وقت ذکر کیا کرتے تھے اور نرا ذکر نہیں بلکہ ویسا بننے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ پھنڈ جو اب ہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کہیں نام کو نہ تھے کسی صحابی نے کبھی مٹھائی تقسیم نہیں کی کبھی ذکر کی تاریخ مقرر نہیں کی اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو خوشی میں مٹھائی تقسیم کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ روز کیوں تقسیم نہیں کرتے اس کی کیا وجہ کہ ایک مجمع خاص میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح کھڑا ہونا اس کی بابت بھی یہی ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ خاص مجمع میں خاص وقت میں قیام ہو اس وقت جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ہو رہا ہے اس کی کیا وجہ کہ اس وقت کوئی نہیں اٹھتا۔

یہ یاد رکھو کہ یہ سب کمانے والوں کی من گھڑت ہے کہ ہر ہر جز کو خاص طور سے ایجاد کیا کہ لوگ ہر کام میں ان کے محتاج رہیں اور جب ان سے وہ کام لیں تو کچھ دیں بھی اور جب وعظ کے لئے کچھ ہوا تو آنے والوں کے لئے بھی کچھ چاہیئے اس لئے مٹھائی ایجاد کی گئی۔ لوگ عرب کے فعل سے استدلال کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ عرب میں کس طرح کا مولد ہوتا ہے گو اس میں بھی نشیب و فراز ہے مگر پھر بھی یہاں کی نسبت بہت سادگی ہے مٹھائی تقسیم کرتے ہیں لیکن حالت

یہ ہے کہ اگر نصف مجلس کو تقسیم ہونے کے بعد مٹھائی ختم ہو گئی تو بلا تامل کہدیں گے کہ خلاص یعنی اب ختم ہو گئی بھلا یہاں کوئی صاحب مجلس ایسا کر کے دکھلا دیں۔ واللہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے سب تفاخر کے لئے ہوتا ہے۔

صاحبو! محبت کے طریقے ہی دوسرے ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ربیع الاول میں کچھ کھانا پکا کر تقسیم کیا کرتے تھے ایک مرتبہ آپ کو کچھ میسر نہ ہوا تو آپ نے پیسے دو پیسے کے چنے بھنوا کر تقسیم کر دیئے۔ خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان چنوں کو تناول فرمارہے ہیں۔ دیکھئے محبت اللہ والوں ہی میں ہوتی ہے ان سے سیکھو اور ان کے طرز عمل پر چلو۔ میں اس کا بہت آسان طریقہ بتلاتا ہوں مگر وہ طریقہ نفس کو گوارا نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ خفیہ خرچ کیا کرو، مثلاً ربیع الاول کے مہینے میں پچاس روپیہ خرچ کرو مگر ظاہر نہ کرو اور ایک ایک روپیہ ایک ایک مسکین کو دیدو۔ اگر واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو اس طریقے پر عمل کرو مگر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ نفس کہے گا کہ میاں پچاس روپے بھی خرچ ہوئے اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی۔ آج کل تو یہ حالت ہے کہ میں کانپور میں تھا ایک شخص ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مجھے بلا کر لے گئے میں چلا گیا۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ اسی جگہ جہاں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوا تھا آج رنڈی کا ناچ ہوا ہے مجھے سن کر بے حد صدمہ ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کے یہاں شادی تھی اور اصل مقصود ناچ کرانا تھا۔ لیکن بعض ثقہ احباب کی خاطر سے ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کرا دیا تھا تو یہ ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ ثقہ دوستوں کے لئے ہوا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ناچ کا موازنہ ہوا اور ناچ اسی جگہ ہوا، نعوذ باللہ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہے اور ہم محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور میں کانپور میں سنا کرتا تھا کہ آج فلاں رنڈی کے ہاں مولود ہے۔ آج فلاں کے ہاں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے افسوس ہے کہ جب وہاں ضروری مضامین زنا کی مذمت

وغیرہ کو کوئی بیان نہیں کرتا تھا تو نرے ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا فائدہ کی توقع ہے ر دیکھو اگر دستر خوان پر نری چٹنی ہو تو کیا کوئی اس دستر خوان سے سیر ہو سکتا ہے کبھی نہیں البتہ اگر نرا کھانا ہو اور چٹنی نہ ہو تو وہ کارآمد ہو سکتا ہے اور اگر دونوں چیزیں ہوں تو نورٌ علیٰ نور ہے۔ یہ اس پر یاد آ گیا تھا کہ لوگ دعوائے محبت کرتے ہیں تو دیکھئیں کہ ابو طالب کی کیا حالت ہے کہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت صرف دو جوتے آگ کے پیر میں ہوں گے مگر حالت یہ ہوگی کہ یوں سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں۔ دنیا ہی میں دیکھ لو کہ اگر ببول کا کانٹا بھی لگ جاتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے تو اگر یہ کوئی کہے کہ مجھے تو ہلکا عذاب ہوگا تو خوب سمجھ لے کہ وہاں کا ہلکا بھی ناقابل برداشت ہے تو اس ناز میں ہرگز نہ رہنا چاہیئے کہ مجھے تو تھوڑی سزا ہوگی۔ یہ شبہات تو رفع ہو گئے۔ اب وہ باتیں بھی سن لیجئے جن پر اس آیت میں لتاڑ آ گیا ہے، فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایسے ہیں کہ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے۔ سو اس سے تو ہم بری ہیں لیکن اس سے بےفکری نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے نہ ہونے سے گو سزا کم ہو لیکن ہوگی تو ضرور اور دوسری بات یہ فرمائی کہ وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ کہ جو حیٰوۃ الدنیا پر راضی ہیں اور اس پر مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہمارے احکام سے غافل ہیں یہ کل چار چیزیں ہیں ان پر فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ط ترجمے سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان چار پر سزا ہے تو ان چاروں کا مذموم ہونا ثابت ہوا۔ اور یہ احتمال نہ کیا جائے کہ شاید مجموعہ پر یہ سزا ہوگی اور ہم مجموعہ سے بری ہیں کیونکہ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا یہ جزو ہم میں نہیں پایا جاتا سو بات یہ ہے کہ یہاں اول تو اس احتمال کی کوئی دلیل نہیں اور عطف بالواؤ میں کبھی ہر واحد بھی مقصود بالافادہ ہوتا ہے اور شاید سے بےفکری ہو نہیں سکتی۔ دوسرے اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی لَا يَرْجُوْنَ پر اکتفا نہ کرنا اور دوسرے افعال کا بھی ذکر کرنا ظاہر ہے کہ عبث تو نہیں ہے اور اگر ان کو حکمِ جزوی میں کچھ دخل نہ ہو تو محض عبث ہونا لازم آئے گا۔

پس سب کو دخل ہوا پس سب کا مذموم اور موثر فی العقوبۃ ہونا ثابت ہوگیا ان چار چیزوں میں سے ایک تو یقیناً ہم میں نہیں ہے اس دفعہ سے تو ہم یقیناً بری ہیں اور ایک میں شبہ ہے یعنی اخیر کا جرم اس میں شک ہے کہ ہم میں ہے یا نہیں کیونکہ اس کی تفسیریں دو ہیں ایک تو یہ کہ عقیدہ نہیں اس لئے غفلت ہے اور التفات نہیں ہوتا اس سے تو ہم بچے ہیں یا مطلق غفلت مراد ہو تو اس میں ہم مبتلا ہیں رہے بیچ کے دو جرم اُن میں ہم یقیناً مبتلا ہیں اور وہ دونوں ایک ہیں مگر قدرے تفاوت ہے یعنی ایک تو مرتبہ عقل کا ہے اور ایک مرتبہ طبع کا کیونکہ رضا تو امر عقلی ہے اور اطمینان امر طبعی ہے تو بعض دفعہ تو ایک فعل کو عقلاً پسند کرتا ہے مگر دلچسپی نہیں ہوتی جیسے کڑوی دوا یا شہادت کے لئے سفر کہ عقلاً تو پسند ہے مگر اس کے ساتھ دلچسپی نہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دلچسپی تو ہوتی ہے مگر عقلاً ناپسند کرتا ہے جیسے زنا وغیرہ۔ غرض کبھی رضا ہوتی ہے اور اطمینان نہیں ہوتا اور کبھی بالعکس لیکن وہ حالت نہایت سخت ہے کہ رضا اور اطمینان دونوں ہوں تو کفار کو تو علی العموم یہ بات ہے مگر اکثر مسلمانوں کو بھی ہے چنانچہ پسند کی تو کھلی دلیل یہ ہے کہ اگر دنیا اور دین میں تزاحم ہو جیسے مقدمات میں یا رشوت لینے میں یا جیسے بعضوں کے پاس زمینیں دبی ہوئی ہیں تو ان سب کو جانتے ہیں کہ گناہ ہے مگر دل سے پسند ہے کہ جی بُرا نہیں ہوتا بلکہ جب اس کی اصلاح کی رائے دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ ریاست کے معاملے ہیں ناصح کیا جانیں غرض عقلاً پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں اگرچہ عقیدہ ایسا نہیں ہے۔ علیٰ ہذا تعلیم کے باب میں جانتے ہیں کہ ابتداء سے تعلیم زمانۂ حال میں مشغول کرنے سے اولاد دین سے بے خبر رہتی ہے مگر کہتے ہیں کہ ایسا نہ کریں تو ترقی کیونکر کریں یہ سب رضا بالدنیا ہے۔ بلکہ اب تو وہ پالیسی ہوگئی ہے کہ اہلِ علم اور درویشوں میں بھی یہ مرض ہے اِلّا ما شاء اللہ حالانکہ درویش کو زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کثرت سے ایسے

مولوی اور درویش ہیں کہ اس رضاء بالدنیا سے اُن کا مذہب یہ ہوگیا ہے کہ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں ہمارے چار پیسے سیدھے ہوجائیں اور یہی وہ جماعت ہے جن کو دیکھ کر اہل دنیا علم دین سے نفور ہوگئے ہیں۔ صاحبو! علم دین کو ہم نے خود ذلیل کیا ورنہ وہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کے سامنے سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ دربار دہلی میں جب بادشاہ کے سامنے علماء گئے ہیں تو ان کو دیکھ کر بادشاہ خود جھک گئے افسوس ہے کہ دوسری قوم کے لوگ تو عزت کریں بادشاہ کی یہ حالت تھی کہ والیانِ ریاست کے سامنے اس نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور علماء کو دیکھ کر جھک کر اُن سب کی تعظیم کی اب بتلائیے کہ ان کے پاس کیا چیز تھی کونسا ملک تھا صرف یہ بات تھی کہ یہ عالم ہیں دین کے پیشوا ہیں لیکن اگر ہم خود ہی بیقدری کرائیں تو اس میں کسی کا کیا قصور یہی حالت ہوگئی ہے پیروں کی کہ طمع سے ان کی بھی سخت بیقدری ہوگئی ہے۔ مجھے ایک گنوار کا واقعہ یاد آیا کہ فصل پر جب کمینوں کا اناج نکالنے بیٹھا تو گھر والوں نے سب کو شمار کیا دھوبی کو بھی خاکروب کو بھی اور یہ بیٹھا سنتا رہا جب سارے کمینوں کا نام سن چکا تو کہنے لگا کہ اس سسرے پیر کا بھی تو نکالدو۔ مگر یہ پیر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ موضع مساوی کے بعضے لوگ قاضی صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوگئے تھے پھر خاندانی پیر صاحب کو جب خبر ہوئی تو کہنے لگے کہ اچھی بات ہے دیکھو میں بھی تمہیں پلصراط سے دھکا دوں گا۔ تو ایسے پیر ہیں ہی اس قابل۔ علیٰ ہذا بعضے علماء بھی ایسے ہونے لگے ہیں۔ ایک سب جج پرانی وضع پرانی روشنی کے ایک مقام پر بدل کر آئے انھوں نے چاہا کہ وہاں کے رؤساء سے مل آئیں۔ ایک رئیس صاحب کے پاس پہونچے تو وہ دور ہی سے صورت دیکھ کر گھر میں چلے گئے انھوں نے خادم کے ذریعے سے کہلا کر بھیجا کہ میں فلاں شخص ہوں آپ سے ملنے کو آیا ہوں۔ نام سن کر وہ رئیس صاحب باہر آئے اور معذرت کر کے کہنے لگے کہ آپ کا حلیہ دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں چندہ لینے کی غرض سے آئے ہیں

یہ خیالات ہیں عوام کے علماء کے متعلق مگر اس میں زیادہ قصور ان عوام کا نہیں بلکہ ایسے مولویوں کا ہے کہ ان ہی نے اپنے افعال سے عوام کے خیالات کو خراب کیا اگر علماء اس سے پرہیز کرتے تو عوام کو کبھی ایسی جرأت نہیں ہو سکتی یہ تو اہلِ علم کی غلطی تھی۔ لیکن جن لوگوں نے ایسوں کو دیکھ کر علم دین سے کنارہ کیا ہے وہ بھی غلطی سے خالی نہیں کیونکہ علم دین کے ساتھ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اخلاق بھی سکھلائیں جن سے یہ افعال نا ملائم پیدا نہ ہوں۔ دوسرے ایک خاندانی رئیس زادہ اگر علمِ دین پڑھے گا تو وہ بوجہ اس کے کہ فطرۃً عالی حوصلہ ہے کیونکہ ایسی حرکات کرنے لگا اور جو لوگ ایسے حرکات کرتے ہیں وہ اکثر کم خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ پس جب یہ ہے تو تعجب ہے کہ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اپنے بچوں کو تعلیم دینی نہ دو میں یہ نہیں کہتا کہ تعلیم حال نہ دو ضرور دو مگر یہ بھی تو دیکھو کہ علم دین ہر وقت کی ضرورت کی چیز ہے تو چاہیئے تو یہ کہ اول علم دین پڑھاؤ اور اس کے بعد دوسرے علوم ورنہ دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ تو اس کی تعلیم ضرور رہی ہونی چاہیئے اگر زیادہ وقت نہ ہو تو اردو ہی کے رسائل پڑھاؤ لیکن سبقاً سبقاً پڑھاؤ یہ نہیں کہ کتاب دے دی اور کہہ دیا کہ دیکھ لو بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ پورا نصاب ہو اور کسی دیندار آدمی کو رکھ کر سبقاً سبقاً پڑھاؤ اگر چوبیس گھنٹے میں سے ایک گھنٹہ ہی دو بلکہ میں کہتا ہوں کہ فضول وقت میں سے جو کھیل کود میں ختم ہو جاتا ہے اس میں سے اگر ایک گھنٹہ دو اور وقتاً فوقتاً امتحان لیا کرو کامیابی پر بچہ کو انعام دو اور ناکامی پر سزا دو اور عمل کرانے کی بھی کوشش کراؤ جیسے حساب میں مشق کراتے ہو۔ اور اگر وہ نہیں کرتا تو سزا دیتے ہو اسی طرح ہر مسئلے میں التزام کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ ساتھ کے ساتھ دیندار ہوتا چلا جائے گا ہاں اس کے لئے ایک عالم کے بلانے کی ضرورت ہوگی تو جب سینکڑوں روپیہ انگریزی میں صرف ہو جاتا ہے اگر دس روپے اس میں صرف ہو جائیں گے تو کیا ظلم ہوگا اور ان مولوی صاحب سے آپ اپنے لئے بھی یہی کام لے سکتے ہیں کہ ان سے خود بھی مسائل سیکھیں اور اس موقع پر یہ کہنا بھی ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں جیسا پہلے تھا پھر کوئی سلسلہ علم دین کا ہو تو اچھا ہے کہ یہاں کے بچے کچھ نہ کچھ تو ضرور پڑھ لیں۔ دیکھو اگر دو گھنٹے کی صحبت کسی عالم کی ہو جائے تو خواہ یہ بچے دیندار نہ ہوں لیکن ان کو بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی مگر اس طرف لوگوں کو توجہ نہیں۔ اگر کہیئے کہ یہاں کوئی مولوی نہیں ملتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر راج کی ضرورت ہو اور وہ نہ ملے تو کیا کرتے ہو یہ ہی کہ دوسرے مقام سے راج بلاتے ہیں۔ پھر مولوی کو دوسرے مقامات سے کیوں نہیں بلاتے یہاں اس کے منتظر کیوں رہتے ہو کہ مولوی خود آئیں۔ صاحبو! اگر دین کی کچھ بھی عظمت قلب میں ہوتی تو خود مولویوں کو تلاش کرتے خلاصہ یہ کہ رضا بالدنیا کی ان خرابیوں سے بہت کم لوگ خالی ہیں حتیٰ کہ مولوی اور درویش بھی اور مولویوں اور درویشوں سے ایسا ہونا یہ زیادہ برا ہے کیونکہ یہ دھوکا دے کر کماتے ہیں مگر ہر جماعت میں کچھ لوگ مستثنیٰ بھی ہیں۔ دنیا داروں میں بھی اور دینداروں میں بھی یہ تو رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تھا۔ آگے فرماتے ہیں وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا کہ دنیا میں جی بھی لگایا اور دنیا ان کے دل میں بھی گھس گئی اس کا ازالہ ذرا مشکل ہے دنیا سے تو دل گھبرانا چاہیئے مگر ہر مسلمان بتلائے کہ روزانہ کتنی مرتبہ دنیا میں رہنے سے اُس کا جی گھبرایا ہے اور کب وحشت ہوتی ہے۔ ہاں اگر وحشت ہوتی ہے تو آخرت میں جانے سے ہوتی ہے حالانکہ دنیا سے وہ تعلق ہونا چاہیئے کہ جو مظفر نگر کی سرائے سے کہ اگرچہ وہاں سارے کام کرنے ہوتے ہیں مگر دل جلال آباد میں پڑا رہتا ہے۔ اس کا مطلب بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں مولوی یہ کہتے ہیں کہ دنیا سے سرائے کا تعلق رکھو۔ دیکھو کیا سرائے میں کھاتے نہیں ہو یا کوٹھری کرائے پر نہیں لیتے سب کچھ کرتے ہو مگر وہاں جی نہیں لگتا اور دنیا میں جی لگا لیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہماری بعینہٖ وہ حالت ہے۔ جیسے بچہ سرائے کے کسی آرام کو دیکھ کر ضد کرنے لگے کہ میں تو یہیں رہوں گا۔ باقی جن کو دنیا کی حقیقت سے واقفیت ہے

ان کی یہ حالت ہے کہ کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم | راحت جاں طلبم وزپئ جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے | بر درِ میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

(وہ دن کیا خوشی کا ہوگا کہ میں اس ویران منزل یعنی دنیا فانی سے چلا جاؤنگا روح کے لئے راحت آرام طلب کرتا ہوں اور اپنے محبوب کے پاس جا رہا ہوں میں نے منت مانی ہے کہ اگر کسی روز یہ غم میرے اوپر آ پڑا تو میکدہ کی طرف مستانہ وار گنگناتا ہوا جاؤں گا)

دیکھئے منت مان رہے ہیں کہ اگر یہاں سے چھٹکارا ہو تو یوں کریں گے۔

بیان تو بہت طویل ہے مگر میں وقت نہ ہونے سے ایک ترکیب بتلاکر مضمون کو مختصر کرتا ہوں اور وہ ایسی ترکیب ہے کہ جس سے تم کو انشاء اللہ تعالےٰ صحبت کی برکت حاصل ہوگی اور یہ جو دائرے سے باہر قدم نکلا جا رہا ہے یہ رُک جائے گا اور وہ حالت ہوجائے گی جو طاعون کے زمانہ میں ہوتی ہے کہ سب کچھ کرتے ہو لیکن کسی چیز سے دل چسپی نہیں ہوتی تو وہ ترکیب یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کرکے اُس میں موت کو یاد کیا کرو اور پھر قبر کو یاد کرو پھر حشر کو یاد کرو اور یوم حشر کے احوال کو اور وہاں کے شدائد کو یاد کرو اور سوچو کہ ہم کو خدائے تعالےٰ قادر کے روبرو کھڑا کیا جائے گا اور ہم سے باز پرس ہوگی۔ ایک ایک حق اگلنا پڑیگا پھر سخت عذاب کا سامنا ہوگا اسی طرح روزانہ سونے کے وقت سوچ لیا کرو دو ہفتے میں انشاء اللہ تعالےٰ کایا پلٹ ہو جائے گی اور جو اطمینان واُنس و دلچسپی دنیا کے ساتھ اب ہے باقی نہ رہے گی اور اس وقت اگرچہ احکام فرعیہ بیان نہیں ہو سکے مگر اصول بحمد اللہ کافی بیان ہوگئے ہیں۔ اب خدا تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق عمل تمام ناظرین اور ناشر کو دے۔:

آمین برحمتک یا ارحم الراحمین ؕ

تمام شد

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رَوَاہُ الْبُخَارِیُ)

دعوات عبدیت جلد چہارم
کا
چوتھا وعظ ملقب بہ

الاتعاظ بالغیر

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم۔ اے جناح روڈ) کراچی ۱

دعوات عبدیت جلد چہارم

کا

چوتھا وعظ ملقب بہ

الاتّعاظ بالغیر

اَشْتَاتٌ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	مَنْ ضَبَطَ	مَاذَا	کَیْفَ	کَمْ	مَتٰی	اَیْنَ
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے لکھا	کیا مضمون تھا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
.	تقریباً ۱۰۰ سو آدمی	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم	عبرت پکڑنے اور نصیحت حاصل کرنے	بیٹھ کر	۲ گھنٹے ۵ منٹ	۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ	قصبہ جلال آباد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صلی اللہ علیہ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِہٖ (نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے)

یہ ایک جملہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کیا ہوا اس میں ہمارے ایک عام مرض کے علاج پر تنبیہ ہے اس واسطے اس جملے کو اختیار کیا ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ مختصر ہے اور جامع اور اس وقت طبیعت کی حالت اضمحلالی اسی کو مقتضی ہے کہ مختصر مضمون تجویز کیا جائے لیکن یہ مضمون باوجود اختصار کے ہے جامع ہماری

حالت پر اس سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ اب سمجھئے کہ مرض دو قسم کے ہیں ایک وہ مرض کہ جن پر اطلاع نہ ہو ایک وہ کہ اطلاع ہو اور پرواہ نہ ہو اور ایسا مریض زیادہ قابل رحم ہے سو ہم میں بعض امراض بوجہ بے علمی کے ہیں اور بعض بوجہ قلت تدبر کے کیونکہ بعض تو ہم میں بے علم ہیں سوان کی تو زیادہ شکایت نہیں ہے لیکن بعض وہیں کہ ذی علم ہیں اور باوجود اس کے ان میں قلت تدبر ہے یعنی اپنی حالت کو سوچتے نہیں دنیا کا کام جس طرح سوچ سمجھ کر کرتے ہیں سچ ہے کہ دین کے کاموں میں اتنا اہتمام نہیں بلکہ جس میں جتنا دین ہے وہ عادت کی وجہ سے ہے اگرچہ یہ خوشی کی بات ہے کہ دین کی عادت ہوئی لیکن شکایت یہ ہے کہ اس سے زیادہ التفات کیوں نہیں ہے یعنی کہ لبقیہ میں بھی تدبر سے کام لیتے دیکھئے دنیا میں کبھی قناعت نہیں کرتے بلکہ اس کی ترقی اور زیادتی میں مشورہ کرتے ہیں اگرچہ کامیابی بھی نہ ہو کیونکہ دنیا میں کامیابی اکثر کم ہوتی ہے ورنہ اگر سب کامیاب ہوا کرتے تو آج ساری دنیا بادشاہ ہوتی تو دنیا دی مساعی میں باوجود کامیابی کم ہونیکے پھر بھی کوشش کی جاتی ہے اور خدا کی مصلحت ہے کہ کسی کی تدبیر کارگر کردیتے ہیں اور کسی کو ناکام۔ آج جن لوگوں کی تدبیر مساعد ہو گئی ہے۔ وہ تدابیر ہی کو مؤثر سمجھتے ہیں۔ صاحبو! ذرا ان سے پوچھو کہ جن کو تمام عمر ناکامی ہی رہی تو صرف تدبیر نہ مؤثر ہے اور نہ یہ تدبیر محض بیکار ہے مگر آخرت کے لئے ناکامی کبھی نہیں ہوتی۔ پس تعجب ہے کہ جس میں اکثر ناکامی ہو اس میں تو سعی و اہتمام کیا جائے اور جس میں کبھی ناکامی نہ ہو اس میں کبھی التفات نہ کیا جائے۔ حالانکہ جس قدر سعی دنیا کے لئے کی جاتی ہے اس سے نصف بھی آخرت کے لئے کریں تو ناکام نہ رہیں غرض بعض میں خرابی قلت تدبر کی وجہ سے ہے۔ بہرحال یہ مرض ہم میں ضرور ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی مرض ہم میں ہے بلکہ منجملہ اور بہت سے امراض کے یہ مرض بھی ہے اور یہ مرض قریب قریب عالمگیر ہے مگر پھر بھی اس کے معالجہ کی طرف التفات نہیں ہے تو اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہماری حالت یعنی عدم تدبر وہ ہے جس کا مقابل اس حدیث میں مذکور ہے یعنی تدبر تو چونکہ یہ مضمون اس مرض کی ضد ہے اس لئے اس سے اس کا علاج ہو جائیگا سو فرماتے ہیں کہ سعید وہ ہیں کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے اور ظاہر ہے

کہ یہ تدبیر ہی میں داخل ہے اور عجب نہیں کہ ایسا مضمون بہت دفعہ سنا ہو چنانچہ عام محاورہ میں کہتے ہیں کہ تازی پٹے اور ترکی کانپے اس مثل کا خلاصہ یہی ہے کہ اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُعِظَ بِغَیْرِہٖ کہ سعادت مند وہ ہے کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر اس کو عبرت حاصل ہو۔ پس یہ مضمون تسلیم شدہ ہونے کے سبب مستقل تسلیم کرانے کی ضرورت نہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم کو کوئی مضمون ایسا نہیں سکھلایا گیا کہ وہ ہم سے اجنبی ہو بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ شریعت کی ہر تعلیم طبیعت کے اتنی مناسب ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ہزاروں مشقتیں پڑ جائیں تو شریعت کی ہر تعلیم طبیعت کے مناسب ہے اور اس کی مضاد تعلیم کے منافی ہے مگر اس کے دریافت کے لئے بصیرت کی ضرورت ہے ہمارا نفس چونکہ بصیر نہیں ہے اس لئے شریعت کی تعلیم سے بھاگتا ہے جیسے مریض بدپرہیزی کی طرف مائل ہوتا ہے اور مفید ادویہ واغذیہ سے بھاگتا ہے۔ چنانچہ استسقاء کے اندر سارے سمندر کی خواہش ہوتی ہے اور جو تندرست ہوتا ہے وہ اعتدال سے پیتا ہے۔ اور اگر مریض کو طبیب روکے گا تو وہ یوں سمجھے گا کہ یہ تعلیم طبیعت کے خلاف ہے حالانکہ اس کی طبیعت ہی حدِ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے ورنہ ایک گھونٹ زیادہ پینے سے بھی طبیعت پر گرانی ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا کھانے میں ایک شخص کو ہم نے دیکھا ہے کہ کھا رہے ہیں اور نکل رہا ہے مگر کھائے جاتے ہیں اور نکلتا جاتا ہے اسی طرح برابر سلسلہ رہتا تھا تو کیا طبیعت سلیم ہے ہرگز نہیں میں تو دعوے کرتا ہوں کہ اگر طبیعت سلیم ہو تو کشش شریعت ہی کی طرف ہو گی۔ اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو امتحان کر لیجئے کہ جب کبھی شریعت کے خلاف کیجئے گا ضرور ضرر ہو گا۔ جیسے زیادہ کھانے سے ضرر ہوتا ہے اور عاجل ضرر یہ ہے کہ فوراً طبیعت گرفتہ ہو کے منقبض ہو گے۔ مخالفت شریعت کا اول تو تقاضا پیدا ہوتا ہے مگر بعد فراغ اس عمل کے گرانی ہو گی اگر کہیے کہ ہم کو تو کچھ بھی گرانی نہیں ہوتی تو سمجھئے کہ یہ ظلمت بڑھ جانے سے ہے۔ یہ دیکھئے کہ اول اول جب یہ گناہ کیا تھا اس وقت کیا حالت ہوئی تھی۔ مثلاً ایک شخص نے اول ہی اول رشوت لی تو اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا ہے اور اپنی نظر میں بھی بالکل وقعت جاتی رہی تھی۔ اسی طرح اول زنا کرنے سے خود اپنے اوپر شرم آئی تھی اور خود اپنی نظر میں ذلیل ہوا تھا۔ علیٰ ہذا دوسرے

گناہوں کی بھی یہی حالت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ طبیعت کے خلاف ہے اور شریعت طبیعت کے موافق ہے البتہ بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ ان کا اثر فوراً ہی ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتا بلکہ بعد مرنے کے معلوم ہوگا غرض یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی باتیں بتلائی ہیں جو طبیعت کے موافق ہیں تو یہ تعلیم بھی طبیعت کے موافق ہے۔ دیکھو اگر چور کو سزا ہو تو دوسرے کے لئے راحت اس میں ہے کہ چوری چھوڑ دے اور کلفت اس میں ہے کہ دیکھے اور برا بن جائے اور جب یہ حالت رہے گی تو مثل مشہور ہے کہ سو دن چور کے ایک دن ساہو کا کبھی نہ کبھی یہ بھی ماخوذ ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں ایک چور پکڑا ہوا آیا آپ نے قطع ید کا حکم دیا۔ اس نے کہا امیر المؤمنین ؓ میں نے پہلی ہی مرتبہ ایسا کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تو غلط کہتا ہے خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے وہ کبھی اول گناہ پر نہیں پکڑتے آخر تحقیق جو کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بڑا عیّار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

حکمِ حق با تو مواسا ہا کند چونکہ از حد بگذری رسوا کند

(حق تعالیٰ کی بردباری اولاً تیری ہمدردی اور موافقت کرتی ہے اور جب تو حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر رسوا کر دیتی ہے)

اول اول تو مواساۃ کرتا ہے لیکن جب کوئی حد ہی سے نکل جائے تو وہ رسوا بھی کر دیتے ہیں۔ تو یہ تعلیم کہ دوسرے کی حالت کو دیکھ کر نصیحت پکڑے بالکل مصلحت اور طبیعت کے موافق ہے اس سے تو فراغت ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں یہ مرض ہے یا نہیں تو اگر ذرا بھی اپنی حالت کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ بہت شدت سے ہم میں یہ مرض ہے اور ہر ہر امر میں ہماری یہ حالت ہے مگر میں اس وقت ایک خاص امر کو بیان کرتا ہوں۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ جا بجا اس وقت طاعون ہے۔ نیز اخباروں میں بھی ضرور پڑھا ہوگا کیونکہ آپ لوگوں نے اخباروں کو تو ایک مشغلہ بنا لیا ہے، میں نے ایک مرتبہ اخبار کے متعلق ایک مضمون لکھ دیا تھا جس میں اُس کے حکم کی تفصیل تھی مگر اخبار والوں نے اس مضمون کو

بلا دیکھے ہی وہ شور و غل مچایا کہ خدا کی پناہ میں نے کہا کہ اس وقت تک تو میں نے اخبار بینی کے متعلق تشدد نہیں کیا تھا مگر اب تو میرے پاس ایک دلیل بھی مقتضی تشدد کی ہے کہ اخبار تہمت بھی لگاتے ہیں واقعی اخباروں کی یہی حالت ہے کہ اکثر باتیں بے تحقیق محض تخمین سے لکھ دیتے ہیں۔ نوجوان اسی لئے اس کو خریدتے ہیں صاحبو! اخبار ایک تاریخ کا شعبہ ہے۔ تاریخ بہت مفید چیز ہے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (ان کے قصہ میں سمجھدار لوگوں کے لئے عبرت ہے) کہ اُمم سابقہ کے قصے اس واسطے نقل کئے جاتے ہیں کہ لوگ عبرت پکڑیں۔ عبرت کا خلاصہ یہی ہے کہ کسی امر مشترک کی وجہ سے اپنے کو ان پر قیاس کریں کہ فلاں شخص نے ایسا کیا تھا اس کو یہ نتیجہ ملا کو ہم کو بھی یہی نتیجہ ملے گا یہ حقیقت ہے عبرت کی اس کی وجہ سے علم تاریخ مفید ہوا پس اخبار سے بھی اگر یہی سبق حاصل کریں تو وہ مفید ہے ورنہ غیر مفید اب دیکھ لیجئے کہ کون شخص یہ سبق حاصل کرتا ہے اکثر لوگ مسلمانوں کی مصیبت کو سنتے ہیں مگر کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ علیٰ ہذا طاعون کہ دوسری جگہ کے مسلمانوں کو مبتلائے طاعون سن کر فیصدی ننانوے آدمی ایسے ہیں کہ ان کے دل پر ایسا اثر نہیں ہوتا جیسا اپنی بستی کے اندر مرض طاعون ہونے سے ہوتا ہے ؎

چو از محنتِ دیگراں بے غمی   نہ شاید کہ نامت نہند آدمی

(جبکہ تو دوسروں کے غم اور تکلیف سے بے پرواہ ہے تو مناسب نہیں ہے تیرا آدمیوں میں شمار کیا جاوے)

جب دوسروں کی تکلیف کو سن کر ہمارا دل نہ دکھا تو ہم آدمی نہیں اب ہم نے اخبار کو جس غرض کے لئے تجویز کیا ہے اس کا خلاصہ گھر پھونک تماشا دیکھنا ہے کہ دوسرے کا گھر جلے اور ہم بیٹھ کر ہاتھ تاپیں تو اگر اخبار نہ دیکھتے تو یہ نہ ہوتا کہ ہمنے مسلمانوں کی مصیبت کو مشغلہ بنا رکھا ہے اور سبق حاصل کرتے تو یہ سبق حاصل کرتے کہ ان کی امداد کریں سو یہ بہت کم لوگوں کے دل میں آتا ہے ہاں یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ فلاں جگہ کے لوگوں نے صفائی نہیں رکھی اس لئے طاعون میں مبتلا ہوئے مگر اس سے بڑھ کر عبرت اور بھی ہے جس کی

ابھی آپ کو ہوا ابھی نہیں لگی اور جس کی نسبت مولاناؒ کہتے ہیں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں

(بہت کچھ یونانیوں کی حکمت تو پڑھ چکا ذرا تھوڑی سی ایمان والوں کی حکمت بھی پڑھ لے)

کہ یونانیوں کی حکمت کہاں تک پڑھو گے اب کچھ ایمانیوں کی حکمت بھی پڑھ لو صاحبو! مطلب دو ہیں۔ ایک یونانی، ایک ایمانی۔ یونانی سے مراد مطلب جسمانی ہے اس پر تو آپ کی نظر جاتی ہے مگر حکمت ایمانیاں پر نظر نہیں جاتی اس کو بھی تو دیکھو آپ نے تو تشخیص کرلی کہ ہوا صاف نہ ہونے سے طاعون ہوا مگر یہ بھی تو بتلایئے کہ ہوا کے صاف نہ ہونے کی کیا علت ہے آپ نے طاعون کی علت کو دیکھا مگر علۃ العلۃ کو نہ دیکھا۔ ہم اطباء کی تکذیب نہیں کرتے مگر اہل دنیا کی کوتاہ نظری دکھلاتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص قلم سے لکھ رہا ہے چند چیونٹیوں نے دیکھا۔ ایک نے تو کہا کہ یہ نقوش خود بخود ہو رہے ہیں دوسری جو اس سے وسیع النظر تھی اُس نے کہا کہ نہیں بلکہ قلم چل رہا ہے تیسری اس سے بھی وسیع النظر تھی اُس نے کہا کہ قلم خود نہیں چل رہا بلکہ وہ انگلیوں میں ہے انگلیاں اس کو چلا رہی ہیں چوتھی جو ان سب میں محقق تھی اس نے کہا کہ انگلیاں خود بخود نہیں چل رہیں بلکہ ایک قوتِ ارادیہ ان کو چلا رہی ہے۔ اب بتلایئے کہ ان میں محقق کون ہے ظاہر ہے کہ جس نے قوت ارادیہ کا پتہ چلالیا وہ محقق ہے باقی سب کوتاہ نظر ہیں ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ؎ قَالَ الجدارُ للوتد لم تشقنی ❊ قال الوتد انظر الیٰ من یدقنی

(دیوار نے میخ سے کہا کہ تو مجھ کو کیا ٹھوک رہا ہے تو میخ نے جواب دیا کہ اس کی طرف دیکھ جو مجھ کو ٹھوک رہا ہے)

غرض یہ ہے کہ علت کو بھی تو دیکھو۔ دوسری مثال لیجئے کسی شخص کو پھانسی ہوئی کسی نے پوچھا کہ کیونکر ہوئی ایک نے کہا کہ چمڑے سے گلا گھونٹ دیا گیا۔ دوسرے نے کہا کہ احمق سبب یہ ہے کہ حاکم نے حکم دیا تھا۔ تیسرے نے کہا کہ حاکم نے حکم اس لئے دیا کہ اس نے ڈکیتی کی تھی تو اصل محقق یہ تیسرا شخص ہے کہ حکم حاکم کو اور مجرم کے عمل کو بھی دیکھا۔ یہی فرق ہے عقلائے ظاہر اور عقلائے حقیقت میں۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ

موت چمڑے سے ہوئی اور طاعون سمیت سے ہوا اگر یہ بھی تو دیکھو کہ ہوا میں سمیت کیوں پیدا ہوئی سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم حقیقی نے اس میں سمیت پیدا کر دی اور اس کے پیدا کرنے کا سبب مخلوق کے گناہ ہوئے تو محض چوہوں کے مارنے پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ جرائم کی وجہ سے طاعون ہوا تھا ان کو بھی چھوڑنا چاہیئے۔ اور ایک طاعون کیا سب مصیبتیں ہمارے جرائم اور اعمال کی وجہ سے آتی ہیں مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (جو کچھ مصیبت تم کو پہونچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہونچتی ہے) اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ اہل شریعت پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہر امر میں گناہوں کو سبب بتاتے ہیں اسباب کے منکر ہیں سو یہ اعتراض غلط ہے وہ اسباب سے بیخبر نہیں مگر اسباب کے ساتھ اسباب اسباب کو بھی دیکھتے ہیں اور اس لئے کہتے ہیں کہ جو مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ ہوا، آگ، پانی سب خداوند کریم کے حکم کے تابع ہیں ان کو جب حکم ہوتا ہے جیسا حکم ہوتا ہے کرتے ہیں ؎

خاک و آب و باد و آتش بندہ اند   با من و تو مردہ با حق زندہ اند

(مٹی اور پانی اور ہوا اور آگ سب خدا کے بندے ہیں ہمارے اور تمہارے اعتبار سے مردہ ہیں)

یہ ہمارے سامنے مردہ ہیں ورنہ سب زندہ اور تابع حکم ہیں۔ ایک کافر بادشاہ نے بہت سے مسلمانوں کو آگ میں ڈال دیا تھا کیونکہ وہ لوگ بت کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے تھے آخر ایک عورت کو لایا گیا اور اس سے بھی سجدہ کرنے کو کہا گیا تو اس نے بھی انکار کیا اس کی گود میں ایک بچہ تھا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی گود سے بچہ لے کر آگ میں پھینک دیا جائے چنانچہ پھینک دیا گیا قریب تھا کہ وہ عورت سجدہ کر لے کہ لڑکے نے آواز دی ؎

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت   بانگ بر زد طفل کانی لم امت
اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم   گرچہ در ظاہر میان آتشم

(عورت نے چاہا کہ سجدہ کرے بت کے سامنے تو بچہ نے آواز لگائی کہ میں نہیں مرا بلکہ زندہ ہوں اے ماں تو اندر آجا اس لئے کہ میں یہاں پر خوش ہوں اگرچہ ظاہر میں آگ کے اندر ہوں)

اُس کے بعد اوروں سے خطاب کرنا شروع کیا کہ یہاں آؤ یہاں آؤ بہت بڑا عجیب باغ ہے۔ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ لوگ بے قرار ہو کر اس میں کودنے لگے سپاہی روکتے تھے مگر لوگ برابر آگ میں کودتے جاتے تھے۔ جب بادشاہ نے یہ حالت دیکھی تو آگ کو خطاب کر کے کہا کہ اے آگ کیا تو آگ نہیں رہی یا تجھ میں سے جلانے کی قوت سلب ہو گئی آگ نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم　　اندر آتا تو بہ بینی تابشم

(اس نے کہا میں اب بھی آگ ہی ہوں اندر داخل ہو تاکہ تو میرا جلانا دیکھ سکے)

یعنی تو اندر آ تو معلوم ہو کہ میں آگ ہوں یا نہیں باقی ان کو کیوں کر جلاؤں چھری کاٹتی ہے مگر جلانے سے ؎

طبع من دیگر نگشت و عنصرم　　تیغ حقم بدستوری برم

(میری طبیعت دوسری نہیں بدل گئی میں وہی عنصر ہوں خدا کی تلوار ہوں بدستور اب بھی جلاتی ہوں)

اسی طرح آب و ہوا خدا کے حکم سے ستی ہو جاتی ہیں اور وہ ہلاک کر دیتی ہیں حضرت مولانا نظامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

نبارد ہوا تا نگوئی ببار　　زمیں نا ورد تا نگوئی بیار

(ہوا بھی نہیں حرکت کرتی جب تک تو نہ کہے کہ حرکت کر اور زمین نہیں اُگاتی جب تک کہ تو نہ کہے اُگا۔)

کہ جب تک حکم نہ ہو زمین ایک دانہ بھی نہیں نکال سکتی۔ تو سبب اصلی جرائم و معاصی ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

ہر چہ بر تو آید از ظلمات وغم　　آں ز بیباکی و گستاخی ست ہم

غم چو بینی زود استغفار کن　　غم باخالق آمد کار کن

(جو کچھ بھی ظلمت غم میں پیش آئے وہ بوجہ گناہوں میں بے باکی اور احکام میں گستاخی کے ہے جب تو رنج وغم کو زیادہ دیکھے تو استغفار کر رنج وغم کو

اُن کے پیدا کرنے والے کی طرف ظاہر کرا ور نیک عمل کر)

کہ جب غم دیکھو فوراً توبہ کرلو دیکھئے کیا عجیب تعلیم ہے ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر تم حکام کی طرف سے کوئی ناگوار بات دیکھو تو ان کو برا مت کہو اس کی وجہ فرماتے ہیں (قربان ہوجایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر کہ فضول باتوں سے کیسا روک دیا ہے) کہ حکام کے قلوب میرے اختیار میں ہیں اگر راحت چاہتے ہو تو میری اطاعت کرو اور مجھ سے معاملہ درست رکھو میں حکام کے دل نرم کردوں گا۔ ایک مرتبہ کانپور میں طاعون ہوا لوگوں نے چاہا کہ ایک جلسہ کریں اور حاکم ضلع سے درخواست کریں کہ جدید قوانین طاعون کے متعلق اٹھادیئے جائیں سو مجھ کو بھی اُس جلسے میں شریک کرنا چاہتے تھے میں نے انکار کردیا جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اچھا میں دیوان حافظ میں بطور فال کے دیکھتا ہوں۔ یہ دیکھنا اس وجہ سے نہ تھا کہ میں فال کو مؤثر سمجھتا تھا مگر دیوان حافظ میں اکثر صحیح مذاق کے موافق باتیں نکل آتی ہیں اس لئے میں نے اس کو دیکھا تو اس میں یہ شعر نکلا ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش رموز و مصلحتِ ملک خسرواں دانند

(اب تو اے حافظ گوشہ نشین فقیر ہے شور مت کر ملک کی بھلائی اور دیگر رازوں کو ملک والے ہی جانتے ہیں)

کہ تم کون ہو خواہ مخواہ گڑ بڑ کرنے والے میں نے ان سے کہا کہ بھائی اب تم بھی نہ بولو بس خدا کے سپرد کردو اور اللہ اللہ کیا کرو اور بعد عصر لاحول کی تسبیح پڑھنے لگو اور اتفاق سے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہفتہ دو ہفتہ کے اندر ہی سب پریشانی رفع ہوجائے گی چنانچہ ایسا ہی کیا حاکم ضلع نے از خود رپورٹ کی کہ ان قوانین سے لوگوں کو تکلیف ہے ان کو اٹھالیا جائے۔ چنانچہ سب موقوف ہوگئے۔ لوگ بہت خوش ہوتے ہوئے آئے اور کہنے لگے صاحب کام ٹھیک ہوگیا میں نے کہا کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتلائی ہوئی تدبیر نہ چلے گی صاحبو! اگر ہم عمل کریں تو دنیا کی راحت بھی شریعت ہی کی تعلیم میں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فضول باتوں سے یہاں تک روکا کہ حکام کو بھی بُرا نہ کہو غرض مصیبتوں کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو ناراض کر رکھا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس قوم میں زنا زیادہ ہوگا

اس میں طاعون ہو گا۔ اور اس طاعون کا دوسرا سبب بھی ہے۔ اگرچہ بعضی باتیں ظاہر کرنے کی نہیں ہوتیں مگر اس لئے ظاہر کئے دیتا ہوں کہ شاید اس کو سن کر لوگ اپنی حالت درست کر لیں تین چار سال ہوئے کہ جب تھانہ بھون اور اس کے گرد و نواح میں طاعون ہوا تھا۔ تو قبل طاعون ایک روز میں آخیر شب میں بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر یہ آیت وارد ہوئی اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰۤى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (ہم اس بستی کے باشندوں پر ایک آسمانی عذاب ان کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں) میں نے اس کو وعظ میں بیان کیا لیکن اپنی طرف منسوب نہیں کیا کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا مگر لوگوں نے توجہ نہ کی اور طاعون پھیلا تو غرض ایک سبب وہ گناہ بھی نکلا جو قوم لوط میں تھا۔ اس وقت لوگوں میں یہ مرض بہت شدت سے پھیل رہا ہے کوئی خاص اصلی گناہ میں مبتلا ہے اور کوئی اس کے مقدمات میں یعنی اجنبی لڑکے یا اجنبی عورت پر نظر کرنا حدیث میں ہے اللسان یزنی وزناہ النطق والقلب یتمنی ویشتھی (زبان زنا کرتی ہے اور اس کا زنا بات سے ہوتا ہے اور قلب تمنا کرتا ہے اور خواہش بھی کرتا ہے) اس میں ہاتھ لگانا بری نگاہ سے دیکھنا سب داخل ہو گئے یہاں تک کہ جی خوش کرنے کے لئے کسی حسین لڑکے یا لڑکی سے باتیں کرنا یہ بھی زنا و لواطت میں داخل ہے اور قلب کا زنا سوچنا ہے جس سے لذت حاصل ہو جیسے زنا میں تفصیل ہے۔ ایسے ہی لواطت میں بھی۔ اس بلا میں اکثر لوگ مبتلا ہیں اور یہ نہایت ہی افسوس اور رنج کی بات ہے۔ باوجودیکہ عورت کی طرف طبعاً میلان ہوتا ہے مگر لوگ پھر بھی لڑکوں کی طرف مائل ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ عورت سے ملنے میں بدنامی ہو جاتی ہے دوسرے عورت ملتی بھی مشکل سے ہے اور لڑکے سے ملنے میں زیادہ بدنامی کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا اور ملتے بھی ہیں آسانی سے بالخصوص دیکھنا اور تصور کرنا تو اس لئے بھی سہل ہے کہ اس کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی اور یہ سب بدکاری ہے اور نہایت افسوس ہے کہ یہ مرض تاک جھانک کا اکثر پرہیزگاروں میں بھی ہے اور ان کو دھوکہ اس سے ہو جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی طبائع میں اکثر شہوت کی خلش نہیں پاتے اور اس سے سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر شہوانی نہیں لیکن بہت جلد شہوت ظاہر ہو جاتی ہے اس لئے ابتدا ہی سے احتیاط واجب ہے۔

صاحبو! امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر تو آج کل کوئی مقدس نہیں ہوگا مگر دیکھئے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو امام صاحب نے اول دفعہ تو دیکھا لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کی داڑھی نہیں آئی تو یہ حکم کر دیا کہ جب تک داڑھی نہ نکل آئے پشت کی طرف بیٹھا کرو۔ دونوں طرف متقی مگر احتیاط اتنی بڑی بعد مدت دراز ایک مرتبہ اتفاقاً امام صاحب کی نظر پڑ گئی تو تعجب سے پوچھا کہ کیا تمہارے داڑھی نکل آئی ہے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس قدر احتیاط کی ہے تو آج کون ہے کہ وہ اپنے اوپر اطمینان کرے۔ تو اس آیت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ لوگوں کے اس عمل سے ان پر عذاب نازل ہونے کو ہے میں نے رد کا مگر کون سنتا ہے جب اس لغو کام کی عادت پڑ جاتی ہے تو کم ہمتوں سے بڑی مشکل سے چھوٹتا ہے ہاں اگر ہمت کی جائے اور پختہ قصد کرے تو چھوٹ بھی جاتا ہے کیونکہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں ایک حد تک مجبوری بھی ہوسکتی ہے جیسے غریب آدمی کا رشوت لینا اگر نہ لے تو بظاہر اس کے کام اٹکتے ہیں اور اس میں تو کوئی ایسی مجبوری نہیں کہ کوئی کام اس پر اٹکا ہو بس اس میں تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ تھوڑی سی تکلیف نفس کو ہوگی تو اس کا چھوڑ دینا ہمت والے کے لئے بہت آسان ہے ہمت والوں نے تو خدا کی راہ میں جانیں تک دیدی ہیں۔ بہت سے ایسے باہمتوں کے واقعے سُنے گئے انھوں نے تمام عمر کی افیون کی عادت چھوڑ دی۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور بیعت کی درخواست کی مولانا نے اس کو بیعت کر لیا اور تمام گناہوں سے یعنی کفر و شرک وغیرہ سے توبہ کرادی جب مولانا بیعت کر چکے تو کہنے لگا مولوی جی اور تم نے افیم (افیون) سے تو توبہ کرائی نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر تھی کہ تو افیون بھی کھاتا ہے اچھا جس قدر افیون تو روزانہ کھاتا ہو اس کی گولی بنا کر میرے ہاتھ پر رکھ دے چنانچہ اس نے گولی بنا کر مولاناؒ کے ہاتھ پر رکھدی مولانا نے اس کو دیکھا اور اس میں سے تھوڑا سا حصہ لے کر اس سے کہا کہ اس قدر کھالیا کر مقصود یہ تھا کہ بتدریج چھوڑا دی جائے گی۔ مگر جب قلب میں محبت خدا آتی ہے تو افیون کیا سلطنت بھی چھوٹ جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی جی اب کیا کھاؤں گا اور یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور بہت دور پھینکدی۔ گھر پہنچکر افیون کا تقاضا ہوا مگر

اس نے نہیں کھائی آخر دست لگے۔ مولانا کے پاس کہلا کر بھیجا کہ مجھے دست لگ رہے ہیں مگر میں توبہ کو نہیں توڑوں گا۔ چند روز میں دست بند ہو گئے جب بالکل تندرست ہو گیا تو مولانا کے پاس آکر سلام کیا مولانا نے پوچھا کہ بھائی کون ہو کہنے لگا جی میں ہوں افیم والا اور دو روپے نکال کر مولانا کو دیئے اور کہا کہ مولوی جی یہ افیم کے روپے ہیں مولانا نے فرمایا کہ بھائی افیون کے روپے کیسے کہنے لگا میں دو روپے مہینے کی افیم کھاتا تھا جب میں نے چھوڑ دی تو نفس بہت خوش ہوا کہ دو روپے ماہوار بچے میں نے نفس سے کہا کہ میں یہ دو روپے تجھے ہرگز نہ دوں گا میں اپنے پیر کو دوں گا۔ دیکھئے اس شخص نے دین کو کتنا خالص کیا کہ وہ دو روپے بھی اپنے پاس نہیں رکھے خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ ہمت وہ چیز ہے کہ وہ سب کچھ کرا دیتی ہے تو اگر ہمت کی جائے تو نگاہ بد کا چھوڑنا کیا مشکل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ تو اس کو ایسا خفیف جانتے ہیں کہ گویا حلال ہی سمجھتے ہیں حالانکہ حلال سمجھنا معصیت کا قریب بہ کفر ہے۔ اور ایک بے باک شاعر نے تو اس کو ایک مثال میں بیان کیا ہے کہ ؎

نگاہ پاک لازم ہے بشر کو روئے جاناں پر　　　خطا کیا ہوگئی گر رکھ دیا قرآن کو قرآن پر

اس میں ایک تو یہ کھلا دھوکہ ہے کہ ناپاک کو پاک سمجھا دوسرے اگر پاک بھی مان لیا جائے تو خوب سمجھ لو کہ شیطان اول اول تو اچھی نیت سے دکھلاتا ہے چند روز کے بعد جب محبت جاگزیں ہوتی ہے تو پھر نگاہ کو ناپاک کر دیتا ہے تو ضروری امر یہ ہے کہ علاقہ ہی نہ کرو اور علاقہ ہوتا ہے نظر سے لہذا نظر ہی نہ کرو غالباً حدیث میں ہے یا کسی بزرگ کا قول ہے النَّظْرُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ (نظر شیطان کے تیروں میں سے (پہلا) تیر ہے) کہ اس کا زخم بھی نہیں ہوتا اور سودا قلب تک اترتا چلا جاتا ہے۔ کسی شاعر کا شعر ہے ؎

درونِ سینہ من زخم بے نشان زدۂ　　　بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ

(میرے سینہ میں ایسے زخم تو نے مارے کہ جن کا دیکھنے میں کوئی نشان نہیں معلوم ہوتا)

یں حیرت میں ہوں کہ بغیر کمان کے تیر کیسے تو نے چلا دیئے)

یہ نظر ایسی چیز ہے کہ اس کا اثر پیدا ہونے کے بعد بھی مدت تک یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کو تعلق ہو گیا بلکہ جب کبھی محبوب جدا ہوتا ہے اس وقت قلب میں ایک سوزش سی پیدا ہوتی ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ تعلق ہو گیا اور جس قدر یہ سوزش بڑھتی ہے خدا کی محبت کم ہو جاتی ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کو بہت غیرت آتی ہے اور کیوں نہ آئے گی جبکہ محبوبان دنیا کو غیرت آتی ہے ۔ مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے پیچھے چلا اس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے کہنے لگا کہ میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں اس نے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے میری بہن چلی آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے ہوسناک تو تھا ہی فوراً پیچھے لوٹا جب یہ لوٹنے لگا تو اس نے ایک دھول اس کے رسید کیا اور ؎

گفت ای ابلہ اگر تو عاشقی در بیانِ دعویٰ خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

(اُس نے کہا بیوقوف اگر تو سچا عاشق ہے اور اپنے اس دعوے میں سچا ہے تو تو نے میرے سوا دوسرے پر نظر کیوں ڈالی ہے اے بیوقوف یہ تو محض زبانی دعویٰ ہے)

کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیروں پر کیوں نگاہ کی ۔ محبت تو وہ چیز ہے کہ ؎

ہمہ شہر پُر ز خوبانِ منم و خیالِ ماہے چہ کنم کہ چشم بدبین نہ کند بکس نگاہے

تمام دنیا بھی اگر حسینوں سے بھر جائے تو یہ محبوب کو چھوڑ کر اُدھر متوجہ نہ ہو ۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر ایک مجلس میں حضرت جنید اور حضرت حاجی صاحبؒ دونوں ہوں تو ہم حضرت جنید کی طرف التفات بھی نہ کریں البتہ حضرت حاجی صاحب ان کو دیکھیں سو محبت تو ایسی چیز ہے یہ کیسی محبت کہ دعویٰ خدا کی محبت کا اور لڑکوں سے تعلق معلوم ہوا کہ ؎

ایں نہ عشق ست آنکہ در مردم بود ایں فساد خوردن گندم بود

(یہ ایسا عشق نہیں ہے کہ جو عام سے لوگوں میں پایا جاتا ہے یہ تو گیہوں کھانے کا فساد ہے)

اگر چار دن کھانے کو نہ ملے تو سب بھول جائیں تو یہ نفس کی شرارت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عشق انہی کو ہوتا ہے جن کو خوب فرصت اور فراغ ہے ورنہ جو لوگ کسی کام میں مشغول ہیں ان کو کبھی ایسی لغویات کی نہیں سوجھتی۔ جیسے کاشتکار اس واسطے اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اپنے کو کسی کام میں لگا دو جس میں کھپ جاؤ اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کا کوئی جائز کام کرو۔ طبیبوں نے بھی لکھا ہے اس مرض کے متعلق کہ یعرض للبطالین (یہ بیکار اور فارغ لوگوں کا ہوتا ہے) افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ نے فراغت اس لئے دی تھی کہ دین کا کام کریں مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ محروم رہے خوب کہا ہے ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے — کہ بازار حرصش نہ باشد بسے

بقدر ضرورت یسارے بود — کند کارے از مرد کارے بود

(جو کام کسی شخص کو مل گیا ہے وہ اچھا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی حرص و ہوس محدود ہو جائے گی۔ پھر بقدر ضرورت آسانی ہوگی پھر اگر وہ کوئی کام کا ارادہ کرے تو پہلا کام بھی مل جائے گا۔)

کہ بڑا خوش قسمت وہ ہے کہ اس کو حرص نہ ہو اور ضرورت کے موافق کھانے کو ہو لیکن افسوس ہے کہ ہم قدر نہیں کرتے اور اس بیکاری میں اپنے پیچھے یہ علتیں لگا لیتے ہیں۔ اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ میں نے بعض درویشوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک ایک لڑکا پلا ہوا ہے اور کہتے ہیں کہ ان کے حسن میں خدا کا حسن جلوہ گر ہے۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بقراط نے ایک شخص کو ناچتے ہوئے دیکھا پوچھا اس کو کیا ہوا معلوم ہوا۔ کسی امرد حسین کو دیکھ کر اس لئے بیخود ہو گیا کہ اس میں جلوۂ حق نظر آیا کہنے لگا یہ کیا بات ہے کہ اس کو امرد میں تو جلوۂ حق نظر آیا میرے اندر کبھی نظر نہ آیا یہ تو بقراط کا قول ہے اس کا چاہے اعتبار نہ کرو لیکن شیخ کے مقولہ کا اعتبار کرو گے وہ اس کے بعد لکھتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل　　که در خوبرویان چین و چگل

(محقق ہی دیکھ سکتا ہے اونٹ کے اندر خوبصورتی ہے جو اور حق کی کاریگری ہے جو کم نظر لوگ حسینوں تک محدود رکھتے ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

ندانند صاحبدلاں دل بہ پوست　　اگر ابلہے داد بے مغز اوست

(صاحب دل صرف چمڑی کی رنگت پر دل نہیں دیدیتے اگر کوئی بیوقوف دیدے تو وہ بے عقل ہی ہے)

ایک بزرگ تھے پنجاب میں ان کی بابت ایک دوست بیان کرتے تھے کہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی حسین مکان دیکھتے تو وجد کرنے لگتے تھے اور یہ حالت تھی کہ ان کے سامنے کوئی کواڑ نہ کھول سکتا تھا اس کی آواز سے وجد کرنے لگتے تھے ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند　　بر آواز دولاب مستی کنند

(جو لوگ حق پرست ہیں اور انھیں صحیح ذوق ہے تو وہ دولاب کی آواز میں بھی جذب پاتے ہیں)

اور یہ حالت تھی کہ ان کو پنکھا نہ جھل سکتے تھے اس کی آواز سے وجد ہو جاتا تھا تو ایسا شخص اگر کسی حسین آدمی کو بھی دیکھ کر وجد کرنے لگے تو یہ اس کی ایک حالت ہے اور اگر یہ نہیں تو محض فسق و فجور ہے اور یہ ایسا مرض ہے کہ مدعیانِ تصوف میں بہت زمانے سے چلا آتا ہے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جو ساتویں صدی میں ایسوں ہی کے حق میں فرماتے ہیں ؎

صوفئ ماندہ بنستر دِ ایں لئام　　الخیاطت و اللواطت والسلام

کہ بس اس کا نام تصوف رہ گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ بہت پرانا مرض ہے اور سب سے اول لوط علیہ السلام کی قوم میں یہ مرض پیدا ہوا تھا اور شیطان نے ان لوگوں کی راہ ماری حدیث میں ہے کہ قوم لوطؑ پر یہ عذاب نازل ہوا کہ پانچ بستیوں کو حضرت جبریل علیہ السلام نے بازو پر اٹھایا اور آسمان تک لے جاکر گرادیا گویا یہ دکھلادیا کہ

چونکہ تمہاری امت الٹی ہوگئی تھی اس لئے سزا بھی تمہارے لئے الٹنے کی تجویز کی گئی غرض اول تو نفس اس فعل ہی کی اس وقت کثرت ہے دوسرے اس کی وسعت مفہوم سے نظر وغیرہ سب اسی حکم میں ہے معلوم ہو گیا ہوگا کہ شاید ہی کوئی اس سے بچا ہوا ہو الا ماشاء اللہ اسی طرح اجنبی عورت یا امرد مشتہیٰ سے گانا سننا یہ بھی ایک قسم کی بدکاری ہے حتیٰ کہ کسی لڑکے کی آواز سننے میں نفس کی شرکت ہو تو اس سے قرآن شریف سننا بھی جائز نہیں اکثر لوگ لڑکوں کو نعت کی غزلیں یاد کرا دیتے ہیں یہ بھی جائز نہیں ہے فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر بے ریش لڑکا مرغوب طبع ہو تو اس کی امامت بھی مکروہ ہے اور نابالغ کے پیچھے تو نماز ہی نہیں ہوتی تو جب امام بنا کر کھڑا کرنا جائز نہیں حالانکہ قرآن شریف ہی پڑھے گا مگر فقہاء نے بلا ضرورت اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ دوسرے یہ بھی وجہ ہے کہ لڑکوں کا اعتبار ہی کیا عجب نہیں کہ وہ بے وضو ہی پڑھا دیں۔ چنانچہ ایک لڑکا کہتا تھا کہ میں نے بے وضو نماز پڑھائی۔ اور لیجئے دو لڑکے نماز پڑھنے کھڑے ہوئے ان میں ایک امام تھا ایک مقتدی ایک نے دوسرے کے پیر میں گدگدی اٹھائی خوب کہا ہے اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ وَلِیًّا (لڑکا لڑکا ہی ہے اگرچہ وہ ولی ہی کیوں نہ ہو) خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ امرد صبیح کی امامت کو فقہاء نے ناجائز کہا ہے جوان یا میانہ عمر عورت کو مسجد میں آنے سے منع کیا ہے البتہ بوڑھی کے لئے بحر امام صاحب کے اوروں نے اجازت دی ہے کہ اس میں فتنہ نہیں ہے مگر یہ اس زمانہ میں ہوگا آج تو ایسی گندی طبیعتیں ہوگئی ہیں کہ مطلقاً ناجائز کہا جائے گا اگرچہ بڑھیا ہی ہو۔ ایک بادشاہ کی حکایت سنی ہے کہ اس کے سامنے ایک بیوہ عورت نکلی جو کہ بے انتہا بدصورت اور نفرت کی ہیئت و لباس رکھتی تھی اور اس کو حمل تھا اس نے وزیر سے کہا کہ تحقیق کرو یہ حمل کس کا ہے اس کی طرف کس کو رغبت ہوئی ہوگی۔ وزیر تحقیق کرتے کرتے پریشان ہو گیا عتاب شاہی بڑھنے لگا ایک روز اس پریشانی سے کسی سڑک پر گذر رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہے ایک شخص نہایت تکلف کا لباس پہنے ہوئے ایک گندہ پرتالے کے نیچے جس میں پیشاب وغیرہ گرتا تھا ایک دوات لئے ہوئے کھڑا اس میں پانی ڈال رہا ہے سخت حیرت ہوئی

اور اس کو گرفتار کر لیا تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان ہی صاحب کا اس عورت کو حمل تھا لہٰذا اس زمانے میں اس تفصیل کی بھی گنجائش نہیں رہی سب ہی کو روکنا چاہیئے غرض فقہائے جب محل شہوت میں قرآن شریف سننا گوارا نہیں کیا تو غزلیات پڑھانے کی اجازت کب ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ شریعت سے بے پروائی کی وجہ سے اب ان امور کا ذرا خیال نہیں کیا جاتا۔ اکثر واعظین عورتوں کے مجمع میں خوش الحانی سے اشعار پڑھتے ہیں یہ بالکل ہی مصلحت دین کے خلاف ہے۔ میں بحمداللہ عورتوں کے مجمع میں اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ سفر میں ایک غلام سار بان کو عورتوں کے سامنے اشعار پڑھنے سے روک دیا اور فرمایا تھا کہ رویدک یا انجشہ لا تکسر القواریر (باز آجا رک جا اے انجشہ شیشوں کو نہ توڑ (مرد عورتوں کے دل ہیں) تو جب اس زمانہ میں کہ سب پر تقویٰ ہی غالب تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی اجازت نہیں دی تو آج کس کو اجازت ہو سکتی ہے بالخصوص جبکہ خود عورتیں یا لڑکے ہی پڑھنے والے ہوں حاصل یہ ہے کہ اس معصیت کو طاعون میں خاص دخل ہے اور اس کی وجہ سے زیادہ تر طاعون ہوتا ہے اگرچہ مطلق ناراضی ہر گناہ سے ہوتی ہے یہ صدور معاصی اصل علت ہے طاعون کی تو جہاں طاعون آیا ہو سمجھ لیجئے کہ اس علت کی وجہ سے آیا۔ اب دوسری جگہ کے طاعون کی خبر سُنکر اور اس علت کو معلوم کر کے یہ دیکھے کہ اس میں ہم بھی مبتلا ہیں یا نہیں اگر مبتلا ہیں تو اس کو چھوڑنا چاہیئے یہ معنی ہیں السعید من وعظ بغیرہ کے چونکہ اس وقت مختصر ہی بیان کرنا تھا اس لئے اس خاص مضمون کو بیان کیا۔

اب میں قطع نظر طاعون و اسباب طاعون کے اس مضمون کی عام تعلیم کرتا ہوں کہ جو مصیبت آئے اس کو کسی گناہ کا ثمرہ سمجھا کرو اور جب کسی کو مصیبت میں دیکھو تو اس سے عبرت حاصل کیا کرو اسی طرح جب کوئی مر جائے تو سوچو کہ ہمارے لئے بھی یہ دن آنے والا ہے مگر اس وقت کچھ ایسی غفلت پڑی ہے کہ مردے کو دیکھ کر بھی ذرا التغیر ہماری حالت میں نہیں ہوتا میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں کہ اول اول زمانے میں مُردے کو دیکھ کر ایک عبرت سی ہوتی تھی مگر اب تو مساوات سی ہو گئی ہے حالانکہ اس بارہ میں شریعت نے ہم کو یہاں تک

تعلیم کیا ہے کہ قرآن شریف میں حکم ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہو تو یہ آیت پڑھو
سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ
پاک ہے وہ ذات کہ جس نے ہمارے لئے اس سواری کو مطیع و فرماں بردار بنا دیا
حالانکہ ہم اس کو اپنا تابع نہیں بنا سکتے تھے اور بے شک ہم اپنے رب کی
طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) کہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے ہمارے لئے اُس کو
مسخر کر دیا ورنہ اگر بگڑ جاتا تو ہم کیا کر لیتے یہ تو خاص رکوب کے مناسب ہوا
آگے فرماتے ہیں وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ اس کو بظاہر پہلے مضمون سے
کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی مگر اہل لطائف نے سمجھا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے
کہ بندہ اس جانور پر سوار ہونے سے دوسری سواری کو بھی یاد کرے اور سمجھ لو کہ تم
کو کسی تختہ اور چارپائی پر بھی سوار ہونا ہے پس جس میں تم کو رکھ کر چار آدمی لے جائیں گے
اصل سواری وہی ہے جس پر سوار کر کے تم کو خدا کے ہاں پہونچا دیں گے تو جب
جانور پر سواری لیتے وقت بھی اس کے یاد کرنے کا حکم ہے تو مردے کو دیکھ کر
تو یاد کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا اس وقت بھی یاد نہ کرنا سخت قساوت ہے۔ اب
لوگوں کی یہ حالت ہے کہ قبر پر بیٹھے ہیں اور مقدمے کی باتوں میں مشغول ہیں اسی
طرح اگر مصیبت میں کسی کو گرفتار دیکھتے ہیں اس کو اسی شخص تک محدود سمجھتے ہیں
حالانکہ سمجھنا چاہیئے کہ اس پر یہ مصیبت کیوں مسلط ہوئی ظاہر ہے کہ گناہوں کی
وجہ سے تو ہم کو بھی گناہوں سے بچنا چاہیئے اسی لئے حدیث میں ہے کہ جب
کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھو تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاكَ
بِهٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا (تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے
لئے ہیں جس نے مجھ کو عافیت دی اس چیز سے جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور مجھ کو
بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی اس میں بھی تذکیر ہے احتمال ابتلاء کی
اور اسی میں تنبیہ اجمالی ہے اسباب ابتلاء کی کہ معصیت ہے اسی پر یہ شکر
سکھلایا کہ احتمال تھا کہ اسی معصیت کے سبب شاید ہم بھی مبتلاء

نہ ہو جائیں لیکن یہ دعا آہستہ[۵] پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں لا تظہر الشماتۃ لاخیک بعض دوسرے کے مصائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں حالانکہ ان کو ڈرنا چاہیئے کیونکہ مقتضی تو ہم میں بھی موجود ہے بعض لوگ وہ ہیں کہ دوسرے کی مصیبت پر افسوس تو کرتے ہیں لیکن طعن کے طور پر اس کی بابت اسی حدیث میں ہے فیرحمہ اللہ و یبتلیک یعنی ہنسو مت شاید بجائے اُس کے تم مبتلا ہو جاؤ اسی کو کہتے ہیں

نہ خواہندہ بر درِ دیگراں بشکرانہ خواہندہ از درمراں

(نہ مانگنے والا دوسروں کے دروازہ پر شکرانہ کے ساتھ مانگنے والے کو دروازے سے مت بھگا یعنی اسی شکرانہ میں ہی دے دو کہ تم اس کے دروازے پر مانگنے نہیں گئے۔)

یعنی اگر اور کچھ نہیں تو سائل کو اسی شکر میں دیدو کہ تم مانگنے نہیں گئے تو یہ شکر اسی احتمال پر تو ہے کہ شاید ہم ہی اپنی معاصی کے سبب اس حالت کو پہنچ جاتے اس کے مناسب ایک حکایت تاریخ میں عجیب لکھی ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس بیٹھا کھا رہا تھا اس وقت ایک فقیر مانگنے آیا اس نے فقیر کو جھڑک دیا۔ اتفاق سے کچھ ایسا انقلاب ہوا کہ یہ شخص بالکل تباہ و پریشان ہوگیا حتیٰ کہ بیوی کا نان ونفقہ جب نہ چل سکا تو اس کو بھی طلاق دیدی اور اُس نے کسی اور دولتمند سے نکاح کر لیا۔ اتفاق سے اُس دولت مند کے دروازے پر کوئی شخص سوال کرنے آیا اس شخص نے بیوی سے کہا کہ اس کو بھیک دے آؤ جو دروازے پر گئی تو وہاں سے روتی ہوئی لوٹی۔ شوہر نے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ سائل میرا پہلا شوہر ہے اور اسی تذکرے میں وہ قصہ سائل کے جھڑک دینے کا بھی بیان کیا اس شوہر ثانی نے کہا کہ وہ سائل جو جھڑکا گیا تھا میں ہوں۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو مال بھی دیا اور اس کی بیوی بھی دیدی

[۵] ہاں اگر وہ شخص گناہ کی مصیبت میں مبتلا ہو اور کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو یہ دعا زور سے پڑھے تاکہ زجر ہو کما قال الشیخ دہلوی فی شرح المشکوٰۃ ۱۲ احمد حسن عفی عنہ

توخدا تعالیٰ کی بڑی قدرت ہے عبرت حاصل کرو اور عبرت میں یہ بھی داخل ہے کہ جس کو کسی مصیبت میں مبتلا دیکھو ڈرو۔ بزرگوں نے ہر جگہ یہ بات یاد دلائی ہے مگر ہم بے فکر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو اس کے اسباب سے بری سمجھتے ہیں کہ ہم کو مثلاً طاعون کیسے آئے گا۔ ہم تو تعویذ یا قتائل رکھتے ہیں۔

صاحبو! جس وقت کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو فتائل وغیرہ بیکار ہو جاتے ہیں یہ چیزیں ان کے حکم کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں ؎

اوست سلطان ہرچہ خواہد آن کند عالمے را در دمے ویراں کند

(بادشاہ وہی ہے جو چاہے وہ کر ڈالے چاہے تو پوری دنیا کو ایک دم میں ویران کر دے)

کیا انتہا ہے قدرت کی فرماتے ہیں قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ط (آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابل کسی کو کچھ اختیار ہے؟ اگر وہ چاہے تو مسیح بن مریم (علیہما السلام) اور ان کی والدہ (مریم علیہا السلام) کو اور تمام مخلوق کو ہلاک کر دے) کہ اے عیسائیو بتلاؤ کہ کس کو قدرت ہے کہ وہ خدا کے مقابلے میں آسکے اگر ان سب کو ہلاک کر دیں تو دیکھئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کس طرح تحت قدرت فرمایا ہے جب یہ ہے تو فقیر درویش جن کے تعویذوں پر ناز ہے وہ تو کیا چیز ہیں اسی لئے ناز کرنا بھروسہ کرنا سب بیجا ہے۔ البتہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ خدا کو راضی رکھو اور احکام پر عمل کرو خصوص بہت جلد نمازیں شروع کر دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نماز پڑھنے سے کوئی مرے گا نہیں۔ مرے گا تو ضرور مگر اطاعت میں فائدہ یہ ہوگا (میں اس سے ایک شبہ کو دور کرنا چاہتا ہوں کہ اصلی سبب تو نزول بلا کے گنہگار لوگ ہوتے ہیں۔ جب حدیث شریف میں یہاں تک ہے کہ ظالم کو سرخاب تک کوستا ہے کہ اس کے

سبب قحط پڑتا ہے۔ جس سے جانوروں کو بھی تکلیف پہونچتی ہے مگر باوجود اس کے آتی ہے مصیبت سب پر تو اس صورت میں بظاہر اطاعت بیکار معلوم ہوتی ہے یہ ہے شبہ مگر جواب یہ ہے کہ اطاعت بیکار نہیں بلکہ اُس سے فائدہ یہ ہوتا ہے) کہ مطیع اس مصیبت سے پریشان نہیں ہوگا اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ کہ اگر ماں کی گود میں ہو تو اس کو کسی واقعہ سے پریشانی نہیں ہوتی خدا تعالےٰ ہمارے مربی ہیں ان کا جس قدر قرب ہوگا اسی قدر زیادہ اطمینان ہوگا خواہ کچھ ہی ہوا کرے جیسے ماں کے پاس بچہ اسی قدر کے حافظ عن التشویش ہوتے پر ایک حکایت یاد آئی۔ افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ جب آسمان کمان ہے اور حوادث تیر اور خدا کمان انداز ہو تو آدمی کہاں جاکر بچے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو کہنے لگا کہ بیشک آپ نبی ہیں یہ علوم حضرات انبیاء ہی کا حصہ ہے۔ تو خدا تعالےٰ کا قرب جب ہوگا مصیبت نہیں آسکتی یعنی حقیقت مصیبت نہ آئے گی گو صورت مصیبت آئے وہ باطن میں بالکل مسرور ہوگا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میری توبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ ایام قحط میں میں نے ایک غلام کو دیکھا کہ نہایت ہی خوش ہے میں نے اس سے پوچھا کہ یہ تو قحط اور تو ایسا خوش ہے کہنے لگا کہ میں فلاں شخص کا غلام ہوں میرا کھانا کپڑا اُس کے ذمہ ہے اور اس کے پاس ایک گاؤں ہے اس سے آمدنی آجاتی ہے وہ اس میں سے مجھے دونوں وقت کھانے کو دیتا ہے اس لئے میں بالکل بے فکر ہوں یہ سن کر اُس کے دل پر ایک چوٹ لگی کہ تیرے مالک کے پاس تو زمین و آسمان کے خزائن ہیں اور پھر تو اس قدر فکر مند ہے تو واقعی جب خدا سے قرب بڑھ جاتا ہے بے فکری ہو جاتی ہے۔ دیکھئے معمولی غنی کے قرب کے سبب کیسی بے پروائی ہو جاتی ہے تو غنی حقیقی کے تعلق میں تو یہ حالت بدرجہ اولیٰ

ہونی چاہئے ؂

موحّد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس　　ہمیں ست بنیاد توحید وبس

(موحّد کے پیر پر چاہے تو سونا ڈالے مشہور اور خالص تلوار ہندی لوہے کی اس کے سر پر رکھے یعنی وہ بالکل مستثنیٰ ہے اس کو کسی شخص کا ڈر نہیں ہے اور نہ اُس کو امید ہے بس توحید کی بنیاد یہی ہے کہ انسان خدا کے سوا بے پروا ہو جاتا ہے)

ایک بزرگ ہیں صحابی یا تابعی انھوں نے لوگوں کو دیکھا کہ بھاگ رہے ہیں پوچھا کیوں بھاگ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ طاعون سے بھاگ رہے ہیں آپ نے فرمایا: یَاطَاعُوْنُ خُذْنِیْ اِلَیْكَ آخر ان کا انتقال طاعون میں ہو گیا۔ جب قرب ہوتا ہے تو یہی حالت ہوتی ہے کہ دوست کی بلا کی آرزو کرنے لگتا ہے اسی کو عراقی کہتے ہیں ؂

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(کسی دشمن کا نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت چاہئے اس لئے کہ تو خنجر آزمانے والا ہے)

یعنی دوست کیا تھوڑے ہیں پھر بیقدر دشمن کو طاعون کیوں عنایت کیا جائے یہ تو اطاعت والوں کا حال ہوتا ہے اور نافرمانی میں ہر حال میں پریشانی

ع ھٰذا للاقویاء علی المصائب والبلواء کما ورد فضل طلب الشھادۃ لھم فی الحدیث ولٰکن لایجوز للضعفاء ولھم ان یطلبوا عافیۃ الدنیا والاٰخرۃ والشھادۃ بالطاعون کالشھادۃ باعلاء کلمۃ اللہ رأسا برأس لافرق بینھما ھٰذا کلہ جاء فی الحدیث کما فصلہ فی فتح الباری شرح البخاری

احمد حسن سنبھلی عفی عنہ

ہوتی ہے حیات میں بھی اور مرنے کے وقت بھی مطیعین کی ایک حکایت یاد آئی۔ تھانہ بھون ہی میں ایک طالب علم کا انتقال ہوا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی چونکہ کئی طالب علم طاعون میں مر چکے تھے اِن کا ارادہ وطن جانے کا تھا اس میں مبتلائے طاعون ہو گئے دوسرے طالب علموں کو خیال ہوا کہ یہ تو گھر جانے والے تھے اب ان کو سخت پریشانی ہوگی چنانچہ ان کی تسلی کے لئے کہا کہ تم اچھے ہو جاؤ گے کہنے لگے کہ یوں مت کہو اب تو یہ دعا کرو کہ خدا بخیریت اپنے پاس بلالیں۔ اب تو اللہ میاں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ایمان پر خاتمہ کی تمنا ہے۔ ایک میرے دوست تھے مولوی احمد علی وہ گورکھپور میں مدرس تھے ان کی بیوی وہاں ہی مبتلائے طاعون ہوئی یہ اس کے علاج کے واسطے قنوج اس کے میکے میں لائے وہ اچھی ہوگئی اور یہ خود مبتلائے طاعون ہو گئے ایک روز اسی حالت میں لیٹے ہوئے تھے اچانک اٹھ کر پائنتی کی طرف بیٹھ گئے اور کسی کو خطاب کر کے سرہانے بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر یہ کہا کہ چلنے کے لئے حاضر ہوں مگر وقت نہیں آیا بارہ بجے کا وعدہ ہے اس وقت چلوں گا لوگوں نے ہذیان سمجھا مگر ٹھیک بارہ بجے روح نکلی۔ حضرت واللہ یہ سب اطاعت کی برکت ہے۔ اطاعت کرنے والے کے پاس بھی پریشانی نہیں آتی پس ایک تو اطاعت میں یہ فائدہ ہے دوسرے یہ کہ طاعون ان کیلئے رحمت ہے اور رحمت ہی کے یہ آثار ہیں پس اطاعت کرنے والے کو گو طاعون ہی کیوں نہ ہو مگر یہ دولتیں کیا تھوڑی ہیں جن سے عاصی محروم ہے غرض اطاعت سے اول تو بلیات نہ آئیں گی اور اگر کسی مصلحت سے آ بھی گئیں تو پریشانی سے بچیں گے یہ جواب ہو گیا شبہ کا۔

اب میں اصل مقصود کا خلاصہ پھر اعادہ کرتا ہوں کہ میرا یہ مطلب ہے السعید من وعظ بغیرہ سے کہ دوسرے کی مصیبت دیکھ کر اس گناہ سے بچو کہ جس کی وجہ سے اس پر مصیبت آئی۔ بس اب ختم کرتا ہوں اور خدا تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق (تمام مسلمانوں کو اور ناشر کو) دے آمین برحمتك یا ارحم الراحمین

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد چہارم

کا

پانچواں وعظ ملقّب بہ

طلبُ العِلم

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:- محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ——— دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ؁
ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم کا

پانچواں واعظ ملقّب بہ

طَلَبُ العلم

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
پختہ گڑھی مکان امام علی خانصاحب	۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۰ھ بعد مغرب	۲ گھنٹے	بیٹھ کر	ضرورت طلب علم دین	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم تھانوی	تقریباً ۱۵۰ آدمی	عورتوں کا مجمع بھی تھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

وَسَلَّمَ۔ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا۔

یہ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ اس وقت پڑھے گئے اس میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک نہایت سچا واقعہ جو نتیجہ خیز ہے اور جس سے ایک امر مہتم بالشان پر تنبیہ فرمایا ہے اور مہتم بالشان ہونے کے ساتھ ہم کو اُس سے غفلت بھی ہے بیان فرمایا ہے یعنی وہ مضمون نہایت ضروری ہے اور اس سے زیادہ ضروری ہونے کا کیا مرتبہ ہوگا کہ وہ باوجودیکہ مفید ہے مگر لوگ اس سے غافل ہیں۔ اس حدیث میں ایسا ہی مضمون بیان کیا ہے اس لئے بیان کے لئے اس کو اختیار کیا گیا۔ اسی کی شرح سے اس کا مفید ہونا اور اُس سے ہمارا غافل ہونا معلوم ہو جائے گا کیونکہ اپنی حالت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دو باتوں کی ضرورت ہے ایک امر واقعی پر مطلع ہونے کی دوسرے اس امر واقعی کے متعلق اپنی حالت پر مطلع ہونے کی اس طرح سے کہ ہماری حالت کیا ہے دوسرے یہ کہ کیا ہونا چاہیئے اس سے مضمون کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے گا۔

ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ دو حریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ طالب علم کا اور طالب دنیا کا۔ حرص کا خاصہ ہے کہ جس قدر چیز بڑھتی جائے اس کی طلب بڑھتی جائے پس اس حدیث میں دو حریصوں کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کا بھی پیٹ نہیں بھرتا ایک تو طالب علم یعنی دین کا طلب کرنے والا کیونکہ علم شارع علیہ السلام نے اُسی کو قرار دیا ہے باقی علم دنیا اگر دہ مُعین ہو جائے تو علم ہے ورنہ نہیں۔ اس کی ایسی مثال سمجھو کہ لکڑی باوجودیکہ کھائی نہیں جاتی اور نہ وہ کھانے میں داخل ہے لیکن چونکہ کھانے میں معین ہے اس لئے اس کو بھی کھانے کے حساب میں شمار کرتے ہیں کہ جب کھانے کا حساب ہوتا ہے تو یہ بھی حساب ہوتا ہے کہ ایک روپیہ ماہوار کی لکڑیاں صرف ہوئیں اور کھانا سب ملا کر پانچ روپیہ میں پڑا۔ اب اگر کوئی کہے کہ کیا لکڑیاں

بھی کھاتے ہو تو اس کو دیوانہ بتلائیں گے اور کہیں گے کہ معین بھی تابع ہو کر مقصود میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر علوم معاش معین ہوں تو ضمناً ان کو بھی اُسی میں داخل کر دیں گے۔ لیکن اصل علم دین ہی ہے اور جو نہ علم دین ہو اور نہ معین ہو وہ جہل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ لَجَهْلًا (علم کا بعض حصہ جہالت ہے) کہ اس کا نام تو علم ہے اور حقیقت میں وہ جہل ہے اس میں وہ علم دین بھی جس پر عمل نہ ہو خاص اس بدعمل کے اعتبار سے داخل ہے اور علم دنیا میں جبکہ معین نہ ہو۔ بہرحال مقصود عمل ہے اور جب یہ نہ ہو خواہ علم دین ہو اور عمل نہ ہو اور خواہ علم دین ہی نہ ہو کہ اس سے عمل بالشریعۃ ممکن ہی نہیں تو یہ سب جہل ہیں۔ چنانچہ کسی کا قول ہے۔

ع علمی کہ رہ بہ حق ننماید جہالت است

(وہ علم جو حق کا راستہ نہ دکھلائے جہالت ہے)

اس وقت گو اصطلاح میں ان کو علوم کہا جاتا ہے مگر شارع کی نظر میں وہ علم نہیں جیسا اہل دنیا کی نظر میں بہت سے علوم خسیسہ علم نہیں جیسا غلیظ اٹھانا کہ کوئی متمدن اس کو علم نہ شمار کرے گا باوجودیکہ وہ بھی بالمعنی الاعم علم ہے مگر فن خسیس ہونے کی وجہ سے اس کو علم کی فہرست سے خارج کر دیا کیونکہ باتفاق عقلاً علم وہ ہے جس میں کوئی وجہ شرف کی بھی ہو تو شارع علیہ السّلام کے نزدیک چونکہ سوائے علم دین کے اور دوسرے علوم میں کوئی شرف نہیں لہذا ان کو علوم میں شمار نہیں کیا اور اس باب میں شارع علیہ السلام اور ان کے متبعین پر تعصب کا الزام نہیں لگ سکتا کیونکہ آپ جیسا جواب دیں گے۔ مہتر کے علم کو علم نہ کہنے میں وہی شارع علیہ السلام جواب دیں گے اسی لئے میں نے علم کے ترجمے میں دین کی قید لگا دی تھی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان دو شخصوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا ایک طالب علم دین دوسرا طالب دنیا یہ ایک واقعہ ہے جس کو ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے مگر مقصود صرف واقعہ کا

بیان کرنا نہیں کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں اور شارع علیہ السلام کا دامن تقدس اس دھبّہ سے پاک ہے کہ وہ محض فضول باتوں کو بیان کریں بلکہ میں غور کرتا ہوں تو یہ کلیّہ پاتا ہوں کہ جتنے جملِ خبریہ شارع علیہ السلام کے کلام میں ہیں وہ مِنْ حَیْثُ ہِیَ خبرٌ مقصود نہیں. بلکہ ہر جملہ خبریہ سے کوئی جملہ انشائیہ مقصود ہے. خواہ وہ عقائد میں سے ہو یا اعمال میں سے۔ پس جب کوئی جملہ خبریہ دیکھے سمجھے کہ مقصود اس سے کوئی جملہ انشائیہ ہے حتیٰ کہ قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ ٥ (آپ فرما دیجئے اللہ تعالیٰ ایک ہے) میں بھی ایک جملہ انشائیہ مقصود ہے کہ یہ اعتقاد رکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ہمارا علاج کرتے ہیں۔ طبیب کا یہ کہنا کہ تم کو تپ دق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کا علاج بہت جلد کرو۔ تو جب شارع علیہ السلام ہمارے طبیب ہیں تو انھوں نے یا تو دوا کی خاصیت بیان کی ہے یا مرض کی خبر دی ہے اور دونوں سے مقصود انشا ہی ہے لہٰذا ہر عاقل پر ضرور ہے کہ ہر جملہ خبریہ سے انشا کا پتہ چلالے۔ پس یہاں بھی ایک جملہ انشائیہ مراد ہے تو اس خبر سے کہ ان دو حریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا بعد انضمام مقدماتِ خارجیہ کے کہ حرص دنیا کی مذموم ہے اور حرص علم کی محمود۔ ایک میں جملہ انشائیہ اُتْرُکُوْا اور دوسرے میں اُطْلُبُوْا نکلا۔ مزید توضیح اِس دعوے کی کہ مقصود اس خبر سے انشا ہے یہ ہے کہ ان دونوں حریصوں کا سیر نہ ہونا ایک امر مشاہد ہے چنانچہ دنیا کی نسبت تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جب اس کی طلب ہوتی ہے تو واقعی ہرگز پیٹ نہیں بھرتا اور حدیث میں بھی ہے کہ اگر آدمی کے پاس دو نالے مال کے ہوں تو یوں چاہے گا کہ تیسرا اور ہو اور دو ندیوں کے ہونے سے یا تو یہ مراد ہے کہ خود چاندی سونے کا نالہ بہنے لگے اور یا یہ مراد ہے کہ جہاں وہ ندیاں ہوں اس جگہ مال بھرا ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را ۔۔۔ یا قناعت پُر کند یا خاک گور

(اس نے کہا کہ دنیا دار کی تنگ آنکھ کو یا تو قناعت پُر کر سکتی ہے یا قبر کی مٹی ہی اُسے بھر سکے گی)

حدیث میں ہے لَا یَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلَّا التُّرَابُ (ابنِ آدم کا پیٹ صرف مٹی ہی بھرے گی) یہ حدیث میں بھی ہے اور بزرگوں کے کلام میں بھی اور مشاہد بھی ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں کہ لوگ تعلیم بھی کرتے ہیں حرص دنیا کی جس کا نام ترقی رکھا ہے کہتے ہیں کہ دنیا کی ترقی کرو اور قناعت نہ کرو۔ میں دنیا کی ترقی کو منع نہیں کرتا مگر دنیا کو قبلۂ توجہ بنانے سے روکتا ہوں کسبِ دنیا منع نہیں ہے لیکن طلب دنیا منع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ (حلال کمائی مستقل فریضہ ہے) فرمایا اور حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ (دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے) بھی فرمایا تو کسبُ الدنیا دنیا نہیں طلب الدنیا دنیا ہے جہاں یہ پیدا ہو جاتی ہے قناعت رخصت ہو جاتی ہے اور طمع غالب ہو جاتی ہے اسی پر میں ملامت کرتا ہوں اور یہی خدا کے نزدیک بھی ناپسندیدہ ہے اور اس کی خرابیاں بھی مشاہد ہیں۔

اسی طرح طلب علم میں بھی اہلِ علم کے حالات کے تتبع سے معلوم ہے کہ اس کا بھی کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ کتنا ہی بڑے سے بڑا علاّمہ ہو مگر پھر بھی ہر مسئلہ کی تلاش کرے گا اور کبھی قناعت نہ ہوگی اور جب تلاش سے معلوم ہوگا تو حظ ہوگا تو یہ بھی مشاہد ہے پس جب دونوں مشاہد ہیں تو ان کے خبر دینے سے کیا غرض ہے۔

یہ خبر دینا بظاہر تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے پاک ہے پس معلوم ہوا کہ مقصود اس خبر دینے سے کچھ اور ہے اور وہ یہی ہے کہ ایک حرص کے ترک کا امر اور ایک حرص کے اختیار کا امر اور اس میں ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں دو چیزوں کو فرمایا طالب علم اور طالب دنیا تو مضاف الیہ دو ہیں جن کو ایک دوسرے کے مقابلے میں فرمایا ہے اور چونکہ متقابلین تقابل کے درجے میں جمع نہیں ہوا کرتے اس لئے

اس مقابلے سے معلوم ہوا کہ دنیا اور علم کی طلب جمع نہیں ہوتی۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ کہ علم کا سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے یہ دوسرا مقدمہ ہوا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ طلب علم سے تو بوجہ فرضیت کے کبھی تقاعد کرنا نہ چاہیئے اور چونکہ طلب دنیا اس کے ساتھ جمع نہیں ہوتی اس لئے اس کو طلب دنیا نہ چاہیئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ بات فرما دی کہ اصلی کام مسلمان کا علم دین کا طلب کرنا ہے اور اس سے اُن کی غلطی ظاہر ہوئی جو علم دین کو چھوڑ کر دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور میں اس تقریر سے کسب دنیا کو منع نہیں کرتا کسب وہ ہے کہ جس میں نقصانِ دین نہ ہو اور طلب وہ ہے جس میں دین مغلوب یا گم ہو جائے تو اصلی چیز مطلوب علم دین ہونا چاہیئے اور علم دنیا ہو تو اس کا معین ہو۔ دیکھو جب ایک شخص گھوڑے کی خدمت کرتا ہے تو اصلی غرض قطع مسافت ہوتی ہے کہ یہ کھا کر قطع مسافت کریگا اور گھاس دانہ دینا مقصود بالعرض ہوتا ہے اب اگر کوئی شخص گھوڑے کو کھلائے اور اس سے کام نہ لے تو کہا جائے گا کہ اس نے گھوڑے کو قبلۂ توجہ بنا رکھا ہے اور سب اس کو بیوقوف کہیں گے کہ مقصود بالغیر کو مقصود بالذات بنا لیا۔ غرض گھوڑے کی خدمت منع نہیں مگر جب اصل مقصود میں مزاحم ہو تو روکا جائے گا۔ اور مشورہ نیک دیا جائے گا۔ اسی طرح کسب دنیا اس درجہ میں کہ مزاحم نہ ہو طلب دین پر غالب نہ ہو تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں اسی کو فرماتے ہیں کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ (فرائض کے بعد کسب حلال مستقل فریضہ ہے) اور عجب نہیں کہ یہ بعدیۃ اسی اشارہ کے لئے ہو کہ یہ تابع ہے کیونکہ اس میں بعدیۃ رتبیہ ہے اور تابع رتبہ میں متبوع کے بعد ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ یہ تابع ہے اسی پر تنبیہ فرمایا ہے اس حدیث میں۔ مگر اس کے متعلق اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ اس وقت مسلمان بہت کم طلب علم میں اہتمام کے ساتھ مشغول ہیں اور دنیا میں بہت زیادہ مشغول ہیں بعض کی تو یہ کیفیت ہے کہ مہینوں میں بھی ان کو نوبت

نہیں آتی کسی مسئلہ کے دریافت کی۔ کیا ان لوگوں کو کبھی کوئی شبہ نہیں پڑتا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے بہت سے کاموں کو دین سے خارج کر رکھا ہے مثلاً معاملات معاشرت اخلاق کے بہت کم لوگ ہیں کہ جائداد خریدکر یا بیچ کر کسی مولوی کو اس کا مسودہ دکھلاتے ہوں کہ کوئی معاہدہ اس میں خلاف شریعت تو نہیں یوں سمجھ رکھا ہے کہ اس کو دین سے کیا واسطہ۔ صاحبو! دین ایک قانون الٰہی ہے اس کو یاد رکھئے۔ اب سنئے کہ معاملات میں کیا قانون کی ضرورت نہیں اگر ایسا ہے تو بلا لیسنس افیون بھی فروخت کرنے کی جرأت کرنی چاہئے اگر کوئی ایسا کرے تو کیا اس میں دست اندازی قانون کی نہ ہوگی کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو قانون سے کیا واسطہ۔ کیا یہ عذر چل سکے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ کہا جائے گا کہ حاکم ہر امر میں دست اندازی کر سکتا ہے تم محکوم ہو اور گورنمنٹ حاکم اور حاکم کو اختیار ہے کہ جو قانون جس طرح چاہے مقرر کرے گو کسی کو ناگوار ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ حاکم وقت جمہور کی مصلحت پر نظر کرتا ہے لہٰذا بعض قوانین گو بعض کو ناگوار ہوں مگر جمہور کے لئے از بس مفید ہوتے ہیں اس لئے باوجود بعض کی ناگواری کے پھر بھی حاکم کو صاحب اختیار اور صاحب عدل سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح خداوندی قوانین کو سمجھنا چاہئے۔ تعجب ہے کہ حاکم مجازی کو تو یہ اختیار ہو کہ اور آپ اس کی ضرورت کو بھی تسلیم کریں اور خدائے تعالیٰ کو اعتقاداً یا عملاً اس کا مختار نہ سمجھا جائے اور اپنے کو ان پر عمل کرنے میں مجبور نہ قرار دیا جائے۔ صاحبو! جب گورنمنٹ کے متعلق یہ کہہ دینا کہ فلاں امر میں گورنمنٹ کے قانون سے کیا واسطہ بے وقوفی ہے تو خدا تعالیٰ کے قوانین کے متعلق یہ کہہ دینا کیوں بیوقوفی نہ ہوگا یاد رکھو کہ ہر امر میں قانون شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے ہم کسی امر میں آزادِ محض نہیں اور وجہ اس آزاد سمجھنے کی یہ ہے کہ شریعت کا علم نہیں اور پوچھتے اس اس لئے نہیں کہ علی العموم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ شریعت میں ہر جگہ لَا یَجُوْزُ ہے تو پوچھ کر کون مصیبت میں پڑے کیونکہ نتیجہ سوال تو ہم کو پہلے

سے معلوم ہے کہ لَا یَجُوْزُ جواب ملے گا۔ حالانکہ یہ بڑی بھاری غلطی ہے کیونکہ شریعت کو لوگوں سے ضد نہیں بلکہ اس میں مباحات بھی نکلیں گے البتہ اگر چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی معاملات پوچھوگے جو ناجائز ہوں گے تو ان میں لَا یَجُوْزُ ضرور ہی کہا جائے گا۔

جیسے مثلاً طبیب سے کوئی مریض تمام مضر ہی اغذیہ کے کھانے کو پوچھے تو وہ ہر ایک کے استعمال سے منع کرے گا۔ اب اگر کوئی کہنے لگے کہ یہ طب تو نہایت تنگ ہے تو یہ اس کی غلطی ہے طب ہرگز تنگ نہیں بلکہ تم نے چھانٹ کر اغذیہ ہی وہ انتخاب کی ہیں جو مضر ہیں۔ اسی طرح جب ہم نے اپنے تمام معاملات تباہ کر دیئے اور صبح سے شام تک ناجائز ہی معاملات کرنے لگے تو شریعت ان کو کیسے جائز کہدے گی تو یہ تنگی شریعت میں نہیں بلکہ تمہارے عمل میں تنگی ہے۔

اگر کہو کہ جب سب کے سب ان ہی معاملات میں مبتلا ہیں تو ہم کیسے چھوڑ دیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر شریعت کو کیوں الزام دیتے ہو اپنے کو یا اور لوگوں کو الزام دو۔ غرض اس خیال سے مسائل نہ پوچھنا بناء الفاسد علی الفاسد ہے جب پوچھوگے تو پھر معاملات دنیوی میں یوں نہ کہوگے کہ اس کو شریعت سے کیا واسطہ۔

صاحبو! یہ کہتے ہوئے شرم آنا چاہئے کہ شریعت سے اس کو کیا تعلق ذرا فقہ کی کوئی کتاب پڑھ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ شریعت نے ہر چیز سے تعرض کیا ہے۔ علیٰ ہذا معاشرت کو بھی لوگوں نے شریعت سے خارج سمجھ رکھا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ فلاں وضع جائز ہے یا ناجائز اور فلاں قسم کا طرز و انداز حلال ہے یا حرام۔ بس سستا سا شیخ کا فتویٰ یاد کر لیا ہے کہ

ع: در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش
(نیک عمل کرنے میں پوری کوشش کر اور جو چاہے پہن)

یں کہتا ہوں کہ اگر ہر چہ خواہی پوشش ایسا عام ہے تو ذرا مہربانی کر کے زنانے کپڑے بھی پہن کر دکھلا دیجئے اور بیوی صاحبہ کو اپنے مردانے کپڑے بھی پہنا دیجئے۔ اگر آپ ایسا کر لیں تو پھر ہم وضع کی نسبت فتویٰ دینا چھوڑ دیں اور سب اہل فتویٰ سے بھی یہ کہہ کر چھڑ وا دیں گے کہ اب معاملہ بہت دور پہونچ گیا ہے۔ اور اگر فتوائے شیخ کے عموم سے یہ مستثنیٰ ہے تو کیا وجہ کہ جس وضع کو شریعت منع کرے وہ اُس کے عموم سے مستثنیٰ نہ ہو۔ اسی طرح کھانے کی چیزیں کہ ان میں بھی بہت سی چیزوں کو شریعت سے بے تعلق سمجھا جاتا ہے مثلاً آج کل آموں پر پھول آرہا ہے مگر ہزاروں آدمی اسی وقت سے بیچ رہے ہوں گے حالانکہ اس وقت کا فروخت شدہ غصب کے حکم میں ہے اس کا خریدنا آگے کو بھی جائز نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تمام بازار حرام سے بھرا ہوگا اور سب لوگ حرام کھائیں گے اور جب یہ حالت ہو تو نماز روزہ میں کہاں سے حلاوت ہو۔

صاحبو! اگر حلال غذا ہو تو پھر دیکھو کہ نماز روزے میں کیسی حلاوت ہوتی ہے۔ بعض قصبات میں یہ غضب ہے کہ کھانے کی چیزوں کا نرخ ظلماً مختلف کر رکھا ہے۔ مثلاً گوشت کہ غریبوں کا اور نرخ ہے اور رئیسوں نے اپنا اور نرخ مقرر کر رکھا ہے اور دونوں وقت اس حرام غذا سے پیٹ بھرتے ہیں اور اپنے جی کو سمجھا رکھا ہے کہ یہ ہمارے مکانوں میں رہتے ہیں یا ہماری گھاس چراتے ہیں۔ صاحبو! جی کو سمجھانا تو بہت آسان ہے مگر یہ دیکھئے کہ یہ عذر واقع میں چل بھی سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کے قانون میں کیوں جی کو نہیں سمجھا لیا جاتا ذرا کسی مولوی سے پوچھا تو ہوتا کہ یہ سمجھ کر سستا گوشت خریدنا جائز بھی ہے یا نہیں اور آیا مکان کا کرایہ اس طور سے ٹھہرانا درست ہے یا نہیں یا چرائی کے عوض میں گوشت لینا جائز بھی ہے یا نہیں۔

رہی یہ بات کہ اس کے حرام ہونے کی وجہ کیا۔ سو اول تو وجہ سمجھنے کی

ضرورت نہیں۔ سہارنپور میں اسی وجہ سمجھنے کے متعلق ایک عجیب لطیفہ ہوا کہ بہشتی زیور کے ایک مسئلے کے متعلق ایک صاحب نے وجہ پوچھی میں نے کہا کیا آپ کو سب مسائل کی وجہ معلوم ہے اگر ہے تو مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں دو چار کی وجہ پوچھوں اور اگر معلوم نہیں تو چلو اس مسئلے کی بھی وجہ معلوم نہ سہی۔ پھر ایک اور صاحب تشریف لائے وہ اپنے نزدیک بُوجھ بُجھکر تھے۔ کہنے لگے کہ اگر آپ اس مسئلے کو مجمع عام میں صاف ہی کر دیں تو کیا حرج ہے۔ میں نے کہا کہ آپ حکم کرتے ہیں یا مشورہ دیتے ہیں۔ کہنے لگے کہ مشورہ ہے۔ میں نے کہا کہ بس آپ اپنا فرض ادا کر چکے اب مجھے اختیار ہے کہ مشورہ پر عمل کروں یا نہ کروں آپ تشریف لے جایئے۔ غرض اول تو وجوہِ مسائل کے درپے ہونا یہ بڑا خبط ہے۔ دیکھو اگر جج کوئی فیصلہ کرے تو ملزم کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس قانون کی وجہ دریافت کرے جس کی بناء یہ فیصلہ ہوا ہے اور اگر پوچھے تو کان پکڑ کر نکالدیا جائے گا اور حاکم کہے گا کہ ہم عالم قانون ہیں واضع قانون نہیں اس لئے ہم کو نہ وجہ معلوم ہونا ضرور نہ ہمارے ذمہ بتلانا ضرور۔ تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم عالم قانون ہیں ہمارے ذمہ اس کے وجوہ اور اسرار کا بتلانا نہیں ہے۔ نہ تو ہم جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو بتلاتے نہیں۔ غرض بعض لوگ اس وجہ سے بھی رُکے ہوئے ہیں مسائل پر عمل کرنے سے کہ وہ ان کو بظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔

ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک شخص ہمارے مکان میں رہتا ہے تو ہم کو کرایہ میں اس سے سستا گوشت لینا درست ہے مگر بات یہ ہے کہ کرایہ کے شرعاً کچھ قانون ہیں چونکہ یہ اس پر منطبق نہیں لہذا درست نہیں۔ غرض اول تو ہم اسرار جاننے کا دعوےٰ نہیں کرتے دوسرے لوگ اُن اسرار کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ تیسرے ہر شخص سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا بلکہ غرض زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ مجیب کو عاجز کیا جائے غرض یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ بدون پھل آتے ہوئے فروخت کرنا جائز نہیں اسی طرح مکان میں رہنے کے عوض میں جبکہ اس کے

معاوضہ کی کوئی حد نہ معلوم ہو کچھ لینا جائز نہیں اور یہ اس لئے کہا کہ اگر عوض کی کوئی حد مقرر ہو تو جائز ہے یعنی مثلاً اگر ہم نے کسی کو مکان رہنے کو دیا تو اس کا عوض لینے کی ایک تو یہ صورت ہے کہ اس سے یوں کہا جائے کہ جب ہم کو ضرورت ہوگی ایک آنہ سیر گوشت لیں گے یا جب ضرورت ہوگی تم کو بیگار میں بلا لیں گے۔ یہ تو ناجائز ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سال بھر کے خرچ کا اندازہ کر لیں اور پلا کر اس سے یوں کہیں کہ ہم چار من گوشت تک تو آنہ سیر قیمت دیں گے اور اس کے بعد پوری قیمت دیں گے یہ جائز ہے تو دیکھئے کتنی آسان صورت ہے۔ البتہ اس میں یہ ضروری ہوگا کہ سال بھر کے گوشت کا حساب یاد رکھنا پڑے گا محض من سمجھوتی سے کام نہ چلے گا کیونکہ اکثر غیر معین طور پر آتا ہے لہٰذا لکھنا چاہیئے کہ فلاں تاریخ میں پانچ سیر آیا اور فلاں میں چھ سیر اور جب سال ختم ہو جائے تو اس کو جوڑ لو اگر ایک سیر بھی زائد آیا ہو تو اس کی پوری قیمت دیدو اور محض گول مول رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

اسی طرح اور بہت سے کام ہیں جن میں غرباء اور امراء مبتلا ہیں اور ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ مثلاً چرائی کا بکرا لینا یہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ایک صاحب نے اس کے جواز کی ایک تاویل نکالی واقعی پڑھے لکھے جنوں سے بچنا بہت ضروری ہے تو یہ تاویل نکالی کہ جب ہماری زمین میں آتے ہیں تو ہم زمین کا کرایہ لیتے ہیں تو اول تو اس کام کے لئے زمین کا کرایہ لینا ہی محل نظر ہے۔ دوسرے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی کی زمین میں گھاس ہو اور وہ کسی کو بدون عوض کے نہ آنے دے اور کسی شخص کو عوض دینا منظور نہ ہو مگر گھاس کی ضرورت ہو اور دوسری جگہ بھی اسی طرح نہ ملے تو زمین والے کو شرعی حکم ہے کہ گھاس کھود کر حوالے کر دو پھر عوض لینے کا کیا حق ہوا پس یہ تاویل بھی نہیں چل سکتی اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ کھلم کھلا گناہ کرنے والا اس قسم کی تاویل کرنے والوں سے اچھا ہے کہ وہ اپنے کو گنہگار تو سمجھتا ہے۔ غرض ان خرابیوں میں اکثر بڑے چھوٹے سب مبتلا ہیں اور اول تو احتیاط چاہیئے کہ خود بھی

نہ کھائیں اور اگر خود کھائیں تو کم از کم دوسروں کو تو ہرگز نہ کھلائیں۔ میں نے تھانہ بھون میں بحمد اللہ اس رسم کو کئی گھروں سے روک دیا ہے اور یاد رکھو کہ اگر تم نے ایسا گوشت کسی کو کھلا دیا تو بے خبری میں کھانے سے اس کو گناہ تو نہیں ہوتا لیکن قلب پر تب بھی ایک ظلمت چھا جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اکثر معاملات اور معاشرت و اخلاق کو لوگوں نے شریعت سے خارج سمجھ رکھا ہے ایک اور جزئی یاد آئی یعنی سلام کرنا کہ شریعت نے حکم کیا ہے السلام علیکم کا مگر اب لوگوں نے اس کے بجائے بندگی اور آداب اختیار کیا ہے۔ بس جب کا نپور گیا تو لوگوں نے آکر بندگی کہنا شروع کیا مجھ کو بہت ناگوار ہوا کیونکہ یہ لفظ شرک کا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں اس کو ظالم بادشاہوں نے ایجاد کیا تھا اور اس سے بھی زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ لوگوں السلام علیکم کو بے تمیزی میں داخل کیا ہے۔ ایک طالب علم نے اپنے والد کو جا کر سلام کیا تو وہ کہنے لگے کہ بیٹا یہ بے تمیزی ہے اداب کہا کرو۔ صاحبو! یاد رکھو کہ سلام کو بے تمیزی کہنا کفر ہے کیونکہ سلام کو بے تمیزی کہنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو بے تمیزی کہنا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو بے تمیزی کہنے والا کافر اور واجب القتل ہے اسی طرح تمام معاشرت ہماری خراب ہو رہی ہے اور اخلاق بھی۔ اور اخلاق سے مراد ملکات نفسانیہ ہیں۔ اس میں علماء بھی مبتلا ہیں کہ ان کو بھی اپنے اخلاق کی ذرا خبر نہیں چنانچہ ہم لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ علم دین پڑھ کر ہم اس کے منتظر رہتے ہیں کہ لوگ ہم کو سلام کریں کیونکہ یہ دنیادار ہیں اور ہم دیندار ہیں نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں سو اس قسم کے لوگ متکبر ہیں اور زیادہ وجہ اس انتظار کی یہ ہوتی ہے کہ اپنے کو عالم سمجھتے ہیں مگر صاحبو! یہ کہاں لکھا ہے کہ جاہل عالم کو سلام کرے ہاں یہ لکھا ہے کہ سوار پیادے کو سلام کرے۔ آنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے مگر یہ کہیں نہیں کہ جاہل عالم کو سلام کرے بلکہ دونوں کے ذمہ برابر ضروری ہے تو یہ انتظار تکبر نہیں تو

کیا ہے۔ دوسرے ہم عالم ہی کیا ہیں راس سے اپنے کو عالم سمجھتے ہیں کہ ڈاڑھی درست ہو یا پاجامہ ٹخنوں سے اونچا ہو دو چار موٹی موٹی باتیں یاد ہوں سو ہم نے لباس کو تو درست کر لیا مگر اندر سینکڑوں خرابیاں بھری ہوئی ہیں۔ ان ہی لوگوں کے بارے میں ہے۔

از بروں چوں گور کافر پرُ حلل   و اندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین ہے اور اندر سے خدا کے عذاب کا مستحق ہے

باہر سے بایزید کو طعنہ مارتا ہے حالانکہ تیرا باطن یزید کو شرمندہ کردینے والا ہے)

اور علماء کی کیا شکایت کروں اس وقت تو فقراء بھی إلا ماشاء اللہ تکبر وغیرہ بہت سی خرابیوں میں مبتلا ہیں اور فقراء کا تکبر بہت ہی عجیب ہے کیونکہ فقیری کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اپنے کو مٹایا جائے تو یہ فقیر ہو کر بھی نہ مٹے غرض سب قابلِ الزام ہیں کہ معاشرت و اخلاق وغیرہ کو سب نے دین سے نکال دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جس کو دین سمجھتے ہیں اس کی بھی تحقیق نہیں جیسے نماز مثلاً اور ان میں بھی سب سے زیادہ خاص ان لوگوں کی شکایت ہے جو نمازی بھی ہیں کہ باوجود اس کے پڑھنے کے کوئی مسئلہ کبھی کسی عالم سے دریافت نہیں کرتے۔ خدا جانے ان کو کبھی کوئی شبہ ہی نہیں ہوتا یا خود سارے مسائل معلوم ہیں یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ سارے مسائل ان کو معلوم ہیں کیونکہ نماز کے متعلق اتنے مسائل ہیں کہ اب تک بھی مجھے کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو جو لوگ نہ لکھے نہ پڑھے ہیں ان کو کیونکر معلوم ہو گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ جی کو سمجھا لیا ہے کہ یوں بھی ہو جاتی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی طلب نہیں یہی ہے وہ مرض جس کو میں بیان کر رہا ہوں اور اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس تقریر کو پھر پیش نظر کر لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں پر طلب دین کو فرض کر رہے ہیں

اس حد تک کہ کبھی طالب کا پیٹ نہ بھرے تو ہر مسلمان پر فرض ہوا کہ کتنی ہی عمر ہو جائے۔ برابر دین کی طلب میں رہے اس سے کوئی ڈرے نہیں کہ انھوں نے تو مولویت ہی کو فرض کر دیا۔

صاحبو! حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طالب الکتاب نہیں فرمایا بلکہ طالب العلم فرمایا ہے تو احکام سے واقفیت پیدا کرو خواہ پوچھ کر یا پڑھ کر عربی زبان میں یا اردو زبان میں۔ زبان کوئی خاص مقصود نہیں ہے۔ اس پر مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ یاد آیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شیخ رومی اسعد آفندی تشریف لائے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مثنوی شریف کا درس دے رہے تھے اور اردو میں تقریر فرما رہے تھے اور وہ شیخ متلذذ تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم نے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے ہوتے تو ان کو زیادہ لطف آتا۔ حضرتؒ نے فرمایا میاں کچھ زبان کی قید نہیں اور یہ شعر پڑھا ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست — عشق را خود صد زبانِ دیگر ست

بوئے آں دلبر کہ پرّاں میشود — ایں زبانہا جملہ حیراں میشود

(فارسی کہہ اگرچہ عربی میں بولنا بہتر ہے عشق خود ہی دوسری سینکڑوں زبانوں کا عارف ہے اس دل ربا کی خوشبو جب پھیل جاتی ہے تو یہ تمام زبانیں خود حیرت میں رہ جاتی ہیں)

سو حقیقت میں خدا تعالیٰ زبان کو نہیں دیکھتے بلکہ صحّت اور غلطی کو بھی زیادہ تر نہیں دیکھا جاتا۔

کہتے ہیں:

برا شہدِ تو خندہ زند اسہدِ بلالؓ

(تیرے اشھد ان لا الہ الا اللہ صحیح اور فصیح پڑھنے پر بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اسھد غیر فصیح ہونے کے ہنسی کرتا ہے)

یہ روایت تو میری نظر سے نہیں گزری کہ حضرت بلال رضؓ اسہد کہتے تھے لیکن اگر کہتے ہوں تو وجہ اس مصرعہ کی یہ ہے کہ آجکل کا اشہد تو محض زبان تک ہے لایجاوز حناجرہم قلب پر ذرا اثر بھی نہیں ہوتا اور اللہ کے بندے جو نہ تجوید جانتے ہیں اور نہ کچھ ان کا قرآن شریف قلب اور عرش سے متجاوز ہے بلکہ عدم مہارت میں بھی دوہرا ثواب ملتا ہے کہ وہ لفظ کو ادا نہیں کر سکتا اور کوشش کرتا ہے آپ نے حکایت سنی ہوگی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک چرواہا تھا ایک مرتبہ وہ بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ اے اللہ میاں تو کہاں ہے۔ میں تجھے روغنی روٹیاں کھلاؤں اور تیرے ہاتھ پاؤں دباؤں اور آرام سے سلاؤں وغیر ذالک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کہتے سنا تو پوچھا کہ کس کو کہہ رہا ہے۔ اسی کو مولنٰا رحمہ اللہ کہتے ہیں ؎

گفت موسیٰؑ با کیستت اے فلاں ۔۔۔ ایں نمط بیہودہ میگفت آں شباں

ایں زمان و چرخ ازو آمد پدید ۔۔۔ گفت باآں کس کہ مارا آفرید

خود مسلماں ناشدہ کافر شدی ۔۔۔ گفت موسیٰؑ ہائے خیرہ سر شدی

پنبہ اندر دہان خود فشار ۔۔۔ ایں چہ کفرست ایں چہ ژاژست و فشار

(چرواہا اس بیہودہ طریقے سے کہتا تھا حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کس سے بات کر رہا ہے اس نے جواب دیا اس ذات کے ساتھ جس نے ہم کو پیدا کیا اور یہ زمین و آسمان اس سے وجود میں آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تو پاگل ہوگیا ہے تو تو مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہوگیا یہ کیا کفر کی بات ہے

لہ قال الشیخ ابوالطاہر فی مجمع البحار ان ہذہ الروایۃ لیست بثابتۃ وبلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کان فصیحا وکان مواظبًا علی الاذان فلو صدرت منہ ہٰذہ الکلمۃ لنقل انتھی حاصل کلامہ قلت ان الروایۃ المذکورۃ علی الظن الغالب موضوعۃ۔ واللہ اعلم (مجمع البحار میں شیخ ابوطاہر نے فرمایا کہ یہ روایت ثابت نہیں ہے اور حضرت بلالؓ فصیح تھے اور پابندی سے اذان دیتے تھے اگر ان سے یہ کلمہ صادر ہوتا تو ضرور منقول ہوتا یہ ان کے کلام کا خلاصہ ہے۔ یہ مذکورہ روایت غالب گمان ہے کہ موضوع ہے

اور کیا خلاف ورزی ہے تو خود اپنے منہ کے اندر روئی رکھ لے اور خاموش ہو جا)

بس حضرت یہ سنکر سناٹا نکل گیا اور بہت ڈرا کہ سب کیا کرایا غارت ہوا اور سے

گفت اے موسیٰؑ دہانم دوختی وز پشیمانی تو جانم سوختی

(خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل ہوئی کہ ہمارے بندہ

کو تو نے ہم سے جدا کر دیا تو تو ملانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جدا کرنے کے واسطے)

موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے وہاں سے ارشاد ہوا سے

وحی آمد سوئے موسیٰؑ از خدا بندۂ ما را ز ما کردی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

(خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل ہوئی کہ ہمارے

بندہ کو تو نے ہم سے جُدا کر دیا۔ تو تو ملانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جدا کرنے کے

واسطے) اور ارشاد ہوا کہ سنو سے

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم

اور

ما بروں را ننگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را

(ہر شخص کو ہم نے ایک عادت دے رکھی ہے اور ہر شخص کو اس کی خاص اصطلاح

عطا کر رکھی ہے ہم کسی کے ظاہر کو نہیں دیکھتے اور نہ کسی کے قال کو بلکہ ہم تو اس کے

اندر اس کے دل اور اس کے حال پر نظر رکھتے ہیں)

ے اگر کسی کو خدشہ ہو کہ تعلیم نبوت سے کیوں حضرت موسیٰ کو روکا گیا اور اس شبان کی خلاف شرع گفتگو کیوں پسند ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ وہ مغلوب الحال تھا تعلیم نبوت اس پر اثر نہیں کر سکتی تھی اور خوش نیت تھا لہٰذا اس تعلیم سے خوامخواہ اس کو وحشت اور پریشانی ہوئی اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو روکا گیا اور خوش نیتی کی وجہ سے یہ الفاظ مقبول تھے۔ ہر شخص جو مغلوب الحال نہ ہو اس کا اہل نہیں۔ لہٰذا بڑے اہتمام سے اتباع شریعت کرے ۱۲

احمد حسن سنبھلی عفی عنہ

تو صاحبو! خدا تعالیٰ صحیح اور غلط کے بھی مقید نہیں تو طالب علم کے یہ معنی نہیں کہ وہ عربی پڑھیں یہ تو ان کے لئے ہے جو فارغ ہوں ورنہ یہی معمول رہا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی اور تابعینؒ کا بھی کہ ضرورت کے موافق پوچھتے اور اس پر عمل کرتے تھے تو عربی نہ پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم کو طلب دین کی فضیلت نہیں ہوتی۔ حدیث میں ہے ان الملٰئکۃ لتضع اجنحتھا رضاً لطالب العلم (بیشک فرشتے طالب علم کے مقصد سے خوش ہو کر اس کے لئے جھک جاتے ہیں) یعنی ان کے لئے جھک جاتے ہیں یہ معنی ہیں تضع کے اور یہ کہیں نظر سے نہیں گذرا کہ طالب علم کے پیر کے نیچے پر بچھا دیتے ہیں اگر انہی لفظوں سے یہ سمجھا ہے تو محل کلام ہے اور اگر کوئی اور روایت ہے جو ہم تک نہیں پہونچی تو بسر وچشم۔ تو ان روایتوں کو سن کر اکثر لوگ دل شکستہ ہوتے ہیں کہ ہم کو یہ فضیلت حاصل نہیں مگر میں مطلع کرتا ہوں کہ کوئی دل شکستہ نہ ہو ہر شخص یہ فضیلت حاصل کر سکتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ معاملات عقائد وغیرہ کا اہتمام کرے اور غور کرتا رہے اور جو نہ معلوم ہو پوچھتا رہے۔ بس یہ طالب علم ہو گیا اور اس کے لئے وہی تعظیم ہو گی ہاں جو مقتدا بن جائے وہ اس فضیلت کے ساتھ نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو گا ورنہ فضیلت طالب ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے تو یہ کیا کچھ کم دولت ہے پس میں عورتوں اور مردوں دونوں سے کہتا ہوں کہ طلب علم میں جو بے فکری ہے اس کو چھوڑ دو۔ اور آج کل اگر لوگوں کو کچھ فکر بھی ہے اور پوچھتے بھی ہیں تو صرف نماز کی بابت صاحبو! سب چیزوں کی بابت پوچھو کہ یہ جائز ہے یا نہیں۔ یہ شان ہونی چاہئے مسلمان کی۔ اس میں بہت کمی ہے اس واسطے میں نے اس حدیث کو اس وقت بیان کیا اگرچہ احکام بہت سے بیان نہیں ہو سکے مگر مختصراً اصول کے طور پر جو مضامین بیان ہو گئے ہیں وہ بہت کافی ہیں نیز اس لئے بھی اس مضمون کو بیان کیا کہ میرا آنا اس وقت محض مدرسہ کی حالت دیکھنے کے لئے ہوا اور اسی لئے مجھے بلایا گیا تھا چنانچہ میں نے دیکھا اور دیکھ کر بہت ہی جی خوش ہوا

یں چند لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں اول واقفین جائداد کو دوسرے منتظین کو کیونکہ وہ معین ہیں ان کو بھی وہی ثواب ملتا ہے۔ تیسرے تمام اہل بستی کو مبارک باد دیتا ہوں کیونکہ حدیث میں اہل علم کے لئے ہے حفتهم الملئکۃ ونزلت علیهم السکینۃ کہ فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور ان پر کیفیت جمعیت کی نازل ہوتی ہے وذکرهم اللہ فیمن عندہ کہ اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ اپنے مقربین میں فرماتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے تو سب پر نازل ہوتی ہے جیسے بارش کہ جب ہوتی ہے تو سب جگہ ہوتی ہے اور اگر کوئی اسی مثال پر یہ خدشہ کرے کہ بھادوں میں بارش سب جگہ نہیں ہوتی بلکہ کچھ دور تک ہوتی ہے اور کچھ دور تک خشک رہتا ہے تو میں کہوں گا کہ اول بدل کر سب جگہ ہو جاتی ہے تو خدا کی رحمت تو اس سے بھی عام ہے پس اسی طرح اول اہل علم پر رحمت ہوگی ان کی بدولت خدا کی رحمت ساری بستی پر ہوگی تو سب کو خوش ہونا چاہئے اور قدر کرنا چاہیئے۔ مگر لوگ ڈریں نہیں کہ بس اب چندہ مانگا جائے گا۔ ہم چندہ نہیں مانگتے ہاں ایک دوسرا چندہ مانگتے ہیں وہ یہ کہ اپنے بچوں کو مدرسے میں پڑھنے کے واسطے بھیجو کہ ان کو دین کی خبر ہو اور ان کی بدولت آئندہ کو یہ سلسلہ جاری رہے یہ بچوں کا حق ہے۔ اور یاد رکھو کہ جس گھر میں رحمت ہو اور گھر والے محروم رہیں تو یہ بہت بڑی محرومی کی دلیل ہے دوسرے یہ کرو کہ جو بچے پڑھ کر آتے ہیں ان کو تاکید کرو کہ عورتوں کو سبق سنائیں اگر یہ انتظام ہو جائے تو ہر روز دو چار مسئلے ان کے کان میں بھی پڑ جائیں اور جب ہر روز یہ احکام سنیں گے تو کبھی نہ کبھی اثر بھی ضرور ہوگا۔ صاحبو! خدا کا نام بے اثر نہیں ضرور اثر ہوگا اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا مگر اس سے استدلال مقصود نہیں کیونکہ یہ امر مشاہد ہے مگر وہ نمونہ کے طور پر ایک نظیر ہے وہ یہ ہے کہ کھٹائی کا نام لینے سے منہ میں پانی بھر آتا ہے تو کیا خدا کا نام کھٹائی کے برابر بھی نہیں ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

مست ولا یعقل نہ از جامِ ہُو

اے زہو قانع شدہ بر نامِ ہُو

(وہ سالک جو ہو کے جام کو ہی کافی سمجھتا ہے وہ عقل میں ناپختہ ہے کیونکہ منزل اب بھی آگے ہے ہو کے نام پر قناعت نہ کر بلکہ جس ذات کا یہ نام ہے اس تک رسائی حاصل کرنے کا اسے ذریعہ بنا)

کہ نہ مستی ہے نہ ذوق وشوق ہے یہ تو شکایت ہے آگے فرماتے ہیں ؎

از صفت وز نام چہ زاید خیال

واں خیالت ہست دلّالِ وصال

(نام اور صرف تعریف جان لینے سے کچھ حاصل نہیں ہاں اسے وصال کا پیمبر کہا جا سکتا ہے)

کہ یہ بھی غنیمت ہے کہ اس سے بھی اثر ہوتا ہے اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ط یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ایمان بڑھ جاتا ہے اور عورتیں بھی اس پر توجہ کریں کہ روزانہ اپنے بچوں سے سبق پڑھوا کر سنا کریں اور جو بات نہ معلوم ہوا پنے مردوں سے کہہ کر علماء سے پوچھا کریں۔ کیونکہ مسائل سیکھنا تو ضروری اور ان کو اس کے مواقع بکثرت حاصل نہیں خلاصہ یہ ہے کہ اول تو یہ خیال ہر وقت رکھو کہ کونسا کام شریعت کے خلاف ہے اور کونسا شریعت کے موافق ہے اور اپنے مردوں سے کہو کہ علماء سے پوچھ پوچھ کر تم کو بتلائیں دوسرے اپنے بچوں سے سبق سنا کرو یہ بہت ہی سہل ترکیب ہے۔ یہ صورت تو عورتوں کے لئے ہے اور مردوں کو تو بہت ہی آسان ہے۔ نیز مردوں کو یہ بھی چاہیئے کہ دیکھتے رہیں کہ کوئی بات خلافِ شریعت تو عورتوں سے نہیں ہوتی اور اگر کوئی بات دیکھیں فوراً باز پرس کریں پس نعمت مدرسہ کی قدر اور شکر گزاری یہی ہے کہ دین کی تلاش میں لگ جاؤ۔ دوسرے قدر دانی یہ کرو کہ آج کل جو ہم لوگ کسی کام کو ایک ہی کے ذمہ ڈال دیتے ہیں اس عادت کو بھی چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ بہت ہی بُرا ہے۔ صاحبو! جو شخص جتنا کام کر رہا ہے

غنیمت سمجھو کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے وہ تم سب کی طرف سے کر رہا ہے سو جن باتوں میں تمہاری ضرورت ہے ان میں تم بھی شریک ہو جاؤ۔ مثلاً جو صاحب وسعت ہیں وہ اس طرح شرکت کریں کہ کچھ طالب علم یہاں باہر کے بھی رہیں اور وہ ان کی امداد کریں اگرچہ یہ ضروری ہے کہ سب بالکل باہر ہی کے نہ ہوں کیونکہ بستی کو زیادہ نفع ہونا چاہیئے تو زیادہ تو بستی کے ہوں اور چار پانچ باہر کے بھی ہوں اس میں ایک تو برکت ہوتی ہے دوسرے وہ صرف طلب علم کے لئے آئے ہیں ان کی امداد میں بڑی فضیلت ہے۔ تیسرے ان سے مدرسے کی رونق ہوتی ہے۔ چوتھے ان سے مدرسہ کی دلچسپی ہوتی ہے تو خواہ تو یوں سمجھو کہ مدرسے میں ان کی امداد کی گنجائش نہیں یا اگر گنجائش بھی ہو تو ثواب کے لئے ایک ایک آدمی کا کھانا اپنے ذمہ کر لیں یا دو آدمی ایک کا کھانا کر لیں یا دیوبند کے بعض غربار کی طرح سات آدمی ہفتہ بھر میں نوبت بنوبت کھانا دیں۔ غرض اہل بستی مشورہ کر کے کوئی طریق مقرر کر لیں اور ایک ایسے صاحب جن کو لوگ سچا سمجھیں کھڑے ہو کر فہرست لکھیں کون شخص کس طرح دے گا اور پھر دیکھ لیں کہ کتنے کھانے ہوئے اُن ہی کے موافق اجازت دیدی جائے کہ اتنے طلبہ بلا لئے جائیں اور اگر چندہ میں گنجائش ہو تو مہتمم سے لے کر بھی کچھ دیں لیکن اگر اور سب بھی شریک ہو جائیں تو اچھا ہے۔ یہ مدرسہ کے حالات تھے جن کو دیکھ کر میں نے بیان کیا اور اس لئے اس مضمون کو اختیار کیا۔ بہرحال اس مضمون سے آپ نے سمجھا ہوگا کہ ہم لوگوں کو واقعی مسئلوں کی تلاش نہیں ہے تو میں اس کے کئی ذریعے بتلاتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ کتابیں پڑھو پھر اس میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ عربی پڑھو تو بہت ہی اچھی صورت ہے بالخصوص نوجوان لڑکے تو ایک چھوٹا سا سبق جا کر ضرور ہی شروع کر لیں۔

صاحبو! کیا چوبیس گھنٹے میں سے ایک گھنٹہ بھی اس کے لئے نہیں ہو سکتا یہ بھی نہ ہو تو ہفتہ میں دو دن ہی سہی اور اگر عربی کی کتابیں نہ پڑھ سکیں تو یہ کریں اگر کچھ پڑھے ہوئے ہیں تو مسئلوں کی کتابیں خرید کر پڑھا کریں اور جہاں شبہ ہو اہل علم سے

پوچھ لیا کریں اور اگر بے پڑھے ہیں تو اس کے لئے یہ ترکیب کریں کہ ہر محلہ کی مسجد میں ہفتہ کا کوئی ایک دن مقرر کردیں اور کسی سمجھ دار آدمی کو مقرر کرکے ایک مسئلوں کی کتاب اس کو دیں اور کہیں کہ نصف گھنٹے تک اس کو پڑھ کر سناتا جائے اور سمجھاتا جائے اگر ہر محلہ میں ہفتہ میں ایک دن بھی ایسا ہو جائے تو اندازہ کرو کہ سال بھر میں کتنے مسئلے معلوم ہو جائیں اور پھر عمر بھر میں کتنا ذخیرہ مسائل کا اپنے پاس ہو جائے۔ اب رہ گئیں عورتیں وہ یا تو کتاب دیکھ کر پڑھیں اور اگر بے پڑھی ہیں تو مردوں سے کہیں کہ ہم کو مسائل سناؤ اور اپنے بچوں کا سبق روز سنا کریں اور اگر کسی کے بچہ نہ ہو وہ دوسرے کے بچے کو بلا کر اس سے سُنے یہ کوئی مشکل امر نہیں۔ دیکھو اگر ایک خط لکھوانا ہوتا ہے تو کیسا لڑکوں کو تلاش کیا جاتا ہے اگر بچے روزانہ نہ آسکیں تو دوسرے تیسرے دن بلا لیا کرو یہ طریقے ہیں علم دین سیکھنے کے ان میں جس کو جو آسان ہو وہ کرے اگر ایسا کیا تو ان شاء اللہ چند روز میں ہر مسلمان آدھا مولوی ہو جائے گا۔ اگر ایک ہی مسئلہ روزمرہ معلوم ہوا تو سال بھر میں تین سو ساٹھ[۳۶۰] مسئلے تو کان میں پڑیں گے پھر ان شاء اللہ ہر وقت پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ کافی ذخیرہ ہوگا اس لئے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی۔ اب پھر حدیث کو مکرر پڑھتا ہوں کہ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا اور پھر اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں کہ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ طالب دین کا پیٹ کبھی نہ بھرنا چاہئے جیسے طالب دنیا کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا اب میں ختم کرتا ہوں اور مجھے یہ امید ہے کہ چونکہ یہ کام کی بات تھی اور اسہل طور سے بیان ہوئی ہے اس لئے ان شاء اللہ اثر ہوگا اور خدا کرے کہ جب دوسری مرتبہ آؤں تو سب پر اثر دیکھوں۔ اب دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اور محمد عبد المنان ناشر کو توفیق دیں آمین ہ

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعواتِ عبدیت جلد چہارم

کا

چھٹا وعظ ملقّب بہ

تادِیبُ المُصِیبۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم کا

چھٹا وعظ ملقّب بہ

تادیب المصیبۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمینی	متفرقات
تھانہ بھون مکان منشی غیور احمد صاحب مرحوم	۵ ربیع الاول ۱۳۳۰ ہجری	ایک گھنٹہ ۱۵ منٹ	کھڑے ہوکر	مصیبت سے سبق لینا	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم	تقریباً ۵۰ آدمی	عورتیں بھی تھیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِہٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ط فَلَمَّا کَشَفْنَا عَنْہُ ضُرَّہٗ مَرَّ کَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَآ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّہٗ ط کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی بیٹھے بھی کھڑے بھی پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف اُس سے ہٹا لیتے ہیں تو پھر اپنی پہلی حالت پر آجاتا ہے کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال (بد) ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں) اس آیت میں ایک ایسا مضمون

جو اکثر لوگوں کی حالت کو عام ہے مذکور ہے نیز اس وقت خاص سے بھی اس کو مناسبت ہے اسی واسطے اس وقت یہ آیت تجویز کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا تو کوئی انسان نہیں جس کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے اور کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو انسان تحت القدرہ ہے مستقل نہیں ہے اگرچہ ہر امر میں انسان کی ایک مستقل تجویز بھی ضرور ہوتی ہے جسے اس کا ذہن اختراع کر لیتا ہے۔ مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہر امر اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ۝ یعنی انسان کو اس کی ہر تمنا نہیں ملتی۔ تمنائیں انسان کی بہت کچھ ہوتی ہیں مگر ملتی کم ہیں بلکہ جو خدا تعالٰے چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے وہی انسان کے لئے بہتر ہوتا ہے اگرچہ اول نظر میں اس کی بہتری انسان کو محسوس نہ ہو لیکن اس کے نتیجے پر اگر غور کیا جائے تو اس کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے اور اول نظر میں چونکہ حکمت پر نظر نہیں ہوتی اس لئے خلاف تمنا کو مصیبت کہتے ہیں ورنہ اگر مصلحت اور حکمت پر نظر ہو تو کوئی مصیبت مصیبت نہیں بلکہ ہر مصیبت نعمت ہے مگر مراد مصیبت غیر اختیاریہ ہے اور اسی میں گفتگو ہو رہی ہے۔ برخلاف اُن کے جن کو اپنے ہاتھوں اختیار کرتے ہیں یعنی گناہ کہ اس کو انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے سو اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اس کو گناہ اور معصیت قرار دیا گیا یعنی اس سے روکا گیا اور یہی فرق ہے درمیان فعلِ عبد اور فعلِ حق کے کہ کوئی فعل شر کا خدا تعالٰے سے صادر نہیں ہوتا فعل شر وہی ہے جو بندہ اپنے اختیار سے خلاف رضائے حق کرتا ہے تو امور اختیاریہ عبد تو خیر اور شر دونوں ہیں اور غیر اختیاری جو محض من جانب اللہ ہے وہ خیر محض ہے۔ اسی لئے عارفین نے اپنے متعلقین کو یہ تعلیم کی ہے اور اسی سے انھیں ایک استواری پیدا ہو گئی ہے کہ جس سے وہ پریشان نہیں ہوتے کہ؂

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست
در صراطِ مستقیم اے دل کسی گمراہ نیست

(یعنی درویشی کے راستہ میں چلنے والے کے سامنے خدا کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ

بہتر ہی ہوتا ہے۔ اے دل صراطِ مستقیم میں کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا)

توجو پیش آئے سب کو خیر سمجھے خواہ وہ بیماری ہو یا دشمن کا اپنے اوپر غالب آنا ہو یا فقر و فاقہ ہو یا اور کوئی مصیبت ہو غرض سب میں بہتری ہے مگر یہ بہتری ایسی ہے جیسے دوا کی بہتری شفیق ماں باپ تو جانتے ہیں کہ حلق سے اترتے ہی تریاق کا کام کرے گی۔ لیکن بچہ نہیں سمجھتا بلکہ ماں باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے کہ انھوں نے ایسی دوا پلادی یا جیسے دنبل میں نشتر دینا کہ ماں باپ خوش ہیں مگر بچہ ان کو دشمن سمجھتا ہے نشتر زن ماں باپ سے انعام طلب کرتا ہے اور بچہ تعجب کرتا ہے لیکن ہر عاقل جانتا ہے کہ واقع میں یہ کام انعام کا ہے تو بچے کے علم کو جو تفاوت ماں باپ کے علم سے ہے اُس سے بہت زیادہ تفاوت بندہ اور خدا کے علم میں ہے تو خدا تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ جس حادثہ کو بندہ مصیبت سمجھ رہا ہے اس میں کیا کیا حکمتیں مخفی ہیں چنانچہ فرماتے ہیں عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تم لوگ ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو اور در حقیقت وہ تمہارے لئے بہتر ہوتی ہے) اس پر جس کی نظر ہوگی وہ ہرگز اس کو مصیبت نہ سمجھے گا جس طرح جرّاح نے نشتر لگا کر مصیبت میں نہیں پھنسایا اسی طرح خدا تعالیٰ جو بندے کے ساتھ کرتے ہیں سب بہتر ہی ہوتا ہے مگر بندہ اس کی حکمت کو سمجھتا نہیں حالانکہ اگر ذرا غور کرلے تو بعض حکمتیں معلوم ہو بھی سکتی ہیں مثلاً یہ کہ مصیبت میں یہ خاصیت ہے کہ اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ انسان خدا کو یاد کرنے لگتا ہے تو یہ نصیب ہو جاتی ہے تنبیہ ہوتا ہے کہ فلاں امر کی وجہ سے یہ ہوا تو یہ کھلے فائدے نظر آتے ہیں مگر بعض لوگ اس کو یاد نہیں رکھتے پس اس معنی کر مصیبت نہ کہی جائے گی مگر ظاہر نظر میں وہ مصیبت ہے کیونکہ حقیقتِ لغویہ مصیبت کی یہ ہے کہ کوئی بات خلاف طبیعت پیش آئے اور چونکہ زندگی میں زیادہ واقعات ایسے ہی ہوتے ہیں اس لئے کوئی بھی مصیبت سے خالی نہیں ہے کوئی مال کی طرف سے پریشان ہے کوئی صحت کی طرف سے پریشان ہے کوئی اولاد کی طرف سے پریشان ہے۔ غرض ہر شخص کو

کوئی نہ کوئی مصیبت لاحق ہے اگرچہ ہر ایک پر اثر الگ الگ ہوتا ہے اور ایک سرسری اثر ایسا بھی ہے کہ کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں اگرچہ برائے چندے ہی اور وہ اثر تنبہ ہے اپنی بدعملی اور اپنے ضعف و عجز پر بڑا ظالم ہے وہ شخص کہ اس پر کوئی مصیبت آئے اور وہ اس پر متنبہ نہ ہو بلکہ کہنا چاہیئے کہ وہ انسان ہی نہیں ہے تو جو انسان ہوگا وہ ضرور اسی طرح متاثر ہوگا اور یہ تاثر بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ قبول حق اور رجوع عن الباطل سے بڑا استدراہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو سب سے بڑا سمجھے اسی وجہ سے یہودی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اگرچہ جانتے تھے کہ آپ پیغمبر برحق ہیں خدا کے نبی ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پیشتر ہی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے تھے حتیٰ کہ مشرکین سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ہم تمہاری خبر لیں گے جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں گے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (پھر جب وہ چیز آپہونچی جس کو خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا صاف انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکرین پر) لیکن جب آپ تشریف لائے تو آپ کی اطباع میں اپنے جاہ کا نقصان ہوتے دیکھ کر آپ کے ساتھ کفر کیا۔ سمجھے کہ آج تو ہم احبار کہلاتے ہیں مقتدا شمار ہوتے ہیں اگر ایمان لے آئیں گے تو چھوٹے ہو جائیں گے اسی طرح رؤسا مکہ شریف یہ کہتے تھے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ کہ اگر یہ کلام خدا کا کلام ہے تو کسی بڑے شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا ایک یتیم پر کیوں نازل ہوا پھر یہ کہ آپ کے پاس تمول بھی نہیں تھا ابوطالب کی پرورش میں آپ رہتے تھے اور ان کی یہ حالت تھی کہ اکثر اوقات پیٹ بھرائی نہ ملتا تھا انھوں نے چونکہ کئی مرتبہ یہ تجربہ کیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سب گھر کے لوگ کھاتے تو سب شکم سیر ہو جاتے اور اگر آپ علیحدہ تناول فرماتے تو سب بھوکے رہتے اس لئے انھوں نے یہ معمول کر رکھا تھا کہ روزانہ آپ کے ہمراہ کھانا کھاتے اور اگر کبھی آپ تشریف فرما نہ ہوتے تو ابوطالب آپ کو ڈھونڈھتے تھے کہ آپ کی برکت سے پیٹ تو بھر جائے گا تو آپ کے گھر میں کسی قسم کا تموّل بھی نہ تھا البتہ آپ حسب نسب میں

سب سے اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس میں نبوت میں کوئی دخل نہیں مگر بات یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ صاحب حسب شریف کے اتباع میں کسی کو عار نہیں آتی کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سے کس بات میں کم ہے تو حضور صلی علیہ وسلم میں یہ بات تو تھی مگر اور کوئی دنیوی فراغت نہ تھی اس لئے رؤسا کہتے تھے کہ کسی رئیس پر کیوں نازل نہ ہوا تو یہی مانع تھا۔ اور اس کی بڑی مذمت آئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رائی برابر بڑائی بھی جس کے قلب میں ہوگی وہ جنت میں نہ جائے گا[1]۔ اور اس مرض سے بہت کم لوگ خالی ہیں کم و بیش سب میں ہوتا ہے اسی مرض نے شیطان کو جس نے آٹھ لاکھ برس تک عبادت کی تھی ایک پل میں مردود بنا دیا۔ اور اسی راز کی وجہ سے حکمائے امت نے کہا ہے کہ نرے وظیفہ سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ کسی کے پاس نہ رہے کہ وہ اس کے تکبر کا علاج کرے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ محض کتابیں دیکھ کر کچھ کرتے ہیں ان کے اخلاق درست نہیں ہوتے۔ غرض شیطان نے تکبر ہی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے سبب ملعون ہو گیا محققین نے کہا ہے کہ آسمان پر سب سے پہلا گناہ یہ ہوا اور کوئی گناہ نہیں ہوا تو یہ تکبر ایسی بری چیز ہے جس قدر بھی کم ہو زیادہ۔ سو مصیبت سے ایسے بڑے مرض کا بھی علاج ہو جاتا ہے کہ اس سے تکبر بھی ٹوٹ جاتا ہے غرض یہ ہے کہ کوئی ایسا مسلمان نہیں جس پر مصیبت سے اثر نہ ہو مگر فرق یہ ہے کہ بعض لوگ تو یاد رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں اور اگرچہ بھول جانے کے یہ معنی نہیں کہ ان کو یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو قدرت نہیں رہی مگر برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہے جس سے دوسرا ناواقف یہ اخذ کر سکتا ہے۔ پس اس آیت میں اسی مرض کو ذکر کیا گیا ہے اور اس مرض کے کئی درجے ہیں بعض کو تو مصیبت آتے وقت بھی پوری طرح تنبہ نہیں ہوتا مجھے تعجب ہوا کرتا ہے اس شخص سے جو کہ مصیبت آنے پر یہ کہتا ہے کہ معلوم نہیں ہم سے کیا گناہ ہوا ہے جس کی پاداش بھگت رہے ہیں۔

---

[1] ای علیٰ سبیل الکمال وفیہ تشدید العتاب ۱۲ احمد حسن عفی عنہ

صاحبو! کونسا وقت ہے کہ ہم اس میں گناہ نہیں کرتے۔ ہم تو ہر وقت ہی گناہ میں مبتلا ہیں پھر اس سوال کے کیا معنی اور بعض کو دوسری طرز کی غفلتیں ہوتی ہیں چنانچہ ہم بس تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ کہ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم نے کچھ کیا ہے جس سے مصیبت آئی دوسرے وہ کہ ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ کیا ہے مگر پھر بھی اس کا تدارک نہیں کرتے استغفار نہیں کرتے بلکہ بعضے تو اور زیادہ گناہ کرنے لگتے ہیں میں نے جہاز میں دیکھا ہے کہ عین شدتِ طوفان کے وقت نہایت پریشانی میں بعض لوگ یا علیؓ یا علیؓ کہتے تھے اور بہت سے لوگ حضرت غوث الاعظمؒ کو پکارتے تھے میں نے اپنے جی میں کہا کہ اے اللہ یہ مشرکین عرب سے بھی بڑھ گئے۔ بلکہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں اتنی حفاظت نہیں کرتے جتنی بزرگ کرتے ہیں۔

مکہ شریف میں ایک شاہ صاحب ہمارے حافظ احمد حسن صاحب برادرزادہ حاجی صاحبؒ کے پاس آئے اور کچھ نقد امانت سپرد کی۔ انھوں نے کہا کہ بھائی اللہ کے سپرد کر دو کہنے لگے کہ یوں نہ کہو اور اس پر ایک بیہودہ حکایت نقل کر دی کہ کوئی شخص اپنی دوکان حضرت غوث پاکؒ کے سپرد کر کے چلا جاتا۔ ایک بار اس کے بھائی کو دوکان سے اٹھنے کا اتفاق ہوا تو اس نے خدا کے سپرد کر دی اسی دن چوری ہوگئی اس کے بھائی نے کہا کہ بھائی بڑے پیر کے سپرد کرنا چاہیئے تھا۔ اسی طرح کی ایک اور حکایت ہے کہ ایک قافلہ چلا جا رہا تھا رستے میں چور مل گئے قافلہ والوں نے اول اللہ میاں کو پکارا تو کچھ نہ ہوا پھر ایک بزرگ کو پکارا تو چور بھاگ گئے غضب یہ ہے کہ کتابوں میں اس قسم کی حکایات لکھدی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کافر سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا کہ سات ہیں چھ زمین میں اور ایک آسمان میں آپ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت کا خدا کون ہے اس نے کہا کہ آسمان والا۔ تو مشرکین عرب بھی مصیبت کے وقت ایک خدا ہی کو پکارتے تھے۔ مگر ہندوستان میں مصیبت کے وقت بھی دوسروں ہی کو پکارتے ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے

کہ گناہ کو یاد کر کے تدارک بھی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

اہلکاراں بوقت معزولی شبلیؒ وقت و بایزید شوند
باز چوں میر مسند بر سر کار شمر ذی الجوشن و یزید شوند

(سرکاری ملازم نوکری سے علحدہ کر دیئے جائیں تو وہ ایسے نیک بن جاتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اپنے زمانہ کے حضرت شبلیؒ اور بایزید کے جیسے بہت بڑے ولی ہیں اور پھر جب اپنی ملازمت پر آجاتے ہیں تو اس قدر برے اعمال کرتے ہیں جیسے کہ شمر جس نے حضرت امام حسینؓ کو شہید کیا اور جیسا کہ یزید تھا کہ جس کی اس وقت حکومت تھی)

یعنی جب تک مصیبت رہے اللہ بھی یاد رہے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی یاد رہے اور جب مصیبت ٹلی تو ایسے آزاد کہ گویا خدا تعالیٰ کی حدود حکومت ہی سے نکل گئے اسی کو فرماتے ہیں اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا کہ مصیبت کے وقت تو خوب پکارتا ہے اور جب مصیبت دور کر دیتے ہیں تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ گویا تعلق ہی نہ رہا اور اس کی وجہ فرماتے ہیں کَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ یعنی وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حدود سے باہر ہو گئے ہیں اور یہ خاصیت ہے کہ نیک عمل میں بصیرت ٹھیک رہتی ہے اور جب گناہ کرتا ہے تو بصیرت جاتی رہتی ہے اسی لئے فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اعمال خوش معلوم ہوتے ہیں پس علت اس کی اسراف ہے کہ اس کی وجہ سے بری باتیں مزین معلوم ہونے لگتی ہے اس کو سن کر ہر شخص اپنی حالت کو دیکھ لے کم و بیش سب کی یہ حالت ہے اور دوسری جگہ بھی ایسا ہی مضمون ارشاد ہے۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ یعنی جب مصیبت آتی ہے اس وقت تو سب کو بھلا کر کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس سے نجات ہو جائے تو ہم خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں گے مگر جب اس سے نجات ہو جاتی ہے تو اعراض کرنے لگتے ہیں آگے فرماتے ہیں وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ

لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝ یعنی تم کیا اس سے امن میں ہو گئے ہو کہ تم کو زمین ہی میں دھنسا دیں (یا تم پر کوئی ایسی تند ہوا بھیجدیوے جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ) چنانچہ قارون کو دھنسا دیا گیا تھا۔ اور اس واقعہ پر گو سب کو ایمان تھا لیکن عین الیقین نہ تھا مگر اب چند ہی سال ہوئے کہ کانگڑہ کے قریب زلزلہ میں ایک بہت بڑے حصے کو دھنسا دیا گیا کہ لوگ اب بھی دیکھ لیں آگے فرماتے ہیں یا تم پر تند ہوائیں بھیجدیں کہ پھر تم اپنے لئے کوئی وکیل نہ پاؤ غرض ہر طرح تم ہمارے قبضے میں ہو کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خیر وہ دریائی اندیشہ تو کٹ گیا اس کو فرماتے ہیں اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى (یا تم اس سے بیفکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لیجاویں) دیکھو روز مرہ یہ بات پیش آتی ہے کہ انسان ایک جگہ نہ جانے کی قسم کھاتا ہے مگر پھر مجبوراً جانا پڑتا ہے اور یہ اوپر بتلا دیا ہے کہ اگر دریا میں بھی نہ جانا ہو تو دوسری جگہ بھی تو ہلاک کر دینا ممکن ہے کیونکہ اس کی قدرت خشکی اور دریا میں برابر ہے مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک ملاح سے ایک شخص نے پوچھا کہ تمھارے باپ کہاں مرے اس نے کہا دریا میں ڈوب کر۔ کہنے لگا اور دادا۔ کہا کہ دریا میں کہنے لگا کہ پھر بھی تم دریا میں رہتے ہو۔ ڈرتے نہیں ملاح نے کہا کہ تمھارے باپ کہاں مرے کہنے لگا کہ گھر میں۔ پوچھا اور دادا کہنے لگا کہ گھر میں۔ ملاح نے کہا کہ پھر بھی تم گھر میں رہتے ہو ڈرتے نہیں تو خدا تعالیٰ کی قدرت ہر جگہ موجود ہے بلکہ دریا میں تو بہت سی تدابیر بچنے کی ممکن بھی ہیں خشکی میں اگر کوئی آفت آئے تو اس سے بچنے کی تو کوئی تدبیر ہی نہیں مثلاً اگر دو ریل گاڑیوں میں تصادم ہو جائے تو کوئی صورت بچنے کی ہو ہی نہیں سکتی برخلاف جہاز کے کہ اگر ٹوٹ جائے تو غرق ہوتے ہوئے بھی اس کو بہت دیر لگ جاتی ہے دوسرے جہاز اکثر کنارے کے قریب ہی ہوتے ہیں کہ وہاں سے مدد کا آجانا بھی ممکن ہوتا ہے تو جو شخص سمندر میں خدا سے ڈرے اور خشکی میں نہ ڈرے وہ کس قدر نادان ہے۔ دوسرے اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ سمندر ہی میں زیادہ خطرہ ہے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تعالےٰ دوبارہ سمندر ہی میں بھیجدیں اور ایک ایسی ہوا کو مسلط کر دیں کہ وہ کشتی کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے اسی کو خدا تعالےٰ

فرماتے ہیں اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی اور یہ کچھ اسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر صاحب مصیبت کو کہا جا سکتا ہے کہ کیا پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ پھر اسی قصہ میں تم کو پھنسا دیں۔ صاحبو اپنے کو کسی وقت خدا تعالیٰ کے قبضے سے نکلا ہوا نہ سمجھو۔ اور سب گناہوں کو چھوڑ دو۔ دیکھو گناہ میں مصیبت اس لئے آتی ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ ناراض ہیں یہ بات سب گناہوں کو عام ہے اگرچہ وہ کسی قسم کا گناہ ہو تو جب خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور ہر قصہ ان کے قبضہ میں ہے تو ممکن ہے کہ پھر کسی قصہ میں مبتلا کر دے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوا تو نمرود کو ایک مچھر سے پریشان کر دیا۔ اہل سیر نے لکھا ہے کہ نمرود کی یہ حالت تھی کہ جب سر پر چوٹ لگتی تھی تو چین آتا تھا تو وہ مچھر اب بھی تو موجود ہیں اور خدا تعالیٰ کو اب بھی تو وہی قدرت ہے دیکھو کہاں نمرود اور کہاں مچھر مگر خدا تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ ہمارا ایک معمولی سپاہی بھی کافی ہے۔ ایک چیونٹی اگرچہ بظاہر نہایت چھوٹی اور معمولی چیز ہے لیکن جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں تو اسی سے ہلاک کر دیتے ہیں اور جب ان کی حفاظت ہوتی ہے تو کسی سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا میں نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے کہ سر میں تیل ڈال کر سر کے نیچے رومال رکھ کر سو گیا ہوں اٹھ کر دیکھا رومال پر چیونٹیاں چڑھی ہوئی ملیں لیکن سر میں ایک چیونٹی بھی نہیں پائی گئی۔ سو اس سے بچانے والا کون ہے بجز خدا کے اور اگر وہ نہ بچائے تو ادنیٰ ذرہ پریشان کرنے کو کافی ہے۔ ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس کی ناک پر بار بار ایک مکھی آکر بیٹھتی تھی اس نے تنگ آکر کہا کہ معلوم نہیں مکھی کو کیوں پیدا کیا ہوگا وزیر نے کہا کہ اس واسطے پیدا کیا ہے کہ متکبرین کا تکبر ٹوٹے۔ حاصل یہ ہے کہ ذرا سنبھلکر خدا تعالیٰ کی مخالفت کرو تم میں تو ایک مکھی کی مقاومت کی بھی تاب نہیں بس اگر بچنے کی کوئی صورت ہے تو یہی کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ میں نے افلاطون کی ایک حکایت دیکھی ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر آسمان قوس ہو اور حوادث تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہوں تو بچکر کہاں جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز سے قریب ہو جائے کہ تیر دور والے پر چلاتے ہیں۔ افلاطون نے کہا بیشک آپ نبی ہیں کیونکہ یہ جواب سوائے نبی کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔ مگر ان لوگوں کی ایک سفاہت یہ تھی کہ اپنے لئے نبی کی ضرورت

نہ سمجھتے تھے یہ تو خدا کو معلوم ہے کہ افلاطون کا کیا عقیدہ تھا لیکن اس حکایت کو اس لئے عرض کیا کہ خدا کے ان لشکروں سے اگر بچنا چاہے تو خدا کا قرب حاصل کرے شائد اس موقع پر کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ خدا کے نیک بندوں پر بھی تو مصائب آتے ہیں پھر قرب حاصل کرنے سے کیا فائدہ۔ جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ وہ واقع میں مصیبت ہی نہیں کیونکہ مصیبت ایک تو حقیقی ہوتی ہے جس سے پریشانی ہو جائے اور پریشانی صرف اس گناہ سے ہوتی ہے اور وہ اس سے محفوظ ہیں اور ایک مصیبت صوری ہوتی ہے کہ ظاہر میں تو مصیبت ہو مگر اس سے وہ پریشانی نہیں سو یہ واقعات ان کے لئے مصیبت اس لئے نہیں کہ ان کی نظر ہر وقت مصلحت پر رہے اور وہ ہر حال میں راضی ہیں جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کو خیر سمجھتے ہیں اگرچہ اس میں کچھ تکلیف جسمانی سہنی پڑے مگر روح مسرور رہے اور جسمانی تکلیف تو سب ہی کو ہوتی ہے مگر پریشانی اور شکوہ شکایت ان میں نہیں ہوتا۔ حضرت بہلول نے ایک بزرگ سے مزاج پوچھا انھوں نے کہا کہ اس شخص کے مزاج کی کیفیت کیا پوچھتے ہو کہ دنیا میں جو کچھ ہو اس کی خواہش ہی کے موافق ہوتا ہو حضرت بہلول نے پوچھا یہ کس طرح ہو سکتا ہے انھوں نے کہا یہ تو جانتے ہو ہر بات خدا کے ارادے اور خواہش کے موافق ہوتی ہے اور میں نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا اور اس کے تابع کر دیا ہے اسی طرح پر وہ میری خواہش کے موافق بھی ہے۔ اسی طرح ایک حکایت مشہور ہے کہ پنجاب میں ایک بزرگ تھے شاہ دولا ایک مرتبہ ایک دریا گاؤں کی طرف چلا آرہا تھا لوگوں نے کہا کہ دعا کیجئے ان بزرگ نے پھاوڑوں سے کھدواکر اور بھی گاؤں کے قریب کر لیا اور پوچھنے پر فرمایا کہ جدھر مولا اُدھر شاہ دولا یہ حکایت تو بہت بڑی ہے میرا مقصود یہ ہے کہ وہ جدھر خدا کی مرضی دیکھتے ہیں اُدھر ہی ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب کے صاحبزادے پر ایک مقدمہ ہو گیا تھا ایک حافظ لکھنؤ کے کہتے تھے کہ مجھ کو تعجب تھا کہ سب کے لئے تو یہ دعا کرتے ہیں اپنے بیٹے کے معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ بس خواب میں دیکھا کہ مولانا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے

یہ عرض کر رہے ہیں کہ یا اللہ میں احمد کے بارے میں تو کچھ کہوں گا نہیں؎ جو آپ کی مرضی ہو اسی پر راضی ہوں جس کی یہ شان ہو کہ خدا کی مرضی ہو وہی اس کی مرضی ہو اس کو کوئی ناگواری کیوں پیش آئے گی پس اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ اہل اللہ پر تو مصائب نازل ہوتے ہیں۔ دیکھئے سنکھیا ایک کے لئے زہر ہے دوسرے کے حق میں شفا جس نے مدبر کر لیا ہو۔ ع درحق او شہد و درحق تو سم (اس کے حق میں شہد ہے اور تیرے حق میں زہر ہے) پس وہ لوگ اس مصیبت کا زہر مار دیتے ہیں اور خدا کی رضا اور محبت کے سبب میں مدبر کر کے اس کی ساری تیزی کھو دیتے ہیں اب نہ کہیں کڑوی ہے نہ سنکھیا زہر ہے غرض حقیقی مصیبت گناہ ہی سے آتی ہے سو چونکہ ہم میں کوئی ایسا نہیں جس پر مصیبت نہ آتی ہو اور کوئی ایسا نہیں جس کی حالت معصیت کی نہ ہو اس لئے اس وقت اسی آیت کا مختصر بیان کر دیا گیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت آئے فوراً توبہ کرو اور اسی توبہ پر قائم رہو ؎

غم چو بینی زود استغفار کن ۔۔۔ غم بامر خالق آمد کار کن

(جب تو کوئی مصیبت دیکھے فوراً توبہ کر کیونکہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے لہٰذا کام کرو)

یعنی خدا تعالیٰ کو راضی کرو یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر حکام کی جانب سے کوئی بات خلاف مرضی پیش آئے تو حکام کو برا بھلا مت کہو بلکہ خدا کو راضی کر دو وہ حکام کے قلوب کو بھی نرم کر دیں گے دیکھئے کتنی پاکیزہ تعلیم ہے یعنی اُن کے دل تو میرے قبضے میں ہیں جب میں تمہارے اعمال برے دیکھتا ہوں اور ان کے دل سخت کر دیتا ہوں۔ کسی کا قول ہے عَمَّالُكُمْ اَعْمَالُكُمْ (تمہارے اوپر جو حاکم ہیں وہ تمہارے اعمال

؎ لا یوھم ان الدعاء ینافی الرضاء بل الدعاء مامور بہ وھو لا یخالف الرضاء کما علیہ الکتاب والسنۃ وکیفیۃ ومولانا فضل الرحمٰن حال من الاحوال غلبت علیہ وھو التفویض بالغلبۃ وصاحب الحال معذور ولکن لحکایۃ تؤید مقصود المقام لان المقام بیان الرضاء بالقضاء فافھم ۱۲ احمد حسن عفی عنہ

مناسب تم پر مقرر کئے گئے ہیں) اور کسی نے کہا ہے۔ ع زشتیٔ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت (ہمارے برے اعمال کی سزا میں نادر شاہ کے ذریعہ ہم کو سزا ملی ہے) کہ نادر شاہ کی صورت میں ہمارے اعمالِ بد ہم کو ستا رہے ہیں تو جب حاکم کی طرف سے سختی دیکھو مجھے راضی کر دو ان کے قلوب کو نرم کر دوں گا پھر وہ تمہارے ساتھ نرمی برتیں گے کیونکہ یہ کارخانہ ظاہری وابستہ ہے کارخانہ باطن کے ساتھ اول حکم وہاں سرزد ہوتا ہے پھر اُسی کے موافق یہاں ہوتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ کی حکایت سنی ہے کہ ایک مرتبہ شہر کا انتظام بہت سست تھا ایک شخص نے شاہ صاحب سے وجہ پوچھی فرمایا آجکل یہاں کے صاحب خدمت سست ہیں پوچھا کہ کون صاحب ہیں شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک کنجڑہ بازار میں خربوزے فروخت کر رہا ہے وہ آجکل صاحبِ خدمت ہے یہ اس کے امتحان کے لئے آ گئے اور امتحان اس طرح کیا کہ خربوزے کاٹ کاٹ اور چکھ چکھ سب ناپسند کر کے ٹوکرے میں رکھ دیئے وہ کچھ نہیں بولے۔ چند روز کے بعد دیکھا کہ انتظام بالکل درست ہو گیا۔ اسی شخص نے پھر پوچھا کہ آجکل کون ہیں شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک سقّہ ہے چاندنی چوک میں پانی پلاتا ہے مگر ایک پیاس کی ایک چھدام لیتا ہے یہ ایک چھدام لے گئے اور ان سے پانی مانگا انھوں نے پانی دیا اس نے پانی گرا دیا کہ اس میں تنکا ہے اور دوسرا کٹورہ مانگا انھوں نے پوچھا اور چھدام ہے اس نے کہا نہیں انھوں نے ایک دھول رسید کیا اور کہا کہ خربوزہ والا سمجھا ہوگا اس شخص نے آکر بیان کیا کہ یہ واقعہ ہوا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ دیکھو آجکل یہ ہیں کہ سب کو نچا رکھا ہے۔ تو ظاہری انتظام باطنی انتظام کے تابع ہے تو جب خدا کو ناراض کرو گے اول محکمہ باطن میں حکم نازل ہوگا۔ پھر اس کے تابع ظاہر میں مگر اس کو سن کر کوئی شخص اس غلطی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ ایسے فقیروں کو ڈھونڈھنے لگے۔ ان کا ڈھونڈھنا محض بیکار ہے اس لئے کہ وہ خدا کے قبضے میں ہیں ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے اگرچہ ان کی خدمت بھی نہ کرو بلکہ جو ان کے منہ سے نکلوا تا ہے اس کو راضی کرو۔ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈھتے ہیں اسی طرح بزرگوں کی فاتحہ اس نیت سے دلانا کہ ان سے ہمارا کوئی کام نکلے گا یہ بھی سخت غلطی ہے۔ دیکھئے آخر فرشتے بھی تو مقبول بڑے ہیں مگر ان کی فاتحہ کوئی نہیں دلاتا کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ بالکل مجبور اور حکم حق کے تابع ہیں۔ پس اسی طرح سے یہ

لوگ ہیں اور اگر کہو فرشتے تو زندہ ہیں اس لئے ان کی فاتحہ نہیں دلاتے تو میں کہتا ہوں کہ زندہ لوگوں کو بھی تو ثواب پہنچانا ناجائز ہے۔ پس جب ان کی فاتحہ اس لئے نہیں کرتے کہ وہ بالکل حکم حق کے تابع ہیں تو سمجھو کہ یہ حضرات بھی بالکل حکم حق کے تابع ہیں۔ غرض اہل خدمت اور اقطاب بالکل حکم حق کے سامنے مجبور ہوتے ہیں کہ جیسا حکم ہوا ویسا کر دیا پس ان سے محبت تو رکھنی چاہیئے مگر ان سے دنیا کا کوئی کام نکلنے کی امید رکھنا سخت غلطی کی بات ہے۔ ہاں بزرگوں سے دعا کراؤ وہ بھی صرف ان بزرگوں سے جو مشابہ انبیاء علیہم السلام کے ہوں کہ وہ دعا بھی کرتے ہیں اور تعلیم و اصلاح بھی کریں گے کیونکہ وہ طبیب بھی ہیں اور دعا کرانے کے ساتھ اپنے اعمال کی بھی درستی کرو، گناہوں سے توبہ کرو کیونکہ بدون درستی اعمال کے محض ان کی دعا سے کچھ معتدبہ نفع نہ ہوگا اور نہ اُن کی سفارش کچھ کام آدے گی اس وقت لوگوں نے اول تو عمل کو بالکل چھوڑ ہی دیا ہے اور اگر کرتے بھی ہیں تو یہ بہت سے وظیفے پڑھ لئے حالانکہ دنیا کی غرض سے وظائف پڑھنے میں قلب میں ایک دعویٰ مضمر ہوتا ہے چنانچہ ان کو تیر بہدف سمجھا جاتا ہے بخلاف دعا کے کہ اس میں عجز و انکسار ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اعمال کی درستی کرے اور ہمیشہ اس سبق کو یاد رکھے اور پھر خدا کو ناراض نہ کرے اور ناراض کرنا خاص یہی نہیں کہ اس خاص گناہ کو چھوڑ دے بلکہ سب گناہوں کو چھوڑے کیونکہ یہ تو محض اسی کا خیال ہے کہ فلاں گناہ سے مصیبت آئی ممکن ہے کہ کسی دوسرے گناہ سے آئی ہو پھر اگر گذشتہ مصیبت کسی خاص گناہ ہی سے آئی ہو تو کیا ضرورت ہے کہ مستقبل میں دوسرے سے نہ آئے گی۔ دیکھو اگر انگارے سے چھپر جل جائے تو کیا چنگاری کو چھپر میں رکھ دیں گے۔

غرض گناہ چھوٹا ہو یا بڑا سب چھوڑ دو۔ چونکہ اس مضمون کی ضرورت اس وقت عام تھی اس لئے اس کو بیان کر دیا گیا اب خدا سے دعا کرو کہ وہ توفیق عمل (تمام مسلمانوں اور ناشر محمد عبدالمنان کو) بخشیں۔ آمین (برحمتک یا ارحم الراحمین)

تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعواتِ عبدیت جلد چہارم

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

حُبُّ العاجلہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی - دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم - اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم کا
ساتواں وعظ ملقب بہ

حُبُّ العَاجِلَہ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
صدر میرٹھ جلسہ موتمر الانصار	۱۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ	تقریباً ۳ گھنٹے	کھڑے ہو کر	شکایت ترجیح دنیا بر آخرت	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم	اندازاً زائد از پنجہزار (۵۰۰۰)	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۔ اَمَّا بَعْدُ! مضمون مقصود کے شروع کرنے کے پیشتر دو باتیں جو نہایت ضروری ہیں کہتا ہوں ان میں ایک بات تو کل گذشتہ تقریر کے بعض اجزا کے متعلق ہے اور دوسری آج ہی کے متعلق ہے ان کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ مقصود شروع ہوگا۔ کل کی تقریر کے متعلق تو یہ کہنا ہے کہ سب صاحبوں کو جو کل کے بیان میں شریک تھے یاد ہوگا کہ میں نے یہ کہا کہ خدا کا احسان ہے کہ ہم اس جماعت میں ہیں جن کے چھوٹوں کو بھی میں اپنے سے بڑا سمجھتا ہوں۔ اس وقت ممکن ہے کہ بعض خواہ مخواہ کے معتقدین کو شبہ ہوا ہو اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ہو مگر آج کی تقریر سے جو ابھی آپ لوگوں نے سُنی میرے گذشتہ دعوے کی

بدیہی دلیل آپ نے دیکھی ہوگی۔ یہ صاحب جنھوں نے تقریر پڑھی ہے اس جماعت میں سب سے چھوٹے ہیں مگر مجھ سے بڑے ہیں میں ان کی مدح نہیں کرتا محض تحدث بالنعمۃ کے طور پر بیان کرتا ہوں۔ اور اس پر میں اس لئے مجبور ہوا ہوں کہ یہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں اسلام ہوگا اس کے دل میں اہل اسلام کے ساتھ درد اور ان پر شفقت بھی ہوگی جو کہ اسلام کے آثار سے ہے اسی قاعدہ کے مطابق چونکہ بحمد اللہ مجھے بھی خدا تعالیٰ نے دولت اسلام سے مشرف فرمایا ہے اس لئے اس کے آثار مذکورہ ہمدردی و شفقت بھی عطا فرمائے ہیں اس لئے میں براہ شفقت سوچا کرتا تھا کہ یہ کام جو خدا تعالےٰ نے مجھ سے لیا ہے میرے بعد اس کی کیا حالت ہوگی اور کون شخص اس کو سنبھال سکے گا اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی تعریف کرتا ہوں۔ یا اس کام کے کرنے میں اپنا کوئی کمال یا اپنے کسی احسان کا اظہار کرتا ہوں بلکہ یہ خدا تعالےٰ کی عادت ہے کہ چاہے چھوٹے سے بڑا کام لیلے اور اس میں خدا تعالیٰ ہی کا احسان ہے پس اگر ہم کو کسی کام کی توفیق ہوگئی ہے تو اس میں ہمارا کیا احسان ہے۔ خدا تعالےٰ کا احسان ہے کہ اسے توفیق دی ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیں کنم منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(تو بادشاہ پر اس بات کا احسان مت رکھ تو اس کی خدمت کر رہا ہے بلکہ احسان مان کہ اس نے تجھ کو اپنی خدمت کے لئے رکھ لیا)

تو میں نہ تواضعاً کہتا ہوں نہ تکبراً۔ اور اگر یہ تکبر ہے تو پہلی تواضع سے اس کو برابر کر لیا جائے تو ان خدمتوں کو دیکھ کر جن کی خدا تعالےٰ نے مجھے توفیق دی اس بنا پر کہ جب علت میں کمی ہوتی ہے تو معلول میں بھی کمی ہوتی ہے یہ سوچا کرتا تھا کہ میرے بعد ان کاموں کا کیا انتظام ہوگا اور اس بناء پر میں ہمیشہ موت سے ڈرا کرتا تھا کیونکہ یہ خیال ہوتا تھا کہ جب میں نہ ہوں گا تو بعضے کام یوں ہی رہ جائیں گے اور سبب اس خیال کا وہی تھا کہ ان خاص خدمتوں کا بظاہر کوئی ذریعہ نظر میں نہ تھا گو بڑے کام کے لئے بڑے حضرات موجود ہیں مگر یہ چھوٹے کام کون کرے گا اگرچہ یہ اعتقاد بھی تھا کہ خدا تعالیٰ اپنا کام لینے کے لئے کوئی سبیل ضرور کر دیتے ہیں مگر پھر بھی سوچ طبعی

تھی مگر اب بحمد للہ یہ سب خلجان رفع ہو گئے کیونکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بہت سے نوجوان کام کر رہے ہیں جن سے امید ہے کہ وہ کام کو نباہ لیں گے لہٰذا ہم اگر آج چلے جائیں تو کیا اور کل چلے جائیں تو کیا (جو صاحب اس وعظ کو مطالعہ فرمائیں ان سے جامع وعظ کا ملتجیانہ التماس ہے کہ وہ صدق دل سے جناب باری سے دعا کریں کہ خدا تعالیٰ حضرت مولانا دامت برکاتہم کو تا دیر بایں فیوض و برکات قائم رکھے اور تشنگانِ زلالِ شریعت کو اس سرچشمہ سے سیراب فرماتا رہے آمین) انہی نوجوانوں میں ایک مولوی محمد مرتضیٰ حسن صاحب بھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف اگرچہ صورت سے بڈھے معلوم ہوتے ہیں لیکن طبیعت اور عمر کے اعتبار سے ابھی بالکل نوجوان ہیں بلکہ اگر بے ادبی نہ ہوتی تو کہتا کہ مولوی صاحب میری گود کے کھلائے ہوئے ہیں اور ابھی تو آپ نے دو ہی دیکھے ہیں ایسے بحمد للہ بہت سے ہیں آپ سب صاحب دعا کریں کہ خدا تعالیٰ ان کی عمروں میں برکت دیں اور ان سے اپنے دین کی خدمت علی الوجہ الاتم لیں اور ان کی طبیعتوں میں استقلال اور پابندی پیدا کریں۔ ان مولوی صاحب میں (مولوی شبیر احمد صاحب کی طرف اشارہ فرما کر) ابھی اتنی کمی ہے کہ یہ پابند نہیں۔ دعا کیجئے کہ خدا تعالےٰ ان کو پابندی عطا فرمائیں (سب لوگ دست بدعا ہوئے) اور اس کے ذکر کرنے کی مجھے ضرورت نہ تھی لیکن صرف اس خیال سے کہ شاید مجمع کے سامنے اس کو سن کر آئندہ مولوی صاحب پابندی کا خیال فرمائیں۔ میں نے ظاہر کر دیا باقی کام جیسا کچھ یہ کر سکتے ہیں وہ آپ نے دیکھ ہی لیا دوسرا مختصر مضمون جو آج کے متعلق کہنا ہے وہ یہ ہے کہ جو وقت میرے لئے وعظ کا مقرر کیا گیا تھا اس میں سے کچھ حصہ گذر گیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ بہت اچھی حالت میں گذرا اب اگر میں پورا وقت لیتا ہوں تو بہت زیادہ دیر ہو گی اس لئے وقت کم لوں گا اور اپنی تقریر کو انتہائے جلسہ کے معین وقت ہی پر ختم کر دوں گا اور اس کمی کا ایک سبب بھی ہے اور وہ یہ کہ گذشتہ مضمون کے بعد اب میرے بیان کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہی اور شاید اس مضمون کی عظمت کے سامنے میں چل بھی نہ

سکوں (حضرت مولانا نے یہاں تک فرمایا تھا کہ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ آپ جتنی دیر چاہیں بیان فرمائیں ہم لوگوں کو دیر ہونے کی ذرا پروا نہیں آپ ہماری تکلیف کا ذرا خیال نہ کریں۔ لِلّٰہِ دَرُّ مَنْ قَالَ (اللہ تعالیٰ اس کا بھلا کریں جس نے یہ بات کہی) ع قبول خاطر و لطف سخن خدا داد ست) اب میں شروع کرتا ہوں اور اس طریقۂ قدیم کے موافق خطبہ پڑھتا ہوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (اے منکرو) ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو ترک کئے دیتے ہو) جس مضمون کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایک نہایت ضروری مضمون ہے اور تتمہ ہے مولوی شبیر احمد صاحب کے مضمون کا۔ مشہور تو یوں ہے کہ اگر پدر نتواند پسر تمام کند (اگر باپ کسی کام کو پورا نہ کر سکے تو بیٹا پورا کرے گا) مگر اس وقت اس کا عکس پڑھ لیجئے اگر پسر نتواند پدر تمام کند (اگر بیٹا کسی کام کو پورا نہ کر سکے تو باپ پورا کرے گا) مگر یہ میں نے از راہ بے تکلفی ان کی کم عمری کے اعتبار سے کہدیا ہے امید ہے کہ مولوی صاحب برا نہ مانیں گے کیونکہ واقع میں اُن کو میں اپنے سے بڑا سمجھتا ہوں۔ غرض اس وقت میں جو کچھ بیان کروں گا وہ مولوی صاحب کے مضمون کا تتمہ ہوگا اور مولوی صاحب کا مضمون اگرچہ بالکل کافی تھا لیکن اس کے بعض اجزاء کی توضیح کی ضرورت ہے۔ میرا قصد پہلے سے بھی اس مضمون کو بیان کرنے کا تھا مگر اتفاق سے مولوی صاحب کے لئے بھی یہ ہی مضمون تجویز کیا گیا مگر مولوی صاحب نے صرف اعتقادی حالت کو آخرت کے متعلق زیادہ بیان کیا ہے چونکہ اس کے متعلق ایک دوسرا پہلو عمل کا بھی ہے اس لئے میں اس کو بیان کئے دیتا ہوں کہ دونوں بیانوں کا مجموعہ آخرت کے دونوں ضروری پہلوؤں کو حاوی ہو جائے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو تم دنیا سے محبت رکھتے ہو

اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ ان دنیا داروں کی شکایت فرماتے ہیں جو کہ آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ دنیا سے محبت کرنا اور آخرت کو چھوڑنا یہ دونوں باتیں عمل ہی علم نہیں۔ اور عمل کے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ ہر علم کے لئے عمل غایۃ ہے اگرچہ ظاہر نظر میں بعض علم خود بھی مقصود معلوم ہوتے ہیں مگر نظر غائر سے ان علوم کا ثمرہ بھی کوئی عمل ہے چنانچہ آگے عنقریب معلوم ہوگا اور اس مسئلے کی بابت کہ ہر علم کے ساتھ عمل بھی ہے علمائے شریعت کا قول تو سب کو معلوم ہے کہ وہ احکام میں ایک درجۂ اعتقاد اور ایک درجۂ عمل نکالتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ عقلاء حکماء اطبا وغیرہ ہر فرقہ اسی حکم پر ہے اور ہر جماعت ہر فن میں دو چیز ضروری مانتی ہے ایک علم اور دوسرا عمل۔ اور اپنے اپنے درجہ میں دونوں مطلوب سمجھے جاتے ہیں اور علوم تو بعض بظاہر ایسے بھی ہیں جن کو عمل سے کوئی تعلق نہیں یعنی ان علوم کا اثر مرتب ہونے میں کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ محض علم ہی سے اس کا اثر اس پر مرتب ہو جاتا ہے گو نظر غائر سے ان علوم سے بھی بعض اعمال کسی درجے میں مقصود ہیں لیکن عمل کوئی ظاہر میں بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ علم سے مستغنی ہو مثلاً علم توحید ایک ایسا علم ہے کہ اگر کسی قسم کا عمل نہ کیا جائے تب بھی اس کا ثمرہ یعنی نجات اگرچہ بدیر سہی اس پر مرتب ہوگا اور اس کو کسی عمل کی ضرورت نہ ہوگی لیکن کسی عمل مثل نماز روزہ کی بابت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بغیر اعتقاد کے اس عمل کا اثر اس پر مرتب ہو جائے گا تو دونوں کے تعلق میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم تو کسی درجے میں عمل سے مستغنی ہے لیکن عمل علم سے اصلاً مستغنی نہیں اور یہی راز ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عبادت کا مقابلہ کوئی عبادت نہیں کر سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں علم اور معرفت درجۂ کمال پر تھا اس کی تائید میں مرشدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ عارف کی دو رکعتیں غیر عارف کی ہزار رکعتوں سے بھی زیادہ درجہ رکھتی ہیں وجہ فرق کی یہ ہی ہے کہ عارف کو جو علم و معرفت حاصل ہے غیر عارف کو حاصل نہیں۔ اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ نے مبالغۃً ایسا فرما دیا ہوگا ہرگز نہیں صاحبو! یہ بالکل واقع کے مطابق اور اس سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ کا عمق علم معلوم ہوتا ہے اور یہی وہ علوم ہیں جن کی وجہ سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ جیسے متبحر یوں

فرماتے تھے کہ مجھے حاجی صاحب رحمہ اللہ سے جو کچھ اعتقاد ہوا ہے وہ حاجی صاحب رحمہ اللہ کے علم کی بدولت ہوا ہے تو اس میں اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ حاجی صاحب رحمہ اللہ نے ذرا مبالغہ نہیں فرمایا۔ خود حدیث شریف میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اگر ایک صحابی (رضی اللہ عنہ) ایک مُد یا نصف مُد صدقہ دیں اور غیر صحابی جبل احد کی برابر صدقہ دیں تو غیر صحابی کا یہ صدقہ صحابی کے نصف مُد کی برابر نہیں ہوسکتا۔ اب ذرا مدینہ منورہ جا کر دیکھئے کہ نصف مُد غلہ کس قیمت کا ہوتا ہے اور اس قیمت کا کس قدر چاندی یا سونا آتا ہے اور وہ سونا جبل احد سے کیا نسبت رکھتا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ بلا توسط قیمت کے اگر خود نصف مُد غلہ کا طول و عرض بھی لیجئے اور اس مقدار کو جبلِ احد کے مقابلہ میں دیکھئے کہ کیا نسبت رکھتا ہے ظاہر ہے کہ اس کو جبل احد سے کوئی نسبت بھی نہیں تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کو کروروں حصے سے زیادہ فرماتے۔ بہرحال مقصود واضح ہوگیا۔ تو وجہ اس تضاعف کی یہی علم اور معرفت ہے اور یہاں شاید کسی شخص کو یہ شبہ ہو کہ مولوی بھی عجیب چیز ہوتے ہیں ایک ہی چیز سے جو کام چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ اس حدیث شریف سے اس وقت علم کی فضیلت ثابت کر دی گئی اور اکثر اس سے صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت ثابت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ صحبت سے ایسا خلوص میسر ہوا تھا کہ عمل میں یہ برکت ہوگئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ایک کا حصول دوسرے کا حصول ہے مقصود ہر طرح حاصل ہے اس تلازم و تجاذب کی وہ حالت ہے کہ ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بہ کف　　　گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(اگر میری قسمت ساتھ دے تو میں اس کا دامن اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لوں پھر اگر وہ اپنی طرف کھینچ لے تب بھی میں خوش ہوں اگر میں اس کو اپنی طرف کھینچ لوں تو یہ بھی میرے لئے عزت کی بات ہے)

عِبَادَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ　　　وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(ہمارے مضمون تو الگ الگ ہیں مگر سب کا مقصد ایک ہی ہے اور ہمارے سب مضامین اسی کے جمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں)

خواہ اس طرح کہدیجئے یا اس طرح۔ اگر خلوص صحبت کی برکت سے ہے تو علم خلوص کی برکت سے بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات میں علم کا مرتبہ صحبت وغیرہ سب سے مقدم ہے کیونکہ صحبت بھی علم ہی کی بدولت نصیب ہوئی۔ پس علم مستلزم ہوا صحبت کو اور صحبت مستلزم خلوص کو۔ پھر اس خلوص سے اور علم اور معرفت میں ترقی ہوئی تفصیل اس کی کہ علم سے صحبت ہوئی یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام فرمائی تو تمام عرب بلکہ تمام انس وجن مخاطب تھے تو اس کی کیا وجہ کہ اُن سب میں صرف انہی حضرات کی سمجھ میں آیا دوسرے مخاطبین مثلاً ابوجہل ابولہب کیوں نہیں سمجھ سکے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے پاس خدا تعالیٰ کی عطا کی کوئی ایسی دولت موجود تھی جو کہ ابوجہل کے پاس نہ تھی اگرچہ ظلمات کفر میں اس کی چمک دمک چھپی ہوئی تھی یہی وجہ تھی کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی اقرار رسالت کیا چنانچہ انھوں نے فرمایا ہے فَلَمَّا تَبَيَّنْتُ وَجْهَهٗ عَلِمْتُ اَنَّهٗ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ کہ میں نے آپ کو دیکھتے ہی یہ معلوم کرلیا کہ یہ چہرا جھوٹے کا نہیں ہے ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب   گر دلیلت باید ازوے رُو متاب

(دھوپ ہی سورج کے ہونے کی کافی دلیل ہے اگر دلیل ہی چاہتا ہے اس کی طرف سے منہ کو مت پلٹا اور نہ ہٹا)

مولانا رومیؒ کا یہ آئندہ شعر عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے قول کا گویا پورا ترجمہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی   نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(اللہ تعالےٰ کا نور اللہ کے ولی کے اندر خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو اچھی طرح دیکھ)

گفتگو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت ہے، اس لئے بجائے ولی کے نبی بدل دینا چاہیئے اور اسی کا ترجمہ مولوی ابوالحسن صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ کا شعر ہے ؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نُور   کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

سِیۡمَاھُمۡ فِیۡ وُجُوۡھِھِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ۝ (ان کی عبادتوں کا نور ان کے چہرہ پر ظاہر ہو جاتا ہے) تو ضرور یہ کوئی بات تھی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھی دوسروں کو نصیب نہیں۔ اور صاحبو! وہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم کے علوم اور ان کے معارف ہیں اور یہ اس وقت کے علوم ہیں کہ جب تک دولت ایمان بھی ان حضرات کے پاس نہ تھی صرف اس کے حاصل ہونے کا احتمال تھا جس کے ساتھ ہی جانب مخالف کا احتمال بھی موجود تھا۔ گویا فیضان کا ایک ذرہ تھا کہ جس نے ہلا رکھا تھا اسی کو فرماتے ہیں ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

(مٹی ملی ہوئی ایک گھونٹ یعنی عشق مجازی جب مجنوں بنا سکتی ہے تو اگر صاف ہو یعنی عشق حقیقی ہو تو معلوم نہیں کیا سے کیا بنا دے)

جب اس پر علم کی یہ حالت تھی تو اسلام کے بعد اور فیض صحبت حاصل کر کے کیا حالت ہوئی ہو گی۔ شاید کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ اس مجموعی تقریر سے صحابہ کرام کی معارف و علوم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے لیکن دوسروں کے علوم و معارف کی فضیلت کیسے ثابت ہو گئی کہ کسی ولی کی بھی یہ حالت ہو جائے کہ اس کی دو رکعت دوسرے کی ہزار رکعت سے بڑھ کر ہو سکیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولیاء کے معارف و علوم انہی حضرات سے حاصل ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر چلا جاتا ہے تو صحابہ کرام ہی کا فیض دوسرے اولیاء کو بھی پہونچا ہے اس کی توضیح کے لئے میں ایک محسوس مثال اختیار کرتا ہوں۔ ریل کو چلتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں اب میں اس کے متعلق دریافت کرتا ہوں کہ ریل میں جس قدر گاڑیاں لگی ہوتی ہیں ان کے چلنے کی تدبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تدبیر اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انجن میں آگ اور پانی سے اسٹیم تیار کی جائے اور گاڑیوں کو اُس کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے جب انجن کو حرکت ہو گی گاڑیاں خود بخود متحرک ہوں گی اس مثال میں متحرک بالذات صرف انجن ہے گاڑیاں محض وابستگی کی وجہ سے کھنچی چلی جا رہی ہیں نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ انجن ہر ہر گاڑی کے ساتھ نہیں بلکہ انجن کے ساتھ صرف ایک گاڑی بلا واسطہ وابستہ اور دوسری گاڑیاں بوسائط اس سے وابستہ ہیں تو جب انجن کے ساتھ محض ظاہری وابستگی کی وجہ سے ساری گاڑیاں متحرک ہو گئی ہیں تو کیا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متوسلین اور وابستگان میں

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے فیوض نہ آئیں گے اور ان میں حرکت پیدا نہ ہوگی ضرور ہوگی اور اسی تقریر سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اگر کسی کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا مقصود ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنی زنجیر ان انجنوں سے ملا دے جب ان کو حرکت ہوگی یہ بھی متحرک ہوگا اور پہونچ جائے گا خوب کہا ہے ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد دست بر پائی کبوتر زد و ناگاہ رسید

(ایک چیونٹی کو شوق ہوا کہ کعبۃ اللہ میں پہونچے اس نے کبوتر کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیا اور بہت جلد کعبۃ اللہ پہونچ گئی)

یعنی ایک چیونٹی کو اشتیاق ہوا کہ کسی طرح کعبۃ اللہ پہونچوں لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ کعبہ تو بہت دور ہے اور بہت سی دقتوں کے بعد مدت میں وہاں پہنچنا ہوتا ہے۔ غریب مشتاق چیونٹی نے جب ان موانع کو سنا اور اپنے کمزور جثہ کو دیکھا نیز دھوپ کی تیزی ہوا کی سختی زمین کی تپش کی طرف نظر کی تو بہت مایوس ہوئی اسی حالت میں ناگاہ ایک رہبر پر اس کی نظر پڑی جس کے چہرے سے گویا آثار رہبری مترشح تھے جس کی صورت دیکھ کر پژمردہ دل کو تسلی ہوگئی جسکی یہ حالت تھی کہ

؎ اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(اے وہ ذات کہ تیری ملاقات ہی سے سب سوالوں کا جواب خود بخود حاصل ہوگیا مشکل سے مشکل باتیں تجھ سے پوچھے بغیر ہی حل ہوگئیں ہیں)

اس رہبر نے کہا کہ اطمینان رکھو میں تمہیں ایک سہل طریقہ منزل مقصود پر پہونچنے کا بتاتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ خود رائی اور تکبر کو آگ لگا دینی پڑے گی ورنہ اگر اس کو نہ چھوڑا تو پھر کوئی طریقہ نہیں مشتاق چیونٹی نے تکبر کے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا آخر تھوڑی دیر میں حرم شریف کا ایک کبوتر نظر پڑا رہبر نے اسے دیکھ کر پہچانا اور چیونٹی سے کہا کہ مبارک ہو اب مقصود حاصل ہونے کا وقت قریب آیا دیکھو یہ کبوتر حرم شریف کا ہے اگر اس کی قدمبوسی ناگوار نہیں اور اس کو ذلت نہیں سمجھتی ہو تو بے تامل اس کے پیروں کو لپٹ جاؤ اس کو تو خبر بھی نہ ہوگی اور تم اس کی ایک پرواز میں کعبہ میں ہوگی چنانچہ چیونٹی نے ایسا ہی کیا اور پہونچ گئی۔ ع۔ دست در پائے کبوتر زد و ناگہ رسید۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ وابستگی کے

ساتھ استنکاف کا نہ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ اگر استنکاف باقی رہے گا تو مقصود سے ادھر ہی رہ جاؤ گے۔ صاحبو! یہ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت توجہ سے سننے کے قابل ہے۔ ہمارے مسلمان بھائیوں میں اس وقت ایک بڑی کوتاہی یہ ہو رہی ہے کہ ان کو متحرکین سے استنکاف اور استکبار ہے ایسے لوگوں کو نظر حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور وجہ صرف یہ کہ اُن کی آمدنی بہت کم ہے سامان آسائش اُن کے پاس نہیں بہت سے خدم حشم نہیں رکھتے۔ لباس بہت قیمتی نہیں پہنتے۔ جب اپنے لباس سے اُن کے لباس کا موازنہ کرتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے کیونکہ اہل دنیا کا لباس تن دو سو ڈھائی سو کا ہے اور وہاں ؎ لنگ کے زیر ولنگ کے بالا ۔ نے غم دُزد نے غم کالا۔ نشست کی جگہ دیکھتے ہیں تو اپنے ہاں سینکڑوں روپیہ کے قیمتی فرش پاتے ہیں وہاں چار پیسے کی ایک چٹائی وہ بھی خستہ شکستہ میلی کچیلی اس لئے سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے پاس سامان زیادہ ہے تو ہم بڑے ہیں۔ مگر صاحبو! یاد رکھو کہ اسی بڑے سمجھنے کی بدولت عزازیل برباد ہوا جس کے برباد اور خراب ہونے سے آج تم خراب ہو رہے ہو اس نے بھی یہی کیا تھا کہ اپنا ظاہری اعزاز یعنی ناری ہونا اور حضرت آدم علیہ السلام کی ظاہری حقارت یعنی خاکی ہونا دیکھ کر اپنے کو بڑا اور ان کو چھوٹا سمجھا اور ارشاد خداوندی سے معترضانہ انکار کر دیا۔ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ آج بھی یہ مرض عام ہو رہا ہے۔ صاحبو! میں براہ شفقت کہتا ہوں کہ یہ سامان ظاہری تمہارے لئے رہزن ہو رہا ہے ظاہری حالت پر مدار نہ رکھو حقیقت بین بنو۔ یاد رکھو کہ ؎

گر بصورت آدمی انساں بُدے ‏ احمد و بوجہل ہم یکساں بُدے

اینکہ می بینی خلاف آدم اند ‏ نیستند آدم غلاف آدم اند

(اگر ہر آدمی کی صورت والا انسان ہوا کرتا تو حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوجہل دونوں یکساں ہوتے کیونکہ دونوں قریشی تھے اور مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے ہرگز ایسا نہیں ہے۔ یہ جو کچھ تو دیکھ رہا ہے آدمیت کے خلاف ہیں بلکہ یوں سمجھ کہ آدمی نہیں ہیں آدمی کے اُوپر کا غلاف ہیں)

لہٰذا صورت کو یا لباس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور اس کو معیار نہ بنانا چاہیئے۔ بعض لوگ اپنے

دنیاوی سامان کو معیار بناتے ہیں اور چونکہ اہل اللہ کو ان سے علیحدہ پاتے ہیں اس لئے
ان کو حقیر سمجھتے ہیں خوب سمجھ لو کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ؎

نباشد اہل باطن در پئے آرائشِ ظاہر — بہ نقاش احتیاجے نیست دیوارِ گلستاں را

(جو اہلِ دل ہوتے ہیں وہ اپنے ظاہر کے سنوارنے کی فکر میں نہیں رہتے۔ باغ کی چہار دیواری
کو نقش ونگار بنانے والے کی ضرورت نہیں)

ان حضرات کو ادھر توجہ بھی نہیں ہوتی میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر شریعت کا حکم
نہ ہوتا تو یہ حضرات پاجامہ بھی نہ پہنتے ان کے لئے اتنا تعلق بھی بار ہے ان کی مذاق کی وہ حالت
ہے جیسا کہ ذوق کہتا ہے ؎

عُریاں ہی دفن کرنا تھا زیر زمیں مجھے — اک دوستوں نے اور لگا دی کفن کی شاخ

اور زینت اور لباس تو کیا چیز ہے ان حضرات کی نظروں میں سلطنت کی بھی کوئی حقیقت
نہیں ہوتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہلِ سلطنت کی اطاعت بھی یہ لوگ نہیں کرتے
بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے لئے اس کی تمنا نہیں ہوتی۔ ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ صرف
ایک تہبند باندھے رہتے تھے اور کوئی کپڑا نہ پہنتے تھے اُن کے بھائی بادشاہ وقت تھے
ایک روز انھوں نے ان بزرگ سے کہا کہ اگر آپ پاجامہ پہن لیتے تو اچھا تھا آپ کے
اس حال میں رہنے سے میری بھی سبکی ہے انھوں نے کہا کہ اگر میں پاجامہ پہنوں گا تو اس کے
لئے کرتہ بھی ہونا چاہیئے۔ بادشاہ نے کہا کرتہ بھی حاضر ہے وہ بولے تو پھر ٹوپی جوتہ بھی
ہو بادشاہ نے کہا وہ بھی کیا مشکل ہے انھوں نے کہا تو پھر سواری کے لئے گھوڑا بھی ہو
اور پھر کہا کہ سائیس بھی ہو اور اصطبل بھی ہو اور ان سب مصارف کے لئے گانوں بھی
ہو پھر اس شان کے موافق فلاں فلاں سامان بھی پھر اس کے لئے ایک گانوں کافی نہ ہوگا
بہت سے دیہات ہوں حتیٰ کہ پھر سلطنت بھی ہو۔ بادشاہ ساری باتوں کو منظور کرتا گیا
تو آپ فرماتے ہیں کہ یہ سارا جھگڑا ایک پاجامہ پہننے کی بدولت اکٹھا ہوا مجھے پاجامہ ہی
پہننے کی کیا ضرورت کہ ان مصیبتوں میں پھنسوں۔ غرض ان حضرات کے نزدیک اس
تمام ساز وسامان کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔ ایک اور بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ

انھوں نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر تم کسی وقت شکار میں جاؤ اور اپنے ساتھیوں سے جدا ہو جاؤ اور پیاس کی شدت سے تمھارا برا حال ہو جائے اس وقت ایک شخص تمھارے پاس ایک پیالہ پانی لے کر آئے اور کہے کہ اگر مجھکو نصف سلطنت بخشدو تو میں تم کو یہ پیالہ پانی کا دوں تو اس وقت تم کیا کرو بادشاہ نے کہا میں نصف سلطنت دیکر پیالہ خرید لوں اس کے بعد ان بزرگ نے کہا کہ اگر اتفاق سے تم کو بند پڑ جائے اور کسی طرح پیشاب نہ اترتا ہو تمام اطباء عاجز ہو جاتے ہیں اور اس وقت ایک شخص اس شرط پر پیشاب کرادینے کا وعدہ کرے کہ باقی نصف سلطنت اس کو دے دو تو تم کیا کرو بادشاہ نے کہا کہ میں بقیہ نصف سلطنت بھی دیدوں۔ فرمایا کہ اب تو تم کو اپنی سلطنت کی حقیقت اور اس کی قیمت معلوم ہو گی ہو گئی کہ صرف ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب اس کی قیمت ہے۔ صاحبو! آج کل جو کچھ ترقی کی پکار ہو رہی ہے اور دلوں میں ترقی کی محبت ہے صرف اسی وجہ سے کہ آپ لوگوں نے ایک ہی چیز کو دیکھا اور پہچانا ہے اگر دوسری طرف بھی کچھ نظر ہوتی تو یقیناً آپ بھی وہی کہتے جو ہم کہتے ہیں کہ ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

(جس شخص نے تجھ کو جان لیا وہ اپنی جان کو کیا کرے گا اور بیوی بچوں اور خاندان والوں کے خیال میں کس طرح رہے گا)

اہل دنیا اور ان کے شغفات کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے آپ نے بچوں کو دیکھا ہو گا کہ بہت سی بالو جمع کر کے پیروں پر اس کو جماتے ہیں اور گھروندہ تیار کرتے ہیں اور جب ان کے بزرگ اس لغو حرکت سے روکتے ہیں تو لڑکے اپنے دل میں بہت خفا ہوتے ہیں اور اپنے بزرگوں بڑوں کو اپنا دشمن اور مخالف سمجھتے ہیں اور اپنے کھیل پر اصرار کرتے ہیں عقلاء ان کی اس حرکت کو دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں تو بچوں کی خفگی اور اپنے کھیل پر اصرار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ ان کی نظر ابھی تک اسی گھروندے کی چند دہی خوبیوں پر ہے ابھی تک عالی شان قصر اور پختہ محل ان کی نظر دل میں نہیں آئے اور ان کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور اسی وجہ سے اپنے گھروندے کا ہیچ ہونا ہنوز ان کی سمجھ میں

نہیں آیا جس دن اپنے گھروندے کی حقیقت اپنے ذہن میں آجائے گی اس دن وہ بھی اپنے بزرگوں کے ہم آہنگ ہوں گے۔ اسی طرح عقلاء امت آپ کو ان عالیشان کوٹھیوں اور محلات میں پھنسا ہوا دیکھ کر دارِ آخرت کی ترغیب دیتے ہیں اور اس شغف پر ہنستے ہیں لیکن آپ اپنی حقیقت ناشناسی کی وجہ سے اُن پر خفا ہوتے اور اُن سے استنکاف کرتے ہیں ورنہ اگر آپ کو حقیقت کا علم ہوتا تو اپنی اس حالت پر افسوس کرتے اور یوں کہنے لگتے کہ ؎

دلا تا کے درین کاخ مجازی کنی مانندِ طفلاں خاک بازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا زاں آشیا بے گانہ گشتی چو دوناں چغدِ ایں ویرانہ گشتی

(اے دل تو کب تک بچوں کی طرح اس مجازی گھر کے کھیل میں لگا رہیگا جو مٹی کے گھر بنا بنا کر کھیلا کرتے ہیں۔ اے نافرمان پرندے تو اسی کے ہاتھوں کا تو پالا ہوا ہے۔ اس دنیا کے محلوں سے تو علیحدہ تیرا گھر ہے تو اپنے اصلی گھر سے کیوں غافل اور بے پروا ہو گیا ہے اور کمینہ ذلیل جانور چکور کی طرح ویرانی جگہوں میں پھر رہا ہے)

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بے گھرے ہو جاؤ اور جو کچھ ہے برباد کردو بلکہ مطلب یہ ہے کہ محبت چھوڑ دو اور دل سے بے تعلق ہو جاؤ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ ان لوگوں کے پاس کوئی چیز ہی نہیں اس لئے ان کو محبت اور تعلق بھی نہیں عصمت بی بی از بے چادری کی حالت ہے تو میں کہوں گا جس کا جی چاہے جائداد پیش کر کے بھی دیکھ لے۔ صاحبو! جائداد کیا چیز ہے سلطنت تک کو لات ماردی ہے۔ سنجر شاہ نیم روز نے حضرت غوث الاعظم رحمہ اللہ کے پاس التجا بھیجی کہ آپ کی خدمت میں کچھ حصہ سلطنت کا پیش کرنا چاہتا ہوں قبول فرمایئے آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد در دل اگر بود ہوسِ ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب من ملکِ نیمروز بیک نمے نخرم

(جیسے کہ ملک نیم روز کے بادشاہ سنجر کا تاج سیاہ ہے اسی طرح میرا نصیبہ بھی سیاہ ہو جائے اگر خدانخواستہ میرے دل میں اس بادشاہ کے ملک کی خواہش پیدا ہو جائے

جب سے مجھے آدھی رات کی لذت حاصل ہوگئی اور اس ملک کی خبر لگی ہے میں تو اس

بادشاہ کے ملک نیم روز کو ایک جو کے پلے بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوں)

یعنی اگر تمہارے پاس ملک نیم روز ہے تو میرے پاس ملک نیم شب موجود ہے اس میں یہ

لطیفہ بھی ہے کہ بادشاہ کے ملک کا م ملک نیمروز تھا۔ ایک اور عارف کہتے ہیں ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روزہا و ہوئے

(دل کے سکون و اطمینان کے ساتھ اس چاند جیسے چہرہ والے کی طرف تھوڑی

دیر کے لئے دیکھتے رہنا ہی بادشاہ کے تاج اور تمام شان و شوکت سے بہتر ہے)

تو ان حضرات کی ظاہری شکستگی کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اس سامان کی مطلق قدر نہیں ہے نیز یہ

بھی وجہ ہے کہ خود آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حالت پسند ہے چنانچہ حدیث

قدسی ہے کہ اَنَا عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ یعنی میں ان سے قریب ہوں جن کے دل ٹوٹے

ہوئے ہیں مولانا رومی ارشاد فرماتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(اپنے دل و دماغ سے زیادہ کام لینا یہ راستہ کا پالینا نہیں ہے عاجز اور ٹوٹے

ہوئے دل کے سوا فضل الٰہی حاصل نہیں ہوتا)

کیوں؟ اس لئے کہ ؎

ہر کجا پستی ست آب آں جا رود   ہر کجا مشکل جواب آں جا رود

(جس جگہ پستی (نیچا حصہ ہے) پانی اسی طرف کو بہتا ہے جہاں انسان کی سمجھ سے

زیادہ مشکل سوال پیدا ہوتا جواب اسی کو سمجھا جاتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آں جا رود   ہر کجا رنجے شفا آں جا رود

(جہاں تکلیف اور بیماری ہوئی دوا وہیں کی جائے گی اور جہاں زخم لگا ہو شفا اسی طرف جائیگی)

تو چونکہ یہ شکستگی ہی خدا تعالیٰ کو پسندیدہ ہے اس لئے ان حضرات کو بھی یہی پسند ہے۔ صاحبو!

کیا سنا نہیں پیا جس کو چاہیں وہی سہاگن ہو دیکھئے اگر کسی بازاری عورت سے عشق ہو جائے اور

وہ حکم کرے کہ سر بازار لنگوٹا باندھ کر پھرو تو یقیناً عشق و محبت ایسا ہی کرنے پر مجبور کرے گی

اور اگر ایسا نہ کیا تو عشق کامل نہ سمجھا جائیگا۔ اللہ اکبر جب ایک بازاری عورت کی محبت میں یہ حالت ہوجاتی ہے تو عشق خدا میں کیا کچھ حالت ہونی چاہیئے اور بڑا مقام غیرت ہے ان لوگوں کے لئے جن کو اس کی حس نہ ہو خوب کہا ہے ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　　کوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(کیا حق تعالیٰ کا عشق لیلیٰ سے کم ہے نہیں بلکہ اس کے لئے گلی گلی اور کوبکو پھرنا تو اور ہی بہتر ہے)

غرض ان حضرات کی شکستگی کو موجب حقارت نہ سمجھو اور استنکاف کو چھوڑ کر انکا اتباع کرو۔ اور اپنے میں طلب کی شان پیدا کرو جب یہ پیدا ہوجائے گی استنکاف خود بخود جاتا رہیگا میں اس کی ایک زندہ نظیر دیتا ہوں۔ آپ نے اکثر ایسے رئیس دیکھے ہوں گے جن کو کیمیا کی تلاش رہتی ہے اور اس تلاش میں جو شخص بھی کیمیا دانی کا مدعی ان کو ملتا ہے اس کو کیمیا گر سمجھ کر اس کے پیچھے ہولیتے ہیں حتیٰ کہ بعض مرتبہ اگر ذرا پختگی سے ان کے کیمیا گر ہونے کا یقین ہوجائے تو اپنا ننگ و نام مال و جائداد سب ان کے پیچھے گنوا دیتے ہیں اور اگر کوئی ان کو کچھ کہتا اور ملامت کرتا ہے تو اس کو ہنستے ہیں تو یہ اتباع اور شغف کیوں ہے؟ صرف اس واسطے کہ ان کو کیمیا آنے کا گمان ہے۔ پس جب حصول کیمیا کے موہوم الیہ بظاہری کیمیا جاننے والوں کا اس قدر اتباع کیا جاتا ہے اور اپنی شان وشوکت کو طاق میں رکھ دیا جاتا ہے اور ذرا پروا نہیں کی جاتی جن لوگوں کو سچ مچ کیمیا آتی ہے کہ اگر لوہے اور پتھر کو کندن کردیں تو کوئی تعجب نہیں ان کا اتباع کرتے استنکاف کیوں ہوتا ہے یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود میرا یہ تھا کہ جب انجن میں یہ طاقت ہے کہ اس کے ساتھ وابستہ ہونے سے گاڑیاں منزل پر پہنچ جاتی ہیں تو کیا صحابۂ کرام کے ساتھ وابستگی کا یہ اثر نہ ہوگا۔ بالخصوص جبکہ یہ بھی ثابت ہو کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد دیگر اولیاء اللہ پر بھی کبھی بلا واسطہ نزول انوار و برکات ہوتا ہے کیونکہ یہ سلسلہ نہ منقطع ہوا ہے نہ ہوگا ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست　　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(ابھی وہ رحمت کا بادل موتی برسا رہا ہے شراب عشق کے مٹکے اور میخانے پر مہر اور نشان لگی ہوئی ہے) اب تک وہی جام گردش میں ہے وہی دور چل رہا ہے ہر وقت یہی صدا بلند ہے ؎

حریفاں ہمہ مے پرستی کنید بجو شید و نوشید و مستی کنید

(اے دوستو تم شرابِ عشق کی محبت میں لگے رہو خوب جوش میں آؤ خوب پیو اور خوب مست رہو)

غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی وابستگی کی بدولت کہیے یا وابستگی اور ذاتی حرکت دونوں کے سبب کبھی علم اور معرفت اب بھی عطا ہوتا ہے اور وہی ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت ان کی دو رکعت غیر عارف کی ہزار رکعت کے برابر ہے اسی علم نے صحابہ کرامؓ کو اُس مرتبہ تک پہنچا دیا اور یہی علم و معرفت آج بھی ہزاروں کو اپنی اپنی استعداد کے موافق مراتب عُلیا پر پہنچا رہا ہے غرض علم ایسی چیز ہے کہ عمل کوئی بھی علم سے مستغنی نہیں لیکن بعض علوم عمل سے مستغنی ہیں مگر بایں معنی کہ اس کی صحت کسی عمل پر موقوف نہیں گو کمال اس کا کسی عمل پر موقوف ہو تا بایں معنی کہ اس علم کا ثمرہ بھی کوئی عمل نہیں نظر غائر سے جیسا کہ شروع ترجمۂ آیت کے ساتھ عرض کیا گیا ہے اس کا ثمرہ کوئی عمل بھی ضرور ہے یعنی اُس کی ایک غایت کوئی نہ کوئی عمل ضرور ہے مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کا عقیدہ ہے کہ اس میں کسی عمل کی ضرورت بمعنی توقف نہیں ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمل کی طرف سے بالکل توجہ ہٹالی جائے بلکہ اس علم کا کمال ضرور عمل پر موقوف ہے اور غایت بھی اس کی کوئی عمل ضرور ہے مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ہی کو لیجئے کہ عقیدۂ توحید کی صحت گو اعمال پر موقوف نہیں لیکن توحید میں نورانیت اعمال صالحہ ہی سے ہوتی ہے اور نیز اس کی غایت میں ایک عمل بھی ہے مثلاً جب خدا کو کمالات اور تصرفات میں منفرد مانا تو غیر اللہ سے ایسا تعلق رغبت و رہبت کا نہ ہونا چاہیے جیسا کہ ہے میں اپنے اس مضمون کا مخاطب خصوصیت کے ساتھ طلبہ کو بتاتا ہوں کہ ان میں اکثر کو اپنے علوم پر ناز ہوتا ہے خصوصاً حصہ عقائد میں کہ میں خود اپنے کو دیکھتا ہوں کہ عقائد درست کرنے کی فکر تو ہے مگر عمل کی طرف توجہ نہیں ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عقیدہ بوجہ اصل ہونے کے کافی سمجھتے ہیں اور حالانکہ دل میں جما رکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں عقیدے کی پوچھ ہوگی اس کے بعد اور کوئی باز پُرس نہ ہوگی لہٰذا جو چاہو کرو۔ صاحبو! خدا کے لئے سنبھلو اور اپنی خبر لو۔ مجھ سے قنوج میں ایک تاجر عطر نے جو اہلِ حدیث تھے یہ کہا کہ ہم لوگوں کا جو کچھ تقویٰ ہے وہ چند مسئلوں میں ہے جن میں حنفیوں سے اختلاف ہے ورنہ ہمارے اعمال کی یہ حالت ہے کہ میں عطر کی تجارت کرتا ہوں اور اس میں تیل ملا کر

فروخت کرتا ہوں بیچارے سچے آدمی تھے صاف کہدیا کہ اس امر میں کبھی مجھے عمل بالحدیث کا خیال پیدا نہ ہوا اور ہمیشہ غلط کر کے فروخت کرتا رہا۔ ہم لوگ حنفی ہیں خدا کا شکر ہے مگر یہ افسوس ہے کہ ہم نے بھی اسی درستی عقائد پر قناعت کر لی ہے اور عمل کی ذرا فکر نہیں ہے سراپا دنیا میں منہمک ہیں اور محض علوم کو اور اعتقادات کو کافی سمجھتے ہیں بلکہ جو لوگ اپنے کہلاتے ہیں اور دخول سلسلہ رکھتے ہیں ان میں بھی تقویٰ کا اہتمام نہیں۔ خالی محبت و صحتِ عقیدہ پر کفایت کئے ہوئے ہیں تو اس مرض کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے مجھے ایک بات سجھائی ہے بظاہر بالکل نئی جس کو اجمالاً ابھی ذکر کیا ہے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر چند بعض علوم کو عمل سے تعلق یعنی توقف نہیں ہے مگر قرآن شریف و حدیث کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم کی غایت علاوہ نفسِ نجات کے کوئی عمل بھی ہے یعنی ایک غایت تو ان علوم کی یہ ہے کہ ان پر نفس نجات من العذاب مرتب ہو جاتی اگرچہ وہ چند روز کی تکالیف اٹھانے کے بعد ہو نیز اس غایت کے سوا اور بھی ایک غایت ہے جو کہ بدون عمل کے حاصل نہیں ہو سکتی مثلاً علم تقدیر کی جہاں یہ غرض ہے کہ اس کے ماننے سے نجات ہوگی وہیں یہ غرض بھی ہے جس کو اس آیت میں اشارہ فرماتے ہیں مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ الایۃ یعنی جو کچھ آفاقی یا انفسی مصیبت تم کو پہنچی وہ پہلے سے کتاب میں یعنی لوحِ محفوظ میں موجود ہے اور ہم نے کتابِ مبین میں پہلے سے اس لئے لکھا اور تم کو یہ تعلیم اس لئے دی کہ تم ما فات پر مغموم اور پریشان نہ ہو الخ۔

اس آیت میں تصریح کر دی کہ ایک بڑی مصلحت مسئلہ تقدیر کی اطلاع میں یہ بھی ہے۔ کیونکہ طبعی بات ہے کہ نقصان ہونے پر انسان کو رنج و صدمہ ہوا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت کو ملاحظہ فرمایئے کہ باوجود غنی اور بے پروا ہونے کے ہماری مصلحت پر نظر فرما کر ہم کو ایسی بات بتلادی جو کہ نہایت درجہ ہمارے لئے سرمایۂ تسلی ہے اگر تمام جہان کے عقلاء متفق الرائے ہو کر اس کی تدبیر کرتے تو ایسی بات ہاتھ نہ آتی جو خدا تعالیٰ نے بتلادی یعنی ہم کو مسئلہ تقدیر سکھلا دیا۔

صاحبو! یہی مسئلہ ہے جس کی بدولت ہم بڑے سے بڑے فکر اور مصیبت میں پڑ کر بھی اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں اور غم کو دھو لیتے ہیں اگر ہم کو اس مسئلہ کی تعلیم نہ کی جاتی تو کوئی

سبیل ہمارے پاس نہ تھی کہ ہم اپنے رنج کو دھو سکیں۔ اس کی حقیقت ایک مثال میں سمجھئے فرض کیجئے کہ دو شخص ایسے ہیں جن کی حالت ہر پہلو سے بالکل یکساں ہے جو کچھ سازوسامان روپیہ پیسہ ایک کے پاس ہو وہی دوسرے کے پاس بھی ہے۔ جو سامانِ آسائش ایک کو میسر ہے دوسرے کو بھی ہے ایک ہی خاندان کے ایک ہی مزاج اور طبیعت کے ہیں اور دونوں کو خدا تعالیٰ نے ایک ایک لڑکا بھی عنایت فرمایا ہے اور دونوں نے اپنے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت میں یکساں کوشش کی ہے اور دونوں لڑکے نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے ہوں اور عین ایسے وقت میں کہ جب سارے گھرانے کی امیدیں ان کے ساتھ وابستہ ہونے لگی ہوں اور ان کے پھلنے پھولنے کے دن آئے ہوں ان دونوں کا انتقال ہو جائے اور اتفاق سے ایک ہی مرض میں اور ایک ہی طبیب کی سوء تدبیر سے مرض بگڑ کر انتقال ہوا ہو اس وقت ان کے والدین کے غم اور رنج کا جو عالم ہوگا ظاہر ہے اور رنج بھی دونوں کا قریب قریب برابر ہوگا کیونکہ دونوں کی یکساں حالت فرض کی گئی ہے لیکن باوجود اس اتحادِ حالات کے ایک یہی فرق دونوں میں تھا کہ ایک ان میں منکرِ تقدیر تھا اور دوسرا قائلِ تقدیر۔ اس لئے ضرور ہے کہ ان دونوں کے رنج میں باوجود اسباب رنج برابر ہونے کے فرق ہوگا یعنی اس شخص کا غم جو قائلِ تقدیر ہے بہت تھوڑی دیر باقی رہے گا کیونکہ فوراً ہی اس کو یہ مضمون یاد آئے گا کہ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ھُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ کہ جو مصیبت آتی ہے وہ خدا کے حکم سے آتی ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ حکیمِ مطلق ہیں اور فعلُ الحکیم لایخلوا عن الحکمۃ (حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا) قضیہ مسلمہ ہے اس لئے یہ مصیبت بھی کسی مصلحت کو لئے ہوئے ضرور ہے اور اگر حضرت خضرؑ کا قصہ قتل صبی کا یاد آ گیا جس کو قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے اور جس کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

آں پسر را کش خضرؑ ببرید حلق   سرّ آں را در نیابد عام خلق

(اس لڑکے کو حضرت خضرؑ نے مار ڈالا اور حلق کو کاٹ دیا مگر اس کا بھید عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا) نیز خدا تعالیٰ کی رحمت واسعہ پر نظر گئی ان سب باتوں سے سمجھ گیا کہ کوئی مصلحت ضرور ہو گی جن میں ایک مصلحت وہ بھی جس کو ایک اعرابی نے سمجھا۔ صاحبو! یہ مضمون سننے اور

غور کرنے کے قابل ہے۔ جب حضرت عباسؓ کا انتقال ہوا تو عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ایک اعرابی تعزیت کے واسطے آیا اور یہ دو شعر تعزیت میں پڑھے۔

اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ فَإِنَّمَا صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاسِ

(اے ابن عباس تم صبر کرو ہم بھی تمہارے ساتھ صبر کریں گے کیونکہ سردار کے صبر کے بعد ہی رعایا بھی صبر کرسکتی ہے) یعنی آپ بڑے ہیں صبر کیجئے کہ ہم چھوٹے بھی صبر کریں آگے کہتا ہے ؎

خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهٗ وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

(حضرت عباسؓ کی وفات پر صبر کی وجہ سے جو تجھے ثواب ملیگا وہ تیرے لئے حضرت عباسؓ سے بہتر ہے اور حضرت عباس چونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہونچ چکے تو حضرت عباسؓ کو تجھ سے بہتر یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات مل گئی ہے)

یعنی حضرت عباس کے انتقال سے تم کو ایسی چیز مل گئی جو تمہارے لئے حضرت عباس کی ذات سے زیادہ نفع رساں ہے یعنی ثواب کیونکہ حضرت عباسؓ کی ذات ان کے لئے اتنی کارآمد نہ تھی جتنا کہ ثواب آخرت کا کارآمد ہے اور حضرت عباسؓ کو تم سے اچھی ایک چیز مل گئی یعنی خدا تعالیٰ کا قرب لہذا نہ تم خسارہ میں ہو نہ وہ۔ تو اگر کوئی اور حکمت سمجھ میں نہ آئے تو یہی حکمت تسلی کے لئے کافی ہے یہ تو قائل تقدیر کی حالت تھی۔ اب منکر تقدیر کو لیجئے کہ اس کے پاس تسلی اور تسکین کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے وہ عمر بھر اسی رنج میں رہے گا کہ افسوس میں نے فلاں تدبیر کیوں نہیں کی اور فلاں طبیب سے کیوں رجوع نہ کیا کبھی اپنی خطا تجویز کرے گا کبھی معالج کی بے پروائی سمجھے گا اور اس کو برا بھلا کہنا شروع کرے گا لیکن وہ ہزار شکایت کرے بلکہ معالج کو سزا بھی کرادے لیکن اس کے دل کی حسرت کسی طرح کم نہ ہوگی کیونکہ اس کو ہمیشہ یہ خیال رہے گا کہ اگر میں فلاں تدبیر کرتا تو ضرور کامیاب ہوتا تو اس کا غم اس کی عمر کے برابر ہے کہ جب تک زندہ رہے گا غم و رنج ہی میں رہے گا اور قائل تقدیر کے غم کی عمر زیادہ سے زیادہ ہفتہ دو ہفتہ۔ اس مثال سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہر علم کی ایک نہ ایک غایت ضرور رکھی ہوئی ہے اگر اہل علم غور کریں گے تو قرآن شریف و حدیث شریف میں بکثرت ان غایات کو پائیں گے غضب کی بات ہے کہ ان

غایات کا اتنا بڑا ذخیرہ اور بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ صاحبو! قطع نظر اس سے کہ یہ علم کا ذی غایت عملیہ ہونا فی نفسہ ایک علم ہے اور اس لئے قابل تحصیل ہے اس میں ایک بڑا نفع یہ ہے کہ اگر ان غایات پر نظر ہو تو بہت سے شبہات اور شکوک کا خاتمہ ہو جاتا ہے مثلاً مسئلہ تقدیر کی غایت معلوم ہونے سے یہ نفع ہو گا کہ اس مسئلہ پر جو بہت سے شبہات ہوتے ہیں وہ جاتے رہیں گے کیونکہ جو شخص غایت کو سمجھ کر کام میں لگے گا اس کو شبہ واقع ہونے کی نوبت ہی نہ آئے گی اسی طرح مثلاً نزول باری کے متعلق شبہ کیا جاتا ہے کہ نقل و حرکت اجسام کا خاصہ ہے لہذا کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا کے لئے خواص اجسام ثابت کئے جائیں۔ صاحبو! مجھے اسی کی شکایت ہے کہ اس شبہ کی نوبت ہی کیوں آتی ہے اصل وجہ اس نوبت آنیکی یہ ہے کہ ہم کو اس اطلاع دہی کی غایت کا علم نہیں اور جس دن اُس غایت کی خبر ہو جائے گی اعتراضات پیدا ہی نہ ہوں گے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص قصبہ کے تحصیلدار کو یہ اطلاع کرے کہ صاحب کلکٹر یہاں سے چھ میل کے فاصلہ پر ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں اور تحصیلدار اس خبر کو سن کر اس خبر رساں پر اعتراض کرنے لگے کہ تم کو کیونکر معلوم ہوا کہ یہ مسافت چھ میل کی ہے اور تم نے کیسے پہچانا کہ وہ کلکٹر ہے وغیرہ وغیرہ تو سمجھا جائیگا کہ تحصیلدار اپنی تحصیل کے کام کو ضروری نہیں سمجھتا نیز اس کو معلوم نہیں کہ کلکٹر کس غرض سے دورہ کر رہا ہے کیونکہ اگر یہ کام کو ضروری سمجھتا اور اس دورہ کی غرض معلوم ہوتی تو ہرگز اس کو ایسے اعتراض نہ سوجھتے بلکہ اپنے کام کی فکر ہوتی اور سب سے پہلے اپنے کام کی درستی کی فکر کرتا جب اس سے فراغت ہوتی اس کے بعد البتہ اس قسم کے سوالات کی گنجائش تھی پس خدا تعالیٰ کے نزول کی اطلاع سے بھی مقصود ہم کو یہ جتلانا ہے کہ وہ تمھاری طرف متوجہ ہوتے ہیں تم انکی طرف متوجہ ہو اور اس نے تم کو یہ شرف بخشا ہے کہ ؎

امروز شاہ شاہاں مہماں شدست مارا ۔۔۔ جبریل با ملائک درباں شدست مارا

(آج بادشاہوں کے بادشاہ ہمارے مہمان ہوئے ہیں آج جبرئیل علیہ السلام بہت سے فرشتوں کو لیکر ہمارے گھر کا پہرہ دار ہیں)

یہ بات تھی جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یاد دلایا تھا جس سے مقصود یہ تھا کہ حاکم حقیقی کے قرب کی خبر سن کر جو کچھ کرتا ہے وہ کر لو مگر افسوس کہ ہم نے کرنے کا کام تو نہ کیا۔ ہاں ترمذی شریف کی

حدیث میں شکوک پیدا کر دیئے مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حدیث شریف پڑھا رہے تھے ایک طالب علم نے اس حدیث میں کہ نماز میں حدیث النفس نہ کرنے سے گذشتہ گناہ معاف ہوتے ہیں اعتراض کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حدیث نفس بھی نہ ہو مولانا نے اس پر فرمایا کہ بھائی کبھی اس کا ارادہ تم نے کیا ہے؟ اگر کبھی ارادہ کیا ہوتا اور پھر حاصل نہ ہوسکا ہوتا تو یہ سوال زیبا تھا اور جب ارادہ ہی نہیں کیا تو کس منہ سے عسیر الحصول کہا جاتا ہے خوب کہا ہے ؎

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن ... بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ... اے رُوسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

فرہاد اپنے عشق میں کامیاب نہیں ہوسکا لیکن آج دفتر عشق میں سب سے اول اس کا نام ہے اس لئے کہ اس نے اپنی وسعت بھر کوشش تو کی لیکن اگر تم بھی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تو تمہارے سوالات قابل قدر تھے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا کی زندگی قیل وقال کے لئے نہیں وجد وحال کے لئے ہے ہاں اشکال کے حل کا وہ وقت ہے جب تمہیں ہر طرح اطمینان کلی نصیب ہو جائے اور یہ اس وقت ہوگا جس کی نسبت ارشاد ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (بہت سے چہرے اُس روز (ایمان کی وجہ سے) روشن (اور مسرت سے) خنداں شاداں ہوں گے) اس وقت فرصت میں جا کر پوچھ لیجئے گا کہ نزول کے کیا معنے تھے باقی نری الفاظ کی توجیہہ سے تسلی نہیں ہوا کرتی اور دیکھئے صحابہ کرام نے سب کچھ سنا لیکن کبھی نہ پوچھا کہ یہ کیونکر ہوتا ہے اور اس کو تو کیا پوچھتے ایک ہلکی سی بات کو پوچھا تھا اسی کی نسبت ارشاد فرمایا گیا کہ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ ط (آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بیکار سوالات کے جواب کی ضرورت نہیں نہ اس قسم کے سوالات کی اجازت ہے اپنے کام میں لگا رہنا چاہئے۔ کسی شخص نے ایک عارف سے پوچھا کہ معراج میں کیا کیا باتیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے کیں چونکہ یہ ضروری سوال تھا جواب دیا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں ... بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس کا دماغ ہے اور کس کی ہمت ہے باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور باد صبا نے کیا کیا)

اور صاحبو! ذات و صفات کے بارے میں حق کس کو ہے کہ وہ کچھ زبان کھول سکے اور دماغ کس کا ہے کہ وہ کچھ سمجھ سکے

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبانِ مرغاں را

(جب تو نے حضرت سلیمانؑ ہی کو نہیں دیکھا تو پرندوں کی بولیاں کیا سمجھ سکتا ہے)

نیز یہ بھی ہے کہ

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کا ینجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

(اے شکاری اپنا پھندا اٹھا لے عنقا (شبہ باز) کا شکار کوئی نہیں کر سکتا اس جگہ ہمیشہ ہوا ہی کے پھندے کو توڑ دیا ہے یا پھندے کے اندر ہوا ہی رہی ہے)

اور یہی وجہ ہے کہ علامہ غزالی رحمہ اللہ اپنی تصانیف میں علم کلام پر بہت انکار کرتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو اس شعر کا حاصل ہے

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کا ینجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

غرض ذات و صفات کے متعلق احاطہ ہو سکنا ممکن نہیں اس لئے کہ اَلَا اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ

اور جب وہ عالم بھر کو محیط ہے تو ایک ضعیف انسان اس کی ذات با صفات کو کما حقہٗ کیونکر علماً احاطہ کر سکتا ہے اگر ایک پانی کا کیڑا عالم بھر کے اسرار کی دریافت کی کوشش کرنے لگے اور چاند سورج پر کہ جو اس کو پانی میں نظر آتی ہیں رائے زنی کرنے لگے تو کیا وہ ان کی پوری جسامت کو دریافت کر سکے گا۔ ہرگز نہیں۔ ہماری وہ حالت ہے کہ

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں ست زمین و آسمانِ وے ہماں ست

(اس کیڑے کی طرح جو پتھر کے اندر چھپا ہوا ہے اس کا زمین و آسمان وہ ہی ہے)

تو اگر پتھر کا کیڑا اس کے اندر رہ کر سنے کہ بہت سی متحرک چیزیں دنیا میں ہیں اور وہ اُن سب کی حقیقت وہاں ہی ڈھونڈھنے لگے اور جب اس کی سمجھ میں نہ آسکیں تو قطعاً انکار کر دے اور سب کو ہیچ بتلادے تو کیا اس کا ہیچ کہنا قابل التفات ہوگا یا اس کی جستجو قابل شمار جستجو ہوگی کبھی نہیں اور یاد رکھو کہ جن لوگوں نے کچھ سمجھ لیا ہے وہ یوں کہتے ہیں

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو کہ کس نکشود نکشاید بحکمت ایں معمّا را

رگانے بجانے والے اور شراب کے متعلق جو کچھ کہنا ہے کہو اور زمانے کے بھید معلوم کرنے کی فکر میں نہ رہو کیونکہ حکمت کے ذریعہ کوئی بھی اس راز کو نہ سمجھ سکا نہ سمجھ سکتا ہے)

اے اہل سائنس سائنس کی تحقیق اس وقت کیجیے کہ جب آپ کو اپنے ضروری مشغلوں سے فرصت ہولے ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے آپ کس منجھدار میں پھنسے ہیں خود آپ کا ضروری مشغلہ ایسا عظیم الشان ہے کہ ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(عشق کا دریا بڑا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اس جگہ تو سوائے اپنی جان کو سپرد کر دینے کے اور کوئی علاج نہیں) تو جب اس بحر عشق کے پیچ د خم لامتناہی ہیں تو اس کو چھوڑ کر کواکب کے اسرار میں کہاں جا پھنسے اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ کواکب وغیرہ کا ذکر خود قرآن شریف میں بھی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف میں محض خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کے مفرد من الکمال ہونے پر استدلال کرنے کے لئے ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے ان چیزوں کا اجمالی علم کافی ہے جس کو ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے چنانچہ ایک بدوی کا قول ہے اَلْبَعْرَۃُ تَدُلُّ عَلَی الْبَعِیْرِ وَالْاَثَرُ یَدُلُّ عَلَی الْمَسِیْرِ فَالسَّمَآءُ ذَاتُ الْاَبْرَاجِ وَالْاَرْضُ ذَاتُ الْفِجَاجِ کَیْفَ لَا یَدُلُّ اٰنِ عَلَی اللّٰطِیْفِ الْخَبِیْرِ (اونٹ کی مینگنیوں سے سمجھا جاتا ہے کہ یہاں سے اونٹ گذرا ہے قدموں کے نشان دیکھ کر سمجھا جاتا ہے کہ یہاں سے کوئی گذرا ہے تو پھر یہ برجوں والے آسمان اور گڑھوں والی زمین کو دیکھ کر اس کے بنانے والے اللہ تعالیٰ کو نہیں سمجھا جا سکتا جو لطیف بھی اور باخبر بھی ہے) صاحبو! اس سے زیادہ اور کیا پاکیزہ استدلال ہوگا اب فرمائیے کہ اس بدوی نے سائنس اور ہیئت کی کونسی کتاب پڑھی تھی اور کس مدرسہ میں تعلیم پائی تھی صرف ایک چیز کو دیکھا اور خدا تعالیٰ کی ہستی پر استدلال کیا پس قرآن مجید میں بھی بقدر ضرورت اجمالاً ایسے مضامین آئے ہیں انکی فضول تحقیقات جن پر استدلال علی الصانع موقوف نہ ہو ندکو نہیں غرض ان امور میں پڑنا ایک شغل لایعنی ہے پھر آج اس سے بھی زیادہ یہ غضب کیا جا رہا ہے کہ سائنس کے ان لایعنی مسائل کو قرآن شریف میں تلاش کیا جاتا ہے صاحبو! اس قسم کے مسائل کا قرآن شریف میں تلاش کرنا ایسا ہے جیسے طب اکبر میں جوتیاں سینے کی ترکیب تلاش کرنا۔ غرض جو شخص کام میں لگے گا اس کو اس قسم کی خرافات کی طرف توجہ نہ ہوگی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس قسم کے سوالات نہ کرنا بتلا رہا ہے کہ یہ سوالات سب غیر ضروری اور بے کار ہیں صرف اس قدر

اجمالاً سمجھنا کافی ہے کہ یہ مصنوعات ہیں لہٰذا ان کے لئے کسی صانع کا ہونا ضروری ہے۔ اب توحید کی غایت کو لیجئے **اس کو** اہتمام کے لئے مکرر بیان کرتا ہوں کہ ہم کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ کہ خدا کا کوئی شریک نہیں وہ بے نیاز ہیں نہ اس نے کسی کو جنا نہ کسی نے اس کو جنا نہ اس کے کوئی کفو ہیں۔ اس تعلیم کی ایک غایت تو یہ ہے کہ اس کے اعتقاد سے ہم کو نجات حاصل ہو دوسری ایک غایت اس کی یہ بھی ہے کہ غیر خدا پر کبھی طمعاً و خوفاً نظر نہ ہو کیونکہ طبعی امر ہے کہ جب کسی بہت بڑے سے تعلق ہو جاتا ہے تو چھوٹوں کی ہیبت یا احتیاج دل میں باقی نہیں رہا کرتی۔ اکبر شاہ کی حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ شکار میں گیا اتفاقاً تن تنہا کہیں دور نکل گیا ایک دیہاتی کے یہاں مہمان ہوا جب چلنے لگا تو اس دیہاتی سے کہا کہ اگر تم کو کبھی حاجت واقع ہو تو تم دار السلطنت میں ہمارے پاس آنا چنانچہ وہ ایک بار آیا اکبر اس وقت نماز پڑھ رہا تھا نماز سے فارغ ہو کر اس نے دعا مانگی جب دعا سے بھی فراغت کر چکا تو اس دیہاتی نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے۔ اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا۔ دیہاتی نے کہا تم کو بھی مانگنے کی ضرورت ہے؟ اکبر نے کہا کہ بیشک مجھے بھی ضرورت ہے۔ کہنے لگا کہ پھر مجھے تم سے حاجت کہنے کی کیا ضرورت جو شخص تمہارے شاہانہ سوالات کو پورا کرے گا کیا وہ میرے غریبانہ سوالات کو پورا نہ کرے گا۔ تو یہ استغنا اس توحید ہی کے رنگ کی بدولت تھا جو کہ چھلک اٹھا اسی کو کہتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ❊ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد ز کس ❊ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(ایک اللہ تعالیٰ پر یقین اور بھروسہ رکھنے والا سونے چاندی کو ٹھوکر سے مارتا ہے خواہ تم اس کے قدموں میں زر و زیور رکھدو یا اس کے سر پر ہندی لوہے کی مشہور تلوار رکھدو)

اسی طرح عقائد کے ہر مسئلہ کی ایک غایت علاوہ نجات کے قرآن شریف و حدیث شریف میں ملے گی تو ان غایات کو بالکل نظر انداز کر دینا بڑا ظلم ہے ان کو بھی لینا چاہیئے۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہو گئی جس طرح ہر عمل کو علم سے تعلق ہے اسی طرح ہر علم کو بھی عمل سے تعلق ہے گو کیفیت تعلق کی مختلف ہو لہٰذا بڑی کمی ہو گی کہ صرف علم کو بیان کر کے چھوڑ دیا جائے اور اس کے متعلق عمل کو بیان نہ کیا جائے۔ یہاں تک تمہید تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بحث علمی کے بعد ضرورت اس کی بھی ہے کہ اعمال سے بحث کیجائے

اسی واسطے میں نے اس آیت کو اس وقت پڑھا ہے تاکہ مولوی شبیر احمد صاحب کے بیان علمی کے بعد اسی آیت کا بیان عملی بھی ہو جائے۔ بالجملہ اس میں خدا تعالیٰ ایک شکایت کو ظاہر فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگ دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت چھوڑتے ہو یہاں تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ کے بعد تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (تم جلدی سے ملنے والی چیز دنیا سے محبت کرتے ہو اور چھوڑ دیتے ہو آخرت کو) بڑھانے سے حبِّ دنیا کی تفسیر بھی ہو گئی یعنی حبِّ دنیا اس کو کہیں گے جس میں آخرت کا ترک ہو جائے اور اسی سے حُبُّ الدُّنْیَا رَاسُ کُلِّ خَطِیْئَةٍ کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ہوں گے یعنی حبِّ دنیا وہ ہے کہ اس کی بدولت آخرت چھوٹ جائے ورنہ اگر آخرت نہ چھوٹے تو وہ حبِّ دنیا نہ سمجھی جائے گی اور وہ رَاسُ کُلِّ خَطِیْئَةٍ میں داخل نہ ہو گی گو اس کی طرف طبعی میلان اور بقدر ضرورت اس کا اکتساب بھی ہو اس کے دریافت کرنے سے بہت سے اشکالات رفع ہو جائیں گے کیونکہ فدایان ترقی یہ سمجھتے ہیں کہ علماء ہم کو دنیا کے لینے سے بالکل روکتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہم مسجد کے ملا ہو کر بیٹھ رہیں چنانچہ ان لوگوں نے اس قسم کی ایک حکایت بھی گڑھی ہے کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ کے ہاں بہت سے مولوی جمع ہو گئے تھے سب نے اتفاق کر کے بادشاہ سے کہا کہ فوج پر یہ روپیہ فضول خرچ ہو رہا ہے سب کو موقوف کر دو اس نے کہا کہ فوج اس ضرورت سے رکھی ہے کہ اگر کوئی غنیم آئے تو یہ اس کو دفع کریں مولویوں نے کہا کہ اگر ایسا ہو گا تو اس کام کو ہم انجام دیں گے۔ غرض فوج موقوف کر دی گئی یہ خبر مشہور ہوئی تو کوئی غنیم آ چڑھا۔ بادشاہ نے مولویوں سے خبر کی یہ لوگ کتابیں لیکر پہونچے اور وعظ و نصیحت سنایا وہ کیوں سننے لگا تھا آخر ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ صاحب وہ بڑا نالائق ہے مانتا نہیں خیر پھر آپ ملک چھوڑ دیجیے آپ کا ملک گیا اس کا ایمان گیا اور اس حکایت کو پیش کر کے کہا کرتے ہیں کہ مولویوں کے کہنے پر چلیں تو گھر بار سب چھوڑ دیں۔ صاحبو! اس افواہی حکایت کی تو کچھ اصل ہی نہیں ہے جس کا جواب دیا جائے لیکن اصل اعتراض کی نسبت کہتا ہوں کہ آپ لوگ کسی مولوی کے پاس رہے نہیں اس لئے آپ کو اس قدر وحشت اور اجنبیت ہے چند روز تک اگر کسی مولوی کے پاس رہیے تو ان شاء اللہ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مولوی کیا تعلیم آپ کو دیتے ہیں اور اگر کہیے کہ ہم اتنا وقت کہاں سے لائیں تو میں کہوں گا کہ آپ امراض جسمانی کی ضرورت سے رخصت

لیتے ہیں یا نہیں اور اس رخصت میں تین تین چار چار مہینے گنوا دیتے ہیں یا نہیں تو جب امراض جسمانی کے لئے ایک سول سرجن انگریزی کے کہنے سے چار مہینے فضول برباد کر دیئے تو امراض روحانی کے علاج کے لئے ایک عربی سول سرجن کے کہنے سے بجائے چار مہینے کے چالیس دن ہی اس کے پاس فارغ ہو کر رہ لو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ معتقدانہ رہو بلکہ ممتحنانہ رہنے کی اجازت ہے ہاں معاندانہ طور پر نہ رہو اب اس سے زیادہ اور کیا آسانی ہوگی کہ عمر بھر میں سے صرف چالیس دن مانگے جاتے ہیں واللہ اگر آپ ایسا کریں تو قریب قریب تمام سوالات کے جوابات خود بخود بدون مناظرہ کے آپ کی سمجھ میں آ جائیں اور جب آپ چلنے لگیں اس وقت آپ سے پوچھا جائیگا آیا یہ کہنا صحیح تھا یا نہیں کہ ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(اے وہ ذات کہ تیری ملاقات ہی سے سب سوالوں کا جواب مل جاتا ہے اور تیرے ذریعہ ساری مشکلیں بغیر حجت کے پوری ہو جاتی ہیں)

اور اس وقت کہا جائے گا کہ دیکھ لو ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت بایداز وی رو متاب

(آفتاب خود آفتاب کی دلیل ہے اگر تو اس کے وجود کی دلیل چاہتا ہے تو اس کی طرف سے چہرہ مت ہٹا)

اور چالیس دن کی تخصیص اپنی رائے سے نہیں کرتا بلکہ خود حدیث سے ہم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اگر ہم چالیس دن تک کسی کام کو نباہ کے کریں تو پھر ہماری مدد ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا اجری اللہ مِنْ قَلْبِہٖ یَنَابِیعَ الْحِکْمَۃِ اَوْ کَمَا قَالَ۔ (جس شخص نے چالیس دن خالص اللہ کے لئے کر دیئے اللہ تعالیٰ اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہو جایئے کہ ہر ہر ضرورت میں ہماری دستگیری فرمائی اور ایک معیار ہم کو بتلا دیا کہ اس کے موافق ہم باطمینان کام کر سکیں اور وہ معیار یہ ہے کہ اس میں اخلاص ہو ایسا چلہ نہ ہو جیسا کہ ایک گنوار نے کیا تھا کہ اس کو مولوی صاحب نے نماز پڑھنے کے لئے کہا اور چلہ بھر پڑھنے پر ایک بھینس دینے کا وعدہ کیا جب چلہ پورا ہو گیا تو یہ شخص مولوی صاحب کے پاس گیا اور کہا چالیس دن پورے ہو گئے لہذا بھینس دیجئے مولوی صاحب نے کہا کہ بھائی میں نے تو اس لئے کہہ دیا تھا کہ اگر تو نے چلہ بھر جم کر نماز پڑھ لی تو عادت پڑ جائے گی اور پھر نہ چھوٹ سکے گی کہنے لگا بہتر ہے نہ دیجئے جاؤ پھر

لہ رواہ الدیلمی ولم یصب ابن الجوزی حیث قال انہ موضوع کما صرح بہ الامام السیوطی ۱۲ احمد حسن عفی عنہ

یاروں نے بھی بے وضو تر خائی ہے تو جیسے اس کو بے وضو پڑھنے کی وجہ سے اثر نہ ہوا اسی طرح اگر تم بھی مثلاً اس نیت سے رہو کہ مولوی صاحب کے پاس رہکر خوب دعوتیں کھانے کو ملیں گی تو خاک بھی اثر نہ ہوگا۔ بلکہ میں یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اگر کسی کے پاس جاکر رہنے کا قصد ہو تو اپنے پاس ہی سے کھانا بھی ہو گا تا کہ خرچ کر کے تعلیمات کی قدر تو ہو کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز مفت آتی ہے اس کی کچھ قدر بھی نہیں ہوا کرتی لہٰذا اس تعلیم کا معاوضہ یہ ہے کہ چالیس دن تک اپنا خرچ کر کے رہو مجھے۔

حضرت حاجی صاحب قبلہ نے ایک کتاب چھپوانے کے لئے فرمایا میں نے اس کے مفت تقسیم کرنے کا خیال ظاہر کیا فرمایا کہ بھائی مفت تقسیم نہ کرنا کیونکہ لوگ دیکھیں گے بھی نہیں۔ غرض علماء سے وحشت یا ان پر اعتراضات یا مسائل اسلام میں شکوک اسی وقت تک ہیں کہ جب تک آپ ان کے پاس جاکر نہیں رہتے مگر نہایت افسوس ہے کہ اظہار طلب اور شکوک ہونے کے باوجود بھی یہ نہیں ہوتا کہ چالیس دن کسی کے پاس جاکر رہ لیں۔ قصبۂ کیرانہ میں ایک تحصیلدار صاحب نے ایک صاحب کو پیش کر کے کہا کہ ان کو بعض مسائل اسلام میں شکوک ہیں میں نے کہا ان شکوک کا علاج یہ نہیں کہ اس مختصر جلسہ میں یہ ان کو پیش کریں اور میں جواب دیدوں اور سن کر چلے جائیں ان کا علاج یہ ہے کہ چند روز کے لئے میرے پاس تھانہ بھون میں آکر رہیں اور میں جو کہا کروں اس میں یہ غور کیا کریں ان صاحب نے نہایت زور کے ساتھ تھانہ بھون آکر رہنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مدت گذر گئی اور ان کا وعدہ وفا نہیں ہوا اصل بات یہ ہے کہ لوگ اپنی اس حالت کو مرض نہیں سمجھتے حالانکہ یہ اتنا بڑا مرض ہے کہ کوئی مرض بھی اس کی برابر نہیں نیز مرض بھی پرانا ہے لہٰذا ایک دو جلسہ میں اس کا ازالہ ممکن نہیں کم سے کم ایک چلّہ تو ضرور طبیب کے پاس رہنا چاہیے جیسا حدیث میں مذکور ہوا اسی حدیث کا حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ نے گویا ترجمہ کیا ہے۔

شنیدم رہروی در سرزمینی ہمے گفت ایں معمارا فریبے
کہ اے صوفی شراب انگہ شود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے

(کسی ملک میں میں نے ایک راستہ چلنے والے شخص سے یہ بات سنی وہ اس بات کو بڑے قاعدے اور مزے سے کہتا تھا کہ اے صوفی شراب اس وقت صاف ہوتی ہے جبکہ شیشے کے اندر چالیس روز رہے) شیشے سے مراد قلب ہے اور شراب سے مراد محبت الٰہی ہے معلوم ہوا کہ ایک چلّہ علاج کرنے

سے ان شاء اللہ اصل مرض جاتا رہے گا۔ اور پھر ان شاء اللہ عمر بھر مقویات پہونچتی رہیں گی گویا مسہل تو طبیب کے پاس رہ کر ہو جائیگا اور ازالہ مرض کے بعد تقویت پہنچانے والی دوائیں دور رہکر بھی پہونچتی رہیں گی۔ خدا کے لئے صاحبو اس علاج کو آزما کر تو دیکھو۔ اور چونکہ میں نے اصل علاج بتلا دیا ہے لہذا مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں لوگوں کے جزئی شکوک اور شبہات کا جواب دوں لیکن تبرعاً خاص اس مقام کے اقتضاء سے اتنا کہتا ہوں کہ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ کے بعد بطور تفسیر کے تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ بڑھا دینے سے حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ کے متعلق شبہات کا جواب ہو گیا کہ حُبُّ الدُّنیا وہی ہے جس میں ترک آخرت ہو نہ کہ کسب دنیا پس کسب دنیا جائز ہے اور حُبّ دنیا ناجائز۔ کسب اور حب میں وہی فرق ہے جو کہ غلیظ کے صاف کرنے اور کمانے اور اس کے کھانے میں کہ اول برا نہیں دوسرا برا اور معیوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ فرمایا تَکْسِبُوْنَ الْعَاجِلَۃَ نہیں فرمایا اب اپنے اوپر منطبق کر لیجئے اور دیکھئے کہ آپ تُحِبُّوْنَ کے مصداق ہیں یا تَکْسِبُوْنَ کے۔ اس انطباق میں عوام سے تو کچھ خوف اور اندیشہ اس لئے نہیں کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں ان بیچاروں سے جو بات کہدی گئی انھوں نے سن لی اور عمل کر لیا اور علماء سے اس لئے خوف نہیں کہ ان حضرات کی نظر میں اصل حقیقت تک پہونچی ہوئی ہوتی ہیں البتہ ان نیم خواندہ لوگوں سے جو بوجہ نیم ہونے کے تلخ بھی ہیں ڈر لگتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ کر یہ نہ کہدیں کہ ہم کو یہ آیت سنکر اپنی حالت پر منطبق کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ہم اس کے مخاطب ہی نہیں کیونکہ یہ آیت مکی ہے لہذا کفار اس کے مخاطب ہوں گے ہم مسلمان اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے ہم سے اس آیت کو کیا تعلق لہذا اس کے متعلق عرض کرتا ہوں اور میں نے اس مضمون کو متعدد مرتبہ اس کے قبل بھی بعض جلسوں میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ آیات کے متعلق یہ سن کر کہ کفار کو خطاب کیا گیا تھا بے فکر ہو جاتے ہیں حالانکہ اس سے بیفکر نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ زیادہ فکر میں پڑجانا چاہیے اور زیادہ اثر لینا چاہیئے کیونکہ جب کوئی آیت عتابیہ کفار کی شان میں نازل ہوتی ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس آیت کے مضمون کا خطاب کفار کو ان کی ذات کی وجہ سے ہوا ہے یا کسی صفت کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ذات کی وجہ سے یہ خطاب نہیں ہوا ورنہ ہر انسان کو گو وہ متقی ہی ہو اس کا خطاب ہوتا کیونکہ ذاتاً سب

متحد ہیں اور لازم باطل ہے پس معلوم ہوا کہ کسی صفت کی وجہ سے یہ خطاب ہوا ہے اور کوئی حالت خاص اس مضمون کے ترتب کی علت ہے تو اگر وہ علت کفار کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی پائی جائیگی تو اس جگہ بھی یہ مضمون مرتب ہوگا مثلاً اسی آیت میں وعید کا مدار حب العاجلہ ہے لہٰذا اگر حب عاجلہ تمہارے اندر پائی جائیگی تو تم بھی وعید کے تحت میں داخل ہوگے پس اب غور کرلو اور اگر اپنے اندر حب عاجلہ دیکھو تو بہت جلد اس کا علاج کرو اور اپنی حالت پر افسوس کرو کہ جو امور اس زمانے میں کفار میں ہوتے تھے وہ آج ہمارے یعنی مسلمانوں کے اندر موجود ہیں۔

اسی طرح حدیث مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ (کسی نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کا کام کیا) میں تاویل کرکے لوگ بے فکر ہوگئے ہیں حالانکہ یہ بے فکری کی بات نہیں بلکہ اگر تاویل اس میں نہ ہوتی اور حقیقی معنی مراد ہوتے تو کچھ زیادہ حرج نہ تھی کیونکہ اگر کسی چمار کو چمار کہدیا جائے تو اس کو کچھ غیرت نہ آئے گی اور اگر کسی شریف کو چمار کہدیا جائے تو اس کو مر رہنا چاہیئے تو تاویل کرنے سے وعید میں من وجہ زیادہ شدت ہوگئی اور زجر بڑھ گیا مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ فہم سے کام نہیں لیتے بحمد اللہ ہم خوانوں کا شبہ تو رفع ہوا لیکن ایک شبہ تین پاؤ خوانوں کا رہ گیا ہے کہ تُحِبُّوْنَ اور تَذَرُوْنَ سے مطلق محبت اور ترک مراد نہیں بلکہ یہ دونوں لفظ خاص ہیں یعنی وہ ترک مراد ہے جو اعتقاداً ہو اسی طرح محبت سے وہ محبت مراد ہے جو اعتقاداً بقائے دوام کے ساتھ ہو اور ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں کیونکہ ہم بحمد اللہ قیامت کے قائل ہیں دنیا کو فانی جانتے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں کوئی قید نہیں اور تمہارے پاس اس قید کی کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل کوئی دعویٰ مسموع نہیں ہوتا پس اس قسم کی قید لگانا قرآن شریف کے مقصود کو باطل کرتا ہے اور ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے کسی مقام پر پہنچکر ایک مجمع میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا میں جب یہاں آیا تو ایک عورت سے میری آشنائی ہوئی اور میں اس کے گھر جایا کرتا تھا اور اس کا گھر ایسا ایسا تھا اور اس کا شوہر ایک بار آگیا تھا اور اس نے مجھ کو اس طرح چھپا دیا تھا اور اس موقع پر اس عورت کا شوہر بھی تھا اور اس کے پکڑنے کی فکر میں تھا اب یہ اقراری مجرم مجمع کے سامنے ہوگیا جرم ثابت ہونے میں کوئی حجت باقی نہ رہی اس عورت کو خبر ہوئی اور یہ کچھ اشارہ کردیا جس کو یہ سمجھ گیا اور تمام قصہ ختم کرکے اخیر میں کہدیا کہ بس اتنے میں آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا لوگوں نے کہا کہ کیا یہ سب خواب تھا کہنے لگا اور نہیں تو بھلا میں

غریب پردیسی مجھ کو کون پوچھتا ہے تو ایسی تاویل آپ حضرات ہی کو مبارک ہو۔ ہمارا مذہب تو یہ ہے کہ اَلْمُطْلَقُ یُجْرٰی عَلٰی اِطْلَاقِہٖ (جس میں کوئی شرط اور قید نہ ہو وہ عام ہی رہیگا) البتہ اگر ترکِ عمل کی اباحت کہیں قرآن شریف یا حدیث شریف میں مذکور ہوتی تو البتہ رفع تعارض کے لئے اس موقع پر قید مذکور لگا کر تاویل کی جاتی اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مسئلہ اجرائی مطلق علی الاطلاق ہر جگہ نہیں بلکہ اس مقام پر ہے کہ جہاں مطلق کو اطلاق پر رکھنے میں کسی دوسری آیت یا حدیث سے تعارض واقع نہ ہو اور اگر تعارض ہو گا تو مطلق اپنے اطلاق پر نہ رہے گا غرض یہ ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں کرلیں مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کی ذرا پروا نہیں وہ حالت ہو رہی ہے کہ ؎

بر ہوا تاویل قرآں میکنی پست و کژ شد از تو معنی سنی

چوں ندارد جانِ تو قندیل ہا بہر بینش میکنی تاویلہا

کردہ تاویل لفظِ بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را

(جو تیرے پاس روشنی کے لئے قندیلیں نہیں ہیں تو تو اپنی عقل کے لئے تاویلیں گھڑ رہا ہے)

اور میں علی سبیل التنزیل کہتا ہوں کہ اگر یہ معنے مطلق نہ بھی ہوں اور تذرون مقید ہی ہو اعتقادی ترک کے ساتھ مرتب بھی آپ کو بے فکری نہ ہونا چاہیئے کیونکہ جس دل میں درد ہوتا ہے اس کو تھوڑے سے التفات سے تنبیہ ہو جاتا ہے گو وہاں دوسری ہی کسی حالت کا بیان ہو مشہور ہے کہ ؏ عشق ست و ہزار بدگمانی۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سبزی فروش صدا لگاتا ہوا نکلا الخیار العشرۃ بدانق جس کے معنی یہ ہیں کہ دس لکڑیاں ایک دانق کی عوض لیکن حضرت شبلی رحمہ اللہ نے سن کر ایک چیخ ماری اور رونے لگے اور فرمایا کہ جب دس پسندیدہ آدمیوں کی یہ قیمت ہے تو ہم گنہگار کس شمار میں ہیں ان کا ذہن منتقل ہوا خیار کے دوسرے معنے کی طرف یعنی نیک لوگ۔ ان لوگوں کے دل میں ہر وقت وہی ایک بات رچی رہتی ہے۔

حضرت جامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

بسکہ در جانِ نگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

(حقیقت یہ ہے میری جان میں جان ڈالنے والا اور میری کھلی آنکھ تو ہی ہے اور دور سے بھی جو کچھ مجھے دکھائی دیتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ بس تو ہی ہے)

ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ شعراء کے کلام سے مسائل پر استدلال کیا جاتا ہے اس لئے میں حدیث سے بھی اس کو ثابت کرتا ہوں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے اور صحابہ کرام کچھ کھڑے کچھ بیٹھے تھے اور کچھ آرہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِجْلِسُوْا یعنی بیٹھ جاؤ اس ارشاد کو سن کر جو شخص جس جگہ تھا اسی جگہ بیٹھ گیا حتیٰ کہ ایک صحابیؓ اسی وقت مسجد میں داخل ہوئے تھے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سن کر فوراً جوتوں کے پاس بیٹھ گئے حالانکہ جانتے تھے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو جگہ پہنچ کر بھی بیٹھے نہیں لیکن محض اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے اور ہمارے کانوں میں پڑا ہے اگرچہ ہم بظاہر مخاطب نہیں لیکن خطاب محبوب کو سننے والے تو ہو لہذا بیٹھ ہی جانا چاہیئے تو آپ لوگ جامیؒ اور شبلیؒ کو بھی جانے دیجئے خود حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دردِ دل کا اور محبت کا مقتضا یہ ہے کہ احتمال پر بلکہ بہت مشتبہ احتمال پر بھی اپنے کو مخاطب سمجھے اگرچہ اپنے مخاطب ہونے کا یقین نہ ہو بلکہ مخاطب نہ ہونے کا بھی یقین ہو مگر یہ سمجھ لیجئے کہ جامیؒ کو چھوڑ کر جام نصیب نہ ہوگا غرض جس طرح آپ چاہیں ثابت سمجھیں حدیث سے یا شعراء کے اقوال سے ہمارا مقصود ہر طرح حاصل ہے اب میں مقصود کی تفصیل کرتا ہوں کہ اس آیت میں حُبِّ عاجلہ پر ملامت فرمائی گئی ہے اور اس کے مراتب مختلف ہیں تو جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجہ کی ملامت بھی اس پر مرتب ہوگی۔

ایک درجہ تو محبت کا انتہائی ہے جس کو کفر کہتے ہیں اور اس پر ابدالآباد کی سزا اور ملامت مرتب ہوگی بحمد اللہ مسلمان اس سے تو پاک ہیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعتقاد تو صحیح ہے یعنی آخرت کے امکان اور وجود دونوں کا قائل ہے لیکن اس اعتقاد اور علم کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا کہ اعمال درست ہوتے خشیت کا غلبہ ہوتا دنیا سے دل سرد ہوتا یہ بات نہیں ہے اس کے متعلق خدا تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتے ہیں اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ کہ قیامت کا دن جس میں حساب کتاب ہوگا اور ایک

جزئی عمل کو جانچا جائے گا۔ سر پر آگیا ہے مگر لوگ ابھی خوابِ غفلت میں مست ہیں جو لوگ صرف علم کو کافی سمجھ کر عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ اس میں غور کریں اور دیکھیں کہ اب بھی ان کی رائے صحیح رہتی ہے یا نہیں۔ صاحبو! یاد رکھو یہ مرجیہ کا مذہب ہے۔ آپ لوگ اگرچہ درجۂ اعتقاد میں اس کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے اعتقادی مؤاخذے سے بچات پا جائیں لیکن بالکل بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ صاحبو! ہم لوگ خدائے تعالیٰ کے فضل وکرم سے اہل سنت والجماعت ہیں ہمارے نزدیک ہر ایک چیز اپنے درجے پر ہے۔ علم اپنے درجے پر ہے اور عمل اپنے درجے پر ہے۔ اور یہ نہ سمجھو کہ ترکِ عمل گناہ صغیرہ ہے اس لئے قابل توجہ نہیں کیونکہ اول تو یہ گناہ صغیرہ نہیں بلکہ کبیرہ ہے۔ دوسرے اگر بالفرض صغیرہ بھی ہوتا تب بھی قابل توجہ تھا اس لئے کہ گناہ صغیرہ اور کبیرہ کی مثال چھوٹی چنگاری اور بڑے انگارے کی سی ہے یعنی جس طرح ایک بڑا انگارا غفلت ہونے کی صورت میں قصر عالیشان کو خاکستر بنا دینے کے لئے کافی ہے اسی طرح ایک چنگاری بھی تھوڑی مدت میں اس انگارے کی برابر بلکہ اس سے زائد کام کر سکتی ہے اور اگر اب بھی کسی صاحب کو گناہ صغیرہ کے قابل ترک ہونے میں تامل ہو تو وہ مہربانی کر کے ایک چھوٹی چنگاری اپنے گھر کے چھپر میں رکھ کر دیکھ لیں۔ صاحبو! سچ کہتا ہوں کہ تمہارے قصر ایمان کے لئے گناہ صغیرہ ایسا ہی ہے جیسے چھپر کیلئے چھوٹی چنگاری اور یہ گفتگو علی سبیل التنزل تھی ورنہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے ترک عمل صغیرہ نہیں۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ شریعت کے خلاف وضع رکھنا یا رشوت لینا عدل نہ کرنا چوری کرنا ہمیشہ داڑھی منڈانا ٹخنوں سے نیچے یا ٹخنوں کی برابر پاجامہ پہننا معاصی صغیرہ ہیں۔ کبھی نہیں۔ البتہ کفر سے کم ہیں لیکن جو چیزیں کفر سے کم ہوں ان سے بے فکری کی اجازت مل جانا ضروری نہیں ہے

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالیست پیشِ خاکِ تُود

(عرش الٰہی کے لحاظ سے تو آسمان نیچے ہے مگر مٹی کے ڈھیر اور پہاڑوں سے بہت بلند ہے)

صاحبو! چھوٹا بڑا ہونا امر اضافی ہے لہذا ممکن ہے کہ جو امر دوسرے امر کی نسبت چھوٹا ہو وہ نظر آالیٰ ذاتہ بہت بڑا ہو۔ ہمارے عرف میں باپ کے بڑے بھائی کو تایا کہتے

ہیں تو باپ تایا سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ تایا سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اپنے باپ کو اپنا صاحبزادہ سمجھنے اور کہنے لگا ہو بلکہ تایا کی برابر ہی اسکی عزت بھی کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اگرچہ تایا کی نسبت چھوٹا ہے لیکن فی نفسہ تو چھوٹا نہیں اسی طرح عمل کا گناہ اگرچہ کفر سے چھوٹا ہے لیکن فی نفسہ وہ چھوٹا نہیں ہے اور عمل کو ضروری نہ سمجھنے کی بلا کہ عملی حُبِّ عاجلہ ہے ایسی عام ہے کہ اس میں عوام علماء بلکہ اہلِ باطن کم وبیش سب ہی مبتلا ہیں لیکن سب کا ابتلاء مختلف حیثیتوں اور مختلف مراتب کا ہے اسی لئے ممکن ہے کہ بعض فرقوں کا ترکِ عمل صغیرہ ہی کے مرتبہ میں ہو یا بعض خلاف اولیٰ ہی کے مرتکب ہو رہے ہیں لیکن جس طریق میں وہ ترک پیش آرہا ہے اس کے اعتبار سے وہ کبیرہ یعنی مہتم بالشان ہی سمجھا جائے گا۔ پس سب سے بڑا درجہ تو کفر ہے اُس کے بعد مسلمان دنیاداروں کی حالت۔ بالخصوص ان میں سے ایک خاص جماعت کی جس کو اس زمانہ کی نیرنگیٔ جدت نے بیحد متاثر کیا ہے یہ لوگ خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قائل نہیں اس کو برحق مانتے ہیں لیکن ایسا مانتے ہیں کہ وہ ماننا نہ ماننے کی برابر ہے چنانچہ بعضے یہاں تک کہتے ہیں کہ ضرورت مذہب مجبور کرتی ہے کہ خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جائے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ہم اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں اس لئے ہم کو بھی ماننا چاہیئے اور اس اعتقاد وتسلیم کی جو حقیقت ہے ظاہر ہے۔ نیز بعض لوگ ان میں ایسے بھی ہیں کہ محض قومیت کی وجہ سے مذہب اور مذہب کے مسائل کے قائل ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ترقی قومی ان لوگوں کے نزدیک اصل مقصود ہے اور ترقی بدون اتحاد کے حاصل نہیں ہو سکتی اور حصول اتحاد قومی کے لئے اتحادِ مذہب سب سے اچھا ذریعہ ہے لہٰذا ہم سب کو ایک مذہب ماننا چاہیئے تو چونکہ اتحادِ مذہب ترقی قومی کا موقوف علیہ ہے اس لئے مجبوراً اس کو مانا جاتا ہے تاکہ ان کا تمدن اور ترقی محفوظ رہے اس جماعت کے نزدیک اسلام کی جو وقعت ہے وہ بالکل ہی ظاہر ہے یعنی اس نے مذہب اسلام کو ایک دنیوی مطلوب کے حصول کا آلہ قرار دیا اور آلہ خود مقصود بالذات نہیں ہوا کرتا بلکہ اگر کبھی مقصود کسی دوسرے طریقے سے

حاصل ہونا ممکن ہو تو آلہ کو ترک کر دیا جاتا ہے لہذا یقینی ہے کہ اگر بدون اتحاد فی المذہب کے کسی دوسرے طریقہ سے تمدنی ترقی ان لوگوں کو حاصل ہو سکے تو ہرگز یہ متحد فی المذہب نہ رہیں یا کم از کم اس اتحاد کو غیر ضروری سمجھنے لگیں یا اگر اتحاد پر تو موقوف ہو لیکن اتحاد فی الاسلام پر موقوف نہ ہو تو ہرگز یہ لوگ مسلمان نہ رہیں۔ چنانچہ اسی جماعت کے ایک صاحب حال نے یہ رائے پیش کی تھی کہ دنیا میں سب کے لئے ایک مذہب ہونا چاہیئے۔ اور وہ مذہب توحید ہے غیر موحدین کو توحید اختیار کرنا چاہیئے اور اہل توحید کو اعتقاد رسالت کی قید سے قطع نظر کرنا چاہیئے اگر کوئی شخص رسالت سے مختلف الرائے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں اس کو مذہب کا مخالف نہ سمجھنا چاہیئے (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے نفس کی برائیوں سے بچائے) صاحبو! یہ وہی مذہب ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ ع

از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد

اور لیجئے ایک مسلمان نے ایک مجمع میں کہا کہ توحید پر مدار نجات ہے رسالت کا اقرار کوئی ضروری مسئلہ نہیں ہے اگر اس کا کوئی منکر بھی ہو تو اس کی نجات ہو جائے گی میں نے جواب میں کہا کہ توحید کو تو موقوف علیہ نجات کا مانا جاتا ہے اب سمجھو کہ توحید کی حقیقت کیا ہے؟ سو توحید کی حقیقت یہ ہے کہ ہم ایسا معبود ایک مانیں کہ نہ اس کا کوئی شریک و سہیم ہو نہ کمالات میں کوئی حالت منتظرہ اس میں باقی ہو نہ عیوب میں سے کوئی عیب اس کے اندر پایا جاتا ہو اگر کوئی عیب خدا میں کوئی مانے وہ توحید کا منکر ہوگا۔ اور منجملہ عیوب کے ایک عیب وقوع کذب بھی ہے لہذا جس میں کذب پایا جائیگا وہ خدا نہ ہوگا اور قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط تو جو شخص آپ کو رسول نہ مانے اس نے خدا کو کاذب کہا اور جو کاذب کہے وہ موحد نہیں پس جو شخص آپ کو رسول نہ مانے وہ موحد نہیں پس انکار رسالت مستلزم ہے انکار خدا کو تو ثابت ہوا کہ منکر رسالت کو تمہارے ہی قاعدے سے نجات نہیں ہو سکتی اور میں نے کہا کہ قیامت تک اس کے جواب کی مہلت دیتا ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ غرض ان لوگوں کا مذہب محض

ان کی قوم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی کسی اسلامی خدمت سے مسلمانوں کا دل خوش نہیں ہوتا کیونکہ ان کی تمام خدمات قوم کی دنیاوی ترقی کے لئے ہوتی ہیں اسلام کے لئے نہیں ہوتیں دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر یہ خدمات اسلام کے لئے ہوتیں تو اس کی غایت رضاء خداوندی ہوتی جو کہ اسلام کی اصلی غایت ہے اور اگر یہ غایت ہوتی تو اس کے آثار بھی ضرور نمایاں معلوم ہوتے اور ہر ہر کام میں اس کی جھلک موجود ہوتی حالانکہ ہم اس کے برخلاف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اہل دین اور خادمین مذہب کو نہایت درجہ ذلیل سمجھتے ہیں اور ان پر تمسخر کرتے ہیں۔ نماز روزہ عبادات میں شکوک پیدا کئے جاتے ہیں تو اگر یہ لوگ مذہب اسلام کو حق سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا کے جویاں ہیں تو ان حرکات کی کیا وجہ معلوم ہوا کہ محض قوم کے لئے سب خدمات کی جاتی ہیں اور طرّہ یہ کہ قوم کے لئے بھی جو کچھ نامبارک بیداری پیدا ہوئی وہ دوسری قوموں کو ہندوؤں، آریوں، عیسائیوں کو دیکھ کر اور نامبارک بیداری اس لئے کہا گیا کہ دین سے لاپرواہی اور اعتراضات یہ اسی بیداری کا نتیجہ ہیں ان کے لئے اس بیداری سے خواب ہی بہتر تھا ؎

ظالمی را خفتہ دیدم نیم روز گفتم ایں فتنہ است خوابش بُردہ بہ
آنکہ خوابش بہتر از بیدار لیست آں چناں بد زندگانی مُردہ بہ

(میں نے ایک ظالم شخص کو دوپہر میں سوتے ہوئے دیکھا میں نے دل میں کہا یہ ایک فتنہ ہے اس کا سونا ہی بہتر ہے اور جو شخص ایسا ہو کہ جاگنے سے اس کا سونا ہی بہتر ہو ایسی بری زندگی والے کا مرجانا ہی بہتر ہے)

صاحبو! ہمارے پرانی وضع کے امراء اگرچہ بہت سے قبائح میں گرفتار ہیں گنہگار ہیں بدعمل ہیں لیکن ان میں اتنی بات اب بھی باقی ہے کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام یا ارشادات و احکام سنکر شرمندہ ہو جاتے ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اپنے کو خطاوار سمجھتے ہیں خدا کے نیک بندوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں وہ اگرچہ بھنگڑ ہی ہوں لیکن ان میں فروتنی عجز والکسار نیک نیتی ضرور ہے تو ایسے لوگ عملی غلطی میں مبتلا ہیں اور ایسے قابل رحم ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی ایک شہر کے متعلق میرے ایک بزرگ کہتے تھے کہ اس جگہ کے فقیر

جہنمی اور امیر سب جنتی ہیں کیونکہ امراء تو فقیراء کو اللہ والا سمجھ کر اُن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور فقراء تحصیل مال و جاہ کے لئے امراء سے ملتے ہیں آجکل کے پیروں کی حالت سوچ کر مجھے ایک شخص کا خواب یاد آتا ہے کہ اس نے اپنے پیر سے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے یعنی یہ کہ میری انگلیوں میں نجاست لگی ہے اور آپ کی انگلیوں میں شہد لگا ہے۔ پیر صاحب نے کہا تو دنیا کا کتا گنہگار ہے ہم تارکِ دنیا ہیں ایسا تو ہونا ہی چاہیئے۔ مرید نے عرض کیا کہ حضور ابھی خواب ختم نہیں ہوا میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری انگلیاں اس پر پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔ خیر یہ خواب تو خواہ صحیح ہو یا غلط لیکن اجکل کے مکار اور طالبِ دنیا پیروں کی حالت تو واقعی ایسی ہی ہے مقصود یہ ہے کہ پُرانی وضع کے لوگ اگرچہ رند بھی ہوں لیکن وہ دین کا جو کچھ کام کرتے ہیں دین کی نیت سے کرتے ہیں۔ تو ان لوگوں میں اگرچہ بیدار مغزی نہیں بلکہ نری رندی ہے لیکن اُن کی حالت پر یاد آتا ہے کہ ؎

گُنہ آمرزِ رنداں قدح خوار   بطاعت گیر پیرانِ ریاکار

(وہ شراب خور آزاد لوگ بھی جو پیالے پر پیالے چڑھاتے ہیں اور نئے نئے گناہ ایجاد کرنے والے ہیں ریاکار پیروں کے اطاعت گذار ہیں)

ایک بھنگڑ بھی اگر ان کے سامنے خدائی حکم بیان کرے تو وہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ اگرچہ بدعمل ہیں لیکن ان میں قوت ایمانیہ ضرور ہے اور اس قوتِ ایمانیہ کی بدولت ایسے لوگ پیروں سے بھی تعلق رکھتے ہیں اگرچہ اپنی جہالت اور کم علمی کی وجہ سے پیر پرستی تک نوبت پہنچا دی ہے بلکہ پیروں سے گذر کر قبر پرستی تک پہنچ گئے ہیں لیکن ان گنہگاروں میں اور بیدار مغز آزادوں میں موازنہ کر کے رَحِمَ اللهُ النَّبَّاشَ الْاَوَّلَ (اللہ تعالیٰ پہلے کفن چور پر رحم کریں) یاد آتا ہے یہ زبان عربی کی ایک مثل ہے جس کا قصہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک شخص نبّاشی کیا کرتا تھا اہلِ شہر اس سے سخت عاجز تھے کہ یہ مر جائے آخر ایک روز وہ مر گیا اس کے مرنے کے بعد اُس کے لڑکے نے پدری کام انجام دینا شروع کیا لیکن اتنا اضافہ بھی اس کام میں کر لیا کہ کفن چرا کر مردہ کے ایک میخ ٹھوک دیتا تھا اس پر یہ مثل جاری ہوئی اور عام ہو کر ہر ایسے موقع پر کہ دو بُرے آدمیوں میں سے دوسرا پہلے سے زیادہ بُرا ہو بولی جانے لگی تو نباشی کے اعتبار سے اگرچہ پہلا اور دوسرا دونوں قابلِ نفریں ہیں لیکن اضافہ کی رو سے دوسرا زیادہ قابلِ ملامت ہے اور پہلا اس کے مقابلے میں قابلِ مدح۔ اسی طرح نفس گناہ

کے اعتبار سے دونوں فرقوں کی حالت افسوس کے قابل ہے لیکن پرانی وضع کے لوگ ابھی تک دولت ایمان سے بہرہ ور ہیں اور انکی یہ حالت کسی درجے میں اب بھی یہ ہے کہ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا کہ جب ان کے سامنے خدا تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور اس کے احکام سنائے جاتے ہیں تو ان کے ایمان کو قوت ہوتی ہے اور اپنی بدعملی پر رنج اور افسوس ہوتا ہے۔ برخلاف اس نو پیدا جماعت کے کہ یہ لوگ اکثر عملی خرفات سے تو پرہیز کرتے ہیں ناچ نہیں دیکھتے فضول رسوم کو روکتے ہیں بیوی کو فضول زیور بنانے سے روکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اگرچہ یہ سب باتیں بھی ان لوگوں کی دوسروں ہی کے لئے ہیں مثلاً بیوی کو تو فضول روپیہ خرچ کرنے سے روکتے ہیں اور خود سیکڑوں روپیہ ہارمونیم وغیرہ خرافات میں برباد کر دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی اس روک ٹوک کو دیکھ کر بھولے بھالے مولوی بہت خوش ہوتے ہیں حالانکہ یہ کوئی مسرت کے قابل نہیں اس لئے کہ یہ ممانعت خلاف شرع ہونے کی نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس قسم کی رسوم وغیرہ خلاف عقل ہیں اور اگر شریعت کے خیال سے ممانعت ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ رسوم شادی غمی کو تو روکا جائے اور سود و رشوت کی آمدنی کو حلال بنانے کی کوشش کی جائے۔ غرض یہ کہ یہ جماعت ظاہری حالت کے اعتبار سے سراپا مذہب ہے مگر مذہب سے بالکل الگ ہے اور ان کا سارا اسلام محض دنیا کی درستی ہے اور اسی لئے ان کا ذکاوت یا جدت بالکل قابل قدر نہیں ہے میرے نزدیک ان لوگوں کی سرحد بھی قسم اول بعض منکرین اسلام کی سرحد سے ملی ہوئی ہے گو ملک الگ الگ ہیں لہٰذا ان کی حالت بھی نہایت خطرناک ہے اور چونکہ یہ لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اس لئے ہم بھی خاموش ہیں ورنہ انصاف یہ ہے کہ ان لوگوں میں کوئی بات بھی اسلام کی نہیں ہے بلکہ ہر ہر بات اسلام کے خلاف ہے۔ اور اس کا علاج یہی ہے کہ چند روز کسی صاحب باطن کے پاس رہے۔ میں نہایت شفقت سے کہتا ہوں کہ اگر اپنی اصلاح کی فکر ہے اور اصلاح کو ضروری سمجھتے ہو تو چند روز کسی مولوی کے پاس رہ لو اگر کہو کہ مولوی تو سب کھانے پینے کے ہوتے ہیں ان کے پاس رہنے سے اصلاح کیونکر ہوگی تو میں کہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے تم سب مولویوں کے پاس تھوڑا تھوڑا قیام کر کے دیکھ لو ان شاء اللہ تم کو اپنی غلطی خود معلوم ہو جائے گی اور دیکھ لوگے سب ایک طرح کے نہیں ان میں تمہارے

مصلح بھی ملیں گے اور اگر ایسا کرنا یعنی ایک کو دیکھ کر آزما کر پھر دوسرے کی طرف رجوع کرنا دشوار معلوم ہو تو میں کہوں گا کہ اگر کسی بازاری عورت سے محبت ہو جاتی ہے اور لوگ تم کو وصال کی امیدیں دلا کر رہبری کا وعدہ کرتے ہیں اور پھر دھوکے پر دھوکہ دیتے ہیں اس وقت ہر مدعی رہبری کے ساتھ کیوں ہو لیتے ہو اور یہ بار بار عذر اس وقت کہاں چلے جاتے ہیں۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کے ساتھ اتنی محبت بھی نہیں اور اس کے طریق کی اتنی جستجو بھی نہیں ہو سکتی مولانا نے خوب کہا ہے ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئی گشتن بہر او اولیٰ بود

(مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہوتا ہے بلکہ اس کے عشق میں کوچہ میں پھرنا زیادہ بہتر ہے)

صاحبو! اگر ہر تعطیل میں ایک ہفتہ ایک ایک بزرگ کے پاس قیام کر لو تو کیا بڑا حرج ہو جائے پھر جب کوئی شافی کافی مل جائے بس اس کو لے لو۔ ایک مرتبہ اختلال عمل کا یہ ہے کہ اعتقادات سب درست ہوں مگر کاہلی اور حظوظ پرستی کی وجہ سے دنیا میں انہماک ہو اور نفس پرستی درستی اعمال نہ کرنے دیتی ہو اس طبقے کا علاج یہ ہے کہ ان کو چاہیے کہ موت کو یاد کیا کریں۔ موت وہ چیز ہے کہ اس کے یاد کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ ہر طرح حالت درست ہو جائیگی۔ کیونکہ اعتقاد تو پہلے سے صحیح ہے صرف حظوظ کو کم کرنے کی ضرورت ہے اس کا علاج اس سے ہو جائیگا۔ چنانچہ ارشاد ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ (لذتوں کو ختم کر دینے والی یعنی موت کا ذکر زیادہ کیا کرو) اس حدیث کے الفاظ خود غور کرنے کے قابل ہیں کہ اول موت کی صفت کو بیان کیا اس کے بعد موت کے نام کی تصریح فرمائی جس سے اس امر اکثروا کی حکمت دریافت ہو گئی یعنی موت زیادہ یاد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے لذات کی جڑ اکھڑ جاتی ہے اور سہل ترکیب اس کے یاد کرنے کی یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے مراقبۂ موت کیا کرے اور سوچا کرے کہ ایک دن میں مردوں گا دوزخ اور جنت میرے سامنے پیش کی جائے گی اگر میں گنہگار مروں گا تو جنت کو مجھ سے چھپا لیا جائے گا اور تا قیامت مجھ کو عذاب قبر ہوتا رہیگا پھر قیامت آئے گی اور سب کے نامہائے اعمال ان کو دکھلائے جائیں گے اس کے بعد حساب ہوگا اگر خدانخواستہ میری ناشائستہ حرکات بڑھ گئیں تو فرشتے کشاں کشاں مجھے جہنم کی طرف لے جائیں گے وغیرہ

وغیرہ اس مراقبے سے ان شاء اللہ تعالیٰ انہماک فی الدنیا کا مرض بالکل زائل ہو جائے گا دوسری حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دن میں بیس دفعہ موت کو یاد کرے گا اس کو شہادت حاصل ہوگی مگر موت کے یاد کرنے کے یہ معنی نہیں کہ لفظ موت کو بیس دفعہ دہرالیا جائے اس لئے کہ موت کو یاد کرنے سے شہادت کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو بالکل سونپ دے گا اور تسلیم کر دے گا اور اس کے حظوظ نفسانی بالکل چھوٹ جائیں گے اور یہ ان لوگوں میں ہوگا کہ ۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر است

(جو لوگ تسلیم و رضا یعنی عشق کی تلوار کے مارے ہوتے ہیں غیب کی جانب سے ہر ہر گھڑی ان کو نئی زندگی حاصل ہوتی ہے)

بس موت کو یاد کرتا وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یہ تقسیم تو اہل دنیا کے حالات کے اعتبار سے تھی اب اہل دین کی خدمت میں متوجہ ہوتا ہوں۔ ان میں ایک تو اہل ظاہر ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ بعض اعمال جو عرفاً ان کی وضع کے خلاف نہیں ہیں اگرچہ شرعاً منہی عنہ ہیں وہ ان میں مبتلا ہیں اور جن اعمال سے ان کے ظاہری تقدس پر حرف آنے کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کرتے ہیں مثلاً غیبت کہ بہت بڑا گناہ ہے مگر چونکہ عادتاً خلاف تقدس نہیں سمجھا جاتا اس لئے اکثر ایسے لوگ اس میں مبتلا ہیں اور جب بیکار چار آدمی بیٹھتے ہیں تو غیبت شکایت ضرور کرتے ہیں اور شراب پینا چونکہ تقدس کے خلاف ہے اس لئے اس کے پینے سے احتراز کرتے ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ ایسے لوگ خود بھی اپنے کو مقدس سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ یہ عجیب تقویٰ ہے کہ کچھ ہی کر لیجئے پھر متقی کے متقی رہیئے تو گویا ایسے لوگوں کا تقویٰ بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ اسے ایک مرتبہ کسی بزرگ نے وضو کرا دیا تھا پھر ساری عمر اس ایک وضو سے اس نے نماز پڑھی تو جیسے بی بی تمیزہ کا وضو نہ پیشاب سے ٹوٹتا تھا اور نہ پیخانہ سے ایسا ہی ان متقیوں کا تقویٰ نہ غیبت سے ٹوٹتا ہے نہ شکایت سے کچھ ہی کر لیں مگر یہ تاج الاتقیا بنے رہیں گے۔ صاحبو! اگر یہ اس کو گناہ نہیں سمجھتے تو یہ سخت غلطی ہے اور اگر گناہ سمجھتے ہیں اور پھر اس بے پروائی کے ساتھ مبتلا ہیں تو بہت ہی سخت غلطی ہے ۔

فَاِنْ کُنْتَ لَاتَدْرِیْ فَتِلْکَ مُصِیْبَۃٌ وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ

(اگر تو نہیں جانتا تھا اس لئے گناہ کیا تب تو گناہ ہے ہی اور اگر جانتا ہے اور پھر گناہ کیا تو بہت بڑا گناہ ہے)

اس کا علاج یہ ہے کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کامل پامال شو

(باتیں بنانا چھوڑ دو اہل حال بنو اور اس کام کے لئے کسی مرد کامل ولی کی خدمت کرو)

آج تک آپ لوگوں نے قال یقول کی خدمت کی ہے اس لئے شریعت کا رنگ نہیں چڑھا۔ اب ذرا تھوڑے دنوں کے لئے اس کو چھوڑ کر حال پیدا کیجئے مگر یہ بدون صحبت اہل اللہ کے نہیں ہوتا۔ چند روز تک ان کی صحبت کی نہایت ضرورت ہے اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ سب گناہ چھوٹ جائیں گے۔ اس مقام پر ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ اہل حال سے خود گناہوں کا صدور ہوتا ہے تو ان کی صحبت سے دوسروں کے گناہ کیونکر چھوٹ جائیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ان حضرات سے گناہ بہت کم ہوتا ہے دوسرے اگر کبھی ابتلا ہو جاتا ہے تو فوراً ان کو تنبہ ہوتا ہے اور وہ ندامت و گریہ وزاری سے اسے معاف کرا لیتے ہیں ہم لوگوں کو نہ تنبہ ہوتا ہے نہ اس پر کڑھتے ہیں ہم کو شیطان نے سمجھا دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے اس لئے جو جی میں آئے کرو۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنے کو اس سے خارج سمجھتا ہوں۔ ہم ہی لوگوں کی بابت حافظ رحمہ اللہ کہتے ہیں ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

(تقریریں کرنے والے جو محراب و منبر پر بیٹھ کر بڑا شاندار وعظ کہتے ہیں جب خلوت اور تنہائی میں جاتے ہیں تو جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں)

مگر ہم واعظوں نے اس کے ایک نئے معنی گھڑے ہیں یعنی حافظؒ کا مطلب یہ ہے کہ جب جلوت میں جاتے ہیں تو ذکر اللہ میں مشغول ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد کا شعر اس معنی کی گنجائش نہیں چھوڑتا ؎

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

(مجھے ایک مشکل یہ درپیش ہے کہ کوئی مجلس میں بیٹھنے والے عقلمند سے پوچھے کہ دوسروں کو توبہ کا حکم کرتے ہیں خود کیوں بہت کم توبہ کرتے ہیں)

کہ دوسروں کو تو گناہوں سے روکتے ہیں اور طاعات کی ترغیب دیتے ہیں اور خود اس آیت کے مصداق بن رہے ہیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ؂ اور اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ

وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ (اے مسلمانوں ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے کیا تم لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو) یہاں بعض لوگوں کو اس میں یہ شیطانی دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ وعظ ہی چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ہماری حالت خود ہی درست نہیں تو ہم دوسروں کو کس منہ سے کہیں حالانکہ یہ دوسرا جرم ہے کیونکہ انھوں نے ترکِ عمل بھی کیا اور ترکِ تبلیغ بھی کیا۔ ان اہل ظالموں میں مذکورہ بالا کمی کے ساتھ ایک کمی یہ بھی ہے کہ چونکہ ان میں نسبت مع اللہ راسخ نہیں ہوتی اس لئے اس کے خواص و آثار سے بھی خالی ہوتے ہیں اور اس سبب سے ایک گونہ محبت مال سے ان کو ہو جاتی ہے اور اس محبت مال کے سبب ایسے لوگ اہل دنیا کے پاس جا کر اپنی حالت ظاہر کرتے ہیں اور ان کی نظروں میں ذلیل ہوتے ہیں اور ان کی ذلت کی وجہ سے علم دین کی ذلت ہوتی ہے ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیئے۔

بِئْسَ الْفَقِيْرُ عَلٰى بَابِ الْاَمِيْرِ (وہ درویش بہت برا جو امیر کے دروازہ پر جاتا ہے) انکی تو یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک بادشاہ گئے وہاں خدام کا پہرہ تھا بادشاہ نے اندر جانے کی اجازت چاہی خادم نے اجازت نہ دی اور کہا اول میں شیخ سے دریافت کرلوں اگر وہاں سے اجازت ہوگئی تو اجازت دیدونگا چنانچہ شیخ سے جاکر عرض کیا اور شیخ کے اجازت دینے پر آکر بادشاہ کو اجازت دیدی بادشاہ کو چونکہ اس قسم کی روک ٹوک کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی سخت ناگوار گذرا اور شیخ کے روبرو جاکر برہمی کے لہجے میں کہنے لگا کہ ع۔ در درویش را درباں نباید (درویش کے دروازہ پر درباں نہیں رہتا ہے) اس کو سن کر شیخ نے اس کے تکبر کے مقابلہ میں نہایت بے باکانہ انداز سے فرمایا کہ ع۔ بباید تا سگِ دنیا نیاید۔ (درباں ضرور چاہیئے تاکہ کوئی دنیا کا کتا نہ گھسے) اور وجہ اس بے پروائی اور استغنا کی یہ ہوتی ہے کہ ع طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگو (حرص اور لالچ کو چھوڑ دو پھر جو جی میں آئے کہو یعنی لالچی آدمی حق بات نہیں کہہ سکتا) حضرت سلیم چشتی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ پیر پھیلائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے کہ بادشاہ مع وزیر کے آیا بادشاہ کو دیکھ کر آپ اسی طرح بیٹھے رہے وزیر کو آپکا یہ انداز گراں گذرا اسنے کہا کہ حضرت پیر پھیلا کر بیٹھنا کب سے سیکھ لیا۔ فرمایا کہ جب سے ہاتھ سمیٹ لیا ہے۔ اس کے بعد وزیر نے کہا کہ بادشاہ اولی الامر میں داخل ہے اس کی تعظیم آپ کو کرنی چاہیئے۔ فرمایا بادشاہ تمہارے اولی الامر میں ہوگا میرے تو غلام کا غلام ہے وزیر نے کہا کہ حضرت یہ کیسے؟ فرمایا کہ ہوا و ہوس میرے غلام ہیں اور بادشاہ ہوا و ہوس کا غلام ہے لہذا میرے غلام کا غلام ہوا۔ مولانا شہید کا واقعہ ہے کہ جب آپ لکھنو تشریف لائے۔ تو ایک شاہزادہ خدمت میں حاضر ہوا اور زمین بوس سلام کیا آپنے اس سلام کے جواب میں اسکو انگوٹھا دکھلایا۔ آج تو اگر کوئی معمولی زمیندار مرید ہو جائے تو بس اغنیمت سمجھا جاتا ہے آخر یہ کیا بات تھی۔ بات یہی تھی کہ ان حضرات کے دل میں دنیا کی نہ وقعت تھی نہ محبت اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان حضرات کی زندگی تکالیف میں بسر ہوئی ہو بخدا ان کی زندگی ایسی آسائش میں بسر ہوتی ہے

کہ دوسروں کو وہ آسائش نصیب بھی نہیں ہوتی اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو وہ آج بھی بزرگوں کی حالت کو جاکر دیکھ لے کہ وہ کس قدر آسائش میں ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان حضرات کو ظاہری بے لطفی کسی قسم کی ہوتی بھی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ان کے دل میں ایک ایسی چوٹ لگی ہے کہ اس بے لطفی میں ہزاروں لطف ہیں۔ غرض اس فرقہ میں حبِّ مال کا مرض ہے اس کا علاج بھی وہی ہے کہ اہلِ باطن کی صحبت سے ان کو مستفیض ہونا چاہئے۔ دوسرا فرقہ اہلِ دین میں وہ ہے جو اہلِ باطن کہلاتے ہیں یہ لوگ اپنے دل میں بہت خوش ہونگے کیونکہ سارے فرقوں میں تو کوتاہیاں اور عیب نکال دیئے گئے اب صرف یہی ایک فرقہ رہگیا ہے کہ درجہ بدرجہ ترقی ہوکر یہی فرقہ ایسا نکلے گا جس میں کوئی عیب نہ ہو اور اپنے مقابلین میں سب سے اچھے یہی ثابت ہوں گے۔ سو غرض یہ ہے کہ یہ حضرات سب سے اچھے ہیں۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز زیادہ لطیف ہوتی ہے اگر وہ بگڑتی ہے تو دوسری سب چیزوں سے زیادہ بدبو اس میں پیدا ہوتی ہے اور یہ حضرات دوسرے سب فرقوں سے لطافت اور نظافت میں بڑھے ہوئے ہیں اس لئے ان میں اگر کچھ خرابی پیدا ہوگئی تو سب سے زیادہ بدبو تما ہوگی سو اس فرقے میں خدا کے فضل وکرم سے وہ عیوب تو نہیں ہیں جو مذکورہ بالا فرقوں میں تھے مگر انصاف یہ ہے کہ یہ بھی کوتاہیوں سے خالی نہیں چنانچہ بعض لوگوں میں یہ کوتاہی ہے کہ انھوں نے بالکل یکسوئی اختیار کرکے اس کو ایسا ضروری اور اپنا مابہ الامتیاز سمجھا کہ بیچارے دنیاداروں سے بدخلقی برتنی شروع کردی حالانکہ یہ شریعت میں مطلوب نہیں شریعت نے بدخلقی کی سخت ممانعت کی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب نوراللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ فقراء کو بدخلقی نہ ہونا چاہیئے اور فرماتے تھے کہ بزرگوں کا ارشاد ہے بِئْسَ الْفَقِيْرُ عَلٰى بَابِ الْاَمِيْرِ وَنِعْمَ الْاَمِيْرُ عَلٰى بَابِ الْفَقِيْرِ (برا ہے درویش کا امیر کے دروازہ پر جانا۔ وہ امیر بہت اچھا ہے جو درویش کے دروازہ پر جاتا ہے) تو جب کوئی امیر فقیر کے دروازہ پر جاتا ہے تو وہ نعم کا مصداق ہوکر جاتا ہے اس واسطے ہم کو اس نعم کی تعظیم کرنی چاہیئے۔ اگرچہ من حیث الامیر اس کی تعظیم نہ ہو اور اسی بناء پر حضرت حاجی صاحب امراء کی بہت تعظیم فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اَنْزِلُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ مَنَازِلِهِمْ (مرتبہ کے اعتبار سے لوگوں سے پیش آؤ) یہ تو نقل تھی حضرت رحمہ اللہ کے ارشاد اور برتاؤ کی اس کے ماسوا ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ امراء کو جو وصف امارت حاصل ہوا ہے خداتعالیٰ کی جانب سے عطا ہوا ہے لہذا ہم کو ضروری ہے کہ اس کے حق کی رعایت کریں البتہ ان سے تعلق نہ کرنا چاہیئے بس یہ برتاؤ رکھنا چاہیئے کہ جو تمھارے پاس آئے خوش ہوکر جائے۔ صاحبو! اگر آپ لوگ امراء کو اپنے پاس نہ آنے دیں گے اور ان سے بدخلقی سے پیش

آئیں گے تو آخر وہ لوگ کہاں جائیں گے اور کس جگہ اپنا ٹھکانا تلاش کریں گے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ تم خود ان کے دروازے پر نہ جاؤ۔ مگر اس میں بھی اس قدر تفصیل ہے کہ اگر تم سے اصلاح نفس متعلق ہو اور امراء تم کو خود بلائیں تو بشرطِ عدمِ تذلّل چلے جاؤ اس میں انکار نہ کرو۔ مجھ سے بعض امراء نے یہ اعتراض پیش کیا کہ علماء ہماری خبر نہیں لیتے۔ میں نے کہا کہ جناب کبھی آپ بھی تو توجہ کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء آپ کی دستگیری کرتے ہیں یا نہیں۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ علماء پر دستگیری نہ کرنے کا الزام بالکل غلط الزام ہے۔ امراء تو جہ تو خود نہیں کرتے حالانکہ یہ ان کا کام ہے اور الزام علماء پر رکھتے ہیں اصل یہ ہے کہ ان کو طلب حق ہی نہیں ورنہ ممکن نہ تھا کہ یہ چین سے بیٹھ سکتے۔ ایک کوتاہی ان میں یہ ہے (اور اسی کوتاہی کی وجہ سے یہ بھی من وجہ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ کے مصداق ہیں کہ ذکر کے آثارِ عاجلہ کو مطلوب سمجھتے ہیں۔ البتہ محققین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ باقی محققین کے علاوہ اکثر اس کے منتظر رہتے ہیں کہ دل میں کچھ گرمی پیدا ہو یا کچھ نظر آنے لگے۔ صاحبو! یہ بہت کمی ہے اور یہ ایسا نقص ہے کہ اکثر اس پر نظر بھی نہیں جاتی اس کا علاج علمی تو یہ ہے جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی کوئی شخص آکر شکایت کرتا اور کہتا کہ حضرت مجھے نفع نہیں ہوا تو فرمایا کرتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم اللہ کا نام لیتے ہو اور مثنوی سے استشہاد فرمایا کرتے تھے مولانا کی مثنوی میں ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ روزانہ ذکر کیا کرتا تھا لیکن اس کو کوئی اثر مرتب ہوتا ہوا معلوم نہ ہوتا تھا آخر ایک روز مایوس ہو کر ذکر کئے بغیر ہی سو گیا خواب میں ایک فرشتے کو دیکھا اور اس نے یہ سوال کیا کہ آج تم نے ذکر کیوں نہیں کیا کہنے لگا کہ کچھ نفع تو ہوتا ہی نہیں نہ وہاں سے کچھ جواب ملتا ہے ارشاد ہوا کہ ؎

گفت آں اللہ تو لبیکِ ماست وایں نیاز و سوز و دردت پیکِ ماست

(انھوں نے کہا کہ تیرا اللہ اللہ کہنا ہی ہماری طرف سے لبیک کہنا اور قبول کرنا۔ یہ تیرا نیاز اور سوزش اور درد سب ہمارے ہی تو دیئے ہوئے ہیں)

کہ تمھارا اللہ اللہ کہنا یہ ہی ہمارا لبیک کہنا ہے اور یہی جواب دینا ہے اور اس کو ایک مثال سے واضح فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کسی صاحب اختیار رئیس کے پاس جاؤ اور اس کو تمھارا جانا

؎ یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا ؛ میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا ۱۲ جامع

ناپسند ہو تو وہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا ظاہر ہے کہ دوسرے وقت گھسنے بھی نہ دیگا
پس خدا تعالیٰ کا پانچواں وقت کی نماز کے لئے مسجد میں آنے کی قوت باقی رکھنا ذکر کی توفیق
عطا فرمانا یہ دلیل ہے اس کی کہ تمہارا پہلا عمل ناپسند نہیں ہوا ورنہ کوئی ایسا سخت پہرا
ہوتا کہ تم مسجد میں گھسنے بھی نہ پاتے اور پہرے سے مراد ظاہری پہرہ نہیں بلکہ وہ پہرا مراد ہے
جو کہ ایک نوکر اور آقا کے قصے میں ہوا تھا کہ دونوں بازار کام کو چلے راستہ میں نماز کا وقت
آگیا نوکر نمازی تھا آقا سے اجازت لے کر مسجد میں چلا گیا اور آقا دروازے پر بیٹھا رہا
جب بہت دیر ہوئی آقا نے پکارا کہ بھائی باہر کیوں نہیں آتا نوکر نے کہا کہ آنے نہیں دیتا
آقا نے کہا کہ کون نہیں آنے دیتا کہنے لگا کہ مجھے وہی باہر آنے نہیں دیتا جو تمہیں اندر نہیں
آنے دیتا تو یہ پہرہ ہے جو کہ ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیتا اور جبکہ عمل کا مسلسل سلسلہ چلا
جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ سب مقبول ہو رہا ہے۔ یہ مولانا رومیؒ اور حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ کی تحقیق
ہے۔ ایک اور ملفوظ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کا اس موقع پر یاد آگیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ لوگ
آکر کچھ فائدہ نہ ہونے کی شکایت فرماتے تو حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ جواب میں یہ ارشاد فرمایا کرتے ؎

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے میکنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کرتا رہوں کچھ حاصل ہو یا نہ ہو بس آرزو کرتا رہوں)

اس کا حاصل یہ ہے کہ نفع بھی نہ ہو تب بھی کچھ پروا نہ کرنی چاہیئے اس واسطے کہ ہم مخلوق
اور غلام ہیں غلام کا یہ منصب نہیں کہ وہ کام کے معاوضہ کا امیدوار ہو اگر کسی غلام سے یہ کہا جائے
کہ جا کر کنویں سے پانی لے آؤ اور وہ کہے کہ مجھے اس کے معاوضہ میں کیا ملے گا تو وہ نہایت گستاخ
ہے تو ہم کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم غلام ہیں اور اس وجہ سے ہم کو حکم ہے۔ اسی پر فرماتے ہیں۔

ع حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم۔ اس کے استشہاد میں بوستان کی ایک حکایت یاد آئی۔

شیخ نے بوستان میں ایک شخص کی حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص روزانہ عبادت کیا کرتا آخر ایک روز
یہ آواز آئی کہ خواہ کچھ ہی کرو ہرگز قبول نہ ہوگا یعنی عدم النفع معلوم ہوگیا لیکن وہ پھر بھی عبادت
میں مشغول رہا اس قصے کی خبر اس کے ایک مرید کو بھی ہوئی اس نے کہا کہ جب وہاں قبول ہی نہیں ہے
تو عبادت کرنے سے کیا فائدہ۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے عزیز ؎

توانی ازاں دل بپرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(اس کی طرف سے اپنے دل کو جب ہٹایا جا سکتا ہے جبکہ میں یہ یقین کر دوں کہ اس کے بغیر گذر ہو سکتی ہے۔)

قلب کو اس سے فارغ کر سکتے ہیں جس کے بدون گذر ہو جانے کی امید ہوا اور جبکہ یہ نہیں ہے

تو میں اب کہاں جاؤں۔ معاً بحرِ رحمت جوش میں آیا اور یہ ارشاد ہوا کہ ؎

قبولست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہ دگر نیستت

(تمھاری سب عبادتیں قبول ہیں اگرچہ یہ تمھارا کوئی کمال اور ہنر نہیں مگر چونکہ تمھارے لئے سوائے میرے اور کوئی پناہ کی جگہ ہے ہی نہیں)

کہ چونکہ کوئی پناہ نہیں ہے اس لئے قبول کرتا ہوں۔ تو ہمارا یہ مذہب ہونا چاہیئے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اپنا کام کئے جائیں باقی ثمرات کا ترتّب۔ اس پر ذرا بھی نظر نہ ہونی چاہیئے ؎

بدر و صاف ترا حکم نیست دم در کش کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطافست

(شراب کے نیچے کا تلچھٹ ہو یا صاف شراب ہو تجھے سوچنے کی ضرورت نہیں بس چڑھا جا کیونکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ بھی دیا یہ اسکی عین مہربانی ہے)

اور اگر ایسا نہ کیا تو تم ہی یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ میں ہو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کے نتیجے کا وعدہ آخرت میں ہے نہ کہ دنیا میں وہاں نیا یم البتہ نہ ہوگا بلکہ وہاں یہ ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (وہ لوگ جو ہمارے راستہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کے راستے آسان کر دیتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ مخلص لوگوں کے ساتھ ہیں) اس آیت کے معنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں تو یہ وعدہ ہے کہ لَنَهْدِیَنَّهُمْ اور لطائف کے صاف ہونے کا کہیں وعدہ نہیں اور آخرت میں وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ اور معیت کا وجوب تو یہاں ہو جاتا ہے مگر کامل ظہور آخرت میں ہوتا ہے گو دنیا میں بھی اس کے آثار معلوم ہوں یعنی ایسا شخص اپنے قلب کو دیکھتا ہے کہ وہ خدا سے راضی ہے جس کی بابت ارشاد ہے رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ مگر عینی ظہور آخرت میں ہوگا۔ اب تمام مراتب یُحِبُّوْنَ کے معلوم ہو گئے ہوں گے۔ اگرچہ جزئیات بیان نہیں ہوئیں مگر اصول بحمد اللہ بہت کافی بیان ہو گئے۔ اب خدا سے دعا کیجئے کہ وہ (محمد عبد المنّان ناشر اور تمام مسلمانوں کو) توفیقِ عمل دے۔ آمین (برحمتك یا ارحم الرحمین)

تمت

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ)

دعوات عبدیت جلد چہارم کا

آٹھواں وعظ ملقب بہ

اِزَالَۃُ الْغَفْلَۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ

ناشر: محمد عبد المنّان غُفِرَلَہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقا

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی

ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم

کا

آٹھواں وعظ ملقّب بہ

اِزَالَۃُ الغَفْلَۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمینی	متفرقات
مسجد نیلہ روضہ قصبہ جھنجھانہ	۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ	اڑھائی گھنٹہ	کھڑے ہو کر	دنیا میں منہمک ہو کر آخرت سے غافل نہ ہو جائے	سعید احمد تھانوی مرحوم	۲۰۰ آدمی	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ط وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

(اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد (اللہ تعالیٰ) کی یاد اور (اطاعت) سے غافل نہ کرنے پاویں جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (حقوق واجبہ) اس سے پہلے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آکھڑی ہو پھر وہ کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہوجاتا اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد (عمر کی ختم ہونے پر) آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے)

یہ سورۂ منافقون کی تین آیتیں ہیں ان میں خدا تعالیٰ کو ایک ضروری مضمون بیان کرنا مقصود ہے باقی مضامین اس کے مؤید و تابع ہیں۔ اور وہ مضمون ایسا ہے کہ اس کے معلوم کرنے کی اس وقت ضرورت عام ہے کیونکہ اس میں کوتاہی بھی عام ہورہی ہے اور اس کے وقوع کا احساس تو سب کو ہوسکتا ہے مگر بوجہ غور نہ کرنے کے اس کو کوتاہی د مرض شمار نہیں کرتے اور اسی وجہ سے اس کو شدید مرض کہا جاوے گا کیونکہ امراض دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ مرض جس کے مرض ہونے کی اطلاع مریض کو ہو۔ دوسرا وہ مرض ہے جس کے مرض ہونے کی اطلاع ہی نہ ہو ایسا مرض زیادہ مہلک ہوتا ہے اور اسی لئے زیادہ قابل اہتمام ہوتا ہے اس وقت جن امراض میں گفتگو ہے یعنی معاصی ان کی مختصر سی فہرست تو ہر شخص کے ذہن میں ہے یعنی زنا چوری جھوٹ بولنا وغیرہ کہ اس کو سب گناہ جانتے ہیں لیکن بعض معاصی ایسے بھی ہیں کہ وہ سب ان کی جڑ ہیں اور اس لئے سب سے اول فہرستِ معاصی میں ان کا نام ہونا ضروری ہے مگر ہم کو ان کی طرف التفات بھی نہیں نہ ہماری فہرستِ معاصی میں کہیں ان کا شمار ہے اور یہ بہت بڑی غفلت ہے اس آیت میں بھی ایسے ہی مرض کا ذکر ہے جو ہماری فہرست میں داخل نہیں کیا گیا۔ اس کے نام سے معلوم ہوجائے گا کہ ہم نے اس کو شمار نہیں کیا اور وہ مرض دنیا میں منہمک ہوتا ہے۔ اب جس سے چاہے دریافت کرلیجئے معلوم ہوجائے گا کہ کسی نے بھی اس کو مرض نہیں سمجھا۔ نماز نہ پڑھنے کو دوسرے کا مال دبا لینے کو زنا کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں مگر دنیا میں کھپ جانے کو کوئی بھی گناہ نہیں سمجھتا حالانکہ یہ ایسا مرض عام مرض ہے جس میں قریب قریب سب مبتلا ہیں۔ اور ایسا قوی ہے کہ سب معاصی اسی کی فرع ہیں مثلاً کوئی شخص نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ دنیا میں غرق ہے۔

اور دین سے بے فکر ہے علیٰ ہذا روزہ، حج، زکوٰۃ جس چیز میں بھی کوتاہی ہو اس کا سبب یہی ہے اگر کوئی شخص بدکاری میں مشغول ہے تو اس کی وجہ بھی دین سے بے فکری اور دنیا میں انہماک ہے۔ غرض اس میں تطویلِ تقریر کی ضرورت نہیں۔ اگر ذرا غور کیا ہوگا تو معلوم ہوا ہوگا کہ وجہ سب معاصی کی یہی انہماک فی الدنیا ہے مگر پھر بھی یہ سب ہی کا شعار ہو رہا ہے حتیٰ کہ دیندار بھی باستثنار عارفین و اہلِ تقویٰ و اہلِ فکر کے سب اس میں مبتلا ہیں۔ دینداروں کی دینداری بھی اتنی ہی ہے کہ نماز پڑھ لیں اگرچہ بے فکری ہی سے ہو اور ڈاڑھی نیچی کر لیں اگرچہ لوگوں کا مال دبا رکھا ہو معاملات میں ضرر پہنچاتے ہوں۔ غرض دینداری بھی آجکل اس کا نام ہے کہ صورت دینداروں کی سی ہو اور سیرت میں صرف وہ باتیں ہوں جو رسوائی سے بچائے رکھیں۔ مثلاً پانچ وقت کی نماز پڑھنا، روزہ رکھ لینا اگرچہ حالت یہ ہو ؎

از بروں چوں گورِ کافر پر حلل وا اندروں قہرِ خدائے عز و جل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے یعنی ظاہری حالت تو ایسی ہے جیسے کافر کی قبر ہوتی ہے جن پر ریشمین غلاف ہوں اور اندر خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے اپنی ظاہری حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ اپنے مقابلہ میں حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ میں بھی عیب نکالا جاتا اور اندر کی حالت یہ ہے کہ اگر یزید جیسا شخص بھی دیکھے تو اس کو غیرت آئے)

تو اگرچہ یہ حالت ہو لیکن وہ خود بھی اپنے کو اور دوسرے بھی اس کو دیندار سمجھیں گے اور اس میں ضرر یہ ہوتا ہے کہ اگر ایسے آدمی سے مکر و فریب وغیرہ کی کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو لوگ اس کو دیندار سمجھ کر اور پھر ان افعال کا مرتکب دیکھ کر سب دینداروں کو اُس پر قیاس کرتے ہیں اور اگر ان کا لقب کہیں مولوی ہے تو ان کو ساتھ مولوی بھی بدنام ہوتے ہیں تو ایسے لوگوں کی بدولت سچے دیندار اور مقبول بھی بدنام ہوئے۔ کاش اگر اس کی شکل دینداروں کی نہ ہوتی تو اس کے حرکات سے دیندار تو بدنام نہ ہوتے اور ایک برا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ ایسے حرکات دیکھ کر

لوگوں کو دینداری سے نفرت ہو جاتی ہے کہتے ہیں کہ ہم نے بڑے بڑے دین دار دیکھے سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور شیطان یہ سمجھاتا ہے کہ جب دیندار ایسے ہیں تو اس دین داری میں کچھ اثر نہیں اور اس طرح اور بھی دنیا میں منہمک کر دیتا ہے کہ فائدہ ہی کیا تو اس سے تو دنیا دار ہی اچھے کیونکہ دیندار ہوئے تو فلاں شخص جیسے ہو جائیں گے۔ اور اگر دینداروں کی شکل نہ ہو تو اگرچہ خود برباد ہو لیکن کوئی دوسرا تو فریب میں نہیں آتا۔ صاحبو! آج بہت بڑی جماعت ان ہی نام کے مولویوں کو دیکھ کر علم دین سے متنفر ہو گئی ہے۔ جب اُن سے کہا جاتا ہے تو وہ صاف یہ جواب دیتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب جیسے ہیں ویسے ہی ہم بھی ہو جائیں گے پھر کیا نتیجہ ہو گا کہ دنیا سے بھی کھوئے گئے اور دینداری ملی تو ایسی ملی یہ ضرر ہوا ان کے دین سے بے فکری کرنے کا کہ خود تو بگڑے ہی تھے دوسروں کے لئے بھی ایک برا نمونہ بن گئے۔ سلف صالحین کی یہ حالت تھی کہ ان کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔ دیکھئے صحابہ کرامؓ کی کیا حالت تھی کہ ان کے اعمال کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام سے اُنس ہوتا تھا۔ رہا تلوار اٹھانے کا قصہ سو یہ محض دفعِ اعلاءِ حق کیلئے تھا خواہ اسلام سے یا استسلام سے نہ کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان کرنے کے لئے چنانچہ تلوار سے کوئی اسلام نہیں لایا۔ کیونکہ اسلام دل سے ماننے اور تصدیق کرنے کا نام ہے سو اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے اُن کے قلوب پر تلوار کا اثر کیسے ہو جاتا اور دل پر اثر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے اخلاق و عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے بالکل مطابق ہو گئے تھے پس معلوم ہوا کہ دل پر کوئی اثر ہوتا تھا۔ پس اس اثر کا ایک سبب مسلمانوں کے معاملات تھے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ جو چوری ہو گئی تھی ایک یہودی کے پاس ملی آپ نے دیکھ کر پہچانی اور فرمایا کہ یہ میری زرہ ہے۔ یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ۔ اللہ اکبر کس قدر اسلامی تعلیم کا نمونہ اپنے کو بنا لیا تھا کہ جہاں رعایا کو زبان سے آزاد کیا عمل سے بھی دکھلا دیا کہ ایک یہودی کی یہ جرأت ہے کہ صاحب سلطنت سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ

حالانکہ یہود خود ایک ذلیل قوم تھی جب سے انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ سرکشی کی تھی اس وقت سے برابر ذلت اور خواری ہی کی حالت میں رہے اور اب بھی جہاں ہیں ذلیل اور خوار ہی ہیں سچ کہا ہے ؎

ع: ہر کی کہ از درگہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

(جس کسی عزت والے نے بھی اس کے دروازے سے منہ موڑا پھر جس در پر بھی گیا پھر عزت نہیں ملی)

پس ایک تو اس کو قومی ذلت اور پھر یہ کہ آپ ہی کی قلمرو کا رہنے والا مگر اس پر بھی یہ جرأت صاحبو! یہ ہے حقیقی آزادی نہ وہ جو آجکل اختیار کی گئی ہے کہ دین سے نکل گئے۔ خدا کو چھوڑا رسول کو چھوڑا۔ آزادی یہ ہے کہ کسی صاحب حق کی زبان بند نہ کریں، کسی پر ظلم نہ کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ ایک یہودی کا کچھ قرض آپ کے ذمہ تھا ایک روز اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بے باکانہ کچھ الفاظ کہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو دھمکایا حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا (جس کسی شخص کا کسی دوسرے پر کچھ حق ہوتا ہے اس کے کہنے کا حق حاصل ہے) تو آزادی یہ ہے کہ حکومت کرکے رعایا کو اتنا آزاد کر دیں چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے عمل سے اتنا آزاد بنا دیا تھا کہ اس یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ یا نالش کرو۔ چنانچہ حضرت شریح رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ہاں جو کہ اس وقت قاضی تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت سے اُسی عہدے پر چلے آتے تھے۔ جاکر نالش دائر کی۔ دونوں مدعی مدعا علیہ بن کر مُساوات کے ساتھ عدالت میں گئے۔ حضرت شریح رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے موافق قاعدہ شریعت کے پوچھنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے سے ہل چل پڑ جائے۔ غرض نہایت اطمینان سے اس یہودی سے پوچھا کہ کیا یہ زرہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ہے اس نے انکار کیا اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے کہا کہ گواہ لائیے، اللہ اکبر ذرا آزادی دیکھئے

کہ ایک قاضی سلطنت خود امیر المؤمنین سے گواہ طلب کر رہے ہیں اور امیر المؤمنین بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن پر احتمال دعویٰ خلاف واقع کا ہو ہی نہیں سکتا مگر یہ محض ضابطہ کی بدولت تھا۔ واللہ جن لوگوں نے تمدن سیکھا ہے اسلام سے سیکھا اور پھر بھی اسلام کی برابر عمل نہ کر سکے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ دو گواہ لائے ایک امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ایک اپنا آزاد کردہ غلام جس کا نام قنبر تھا۔ حضرت شریح اور حضرت علی رضی اللہ عنہما میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا۔ کہ حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹے کی گواہی باپ کے لئے جائز نہ سمجھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک جائز تھی اس لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیش کر دیا آج اختلاف پر علماء کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے حالانکہ یہ اختلاف پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے مگر آجکل کی طرح اُن حضرات میں برا بھلا کہنا نہ تھا ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل نہ کرتے تھے آج کل سب و شتم کی زیادہ تر وجہ علاوہ نفسانیت کے ایک یہ بھی ہے کہ ہر جگہ اصاغر کی عملداری ہے اور اکابر خود آپس میں ملتے نہیں کہ اصل بات کا پتہ چل سکے جس طرح چھوٹے کہدیتے ہیں اسی کو صحیح سمجھا جاتا ہے یہ نہیں کرتے کہ راوی کو ڈانٹ دیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھانہ بھون میں رہتے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا آپ کو فلاں شخص یوں کہتا ہے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس نے تو پس پشت کہا تھا لیکن تو نے تو منہ ہی پر کہدیا تو اس سے بھی زیادہ بُرا ہے پھر کبھی اس شخص کا حوصلہ کسی بات کے نقل کرنے کا نہیں ہوا اگر ایسا کر دیں تو راوی درست ہو جائیں۔ تو اکثر وجہ یہی ہوتی ہے کہ بڑے تو ملتے نہیں چھوٹے بات کو بڑھا کر نقل کرتے ہیں اور ان کو روکا جاتا نہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی رد میں رسالے تصنیف ہوتے ہیں، ایک دوسرے پر تبرّا کہہ رہے ہیں پس یہ اختلاف مذموم ہے ورنہ نفس اختلاف اہلِ فن میں ایک لازمی بات ہے چنانچہ علماء سلف میں بھی ہوا اور اسی طرح اطباء میں بھی ایک مریض کے علاج میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک ہی مقدمہ دو وکیلوں کے پاس لیجاؤ تو ہر ایک علیحدہ رائے دیگا۔ مگر باوجود اس کے دونوں ایک ہی دسترخوان

پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں ان میں ذرا بھی لڑائی نہیں ہوتی پھر اس کی کیا وجہ کہ علماء میں ذرا سے اختلاف سے لڑائی ہو جاتی ہے بس ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چھوٹوں کی عملداری ہے اور کبھی غرض نفسانی بھی ہے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مذہب تھا کہ بیٹے کی گواہی معتبر ہے اور حضرت شریح رضی اللہ تعالےٰ عنہ اس کو نہیں مانتے تھے حضرت شریح رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی گواہی نہیں مانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ غلام تو چونکہ آزاد ہو چکا اس کی گواہی تو مقبول ہے مگر بجائے امام حسن رضی اللہ عنہ کے اور کوئی گواہ لائیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اور تو کوئی گواہ نہیں ہے۔ آخر حضرتِ شریح رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا دعوےٰ خارج کر دیا۔

اگر آج کل کے معتقد ہوتے تو حضرت شریح رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے لڑ مرتے لیکن حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ ان کی طرح مذہب فروش نہ تھے وہ مذہب کے ہر امر پر جان فدا کرتے تھے۔ اگر حضرت شریح رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سچے ہیں لیکن چونکہ ضابطۂ شریعت اجازت نہیں دیتا تھا اس لئے آپ نے اپنے عقیدت پر کارروائی نہیں کی۔ آخر باہر آکر یہودی نے دیکھا کہ اینر تو ذرا بھی ناگواری کا اثر نہیں ہوا باوجود یکہ آپ اسد اللہ ہیں بر سر حکومت ہیں۔ تو کس چیز نے ان کو برہم نہیں ہونے دیا۔ غور کر کے کہا کہ حقیقت میں اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے۔ یہ اثر اسی کا ہے لیجئے یہ زرہ آپ ہی کی ہے اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ آپ نے فرمایا کہ ہم نے یہ زرہ تجھی کو دی غرض وہ یہودی مسلمان ہو گیا اور آپ ہی کے ساتھ رہا حتیٰ کہ ایک لڑائی میں شہید ہو گیا۔

اب بتلائیے کہ یہ یہودی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار کو سر پر دیکھ کر مسلمان ہوا یا اس کو نیام میں دیکھ کر غرض حضرات سلف ایسے تھے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔ اور آج سب سے زیادہ مسلمان ہی بدنام ہیں اور کفار تو کیوں نہ بدنام کرتے

خود مسلمان ہی اپنے کو بدنام کرتے ہیں۔ ہماری یہاں تک حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کہیں باہر جانے لگے اور اس کو دس ہزار روپے رکھنے کی ضرورت ہو تو کسی مسلمان پر بخوف خیانت اعتماد نہ کرے گا اس کام کے لئے اور مہاجن پر اعتماد کرے گا بعض مقامات پر مجروحین طرابلس کے لئے چندہ ہوا اور انگریزوں کے وسیلے سے بھیجا گیا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ بڑے بڑے رئیس جائداد وقف کرتے ہیں اور حکام انگریزی کو متولی کرتے ہیں اس لئے کہ ان کو کوئی مسلمان اس کا اہل نہیں ملتا مگر افسوس کہ ہم کو اپنی اس حالت کی بھی ذرا خبر نہیں۔ ہاں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ خیانت تو کیا روپیہ کو ہاتھ لگانے سے بھی احتیاط کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بریلی تشریف لے گئے۔ ایک رئیس نے بہت سا روپیہ آپ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس کو جہاں آپ کا جی چاہے صرف کیجئے مولانا نے فرمایا کہ میں اس روپے کو خرچ کرنے کے قابل نہیں ہوں اور بطور ظرافت کے فرمایا کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر مجھے اس قابل سمجھا جاتا ہے تو یہ روپیہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو ملتا جب نہیں ملا تو معلوم ہوا کہ میں اس قابل نہیں ہوں آپ خود ہی خرچ کیجئے آخر اس نے مصرف کے متعلق مشورہ دریافت کیا آپ نے رائے دی کہ اس کی جائداد خرید کر اس کی آمدنی سے ایک مدرسہ جاری کر دیجئے لیکن اس وقت میں مولانا کے ساتھ دس پندرہ نام بھی نہ لے سکا کیونکہ ایسے بہت کم لوگ ہیں اور قبل زمانے میں سب ایسے ہی تھے اور خائن بہت کم ہوتے تھے اس لئے جب تذکرہ اس قسم کا ہوتا تھا تو خائنوں کو گنا جاتا تھا اب چونکہ علی العموم لوگ خائن ہیں اس لئے دیانت داروں کو شمار کیا جاتا ہے جس کے معنی صاف یہ ہیں کہ ان کے سوا سب خائن اور ناقابل اعتبار ہیں غرض مسلمانوں کی عموماً الا ماشاء اللہ یہ حالت ہوگئی اور یہ تمام تر اسی کی وجہ سے ہے کہ ہم سب دنیا میں منہمک ہیں دین کی فکر نہیں اگر کہیئے کہ جن قوموں میں تہذیب ہے اور جنھوں نے اخلاق درست کر لئے ہیں اُن میں دین کیا ہے وہ تو بے حد دنیا میں منہمک ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ تشخیص غلط ہے کہ انہماک فی الدنیا کی نسبت ہماری سب بدحالی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ ان کی ظاہری تہذیب

کی وجہ[1] ہے کہ انھوں نے ان اخلاق میں دینداروں ہی کی نقل کی ہے پس علت تہذیب کی وہی دین نکلا اگرچہ معنًی نہیں صورتاً ہی سہی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ان کے مصنفین نے اقرار کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ تہذیب و تمدن سیکھا وہ مسلمانوں[2] سے سیکھا۔ اور مسلمانوں میں یہ تہذیب دین کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مثلاً سچ بولنا ایک ایسی صفت ہے کہ سچ بولنے والے کا سب ہی اعتبار کرتے ہیں حتیٰ کہ اس صفت کی بدولت کفار حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو محمد امین کہتے تھے۔ چنانچہ بناء کعبہ کے وقت حجر اسود کے رکھنے میں جب اختلاف ہوا اور قریب تھا کہ تلوار نکل پڑے کیونکہ وہاں تلوار کا نکل آنا کیا مشکل تھا آخر عقلاء نے کہا کہ کسی کو پنچ بنالو فیصلہ اس پر ہوا کہ جو مسجد میں سب سے پہلے آئے وہی پنچ ہے اور سب نے دعا کی کہ یا اللہ کسی ایسے شخص کو بھیج جو مناسب فیصلہ کردے۔ آخر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ جب لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو مسرت کا نعرہ مارا کہ جَاءَ مُحَمَّدٌ الْاَمِیْن (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو بڑے امانت دار ہیں تشریف لے آئے) اگر کوئی دوسرا ابھی آتا تو لوگ اسی کو حکم بنالیتے لیکن یہ مسرت جس کا اظہار انھوں نے اپنے ان لفظوں میں کیا کہ جاءَ محمد الامین ہرگز نہ ہوتی یہ محض آپ کی صفتِ صدق کی بدولت تھی۔ غرض آپ سے فیصلہ کے لئے کہا گیا آپ نے فرمایا کہ اس کو ایک کپڑے میں رکھ کر ہر قبیلہ کا سردار اس کا ایک کونہ پکڑے اور سب اس طرح اس کپڑے کو خانۂ کعبہ تک پہونچادیں وہاں پہونچکر اس کے نصب کرنے کے لئے مجھے وکیل بنادیں کہ وکیل کا فعل مؤکل کا فعل ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صفت صدق کی وجہ سے لوگوں کو پورا اعتماد تھا کہ آپ ہرگز کسی کی طرفداری نہ کریں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تجارت کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے یہ بالکل غلط ہے صرف صدق کی ضرورت ہے دیکھئے اکثر روپیہ والوں کو بھی قرض نہیں مل سکتا اور بہت سے مفلسوں کو مل جاتا ہے اور اسی سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ روپیہ ہونا کوئی عزت کی بات نہیں بلکہ صدق اور اعتبار اصل عزت ہے

---

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ اگر لوگوں کی خاطر سے ان کا مہذب ہونا تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ جواب ہے ورنہ ہنوز یہ ہی تسلیم نہیں معاملات روزمرہ اور معاہدات فیما بین میں ان کی غداریاں کالشمس فی رابعۃ النہار رہیں جو ہمارے دعوے پر شاہد عدل ہیں ۱۲ سعید

[2] گو اس کو کما ھُوَ باقی نہیں رکھا ۱۲ سعید

تو اپنی شریعت کی تعلیم دیکھئے کہ ایسی چیز سکھائی اگر وہ ہو تو ایک پیسے کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہو تو ہزاروں روپیہ بھی بیکار ہیں۔ تو ان لوگوں نے دیکھا کہ مسلمان برابر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں یہ دیکھ کر اس کے اسباب میں غور کیا۔ اصل راز کو تو سمجھ نہیں سکے کیونکہ وہ تو یہ ہے کہ مسلمان خدا کی اطاعت کرتے تھے اور جو خدا کی اطاعت کرتا ہے اس پر خدا تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں اور اُس کی وجہ سے اس کو ہر حالت میں ترقی ہوتی ہے مگر یہ اعمال صالحہ اس اصلی سبب کے قائم مقام ہوئے مثلاً ایثار صدق مساوات آزادی۔ لیکن مساوات سے مُساوات بالمعنی المتعارف اور آزادی سے آزادی بالمعنی المتعارف مُراد نہیں بلکہ وہ مُساوات اور آزادی جو حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے برتی تو ان آثار کو دیکھ کر ان اخلاق کو اختیار کیا۔ اور ان پر وہ آثار مرتب ہوئے اور یہ اسلام کے سچے ہونے کی دلیل ہے کہ جہاں صورتِ اخلاق بھی ہے وہاں بھی وہ آثار مرتب ہو جاتے ہیں تو حقیقت اخلاق پر تو کیوں نہ مرتب ہوں گے تو معلوم ہوا کہ دوسری قوموں کی ترقی کے اسباب یہ اخلاق ہیں اور گو ان کو دنیا میں بھی انہماک ہے مگر وہ لوگ غایت دانشمندی سے اس انہماک سے ان اخلاق میں خلل نہیں ڈالتے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھئے کہ مسلمانوں اور غیر قوموں کے اخلاق میں ایک بڑا فرق ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی غرض تو ان اخلاق سے محض خدا تعالیٰ کی رضا ہے مثلاً مسلمان اس لئے سچ بولے گا کہ اس میں خدا تعالیٰ راضی ہیں اور دوسری قوموں کی غرض تحصیل دنیا ہے مثلاً ان میں کا اگر کوئی سچ بولے گا تو محض اس لئے کہ اس سے دنیا خوب حاصل ہوتی ہے اور اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان کا تو اگر سچ بولنے میں ضرر بھی ہو گا تب بھی وہ سچ ہی بولے گا اور دوسری قوموں کو اگر سچ میں ضرر کا اندیشہ ہوا اور یہ یقین ہو کہ جھوٹ کی کسی کو اطلاع بھی نہ ہو گی جس سے بدنامی کا اندیشہ بھی جاتا رہے جو کہ آئندہ کے لئے مضر ہے تو ایسے وقت ممکن نہیں کہ غیر مسلم سچ بولے کیونکہ اس کے صدق کا مدار دنیاوی نفع تھا اب اُس پر مرتب نہیں لہٰذا وہ یقیناً جھوٹ بولے گا۔ تو مسلمانوں کے اخلاق دین ہیں اور دوسروں کے اخلاق محض صورتِ دین۔ اب اس اعتراض کا جواب ہو گیا۔ کہ غیر قومیں بھی ترقی کر رہی ہیں حالانکہ اُن میں دین نہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ اس کا مدار دین پر نہیں کیونکہ گو وہاں دین نہیں لیکن صورتِ دین تو ہے تو وہاں بھی دین ہی کی برکت ہے گو درجۂ صورت ہی ہے پس یہ آثار محض دین کی

برکت سے ہوئے۔ سو جس قوم کو یعنی مسلمانوں کو ان کا حکم ہے جب وہ ان کو چھوڑ دیں گے تو ان میں خرابیاں اور بدنامیاں ضرور ہوں گی۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی سب پستیاں دین کو چھوڑنے سے ہیں۔ یہ ہے وہ مرض جس کو میں کہتا تھا اور جس کی طرف سے ایسی بے خبری ہے کہ اس وقت اُس شخص کو وحشی سمجھا جاتا ہے جس کو دنیا کی حرص کم ہو کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی ضرورت سے ناواقف ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین کی فکر کو حماقت سمجھا جاتا ہے بلکہ عقلمند صرف وہ ہے کہ سود کو بھی نہ چھوڑے، قمار و رشوت کو بھی نہ چھوڑے۔

دِلّی میں ایک شخص نے کہا تھا کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسلمان حلال و حرام کو دیکھیں اس وقت جس طرح بنے روپیہ لینا چاہیئے۔ اللہ اکبر اس وقت وہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے معاملات میں احتیاط کرتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ اس سے کیا ہو سکتا ہے یہ کچھ نہ کرے گا۔ تو غور کیجئے کہ یہ کتنا شدید مرض ہے کہ جس کو صحت سمجھا جاتا ہے یعنی آج دین سے بے فکری اور لاپرواہی کرنے کو ہنر سمجھا جاتا ہے کہ اگر ایک وقت کی نماز بھی نہ پڑھتا ہو۔ لیکن بی۔اے پاس ہو تو وہ ترقی پر ہے اور اگر نماز بھی پڑھے اور تمام احکام شریعت کا پابند بھی ہو لیکن انگریزی نہ جانتا ہو تو وہ نیم وحشی اور غیر مہذب ہے تو جس قوم کا مذاق اتنا بگڑ گیا ہو اس کے مریض ہونے میں کیا شک ہے۔ اور میں صرف دنیا داروں ہی کو نہیں کہتا بلکہ دینداروں کو بھی کہتا ہوں کہ وہ بھی صرف تسبیح پڑھنے کو دین سمجھنے لگے ہیں نہ اُن میں اخلاق ہیں نہ اخلاق کے آثار ہیں۔ صبر توکّل انس شوق وغیرہ کا ان میں پتہ بھی نہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ تسبیح تو بہت پڑھتے ہیں لیکن غریبوں پر ان کو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ سر پر عمامہ بھی ہے کُرتا بھی نیچا ہے مگر ظلم و ستم انتہا درجہ کا ایک پیسہ کہیں خرچ نہ کریں گے اپنا حق بھی نہ ہو مگر اس کو اپنا حق سمجھیں گے۔ ایسے لوگوں نے دین کو بدنام کر دیا اور ایسے ہی لوگ ہیں جو مرض کو ہنر اور ہنر کو مرض سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زیادہ تقوےٰ کرنے سے دنیا کا نقصان ہوتا ہے تو جب ان کی یہ حالت ہے تو دنیا داروں کی کیا شکایت کی جائے غرض یہ مرض اس لئے بھی اشد ہو گیا کہ لوگ اس سے غافل ہیں اور انھوں نے اس کو صحت سمجھ رکھا

ہے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے ہمارے اسی مرض کا علاج بتلایا ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم کو تمھارا مال اور تمھاری اولاد خدا کے ذکر سے غافل نہ کردے۔ یہ اول آیت کا ترجمہ ہے جو کہ اس مقام پر مقصود ہے اور اس آیت میں دنیا کو ایک مختصر سی فہرست میں بتلادیا یعنی مال اور اولاد۔ گویا خلاصہ دنیا کا یہ ہے۔ چنانچہ جب کسی کی خوش حالی کی تعریف کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ مال بھی ہے اولاد بھی ہے اور ذکر اللہ سے مراد یہ ہی نہیں کہ اللہ اللہ کیا کرے بلکہ مطلق اطاعت مراد ہے چنانچہ حصن حصین میں منقول ہے کہ کُلٌّ مُطِیعٌ لِلّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ (جو شخص اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والا ہے در اصل وہی سچا ذاکر یعنی اللہ تعالیٰ کا یاد کرنے والا ہے) حتیٰ کہ اگر خدا تعالیٰ کے امتثالِ امر کے لئے کھانا بھی کھائے تو وہ بھی ذکر ہے بلکہ اگر قربتِ منکوحہ میں بھی پابندیِ دین مقصود ہو تو وہ بھی ذکر ہے۔ علیٰ ہذا اگر استنجا بھی اس نیت سے کرے کہ اس سے فارغ ہو کر عبادت میں مشغول ہوگا تو وہ بھی ذکر ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ جو کام ہو مرضی کے موافق ہو پس اسی کو ذکر نہیں کہتے کہ تسبیح لیکر بیٹھے اگر کوئی پانچ وقت کی نماز پڑھے روزہ رکھا کرے اور بصورت وجوب حج کرے زکوٰۃ ادا کردے اور ایک تسبیح بھی نہ پڑھے تو اگرچہ خاص برکات سے یہ محروم رہے گا لیکن نجات میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی ہاں یہ شرط ہے کہ گناہوں کا ارتکاب نہ کرے تو گویا جو شخص صرف اَوَامِرْ اور نواہی پر عمل کرے وہ خدا کا مقبول ہے اس کو نہ قبر میں تکلیف ہوگی نہ قیامت میں عذاب ہوگا تو حقیقتِ دین کی ذکر ہے اور اس کے لئے تسبیح کی ضرورت نہیں توضیح کے لئے ایک مثال اس کی عرض کرتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کسی عورت پر فریفتہ ہوگیا اور اس عورت نے کہا کہ میں رات کو ملوں گی لیکن ذرا آدمیوں کی شکل بنا کر آنا۔ یہ حکم اس عورت کی طرف سے نازل ہوا۔ اب یہ شخص کیا کرے گا؟ یہ کرے گا کہ نائی کو بلا کر خط بنوائے گا غسل کے لئے پانی مہیا کرے گا اور غسل کرے گا۔ بازار جاکر کچھ زیور وغیرہ ہدیہ دینے کو خریدیگا صبح سے شام تک اُسی دُھن میں رہے گا۔ لیکن صبح سے شام تک نام ایک دفعہ بھی اس کا نہیں لیا تو بظاہر اس نے اپنے ہی کو بنایا سنوارا اور خرید و فروخت میں مشغول رہا اور اس وجہ سے جس کو راز کی خبر نہیں وہ یوں سمجھے گا کہ یہ شخص دعوے عشق میں بالکل کاذب ہے

مگر جس کو دل کی لگی کی خبر ہے وہ جانتا ہے کہ ہر وقت دل میں وہی محبوبہ بسی ہے اگر عطر خریدا رہے تو اسی لئے کہ اس سے ملوں گا۔ زیور خریدا ہے تو اس واسطے کہ اس کو پہناؤں گا غرض ہر کام اسی کے لئے ہے اپنے لئے کچھ بھی نہیں ورنہ گذشتہ کل میں یہ سب کام کیوں نہیں کیا تھا۔ تو جب محبوبۂ دنیا یہ غلبہ کر سکتی ہے تو کیا محبوب حقیقی کی محبت ہر چیز میں غالب نہیں آسکتی ؎

عجب داری سالکان طریق کہ باشند در بحر معنے غریق

(تو تعجب کرتا ہے طریقت اور سچی درویشی کے راستہ پر چلنے والوں پر کہ وہ ہر وقت معنے کے دریا کی گہرائیوں میں غوطے لگاتے رہتے ہیں)

تو اگر کسی تاجر کو خدا سے محبت ہو تو وہ تاجر وہی چیز لے گا جو خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہو کھانا بھی اسی لئے کھائے گا کہ خدا کا حکم ہے آرام بھی اسی لئے کرے گا کہ اس وقت آرام کرنے کا حکم ہے۔ تو ظاہر حالت دیکھنے والا اگرچہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دیندار نہیں ہے مگر واقع میں وہ پکا دیندار ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص دین کے لئے گھوڑا پالے تو اس گھوڑے کا کھانا پینا سونا حتیٰ کہ اچھلنا کودنا پیشاب لید کرنا سب اس شخص کے اعمال صالحہ میں لکھا جاتا ہے دیکھئے خود اس شخص کا عمل بھی نہیں بلکہ گھوڑے کا عمل اور اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے تو جب نیک نیت کے گھوڑے کا استنجا کرنا بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا تو خود اس کے اعمال جن کا دین سے تعلق ہو گو صورۃً وہ دنیاوی ہوں وہ کیوں اس کے نامۂ اعمال میں نہ لکھے جائیں گے پس خود اس کا بول و براز کرنا بھی اس کے لئے موجب اجر ہوگا پس استنجا بھی اگر موافق حکم کے ہو اور بغرض عمل بالحکم ہو وہ بھی دین ہے چنانچہ اسی سبب سے اس کے قواعد بھی ہم کو بتلائے گئے اور اسی بنا پر جب ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پر ایک شخص نے یہ طعن کیا کہ تم کو تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہگنا موتنا بھی سکھلاتے ہیں تو ان صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے نہایت دلیری سے یہ جواب دیا کہ بیشک ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم کو ہگنا موتنا بھی سکھلاتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ حقیقت سمجھتے تھے ایسے مواقع میں اعداء دین سے پچتے نہ تھے اب ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ صریح دین کی بات میں بھی

لگنے لگتے ہیں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں نے ریل میں نماز اس لئے نہیں پڑھی کہ سب کے سب ہندو ہی اس میں تھے وہ میری حرکات پر ہنستے اور اسلام کی اہانت ہوتی استغفر اللہ اور یہ گو الحمد للہ ہم پر اتنا اثر تو نہیں ہوتا کہ نماز چھوڑ دیں لیکن اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ اگر ہم غیر دں کے سامنے کھانا کھاتے ہوں اور ہمارے ہاتھ سے ٹکڑا زمین پر گر پڑے تو اس کو اٹھا کر کبھی کھانے کی ہمت نہ ہوگی اس کو عار سمجھیں گے اگر بہت ہی ادب اور دینداری کا غلبہ ہوگا تو کسی نوکر اٹھا کر دیدیں گے کہ اس کو کہیں ادب سے رکھدو مگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہیں کے حاکم ہو کر گئے ایک مرتبہ دورہ میں تھے کہ کھانا کھاتے وقت ایک لقمہ آپ سے گر گیا مٹی لگ گئی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرش بھی کافی آپ کے آگے نہ تھا آپ نے اس لقمے کو اٹھا کر صاف کر کے کھالیا اور سب عجمی دیکھتے رہے ایک شخص نے اسی وقت آپ کے کان میں کہا کہ یہ لوگ ایسی باتوں کو ذلت سمجھتے ہیں آپ نے باآواز بلند یہ جواب دیا کہ میں ان احمقوں کی خاطر اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتا صاحبو! ہم کو جو کچھ ذلت ہوئی وہ اپنے اسلاف کی اتباع چھوڑنے سے ہوئی۔ ایسا ہی قصّہ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے کہ ماہان ارمنی کے پاس جب مسلمان گئے تو وہاں حریر کا فرش بچھا ہوا تھا حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ اس کو الٹ دیا جائے ماہانِ ارمنی نے کہا کہ میں نے آپ کی عزت کی تھی آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو اس سے منع کیا ہے اور تو جو یہ کہتا ہے کہ میں نے عزت کی تھی تو سمجھ زمین خدا کا فرش ہے جو تیرے حریری فرش سے بدرجہا بہتر اور افضل ہے ؎

نباشد اہلِ باطن درپئے آرائش ظاہر بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

(جو اہل باطن ہوتے ہیں وہ اپنے ظاہر کو سنوارنے کی فکر میں نہیں رہتے باغ کی چہار دیواری جس پر خود پھولوں کی بیلیں پھیلی ہوئی ہیں اس کو نقش و نگار بنانے والے کی کیا ضرورت)

اُن حضرات کے قلوب ایسے کھلے ہوئے تھے کہ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے صاحبو! یہ ہے اولوالعزمی اور جب ہر چمکدار چیز کی چمک دمک سے ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں تو

قلوب میں سے وہ اولوالعزمی جاتی رہی۔ ایک کنیسہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو قید کی حالت میں عیسائیوں نے محض اپنی شان و عظمت دکھلانے کو جہاں نہایت ہی آرائش اور چمک دمک تھی نیز وہاں حسین عورتوں کو جمع کیا گیا تھا مقصود یہ تھا کہ ان عورتوں کو دیکھ کر ان کی طرف میلان ہوگا اور ہمارے دین کی طرف راغب ہوں گے جب اس سامان کو دیکھا ہے تو باآواز بلند کہنا شروع کیا اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لکھا ہے کہ اس تکبیر کی ہیبت سے کنیسہ میں حرکت ہوگئی اور وہاں کے قندیل آپس میں ٹکرانے لگے۔ صاحبو! آج ہم لوگوں کی تکبیروں سے کیوں نہیں ٹکرا جاتے۔ واللہ ہم لوگ گر گئے ہیں۔ مولوی عبدالجبار صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ جب میں لارڈ ڈفرن سے ملا ہوں تو اس نے میری عبا کا دامن پکڑ کر کہا کہ اس لباس میں آپ شہزادہ معلوم ہوتے ہیں اور ہم تو اپنی وضع سے مجبور ہیں۔ میں اس قول کو نقل کرکے کہا کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے نزدیک علماء کا فتویٰ قابل وقعت نہیں ہے تو صاحب وائسرائے کا فتویٰ ضرور قابل وقعت ہونا چاہئے۔ غرض ہمارے قلوب میں ہر معمولی و غیر معمولی چیز کی عظمت ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب میں صرف خدا کی عظمت تھی۔ اب میں گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا کر کھالینے کا راز بتلاتا ہوں سمجھئے کہ اگر کوئی بادشاہ اپنے دربار میں بلا کر آپ کو کھانے کے لئے کچھ دے اور کہے کہ میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ اور اثنائے اکل میں آپ سے ایک لقمہ زمین پر گر جائے تو اس وقت آپ کیا کریں گے؟ کیا اس لقمہ کو پھینک دیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ نہایت سرعت کے ساتھ اس کو اٹھائیں گے اور اٹھا کر صاف کرکے کھالیں گے تاکہ بادشاہ خوش ہو کہ ہماری دی ہوئی چیز کی اس نے قدر کی افسوس کیا خدا کی عظمت شاہ دنیا کی عظمت کی برابر بھی نہ رہی ان حضرات کے قلب میں خدا کی عظمت تھی ہم نے عطیہ شاہ کی تو اتنی عظمت کی اور عطیہ شاہنشاہ کی عظمت نہ کی۔ افسوس ہے کہ دل کی آنکھیں جاتی رہیں ہر چیز میں عیب نکالا جاتا ہے کہ یہ تو کچی رہ گئی ہے اور اس میں تو نمک نہیں ہے مگر میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ کچی کھا جایا کرو اگرچہ عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ کچی بھی کھا جاؤ کیونکہ عطیہ شاہنشاہ ہے اور اسی سے یہ بھی سمجھو کہ ہماری عقل ہماری دشمن ہے بربنائے مذکور کچی کھانے کو بھی واجب کہتی ہے لیکن قربان ہو جایئے شریعت مطہرہ کے کہ اس نے رحم کیا اور اس کو چھوڑ دینے کی اجازت دی۔ اور یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی

کہ عقل ہم کو صعب اور دشوار گذار راہ پر لے چلنا چاہتی ہے لیکن شریعت مطہرہ تسہیل کرکے نرم راہ بتاتی ہے اور عقل کے فتوے کو منسوخ کرتی ہے اے عقل کے پرستو آپ عقل پر عمل کیجئے اور ہم شریعت پر عمل کرتے ہیں جن لوگوں نے عقل اور شریعت کے فتاوے کا موازنہ کرلیا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے دور تک سوچنے والی عقل کو بہت آزمایا بالآخر اپنے کو دیوانہ یعنی شریعت کا فرمانبردار بنانے ہی میں فائدہ دیکھا)

یعنی عقل تو بہت بڑی دشمن ثابت ہوئی اب شریعت پر چلیں گے۔ یہ بطور جملہ معترضہ کے تھا۔ مقصود یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالٰی عنہم کی یہ کیفیت تھی کہ وہ حقیقی دین کو سمجھتے تھے یعنی جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے گو صورۃً وہ دنیوی حاجت ہی ہو چنانچہ حدیث شریف میں ہے نَهٰى عَنِ الصَّلٰوةِ وَهُوَ حَاقِنٌ (جبکہ پیشاب پاخانہ کی سخت حاجت ہو نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے) فقہاء عظام نے لکھا ہے کہ ایسے وقت نماز پڑھنا حرام ہے۔ یہاں سے ایک اور کام کی بات ذہن میں آئی وہ یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی فاتحہ اور تیجے وغیرہ کو حرام بتاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو نماز کو منع فرماتے ہیں۔ اس کے جواب میں تم یوں کہو گے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے منع نہیں فرماتے بلکہ بے ڈھنگے پن سے منع فرماتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ مولوی بھی ایسے ہی بے ڈھنگے پن سے منع کرتے ہیں۔ اب اگر کہو کہ اچھا پھر ڈھنگ کیا ہے؟

تو جواب یہ ہے ڈھنگ وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالٰی عنہم کرتے تھے کیا اُن کے متعلقین نہ مرتے تھے اور مرتے تھے تو اُن سے فاتحہ اور تیجہ

کرنا کہیں ثابت ہوتا ہے؟ کہیں بھی نہیں۔ بلا قید ثواب بخشتے تھے تم بھی ایسا ہی کرو۔ اخیر عذر لوگوں کا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو تو نیک کاموں کی رغبت تھی ان کو قیود کی ضرورت نہ تھی۔ اب چونکہ رغبت نہیں رہی لہٰذا اگر قیود ہوں جس میں تہلیل و قرآن شریف پڑھنے والوں کا کچھ نفع دنیاوی بھی ہو تو رغبت پیدا ہوتی ہے اور نیک کام ہو جاتا ہے ورنہ بالکل رہ ہی جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ نفع اس لئے معتبر نہیں کہ اس طرح سے تہلیل وغیرہ پڑھنے سے ثواب بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ دنیا کے لئے وہ پڑھنا ہوتا ہے جب اُس کو ہی ثواب نہ ملا تو بخشے گا کیا پس وہ نفع کہاں محقق ہوا دوسرے شریعت کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی غیر مامور بہ چیز میں مصلحت نفع اور مفسدہ دونوں جمع ہو جائیں تو مفسدہ کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیں گے۔ اور یہاں وہ مفسدہ یہ ہے کہ عوام اس کا دین کا جزو سمجھ گئے ہیں اور غیر دین کو دین کا جزو سمجھنا مذموم ہے کیونکہ اس میں اپنی تجویز کو حق تعالے کی طرف منسوب کرنا لازم آتا ہے اور اُس کا مذموم ہونا یوں سمجھو کہ اگر ایک منادی یہ ندا دے کہ صاحب کلکٹر کا حکم ہے کہ ہر شخص ایک آنہ دے اور جمع کر کے کھانا پکوایا جائے اور فقراء کو کھلا کر گورنمنٹ کے لئے دعا کی جائے۔ حالانکہ صاحب کلکٹر نے یہ حکم نہیں دیا تھا۔ تو یہ ندا کرنا گو گورنمنٹ کی مصلحت ہی کو متضمن ہے مگر باوجود اس کے صرف اس لئے جرم ہوگا کہ اس منادی نے گورنمنٹ کی طرف ایسی چیز کو منسوب کر دیا جو واقع میں اس کی طرف منسوب نہیں ہے اگرچہ اس میں مصلحت بھی ہو۔ اسی طرح تیجہ وغیرہ کو داخل دین کرنے والوں نے بھی خدا تعالےٰ کی طرف ایسی چیز کو منسوب کیا جو واقع میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہے اگرچہ اس میں مصلحت بھی مان لی جائے۔ اب اس میں غور کر لو کہ لوگ اس رسم کو ایسا سمجھتے ہیں یا نہیں میں نے کان پور میں ایک شاہ صاحب کو خود یہ کہتے سُنا ہے کہ گیارھویں (۱۸) تاریخ تک جائز ہے پھر جائز نہیں۔ اور لیجئے کان پور کی کسی مسجد میں دو طالب علموں میں گفتگو ہو رہی تھی ایک کہتا تھا کہ نیاز دلانے والوں کا عقیدہ اچھا نہیں ہوتا دوسرا کہتا

تھا کہ نہیں اچھا ہوتا ہے مقصود صرف بزرگوں کو ثواب بخشنا ہوتا ہے اور یہ نیاز خدا ہی کی دلائی جاتی ہے۔ اتفاقاً اسی وقت ایک بڑھیا دونے میں مٹھائی لیکر آئی کہ مولوی صاحب اس پر بڑے پیر کی نیاز دیدو۔ مانع نے اس بڑھیا سے پوچھا کہ بڑی بی؟ اللہ میاں کی نیاز دیدیں اور بڑے پیر صاحب کو ثواب بخشدیں یہ پڑھے لکھے لوگ تاویل تو کر لیتے ہیں لیکن واقع میں وہ تاویل چل نہیں سکتی چنانچہ اس بڑھیا سے جو پوچھا گیا تو کہنے لگی نہیں بیٹا اللہ میاں کی نیاز تو میں دلا چکی ہوں یہ تو بڑے پیر صاحب کی نیاز ہے ممکن ہے کہ اس کے جواب میں کوئی یہ کہے کہ ہمارا تو یہ عقیدہ نہیں لہذا ہم کو تو جائز ہونا چاہیئے۔ تو سمجھو کہ شریعت کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر ہمارے جائز فعل سے کوئی دوسرا مبتلائے معصیت ہو جائے تو ہم کو بھی اس فعل کا کرنا جائز نہ رہے گا اس کی ایسی مثال ہے کہ اگر طبیب منع کر دے کہ بچے کو حلوہ نہ دینا تو ماں باپ کو بھی حلوہ پکانا یا کھانا نہ چاہیئے کہ ان کو دیکھ کر بچہ ضد نہ کرنے لگے بلکہ بچہ کی حرص کے خیال سے ماں باپ خود ہی اس کو بوجہ محبت کے گوارا نہ کریں گے۔ صاحبو! اسی طرح اگر تم کو مسلمانوں سے محبت ہو تو سمجھ میں آجائے کہ اگر ہمارے کسی فعل سے کوئی بگڑے تو ہم کو بھی اُس کے کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ بلکہ اجازت نہیں اور اگر کرنا ہی ہے تو یہ کرو کہ اس کی صورت بدل دو۔

میری ہمشیرہ کا جب انتقال ہوا تو طالب علموں نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو ہم جمع ہو کر قرآن شریف پڑھ دیں۔ میں نے کہا کہ پڑھو لیکن جمع ہو کر نہ پڑھو بلکہ ہر شخص اپنے حجرے میں بیٹھ کر جتنا جی چاہے پڑھ دے۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ جو کام خدا کے لئے نہیں ہوتا وہ مقبول نہیں ہوتا اور ثواب بخشنے کی حقیقت یہ ہے کہ اپنا ثواب دوسرے کو دیا جائے تو جب اپنے ہی کو ثواب نہ ملے گا تو دوسرے کو کیا چیز دی جائے گی اور جب جمع ہو کر پڑھا جائے گا تو چار آدمی تو اللہ کے واسطے پڑھیں گے اور دس آدمی محض شکایت رفع کرنے کے لئے۔ اور اس نیت سے کہ اگر ہم نہ پڑھیں گے تو یہ اپنے دل میں سمجھیں گے کہ دیکھو ان لوگوں کو ہم سے تعلق

کم ہے اور ایسوں کو خود ہی ثواب نہ ملیگا پھر وہ مرحومہ کو کیا بخشیں گے لہذا تم سب حجرے میں بیٹھ کر پڑھو اور پھر پڑھنے کے بعد بھی نفس تلاوت یا مقدار تلاوت کی مجھ کو اطلاع نہ کرو کیونکہ اس میں میری خوشی مدنظر ہوگی۔ اس کے جواب میں لوگ کہتے ہیں کہ یوں تو کوئی بھی نہ پڑھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ رسم کے طور پر ہوتا بھی تو نہ ہونے کے برابر ہے پھر اگر فرضاً کسی نے نہ بھی پڑھا تو کیا نقصان ہوگیا ثواب اب بھی نہیں ہوتا اُس وقت بھی نہ ہوگا۔ ایک شخص کہنے لگا کہ اصلاح الرسوم سے مردوں کو بہت نقصان ہوا میں نے کہا کہ مُردوں کو تو نقصان نہیں ہوا لیکن زندوں کو نفع ہوگیا کیونکہ لوگ جو کچھ کرتے تھے دکھاوے کے لئے کرتے تھے اور اُس سے ان کے نقصان کے سوا مُردے کو کچھ بھی نفع نہ ہوتا تھا اور دکھاوے کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ فلاں شریف آدمی کو جو کہ نہایت غریب ہے پچاس روپے دیدو لیکن خفیہ دینا ورنہ وہ لے گا نہیں تو کوئی دینے والا بھی اس کو گوارا نہ کرے گا اور دل میں کہیگا کہ واہ اتنا روپیہ بھی خرچ ہوا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی تو جب وہ عمل مخلوق کے دکھانے کو ہوا تو اس میں ثواب تو یقیناً نہ ملا پھر اس کے نہ دینے سے مردوں کا کیا نقصان ہوگیا ہاں زندوں کا نفع ہوگیا کہنے لگا کہ واقعی سچ کہتے ہو۔ تو یہ ایسی صاف باتیں ہیں کہ ہر شخص سمجھتا ہے۔

ع۔ اور اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اُس بُت کو خدا سمجھے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلے بھی تو علماء تھے انھوں نے کیوں منع نہیں کیا میں کہتا ہوں کہ پہلے بھی منع کیا ہے کتابوں میں سب کچھ موجود ہے۔ ہم لوگ حنفی ہیں حنفیہ کی کتابوں میں دیکھ لیجئے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کا فتویٰ کیا ہے یہ سب جزئیات ان کے اصول کے موافق ہیں۔ غرض جب ایک وقت میں نماز بھی ممنوع ہو جاتی ہے تو رسوم کس شمار میں ہیں سو پیشاب پاخانہ کے دبائے کے وقت نماز کے ممنوع ہونے سے معلوم ہوا کہ ایک وقت پر استنجا بھی طاعت ہے حالانکہ صورۃً اس کی عبادت نہیں اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی فعل جو صورۃً عبادت نہ ہو موافق حکم کے کیا جائے وہ بھی عبادت ہے یہ شرح ہے اس قول کی کُلُّ مُطِیْعٍ لِلّٰہِ فَھُوَ ذَاکِرٌ۔ پس دین خدا کے راضی کرنے کا نام ہے اگر صبح سے شام تک کوئی ایک تسبیح نہ پڑھے لیکن احکام میں اطاعت کرے تو وہ دیندار اور ذاکر ہے دنیادار اور غافل نہیں ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(خدا تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے سونا چاندی بیوی بچے ان کو دنیا نہیں کہتے)
میرا یہ مقصود ہرگز نہیں کہ لوگ کماتے کیوں ہیں۔ صاحبو! دکان کرو تجارت کرو
لیکن حدود شرع کی رعایت رکھو سودے کے عیب کو ظاہر کر دیا کرو یہ کہہ دو کہ یہ جدوار اصلی
ہے اور یہ نقلی۔ اگر وبا کے دن ہیں تو ایسا نہ کرو کہ ایک ہی بوتل سے عرق بادیان اور گلاب
اور بید مشک سب نکلتا چلا آئے۔ اسی طرح برسوں کی رکھی ہوئی دوا نہ دو۔ اکثر لوگ کہا کرتے
ہیں کہ اگر ہم سچ بولیں تو تجارت کیسے چلے؟ اول تو یہ غلط ہے کہ سچ بولنے سے تجارت نہ چلے گی
دوسرے نہ بھی چلے تو تمہارا کیا حرج ہے خدا دوسرے ذرائع سے رزق دے گا۔ کان پور میں
ایک شخص نے بانس کی تجارت شروع کی جب کوئی خریدار آتا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ بانس چار برس
چلے گا یہ سن کر خریدار واپس چلا جاتا لوگوں نے ان سے کہا کہ اور سچ بولو کہنے لگے کہ نہ بکیگا تو میرا
کیا حرج ہے خدا تعالیٰ دوسرے طریق سے دیگا آخر ان کا ایسا اعتبار بڑھا کہ ان کے ہاں مال بکتے
ہوئے دوسروں کا مال بکنا کم ہو گیا۔ مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ کے ہاں ایک طالب علم مثنوی
پڑھنے کے لئے آیا مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اول روٹیوں کا بند و بست کر لو پھر پڑھنا اس نے
کہا روٹی تو اللہ تعالیٰ دیں گے اور جب نہ دیں گے اپنی جان لے لیں گے اس کی کیا فکر۔ لوگوں
کو کہیں اطلاع ہو گئی پھر تو ان کی دعوتیں ہونا جو شروع ہوئیں تو کئی ماہ تک خوب مزے
دار کھانے دو وقت ملتے تھے اور جتنا ان کو پڑھنا تھا خوب اطمینان سے پڑھ لیا کسی نے
خوب کہا ہے ؎

رزق مقسوم ست و وقت آں مقرر کردہ اند پیش ازاں و بیش ازاں حاصل نمیگردد بجہد

(رزق تقسیم اور حساب سے ملتا ہے اور اس کا وقت مقرر ہے کتنی ہی کوشش کرو وقت سے پہلے اور
مقررہ مقدار سے بڑھ کر نہیں مل سکتا)

تو رزق تو ملے گا ہی اور اگر قسمت کا نہیں تو تم کو مل کر بھی تمہارے کام نہ آئیگا۔ مثلاً ایک طبیب نے کہا کہ دو تولہ
یخنی کھایا کرو زیادہ کی اجازت نہیں اب اگر ہوس سے زیادہ بھی پی لیں گے تو وہ دستوں کی راہ نکل جائیگی
ایک واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب کو کسی مرض معدہ کے سبب صرف چند تولہ قیمہ چوسنے کی اجازت تھی

اور زیادہ ہضم بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک لکڑ ہارے کو دیکھا کہ سر پر سے لکڑیوں کا بوجھ اتار کر ان کے گھر کے سامنے رکھا اور چادر میں سے وہ موٹی روٹی نکالکر پیاز یا چٹنی سے کھا کر پانی پی کر زمین ہی پر لمبا لمبا ہو کر سو گیا اور خراٹے لینے لگا نواب صاحب کہتے تھے کہ میں دل سے راضی ہوں کہ میری نوابی اس کو مل جائے اور اس کا آرام و چین مجھے دیدیا جائے۔ افسوس کہ انسان خدا پر نظر نہیں رکھتا۔ غرض رزق کی یہ حالت ہے تو اس کے لئے جھوٹ بولنا دغا کرنا حماقت محض ہے غرض تجارت کرنا زراعت کرنا جبکہ حدود کے اندر ہو سب دین ہے اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ کچھ نہ کرو مگر یہ کہتا ہوں کہ دغا فریب نہ کرو جھوٹ نہ بولو اور یہ نہ سمجھو کہ جھوٹ بول کر ملے گا۔ صاحبو! کیا خدا کو ناراض کر کے ملے گا۔ تو خدا کو راضی کر کے اس سے زیادہ نہ ملے گا۔ عجیب خیال ہے اور اگر کہو کہ اس دلیل کا یہ ہی مقتضا ہے کہ فرمانبرداری میں زیادہ ملے مگر مشاہدہ تو یہی ہو رہا ہے کہ نافرمانی میں زیادہ ملتا ہے، تو صاحبو! کہیں ایسا ہے بھی تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ فرمانبرداروں کی ناداری محض ظاہری ہے اس کی حقیقت اس مثال سے سمجھو ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پیران کے ہاں مہمان ہوئے اس روز شاہ صاحب مکان پر نہ تھے اور گھر میں فاقہ تھا بیوی کو فکر ہوئی اِدھر اُدھر سے قرض لینا چاہا تو قرض بھی نہ ملا پیر صاحب کو اس حالت کا پتہ چل گیا انھوں نے ایک روپیہ دیا اور کہا کہ اس کا اناج لے کر ہمارے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا آپ نے اس کو ایک برتن میں رکھ کر ایک تعویذ اس کے اندر رکھدیا اور فرمایا کہ جب ضرورت ہوا کرے اس میں سے نکال لیا کرو اس تعویذ کی برکت سے اس اناج میں خوب وسعت ہوئی چند روز کے بعد حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ واپس تشریف لائے۔ بیوی نے پیر صاحب کے آنے کا اور تعویذ رکھنے کا قصہ بیان کیا حضرت کو اس سے بہت تنگی پیش آئی کہ اب کبھی فاقہ کی نعمت نصیب نہ ہوگی آپ نے فرمایا کہ اس برتن کو میرے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا آپ نے تعویذ نکال کر اپنے سر میں رکھا اور فرمایا کہ حضرت کے تبرک کا مستحق تو میرا سر ہے اور اناج کے لئے حکم دیا کہ سب تقسیم کر دیا جائے۔ اگلے وقت سے پھر فاقہ شروع ہو گیا اور فرمایا ہمارا فقر اضطراری نہیں اختیاری ہے سو آپ تو ان کو نادار سمجھتے ہیں

مگر یہ لوگ اسی کو دولت سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مطیع کو ناداری میں بھی اس قدر انشراح ہوتا ہے کہ حرام کھانے والوں کو سلطنت میں بھی نہیں ہوتا اور اصل دولت یہی انشراح ہے جو کہ اموال سے بھی وہی مقصود ہے سو اہل اطاعت کو وہ بدون اموال کے بھی میسر ہے ہاں حس کو درست کرنے کی ضرورت ہے جس کا طریقہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ بتلاتے ہیں ؎

صحتِ ایں حس بجوئید از طبیب　　　صحت آں حس بجوئید از حبیب

صحتِ ایں حس ز معموریِ من　　　صحتِ آں حس ز تخریب بدن

(جسمانی احساسات کا علاج طبیبوں کے پاس ڈھونڈو اور اندرونی احساسات کا علاج محبوب کے پاس ڈھونڈو۔ جسمانی حس کی صحت تو بدن کی درستی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اندرونی حس کی صحت بدن سے بے تعلق ہونے پر ہے)

غرض اطاعت ہی کرنے سے اصل دولت وراحت ملتی ہے۔ دیکھئے اگر غذا بہت سی ملے لیکن سب فضلہ ہی ہو جائے تو ہیچ ہے اور اگر روح غذا یلا غذا مل جائے تو کھانے کی ضرورت نہیں تو میرا دعوٰی ثابت رہا اگر اطاعت کرو گے تو اور بھی زیادہ ملے گا یعنی رُوح غذا عطا ہو گی۔ غرض شکایت یہ ہے کہ اس وقت جس طرح سے دنیا ہاتھ آتی ہے لیتے ہیں نافرمانی سے پاک نہیں۔ اس کی اصلاح ہونی چاہیئے اور دینداری پیدا کرنی چاہیئے۔ گو تہجد اور تسبیح نہ ہو کیونکہ کچھ تسبیح اور تہجد پڑھنے والوں ہی کے لئے رحمت خاص نہیں ہے بلکہ

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشانست

خم و خمخانہ با مُہر و نشانست

(وہ رحمت کا بادل اب بھی موتی برسا رہا ہے۔ شراب معرفت کے مٹکے اور میخانہ پر مہر اور نشان لگا ہوا ہے)

مگر افسوس تو یہ ہے کہ کوئی لیتا ہی نہیں۔ اور لینے کی صورت یہ ہی ہے

کہ تقویٰ سے طہارت اختیار کرے۔ حقوق العباد کو حتی الوسع ادا کرے اس وقت حقوق کے متعلق ذرا خیال نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ اگر کسی کے تین پیسے بھی کسی کے ذمہ رہ گئے تو اس کی سات سو نمازیں اس صاحبِ حق کو دلوائی جائیں گی۔ آجکل دوسرے کا حق ادا کرنا ایسا گراں ہوتا ہے گویا کہ اپنے گھر سے دے رہے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات تو صاحبِ حق کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کے واسطے دیدو اور اسی سبب سے دوسرے کو قرض دینے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے اسی لئے قرض میں اٹھارہ گنا ثوابؓ ملتا ہے اور صدقے میں دس کا ملتا ہے۔ اٹھارہ کا حساب اس طرح ہوا کہ اصل میں صدقہ سے مضاعف ملا تھا ایک کے مقابلہ میں دو مگر جب اصل روپیہ واپس مل گیا تو اس کے مقابلے میں دو کٹ گئے۔ اور اٹھارہ رہ گئے اور ہمارے اس برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگوں کو قرض نہیں ملتا۔ آج مسلمانوں میں بہت سے لوگ اپنے بھائیوں کا کام نکال سکتے ہیں کہ مالدار ہیں مگر کسی وجہ سے خود تجارت نہیں کرنا چاہتے اور چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کام میں لگالے تاکہ حفاظت سے بچیں مگر اس خوف سے نہیں دیتے کہ ان سے وصول کون کرے گا۔ لہذا مسلمانوں کو وقت ضرورت مہاجن سے قرض لینا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد تمام گھر باہر کا مالک مہاجن ہی ہوجاتا ہے اور یہ محض مسلمانوں کی بے اعتباری کی وجہ سے۔ مظفر نگر میں میرے ایک دوست سے ایک شخص نے دس روپے یہ کہکر قرض لئے کہ آج میرے مقدمے کی تاریخ ہے اور گھر سے دن کے دن منگا نہیں سکتا تم اس وقت دیدو میں وطن جاتے ہی بھیجدوں گا غرض انھوں نے جب وطن جا کر بھی مدت تک نہ بھیجا انھوں نے تقاضا شروع کیا اخیر میں کہا کہ کیا ہمارا کوئی رقعہ ہے صبر کرکے بیٹھ رہے اور پھر غضب یہ کہ اس حرکت کو دین کے خلاف بھی نہیں سمجھتے۔ صاحبو! کیا قبر میں حاکم کو جواب دوگے

ؓ اور ایک حدیث میں بیس حصہ ثواب آیا ہے کذا فی الترغیب والترہیب ۱۲ احمد حسن عفی عنہ۔

اپنے سارے کام کر لیتے ہیں مگر دوسرے کا قرض نہیں دیتے۔ اور اگر کوئی مانگتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ کیا قرض ماریں ہے اور اس سب کی وجہ ایک ہی بھاری مرض ہے کہ دین کی فکر نہیں۔ بہت سے مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ ریل میں زیادہ مال لے جاتے ہیں اور ذرا پروا نہیں کرتے بلکہ بعضے تو کہتے ہیں کہ کافر کا حق مار لینا کچھ ڈر نہیں حالانکہ وہ بھی واجب التحرز ہے بلکہ ایک بزرگ تو یہ کہتے تھے کہ مسلمان کا تو چاہے لے لو لیکن کافر کا حق نہ لو کیونکہ مسلمان سے تو یہ امید ہے کہ وہ قیامت میں معاف کر دے اور کافر سے تو یہ بھی امید نہیں۔ دوسرے اگر معاف نہ کیا تو خیر اپنی نیکیاں اپنے ہی بھائی کے پاس جائیں گی دشمن کے پاس تو نہ جائیں گی۔ خصوصاً میراث میں تو ایسی گڑبڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ جس کے ہاتھ جو آگیا وہ اس نے دبا لیا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بیوی مہر معاف کر دیتی ہے لیکن پھر بعد وفات ورثاء سے اختلاف کر کے وصول کر لیتی ہے بعضے لوگ شرعی حیلے ایجاد کر کے ورثاء کو نہیں دینا چاہتے۔ چنانچہ ایک صاحب میرے پاس آئے کہنے لگے کہ میری بہن اہل سنت والجماعت میں سے تھی اور اس کا شوہر شیعی تھا اب اس بہن کا انتقال ہو گیا ہے تو اس شوہر کو تو اُس کے ترکہ میں سے کچھ حصہ نہ ملنا چاہیئے کیونکہ سنی عورت سے شیعی مرد کا نکاح درست نہیں ہوتا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کفر کا فتویٰ لکھا ہے۔ میں نے کہا کہ غیرت دار آج جائداد کے بچاؤ کے لئے شاہ صاحب کا فتویٰ نظر آگیا اور دس برس سے جو بہن سے حرام کرایا اُس وقت اُس فتوے پر عمل نہ کیا۔ اب تو میں یہ ہی کہوں گا کہ نکاح ہو گیا۔ اور میں نے کہا کہ ایمان سے بتلاؤ کہ اگر تمہاری بہن سے پہلے یہ شخص مر جاتا اور بہت سی جائداد چھوڑ جاتا کیا تب بھی تم یہ ہی کہتے کہ نکاح نہ ہوا تھا اس لئے میراث نہ ملنا چاہیئے ہرگز بھی نہ کہتے۔ تو حیلے نکال نکال کر شریعت کو بدلنا چاہتے ہو صاحبو! یاد رکھو ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودی و نبی را بدرودے

(ہرگز اس جماعت میں سے نہ بن جو حق تعالیٰ کو صرف سجدوں سے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف درود پڑھ دینے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں اور کسی کام میں اطاعت نہیں کرتے)

لوگ اس وقت خدا تعالیٰ کو بھی پھسلانا چاہتے ہیں یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ (دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو اور مسلمانوں کو اور وہ کسی کو بھی دھوکے میں نہیں ڈال سکتے خود ہی دھوکہ میں ہیں) افسوس کہ بعضے لوگوں نے دین کو اغراض نفسانی کے لئے آڑ بنا لیا ہے حتیٰ کہ مشہور ہوگیا ہے کہ دیندار لوگ اپنے مطلب کے مسئلے نکال لیتے ہیں۔ خدا کی قسم دینداروں کا تو یہ مذہب ہے کہ اگر ظاہراً گناہ کریں تو اس سے اچھا ہے کہ دین کے پردے میں گناہ کریں۔ غرض میراث میں یہ گڑبڑ ہورہی ہے حتیٰ کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کو میراث دینا نہیں چاہتا حالانکہ میراث کا مسئلہ ایسا نازک ہے۔ کہ ایک بزرگ اپنے دوست کی عیادت کو گئے جب ان کا انتقال ہوگیا تو آپ نے فوراً چراغ گل کردیا اور فرمایا کہ اب اس چراغ میں وارثین کا تیل ہے اور سب سے اجازت دشوار ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ اللہ واسطے دینے میں بھی احتیاط نہیں کہ جہاں کوئی مرا فوراً اس کے کپڑے مسجد یا مدرسے میں بھیجدیئے۔ حالانکہ جس وقت تک تقسیم نہ ہوجائیں اس وقت تک یہ مشترک میں تصرف ہے جو بدون سب کے اذن اور طیب خاطر کے جائز نہیں ہے اور اگر کوئی ایک وارث دیدے گا تو شرعاً اُس کا اُس قدر حصہ مجموعہ ترکہ سے کم ہوجائے گا مگر لوگوں نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے جو جی میں آیا کرلیا شریعت سے کچھ بحث ہی نہیں وہ حالت ہے اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ (کیا تونے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنا رکھا ہے) اور پھر بعضے اس کی بھی الٹی کوشش کرتے ہیں کہ اہوار نفسانیہ کو علماء سے جائز کرالیں میں نے اس کی ایک مثال میرٹھ میں بیان کی تھی۔ کہ علماء سے ہر بات کے جائز کرانے کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک رئیس کی عادت

تھی کہ وہ اکثر بے سروپا باتیں کہا کرتا تھا لوگ اس کو ہنسا کرتے تھے اس نے ایک شخص کو اس کام کے لئے نوکر رکھا کہ جو کچھ ہم کہا کریں اس کی تاویل کر دیا کرو۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ آج ہم شکار کو گئے ہرن پر جو فیر کیا تو گولی اس کے کھر میں لگ کر پیشانی کو توڑتی ہوئی نکل گئی لوگ ہنسنے لگے خادم نے عرض کی حضور بجا ہے وہ ہرن اس وقت کھر سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔ تو جیسے کام کے لئے اس رئیس نے نوکر کو انتخاب کیا تھا ویسا ہی کام آج ہمارے بھائی علماء سے لینا چاہتے ہیں۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ کھلم کھلا گناہ کرے لیکن ناجائز کو جائز تو نہ بنائے مولانا فرماتے ہیں ؎

تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست چوں ہوا جز قفلِ آں دروازہ نیست

(جب تک نفس کی خواہشات تازہ ہیں ایمان تازہ نہیں ہے۔ یہ خواہشات نفس ایمان کے دروازہ کے لئے سب سے بڑا قفل ہے)

جب تک خواہش نفسانی کو مغلوب نہ کرو گے ایمان میں تازگی نہ آئے گی۔ مگر خواہشِ نفسانی کو کم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ کھانا پینا کم کر دیں اس وقت تو درویشوں کو بھی کھانا کم نہ کرنا چاہیئے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ اور نفس سے خوب کام لو۔

ع کہ مزدورِ خوشدل کند کار بیش۔ (جو مزدور مالک سے خوش ہوگا وہ زیادہ کام کرے گا)

تو کھاؤ، پیو، کپڑا پہنو ہنسو بولو مگر حدودِ شرعیہ کی حفاظت ہر چیز میں رکھو۔ آمدنی آئے تو اس کو دیکھ لو کہ حرام طریقہ سے تو نہیں آئی۔ ریل میں سفر کرو تو دیکھ لو کہ اسباب اجازت قانون سے تو زیادہ نہیں ہے نیز ہم جو ریل میں بیٹھتے ہیں تو ہم نے شریعت کے موافق جگہ گھیری ہے یا زیادہ جگہ گھیری ہے۔ صاحبو! دین ریل میں بھی کچہری میں سب جگہ تمہارے ساتھ ہے۔ رعایا کسی وقت قانون سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ سونے کے وقت دیکھ لو کہ پیر قبلہ کی طرف تو نہیں ہیں۔ بے نماز پڑھے نہ سو رہو اور اگر سونے لگو اور خود جاگنے کی توقع نہ ہو تو کسی کو مقرر کر دو کہ وہ تم کو نماز کے وقت جگا دے اور مصلحت دین کے ساتھ دنیوی مصالح کی بھی تمہارے لئے رعایت کی ہے چنانچہ یہ بھی قانون ہے کہ بے روک چھت پر

نہ سورہو پس شریعت محض گرانی کا نام نہیں ہے بلکہ اس نے تمھاری ہر طرح کی مصلحت کی رعایت کی ہے۔ غرض عمل با شریعت یہ ہے کہ ہر حال میں خدا سے تعلق رکھو دنیا یا دین کا جو کام کرو حدود کے موافق کرو اسی کو کہتے ہیں لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥ (دیکھو تمہارا مال اور تمھاری اولاد تم کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کردے اور جو ایسا کرتے ہیں وہ سراسر نقصان میں ہیں) آگے ایک عام عنوان سے اس کی تائید ہے کہ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ یعنی خرچ کرو اس چیز سے کہ دیا ہم نے تم کو۔ اس عام میں ایک یہ خاص فرد بھی داخل ہے کہ تعلیم دین میں بھی اگر ضرورت ہو خرچ کرو اور اس فرد کو میں نے اس لئے بالخصوص بیان کیا یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ دین کو دنیا سے مقدم کرنا ضروری ہے لیکن دین کا مقدم کرنا دین کے علم پر موقوف ہے مگر اس جملہ سے کوئی یہ مطلب نہ سمجھ جائے کہ میں سب کو مولوی بنانا چاہتا ہوں۔ بلکہ جن علماء کی نسبت آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سب کو مولوی بنانا چاہتے ہیں وہ خود ہی سب کو مولوی بنانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ اس سے دو نقصان ہوں گے ایک تو یہ کہ تمام لوگ مولوی بن جائیں گے تو کھیتی اور تجارت سب برباد ہو جائے گی اور مجموعۂ قوم پر معاش کی حفاظت کرنا فرض ہے اگر سب چھوڑ دیں اور اس سبب سے سب مر جائیں تو سب گنہگار ہوں گے تو واجب ہے کہ ایک جماعت کھیتی کے لئے رہے۔ ایک تجارت کے لئے اور ایک خدمتِ دین کے لئے جس کو لوگوں نے اڑا دیا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر سب مولوی بنے تو چونکہ اکثر طبائع میں حرص اور لالچ غالب ہے اور معاش سے بھی اکثر لوگ مستغنی نہیں ہوتے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مولوی کہلائیں گے اور حرصِ دنیا میں دین کو تباہ کریں گے۔ اور دین کو ذریعۂ تحصیل دنیا کا بنائیں گے ان کا تو یہ ضرر ہوگا اور دوسرے لوگ ان کو اس حالتِ ذلیل میں دیکھ کر دین کو بھی ذلیل سمجھنے لگیں گے دوسروں کا یہ ضرر ہوگا۔ سلفِ صالحین کا اس وجہ سے یہ معمول تھا کہ جو شخص امراء سے زیادہ ملتا تھا اس کو اپنے حلقۂ درس میں شریک ہونے سے روک دیتے تھے غرض یہ تو

مطلب نہیں ہے کہ سب کے سب اصطلاحی عالم بنیں لیکن یہ ضروری ہے کہ کچھ لوگ اصطلاحی عالم ہوں اور کچھ لوگ متوسط درجہ تک پڑھ لیں۔ اور ان کو جو ضرورت پیش آتی جائے علمائے کاملین سے اس کے متعلق استفتاء کر لیں صاحبو! اس وقت دو پیسے میں کلکتے تک سے ہر بات دریافت ہو سکتی ہے دیکھئے اگر ایک ہفتہ میں چار مسئلے معلوم ہوں تو ایک ماہ میں کس قدر ہو جائیں۔ پھر ایک سال میں اُن کی کتنی تعداد ہو جائے اور چند سال میں کیسا معتد بہ ذخیرہ اپنے پاس ہو جائے تو ان کے لئے جو پڑھے لکھے ہیں اور جو حرف شناس نہیں ہیں ان کے لئے یہ کیا جائے کہ کسی ایک شخص کو مقرر کیا جائے جو ان کو ہر ہفتہ مسائل سنایا کرے اور یہ نہ ہو سکے تو ہر مہینے میں ایک بار تو ضرور ہی کچھ مسائل سنا دیا کرے اور یہ لوگ اپنی عورتوں کو سنا دیا کریں مگر اس کے لئے ایک مرکز کی ضرورت ہو گی کہ وہ اُس کو اپنے ذمہ لے اور وہ کوئی عالم ہونا چاہئے اس کا کام یہ ہو کہ محض مسائل کا وعظ کہا کرے اس لئے میں نے اس وقت وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ کو پڑھا کہ لوگ اس کی طرف توجہ اور ہمت کر کے ایک مولوی کو مناسب معاوضہ پر اس کام کے لئے رکھ لیں۔ مجھے یہ سنکر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ یہاں یہ انتظام ہوا ہے۔ اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ روزانہ جب کھانا پکانے بیٹھو تو آٹے کی ایک چٹکی نکال کر علیحدہ کسی برتن میں ڈال دیا کرو اسی طرح جب روپے کے پیسے لو تو اس میں سے ایک پیسہ نکال کر اس مد کے لئے رکھ دیا کرو اور اس میں بستی کے ہر ایک شخص کو شریک کرو۔ اور جب مدرسے کی صورت ہو جائے تو اس میں تین چیزوں کی ضرورت ہو گی ان کو جاری کرو ایک تو یہ کہ قرآن شریف کی تعلیم ہو جو لڑکے ناظرہ پڑھیں ان کے ساتھ تو یہ طرز رکھو کہ جب بیس۲۰ پارے قرآن شریف کے پڑھ لیں تو اُن کو مسائل کا کوئی اردو رسالہ شروع کرا دیا جائے اور جو لڑکے حفظ پڑھیں ان کے ساتھ یہ طرز رکھو کہ جب تک قرآن شریف ختم نہ ہو جائے کسی دوسرے شغل میں نہ لگاؤ دوسرا کام یہ کہ ایک شخص کو ملازم رکھو کہ وہ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھا دیا کرے تیسرا کام یہ کہ ایک واعظ مدرسے میں رکھا جائے کہ وہ ہر ہفتہ وعظ کہا کرے اور قرب و جوار کے دیہاتوں میں بھی وقتاً فوقتاً مسائل کی تعلیم دیا کرے

تو اس کی کوشش کرنا بھی اَنْفِقُوْا میں داخل ہے اور دیکھئے خدا تعالیٰ نے مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ فرما کر بتلا دیا کہ ہم نے ہی تو دیا ہے پھر بخل کیوں کرتے ہو نیز لفظ مِنْ تبعیضیہ فرما کر یہ بھی تسلی فرما دی کہ ہم سارا مال نہیں مانگتے۔ آگے فرماتے ہیں مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ (اس سے پہلے کہ تمھیں موت آجائے) یہ وہ تعلیم ہے کہ اگر روزانہ پندرہ بیس منٹ بھی اس کو سوچ لیں تو دنیا کی محبت بالکل جاتی رہے۔ یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ ایک دن ہم کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد ہم سے ہر ہر بات کے متعلق ایک دن سوال ہوگا۔ میزان عدل قائم کی جائے گی اگر ہماری نیکیاں غالب آگئیں تو فبہا ورنہ قعرِ جہنم ہے اور ہم ہیں اور وہاں یہ حالت ہوگی لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی (نہ تو موت ہی ہو نہ زندگی) آگے فرماتے ہیں کہ اگر خرچ نہ کروگے تو یہ کہوگے لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (اگر مجھے تھوڑی سی مہلت دیدی جاتی تو میں خوب خیرات کرتا اور اچھے لوگوں میں سے ہو جاتا) دوسری آیت اس طلبِ مہلت کے جواب میں ہے کہ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا یعنی جب موت کا وقت آجائے گا تو ہرگز مہلت نہ ملے گی اس کے بعد غفلت پر وعید ہے وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ لفظ خَبِیْرٌ فرمایا جس کے معنے یہ ہیں کہ اس کو دل تک کی خبر ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دین یہ ہے کہ باطن بھی درست کرو۔ حاصل یہ ہے کہ ان آیات میں ہم حُبِّ دنیا کے مرض پر جتایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ ؎

غمِ دیں خور کہ غمِ غمِ دین ست
ہمہ غمہا فروتر ازیں ست

(دین کی فکر میں رہو کیونکہ اصل فکر دین ہی کی فکر ہے۔ اور تمام فکریں اس سے کم درجہ کی ہیں)

خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل بخشیں۔ ناظرین کرام سے التماس ہے کہ جامع وعظ (اور ناشر وعظ عبد المنان) کے لئے حسن خاتمہ وحصولِ رضا باری تعالیٰ کی دعا فرمائیں۔ آمین۔

برحمتك یا ارحم الراحمین۔

تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد چہارم

کا

نواں وعظ ملقب بہ

قطع التمنیٰ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔اے جناح روڈ

دعواتِ عبدیت جلد چہارم کا

نواں وعظ ملقب بہ

قطع التمنّی

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
قصبہ کاندھلہ مکان مولوی اسمٰعیل صاحب	۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ ہجری	۳ گھنٹے	کھڑے ہو کر	اپنی تجویز کا ناچیز ہونا خدائی تجویز کے سامنے	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم	تقریباً ۶۰ آدمی	عورتوں کا مجمع بھی تھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔ عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی

امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے) یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک مضمون جس کے حاضر رکھنے کی ہم کو ہر وقت ضرورت ہے ارشاد فرمایا ہے اور ایک بڑی غلطی کو جس میں ہم سخت مبتلا ہیں رفع فرمایا اور اس غلطی میں اکثر اہل علم اور عوام بڑوں اور چھوٹوں سبھی کو ابتلا ہے بلکہ اس کے غلطی ہونے کی طرف بھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ ہم لوگوں کی فہرست اعمال میں بڑی بڑی باتیں تو شمار ہوتی ہیں مگر جن میں ذرا بھی غموض ہوتا ہے ان کی طرف التفات نہیں ہوتا جس کی وجہ قرآن مجید میں تدبر نہ کرنا ہے اور مسلمانوں میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ وہ قرآن مجید کے اندر تدبر نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم میں دو قسم کے لوگ ہیں عوام الناس اور خواص۔ سو عوام الناس تو ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ ہی کو پڑھتے ہیں اور گو یہ بھی بیکار نہیں بلکہ ایک درجہ میں یہ بھی مطلوب ہے۔ اور جو لوگ بدون فہم معانی تلاوت کرنے کو بیکار اور بے فائدہ قرار دیتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے ہم ان سے فائدہ کی شرح پوچھیں گے اگر وہ کہیں کہ فائدہ اس کا فہم معانی ہے تو ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے پاس اس امر کی کیا دلیل ہے کہ فائدہ اسی میں منحصر ہے کہ قرآن شریف کو سمجھیں بلکہ جس طرح یہ ایک فائدہ ہے ایسا ہی ثواب بھی ایک فائدہ ہے مگر ثواب کو آج کل لوگ بہت ہی بے وقعتی سے زبان پر لاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اگر کسی کی ہزار روپیہ کی تنخواہ ہو یا اس کی توقع ہو جو ثواب کے مقابلے میں محض ہیچ ہے تو اس پر کیسا فخر کیا جاتا ہے اور ثواب کو جو کہ ہزار درجہ افضل ہے اس بے وقعتی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ خبر بھی ہے کہ تنخواہ کی کیا حقیقت ہے۔ تنخواہ کی حقیقت ہے کام کا عوض بس یہی حقیقت ثواب کی ہے پھر افسوس ہے کہ دنیا کا فانی عوض جو صدہا کدورات کے ساتھ ہے اور جس میں ترقی کے بعد تنزل بھی ہو جاتا ہے چنانچہ پنشن میں ظاہر ہے اور پھر انقطاع ہو جاتا ہے چنانچہ موت میں ظاہر ہے۔ اس کو تو مایہ فخر سمجھا جائے اور خدا کے گھر کی تنخواہ جس میں سدا تزائد اور پھر خلود۔ اس کو حقیر سمجھا جائے ما قدروا اللہ حق قدرہ (انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ کی جیسی کہ قدر کرنی چاہئے۔

تھی) کہ خدا کے نام کی لگی ہوئی چیز کو ایسا حقیر سمجھا جائے۔ غرض خدا تعالیٰ کے ہاں کی تنخواہ کو ثواب کہا جاتا ہے مگر اس وقت ایسی حالت بگڑ گئی ہے کہ لوگ اس معاوضہ آخرت کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ میں بریلی ایک مرتبہ گیا تو صاحب جنٹ نے ملاقات کی رغبت ظاہر کی میں ان سے ملا۔ اول سوال انھوں نے یہ کیا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ نے کوئی تفسیر لکھی ہے میں نے کہا کہ ہاں لکھی ہے پوچھا کہ آپ کو اس میں کتنا روپیہ ملا میں نے کہا کہ ایک بھی نہیں۔ کہا کہ پھر آپ نے اتنا محنت کیوں کیا میں نے کہا کہ ثواب آخرت کی نیت سے کہنے لگا کیا ابھی مسلمانوں میں ایسے خیال کے لوگ موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت کثرت سے۔ اس حکایت کے نقل کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں اس متاع دنیا کے مقصود سمجھنے کی جڑ بتلا دوں کہ یہ خیال مسلمانوں میں غیر مسلم قوموں سے آیا ہے اور یہ لوگ اہل یورپ کی شاگردی کرتے ہیں لیکن شاگردی بھی ناتمام ہے کیونکہ وہ لوگ تو مادہ پرست ہیں صانع عالم کے بھی قائل نہیں تو جو شخص نہ مبدء کا قائل ہو نہ معاد کا وہ تو اس خیال میں معذور ہے اگر یہ اس میں وہ بھی معذور نہیں کہ مبدء ومعاد کا باوجود قیام دلائل کے انکار کیا مگر بعد انکار کے اس انکار کی فرع کا قائل ہونا یعنی دنیا کو مقصود بالذات سمجھنا زیادہ عجیب نہیں مگر مسلمان پر کیا آفت نازل ہوئی کہ باوجود قیامت کے قائل ہونے کے پھر بھی اگر کسی کام میں دنیا کا فائدہ یا دنیا میں فائدہ نہ ہو تو اس کو بیکار سمجھے اس لئے یہ شاگردی بھی ناتمام شاگردی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ (نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے) اب سمجھئے کہ فائدہ صرف نفع عاجل ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ نفع عاجل کے ساتھ ہی ایک نفع آجل بھی ہے یعنی اجر وثواب اور حقیقت اس کی رضا وجنت ہے مگر اس وقت لوگ جنت کو بھی بہت ذلت سے ذکر کرتے ہیں اور دنیا پرستوں سے تو یہ امر زیادہ عجیب نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ بعضے صوفی مشرب بھی اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس آئے کہنے لگے کہ مجھے دس روپے کی ضرورت ہے پھر تھوڑی دیر بعد کسی تذکرہ میں کہنے لگے کہ ہمیں کیا ضرورت ہے جنت کی اور کیا پرواہ ہے دوزخ کی۔ میں نے کہا کہ ہوش کی دارو کرو۔ تم کو دس روپے سے تو استغنا ہوا نہیں جنت سے تو تم ضرور ہی مستغنی ہو گئے۔ وجہ اس تمام تر بکواس کی یہ ہے کہ جنت کو ابھی دیکھا

نہیں ہے۔ جب دیکھو گے تو ہائے ہائے کر کے مر جاؤ گے۔ سمجھ لو جنت تو بڑی چیز ہے انسان اپنی معمولی ضرورتوں سے تو مستغنی ہو ہی نہیں سکتا یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت شناسی میں غور کرنا چاہیئے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانا کھا کر یہ دعا فرماتے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ غَیْرَ مَوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا یعنی اس کھانے کو نہ ہم رخصت کرتے ہیں اور نہ ہم اس سے مستغنی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی شخص افضل تو کیا کوئی برابر بھی نہیں آپ خدا تعالیٰ کے سب سے زیادہ مقبول اور کھانا پینا بظاہر بہت ہی سرسری چیز مگر باوجود اس کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہمیں اس سے استغنا نہیں کیونکہ جب تک زندہ ہیں دونوں وقت اس کے محتاج ہیں تو اس حدیث شریف سے پتہ چلا کہ بندہ کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مجھے صحت کی ضرورت نہیں یا بیوی کی ضرورت نہیں ہے یا کھانے کی ضرورت نہیں اور عجب نہیں کہ اسی وجہ سے دوا کو مسنون کیا گیا ہو یعنی اگر دوا نہ بھی کی جائے تب بھی مرض کی مدافعت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایسے بہت لوگ دیکھنے میں آئے ہیں کہ وہ دوا بالکل نہیں کرتے اور ان کو بھی شفا ہوتی ہے مگر باوجود اس کے پھر بھی جو دوا کو مسنون کیا گیا تو شاید اس میں یہ ہی مصلحت ہو کہ اس سے افتقار کا اظہار ہو۔ اور اسی کی بنا پر بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ بھوک میں رونے لگے کسی نے کہا کیا بچے ہو؟ کہ بھوک میں روتے ہو فرمایا تم کیا جانو مجھ کو بھوکا اسی لئے کیا ہے کہ میرا رونا دیکھیں۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھے ایک شخص نے کہا کیسی طبیعت ہے، فرمایا کہ اچھی نہیں اس نے کہا کہ آپ ایسا فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ سبحان اللہ خدا تعالیٰ تو مجھے بیمار کریں کہ میرا عجز ظاہر ہو اور میں اپنی بہادری ظاہر کروں، جب خدا نے بیمار کیا ہے تو کیوں نہ ظاہر کروں۔ ظاہر میں تو بہت تعجب کریں گے مگر جو حقیقت سمجھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ رنج ان وقتوں کی اظہار افتقار ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ علماء کی جب ان حقائق پر نظر ہے اور وہ ہر چیز کو ضروری محتاج الیہ سمجھتے ہیں تو اس کا ان پر کب

احتمال ہے کہ وہ معاش کو ترک کرنے کی رائے دیں جیسا کہ ان کو بدنام کیا جاتا ہے اصل سبب اس بدنام کرنے کا یہ ہے کہ معترضین کو اُن سے اختلاط کا اتفاق نہیں ہوا دھوری بات دور سے سن کر بدگمان ہو جاتے ہیں اس لئے ایسے لوگوں کی تشفی کا ایک سہل طریق تھوڑے دنوں سے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ کہ جس شخص کو مقتدیان اسلام پر اعتراض ہوں وہ چالیس دن کسی مقتدا کے پاس صرف رہ لیں خصوصیت کے ساتھ کسی شبہ کے پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی خود اختلاط ہی سے ان شاء اللہ تعالیٰ اس مدت میں سب شبہات حل ہو جائیں گے اور اگر کوئی کہے کہ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ تو لیجئے میں سمجھائے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ جب پاس رہیگا تو وقتاً فوقتاً ان کے معاملات دیکھے گا ان سے قواعد دینیہ سنے گا اسی سے وشبہات خود بخود جاتے رہیں گے یہ تو ظاہر بینوں کے سمجھانے کی بات ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگ اہل نور ہیں اُن کے قرب سے نورانیت آتی ہے اُس نور سے حقائق منکشف ہوتے ہیں پس اِس انعکاس کی وہ حالت ہوتی ہے کہ نُوْرُ الْقَمَرِ مُسْتَفَادٌ مِنْ نُوْرِ الشَّمْسِ (چاند کا نور سورج کے نور سے حاصل ہوا ہے) تو صاحب نور کے پاس ظلمت نہیں رہتی یعنی جب نور آتا ہے تو ظلمت بھاگ جاتی ہے غرض اہل نور کی صحبت میں یہ خاصہ ہے گو وجہ بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے بلکہ اس سے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو بدون اختلاط کے صرف ان کا دیکھنا ہی کشف حق کے لئے کافی ہو جاتا ہے اسی کو کہتے ہیں ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(اے وہ ذات کہ تیری ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے تیرے سامنے بغیر حجت ہی کے ہر مشکل حل ہو جاتی ہے)

بے قیل و قال کے معنی یہ ہیں کہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر اس درجہ کی سلامتی نہ ہو تو البتہ پھر چند روز کی صحبت کی بھی ضرورت ہے بشرطیکہ جبکہ خَتَمَ اللّٰہُ کی نوبت نہ آگئی ہو اور بحمد اللہ کسی مسلمان کی یہ حالت ہوتی بھی نہیں ورنہ وہ مسلمان ہی کیوں ہوتا غرض میں نے معترضین کے ایسے شبہات کا یہ عملی جواب تجویز کیا ہے۔ یعنی

اختلاط مع العلماء کیونکہ محض لسانی جواب سے اگر سکوت ہو جائے مگر شفا نہیں ہوتی. لیکن اس عملی جواب میں اتنی شرط ضرور ہے کہ نظر انکار کے ساتھ وہاں نہ رہے گو اعتقاد بھی نہ ہو بلکہ صرف یہ احتمال کافی ہے کہ شاید صحیح ہو اس کے بعد انصاف کے ساتھ غور سے کام لے میں وعدہ بلکہ خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے دعوےٰ کرتا ہوں کہ کوئی بھی مرض اس قسم کا نہ رہے گا مگر آج کل لوگوں نے ہر چیز کا ست نکالنا شروع کر دیا ہے تو علماء کی تعلیم کا بھی جو کہ ترکِ معاصی کے متعلق ہے ست نکالا ہے کہ یہ دنیا کو چھڑاتے ہیں اور محض غلط ست نکالا ظاہر ہے کہ حاجت ایک ایسی چیز ہے کہ کسی وقت بھی اس سے استغناء کا دعویٰ نہیں ہو سکتا پس علماء جو کہ اس بات کا احساس کرتے ہیں کیا بچے ہیں کہ وہ حاجت کی چیزوں کے چھوڑنے کو کہیں گے البتہ اتنا اور کہتے ہیں کہ جب دنیا سے استغنا نہیں تو آخرت سے استغنا کیونکر کیا جاتا ہے غرض علماء پر یہ الزام کسی طرح صحیح نہیں لیکن اہل دنیا پر یہ الزام صحیح ہے کہ وہ جنت اور ثوابِ آخرت سے چھڑاتے ہیں جیسا ان کے حال اور قال سے ظاہر ہے کہ اس کی وقعت اُن کے قلب میں نہ خود ہے اور نہ اوروں کے دل میں پیدا ہونے دیتے ہیں چنانچہ جس عمل میں کوئی عاجل نفع نہ ہو محض ثواب ہی ہو کہتے ہیں کہ اس میں کیا فائدہ ہے جس کے جواب میں تنخواہ کی مثال لایا ہوں کہ جس عمل پر تنخواہ ملے اس کو تو مفید سمجھتے ہیں تو بس ثواب بھی ایسی تنخواہ کا نام ہے جو ابد سے ابد الآباد تک بڑھے گی اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ الفاظ قرآن شریف کی تعلیم میں کوئی فائدہ نہیں اور قرآن شریف کی تعلیم میں گو اور بھی منافع ہیں مگر اس وقت ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں صرف ایک فائدہ یعنی ثواب بیان کر دیا ہے. اگرچہ وہ دوسرے فوائد بھی واجب الرعایت ہیں لیکن ایک بتلا دینا بھی کافی ہے. غرض ثواب کے مطلوب ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن صرف اس پر اکتفا بھی نہ کرنا چاہیئے جیسا عوام نے اختیار کیا ہے بلکہ تدبر کا بھی اہتمام چاہیئے کیونکہ اس ثواب کی تکمیل بھی جبھی ہوتی ہے کہ اس پر عمل ہو اور عمل موقوف ہے سمجھنے پر بواسطہ یا بلا واسطہ اس لئے میں شکایت کرتا ہوں کہ اس وقت عوام الناس اور علماء سب میں اس باب میں تفریط ہے کہ عوام نے تو محض حرف پڑھ لینا کافی سمجھا اور اہلِ علم نے

محض لغت کی تحقیق کر لی چنانچہ تحصیل تفسیر کے وقت محض الفاظ قرآن شریف کا حل ہونا ہے باقی قرآن شریف کی جو اصل غرض تھی جو اس آیت شریف میں مذکور ہے:۔
كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں) یعنی سمجھنا اور تدبر کرنا کہ اصل مقصود تنزیل سے یہی ہے جس کو لام سے ذکر کیا ہے کسی کو اس پر نظر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں کھلی کھلی باتیں ہیں لیکن بعض اہل علم کو بھی نظر نہیں آتیں چنانچہ اس آیت شریف میں بھی ایک ضروری مسئلہ ہے جس کی طرف التفات نہیں ہوتا اس وقت اسی کو مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں فرماتے ہیں عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ یعنی ممکن ہے تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے واسطے بہتر ہو اسی طرح ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور ممکن ہمارے اعتبار سے فرمایا یعنی تم اس بات کا احتمال رکھو آگے فرماتے ہیں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ کو (ہر خیر و شر کا) علم ہے اور تم نہیں جانتے۔ اس ترجمے کے سننے سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ آیت ہمارے ایک مرض کی اصلاح کر رہی ہے جس کو ہم بہت ہی ہلکا سمجھتے ہیں یعنی تمنّا۔ ہماری نظر تو اس طرف جاتی نہیں لیکن آیت بتلا رہی ہے کہ ہم جو یہ کہا کرتے ہیں کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اور یوں ہوتا تو اچھا ہوتا یہ سب ناپسندیدہ بات ہے اور یہاں سے غلطی کو ظاہر فرما رہے ہیں کہ تم کو کیا خبر ممکن ہے کہ جس کو تم نے مضر سمجھا ہے وہ واقع میں تمہارے لئے نافع ہو اور جس کو تم نے نافع سمجھا ہے وہ واقع میں مضر ہو یہ تو محض احتمال عقلی کے طور پر فرمایا تھا۔ آگے فرماتے ہیں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی شاید کسی کو یہ احتمال ہوتا کہ ممکن ہے وہی نافع ہو اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ جانتا ہے یعنی جو شخص خدا کا قائل ہوگا وہ صفتِ علم کا بھی قائل ہوگا۔ اور کمال اُس کا یہ ہے کہ کوئی اس کے برابر علم میں نہ ہو تو اپنے علم کے اثبات سے استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے جو کہ واقعی نفع و ضرر کو جانتے ہیں

اس کو واقع فرمایا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں تو اُن کا واقع کرنا دلیل اس کی ہے کہ یہی بہتر تھا تو دوسرا احتمال بالکل قطع ہو گیا اور معلوم ہوا کہ تمہاری رائے غلط ہے اگر اس میں مصلحت ہوتی تو خدا تعالیٰ اسی کو واقع فرماتے غرض اس آیت شریف کے ترجمے سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ خدا تعالےٰ نے ہم کو ہماری ایک غلطی پر متنبہ فرمایا ہے اب دو باتیں دیکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ آیا ہم میں یہ غلطی ہے یا نہیں سو اس کا ہم میں ہونا تو اس قدر ظاہر ہے کہ شاید کوئی قلب اس سے خالی ہو اور یہ اس قدر بڑھا ہے کہ تکوینیات سے گذر کر تشریعیات تک اس کی نوبت پہونچی ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ احکام دو قسم کے ہیں ایک احکام تشریعیہ جیسے نماز روزہ کا فرض ہونا چوری غضب جھوٹ تفاخُر ریا بخل کا حرام ہونا۔ دوسرے احکام تکوینیہ جس کو حوادث کہتے ہیں جیسے مرنا جینا قحط طاعون یا اور کوئی وبا۔ مال کا ضائع ہو جانا آگ لگ جانا اور ان دونوں قسم کے امور کا صدور خدا تعالےٰ کے حکم سے ہوتا ہے تو ہم کو یہاں تک تمنّیٰ کا ہیضہ ہوا ہے کہ دونوں قسموں کے متعلق تمنّائیں کرتے ہیں یعنی جس طرح یہ کہتے ہیں کہ فلانا اور جیتا تو اچھا ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ روزہ فرض نہ ہوتا سود حرام نہ ہوتا تو خوب ہوتا فرق اتنا ہے کہ جو علم دین پڑھے لکھے ہیں وہ احکام تشریعیہ میں ایسی بے باکی نہیں کرتے اور جو آزاد و بے باک ہیں وہ دونوں میں ایسی تجویزیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک نوجوان نے تو یہاں تک نوبت پہنچائی کہ نماز کے متعلق یہ رائے ظاہر کی اسلام میں اگر نماز نہ ہوتی تو اسلام کو خوب ترقی ہوتی کیونکہ نماز سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں نعوذ باللہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بھی رائے دیتے ہیں لیکن اول تو آپ چیز ہی کیا ہیں دوسرے وہاں کثرت رائے پر کب عمل ہے کیا وہاں بھی سلطنت جمہوری ہے۔ میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ خود دنیا میں بھی سلطنت جمہوری کی شریعت میں کچھ اصل نہیں جیسا آج کل اس سیاسی غلطی میں مبتلا ہیں کہ شریعت سے حکومت جمہوری کو ثابت کرنا چاہتے اور علماء سے بھی اپنے خیال کی تائید کی درخواست کرتے ہیں کہ یہ بھی ہر نئی بات کو قرآن شریف سے ثابت کر دیں اور ایسے اہل علم کو

روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔ دیوبند کے ایک تعلیم یافتہ ندوے میں گئے تو وہاں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ روشن خیال معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جس اصطلاح کے موافق آپ فرماتے ہیں میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اُس روشن خیالی سے بچائے آج کل روشن خیالی کے یہ معنی ہیں کہ اُس کو کفر اور اسلام دونوں متطابق نظر آئیں۔ غرض علماء سے یہ فرمائش ہوتی ہے کہ جو ہمارے منہ سے نکلتا جائے تم اس کو شریعت سے ثابت کرتے چلے جاؤ۔ تو شریعت کو اپنی ہوائے نفسانی کے تابع کرنا چاہتے ہیں اس پر ایک مثال یاد آئی ہے کہ ایک شخص تھا اس کی عادت تھی کہ جس مجلس میں بیٹھتا تھا لغو باتیں دور از قیاس کیا کرتا تھا لوگ اس کو بناتے آخر اس نے محض اس کام کے لئے ایک نوکر رکھا کہ جو کچھ ہماری زبان سے نکلا کرے تم اس کو صحیح بنا دیا کرو۔ ایک مرتبہ کہنے لگا کہ آج ہم جنگل گئے تو ایک ہرن ملا ہم نے جو گولی ماری تو وہ سم کو توڑ کر سر کو پھوڑ کر نکل گئی۔ لوگ سنکر ہنسنے لگے خادم نے عرض کیا کہ حضور بجا ارشاد ہے وہ ہرن اُس وقت کھر سے سر کھجلا رہا تھا۔ سو ہمارے روشن دماغ احباب علماء سے ایسا ہی کام لینا چاہتے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ علماء کو ایسی نوکری کی ضرورت نہیں ہے ایسی لغویات کو کون بناتا پھرے ان ہی میں سے ایک بحث یہ بھی ہے۔ سلطنت کے جمہوری و شخصی ہونے کی ابھی ہم کو اس میں کلام نہیں کہ یہ مسئلہ واقع میں صحیح ہے یا غلط۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ جو خیال ہے کہ جمہوری سلطنت شریعت ہی کی تعلیم ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سلطنت بھی جمہوری ہی تھی یہ کہاں تک صحیح ہے سو میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ دلیل میں اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔ کو پیش کرتے ہیں کہ دیکھئے مشورہ کا حکم ہے اور جمہوری سلطنت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ مشورے سے ہوتی ہے لیکن ان مستدلین کی وہ حالت ہے کہ حفظت شیئاً وَغَابت عنك اَشْيَاءُ کہتے تو یہ ہیں کہ ہم بڑے فلسفی ہیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں سمجھتے صاحبو! جمہوری سلطنت محض مشورہ کا نام نہیں ہے بلکہ جمہوری سلطنت میں مشورہ کے خاص اصول بھی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ اگر اختلاف ہو تو کثرت رائے پر فیصلہ ہو اور بادشاہ

اس کے خلاف ہرگز نہ کر سکے اور اگر بادشاہ سب کو جمع کر کے رائے لے مگر سب کے خلاف اپنی رائے پر عمل کرے تو وہ سلطنت شخصی ہوگی پس معلوم ہوا کہ محض مشورے سے سلطنت کا جمہوری ہونا لازم نہیں آتا اب اس کو ثابت کیا جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سلطنت میں کبھی یہ بات ہوئی ہو کہ کوئی ایک ہی واقعہ بتلا دے کہ خلیفہ مشورہ دینے کے بعد مجبور کیا گیا ہو واقع میں شریعت میں سلطنت شخصی ہی ثابت ہے چنانچہ میں اسی آیت شریف وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ سے سلطنت شخصی کو ثابت کرتا ہوں اگرچہ بظاہر یہ آیت شریف دونوں سے ساکت معلوم ہوتی ہے تقریر اثبات یہ ہے کہ اسی سے آگے فرماتے ہیں فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پس جب تو ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر) یہ جملہ صاف بتلا رہا ہے کہ شریعت میں سلطنت شخصی ہے کیونکہ مشورے کے بعد اِذَا عَزَمَ اَكْثَرُهُمْ یا اِذَا عَزَمُوْا نہیں فرمایا بلکہ مدار کار محض آپ کے عزم پر رکھا کہ بعد مشورہ لینے کے جب آپ تن واحد کسی بات کا عزم فرمالیں خواہ وہ سب کے مشورے کے موافق ہو یا مخالف تو خدا پر توکل کر کے اس کو کر لیجئے۔ اب بتلایئے کہ اس آیت شریف سے سلطنت شخصی ثابت ہوئی یا جمہوری اور اس سے بھی واضح یہ مسئلہ ایک دوسری آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ (مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جو بہت اہم اور جامع ہو اور اتفاقاً وہاں سے جانے کی ضرورت پڑتی ہے تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں نہیں جاتے جو لوگ آپ سے اجازت لیتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ پر اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں تو جب یہ لوگ ایسے موقع پر اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے آپ سے اجازت چاہیں تو ان میں سے جس کے لئے آپ چاہیں اجازت دیدیا کریں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے

مغفرت کی دعا کیا کریں) اس میں اول تو یہ حکم ہے کہ پوچھ کر جایا کریں پھر آگے فرماتے ہیں کہ جب وہ پوچھیں تو جس کو آپ چاہیں اجازت دے دیں سو غور کیجئے کہ اِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ کے بعد فَاْذَنْ میں مِنْ شِئْتَ بھی فرماتے ہیں اور اِسْتَاْذَنُوْكَ سب کے اذن چاہنے کو بھی مشتمل ہے تو فرض کیجئے اگر سب کے سب اذن چاہنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس وقت سب کا اتفاق اعطائے اِذن پر متحقق ہوگا مگر اس وقت بھی یہی حکم ہے کہ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ کہ جس کو چاہو اجازت دو اور جا ہو نہ دو دیکھئے باوجود اتفاق کے مدارِ کار تنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے ہی پر رکھا تو بتلایئے اس وقت سلطنت جمہوری ثابت ہوئی یا شخصی۔

صاحبو! انسان کو چاہیئے کہ وہ جس کام کا نہ ہو اس میں دخل نہ دے نصوص کا سمجھنا ہر ترجمہ دیکھنے والے کا کام نہیں۔ ع نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند۔ (جو شخص بھی آئینہ رکھتا ہو ضروری نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو) ایسے لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے کہ کسی ہندو کے ہاتھ سونٹھ کی گرہ آگئی وہ پنساری بن بیٹھا ذخیرہ تو کل یہ ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ لیا و بس اس پر جوشِ اجتہاد۔ پھر ترجمہ بھی ایسا نور بھرا کہ جو ترجمہ سب سے زیادہ مقبول و مشہور ہے اُس کی یہ حالت ہے کہ لفظ نَسْتَبِقُ کا ترجمہ کیا ہے کہ کبڈی کھیلنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے یا تو کبھی کبڈی کھیلی نہیں یا بھول گئے ہوں گے۔ اِستباق کبڈی کو کہتے ہی نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑنے لگے سو اول تو یہ ترجمہ لغت کے خلاف دوسرے عقل کے بھی خلاف کیونکہ کبڈی کا میدان بہت کم ہوتا ہے۔ اس میں کپڑوں کا محافظ پیشِ نظر رہتا ہے تو اُس میں بھیڑیے کے کھانے کا عذر کہاں چل سکتا ہے۔ بخلاف اِستباق کے صحیح معنی کے کہ اس میں محافظ نظر سے غائب ہو جائیگا۔ غرض اس قسم کے تو تراجم پیشِ نظر رکھیں اور اس پر اجتہاد کریں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اجتہاد اب منقطع ہو گیا ہے اسی کو فقہاء نے بھی لکھدیا ہے کہ بعد چوتھی صدی کے اجتہاد ختم ہو گیا اور جب علماء سے بھی اجتہاد منقطع ہو گیا تو عوام الناس

یں تو کہاں محتمل ہے یہ سلطنت جمہوری کا مسئلہ ایک جملہ معترضہ تھا اصلی مضمون یہ تھا کہ خدا کے ہاں کوئی دخل نہیں دے سکتا تو اب آپ کو کیا منصب ہے کہ نماز میں رائے دیں۔ یہ تو نماز میں تھا۔ ایک صاحب نے روزہ میں یہ رائے دی کہ روزہ اگر فروری میں ہوتا تو اچھا ہوتا کہ آسانی ہوتی حالانکہ اس عقلمند نے یہ نہ سوچا کہ روزہ صرف اس کے لئے تو نہیں کہ اس کی آسانی دیکھ لیتے وہ تو تمام روئے زمین کے لئے ہے کیا ساری دنیا میں فروری کے مہینے میں یہی حالت رہتی ہے جو کہ یہاں رہتی ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں ان کو واقعات کی خبر نہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ خود کونسے گنبد میں بیٹھے رہتے ہیں کہ ان کو اتنا واقعہ معلوم نہیں کہ فروری میں مختلف اقالیم میں کیا حالت ہوتی ہے اور اگر معلوم ہے تو اور بھی زیادہ افسوس کی بات ہے کہ باوجود اطلاع کے پھر ایسی بیہودہ رائے دیتے ہیں ؎

فَاِنْ کُنْتَ لَاتَدْرِیْ فَتِلْکَ مُصِیْبَۃٌ

وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ

(اگر تو نہیں جانتا ہے تو یہ خود ایک مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ مصیبت اس سے بھی بڑھ کر ہے)

کیا خوبصورت تجویز ہے کہ صرف آپ اور آپ کے چند بھائی تو آرام میں رہیں اور ساری دنیا مصیبت میں رہے بخلاف اس حالت موجودہ کے کہ رمضان المبارک کا قمری مہینہ ہو کہ ہر مقام پر اس میں کبھی سردی کبھی گرمی کبھی بڑا دن کبھی چھوٹا دن تو اس میں کبھی کسی اقلیم کی رعایت ہے اور کبھی کسی دوسری کی ہے جس سے سب مساوی ہو گئے تو حکمت کی بات یہ ہے یا وہ ہے۔

علیٰ ہذا قربانی کے متعلق یہ رائے دی جاتی ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ روپیہ پیسہ نہیں تھا اور مواشی ان لوگوں کے پاس بکثرت ہوتے تھے اس لئے صدقہ کا یہ طریقہ مقرر کیا گیا تھا کہ ذبح کرو اور تقسیم کر دو اور اب چونکہ روپیہ بکثرت موجود ہے اور نقد سے صدقہ کر سکتے ہیں اس لئے اب اس وحشی طاعت کو چھوڑ دینا چاہیئے (نعوذ باللہ منہ) ایک صاحب

لندن سے بیٹھے ہوئے اپنے دستِ مبارک سے یہ رائے خط میں لکھ رہے ہیں اِن حضرات سے کوئی پوچھے کہ آپ کے پاس سے کی کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو یاد رکھیں کہ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (خیالی باتیں کسی درجہ میں بھی حق کے مقابلہ میں مفید نہیں ہوسکتیں) آگے ترقی کرکے کہتا ہوں کہ اس رائے کے خلاف پر خود دلیل قائم ہے یہ دیکھیے کہ قربانی میں طاعت مقصودہ اراقۂ دم[۵۷] ہے یا مساکین کو کھلانا سو یہ امر ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص ذبح کرکے سارا گوشت خود کھا جائے اور ایک بوٹی بھی کسی کو نہ دے تب بھی اس کو پورا ثواب قربانی کا ملے گا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ مقصود اراقۂ دم ہے نہ کہ کھلانا جیسا اس ذی رائے نے دعویٰ کیا۔ رہی یہ بات کہ اراقۂ دم کیوں مقصود ہوا سو اس کی لِم کی اطلاع ہم کو ہونا ضروری نہیں نہ ہمارا دعوےٰ ہے کہ ہم جانتے ہیں پھر یہ کہ اگر نفع ہی پہنچانا ہوتا تو زندہ بھی تو دیا جا سکتا تھا تو جس زمانے میں یہ حکم ہوا تھا اس وقت مسلّم دینے کی کیوں اجازت نہ ہوئی بلکہ مسلّم کی قیمت تو زیادہ اٹھتی ہے پس معلوم ہوا کہ محض اراقۂ دم ہی مقصود ہے۔ غرض اسی طرح ہر چیز کے درمیان میں کم و بیش تمنّیٰ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سود میں بھی اول تو یہی تمنا ہوئی کہ کاش سود حلال ہوتا مگر اب اس پر تو قدرت نہیں رہی اس لئے دوسری تمنّیٰ یہ ہوئی کہ کاش علماء کچھ تاویل وغیرہ کر دیں چنانچہ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو خود ہی اس میں اصلاح شروع کر دی میں نے ایک مطبوعہ رسالے میں خود دیکھا ہے ایک صاحب نے فرمایا ہے کہ سود حلال ہے۔ اور یہ جو قرآن شریف میں ربٰو کا حرام ہونا آیا ہے۔ یہ لفظ رُبا بضم الرّائے ہے جو ربودن سے مشتق ہے یعنی غصب اور لوٹ یہ حرام ہے نہ کہ سود۔ اور مولویوں نے اپنی رائے سے اعراب لگا دیئے خدا تعالےٰ جزائے خیر دے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علماء سلف رحمہمُ اللہ کو کہ انھوں نے رسمِ خط کو محفوظ و باقی رکھنے کو واجب فرمایا پس اگر یہ لفظ رُبودن سے ہوتا تو رسمِ خط میں کیوں ہوتا فارسی لفظ ہے اور فارسی میں بھی رُبا اس معنی مصدری میں آتا ہی نہیں تو دیکھیے کہاں تک ان لوگوں کی نوبت پہونچ گئی اور اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں کہ احکامِ فرعیہ بلکہ اصولیہ میں اول ایک تمنّا تغیر د

[۵۷] خون کا بہانا۔

تبدیل کی تجویزیں ہوتی ہیں چنانچہ ایک مرتبہ میں رڑکی میں تھا کہ میں نے سنا کہ آج یہاں چند عقلاء میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ نکاح کی رسم کو اٹھا دینا چاہیئے مثل دیگر متاع بازاری کے یا مثل جانوروں کے جس سے جس کی موافقت ہو جائے اس میں اجتماع رہے پھر رضامندی نہ رہے جدا ہو کر دوسرے سے رضامند ہو جائے۔

بلکہ ایک صاحب کا تو یہاں تک مضمون اخبار میں لکھا دیکھا ہے کہ خود اسلام کی بھی ضرورت نہیں اس اسلام وغیر اسلام میں اختلاف سے باہم جنگ وجدل ہوتا ہے اور یہ تجویز کیا کہ ساری دنیا مل کر ایک نئے مذہب کو اختیار کرے جس کا نام مذہب توحید ہو باقی رسالت وغیرہ۔ سو جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے نہ مانے اور ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں متحد المذہب سمجھے جائیں۔ اللہ اکبر کہاں تک یہ لوگ پہونچے ہیں اور اس قسم کی رائیں بوجہ محبت کے اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ان کو نقل کیا جائے ان میں ایک قسم کی ظلمت ہے اسی واسطے میں اس میں تطویل کلام نہیں کرنا چاہتا مگر یہ بتلاتا ہوں کہ احکامِ شرعیہ میں یہ گڑبڑ لوگوں نے مچار کھی ہے گویا در پردہ شریعت کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔ اب دوسرے احکام تکوینیہ رہ گئے اور اس وقت انھیں کا بیان کرنا زیادہ مقصود بھی تھا سو ان کے متعلق تمنی و تجویزیں کرنے میں دیندار اور دنیا دار سبھی مبتلا ہیں چنانچہ میں واقعات یاد دلاتا ہوں جس سے میرے اس دعوے کی تصدیق ہو جائے گی فرض کیجئے کہ کوئی شخص مرجائے اس وقت عموماً خدا تعالےٰ کو رائے دیجاتی ہے جس کی تعیین ابھی بتلاؤں گا لیکن چونکہ مقصود رائے دینا نہیں ہوتا اس لئے میں اس کو کفر نہ کہوں گا تاہم ہے بہت سخت ہونے کو یہ آیت بتلا رہی ہے اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ (یا کیا تم اسے اطلاع اور خبر دینے والے ہو کہ وہ زمین میں سے یہ بات نہیں جانتا) اور وہ رائے دینا یہ ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ اگر دس برس اور زندہ رہ جاتا تو بچوں کی پال ہو جاتی کوئی کہتا ہے ابھی کیا مرنے کی عمر تھی ایک کہتا ہے پس ماندوں کا کیا حال ہوگا۔ اللہ اکبر واللہ العظیم۔ اگر کبھی مخلاً بالطبع ہو کر غور کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ان

کلمات کا کس کو سنانا مقصود ہے اگر مخلوق کو سناتا ہے تو محض بیکار ہے کیونکہ ان کے سنانے سے کیا کام چلے گا جو بات ان کے اختیار میں ہو وہ ان کو سناؤ باقی مارنا جلانا یہ تو خدا تعالےٰ ہی کے اختیار میں ہے اس لئے مخلوق تو مخاطب نہیں پھر سوائے خالق کے اور کون مخاطب ہے کیونکہ یہ سب ان کی ہی قدرت میں ہے تو گویا یہ شخص خدا تعالےٰ کو رائے دیتا ہے کہ اس وقت کا مرنا تو کچھ نامناسب سی بات ہوئی اب غور کیجئے کہ اس گستاخی کا کیا درجہ ہے۔ علیٰ ہٰذا البعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ ابھی تو اس کی عمر مرنے کی نہ تھی۔ صاحبو! اگر اس کی تاویل نہ کی جائے تو دیکھئے کہ آیت قرآنی کے کس قدر خلاف ہے فرماتے ہیں فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ ایک گھڑی کی دیر کر سکتے ہیں نہ جلدی کر سکتے ہیں) اور اگر تاویل کی جائے تو وہ تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ اس عمر میں مرنا بے محل ہوا تو گویا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے نامناسب کام کیا۔ نعوذ باللہ یہ وہی اعتراض ہے جو کہ شیطان نے کیا تھا۔ اور اس کی بدولت کافر ہوا۔

کیونکہ شیطان صرف سجدہ نہ کرنے سے کافر نہیں ہوا بلکہ اس سجدہ کو خلاف حکمت بتلانے سے جیسا اس کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے۔ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا (کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے) جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں ان سے افضل ہوں اور افضل کو مفضول کی اطاعت خلاف حکمت ہے تو یہی حاصل ہوا اس شخص کے قول کا پس اگر یہی معنی ہیں تو یہ بعینہٖ وہی ہوا جو شیطان نے کہا تھا اور بعض لوگ اس سب سے بڑھ کر یہ غضب کرتے ہیں کہ ایک نے تو بعنوان یا لا افسوس کا اظہار کیا دوسرے صاحب اس کی تائید میں گلفشانی کرتے ہیں کہ بھائی اللہ کی ذات بڑی بے پرواہ ہے ذرا سمجھ سے کام لیا جائے تو اس موقع پر بے پرواہ کہنے کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ وہ موقع بے موقع کو نہیں دیکھتے غایت بے پروائی کے سبب جو چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں تو اس حساب سے تو خدا تعالےٰ نعوذ باللہ گویا ان نیاؤ نگر کا راجہ ہے ان نیاؤ کے معنے بے انصافی کے ہیں۔ اَنْ حرف نفی ہے اور نیاؤ انصاف کو کہتے ہیں یعنی شہر نا انصافی

کا حاکم۔

ایک مرتبہ ایک گرو اور ایک چیلہ کا وہاں گذر ہوا نیا شہر تھا حالات دریافت کئے بھاؤ بھی مختلف اجناس کا پوچھا تو سب سولہ سیر۔ گرو نے کہا یہاں ادنیٰ اعلیٰ سب برابر ہیں۔ یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ چیلہ نے کہا خوب گھی شکر کھائیں گے موٹے ہوں گے۔ غرض وہاں رہ پڑے۔ ایک روز بطریق سیر پھرتے پھرتے راجہ کی کچہری کی طرف جانکلے دیکھا ایک مجمع ہے اور ایک مقدمہ پیش ہے۔ مقدمہ یہ ہے کہ ایک چور ایک مہاجن پہ دعوے کرتا ہے کہ میں اور میرا ایک رفیق جس کی لاش سامنے پڑی تھی اس کے گھر چوری کرنے گئے نقب دیا نقب کے اندر میرا رفیق گھستا تھا کہ دیوار اوپر سے آرہی اب مجھ کو خون کا بدلہ خون ملنا چاہیئے۔ راجہ صاحب نے فرمایا کیوں؟ کہا ایسی دیوار کیوں بنائی تھی۔ مہاجن نے کہا کہ یہ تو معمار کی خطا ہے۔ معمار بلایا گیا اس نے مزدور کا نام لے دیا جس نے ایسا خراب گارا دیا۔ مزدور بلایا گیا اس نے کہا سقّہ نے زیادہ پانی چھوڑ دیا تھا وہ بلایا گیا اس نے کہا سرکاری ہاتھی بھاگا ہوا آتا تھا ڈر کر مشک کا منہ زیادہ کھل گیا فیلبان کو بلایا اس نے کہا ایک عورت پازیب پہنے سامنے سے گذری ہاتھی بھڑک گیا عورت حاضر کی گئی اس نے کہا یہ سنار کی خطا ہے اس نے باجہ ڈال دیا۔ سنار بلایا گیا وہ کوئی بات نہ بنا سکا آخر اس کے لئے پھانسی کا حکم ہوا جب پھانسی پر چڑھانے لگے اطلاع کی گئی کہ سُنار دبلا ہے اور پھانسی کا حلقہ فراخ ہے حکم ہوا کہ اچھا کسی موٹے کو پکڑ کر پھانسی دیدو۔ اتنے موٹے میاں چیلے ملے جنھوں نے خوب گھی شکر کھایا تھا یہ پکڑے گئے اب تو بڑے گھبرائے اور گرو سے کہا کسی طرح بچاؤ تو بہانے سے بھاگیں گرو کو رحم آیا اور یہ ترکیب کی کہ افسران فوجداری سے التجا کرنا شروع کی کہ مجھ کو پھانسی دیدو اس پر سب کو تعجب ہوا راجہ کو خبر پہونچائی ان سے وجہ پوچھی تو گرو نے کہا کہ یہ ساعت ایسی ہے کہ اس میں جس کو پھانسی ہو وہ سیدھا بیکنٹھ (ہندوؤں کی جنّت) میں جاوے۔ راجہ نے کہا تو بس مجھ کو پھانسی دیدو۔ آخر اس راجہ سے اس طرح زمین پاک ہوئی۔ یہ ایک قصّہ ہے اَن نیاؤ نگر کا کیا ہمارے بھائی بند خدا تعالیٰ کے ساتھ بھی نعوذ باللہ ایسا ہی اعتقاد

رکھتے ہیں کہ ان کے کام نعوذ باللہ بے محل ہوتے ہیں مثلاً ابھی موقع نہ تھا اور مار دیا۔ غرض یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت قلوب میں نہیں جو منہ میں آیا بک دیا۔ صاحبو! وہ بے پرواہ ہے مگر اس کے بے پرواہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی اس کی عبادت نہ کرے تو اس کا کوئی ضرر نہیں اور اگر کرے تو اس کا کوئی نفع نہیں تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور یہ معنی ہرگز نہیں کہ نعوذ باللہ وہ بیرحم ہے اور مصلحت نہیں دیکھتا بے سمجھے کر بیٹھتا ہے (نعوذ باللہ منہ) صاحبو! یہ عقیدہ نہایت گمراہی کا ہے اور دلیل اس معنی کی یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے مَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ (جو شخص کوشش کرتا ہے وہ اپنے لئے کوشش وسعی کرتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ دنیا والوں کا محتاج نہیں) دوسری جگہ فرماتے ہیں إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ (اگر تم کفر کروگے تو خدا تم سے بے پرواہ ہے) تو خدا تعالےٰ نے اپنے غنی ہونے کو طاعت اور معصیت کے ساتھ ذکر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کو نہ کسی کی طاعت کی ضرورت ہے اور نہ معصیت سے اس کو ضرر ہے کیونکہ اس کی سلطنت کسی کی اطاعت پر موقوف نہیں۔

ع۔ کہ ملکش قدیمست و ذاتش غنی۔ (اس کی سلطنت ہمیشہ سے ہے اور اس کی ذات کسی کی محتاج نہیں) اور ارشاد ہے وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ یعنی خدا تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں اور تم اس کے محتاج ہو۔ تو بے پرواہ کے معنی بے انتظام کے بھی ہیں اور غیر محتاج کے بھی۔ لوگوں نے ظلم کیا کہ خدا تعالےٰ کو معنی اول کے اعتبار سے بے پرواہ کہنے لگے۔ جیسا کہ قرینۂ مقام استعمال سے معلوم ہوتا ہے۔ غرض ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعاتِ تکوینیہ میں بھی تجویزیں لگاتے ہیں اور یہ مرض سخت عام ہو گیا ہے اس سے توبہ کرنا چاہیئے اور ہم بے دقوفوں کے ساتھ تو ان حماقتوں پر حلم کا برتاؤ کیا جاتا ہے باقی جن کی بڑی شان ہے ان کے کلام میں تو اگر ذرا اس کا شبہہ بھی ہو جائے تو ان کی گوشمالی کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بزرگ نے کہا کہ آج کیا موقع پر بارش ہوئی ہے فوراً عتاب ہوا کہ او بے ادب بے موقع کب ہوئی تھی جو موقع کے ہونے میں آج کی تخصیص کرتا ہے بس کر تھرّا گئے۔ تو دیکھئے حالانکہ یہ مداح تھی مگر اس میں چونکہ ایک

اعتراض ایہام تھا عتاب ہوگیا اگرچہ باستلزام بعید سہی۔ صاحبو! وہ خدا ہے کوئی برابر کا دوست نہیں وہ سلطان السلاطین ہے مگر خدا جانے کس نے مشہور کر دیا ہے کہ

ع باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

(خدا کے ساتھ دیوانے بنے رہو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوشیار)

اگر اس کے یہی معنی ہیں جو کہ متبادر ہیں تب تو محض مہمل بات ہے اور اگر اس میں کوئی مناسب تاویل کی جائے تو خیر اور وہ تاویل یہ ہے کہ غلبۂ حال میں کچھ کلمات خدا کے معاملے میں نکل جائیں تو وہ معاف ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہیے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو سمجھ لیا جائے کہ ؎

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(بے ادب آدمی کی برائی تنہا خود اس کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس کی آگ ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے)

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم کو تو کہیں بھی آگ لگی نظر نہیں آتی تو اس کے جواب میں کہتے کہ

آتشے گر تا مدت ایں دود چیست جاں سیہ گشت و رواں مردود چیست

(آگ تجھ تک نہیں پہنچتی ہے تو یہ دھواں کہاں سے آگیا بدن تک سیاہ ہوگیا اور بال تک جل گئے یہ سب آخر کیوں ہے)

پس مقام ادب ہے احتیاط سخت لازم ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اس قسم کے کلمات کہتے ہیں واقعہ میں رائے لگاتے ہیں تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب کی جڑ کاٹ دی اور لفظِ شَیْئًا اس آیت میں عام ہے امورِ تشریعیہ اور امورِ تکوینیہ سب کو کیونکہ اس سے اوپر ارشاد ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور تم اس کو ناپسند کر رہے ہو) ھُوَ کی ضمیر یا تو قتال کی طرف راجع ہے جو کہ امرِ تکوین ہے یا کتابتِ قتال کی طرف جو کہ امرِ تشریعی ہے اور یا ترجیح بلا مُرجّح سے بچنے کے لئے عام کہا جائے دونوں کو اس طرح کہ مرجعِ قتال ہو باعتبار وجود تشریعی اور تکوینی اور بہتر یہی ہے کہ عام کہا جائے

اور معنی عام کی تعلیل میں اس جملہ وعسیٰ الخ کو کہا جائے اب اس کی اور کثیر الوقوع مثالیں عرض کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ مثلاً جب تک پھل نہ آ جائے بہار کا بیچنا حرام ہے بہت لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں کہ یہ جائز ہوتا تو اچھا ہوتا کہ مصلحت حاصل ہوتی لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ یہ ممنوع ہو چنانچہ بعض اوقات جو پھل نہیں آتا تو خریداروں کو کس قدر خسارہ اٹھانا پڑتا ہے باقی اگر شبہ ہو کہ اس میں خریدار کی مصلحت محفوظ رہی مگر بائع کی مصلحت تو جاتی رہی تو اس کا جواب یہ ہے کہ منفعتِ عام مقدم ہوتی ہے منفعتِ خاص پر اور اسی طرح مضرتِ عام کا بمقابلہ مضرتِ خاص کے زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے چنانچہ ہر سلطنت میں اس پر نظر کی جاتی ہے دیکھئے بعض مرتبہ حکام کی طرف سے امرود وغیرہ فواکہ کھانے کی ممانعت ہو جاتی ہے اور اس کی فروخت سے بھی روک دیا جاتا ہے حالانکہ فروخت کرنے میں بائع کی مصلحت ہے مگر چونکہ پچاس کا نقصان ہے اور فروخت نہ کرنے میں ان پچاس کی مصلحت تھی اس لئے یہاں مصلحت خاص کی کچھ پروا نہیں کی گئی اور پھر اس تجویز کو کوئی خلاف عقل نہیں کہتا پس اسی طرح یہ جو حکم ہوا کہ بہار قبل پھلنے کے نہ بیچو اگر فرضاً اس میں کسی ایک کا نقصان بھی ہو تو عام مضرت کا تو انسداد ہو گیا اور اول تو مضرت خاص بھی یقینی نہیں بلکہ پھل آنے کے بعد زیادہ دام ملنے کی امید ہے اور اگر کوئی کہے کہ دس برس سے تو مجھ کو نقصان کا تجربہ ہو رہا ہے تو خیرا خیر بات یہی ہے کہ بہت سے بہت ایک ہی کا تو نقصان ہوا لیکن اور خریداروں کو تو بچالیا کہ اگر پھل کم آتا تو ان کا کتنا نقصان ہوتا تو اب ایک کی مصلحت کو دیکھا جائے یا پچاس کی مصلحت کو اور اگر اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو خود صورت بیع اس کو ناجائز بتلا رہی ہے کیونکہ معدوم کی بیع خود عقلاً ناجائز ہے خدا جانے ان مواقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے اور اگر بیع کو بدون وجود مبیع کے جائز رکھتے ہیں تو پھل آنے کی مدت تک اکل کو بھی بلا وجود ماکول کے جائز رکھیں اور یوں ہی بیٹھے ہوئے منہ چلایا کریں اور زور سے پیٹ بھر لیا کریں جو شخص بغیر ماکول کے فعل اکل واقع کر کے دکھلا دے گا میں اس کو بیع بلا مبیع کی اجازت دیدوں گا غرض عقل بھی اس کو

حرام ہی کہتی ہے تو اگر کوئی مصلحت بھی نہ ہو تب بھی یہ واجب الاحتراز ہے کیونکہ محرمات عقلیہ سے ہے اب ایک عذر بارد یہ ہے کہ صاحب اس مدت تک کون انتظار کرے کیونکہ اگر بڑھنے تک انتظار کریں تو پھر باغوں کی خریدہی ختم ہو جائے گی چنانچہ خریدار اس قدر نہیں ٹھہرتے۔ اس کا جواب میں صرف یہ دیتا ہوں کہ اگر گورنمنٹ کا یہی قانون ہو جائے جواب شریعت کا ہے تو اس وقت کیا کرو گے اور اگر اس پر بھی سمجھ میں نہ آئے تو میں پڑھوں گا فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (اب اس کے بعد کونسی بات پر ایمان لاؤ گے) تو گویا خدا کے حکم کی وہ وقعت بھی نہیں جو گورنمنٹ کے حکم کی ہے صاحبو! صرف دنیا ہی کمانا تو مقصود نہیں۔ دنیا کماؤ مگر خدا کو راضی رکھ کر اور اگر اس کی فکر نہیں ہے تو پھر حکام کو راضی رکھنے کی بھی فکر چھوڑ دو اور ڈکیتی بھی شروع کر دو۔ افسوس حکام کی ناراضی کی تو اتنی فکر اور خدا کی ناراضی کی پروا بھی نہ ہو کیا خدا تعالیٰ حاکم نہیں ہے۔ ان مضامین کو سن کر بعض لوگ کہتے ہیں کہ شریعت نے آمدنی کے بہت سے صیغے بند کر دیئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کے قوانین بھی معقول ہیں یا نہیں ظاہر ہے کہ ان کو تو معقول ہی کہو گے تو ان ہی قوانین میں ایک قانون یہ بھی ہے کہ ڈکیتی ناجائز ہے دیکھئے کتنا بڑا صیغہ تھا آمدنی کا اور اس کو حرام کر دیا اگر کہئے کہ اس سے مصلحت عام میں خلل ہوتا تھا اس لئے اس کو جرم قرار دیدیا تو میں کہتا ہوں کہ اسی طرح ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب سے بھی مصلحت عام میں خلل ہوتا ہے اس کا کسی قدر اوپر بیان بھی کیا گیا ہے۔ صاحبو! اصل بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی قلب میں وقعت نہیں ورنہ اگر وقعت ہو تو خود بخود مصلحتیں سمجھ میں آنے لگیں پس مصالح احکام و اسرار الٰہیہ کو اگر دریافت کرنا چاہتے ہو تو ان کی وقعت دل میں رکھو اور ساتھ ساتھ عمل بھی شروع کر دو اور عمل میں خلوص پیدا کرو اس کا اثر یہ ہوگا کہ حسب استعداد خود بخود اسرار منکشف ہوں گے اور اگر نہ بھی منکشف ہوں تو یہ تو معلوم ہے کہ خدا کا حکم ہے وجوب عمل کے لئے یہی کافی ہے دیکھئے اگر ہم نوکر سے کہیں کہ یہ چارپائی فلاں جگہ سے اٹھا کر فلاں جگہ رکھدو تو اس کو مصلحت دریافت

کرنے کی اجازت نہیں اور اگر وہ پوچھے بھی کہ حضور وہاں آدمی ہی کہاں ہے جس کے لئے چارپائی بھیجی جاتی ہے تو کہیں گے کہ احمق اول تو تو مصلحت پوچھنے والا کون ہوتا ہے پھر کیا مصلحت اس میں منحصر ہے کیا چارپائی بھیجنا اسی لئے ہوتا ہے کہ وہاں آدمی ہوں بلکہ کبھی یہاں کی جگہ کا خالی کرنا بھی مقصود ہوتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو اتنے جواب کا بھی استحقاق نہیں اور سمجھو کہ خدا کے علم کے ساتھ آپ کے علم کو اتنی بھی نسبت نہیں جو بچے کے علم کو آپ کے علم کے ساتھ ہے کیونکہ ایک نسبت متناہی کی متناہی کے ساتھ ہے دوسرے متناہی کی غیر متناہی کے ساتھ اور اس پر بھی باوجودیکہ بچہ نشتر سے ڈرتا ہے اور نشتر کو اپنے لئے تجویز نہیں کرتا لیکن آپ اس کی اس تجویز کی ذرا پروا نہیں کرتے اور ضرورت کے وقت اس کے نشتر لگادیتے ہیں صرف اسی لئے کہ اس کے علم کو آپ کے علم سے کوئی نسبت نہیں پس اسی طرح تمہارا خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے تو پھر وہ تمہاری تجویزوں کی کیوں پروا کریں۔ اسی کو فرماتے ہیں عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ۔ یہ مثال تو ہے حکم تشریعی کی۔ اب احکامِ تکوینیہ کی مثال لیجئے کہ بعض لوگ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں اور اس کی شکایت کرتے ہیں مگر اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں ایک یہ کہ اس میں کبھی تو اجر ملتا ہے دوسرے یہ کہ بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں تیسرے یہ کہ بیماری سے اکثر اخلاق درست ہو جاتے ہیں عجز و انکسار و پستی و نیستی یہ سب بیماری کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح امنگیں قطع ہو جاتی ہیں تو ایسی حالت کا رہنا جس میں یہ مصالح ہوں واقع میں بہت بڑی رحمت ہے امنگوں کے قطع کرنے کا مطلوب ہونا ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ (دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو گویا کہ تم مسافر ہو بلکہ اس طرح کہ راستہ طے کر رہے ہو) دوسرے ممکن ہے کہ تندرستی میں کچھ گناہ ہو جاتے بیماری میں اُس سے بچ گیا جیسا حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچے کو قتل کر دیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت غصہ آیا تھا آخر حضرت خضر علیہ السلام نے اس میں یہی حکمت بیان فرمائی کہ اَمَّا الْغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰہُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَا اَنْ یُّرْھِقَھُمَا طُغْیَانًا وَّ

کُفْرًا ٥ (وہ لڑکا جو تھا تو اس کے ماں باپ مسلمان تھے تو ہم اسی بات سے ڈرے کہ کہیں یہ لڑکا اپنے ماں باپ کو کفر اور سرکشی میں مبتلا نہ کر دے) تو سب کے حق میں یہی رحمت ہوا کہ وہ مرگیا اس کے لئے تو اس واسطے کہ بچپن میں مرا بقول اکثر علماء ناجی ہوا اور ماں باپ کے لئے اس واسطے کہ اگر وہ زندہ رہتا اور کفر کرتا تو ان پر بھی اثر پڑتا دہ بھی بچے۔ مولانا رحمۃ اللہ نے اسی کو فرمایا ہے ؎

آں پسر را کش خضر ببرید حلق   سرّ آنرا در نیابد ہیچ خلق

(اس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے مارڈالا اور اس کا گلا کاٹ دیا اس کے بھید کو مخلوق نہیں پہنچ سکتی)

اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی بہرا اپنے بہرے پن پر افسوس کرے اور یہ تمنا کرے کہ مجھ میں سننے کی قوت ہوتی تو کیا اچھا ہوتا لیکن اس کو کیا خبر ہے کہ اس وقت کیا حالت ہوتی ممکن ہے کہ وہ گانا بجانا سننے میں مشغول ہو جاتا غیبت سُنا کرتا تو اس کے لئے کانوں کا نہ ہونا ہی خیر ہو گیا۔ علی ہذا آنکھوں کی بیماری کہ اس میں بھی ممکن ہے کہ آنکھیں ہونے کی صورت میں یہ بہت زیادہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا۔ شیخ نے خوب فرمایا ہے ؎

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند   او مصلحتِ تو بہتر داند

(جس ذات نے تجھ کو مال دار نہیں بنایا وہ تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ جانتی ہے)

علیٰ ہذا ہر چیز میں اسی قسم کی مصالح ہیں پس ضرور ہے کہ یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ حکیم ہیں اور بڑے رحیم بھی ہیں اس لئے وہ جو کچھ مناسب ہوگا وہی کریں گے۔ حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا اس کو یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک روز جو سویا تو اس کو احتلام ہو گیا فوراً اٹھ کر غسل کیا اور سویا تو پھر احتلام ہوا۔ غرض ایک شب میں ستّر بار احتلام ہوا اور ہر بار میں ایک نئی اجنبیہ عورت کو دیکھتا تھا اس کو خیال ہوا کہ شیطان کے اس قدر تسلط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں مردود ہو گیا۔ حضرت سیدنا عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نہایت مغموم حاضر ہوا۔ آپ نے تبسّم فرما کر ارشاد فرمایا کہ خدا کا شکر کرو مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ تمہاری قسمت میں ستر اجنبیہ عورتوں سے زنا کرنا لکھا ہے

میں نے خدا تعالےٰ نے بارگاہ میں دعا کی کہ اس کو اس سے بچائیے۔ خدا تعالیٰ نے میری دعا کو قبول فرمایا اور اس کو بیداری سے خواب میں منتقل فرمایا کہ تقدیر یہی پوری ہوگی اور تم گناہ سے محفوظ رہے اور یہاں تقدیر کے اس طرح بدلنے کے متعلق ایک مسئلہ بھی ہے مگر مجلس عام میں اس کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں کہ شاید سمجھ میں نہ آئے تو دیکھئے واقع میں تو یہ حالت رحمت تھی جو حضرت پر منکشف ہوگئی اور اس کے نزدیک عذاب تھا۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور آکر یہ عرض کیا کہ میں بیمار ہوگیا تھا اتنی مدت تک مجھ کو حرم کی نماز نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خواص سے فرمایا کہ عارف ان باتوں سے مغموم نہیں ہوتا کیونکہ مقصود تو حق تعالیٰ کا قرب ہے اور جس طرح حالت اختیار میں حرم کی نماز قرب کا ایک طریق ہے اسی طرح قرب کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بیمار ہوجائیں اور بیماری کا اجر ملے اور بحسب حدیث اس کے ساتھ ہی نماز کا بھی وہی اجر ملے جو تندرستی کی حالت میں حاضری حرم سے ملتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ بندہ کو مولیٰ پر فرمائش کرنے کا حق نہیں کہ مجھ کو فلاں طریق سے قرب عنایت ہو دونوں رستے خدا تک پہونچنے کے ہیں جس طریق سے چاہے پہونچائے بندے کو کیا حق ہے کہ ایک طریق کو تجویز کرے۔ خوب کہا ہے ؎

بدرد وصاف ترا حکم نیست دم درکش کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

(تجھے یہ نہ سوچنا چاہیئے کہ شراب میلی ہے یا صاف بس پی لینی چاہیئے ہمارے ساقی نے جو کچھ ہم کو دیا ہے وہی عین مصلحت ہے۔

اور ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط لگاکر عبادت مت کر جو آقا ہے وہ خود اپنے غلاموں کی پرورش کے طریقے کو جانتا ہے)

؎ مختصر حاصل اس کا یہ ہے کہ بعض واقعات کی بعض قیود لوح محفوظ میں نہیں ہوتیں علم الٰہی میں ہوتی ہیں۔ پس جس کو لوح محفوظ منکشف ہوتی ہے اس کو وہ قید معلوم نہیں ہوتی وقوع کے وقت وہ اس کو تبدیل سمجھتا ہے ۱۲ منہ

اور ؎

فکر خود و رائی خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(عاشقی کے معاملہ میں اپنی فکر کرنا یا اپنی رائے پر چلنا درست نہیں ہے عشق کے مذہب میں خود کو کچھ سمجھنا اور اپنی رائے پر چلنا کفر کے برابر ہے)

بس جس طرف سرکار لے جائیں بالکل خیر ہے ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست بر صراط مستقیم اے دل کسی گمراہ نیست

(درویشی کے راستے میں درویش کے سامنے جو مصیبت بھی آجائے اس کو بہتر ہی سمجھے اے دل صراط مستقیم میں کوئی شخص کبھی گمراہ نہیں ہوا)

لیکن آید کہا ہے آرد نہیں کہا یعنی ایک تو آید ہوتا ہے اور وہ غیر اختیاری امور ہیں وہ سب محمود ہیں اور ایک آرد اور وہ امور اختیاریہ ہیں ان میں بعضے مذموم بھی ہیں اس شعر میں اس کا ذکر نہیں اور اس سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا یعنی مثلاً اگر کوئی شخص کہنے لگتا کہ ہم سود لیتے ہیں اور یہ بھی ہر چہ پیش آید میں داخل ہے تو اس میں بھی خدا تعالیٰ کی مصلحت ہوگی۔ تو اس قاعدے سے اس شبہ کا جواب ہو گیا یعنی یہ حکم خدائی افعال میں ہے تمھارے افعال میں نہیں۔ پس ہمارے اختیاری افعال ہیں تو اچھے بُرے دونوں ہوں گے اور خدا تعالیٰ کے جتنے افعال ہیں وہ سب رحمت محض ہیں مثلاً کسی عزیز کا مرجانا یا قحط ہونا یا طاعون ہونا اور اگر کوئی کہے قحط تو گناہوں سے آتا ہے۔ علیٰ ہذا طاعون بھی سو رحمت کیسے ہوا تو صاحبو! یہ بھی تو رحمت ہے کہ تم گناہوں سے صاف ہو گئے اسی واسطے حدیث میں ہے کہ طاعون مومن کے لئے رحمت ہے کیونکہ اس سے تطہیر ہوگی حدیث میں ہے کہ ہر بیماری سے گناہ پاک ہوتے ہیں بلکہ یہاں تک آیا ہے کہ اگر کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اتنی پریشانی سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں غرض ہر چیز جو ہمارے اختیار سے خارج ہو وہ ہمارے لئے رحمت ہے۔ پھر ایک بات یہ سمجھو کہ ہم خدا کے ہیں یا اپنے ہیں ظاہر ہے کہ ہم خدا کے ہیں اسی واسطے ارشاد ہے وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ (مت قتل کرو اپنی جانوں کو) اگر ہم اپنے ہوتے تو ہم کو ہر تصرف اپنے نفس میں جائز ہوتا تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی چیز میں جس طرح چاہے تصرف کرے

عقل کا فتویٰ تو یہی ہے اور اسی واسطے اِنَّا لِلّٰہِ کی تعلیم فرمائی جس میں لاتملیک ہے جس کا مقتضا یہ ہے۔ اگر بالفرض ان احکام میں کوئی مصلحت بھی نہ ہوتی تب بھی ہم کو اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیے تھا چہ جائیکہ ہر مصیبت میں نفع اور مصلحت بھی ہے اور یہاں تک مصائب ظاہرہ کا ذکر تھا ان کے علاوہ ایک اور باطنی مصیبت ہے جو بعض ان خاص لوگوں کو پیش آتی ہے جو ذکر و شغل کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ مجاہدہ کرتے ہیں مگر کوئی نفع ان کے خیال میں محسوس نہیں ہوتا مثلاً میلان الی الطاعۃ نہیں ہوتا ذوق و شوق نہیں ہوتا علیٰ ہذا جس سے وہ اس قدر تنگ آتے ہیں کہ اگر بے اختیاری کی حالت غالب ہوتی ہے تو اس قسم کے الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں ؎

خستگان را چو طلب باشد و قوت نہ بود　　گر تو بیداد کنی شرطِ مُروّت نہ بود

(کمزور لوگوں میں جب کسی چیز کا شوق تو ہوتا ہے مگر قوت نہیں ہوتو ان پر زبردستی کرنی مروت کے خلاف ہے)

لیکن اختیار سے ایسا کہنا جائز نہیں اس آیت شریف سے اس کا بھی علاج سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس وقت یہ سمجھنا چاہیئے کہ ممکن ہے جس حالت کو تم مفید سمجھے وہ مفید نہ ہو حالاً یا مآلاً اور بالعکس اسی کو فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضی آیدت اے راہ رو　　آں صلاحِ تُست آیس دل مشو
چونکہ قبض آمد تو در وی بسط بیں　　تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

(اے راستہ کے چلنے والے جب تجھے تنگی پیش آئے اس میں تیرے لئے بہترائی ہے ناامید مت ہو جب تجھے تنگی ہو تو اسی میں کشادگی کو تلاش کر خوش رہ اور پیشانی پر بل نہ آنے دے)

خلاصہ یہ کہ اس میں مصلحت ہوگی چنانچہ نمونے کے لئے ایک مصلحت تو میں بتلاتا ہوں نیز بعض اوقات جو بسط میں حیرانی ہو جاتی ہے اس کو بھی بتلاتا ہوں وہ نفع تو قبض میں یہ ہے کہ اس وقت اپنا ناکارہ ہونا بالکل پیش نظر ہو جاتا ہے اور بسط میں وہ ضرر یہ ہے کہ بعض اوقات عُجب پیدا ہو جاتا ہے کہ اب تو ولی ہو گئے تو اس صورت میں قبض منجی ہے اور بسط مہلک

ہے تو قبض کا عطا ہونا گویا ایک ایسا کیفیت کا عطا ہونا ہے جو سبب نجات ہے پس
اس پر راضی ہونا چاہیئے اسی کو فرماتے ہیں ؎

باغباں گر پنج روزے صحبتِ گل بایدش
بر جفائے خارِ ہجراں صبر بلبل بایدش

(اے باغبان اگر تو چند روز کے لئے پھول کے پاس رہنا چاہتا ہے تو بلبل کی طرح
جدائی کے کانٹوں کے ظلم پر صبر کرتے رہو)

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام اُفتد تحمل بایدش

(اے دل اس کی زلف کی قید میں رہ کر پریشانی سے مت رو. سمجھ دار پرندہ جب پھندے
میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے)

تکیہ بر تقویٰ و دانش اور طریقت کافریست
راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

(درویشی کے راستہ میں اپنی پرہیزگاری اور سمجھ پر بھروسہ کرنا کفر ہے اے راستہ کے
چلنے والے اگرچہ تو سو کمال بھی رکھتا ہو پھر بھی اپنے کمال پر بھروسہ نہ کرنا صرف
اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا)

باقی یہ کہ قبض کی حالت میں لذت نہیں رہتی سو لذت خود مطلوب نہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(جدائی اور ملاقات کا کچھ خیال مت کر محبوب کی خوشنودی تلاش کر وہ جس حالت میں بھی
راضی ہو اسی کو پسند کر افسوس کا مقام ہے اگر اس کی ذات کے سوائے دوسری چیز طلب کیجائے)

بعض کہتے ہیں کہ ذکر و مجاہدہ سے ہمارا میلان معصیت بھی دفع نہیں ہوتا اور اس کو مصیبت
سمجھتے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ اگر میلان کے ساتھ ہمت بھی گناہ سے بچنے کی ہو تو یہ بڑا بھاری
مجاہدہ ہے اور مجاہدہ جتنا زیادہ ہوتا ہے اس میں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے تو گویا
خدا تعالیٰ کو ثواب زیادہ دنیا منظور ہوتا ہے سو یہ خدا کی رحمت ہے کہ اجر بڑھانے کے
واسطے یہ داعیہ پیدا کر دیا۔ غرض کام کیے جاؤ اور معصیت سے بچو اور اگر اتفاقاً معصیت
بھی ہو جائے تو اس کے بھی زیادہ پیچھے نہ پڑو بلکہ اس کا علاج کر کے آئندہ کو بچو جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس کا علاج استغفار کو فرمایا ہے بعض اوقات شیطان سالک پر

بڑا قبضہ کرلیتا ہے کہ شرم کے مارے توبہ نہیں کرتا اور محروم رہ جاتا ہے سو صاحبو! گناہ سے محض مغموم ہونا کافی نہیں بلکہ استغفار کرنا چاہیئے اور بعد توبہ خالصہ کے پھر اس کو قصداً یاد نہ کرے کہ بعض اوقات اس سے کیفیت مایوسی کی پیدا ہو کر آدمی معطل ہو جاتا ہے اور اگر بلا قصد یاد آئے تو پھر توبہ کرلے اور توبہ میں ہر ہر گناہ کو سوچنے اور فہرست گننے کی بھی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغۂ استغفار میں خود اشارہ فرمایا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَآ اَخَّرْتُ وَمَآ اَسْرَرْتُ وَمَآ اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ (اے اللہ آپ میری مغفرت فرما دیجئے اس سے جو میں نے ابتک کیا یا آئندہ کروں اور جو کچھ میں نے چھپاکر کیا اور جو کچھ آپ میرے متعلق جانتے ہیں) اس میں مجمل و مبہم عنوان کو کافی قرار دیا۔ قربان جایئے آپ کے کہ ہم کو کس قدر مضائق سے بچا لیا اور کیسی آسان راہیں بتلائی ہیں لیکن اگر کوئی کام ہی نہ کرے تو کچھ علاج ہی نہیں ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(چمگادڑ اگر دن میں نہیں دیکھ سکتا تو اس میں آفتاب کا کیا قصور)

یہ استغفار کا ذکر استطراداً تھا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج پیش آئے اُس کو مصلحت سمجھے اور اس پر خدا کا شکر کرے خواہ بلائے ظاہری ہو خواہ بلائے باطنی ہو۔ یہ تھا بیان مرض تمنی کا جس میں اہل سلوک بھی کم و بیش مبتلا ہیں اسی کی ممانعت اس حدیث میں ہے کہ اِیَّاکُمْ وَ اللَّوْفَانَّ لَوْ یَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ ہم نے ہزاروں مرتبہ یہ آیت شریف پڑھی ہوگی لیکن آج جو بات اس سے سمجھ میں آئی وہ آج تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔ الحمد للہ اور ایک بڑی رحمت اس کے ساتھ یہ فرمائی ہے کہ طبیعت انسانی کا بھی لحاظ فرمایا یعنی تمنا خود بخود طبیعت سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اُس کی تعدیل فرما دی ہے وہ یہ کہ دعا کو مشروع فرما دیا کہ اگر کسی چیز کی تمنا پیدا ہو تو بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کو رائے دو وہ ارمان اس طرح نکالو کہ دعا کرلیا کرو کہ تمنا سے وہ بہتر ہے کیونکہ تمنا کے معنی تو خدا کو رائے دینا ہے کہ اس طرح کرنا مناسب تھا بخلاف دعا کے کہ وہ عرض ہے جناب باری میں اور ساتھ ہی اس پر رضا ہے کہ اگر یہ اس طرح نہ ہوگا تو میں اسی کو مصلحت سمجھوں گا جو حاصل ہے مضمون عَسٰۤی اَنْ تَکْرَھُوْا الآیۃ کا پس دعا غبار نکالنے میں تو تمنی کے ہم پلہ ہے اور عرض میں اس کے خلاف مثلاً جب بیمار ہو تو

صحت کی دعا کرو اسی طرح صبر کی دعا کرو تو اس سے غبار تو نکل جائے گا جو بات پسند آئے کہہ لے اور حسرت نہیں ہو گی جیسے تمنی میں ہوتی ہے کیونکہ حسرت ما فات پر ہوتی ہے اور ما فات کی دعا جائز نہیں جیسے کوئی کہے کہ مجھے نبی کر دے کہ اس کا انتفا اور فوت یقینی ہے تو اثر میں دعا تمنی سے اچھی ہوئی اور حقیقت کے اعتبار سے اس سے یوں متغائر ہے کہ وہاں مشیت میں دخل دینا ہے اور یہاں چونکہ مشیت کا علم نہیں لہذا اس کے ساتھ مقابلہ نہیں ہے بلکہ استدعا ہے اور ساتھ ہی مشیت پر رضا اور اس سے دونوں کا فرق بھی معلوم ہو گیا اور اگر حسرت کے مضمون مذکور پر یہ شبہ ہو کہ ہم فائت پر تمنا نکریں گے بلکہ مستقبل پر تمنا کریں تو اس میں حسرت کیا ہو گی تو میں کہتا ہوں کہ پھر دعا ہی کیوں نہ کرو کہ ایہام رائی سے بھی محفوظ رہو اور دعا کے مفید و مشروع ہونے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ واقعات کا مخفی رہنا اور کشف نہ ہونا بہتر ہے کیونکہ پھر کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ خلاف کشف سوال کرنے سے ضرور اندر سے جی کھٹکتا ہے سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اپنی ہمکلامی میں لذت بخشنے کے لئے واقعات کو مخفی رکھا پھر چاہے ہو یا نہ ہو لیکن برکاتِ دعا تو حاصل ہو رہی یہ بات کہ اگر دعا کی اور مقصود حاصل نہوا تو پھر کیا کرے یا جب تک حاصل نہوا اس وقت تک کیا ہی کرے تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ دعا تو نہ چھوڑے لیکن جب تک وقوع نہ ہو صبر کرے بس صبر اور دعا دونوں رکھے اور یہ دعا بعد ظہور عدمِ اجابت رضا بقضا کے بھی منافی نہیں کیونکہ وہ عدم اجابت جس وقت تک ظاہر ہوا ہے اس وقت تک کے لئے اسی عدم استجابۃ پر راضی رہے اور جن اوقات کے متعلق عدم استجابۃ ثابت نہیں ہوا ان کے لئے پھر دعا کرتا رہے تو دونوں سلسلے برابر جاری رہیں غرض دعا کو بھی مشروع فرمایا جیسا دوسرے نصوص میں ہے اور تمنی کو منع فرمایا جیسا اس آیت میں ہے عَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ الخ خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جتنے احکام ہیں تکوینی یا تشریعی ان کے خلاف تمنا نہ کرے بلکہ ان پر صبر کرے اور جو دل میں کوئی تمنا پیدا ہو جائے اس کے دعا کرتے رہے۔ میں نے اس وقت اس مضمون کو اس لئے زیادہ بیان کیا کہ یہاں ایک واقعہ؏ ہو گیا ہے جس سے اکثر کے قلب پر اثر ہو گا اور اثر ہونا تو بعید نہیں واقعہ میں بھی مثل نشتر کے اثر ہوتا ہے دیکھو اگر نشتر لگاتے ہیں تو کھال میں کتنا اثر ہوتا ہے لیکن ہم کو اعتراض کا کوئی حق نہیں کیونکہ ہم کوئی رشتہ دار یا سر رشتہ دار

؏ منشی خلیل الرحمن صاحب کاندھلوی تحصیلدار بھوپال کی وفات ہوئی تھی ۱۲ منہ

کہ حکمت کی تفتیش کریں باقی حکمتیں ہیں ضرور لیکن مصیبت ختم ہونے کا طریقہ یہ نہیں کہ ان حکمتوں کی تفتیش کی جائے بلکہ مصیبت کے ختم ہونیکا طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کو سوچے نہیں اور تذکرہ نہ کرے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کئی کئی مہینے کے بعد بھی مصیبت زدہ کے پاس آکر برابر رنج وصدمہ کا تذکرہ کرکے اسس کو تازہ کیا کرتے ہیں فقہاء نے لکھا ہے کہ تین دن کے بعد تعزیت نہ کرے کیونکہ وہ واقع میں تعزیت ہی نہیں کیونکہ تعزیت کی حقیقت ہے تسلی دینا اور اس میں بجائے تسلی کے دبی آگ بھڑکتی ہے بس کا طریقہ تو یہی ہے کہ پھر ایسے قصوں کو یعنی ان واقعات کو قصداً یاد نہ کرے البتہ مردے کو نفع پہونچانے کے لئے یاد کرے اور جو حقوق اس کے ذمہ ہیں وہ ادا کرے۔ اس سے اس کو نفع ہوگا اور اپنے سکون کے لئے ذکر اللہ میں مشغول رہے کہ ذکر اللہ سے سکون ہوگا نیز متممات راحت رسانی اموات سے یہ ہے کہ اس کے اموال میں گڑبڑ نہ کرو کیونکہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اَعْمَالُ الْاَحْيَاءِ تُعْرَضُ عَلَى الْاَمْوَاتِ۔ تو اس کے متعلق خلاف شرع کام کرنے سے اس کو اذیت ہوگی اگر کوئی کہے کہ اس کی اذیت سے مجھ کو کیا' تو میں کہوں گا کہ عذاب کی تم کو بھی تو تکلیف ہوگی نیز اگر عذاب بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی مرضی کی تو پرواکرنا ضرور تھا غرض اس کا نفع اس میں ہے کہ اس طور سے اس کو یاد کرو اور اپنے سکون کے لئے ایک تدبیر یہ ہے کہ کسی کام میں لگے رہو کیونکہ بیکاری میں یہ سب قصے یاد آتے ہیں اگر دین کا کام نہ ہو تو دنیا ہی کے کام میں لگ جاؤ مگر مباح کام ہو غرض غم کو ہلکا کرنا چاہیئے ورنہ قضائے خداوندی سے تنگی ہوتی ہے پس اسی کے علاج کے لئے ارشاد ہے عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمھارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمھارے حق میں (باعث) خرابی ہو اور اللہ تعالٰے جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے)۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ اپنے (اور ناشر محمد عبدالمنّان کے) لئے بھی دعا ر توفیق کیجئے اور اموات کے لئے بھی دعا کیجئے کہ خدا تعالٰے مغفرت کرے (آمین برحمتك یا ارحم الرّاحمین)

تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعواتِ عبدیت جلد چہارم

کا

دسواں وعظ ملقب بہ

تیسیرُ الِاصلاح

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ

ناشر: محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم۔اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد چہارم کا

دسواں وعظ ملقب بہ

تیسیر الاصلاح

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
تھانہ بھون مسجد جامع	۲۹ جمادی الاوّل ۱۳۳۰ھ	۲½ گھنٹہ	بیٹھ کر	ترک معاصی کا سب سے سہل طریقہ	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم تھانوی		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى. اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝

(مگر جو شرک و معاصی سے) توبہ کرے اور ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے تو وہ (بھی عذاب سے بچا رہے گا کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور پر رجوع کر رہا ہے)

یہ دو آیتیں ہیں جن میں پہلی آیت اپنے سے پہلی آیت کی محتاج ہے مگر جو مضمون اس وقت مقصود ہے اس کے لئے چونکہ یہ بھی کافی ہے اس واسطے پہلی آیت کو جس میں مستثنیٰ منہ مذکور ہے تلاوت نہیں کیا گیا اور اس کی تلاوت کی ضرورت نہیں سمجھی اور محض مضمون استثناء اور اس کی تتمیم پر اکتفا کیا گیا۔ ان دونوں آیتوں میں سے اول آیت میں ایک بہت بڑے مرض کا ایک نہایت ہی سہل علاج فرمایا ہے۔ ہم میں امراض تو بہت ہی شدید ہیں اور اس لئے قاعدہ معتادہ کے موافق ان کے علاج بھی بہت ہی سخت ہونے چاہئیں تھے مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ سخت سے سخت امراض کے نہایت سہل علاج تجویز فرمائے اور یہ بھی ایک امتیاز ہے شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے شرائع اور دیگر طرق اصلاح سے کہ اس شریعت میں سخت امراض کے لئے بھی نہایت سہل علاج بتلائے گئے ہیں ورنہ تمام دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس درجہ کا مرض ہوتا ہے اسی درجہ کا علاج بھی کیا جاتا ہے اگر مرض سخت ہے تو اس کا علاج بھی سخت ہوگا اور مرض ہلکا ہے تو علاج بھی ہلکا ہوگا۔ غرض اس روحانی طب میں یہ امتیاز ہے کہ سخت امراض روحانی کا علاج بھی سہولیت سے کیا گیا ہے اور امراض روحانی سے مراد معاصی ہیں حدوثاً یا بقاءً یعنی گناہ کا صادر ہونا یا اس کا باقی اور مستمر رہنا۔ حاصل یہ ہے کہ معصیت مرض ہے اور اس میں دو درجے ہیں ایک تو اس کا حدوث اور ایک اس کا بقاء یعنی صدور کے بعد اس سے رجوع میسر نہ ہو تو اصل مرض معصیت ہوا اس کے مرض ہونے میں تطویل کلام کی ضرورت نہیں جس میں ایمان ہوگا وہ اس کو ضرور ہی تسلیم کرے گا کیونکہ مرض کی حقیقت ہے مزاج کا اعتدال سے خارج ہونا اور جس طرح ایک قسم اعتدال کی طبعی ہے اسی طرح ایک قسم اعتدال کی روحانی بھی ہے جس کو شریعت نے بتلایا ہے کہ انسان کو اس حالت پر رہنا چاہیے کہ نہ اس میں افراط

ہو اور نہ تفریط ہو یعنی غلو اور انہماک کو بھی جائز نہیں رکھا پس یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ دین میں مبالغہ کرنا مقصود ہے یہ بھی خلافِ واقع ہے سو اس میں دو غلطیاں لوگوں کو واقع ہوئی ہیں بعض تو یہ سمجھے کہ عبادات میں خوب مبالغہ کرو جتنا مبالغہ ہوگا اچھا ہوگا اس کا ایک برا نتیجہ تو یہ ہے کہ دین سے توحش وثقل پیدا ہوگا۔ دوسرا برا اثر بعض معتقدین پر یہ ہوگا کہ اس کو قبول کرکے ایسے منہمک ہوں گے کہ تمام دنیا کے کاروبار کو چھوڑ کر اور ترک تعلقات کرکے بیٹھ رہیں گے اگرچہ وہ تعلقات واجب ہی کیوں نہ ہوں جیسے بیوی بچوں وغیرہ کا اور اس کا نام رکھا ہے آزادی وتفرّد وتجرّد کہ ہم کو خدا کے سوا کسی سے غرض نہیں نہ بیوی سے نہ بچے سے اور اس کا ثمرہ آخر یہ ہوا کہ تمام حقوق واجبہ ضائع ہو گئے ان لوگوں نے یہ نہ سمجھا کہ آزادی اسی حد تک جائز ہے جہاں تک کہ شریعت نے اجازت دی ہے اور جہاں شریعت نے مقیّد کر دیا ہے وہاں مقید ہی رہنا چاہیئے ؂

چونکہ برمیخت بہ بندد بستہ باش　　چوں کشاید چابک وبرجستہ باش

(جب کسی میخ سے تجھے باندھ دیا جائے تو اسی جگہ بندھا ہوا رہنا بہتر ہے اور جب کھول دیا جائے تو خوب چستی وچالاکی دکھلا)

یعنی جب باندھ دیں بندھ جائے اور جب کھول دیں تو اچھلتا کودتا پھر دیکھئے گھوڑے کی شائستگی یہی ہے کہ جب اس کو باندھ دیا جائے تو بندھا رہے اور جب کھول کر چلایا جاوے تو کھل کر چلے اور اگر وہ کھولنے پر بھی بندھ جائے یعنی چلے نہیں یا باندھنے کے بعد بھی اچھلے کودے تو وہ شریر گھوڑا ہے پس اطاعت یہی ہے کہ باندھنے سے بندھ جائے اور کھولنے سے کھل جائے۔ اس وقت دنیاداروں نے تو بالکل اپنے گلے سے پٹا ہی نکال دیا ہے اور دینداروں نے اپنے کو زاویہ میں ہی جکڑ لیا ہے سو یہ سخت غلطی ہے اور بہت لوگ اس میں مبتلا ہیں اور اس غلطی سے یا تو دین سے توحش پیدا ہوتا ہے اور یا انہماک تو اصل سبب اس توحش اور انہماک کا یہی ہے کہ مبالغہ کو مستحسن سمجھا اسی مبالغہ کی نسبت فرماتے ہیں یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (اے اہل کتاب دین کے معاملات میں تم غلو اور زیادتی مت کرو) تو ہر چیز میں سخت ضرورت اعتدال کی ہے دنیا میں بھی اور دین میں بھی۔ اور جب معلوم ہوا کہ دین

یں اعتدال مقصود ہے تو جو اس اعتدال سے نکلے گا وہ مریض روحانی سمجھا جائے گا یہ تو حقیقت کے اعتبار سے تقریر ہے اور اثر کے اعتبار سے کہ معصیت اس طرح مرض ہے یہ ہے کہ مرض سے طبیعت مکدر ہوتی ہے ادھر معصیت میں بھی طبیعت مکدّر ہوتی ہے اور اُس سے پریشانی اور ضعفِ روحانی بڑھتا ہے اور صاحب معصیت ہر وقت پریشان اور افسردہ رہتا ہے اور یہ بات مشاہدہ کرنے کی ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ عبادت کے بعد قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے جس کو عابد محسوس کرتا ہے اور معصیت کے بعد قلب میں ایک ظلمت اور تکدر ہوتا ہے جس سے قلب بالکل پژمردہ ہوجاتا ہے۔ دیکھو نمازی کی نماز اگر قضا ہوجائے تو اس کو کس قدر رنج ہوتا ہے اور اگر اپنے وقت پر ادا ہوجائے تو کیسی فرحت ہوتی ہے خوب کہا ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود گر ز باغِ دل خلالے کم بود

(درویش کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں اگر ان کے دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہوجائے)

دیکھیے اگر کسی کو نماز سے محبت ہوجائے تو گو اس کی حالت اہل اللہ کی سی نہ ہو لیکن پھر بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر اس کو کوئی ایک ہزار روپیہ بھی دے اور یہ کہے کہ تم ایک وقت کی نماز مت پڑھو تو قیامت تک نہ مانیگا بلکہ اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس شرط پر اس کو دی جائے اس پر بھی لات ماردے گا تو اس شخص کو نماز میں آخر کوئی شگفتگی تو ہے جس کی وجہ سے ہفت اقلیم کو بھی اس کی عوض میں ہیچ سمجھتا ہے وہ یہی روحانی فرحت ہے وہ جانتا ہے کہ نماز کو چھوڑنے سے یہ فرحت جاتی رہے گی اور قلب میں اس کی جگہ ایک کدورت اور ظلمت پیدا ہوجائے گی اس سے معلوم ہوا کہ طاعت سے ایک نور پیدا ہوتا ہے اور معصیت سے ایک قسم کا تکدّر ہوتا ہے اور اس نور میں یہ بھی خاصیت ہے کہ وہ قوت بخشتا ہے اور اسی طرح اس تکدر کا خاصہ ہے کہ وہ کم ہمّت اور کسل مند کردیتا ہے چنانچہ دیکھ لیجیے اگر دو شخص قوت میں برابر ہوں مگر ان میں سے ایک متقی ہوا اور ایک غیر متقی تو ان دونوں کی حرکات میں غور کرنے سے یہ تفاوت نظر آئیگا کہ متقی سے جو کام

ہمت کا ہو سکے گا وہ غیر متقی سے نہ ہو گا اور ہر کام میں جو ہمت متقی سے ظاہر ہو گی وہ غیر متقی سے کبھی نہ ہو سکے گی اور یہی راز ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم باوجود اپنے ضعف جسمانی کے اپنے مقابل کفار پر باوجود ان کی قوت کے غالب آگئے حتیٰ کہ اہل فارس جن میں رستم جیسا شخص موجود تھا جو اپنے زمانہ کا بڑا زور آور سمجھا جاتا تھا ان کے مقابلے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے دبلے پتلے کمزور جب کام کا وقت آیا تو یہ کمزور قوی ثابت ہوئے اور وہ زور آور کمزور ثابت ہوئے تو یہ قوت اسی نور کی تھی جو عبادت کی وجہ سے ان کے قلب میں بلکہ رگ وپا میں سرایت کر گیا تھا اور یہی نور ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ لَحْمِیْ نُوْرًا وَّفِیْ دَمِیْ نُوْرًا وَّمِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا وَّمِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ نُوْرًا یعنی اے اللہ میرے قلب میں رگ وپے میں گوشت پوست میں خون میں نور پیدا کیجئے اور میرے نیچے اوپر اوپر اور داہنے اور بائیں نور پیدا کیجئے اور مجھ کو بھی نور کر دیجئے۔ حقیقت میں اطاعت اور عبادت سے ایک نور پیدا ہو جاتا ہے اور عابد کو اس کا ادراک بھی ہوتا ہے اگرچہ ہم کو بوجہ اخبار صادق کے بلا ادراک بھی ایمان لانا چاہیئے اور اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو کبھی نور محسوس نہیں ہوا تو میں کہوں گا کہ اس لئے نہیں محسوس ہوا کہ ابھی آپ نے وہ تقویٰ اختیار نہیں کیا جس سے نور پیدا ہوتا ہے ورنہ آپ دیکھتے کہ ایسا نور آپ کے قلب میں پیدا ہوتا ہے جس کے سامنے کسی قسم کا ضعف ہی نہیں رہتا اسی پر میں فرماتے ہیں کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر فتح پالیتی ہے) اور کسی کا قول ہے ؎

ہر چند پیر خستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

میں اگرچہ بوڑھا ہو گیا لیکن جب تجھ پر نظر پڑتی ہے تو وہی جوانی کی قوت آجاتی ہے محسوسات سے اس کی تائید دیکھ لیجئے کہ اگر کسی شخص کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی کیا حالت ہو جاتی ہے کہ اس کے کسی کام میں بھی اس کو تکان نہیں ہوتا پھر اگر کسی کو خدا تعالیٰ سے اور اس کے احکام سے محبت ہو جائے تو اس کی قوتِ قلبی کا کیا تعجب ہے جیسا

سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ؎

عجب داری از سالکانِ طریق — کہ باشند در بحر معنی غریق

(جو لوگ درویشی کے سیدھے راستہ پر چلنے والے ہیں تجھے سنکر تعجب ہوگا وہ ہمیشہ معنی کے دریا میں غرق رہتے ہیں)

مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

خود قوی تر میشود خمرِ کہن — خاصہ آن خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب خود بخود زیادہ قوی ہو جایا کرتی ہے یہ خصوصیت اس شراب کی ہے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے)

یعنی بڑھاپے میں زور گھٹتا نہیں بلکہ اور زیادہ ہو جاتا ہے کیونکہ شراب جتنی پرانی ہوتی ہے اتنی ہی تیز ہو جاتی ہے تو اس نور سے باوجود ضعف جسمانی کے روحانی قوت بڑھتی جاتی ہے تو معلوم ہوا کہ ایک درجہ قوت اور صحت کا روحانی بھی ہے اور اس سے خروج کا نام مرض ہے اور گناہ اسی خروج کا نام ہے اور اس میں بہت زیادہ تطویل کی ضرورت نہیں کیونکہ بحمد اللہ ہر مسلمان اس کو سمجھتا ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں۔ یہ تو امراض تھے۔

اب ان امراض کے خاص خاص معالجات ہیں کیونکہ ہر مرض کی دوا ہونا حدیث شریف میں مصرح ہے مگر امراض روحانی کی دوا سے اکثر لوگ بے خبر ہیں اسی لئے اکثر لوگ گناہ کو باوجودیکہ چھوڑنا چاہتے ہیں مگر اس کے چھوٹنے کا طریقہ اور اس کا علاج معلوم نہ ہونے کے سبب ان سے نہیں چھوٹتے دیکھو اگر کوئی اچھا ہونے کا متمنی ہو مگر اس کا طریق معلوم نہ ہو یا کہ اس طریق کا استعمال نہ کرے تو کبھی اچھا نہیں ہو سکتا اسی طرح آجکل لوگ بڑی تمنائیں کرتے ہیں بعضے تو طریقہ ہی نہیں جانتے اور بعضے جان کر بھی عمل نہیں کرتے چنانچہ اکثر لوگ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ کچھ توجہ کر دیجئے مطلب یہ کہ ان کو کچھ نہ کرنا پڑے۔ صاحبو! ہر کام اس کے طریقے ہی سے ہوا کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آنا چاہیئے) تو ہر مقصود ایک گھر ہے اور اس کا ایک دروازہ ہے کہ اگر اس سے داخل ہوا جائے تو عادۃً اس گھر میں پہونچ سکتا ہے ورنہ نہیں

تو نری تمنّا دارالمقصود کا دروازہ نہیں ہے اور نہ ہر تمنّا کا پورا ہونا ضروری ہے ؎

عُرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال   صد سال میتواں بہ تمنّا گریستن

(اے عرفی اگر رونے چلانے سے محبوب کا وصال ہو جایا کرتا تو میں اسی تمنا میں سو سال تک روسکتا ہوں)

جیسا بعض لوگ دو آنسو گرا لیتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں۔ اسی باب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے ؎

لَوْکَانَ ھٰذَا الْعِلْمُ یُدْرِکُ بِالْمُنٰی   مَاکَانَ یَبْقٰی فِی الْبَرِیَّۃِ جَاھِلٌ

(یعنی اگر علم اور اسی طرح عمل تمنّا سے حاصل ہو جاتا تو دنیا میں کوئی بھی جاہل نہ رہتا)

فَاجْھَدْ وَلَا تَکْسَلْ وَلَا تَکُ غَافِلًا   فَنَدَامَۃُ الْعُقْبٰی لِمَنْ یَّتَکَاسَلُ

(پس کوشش کر سستی مت کر نہ غافل بن آخرت میں اس شخص کو شرمندہ ہونا پڑے گا جو سستی کرتا رہا)

(صاحبو! نری تمنا سے کچھ نہیں ہوتا مگر افسوس کہ آج کل تمنّائیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن کام کے طریقے سے کوئی بھی کام نہیں کرتا خوب کہا ہے ؎

ماکل مایتمنی المرءُ یدرکہ   تجری الرّیاح بِمَالا تشتھی السفن

(آدمی جو تمنّا کرتا ہے وہ سب پا نہیں لیتا بسا اوقات کشتیوں کی مخالف ہوائیں بھی چلا کرتی ہیں)

غرض خدا تعالےٰ نے ہر ایک کام کے لئے عادۃً ایک تدبیر بتلائی ہے کہ جب اس تدبیر سے وہ کام کیا جائے گا تو اس میں کامیابی ہوگی ورنہ نہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ محض دعا ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ صاحبو! دعا میں برکت ضرور ہے لیکن ہر جگہ اُس کا بھی محل نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقاصد دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ ان کا اسباب سے کچھ تعلق نہیں وہاں تو باستثناء ممتنعاتِ عقلیہ یا شرعیہ دعا کا صرف یہ اثر ہے کہ بصورت استجابت مقصود بلا تدبیر حاصل ہو جائے گا اور بعض کام عادۃً تدبیر پر موقوف ہیں ان میں باستثناء خوارق کا دعا کا وہ اثر نہ ہوگا۔ جو پہلی قسم کے کام میں ہوا بلکہ ان میں دعا کا اثر

یہ ہوگا کہ اگر تدبیر کی جائے گی تو اس تدبیریں برکت ہوگی اور اگر تدبیر نہ کی جائے گی تو کچھ بھی نہ ہوگا اور اسی سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ جب کاموں کا مدار تدبیر پر ہے تو پھر دعا کا ان میں کیا دخل اور اثر ہوا۔ سو وہ اثر یہ ہوا کہ تدبیریں برکت ہوگئی اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے زراعت کہ اگر کوئی تخم پاشی ہی نہ کرے اور دعا کرے کہ غلہ پیدا ہوجائے تو عادۃً ہرگز پیدا نہ ہوگا اور خرقِ عادت میں کلام نہیں ہے مگر وہ دائم نہیں تو وہاں اس کی ضرورت ہے کہ تخم پاشی کرد اس کے بعد دو حالتیں ہیں پیدا ہونا یا نہ پیدا ہونا جو متعلق ہے مشیت کے تو یہاں تعلقِ مشیت کے لئے دعا کی جائے گی کہ آپ اِس میں اپنی مشیت سے غلہ پیدا کردیں اور یہی حالت ہے اپنی اصلاح اعمال و ترکِ معاصی کی ہر مقام پر نری دعا کو کافی سمجھنا سخت غلطی ہے آجکل بھی اصلاح چاہتے ہیں مگر تدبیر نہیں کرتے صرف دعا پر اکتفا کرتے ہیں۔ تو صاحبو تدبیر کرو کامیابی ہوگی۔ ورنہ دوسری ایسی مثال ہے کہ اگر کوئی شخص کمر بند کھول کر کھڑا ہوجائے اور دعا کرے کہ کمر بند بندھ جائے تو ہرگز بھی نہ بندھے گا۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ دعا کا کیا اثر ہے اور یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ بعض جگہ ناکافی ہے۔ حاصل یہ کہ لوگوں نے یہ ناکافی تدابیر تجویز کر رکھی ہیں اور کافی تدابیر ان کی وہی ہیں جو قرآن و حدیث شریف نے بتائی ہیں مگر ہم لوگ ان کو بالکل نہیں ڈھونڈتے اور یہ بہت بڑا علم ہے جو علی العموم مسلمانوں سے مخفی ہورہا ہے بلکہ اکثر اہل علم سے بھی کہ اس فن کی کتابوں میں غور نہیں کرتے اِس لئے وہ علم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں وہ بھی اس نظر سے نہیں پڑھتے کہ اس میں معالجات امراض کو سمجھیں کہ اس میں عجیب معالجات ہیں چنانچہ اس آیت شریف میں بھی ایک سخت مرض کا ایک سہل علاج بتلایا ہے لیکن افسوس ہے کہ لوگوں کو محض اِس وجہ سے قدر نہیں کہ بہت سہل علاج ہے اور لوگوں کا طبعی امر ہے کہ جو چیز سہل طریق سے حاصل ہو اس کی قدر نہیں ہوتی اور جو عجیب طور پر حاصل ہو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ انبہٹہ میں ایک دولت مند شخص کو بہت سخت مرض غلیظ سودا کا بہت زور ہوگیا تھا مولانا کو بلایا گیا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے

افیتمون تجویز فرمایا اوران لوگوں نے ارزاں دوا سمجھ کرٹال دیا وہاں ایک نابینا حافظ جی رہتے تھے ان سے علاج پوچھا گیا انھوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص افیتمون ہی بتلاتے ہیں انھوں نے لوگوں سے ذکر کیا لوگوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا مولانا رحمۃ اللہ علیہ خوش مزاج بہت تھے حافظ جی سے پوچھا کہ خواب میں میں تو نہ تھا تو حافظ جی کہتے ہیں جی ہاں آواز تو ایسی ہی تھی اور پھر اس کا استعمال کیا یہ مثال اس پر یاد آگئی کہ یہ نسخہ چونکہ نہایت سہل تھا اس لئے اس کی قدر نہیں کی گئی اس طرح ہمارے مولانا نے ایک شخص کو جامن کی کوپل بتلائی تھی وہ بھی بڑے آدمی تھے کچھ التفات نہ کیا اکثر سہل الوصول چیز کی وقعت کم ہی ہوتی ہے مولانا رحمۃ اللہ علیہ بعنوان شکایت فرماتے ہیں ؎

ای گراں جاں خوار دیدستی مرا زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

ہرکہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرصے ناں دہد

(اے بڑے آدمی تو مجھ کو ذلیل سمجھ رہا ہے اس لئے کہ تو نے مجھ کو بہت سستا خرید لیا ہے جو سستا خریدتا ہے وہ سستا ہی فروخت بھی کر دیتا ہے مثلاً بچہ قیمتی موتی کو ایک روٹی کے بدلے میں دیدے گا)

غرض جو معالجات سہل ہوتے ہیں ان کی قدر نہیں کی جاتی اس لئے اطبا بعض اوقات دوا کی قدر بڑھانے کو ورق نقرہ وغیرہ بڑھا دیتے ہیں تاکہ مریض کو قدر ہو جائے۔ مگر ارزانی کو دلیل قلت نفع کی قرار دینا خود یہی غلطی ہے اکثر تو یہی ہے کہ جس قدر کوئی چیز نافع ہے اسی قدر وہ زیادہ ارزاں ہے جیسے ہوا کہ نافع تو اس قدر کہ مدار زندگی اسی پر ہے اور ارزاں اتنی کہ بالکل بے قیمت۔ ہوا کے بعد پانی ہے کہ وہ ہوا کے برابر نافع نہیں اس لئے اتنا تو سستا نہیں مگر چونکہ اور دوسری تمام چیزوں سے زیادہ نافع ہے اس لئے اور سب چیزوں سے سستا ہے تو اسی طرح سوچتے چلے جائیے معلوم ہوگا کہ جتنی کوئی چیز بیکار ہے اتنی ہی وہ گراں ہے حتیٰ کہ سب سے زیادہ گراں جواہرات ہیں پھر دیکھئے کہ ان کا فائدہ سوائے تفاخر کے اور کیا ہے ہزاروں غرباء نے کبھی موتی کی شکل بھی نہیں دیکھی چنانچہ خود میں نے عمر بھر میں کل ابتک ایک مرتبہ لکھنؤ میں ایک

سوداگر سے درخواست کرکے یہ جواہرات دیکھے ہیں غرض جواہرات جو سب سے نکمے ہیں وہ سب سے گراں ہیں اگرچہ چاہیے تو یوں تھا کہ جتنی زیادہ ضرورت کی کوئی چیز ہوتی اتنی ہی گراں ہوتی لیکن چونکہ اس میں سخت دشواری ہوتی اس لئے رحمتِ خداوندی نے اس کے برعکس معاملہ کیا کہ ضرورت کی چیزوں کو ارزاں بنایا اور بیکار چیزوں کو گراں کردیا بلکہ جو سب سے زیادہ ضرورت کی چیز ہے اس میں طلب کی بھی ضرورت نہیں۔ دیکھو اگر سانس کو بھی کہ ایک ہوا ہے اور ہر وقت ضروری پانی کی طرح بقصد لینا پڑتا تو ہر وقت کی مصیبت تھی بالخصوص سونے کے وقت تو مرہی جایا کرتے کیونکہ اس وقت قصد ممکن نہیں تو خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ اس کو کیسا یسیر الحصول کردیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کی ارزانی اس کی بے وقعتی کی دلیل نہیں ہے پس امراض روحانی کا علاج بھی ایسا ہی ہے کہ سب سے زیادہ ضروری اور سب سے آسان سہل۔ یہ تمہید میں نے اس لئے عرض کی کہ اس مقام پر مرض کی صعوبت اور علاج کی آسانی کو دیکھ کر اس علاج کی بیقدری نہ ہو۔ اب سنو کہ وہ علاج کیا ہے اور سننے کے بعد اس کو برتو اور پہلے ہی اس کی بے وقعتی نکرو بلکہ اگر برتنے سے بھی مفید ثابت نہ ہو تو بیشک بیکار اور غیر مفید ہونے کی اطلاع کرکے ہم سے جواب لو۔ دیکھو اگر طبیب کوئی علاج بتلائے تو اول اس کو برتا جاتا ہے پھر اس کی نسبت مفید یا غیر مفید ہونے کی رائے قائم کی جاتی ہے یہ نہیں کہ نسخہ سنتے ہی اس کو ردی کردیا جائے اسی طرح جو علاج یہاں بتلایا جارہا ہے اول اس کو استعمال کرو اس کے بعد پھر شبہ کرو اور میں وہ مرض اور علاج بتلاتا ہوں اور تحدث بالنعمۃ کے طور پر یہ بھی ظاہر کرتا ہوں کہ ان آیتوں سے جو بات اس وقت بیان کرتا ہوں اس کے قبل یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی یہ علم تھوڑا ہی زمانہ ہوا کہ عطا ہوا ہے اور چونکہ علم بے حد مفید تھا۔ اس لئے جی چاہا کہ

ع: حلوا بہ تنہا نبایست خورد

(حلوا تنہا نہ کھانا چاہیئے)

سو وہ مرض یہ ہے کہ بسا اوقات انسان گناہ کو چھوڑنا چاہتا ہے لیکن وہ نہیں چھوٹتا یعنی دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ گناہ کی پرواہی نہیں کرتے اور بعض وہ ہیں گو

کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن وہ پھر ہو جاتا ہے پھر چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد پھر مبتلا ہو جاتے ہیں چنانچہ بعضوں کی تمام عمر اسی میں گذر جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ اُن سے نہیں چھوٹتا سو اول تو معصیت خود مرض دوسرے اس کی معاودت مرض پھر اس میں کچھ معصیت کے اثر سے بھی اور کچھ ارادہ ترک میں ناکامی کی وجہ سے بھی کوفت ہوتا کہ یہ جسمانی اذیت ہے پھر ممتد اتنا کہ عمر بھر نہیں چھوٹتا جس سے عمر بھر یہ کلفتیں جمع رہتی ہیں چنانچہ مجھ سے ایک بوڑھے شخص نے اپنی حالت بیان کی کہ میں ایک مرض میں ابتدائے عمر سے مبتلا ہوں اور اس وقت قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں لیکن ابھی تک وہ مرض موجود ہے وہ بیچارے کہتے ہوئے شرماتے تھے مگر چونکہ اس کے ضرر کو جانتے تھے اس لئے باوجود شرم کے کہہ رہے تھے کیونکہ

ع - نتواں نہفتن درد از طبیبان

(طبیبوں سے مرض چھپایا نہیں جا سکتا)

میں طبیب ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن وہ ایسا سمجھتے تھے اور جب کوئی مشفق خیر خواہ جاننے والا مل جائے تو ایسے موقع پر پھر چھپانا نہ چاہیئے کیونکہ چھپانا یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ یہ شخص ہم کو حقیر سمجھے گا اور یا اس لئے ہوتا ہے کہ دوسروں کو کہتا پھرے گا سو بحمد اللہ ان حضرات میں یہ دونوں احتمال نہیں اس لئے ایسے لوگوں سے کہنے میں کچھ پروا نہ کرنا چاہیئے اور اظہار گناہ سے جو ممانعت آئی ہے وہ اس وقت ہے جبکہ محض براہ بیباکی ہو جیسے تفاخراً کہا کرتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ معالجے کے لئے ظاہر کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض ان بزرگ نے اپنا ایک مرض جو کہ بچپن سے آخر عمر تک تھا بیان کیا اسی طرح بعض لوگوں کو جھوٹ بولنے کا مرض ہو جاتا ہے یا نظر بازی کا کہ بعض اوقات تو یاد نہیں رہتا اور بعض اوقات آدمی مغلوب ہو جاتا ہے اور پھر ارتکاب کے بعد نادم ہوتا ہے مگر وہ پھر ہو جاتا ہے۔ غرض ہر گناہ جس کی بار بار معاودت ہو اس میں ایسا ہی ہوتا ہے سو عقل کے موافق اس کا علاج بھی سخت ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ اہل عقل نے جو اخلاق کی درستی کی تعلیم کی ہے تو انہوں نے اس کے لئے سخت سخت علاج تجویز کئے ہیں جن کا حاصل مجاہدہ ہے مثلاً تکبر کا علاج

یہ تجویز کیا ہے کہ متکبّر سے چھوٹوں کی تعظیم کرائی اور مدت تک ایسے کاموں پر مجبور کیا جن میں نفس کو ذلت ہو تو اصل با قاعدہ علاج یہی مجاہدہ ممتدّہ ہے ایک حکیم کہتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(تصوف اختیار کرنے والا اس وقت تک پاکیزہ و مزکی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ شراب معرفت کا جام نوش نہیں کر لیتا اور ہر ناپختہ کو پختگی حاصل کرنے کے لئے بہت محنت و مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے)

پس ایسی ایسی مشقتوں کے بعد کچھ فائدہ محسوس ہوتا ہے اور اسی قسم کے علاج سے تمام تصوّف کی کتابیں بھری پڑی ہیں احیاء اور قوت القلوب میں اسی طرز کے علاج کو مفصلاً ذکر کیا گیا ہے اور یہ اس قسم کے علاج ہیں کہ ایک ایک مرض کے علاج کے لئے عمر چاہیئے اسی لئے حضرات متاخرین نے ان علاجوں کی جگہ دوسرا اس سے سہل علاج اختیار کیا اور وہ خلوت و کثرتِ ذکر ہے مگر پھر بھی وہ اتنا سہل نہیں کہ ہر شخص اور ہر مشغول اس کو اختیار کر سکے مثلاً جیسے ایک تاجر ہے کہ وہ خلوت میں نہیں رہ سکتا تو ان دونوں طرزیں سے اس کے لئے ایک بھی کارآمد نہیں تو بظاہر یہ غریب محروم ہی رہا حالانکہ ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشانست   خم و خمخانہ با مہر و نشانست

(ابھی تک وہ رحمت کا بادل موتی برسا رہا ہے شراب کا مٹکا اور میخانہ سب پر مہر اور نشانی لگی ہوئی ہے)

اور ؎ ع۔ چہ دشمن بریں خوانِ نعیما چہ دوست

(اللہ تعالیٰ کے دسترخوان پر دوست دشمن سب برابر ہیں)

تو ایسوں کے لئے کونسی تدبیر ہونا چاہیئے جو ان کو بھی سہل ہے سو الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ اول خدا تعالیٰ نے وہ تدبیر بلا واسطہ قلب میں ڈالی اور پھر اس پر اس قدر اطمینان ہوا کہ اس میں ذرا شک و شبہ باقی نہ رہا جس کے بعد اپنے بہت احباب کو بتلایا اور خود بھی اس کو برتا اور آزمایا سو بحمد اللہ مفید ثابت ہوا اور بالکل حق الیقین ہو گیا کہ یہ نافع ہے۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ کا دوسرا فضل یہ ہوا کہ ابھی تک اُس میں جو ایک کمی تھی کہ وہ

معالجہ بوجہ اس کے کہ علوم القائیہ ظنی ہوتے ہیں اور تجربہ میں احتمال خصوصیت مزاج کا بھی ہوتا ہے ظنی سمجھا جاتا تھا آج وہ بھی جاتی رہی اور آج ہی قرآن مجید میں اس معالجہ کا منصوص اور مفید ہونا معلوم ہوگیا اگرچہ اس معنی کر اب بھی ظنی ہے کہ اس آیت کی دوسری تفسیر بھی ہوسکتی ہے مگر ثبوتاً تو مظنون نہیں رہا گو دلالۃً مظنون ہو تو وہ تدبیر وہ ہے جو اس آیت میں بتلائی گئی ہے اب میں اول آیت کا ترجمہ کرتا ہوں اس آیت کے قبل بعضی وعیدوں اور بعضے گناہ کرنے والوں کی حالت کا بیان ہے اس کے بعد فرماتے ہیں إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ الخ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کا علاج توبہ ہے مگر اس کو سن کر آپ سامعین بداعتقاد نہ ہوجائیں کہ یہ تو معمولی بات نکلی جو پہلے سے موہوم ہے سو ابھی بات تم نے سنی نہیں ۔

فرماتے ہیں کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے تو ان کے گناہوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا تو خدا تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کے باب میں (جبکہ اس کے شرائط بھی پائے جائیں جن میں ایک ایمان ہے کیونکہ کافر کی توبہ مقبول نہیں۔ اور دوسرا عمل صالح ہے) یہ فرمایا ہے کہ اس کی برائیاں مبدل بہ حسنات ہوجائیں گی ! اور یہ دوسری شرط یعنی عمل صالح قبول توبہ کے لئے تو نہیں ہے کیونکہ بالاجماع خود گناہ معاف ہونے میں اس کی ضرورت نہیں کہ دوسرے نیک عمل بھی کرے صرف توبہ بطرقہائے کافی ہے لیکن أُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (یہی وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نیکیاں عطا فرمادیتے ہیں) میں اس دوسری شرط کی ضرورت ہے اور تفسیر اس تبدیل سیأت کی مختلف ہے اور یہ مسئلہ اس آیت سے اس تفسیر کی بنا پر ماخوذ ہے جو میں عرض کررہا ہوں دوسری تفسیر کی بنا پر نہیں لیکن اگر کوئی دوسری تفسیر کو بھی اختیار کرے تو ہمارے مقصود میں مضر نہیں کیونکہ اس علاج کا نافع ہونا تجربہ سے بھی ثابت ہوچکا ہے تو ایک تفسیر تو اس کی یہ ہے کہ قیامت کے دن بعض بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ اول ان کے بعضے گناہ ظاہر کئے جائیں گے اور وہ ڈریں گے کہ اب دوسروں کی نوبت آئے گی مگر رحمت سے ان کو کہا جائے گا کہ اچھا ہم نے گناہوں کو معاف کیا اور ان کے برابر نیکیاں تم کو دیں اس وقت وہ بندہ عرض کرے گا کہ یا الٰہی میں نے تو اور بھی گناہ کئے ہیں تو بعض نے اس

قصے سے اس کی تفسیر کی ہے مگر یہ تفسیر میرے نزدیک اس لئے مرجوح ہے کہ خود اس حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ سب کے ساتھ نہ ہوگا اور یہاں ہر تائب کے لئے یہ حکم فرمایا گیا ہے تو راجح تفسیر وہی ہوئی جو میں عرض کرتا ہوں اور وہ بھی سلف سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ سیّات سے مراد ملکاتِ سیّآت ہیں اور حسنات سے مراد ملکات حَسَنات ہیں۔

یعنی ہر عمل کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو تکلف سے کیا جائے یا اتفاقاً صدور ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ملکہ ہو جائے۔ اول کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ اتفاق سے ایک جیم نہایت اچھی لکھ دے تو یہ ملکہ نہیں بلکہ اتفاق ہے۔ میرے ایک عزیز نے ایک مرتبہ بے ساختہ ایک شعر لکھدیا تھا جو نہایت ہی لاجواب تھا لیکن ایک کے بعد پھر دوسرا باوجود تعب کے بھی نہیں لکھ سکے وہ شعر یہ تھا۔

نظر جب سے آئی نہیں تیری صورت عجیب قابلِ دید ہے میری صورت

تو یہ شعر تو اتنا عجیب ہے کہ لاثانی ہے مگر چونکہ ان کو فن میں علماً وعملاً ملکہ نہ تھا اس لئے خود اس کی بھی خبر نہ تھی کہ یہ شعر ممتنع النظیر ہے چنانچہ جب دوسرے شعر سے عاجز ہوکر تنگ ہوگئے تو اپنے استاد سے جاکر عرض کیا انھوں نے کہا ظالم! اس میں تیری میری قافیہ ہے تو یہ قافیہ کہاں سے لائے گا۔ علیٰ ہذا میرے ایک دوست نے اپنے وعظ میں لکھنؤ کے ایک سقّے کا ایک مصرعہ سنایا تھا کہ اس کے سامنے کسی نے بارش کے وقت ایک مصرعہ پڑھا تھا

ع۔ اگر یوں ہی پانی برستا رہے گا

تو اُس سقّے نے فوراً دوسرا مصرعہ کہا کہ

ع۔ تو کاہے کو گلیوں برستا رہے گا

یہ تو سب اتفاقیات ہیں یا اسی طرح کوئی تکلف کرکے کہدے تو وہ ہر دفعہ نہ کہہ سکیگا۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ بھی کبھی تو تکلف سے ادا ہوتے ہیں جیسے بعض کو نماز کی عادت نہیں ہوتی مگر مارے باندھے پڑھتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم ایک مرتبہ تہجد کیوقت مسجد میں تشریف لائے سب پڑے سوتے تھے آپ نے ان کو ڈانٹا کہ کمبخت پڑے سوتے ہیں اور تہجد نہیں پڑھتے تو سب کے سب خوف سے اٹھ کر بے وضو ہی پڑھنے لگے لیکن چونکہ

عادت نہ تھی بس ایک ہی دن میں ختم بھی کر دی یا جیسے ساڈھورہ کے ایک پیرزادے کا واقعہ ہے کہ ان کو ایک مولوی صاحب نے زبردستی نماز میں کھڑا کیا نیت بندھوائی تو ان پیرزادے نے نیت میں یہ بھی کہا کہ نماز ظہر کی منہ طرف قبلہ کے ظلم اس مولوی صاحب کا واقعی بعض لوگ تو محض ظلم ہی سے نماز پڑھتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے بعضے کالج ایسے ہی ہیں کہ وہاں کے اکثر طالب علم محض ظلماً ظلمی نماز پڑھتے ہیں تو یہ عمل تکلف سے تھا اور ایک عمل ہوتا ہے ملکہ کے بعد جس سے قلب میں خود تقاضا نیکی کا پیدا ہوتا ہے علیٰ ہذا گناہ سے بچنا بھی کہ اس میں بھی کبھی تو ملکہ کا درجہ ہوتا ہے اور کبھی محض تکلف سے اجتناب ہوتا ہے تو صدور بھی دو طرح ہوا اور اجتناب بھی دو طرح ہوا۔ تو جو عمل بے ملکہ کے ہوگا اس کو پائداری نہیں ہوگی اس کی حالت یہ ہوگی کہ

ع۔ اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند

اور جو عمل ملکہ کے ساتھ ہوتا ہے اس کو دوام ہوتا ہے عراقی رحمہ اللہ اسی کی تمنا میں کہتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سزوار بمن نمائی   کہ دراز و دور بینم رہ ورسم پارسائی

(اے محبوب میرے لئے قلندروں والا رستہ یعنی عشق کا راستہ مناسب ہے وہی راستہ مجھے دکھاوے کیونکہ پارسائی پرہیزگاری یعنی شریعت کا راستہ تو بڑا لمبا ہے)

یعنی وہ محبت اور عشق کا رستہ دکھا دے جس سے عمل پر رسائی ہو اور یہ تکلف کی پارسائی کا رستہ تو بہت دور دراز ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک گاڑی کو تو مزدور لیجائیں جب چھوڑ دیں گے کھڑی ہوجائے گی اور ایک کو انجن لے جائے جس میں اسٹیم بھری ہو۔ بس یہی فرق ہے تکلف اور ملکہ میں۔ اب سمجھئے کہ ہر شخص جس میں ذرا بھی تدین ہوگا گناہ کو چھوڑنا چاہیگا مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ پھر بھی نہیں چھوٹ سکتا بلکہ کشاکش ہوتی ہے تو وجہ اس کی یہی ہے کہ اس کا ملکہ حاصل نہیں اور جس عمل میں ملکہ مساعد نہ ہوگا اس کا فعل یا ترک دونوں نہایت دشوار ہوں گے کیونکہ ملکہ تو ہے اور بات کا اور کوشش کرتا ہے اس کے خلاف کی تو دشواری ہوہی گی تو اصل تدبیر یہ ہے کہ اول گناہ کا ملکہ کم کیا جائے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ زیادہ کھانے سے گناہ کا صدور ہوتا ہے مگر یہ غلط ہے بلکہ اصل وجہ وہی ہے کہ گناہ کے

ملکہ کو نہیں مٹایا اس لئے گناہوں کا صدور ہوتا ہے تو اس کو دور کرو۔ اور اس کے دور کرنے کے لئے بظاہر عمر بایدہ۔ کیونکہ جتنا پرانا مرض ہوتا ہے اتنا ہی طویل زمانہ اس کے زائل ہونے کے لئے بھی چاہیئے وہ جلد زائل نہیں ہوتا چنانچہ مشہور ہے کہ جب محمود غزنوی رحمہ اللہ ہندوستان میں آئے تو سومنات میں ایک ہندو کو ایک بت کے سامنے مراقب بیٹھا ہوا دیکھا ایک سپاہی نے للکار کر اس سے کہا کہ کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ورنہ تلوار سے گردن اڑاتے دیتا ہوں اس نے کہا ذرا ٹھہرو کہتا ہوں جب تلوار ہٹالی تو چپ ہو رہا کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا سپاہی نے کہا تو کئی بار حیلے کر چکا ہے اب کی بار میں نہ چھوڑونگا ورنہ کلمہ پڑھ تب اُس ہندو نے کہا کہ میاں سپاہی چاہو مارو چاہو چھوڑو اتنی جلدی تو کلمہ نہیں پڑھ سکتا۔ دیکھو میری عمر نوّے برس کی ہے تو نوے برس کا رام تو نکلتے ہی نکلتے نکلے گا مسلمان تو ہو جاؤں گا مگر مجھے دو چار دن کی مہلت دو دیکھو پرانا مرض اس دشواری سے جاتا ہے۔ ایک اور حکایت یاد آئی کہ ایک چور کسی بزرگ سے بیعت ہو گیا۔ اور چوری سے توبہ کی اور خانقاہ میں رہنا شروع کیا جب رات ہوتی تو چوری کا جوش ہوتا مگر عہد یاد آتا تو طبیعت کو روکتا آخر جب طبیعت بہت بے چین ہوتی تو اٹھتا اور تمام لوگوں کے جوتے اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر کر دیتا اور پھر جا سوتا تمام لوگ سخت پریشان ہوتے آخر ایک دن لوگوں نے ان کو دیکھ لیا اور پکڑ کر پیر صاحب کے پاس لے گئے۔ پیر صاحب نے پوچھا کہ بھائی یہ کیا حرکت ہے تو نے تو توبہ کر لی تھی کہنے لگا کہ جناب میں نے چوری سے توبہ کر لی ہے ہیرا پھیری سے نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ میں رئیس السارقین ہوں پچاس برس کی بری عادت ہے ہر روز رات کو قلب میں تقاضا پیدا ہوتا ہے مگر چونکہ آپ سے عہد کیا ہے اس لئے روکتا ہوں جب تقاضے سے مجبور ہوتا ہوں تو نفس کو اس پر راضی کرتا ہوں کہ لوگوں کے جوتے اِدھر سے اُدھر کو کر دوں گا یہ بھی ایک قسم کی چوری ہے اب آپ کو اختیار ہے اگر آپ اس کو چھوڑ آئیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ میں پھر چوری کرنے لگوں گا پیر صاحب نے کہا کہ اچھا تم کو ہیرا پھیری کی اجازت ہے تو جس چیز کا ملکہ ہوتا ہے وہ فرد بار بار عود کرتا ہے اور یہاں ایک فائدہ بطور جملہ معترضہ کے ہے وہ یہ کہ کبھی سالک کو

بعد خلوات و ریاضات کے بھی میلان ہوتا ہے معاصی کی طرف اور اس میں آکر شیوخ پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اذکار و اشغال سب بیکار گئے کامیابی نہیں ہوئی سو یہ غلط ہے ذکر و شغل نافع ہوا لیکن اس کا نفع یہ نہیں ہے کہ میلان بھی نہ رہے البتہ جو تقاضا قبل مجاہدہ ہوتا تھا کہ اس کا دفع و مقابلہ دشوار تھا اب مقابلہ آسان ہے باقی نفس میلان وہ گاہ گاہ ہو سکتا ہے اور اس میں دھوکا اس سے ہو جاتا ہے کہ اکثر ابتداءً سلوک کی حالت میں بالکل میلان نہیں رہتا اس سے خیال ہوتا ہے کہ منتہی کو بدرجۂ اولیٰ نہ ہونا چاہیئے حالانکہ یہ قیاس غلط ہے کیونکہ سالک کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اول اول ولولہ میں اس کو گناہ سے سخت نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس وقت ذکر کی لذت کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر یہ لذت اخیر تک نہیں رہتی جیسا کہ ہر کام کا قاعدہ ہے کہ ابتداء میں اُس میں لذت ہوتی ہے اور اس کا غلبہ ہوتا ہے پھر آخر میں مُساوات سی ہو جاتی ہے اسی مضمون کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ ایک مرتبہ ایک مرید کے جواب میں کہ انھوں نے سابق جیسی لذّت ذکر میں نہ ہونے کی شکایت کی تھی بطور لطیفہ کے فرماتے تھے کہ میاں پرانی جورو ماں ہو جاتی ہے مطلب یہ تھا کہ لذت کا جوش جو ابتداء میں ہوتا ہے وہ اخیر میں نہیں رہتا۔ پس بیوی کے متعلق اتنا ہی کام رہ جاتا ہے کہ ماں کی طرح وہ ان کی خدمت کرے۔ ایک بھولے سیدھے نواب صاحب کی حکایت سُنی ہے کہ ان کی بیوی مر گئی تھی کلکٹر تعزیت کے لئے آئے اور کہنے لگے کہ ہم کو افسوس ہوا کہ آپ کی بیوی مر گیا۔ اس پر نواب صاحب فرماتے ہیں کہ جناب وہ بیوی نہ تھا ہمارا اماں تھا۔ اسی طرح ابتدائے ذکر میں لذّتِ ذکر کا جوش ہوتا ہے اُس وقت ترکِ معاصی کا تو کیا ذکر ہے ترکِ آباؤ ترکِ ازواج اور ترکِ اہل تک کی سوجھتی ہے مگر اس جوش کی مثال صبح کاذب کی سی ہے کہ اُس میں ضیاء تو صبح صادق سے زیادہ ہوتی ہے مگر اُس کو بقا نہیں ہوتا اسی کو فرماتے ہیں ؎

اى شده تو صبح کاذب را رہیں　　صبح صادق را ز کاذب ہم ببیں

(اے شخص تو صبح کاذب کے پیچھے ہی لگ گیا ہے۔ صبح صادق اور صبح کاذب میں فرق دیکھ)

کہ تم تو صبح کاذب کے مرہون ہو گئے اس کو چھوڑ و اور کاذب و صادق میں تمیز پیدا کرو۔ دیکھو

ایک پھول وہ ہوتا ہے جو آکر جھڑ جاتا ہے اور اس کے بعد پھر اصلی پھول آتا ہے جس پر پھل آتا ہے اسی طرح ایک حالت راسخ ہوتی ہے اور ایک عارض۔ تو ابتداء میں جو حالت ہوتی ہے وہ قائم اور باقی اور صادق حالت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر ترکِ ذکر نہ کرے تو اس کے بعد جو حالت پیدا ہوگی وہ صادق ہوگی اور وہ مقام کہلاتا ہے مگر اس میں جوش و خروش اور ولولہ نہ ہوگا اس کی حالت پختہ ہنڈیا کی سی ہوگی کہ اس میں نہ قلیان ہوتا ہے نہ شور ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا کہ مَا النِّهَايَةُ تو فرمایا اَلْعَوْدُ اِلَى الْبِدَايَةِ۔ یعنی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ عوام الناس تو یہ سمجھیں کہ یہ عوام میں داخل ہیں اور خواص واقفین یہ جانیں کہ یہ خواص میں سے ہیں جیسے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حالت تھی کہ وہ بالکل عوام میں ملے جلے رہتے تھے بازاروں سے جا کر ترکاری بھی لے آتے تھے تو انتہا میں جوش وغیرہ تو جاتا رہتا ہے لیکن ایک دوسری قسم کی حلاوت لطیف پیدا ہوتی ہے پہلی حالت کی مثال گڑ کی شیرینی کی سی ہے اور دوسری حالت کی مثال قند کی شیرینی کی سی ہے کہ گڑ کی شیرینی کا ادراک تو ہر عامی شخص کو بھی ہوتا ہے لیکن قند کی شیرینی چونکہ لطیف ہے اس کا کامل ادراک ہر شخص کو نہیں ہوتا صرف لطیف المزاج ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ دیوبند میں شیخ کرامت حسین نے اپنے فرزند کی شادی کی تو اس میں چماروں کو بھی جو کہ بیگار میں آئے تھے کھانا دینے کا حکم دیا کھانے کے ساتھ فرینی تھی جب فرینی سامنے آئی تو چکھ کر چمار کہتے ہیں کہ یہ تھوک سا کیا ہے تو جیسا ان چماروں نے فرینی کی شیرینی کو نہیں سمجھا اسی طرح عامی بھی منتہی کی حالت کو نہیں سمجھ سکتے ؎

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

(جو ابھی درویشی میں کچا ہے وہ پختہ اور کامل درویشوں کے حالات کو نہیں سمجھ سکتا بس ٹھیک بات تو یہی ہے کہ ان کے ساتھ بحث و مناظرہ نہ کیا جائے بلکہ انھیں ان ہی کے حال پر چھوڑ دیا جائے)

اس شعر سے ایک نیا مسئلہ اس وقت یہ بھی سمجھ میں آیا کہ پختہ لوگوں کو چاہیئے کہ خام سے گفتگو نہ کیا کریں کیونکہ وہ ان کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کی تائید اس شعر سے ہوتی ہے۔

۵ با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(جو خواہ مخواہ درویشی کے دعویدار ہوں اُن سے عشق و مستی کی راز کی باتیں مت کہو ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو تاکہ وہ اپنی اسی خود پرستی میں ٹھوکریں کھاتے رہیں)

کہ ان منکرین کو شبہات ہی میں مرنے دو ان سے اسرار عشق نہ کہو تو عوام کو منتہی کی حالت کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ منتہی میں جوش و خروش نہیں رہتا چونکہ غلبۂ لذت ذکر نہیں رہتا اور جب اس لذت کا غلبہ نہیں رہتا اور یہی لذت غالب تھی میلان الی المعصیۃ پر اس لئے کبھی کبھی معاصی کی طرف میلان ہو جاتا ہے اور ناواقفی سے اس وقت سالک کو سخت شکستہ دلی ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میری محنت و مجاہدہ بالکل بیکار ہوا حالانکہ اس کو شکستہ دل نہ ہونا چاہیئے کیونکہ میلان الی المعصیۃ مذموم نہیں اصل مذموم تو معصیت ہے اور مفضی قریب الی المذموم تقاضائے معصیت ہے اس لئے اس کو بھی زائل کیا جاتا ہے اور مجاہدے کے بعد تقاضا باقی نہیں رہا اور جب تقاضا باقی نہیں رہا تو معلوم ہوا کہ یہ ناکام نہیں بلکہ کامیاب ہے ہاں اگر پھر تقاضا ہونے لگے تو پھر مجاہدہ کرے خیر یہ ضمن میں ایک بات بطور جملہ معترضہ کے یاد آگئی تھی اس کو بھی عرض کر دیا مگر بالاصالۃ یہ کہہ رہا تھا کہ قاعدہ کے موافق اتنے مجاہدوں کے بعد تبدیل ملکہ میں کامیابی ہوتی ہے مگر ظاہر ہے کہ ہر شخص مجاہدہ کے لئے آمادہ نہیں ہے تو پھر ایسے لوگوں کے لئے اس تبدیل کی کیا تدبیر ہے اور ضرورت اس تبدیل کی اوپر ثابت ہو چکی ہے کہ بدون اس کے معاصی سے بچنا سخت دشوار ہے سو خدا کا فضل ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے اس آیت سے یہ سمجھ میں آیا کہ توبہ کرنے میں بھی وہی خاصیت ہے جو مجاہدہ میں ہے یعنی جس مجاہدے نے ملکۂ معصیت کو جو کہ منشا گناہ کا تھا بدل دیا تھا۔ اور جس کا اثر یہ ہوا تھا کہ گناہ کا تقاضا نہ رہا تھا اس مجاہدے کے قائم مقام یہ ایک بے مشقت بوٹی ہے یعنی توبہ جس کے لئے کہیں جانا بھی نہیں پڑتا اور جس کے عامل کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ۵

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است چوں کوئی دوست ہست بہ صحرا چہ حاجت است

(جس نے خلوت و تنہائی کا مزہ چکھ لیا وہ ہنگامہائے حیات سے بے نیاز ہے اور جو کوچۂ جاناں سے

آشنا ہو گیا اس کا جنون صحرا و بیابان کی تلاش نہیں کرتا)

اور جس کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ ؎

سمست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

(اگر تجھے جذبۂ عشق و محبت اب بھی چمن کے رنگ و بو کی طرف کھینچ لے جائے تو افسوس ہے

تو خود ایک حسین غنچے کی طرح کھلا ہوا ہے اپنے دل کا دروازہ کھول اور اس باغ و بہار کی سیر کر)

اور یہ کہیں گے ؎

اے برادر عقل یکدم باخود آر دمبدم در تو خزاں ست و بہار

(اے بھائی عقل کو کام میں لا اور سوچ تو ہی بہار اور خزان تو ہمہ اوقات تیرے

اندر موجود ہیں)

اس سہل نسخہ کی نسبت الحمدللہ کہ امتحان سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس میں وہی اثر ہے جو مجاہدہ میں ہے اور مجھے افسوس ہوتا ہے جب دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ معالجہ نہیں آتا۔ صاحبو! امتحان تو کرو اور بحمداللہ میں نے تو اپنے دوستوں پر اس کا امتحان کر کے آپ صاحبوں کے سامنے پیش کیا ہے اور امتحان اس طرح کیا گیا کہ خاص دوستوں کو یہ کہا گیا کہ جب گناہ ہو جایا کرے تو بہ کر لیا کرو اگر پھر ہو جائے پھر توبہ کر لو پھر ہو جائے پھر توبہ کر لو۔ غرض جب گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو فوراً توبہ کر لیا کرو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ آئے گا جو گناہ کے مادہ کا یا لکلیہ قلع قمع ہو جائے گا۔ دیکھئے اس میں نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ بار بار جو توبہ کرنے کا حکم ہے اس میں یہ بھی ایک مصلحت ہے افسوس ہے کہ بعض لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ شریعت نے یہ ایک کھیل ہم کو بتلا دیا ہے۔ صاحبو! اس علاج کا اثر یہ ہے کہ وہ گناہ ساری عمر چلے ہی گا نہیں کیونکہ ہرگز ممکن نہیں کہ آدمی بار بار توبہ کرے اور پھر گناہ چلتا رہے بار بار توبہ کرنے کی نسبت فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا (اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گذرتے ہیں جس میں زیادتی ہو اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں

پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے) حدیث شریف میں ہے مَآ اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً (جو توبہ کرتا رہتا ہے پھر چاہے وہ دن میں ستر مرتبہ گناہ کر بیٹھے گناہ پر اصرار کرنے والا نہیں) صاحبو! کیا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے کہ جب گناہ ہو گیا توبہ بھی کر لی۔ دیکھو جب گناہ کرتے ہو تو کس توجہ سے کرتے ہو کہ پیر بھی ہلاتے ہو ہاتھ بھی ہلاتے ہو ارادہ بھی کرتے ہو تو اگر توبہ میں بھی ذرا زبان اور قلب کو حرکت دے لیا کرو تو کیا دشوار ہے اصل یہ ہے کہ جب شیطان نے دیکھا کہ یہ تو بڑا چلتا ہوا نسخہ ہے اور سب ہی اس کا استعمال کریں گے اور میری ساری کوشش جو گناہ کرانے میں ہوئی تھی مٹ جائے گی تو اس نے ہم کو اس طرح گمراہ کیا کہ اس علاج کی وقعت ہی دلوں سے نکال دی اور یہ سمجھا دیا کہ جب پھر گناہ ہو جائے گا تو توبہ سے کیا فائدہ چنانچہ عام طور سے سب اس میں مبتلا ہیں کہ توبہ اس وقت کرتے ہیں جبکہ بالکل ہی ترک کا یقین کر لیتے ہیں اور جب تک یہ اندیشہ رہتا ہے کہ پھر ہو جائے گا تو توبہ ہی نہ کریں گے۔ صاحبو! توبہ ہر حالت میں کرنا ضروری اور مفید ہے

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی بازآ گر کافر و گبر و بت پرستی بازآ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی بازآ

(تو پھر آ تو پھر آ تو جیسا بھی کچھ ہے پھر آ اگرچہ کافر یا بت کا پوجنے والا ہے پھر بھی آ جا۔ ہمارا یہ دربار ناامیدی کا دربار نہیں۔ سو دفعہ بھی اگر تو توبہ کو توڑ چکا ہے پھر بھی آ جا)

علاوہ اس کے میں کہتا ہوں کہ اندیشہ ابتلاء فی المعصیۃ کی صورت میں اگر بالفرض توبہ مفید بھی نہ ہوتی جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے تب بھی توبہ کر لینے میں کوئی حرج بھی تو نہیں ہے اور اس سے کوئی نقصان بھی تو نہ ہو جائے گا۔ مثلاً اگر ایک شخص دن میں پانچ مرتبہ شراب پیتا ہے اور ہر دفعہ توبہ کر لے تو اُس کا نقصان کیا ہوا۔ غرض انتہائے مرتبہ پر پہنچ کر میں صلح کرتا ہوں کہ اگر آپ کے خیال کے موافق اس کوئی نفع بھی نہیں لیکن کوئی نقصان بھی تو نہیں ہے۔ افسوس کہ ایسی اکسیر کی پوڑیہ مگر شیطان برتنے

نہیں دیتا۔ صاحبو! یہ عمل دس پانچ مرتبہ کر کے تو دیکھو واللہ یقیناً گناہ چھوٹ جائیں گے
میں صلائے عام دیتا ہوں کہ جس گناہ کو کوئی شخص چھوڑنا چاہے اس کے لئے یہ کافی
تدبیر ہے کہ جب وہ ہو جایا کرے فوراً ہی اس سے توبہ کر لیا کرے۔ کیا کسی نے کبھی ایسا
سہل علاج سنا ہے۔ یہ ہیں قرآن شریف کے علوم جو اُمّۃ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئے
ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر گناہ کے بعد ضرور توبہ کر لیا کرے اس سے ان کے بُرے
ملکات مبدّل بہ ملکاتِ حَسنہ ہو جائیں گے اس کو فرماتے ہیں فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ
سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ یہ وعدہ ہے جو قرآنِ کریم میں کیا گیا ہے اور اگرچہ آیت شریف
کی دلالت اس پر ظنّی ہے لیکن یہ تفسیر دوسری تفسیر سے راجح ہے اور دوسری تفسیر اس کے
مقابلے میں مرجوح ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے بتلایئے اس علاج میں کیا دشواری
ہے چونکہ مسلمانوں میں یہ مرض عام ہے کہ وہ گناہ کے چھوڑنے کو سخت دشوار سمجھتے ہیں اس لئے
میں نے اس کو یہ علاج بتلا دیا کہ بار بار توبہ کر لیا کرو مگر توبہ بھی اسی طرح کی ہو کہ جس طرح سے
ذاتِ پاک نے ہم کو بتلائی ہے اور اس کی تعلیم ہم کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
واسطے سے پہونچی ہے اور وہ طریقہ موافق حدیث کے یہ ہے کہ اول وضو کرو اور دو رکعت
پڑھو اور خوب دل لگا کر دعا مانگو اور دل لگانے کا ارادہ کرو گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ
دل بھی لگنے لگے گا۔ باقی یہ سوال کہ اگر دل نہ لگے تو کیا کریں اس کے جواب میں یہ کہوں گا
کہ اگر ایسا ہے جیسا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد کا اگر تھا کہ امام صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں جب کہ سب اپنی اپنی پوچھ رہے تھے ان سے کہا
کہ تم کبھی کچھ نہیں پوچھتے کہنے لگے کہ اب کے پوچھوں گا امام صاحب نے اثناء تقریر
میں اتفاقاً یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ جب سورج چھپ جائے تو روزے کے افطار میں تاخیر
نہ کرے آپ سنکر فرماتے ہیں کہ کیوں حضرت اگر کسی دن سورج نہ چھپے تو کیا کرے امام
صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہاں بھائی تمہارا ساکت ہی رہنا اچھا ہے جس طرح سے
ایک ساس بہو کی حکایت مشہور ہے کہ بہو بالکل ہی نہیں بولتی تھی ساس نے کہا کہ بہو
بولا کرو ورنہ لوگ گونگا کہیں گے۔ آخر کہنے سننے سے بولی تو یہ کہ اماں اگر تمہارا لڑکا

مر گیا تو میرا دوسرا بیاہ بھی کرادو گی اس نے کہا بس بھائی ایسے کا خاموش ہی رہنا بہتر ہے تو جیسا حال امام صاحب کے اس شاگرد کا تھا ویسا ہی اگر آپ کا بھی ہے۔ صاحبو! پہلے عمل کر کے تو دیکھو پھر دیکھنا دل لگتا ہے یا نہیں ممکن نہیں کہ ایک شخص خدا تعالیٰ کے سامنے دیر تک متوجہ ہو کر بیٹھے اور دل نہ لگے ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور دل لگے گا۔ اور جب دل لگنے لگے تو دعا اور استغفار کر و اور فارغ ہو جاؤ اور اگر وہ گناہ پھر ہو جائے پھر ایسا ہی کر و اس کے بعد دیکھو کہ وہ گناہ کیسا رفو چکر ہوتا ہے۔ صاحبو! غضب ہے کہ محمد بن زکریا اگر ایک نسخہ بتلائے تو اس کا تو یقین کر لو اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ کے بتلائے ہوئے نسخہ پر یقین نہ کرو تو کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ کا ارشاد نعوذ باللہ محمد بن زکریا کی رائے سے بھی کم ہے۔ اسی ارشاد کی ترجیح کی تعلیم فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں ! حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں
صحتِ ایں حس بجوید از طبیب صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں حس ز معموریِ تن ! صحت آں حس ز تخریبِ بدن

(یونانی حکیموں کی باتیں تم نے بہت پڑھ لی ہیں اب ایمان والوں کی باتیں بھی پڑھو جسمانی احساس کی درستی طبیب سے کراؤ اور ایمانی احساس کی درستی محبوب سے کراؤ۔ جسمانی احساس کی درستی جسم کی درستی سے ہوتی ہے اور ایمانی احساس کی درستی جسم سے بے نیاز ہو جانے میں ہے)

تخریب بدن کا مطلب یہ ہے کہ حظوظِ نفسانیہ کو چھوڑ دو حرام کو بالکلیہ اور مباح کو انہماک کے درجے میں۔ صاحبو! اس میں ہرگز شک نہ کرو آزمانے ہی کے لئے چند روز تک کر دیکھو ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش

(تو برسوں تک پتھر کی طرح دل کو زخمی کرنے والا بنا رہا یہ بھی آزما کر دیکھ لو کہ کچھ دیر کے لئے مٹی بن جاؤ۔)

یہ ہے طریق استعمال کا۔ اب یہ بات رہی کہ اس معالجہ کو اس مرض کے ازالہ میں دخل کیا ہوا اور یہ کیوں مؤثر ہے۔ سو اول تو یہ سوال ہی لغو ہے کیونکہ ممکن ہے اس میں بالخاصّہ یہ اثر ہو جیسے مقناطیس میں جذب آہن کا اثر ہوتا ہے۔ دوسرے اگر یہ مؤثر بالکیفیۃ ہی ہو تو ہم نے جاننے کا کب دعویٰ کیا ہے۔ تیسرے اگر ہم جانتے بھی ہوں تو کیوں بتلائیں کیونکہ مریض کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں کہ گل بنفشہ کیوں مؤثر ہے اور اس کا کیا مزاج ہے دیکھو اگر کوئی بادشاہ کسی کو کچھ روپیہ عطا فرمائے اور وہ سوال کرے کہ یہ بتلائیے کہ یہ روپیہ ٹکسال میں کس طرح بنتا ہے تو اس کو گستاخ اور بے ادب سمجھا جائے گا لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی میں بتلائے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ نفس کو عبادت کا کرنا سخت ہوتا ہے اور تو بہ خصوص نفلیں پڑھ کر یہ ایک گراں عبادت ہے پس جب کوئی شخص یہ التزام کرلے گا کہ جب گناہ ہو جایا کرے ہر دفعہ تو بہ بھی کیا کرے اور اس کے لئے وضو کیا کرے اور نفلیں پڑھا کرے تو نفس اس سے سخت پریشان ہوگا اور بآسانی صلح اس پر کرلے گا کہ میں اب گناہ نہ کروں گا اس کی بالکل ایسی حالت ہے جیسے شریر لڑکا کہ کسی طرح نہ مانتا ہو لیکن جب اس کے لئے میاں جی یہ تجویز کردیں کہ اس کے گلے میں اتنا بھاری پتھر ڈالو کہ اس سے اُٹھ ہی نہ سکے تو وہ فوراً سیدھا ہو جاتا ہے تو نفس بھی اعمالِ صالحہ کو چونکہ بوجھ سمجھتا ہے اس لئے اس بوجھ کے رکھتے ہی گناہ سے باز آجاتا ہے اور اس کو عبادت سے یہاں تک گرانی ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اُس نے بیان کیا کہ میں کسی مقام پر روپیہ دفن کرکے بھول گیا ہوں ہر چند یاد کرتا ہوں لیکن کسی طرح یاد ہی نہیں آتا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تم جاکر نفلیں پڑھنا شروع کردو اور جب تک روپیہ یاد نہ آئے برابر نفلیں پڑھتے رہو اس ترکیب سے ان شاء اللہ بہت جلد یاد آجائے گا۔ چنانچہ اس نے جاکر نفلیں شروع کیں چند ہی نفلیں پڑھی تھیں کہ بہت جلد روپیہ کی جگہ یاد آگئی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فراست سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ شیطان نے اس کو پریشان کرنے کے لئے روپے کی جگہ بھلادی ہے جب یہ نفلیں پڑھے گا

اور شیطان کو نفلیں پڑھنا ناگوار ہوں گی تو نفلوں سے روکنے کے لئے فوراً اس جگہ کو یاد دلا دے گا مگر یہ دریافت کرنا بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا کام تھا کہ یہ شیطان نے بہکایا ہے غرض نفس اور شیطان عبادت سے بہت گھبراتے ہیں۔

دوسری مثال اس کی ایسی ہے کہ جیسے بچے کے دودھ چھڑانے کے وقت اکثر چھاتیوں کو ایلوا لگا دیتے ہیں کہ وہ جب دودھ پینے کا ارادہ کرتا ہے فوراً ہی تلخی منہ میں پہونچتی ہے بس وہ دودھ ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح چونکہ عبادت بھی نفس کو سخت بار اور ناگوار ہوتی ہے اس لئے اس کی ناگواری کے اندیشے سے وہ اپنی مرغوب چیز یعنی معصیت کو چھوڑ دیتا ہے لیکن اس میں اتنا شبہ رہا کہ جب یہ علت ہے تو نفس کو تو ہر عمل صالح میں گرانی ہوتی ہے تو پھر تو بہ ہی کی کیا تخصیص ہے دوسرے اعمال کا بھی یہی اثر ہونا چاہیئے۔ جواب یہ ہے کہ اول تو اوپر آچکا ہے کہ اس تبدیل کے لئے توبہ کے ساتھ دوسرے اعمال صالحہ بھی شرطِ عادی ہے دوسرے ممکن ہے کہ اور اعمال تو اپنی نوع کے اعتبار سے کہ وہ عمل صلح ہے مؤثر ہوا اور توبہ اپنے مرتبۂ شخص میں بھی مؤثر ہو۔

تیسرے توبہ میں یہ تو ضرور ہی کہے گا کہ میرا قصور معاف کر دیجئے اور یہ طبعی بات ہے کہ جب کوئی اپنے کسی بڑے سے بار بار معافی چاہے اور آئندہ موافقت کا عہد کرے تو پھر اُس کے خلاف کرتے ہوئے شرماتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ دل سے توبہ ہو کیونکہ اسی سے عہد کے یاد میں رسوخ ہو جائیگا اور اس سے طبعی طور پر حیاء غالب ہوگی۔

چوتھی وجہ ایک اور ہے جو کہ قرآن شریف سے سمجھ میں آئی یعنی اگلی آیت شریف میں فرماتے ہیں وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللهِ مَتَابًا ترجمہ یہ ہے کہ جو توبہ کرتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے اب اس آیت شریف کے ساتھ حدیث شریف کو ملایئے۔ فرماتے ہیں حدیث قدسی میں

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تقربتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً (اور یہیں سے آپ کو یہ بھی کائی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قرآن شریف سے بغیر استعانت حدیث شریف کے کسی مقصود کا اثبات کم ممکن ہے۔ جامع) یعنی خدا تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ جو شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے خدا تعالیٰ اس سے زیادہ اس شخص کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ اور اس توجہ سے وہ بُعد جو وجوب اور امکان کے سبب سے تھا اور جس کی وجہ سے بندے کو خدا تک پہونچنا مصیبت تھا وہ جاتا رہتا ہے اور یہ بعد ہر چند کہ خدا تعالیٰ کی توجہ سے دور ہوتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی توجہ کی شرط یہ ہے کہ بندہ متوجہ ہو اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بچہ ہے کمزور اور وہ باپ سے دور کھڑا ہے اب اگر وہ باپ تک پہونچنا چاہے تو وہ بدون اس کے ممکن نہیں کہ خود باپ آگے بڑھ کر اس کو اٹھالے کیونکہ درمیانی مسافت کو وہ بچہ قطع نہیں کرسکتا لیکن بعض اوقات باپ کی توجہ کی شرط یہ ہوتی ہے کہ بچہ ہاتھ پھیلا کر آنے کی کوشش کرے۔ تو اسی طرح بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان جو بُعد ہے وہ بندہ کے قطع کئے قطع نہیں ہوتا ؎

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہوتا بلکہ یہ آپ ہی آپ بڑھتا ہے جیسے شاخیں کاٹنے سے پودے بڑھتے ہیں)

تو جب یہ راہ قطع ہوگی خدا تعالیٰ ہی کی عنایت سے ہوگی مگر اُس کے لئے شرط عادی ہے کہ بندہ کی طرف سے توجہ ہو اس لئے فرمایا ہے مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا الخ غرض اس طرح خدا تعالیٰ اُس کو آغوش رحمت میں لے لیتے ہیں۔ تو ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ جو توبہ کریگا وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا جو آیت سے ثابت ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہوا جو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا خدا تعالیٰ اُسکی طرف متوجہ ہوگا جو حدیث شریف سے ثابت ہے نتیجہ یہ نکلا کہ جو توبہ کرے گا خدا تعالیٰ اسکی طرف متوجہ ہوگا۔

اب اس کے ساتھ ایک اور مقدمہ ملایئے کہ جس کی طرف خدا تعالیٰ متوجہ ہوں گے وہ یقیناً اعدار کی دست بُرد سے محفوظ رہے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو توبہ کرے گا وہ اعدار (نفس وشیطان) کی دست بُرد سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ خود شیطان نے بھی ایسے لوگوں کو مستثنیٰ کیا تھا جبکہ کہا تھا لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (میں ضرور ضرور ان سب کو بہکاؤں گا سوائے ان کے جو تیرے مخلص بندے ہیں) اور معصیت اثر ہے نفس وشیطان کی دست بُرد کا پس وہ اس سے محفوظ رہے گا اور عادۃً بدون تبدیل ملکات کے محفوظی مستعبد ہے پس توبہ وعملِ صالح پر اس طرح تبدیل ملکات مرتب ہوگیا۔ اور یہی معنی ہیں اس کے اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ط اب اس مسئلہ میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا ہر طرح اچھی طرح ثابت ہوگیا۔ اب میں مکرر اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں تاکہ یاد رہنا آسان ہو اور اسی پر بیان کو ختم کردوں گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص مجاہدہ نہ کرسکے اس کے لئے بھی خدا تعالیٰ نے ترکِ معاصی کا ایک علاج مقرر فرمایا ہے جو نہایت ہی سہل ہے یعنی جو طالب ہوا اور مجاہدہ پر قادر نہ ہو وہ یہ کرے کہ جب گناہ ہوجایا کرے فوراً توبہ کرلیا کرے اور اگر معاودت ہوجائے پھر فوراً توبہ کرے۔ یہ ہے وہ علاج اور اگر اب اس سہولیت پر بھی کوئی اس کو اختیار نہ کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی طینت ہی خراب ہے اپنی اصلاح ہی نہیں چاہتا تو اُس کے لئے یہ کہا جائیگا کہ ؎

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اور آخر میں یہ کہا جائے گا کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط
اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ فہم دے۔ آمین۔

تمت بالخیر

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

دعواتِ عبدیت

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۲۷۷۶۲۰ - ۲۷۷۰۰۹۴

کتب خانہ اشرفیہ
قاسم سینٹر، دوکان نمبر ۳۳، اردو بازار کراچی
فون: ۲۲۱۳۰۵۸

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃً
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد پنجم کا

پہلا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ العلماء

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ا
ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد پنجم کا

پہلا وعظ ملقب بہ

ضَرُورَۃُ العُلَمَاءِ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمیناً تعداد	متفرقات
خورجہ چوپال حشمت اللہ خان صاحب	۸ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۳۰ھ اتوار	۳ گھنٹے	کھڑے ہوکر	دنیا میں سب سے زیادہ ضرورت علماء دین کی ہے	سعید احمد تھانوی	۲۰۰ دوسو	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بعد فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً ط اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

(تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو عاجزی سے بھی اور چپکے چپکے بھی (واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو دعاء میں حد ادب سے نکل جاویں اور دنیا میں بعد اس کے کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس سے ڈرتے رہو اور اس سے امیدوار ہوتے ہوئے بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے)

ہر چند کہ اس وقت میں نے دو آیتیں پڑھی ہیں جن کے سننے کے بعد یہ انتظار ہوگا کہ ان دونوں کی تفسیر بیان کی جائے گی۔ مگر اس وقت مقصود ان آیات کے مدلول میں سے صرف ایک ہی جزو کا بیان کرنا ہے یعنی لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ کا کہ اس سے ایک دعوے کا مستنبط کرنا ہے باقی اس جزو کے سیاق و سباق کو اس دعوے کے لئے مؤید بتانا ہے اور اس سیاق و سباق سے اس دعویٰ پر استدلال کرنا ہے وہ دعوے جس کو ثابت کرنا ہے نہایت عجیب ہوگا مگر بالکل سچا اور مانوس اور واقع کے مطابق ہوگا اور اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ دعوے پہلے کے نزدیک مسلّم تھا مگر عدم تدبر کی وجہ سے متکلم فیہ ہوگیا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بعض السنہ پر اس کی ضد کا دعویٰ ہونے لگا ہے لیکن اگر ذرا تدبر سے کام لیا جائے گا تو وہ دعویٰ بالکل فطری معلوم ہوگا۔ علماء کے نزدیک تو اس کا فطری ہونا مسلّم ہی ہے لیکن مدعیانِ عقل کے نزدیک بھی اس سے انکار نہ ہو سکے گا۔ مگر پھر بھی اس دعوے کو عجیب اس لئے کہا کہ اس وقت قلت علم سے بکثرت لوگوں کو اس میں تعجب ہونے لگا ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ عقائد میں داخل ہوتا مگر اس وقت اس کی ضد عقائد میں داخل ہوگئی ہے تو چونکہ وہ عام خیالات کے خلاف ہے اور دنیا کا اکثر حصہ اس وقت عامیوں ہی کا ہے اس لئے وہ دعوے اس وقت عجیب ہوگیا اور وہ دعوے اس سوال کا جواب ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ضروری وجود کس کا ہے اور وہ ضرورت بھی دنیوی حیثیت سے جس کے لوگ طالب ہیں نہ کہ دینی حیثیت سے جس کو ترک کر دیا گیا ہے اور اس قید سے ظاہر ہے کہ یہ سوال

عام لوگوں کی نظر میں نہایت باوقعت و قابل اہتمام ہوگا کہ وہ کونسی چیز ہے کہ فلاح دنیوی کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

سو جواب اس سوال کا یہ ہے کہ فلاح دنیوی کے لئے بھی سب سے زیادہ ضروری وجود جماعت علماء کا ہے اور اس دعوے کا عام خیالات کے خلاف ہونا ظاہر ہے کیونکہ عموماً لوگ ان کو نکمّا سمجھتے ہیں پھر ان میں جو بے باک ہیں وہ تو صاف کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایسے نکمّے ہیں کہ انھوں نے دوسروں کو بھی نکما کر دیا اور جو ذرا تہذیب سے کام لیتے ہیں وہ عام مجمعوں میں تو ایسا نہیں کہتے مگر اس عقیدے کے جو آثار ہیں وہ ان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور جب آثار پائے جاتے ہیں تو وہ بھی عملاً مدعی ہیں اور دعوے عملی قولی دعوے سے زیادہ قوی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص تو یہ کہے کہ میں پانی پیوں گا اور ایک جا کر پی ہی لے تو اگرچہ دوسرے نے زبان سے پانی پینے کا دعوےٰ نہیں کیا لیکن اس کا عمل پہلے کے لسانی دعوے سے زیادہ قوّت کے ساتھ اس کے دعوے کو ثابت کر رہا ہے اور وہ آثار جو اس عقیدے کے خواص ہیں سے ہیں یہ ہیں کہ وہ شخص جو کہ اس مضمون کا کہ یہ جماعت نکمّی ہے معتقد ہوگا وہ اس جماعت سے معرض ہوگا اور اس کی طرف متوجہ ہونے کو پسند نہ کرے گا بلکہ دوسروں کو بھی اس جماعت کے ساتھ تعلق رکھنے سے روکے گا اب دیکھ لیجئے کہ عقلاء زمانہ میں یہ آثار پائے جاتے ہیں یا نہیں اور وہ ان امور کے مرتکب ہیں یا نہیں سو ظاہر ہے کہ یہ آثار واقع ہو رہے ہیں اس لئے میں کہتا ہوں کہ عام طور پر یہ لوگ اس جماعت کو ناکارہ سمجھتے ہیں اس لئے یہ دعوےٰ کہ سب سے زیادہ ضروری وجود ان ہی کا ہے اس طور پر عجیب ہوگیا۔ اب میں اس دعوے کے اثبات کی تقریر کرتا ہوں مگر اس دعوےٰ کے اثبات سے پہلے میں ایک اور بات دفع توحّش کے لئے یہ کہتا ہوں کہ اس کے ثابت کرنے سے مجھ کو یہ کوشش کرنا مقصود نہیں ہے کہ سب مولوی ہو جائیں۔ ممکن تھا کہ اس جماعت کو سب سے زیادہ ضروری الوجود سن کر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ اب یہ رائے دی جائے گی کہ سب لوگ مولوی ہو جاویں

اس لئے رفع وحشت کے واسطے ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ میرا یہ مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی رہنا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کو اس جماعت سے وابستگی رہنا چاہیئے اب تو وحشت بالکل دور ہوجانا چاہیئے کیونکہ سب کو مولوی نہیں بنایا جاتا صرف اتنی اصلاح کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو بیکار نہ سمجھو سو اس سے آپ کے کسی کام میں یا کسی قسم کی ترقی میں کسی نوکری میں کوئی فرق نہیں آتا ہاں ایک غلط خیال میں جو آپ مبتلا ہیں اس سے وہ غلطی جاتی رہے گی نیز اس جماعت کے فیوض سے اس وقت جو آپ محروم ہیں جب آپ کو ان کے ساتھ وابستگی ہوگی تو آپ ان کے فیوض سے متمتع ہوں گے۔ البتہ موجودہ حالت میں اور اس حالت میں ایک فرق ضرور ہوگا خواہ اس کو آپ دنیوی ضرر یا ترقی کی کمی سمجھ لیں تو ممکن ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ اس وقت آپ تعزیرات الٰہیہ کے بہت سے جرائم میں مبتلا ہیں وہ اس وقت چھوٹ جائیں گے تو اس کو آپ خواہ نفع سمجھیں یا نقصان۔ آپ کے عادات میں بھی تغیر و تبدل ہوگا لیکن نہایت لطف اور تدریج نرمی کے ساتھ اس کی تائید یہ ہے کہ آپ دیکھیں عقل کا فتوٰے یہ ہے کہ اگر کوئی کسی جرم کا مرتکب ہو تو اس کو فوراً چھوڑ دینا چاہیئے لیکن قواعد شریعت بعض معاصی کی نسبت جو کہ جرائم ہیں یہ تجویز کرتے ہیں کہ چھوڑنے میں جلدی نہ کرو پہلے کوئی اس کا بدل تجویز کرلو اور اس زمانے تک اپنے کو گنہگار سمجھ کر استغفار کرتے رہو پھر جب دوسرا انتظام ہوجائے تو اس کو چھوڑ دینا بھلا دنیا کا کوئی قانون بھی ایسا ہے جس میں یہ سہولت ہو واللہ العظیم شریعت میں وہ حسن و جمال ہے وہ لطف ہے کہ اس کی نسبت بلیساختہ یہ شعر زبان سے نکلتا ہے ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

(چوٹی سے لیکر ایڑی تک جہاں بھی غور کرتا ہوں ہر خوبی دل کو کھینچتی ہے کہ اس کو دیکھو یہی قابل دید ہے)

مگر افسوس کہ لوگوں نے کبھی شریعت کو تحقیق کی نظر سے نہیں دیکھا اس لئے وہ لوگوں کو

ایک خونخوار دیو نظر آتا ہے۔ صاحبو! شریعت آپ کی دستگیری کرنے والی ہے بعض جرائم تک میں مثلاً ناجائز نوکری میں یہ اجازت ہے کہ اگر اس وقت کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا اور کوئی سبیل نہیں نکل سکتی تو پہلے اس کا انتظام کر کے پھر چھوڑ دینا اور اگر اس پر بھی شریعت سے وحشت ہوتی ہے تو ہم ذمہ دار نہیں۔ غرض علم و اہل علم کے ساتھ تلبس رکھنے سے کوئی دنیوی ضرورت و مصلحت فوت نہیں ہوتی صرف جرائم کا انسداد ہوگا اور وہ بھی اس لطف کے ساتھ سو اس کی نسبت میرا یہ کہنا کہ اس جماعت کے ساتھ وابستگی کرنے سے اتنا نقصان ہوگا کہ یہ جرائم چھوٹ جائیں گے ایسا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

وَلَا عَیْبَ فِیْھِمْ غَیْرَ اَنَّ سُیُوْفَھُمْ

بِھِنَّ فُلُوْلٌ مِّنْ قِرَاعِ الْکَتَائِبِ

(ان لوگوں میں اس بات کے سوائے اور کوئی عیب نہیں ہے کہ دشمنوں کی گردنیں کاٹتے کاٹتے ان کی تلواروں کی دھاریں میں دندانے پڑ گئے یعنی وہ بہت بہادری سے لڑتے ہیں)

یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر تھا اب اس دعوے کو عرض کرتا ہوں اور احتیاطاً پھر کہے دیتا ہوں کہ آپ اس دعوی سے متوحش نہ ہوں کہ شاید سب کو مولوی بنانا مقصود ہے۔ میں ہرگز سب کو مولوی نہیں بنانا البتہ جس غلط دعوے کے آپ معتقد ہیں کہ علماء کو نکما سمجھتے ہیں اس کو بدلنا چاہتا ہوں۔ واقعی ہمارے عقلاء میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ اولاً علماء عموماً پھر ان میں وہ علماء خصوصاً جو کہ درس و تدریس میں مشغول ہیں محض بیکار ہیں کیونکہ واعظین کو تو بعضے کام کا سمجھتے بھی ہیں سو کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو کام سارے کاموں سے زیادہ ضروری ہو اسی کو سب سے زیادہ بیکار کہا جائے۔ صاحبو! افسوس ہے کہ آپ کے ہم وطن ہندوؤں نے تو تعلیم کے اہم ہونے کو محسوس کیا کہ ان میں بکثرت لوگ امتحان سے فارغ ہو کر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک بڑی جماعت سررشتہ تعلیم میں داخل ہو اس لئے کہ سب شاخیں اسی کی فرع ہیں

تعلیم میں اپنا دخیل ہونا ذریعہ ہے ترقی قومی کا مگر ہم کو اب تک بھی اس کی خبر نہیں اور پھر بھی اپنے کو عاقل سمجھے ہوئے ہیں۔ تعلیم کی حالت دوسرے کاموں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے انجن کا پہیہ کہ اسی کے چکر پر تمام گاڑیوں کو حرکت ہوتی ہے اگر اس کی حرکت بند ہوجائے تو تمام گاڑیوں کی حرکت بند ہوجائے گی مگر اس کی ضرورت کا احساس لوگوں کو اس واسطے نہیں ہوتا کہ جو چیز مدار کار ہوا کرتی ہے وہ اکثر لطیف زیادہ ہوا کرتی ہے جیسے گھڑی کا فنر اور بال کمانی کہ گنوار آدمی گھڑی کو دیکھ کر سب سے بڑی چیز اس کے گھنٹے کو سمجھتا ہے لیکن حقیقت شناس جانتے ہیں کہ گھنٹہ کی حرکت کا مدار فنر پر ہے اگر فنر کی حرکت بند ہوجائے تو گھنٹہ کو ایک دفعہ بھی حرکت نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح درس و تدریس سب محکموں کی روح ہے خواہ تقریر ہو خواہ تحریر خواہ تصنیف سب اسی تعلیم کی فرع ہیں، مگر اس وقت سب سے زیادہ اسی کو بیکار سمجھ رکھا ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ عام طور سے لوگوں کی نظر میں علماء کی وقعت کم ہے اور اس علامت کی بڑی علامت یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لئے علم دین بہت کم تجویز کیا جاتا ہے۔ پھر ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ مدارس میں چندہ بھی دیتے ہیں اور مدارس دینیہ کی ضرورت بقاء کو لساناً تسلیم کئے ہوئے بھی ہیں جن کے لئے اہل مدارس ان کے بڑے بڑے شکریئے ادا کرتے ہیں تاکہ ان کو زیادہ دلچسپی ہو لیکن واقع میں ان کو دلچسپی کچھ بھی نہیں ہوتی۔ صاحبو! دلچسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی اس کو قولاً وعملاً اختیار کرکے دکھلا دیا قولاً تو یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کی اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا (اے اللہ اولاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رزق بقدر کفایت مقرر فرما) اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں اور جن کے لئے آپ فرط محبت سے سیدھے کھڑے ہوجاتے تھے اور جن کے لئے آپ نے یہ فرمایا کہ سَیِّدَۃُ النِّسَاءِ اَھْلُ الْجَنَّۃِ فَاطِمَۃُ (اہل جنت کی عورتوں کی سردار فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں) نیز حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

جب نکاح ثانی کا قصد فرمایا تو آپ نے یہ فرمایا کہ یوذینی ما اذاھا (تکلیف دیتی ہے مجھے وہ چیز جو فاطمہؓ کو تکلیف دیتی ہے) اتنی پیاری بیٹی نے جب ایک مرتبہ چکی چلانے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جانے کی شکایت کی جس کو آجکل اس قدر عیب سمجھا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو بوجہ مصلحت صحت یہ رائے دی کہ نئی لڑکیوں سے چکی پسواؤ کیونکہ اکثر امارت کے لئے بیماری لازم ہو گئی ہے وہ امیر بھی کیا ہوا جس کے پاس صحت جیسی خدا کی نعمت نہ ہو اور وجہ اس کی یہی آرام طلبی ہے۔ اس لئے میں نے جو کہا کہ تم ایسا کیا کرو تو ان میں سے بعض کہنے لگیں کہ خدا نہ کرے تم ایسی فال کیوں نکالتے ہو اور یہاں تک ہم لوگوں کی شان بڑھ گئی ہے کہ اکثر عورتوں نے چرخہ کاتنا تک چھوڑ دیا۔ ہمارے وطن میں ایک عورت کا قصہ ہے کہ وہ چرخہ کات رہی تھیں اور اُس زمانہ میں اُن کی ساس مر گئی تھیں تو کوئی عورت جوان کے یہاں تعزیت کے لئے آئی تو آہٹ پاتے ہی چرخہ کو اٹھا اور اندھے باؤلوں کی طرح ایک کوٹھری میں پھینک آگے سے کواڑ بند کر دیئے تاکہ مہمان کو معلوم نہ ہو۔ غرض حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی غلام لونڈی لے آؤ تاکہ کچھ مدد دے، چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اپنی راحت کے لئے یا شوہر کے امتثال امر کے لئے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہونچیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما نہ تھے، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے کہہ کر چلی آئیں جب حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے معلوم ہوا، آپ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے

؎ ھٰذہ قصۃ طویلۃ وفیہ خصوصیۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقد رواھا البخاری۔

پاس تشریف لے گئے اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لیٹی ہوئی تھیں آپؐ کو دیکھ کر اٹھنے لگیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لیٹی رہو۔ غرض اس وقت پھر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا گیا آپ نے فرمایا کہ اگر کہو تو غلام لونڈی دیدوں اور کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دیدوں، یہ سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے پھر یہ نہیں پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی ہی چیز دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سوتے وقت سُبْحَانَ اللہ تینتیس ۳۳ بار اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ تینتیس ۳۳ بار اور اَللہُ اَکْبَرُ چونتیس ۳۴ بار پڑھ لیا کرو بس یہ غلام اور لونڈی سے بھی بہتر ہے۔ اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی اس کو قبول کر لیا۔ تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقر محبوب تھا تو اپنی اولاد کے لئے بھی آپ نے اس کو تجویز کر کے دکھلا دیا نیز ارشاد فرمایا کہ ہماری اولاد کے لئے زکوٰۃ حلال نہیں کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ایسے قوانین مقرر ہوتے کہ سب روپیہ انہی کو ملتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ تو دلچسپی اس کو کہتے ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ جو لوگ چندہ دیتے ہیں کیا انھوں نے اپنے لڑکوں کے لئے بھی کبھی اس تعلیم کو تجویز کیا ہے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ ریاست رامپور میں ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو جن کا لڑکا قرآن شریف پڑھتا تھا انگریزی پڑھنے کی رائے دی، انھوں نے کہا ذرا قرآن ختم ہو جائے تو انگریزی میں لگایا جائے۔ انھوں نے پوچھا کتنا قرآن ہوا ہے اور کتنے روز میں ہوا ہے، انھوں نے کہا کہ دو سال میں نصف ہوا ہے۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ میاں دو برس تو ضائع کئے اور دو برس بھی کیوں ضائع کرتے ہو۔ صاحبو! غضب تو یہ ہے کہ خدا کے قائل آخرت کے قائل اور پھر یہ خیالات اور یہ مقالات۔

مجھے ایک دین دار فلسفی کا قول یاد آیا کہ انہوں نے ایک معتقد ارتقا کو لکھا تھا کہ ڈارون نے جو ارتقاء کے مسئلہ کو مانا ہے اس کو تو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ خدا کا قائل نہ تھا تو جس امر میں اس کو مشاہدہ نہیں ہو سکا اس کی بابت تخمین کی رائے

قائم کرلی۔ انسان کا تکوّن بھی ایک واقعہ تھا اس کی نسبت بھی ایک رائے قائم کرنی پڑی تو انکار صانع کی صورت میں اس کا قائل ہونا چنداں بعید نہیں، لیکن جو شخص خدا کا قائل ہے اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اس تخمین پر چلے اگر وہ یوں کہدے کہ خدا نے پیدا کیا تو اس میں کیا اشکال ہے پس وجود صانع کا قائل ہوکر اس کا قائل ہونا سخت بعید ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ تعظیم قرآن کو بیکار اور تضیع اوقات کہنا اس سے تو بعید نہیں جو آخرت کا قائل نہو مگر جو شخص آخرت کا قائل ہے اس کی زبان سے ایسا نکلنا کہ قرآن کی تعلیم میں وقت کے صرف کرنے کو اضاعۃ وقت کہنا سخت عجیب ہے کیا آخرت ہونے کی صورت میں اس کا ثمرہ نہ ملے گا۔

صاحبو! خدا تعالےٰ نے عقل اس واسطے دی ہے کہ اس سے انجام کو سوچے اور جیسا یہ انجام سوچنے کے قابل ہے کہ ہم آج پڑھ لیں گے تو کل ڈپٹی کلکٹری ملے گی۔ ایسا ہی اس سے آگے کا انجام بھی تو سوچنے کے قابل ہے کہ آخرت میں کیا ہوگا اور اگر کہو کہ آگے کوئی انجام نہیں تب تو پھر تم سے خطاب ہی نہیں لیکن چونکہ تم اگلے انجام کے بھی قائل ہو اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ وہاں کیا ذخیرہ کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو پھر قرآن کی تعلیم کو تضیع اوقات کس منہ سے کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ دنیا میں رہنا محض موہوم اور اس کے لئے یہ اہتمام اور کوشش اور آخرت میں جانا یقینی اور اس کے لئے سامان کی ضرورت نہ ہو اور اس کے سامان کو اضاعت وقت کہا جائے۔

اصل یہ ہے کہ خود آخرت ہی سے اس درجہ غفلت ہوگئی ہے کہ وہ یاد ہی ہی نہیں آتی۔ ایک مرتبہ میں سہارنپور سے کانپور کو جا رہا تھا، میرے ساتھ کچھ پونڈے بھی تھے میں نے وزن کرانا چاہا، جو لوگ رخصت کرنے آئے تھے انھوں نے تو رائے کی مخالفت کی ہی مگر خود اسٹیشن والوں نے بھی کہا کہ آپ لیجائیں ہم گارڈ سے کہدیں گے کوئی مزاحمت نہ کرے گا۔ میں نے پوچھا یہ گارڈ کہاں

؎ انظر الیٰ ھذا التقویٰ و تامل فیہ ۱۲ منہ

تک جائے گا، جواب ملا کہ غازی آباد تک ۔ میں نے کہا آگے کیا ہوگا ۔ جواب ملا کہ آگے وہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہدے گا ۔ میں نے کہا آگے کیا ہوگا، جواب ملا پھر وہ کانپور تک برابر رہے گا اور کانپور آجائے گا ۔ میں نے کہا آگے کیا ہوگا جواب ملا بس آگے تو کانپور آجائے گا اور سفر ختم ہو جائے گا' میں نے کہا کہ نہیں اس سے آگے آخرت ہوگی وہاں کونسے گارڈ مزاحمت سے بچائیں گے ۔ سب چپ ہو گئے اور محصول لیا گیا ۔ غرض آخرت ان اہل الرائے کو یاد نہ آئی یہاں سے ایک جملہ معترضہ بھی قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اس قصہ میں جو باوجود اہل اختیار کی رعایت کے اس رعایت کو قبول نہیں کیا گیا اس کا سبب بجز اثر تعلیم شریعت کے کیا ہے کیا آج کل کوئی مہذب ایسا کر سکتا ہے کہ اگر صاحب حق کو حق کی اطلاع بھی نہ ہو تب بھی دوسرے کا حق ادا کرے لیکن شریعت اس کو ضروری بتلاتی ہے اب شریعت اور اپنی تہذیب مخترع کو مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے واللہ ہم نے دیکھا ہے کہ غریب دیندار لوگ جن کو کم عقل سمجھا جاتا ہے وہ تو ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں مگر ہمارے معزز جو عقلاء کہلاتے ہیں ذرا بھی خیال نہیں کرتے ۔ صاحبو! عاقل وہی ہے جو انجام پر بھی نظر کرے ۔ پس جس میں دین نہیں وہ عاقل کیا ہو سکتا ہے ۔ آج کل عقل اور دین میں منافاۃ سمجھی جاتی ہے حالانکہ ہمارے تمام بزرگ دنیا کی عقل کے ساتھ دین میں بھی ہمیشہ کامل ہوئے ہیں ۔

ہرقل[۵] نے حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ کی نسبت سفراء اسلام سے پوچھا تھا کہ وہ کیسے شخص ہیں اس نے جواب دیا تھا کہ ان کی حالت یہ ہے لَا یَخْدَعُ وَلَا یُخْدَعُ یعنی نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں نہ ان کو کوئی دھوکہ دے سکتا ہے ۔ ہرقل نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہیں تو ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا ۔ کیونکہ جس میں دین اور عقل دونوں جمع ہوں اس کی قوت کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا ۔ یہ جملہ معترضہ ختم ہوا ۔

---

۵ یہ روم کا نصرانی بادشاہ تھا ۱۲

لیان اس کو کررہا تھا کہ آخرت سے بے خبری بے حد ہو گئی ہے اور اس بے خبری کی یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ جو باخبر ہو کر اس کی فکر کرتے ہیں ان کو احمق سمجھا جاتا ہے۔

میرے ایک دوست جو بی اے تک تعلیم پائے ہوئے ہیں مگر دیندار ہیں، اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک بار بوجہ تنگی وقت بدون اسباب وزن کرائے ہوئے ریل میں سوار ہو گئے منزل مقصود پر پہونچکر ٹکٹ کلکٹر سے اس کی اطلاع کی اور وزن کراکر محصول دینا چاہا، ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ لے بھی جاؤ وزن کی کچھ ضرورت نہیں انہوں نے کہا کہ آپ کو رعایت کا حق نہیں آپ مالک نہیں اس کو تعجب ہوا اور اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا انھوں نے وہاں بھی یہی تقریر کی تو وہ دونوں باہم انگریزی میں یوں کہنے لگے تھے کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے شراب پی رکھی ہے، گویا دوسرے کا حق دینا ایسا عجیب امر ہے کہ حق دینے والے پر نشہ پینے کا شبہ ہوا لیکن ہاں واقع میں وہ شراب محبت میں مدہوش تھے اور اسی کا نشہ ان کو چور کئے ہوئے تھا۔ آخر انہوں نے کہا کہ جناب میں شراب پئے ہوئے نہیں ہوں، لیکن اسٹیشن والوں نے ہرگز محصول نہ لیا۔ مجبور ہو کر دوسرے طریقے سے انہوں نے ادا کیا اور وہ طریق یہ ہے کہ اگر کسی ریلوے کا ہمارے ذمہ کچھ رہ جائے تو اس قیمت کا ٹکٹ اسی لین کا لیکر تلف کردیں اور اس ٹکٹ کو استعمال نہ کریں۔ اس قصہ کو میں نے اس واسطے بیان کیا کہ انجام پر بھی نظر ہونا چاہیئے۔ بالخصوص جبکہ دنیا کے کاموں میں انجام پر نظر کرتے ہو تو آخرت کے انجام پر تو بہت ہی ضرور ہے صاحبو! کیا موت کے انجام کا انکار ہو سکتا ہے یہ تو وہ انجام ہے کہ اس سے کفار کو بھی انکار نہیں۔ البتہ کفار میں ایک شرذمہ قلیلہ جو اہل ملت نہیں وہ البتہ آخرت کے منکر ہیں وَھُمْ لَا عِبْرَۃَ بِھِمْ (وہ جو قابل شمار نہیں) غرض جب آخرت حق ہے اور اس کے لئے عمل کی ضرورت اور اس کے لئے علم اور تعلیم

کی ضرورت پھر اس میں مشغول ہونا اضاعۃ وقت چہ معنی مگر بہت لوگ پھر بھی اس کو اضاعۃ وقت سمجھتے ہیں اور اگر یہ اعتقاد بھی نہ ہو تو عمل تو اسی کے موافق ہے جس سے اعتقاد میں بھی ایک گونہ ضعف ثابت ہوتا ہے ورنہ اگر علم دین سے دلچسپی ہے تو علماء کی بے وقعتی کی کیا وجہ اور اگر ان کی وقعت بھی کی جائے تو اولاد کو علم دین نہ پڑھانے کی کیا وجہ یہ آثار بُرے ہی عقیدے کے ہیں علماء کی بے وقعتی کے متعلق بعضے یہ عذر کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے وعظ سُنا اور معتقد بھی ہوئے مگر اخیر میں جو مولوی صاحب نے سوال کر دیا تو سارا اعتقاد دُھل گیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص حکیم عبدالعزیز صاحب وغیرہ سب کو اس وجہ سے چھوڑ دے اور سب کی برائیاں شروع کر دے کہ اس نے عطائیوں کو دھوکہ دیتے ہوئے دیکھا تھا تو آپ اس کو صائبُ الرائے سمجھیں گے اور کیا آپ نے بھی سب ہی حاذق اطبا کو چھوڑ دیا ہے تو جن کی حکائتیں آپ نے یاد کر رکھی ہیں وہ واقع میں اناڑی عطائی ہیں افسوس عطائیوں کے پھیل جانے سے آپ نے اطباء کو نہ چھوڑا مگر چند سائلوں کی وجہ سے محقق مولویوں کو چھوڑ دیا۔ مگر مولویوں کے نہ چھوڑنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ تم ان کے خالی معتقد رہو اور ان کے ہاتھ چوم لو۔ ہاتھ تو ہم خود تمہارے چوم لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ علماء سے دین کا نفع حاصل کرو اس وقت مولویوں کے ساتھ جو تمہارا خشک اعتقاد ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مشہور ہے کہ دو کنجوس تھے ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ تم کھانا کیونکر کھاتے ہو اس نے کہا بھائی ہر مہینے ایک پیسہ کا گھی لے آتے ہیں اور سامنے رکھ کر اس کو خطاب کرتے ہیں کہ میں تجھ کو کھا جاؤں گا پورا مہینہ یوں ہی کاٹ دیتے ہیں پھر اخیر میں اس کو کھا لیتے ہیں وہ بولا تم بڑے فضول خرچ ہو ہم تو روٹی پکا کر جس گلی میں گوشت بھننے کی خوشبو آتی ہو وہاں کھڑے ہو کر خوشبو سونگھتے جاتے ہیں اور روٹی کھا لیتے ہیں تو یہ دونوں بھی گھی کے معتقد تھے اور ایک گونہ تلبس بھی تھا لیکن ان کو اس کا

کیا نفع ہوا ایسے ہی آپ کو نرے اعتقاد سے اور محض ادب و تعظیم سے کیا نفع ہوگا غرض یہ آثار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علماء کو بالکل بیکار چیز سمجھتے ہیں۔ مجھ سے ایک شخص کی گفتگو ہوئی کہنے لگے کہ آپ نے اپنے بھتیجے کے لئے کیا تجویز کیا، میں نے کہا کہ عربی پڑھتا ہے تاکہ دین کی خدمت کرے۔ کہنے لگے مدرسہ دیوبند میں ہمیشہ سوڈیڑھ سو آدمی فارغ ہوکر نکلتے ہیں وہ خدمت دین کے لئے کافی ہیں آپ نے اس کے لئے انگریزی کیوں تجویز نہ کی کہ دنیوی ترقی کرتا۔ میں نے کہا کہ جناب خادم دین ہونا اگر خسارہ کی بات ہے تب تو کیا وجہ ہے کہ طلبائے دیوبند کے لئے یہ پست حالت پسند کی جائے بلکہ چلو اور یہ مشورہ دو کہ سب چھوڑ کر انگریزی میں مشغول ہو جاؤ آخر وہ بھی قوم ہی کے بچے ہیں اور اگر خادم دین ہونا کوئی نافع امر ہے تو کیا وجہ کہ میرے بھتیجے کے لئے اس کو تجویز نہ کیا جائے۔ آخر بالکل خاموش رہ گئے۔ افسوس کی بات ہے کہ دیوبند کے طالب علم تو ایسے ذلیل کہ جس شغل کو آپ بالکل بیکار سمجھ رہے ہیں وہ تو ان کے لئے تجویز کیا جائے، اور آپ کی اولاد ایسی محبوب و معزز کہ اس کے لئے ڈپٹی کلکٹری اور تحصیلداری تجویز کی جائے۔

صاحبو! میں ڈپٹی کلکٹری وغیرہ سے منع نہیں کرتا لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ آپ نے اولاد کے لئے دین کی کیا فکر کی ہے، کیا آپ کو یہ اطمینان ہے کہ آپ کی اولاد دارِ آخرت میں نہ جائے گی اور اگر جائیں گے تو ان کا کیا حشر ہوگا اسی طرح یہ سوچئے کہ کیا خادمانِ دینی کی ضرورت نہیں اور اگر ضرورت ہے تو کیا سب مسلمانوں پر اس کا اہتمام ضروری نہیں تو آپ نے کیا اہتمام کیا، اس موقع پر ممکن ہے کہ بعض لوگ خوش ہوں کہ ہم اس الزام سے بری ہیں کیونکہ ہم نے ایک بچہ کو عربی میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن یہ کوئی خوشی کی بات نہیں کیونکہ آپ نے جس معیار پر اس بچہ کو انتخاب کیا ہے اس طرز پر وہ بچہ خود اس مقصود کے لئے کافی نہیں کیونکہ آجکل معیار انتخاب یہ ہے کہ جو سب سے زیادہ غبی اور کم عقل ہوتا ہے

اس کو عربی کے لئے تجویز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ دنیا کمانے کے لئے بڑے عالی دماغ ہونے کی ضرورت نہیں یہ تو چکی پیسنا ہے جس کو تھوڑی سی مناسبت بھی ہوگی وہ بھی اس کو بخوبی کرسکتا ہے دماغ کی ضرورت زیادہ اس کام کے لئے ہے جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے اللہ اکبر۔ کتنا قلب موضوع ہوگیا ہے آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام کیا چیز ہیں۔ صاحبو! دنیا کی عقل بھی ان کی برابر کسی کو نہیں ہوتی۔ ان حضرات کو ہر ایک قسم کا شرف عطا فرمایا جاتا ہے۔ تو جو کام نیابت انبیاء علیہم السلام کا ہے اس کے لئے بھی تو اس ہی عقل کامل کی ضرورت ہے، اب بتلایئے کہ اولاد کا انتخاب کس قاعدے پر ہونا چاہیئے اور بعضے لوگوں کے اس خیال کا کہ با کار اولاد کے لئے علم دین تجویز نہیں کرتے یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ عربی پڑھ کر لڑکا کھانے کمانے کے قابل نہیں رہے گا۔ سو اول تو یہ غیر مسلم ہے کیونکہ کھانا کمانا تو ایک محدود حاجت ہے تو اپنی حاجت کے لائق سب ہی کر لیتے ہیں اور اگر بہت ہی کمایا تو خاص اس کے کام میں تھوڑا ہی آئیگا بلکہ جو اصلی مقصود ہے کھانے کمانے سے کہ جان کو لگے اس میں اکثر غرباء اکثر امراء سے بڑھے ہوئے ہیں۔

میں ایک امیر اور ایک غریب کی حکایت سناتا ہوں کہ وہ دونوں آپس میں دوست تھے مگر غریب تو بہت موٹا تازہ اور امیر صاحب نہایت دُبلے پتلے۔ ایک روز اس نے اپنے غریب دوست سے پوچھا کہ یار تم کیا چیز کھاتے ہو کہ اس قدر توانا ہو رہے ہو اس نے کہا کہ میں کھانا تم سے لذیذ کھاتا ہوں امیر بولا بھائی وہ کھانا ہم کو بھی کھلاؤ۔ اس غریب نے دعوت کر دی وقت پر اس کے مکان پر پہونچے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں آخر جب دیر ہوگئی اور بھوک لگی تو بے تکلفی کے سبب کھانے کا تقاضا کیا اس نے وعدہ کیا ابھی آتا ہے پھر اور دیر ہوئی اور زیادہ بھوک لگی زیادہ تقاضا کیا اور وہ یوں ہی ٹالتا رہا آخر جب وہ بہت ہی بے تاب ہوا اور سخت تقاضا کیا میزبان نے

کہا کہ بھائی کھانا تو ابھی تیار نہیں لیکن دن کی باسی روٹیاں موجود ہیں اگر کہو تو لے آؤں، اس نے کہا کہ خدا کے لئے تم باسی ہی لے آؤ چنانچہ وہ کچھ تھوڑے سے باسی ٹکڑے اور کچھ ساگ وغیرہ لایا' ان کی تو بھوک کے مارے بری حالت تھی بس اُن ہی ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑے اور نہایت مزے لے لے کر شکم سیر ہو کر کھائے۔ وہ غریب منع کر رہا ہے کہ صاحب زیادہ نہ کھائیے بہت مزہ دار کھانا پک رہا ہے۔ اس نے کہا کہ بھائی اب تو یہی بے حد مزہ دار معلوم ہوتا ہے۔ تب اس غریب نے کہا کہ صاحب جو مزہ دار کھانا میں ہر روز کھاتا ہوں وہ یہی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ میں اسی وقت کھاتا ہوں جب سخت بھوک لگتی ہے اس لئے جو کچھ کھاتا ہوں جزو بدن ہوتا ہے اور تم محض ضابطہ پوری کرتے ہو کہ کھانے کا وقت ہوا خادم نے آکر عرض کیا حضور کھانا تیار ہے، تم نے سُنا اور کھانے کے لئے آمادہ ہوگئے ' اگرچہ اس وقت تم کو بھوک بھی نہ ہو۔ غرض اگر کسی نے بارہ تیرہ سو کمائے بھی تو کھانا تو اس کا بھی جو کہ مقصود بالذات ہے محدود ہی ہوگا ہاں کمانا غیر محدود ہوگا مگر جبکہ کھانے کی غایت محدود ہے تو کمانے کا غیر محدود ہونا اس کو کیا کار آمد ہوا۔ جب مقصود بالذات ہی کم ہے تو مقصود بالغیر کے زیادہ ہونے سے کیا نفع۔ سو اول تو اسی مقدمہ میں کلام ہوا کہ مولوی ہو کر کما کھا سکیں گے کیونکہ بقدر ضرورت تو سب ہی کما کھا لیتے ہیں اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کو بھی ثابت کیجئے کہ وہ کمانا جو آپ لوگوں کے ذہن میں ہے یعنی نوکری۔ تجارت وغیرہ آیا وہ ضروری بھی ہے اس کا اندازہ اس طرح ہو جائے گا کہ آپ کسی خادم دین کو بھوکا ننگا دکھا دیجئے اور خدمت دین کی عام ہے خواہ وہ تدریس ہو یا وعظ ہو یا کسی خادم دین کو ذلیل دکھلا دیجئے پھر جب یہ بھوکے ننگے بھی نہیں ذلیل بھی نہیں تو وہ کونسی چیز ہے جو خادمان دین میں کم ہے اگر وہ کوئی چیز ہے تو آپ کی ہوسیں ہیں تو ان کے لئے یہ جواب کافی ہے کہ ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

(ہماری لالچی طبیعت کو صبر نہیں ہے ورنہ اے صائب سامان جو ہمارے کام آتا ہے
اس میں سے بہت سا تو ایسا ہے جو بے ضرورت ہے)

ذرا آپ اپنے ہی گھر میں جا کر اسباب کا جائزہ لیجئے تو نصف سے زیادہ وہ سامان نکلے گا جس کے استعمال کی کبھی نوبت بھی نہیں آتی اور چوتھائی سے زیادہ وہ نکلیگا کہ اس کی نسبت آپ کو آج تک یہ بھی خبر نہیں کہ وہ گھر میں بھی ہے تو ایسے اسباب کے جمع کرنے کی آپ ہی بتلائیے کیا ضرورت ہے اور اگر مراد آپ کی ناکارہ ہونے سے یہ ہے کہ وہ ترقی نہیں کر سکتا تو حضرت ایسا ناکارہ ہونا تو عین مطلوب اور آئین وفاداری ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند
از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

(تو اس بات کو سمجھ لے کہ جس کسی کو خدا بلاتا ہے وہ دنیا کے تمام
کاموں سے بیکار ہو جاتا ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم
مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(اگرچہ ہم بظاہر مفلس اور دیوانے ہیں تو در اصل ہم اس ساقی کے
دیوانے اور اس کے پیمانے کے مست ہیں)

لیکن یہ تو مولانا رومی کا کلام ہے اس سے تو صرف اہلِ دل متاثر ہوں گے اب میں آپ کے مسلمات سے ایک مثال دیتا ہوں، کہ آپ کا ایک نوکر ہے اس کو آپ دس۱۰ روپے دیتے ہیں اور آپ کو اس پر اعتماد ہے، اتفاق سے کہیں باہر کا ایک شخص اس کو ملا اور اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو اور تم کو کیا معاوضہ ملتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نوکر ہیں اور دس۱۰ روپے ملتے ہیں۔ اس کو سن کر اس مسافر نے

کہا کہ تم میرے ساتھ چلو میں تم کو بیس۲۰ روپے دوں گا اور اس سے نصف کام تم سے لوں گا۔ اب دل میں ٹٹول کر بتلایئے کہ اس نوکر کے لئے خوبی اور فخر کی بات کیا ہے آیا یہ کہ ترقی کا نام سن کر پھسل جائے یا یہ کہ صاف جواب دیدے اور کہدے کہ آپ مجھے بہکانے آئے ہیں یقیناً آپ دوسری شق کو اس کے لئے خوبی سمجھیں گے اب انصاف سے بتلایئے کہ اگر کوئی خدا کا نوکر ہے اور پانچ روپے میں گذر کرتا ہے اور اس حالت میں وہ ہزار روپے پر اس طرح لات مار دے کہ باوجود قدرت تحصیل اسباب کے وہ اسباب تعلیم معاش وغیرہ ترک کر دے تو اس کو کم حوصلہ اور محروم الترقی کیوں کہا جاتا ہے۔ صاحبو! اس کی قدر تو اور بھی زیادہ ہونی چاہیئے نہ یہ کہ اس کو خشک دماغ بتلایا جائے۔ صاحبو! جس کا نام آپ نے ترقی رکھا ہے اس کا خلاصہ واللہ محض غرض پرستی، خود پرستی ہے اگرچہ اس کے پیچھے ساری عقل اور دین سارب ہو جائے۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

عاقبت سازد ترا از دیں بری
ایں تن آرائی وایں تن پروری

(صرف بدن کا سنوارنا اور بدن ہی کی پرورش کرنا انجام کار تجھے دین سے دور کر دیں گے)

تو مولانا رحمۃ اللہ کے قول سے اگر تسلی نہ ہوئی تھی لیکن آپ کے نوکر کی مثال سے تو تسلی ہو گئی ہو گی صاحبو! جس سے دلچسپی نہیں ہوتی اس میں انسان ترقی نہیں کر سکتا ؎

انبیا در کارِ دنیا جبریند | اشقیا در کارِ عقبیٰ جبریند
انبیا را کارِ عقبیٰ اختیار | اشقیا را کارِ دنیا اختیار

(انبیاء علیہم السلام دنیا کے کام کو مجبور ہو کر کرتے ہیں اور بدبخت لوگ دین کے کام کو مجبوری سے کرتے ہیں انبیاء علیہم السلام دین کے کام کو پسند کرتے ہیں اور بدبخت لوگ دنیا کے کام کو خوش ہو کر کرتے ہیں۔)

غرض ایا بج اور چست سب ہیں لیکن اہل دنیا کارِ دنیا میں چست اور کارِ عقبیٰ میں سست ہیں اور اہل اللہ کارِ دنیا میں سست اور کارِ عقبیٰ میں چست ہیں اور اگر اب بھی تمہارے نزدیک فیصلہ نہیں ہوا تو سمجھ لیجئے کہ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی تم سے ٹھٹھا کرتے ہیں جس طرح تم ٹھٹھا کرتے ہو سو عنقریب معلوم کر لوگے کہ رسوا کرنے والا عذاب کس پر آتا ہے اور دائمی عذاب کس پر اُترتا ہے) اور ؎

فسوف ترٰی اذا انکشف الغبار
افرس تحت رجلك ام حمار

کہ ایک شخص گدھے پر سوار ہے اور دوسرا اس کو کہتا ہے کہ تو گدھے پر سوار ہے مگر کثرتِ غبار سے اس کو پتہ نہیں چلتا اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ پہلا شخص جواب دیتا ہے کہ اچھا ذرا غبار بیٹھ جائے تو پھر تم کو معلوم ہوگا کہ تمہاری ران کے نیچے گدھا ہے یا گھوڑا۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ اس پر راضی نہیں تو ذرا صبر کیجئے سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ (ان کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا شیخی باز کون تھا) ورنہ صاحبو جب آپ کے ملازم کے لئے ترقی نہ چاہنا خوبی اور وفاداری ہے تو خدا کے نوکر کے لئے کیوں یہ خوبی اور وفاداری نہیں ہے۔ تو صاحب یہ ہے وہ نکما ہونا جس کی حقیقت آپ نے اعتراض کر کے خود کھلوائی۔

میں پھر کہتا ہوں کہ وہ نکما کہنے سے بُرا نہیں مانتا بلکہ خود اس پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے اس کا یہ کام ہوتا ہے کہ ؎

عاشق بدنام کو پروا ئے ننگ و نام کیا
اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

صاحبو! وہی نکمے تھے کہ اگر آج ان کی جوتیاں مل جاتیں تو سر پر رکھی جاتی ہیں بس

یہ معنے تھا علم دین سے بے رغبتی کا کہ لوگ ان کو بیکار سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس سے مطلق دلچسپی نہیں ہے ورنہ دلچسپی کی علامت تو یہ ہے کہ اس کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بھی تجویز کرتے۔ مجھے عالمگیر رحمہ اللہ کی ایک حکایت یاد آتی ہے (یہ حکایت زبانی ہے کتابی نہیں) کہ ایک روز جامع مسجد میں انھوں نے طالب علموں کو دیکھا کہ سخت پریشان پھرتے ہیں اور خورد و نوش کی کوئی سبیل نہیں۔ سمجھے کہ سبب اس کا بے رغبتی امراء کی ہے چاہا کہ اس کی اصلاح ہو بس وضو کرتے ہوئے وزیر اعظم سے ایک مسئلہ پوچھا کہ اگر نماز میں فلاں شبہ ہو جائے تو کیا کرے۔ وزیر صاحب اس کا جواب نہ دے سکے۔ عالمگیر رحمہ اللہ نے ذرا غضبناک نظر سے وزیر کی طرف دیکھا اور کہا تم کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ فقہ کے ضروری مسائل یاد کرو وزراء وغیرہ سب تھرا گئے اور فوراً ہی طلبہ کی تلاش شروع ہو گئی اور روزانہ ان سے سیکھتے اور اس طرح سے وہ سب اطمینان کی حالت میں ہو گئے پھر تو یہ حالت تھی کہ طالب علم ڈھونڈھے نہ ملتے تھے۔

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے تھے کہ عالمگیر رحمہ اللہ کو بارہ ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ دیکھئے جب امراء کو اس جماعت سے دلچسپی ہوئی گو بضرورت سہی تو اس کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ ان سے مستفید ہونے لگے اگر آپ کو بھی اس سے دلچسپی ہوتی تو کم از کم ہفتہ میں ایک ہی دن کسی عالم سے مسائل پوچھ لیا کرتے اگر خود ان کے پاس نہ جاتے تو ان ہی کو اپنے پاس بلا لیتے کیونکہ آج وہ رئیس کہاں رہے ہیں جو خود طالبانہ حاضر ہوں۔ پہلے یہ حالت تھی کہ ہارون الرشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ شہزادوں کو حدیث پڑھا جایا کیجئے انہوں نے فرمایا کہ آپ ہی کے خاندان سے علم دین کی عزت ہوئی ہے اور آپ ہی بے عزتی کرتے ہیں ہارون نے کہا کہ اچھا شہزادے وہاں ہی حاضر ہوں گے مگر اس وقت عام رعایا سے الگ کر دیئے جایا کریں۔ آج بھی بعض رئیس جماعت میں نہیں آتے کہ خلط ملط سے لوگ ہمارا رعب نہ کھائیں گے۔

صاحبو! ذرا سنبھلو یہ طرز در پردہ حکم شریعت پر اعتراض ہے کہ ایسا مضر قانون تجویز فرمایا۔ دوسرے یہ بالکل غلط ہے کہ خلط ملط سے رعب جاتا رہے گا۔ رعب تو اس وقت بھی ہوگا لیکن انس کے ساتھ ہوگا۔ اب وحشت کے ساتھ ہے خدا تعالیٰ کے احکام ایسے بے ڈھنگے نہیں ہیں کہ ان کے مضر آثار ہوں۔ دیکھئے خلفاء راشدین کا کس قدر رعب رعایا پر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھ لیجئے کہ خلفاء رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف سے کیا تواضع حق کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے برسر منبر فرمایا کہ اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا (تم سنو حکم خلیفہ اور اطاعت کرو) سامعین میں سے ایک شخص نے کہا کہ لَا نَسْمَعُ وَلَا نُطِيْعُ (ہم نہیں سنتے اور نہ اطاعت کریں) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وجہ پوچھی تو اس شخص نے کہا کہ غنیمت کے چادرے جو آج تقسیم ہوئے ہیں سب کو تو ایک ایک ملا ہے اور آپ کے بدن پر دو ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے تقسیم میں عدل نہیں کیا آپ نے فرمایا بھائی تو نے اعتراض میں بہت جلدی کی۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس آج کرتہ نہیں تھا تو میں نے اپنے چادرے کو ازار کی جگہ باندھا اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ان کا چادرہ مستعار لے کر اس کو کرتہ کی جگہ اوڑھا ہے۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان حضرات میں بڑے چھوٹے سب برابر حصے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ آج بڑوں کا دوہرا حصہ ہونا تو گویا لازمی امر ہے البتہ اگر مالک ہی دوہرا حصہ دے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض تواضع کی تو یہ کیفیت تھی اور باوجود اس نرمی کے رعب کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ آپ بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ جا رہے تھے اتفاقاً پشت کی طرف جو آپ نے نظر کی تو جس جس پر نظر پڑی سب گھٹنوں کے بل گر پڑے ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

(جو شخص حق تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور پرہیزگاری اختیار کر لیتا ہے پھر جن و انسان

بلکہ ہر ایک چیز جس کو وہ دیکھ لے اس سے وہ ڈرتی ہے)

یعنی جو خدائے تعالیٰ سے ڈرے گا اس سے سب ڈریں گے اور اگر کسی کے رعب میں کمی ہے تو تقوی کی کمی کی وجہ سے ورنہ ضرور ہیبت ہوتی ہے ہاں وحشت اور نفرت نہیں ہوتی اور اجتناب و عدم اختلاط کے ساتھ جو ہیبت ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے لوگ بھیڑیئے سے ڈرتے ہیں کہ اگر اس مجلس میں بھیڑیا آجائے تو ابھی سب کھڑے ہوجائیں تو جیسے آج کل رؤسا کو خیال ہے ایسا ہی ہارون الرشید کو یہ خیال ہوا کہ اگر شاہزادے سب سے الگ پڑھیں گے تو ان کا رعب باقی رہے گا اس لئے امام مالک رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ شاہزادوں کے ساتھ کسی کو نہ بٹھلایئے امام صاحب نے فرمایا کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا غرض آخر شہزادے ہی حاضر ہوا کرتے اور حدیث سُنا کرتے۔ تو اس وقت تو بادشاہ ایسے تھے کہ ایک عالم نے ٹکا سا جواب دیدیا اور اس کو بادشاہ نے قبول کرلیا۔ لیکن آج وہ حالت نہیں ہے اس وقت بھی علماء کو چاہیئے کہ اپنے کو ذلیل نہ کریں لیکن بہت زیادہ اجتناب بھی نہ کریں کہ اس میں اہل دنیا بالکل ہی محروم رہیں گے۔ یعنی اگر کوئی شخص انتفاع دین کے لئے اہلِ علم کو قدر کے ساتھ بلائے تو چلا جانا مناسب ہے اور میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ عالموں کو بلاکر آپ ان سے عربی پڑھیئے اس میں تو آپ کو پھر عذر سوجھیں گے۔ سو میرا یہ مطلب نہیں کیونکہ بحمداللہ اردو میں بھی ایسا کافی ذخیرہ مذہبی ہوگیا ہے کہ آپ کو عربی کی ضرورت نہ پڑے گی لیکن یہ خوب یاد رکھیئے کہ مذہبی کتابوں سے مراد علماء باعمل کی کتابیں ہیں نیچریوں کے خرفات مراد نہیں اگرچہ لقب ان کا بھی مولوی ہو۔

مجھ سے ایک نائب تحصیلدار صاحب نے کہا کہ میں مذہبی کتابیں دیکھا کرتا ہوں دریافت جو کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نیا چرہ کی کتابیں دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صاحب اگر آپ قانون گورنمنٹ یاد نہ کریں اور اخبار ہی دیکھا کریں تو کیا آپ گورنمنٹ کی عملداری میں رہ کر کام چلا سکتے ہیں ہرگز نہیں کیونکہ جو نصاب گورنمنٹ نے تجویز کیا تھا آپ نے اس کو نہیں دیکھا بلکہ اپنی طرف سے ایک نیا نصاب تجویز کرلیا تو اسی طرح مذہب میں

بھی وہ کتابیں دیکھئے جو مذہبی نصاب میں داخل ہیں۔ اس وقت لوگوں نے نصاب تعلیم بھی اپنی رائے سے تجویز کرلیا ہے چنانچہ مردوں نے تو یہ نصاب مذکور تجویز کیا یعنی بددینوں کی تالیفات اور عورتوں نے موضوع قصے کہانیوں کی کتابیں تجویز کیں جیسے معجزہ آل نبی وغیرہ جس کا مہمل ہونا نام ہی سے ظاہر ہے کیونکہ معجزہ آل نبی کا نہیں ہوتا دوسرے اس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو کسی فقیر کو ہبہ کر دیا تھا اور اس نے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور ایسے قصے پڑھنے والے تو جاہل ہی ہیں۔ ان جاہلوں سے بڑھ کر بعض مولویوں نے یہ غضب کیا ہے کہ نفع تجارت کے لئے وہ قصہ چھاپا اور چونکہ موضوع کی اشاعت ناجائز ہے اپنے کو بری کرنے کے لئے اخیر میں یہ لکھدیا کہ یہ قصہ موضوع طبع ہوا اول تو آپ کو اس کی اشاعت کی کونسی دینی ضرورت تھی پھر یہ کہ عوام تو موضوع کے معنے بھی نہیں سمجھتے اگر لکھنا تھا تو یہ لکھتے کہ یہ قصہ بالکل لغو اور جھوٹ ہے اس کا پڑھنا جائز نہیں لیکن اگر ایسا لکھتے تو وہ بکتا کہاں۔ خدا بچائے ایسے دین فروشوں سے اسی لئے کہا ہے ؎

بدگہر را علم و فن آموختن

دادن تیغ است دست راہزن

(بری فطرت والے کو علم و فن سکھانا ایسا ہے جیسا کہ ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دے دی جائے)

اب اگر کہو کہ پھر اس صورت میں تو انتخاب بہت مشکل ہوا تو واقعی تم کو انتخاب مشکل ہے مگر کسی عالم سے انتخاب کرائیے یہ تو نصاب تعلیم میں گفتگو تھی مگر اس کے ساتھ ہی یہ اس سے زیادہ ضرور ہے کہ ابتداء ہی سے اپنی اولاد کو کسی بزرگ کی صحبت میں وقتاً فوقتاً رکھئے اور خود بھی رہیئے اس کی صحبت میں خدا تعالیٰ نے اصلاح کا اثر رکھا ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

صحبت نیکاں اگر یک ساعتست بہتر از صد سالہ زہد و طاعتست
ہرکہ خواہد ہمنشینی با خدا گو نشیند در حضور اولیا

رباتیں بنانا چھوڑ دے اپنے اندر کیفیت پیدا کرنے والا بن اور کسی کامل پیر مرشد کے سامنے اپنے کو مٹا دے۔ نیکوں کی صحبت میں ایک گھڑی کو رہنا سو سال کے تقوے اور فرمانبرداری سے بڑھ کر ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ حق تعالیٰ کی مجلس میں بیٹھے اس سے کہدو کہ اولیاء اللہ کی مجلس میں بیٹھے)

مگر صحبت کا ہم لوگوں میں بالکل ہی اہتمام نہیں۔ میں نے ایک موقع پر اس کو ایک مستقل تقریر میں بیان کیا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ جہاں اور تمام ضروریات اپنی اولاد کے لئے تجویز کی جاتی ہیں چند روز کے لئے اس کا بھی انتظام کر لیجئے۔ کہ اس کو کسی بزرگ کی سپرد کر دیجئے اور کم سے کم ایک سال تک ان کے پاس ضرور رکھئے۔ اگر کہئے کہ اس میں تو ان کی دنیوی تعلیم کا بڑا نقصان ہو گا تو میں کہتا ہوں کہ اس کی یہ صورت کیجئے کہ ہر چھٹی میں چند روز رکھا کیجئے۔ اس طرح چند مرتبہ میں یہ مدت پوری ہو جائے گی۔ غرض صحبت کا بھی اہتمام ہو اور محقق علماء کے تجویز کردہ نصاب کی تعلیم ہو اس طرح دین کی درستی ہو سکتی ہے اگر فرصت کم ہو تو اردو سہی ورنہ وقت ملے تو عربی ہی سہی نہ چوکئے کہ تبحر و تحقیق کا یہی طریقہ ہے۔

اور میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ علوم عربیہ اگر دین کے لئے نہ پڑھائے جائیں تو دنیا ہی کی لیاقت اور استعداد کے لئے پڑھائیے میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ ایم۔ اے ہیں مگر عربی کی استعداد نہیں رکھتے ان سے لیاقت میں عربی خواں جو انٹرینس بھی نہیں پڑھے بڑھے ہوتے ہیں تو اگر عربی کی تعلیم دین کے لئے نہ ہو تو کم از کم دنیا ہی کے لئے ہو لیکن اس سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ میں علم دین کی دنیا کے لئے حاصل کرنے کی رائے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ علم دین کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی اپنا اثر ضرور کرتا ہے اور حاصل کرنے والے کو دین دار بنا کر رہتا ہے یہ سمجھ کر میں نے کہدیا ہے کہ خواہ دنیا ہی کے لئے حاصل کرو غرض

جس طرح ہو علمِ دین کا اہتمام کرو گو اس کے ساتھ انگریزی بھی ہو میں انگریزی تعلیم سے منع نہیں کرتا مگر اس وقت تو اسلام ہی کے لالے پڑ رہے ہیں آخر اس کو بھی سلجھانے کی ضرورت ہے یا نہیں بس اس کی رائے دے رہا ہوں اور یہ دعوٰی کرتا ہوں کہ دنیا کے سنبھالنے کے لئے بھی دین ہی کی ضرورت ہے اس لئے میں نے تمہید میں یہ دعوٰی کیا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری جماعت مولویوں کی ہے۔ اب ان آیتوں سے اس کو ثابت کرتا ہوں تو سمجھئے کہ ان دو آیتوں میں یہ بھی ارشاد ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (دنیا کے درست ہو جانے کے بعد اب اس میں فساد مت پھیلاؤ) اور یہی جزو ہے جو اس وقت مقصود بالبیان ہے۔ یعنی اصلاح کے بعد زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔ اب یہ دیکھئے کہ فساد کیا ہے اور اصلاح کیا ہے اسی کے فیصلے کیلئے میں نے یہ دونوں آیتیں پوری پڑھ دی ہیں تاکہ سیاق و سباق سے اس کی تعین ہو جائے تو پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اپنے رب کو تنہائی میں رو رو کر یاد کیا کرو) اور بعد میں یہ فرمایا کہ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اس کو اس سے ڈر کر بھی اور اس کے انعام کی امید کا خیال کر کے بھی ہر طرح یاد کرو) اور دعا میں دو احتمال ہیں یا تو دعا کے وہی معنی ہوں جس کو عرف میں دعا کہتے ہیں یا دعا کے معنے عبادت کے ہوں کیونکہ قرآن میں دعا کے معنی عبادت کے بھی آئے ہیں چنانچہ بعض نے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (تم مجھے پکارو میں تمہاری بات سنوں گا) میں عبادت کے لئے ہیں اور بعض نے دعا کو اپنے معنی میں رکھ کر لفظ عبادت کو جو اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ (بیشک جو لوگ خدا کی عبادت سے انکار کرتے ہیں) میں ہے دعا کے معنوں میں لیا ہے۔ نیز دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے امید رکھ کر پکارتا ہے) یہاں دعا بمعنی عبادت ہے غرض دعا، دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس آیت میں اگر عبادت کے معنی لئے جائیں تب تو خلاصہ یہ ہوگا کہ اول بھی عبادت کا حکم ہے اور بعد میں بھی اور

درمیان میں فساد کی ممانعت ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبادت نہ کرنا فساد ہے اور اس سے اصلاح کی بھی تعیین ہوگئی کہ بعد انتظام عبادت کے ترک عبادت نہ کرو اور اگر دعاء کے معنے عبادت کے نہ لئے جائیں بلکہ اپنے ظاہری معنے پر رکھا جائے تو اگرچہ اُس وقت بظاہر یہ آیت اس دعوے کے اثبات کے لئے مفید نہ ہوگی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس صورت میں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ عبادت دو قسم کی ہے۔ ایک تو وہ عبادت جس سے مقصود دین بھی ہے اور ایک وہ عبادت جس سے کبھی دنیا بھی مقصود ہوتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی عبادت اپنے عبادت ہونے میں زیادہ قوی ہے۔ اب سمجھئے کہ دعا عبادت کی ایسی فرد ہے کہ اس سے دنیا کی بھی طلب ہوسکتی ہے تو اس اعتبار سے دعا دوسرے درجے کی عبادت ہوگی تو جب اس کے ترک کو فساد فرمایا گیا ہے تو جو عبادت خالصہ ہے اُس کا ترک تو کیوں موجب فساد نہ ہوگا۔ تو قرآن اس کا دعوےٰ کرتا ہے کہ عبادت کا ترک کرنا موجب فساد فی الارض ہے اور انتظام عبادت کو اصلاح فی الارض فرمارہا ہے۔ باقی یہ کہ جس وقت یہ ارشاد ہورہا ہے اُس وقت بھمہ وجود اصلاح کہاں تھی جس کے بعد فساد سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی کثرت تھی جو ہر وقت فساد ہی میں رہتے تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اصلاح سے سامان اصلاح ہوگا یعنی بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ سامان تھا اصلاح فی الارض کا تو معنے یہ ہوئے کہ ہم نے یہ اصلاح کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر سامان اصلاح کر دیا اگر تم ان کو چھوڑ دو گے تو تم فساد کرو گے۔ یہ تو آیت کا مدلول ہوا جس کا حاصل یہ ہوا کہ عبادت یعنی دین نہ ہونا موجب فساد ہے اب میں اس کو مشاہدہ سے ثابت کرتا ہوں لیکن اول اس کو سمجھئے کہ دین کیا چیز ہے تاکہ آپ کو بھی مدلول آیت میں تعجب نہ ہو تو دین حقیقت میں چند چیزوں کے مجموعے کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے اس وقت دین کا یہ ست نکالا ہے کہ پانچ وقت کی

نماز پڑھ لی وبس اور بعض نے یہ بھی نہیں رکھا بلکہ محض مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ اپنی مزعوم تفسیر کے اعتبار سے ان کا مذہب ہے اور اس پہ غضب یہ ہے کہ بعض نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی بھی ضرورت نہیں سمجھی میں نے اس کی تصریح دیکھی ہے کہ (نعوذ باللہ) رسالت کا ماننا نجات کا موقوف علیہ نہیں۔

صاحبو! مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے لیکن آپ کو خبر نہیں صاحبو! غضب ہے کہ غیر قومیں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی جاتی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے۔ اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور وہ پانچ چیزیں ہیں۔ عقائد[۱]، عبادات[۲]، معاملات[۳]، آداب معاشرت[۴]، اخلاق باطنی[۵] یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو، ریا نہ ہو، تواضع ہو، اخلاص ہو، قناعت ہو، شکر ہو، صبر ہو۔ وعلیٰ ہذا۔ بس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے۔ اس وقت کسی نے کسی کو کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے۔ کسی نے اعمال کو چھوڑا کسی نے معاملات کو کسی نے معاشرت کو اس طرح سے کہ اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے۔ اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے بلکہ ان اخیر کے دو جزو کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے اس تفصیل کے بعد حاصل آیت کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلال کو افساد فی الارض میں دخل ہے بس اب اس کو دیکھ لیجئے مشاہدۃً کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے۔ سو بعض کا دخل تو بین ہے۔ مثلاً اخلاق کہ ان کا اثر امن عام میں بین ہے اور ذرا سے غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ احکام معاملہ کا حاصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع

نہ کیا جائے پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جن کی شریعت نے کی ہے جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کئے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں اور جب کسی کا ضرر نہیں تو امن قائم ہوگا۔ تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے باقی اور تین چیزوں کا امن عام میں دخیل ہونا سو یہ کم ظاہر ہے اس لئے اس کو بھی ثابت کرنا ضرور ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخیل ہیں۔ سو اوّل یعنی عقائد کو تو یوں سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معاد اُمّ العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں بڑا دخل ہے۔ آپ نے اخلاق اور معاملات کو تو امن عام میں دخیل مان ہی لیا ہے اسی کی تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائیگا ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا سچ بولنا، ہمدردی کرنا، خودغرضی نہ کرنا سب داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے۔ لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں جن میں ایک توحید ورسالت کا قائل ہو اور دوسرا اس کا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اُن کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر رسوائی کا اندیشہ ہو اس وقت تک تو ان اخلاق پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آپڑے گا کہ ان اخلاق پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید ورسالت کو

کبھی ان اخلاق کے ترک کی پرواہ نہ ہوگی۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کی جاتی ہے جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ یا فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں اور دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فاقے گذرتے ہوں اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے اور دوسرے رفیق سفر کو ان نوٹوں کے لے لینے کا موقع ملے اور عاقل بھی یہ اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف ان کو فروخت کر سکے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے اس صورت میں اخلاق اور نفس میں سخت کشاکشی ہوگی اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہیے۔ اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر ان کو کیوں نہ رکھ لیا جائے اس کشاکش میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم مہلکہ سے بچا لے پس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا۔ البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا اسی طرح ایک اور جزئی یاد آئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آ جاتے ہیں کہ ڈاکخانہ کی مہر سے بالکل بچے ہوئے ہوتے ہیں اگر میں ان کو استعمال کر لوں تو کوئی بھی بازپرس نہیں کر سکتا کیونکہ نہ میرے پاس ڈاکخانہ والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اول ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں اس کے بعد خط پڑھتا ہوں

علیٰ ہذا اگر روزمرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبدا اور معاد کا معتقد ہو اس کے تفصیل کے لئے رسالہ مآل التہذیب دیکھنے کے قابل ہے اس میں دکھلایا ہے کہ اس مخترع تہذیب کا مآل دنیا ہی میں ہونے والا ہے۔ انہوں نے ایک ایک مفسدہ کو لکھا ہے اور ختم پر ہر جگہ یہ کہدیتے ہیں وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُهَذِّبِيۡنَ (بس سخت عذاب ہوگا قیامت میں (نئے) مہذبین کو) فرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جب ہو سکتی ہے کہ عقائد درست ہوں۔ اب اعمال کا دخل لیجئے یہ بھی ان شاء اللہ تعالےٰ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا۔

سب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کا منشا ہے نااتفاقی اور نااتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نااتفاقی کی کوئی وجہ نہیں تو اتفاق کے لئے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے۔ اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت نہ سکھلائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہو جاتی ہے اور نماز میں اول ہی سے اللہ اکبر کی تعلیم ہے تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور جوارح سے رکوع اور سجدہ کرے گا، زمین پر پیشانی رکھے گا وہ کیونکر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔ اگر کہو اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا نہ سمجھیگا لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ ناتجربہ کاری کا اعتراض ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار اپنے جوشِ حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک لفٹنٹ گورنر آجائے

تو خود ان کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب سے ہوئے ہیں اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی ماردی تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو چیونٹی سے بھی مغلوب اور ناتواں سمجھے گا کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی تو اللہ اکبر کی تعلیم وہ ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نااتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے علیٰ ہذا قوت بہیمیہ سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزے سے قوت بہیمیہ ٹوٹتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کہ اس سے لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے دیکھو حاتم طائی سے بوجہ سخا کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنیٰ یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔ علیٰ ہذا حج پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں ایک زمانہ میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق واتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجمعوں میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی بہت سی وارداتیں ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں البتہ اکثر لوگ شاید بدوؤں کے شاکی ہوں گے سو اصل میں ان کا مقصود سلب وقتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں ان کی حالت بالکل یہاں کے گاڑی بانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پیر پھیلاتے ہیں ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کی جائے ان کو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دیدیا جائے تو وہ بہت آرام پہونچاتے ہیں اور یہ جو سننے میں آتا ہے کہ بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں تو اول تو ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں

اور وہ بھی اس وقت جبکہ خود اپنی حفاظت نہ کرے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے غرض حج کو اتفاق و امن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اعمالِ حج از سرتا پا تو اضع سے پرُ ہیں۔ اب رہی معاشرت سو تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر ٹپکتا ہے مثلاً ناجائز وضع سے شریعت نے منع کیا ہے سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں ان سب میں تکبر ہے جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں وہ غور کرلیں کہ اس وقت اُن کے دل کی کیا حالت ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع ولباس اختیار کرکے اس کا اثر دیکھیں تو ان کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا یہ تو سمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔ ایک دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے پس اسی طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرت میں بھی اور وہ یہ ہے کہ ان سب سے قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے اور اس نور سے اس کی وہ حالت ہوجاتی ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں یعنی ان کو کچھ ایذا نہ دے) اب میں ایک اور بات کہتا ہوں جو تمام اجزاء دین کو عام ہے وہ یہ کہ دین کی یہ غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمالیں گے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (جو اللہ سے ڈرتا ہے تو وہ اس ڈرنے والے لئے رہائی (آفات دارین) کرتا ہے اور ایسی جگہ سے روزی پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا) پس دین کی درستی کو اس طرح دنیا کی درستی میں دخل ہوا مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہوگا تو دنیا کے کام بنیں گے بلکہ صرف اس لئے کہ ؎

دلا آرامی کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جو تیرا محبوب ہے اس میں اپنے دل کو لگا اور دوسرے سارے عالم سے اپنی آنکھوں کو بند کرلے)

اور جو مصلحتیں سامنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار ؛ بگذار ند و خم طرۂ یارے گیرند

(میرے نزدیک صحیح مشورہ یہ ہے کہ میرے دوست سب کاموں کو چھوڑ دیں اور صرف محبوب کے دامن کو پکڑ لیں)

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار

کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(ایسے عاشق کو جس کا عشق اپنی گرمی سے دنیا کو جلا سکتا ہو اس کو ہر کام میں مصلحت سوچنے سے کیا کام مصلحتیں سوچنا اور ملک کی تدبیروں کا سوچنا اس شخص کا کام ہے جس کو تحمل اور صبر و برداشت کی عادت ہو)

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا مگر حاصل ضرور ہوں گی وفادار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو خود غرض اور خود کام کہا جائے گا پھر آقا اپنے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائے گا اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کا تابع رہے چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچتا رہے تو کام کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص الحمد کچھ ہی کام کرنے کی حالت میں بھی ہر وقت تنخواہ کے روپئے کے مصارف و مداخل کے حساب میں لگا رہے تو یقیناً کچہری کا سارا کام برباد ہو جائے گا۔ جیسا ایک کاتب کی حکایت ہے کہ بیوی کو خط لکھ رہے تھے ایک چڑیا نے ہگدیا تو آپ نے اس چڑیا کو ایک گندی گالی دی چونکہ اس گالی میں مشغولی زیادہ ہوئی تو وہی گالی خط میں بھی لکھی گئی وہاں جو خط پہونچا تو تعجب ہوا اور وجہ پوچھی کہ مجھ سے کیا قصور ہوا آخر سارا

قصہ لکھا تو یہی حال ہو مصالح کے مشتغل کا کہ مقصود کام کا ستیاناس ہو جائے حاصل یہ کہ اگر آدمی کام کے وقت ثمرات پر نظر رکھے تو وہ خود کام سے حجاب ہو جاتے ہیں۔ حضرت سڑک کوٹنے والا مزدور اگر کوٹتے وقت پیسوں کی فکر میں رہے تو ضرور کہیں چوٹ کھائے گا اگر چوٹ سے بچنا ہے تو اس وقت مزدوری پر بالکل نظر نہ کرے بلکہ کام پر نظر کرے مگر دنیا کے کاموں میں تو لوگ ان قواعد کو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے کاموں میں ان سے کچھ کام نہیں لیا جاتا حالانکہ ضروری بات ہے۔ میں نے تین تقریریں کیں ہر تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ دین کو طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لئے کیں کہ مذاق مختلف ہیں یہ قواعد دینیہ کی خوبی ہے کہ ان سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہو گیا تو دین گویا اس شعر کا مصداق ہی ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

(اس کے حسن کے عالم کی بہار دل کو اور روح کو خوش رکھتی ہے۔ جو صورت کو پسند کرنے والے ہوتے ہیں وہ رنگ و روپ سے خوش ہوتے ہیں)

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھ لو پرکھا لو الحمد للہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ امن کی صورت اگر ہے تو احکام خداوندی کی پابندی سے ہے اور اگر کہو کہ بہت تو میں مسلمان نہیں ہیں اور وہ پابند احکام نہیں ان میں امن کیسے قائم ہے تو میں اجمالی جواب تو پہلے دے چکا ہوں اور اس اجمال کی تفصیل کو مآل التہذیب پر حوالہ کرتا ہوں پتہ مطبع نظامی کانپور۔ اس کے نو مقالے ہیں وہ قابل اس کے ہیں کہ اپنے بچوں کو پڑھلائے۔ غرض یہ بات بلاشبہ ثابت ہو گئی کہ امن عام کی بقا محض دین پر ہے اور اس سے اس حدیث کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالُ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ۔ معنی۔ جب تک کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ قیامت نہ آئے گی اور مختصر وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام طاعت ہے اور کفر بغاوت ہے

تو دنیوی سلطنتوں کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شہر میں باغی زیادہ ہوں تو شہر پر توپ خانہ لگا دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ بھی اگر یہی کرتے تو اکثر اوقات توپ لگنے کے ہوتے مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے یہ قانون مقرر کیا کہ اگر کل باغی ہوں مگر صرف ایک غیر باغی ہو تو اس کی بدولت تمام عالم محفوظ رہے گا۔ ہاں جب بغاوت عام ہو جائے اس وقت پھر ہلاک عام بھی ہوگا اور یہیں سے ایک اور بات بھی سمجھ میں آگئی کہ بہت سے لوگ جن کو آپ حقیر سمجھتے ہیں جیسے اللہ اللہ کہنے والے غرباء۔ وہ آپ کی بقاء کے سبب ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس خلق کا اتباع ہم کو بھی کرنا چاہیئے کہ ایک کے لئے سب کی رعایت فرمائی، شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ع مراعات صد کُن برائے یکے

اور فرماتے ہیں

ع خورند برائے گلے خارگلے

یعنی ایک پھول کے لئے دس جگہ کانٹوں میں الجھتے ہیں تو ہم کو بھی ایسے لوگوں کیلئے مشقتیں اٹھانا چاہئیں غرض جب ان میں سے ایک بھی نہ رہے گا اس وقت توپ لگ جائے گی کہ گھر کا گھر گر پڑے گا تو تمدن اور امن اطاعت ہی سے ہے اب یہ بھی سمجھو کہ اطاعت ایک عمل ہے اور عقلی مسئلہ ہے کہ عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا تو امن عام کے لئے علم دین کی ضرورت ہوئی اور اس کے عامل علماء ہیں تو اب بتلاؤ کہ یہ جماعت دنیا میں سب سے زیادہ ضروری ہوئی یا سب سے زیادہ بیکار۔ اور اگر کسی مقدمہ میں کوئی خدشہ رہے تو بسم اللہ میں ہر وقت حاضر ہوں میں نے کوئی شاعری نہیں کی نہ کسی کی طرفداری کی اور صاف کہدیا کہ ان میں بعض بدنام کنندہ نیکاں بھی ہیں وہ ہماری بحث سے خارج ہیں لیکن اگر وہ بھی اپنی اصلاح کر کے اس مقبول جماعت میں آنا چاہیں تو بسر و چشم آئیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں بریں درگاہ نیست

(جو آنا چاہے آجائے اور جو جانا چاہے وہ چلا جائے اس دربار میں کوئی کسی سے پوچھ گچھ اور روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے)

لاکھ برس کا عابد اگر چلے تو کان پکڑ کر باہر اور اگر لاکھ برس کا کافر آئے تو بسم اللہ۔

صاحبو! امید ہے کہ مسلمانوں کو اس بیان سے حقیقت حال منکشف ہوگئی ہوگی۔ اب میں نہایت ادب سے تھوڑا سا خطاب طالب علموں کو کرتا ہوں کہ آپ کی ضرورت محض علم و عمل کی وجہ سے ہوئی ورنہ آپ کوئی چیز نہیں اور یاد رکھو جتنا لطیف کھانا ہوتا ہے اس میں زیادہ اور جلدی بدبو ہو جاتی ہے۔ پس جس طرح آپ بحالت درستی نافع الوجود ہیں اسی طرح نادرستی میں مضر اور سبب فساد بھی ہوں گے اس لئے آپ کو بھی اپنی اصلاح کرنا ضرور ہے اور آپ کی اصلاح کے دو طریق ہیں ایک تو یہ کہ زمانہ تحصیل میں استاد دیندار ڈھونڈیئے بددین استاد ہرگز ہرگز اختیار نہ کرو۔ یہی طالب علمی وقت ہے تخم پاشی کا پھر اس کے بعد کچھ دنوں پڑھ کر کسی اہل اللہ کی چندے صحبت اختیار کرو تب البتہ تم خادم دین بن سکو گے پھر لوگ تمہارے قدم دھوئیں گے اور پھر پہلی جماعت غیر اہل علم سے خطاب کرتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب علم ایسا نہ ہو تو اس کو چھوڑ دو اور اس کو نہ دیکھو وہ سرکاری آدمی نہیں مگر یہ یاد رہے کہ وہ کام کا آدمی بھی ان ہی ناکاروں میں رلا ملا ہوا ہے اور اس کی تلاش کے لئے البتہ ان سب کی بھی خدمت کرو ان ہی میں وہ مل جائے گا۔

ع۔ مراعات کن صد برائے یکے

کا یہی مطلب ہے شیخ نے حضرت ابراہیم کی حکایت لکھی ہے کہ وہ بغیر مہمان کے کھانا نہ کھاتے تھے۔ ایک دن مجوس مہمان ہوا جس نے کھانے پر بسم اللہ نہ کہی آپ نے ناراض ہو کر اٹھا دیا فوراً وحی سے ارشاد ہوا کہ ؎

گر او می برو پیش آتش سجود تو واپس چرا میکشی دست جود
خورش دہ بگنجشک وکبک و حمام کہ شاید ہمائے در افتد بدام
چو ہر گوشہ تیر نیاز افگنی بنا گاہ بینی کہ صیدے کنی

(اگر وہ آگ کو سجدہ کرتا ہے تو سخاوت سے اپنا ہاتھ کیوں روکتا ہے تو چڑیوں اور چکوروں اور کبوتروں سب کو دانے ڈالتا رہ شاید کسی روز ہما پرندہ بھی جال میں آ پھنسے تو عاجزی کا تیر ہر طرف پھینکدے ممکن ہے کسی وقت اچانک کوئی شکار مل جائے)

جب شکاری شکار ہما کرتا ہے تو چیل اور کوؤں کو نہیں اڑاتا اُن ہی کے ساتھ ہما بھی پھنس جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم انتخاب کر کے تعلیم دین اوران میں عیب نکالیں جیسا کہ آجکل لوگ طالب علموں میں عیب نکالتے ہیں تو بخدا بہت سے اچھے اچھے بھی دولت علم سے محروم رہ جائیں گے کیونکہ بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ اول اول ان میں قابلیت نظر نہیں آتی مگر بعد میں ان کے جواہر کھلتے ہیں۔ پس ان سب کی خدمت کرو۔ انہیں میں سے لعل وجواہر بھی نکل آئیں گے۔ ایک بادشاہ زادے کا لعل شب کو جنگل میں گر پڑا تھا تو حکم دیا کہ سب کنکروں کو جمع کر لو روشنی میں چھانٹ لیں گے اُنہیں کنکروں میں سے وہ لعل پاگیا۔

تو آپ اپنے اس انتخاب[۵] سے ہمیں معاف کیجئے اور آپ ان پر اعتراض نہ کیجئے البتہ اگر تم طالب علموں کے ساتھ اولاد کا سا برتاؤ کرو اور اپنی اولاد سمجھو اور پھر شفقت وخیر خواہی سے ان کی بے عنوانی پر ان کو تنبیہ بھی کرو تو پھر دیکھو وہ بھی سمجھیں گے کہ ؎

آنزا کہ بجای تست ہر دم کرمے
عذرش بنہ ار کند بعمری ستمے

[۵] یہ عدم انتخاب اس طالب علم کے اعتبار سے ہے جس کا صرف غیر نافع ہونا محتمل ہو باقی جس کا مضر دین ہونا معلوم ہو جائے اسکو متبوع ہونے کے درجے تک ہرگز نہ پڑھائیں البتہ اپنے عمل کے لائق اسکو بھی تعلیم دینا فرض ہے ۱۲ منہ

(وہ ذات کہ جو تجھ پر ہر وقت بخششیں کر رہی ہے اگر عمر بھر میں کسی وقت میں اس کی طرف سے تجھے دکھ اور گلہ بھی ہو تو اُسے معذور رکھ)

غرض اولاد کو جس درجے کی تنبیہ کرتے ہو اس کی اجازت ہے اور اس سے زائد اجازت نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت بڑی ضرورت دنیا میں اہلِ علم اور دین کی ہے ان کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ مگر وابستگی کے یہ معنے نہیں کہ چندہ میں روپیہ دیکر بے فکر ہو جاؤ۔ روپیہ تو خدا دے گا۔ بلکہ اُن سے کھل کر ملو اور ان سے مسئلے پوچھتے رہو تاکہ تم کو دین اور اہل دین کی محبت بڑھے اور تمہارے لئے یہ وعدہ صادقہ پورا ہو جائے کہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی قیامت میں) اس کے ساتھ ہوگا جسے (دنیا میں) دوست رکھتا ہے) اور اگر تم کو ان کی محبت ہو گئی تو ان شاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سے بھی تم کو محبت صادقہ ہو جائے گی اور بعض لوگ خود تو علماء کی طرف متوجہ ہوتے نہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری خبر نہیں لیتے تو صاحبو! مریض طبیب کے پاس جایا کرتا ہے طبیب مریض کے پاس از خود نہیں جایا کرتا کیا وجہ ہے کہ سول سرجن کی شکایت نہیں کیجاتی کہ ہماری خبر نہیں لیتا۔ صاحبو! سول سرجن کی شکایت تو ناجائز اور علماء کی شکایت جائز۔ صاحبو! تم نے علماء کو اپنی خبر کب دی۔ اگر تم دو دفعہ جاکر ان کو اپنے مرض کی خبر دوگے تو وہ ایسے شفیق ہیں کہ چار دفعہ خود آئیں گے۔ اب تو مولوی اس لئے بھی بچتے ہیں کہ ان کا از خود متوجہ ہونا خود غرضی پر محمول ہوگا۔ مشہور مقولہ ہے:۔

نِعْمَ الْاَمِیْرُ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ وَبِئْسَ الْفَقِیْرُ عَلٰی بَابِ الْاَمِیْرِ (وہ امیر اچھا ہے جو فقیر کے دروازے پر حاضر ہو اور وہ فقیر بُرا ہے جو امیر کے دروازے پر جائے)

تو یہ معنی ہیں وابستگی کے اور جب آپ وابستہ ہوں گے تو وہ بھی آپ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اور اس سے ملاپ پیدا ہوگا۔ مگر ابتداء اس کی اہلِ دنیا کی طرف سے ہونا چاہیئے اور اس وابستگی کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی علم دین پڑھایئے۔

غرض یہ چیزیں ضروری الوجود ہیں ان کی فکر کیجئے۔ اب ختم کرتا ہوں اللہ تعالےٰ سے توفیق علم و عمل کی دعا کیجئے۔

تمت بالخیر

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

دوسرا وعظ ملقب بہ

طریق النجاۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر: محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم۔ اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

دوسرا وعظ ملقب بہ

طریق النجاۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد کیرانہ ضلع مظفرنگر	۲۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۳۰ھ	۳ گھنٹے	بیٹھ کر	نجاۃ کے دو طریقے ہیں یا تحقیق یا تقلید اہلِ تحقیق	مولوی سعید احمد تھانوی	تقریباً ۳۰۰۰	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔ وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ

اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ (اور کافر کہیں گے کہ ہم سنتے یا سمجھتے تو اہلِ دوزخ میں شامل نہ ہوتے) یہ ایک آیت ہے سورۂ ملک میں اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے کفار کی ایک حکایت نقل فرمائی ہے یعنی ان کا ایک قول ہے جو کہ وہ قیامت میں کہیں گے مگر مقصود حکایات سے خود وہ حکایات نہیں ہوتیں خواہ وہ حکایات ماضیہ ہوں یا حکایات مستقبلہ بلکہ ان سے مقصود کوئی عبرت یا کسی بات کا جتانا ہوا کرتا ہے چنانچہ اس کے متعلق ایک آیت میں ارشاد بھی ہے لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ کہ ہم نے جو قرآن شریف میں اگلی قوموں کے قصے بیان کئے ہیں ان سے عقلمند لوگوں کو عبرت ہوتی ہے اس کا حاصل یہی ہے کہ قصوں کے نقل کرنے سے غرض عبرت دلانا ہوتا ہے عبرت کا ماحصل قیاس ہوتا ہے یعنی پہلی قوموں کے حالات پر اپنے حالات کو کسی امر مشترک کی وجہ سے قیاس کرنا اور اپنے لئے بھی ان کی حالت کے مشابہ اپنی کسی حالت کی تقدیر پر اُسی امر کو ثابت کرنا جو کہ ان کے لئے ثابت ہو چکا ہے۔ اس مقام پر بھی حکایت کو نقل کرنے سے یہی مقصود ہے کہ وہ حکایت ہم کو سنائیں تاکہ ہم غور کریں اور جانچیں کہ جس امر پر ان کو وعید ہو رہی ہے ہمارے اندر بھی وہ پایا جاتا ہے یا نہیں اور ہماری حالت اس پر منطبق ہے یا نہیں اور اس سے نجات کا کیا ذریعہ ہے کہ ہم اس کو اپنا دستور العمل قرار دیں یہ حاصل ہے مجملاً اس آیت کا جیساکہ ترجمے سے آپ کو معلوم ہوگا اور تفصیل اس کی بیان سے معلوم ہو جائے گی۔

ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ قیامت کے دن کفار یوں کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو آج ہم اصحاب جہنم میں نہ ہوتے۔ اس ترجمے سے معلوم ہوا کہ کفار اپنی بدحالی کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ ہم بہت چوکے کہ ہم نے دنیا میں کرنے کا کام نہ کیا اور اس کرنے کو خدا نے اس حکایت میں دو باتوں میں منحصر کیا ہے ایک تو سننے میں اور ایک سمجھنے میں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے

کہ عمل علی الحق کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ کسی سے سنا ہو دوسرے یہ کہ خود سمجھا ہو۔ کفار نے چونکہ نہ سنا تھا نہ خود سمجھا تھا اس لئے ان کو افسوس اور حسرت کی نوبت آئی۔ اس سے آپ کو آیت کا ماحصل مجملاً معلوم ہو گیا ہو گا خدا تعالیٰ نے اس حکایت کو نقل کر کے اس پر انکار نہیں فرمایا اور اس کو غلط نہیں کہا بلکہ اگلی آیت میں اس کی تصدیق فرمائی فَاعْتَرَفُوا بِذَنْبِهِمْ (انہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا، جس سے معلوم ہوتا ہے ان کا ذنب یہی تھا تو معلوم ہوا کہ یہ امر حق ہے اور ان ہی دو کا نہ ہونا باعث دخول جہنم ہوا بلکہ اگر اس کو نقل فرما کر سکوت بھی کیا جاتا تب بھی یہ حق سمجھا جاتا کیونکہ عقلی قاعدہ ہے کہ جس بات کو بیان کر کے اس پر سکوت کیا جائے اور رد و انکار نہ کیا جائے تو وہ حاکی کے نزدیک امر مرضی ہوا کرتا ہے نیز اصولیین نے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے نیز قطع نظر اس مقدمہ کے اس کے حق میں ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ یہ مقولہ قیامت کا ہے اور قیامت میں چونکہ سب امور منکشف ہو جائیں گے اس لئے کوئی جھوٹ نہ بولے گا اور اگر بعض آیات سے مثلاً وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ (قسم ہے اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں ہیں) یہ شبہ ہو کہ ان لوگوں نے جھوٹ بولا چنانچہ ارشاد ہے اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (دیکھو تو اپنی جانوں پر کس طرح جھوٹ بول رہے ہیں) تو جواب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ ایک عارض کی وجہ سے بولا اور وہ عارض یہ ہے کہ بولنے میں ان کو نفع کی توقع تھی اور یہاں یہ بات نہیں ہے بلکہ اس قول میں خود ان ہی کا ضرر ہے کہ اعتراف ذنب لازم آتا ہے اس لئے یہ قول غلط نہ ہو گا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت میں کشف حقیقت کا اصل مقتضا یہ ہے کہ وہاں جو بات کہی جائے بالکل صحیح کہی جائے۔ لیکن بعض لوگ عارض نفع کی وجہ سے اس مقتضا کے خلاف کریں گے تو جس جگہ وہ عارض پایا جائے گا اس موقع پر تو ان کے قول میں کذب کا احتمال

ہوگا اور جس موقع پر دہ عارض نہ ہو وہاں اصل مقتضا کی وجہ سے قول کو صادق ہی سمجھا جائے گا لہٰذا کفار کا یہ قول بالکل سچا ہے اور پھر جبکہ اس کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تائید بھی موجود ہے تو اس کے صدق میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا۔ چنانچہ ارشاد ہے فَاعْتَرَفُوا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (انہوں نے اپنے گناہ کا اقرار کرلیا) جس کی اوپر تقریر ہو چکی ہے۔ اب میں اصل مقصود کو بیان کرتا ہوں اور اس آیت سے ان شاء اللہ تعالیٰ اس کو ثابت کردوں گا کیونکہ وہ مضمون اس آیت کا مدلول ہے اور اس کی ضرورت نہایت عام ہے ہر وقت ہر جگہ ہر مسلمان کو اس کی ضرورت ہے ایسے مضامین بتلانا نہایت ضروری ہیں اور جیسے اس کی ضرورت عام ہے ایسا ہی اس کا فائدہ بھی نہایت عام ہے یعنی اس کے استعمال کے بعد حتمی فائدہ اس میں ہے۔ نیز یہ مضمون نہایت سہل ہے۔ تو ان تینوں باتوں پر نظر کر کے اس کی ضرورت میں ذرا بھی کلام نہیں رہتا۔ دیکھئے عقلی قاعدہ یہ ہے کہ مرض جس قدر صعب ہوتا ہے اس کا علاج بھی اسی قدر صعب ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو یا کسی جماعت کو یا کسی ایک شہر میں کوئی سخت مرض پھیل جائے تو عقلاً اس کے لئے نہایت سخت تدابیر تجویز کرتے ہیں اور جب یہ قاعدہ مسلم ہے اور عقلاً اس کو برداشت کیا جاتا ہے اور اگر برداشت کی تاب نہیں ہوتی تو علاج سے مایوس ہونا پڑتا ہے چنانچہ بعض مرتبہ اطبا کہتے ہیں کہ تمہارا مرض امیرانہ ہے مثلاً کسی غریب آدمی کو جنون ہو جائے اور کوئی طبیب اس کا علاج شروع کرے اور کسی طرح اس کو فائدہ نہ ہو تو پریشان ہو کر طبیب کو یہ کہنا پڑے گا کہ بھائی تمہارا مرض تو امیرانہ ہے اور تم دو چار پیسے کی دوائیں اس کا علاج چاہتے ہو یہ کیونکر ہو سکتا ہے اس کے لئے تو بہت سخت تدابیر کی ضرورت ہے جن کی وسعت تم میں نہیں ہے لہٰذا تم اچھے نہیں ہو سکتے۔

تو از روئے عقل ہر مرض صعب کی تدابیر بھی صعب ہوتی ہیں اور بعض اوقات مایوسی کی نوبت آتی ہے۔ لیکن اس طب میں جس کا نام طب ایمانی ہے کوئی درجہ بھی ایسا نہیں ہے کہ وہاں پہونچکر مایوس کر دیا جائے اور یہ کہدیا جائے کہ اب تمہارا مرض لا علاج ہوگیا، بلکہ ہر مرض کے لئے علاج موجود ہے اور نہایت سہل علاج موجود ہے میں ان شاء اللہ تعالےٰ اس کو بدلیل بیان کردوں گا کہ صعب سے صعب مرض میں بھی نہایت سہل نسخہ تجویز کیا ہے اور یہ دلیل ہے خدا تعالےٰ کی رحمتِ عامہ کی کہ اتنا بڑا مرض اور اس کا علاج اس قدر سہل۔ اور اس سے اس آیت کے معنی بھی منکشف ہوجائیں گے کہ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ اور مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ یعنی خدا تعالےٰ نے دین میں تم پر کچھ تنگی نہیں کی۔ یہاں سے ایک جملہ معترضہ عرض کرتا ہوں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کچھ تنگی نہیں ہے حالانکہ مشاہدہ اس کے بالکل خلاف یعنی اکثر دینداروں کو عمل بالشرع میں بہت تنگی پیش آتی ہے اور جو لوگ آزاد ہیں وہ نہایت مزے میں ہیں کہ جو جی میں آیا کرلیا ان کو کارروائی میں تنگی نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنے میں تنگی ہے۔ اور آزاد رہنے میں آسانی کیونکہ دیندار آدمی کو تو قدم بقدم حرام کی فکر لگی رہتی ہے بلکہ جس بات کو ان سے پوچھئے اس کو حرام ہی کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کو نہایت پریشانی اور تنگی ہوتی ہے۔

مثلاً اب آموں کی بہار آرہی ہے۔ جو لوگ آزاد ہیں وہ تو نہایت چین میں رہیں گے کہ فصل شروع ہوتے ہی فروخت کردیں گے۔ اگرچہ ابھی تک نرا پھول ہی ہو اور ان کو نہایت اچھے دام اٹھیں گے۔ اور جو لوگ دیندار ہیں وہ اس فکر میں لگے رہیں کہ پھول فروخت کرنا حرام ہے، لہٰذا اس وقت فروخت کرنا چاہیئے کہ جب پھل آجائیں اور پھل بھی بڑھ جائیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی حفاظت کے لئے کم سے کم پانچ رو پیہ

ما، ہوا رہ کا ایک ملازم رکھیں گے یا خود حفاظت کریں گے پھر آندھیوں میں جو کچھ آم گریں گے سب اُن کے گریں گے ان کی وجہ سے قیمت کم اُٹھے گی علیٰ ہذا اگر تجارت کریں تو شریعت پر عمل کرنے میں کوئی صورت قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے کسی داد و ستد میں سود لازم آگیا وہ اس لئے حرام ہے۔ غرض شریعت پر عمل کرنے میں ہر طرح تنگی و مصیبت ہے اور جب کوئی چیز بھی تنگی سے خالی نہیں تو یہ تو قرآن ہی میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) تو یہ شبہ بعض لوگوں کو پیدا ہوتا ممکن ہے میں نے متعدد مقامات پر اس کا جواب عرض کیا ہے اس وقت بھی وہی جواب دیتا ہوں مگر توضیح کے لئے اول ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ فرض کرو کہ ایک شخص مریض ہوا اور وہ کسی طبیب کے پاس گیا اور نسخہ دریافت کیا اور حکیم صاحب نے نسخہ لکھا لیکن اتفاق سے مریض ایسی جگہ رہتا ہے کہ اس جگہ کوئی دوا دستیاب نہیں ہوتی اس کے بعد حکیم صاحب نے پرہیز بتلایا اور اتفاق سے اس گانؤں میں صرف وہی چیزیں ملتی ہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے اور جن چیزوں کی اجازت ہے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں ملتی۔ پس اگر یہ مریض حکیم صاحب کے نسخہ کو دیکھ کر اور پرہیز کو سن کر یہ کہنے لگے کہ طب میں نہایت ہی تنگی ہے کیونکہ دوائیں وہ بتلائیں جن میں سے ایک بھی میسر نہیں غذائیں وہ تجویز کیں جو کبھی گانؤں بھر میں بھی نہیں آتیں اور جتنی چیزیں کھانے کی ہیں وہ سب ممنوع کہ نہ بینگن کھاتا نہ آلو کھاتا نہ بھینس کا گوشت کھاتا اور اس کے ساتھ ہی حکیم صاحب کو بھی اپنے جہل کی وجہ سے بُرا بھلا کہنے لگے تو عقلاء اس کو کیا جواب دیں گے۔ یہی جواب دیں گے کہ طب میں کوذرا بھی تنگی نہیں۔ اس شخص کے گانوں ہی میں تنگی ہے کیونکہ طب میں تنگی تو اس وقت سمجھی جاتی ہے جبکہ دو چار چیزوں کی اجازت ہوتی اور باقی سب چیزیں ممنوع ہوتیں اور جبکہ بیس کی اجازت ہے اور صرف چار کی ممانعت تو طب میں تنگی ہرگز نہیں بلکہ اس شخص کے گانؤں میں تنگی ہے کہ اس میں صرف وہی چیزیں منتخب ہو کر آتی ہیں جو کہ سراسر مضر ہیں تو علاج اس کا یہ نہیں ہے کہ حکیم صاحب کا نسخہ

ردی کر دیا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے بلکہ علاج یہ ہے کہ اپنے گانوں کی اصلاح کی جائے وہاں کی تجارت کو وسعت دی جائے لوگوں کو مفید چیزیں فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے جب یہ مثال ذہن نشین ہوگئی تو اب غور و انصاف سے دیکھئے کہ تنگی شریعت میں ہے یا یہ کہ آپ کے معاملات میں شریعت کو تنگ اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب تجارت اور داد و ستد کی صرف دو چار صورتیں شریعت نے جائز بتلائی ہوں اور ان کے ماسوا ساری صورتیں حرام کر دیں اور جبکہ شریعت نے دو چار صورتوں کو حرام کر کے باقی سب کو جائز قرار دیا ہے تو شریعت کو تنگ نہیں کہا جا سکتا لیکن شریعت اس کا کیا علاج کرے کہ آپ کے معاملہ کرنے والوں نے بدقسمتی سے ان ہی صورتوں کو اختیار کر رکھا ہے جو حرام کر دی گئی ہیں اس کا علاج یہ ہے کہ آپ متفق ہو کر اصلاح کریں اپنی تجارت کو درست کریں اور ان دو چار مروجہ صورتوں کو جو حرام ہیں چھوڑ دیں اور ان سیکڑوں صورتوں کو اختیار کریں جو شریعت نے جائز کہیں ہیں نہ یہ کہ شریعت کو تنگ کہکر اس پر عمل کرنا ترک کر دیں اور شتر بے مہار کی طرح آزاد ہو جائیں تو آپ لوگوں کا شریعت پر اعتراض کرنا واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(اے سادہ لوح شخص تو خود اپنے اوپر حملہ کر رہا ہے اس شیر کی طرح جو کنویں کے پانی میں اپنے عکس کو دیکھ کر کنوئیں میں کود پڑا تھا)

مشہور ہے کہ ایک حبشی چلا جا رہا تھا راستہ میں ایک آئینہ پڑا ملا کبھی آئینہ دیکھنے کا اتفاق ہوا نہیں تھا اس کو اٹھا کر دیکھا تو اپنی کالی بھنچک صورت نظر پڑی کہنے لگا کہ ایسا بدصورت تھا جب تو کسی نے یہاں پھینکدیا تھا۔ یہی بعینہ حالت ہم لوگوں کی ہے کہ اپنے عیوب کو شریعت میں ثابت کرتے ہیں!

صاحبو! اگر کسی معاملہ کی دس صورتوں میں سے نو صورتوں کو حرام اور

ایک کو حلال کہا گیا ہوتا تو بیشک شریعت کو تنگ کہہ سکتے تھے اور جبکہ دس صورتوں میں سے آٹھ حلال اور صرف دو حرام ہیں تو شریعت کو تنگ کیسے کہیں گے، البتہ اپنے کو ملزم کہیں گے ہم نے حلال صورتوں کو ترک کر کے صرف ان دو کو اختیار کر لیا جو حرام تھیں اگر آپ شریعت سے دریافت کر کے تمام معاملات کو کرتے اور پھر بھی کوئی صورت جواز کی نہ نکلتی تو شریعت پر تنگی کا الزام تھا۔ غضب ہے کہ ہم اپنی ہوا و ہوس سے معاملات کو مقرر کریں اور پھر شریعت کو مجبور کریں کہ ان معاملات کو جائز کہے گویا شریعت ہماری محتاج یا نوکر ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کو جائز کر دیا کرے یہ تو بالکل ایسی بات ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ ایک رئیس کو لغو بولنے کی عادت تھی بہت اور اکثر بے تکی باتیں ہانکتے تھے لوگ ان پر ہنسا کرتے، آخر انہوں نے ایک شخص کو اس لئے نوکر رکھا کہ ہم جو کچھ کہا کریں اس کی کوئی معقول توجیہ کیا کرو۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ کسی مجلس میں تھا کہنے لگا کہ ہم شکار میں گئے۔ ہرن کو جو گولی ماری تو وہ سُم توڑ کر ماتھا پھوڑ کر نکل گئی، یہ سُن کر تمام لوگ ہنسنے لگے کہ سُم اور ماتھے کو کیا تعلق فوراً اس نوکر نے کہا حضور بجا ارشاد ہے وہ اس وقت کھُر سے ماتھے کو کھُجلا رہا تھا تو ہمارے ہوا پرست اور دنیا پرست بھائی چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے منہ سے نکل جائے اس نوکر کی طرح شریعت اس کو جائز ہی کر دے تو گویا شریعت آپ کی لونڈی ہوئی۔ صاحبو! آپ خود شریعت کے غلام بن جائیے اور پھر دیکھئے کہ کس قدر آسانیاں شریعت میں ہیں حالت موجودہ میں دینداروں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کا سبب زیادہ تر یہ بد دین لوگ ہیں اس واسطے کہ دیندار آدمی معاملہ تو دوسروں سے کرے گا اور دوسرے وہی ہیں جو دین سے بالکل آزاد ہیں اور جنہوں نے کہ اپنے سب معاملات بگاڑ رکھے ہیں تو اگر ایک آدمی تقویٰ اختیار بھی کرلے تو اس کو بیشک تنگی پیش آنی چاہیئے مگر یہ تنگی قوم کے معاملات میں تنگی ہونے کی وجہ سے ہوئی نہ کہ شریعت میں تنگی ہونے کی وجہ

سے۔ پس آپ لوگ دو طرح اپنی اصلاح کیجئے ایک تو اس طرح کہ شریعت مطہرہ کو کبھی الزام نہ دیجئے۔ دوسرے علماء سے طمع نہ رکھئے کہ وہ ناجائز صورت کو جائز کہدیں یا جائز کر دیں۔ صاحبو مسائل شریعت ایک قانون ہے اور قانون میں کسی شخص کی رائے سے تغیر نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر مقنن خود ہی بدل دے تو وہ دوسری بات ہے۔ اسی طرح اگر سب لوگ قانون پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو اُن کے چھوڑ دینے سے قانون نہیں بدل سکتا بالخصوص خدا تعالیٰ کا قانون کہ ان کی حکومت کا مدار بندوں کی اطاعت پر نہیں اگر کوئی کہے کہ نزول وحی کے وقت ہماری آئندہ حالت پر نظر کر کے قانون دوسرا مقرر ہوتا کیونکہ شریعت میں ہر زمانہ کی مصالح کی رعایت ہونا چاہیئے تو جواب اس کا یہ ہے کہ قانون میں مصلحت عامہ پر نظر ہوتی ہے مصالحہ خاصہ کی رعایت اس میں نہیں ہو سکتی مثلاً گورنمنٹ کا قانون ہے کہ کوئی شخص بغیر لیسنس کے بارود اور چھرّے نہیں بیچ سکتا اس قانون کو سن کر اگر کوئی احمق یہ کہنے لگے کہ گورنمنٹ کے قانون میں بڑی تنگی ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم بارود اور چھرّے خوب فروخت کیا کریں لیکن قانون لیسنس کی بیخ رکاتا ہے تو عقلاء اس کو یہی جواب دیں گے کہ قانون مصلحت عامہ کی بنا پر مقرر ہوا کرتا ہے نہ کہ مصلحت خاصہ کی بنا پر کیونکہ اگر مصلحت خاصہ کی رعایت کی جائے اور ہر شخص کو بندوق و بارود رکھنے کی اجازت دیدی جائے تو امن عام میں خلل پڑ جائے اور جس شخص کا جو جی چاہے سو کر دے بیسیوں خون روزانہ ہوا کریں تو امن عام کا مقتضا یہی تھا کہ ایسا جکڑ بند کیا جائے کہ عام طور پر اجازت نہ ہو اگرچہ کسی خاص شخص کا نقصان ہی کیوں نہ ہو البتہ اگر کسی شخص کا چال چلن اچھا ہو اور اس سے کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو اور وہ لیسنس بھی حاصل کر لے تو اس کو اجازت ہو جائے گی تو معلوم ہوا کہ قانون مصلحت عامہ کی بنا پر مقرر کئے جاتے ہیں۔ اب جو لوگ شریعت پر اعتراض کرتے ہیں وہ غور کر کے دیکھیں کہ شریعت کے کسی قانون میں بھی مصلحت عامہ فوت ہوئی ہے ہاں

مصالح خاصہ بعض جگہ فوت ہو جاتی ہیں جہاں ان کی رعایت کرنے سے مصالحہ عامہ میں خلل ہونے والا ہوتا ہے اور انہی پر نظر کرکے لوگ اعتراض کرتے ہیں مثلاً اب آموں کی فصل آرہی ہے اس میں باغ والوں کو یہ وہم ہوتا ہے کہ شریعت نے بہت تنگی کی ہے اور وجہ اس وہم کی یہی ہے کہ شریعت کے قانون پر عمل کرنے میں اپنی ذاتی منفعت فوت ہوتی ہے حالانکہ شریعت مصلحت عامہ کی بنا پر یہ قانون مقرر کیا تھا اور وہ مصلحت عامہ یہ ہے کہ بیع المعدوم میں آئندہ احتمال ہے مشتری کے خسارہ کا کہ اگر پھل نہ آیا تو اس کا روپیہ مفت ہی ضائع گیا گویا کسی ایک کا نفع اس میں زیادہ ہو جائے۔ اور پھل آنے کے بعد فروخت کرنے میں عام لوگ اس مصیبت سے محفوظ رہتے ہیں اگرچہ کسی ایک کے تھوڑے سے داموں کا نقصان ہو۔ اور پھر غضب یہ ہے کہ تنگی کا وہم کرکے بعض تو اس حکم کے حکم شرعی ہونے ہی سے انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب مولویوں کی اختراع ہے حالانکہ یہ محض الزام اور افترا ہے اور اس کا سبب قلت علم اور کثرتِ جہل ہے جس شخص نے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث یا اس کے ترجمے کو پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ سب احکام جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام ہیں اور بعض لوگ حکم شرعی ہونے سے تو انکار نہیں کرتے لیکن یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو دنیا دار لوگ ہیں ہم سے شریعت پر کیسے عمل ہوسکتا ہے میں اُن لوگوں کو مخاطب کرکے کہتا ہوں کہ اگر خدا تعالےٰ کے احکام پر عمل کرنا نہیں چاہئے تو خدا تعالےٰ کا دیا ہوا رزق بھی چھوڑ دو۔ یہ کیا کہ شریعت پر عمل تو کریں مولوی اور خدا تعالےٰ کا دیا ہوا کھاؤ پیو تم لوگ بھی۔ غرض شریعت میں تنگی محسوس ہونے کا راز یہ ہے کہ لوگ اپنی مصالح خاصہ پر نظر کرتے ہیں اور جب ان کو فوت ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو شریعت کو تنگ سمجھتے ہیں حالانکہ شریعت یا کوئی قانون صالح خاصہ کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوتا نہ ہوسکتا ہے کیونکہ مصالح خاصہ باہم متناقض ہوتے ہیں جن کا جمع ہوسکنا

بھی محال ہے بلکہ قانون مصالح عامہ کی حفاظت کرتا ہے سو بحمد اللہ قانون شریعت مصلحت عامہ کے خلاف نہیں ہے۔

مثلاً اسی آموں کی صورت میں آپ کہتے ہیں کہ پھل آنے کے قبل فروخت کی اجازت نہ دینا مصلحت کے خلاف ہے کیونکہ بسا اوقات آندھی وغیرہ سے سارا پھول یا چھوٹے آم گر جاتے ہیں اور اس میں نقصان ہو جاتا ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ نقصان خاص ہے یا عام۔ ظاہر ہے کہ یہ نقصان خاص ہے کیونکہ اگر کسی جگہ دس ہزار کی مردم شماری ہو تو بمشکل سو آدمی ایسے نکلیں گے جو کہ باغ رکھتے ہوں گے باقی تو ہزار نوسو وہ ہوں گے جو باغ نہیں رکھتے۔ پس یہ قانون مقرر کر کے شریعت نے ان سو کی خاص خاص مصالح کے مقابلہ میں نو ہزار نوسو کی مصالح کو ترجیح دی اور ان کی حفاظت کی کیونکہ بیع معدوم میں ان بقیہ کا نقصان محتمل ہے اور اگر کوئی کہے کہ ان بقیہ کی اگرچہ وہ عدد میں زیادہ ہوں رعایت ضروری نہ تھی کیونکہ یہ جب اپنے اختیار سے خریدتے ہیں تو نقصان خود گوارا کرتے ہیں پھر ان کی رعایت کیا ضرور تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے کہ جس کو اپنے پیٹ اور اپنی ہوس کا جہنم بھرنے کے سوائے اور کوئی امر ہی پیش نظر نہ ہو اور دنیا میں کسی سے بھی اس کو محبت نہ ہو دیکھو اگر کوئی بچہ آگ میں گرنے لگے اور مشفق باپ دوڑ کر اس کو پکڑ لے اور باپ کی یہ حرکت دیکھ کر کوئی شخص کہے کہ آپ نے ناحق تکلیف اٹھائی آپ کو دوڑنے کی کیا ضرورت تھی وہ اپنے اختیار سے گرتا تھا سو گرنے دیا ہوتا تو عقلاء اس شخص کی بابت کیا فتویٰ دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کو نہایت درجہ سنگدل اور بے رحم کہا جائے گا۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خداوند عالم جو شفیق باپ سے بھی بدرجہا زیادہ شفیق ہیں کیونکر یہ گوارا کرتے کہ ہم کو ضرر برداشت کرنے کی اجازت دیتے غرض یہ شبہہ علی وجہ الاحسن زائل ہو گیا اور یہ بات ثابت رہی کہ دین میں نہایت سہولت اور آسانی ہے البتہ عقل کی

بتجاویز بعض سخت ہیں مثلاً ایک یہی بات ہے جس کا اوپر ذکر تھا کہ
مرض صعب کے لئے عقل علاج بھی صعب تجویز کرتی ہے اور شریعت مرض
صعب کے لئے علاج سہل تجویز کرتی ہے پس کتنا بڑا فرق ہے اسلام کی تعلیم اور
عقل کے فتوے میں کہ عقل تو مرض صعب کے لئے تدابیر بھی صعب تجویز کرتی ہے اور اسلام
سخت سے سخت مرض کے لئے بھی نہایت سہل نسخہ تجویز کرتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے
کہ مسلمانوں میں کیا مرض ہے جس کے لئے اس آیت میں علاج تجویز کیا گیا ہے
اور مسلمانوں کی تخصیص اس وجہ سے نہیں کہ دوسروں میں امراض نہیں ہیں دوسروں
میں وہ امراض ہیں کہ بحمد اللہ مسلمان اُن سے بالکل بچے ہوئے ہیں بلکہ تخصیص اس
واسطے کی گئی ہے کہ دوسروں سے ہمیں کیا غرض اور مرض دریافت کرنے کے بعد
ان کا سبب دریافت کیجئے تو مرض کی نسبت تو یہ کہا جاتا ہے کہ

ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ہماری قوم کی یہ حالت ہے کہ اس کا کوئی عضو بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ہماری دو
حالتیں ہیں ایک دنیا دوسرے دین اور پھر ہر ایک کے اجزا ہیں اور اس کا
مقتضا یہ تھا کہ دین کے ساتھ دنیا کی بھی ایک بڑی فہرست بتلائی جاتی بالخصوص اس
وقت کہ ریفارمروں کی رائے یہ ہے کہ اگر دنیا کی اصلاح نہ کی جائے گی تو دین کی کیا
اصلاح ہو سکتی ہے۔ افسوس ان مصلحین نے جتنی اصلاح کی کوشش کی اسی
قدر مرض بڑھتا گیا۔ وہ حالت ہو گئی کہ ؎

ہرچہ کردند از علاج و از دوا
رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

(انہوں نے جو کچھ علاج اور دوا کی ہے تکلیف زیادہ بڑھتی رہی اور
ضرورت پوری نہ ہوئی)

یہ ایک کنیز کا قصہ ہے مولاناؒ نے مثنوی میں اس کو نقل کیا ہے یعنی طبیبان ظاہری
جوں جوں علاج کرتے گئے مرض میں افزونی ہوتی گئی آخر جب طبیب روحانی آئے

اور انہوں نے حالت دیکھی تو یہ کہا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند — آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

بیخبر بودند از حال درون — استعیذ اللہ مما یفترون

یعنی جس قدر دوائیں کی ہیں سب نے برباد کیا ہے اور حقیقت حال سے ان کو کچھ خبر بھی نہیں ملی اور یہ ہوا کہ ؎

دید از زاریش کو زار دلست — تن خوش است اما گرفتار دلست

عاشقی پیداست اززاری دل — نیست بیماری چو بیماری دل

کہ مرض دل کا تھا اور علاج بدن کا ہو رہا تھا جس میں مرض کا بڑھنا لازمی تھا یہی حالت اس وقت کے لیڈروں کی ہے کہ انہوں نے سب سے بڑا مرض روپیہ کے نہ ہونے کو سمجھا کہ روپیہ ہوتا تو یہ ہوجاتا اور وہ ہوجاتا۔

صاحبو! جہاں روپیہ بہت سا ہے وہاں کیا نور برس رہا ہے۔ ذرا امراء کی حالت کو ملاحظہ کر لیجئے اگر روپیہ کا نہ ہونا دین کے ضعف کا سبب ہے تو امراء میں دین زیادہ ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ ان کے پاس روپیہ زیادہ ہے۔ آج کل تو مشاہدہ کی بڑی پرستش ہوتی ہے سو آپ مشاہدہ کر لیجئے کہ روپیہ والوں میں دین زیادہ ہے یا غریبوں میں اور صورت اس کی یہ ہے کہ کیف ما اتفق چند غریبوں اور چند امیروں کو لے لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ زیادہ دیندار کون ہے۔ خود خدا تعالیٰ اس کے متعلق فیصلہ فرما رہے ہیں کہ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی (ہرگز نہیں بیشک انسان اپنے آپ کو غنی اور دولت مند دیکھتا ہے تو وہ سرکشی کرنے لگتا ہے) بس ہم کو تو یہ کہنے کا حق ہے کہ دنیا کی ترقی کو مانع ہے جیسا کہ مشاہدہ و مضمون آیت دونوں اس کی شہادت دے رہے ہیں لیکن ہم اپنے بھائیوں کی خاطر سے یہ کہتے ہیں کہ روپیہ فی نفسہ نہ مضر ہے اور نہ مفید ہے اگر ہمارے بھائیوں کے پاس اس قسم کی کوئی دلیل ہوتی تو وہ ہرگز بھی رعایت نہ کرتے تو ہم اپنے اس دعوے سے کہ روپیہ مانع ترقی دین ہے دست بردار ہوتے ہیں لیکن کوئی یہ بھی ثابت نہیں

کر سکتا کہ روپیہ نافع ہے دین میں۔ پس معلوم ہوا کہ نافع فی الدین واقع میں کوئی دوسری چیز ہے اور وہ قلب سلیم ہے یعنی اگر قلب سلیم ہے تو روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں مضر نہیں اور اگر قلب سلیم نہیں ہے تو روپیہ کا نہ ہونا تو کم مضر ہوتا ہے اور روپیہ کا ہونا زیادہ مضر ہو جاتا ہے روپیہ اور قلب سلیم کی مثال بالکل تلوار اور ہاتھ کی سی ہے کہ تلوار کاٹتی ہے لیکن اسی وقت جبکہ ہاتھ بھی ہو اور اس میں قوت بھی ہو اور اگر ہاتھ نہیں یا ہاتھ تو ہے لیکن اس میں قوت نہیں تو نری تلوار کیا کام دے سکتی ہے بلکہ بعض اوقات خود اپنے ہی زخم لگ جاتا ہے اسی طرح اگر قلب سلیم نہ ہو تو نرا روپیہ کیا کام دے سکتا ہے اصل چیز قلب سلیم ہے اگر ایسے شخص کے پاس مال ہے تو وہ بیشک حدیث نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ عِنْدَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ (اچھا مال اسی وقت اچھا ہے جبکہ اچھے آدمی کے پاس ہو) کا مصداق ہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

مال اگر بہر دیں باشی حمول ۔۔۔ نعم مالٌ صالحٌ گفت آں رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(اگر دین کی ترقی کے لئے ہی مال کام میں آتا ہو تو ایسے مال کے متعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایسا پاکیزہ مال اچھا ہوتا ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است ۔۔۔ آب اندر زیر کشتی پشتی است

یعنی اگر کشتی کے اندر پانی بھر جائے تو اس کے ہلاک کا سبب ہوتا ہے اور اگر کشتی کے نیچے رہے تو اس کے لئے معین ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مال قلب کے اندر گھس گیا تو وہ قلب کے لئے مہلک ہے اور اگر قلب سے باہر رہے تو وہ معین ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب صاحبِ قلبِ سلیم کے پاس روپیہ ہو۔ غرض روپیہ کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہی ہوئے۔ لہٰذا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ ترقی دین دنیا کی ترقی پر موقوف ہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ؎

زر و نقرہ چیست تا مفتوں شوی چیست صورت تا چنیں مجنوں شوی

کہ یہ صورت ہی کیا چیز ہے جس پر اس قدر مفتوں ہوتے ہو۔

صاحبو! اپنے بزرگوں ہی کو دیکھ لیجئے کہ ان کے پاس اس قدر روپیہ کہاں تھا اور پھر دینداری میں ان کی کیا حالت تھی۔ غرض ایک ضرورت کی چیز۔ تو دنیا تھی تو اس کے تو جاننے والے مجھ سے زیادہ ہیں۔ دوسرے دنیا کے متعلق کچھ بتلانا ان کے وہمیات میں ان کی مدد کرنا ہے۔ تیسرے ہم لوگ طالب علم ہیں ہمارا یہ کام بھی نہیں ہے اس کو آپ خود ہی کریں۔ البتہ مولویوں سے پوچھ کر اور حلال و حرام کو دریافت کرکے کریں آج کل بہت سی صورتیں آپ نے ایسی اختراع کرلی ہیں کہ وہ بالکل ناجائز ہیں۔ مثلاً شادی فنڈ، موت فنڈ کہ یہ سب قمار میں داخل ہے افسوس ہے کہ لوگ ترقی کی صورت تجویز کرکے ان پر خود ہی عمل کرلیتے ہیں یہ احتمال ہی نہیں ہوتا کہ ممکن ہے یہ جائز نہ ہو۔ صاحبو! جو چاہو وہ کرو لیکن خدا کے لئے مولویوں سے حلت و حرمت کو دریافت کرلیا کرو۔ اور یہ کوئی عار کی بات نہیں۔ دیکھو تم بہت سی ضرورتوں میں مختلف جماعتوں سے پوچھتے اور مدد لیتے ہو۔ مثلاً اگر تجارت کرنا چاہو تو قانون داں لوگوں سے پوچھتے ہو اس کی اجازت کے پہلو دریافت کرتے ہو علیٰ ہذا۔ تو اگر شریعت کے احکام پوچھنا بکھیڑا اور دردِ سر ہے تو گورنمنٹ کے قانون پوچھنا کیوں دردِ سر نہیں۔ جو آزادی قانون شریعت پر عمل کرنے میں فوت ہوتی ہے وہ تو گورنمنٹ کے قانون پر عمل کرنے میں بھی فوت ہوتی ہے۔ تو سب سے بڑی آزادی تو اس میں ہے کہ کسی قانون پر بھی عمل نہ کیا جائے اور ڈکیتی ڈالنی شروع کردی جائے پھر کیا کوئی عاقل اس کو آزادی کہے گا اور اگر چند احمق مل کر ڈکیتی ڈالنی تجویز کریں اور کوئی عقلمند آدمی اُن سے کہے کہ یہ قانون میں ناجائز ہے تو کیا ان کو محض اس بنا پر کہ یہ قانون آزادی کے خلاف ہے اس قانون پر عمل کرنا ضروری نہیں ہوگا معلوم ہوا کہ جب گورنمنٹ کے ملک میں رہو اس کے قوانین پر عمل کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ پس بموجب

اس قاعدہ کے یا تو خدا تعالیٰ کے ملک سے نکل جاؤ۔ اور کوئی دوسرا ملک تلاش کر لو اور اگر خدا کے ملک میں رہو تو حیرت کی بات ہے کہ ساری گورنمنٹوں کے قانون پر تو عمل کرو مگر خدا کے قانون پر عمل نہ کرو۔ غرض دنیا کے کام آپ لوگ خود ہی کریں اور علماء سے پوچھ کر کریں۔ باقی علماء سے اس کی امید نہ رکھیں کہ وہ دنیا کے کاموں میں آپ کی اعانت کریں اور ان کی تدابیر آپ کو بتلائیں۔ دنیا کا کام آپ کا کام ہے علماء کا نہیں۔ علماء سے اس کی امید رکھنا ایسا ہے جیسے کوئی چمار حکیم عبدالمجید سے جوتے گھٹوانے کے کام میں مدد چاہنے لگے مثلاً اگر حکیم عبدالمجید کے پاس کوئی دق کا مریض جائے اور وہ نسخہ لکھدیں نسخہ لے کر مطلب سے باہر آئے تو ایک چمار ملے اور مریض سے پوچھے کہ تم کہاں گئے تھے اور وہ بتلائے اس پر وہ چمار کہنے لگے کہ حکیم عبدالمجید بھی عجب بے خبر آدمی ہیں کہ ان سے اتنا نہ ہوا کہ اس نسخے میں جوتی گھٹوانے کو بھی لکھ دیتے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کی حالت سے بالکل بے خبر ہیں تو ساری دنیا اس چمار کو احمق بتائے گی اور کہے گی کہ حکیم عبدالمجید کا یہ کام نہیں کہ وہ جوتی گانٹھنے کی ترکیب بتلائیں یا اس کام کے چلنے میں مدد دیا کریں۔ حکیم عبدالمجید کا کام امراض کے لئے ادویہ تجویز کرنے کا ہے۔ تو علماء کو بھی حکیم عبدالمجید ہی سمجھنا چاہئے کہ ان کا کام امراض باطن کے لئے نسخے تجویز کرنے کا ہے۔ نہ کہ دنیا کے کاموں میں تجاویز بتلانے کا۔ اگر حکیم صاحب پر جوتی سلوانے کو نہ بتلانے کا الزام صحیح ہے تو علماء پر بھی سہی۔ البتہ حکیم صاحب کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ اگر جوتی سینے سے پہننے والے کے پیر میں زخم نہ پڑے اور پیر کے سڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو جوتی پہننے سے منع نہ کریں ورنہ منع کرنا ضروری ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نے پہنے پہنے اس طرح جوتہ سلوایا کہ سُوا پیر کی کھال کے اندر سے ہو کر نکلا تو حکیم صاحب کو اطلاع ہونے پر منع کرنا ضرور ہے اسی طرح علماء کے ذمہ بھی یہ ہے کہ اگر دنیا کے کام کرنے سے لوگوں کے قلب میں بد دینی کا زخم نہ پڑے تو ان کاموں سے نہ روکیں اور اگر قلب زخمی ہونے لگے

تو پھر ان کو روکنا ضرور ہے۔ اور اگر زخم کے ڈر سے روکنے میں حکیم صاحب بڑے شفیق ہیں تو زخم قلب سے بچانے کے لئے روکنے میں علماء بھی بڑے شفیق ہیں۔ اور اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو میں دس برس کی مہلت دیتا ہوں۔ الحاصل جب کسی حکیم پر یہ ضروری نہیں کہ وہ جوتی سینے کی ترکیب بتلایا کرے یا اس میں مدد کرے علماء کو بھی جو کہ طبیبِ روحانی ہیں کامل حق ہے کہ وہ اس باب میں یہ کہدیں کہ ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم   چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ میں رات ہوں نہ رات کا پوجنے والا کہ سونے کے بارے میں باتیں کروں میں جب آفتاب کا غلام ہوں تو ساری باتیں آفتاب ہی کی کروں گا)

دنیا کی مثال بالکل خواب کی ہے اس کو وہ بتلائے جو شب پرست ہو، ہم آفتاب دین کے غلام ہیں، ہم سے اس کی بات پوچھیے ہم اس کے سوا کچھ نہ بتلائیں گے۔ اور نہایت فخر سے یہ کہیں گے ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم   اِلّا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

(ہم نے جو کچھ پڑھا تھا وہ سب بھلا دیا سوائے محبوب کی بات کے اور کسی بات کو یاد نہیں رکھا)

ہاں یہ علماء کا احسان ہوگا کہ وہ منع نہ کریں یہ تو آپ کے شبہات اور اعتراضات کے جواب کی بناء پر گفتگو تھی اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علماء دنیا بھی سکھلاتے ہیں وجہ یہ ہے کہ تاریخ اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی دنیا دین کے ساتھ درست ہوتی ہے یعنی جب ان کے دین میں ترقی ہوتی ہے تو دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے اور جب دین میں کوتاہی ہوتی ہے تو دنیا بھی خراب ہو جاتی ہے تو جب ہم دین سکھلاتے ہیں معاملات معاشرت اخلاق کو درست کرتے ہیں تو گویا ہم دنیا کی ترقی کی تدابیر بھی بتلاتے ہیں۔ البتہ ہماری تدابیر اور دوسروں کی تدابیر میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کی تدبیر میں پریشانی زیادہ ہوتی ہے ان کی

یہ حالت ہوتی ہے کہ

ع ۔ چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

(جب مرتے ہیں جب مصروف ہوتے ہیں جب اٹھتے ہیں جب مصروف ہوتے ہیں)

واللہ العظیم جو لوگ بظاہر نہایت آسائش میں معلوم ہوتے ہیں ان کی اندرونی حالت اگر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری پریشانیوں کا نشانہ یہی ہیں۔ ان لوگوں کی حالت پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ میرے استاد علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ ایک شخص نے یہ دعا کی مجھے حضرت خواجہ خضر مل جائیں، چنانچہ خواجہ خضر اس کو مل گئے اس نے کہا کہ حضرت یہ دعا کر دیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اس قدر دنیا دے دیں کہ میں بالکل بے فکر ہو جاؤں۔ خواجہ خضر نے کہا کہ بیفکری اور راحت دنیادار میں نہیں ہو سکتی، اس نے پھر اصرار کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا تو کسی ایسے شخص کو انتخاب کر لے جو تیرے نزدیک بالکل بے فکر اور نہایت آرام میں ہو، میں یہ دعا کروں گا کہ تو بھی اسی جیسا ہو جائے اور تین دن کی اس کو مہلت دی آخر اس نے لوگوں کی حالت کو دیکھنا شروع کیا۔ جس کو دیکھا کسی نہ کسی تکلیف یا شکایت و پریشانی میں مبتلا پایا۔ بہت سی تلاش کے بعد اس کو ایک جوہری نظر پڑا جس کے پاس حشم و خدم بھی بہت کچھ تھے۔ صاحب اولاد بھی تھا اور اس کو بظاہر کوئی فکر نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کو خیال ہوا کہ اس جیسا ہونے کی دعا کراؤں گا، لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی کسی بلا میں مبتلا ہو اور میں بھی دعا کی وجہ سے اُسی میں مبتلا ہو جاؤں۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اول اس سے اس کی اندرونی حالت دریافت کر لوں چنانچہ اس جوہری کے پاس گیا اور اپنا پورا ماجرا اس کو کہہ سنایا۔ جوہری نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا کہ خدا کے لئے مجھ جیسا ہونے کی دعا ہرگز نہ کرانا میں تو ایک مصیبت میں گرفتار ہوں کہ خدا نہ کرے کوئی اس میں گرفتار ہو واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ میری بیوی بیمار ہوئی اور بالکل مرنے کے قریب ہو گئی۔ میں اس کو مرتے دیکھ کر رونے لگا اس نے کہا کہ تم کیوں روتے ہو میں مرجاؤں گی تم دوسری

کرلوگے۔ میں نے کہا کہ نہیں میں اب ہرگز نکاح نہ کروں گا۔ کہنے لگی کہ سب کہا ہی کرتے ہیں ایفاء کوئی بھی نہیں کرتا۔ میں چونکہ اس کی محبت میں مغلوب تھا اور اس وقت اس کے مرنے کا نہایت سخت رنج دل پر تھا میں نے اس کے کہنے پر استرا لے کر اپنا اندام نہانی فوراً کاٹ ڈالا اور اس سے کہا کہ اب تو مجھ کو بالکل اطمینان ہوگیا۔ اتفاق سے وہ اپنے مرض سے جانبر ہوگئی۔ اب چونکہ میں بالکل بیکار ہو چکا تھا اس لئے اس نے میرے نوکروں سے سازباز کرلیا' یہ جس قدر اولاد تم دیکھتے ہو سب میرے نوکروں کی عنایت ہے' میں اپنی آنکھوں سے اس حرکت کو دیکھتا ہوں لیکن اپنی بدنامی کے خیال سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس واسطے تم مجھ جیسے ہونے کی دعا ہرگز نہ کرانا۔ آخر اس شخص کو یقین ہوگیا کہ دنیا میں کوئی آرام سے نہیں جب تیسرے دن حضرت خضر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ کہو کیا رائے ہے اُس نے کہا حضرت یہ دعا کر دیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھے اپنی محبت کاملہ اور دین کامل عطا فرمائے چنانچہ آپ نے دعا فرمادی اور وہ نہایت کامل دیندار ہوگیا۔ تو حقیقت میں دنیا داروں میں کوئی بھی آرام سے نہیں ہے' اندرونی حالت سب کی پریشان ہے اس واسطے کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ لاینتھی ادب الا الی ادب ایک آرزو ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع ہو جاتی ہے اور تفویض و رضا بالقضا ہے نہیں۔ ہر کام میں یوں چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار اس لئے نتیجہ اس کا پریشانی ہی پریشانی گو ظاہر میں اموال و اولاد سب کچھ ہے مگر اس حالت میں وہ خود آلہ تعذیب ہیں اسی کو فرماتے ہیں فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ (ان کے مال و اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالے) کہ بظاہر اگرچہ ان کے پاس مال و دولت بہت کچھ ہے لیکن وہ ان کے لئے عذاب ہے۔ میں نے کانپور میں ایک رئیس کو دیکھا ہے کہ ان کو اپنی اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ اولاد کی بدولت کبھی چارپائی پر سونا نصیب نہیں ہوا کیونکہ بچے کئی تھے ایک چارپائی پر کیسے سمائیں اور سب اپنے پاس لیکر سوتی تھیں کسی پر ایک ہاتھ رکھ لیا کسی پر دوسرا ہاتھ رکھ لیا

کسی پر پیر رکھ لیا پھر غضب یہ کہ رات کو اٹھ کر ٹٹولتی تھیں کہ سب ہیں بھی یا نہیں۔ تمام رات ان کو اس مصیبت میں گذرتی تھی۔ اتفاق سے ان کا ایک بچہ مرگیا تو وہ اس قدر پریشان ہوئیں کہ اس کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئیں اور کانپور چھوڑ کر لکھنؤ یا اور کہیں چلدیں علیٰ ہذا مال بھی اکثر لوگوں کو عذاب جان ہوتا ہے اور راز اس کا بھی یہی ہے کہ واقعات تو اختیار میں ہوتے نہیں اور ہوس زیادہ ہوتی ہے اس واسطے ہمیشہ مصیبت میں گذرتی ہے برخلاف اس شخص کے کہ اس کے پاس دین ہو کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور محبت میں یہ حالت ہوتی ہے کہ

ع۔ ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود

(وہ بادشاہ جو کچھ بھی کرتا ہے میٹھا ہی ہوتا ہے)

حضرت غوث اعظم کا واقعہ ہے کہ ان کو کسی نے ایک آئینہ چینی نہایت بیش قیمت لاکر دیا آپ نے خادم کے سپرد کردیا کہ جب ہم مانگا کریں تو ہم کو دید یا کرو۔ ایک روز اتفاق سے خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا خادم ڈرا اور حاضر ہو کر عرض کیا کہ

ع۔ از قضا آئینہ چینی شکست

(قضا سے چینی آئینہ ٹوٹ گیا)

آپ نے بے ساختہ نہایت خوش ہو کر فرمایا کہ :۔

ع۔ خوب شد اسباب خود بینی شکست

(اچھا ہوا خود بینی کے اسباب ختم ہوئے)

اور مال تو کیا چیز ہے اولاد کے مرجانے پر بھی یہ حضرات پریشان نہیں ہوتے یہ دوسری بات ہے کہ طبعی رنج ہو سو یہ کوئی مذموم نہیں انبیاء السلام کو بھی ہوا ہے۔ غرض دین کے ساتھ اگر دنیا ہوگی تو وہ دنیا بھی مزیدار ہوگی بلکہ اگر نرا دین ہو اور دنیا نہ ہو تب بھی ان کی زندگی نہایت مزیدار ہے اس لئے کہ وعدہ ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ (جس کسی نے اچھا عمل کیا خواہ وہ مرد ہو یا

عورت بشرطیکہ وہ صاحب ایمان ہو پس ضرور ہم اس کو عطا کریں گے پاکیزہ زندگی)
ان حضرات کو بیچ ناداری میں بھی لطف آتا ہے۔ حضرت شاہ ابوالمعالی کی حکایت ہے کہ ایک
مرتبہ آپ گھر پر موجود نہ تھے کہ آپ کے مرشد تشریف لائے اتفاق سے اس روز
گھر میں فاقہ تھا۔ اہل خانہ نے دیکھا کہ حضرت تشریف لائے ہیں آپ کے لئے کوئی
انتظام ہونا چاہیئے۔ آخر خادمہ کو محلے میں بھیجا کہ اگر قرض مل جائے تو کچھ لے آئے خادمہ
دو تین جگہ جا کر واپس چلی آئی اور کچھ نہ ملا متعدد مرتبہ کے آمد و رفت سے حضرت کو شبہ
ہوا اور آپ نے حالت دریافت فرمائی معلوم ہوا کہ آج فاقہ ہے آپ کو بہت صدمہ ہوا اور
آپ نے ایک روپیہ نکال کر دیا کہ اس کا اناج لاؤ چنانچہ اناج آیا آپ نے ایک تعویذ
لکھ کر اس میں رکھدیا اور فرمایا کہ اس اناج کو مع تعویذ کے کسی برتن میں رکھدو اور اسی میں
سے نکال کر خرچ کرتے رہو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اس اناج میں خوب برکت ہوئی چند
روز کے بعد جو شاہ ابوالمعالی صاحبؒ آئے تو کئی وقت تک کھانے کو برابر ملا آپ نے ایک
روز تعجب سے پوچھا کہ کئی روز سے فاقہ نہیں ہوا معلوم ہوا کہ اس طرح سے حضرت ایک تعویذ
دے گئے تھے۔ اب اس موقعہ پر ملاحظہ فرمایئے حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے ادب کا اور آپ کی
خداداد سمجھ کا کہ ادب توکل کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ادب پیر کو بھی ملحوظ رکھا فرمانے
لگے کہ اس اناج کو ہمارے پاس لاؤ چنانچہ لایا گیا آپ نے اس میں سے تعویذ کو نکال کر تو
اپنے سر پر باندھا اور فرمایا کہ حضرت کا تعویذ تو میرے سر پر رہنا چاہیئے اور اناج کی بابت
حکم دیا کہ سب فقراء کو تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ سب تقسیم کر دیا گیا اور اسی وقت
سے پھر فاقہ شروع ہو گیا۔ ان حضرات کا فاقہ اختیاری فاقہ تھا کیونکہ اس کو سنت
سمجھتے تھے ۔ حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ پر تین تین دن فاقہ کے گذر جاتے
تھے اور جب بیوی بہت پریشان ہو کر عرض کرتیں کہ حضرت اب تو تاب نہیں رہی ۔
فرماتے کہ تھوڑا صبر اور کرو جنت میں ہمارے لئے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں
لیکن بیوی بھی ایسی نیک ملی تھیں کہ وہ نہایت خوشی سے اس پر صبر کرتیں۔ صاحبو !
ان حالات پر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر تعجب ہے تو یہ ایسا ہی تعجب ہے جیسے

کوئی عنین تعجب کرنے لگے کہ صحبت میں بھی لطف ہوتا ہے کیونکہ اگر ذرا سا بھی ادراک ہوتا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا تعالےٰ کی محبت کا کیا عالم ہوتا ہے محبت میں تو مطلقًا یہ عالم ہوتا ہے کہ ؎

چو در چشم شاہد نیاید زررت زر و خاک یکساں نماید برست

(اگر تیرے روپے کی محبوب کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے تو تیرے نزدیک بھی روپیہ اور مٹی برابر ہو جائیں گے۔)

دیکھو اگر محبوب کو ایک ہزار روپیہ دو اور وہ لات مار دے تو تمہارے دل میں بھی اس روپیہ کی قدر نہیں رہتی اور محبت مجازی میں جب یہ حالت ہے تو حقیقی کا کیا پوچھنا، اسی کو فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہیچو خودے ز آب و گل ربایدہمہ صبر و آرام دل
عجب داری از سالکان طریق کہ باشند در بحر معنی غریق

(تیرا عشق یونہی پانی مٹی سے ہے اس لئے تمام صبر اور دل کا آرام جاتا رہتا ہے تجھ کو تعجب ہوگا کہ درویشی کے راستہ پر صحیح طور پر چلنے والے ہر وقت معنے کے دریا میں غرق رہتے ہیں)

دیکھئے اگر کوئی محبوب اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدے اور اس درمیان میں کھانے کا وقت آجائے اور محبوب کہے کہ اگر بھوک لگی ہے تو جا کر کھانا کھالو۔ کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ عاشق اس وقت اٹھنے اور کھانا کھالے کو گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں تو جب محبت کی یہ حالت ہوتی ہے تو شیخ کے فاقہ پر کیا تعجب ہے، وہ حضرت حق محبوب حقیقی سے معیت رکھتے ہیں۔ مولانا رحمہ اللہ کہتے ہیں ؎

گفت معشوقے بعاشق کای فتا تو بہ غربت دیدۂ بس شہر ہا
پس کدامی شہر ازانہا خوشتر ست گفت آں شہرے کہ در وے دلبر ست

(ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا کہ اے جوان تو نے سفر میں بہت سے شہر دیکھے تو کونسا شہر ان میں سے تیرے نزدیک اچھا ہے اس نے جواب دیا کہ بس وہی شہر جس میں میرا

محبوب موجود ہے)

آگے مولانا رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں | فوقِ گردون ست نے قعر زمیں
ہر کجا یوسف[۲] رُخے باشد چو ماہ | جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

(جس جگہ محبوب خوشی سے رہتا ہو وہ تو آسمانوں سے بھی اونچا ہے زمین کے گڑھے میں نہیں ہے جس کسی کی جگہ چاند کی طرح حضرت یوسف علیہ السلام جیسے چہرہ والا موجود ہو وہی جنت ہے اگرچہ وہ کنوئیں کی گہرائی ہی میں کیوں نہ ہو)

تو اگر محبوب کنوئیں کے اندر ہو تو وہ بھی جنت ہے۔ تو جب محبوب مجازی کی معیت کی یہ حالت ہوتی ہے تو محبوب حقیقی کی معیت اگر میسر ہو جائے تو کیا حالت ہو گی، غرض دنیا دار آپ کو بے مزہ دنیا سکھلاتے ہیں اور ہم مزے دار دنیا سکھلاتے ہیں اور وہ وہی دنیا ہے جو کہ دین کے ساتھ ہو کہ وہ نہایت لطیف اور مزیدار ہوتی ہے اور اگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تو ضابطہ کا جواب وہی ہے کہ دنیا کا بتلانا ہی میرے ذمہ نہیں ہے۔ یہ تو دنیا کے متعلق تھا۔ اب رہ گیا دین، سو اس کی یہ حالت ہے کہ اس کے پانچ جزء ہیں۔ عقائد[۱]۔ دیانات[۲]۔ معاملات[۳]۔ معاشرت[۴]۔ اخلاق[۵]۔ ان میں سے ہر جزء کے اعتبار سے ہماری حالت ناگفتہ بہ ہے۔ عقائد میں توحید و رسالت کے متعلق جو گڑبڑ کر رکھی ہے سبھی جانتے ہیں، کہیں تخمینی فلسفہ کی وجہ سے اس پر اعتراض کئے جاتے ہیں کہیں باطل تصوف کی وجہ سے شکوک گذرتے ہیں۔ اولیاء اللہ کو انبیاءؑ کے درجے سے متجاوز کر دیا ہے، انبیاء کو خدا کے درجہ سے متجاوز بنا دیا ہے اور وہ حالت ہے کہ جس شخص کو شریعت سے جتنا بُعد ہے اُس کو خدا تعالیٰ سے اُسی قدر زیادہ مقرب کہا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فساق اولیاء اللہ میں شمار ہونے لگے ہیں۔ دوسرا جزء دیانات ہیں ان کے متعلق معلوم ہے کہ روزہ کتنے لوگ رکھتے ہیں، زکوٰۃ کتنے ادا کرتے ہیں، حج کتنوں نے ادا کیا ہے۔ تیسرا جزء معاملات کا ہے ان کو لوگوں نے شریعت سے بالکل خارج ہی سمجھ رکھا ہے ان کے یہاں نہ

بیع المعدوم حرام ہے نہ معاملات سود حرام ہیں ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے بہت سارو پیہ سمیٹ لیا جائے کھانے میں گھی خوب زیادہ ہو، کسی کی زمین دبی ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ ڈگریاں سود سمیت کرائی جاتی ہیں تو کچھ غم نہیں۔ چوتھا جزء معاشرت ہے اس کی جو گت ہے سبھی واقف ہیں شادی غمی میں جس طرح جی چاہتا ہے کرتے ہیں نہ ان کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ فتویٰ لینے کی حاجت جو کچھ بیوی صاحبہ نے کہدیا وہ کرلیا گویا وہی شریعت کی مفتی ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جن کی سردار عورت ہو گی۔ علیٰ ہذا وضع کو دیکھئے تو اس کی یہ حالت ہے کہ صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ مسلمان ہیں یا کافر، داڑھی بالکل صاف سر پر وحشیوں کے سے بال بڑھے ہوئے۔ صاحبو! آج قوم قوم پکارا جاتا ہے لفظ قوم کی بڑی پرستش کی جاتی ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ کو امتیاز قومی کی بھی پرواہ نہیں اگر آپ پر داڑھی کا رکھنا فرض بھی نہ ہو تب بھی قومی شعار ہی سمجھ کر اس کو رکھنا چاہیئے تھا آخر قومی شعار بھی تو کوئی چیز ہے۔ کتنا افسوس ہے کہ مسلمان ہندوؤں کا شعار اختیار کریں اور ہندو مسلمانوں کا۔ میرے بھائی کے پاس دو شخص عہدہ دار آئے۔ ایک ان میں سے ہندو بہ شکل مسلمان تھا۔ ایک مسلمان بہ شکل ہندو تھے۔ مسلمان صاحب کے لئے گھر میں سے پان آیا، خادم چونکہ دونوں سے ناواقف تھا اس لئے اس نے ہندو کے سامنے پان پیش کیا اس پر وہ دونوں ہنسے اس سے وہ خدمتگار سمجھا کہ مسلمان یہ ہیں جن کی ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے۔ صاحبو! اگرچہ گناہ بہ حیثیت گناہ ہوتے تو سب ہی بڑے ہیں لیکن تاہم بعض گناہ ایسے ہیں کہ گو وہم ہی کے درجے میں ہو لیکن انسان اس میں اپنی مجبوری اور عذر بیان کرسکتا ہے مثلاً رشوت کا لینا کہ اس کی جس قدر مجبوریاں بیان کی جاتی ہیں گو وہ سب وہمی ہیں لیکن تاہم ہیں تو یہ بھلا ڈاڑھی منڈانے کی ناشائستہ حرکت میں کیا مجبوری ہے اس میں کونسا کام اٹکا ہے اگر کوئی صاحب کہیں کہ اس سے حسن بڑھتا ہے تو میں کہوں گا کہ بالکل غلط ہے ایک عمر کے دو آدمیوں کو پیش کیا جائے جن میں ایک کی داڑھی منڈی ہو اور دوسرے کے چہرے پر داڑھی ہو اس کے بعد موازنہ

کرکے دیکھ لیا جائے کہ کس چہرے پر حسن برستا ہے اور کس پر پھٹکار برستی ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک جماعت فرشتوں کی ایسی ہے کہ وہ ہر وقت یہی تسبیح پڑھتے ہیں سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللِّحٰى وَالنِّسَاءَ بِالذَّوَائِبِ (پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھی سے خوبصورتی دی اور عورتوں کو بالوں کی چوٹی سے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے لئے داڑھی کا ہونا زینت ہے اور اگر اس زینت کے رکھنے کی ضرورت نہیں تو عورتوں کا سر بھی منڈانا چاہیئے۔ غرض داڑھی منڈانے کی وجہ حسن وجمال تو نہیں ہو سکتا۔

کلکتہ میں ایک ملحد نے مولانا شہید دہلوی رحمۃ اللہ سے کہا تھا کہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی رکھنا خلاف فطرت ہے کیونکہ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت بھی ہوتی۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ اگر خلاف فطرت ہونے کی یہی وجہ ہے تو دانت بھی خلاف فطرت ہیں ان کو بھی توڑ ڈالو کیونکہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت دانت بھی نہیں تھے۔ غرض داڑھی کا منڈانا نہایت لغو حرکت ہے اور میں نے اس وقت بالقصد داڑھی کا تذکرہ نہیں کیا لیکن میں چونکہ اپنے عیوب و امراض کو بتلا رہا ہوں اسی ذیل میں اس کا تذکرہ بھی آگیا۔ صاحبو! واللہ بعض دفعہ داڑھی کے تذکرہ سے شرم آتی ہے کہ شاید کسی کو ناگوار گذرے مگر منڈانے والوں کو اتنا حجاب بھی نہیں ہوتا۔ اور اب تو غضب یہ ہے کہ بعض لوگ داڑھی منڈانی حلال بھی سمجھنے لگے ہیں اور جب اس کی بابت ان سے گفتگو کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کی حرمت دکھلایئے اور یہ سوال آج کل ایسا عام ہوا ہے کہ ہر شخص ہر بات کو قرآن سے مانگنے لگا ہے میں اس سوال کا ایک فیصلہ کن جواب دیتا ہوں یہ کوئی لطیفہ نہ ہوگا بلکہ قابل غور جواب ہوگا۔ لیکن اول ایک شرعی اور ایک تمدنی قاعدہ بیان کرتا ہوں۔ تمدنی قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عدالت میں ایک ہزار روپے کا دعویٰ پیش کرے اور اس کی شہادت میں دو شاہد ایسے پیش کردے جن میں مدعا علیہ کوئی نقص یا عیب نہ نکال سکے تو مدعا علیہ پر ڈگری ہو جاتی ہے اور اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ ان گواہوں کو تسلیم نہ کرے

اور یہ ہے کہ میں تو دعوے کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک کہ خود صاحب جج اور مجسٹریٹ ضلع آ کر گواہی نہ دیں اور اگر مدعا علیہ ایسا کرے تو عدالت اس کو کہے گی کہ دعوے کے اثبات کے لئے مطلق شاہد کی ضرورت ہے شاہد خاص کی ضرورت نہیں ہے پس یا تو ان گواہوں کو کلام کرو یا دعوے کو تسلیم کرو۔ یہ قاعدہ تمدنی ہے اور شرعی بھی۔ اور شرعی قاعدہ یہ ہے کہ شریعت کے چار دلائل ہیں قرآن، حدیث، اجماع، قیاس۔ تو گویا یہ شاہد ہیں احکام کے پس جو شخص یہ دعوےٰ کرے کہ هٰذَا حُكْمٌ شَرْعِيٌّ تو مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ان چاروں دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہے اور یہ دعویٰ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ کوئی ایک ہزار روپیہ کا دعوےٰ کرے پس اسی شخص کی طرح اس کو بھی اختیار ہے کہ جس دلیل سے چاہے ثابت کر دے خواہ حدیث پڑھ دے خواہ امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کر دے۔ ان دونوں قاعدوں کے معلوم کرنے کے بعد اب اُس سوال کا جواب سنئے وہ یہ ہے کہ ڈاڑھی کٹانے یا منڈانے کی حرمت حدیث شریف سے ثابت ہے اور حدیث بھی دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل ہے اگر یہ قرآن اس سے بڑا ہے تو قرآن سے دلیل کا طلب کرنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص خاص مجسٹریٹ کی گواہی پر ثبوت مدعا کا مدار رکھے۔ البتہ یہ حق ہر شخص کو حاصل ہے کہ اگر ممکن ہو حدیث میں کلام کرے لیکن اگر حدیث میں کلام نہ کر سکے تو آگے گنجائش باقی نہیں رہتی اور میں مجیبوں کو بھی کہتا ہوں کہ آپ بھی اتنی خوش اخلاقی نہ کیا کیجئے کہ جس کسی نے جس قید کے ساتھ کوئی بات پوچھی آپ اسی طرح جواب دینے کی فکر میں پڑ گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی بد اخلاق ہوتے ہیں، حالانکہ مولوی اس قدر خوش اخلاق ہوتے ہیں کہ ان کی خوش اخلاقی کی بدولت آپ خراب ہو گئے غرض قرآن شریف سے داڑھی منڈانے کی حرمت کو تلاش کرنا اور حدیث وغیرہ کو حجت نہ سمجھنا بڑی غلطی ہے اسی طرح مجیب صاحبوں سے عرض ہے کہ آپ جو اس کی حرمت کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ داڑھی منڈانے کی حرمت کو قرآن سے

ثابت کر بھی دیا تو ہر ہر مسئلہ کو کہاں تک قرآن سے ثابت کیجئے گا۔ مثلاً مغرب کی تین رکعتیں وتر کا وجوب اور اس کی تین رکعتیں قرآن کی کس آیت سے ثابت کرو گے۔ رہے اخلاق اور یہ پانچواں جزء ہے سو اس کی بابت سبھی جانتے ہیں کہ اخلاق کی خرابی سے ہمارے علماء اور طلبہ بھی بہت ہی کم بچتے ہیں اکثر دیندار لوگوں کو اس کی تو فکر ہوتی ہے کہ داڑھی بھی ہو۔ ٹخنے سے اوپر پاجامہ بھی ہو لباس سارا شریعت کے موافق ہو لیکن اخلاق کو دیکھئے تو اس قدر خراب کہ گویا کبھی شریعت کی ہوا بھی نہیں لگی جس سے وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل   واندروں قہر خدائے عز وجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وازدرونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے تو ایسے جیسے کافر کی قبر سجی ہوئی ہوتی ہے اور اندر خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے۔ باہر کی حالت تو ایسی بنا رکھی ہے کہ حضرت بایزید بسطامی جیسے بزرگ پر بھی اعتراض کرنے لگے اور تیرے اندر کی حالت ایسی ہے کہ اس کو دیکھ کر یزید جیسے شخص کو بھی شرم آنے لگے)

بہت لوگ ہماری پارسایانہ صورت کو دیکھ کر دھوکہ میں آجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کے خاص مقبولین میں ہیں حالانکہ ہم میں یہ جزء اخلاق کا جو کہ شعب دین سے ایک عظیم الشان شعبہ ہے ہم میں نشان تک نہیں ہوتا ہماری ساری حرکتیں تکلف پر مبنی اور سارے افعال بناوٹ سے ناشی ہوتے ہیں۔ تو یہ امراض ہم میں ہیں جن کا علاج نہایت ضروری ہے اور جن کی وجہ سے ہماری حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے، سو میں ان کا علاج بتلاتا ہوں۔ علاج ہر مرض کا دو قسم کا ہوتا ہے ایک علاج کلی اور ایک علاج جزئی۔ علاج جزئی تو اس کو کہتے ہیں کہ ہر ہر شکایت اور ہر ہر مرض کا فرداً فرداً علاج کیا جائے اور علاج کلی اس کو کہتے ہیں کہ تمام امراض کی جڑ یعنی ایک امر مشترک کا ازالہ کر دیا جائے کہ اس سے ہر شکایت خود بخود جاتی رہے شریعت میں پہلی قسم کے علاج بھی ہیں اور دوسری قسم کے بھی لیکن پہلی قسم کے علاج کی آج

لوگوں میں ہمت نہیں رہی البتہ پہلے لوگ اسی طرح کرتے تھے کہ ریا، عُجب، حسد، کبر، بغض وغیرہ سب کا علاج علیحدہ علیحدہ کرتے تھے اور معالج کے لئے یہی سہل بھی ہے گو مریض کے لئے اس میں دشواری ہے مثلاً اگر ایک شخص سر سے پیر تک بیماریوں میں مبتلا ہو اس کیلئے بہت اچھا یہ ہے کہ کوئی ایسا نسخہ تجویز کیا جائے کہ اسی ایک نسخے سے سب مرض جاتے رہیں مگر یہ معالج کو نہایت دشوار ہے۔ شریعت اسلامیہ کے قربان جایئے کہ اس نے ایسا علاج بتلا دیا کہ ایک ہی علاج میں ہر مرض سے رہائی ہو جاتی ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ بعض شکایتوں میں اصل مرض ایک ہوتا ہے اور باقی سب اعراض ہوتے ہیں جو کہ اس مرض سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسا ایک شخص کا قصہ ہے کہ اس نے ایک طبیب سے شکایت کی کہ مجھے نیند نہیں آتی اُس نے کہا بڑھاپے کے سبب۔ پھر اُس نے کہا کہ میرے سر میں درد بھی رہتا ہے۔ طبیب بولا کہ یہ بھی بڑھاپے کے سبب اسی طرح اس نے بہت سی شکائتیں بتلائیں اور طبیب نے سب کا یہی جواب دیا کہ یہ سب بڑھاپے کی بدولت ہے تو اصل مرض اس شکایت میں بڑھاپا تھا اور باقی سب اسی کے اعراض تھے۔ ایک اور نظیر لیجئے۔ رات کے وقت آپنے چراغ گل کر دیا اور چوہے چھچھوندر چھپکلی وغیرہ نکلنے شروع ہوئے تو بظاہر یہ بہت سے موذیوں کا ہجوم ہے کہ فرداً فرداً ہر ایک کا دفع کرنا دشوار ہے لیکن سبب ان سب کا صرف ایک چیز ہے یعنی ظلمت جب اس کو دور کر دیا جائیگا تو یہ سارے موذی خود بخود دور ہو جائیں گے۔ اسی طرح شریعت مطہرہ کی خوبی یہ ہے کہ اس نے تمام شکایتوں میں سے اصل مرض کو منتخب کر کے بتلا دیا اور اس کی تدبیر بتلا دی کہ اصل مرض ہم میں دو ہیں علی سبیل منع الخلو یعنی کبھی تو وہ دونوں ہوتے ہیں اور کبھی ایک ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوتا لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس میں سے ایک بھی نہ ہو میں اس کو ذرا مفصل اس لئے بیان کرتا ہوں کہ ہماری حالت بہت کچھ محتاج اصلاح ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ہم نے یہ سمجھا رکھا ہے کہ ہماری اصلاح ممکن ہی نہیں کیونکہ اصلاح اس وقت ہو کہ ہم ساری دنیا کو آگ لگا دیں بیوی، کو چھوڑ دیں

بچوں کو چھوڑ دیں غرض سب کو ترک کر کے بیٹھیں تب علاج ہوا اور جب تک یہ نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ علاج ممکن نہیں حالانکہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے۔ صاحبو! اگر دین ایسا تنگ ہوتا تو قرآن شریف میں یہ ارشاد نہ ہوتا لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (البتہ تحقیق ہم نے بھیجا ہے رسولوں کو تجھ سے پہلے اور پیدا کئے ہم نے ان کے لئے بیویاں اور بچے) نیز مسلمانوں کے لئے خلافت اور سلطنت عطا نہ ہوتی بس یہ سمجھنا کہ اصلاح حالت کے لئے بالکلیہ ترک تعلق کر دینا ضروری ہے محض غلطی ہے وہ اصل مرض ایک تو یہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم نہیں اور علم دین سے بالکل ناواقف ہیں دوسرے یہ کہ بزرگوں کی صحبت نصیب نہیں اور میرے اس جملہ سے عقلاء کو اس بیان کی اصل غرض کا پتہ چل گیا ہوگا اور ایک بڑا شبہ بھی حل ہو گیا ہوگا کیونکہ بعض لوگ علی العموم یہ سمجھتے ہیں کہ علماء کا مقصود تعلیم دین کی ترغیب سے پورا مولوی بنانا ہے اور بدون اس کے ان کے نزدیک مقصود حاصل نہیں ہوتا تو میرے اس عطف سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کے نزدیک پورا مولوی بنانا ضروری نہیں بلکہ یا تو پورا مولوی بنایا جائے اور یا بزرگوں کی صحبت ہو۔ اس کو ذرا تفصیل سے یوں سمجھئے کہ ایک تو علم دین کی تعلیم بقدر ضرورت ہے اس تعلیم کا عام ہونا تو نہایت ضروری ہے اور ایک تعلیم ہے اصطلاحی عالم بننا یہ سب کے لئے ضروری نہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے گورنمنٹ کا قانون کہ بقدر ضرورت قانون کا جاننا رعایا میں سے ہر واحد کے لئے ضروری ہے اور قانون میں پاس کرنا ساری رعایا کے لئے ضروری نہیں اور اگر کوئی گورنمنٹ اس پر مجبور کرے تو بیشک یہ تنگی ہے تو اصطلاحی علماء سب نہیں بن سکتے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ہم تو سب کا اصطلاحی عالم بنانا مناسب بھی نہیں سمجھتے اب تو آپ کے شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر سب مولوی ہو جائیں اور مولویت میں مشغول ہو جائیں تو معاش کے اسباب بالکل گم ہو جائیں۔ اور ان اسباب کا محفوظ رکھنا خود شریعت کو مقصود ہے۔ اور اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ سب کا مولوی بنانا جائز بھی نہیں ہے۔ اس پر شاید لوگوں کو تعجب ہو لیکن

بات یہ ہے کہ مولوی ہونے سے مراد مقتدا ہونا ہے اور مقتدا ہونے کے لئے کچھ شرطیں ہیں جن میں سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس شخص میں حق پرستی ہو نفس پرستی نہ ہو طمع اور لالچ اس میں نہ ہو کہ اپنی طمع کی وجہ سے مسئلے کو بدل دے۔ علماء بنی اسرائیل میں یہی بات تھی کہ جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہوئے، اسی کی نسبت کہتے ہیں ؎

بے ادب را علم و فن آموختن
دادن تیغ ست دست راہزن

(بری فطرت والے شخص کو علم اور فن سکھانا ایسا ہے جیسے ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دیدی جائے)

اور یہ مشاہدہ ہے کہ طمع میں بہت طبائع مبتلا ہیں جب یہ ہے تو فرض کیجئے کہ ایک شخص میں طمع اور نفس پرستی ہے اور اس کو مقتدا بنا دیا گیا تو وہ کیا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح قوم کے قوم کو تباہ کرے گا اور اپنی طرف سے تراش کر مسئلے لکھے گا۔ میں نے ایک شخص کا فتوےٰ دیکھا ہے کہ اس نے ایک ہزار روپیہ لے کر سالی سے نکاح حلال کر دیا تھا۔ دہلی کے ایک بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو ایک مرتبہ حریر پہننے کی طرف میلان ہوا۔ بعض تنخواہ دار مولویوں نے اس کی حلت کا فتویٰ دیدیا اور بہت سے وجوہ حلت کے لکھدیئے بادشاہ نے کہا کہ اگر ملا جیون بھی دستخط کر دیں تو میں پہن لوں گا، ملا جی کے پاس استفسار گیا۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ میں دہلی آکر جواب دوں گا۔ اور جامع مسجد میں جواب دوں گا۔ چنانچہ آپ دہلی تشریف لائے اور جامع مسجد میں ممبر پر جا کر بعد نقل سوال و جواب کے استحلال معصیت کی بناء پر بطور زجر کے فرمایا کہ "مفتی و مستفتی ہر دو کافر ند" (فتوے کو پوچھنے والا اور فتوی دینے والا دونوں کافر ہیں) بادشاہ یہ سن کر نہایت غضبناک ہوا اور اس نے قتل کا حکم دیا بادشاہ کے ایک فرزند کو جو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے ملا جی کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے قتل کی تدابیر ہو رہی ہیں۔ ملا جی نے جو سنا تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ کیا میں نے ایسا

قصور کیا ہے اور فرمایا کہ وضو کے لئے پانی لاؤ کہ میں بھی ہتھیار باندھلوں کیونکہ الوضوء سلاح المؤمن (وضو مومن کا ہتھیار ہے) حقیقت میں ان حضرات کو تمغا نہ سمجھنا چاہیئے۔ حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(ہم نے اس دنیا میں بہت تجربہ کیا تو یہ بھی بدلہ ملنے کی جگہ ہے جو بھی عاشقانِ الٰہی کے ساتھ الجھتا ہے خود نقصان اٹھاتا ہے)

حدیث شریف میں ہے من عادی لی ولیًّا فقد اٰذنتہٗ بالحرب شہزادے نے جو آپ کے جلال کی حالت دیکھی تو دوڑا ہوا باپ کے پاس گیا اور کہا آپ کیا غضب کرتے ہیں، ملاجی آپ کے مقابلہ کے لئے وضو کر رہے اور سلاح وضو درست کر رہے ہیں سج رہے ہیں، بادشاہ یہ سن کر تھرّا گیا اور کہا کہ اب کیا کروں میں تو حکم دے چکا ہوں۔ شہزادے نے کہا کہ سب کے سامنے میرے ہاتھ ایک خلعت بھیجدیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تب ملاجی کا غصہ فرو ہوا۔ اس قسم کے لوگ البتہ مقتدا ہونے کے قابل ہیں اور ایسے بہت لوگ گذرے ہیں۔ برخلاف ان طماع لوگوں کے کہ یہ بجز افساد کے اور کیا کریں گے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی بزرگوار کا قصہ ہے اور میں نے ان کو دیکھا بھی ہے کہ ان سے ایک عورت نے جس کا دوسرے شخص سے تعلق تھا کہا کہ میں اپنے شوہر کے پاس رہنا نہیں چاہتی اور وہ مجھے طلاق نہیں دیتا انہوں نے کہا کہ تو کافر ہوجا (نعوذ باللہ) اس سے نکاح ٹوٹ جائے گا۔ فرمایئے جب ایسے لوگ مقتدا ہوں گے تو قوم کی کیا حالت ہوگی۔ اور عجب نہیں کہ ایسے لوگوں کی وجہ سے ان کے پڑھانے والوں سے بھی باز پرس ہو جبکہ ان کو قرائن سے معلوم ہو کہ یہ ایسے ہوں گے اور یہی وجہ تھی کہ سلف صالحین انتخاب کر کے پڑھاتے تھے ہر کس و ناکس کو علم دین مقتدائیت کے درجہ تک نہ سکھلاتے تھے اس مقام پر شاید متکبرین خوش ہوں کہ ہم کہا کرتے تھے کہ جلاہے تیلیوں کو نہ پڑھایا جائے وہی بات ثابت ہوگئی سو ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرات سلف صالحین کا

انتخاب انساب سے نہیں ہوتا تھا بلکہ ملکات سے ہوتا تھا یعنی جس شخص میں ملکات فاضلہ دیکھتے تھے ان کو علم دین کی تعلیم کامل دیتے تھے اور جس شخص میں ملکات رذیلہ دیکھتے تھے اس کو بقدر ضرورت سکھا کر کسی دوسرے کام میں مشغول ہونے کی رائے دیتے تھے اگرچہ پہلا کسی ادنیٰ اور معمولی گھرانے کا ہوا اور دوسرا کسی عالی خاندان کا اور اگر آپ کو ان جلا ہے تیلیوں سے اس قدر عار آتی ہے تو ان کی جنت میں بھی نہ جایئے گا بلکہ فرعون و ہامان کے ساتھ چلے جایئے گا کیونکہ وہ بہت بڑے لوگوں میں تھے۔ صاحبو! نسب کا علو اور تسفّل غیر اختیاری ہے اور ملکات کا مقتضا پر چلنا اختیاری ہے اور غیر اختیاری امور میں عزت و ذلت نہیں ہوا کرتی، عزت و ذلت کا مدار اختیاری افعال ہوا کرتے ہیں اسی وجہ سے قیامت میں ان انساب کا اعتداد نہ ہوگا۔ ارشادِ خداوندی ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ (پس قیامت کے روز نسب کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور نہ اس کے متعلق سوال ہوگا) پھر یہ کہ شریف تو پڑھیں نہیں اور اسافل کو پڑھنے نہ دیں کیسا ظلم ہے۔ خدائی مذہب کا نشر اور اشیوع تو ضرور ہونے والا ہے اور اس کیلئے ہر زمانے میں غیب سے سامان ہوتا رہا ہے جس وقت تک شرفا علم کی طرف متوجہ رہے خدا تعالیٰ ان میں بڑے بڑے لوگ پیدا کرتا رہا جن سے دین کی اشاعت ہوئی جب انھوں نے تقاعُد کیا اور علم دین کی طرف سے روگردانی کی خدا تعالیٰ نے یہ دولت دوسری قوموں کو دیدی۔ غرض انساب کو نہ دیکھئے اخلاق کو دیکھنا چاہیئے میں اہلِ مدارس کو یہ رائے دیتا ہوں کہ وہ اپنی ضابطہ پری اور کارروائی دکھلانے کی غرض سے بدطینت لوگوں کو داخل نہ کریں کثرت و قلت تعداد طلبہ کی ذرا پروا نہ کیا کریں بلکہ جس شخص کی حالت مقتدائیت کے مناسب نہ دیکھیں اس کو فوراً مدرسے سے خارج کردیں۔ میں جب کانپور میں تھا تو ایک مرتبہ تقریباً آٹھ طالب علموں کو جو کہ قریب الفراغ مدرسہ سے خارج کردیا تھا اہل مدرسہ نے بہت کچھ کہا سنا کہ ان کے نکلنے سے مدرسہ کی کارگذاری میں بڑی کمی واقع ہوگی اور اس سال کارروائی بالکل نہ دکھلائی

جا سکے گی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو کارروائی دکھلانے کا تو اس قدر خیال ہے اور اس کا خیال نہیں کہ یہ لوگ مقتدائے دین ہوں گے لوگ ان کی پیروی کریں گے اور حالت ان کی یہ ہے کہ بجز گمراہ کرنے کے اور کیا ان سے ہو سکے گا تب ان لوگوں کی سمجھ میں آیا غرض آپ لوگ اس کا ہرگز اندیشہ نہ کریں کہ ہم سب کو مولوی بنانے کی فکر میں ہیں کیونکہ ہم بہت سوں کو مولوی بنانا جائز بھی نہیں سمجھتے اور وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے ؎

زیاں میکند مرد تفسیر داں — کہ علم و ادب میفروشد بناں

(تفسیر کا جاننے والا ایسا شخص جو علم ادب کو روٹی کے بدلہ نہ بیچتا ہے (دین کو) سخت نقصان پہنچاتا ہے)

آجکل جو علماء کا گروہ بدنام ہے یہ انہی طماعوں کی بدولت۔ واللہ اگر علماء آج دست کش ہو جائیں جیسا کہ اہلِ حق بحمد اللہ ہیں تو یہ بڑے بڑے متکبرین ان کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ بلکہ علماء کے لئے تو یہ مناسب ہے کہ اگر کوئی دنیا دار ان کے سامنے کوئی چیز پیش بھی کرے تو لینے سے انکار کر دیں صاحبو! علماء کا وجود فی نفسہٖ ایسا محبوب تھا کہ اگر یہ کسی کے گھر چلے جاتے تو اس دن عید ہونی چاہیئے تھی حالانکہ آج وہ دن یوم الوعید ہو جاتا ہے اور وجہ اس کی یہی ہے کہ ان طماعوں کی بدولت ہر عالم کی صورت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کچھ مانگنے آئے ہونگے صاحبو! استغفار و آزادی میں علماء کا تو یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ ؎

ای دل آں بہ کہ خراب از مئی گلگوں باشی — بے زر و گنج بہ صد حشمت قاروں باشی

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل بہتر بات یہ ہے کہ عشق کی شراب میں مست ہو کر بغیر زر اور قارون کے خزانہ زندگی بسر کرے۔ لیلیٰ تک پہنچنے کے لئے راستہ میں جان کو بہت سے خطرات ہیں لیکن آگے قدم بڑھانے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مجنوں ہو جائے)

یعنی وہ حالت ہونی چاہیئے کہ مال اور جاہ دونوں کو آگ لگا دو۔ اگر تم ان امراء کے دروازے پر جانا چھوڑ دو تو یہ خود تمہارے دروازے پر آئیں گے تو ایسے لوگوں کا وجود

ہوتے ہوئے ہم تعلیم کامل کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ تعلیم بقدر ضرورت عام ہونی ضروری ہے اور تعلیم کامل کا بدل ایک دوسری چیز ہے یعنی اہل اللہ کی صحبت کہ اس سے بھی وہی فائدہ ہوتا ہے بلکہ یہ ایسی چیز ہے کہ تعلیم کامل کے بعد بھی اس کی ضرورت ہے۔ دیکھئے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے تھے کہ وہ بالکل بھی پڑھے نہ تھے۔ اور اسی حالت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فخر فرماتے ہیں نَحْنُ اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَلَا نَحْسَبُ (ہماری جماعت ایسے ان پڑھوں کی جماعت ہے جو نہ لکھنے سے تعلق رکھیں نہ حساب سے) لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور معیت حاصل تھی وہی بالکل کافی ہوگئی یہ تو دینی پہلو سے گفتگو تھی۔ اب میں تمدنی پہلو سے صحبت کی ضرورت اور بدون صحبت کے تعلیم کامل کے مفاسد بتلاتا ہوں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اجتماع اور تمدن کے تمام مصالح علی وجہ الکمال امن وامان سے اس وقت پورے ہو سکتے ہیں کہ جب تمام لوگوں کی زندگی میں نہایت سادگی اور معاشرت میں بالکل بے تکلفی ہو۔ بناوٹ اور چالاکی کے ساتھ تمام مصالح کا پورا ہونا ممکن نہیں نیز یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اگر علم کامل ہو اور تربیت نہ ہو تو چالاکی اور دھوکہ دہی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر جاہل ہو اور تربیت نہ ہو تب بھی یہی حالت ہوتی ہے اور مصالح تمدن کا پورا ہونا ضروری ہے۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ مصالح تمدن کا پورا ہونا ضروری اور وہ علی وجہ الکمال بدون سادگی اور امن وامان کے پورے ہو نہیں سکتے۔ اور سادگی بدون تربیت کے حاصل نہیں ہوتی اور تربیت بغیر علم بقدر ضرورت کے ممکن نہیں تو تربیت کے لئے علم بقدر ضرورت حاصل ہونا ضروری اور سادگی کے لئے تربیت ضروری اور مصالح تمدن کے پورا ہونے کے لئے سادگی زندگی ضروری لہذا مصالح تمدن کے لئے علم بقدر ضرورت اور تربیت ضروری ہے اور چونکہ علم بدون تربیت مورث عیاری ہے اور عیاری مصالح تمدن کے لئے مضر ہے لہذا علم کامل بدون تربیت کے مضر ہے اور چونکہ ہر شخص سامان تربیت کا حاصل نہیں کرتا لہذا ہر شخص کو

علم کامل پڑھانا مفید نہیں بلکہ مضر ہے لیکن اس پر ناخواندہ لوگ خوش نہ ہوں کہ ہماری امیت ایک درجہ میں مطلوب ہو گئی۔ پس اچھا ہوا کہ ہم نے علم حاصل نہ کیا بات یہ ہے کہ آپ کی اُمیّت تو حد سے بہت زیادہ گذری ہوئی ہے کہ صحبت سے بھی محروم ہو۔ لہذا یہ مطلوب نہیں ہو سکتی تو یا تعلیم کامل مع صحبت ہو یا نری صحبت ہو کیونکہ نری تعلیم کافی نہیں اور نری صحبت کافی ہے مگر ایک شرط کے ساتھ۔ وہ یہ کہ جس کے پاس جائے اس کو اپنے دنیوی قصوں میں مشغول نہ کرے اور اپنے تمام امراض باطن کو بلا کم و کاست اس کے سامنے پیش کر دے اور وہ جو کچھ کہے اس پر کاربند رہے۔ ہم نے ایسا ایک آدمی بھی نہیں دیکھا کہ پورا عالِم ہو اور صحبت یافتہ نہ ہو اور پھر اس سے ہدایت ہوئی ہو اور ایسے بہت سے دیکھے ہیں کہ شین اور قاف بھی ان کا درست نہیں لیکن دین کی خدمت کرتے ہیں پس نرا علم۔ شیطان اور بلعم باعُور کا سا علم ہے لیکن پھر بھی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے کہ وہ ان سب کے لئے مرکز ہو۔ یعنی سب تو پورے عالم نہ ہوں مگر چند لوگ ایسے ہوں کہ ضرورت کے وقت یہ لوگ ان کی طرف رجوع کر سکیں۔ حاصل یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ایک تو ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو کہ علماء کہلائیں۔ دوسرے یہ ضرورت ہے کہ ہر شخص بقدر ضرورت عمل عالم ہو۔ تیسرے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو اہل اللہ کی صحبت حاصل ہو اب میں ہر ایک کی تدبیر بتلاتا ہوں۔ سو اول کی تدبیر تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ بچّے ایسے انتخاب کئے جائیں جو کہ ذکی اور ذہین ہوں۔ طبیعت میں سلامتی ہو۔ اور ان کو باقاعدہ تعلیم دی جائے اور ان کے لئے ہر شہر میں ایک ابتدائی مدرسہ ہو مثلاً اس بستی میں ایک ابتدائی مدرسہ قائم کیا جائے کہ اس میں شرح وقایہ، نور الانوار تک تعلیم دی جائے اور یہاں تک پڑھ لینے کے بعد ان کو کسی بڑے مدرسہ میں بھیجدیا جائے کہ وہاں ان کی درسیات پوری ہو جائیں۔ اس کی فکر ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے بالخصوص امراء پر اس کا حق زیادہ ہے کیونکہ ان کو خدا تعالے نے فراغ دیا ہے۔ اور ان چھوٹے مدرسوں کو کسی بڑے مدرسہ سے وابستہ کیا جائے کہ وہاں کی ستہدان

لوگوں کے لئے حجت ہو اور وہ مدرسہ ان سب مدارس کے لئے دار العلوم کے طور پر ہو۔ پھر ایسے لوگوں کے فتوے اور تعلیمات پوری طرح قابلِ اطمینان ہوں گے بلکہ بہتر یہ ہے کہ جو لوگ وعظ کہنے کے لئے آئیں ان کی نسبت بھی تحقیق کر لیں کہ وہ کسی مدرسہ کے سند یافتہ بھی ہیں چونکہ آج کل کے واعظوں سے نفع کے بجائے بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔ میں نے دیوبند میں ایک واعظ صاحب کو وعظ کہتے سُنا اول اس نے یہ آیت پڑھی ذَالِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اس کے بعد ترجمہ اس آیت کا کیا کہ تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ تم تالا لگا کر نماز جمعہ کو جایا کرو یہ خرابی کی تَعْلَمُوْنَ کی یعنی تالا موندر۔ اس زمانے میں مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی مہتمم مدرسہ زندہ تھے، اس واعظ کو بہت ڈانٹا۔ اور ایک واعظ کانپور میں آئے تھے جامع العلوم میں انہوں نے وعظ کہا یہ آیت پڑھی وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ ۝ اور ترجمہ کیا کہ جنت میں ایک تخت ہوگا جس کا ایک ایک پایہ ایک ایک ہزار کوس کا ہوگا اور طرہ یہ کیا کہ کوس کی تفسیر بھی کی کہ بڑے کوس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے ایسے واعظ بھی دیکھے ہیں کہ وہ وعظ کہتے ہیں اور لوگوں سے معلوم ہوا ہوا کہ شراب پیتے ہیں۔ آج کل مقتدا بننا بھی ایسا سستا ہو گیا ہے کہ جس کا جی چاہے وہی مقتدا بن جاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ کسی ایک بڑی جگہ اور مرکزی جماعت سے وابستہ نہیں اس لئے سب خود مختار ہیں لہٰذا بہت ضروری ہے کہ سب کے سب کسی ایسی جگہ اور ایسی جماعت سے وابستہ ہوں کہ ان کا ہر فعل وہاں کی اجازت اور سند کے بعد ہو۔ بدون خاص اہتمام کے یہ جماعت علماء کی قائم نہیں ہو سکتی اس لئے اس کا اہتمام نہایت ضروری ہے مگر اس کا تمام تر اہتمام مولویوں پر نہ رکھو کیونکہ اس میں بعض کام ایسے بھی ہوں گے کہ اس کو مولوی نہ کر سکتے ہیں نہ ان کے لئے مناسب ہے۔ مثلاً مدارس قائم کرنے کے لئے چندہ کرنے کی ضرورت ہو گی سو علماء کو مناسب نہیں کہ وہ چندہ کی تحریک میں حصہ لیں اس سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عام لوگ ان کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنی اولاد کو پڑھایا تو وہ بھی

یہی مانگنے کا کام کریں گے پس مولوی پڑھانے کا کام کریں اور رئیس چندہ وصول کریں کیونکہ ان پر یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ خود کھا جائیں گے۔ دوسرے جب مولوی پڑھانے کا کام کرتے ہیں تو کھانے کمانے کے کام بھی ان ہی کے سر کیوں ڈالے جائیں۔ آج کل عام مولویوں کو بھانڈ کا ہاتھی سمجھتے ہیں۔ مشہور ہے کہ اکبر نے کسی بھانڈ کو خوش ہو کر ایک ہاتھی دیدیا تھا۔ بھانڈ نے ہاتھی تو لے لیا لیکن اس کو خیال ہوا کہ میں غریب آدمی اس ہاتھی کو کھلاؤں گا کہاں سے اس کی تو چار خوراکوں میں میرا سارا گھر بھی ختم ہو جائے گا، آخر اس کو معلوم ہوا کہ آج اکبر کی سواری فلاں طرف سے فلاں وقت گذرے گی جب وہ وقت آیا تو اپنے ہاتھی کے گلے میں ایک ڈھول ڈال کر اسی طرف اس کو چھوڑ دیا۔ اکبر کی سواری جب گذری تو اس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک ہاتھی چلا آرہا ہے اور گلے میں ڈھول پڑا ہوا ہے غور کیا تو معلوم ہوا کہ خاصہ کا ہاتھی ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ ہاتھی اس حالت میں کیوں پھرتا ہے۔ لوگوں نے کہا حضور نے اپنے بھانڈ کو یہ ہاتھی دیدیا تھا۔ اکبر نے بھانڈ کو طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے ہاتھی کو اس حالت میں کیوں چھوڑا ہے کہنے لگا کہ حضور نے مجھے ہاتھی تو عنایت فرمایا مگر میرے پاس کھلانے پلانے کو کیا دھرا تھا آخر یہ سمجھ میں آیا کہ جو میرا پیشہ ہے وہی اس کو بھی سکھلاؤں اس لئے میں نے گلے میں ڈھول ڈال کر چھوڑ دیا کہ مانگو اور کھاؤ۔ اکبر کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اس نے ایک گاؤں بھی انعام میں دیا۔ تو لوگوں نے مولویوں کے لئے بھی یہی تجویز کر رکھا ہے کہ کام بھی کرو اور مانگو اور کھاؤ بھی۔ صاحبو! ان کو کیا غرض پڑی ہے خدا تعالیٰ نے ان کو دولت علم کی دی ہے ان کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ تم سے بھیک مانگیں۔ اور میں مولویوں کو بھی کہتا ہوں کہ آپ کو کامل توکل کرنا چاہیئے۔ نیز مولویوں کے مانگنے میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ لوگ ان پر یہ اعتراض کریں گے کہ یہ لوگ دوسروں سے

تو مانگتے ہیں لیکن خود کبھی نہیں دیتے اور یہ جو محرک نہ دے اس کی تحریک میں شبہات پیدا ہوتے ہیں اور رُوسا اگر دوسروں سے پچاس مانگیں گے تو کم سے کم بیس تو خود بھی دیں گے۔ اس لئے ان پر اعتراض کرنے کا کسی کو موقع نہیں۔ تو یہ طریقہ ہے کام کرنے کا اس طور پر مدرسے کا قائم ہونا نہایت ضروری ہے بالخصوص اس شہر میں کہ یہاں کے لوگوں کو دین کی طرف بہت ہی کم رغبت ہے سراسر دنیا ہی میں کھپے ہوئے ہیں اور زیادہ تر وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کو علماء کی صحبت بہت ہی کم ہے جس کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے کہ خود علماء کو یہاں بلاؤ

ے اگرچہ لوگوں کا یہ اعتراض نظر بر واقع صحیح نہیں کیونکہ اول تو مولویوں کے پاس اس قدر سرمایہ کہاں ہوتا ہے کہ وہ چندے دیں، دوسرے وہ باوجود سرمایہ نہ ہونے کے بہت زیادہ دیتے ہیں۔ میں بطور مشتے نمونہ از خروارے چند مثال پیش کرتا ہوں۔

اول حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے زمانہ قیام کانپور میں مدرسہ کی آمدنی میں قلت دیکھ کر اپنی تنخواہ یک قلم چھوڑ دی تھی جو کہ ۵۰ روپیہ ماہوار تھی۔

دوسرے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سلمہٗ مدرس اول مدرسہ مظاہر العلوم ۳۰ روپیہ ماہوار پاتے ہیں اہل مدرسہ نے بہت کوشش کی کہ مولانا کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے لیکن مولانا نے صاف انکار فرما دیا اور فرمایا کہ میرے لئے یہی بہت کافی ہیں۔

سوم حضرت مولانا مولوی محمود حسن صاحب سلمہٗ مدرس اول مدرسہ دیوبند دار العلوم ۵۰ روپیہ ماہوار پاتے ہیں اہل مدرسہ نے مولانا سلمہٗ کی ترقی کرنی چاہی لیکن آپ نے منظور نہیں فرمایا۔

چہارم مولانا مولوی عنایت الٰہی صاحب سلمہٗ مہتمم مدرسہ سہارنپور ۲۵ روپیہ ماہوار پاتے ہیں اراکین مدرسہ کے کہنے پر اپنے اس تنخواہ سے زیادہ لینے سے بالکل انکار کر دیا۔

میرے خیال میں آج کوئی شخص دنیا داروں میں اس کی ایک نظیر بھی پیش نہیں کر سکتا کہ کسی نے اپنے باب ترقی کو بالکل مسدود کر دیا ہو یا اپنی پوری تنخواہ محکمے کے حوالہ کر دی ہو اور یہ علاوہ بعض وجوہ سے متعارف چندہ دینے سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور اسی قسم کی بہت سی مثالیں ہیں ۱۲ سعید

اور ان سے فیض حاصل کرو۔ عالم کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ اس کے طلوع ہوتے ہی نصف کرۂ زمین منور ہو جاتا ہے اور ظلمت بالکل جاتی رہتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دیندار عالم ہو ایسا نہ ہو کہ تمہارے تابع بن جائے۔ اس کی صفت یہ ہو کہ لَا یَخَافُوْنَ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ (وہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی بُرا کہنے والے کے بُرا کہنے سے نہیں ڈرتے) اور اس کے لئے کم از کم بیس پچیس روپیہ ماہوار کا انتظام کر دو آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عالم تو بہت بڑا ہو لیکن دس بارہ روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ دینے پڑیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس ایک عالم کی طلب میں ایک خط آیا تھا جس میں ان عالم کے لئے بہت سی شرطیں لکھی تھیں کہ وہ ایسے ہوں اور ایسے ہوں اور کل دسؔ روپیہ تنخواہ لکھی تھی۔ مولانا فرمانے لگے کہ بھلے مانسو فی وصف ایک روپیہ تو رکھا ہوتا۔ صاحبو! خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو وسعت دی ہے کچھ مشکل نہیں کہ بیس، پچیس روپے ماہوار کا ایک مولوی کے لئے انتظام کر دیں۔ عمائد شہر اگر اس پر متوجہ ہو جائیں تو بہت آسانی سے سب کچھ ہو سکتا ہے یہ تو بقاء علماء کی صورت تھی۔ دوسرے کام یعنی عمل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مدرسہ میں جو عالم ہوں ان سے مسائل دریافت کر کرکے اور علت وحرمت کو معلوم کر کے ان کے فتوے کے موافق عمل کیا جائے اور جس وقت تک مدرسہ کا انتظام نہ ہو اس وقت تک یہ کیجئے کہ کسی ذی علم کو وعظ کے لئے نوکر رکھ لیجئے اس کا کام یہ ہو کہ محلوں میں جا کر وعظ کہے اور ترغیب و ترہیب اور احکام شرع کو اس میں بیان کرے۔ آپ اس طریق پر عمل کر کے دیکھئے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک سال میں کتنی حالت درست ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کیجئے کہ ہر محلے کے لوگوں کو ہفتے بھر میں ایک دفعہ کسی جگہ جمع کر کے ایک آدمی مسائل کی کتاب لے کر ان کو مسائل سنا دیا کریں اور جو لوگ خود پڑھے لکھے ہیں وہ مسائل کی کتابیں خرید کر اپنے پاس رکھ لیں اور روزانہ ان کو دیکھا کریں اور جہاں شبہ رہے کسی عالم سے حل کر لیں بغرض اس کو عمر بھر کا

شغل رکھیں اور عورتوں کے لئے یہ کریں کہ جو پڑھی لکھی ہیں وہ تو یہ کریں کہ کتابیں خرید کر ان کو سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور جو بے پڑھی ہیں وہ پڑھی لکھی عورتوں سے سن لیا کریں۔ رہی تیسری چیز یعنی صحبت کہ بدون اس کے نہ اعلیٰ درجے کی تعلیم کافی ہے اور نہ ادنےٰ درجے کی اور اسی لئے علماء، طلباء، سب کے ذمہ اس کا اہتمام ضروری ہے۔ پہلے زمانے میں جو سب لوگ اچھے ہوتے تھے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سب اس صحبت کا اہتمام رکھتے تھے۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ تعلیم کا اہتمام تو کسی قدر ہے بھی کہ اُس پر ہزاروں روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور بہت سا وقت اس کو دیا جاتا ہے مگر صحبت کے لئے فی سال ایک ماہ بھی کسی نے نہیں دیا واللہ اگر صحبت کی طرف ذرا بھی توجہ کرتے تو مسلمان ساری تباہیوں سے بچ جاتے اور اگر کسی کو اس میں شبہ ہو تو وہ اب امتحان کر کے دیکھے اور خود کو بھی اور اپنی اولاد کو بھی بزرگوں کی صحبت سے فیضیاب کرے میں ان شاء اللہ تعالیٰ پانچ برس کے بعد دکھلاؤں گا کہ سب کے اقوال افعال اعمال کس قدر درست ہوئے اس وقت شائستگی کے عام ہونے سے یہ حالت ہوگی کہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

(جنت ایسی جگہ ہے جہاں کوئی تکلیف نہیں اور کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں)

کارے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کار موذی نہ ہوگا اور اس لئے دنیا جنت کی مثل ہو جائے گی اور راز اس کا یہ ہے کہ علم سے نیک باتیں معلوم ہوں گی اور صحبت سے اخلاق رذیلہ دور ہوں گی اور یہی دو چیزیں جہل اور بدخلقی ساری خرابیوں کی جڑ ہیں کیونکہ مثلاً اگر کسی شخص میں تکبر ہو اور اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا تکبر کبھی اعتراف اور قبول حق کی اجازت نہ دے گا بلکہ وہ اپنی غلطی پر مصر ہوگا اور ہزاروں آدمی اس غلطی سے گمراہ ہونگے۔ اور جب تکبر کی اصلاح ہو جائے گی تو یہ بات نہ رہیگی اور اثر اسکا یہ ہوگا کہ ہر غلطی کو تسلیم کر لے گا۔ سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں تشریف

فرماتے تھے کہ ایک شخص نے عشاء کے وقت پوچھا آپ نے اس کا جواب دیدیا مستفتی کے جانے کے بعد ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے یہ مسئلہ یوں یاد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو اور مستفتی کو تلاش کرنا شروع کیا، لوگوں نے عرض کیا اس وقت رات زیادہ ہو گئی ہے آپ آرام فرمایئے ہم صبح ہونے پر اس کو بتلا دیں گے، لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا اور اس کے مکان پر تشریف لے گئے گھر میں سے اس کو بلایا اور فرمایا کہ ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلایا تھا۔ تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے صحیح مسئلہ ہم کو بتلایا اور وہ اس طرح ہے، جب یہ فرما چکے تب چین آیا اور واپس آکر آرام فرمایا۔ تو اس بے چینی کا سبب کیا نرا علم تھا ہرگز نہیں یہ صرف حال کا اثر تھا جو صحبت سے عطا ہوا تھا اسی کو کہتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

(باتیں بنانا چھوڑ دو اپنے اندر کیفیت پیدا کرنے والے بنو اور کسی کامل درجے کے بزرگ کے پاس رہ کر اپنے آپ کو مٹا دو)

بعض لوگ جن کی تربیت نہیں ہوتی اور مقتدا ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق نہایت خراب ہوتے ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ چھوٹا ہونے کے قبل، بڑے ہو جاتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی تا راہ بیں نباشی کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ہاں اے پسر بکوش کہ روزی پدر شوی

(اے بے خبر تو کوشش کر کے معلومات حاصل کر جب تک تو خود راستہ نہ جانے گا راستہ بتانے والا کیسے بنے گا جہاں حقیقتوں کا علم سکھایا جاتا ہو وہاں عشق کا ادب سکھانے والے کے سامنے پیش ہو جاتا اور وہاں پیارے بیٹے کوشش کرتے رہو کسی دن باپ ہی بن جاوے گا)

تو پسر بننے سے پہلے پدر بن جانا بہت سی خرابیوں کا باعث ہے۔ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ اول چھوٹا بن کر اخلاق کی درستی کی جائے کہ اس سے اعمال کی بھی

درستی ہو جائے گی اور تدبیر اس کی یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے فراغ دیا ہے وہ توکم ازکم چھ ماہ تک کسی بزرگ کی خدمت میں رہیں لیکن اس طرح کہ اپنا تمام کچا چٹھا ان کے سامنے پیش کر دے اور پھر جس طرح وہ کہیں اس طرح عمل کریں اور اگر وہ ذکر وشغل تجویز کر دیں تو ذکر وشغل میں مصروف ہو جائے اگر وہ اس سے منع کر کے کسی دوسرے کام میں لگا دیں اس میں لگ جائے اور ان کے ساتھ محبت بڑھائے اور ان کی حالت کو دیکھتا رہے کہ کسی چیز کے لینے کے وقت یہ کیا برتاؤ کرتے ہیں اور دینے کے وقت کس طرح پیش آتے ہیں اس کا اثر یہ ہوگا کہ تخلق اخلاق اللہ ہو جائیگا اور پھر اس کی ذات سے سراسر نفع ہی پہونچیگا اور جن لوگوں کو فراغ نہیں ہے وہ یہ کریں کہ وقتاً فوقتاً جب ان کو دو چار یوم کی مہلت ہوا کرے اس وقت کسی بزرگ کے پاس رہ آیا کریں اور اپنی اولاد کے لئے یہ کرو کہ روزمرّہ جیسا ہر کام کیلئے نظام الاوقات ہے ایسا ہی اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر دو کہ فلاں مسجد میں فلاں بزرگ کے پاس جاکر کچھ دیر بیٹھا کریں۔ صاحبو! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ فٹ بال کے لئے وقت ہو اور درستی اخلاق کے لئے وقت نہ نکل سکے اور اگر اس شہر میں کوئی ایسا شخص نہ ہو تو چھٹی کے زمانہ میں کسی بزرگ کی خدمت میں بھیجدیا کرو۔ اس زمانے میں تو ان کو کوئی کام بھی نہیں ہوتا، کمبخت دن رات مارے مارے پھرتے ہیں۔ نہ نماز کے نہ روزے کے ماں باپ خوش ہیں کہ ہم نماز کے بہت پابند ہیں، حالانکہ ان کو یہ خبر نہیں کہ قیامت میں وہ اولاد کے سبب ان کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے کُلُّکُمْ دَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ (تم میں سے ہر ایک شخص ذمہ دار ہے اور تم سب سے اپنے اپنے ماتحت کے متعلق قیامت میں سوال ہوگا)

آج کل لوگ اپنی اولاد کی تربیت ایسی کرتے ہیں جیسا کہ قصائی گائے کی تربیت کیا کرتا ہے کہ اس کو کھلاتا ہے پلاتا ہے حتیٰ کہ وہ خوب موٹی تازی ہو جاتی ہے لیکن غرض اور مآل اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے گلے پر چھری پھیری

جاتی ہے اسی طرح یہ لوگ اپنی اولاد کو خوب زیب و زینت تعیش میں پرورش کرتے ہیں اور انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ لقمۂ جہنم ہوتے ہیں اور ان کی بدولت مربی کی بھی گردن ناپی جاتی ہے کیونکہ اس تعیش کی بدولت اولاد کو نہ نماز کی خبر ہوتی ہے اور نہ روزے کی۔ بعض نا معقول تو حد سے اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کو اسلام کی کسی بات کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ ایک نوجوان کی نسبت میں نے سنا ہے کہ وہ بیرسٹری پاس کر کے آ رہے تھے ان کے باپ نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ میرا لڑکا لندن سے آ رہا ہے تمہارے شہر سے اس کا گذر ہوگا اگر تم اسٹیشن پر اس سے مل لو تو بہتر ہو تاکہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ ان کے لکھنے کے موافق یہ مکتوب الیہ اسٹیشن پر گئے اور جا کر ان بیرسٹر صاحب سے ملے اس وقت بیرسٹر صاحب کھانا کھا رہے تھے چونکہ رمضان شریف تھے اس لئے ان کو تعجب ہوا اور انہوں نے دریافت کیا کہ رمضان شریف ہے آپ نے روزہ نہیں رکھا۔ صاحبزادے پوچھتے ہیں کہ رمضان کیا چیز ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رمضان ایک مہینہ کا نام ہے کہنے لگا جنوری، فروری الخ ان میں تو رمضان کہیں آیا نہیں۔ آخر اس کی یہ حالت دیکھ کر ان کو سخت صدمہ ہوا اور سمجھے کہ منبع الکفر کا مسخ شدہ ہے اس کی حالت میں تغیر آنا ناممکن اور انا للہ پڑھ کر چلے آئے۔ اب آپ غور کیجئے کہ یہ مسلمانوں کے بچے ہیں مسلمان خواتین کی گودوں کے پرورش کئے ہوئے ہیں اور آغوش جہنم میں دیئے جا رہے ہیں۔

صاحبو! اگر یہی رنگ رہا تو عجب نہیں کہ پچاس برس کے بعد یہ لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی ننگ و عار سمجھیں۔ اتنا اثر تو اب بھی آ گیا ہے کہ اسلامی نام پسند نہیں ہے آپ خوش ہیں کہ ہم نے بی۔ اے کر دیا۔ ایم۔ اے کر دیا حالانکہ آپ نے جہنم کی پگڈنڈی پر چھوڑ دیا ہے اور آنکھوں پر ایسے چشم بند چڑھائے ہیں کہ شاہراہ جنت نظر ہی نہ آ سکے۔

صاحبو! آپ کہتے ہیں کہ مولوی انگریزی پڑھنے سے منع کرتے ہیں، واللہ ہم منع نہیں کرتے۔ خدا کے لئے ان کا دین تو خراب نہ ہونے دو اور اس کا

طریقہ یہی ہے کہ ان کو اہل اللہ کی صحبت حاصل ہو خیر اگر چھ مہینے دوزخ میں جانے کا کام کریں گے تو چھ مہینے جنت میں جانے کے کام بھی تو کرلیں گے یاد رکھو کہ اہل اللہ کی صحبت وہ اکسیر ہے کہ ؎

گر تو سنگ خارہ مرمر شوی ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

(اگرچہ تو سنگ خارہ اور مرمر جیسا سخت دل بھی ہو جب کسی صاحب دل کے پاس پہونچے گا گوہر کی سی قدر و قیمت پائے گا)

اور کہتے ہیں ؎

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت است ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بہتر از صد سالہ زہد و طاعتست

(تھوڑی سی دیر اللہ والوں کے ساتھ بیٹھ جانا سو سال کی بے ریا عبادت سے بڑھ کر ہے نیکوں کی صحبت اگر ایک گھڑی کی بھی حاصل ہو جائے تو سو سال کے زہد و طاعت سے بڑھ کر ہے)

صاحبو! صحبت سے وہ بات حاصل ہو گی کہ اس کی بدولت اسلام دل میں رچ جائیگا اور یہی مذہب کی روح ہے کہ دین کی عظمت دل میں رچ جائے اگرچہ کسی وقت نماز روزے میں کوتاہی ہو جائے اگرچہ یہ بات میرے منہ سے کہنے کی نہیں ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ کوئی شخص نماز روزے کو خفیف سمجھ جائے مگر مقصود میرا جو کچھ ہے ظاہر ہے غرض ضرورت اس کی ہے کہ مذہب دل میں رچا ہو اور اگر دل میں یہ حالت نہیں ہے تو ظاہری نماز کام کی اور نہ روزہ۔ وہ حالت ہے جیسے طوطے کو سورتیں رٹا دیں کہ وہ محض اس کی زبان پر ہیں۔ ایک شاعر نے طوطے کی وفات کی تاریخ کہی ہے کہتا ہے کہ ؎

میاں مٹھو جو ذاکر حق تھے ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ رات دن ذکر حق رٹا کرتے

گر بہ موت نے جو آ دابا ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے ٹے

اس میں سے سن ۱۲۳ہجری تاریخ موت نکلتی ہے یہ تاریخ اگرچہ ہے تو مسخرہ پن لیکن

غور کیا جائے تو اس نے ایک بڑی حکمت کی بات کہی ہے یعنی یہ بتلا دیا کہ جس تعلیم کا اثر دل پر نہیں ہوتا۔ مصیبت کے وقت وہ کچھ کام نہیں دیتی تو اگر دین کی محبت دل میں رچی ہوئی نہ ہو تو حافظ قرآن بھی ہوگا تب بھی آٹے دال ہی کا بھاؤ دل میں لے کر مرے گا جیسا اس وقت غالب حالت رہتی ہے کہ دل میں سے اسلام کا اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ اور صاحبو! اسی کو دیکھ کر میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں سے اسلام نکلا جاتا ہے۔ خدا کے لئے اپنی اولاد پر رحم کرو اور ان کو اسلام کے سیدھے ڈگر پر لگاؤ۔ اب میں اپنے بیان کو ایک ضروری بات پر ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ صحبت کے لئے جس شخص کو تجویز کیا جائے وہ کیسا ہو اور اس کے صاحب کمال ہونے کی علامتیں کیا ہیں سو علامتیں اس کی یہ ہیں کہ ایک تو بقدر ضرورت علم دین جانتا ہو۔ دوسرے شریعت پر پوری طرح کاربند ہو۔ تیسرے اس میں یہ بات ہو کہ جس امر کو خود نہ جانتا ہو علماء سے رجوع کرتا ہو۔ علماء سے اس کو وحشت نہ ہو۔ پانچویں یہ کہ اس میں روک ٹوک کی عادت ہو۔ مریدین اور متعلقین کو ان کی حالت پر نہ چھوڑ دیتا ہو۔ چھٹے یہ کہ اس کی صحبت میں یہ برکت ہو کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہوتی جائے۔ ساتویں یہ کہ اس کی طرف صلحاء اور دین کے سمجھنے والے لوگ زیادہ متوجہ ہوں اور یہ بڑی علامت ہے کمال کی۔ جس شخص میں یہ علامتیں پائی جائیں وہ مقبول ہے اور کامل ہے۔ اس کے پاس جائیے اور اس کی صحبت سے مستفیض ہوجیے اور اس کی ضرورت نہیں کہ آپ اس سے بیعت ہو جائیں کیونکہ پیری مریدی کی حقیقت مقصود ہے اور وہ یہی ہے جو مذکور ہوئی اس کی صورت مقصود نہیں ہے جیسے آج کل کہ وہ محض رسم کے طور پر رہ گئی ہے جیسے کہ بعض جگہ نکاح ایک رسم سمجھ کر کیا جاتا ہے گو عنین ہی ہو۔ ایسے ہی بطور رسم کے مرید بھی ہوتے ہیں۔ ہاں اگر قلب میں نہایت تقاضا پیدا ہو تو مرید ہونے میں بھی مضائقہ نہیں لیکن مرید ہونے کے لئے سخت جانچ کی ضرورت ہے، ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے۔

یہ سات علامتیں جو اوپر مذکور ہوئیں ضرور دیکھ لے۔ مولانا رومؒ علیہ الرحمۃ نے ان کو دو لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔

فرماتے ہیں ؎

کار مرداں روشنی و گرمی ست
کار دُوناں حیلہ و بے شرمی ست

(مردوں کا کام روشنی اور گرمی اور کمینوں کا کام بہانے بنانا اور بے حیائی ہے)

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ ؎

اے بسا ابلیس آدم روی ہست
پس بہر دستی نباید داد دست

(بہت سے لوگ جو آدمی کے جیسی صورت تو رکھتے ہیں مگر در اصل شیطان ہیں اس لئے ہر شخص کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے)

البتہ صحبت کے کچھ آداب بھی ہیں بدون اُن کے صحبت نافع نہیں، منجملہ ان آداب صحبت کے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے پاس جاکر دنیا کی باتیں نہ بتایئے جیسے کہ اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے پاس جاکر بھی دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار کے واقعات ذکر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ نیز حتی الوسع بزرگوں کو تعویذ گنڈوں کی تکلیف بھی نہ دینی چاہیئے ان حضرات سے تعویذ گنڈے لینا ایسا ہے جیسا کہ ستار کے پاس کھرپا یا کھاڑی بنوانا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص ہاتھ میں ہاتھ لیتا ہے وہ اللہ میاں کا نعوذ باللہ رشتہ دار ہو جاتا ہے کہ جو کام بھی اس سے کہا جائے وہ اللہ میاں اسے ضرور پورا کرا دیتا ہے حالانکہ ایسا مختار سمجھنا خلاف توحید ہے۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ بجز عرض کے ذرا کچھ دخل دے سکے۔

مولانا فضل الرحمن صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میرا مقدمہ

ہے، مولانا نے فرمایا کہ دعا کردوں گا۔ اس نے کہا کہ دعا کرانے نہیں آیا یہ تو میں بھی کرسکتا ہوں، یوں کہدیجئے کہ میں نے یہ کام پورا کردیا۔ مولانا ناخوش ہوئے۔ پیلی بھیت میں ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا آئی اور کچھ عرض کیا، انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ فضل کرے اس نے سُنا نہیں ایک شخص اور بیٹھے تھے انہوں نے حکایت کے طور پر اس سے کہا کہ یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ فضل کرے گا۔ وہ بزرگ سخت برہم ہوئے اور کہا مجھ کو کیا خبر کہ فضل کرے گا یا نہ کرے گا۔ تم نے اپنی طرف سے گا کیسے بڑھادیا۔

اسی طرح تعویذوں کی فرمائشیں بھی ان حضرات کے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ جس نے عمر بھر طالب علمی اور اللہ اللہ کیا ہو وہ کیا جانے کہ تعویذ کیا ہوتے ہیں اور ان کو کس طرح لکھا جاتا ہے اور پھر لطف یہ کہ تعویذ بھی دنیا سے نرالے کاموں کے لئے۔

بمبئی سے ایک پہلوان کا خط آیا کہ میری کشتی ہونے والی ہے مجھے ایک تعویذ لکھدو کہ میں جیت جاؤں میں نے لکھا کہ اگر تمہارا مقابل بھی کسی سے تعویذ لکھالے تو کیا ہوگا۔ پھر تعویذ تعویذ میں کشتی ہوگی۔ عجب نہیں کہ لوگ چند روز میں مردوں کے بچہ پیدا ہونے کے لئے بھی تعویذ ہی لکھوالیا کریں جس میں نکاح ہی کی ضرورت نہ رہے کیونکہ جب تعویذ میں ایسا اثر ہے کہ وہ ہر ایک چیز میں کام آسکتا ہے تو مردوں کے بچہ پیدا ہونے میں بھی ضرور کام آنا چاہیئے صاحبو! اہل اللہ کے پاس اللہ کا نام دریافت کرنے کے لئے جاؤ۔ خلاصہ اس سب تقریر کا یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لئے اہل اللہ کی صحبت طویلہ کو تجویز کرو۔ یہ تو مردوں اور تندرستوں کے لئے ہے۔ اور جو اپاہج ہوں یا عورتیں ہیں تو ان کے لئے صحبت کا بدل یہ ہے کہ ایسے بزرگوں کے ملفوظات دیکھا کریں یا سنا کریں، ان کے توکل صبر و شکر تقویٰ طہارت کی حکایتیں دیکھتا سنتا یہی صحبت کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔ ان دونوں کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے

صحبت کے متعلق تو کسی کا قول ہے ؎

مقام امن و مے بیغش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(امن کا تو مقام ہو اور شراب بغیر کسی دھوکے کے ہو اور سچا دوست موجود ہو تو اگر یہ چیز ہمیشہ کے لئے حاصل ہو جائے تو بڑی خوش قسمتی ہے)

اور ان کے حکایات وارشادات کے متعلق کسی کا شعر ہے کہ ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحی مئے ناب و سفینۂ غزل ست

(اس زمانہ میں وہ دوست جو برائی سے خالی ہو عمدہ شراب کی بھری صراحی ہے اور غزل کی کشتی)

مگر یہ وصیت کرتا ہوں کہ مثنوی اور دیوان حافظ یعنی علوم مکاشفہ اور اہل حال کا کلام نہ دیکھیں کیونکہ اکثر اوقات ان کی بدولت ہلاک ہوتے ہیں۔ مولانا رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ فولاد ست تیز ۔۔۔ چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا ۔۔۔ کز بریدن تیغ را نبود حیا

(تصوف کے نکتے فولاد کی تلوار کی طرح تیز ہوتے ہیں اگر تیرے پاس ڈھال حفاظت کا سامان نہ ہو تو واپس ہو جا اس الماس کے سامنے بغیر ڈھال کے مت جا کیونکہ تلوار کو کاٹتے وقت کسی کا لحاظ اور شرم نہیں ہوتا)

اور جب اہل حال صادق کے کلام میں اس قدر احتمال مضرت ہے تو جو جاہل بے شرع بدلگام ہیں ان کا کلام تو کس درجہ مضر ہوگا۔ ان لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند
از سخنہا عالمے را سوختند

(وہ لوگ کیسے ظالم ہیں جو آنکھیں بند کر کے اپنی باتوں سے دنیا کو جلا دیتے ہیں)

اسی طرح جو لوگ محض بزرگوں کے کلاموں کی نقل بے سمجھے کیا کرتے ہیں ان کی تحریر و

تقریر سے بھی بوجہ اس کے کہ اصل سے بدلی ہوئی ہوتی ہے کچھ نفع نہیں ہوتا، ایسوں کی نسبت فرماتے ہیں ؎

حرف درویشاں بدزد و مرد دوں

تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(ناسمجھ کمینے لوگ درویشوں کے الفاظ کو چرا کر ناواقف لوگوں کے سامنے منتر کی طرح پڑھتے ہیں)

ہاں احیاء العلوم کا ترجمہ دیکھو اربعین[ا] کا ترجمہ دیکھو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ہر طرح کا فائدہ ہوگا یہ بیان ختم ہو چکا اس بیان میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے وہ نسخہ بتلایا ہے کہ اس میں نہ معاش کا حرج ہے نہ کوئی نقصان ہے اور مسلمانوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے۔

اس آیت میں اسی کے متعلق ارشاد ہے نَسۡمَعُ میں تقلید اور نَعۡقِلُ میں تحقیق کو ذکر فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ دوزخ سے بچنے کے دو طریق ہیں یا تقلید ہو یا تحقیق ہو۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائیں یہ بھی دعا کیجئے کہ یہاں مدرسہ ہو جائے کہ اس کے بہانے سے پھر آنا ہو۔

تمت

[ا] اسی اربعین میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ تیس اصول جن کے بغیر زندگی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی بیان کئے ہیں۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ترجمہ کرا دیا ہے۔ نام اس کتاب کا مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے تبلیغ دین رکھا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
(رواہ البخاری)

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

نسیان النفس

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ علیہ

ناشر: عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ــــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔اے جناح روڈ

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

نسیان النفس

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمینی	متفرقات
مسجد تھانہ بھون	۵/رجب ۱۳۳۰ ہجری	۲ گھنٹے	بیٹھ کر	اپنے عیوب کو نہ دیکھ کر دوسروں کے عیوب دیکھنے پر ملامت کرنا	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم	تقریباً ۱۰۰ آدمی	

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

یہ ایک آیت ہے جس میں ظاہراً اہلِ علم کو خطاب اور ان کے ایک عمل پر ان کو عتاب کیا گیا ہے۔ یہ آیت اس معنی میں نہایت مشہور ہے اور اکثر لوگ اس سے یہی سمجھتے ہیں اور اس کا اثر یہ ہے کہ غیر اہلِ علم اپنے کو بوجہ فقدانِ علم اس سے بری سمجھتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس امر پر بانہ پرس کی گئی ہے اور جو امر اس بانہ پرس کی بناء ہے اس میں عوام الناس بھی بدرجہ اولیٰ شریک ہیں۔ اس آیت میں اول سے آخر تک غور کرنے سے عوام اور علماء سب کے لئے اس آیت کا عام ہونا بخوبی واضح ہو جائے گا اسی طرح قرآن کی دوسری وہ آیات بھی ہیں جن میں سے بعض میں بظاہر اہلِ علم کو خطاب معلوم ہوتا ہے جس کی بناء پر عوام الناس ان کے مضمون سے اپنے کو بالکل بری سمجھتے ہیں بلکہ بسا اوقات علماء کو کسی مضمون کی وجہ سے مورد عتاب دیکھ کر اپنا عالم نہ ہونا غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے جہل پر فخر کرتے ہیں اور بعض میں عوام الناس کو خطاب معلوم ہوتا ہے اِن سے اہلِ علم اپنے کو بری سمجھتے ہیں لیکن یہ تقسیم اسی وقت تک ہے جب تک کہ سرسری اور ظاہری نظر کی جائے ورنہ غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا کہ احکامِ شرعیہ سب عام ہیں ہر جاہل و عالم اس کا مخاطب ہے لہٰذا نہ کسی کو ناز کا موقع ہے اور نہ اعتقادِ برارت کی گنجائش ہے اور چونکہ یہ آیت بھی احکامِ شرعیہ میں سے ایک حکم ہے اس لئے اس کا مضمون بھی سب کو عام ہے یہ مجمل تعیین اس آیت کے مضمون کی۔

اب مجھے اس آیت سے جو بیان کرنا مقصود ہے اس کو مجملاً بیان کرتا ہوں اور تفصیل اس کی ان شاء اللہ تعالےٰ پوری بیان میں ہو گی۔ لیکن اس کے لئے اول آیت کا ترجمہ کر دوں کہ آیت کا مدلول ظاہری معلوم ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ کیا تم دوسروں کو تو نیک اور بھلی باتوں کی فرمائش کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو (یعنی یہ کیا لغو حالت ہے) حالانکہ تم کتاب اللہ پڑھتے ہو (اور اس میں یہ لکھا ہے کہ عمل قول کے مخالف ہونا مذموم ہے اور حکم خداوندی

کے بالکل خلاف) کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ یہ مذموم ہے اور خدا کے نزدیک بُرا ہے
یہ حاصل ہے آیت کے مدلول ظاہری کا۔ اس آیت کے متعلق ایک شبہ تو اہلِ
علم کو ہوا اس کو ان شاء اللہ تعالیٰ ضمناً بیان کر دیا جائے گا۔ اور ایک شبہ
عوام الناس کو ہوا وہ یہ کہ انہوں نے صرف علماء ہی کو اس آیت کا مخاطب
سمجھا اور اپنے کو بری سمجھا، اور سمجھا کہ صرف علماء پر ملامت ہے اور قرینہ اس
شبہ کا یہ ہوا کہ عنوان ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
مخاطب وہ شخص ہے جو کہ دوسرے کو امر یا نصیحت کرتا ہے اور یہ منصب
صرف علماء کا ہے لہٰذا علماء ہی اس آیت کے مخاطب بھی ہوں گے۔ یہ عوام
الناس کا شبہ ہے، اور اثر اس شبہ کا یہ ہوا کہ اپنے کو اس خطاب سے
بالکل پاک سمجھا اور یہ بہت بڑی خرابی ہے اس واسطے کہ یہ سمجھنا ایسا ہے
جیسا کہ کوئی مریض جو کہ مرض مزمن میں مبتلا ہو اپنے کو اس مرض سے پاک
سمجھنے لگے سو ظاہر ہے کہ ایسا مریض نہایت بد قسمت ہے اور اس کا مآل
نہایت بُرا ہے کیونکہ اگر یہ اپنے کو مریض سمجھتا تو اس کے معالجے اور ازالے
کی فکر بھی کرتا، کسی طبیب سے رائے لیتا، اس کی تجویز پر عمل کرتا مضرات
سے پرہیز کرتا۔ اور جبکہ وہ اپنے کو مریض ہی نہیں سمجھتا تو نہ کسی طبیب سے
رجوع کرنے کو ضروری سمجھے گا نہ پرہیز کرے گا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیشہ مرض میں
ترقی ہوتی جائے گی اور اس سے پھر دوسرے امراض پیدا ہوں گے۔ ایک خرابی
تو اپنے کو پاک سمجھنے کی یہ ہوئی۔ دوسرے جب عوام نے سمجھا کہ علماء کو اپنے عمل
نہ کرنے اور دوسروں کے نصیحت کرنے پر عتاب ہوا ہے تو انہوں نے اپنے عالم
نہ ہونے کو غنیمت جانا بلکہ بعض اوقات اپنے جاہل رہنے پر فخر کیا جاتا ہے اور کہا
جاتا ہے کہ اس سے تو جاہل ہی اچھے حالانکہ یہ نہایت لغو فخر ہے اس کی حقیقت
ان شاء اللہ تعالیٰ آگے معلوم ہو گی۔ آج کل ہم لوگوں کی کچھ ایسی عجیب حالت
ہے کہ ہم کو نہ نقائص کی خبر نہ فخر و مباہات کی اشیاء پر اطلاع جس چیز پر مرجی چاہا

فخر کرنے لگے جس چیز میں جی چاہا عیب نکال دیئے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے غریب اور مفلوک الحال ہونے پر فخر کیا کرتے ہیں اور امارت میں عیب نکالا کرتے ہیں، بھلا امیر آدمی اگر فخر کرے تو ایک حد تک بجا بھی ہے کیونکہ اس کے پاس سامان فخر موجود ہے غریب آدمی نہ جس کے کھانے کو ٹکڑا نہ پہننے کو لنگوٹا وہ کس چیز پر فخر کرے اور پھر لطف یہ کہ یہ فخر قولاً ہی نہیں بلکہ عمل میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے چنانچہ جب کبھی موقع تقریب وغیرہ کا ہوتا ہے تو ہم نے ان غرباء ہی کو زیادہ اینٹھتے ہوئے دیکھا ہے ان ہی کو سب سے زیادہ نخرے اور ناز سوجھتے ہیں اور اس کی یہ بھی وجہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ یہ شخص ہماری دعوت کا منتظر بیٹھا تھا۔ اسی طرح ان غرباء کا ایک اور مقولہ بھی مشہور ہے کہتے ہیں کہ میاں کوئی مال میں مست ہے کوئی کھال میں مست ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کھال میں مست ہونے کے کیا معنے ہیں لیکن خیر انہوں نے اتنا اقرار تو کیا کہ ہم میں عقل نہیں کیونکہ اپنے کو مست کہا اور مستی عقل کے خلاف ہوتی ہے اور اگر عقل ہوتی تو ایسی حرکت ہی کیوں کرتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ خدا تعالےٰ کو تین آدمیوں سے سخت بغض ہے۔ ایک وہ شخص کہ بادشاہ ہو کر جھوٹ بولے کیونکہ جھوٹ بولنے کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ جو بات سچ بولنے میں حاصل نہ ہو سکے اس کو اس ذریعہ سے حاصل کیا جائے اور یہ ضرورت اس شخص کو پیش آسکتی ہے جس کے مزاحم کوئی ایسی قوت موجود ہو جو کہ اس کے اور مقصود کے درمیان حائل ہو جائے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کو کوئی ایسا مزاحم پیش نہیں آیا لہٰذا اس کا جھوٹ بولنا خبث باطن کی کھلی دلیل ہے۔ دوسرے وہ شخص کہ بڈھا ہو اور پھر زنا کرے کیونکہ زنا اول تو حرام ہے دوسرے بڈھے آدمی میں کوئی ایسا جوش بھی نہیں جس کی بنا پر کسی مرتبے میں اس کو معذور رکھا جا سکے اس لئے اس کا یہ فعل

بھی اس کے خبث باطن کی دلیل ہے۔ تیسرے وہ شخص جو کہ غریب ہو اور تکبر کرے گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے شخص تیرے پاس کیا چیز ہے کہ جس پر تو تکبر کرتا ہے تو ایسے ہی جاہل کا فخر بھی بہت ہی برا ہے۔ بالخصوص جبکہ جہل پر فخر ہو یعنی جاہل آدمی کا دوسری اشیاء پر فخر کرنا بھی زیبا نہیں لیکن صفت جہل پر فخر کرنا بہت ہی نا زیبا ہے کیونکہ علم انسان کے لئے حیات ہے اور جہل موت اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اکثر امراء جو روپیہ پیسے پر فخر کرتے ہیں یہ بھی حقیقت ناشناسی کے سبب سے ہے کیونکہ جب ان میں علم نہیں تو گویا فخر کی کوئی بات نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ؎

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءُ ۔۔۔ اَبُوْهُمْ اٰدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّاءُ

مَا الْفَخْرُ اِلَّا لِاَهْلِ الْعِلْمِ اَنَّهُمْ ۔۔۔ عَلَى الْهُدٰى لِمَنِ اسْتَهْدٰى اَدِلَّاءُ

(لوگ شکل و صورت میں تو سب ایک جیسے ہیں باپ ان کے حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ماں حضرت حوا علیہا السلام ہیں پھر ایک دوسرے پر فخر کیسا سوائے اہلِ علم کے کیونکہ وہ اہلِ ہدایت ہوتے ہیں اور طالب حق کی رہنمائی کرتے ہیں)

دنیا پر فخر کرنے والوں کی نادانی بیان کرتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ حسب ونسب کوئی فخر کی چیز نہیں کیونکہ تمام لوگ **ایک** آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کی اولاد ہیں اور اسی کے حکم میں ہے مال پر فخر کرنا کیونکہ آگے جو علت مذکور ہے مشترک ہے آگے کہتے ہیں کہ البتہ فخر اگر کریں تو علماء کر سکتے ہیں کیونکہ وہ خود راہِ راست پر ہیں اور دوسروں کے لئے دلیل راہ بنتے ہیں اور مال کو تو اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس کا نہ ہونا موجب فخر ہو سکتا ہے کیونکہ مال کی حالت سانپ کی سی ہے کہ اس کا ظاہر نہایت دلکش دلفریب چکنا چمکدار لیکن اس کے باطن میں مہلک زہر بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح مال اگرچہ ظاہر میں آسائش و آرائش و راحت

وآرام کا سبب ہے لیکن اس کا باطن تمام خرابیوں اور مصیبتوں کی جڑ ہے تو مال پر فخر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی اس پر فخر کرنے لگے کہ میرے تمام جسم کو سانپ لپٹے ہوئے ہیں اگر کوئی اس پر فخر کرے تو ظاہر ہے کہ سب عقلاء اس کو احمق بتائیں گے اسی طرح مال پر فخر کرنے والے کو بھی احمق سمجھنا چاہیئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں ؎

رَضِیْنَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِیْنَا لَنَا عِلْمٌ وَّلِلْاَعْدَاءِ مَالٌ

فَاِنَّ الْمَالَ یَفْنیٰ عَنْ قَرِیْبٍ وَاِنَّ الْعِلْمَ بَاقٍ لَایَزَالُ

(اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم سے ہمیں بہت خوشی ہے کہ انہوں نے ہمیں علم دیا اور دشمنوں کو مال اس لئے کہ مال بہت جلد فنا ہو جائیگا اور علم ہمیشہ باقی رہے گا)

یعنی مال تو فنا ہو جائے گا اور علم ہمیشہ باقی رہے گا۔ صاحبو! مال وہ چیز ہے کہ اکثر تو حالت ہی میں جاتا رہتا ہے ورنہ مرض الموت میں تو اس کا جاتا رہنا بالکل ہی یقینی ہے کیونکہ شریعت مطہرہ کا قانون ہے کہ مرض الموت میں دو تہائی مال سے مالک کا حق جاتا رہتا ہے اور وارثین کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرض الموت میں وصیت کرے یا اپنا مال کسی کو ہبہ کرنا چاہے تو وہ ایک ثلث میں جاری ہوتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کے پاس تین ہزار روپے ہو اور وہ ان تین ہزار کی وصیت کرے یا دو ہزار کی وصیت کرے تو یہ صرف ایک ہزار میں جاری ہو گی بقیہ دو ہزار ورثہ کو دیا جائے گا اور یہ ایک تہائی بھی اس کے آنسو پونچھنے کے لئے اس کو دیدیئے ورنہ وارثین کا حق کل مال کے متعلق ہو جاتا ہے چنانچہ اگر وصیت نہ کرے تو یہ ثلث بھی وارثوں کو ہی مل جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مال جس کو ہم اپنا سمجھ رہے ہیں واقع میں ہمارا نہیں ہے بلکہ بسا اوقات ایسوں کو پہونچ جاتا ہے کہ جن کو دینا گوارا بھی نہیں ہوتا نیز اس تنہائی پر جو کچھ اختیار رہتا ہے وہ مرنے کے قبل تک رہتا ہے اور مرنے کے بعد تو کچھ بھی اختیار نہیں رہتا۔ یعنی اگر کوئی کفن بھی نہ دے تو یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا

معلوم ہوا کہ مال بہت جلد جدا ہونے والا ہے۔ حتیٰ کہ قبر تک بھی ساتھ نہیں دیتا کیونکہ قبر میں صرف ایک کفن جاتا ہے مگر کفن سے مردے کو کیا فائدہ۔ غرض نہ قبر میں گیا نہ حشر میں گیا اس لئے کہ وہاں یہ حالت ہوگی کہ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ۔ یعنی قیامت کے دن خدا تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم ہمارے پاس بالکل تنہا آئے ہو کہ کوئی چیز بھی تمہارے ساتھ نہیں بالکل ایسے جیسا ہم نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا تھا۔ یعنی یکہ و تنہا ہاں اگر زندگی میں کچھ فی سبیل اللہ دیدیا ہے تو وہ جائے گا لیکن اس کا جانا کچھ مال ہونے پر موقوف نہیں کیونکہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے خود مال تو جاتا نہیں بلکہ اس کا ثواب جاتا ہے جو کہ حشر میں کام آئے گا اور ثواب کا حصول مال پر موقوف نہیں بلکہ اس کا مدار نیت پر ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص لاکھوں روپیہ فی سبیل اللہ خرچ کرے اور نیت درست نہ ہو تو اس کو کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا اور اگر ایک پیسہ بھی پاس نہ ہو اور یہ نیت ہو کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو مال دیں تو ہم خوب نیک کاموں میں صرف کریں تو ثواب کامل مل جائے گا۔ برخلاف علم کے کہ جس کے ساتھ ہو وہ دنیا بھر سے مستغنی ہے اس کو نہ رفیق کی ضرورت نہ مونس کی ضرورت وہ ہر وقت خوش اور مطمئن ہے بلکہ اس کی خوشی اور اطمینان کی یہ حالت ہے کہ کسی بادشاہ کو بھی وہ خوشی اور اطمینان حاصل نہیں بادشاہ کو سب سے اول اپنے مصاحبوں ہی سے خطرہ ہوتا ہے کہ یہ مجھے زہر نہ دیدیں مار نہ ڈالیں ایسے متعدد واقعات ہیں کہ خود بادشاہ کے حرم سرائے اس کو زہر دیا اور عالم کے اطمینان کی یہ حالت ہے کہ تن تنہا جنگل میں ہے مگر محفوظ بادشاہ سے زیادہ اطمینان میں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ علم کے ثمرات اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں ہاں جن لوگوں کو علم نہیں ہے ان کو تعجب ہو تو تعجب نہیں مگر علم سے مراد یہ نہیں کہ قَالَ دراصل قَوَلَ بود جانتا ہو بلکہ علم ایک نور ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ (ہم نے علم کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں میں چلتے پھرتے ہیں) اور اس نور کے ہوتے ہوئے قلب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

موحد چہ برپای ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس ہمین ست بنیاد توحید و بس

(موحد کے پیر پر خواہ تم سونا بکھیر دو یا اس کے سر پر ہندی تلوار رکھ دو وہ نہ کسی سے خوف کھاتا اور نہ کسی سے امید وابستہ کرتا ہے اور توحید کی بنیاد بھی یہی ہے)

اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیر لیا جائے تب بھی اس کے دل پر ہراس نہیں ہوتا ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی سفر میں تھے دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرمانے کے لئے اترے۔ اتفاق سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بھی کوئی اس وقت قریب نہ تھا آپ نے اپنی تلوار درخت میں لٹکا دی اور درخت کے نیچے سو گئے اسی وقت آپ کے ایک دشمن کو خبر ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تن تنہا فلاں درخت کے نیچے سو رہے ہیں۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً وہاں آیا آکر دیکھا تو واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تن تنہا سو رہے تھے اور تلوار درخت میں لٹک رہی تھی اس نے اول دبے پاؤں آکر تلوار پر قبضہ کیا اس کے بعد اس کو نہایت آہستگی سے نیام سے نکالا اور آپ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا جب بالکل تیار ہوگیا تو آپ کو بیدار کیا اور پوچھا مَنْ يَّعْصِمُكَ مِنِّيْ اس وقت آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے آپ نے اس کی یہ ہیئت دیکھ کر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں فرمائی اور اس کے سوال کے جواب میں نہایت اطمینان سے فرمایا کہ اَللّٰہُ یعنی مجھے اللہ بچائے گا۔ بھلا کوئی ایسا کر تو دکھلا دے۔ بدون خدا کے تعلق کے کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ تو علم اس کا نام ہے ورنہ نرے الفاظ تو شیطان بھی خوب جانتا ہے۔ اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ وہ لرزنے لگا اور تلوار چھوٹ کر زمین پر گر گئی آپ نے فوراً لپک کر تلوار اٹھالی اور فرمایا کہ اب تجھ کو مجھ سے کون بچائے گا وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حالت کو دیکھ کر نہایت گھبرایا اور کہنے لگا کہ مجھے آپ ہی بچائیں گے آخر آپ نے اس پر کرم فرمایا اور اس کی گستاخی کو معاف فرما کر اس کو چھوڑ دیا۔ تو یہ ہے علم اور اس کا اثر جس کو کہتے ہیں کہ ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش — چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس — ہمیں ست بنیاد توحید و بس

اور راز اس کا یہ ہے کہ علم کامل سے معرفت کامل ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ (یعنی بسا اوقات ایک چیز ظاہراً بری معلوم ہوتی ہے لیکن فی نفسہ وہ اچھی ہوتی ہے) اس لئے گھبراتا نہیں اور سمجھتا ہے کہ یہ میرے لئے علاج اور کفارۂ سیئات ہو رہا ہے نیز اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں اُن کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لئے مناسب سمجھیں اس میں ہمیں رکھیں چنانچہ اسی کو مصیبت کے موقع پر فرماتے ہیں وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ آپ ان صابر لوگوں کو جو مصیبت پڑنے پر کہتے ہیں کہ میں اللہ ہی کا ہوں اور مجھے اسی کے پاس لوٹ جانا ہے خوشخبری دے دیجئے) مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں نے اب اس آیت کو موت ہی کے موقع کے لئے خاص کر لیا ہے ایک بڑھیا کا واقعہ ہے کہ اس کا بچہ اکثر مصیبت کے موقع پر اِنَّا لِلّٰہ پڑھ دیا کرتا تھا ایک دن وہ بڑھیا کہنے لگی کہ بچے خیر ماتگ کس کو مارنیکا ارادہ ہے۔ اسی طرح سورۂ یٰسین کہ اس کو مصیبت کے آسان کرنے کے لئے پڑھا جاتا ہے لیکن اب عام طور سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سورۂ یٰسین صرف نزع کے وقت پڑھنی چاہیئے۔ چنانچہ آج دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کو جائے اور اس کی تکلیف دیکھ کر سورۂ یٰسین پڑھنے لگے تو اس پر کیسی ملامت اور لعنت ہوتی ہے حالانکہ نزع کے وقت بھی سورۂ یٰسین کو اس واسطے پڑھا جاتا ہے کہ اس کی برکت سے مشکل آسان ہو اگر حیات ہے تو اچھا ہو جائے اور اگر موت آ گئی ہے تو اس کی برکت سے آسانی سے خاتمہ ہو جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ شب کے وقت گھر میں چراغ گل ہو گیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالے عنہا فرمانے لگیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ بھی کوئی مصیبت ہے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالے عنہا

گو یہ معلوم تھا کہ اِنَّا لِلّٰہِ مصیبت کے وقت پڑھا جاتا ہے لیکن ان کو اس واقعہ کے مصیبت ہونے میں تامل تھا کیونکہ ظاہراً یہ واقعہ ایک معمولی بات تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جو بات مومن کو ناگوار ہو وہ مصیبت ہے اور چراغ کے گل ہونے سے جبکہ قصد نہ ہو ناگواری ہوتی ہے لہٰذا یہ بھی مصیبت ہوئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوگا کہ خدا نے اپنے بندوں کو ثواب عطا فرمانے کے کیسے معمولی معمولی طریقے رکھے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

ع : رحمت حق بہانہ می جوید

(اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک بہانہ ڈھونڈتی ہے)

اور اس سے بڑھ کر لیجئے حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز جیب میں رکھ کر بھول جائے اور ادھر ادھر اس کو تلاش کرے تو اس تلاش کرنے میں جو پریشانی اس کو ہوگی خدا تعالیٰ اس پر بھی ثواب عطا فرمائیں گے اور کفارہ سیئات فرمائیں گے۔ بالکل ایسی حالت ہے کہ جیسے ہمارا چھوٹا بچہ کہ اس کے چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے حتیٰ کہ گرنے پڑنے پر بھی ہم کو پیار آتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ بھی ہم کو ہر ہر فعل پر ثواب عطا فرماتے ہیں مَا لَمْ يَكُنْ مَعْصِيَةً وَّعِنَادًا (جبکہ وہ کسی گناہ اور دشمنی کی بنا پر نہ ہو) تو اِنَّا لِلّٰہ جو سکھلایا گیا ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے سے تخفیف حزن ہو کیونکہ جب اس کو پڑھیگا تو اس مضمون کی یاد تازہ ہوگی کہ ہم خدا کی ملک ہیں وہ ہمارے مالک ہیں اور مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے مملوک میں جو چاہے تصرف کرے لہٰذا خدا تعالیٰ کو بھی اختیار ہے کہ ہم میں جو چاہیں تصرف کریں اور اس کا مخفف حزن ہونا ظاہر ہے دوسرے اس خیال کے تازہ ہونے سے خدا تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کی بدولت سخت سے سخت مصیبت بھی ہلکی ہو جاتی ہے

ع۔ از محبت تلخہا شیریں بود

(محبت کے سبب تلخیاں شیریں ہو جایا کرتی ہیں)

دیکھئے جن لوگوں کو امردوں یا بازاری عورتوں سے تعلق ہو جاتا ہے وہ ان کے پیچھے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ جوتیاں بھی مارے تو ان میں لطف آتا ہے اور فخر کرتا ہے مشہور ہے کہ ایک شخص بیوی پر توجہ نہ کرتا اور کسی بازاری عورت سے تعلق پیدا کر لیا تھا بیوی کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہ بازاری مجھ سے زیادہ حسین ہو لیکن تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ بالکل کالی بھجنگ ہے سخت تعجب ہوا اور اب وہ اس فکر میں لگی کہ آخر اس میلان کا سبب کیا ہے چھان بین سے معلوم ہوا کہ جب یہ شخص اُس کے پاس جاتا ہے تو دور ہی سے دیکھ کر اس کو بُرا بھلا کہنا شروع کرتی ہے اور خوب جوتیوں سے خبر لیتی ہے۔ کہنے لگی کہ کیا مشکل کام ہے آج سے میں بھی یہی وتیرہ اختیار کروں گی چنانچہ جب شوہر آیا تو اس نے دروازے ہی سے اس کی خبر لینی شروع کی اور خوب جوتیوں سے پیٹا کہنے لگا کہ بس اب میں کہیں نہیں جاؤں گا آج تک تجھ میں یہی کسر تھی سو اب وہ پوری ہو گئی اس حکایت سے معلوم ہو کہ اگر محبت میں اگر محبوب کی طرف سے کوئی مصیبت بھی آئے تو وہ موجب فرح ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ یہ محبت مجازی کیا ہوتی ہے اس محبت کی حقیقت یہ ہے کہ ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

(وہ عشق جو فقط اچھے رنگ اور خوبصورتی کے باعث ہو وہ عشق نہیں ہوتا بلکہ آخرت کی بربادی ہوتی ہے)

البتہ خدا تعالیٰ سے جو محبت ہو وہ قابل اعتبار ہوتی ہے فرماتے ہیں کہ ؎

عشق با مُردہ نباشد پائدار عشق را با حیّ وبا قیوم دار

(مرنے والوں کے ساتھ عشق پائدار نہیں ہو سکتا عشق صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ پیدا کرو جس کی صفت زندہ اور باقی رہنے والا ہے)

تیسرے اس معرفت سے یہ معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے اور

کوئی محب محبوب کو تکلیف نہیں دیا کرتا لہذا ہم پر جو ظاہراً تکلیف آئی ہے یہ ایسی ہی ہے جیسے کہ ماں باپ کسی بچے کے دنبل میں جس نے اس کو بیحد تکلیف دے رکھی ہو یا آیندہ تکلیف پہونچانے کا اندیشہ ہو نشتر لگواتے ہیں کہ وہ ظاہراً تو تکلیف ہوتی ہے لیکن واقع میں کامل راحت کا سامان ہونا ہے اس تکلیف کی وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

طفل می لرزد زنیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شادکام

کہ بچہ تو ڈرتا ہے لرزتا ہے اور ماں خوش ہوری ہے حتی کہ نشتر لگانے والے کو انعام دیتے ہیں سو اگر کوئی اجنبی تعجب کرنے لگے اور کہے کہ یہ انعام کس بات کا دیا ہے اس شخص نے تو تکلیف پہونچائی ہے اس کو تو سزا دینی چاہیئے تو ماں باپ کہیں گے کہ احمق یہ تکلیف نہیں یہ عین راحت ہے کیونکہ یہی تکلیف ہے جس کی بدولت لڑکے کی زندگی کی امید ہوگئی ورنہ یہ دنبل بڑھتا اور اس کا زہریلا مادہ تمام جسم میں سرایت کر جاتا اور لڑکا ہلاک ہو جاتا۔ تو جب ماں باپ کا نشتر لگوانا اور اس کی تکلیف دینا بوجہ ذریعہ راحت ہونیکے ناگوار نہیں ہے تو خدا تعالے کو تو ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت اپنے بندوں سے ہے پھر اگر وہ فقر و فاقہ ڈالدیں یا کسی اور مصیبت میں گرفتار کر دیں تو اس کو نشتر کے قائم مقام کیوں نہیں سمجھا جاتا تو علم سے یہ فائدے ہیں جو کہ مال سے نہیں ہو سکتے اور یہ فائدے تو دنیا میں ہوتے ہیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو اور یہ علم کی بدولت ہوتا ہے جاہل آدمی کا خاتمہ اکثر خراب ہوتا ہے لیکن جاہل سے مراد وہ ہے کہ نہ تو خود پڑھے اور نہ اہل علم سے ملے نہ کسی سے پوچھے تو ایسے شخص کے ایمان کا بھروسہ نہیں کیونکہ جب یہ شخص مرتا ہے تو شیطان اس کو یہ سمجھاتا ہے کہ تو اس وقت اپنی سب پیاری چیزوں سے چھوٹ رہا ہے اور خدا تعالے تم کو ان چیزوں سے چھڑا رہے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالے سے بغض ہو جاتا ہے اور کفر پر خاتمہ ہوتا ہے برخلاف اس کے

اگر علم ہو تو اس قسم کے اندیشے نہیں رہتے۔ لیکن عالم سے خاص وہی مراد نہیں جو عربی ہی پڑھا ہو بلکہ یا پڑھا ہو یا علماء کی صحبت میں بیٹھکر حاصل کر لیا ہو یا علماء سے پوچھ پوچھ کر قدر ضروری معلوم کر لیا ہو غرض علم ایسی نعمت ہے مگر آج کل دنیا کو ایسا مقصود بنا رکھا ہے کہ بہت لوگ علماء کو ترقی کا مانع سمجھتے ہیں اور ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور نمازیں بھی ان کی اکثر کسی وبا کی وجہ سے ہوتی ہیں اور اگر وباء کی وجہ سے نہ بھی ہوں تب بھی چونکہ دل میں رچی ہوئی نہیں ہوتی اس لئے وہ کچھ بھی مفید نہیں ہوتی۔ ان کے پڑھنے کی بالکل وہ حالت ہوتی ہے جیسے کہ کسی نے ایک طوطے کو الٓمٓ ترکیف تک یاد کرا دیا تھا کہ وہ بے تکلف اس کو پڑھتا چلا جاتا تھا لیکن اگر اس پر بلی گرتی تو کیا اس وقت بھی اس کو کوئی سورۃ یاد رہ سکتی تھی کبھی نہیں اس لئے کہ اس کے دل میں کچھ بھی نہ تھا کسی ظریف نے ایک طوطے کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے اگرچہ اس نے محض تمسخر کی بناء پر لکھی ہے لیکن بات نہایت گہری اور کام کی ہے۔ سنہ ۱۲۳۰ھ میں کسی طوطے کا حادثہ ہوا تھا اس وقت یہ تاریخ لکھی گئی ہے لکھا ہے ؎

میاں مٹھو جو ذاکر حق تھے رات دن ذکر حق رٹا کرتے
گربہ موت نے جو آدبایا مضطرب ہو کے اور گھبرا کے
چوپخ میں لیکے پانی کی کلھیا کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے ٹے

ٹ کے عدد ت کی برابر ہیں تو تین ٹ کے عدد ۱۲ سو ہوئے اور تین ی کے عدد ۳۰ کل ۱۲۳۰ ہوئے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ چونکہ طوطے کے محض زبان پر ذکر حق تھا اور دل میں اس کا کچھ اثر نہ تھا اسلئے اس مصیبت کے وقت کچھ بھی یاد نہ آیا اور ٹاں ٹاں کر کے خاتمہ ہو گیا۔ یاد رکھو اگر محبت دین کی دل میں نہیں ہے تو یہ سب لفافہ ہے کہ اوپر سے نہایت مکلف اور خوشنما لیکن اندر سے بالکل سادہ۔ مشہور ہے کہ ایک میراثی کسی کے پاس لفافہ لے کر آیا دیکھا کہ اوپر سے بالکل سادہ ہے سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ حضور نہایت جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کا موقع نہیں ملا

مکتوب الیہ کو خیال ہوا کہ اندر مضمون ہوگا کھول کر دیکھا تو خط بھی بالکل سادہ، پوچھا کہ بھائی اس کا کیا سبب کہنے لگا حضور میں عرض کرچکا ہوں کہ بہت ہی جلدی میں خط دیا ہے لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ یہ ہم لوگوں میں اکثر کی تو بعینہٖ یہی حالت ہے کہ اندر باہر دونوں جانب سے محض کورے۔ اور جو لوگ کچھ ہیں بھی تو محض ظاہر ہی ملکف ہے اندر خاک بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ چاہے لفافہ باہر سے زیادہ مکلّف نہ ہو لیکن اندر مضمون سے پُر ہو۔ اسی طرح ہم اگر بہت سی نفلیں نہ پڑھیں بہت ذکر و شغل نہ کریں صوفیہ کی صورت نہ بنائیں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن دل محبت الٰہی سے بھرا ہوا ہونا چاہیئے۔ اور علم حقیقی یہی ہے جس سے دولت محبت دل میں ہو اسی علم کو حضرت علیؓ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ ؎

رضینا قسمۃ الجبار فینا لنا علمٌ وللجہال مال

(ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم سے راضی اور بہت خوش ہیں جو ہمارے اندر جاری فرمائی کہ ہمیں علم دیا اور جاہلوں کو مال)

تو فخر کی چیز اگر ہوسکتی ہے تو یہ علم ہوسکتا ہے نہ کہ جہل مگر آج وہ حالت ہے کہ جہل پر بھی فخر کیا جاتا ہے کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی تم کس طرح اچھے اور قابل فخر ہوگئے بلکہ عالم اگر بدعمل بھی ہے تو وہ تم سے بدرجہا اچھا ہے کیونکہ وہ مریض ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو نسخہ بھی معلوم ہے۔ جب ذرا توجہ کرے گا علاج کرلے گا اور تم سراپا مرض ہو لیکن نہ مرض کی خبر نہ نسخہ پر اطلاع۔ غرض کسی حال میں جہل کوئی فخر کی چیز نہیں۔ مگر بعضے جہال اس بناء پر فخر کرتے ہیں کہ اہل علم کے متعلق وعیدوں سے بری ہیں حالانکہ اول تو اہل علم کے متعلق جو وعیدیں ہیں ان میں علم سے خاص اصطلاحی مولویت ہی نہیں بلکہ مطلقاً جاننا مراد ہے سو ایسا علم تھوڑا بہت ہر شخص کو ہوتا ہے دوسرے اگر علم نہ بھی ہو تب بھی الزام سے بری نہیں ہوسکتے کیونکہ علم نہ ہونیکا الزام اس سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ علم عمل کا موقوف الیہ ہے اور موقوف علیہ زیادہ مہتم بالشان اور باعتبار اہتمام کے زیادہ افضل ہوا کرتا ہے اب میں اس کو بیان کرتا ہوں کہ آیت کے خطا

سے جہلا کیوں پاک نہیں ہو سکتے اور اس کو سمجھنے کے لئے الزام کی حقیقت پر غور کرنے کی
ضرورت ہے جس کو میں اس آیت سے استنباط کرتا ہوں لیکن یہ استنباط قیاسی وظنی
نہیں ہے بلکہ دلالۃ النص سے ثابت ہوتا ہے جو کہ قیاس قطعی ہے۔ حاصل اس الزام کا جو
آیت میں مقصود ہے اور جو کہ عالم جاہل سب میں پایا جاتا ہے اور جو کہ نہایت زہریلا
مرض ہے یہ ہے کہ ہم اپنے عیوب کو نہیں دیکھتے بلکہ دوسرے کے عیبوں کو دیکھا کرتے
ہیں ہم شب و روز دوسروں کا تذکرہ کرتے ہیں ان کے عیب نکالتے ہیں لیکن نہیں
دیکھتے کہ ہم میں کیا کیا عیوب موجود ہیں اور یہ عیوب دوسروں کے عیوب سے بڑھ کر
ہیں یا نہیں کیونکہ امر کرنا لوگوں کو نیک کام کا موقوف اس پر ہے کہ دوسروں کی
کوتاہیوں پر نظر ہو پھر اس کے ساتھ نسیان نفس کو ملا کر دیکھا جائے تو حاصل یہ
نکلیگا کہ تم دوسروں کے عیوب کو تو دیکھتے ہو اور اپنے عیوب کو نہیں دیکھتے یہ مرض
ایسا رچا ہے کہ اکثر مواقع پر اس کا زبان سے بھی اظہار ہوتا ہے چنانچہ جب کبھی امراض
وبائیہ پھیلتے ہیں تو اکثر کو تو اس کا احساس بھی نہیں کہ ان مصائب میں معاصی کا کچھ
دخل ہے بلکہ اس کو ہوا کے فساد کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کا تو ذہن بھی یہاں تک
نہیں پہونچتا کہ گناہوں کو بھی اس میں کوئی دخل ہے حالانکہ یہ ان کی سخت غلطی ہے ہم
ان سے سوال کرتے ہیں کہ آخر ہوا میں فساد کیوں آیا اگر کہا جائے کہ شدت گرمی یا
سردی کے سبب ایسا ہوا تو میں کہونگا کہ گرمی یا سردی میں اس قدر شدت کیوں ہوئی
لیکن یہ خطاب جس کا انتہا آگے خدا کی مشیت پر ہوگا مسلمانوں ہی سے ہے ملحدین سے
نہیں اگرچہ ہمارے پاس جواب ان کے اعتراضات کے موجود ہیں اللہ کا شکر ہے
کہ ہم ان کے جواب دینے سے بھی عاجز نہیں مگر یہ اس کا موقع نہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

غرض مسلمان عوام الناس جس چیز کو بھی سبب بتلائیں گے ہم اسی کی بابت پوچھیں گے کہ
آخر یہ کیوں ہوا کسی حد پر پہونچ کر ان کو یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ خدا کے حکم سے
ہوا اس وقت کہیں گے کہ اس کا کیا سبب کہ خدا تعالیٰ نے اس وقت یہ حکم

کیوں فرمایا جس سے یہ مصیبت پیدا ہوگئی اور پھر خود ہی قرآن سے ہم جواب میں کہیں گے کہ سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تم سے گناہوں کے سبب ناراض ہوئے اور مصیبت بھیجی مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ یعنی تم کو جو کچھ مصیبت پہونچتی ہے وہ تمہارے کرتوتوں کی بدولت پہونچتی ہے اور بہت سی باتوں سے درگذر بھی فرماتے ہیں اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کو پھانسی دیدی جائے اور اس کی موت کا سبب پوچھا جائے تو ظاہر بین ہر شخص یہی کہیگا کہ پھانسی کی رسی گلے میں اٹک گئی اس سے مرگیا مگر ایک عقلمند اس پر بس نکریگا بلکہ وہ پوچھیگا کہ رسی کیوں گلے میں لٹکی اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ایک شخص نے لٹکا دی تو وہ پوچھیگا کہ اس نے کیوں لٹکائی اس پر کہا جائے گا کہ حاکم نے اس کو حکم کیا تھا تو علت اخیر حاکم کا حکم نکلا۔ لیکن ابھی یہ سوال باقی ہے کہ حاکم نے ایسا حکم کیوں دیا اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس شخص نے کسی کو قتل کیا تھا یا ڈکیتی کا مرتکب ہوا تھا اس جواب کے بعد پھانسی پر لٹکنے کا اصلی سبب کھل جاتا ہے تو ایسے ہی وباء خدا کے حکم سے آئی لیکن خدا تعالیٰ کا حکم ہمارے جرائم کے سبب سے ہوا اسی کو فرماتے ہیں فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (جب ہمیں ان لوگوں نے دکھ دیا تو ہم نے بھی ان سے بدلہ لیا) جزاء الاعمال[1] میرا ایک رسالہ ہے اس میں اس بحث کو مبسوط لکھا گیا ہے اور بحمد اللہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہم کو جو کچھ ابتلاء ہوتا ہے ہمارے اعمال کے سبب ہوتا ہے تو عوام الناس کا مبلغ پرتو محض اسباب طبعیہ ہیں لیکن جو قدرے فہیم اور دیندار ہیں وہ اگر ان سب امراض کو خدا تعالیٰ کے حکم سے مانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گناہوں کے سبب سے یہ حکم ہوا لیکن ہمیشہ دوسروں کے گناہوں کو شمار کرتے ہیں اوپر اس کا ذکر تھا کہ دوسروں کے عیوب پر ہم لوگوں کی نظر ہوتی ہے اکثر لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ لوگوں کو زنا اور قمار میں مبتلا دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ اسی سبب سے تو قحط لوٹ رہا ہے۔ مگر کبھی کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اس نے اپنے اعمال کو اس کا سبب بتلایا ہو حالانکہ زیادہ ضرورت اس کی ہے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ

---

[1] جزاء الاعمال ملنے کا پتہ مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی

سے لوگوں نے قحط کی شکایت کی فرمایا کہ قحط کے دور ہونے کی سوائے اس کے اور کوئی ترکیب نہیں ہے کہ مجھ کو شہر سے نکالدو کیوں کہ میرے گناہوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اور یہی نہیں کہ محض زبان سے کہنے پر بس کیا ہو بلکہ آپ اس شہر کو چھوڑ کر چلے بھی گئے۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ جب ریل میں بیٹھتا ہوں تو خدا تعالےٰ سے دُعاء کرتا ہوں کہ اے اللہ میرے گناہوں کے سبب یہ سب لوگ ہلاک نہ ہو جائیں یہی امراض ہیں جن کا علاج بزرگوں نے کیا ہے کہتے ہیں ؎

یکے آنکہ بر غیر بد بین مباش دوم آنکہ بر خویش خود بین مباش

(ایک تو یہ غیر کو بُرا مت سمجھو اور دوسرے یہ کہ خود کو سب سے بہتر نہ سمجھ)

یہاں رات دن ہمارا سبق ہے کہ ہم ایسے ہم ویسے اور دوسرا ایسا اور ایسا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اے عزیز تیری ایسی مثال ہے کہ تیرے بدن پر سانپ بچھو لپٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے شخص کے بدن پر ایک مکھی بیٹھی ہے تو اس کو مکھی بیٹھنے پر ملامت کر رہا ہے لیکن اپنے سانپ اور بچھو کی خبر نہیں لیتا جو کوئی دم میں تجھکو فنا کئے ڈالتے ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو اپنی آنکھ میں کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا اور دوسرے کی آنکھ کے تنکے کا تذکرہ کر رہے ہیں حالانکہ اول تو یہ دونوں مستقل عیب ہیں کیونکہ اپنے عیبوں کا نہ دیکھنا یہ بھی گناہ اور دوسرے کے عیوب کو بے ضرورت دیکھنا یہ بھی گناہ اور بے ضرورت کے معنے یہ ہیں کہ اس میں کوئی ضرورت شرعی نہ ہو اور ایسے افعال جو شرعاً ضروری اور مفید نہوں عبث اور لایعنی کہلاتے ہیں حدیث میں ان کے ترک کا امر ہے اور بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام فرمایا ہے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کسی شخص کے مکان پر گئے اور دروازے پر جاکر آواز دی گھر میں سے جواب آیا کہ وہ نہیں ہیں انھوں نے پوچھا کہ کہاں گئے ہیں جواب آیا کہ معلوم نہیں۔ لکھا ہے کہ اپنے اس سوال پر کہ کہاں گئے ہیں تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے ایک لایعنی

سوال کیوں کیا۔ مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ دیوبند کے والد مولانا فریدالدین صاحبؒ کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت ہی کم بولتے تھے اور بلا کسی شدید ضرورت کے نگاہ کبھی اوپر نہ اٹھاتے تھے حتٰی کہ اگر ان سے کوئی بات پوچھتا تو زبان سے جواب دیتے لیکن منہ نہ اٹھاتے تھے صرف اس لئے کہ بلا ضرورت کیوں نگاہ کو صرف کیا جائے۔ نیز قرآن میں حکم بھی ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (آپ مومنین سے فرما دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو جھکا کر چلا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں)، دوسری جگہ ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا یعنی غاضین اَبْصَارَهُمْ (جو لوگ زمین پر اپنی نگاہیں جھکا کر چلتے ہیں)

اہل لطائف نے لکھا ہے کہ شیطان نے بنی آدم کو بہکانے کی چار سمتیں بیان کی ہیں ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ (پھر یقیناً میں ان کے آگے پیچھے دائیں اور بائیں چاروں طرف سے آؤں گا) اور دو سمتوں کو بیان نہیں کیا یعنی فوق اور تحت اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سمتیں محفوظ ہیں لیکن اوپر سے مراد دہلی کے چاندنی چوک کا کوٹھا نہیں ہے بلکہ آسمان مراد ہے لیکن ہر وقت اوپر دیکھنا بہت دشوار تھا اس لئے سب سے اسلم سمت تحت ہے باقی چار سمتیں قدام۔ خلف۔ یمین۔ شمال۔ ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی طرف دیکھنے میں اکثر انسان فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے بعض اکابر نے یہاں تک کیا ہے کہ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں بود و باش اختیار کر لی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے ؎

بزرگے دیدم اندر کوہسارے | نشستہ از جہاں در کنج غارے
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی | کہ بارے بندے از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویان نغز اند | چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

(میں نے ایک بزرگ کو ایک جنگل میں دیکھا کہ وہ دُنیا کو چھوڑ کر ایک غار کے گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ شہر میں کیوں نہیں آتے کہ کم از کم

ایک بار تو لوگوں کے دلوں سے گرھیں کھولیں یعنی لوگ آپ کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے جواب دیا وہاں پری رو اپنے دام میں پھانس لیتے ہیں اس لئے کہ جب کیچڑ زیادہ ہو جاتا ہے تو ہاتھی بھی پھسل جاتا ہے)

اسی حالت کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

زاہد نداشت تابِ جمالِ پری رُخاں کنجے گرفت و ترسِ خدا را بہانہ ساخت

(زاہد پری رُخ والوں کے جمال کی تاب نہیں رکھتا تو تنہائی اختیار کر لیتا ہے اور خوفِ خدا کا بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے)

بہرحال ایسا ہوتا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ ان چاروں سمتوں کی جانب دیکھنا بہت کم کر دیا جائے اور اوپر کے دیکھنے میں گرنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا پس تجربہ عقل نقل سب سے معلوم ہو گیا کہ حفاظت اور امن کی سمت سمت تحت ہے۔ اور جب بزرگوں نے لا یعنی امور سے اس قدر پرہیز کیا ہے اور حدیث نے بھی مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ (انسان کا اچھا اسلام یہ ہے کہ وہ بے فائدہ اور فضول قول و عمل ترک کر دے) کا حکم کیا ہے اس لئے تفتیش عیوب کے گناہ ہونے میں یہ قید لگائی ہے کہ بیضرورت ہو اور دوسروں کی عیب جوئی اگر گناہ بھی نہ ہوتی تو لا یعنی تو ضرور تھی اس سے بچنا بھی ضروری ہے تو جبکہ وہ گناہ بھی ہے تو اس سے بچنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے بعض احمقوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تمام وقت فضولیات ہی میں برباد کرتے ہیں مثلاً اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جناب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملے میں آپ کی کیا تحقیق ہے کوئی اس عقلمند سے پوچھے کہ تجھ کو حضرت معاویہ رضؓ کے معاملہ کی کیا پڑی تو اپنا معاملہ درست کر۔ مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی فرنگی محلی کے پاس ایک رنگریز آیا کہنے لگا کہ حضرت معاویہؓ کے معاملہ میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میاں تم جا کر کپڑے رنگو جب تمہارے پاس حضرت معاویہ رضؓ کا مقدمہ آئیگا تو لینے سے انکار کر دینا اور کہدینا کہ میں نے اکی

تحقیق کی تھی مگر مجھے کسی نے تبلائی نہیں ایک اور صاحب ایک مولوی صاحب کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی بابت دریافت کرتے ہوئے آئے کہ وہ ایماندار تھے یا نہیں انھوں نے فرمایا کہ تم کو نماز کے فرائض معلوم ہیں یا نہیں کہنے لگا کہ نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ غضب کی بات ہے کہ نماز جس کا سوال سب سے اول قیامت میں ہوگا اس کے وہ فرائض جن سے دن میں پانچ مرتبہ کام پڑتا ہے اور جن کے معلوم نہ ہونے سے احتمال ہے کہ وہ فوت ہو جائیں تو نماز ہی نہ ہو ان کی تم کو خبر نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ایمان جس کی بابت یقیناً ہم سے نہ قیامت میں سوال ہوگا نہ دنیا کا کوئی کام اس علم پر موقوف اس کی تحقیق کی جاتی ہے۔ صاحبو! اگر کوئی بُرا ہے تو تم کو کیا غرض اور اچھا ہے تو تم کو کیا مطلب تمہیں اپنی اچھائی بُرائی کی فکر ہونی چاہیئے۔ باقی ہر شخص کی خبر رکھنا یا اس کا خیال ہونا یہ کام خدا تعالےٰ کا ہے یا اس کے بندے کا کام ہے جس کے سپرد خدا تعالےٰ نے اصلاح خلق کا کام کر دیا ہو کہ اس شخص کو بھی تفتیش حالات کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر علم حالات اصلاح ممکن نہیں ہے اور اسی وجہ سے میں نے بلا ضرورت کی قید لگا دی تھی۔ اس لئے کہ مثلاً حاکم وقت جب تک تفتیش حالات نہ کرے گا مجرموں کو سزا نہ دے سکیگا مگر اس کو بھی ایسے اُمور میں اجازت ہے کہ جن میں تفتیش نہ کرنے سے فساد کا احتمال ہو اور جو اُمور ایسے نہیں ہیں ان میں حاکم کو بھی تجسس کی اجازت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر میں سے گانے کی آواز آئی آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لےگئے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ خلاف حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو ہرگز غصہ نہ آئیگا اس لئے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی

گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کئے ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلٰى أَهْلِهَا (بلا اجازت اپنے گھر کے علاوہ کسی کے گھر میں مت جاؤ اور جب جاؤ تو پہلے گھر والوں کو سلام کرو) دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن میں تجسس کی ممانعت ہے لَا تَجَسَّسُوا تیسرا یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو۔ آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیان آزادی میں کہ بہائم کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے کھا لیا اور ہوا پرستی میں عمر گذار دی

صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا اور مطلق العنانی ہے اور یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا جدھر چاہا چل دیا جو چاہا کر لیا تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں اگر اس کا جواب نعم ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے یہی لقب لیجئے اور اگر لا میں جواب ہے تو پھر ذرا مہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق تبلائیے اسی طرح اگر کوئی شخص اتالیق یا نگراں ہو تو اس کو بھی تفتیش حالات کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر اصلاح غیر ممکن ہے۔ یا شوہر ہو کر اس کو بھی بیوی کے حالات کی تفتیش کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے متعلق اس کی اصلاح ہے یا کوئی شخص مصلح قوم ہو کہ اس کو بھی مجموعی طور سے قوم کے حالات کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ وعظ کچھ بھی نہ کر سکیگا مگر مصلح کو بھی اسی وقت تک اجازت ہے کہ تفتیش سے مقصود اصلاح ہو اور اگر تحقیر کے لئے ایسا کرے گا تو اس کو بھی ہرگز اجازت نہ ہوگی کیونکہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا دارو مدار صرف نیت پر ہے) اس استثنا کے بعد جو لوگ رہ گئے وہ دیکھ لیں کہ عیب جوئی اور عیب گوئی سے ان کا

کیا مقصود ہوتا ہے آیا یہ کہ اس شخص میں سے یہ عیب جاتا رہے یا محض بدنام کرنا اگر پہلا امر مقصود ہے تو کیا وجہ کہ کبھی اس کے آثار کیوں نہیں پائے گئے کیا کبھی کسی شخص نے صاحب عیب کو خطاب کرکے نہایت شفقت کے ساتھ اس کے عیوب پر مطلع کیا ہے اور اگر نہیں کیا تو کیا محض چار آدمیوں میں کسی کے عیب کا تذکرہ کر دینا اصلاح کہلائے گا۔ ہرگز نہیں۔ ہم لوگوں کی مجالس میں رات دن تمام مخلوق کی غیبتیں شکایتیں ہوتی ہیں کیا ان سے سوائے بدنام کرنے کے اور کچھ مقصود ہوتا ہے کچھ بھی نہیں تو یہ لوگ ایک تو غیبت کے گناہ میں مبتلا ہوئے دوسرے ایک لایعنی فعل کے مرتکب ہوئے جس کی برائی اوپر بیان ہو چکی ہے۔ حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کبھی شیطان کو بھی برا نہ کہتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ جتنی دیر اس فضول کام میں صرف کی جائے اتنی دیر تک اگر محبوب کے ذکر میں مشغول رہیں تو کس قدر فائدہ ہے شیخ شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئے ... چو بگذشت بر عارف جنگ جوئے

گر ایں مدعی دوست بشناختے ... بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(نیک خصلت بہلول نے کیا اچھا کہا تھا جب وہ ایک عارف سے ملا جو ہر وقت لوگوں سے جھگڑا تلاش کیا کرتا تھا کہ اگر یہ مدعی دوست کو پہچانتا تو ہر وقت دشمنوں سے جھگڑا نہ تلاش کیا کرتا)

دیکھو اگر کسی کا محبوب بغل میں بیٹھا باتیں کر رہا ہو اس حالت میں ایک شخص آکر اس عاشق کو ماں کی سڑی ہوئی گالی دے تو کیا عاشق کی طبیعت اس کو گوارا کریگی کہ محبوب کو چھوڑ کر دشمن کے انتقام لینے کے درپے ہو جائے اور اگر اس نے ایسا کیا تو کہا جائے گا کہ اس کا عشق نہایت خام اور ناتمام ہے اسی طرح سمجھدار لوگ ایسے موقع پر سمجھ جاتے ہیں کہ شیطان جو ہمارا دشمن ہے وہ اس شخص کو بہلا کر لایا ہے کہ اس کو دوسری طرف مشغول کرکے بہکائے اس لئے وہ پروا بھی نہیں کرتے اور محبوب کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور جتنی اس میں کمی ہوتی ہے اسی قدر ان میں کبھی کمی ہوتی ہے

ایک شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ بزرگوں کی شان اور ان کے حالات کس طرح مختلف ہوتے ہیں انہوں نے جواب دیا فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں ان کے پاس جاؤ معلوم ہو جائے گا کہ بزرگوں کے حالات میں کیا فرق ہے چنانچہ وہ شخص گیا اور جاکر دیکھا کہ کوئی بے ادب آیا اور ان بزرگوں میں سے اول ایک کے ایک چپت رسید کیا انھوں نے اٹھ کر اتنے ہی زور سے ایک چپت اس کے بھی مار دیا اور پھر بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہو گئے اس کے بعد وہ دوسرے بزرگ کی طرف متوجہ ہوا اور ایک چپت ان کے بھی مار دیا وہ بولے بھی نہیں اور اپنے کام میں لگے رہے اس کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوا اور ایک چپت ان کے مارا انھوں نے اُٹھ کر فوراً اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو دبانا اور پیار کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں بہت چوٹ لگی ہوگی یہاں سے یہ تماشا دیکھ کر ان بزرگ کے پاس گیا اور تمام ماجرا بیان کیا کہنے لگے کہ بس اتنا ہی فرق ان تینوں کی حالات اور شان میں بھی ہے۔ تو دیکھ لیجئے کہ جو غیر صابر تھے اور انتقام لئے بغیر نہ رہ سکے وہ بھی لایعنی کے مرتکب نہیں ہوئے یعنی مارنے والے سے یہ سوال تک بھی نہیں کیا کہ تو نے ایسی حرکت کیوں کی بلکہ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا پر عمل کر کے ایک چپت خود بھی اس کو مار دیا پھر اپنے کام میں لگ گئے آج یہ حالت ہے کہ ایک ذرا سی بات کسی کو کہہ دیجئے پھر دیکھئے کیا قیامت قائم ہوتی ہے بلکہ بلا وجہ بھی لوگ سر ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست مولوی اسحٰق علی صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ چلا جا رہا تھا سامنے سے ایک شخص نظر پڑے مجھے خیال ہوا کہ یہ میرے ملنے والوں میں سے کوئی شخص ہیں اس خیال کی بنا پر میں نے نہایت تپاک سے ان کو سلام کیا قریب آئے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی دوسرے صاحب ہیں اپنے دھوکہ کھانے پر میرے منہ سے لاحول نکل گئی بس وہ شخص سر ہو گیا کہ تم نے مجھ کو شیطان سمجھا اس لئے لاحول پڑھی۔ اب یہ کتنا ہی سمجھاتے ہیں خوشامد کرتے ہیں وہ مانتا ہی نہیں بڑی دور تک ان کے پیچھے پیچھے چلا آخر شاید کسی گلی میں نظر بچا کر گھس کر جلدی سے نکل گئے جب پیچھا چھٹا غرض یہ حالت ہے

ہم لوگوں کے دینداروں کی حالانکہ پہلے لوگوں نے اس قدر احتیاط کی ہے کہ فضول باتوں سے بھی بچے ہیں ایک خرابی اور مضرت عیب جوئی اور عیب گوئی میں یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ جس شخص کی برائی کی جارہی ہے اس کو خبر نہ ہو اور خبر ہونے کے بعد بہت دشوار ہے کہ وہ تم کو برا نہ کہے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے کہنے کی تم کو خبر نہ ہو اور اس تمام الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں عداوتیں بڑھیں اور دشمنیاں قائم ہوں اور پھر یہ عداوتیں بعض اوقات پشتہا پشت تک چلتی ہیں اور بناء ان کی محض ذرا سی بات کہ اس نے ہم کو یوں کہدیا تھا۔ حالانکہ اگر کہہ بھی دیا تو کیا عزت میں فرق آگیا ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ چلے جارہے تھے چند مرید ساتھ تھے راستے میں ایک شخص نے دیکھ کر کہا کہ یہ شخص بڑا ٹھگ ہے ایک مرید کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس شخص کے مارنے کو چلا۔ پیر صاحب نے روکا اور گھر پہنچ گئے اور بہت سے لفافے جو ان کے نام آئے ہوئے تھے اس کے سامنے ڈال دیئے اُن لفافوں میں بڑے بڑے القاب وآداب لکھے ہوئے تھے کسی میں قبلہ کونین کعبہ دارین کسی میں رہنمائے جہاں وغیرہ وغیرہ اور فرمایا کہ بھائی میں نہ تو اس قدر بُرا ہوں جتنا اس شخص نے ظاہر کیا اور نہ اس قدر اچھا ہوں جتنا ان لوگوں نے لکھا پس اگر خلاف واقع کہنے کی وجہ سے اس شخص پر غصہ آیا تو ان لوگوں پر بھی تو غصہ آنا چاہیئے اور ان کا منہ بھی تو بند کرنا چاہیئے جو کہ جنید عصر اور فرید وقت لکھتے ہیں۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کو ایک شخص نے آکر بُرا بھلا کہنا شروع کیا مولانا چونکہ بڑے مرتبے کے شخص تھے طالب علموں کو سخت غصہ آیا اور اس کے مارنے کو اٹھے مولانا نے فرمایا کہ بھائی سب باتیں تو جھوٹ نہیں کہتا کچھ تو سچ بھی ہے تم اسی کو دیکھو۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایک شخص نے بُرا کہا تو آپ نے اس کو ہدیہ بھیجا اور امام صاحبؒ کی نسبت لکھا ہے کہ آپ کبھی کسی کی غیبت نہ کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی کی غیبت کروں تو اپنی ماں کی غیبت میں زیادہ مصلحت ہے تاکہ میری نیکیاں میری ماں ہی کے پاس رہیں غیروں کے پاس تو نہ جائیں حضرت۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے یا فرمایا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے عقلمند ہیں ہم لوگوں کی نیکیاں تو وہ لے لیتے ہیں (یعنی چونکہ ہم ان کی بابت کبھی کچھ کہدیتے ہیں)، اور وہ اپنی نیکیاں کسی کو نہیں دیتے (یعنی چونکہ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتے) صاحبو! غور کرو کہ ایک یہ اسلاف ہیں جن کے وہ حالات ہیں ایک ہم اخلاف ہیں کہ جن کے یہ حالات ہیں خوب کہا ہے ؎

شنیدم کہ مردان راہ خدا دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام کہ با دوستانت خلافست وجنگ

(میں نے سنا ہے کہ خدا کے بندے دشمنوں کے دل کو بھی کبھی نہیں دکھاتے تمہیں یہ مقام کس طرح حاصل ہو سکتا ہے جبکہ تم دوستوں سے بھی ہر وقت جھگڑتے رہتے ہو۔)

آجکل بڑے زور سے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم لوگوں میں اتفاق رہے اس کے لئے تقریریں ہوتی ہیں اخباروں میں تحریری مضامین بھیجے جاتے ہیں جلسے کئے جاتے ہیں لیکن جو نااتفاقی کی جڑ ہے یعنی زبان اس کے کاٹنے کی آج تک کسی کو فکر نہیں صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ نااتفاقی کا بڑا سبب ہم لوگوں کی زبان ہے جس کو لگام ہی نہیں جو چاہا کہدیا جس کو چاہا کہدیا۔ یہ ظالم اس قدر چلتی ہے کہ جس کی حد نہیں اور پھر غضب یہ کہ بیچیا کبھی تھکتی بھی نہیں۔ دوسرے اعضا مثلاً سر آنکھ۔ کان ہاتھ پیر جب ان سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو تھک جاتے ہیں لیکن زبان کسی وقت بھی تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اسی لئے حدیث حدیث میں آیا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضاء زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا اگر تو درست رہی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بھی بگڑ جائیں گے۔ غرض عیب گوئی اور عیب جوئی کا مرض ہم میں نہایت عام ہے اور جن کو خدا تعالیٰ نے چار پیسے دیئے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ اسمیں مبتلا ہیں کیونکہ معاش کی طرف فراغت ہو جانے کی وجہ سے کوئی کام تو رہا نہیں اور جو اصلی کام تھا یعنی ذکر اللہ اسکو

کرتے نہیں اس لئے دن رات کے چوبیس گھنٹے پورے ہونیکی اس کے سوا کوئی ترکیب نہیں کہ چند ایسے ہی ایسوں کا مجمع ہو اور اس میں دنیا بھر کے خرافات ہانکے جائیں بلکہ بعض دیندار بھی جن کو کچھ فراغت ہے اس میں مبتلا ہیں بلکہ عوام فارغین سے زیادہ مبتلا ہیں کیونکہ وہ لوگ تو بسا اوقات شطرنج گنجفہ نرد وغیرہ میں مشغول ہو کر اس سے چھوٹ بھی جاتے ہیں اور دیندار لوگ اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اسلئے ان کو سوائے مجلس آرائی اور عیب گوئی کے اکثر اور کوئی شغل ہی نہیں ملتا۔ لیکن اس سے میرا یہ مقصود نہیں کہ عیب جوئی سے بچنے کے لئے شطرنج یا گنجفہ کی اجازت دیتا ہوں ہرگز نہیں۔ ان دونوں کی حالت بول و براز کی سی ہے کہ براز بول سے زیادہ خراب اور بول براز سے زیادہ دوسرے شطرنج وغیرہ میں اکثر اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ اس کی بدولت تمام دنیا و دین کے کاروبار چھوٹ جاتے ہیں میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے سنا ہے کہ ایک شخص شطرنج کھیل رہے تھے اور ان کا لڑکا بیمار پڑا ہوا تھا اثناء شغل میں کسی نے آکر اطلاع کی کہ لڑکے کی حالت بہت خراب ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں اور پھر شطرنج میں مشغول ہو گئے تھوڑی دیر میں پھر کسی نے آکر کہا کہ وہ مر رہا ہے کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں اور یہ کہکر پھر مشغول ہو گئے اس کے بعد کسی نے آکر کہا کہ لڑکے کا انتقال ہو گیا کہنے لگے کہ اچھا آتے ہیں یہ سوال و جواب سب کچھ ہو لیا لیکن ان کو اٹھنے کی توفیق نہ ہوئی جب شطرنج کی بازی ختم ہوئی تو آپ کی آنکھیں کھلیں اور ہوش آیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا فرمایئے جس کھیل کا انجام یہ ہو اس کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے سو اجازت مقصود نہیں بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ عوام تو مرتکب گناہوں میں مشغول ہو کر غیبت سے بعض اوقات بچ بھی جاتے ہیں مگر مدعیانِ دینداری ظاہری تقدس کے پردے میں اس سے بڑھ کر گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں پس اس بنا پر ہماری وہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پرحلل　　　واندروں قہر خدائے عز وجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　واز درونت ننگ میدارد یزید

(ظاہر تو کافر کی قبر کی طرح آراستہ و پیراستہ اور اندر اﷲ تعالیٰ کا قہر نازل ہوتا ہے ظاہر کی حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے بزرگ پر بھی اعتراض کرنے لگے اور اندر کی حالت ایسی ہے کہ اس کو دیکھ کر یزید کو بھی شرم آنے لگی۔)

صرف وضع کی درستی اور ظاہر کی آراستگی کا نام آج کل دینداری رکھ لیا ہے باقی اعمال و اخلاق وہ چاہے کیسے بھی ہوں اور عوام کی حالت پر ایک اعتبار سے اس سے بھی زیادہ افسوس ہے کہ ان کا ظاہر بھی درست نہیں دینداروں میں اگر ایک کمی ہے تو ان میں دو ہیں اور یاد رکھو کہ ظاہر کی درستی بھی بیکار نہیں ہے اس کا بھی باطن پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے حضرت موسیٰؑ جب ساحران فرعون کے مقابلے کے لئے تشریف لے گئے تو مقابلے کے بعد ساحر تو سب مسلمان ہو گئے تھے لیکن فرعون نہیں ہوا تھا حضرت موسیٰؑ نے خدا تعالیٰ سے اس کا سبب پوچھا ارشاد ہوا کہ اے موسیٰؑ ساحران فرعون اس وقت تمہارا لباس پہنکر آئے تھے ہماری رحمت نے گوارا نہ کیا کہ تمہارے ہم لباس دوزخ میں جائیں اس لئے ہم نے ان کو ایمان کی توفیق دیدی اور فرعون محروم رہا پس خلاصہ یہ نکلا کہ ظاہر کی درستی بھی اچھی چیز ہے مگر محض اس کی درستی پر اکتفا نکرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ باطن کو بھی درست و آراستہ بنانیکی فکر ہونی چاہیئے۔ اور جو لوگ مقتدا ہیں وہ اس کی زیادہ فکر کریں کیونکہ غیر مقتدا کو تو غیبت کرنے کی نوبت کم آتی ہے اور یہ لوگ چونکہ مرجع الخلائق ہوتے ہیں اس لئے ان کو غیبت سننے کی بھی بہت نوبت آتی ہے سینکڑوں آدمی ان کے پاس آتے ہیں اور ہر شخص ان کے پاس یہی تحفہ لے کر آتا ہے اور یہ اس تحفہ کو قبول کرتے ہیں۔ ہاں جو عاقل ہوتے ہیں وہ ایسے لوگوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ فلاں شخص آپ کو یوں کہتا تھا حضرت نے فرمایا کہ اس نے تو پس پشت کہا لیکن تم اس سے زیادہ بیحیا ہو کہ میرے منہ پر کہتے ہو۔ حضرت میر درد دہلویؒ کو سماع سننے سے کچھ رغبت تھی ان کی نسبت حضرت میرزا مظہر جانِ جاناںؒ سے آکر کسی نے کہا کہ حضرت میر درد سماع سنتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی! کوئی کانوں کا بیمار ہے کوئی آنکھوں کا بیمار ہے

مرزا صاحب کے اس مقولے سے اکثر جاہلوں نے یہ سمجھا کہ میرزا صاحب حسن پرست تھے حالانکہ یہ الزام بالکل غلط اور بہتان ہے اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب بوجہ لطافت مزاج کے بدصورت آدمی کو دیکھ نہ سکتے تھے اور مرزا صاحب کے بچپن کے واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی مرزا صاحب کی نسبت یہ مشہور بات ہے کہ شیرخوارگی کے زمانے میں آپ کسی بدصورت عورت کی گود میں نہ جاتے تھے حالانکہ اس وقت آپ کو خوب صورتی بدصورتی کا ادراک بھی نہ تھا لیکن لطافت روح کے باعث آپ کو بدصورت آدمی سے اسی وقت تکلیف ہوتی تھی اور اس کا اثر بڑے ہو کر بھی تھا۔ غرض اس قسم کے حضرات ایسے لوگوں کا منہ اسی وقت بند کر دیتے ہیں اور جو لوگ احتیاط نہیں کرتے وہ ان آنے والوں کی بدولت اکثر گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے کہ ؎

ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد بیگماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد

(جو شخص تمہارے سامنے اگر دوسروں کے عیب پیش کر کے شمار کراتا ہے یقیناً وہ تمہارے عیوب کو بھی دوسروں کے سامنے جاکر گنائے گا)

اس لئے میں نے کہا تھا کہ مقتدا لوگ باستثناء محتاطین و متقین کے زیادہ اس آفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ ہے وہ مرض اب میں اس مضمون کا مدلول آیت ہونا ظاہر کرتا ہوں۔ مگر اس کے لئے چند مقدموں کی ضرورت ہے اول اُن کو سمجھ لیا جائے اس کے بعد بآسانی یہ سمجھ میں آجائے گا۔

اول مقدمہ یہ ہے کہ نیک بات بتلانا ہر وقت طاعت ہے خواہ عمل کرے یا نہ کرے اور یہی وہ غلطی ہے جو کہ اس آیت کے غلط سمجھنے کی بدولت علماء کو ہوئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض نے وعظ و تلقین کو بالکل ہی ترک کر دیا اور جب ان سے سبب پوچھا گیا تو یہ جواب دیا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ

دراس جواب کے بعد اپنے کو بالکل بری الذمہ سمجھ لیا مگر یہ دھوکہ ہے اور سبب اس دھوکہ کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ اگر خود عمل نہ کرو تو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرو حالانکہ یہ مقدمہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ امر بالمعروف طاعت ہے اور اس طاعت کی شرائط میں یہ شرط کہیں نہیں کہ اگر خود بھی عمل کرے تو طاعت ہو گی ورنہ نہیں ہاں اپنا عمل نہ کرنا ایک مستقل گناہ ہے جو کہ قابل ترک ہے لیکن امر بالمعروف کے ساتھ اس کو شرطیت وغیرہ کا کچھ تعلق نہیں اور یہ کسی حدیث سے یا کسی مجتہد کے قول سے ثابت نہیں کہ اگر گناہ سے نہ بچے تو دوسری طاعت بھی طاعت نہ ہو گی اور اگر اس کو مانا جائے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے بارے میں ہے جو کہ نیکی بھی کرتا ہے لیکن گناہ میں بھی مبتلا ہے تو اگر گناہ کرنا دوسری طاعت کے طاعت نہ ہونے کا موجب ہو تو اس کفارۂ سیات کی کوئی صورت ہی نہ رہے گی اور مضمون آیت کے بالکل خلاف لازم آتا ہے البتہ اگر کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو کہ مفوت طاعت ہے تو بیشک پھر طاعت طاعت نہ رہے گی اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں طاعت اپنی حالت پر رہے گی اگرچہ معصیت کرنے سے گناہ بھی ہو گا ہاں اتنا اثر ضرور ہو گا کہ گناہ کی وجہ سے طاعت کی برکت کم ہو جائے گی سو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کو انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے وقت مستقل طور پر بیان کروں گا (فرمایا کہ بہتر ہو اگر مجھے اس کے متعلق یاد دلایا جائے کیونکہ بعض لوگوں کو اس مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے گناہ کرنے میں بہت بے پروائی ہو گئی ہے اور یوں سمجھتے ہیں کہ گناہ کو طاعت کے عدم میں کچھ بھی علاقہ نہیں حالانکہ عدم برکت کا علاقہ ہے) مگر اس وقت یہ بیان کرنا ہے کہ گناہ کرنے سے طاعت منعدم نہ ہو جائیگی اور دلیل اس کی یہ آیت ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں)

جب اس کی بناء الگ ہوئی تو یہ سمجھنا کہ اگر وعظ کہوں گا تو گنہگار ہوں گا غلطی پر مبنی ہے پس امر بالمعروف طاعت ہوا اور اس کا طاعت ہونا گناہ نہ کرنے پر موقوف نہ ہوا بلکہ آیت میں ملامت اس پر ہے کہ تم خود کیوں عمل نہیں کرتے۔ اور وعظ کے چھوڑ دینے سے تو دوسرا جرم قائم ہو گیا یعنی نہ خود عمل کریں اور نہ باوجود معلوم ہونے کے دوسروں کو تبلائیں یہ ہے علماء کی اس غلطی کا کشف۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب ایک شخص امر بالمعروف کرتا ہے جو کہ طاعت ہے اور طاعت مُزیل ہوتی ہے معصیت کی تو اس کا اقتضا یہ ہو سکتا تھا کہ یہ کفارہ ہو جاتا نسیان نفس بمعنی ترک عمل کا مگر اس طاعت کے ہوتے ہوئے بھی اس کا یہ نسیان اس امر بالمعروف سے ہوا تو جہاں امر بالمعروف بھی نہ ہو نری بد عملی ہی ہو جس میں عیب جوئی بھی داخل ہے وہ تو کیونکر موجب ملامت نہ ہو گی ضرور ہو گی۔ خلاصہ یہ ہو گا کہ اے شخص جو کہ اپنی حالت کو بھول رہا ہے جبکہ تیری حالت ایک معصیت اور ایک طاعت کے مجموعہ پر بھی محل ملامت ہے تو جب طاعت ایک بھی نہ ہو بلکہ دونوں امر معصیت ہوں تو کیونکر موجب ملامت نہ ہو گی اور دو معصیتیں اس طرح ہوئیں کہ بد عملی تو اپنی حالت پر رہی جس کو تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ فرمایا ہے اور امر بالمعروف کے بجائے دوسرے کی عیب جوئی ہو گئی۔ تو اس حالت میں تو بدرجہ اتم ملامت ہونی چاہیئے پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس میں ملامت کی بناء بد عملی و عیب جوئی ہے علماء کو ہی خطاب نہیں بلکہ جہلاء کو بھی ہے کیونکہ اس کا ارتکاب وہ بھی کرتے ہیں بلکہ جہلا کو زیادہ سخت خطاب ہے اور علماء کو ہلکا کیونکہ ان کے پاس ایک نیکی تو ہے امر بالمعروف اور جہلاء کے پاس تو ایک بھی نہیں اب اس کو غور کیجیئے اور جہل پر اپنے فخر کو دیکھیئے کہ اس کی بدولت تعزیرات الٰہیہ کی ایک دفعہ اور بڑھ گئی۔ مقصود اس سب سے یہ ہے کہ ہماری جو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی کیا کرتے ہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور اپنی فکر میں لگنا چاہیئے۔

صاحبو! اپنے جرائم کیا کچھ کم ہیں کہ ہم دوسروں کی فکر کریں۔ اور یہ جو میں نے کہا تھا کہ اصلاح قوم کے لئے تفتیش حالات جائز ہے اس کے کچھ آداب بھی ہیں ان کو معلوم کر لینا ضروری ہے سو ایک ادب تو اس کا یہ ہے کہ اصلاح کسی شخص کی مجمع عام میں نہ کیجائے کیونکہ اس سے دوسرے کو شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کا اثر یہ ہے کہ نصیحت کرنے والے سے بغض ہوجاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس امر کو ترک کرنے کے بجائے اس میں اور زیادہ پختہ ہوجاتا ہے کیونکہ سمجھتا ہے کہ میری رسوائی تو ہو ہی گئی پھر میں کیوں چھوڑوں اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ یا تو خود اس کو خلوت میں لے جا کر اس سے کہدے یا اگر اس سے نہ کہہ سکے تو کسی ایسے شخص سے کہدے جو کہ اس کی اصلاح کر سکے لیکن اس کے دشمن سے نہ کہے کیونکہ دشمن سے کہنے میں اصلاح تو ہو نہیں سکتی ہاں تذلیل ہوگی۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ نرمی سے کہے تحقیر اور طعن کے طور پر نہ کہے۔ تیسرا ادب یہ ہے کہ اگر مجمع میں عام خطاب سے کہے تو ایسے پتے نہ دے کہ مجمع عام میں اس کی رسوائی ہو مجھے یہ امر بہت پیش آتا ہے یعنی یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ فلاں شخص سود لیتا ہے ذرا وعظ میں اس کی خبر لیجیئے گا یا فلاں شخص نے حقوق دبا رکھے ہیں ذرا اس کے متعلق فرما دیجیئے گا لیکن میں بحمد اللہ ان فرمائشوں پر کبھی عمل نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ طریق اصلاح بجائے مفید ہونے کے مضر ہے سننے والے قرائن سے سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کو کہا جا رہا ہے اور اس سے مجمع عام میں اس کو شرمندگی ہوتی ہے جس کا نتیجہ بغض و عداوت ہے اور اس کے سبب اپنے فعل کی اور زیادہ پچ ہوجاتی ہے اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اگر واقعی ان لوگوں کی اصلاح کرنی منظور ہے تو اول ان سے میل جول پیدا کیا جائے جب خوب بے تکلفی ہوجائے تو وقتاً فوقتاً نرمی سے ان کو سمجھایا جائے اور خدا تعالےٰ سے ان کے لئے دُعا کی جائے اور جو تدبیر مفید ثابت ہوں ان کو عمل میں لایا جائے غرض وہ برتاؤ کیا جائے جو کہ اپنی اولاد سے کیا جاتا ہے کہ اگر ان کی شکایت کسی دوسرے سے کی جائیگی تو اپنے دوستوں سے کیجائیگی جو کہ اس کی اصلاح کر سکیں یا بزرگوں سے کی جائے گی کہ وہ اس کے لئے دعا کریں علیٰ ہذا

جن سے درستی کی امید ہو گی اُن ہی سے کہا جائے گا اور جہاں یہ بات نہ ہو گی وہاں زبان پر بھی اپنی اولاد کے عیوب کو نہ لایا جائے گا۔ یہ مثال بحمد اللہ ایسی عمدہ ہے کہ اس کے پیشِ نظر رکھنے کے بعد اصلاح کے تمام آداب معلوم ہو جائیں گے۔ یعنی جس مسلمان کی اصلاح کرنی چاہو یہ غور کر لو کہ اگر یہ حالت ہماری اولاد کی ہوتی تو ہم کیا برتاؤ اس کے ساتھ کرتے بس جو برتاؤ اس کے ساتھ طبیعت تجویز کرے وہی برتاؤ اس غیر کے ساتھ بھی کرو اور میں اس حدیث کے کہ اَلْمُسْلِمُ مِرْاٰۃُ الْمُسْلِمِ (ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے آئینہ ہوتا ہے) یہی معنی بیان کیا کرتا ہوں یعنی جس طرح آئینہ کا خاصہ ہے کہ وہ تمہارے عیوبِ چہرہ کو تم سے چھپاتا نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہیں کرتا اسی طرح مسلمان کو بھی ہونا چاہیئے کہ کسی مسلمان کے عیوب کو اس سے چھپائے نہیں اور دوسروں پر ظاہر نہ کرے نیز یہ کہ کسی مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ نہ رکھنا چاہیئے بلکہ آئینہ کی طرح بالکل صاف باطن رہنا چاہیئے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن | آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

(ہمارے مذہب میں بغض و کینہ دل میں رکھنا کفر ہے۔ ہمارا دستور یہ ہے کہ دل کو آئینے کی طرح صاف و شفاف رکھا جائے۔)

یہ شعر اس مقام پر بہت زیادہ چسپاں تو نہیں ہے لیکن لفظ آئینہ کی مناسبت سے پڑھ دیا گیا ہے کہ آئینہ کی شان صفائی ہوتی ہے اور اوپر جو وجہ شبہ بیان کیگئی ہے وہ بھی صفائی کی فرد ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب کسی کے عیوب پر مطلع ہو تو اس کو اطلاع کر دو اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو خدا تعالےٰ سے دُعاء کرو۔ غرض دوسرے کی عیب جوئی و عیب گوئی اِن مصالح سے تو جائز ہے اور اگر یہ مصالح نہ ہوں تو باستثناء ایک موقع کے بالکل حرام ہے اور وہ موقع یہ ہے کہ مظلوم شخص ظالم کی عیب گوئی کرے کیونکہ مظلوم کو ظالم پر غصہ ہوتا ہے اور وہ غصہ حق ہوتا ہے پس شریعت نے مظلوم کو اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنے غصے کو نکال

سبحان اللہ شریعتِ اسلام کی تعلیم بھی عجیب پاکیزہ تعلیم ہے کہ کسی ایک قابل رعایت پہلو کو بھی نہیں چھوڑا۔ مجھے تو اسلام کی تعلیم دیکھ دیکھ کر یہ شعر یاد آیا کرتا ہے کہ ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر کی مانگ سے لے کر پاؤں تک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں ایک عجوبہ سامنے آتا ہے اور وہ عجوبہ دل کو کھینچے چلا جاتا ہے کہ اصل دیکھنے کی جگہ تو یہی ہے)

دیکھئے مظلوم چونکہ اپنے جائز غصے کو نکالتا ہے اور یہ طبعی امر ہے کہ اس کے ضبط سے کلفت ہوتی ہے تو اس کو اجازت دیدی گئی نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جب اس مظلوم کی غیبت سے لوگوں کو ظالم کے ظلم کی حالت معلوم ہوگی تو وہ اپنے بچانے کی فکر کرلیں گے بلکہ بعض بزرگوں نے تو ایک مضمر مصلحت سے یہاں تک کہدیا ہے کہ مظلوم کو چاہیئے کہ اگر اس کو باطنی قرائن سے معلوم ہوجاوے کہ میرے صبر کرنے سے ظالم پر ضرور قہر نازل ہوگا (کیونکہ بعض شخص کا معاملہ خدا تعالےٰ کے ساتھ خاص ہوتا ہے) تو اپنی زبان سے کچھ تھوڑا ضرور ظالم کو کہہ لیا کرے کیونکہ اس کی خاموشی سے اندیشہ ہے کہ خدا تعالےٰ کا غضب دنیا ہی میں ظالم پر ٹوٹے۔ اور بعض بزرگوں کے کلام سے جو نہ کہنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے وہ اس بناء پر کہ صبر ایک نیک عمل ہے اس کے کرنے سے مظلوم کو زیادہ ثواب ملیگا۔ لیکن جنہوں نے کچھ کہنے کی اجازت دی اور اس کو افضل بتلایا انھوں نے یہ خیال کیا کہ مسلمان بندے کو دوزخ کا عذاب نہ ہو اور خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ رہے شاید کسی طالب علم کو شبہ ہو کہ خدا تعالےٰ کے قہر سے محفوظ رہنے کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ وہ مظلوم معاف کردے تو سمجھنا چاہیئے کہ بعض لوگوں کا معاملہ خدا تعالےٰ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ معاف بھی کردیں تو خدا تعالےٰ اپنا حق کہ ان کے بندے کو ستایا تھا معاف نہیں فرماتے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ چلے جارہے تھے کہ ایک شخص نے ان کو کچھ بیہودہ کہا ان بزرگ نے اپنے ایک مُرید کو حکم دیا کہ اس کے ایک دھول مار۔ وہ ذرا متامل ہوا فوراً وہ شخص زمین پر گرا اور مرگیا انھوں نے

اپنے مرید سے کہا کہ تم نے دیر کی اور اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ اور فرمایا کہ جب اس نے مجھے بُرا بھلا کہا تو میں نے دیکھا کہ قہر خداوندی اس پر نازل ہوا چاہتا ہے اسلئے میں نے چاہا تھا کہ میں خود ہی اس کو کچھ کہہ لوں تاکہ قہر خداوندی اس پر نہ پڑے لیکن تم نے دیر کی آخر یہ شخص ہلاک ہو گیا۔ اور یہی راز ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک میں کڑوی دوا ڈالی گئی اور آپ کے منع فرمانے پر لوگوں نے نہیں مانا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوش آجانے کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں نے میرے منہ میں دوا ڈالی ہے ان سب کے منہ میں دوا ڈالی جائے سوائے عباسؓ کے کہ وہ شریک رائے نہ تھے تاکہ مکافات ہو جائے اور یہ لوگ قہر خداوندی میں مبتلا نہ ہوں حضرت مرزا مظہر جان جاناں اکثر لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دیتے تھے کسی نے اسکا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی اکثر حرکات سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میری تکلیف کی وجہ سے لوگ وبال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور میں نے ہر چند خدا تعالےٰ سے یہ دُعا کی کہ میری وجہ سے لوگوں کو تکلیف نہ پہونچے لیکن میری یہ دُعا قبول نہیں ہوتی حافظ فرماتے ہیں

؎ بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات با دردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

اور ؎ ہیچ قومی را خدا رسوا نہ کرد تا دلی صاحبدلی نامد بدرد

(ہم نے اسی بدلا دیئے جانے والے جہاں میں تجربہ کیا ہے کہ جو کوئی بھی اللہ والوں کے ساتھ اُلجھ گیا وہ خود مبتلائے غضب ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے کبھی کسی قوم کو رسوا نہیں کیا مگر اسی وقت جب کسی صاحب دل کا دِل دُکھایا)

تو چونکہ بعض کے معاف کرنے سے بھی پورا معاف نہیں ہوتا اسلئے وہاں کچھ کہہ لینا ہی مصلحت ہے غرض مظلوم کو اظہار ظلم کی بدون کسی مصلحت کے بھی اجازت ہے اگر وبال کے ٹل جانے یا ہلکا ہو جانیکی نیت ہو تو وہ مستحسن ہے لیکن غیر مظلوم کو مصالح سابقہ کے بغیر اجازت نہ ہوگی۔ اب میں اپنے بیان کو بقیہ آیت کا ترجمہ کر کے ختم کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ یعنی باوجودیکہ تم

کتاب اللہ کو پڑھتے ہو اور اس کے احکام تم کو معلوم ہیں۔ شاید بعض لوگ اس ترجمے کو سنکر خوش ہوں کہ یہ تمام خطاب تو اون لوگوں کے لئے ہے جوکہ کتاب کو پڑھتے ہیں ہم چونکہ پڑھے ہوئے نہیں اس لئے ہم مخاطب نہیں ہیں لیکن یہ خوشی صحیح نہیں کیونکہ آگے یہ بھی ارشاد ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ہ یعنی کیا تم سمجھتے نہیں ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ جس طرح نقلی ہے عقلی بھی ہے۔ یعنی عقل بھی اس کے قبح کا فتویٰ دیتی ہے بہرحال اس آیت سے بدلالت مطابقی اس پر وعید ہوئی کہ اوروں کو سمجھاؤ اور خود عمل نکرو اور بدلالت التزامی و بدلالت النص یہ ثابت ہوا کہ اوروں کی برائی کے درپے ہونا اور اپنی برائیوں کو فراموش کرنا برا ہے ضرورت اس کی ہے کہ ہر وقت اپنے گناہوں اور عیوب پر نظر ہو اور اس کے معالجے کی فکر کی جائے اور جس میں اپنی فکر کافی نہ ہو اس میں دوسرے ماہر سے رجوع کرو شرم و حجاب کی وجہ سے اپنے امراض کو معالج سے چھپایا نہ جائے کیونکہ اظہار مرض کے بغیر علاج ممکن نہیں۔ یہ بیان ختم ہوا۔ چونکہ اس مرض میں اکثر لوگ مبتلا تھے اس لئے اس کا بیان کرنا ضروری سمجھا گیا سو بحمد اللہ کافی گفتگو اس پر ہو گئی۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ وہ ہم کو فہم صحیح اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ

دعواتِ عبدیت جلد پنجم

کا

چوتھا وعظ ملقب بہ

تعلیم البیان

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی " دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

چوتھا وعظ ملقب بہ

تعلیم البیان

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون	۱۱ رجب ۱۳۳۰ھ ہجری۔	۱۔ گھنٹہ ۴۰ منٹ ،، ،، ،،	کھڑے ہو کر ،، ،، ،،	طلبہ نے ایک مجلس مشق تقریر کا افتتاح کیا تھا اس لئے تقریر کے طریقہ کے متعلق بیان کیا گیا تھا۔	مولوی سعید احمد صاحب	اندازاً ۳۰ یا ۳۵۔ آدمی	سب طلبہ ہی تھے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلَّمۡ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○ (رحمن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اسی نے انسان کو بولنا سکھایا۔) یہ معلوم ہے کہ اس وقت ایک خاص مبارک مجلس کا افتتاح ہے جس کی غرض صرف یہ ہے کہ طلبہ کو بیان کرنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ وہ غایت علم میں قاصر نہ رہیں اور ان کا پڑھا لکھا ان ہی تک محدود نہ رہے دوسروں کو بھی پہونچا سکیں اور اسی کے متعلق بیان کرنے کی غرض سے اس وقت یہ آیت تلاوت کی گئی ہے میں نے اپنے بیان کے لئے پہلے سے یہی آیت تجویز کی تھی مگر حسن اتفاق سے قاری صاحب نے بھی یہی رکوع سنایا۔ قاری صاحب کے شروع کرتے ہی مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ توافق تجویزوں کا انشاء اللہ اس مجلس کے مقبول ہونیکی علامت ہے حدیث شریف میں شب قدر کی بابت ارشاد ہے کہ چونکہ چند خواب متفق ہیں کہ اس عشرے میں قدر ہے اس لئے گمان غالب اسی کی موافق ہے اس سے عرفاء نے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ چند قلوب کا واردات مجتمع ہو جانا دلیل ظنی اس وارد کے صحیح ہونیکی ہوتی ہے اور ہرچند کہ ہم کیا اور ہمارے واردات کیا لیکن چھوٹی باتوں میں چھوٹے واردات کا بھی ہم وہی اثر کہیں گے جو کہ بڑی باتوں میں بڑے واردات کا اثر ہوتا ہے تو اس وقت میرے اور قاری صاحب کے دل میں یہ آنا کہ اس آیت کی تلاوت کی جائے اور ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں کم از کم بحمداللہ اسلام تو ضرور ہے اور ہماری مجلس چھوٹی ہی سی مجلس ہے قرینہ اس کا ہے کہ یہ مجلس انشاء اللہ لاطائل نہیں ہے بلکہ امید ہے کہ مقبول ہوگی لیکن صرف اس قرینہ پر اکتفا و اعتماد نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کی مقبولیت کے لئے تدبیر بھی کی جائے جو کہ اتباع سنت ہے اور اس کے ساتھ دُعاء بھی کرنی چاہیئے جو کہ انشاء اللہ تعالےٰ ختم بیان پر ہوگی دُعا میں یہ بھی ہونا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ اس کو باثمر کریں اور اس میں سُنّتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت ہو اور حدود شریعت سے متجاوز نہو۔ بڑی چیز ہر امر میں دُعا ہے باقی سب دل خوش کن

عہ یعنی مقصود عہ اول قاری محمد یامین صاحب نے تبرکاً ایک رکوع پڑھا تھا وہ یہی تھا

قرائن درجہ فال میں ہیں جو کہ مبشرہوتی ہیں اور سب سے ادنیٰ درجہ بشارت کا ہوتا ہے اور اس کے بعد تدبیر کا مرتبہ ہے اور سب سے اعلیٰ مرتبہ دُعاء کا ہے جو تدبیر کے ساتھ ہو۔ گویا ہر امر میں کامیابی کے لئے علّت تامہ کا جز و اخیر دُعاء ہے سو دُعاء کو بھی جلب منفعت میں بہت بڑا دخل ہے۔ یہ جُملہ معترضہ تھا۔ اب میں مقصود عرض کرتا ہوں۔

حق سبحانہ تعالےٰ نے ان چھوٹی سی آیتوں میں اپنے خاص افعال کا ذکر فرمایا ہے کہ جو سراسر رحمت ہے اور پھر اپنے اسم مبارک کو بھی عنوان رحمت ہی سے ذکر فرمایا اور اس آیت میں تین رحمتوں کا ذکر ہے اور تینوں بڑی رحمتیں ہیں اور ہر ایک کو الرحمٰن ہی سے شروع کیا ہے کیونکہ الرحمٰن مبتداء ہے اور اس کے بعد خبر ہیں تو گویا عبارت یوں ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ٥ اَلرَّحْمٰنُ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ٥ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَهُ الْبَیَانْ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں نعمتوں کا منشاء خدا تعالےٰ کی رحمت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی سے کہے کہ مہربان حاکم نے تم کو عہدہ دیا۔ مہربان حاکم نے تمہاری ترقی کی۔ مہربان حاکم نے تم کو افسر بنایا۔ اس سے ہر اہل زبان سمجھ سکتا ہے کہ منشاء ان تمام عنایتوں کا مہربان ہے پس اسی طرح ان سب نعمتوں کا منشاء بھی خدا تعالےٰ کی رحمت ہے اور پھر رحمت بھی عظیمہ کیونکہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہے تو ترجمہ کا حاصل یہ ہوا کہ جس ذات کی بڑی رحمت ہے اس نے قرآن کی تعلیم دی یہ تو پہلی نعمت کا بیان ہے دوسری نعمت یہ کہ اُسنے انسان کو پیدا کیا اور تیسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو بیان کرنا سکھلایا۔ ان تینوں نعمتوں میں اس وقت کی غرض کے مناسب تیسرا جملہ ہے مگر چونکہ ان دو نعمتوں کی تقدیم جس طرح ذکر میں ہے اسی طرح وہ دونوں وجود میں بھی اس تیسری نعمت پر مقدم ہیں خواہ وجود حسی ہو یا وجود معنوی اس لئے ان کے دو جملوں کی بھی تلاوت کی گئی چنانچہ ایک مقام کا تقدم اور دخل تو ظاہر ہے۔ یعنی خلق الانسان کہ اس کو تو تکوینًا دخل ہے اور یہ شرط تکوینی ہے کیونکہ جب تک انسان پیدا نہ ہو اس وقت

تک تعلیم بیان ہو ہی نہیں سکتی تو تعلیم و تعلم موقوف ہے وُجود پر اور وُجود موقوف ہے ایجاد پر اور اسی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ اگر پیدا نہوتے تو بیان نہ کرسکتے۔ لیکن اس کے مستقلاً ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس پر متنبہ فرمانا ہے کہ جو نعمت کسی دوسری نعمت کا وسیلہ ہو وہ ایک درجے میں مستقل اور مقصود بھی ہے اس کو محض واسطہ ہی نہ سمجھا جائے یعنی بعض نعمتیں چونکہ وسیلہ ہوتی ہیں اس واسطے ان کی طرف اکثر توجہ نہیں ہوا کرتی اس لئے مستقلاً ذکر کرنے سے گویا یہ ارشاد فرمادیا کہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ بھی قابل مستقل ذکر اور توجہ کے ہے صرف علمہ البیان ہی نعمت نہیں پس اگر یہ نعمتِ تکوین مذکور نہ ہوتی تو اس کی مقصودیت پر لفظاً تنبیہ نہ ہوتی اور ذکر کرنے میں تنبیہ ہوگئی کہ یہ مستقلاً بھی نعمت ہے اور ظاہر بھی ہے کیونکہ پیدا کرنا صرف واسطۂ تعلیم بیان ہی نہیں بلکہ اس میں اور بھی تو مصالح ہیں۔ بہرحال اس پر توقف تکوینی ہے اور بہت ظاہر ہے۔ رہا دوسری شرط کا تقدم وہ بہت غامض ہے حتّٰی کہ اہل علم بھی بعض اوقات اس کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ شرط علم القرآن ہے کہ اس پر توقف تشریعی ہے یعنی بیان کا وجود اگرچہ بدون قرآن کے حسًا ہوگیا لیکن وجود صحیح قابل اعتبار تعلیم قرآن کے بعد ہوگا کیونکہ اگر بیان میں تعلیمات قرآنیہ کا لحاظ نہیں تو وہ بیان اور تقریر شرعًا باطل اور کالعدم ہے جیسا آج کل اکثروں نے قرآن کی تعلیم کو بالکل ترک کردیا ہے۔ عوام الناس کو تو بہت ہی دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر امور میں حدود شرعیہ سے متجاوز ہوگئے ہیں اور ان کی ذرا رعایت نہیں کرتے مگر ہم اسی طرح طلبہ کو بھی اپنے اقوال وافعال میں جادہ شریعت سے بہت زیادہ بڑھا ہوا پاتے ہیں اور قرآن کی تعلیم کو انھوں نے بھی بہت زیادہ چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق طلبہ کو ایسے جلسوں اور انجمنوں کی اجازت دیتے ہوئے کھٹکتے ہیں کیونکہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے

کہ یہ لوگ جلسوں کی کارروائی میں متجاوز عن الشرع نہ ہو جائیں۔

چنانچہ میں اس وقت بعض نوجوان عربی طلبہ کو بھی دیکھتا ہوں کہ وہ ان مجالس میں بھی شریعت کی بہت سی باتیں چھوڑ جاتے ہیں چنانچہ کبھی خلاف تحقیق مضامین بیان کرتے ہیں کہیں طرز بیان مقلدان یورپ کا اختیار کرتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ ان کے بزرگ واساتذہ بھی ان کو اس طرز سے نہیں روکتے بلکہ ان کے سرمایہ تقریر میں اس کو معین اور قوت پیدا کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ علم کی نو کمی ہو گئی ہے اسلئے تلمیع کی ضرورت پڑتی ہے چونکہ کھری چیز پاس نہیں ہے اور جس کے پاس کھری چیز ہو گی اس کو تلمیع کی ضرورت کیوں ہو گی پس اس کی غیر ملمع تقریر گو لفظی آب و تاب نہ رکھے مگر اس میں حسن باطنی ہوتا ہے اور ملمع تقریر میں گو آب و تاب ظاہری ہوتی ہے مگر تدبر و تفکر کے بعد وہ تمام رنگ اتر کر الفاظ ہی الفاظ رہ جاتے ہیں پس تفکر و تامل سے دونوں کا امتحان ہو جاتا ہے اسی مضمون کو حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں تا سیہ روئے شود ہر کہ درو غش باشد

یعنی بہتر یہ ہے کہ کھوٹے اور حریف کو تجربہ کی کسوٹی پر کس لیا جائے جس میں غش ہو گا وہ سیہ رو ہو جائیگا کیونکہ اس میں اگرچہ آب و تاب ہے لیکن کسوٹی کے پاس ملمع کہ سب مٹ جائیگی اور جو کھرا ہے وہ وہاں بھی اسی آب و تاب کے ساتھ رہیگا بلکہ اور دونی رونق بڑھ جائیگی غرض جن کے پاس علمی سرمایہ ہے ان کو کسی قسم کی تلمیع کی ضرورت نہیں اور جن کے پاس یہ نہیں وہ ہر طرح تلمیع سے کام لیتے ہیں اور پھر بھی وہ حسن پیدا نہیں ہوتا اسی حسن کو حافظ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ قبول خاطر و حسنِ سخن خداداد است

(حاسد و حافظ کی نظم پر تم حسد کیوں کرتے ہو کلام کی اچھائی اور اس کا قبول خاطر ہونا خداداد ہے)

اورے دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ با حسنِ خداداد آمد

دنیا تات اور پودوں کی دلفریبیاں دل لبھا رہی ہیں مگر میرا محبوب جب اپنے حُسنِ خداداد سے

جلوہ آرا ہوا تو اُس کے سامنے دل فریبیاں اور رنگینیاں مات ہیں)

ہم نے حضرات اہل حق کو دیکھا ہے کہ ان کے سادہ الفاظ میں وہ خوبی اور دلچسپی ہوتی ہے کہ بڑے بڑے استعاروں میں نہیں ہوتی۔ یہ جتنی شستہ اور حسینت تقریریں کہلاتی ہیں ان کی خوبی محض نظر اول ہی تک ہے اور جس قدر زیادہ غور کرتے جائیے ان کا پوچ اور لچر اور محض مجموعہ الفاظ ہونا ظاہر ہوتا جاتا ہے کیونکہ وہاں سرمایۂ علم نہیں ہوتا۔ برخلاف اہل علم کے کہ ان کے سادہ الفاظ کی یہ حالت ہے کہ

یزیدك وجهه حسنًا اذا ما زدته نظرًا۔

(میرے محبوب کو تم جس قدر زیادہ دیکھوگے اُس کا حسین چہرہ خود تمہارے حُسن میں اضافہ کریگا)

مجھے ایک انسپکٹر ڈاکخانہ جات ملے وہ طالب حق تھے اور طلب حق کا خاصہ ہے کہ اس میں حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ وہ ایک صاحب کی بابت کہ وہ اس دُنیا میں جس کو آجکل اخباری دنیا کہا جاتا ہے بہت مشہور ہیں کہتے تھے کہ مجھے ان کی معیت میں رہنے کا اور تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے اور میں ان کی تقریریں سُنکر سمجھا کرتا تھا کہ ان کی برابر کوئی محقق نہیں لیکن جب سے میں نے اہلِ حق کی تقاریر سنی کہ جن کو نہ لکچر دینا آتا ہے نہ وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ اصل علم کیا چیز ہے اور کہتے تھے کہ غور کر کے اہل حق کی اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریریں میں جو فرق میں نے سمجھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں تو نہایت وقیع اور موثر ہوتی ہیں اور حق انھیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو ان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور ان کا لچر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور پر تلبیع ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی تقریر نظر اول میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو ان کی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور قلب پر نہایت گہرا اثر ان کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تلمیعات قلب سے دھل جاتی ہیں یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آجکل کے علماء پر منجملہ دوسرے

اعتراض کے وہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کو لکچر دینا نہیں آتا وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن و حدیث ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب و تاب کی کیا ضرورت ہے خوب کہا ہے ؂

زعشقِ ناتمام ما جمال یار مستغنی ست   بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

(دوست کا جمال ہمارے ناتمام عشق سے مستغنی ہے اس لئے کہ جو چہرہ فی نفسہٖ حسین ہو اسے خالی خواہ مخواہ زیبائش کی کیا ضرورت۔)

ہمیں لکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّیَّةٌ ۔ اُمّیتہ کے معنی سادگی کے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے اسی لئے آپ نے لفظ نحن فرما کر ساری امت کو شامل فرما لیا یہی روح ہے اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو امیۃ ام کی طرف منسوب ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کی کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی بلکہ ہر حرکت میں بیساختگی ہوتی ہے اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے ورنہ طبعًا بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہیئے تھی اور یہی بیساختگی ہے کہ جن بوڑھوں میں یہ پائی جاتی ہے آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں۔ تو اصلی مفہوم امیت کا یہی بیساختگی ہے اور نہ لکھنا، پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہیئے اور تلبیس اور تلمیع سے بالکل پاک ہونا چاہیئے البتہ بیان میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آتا جاتا ہے۔

حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور
اور اس کی کچھ خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر زبان کے لئے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں
اب اس طرز جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اردو میں سے
لیگیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں حالانکہ انگریزی کی
خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتیں ان کی بدولت زبان بالکل بھدی اور خراب
ہوتی جاتی ہے ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا
حامی کہتی ہے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے ماحی ہیں کیونکہ
ہر زبان میں ایک مادّہ ہوتا ہے اور ایک ہیئت۔ اور زبان ان دونوں کے مجموعے
کا نام ہوتا ہے نہ کہ صرف مادہ کا۔ تو جب زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہیگی
تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی پس اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہیئے
کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی
سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے
ہم کو مناسبت ہے اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی خواں
طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں حالانکہ ان کی
تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے کیونکہ اول
تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان
ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت
تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی اور پدری زبان
عربی ہی ہے کیونکہ ہمارے آباء و اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان
میں بود و باش اختیار کر لی ہے۔ مجھے اکثر اس کا افسوس ہوا کرتا ہے کہ
ہمارے بزرگوں نے اپنے نسب نامہ تک کو محفوظ رکھا لیکن زبان کی حفاظت
نہ کی حالانکہ ان حضرات کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ
عنہم نے جہاں جہاں فتوحات حاصل کی ہیں اکثر ملک بھر میں ان کی زبان اختیار

کرلی ہے اور آج تک وہی زبان چلی جاتی ہے حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا کوئی اہتمام بھی نہ کیا ہوگا مثلاً مصر ہی کو دیکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بدولت تمام مصر کی زبان عربی ہے اگرچہ تمام مصر کا مذہب اسلام نہیں خیر اگر صحابہ کی سی برکت غیر صحابہؓ میں نہیں تھی اور اس لئے تمام مفتوح قوم نے ان کی زبان نہیں لی مگر کم از کم یہ تو اپنی زبان سنبھالتے لیکن تعجب ہے کہ ہندوستان میں آکر ہمارے ان بزرگوں نے اپنی زبان کو رواج دینا کجا سنبھالا بھی نہیں۔ غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہمارے بزرگ اکثر جریدہ تشریف لائے ہیں اور یہیں بودوباش اختیار کرکے یہیں کی نومسلم عورتوں سے نکاح کئے ہیں اسلئے اولاد پر زیادہ اثر ماں ہی کی زبان کا پڑا اور اسی سے یہ نئی زبان پیدا ہوگئی اور یہی مادری اثر ہے کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں آج تک تیجے وغیرہ کی رسمیں باقی ہیں۔ یعنی چونکہ ہندی عورتوں میں اپنے آباء واجداد کی رسوم باقی تھی اسلئے جب وہ ایام آئے ہوں گے تو انھوں نے کہا ہوگا کہ ہم ایسے موقع پر یوں کیا کرتے ہیں۔ ان حضرات نے بظاہر کوئی خرابی نہ دیکھ کر محض دلجوئی کے لئے تھوڑا سا تغیر کرکے مثلاً بجائے اشلوک کے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ومثل ذلک اجازت دیدی ہوگی لیکن اس وقت یہ محض عارضی طور پر تھا اب لوگ اس کو فرض عین سمجھنے لگے اور اس لئے علماء نے منع کیا تو ان کو وہابی اور کیا کیا کہنے لگے۔ غرض اسی عارضی مادری اثر کی بدولت ہندوستان میں عربی بھی نہ چل سکی کیونکہ ابا جان تو عربی بولتے ہونگے اور اماں جان ہندی اور بچہ زیادہ تر ماں ہی کے پاس رہتا ہے اسلئے کچھ عربی اور کچھ ہندی مل کر ایک مجموعہ ہوگیا اور اگر گھر میں عربی ہوتی اور باہر آکر لوگوں سے ہندی سنتے تو دونوں زبانیں باقی رہتیں چنانچہ ہم بنگالیوں اور انگریزوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بھی بولتے ہیں اور اردو بھی بولتے ہیں وجہ یہی ہے کہ ان کے گھروں میں وہی بنگلہ اور انگریزی بولی جاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے چونکہ اس کا اہتمام نہیں کیا یا ہو نہ سکا اس لئے ہماری زبان مرکب ہوگئی۔

مرکب ہونے پر یاد آیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے کہ میں نے مکہ معظمہ میں ایک ہندی عربی مرکب بچے کو دیکھا کہ رو رہا تھا کہ آنا بازار جاوں غرض ماں کی ہندیت نے زبان کی عربیت کو ضائع کیا اور اصلی زبان برباد ہوئی۔ اور اگر کوئی شخص کہے کہ ہم تو مادری زبان کو اصل سمجھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جب نسب باپ سے ہے تو کیوں باپ کی زبان کو اپنی اصلی زبان نہ کہا جائے۔ غرض جب ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو اس بناء پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کر دیتے مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اردو ہو ہی سے نکل گئی۔ اصل اردو زبان وہ ہے جیسے چہار درویش یا اردوئے معلٰی غالب کی اور اگر اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش ہونا چاہیئے کہ عربی کی آمیزش لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گلفشانی ہو گئی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے خلط سے ایک جدت پیدا ہو گئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہو سکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اسکو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہونا ہے اور یہ تشابہت خود حرام ہے حدیث شریف میں ہے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (جس نے کسی قوم کی صورت اختیار کی وہ انہیں میں سے ہے) کیونکہ تشبہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کو اور گو ممکن ہے کہ اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن ہم کو اسکی اصلاً پرواہ نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر ان کے مسلم دلائل عہ سے اسکا برا ہونا ثابت کر چکے ہیں باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کیلئے پڑھی ہے۔ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں غرض اسوقت تقریرات میں یہ تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں جن کے سبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کالعدم سمجھا جائیگا پس ثابت ہو گیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلق انسان پر اسی طرح اسکا وجود شرعی موقوف ہے تعلیم قرآن پر اور یہی حاصل ہے ان آیات کا جن کی اسوقت تلاوت کی گئی اور چونکہ تقاریر میں آجکل یہ نقص عام طور سے پیدا

عہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی مرد زنانہ جوڑا پہنکر مردوں میں آ بیٹھے اس کو معیوب کیوں سمجھا جاتا ہے اسے بجز تشبہ کے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ۱۲ منہ۔

ہوگیا ہے اسلئے یہ جی بھی چاہتا تھا کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کیجائے کہ قرآن ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہوجائے سو بحمد اللہ یہ آیت ملی کہ اسمیں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور ہے کہ قرآن سکھلایا کیونکہ غایت اس کی عمل ہے اور بیان میں اگر حدود شرع کا لحاظ نہ رہا تو قرآن پر عمل نہ ہوا کیونکہ عمل بالقرآن کے فوت ہونے کے معنی یہی شریعت کا فوت ہونا ہے کیونکہ قرآن مثل متن کے ہے اور سب علوم شرعیہ اسی کی شرح ہیں اور اسی کی مدلول ہیں کوئی عبارت النص سے کوئی اشارہ یا اقتضاء سے کوئی جزئیا کوئی کلیا۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بال نوچنے والی وغیرہا کو لعنت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جس کو قرآن لعنت کرے میں اسکو کیوں نہ لعنت کروں کہنے لگی میں نے تو تمام قرآن پڑھا اسمیں تو یہ نہیں ہے آپنے فرمایا لو قراتیہ لوجدتیہ یعنی اگر خیال کر کے پڑھتی تو اسمیں ملتا کیونکہ ان افعال کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور قرآن میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمکو جو حکم دیں اسکو قبول کرلیا کرو اس طرح یہ احکام بھی مدلول قرآن ہو گئے تو دیکھیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کو بھی قرآن ہی میں داخل فرماتے ہیں اور خود قرآن میں بھی ہے فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (جب ہم پڑھائیں تو آپ پیچھے پیچھے پڑھتے رہیئے اسکے بعد اس کے بیان کر دینے کی ذمہ داری تو ہمارے اوپر ہے) تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے اجمال کو بیان فرمایا اور اگر کہیں حدیث میں بھی خفا رہا تو اسکو حضرات مجتہدین نے ظاہر فرما دیا حتیٰ کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ پوری طرح ظاہر ہو گیا اور اس ظہور اکمال کے بعد چونکہ پھر کوئی حاجت باقی نہیں رہی بحکمتِ الٰہیہ چوتھی صدی کے بعد قوت اجتہادیہ کا بھی خاتمہ ہو گیا کیونکہ اب اسکی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ خدا تعالےٰ کی عجیب قدرت ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسکو پیدا کر لیتے ہیں اور جب ضرورت پوری ہو چکتی ہے وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا جب وہ پیدا ہو چکے تو ان کی پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا جب ایک مرد و عورت ہو گئے تو وہ طریقہ بند کر دیا گیا اور زن و شو کے تعلق سے سب لوگ پیدا ہونے لگے۔ رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیدا ہونا وہ خرق

ف یعنی جو حسن کے لئے پیشانی وغیرہ کے بال نوچدے تاکہ پیشانی فراخ معلوم ہو ۱۲ منہ

عادت کے طور پر ہے علیٰ ہذا اور امور میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے چنانچہ میں نے اخبار میں ایک ڈاکٹر کا قول دیکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ بارش اسلئے کم ہوتی ہے کہ درخت کٹ کٹ کر کم رہگئے ہیں تو بارش کثرت سے ہونیکی صورت یہ ہے کہ جہاں جہاں درخت کم ہیں بہت کثرت سے درخت لگائے جائیں۔ اس ڈاکٹر نے تو خلا جانے اسکی وجہ کیا سمجھی ہو گی لیکن راز اس میں یہی ہے کہ جب درخت نہ رہے تو بارش کی زیادہ ضرورت نہ رہی اور جہاں درخت بکثرت ہیں وہاں بارش کی بھی ضرورت زیادہ ہوتی ہے رہی زراعت کی ضرورت اس کا کام نہروں سے نکلنے لگے ہیں تو بارش سے اس کا بھی کم تعلق ہو گیا غرض فلسفہ بھی اسکا اتنا ہے اور ہم تو مانتے ہی ہیں وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ (ترجمہ تم نے مانگا ہم نے دیا) بھی اسی طرف مشیر ہے تو اسی طرح جب تک حضرات مجتہدین کی ضرورت تھی اجتہادی قوت پیدا ہوتی رہی اور جب یہ ضرورت پوری ہو چکی یہ قوت بھی ختم ہو گئی۔ علیٰ ہذا قوت حافظہ کی جس زمانے تک ضرورت تھی اسوقت تک علیٰ وجہ الکمال یہ قوت عطا ہوتی تھی حتیٰ کہ حضرت ابن عباس کو سو شعر کا قصیدہ ایک دفعہ سنکر یاد ہو جاتا تھا۔ حضرت امام ترمذی علیہ الرحمۃ جب نابینا ہو گئے تو ایک مرتبہ آپ کو سفر کا اتفاق ہوا راستہ میں ایک مقام پر پہونچکر آپ نے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے سر جھکا لیا۔ حمال نے اس کا سبب پوچھا تو آپنے فرمایا کہ یہاں ایک درخت ہے اس میں ٹکر لگتی ہے۔ حمال نے کہا کہ یہاں تو کوئی درخت نہیں ہے آپ نے اونٹ کو وہیں رکوادیا اور فرمایا کہ اگر میرا حافظہ اسقدر کمزور ہو گیا ہے تو میں آج سے حدیث بیان کرنا چھوڑ دوں گا اور قریب کے گانوں میں اول بھیجکر دریافت کیا اکثر لوگوں نے وہاں درخت ہونے سے انکار کیا لیکن گانوں کے بعض بوڑھوں نے کہا کہ مدت گذری جب یہاں ایک درخت تھا اور تقریباً بارہ برس ہوئے کہ اس کو کاٹ دیا گیا ہے جب اسکی تصدیق ہو گئی تو آپ آگے بڑھے اسی طرح ابوداؤد میں قصہ ہے ایک راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک اعرابی سے ایک حدیث سنی تھی مدت کے بعد مجھے خیال ہوا کہ اس کے حافظے کا امتحان کرنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ اس نے غلط حدیث مجھ سے بیان کر دی ہو چنانچہ یہ راوی اس کے پاس گئے اور جاکر وہ حدیث پوچھی اس نے وہ حدیث بتلائی اور کہا کہ تم میرا امتحان کرتے ہو میرا حافظہ اس قدر قوی ہے

کہ میں نے ستر حج کئے ہیں اور ہر سال نئے اونٹ پر حج کیا اور مجھ کو یاد ہے کہ فلاں سال فلاں اونٹ پر حج کیا تھا۔ امام بخاری کسی مقام پر تشریف لیگئے وہاں کے عالموں نے آپکا امتحان کرنا چاہا اور سَو حدیثیں الٹ پلٹ کر کے آپکے سامنے پڑھیں آپ ہر حدیث پر لَا اَعْرِفُ فرماتے رہے جب وہ لوگ ختم کر چکے تو آپ نے اُن سب احادیث کو جو انھوں نے سنائی تھیں اسی طرح نقل فرمایا اور ساتھ ساتھ تصحیح کرتے گئے کہ اما الحدیث الاول فھو کذا واما الثانی فھو کذا۔ مگر جب حدیثیں مُدوّن ہوگئیں اور ضرورت اس قدر حافظے کی نہ رہی تو قوت حافظہ کم ہونا شروع ہوگئی غرض انقطاع اجتہاد بعد ظہور اکمال دین کے ہوا ہے اور اجتہاد سے اکمال کے ظہور کا یہی حاصل ہے کہ ان کا قیاس بھی مثل حدیث مبین قرآن و نیز مبین حدیث ہے پس مجتہدین کے قیاسات یا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات یہ سب علوم قرآنیہ ہیں لہٰذا علم القرآن سے علم الشریعۃ مراد ہوگا اور قرآن کو ترک شریعت کا ترک ہوگا اسپر استدلال کرنے کیلئے بھی زیادہ صاف ایک واقعہ یاد آیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مقدمہ کے متعلق فرمایا تھا اَقْضِی بَیْنَکُمَا بِکِتٰبِ اللّٰہِ اور پھر وہ فیصلہ حدیث کے موافق تھا۔ خلاصہ سب کا یہ ہوا کہ قرآن کے موافق بیان وہ ہوگا جو کہ شریعت کے موافق ہو اور بیان میں تقریر اور تحریر دونوں داخل ہیں چنانچہ اسی تعلق کے اعتبار سے قرآن شریف میں ایک مقام پر ارشاد ہے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ یعنی بیان کبھی تو بالبیان ہوتا ہے اور کبھی باللسان۔ یہ دونوں قسمیں بیان ہی کی ہیں۔ اور اس بیان کا نعمت ہونا منافع دنیوی کے اعتبار سے بھی ہے لیکن اس وقت ان کا ذکر نہیں اسوقت خاص منافع دین کا ذکر ہے جن کے اعتبار سے یہ بیان ایک بڑی نعمت دینیہ بھی ہے اور وہ یہ ہیں کہ آج ہم لوگوں میں جو علم موجود ہے کہ اسکی بدولت ہم خدا تعالٰے کے مقبول بندوں میں داخل ہو سکتے ہیں یہ نعمت بیانیہ ہی کی بدولت ہے کیونکہ اگر ہمارے حضرات سلف صالحین علوم کو مبیّن و مدوّن نہ کر جاتے تو ہم کو کچھ بھی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی طرح اگر ہم نفع متعدی کا ثواب حاصل کرنا چاہیں تو اسکی بھی یہی صورت ہے کہ ہم تحریر و تقریر میں پوری مہارت پیدا کریں اور علوم دینیہ دوسروں کو پہنچائیں ہم نے بعضے ایسے اہل علم بھی دیکھے ہیں کہ جن کو تحریر و

تقریر نہیں آتی سوان سے بہت کم لوگوں کو نفع پہونچ سکتا ہے۔ اور پھر بہ نسبت تحریر کے تقریر میں مہارت پیدا کرنیکی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ تحریر سے تو نفع خاص ہوتا ہے یعنی صرف طلبہ اور خواندہ لوگوں کو اور تقریر میں نفع عام ہے جن میں خاص بھی داخل ہیں تو نفع عام و خاص کے اعتبار سے زبان بیان کی دو صورتیں ہیں ایک درس جسکا نفع خاص طلبہ کو ہے اور ایک وعظ جس کا نفع عوام کو ہے اور ان دونوں کا افادہ اسپر موقوف ہے کہ قوت بیانیہ بقدر ضرورت حاصل ہو پس ہمارے طلبہ کو اسوقت ان دونوں کی تکمیل اور مشق کی ضرورت ہوئی یعنی جب وعظ کہا جائے تو اس طرح کہا جائے کہ عوام الناس پورے طور سمجھ جائیں اور جب درس دیا جائے تو اس طرح کہ طلبہ مخاطبین اسکو خوب سمجھ لیں۔ پھر درسیات میں دو قسم کی کتابیں ہیں ایک تو محض آلیات اور دوسری مقاصد۔ آلیات کا خطاب تو بالکل ہی خاص ہوتا ہے کیونکہ اس کو محض طلبہ ہی پڑھتے اور سمجھتے ہیں اور مقاصد کا خطاب عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی یعنی قرآن و حدیث طلبہ کے سامنے بھی پیش کیا جاتا ہے اور عوام الناس کے سامنے بھی پس مشق میں بھی اس کی رعایت کی جائے یعنی جو لوگ صرف آلیات میں مشغول ہیں انسے تو جلسۂ مشق میں صرف اس قسم کی تقریر کرائی جائے کہ وہ اول کتاب کی عبارت پڑھیں اور پھر اس کے مضامین کو حل کر دیں اس سے زیادہ توسیع نہ کریں؀۔ اس میں علاوہ صفائی تقریر کے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کو پڑھانیکا طریقہ معلوم ہو گا ہمارے بزرگوں کا طریقہ پڑھانیکا یہی تھا کہ وہ حضرات محض کتابوں کو حل فرما دیتے تھے اور زائد کچھ نہ بتلاتے تھے ہاں اگر کوئی بہت ہی ضروری بات ہوتی تو اسکو فرما دیتے تھے اور پڑھانے میں ایک اس امر کی بھی رعایت ضروری ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو تو اس کو صاف صاف کہدے

؀ کیونکہ ایسے مبتدیوں کو کوئی خاص مضمون دینے میں جس کو وہ بطور وعظ کے بیان کریں چند خرابیاں ہیں اول تو وہ ان مضامین کو بوجہ قلتِ معلومات صحیح بیان نہیں کر سکتے سو اگر اصلاح کی جائے کہاں تک کی جائے اگر نہ کیجائے تو وہ بھی جہل میں مبتلا رہیں گے اور سامعین بھی غلطی میں پڑینگے دوسرے وہ اپنے اسباق کو چھوڑ کر شب و روز ان ہی مضامین کے جمع کرنیکی فکر میں رہیں گے تیسرے اگر ان کی کتابیں رہ گئیں تو مشاق ہونے کے سبب وہ وعظ کا پیشہ اختیار کریں گے اور جاہل واعظ ہو کر خلق کو خراب کریں گے اور جس طرح ایسے مبتدیوں کو تقریر میں توسیع مضر ہے اسیطرح تحریر میں بھی۔ جیسے اسوقت انکی بھی عادت سی ہو گئی ہے کہ ایسے لوگ بھی اخباروں میں مضمون بھیجتے ہیں۔ ۱۲ منہ

یہ طریقہ حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ سے موروث چلا آتا ہے اس طریق میں یہ نفع ہے کہ طالب علم
کو مدرس پر ہمیشہ وثوق رہتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے جو کچھ تبلایا جا رہا ہے سب صحیح ہے
اور جہاں اس طریقے پر عمل نہیں کیا جاتا بلکہ بات کو بنایا جاتا ہے اور اکثر طالب علم ان کی
ہٹ دھرمی کو سمجھ جاتا ہے تو وہاں مصیبت ہوتی ہے جھک جھک میں سبق بھی خراب
ہوتا ہے اور یہی بد خلقی طالب علم بھی سیکھتا ہے۔ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ اس اقرار غلطی
سے طالب علم بگڑ جاتا ہے حالانکہ محض لغو بات ہے وہ اور زیادہ سنور جاتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا
کہ اسکو مدرس پر وثوق ہو جاتا ہے۔ غرض یہ ہے طرز درس تو تفہیم کے وقت بھی اسکا خیال رکھیں
اور تحقیقات و زیادات کو بالکل حذف کریں کیونکہ یہ تقریریں صرف پڑھانے کا طریقہ تبلانے کیلئے
کرائی جائینگی طبیعت کی جولانیاں دکھلانے کیلئے نہیں اور جو درس کے وقت ایسی فضولیات بیان کیجاتی
ہیں وہ اس لئے بھی مفید نہیں کہ کسی کو کچھ یاد نہیں رہتی اور اضاعۂ وقت کا ضرر جدا جیسے مولوی محمد صدیق
صاحب مرحوم گنگوہی کہتے تھے کہ میں دہلی میں جب مدرس ہو کر گیا تو ولایتی طالب علم میرے سر ہوئے اور سُلّم شروع ہوئی
میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ تحقیق سے پڑھو گے یا سیدھا سادہ کہنے لگے کہ ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے میں نے رات
کو بہت سے حواشی اور شرح دیکھ کر صبح کو نہایت تحقیق سے پڑھایا جب دوسرا دن ہوا اور پھر میں نے یہی سوال
کیا طلبہ نے پھر یہی کہا کہ ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے میں نے کہا کہ اگر تحقیق سے پڑھو گے تو کل جو کچھ میں نے تم کو
تبلایا تھا اسکا اعادہ کر دو تاکہ مجھے یہ اندازہ ہو کہ تم میں قابلیت تحقیق سے پڑھنے کی ہے یا نہیں یہ سنکر
سب کے سب میرا منہ تکنے لگے اور ایک سے بھی اعادہ نہ ہو سکا اسوقت میں نے کہا کہ سنو! تم نے باوجودیکہ
مجھ سے یہ تقریریں سنیں اور بیان نہ ہو سکا اور میں نے باوجود اس کے کہ استاذ نے اس مقام پر مجھکو
درس کیوقت یہ تقریریں نہیں تبلائیں اور میں نے بیان کریں آخر اس کا کیا سبب ہے معلوم ہوا کہ استعداد
کی ضرورت ہے جو کتاب سے پیدا ہوتی ہے ان تقریروں سے کچھ نہیں ہوتا سو کتاب پڑھو تب وہ سمجھے اور
حل کتاب پر کفایت کی غرض یہ ہے کہ مدرس کیلئے لکچر کا طرز بہت مضر ہے میں نے ایک طالب علم کو دیکھا کہ
وہ ایک مبتدی کو میزان پڑھا رہے تھے اور اسکے خطبے میں الف لام تعریف کی قسمیں بیان کر رہے تھے میں نے
کہا کہ مولوی صاحب اس غریب کا کیوں راہ مارتے ہو یہ ان سب مضامین کو جز میزان سمجھیگا اور مشکل سمجھ کر
میزان ہی کو چھوڑ دیگا میں نے اپنے پڑھانے کا طرز ہمیشہ یہی رکھا کہ نفس کتاب کو حل کر دیا اور زوائد کبھی

بیان نہیں کئے اور عمل بھی اس طرز سے کہ بڑے بڑے مشکل مقامات بھی کبھی طالب علموں کو مشکل نہیں معلوم ہوئے۔ صدرا میں مثناۃ بالتکریر کی بحث ایک مشہور بحث ہے۔ کانپور میں ایک مولوی فضل حق طالب علم مجھ سے صدرا پڑھتے تھے جس دن یہ مقام آیا ہے تو میں نے بلا اہتمام معمولی طور سے اسکی تقریر کردی جب انہوں نے اسکو اچھی طرح سمجھ لیا تو میں نے یہ کہا کہ یہی مقام ہے جو مثناۃ بالتکریر کے لقب سے مشہور ہے انکو بڑا تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں آخر سالانہ امتحان میں ممتحن نے یہی مقام سوال میں دیا مولوی فضل حق صاحب مرحوم نے اس مقام کی جو تقریر لکھی تھی وہ ابتک مدرسہ جامع العلوم میں محفوظ ہے، ممتحنین بھی اس پر عش عش کرتے تھے بعض نے یہ کہا کہ ہم نے اس مقام کی تقریر ایسی کبھی نہیں دیکھی۔ تو بڑی کوشش اسکی ہونی چاہیئے کہ کتاب کو پانی کردے نہ یہ کہ اپنی فضیلت کا اظہار کرے۔ یہ تو تقریر آلیات کا طرز ہے اب رہے مقاصد یعنی علوم دینیہ سو انکو چونکہ کبھی عوام کے سامنے بیان کرنیکی نوبت آتی ہے اور کبھی خواص کو خطاب ہوتا ہے اسلئے اسکے متعلق دونوں طرز کی مشق ہونی چاہیئے اور اسکی دو صورتیں ہیں یا تو ہر جلسے میں نصف وقت طرز خاص اور نصف وقت طرز عام کیلئے رکھا جائے یا یہ کیا جائے کہ ایک باری میں طرز خاص کے موافق تقریر ہوا اور دوسری باری میں طرز عام کے موافق تقریر ہو۔ اب بحمداللہ سب ضروری باتیں اسکے متعلق ہوگئیں صرف یہ بات رہی کہ اس جلسے کا نام کیا رکھا جائے سو میرے خیال میں تعلیم البیان اسکا نام بہتر ہے آجکل لوگوں کو ایک یہ خبط بھی بہت بڑھا ہوا ہے کہ جب کوئی کام شروع کریں تو اسکے لئے نام بھی کوئی نیا اور نرالا تجویز کریں۔ اسی خبط کی بدولت ندوہ کو ایک بڑی لغزش ہوئی یعنی نیا نام تلاش کرنیکی وجہ سے علماء کی مجلس کا نام ندوہ تجویز کیا گیا جو کہ راس الجہال عدو اللہ ابوجہل کی اس مجلس کا نام تھا جس کی بنیاد محض اسلئے قائم ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرر رسانی اور آپ کے دین کی اشاعت روکنے کی تدابیر پر غور کیا جائے اور عجب نہیں کہ اسی نام کا اثر ہو کر آج یہ پاکیزہ نور ندوے میں برس رہا ہے۔ اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ غرض بیان کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کردیجائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے من تعلم صرف الکلام لیسبی بہ قلوب الناس لم یقبل اللہ منہ صرفاً ولا عدلاً۔ دیکھئے اسوقت نہ کوئی اس قسم کی انجمن تھی نہ مجالس کا یہ طرز تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکا انتظام بھی اسیوقت فرمادیا کہ جو شخص کلام کے ہیر پھیر اسلئے سیکھے کہ اسکے ذریعے سے لوگوں کے قلوب مسخر کرلیگا تو خدا تعالیٰ اس سے

سی نفل و فرض کو قبول نہ فرمائینگے۔ یہ حدیث فساد غرض پر تنبیہ کے لئے بہت کافی ہے اور اس تتمۂ البیان پر علّمہ القرآن کو مقدم کرنیکی غرض اور زیادہ وضاحت سے ہوگئی جس کا اوپر بھی بیان ہوا ہے۔ میں ان طالب علموں کو چونکانا چاہتا ہوں جو آجکل طرز جدید کو تقریر میں اختیار کرتے ہیں جس کی غرض زیادہ تر یہی ہے کہ جاہ اور وقعت اور قبول عام ہو اسی لئے یہ کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ پُر شوکت ہوں بندشیں چست ہوں حالانکہ اس سے خاک بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تقریروں کی ہستی صرف اتنی ہوتی ہے کہ جیسے مشہور ہے کہ ایک منہار چوڑی کی پوٹ لئے جاتا تھا ایک گنوار نے اسمیں لاٹھی مار کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے کہنے لگا کہ ایک اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ برخلاف پرانی تقریروں کے کہ اگر ان پر پچاس چوٹیں بھی ماریں تو وہ اپنی اسی حالت پر قائم ہیں ان کی قوت میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوتا بلکہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بیباکی اور آزادی سے تقریر کرنا بھی مذموم ہے چنانچہ حدیث میں ہے الحیاء والعی شعبتان من الایمان والبذاء والبیان شعبتان من النفاق اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء کو بذاء کے مقابلے میں اور عی کو بیان کے مقابلے میں فرمایا ہے اور حیا اور عی کو ایک ساتھ جمع کرکے ایمان کے شعبوں میں سے قرار دیا ہے اور بذاء اور بیان کو نفاق کے شعبے قرار دیئے ہیں اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ عی سے وہ عی مراد ہے جو کہ حیا کی وجہ سے ہو اور حیا فی نفسہٖ عام ہے خواہ حیامن الخلق ہو خواہ من الخالق مگر اس مقام پر مقصود حیا من اللہ ہے یعنی ہر لفظ پر یہ سوچے کہ کہیں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ نکل جائے اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو بیان حدود شرعیہ سے متجاوز ہو وہ علمہ البیان میں داخل نہیں کیونکہ وہ بیان جس کا آیت میں ذکر ہے نعمت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور حدیث میں ایسے بیان کو جس کا منشاء بذاء ہو نفاق میں داخل فرمایا ہے اور قرآن و حدیث میں تعارض ہو نہیں سکتا پس معلوم ہوا کہ جو بیان مذموم ہے وہ نعمت نہیں لہٰذا ایسے بیان سے بچنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہر امر میں اتباع کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین تمت بالخیر

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

پانچواں وعظ ملقب بہ

آثار المحبۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی نمبر۱

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

پانچواں وعظ ملقّب بہ

آثار المحبّۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھکر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کسنے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
قصبہ کھتولی مسجد حلوائیاں	۴ ر رجب ۱۳۳۰ھ وقت شب۔	تقریبًا ۲۔ گھنٹہ ؍ ؍	کھڑے ہو کر ؍ ؍	مومن کو محبت الٰہی کی تکمیل کے لئے پوری اطاعت ضروری ہے۔	مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم	غالبًا ایکہزار آدمی ہونگے ؍ ؍	ناخواندہ لوگ زیادہ تھے۔ ؍ ؍

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (ایمان والے اللہ تعالیٰ سے بہت زبردست محبت رکھتے ہیں) یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے ایک نہایت ضروری مضمون جس کے جاننے کی سب کو ضرورت ہے بیان فرمایا ہے اور چونکہ ضرورت مشترک ہے تمام مسلمانوں میں اور پھر ہر وقت کے اعتبار سے ضروری ہے لہٰذا یہ بیان بہت سے مضامین کے قائم مقام ہوگا جن کے لئے مختلف اوقات میں متعدد جلسوں کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ اسوقت یہاں بیان کرنے کا پہلا موقع ہے اور پھر خدا جانے کب موقع ملے اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ایسا مضمون اختیار کیا جائے جو کہ جامع ہو چنانچہ یہ مضمون اسی قبیل کا ہے اور قرآن شریف میں اس قبیل کے اکثر مضامین ہیں نیز یہ بھی ارادہ ہے کہ نہایت سہل عنوان سے اس کو بیان کیا جائے کیونکہ یہاں اکثر لوگوں کو یہ پہلا موقع وعظ سننے کا ہوگا اور دقیق مضامین سمجھنے کے لئے اکثر پہلے سے مناسبت کی ضرورت ہوتی ہے خاص کر اسلئے بھی کہ اس وعظ میں عورتوں کا بھی مجمع ہے اور دقیق مضامین اُن کے فہم سے بالا ہیں اسلئے دقیق مضامین کو بیان نہ کیا جائیگا بلکہ بہت سہل مضامیں ہونگے۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں بلا تخصیص مسلمانوں کی ایک شان کو بیان فرمایا ہے اور ہر چند کہ عنوان کے اعتبار سے یہ جملہ خبریہ ہے لیکن غور سے معلوم ہوگا کہ مراد اس سے ایک انشاء ہے اور قرآن مجید میں جس قدر بھی جملہ خبریہ ہیں اُن سے کوئی نہ کوئی انشاء ہی مراد ہے۔ بلکہ روزمرہ کے معاملات میں بھی دانشمندوں کے کلام میں جملہ خبریہ سے انشاء ہی مراد ہوتی ہے کیونکہ مقصود ہر خبر سے کوئی نتیجہ ہوتا ہے اور وہ انشاء ہوتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی کے مرض کی خبر دے تو ہر عاقل سمجھتا ہے کہ مقصود اس سے یہ ہے کہ اس کی خبر لو یا اس کے ساتھ ہمدردی کرو اسی طرح ہر خبر کو دیکھ لیجئے تو ہر کلام مفید میں خبر سے مقصود انشاء ہوتی ہے اور جب ادنیٰ درجے کے حکماء کے کلام میں ایسا ہے تو خدا تعالیٰ کے کلام میں تو بدرجہ اولیٰ ایسا ہوگا بس یہ کلام بھی جو اس موقع پر پڑھا گیا ہے اگرچہ بظاہر خبر ہے

لیکن بقاعدۂ مذکورہ اس سے بھی ایک نتیجہ مقصود ہے اور وہ جملہ انشائیہ ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا نتیجہ کا پتہ انشاء اللہ اس آیت کے ترجمہ اور تفسیر سے معلوم ہوگا اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ نہایت غور کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں کہ اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ خدا تعالےٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہیں اوپر سے بعضے لوگوں کی حالت بیان ہوتی چلی آرہی ہے اگرچہ اس وقت اس کے بیان کرنیکی ضرورت نہیں لیکن چونکہ یہ جملہ پہلے جملے پر معطوف ہے اس لئے توضیح ارتباط کے لئے ترجمہ میں اس کی بھی ضرورت ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ خدا کے سوائے ایسے شریک بھی ٹھہراتے ہیں کہ جن کو خدا کی برابر محبوب رکھتے ہیں اور جو لوگ ایماندار ہیں وہ خدا تعالےٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہیں حاصل جملہ کا یہ ہوا کہ مسلمان خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہوتے ہیں ترجمہ سنکر معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس مقام پر ایک جملہ خبریہ ارشاد ہوا ہے لیکن بقاعدۂ مذکورہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خبر سے ایک نتیجہ مقصود ہے اور وہی اس خبر کا ثمرہ ہے لیکن بصورت خبر اسلئے بیان فرمایا کہ یہ حکم بہت ہی مہتم بالشان ہو جائے جیسا کہ علم بلاغۃ میں ثابت ہو چکا ہے کہ اس تعبیر میں یہ نکتہ ہوتا ہے کہ مخبر صادق کے کلام میں خبر تو ضروری الوقوع ہے ہی پس انشاء کو اس کی صورت میں لانا تحریض ہے سامع کو کہ اس کو ضرور واقع کرے تاکہ صورت عدم وقوع کی نہ ہو اور وہ نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ کی محبت میں نہایت مضبوط ہونا چاہیئے اور خدا تعالےٰ کی برابر کسی کی محبت اس کے دلمیں نہونی چاہیئے۔ اب دیکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ جو شان مومن کی ہے خدا تعالےٰ نے بیان فرمائی ہے وہ ہم میں پائی جاتی ہے یا نہیں یعنی ہم خدا تعالےٰ کی محبت میں پورے طور سے مضبوط ہیں یا نہیں اگر پورے طور سے مضبوط ہیں تو ہم وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے پورے مصداق ہیں ورنہ جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجے کا ایمان بھی ہوگا یعنی یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ کسی مسلمان کو خدا تعالیٰ سے بالکل ہی محبت نہیں تھوڑی بہت تو سب کو ہی ہے کیونکہ یہ اس آیت کی رو سے

ایمان کے لئے لازم ہے اور انتفاء لازم مستلزم ہوتا ہے انتفاء ملزوم کو پس اگر محبت کی بالکل نفی کیجائیگی تو اس کے ساتھ ہی ایمان کی بھی نفی کر دینی پڑیگی حالانکہ ایمان بحمد اللہ ہم سب میں پایا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ محبت سب میں ہے بلکہ محبت کے ساتھ اس کی شدت بھی ہر مومن میں پائی جاتی ہے اسی آیت کی رو سے لیکن خود شدت کے بھی مراتب مختلف ہیں کہ کسی میں بہت شدت ہے اور کسی میں اس سے کم۔ اور اسی مناسبت سے ایمان کے مراتب بھی مختلف ہونگے باقی ضعف محبت کسی مسلمان میں پایا ہی نہیں جاتا اور نہ پایا جاسکتا ہے کیونکہ شدت محبت کی نفی سے بھی ایمان کی نفی ہوجائیگی تو اس اعتبار سے مراتب کا اختلاف شدت بلکہ اشدیت ہی میں رہا یعنی کسی کو اشد محبت ہے اور کسی کو اشد سے بھی اشد۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اشدیت محبت ہر مسلمان کے لئے لازم ہے اب اپنی حالت کو دیکھیے کہ خدا تعالےٰ کے ساتھ آپ کو اشدیت محبت کس درجے کی ہے اور اس میں کلام ہی نہیں کہ آپ کو اشدیت محبت حاصل ہے اور یہ بالکل نئی بات ہے ورنہ سب واعظین یہی کہتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں تو گویا میں نے آپ کو یہ نئی بشارت دی ہے یعنی اگر کوئی شخص فاسق فاجر گنہگار شرابی بھی ہے تو اس میں بھی اشدیت محبت کی ہے لیکن باوجود اس اشتراک کے پھر بھی مراتب اس کے مختلف ہیں کیونکہ ہر اشدیت برابر نہیں ہوتی اور اشتراک اشدیت اگرچہ اسوقت محسوس نہیں ہوتا لیکن امتحان کے موقع پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے مثلاً اگر کسی مسلمان کے سامنے کوئی شخص خدا تعالےٰ کی شان میں یا اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے تو اگرچہ وہ مسلمان نہایت درجہ کا ضعیف الایمان ہو لیکن اس گستاخی کو سُنکر اس قدر بے چین ہو جاتا ہے کہ ماں کی گالی سننے سے بھی اسقدر بیچین نہیں ہوتا اور اس درجہ کی بیچینی بدون اشدیت محبت کے نہیں ہوسکتی پس معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو خدا تعالےٰ سے اشد محبت ہے اگر ضعیف محبت ہوتی تو اس قدر بیچین نہ ہوتا۔ گو نہ بیچینی کسی نہ کسی مرتبے میں اس وقت بھی ہوتی اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کا ایک پیسہ گم ہوجائے تو اس کو بھی

قلق ہوتا ہے اور اگر کسی کا ایک روپیہ گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور کسی کی گنی گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور دس گنی گم ہو جائیں تو اس کا بھی قلق ہوتا ہے لیکن پیسے کے گم ہونیکا قلق ضعیف ہوتا ہے اور روپے کے گم ہونیکا قلق شدید اور گنی کے گم ہونیکا قلق اشد ہوتا ہے اور دس گنی کا اشد سے بھی اشد ہوتا ہے غرض کوئی فاسق بھی شدت محبت سے خالی نہیں ہے لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں فسق کی اجازت دیتا ہوں لیکن جو بات واقعی ہے اس کو ظاہر کیا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص کہے کہ ہم تو خود اسلام کے ساتھ مسخرا بن کیا کرتے ہیں اور ہنسا کرتے ہیں اور ہم کو ذرا بھی بے چینی نہیں ہوتی تو ایمان کے لئے شدت محبت لازم کہاں ہوئی تو میں کہونگا کہ خدا کی قسم اگر کسی شخص کی یہ حالت ہے تو وہ ہرگز مسلمان نہیں اگرچہ وہ اپنی زبان سے اپنے کو مسلمان کہے اور اگرچہ وہ کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہو اور اسوقت ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کو ذرا بھی پروا اس بات کی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے وطن میں ایک ماسٹر عارضی طور پر آئے ہوئے ہیں اور داڑھی منڈاتے ہیں ان سے جب داڑھی رکھنے کو کسی نے کہا تو کہنے لگے کہ داڑھی تو بکرے کے ہوا کرتی ہے افسوس ہے کہ لوگ مولویوں کو فتوی تکفیر میں متعصب بتلاتے ہیں لیکن ان کو انصاف کرنا چاہیئے کہ کیا یہ بات بھی کفر کی نہیں میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ ایک ایسا شخص جس کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈاڑھی رکھی ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام ڈاڑھی رکھتے تھے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سب نے رکھی اور پھر وہ یہ کہے کہ داڑھی تو بکرے کے ہوتی ہے کیا آپ لوگ انصاف کی رو سے اس کو مسلمان کہیں گے دیکھو اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرنے لگے تو وہ کتنا بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے تو کیا یہ توہین عدالت کی توہین کی برابر بھی نہیں ہے ہر معنی شناس جانتا ہے کہ عدالت کی توہین سلطنت کی توہین ہے اسی طرح اسلام کے کسی حکم کی توہین شارع علیہ السلام اور بانی اسلام یعنی خدا تعالیٰ کی توہین ہے پس اگر خدا تعالیٰ کی توہین کرنیکے بعد بھی ایمان نہیں گیا تو گویا ایمان لڑ کی ہیں اور گوند سا کر دیا گیا

چپکا ہے جو کسی طرح چھوٹتا ہی نہیں۔ صاحبو! اسلام ایسا سستا اور اتنا بے غیرت نہیں ہے کہ اس کو کوئی شخص دھکے بھی دے اور وہ نہ ٹلے۔ آج اکثر مسلمان روزے کو نماز کو فاقے اور اٹھک بیٹھک کہتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں حالانکہ کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا (بڑا ہے وہ کلمہ جو اُن کے موہنوں سے نکلتا ہے وہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں کہتے) آخر ضابطہ اور حدود بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں یہ اچھا اسلام ہے کہ تمسخر اور اہانت کرنے سے بھی نہیں جاتا۔ افسوس ہے کہ اپنی ماں کے متعلق تو دوسروں سے بھی بیموقع الفاظ نہ سن سکیں اور اسلام کے متعلق خود خرافات اور تمسخر پر آمادہ ہوں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسے لوگوں کا نکاح اگر کسی مسلمان عورت سے ہوا ہے تو اس قسم کے تمسخر سے وہ نکاح فوراً ٹوٹ گیا اور جو اولاد ان سے اس کے بعد پیدا ہوگی وہ سب ولد الزنا ہوگی۔ صاحبو! کھلی ہوئی بات ہے مگر لوگوں کو اس پر ذرا التفات نہیں ہے اور نظیر اس کی وہی ہے کہ اگر حدِ السلطنت کی توہین کی جائے تو وہ سلطنت اور گورنمنٹ کی توہین کی جاتی ہے سو کیا وجہ کہ دفعات اسلام میں سے کسی دفعہ کی توہین یا کسی نبی کی توہین خدا تعالےٰ کی توہین نہ سمجھی جائے پس یہ شبہ جاتا رہا کہ تمسخر کے بعد بھی ہم تو مسلمان ہیں اور رفع اس طرح ہوا کہ وہ مسلمان نہیں اگرچہ کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے ہوں اور یہ مسئلہ بلا غبار ثابت رہا کہ جو مسلمان ہوگا اس کو خدا تعالےٰ سے شدت محبت ضرور ہوگی لیکن اس میں درجات متفاوت ہوں گے مثلاً ایک شدت یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کے متعلق گستاخی سُنکر بیچینی ہو جائے دوسرا درجہ یہ ہے کہ محض خدا تعالےٰ کا ذکر ہی سُنکر قلب میں ایک ولولہ پیدا ہو اور نافرمانی کے چھوڑنے کی فکر ہو جاتے اور یہ سوچے کہ خدا تعالےٰ کے یہ انعامات مجھ پر ہیں اور اس قدر فضل وکرم ہے حالانکہ اگر دنیا میں کوئی چار پیسے ہم کو دیتا ہے تو اس کی کس قدر اطاعت کیجاتی ہے تو جب چار پیسے دینے والے کی اتنی اطاعت ہوتی ہے تو خدا تعالےٰ کی اطاعت تو اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیئے اور اس کی نافرمانی کا تو وسوسہ بھی دل میں نہ آنا چاہیئے غرض

خدا تعالیٰ کا نام اور احکام سُن کر یہ خیالات اطاعت کے پیدا ہوتے مگر چند روز کے بعد پھر ذہن سے نکل گئے ایک درجہ یہ تھا۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس خیال کے ساتھ ہی اس پر عمل بھی شروع کر دیا یعنی جس قدر اسباب معاصی تھے سب کو ترک کر دیا اگر اپنے پاس تصویر تھی ان کو چاک کر ڈالا اور اگر حرام کی کمائی تھی اس کو مالکین کو واپس کر دیا اگر مالک نہ مل سکے تو اس کو مالکین کی طرف سے صدقہ کر دیا اگر نماز نہ پڑھتے تھے نماز شروع کر دی پاجامہ اگر ٹخنوں سے نیچا تھا اس کو کاٹ کر ٹخنوں سے اونچا کر لیا اور یہ پختہ قصد کر لیا کہ اب کوئی حرکت خلاف حکم نہ کریں گے اور اس قصد کو نباہ دیا یہ درجہ سب میں بڑھ کر ہے اور اس کے بہت سے اور مراتب بھی نکل سکتے ہیں لیکن میں نے قصر مسافت کے لئے مثال میں کم کر دیئے کہ عاقل آدمی خود ہی سب مراتب کو سمجھ لیگا حاصل یہ ہوا کہ شدّت محبت لازم ایمان اور اس کے مراتب مختلف اور جس مرتبے کی شدت اسی مرتبے کا ایمان ہوگا۔ اور یہی بات خدا تعالےٰ کو اس آیت میں تبلانا ہے اور مقصود اس تبلانے سے یاد دلانا ہے کہ تم شدّت محبت اختیار کرو جس کی علامت اطاعت کاملہ ہے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنے نوکروں سے یہ کہنے لگے کہ جو ہمارا وفادار نوکر ہوگا وہ ہماری اطاعت کرلیگا تو ہر عاقل سمجھتا ہے کہ اطاعت اختیار کرو ورنہ جس قدر اطاعت میں کمی ہوگی اسی قدر وفا میں بھی کمی سمجھی جائیگی تو خدا تعالےٰ نے بھی اسی خبر کے ذریعے سے ہم کو متنبہ کیا ہے کہ تم شدت محبت اختیار کرو ورنہ اسی ضعیف درجے کا تمہارا ایمان بھی ہوگا۔ اب غور کی بات یہ ہے کہ آپ اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھئے کہ آپ میں کس درجہ کی محبت ہے سو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے کیونکہ اس کے کچھ آثار ہوتے ہیں کہ وہ آثار جس مرتبے میں پائے جائیں محبت بھی اسی مرتبے میں ہوگی۔ اور یہ گویا محبت کے پرکھنے کی کسوٹی ہے کہ جس طرح چاندی کا کھوٹا کھرا ہونا کسوٹی سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح محبت کا کم اور زیادہ ہونا اُن آثار سے معلوم ہوگا اور یہی کسوٹی ہے جس کو حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ نے بیان فرمایا ہے کہ ؎

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں تا سیہ روئے شود ہر کہ درو غش باشد

(اگر تمہارے پاس تجربے کی کسوٹی ہے تمہیں خوش ہونا چاہیئے تاکہ جو شخص جھوٹ بولتا ہو وہ تجربے کے بعد جب اس کا جھوٹ ظاہر ہو جائے تو روسیاہ اور شرمندہ ہو)

حقیقت امر یہ ہے کہ بدون امتحان کے پتہ نہیں چل سکتا اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اپنے کو جانچا ہے یا نہیں اگر نہیں جانچا تو اب جانچنا چاہیئے اور اپنے افعال و اقوال کو غور سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ شدت محبت کے آثار ہیں یا نہیں اور اگر آثار یوں سمجھ میں نہ آئیں تو آثار دنیا کے نظائر پر قیاس کر کے دیکھئے یعنی اگر دنیا میں کسی مرد یا عورت سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے کیا آثار ہوتے ہیں سو آثار اس کے یہ ہوتے ہیں کہ اول تو ہر وقت کی یاد کہ کوئی وقت ایسا نہیں گذرتا جس میں محبوب کی یاد سے دل پر نہ ہو دوسرے نہایت خوشی سے اطاعت کرنا اور اس میں ذرا بھی کلفت نہ ہونا مثلاً اگر وہ گھر بھر بھی مانگ لے تو اس میں کچھ بھی دریغ نہیں ہوتا پس جب یہ دو چیزیں آثار محبت سے ہیں تو انہیں کو پیش نظر رکھ کر اپنے کو جانچ لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ چوبیس گھنٹے میں کتنی دیر آپ خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں خاص کر جبکہ ہر وقت اس کی نعمتوں میں بالکل سرتاپا غرق بھی رہتے ہو جن سے ہر وقت یاد آجانا طبعاً بھی ضروری ہے۔ صاحبو! یہ باتیں بھولنے کی نہیں ہیں کہ خدا کے دیئے ہوئے مکانوں میں رہتے ہو اس کا دیا ہوا کھانا کھاتے ہو اس کی دی ہوئی اولاد سے متمتع ہوتے ہو لیکن اس کو یاد نہیں کرتے دیکھو اگر کوئی دوست تم کو دو آم بھیجدے تو ان کو کھاتے وقت دل میں اس کا تصور ضرور ہی رہتا ہے ذرا انصاف سے بتلائیے خدا تعالیٰ کا دیا ہوا کھانا دونوں وقت تمہارے سامنے آتا ہے لیکن تم نے کسی دن بھی کھاتے وقت خدا تعالیٰ کو یاد کیا ہے سارا کھانا کھا جائیں گے لیکن کسی لقمے پر بھی یہ خیال نہ ہو گا کہ یہ خدا کی دی ہوئی نعمت ہے یہ دوسری بات ہے کہ بوجہ عقیدہ درست ہونے کے کسی کے پوچھنے پر ہم کہدیں کہ یہ خدا تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے کیوں صاحبو! پھر کیا اسی منہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے ... محبت بدرجہ

مطلوبہ ہے اور ہم کامل ایماندار ہیں دیکھئے کہ اس کی خاصیتیں کس حد تک ہم میں پائی جاتی ہیں اور اگر کوئی کہے کہ ہم میں محبت کے خواص مشترک تو پائے جاتے ہیں جو ادنیٰ مسلمانوں میں بھی مشترک ہیں مثلاً یہی کہ ان کی شان میں گستاخی سنکر بیچین ہوجانا تو میں کہونگا کہ کیا آپ کو ان مشترک خواص پر قناعت ہے۔ صاحبو! ذرا غور کر کے دیکھو کہ تمہارے پاس سوائے دولت ایمان کے اور کیا دھرا ہے پھر اگر اس کے بھی ادنیٰ درجے پر قناعت کرلو تو غضب ہے اور اگر کسی کو دولت دنیا پر ناز ہو اور اس لئے دولت ایمان کے کمال کا طالب نہ ہو تو یاد رکھو کہ یہ دولت بہت جلد تم سے چھوٹ جانے والی ہے مثلاً چوری ہوگئی آگ لگ گئی اور یا تم اس سے بہت جلد چھوٹنے والے ہو جبکہ مرنے تک تمہارے پاس رہی دنیا میں سب سے بڑا خوش قسمت وہ شخص سمجھا جاتا ہے کہ مرتے دم تک دولت اس کے پاس رہے لیکن پھر بھی مرتے وقت آخر چھوڑنا پڑیگی اور اس وقت دس منٹ بلکہ ایک سکنڈ کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ صاحبو! کیا کوئی عقلمند آدمی ایسے سرمایہ کو جو اتنے جلدی چھوٹنے والا ہو اور بعد کو ایسے لوگوں کے پاس جانے والا ہو جو آپکے دشمن ہوں اور آپ اپنا سرمایہ انکو دینا پسند نہ کرتے ہوں سرمایہ کہہ سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ جب یہ سرمایہ قابل اعتبار نہیں تو اب بتلائیے کہ ابدالآباد تک کام آنے والا اور ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے والا سرمایہ سوائے ایمان کے اور کیا ہے اور چونکہ یہ جلسہ مسلمانوں کا ہے اس لئے اسکے منوانے کے لئے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں یہ مثل اصول موضوعہ کے پیشتر سے مسلم ہے تو معلوم ہوا کہ ایمان ہی ایسی دولت ہے کہ چند روز کے بعد یہ قبر میں ساتھ دیگا اور اس کے بعد پلصراط پر کام آئیگا اس کے بعد میزان کے تولنے پر کام آئیگا تو اگر اس کا کمال مطلوب نہ ہو تو ستم ہے اس لئے دیکھنا ضرور ہوا کہ اس کا کمال ہم کو حاصل ہے یا نہیں مثلاً یہی دیکھ لو کہ جو ایمان ہمارے پاس ہے آیا وہ اس قابل ہے کہ ان مواقع مذکورہ میں ساتھ دے سکے یا نہیں اگر ہمارا ایمان ایسا ہے اور ہم کو یہ اُمید ہے کہ اس کی بدولت ہم پلصراط وغیرہ پر اول ہی مرتبہ سُرخرو

ہو جائیں گے تو نہایت خوشی کی بات ہے اور اس کا اس قابل ہونا اس کے خواص اور آثار سے معلوم ہوگا اور اگر ہمارا ایمان ایسا نہیں ہے تو کیا کسی کو دوزخ کے سانپ بچھو اور طرح طرح کی تکالیف کی برداشت ہے اگر کوئی اس کا مدعی ہو تو ذرا مہربانی کر کے ہمارے سامنے ایک معمولی چراغ میں اپنی ایک انگلی جلا کر دکھلا دے اور اگر اس کی تاب نہیں ہے تو دوزخ کی آگ کی تاب کیونکر ہوگی اور جب اسکی تاب نہ ہوگی تو اس سے بچنے کا کیا سامان آپ نے فراہم کیا ہے اور کیا کیا تدابیر اس کے لئے اختیار کی ہیں صاحبو! اگر کوئی شخص درد گردے میں مبتلا ہو جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور وہ اس کے ازالے کی کتنی تدبیریں کرتا ہے حالانکہ درد گردے کا مآل اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ زندگانی کا خاتمہ کر دے اس کے بعد پھر ابداً لآباد تک اس سے نجات خود بخود ہو جاتی ہے برخلاف اس تکلیف کے کہ اگر یہ شروع ہو گئی تو یا تو بالکل ختم نہ ہوگی اور یا اگر شمۂ ایمان کی وجہ سے ختم بھی ہوئی تو خدا جانے کتنی مدت کے بعد جہاں کا ایک دن ہزار برس کی برابر ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ہ تو اگر چار برس کی سزا بھی ہو گئی تو چار ہزار برس ہوئے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ غفور رحیم بھی وہ سب تکالیف سے نجات دیدینگے لیکن اگر یہ ہوس کافی ہے تو تھوڑا سا سنکھیا بھی کھا لینا چاہیئے کیونکہ خدا تعالےٰ غفور رحیم ہیں وہ بچالیں گے اور اگر سنکھیا کھا کر مرجانا خدا تعالےٰ کے غفور رحیم ہونیکے منافی نہیں تو گناہ کر کے دوزخ میں جانا بھی اس کے غفور رحیم ہونے کے خلاف نہیں ہے پس اس کا بچاؤ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایمان اور محبت کی تکمیل اس کے آثار سے کی جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ اطاعت پوری طرح کی جائے اور گناہ کو ترک کیا جائے صاحبو! کس قدر افسوس ہے کہ دنیا کے مکان کی تکمیل میں تو اس قدر انہماک کہ اگر ایک پرنالہ بھی رہ جائے تو چین نہ آئے اور قصر ایمان کی بنیاد تک ضعیف ہونے پر بھی پروا نہیں اور کچھ خیال نہیں کیا جاتا علیٰ ہذا اگر کسی کپڑے کی آستینیں ناقص رہ جائیں تو اس کے لئے

دس جگہ سے کپڑا تلاش کریں گے اور بیکر ایمان کے ہاتھ پانو قلم ہو جانے پر بھی غم نہیں غرض آپ صاحبوں کے نزدیک ہر چیز کی تکمیل کی ضرورت ہے مگر ایمان کی تکمیل گویا محض بے سود ہے حالانکہ اس کی تکمیل سب سے اول ضروری ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ وہ سرمایہ ہے کہ دونوں جہان میں ساتھ رہنے کے علاوہ دونوں جہان کی راحت بھی اسی سے ہے آخرت کی راحت تو سب ہی جانتے ہیں کیونکہ ایمان ہی کی بدولت دوزخ سے نجات ہوگی۔ لیکن ایمان کے کامل ہونے سے دنیا کی بھی راحت ہوتی ہے یہ بات شاید ابھی سمجھ میں نہ آئی ہو کیونکہ ظاہراً یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس قدر علم وعمل والے لوگ ہیں اور جو زیادہ پکے ایماندار کہلاتے ہیں دنیوی مصیبت میں وہی زیادہ گرفتار نظر آتے ہیں۔ کوئی افلاس میں مبتلا ہے کسی پر مخالفین کا نرغہ ہے۔ علیٰ ہذا بڑے بڑے متقی فقر و فاقے میں اکثر مبتلا رہتے ہیں تو ان کو کیا خاک راحت ہوئی لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ راحت کس چیز کا نام ہے اگر آپ دنیا کے حالات اور دنیاوی نظائر میں غور کریں تو اس کا پتہ چل جائیگا اول میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ راحت کی حقیقت کیا ہے آیا ظاہری ٹیپ ٹاپ چہل پہل یا کہ قلب کا اطمینان سو ظاہر ہے کہ محض ٹیپ ٹاپ کا نام راحت نہیں کیونکہ اگر کسی شخص کے پاس دس گانوں بھی ہوں بڑے عالیشان قصر بھی رہنے کے لئے ہوں حشم خدم بھی ہوں لیکن سلطنت کی طرف سے اس کو یہ حکم ہو جائے کہ ایک ماہ کے بعد تم کو پھانسی دیجائیگی کیا کوئی عقلمند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ساز و سامان اس خبر سننے کے بعد کچھ بھی اس شخص کے لئے موجب راحت ہو سکتا ہے بلکہ اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسوقت میں یہ سامان اور زیادہ کلفت اور حسرت کا موجب ہوگا تو معلوم ہوا کہ یہ سامان موجب راحت نہیں بلکہ گاہے باعث کلفت ہے اس کے مقابلے میں ایک مزدور کو لیجئے جو کہ دو آنے روز کماتا ہے لیکن اس پر نہ تو کوئی دفعہ جرم کی عائد ہے نہ اس کو کوئی دوسرا غم ہے اب اگر اس رئیس سے

کہا جائے کہ تم اپنی ساری جائداد اس مزدور کو دیدو اور دو آنے روز لینا گوارا کرو تو تم کو پھانسی سے نجات ہوجائیگی تو کیا وہ اس پر راضی نہوگا مزدور راضی ہوجائیگا اور اگر اس مزدور سے پوچھا جائے کہ تم کو اس شخص کی ساری جائداد دی جاتی ہے لیکن ایک مہینہ کے بعد تم کو پھانسی دی جائیگی۔ تو کیا یہ مزدور اس جائداد کو لینا گوارا کرے گا ہرگز نہیں پس مزدور کا انکار اور اس رئیس کی رضا صاف تبلا رہی ہے کہ راحت اصل میں اطمینان قلب کا نام ہے نہ کہ ظاہری چہل پہل اور بھڑک کا۔ اب اس کے بعد آپ دیکھ لیجئے کہ حضرات اہل اللہ پر اگر ظاہری کوئی مصیبت بھی آتی ہے تو اگرچہ طبعًا کچھ اثر ہو لیکن پریشانی نہیں ہوتی نہ وہ مضطر ہوتے ہیں بلکہ وہ اندر سے نہایت خوش ہوتے ہیں۔ برخلاف اسکے اگر اہل دنیا پر ایک صدمہ بھی آجائے تو کھانا پینا اور آرام سب چھوٹ جاتا ہے اور یہ محض نقص ایمان کی وجہ سے ہوتا ہے تو وہ شبہ جاتا رہا کہ ایمان والے بھی تکلیف میں ہوتے ہیں پس معلوم ہوا کہ ایمان کامل دنیا میں بھی موجب راحت ہے۔ تو پھر غضب ہے کہ ایسے نایاب اور عجیب و غریب سرمایہ کی تکمیل کی طرف سے اس طرح بے پروائی کی جاوے۔ صاحبو! آپ کو اس تکمیل کی فکر کرنی چاہیئے اس طرح سے اس کے علامات و آثار یعنی ذکر دائم اور اطاعت دائمہ اپنے اندر پیدا کرنیکی کوشش کرنی چاہیئے لیکن ذکر اس کو نہیں کہتے کہ محض زبان سے رٹ لیا اور دل میں وہی دنیا کی خرافات بھری رہیں ایسے ذکر سے کچھ نفع نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

عہ مراد اس ذکر لسانی سے وہ ذکر لسانی ہے جس سے ذکر قلبی کا پیدا ہونا بھی مقصود نہو کہ یہ ذکر کچھ مفید نہیں اور اگر سر دست محض ذکر لسانی ہو لیکن اس قصد سے ہو کہ اس سے ذکر قلبی پیدا ہوجائے تو تجربہ ہوا ہے کہ یہ ذکر لسانی بھی مفید ہے۔ کما صرح بہ فی تربیۃ السالک ۱۲ سعید

(زبان پر تسبیح اور دل میں بیل گدھے یعنی دنیا کی محبت ایسی تسبیح جو صرف دکھاوے کیلئے ہو بھلا کس طرح موثر ثابت ہو سکتی ہے)

یہ یاد تو ایسی ہے جیسے کوئی طوطے کو نبی جی بھیجو یاد کرائے کہ وہ ہر وقت اسی کو رٹا کرے مگر جب بلی آکر دبائیگی تو سوائے ٹاں ٹاں کے کچھ بھی یاد نہ آئیگا یہ ذکر بھی ایسا ہی ذکر ہے۔ تو وہ ہے کہ دل اور زبان سب اسی میں محو ہو جائیں کم سے کم ایسی حالت تو ہو جو ایک مرد اور بازاری عورت کے ساتھ ہوتی ہے۔ گو یہ حالت تدریجاً ہو مگر اس کا قصد تو رہنا چاہیئے پس ایک اثر تو کمال ایمان و محبت کا یہ ہے دوسرا اثر اس کا سہولت و طاعت ہے سو اس کو بھی دیکھ لیجئے کہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کہ ہماری کیا حالت ہوتی ہے کیا اکثر لوگوں کو اس کا امتثال گراں نہیں ہوتا واللہ بعض کی تو یہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی نے گولی مار دی ہو اس سے زیادہ اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ ہر عمل ہر خلق میں ہم نے شریعت کے خلاف ایک نرالا طریقہ تجویز کر رکھا ہے گویا شریعت اسلام کے مقابلے میں ایک دوسری شریعت بنائی ہے اور اس کو اپنے لئے فخر اور ہنر سمجھا جاتا ہے اس کے متعلق اگر ایک ایک جزئی کو بیان کیا جائے تو بہت سا وقت صرف ہو لیکن میں مختصر طور پر بیان کرتا ہوں مثلاً شادی اور غمی کی رسمیں ہیں کیا آج کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ رسمیں شریعت کے خلاف نہیں ہیں اور اگر واقعی کسی کو معلوم نہیں تو اس کو چاہیئے کہ اس قسم کی کتابیں مطالعہ کرے جو اس کے بیان کرنے کے لئے تصنیف کی گئی ہیں یا جو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں وہ اسی وقت کچھ سن لیں سنئے شادی غمی کی رسمیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جنکا قبیح ہونا نہایت ہی ظاہر ہے اور شرفاء و ثقات نے ان کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اب صرف اسافل اور فساق الناس اس میں مبتلا ہیں مثلاً ناچ رنگ وغیرہ۔ اور بعض وہ رسمیں ہیں کہ ان کا قبح اتنا ظاہر نہیں ان میں عوام و خواص قریب قریب سب مبتلا ہیں اور ان کو بالکل جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات

ادعائے تقویٰ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شادی میں کونسی رسم کی ہے بنہ ہمارے ہاں ناچ ہوا اور نہ باجا منگایا گیا پھر ہم نے کیا گناہ کیا سو میں تبلاتا ہوں کہ آپنے کیا گناہ کیا ہے لیکن پہلے مجھے یہ تبلا دیجئے کہ گناہ کہتے کس کو ہیں ظاہر ہے کہ جو امر شرعًا ممنوع ہو وہ گناہ کہلاتا ہے خواہ وہ ناچ ہو یا کوئی دوسرا امر ہو کیونکہ ناچ بھی تو اسی واسطے حرام ہوا کہ شریعت نے اس کو حرام اور جرم قرار دیدیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ناچ کے علاوہ دوسری رسوم کو بھی شریعت نے جرم قرار دیا ہے یا نہیں اس پر مفصل گفتگو تو اصلاح الرسوم[1] میں ملیگی میں مختصر اسوقت بقدر ضرورت بیان کئے دیتا ہوں یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حدیث میں فرمایا تکبر کی سخت ممانعت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ حدیث شریف میں ہے لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرٍ دوسری حدیث میں ہے مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالےٰ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے اور حدیث اول کا ترجمہ یہ ہے جس کے قلب میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے اگر کوئی شہرت کے لئے کپڑا پہنے گا تو قیامت میں خدا تعالےٰ اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ فخر کے لئے کوئی کام کرنا حرام ہے ایک حدیث میں ارشاد ہے مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ رَآءٰی رَآءَی اللّٰهُ بِهٖ اس سے معلوم ہوا کہ دکھلاوے اور شہرت کا کام کرنا حرام ہے اب غور کرکے دیکھئے کہ شادی میں جو کام ہم کرتے ہیں اور جن کے لئے ہم نے نہایت خوبصورت الفاظ تراش رکھے ہیں کہ بھات دیا ہے اور بھائیوں کو کھلایا ہے اور بیٹی کو دیا ہے وغیرہ وغیرہ ان میں نیت ہماری کیا ہوتی ہے۔ صاحبو! محض الفاظ کے خوبصورت ہونے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ سب سے بڑی چیز نیت ہے لہٰذا نیت کو دیکھنا چاہئے

[1] اصلاح الرسوم ملنے کا پتہ: مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۱

کیا ہم لوگ یہ تمام رسمیں محض رسم اور نمود کے لئے نہیں کرتے بہنوں کو بڑا اڑا بھات دیا جاتا ہے اور اُس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے کیوں صاحبو آج سے آٹھ دن پہلے بھی تو یہ بہن آپ ہی کی بہن تھی، پھر کیا آپ نے کبھی اس کی خبر لی ہے کبھی بہن کے فقر و فاقے پر آپ کو رحم آیا ہے نیز اگر یہ صلہ رحمی ہے تو تمام برادری کو اس کا معائنہ کرانے کی کیا ضرورت ہے کیا کبھی اپنی لڑکی کے لئے کپڑا خریدتے وقت یا اس کو کھلاتے پلاتے وقت بھی آپ نے برادری کو جمع کیا ہے اگر نہیں کیا تو بھات اور جہیز دیتے وقت برادری کو کیوں جمع کیا جاتا ہے معلوم ہوا کہ محض فخر اور نمود کے لئے ایسا کیا جاتا ہے بس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ سب رسوم محض شہرت کے لئے ہیں اور شہرت کے لئے جو کام کیا جاتا ہے وہ بردئ حدیث حرام ہوتا ہے تو یہ سب رسوم بھی حرام ہی ہوئیں بالخصوص ایک رسم تو ایسی گندی ہے کہ وہ توبہ سے بھی معاف ہونا مشکل ہے کیونکہ اُس کی توبہ بھی مشکل ہے اور لطف یہ کہ اس کو بظاہر عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے اور وہ رسم نیوتہ لینا دینا ہے لوگ اس کو قرض حسنہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنا عبادت ہے تو گویا نیوتہ دینا عبادت ہوا حالانکہ نیوتہ دینا اس قدر بُری رسم ہے کہ سب رسموں میں گندی ہے۔ اس کو شاید آپ نے آج تک نہ سُنا ہوگا مگر میں اسوقت انشاء اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت بیان کرونگا اور وہ کوئی عجیب اور نئی بات نہ ہوگی بلکہ پُرانی بات ہے لیکن آپ نے عدم توجہ کے سبب اس میں غلطی کر رکھی ہے مقدمات سب آپ کے مسلم ہیں صرف نتیجے میں آکر غلطی ہو رہی ہے جیسے کسی شخص نے تبتت کے ہجے کئے تھے ت ب زبر تب۔ ب ت زبر بت اور رواں پڑھا تھا بتلخ تو آپنے بھی ہجے تو صحیح کئے ہیں صرف رواں میں غلطی کر رکھی ہے جس کو میں بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ امر سب کو مسلم ہے اور کوئی شخص اس سے منکر نہیں کہ نوتہ ایک قرض ہے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض واجب الادا ہوتا ہے تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ

قرضخواہ کی موت کے بعد اس کا کل ترکہ اس کے ورثاء کی ملک ہوتا ہے خواہ وہ ترکہ عین ہو یا کسی کے ذمہ دَین ہو مثلاً اگر کوئی شخص مرے اور سَو روپئے اس کے گھر میں موجود ہوں اور سَو روپئے اُدھار میں تو اس کا کل ترکہ دو سو روپیہ سمجھا جائیگا اور یہ دو سو روپئے ملا کر سب ورثاء کو تقسیم کئے جائیں گے۔ ان تینوں مسئلوں کے معلوم ہونے کے بعد دیکھئے کہ نوتہ میں کیا ہوتا ہے سو نوتہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے پچیس جگہ دو دو روپئے دیئے اور اس طرح پچاس روپئے اس کے قرض میں پھیل گئے اور اس کے بعد یہ شخص مرا اور دو بیٹے اس نے وارث چھوڑے جن میں ایک بالغ دوسرا نابالغ تو موجود ترکے میں سے تو ان دونوں نے نصفا نصف لے لیا وہ بھی جبکہ بڑا بھائی بڑا ایماندار ہو لیکن جو نوتہ میں قرض ہے اس کو کوئی بھی تو تقسیم نہیں کرتا چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر چند روز کے بعد اس بالغ لڑکے کی کسی اولاد کی شادی ہونے لگی تو لوگ وہ نیوتہ اسی کو لاکر دینگے اور یہ بلا تامل سارا نوتہ خود ہی خرچ کریگا اور اپنے کو ہی اُس کا مالک سمجھیگا حالانکہ ان پچاس میں سے پچیس روپیہ اس کا حق ہے اور پچیس اس کے چھوٹے نابالغ بھائی کا حق ہے اسی طرح علی العموم تمام نوتوں میں یہی کیا جاتا ہے کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ کسی نوتہ کو فرائض کی رو سے تقسیم کیا گیا ہو میرے خیال میں ایک جزئی بھی اس کی نہیں بتلائی جا سکتی تو اس میں ایک گناہ تو اس بالغ کو ہوا کہ اس نے یتیم کا مال کھایا قرآن شریف میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝ (بیشک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں یہ عنقریب جہنم میں داخل کئے جائیں گے) اور ایک گناہ نوتہ واپس کرنے والوں پر ہوا کہ انھوں نے مشترک مال ایک شریک کو دیدیا اور لطف یہ ہے کہ نوتہ دینے والے سمجھتے ہیں کہ ہم قرض سے سبکدوش ہوگئے حالانکہ ابھی پچیس روپیہ یتیم کے ان کے ذمہ باقی ہیں اور درمختار میں روایت لکھی ہے کہ اگر کسی کے ذمہ کسی کے

تین پیسے قرض کے رہ جائینگے تو قیامت میں اس کی سات سو نمازیں قرضخواہ کو دلائی جائیں گی۔ اور یہ اسوقت ہے کہ جب مالک کے بیٹے ہی کو وصول ہوگیا ہو اور اگر دو تین پشتیں گذر گئیں اور رسم کا نسخہ جاری ہوگیا پھر تو خدا جانے دور تک کس کس کا حق اس میں متعلق ہوگیا جس کا پہونچانا سخت ہی دشوار ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ یہ تو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے تو میں کہونگا کہ یہ عذر ہرگز قابل سماعت نہیں کیونکہ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو آج ہم لوگ مسلمان نہ ہوتے آخر ہیں ہم کو اسلام تو اسی لئے نصیب ہوا کہ ہمارے باپ دادا نے اپنے آبا و اجداد کے رسم و رواج کو ترک کر دیا لہٰذا یہ عذر نہایت بارد ہے اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پچھلے قرض کو تحقیق کر کے ادا کیا جائے اور آیندہ کو یہ رسم بالکل چھوڑ دی جائے یا کوئی عربی خواں یا انگریزی خواں اس کے سوا کوئی دوسرا علاج مجھے بتلائیں غرض نوتہ کی رسم نہایت گندی اور خراب ہے اگرچہ بظاہر یہ ثواب کا کام نظر آتا ہے اور جب یہ اس قدر خراب رسم ہے جس میں ایک گونہ اعانت غریب کی مصلحت بھی ہے تو دوسری رسوم تو جس میں کوئی مصلحت بھی نہیں بالکل ہی قابل ترک ہونگی اسی طرح ہم نے ہر ہر قدم پر ایک ایک رسم ایجاد کی ہے کہ جب تک وہ نہ ہو گویا شادی ہی نہیں ہو سکتی اور ان رسوم میں جو دنیا کی مضرتیں ہیں ان کا بیان کرنا میرا منصب نہیں ہے لیکن ایک مختصر سے جملہ میں جس میں ایک گونہ رعایت بھی غریب کی مصلحت بھی ہے تبرعًا ان کو بھی بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں پر جس قدر تباہی آئی ہے زیادہ تر انھیں رسموں کی بدولت آئی ہے کیونکہ آمدنی ہر مسلمان کی جتنی ہے سب پر ظاہر ہے اور خرچ ان رسموں کی بدولت جیسا کچھ ہوتا ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے مآل اس مجموعہ کا اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ آج زمین رہن ہو رہی ہے اور کل مکان پر قرقی ہے پرسوں زیور اور اثاث البیت نیلام ہو رہا ہے چوتھا دن نہیں آیا کہ میاں پابند رسوم بہ یک بینی و دو گوش رہ گئے بعض لوگ اس کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم میں گنجائش ہے اور ہم کو قرض نہیں

لینا پڑتا - سو اول تو یہ جواب مسلم نہیں کیونکہ ہر حیثیت کا آدمی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا چاہتا ہے اور اس میں قرض لینا لازمی ہے دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ ان کو قرض لینا نہ پڑے گا تو کم از کم ان کو اپنے غریب بھائیوں کا تو خیال ضرور ہی کرنا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ ہم کریں گے تو حرص کے مارے وہ بھی کریں گے اور تباہ ہونگے تو اس سے ہم بھی نہ کریں تیسرے جب یہ گناہ ہے اسلئے بھی اس کو چھوڑ دینا چاہیئے گو دنیوی مضرت بھی نہ ہو۔ اسی طرح غمی کی رسمیں ہیں کہ ان میں بھی جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض شہرت کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ خدا کے لئے کیونکہ اگر خدا کے لئے کیا جاتا تو پوشیدہ طور پر کرنا بھی گوارا کیا جاتا اس دکھلانے اور سب پر ظاہر کرنیکا اہتمام کیوں ہوتا معلوم ہوا کہ محض شہرت ہی مقصود ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر کسی پابند رسوم سے یہ کہا جائے کہ بجائے اس ڈھونگ کے تم پچاس روپئے دس مساکین کو دیدو اور کسی کو خبر نہ کرو تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا بلکہ یوں سمجھیگا کہ اس طرح کرنے سے یہ پچاس روپیہ ضائع ہی ہو جائیں گے اور کہیگا کہ اچھی مولوی صاحب نے رائے دی کہ پچاس روپیہ بھی خرچ کروں اور کسی کو خبر بھی نہ ہو صاحبو! یہ تو آپ لوگوں کی حالتیں ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ مولوی ثواب بخشنے سے روکتے ہیں یہ تو بتلاؤ کہ خود آپ ہی کو کب ثواب ہوا تھا کہ دوسرے کو بخشتے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مولوی تو آپ کو ثواب ملنے اور ثواب بخشنے کی ترکیب بتلاتے ہیں ثواب سے منع نہیں کرتے اور وہ ثواب بخشنے کی ترکیب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو اور بائیں کو خبر نہ ہو۔ نیز اپنے خاص حصے سے دو مُردے کے وہ کپڑے جن میں تمام ورثاء بالغ و نابالغ کا حق متعلق ہو گیا ہے وہ نہ دو۔ اور اگر دو تو ان کو تقسیم کر لو اور جو تمہارے حصے میں آئیں وہ دو مشترک ہرگز نہ دو تو ثواب کا طریقہ یہ ہے نہ وہ جو آپنے تراشش رکھا ہے لوگ چاہتے ہیں کہ نام بھی ہو اور ثواب بھی ہاتھ سے نہ جائے سو ریاء میں ثواب کہاں اور الٹا عذاب ہے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اس کی بابت فرماتے ہیں ؎

کلید در دوزخ ست آں نماز که در چشم مردم گذاری دراز

(وہ نماز جو صرف دکھاوے کے لئے گھنٹوں ادا کی جاتی ہے وہ دراصل دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے)

یہ نمونہ کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے دوسری رسموں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئے یہ تو دلائل قولیہ تھے فعلی بھی سنو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی کر کے دکھلا دیا کہ شادی اس طرح کرنی چاہیئے۔ علیٰ ہذا اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی غمی کر کے بتلا دیا ہے کہ غمی یوں کرنی چاہیئے پھر جب ہم نے اس کے موافق نہ کیا اور ہر امر میں اپنی ٹانگ اڑالی اور اس کا خلاف گراں ہوا تو سہولت اطاعت کہاں ہوئی پھر محبت مطلوبہ کہاں ہوئی اس محبت کا اثر تو یہ ہے کہ اطاعت میں سہولت پیدا ہو اور جبکہ ہم نے بالکل شریعت کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی جو شریعت کے بالکل خلاف۔ معاشرت وہ پسند ہوئی جس کو شریعت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے خلاصہ یہ ہے کہ کامل محبت کے دو اثر ہیں ایک دوام ذکر اور دوسرے سہولت اطاعت اور یہی علامت کامل ایمان کی ہے اگر ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جائیں تو ہم کو اپنی حالت پر افسوس کرنا چاہیئے۔ صاحبو! یہ تو بفضلہ تعالےٰ بلا غبار ثابت ہو گیا کہ خدا تعالےٰ کی محبت کاملہ کا دعویٰ بدون ذکر دائم و سہولت اطاعت کے غلط ہے اب یہ بات باقی رہی کہ آیا خدا تعالےٰ اس محبت کاملہ کے مستحق بھی ہیں یا نہیں سو اسکو بھی سمجھ لو کہ در حقیقت خدا تعالےٰ ہی مستحق محبت ہیں اور یہ ایسی ظاہر بات ہے کہ شریعت کے علاوہ عقل بھی اس کا فتوےٰ دیتی ہے اس لئے کہ محبت کے تین سبب ہوا کرتے ہیں یا تو یہ کہ کوئی شخص ہم پر احسان کرتا ہو اور اس کے احسان کی وجہ سے ہم کو اس سے محبت ہو یا یہ کہ وہ خود نہایت حسین جمیل ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف میلانِ خاطر ہو یا یہ کہ اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو اور وہ کمال باعث محبت ہو جیسے حاتم طائی سے اس کی سخاوت کے

سبب اور رستم سے اس کی قوت کے سبب یا کسی عالم فاضل سے اس کے علم و فضل کے سبب محبت ہوتی ہے اب غور کیجئے کہ ان تینوں وجوہ محبت میں سے کوئی وجہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ میں نہ پائی جاتی ہو۔ منعم وہ اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ان کی برابر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ سب اس کی مخلوق و مملوک و محتاج ہیں جمال ان کا اس حد تک ہے کہ کسی کو حاصل ہونا ممکن ہی نہیں بڑے بڑے حسین جمیل ان ہی کے حسن و جمال کے فیض سے حسین جمیل بنے بیٹھے ہیں۔

ع : چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا

علیٰ ہذا صاحب کمال اتنے بڑے ہیں کہ علم کامل انہی کو ہے نیز ہر صفت کمال علیٰ وجہ الکمال ان ہی میں پائی جاتی ہے تو انعام و نوال اور حسن و جمال اور فضل و کمال ہر طرح سے عقلاً و نقلاً ان ہی میں ہے پس وہی مستحق محبت ہیں بس اب اپنے قلوب کو ٹٹولو کہ خدا تعالیٰ سے محبت کاملہ ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو اس کی تحصیل کی تدبیر کرو اور تدبیر بھی میں بتلاتا ہوں اور اسی پر انشاء اللہ تعالیٰ بیان کو ختم کردونگا لیکن یہ نہ سمجھ لیجیو کہ محبت امر غیر اختیاری ہے اس کا پیدا کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے پھر اس کی تدبیر کیا ہو تو کیونکہ یہ گمان غلط ہے محبت گو خود غیر اختیاری ہو مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں جن پر ترتب محبت کا عادۃً ضروری ہے اور ایسے امور میں خدا تعالیٰ نے ہر امر کی تدبیر بتلائی ہے سو وہ تدبیر یہ ہے کہ تم چند باتوں کا التزام کرلو ایک تو یہ کہ تھوڑی دیر خلوت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرلیا کرو اگرچہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو لیکن اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعے سے خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔ دوسرے یہ کیا کرو کہ کسی وقت تنہائی میں بیٹھکر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچا کرو اور پھر اپنے برتاؤ کو غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کیا معاملہ کر رہے ہیں اور ہمارے اس معاملے کے باوجود بھی خدا تعالیٰ ہم سے کس طرح پیش آرہے ہیں۔ تیسرے یہ کرو کہ جو لوگ محبان خدا ہیں ان سے علاقہ پیدا کرلو اگر ان کے پاس آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت

ہی جاری رکھو لیکن اس خیال کا رکھنا ضروری ہے کہ اہل اللہ کے پاس اپنے دنیا کے جھگڑے نہ لیجاؤ نہ دنیا پوری ہونیکی نیت سے ان سے ملو بلکہ خدا کا راستہ ان سے دریافت کرو اپنے باطنی امراض کا علاج کراؤ اور ان سے دعاء کراؤ چوتھے یہ کرو کہ خدا تعالےٰ کے احکام کی پوری پوری اطاعت کیا کرو کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے وقت میں گنجایش نہیں ہے ورنہ میں اس کو مفصل طور پر بتلاتا۔ پانچویں یہ کہ خدا تعالےٰ سے دعا کیا کرو کہ وہ اپنی محبت عطا فرمائیں یہ پانچ جز کا نسخہ ہے اس کو استعمال کر کے دیکھئے۔ انشاء اللہ تعالےٰ بہت تھوڑے دنوں میں خدا تعالےٰ سے کامل محبت ہو جائے گی اور تمام امراض باطنی سے نجات حاصل ہو جائیگی اور آپ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کے پورے مصداق ہو جائیں گے مگر ان پانچ اجزاء میں جو ایک جزو ہے اطاعت وہ اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب احکام کا علم ہو اور احکام کا علم اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب ان کو سیکھا جائے لہٰذا ایک چھٹے جزو کی اور ضرورت ہوگی وہ یہ ہے کہ علم دین سیکھا جائے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص مولوی عالم بنے۔ عالم بننے کیلئے تو صرف وہ لوگ مناسب ہیں جن کو خدا تعالےٰ نے فراغ اور وقت دیا ہے آپ صرف اتنا کریں کہ اردو کے چھوٹے چھوٹے رسائل دینیہ جو اسی غرض سے لکھے گئے ہیں کسی سے پڑھ لیں اور اگر پڑھنے کے لئے وقت نہ ہو یا عمر زیادہ ہو جانیکی وجہ سے یہ دشوار معلوم ہو تو کسی سے سن لیں سو اس کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شہر میں ایک دو عالم ایسے رہیں کہ جن سے یہ دو کام یعنی ان سے پڑھنے اور سننے کے لئے جائیں اور ان دونوں کام لینے کی چار صورتیں ہونگی۔ اول تو یہ کہ اگر ان سے کوئی شخص پڑھنے جائے تو پڑھائیں۔ دوم یہ کہ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ بتلاسکیں۔ تیسرے ہر ہفتے میں ایک دن ایسا نکالیں کہ لوگوں کو جمع کر کے کوئی کتاب مسئلوں کی لے کر خود اس کے مسائل پڑھا کریں اور عام لوگ ان کو سنا کریں اور مسائل میں نماز روزہ حج زکوٰۃ معاشرت معاملات وغیرہ

سب کے احکام داخل ہیں سب سنائیں۔ چوتھا کام ان کا یہ ہو کہ ہر ہفتہ یا پندرھویں دن ترغیب وترہیب کا وعظ کہا کریں اور وعظ کی مجلس کو بیان مسائل کی مجلس سے علیحدہ کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ یہ تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ وعظ میں مسائل فقہیہ کا زیادہ بیان نہیں ہو سکتا اکثر یاد بھی نہیں رہتے کبھی خلط ہو جاتا ہے اور بالخصوص اسلئے بھی کہ وعظ میں اکثر لوگ مزیدار مضامین سننے کی غرض سے آتے ہیں اسلئے وعظ میں زیادہ صرف ترغیب وترہیب کے مضامین ہوں یہ چار کام ان کے سپرد ہوں اور ان کی تنخواہ اہل شہر خود اپنے ذمہ لیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے دیکھئے جس مقام پر طبیب نہیں ہوتا اہل شہر چندہ کر کے کسی ایک طبیب کو بلاتے ہیں اور تنخواہ دیتے ہیں تو کیا باطنی امراض کا ازالہ بدنی امراض کی برابر بھی ضروری نہیں ہے یہ دستور العمل تو مردوں کے لئے ہے رہیں عورتیں ان کے لئے آسان یہ ہے کہ جو عورتیں پڑھی لکھی ہیں وہ اپنے گھر میں بیٹھکر بہشتی زیور وغیرہ پڑھا کریں اور جو پڑھی ہوئی نہیں ہیں وہ اپنے لڑکوں بچوں سے کسی وقت بہشتی زیور کے مسائل سن لیا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو لڑکیوں کو پڑھوا کر تیار کر لیں اور ان سے اسی سلسلے کو جاری کریں یہ ہے مختصر دستور العمل اس سے انشاء اللہ ہر شخص کو علم دین حاصل ہو جائیگا اور محبت بھی بڑھے گی اور دین کی تکمیل ہو گی۔ خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ ایمان والوں کے لئے محبت کاملہ لازم ہے اور محبت کاملہ کے لئے سہولت اطاعت لازم اور اس کی تائید کے لئے کچھ وقت ذکر اللہ کے لئے مقرر کرنا بھی مناسب اور پھر طاعت کے لئے ضروری ہے واقفیت اور واقفیت حاصل کرنے کے طریقے سہل یہ ہیں تو ان طریقوں پر عمل کیا جائے کہ علم حاصل ہو اور اس سے

طاعت میں سہولت ہو اور اس سے محبت بڑھے اور ایمان کی تکمیل ہو اور یہ تدابیر اختیار کر کے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دعا کیجاتے کیونکہ ہر امر اس کی مشیت پر موقوف ہے اس کی مشیت نہ ہو تو یہ سب تدابیر بے سود ہیں لیکن نری دعا پر بھی نہ رہنا چاہیئے جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں سے دعا کی التجا کرتے ہیں لیکن خود کچھ نہیں کرتے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ایک تاجر نے بمبئی میں کہا کہ حضرت دُعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کریں آپ نے فرمایا کہ اس شرط سے دعا کروں گا کہ جس روز جہاز چلے اس روز کامل اختیار تم مجھے اپنے اوپر دیدینا کہنے لگے حضرت اسمیں کیا مصلحت ہے آپ نے فرمایا مصلحت یہ ہے کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں بٹھلا دوں گا اور پھر خُدا تعالیٰ سے دُعا کروں گا کہ تمہیں صحیح و سالم پہنچا کر حج کرا دے ورنہ میری خالی دعا کرنے سے کیا ہو گا جبکہ تم بمبئی سے باہر نکلنے کا قصد ہی نہ کرو غرض محض دُعا کرانے سے کام نہیں چلتا ضرورت اس کی ہے کہ اول کوشش کی جائے اور اس کے ساتھ خدا سے دعا کی جائے البتہ جو کام ایسے ہیں کہ ان میں تدبیر کو بالکل دخل نہیں ہے وہاں نری دعا ہی کافی ہے مثلاً بارش کا ہونا کہ وہ محض خُدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے ہم اس کے لئے کوئی تدبیر کر ہی نہیں سکتے لیکن جو کام ہمارے اختیار میں ہیں جیسے خُدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنا ان میں نہ تو نری تدبیر پر اکتفا کیا جائے کہ وہ بسا اوقات ناز اور عجب کا باعث ہو جاتی ہے اور نہ نری دعا پر بس کیا جائے کہ وہ کچھ مفید نہیں۔ اب خُدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ ہماری تدابیر میں برکت عطا فرمائیں اور ہم کو موانع سے محفوظ رکھیں اور اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرمائیں - آمین یا رب العالمین۔

تمت بالخیر

مواعظ حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۱

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رَوَاہُ الْبُخَارِی

دعواتِ عبدیت جلد پنجم

کا

چھٹا وعظ مُلقب بہ

العمل للعلماء

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی " دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

دعواتِ عبدیت جلد پنجم

کا

چھٹا وعظ ملقب بہ

العمل للعلماء

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھکر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
مدرسہ عربیہ دیوبند	۱۵ رجب ۱۳۳۰ سنہ ہجری وقت شب	دو گھنٹہ ،، ،،	کھڑے ہوکر ،،	طلبا کو علم کرشتہ عمل کا ہونا ضروری ہے تبلایا تھا بالخصوص وہ امور جن میں طلبہ کوتاہی کرتے ہیں	سعید احمد تھانوی مرحوم	۳۰۰ آدمی ،، ،،	عربی طلبہ کا مجمع زیادہ تھا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا

رَغَبًا وَّرَهَبًا ۖ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ٥ (وہ لوگ نیک کاموں میں مستعدی کرتے تھے اور ہم کو نہایت ہی شوق اور خوف سے پکارتے تھے اور ہم سے ڈرتے تھے) یہ آیت کا ایک جزو ہے اس کے قبل سے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السّلام کا ذکر اور حسب ضرورت مقام کے خاص خاص اغراض کے لئے ان کے کچھ خیالات بیان فرمائے ہیں ان حالات کے بعد ان حضرات کے مشترک اوصاف کو اس آیت میں ذکر فرمایا ہے جس کا ترجمہ آپ کو معلوم ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا۔ اور مقصود اس آیت سے اس وقت ایک خاص امر کو ظاہر کرنا ہے اور وہ امر کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آپ لوگوں کی جانی ہوئی بات ہے لیکن بعض بات ایسی ہوتی ہے کہ باوجود اس کے معلوم ہونے کے وہ ملتفت الیہ نہیں ہوتی اور اس لئے اس کو امر جدید بھی کہہ دیا جاتا ہے تو یہ بھی چونکہ ملتفت الیہ نہیں ہے اس واسطے اس کو بھی اس خاص اعتبار سے امر جدید کہنا درست ہوگا اور التفات نہ ہونے کے اسباب مختلف ہوتے ہیں کبھی تو کسی امر کے غایت درجہ بیّن ہونے کی وجہ سے اس کو معمولی سمجھا جاتا ہے اور اس کی طرف التفات نہیں ہوتا اور کبھی کسی امر کا غیر بیّن ہونا اس کے غیر ملتفت الیہ ہونیکا سبب ہوتا ہے اور جب یہ ہے تو یہ امر مقصود بالبیان بھی ممکن ہے کہ بعض افراد کے اعتبار سے تو غایت درجہ بیّن ہونے کی وجہ سے معمولی بات ہو کر غیر ملتفت الیہ ہو گیا اور بعض افراد کے اعتبار سے غیر بیّن ہو کر غیر ملتفت الیہ ہو گیا غرض چونکہ بعض امور غیر ملتفت الیہ ہو جاتے ہیں اور واقع میں ان کی طرف التفات کرنا ضروری ہوتا ہے اس لئے ان کو بیان کیا جایا کرتا ہے اور ان کا بیان کرنا باوجود ان کے معلوم للمخاطب ہونے کے عبث نہیں ہوتا بیان اور شرح

عہ وہ مقصود بالبیان عمل ہے اور اس کے مختلف افراد ہیں اعمال جوارح و اعمال لسان و اعمال قلب جیسا کہ آگے تفصیل آتی ہے اور ان میں بعض تو غایت ظہور و شہرت کے سبب سرسری سمجھے جاتے ہیں اسلئے ان کا اہتمام کم کیا جاتا ہے جیسے افعال جوارح اور بعض کی طرف بوجہ عدم شہرت التفات کم ہوتا ہے جیسے اکثر اعمال قلب۔ یہ معنی ہیں اس قول کے کہ ممکن ہے کہ بعض افراد الخ ۱۲ منہ

اس امر کی یہ ہے کہ اس مقام پر انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے اور آپ حضرات بوجہ دولت علم کے ان حضرات کے وارث ہیں چنانچہ ارشاد ہے اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ (علماء انبیاء کے وارث ہیں) اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو ہر ذی علم نے بڑی خوشی سے تسلیم کرلیا ہے اور سب کا اتفاق اس وراثت پر ہوگیا ہے جس اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے کے ماننے میں اہل علم کا نفع ہی نفع ہے وہ یہ کہ اس سے ایک عظیم الشان فخر حاصل ہوتا ہے اور کسی قسم کی مؤنت اور مشقت اس میں ہے نہیں اسلئے اپنا لقب وارث قرار دیکر بیٹھ رہے حالانکہ اس میں اس بات پر غور کرنے کی ضرورت تھی کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں کمال علمی کے ساتھ کوئی دوسرا کمال یعنی کمال عملی بھی تھا یا نہیں ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں دیا جائیگا کیونکہ اگر انبیاء علیہم السلام میں بھی کمال عملی نہ مانا جائے تو پھر کس کے اندر مانا جائے گا کیونکہ وہ حضرات تو افضل المخلوقات ہیں پس یہ کہنا ضروری ہوگا کہ انبیاء میں اس درجہ کمال علمی تھا کہ کسی دوسرے میں ہونا ممکن نہیں جب یہ بات ثابت ہوچکی تو اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وجہ وراثت آیا صرف کمال علمی ہے یا کمال عملی بھی اس میں داخل ہے ہم جو غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف کمال علمی وجہ وراثت نہیں ہوسکتا اسلئے کہ جو عالم بے عمل ہیں ہم انہیں کوئی شان مقبولیت کی نہیں پاتے حالانکہ وارث نبی کے لئے مقبول ہونا ضروری ہے مثلاً ابلیس کہ وہ بہت بڑا عالم ہے اور دلیل اس کے عالم ہونے کی یہ ہے کہ وہ علماء کے اغواء کی تدبیر کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ کسی شخص کے خیالات کو وہی بدل سکتا ہے جو کہ خود بھی ان خیالات میں کم ازکم اس کے برابر تو ماہر ہو جس کے خیالات بدلنے کی کوشش ہے۔ قانون کے سمجھنے میں قانون دان کو وہی شخص دھوکہ دیسکتا ہے جو کہ خود بھی قانون کو جانتا ہو۔ تو شیطان کا علماء کے اغواء میں کامیاب ہونا صاف بتلا رہا ہے کہ وہ بھی بہت بڑا عالم ہے لیکن اس کا جو انجام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ علیٰ ہذا علماء بنی اسرائیل جن کی نسبت اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ (تم لوگ

کتاب کی تلاوت کرتے ہو) ارشاد ہے مگران کی دخامت عاقبت کا ذکر خود قرآن شریف میں مذکور ہے اور جگہ جگہ ان لوگوں کی مذمت فرمائی گئی ہے حتیٰ کہ کسی فرقے کی اتنی مذمت قرآن میں نہیں جتنی بنی اسرائیل کی ہے پس معلوم ہوا کہ صرف کمال علمی وجہ وراثت نہیں ہے بلکہ عمل کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بدون عمل کے قبولیت نہیں ہوتی اور غیر مقبول وارث انبیاء نہیں ہوسکتا۔ اس کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں نہایت واضح فرمادیا ہے فرماتے ہیں اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ (علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور انبیاء علیہم السلام اپنے ورثہ میں نہ تو کوئی دینار چھوڑتے ہیں اور نہ درہم بلکہ وہ علم چھوڑتے ہیں لہٰذا جس شخص نے علم کو اپنا لیا اُسے بہت بڑا حصہ دستیاب ہوا۔) اس حدیث میں علم کو حظِ وافر فرمایا ہے اور علم حظ وافر اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب مقرون بالعمل ہو نری صفت علم کو حظ وافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا وبال جان ہونا خود حدیث میں مذکور ہے ارشاد ہوتا ہے اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ لَجَهْلًا (بیشک علم کے اندر جہالت بھی ہے) اسی طرح کلام مجید میں ارشاد ہے وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۭ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (وہ جان چکے ہیں کہ جو کوئی اس کا خریدار ہو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بہت بری چیز ہے وہ جس کے بدلہ میں اپنی جانوں کو دے رہے ہیں کاش اُن کو (اتنی) عقل ہوتی) تو حدیث میں ایسے علم کو جہل فرمانا اور آیت میں عَلِمُوْا کے بعد لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ فرمانا صاف بتلاتا ہے کہ یہ علم کسی درجہ میں بھی قابل اعتبار نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ واضح لیجئے حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کو دیکھا جائیگا کہ اس کی آنتیں باہر نکلی پڑی ہیں اور وہ ان کے گرد گھوم رہا ہے لوگ اس سے اس سزا کا سبب پوچھیں گے۔ کہیگا کہ میں اپنے علم پر عمل نہ کرتا تھا پس ان آیتوں اور حدیثوں سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ علم بلا عمل حظ وافر نہیں ہوسکتا کیونکہ جو علم عقاب سے نہ بچا سکے وہ حظ وافر کیا ہوگا پس حظ

وافر وہی علم ہوگا جو کہ مقرون بالعمل ہو پس وجہ وراثت بھی وہی علم ہوگا جو کہ مقرون بالعمل ہو مطلق علم وجہ وراثت نہ ہوگا مگر باوجود اس کے ہم لوگ جو اپنے کو اہل علم کہتے ہیں ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے قلوب میں محض صفت علم ہی پر ایک ناز پایا جاتا ہے اور ہم اپنے کو صرف اسی صفت کی وجہ سے بہت بڑا سمجھتے ہیں اور عمل کی کمی سے ہم کو اپنے کمال میں نقص کا شبہ ہی نہیں ہوتا اور یہ ایسا بدیہی امر ہے کہ اس پر کسی قرینے کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہر شخص ذرا سے غور سے خود معلوم کر سکتا ہے اور اگر قرینے کی ضرورت ہے تو قرائن بھی اس کے موجود ہیں۔ مثلاً ایک قرینہ اس کا یہ ہے کہ باوجود عمل نہ کرنے کے عوام الناس سے اپنے کو برتر سمجھتے ہیں اور اپنی حالت کو ان سے ارفع خیال کرتے ہیں چنانچہ اگر عوام الناس ہماری تعظیم میں کمی کریں تو ہم کو سخت تعجب ہوتا ہے اور بہت ہی غصہ آتا ہے یہ صاف دلیل اس کی ہے کہ ہم لوگ محض علم کی وجہ سے اپنے کو ارفع سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کہیں چلے جارہے ہوں اور کوئی عامی آدمی ہم کو راستہ میں ملے تو خود سلام کرنا تو درکنار اس کے سلام کا جواب دیدینا بھی اپنا احسان سمجھتے ہیں۔ کیوں صاحب کیا قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کی بابت فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ (وہ اپنے علم کی وجہ سے جو کہ ان کے پاس ہے شاد و سرور ہو گئے) ارشاد نہیں ہوا اور جب یہ ہے تو کیا نرا علم قابل ناز یا فخر کرنے کے ہو سکتا ہے کبھی نہیں جیسا کہ حدیث شریف میں صاف مذکور ہے ایک علم بندے کے لئے حجت ہے اور ایک علم خدا کی حجت ہے بندے پر تو ایسا علم کیا مایۂ ناز ہو سکتا ہے اور ہم جو اپنے کو انبیاء کا وارث سمجھتے ہیں تو کیا ہمارا نرا علم حاصل کر لینا اس وراثت کے لئے کافی ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ چونکہ ہم لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں خواہ وہ ابتلاء اعتقاداً ہو یا عملاً یا حالاً اور یہ آیت اس خیال کا باطل ہونا بتلا رہی ہے اس لئے اس آیت کو اس وقت اختیار کیا گیا ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کے لئے صفت علم کے اثبات کے بعد شان عملی کو بیان کیا گیا ہے تاکہ ہم

متوجہ ہوں اور غور کریں کہ جن کے ہم وارث بنتے ہیں ان میں کیا کیا اوصاف تھے۔ اور یہی غور کرنا غرض ہے قرآن شریف میں متعدد جگہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصص مذکور ہونے کی تاکہ ہم غور کیا کریں پس ہم کو متوجہ ہونا چاہیئے آیا کہ ہم میں وہی شان عمل پائی جاتی ہے یا نہیں اگر نہیں پائی جاتی تو وراثت کا دعوے ہم کو چھوڑ دینا چاہیئے تو گویا یہ آیت ہمارے اس مرض کا علاج ہے پس بیان آیت کا یہ ہے کہ اس میں اول حضرات انبیاء علیہم السلام کے علم کو بیان کیا گیا ہے جس کی برابر کسی کا علم بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے علم کامل کے لئے نبوت لازم ہے یا یوں کہئے کہ ایسا علم کامل نبوت کے لئے لازم ہے یا دونوں طرف سے تلازم مانا جائے بہرحال جو کچھ بھی کہا جائے اتنا قدر مشترک ماننا پڑتا ہے کہ نبوت اور کمال علم میں انفکاک نہیں ہوتا تو باوجود علم کے اس کامل مرتبہ پر ہونیکے پھر بھی ان کی مدح کا مدار صرف اس علم کو قرار نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ اِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ (یہ سب نیک کاموں میں دوڑتے تھے) کو بھی مقرون کیا اور مدار مدح کا ایک جزو اس کو قرار دیکر مجموعہ جزئیں پر مدح کو ختم فرمایا جس کا حاصل یہ ہوا کہ کمال علمی بھی اگرچہ کمال ہے لیکن وہ کمال تمام اس وقت ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ عمل بھی مقرون ہو کیونکہ اگر عمل کو مدح میں داخل نہ مانا جائے اور صرف صفت علم پر مدح کو مقصور مانا جائے تو صفت علم کو معرض مدح میں ذکر کرنا ایک امر زائد ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ باعث مدح صرف کمال علمی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کمال بھی ہے اور وہ کمال کمال علمی ہے جس کو اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس وقت آپ حضرات کو یہی سنایا جا رہا ہے اگرچہ آپ کو سنانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ آپ خود متکلم سے زیادہ جانتے ہیں لیکن اسی قاعدہ مذکورہ کی بناء پر کہ کبھی باوجود معلوم ہونے کے بعض امور ملتفت الیہ نہیں ہوتے سنانا مفید معلوم ہوا اور گو اس وجہ سے کہ مقصود بالذات علم سے عمل ہے اور مقصود بالذات کا ملتفت الیہ ہونا ضروری ہے اس اعتبار سے اس مقصود بالذات پر متنبہ کرنے کی حالت

نہ ہونا چاہیئے لیکن کبھی مقصود بالغیر میں اس قدر انہماک ہوجاتا ہے کہ اصل مقصود بالذات نظر سے غائب ہوجاتا ہے اگرچہ یہ ہے بڑی غلطی کیونکہ اس سے اکثر خود طریق میں بھی غلطی واقع ہوجاتی ہے توضیح اس کی یہ ہے کہ اگر مقصود پیش نظر نہ ہو تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس طریق کو تو مقصود سے تعلق ہے کہ وہ قابل اہتمام ہو اور کس طریق کو اس سے تعلق نہیں کہ وہ قابل ترک ہو توسعی کا مفید یا لاطائل ہونا معلوم نہیں ہوتا مثلاً اگر کوئی شخص دہلی جانا چاہے تو ریل میں بیٹھنا وہاں پہونچنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن اگر دہلی پہنچنا نظر ہے تو اس کو اہتمام ہوگا کہ وہ گاڑی تلاش کرے جس کے ذریعہ سے دہلی پہونچ جاوے اور اگر دہلی پیش نظر نہیں بلکہ محض چلنا ہی پیش نظر ہے تو عجب نہیں کہ اس میں غلطی ہو اور بجائے دہلی کے کلکتہ پہونچ جائے یہی حالت ہر طریق اور مقصود دین ہے کہ اگر خود طریق ہی کو مثل مقصود بالذات کے سمجھ لیا اور بالذات کو پیش نظر نہیں کیا تو اس میں لگا ہے انہماک ہو کر ضرور غلطی ہوگی لہٰذا طریق کے اہتمام میں مقصود کو بھلانا بڑی کمی ہے مگر پھر بھی تحصیل علم میں یہ کوتاہی بکثرت واقع ہو رہی ہے کہ محصلین کو یہ یاد ہی نہیں کہ اس علم کی غایت عمل ہے اسی وجہ سے باوجود آپ کے جاننے کے پھر بھی آپ کو متنبہ کرنے کا خیال پیدا ہوا سو اس باب میں انبیاء علیہم السلام کی حکایت ہمارے لئے کافی نمونہ ہے کیونکہ ہم انبیاء علیہم السلام کے جانشین ہیں جو ان کی حالت تھی وہی ہم کو اختیار کرنی چاہیئے اور وہ حالت اس آیت میں مذکور ہے اور اس میں کئی قسم کے حکم بیان کئے گئے ہیں اور سب کا حاصل مشترک یہ ہے کہ اس میں شان عمل کو ذکر کیا ہے جس میں سے مختلف انواع کو ایک ایک جملہ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کا حاصل کرنا ضروری ہے فرماتے ہیں اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ کہ وہ لوگ مستعدی کرتے تھے نیک کاموں میں یہ ایک جملہ ہے جس میں ایک نوع عمل کو ذکر کیا ہے آگے ارشاد ہے وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا یعنی ہم کو پکارتے تھے شوق سے اور

خوف سے یہ دوسرا جملہ ہے جس میں دوسری نوع کا ذکر کیا گیا تیسرا جملہ ہے وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ٥ جس میں ایک خاص نوع عمل کا بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر ہر جملہ میں تینوں قسم عمل کے مجموعے کو مُراد لیا جائے لیکن پھر بھی اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہر جملہ کو کسی ایک نوع سے زیادہ تعلق ہے یعنی عمل تین قسم کے ہوتے ہیں اعمال جوارح۔ اعمال لسان۔ اعمال قلب۔ مثلاً نماز ہاتھ پانوں کے متعلق ہے ذکر اللہ زبان کے متعلق ہے خشوع قلب کے متعلق ہے تو ان انواع اعمال میں اگرچہ ہر ہر جملہ کو سب ہی اقسام کے ساتھ ایک طرح کا تعلق ہے لیکن زیادہ تعلق ایک ایک جملہ کو ایک ایک ہی عمل کے ساتھ ہے چنانچہ پہلا جملہ اعمال جوارح کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا جملہ عمل لسان کے ساتھ اور دوسرے جملے یعنی يَدْعُوْنَنَا میں جو رَغَبًا وَّ رَهَبًا کی قید ہے وہ تابع ہے لہٰذا اصل مقصود بالذکر يَدْعُوْنَنَا ہی ہوا اگرچہ اس جملہ میں دوسرا احتمال بھی ہے کہ قید زیادہ مقصود ہو اور اسی بناء پر میں نے کہا تھا کہ ہر جملہ کو ہر ہر نوع عمل کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے تیسرا جملہ اعمال قلب کے ساتھ متعلق ہے اور اسی پر ختم کر دیا گیا ہے پس اس جمع کرنے سے لازم آیا کہ عمل کی تینوں قسموں کے جمع کرنے سے عمل کا کمال ہوتا ہے اور اگر ایک جزو کی بھی کمی رہی تو عمل ناقص رہیگا اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص گھر بنائے تو اُس گھر کو کامل گھر اُس وقت کہا جائیگا کہ اُس میں گھر کے تمام ضروری حصے ہوں کمرہ سہ دری باورچی خانہ وغیرہ اور اگر ایک جزو بھی کم ہو تو اس گھر کو کامل گھر نہ کہیں گے بس یہی حالت عمل کی بھی ہے کہ اگر ایک نوع بھی چھوٹ گئی تو عمل کامل نہ ہوا بلکہ ناقص رہا اب ہم اپنی حالت کو غور کر کے دیکھیں کہ اول تو مسلمانوں میں نفس عمل ہی کی کمی ہے اور اگر کچھ عمل کیا بھی جاتا ہے تو وصف میں بالکل ناقص اور زیادہ افسوس علماء کی جماعت پر ہے اس لئے کہ جانتے ہیں اور پھر کوتاہی کرتے ہیں ؎

فان کنت لاتدری فتلک مصیبة وَاِنْ کنتَ تدری فالمصیبة اعظم

(اگر تم نہیں جانتے تھے تو جب بھی یہ ایک مصیبت ہے اور اگر تمہیں اس کے متعلق علم تھا تو پھر تو ڈبل مصیبت ہے)

اور علماء کی جماعت میں اگرچہ سب ایسے نہیں ہیں لیکن ان کیلئے کسی ایک کا ایسا ہونا بھی موجب شکایت ہے کہ کیوں اپنے کو عمداً تباہ کرتے ہیں دوسرے وہ تباہی اُن ہی تک مقصور نہیں رہتی بلکہ اس ایک کو دیکھ کر دوسرے بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ علماء کی جماعت میں اگر ایک شخص بھی لا اُبالی ہوتا ہے تو اُس کا اثر سب پر پہونچا ہے اور یہ اثر دو طرح سے ہوتا ہے ایک یہ کہ اس کو دیکھ کر دوسرے عوام بدعملی پر جرأت کرتے ہیں دوسرے یہ کہ سب علماء سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے عام علماء پر جو اعتراض کی نوبت آتی ہے اور پھر اعتراض سے بدزبانی تک نوبت آجاتی ہے اس میں اگرچہ اکثر عوام غلط کار ہیں کیونکہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (نہیں اٹھائیگا کوئی اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) لیکن زیادہ تر اس کا سبب ہم ہیں اور وہ اعتراضات اکثر مخالفین کے نہیں ہوتے کہ ان کو حسد یا بغض پر محمول کر لیا جائے یا یہ کہا جائے کہ اعتراضات تو انبیاء علیہم السلام پر بھی ہوتے ہیں پھر ہم کو اعتراضات کی کیا پرواہ کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام پر جو اعتراضات ہوتے تھے وہ کفار کی طرف سے ہوتے تھے اور جماعت علماء پر اکثر ان کے موافقین بھی جو کہ ہر وقت ان کا دم بھرتے ہیں اعتراض کرتے ہیں اور ہمارے لئے یہ امر بڑا عیب ہے کہ ہم کسی موافق یا مخالف کو اتنا موقع دیں تو جب اپنے لوگ بھی اعتراض کرنے پر مجبور ہوں تو ہماری حالت بیحد محل تاسف ہے اور وہ اعتراض اگرچہ اول ایک ہی شخص پر ہو لیکن ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

(جب کسی قوم کا کوئی آدمی کوئی نادانی کرتا ہے تو نہ تو اس قوم کے چھوٹوں کی کوئی قدر باقی رہ جاتی ہے نہ بڑوں کی)

بالخصوص اس زمانے میں علی العموم علم دین سے لوگوں کو نفرت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس سے بھاگنے کے لئے لوگ، بہانے تلاش کرتے ہیں ایسے وقت میں ہماری ایسی حالت ہونا لوگوں کے فاسد خیالات کی گویا اعانت کرنا ہے مگر باوجود اس کے افسوس ہے کہ ہم ہیں. ایسے بھی افراد ہیں کہ وہ صرف علم ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور عمل کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے بعض کی حالت تو یہاں تک ناگفتہ بہ ہے کہ وہ نماز بھی نہیں پڑھتے بعض ایسے ہیں کہ وہ اس قدر کھلم کھلا تو بے عمل نہیں لیکن اپنی زبان وغیرہ کی حفاظت وہ بھی نہیں کرتے جس جگہ بیٹھیں گے لوگوں کی غیبت شکایت کے انبار لگائیں گے بعض ایسے ہیں کہ وہ زبان کی بھی حفاظت کرتے ہیں لیکن وہ نظر کی حفاظت بالکل نہیں نہیں کرتے اکثر نامحرموں کو دیکھنا راستہ چلتے ہوئے ادھر اُدھر تاکنا جھانکنا عادت ہو جاتی ہے

صاحبو! اول تو علم مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ مقصود بالذات عمل ہے دوسرے اگر علم کو مقصود ہی مان لیا جائے تو تب بھی یہ سمجھ لو کہ یہ حالت بدعملی کی تو خود کمال علمی میں بھی حارج ہے کیونکہ یہ تجربہ ہے کہ تقوے میں جتنی کمی ہوگی اسی مرتبے کی کمی علم میں بھی ہوگی اس کا آسان امتحان یہ ہے کہ دو مہینے کے لئے آپ بالکل متقی بن جائیں اور پھر اپنی پہلی علمی حالت اور اس زمانہ تقوے کی علمی حالت میں موازنہ کریں ان دونوں حالتوں میں جو تفاوت ہوگا وہ بتلادے گا کہ تقویٰ کو اس میں بڑا دخل ہے۔ ممکن ہے کہ کسی صاحب فہم کو یہ خیال ہو کہ ہم تو متقی بھی نہیں لیکن پھر بھی ہم کو تو اچھا خاصہ علم حاصل ہے سو سمجھ لیں کہ علم صرف ترجمہ کر لینے کا یا چند تصدیقات حاصل ہو جانے کا نام نہیں بلکہ ان تصدیقات کے حاصل ہونے کے بعد جو ایک ملکہ ہو جاتا ہے اس کا

نام علم ہے سو وہ بالذات اختیاری نہیں یعنی اگرچہ اس کے اسباب کے اختیاری ہونے کے اعتبار سے وہ اختیاری ہو لیکن بدون اسباب کے حاصل کئے ہوئے خود اس کا حاصل ہونا اختیاری نہیں اور اس کے اسباب میں سے ایک سبب اعظم تقویٰ ہے کہ بدون اس کو حاصل کئے ہوئے وہ ملکہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے ۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی ۔۔۔ فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم فضل من الٰہٖ ۔۔۔ وفضل اللہ لا یعطی لعاصی

(میں نے حضرت وکیع سے اپنی قوت حافظہ کے کمزور ہونیکی شکایت کی اُنہوں نے مجھے گناہوں کے ترک کرنے کی نصیحت فرمائی اس وجہ سے کہ علم باری تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے اور اس کا عطیہ گناہگاروں کو نہیں ملا کرتا)

غرض یہ مطلب نہیں ہے کہ جو متقی نہ ہوگا وہ جلالین یا بیضاوی کے پڑھانے پر قادر نہ ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ بدون تقوے کے وہ خاص ملکہ میسر نہ ہوگا چنانچہ یہ شخص اگر اپنی پہلی حالت اور تقوے کے بعد کی حالت میں غور کرے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ پہلے میرا مبلغ علم کیا تھا اور مہینہ دو مہینہ کے اندر علم میں کیسی ترقی ہوگئی تو علم اگر مقصود بالذات بھی مان لیا جائے تب بھی اس کے حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کی ضرورت ہے مگر ہم لوگ اکثر بے باک ہیں تمام تر انہماک اس میں ہے کہ کسی طرح کتابیں ختم ہو جائیں۔ بہت لوگوں کی تو ایسی حرکتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے تمام قوم بدنام ہوتی ہے اور چونکہ ان لوگوں کی عادت ہوگئی ہے لہٰذا اس کے ساتھ توبہ بھی ان کو نصیب نہیں ہوتی یعنی بشر سے غلطی تو ہو ہی جاتی ہے لیکن اگر چار دن تقوے رہے اور ایک دن ٹوٹ جائے اور گناہ ہونے پر پھر توبہ کرلی جائے تب بھی اس قدر خراب حالت نہ ہو اور تھوڑے دنوں میں گناہ چھوٹ جائیں۔ لیکن بعض لوگوں کی تو مبالات ہی نہیں رہتی اور اس سے عوام الناس پر بہت برا اثر پڑتا ہے یعنی ان کو یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے کہ

علماء ایسے ہوتے ہیں پس اگر خلوص سے تقویٰ کو اختیار نہ کیا جائے تو اسی مصلحت سے اختیار کرلیا جائے کہ اس سے عوام بگڑیں گے ورنہ ایسے لوگ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ (وہ لوگ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں) کے مصداق کہے جاسکتے ہیں کیونکہ روکنا جس طرح مباشرۃً ہوتا ہے کہ زبان سے روکے یا ہاتھ سے روکے اسی طرح تسبّب بھی ایک قسم کا روکنا ہے تو اس کو بھی صَدّ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ کہا جائے گا کیونکہ سبب معصیت بھی معصیت ہوتا ہے اور اسی معصیت کے ساتھ اس کا بھی شمار ہوتا ہے حتی کہ بعض ایسے اُمور جو فی نفسہٖ طاعت ہیں جب کسی معصیت کا سبب بن گئے تو اُن کی بھی ممانعت ہوگئی چنانچہ ارشاد ہے لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللہِ فَیَسُبُّوا اللہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں اُن کو گالی مت دو اس وجہ سے کہ وہ پھر دشمنی میں بغیر جانے بوجھے اللہ کو گالی دینگے) تو دیکھئے بتوں سے نفرت کا ظاہر کرنا اور ان کو بُرا کہنا ایک حد تک طاعت تھا لیکن چونکہ وہ مفضی تھا ایک معصیت کی طرف اس لئے اس سے بھی ممانعت ہوئی پس معلوم ہوا کہ جس طرح معصیت کی مباشرت معصیت ہے اسی طرح تسبب بھی معصیت ہے تو اگر ایک شخص نے عمل نہ کیا تو دیکھنے والوں کے لئے درجہ تسبّب میں یَصُدُّوْنَ کا مصداق بنگیا۔ غرض ترک عمل میں یہ مضرتیں ہیں اس لئے اگر خلوص سے بھی عمل نہو تو کم سے کم دین کی احتیاط اور حفاظت ہی کے لئے ہوا سی کو ہمارے حضرت نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ ریاء الشیخ خیر من اخلاص المرید (شیخ اور پیر کی ریا کاری مریدوں کے اخلاص سے بہتر ہے) یعنی چونکہ شیخ کا عمل دوسروں کیلئے باعث ہوجاتا ہے اس لئے اگر اس کے عمل میں ایک درجہ کی ریاء بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اور یہ مقولہ حضرت کا میں نے قیاس کے لئے کہا ہے ورنہ مدلول اس کا یہ نہیں ہے کیونکہ اس مقولہ میں ریاء سے مراد ریاء لغوی ہے نہ کہ شرعی اور میں درخواست کررہا ہوں ان بدعملوں سے علیٰ سبیل التنزل ریاء شرعی کی۔ اور حکم مشترک یہ ہے کہ اگر دوسرے کی حفاظت دین کے لئے کوئی عمل کرے تو اس میں بھی خیریت

ہے کم سے کم یہی کہ سبب عمل بد کا نہ بنا تو دین کی حفاظت چونکہ ضروری ہے اس لئے یہی سمجھ کر اپنے کو بد عملی سے روکنا چاہیئے۔

الحاصل ارشاد ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام انواع عمل کے جامع تھے اور چونکہ اخبار سے مقصود کوئی انشاء ہوتی ہے اسلئے مطلب یہ ہوگا کہ ہم کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ انواع عمل کے جامع ہوں مگر ہم لوگوں میں اس کے متعلق چند کوتاہیاں ہیں چنانچہ ایک کوتاہی تو یہ ہے کہ عمل ہی کی طرف التفات نہیں کرتے اور اگر کچھ عمل کرتے بھی ہیں تو غضب یہ کیا ہے کہ ہم نے اس میں انتخاب کرلیا ہے اور اپنے اس انتخاب کو کافی سمجھ کر اپنے کو عامل با شریعت اور دیندار سمجھتے ہیں۔ صاحبو! ظاہر ہے کہ حسین وہ شخص کہلائیگا کہ اُس کی آنکھ ناک چہرہ سب خوبصورت ہوں ورنہ اگر کسی کی آنکھیں تو نہایت اچھی ہوں اور ناک بالکل خراب چپٹی ہو یا برعکس ہو یا دانت باہر کو نکلے ہوئے ہوں تو وہ حسین نہ کہلائیگا بس اسی طرح دین بھی ایک حُسنِ معنوی ہے تو حسینِ معنوی یعنی دیندار بھی اسی کو کہیں گے جو تمام وجوہ دین وانواعِ عمل کا جامع ہو اور جس نے ایک کو لیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا مثلاً اعمال جوارح کو تو لے لیا اور اعمال قلب کو اور اعمال لسان کو چھوڑ دیا یا اعمال قلب کو لیا اور دوسرے دونوں کو چھوڑ دیا یا اعمال لسان کو لے لیا اور بقیہ دو کو چھوڑ دیا وہ شخص ہرگز اس حُسنِ معنوی کے ساتھ متصف نہ سمجھا جائیگا۔ آج کل ہم لوگوں میں اکثر افراد جو کچھ عمل کرتے بھی ہیں تو وہ اعمال جوارح مثلاً روزہ نماز حج وغیرہ کرلیتے ہیں ورنہ اکثر تو عمل ہی نہیں کرتے کہ نماز ہو رہی ہے اور وہ پڑے سے سو رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسے لوگ اپنے عذر میں وہ حدیث پیش کریں کہ لَا تَفْرِیْطَ فِی النَّوْمِ لیکن یہ حدیث ان کے لئے کچھ مفید نہیں کیونکہ یہ عدم تفریط اس وقت ہے کہ اپنی طرف سے تو پورا انتظام کر کے سوئے لیکن باوجود اہتمام اور انتظام کے پھر بھی آنکھ نہ کھلے اور اگر ایسے وقت سویا

کہ غالب گمان یہ ہو کہ نماز کے وقت آنکھ نہ کھلے گی اور کچھ انتظام بھی نہیں
کیا تو یہ ضرور تفریط میں داخل ہے قرینہ اس تقیید کا یہ ہے کہ یہ ارشاد
ایک خاص قصے کے متعلق ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک مرتبہ
لیسے وقت سونے کی نوبت آئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت
بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو بٹھلا دیا تھا کہ جب صبح ہو ہم کو جگا دو مگر
اتفاق سے ان کی بھی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی اور پھر اُٹھے تو صحابہ رضی اللہ
تعالےٰ عنہم بیحد گھبرائے تو اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد
فرمایا تھا کہ لَا تَفْرِيطَ فِي النَّوْمِ یعنی چونکہ ہم لوگوں نے جاگنے کا پورا انتظام
کیا لیکن باوجود کوشش کے پھر بھی آنکھ لگ گئی اس لئے اس سونے
میں تفریط نہیں ہوئی یہ تو ان کا ذکر تھا جو بیدار ہی نہیں ہوتے اور بعض
لوگ باوجود بیدار ہونے کے محض سستی کی وجہ سے پڑے رہتے ہیں
سو اول تو نماز وغیرہ میں بھی ٹوٹا ہے لیکن خیر اگر بڑی دوڑ دوڑی تو
نماز کے پابند ہو گئے لیکن دوسرے اَعمال یا تقویٰ کے شعبے اکثر ندارد چنانچہ
بعض لوگ نظر میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی غیر محرموں کی طرف بیباکانہ دیکھتے
ہیں اور اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتے بلکہ یہ ایسا مرض ہے کہ اس سے بہت کم
لوگ پاک ہیں کیونکہ اکثر ان گناہوں سے لوگ بچتے ہیں جن کے ارتکاب میں
فوت جاہ یا رسوائی کا خیال ہو اور اس گناہ میں جاہ فوت نہیں ہوتی اسلئے
کہ اول تو دوسرے کو نظر کی خبر ہی کیونکر ہو سکتی ہے دوسرے اگر نظر کی اطلاع
بھی ہو جاتے تو نیت کی کیا خبر اس کا امتیاز کسی کو بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ نظر بہ شہوت
ہے یا بہ شفقت و محبت کیونکہ یہ ایک امر مُبطن ہے خاصکر جبکہ شریعت نے
دوسروں کو بدگمانی کی ممانعت بھی فرمادی تو اور بھی بدنظری کا گمان نہ
کیا جائیگا اور جاہ فوت نہ ہوگی پس اس گناہ سے چونکہ جاہ فوت
نہیں ہوتی اسواسطے اس میں اکثر وہ لوگ بھی مبتلاء ہیں جو بظاہر ثقہ معلوم

ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس گناہ کی نسبت خاص طور سے خدا تعالیٰ نے اپنے علم کی اطلاع دی فرماتے ہیں یَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡیُنِ اگر کسی دوسرے کو اس خیانت کی اطلاع نہیں ہوتی تو ہم کو تو اطلاع ہے اور ہماری ہی اطلاع قابلِ نظر ہے اس کے بعد فرماتے ہیں وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ کہ جو امر سینوں میں پوشیدہ ہے وہ بھی ہم جانتے ہیں یہ اسلئے بڑھا دیا کہ بعض لوگ محض وقوعِ نظر کی اطلاع کو مفوّتِ جاہ سمجھکر اس سے بھی بچتے ہیں کیونکہ سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے اس کے وقوع ہی سے کسی کو بدگمانی پیدا ہو جائے اسلئے اس سے بھی بچتے ہیں لیکن ان کے قلب میں یہ مرض شہوت کا ہوتا ہے اور لطف یہ کہ باوجود اس مرض قلبی کے یہ شخص اپنے کو متقی سمجھتا ہے حالانکہ خیالات اس کے نہایت گندے ہوتے ہیں کہ وہ اکثر حدیث نفس میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات عزم بھی ہو جاتا ہے یعنی اگر اس کو موقع ملجائے تو یہ ہرگز نہ بچے تو اِن لوگوں کے علاج کے لئے یہ بڑھا دیا کہ ہم دلوں کی پوشیدہ بات کو بھی جانتے ہیں غرض نظر کی معصیت اتنی مہتم بالشان معصیت ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو مستقل طور پر ذکر فرمایا اور جب اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کا چھوٹنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس میں یہ ہوتا ہے کہ شیطان بہکاتا ہے کہ ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لو توجی بھر جائیگا اور یہ شیطان کا ایسا دھوکہ ہے کہ صغائر کبائر سب میں اس کے ذریعے سے کام لیتا ہے یہ دھوکہ بظاہر نظر خفیف سا معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا دھوکہ ہے اور کس قدر قبیح میں اشد ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ایک معصیت کو بصورت طاعت اس سامنے پیش کیا اور اس طرح اس میں مبتلا کر دیا اور صورتِ طاعت اسلئے ہوئی کہ شیطان نے دل میں یہ ڈالا کہ یہ ارتکاب ایک گناہ کے چھوٹنے کا ذریعہ ہے

اور ترک گناہ کا ذریعہ سبب اوّل تو طاعت واجبہ یا کم از کم ایک امر مستحب تو ضرور رہو گا اور اگر مستحب بھی نہ ہو گا تو جائز تو ضرور ہو گا تو گویا شیطان نے ایک معصیت کو طاعت یا جائز اس کے ذہن میں ڈالا تو کس درجہ کا قبیح اعتقاد ہوا اور باوجود اس خرابی کے پھر وہ مقصود بھی جس کا شیطان نے وعدہ کیا ہے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ خاصیت اس کی یہ ہے کہ اَلْقَلِیْلُ یُفْضِیْ اِلَی الْکَثِیْرِ (قلیل کثیر تک پہونچا دیتا ہے) یعنی جب تک انسان بچا رہے اس وقت تک تو محفوظ رہتا ہے اور جب ایک مرتبہ مبتلا ہو جائے اور پھر ترک بھی کر دے اگرچہ دو چار دن کے لئے ترک میں کامیاب ہو جائے اور اس مدت تک پھر طبیعت اُدھر متوجہ نہ ہو لیکن دو چار دن گذرنے کے بعد پھر تقاضا شروع ہوتا ہے اور چونکہ ایک مرتبہ ارتکاب ہو جانے سے وہ رکاوٹ رہی نہیں اس لئے بہت جلد اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ساری عمر اسی میں گذر جاتی ہے اور پھر وعدۂ ترک کی وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم ‏ ‏ ‏ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(ہر رات کو یہ وعدہ کرتا ہوں کہ کل یہ دھندا ترک کر دوں گا اور جب کل آتی ہے اُسے پھر کل پر ٹال دیتا ہوں)

اور یہ دو چار دن کے لئے ترک معاصی کی کامیابی بھی علی سبیل الفرض مان لی ہے ورنہ اصل تو یہ ہے کہ گناہ پر کبھی یہ اثر ترک معصیت کا مرتب ہی نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

شکم صوفیے را زبوں کرد و فرج ‏ ‏ ‏ دو دینار بر ہر دو آں کرد خرج الخ

صوفی سے ظاہری صوفی مراد ہے۔ یعنی ایک دینار سے اپنے شہوت کو پورا کر لیا اور دوسرے دینار سے پیٹ کو بھر لیا اور سمجھا کہ اب اطمینان ہو گیا آگے فرماتے ہیں کہ پیٹ جس کو بھرا تھا وہ تو پھر خالی ہو گیا اور فرج جس کو خالی

کیا تھا وہ پھر بھر گیا خواہش نہ پیٹ کی کم ہوئی نہ فرج کی اور دین ار دونوں برباد گئے۔ تو واقعی یہی حالت ہے تو اول تو یہ گمان ہی غلط ہے کہ ایسا کرلینے سے یکسوئی ہوجائیگی اور اگر کسی کو شاذ و نادر ہو بھی جائے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ اس گناہ میں یہ منفعت ہے لیکن کسی گناہ میں منفعت ثابت ہوجانے سے بھی وہ گناہ گناہ ہی رہتا ہے دیکھئے شراب میں بھی منافع ہیں چنانچہ اہل تجربہ نے لکھا ہے کہ اس کے پینے سے سخاوت بڑھتی ہے اور بہادری پیدا ہوتی ہے نیز اور بھی بعض اخلاق کہ ان کا حصول شرعًا مطلوب ہے اس سے حاصل ہوتے ہیں بلکہ خود قرآن میں اس کے اندر منافع مان لئے گئے ہیں فرماتے ہیں۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (وہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہدیں کہ ان دونوں میں لوگوں کے لئے بہت بڑا گناہ بھی ہے اور بہت بڑا نفع بھی ہے لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہے) لیکن ان منافع کے ہونے سے شراب کو حلال نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی حرمت ویسی ہی باقی رہی پس اسی طرح اگر کسی دوسری معصیت میں بھی کچھ منافع ثابت ہوجائیں تو ان منافع کی وجہ سے وہ حلال اور جائز نہ ہوجائے گی بلکہ ان منافع کو کالعدم قرار دیں گے اور اس فعل کو معصیت ہی کہیں گے پھر ان سب باتوں کے ماسوا اگر عین ارتکاب کے وقت دم نکل جائے کیونکہ موت حیات کسی کے اختیار میں نہیں ہے تو بتلائیے کہ کس ردی حالت میں انتقال ہوگا اور اگر نہ بھی مرے تو ممکن ہے کہ ارتکاب کے بعد توبہ نصیب نہ ہو بلکہ ایسے لوگوں کو اکثر توبہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ جب بیباکی بڑھ جاتی ہے تو افعال پر ندامت نہیں ہوتی اور جب ندامت نہیں ہوتی تو توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ہر چند توبہ مقولہ فعل میں سے ہے لیکن اس کا جزو اخیر

ایک انفعال ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ارشاد ہے اَلتَّوْبَةُ نَدَمٌ (توبہ پشیمانی اور ندامت ہے) اور یہ جزو پورے طور سے اختیار میں نہیں اور جب کثرتِ معاصی سے بیباکی ہو جاتی ہے تو ندم پھر مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور جب یہ حالت ہے تو ذرا غور کر لیجئے کہ ہم لوگ کس بر تے پر گناہ کی جرأت کرتے ہیں۔ یہ لکھے پڑھے لوگوں کے گناہ ہیں کہ تاویلیں کر کر کے ان کے مرتکب ہوتے ہیں۔

علیٰ ہذا اہل دل کو بھی بسا اوقات اسی قسم کا دھوکا ہوتا ہے چنانچہ اگر عُجب پیدا ہوتا ہے تو اس کا علاج کسی معصیت سے کیا جاتا ہے اور مصلحت یہ سمجھی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے ہم اپنی نظروں میں ذلیل رہیں گے اور اس سے عُجب کی جڑ کٹ جائے گی۔ صاحبو! یہ ایسا علاج ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بدن سے پاخانے کو بذریعہ پیشاب دھونے لگے نیز در پردہ یہ لوگ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرتے ہیں اور شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہنوز کامل نہیں سمجھتے کیونکہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گناہ سے بچنے کی ترکیب یہ کہیں نہیں بتلائی کہ اُس گناہ میں مبتلا ہو جاؤ اور یہ لوگ اس ترکیب کو علاج سمجھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امراض باطن کے علاج میں ناقص سمجھتے ہیں اور یہ مقابلہ ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا) کا اور اگر کہئے کہ بعض بزرگوں نے بھی اس کو علاج بتلایا ہے تو ہم کہیں گے اگر یہ حکایت صحیح ہے تو انھوں نے غلطی کی اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس شخص کا نام کتاب میں لکھا ہو وہ ضرور شیخ قابل تربیت ہو یا وہ اس قابل ہو جائے کہ اس کی تقلید کریں۔ اسی طرح زبان کا گناہ ہے کہ شاید طالب علم سے زیادہ اس میں کوئی شخص مبتلا نہیں ہوتا ہو اور یہ گناہ نہایت ہی شدید ہے حدیث میں ہے

اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَاءِ (غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے) اور پھر غیبت بھی دو قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے ایک تو بُرے کو بُرا کہنا اور ایک اچھے کو بُرا کہنا عوام الناس اگر غیبت میں مبتلا ہیں تو وہ اکثر ایسے لوگوں کو بُرا کہتے ہیں جو کہ واقع میں بھی بُرے ہیں اور ہم لوگ ایسے لوگوں کو بُرا کہتے ہیں جو کہ نہایت صالح متقی عالم فاضل ہیں اکثر طالب علموں کی زبان سے سنا ہوگا کہ فلاں شخص کو آتا ہی کیا ہے۔ فلاں میں یہ عیب ہے۔ اگرچہ ان فضلاء میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ فضول سے مشتق ہیں اور ان کی غیبت جائز بھی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کہ خلق اللہ کو گمراہ کر رہے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ ان کی غیبت سے بھی بچا جائے کیونکہ جب غیبت کی عادت ہو جاتی ہے تو پھر اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں رہتی اور حفظ حدود نہیں ہو سکتا۔ یہ حالت ہوتی ہے کہ جس کی طرف سے ذرا بھی کدورت ہوئی فوراً اس کا تذکرہ بُرائی کے ساتھ شروع کر دیا۔ اسی طرح قلب کی یہ حالت ہے کہ اس میں کینہ حسد بغض عداوت غرض تمام امراض بھرے ہوئے ہیں اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اگر عمل کا تھوڑا بہت اہتمام ہے بھی تو صرف اعمال جوارح کا باقی زبان اور قلب اکثر تباہ ہے اور اکثر تو ہم میں سے تینوں ہی قسم کے گناہوں میں خوب اچھی طرح سے مبتلا ہیں غرض بیباکوں کو تو سب میں ابتلا ہے اور محتاط قدرے جوارح کی حفاظت کرتے ہیں مگر زبان کی حفاظت نہیں کرتے اور جو بہت ہی متقی ہیں وہ زبان کی بھی حفاظت کر لیتے ہیں قلب کی حفاظت وہ بھی بہت کم کرتے ہیں اور معاصی قلوب سے ان کو بہت کم نجات ہوتی ہے۔ تو مرض قلب وہ مرض ہوا کہ قریب قریب سب کے سب ہی اس میں مبتلا ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں تینوں نوعوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ انبیاء جوارح کو بھی بچاتے تھے کہ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ ان کی حالت تھی اور زبان کو بھی معاصی سے روک کر اس کو طاعت میں لگاتے تھے یَدْعُوْنَنَا ان کی شان تھی اور پھر ان کی دعا ر

بھی رغبت اور رہبت کے ساتھ تھی یعنی ظاہر یہ ہے کہ رغبت اور رہبت کو بہ طور شرط فرمایا ہے اور مقصود یَدْعُوْنَنَا معلوم ہوتا ہے اگرچہ دوسری تفسیر بھی اس کی ممکن ہے جیساکہ میں نے پہلے اشارہ بھی کیا ہے لیکن مجھے اختیار ہے کہ میں اِس تفسیر کو اختیار کرلوں۔ اور قلب کو بھی معاصی سے پاک رکھتے تھے کہ ان میں خشوع پایا جاتا تھا۔ مجھے زیادہ تر اس وقت یہی بیان کرنا بھی ہے کہ یہ تیسرا جزو یعنی خشوع کہ عمل قلب ہے ہم میں بہت کم پایا جاتا ہے حالانکہ یہ ساری طاعت کا راس ہے مگر ہم لوگ اس کی ذرا فکر اور اہتمام نہیں کرتے اور ہماری اس حالت فقدانِ خشوع کی شکایت نہایت صاف لفظوں میں قرآن شریف میں بھی ہے فرماتے ہیں اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ یعنی کیا مسلمانوں کے لئے ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب خشوع کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ شکایت اس امر کے ترک پر ہوتی ہے جس کا کرنا نہایت ضروری اور واجب ہو۔ تو معلوم ہوا کہ خشوع نہایت ضروری عمل ہے اور اس کا مقابل قساوت ہے چنانچہ ارشاد ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ ط فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَۃِ قُلُوْبُھُمْ مِّنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ط الخ (بھلا جس کا سینہ کھولدیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے سو وہ اُجالے میں ہے اپنے رب کی طرف سے سو خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے قاسی ہیں۔ اور آگے فرماتے ہیں اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَ قُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ط (اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی بہتربات (یعنی) کتاب جوکہ آپس میں ملتی جلتی ہوئی ہے دہرائی ہوئی ہے اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جوکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف مائل ہوجاتے ہیں) تو اس آیت میں قساوت کا مقابل لین کو فرمایا ہے اور لین وہی خشوع ہے

تو معلوم ہوا کہ خشوع کا مقابل قساوت ہے اور قساوت کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے اِنَّ اَبْعَدَ شَیْئٍ مِنَ اللّٰہِ الْقَلْبُ الْقَاسِیْ تو خشوع کی تاکید کرنا جیسا کہ سابق کی آیت میں ہے اور قساوت کی مذمت کرنا جس کا حاصل خشوع کے ترک پر مذمت کرنا ہے جیسا مابعد کی آیت میں ہے اس سے زیادہ اور اس کے ضروری اور واجب ہونے کے لئے کیا چاہیئے۔

پس ہر عالم اور طالب کے لئے لازم ہے کہ وہ قلب میں خشوع پیدا کرے اور اس کے ظاہری آثار یہ ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے بات چیت میں معاملات میں سختی نہ کرے غیظ اور غضب میں مغلوب نہ ہو۔ انتقام کی فکر میں نہ رہے۔ علیٰ ہذا اور ان کو آثار اس لئے کہا کہ جب قلب میں خشوع کی صفت ہوگی تو جوارح پر اس کا اثر ضرور پڑیگا حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو یہ ایسا ہرگز نہ کرتا اب اس کی ضرورت اور آثار معلوم ہو جانے کے بعد دیکھ لیجئے کہ آیا ہمارے قلب میں خشوع ہے یا نہیں اور اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ کے مضمون میں داخل ہیں یا نہیں اور ہمارے قلوب میں ترفع اور شیخی تو نہیں پائی جاتی پس اگر ہمارے قلوب میں خشوع ہے تو کیا وجہ کہ اس کے آثار نہیں پائے جاتے اس کی کیا وجہ کہ ہم کو اپنا کام خود کرنے سے یا کسی مسلمان کا کام کرنے سے عار آتی ہے۔

صاحبو! حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ تو کوئی مخدوم نہیں ہے پھر دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا حالت تھی فرماتے ہیں۔ اِنِّیْ اٰکُلُ کَمَا یَاْکُلُ الْعَبْدُ کہ میں کھانا اس طرح کھاتا ہوں

جیسے کوئی غلام کھاتا ہے جس میں تجبر اور تکبر کا نام نہیں ہوتا۔ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے چلنے پھرنے کی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی آگے نہ چلتے تھے بلکہ کچھ صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم آگے ہوتے تھے اور کچھ برابر میں ہوتے تھے اور کچھ پیچھے ہوتے تھے اور یہ کسی کا آگے اور کسی کا پیچھے چلنا بھی کسی خاص نظم اور ترتیب سے نہیں تھا جیسے آج کل بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کی عادت ہے کہ جب چلتے ہیں تو باقاعدہ کچھ لوگ ان کی عزت وشان بڑھانے کو ان کے آگے پرا جماتے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ان کے پیچھے ہوتے ہیں سو یہ نہ تھا بلکہ جس طرح بے تکلف احباب ملے جلے چلتے ہیں کہ کبھی کوئی آگے ہوگیا اور کبھی کوئی آگے ہوگیا اس طرح چلتے تھے لباس کی یہ شان تھی کہ ایک ایک کپڑے میں کئی کئی پیوند لگا کر پہنتے تھے آرام کرنے کی یہ حالت تھی کہ ٹاٹ کے اوپر آرام کرتے تھے۔ معاشرت کی یہ حالت تھی کہ اپنا کاروبار خود کرتے تھے بازار سے ضرورت کی چیزیں جاکر خرید لاتے تھے۔ غرض یہ سب افعال جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منقول ہیں تو کس لئے۔ کیا اس لئے کہ ہم سنیں اور پرواہ بھی نہ کریں۔ صاحبو! جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول متبوع ہے اسی طرح آپکا فعل بھی متبوع ہے جب تک تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو۔ ارشاد ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لئے اللہ تعالےٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر اچھی اور عمدہ عادتیں ہیں) تو یہ افعال بھی سب اتباع ہی کے لئے ہیں کہ ہماری بھی وہی وضع ہو وہی چال ڈھال ہو وہی معاشرت ہو۔ ایک صحابی رضی اللہ تعالےٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانا کھاتے

دیکھا تو کانپ اٹھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تواضع کی کس حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی باہر کا ایلچی ڈر گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے مت ڈرو میں ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو کہ سوکھا گوشت کھاتی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات کو دیکھئے اور پھر اپنے کو تو معلوم ہو گا۔

ع ، ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(راستے کا فرق دیکھو کہاں سے کہاں تک ہے)

حدیث شریف میں وارد ہے کہ اَلْبَذَاذَۃُ مِنَ الْاِیْمَانِ کہ سادگی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ سو دیکھ لیجئے کہ ہم میں بذاذۃ اور سادگی پائی جاتی ہے یا نہیں میرے خیال میں جہاں تک غور کیا جائیگا ہم میں سادگی کا پتہ بھی نہیں ملے گا اور نہایت افسوس اس امر کا ہے کہ اس وقت خود اکثر اہلِ علم میں عورتوں کی سی زینت آگئی ہے۔ صاحبو! یہ ہمارے لئے دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا میں بھی سخت نقص ہے اس سے بجائے عزت بڑھنے کے اور ذلت بڑھتی ہے ہمارا کمال تو ہے کہ ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمتِ قاروں باشی

(اے دل بہتر یہ ہے کہ تو مئے گلگوں کو پی کر مست ہو جائے اور بغیر کسی مال اور بغیر کسی خزانے کے قارون کی حشمت اور اس کا رعب پیدا کرے)

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(منزل لیلےٰ کے راستہ میں جس میں جان کے خطرے ہیں پہلی شرط یہ ہے کہ تو مجنوں بنے)

ہمارے لئے کمال یہی ہے کہ نہ لباس میں کوئی شان و شوکت ہو نہ دوسرے سامان میں۔ مگر اس وقت یہ حالت ہے کہ اکثر طالب علموں کو دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طالب علم ہیں یا کسی نواب کے لڑکے۔ اور یہ کوئی دیندار ہیں یا دنیا دار کسی نے خوب کہا ہے ؎

یا مکن با پیلباناں دوستی　　یا بنا کن خانہ بر انداز پیل
یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی　　یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

(یا تو ہاتھی ہانکنے والوں کے ساتھ دوستی مت کرو یا اگر کرتے ہو، تو ہاتھی کے برابر اپنا مکان بھی بناؤ۔ یا تو چہرے پر عاشقی کا رنگ مت لگاؤ اور اگر لگاتے ہو تو پھر تقویٰ کے لباس کو بھی اُسی رنگ میں رنگو)

یعنی یا تو آدمی کسی جماعت میں داخل نہ ہو اور اگر داخل ہو تو پھر وضع قطع سب اسی کی سی ہونا چاہیئے علم کی یہی زینت ہے کہ اہل علم کی وضع پر رہے میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا بھی خیال نہیں تو کم ازکم اس کا خیال تو ضرور کیجیے کہ آپ کس کے وارث ہونے کے مدعی ہیں اور ان مورث کی کیا حالت تھی۔ واللہ ہماری حالت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دین کا ہم پر کامل اثر نہیں ہوا دین نے ہمارے قلب میں پوری جگہ نہیں کی ہمارے سلف صالحین کی تو یہ حالت تھی کہ انھوں نے بعضے مباح امور کو بھی جبکہ وہ مفضی بہ تکلف یا فساق کا شیوہ ہو گئے تھے ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ بناء اول پر باریک کپڑا پہننا چھوڑ دیا تھا اور اسی بناء پر حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ رَقَّ ثَوْبُہٗ رَقَّ دِیْنُہٗ (جس نے اپنے لباس کو باریک بنایا اس کا دین بھی رقیق اور کمزور ہو گیا) دوسری بناء کے متعلق ایک واقعہ ہے کہ کسی صحابی یا تابعی نے (میں اس وقت بھولتا ہوں) ایک مرتبہ کسی خلیفہ کو مہین لباس پہنے دیکھ کر یہ کہا تھا کہ اُنْظُرُوْا اِلٰی اَمِیْرِنَا ھٰذَا یَلْبَسُ ثِیَابَ الْفُسَّاقِ (ہمارے سردار کو دیکھو یہ فاسقوں کا لباس پہنتے ہیں) اور بناء ثانی بھی درحقیقت ناشی بناء اول سے تھی یعنی چونکہ سلف میں سادگی بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی اسلئے اس وقت صلحاء باریک کپڑے نہ پہنتے تھے بلکہ فُسّاق ہی پہنتے تھے اس لئے امیر کو فساق کا لباس پہنے دیکھ کر یہ اعتراض کیا۔ پس اسوقت بھی جو امور وضع اہل باطل یا اہل کبر کی ہیں گو فی نفسہ مباح ہی ہوں ان کو ترک کرنا چاہیئے جیسے انگریزی

بوٹ جوتے پھندنے دار ٹوپی وغیرہ۔ کیونکہ اس قسم کے امور اوّل تو من تشبہ میں داخل ہیں دوسرے اگر ان کو تشبہ سے قطع نظر کر کے مباح مطلق بھی مان لیا جائے تب بھی چونکہ ثقہ لوگوں کی وضع نہیں اسلئے بھی وہ قابل ترک ہوں گے۔ ہماری وضع ایسی ہونا چاہیئے کہ لوگوں کو دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ ان لوگوں میں ہیں جن کو وحشی ونا کارہ سمجھا جاتا ہے جو کہ ہمارے لئے مایۂ فخر ہے کیونکہ ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند از ہمہ کارِ جہاں بیکار ماند
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد مرعسس را دید و در خانہ نہ شد
ما اگر قلاشِ وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ جسے یزداں کہا جاتا ہے وہ دُنیا کے سارے دھندوں سے بیکار ہوتا ہے۔ وہ پاگل ہے جو کہ دیوانہ نہیں ہوا محافظ کو دیکھا اور گھر میں نہ رہا اگر ہم محتاج اور دیوانے ہیں تو اُس ساقی اور اس پیمانے کے مست بھی ہیں)

اور اہلِ تکلف کی وضع کی نسبت فرماتے ہیں ؎

عاقبت سازد ترا از دیں بری ایں تن آرائی وایں تن پروری

(تو اپنی عاقبت سنوار تجھکو یہ تکلف اور تصنع انجام کار تجھے دین سے دور کر دیگا)

حقیقت میں اس کا انجام بہت ہی بُرا ہے کیونکہ اس میں قطع نظر اس کے کہ یہ بذاتِ کے بالکل خلاف ہے ایک بڑی مضرت یہ ہے جب ہر وقت یہی شغل رہے گا تو بہ قاعدہ اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰى شَيْئَيْنِ فِي اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک ہی وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) یہ ضروری ہے کہ علم کی طرف توجہ نہ رہے گی اور علم سے بالکل بے بہرہ رہیگا چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ ہر وقت اپنے بناؤ سنگار میں رہتے ہیں نہ ان میں کوئی استعداد ہوتی ہے نہ مناسبت اور یہ یقینی ہے کہ جو شخص امور عظام میں

مشغول ہوتا ہے اس کی نظر امور صغار پر نہیں رہا کرتی حتیٰ کہ یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ غسل کب کیا تھا اور کپڑے کب بدلے تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ شریعت مطہرہ نے یہ قانون مقرر کر دیا کہ ایک ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور غسل کر لیا کرو ورنہ یہ تو خود امر طبعی تھا مگر کام کرنے والے لوگوں کو اس طرف التفات نہیں رہتا اس لئے قانون کی ضرورت پڑی۔ سبحان اللہ کس قدر رعایتیں شریعت مطہرہ نے مرعی رکھی ہیں کہ ایک طرف تو بذاذۃ کا حکم ہو رہا ہے تاکہ زینت اور تکلف نہ آجائے اور چونکہ بعض لوگوں سے اس پر ایسا عمل کرنے کا احتمال تھا کہ وہ اپنے تن بدن کی خبر نہ رکھنے کی وجہ سے حد نظافت سے بھی خارج ہو جاتے اس لئے دوسرے موقع پر یہ بھی فرما دیا کہ ہفتے بھر میں ایک مرتبہ ضرور غسل کر لیا کرو۔ تاکہ نظافت بھی فوت نہ ہو جائے کیونکہ نظافت مطلوب ہے چنانچہ اس کی اس قدر ترغیب دی ہے کہ یوں ارشاد فرمایا نظفوا افنیتکم ولاتتشبھوا بالیھود یعنی اپنے فناء دار کو صاف رکھا کرو اور اس کو میلا کچیلا رکھ کر یہود جیسے نہ بنو۔ فناء دار اس حصہ زمین کو کہتے ہیں جو کہ گھر سے باہر دروازے کے سامنے ہو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب فناء دار تک کی نظافت مطلوب ہے تو خود دار کی اور اس سے بڑھ کر لباس اور بدن کی نظافت کس درجہ مطلوب ہوگی۔ سو شریعت کی تو یہ تعلیم ہے کہ دونوں امر میں اعتدال تبلایا مگر اس کے بعد اپنے اوپر نظر کر کے وہ شعر یاد آتا ہے کہ ؎

چوں گرسنہ میشوی تو سگ شوی چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

(جب تم بھوکے ہوتے ہو تو کتا ہو جاتے ہو اور جب کھاتے ہو تو سرکش اور کمینے ہو جاتے ہو)

یعنی ہماری بھوک بھی ایک آفت اور سیری بھی ایک مصیبت یعنی

اگر نظافت اختیار کریں گے تو اس درجہ کہ نواب معلوم ہوں اور بذاذۃ پر اتریں گے تو اس حد تک کہ کپڑے بھی سڑے ہوئے بدن بھی سڑا ہوا وہ تعدیل کی شان جو شریعت نے سکھلائی ہے اس کا کہیں کوسوں بھی پتہ نہیں حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ نظافت اور بذاذۃ دونوں کو ہاتھ سے نہ جانے دے یہ تو شرعی پہلو سے بذاذت پر گفتگو تھی اب حِسّی اعتبار سے لیجئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حِسًّا بھی یہی حالت ہے کہ جو آدمی کسی بڑے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کو چھوٹے کاموں کی طرف توجہ نہیں ہوتی مثلاً شادی کے موقع پر جن لوگوں کی سپرد شادی کا انتظام ہوتا ہے ان کو نہ اپنے کپڑوں کی خبر ہوتی ہے نہ بدن کی اور وہ اس کو کچھ عار نہیں سمجھتے بلکہ اپنی کارگذاری پر ناز کرتے ہیں بلکہ جو زیادہ مشغول ہوتے ہیں ان کو اس طرف بھی التفات نہیں ہوتا کہ اس سے کارگذاری کا اظہار ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ انہماک فی الامور العظام کے لئے بذاذۃ اور عدم الالتفات الی صغار الامور لازم ہے۔ پس جو طالب علم اپنے علم کے شغل میں لگا ہوگا اس کو کبھی اس کی فکر نہ ہوگی کہ میرے پاس بوٹ بھی ہے یا نہیں اور رومال بھی ہے یا نہیں۔ اسی کی بناء پر محققین نے کہا ہے کہ ریفارمر ہونے کے لئے عادۃً لازم ہے کہ وہ بالکل سادہ زندگی بسر کرے گا اور بڑے لوگوں کی سوانحعمری دیکھنے سے بھی اگرچہ وہ دنیا ہی کے بڑے ہوں صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ انھوں نے زندگی نہایت بے تکلف بسر کی۔ پس جو شخص ہر وقت مانگ پٹی میں مشغول رہے اس کی نسبت سمجھ لینا چاہیئے کہ لیس من الکمال فی شیٔ (اسے کوئی کمال حاصل نہیں ہے) ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ اُن کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی ان ان کو گھر پر جاکر آواز دیتا تو کم سے کم نصف گھنٹہ میں باہر آتے اس کی وجہ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس وقت پکارنے کی آواز گھر میں پہنچتی ہے تو

وہ آئینہ اور کنگھا طلب کرتے ہیں اور نہایت تکلف سے بالوں کو درست کر کے مانگ نکال کر داڑھی میں کنگھا کر کے ایک ایک بال کو موزوں بنا کر غرض دولھا بنکر باہر تشریف لاتے تھے

(ع۔ جنوں وخبط نہ کہئے اسے تو کیا کہئے۔ جامع)

اسی طرح اکثر متکلفین کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک دو جوڑا محض اس اس کام کے لئے رہتا ہے کہ جب باہر نکلیں تو اس کو زیب تن کر کے نکلیں اور جب واپس آئیں تو پھر وہی لنگوٹی یا سڑے ہوئے کپڑے ان کا لباس گویا ہاتھی کے دانت ہیں کہ کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ اور ان لوگوں کو شیطان نے یہ دھوکہ دیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالَ (اللہ تعالےٰ خوبصورت ہیں اور خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں) اور جب خدا تعالےٰ کو جمال پسند ہے تو ہم کو بھی جمیل بنکر رہنا چاہیئے لیکن میں ان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر یہ تزئین محض جمال کی وجہ سے ہے تو اس کی کیا وجہ کہ محض جلوت میں یہ تکلف کا لباس پہنا جاتا ہے کیا خلوت میں خدا تعالےٰ کو جمال پسند نہیں۔ صاحبو! یہ سب نفس کی توجیہات اور نکات بعد الوقوع ہیں اور خود آثار سے پتہ چل جاتا ہے کہ اصل مقصود کیا ہے چنانچہ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ نہایت کم قیمت کپڑا معمولی کپڑا پہنیں گے لیکن وضع ایسی اختیار کریں گے کہ دوسرے کو نہایت قیمتی معلوم ہو نیز تراش ایسی ہوگی کہ یہ بڑے لوگوں میں شمار ہوں اور وضع وتراش کا ذکر تکلف کی مثال میں اس لئے کیا کہ کپڑے میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک صورت اور ہیئت۔ سو تکلف میں اکثر زیادہ دخل ہیئت کو ہوتا ہے یعنی اگر کسی قیمتی کپڑے کی سادہ ہیئت بنالی جائے تو وہی معمولی اور سادہ معلوم ہونے لگتا ہے ہمنے بعض امراء کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت قیمتی کپڑا پہنتے ہیں لیکن اس کی وضع ایسی سادہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل معمولی معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض غرباء کو دیکھا ہے کہ وہ کپڑا کم قیمت پہنتے ہیں مگر بہت ہی خوبصورت بنا کر۔ تو اگر خدا تعالیٰ نے وسعت دی ہو قیمتی کپڑا پہنو لیکن اس کی وضع بالکل سادہ رکھو اس میں بناوٹ اور تزئین ہرگز نہ ہونے دو مگر یہ اُسی سے ہو سکے گا جو کسی بڑے کام میں مشغول ہوگا۔ پہلے طالب علموں کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ وہ بالکل اول جلول رہتے تھے کہ نہ کُرتے کی خبر ہے نہ پاجامے کی پھر دیکھ لیجئے کہ اُن میں سے جو اب موجود ہیں وہ اپنے وقت کے مقتدا ہیں اور جو شخص کرتے پاجامے کی زیب و زینت میں مشغول رہے گا اس کو کبھی یہ بات کہاں میسر ہو گی نیز ان لوگوں کو یہ بھی غور کرنا چاہیئے کہ ہم جو تکلف اور فیشن کے پیچھے پڑے ہیں آخر اس کی غرض کیا ہے ظاہر ہے کہ اپنی قدر بڑھانا اور لوگوں کی نظروں میں عزیز بننا یہی اس کی غرض ہوتی ہے سو علماء کی جماعت میں تو اس سے کچھ قدر نہیں ہوتی اس جماعت کی نظروں میں قدر بڑھانے کی تو صورت یہ ہے کہ علم میں کمال حاصل ہو اگرچہ پیجامہ نصف ساق تک ہی ہو اور اگرچہ کرتہ بالکل بھی نہ ہو کانپور میں جس زمانہ میں میرا قیام تھا ایک مرتبہ میں مدرسہ میں پڑھاتا تھا کہ ایک شخص آکر بیٹھے ان کے بدن پر صرف ایک لنگی اور ایک چادر تھا۔ اس ہیئت کو دیکھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی لیکن جب انھوں نے گفتگو شروع کی تو معلوم ہوا کہ بہت بڑے فاضل ہیں۔ پھر تو ان کی اس قدر وقعت ہوئی کہ ہر ہر طالب علم ان پر جھکا جاتا تھا اور تتبع حالات وخیالاتِ عوام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظروں میں بھی اہل علم کی وقعت وضع ولباس سے نہیں غرض آپ لوگوں کی وقعت علم سے اور تقویٰ وطہارات سے ہے نہ کہ لباس سے۔ یہ ظاہری زیب وزینت صرف ان لوگوں کے لئے ذریعہ حصول وقعت ہے

جو کمال سے عاری ہیں ورنہ خوب سمجھ لو کہ ؎

زعشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی ست ٭ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روی زیبا را

(ہمارے ناقص عشق کی جمال یار کو کوئی ضرورت نہیں آب و رنگ تل اور خط کی حسین چہرے کو کیا حاجت ہوسکتی ہے)

اور یہ بھی اس وقت ہے کہ وقعت کو کسی درجے میں قابل شمار کہا جائے ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود یہ وقعت ہی کوئی چیز قابل اہتمام نہیں غرض یہ آثار ہیں کپڑے میں خشوع و تجبّر کے۔ اسی طرح چلنے اور بولنے میں بھی اس کے کچھ آثار ہیں جن کی نسبت ارشاد خداوندی ہے وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ یعنی اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا کرو اور آواز کو پست کرو۔ پس معلوم ہوا کہ جب قلب میں خشوع ہوتا ہے تو رفتار میں بھی خشوع کا اثر ہوتا ہے اور آواز میں بھی اس کا اثر ہوتا ہے اور جیسے خشوع کے لئے یہ آثار لازم ہیں اسی تجربہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ان آثار کے لئے بھی خشوع لازم ہے بلکہ ہر ظاہری ہیئت کا اثر باطن پر پڑتا ہے دیکھئے اگر کوئی شخص غمگین صورت بناکر بیٹھ جائے تو قلب میں بھی اضمحلال کا اثر محسوس ہوگا۔ یا اگر کوئی شخص متکبرانہ وضع بنالے تو دل میں بھی ایک تجبّر اور تکبر کی شان پائی جائے گی تو جیسے باطن ظاہر میں موثر ہے کہ باطن کے موافق آثار ظاہر میں پائے جاتے ہیں اسی طرح ظاہر بھی باطن میں موثر ہے جب ایسا ہے تو جن لوگوں کو اس وقت تک صفت خشوع حاصل نہیں ہوسکی ان کو چاہیئے کہ وہ متواضعین کے افعال اختیار کریں انشاء اللہ تعالےٰ اس سے قلب میں بھی تواضع کی صفت پیدا ہوگی اور صاحبو کوئی تو وجہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متکبرین کے افعال سے ممانعت فرمائی اور قرآن شریف میں وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ارشاد ہوا۔ ذرا آپ اپنے اسلاف کے حالات کو دیکھئے کہ ان کی کیا شان

تھی بلکہ میں کہتا ہوں کہ جو حضرات اکابر دین اس وقت موجود ہیں اُن
ہی کے حالات کو دیکھ لیجئے کیا ان کے افعال قابل اتباع نہیں جب ضرور ہیں
پس ہم کو لازم ہے کہ ہم وہی وضع اختیار کریں جو کہ ان کو مرغوب ہو اور
جس کو وہ اختیار کر چکے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہم اس تشبہ ظاہری کی بدولت
اپنے باطن کو درست کر سکیں۔ اہل اللہ کے ساتھ یہ ظاہر کا تشابہ بھی وہ چیز ہے
کہ اس کی بدولت کفار پر فضل ہو گیا ہے۔ سیر کی روایت ہے کہ جب فرعون
نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے ساحرین کو جمع کیا تو وہ لوگ اسی لباس
میں آئے تھے جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لباس تھا آخر مقابلہ ہوتے ہی
تمام ساحرین مسلمان ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خداوندی
میں عرض کیا کہ یا الٰہی یہ سامان فرعون کے اسلام کے لئے ہوا تھا کیا سبب
کہ اس پر فضل نہ ہوا اور ساحرین کو توفیق ایمان ہو گئی ارشاد ہوا کہ اے
موسیٰ یہ لوگ تمہاری سی صورت بنکر آئے تھے ہماری رحمت نے پسند
نہ کیا کہ ہمارے محبوب کے ہم وضع لوگ دوزخ میں جائیں اسلئے ان کو
توفیق ہو گئی اور فرعون کو چونکہ اتنی مناسبت بھی نہیں تھی اس لئے
اس کو یہ دولت نصیب نہ ہو سکی۔ اس حکایت سے احتجاج مقصود نہیں
کہ اس کے ثبوت میں کلام کرنے لگو بلکہ صرف تائید منظور ہے اگر یہ حکایت
صحیح نہ ہو اور اس لئے تقریر سے حذف بھی کر دیا جائے تو بھی اصل مضمون
دلائل سے ثابت ہے کسی حکایت کا عدم ثبوت مضر نہیں غرض یہ ہے خشوع
اور اس کے آثار اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اگر ہم میں صفت خشوع موجود ہے تب تو
ہم کو اس کے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے اور اگر یہ صفت موجود نہیں
ہے تو خود اس کی تحصیل کے لئے ایسا کرنا یعنی اس کے آثار کا اختیار کرنا ضروری
ہے کیونکہ تحصیل خشوع کی علت کے اجزا میں سے ایک جزو یہ بھی ہے اور دوسرا
جزو یہ ہے کہ اہل خشوع کی صحبت اختیار کی جائے تیسرا جزو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی خشیت کو بیٹھ جگہ دیجائے

اور اس خشیت کو پیدا کرنے کے لئے یہ تدبیر کی جائے کہ کوئی وقت مناسب تجویز کرکے اُس میں تنہا بیٹھکر اپنی حالت عصیاں اور پھر خدا تعالےٰ کے نعم اور نیز اس کے عذاب آخرت اور قیامت کے احوال پلصراط میزان دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا جائے اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کو معمول کرلیا جائے تو انشاء اللہ بہت کچھ فائدہ ہوگا کیونکہ اس کو خشیت کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خشیت سے خشوع ہوگا نیز دوسرے طور پر بھی اس کو حصول آثار خشوع میں دخل ہے وہ یہ کہ سب سے پہلا اثر جو اس سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے دل بالکل اُٹھ جاتا ہے اور جب دنیا سے دل اُٹھ جاتا ہے تو تکلف اور زینت اور اسی طرح دلبستگی کے سب آثار جاتے رہتے ہیں اور اس قسم کی تمام باتوں سے نفرت ہوجاتی ہے اسلئے کہ اس شخص کے پیش نظر ہر وقت سفر آخرت رہیگا اور دنیا میں اپنے تئیں مسافر سمجھے گا اور ظاہر ہے کہ مسافر کو سفر میں دلبستگی نہیں ہوا کرتی۔ اس کو منزل کا خیال ہر وقت سوہان روح رہتا ہے چوتھا جزو علت خشوع کا یہ ہے (اور یہ بعد فراغ کتب درسیہ آپکے ذمہ واجب العمل ہے) کہ اگر ظاہری علوم کی تحصیل میں دس سال ختم کئے ہیں تو باطن کی درستی میں کافی سال تو کیا چند ماہ ہی خرچ کردیجئے یعنی کم سے کم دس مہینے ہی کسی کامل کی خدمت میں صرف کیجئے اور اس کے ارشاد کے مطابق چلئے۔ خداوند تعالےٰ کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے دولت خشوع عطا فرماتے ہیں اور علم کا اثر قلب کے اندر پیوست ہوجاتا ہے۔ خوب کہا ہے ؎

علم چوں بر تن زنی مارے بود　　علم چوں بر دل زنی یارے بود

(علم کو اگر تم بدن سے لگاؤ گے تو وہ تمہارے لئے سانپ ہوجائیگا اور اگر دل سے لگاؤ گے تو وہ تمہارا دوست ہوگا)

ایک جگہ اس کی تدبیر بتلاتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو　　پیش مردِ کاملے پامال شو

بات کو چھوڑ کر صاحب حال ہو اور کسی بزرگ کے سامنے پامال ہو جاؤ

صحبت نیکاں اگر یکساعت است بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

اگر ایک ساعت کے لئے بھی نیک لوگوں کی صحبت میسر آجائے تو وہ سو سال کی عبادت اور پرہیزگاری سے بہتر ہے

یک زمانے صحبتے با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اولیاء کی تھوڑی صحبت سو سال کی پر خلوص عبادت سے بڑھ کر ہے

نفس نتواں کشت الا ظلِ پیر دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

علاوہ کسی پیر کے سائے کے نفس کو اور کوئی نہیں مار سکتا تم نفس مارنے والے پیر کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر و پس برآ

(اے دل اگر تجھے اس سفر کی خواہش ہے تو رہبر کا دامن تھام کے چلا آ)

در ارادت باش ثابت اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

ارادے میں اے فرید ثابت اور اٹل رہو تاکہ معرفت کے خزانے کی کنجی تمہیں دستیاب ہو جائے

شاید کسی کو ناز ہو کہ ہمارے پاس تو کتابیں ہیں ان کو دیکھ کر ہم سب کچھ حاصل کر لیں گے اسلئے آگے فرماتے ہیں ؎

بے رفیقی ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق

(جس نے کہ بغیر کسی رفیق سفر کے عشق کے راستے میں قدم رکھا عمر گذرنے کے باوجود بھی اسے عشق سے آگاہی نہیں ہو سکتی)

اس شعر کو سنکر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے متعدد حضرات کی نسبت سنا ہے کہ وہ بغیر مرید ہوئے اس راہ میں کامیاب ہو گئے اس لئے اس کا جواب دیا جاتا ہے ؎

یار باید راہ را تنہا مرو بے قلاوز اندریں صحرا مرو

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ہم بعونِ ہمت مرداں رسید

(راستے کے لئے ساتھی کی ضرورت ہے تنہا مت جا۔ جس نے تنہا اور اکیلے اس راستے کو اختیار کیا وہ بھی بزرگوں کی توجہ سے ہی پہونچا ہے)

یعنی اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو وہ بھی محض ظاہرًا ہوا ہے ورنہ واقع میں وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور مدد ہی سے مقصود تک پہونچا ہے اگرچہ اس کو اس مدد کی خبر بھی نہ ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچے کی پرورش کہ بدوں ماں باپ کی مدد اور اعانت کے وہ پرورش نہیں پا سکتا لیکن اس کو خبر نہیں ہوتی تو اگر وہ بچہ بڑا ہو کر کہنے لگے کہ بغیر کسی کی مدد کے اتنا بڑا قوی الجثہ ہو گیا ہوں تو جس طرح اس کا یہ قول غلط اور قابل مضحکہ ہے اسی طرح اس راہ کے قطع کرنے والے کا قول بھی بالکل غلط ہو گا بات یہ ہے کہ بعض مرتبہ ظاہرًا ایک شخص کو کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا لیکن واقع میں بہت سے حضرات باہر خداوندی اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور وہ اس کو غلطیوں میں پھنسنے سے بچاتے ہیں اور قطع راہ میں مدد فرماتے ہیں بہرحال اس جز کی بھی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اس پر اسی وقت عمل کرنا مناسب ہے کہ جب کتب درسیہ سے فراغ ہو چکے اور اساتذہ ادھر متوجہ ہونے کی اجازت دیدیں اور اگر اساتذہ ختم درسیات کے بعد بھی چندے درسیات ہی میں مشغول رہنے کا حکم فرمائیں تو ان کے ارشاد پر عمل کرے اور جب تک کافی مناسبت نہ ہو جائے اس وقت تک درسیات ہی میں مشغول رہے اور جب کافی مناسبت ہو جائے تو چند روز کسی کے پاس رہکر اصلاح باطن کرلے اور پھر درس تدریس کا شغل بھی جاری کر دے یہ ہے تدبیر خشوع کے پیدا ہونیکی چونکہ اس کا اہتمام بہت ضروری تھا اسلئے اس وقت اس کو عرض کیا گیا اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بذاذة جس کو اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق کچھ تھوڑی توضیح عرض کر دوں کیونکہ ممکن ہے کوئی صاحب بذاذة کے وہ معنے سمجھ لیں جیسے غالب نے سمجھے تھے مشہور ہے کہ غالب نے ایک دوست کو اپنے گھر بلانا چاہا اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم تکلف زیادہ کرتے ہو اور اس سے مجھے اور تمہیں دونوں کو تکلیف ہوتی ہے اس واسطے آنیکی ہمت نہیں ہوتی آپنے

اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں وعدہ کرتا ہوں اس مرتبہ کچھ تکلف نہ ہوگا اور اسکے بعد محلہ بھر کا گھورا جمع کر کے اپنے گھر میں ایک ٹیلہ لگا دیا جب دوست کے آنیکا وقت ہوا تو آپ اس پر چڑھ بیٹھے اور نہایت ہی مفلسانہ وضع بنائی مہمان نے آکر یہ وضع دیکھی تو اس کو سخت رنج ہوا سمجھا کہ آجکل غالب کسی سخت مصیبت میں ہے قریب پہونچکر حال دریافت کیا تو آپ فرماتے ہیں کہ میں بہت اچھا ہوں لیکن چونکہ تم نے تکلف سے روکدیا تھا اسلئے میں نے یہ بے تکلفی کی وضع اختیار کی ہے تو جیسے غالب نے بے تکلفی کے معنی سمجھے تھے اسی طرح بعض لوگ شاید بذاذۃ کے یہ معنے سمجھ جائیں کہ نہ صفائی ہو اور نہ نظافت ہو بالکل میلی کچیلی حالت میں رہے حالانکہ میلے پن سے بذاذۃ کو کوئی ملاقہ نہیں اور یہ بات بھی ضروری بیان کرنے کے قابل تھی کیونکہ ہماری جماعت جو کہ علماء طلبہ کی جماعت کہلاتی ہے اس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ یہ نظافت کی طرف متوجہ ہوں جہاں تک دیکھا جاتا ہے ان لوگوں کو اس کا ذرا خیال نہیں ہے بعض لوگ تکلف کے تو خوگر ہوتے ہیں لیکن صفائی ان میں بالکل نہیں ہوتی۔ حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ تکلف نہ ہو اور صفائی ہو مثلاً آجکل گرمی کا موسم ہے اسی موسم میں علی العموم کپڑوں میں جلدی بدبو ہوجاتی ہے اسلئے ضرورت اس کی ہے کہ ہفتے میں دو مرتبے ضرور غسل کر کے کپڑے بدلے جائیں اور اگر کسی کے پاس اتنی گنجایش نہ ہو تو وہ یہ کرے کہ اپنے انہی کپڑوں کو جن کو پہنے ہوئے ہے دھو کر صاف کرلے۔ صاحبو! کپڑے میں تکلف اور استری کی ضرورت نہیں ضرورت صرف اس کی ہے کہ میلا نہ ہو پسینے کی بدبو نہ آتی ہو کیونکہ بدبو سے دوسروں کو بیحد تکلیف ہوتی ہے خصوصاً اساتذہ کو ایسے لوگوں سے سخت تکلیف پہونچتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اس کا خود خیال ہونا چاہیئے اور اگر کسی کے ذہن میں ابتک خود یہ بات نہیں آئی تھی تو اب سننے کے بعد تو ضرور خیال رکھنا چاہیئے آپ لوگوں نے حدیث میں پڑھا ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں)

اور پسینے کی بدبو سے اذیت ہوتی ہے چنانچہ حدیث قصہ سُنیت غسل جمعہ میں آیا ہے کَانَ یُؤْذِیْ بَعْضُھُمْ بَعْضًا (ان میں کا ایک دوسرے کو تکلیف پہونچاتا تھا) یعنی ایک دوسرے سے بوجہ پسینے کے تکلیف ہوتی تھی اس لئے غسل کا حکم ہوا۔ اور لہجہ فقہانے کہا ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ کچی پیاز کھاکر مسجد میں نجاتے علیٰ ہذا یہی حدیث نَظِّفُوْا اَفْنِیَتَکُمْ (اپنے گھر کے سامنے کا حصہ صاف رکھو) سن چکے ہو جس میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ جب فناء دار کے صاف کرنے کا حکم ہے تو خود حجرہ اور لباس و بدن کے صاف کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ اور علاوہ دوسرے کی تکلیف کے صفائی نہ رکھنے سے طرح طرح کی بیماریوں کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اور صفائی کو صحت میں بہت زیادہ دخل ہے کیونکہ صفائی سے نشاط پیدا ہوتا ہے اور نشاط معین صحت ہے اب طالب علموں کی یہ حالت ہے کہ چاہے دو بالشت کوڑا ان کے حجرے میں ہوجاوے لیکن یہ کبھی صاف نہ کریں گے مجھے تھانہ بھون کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک طالب علم کے حجرے میں چوہے نے زمین کھود کر بہت سی مٹی نکالدی تھی اور وہ کئی روز تک اسی طرح رہی لیکن اس کو بھٹ بند کرنے یا مٹی پھینکنے کی توفیق نہ ہوئی اتفاق سے ایک صاحب جو حاجی بھی ہیں اس طرف کو جو گذرے تو انھوں نے اس کو درست کردیا چند روز کے بعد چوہے نے پھر کھود ڈالی اور پھر مٹی اسی طرح جمع ہوگئی کسی شخص نے دیکھ کر اس طالب علم سے کہا کہ اس کو ٹھیک کردو تو آپ فرماتے ہیں کہ حاجی جی ٹھیک کر دینگے۔ گویا حاجی صاحب ان کے نوکر ہیں کہ وہ آکر ان کے حجرے کو صاف کیا کریں۔ اسی طرح آجکل آموں کی فصل ہے مدرسے میں جس جگہ دیکھئے چھلکا گٹھلی پھیلا پڑا ہے میں نے تھانہ بھون میں یہ انتظام کیا ہے کہ ایک جگہ ایک بڑا ٹوکرہ رکھدیا ہے اور سب سے کہدیا ہے کہ اسمیں چھلکے وغیرہ ڈالو لیکن باوجود اس کے بھی کسی کو اس کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ وجہ یہی ہے کہ مزاج میں صفائی اور نظافت نہیں۔ علیٰ ہذا گرمی کی وجہ سے سب لوگ صحن میں سوتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں کہ صبح اُٹھکر چارپائی کو کسی ٹھکانیکی جگہ رکھدیں بلکہ جس جگہ پڑی ہے وہیں دن چڑھے تک پڑی رہیگی۔ اکثر طالب علم اپنی ضرورت سے مسجد کے

لوٹے حجرے میں لیجاتے ہیں لیکن پھر مسجد میں لاکر لوٹا رکھے اول تو مسجد کا لوٹا اپنے حجروں میں لیجانا ہی جائز نہیں اور اگر کسی جگہ مسجد و مدرسے کا خرچ مشترک ہونیکی وجہ سے جائز بھی ہو تو حجرے میں رکھ لینا تو پھر بھی جائز نہیں۔ غرض ہم لوگ تکلف کریں گے تو نوابوں کی طرح اور بذاتہٖ اختیار کرینگے تو بالکل ہی بدنظم بن جائیں گے اسلئے میں نے عرض کردیا ہے کہ نظافت بذاتہٖ کے خلاف نہیں ہے بلکہ جس طرح طہارت ضروری ہے نظافت بھی ضروری ہے۔ اب تو ہماری بدمذاقی کی یہ حالت ہوگئی کہ مدراس میں ایک انگریز مسلمان ہوا مسجد میں آکر دیکھا کہ نالی میں بہت سارینٹھ وغیرہ پڑا ہے اس نے منتظمین سے کہا کہ مسجد کو صاف رکھنا ضروری ہے۔ اسکی حالت ایسی خراب نہ رکھنی چاہیئے اس کو سنکر وہ لوگ کہنے لگے کہ تجھ میں ابھی عیسائیت باقی ہے ابھی صفائی کی بو دماغ سے نہیں نکلی گویا مسلمانوں کے لئے میلا کچیلا خراب خستہ رہنا لازم ہے اور اس قدر برہم ہوتے کہ اس کو مار کر مسجد سے نکالدیا۔ بعض داناؤں کو اس حرکت کی اطلاع ہوئی تو وہ اس انگریز کے پاس آئے اور تسلی تشفی کرنے لگے۔ اس نے کہا کیا آپ کو یہ اندیشہ ہے کہیں ان لوگوں کی اس حرکت سے اسلام کو چھوڑ دوں گا۔ میں ان لوگوں پر ایمان نہیں لایا بلکہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لایا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے نہ تھے تو بعض آدمی ستھرائی کو ہی اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں استغفر اللہ حالانکہ دوسری قوموں نے صفائی اور ستھرائی اسلام ہی سے سیکھی ہے اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ سارے بیان کا یہ ہے کہ ہم کو صرف علم حاصل کرلینے پر بس نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے اور بالخصوص صفت خشوع اور اسکے آثار و تدابیر کا اختیار کرنا اور اہل علم کے لئے زیادہ خصوصیت کے ساتھ ضروری ہے کہ ان کے لئے زینت اور زیور ہے۔ اب خدا تعالےٰ سے دُعا کیجیے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائیں اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی اے اللہ ہمیں (اور عبدالمنان ناشر کو) ان کاموں کی توفیق عطا فرما جنھیں آپ پسند فرماتے ہیں اور جس سے آپ خوش ہوتے ہیں) آمین یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

وعظ ہذا دیگر مواعظ مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۱ سے طلب کریں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

احسان التدبیر

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ، دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

ساتواں وعظ ملقب بہ

احسان التدبیر

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۹ رجب ۱۳۵۰ھ یوم جمعہ	۲½ گھنٹے	بیٹھکر	قحط وغیرہ میں جو غلہ جمع کرکے پکڑواتے ہیں اس پر کلام تھا	سعید احمد تھانوی عفی اللہ لہ		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ

وَتَعَالٰی وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (گھروں

میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں کامیابی ہو) یہ ایک لمبی

آیت کا ٹکڑا ہے اور دو جملوں پر مشتمل ہے اس کا شان نزول گو خاص ہے مگر

مقصود اس سے ایک عام مضمون پر دلالت کرتا ہے اور اسی عام مضمون میں

یہ مضمون بھی داخل ہے جس کو اس وقت میں بیان کرتا ہوں۔ اگرچہ اس وقت

قصد ایک دوسرے مضمون کے بیان کا تھا لیکن بقاعدہ الاہم فالاہم چونکہ اس

وقت یہ مضمون زیادہ ضروری معلوم ہوا اسلئے اس کو اختیار کیا گیا ہے یہ

سب کو معلوم ہے کہ آج کل ہمارے نواح میں بارش کا کہیں پتہ نہیں ہے

اور لوگوں کو قحط کا اندیشہ ہے بلکہ لوگوں کو اسی وقت سے بارش نہ

ہونے کے سبب تکلیف شروع ہوگئی ہے خاص کر ان لوگوں

کو جن کے پاس نہ غلہ ہے نہ اس قدر وافر روپیہ ہے کہ وہ اس سے اپنی

ضرورت پوری کر سکیں البتہ جن لوگوں کے گھروں میں غلہ بھرا پڑا ہے یا جو لوگ

روپے والے ہیں وہ البتہ اس تکلیف سے بچے ہوتے ہیں اور یہ تو خوشی

کی بات ہے اور ان کو کسی قسم کی فکر بھی نہیں کیونکہ آثار قحط سے بچنے کا

سامان ان کے پاس موجود ہے نہ اپنی فکر ہے اور یہ بھی محل شکایت نہیں

اور نہ برائی اور یہ محل شکایت ہے کیونکہ یہ خاصیت جانور کی ہے چنانچہ طوفان

میں ہر جاندار کو غرق کی فکر ہوتی ہے لیکن بط کو فکر نہیں ہوتی کیونکہ

وہ جانتی ہے کہ پانی کتنا بھی اونچا ہو جائے میں بہر صورت اس سے اونچی

ہی رہوں گی ؎

گر از نیستی دیگرے شد ہلاک تراہست بط را ز طوفاں چہ باک

(اگر کوئی مصیبت سے ہلاک ہو گیا تو اے بطخ تجھے طوفان سے کیسا ڈر)

اسی طرح ناداران کی حالت کا امراء کو بھی کچھ خیال نہیں امراء کی طرف سے

نادار لوگ بچیں یا ہلاک ہوں اُن کے پاس تو غلہ بھرا ہے وہ بے فکر ہیں کہ

ہم کو کوئی گزند نہیں پہونچ سکتا گھر میں سے نکالیں گے اور کھائیں گے اور بعض لوگ ہیں جن کی سنگدلی بہت بڑھ جاتی ہے اور ترحم کا پتہ بھی ان میں نہیں رہتا لیکن ہے یہ بہت بڑی غلطی۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ بنی آدم مثل اعضاء یکدگر ہیں یعنی جو حالت ایک انسان کے اعضاء کی ہوتی ہے کہ اگر پیر میں درد ہے تو سر بھی متاثر ہے آنکھیں بھی متاثر ہیں اسی طرح بنی آدم کا حال بھی ہونا چاہیئے خاصکر مسلمانوں کا اکثر ان کو ایک دوسرے کی ضرور مدد کرنا چاہیئے اور ہر شخص کو دوسرے کے غم سے غمگین ہونا چاہیئے اور اسکے ازالے کی تدابیر میں لگنا چاہیئے جس قسم کی تدبیر بھی ممکن ہو اسلئے کہ تدبیر مختلف ہوتی ہیں کسی امر کی تدبیر یہ ہے کہ اس کے لئے دعاء کی جائے کسی کی تدبیر یہ ہے کہ اسباب طبیعہ کی مباشرت کی جائے ایک کو دوسرے سے غافل ہرگز نہ رہنا چاہیئے یہ ہے انسانیت جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے اور اس کا ترجمہ شیخ شیرازی علیہ الرحمۃ نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آدمیت ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار
چو از محنت دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

(بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں اس لئے کہ آدمی ہونے میں وہ ایک ہی جوہر ہے ہیں جب گردش زمانہ کسی ایک عضو کو تکلیف پہونچاتی ہے تو اس تکلیف کی وجہ سے دوسرے عضو کو بھی قرار نہیں آتا جب تو دوسروں کی تکلیف اور مشقت سے بے پرواہ ہے تو تجھے آدمی نہ کہنا چاہیئے)۔

شریعتِ مطہرہ نے مواساۃ کی یہاں تک رعایت کی ہے اور اس کی تعلیم دی ہے کہ ارشاد ہوتا ہے جب گوشت پکایا کرو تو اس میں شوربا زیادہ کرلیا کرو آگے فرماتے ہیں وَتَعَاهَدُوْا جِیْرَانَکُمْ اللہ اکبر شریعت مطہرہ نے کس قدر

رعایتیں کی ہیں اور کیسی پاکیزہ تعلیم دی ہے اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمدردی کی تعلیم کے ساتھ ہی ایک دوسرے بڑے دقیق امر کی کتنی رعایت فرمائی ہے یعنی اس حکم کے ساتھ کہ شوربا زیادہ کرلیا کرو اور خود ہی سب بھونکر مت کھا جایا کرو ایک ایسے امر کی رعایت کی ہے کہ نبی کے سوا دوسرے کے کلام میں اتنی دقیق رعایت ممکن نہیں اور ایسی رعایتیں نبی کے کلام میں اس لئے ہوا کرتی ہیں کہ ان حضرات کو خدا تعالے خود ادب اور علم سکھلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَاَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِیْ (مجھے میرے رب نے تعلیم دی ہے اور بہترین تعلیم دی ہے اور مجھے میرے رب نے ادب سکھلایا ہے اور اچھی طرح سکھلایا ہے) اور وہ امر یہ ہے کہ انسان اگرچہ کتنا ہی بڑا ہمدرد ہو اور صفت ایثار اس میں کتنی ہی غالب کیوں نہ ہو لیکن اس میں یہ خصلت بھی طبعًا ضرور ہوتی ہے کہ وہ ہر امر میں دوسرے کو اپنی برابر نہیں رکھتا اور اپنے مرافق خاصہ میں طبعًا دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرتا اور قرآن مجید نے بھی اس کی اجازت دی ہے اور یہ بالکل فطرت کا مقتضا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ غالبًا ہر شریعت آسمانی میں اس کی اجازت ہوگی سو قرآن مجید میں ارشاد ہے هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْمَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (کیا تمہاری مملوکہ اشیاء میں جنہیں ہم نے تمہیں بطور رزق کے عطا کی ہے کچھ لوگ شریک ہیں اور تم سب لوگ اس سلسلے میں برابر ہو) اس آیت میں توحید کو بیان فرما رہے ہیں اور اس کی توضیح کے لئے ایک مثال دیتے ہیں کہ تم خدا کی مملوک کو خدا کی برابر کیسے قرار دیتے ہو حالانکہ اگر تمہارا ایک غلام ہو تو کیا تم اس کو اپنی برابر سمجھ لوگے یعنی حظوظ اور انتفاعات کے حاصل کرتے میں تم اُن کو اپنی برابر نہیں سمجھتے اس مثال کو ذکر کرکے اس کو رد نہ فرمانا بلکہ استدلال کرنا اس عدم مساوات کی اجازت کی صاف دلیل ہے اور یہ مساوات واجب بھی نہیں ہے اور حکمت اس کے واجب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اس پر بہت کم آدمی عمل

کرسکتے علیٰ ہٰذا حدیث سے بھی اس کی اجازت مفہوم ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر غلام سے اچھا کھانا پکواؤ تو بہتر تو یہ ہے کہ اس کو اپنے ساتھ کھلاؤ لیکن اگر ایسا نہ کرسکو تو کم از کم اتنا تو ضرور کرو کہ ایک لقمہ بنا کر اس کے ہاتھ پر رکھدو اور اس حدیث میں بھی علاوہ تعلیم ہمدردی کے ایک بڑی حکمت تمدنی بھی ہے کہ اس سے چوری کا انسداد بالکل ہوگیا کیونکہ جب غلام یہ سمجھیگا کہ آقا خود مجھے دیدے گا تو چوری نہ کرے گا اسی طرح جس تعلیم کو دیکھئے اس میں بڑے بڑے دقیق امور کی رعایت ہے اگرچہ اس وقت وہ امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مقصود نہ ہوں چنانچہ اس مقام پر بھی گو اس انسداد کی غرض سے ایسا نہ فرمایا ہو لیکن تعلیم اتنی پاکیزہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے اس کا بھی انسداد ہوجائے گا غرض اس لقمہ رکھدینے کی حدیث میں ہمدردی کی بھی رعایت ہے اور انسان کے طبعی مقتضا کی بھی رعایت ہے کہ بہتر تو ساتھ کھلانے کو فرمایا اور ساتھ ہی اس کی بھی اجازت دیدی کہ الگ سے تھوڑا سا دیدو کیونکہ نفس میں یہ بات پیدا ہوسکتی ہے کہ جب میں کماتا ہوں تو دوسرا اس میں برابر کا کیوں شریک ہوا اسی طرح قرآن میں اَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ فرمایا یعنی کیا تم غلاموں کو اپنے برابر بنالوگے یہ تمثیل بھی اس پر دال ہے کہ مساوات باہم نہیں ہوسکتی اسلئے کہ خدا نے اس پر انکار فرمایا اور یہ قاعدہ مقررہ ہے کہ جب کسی امر کو نقل کرکے قرآن و حدیث میں اس پر انکار نہ کیا جائے تو وہ ہمارے لئے بھی شریعت ہوتا ہے جیسا اوپر بیان کیا گیا اگر کسی کو شبہ ہو کہ حدیث میں تو اَلْبِسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبَسُوْنَ وَاَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تُطْعِمُوْنَ (جو تم پہنتے ہو وہی ان کو بھی پہناؤ اور جو تم کھاتے ہو وہی ان کو بھی کھلاؤ) آیا ہے پھر عدم مساوات کی اجازت کہاں ہوئی جواب اس کا یہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ استحباب کے لئے ہے اور بصورت وجوب اس لئے فرمایا کہ مخاطب اس کے ایک خاص شخص تھے اور ان کی خصوصیت وقتیہ کا مقتضا یہ ہوگا کہ اس میں تاکد ہو۔

واقعہ اس کا یہ ہوا تھا کہ حضرت ابوذرؓ غفاری جو کہ نہایت جلیل القدر صوفی مشرب صحابی ہیں اور ان کی شان دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بالکل جدا ہے ایک مرتبہ یہ ایک غلام سے لڑ رہے تھے اسی اثناء میں انھوں نے اس کے نسب پر طعن کیا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جاکر شکایت کردی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اور یہ فرمایا کہ اِنَّكَ امْرَءٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ (تم ایک ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت (کی بو) ہے) اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو تمہارے قبضے میں کردیا ہے ان کو حقیر نہ سمجھو بلکہ جو خود کھاؤ وہ کھلاؤ جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ تو اس واقعہ میں اگر تعلیم مجاہدہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصود کہا جائے تو اس کی خصوصیت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صیغے کو تاکد کے لئے بھی کہا جاسکتا ہے اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس پر یہاں تک عمل کیا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس دو چادرے تھے جن کے مجموعے کو عربی میں حلّہ کہتے ہیں انھوں نے ایک تو خود پہنا اور ایک اپنے غلام کو دیدیا ایک شخص نے ان کو ایک چادرے میں دیکھا تو کہا اے ابوذرؓ یہ چادرے دونوں اگر تم رکھتے تو پورا حلہ ہو جاتا اور اچھا معلوم ہوتا حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ تو تم سچ کہتے ہو لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ اُس روز سے میں اپنے اور غلام کے کھانے کپڑے میں کچھ فرق نہیں کرتا یہ تو آپ کی خصوصیت کے اعتبار سے کلام تھا اور اگر عام لیا جائے اور ظاہر یہی ہے بھی تو پھر یہ امر استحباب کے لئے ہے اور دلیل استحباب کی وہی سابق حدیث ہے کہ کم سے کم ایک لقمہ ہی دیدیا کرو تو تفاوت رکھنا تو جائز ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ بالکل رحم نہ کیا جائے اور خبر ہی نہ لی جائے پس اسی جواز تفاوت کی رعایت سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر گوشت پکایا کرو تو شوربا زیادہ کرلیا کرو

یعنی اگر اپنی برابر دوسروں کو بھنا ہوا گوشت نہ کھلاسکو تو خیران کو کچھ شوربا ہی دیدیا کرو۔ بعض صالحین کا بھی عمل اس کے موافق سنا گیا ہے کہ جب ان کے ہاں گوشت پکتا تو شوربا بڑھاکر پڑوسیوں کو بھی دیتے تھے یہ ایسا حکم ہے کہ عمل کرنے والے کو اس میں ذرا بھی گرانی نہیں ہوسکتی اور مصلح کی یہی داناتی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھکر دانا کون ہوسکتا ہے غرض ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ ہمدردی کی سخت ضرورت ہے بلکہ بعض احادیث سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی ہمدردی کرنا ضروری ہے اور ان کو ستانا جائز نہیں چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر سواری کو ٹھہرا کر بات کرنا ہو تو اس پر سے اُتر پڑو اس پر چڑھے چڑھے زیادہ باتیں مت کرو حتیٰ کہ جن جانوروں کے ذبح کرنے یا قتل کرنے کی بھی اجازت دی ہے اُن کے ذبح اور قتل کے بھی قاعدے تبلادیئے ہیں اور اس میں ظلم کی اور ترسانے کی ممانعت اور اس پر وعید فرمادی ہے ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بلّی پالی تھی اور اس کو باندھ کر رکھ چھوڑا تھا نہ خود کچھ کھلاتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ کچھ کھاکر گذر کرلے حتیٰ کہ وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرگئی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب عالم برزخ کا معائنہ فرمایا تو دیکھا کہ وہ عورت دوزخ میں جل رہی ہے اور وہ بلّی اُس پر مسلط ہے اور نوچ رہی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب بلّی آگ میں تھی تو سزا تو اس کو بھی ہوتی پھر اُس نے بدلہ کیا لیا جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو یہی ضروری نہیں کہ جو چیز آگ میں ہو وہ جلا ہی کرے اسلئے کہ آگ میں جلانے کی قوت خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کسی خاص چیز کے حق میں اس اثر کو باطل فرمادیں دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس بلی کی صورت میں کوئی دوسری چیز اس پر مسلط کی گئی ہو اور بلی کی صورت اسلئے بنادی گئی ہو تاکہ اس عورت کو یاد آجاوے کہ میرے فلاں عمل کی سزا مجھکو مل رہی ہے تو معلوم ہوا کہ جانوروں

ستانا بھی جائز نہیں البتہ جو جانور ستاتے ہوں ان کو مار ڈالنا جائز ہے لیکن ایک دم سے مار دینا چاہئیے ستا ستا کر مارنا جائز نہیں ہے اسی طرح ذبیحہ کے لئے فرمایا کہ چھری کو تیز کر لیا کرو اور جلدی ذبح کر دیا کرو جب چار رگیں کٹ جائیں تو پھر آگے تک چھری چلانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ چاروں رگوں کے کٹنے کے بعد فورًا تو جان نکلتی نہیں اسلئے اگر آگے بھی چھری چلائی جائیگی تو بلا ضرورت اس کو تکلیف ہوگی اور یہ حرام ہے افسوس ہے کہ آجکل دوسری قومیں مسلمانوں کو بیرحم تبلاتی ہیں وہ ذرا آنکھیں کھولکر دیکھیں کہ مسلمانوں میں کس قدر رحم ہے اور اگر اس کا نام بھی بے رحمی ہے تو دنیا میں کوئی بھی رحیم نہیں کیونکہ تمام قومیں اپنی ضرورت میں آدمی کے قتل تک کو بھی جائز کہتی ہیں چنانچہ ملکی لڑائیوں میں اور مذہبی جنگوں میں ہزاروں آدمی تیغ کے گھاٹ اتر جاتے ہیں جو لوگ ہتیا کرتے ہیں وہ بھی بکری وغیرہ کو سانپ کو بچھو کو مار ڈالتے ہیں اور اگر کوئی کہے کہ ہم تو کسی کو بھی نہیں مارتے تو میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ جب آپ کے گھر میں بہت سے چوہے ہو جاتے ہیں اور وہ آپ کو ستاتے ہیں تو آپ ان کا کیا علاج کرتے ہیں بعضے یہ کہیں گے کہ ہم ان کو پکڑ کر دوسرے محلے میں چھوڑ دیتے ہیں چنانچہ بعضے ایسا کرتے بھی ہیں تو نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اُس محلے کے مسلمان خوب اچھی طرح جوتوں سے مار مار کر ان کا خاتمہ کریں تو صاحبو کیا کوئی عقلمند اس کو رحم کہیگا کہ جن چیزوں کو اپنا دیوتا سمجھا جاتا ہے ان کو ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے جن کو بیرحم سمجھا جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ اپنی مصلحت سے دوسروں کی جان لینا جائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی اجازت اپنی مصلحت سے بڑھ کر ہے تو خدا تعالیٰ کی اجازت سے دوسروں کی جان لینا کیوں نہ جائز ہوگا اور جب جائز ہے تو مسلمانوں پر بیرحمی کا اعتراض بالکل غلط ہوا اور اگر اب بھی وہ بیرحم ہیں تو آپ اُن سے زیادہ بیرحم ہیں کہ ان کے ہاتھ سے بیرحمی کراتے ہیں غرض جانور کے ذبح کو بھی بیرحمی بتلانا سخت غلطی ہے ہاں ذبح میں اس کو تکلیف دینا ستانا یہ بیرحمی ضرور ہے تو شریعت مطہرہ نے اس کی کہیں

اجازت نہیں دی مگر افسوس ہے کہ آجکل ذبح کرنے والے اکثر اس کی پروا نہیں کرتے بلکہ بعض تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ ٹھنڈا ہونے سے قبل ہی کھال کھینچنا شروع کر دیتے ہیں، خیر قصائیوں کو اختیار ہے وہ جو چاہیں کریں خود بھگتیں گے لیکن جو لوگ ذبح کرتے ہیں وہ تو ذبح میں کہ ان کا فعل ہے تکلیف نہ دینے کا اہتمام کر سکتے ہیں خدا ہمارے بزرگوں کو جزاء خیر دے کہ انھوں نے قصائیوں کو ذبح کی اجازت ہی نہیں دی اس میں منجملہ دوسرے مصالح کے ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اکثر سخت دل ہوتے ہیں پس دوسرے لوگ کچھ تو رحم کریں گے بالخصوص قربانی کے جانوروں میں تو لوگوں کو بہت ہی احتیاط کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ تو خالص اپنی ملک ہیں قصائیوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں پس جب تک وہ ٹھنڈی نہ ہو جائیں ہرگز کھال نہ نکالنے دیں تو جب شریعت میں جانوروں کو ستانے کی اجازت نہیں اور انپر رحم کا حکم ہے اور اس رحم پر ثواب بھی مرتب ہوتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک فاحشہ عورت چلی جا رہی تھی راستہ میں اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ پیاس کے مارے بسنک رہا ہے اس عورت کو بہت قلق ہوا اور اس نے کتے کیلئے پانی تلاش کرنا شروع کیا آخر ایک کنواں ملا لیکن اس کنویں پر نہ رسی تھی نہ ڈول تھا اس عورت نے اپنا چمڑے کا موزہ اتارا اور اپنی اوڑھنی سے رسی کا کام لے کر پانی نکالا اور اس کتے کو پلایا خدا تعالیٰ نے اس عمل کی بدولت اس کے عمر بھر کے گناہ بخشدیئے اور بیحساب اس کو جنت میں داخل کر دیا اس حدیث کو سنکر صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا جانوروں کو پانی پلانا بھی ثواب ہے آپ نے فرمایا کہ ہر جاندار کو آرام دینے میں ثواب ہے غرض جب شریعت میں جانور تک کو آرام دینے کا حکم ہے تو کیا اس میں انسان کو آرام پہونچانے کا حکم نہ ہوگا یا انسان کا کوئی حق اس شریعت میں مقرر نہ کیا گیا ہوگا۔ افسوس ہے۔ آجکل اکثر لوگ جانوروں پر تو رحم کرتے ہیں لیکن اپنے بھائیوں پر رحم نہیں کرتے بعض کی تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کے گھر میں چیزیں رکھی رکھی سڑ جائیں گی لیکن کبھی یہ توفیق نہ ہوگی کہ پڑوسیوں کو یا کسی دوسرے

حاجتمند کو اس میں سے کچھ دیدیں اور اگر کسی کو دینگے تو ایسے شخص کو جس کے دینے سے ان کا نام ہو یا ان کا کوئی کام نکلے تو یہ دینا واقع میں اپنے ہی کو دینا ہے باقی ترحم کے لئے بہت کم لوگ ہیں کہ وہ کسی کو کچھ دیتے ہوں اور یہ لوگ زیادہ تر وہ ہیں جو کہ خود نہایت آرام میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکلیف کس چیز کا نام ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سات برس کے مسلسل قحط میں کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا اور جب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ آجکل قحط کا زمانہ ہے لوگ وقت بے وقت میرے پاس غلہ لینے کے لئے آتے ہیں اگر میں شکم سیر ہو کر کھاؤنگا تو مجھ کو ان کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوسکیگا تو ممکن ہے میں کسی وقت غلہ دینے سے انکار کر دوں اور بھوکا رہوں گا تو ہر وقت یہ معلوم رہیگا کہ بھوک کی تکلیف ایسی ہوتی ہے اس کو بھی ایسی ہی تکلیف ہو رہی ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خود آرام میں ہو اس کو دوسرے کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا اور یہی سبب تھا کہ پہلے زمانہ میں تربیت کرتے وقت کچھ تکلیف بھی دیا کرتے تھے ایک قصہ مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کا لڑکا ایک میاںجی کے سپرد تھا وہ اس کو پڑھاتے لکھاتے تھے ایک مرتبہ بادشاہ جو مکتب میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ میاںجی سوار ہو کر فلاں جانب کو گئے ہیں یہ سنکر بادشاہ خود بھی اسی جانب چلدیا دونوں ملے مگر اس حالت میں کہ میاںجی گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ سائیس کی طرح گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے یہ دیکھ کر بادشاہ کو نہایت غصہ آیا لیکن اس وقت تحمل سے کام لیا اور پھر اطمینان سے میاںجی سے اس کی وجہ دریافت کی اس نے کہا کہ یہ شاہزادہ ہے خدا اس کی عمر میں برکت کرے ایک دن یہ تخت سلطنت پر متمکن ہوگا ہزاروں آدمی اس کی خدمت میں ہونگے سواری کریگا تو جلو میں بھی سینکڑوں آدمی ہونگے سو میں اس پر اس واسطے مشقت ڈالی کہ بادشاہی کے زمانے میں یہ دوسروں کی مشقت کا بھی اندازہ کرسکے اور لوگوں کو تحمل سے زیادہ تکلیف نہ دے بادشاہ اس کو سنکر بہت خوش ہوا اور انعام واکرام دیا۔ تو جو لوگ آسودہ ہیں اور اتنا کھاتے

ہیں کہ ان کو نمک سلیمانی کی بھی ضرورت ہو ان کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ دوسروں پر کیا گذرتی ہے ایک جماعت تو ان بیرحموں کی ہے لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں اسلئے کہ ایسے لوگ اکثر امراء ہیں اور امراء کی تعداد خود بہت کم ہے دوسری جماعت وہ ہے اور یہی تعداد میں زیادہ ہے کہ جن کو ابھی سے آثار قحط سے تکلیف ہونے لگی ہے اور اس کے رفع کی بھی تمنا ہے اور مجھے اس وقت زیادہ تر اس جماعت کے متعلق ایک مضمون بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو بظاہر قحط کی طرف سے فکر لگی ہوئی ہے اُن میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ آیا صرف اُن کی زبانوں پر اس کا ذکر ہی ہے یا کوئی تدبیر بھی کر رہے ہیں اور اگر تدبیر کر رہے ہیں تو واقع میں بھی وہ تدبیر مفید ہے یا نہیں اور اس کو تدبیر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

تو مجموعی حالت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس میں دو غلطیاں کر رہے ہیں بعض تو ایسے ہیں کہ وہ کوئی تدبیر ہی نہیں کرتے بلکہ جس طرح اُن کی مجلس میں اور دنیا بھر کی باتوں کا تذکرہ ہوا کرتا ہے اسی طرح اس کا بھی تذکرہ ہو جاتا ہے اس کو اس کی خبر ہی نہیں ہے کہ قحط کے رفع کے لئے کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں اور بعض ایسے ہیں کہ وہ تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں اور تدبیر کرتے بھی ہیں لیکن وہ تدبیر صحیح نہیں ہوتی اور شاید ہزاروں میں دو چار ہی آدمی ایسے ہوں جو سمجھ سکتے ہوں اسلئے وہ بھی بے تدبیری کرتے ہیں مجھکو اس وقت اسی بے تدبیری کے متعلق کچھ کہنا ہے لیکن میں نے اس وقت جو آیت پڑھی ہے وہ کچھ اسی بے تدبیری کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس بے تدبیری اور ہر بے تدبیری کو شامل ہے آیت یہ ہے وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم فلاح حاصل کر لو۔ مناسبت اس آیت کی آج کے مضمون سے انشاء اللہ ابھی ظاہر ہو جائے گی۔ شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں منجملہ اور رسوم قبیحہ کے ایک رسم یہ بھی تھی کہ ایام حج میں احرام باندھنے کے بعد گھر میں

سے کَرَدَهَا لِبُعْدِهَا۔

نہ جاتے تھے اور اگر بہت ہی ضرورت گھر میں جانے کی ہوتی تو گھر کی پشت سے اندر جاتے تھے دروازے سے مکان میں جانے کو ان ایام میں حرام سمجھتے تھے خدا تعالیٰ اس رسم کو مٹا رہے ہیں اور اس کا لغو ہونا ظاہر فرما کر مکان میں دروازے کے ذریعے سے داخل ہونے کا حکم فرماتے ہیں اس کے بعد دوسرے جملے میں تقوے کا حکم دیتے ہیں جس سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اصل چیز تقوے ہے یعنی جن باتوں سے خدا تعالیٰ ناراض ہوں ان کو ترک کر دینا۔ باقی یہ مخترع رسوم۔ سو یہ کوئی چیز نہیں ہیں کیونکہ محض نفس کی مخالفت کرنے سے خدا تعالیٰ کی رضامندی حاصل نہیں ہوتی جیسا وہ لوگ سمجھتے تھے کہ پشت کی طرف کو جانا نفس پر شاق ہے اس لئے یہ قربت ہے اور یہ ایسا مرض ہے کہ آجکل کے صوفی بھی اکثر اسمیں مبتلا ہیں یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس قدر نفس کی زیادہ مخالفت ہوگی خدا تعالیٰ زیادہ راضی ہوں گے اگرچہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف بھی ہو۔ چنانچہ بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر گوشت کھانا حرام کر لیتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ کے خزانے میں اُن کے اس فعل سے بڑی توقیر ہوگئی۔ اسی طرح بعض لوگ سرد پانی نہیں پیتے۔ بعضے چارپائی پر نہیں سوتے اور بعضے لوگ جن کو دولت اسلام نصیب نہیں وہ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اپنے اعضاء تک سکھلا دیتے ہیں چنانچہ ایسے جوگی سُنے گئے ہیں کہ انھوں نے اپنا ہاتھ سکھلا دیا۔ میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے ایام میں چاروں طرف آگ جلا رکھی ہے اور اس کے بیچ میں خود بیٹھا ہے گویا یہیں دکھلا رہا ہے کہ میں دوزخی ہوں)۔ یہ سب جہل کی باتیں ہیں حدیث میں وارد ہے اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بیشک تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے۔ اور بے شبہ تیری آنکھ کا تیرے ذمہ حق ہے) اتنی مشقت نہ اٹھاؤ کہ پھر بالکل کام ہی سے جاتے رہو۔

پس معلوم ہوا کہ کوئی خاص تکلیف اپنی طرف سے اختراع کر کے برداشت کرنا تقوے نہیں ہے لیکن اس سے اُن لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنھوں نے اپنے

نفس کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں اس لئے کہ اول تو وہ حضرات حدّ اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے پھر وہ بھی اس کو بطور علاج کے کرتے تھے عبادت اور ذریعہ قرب نہیں سمجھتے تھے ان کے مجاہدے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص گل بنفشہ پینے لگے یا کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑ دے کہ وہ اس دوا پینے اور ترک اطعمہ کو عبادت نہیں سمجھتا بلکہ ذریعہ حصول صحت سمجھتا ہے اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر پینے لگے تو وہ یقیناً گنہگار ہوگا اس واسطے کہ اُس نے قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے اگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو روزمرہ میں اس کی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کرے اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کر دے اور وہ ملک و سلطنت کے لئے بھی بے حد مفید ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائے گا اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا پس جب قانون دُنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا تو اگر اس طرح سے کوئی گوشت وغیرہ کو ترک کریگا تو بلا شبہ جُرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں بہر حال نفس کو راحت پہونچانا اور اس کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالےٰ عنہ صحابی کا واقعہ ہے کہ وہ رات کو بہت جاگتے تھے حضرت سلمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ان کو روکا، آخر مقدمہ جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں اور یہ ارشاد فرمایا اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا الخ

غرض ایام جاہلیت میں لوگ منجملہ اور تکالیف کے ایک تکلیف اپنے نفس کو

یہ بھی دیتے تھے کہ خدا تعالیٰ اس کو فرماتے ہیں کہ اصل چیز تقویٰ ہے اس کو اختیار کرو اور گھر میں پس پشت سے آنا کوئی ثواب کا کام نہیں ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ گو لفظاً خاص ہے ایک ہی امر کو مگر معنًا عام ہے ایسے امور کو جو اس کی نظیر ہوں وہ معنے مشترک یہ ہیں کہ جس کام کا جو طریقہ ہے اسی طریقے سے اس کام کو کرو بے طریقے نہ کرو اور یہ مضمون عام ہے لہٰذا آیت میں معنے تعمیم ہو گئے اور جملہ ثانیہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الخ سے بدلالت مطابقی ہی تعمیم ہو رہی ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ جو بات تقوے پر مبنی نہ ہو گی۔ گو ظاہرًا وہ موجب قربت نظر آئے وہ موجب کامیابی نہ ہوگی اور تمہارا ظہور یا ابواب سے بیوت میں داخل ہونا تقوے پر مبنی نہیں ہے لہٰذا یہ بھی اس کامیابی کا سبب نہیں جو تمہارا مقصود ہے کہ رضاء حق حاصل ہو اب آیت کا مضمون پیش نظر رکھ کر اپنی حالت کو دیکھئے کہ ہم اکثر کام ایسے ہی طریقے سے کرتے ہیں جس میں کامیابی نہیں ہوتی اور مراد اس وقت دنیا کے کام نہیں کیونکہ اس کی کامیابی کے طریقہ کا تعلیم کرنا ہمارا کام نہیں ہم سے یہی بہت غنیمت ہے کہ ہم دنیا کے کام کی اجازت دیدیتے ہیں اسوقت مجھے یہ شعر یاد آتا ہے جس میں اہل دنیا کے اس انتظار کا جو کہ علماء سے کامیابی دنیا کا طریقہ بتلانے کے متعلق ان کو رہتا ہے جواب ہے کہتے ہیں ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم		چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ تو میں شب ہوں اور نہ شب پرست ہوں جو خواب کی کہانی کہوں جب میں آفتاب کا غلام ہوں تو ساری باتیں آفتاب کی کہوں گا)

؎ ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم		الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

(جو کچھ ہم نے پڑھا ہے سب بھول گئے ہیں علاوہ حدیث یار کے کہ بار بار اسی کے دہراتے ہیں)

یعنی ہم کو خدا تعالیٰ کی باتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہا اور ہم دنیا کی باتیں کچھ نہیں جانتے اور اگر اب تک جانتے تھے تو اب بھول گئے غرض اس وقت گفتگو دین کے کاموں کے متعلق ہے کہ ان میں بھی وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہونیکے

سبب اخروی کامیابی کا سبب نہیں مثلاً یہی جو اوپر مذکور ہے کہ اپنے نفس کو خوب تکلیف دینا سبب قربت کا سمجھا جاتا اس پر مجھے ایک جاہل فقیر کی حکایت یاد آئی وہ یہ ہے کہ ایک عالم کے صاحبزادے گھر سے خفا ہو کر چلے گئے ایک مقام پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ یہاں پہاڑ پر ایک فقیر رہتا ہے ان کو چونکہ دین سے مناسبت خاندانی تھی اس لئے ان کو اس فقیر سے ملنے کا شوق پیدا ہوا وہاں جا کر دیکھا کہ ایک شخص ہے جس نے ایک آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ناک کا ایک سوراخ نجاست بھری بتی سے بند کر رکھا ہے انھوں نے اس حرکت کا سبب پوچھا تو اس فقیر نے کہا کہ ناک میں گوہ کی بتی تو اس لئے دی ہے کہ یہاں پھولوں کے درخت بہت ہیں ہر وقت خوشبو سے دماغ معطر رہتا ہے اور اس سے نفس پھولتا ہے تو میں نے نفس کا علاج کرنے کے لئے ایک طرف ناک میں نجاست کی بتی دے رکھی ہے تاکہ اس کی تکلیف سے نفس محظوظ نہ ہونے پاتے اور آنکھ پر پٹی اس واسطے باندھ رکھی ہے کہ کام تو ایک آنکھ سے بھی چل جاتا ہے پھر بلا ضرورت دوسری آنکھ کو کیوں خرچ کروں یہ سنکر اس مسافر نے کہا کہ فقیر صاحب میں خود تو عالم نہیں ہوں لیکن عالموں کی صحبت میں رہا ہوں ان سے جو کچھ سنا ہے اس کی بناء پر کہتا ہوں کہ نہ تو آپ کا وضو ہوتا ہے اور نہ نماز ہوتی ہے کیونکہ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہے وہ جگہ ہمیشہ خشک رہتی ہوگی اور یہ مانع وضو ہے لہٰذا آج تک کی سب نمازیں آپ کی برباد ہوئیں چونکہ وہ فقیر باعتبار نیت کے طالب حق تھا صرف جہل سے مبتلا ہو گیا تھا اس کو سنکر بہت رویا اور توبہ کی واقعی جہل بھی بہت بری چیز ہے۔ ہمارے تھانہ بھون کا واقعہ ہے کہ یہاں ایک فقیر رہتا تھا بالکل جاہل اور محلے کے اکثر لوگ اس کے معتقد تھے حتیٰ کہ ہمارے نانا صاحب بھی چونکہ صلحاء سے فقراء سے ان کو خاص تعلق تھا وہ بھی معتقد تھے۔ محلے بھر میں صرف ایک شخص ایسا تھا کہ وہ اس فقیر کا معتقد نہیں تھا اور یہی کہتا تھا کہ جاہل آدمی کی کیا فقیری اس حرکت پر تمام اہل محلہ ان کو ملامت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس شخص کو یہ شرارت سوجھی کہ اخیر شب میں تہجد کے وقت

کسی ذریعے سے اُس فقیر کے مکان کی چھت پر جا بیٹھا اور جب وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو نہایت دھیمی اور سُریلی آواز میں اس کا نام لے کر پکارا اُسنے اپنا نام سُنکر پوچھا کون پکارتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اخی جبرئیل۔ جبریل کا نام سُنکر وہ نہایت غور سے متوجہ ہوا (اَلْحَائِكُ اِذَا صَلّٰی یَوْمَیْنِ اِنْتَظَرَ الْوَحْیَ جولاہا جب دو دن نماز پڑھ لیتا ہے تو پھر وحی کا انتظار کرنے لگتا ہے) اور کہا کیا ارشاد ہے اسنے جواب دیا کہ مجھے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ تجھے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اب تو بہت بوڑھا ہوگیا ہم کو تیری کبڑی کمر دیکھ کر شرم آتی ہے اسلئے اب ہم نے تجھ سے نماز کو معاف کر دیا یہ کہکر آپ وہاں سے چلے آئے اس فقیر نے جو اخی جبریل کی زبان سے پروانہ معافی سنا پھر کیا تھا وضو کا لوٹا رکھ اور سو گئے۔ اب تہجد بھی غائب صبح بھی ظہر بھی۔ معتقدین نے جو دیکھا کہ بڑے میاں کئی وقت سے مسجد میں نہیں آئے تو بعضوں کو فکر ہوئی اِدھر اُدھر تذکرہ شروع ہوا آخر گھر پر پہونچے تو دیکھا کہ اندر ہیں بہتیری آوازیں دیں تو جواب ندارد آخر بڑی مشکل سے دروازہ کھولا بڑے میاں سے نماز میں نہ آنیکا سبب پوچھا تو اوّل تو مارے نخوت کے آپ نے کچھ جواب ہی نہیں دیا لیکن جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے کہا کہ میرے پاس اخی جبریل آئے تھے وہ فرما گئے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تجھے نماز معاف کر دی یہ سنکر وہ شخص جو غیر معتقد تھا اور جس نے یہ حرکت کی تھی بہت ہنسا لوگوں کو اس کے ہنسنے سے شبہ ہوا کہ اسی نے یہ حرکت کی ہے۔ پوچھا تو اس نے کہا کہ دیکھ لیجئے آپ ان کو فقیر اور بزرگ تبلاتے ہیں حقیقت میں جاہل کی فقیری کیا اور جب وہ فقیر نہیں ہو سکتا تو پیر اور مقتدا تو بدرجۂ اولیٰ نہیں ہو سکتا۔ ایک اور جاہل فقیر میں تھانہ بھون میں تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے تفسیر فرمائی تھی۔ وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی اے نفس تیری یہی سجا دہی سزا ہے صاحبو! سب جہل کے کرشمے ہیں اور یہ نامعقول پیٹ اس قسم کی کرتوتیں کراتا ہے زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی تمیز ہی نہیں رہی کہ یہ واقع میں فقیر ہے یا مکار ہے اور بعض بعض مقامات کی تو یہ حالت ہے کہ وہاں فساق فجار تک کے معتقد ہوجاتے

عہ اشارة الی انہ کان حائکًا ۱۲ منہ

ہیں چنانچہ ایک مشہور شہر کی نسبت ایک ثقہ سے سُنا ہے کہ ایک ایسے ہی نامعقول پیر کے پاس ان کا مرید بیٹھا ہے اور اس کی بیوی بھی بیٹھی ہے اور حضرت پیر صاحب اس کا مُنہ چوم رہے ہیں اور مرید صاحب اس پر خوش ہیں اور بیوی سے ہنس ہنس کر فرماتے ہیں کہ اب تمہارا منہ بڑے رتبہ کا ہوگیا اب ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اس میں تصرف کریں میرے ایک خاندانی بزرگ اس شہر کی نسبت کہتے تھے کہ وہاں کے فقیر تو دوزخی اور امیر جنتی۔ کیونکہ امراء تو فقراء سے ان کو اہل اللہ سمجھکر تعلق رکھتے ہیں اور فقراء ان سے دنیا حاصل کرنے کے لئے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیروں کو بھی جنتی کہنا مشکل ہے کیونکہ جو شخص اتنا جاہل ہو کہ اس کو فاسق اور صالح میں تمیز نہ ہو سکے وہ کیا جنتی ہونے کے کام کرے گا۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ پیر کے فعلوں سے کیا کام اس کی تعلیم سے کام تو میں کہتا ہوں کہ شیطان کے مرید کیوں نہیں ہو جاتے اس لئے کہ اس سے بڑا عالم اور واقف تو کوئی فقیر نہ ہوگا یہ تو عالموں سے بھی بڑا عالم ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ عالموں کو بھی علوم میں بہکا لیتا ہے اور کسی دوسرے کو کسی خاص امر میں وہی بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ اس امر میں مہارت رکھتا ہو غرض جاہل کی پیروی کچھ بھی نہیں ہے۔ ؎

سرانجام جاہل جہنم بود که جاہل نکو عاقبت کم بود

(جاہل کا انجام جہنم ہے اس وجہ سے کہ جاہل نیک عاقبت بہت کم ہوتا ہے)

چنانچہ وہ پہاڑ کا رہنے والا اگرچہ فقیر تھا لیکن بوجہ جاہل ہونے کے اس نے یہ خرافات کی کہ آنکھ پر پٹی باندھ لی کہ نفس کو شاق ہوگا اور اسی کو طاعت سمجھا۔ صاحبو اگر نفس پر مشقت ہی ڈالنا ذریعۂ قرب ہوتا تو لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ (اپنی جانوں کو مت قتل کرو) نہ فرمایا جاتا کیونکہ یہ تو بہت بڑی تکلیف ہے اس سے بہت زیادہ قرب ہونا چاہیئے تھا۔ غرض قرب ہوتا ہے صرف دین کا کام اس کے طریقے کے ساتھ کرنے سے اور اس میں بھی بہت سی بے تدبیریاں

کرتے ہیں مثلاً آجکل رمضان شریف آرہے ہیں اس میں اکثر لوگ قرآن تراویح میں سنائیں گے لیکن اس قدر تیزی سے پڑھیں گے کہ سوائے یَعْلَمُوْنَ اور تَعْلَمُوْنَ کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے گا تو تراویح ذریعہ قرب ہے لیکن اس کو ایسی بے تدبیری سے ادا کیا گیا کہ وہ ذریعہ بُعد ہو گیا اور پھر غضب یہ کہ اپنی ان حرکات پر متنبہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے اتنا زیادہ دین کا کام کیا خدا تعالے ایسوں ہی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ (آپ فرما دیجئے کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ کن کن لوگوں کے اعمال اکارت ہیں وہ لوگ جن کی کوشش دنیاوی زندگی کے سلسلے میں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کام خوب اچھا بناتے ہیں اور یہ سب دنیا ہی ہے دوسری بار ارشاد ہے أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ (بھلا دیکھ تو جس نے پوجنا پکڑا اپنی چاہ کا) بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث میں إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ آیا ہے اور ہماری نیت درست ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا محمل عام نہیں ہے بلکہ اس کا محمل صرف طاعت و مباحات ہیں نہ کہ گناہ پس گناہ میں نیت نیک کرنے سے عمل کا کچھ ثواب نہیں ملتا بلکہ وہاں تو یہ نیت اور بھی زیادہ موجب وبال ہے کیونکہ معصیت کو ذریعہ قرب کا اعتقاد کیا اسی طرح مثلاً اب شب برات آرہی ہے اس میں حلوا پکانے کو دین سمجھتے ہیں اور اس کی عام رسم ہے اور اگر کوئی مولوی منع کرتا ہے تو اس کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور غضب یہ ہے کہ بیچارے مولوی پر افترا پردازی کی جاتی ہے کہ یہ لوگ حلوے کو منع کرتے ہیں۔ صاحبو! میں صاف کہتا ہوں کہ خود حلوے کو کوئی منع نہیں کرتا صرف اسلئے منع کیا جاتا ہے کہ اس دن پکانے کو ثواب سمجھتے ہو جس کی کوئی اصل نہیں۔ حدیث شریف سے اس کا صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس رات کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبرستان میں تشریف لے گئے اور آپ نے مُردوں کے لئے دعاء فرمائی۔ اس سے ممکن ہے کہ کسی نے یہ سمجھ کر کہ اس شب میں اموات کو نفع پہونچانا تو ثواب ہو ہی گیا

نفع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کھانے کے ذریعے سے ثواب پہونچا دیا جائے تو یہاں تک تو قیاس کی گنجائش ہے اس کے بعد تو وہ طوفان بے تمیزی برپا ہوا ہے کہ الامان الحفیظ کہیں حلوے کی تخصیص ہے اور کہیں مسور کی دال کی بھی قید ہے خدا جانے ان دونوں میں کیا مناسبت ہے البتہ اتنی مناسبت تو سمجھ میں آتی ہے دونوں کے متعلق ایک ایک مثل قریب المعنی مشہور ہے چنانچہ کہتے ہیں حلوا خوردن را روئے باید۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ اس دوسری مثل کی اصل ایک دوست نے عجیب تبلائی کہ یہ منہ اور منصور کی دار یعنی منصور کے منہ سے جو انا الحق نکلا جس سے وہ دار پر چڑھائے گئے ہر منہ اس کلمہ کے لائق نہیں لیکن مشہور وہی ہے اور شہروں میں تو غضب یہ کرتے ہیں کہ ہر چیزیں رہن رکھ کر اور سودی قرض لے کر یہ رسمیں پوری کرتے ہیں۔ چنانچہ میں جس زمانے میں کانپور میں تھا ایک ماما ہمارے ہاں رہتی تھی۔ ماما کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ شب برات جو آئی تو اس نے اپنے برتن رہن رکھے اور کچھ سودی قرضہ لیا اس کے بعد اُسنے ایک جگہ کو خوب اچھی طرح لیپا اور حلوا پکایا ایک اور طرہ بھی ہو کہ اکثر لوگ فاتحہ کے لئے بہت سے پتوں میں علیحدہ علیحدہ رکھکر مُردوں کو ثواب بخشتے ہیں اور غالباً علیحدہ علیحدہ پتوں میں رکھنے کی رسم پیرزادوں نے اسلئے نکالی ہے تاکہ پیرجی صاحب کو بہت سا ملے کیونکہ پیرجی کا حصہ ہر فاتحہ کے لحاظ سے زیادہ ہوتا ہے اور اسی کیلئے زیادہ تر مولویوں پر خفا بھی پیرجی لوگ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں بطور لطیفہ کے اس کے متعلق اپنے ناصح دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم کو چاہیئے کہ عوام الناس کو ان چیزوں سے دفعۃً منع نہ کرو کہ وہ بگڑتے ہیں بلکہ ان سے یوں کہو کہ تم جو پیرجی کو حصہ دے کر ان سے ثواب بخشواتے ہو یہ ثواب نہیں پہونچتا اس لئے کہ انھوں نے جو کچھ پڑھا ہے اجرت لے کر پڑھا ہے اور اجرت لینے کے بعد ثواب ملتا نہیں تو جب پیرجی کو خود ہی ثواب نہیں ملا تو تمہارے مردوں کو ثواب کیسے مل جائیگا اس لئے تم پیرجیوں سے پڑھوا تو لیا کرو لیکن ان کو کچھ دیا مت کرو۔ اور اسی طرح پیرجیوں سے بھی یہ کہا جائے کہ تم فاتحہ خوانی بھی کرد یا نہ بھی لیکن اس پر نہ حصہ لیا کرو نہ کوئی اُجرت

لیا کرو جب پیرجیوں پر منت تو پڑی پوری اور ملا نہیں ایک پیسہ بھی تو دیکھ لینا انشاء اللہ تعالے خود یہ پیرجی ہی بہت جلدی اس کو حرام کہنے لگیں گے اور بدعت کا فتوے لگا دیں گے کیونکہ ان کے نزدیک اس کام سے زیادہ بدعت کیا ہوگا جس کو دن میں دس دس دفعہ کرنا پڑے اور ایک پیسہ بھی نہ ملے اِدّعاءِ سنیت کا منشاء تو صرف یہ تھا کہ کچھ وصول ہو جاتا تھا اور وصول ہونے ہی کے لئے زیادہ تران لوگوں نے اپنی ہوشیاری سے ایصال ثواب کے ایسے طریقے ایجاد کئے ہیں جن کو سوائے ان کے دوسرا عامی آدمی جان ہی نہیں سکتا کہ اول قُلْ ھُوَاللہ ہو پھر تَبَارَکَ الَّذِیْ ہو پھر یہ ہو اور پھر وہ ہو اور بعض سورتوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر نہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے تو چونکہ یہ طریقہ وہی لوگ جانتے ہیں اس لئے مجبوراً سب عوام ان کے محتاج ہو کر انھیں کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح سے ان کو ملتا ہے اور پھر غضب یہ کہ یہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کرتے ہیں۔ ایک سب انسپکٹر مجھ سے کہتے تھے کہ میں کسی تھانہ میں تھا کہ میرے پاس ایک شخص یہ رپٹ لکھوانے آیا کہ کوئی آدمی میری فاتحہ چرا کرلے گیا میں سخت پریشان ہوا کہ فاتحہ چرانے کے کیا معنے اس شخص سے پوچھا تو اس نے کہا کہ موقع پر چلئے آخر موقع پر جاکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نلکی میں پیرجی ایک سال کے لئے فاتحہ پڑھ کر بند کر جاتے ہیں اور کہہ جاتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے تھوڑی سی جھاڑ لینا فی نلکی دو روپیہ ان کا مقرر ہے اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں اور اس کو فاتحہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اس شخص کی نلکی چرا لی۔ اس سے بڑھ کر ایک حکایت حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سناتے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملا رہتا تھا سب لوگ اسی سے فاتحہ وغیرہ دلاتے تھے ایک مرتبہ ایک بڑھیا کھانا لے کر آئی اتفاق سے ملاجی اسوقت مسجد میں موجود نہ تھے ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود تو ثواب ہے چلو مسافر ہی کو دے دو اُس کو کھانا دیکر چلی مسجد کے دروازے سے نکلی ہی تھی کہ ملاجی مل گئے پوچھا کہ بڑھیا کیسے آئی

تھیں اس نے سب وقعہ کہدیا آپ فوراً مسجد میں آئے اور ایک لاٹھی لے کر تمام مسجد کے فرش کو خوب پیٹنا اور غل مچانا شروع کیا اور پیٹتے پیٹتے تھوڑی دیر میں دھم سے مسجد کے فرش پر گر گئے لوگوں نے جو غل شور سُنا تو سب آ کر جمع ہو گئے پوچھا کہ ملاجی کیا ہوا کہنے لگے کہ بھائیو میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں سب مُردوں سے واقف ہوں انہی کو ثواب بخشدیتا تھا یہ نیا آدمی ہے خدا جانے اس نے کس کس کو ثواب بخشدیا یہاں کے سب مُردے مجھے آ کر لپٹ گئے میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا لیکن میں تنہا تھا کہاں تک لڑتا آخر تھک کر گر گیا اگر دو چار دفعہ ایسا ہوا تو میں تو مر ہی جاؤں گا اسلئے اور کہیں جاتا ہوں لوگوں نے کہا کہ ملاجی آپ کہیں نہ جائیے ہم آپ ہی کو ہر چیز دیا کریں گے تو جب بنا ان رسوم کی یہ اغراض ہیں تو جب فاتحہ کی عوض ان کو کچھ نہ ملیگا تو الگ الگ بیٹھ کر فاتحہ پڑھنا ان کو خود ہی مشکل معلوم ہوگا اور اس طرح بہت جلد اس کا انسداد ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ایک علامت ہے ان رسوم کے زائد علی الدین ہونیکی کیونکہ اصل چیز منجانب اللہ ہر حالت میں محفوظ رہتی ہے چنانچہ جس زمانے میں طاعون کی کثرت ہوتی ہے تو تیجہ دسواں وغیرہ سب چھوٹ گئے صرف وہی چیزیں باقی رہ گئی تھیں جو شرعاً ضروری تھیں بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسوم کیوں نہیں ہوتیں تو کہنے لگے کہ صاحب کس کس کی رسمیں کریں یہاں تو روز تیجہ ہی رہتا ہے میں نے کہا دیکھو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ امور محض زائد ہیں ورنہ اس کثرت موت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مُردے کو بغیر کفن دیئے اور بلا نماز پڑھے دفن کر دیا ہو اور تیجہ دسواں بہت لوگوں کا نہیں ہوا غرض یہ کہ دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے ہیں جن سے مقصود دین یعنی کامیابی یعنی رضاء حق بمراحل بعید ہے۔

چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ موقع بھی ہے کہ آجکل قحط کے آثار معلوم ہوتے ہیں سو اس کے متعلق بعضے تو تدبیر ہی نہیں کرتے بلکہ شغل کے طور پر محض تذکرے ہی کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ نرا تاسف کچھ بھی مفید نہیں ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(اے عرفی اگر رونے سے وصال محبوب میسر ہو جائے تو اس تمنا میں سو سال رویا جا سکتا ہے)

اور اگر یہ سمجھ کر کہ اس کا سبب معاصی ہیں اور معاصی کا کفارہ طاعات سے ہوتا ہے پس کوئی طاعت اختیار کرنا چاہیئے تاکہ اس سے مقصود دیں کہ رفع سخط حق و دفع بلا ہے کامیابی ہو یہ سمجھ کر اس مقصود کی تدبیر کی تو اس کی تعیین میں غلطی کی یعنی یہ کیا کہ بہت سا اناج اکٹھا کر لیا اور تنور میں روٹیاں پکوا کر تقسیم کر دیا گویا اس سے میکائیل علیہ السلام کے محکمے کو خرید لیں گے اور کبھی اس کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو دو جواب ملتے ہیں ایک تو یہ کہ دیکھئے ایک نیک کام سے روکتے ہیں۔ صاحبو! اگر کوئی شخص ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھنے لگے تو اس کو کیوں منع کیا جاتا ہے آخر پانچویں رکعت بھی تو نماز ہی ہے اسی طرح اگر کوئی طبیب پانچ ماشہ گل بنفشہ تجویز کرے تو دس ماشہ استعمال کرنے سے کیوں رکتے ہو زائدہ ماشہ بھی تو گل بنفشہ ہی ہے اس کے بھی تو وہی خواص ہیں۔ صرف اسی لئے منع کیا جاتا ہے کہ یہ تحدید طبی سے زائد ہے اور تحدید سے آگے بڑھنا ممنوع ہے پس تحدیدات شریعت کی آپ کے نزدیک اتنی وقعت بھی نہیں ہے جب پانچویں رکعت کا پڑھنے والا اسلئے بدعتی ہے کہ وہ حدِ مقرر سے آگے بڑھ گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیک کام کرنے کی علی الاطلاق اجازت نہیں ہے بلکہ اس شرط سے اجازت ہے کہ حدود کے اندر ہو اور اگر تم کو حدود کی اطلاع نہیں ہے تو تم کو اس کہنے کا کیا مجاز ہے کہ یہ نیک کام ہے اور یہ بد۔ یہ حق علماء کا ہے یا انبیاء علیہم السلام کا تھا کم علم یا بے علم لوگ علماء کے سامنے مسائل شریعت میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی وکیل کے سامنے ایک دیہاتی آدمی۔ جس طرح ایک دیہاتی کسی وکیل کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کر لینے میں کیا حرج ہے اسی طرح آپ کو بھی یہ حق نہیں اور جس طرح وہ ہر کام میں وکیل سے مشورہ کرنیکا محتاج ہے اسی طرح آپ بھی ہر مذہبی کام میں علماء سے مشورہ کرنے کے محتاج ہیں پس طریقہ اس کا یہ ہے کہ جو کام کرو اول علماء سے مسئلہ پوچھ لو اور اگر کوئی عالم شفیق بھی ہوں تو اُن سے

وجہ بھی پوچھ لو اور اگر وجہ نہ تبلائیں تو سعادتمندی یہ ہے کہ اس کو اپنے فہم سے باہر سمجھ کر خاموش رہو اور اگر بیان کر دیں تو ان کا احسان سمجھو۔ اور بعض لوگ اس سے بھی چلتا ہوا ایک دوسرا جواب دیا کرتے ہیں وہ یہ کہ کیوں صاحب؟ یہ آجتک ہوتا چلا آیا ہے کیا یہ کرنے والے سب بیوقوف ہی تھے صاحبو! یہ سب عامیانہ باتیں ہیں۔ اب اپنی اس رسم کی حقیقت ابتداء سے سمجھئے سب سے پہلے اناج وصول کرنا شروع کیا جاتا ہے یعنی دو آدمی اٹھے اور گھر گھر جاکر انھوں نے کہنا شروع کیا اور لوگوں نے جمع کر دیا۔ سو دیکھنا یہ ہے کہ یہ اناج لوگوں نے خوشی سے جمع کیا ہے یا محض ان کے لحاظ اور دباؤ سے کہ جب یہ مانگنے آئے ہیں تو ان کو خالی کیا جانے دیں جس نے لوگوں کی حالت میں کچھ بھی غور کیا ہوگا یا کم از کم اپنی حالت میں غور کیا ہوگا کہ ہم نے خوشی سے دیا ہے یا محض لحاظ سے یا اگر نفس اناج تو خوشی سے دیا ہے تو یہ مقدار خاص پانچسیر یا دس سیر خوشی سے دی یا لحاظ سے تو خوب اندازہ کر لیگا کہ اکثر محض آنے والے کے لحاظ سے یا محلے میں بدنامی کے خیال سے دیا جاتا ہے یعنی چونکہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر نہ دینگے تو تمام محلے والے ہم کو کنجوس فقیر کہیں گے اور یہ مانگنے والے بدنام کرتے پھریں گے اس لئے بمجبوری دیدیا جاتا ہے اور اس کی نسبت حدیث شریف میں مصرح ہے اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْہُ یعنی کسی کا مال بدون اس کی خوشدلی کے لینا جائز نہیں ہے اور اگر ایک دو مثالیں ایسی بتلا بھی دو کہ فلاں شخص نے خوشی سے دیا تو زیادہ سے زیادہ چار من میں چار سیر حلال نکلیگا باقی سب حرام اور حلال و حرام کا مجموعہ جب کہ حرام غالب ہو جیسا کہ غالب یہی ہے حرام ہوتا ہے اور اگر اب بھی سمجھ میں نہیں آتا تو یہ کیجئے کہ جس محلے سے ابتک وصول نہیں کیا ہو اس میں ایک اعلان عام کر دو کہ اس کام کے لئے اناج جمع کیا جا رہا ہے اور اعلان کر کے ایک کوٹھی کسی موقع پر رکھدو اور اس میں قفل لگا دو اور کہدو کہ چار دن کے بعد جس قدر اناج اسمیں جمع ہو جائے گا اس کو پکا کر تقسیم کیا جائے گا پھر پانچویں دن اس کوٹھی کو کھول کر دیکھو انشاء اللہ ایک چوتھائی اناج اس میں نہو گا۔ اس سے اندازہ ہو جائیگا کہ طیب خاطر سے کتنے لوگ دیتے ہیں اور مسلمانوں کے پاس رکھا بھی کیا

کہ وہ خوشی سے اتنا دیکیں ان بیچاروں کو خود تو کھانیکو ملتا ہی نہیں دوسروں کو کہاں
سے دینگے توسب سے اول تو یہ لغو حرکت کی جاتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اگر پانی بہنے
والا بھی ہو تو نہ برسے کیونکہ ایک تو گناہ دوسرے حق العبد دوسری بات دیکھنے کی
یہ ہے کہ جن لوگوں نے خوشی سے بھی دیا ہے انھوں نے اپنا مال دیا ہے یا دوسرے کا
اور اگر دوسرے کا مال دیا ہے تو اس کی اجازت سے دیا ہے یا بلا اجازت کیونکہ
ایسا اکثر ہوتا ہے کہ میاں کا مال بغیر اجازت بیوی نے دیدیا اور شوہر سنکر بھی
خاموش رہا اور بعض جگہ کراہت کا اظہار بھی کر دیتا ہے چنانچہ کانپور میں ایک مرتبہ
مدرسہ میں جلسہ ہوا ایک صاحب کے گھر سے بعض حقہ باز مہمانوں کے لئے حقہ منگایا
گیا۔ بیوی نے شوہر کا مُرادآبادی حقہ بھیجدیا شوہر کو جو خبر ہوئی تو انھوں نے بیوی
کو خوب پیٹا اور اگر اب بھی سمجھ میں نہیں آیا تو انتظار کیجئے تھوڑے دنوں میں خدا
تعالے خود سمجھا دیں گے یعنی بعد موت کہ سب حقائق منکشف ہو جائینگے۔ اس کے
بعد اناج کے پیسنے کا وقت آتا ہے اُسمیں وہ گڑ بڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ اکثر ایسا
ہوتا ہے کہ پیسنے والی نہیں ملتی تو رؤسا سے کام لیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے سے
چماریوں کو بیگار میں پکڑ کر ان سے پسوایا جاتا ہے اور اگر ان کو پسائی دی جاتی
ہے تو بہت ہی کم اور اگر پوری ہی دی تب بھی تو کسی سے کام لینا بلا رضا مندی حرام
ہے اس کے بعد اس کے پکانے کا وقت آتا ہے پکوانے کے منتظم اکثر وہ لوگ ہوتے
ہیں کہ ان کو خدا کا خوف نہ حلال و حرام کی پروا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندھا بانٹے
شیرنی اپنے اپنوں کو دے یا جس کو جی چاہا دیا جس سے چاہا انکار کر دیا اکثر بھنگی
چمار چماریاں اس کھانے کی مستحق سمجھی جاتی ہیں اور چیلیں گوشت کی حقدار سمجھی جاتی
ہیں اور ویسے مریض کے لئے صدقہ دینے میں بھی چیلوں کے کھلانے کی رسم ہے اور شہر
میں ہم نے صدقے کے متعلق بعض خاص رسوم دیکھی ہیں یعنی وہاں اکثر لوگ مسلم ماش
اور تیل اور پیسے تقسیم کرتے ہیں اور اکثر بھنگیوں کو دیتے ہیں اس کی وجہ غور کرنے
سے یہ سمجھ میں آئی کہ عوام الناس بلا کو کالی سمجھتے ہیں اسلئے چھانٹ کر کالی کالی چیزیں

دیتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے بلا دفع ہوگی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کھانوں کا حقدار بھنگیوں اور چماروں کو سمجھا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر کالے ہوتے ہیں گویا جب وہ کھائیں گے تو ساری بلا ان کے پیٹ میں چلی جائیگی مگر وہ ایسے بلا نوش ہیں کہ ان کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ علیٰ ہذا اکثر ایسے لوگ بھی اس کھانے کو لیجاتے ہیں جو خود بھی خوشحال ہوتے ہیں چنانچہ ہمارے محلہ میں ایک مرتبہ کھانا پکا تھا ایک بڑے میاں کو میں نے دیکھا کہ کھانا لئے ہوئے چلے آرہے ہیں میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہنے لگے کہ یہ کھانا ذرا مزیدار ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب آپ کو لینا جائز نہیں تب ان کی سمجھ میں آیا اور ان بے عنوانیوں کے سبب میں تو ایسے کھانیکو کسی کے لئے بھی پسند نہیں کرتا ایک مرتبہ ہمارے مدرسے کے طالب علموں کی بھی دعوت کی گئی تھی لیکن میں نے اسکو منظور نہیں کیا کیونکہ یہ جائز نہیں ہے غرض آجکل چندوں کے جمع کرنے میں اس قدر بے عنوانیاں ہوتی ہیں جس سے اکثر چندے ناجائز ہو جاتے ہیں اکثر مدارس کے چندوں میں بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا اور پھر اپنی اس حرکت پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہم نے خوب خوب کوشش کی۔ کوشش یہ کہ خوب جمٹ کر وصول کیا اور بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے دین کے کاموں میں کوشش کر کے خدا کے مقرب ہوگئے۔ صاحبو! خدا تعالیٰ نے کب کہا تھا کہ تم لوگوں کو چمٹ کر اور پریشان کر کے وصول کرنا اور ہمارے حکموں کو چھوڑ دینا۔ بعض لوگ اس کے جواب میں کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہم نے اپنے لئے تو نہیں کیا خدا کے کام کے لئے کیا ہے۔ صاحبو! یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے اگر اپنے لئے کرتے تو خیر کچھ تو ملتا دنیا ہی سہی اور اب تو سوائے گناہ کے کچھ بھی نہ ملا اور یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو محض دین کا کام سمجھ کر کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے نفس کی کسی غرض کے حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پس ازالہ قحط کی یہ تدابیر نہیں ہیں۔ تدبیر اس کی اور ہے اور وہ ایک ضروری امر کے معلوم کرنے پر موقوف ہے وہ یہ ہے کہ ہر مصیبت کا ازالہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب اس مصیبت کا سبب دریافت ہو جائے پھر اس سبب کو دور کر دیا جائے۔

لہذا اس موقع پر بھی اول بارش نہ ہونے اور ہونے کے اسباب دریافت کئے جائیں اور پھر ان کو زائل یا حاصل کریں۔ سو بارش نہ ہونیکا سبب غیر تام تو معصیت ہے اور سبب تام مشیت۔ اور بارش ہونیکا سبب غیر تام طاعت ہے اور سبب تام مشیت۔ یعنی طاعت کو بارش ہونے میں اور گناہ کو بارش نہ ہونے میں دخل ہے چنانچہ ارشاد ہے فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ (تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بیشک وہ ہے بخشنے والا چھوڑ دے آسمان کی تم پر دھاریں اور بڑھتی دے تم کو مال اور بیٹوں سے) یہ اگرچہ خاص قوم کو خطاب ہے اور ان ہی سے یہ وعدہ بھی تھا اور یہ اس لئے کہہ دیا کہ اگر استغفار کے بعد بھی بارش نہ ہو تو خدا کے کلام کو غلط نہ سمجھو لیکن تاہم استغفار کا دخل تو اس میں معلوم ہوا دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اور اگر وہ یقین لاتے اور بچ چلتے تو ہم کھول دیتے ان پر خوبیاں آسمان اور زمین سے) یہاں بھی ایک خاص قوم کی نسبت ارشاد ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کے لئے ایسا ہی ہوتا عام وعدہ قطعی نہیں ہے لیکن ایمان اور تقوے کا اس فتح برکات میں دخل تو ضرور ثابت ہوا اور تیسری جگہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (اور اگر وہ قائم رکھیں توریت اور انجیل کو اور جو اترا ان کو ان کے رب کی طرف سے تو کھائیں اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے) یہ آیت بھی اسی قبیل کی ہے اور جو آیتیں ایسی ہیں کہ ان میں وعدہ عام معلوم ہوتا ہو وہاں بھی دوسری آیات کے انضمام سے تقیید بالمشیت ہوگی چنانچہ فرماتے ہیں فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (پھر کھول دیتا ہے جس پر پکارتے تھے اگر چاہتا ہے) تو جہاں وہ بھی ہے وہ مقید بالمشیت ہے نیز اس آیت اخیرہ سے جیسے یہ بات معلوم ہوئی کہ طاعت سبب غیر تام ہے چنانچہ فَيَكْشِفُ کو اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ پر مرتب فرمایا ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ مشیت سبب تام ہے تو تدبیر بارش ہونیکی یہ ہوئی کہ موانع کو مرتفع کیا جائے

اور بواعث کو پیدا کیا جائے یعنی دونوں پہلوؤں پر نظر کر کے ایک دستور العمل مقرر کریں اور وہ یہ کہ گناہ کو بالکل ترک کر دیں اور طاعت کو پوری طرح اختیار کریں یہ تو سبب غیر تام کا رفع اور اس کا ساتھ تشبث ہوا۔ رہا دوسرا سبب یعنی خدا تعالیٰ کا چاہنا کہ بارش ہو سو اس کی وہ تدبیر کرو جس سے خدا تعالیٰ چاہیں اور یہ بات اگرچہ ہمارے قبضہ میں نہیں ہے لیکن ہم کو اس کا طریقہ بتلایا گیا ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے درخواست کی جائے کہ آپ مشیت کو متعلق فرما دیجئے اور یہ ضرور نہیں کہ اس عنوان سے درخواست ہو بلکہ یہ دعا کرنا کہ اے اللہ بارش عطا فرما اس کا حاصل وہی درخواست مشیت ہے کیونکہ مشیت موقوف علیہ ہے اور موقوف کی دعا موقوف علیہ کی دعاء ہے تو حاصل ساری تدبیر اور دستور العمل کا تین عمل ہوئے ایک تو گناہ نہ کرنا کہ اس میں ہم لوگ بہت زیادہ مبتلا ہیں اور پھر ظلم یہ ہے کہ طرح طرح کے گناہ ہم سے سرزد ہوتے ہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو بالکل پاک صاف سمجھتے ہیں حالانکہ ہمارے سلف کی یہ حالت تھی کہ باوجود بالکل پاک ہونے کے بھی وہ اپنے کو گنہگار سمجھتے تھے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مدین میں قحط پڑا لوگ ان کے پاس دعاء کرنے کے لئے آئے تو آپ نے فرمایا کہ امساک باراں گناہوں کے سبب ہوتا ہے اور سب سے زیادہ گنہگار شہر میں میں ہوں لہٰذا مجھے شہر سے نکال دو تو بارش ہو جائے گی اور یہی نہیں کہ محض زبانی کہدیا ہو بلکہ آپ اس شہر سے چلے بھی گئے ہم لوگ شب و روز گناہوں میں مبتلا ہیں لیکن ہم کو کبھی وہم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے اعمال کی شامت ہے حضرت سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کی شان یہ تھی کہ قدمی علیٰ رقاب کل اولیاء اللہ اُن کا مقولہ ہے ان کی وہ حالت تھی جو شیخ نے گلستان میں نقل کی ہے کہ

ع قال العارف الشہروردی انہ قال فی حالۃ السکر وقال بعض العلماء انہ قالہ بالالہام من اللہ عزوجل والاقرب الی سیرتہ ھو الاول واللہ اعلم لکن من ثبت فضلہ علیہ فھو مستثنی من ذلک والکشف ظنی فافھم۔ احمد حسن سنبھلی عفی عنہ

وہ یہ کہہ رہے تھے ؎

من نگویم کہ طاعتم بپذیر قلم عفو برگناہم کش

یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت کو قبول فرمالیجئے اسلئے کہ میرے پاس طاعت ہی کہاں ہے صرف یہ التجا ہے کہ میرے گناہوں کو بخشدیجئے اور آپ کے اس قول میں قدمی علی رقاب کل اولیاء اللہ اگرچہ اختلاف ہے کہ تمام اولیاء اللہ مراد ہیں یا اس زمانہ کے اولیاء اللہ لیکن دوسری شق میں بھی کچھ کم فضیلت ثابت نہیں ہوتی تو جب یہ حضرات اپنے کو ایسا کہیں تو ہم کو کیا حق ہے کہ ہم اپنے کو جنید رحمۃ اللہ علیہ وقت سمجھیں اور اگر جنیدؒ ہی سمجھیں تب بھی اپنے کو گنہگار سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ جنیدؒ تو اپنے کو بہت بڑا گنہگار سمجھتے تھے۔ مگر ہمارا تقویٰ کچھ ایسا لوہے جڑا ہے کہ فسق و فجور سے کبھی نہیں جاتا کچھ بھی کریں مگر پھر بزرگ کے بزرگ ہمارے تقوے کی وہ حالت ہے کہ جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ بی بی تمیزہ کا ایک قصہ مثنوی میں لکھا ہے کہ یہ ایک عورت فاحشہ تھی کسی بزرگ نے اس کو نصیحت کی اور نماز پڑھنے کی تاکید کی اور وضو بھی کرادیا اس نے نماز شروع کردی ایک مدت کے بعد جو ان بزرگ کا وہاں کو گذر ہوا تو بی بی تمیزہ بھی ملیں۔ انھوں نے پوچھا کہ بی نماز بھی پڑھا کرتی ہو کہنے لگی جی ہاں پڑھتی ہوں۔ انھوں نے کہا اور وضو بھی کرتی ہو کہنے لگی کہ آپنے اس روز کرا نہیں دیا تھا۔ صاحب مثنوی نے اس قصے کو نقل کرکے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کا تقویٰ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ نہ وہ زنا سے ٹوٹتا ہے نہ اور کسی فعل سے اسی طرح ہم لوگ اپنے ایسے معتقد ہیں کہ کوئی عیب ہی نہیں نظر آتا البتہ دوسرے پر طعن کرنے میں خوب پختہ ہیں۔ کیوں صاحبو! کیا ہم کو گناہوں کے معاف کرانیکی ضرورت نہیں ہے جو اس کو چھوڑکر دوسروں کے پیچھے پڑ گئے کیا ہم آنکھ ناک کان ہاتھ پیر کے گناہوں میں مبتلا نہیں ہیں کیا ہمارے ذمہ حقوق العباد نہیں ہیں کیا ہم میں بہت لوگوں نے دوسروں کی زمین نہیں دبا رکھی کیا بہت سے لوگ زمین کی موروثیت کے مدعی ہم میں نہیں ہیں باوجود اس کے پھر ہم میں بعضے لوگ

بارش نہ ہونے پر یا کسی دوسری بلا آنے پر تعجب کیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے۔ صاحبو! آپ کو تو اس پر تعجب ہونا چاہیئے کہ ہم کو جو دو وقت روٹی ملجاتی ہے یہ کونسی طاعت سے ملتی ہے اس واسطے کہ باغیوں کو تو روٹی نہیں ملا کرتی۔ غرض ایک تدبیر تو یہ ہے کہ یہ سارے گناہ چھوڑ دو اور دوسری تدبیر یہ ہے کہ طاعت کو اختیار کرو۔ جن لوگوں کے ذمے زکوٰۃ واجب ہے وہ زکوٰۃ دیں جن پر حج فرض ہے وہ حج کریں اور پختہ قصد کرلیں کہ انشاء اللہ عید سے اگلے دن ضرور حج کو چلے جائیں گے بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ سالہا سال سے ان کا ارادہ حج کا ہے لیکن آجتک پورا ہی نہیں ہوا آئے دن کوئی نہ کوئی بہانہ ان کو لگا رہتا ہے کسی نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا ہے کہ ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم — باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

اور تیسری تدبیر یہ ہے کہ دعا کریں لیکن دعا کے یہ معنے نہیں کہ جماعت میں سے کسی ایک نے پکار دیا کہ بارش کے لئے دعا کیجئے اور دوسرے نے کہدیا کہ اے اللہ باران رحمت نازل کیجئے حالانکہ نہ دل میں درد ہے نہ قلب کو توجہ ہے بلکہ دعا اس طرح کرو کہ پوری طرح دل ادھر متوجہ ہو اور دل میں درد بھرا ہوا ہو اور اگر درد اختیار میں نہیں ہے تو توجہ کرنا تو اپنے اختیار میں ہے اور کم سے کم اس قدر توجہ تو ہو جس قدر حکام سے التجا کرتے وقت ہوا کرتی ہے صاحبو جو دعا توجہ سے کی جاتی ہے وہ اکثر قبول ہوتی ہے اور اکثر محض احتیاطاً کہا ورنہ اصل یہ ہے کہ ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد — اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(جس عاشق کے حال پر دوست کی نظر نہ ہو اے خواجہ کہ اسکے دل میں درد نہیں ہے ورنہ طبیب تو موجود ہے)

طبیب کے ہونے میں شک نہیں مگر درد ہی نہ ہو تو کیا کریں اور دعا کرنے کے تین طریقے ہیں ایک تو یہ کہ ہر نماز کے بعد دعا کیا کرے دوسرے یہ کہ فرض نمازوں کے علاوہ ہر شخص کچھ نفلیں بھی پڑھ لیا کرے اور ان کے بعد دعا کیا کرے تیسرے

یہ کہ سب مل کر کسی جنگل میں جمع ہوں اور وہاں جاکر خدا تعالیٰ سے دعا کریں ان میں سے جو آسان معلوم ہو اس کو کرلیں بس تدبیر یہ ہے نہ وہ جو کہ لوگوں نے اختراع کی ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ کلام ان سب تدابیرِ مذکورہ کو شامل ہے اور مولانا نے اسی کو نظم بھی کیا ہے ؎

اُطْلُبُوا الْاَرْزَاقَ مِنْ اَسْبَابِهَا وَادْخُلُوا الْاَبْيَاتَ مِنْ اَبْوَابِهَا

(روزی روزی کے اسباب کے ذریعہ تلاش کرو اور گھروں میں اُن کے دروازے سے داخل ہو)

جس کام کو کرو اس کے دروازے سے کرو اور دروازہ ہر کام کا وہی ہے جو اس کا اصلی طریقہ ہے یہ تو حاصل تھا وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا کا۔ آگے خدا تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے اگرچہ یہ جملہ بھی قاعدہ کلیہ تھا مگر وہ مقاصد پر مطابقۃً دلالت نکرتا تھا اور یہ مطابقۃً دلالت کرتا ہے فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ ہم خلاف شرع تو نہیں کرتے یعنی دین کا جو کام کرو اس کا تو طریقہ کامیابی بھی دیکھ لو اور دنیا کا جو کام کرو اس میں صرف اتنا دیکھ لو کہ یہ جائز ہے یا نہیں۔ چونکہ یہ مضمون حالت موجودہ پر نظر کرکے نہایت ضروری تھا اسلئے اس کو اس حالت کے ساتھ بالتخصیص بیان کردیا گیا باقی ہے یہ ایسا امر کہ اس کو ہر وقت ہر کام میں پیش نظر رکھنا چاہیئے البتہ طاعت میں علاوہ طاعت عامہ مذکورہ سابقہ کے خصوصیت کے ساتھ رفع قحط کے لئے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کچھ صدقہ دیدیا جائے کیونکہ صدقے کو خدا تعالیٰ کے غصے کے دور کرنے میں بہت دخل ہے اور اس صدقے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں وقت اپنے گھر میں سے ایک ایک روٹی غریبوں کو دیدو یا جس قدر توفیق ہو۔ یہ آسان بھی ہے اور ہمیشہ جاری بھی رہ سکتا ہے یا جو لوگ صاحب وسعت ہیں وہ ایک ایک خوراک دونوں وقت مقرر کردیں اس میں غلہ بھی خرچ ہو جائیگا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

حدیث شریف میں اخفائے صدقہ کی یہاں تک تاکید آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس طرح صدقہ کرو کہ داہنا ہاتھ دے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی نیک کاموں سے منع کرتے ہیں۔ صاحبو! منع نہیں کرتے بلکہ تمہاری چیزوں کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں اور تم کو ان کے صرف کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ اس طرح کرو تاکہ ٹھکانے لگے۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم کو توفیق عمل دے۔ اور ہمارے (اور ناشر عبدالمنان کے) گناہوں کو بخشدے اور باران رحمت نازل فرمائے۔ آمین یارب العالمین تمت بالخیر

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ۔

رواہ البخاری

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

آٹھواں وعظ ملقب بہ

فضل العلم والعمل

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی ۱

دعواتِ عبدیت جلد پنجم

کا

آٹھواں وعظ مُلقّب بہ

فضلُ العِلم والعمل

اَینَ	مَتیٰ	کَم	کَیفَ	ماذا	مَن ضَبَطَ	اَلمُستَمِعُونَ	اَشتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
دار الطلبہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور	شب ۲۶ رجب ۱۳۳۰ھ	۲ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	فلاح دنیوی کا طریقہ یعنی اطاعت احکام حق ہے مع بعض فوائد مناسبہ اہل علم	سعید احمد صاحب تھانوی	تقریباً ۱۰۰۰ آدمی	

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ؕ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّئَاتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَولٰنَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ ۔ اَمَّا بَعدُ فَقَد قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یٰاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اِذَا قِیلَ لَکُم تَفَسَّحُوا فِی المَجَالِسِ فَافسَحُوا یَفسَحِ اللّٰہُ

لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ جس آیت کی تلاوت اسوقت کی گئی ہے ہرچند کہ اس میں ایک خاص مضمون ایک خاص مقام کے متعلق بیان کیا گیا ہے یعنی اس میں ایک خاص عمل کا حکم ہے ایک خاص حالت میں۔ لیکن اُس پر جس ثمرے کو مرتب کیا گیا ہے اس کے مبنیٰ پر نظر کرنے سے ایک عام قاعدہ پیدا ہوتا ہے جس کے مستحضر رکھنے کی ہر وقت ہر مسلمان کو ضرورت ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں کہ علی العموم لوگوں کے خیالات منتشر ہیں اور اہل الرائے میں سے ہر شخص کی ایک جداگانہ رائے ہے۔ اسی لئے اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا ہے ترجمے سے وہ خاص مضمون اور ذرا تامل سے وہ مبنیٰ معلوم ہوجائے گا اور پھر اس سے جو ایک عام فائدہ پیدا ہوتا ہے اس کی تقریر کردی جائے گی۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم کو یہ حکم ہو کہ مجلس میں فراخی کردو تو فراخی کردیا کرو۔ حق سبحانہ تعالےٰ تمہارے لئے فراخی کردیں گے اور جب تم سے کہا جائے کہ اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو خدا تعالےٰ تم میں سے مومنین اور اہل علم کے بہت سے درجے بلند کردیں گے۔ یعنی جب کسی مصلحت سے منجانب منتظم مجلس ایسا حکم ہو تو اس پر عمل کیا کرو۔ یہ عام ہے نبی اور غیر نبی کو جو بھی منتظم مجلس ہو اسی لئے قیل کہا گیا قائل کی تخصیص نہیں کی اور اللہ تعالےٰ تمہارے سب اعمال پر خبیر ہیں یعنی اُن اعمال کے باطن پر بھی مطلع ہیں مفسرین نے خبیر کی تفسیر میں اس کی تصریح کی ہے یہ آیت کا ترجمہ تھا۔ ترجمے کے ساتھ ہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا شانِ نزول بھی معلوم کرلیا جائے کیونکہ اُس سے فہم مراد میں بھی اعانت ہوتی ہے اور تفسیر میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حاضر تھے کہ اصحاب بدر آئے۔ اصحاب بدر وہ لوگ کہلاتے ہیں کہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں ان کی فضیلت بہت ہے اس وقت مجلس میں کچھ تنگی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین مجلس کو حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو اور ایک روایت میں ہے

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض کو فرمایا کہ تم اُٹھ جاؤ اپنے کسی دوسرے کام میں لگو یا اُٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔ ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ آیت کا مجموعہ ان دونوں کے مجموعے پر دال ہے ممکن ہے کہ بعض کو مل کر بیٹھنے کا حکم دیا ہو اور بعض کو اٹھ جانیکا حکم دیا ہو۔ صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبوں کو تکتے تھے وہ تو اس پر نہایت خوشی سے عامل ہو گئے۔ لیکن منافقین نے کہ وہ ایسے مواقع کے لئے اُدھار کھائے بیٹھے رہتے تھے اس پر اعتراض کیا اور یہ گویا ان کو عیب جوئی کا ایک موقع مل گیا۔ حالانکہ اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تب بھی اس انتظام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمال خوبی معلوم ہوتی ہے کہ تمام طالبان حق کی کس قدر رعایت کی کہ جگہ نہ ہونے کی مجبوری سے کوئی شخص محروم نہ رہ جائے لیکن چشم بدبیں میں ہنر بھی عیب ہی ہو کر نظر آتا ہے ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

(بد اندیش آدمی جب کسی کام کو دیکھتا ہے تو اُس کی نظر میں اُس کا ہنر عیب معلوم ہوتا ہے)

منافقین کو اعتراض کا بہانہ مل گیا۔ کہنے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ نئے آنے والوں کی خاطر پہلے بیٹھے ہوؤں کو اُٹھایا جائے خدا تعالےٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ دونوں حکم مناسب اور مستحسن تھے اور مستحسن کو غیر مستحسن کہنا حماقت ہے اور مستحسن ہونا اس طرح ظاہر فرمایا کہ ان حکموں کا خود بھی امر فرمایا اور خدا تعالےٰ اگر کوئی حکم فرمائیں تو وہ قبیح ہو نہیں سکتا۔ عقلاً بھی اور نقلاً بھی جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اور اس کا حکم خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مستحسن ہے کیونکہ ایسی ذات کا حکم ہے جس کی برابر کوئی حکیم نہیں پھر ہر حکم پر ایک ایک ثمرۂ مطلوبہ کو بھی مرتب فرمایا کہ وہ استحسان کی مزید دلیل ہے چنانچہ حکم اور ثمرہ دونوں کے لئے ارشاد ہے اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا۔ ایک حکم کا تو یہ صیغہ امر اس میں ارشاد ہے اس کے بعد فرماتے ہیں

یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ یہ اُس کا ثمرہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو خدا تعالیٰ جنت میں تمہارے لئے فراخی فرمائیں گے یہاں تک تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ تھا آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم فرماتے ہیں وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا۔ یعنی جب اٹھ جانے کا حکم ہوا کرے تو اُٹھ جایا کرو۔ نقلی استحسان تو اس ارشاد ہی سے ثابت ہو گیا باقی عقلی استحسان کی تقریر یہ ہے کہ صدر مجلس جب اہل ہو اور یہ حکم کرے تو وہ کسی مصلحت کی بنا پر ہوگا۔ پس اس کا قبول کرنا ضرور ہوگا اور مطلق صدر مجلس بلاتخصیص اس لئے کہا گیا کہ قرآن میں لفظ قیل ہے جو کہ ہر صدر مجلس کے کہنے پر صادق آتا ہے پس یہ شبہ جاتا رہا کہ یہ خاص ہے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ اگرچہ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے ارشاد فرمایا تھا لیکن جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی ضرورت پیش آئی اسی طرح جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں اور نیابت کی اہلیت ان میں ہے ان کو بھی صدر مجلس ہو جانے کی صورت میں ایسی ضرورت پیش آسکتی ہے اور اس کے قبول پر بھی عمل کرنا ایسا ہی واجب ہوگا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر۔ تو اگر وہ اُٹھنے کا حکم دیں تو فوراً اُٹھ جانا چاہیئے اور اس کے امتثال میں ننگ و عار نہ کرنا چاہیئے کیونکہ مصلحتِ وقت سے ایسا کیا جاتا ہے اور توضیح مقام کی یہ ہے کہ ان حکموں کا حاصل تنادب فی الانتفاع ہے اور تنادب شرعاً بھی محمود ہے یعنی اگر کوئی مطلوب مشترک ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لئے سب طالبین کی گنجائش ایک مجلس میں نہ ہو تو شریعت نے اس کے لئے تنادب تجویز فرمایا ہے اور عقل بھی اس کے ساتھ اس میں متفق ہے کہ سب طالبین کے کمال حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ آپس میں تنادب ہو نہ یا دہ وضاحت کے لئے اِس کو ایک مثال میں سمجھئے مثلاً ایک کنواں ہے کہ شہر کے ہر شخص کو اُس کے پانی کی ضرورت ہے اور ایک ساتھ سب کے سب اس سے پانی نہیں بھر سکتے۔ تو سب کے پانی حاصل کرنے کی صورت یہی ہے کہ یکے بعد دیگرے سب کے سب پانی حاصل کریں اور چار آدمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کنوئے پر جم کر بیٹھ جائیں

اور دوسروں کو جگہ نہ دیں یہ مثال ایسی ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو بھی کلام نہیں تو جس طرح دُنیاوی نفع میں تناوب مسلم ہے اسی طرح دینی نفع میں بھی سب کے انتفاع کی یہی صورت ہے کہ علی سبیل التناوب سب نفع حاصل کریں۔ اسی مثال کے قریب ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں کہ وہ وضاحت میں تو اس سے کم ہے مگر اس موقع کے زیادہ مناسب ہےعہ وہ یہ کہ اگر ایک مدرسے میں ایک عالم ایسے ہوں کہ ہر طالب علم کو ان کی ضرورت ہو اور ہر شخص ان سے نفع حاصل کرنا چاہے کوئی بخاری شریف پڑھنا چاہے اور کوئی نسائی اور کوئی منطق و فلسفہ تو اگر بخاری شریف والے ان کو گھیر کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو وقت ہی نہ دیں تو دوسروں کے نفع حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے اور اسلئے بخاری والوں کو یہ حق نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ دوسری جماعتوں کے لئے بھی وقت چھوڑ دیں۔ ان مثالوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ نفع دنیاوی اور دینی دونوں میں اگر طالبین کا اجتماع نہ ہوسکے تو تناوب ہونا ضروری ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نہایت ہی قرین مصلحت تھا اور چونکہ تَفَسَّحُوْا اور اُنْشُزُوْا عام ہے بعض اور کل دونوں کو۔ اس لئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کو اٹھنے کو فرمائیں سب کو اٹھ جانا واجب ہوگا اور اس میں یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ مبنےٰ اس کا تو انتفاع الجمیع تھا سب کے اٹھا دینے میں تو حرمان الجمیع ہے جواب یہ ہے کہ اس میں بھی انتفاع الجمیع اس طرح ہوسکتا ہے کہ شاید آپ خلوت میں کچھ نفع عام کے لئے سوچیں یا آرام فرمائیں تاکہ پھر سب کی مصلحت کے لئے تازہ ہو جائیں پس اس میں بھی جمیع کا انتفاع ہوا اسی طرح اگر کبھی دوسرے صدر مجلس کو بھی اس کی ضرورت پیش آئے کہ وہ کسی مصلحت سے بعض مجلس یا ساری مجلس کو اُٹھنے کا حکم دے تو اس کو اجازت ہے کہ کہدے کہ اب تم لوگ اٹھو اور اُس کا یہ کہدینا بدلیل اس کے اہل ہونے کے قرین مصلحت سمجھا جائے گا اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ تو منافقین کی یہ شکایت محض حسد کی بنا پر تھی اور اس کے قبول کرنے سے اباء کرنا محض عار واستنکاف تھا ورنہ واقع میں بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں

عہ وجہ یہ کہ مجمع طلبہ کا زیادہ تھا اور ان کے حال کے مناسب ہونا اس مثال کا ظاہر ہے ۱۲ منہ

کہ وہ ایسے امور میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اس وقت مجھے اپنی ایک حکایت یاد آئی اپنی اوائل عمر میں جبکہ میں بالغ ہو چکا تھا ایک مرتبہ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے کھڑا ہوا صف میں داہنی طرف آدمی زیادہ ہو گئے تھے اور بائیں طرف کم تھے۔ میں نے داہنی طرف کے ایک شخص کو کہا کہ آپ بائیں طرف آجائیں یہ سن کر ان کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ تمتما گیا زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہوئے حالانکہ یہ کوئی غصہ کی بات نہ تھی ترتیبِ صفوف تو شریعت میں بھی ضروری قرار دیگئی ہے ان کی یہ حرکت مجھے بھی ناگوار ہوئی آخر میں نے ان کے قریب کے آدمی سے کہا کہ بھائی تم ادھر آجاؤ کیونکہ ان کی تو شان گھٹ جائیگی اس پر تو وہ ایسے خفا ہوئے کہ صف میں سے نکل کر مسجد ہی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ تو بعض طبیعتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ اس کو عار سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے کا کہنا کریں اور اس کا اندازہ ایسے لوگوں کے حالات دیکھنے اور اُن سے ملنے سے ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے ذریعے سے یہ قانون دائمی مقرر کیا گیا ورنہ بظاہر اس کا قانون بنانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ تو ایسی ظاہر بات ہے کہ معاشرت روزمرہ میں داخل اور فطرتِ سلیمہ کا مقتضا ہے مگر اسی قسم کی طبائع کی بدولت یہ قانون مقرر فرمایا کہ واجب سمجھ کر ماننا پڑے اور اس کا امر بھی فرمایا اور امر کے ساتھ ترغیب بھی دی تاکہ کوئی ہیبت سے مانے اور کوئی ترغیب سے۔ کیونکہ دو ہی قسم کی طبیعتیں ہوتی ہیں بعض پر رغبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور بعض پر ہیبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن میں زیادہ لطف اُسی شخص کو آتا ہے جس کی نظر واقعات پر ہو اور وہ واقعات میں غور کرے مثلاً اگر اُن بڑے میاں کا واقعہ پیش نظر نہ ہوتا تو اس حکم کی مشروعیت کی حکمت سمجھنے کا لطف نہ آتا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر پاکیزہ انتظام فرمایا ہے کہ ذرا سی بات کو بھی نہیں چھوڑا غرض اس قسم کے واقعات ہوئے بھی ہیں اور قیامت تک ہونے والے بھی ہیں اس لئے یہ قانون دائمی مقرر فرما دیا اور اُس پر اِس ثمرے کو مرتب فرمایا کہ

ہم تمہارے لئے جنّت میں جگہ کو فراخ فرمائیں گے اور دوسرا حکم یہ فرمایا کہ اگر اُٹھ جانیکا حکم ہوا کرے تو اُٹھ جایا کرو۔ خدا تعالےٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور اہل علم کے درجات بلند فرمائیں گے یہ حاصل ہے ارشاد کا۔ اس تقریر سے آپ کو سبب نزول آیت بھی معلوم ہوگیا اور حاصل آیت بھی جس میں حکم اور ثمرہ دونوں مذکور ہیں اب میں وہ بات بیان کرتا ہوں جس کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے میں نے کہا تھا کہ اس ثمرے کا ایک مبنےٰ ہے اس میں غور کرنے سے وہ قاعدہ عامّہ نکلیگا جس کا استحضار ہر وقت ضروری ہے سو یہاں ایک امر تو یہ ہے کہ تَفَسَّحُوْا اور ثمرہ یہ ہے کہ یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ یعنی جنت میں فراخی ہوگی اور دوسرا حکم یہ ہے کہ فَانْشُزُوْا اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ تو ان دونوں میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ صدر مجلس کے کہنے سے فراخی کردینے میں جنّت میں فراخی کیوں ہوگی اور اُٹھ جانے میں رفع درجات کیوں ہوں گے جس کو ذرا بھی عقل ہوگی وہ تو اس میں بالکل بھی تامل نہ کرے گا بلکہ یہی کہیگا کہ مبنیٰ یہ ہے کہ اس نے خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد خدا تعالےٰ کا ارشاد ہے اور اولی الامر کا حکم بھی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اس لئے کہ خدا تعالےٰ ہی نے ہم کو اولی الامر کا کہنا ماننے کو فرمایا ہے پس اگر ہم نے صدر مجلس کا حکم مان لیا تو خدا تعالےٰ کا حکم مان لیا غرض پھر پھرا کر مبنےٰ یہی نکلیگا کہ چونکہ اس امر کا امتثال کرنے والا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے والا ہے اس لئے اس کو یہ ثمرہ حاصل ہوا۔ سو اصل مقصود اس وقت اسی امر کا بیان کرنا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کررہی ہے کہ خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر یہ دو ثمرے مرتب ہوتے ہیں۔ اور دوسرے مضامین اگر آئیں گے تو استطراداً اسی کی توضیح کے لئے آئیں گے یا بعض اس پر مرتب ہونگے۔ اب رہی یہ بات کہ اس مضمون کو اس وقت کیوں اختیار کیا گیا اس کی بابت میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ آجکل اس کی سخت ضرورت ہے

کہ خیالات اور آراء اس وقت نہایت منتشر ہیں اور طلب مال وطلب جاہ کا بہت چرچا اس وقت ہورہا ہے جس کو دیکھئے اس میں منہمک ہے نیز ان کیلئے کچھ تدابیر بھی اپنی طرف سے تراش رکھی ہیں اور ان میں یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ کونسی تدبیر حلال ہے اور کونسی تدبیر حرام ہے۔ بکثرت خیال ادھر متوجہ ہیں کہ اصل چیز مال اور جاہ ہے اور اسی کو ترقی کہا جاتا ہے اور اسی کے لئے سعی کی جاتی ہے خواہ وہ سعی شریعت کے موافق ہو یا مخالف۔ چنانچہ ذرائع تحصیل مال وہ ہیں جن کی بدولت شریعت سے بعد ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ تعلیم جدید کمال کے ساتھ حاصل کرنا چاہیئے اور اس میں بڑے بڑے درجے حاصل کرنے چاہئیں گو اس پر کیسے ہی آثار و مفاسد مرتب ہوں آجکل تعلیم جدید کے متعلق علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تعلیم جدید سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں۔ حالانکہ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہورہے ہیں تو علماء ہرگز اس سے منع نہ کرتے لیکن اب دیکھ لیجئے کہ کیا حالت ہورہی ہے جس قدر جدید تعلیم یافتہ ہیں باستثناء شاذ و نادر ان کو نہ نماز سے غرض ہے نہ روزے سے نہ شریعت کے کسی دوسرے حکم سے بلکہ ہر ہر بات میں شریعت کے خلاف ہی چلتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس سے اسلام کی ترقی ہوتی ہے۔ صاحبو! موٹی بات ہے کہ جب ان میں اسلام کی کوئی بات نہ رہی تو وہ اسلام کی ترقی کہاں ہوئی۔ البتہ مال و جاہ کی ترقی ہوئی سو اسلام روپیہ اور جاہ کو تو نہیں کہتے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کو محتاج تفسیر نہیں چھوڑا اور خدا تعالیٰ نے بھی اس کی تفسیر کا خاص اہتمام فرمایا اور عجب نہیں کہ اسی زمانہ کے لئے اہتمام کیا ہو بیان اس کا یہ ہے کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہیبت سے بہت سی باتیں نہیں پوچھ سکتے تھے تو خدا تعالیٰ نے ایکبار جبرئیل

علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بشکل انسان بھیجا وہ ایک مجلس عام کے وقت تشریف لائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوسروں کے سنانے کو چند سوال کئے چنانچہ ان سوالوں میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ مَاالْاِسْلَامُ یعنی اسلام کیا چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءَ الزَّکٰوۃِ وَصَوْمَ رَمَضَانَ وَاَنْ تَحُجَّ الْبَیْتَ۔ الحدیث شہادتوں کا اقرار کرو دل سے بھی اور زبان سے بھی ظاہر ہوا اور نماز وزکوٰۃ وصوم وحج کا ادا کرنا پس جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر سے اسلام کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اسلام کی ترقی تو یہ ہوگی کہ ان احکام کے امتثال میں ترقی ہو نماز میں ترقی ہو روزے میں ہو۔ نہ یہ کہ ٹم ٹم ہو اور عالیشان محل ہو یعنی اس کو اسلام کی ترقی نہ کہا جائے گا۔ غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی تفسیر فرما چکے ہیں تو آج کون ہے کہ وہ بڑے بڑے عہدوں کو اور مال وجاہ کی ترقی کو اسلام کی ترقی بتلائے مسلمان اگر اپنی حالت دینیہ پر بھی پورے قائم رہتے تب بھی ان چیزوں کو اسلام کی ترقی نہ کہتے البتہ ترقی اہل الاسلام کہتے مگر جبکہ وہ دین پر بھی باقی نہیں ہیں تو اس حالت میں یہ ترقی مال لاہل الاسلام نہ ہوئی بلکہ ترقی مال لاہل الکفر ہوئی۔ یعنی جب نماز و روزہ عقائد اسلام سب رخصت ہوگئے تو اب اگر مال اور جاہ کی ترقی بھی ہوئی تو یہ اہلِ اسلام کی ترقی بھی نہ کہلائے گی بلکہ اہل کفر کی ترقی کہلائے گی غرض اس ترقی کو ایسا قبلہ توجہ بنا رکھا ہے کہ حلال وحرام کی بھی مطلق تمیز نہیں رہی چاہے سود سے حاصل ہو چاہے رشوت سے حاصل ہو چاہے شریعت کو بھی بالکل چھوڑنا پڑے مگر یہ فوت نہ ہو چنانچہ بعض نے تو تصریحاً یہ کہدیا کہ اس وقت حلال وحرام کے دیکھنے کا وقت نہیں ہے یہ وہ وقت ہے کہ جس طرح ہوسکے روپیہ سمیٹ لو۔ غور کیجئے جب

مسلمان ایسی رائے دینے لگے تو علماء کا کیا قصور ہے اگر وہ تعلیم جدید سے رکیں علیٰ ہذا ترقی جاہ کہ اُس میں بھی یہ تمیز نہیں رہی کہ ذریعہ اس کی تحصیل کا حلال ہے یا حرام اکثر ایسے ذرائع سے جاہ حاصل کی جاتی ہے جو کہ شریعت کے بالکل ہی خلاف ہیں اور پھر اس پر طرہ یہ کہ جاہ سے کام بھی ناپاک ہی لیا جاتا ہے کبھی اس کو آلۂ ظلم وستم بناتے ہیں اور اسی ظلم کو اپنی شان ریاست سمجھتے ہیں چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لَا رِیَاسَۃَ اِلَّا بِالسِّیَاسَۃِ (ریاست بغیر تدبیر کے نہیں آتی) ہے اور یہ جملہ فی نفسہٖ بالکل صحیح ہے لیکن سیاست کے معنے وہ نہیں ہیں جو کہ ان لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں یعنی ظلم کرنا بلکہ سیاست کے معنی ہیں اصلاح اور اصلاح کہتے ہیں احکام کے جاری کرنے کو جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا (زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت کرو) جس کی کافی تقریر ایک مستقل وعظ میں ایک مقام پر بیان کر دی گئی ہے غرض مال اور جاہ کو لوگوں نے مقصود بالذات کے درجے میں قبلۂ توجہ بنا لیا ہے اور یہ مرض بالکل عالمگیر ہوگیا ہے اسی لئے اس وقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی اور حق تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں حکموں پر دو ثمرے عجیب مرتب فرمائے ہیں جو اس وقت کے مقاصد کے نہایت مناسب ہیں یعنی یفسح جس کے معنے ہیں فراخی جو مناسب ہے ترقی مال و تنعم کے۔ دوسرا یرفع جو مناسب ہے ترقی جاہ کے گویا خدا تعالیٰ نے اس میں یہ فرما دیا ہے کہ اگر فراخی و رفعت ہو سکتی ہے تو اطاعت ہی سے ہو سکتی ہے اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ خلاف شریعت کرنے میں فراخی ہوگی اور شریعت پر عمل کرنے میں تو ناجائز عہدے متروک ہونگے حرام مال سے بچنا پڑے گا تو بس تو پانچ روپئے کے ملازم رہیں گے۔ پھر نہ پلیٹ

عہ یہ وعظ حصہ پنجم کا پہلا وعظ مسمّیٰ بہ ضرورۃ العلماء ہے جو کہ ۸ رجادی الآخر ۱۳۳۰ھ کو خورجہ میں ہوا تھا۔ ۱۲ منہ

فارم پر جا سکیں گے نہ بے ٹکٹ گاڑی میں بیٹھ سکیں گے تو کچھ عزت بھی نہ ملیگی گویا ساری عزت پلیٹ فارم پر جانے میں ہے تو خدا تعالیٰ اس کو فرماتے ہیں کہ ترتب فراخی کا محض اطاعت پر ہے اور چونکہ حاصل مال کا تنعم ہے اور وسعت مکانی بھی ایک تنعم ہے لہذا اگر ہم اس مضمون کو ذرا وسیع کر دیں تو مضائقہ نہیں ہے تو اب ہم یوں کہیں گے کہ تنعم یعنی ترقی مال اور رفعت یعنی ترقی جاہ دونوں اطاعت پر موقوف ہیں اگر یہ نہیں ہے تو نہ ترقی مال ہے اور نہ ترقی جاہ بلکہ ذلت ہے اور تنگی ہے چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۔ (جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی اور لائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن اندھا) اس میں حشر قیامت کے مقابلے میں معیشت ضنک فرمانا دلیل اس کی ہے کہ یہ تنگی عیش قبل قیامت ہے اور قبل قیامت یا عالم برزخ ہے یا دنیا۔ سو آیت میں چونکہ کسی عالم کی تخصیص نہیں ہے اس لئے دونوں کے لئے عام کہا جائیگا برزخ کے ساتھ خاص نہیں ہوگا خاص کر جبکہ واقعات اس کی تصدیق بھی کرتے ہوں کہ معصیت سے دنیا میں بھی تنگی ہوتی ہے چنانچہ عنقریب مذکور ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اطاعت نہ کرنے کی صورت میں دو سزائیں ملیں گی ایک تو قیامت میں کہ اندھا اٹھایا جائے گا اور ایک دنیا اور برزخ میں کہ تنگی عیش میں وقت بسر ہوگا تو فراخی اور راحت کا ہونا اسی میں منحصر ہے کہ اطاعت ہو ورنہ برزخ کے علاوہ دنیا میں بھی تنگی ہوگی اس مقام پر یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو لوگ نافرمان ہیں وہ بڑے فراخی میں ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو آپ فراخی سمجھتے ہیں یہ سب ظاہری اور دیکھنے ہی کی حالت ہے ورنہ اگر حقیقت حال کو دیکھئے تو فی الواقع وہ نہایت تنگی ہے اسلئے فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا (اور تعجب نہ کران کے مال اور اولاد سے یہی چاہتا ہے اللہ کہ عذاب کرے

ان کو ان چیزوں سے دنیا میں) تو اطاعت نہ ہونے کی صورت میں یہ سب لفافہ ہے
اور حقیقت میں ایسے شخص کے قلب کے اندر بیحد پریشانی اور تنگی ہوتی
ہے اور کسی وقت اس کو چین نہیں ہوتا اس واسطے کہ واقعات کثرت سے
غیر اختیاری ہوتے ہیں اولاد ہے وہ بیمار بھی ہوتی ہے مرتی بھی ہے خود ان صاحب
مال پر بھی مقدمات ہو جاتے ہیں مال کی بھی چوری ہو جاتی ہے اس میں نقصان
بھی ہو جاتا ہے تکالیف بھی پیش آتی ہیں اور چونکہ تنعم کی زیادہ عادت ہو جاتی
ہے اور امور پیش آتے ہیں طبیعت کے خلاف اور کوئی چیز ان کو ہلکا کرنے
والی ہوتی نہیں اسلیئے ان کو بیحد تکلیف ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح
کرنے کے لئے میں ایک مثال عرض کرتا ہوں فرض کیجیے کہ دو آدمیوں کے
دو جوان لائق بیٹے مرگئے اور یہ دونوں شخص سب حالتوں میں مساوی ہیں
لیکن صرف فرق اتنا ہے کہ ایک ان میں سے مطیع خدا ہے اور دوسرا مطیع نہیں
بلکہ اسباب دنیا و غفلت میں منہمک ہے اب دیکھیے کہ بیٹے کے مرنے کا زیادہ
غم کس کو ہوگا اور زیادہ دنوں تک کس کو رہیگا ظاہر ہے کہ مطیع کو ہرگز زیادہ
غم نہ ہوگا کیونکہ وہ سمجھیگا کہ

ع ۔ ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

نیز وہ جانتا ہے کہ یہ تو آج ہی مرنے والا تھا ٹل نہ سکتا تھا۔ اور سمجھتا ہے
کہ قیامت میں بھی مجھے ثواب ملیگا اور اب بھی ثواب ملا تو ان خیالات کی
بدولت بہت جلد اس کو تسلی ہو جائے گی۔ برخلاف اُس غیر مطیع کے کہ اس کو
عمر بھر کڑھتے اور غم کرتے ہی گذر جائے گی کبھی خیال ہوگا کہ افسوس فلاں حکیم کے
بلانے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے بچہ مرا کبھی خیال ہوگا کہ اگر فلاں نسخہ پلایا جاتا
تو ضرور شفا ہو جاتی۔ غرض اس قسم کے توہمات کا سلسلہ عمر بھر کے لئے بندھ گیا
اور گویا ایک گھن لگ گیا۔ تو اس کے پاس ظاہری سامان اگرچہ سب کچھ ہو

عــہ یہ ہلکا کرنے والی چیز تعلق مع اللہ ہے آگے آتا ہے۔ ۱۲ منہ

لیکن وہ سامان اس کے لئے سرمایہ فراخی نہیں ہے کیونکہ اس کے قلب میں تنگی ہے جو کہ اور قلب پر ایک عذاب ہے اور اسی راز کے سبب آپ کسی منہمک فی الدنیا کو آرام میں نہ دیکھیں گے یوں کہ نافرمانی کر کے سکون قلب نصیب نہیں ہو سکتا البتہ اگر فرمانبردار ہے تو وہ چین میں ہوگا گو امیر بھی نہ ہو اور اگر امیر بھی ہو تب بھی اس کی راحت کا سبب اس کی ریاست نہ ہوگی بلکہ اطاعت ہوگی تو علت تامہ راحت کی اطاعت ہے اب وہ شبہ جاتا رہا اسی طرح عزت بھی اطاعت ہی سے ہوتی ہے لیکن اس بارے میں بھی لوگ بڑی غلطی میں ہیں کہ مخالفت کر کے رفعت چاہتے ہیں غرض مشاہدہ ہے کہ موافقت میں چاہے مال زیادہ نہ ہو لیکن مال کا جو ست ہے یعنی منفعت وکار دانی اور جاہ کا جو ست ہے یعنی حفظ مضرت کیونکہ مال تو جلب منفعت کیلئے ہوتا ہے اس کے ذریعے سے انسان کے کام بہت چلتے ہیں مثلاً مال سے کھانے پینے کی چیزیں خریدی جاتی ہیں تو اس کو منفعتیں حاصل ہوتی ہیں اور جاہ دفع مضرت کے لئے ہوتی ہے یعنی اس کا اثر اور اس کی غایت یہ دفع مضرت ہے کیونکہ عقلاء کے نزدیک عزت محض اس لئے حاصل کی جاتی ہے کہ اس کی بدولت بہت سی آفتوں سے محفوظ رہیں گے مثلاً اگر آبرودار نہ ہو تو جس کا جو جی چاہے بیگار میں پکڑ لے اور عزت دار آدمی کو کوئی ستاتا نہیں تو عزت کی روح حفاظت ہوئی مضرتوں سے پھر ان دونوں کی روح ہے راحت سو یہ اطاعت ہی سے میسر ہوتی ہے گو ظاہر سامان کچھ ہی ہو چنانچہ دیکھ لیجئے کہ یہ راحت خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والے کو حاصل ہے یا مخالف کو شرق سے غرب تک تلاش کر لیجئے خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ایک بھی راحت میں نہ ملیگا۔ اس کا پتہ واقعات میں غور کرنے سے چلتا ہے کہ مخالف ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے غرض مال وجاہ کی جو روح ہے وہ اطاعت ہی پر مرتب ہے سو دنیوی راحت کا ذریعہ بھی اطاعت ہی ہوا تو اس تقریر کے بعد ان طالبانِ جاہ

وہاں سے کہا جائیگا کہ ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

(مجھے ڈر ہے کہ اے اعرابی کہ تو کعبہ شریف تک نہ پہونچیگا اس وجہ سے کہ جو راستہ تونے اختیار کیا ہے وہ ترکستان کو جاتا ہے)

یعنی جس رستے سے تم راحت دنیوی حاصل کرنا چاہتے ہو اس کا وہ رستہ ہی نہیں اسی کو اس آیت میں تبلایا ہے کہ فراخی اور رفعت خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر موقوف ہے یہ ہی مسئلہ اس وقت مقصود بالبیان تھا اور بہ قدر ضرورت بحمداللہ اس کا بیان بھی ہو چکا اور اس کی بابت مسلمانوں کی غلطی رفع کردی گئی البتہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس آیت میں تو جنت کی فراخی مراد ہے اور ہمیں ضرورت ہے دُنیا کی فراخی کی اور اس کا ترتب اطاعت پر آیت سے ثابت نہیں ہوا تو جنت کے ادھار پر کہاں تک بیٹھے رہیں اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آیت میں کہیں جنت کا نام نہیں تو اگر ہم عموم پر دعویٰ کریں تو کون چیز مانع ہے بالخصوص جبکہ ہم مشاہدہ بھی کرا رہے ہیں جیسا کہ تقریر بالا سے معلوم ہوا۔ اور اگر فرض بھی کرلیں کہ یہ وعدہ جنت ہی کے لئے ہے تو جنت کے مقابلے میں دُنیا کیا چیز ہے جب جنت کی فراخی کا وعدہ ہوگیا تو دنیا کی کیا رغبت رہنا چاہیے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں تم کو ایک روپیہ دوں گا تو اس کو پھر پیسے کی کیا تمنا رہے گی۔ اب اس مثال کے بعد یہ دیکھئے کہ ان دونوں میں کیا نسبت ہے سو حدیث میں ہے دنیا بمقابلہ آخرت ایسی ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں ایک سوئی کے ناکے پر لگا ہوا قطرہ کہ اگر جزو لایتجزی ثابت ہو جاتے تو وہی ہو تو اس پانی کو سمندر کے ساتھ جو نسبت ہے وہی نسبت ہے دُنیا کو آخرت کے ساتھ تو اگر دنیا میں مال وجاہ نہ بھی حاصل ہوا اور اس آیت میں وہ نہ بھی مراد ہو تو کیا حرج ہے اور یہ بالکل اخیر درجے کی بات ہے ورنہ ہمارا دعوے یہ ہے کہ یہاں بھی فراخی ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ تمہاری تخصیص فی التفسیر مان لینے کے بعد

وہ اس آیت سے ثابت نہ ہوگا مگر ہم دوسری آیات سے ثابت کر دینگے چنانچہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اگر وہ لوگ ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کو کھول دیتے) دوسری آیت میں ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (اور اگر وہ توریت اور انجیل اور اس چیز کو جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھی قائم رکھتے تو اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور پیروں کے نیچے سے بھی) ان کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں تو اگر بعض آیات میں ایک عالم کی وسعت مراد ہو اور دوسری بعض میں دوسرے عالم کی وسعت تو جرم کیا ہے۔ اور یہ تمام تر گفتگو دنیا پرستوں کے مذاق کے موافق لے گئی ہے ورنہ اصل تو یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا کی طرف جس قدر رغبت اور طلب ہے نہ ہونا چاہیئے اس کا مطمع نظر آخرت ہی ہونا چاہیئے کیونکہ آخرت کی فراخی کے مقابلے میں دنیا کی فراخی اور آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کا عذاب کچھ بھی نہیں ہے حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص کو جو کہ عمر بھر نعمت میں رہا ہوگا دوزخ میں ایک غوطہ دیکر کہیں گے کہ هَلْ رَاَيْتَ نَعِيْمًا قَطُّ۔ یعنی کیا تم نے کبھی کوئی نعمت و آرام دیکھا ہے تو وہ کہیگا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا اور ایک شخص کو جو کہ عمر بھر تکلیف میں رہا ہوگا جنت میں داخل کر کے پوچھا جائیگا کہ تم کو کبھی تکلیف ہوئی ہے تو وہ کہیگا کہ کبھی نہیں۔ توضیح کے لئے اس کو ایک مثال میں پیش کرتا ہوں فرض کیجئے کہ ایک شخص نے حالت خواب میں یہ دیکھا کہ مجھے خوب پیٹا جا رہا ہے اور مجھے چاروں طرف سے سانپ بچھو ڈس رہے ہیں لیکن بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ تخت شاہی پر آرام کرتا ہے کوئی مور چھل جھل رہا ہے کوئی عطر لا رہا ہے کوئی پان لا رہا ہے چاروں طرف لوگ دست بستہ کھڑے ہیں تو کیا اس کے دل پر اس خواب کا کوئی اثر باقی رہے گا ہرگز نہیں بلکہ اگر وہ خواب از خود یاد بھی آویگا تو طبیعت اس کو

بہلا دیگی اور اس کے برعکس ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوں اور تمام لوگ میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں لوگ اپنی حاجتیں میرے سامنے پیش کرتے ہیں اور میں ان کو پورا کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ لیکن آنکھ جو کھلی تو دیکھا کہ ایک شخص سر پر جوتیاں مار رہا ہے اور بہت سے سانپ بدن کو لپیٹے ہوئے ہیں اور ایک کتا منہ میں موت رہا ہے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بیداری کی اس مصیبت کے بعد بھی خواب کی کسی قسم کی مسرت اس کے دل پر رہ سکتی ہے کبھی نہیں پس دُنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ خواب کی مثال بیداری کے مقابلے میں کسی نے خوب کہا ہے ؎

حال دُنیا را بپر سیدم من از فرزانۂ گفت یا خوابےست یا بادلیست یا افسانۂ
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے ببست گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانۂ

(میں نے ایک عقلمند سے دنیا کی حالت دریافت کی تو اُس نے تبلایا کہ یا تو وہ ایک خواب ہے یا ہوا ہے یا افسانہ ہے پھر میں نے اس شخص کے متعلق پوچھا جو دنیا میں پھنس گیا تو اس نے کہا کہ وہ کوئی جن ہے یا دیو ہے یا کوئی پاگل ہے۔)

تو واقعی دُنیا کی مثال خواب ہی کی سی ہے۔ اگر دُنیا میں عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے ساتھ ہی پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا۔ دُنیا کی حالت پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے تو مہمل سی لیکن منطبق خوب ہے۔ ایک شخص کی عادت تھی کہ روزانہ سوتے میں پیشاب کر لیا کرتا تھا اور اس کی بیوی اس کو دھوتی تھی ایک روز بیوی نے کہا کہ کمبخت میں تو پیشاب دھوتے دھوتے بھی پریشان ہو گئی آخر تجھ پر یہ کیا شامت سوار رہتی ہے کہنے لگا کہ میں روزانہ خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ چل تجھے سیر کرا لاؤں جب میں چلنے پر آمادہ ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ پہلے پیشاب تو کر لو میں سمجھتا ہوں کہ پیشاب خانہ میں پیشاب کر رہا ہوں حالانکہ وہ بستر ہوتا ہے۔

بیوی نے یہ خواب سنکر کہا کہ ہم لوگ غریب ہیں۔ شیطان تو جن کا بادشاہ ہے اس سے کہنا کہ ہم کو کہیں سے کچھ روپیہ لادے۔ چنانچہ شوہر نے کہنے کا وعدہ کیا رات کو جب سویا تو شیطان پھر خواب میں آیا اس نے شیطان سے کہا کہ یار ہم خالی خولی نہیں چلتے کہیں سے کچھ روپیہ دلواؤ۔ شیطان نے کہا کہ یہ کیا مشکل ہے تم میرے ساتھ چلو پھر جس قدر روپیہ کہوگے ملیگا اس نے ایک بادشاہ کے خزانے کے سامنے لیجا کر کھڑا کر دیا اور ایک گٹھری میں بہت سا روپیہ بھر کر اس کے کندھے پر رکھدیا اس میں اس قدر بوجھ تھا کہ مارے بوجھ کے اس کا پاخانہ نکل پڑا جب صبح ہوئی تو بستر پر پائے خانہ دھرا ہوا۔ پوچھا کہ یہ کیا ہوا۔ کہنے لگا کہ شیطان نے روپیوں کے اس قدر توڑے میرے کندھے پر رکھدیئے کہ بوجھ کے مارے پاخانہ خطا ہوگیا۔ وہ کہنے لگی میاں تم پیشاب ہی کر لیا کرو ہمیں روپیوں کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لئے ہگا تو نہ کرو۔ تو یہ حکایت ہے تو مہمل سی لیکن اگر غور کیجئے تو یہ ہماری حالت پر بالکل منطبق ہے کہ ہم بھی مثل اس شخص کے اِس وقت خواب میں ہیں اور بہت سے درہم و دینار کے توڑے اپنے سروں پر لادے ہوئے ہیں لیکن جس وقت آنکھ کھلیگی جس کو موت کہتے ہیں اس وقت معلوم ہوگا کہ وہ سب خیال تھا دلبس اور اس وقت ہم اپنے گناہوں کی نجاست میں لت پت ہوں گے۔ نہ روپیہ پیسہ ہمارے پاس ہوگا نہ کوئی یار و مددگار ہوگا۔ بالکل جریدہ و تنہا ہوں گے چنانچہ فرماتے ہیں وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ؕ اور تم ہمارے پاس آئے ایک ایک جیسے ہم نے بنائے تھے پہلی بار اور چھوڑ دیا جو ہم نے اسباب دیا تھا پیٹھ کے پیچھے) اور اگر بالفرض روپیہ ہوتا بھی تب بھی کچھ کام نہ آتا۔ چنانچہ دوسری آیت میں فرماتے ہیں وَلَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ

جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ یعنی قیامت کے دن اگر دُنیا ساری ایک شخص کو مل جائے اور وہ فدیہ میں دینا چاہے تو اس سے قبول نہ کی جائے گی۔ تو یہاں چند روز عیش کر کے اگر یہ انجام ہوا تو وہ عیش بھی کلفت ہے اور اگر یہاں چند روز تکلیف اُٹھا کر ابدالآباد کی نعمت حاصل ہوگئی تو یہ کلفت بھی راحت ہے۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر جب متصل تین دن تک فاقہ ہوتا تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو صبر نہیں ہوسکتا آپ فرماتے کہ ہمارے لئے جنت میں کھانے تیار ہو رہے ہیں ذرا صبر کرو انشاء اللہ اب بہت جلد اس نعمت سے مالا مال ہوں گے۔ اللہ اکبر۔ بیوی بھی ایسی شاکر صابر کہ جنت کے ادھار پر رضامند ہوکر خاموش ہو جاتیں۔ ایک اور بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کو ایک بادشاہ نے لکھا کہ آپ پر بہت تنگی ہے کھانے کی بھی کپڑے کی بھی بہتر ہو کہ آپ میرے پاس چلے آئیں اور یہاں رہیں آپ نے جواب میں ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

خوردن تو مرغِ مُسمّن ومے بہتر از و نانک جوین ما

(موٹے موٹے مرغ اور شراب کھانے پینے سے ہماری جو کی روٹی بہتر ہے)

پوشش تو اطلس و دیبا حریر بخیہ زدہ خرقۂ پشمین ما

(تمہارے لباس اطلسی اور ریشمی کپڑے ہیں اور ہماری پوشاک بخیہ کی ہوئی اُونی گدڑی)

نیک ہمیں ست کہ بس بگذرد راحتِ تو محنتِ دوشین ما

(بہتر یہ ہی ہے کہ تو بس دل میں بات رکھ (اس وجہ سے) کہ تیرا آرام ہمارے کندھے کا بوجھ)

باش کہ طبل قیامت زنند آں تو نیک آید و یا این ما

(ٹھہرو طبل قیامت میں جب بجیگا تو اُس وقت یا تو تمہارا بھلا ہوگا یا ہمارا)

واقعی وہاں جاکر نہ یہاں کا عیش رہیگا نہ مصیبت اور آخرت میں تو یہ گذشتہ

چیزیں کیا یاد رہتیں دنیا ہی میں دیکھ لیجئے کہ عمر گذشتہ پیش از خواب نہیں ہے۔ زمانہ گذرتا چلا جاتا ہے کہ جیسے برف کا ٹکڑا کہ پگھلنا شروع ہوا تو ختم ہی ہوکر رہا اسی واسطے حدیث شریف میں ہے کہ جب قیامت کے روز اہل مصیبت کو بڑے بڑے درجے عنایت ہونگے تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں مقراض سے کاٹی گئی ہوتیں لیکن آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے تو اس حالت پر نظر کرکے دیکھا جائے تو بے تامل یہ کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں کچھ نہ بھی ملتا تو کچھ بھی حرج نہ تھا۔ تو یہ اعتراض محض لغو ہے کہ یہ جنت کا وعدہ ہے۔

صاحبو! کیا جنت تھوڑی چیز ہے۔ ابھی چونکہ دیکھا نہیں اس واسطے جنت کی کچھ قدر نہیں ہے جب دیکھو گے تو حقیقت کھلیگی اور جنہوں نے ان چیزوں کو دل کی آنکھوں سے آج دیکھ لیا ہے ان کی وہی حالت ہے جو دیکھنے والے کی ہوتی ہے رہا یہ شبہ کہ جب ہوگا تب ہوگا اس وقت تو مصیبت میں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی غلطی ہے اللہ سے تعلق رکھنے والا کبھی مصیبت میں نہیں ہے بات یہ ہے کہ جس چیز کا نام آپ نے مصیبت رکھا ہے وہ مصیبت ہی نہیں ہے تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس طرح آرام کی ایک صورت اور ایک حقیقت ہوتی ہے اسی طرح مصیبت کی بھی ایک صورت اور ایک حقیقت ہوتی ہے دیکھو اگر ایک شخص کا محبوب مدت کا بچھڑا ہوا اچانک مل جائے اور اس عاشق کو بہت زور سے اپنی بغل میں دبائے حتی کہ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں تو بظاہر یہ نہایت تکلیف میں ہے لیکن قلب کی یہ حالت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اور دبائے تو اچھا ہے اور اگر محبوب کہے کہ تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں تو جواب میں کہیگا کہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی زبند شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیری قید سے رہائی نہیں چاہتا تمہارا شکار کسی صورت سے چھٹکارا نہیں حاصل کرنا چاہتا)

اور اگر وہ کہے کہ اگر تم کو دبانے سے تکلیف ہو تو تم کو چھوڑ کر تمہارے اس رقیب کو اسی طرح دباؤں تو کہیگا ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(خدا کرے یہ دشمن کا نصیب نہ ہو کہ وہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرتا ہے)

اور کہے گا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے   یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

حتیٰ کہ اگر اس کا دم بھی نکل جائے تو اس کے لئے عین راحت ہے حالانکہ بظاہر یہ نہایت ہی تکلیف میں ہے کہ اگر کسی اجنبی کو جس کو علاقۂ محبت معلوم نہ ہو اس کی خبر ہو تو وہ بہت ہی رحم کھائے اور محبوب سے سفارش کرے لیکن عاشق کو یہ رحم اور سفارش بے رحمی اور عداوت نظر آئیگی کیونکہ جانتا ہے کہ اس سفارش کا اثر یہ ہے کہ محبوب چھوڑ کر ابھی علحدہ ہوا جاتا ہے اسی طرح جن لوگوں کو خدا تعالےٰ سے تعلق ہوگیا ہے وہ آپ کی اس خیر خواہی کو کہ ہائے یہ اللہ والے بڑی مصیبت میں ہیں ان کو اس سے نکلنے کی تدبیر بتلائیں نہایت ناگوار سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے ایک حکایت سُنی ہے کہ ایک بزرگ چلے جاتے تھے رستے میں ایک شخص کو دیکھا کہ زمین پر پڑا ہوا ہے اور تمام بدن زخمی ہو رہا ہے غور کرکے دیکھا تو انوار اس شخص کو گھیرے ہوئے ہیں اور اہل اللہ میں سے ہیں ان کو بہت رحم آیا اور قریب جاکر ادب سے زخموں کی مکھیاں جھلنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ان کو افاقہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کون شخص ہے کہ میرے اور محبوب کے درمیان حائل ہو رہا ہے اور فرمایا کہ میری وہ حالت ہے کہ ؎

خوشا وقتے وخرم روزگارے کہ یارے برخورداز وصل یارے

(بہتر وقت وہ بہتر زمانہ ہے کہ ایک دوست اپنے دوست سے ملنے جارہا ہے)

تو محبت کا علاقہ ایسی چیز ہے کہ ناگوار بھی گوارا ہوتا ہے۔ ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی شخص کی محبت کے جرم میں اس کو چابک کی سزا دی جارہی تھی ننانوے چابکوں میں تو آہ نہیں کی لیکن اس کے بعد جو ایک چابک لگا ہے تو اس میں بہت زور سے آہ کی لوگوں نے سبب پوچھا کہنے لگا کہ ننانوے چابک تک تو محبوب بھی میرے سامنے کھڑا تھا مجھے یہ حظ تھا کہ محبوب میری حالت کو دیکھ رہا ہے اس میں تکلیف محسوس نہیں ہوئی اور اخیر کے چابک میں وہ جا چکا تھا اس لئے اس کی تکلیف محسوس ہوئی حق سبحانہٗ تعالےٰ اسی کو فرماتے ہیں وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اور تو ٹھہرا رہ اپنے رب کے حکم تک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال میں بھی یہ خاصیت ہے کہ کلفت مبدل بہ راحت ہو جاتی ہے اور عشاق نے بھی اس کی تمنا کی ہے ؎

بجرم عشق توام میکشند غوغائیست تونیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

(تیرے عشق میں لوگ مجھے مار رہے ہیں اور ایک ہنگامہ ہے تو بھی بر سر بام آ اس لئے کہ ایک بہترین تماشہ ہے)

یہ جو بر سر بام بلا رہا ہے محض اسی حظ و راحت کے لئے تو جب محبت میں یہ خاصہ ہے تو جن کو آپ تکلیف میں سمجھتے ہیں اور ان کے اس حالت کے برداشت پر تعجب کرتے ہیں اگر ان کو بھی اس تکلیف میں راحت ہوتی ہو تو کیا تعجب ہے حدیث شریف میں ہے ایک صحابی نماز میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ان کے ایک تیر آکر لگا لیکن قرآن پڑھنا ترک نہیں کیا آخر ایک دوسرے صحابی سوتے تھے جاگنے کے بعد انھوں نے اس حالت کو دیکھا اور بعد سلام ان سے پوچھا تو فرمانے لگے جی نہ چاہا کہ

تلاوت قرآن کو قطع کر دوں۔ غرض محبت ایسی چیز ہے لیکن چونکہ ہم نے محبت کا مزہ چکھا نہیں اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مصیبت میں ہیں اور واقع میں وہ مصیبت میں نہیں کیونکہ مصیبت نام ہے حقیقتِ مصیبت کا نہ کہ صورت مصیبت کا پس وہ شبہ بھی جاتا رہا کہ اللہ والے مصیبت میں ہیں اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ نافرمانی کے ساتھ راحت اور عزت نہیں اور اطاعت کے ساتھ تکلیف اور ذلت نہیں۔ پس اگر ہم عزت کے خواہاں ہیں تو اطاعت خداوندی کو اختیار کریں ہم نے جیسے اس کو چھوڑ دیا ہے اسی وقت سے ہماری راحت اور عزت بھی جاتی رہی ہے بحمدہٖ اس وقت یہی بیان کرنا تھا جو کافی مقدار میں بحمد اللہ بیان ہو چکا۔ اب میں اس آیت کے متعلق کچھ فوائد متفرقہ بیان کرتا ہوں جو کہ زیادہ تر اہل علم کو مفید ہیں۔ یعنی علاوہ مضمون مذکور کے اس آیت کے کچھ مدلولات اور بھی ہیں اور ان مدلولات میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مدلول یہ ہے کہ شریعت میں جیسے کہ عقائد اور معاملات وغیرہ مقصود ہیں اسی طرح حسنِ معاشرت بھی شریعت کا جزو ہے۔ چنانچہ تفسح فی المجالس وقیام وقت حاجت جو کہ معاشرت میں سے ہے آیت میں صاف مذکور اور مامور بہ ہے حاصل یہ ہے کہ اس وقت لوگوں نے اجزائے دین کو مختصر کیا ہے کسی نے تو صرف عقائد کو لیا کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس شخص نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا) کو لے کر نماز وغیرہ سب کو اڑا دیا ایسے لوگوں کا مقولہ ہے کہ سزا پاکر پٹ پٹاکر کسی وقت تو جنت میں ضرور چلے ہی جائیں گے تو ان لوگوں نے اعمال کو عملاً چھوڑ دیا۔ بعض ایسے ہیں کہ انھوں نے عقائد کے ساتھ اعمال کو بھی لیا لیکن اس میں سے معاملات کو عملاً خارج کر دیا یعنی نماز روزہ وغیرہ کا اہتمام

عہ باقی خون سے وضو اور نماز کا جاتا رہنا یہ ایک فقہی بحث ہے جو مختلف فیہ ہے اور قصہ کی توجیہ دونوں قول پر ہو سکتی ہے۔

تو ہے لیکن لین دین میں اس کی ذرا پرواہ نہیں کہ یہ جائز ہوا یا ناجائز ہوا نیز آمدنی کے ذرائع میں اس کا بالکل خیال نہیں۔ بعض وہ ہیں کہ انھوں نے معاملات کو بھی جزو شریعت قرار دیا لیکن اخلاقِ باطن کی درستی کو شریعت کا جزو نہ سمجھکر کچھ ضروری نہ سمجھا بہت ہی کم افراد ہیں کہ وہ اس کا بھی اہتمام کرتے ہوں۔ چنانچہ ایسے بھی لوگ ہیں کہ ان کو دوسرے کی اصلاح کرتے ہوئے مدتیں گذر جاتی ہیں لیکن خود ان کے اخلاق سے لوگوں کو عام طور سے تکلیف پہونچتی ہے اور ان کو اپنی حالت کی ذرا پرواہ نہیں ہوتی بلکہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم نے کیا حرکت کی۔ اور ایسے تو بہت ہی ہیں کہ اگر رستے میں کوئی غریب مسلمان ان کو مل جائے تو ابتداء بالسلام کبھی نہ کریں گے بلکہ خود اس کے سلام کے منتظر رہیں گے۔ بعض لوگ عقائد و اعمال و معاملات کے ساتھ اخلاق باطنہ کو بھی داخلِ شریعت سمجھتے ہیں اور اس کا علاج بھی کرتے ہیں لیکن انھوں نے معاشرت کو شریعت سے خارج کر رکھا ہے کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے آپس کے برتاؤ ہیں ان سے شریعت کو کیا غرض اگرچہ یہ ضروری ہے کہ یہ سب اجزاء مساوی نہیں ہیں تاہم واجب الرعایت سب ہیں تو اس قسم کے بہت سے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ دیندار بھی ہیں ان کے اخلاق بھی مثل تواضع وغیرہ درست ہیں لیکن معاشرت میں اکثر چھوٹی باتوں میں اس طرف التفات نہیں کہ ان سے دوسروں کو اذیت تو نہ پہونچے گی بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت زیادہ تکلیف پہونچ جاتی ہے لیکن اُس طرف التفات نہیں ہوتا حالانکہ حدیث شریف میں بکثرت وارد ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف بھی اسی قدر التفات اور ان کا بھی اتنا ہی اہتمام تھا جتنا کہ بڑی باتوں کا تھا۔ میں نے اس باب میں ایک رسالہ کی تالیف شروع کی ہے

اس کا نام آداب المعاشرت رکھا ہے اسی قسم کی بہت سی حدیثیں اس کے خطبے میں جمع کر دی ہیں آپ لوگ خدا تعالےٰ سے اس کے پورا ہونے کی دُعا کریں ان احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ شریعت اسلام ایسے امور کو ہرگز جائز نہیں رکھتی جن سے کسی کو ذرا بھی تکلیف یا کسی قسم کا بھی بار پہونچے۔ اس وقت یہ مرض ایسا عام ہوا ہے کہ جو لوگ اللہ اللہ کرنے والے اور ذاکر وشاغل بحق کہلاتے ہیں ان کو بھی اس کی پرواہ نہیں ہے اور انھوں نے بھی عملاً اس کو شریعت سے خارج کر رکھا ہے۔ میں نے یہی حالت دیکھ کر اپنے ذمے اس کو ضروری سمجھ لیا ہے کہ جو لوگ میرے پاس آئیں ان کو ذکر شغل میں لگنے سے زیادہ ان کے اخلاق اور معاشرت کی زیادہ توجہ کے ساتھ اصلاح کی جائے آداب معاشرت میں سے کسی جزو میں حتی الوسع کمی نہو۔ کیونکہ اس کی بڑی ضرورت ہے ہم لوگوں سے اس کی اصلاح بالکل ہی مفقود ہو گئی ہے اور جب تک اس کی تفصیل معلوم نہو میں اس کا ایک سہل معیار بتلائے دیتا ہوں کہ اس میں ذرا توجہ کرنے سے قریب قریب تمام آداب معاشرت خود بخود سمجھ میں آنے لگیں گے وہ معیار یہ ہے کہ جب کسی شخص کے ساتھ کوئی برتاؤ کرنا ہو گو وہ برتاؤ ادب وتعظیم ہی کا ہو اول یہ دیکھ لے کہ میرے ساتھ یہی برتاؤ ایسے شخص کی طرف سے کیا جائے کہ اس شخص کو میرے ساتھ وہ نسبت ہو جو مجھکو اس شخص سے ہے کیا جائے تو مجھ کو ناگوار اور گراں تو نہ ہو گا۔ جو جواب اپنے ذہن سے ملے اسی کے موافق دوسرے سے برتاؤ کرے۔ ایک مرتبہ میں پڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب میری پشت کی طرف آکر بیٹھ گئے میں نے ان کو منع کیا جب نہ مانے تو میں ان کی پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا گھبرا کر فوراً کھڑے ہو گئے میں نے کہا کہ جناب پشت کی طرف بیٹھنا اگر بُری بات ہے تب تو آپ باوجود منع کرنیکے

اس سے کیوں نہیں باز آئے۔ اور اگر اچھی بات ہے تو مجھے کیوں نہیں کرنے دیتے اور میں نے کہا کہ آپ اندازہ کیجئے کہ میرے پشت کی جانب بیٹھنے سے آپ کو کس قدر گرانی ہوئی اسی سے میری تکلیف کا بھی اندازہ کر لیجئے اور اگر بجائے میرے کوئی دوسرا بھی اسی طرح بیٹھ جائے تب بھی گرانی یقینی ہے گو میرے بیٹھنے اور اس کے بیٹھنے میں کچھ تفاوت ہو مگر ایذا رسانی کا تو کوئی جز و بھی بلا ضرورت جائز نہیں۔ خدا جانے لوگ پشت کی طرف بیٹھنے میں کیا مصلحت سمجھتے ہیں۔ آیا یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص بزرگ ہے ہماری عبادت اس کے اندر سے نکل کر جائے گی تو ضرور قبول ہو گی گویا کہ وہ خس کی ٹٹی ہیں کہ ہوا کی طرح سے ان میں سے عبادت چھنکر جائے گی بعض لوگ تو یہ غفلت کرتے ہیں کہ جن کو بزرگ سمجھتے ہیں ان کے پس پشت کھڑے ہو کر نماز شروع کر دیتے ہیں کہ اگر وہ کسی ضرورت سے اٹھنا چاہیں تو اٹھ ہی نہ سکیں صاحبو! یہ کیا ادب ہے کہ ایک شخص کو متقفل کر کے بٹھلا لیا فرض کیجئے کہ نماز کی نیت باندھنے کے ساتھ ہی ان بزرگ کو قضاء حاجت کی ضرورت ہو اور تقاضا بھی شدت سے ہو تو وہ کیا کریں یا تو نماز کے سامنے سے اٹھ کر جائیں یا ان کی چار رکعتیں پوری ہونے تک جبراً و قہراً بیٹھے رہیں علی ہذا بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بزرگوں کے پاؤں باوجود ممانعت کے پکڑتے ہیں اور ان کی تکلیف کی ذرا پرواہ نہیں کرتے اور اگر روکا جاتا ہے تو اس کے روکنے کو تصنع اور تکلف پر محمول کرتے ہیں اور باز نہیں آتے حالانکہ غور کرنا چاہیئے کہ جب ان کے روکنے کو تصنع پر محمول کیا تو ان کو متصنع سمجھا تو پھر وہ بزرگ ہی نہ ہوئے پھر پانوں کیوں پکڑتے ہو۔ مجھے ایک مرتبہ بنگالے کے سفر کا اتفاق ہوا وہاں جا کر اس رسم کا کچھ ایسا رواج پایا کہ شاید ہی کہیں ہو۔ جو شخص مجھ سے ملنے آتا مصافحہ کے بعد پیر بھی ضرور ہی پکڑتا۔

دو چار آدمیوں کو تو میں نے منع کیا لیکن جب دیکھا کہ کوئی نہیں مانتا تو میں نے یہ علاج کیا کہ جو شخص میرے پیر پکڑتا میں اس کے پیر پکڑ لیتا وہ لوگ گھبراتے تب میں کہتا کہ جناب پیر پکڑنا اگر اچھی بات ہے تو مجھے کیوں اجازت نہیں دی جاتی کہنے لگے آپ تو بزرگ ہیں میں نے کہا کہ میں بقسم کہتا ہوں کہ میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں تب لوگوں نے پیر پکڑنا چھوڑا تو میں کہتا ہوں کہ ایذا کے جو اسباب ظاہری ہیں ان کے واجب الترک ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں مگر جن کا نام آج کل کی اصطلاح میں تکریم ہے وہ بھی اگر موجب ایذا ہو جائیں ان کا ترک بھی لازم ہے میں نے اپنے بزرگوں کی خدمت اکثر اس لئے نہیں کی کہ شاید میری ناواقفی کے سبب اس خدمت سے ان کو تکلیف ہو یا اُن کے قلب میں میرا لحاظ اور اس کے سبب سے ان کو تکلیف اور گرانی ہو کیونکہ بعض کے قلب میں بعض کا کچھ ایسا لحاظ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح نکلتا ہی نہیں اگرچہ طبیعت کو کتنا بھی مجبور کیا جائے تو اگر ایسا شخص آکر بدن دبانے لگے یا پنکھا جھلنے لگے تو اس سے بجائے آرام کے تکلیف ہوتی ہے۔ اب لوگ اس کی مطلق پروا نہیں کرتے زبردستی بھی آکر چمٹ جاتے ہیں تو ان مواقع میں سمجھ سے کام لینا چاہیئے اور اگر اپنے کو اتنی سمجھ نہ ہو تو دوسرے کے کہنے کے بعد تو اصرار نہ کرے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جان فدا کرتے تھے فرماتے ہیں کہ چونکہ ہم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمارا تعظیم کے لئے اٹھنا پسند نہیں اس لئے ہم آپ کی تعظیم کو نہ اُٹھتے تھے مجھے اپنے ایام طالب علمی کا قصہ یاد ہے کہ جب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسے میں تشریف لاتے تو ہم سب لوگ ادب سے اُٹھ کھڑے ہوتے ایک روز مولانا نے فرمایا کہ مجکو اس سے تکلیف ہوتی ہے تم لوگ میرے آنے کے وقت مت اُٹھا کرو۔ اس روز سے ہم نے اٹھنا چھوڑ دیا۔ دل میں ولولہ پیدا ہوتا تھا لیکن یہ خیال ہوتا تھا کہ مقصود تو ان کو راحت پہنچانا ہے سو جس میں ان کو راحت ہو وہی کرنا مناسب ہے بعض لوگوں کو بزرگوں کے جوتے اٹھا کر چلنے پر اصرار ہوتا ہے تو فی نفسہ اس فعل کا تو مضائقہ نہیں

لیکن اگر کسی وقت منع کیا جائے تو فوراً رک جانا چاہیے کیونکہ اصرار میں تکلیف ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ تھانہ بھون کی جامع مسجد سے اُستاذی مولانا فتح محمد صاحب مرحوم جمعہ کی نماز پڑھ کر چلے وسط فرش تک پہونچے تھے کہ ایک شخص نے آکر ہاتھ سے جوتے لینا چاہے مولانا نے براہ تواضع انکار فرمایا لیکن اس نے نہ مانا آخر قیل وقال میں بہت دیر ہوگئی اور اس احمق کی بدولت مولانا کو طپش آفتاب میں کھڑا رہنا پڑا جب اس نے دیکھا کہ مولانا کسی طرح نہیں مانتے تو ایک ہاتھ سے مولانا کی کلائی پکڑلی اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا مارا اور جوتے لے لئے اور دوڑ کر کنارہ فرش پر رکھ آیا اور اپنی اس کامیابی پر بہت خوش ہوا میں نے جو یہ حرکت دیکھی، تو مجھے سخت ناگواری ہوئی اور اس شخص کو میں نے بہت ہی بُرا بھلا کہا اور میں نے کہا کہ ظالم تو نے جوتے لیکر چلنے کو تو ادب سمجھا لیکن اس بے تمیزی اور بے ادبی کا خیال تجھکو نہ ہوا کہ تو نے تپتے ہوئے فرش پر مولانا کو کھڑا کئے رکھا اور ہاتھ کو جھٹکا دیکر جوتا چھین لیا۔ آج کل لوگوں نے خدمت تعظیم کا نام رکھا ہے حالانکہ خدمت تعظیم کو نہیں کہتے۔ بلکہ خدمت راحت رسانی کو کہتے ہیں تو جو بزرگ تعظیم سے خوش نہ ہوں اور اس سے روکیں ان کی ایسی تعظیم مت کرو۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس بات سے کسی کو تکلیف ہو اس کو بالکل ترک کر دینا چاہیے اگرچہ وہ بصورت تعظیم ہی ہو۔ اور اگر بصورت تعظیم بھی نہ ہو تب تو ظاہر ہے کہ وہ بُری اور واجب الترک ہوگی مثلاً رات کو ایک شخص کی آنکھ کھلی اور استنجے کی ضرورت ہوئی اور اس نے بیٹھ کر زور زور سے ڈھیلے توڑنے شروع کر دیئے جس سے قریب کے سونے والوں کی نیند خراب ہوئی اور نیند خراب ہونے سے کسی کے سر میں درد ہوگیا کسی کی آنکھوں میں درد ہوگیا کسی کی نماز صبح قضا ہوگئی۔ تو یہ وہ باتیں ہیں کہ بظاہر نہایت چھوٹی اور معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کے آثار بہت مضر ہیں۔ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر ذکر جہر سے سونے والے کی نیند

میں خلل پڑتا ہو تو پکار کر ذکر کرنا حرام ہے۔ تو جب اللہ کا نام لینا بھی تکلیف پہونچا کر جائز نہیں تو دوسرے کام تو تکلیف پہونچا کر کیونکر جائز ہوں گے۔ نسائی شریف میں حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آرام فرماتے تھے کہ رات کو اُٹھنے کی ضرورت ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ قَامَ رُوَيْدًا یعنی نہایت آہستہ اُٹھے وَانْتَعَلَ رُوَيْدًا اور جوتے نہایت آہستہ سے پہنے وَفَتَحَ الْبَابَ رُوَيْدًا اور نہایت آہستہ سے دروازہ کھولا وَخَرَجَ رُوَيْدًا اور آہستہ سے باہر تشریف لے گئے۔ غرض کئی جگہ لفظ رُوَیدًا آیا ہے حدیث بہت بڑی ہے۔ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی چپکے سے اُٹھ پیچھے پیچھے ہولیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنۃ البقیع میں تشریف لے گئے پیچھے پیچھے حضرت عائشہ بھی رہیں جب آپ واپس ہونے لگے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جلدی سے آکر اپنے بستر پر لیٹ رہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشریف لاکر دیکھا کہ ان کا سانس پھول رہا ہے پوچھا مَا لَكِ يَا عَائِشَةُ حَشْيَا رَابِيَةً یعنی سانس کیوں پھول رہا ہے انھوں نے چھپانا چاہا لیکن چھپ نہ سکا تب انھوں نے اپنے پیچھے جانیکا تمام قصہ بیان کیا آپ نے فرمایا شاید تم کو خیال ہوا کہ میں تمہاری باری میں کسی دوسری بیوی کے پاس چلا جاؤں گا تو ایسا کب ہوسکتا ہے بڑی حدیث ہے۔ مجکو اس حدیث میں سے صرف بیان کرنا اس کا مقصود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ آپ کی شان وہ محبوبیت مطلقہ ہے کہ اگر آپ کسی کو تکلیف بھی پہونچائیں تب بھی راحت ہی ہو پھر خاص کر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ کہ عاشق زار تھیں تو اگر ان کی آنکھ کھل بھی جاتی تب بھی ناگواری کا احتمال نہ تھا۔ لیکن چونکہ صورت تکلیف کی تھی اسلئے آپ نے اس کو بھی گوارا نہیں فرمایا تو اتنے موانع کلفت کے ساتھ جب آپ نے اتنی رعایت فرمائی تو ہم کو کب اجازت ہے کہ کوئی ایسی حرکت کریں جس سے

دوسروں کو تکلیف کا احتمال ہو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ سفر میں جانے والے کو کچھ نہ کچھ فرمائش کر دیتے ہیں اس سے بعض اوقات اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ جب میں کانپور میں تھا تو دیکھتا تھا کہ جب کوئی شخص لکھنؤ جاتا تو لوگ فرمائش کر دیتے کہ وہاں سے فلاں ترکاری لیتے آنا۔ اور بعض اوقات اس مسافر کا جائے قیام سبزی منڈی سے اتنی دور ہوتا تھا کہ وہاں تک پہنچنے کے لئے کم ازکم ۲ر میں یکہ کرایہ ہوتا تو ۲ر کرایہ کے اپنے پاس سے صرف کر کے تب اس فرمائش کرنے والے کی چار پیسے کی فرمائش پوری کرو اور شرم کے مارے یکے کے پیسے مت مانگو اور ایسا نہ کرو تو عمر بھر کی شکایت خرید و۔ پھر بعض تو یہ غضب کرتے ہیں کہ فرمائش کر کے قیمت بھی نہیں دیتے۔ گویا وہ اپنے گھر سے خزانہ لے کر چلا ہے کہ اپنی اور دوسروں کی سب کی ضرورتیں پوری کر کے لائیگا بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جب کسی کو جاتے ہوئے دیکھا ایک دستی خط کسی کے نام دیدیا اس میں بھی اکثر اوقات بہت تکالیف ہوتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مرسل مطمئن ہو جاتا ہے کہ خط مکتوب الیہ کو پہونچ گیا مگر اتفاق سے خود وہ مسافر ہی کبھی درمیان ہی میں رہ جاتا ہے کبھی خط ضائع ہو جاتا ہے یہ تو خود مرسل کی مضرت ہے کبھی مکتوب الیہ کو تنگی ہوتی ہے کہ آرندہ تقاضا جواب کا کرتا ہے کہ میں ابھی جاؤنگا بعض اوقات تو فرصت نہیں ہوتی اور بعض اوقات جواب بے تحقیق لکھدیا جاتا ہے چنانچہ میرے پاس بعض دستی فتوے آتے ہیں اور لانے والا تقاضا کرتا ہے کہ میں ابھی واپس جاؤں گا آخر دوسرے کام کا حرج کر کے لکھنا پڑتا ہے اس میں بعض مرتبہ جلدی کی وجہ سے کسی پہلو سے نظر چوک جاتی ہے اور جواب میں غلطی ہو جاتی ہے۔ بعض مرتبہ جواب لکھنے کے لئے کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور عین وقت پر روایت نہیں ملتی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اسی طرح ایک شخص کو میں نے ایک مسئلہ فرائض کا جواب لکھ کر دیا جب وہ لے کر چلا گیا تب یاد آیا کہ جواب غلط لکھا گیا سخت تشویش ہوئی اس شخص کو تلاش کرایا تو نہ ملا

اور یہ پوچھا نہ تھا کہ کدھر جاؤ گے آخر خدا تعالےٰ سے دُعا کی کہ یا الٰہی میرے اختیار سے تو یہ خارج ہو چکا ہے اب آپ کے اختیار کی بات ہے خدا تعالےٰ نے یہ دُعا قبول فرمائی پندرہ منٹ نہ گذرے تھے کہ وہ شخص واپس آیا کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے مہر تو کی ہی نہیں مجھے بڑی مسرت ہوئی میں نے کہا کہ ہاں بھائی لے آؤ اس سے لے کر جواب کو صحیح کیا اور اس سے کہا کہ بھائی مُہر تو میرے پاس ہے نہیں اس وقت تو خدا تعالےٰ نے میری دُعاء قبول فرما کر تجھے واپس بھیجا ہے کیونکہ مسئلے میں ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس واقعے کے بعد سے میں نے عہد کر لیا کہ کبھی دستی فتوے کا جواب نہ دونگا اکثر لوگ ایسے امور پر مجھے بے مروت کہتے ہیں لیکن بتلائیے کہ ان واقعات پر کیونکر خاک ڈالدوں۔ اب میں نے یہ معمول کر رکھا ہے کہ جب کوئی شخص دستی فتویٰ لاتا ہے تو اس سے کہتا ہوں کہ اپنا پتہ لکھ کر اور دو پیسے کا ٹکٹ دیکر رکھ جاؤ میں اطمینان سے جواب لکھ کر تمہارے پاس ڈاک میں بھیجدوں گا۔ میرے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب تو کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جب ان کو کوئی دستی خط دیتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کو لفافے میں بند کر کے پورا پتہ اس پر لکھدو تاکہ پہونچانے میں سہولت ہو اس کے بعد دو پیسے کا ٹکٹ لگا کر اس کو ڈاکخانے میں چھوڑوا دیتے ہیں کہتے ہیں کہ دستی خط دینے کی زیادہ غرض یہی ہے کہ دو پیسے بچیں سو ہم اپنے پاس سے یہ دو پیسے صرف کر دیں گے مگر ان خلجانوں سے تو بچیں گے اور شاذ و نادر جہاں بے تکلفی ہو وہ موقع تو مستثنٰی ہے لیکن عام طور پر ایسا کرنا بڑی تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں نمونہ کے طور پر عرض کر دی ہیں مقصود یہ ہے کہ معاشرت ایسی ہونی چاہیئے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ پہونچے۔ اور معاشرت کا مسئلہ قرآن شریف میں کئی مقام پر مذکور ہے۔ چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا

بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ (اے لوگو! اپنے گھر کے علاوہ کسی غیر کے گھر میں مت داخل ہو) اور اس آیت کا بھی مدلول ہے جس کو شروع میں تلاوت کیا گیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا کہ اس میں معاشرت کے دو مسئلے بیان فرمائے گئے ہیں اور یہاں ایک علمی نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دو حکم یہاں مذکور ہیں اس میں اول کو ثانی پر کیوں مقدم فرمایا سو وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ ان میں دوسرا حکم اول سے اشد و اشق ہے کیونکہ تَفَسَّحُوْا میں تو مجلس سے نہیں اٹھنا پڑتا اور اُنْشُزُوْا میں مجلس ہی سے اٹھادیا ہے اسی لئے تَفَسَّحُوْا کو مقدم کیا تاکہ تعلیم اور عمل میں تدریجی ترقی ہو یعنی اول سہل پر عمل کرنے سے اطاعت کی عادت پڑے پھر اشد کا کرنا بھی آسان ہو اور عجب نہیں کہ حکم ثانی پر رفع درجات کا ترتب بھی اسی لئے ہوا ہو یعنی چونکہ اُنْشُزُوْا کا حکم نفس پر اس وجہ سے زیادہ شاق تھا کہ اس میں عار آتی ہے تو اس پر عمل کرنا غایت تواضع ہے اور تواضع کی جزا رفعت ہے اس لئے اس پر یہ رفع کو مرتب فرمایا پس آیت میں دونوں حکم میں عنوان کے اعتبار سے ایک تفاوت تو یہ ہوا کہ پہلے عمل کو فراخی پر مرتب فرمایا جو کہ عادۃً مال کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے اور مال کم درجہ کا مطلوب ہے اور دوسرے عمل پر رفع درجات کو مرتب فرمایا جو کہ جاہ کے ذریعے سے ہوتا ہے اور جاہ بہ نسبت مال کے اعلیٰ درجے کا مطلوب ہے سو یہ تفاوت تو اسی لئے ہوا کہ عمل اول نفس پر سہل تھا اس لئے جزاء بھی اس کی دوسرے درجے کی ہوئی اور عمل ثانی نہایت شاق تھا اس لئے جزاء بھی اعلیٰ درجے کی ہوئی تو عمل ثانی کے متعلق جو وعدہ ہے وہ گویا من تواضع اللہ رفعہ اللہ (جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کی اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند فرمادیں گے) کا ہم مضمون ہوا کہ غایت تواضع کی وجہ سے رفع درجات کا ثمرہ مرتب ہوا اور دوسرا تفاوت عنوان میں یہ ہے کہ ثمرہ اول میں لکم بتعمیم خطاب فرمایا اور ثمرۂ ثانی میں یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (اللہ تعالیٰ تم میں سے مومنوں اور اہل علم کے درجات کو

بلند فرما دیں گے یہ تخصیص بعد تعمیم فرمایا یعنی ثمرہ اول میں تمام مومنین کو درجہ مسافات میں خطاب عام ہے اور ثمرہ ثانی میں اہل علم کو تخصیص بعد تعمیم کے طور پر اہل ایمان میں سے خاص کرکے بھی خطاب فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ تفسح کوئی امر شاق نہ تھا اس میں بہت کم احتمال تھا نیت کے صاف اور خالص نہ ہونے کا تو اس کے امتثال میں سب مومنین قریب قریب یکساں ہونگے بخلاف و وسرے عمل کے کہ نفس پر بہت شاق ہے اس میں احتمال ہے کہ بعضے لوگ محض وضعداری سے اُٹھ کھڑے ہوں اور اس میں وہ مخلص نہوں اور خلوص میں زیادہ دخل ہے علم کو کیونکہ اس سے اس کے دقائق معلوم ہوتے ہیں اس لئے اس میں علم والوں کی تخصیص بعد تعمیم فرمائی کیونکہ اہل علم میں منشاء امتثال بدرجہ اول پایا جائے گا اس لئے وہ خلوص میں دوسرے مومنین سے زیادہ ہوں گے ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اصلاح معاشرت پر بھی آخرت کے ثمرے ملتے ہیں جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ احکام شرعیہ میں سے جس امر کو تم بالکل دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی تم کو اجر ملیگا وجہ دلالت ظاہر ہے کہ فسحت اور قیام پر جوکہ معاشرت میں سے ہیں اجر آخرت کا وعدہ فرمایا اس کے متعلق بعض اہلِ زیغ نے لکھا ہے کہ مولویوں نے شریعت کو طومار بنا دیا ہے کہ روٹی توڑنا بھی شریعت میں داخل۔ پانی پینا بھی شریعت میں داخل۔ اس پر مجھے ایک دردناک قصہ یاد آیا ایک شخص نے ایک کتاب شعب ایمانیہ میں لکھی ہے انھوں نے میرے پاس وہ کتاب اصلاح کے لئے بھیجی اور لکھا کہ میں نے یہ کتاب اپنے ایک عزیز کو بھی جو کہ وکالت کرتا ہے دکھلانے کے لئے بھیجی تھی اس نے لکھا کہ اگر یہ سب باتیں ایمان میں داخل ہیں تو ایمان (نعوذ باللہ) شیطان کی آنت ہوا۔ اور اس کفریہ کلمہ کو نقل کرکے سخت افسوس اور رنج کا اظہار کیا تھا۔ اور اس کے جواب میں اس مولف نے اس وکیل کو جو خط بھیجنے کا ارادہ کیا تھا وہ بھی میرے پاس اصلاح کے لئے بھیجدیا تھا میں نے

لکھا اختیار ہے۔ جواب بعید و لیکن یہ شخص بالکل مسخ ہو چکا ہے اس لئے نفع کی ہرگز امید نہیں۔ یہ مخاطبت سے رو براہ ہونے والا نہیں ہے اس کا اصلی جواب یہی ہے کہ اس کو خدا تعالیٰ کے حوالے کیا جائے اگر کمبخت کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ ایمان کے شعبے ہیں تو اس مضمون کو کسی مہذب پیرایہ میں لکھ سکتا تھا لیکن خبیث روح کی خباثت تہذیب کی کیسے اجازت دیتی اصل یہ ہے کہ جب تک علم یا اہل اللہ کی صحبت نہ ہو ایمان کا بھی بھروسہ نہیں ہے۔ دیکھئے جہل سے کیا کلمہ کفر کا بک دیا۔ کیوں صاحب تبلایئے۔ اگر اس شخص کی بھی تکفیر جائز نہیں تو اسلام میں کفر بھی داخل ہے لوگ کہتے ہیں کہ مولوی کافر بنا دیتے ہیں۔ صاحبو! انصاف شرط ہے یہ کافر بنانے کی نسبت تو مولویوں کی طرف اس وقت ہوسکتی تھی جب کہ وہ کسی کلمہ کفر یا عمل کفر کی تلقین کرتے اور جبکہ لوگ خود ہی اپنی جہالت اور خباثت سے کفر کرتے ہوں تو مولویوں نے کب بنایا یہ تو خود بنے البتہ مولوی اس کو بتا دیتے ہیں تو علماء لوگوں کو کافر بناتے نہیں بلکہ کافر بننے والوں کو کافر بتا دیتے ہیں پس ایک نقطہ کا فرق ہے۔ غرض اسی قسم کے لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ معاشرت دین کا جزو نہیں اور ان کے رد کے لئے یہ آیت بالکل کافی ہے دو طور پر ایک تو یہ کہ ان دونوں حکموں میں امر کا صیغہ آیا ہے جو کہ اصل میں وجوب کے لئے ہوتا ہے اور یہاں کوئی صارف اصل سے نہیں دوسرے اس طرح کہ اس پر ثواب کا وعدہ کیا اور ثواب ہوتا ہے دین کے کام پر پس اس میں اشارہ اس طرف ہوا کہ جس امر کو تم دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی اگر امتثال امر کرو گے تو اس پر بھی ثواب کا ثمرہ مرتب ہوگا اور اس سے اطاعت کی فضیلت بھی معلوم ہو گئی کہ اگر ادنیٰ امر میں بھی اطاعت ہو تب بھی ثمرے سے خالی نہیں۔ ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ قبول اعمال کے لئے ایمان شرط ہے کیونکہ بیان جزا میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ (جو لوگ تم میں سے

ایمان لاتے ہیں) فرمایا ہے اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ حکم اول میں تو لفظ لکم فرمایا ہے جو کہ عام ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں بھی ضمیر کُم سے مراد اہل ایمان ہیں کیونکہ اوپر سے خطاب مومنین ہی کو ہے لیکن چونکہ حکم ثانی میں تخصیص بعد تعمیم کرنا تھا جیسا کہ پہلے بیان ہوا اس لئے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا لفظوں میں آنا مناسب ہوا۔ نیز دوسری آیات سے بھی یہ اشتباہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ تو اس آیت سے اور دوسری آیات سے بھی ثابت ہے کہ بدون ایمان کے کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ اس مسئلے سے عوام الناس کے کام کی ایک بات ثابت ہوئی یعنی بعض عوام جو کہ بزرگوں سے ملنے کے شائق رہتے ہیں ان میں کچھ ایسی بے تمیزی ہوگئی ہے کہ تارک تعلقات ہندوں کو بھی بزرگ سمجھتے ہیں اور ان مسلمانوں کو بھی جو کہ شراب پیکر سکر کی حالت میں یا جنوں کے مرض میں بے تکی ہانکنے لگتے ہیں ان کو مجذوب سمجھتے ہیں اور ان لوگوں نے مجذوبوں کی ایک عجیب پہچان تراشی ہے کہ اگر اس کی پشت کی طرف کھڑے ہو کر درود پڑھا جائے تو وہ فوراً اُدھر منہ کرلے سو اول تو یہ خود اطلاع کی بھی دلیل نہیں ممکن ہے کہ اتفاقاً منہ کرلیا دوسرے زیادہ سے زیادہ اس کے صاحب کشف ہونے کی دلیل ہوگی اور صاحب کشف ہونا کوئی بڑا کمال نہیں اگر کافر بھی مجاہدہ دریاضت کرے تو اس کو کشف ہونے لگتا ہے نیز مجانین کو بھی کشف ہوتا ہے چنانچہ صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے۔ میں نے خود ایک مجنونہ کو دیکھا کہ اس کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا لیکن جب اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ ہی کشف بھی نکل گیا تو کشف بھی دلیل مجذوب ہونے کی نہیں۔ غرض عوام کو یہ معلوم ہونا نہایت دشوار ہے کہ یہ شخص مجذوب ہے اور بالفرض اگر وہ اس علامت سے مجذوب بھی ثابت ہوگئے تو تم نے مجذوب کو تلاش کرلیا اور حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مبارک کی بے ادبی کی کہ قصداً اس کی پشت کی طرف درود شریف پڑھا پھر یہ کہ اس کے مجذوب ہونے سے تم کو کیا فائدہ۔ مجذوب سے تو نہ دنیا کا فائدہ ہوتا ہے نہ دین کا دین کا تو اس لئے نہیں کہ وہ تعلیم پر موقوف ہے اور تعلیم اس سے حاصل نہیں ہوتی اور دنیا کا اسلئے نہیں کہ وہ دُعا سے ہوتا اور مجذوب دعا کرتے نہیں کیونکہ وہ لوگ اکثر صاحب کشف ہوتے ہیں ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں معاملے میں اس طرح ہوگا تو اس کے موافق دُعا کرنا تو تحصیل حاصل ہے اور خلاف دُعا کرنا تقدیر کا مقابلہ ہے البتہ وہ کشف کی بناء پر بطور پیشین گوئی کچھ کہدیتے ہیں کہ فلاں معاملے میں یوں ہوگا۔ سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اُسی طرح ہوتا اس طرح ہوجانا کچھ ان کے کہنے کے سبب نہیں ہوا۔ ہاں سالک سے ہر طرح کا نفع ہوتا ہے کیونکہ وہاں تعلیم بھی ہوتی ہے اور دُعا بھی بلکہ مجذوب کے فکر میں پڑنے سے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں حاصل یہ کہ غیر مؤمن کو مقبول سمجھنا بالکل قرآن کا معارضہ ہے لہٰذا جوگیوں اور جاہل فقیروں کے پیچھے پڑنا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے۔ ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اہل علم عام اہل ایمان سے افضل ہیں کیونکہ مقام مدح میں تخصیص بعد تعمیم بہ قاعدۂ بلاغت خود افضلیت خاص کی دلیل ہوتی ہے اور علماء کی افضلیت کی تفصیل کا یہ وقت نہیں اگر کوئی دوسرا موقع ملا تو انشاء اللہ تعالےٰ اس کو بیان کردیا جائیگا ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ عام اہل ایمان بھی اگرچہ وہ جاہل ہوں مقبول ہیں کیونکہ اہل علم سے قبل اہل ایمان کو بھی مقام فضل میں فرمایا ہے لہٰذا عام مومنین کو بھی حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا چاہیئے بس ہر صاحب ایمان اگر وہ مطیع ہو مقبول ہے اور مطیع کی قید اس لئے لگائی کہ فسحت اور رفع درجات کو جس سے کہ اہل ایمان کے فضل پر استدلال کیا گیا ہے اطاعت ہی پر مرتب کیا ہے کیونکہ تقدیر کلام یہ ہے تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ اِنْ تَتَفَسَّحُوا

يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا اِنْ تَنْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ لَكُمْ
د محلوں میں فراخی کردو اگر کردگے تو اللہ تعالے تمہارے لئے فراخی کریں گے اور جب تم سے کہا جائے
کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جاؤ اگر اُٹھو گے تو اللہ تعالے تمہارے مرتبے بلند فرمادینگے) مطلب یہ
ہے کہ جب ان دو امر میں امتثال ہوگا تو یہ مرتبہ ملیگا اور اس مدلول کے
بیان کرنے سے جیسے اہل علم کی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ عوام مؤمنین کو حقیر نہ
سمجھیں اسی طرح غیر اہل علم میں سے متکبرین کی بھی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ ان
کو بھی جلا ہے تیلیوں کو ذلیل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہاں مدار فضل مطلق ایمان
واطاعت خواہ کوئی قوم ہو۔ ایک مدلول اس آیت کا اور ہے جو کہ ذرا غور کرنے
سے معلوم ہوتا ہے یعنی فَانْشُزُوْا کے بعد جو ثمرہ مرتب کیا ہے تو ایک خاص عنوان
سے کیا ہے یعنی اس طرح فرمایا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
اور یوں نہیں فرمایا یَرْفَعْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ پس اس وضع مظہر موضع مضمر
میں اشارہ اس طرف ہوگیا کہ زیادہ دخل اس ترتیب رفعت میں ایمان کو ہے
پس اس سے یہ بات نکل آئی کہ اگر کوئی مؤمن پورا مطیع نہ ہو مگر مومن ہو تو
وہ بھی عند اللہ ایک گونہ رفعت سے خالی نہیں تو جو لوگ عاصی مومن ہیں ان کو
بھی ذلیل نہ سمجھو البتہ اگر خدا کے لئے ان پر ان کے سوء اعمال کے سبب غصہ کرو
تو جائز ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمدردی اور ترحم ہونا بھی ضروری ہے نفسانی
غیظ اور کبر نہ ہو اور ان میں فرق کے لئے میں ایک موٹی سی مثال بیان کرتا
ہوں جس کو میرے ایک دوست نے بہت پسند کیا اور ان ہی کی پسند سے
مجھے بھی اس کی بہت قدر ہوئی یعنی معمولی قصوں میں غصہ دو موقعوں پر آتا ہے
ایک تو اجنبی پر اور ایک اپنے بیٹے پر۔ سو اجنبی سے تو اس کی شرارت پر
نفرت اور عداوت ہو جاتی ہے اور اگر اپنا بیٹا وہی حرکت کرے تو اس سے
نفرت نہیں ہوتی بلکہ شفقت کے ساتھ تاسف ہوتا ہے اس کے لئے دُعاء
کرتا ہے دوسروں سے دُعاء کراتا ہے اس کی حالت پر دل کڑھتا ہے اور

غصہ جو ہوتا ہے تو اس کے ساتھ یہ شفقت ملی ہوتی ہے۔ پس اخوۃ اسلامیہ کا مقتضا یہ ہے کہ اجنبی عاصی کے ساتھ بھی بیٹے کا سا برتاؤ رکھنا چاہیئے یعنی اگر کبھی اس پر غصہ آئے اور خیال ہو کہ یہ غصہ خدا کے لیے ہے اس میں نفس کی آمیزش نہیں تو اس وقت دیکھنا چاہیئے کہ اگر میرا بیٹا اس حالت میں مبتلا ہوتا تو اس پر مجھے اسی قسم کا غصہ آتا یا نہیں اگر قلب سے نفی میں جواب آئے تو سمجھے کہ یہ غصہ خدا کے لئے نہیں ہے بلکہ ترفع کا غصہ ہے اور یہ اس شخص کی معصیت سے بھی بڑھکر معصیت ہے اور خوف کا مقام ہے۔ خدا تعالےٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر ایک گنہگار اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے تو وہ مغفور ہوجاتا ہے۔ اور اگر ایک مطیع اپنے کو بڑا سمجھتا ہے تو وہ مقہور ہوجاتا ہے سو نہ تو خدا پر ناز کرنا چاہیئے اور نہ نا امید ہونا چاہیئے۔ غرض تحقیر تو کسی مسلمان کی کرے نہیں لیکن غیظ و غضب جس کا منشا بغض فی اللہ اور رحم و ہمدردی ہو اس کا مضائقہ نہیں۔ باقی۔ کبر و عجب تو خدا تعالےٰ کو بہت ناپسند ہے۔ ہمارے ہاں ایک لڑکی تھی نماز روزے کی پابند (اب اس کا انتقال ہوگیا ہے) اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو کہ اس قدر پابند نہ تھا ایک روز کہتی ہے کہ اللہ کی شان میں ایسی پرہیزگار پارسا اور میرا نکاح ایسے شخص سے ہو۔ صاحبو! کتنی حماقت کی بات ہے کیونکہ اگر کوئی بزرگ بھی ہے تو ناز کس پر کرتا ہے۔ بزرگی پر ناز کرنے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ کوئی مریض طبیب کا نسخہ پیکر ناز کرنے لگے کہ ہم ایسے بزرگ ہیں کہ ہم نے دوا پی لی۔ کوئی اس سے پوچھے کہ اگر دوا پی لی

عہ خوب کہا ہے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان زہدرا ... در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ... ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

تو کس پر احسان کیا نہ پیتا مرض میں گھل گھل کر مرتا اسی طرح اگر کسی نے نماز پڑھی روزہ رکھا تو کس پر احسان کیا اور کیا کمال کیا نہ کرتا جہنم میں پڑتا البتہ بجائے ناز کے خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرمائی حاصل یہ کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ گنہگار بھی رفعت عند اللہ سے خالی نہیں۔ ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ میں تخصیص بعد تعمیم سے معلوم ہوا کہ قبول اعمال کا تفاوت خلوص سے ہوتا ہے کیونکہ اہل علم کے درجات میں امتیاز اس خلوص ہی کے سبب سے تو ہوا جیسا اوپر مذکور ہوا ہے اور اس مسئلے کو بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ آج کل لوگ اعمال کے تو شائق ہیں لیکن خلوص کی پروا اکثر نہیں ہوتی۔ حالانکہ خلوص وہ چیز ہے کہ اسی کی بدولت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ ان کا نصف مُد جَو خرچ کرنا اور ہمارا احد پہاڑ برابر سونا خرچ کرنا برابر نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ یہ صحبت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اُن کا خلوص بھی صحبت کی برکت سے ہے تو یہ دونوں متلازم ہیں اب خواہ صحبت کو سبب کہہ دیجئے خواہ خلوص کو بالکل وہ حالت ہے کہ ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
فَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(ہماری تعبیرات مختلف ہیں اور تیرا حُسن ایک ہے ساری تعبیریں اسی (ایک) جمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں)

کہ سب ایک ہی جمال کی تعبیریں ہیں۔ میں نے اپنے پیر و مرشد سے سنا ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی ایک لاکھ رکعت سے افضل ہے تو وجہ یہی ہے کہ اس کی ایک رکعت میں بوجہ معرفت کے خلوص زیادہ ہوگا۔ اور اسی مدلول پر ایک اور بات بھی متفرع ہوتی ہے یعنی آج کل

اکثر لوگ بعضے انگریزی خوانوں کی تعریف کیا کرتے ہیں کہ یہ اس قدر انگریزی پڑھے ہوئے ہیں لیکن قرآن کے بہت پابند ہیں یا نماز پنجوقتہ پڑھتے ہیں اور ان کی باطنی حالت خلوص وغیرہ پر بالکل نظر نہیں کی جاتی میں بھی مدتوں اس دھوکے میں مبتلا رہا مگر میرے ایک نوجوان دوست نے ایسے لوگوں کی نسبت کہا کہ بعض لوگوں میں دین کی صورت ہوتی ہے مگر دین کی حقیقت نہیں ہوتی یعنی ان کے دلوں میں دین رچا ہوا نہیں ہوتا اسی طرح اس قسم کے لوگوں میں دین کی کوئی عظمت اور محبت نہیں ہوتی گو ظاہری اعمال کے پابند ہوتے ہیں مگر امتحان کے وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی خاص حمیت و محبت دین کی نہیں اور جب یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں کیونکہ اصل دینداری یہی ہے کہ دل میں دین کی عظمت و محبت گھس گئی ہو اگرچہ شاذ و نادر کسی عارض کی وجہ سے اعمال میں کسی قدر کمی بھی ہو جائے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ٥ یعنی اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال پر خبردار ہیں۔ اس کو ہر جملے سے تعلق ہے کہ تم ہر حکم کی پابندی کرو اور اس میں کوتاہی نہ ہونے دو کیونکہ خدا تعالےٰ کو تمہارے باطن کی بھی خبر ہے تو خدا تعالےٰ کو اس کمی اور فرد گذاشت تک کی بھی اطلاع ہو جائیگی جو تمہاری نیتوں میں بھی ہوگی۔ گویا اس جملہ سے خدا تعالےٰ نے اپنے بندوں کو ایک مضمون کا مراقبہ سکھلایا ہے کہ اگر اس کو مستحضر رکھیں تو عمل میں کبھی کوتاہی نہ ہو۔ یعنی ہر وقت یہ خیال رکھیں کہ اللہ تعالےٰ میرے ظاہر و باطن کو دیکھ رہے ہیں اس کی مزاولت سے بعد چندے ایک حال پیدا ہوگا اور ذوقاً یہ سمجھیگا کہ گویا میں خدا تعالےٰ کو دیکھ رہا ہوں اور قرآن و حدیث میں اس قسم کے جتنے مضامین ہیں یہ سب مراقبات ہیں ان میں بتلا دیا ہے کہ اطاعت کی اصل اور راسخ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ یہ مراقبات مستحضر ہو جائیں کیونکہ جب یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے اس کام کی حاکم کو بھی اطلاع ہے

تو پھر اس میں کوتاہی نہیں ہوا کرتی۔ اور یہ نہایت سہل مراقبہ ہے اس میں فی نفسہٖ کسی شیخ کی کسی خلوت وغیرہ کی ضرورت نہیں ہر شخص اس سے منتفع ہوسکتا ہے لیکن اس وقت کچھ ایسے عوارض ہو گئے ہیں کہ ان کی وجہ سے عادت اللہ یوں جاری ہے کہ کسی قدر خلوت کی اور کسی کامل شیخ سے مشورے کی بھی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس وقت علوم اور اعمال میں ایک گونہ ضعف آگیا ہے توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر عمل میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو رائے کے درست ہونے کی اور دوسرے ہمت کی۔ ہم لوگوں میں دونوں کی کمی ہے۔ رائے کی کمی یہ کہ بسا اوقات بعض اعمال کے منشاء یا ناشی کے متعلق ہم ایک امر کو شر سمجھتے ہیں اور وہ خیر ہوتا ہے اور بسا اوقات کسی امر کو ہم خیر سمجھتے ہیں اور وہ شر ہوتا ہے علیٰ ہذا بعض اوقات باوجود درستی رائے کے کسی عمل میں ہمت اکثر ٹوٹ جاتی ہے پس شیخ چونکہ صاحب تجربہ وصاحب بصیرت ہوتا ہے اس سے رائے کی بھی مدد ملتی ہے اور اس کے کہنے میں کچھ برکت ہوتی ہے کہ اس سے ہمت بھی زیادہ ہوجاتی ہے اور اس کی رسم اصلی جو کچھ بھی ہو یہ ضرور قدرتی بات ہے کہ جب کسی کو شیخ بنالیا جاتا ہے تو اس کی مخالفت کم ہوتی ہے۔ تو رائے کے صحیح کرنے کا اور ہمت کے قوی کرنیکا عادۃً بجز شیخ بنانے کے اور کوئی ذریعہ نہیں پس بقاعدہ مقدمۃ الواجب واجب عمل کے لئے کسی شیخ کا دامن پکڑنا ضرور ہوگا۔ اور شیخ کامل ہونا چاہیئے اور اس کے پہچاننے میں اکثر غلطی ہوجاتی ہے لہٰذا اس کی پہچان معلوم کرنا ضروری ہے سو پہچان یہ ہے کہ علم دین بقدر ضرورت رکھتا ہو خواہ پڑھ کر یا علماء کی صحبت سے عمل میں مستقیم ہو۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر طالبین کو کرتا ہو۔ کسی مسلم شیخ سے تعلق رکھتا ہو۔ علماء سے نفور نہ ہو۔ ان سے استفادے میں عار نہ کرے۔ اس کی صحبت میں رغبت آخرت و نفرت عن الدنیا کی خاصیت ہو پس جس شخص میں یہ علامتیں ہوں وہ کامل ہے

اس سے ارتباط پیدا کرلے۔ یہ مضامین تھے جو اس وقت بیان کئے جانے ضروری سمجھے گئے۔

اب خدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ توفیق عمل عطا فرمائیں اور حسن خاتمہ آمین

تمت بالخیر ٭

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

نواں وعظ ملقب بہ :-

متاع الدنیا

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

نواں وعظ ملقب بہ

متاع الدنیا

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھکر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
تھانہ بھون مکان جناب منشی اکبر علی صاحب	شب ۱۷ ر شعبان سنہ ۱۳۳۰ ہجری	ایک گھنٹہ	کھڑے ہوکر	دنیا کو اپنا وطن اور قرارگاہ نہ سمجھنا چاہیے	سعید احمد تھانوی	تقریباً ۶۰	مستورات میں یہ وعظ ہوا تھا جسکا سبب یہ ہوا تھا کہ واعظ کی برادر زادی کی ایک بچی مر گئی تھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا

مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝ (اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کوچ کرو تو تم زمین کو سختی سے تھام لیتے ہو۔ کیا تمہیں آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پسند ہے سو آخرت کے حساب میں دنیا کی زندگی بالکل کم درجہ ہے) یہ ایک آیت ہے جس میں حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے دین کے ایک خاص کام میں سستی کرنے پر ملامت فرمائی ہے مگر اس وقت اس خاص ہی کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس ملامت کی جو بنا اور علت بیان فرمائی ہے جس کا ذکر اَرَضِیْتُمْ سے شروع ہوتا ہے اس کا بیان کرنا مقصود ہے تاکہ اس کے عموم سے مضمون بھی عام ہو جائے ہر عمل کی کوتاہی کو فرماتے ہیں تم جو دین کے کام میں سستی کرتے ہو کیا حیات دنیا پر راضی ہو گئے ہو اور یہ سستی جو تم میں آگئی ہے تو کیا آخرت کی ضرورت اور خیال تم کو نہیں رہا پھر فرماتے ہیں کہ آخرت کے مقابلے میں حیات دنیا کی متاع تو بالکل ہی قلیل ہے کچھ بھی نہیں اور باوجود اس کے تم پھر دنیا پر راضی ہو یعنی اس سے اتنی محبت ہے کہ اس کو اپنا قرار گاہ سمجھتے ہو اور اسی لئے اس دینی کام^ع سے گھبراتے ہو سو یہ تو ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس کی حیات پر راضی ہو جائے یہ ہے مضمون اس علت کا اور اسی کو بیان کرنا مقصود ہے اس کا حاصل اس کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں پر ملامت کر رہے ہیں جنھوں نے دُنیا پر قناعت کر لی ہے اور آخرت کو بھول گئے ہیں اور دنیا کو محبوب سمجھتے ہیں مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے آخرت کی وہ محبت اور اس کا اتنا شوق نہیں ہے چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ ہم یوں رہیں گے یوں بسیں گے بہو آئے گی جائداد ہو گی یوں ہم ملازم ہوں گے ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ اب انصاف سے دیکھ لو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوئی ہیں کہ مرجائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے یوں جنت ہو گی اس میں باغات اور مکانات ہوں گے یوں حوریں ہوں گی غالباً کبھی

ع لانہ سبب الفراق عن الدنیا زاھدًا ۱۲ منہ

بھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے۔ تو دُنیا کی جس قدر محبت ہے نہ آخرت کی وہ محبت ہے نہ وہاں جانے کا اتنا شوق اور اگر ہوتی تو جیسے یہاں کی زندگی کے متعلق دل میں خیالات پیدا ہوتے ہیں وہاں کی زندگی کے متعلق بھی تو ہوتے اور جیسے دنیاوی امور میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں اور یہاں کی خوشیوں میں کھپے رہتے ہیں ایسا ہی امور آخرت کے متعلق بھی تو کچھ ہوتا۔ سو بعض تو ایسے ہیں کہ وہ دنیا کی خوشیاں مناتے ہیں اور آخرت کی امنگ کبھی خواب میں بھی نہیں آتی اور بعض ایسے ہیں جن کے پاس دنیا میں خوشی کا کوئی سامان نہیں اور اس لئے وہ ہمیشہ غمزدہ رہتے ہیں اور ان کو کبھی خوشی نصیب نہیں ہوتی وہ شاید میرے جواب میں یوں کہیں کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو یہ سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی نہیں وارث نہیں یہ زندگی کیسے کٹے گی تو میں جواب میں کہوں گا کہ مجھکو ان کی یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کی زندگی کو بھی سوچا اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی دوزخ میں جانا پڑا تو وہ مصیبت کیونکر سہی جائے گی پھر جیسے یہاں کی تکلیف کو سوچکر تدبیر سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ مصیبت کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے مشکل آسان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کو بھی سوچا ہے حالانکہ دنیا کے مصائب تو بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کی کوئی تدبیر ہی نہیں ہے اور اس لئے اس کو سوچنا عبث ہے مگر پھر بھی سوچتے ہو اور آخرت کی تو کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں ہے جو لا علاج ہو بلکہ اس کی ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے مگر پھر بھی اس کا نہ ذکر نہ فکر اور اگر بعض ایسے لوگ ہوئے بھی کہ وہ کبھی علی سبیل التذکرہ آخرت کا ذکر کر دیتے ہوں اور اس لئے سمجھتے ہوں کہ ہم کو دین کی فکر ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے دیکھو اگر کسی کے پاس آٹا بھی ہو اور توا بھی ہو لکڑیاں بھی ہوں اور پکاتے نہیں مگر ان سب سامانوں کا ذکر کرتا رہے اور سوچتا رہے تو اس ذکر سے اور اس سوچنے سے کیا ہوتا ہے تدبیر تو یہ ہے کہ ہمت کر کے اٹھے اور پکانا شروع کر دے اور جب بھوک لگے کھالے تو آخرت کی فکر بھی یہ ہے کہ یوں سمجھے کہ میں مروں گا خدا کا سامنا ہوگا یوں عذاب ہوگا اور یہ سوچکر عذاب سے بچنے اور نجات

حاصل کرنے کے لئے تدابیر شروع کردے۔ شیطان نے بہت سے لوگوں کو بہکا رکھا ہے کہ گاہ گاہ ان کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ دل میں ڈالدیتا ہے کہ تم کو دین کی بہت فکر ہے۔ صاحبو! اگر تمہارے پاس سامان نہ ہوتا تو اتنا ہی غنیمت تھا لیکن جب خدا نے ارادہ یا ہمت دی بھلے بُرے کی پہچان دی پھر کیا وجہ کہ دنیا کے معاملات میں تو نری فکر پر بس نہیں کیا جاتا اور دین کے کام میں نری فکر کو کافی سمجھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں واقع میں آخرت کا خیال ہی نہیں ہے بہرحال اگر کوئی کہے کہ دنیا کی خوشیاں کیوں نہیں منائی جاتیں اور اگر کوئی دنیا کے غم میں رہتا ہے تو اس کی یہ شکایت ہے کہ آخرت کا غم کیوں نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی خوشی منانے والا کہے کہ آخرت کی خوشی کہاں سے منائیں اس کی ہمیں امید ہی کہاں ہے ہم تو گنہگار ہیں اور دنیا کی خوشی تو حاضر ہے اس کو کیسے نہ منائیں تو یہ شیطان کا دھوکہ ہے اس میں دو دعوے ہیں اور دونوں غلط ہیں یعنی اول بھی غلط کہ دنیا کی خوشی حاضر ہے دوسرا بھی غلط کہ آخرت کی خوشی کہاں ہے پہلا تو اس لئے غلط کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یوں بیٹا ہو گا یوں چین کریں گے تو یہ تمہارے قبضہ میں کہاں ہے ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ وہ سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے پھر اگر خوشی ہوتی بھی ہے تو تجربہ یہ ہے کہ تمنائیں ہمیشہ عدد میں حاصل سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں یعنی حاصل ہوتا ہے کم اور تمنا ہوتی ہے زیادہ تو جس کی تمنا جس قدر زیادہ ہوگی وہ ہمیشہ اسی قدر زیادہ غم میں رہے گا اللہ والے البتہ خوش رہتے ہیں اس لئے کہ وہ دنیا کی کچھ تمنا ہی نہیں کرتے اولاد ہوئی اس پر خوش ہیں نہ ہوئی اس پر خوش ہیں ہر حال میں راضی ہیں اور دنیا داروں کو خوشی کہاں واللہ راحت جس چیز کا نام ہے اگر وہ حاصل نہ ہوئی تو پھر اس کا جتنا سامان ہو گا زیادہ موجب تکلیف اور موجب حسرت ہو گا۔ لوگ روپے پیسے کو راحت سمجھتے ہیں حالانکہ راحت روپیہ پیسہ نہیں ہے ورنہ چاہیئے تھا کہ صندوق کو زیادہ لذت ہوتی مگر یہ لوگ صندوق سے بھی زیادہ بدتر ہیں کیونکہ اس کو ادراک الم کا تو نہیں ہے اور یہ لوگ تو آلام میں مبتلا رہیں تو معلوم ہوا کہ دنیا دار بہت ہی کم آرام میں رہیں غرض دنیا میں

کہیں خوشی نہیں ہے اور دوسری بات کہ آخرت میں کونسی خوشی ہے اس لئے غلط ہے کہ وہ بعدِ وعدہ الٰہیہ بالکل تمہارے اختیار میں ہے۔ چنانچہ دنیا کی خوشی تو کبھی کبھی حاصل بھی نہیں ہوتی کہ ساری عمر چاہو اور نہ ہو اور آخرت کی کوئی راحت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اختیاری نہ ہو خدا کی یہ رحمت ہے کہ آخرت کی کتنی ہی بڑی سے بڑی تمنا ہو مگر وہ باستثنا منصوص مثلاً درجات نبوت وغیرہ مباشرت اسباب سے ضرور پوری ہوتی ہے مثلاً اگر چھوٹے درجے کا آدمی جیسے عاصی گنہگار بڑے درجے میں جانا چاہے مثلاً حضرت جنید رحمۃ اللہ کے درجے میں تو جا سکتا ہے اس طرح سے کہ اپنے اعمال میں ترقی کرلے۔ تو بس وہاں تو خوشی ہی خوشی ہے جو بالکل اپنے اختیار میں ہے تو اس کی فکر کرو اور اس کی امنگیں پیدا کرو اور اس کی تدبیر کرو یعنی معصیت کو چھوڑ دو نمازیں پڑھو جواب تک چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا کرو زکوٰۃ دو اس کے بعد سب خوشی تمہارے ہی واسطے ہے اس کے بعد حق ہے کہ خوشی مناؤ اسی طرح اگر کوئی مصیبت زدہ کہے کہ یہاں کی مصیبت تو حاضر ہے اس لئے اس کا اہتمام ہے اور وہاں تو اللہ غفور رحیم ہے پھر کیوں غم کریں تو سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے غفور رحیم نے یہ وعدہ کہاں کیا ہے کہ خواہ تم کچھ ہی کرو میں تم کو جنت میں بلا عقوبت اول ہی بار داخل کر دوں گا غرض نہ آخرت کی نعمت کو کوئی سوچتا ہے نہ وہاں کی مصیبت کو جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دنیا کو گھر بنا رکھا ہے۔

اے مسلمانوں تمہارا وطن آخرت ہے مگر تم نے اپنے لئے دنیا کو وطن بنا رکھا ہے اور اپنے لئے اور اپنے ہر عزیز کے لئے دنیا ہی دنیا چاہتے ہو میری ایک خاندانی بزرگ بی بی نے مجھکو ایک بار یہ دعا دی تھی کہ اللہ کرے اس کا بھی دنیا میں ساجھا ہو گیسے گندے عنوان سے دعا کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب تو دین ہی دین ہے خدا کرے دنیا میں بھی پھنسے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دنیا ہی بڑی چیز تھی اس لئے یہ چاہا کہ ہمارے پیارے بھی اس میں پھنسیں اناللہ الخ کیسے غضب کی بات ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ سارے غم اس سے ہیں کہ دنیا کو گھر بنا رکھا ہے۔ ورنہ اگر اس کو گھر نہ سمجھے

تو کوئی بھی غم نہ ہوتا۔ دیکھو جب کسی سفر میں جاتے ہیں اور کسی سرائے میں قیام ہوتا ہے تو وہاں کی چارپائی میں کیسے کھٹمل ہوتے ہیں کبھی چارپائی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے مگر سوچتے ہو کہ ایک شب تو قیام ہی کرنا ہے جس طرح ہو گذار دو ایک شب کی تکلیف ہی کیا پھر تو گھر پہونچ جائیں گے غرض سرائے کی تکلیف اس لئے تکلیف نہیں معلوم ہوتی کہ اس کو گھر نہیں سمجھا یہی حال دنیا کی تکلیفوں کا ہے سو اگر آپ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تو اسی طرح اس کے ساتھ بھی برتاؤ ہوتا ہرگز اس کے متعلق ہر وقت تذکرہ نہ ہوتا نہ اس کا اس قدر سلسلہ گھسیٹتے بلکہ ہر بات میں زبان پر یہ ہوتا کہ ہمارا گھر آخرت ہے وہاں چین و آرام کرینگے یہاں کی ذراسی تکلیف کا کیا ہے حالانکہ ہم کو کبھی بھی یہ خیال نہیں ہوتا۔ خاص کر عورتیں کہ اگر کوئی غم آپڑ آجائے تو وہ حالت ہوتی ہے کہ گویا کبھی خدا تعالےٰ کی کوئی نعمت ہی ان پر نہیں ہوئی اور اس وقت ان کو بجز اس مصیبت کے تذکرہ کے کوئی کام کوئی قصہ نہیں ہوتا گویا یہی ان کا دین ہے یہی دنیا ہے اور کم و بیش مرد بھی اس میں مبتلا ہیں کہ ان کو بھی آخرت یاد نہیں رہتی ورنہ اگر آخرت یاد ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف سرائے کی دو روزہ تکلیف سے زیادہ نہیں ستا سکتی تھی۔ اور اپنے وطن اصلی کو یاد کر کے راحت ہو جایا کرتی خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت ہوتی مثلاً اس شخص کا کوئی پیارا بچہ مر جاتا تب بھی اس کو پریشانی نہ ہوتی اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً اگر کوئی سفر میں ہو اور اس کا کوئی بچہ گم ہو جائے اور اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا بچہ وہاں چلا گیا ہے جہاں میرا گھر ہے اور جہاں میں بھی جا رہا ہوں تو کیا وہ روتے پیٹیگا ہرگز نہیں بلکہ اس کو یہ سنکر اطمینان ہو جائے گا اور سمجھیگا کہ اب کوئی دن میں میں بھی اس سے جا کر مل لوں گا۔ تو اگر ہم آخرت کو اپنا وطن سمجھتے تو اولاد کے جاتے رہنے پر اتنا بڑا قصہ لیکر نہ بیٹھا کرتے۔ ہاں جدائی کا غم ہوتا ہے سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں اس کی اجازت ہے۔ لیکن جیسے جدائی کا غم ہوتا ہے تسلی بھی تو ہونی چاہئے کہ وہ اپنی راحت کی جگہ پہونچ گیا اپنے گھر پہونچ گیا

ہم بھی وہیں جائیں گے اور مل لیں گے خدا تعالیٰ نے یہی مضمون اس آیت کے دوسرے جملے میں سکھلایا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ یعنی جو چیز گئی وہ خدا کے پاس گئی اور ہم بھی خدا کے پاس جائیں گے اور سب کے سب وہیں جمع ہو جائیں گے تو اس کو سوچکر تسلی ہونی چاہیے تھی اگر آخرت کو گھر سمجھتے لیکن اب تو وہ مار دھاڑ ہوتی ہے کہ گویا خدا تعالیٰ نے ان کی جائداد چھین لی۔ غرض یہ ہے کہ یوں ہونا چاہیے تھا جیسے دنیا کی مثال میں سمجھا دیا مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس سے سمجھ میں آیا ہوگا کہ اولاد کے مرنے کا ایسا غم بھی اسی لئے ہوتا ہے کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں پس بڑی بھاری غلطی ہماری یہ ثابت ہوئی کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے اسی لئے یہاں سے جدا ہونیکا رنج و غم ہوتا ہے ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے خوشی بڑھتی جاتی ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں مرنے کے دن قریب آتے ہیں روح فنا ہوتی ہے۔ اور یہ حالت دنیا داروں ہی کی ہے کیونکہ وہ دنیا ہی کو اپنا گھر سمجھتے ہیں بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کو اس کا ذرا بھی غم نہیں ہوتا اور ان کو نہ اپنے مرنے کی پروا ہوتی ہے نہ اولاد کے مرنے کی پروا ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض دفعہ تو جہلا کو ان کے سنگدل ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ان سے زیادہ تو کوئی رحمدل ہی نہیں ہوتا مگر اس پریشانی نہ ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اس لئے ان کو اولاد کے مرنے کا غم اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ سرائے سے لڑکے کے گھر چلے جانے پر مسافر باپ کو ہوتا ہے کہ ایک گونہ مفارقت سے قلق ہوا بس زیادہ نہیں کیونکہ وہ آخرت کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں جس طرح عادت ہے کہ سفر سے واپس آتے ہوتے گھر کے قریب پہونچکر خوشیاں منائی جاتی ہیں چنانچہ اس خوشی کو ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　　راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(وہ دن بڑی خوشی کا دن ہوگا جس دن کہ میں اس ویران منزل سے کوچ کروں گا راحت جان تلاش کروں گا اور محبوب کی طرف جاؤں گا۔ میں نے نذر مانی ہے کہ اگر یہ غم کسی دن مجھے ہوگا تو میں میکدے کے دروازے تک اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب (قدس سرہٗ) کاندھلوی سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اب تو آپ بڈھے ہو گئے۔ آپ نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ الحمد للہ اب قریب وقت آیا مگر ان حکایات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو اعمال پر یا مقبول ہونے پر ناز ہوتا ہے اس لئے احتمال مواغذہ نہ ہونے سے خوش رہتے ہیں استغفر اللہ ناز کی مجال کس کو ہے بلکہ وہ خوشی صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں رہی یہ بات کہ ان کو دار وگیر کا اندیشہ ہوتا ہے یا نہیں تو سمجھو کہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے لیکن رحمت خداوندی سے امید بھی ہوتی ہے کہ انشاء اللہ تعالےٰ پھر چھوٹ جائیں گے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کا گھر ٹوٹا پھوٹا پڑا ہو اور سرائے نہایت پختہ ہو تو وہ اپنے گھر ہی کو پسند کریگا اور سوچیگا کہ اگرچہ اس وقت میرا گھر ٹوٹا پھوٹا ہے لیکن میں انشاء اللہ تعالےٰ پھر اس کو پختہ کر لونگا اسی طرح اگرچہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے مگر جانتے ہیں کہ ایمان کی سلامتی ہے تو ضرور رحمت ہوگی۔ غرض وطن سے طبعی محبت ہوتی ہے گو وہاں کچھ تکلیف بھی ہو تو کوئی یہ شبہ نہیں کرسکتا کہ ان کو ناز ہوتا ہے۔ غرض حقیقت واقعی یہ ہے جو مذکور ہوئی اس کو اگر کوئی سمجھ جائے تو ہزاروں غم کم ہو جائیں اور دنیا کی تمام ہوسیں فنا ہو جائیں۔ ہم جو دنیا میں چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہو جائے یہ ایسا ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ اور فانوس سب لگا دیئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے خاص کر جبکہ یہ بھی حکم ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام

نہیں کرسکیگا اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی تزئین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود القیام سرائے ہے کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑیگا اول تو سرائے میں اگر قیام اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہیئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہیئے بلکہ اس سے توحش اور ضیق رہنا چاہیئے اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِن (دنیا مؤمن کا قیدخانہ ہے) کے۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنے کیے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جیلخانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا کیونکہ بعض مومنین کو دنیا میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس لئے فرمایا کہ جیلخانے میں کبھی جی نہیں لگا کرتا اگرچہ کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے اگرچہ بہ ظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور وہ گھر نہیں ہے۔ پھر جب جی نہ لگیگا تو کیوں ہوسیں ہوں گی اور کیوں سوچیگا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو بلکہ اب یہ سوچیگا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح سے بھی دن گذر جائیں اور دنیا کے سوچ کے بجائے اب یہ ہوگا کہ آخرت کی سوچ ہوگی کہ اس کے لئے یہ سامان ہونا چاہیئے اور یہ فکر ہونا چاہیئے اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہیئے اور یہ سوچے کہ اگر یہ سامان ہوگیا تو پھر یوں بہار ہوگی اور یوں عیش ہوگا ورنہ یوں مصیبت ہوگی یوں پریشانی ہوگی اب غور کرکے دیکھ لو کہ کتنے آدمی ہیں جو یہ سوچتے ہیں میں تو کہتا ہوں کہ دنیادار تو الگ رہے دیندار وں کو بھی آخرت کے متعلق کبھی نہ اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے۔ خدا تعالیٰ صاف فرماتے ہیں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور چاہیئے کہ دیکھے نفس کہ اس نے کل کے لئے کیا بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو) دیکھو ایک دن کا سفر ہوتا ہے تو اس میں ناشتہ بھی ہمراہ لیا جاتا ہے اور سامان بھی ہوتا ہے آخرت کا اتنا بڑا سفر درپیش ہے اس کے لئے کیا زاد راہ تیار کر رکھا ہے بالخصوص جبکہ وہ وطن اور گھر بھی ہے کہ اس صورت میں تو اس کے لئے

بہت کچھ سامان کرنا چاہیئے تھا یعنی قطع سفر کے لئے زاد اور ناشتہ اور گھر پر بیٹھنے کے لئے کمائی اور ذخیرہ پس ایک اثر تو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیئے تھا۔ ایک دوسرا اثر اس کے گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیئے تھا کہ دنیا کے حوادث سے غم نہ ہوتا نہ اپنے واسطے اور نہ لگے سگے کے واسطے۔ گھر تو وہاں ہے۔ اب جو موت سے ہم کو موت آتی ہے یہ صرف اسی لئے کہ اس کو گھر نہیں سمجھتے بلکہ موت کے خیال سے ایسی حالت ہوتی ہے جیسے کسی کو جیلخانے میں لیجاتے ہوں۔ ہمارے حضرت (حاجی صاحب) رحمۃ اللہ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا کہنے لگا کہ میری بیوی مرتی ہے حضرت فرمانے لگے کہ اچھا ہوا جیلخانے سے چھوٹتی ہے اور پھر فرمایا کہ یہ کیوں غم کرتا ہے تو بھی چلا جاے گا کہنے لگا روٹی کون پکائیگا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا ماں کے پیٹ سے وہی روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی۔ تو موت کے متعلق اس تمام ترکرب ورنج کی وجہ یہی ہے کہ ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں ورنہ اگر وہ یاد ہوتی تو موت کا کیا غم ہوتا۔ اور ایک اثر آخرت کو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہیئے تھا کہ کسی سے عداوت اور رنج نہ ہوتا اگرچہ معمولی طور پر کسی بات میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی دیکھو ریل میں مسافروں میں لڑائی تو ہوتی ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ اپنے سفر کے سامان کو چھوڑ کر کسی سے الجھنے لگیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اس سے سفر کھوٹا ہوگا مگر اس طرح سے دنیا کے فضول قصوں میں بھی کسی نے سوچا ہے کہ ان میں پھنسنے سے آخرت کا سفر کھوٹا ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کو گھر نہیں سمجھتے۔ نیز اگر آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تو دنیا کے ساز و سامان پر اترایا نہ کرتے چنانچہ اگر سفر میں کہیں بیچ بند کسا ہوا پلنگ ملے تو کوئی بھی اس پر نہیں اتراتا کیونکہ جانتا ہے کہ یہ تو مانگی ہوئی چیز ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے پاس چار پیسے ہوں تو ہم ان پر اتراتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ہم دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ اور بہت سے دلائل اس کے ہیں کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے یہی بڑی خرابی ہے اور اسی سے آخرت کے کاموں میں سستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے یہ تو ہماری حالتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے آخرت کو اپنا گھر نہیں سمجھا۔ اب صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کو دیکھیے کہ انھوں نے کیسی کیسی سختی اٹھائی لیکن

ان کو کبھی ہراس نہیں ہوا اور ان سختیوں سے تو ان کو کیا اثر ہوتا جو سب سے بڑی سختی ہے موت وہ اس کے مشتاق رہتے تھے کہ کونسا وقت ہوگا کہ ہم یہاں سے چھوٹیں گے۔ وہ حضرات کماتے بھی تھے۔ لیکن لاچاری کو جیسے بڑی زبردستی سے کوئی کام کرتا ہے پس وہ حضرات آخرت کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور یہ اس کے آثار تھے۔ اور میں جو کہتا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا مت کماؤ دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جاؤ جیسے ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ گویا خدا تعالے سے کوئی واسطہ ہی ہم کو نہیں مثلاً جب کپڑا لے کر پسند کرنے بیٹھیں گے تو معلوم ہوگا کہ گویا ان کا یہی دین اور یہی ایمان ہے۔ جب زیور کے پیچھے پڑیں گے تو اس طرح کہ بس وہی دل میں بسا ہوگا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں دنیا کا کام کرنے سے منع نہیں کرتا مگر یہ کہتا ہوں کہ اس میں دل نہ لگاؤ۔ کام سب کرو مگر جی اترا ہوا ہونا چاہیئے۔ دل کا کھپا دنیا یہی زہر ہے یہ وہ بلا ہے کہ اس سے اندیشہ ہے کہ مرنے وقت یہی غالب نہ ہو جائے اور اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے اس وقت بالکل بے تعلقی نہ ہو جائے لہٰذا جہاں تک ہو اس کی کوشش کرو کہ دنیا میں دل لگا ہوا نہ ہو۔ دل کو خدا تعالے ہی میں لگاؤ ہاتھ سے کام کرو کچھ حرج نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں سب کام کر لیتے تھے لیکن جب اذان ہوتی تو یہ حالت ہوتی کہ قام کانہ لا یعرفنا (اس طرح کھڑے ہوتے جیسے کہ ہم کو پہچانتے ہی نہیں) اور ہم لوگوں کی اور بالخصوص عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر مثلاً سینے میں لگیں تو نہ نماز کی فکر ہے نہ روزے کی اسی طرح دنیا کے ہر کام میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دین کی کچھ خبر ہی نہیں۔ اور یہ دین کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ افسوس کیا دین ایسی بے فکری کی چیز ہے یہ معاملہ تو دنیا کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا خوب کہا ہے۔

غم دیں خور کہ غم غم دین ست ❊ ہمہ غمہا فرد تر از این ست

غم دنیا مخور کہ بیہودہ است ❊ ہیچ کس در جہاں نیاسودہ است

(دین کا غم کھا اس وجہ سے کہ غم (درحقیقت) دین کا غم ہے اور تمام غم اس سے کم تر ہیں

دنیا کا غم مت کھا اس وجہ سے کہ وہ بیہودہ غم ہے کوئی شخص بھی دنیا میں آرام سے نہیں رہتا

واقعی یہاں کا غم ہی کیا ؛ یہاں کے غم کی تو ایسی حالت ہے جیسے خواب کا غم سو خواب میں اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے اور اسی وقت آنکھ کھل جائے اور دیکھے کہ ایک نہایت عمدہ سج بند کسے ہوئے پلنگ پر آرام کر رہا ہے اور بہت بڑا محل ہے لوگ ادھر ادھر کھڑے جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں تو کیا اس شخص کے ذہن میں وہ خواب رہیگا ہرگز نہیں اسی طرح یہاں کی خوشی بھی خواب کی سی خوشی ہے چنانچہ اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوں اور آنکھ کھل جائے تو دیکھے کہ چاروں طرف پولیس کے سپاہی بیڑیاں لئے کھڑے ہیں اور اس کو جیلخانہ لیجانا چاہتے ہیں تو کیا اس خواب کی بادشاہت سے اس کو کچھ راحت پہونچے گی ہرگز نہیں۔ بس یہی حالت ہے دنیا کے غم اور دنیا کی خوشی کی کہ اگر خدا کے سامنے خوش گیا تو یہاں کے عمر بھر کے غم و رنج کچھ بھی نہیں ہیں اور اگر خدا کے سامنے غمزدہ گیا تو یہاں کی عمر بھر کی خوشی بھی خاک ہے مگر اب لوگ اس خواب و خیال کو حقیقی غم اور خوشی سمجھتے ہیں جس کی وجہ بس وہی ہے کہ جس کا بیان کر رہا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بس یہ بات نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان حضرات میں نہ تکبر تھا نہ شیخی تھی اور نہ وہ کسی مخلوق سے ڈرتے تھے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھے۔ ہر وقت وقتِ آخر کے منتظر تھے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تو بڑی شان ہے اولیاء اللہ کی یہی حالت ہوتی ہے۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس سرہٗ پر جب فقر و فاقہ ہوتا اور بیوی کئی کئی وقت کے بعد بہت پریشان ہوکر شکایت کرتیں تو آپ فرماتے کہ اب عنقریب ہم کو جنت میں ملنے والا ہے وہاں ہمارے لئے عمدہ عمدہ کھانے تیار ہو رہے ہیں وہ بھی ایسی نیکبخت تھیں کہ فوراً ہی مان جاتیں آجکل کی بیویاں نہ ہوئیں بعض تو اس وقت ایسی ہیں کہ عجب نہیں یوں کہتیں کہ بس وہ نعمتیں تم ہی

یہ تو مجھے تو یہاں لا دو جس سے پیٹ بھرے مگر ان بندئ خدا کی یہ حالت تھی کہ ان کے پاس زیور تو کیا ہوتا صرف ایک چاندی کا ہار تھا اور وہ بھی اس لئے رکھا تھا کہ مولانا رکن الدین یعنی صاحبزادے کے نکاح میں" اگر دو چار مہمان آگئے تو ان کو ایک دو وقت کھانا کھلاویں گے مگر حضرت شیخ کو وہ بھی ناگوار تھا اور ہمیشہ اس کے جدا کرنے کا تقاضا فرماتے اور وہ یہ عذر کرتیں۔ تو دیکھئے یہ نہیں کہا کہ آخر کچھ تو میرے ناک کان میں ہونا چاہیئے آخر عورت ہوں۔ سبحان اللہ وہ حضرات کیسے قانع اور صابر تھے۔ تو ان حضرات کی یہ حالت صرف اس لئے ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو ان کو غم بھی نہیں ہوتا کیونکہ غم خلاف امید ہونے سے ہوتا ہے تو جو شخص کسی چیز کے بارے میں یہ امید رکھے کہ یہ ہم سے جدا نہ ہوگی اس کو اس چیز کے جدا ہونے کا غم ہو گا۔ ورنہ کوئی بھی غم نہ ہونا چاہیئے ہاں طبعی رنج دوسری بات ہے میں پریشانی کے غم کی نفی کر رہا ہوں۔ یہ ہے فرق ان لوگوں میں جو دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ان میں جو دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے۔ اسی کو خدا تعالے فرماتے ہیں اَرَضِیتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ساری خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے اس کو دل سے نکالنا چاہیئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کو کثرت سے یاد کیا جاوے اس سے دنیا کی محبت دل سے نکل جائیگی اور آخرت کی نعمت کی محبت اور آخرت کے عذاب سے خوف یوں پیدا کرو کہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہم کو مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے پھر ایک دن ہمارا حساب ہو گا اگر اچھی حالت ہے تو بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی ورنہ سخت سخت عذاب ہوں گے اور نفس سے کہا کرو کہ لے نفس تو دنیا کو چھوڑنے والا ہے قبر میں تجھ سے سوال ہو گا اگر اچھے جواب

دے سکا تو ابدالآباد کا چین ہے ورنہ سدا کی تکلیف ہے پھر تجھے قیامت کو اُٹھنا ہے اور اس روز تمام نامہ اعمال اُڑائے جائیں گے تجھے پلصراط سے گذرنا ہوگا پھر آگے یا جنت ہے اور یا دوزخ ہے اس کو روزانہ سوچا کرو اس سے آخرت کے ساتھ تعلق ہوگا اور دنیا سے دل سرد ہو جائے گا اور موت کے مراقبے سے ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان ہو کہ اس سے تو وحشت ہوگی اور جی گھبرائے گا اس کا علاج یہ ہے کہ جب وحشت ہونے لگے تو خدا تعالےٰ کی رحمت کو یاد کیا کرو اور سوچا کرو کہ اس کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ ماں کو بھی اپنے بچے سے اتنی محبت نہیں ہے تو اس کے پاس جانے سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں اور اگر اس مراقبے کے بعد پھر کبھی دنیا کی طرف دل راغب ہو اور گناہ کو جی چاہے اور کوئی گناہ صادر ہو چکا ہو تو مراقبے کی تجدید کے ساتھ توبہ کرلیا کرو اور توبہ کا متمم یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا حق تمہارے ذمے ہو اس کو بہت جلدی ادا کر دو۔ اس سے انشاء اللہ تعالےٰ خدا تعالےٰ سب گناہوں کو معاف کر دے گا۔ پھر انشاء اللہ تعالےٰ تمہارے لئے آخرت کا دائمی عیش ہوگا۔ اور آخرت کا شوق پیدا ہونے لگے۔ میں نے ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے شوق وطن۔ اس کا مطالعہ بھی بہت مفید ہوگا حاصل سب کا یہ ہوا کہ دُنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے اور اس کا علاج موت کی یاد ہے اور اس سے توحش سے بچنے کے لئے خدا کی رحمت کو یاد کرنا علاج ہے اور اُن کے موکد کرنے کے لئے شوقِ وطن کا مطالعہ ہے اب میں ختم کرتا ہوں۔ اپنے مرض کی اطلاع سب کو ہوگئی ہے اس کو بہت جلد زائل کریں اور خدا تعالےٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمت عطا فرماویں آمین یارب العالمین

ــــــــــــــــ

ــہ شوق وطن۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تھانوی مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی نمبر ۱

حج اور عمرہ اور زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے ارادہ رکھنے والوں کو خوشخبری۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ نے بہترین کتابت اور بہترین کاغذ پر عکسی معلم الحجاج چھپوا دی جن خوش نصیب مسلمانوں کا ارادہ حج کا ہو وہ آج ہی سے اسکا مطالعہ کرنا شروع کر دیں تاکہ تمام مسائلِ حج اور دعائیں اور طریقے یاد ہو جائیں اور وقت پر حج ادا کرنے میں سہولت رہے اور کوئی غلطی نہ ہونے پائے اِس کتاب میں ہزاروں مسئلے اور بہت سی دعائیں اور طریقے سب درج ہیں۔ شروع میں ایک ضمیمہ یعنی حج کے پانچ دِن یعنی ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ ذی الحجہ تک حج کا مکمل طریقہ اور نیت اور طواف کے ساتوں چکروں کی دعائیں معہ ترجمہ کے ملتزم اور مقام ابراہیم پر پڑھنے کی دعائیں درج ہیں۔ حج کی فرضیت قرآن اور حدیث سے حج کی تاکید اور نہ کرنے والے کو وعید سفرِ حج کے آداب اور دعائیں جہاز کا سفر جہاز میں سمت قبلہ۔ کامران اور یلملم۔ جدہ حرم مکہ مکرمہ اور داخلہ میقات حرم شریف۔ احرام کا بیان۔ حج اور عمرہ کی نیت مسائل احرام۔ نمازِ احرام بیہوش اور مریض کا احرام نابالغ اور مجنون کا احرام عورت کا احرام خنثیٰ مشکل کا احرام ممنوعاتِ احرام مکہ مکرمہ میں داخلہ کی دعائیں طواف کی سات قسمیں اور مسائل۔ آبِ زمزم پینے کا طریقہ۔ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنیکا طریقہ اور دعائیں منیٰ سے عرفات کو جانا اور عرفات کی دعائیں اور مسائل غروب آفتاب کے بعد عرفات سے مزدلفہ کو جانا۔ مزدلفہ میں مغرب عشاء کی نماز جمع کرنا۔ پوری رات مزدلفہ میں ٹھیرنا بعد نمازِ فجر سورج نکلنے کے بعد منیٰ کو روانہ ہونا پھر منیٰ میں ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳ کو جمرات (تینوں شیطانوں) کو کنکریاں مارنا قربانی کرنا طوافِ زیارت کرنا۔ حج افراد۔ حج تمتع حج قران اور عمرہ۔ اور حج بدل کے جملہ مسائل اور طریقے اور دعائیں اگر خدا نہ کرے کوئی غلطی ہو جاوے تو اسکی جنایات دم کفارہ وغیرہ دینے کے مکمل طریقے اور مسائل سفر مدینہ منورہ۔ زیارت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے مسائل اور آداب اور دعائیں اور روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھنے کا طریقہ اور پورے سلام اور دعائیں اور مسائل قیام مدینہ منورہ میں کیا کیا کرے جنت البقیع۔ شہدائے احد اور تمام مساجد مقدسہ پھر واپسی کے وقت وداعی سلام غرضیکہ جسکے پاس یہ کتاب ہو پھر اسکو کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں ضرور اسکو ساتھ رکھیں قیمت مجلد ‎15/-‎ خرچہ ڈاک

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
رواہ البخاری

دعوات عبدیت جلد پنجم

کا

دسواں وعظ ملقب بہ

مضار المعصیۃ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی "دفتر الابقاء"

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

دعواتِ عبدیت جلد پنجم

کا

دسواں وعظ ملقب بہ

مضار المعصیۃ

اَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	مَاذَا	مَنْ ضَبَطَ	اَلْمُسْتَمِعُوْنَ	اَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھکر یا کھڑے ہوکر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون ر ر	۸ ارشعبان ۱۳۳۰ھ ہجری یوم جمعہ		بیٹھ کر ر ر ر	معصیت سے طاعت کی برکت کم ہو جاتی ہے	مولوی سعید احمد صاحب مرحوم	تقریباً ۱۵۰ آدمی	

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ فِیْ حَقِّ الصَّائِمِ مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ

وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے دار کے حق میں ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے قول باطل اور اُس پر عمل کرنا ترک نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ کو اُس کے بھوکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے)

یہ عبادت ایک حدیث کا جزو یاد پڑتا ہے یا یہ پوری حدیث ہو یا اس کے قریب لفظ ہوں بہر حال یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے روزے کے بارے میں اور ہر چند کہ رمضان سے قبل ایک اور جمعہ بھی آنے والا ہے مگر چونکہ وہ جمعہ غالباً سفر میں ہوگا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آج ہی رمضان کے متعلق کچھ مختصر بیان کر دیا جائے اور اتفاق سے اس کے ساتھ ہی ایک مضمون موعود بھی بیان ہوگا جس کا خیال بہت دنوں سے تھا مگر خدا تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ چونکہ وہ مضمون علمی مضمون ہے عوام کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا اس لئے ایک ایسے مضمون کے ساتھ جو کہ عام فہم بھی ہے اور دلچسپ بھی ہے بیان ہو جائے اور وہ مضمون یہ ہے کہ میں نے یہ بیان کیا تھا اور اجمالی دعوے کیا تھا کہ ہر چند کہ طاعات کا صحیح ہونا اس پر موقوف نہیں کہ گناہ کو بالکل چھوڑا جائے اور یہ بات نہیں کہ گناہ کے رہتے ہوئے طاعت صحیح نہ ہو لیکن طاعات کی برکت ضرور کم ہو جاتی ہے یعنی اگر کوئی نماز بھی پڑھتا ہو اور غیبت بھی کرتا ہو تو یہ نہ کہیں گے کہ غیبت کی وجہ سے نماز صحیح نہیں ہوئی جیسا بعض لوگوں کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ جب گناہ نہ چھوڑے تو طاعت ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی کہ اگر گناہ بھی کرے اور طاعت بھی تو دونوں کی جزا و سزا الگ الگ ہے دونوں ملے ہوئے نہیں ہیں اس لئے طاعت ہی کے ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے ورنہ ظاہراً اس مضمون کا بیان کرنا بھی لوگوں کی حالت کو دیکھ کر مناسب نہ تھا کیونکہ اگر وہ اعتقاد رہتا کہ گناہ کرنے سے طاعت صحیح نہ ہوگی تو شاید اس کی بدولت گناہ چھوڑنے کی کوشش کرتے اور اس سے بچ جاتے اور بیان کرنے میں اندیشہ ہے بے فکر ہو جانے کا لیکن مایوسی کی مضرت چونکہ بہت بڑی ہے یعنی اگر یہ خیال ہو گیا کہ

میری سب طاعات بیکار ہیں تو اس میں زیادہ مفسدہ ہے اور بے فکری میں ایسا زیادہ اندیشہ نہیں کیونکہ اس میں شعائر دین پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا اور مایوسی کی حالت میں نماز روزہ وغیرہ پر اثر پڑتا ہے کہ اس کو چھوڑ بیٹھے گا یہ تو عملی اثر ہے کہ اسلام کی رونق جاتی رہے گی اور اعتقادی اثر یہ ہوگا کہ رحمت خداوندی اور بخشش سے مایوسی ہوجائیگی کیونکہ گناہوں کی پوٹ ہر وقت نظر کے سامنے ہوگی اور نیکی کوئی بھی پیش نظر نہ ہوگی اس لیے شیطان مایوس کر دیگا اور ایسی مایوسی کی حالت میں اگر خاتمہ ہوگیا تو کفر پر خاتمہ ہوگا اور یہ شخص اپنے گناہوں سے توبہ بھی نہ کرے گا۔ کیونکہ بالکل نا اُمید ہو چکا ہے تو تلافی کی کوئی صورت نہ رہے گی چنانچہ بعض لوگوں کو یہ بات پیش آئی ہے الجواب الکافی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص سے مرتے وقت کہا گیا کہ کلمہ پڑھ لے مگر اُسنے کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہوگا۔ میرے گناہوں کی پوٹ اتنی ہے کہ ایک کلمہ اس کو میرے سر سے اتار نہیں سکتا آخر اس میں خاتمہ ہوگیا تو چونکہ اس اعتقاد کا یہ مفسدہ سخت تھا اس لئے اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اور میں سے ان واعظین کی غلطی بھی معلوم ہوگئی ہوگی جو بیحد متشدد ہیں اور اپنے تشدد کی وجہ سے صرف سخت مضامین سناتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سامعین کو بالکل ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کچھ کہا ہی نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ سختی کی بھی ایک حد ہونی چاہیئے۔ اس وقت قلوب علی العموم ضعیف ہیں ان کو اگر خوش کر کے اُبھارا جائے تو ان سے عمل دین کی زیادہ توقع ہے اور مایوس کر کے کوئی کام ان سے نہیں لیا جا سکتا اور اس لئے بھی ضروری ہے اس خیال کی تغلیط کر دیں کہ گناہ کرنے سے نیکی کا ثواب نہیں ملتا۔ اور ہر چند کہ یہ مضمون مستقل بیان کرنے کے قابل تھا مگر آج کے مضمون کے ساتھ مل جانا حُسنِ اتفاق ہے اور آج کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص روزے کے درمیان میں جھوٹ اور بُرے کام کو نہ چھوڑے تو خدا تعالےٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے یعنی جب کام گناہ کا اور بات گناہ کی نہ چھوڑے تو کیا فائدہ روزے کا ہوا۔ تو میرے اس بیان کے تین جزو ہوگئے ایک یہ کہ گناہ کرنے سے نیک کاموں کا ثواب ضائع نہیں ہوتا دوسرا دعوے اور

یہی مقصود تھا)، یہ کہ ہرچند کہ ثواب ملتا ہے مگر نیک کاموں کی برکت کم ہو جاتی ہے مثلاً غیبت کی اور پھر نماز بھی پڑھی تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ نماز کا ثواب نہیں ملا لیکن نماز کی برکت ضرور کم ہو جائے گی یعنی جو نورانیت غیبت کے ترک کی حالت میں نماز کے اندر ہوتی ہے وہ نورانیت اب ارتکاب غیبت کے وقت نہ ہو گی اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے غذا اگر قوی تندرست کھائے تب بھی نافع اور مقوی اور بدل مایتحلل ہو گی اور مریض کھائے تب بھی۔ لیکن تندرست کو زیادہ نافع ہو گی اور بیمار کو کم مثلاً اگر خمیرہ گاؤزبان عنبری کسی ایسے شخص کو کھلایا جائے جس کا معدہ خراب ہو اور ہنوز تنقیہ نہ ہوا ہو تو زیادہ مفید نہ ہو گا اگرچہ کم و بیش اثر ضرور ہو گا اور اگر تنقیہ کرانے کے بعد کھایا جائے تو بے حد مفید ہو گا تو گناہوں کو چھوڑنے کے بعد جو نیک کام ہوں گے ان میں زیادہ برکت ہو گی۔ تیسرا جزو بیان کا یہ ہے کہ جس کے متعلق حدیث پڑھی ہے اور مسئلہ جو کہ حدیث میں مصرح ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا نہ چھوڑے تو اس کو روزہ رکھنے سے فائدہ کیا ہوا حاصل یہ ہے کہ روزہ کے آداب ضروریہ میں سے یہ ہے کہ جیسے منہ کھانے پینے سے بند رکھتے ہیں اسی طرح دوسرے گناہوں کو بھی بالکل ترک کر دیں عجیب بات ہے کہ لوگ روزے میں کھانے پینے اور صحبت کے ترک کو ضروری سمجھتے ہیں اور گناہ کے ترک کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ وہ تینوں کام ایسے ہیں کہ دوسرے اوقات میں حلال بھی تھے اور رمضان میں بھی رات کے وقت جائز ہیں تو جب روزے کی وجہ سے بعض حلال کام بھی حرام ہو گئے تو جو اعمال ہر وقت حرام ہیں ان کا ترک روزے میں کیوں ضروری نہ ہو گا پس اگر کسی نے روزے میں غیبت کی اور بری نگاہ سے کسی کو دیکھا تو یہ تو نہ کہیں گے کہ اس کا روزہ نہیں ہوا مگر یہ کہیں گے کہ روزہ کی برکت جاتی رہی اور یہ مضمون دوسرے مسئلہ کی فرع بھی ہے اور دلیل بھی۔ اب صرف پہلے مسئلہ کی دلیل کی ضرورت رہی۔ تو پہلا مسئلہ یہ تھا کہ باوجود گناہ کے بھی نیک کاموں کا ثواب ملیگا۔ دلیل اس کی یہ آیت ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ

ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ط (جو شخص ایک ذرے کے برابر بھی کوئی بھلائی کرے گا اُس (کے فائدے) کو دیکھیگا اور جو شخص ایک ذرہ بھی برائی کرے گا وہ اُس کے سامنے آئے گی) لفظ من عام ہے مطیعین کو بھی اور عاصیین کو بھی تو توجب یہ فرمایا کہ جو شخص کرے گا تو اس کے عموم میں گنہگار اور فرمانبردار دونوں داخل ہو گئے۔ اس سے صاف طور سے معلوم ہوا کہ نیک کام کرنے پر ہر حالت میں ثواب ملیگا کسی وقت میں اس کا ثواب ضائع نہ ہو گا۔ اسی طرح دوسرے جملے میں بھی مَنْ عام ہے، اور اس سے ناز کا علاج بھی ہو گیا جیسے پہلے مَنْ سے مایوسی کا علاج ہو گیا تھا دوسرے مَن میں فرمانبردار بھی داخل ہونگے یعنی اگر کوئی بڑا ولی کامل بھی گناہ کرے تو اس کو بھی گناہ ہو گا۔ بعض لوگ اعتقاداً بعض حالاً یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ بھی کریں ہم کو گناہ نہیں ہوتا جن کا اس کا اعتقاد ہے وہ تو کفر میں مبتلا ہیں وہ اپنی مثال ایسی سمجھتے ہیں کہ جیسے ایک دریا ہو کہ اس میں اگر پیشاب کے قطرات گریں تو وہ دریا ناپاک نہیں ہوتا بلکہ وہ پیشاب ہی اس میں فنا ہو جاتا ہے ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ تم نے جو اپنے کو دریا سے تشبیہ دی یہ تشبیہ تمہاری تراشی ہوئی ہے یا قرآن و حدیث میں کہیں یہ تشبیہ ہے۔ اگر تراشی ہوئی ہے اور تمہارے نزدیک ٹھیک ہے تو یہ بھی کر دو کہ گورنمنٹ جس کی اب تک اطاعت کی ہے اب اس کی عملداری میں ڈکیتی ڈالو اور جب گرفتار ہو کر آؤ تو کہو کہ اب ہم دریا ہو گئے ہیں اگر اس عذر کو سُنکر سرکار چھوڑ دے تو خدا سے بھی امید رکھو اور جیسے خدا سے امید باندھے بیٹھے ہو کہ وہ ہم کو دریا سمجھ کر چھوڑ دے گا ایسے ہی ڈکیتی ڈالنے میں سرکار سے بھی اُمید رکھنی چاہیئے یہ سب نفس کی شرارتیں ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ واقع میں دریا تھے چنانچہ ارشاد ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (اللہ تعالےٰ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف فرمادینگے) آپ نے تو کبھی یہ دعوےٰ کیا ہی نہیں تو آج کس کا منہ ہے

کہ وہ اپنے کو دریا کہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقبولیت پر یہ فرماتے تھے کہ اِنِّیْ اَخْشَاکُمْ اللّٰہَ وَاَعْلَمُکُمْ بِاللّٰہِ (میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوں) تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا اور اس بناء پر کبھی کسی کا حق نہیں دبایا حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چبھودی تھی انہوں نے کہا کہ میں بدلہ لوں گا۔ آپ نے فوراً فرمایا کہ بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ اُن کے سامنے کردی انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا بدن تو کھلا تھا اور آپ تو کپڑا پہنے ہوئے ہیں آپ نے فوراً کرتہ اُٹھا دیا وہ صحابی آپ کے پہلوئے مبارک سے چمٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا تو یہ مقصود تھا۔ لوگوں نے جو وفات نامہ میں حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کی حکایت گھڑلی ہے وہ صحیح نہیں حکایت یہ ہے کہ جو میں نے اس وقت بیان کی ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں عورتوں میں رائج ہیں سب گھڑی ہوئی ہیں جیسے ساپن نامہ معجزۂ آل نبی۔ وفات نامہ۔ البتہ معجزہ ہرنی صحیح ہے اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں بالخصوص جن کا میں نے نام گنوایا ہے سب لغو ہیں اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ایک وہ مسدس ہے جس کا ٹیپ کا مصرع یہ ہے کہ ع: "مری بار کیوں دیر اتنی کری"۔ یہ مسدس بھی نہایت لغو ہے اس کو ہرگز نہ پڑھنا چاہیے اس ظالم نے ابتدا سے انتہا تک خدا تعالیٰ سے لڑائی کی ہے کہیں انبیاء کے نبوت مل جانے پر حسد ہے کہیں سلاطین کی بادشاہت پر رشک ہے اور پھر ہر حسد کے بعد یہ شکایت کہ مجھے کیوں نہیں ملا یہ کتاب ہرگز اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں یہ اس قابل ہے کہ ان کو بلا تامل آگ میں رکھدینا چاہیے۔ معجزہ آل نبی جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دیدیا اور اس نے بیچ ڈالا بالکل غلط اور لغو ہے۔ اسی طرح حضرت عکاشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکایت

مشہور ہے بالکل غلط ہے۔ اصل میں اس کی صرف یہ ہے جو منہ کو رہ ہوئی۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی کسی کا حق نہیں رکھا۔

اسی طرح حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کبھی اپنے کو اتنا بڑا نہیں سمجھا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اتفاقاً اگر کسی پر سختی ہو گئی ہو تو بدلہ نہ دیا ہو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام میں ایک لشکر کے سپہ سالار تھے وہاں کسی عیسائی بادشاہ کی تصویر کھڑی تھی بعض مسلمانوں نے جوش میں اس تصویر کی ایک آنکھ پھوڑ دی حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب خبر ہوئی تو آپ نے کہلا بھیجا کہ میں راضی ہوں کہ وہ لوگ اس تصویر کے بدلے میں میری ایک آنکھ پھوڑ ڈالیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا گیا کہ آپ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچ رہے اور فرما رہے ہیں ھٰذا اوردنی الموارد (اس نے مجھ کو مصیبت میں ڈالا) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا گیا کہ مشکیزے میں پانی لیکر محلہ میں بھرتے پھرتے ہیں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ایک شخص نے آکر تعریف کی تھی میں نے غور کر کے دیکھا کہ نفس اس سے خوش ہوا اس لئے اس کا علاج کر رہا ہوں۔ غور کیجئے ان دونوں صاحبوں نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تو دریا ہیں ہمیں سب معاف ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کرتا پہنا اور اس کی آستینیں تراش دیں پوچھا گیا تو فرمایا کہ جب میں نے اس کو پہنا تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوا اور طبیعت اس میں مشغول ہوئی اس لئے میں نے اس کی آستینیں پھاڑ دیں تاکہ یہ بدنما ہو جائے۔ اب یہ حالت ہے کہ اگر کہیں بخئے میں بھی کمی رہ جاتے تو درزی کے سر پر مارتے ہیں وہ حضرات اچھے کپڑے کو بھی خراب کر لیتے تھے۔ غرض یہ کہ کسی کا یہ خیال کہ ہم دریا ہو گئے ہیں اور ہمیں گناہ سے ضرر نہ ہوگا بالکل غلط خیال ہے۔ اس قسم کے لوگ اب بھی موجود ہیں اور پہلے بھی ہوئے ہیں چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ بعض لوگ اپنی نسبت یہ کہتے ہیں کہ نَحْنُ وَصَلْنَا فَلَا حَاجَةَ اِلَی الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمِ یعنی اب ہم پہونچ گئے اس لئے ہم کو نماز روزے وغیرہ کی ضرورت نہیں آپ نے جواب میں فرمایا کہ صَدَقُوْا فِی الْوُصُوْلِ وَلٰکِنْ اِلَی السَّقَرِ

رپہونچے ہیں تو وہ سچے ہیں لیکن جہنم میں پہونچے ہیں) اور فرمایا کہ اگر ہزار برس کی میری عمر ہو تو اخیر عمر میں بھی ایک وظیفہ بھی نہ چھوڑوں۔ غرض یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس آیت میں فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ خدا تعالےٰ اس کا ابطال فرماتے ہیں غرض اس جملے سے ناز اور دلال کی جڑ کاٹ دی ہے لیکن اس وقت مقصود پہلا جملہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر گنہگار بھی نیک کام کرے تو اس پر اجر ملیگا اور معصیت کا وبال معصیت پر اگر وہ معاف نہ ہو تو الگ ہوگا جیسے کوئی حاکم اپنے عہدے کے کام کو بھی انجام دے اور رشوت بھی لے تو اگر حکام بالا کو اطلاع ہوجاوے تو رشوت ستانی پر سزا ملیگی لیکن جس وقت تک عدالت کا کام کیا ہے اس وقت تک کی تنخواہ بھی ضرور ملے گی تو پہلا دعوے اس آیت سے ثابت ہو گیا رہا دوسرا دعوے کہ گو نفس عمل ضائع نہیں ہوا لیکن اس کی برکت اور نورانیت جاتی رہی اس کی دلیل کے متعلق میں پہلے بھی اشارہ کر آیا ہوں کہ یہی حدیث اس کی دلیل ہے اگرچہ اس کے سوا اور بھی دلائل ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر گناہ نہ چھوڑے تو خدا تعالےٰ کو کچھ ضرورت نہیں۔ اس پر تو سب کا اجماع ہے کہ گناہ کرنے سے روزہ باطل نہ ہوگا اور اس کی قضا کرنا نہ پڑے گی۔ تو معلوم ہوا کہ اس حدیث کے یہ معنے تو نہیں ہیں کہ روزہ نہ ہوگا کوئی اور معنی ہیں سو وہ یہی ہیں کہ خدا تعالےٰ کو زیادہ توجہ اس ترک طعام پر نہ ہوگی اور یہی حاصل ہے اس کہنے کا کہ روزے کی نورانیت کم ہو گئی اور یہ امر شاہد بھی ہے کہ اگر نیک کام کیا جاوے اور گناہوں سے بچتا نہ رہے تو اس وقت طاعت کی بدولت جو نور ہوگا وہ گناہوں کے ساتھ ہرگز نہ ہوگا اور وہ رونق اور شگفتگی اور مسرت جو کہ طاعت کے کرنے سے ہوتی ہے وہ نہ ہوگی بلکہ ایسا ہوگا جیسا کہ بہت لذیذ کھانا پکایا اور اس میں تھوڑی راکھ بھی جھونکدی تو راکھ جھونکنے کے بعد بھی وہ کھانا تو رہا لیکن کرکرا ہو گیا اسی طرح گنہگار آدمی نماز تو پڑھتا ہے لیکن طبیعت پھیکی پھیکی رہتی ہے وہ نشاط اور انبساط جو نماز سے ہوتا ہے وہ اسکو

نہیں ہوتا اگرچہ دلیل سے گھیر چیپ کر یہ سمجھے کہ ثواب ملیگا لیکن قلب بالکل کورا ہوتا ہے معلوم ہوا کہ اس قدر رہے۔ برکتی ہوتی ہے کہ جو ثواب ملتا ہے وہ نظر بھی نہیں آتا بلکہ گناہوں کے حجاب میں چھپ جاتا ہے اس کی ایسی مثال سمجھئے کہ جیسے کسی آئینے میں چراغ کو رکھ کر اوپر سے سیاہ کپڑا لپیٹ دو اس صورت میں چراغ کی روشنی تو باقی رہے گی لیکن اس قدر دھیمی ہو جائے گی کہ بعض اوقات رستہ بھی نظر نہ آئے گا البتہ بہت ہی کوئی دقیق النظر ہو ہو وہ دیکھ لیگا یا کوئی دیکھ کر تبلادے تو مان لیں گے باقی خود کچھ نظر نہ آئے گا۔ تو چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ثواب ملیگا اسلئے ہم مانیں گے کہ اندر روشنی ہے مگر اس قدر مٹی پڑی ہے کہ وہ بالکل نظر نہیں آتی یہ تو اجمالاً دعوےٰ تھا اور دلیل مگر دوسرے نصوص میں غور کرنے سے اس کی تفصیل کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اس تفصیل میں اُن شقوں کا کا ذکر ہوگا جو کہ اس میں مسکوت عنہ ہیں یعنی گناہ کو طاعات سے دو قسم کا علاقہ ہے بعض تو وہ گناہ ہیں کہ نصوص سے ثابت ہے کہ وہ طاعات کو حبط کر دیتے ہیں آسان لفظوں میں اس کا حاصل یہ ہے (یہ عنوان طلبہ کے لئے سہل ہے) کہ بعض گناہ تو ایسے ہیں کہ قبولیت طاعات کے لئے ان کا نہ ہونا شرط ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کو کوئی دخل نہیں ہے اور جن کو دخل ہے اُن کی دو قسمیں ہیں بعض کا نہ کرنا صحت کی شرط ہے اور بعض کا نہ ہونا بقا کی ؎ شرط ہے اول جیسے کفر کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی عمل نیک صحیح نہیں ہے اور نہ باقی رہتا ہے یعنی اگر کوئی کافر نماز پڑھے تو صحیح نہیں اور اگر کوئی نماز پڑھ کر کافر ہو جائے تو وہ نماز باقی نہ رہے گی۔ یہاں سے ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے جو کہ کلمات کفر کی پرواہ ہی نہیں کرتے چنانچہ دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کو جب روزہ رکھنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر کھانے کو نہ ہو اگر کسی کے منہ سے یہ کلمہ نکلیگا تو وہ کافر ہو گیا اور اس کو نکاح پھر کرنا چاہیئے

؎ بطور مانعۃ الخلو ۱۲ منہ

حج پھر کرنا چاہیئے پہلے سب عمل اس کے حبط ہو گئے جب تک اس سے توبہ نہ کرے تب تک اگر یہ کوئی نیک عمل آیندہ کو کرے گا تو وہ بھی مقبول نہ ہوگا۔ دوسرے علاوہ اسکے ایک اور عمل بھی ہے کہ نص قطعی سے ثابت ہوگیا ہے کہ اس کا اثر بھی مثل کفر ہی کے ہے یعنی اس سے بھی حبط عمل ہو جاتا ہے اور وہ عمل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہونچائی جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بے ادبی کی جائے اگرچہ بلا مقصد ہو مگر تلنت جہالات سے ہوا وراس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ معلوم ہوگا کہ آپ کتنے جلیل القدر ہیں۔ وہ نص قطعی یہ ہے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (اے ایمان والو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز بلند مت کرو اور نہ اُن سے اتنی زور سے بات چیت کرو جتنی زور سے تم آپس میں کرتے ہو (اس سے) تمہارے اعمال بیکار ہو جائیں گے اور تم کو احساس بھی نہ ہوگا) اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ بے ادبی سے حبط عمل ہوگا اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شریعت اسلامی نے سلیقہ اور ادب بھی سکھلایا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ شریعت میں سوائے نماز روزے کے اور رکھا کیا ہے واللہ العظیم لوگوں نے اسلام کی حقیقت دیکھی ہی نہیں اور جو کچھ دیکھا وہ ایسا ہے جیسا کہ کسی نے محبوب کا صرف ایک ناخن دیکھا ہو اور صورت چہرہ بالکل نہ دیکھا ہو۔ ایک بہت اچھی مثال یاد آئی اس سے ہماری حقیقت فہمی اور اصلی واقفیت کی پوری حقیقت کھل جاتے گی مشہور ہے کہ اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی آگیا تھا جب سنا تو اس کے دیکھنے کا شوق ہوا لیکن آنکھیں تو تھیں نہیں دیکھتے کیونکر آخر سب اکٹھے ہو کر پہونچے اور اس کے قریب جاکر سب نے ہاتھ سے چھو کر اسکو دیکھا کسی کا ہاتھ تو سونڈ پر پڑا کسی کا پیر پر پڑا کسی کے ہاتھ میں کان آگیا کسی نے دم پکڑ لی۔ دیکھ بھال کر آپس میں اس کی ہیئت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی ایک نے

کہا کہ ایسا تھا جیسا کھمبا ہوتا ہے دوسرے نے کہا نہیں، بلکہ جیسا سانپ تیسرے نے کہا نہیں بلکہ جیسے چھاج چوتھے نے کہا نہیں بلکہ جیسے مورچھل۔ مولانا رومی اس حکایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اگر کوئی بینا ہوتا تو کہتا کہ تم سب سچے ہو اور سب جھوٹے ہو سچے تو اس لئے کہ جس نے جو کچھ دیکھا وہی آکر بیان کر دیا۔ اور جھوٹے اس لئے کہ اصل حقیقت کی خبر ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی اس وقت مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے کہ انھوں نے اسلام کو عموماً پورا نہیں دیکھا سمجھتے ہیں کہ صرف وضو نماز ہی کا نام اسلام ہے وبس۔ میں ایک مقام پر گیا وہاں ایک اسکول بھی تھا اور اس میں دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی نصاب دینیات کو دیکھا تو اس میں صرف راہ نجات اور غضب یہ کہ اس کو کافی سمجھتے تھے میں نے کہا کہ صاحبو اگر راہ نجات تمام ضروریات دین کے لئے کافی ہے تو بتلائیے اگر ایک شخص کے پاس تیل ہو دوسرے کے پاس سرسوں ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بدلنا چاہیں تو اس کی کیا صورت ہوگی اور کیسے یہ بدلا جائے گا سنکر کہنے لگے کہ کیا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے افسوس ہے کہ معاملات کو اور معاشرت کو علی العموم لوگوں نے دین سے خارج سمجھ رکھا ہے لیکن تعجب ہے کہ قانونِ خداوندی سے تو اپنے معاملات اور معاشرت کو مستثنیٰ سمجھ لیا اور گورنمنٹ کے قانون سے مستثنیٰ نہ سمجھا۔ کبھی کسی نے گورنمنٹ سے نہ کہا ہوگا کہ تجارت وغیرہ میں آپ کو کیا دخل ہے آپ صرف امور انتظام سلطنت میں ہم سے باز پرس کیجئے باقی یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں ہم کو لیسنس وغیرہ کا مقید کیوں کیا ہے کیا کوئی شخص ایسا کہہ سکتا ہے اور اگر کہے تو پھر دیکھئے گردن ناپی جاتی ہے یا نہیں۔ یقیناً گردن ناپی جائیگی اور کہا جائے گا کہ جب ہم حاکم ہیں تو ہم کو ہر امر میں قانون مقرر کرنے کا حق ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ گورنمنٹ کو تو اس کہنے کا حقدار سمجھا جائے اور خدا تعالیٰ کے قانون کو صرف وضو اور نماز وغیرہ میں منحصر کر دیا جائے۔ تو خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک قانون مقرر فرمایا ہے اور ہر چیز کا ایک قاعدہ بتلایا ہے مگر چونکہ لوگ دین کو نا تمام طور پر دیکھتے ہیں اس لئے صرف نماز روزہ یا زیادہ سے زیادہ معاملات تک شریعت کے

احکام کو وسعت دیجاتی ہے اور وضع اور معاشرت واخلاق کو اس سے خارج سمجھتے ہیں نیز بعضے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور شریعتِ اسلام کو تہذیب سے معریٰ سمجھتے ہیں ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک یکچشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی گیا سیر کے لئے چاندنی چوک میں نکلا اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہ مڑسکتی تھی اس لئے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دکانیں نظر آئیں دوسری جانب کی نظر نہ آئیں جب وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دکانیں نظر آئیں ان کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دلی کے لوگ بھی کیا ستم کے لوگ ہیں ابھی یہ دکانیں دہنی جانب تھیں ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھدیا تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا سلئے وہ محتاج سمجھتے ہیں ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے چند روز آکر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خونخوار تبلایا جا رہا ہے وہ کیسی دل فریب ہے جب اس کی حقیقت سے واقف ہوگے تو اس پر عاشق ہو جاؤگے اور یہ کہوگے کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کرو دل کھنچا چلا جاتا ہے۔ تو ان ہی تہذیبوں میں سے ایک تہذیب یہ بھی ہے کہ یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ اور اس سے معلوم ہوا کہ بڑوں کے سامنے ذرا جھک کر بولنا چاہیئے الا بات جو کہو نہایت صاف کہو کہ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی اور گنجلگ نہ ہو جائے ابتک میں یہ منحوس حالت ہے کہ ہم دونوں میں فرق نہیں کرتے اب یا تو تکلف ہوتا ہے کہ اپنی حالت بھی صاف بیان نہیں کرتے جیسا کہ آج کل مدعیان محبت کی یہ حالت ہے کہ اگر ادب کریں گے تو یہ کہ چار دن تک رہیں گے لیکن یہ نہ تبلائیں گے کہ کس ضرورت کے لئے آئے تھے اور جب عین چلنے کا وقت ہوگا تو کہیں گے کہ میرے بارے میں کیا ارشاد ہے اور اگر کہو کہ بھائی تم اپنی حالت تو کہی ہوتی پھر لے لی ہوتی تو اس کا یہ جواب کہ حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو سب روشن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی تو خبر ہی نہیں ان کی حالت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر روشن ہوگئی میں کشف کا انکار نہیں کرتا لیکن کشف اختیاری نہیں ہوتا وہ بالکل خارج از اختیار ہے دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کو مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوئی اگر کشف امر اختیاری تھا تو کیوں حضرت یعقوب علیہ السلام مطلع نہیں ہوئے اور جب خبر ہوئی تو اس طرح کہ مبشر کرتہ لیکر چلا تو آپ نے فرمایا کہ انی لاجد ریح یوسف لیکن یہ کہکر ڈرے کہ لوگ کہیں گے کہ اب تک تو آپ کو پتہ چلا نہیں اب یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنے لگی اس لئے میرے کلام کو ہذیان پر محمول کرینگے اس لئے فرمایا لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (خوشبو آرہی ہے وہ دپاس والے) کہنے لگے کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں۔) وہ حالت ہے کہ ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

(کبھی تو نہایت ہی بلند مقام پر بیٹھتا ہوں اور کبھی اپنے پیچھے بھی نہیں دیکھتا)

تو یہ کیا ضرورت ہے کہ ہر وقت کشف ہوا ہی کرے اور وہ تمہارا حال خود بخود جان جایا کرے۔ اسی کی تعلیم فرماتے ہیں عارف شیرازی ؎

چندانکہ گفتنم درد از طبیباں درماں نہ کردند مسکیں غریباں

مادر دل را بایار گفتیم نتواں نہفتن درد از حبیباں

(میں نے ہر چند طبیبوں سے اپنا درد بیان کیا لیکن کسی نے مجھ مسکین غریب کا علاج نہیں کیا۔

ہم نے درد دل اپنے محبوب سے کہدیا اور محبوب سے درد کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے)

مصرع ثالث میں بتلا دیا کہ اپنا حالِ دل پوشیدہ نکرے۔ یہاں تک تعلیم ہے کہ اگر عیب بھی ہو تو مرشد سے صاف کہدے کہ میرے اندر یہ مرض ہے بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ لڑکوں کی محبت میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور اپنے اس مرض کو بلّی کے گو کی طرح چھپاتے ہیں اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور چھپانے کا حکم اس موقع پر ہے کہ جہاں اظہار میں کوئی مصلحت نہ ہو اور طبیب کو دکھلانے کی ممانعت نہیں ہے اظہار کی ممانعت ایسے

موقع پر ہے جیسے کہ ایک شخص کی نسبت سُنا ہے کہ جب حج کو گیا تو رمی جمار کے وقت ایک لمبا جوتہ لے کر ان تین پتھروں میں سے ایک پتھر کو خوب پیٹ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ کمبخت فلاں دن تو نے مجھ سے یہ گناہ کرایا تھا اور فلاں رات کو تو نے مجھے زنا میں مبتلا کیا تھا تو ایسے موقع پر بلا کسی ضرورت اور مصلحت کے اظہار کرنا یہ تو حماقت ہے مگر طبیب سے ہرگز نہ چھپاؤ اور اگر یہ خیال ہے کہ ہم ان کی نظروں میں ذلیل ہوجائینگے تو ایسے شخص کو پیر نہ بناؤ جس پر یہ احتمال ہو کہ وہ تم کو ذلیل سمجھیگا یا رسوا کرے گا اور جو سچے لوگ ہوتے ہیں وہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے کیونکہ جانتے ہیں کہ

ع تا یار کرا خواہد میلش بکہ باشد

(اس وجہ سے کہ پھر وہ دوست کس کو بنائے گا اور کس کیطرف مائل ہوگا)

وہ تو کتے کو بھی ذلیل نہیں سمجھتے وہ کسی کی نسبت یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ مقبول نہ ہوگا ان کا مذہب یہ ہے کہ ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان زہد را — در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش — ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کے مت چلا اس وجہ سے کہ اہل زہد کی سواریوں نے صحرا کی پتھریلی زمین میں ٹھوکریں کھائی اور ان کے پاؤں کٹ گئے)

تو جن کا یہ مذہب ہو تو وہ کسی کو حقیر سمجھیں گے ہرگز نہیں اور اگر کہے کہ وہ کسی سے کہدینگے اور وہ ہم کو ذلیل سمجھیگا تو یاد رکھو کہ وہ کسی سے نہ کہیں گے وہ خدا کا راز تو کہتے نہیں جس کے ظاہر کرنے سے خدا تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں۔ تمہارا راز کیا کسی سے کہیں گے جس کا اظہار تمہارے لئے مضر ہے۔ حضرت شیخ عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ خود اسرار اللہ کے باب میں فرماتے ہیں کہ منصور بچہ بود از یک قطرہ بفریاد آمد اینجا مرد آنند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند (منصور بچہ تھا کہ ایک ہی قطرے میں فریاد کرنے لگا یہاں تو مرد ہیں کہ دریا کا دریا پی جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے) غرض جب یہ بھی اندیشہ نہیں تو ویسی ہی عزت سب کی نظر میں رہے گی جیسے کہ اب ہے اور ویسی ہی ان کی نظر میں بھی رہے گی

اور اسلئے حدیث میں آیا ہے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے کچھ مانگو تو صلحاء یعنی بزرگوں سے مانگو کیونکہ بھیک بوجہ اپنی ذلت اور دوسرے کی گرانی کے حرام ہے اور بزرگوں میں یہ دونوں باتیں نہ پائی جائیں گی ذلت تو اس لئے کہ وہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے اور گرانی اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ بوجہ آزادی کے پابند نہیں کہ ضرور ہی دیں اگر نہ ہوگا تو بے تکلف عذر کر دیں گے اور اگر کبھی غفلت سے ایسا ہوا بھی کہ وہ ذلیل سمجھیں تو ان کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے اس لئے پھر آئندہ اس کا احتمال نہیں رہتا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ خوب قوی اور تندرست موٹا تازہ ہے اور بھیک مانگتا ہے انھوں نے اپنے دل میں اس پر طعن اور اعتراض کیا رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی مردے کا گوشت کھانے کو کہتا ہے اور ان کے انکار پر کہتا ہے کہ تم نے آخر اس فقیر کی غیبت کرکے مردے کا گوشت کھایا نہیں تھا انھوں نے کہا کہ میں نے تو اس کو کچھ نہیں کہا۔ جواب ملا کہ کیا غیبت دل میں نہیں ہوتی بلکہ اول تو دل ہی میں پیدا ہوتی ہے ؎

ان الکلام لفی الفواد وانما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

(کلام دل میں ہوتا ہے اور وہی زبان تو دل کی ترجمان بنائی گئی ہے)

آپ بیدار ہو کر چلے معاف کرانے کے لئے اس شخص نے آپ کو آتے دیکھ کر دور ہی سے یہ آیت پڑھی هُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں) اور پھر فرمایا کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔ تو یہ شخص بہت بڑا کامل تھا غرض بزرگوں کی اس طرح اصلاح ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ کسی کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ دنیا بھر سے اپنے ہی کو اذل و ارزل سمجھتے ہیں حتیٰ کہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ کوئی شخص مومن کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے تو چونکہ وہ لوگ اپنے کو بہت ہی حقیر سمجھتے ہیں اس لئے ان کے سامنے اپنے عیب کا ظاہر کر دینا کچھ مضائقہ نہیں اور اگر کہو کہ کسی بزرگ کا کلام ہے کہ ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن کہ حال خستہ دلاں را تو خوب میدانی

(تیرے سامنے حال دل کہنے کی کیا ضرورت ہے تو خستہ دلوں کی حالت کو خوب جانتا ہے)

تو سمجھو کہ یہ خطاب خدا تعالیٰ کو ہے نہ کہ کسی ولی یا بزرگ کو لیکن کہو خدا تعالیٰ سے بھی ضرور تاکہ تمہاری عاجزی اور احتیاج ظاہر ہو اور پیر سے اسلئے ضرور کہو کہ اس کو کشف ہونا ضروری نہیں ہے دوسرے اگر کبھی ہوا بھی ہو تو تم کو کیا خبر کیا تم کو بھی اس کے کشف کا کشف ہوا ہے تو یہ تو تکلف ہے بزرگوں کے پاس جاکر کچھ نہ کہئے اور یہ بے ادبی ہے کہ وہاں جاکر پتھر توڑنے لگے اسی کو فرماتے ہیں کہ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ عرب میں بے تکلفی بہت زیادہ تھی بڑے بڑے لوگوں کے نام لیتے تھے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بھی بعض نے لیا خدا تعالیٰ نے اس تعلیم میں اس کی ممانعت فرمائی اور یہ فرمایا کہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ تمہارے اعمال حبط نہ ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ کے معنی میں یہ سمجھا ہوں کہ حبط ہوتا ہے ایذاء سے اور ایذا ہوتی ہے ایسے شخص کی بے ادبی سے جو مودب سمجھا جاتا ہو اور یہ فطری قاعدہ ہے چنانچہ حکام کو دیکھو کہ دیہاتیوں سے بہت سی باتیں گوارا کرلیتے ہیں جو کہ شہریوں سے ہرگز گوارا نہیں ہوسکتیں۔ ایک دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس نے ایک درخواست پیش کی تو کاغذ پر ٹکٹ نہیں لگایا اور جب حاکم نے اس سے کہا کہ اس پر ٹکٹ لگاؤ تو روپیہ جیب سے نکالکر کہتا ہے لے روپیہ بس تیری صاحبی معلوم ہوگئی اس میں سے ٹکٹ لگا لیجو جو بچے رکھ لیجو حاکم ہنس کر خاموش ہوگیا اور درخواست مفت لے لی بھلا کوئی شہری تو ایسا کرکے دیکھے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے اسی کو کہتے ہیں ؎

ملت عاشق ز ملتہا جدا ست عاشقاں را مذہب و ملت جدا ست

(عاشق کا مذہب سارے مذہبوں سے جدا ہے اور اُن کا مالک سب سے الگ ہے۔)

گر خطا گوید ورا خاطی بگو ور شود پُر خوں شہیداں را مشو

(اگر وہ غلط ہے تو اُن سے غلط گومت کہو اور اگر وہ شہید ہوجائے تو اس کا خون مت دھوؤ)

موسیا آداب دانا دیگر اند سوختہ جاں و روانا دیگر اند

(کالے بال والے اور آداب سے واقف دوسرے ہیں اور سوختہ جان اور رداء ہونٹلے دوسرے ہیں)

تو دیکھئے خود فرماتے ہیں کہ موسیا آداب دانا دیگرند۔ اس لئے مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

یا ادب ترنیست زوکس درجہاں بے ادب ترنیست زوکس درجہاں

(اس سے زیادہ با ادب دنیا میں کوئی نہیں۔ اس سے زیادہ بے ادب دنیا میں کوئی نہیں)

اس کی کئی توجیہیں ہوسکتی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض عشاق بہت با ادب ہوتے ہیں اور بعض مغلوب الحال ہوتے ہیں اور پہلوں کو فوراً تنبیہ ہوتی ہے چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ بارش پر یہ فرمایا کہ آج کیسے موقع سے بارش ہوئی ہے فوراً تنبیہ کی گئی کہ او بے ادب اور بے موقع کس روز ہوئی تھی سنکر ہوش اڑ گئے اور مواخذہ بالکل سچا ہے کیونکہ بے موقع کبھی بھی نہیں ہوتی تو باادب جب بے تمیزی کرتا ہے تو بہت ناگواری ہوتی اس کی اصلاح اس آیت میں فرماتے ہیں اور اس کی متعدد جگہ اصلاح فرمائی ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ اے مومنو تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھروں میں بجز دعوت کے ویسے مت جاؤ اور اس میں بھی پہلے سے جاکر انتظار تیاری میں مت بیٹھو بلکہ جب بلایا جائے جاؤ اور کھاتے ہی منتشر ہوجاؤ اور باتوں میں مشغول ہوکر مت بیٹھ جاؤ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا ہوتی ہے اور وہ لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالے کیوں شرمانے وہ تو خدا تعالیٰ ہیں۔ دیکھئے اس انداز سے کیا صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالے کا کلام ہے کیسا بیدھڑک فرما دیا کہ واللہ لا یستحی من الحق ایک جگہ ارشاد ہے لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہونچائی تھی بس اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول سے بری کر دیا) غرض اس کا بہت اہتمام فرمایا گیا ہے کہ ایذا نہ ہو تو ایذاء رسول حرام ہے اور اس کا وہ اثر ہے جو کہ کفر کا ہے اور بعض اوقات یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایذاء ہوتی ہے یا نہیں اور اعمال حبط ہو جاتے ہیں اس لئے ارشاد ہوا کہ وہ کام بھی نہ کرو جس میں ایذاء کا احتمال بھی ہو اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذاء پہونچانے سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حبط کے کچھ اور معنی ہیں تو خیر لیکن اس وقت تک مجھے یہی معلوم ہے کہ حبط کے یہی معنی ہیں تو معاصی میں صرف یہ معصیت ایسی ہے البتہ کفر تو ایسی چیز ہے کہ طاعت کی بقاء اور صحت دونوں اس کے ترک پر موقوف ہیں۔ اور بعض معاصی ایسے ہیں کہ ان کا ترک ہی شرط بقاء عمل ہے یعنی عمل تو صحیح ہو گیا تھا لیکن وہ معلق رہا کہ اگر وہ عمل نہ ہوتا تو باقی رہتا ہے ورنہ باطل ہو جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ (اے مؤمنو اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہونچا کر باطل مت کرو) لا تبطلوا کے معنی یہ ہیں کہ قبل منّ واذی ثواب تو ہوا تھا لیکن وہ من واذی سے پھر جاتا رہا۔ غرض بعض معاصی کو یہ دخل ہوا پس ہمارے اس دعوے میں کہ معاصی سے طاعات کا ثواب زائل نہیں ہوتا۔ معاصی سے مراد ایسے معاصی مذکورہ نہیں ہیں بلکہ وہ معاصی مراد ہیں جن کے وجود کو طاعت کے وجود یا بقاء میں دخل نہ ہو ایسے گناہوں میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان سے نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں اور اس کی ایک اور بھی دلیل ہے فرماتے ہیں إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (درحقیقت نیکیاں برائیوں کو ختم کرتی ہیں) تو گناہ کرنے سے اگر نیکیوں کا ثواب نہ ملے تو نیکیوں میں یہ اثر جو مصرح ہے کہاں سے آئیگا اور اس سے ایک بڑی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ گناہوں سے تو نیکیاں نہیں مٹتیں لیکن نیکیوں سے گناہ دھل جاتے ہیں تو یہ نہایت قوی دلیل ہے البتہ اس کے متعلق یہ مستقل تحقیق ہے کہ سیئات سے مراد یہاں صغائر ہیں یعنی نیکیوں سے جو گناہ معاف ہوتے ہیں وہ صغیرہ ہیں

اور کبائر صرف توبہ سے یا فضل بلا وعدہ سے معاف ہوتے ہیں البتہ ایک روایت سے شبہ ہوتا ہے کہ صغیرہ بھی جب معاف ہوتا ہے کہ جب کبیرہ سے بچا رہے کیونکہ حدیث میں ہے مَا اجتنب الکبائر۔ نیز ایک آیت سے بھی یہ شبہ ہوتا ہے آیت یہ ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ (اگر تم کبیرہ گناہوں سے جن سے کہ تمہیں روکا جاتا ہے بچتے رہو ہم اسے تمہارے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنا دیں گے) اب ضرورت ہے اس حدیث اور آیت کے معنے سمجھنے کی تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفارات لما بینہن ما اجتنب الکبائر۔ اور ما عام ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ سارے گناہوں کا کفارہ تو جب ہی ہے کہ کبائر سے بچے ورنہ سب کا نہیں بلکہ صرف صغائر کا ہوگا۔ یہ لازم نہیں آتا کہ صغیرہ بھی معاف نہ ہو اور آیت کے معنی اس سے بھی زیادہ صاف ہیں یعنی ان تجتنبوا میں ایک شرط کی دو جزائیں ہیں نُكَفِّرْ اور نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے) پس اس مجموعہ کے لئے جزا میں بیشک یہی شرط ہے کہ کبائر سے بھی بچے اور اگر کبائر صادر ہوئے تو مجموعہ مرتب نہ ہوگا۔ یعنی مدخل کریما بمعنی دخول جنت بلا عقاب وعتاب توبہ یا فضل پر موقوف ہوگا۔ پس اب وہ شبہ نہ رہا اور یہ ثابت رہا کہ گناہ معاف ہوتے ہیں حسنات سے تو اگر نیکیاں قبول نہ ہوتیں تو اس میں یہ اثر کہاں سے ہوا پس معلوم ہوا کہ قبول تو ہوئیں لیکن ان میں برکت نہیں ہوئی اور یہ برکت نہ ہونا اس حدیث سے ثابت ہے جس کو میں نے روزے کے باب میں پڑھا ہے۔ چنانچہ اب میں اس حدیث سے اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اگر گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے سے کیا فائدہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فائدہ کی نفی فرما رہے ہیں

عہ اریدبہ الصغائر وھذا توجیہ لفظی فقط لابقاء ما علی العموم والمراد فی موضعین ھی الصغائر ھکذا اتاد فی الوعظ العلام ۱۲۔ فافہم۔

اور یہ میں پہلے بدلیل کہہ چکا ہوں کہ روزہ ہوجاتا ہے باوجود گناہوں کے بھی تو جو فائدہ منفی رہا وہ روزے کی برکت ہے اور اس سے وہ مقصود کی ثابت ہوا جس کے لئے مقصودًا اس حدیث کو پڑھا ہے یعنی گناہ کے ترک کا اہتمام بالخصوص روزے میں ضروری ہے۔ اب میں زیادہ تطویل کرنا نہیں چاہتا ہر مسلمان جانتا ہے کہ گناہ برا ہے تو کم ازکم مہینہ بھر کے لئے تو گناہ چھوڑ دو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس مہینہ کے بعد گناہ کرنے کی اجازت ہے بلکہ نفس سے وعدہ لینا چونکہ مشکل ہے اس واسطے میں نے یہ کہا کہ ایک مہینے کے لئے تو گناہ نہ کرنے کا عہد کرلو۔ اس میں آسانی ہوتی ہے اور ہمیشہ کے لئے تنبیہ ہوجاتا ہے۔ بعض نے اپنے نفس کو اسی طرح ایک ایک گھنٹے دو دو گھنٹہ کا وعدہ لے کر بہلایا اور ذکر میں مشغول کیا ہے نفس جتنا شریر ہے اتنا ہی بھولا ہے اس کو شیطان نے شریر بنا رکھا ہے گو بزرگوں کے سامنے شیطان بھی بہت عاجز و پریشان ہوتا ہے اور اس کی عقل بھی چرخ ہوجاتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے پاس ایک شخص آیا نہایت ہی پریشان اور کہا کہ میں نے اپنا خزانہ ایک جگہ دفن کردیا تھا اور اب مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے کہاں دفن کیا تھا آپ نے فرمایا کہ تو گھر جاکر نفلیں شروع کردے اور پکا ارادہ کرلے کہ جب تک یاد نہ آئے گا برابر نفلوں میں مشغول رہوں گا انشاءاللہ تعالیٰ مل جائے گا۔ امام صاحب کا ذہن اس طرف گیا کہ شیطان نے اس کو بھلایا ہے۔ اور جب یہ نفلیں شروع کرے گا تو شیطان کو اس طاعت میں مشغول ہونے سے سخت رنج ہوگا اور وہ زیادہ دیر تک اس میں مشغول نہ رہنے دیگا اس لئے وہ فورًا یاد دلادیگا چنانچہ ایسا ہی ہوا تو اہل اللہ کے سامنے اس کی عقل بالکل چرخ ہے البتہ ہم جیسوں پر اس کا بہت زور ہے اور یہ ایسا گھاگ ہے کہ جب یہ مردود ہوا ہے تو لاغوینّ کے ساتھ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ بھی کہدیا تاکہ بات ہیٹی نہ ہو۔ حاصل یہ کہ شیطان کو بھی دھوکہ ہوجاتا ہے لیکن نفس کو بہت

ہی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ نفس ہر ایک کا علیحدہ ہے اور کم عمر ہے تو گویا وہ بچہ ہے کہ شریر بھی اور بھولا بھی کیونکہ بچوں میں دو صفتیں ہوتی ہیں چنانچہ شریر بچوں کی حکایت یاد آئی ایک مرتبہ ایک میانجی کے پاس بتاشے آئے اس کو خیال ہوا کہ کھلے رکھونگا تو لڑکے کھا جائیں گے اسلئے بدھنے میں بھر کر اس کا منہ آٹے سے بند کردیا۔ ایک وقت جو میانجی کہیں گئے تو لڑکوں نے مشورہ کرکے بدھنے کی ٹونٹی میں کو پانی بھرا اور خوب شربت بنا کر پیا کسی نے خوب کہا ہے ؎

والنفس کالطفل ان تہملہ شب علی

حب الرضاع وان تفطمہ ینفطم

(نفس بچے کی طرح کہ اگر اسے چھوڑ دو تو جوان ہونے تک وہ دودھ پیتا رہتا ہے اور اگر دودھ چھڑا دو تو چھوڑ دے گا۔)

کہ نفس کی حالت بچے کی سی ہے کہ اگر دودھ نہ چھڑاؤ تو دس برس کی عمر تک بھی دودھ مانگے گا اور اگر چھڑا دو تو چھوڑ دیگا۔ اس لئے ایک بزرگ نے اس سے یہ صلح کرلی تھی کہ ایک گھنٹہ ذکر کرلو اس کے بعد پھر ایک گھنٹہ کے لئے اسی طرح مدتوں مشغول رہے ایک اور بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو حلوا بہت مرغوب تھا تو اپنے نفس سے کہتے کہ دس رکعتیں پڑھ لو تو پھر حلوا کھا لینا چنانچہ پھر حلوا کھلا دیتے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو خوب کھلاؤ پلاؤ اور اس سے خوب کام لو کہ

ع۔ مزدور خوشدل کند کار بیش

(خوش دل مزدور زیادہ کام کرتا ہے)

واللہ یہ حکمت آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور حضرت کی ان حکمتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبیب کامل تھے کیونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کچھ دیتے رہو تو کام کرتا رہیگا ورنہ نہیں ہاں اتنا بھی نہ دو کہ شریر ہوجائے۔ غرض نہ اتنا کم دو کہ ضعیف ہوکر کام کرنے کے قابل بھی نہ رہے اور نہ اس قدر زیادہ دو کہ وہ بالکل ہی شریر ہوجائے۔ ہمارے تمام حضرات کا طریقہ یہی ہے کہ سہولت سے کام

ہو جائے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ذکر میں نیند بہت آتی ہے۔ فرمایا علاج یہ ہے کہ تکیہ رکھ کر سو رہا کرو۔ جب نیند بھر جائے پھر اٹھ کر کام میں لگ جاؤ۔ اللہ اکبر کس قدر آسانی ہے اور پھر یہ کہ مقصد میں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ یہ محض اس کی بدولت ہے کہ ان حضرات کا سلسلہ بالکل سنت کے موافق اور یہ سب حضرات نہایت درجہ متبع سنت کے ہیں تو چونکہ اس سلسلے میں اتباع سنت ہے اسلئے اس میں لوگوں کو کامیابی تھوڑی سی توجہ میں ہو جاتی ہے تو یہ بزرگ جن کی حکایت بیان کی ان کی عادت سے بڑی یہی معلوم ہوتا ہے کہ توسع کرنے دیتے۔ ہاں معاصی سے سختی سے روکنا چاہیئے اب بعض تو یہاں تک وسعت کرتے ہیں کہ معاصی سے بھی نہیں روکتے اور بعض اس قدر تنگی کرتے ہیں کہ مباحات کو بھی ترک کر دیتے ہیں حالانکہ مآل دونوں کا خراب ہے تو نفس سے یہ کہو کہ رمضان تک کوئی گناہ نہ کرے اور صرف ایک مہینہ کا عہد اس سے لو پھر اس کے بعد میرا یقین ہے کہ رمضان تقوٰی کی حالت میں گذر گیا تو پھر یہ تقوٰے انشاء اللہ تعالٰے نہ ٹوٹیگا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ رمضان جس حالت پر گذرتا ہے بقیہ گیارہ مہینے بھی نہایت آسانی سے اُسی حالت پر گذر جاتے ہیں اور آسانی سے اس لئے کہا کہ تم یہ نہ کہو کہ گناہ سے گیارہ مہینہ تک بچا رہنا یہ تو ہمارا فعل اختیاری ہے اگر ہم قصد کرینگے تو بچے ہی رہیں گے اس میں رمضان کو کیا دخل ہوا۔ تو صاحبو فرق یہ ہے کہ ویسے دشواری سے بچتے اور رمضان کی برکت سے آسانی بچ سکو گے اور قصد کی ضرورت تو ہر حال میں ہے غرض اس ماہ کے لئے سب گناہ چھوڑ دو زبان کے گناہ بھی جیسے گالیاں غیبت شکایت کرنا کسی ناجائز مضمون کا پڑھنا۔ کان کے گناہ بھی جیسا گالیاں سننا گانا سننا۔ ہاتھ کے گناہ بھی جیسے کسی پر ظلم کر کے اس کو مارنا پیٹنا۔ سودی مضمون کا لکھنا وغیرہ۔ اسی طرح پیر کے گناہ بھی جیسے ناچ کی مجلس میں جانا۔ جھوٹے مقدمے کی پیروی کے لئے جانا۔ جھوٹی شہادت کے لئے جانا اور سب سے بڑھ کر ایک گناہ ہے کہ اس کو تو ضرور ہی چھوڑ دینا چاہیئے یعنی پیٹ کا

گناہ کیونکہ اگر اس کو نہ چھوڑا تو دوسرے گناہوں کا چھوڑنا نہایت دشوار ہوگا اسلئے کہ پیٹ تمام بدن کا حوض ہے یہ ایک حدیث ہے پس اگر اس میں گندا پانی ہوگا تو تمام نالیوں میں گندا ہی پہونچیگا۔ اور یہ حدیث صحت ظاہر و باطن دونوں کیلئے عام ہے یعنی ظاہری بیماریاں بھی جتنی پیدا ہوتی ہیں اکثر ان کا سبب پیٹ ہی کی خرابی ہوتی ہے اسی طرح باطن کے امراض بھی جس قدر پیدا ہوتے ہیں ان کا منبع بھی بطن ہے تو جس طرح ظاہری امراض کے واسطے طبیب کے قول پر عمل کر کے پیٹ کی اصلاح کرتے ہو اسی طرح باطنی امراض کے ازالے کے لئے اطباء باطن کے قول پر عمل کر کے حرام کھانا چھوڑ دو سے

صحت ایں حس بجوئید از طبیب　　صحت آں حس بجوئید از حبیب

تو ایک صحت روحانی ہے اور ایک صحت جسمانی۔ جسمانی تو یہ کہ جیسی غذا معدے میں ہوگی اُسی کے مناسب سب جگہ تقسیم ہوگی۔ اور روحانی یہ کہ اگر حلال غذا معدے میں پہونچی تو تمام اعضاء کو توفیق نیک اعمال کی ہوگی اور اگر حرام غذا پہونچی تو تمام اعضاء کو معاصی کی طرف میلان ہوگا۔ تو کم از کم اتنا کرو کہ رمضان بھر کے لئے تو رشوت کا سود کا غصب کا موروثی کا اناج نہ کھاؤ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ رمضان کے بعد مثلاً موروثی کا کھانا حلال ہو جائیگا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر رمضان بھر اس سے بچے رہے تو پھر امید ہے کہ ہمیشہ بچے رہوگے اور جو لوگ ایسے ہیں کہ ان کے پاس تمام آمدنی موروثی ہی کی ہے وہ کم سے کم اتنا کریں کہ کسی سے بے سودی ادھار لے لیں اگرچہ اس کو اگلے ہی دن ادا کر دیں اور جس جگہ سے بھی ادا کریں گے مگر وہ اناج حلال ہو جائے گا اگرچہ یہ مسئلہ کہنے کے قابل نہ تھا کیونکہ اس سے لوگوں کی جرات بڑھنے کا اندیشہ ہے لیکن شفقت کے غلبے نے کہلا دیا کہ ایک دس روپیہ کا اناج ادھار لے لو اور اگر روپیہ نہوں تو اناج ہی اُدھار لے لو۔ اور اس میں ایک مسئلہ بھی سمجھ لو یعنی اناج اُدھار لینے کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ ہم تم کو اس کے عوض میں فلاں اناج دیدینگے

یہ تو ناجائز ہے اور اس میں بہت تفصیل ہے۔ دوسرا طریق وہ ہے کہ جس طرح علی العموم گھروں میں اُدھار لیا جاتا ہے کہ ایک سیر بھر آٹا دیدو جب ہمارے پاس ہوگا تو تم کو دیدیں گے تو تم اسی طرح بنئے سے اناج قرض لے لو اور پھر اس کا قرض چاہے موروثی اناج میں سے ادا کر دینا اور بنیئے کے لئے موروثی اناج لینا حرام نہیں بلکہ اور بھی بہت سی باتیں اس کو حرام نہیں ہیں کیونکہ وہ خدا کا باغی ہے اس کے جرم بغاوت کے سامنے کہ وہ بہت بڑا جرم ہے ان چھوٹے چھوٹے جرموں پر مقدم نہیں ہوتا۔ غرض بنیئے سے یوں کہہ کہ ہم کو اناج ادھار دیدو پھر ہم ادا کر دیں گے اس کے بعد چاہے ایک گھنٹہ میں ہی ادا کر دینا۔ اور اگر بے سودی نہ ملے تو ہرگز نہ لو مگر انشاء اللہ تعالے مل جائیگا مگر یہ نہ سمجھنا کہ یہ تو بہت اچھی ترکیب معلوم ہوگئی اب جب کبھی حرام چیز آیا کرے گی اس کے بدلے میں حلال چیز لے لیا کریں گے۔ سو یاد رکھو کہ میں نے جو بتلایا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کچھ بھی گناہ نہ ہوگا کئی گناہ اس میں بھی جمع ہیں۔ اول حرام اناج یا مال لینا۔ دوسرے کسی کو حرام دینا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں حرام کھانے سے بچ جائیگا گو دوسرے گناہ رہیں کہ ان کا ترک بھی واجب ہے اور حرام دینا یا کھلانا کسی کو ایسا گناہ ہے کہ کتے کو بھی کھلانا درست نہیں۔ اور اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اکثر لوگ جو ناپاک چیز گائے یا بھینس کو کھلا دیتے ہیں یا بھنگن کو دیدیتے ہیں یہ جائز نہیں البتہ یہ جائز ہے کہ کسی جگہ رکھدیا جائے اور وہ حرص کے مارے بغیر تمہارے ایماء کے خود ہی اٹھا کر لیجائے یا کتا خود کھالے لیکن اگر تم سے کوئی پوچھے کہ میں اٹھالوں یا نہیں تو تم صاف کہدو کہ ہم سے کیوں پوچھتے ہو غرض رمضان میں ہر قسم کے گناہ بالکل چھوڑ دو پھر انشاء اللہ تعالے وہ روزہ مبارک روزہ ہوگا اور پھر وہ روزہ تمہاری شفاعت کرے گا اور وہ روزہ وہ ہوگا جس کی بابت فرماتے ہیں انا اجزی بہ اور اگر گناہ

نہ چھوڑے تو روزہ تو ہو گا لیکن ایسا ہو گا کہ جیسے تم کسی اپنے دوست سے کہو کہ ہم کو ایک آدمی لا دو اور وہ کسی ایسے آدمی کو لا دے کہ اس کے کان بھی نہ ہوں آنکھ بھی نہ ہو لسنگڑا بھی ہو لنجا بھی ہو بات بھی نہ کر سکتا ہو تو یہ شخص آدمی تو ضرور ہے لیکن محض بیکار صرف ایک سانس کے چلنے کی وجہ سے اس کو حیوان ناطق کہیں گے تو جیسے یہ شخص آدمی ہے بھی اور نہیں بھی ایسا ہی یہ روزہ ہے اور نہیں ہے اور یہ روزہ اس قابل ہے کہ اس کو روضہ ہی میں دفن کر دیا جائے اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں ترغیب دے رہے ہیں کہ روزہ میں گناہ کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔

اب ختم کرتا ہوں مجھے جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکا ہوں۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عطا فرمائیں آمین۔

تمت

حج کا ارادہ اور حج کو جانے والے حضرات

معلم الحجاج ضرور پڑھیں

یہ کتاب جس کے پاس ہو تو گویا اس کے ساتھ ایک چلتا پھرتا مولوی ہے جن مسلمانوں کا ارادہ حج کا ہو وہ آج ہی سے اس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیں تاکہ تمام مسائلِ حج اور دعائیں اور طریقے یاد ہو جائیں اور عین وقت پر فریضۂ حج ادا کرنے میں سہولت رہے اور کوئی غلطی نہ ہو جاوے اس کتاب میں حج کے ہزاروں مسئلے اور باتیں اور دعائیں اور طریقے سب درج ہیں اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ۸ ذی الحجہ سے لے کر ۱۲ ذی الحجہ تک پانچ دن کا پورا طریقۂ حج شائع کر دیا ہے یوں سمجھئے کہ اگر حاجی حضرات پوری کتاب کا مطالعہ نہ کر سکیں اور صرف یہی مقام اگر دیکھ لیں تو ان کے سفر حج کا مکمل طریقۂ حج اور نیت اور تمام دعائیں شروع ضمیمہ میں ہی مل جائیں گے۔ ۱۵/

ملنے کا پتہ: مکتبہ تھانوی بندر روڈ کراچی ۱